اس ناول کے تمام جملہ حقوق مصنفہ کی ویبسائٹ کے لیے محفوظ ہیں۔اسے بنااجازت چھاپنے، کسی بھی ویبسائٹ پر پبلش کرنے، کسی سوشل میڈیاپلیٹ فارم یایوٹیوب پر پبلش کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔

انتساب

میرے والدین کے لیے، جنہوں نے مجھے اس ناول

کو لکھنے کے لائق بنایا

اپنی غلطیوں سے سیکھنے والوں کے نام۔۔۔

گر کے خود کو خود ہی اٹھانے والوں کے نام۔۔۔۔

بچھڑ کے پھر سے ملنے والوں کے نام۔۔۔۔۔

تقدیر پر شاکر رہنے والوں کے نام۔۔۔۔۔۔

ایک عام سے انسان کی تحریر۔۔۔۔۔۔

بہت ہی عام سے انسانوں کے نام۔۔۔۔

پیش لفظ

"نحل" میرا پہلا سلسلہ وار طویل ناول ہے۔ یہ ناول میں نے سن ۲۰۲۰ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر چھوڑ دیا، پھر لکھا اور دوبارہ چھوڑ دیا۔ دوسری بار جو وقفہ آیا وہ کافی لمبا تھا، قریباً تین سال کے طویل وقفے کے بعد میں نے دوبارہ اسے وہیں سے لکھنا شروع کیا، جہاں پر چھوڑا تھا۔ اس وقت، جب میں اس ناول کا پیش لفظ لکھ رہی ہوں، تو الحمد اللہ اسکے گیارہ باب مکمل ہو چکے ہیں۔ جنہیں صرف ترمیم کی ضرورت ہے۔ یہ گیارہ باب فقط آدھا ناول ہے۔ علاوہ ازیں یہ میرا وہ پہلا ناول ہے، جسکا باقاعدہ پلاٹ بنایا گیا۔ اُسکی تمام اقساط کا مکمل پلاٹ لکھنے کے بعد ہی میں نے اس ناول کو تحریری شکل میں لکھنا شروع کیا۔ پلاٹ لکھنے کا یہ تجربہ میرے لیے نہ صرف بہترین بلکہ بہت پر سکون کر دینے والا ثابت ہوا ہے۔

اب بات ہو جائے اسکے نام کی تو مجھے تھوڑا نہیں بلکہ پورا پورا یقین ہے کہ اس کے نام کی بدولت، بہت سے لوگ اسے عموماً ناولز کی طرح اسلامی تفاسیر لیے کوئی کہانی سمجھیں گے۔ (معذرت لیکن ایسا ہی ہے)۔ نہ تو میں اپنے آپ کو تفسیر لکھنے کے اہل سمجھتی ہوں اور نہ ہی عام سے فرضی کرداروں کی کہانی کو اس قابل سمجھتی ہوں، کہ وہاں تفسیر جتنا بڑا کام کیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ، اسکا نام نحل کیوں رکھا گیا؟ نحل عربی میں شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ شہد کی ایک مکھی کا بظاہر کیا ہی کام ہو گا؟ دن بھر پھولوں کے رس اپنے منہ میں جمع کرنا اور اپنے مختص کیے گئے حصے میں وہ رس لا کر رکھ دینا۔ ہیں نا؟ بظاہر یہ چھوٹا سا کام ہے، لیکن اس کام کی ایک ایسی حقیقت بھی ہے، جس سے ہم ناواقف ہیں۔ وہ یہ کہ شہد کی مکھیوں کی ایک ملکہ مکھی ہوتی ہے، وہ اپنے چھتے کے مختلف سوراخوں کو مختلف مکھیوں کو مختص کر دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک بلڈنگ میں مختلف فلیٹس یا اپارٹمنٹس مختلف رہائشیوں کو مختص کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر مکھی اپنے سوراخ کو پہچانتی ہے، اور وہیں اپنا رس لا کر جمع کرتی ہے۔ اگر کوئی مکھی واپس نہ آئے، مر جائے یا راستہ بھٹک جائے، تو اُسکا کام ادھورا رہ جاتا ہے اور اُسکے حصے کا کام کوئی دوسری مکھی مکمل نہیں کرتی۔ اسی طرح پورا چھتہ ترتیب پاتا ہے۔

ذرا سوچیے، اگر ساری مکھیاں کام چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو چھتہ بن پائے گا؟ کبھی نہیں۔۔۔ نحل بھی ایک ایسی کہانی ہے۔ شہد کی مکھیوں کی طرح اس کہانی میں بھی مختلف کردار ہیں، سب کی ایک داستان ہے، سب کی اپنی اپنی تکلیفیں ہیں، اور سب کی اپنی اپنی جدوجہد ہیں۔ ان مختلف کہانیوں سے مل کر ہی نحل ناول ترتیب پاتا ہے۔ اس ناول میں آپکو ہر کردار اپنے حصے کی کہانی مکمل کرتا نظر آئے گا۔ کوئی دوسرا کردار کسی اور کردار کے حصے کی کہانی مکمل نہیں کر سکتا اور اگر اُسکی کہانی نامکمل رہ جائے تو ناول بھی نامکمل رہ جائے گا۔ اسی مماثلت کی بنا پر میں نے اس کا نام نحل رکھا ہے۔

اس کہانی کا کوئی ہیرو نہیں ہے، کوئی ہیروئن بھی نہیں ہے۔اس کہانی میں انسان بستے ہیں، بہت ہی عام سے انسان۔۔۔اس ناول کے کردار غیر ماروائی مخلوق نہیں ہیں جو ہر طرح سے پرفیکٹ ہوتے ہیں، غیر معمولی ذہین ہوتے ہیں اور ہر کام بہترین طریقے سے کرتے ہیں، ہر فیصلے صحیح لیتے ہیں، قربانی اور سمجھوتے کا پیکر ہوتے ہیں۔ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔اصل زندگی میں نہیں۔۔۔

لیکن نحل کے کردار عام سے ہیں، یہ غلطیاں کریں گے، اور بہت ہی فاش غلطیاں کریں گے۔ بعض جگہ قارئین اُنکی ان غلطیوں سے چڑ کر اُنہیں ناپسند بھی کرنے لگیں گے۔ لیکن یہی حقیقت ہے، انسان غلطیاں کرتا ہے اور انہی سے سیکھتا ہے۔ بعض جگہوں پر یہ کردار جانتے بوجھتے غلط فیصلے لیتے نظر آئیں گے۔ باوجود اسکے کہ اُنکے سامنے ہی اُنکے فیصلوں کا نتیجے واضح ہوگا مگر وہ پھر بھی یہ غلط قدم اٹھائیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ ہم سب پورے ارادے کے ساتھ اور پورے ہوش و حواس میں غلط فیصلہ لیتے ہیں، اور پھر کتنے ہی عرصے پچھتاؤں اور شرمندگی کے دلدل میں دھنس کے گزار دیتے ہیں؟ بعض جگہ قارئین کو کوئی کردار پسند آنے لگے گا، لیکن اگلے ہی لمحے وہ بہت ہی کوئی خود غرضانہ فیصلہ لے کر اپنا سارا امیج خراب کر دیگا۔ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ بھلا اتنا اچھا کردار، ایسا خود غرض کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا ایسا نہیں ہوتا؟ ہم سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں کبھی نہ کبھی خود غرض بن کر نہیں سوچتے؟ ہم ایسا کرتے ہیں۔ ہم اپنا مفاد دیکھتے ہیں، اپنا فائدہ سوچتے ہیں اور کئی مرتبہ خود غرض بن جاتے ہیں۔

یہ ناول آپکو انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں اُلجھا نظر آئے آئیگا۔ کرداروں کی شخصیت غیر متوازن اور کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہوں گی۔ لیکن اُسکا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟ معاشرہ؟۔۔۔ہر گز نہیں۔۔ ہم ہر شے معاشرے کے سر پر ڈال کر خود کو ہر الزام سے بری کر لیتے ہیں۔ جبکہ قصوروار ہم ہیں۔ معاشرہ بنتا ہے فرد سے، فرد بنتا ہے گھر سے، اور گھر بنتا ماں باپ سے۔ ماں باپ یعنی میاں بیوی۔۔۔اگر وہ آپس میں انسانوں جیسا رویّہ نہیں رکھیں گے، تو وہ اچھے ماں باپ نہیں بن سکیں گے، جب ماں باپ اچھی تربیت کرنے اور اچھا ماحول فراہم کرنے میں ناکام ہوں گے، تو گھر خراب ہوگا، گھر خراب ہوگا تو فرد خراب ہوگا اور فرد خراب ہوگا تو پورا معاشرہ بگاڑ کا سبب بنے گا۔ ہم اپنے ساتھ پیش آنے والے برے واقعات، برے رویوں اور ناانصافی کا بدلہ عموماً دوسروں اور خصوصاً کمزور لوگوں سے لیتے ہیں۔ سو میں سے دو شخص ہی ایسے ہوتے ہیں جو جل کر کندن بن جاتے ہیں اور بہترین انسان بنتے ہیں۔ جیسا سلوک اپنے اوپر سہتے ہیں، ویسا دوسروں کے ساتھ نہیں ہونے دیتے، جن ٹراما سے خود گزرے ہوتے ہیں، وہ دوسروں کو منتقل نہیں کرتے۔ باقی اٹھانوے افراد وہیں ٹراما اپنے آس پاس کے لوگوں اور اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اور یہ سائیکل صدیوں چلتا ہے۔

نحل ایسے ہی لوگوں کی کہانی ہے، میری اور آپکی کہانی ہے، عام سے لوگوں کی کہانی ہے۔ ماضی، حال، مستقبل اور پھر ماضی کے گرداب میں پھنسی کرداروں کی داستان۔۔۔آپ نے بس یہ دیکھنا ہے کہ آپ کندن بننے والوں میں ہیں یا اپنا معاشرہ بگاڑنے والوں میں شامل ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنے آس پاس والوں کو کیا دے رہے ہیں۔ اچھے اخلاق یا مینٹل ٹراما؟

ژیلہ ظفر

پہلا باب

مورخہ چھ

ہم وہ نہیں رہے جو کبھی تم کو یاد تھے

چہرے وہی رہے، دل مگر اجنبی سے ہیں

اک عمر کی تھکن ہے تعلق پہ چھائی ہوئی

باتیں وہی ہیں، لہجے مگر کچھ نم سے ہیں

جانے کہاں گئے وہ پرانے خیال سب

اب لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرے ہوئے سے ہیں

شاعر: مظفر وارثی

(ادبی حوالہ: مظفر وارثی کا شعری مجموعہ)

وقت کی گردش میں گم ہوئے لوگوں کو قسمت جب اکھٹا کرتی ہے، تو وہ اتنے بدل چکے ہوتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک، دوسرے کو اسکی ظاہری شخصیت کی وجہ سے پہچان ہی نہیں پاتا۔اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شخصیت کی اس تبدیلی سے وہ خود بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

----------+----------+-----------

''میرا خیال ہے، کہ واپس چلتے ہیں کیونکہ یہ مقدم شفیق صاحب تو اب نہیں آنے والے۔'' علی کوئی پچاسویں مرتبہ اُسے کہہ چکا تھا، اور مسلسل پچاسویں مرتبہ عمر نے اُسے نظر انداز کیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ آج وہ مقدم شفیق سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔

وہ دونوں اس وقت جدید طرز کے بنے آفس کی انتظار گاہ میں موجود تھے۔انتظار گاہ چاروں جانب سے شیشے کی دیواروں سے مزین تھی۔ شیشے کی دیوار سے باہر کام کرتے عملے کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔انتظار گاہ کی دائیں طرف بالکل اسی طرز کا شیشے کا آفس بنا تھا، جو کہ مقدم شفیق کا تھا اور وہ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ انکی آج اس سے میٹنگ طے تھی۔

''جو شخص دیئے گئے وقت سے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکا ہے، اور اب تک اسکے آنے کے کوئی آثار نہ ہوں، اس سے کسی اچھے کام کی اُمید کیسے رکھ سکتے ہیں ہم؟'' علی کو یہ انتظار بہت کھل رہا تھا۔ وہ ویسے ہی وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتا تھا۔

''دیکھو! ہم بہت جگہ سے دھوکا کھانے کے بعد اور بہت سے لوگوں سے اس فرم کی تعریف سن کر ہی یہاں آئے ہیں، اب جس شخص کا کام اچھا ہوگا، وہ تھوڑے بہت نخرے تو کریگا ہی۔'' اسکے مستقل احتجاج سے تنگ آکر عمر نے کہا تھا۔

''بہت ہی غیر منطقی بات ہے۔ اگر آپ وقت کے پابند ہی نہیں ہیں، تو آپکے کام کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' وہ سخت بیزار تھا۔

''سر مقدم ہمیشہ وقت کی پابندی کرتے ہیں اور وقت کی پابندی کرنے والے کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو اتنا انتظار نہیں کروایا ہے، صرف آج ہی ایسا ہوا ہے اور اس کی یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔ باقی آپ پریشان نہ ہوں، انہوں نے فون کر کے کہا ہے کہ وہ بس کچھ ہی دیر میں یہاں ہونگے۔ اسکے علاوہ انہوں نے آپ سے پیشگی معذرت بھی کی ہے۔'' پاس کھڑا ریسیپشنسٹ جو کافی دیر سے اُن دونوں کی گفتگو ملاحظہ کر رہا تھا، شائستگی سے بولا تو اُن دونوں نے شرمندگی سے سر ہلا دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کا عملہ نہ صرف اپنے باس کا احترام کرتا ہے بلکہ اس سے ایک دلی عقیدت بھی رکھتا ہے۔

''آہستہ بولو! ہم دونوں شاید کافی اونچی آواز میں بات کر رہے ہیں، اور کسی کے آفس میں بیٹھ کر اسی کی برائی کرنا بہت غیر اخلاقی حرکت ہے۔'' عمر نے اُسے احساس دلایا کہ وہ دونوں واقعی غیر مناسب گفتگو کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ علی کوئی جواب دیتا، دونوں کی نظریں ایک ساتھ شیشے کی دیوار کے پار بنے اسٹاف روم پر پڑی، جسکے آخر میں آفس کا داخلی دروازہ تھا اور وہاں سے اس وقت فرم کا مالک داخل ہو رہا تھا۔ نیوی بلیو رنگ کی جینز پر گرے ہائی نیک اور اس پر گرے ہی رنگ کا کیجوال کوٹ پہنے، وہ مصروف سے انداز میں باآواز بلند سلام کرتا ہوا، کسی کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ کیبن میں بیٹھے ملازمین نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اُسکے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ اسی مصروف سے انداز میں اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ چہرے سے بے نیازی چھلکتی تھی، چلنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ ابھی دنیا تسخیر کر لیگا، بلاشبہ وہ غضب کی شخصیت کا حامل تھا، وہ دونوں ساکت سے رہ گئے۔

''آپ دونوں بیٹھے، میں سر کو اطلاع دے کر آتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ دونوں کو مزید انتظار نہیں کروائیں گے۔'' ریسیپشنسٹ خوشدلی سے کہتا اسکے آفس کی جانب بڑھا تھا۔ یہ مقدم کی شخصیت کا رعب نہیں تھا، جس نے اُنہیں ساکت کیا تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ شناسائی، حیرت، بے یقینی جیسے جتنے الفاظ ہو سکتے ہیں، سب کے سب اس وقت اُن دونوں کے چہرے پر یکجا ہو چکے تھے۔

''عمر یہ تو۔۔۔'' علی نے شیشے کی دیوار کے دائیں جانب نظر آتے آفس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن وہ بات مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید حیرت کی زیادتی کی وجہ سے۔

''یہ زندہ ہے؟'' عمر ایک یہی جملہ ادا کر سکا تھا۔ اپنے آفس میں بیٹھا مقدم، ریسیپشنسٹ کو کوئی ہدایت دے رہا تھا جواب میں وہ سر ہلا رہا تھا۔ پھر ریسیپشنسٹ دروازہ کھول کر انتظار گاہ میں داخل ہوا۔

''سر، آپ دونوں میرے ساتھ آئے پلیز، اور انتظار کروانے کے لیے ایک بار پھر معذرت!'' وہ اُنہیں اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اپنے تاثرات نارمل کرنے کی کوشش کی اور اسکے پیچھے چلنے لگے، لیکن جو جھٹکا اُنہیں ابھی ابھی مل چکا تھا، اس سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

----------+---------+----------

''السلام وعلیکم! بیٹھیے۔'' انکے آفس میں داخل ہوتے ہی مقدم شفیق اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں سے ہاتھ ملانے کے بعد انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے تاثرات نارمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ناکام تھے۔ شہر کی فضا خطرناک حد تک خراب ہونے کی وجہ سے احتیاطی طور پر اُن دونوں نے چہرے پر ماسک لگایا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ مقدم اُن کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر دیکھ سکتا تو یقیناً اس وقت حالات مختلف ہوتے۔ البتہ خود اس نے ایسی کوئی احتیاطی تدبیر نہیں اختیار کی ہوئی تھی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے پہلے اسکے بولنے کا انتظار کر رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رکھی اُن کی فائل پر سرسری سی نظر ڈال رہا تھا۔

''میرا نام مقدم شفیق ہے۔ میں یہاں کا اؤنر ہوں۔'' اس نے رسمی سے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ **(میرا نام آغا مقدم ہے۔ کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟)** ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کی آواز انکے کانوں میں بھولی بھٹکی یاد بن کر گونجی تھی۔

''میں دیر سے آنے کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ دونوں سے آپکے نام نہیں پوچھوں گا۔ کیونکہ یہ ہماری فرم کی پالیسی ہے کہ ہم اپنے کلائنٹس کے نام نہیں پوچھتے، صرف انکے کاروبار کی بنیادی معلومات لیتے ہیں، اور جب کوئی ڈیل طے ہو جاتی ہے، تب ہم نام معلوم کرتے ہیں اور باقاعدہ قانونی کارروائی کے ساتھ اپنی سروسز (خدمات) دیتے ہیں۔ آپکے کام کی تفصیلات میں نے کل پڑھ لی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپکو کافی جگہوں سے دھوکہ اٹھانا پڑا ہے، میری طرح۔'' اس نے پیشہ ورانہ طریقے سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ **(معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ بھی یہاں کسی کو نہیں جانتے، میری طرح)** سولہ سال پہلے بھی تو انکے درمیان گفتگو کا آغاز ایسے ہی ہوا تھا۔

اپنے اصولوں کے مطابق اس نے اُن دونوں کا نام نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی انکی فائل میں اُنکا نام لکھوایا تھا۔ اُنہیں نہ پہچاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی شاید۔

''تو آپ دونوں پہلے اپنا مسئلہ بیان کریں۔ پھر جو بھی ہوگا، وہ میں آپ دونوں کو بتا دونگا۔'' اُس نے اُنہیں بولنے کا موقع دیا، تو سب سے پہلے علی نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''چونکہ آپ نے نام بتانے سے منع کیا ہے، تو میں سیدھا اپنے مسئلے پر آتا ہوں۔ ہم دونوں نے دو سال قبل انٹیریئر ڈیزائننگ کا کام شروع کیا تھا۔ اِس وقت ہمارے پاس کا ثیر تعداد میں انٹیریئر ڈیزائنرز موجود ہیں۔ پچھلے سال کی کلوسنگ کے دوران ہمیں اپنے کاروبار میں کافی زیادہ بے ضابطگیاں دیکھنے میں نظر آئی تھیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارا کونسا ملازم ہمارے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ ہم نے انفرادی طور پر سال کے آخر میں آڈیٹر بلوایا تھا، لیکن اُس نے کہا کہ سب ٹھیک ہے۔ ہم مطمئن ہوگئے۔ لیکن اب اِس سال کے آخر میں پھر ایسا ہی ہوا ہے۔ ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ ہمارے کاروبار میں کہیں نہ کہیں کوئی

غبن ضرور ہو رہا ہے۔اسی لیے اِس سال ہم نے دو مرتبہ آڈٹ کروایا، لیکن پھر بھی ہمیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا ہے کہ سب ٹھیک ہے، کوئی غبن نہیں ہوا۔'' اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''تو آپکو لگتا ہے کہ جن آڈیٹرز کو اب تک آپ نے بلوایا ہے، وہ آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیے جاتے ہیں؟یعنی کوئی بہت ہی قریب کا شخص اپنے غبن چھپانے کے لیے آپکو دھوکہ دے رہا ہے۔'' اُس نے پر سوچ انداز میں کہا۔

''جی ایسا ہی ہے، اب تک ہم نے جن لوگوں سے آڈٹ کروایا ہے، وہ سب فری لانسر (بنا کسی کے زیر اثر کام کرنے والے) تھے۔اب تنگ آکر ہم آپکی فرم کے پاس آئے ہیں۔'' علی نے جواب دیا۔عمر بالکل خاموش تھا۔

''ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے پاس آئے ہیں لیکن سر! میں بے حد معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپکے کسی کام نہیں آسکتے۔'' اُس نے معذرت خوانہ انداز میں کہا۔

''میری فرم میں باصلاحیت آڈیٹرز کی تقریباً بھی چار ٹیمز موجود ہیں۔جو کہ مختلف پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیز کے آڈٹ کرتی ہیں، اور الحمدللہ! ہم اِس سال سے پبلک لمیٹڈ کمپنیز کے آڈٹ بھی کرنے جا رہے ہیں۔ایسے میں ہمارے پاس چھوٹے کاروباروں کی آڈٹ کرنے کا وقت، بالکل نہیں ہے۔اس وقت تو ویسے ہی ہر طرف کلوزنگ چل رہی ہے، تو ہماری کوئی بھی ٹیم فری (فارغ) نہیں ہے۔میں بہت معذرت چاہتا ہوں، لیکن ہم چھوٹے کاروباروں کے لیے آڈٹ نہیں کرتے۔''

''ہم یہ بات جانتے ہیں، آپ ہی کی طرح دو تین اور فرمز کے پاس گئے ہیں، لیکن کوئی بھی چھوٹے کاروباروں کے لیے آڈٹ نہیں کرتا۔آپ اگر کچھ کر سکے ہمارے لیے؟'' علی نے درخواست کی، اب وہ کافی پیشہ ورانہ طریقے سے بات کر رہا تھا، البتہ عمر اب تک اس شدید شاک سے باہر نہیں آسکا تھا۔

''ہمارے کاروبار کے آڈٹ کے لیے کسی بڑی ٹیم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اگر آپ اپنا ایک بھی آڈیٹر بھیج دیں، تو ہمارے لیے آپکا نام ہی بھروسے کے قابل ہے۔''

''دیکھیں! جو کام ہم نہیں کر سکتے، اسکے لیے حامی نہیں بھرتے۔'' اس نے کہا تو علی مایوس ہوا۔

''آپ نہیں جانتے، ہمارا کافی زیادہ نقصان ہو چکا ہے۔''

''چلیں میں کوشش کرونگا، اگر کچھ ہو سکا تو ضرور کرونگا۔لیکن وعدہ نہیں کر رہا۔''

''کیا واقعی؟'' علی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مان گیا تھا۔

''اِس بات کی تو میں گارنٹی دیتا ہوں کہ ہمارے آڈیٹر بالکل ہی غیر جانب دار ہو کر رپورٹ تیار کرتے ہیں۔ اب چونکہ آپ اتنی درخواست کر رہے ہیں تو، میں وعدہ تو نہیں کر رہا، پر میں کوشش ضرور کروں گا کہ اپنا کوئی آڈیٹر آپ کے پاس بھیج دوں۔''

''بہت مہربانی آپکی!''

''آپ فکر نہ کریں، میں تین دن کے اندر ہی آپکے آفس کے نمبر پر اطلاع دے دونگا۔'' اُس نے خوشدلی سے کہا۔

''ہمیں انتظار رہے گا۔'' علی نے کہا۔ چپراسی چائے سامنے رکھ کر جا چکا تھا۔

''آپ لگتا ہے کہ زیادہ بات نہیں کرتے۔'' اُس نے براہ راست عمر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ **(بہت کم بولتے ہو تُم، کبھی کبھی تو میں بور ہو جاتا ہوں تمہارے ساتھ)۔**

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، بس آپ نے ہمارے لیے اتنا بھی کر دیا، بہت شکریہ۔ میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' صاف ظاہر تھا، وہ وہاں مزید بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُس نے دونوں سے کافی اچھے طریقے سے مصافحہ کیا اور جلد مطلع کرنے کا وعدہ کر کے اُنہیں رخصت کیا۔ اُنکے جانے کے بعد وہ کافی دیر پر سوچ انداز میں بیٹھا رہا۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اس دوسرے شخص کی آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے؟'' مقدم نے ذہن پر زور ڈالا پر اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اُس دوسرے شخص کی آنکھوں میں کچھ تھا، جیسے وہ مقدم کو جانتا ہو۔

''وہ مجھے بار بار ایسے کیوں دیکھ رہا تھا؟'' علی سے باتوں کے دوران بھی وہ خود پر اُسکی شناسا نظریں محسوس کرتا رہا تھا، بہت دیر سوچنے کے بعد بھی جب کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تو وہ کندھے اچکا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

----------+---------+----------

''سی ٹی ڈی آفیسر نوید عالم؟'' سامنے والے نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''جی! مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایئرپورٹ فورس نے چند مسافروں کے سامان میں سے بھاری مقدار میں منشیات برآمد کی ہیں۔ مجھے اسی کی تفتیش کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' اس نے ایئرپورٹ فورس کے آفیسر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں آفیسر فضل ہوں۔'' سامنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔

''تو اب تک کے کیا حالات ہے؟'' اُس نے آس پاس سے گزرتے مسافروں پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اُن میں سے کافی مسافروں کا موقف ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اُنکے سامان میں منشیات کیسے آئیں۔''

''جو سچ ہو گا وہ سامنے آجائے گا انشاءاللہ، ملزمان کہاں ہیں؟''

''اُنہیں تھوڑی دیر میں تفتیشی کمرے میں لایا جائے گا، تب تک کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔ زحمت کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لونگا۔'' وہ کہتے ہوئے وہاں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ آفیسر فضل چلا گیا تھا۔

ایئرپورٹ پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے، کچھ کے چہروں پر آنے والوں کا انتظار تھا، تو کچھ غمگیں چہرے لیے جانے والے کو رخصت کر رہے تھے۔ کچھ بیزار سے بیٹھے فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ غرض ہر قسم کے لوگ اور بھانت بھانت کے بولیاں سنائی دے رہی تھی۔ وہ عادتاً ہر شخص کا معائنہ کرنے لگا، صرف ایک نظر دیکھنے پر ہی اُسے پتہ چل جاتا تھا کہ کون مسافر ہے؟ کون اُسے رخصت کرنے کیلئے آیا ہے؟ یا اُسکا استقبال کرنے کیلئے؟ ایسے میں ایک منظر پر اُسکی نظریں ٹھہر سی گئی۔

وہ تین لوگ تھے، ایک مرد، ایک عورت اور عورت کی گود میں غالباً ڈیڑھ دو برس کی گول مول سی بچی تھی۔ اگرچہ وہ ایک مکمل فیملی تھی لیکن، اُس فریم میں کچھ نامکمل تھا۔ اگر وہ میاں بیوی تھے، تو اتنی دیر میں اُن دونوں نے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی بات کی تھی، نہ ہی نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے فاصلہ رکھے کھڑے تھے۔

''ہو سکتا ہے یہ فیملی نہ ہو۔'' (ایک تو اُسکی غور و خوص کرنے کی عادت نہیں جاتی تھی)۔ اُس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے نظروں کا رخ پھیرا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ چونکنے کے انداز میں دوبارہ اُسی جانب متوجہ ہوا۔ اور اُسی لمحے اُسکی یاداشت نے اُسے یہ باور کروایا تھا کہ وہ صحیح تھا۔۔۔

وہ اُن دونوں کو جانتا تھا۔۔۔ بہت اچھے سے۔۔

----------+---------+----------

ظلم کا اگر کوئی دوسرا نام ہوتا تو وہ فاطمہ آفندی ہوتا۔

گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا، بلکہ سنّاٹا کہنا زیادہ بہتر تھا، وحشت ناک سنّاٹا، یہ سنّاٹے کبھی کبھار اُسکی جان لینے کے درپے ہو جاتے تھے۔

اور یہی اُسکی زندگی تھی۔ روز کی طرح آج بھی اس خاموش گھر میں تین لوگ موجود تھے۔ ایک وہ اور دوسرا اُسکا باپ، لیکن وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو مخاطب تک کرنے کے روادار نہ تھے۔ تیسرا فرد اُسکا آٹھ سالہ بیٹا تھا جو فلحال دنیا اور اُسکے جھمیلوں سے انجان اپنی دنیا میں مگن رہنے والا ایک بے ضرر وجود تھا۔ روز کی طرح کچن میں کھڑے اپنے لیے چائے بناتے اور لاؤنج سے گزرتے اپنے باپ پر ایک لاتعلق سی نظر ڈال کر، اپنے بیٹے کے کمرے میں جاتے

ہوئے، اُسے آج بھی فاطمہ یاد آئی تھی۔ فاطمہ۔۔۔ جو اُسکی زندگی کا بدترین باب تھی۔ وہ جس نے اپنی موجودگی سے اُسکی زندگی کا سکون حرام کیا تھا، اور وہ جس نے اپنی غیر موجودگی سے اُسکی زندگی زہر آلود کر دی تھی۔ وہ جا کر بھی کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ بدترین یاد بن کر اُسکے لاشعور میں ہمیشہ زندہ تھی۔

وہ فاطمہ جو کبھی اُسکی بیوی تھی۔۔۔

وہ جو اپنی ہی اولاد کی قاتلہ تھی۔۔۔

----------+---------+----------

کلاس میں استاد موجود نہ ہو تو ہر طرف سماعتوں پر گراں گزرنے والا شور ہوتا ہے۔ ایسا شور جس میں کسی کو کسی کی بھی بات سمجھ نہیں آ رہی ہوتی، ایسا شور جیسے ساری باتیں بس ابھی، اسی لمحے ہونگی ورنہ پھر کبھی نہیں ہو سکیں گی۔ ویسا ہی شور اِس وقت وہاں بھی ہو رہا تھا۔ اُس نے جیسے ہی کلاس میں قدم رکھا اور روسٹرم کی طرف آیا، پوری کلاس میں خاموشی چاہ گئی۔ اُس نے ایک نظر کلاس پر ڈالی، سب نو وارد تھے۔ ہر سال کے آغاز میں اُنہیں ایسے ہی نئے چہرے دیکھنے کو ملتے تھے، کچھ پریشان سے، کچھ پریشان سے تو کچھ پُرجوش۔۔۔

''السلام وعلیکم، میرا نام رضاالٰہی ہے۔ اور میں اِس ڈیپارٹمنٹ میں مارکیٹنگ اور مینجمٹ کا لیکچرر ہوں۔ آپکی کلاس کو میں **کمیونیکیشن سکلز** کا مضمون پڑھایا کرونگا۔'' اُس نے ابتدائی تعارف کروانے کے بعد کلاس پر نظر ڈالی۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں سب ہی بہت شوق سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو ذہن میں کسی اُدھیڑ عمر ٹیچر کا خاکہ بنا کر آئے تھی۔ لیکن یہاں موجود جوان اور ہینڈسم سے ٹیچر کو دیکھ کر سب ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ ہر سال طلباء وطالبات کی ایسی ہی پرشوق نگاہوں کا مرکز بنتا تھا۔ اُسکے لیے یہ نئی بات نہیں تھی۔

''یہ مضمون بنیادی طور پر آپکو اخلاقیات، اور بات کرنے کے ادب وآداب سیکھانے کے لیے ہے۔ کسی سے بھی مخاطب کرتے ہوئے آپکی زبان، نظریں اور حرکات وسکنات کس طرح ہونی چاہیے۔ درحقیقت آپکو میں یہاں یہی سب کچھ سکھاؤنگا۔'' وہ پوری سنجیدگی سے کلاس کو اپنے مضمون کے بارے میں ابتدائی معلومات دے رہا تھا۔

اُس نے بلیو جینز پر بلیو ہی شرٹ پہنے، اس پر خاکی رنگ کا جیکٹ ڈال رکھا تھا۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی، جیسے مسکرانا تو اس نے کبھی سیکھا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ وہ بہت ہینڈسم اور بارُعب شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن، اسکی یہ ظاہری پرسنالٹی صرف دنیا دکھاوے کے لیے تھی۔ یہ سنجیدگی کا خول اُس نے خود پر بہت عرصے سے چڑھا رکھا تھا۔

وہ اپنی حقیقت سے کسی کو واقف ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ حقیقت بہت تکلیف دینے والی تھی۔

----------+---------+----------

عمر نے بنا کچھ کہے اپنے دونوں ہاتھ اسکی جانب بڑھا دیے۔ عمارہ نے ایک نظر اُسکے ہاتھوں کو دیکھا پھر گود میں تھامی اپنی پونے دو سال کی بیٹی کو اُسکے حوالے کیا۔ عمر نے اُسے گود میں لیتے ہی بے تابی سے گلے لگایا، بے تابی یا شاید بے بسی۔۔۔ وہ بچی کے دونوں گال چوم رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اُس سے آخری بار مل رہا ہو۔

''عمائمہ! بابا کو یاد کرو گی نا؟'' اس نے اپنی گود میں موجود بچی سے پوچھا، تو اُس نے بس سر ہلایا اور آنکھیں کھولے اُسے دیکھے گئی۔ اُس نے بچی کو پھر سے خود میں بھینچ لیا۔ اِس سارے منظر نامے میں بچی کی ماں عمارہ اپنا ہینڈ کیری لیے لاتعلق سی کھڑی تھی۔ ایک نگاہِ غلط بھی اُن پر ڈالنا گوارا نہ کی۔ پیچھے فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ اُنہیں بورڈنگ کے لیے جانا تھا۔ اُس نے آخری بار بچی کو پیار کیا اور اُسے اُسکی ماں کے حوالے کیا۔

عمارہ ایک ہاتھ میں بچی کو لیے دوسرے ہاتھ سے ہینڈ کیری گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وہ اُس سے دور ہو رہی تھی۔ اُسکے کندھوں سے لگی عمائمہ پیچھے کھڑے اپنے باپ کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ عمر نے اُسے ہاتھ ہلایا۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگی۔ پتہ نہیں کب وہ اُسے دوبارہ ملے گا؟ تب تک وہ کتنی بڑی ہو چکی ہو گی؟ اُسے وہ یاد بھی رہے گا یا نہیں؟ بلکہ وہ کبھی دوبارہ اُس سے مل بھی سکے گا؟

آنسو باہر آنا چاہتے تھے، لیکن وہ اُنہیں آنے روکے ہوئے تھا۔ اُسے اُنہیں روکنا تھا، اُسے ہمیشہ آنسو روکنا ہی سکھایا گیا تھا۔ وہ مرد تھا، اُسے رونا نہیں سکھایا گیا تھا، اُسے کبھی رونے کی اجازت ہی نہیں دی گئی تھی۔ اُسے روتا دیکھ، کبھی تسلی کے الفاظ نہیں کہے جاتے تھے بلکہ شرمندہ کیا جاتا تھا کہ ''مرد ہو کر روتے ہو؟'' اُسے اپنا دل ہلکا کرنے کی اجازت نہ تھی، اُسے صرف کڑھنا تھا، اپنے اندر ہی گھل گھل کر ختم ہونا تھا کہ وہ **"مرد"** تھا۔

بھلا مرد بھی روتا ہے؟

اِس سے پہلے کہ اُس کا بھرم ٹوٹ جاتا۔ وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔ اُسے جاتا دیکھ، بورڈنگ کے لیے لائن میں لگی عمارہ کی گود میں موجود بچی تقریباً چیخ پڑی۔

''مما۔۔ بابا جا رہے ہیں، مما! بابا جا رہے ہیں۔ مما۔۔۔ مما۔۔'' وہ اپنی ماں کو زور زور سے اپنے باپ کے پلٹ جانے کی کی اطلاع دے رہی تھی لیکن جواب ندارد تھا۔

''مما! بابا جا رہے ہیں۔'' پھر بھی اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے وہ اپنے باپ کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

''مما! بابا چلے گئے۔۔۔ بابا چلے گئے۔'' وہ اب مایوسی سے کہہ رہی تھی۔ بورڈنگ پاس کے لیے عملے کو اپنا شناختی کارڈ پکڑاتی اسکی ماں نے ایک نظر مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ ایک نظر دھندلا گئی تھی، آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ سرخ آنکھوں سے اُسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

وہ عورت تھی، رو سکتی تھی

اُسے رونا ہی تو سکھایا گیا تھا۔۔۔

----------+---------+----------

وہ جس راستے پر کھڑا تھا، اُسکے دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب چٹان تھی۔ وہ کوئی وادی تھی۔ آنکھوں کو خیراں کر دینے والا قدرتی حسن، شاید دنیا کو بھلا معلوم ہوتا ہو، لیکن اُسے اِس وقت خوفزدہ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ایک گاڑی اُسے اپنی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دی، گاڑی کی کھڑکی سے ایک لڑکی نے جھانک کر اُسکی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

وہ اُس لڑکی کو وہیں روکنا چاہتا تھا، اُسے کہنا چاہتا تھا کہ آگے نہ بڑھے۔ لیکن اُسکی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آواز گلے میں ہی کہیں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ہر بار اُسے روکنا چاہتا تھا پر روک نہیں پاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی اپنا توازن کھونے لگی، وہ اِس سے اگلا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اسی لیے اُس نے آنکھیں بند کرنی چاہی۔ لیکن یہاں بھی اُسکا بس نہیں چل سکا۔ آنکھیں بند ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، یا شاید وہ بند آنکھوں سے بھی یہ منظر دیکھ سکتا تھا، پوری جزئیات کے ساتھ۔۔۔۔

گاڑی اپنا توازن کھوتے ہوئے پلک جھپکتے ہی کھائی میں جا گری تھی۔ اور ٹھیک اُسی لمحے اسکی آواز واپس آئی تھی۔ وہ پوری شدت سے چیخا تھا۔

''لیلیٰ۔۔۔'' مقدّم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ رات کا شاید تیسرا پہر تھا، اُسکا تنفس تیز چل رہا تھا، جبکہ دل لگتا تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ اُس نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا۔

یہ خواب اُسے پوری طرح یاد ہو چکا تھا، حتٰی کہ وہ خواب کے اندر بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ آگے جو ہونے والا ہے، وہ اُسے پہلے سے معلوم ہے۔ کچھ دیر اپنا سانس بحال کرنے کے بعد اُس نے اپنے برابر میں سوئے مکرّم کو دیکھا تھا۔ اُسکے چیخنے پر بھی وہ نہیں اٹھا تھا۔

مکرّم اُس کا دو سال کا بیٹا تھا۔ وہ بچہ نیند کا پکا تھا جو کہ عموماً اِس عمر کے بچے نہیں ہوتے۔ اُس نے پیار سے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اپنے اِس بچے کے لیے اُس نے دنیا زمانے سے رشتے ختم کر دیئے تھے۔

کوئی اُسے گمشدہ خیال کرتا تھا، تو کچھ نے اُسے مردہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اُسکے لیے سب بے معنی ہو چکے تھے۔

----------+---------+----------

''وہ بھاگ رہی ہے۔۔۔۔ پکڑو اُسے۔۔۔۔ گاڑیاں نکالو وہ بھاگ نہ جائے۔۔۔'' اُسکے سابقہ شوہر کے آدمی چلا چلا کر سب کو مطلع کر رہے تھے۔ رات کے اِس وقت اُس ولا میں کہرام مچ گیا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگ رہی تھی۔ نہ راستے کا پتہ نہ منزل کا تعین، بس پرواہ تھی تو یہ کہ اپنی بیٹی کی جان بچانی ہے، یا جان دے دینی ہے۔

''امی پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔'' اُسکی تین سالہ بیٹی نے کراہتے ہو کہا۔

''بس تھوڑی دیر بیٹا!''

''نہیں میں اور نہیں بھاگوں گی۔'' اُسکی بیٹی نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔اُس نے رک کر اپنی بچی کو دیکھا۔وہ واقعے اتنا نہیں بھاگ سکتی تھی۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا۔اُن کے تعاقب میں آنے والوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔

اُس نے بچی کو لیکر دوڑنا شروع کر دیا، کافی دیر چھپتے چھپاتے وہ بلآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی، جہاں خانہ بدوشوں کی پوری خیمہ بستی تھی۔اُس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور اُس بستی میں جا گھسی۔ کچھ دیر وہ ایک پرانی چادروں سے بنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی رہی، اُسکے تعاقب میں آنے والے آگے چلے گئے، تو اُس نے سکھ کا سانس لیا۔

''کون ہو تم؟'' ابھی وہ سکون سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟ دیکھنے میں تو کسی اچھے خاندان کی ہو۔۔۔ کس سے بھاگ کر اِس گندی بستی میں آئی ہو؟'' بوڑھی عورت نے پے در پے سوالات کیے تھے۔

''میں مجبور ہوں، میری مدد کرو۔ وہ میری بیٹی کو مار دینگے۔'' اُس نے روتے ہوئے کہا

''کون مار دینگے؟'' بوڑھی عورت اُسکے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''وہ۔۔۔ میرا شوہر۔۔۔ اور اُسکے آدمی۔ وہ میری بیٹی کو امیر آدمی کو بیچنا چاہتے ہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ یا تو وہ اِسے بیچ دینگے یا مار دینگے۔''

''میں تو سمجھتی تھیں کہ یہ قباحتیں ہم غریبوں میں ہی ہیں، لیکن امیر بھی انہی گندگی کا حصہ ہیں؟ خیر تم فکر نہ کرو۔ یہاں چھپی رہو، جب تک تمہیں اُسکا خوف ہے، آگے میرا خیمہ ہے۔ میرے ساتھ میری پوتی ہوتی ہے۔'' وہ کھڑی ہوئی اور اُن دونوں ماں بیٹی کو پیچھے آنے کہا۔

''ہم دونوں گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ لیکن تم پریشان نہ ہو۔ آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔'' بوڑھی عورت اُسکے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مختلف خیموں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ اُسے ایک پرانے گندے سے خیمے میں لے آئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اُس نے خیمے کے آگے رک رک کر اُس عورت سے پوچھا۔

''فاطمہ۔۔۔ فاطمہ آفندی''

----------+---------+----------

''سر! آفس کے نمبر پر کال آئی تھی۔'' وہ علی کے ساتھ اپنے آفس میں بیٹھا تھا، جب اُسکے سیکریٹری نے اُسے آکر اطلاع دی۔

''کس کی کال تھی؟'' علی نے پوچھا۔

''مقدم شفیق کے منیجر کی کال تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تین بندوں پر مشتمل ٹیم بھیج رہے ہیں آڈٹ کے لیے، وہ کل آئینگے۔ اُسکے علاوہ اُنکا لیگل ایڈوائزر بھی ساتھ ہو گا، وہی تمام قانونی کارروائی کریگا۔'' اُس نے تفصیل سے بتایا تو اُن دونوں نے ہی سکھ کا سانس لیا تھا، جیسے سر سے بھاری بوجھ ہٹا ہو۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' علی نے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔

''چلو شکر! وہ مان تو گیا۔ ورنہ مجھے لگا تھا کہ اُس نے تکلفاً حامی بھری ہے۔'' علی نے کچھ کاغذات دیکھتے ہوئے، مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

''جو کام وہ نہیں کر سکتا، اُسکے لیے وہ کبھی حامی نہیں بھرتا، تکلفاً بھی نہیں۔۔۔ تم جانتے تو ہو اسے۔'' عمر کے لہجے میں کچھ تھا۔ علی نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں یہ تو ہے، وہ یقیناً اتنی گنجائش نکال سکتا ہو گا، تبھی اُس نے حامی بھری ہو گی، ورنہ اُس نے کونسا ہمیں پہچان لیا تھا۔''

''میں حیران ہوں کہ وہ بنا بتائے، بالکل اچانک سے کہاں چلا گیا تھا؟ اور پھر یوں اچانک سے ہمارے سامنے آ گیا۔'' عمر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

''ہمم۔۔ لیکن میں حیران نہیں ہوں۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے، اُس نے ایسا کیوں کیا ہو گا؟'' وہ مکمل طور پر اُسکی جانب متوجہ تھا۔

''تُم جانتے ہو کہ میں کسی کے بھی ذاتی مسئلوں میں نہیں پڑتا اور نہ ہی اِس بارے میں سوچتا ہوں۔ اور رہی بات اُسکے اچانک واپس آنے کی، تو میں بالکل حیران نہیں ہوں۔''

''کیوں؟'' عمر نے اُسکے لہجے پر غور نہیں کیا تھا۔

''کیونکہ میں نے تمہیں بھی ایسے ہی پس منظر سے غائب ہوتے دیکھا ہے۔ اور پھر چھ سال بعد اچانک واپس آتے بھی، لیکن کیا میں نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟'' علی نے سوال کافی سنجیدگی سے کیا تھا۔ عمر ساکت رہ گیا تھا۔ آج اتنے عرصے میں پہلی بار کسی نے اُسے، اُس بات کا طعنہ دیا تھا۔ جو اُسکے خیال میں سب بھول چکے تھے۔

''میں اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تم بھی ہو جاؤ۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔

گزشتہ دو سالوں میں پہلی بار اُن دونوں نے آفس کے کام کے علاوہ ذاتی نوعیت پر کوئی بات کی تھی۔ ورنہ وہ کام کے علاوہ کسی بھی موضوع پر بات کرتے لیکن کبھی بھی ذاتی قسم کے سوالات نہ کرتے تھے۔ یہ اُنکے درمیان جیسے خاموش معاہدہ تھا۔

اور اِس خاموش معاہدے کو آج ایک پرانے واقف کار نے توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

----------+---------+----------

''کیا مطلب امی! اُنکا بیٹا۔۔نہ اُسکی تعلیم ہے، نہ شخصیت اور تو اور، وہ گٹکا کھاتا ہے۔آپ کیسے ایسے لوگوں کو میرے لیے گھر بلا سکتی ہیں؟'' وہ سخت طیش کے عالم میں چلا رہی تھی، لیکن اُسکی ماں کو مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی شور شرابا کرتی لیکن اُسکی ماں کے پاس ہزاروں جواز ہوتے تھے، اُسے چپ کروانے کو۔

''مرد کی شکل اور تعلیم کون دیکھتا ہے؟ اور گٹکا ہی کھاتا ہے نا۔۔۔شراب تو نہیں پیتا۔ تم جب اُسکی بیوی بنو تو چھڑوا دینا۔'' اُسکی ماں نے اطمینان سے کہا۔

''میں اُسکی بیوی بنو ہی کیوں؟'' وہ چیخی۔

''بس بہت ہوا۔۔۔میں کونسا تمہاری شادی کروا رہی ہوں، بس ملنے کہا ہے۔اب گھر آنے والوں کو منع کر دوں؟''

''بعد میں بھی منع ہی کرنا ہے، تو ابھی کریں۔جب ہاں نہیں کرنی ہے، تو میں کیوں تیار ہو کر اُنکے سامنے بیٹھوں؟''

''خاموش رہو! وہ مجھ سے بات کر چکے تھے فون پر، اب کیسے منع کر دوں کہ نہ آئے؟''

''نہیں! اصل بات یہ ہے کہ آپکے ذہن میں کہیں نہ کہیں اقرار ہے، جب ہی آپ منع نہیں کر رہی۔۔۔آپ کیسے اپنی بیٹی کے لیے ایسی شخصیت کے حامل انسان کو سوچ سکتی ہیں؟'' وہ رو دینے کو تھی۔آگے سے اُسکی ماں کچھ کہہ رہی تھیں، لیکن وہ آنکھوں میں آنسو لیے چپ بیٹھی رہی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔

اور کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ تیار ہوئی کچھ آنٹی نما عورتوں کے سامنے بیٹھی تھی، جو سر سے پاؤں تک اُسکا ایکس سرے کر رہی تھیں۔ بات بات پر اپنے مہنگے گھر اور پیسوں کی زبانی نمائش جاری تھی۔

''میری بیٹی الحمدللہ بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے۔'' اُسکی ماں نے بات شروع کی۔

''بہن پڑھائی لکھائی کا کیا کرنا۔۔۔آپ نے فضول میں اتنا پڑھایا لڑکی کو۔ ہم تو کبھی نہ آتے کسی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ لیکر، ویسے ہی اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔'' لڑکے کی ماں نے کہا۔

''تو پھر کیوں آئیں آپ؟'' اب کہ اُسکی ماں کو بھی برا لگا۔

''بھئی سمجھا کریں! ہمیں بھی ایسی چاہیے، جو زبان دراز نہ ہو۔ سر جھکا کے ہماری ہر بات سنے۔'' اُنہوں نے بات گھمائی۔

''ابھی آپ نے کہا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں چاہیے، کیونکہ اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔اب آپ کہہ رہی ہیں کہ سر جھکا کر ہر بات مانے گی۔آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟میں سمجھ نہیں پائی۔'' اُسکی ماں نے کہا۔

''ارے بیشک پڑھی لکھی ہے لیکن ہے تو کالی نا۔۔۔رنگ گورا ہوتا تو پھر تو میرے بیٹے کو غلام ہی بنا لیتی، بس اِسی وجہ سے آئے ہیں۔ہمیں بھابھی ایسی چاہیے جو بھائی کو ہم سے جدا نہ کرے۔'' لڑکے کی بہن ظالمانہ حد تک صاف گو تھی۔اُس نے شاک کی کیفیت میں اپنی ماں کو دیکھا جو اب بغلے جھانک رہی تھیں۔

''رشتے والی بتا رہی تھی کہ رنگ کالا ہونے کی وجہ سے آپکی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوا اب تک، عمر بھی پچیس چھبیس سال ہے۔اب ہم تو اللہ کی خاطر آئے ہیں کہ کسی کا بھلا ہو جائے، ورنہ ہمارے بیٹے کو کونسی کمی ہے؟اب آپکی بیٹی کا رنگ کم ہے تو آپکو اُسکی شادی کروانے کے لئے کچھ دینا دلانا۔۔۔'' لڑکے کی ماں ہمدردی کے لبادے میں چھپا کر وہی باتیں کر رہی تھی، جو باقی لوگ بھی یہاں سے کر کے جاتے ہیں۔

وہ اٹھی اور اپنی ماں اور مہمانوں کی سامنے سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔روتے ہوئے۔۔۔ سسکتے ہوئے۔۔۔ پیچھے اُسکی ماں اب کیا کہہ رہی تھی، اُسے پرواہ نہ تھی۔دماغ میں بس ایک ہی لفظ تھا۔

''کالی''

----------+----------+----------

''اف۔۔۔''اُس نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تھا۔آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔پچھلے ماہ ایئرپورٹ پر کچھ مسافروں کے سامان سے نکلنے والی منشیات کی وجہ سے اُسے مسافروں سے تفتیش کے لیے بھیجا گیا تھا۔تفتیش کے ذریعے کچھ اسمگلرز کی نشان دہی ہوئی تھی۔کافی محنت کے بعد جب وہ اُن اسمگلرز کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے، تو ایک نیا کیس اُنکے سامنے آیا۔جن لوگوں کو وہ چھوٹا موٹا اسمگلر سمجھ رہے تھے، وہ پورا ایک گروہ تھا۔ایک ایسی گینگ جو منشیات کے ساتھ ساتھ انسانی اسمگلنگ بھی بڑے پیمانے پر کرتی تھی، زندہ انسانوں سے لے کر مردہ انسان اور اُنکے عضو تک بیچے اور خریدے جاتے تھے۔اُسکے علاوہ ذاتی دشمنی کے لیے آپ اُن سے کرائے کے قاتل بھی لے سکتے تھے۔وہ پورا کاروبار تھا۔

یہ کاروبار کون چلا رہا تھا؟اِسکے کتنے مالک تھے؟اور وہ کس ملک میں تھے؟یہ سب اُنکی پہنچ سے باہر تھا۔حتٰی کہ اُن گرفتار کیے گئے اسمگلرز کو بھی نہیں معلوم تھا، کہ وہ کسی گینگ کے لیے کام کر رہے ہیں۔اُن میں سے ہر ایک نے یہی بتایا کہ اُنہیں ایک ''فرمان'' نامی شخص نے یہ کام سونپا تھا۔اُسکا نمبر، نام، پتہ کچھ نہیں معلوم تھا۔وہ شخص اُن سے مختلف جگہوں پر ملا تھا۔

اُن جگہوں سے اُسکا ڈیٹا اور سی سی ٹی وی فوٹیج نکلوانا بہت صبر آزما کام تھا۔

پورے ماہ کی محنت اور شدید بھاگ دوڑ کے بعد وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو سکے تھے، کہ وہ شخص جس کا نام فرمان تھا، وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اور در حقیقت اُسکا نام فرمان بھی نہ تھا بلکہ ''مائیکل'' تھا۔ وہ اپنی جھوٹی شناخت کے ساتھ اُن سے ملا تھا، وہ اِسکے بے حد نزدیک پہنچ چکے تھے۔ آج اُنہیں اُسے گرفتار کرنے جانا تھا لیکن۔۔۔

بد قسمتی سے وہ فرار ہو گیا۔ البتہ انہوں نے ہوٹل میں موجود اُسکا سامان اور دیگر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سارے دِن کی مشقت میں اُسے ایک پل بھی بیٹھنے کا وقت میسر نہ ہوا تھا۔

"تو اتنے ماہ کی محنت بیکار چلی گی؟" اس نے دل میں سوچا۔

''اس مائیکل عرف فرمان کے سامان سے بھی کوئی قابل ذکر چیز نہیں مل سکی ہے۔ ہم کہاں سے پکڑیں گے اُس گینگ کو؟'' اس نے پریشانی سے ماتھا مسلا تھا۔ تب ہی اسکے کمرے کا دروازہ کھلا اور اُسکا جونئیر اندر داخل ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا

''سر! میں ایک بار پھر مائیکل کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا، تو جس بیگ کو ہم نے خالی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، مجھے اس بیگ سے کچھ ملا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ہاں! مجھے یاد ہے کہ میں نے مائیکل کا بیگ خود چیک کیا تھا، اس میں ایسی کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔''

''سر! مجھے اُسی بیگ سے یہ فائل ملی ہے۔'' اس نے ایک لال رنگ کی پتلی سی ڈائری اُسکی جانب بڑھائی، جسے اس نے شدید حیرت کے عالم میں تھاما تھا۔

''پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تلاشی لینے کے بعد خود خالی بیگ وہاں رکھا تھا۔''

''سر! بیگ بظاہر خالی لگتا تھا لیکن میں نے جب اُسے ہاتھ لگایا، تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھاری ہے۔ میں نے بیگ کے اندر موجود کپڑا کاٹا تو مجھے اس کپڑے کے نیچے سے یہ ڈائری ملی ہے۔''

''ویلڈن شیراز! بہت اچھا کام کیا ہے تُم نے، اگر مائیکل نے یہ ڈائری چھپا کر رکھی تھی تو یقیناً یہ اہم ہو گئی۔'' اس نے اندازہ لگاتے ہوئے ڈائری کھولی اور اگلے ہی لمحے وہ اور شیراز سن رہ گئے تھے۔

وہاں ہر پیج پر قریباً بھی بارہ مختلف لوگوں کی تصاویر تھیں۔ کچھ تصویریں مردہ اشخاص کی تھیں تو کچھ زندہ اور مسکراتے چہرے بھی تھے۔ لیکن جس بات نے اُنہیں سن کیا تھا وہ اُن تصویروں پر لال رنگ سے لگایا گیا کراس کا نشان تھا۔ ہر تصویر کے نیچے الگ الگ ماہ کی کوئی ایک تاریخ واضح کی گئی تھی۔

''یہ کیا ہے سر؟''

''دیکھنے میں تو یہ سیریل کلر لگتا ہے، تصویروں اور اُن پر واضع کی گئی تاریخوں، سے لگتا ہے کہ ان سب کو انہی تاریخوں میں مارا گیا ہے۔''اس کا تجربہ تو یہی کہتا تھا۔ وہ مختلف صفحات آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔ ہر تصویر کے ساتھ ایک مہینہ اور ہر صفحے کے ساتھ ساتھ ایک ایک سال بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے پہلے صفحے پر دس سال پہلے کی تاریخیں تھیں۔ اگلے پر نو سال پہلے کی اور اس سے آگے آٹھ سال اور اسی طرح ہر صفحے پر نیا سال ہوتا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے یہ مہینے میں ایک یعنی ہر سال بارہ بندوں کا قتل کرتا ہے۔ اور انکی تصویریں یہاں جمع کرتا ہے۔''

''پر مارنے والا انکی تصویریں اپنے پاس کیوں رکھتا ہے؟''

''سائیکو پیتھ ۔۔۔ یہ جو لوگ ماس کلر یا سیریل کلر ہوتے ہیں۔ انکے پاس عموماً اسی طرح کی تصاویر پائی جاتی ہیں۔ خیر تُم یہ ڈائری لے کر جاؤ اور اس میں موجود تمام لوگوں کی معلومات لے کر آؤ۔ وہ کیسے مرے، کب مرے؟ عدالت میں انکی موت پر کوئی کیس کیا گیا یا نہیں، ساری معلومات لا کر دو مجھے۔''

''اوکے سر!'' وہ ڈائری لے کر باہر چلا گیا۔ اسکے جانے کے بعد وہ پھر سے پریشان سا بیٹھ گیا تھا۔ یہ کیس جتنا آگے بڑھ رہا تھا، اتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ تلاش وہ اسمگلر کو کر رہے تھے اور پتہ نہیں کیا کیا انکے سامنے آتا جا رہا تھا۔

شیراز کو گئے آدھے گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے تھے، کہ وہ دوبارہ واپس آیا۔

''دونٹ ٹیل می کہ تُم نے آدھے گھنٹے میں ہی معلومات اکھٹی کر لی ہیں۔''شیراز کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ اُس سے پہلے ہی بول پڑا۔

''نہیں سر! معلومات ابھی مکمل نہیں ہوئی، مگر اس ڈائری میں کچھ ایسا ہے جو آپکو ضرور دیکھنا چاہیے۔''

''دکھاؤ!''اس نے ڈائری اُسکے ہاتھ سے لی اور دوبارہ کھولی۔

''آخری صفحہ سر۔۔۔''شیراز کی نشان دہی پر اس نے آخری صفحہ کھولا۔ اور اگلے ہی لمحے ڈائری اسکے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی، وہ بے یقینی سے کبھی ڈائری کو، تو کبھی اپنے سامنے پریشان سے کھڑے شیراز کو دیکھتا تھا۔ اس وقت اُسکا چہرہ کوئی دیکھ لیتا تو شاید مردہ خیال کر بیٹھتا۔ لگتا تھا جیسے سارا خون خشک ہو گیا ہو۔

آخری صفحے پر کل چھ تصاویر تھیں۔

سب کی سب قریباً بھی دس سال پہلے کی تھیں۔ اُن چھّ تصویروں پر کسی قسم کا کوئی مارک نہیں تھا۔ کسی قسم کے کوئی کراس کا نشان بھی نہیں لگایا گیا تھا۔

وہ اُن تصویروں میں موجود پانچوں لوگوں کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ بلاشبہ پچھلے دس سالوں سے وہ اُن میں سے کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا۔ لیکن وہ اُن پانچوں کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔

اور رہی بات چھٹی تصویر کی۔۔۔تو چھٹی تصویر اسکی خود کی تھی۔۔وہ یعنی **"سی ٹی ڈی آفیسر ایس ایس پی نوید عالم"**

اس ڈائری کے آخری صفحے نے اُسے بتایا تھا کہ وہ چھ لوگ موت کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

----------+---------+----------

''چھ لوگ، سال کا چھٹا مہینہ اور مورخہ چھ!''

ڈی آئی جی فرّخ کے سامنے وہی ڈائری اور وہی صفحہ کھلا رکھا تھا, جس نے ایک ہی رات میں انکی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

''سر! یہ تاریخ جولائی کی ہے، اور آج نئے سال کی پہلی رات شروع ہو چکی ہے۔یعنی ہمارے پاس چھ ماہ ہے۔''نوید نے چھ تصاویر کے نیچے واضح کی گئی تاریخ کے متعلق کہا۔

''پھر سے چھ ؟''ڈی آئی جی صاحب نے پُر سوچ انداز میں کہا.

''جی سر، دیکھنے میں یہ کسی گیم جیسا لگتا ہے۔جہاں ہر چیز کی تعداد چھ رکھی گئی ہے۔''

''لیکن میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا سر؟''

''فائل میں لکھی گئی سابقہ تاریخوں کے حساب سے، اس مائیکل عرف فرمان نامی شخص نے اب تک ایک تاریخ میں ایک ہی شخص کا قتل کیا ہے۔جو کہ پورے سال میں بارہ قتل بنتے ہیں، لیکن اس آخری صفحے پر موجود چھ افراد کی تصاویر کے نیچے ایک ہی دن کی تاریخ ہے۔اسکا مطلب کہ وہ ان چھ بندوں کو ایک ہی وقت یا ایک ہی دن میں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

''یعنی؟''

''یعنی وہ اپنا پہلا **ماس مرڈر** پلین کر رہا ہے۔''انہوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔نوید کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

''لیکن سر! کسی کو قتل کرنے کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے؟ پہلے ہم اسے اسمگلر سمجھ رہے تھے، پھر وہ سیریل کلر نکلا اب وہ اپنا پہلا **ماس مرڈر** پلین کر رہا ہے۔آخر یہ کس قسم کا کھیل ہے۔یہ ہے کون؟ اور اسکی شاخیں کہاں تک ہیں؟''وہ شدید اضطراب کے عالم میں بولا تھا۔

''وجہ نوید۔۔۔وجہ۔۔۔یہی وجہ تو تلاش کرنی ہے ہمیں، اور مورخہ چھ سے پہلے۔''ڈی جی صاحب نے کہا تو اس نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''اس تصویر میں موجود بقیہ پانچ لوگوں کو تُم جانتے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تواُن سے رابطہ کرو،سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ انکی کسی سے کوئی دشمنی ہے؟''

''سر! میں ان پانچ لوگوں کو جانتا ضرور ہوں، لیکن میں کئی سالوں سے ان سے رابطے میں نہیں ہوں۔ حتٰی کہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ملک میں یاملک سے باہر؟''

''کوئی بات نہیں! اُن سے رابطہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ڈیپارٹمنٹ سے اُنکا موجودہ پتہ اور نمبر فوراً معلوم ہو جائے گا۔بس خدا کرے کہ وہ سب ملک میں موجود ہوں۔''

''باقی سب کا تو نہیں پتہ لیکن ان میں سے ایک کو میں نے پچھلے ماہ دیکھا تھا۔''نوید نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کس کو؟اور کہاں دیکھا؟''

''عمر۔۔۔عمر حفیظ نام ہے اُسکا، پچھلے ماہ جب میں اسی کیس کے سلسلے میں ایئرپورٹ گیا تھا،تب وہاں دیکھا تھااُسے، شاید اپنی بیوی اور بیٹی کو رخصت کرنے آیا تھا۔''

''ہمم۔۔۔چلو کل تک ہم اُن سب کی معلومات اکھٹی کر کے اُنہیں یہاں بلاتے ہیں تاکہ اس کیس کو آگے بڑھایا جاسکے۔''

''انشاءاللہ۔۔۔ٹھیک ہے سر! پھر میں جارہا ہوں۔''نوید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نوید! تُم بھی تو وکٹیم میں شامل ہو۔تم بتاؤ، تمہیں کسی پر شک ہے؟''انکے سوال پر وہ دوبارہ بیٹھا۔

''میں ایف آئی اے کا سی ٹی ڈی(COUNTER TERRORISM DEPARTMENT)آفیسر ہوں، میرے ہزاروں دشمن ہیں۔لیکن اسکو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ہم چھ لوگوں کا مشترکہ دشمن ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے؟''ڈی جی نے پر سوچ انداز میں کہا۔بس یہیں آکر وہ اُلجھ جاتے تھے۔آخر ان سب کے پیچھے تھا کون؟

----------+---------+----------

علی سفیر

عمر حفیظ

مقدم شفیق

رضاالٰہی

حسین مرتضیٰ

نوید عالم

وائٹ بورڈ پر چھ بندوں کے نام لکھے تھے۔ ناموں کے نیچے سب کے پرسنل نمبر اور رہائشی پتہ بھی موجود تھا۔ فرّخ صاحب نے اُن ناموں کو تین سے چار مرتبہ دہرایا۔ پھر شیراز کی جانب متوجہ ہوئے۔

''ان سب سے رابطہ کرو سوائے نوید کے، اور کوشش کرو کہ اصل وجہ بتائے بنا ہی اُنہیں یہاں بلاؤ، ورنہ وہ خوفزدہ ہونگے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں رابطہ کر کے آپکو بتاتا ہوں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ جلد از جلد اُن سب کو یہاں جمع کر کے معاملے کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ دیر کرنا نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ میکائیل عرف فرمان کی تلاش میں بھی سر گرم تھے، لیکن اُسکا کچّھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

----------+---------+----------

پیر صبح آٹھ بجے، مورخہ پہلی جنوری:

ایک خوش شکل مرد، اُسکے برابر میں کھڑی خوبصورت عورت اور مرد کی گود میں موجود تین سالہ بچہ، وہ ایک مکمل فیملی فریم تھا۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے دوبارہ وہ فریم نکالا تھا، دوبارہ خود کو اذیت دی تھی۔ ٹوٹا فریم اب اُسکے ہاتھوں میں تھا۔

اس مکمل تصویر کو توڑنے والی وہی خوبصورت عورت تھی، وہی ظالم عورت جس نے اسکی بیٹی اس سے چھینی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اسکی زندگی سے جا کر بھی کہیں نہیں گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اُسے یاد آتی تھی۔ اور اُسکا اچھا بھلا دن خراب کر دیتی تھی۔

عموماً اس وقت وہ آفس میں ہوتا تھا لیکن گزشتہ رات طبیعت کی ناسازی کے باعث اس نے آج چھٹی کی تھی۔ لیکن کیا فائدہ ہوا؟ آرام کرنے کے بجائے وہ اُسی کو یاد کرنے بیٹھ گیا تھا۔

''اس تو اچھا میں آفس ہی چلا جاتا۔'' اس نے بیزاری سے سوچا تھا اور اٹھ بیٹھا لیکن وہی فریم پھر نظروں کے سامنے آیا تھا۔

''آہ فاطمہ! کاش کہ میں تمہاری جان ہی لے سکتا میں؟'' اس نے کرب سے آنکھیں موندی تھیں۔

''کتنی ظالم ہو تم؟ کتنی؟ اور کچھ باقی رہ گیا تھا جو میری اولاد بھی چھین لی مجھ سے؟'' دل چاہا کہ وہ کہیں سے سامنے آجائے اور وہ اُسے جہنّم کے کسی بدترین کونے میں پھینک آئے۔ کتنی دیر وہ سر تھامے بیٹھا رہا تھا۔ اُسکا موبائل چیخ چیخ کر اُسے اطلاع دے رہا تھا کہ کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے دیکھا تو وہ وہاں **پرائیویٹ نمبر** لکھا تھا۔

''پرائیویٹ؟'' وہ حیران ہوا۔ ''یہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟''

''ہیلو؟'' اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''علی سفیر بات کر رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''جی میں علی سفیر ہی بات کر رہا ہوں۔'' اُسکے بعد دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا تھا، اس نے علی کو حیران کم پریشان زیادہ کیا تھا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا؟'' اس نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔ اُسے اس ہفتے کے آخر تک ایف آئی اے آفس آنے کو کہا جا رہا تھا اور وجہ بھی نہیں بتائی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن ایسا ہے کہ میں اتوار کو فارغ ہوں اگر آپکو اعتراض نہ ہو تو اسی دن آجاؤں؟'' دوسری طرف سے شاید اجازت دے دی گئی تھی، اس نے شکریہ کہہ کر فون کاٹ دیا تھا۔ انہوں نے اُسے کہا تھا کہ کسی بہت ہی حساس کیس میں اُسے نامزد کیا گیا اور بقیہ باتیں ایف آئی اے آفس آنے پر چھوڑ دی تھیں۔ وہ اُن سے زیادہ بحث بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب شدید پریشان تھا۔ آخر اُسے کیوں بلایا جا رہا تھا؟

----------+---------+----------

پیر صبح ساڑھے نو بجے، مورخہ پہلی جنوری:

''اس دنیا میں ہر شخص آواز کے خوف کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ آپ کسی بھی شخص کے پیچھے جا کر بالکل اچانک سے چیخ پڑے یا اچانک اُسکے کانوں کے پاس جا کر کوئی باجا ہی بجا دیں تو وہ بندہ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اچھل پڑتا ہے۔ یہ اونچی آواز کا خوف ہمارے اندر موجود ہوتا ہے۔ ہم اسے ختم تو نہیں کر سکتے البتہ اس پر قابو ضرور پایا جا سکتا ہے۔'' وہ **وائس فیئر** پر کلاس کو لیکچر دے رہا تھا۔ تب ہی اُسکے موبائل نے بہت زور سے بجنا کرنا شروع کیا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ **آواز کا خوف** ضروری نہیں کہ آپکو چیخنے یا اچھلنے پر مجبور کرے۔ وہ آپکو چونکا بھی دیتا ہے۔ اس نے روسٹرم پر رکھے اپنے موبائل پر نظر ڈالی

''پرائیویٹ نمبر؟'' وہ شدید حیران ہوا تھا۔ کال اٹھانے سے پہلے ہی کٹ گئی تھی۔

''آپ سب لوگ لیکچر نوٹ کریں میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ کلاس سے معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

بلیک جینز پر، بلیک شرٹ پہنے اور اس پر نیوی بلیو کلر کا کیجوال کوٹ ڈالے وہ تیز تیز قدموں سے ٹیچر زروم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ''مجھے کسی حساس ادارے کے نمبر سے فون کیوں آیا ہے؟'' وہ پرائیویٹ نمبر کے مفہوم سے بخوبی واقف تھا اسی لیے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ٹیچر زروم خالی تھا، یقیناً سب اپنی اپنی کلاسز لینے گئے ہوئے تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا، کال دوبارہ آ رہی تھی۔ اس بار اس نے اٹھالی۔

"ہیلو! پروفیسر رضاالٰہی بات کر رہے ہیں؟"

''جی میں بات کر رہا ہوں، کہیئے؟''

''سر! میں اے ایس پی شیراز ہوں ایف آئی اے سے، آپکو ایک کیس کے سلسلے میں آفس آنا ہوگا۔ آپ کب تک آ سکتے ہیں؟''

''کس قسم کا کیس اور مجھے کیوں آنا ہوگا؟'' اس نے اپنے لہجے پر کافی حد تک کنٹرول کر لیا تھا۔

''سر! پریشانی کی بات نہیں ہے، بس آپ سے کچھ تفتیش کرنی ہے۔ البتہ کیس کے بارے میں ہم آپکو فون پر نہیں بتا سکتے، آپکو یہاں آنا ہوگا۔ جگہ آپکو جلد بتادی جائیگی۔''

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔''

''تو پھر آپ کب تک آ سکتے ہیں؟''

''ایسا ہے کہ میں اتوار تک آ سکتا ہوں۔ باقی کے دنوں میں مجھے جامعہ میں کلاسز لینی ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے سر! ہم آپکا انتظار کرینگے۔ اتوار کی صبح ۱۰ بجے۔''

''میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے کال کاٹی، لیکن وہ اُلجھ چکا تھا۔ آخر کس قسم کی پوچھ گچھ کے لیے اُسے بلایا جا رہا تھا۔ اور کس کیس میں وہ نامزد تھا اور کیوں؟

----------+---------+----------

پیر صبح گیارہ بجے، مورخہ پہلی جنوری:

آج سال کا پہلا اور ہفتے کا بھی پہلا ہی دن تھا لیکن آج وہ فرم نہیں گیا تھا، چھٹی لینے کے باوجود بھی وہ صبح ہی اٹھ گیا تھا۔ ناشتا کر کے وہ کوئی مارننگ نیوز شو دیکھ رہا تھا کہ مکرّم کے رونے کی آواز نے اُسے متوجہ کیا، وہ یقیناً جاگ گیا تھا اور اپنے جاگنے کی اطلاع رو رو کر دے رہا تھا۔ وہ ریموٹ صوفے پر پھینکتا ہوا کمرے کی

جانب بڑھا۔ دو سالہ مکرّم جس نے حالیہ ہی بولنا سیکھا تھا، اُسے دیکھ کر روتے ہوئے ہی ہنس پڑا۔ اُسے اپنے بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اس نے اسے گود لیا اور اُسکے گال چومے۔

''اٹھ گیا میرا بچہ۔۔۔ چلو آپکو ناشتہ کرواتے ہیں۔'' وہ اُسے گود میں لیے باہر آیا۔ کچن میں آکر اُسکا دودھ بنایا اور فیڈر میں منتقل کر کے اسے مکرّم کے منہ سے لگایا۔ یہ سارے کام اس نے اُسے گود میں لیے ہوئے ہی کیے تھے۔ پھر اُسے لیکر وہ صوفے پر بیٹھا۔ مکرّم اپنی گول گول آنکھیں کھولے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اسکی گود میں ہی فیڈر پیا کرتا تھا اگر وہ اسے اپنی گود سے تھوڑی دیر کے لیے بھی اتارتا تو وہ اتنا روتا کہ الامان۔۔

وہ پیار سے اُسکے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے کی بیل بجی، وہ تھوڑا حیران ہوتا ہوا اٹھا۔ مکرّم اسکی گود میں ہی تھا۔ دروازہ کھولا تو باہر بلیک جینز پر بلیک ہی شرٹ پہنے آنکھوں پر گوگلز لگائے کوئی سمارٹ سا لڑکا کھڑا تھا۔

''جی فرمایئے؟''

''میں اے ایس پی شیراز ہوں، ایف آئی اے سے۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے ہتھیلی پے دھرا اپنا کارڈ اُسکے سامنے کیا۔ وہ سمجھ گیا۔

''جی اندر آیئے!'' اس نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اُسے رستہ دیا، تو وہ دروازے سے اندر آیا۔

''آپکا زیادہ وقت نہیں لونگا، اس اتوار کو آپ نے ایف آئی اے آفس آنا ہے۔ ہمارے ڈی آئی جی کو آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں ایک کیس کے سلسلے میں۔''

''کس قسم کا کیس؟ اور میرا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''آپ کا بہت بڑا تعلق ہے، لیکن فلحال میں آپکو کچھ نہیں بتا سکتا مجھے اجازت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے اتوار کو کتنے بجے؟''

''صبح دس بجے، جگہ کے بارے آپکو جلد اطلاع دے دی جائیگی۔'' وہ اُسے ضروری معلومات دے کر چلا گیا۔ مقدم کافی دیر شش و پنج میں کھڑا رہا۔ اس نے اس لڑکے کا ڈیپارٹمنٹ کارڈ دیکھا تھا، وہ واقعی ایف آئی اے میں تھا۔ مقدم کے گھر بھی ایسے وقت آیا تھا، جب محلے میں سب کام پر جا چکے ہوتے ہیں۔ اُسکی کالے شیشے والی گاڑی دیکھ کر محلے کے لوگ بھی مشکوک ہو سکتے تھے، اور وہ یقیناً محلے والوں کو اسکی خبر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، اسی لیے یہ احتیاطی تدابیر استعمال کی تھیں۔

''یعنی معاملہ کافی گھمبیر ہے؟'' اس نے سوچا۔ اب جو بھی بات تھی وہ اتوار کو ہی سامنے آنی تھی۔

----------+---------+----------

پیر دوپہر دو بجے، مورخہ پہلی جنوری

''میں اندر آسکتا ہوں؟''

''تُم اندر آچکے ہو۔''

''سوری سر!'' وہ شرمندہ ہوا۔

''بولو کیا بات ہے؟''

''سر! آفس کے نمبر پر آپ کے لیے کال آئی ہے۔ جو بھی ہے اسی وقت آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بات کراؤ میری!'' اس نے مصروف سے انداز میں کہا تو وہ وائرلیس اُسکے پاس ہی لے آیا اور خود باہر چلا گیا۔ علی آج آفس نہیں آیا تھا وہ اکیلا ہی تھا۔

''ہیلو! عمر حفیظ اسپیکنگ!'' اس نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا اور اگلے ہی لمحے اُسکے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

''ایف آئی اے؟'' اس نے حیرت سے خود کو کہتے سنا اور جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''جی جی۔۔۔ میں سمجھ گیا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اتوار کو کتنے بجے؟۔۔۔۔ صحیح ہے میں آجاؤں گا۔'' کال ختم ہونے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر وائرلیس ہاتھ میں لیے بیٹھے رہا۔ اُسے بھی اتوار کے دن صبح دس بجے بلایا گیا تھا۔ بس اتنا بتایا گیا تھا کہ کسی حساس نوعیت کے کیس کے سلسلے میں اسے تفتیش کیے آنا ہے۔

''مجھ سے آخر کس قسم کی تفتیش کرنی ہے؟'' وہ پریشان سا سوچ رہا تھا، لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ تھک کر اس نے سوچنا ہی ترک کر دیا۔ اسی اثنا میں علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم۔۔۔'' اس نے عمر کو سلام کیا اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ عمر کو وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا لگا تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کے تم آج آف کر رہے ہو؟'' اس نے علی سے پوچھا۔

''ہاں! ارادہ تو تھا کہ آج نہ آؤں، لیکن طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی اور گھر میں بھی فارغ ہی تھا تو سوچا کہ آفس ہی چلا آؤں'' اس نے اپنی ٹیبل پر رکھی مختلف فائلوں میں سے ایک اٹھالی۔

''علی۔۔۔'' عمر نے اسے پکارا تو اس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ لیکن عمر کو سمجھ نہیں آیا کہ بات کیا کرے۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر چپ رہا۔ غالباً وہ تذبذب کا شکار تھا کہ تھوڑی دیر پہلے آنے والی ایف آئی اے کی کال کے بارے میں اسے بتائے یا نہیں؟ معاملہ تھا بھی حساس۔۔۔

''نہیں۔۔ کچھ نہیں!''

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' علی بھانپ گیا تھا۔

''نہیں بس میں تم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تم کل اچھے بھلے گئے تھے یہاں سے، پھر طبیعت اچانک خراب کیسے ہو گئی؟'' وہ کہنا کچھ چاہتا تھا کہہ کچھ بیٹھا۔ حالانکہ وہ اس سے کبھی ذاتی سوال نہیں کرتا تھا۔

''کچھ نہیں بس کبھی کبھی بلیڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اب ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصر سے جواب دیا۔

''ہونہہ۔۔'' اس نے جواباً بس اتنا ہی کہا۔ وہ خود بھی بہت اُلجھ گیا تھا۔ لہٰذا مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

----------+----------+----------

ایف آئی اے کے کاؤنٹر ٹیررزم ڈیپارٹمنٹ کے ایک آفس میں، اس وقت نوید عالم اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کالی جینز پر ہم رنگ لیدر کی جیکٹ پہن رکھی تھی، جسکی زپ سینے سے تھوڑا نیچے تک بند تھی، جبکہ کھلی ہوئی زپ سے کالی ٹی شرٹ دکھائی دیتی تھی۔ ہاتھوں میں بال پوائنٹ گھماتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ چہرے کے خدوخال میں نمایاں سختی جھلکتی تھی، جو کہ اُسکی شخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔ کلموں پر دکھائی دیتے چند سفید بال اُسکی بارعب شخصیت کو مزید گریس فل بناتے تھے۔ یہی ایک آدھ سفید بال اُسکے بے حد سیاہ بالوں اور سلیقے سے تراشی ہوئی ہلکی داڑھی کے درمیان بھی کہیں کہیں دکھتے تھے۔ گہری سیاہ آنکھیں شدید اضطراب کا شکار نظر آتی تھیں، دائیں آنکھ کے کنارے سے لیکر بھوؤں کے کنارے تک بال جتنا باریک مگر ایک انگلی جتنا لمبا، کٹ کا نشان موجود تھا۔ وہ بہت لیئے دیئے رہنے والا، لیکن سحر انگیز شخصیت کا مالک شخص تھا۔ عورتیں تو عورتیں، مرد بھی ایک بار مڑ کر اُسے ضرور دیکھتے اور مرعوب ہوئے بنا نہ رہ پاتے تھے۔

کل پوری رات وہ سو نہ سکا تھا، بار بار دماغ اسی نقطے پر آ کر اٹک جاتا کہ کون ہو گا جو ان چھ لوگوں کا قتل کروانے کے لیے پیشہ ور قاتل ہائر کریگا؟ اور کوئی آخر انہیں قتل کرنا ہی کیوں چاہئے گا؟ اور وہ بھی ایک ساتھ ایک ہی دن، جب کہ پچھلے دس سالوں سے اُن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے رابطے میں نہ تھا، کم از کم نوید کی اپنے بارے میں تو یہی رائے تھی۔

شیراز اُسے بریفنگ دے رہا تھا جسے وہ غائب دماغی سے سن رہا تھا۔

''سر! عمر حفیظ، علی سفیر، رضاالٰہی اور مقدم شفیق کو اس اتوار صبح دس بجے آفس بلالیا گیا ہے۔ڈی آئی جی صاحب کے حکم کے مطابق تمام بات اُن سے پوشیدہ رکھی گئی ہے، انہیں یہاں آنے پر ہی مکمل تفصیل سے آگاہ کیا جائے گا۔''شیراز کی بات پر وہ چونکا تھا۔

''یہ تو چار لوگ نہیں ہوئے؟اور حسین۔۔۔۔ حسین مرتضیٰ؟اسکے بارے میں نہیں بتایا تم نے؟''

''ہماری اطلاعات کے مطابق وہ اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیوں پر ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔اس وجہ سے اُن سے ہمارا رابطہ بھی نہیں ہو سکا، امید کرتے ہیں کہ اتوار سے پہلے پہلے اُن سے رابطہ ہو جائے۔''

''اوہ۔۔۔ پلیز! اپنی پوری کوشش کرنا کہ اتوار تک وہ بھی ہمارے ساتھ ہو۔یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔''اس نے کہا تو شیراز سر ہلاتے ہوئے باہر چلا گیا۔ جبکہ وہ خود کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نظریں سامنے لگے بورڈ پر تھی، جہاں چھ لوگوں کی تصویریں انکے ناموں کے ساتھ لگی تھیں۔وہ اٹھا اور چلتا ہوا اس بورڈ تک آیا، اور خاموشی سے ایک ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا اُسے اُن سب کی شکلیں دیکھے ہوئے؟اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔۔۔

"شاید نو سال یا دس سال۔۔؟"

زندگی کے چھ سال ساتھ گزارے تھے اُن سب نے، کبھی نہ سوچا تھا ایک وقت آئیگا جب اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے حال تک سے ناواقف ہو گا؟

بورڈ پر نظر آتی پہلی دو تصاویر کے نیچے **عمر حفیظ** لکھا ہوا تھا۔ایک تصویر مائیکل عرف فرمان نامی اس مفرور مجرم کی ڈائری سے نکال کر یہاں لگائی گئی تھی جو کہ تقریباً دس سال پہلے کی تھی، جب کہ دوسری تصویر شاید چند ماہ یا سال بھر پہلے کی تھی جو کہ ڈیپارٹمنٹ والوں نے مہیا کی تھی۔نوید چہرے پڑھنا جانتا تھا، وہ ایک نظر چہرہ دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ کون کس حال میں ہے؟

پچھلے ماہ ہی اس نے عمر کو دیکھا تھا، ایئرپورٹ پر۔۔۔تب پہلی نظر میں تو اسے وہ پہچان ہی نہ سکا۔بس اُسکا چہرہ کچھ شناسا سا لگا تھا، تقریباً بھی پانچ منٹ لگے تھے اُسے یہ یاد کرنے میں کہ وہ عمر ہے۔۔۔

''عمر۔۔۔''اس نے زیر لب اُسکا نام دہرایا۔

کتنا پیارا بندہ تھا وہ، ہر دم مسکرانے والا، ہر ایک کا خیال رکھنے والا۔اُسکی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ اُسکی ذات سے کبھی کسی کا دل نہ دکھے، کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔اُسکی اسی ادا نے ہمیشہ اُسے ہر دل عزیز بنا کر رکھا تھا۔اور اب؟

نوید نے اُسکی حالیہ تصویر پر ہاتھ پھیرا، اتنی اُداسی کیوں تھی اُسکے چہرے پر؟ ہر دم مسکراتی آنکھیں اتنی بجھی بجھی کیوں لگتی تھی؟ اس نے وہ دن یاد کرنے کی کوشش کی جب اس نے اُسے ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ کسی کو نظر آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر نوید کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔۔ دیکھا تھا کہ وہ وہاں سے روتا ہوا گیا ہے۔ پر کیوں؟ اس نے تو کبھی رونا نہیں سیکھا تھا، پھر اب؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اُسکے پاس، وہ دوسری تصویر کی جانب بڑھا۔

مقدم شفیق، کیا انسان تھا وہ بھی۔ نوید مسکرایا۔ پچھلے دس سالوں میں جتنی بار بھی اُسے مقدم بھولے بھٹکے سے یاد آیا تھا، ایک مسکراہٹ ہمیشہ اُسکے چہرے کا احاطہ کر لیتی تھی۔ کتنا زندہ دل شخص تھا وہ، دوستوں کا دوست اور بات بات پر قہقہ لگانے والا۔ اُسے نہیں یاد کہ اس نے مقدم کو کبھی برے موڈ میں دیکھا ہو، چاہئے کتنی بھی پریشانی کیوں نہ ہوتی وہ ہمیشہ خود بھی ہنستا مسکراتا رہتا تھا اور دوسروں کو بھی ہنساتا رہتا تھا۔ اُسکی حس مزاح کبھی بھی اُسے خاموش بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ وہ جہاں ہوتا تھا وہ محفل کشت زعفران بن جاتی تھی۔ اور پھر ایک دن وہ اچانک انکی زندگیوں سے نکل گیا تھا، بنا کچھ کہے، بنا کچھ بتائے۔

اُسے تو وہ مردہ سمجھ بیٹھا تھا، جب فرّخ صاحب نوید سمیت باقی لوگوں کا ڈیٹا لے رہے تھے، تو اس نے سوچا تھا کہ اُن سے کہہ دے کہ مقدم تو شاید مر چکا ہو لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس بات کا فلحال اُسے خود بھی صحیح سے یقین نہ تھا، یہ بس ایک قیاس تھی۔ اور کچھ دیر بعد جب شیراز نے اسے بتایا کہ اُن پانچ لوگ کا پتہ معلوم ہو گیا ہے تو اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ مقدم اسی شہر میں تھا؟ زندہ تھا؟ اتنی بڑی فرم کا اکیلا مالک تھا؟ پھر انکی نظروں سے اوجھل کیوں تھا؟ اگر وہ زندہ تھا تو اتنے عرصے سے کہاں غائب تھا؟ نوید نے ایک نظر اُسکی نئی تصویر پر ڈالی، ایک کامیاب بزنس مین جتنی ساری خوبیاں دکھتی تھیں اس میں، لیکن اُسکی وہ زندہ دل ہنسی؟ وہ کہاں گئی تھی؟ وہ ہر دم شرارت پے آمادہ آنکھیں، اتنی سنجیدہ کیسے ہو گئی تھیں؟ کوئی جواب نہ تھا اُسکے پاس، وہ تیسری تصویر کی جانب بڑھا۔

رضاالٰہی، تیسرے نمبر کی دونوں تصاویر رضا کی تھیں۔ اپنی پرانی تصویر میں بھی وہ خاموش طبع لڑکا تھا، اپنے آپ میں کھویا ہوا، چپ چپ سا۔۔۔ گم سم سا۔۔۔ اپنے سے خول میں بند رہنے والا۔ اُسکا مزاج ہی ایسا تھا شاید، وہ بولنے سے زیادہ سننے پر توجہ دیتا تھا، وہ ایک اچھا سامع تھا۔ قسمت اس پر مہربان تھی۔ وہ جو کام کرتا تھا اس میں کامیاب ضرور ہوتا تھا۔ وہ کم گو ضرور تھا لیکن اُسکے چہرے پر ایک اُداس سی مسکراہٹ ہمیشہ رہتی تھی۔ جو دیکھنے والوں کو اُسکا گرویدہ بناتی تھی۔

نوید نے اُسکی حالیہ تصویر کا بغور جائزہ لیا، انتہا کی سنجیدگی تھی اُسکے چہرے پر، اور اُسکی وہ بھلی سی اُداس مسکان وہ تو کہیں تھی ہی نہیں، ایسا لگتا تھا جیسے اس چہرے سے جینے کی امید ہی ختم ہو گئی ہو۔ پہلے تو وہ گم سم سا رہتا تھا لیکن اب، اب تو موت جیسا سنّاٹا تھا اُسکی آنکھوں میں، کیا وہ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا؟

وہ اسی خاموشی سے اگلی تصویر کی جانب بڑھا۔

علی سفیر، دو تصاویر وہاں بھی تھیں، اس تصویر پر اسے غور کرنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ گئے وقتوں نے اگر کسی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا تھا، تو وہ علی تھا۔ وہ جذباتی تھا، بہت جلدی برہم ہو جایا کرتا تھا، غصّہ بھی ہر وقت ناک پر دھرا رہتا تھا اُسکے، نوید یاد کر کے مسکرایا۔ وہ مزاج کا تیز ضرور تھا لیکن دل کا برا نہ تھا،

وہ صاف گو تھا۔ ہمیشہ سچ بولتا تھااور سچ ہی سننا پسند کرتا تھا۔ جتنے جلدی روٹھتا تھااتنے جلدی مان بھی تو جایا کرتا تھا۔ نوید کہتا تھا کہ علی اُسکا ہی ایک حصہ ہے، اگر نوید کے سب سے زیادہ قریب کوئی تھا، تو وہ یہی تھا، علی۔۔۔ اسے یاد تھا جس دن اُسکی شادی تھی۔ کتنا خوش تھا وہ جیسے اب تا عمر یونہی خوش رہے گا۔ لیکن۔۔۔

یہ چٹانوں جیسی سختی کہاں سے آگئی تھی اس میں ؟ نوید نے غور سے اُسکی تصویر کو دیکھا، وہ اُسکا علی تو نہ تھا۔ وہ تیز مزاج تھا لیکن سخت مزاج تو کبھی نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ کوئی ایسا جسکا دنیا پر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا، کوئی ایسا جس کو انسانوں سے ہی نفرت ہو گئی ہو، کوئی ایسا جو زندگی جی رہا ہو نہ گزار رہا ہو، بلکہ اُسے گھسیٹ رہا ہو۔ بس اُسکے ختم ہونے کے انتظار میں ہو۔ کون تھا یہ ؟ وہ مزید اُسکے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے آگے کی تصاویر کی طرف بڑھا۔

حسین مرتضیٰ، اُسکی دونوں تصاویر میں اگر کوئی فرق تھا تو بس اتنا کہ پچھلی تصویر میں وہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور اس تصویر میں ایک بھرپور مرد۔ بس عمروں کا فرق تھا۔ گزرے وقت نے اس پر اگر کوئی اثر ڈالا تھا تو بس اتنا ہی۔ نوید کے دل میں ایک انہونی سی خوشی نے سر اٹھایا۔ کوئی تو تھا جو ویسا ہی تھا۔ نوید نے اُسکی پرانی اور نئی تصویر کا آپس میں موازنہ کیا، چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ روزِ اوّل کی طرح موجود تھی، زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی، اور وہ آج بھی وہیں تھیں، ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گڑھے پڑتے تھے، وہ ہنسی آج بھی اتنی ہی معصوم تھی۔ وہ سکون سے بیٹھنے والا انسان نہیں تھا، دن بھر میں چلتے پھرتے کسی نہ کسی کو چھیڑنا، کسی بھی طرح اپنے آس پاس کے لوگوں کو تنگ کرنا اُسکا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اُسکی بے ضرر سی شرارتیں سامنے والے کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتی تھی۔ کتنی بار نوید جیسا چالاک بندہ بھی اُسکے ہاتھوں بیوقوف بنا تھا۔ وہ مسکراد یا، یادوں کا خزانہ اُبل اُبل کر باہر آنے کو تیار تھا۔

کیا آج بھی وہ ویسا ہی ہے ؟ نوید نے بغور اُسکی تصویر کو دیکھا۔ دل سے صدا آئی، ہاں ! ! وہی تو تھا جسے دیکھ کر زندگی کا احساس ہوتا تھا، ان اُداس چہروں میں ایک اسی کا چہرہ تھا جو آج بھی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ لیکن جب وہ یہاں آئیگا اور اسے پتہ چلے گا کہ چھ ماہ بعد اسے قتل کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی ہے تو کیا وہ اسی طرح مسکرا اسکے گا ؟ کیا وہ اُسے بتا پائے گا کہ وہ کس پُل صراط پر کھڑے ہیں ؟ کیسے کہے گا وہ اُسے ؟ اس چہرے کو اُداس کرنے کی طاقت تھی اس میں، یقیناً نہیں۔

آخری دو تصاویر پر نظر ڈالنے کی اس نے زحمت بھی نہ کی تھی، وہ اُسکی اپنی تصویریں تھیں۔ اپنے بارے میں تو جیسے اب وہ بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے خود سے نفرت کی آخری منزلوں پر تھا۔ اپنی ہی تصویروں سے نظریں چرا کر، بوجھل قدموں سے دوبارہ اپنی کرسی پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ یادوں کا یہی تو مسئلہ ہے، جب آتی ہیں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اُسکی ڈیوٹی بدلنے کا وقت ہو چکا تھا لیکن اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ماضی تھا کہ دل کے صندوقوں سے باہر آنے کو بیتاب، لیکن اس نے بھی قفل لگا کر کسی اور وقت کے لیے بند کر دیا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسی وقت ڈیوٹی پر مامور دوسرا افسر وہاں آیا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔

''ارے ! تم گئے نہیں اب تک ؟'' آنے والے نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں کچھ کام تھا بس اب نکل ہی رہا ہوں'' وہ اٹھ کر سامان سمیٹنے لگا آنے والے نے بس سر ہلا دیا، اُسکے بعد انکے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور نوید اپنا ضروری سامان لیے وہاں سے نکل گیا۔

----------+---------+----------

''میرا جنازہ رات کے وقت نکالنا، تاکہ کی نامحرم کی نظریں نہ پڑے۔'' (خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا)

وہ بار بار یہ ایک جملہ پڑھے جا رہی تھی۔ آنسوں تواتر سے اُسکی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔

''یارب۔۔۔'' وہ سسکی۔

''یاتواب'' وہ تڑپ تڑپ کر روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

''میرا نام جس عظیم ہستی کہ نام پر رکھا گیا تھا، میں نے۔۔۔ میں نے تو اُن کے نام کی لاج بھی نہ رکھی۔'' وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''میں کیا کروں گی؟ کیا کروں گی اگر محشر میں، میری سردار نے مجھ سے پوچھ لیا کہ فاطمہ! کیا میرے نام کی تمہارے نزدیک اتنی سوقعت نہ تھی۔ اتنی سی بھی۔۔۔ کہ تم میری وصیت سے ہی کوئی نصیحت حاصل کرتی؟'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''میں کیسے سامنا کروں گی اُنکا؟ جب وہ مجھ سے پوچھیں گی کہ کیا میرے بابا ﷺ کا دین اتنا مشکل تھا؟ اتنا کہ تم کچھ دیر کو بھی صبر نہ کر سکی؟ کہ تم محرم اور نامحرم کی تمیز بھول گئی؟ میں کیا جواب دونگی؟ کیا جواب دونگی انکو؟'' رات کے اس پھر فاطمہ آفندی خود احتسابی کی کڑی منزلیں طے کر رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ کوئی اُسکی چھپ کر دیکھ رہا تھا۔

----------+---------+----------

پاو پھوٹنے سے چند لمحوں پہلے جب سب مخلوق خدا سو رہی ہوتی ہے، اور ساری رات درد سے کراہتے مریض کو بھی اس پل نیند آ ہی جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل پر ایک بہت پرانی سی ڈائری کھولے وہ بیٹھا تھا۔ وہ جسکی آنکھوں سے نیند برسوں ہوئے، دور ہو چکی تھی۔ وہ جو رات کے اس پہر جاگ کر اپنے زندہ ہونے کا ماتم منایا کرتا تھا۔ وہ جو یادوں کے سمندر پر بند باندھنے کی کوششوں میں ہمیشہ ناکام رہتا تھا۔

وہ ڈائری کے صفحے آہستہ آہستہ پلٹ رہا تھا۔ ہر صفحے پر مختلف شاعری لکھی ہوئی تھی۔ بہت سارے صفحے آگے بڑھانے کے بعد وہ ایک صفحے پر آکر رکا۔ وہاں پرپل اور براؤن رنگ کے پوائنٹر پین سے ایک غزل نقل کی گئی تھی۔ وہ لکھائی اُسکی نہیں تھی، اُسکے کسی بہت پیارے کی تھی۔ وہ لفظوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

رنجش ہی سہی، دل ہی دُکھانے کے لیے آ

آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اپنے کمرے میں علی وہی فریم ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا جس نے اُسکا آج کا پورا دن خراب کیا تھا۔ لیکن شاید اُسے شوق تھا خود کی اذیت دینے کا، وہ بار بار اس ٹوٹی ہوئی تصویر کو نکال کر دیکھتا تھا۔ اور ہر بار نئے سرے سے اپنے زخموں کو تازہ کر دیتا تھا۔ اُسکا بیٹا کب کا سو چکا تھا لیکن اُسے کہاں اب نیند آنی تھی۔

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو

رسم ورہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

رضا گھر میں داخل ہوا تو روز کی طرح آج بھی سنّاٹوں نے اُسکا استقبال کیا تھا۔ انہی سناٹوں سے اُسے وحشت ہونے لگتی تھی، وہ گھر نہیں آنا چاہتا تو بھی اسے آنا پڑتا کہ یہاں نہ آتا تو کہاں جاتا؟ وہ دنیا میں کہیں بھی چلا جاتا حقیقت تو یہی تھی کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا تھا۔ وہ مر گیا تو اُسکا جنازہ اٹھانے والا بھی شاید کوئی نہ ہو۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم

تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

سارا آفس خالی ہو چکا تھا، لیکن عمر اب تک گھر نہیں گیا تھا۔ کیسے جاتا وہ؟ گھر میں اُسکا انتظار کرتی عمائمہ اب نہیں تھی۔ وہ جو اُسے دیکھ کر بھاگتے ہوئے آتی تھی اور اُسکی گود میں چڑھ جاتی تھی۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُسے دن بھر کی روداد سناتی تھی لیکن اُسے بھی اُسکی ماں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ عمر کی پہنچ سے بہت دور۔ اور اپنے خود کے ماں باپ کی نظر میں تو وہ بہت پہلے ہی نافرمان ٹھہرایا جا چکا تھا۔ ایک عمائمہ ہی تو تھی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اور اب وہ بھی کہیں نہیں تھی۔

جیسے تُجھے آتے ہیں نہ آنے کے بہانے

ایسے ہی کسی روز نہ جانے کے لیے آ

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پوری گلی سنسان پڑی تھی، ایسے میں تیز تیز قدم اٹھاتا نوید، قبرستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ قبرستان میں داخل ہو کر وہ اپنی مطلوبہ قبر کے پاس پہنچا۔ اُسکی امید کے مطابق وہ وہیں تھیں۔ اس گُھپ اندھیرے میں بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ قبر پر سر رکھے کچھ گنگنا رہی ہے۔ وہ گہری سانس لیتا خود کو اس سے بحث کے لیے تیار کرنے لگا، جو اُسے گھر واپس لے جانے کے لیے اسی سے کرنا تھی۔

اب تک دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں

یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

(احمد فراز)

مقدم نے ڈائری کے صفحے الٹے پلٹنے شروع کر دیے اور سب سے پہلے صفحے پر پہنچ گیا۔ وہاں خوبصورت رنگوں کے مارکر سے بڑا بڑا لکھا تھا **لیلیٰ مقدم**۔۔۔اس نے تین سے چار بار اس نام کو پڑھا۔ پھر گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی۔

----------+----------+-----------

دوسرا باب

اوراقِ گزشتہ

اتوار صبح دس بجے، مورخہ چھ جنوری:

عمر اس وقت تفتیشی کمرے کے باہر موجود انتظار گاہ میں اکیلا بیٹھا تھا، جہاں اُسے فلحال انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ انتظار گاہ گول کمرے کی مانند تھی، جسکا کوئی سرا نہ تھا، درمیان میں ایک دروازہ تھا، جسکی ایک جانب سے دیوار گیر صوفہ شروع ہوتا تھا، جو کمرے کی گولائی کے ساتھ ہی گھومتے ہوئے دروازے کی دوسری جانب آکر ختم ہو جاتا تھا۔ کمرے کی دیوار پر ایک جانب اسمارٹ ٹی وی لگا ہوا تھا، جس پر اس وقت کوئی خبر نامہ نشر ہو رہا تھا۔ سردی ہونے کی باعث کمرے کا اے سی بند تھا لیکن پھر بھی کمرے میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ شاندار لائٹنگ ہونے کے باوجود بھی یہ کمرہ وحشت زدہ سا لگتا تھا۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ تب ہی دروازہ اچانک سے کھلا۔

وقت، سانسیں، آوازیں سب رک گئی۔۔۔

حواس، سماعت، عقل سب سلب ہو گئی۔۔۔

اور آنے والے کو دیکھ کر جہاں عمر ساکت ہوا تھا، وہیں اُسکے قدم بھی جیسے لمحے بھر کو تھم گئے تھے۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑا اُسے دیکھتا رہا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ آگے بڑھ کر اُسے مخاطب کرے یا خاموشی سے ایک کنارے پر بیٹھ جائے؟ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ عمر نے خود ہی اُسکی مشکل آسان کر دی۔

''السلام و علیکم!'' عمر نے سر کے اشارے سے اُسے سلام کیا تو وہ بھی اشارے سے جواب دیتا سامنے رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔ پھر کافی دیر اُن دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، جیسے دونوں ہی نہ سمجھ پا رہے ہوں کہ بات کہاں سے شروع کریں؟ کریں بھی یا نہیں؟ حالانکہ عمر، مہینہ بھر پہلے اُسے دیکھ چکا تھا، پورے دس سال بعد۔۔۔ لیکن آج پھر سے اُسے سامنے دیکھ، وہ ویسے ہی گم صم سا ہو گیا تھا، جیسے آخری بار اُسے، اُسکے آفس میں دیکھ کر ہوا تھا۔ عمر خاموش تھا جبکہ وہ سامنے بیٹھا اپنے لب کاٹ رہا تھا۔ ایسا وہ شدید پریشانی میں کرتا تھا، عمر مسکرا دیا۔ دس سال بعد بھی کچھ چیزیں ویسی ہی تھیں۔

پھر اُس نے واپس سر جھکا دیا۔ کیا فائدہ تھا مخاطب کرنے کا جبکہ سامنے والا شاید پہچاننے کا روادار بھی نہ تھا؟ اگر وہ بات نہیں کرنا چاہتا تو اسے بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ اجنبیت برت رہا تھا تو وہ کیوں دوستی نبھاتا؟ ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ کچھ لمحے مزید سر کے پھر کمرے میں اُسکی آواز گونجی۔

''کیسے ہو عمر؟''اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا ہو۔ گول کمرے کی دیواروں سے مقدم کی آواز ٹکرا کر واپس آگئی تھیں۔ جبکہ وہ خود سنجیدہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے براہ راست عمر کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''آن۔۔۔ میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں، الحمدللہ۔۔ تم کیسے ہو؟''اس نے بمشکل کہا۔ دماغ میں سوالات کے انبار جمع ہونے لگے، جسے وہ زبان پر لانے سے روکے ہوئے تھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔''مقدم نے ویسی ہی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مجھے لگا تھا کہ شاید تم مجھے پہچان نہیں سکے۔''نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ زبان سے پھسل گیا تھا۔اور پھر اُس نے دیکھا تھا مقدم کو، سر جھکاتے ہوئے، وہ اُسے شرمندہ تو نہیں کرنا چاہتا تھا۔اُسے افسوس ہوا، اتنی جلدی شکوہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔دس سالوں کا بھرم رکھنا ضروری تھا۔

''تمہیں نہ پہچانوں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟''اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔اتنے آہستہ، جیسے خود سے مخاطب ہو۔لیکن اُس نے سنا تھا، سنا تھا جو اُس نے کہا تھا۔**''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا''**اس ایک جملے میں کچھ تو تھا، کچھ ایسا کہ عمر کو اپنے تمام گلے شکوے بھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔کچھ دیر کہ لیے وہ بھول گئے تھے کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں؟سوال تو یہ تھا کہ وہ دونوں یہاں کر کیا رہے ہیں؟لیکن اس وقت وہ جیسے کہیں اور ہی تھے۔کسی اور ہی دنیا میں۔۔۔

اُس ایک جملے کے بعد اُن دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔مقدم چپ سا بیٹھا تھا، اور عمر اپنی ہتھیلیوں پر نظریں جمائے۔اُن ہتھیلیوں پر کچھ منظر بنتے پھر مٹ جاتے، پھر بنتے پھر مٹ جاتے۔مقدم کے دماغ کے اوراق بھی ماضی کا سفر کر رہے تھے۔بہت سے مناظر اُسکی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں خود کو ان مناظر کا حصہ محسوس کرنے لگے۔یادوں کو باہر آنے سے تو روک دیا تھا لیکن خود کو ماضی میں جانے سے کیسے روکتے؟

وہ وہیں جا چکے تھے آج سے سولہ سال پہلے۔۔۔

----------+----------+----------

سولہ سال پہلے:

صبح نو بجے کا وقت تھا، سال کے پہلے مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی، جہاں سیمسٹر بریک کے بعد کلاسز کا آغاز ہوا تھا، وہیں نو واردان کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔جامعہ کے تمام داخلی دروازوں سے جوق در جوق طلبہ داخل ہو رہے تھے۔کچھ حیران پریشان سے چہرے لیے اپنے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے جو کہ ایک مشکل کام معلوم ہوتا تھا۔کچھ ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈنے کی کوششوں میں مستقل بھٹکتے ہی چلے جا رہے تھے۔حالانکہ جامعہ

میں کلاسز کا آغاز ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا، لیکن اب تک نئے طالبعلموں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پرانے طلبہ ان سب میں الگ سے نمایاں تھے۔ کچھ شیطان کے بچھڑے ہوئے لواحقین، نووارد ان کی اس حالات سے حظ اٹھاتے ہوئے انہیں مزید بھٹکا رہے تھے، تو کچھ بیزار سی شکلیں لیے دنیا سے تمام تعلق توڑے، بس اپنی کلاس میں وقت پر پہنچنے کی سعی کر رہے تھے، ایسے میں اگر کوئی بھولا بھٹکا نیا طالب علم ان آدم بیزاروں سے اپنا مطلوبہ ڈیپارٹمنٹ پوچھ لیتا تو یہ نہایت ہی برا منہ بنا کر کہتے کہ ''ہمیں خود نہیں معلوم'' حالانکہ معلوم انہیں سب تھا۔ جبکہ تیسری قسم کے سینئرز ایسے بھی تھے جو فی سبیل اللہ نئے آنے والوں کو انکے ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ کر آ رہے تھے۔ لیکن ایسی قسم شاذ و نادر ہی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے ڈیپارٹمنٹ کی ایک جماعت میں طلبہ و طالبات کی حاضری لگانے کے لیے نام پکارا جا رہا تھا۔

''آغا مقدم۔۔۔۔'' استاد نے اُسکا نام پکارا۔ پر جماعت میں خاموشی چھائی رہی۔ کچھ چہروں نے یہاں وہاں مڑ کے دیکھا لیکن کوئی جواب نہ پا کر واپس اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

''آغا مقدم شفیق۔۔۔'' اُنہوں نے دوسری مرتبہ نام پکارا لیکن اس بار بھی جواب ندارد تھا۔ اب کی بار کسی نے بھی دیکھنے کی کوشش نہ کی، پچھلے ایک ہفتے سے اس نام کے آگے غیر حاضری کا نشان لگ رہا تھا۔

''غیر حاضر'' استاد نے تاسف سے زیر لب کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اُسکے نام کے آگے غیر حاضری لگا ہی دیتے، جماعت میں زوردار آواز گونجی۔

''پریسینٹ سر'' اس آواز پر پوری جماعت نے ایک ساتھ مڑ کے پیچھے دیکھا تھا، کلاس کے پچھلے دروازے پر کھڑے، اُس سرخ و سفید رنگت والے لڑکے کو دیکھ کر ہی لگ رہا تھا کہ بہت دُور سے پیدل چلا آ رہا ہے، طلباء و طالبات بڑے اشتیاق سے اُسے ہی دیکھنے لگے۔ کیسے نہ دیکھتے؟ ایک ہفتے سے مختلف کلاسز میں اُسکا صرف نام ہی سن رہے تھے، اب جا کے اس نے شکل دکھائی تھی۔ استاد نے بھی اوپر سے نیچے تک اُسے دیکھا بلکہ گھورا تھا۔

''آج پہلا دن ہے تمہارا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''دنیا میں؟'' اس نے معصومیت سے وضاحت مانگی۔ کلاس میں ہنسی کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

''نہیں! میری کلاس میں؟'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں سر!''

''دو ہفتوں سے کہاں تھے؟'' ایک اور سوال۔

''سوات۔۔۔'' مختصر جواب۔

''اوہو۔۔۔''کلاس میں مختلف آوازیں گونجیں۔

''کیا کر رہے تھے وہاں؟''

''آخری دن منا رہا تھا سر!''آگے سے پھر بے تکا جواب آیا۔

''زندگی کے؟''اُنہوں نے بھی اتنی ہی سنجیدگی سے وضاحت مانگی،اب کے پوری کلاس زور سے ہنسی تھی۔انہیں یہ گفتگو سننے میں مزا آرہا تھا۔

''نہیں!آزادی کے۔''

''کیوں؟پڑھنا لکھنا پسند نہیں ہے؟''

''نہیں سر!پڑھنے لکھنے کو میں پسند نہیں ہوں شاید۔''مزید معصومیت سے جواب آیا۔

''مجھے مل جاتے ہیں ہر سال ہی ایسے۔۔۔''اب کہ اُنہوں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''کیسے؟''اشتیاق سے پوچھا۔

''جنکو پڑھائی لکھائی پسند نہیں کرتی۔''

''اچھا۔۔۔کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''مزید معصومیت۔

''اب آہی گئے ہو تو باہر کھڑے ہو کر کیا کرو گے؟آجاؤ۔۔۔''انہوں نے گویا احسان کیا تھا۔وہ مسکراتے ہوئے اندر آیا اور پیچھے والی نشستوں میں سے،ایک ڈیسک کے پاس پہنچا،جہاں دو لوگ بیٹھتے تھے۔کلاس سیڑھیوں پر مشتمل اوپر سے شروع ہو کر نیچے تک جاتی تھی،جہاں سامنے روسٹرم پر استاد کھڑے، بقایا طالبعلموں کی حاضری لے رہے تھے۔پیچھے والی ڈیسک پر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔اس نے لڑکے کے پاس جا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

''میرا نام آغا مقدم ہے۔کیا میں آپکے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟''ڈیسک پر بیٹھے خوش شکل لڑکے نے تھوڑا آگے کھسکتے ہوئے،فوراً اُسکے لیے جگہ بنائی تو وہ بیٹھ گیا۔

''اور سناؤ!تمہارا ابھی پہلا دن ہے آج کلاس میں؟''اس نے بستہ نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں پچھلے ایک ہفتے سے آرہا ہوں۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو اکیلے کیوں بیٹھے ہو لڑکے ؟دوست نہیں بنائے اب تک ؟'' وہ حیران ہوا۔

''اتنی جلدی کیسے دوستی ہو سکتی ہے ؟'' لڑکا اُس سے بھی زیادہ حیران ہوا۔

''ایک ہفتہ جلدی ہوتا ہے کسی سے بات کرنے کے لیے ؟'' مقدم پہلے سے زیادہ حیران۔۔۔

''ارے نہیں !علیک سلیک تو سب سے ہے لیکن دوستی ابھی کسی سے نہیں ہوئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مسکرانا جیسے عادت تھی اُسکی۔

''چلو یار ! کوئی نہیں، آج مجھ سے دوستی کر لو۔'' مقدم نے ہاتھ بڑھایا جو اس نے خوش دلی سے تھام لیا۔

''اب خاموش ہو جاؤ سر پڑھانا شروع کر رہے ہیں'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''نام تو بتا دو اپنا۔'' مقدم نے بھی آہستہ سے پوچھا۔

''عمر۔۔۔ عمر حفیظ''

----------+----------+----------

صبح نو بجے کا وقت تھا، آج جامعہ میں اُسکا پانچواں دن تھا۔ ہر طرف ایک گہما گہمی سی تھی۔ کلاس لینے کے بعد وہ بھٹکتا بھٹکتا کینٹین چلا آیا۔ سامنے اُسے ایک لڑکا نظر آیا، پچھلے پانچ دنوں سے کلاس میں حسین اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اب تک نہ کسی سے دوستی کی نہ ہی بات چیت۔

کینٹین آتے ہوئے راستے میں پڑنے والے مختلف ڈیپارٹمنٹ میں، اُسے طالبعلم ایک دوسرے کی تصاویر کھینچتے ہوئے یا پھر کرکٹ یا ٹینس کھیلتے ہوئی نظر آئے تھے۔ کچھ بلاوجہ ہی بیٹھے ہوئے گپے مار رہے تھے۔ ایسے میں وہ لڑکا خاموشی سے سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس نے کسی سے بھی بات کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور ساری دنیا کو چھوڑ کر جناب حسین بلاوجہ ہی اُسکے پاس چلے آئے۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں ؟'' حسین نے پوچھا تو کسی گہری سوچ میں غرق، رضا نے اُسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''مرضی ہے'' اس بے تکے جواب پر تو حسین کو، اُسے بھاڑ میں جھونک کر چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بھی ڈھٹائی سے وہیں بیٹھ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''رضائے الٰہی !'' بیزار سے منہ کے ساتھ جواب دیا، جیسے حسین کا بیٹھنا بہت ہی ناگوار گزر رہا ہو۔

''کیا بات ہے ؟اتنے خاموش کیوں ہو ؟'' حسین نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں خاموش ہی رہتا ہوں۔'' رضا نے مزید بیزاری سے کہا۔

''تو کیوں رہتے ہو؟ دوستی کرو کسی سے، بات چیت کرو، کچھ تفریح کرو۔''

''میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا،'' مزید روکھا جواب آیا تھا۔

''ٹھیک ہے نہ کرو، مگر دوستی کیوں نہیں کرتے کسی سے؟'' حسین نے دل ہی دل میں اپنی ہمت کو داد دی۔

''میری مرضی۔۔۔'' وہ بلاوجہ ہی کوفت کا شکار ہو رہا تھا۔ چائے کا آرڈر دے دیا تھا، اسی لیے یہاں سے اٹھ کر جا بھی نہیں پا رہا تھا۔

''گھر سے مار کھا کر تو نہیں آئے؟'' رضا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حسین کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کی اتنی بیزاری کے باوجود وہ کیوں اس سے بات کر رہا تھا؟ ایسی کیا کشش تھی اس میں کہ ہر کوئی اس سے بات کرنا چاہتا تھا؟ اور ایسا وہ پچھلے پانچ دنوں میں دیکھ چکا تھا کہ کلاس کا ہر طالب علم اُس سے بات کرنے کا خواہش مند تھا، اور وہ عجیب آدم بیزار مزاج کا حامل تھا۔

''دیکھو! مجھے نا۔۔۔ آج صبح صبح میرے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے'' اس نے اطمینان سے بتایا تو رضا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اور پہلی بار اُس نے رضا کے چہرے کے تاثرات فکر مندی میں بدلتے دیکھیں تھے۔

''کیوں؟'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

''میری امی، صبح نماز پڑھ رہی تھیں۔ انکے گھٹنوں میں درد رہتا ہے، تو وہ صوفے پر بیٹھ کر نماز پڑھتی ہیں۔ میں انکے پاس گیا اور جا کے انکے قدموں میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے بال کھینچنا شروع کر دیے۔'' حسین رکا۔

''کیوں؟'' بال کھینچنے والی بات پر وہ حیران ہوا۔

''ایسے ہی۔۔۔ انکی عادت ہے۔ میں نے پوچھا، امی! جب آپکے پاس آؤ تو آپ بال کیوں کھینچنے لگ جاتی ہیں؟ کہنے لگیں کہ یہ میرے پیار کرنے کا طریقہ ہے۔ اب قسم لے لو! میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ابّو پیچھے کھڑے ہیں۔ میں نے بس اتنا کہا تھا امی سے، کہ ابّو کو بھی آپ نے ہی گنجا کیا ہے؟ اب اس میں گھر سے نکالنے والی کیا بات تھی بھلا؟'' دنیا جہاں کی مظلومیت چہرے پر سموئے اپنی داستان سنائی۔ رضا کے منہ سے نکلنے والا قہقہہ بے ساختہ تھا، اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ آس پاس بیٹھے ہم جماعتوں نے مڑ مڑ کر یہ منظر دیکھا تھا۔ بھلا وہ کونسا روز روز ہنستا تھا؟

''ہنسو مت! میں بہت دکھی ہوں۔'' مزید مظلومیت طاری کیے کہا۔

''ہاہاہا۔۔۔ نظر آرہا ہے کہ تم کتنے دکھی ہو۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد وہ اس طرح بے ساختہ اور کھل کر ہنسا تھا اور وہ بھی اتنی دیر تک۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''بلآخر رضا نے پوچھ ہی لیا۔

''حسین۔۔۔ حسین مرتضیٰ!''

''چائے پیو گے حسین؟'' اب کے اس نے خوشدلی سے پوچھا تھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ؟''اُسکے بعد اُن دونوں نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی، حسین مستقل کوئی نہ کوئی قصّہ اُسے سناتا رہا، جواباً وہ بس ہلکے سے مسکرا دیتا۔

اگلے دن کلاس میں، حسین خود ہی اُسکے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اور نجانے کس طرح، پر اُس نے رضا سے دوستی کر لی تھی۔ کبھی کبھی رضا حیران ہوتا کہ حسین جیسے بندے نے، پوری جماعت کے طالبعلموں کو چھوڑ کر اُسے ہی کیوں دوست منتخب کیا تھا؟

''بات سنو لڑکے!''کلاس ختم ہونے کے بعد وہ دونوں باہر نکل رہے تھے، جب اپنے پیچھے سے اُنہیں کسی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے ہی مڑ کے پیچھے دیکھا۔ نیلی جینز پر نیلی پولو شرٹ پہنے، وہ لڑکا اپنی ڈیسک پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔

''اِدھر آؤ''انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اُسکے پاس ہی ایک اور لڑکا بیٹھا، نہایت بے زاری سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''میں؟''مقدم نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر تصدیق کرنا چاہی کہ آیا اُسے ہی بلایا گیا ہے یا کسی اور کو؟

''ہاں ہاں! تم۔''اس نے کہا تو وہ ذرا حیران سا اُسکے پاس گیا۔ عمر بھی ساتھ ہی تھا۔

''کیا کام ہے؟'' پاس جا کر پوچھا، اس سے پہلے کہ لڑکا کوئی جواب دیتا، اُسکے ساتھ بیٹھا بے زار سا لڑکا بول اٹھا۔

''کوئی کام نہیں ہے اسے، بیکار آدمی ہے یہ اسکی باتوں میں نہ آیا کرو۔''

''تم چپ کرو۔''اس نے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔''اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔

''کہ''مقدم نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''سوات میں تمہارا اپنا گھر ہے؟''لڑکے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میرے باپ کا ہے، تم نے دعوت پر آنا ہے؟''مقدم نے شرارت سے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لو، مجھے بڑا شوق ہے سوات جانے کا۔''لڑکے نے اشتیاق سے کہا۔

''مفت میں تو میں کسی کو نہیں بلاتا۔''مقدّم آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

''قیمت؟''

''خالص دوستی۔''اس بات پر وہاں قہقہ پڑا تھا۔

''یار! تم مجھے ایسے ہی تو اچھے نہیں لگے؟ کہاں تھے اتنے دنوں سے، پہلے کیوں نہیں ملے مجھے؟ کم از کم اس آدم بیزار آدمی سے دوستی نہ کرنی پڑتی۔''لڑکے نے ہنستے ہوئے اپنے دوست کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس نے اُسے مکمل نظر انداز کیا تھا۔ اُنہوں نے اب دیکھا تھا کہ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر نمایاں گڑھے پڑتے تھے۔ اور زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی۔

''بس، قسمت میں آج ملنا لکھا تھا، یہ میرا دوست ہے، عمر حفیظ۔''اس نے لگے ہاتھوں تعارف کروایا۔

''ہاں ہاں! جانتا ہوں اس فادر ٹیریسا کو۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا تو عمر نے برا سا منہ بنایا۔

''اس بات کا کیا مطلب؟''مقدم نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''مطلب پھر کسی دن بتاؤنگا، ابھی تم مجھ سے ملو۔''وہ اُچھل کر نیچے اترا۔

''میں حسین مرتضیٰ!''اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جسے پوری خوشدلی سے تھاما گیا تھا۔

''اور یہ میرا دوست ہے، رضا الٰہی!''اس نے پاس بیٹھے لڑکے کی جانب اشارہ کیا تو رضا، جو کچھ دیر قبل بیزار سا بیٹھا تھا، اب مسکراتے ہوئے اُن سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

''چلو! آج تمہارا پہلا دن ہے، تو اس خوشی میں تمہیں یونیورسٹی کی سیر کرواتے ہیں۔''''حسین نے کہا تو رضا نے پھر سے بیزار سا منہ بنالیا۔

''میرا بالکل موڈ نہیں ہے یونیورسٹی کے چکر کاٹنے کا، ویسے بھی آدھے گھنٹے بعد دوسری کلاس شروع ہو جائے گی۔''رضا نے خود کو اس منصوبے سے باہر کر لیا۔

''صحیح کہہ رہا ہے، یہ یونیورسٹی گھومنے کا پلان پھر کسی دن کے لیے۔''عمر نے بھی تائید کی تھی۔

''ٹھیک ہے، لیکن چائے تو پی جاسکتی ہے نا'' حسین نہیں ٹلنے والا تھا۔

''ہاں! یہ کر سکتے ہیں۔'' اس پر سب راضی تھے۔ پھر وہ سب کینٹین کی طرف چل دیئے۔

----------+----------+----------

اور کچھ ہی دنوں میں مقدم کو معلوم ہو گیا کہ عمر کو **"فادر ٹریسا"** کا لقب کیوں دیا تھا حسین نے؟ کیونکہ وہ ایک درد مند دل رکھنے والا انسان تھا۔ بے حد خوش اخلاق، خوش مزاج اور ہر ایک کا خیال رکھنے والا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر میں گھلنے والا لیکن اپنے مزاج کے بر خلاف اُسکی ایک عادت تھی، وہ اتنی آسانی سے کسی سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ علیک سلیک ہر ایک سے رکھتا تھا، مگر دوستی نہیں، لیکن یہ مقدم تھا، جس نے اُسے خود سے دوستی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ لوگ ساتھ ساتھ ہی تھے۔ آج بھی حسین اور رضا انکے ساتھ کینٹین میں بیٹھے تھے، جہاں اور بھی بہت سے طالبعلم موجود تھے۔ رضا آج گھر سے بنا کچھ کھائے پیئے ہی آیا تھا، لہٰذا پورا پورا ناشتہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تینوں ایک ہی میز پر بیٹھے، رضا کا انتظار کر رہے تھے۔ جو ناشتے کا آرڈر دینے گیا تھا۔ سیلف سروس تھی، اسی لیے وہ کاؤنٹر کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''یار! وہ اکیلے ہی سارا سامان کیسے لائے گا؟'' عمر کو رضا کی فکر ہو رہی تھی، جسے چار ڈسپوزیبل چائے کی پیالیاں اور ایک عدد پراٹھے کی پلیٹ بھی ساتھ لانی تھی۔

''ابھی آرڈر آیا نہیں ہے نا؟ جب آئیگا تو وہ اشارہ کر دے گا۔ بیٹھے رہو چپ کر کے۔'' مقدم نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن بیچارہ اتنی دیر اکیلے کیا کریگا؟ میں جا کے اُسے کمپنی ہی دے دیتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسکے ضمیر کو چین نہیں آنے والا تھا۔

''اشاروں کی زبان آتی ہے؟'' حسین نے حیران ہونے کی ناکام کوشش کی۔

''مطلب؟'''' دونوں حیران ہوئے۔

''تم کم بولتے ہو اور وہ تو بولتا ہی نہیں ہے، اب دو گونگے ایک دوسرے کو کیسے کمپنی دینگے؟'' حسین نے مزے سے کہا، تو عمر جواب دینے کے بجائے اُسکے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے چلا گیا۔

''یہ بلی یہاں کیوں گھوم رہی ہے؟'' مقدم نے اپنے پاؤں کے پاس موجود بلی کو دیکھ کر کہا۔

''اسے بھی تم پسند آ گئے ہو گے۔'' حسین نے جواب دیا۔ اب دونوں کی توجہ کا مرکز وہ بلی تھی۔

عمر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اُسکے ارد گرد مختلف کرسیوں اور میزوں پر لاتعداد طلباء و طالبات اپنے اپنے گروپ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی چائے پی رہا تھا، کوئی ناشتہ کر رہا تھا تو کوئی صبح ہی صبح سموسے رول لیے بیٹھا تھا، لیکن اُسکی نظریں رضا پر تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز کاؤنٹر کی ساتھ والی دیوار پر ٹیک لگائے، اس طرح کھڑا تھا کہ اُسکا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا پاؤں الٹا موڑ کر دیوار سے ٹکایا ہوا تھا۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹے، اُسکی نظریں فرش پر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھی۔ عمر نے اُسے غور سے دیکھا، ایک نامعلوم سے اُداسی تھی اُسکے چہرے پر۔ پچھلے کچھ دنوں میں اُسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ رضا بہت خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم صم رہنے والا لڑکا ہے۔ لیکن اُسکے باوجود بھی چند ہفتوں میں اس نے اپنی قابلیت سے اساتذہ اور کلاس کے تقریباً تمام طالبعلموں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ باوجود اسکے کہ پوری کلاس اس سے بات کرنے کی خواہشمند رہتی تھی، وہ گنتی کے چند لوگوں سے ہی بات کرتا تھا۔ کبھی کبھی عمر کو حیرت ہوتی تھی کہ حسین جیسے انسان نے اس سے دوستی کیسے کر لی تھی؟ لیکن اس بات کا بھی بڑا اچھا جواب ہوتا تھا اس بدتمیز کے پاس، کہتا تھا کہ

''جیسے مقدم نے تمہارے جیسے خوار آدمی سے کر لی۔''

وہ رضا کے قریب پہنچا تو وہ چونک اٹھا۔

''ارے! تم کیوں آ گئے؟ میں لے آتا نا!'' اُسے عمر کی عادت کا پتہ تھا۔

''خیر ہے یار!۔۔۔ ویسے بھی میں بور ہو رہا ہے تھا اُن دونوں کے بیچ میں۔'' اُس نے اُسکے برابر میں، اُسی انداز میں ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں مانتا۔'' رضا نے بیساختہ کہا تو دونوں ہنس دیئے۔

''بھائی! آپکا آرڈر۔'' کاؤنٹر کے اندر سے آواز آئی، تو وہ آگے بڑھے گئے۔ سامان لے کر رضا نے بل ادا کیا اور اب دونوں آہستہ آہستہ چلتے واپس آ رہے تھے۔ عمر نے دو ڈسپوزیبل چائے کی پیالیاں پکڑ رکھی تھیں۔ جبکہ رضا نے ایک پیالی دائیں ہاتھ میں اور دوسری بائیں ہاتھ میں رکھی پراٹھے کی پلیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ دُور کرسیوں پر اُنہیں مقدّم و حسین بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

''ویسے ناشتہ کیوں نہیں کیا آج؟'' عمر نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''بس، آج دل نہیں کر رہا تھا بنانے کو۔''

''کیا مطلب؟ تم خود ناشتا بناتے ہو؟'' عمر حیران ہوا۔

''ہاں!'' آہستہ سے جواب دیا۔

''کیوں؟ اکیلے رہتے ہو؟'' حالانکہ عمر اتنے سوالات نہیں کرتا تھا، پر رضا کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی، جو سامنے والے کو اُس سے بات کرنے پر اکساتی تھی۔

''ایسا ہی سمجھ لو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، اُس مسکراہٹ میں بھی اُداسی گھلی تھی، پر اُسکے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔ سامنے سے تین لڑکوں کا گروپ چلا آرہا تھا۔ اُن میں سے ایک نے رضا کو دیکھتے ہوئے "ہیر سٹائل اچھا ہے برو" کہا اور ساتھ میں انگوٹھا اٹھا کر پسندیدگی کا اشارہ دیتے ہوئے پاس سے گزر گیا، وہ دونوں ہی بس مسکرا دیئے۔

''اتنا اُداس کیوں رہتے ہو؟'' عمر نے بیساختہ ہی سوال کیا۔

''کون؟ میں؟'' وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں!''

''نہیں نہیں۔۔۔ میری فطرت ہی ایسی ہے شاید!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو عمر نے بس سر ہلا دیا۔ وہ میز کے قریب پہنچے تو حسین اُنہیں ہی گھور رہا تھا۔

''کونسے راز و نیاز کرتے ہوئے آرہے تھے تم لوگ؟ یہاں بھوک سے مرنے ہی والا تھا میں۔''

''کونسی بھوک؟ پراٹھے تو بس رضا کے ہیں۔ تمہارے لیے چائے ہے۔'' عمر نے اُسکے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تو میں چائے کی بھوک کی بات ہی کر رہا تھا۔'' اُس نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

قریب ہی ایک اور میز پر لڑکے لڑکیوں کا گروپ بیٹھا تھا۔ اُن میں سے ایک لڑکے کے پاس گٹار تھا، اُس گٹار کی دھن پر وہ اُنہیں کوئی انڈین گانا سنا رہا تھا۔ اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے اتنی بھونڈی آواز پر بھی اُسکے گروپ والے، اس سے فرمائش کر کر کے گانا سن رہے تھے۔

''یہ سائنس والے اتنے فارغ کب سے ہو گئے؟'' حسین نے چائے کی سپ لیتے ہوئے کہا۔

''اوہنوں۔۔۔'' مقدم نے نفی میں سر ہلایا، ''سائنس نہیں، یہ آرٹس والے ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میں نے اس پر کافی غور و خوص کیا ہے اور اُسکے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر ڈیپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹس میں کوئی ایک منفرد بات ہے، جو اُنہیں باقی سب سے نمایاں کرتی ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً۔۔۔اب تم مینیجمنٹ سائنسز کے ڈپارٹمنٹز کے طالبعلموں کو دیکھو۔۔۔روبوٹ جیسی زندگی ہے انکی۔ وقت پر یونیورسٹی آئے یا نہ آئے، وقت پر یونیورسٹی سے باہر ضرور نکل جاتے ہیں۔اپنے ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی دوسری جگہ نظر آتے ہیں۔اب ہمیں ہی دیکھ لو، آج پہلی کلاس فارغ ملی ہے تو کینٹین میں بیٹھے ہیں، ورنہ کہاں وقت ہوتا ہے؟

اسی طرح جو بیچارے مارننگ پروگرام میں داخلہ لینے کے باوجود بھی شام کے پانچ بجے گھر واپس جاتے ہیں، وہ سائنس والے ہیں۔زیادہ تر وقت یہ تمہیں کینٹین میں بیٹھے کچھ نہ کچھ ٹھونستے ہوئے نظر آئیں گے یا پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باغ میں ریکٹ کھیلتے دکھائی دیں گے۔

جو سفید کوٹ پہنے خود کو ڈاکٹر ثابت کرنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے، سفید مرغیاں لگ رہے ہونگے، وہ فارمیسی والے ہونگے۔فارمیسی والے پوری جامعہ میں سب سے منفرد ہیں، کیوں کہ جیسے ہی یہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہیں انکے سفید اوور آل کو دیکھ کر لگتا ہے، جیسے کسی نے مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا ہو اور اس میں سے لاتعداد مرغیاں نکل رہیں ہوں۔

جو بیچارے اول جلول سے حلیے کو فیشن کا نام دیتے ہوئے روز نمونے بن کر آتے ہیں، وہ آرٹس والے ہیں، کبھی یہ اسپیکرز پر گانے لگا کے خود بھی ساتھ ساتھ گا رہے ہوتے ہیں، کبھی گٹار بجا رہے ہوتے ہیں یا کچھ نہیں ملتا تو چھوٹا موٹا ناٹک لگا کر اپنی اداکاری کا شوق پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کچھ کچھ تو کیمرا لیے پورا دن اپنی فوٹو گرافی کا شوق بھی یونیورسٹی میں ہی پورا کر لیتے ہیں۔عرض، یہ تمام کام کرتے ہیں سوائے پڑھائی کے۔۔۔

اور آخر میں آتے ہیں لٹریچر ڈیپارٹمنٹ والے، انکے یہاں کے لڑکے ہمیشہ شلوار قمیض پر، ایک کندھے پر لیپ ٹاپ بیگ جیسا بستہ ڈالے، جون ایلیا جیسے لمبے بالوں میں نظر آئیں گے۔''اس نے ایک ساتھ پوری جامعہ کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔وہ لوگ ہنسنے کے ساتھ ساتھ اس سے متفق بھی نظر آرہے تھے۔

''اوئے خبردار!۔۔۔جون ایلیا کا مذاق نہ بنانا۔'' پاس ہی ایک اور میز پر بیٹھے دو لڑکوں میں سے ایک نے برا منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔یقیناً اس نے انکی گفتگو پوری پوری ملاحظہ کی تھی۔

''میری مجال جو میں ایسا کروں؟ میں تو پہچان کروانے کے لیے کہہ رہا تھا'' مقدم نے جواب دیا۔وہ دونوں لڑکے انکی کلاس کے ہی تھے، انکے نام ٹھیک سے معلوم نہ تھے ابھی۔

''ویسے کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو، بس میرے دوست کو اردو شاعری سے عشق ہے۔بھلے سے شاعری ایک بھی صحیح سے یاد ہو نہ ہو، لیکن پھر بھی اسکی محبت میں ذرا کمی نہیں آتی'' اُسکا دوست جو فرائیز کھا رہا تھا، اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''اسی کو تو محبت کہتے ہیں۔''حسین نے کہا تو سارے ہنس دیئے، سوائے شاعری کے عاشق کے جو برے برے منہ بنا رہا تھا۔

''ویسے مجھے نوید عالم کہتے ہیں۔''فرائیز والے لڑکے نے لگے ہاتھوں اپنا تعارف کروایا۔

''کہتے ہونگے، نام کیا ہے؟ یہ بتاؤ۔''مقدم نے کہا تو وہ مسکرایا۔

''نام بھی یہی ہے بھائی!''

''اور تمہارا کیا نام ہے؟ بانو قدسیہ؟''حسین نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔

''علی نام ہے میرا۔۔ علی سفیر!''اس نے چبا چبا کر کہا۔ پھر بقایا تعارف کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ سارے ساتھ بیٹھے تھے۔ لگتا نہیں تھا جیسے ابھی ملے ہوں۔

----------+----------+----------

''تم لوگوں کے ناشتے کے چکر میں، ہم سارے لیٹ ہو گئے ہیں کلاس سے۔''وہ لوگ بھاگتے بھاگتے ڈیپارٹمنٹ پہنچ رہے تھے، کیونکہ اُنہوں ناشتہ کرنے سائنس ڈیپارٹمنٹ کی کینٹین کا رخ کیا تھا، اب واپسی پر دیر ہو گئی تھی۔

''ہمارے ناشتے نہیں، تمہارے جون ایلیا کی وجہ سے۔''عمر نے علی کو جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا رضا نے دونوں کو ٹوک دیا۔

''اب لڑو تو مت!''

''یار! سر کو کیا جواب دیں گے؟''نوید کو ٹیچر کی فکر ہو رہی تھی۔

''فکر نہ کرو! میں ہوں نہ ساتھ، سنبھال لوں گا۔''سب سے زیادہ پر سکون حسین تھا۔

''تم ساتھ ہو یہی تو فکر ہے۔''رضا نے کہا۔ جب وہ لوگ بھاگتے دوڑتے، گرتے پڑتے، ڈیپارٹمنٹ پہنچے، تو کلاس شروع ہو چکی تھی۔ وہ پیچھے والے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔

''کیا کرنا ہے اب؟''علی نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے، جیسے ہی سر اپنا چہرہ وائٹ بورڈ کی جانب کریں گے۔ ہم جلدی سے جا کر آخری والی رو میں بیٹھ جائیں گے۔''حسین نے منصوبہ بتایا۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔''سب سے پہلے عمر کے اندر کا اچھا انسان جاگا تھا۔

''اس نیک روح کو باہر ہی چھوڑ دیتے ہیں اور ہم اندر چلتے ہیں۔''مقدم نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو اس نے منہ بسورا۔

''ہم خاموشی سے جا کر اندر بیٹھ بھی گئے تو کیا سر کو کلاس میں ایک ساتھ چھ لوگوں کا اضافہ نظر نہیں آئیگا؟''رضا نے پتے کی بات کی تھی۔

''یار! ایک تو تم لوگ کوئی کام ہونے سے پہلے ہی اُسکا ستیاناس مار دیتے ہو۔ کچھ نہیں ہو گا، حسین! میں تیار ہوں تمہارے ساتھ اندر جانے کو۔''نوید نے پہلے عمر اور رضا کو، پھر حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اندر جانے کی نوبت ہی نہ آئی، استاد صاحب نے انکی سرگوشیوں پر نظریں اٹھا کے پیچھے والے دروازے کی جانب دیکھا تو دروازے سے حسین کا چہرہ دکھائی دیا۔

''حسین۔۔۔''انہوں نے اُسے پکارا۔

''مارے گئے۔''علی نے ناخن چبائے تھے۔

''جی سر؟''اس نے نہایت ہی ادب کے ساتھ، دروازے سے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''سر! دراصل میں اور میرا دوست لیٹ ہو گئے ہیں، تو ہم باہر کھڑے آپکی اجازت کے منتظر ہیں۔''اس نے ادب سے کہا۔

''کون ہے تمہارا دوست؟''انہوں میں چشمے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''سر یہ۔۔۔''اس نے بنا دیکھے ہاتھ بڑھایا اور جو پہلا بندہ ہاتھ لگا، اُسے ہی اپنے سامنے کر دیا۔

''اوہ! عمر حفیظ۔۔۔ تو تم دونوں لیٹ ہو؟''سر نے بغور دیکھا۔

''نہیں سر! ساتھ میں اِسکا دوست بھی لیٹ ہے۔''حسین نے کہا تو کلاس میں کھی کھی کی آوازیں آنے لگی۔

''کون ہیں وہ صاحب؟ ذرا آگے کریں اُنہیں بھی۔''

اب کہ حسین نے بائیں ہاتھ سے نوید کو گدّی سے پکڑا اور اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ خود وہ اُن دونوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''السلام وعلیکم سر!''نوید نے دانت نکالیں۔

''ساتھ میں اِسکا دوست بھی ہے کیا؟''استاد صاحب نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بڑی فرصت سے پوچھا۔

''آپکو کیسے پتہ سر؟'' حسین نے حیرت کی انتہا کے ساتھ کہ، تو ایک بار پھر پوری کلاس میں ہنسی کا فوارہ اُبلا تھا۔ جبکہ استاد صاحب نے بھی اپنی مسکراہٹ چھپانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

''انکا دیدار بھی کراؤ!'' اُنہوں نے فرمائش کی۔

''اب میرا ہاتھ خالی نہیں ہے۔ ایسا کرو تم خود ہی آجاؤ!'' اس نے علی کی طرف منہ کر کہ کہا، پوری کلاس اپنے اپنے چہرے پیچھے موڑے آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ یہاں سے اُنہیں باقی تینوں نظر نہیں آرہے تھے۔ علی اُسے گھورتا ہوا کلاس کے اندر داخل ہوا اور ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

''تم چار ہی ہو یا اور بھی ہیں؟'' اُنہوں نے تصدیق کرنی چاہی۔

''سر! ایسا ہے کہ ہم دونوں (انگلی سے عمر اور خود کی طرف اشارہ کیا) کے ایک ایک دوست اور بھی ہیں۔'' اب کے وہاں قہقہ گونجا تھا، اور ان قہقہوں میں استاد صاحب نے دوبارہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے مقدم اور رضا نے جھانکا۔

''آجائیں اندر آپ دونوں بھی۔'' اُنہوں نے، اُنہیں بھی دعوت دی۔ اب وہ سارے ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔

''تو بتانا پسند کرینگے آپ لوگ کہاں تھے؟'' اُنکے پاس آج کافی فرصت تھی۔

''سر! ہم کینٹین میں تھے۔'' کسی کے بھی کچھ بھی کہنے سے قبل ہی عمر بول پڑا۔ باقی پانچوں نے اُسے ایک ساتھ گھورا تھا۔ کیا تھا جو کہہ دیتا کہ ہم لائبریری میں بیٹھے پڑھ رہے تھے؟ لیکن نہیں، جناب کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ نہیں ہونا تھا۔

''سر! وہاں سے آنے میں دیر ہو گئی۔'' مقدم نے بات کو ذرا سا گھمایا۔

''وہ کیسے؟'' وہ لگتا تھا آج چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''سر! ہم آرہے تھے کہ راستے میں ایکسڈنٹ ہو گیا۔'' مقدم نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے؟'' اب کہ وہ واقعی پریشان ہوئے تھے۔

''ہم وہی معلوم کرنے تو رکے تھے۔'' مقدم نے بے ساختہ کہا تو کلاس میں ایک بار پھر ہنسی کا طوفان اٹھا تھا۔ استاد صاحب نے سارو ں کو گھورا۔

''انسان بن جاؤ تم لوگ، یہ پہلی بار ہے اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، تو وہ لوگ بھی اچھے بچوں کی طرح پیچھے والی رو میں ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

----------+----------+---------

''تو تم اکلوتے ہو؟''مقدم نے آخری سموسہ پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے، علی سے پوچھا تھا۔

''ہاں!''اُس نے کیچپ میں فرائیزڈ بوتے ہوئے جواب دیا۔

''اکلوتا ہونا بھی ویسے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔''عمر نے رشک سے کہا۔

''یہ تمہارا تجربہ ہے یا تجزیہ؟''مقدم نے پوچھا۔

''مشاہدہ!''اس نے جواب دیا۔

''بہت غلط مشاہدہ ہے تمہارا، مجھ سے پوچھو ذرا، میں تو کہتا ہوں کہ بندہ کھوتا (گدھا) ہو مگر اکلوتا نہ ہو۔''علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اور جو دونوں ہو؟''حسین نے پوچھا۔

''اُسے علی کہتے ہے۔''مقدم نے فقرہ مکمل کیا تو وہاں قہقہہ پڑا۔

''شٹ اپ!''علی نے بہت ہی سڑا ہوا منہ بنایا تھا۔ تین ہفتے ہو گئے تھے اُن سب کو ایک دوسرے کے ساتھ۔ کافی حد تک ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہونے کے بعد آج تفصیلی تعارف کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

''تم بتاؤ نوید؟''

''میں ایڈاپٹیڈ (لے پالک) ہوں۔''اس نے کہا تو ایک لمحے کو سب خاموش ہوئے۔

''میرے کہنے کا مطلب مڈل چائلڈ ہوں۔''اُن سب کو سنجیدہ دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''حد ہے بھئی۔۔۔''

''مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن۔''اس نے تعارف مکمل کیا۔

''میرے ایک ابّو اور ایک امی ہیں۔''حسین نے درمیان میں اپنے تعارف شروع کر دیا تھا۔

''سب کے ایک ہی ہوتے ہیں۔''علی نے جیسے اُسے سمجھایا تھا۔

''سب کے ایک نہیں ہوتے، میری دو امیاں ہیں۔''مقدم نے بیچ میں کہا۔

''کیسے ؟''

''ابّا نے دو شادیاں کر رکھی ہیں، ایک یہاں اور ایک سوات میں، مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں بھی انکا ایک بیٹا ہے۔ مجھ سے چار ماہ بڑا۔''اس نے بتایا۔

''مطلب تم اکلوتے نہیں ہوئے ؟''نوید نے پوچھا۔

''کہہ سکتے ہو۔''

''یعنی علی اکلوتا کھوتا ہے ؟''حسین نے پوچھا تو کافی سنجیدگی سے تھا، لیکن ایک بار پھر، وہاں قہقہ زوروں کا پڑا تھا۔ علی نے اُسے تھپڑ بھی کافی زور کا ہی رسید کیا تھا۔

''اور رضا تم بتاؤ؟''عمر نے کافی دیر سے خاموش رضا کو مخاطب کیا۔اُنکی گفتگو کے دوران وہ ایسے ہی خاموش رہتا تھا کہ کبھی کبھار اُسکی وہاں موجودگی کا بھی احساس نہ ہوتا۔

''میں اکیلے رہتا ہوں۔''

''گھر والے کہاں رہتے ہیں؟''

''کینیڈا!''

''تم ساتھ کیوں نہیں رہتے ؟''

''وہ رکھنا نہیں چاہتے۔''اس نے کہا تو آہستہ تھا لیکن سناسب نے تھا۔اور یہ اُسکی پہلی غلطی تھی، اُس نے نہ جانے کیسے یہ کہہ دیا؟

''کیوں ؟''نوید کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''پتہ نہیں!''اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے جھک کر سموسے کی پلیٹ اٹھائی، صاف نظریں چرائیں۔اس سے آگے کسی نے کچھ نہ پوچھا، اتنی اخلاقیات تو تھیں اُن میں کہ اگر وہ نہیں بتا رہا تو وہ بھی نہ پوچھے۔

''میرا ایک بھائی ہے، مجھ سے ایک سال چھوٹا۔اور میرا سب سے اچھا دوست بھی وہی ہے۔''عمر نے ماحول میں چھائے بوجھل پن کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''اور میرے چار بھائی ہیں۔اور سارے میرے دشمن،ایک آنکھ نہیں دیکھنا چاہتے مجھے۔'' یہ حسین تھا۔

''حرکتیں ہی ایسی ہیں تمہاری،ناک میں دم کر کے رکھتے ہو گے تم سب کی۔'' علی نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔

''میں سب سے چھوٹا ہوں نا اور اپنے ماں باپ کا لاڈلہ،اسی لیے جلتے ہیں سارے مجھ سے۔''اس نے مصنوعی مظلومیت چہرے پر سجاتے ہوئے کہا،جسکا کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔

اس دن کے بعد وہ لوگ ہر جگہ ساتھ ہی پائے جانے لگے تھے۔لائبریری میں ساتھ،کینٹین میں ساتھ،کلاس میں ساتھ،گروپ ٹاسک میں ساتھ،کھیل میں ساتھ عرض وہ جہاں ہوتے،ساتھ ہی ہوتے تھے۔دیکھنے میں لگتا تھا کہ وہ اپنا گینگ بنا کر چل رہے ہیں۔

----------+----------+---------

اتوار صبح دس بج کر تین منٹ،مورخہ چھ جنوری:

اور آج پورے دس سال بعد وہ یہاں تھا،اُسکی نظروں کے سامنے،بہت سے سوال تھے اس کے پاس کرنے کو،لیکن کیسے کرتا؟اور کیا پوچھتا؟دس سالوں کا فاصلہ تھا درمیان میں۔۔۔وہ بدل گیا تھا۔بہت بدل گیا تھا۔کتنی خاموشی تھی اُسکے چہرے پر،کتنی سنجیدگی۔۔۔آخر کیا ہوا تھا اُسکے ساتھ؟کہاں چلا گیا تھا وہ؟یہ اُسکا مقّی تو نہیں تھا،یہ تو مقدم شفیق تھا۔ایک کامیاب بزنس مین،عمر نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس سے کوئی سوال نہیں کریگا۔

یہ بھی بہت تھا کہ وہ اسے پہچانتا تھا۔

یہ بھی بہت تھا کہ وہ اسے بھولا نہیں تھا۔

اور یہ بھی بہت تھا کہ عمر نے اپنی زندگی میں اُسے صحیح سلامت دیکھ لیا تھا۔

کمرے میں دو نفوس کے موجود ہونے کے باوجود بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن کہتے تو کیسے؟زبان ساتھ دینے سے انکاری تھی۔فضاء میں چھائے اس سکوت کو دروازے کی چڑچڑاہٹ نے توڑا تھا۔آواز پر دونوں ہی نے سر اٹھا کر دیکھا تھا لیکن آنے والے کی نظر سب سے پہلے دروازے کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھے عمر پر گئی تھیں۔

''عمر!۔۔۔تم یہاں؟''صوفے پر اُسکے برابر بیٹھتے ہوئے،اس نے حیرت سے پوچھا تھا،جبکہ خود عمر کی حیرت زدہ نظروں میں بھی یہی سوال تھا۔

''مجھے کسی کیس کی تفتیش کے لیے بلایا گیا ہے۔''اس نے کہا۔

''مجھے بھی۔۔۔''اس نے سر ہلاتے ہوئے کہااور اسی لمحے اُسکی نظریں مقدم تک گئی تھیں۔اس نے حیرت سے پلٹ کر عمر کو دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ یہاں کیسے ؟لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔کیسے دیتا؟وہ خود کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ابھی کچھ ہفتے پہلے بھی وہ تینوں ایک ساتھ تھے۔پورے دس سال بعد اور یقیناً اُس ملاقات کا مقدم کو اب تک علم نہ تھا۔ہوتا تو وہ کچھ جتاتا ضرور، یا شاید جان کر انجان تھا۔

اور آج ؟آج وہ تینوں پھر ساتھ بیٹھے تھے۔کیوں ؟کس لیے ؟کسی کے پاس جواب نہ تھا۔مقدم کی نظریں اٹھی تھیں اور اسی لمحے علی نے بھی اُسے دیکھا، دونوں کی نظریں ملیں۔بہت دیر خاموشی چھائی رہی جیسے دونوں ہی بات کے آغاز کے لیے الفاظ تلاش رہے ہوں۔

''کیسے ہو مقدم ؟''بلآخر اس نے خود ہی سوال کیا تھا۔

''میں ٹھیک۔۔تم کیسے ہو ؟''اس نے ہلکے سے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔۔''اس نے رسمی سے انداز میں جواب دیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اُسکی نظریں بلاارادہ ہی عمر تک گئی اور واپس پلٹنا بھول گئی۔عمر اُسے ہی دیکھ رہا تھا یا شاید جانچ رہا تھا۔اُسکی ایک ہی نظر نے علی کو اندر تک ہلا دیا تھا۔کیا کچھ نہیں تھا اُسکی نظروں میں ؟ملامت، تاسف، افسوس اور شاید طنز بھی۔۔۔کہ یہ تم پوچھ رہے ہو علی ؟تم ؟کس منہ سے اُسکا حال احوال دریافت کر رہے ہو ؟غیر محسوس انداز میں علی کا چہرہ جھک گیا تھا۔

اُن رسمی سے جملوں کے تبادلے کے بعد، اُن تینوں کے درمیان اور کوئی بات نہ ہوئی۔علی کی نظریں نیچے ماربل کے فرش پر ٹکی تھیں۔اس نے دانستہ نگاہیں دوبارہ نہیں اٹھائی تھیں، شاید ڈر تھا کہ کہیں دوبارہ سامنا عمر سے نہ ہو جائے، وہ اُسکی ملامتی نظریں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ماربل کے فرش پر مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ڈیزائین بنے تھے۔اُن پتھروں میں اُسے بہت سارے مناظر اُبھرتے دکھائی دے رہے تھے۔بہت ساری شناسا آوازیں اس خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ مناظر اور آوازیں پورے کمرے میں چھانے لگے۔

وہ سب کہیں غائب ہونے لگے اور علی، عمر اور مقدم اُن مناظر کا حصہ بن گئے۔

----------+----------+----------

چودہ سال پہلے:

''یار میں کیا کروں ؟کوئی مجھے سنجیدہ لیتا ہی نہیں گھر میں۔''اس نے کوئی ساتواں کباب اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے دکھ سے کہا تھا۔عمر ایک کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹکائے، اُسی ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنا دایاں گال رکھے، پوری سنجیدگی سے اُسکی دکھی داستان سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان کبابوں پر فاتحہ بھی پڑھ رہا تھا، جو اُسکی آنکھوں کے سامنے سے مقدم کی پلیٹ میں اور پھر وہاں سے سفر کرتے ہوئے اُسکے پیٹ تک گئے تھے۔مقدم صاحب پر تازہ تازہ عشق کا بھوت سوار

ہوا تھا، اپنی کزن لیلیٰ سے اور کزن بھی وہ جسکی ماں سے مقدم کی امّاں کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُسے تو اپنی داستان شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''تم بتاؤ مجھے کہ میں کیا کروں؟'' اُس نے کوئی ایک ہزار اکیسویں مرتبہ پوچھا تھا، کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

''بتایا تو ہے کہ گھر میں بات کرو۔'' عمر نے آٹھواں کباب اُسکی پلیٹ میں جاتے دیکھ کر ضبط کے گھونٹ بھرے تھے۔

''کی تھی بات، ابّا تو بخوشی راضی ہیں کہ لیلیٰ انکی اکلوتی بھتیجی ہے۔ لیکن جیسے ہی امّاں سے بات کرنے گیا اس سے پہلے ہی انہوں نے اپنی نند پلس میری پھوپھو اور مستقبل کی ساس، کے ظلم و ستم کی وہ داستان سنائی کہ میں نے اپنا فیصلہ ہی ملتوی کر دیا۔'' نواں کباب۔۔

''کیا تمہاری پھوپھو واقعی بہت ظالم ہیں؟''

''نہیں یار! ایسی بات نہیں ہے۔ میری امّاں کی شروع دن سے ہی میرے ددھیال والوں سے نہیں بن سکی بلکہ اُنہیں ہر وہ انسان اچھا لگتا ہے، جو انکے سسرال کے خلاف ہو۔'' دسواں کباب۔

''تم سب سے پہلے لیلیٰ سے بات کر کے دیکھو، پہلے اُسے تو معلوم ہو کہ تم اُسے پسند کرتے ہو۔''

''اُسے معلوم ہے۔''

''کیا واقعی؟'' عمر سیدھا ہو بیٹھا، یہ نیا انکشاف تھا۔

''ہاں! اور اُسکی امّاں یعنی میری پھوپھو بھی، مجھے اتنا ہی ناپسند کرتی ہیں جتنا کہ میری امّاں لیلیٰ کو۔''

''واہ بھئی! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔'' عمر نے کہا تو وہ مسکرایا۔

''خیر! اب کسی طرح امّاں کو راضی کرنا ہے۔'' اس نے پریشانی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''کہو تو اور کباب منگوا دوں؟'' عمر نے اچانک ہی پوچھا۔

''کیا؟'' اس نے ناسمجھی سے پوچھا، پھر خالی پلیٹ پر نظر پڑتے ہی خجل ہوا۔

''لگتا ہے میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہوں۔''

''نہیں! زیادہ نہیں، بس دس کباب ہی تھے۔''اس نے اطمینان سے کہا۔

''بد تمیز آدمی! میرے نوالے گن رہے تھے تم؟''وہ چلایا۔

''جب اپنے نوالے نہیں ملے، تو نظریں خود بخود تمہارے نوالوں پر چلی گئیں۔''اس نے مزے سے کہا تو مقدم نے اُسے گھورا۔

''چلو یار! بہت دیر ہو گئی ہے اب میں چلتا ہوں۔''اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''برا تو نہیں مان گئے؟''''عمر نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''تمہاری باتوں کا میری جوتی بھی برا نہیں مانتی، میں پھر آؤنگا اور اگلی بار آنٹی سے دس کی جگہ بیس کباب فرائی کروا کے کھاؤں گا۔ بے شک تم بیٹھے گنتے رہنا۔''وہ ڈھٹائی سے کہتے ہوئے کھڑا ہوا تو عمر ہنس دیا۔ آج وہ اُسکے گھر آیا تھا، ہمیشہ کی طرح اپنے اور لیلیٰ کے مسئلے کا کوئی حل نکالنے، مگر آج کا دن بھی بے سود گیا تھا۔ کوئی حل سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑا تو عمر نے اچانک ہی اُسے آواز دی۔

''آغا۔۔۔''وہ اکثر اُسے آغا کہہ کر پکارتا تھا، اور ایسا صرف وہی کرتا تھا۔ باقی ساروں نے تو اس کے نام کو توڑ مروڑ کر مقدم سے مقّی بنا دیا تھا۔

''ہاں؟''وہ رکا۔

''پریشان نہیں ہونا، کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔''اس نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔ اُسکا یہ دوسروں کی فکر کرنے والا مزاج ہمیشہ سے اُسے ہر دل عزیز بناتا تھا۔

''جو کام آپکا بھائی کر نہیں سکتا، اُسکے لیے کبھی حامی نہیں بھرتا اور ایسا ہوا ہے کبھی، کہ جو کام میں کرنے کی ٹھان لوں وہ ادھورا چھوڑ دوں۔''اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکراتا تھا تو اُسکی آنکھیں بھی ساتھ مسکراتی تھیں۔ عمر نے نفی میں سر ہلایا اور ہنستے ہوئے اُسکے گلے لگ گیا۔

----------+----------+----------

شام کا وقت تھا، وہ کرکٹ میچ جیت کر، گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی باغیچے میں چادر بچھائے خضر پش اپس لگاتا نظر آیا۔

''کچھ نہیں ہونا ان پش اپس سے، وزن تمہارا ایک انچ بھی کم نہیں ہونا۔''عمر نے اُسکے پاس آتے ہوئے اُسے چھیڑا۔

''کالے ہو جاؤ میری فٹنس سے جل جل کے۔''اس نے ورزش کے بیچ میں ہانپتے ہوئے کہا۔

''کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں۔''عمر نے مزید دل جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''دل والے سے یاد آیا، آپکی جولیٹ صبح سے چھ مرتبہ گھر کے چکر لگا چکی ہیں۔''اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''معلوم نہیں، مجھے نہیں بتا رہی، کہتی ہے میرا رومیو آئیگا تو اُسے ہی بتاونگی۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ڈمبل اٹھا لیے۔

''کوئی اہم بات ہو گی۔''عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں لان کے برابر والی دیوار سے کسی کا سر نمودار ہوا۔

''لو!۔۔۔شیطان کا نام لیا اور اُسکی خالہ حاضر۔''خضر نے ساتھ والی دیوار سے جھانکتی عمارہ پر چوٹ کی تھی۔دونوں گھر کے لان کی دیواریں جڑی ہونے کے باعث، وہ اکثر یہیں سے رابطہ کر لیا کرتی تھی۔

''تم چپ کرو!''اس نے خضر کو گھورا تو وہ شرافت سے دونوں ہاتھوں سے ڈمبلز پکڑے ورزش کرنے لگا۔

''اور تم کہاں تھے صبح سے؟''اب اُسکا رخ عمر کی جانب تھا۔

''یونیورسٹی میں۔''کرکٹ والی بات نہیں بتائی۔

''وہ تو مجھے بھی پتہ ہے لیکن شام کے چھ بج رہے ہیں۔اتنی دیر تک کیا کر رہے تھے یونیورسٹی میں؟تمہارا تو ڈیڑھ بجے آف نہیں ہو جاتا؟''اس نے مشکوک نظروں سے پوچھا تو وہ لمحے بھر کو گڑبڑایا۔جبکہ خضر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''ابھی سے شروع ہو گی تفتیش، سوچ لے بھائی! ابھی بھی وقت ہے، ورنہ ساری زندگی ایسے ہی جواب طلبی ہوتی رہے گی۔''

''تم چپ کرو۔''اس نے پہلے خضر کو کہا اور پھر عمارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''یار! میرا ففتھ (پانچواں) سیمسٹر چل رہا ہے۔دیر سویر ہو جاتی ہے۔کام بھی زیادہ ہوتا ہے آج کل۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا جب ایک بجے آف ہو گیا تھا، تو میں تمہارے ڈیپارٹمنٹ آئی تھیں، تم سے بات کرنے، مجھے حسین ملا اور اس نے بتایا کہ تم اور تمہارا جگری یار مقدم ریسٹورنٹ گئے ہوئے ہو کھانا کھانے۔''عمر کی سیٹی گم ہو گئی۔

''نہیں وہ۔۔۔اصل میں۔''اُس سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔

''تمہیں میں نے صبح کہا بھی تھا کہ ضروری بات کرنی ہے، لیکن نہیں جناب کو یاد ہی نہیں تھا۔ جاؤ جا کر اپنی دوستیاں نبھاؤ۔''غصّے سے کہہ کر جانے کے لیے مڑی۔

''ارے۔۔۔ عمارہ رکو تو۔۔۔۔''اس نے پیچھے سے کہا۔ حسین کو تو وہ بعد میں پوچھے گا۔

''مجھ سے قسم لے لو، میں اور آغا پیپرز پرنٹ کروانے گئے تھے۔ حسین کو تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔''اِس بات پر وہ واپس مڑی اور خفگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''لیکن تم گئے تو تھے ناحالانکہ میں نے آج تم سے ضروری بات کرنی تھی۔''

''اس وقت تم دونوں رومیو جولیٹ کے بجائے میاں بیوی لگ رہے ہو۔''خضر کی زبان پھر پھسلی تھی۔

''بار بار یہ رومیو جولیٹ کہنا بند کرو، اُن دونوں کے بیچ میں سماج کی دیواریں تھی۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔''عمر نے اُسے بتایا۔

''دیوار تو ہے بیچ میں۔''اس نے کہا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

''بتاؤ کیا بات کرنی تھی؟''اس نے خضر کو نظر انداز کرتے ہوئے عمارہ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں! اب بتا دو وہ بات جسکی خاطر صبح سے دس بار گھر آ کر پکوڑے اور کباب کھا چکی ہو۔''اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی خضر صاحب کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔

''میں دس بار آؤں یا سو بار تمہیں کیا تکلیف ہے؟''اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے لڑاکا انداز میں پوچھا۔

''جب سے پیدا ہوئی ہو ہمارے گھر میں ہی پھرتی رہتی ہو، مجھے تکلیف نہیں ہو گی تو کس کو ہو گی؟''اُدھر سے بھی دوبدو جواب آیا تھا۔

''تم چھوڑو اس پاگل کو، مجھے بتاؤ کیا ضروری بات تھی؟''عمر نے اس لایعنی بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

''پہلے اپنے ذلیل بھائی کو ہٹاؤ یہاں سے، اسکے سامنے نہیں بات کرنی مجھے۔''

''کیوں؟ ایسے کونسے عہد و پیمان ہیں جو میرے سامنے نہیں ہو سکتے؟ میں تو نہیں جا رہا کہیں۔''وہ بھی عمر کے کندھے پر بازو ٹکاتے ہوئے، وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

''بد تمیز!''عمارہ نے بس اتنا ہی کہا پھر عمر کی جانب متوجہ ہوئی۔

''عمر! میرا نانا، رشتہ آیا ہے۔''اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے مسئلہ بیان کیا۔دوسری جانب خضر پانی کی بوتل منہ سے لگائے، انکی گفتگو ملاحظہ کر رہا تھا۔

''وہ تو پہلے بھی آتے رہے ہیں۔تم منع کر دو۔''عمر نے فوراً سے حل پیش کیا۔

''میں اور کتنی بار منع کروں؟میرے ماں باپ بھی اب مجھ سے ناراض ہونے لگے ہیں۔اور اس بار تو میں انکار نہیں کر سکتی وہ میری پھوپھو کا بیٹا ہے۔''

''لو بھئی۔۔۔ایک تو یہ پھوپھو کا بیٹا ہمیشہ آجاتا ہے رنگ میں بھنگ ڈالنے۔''خضر نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار! میری پوزیشن بھی تو سمجھو، ابھی میری تعلیم چل رہی ہے، اس وقت میں گھر میں اپنی شادی کی بات کیسے کر سکتا ہوں؟''عمر نے بیچارگی سے کہا۔

''شادی کی نہیں رشتے کی بات تو کر سکتے ہو نا؟میں کچھ نہیں جانتی عمر، اس بار تمہاری طرف سے ہی کوئی بات ہو گی، تب ہی میں اپنے گھر والوں کو منع کر سکتی ہوں۔ورنہ تم بیٹھے رہو اور ہو جانے دو میری منگنی کسی اور سے۔''وہ غصّے سے کہتی دیوار کے پیچھے گم ہو گئی اور وہ بیچارہ "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا۔

''لو! آگئی سماج کی دیوار۔''خضر نے ہنستے ہوئے اُسکے کندھے پر ہاتھ مارا تو عمر نے اسے گھورا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

''اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''خضر نے کہتے ہوئے دوبارہ پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

----------+----------+---------

''ریسرچ پیپر زپرنٹ کروالیئے؟''عمر نے رضا سے پوچھا تھا۔وہ دونوں اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے باہر بیٹھے تھے۔انکے امتحانات تھے، لہٰذا ریسرچ ورک زور و شور سے جاری تھا۔

''کہاں یار؟صبح سے باقی چاروں کے کام کو کمپائل (مرتب) کر رہا تھا۔وقت ہی نہیں مل سکا''اس نے لیپ ٹاپ پر انگلیں چلاتے ہوئے، مصروف سے انداز میں کہا۔

''اوہو، چلو پھر تم بیٹھو میں سامنے اسٹیشنری سے پیپر زپرنٹ کروا کر آتا ہوں۔''وہ کھڑا ہوا۔

''یو ایس بی ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں!''وہ کہہ کر ڈیپارٹمنٹ سے باہر آیا، سامنے سڑک کی دوسری جانب ہی مینیجمٹ سائنس والوں کی اسٹیشنری تھی۔ وہ سڑک پار کر کے اسٹیشنری کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا، کہ جب ہی اچانک ایک لڑکا اس سے بری طرح ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ عمر اس سے معذرت کرتا یا کچھ کہتا وہ بنا رکے اُسی انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

''رکو! بات تو سنو۔''عمر نے اُسے پکارا، مگر وہ نہ رُکا۔ اُسی وقت ایک دوسرا لڑکا خاصی عجلت میں اُسکے پاس آیا اور شرمندہ لہجے میں بولا۔

''سوری یار! میرا دوست دیکھ نہیں سکتا ہے، ہمیشہ میں اُسکے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ ابھی ذرا پیچھے رہ گیا تھا تو وہ خود ہی چل پڑا۔''وہ لڑکا کہہ کر عمر کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ عمر کتنی ہی دیر حیرت زدہ سا وہاں کھڑا رہا تھا۔ پچھلے ڈھائی سالوں میں اُس نے جامعہ میں بہت سارے معذور افراد دیکھے تھے، جو اپنی معذوری کو پس پشت ڈالے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مگر کسی نابینا طالب علم سے اُسکا پہلی بار سامنا ہوا تھا۔

''پھر ہم کس بات پر ناشکرا پن کرتے ہیں؟''اس نے سوچا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پیپر زپرنٹ کروا کر دوبارہ وہیں آ بیٹھا، جہاں رضا تو پہلے سے ہی موجود تھا مگر اب وہاں نوید کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ اس نے پیپرز نوید کے حوالے کیے جو پہلے سے ہی کچھ کاغذات فائل میں ترتیب دے رہا تھا۔ خود وہ خاموشی سے وہیں بیٹھ گیا۔ خیالوں کی رو بھٹک کر اُسی لڑکے تک جا پہنچی تھیں۔ نوید نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا اور پھر مصروف سے انداز میں اس سے پوچھا۔

''تمہیں کیوں خاموشی کے دورے پڑ گئے آج؟''

''ایک لڑکے کو دیکھا ابھی، وہ دیکھ نہیں سکتا مطلب نابینا ہے۔ اسی یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ ہے۔''

''اُسکے ساتھ ایک اور لڑکا بھی ہو گا، جو اُسکا دوست ہو گا اور اُسے سہارا دے کر لے جا رہا ہو گا۔''نوید نے پوچھا، نظریں اُسکی البتہ فائل اور کاغذات پر ہی تھیں۔ وہ حیران ہوا۔

''تم جانتے ہو؟''

''ہاں!۔۔۔ وہ نواز ہو گا یقیناً۔''اُس نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''تم کیسے جانتے ہو اسے؟''عمر حیران ہوا۔

''ہمارے پوائنٹ میں آتا ہے، انگلش لٹریچر (انگریزی ادب) میں آنرز کر رہا ہے۔''

''لوگ کیسی کیسی آزمائشوں میں ہیں۔''اس نے ہلکے سے کہا،تو اتنی دیر میں پہلی بار رضا نے انظریں اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔اُسکی ہر ایک کے لیے فکر مند ہونے والی عادت نے اُسے ہمیشہ پریشان ہی رکھنا تھا۔

''آزمائش تو ہے لیکن اسکا دوست،جو اُسکے پڑوس میں رہتا ہے۔وہ اُسے ساتھ لے کر آتا ہے اور سارا دن ساتھ ہی رہتا ہے اُسکے۔بہت اچھا انسان ہے۔نواز سے میری جب بھی بات ہوئی ہے،وہ ہمیشہ ہی اُسکی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آج میں پڑھ پا رہا ہوں تو یہ صرف میرے دوست کی سپورٹ ہے۔'' نوید نے تفصیل سے بتایا۔

''کتنے اچھے لوگ موجود ہیں دنیا میں،مجھے خوشی ہوتی ہے اُن لوگوں کو دیکھ کے جو بنا کسی رشتے کے بے لوث ہو کر دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔''عمر نے تعریف کی۔

''واقعی۔۔۔''نوید نے اُسکی بات سے اتفاق کیا تھا۔

''کوئی بے لوث نہیں ہوتا کسی کے لیے بھی،سگے رشتے نہیں ہوتے تو غیر کیسے ہونے لگے؟سب کا اپنا مفاد ہوتا ہے کہیں نہ کہیں۔''لیپ ٹاپ پر سر جھکائے رضا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔اُن دونوں نے اُسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو،اُسکے بعد خاموشی سے سر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔رضا اکثر اوقات ایسی ہی کوئی تلخ بات کہہ دیتا تھا،جس سے اگر وہ اختلاف کرتے بھی تو اُسکے پاس،خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سے جواز موجود ہوتے تھے۔عام حالات میں وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا،لیکن اس ایک موضوع پر وہ بحث کر لیتا تھا۔اب تو وہ عادی ہو چکے تھے اس چیز کے،لہٰذا خاموش ہی رہے۔

''تم بتاؤ،گھر والوں سے بات کی عمارہ کے لیے؟''نوید نے گفتگو موضوع ہی بدل دیا۔

''ابھی نہیں کی،ذرا ریسرچ سے فارغ ہو جاؤں پھر موقع دیکھ کر بات کرتا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔عمارہ کے ذکر پر تو وہ گھنٹوں بات کر سکتا تھا،لیکن ابھی اُسکا خود کا دل اداس ہو گیا تھا۔اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ رضا اتنا نالاں کیوں ہے دنیا سے؟رشتوں اور انسانیت سے اُسکا اعتبار کیوں اٹھ گیا تھا آخر؟ایسا کیا کیا ہے زندگی نے اُسکے ساتھ؟لیکن وہ تھا کہ کچھ بتاتا ہی نہ تھا۔

''چلو بیسٹ آف لک(اچھی قسمت ہو)۔''نوید نے خوش دلی سے کہا تو اس نے بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

----------+----------+----------

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کیا کروں؟''عمر پریشانی سے اُسکے برابر آ بیٹھا۔

''عجیب ہی کوئی چول انسان ہو تم۔'' برابر میں نیم دراز خضر نے سلاد کھاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جسے تم حل ہی نہیں کر پا رہے۔''اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''عمارہ کا رشتہ آیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ بڑا مسلہ نہیں ہے؟''وہ حیران ہوا۔

''مسئلہ تم بنا رہے ہو۔امی ابّو سے بات کرو، وہ عمارہ کا رشتہ لے کر جائیں۔یہاں سے انکار ہو گا نہ وہاں سے۔''

''لیکن اس وقت کیسے بات۔۔۔۔''

''اس وقت نہیں کرو گے تو کب کرو گے؟ یار! ہمارے ماں باپ کب سے اتنے کنزرویٹو (قدامت پسند) ہو گئے ہیں کہ اتنی سی بات کا برا منالیں؟''اس نے عمر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم کہہ تو ٹھیک رہے ہیں لیکن۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، میں رات تک کا الٹی میٹم دے رہا ہوں۔آج ہی بات کرو ورنہ میں جا کر بتا دونگا۔تم اپنی انسیکیورٹیز (عدم تحفظات) کی وجہ سے اپنی اور عمارہ دونوں کی زندگی برباد کرو گے۔''وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں جا رہا ہوں رات تک کوئی عملی پیشرفت نظر نہ آئی نا مجھے، تو جان سے مار دونگا تمہیں۔''وہ اُسے دھمکاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔اُسکے جانے کے بعد عمر کافی دیر اُسکی باتوں پر ہی غور کرتا رہا۔عمر دور اندیش تھا اور خضر آج اور ابھی کرنے کا قائل۔لیکن یہاں وہ ٹھیک تھا، عمر کو لگتا تھا کہ اس وقت شادی کی بات کرنے پر والدین برا نہ مان جائیں حالانکہ وہ ایسے نہیں تھے۔اور اپنی غلط فہمیوں میں وہ اپنے اور عمارہ کے بیچ میں واقعی خود ہی سماج کی دیوار کا کردار ادا کر رہا تھا۔

''خضر ٹھیک کہہ رہا ہے۔''بلآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

----------+----------+----------

''حسین کہاں ہے؟''وہ کلاس میں بیٹھا، اپنا اسائمنٹ فائل میں لگا رہا تھا، جب علی تن فن کرتا وہاں داخل ہوا۔پروفیسر صاحبہ نے بنا بتائے چھٹی کر لی تھی، اب وہ سب کلاس میں ہی فارغ بیٹھے تھے، کچھ طلبہ جامعہ کی کینٹین چلے گئے تھے۔کچھ اگلی کلاس نہ ہونے کے باعث گھر چلے گئے تھے اور بقایا کلاس میں ہی بیٹھے اپنا نامکمل کام مکمل کر رہے تھے، جن میں ایک مقدم بھی تھا۔

''وہ تو گھر چلا گیا ہے۔''اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''یہ مارا جائیگا کسی دن میرے ہاتھوں۔۔''اس نے ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''مقدم حیران ہوا۔

''اُس بدتمیز نے میرا اور رضا کا بیگ تبدیل کر دیا۔''

''ہیں؟۔۔۔پر کیسے؟ تم دونوں کے بیگز میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔''وہ حیران ہوا۔

''ارے؟ بیگ نہیں، بیگ میں رکھا سامان تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے ابھی بیگ کھول کر دیکھا، بیگ تو میرا ہی ہے لیکن سامان سارا رضا کا ہے۔''

''ہاہاہا۔۔۔''مقدم دل کھول کر ہنسا تھا۔ علی نے اُسے گھورا۔

''اب تو رضا بھی گھر چلا گیا ہے۔ اگلے دو دن چھٹی ہے۔ اب پیر کو ہی اپنا سامان واپس لینا اُس سے۔''آج جمعہ تھا اور اب پیر کے دن ہی جامعہ آنا تھا۔

''یقیناً اُس نے اپنا بیگ کھول کر نہیں دیکھا ہو گا ورنہ اُسے پتہ چل جاتا۔ اب میں کیا کروں؟''وہ پریشان سا اُسکے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا کرو گے؟ کہا تو ہے کہ پیر کو لے لینا۔''

''اُس میں میری کتابیں ہیں، جس سے مجھے اسائمنٹ بنانا ہے اور وہ پیر کو جمع ہو گا۔''اصل مسئلہ اب بتایا۔

''تو پھر ایسا کرو رضا کے گھر چلے جاؤ۔''اُس نے حل پیش کیا۔

''اُسکا گھر نہیں معلوم مجھے، میں کبھی گیا ہی نہیں۔ جب بھی ملاقات ہوئی ہے، یونیورسٹی میں یا حسین کے گھر ہی ہوئی ہے۔''

''ہاں! ویسے اُسکا گھر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ایسا کرو حسین کے گھر چلے جاؤ۔''

''اُسکے گھر گیا نا تو یقین مانو قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں ایک۔''اس نے کہا۔ رہ رہ کر حسین پر غصّہ آ رہا تھا۔ مقدم ایک بار پھر سے ہنسا اسی اثناء میں نوید وہاں داخل ہوا۔

''کہاں تھے تم؟ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں میں تمہیں۔ گھر نہیں چلنا کیا؟''اس نے علی سے پوچھا۔

''ابھی اسکو حسین کے گھر لے جاؤ۔''مقدم نے کہا تو وہ حیران ہوا۔

''کیوں؟''جواب میں اس نے سارا قصہ اُسکے گوش گزار کر دیا، تو وہ بھی ہنس دیا۔

''یہ ہنسنے والی بات نہیں ہے۔ مجھے بہت غصّہ آرہا ہے۔''وہ شدید تپا ہوا تھا۔

''رضا کا آئی ڈی کارڈ ہے بیگ میں؟''نوید نے پوچھا۔ وہ لوگ جامعہ کا آئی ڈی کارڈ گلے میں ڈالنے کے بجائے، زیادہ تر بیگ میں ہی رکھتے تھے، ضرورت پڑنے پر ہی باہر نکالتے۔

''سب کچھ ہی رضا کا ہے اس بیگ میں۔''اس نے چڑ کر کہا تو اُن دونوں نے اپنی اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

''تو آئی ڈی کارڈ نکال کے دیکھو، اس میں گھر کا پتہ لکھا ہوتا ہے۔''

''ارے ہاں! مجھے کیوں خیال نہیں آیا اِسکا۔''اُس نے جلدی سے بیگ کھول کے کارڈ باہر نکالا۔ وہاں گھر کا پتہ موجود تھا۔

''یہاں سے پہلے رضا کے گھر چلیں گے۔''اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔''نوید نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''دوسرا مسئلہ پیر کو حل کروں گا۔''علی نے کہا۔

''کونسا مسئلہ؟''دونوں ہی نہیں سمجھے۔

''حسین کے قتل کا مسئلہ۔''وہ اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا تھا۔ دونوں ہنس دیئے۔

''اچھا لیلیٰ کے مجنوں! ہم چلتے ہیں پھر۔''نوید نے مقدم سے کہا تو اس نے کھینچ کے اُسکے بازو پر فائل ماری، لیکن وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

----------+----------+----------

اور بلآخر عمر نے اپنے بھائی کی بات مان لی۔ اُسے یقین ہی نہ آیا کہ سب کچھ اتنا آسان تھا؟ اُسے کوئی محنت ہی نہ کرنی پڑی تھی۔ اس نے اپنے والدین سے عمارہ کے بارے میں بات کی، وہ تو بچپن سے اُسے دیکھ رہے تھے، انکی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ ساتھ میں خضر بھی بیٹھا تھا، اُس نے فوراً سے عمارہ کے رشتے والی بات بھی بتادی تاکہ گھر والے دیر نہ کر دیں۔ اگلے ہی دن وہ لوگ طلبگار بن کر اُنکے گھر موجود تھے۔ عمارہ کے گھر والوں نے سوچنے کا رسمی سا وقت لیا اور چونکہ انکی اپنی بیٹی کی پسند بھی شامل تھی اس میں، تو پھر تو انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی ہی نہ رہی۔ عمارہ کی پھوپھو سے سلیقے کے ساتھ معذرت کر کے عمر

کے لیے ہاں کر دی گئی۔اُسکے بعد ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں دونوں کی بات پکی کر کے، شادی عمارہ کی پڑھائی ختم ہونے پر رکھی دی گئی۔جب تک عمر اپنی تعلیم مکمل کر کے سیٹل ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔

آج وہ دونوں اپنے گھر سے اجازت لیکر آئسکریم کھانے آئے تھے۔بچپن سے دوستی تو تھی، لیکن اب منگنی ہونے کے بعد ملاقات کی اجازت مشکل سے ہی ملتی تھی۔

''شکر ہے کہ کسی قسم کی کوئی مشکلات نہیں آئی ہمارے رشتے میں۔''وہ دونوں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑے، اپنے اپنے کپس سے آئسکریم کھا رہے تھے۔

''ہاں واقعی، مجھے لگا تھا کہ پھوپھو شاید اس بات کا برا منالیں گی، لیکن عمر! انہوں نے تو بالکل برا نہیں مانا بلکہ بہت اچھے سے معاملے کو سنبھال لیا۔''وہ بتا رہی تھی۔

''یہ اللہ کا کرم ہے''اس نے دل سے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

''ویسے اچھی لگ رہی ہو بہت۔''عمر نے اُسکی تعریف کی تو وہ مسکرائی۔

''تھنکس!''

''اگر خضر احساس نہ دلاتا، تو میں تو اپنی ہی غلط فہمیوں میں اُلجھ کر، اپنا نقصان کر چکا ہوتا اور اگر خدانخواستہ تم مجھے۔۔۔''

''تم مجھے نہ ملتی، عمارہ تو میں پاگل ہوتا، جنگلوں میں نکل جاتا اور ہر طرف عمارہ عمارہ پکارتا۔۔۔لوگ مجھے پتھر مارتے اور میں بس تمہیں یاد کرتا۔''اس آواز پر دونوں ہی اچھل پڑے تھے۔اور وہ ہنستا ہوا انکی طرف آ رہا تھا۔

''تمہیں چاولوں میں کنکر بننا ضروری ہوتا ہے؟''عمر نے خضر کے وہاں ٹپک پڑنے پر منہ بناتے ہوئے کہا۔اپنی بات نامکمل رہ جانے کا دکھ ہوا تھا۔

''ایں؟ یہ کونسا محاورہ ہے؟''عمارہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ جدید محاورہ ہے بھابھی جی!''خضر نے عمر کے ہاتھ سے آئسکریم کا کپ تقریباً جھپٹتے ہوئے کہا۔

''تم میں کچھ شرم، کچھ حیا ہے؟ دو لوگ بات کر رہے ہوں تو اس طرح گھستے ہیں بیچ میں؟''عمارہ نے اپنی جھینپن مٹانے کے لیے، اُسے غصّے سے کہا۔

''کونسے دو لوگ بھئی ؟آج تک ہم جہاں بھی گئے ہیں، تینوں ساتھ ہی گئے ہیں نا؟ پھر آج کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر آ گئے ؟''اس نے آئسکریم منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''پہلے کی بات اور تھی۔''عمر نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو پہلے کیا بات تھی؟اور اب کیا بات ہو گئی؟ میں بھی سننا چاہتا ہوں''انجان بننے کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

''اِدھر دو یہ۔۔۔خود ہی اپنی ڈائیٹ خراب کرتے ہو، پھر سارا دن ایکسر سائز میں برباد کرتے ہو.''عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا، تو اس نے خضر سے کپ واپس چھین لیا۔

''میں کہہ رہی ہوں عمر! سمجھا کر رکھو اپنے بھائی کو، ورنہ میری اور اسکی جنگ ہو جائے گی۔''عمارہ نے غصّے سے کہا۔

''خبر دار! میرے اور میرے بھائی کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا، سوکن بن جاؤنگا میں تمہاری۔''خالص زنانہ عورتیں کی طرح لڑتے ہوئے کہا۔

''وہ تو تم ویسے ہی بنے رہتے ہو۔''عمر نے بیزاری سے کہا تو خضر تڑپ اٹھا۔

''بھائی بھائی نہ رہا۔''اُس نے مصنوعی دکھ سے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں ہنس پڑے۔

----------+----------+----------

کن من برستی بارش پچھلے تین روز سے جاری تھی، درخت، پرندے، اینٹوں سے بنی ڈیپارٹمنٹ کی خوبصورت عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، ہر شے بھیگی بھیگی سی تھی، سردی بھی بڑھ چکی تھی۔ حسین ہڈی پہنے، ہڈ سر پر ڈالے، دونوں ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالے، اُسکے پیچھے آیا۔

''پہلا دن کیسا گزرا؟''اُسکے قریب جا کر اتنی زور سے پوچھا کہ وہ اچھل ہی پڑی۔

''حد کرتے ہو۔''دل پر ہاتھ رکھ کر اُسے گھورا۔ڈرا دیا تھا اس نے تو۔۔۔

''کیسا گزرنا تھا بھلا؟ تم سے کہا بھی تھا کہ ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ دو، لیکن تم نے بھی ساری زندگی کا بدلا آج نکالا ہے۔''ناراضگی سے کہتی وہ چل پڑی، حسین بھی اُسکے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''تو محترمہ حور عین کو ڈیپارٹمنٹ نہیں ملا یا وہ کسی کی ریگنگ کا شکار ہو گئیں؟''منہ چڑاتی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے پوچھا۔ بارش اتنی تیز نہ تھی کہ وہ گیلے ہو جاتے، لیکن حور عین نے پھر بھی چھاتا سر پر تان رکھا تھا۔ صرف اپنے سر پر۔۔۔ حسین اس سے مستثنیٰ تھا۔

''کسی کی مجال؟ بس تھوڑا سا بھٹکنا پڑا لیکن پہنچ ہی گئیں میں، ڈیپارٹمنٹ۔'' دونوں ساتھ ساتھ چلتے کتنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی بھیگی بھیگی عمارتوں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یونیورسٹی تو جیسے بارش میں نکھر گئی تھی، پھول پودے اپنے رنگوں سے ہر جانب بہار لے آئے تھے۔ ابر آلود موسم اور برستی بوندوں نے ماحول کو عجیب سی تازگی بخش دی تھی۔ سٹوڈنٹس ہر جانب بکھرے ہوئے تھے، کوئی بیگ رکھے بینچ پر بیٹھا تھا، کوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باغ میں گھاس پر بیٹھا تھا، کسی نے سڑک پر ہی تفریح لگائی ہوئی تھی تو کسی کو کلاس میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

''حور! وہ دیکھو کیا ہے اُس طرف؟'' دور کہیں سے نظر آتی عمارت کی چھت پر اشارہ کرتے حسین نے پوچھا۔

''کیا؟'' اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھتی حور عین رکی اور آنکھیں چھوٹی کر کے اسی جانب دیکھا۔

''میرا خیال ہے سولر پینل ہے۔''

''تو یہ بتاؤ چھت پر کیوں رکھا ہے؟''

''چھت پر نہیں رکھیں گے تو کہاں رکھیں گے؟'' اُسکی عقل پر ماتم کرتی دوبارہ چلنے لگی۔

''رکھیں گے تو وہیں، لیکن تم خود سوچو چھت پر تو اسے دھوپ لگتی ہو گی، اسے دھوپ سے بچانے کے لیے کیا کریں گے؟'' سوال معقول تھا۔

''پینا فلیکس ڈال دیں گے۔'' لو بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل سوال تھا؟

''پینا فلیکس؟'' اُس نے اپنی ہڈ پیچھے گراتے ہوئے، رک کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''چادر بھی ڈال سکتے ہیں۔'' متبادل بھی بتا دیا۔

''چادر؟'' آبرو اچکا کے پوچھا، اگلے ہی لمحے حور عین کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''سولر پینل کو دھوپ سے کیوں بچائیں گے؟'' وہ چیخ پڑی۔

''چچ چچ۔۔۔ کس نے داخلہ دیا تمہیں یہاں؟'' اُسکا کام ہو گیا تھا، اس لیے بڑے سکون سے کہتا آگے بڑھ گیا۔

''ایسا نہیں ہے، میرے دماغ نے دھوپ کو بارش سے بدل دیا اور میں سمجھیں کہ تم بارش کہہ رہے ہو۔'' چھاتا سنبھالتی اُسکے پیچھے آئی، بادل ہلکے پھلکے گرج رہے تھے۔

''آپکے پاس دماغ بھی ہے؟'' حیرت سے پوچھا۔

''تم سے تو زیادہ ہی ہے۔'' چڑ کے کہا، آخر اُسکا دماغ اُسے ہمیشہ بے عزت ہی کیوں کرواتا تھا؟

''چلو چھوڑو اس بات کو، ابھی ہم وی ایس جا رہے ہیں، ایمان کو ساتھ لیں گے، اور لنچ کریں گے۔''

''اور یہ لنچ کون کروا رہا ہے؟'' مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، میں۔۔'' فراخ دلی سے کہا۔

''تم کب سے اتنے اچھے ہو گئے؟'' وہ ابھی بھی مشکوک تھی۔

''نہیں نہیں حور عین صاحبہ! میں اتنا اچھا نہیں ہوں، یہ دراصل سرمایہ کاری ہے۔''

''ہیں؟'' اُسکے چھوٹے سے دماغ کو بھلا اُسکی کہانیاں کہاں سمجھ میں آنے والی تھیں۔

''میں تم لوگوں پر آج اپنا سرمایہ لگاؤں گا، تبھی تو مجھے سود سمیت واپس ملے گا۔'' بات اب سمجھ آگئی تھی۔

''ہونہہ۔۔۔ کنجوس انسان۔'' منہ بگاڑ کر کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔ بارش تیز ہو چکی تھی، حسین بھی بھاگتا ہوا وی ایس میں جا گھسا تھا۔

----------+----------+----------

وقت بڑی تیزی سے گزرا تھا، جامعہ میں اُنکا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ آج بھی فارغ وقت میں وہ لوگ آرٹس لابی میں بیٹھے تھے۔ جہاں انہی کی طرح اچھی خاصی فارغ عوام ٹولوں کی شکل میں فرش پر بیٹھی تھی۔ یہ دراصل آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے درمیان میں دائرے کی شکل میں بنا جامعہ کا مشہور آڈیٹوریم تھا، جسکے باہر دائرے کی ہی شکل میں ایک طرح کا سٹنگ ایریا بنا تھا، جو تمام آرٹس ڈیپارٹمنٹ کو یہاں لا کے جوڑتا تھا۔ اسے آرٹس لابی کہتے تھے، کیونکہ یہاں کے گول دیو قامت ستون اور دیوار آرٹس کے طلبہ و طالبات کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتے تھے۔ کچھ جگہ بینچ تھیں، کچھ جگہ چبوترے اور باقی پورا فرش خالی تھا، جہاں طلبہ و طالبات ٹولوں کی شکل میں فارغ بیٹھے تھے۔ دیواروں پر قومی ہیروز کی تصاویر ہاتھوں سے بنائی گئی تھیں۔ باہر تین روز سے جاری سردیوں کی بارش اب بھی برس رہی تھی، ایسے میں پڑھنے کا دل تو کسی نہ ہوتا، لیکن اللہ پوچھے جامعہ والوں کو، آندھی آئے یا طوفان، قیامت آئے یا جنگ ہو جائے، اُنہوں نے جامعہ بند نہیں کرنی تھی۔

''یار! کچھ کرو، کوئی مشورہ ہی دو، میں کیا کروں؟'' مقدم نے باقی چاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ حسین غائب تھا۔

''کیا مشورہ دیں؟ اور کیوں دیں؟ اور کوئی کام دھندہ نہیں ہے کیا ہمارے پاس؟ اپنا مسئلہ خود حل کرو۔'' رضا نے ازلی بیزاری سے کہا۔ وہ کلاس کا ٹاپر تھا، آدھی کلاس تو ایسے ہی اس سے متاثر رہتی تھی۔ اور وہ تھا کہ آدم بیزار۔

''بہت بد تمیز آدمی ہو تم، تم بتاؤ علی میں کیا کروں؟''اس نے علی سے پوچھا۔

''دفعہ دور۔۔میرا دماغ خراب ہوا ہے، جوان بیکار کاموں کے لیے مشورے دوں۔''اس نے بھی ہری جھنڈی دیکھادی جبکہ لفظ بیکار کام پر اُس نے تڑپ کر دیکھا۔

''یار! کوشش تو کی تھی لیکن تمہارا مسئلہ تو جوں کا توں ہی ہے۔''اُسے پریشانی سے لب کاٹتا دیکھ، عمر کو ترس آیا۔

''تمہارا کیا ہے۔۔۔خود تو منگنی کروا کر بیٹھ گئے ہو۔امّاں ابّا سب راضی تھے۔لیکن میں کیا کروں؟ میری تو امّاں ہی نہیں مانیں گی۔''اس نے دکھی شکل بناتے ہوئے کہا۔آج کل اُسکے یہی دکھڑے تھے۔کچھ ماہ پہلے عمر کی منگنی ہو گئی تھی، جس میں کوئی سماج کی دیواریں تھی نہ کوئی ولن سب خوشی خوشی راضی ہو گئے تھے۔

''تمہاری امّاں کو اُسکی ماں سے مسئلہ ہے، ضروری تو نہیں کہ اس سے بھی ہو، تم بات تو کر کے دیکھو، پہلے سے ہی رونے بیٹھ گئے ہو۔''علی نے خاصی سمجھداری سے سمجھایا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے بات کرنے کا امّاں نے سننے سے پہلے ہی انکار کر دینا ہے۔''اس نے منہ بُسورا۔باہر بادل گرجے تھے،اُدھر بادل گرجے اور اِدھر آس پاس بیٹھے فارغ ٹولوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔

''تو پھر بیٹھے رہو منہ بنا کر۔''اس نے جھلا کر کہا اور واپس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔پھر جیسے اچانک ہی کچھ یاد آنے پر دوبارہ سیدھا ہوا۔

''ویسے مجھے پوچھنا تھا کہ ماسٹرز تم لوگ کن مضامین میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''اس نے وہ بات کہہ دی جو وہ پچھلے کئی دنوں سے پوچھ رہا تھا، لیکن وہ لوگ تھے کہ سنجیدہ ہی ہو کر نہیں دے رہے تھے۔

''صبر کر لو بھائی، جلدی کیا ہے؟ پہلے بی بی اے تو مکمل ہو۔''نوید نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''دو سال گزر چکے ہیں، تم لوگ ایسے ہی آرام سے بیٹھے رہنا اور گریجویشن ختم بھی ہو جائے گی۔ابھی سے فیصلہ کر کے رکھو آگے کیا کرنا ہے؟ میں پہلے ہی بتا دوں کہ مجھے ملٹی میڈیا آرٹس سے ماسٹرز کرنا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو میں بھی تمہارے ساتھ ہی ملٹی میڈیا آرٹس میں ایڈمشن لونگا۔''عمر نے اُسے تسلّی دی، جسے سن کر وہ تو خوش ہوا تھا۔لیکن باقی سب نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا کم اور گھورا زیادہ تھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ مجھے شروع سے آرٹس پسند ہے، چاہو تو مقّی سے پوچھ لو۔''اس نے گڑبڑاتے ہوئے مقدم عرف مقّی کی جانب اشارہ کیا۔

''جھوٹ بول رہا ہے۔ عمارہ کے بی ایف اے میں ایڈمشن لینے سے پہلے تک اسے آرٹس نامی شے کی الف بے بھی نہیں معلوم تھی۔''اس سفید جھوٹ پر تو عمر ہکا بکا رہ گیا۔ باقی سب نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی رتی بھر کوشش نہیں کی تھی، یہ سچ تھا کہ عمارہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ سے بی ایف اے کر رہی تھی، لیکن عمر کا آرٹس میں جانے کا ارادہ شروع سے ہی تھا، وہ تو بس کچھ وجوہات کی بنا پر یہاں آگیا تھا۔ اب دوست کی اس غدّاری پر خون کے گھونٹ بھرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا چھوڑ ان لوگوں کو، تمہارا ارادہ ہے نا میرے ساتھ ماسٹرز کرنے کا؟''علی نے اُنہیں ایک بار پھر موضوع سے ہٹتا دیکھ، گھسیٹ کر دوبارہ موضوع پر لانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ہاں! پکا ارادہ ہے۔''اس نے اُسے تسلی دی تھی۔

''بھئی! میرا تو انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔ آگے سی ایس ایس میں آسانی رہے گی۔''نوید نے بتایا، سی ایس ایس اُسکا جنون تھا۔

''اور میرا ایم بی اے۔''رضا نے بھی اپنا منصوبہ بتایا تھا۔

''او!۔۔۔لیلیٰ کے مجنوں! تم نے کیا کرنا ہے آگے؟''نوید نے مقدم سے پوچھا، لیکن اس سے پہلے ہی عمر نے برجستہ جواب دیا۔

''شادی!''سب کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ اُسی لمحے حسین وہاں آیا تھا ساتھ میں دو لڑکیاں بھی چلی آرہی تھی، وہ اُن کے پاس آکر رکا۔

''کیا حال ہیں بھائیوں؟''ہاتھ اٹھا کر سب کو مشترکہ سلام کیا۔

''ان سے ملو یہ دونوں میری کزن ہیں، مگر ایک دوسرے کی کزن نہیں ہیں۔''اس نے اشارے سے دونوں لڑکیوں کے متعلق بتایا۔

''یہ ایمان ہے، میرے ماموں کی بیٹی۔۔۔اس نے ابھی ویژول اسٹڈیز میں داخلہ لیا ہے۔''اس نے اشارے سے سوبر سی لڑکی کا تعارف کروایا تو وہ مسکرائی۔ اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ حسین کی ہی کزن ہے۔ پھر اس نے دوسری کی طرف اشارہ کیا اور اس سے پہلے وہ کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑی۔

''میں اپنا تعارف خود کروا سکتی ہوں ہٹو یہاں سے۔''اپنا چھاتا لپیٹ کر، حسین کو دھکا دیتے، آگے سے ہٹاتی گویا ہوئی۔

''میں حور عین ہوں، اسکے چچا کی بیٹی، ویسے اس سے چھوٹی ہوں لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عقل اور سمجھ بوجھ کے معاملے میں اس سے کافی آگے ہوں۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں! پتہ ہے کتنی عقلمند ہو۔''حسین نے منہ بناتے ہوئے کہااور پھراُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اتنی عقلمند ہے یہ کہ ابھی میں نے اس سے پوچھا کہ جب ہم سولر پینل کو چھت پر رکھتے ہیں تواُسے دھوپ سے بچانے کے لیے کیا کرتے ہیں؟ تو پتہ ہے اس نے کیاجواب دیا؟ کہتی ہے سولر پینل پر پینافلکس ڈال دیں گے۔''حسین نے مزے سے بتایاتو وہاں قہقہہ پڑا، مگر وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

''اپنے بارے میں بھی بتاؤ کہ تم نے پرسوں کیا کیا تھا؟''

''ہاں بتاؤ بتاؤ، کیا کیا تھا؟''سب نے دلچسپی سے پوچھا جبکہ وہ حور عین کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔

''پرسوں صبح یہ ویسلین اپنے بالوں پر لگا رہا تھا، میں نے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگا نظر نہیں آتا کیا؟ بالوں پر جیل لگا رہا ہوں۔''ہنسی کا فوارہ پھوٹا تھا وہاں۔۔۔ حسین برے برے منہ بنا رہا تھا جبکہ وہ خود بھی ہنستی جا رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گڑھے پڑتے تھے۔ وہ واقعی حسین کی ہی کزن تھی۔

''تمہاری کلاس کا ٹائم نہیں ہوا؟ چلو، چلتی پھرتی نظر آؤ مجھے۔''حسین نے اُسکی بکواس سے تنگ آکر اُسے وہاں سے چلتا کرنا چاہا۔

''کلاس سے یاد آیا، میں نے اپنا ڈیپارٹمنٹ تو بتایا ہی نہیں، میں ماس کمیونیکیشن کی سٹوڈنٹ ہوں۔''وہ اتنی آسانی سے ٹلنے نہیں والی تھی۔ اُسکے بعد وہ اور حسین جتنی دیر وہاں رہے بس ایک دوسرے کی ٹانگیں ہی کھینچتے رہے، اور باقی سب لطف اندوز ہوتے رہے۔ جبکہ ایمان ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انکی بچکانہ حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

وہ زندگی کے عجیب دن تھے۔۔۔۔

فضول باتوں پر ہنسی رکتی نہ تھی۔۔

بچکانہ حرکتیں بھی لطف دیا کرتی تھیں۔۔۔

زندگی کا مقصد ضرور تھا، مگر فکریں آزاد تھیں۔۔۔

پریشانیوں میں بھی تفریحات تھیں۔۔۔

وہ زندگی تھی۔۔۔اور بس وہی زندگی تھی۔۔۔۔

لیکن شاید ہمیشہ کے لیے نہ تھی۔۔۔

----------+----------+----------

گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، سامنے ہی لاؤنج میں، صوفے پر اُسکے ابّا کے ساتھ وہ بیٹھی تھی۔ وہ یعنی لیلیٰ۔۔۔

مقدّم خوشگوار حیرت کے ساتھ اندر داخل ہوا اور سب کو سلام کیا۔

''تم کب آئی؟'' وہ سوات میں رہتی تھی۔ لہٰذا یہاں اپنے گھر میں، اُسے دیکھنا مقدم لیے واقعی باعث حیرت تھا۔

''میں صبح ہی آئی ہوں۔ ماموں نے پک کیا ہے مجھے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بہت پیاری اور معصوم تھی وہ۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا ابّا؟'' اس نے اپنے باپ سے شکوہ کیا، لیکن انکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی اُسکی ماں وہاں داخل ہوئیں، وہ غالباً اُسکی گفتگو سن چکی تھیں۔

'کیوں بیٹا؟ اس گھر میں کوئی کام کرنے سے پہلے تمہیں بتایا جاتا ہے کیا؟ یا تم سے اجازت لی جاتی ہے؟''

''نہیں امّاں میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' وہ گڑبڑایا۔

''بھئی یہ سرپرائز تھا۔'' ابّا نے جواب دیا۔

''ہاں واقعی سرپرائز تھا۔۔ بہت بڑا۔'' امّاں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کتنے دنوں کے لیے آئی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''دنوں کے لیے نہیں بیٹا! سالوں کے لیے بھیجا ہے تمہاری پھوپھو نے۔'' لیلیٰ سے پہلے مقدّم کی ماں نے جواب دیا تھا۔

''مطلب؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''بھئی، لیلیٰ نے یہاں داخلہ لیا ہے یونیورسٹی میں، وہاں سوات میں تو کوئی قابل ذکر یونیورسٹی ہے نہیں۔'' ابّا نے جلدی سے کہا کہ آیا امّاں پھر سے کوئی طنز کا تیر نہ چلادیں، مقدم خوش ہوا۔

''داخلہ لیا نہیں ہے بلکہ کروایا ہے تمہارے ابّا نے۔'' وہ کہاں باز آنے والی تھیں؟

''بھلا بتاؤ پورے خاندان میں کوئی لڑکی، میٹرک سے آگے پڑھی نہیں ہے، اور تمہارے ابّا کو پتہ نہیں کیا شوق چڑھا ہے؟ بھتیجی کو شہر کی جامعہ سے ڈگری دلوائیں گے۔'' وہ پیالیوں میں چائے نکالتے ہوئے عام سے انداز میں بولیں۔ لیلیٰ سر جھکائے صوفے کے ہتھے پر ناخن رگڑ رہی تھی۔ وہ لڑنے جھگڑنے والی لڑکی نہیں تھی، زیادہ تر خاموش رہتی تھی۔ مقدم اور اُسکے ابّا کو برا تو لگا لیکن کیا کر سکتے تھے؟

''اب تو آ گئی نہ، اب یہ یہیں رہے گی۔ جاؤ مقدم، لیلیٰ کا سامان پہنچاد و کمرے میں۔'' ابّا نے ماحول کا اثر زائل کرنے کی غرض سے کہا۔

''ارے! میرا بچہ ابھی باہر سے آیا ہے، وہ کیوں سامان پہنچائے گا اسکا؟ ملازم مر گئے ہیں کیا؟'' انہوں نے سختی سے کہا لیکن مقدم ان سنی کرتے ہوئے اُسکا سامان اٹھا چکا تھا۔ لیلیٰ بھی سر جھکائے اُسکے پیچھے چلی گئی۔ صد شکر اس بار انہوں نے کچھ کہا نہیں، بس سر جھکائے بڑبڑ کرتی رہیں۔ جبکہ لیلیٰ کو اُسکا کمرہ دکھاتے ہوئے مقدم کو اپنا مستقبل ہر طرف سے تاریک ہی نظر آ رہا تھا۔

----------+----------+----------

اتوار صبح دس بج کر پانچ منٹ، مورخہ چھ جنوری:

ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک

کمرے میں صرف دو آوازیں تھیں، ایک گھڑی کی سوئیوں کی اور دوسری اُنکی سانسوں کی۔

ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک

گھڑی کی سوئیاں سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ علی کی نظریں گھڑی تک گئی۔ اُسے یہاں آئے ہوئے بس پانچ منٹ ہی گزرے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے یہاں ہو۔

ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک

عمر کی نظریں بھٹک بھٹک کر مقدم تک جاتیں اور واپس آ جاتیں۔ اس نے سلام دعا کے بعد دوبارہ نظر اٹھا کر بھی اُنہیں نہیں دیکھا تھا۔ چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ عمر کو اس پر کسی اجنبی کا گمان ہوتا تھا۔

ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک

گھڑی کی آواز سارے میں گونج رہی تھی کہ اچانک ہی فضاء میں دو نفوس کے بولنے کی آوازوں نے گھڑی کی سوئیوں کو مات دی۔ آوازیں کہیں قریب سے آ رہی تھیں اور آہستہ آہستہ مزید قریب تر ہوتی جا رہی تھیں، جیسے کوئی گول کمرے کی جانب ہی آ رہا ہو۔

''میں نے کوشش کی تھی وقت پر پہنچنے کی لیکن تھوڑا لیٹ ہو گیا۔'' اس آواز پر لمحے بھر کے لیے اندر بیٹھے تینوں نفوس چونکے تھے۔ دماغ کا کوئی گوشہ اس آواز کے شناسا ہونے کا سگنل دے رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، ڈی آئی جی صاحب کو آنے میں ابھی پندرہ منٹ ہیں۔''کسی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھولنے والا وہی ریسیپشنسٹ تھا، جو اُن کو بھی اس کمرے تک لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اُسے اندر آنے کا راستہ دکھایا۔ آنے والے کو دیکھ کر وہاں سنسنی پھیل گئی تھی۔

نہیں۔۔۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟

وہ کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔

یا انکے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جا رہا تھا؟

کیا یہ کوئی مذاق تھا؟

یا کوئی بیہودہ پرانک؟

خود اس نے ایک نظر پورے کمرے پر ڈالی اور بالکل خاموشی سے چلتا ہوا، صوفے کے سب سے الگ تھلگ حصے پر جا بیٹھا۔ اُنہیں دیکھ کر اگر اُسکے چہرے پر شناسائی کی یا حیرت کی کوئی جھلک آئی بھی تھی، تو وہ اُس نے پلک جھپکتے میں غائب کر دی۔ صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے موبائل نکال لیا، اب وہ سکرین اسکرول کر رہا تھا۔

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

گھڑی کی سوئیوں کی آواز پھر سے سنائی دینے لگی تھی۔

''رضاالٰہی۔۔۔''مقدم کے دل کے کسی کونے میں اُسکا نام گونجا تھا۔ رضا کی یہاں آمد نے اُن سب کو جس حیرت کے جھٹکے سے دوچار کیا تھا، وہ اس سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

کیوں تھا وہ یہاں؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ سب یہاں کیوں تھے؟ دس سال بعد اس طرح اُنہیں یہاں کیوں بلایا گیا تھا؟

کیا تھا یہ سب؟

کوئی گیم؟

کوئی اتفاق؟ اتفاق ایسا نہیں ہوتا۔

اب تک وہ تینوں اپنی موجودگی کا کوئی جواز نہیں ڈھونڈ پائے تھے کہ اب رضا بھی یہیں تھا۔اجنبی چہرے کے ساتھ۔۔۔۔

مقدم کچھ حیرت سے تینوں کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ عمر کسی سوچ میں محو تھا، وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ علی کے چہرے پر عجیب سی سختی در آئی تھی، جو رضا کے یہاں آنے سے قبل نہ تھی۔ جب کہ خود رضا، بے تاثر چہرے کے ساتھ موبائل لیے بیٹھا تھا۔ جیسے اُسے اُن سب سے کوئی سروکار نہ ہو۔ جیسے وہ سارے اُسکے لیے اجنبی ہو، جیسے اُن سب سے اُسکا کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ فضاء میں عجیب سا تناؤ پھیل گیا تھا۔ رضا نے تو رسمی طور پر بھی سلام کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ علی نے بھی اُسکی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور عمر۔۔۔ وہ ایک نظر میں ہی جان گیا تھا کہ یہ وہ رضا نہیں ہے، جسے وہ دس سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ وہ ٹوٹا پھوٹا زندگی سے ستایا ہوا لڑکا نہیں ہے۔ یہ تو کوئی سخت مزاج قسم کا جوان مرد تھا۔ جسکی ایک ایک شے سے امارت ٹپکتی تھی۔ جسے اپنے علاوہ کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ کیا وہ خود غرض ہو گیا تھا؟ کون تھا یہ ؟ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے۔ لیکن شاید وہ جلد جان جائیں کہ۔۔

وہ شہر کی سب سے بڑی جامعہ کا بہترین فیکلٹی ممبر، سٹوڈنٹس کا پسندیدہ لیکچرر اور مشہور و معروف **"برجا اسکولنگ سسٹم"** کا مالک تھا۔ اُسکے اسکول کی بیک وقت چالیس شاخیں، شہر میں بہترین طریقے سے چل رہی تھی۔ اور وہ اُس سیاہ و سپید کا اکیلا مالک تھا۔ یہ سب اس نے خود کمایا تھا، اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر، وہ پارس تھا، جس کام کو ہاتھ لگاتا، اُسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا۔ قسمت اس پر مہربان تھی اور وہ تھا کہ قسمت سے شاکی۔۔۔۔

ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔

گھڑی کی سوئیاں آگے بھاگ رہی تھی لیکن وہ پیچھے جا رہے تھے۔ پیچھے کہیں دُور کھڑا ماضی انکا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئیں اور ماضی اُنہیں کچھ لمحے کے لیے خود میں گم کر لے۔

----------+----------+----------

تیرہ سال پہلے:

''یہ مستقیم کہاں غائب ہے؟'' اُستانی سلیمہ نے کلاس پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں میم! پچھلے ایک ہفتے سے کسی نے بھی اُسے نہیں دیکھا۔'' اُسکی پکی سہیلی نے اُنہیں جواب دیا تھا۔

''لیکن کچھ تو پتہ چلے کہ ایسے اچانک کہاں گیا؟ وہ کبھی بھی چھٹی نہیں کرتا، اپنے گاؤں بھی جاتا ہے تو درخواست دے کر جاتا ہے۔'' اُنہوں نے پریشانی سے کہا۔

''آپکو نہیں پتہ میم؟'' حسین کی حیران کن آواز پر سب کی گردنیں پیچھے مڑی تھیں اُسے دیکھنے کے لیے۔

''کیا نہیں پتہ؟''اُنہوں نے اس سے بھی زیادہ حیرانی سے پوچھا۔

''مستقیم کا پچھلے ہفتے انتقال ہو چکا ہے۔''اس نے جتنے افسوس سے کہا تھا، پوری کلاس کے ساتھ ساتھ اُسکے دوستوں کو بھی جھٹکا لگا تھا۔ مستقیم انکا کلاس فیلو تھا۔

''یہ کب ہوا؟''

''کیسے ہوا؟''

''ہمیں تو پتہ نہیں چلا۔''

''ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ملا تھا۔''

کلاس سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''میم! پچھلے ہفتے، شاید منگل کی رات تھی۔ میں کسی کام سے ہسپتال گیا تھا تو میں نے وہاں ایمرجنسی میں مستقیم کو لہولہان دیکھا۔ میں اسکے پاس گیا تو وہ۔۔۔''اس کی آواز بھرا گئی۔ کلاس میں سب کی آنکھیں نم ہونے لگی، دل دہشت زدہ ہونے لگے۔

''تو وہ مر چکا تھا، پھر میں نے اُسکے گھر والوں کو فون کیا، اُسکے سامان میں سے نمبر لے کر۔۔۔رات تک اُسکے گھر والے اندرون سندھ سے کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے کسی کو اطلاع بھی دینے نہیں دی اور جلدی سے جنازہ اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلے گئے، اُسکے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم۔''مرحوم کے کچھ دوست ضبط کی شدت سے لال آنکھیں لیے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور مستقیم کی پلی والی سہیلی نے تو رونا ہی شروع کر دیا تھا۔ اُستانی کو بھی افسوس ہوا وہ ایک اچھا طالبعلم تھا۔

''لیکن یہ بات تم نے پچھلے ہفتے کیوں نہ بتائی؟''اُنہوں نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''کیونکہ پچھلے ہفتے بارشوں کی وجہ سے میں یونیورسٹی نہیں آسکا تھا۔''اس نے سکون سے جواب دیا۔

''اوہو۔۔۔اللہ اُسے جنت نصیب کرے۔''انہوں نے تعزیتی انداز میں کہا اور حاضری لینے کے بعد کلاس سے روانہ ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ بھی کہتا کلاس کے سی آر نے اٹھ کر کلاس میں اعلان کیا۔

''کل، یعنی بروز منگل، ہم اپنے مرحوم دوست مستقیم کی بخشش کے لیے ڈیپارٹمنٹ میں ختم قل کرینگے، آپ سب سے شرکت کی درخواست ہے۔''اِس اعلان پر سب نے ہی اتفاق کیا تھا۔

----------+----------+---------

رضا نے بظاہر تو اُن پانچوں سے دوستی کر لی تھی، لیکن اس نے کسی کو بھی ایک حد سے زیادہ خود کے بارے میں جاننے نہ دیا تھا۔ اُن لوگوں نے بارہا کوشش کی تھی کہ اُس سے، اُسکے گھر والوں کے متعلق پوچھیں، لیکن ہر بار وہ خوش اسلوبی سے بات ٹال جاتا۔ حتٰی کہ تین سال گزر گئے لیکن رضا نے اپنے گرد چڑھے خول سے باہر آنے کی کوشش نہ کی تھی۔

اس دن وہ جامعہ سے واپس گھر آیا اور نہانے چلا گیا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو گھر کا گارڈ سامنے کھڑا تھا۔

''رضا بھائی! یہ دونوں آپ کا پوچھ رہے تھے۔'' اس نے اپنے پیچھے کھڑے دو لڑکوں کے جانب اشارہ کیا، جسے دیکھ کر رضا حیران رہ گیا تھا۔

----------+----------+---------

''مجھے ذرا یہ حسین مل جانے دو، ایسا حال کرونگا کہ اُسکی اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔'' بائیک پر اپنے پیچھے بیٹھے علی کی آواز اُسے سخت تپی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''حسین کا جو حال کرنا ہے کرو، لیکن اُسکی سات نسلوں کا کیا قصور؟'' نوید نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ بائیک چلانے کے باعث اُسکی آواز علی تک نہیں پہنچ رہی تھی، لہٰذا اُسے زور سے بولنا پڑ رہا تھا۔

''چپ کرو تم، مجھے شدید غصّہ آرہا ہے۔ سارا دن برباد ہو رہا ہے اُسکی وجہ سے۔'' اُسکا غُصہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''ہاں! تو ساتھ میں میرا بھی تو ہو رہا ہے۔'' نوید نے احساس دلایا کہ دیکھو میں بھی تو وقت ضائع کر رہا ہوں، اور تمہارا غصّہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔

''میں نے کہا ہے ساتھ آنے کو؟'' علی کا غصّہ آس پاس ہر شے پر اترتا تھا۔

''اچھا ہوا میں ساتھ آگیا۔ جتنے تم غصّے میں ہو نا، یہ بائیک کہیں مار ہی دینی تھی تم نے۔''

''اور کتنا اچھا ہوتا جو بائیک کے سامنے حسین ہوتا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا، غصّے کا گراف مزید بڑھا۔ یونیورسٹی میں حسین نے اُسکے اور رضا کے بیگ کا سامان تبدیل کر دیا تھا، جسکے باعث علی کا ادھورا اسائمنٹ بھی رضا کے پاس چلا گیا تھا۔ اب وہ سارا سامان لینے اُسکے گھر جا رہا تھا۔ اُسے یہ خواری صحیح معنوں میں کھل رہی تھی۔

''شاید یہی گھر ہے۔''نوید نے بائیک روکتے ہوئے گھر کی جانب دیکھا۔

''ایڈریس تو یہی ہے۔'' علی بائیک سے اترا۔ نوید نے بائیک کنارے سے لگا کر کھڑی کی اور دروازے تک آیا، وہ ایک عالیشان بنگلہ تھا۔ جسکے در و دیوار کو سفید اور گرے رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ دروازے پر بیٹھا چوکیدار اُنہیں دیکھ اٹھ کھڑا ہوا۔

''جی؟ کس سے ملنا ہے؟''

''''رضاالٰہی، اسی گھر میں رہتا ہے؟''علی نے پوچھا۔

''جی! یہیں رہتے ہیں۔ آپ؟''

''ہم اُسکے دوست ہیں۔ اُسے بلادیں ذرا!''چوکیدار نے دروازہ کھول کے اندر دیکھا پھر کسی کو اشارے سے پاس بلایا۔

''رضا بھائی اپنے گھر پر ہیں؟''اس نے دروازے پر آنے والے دوسرے چوکیدار سے پوچھا۔

''جی! گھر پر ہی ہیں۔''

''اچھا ان دونوں کو رضا بھائی کے گھر لے جاؤ، یہ انکے دوست ہیں۔''اس نے کہا اور پھر دروازے سے ہٹتے ہوئے، اُن دونوں کو اندر جانے کا راستہ دیا، وہ اندر داخل ہوئے اور دوسرے چوکیدار کے پیچھے چلنے لگے۔ بنگلہ نہ صرف خوبصورت تھا بلکہ اُسکی سجاوٹ بھی سحر انگیز تھی۔ لیکن اُنہیں حیرت کا جھٹکا تب لگا، جب چوکیدار اُنہیں لان سے گھماتا ہوا گھر کے پیچھے بنے چھوٹے سے کوارٹر کے پاس لے کر پہنچا اور اُسکا دروازہ بجانے لگا۔ نوید اور علی نے شدید حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ جتنا خوبصورت یہ بنگلہ تھا اتنا ہی بدصورت یہ کوارٹر تھا۔ دروازہ زنگ آلود اور دیواروں پر جگہ جگہ سیلن کے نشانات نظر آتے تھے۔ سیلن زدہ مقامات پر سے دیواروں کا رنگ بھی اُڑ چکا تھا۔ دو مرتبہ دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا اور اندر سے رضا کا چہرہ دکھائی دیا۔

''رضا بھائی! یہ دونوں آپکا پوچھ رہے تھے۔''چوکیدار نے اُن دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُنہیں وہاں دیکھ کر حیرت کا جو تاثر رضا کے چہرے پر آیا تھا، وہ اُن سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔ گیلے بال اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ ابھی ہی نہا کر آیا ہے۔

''تم دونوں؟ یہاں؟''وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ چوکیدار اُن دونوں کو رضا کا شناسا جان کر مطمئن ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اُنہیں اب سمجھ آیا کہ گارڈ نے رضا کا گھر کیوں کہہ تھا؟

''ہاں وہ، تمہارا سامان میرے پاس ہے، وہی دینے آیا تھا؟''

''مطلب؟''رضا سمجھا نہیں، جواباً علی نے ساری بات اُسے بتادی۔

''اوہ۔۔۔ میں نے بیگ کھول کر دیکھا ہی نہیں، اس لیے مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ خیر، تم دونوں اندر آؤ۔ میں سامان نکالتا ہوں بیگ سے۔'' وہ نظریں جھکا کر کہتا ہوا دروازے سے ہٹا۔ وہ دونوں اُسکے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

اندر آنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوارٹر باہر سے جتنا بدصورت تھا، اندر سے اتنا ہی تباہ حال۔ چار دیواری میں مقید ایک پرانا سا پلنگ، جس پر رضا کا یونیورسٹی بیگ کھلا ہوا پڑا تھا۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار میں ایک دروازہ تھا، جو یقیناً باتھ رُوم کا تھا۔ دروازہ جگہ جگہ سے گل چکا تھا، لگتا تھا کسی بھی وقت اپنی عمر پوری کر کے گر پڑے گا۔ پلنگ کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا فریج تھا اور فریج کے برابر میں گیس سلنڈر، جسکے اوپر ہی چولہا بنا ہوا تھا۔ پلنگ کے دوسری طرف والی دیوار پر ایک سنگل ڈور کی خستہ حال الماری تھی۔ چھت پر لگا پنکھا بھی برائے نام ہی ہوا دے رہا تھا۔ اسکے علاوہ پورے کوارٹر میں کوئی دوسری قابل ذکر چیز نہ تھی۔ حتٰی کہ بیٹھنے کے لئے کرسی تک نہ تھی۔ اُسی پلنگ پر علی نے اپنا بیگ رکھا اور رضا کا سامان نکالنے لگا۔

''حسین کی وجہ سے تم لوگوں کو یہاں آنا پڑا۔ میں یونیورسٹی میں ہی دیکھ لیتا تو اتنی خواری نہ کرنی پڑتی۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ماحول کا بوجھل پن ختم کرنا چاہتا تھا شاید، یا اپنی خفت مٹانا۔

''حسین کو اسکا اچھا بدلا دینے کا ارادہ ہے میرا۔'' علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دونوں اپنا اپنا سامان لے چکے تھے۔

''سوری، اِس وقت تم لوگوں کو چائے پانی نہیں پوچھ سکتا۔'' وہ تھوڑا شرمندہ سا نظر آتا تھا۔

''ارے! کوئی بات نہیں یار! ہمیں ویسے ہی جلدی ہے، چائے پھر کبھی صحیح۔'' علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے، خوشدلی سے کہا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اِس جگہ اُسکا خود کا دم گھٹ رہا تھا۔

''تم اس سلینڈر کو کمرے میں کیوں رکھتے ہو؟ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔'' نوید نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ بیٹھا۔

''یار! کھانا وغیرہ بنانا ہوتا ہے اس لیے، لیکن میں احتیاط سے استعمال کرتا ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ لیکن دھیان رکھنا۔''

''ہم چلتے ہیں۔ اللہ حافظ۔'' علی نے کہا اور دونوں اس سے مصافحہ کرنے کے بعد باہر آ گئے۔ باہر آ کر دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ اس مرتبہ علی نے اپنی بائیک خود چلائی اور نوید کو اُسکے گھر کے باہر اُتارا تھا۔ راستے بھر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی، دونوں ہی گم صم سے تھے۔

''مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا، کہ رضا اتنے برے حال میں رہتا ہوگا۔'' بائیک سے اترنے کے بعد نوید نے کہا۔ علی دونوں بازو بائیک کے ہینڈل پر ٹکائے، اُسے ہی سن رہا تھا۔

''یعنی۔۔۔ وہ کوارٹر تو کیبن کہلانے کے لائق بھی نہیں تھا۔اس سے اچھے تو ہماری یونیورسٹی کے ہوسٹل کے کمرے ہوتے ہیں۔''نوید کو ابھی تک افسوس ہو رہا تھا۔

''رضا نے کبھی اپنے گھر کے حالات کا ذکر نہیں کیا۔اس نے کہا تھا کہ اُسکی ساری فیملی کینیڈا میں رہتی ہے۔مجھے نہیں معلوم اس بات میں کتنی سچائی ہے؟ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جو بات اس نے ہمیں خود نہیں کہی ہے،اس بات کو ہمیں بھی کسی کے سامنے نہیں کہنا۔ہمیں بھی اُسکا پردہ اور بھرم رکھنا چاہیے۔''علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''ظاہر ہے یار!ایسا ہی ہوگا۔اور ایک بات بتاؤں؟رضا جھوٹ نہیں بولتا۔یقیناً اُسکی فیملی اُسے سپورٹ نہیں کرتی۔''نوید نے جواب دیا۔

''اتنا اچھا لڑکا ہے یار!کوئی ماں باپ کیسے اتنے اچھے بیٹے کو disowned کر سکتے ہیں؟''علی نے دکھ سے کہا۔

''اچھے برے سے فرق نہیں پڑتا علی!۔۔سوال یہ ہے کہ کوئی ماں باپ ایسا کر کیسے سکتے ہیں اپنی اولاد کے ساتھ؟''نوید نے کہا اور اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا انکے پاس۔رضا کی زندگی کئی گرہوں میں بندھی تھی۔وہ جتنا کھولنے کی کوشش کرتے اتنا زیادہ ہی اُلجھتے جاتے تھے۔

----------+----------+----------

اگلے دن ڈیپارٹمنٹ میں مرحوم مستقیم کے ایصال ثواب کے لیے ختم قل رکھا گیا تھا،جس میں سب شریک ہوئے تھے،سوائے حسین کے،اُسکا فلحال کچھ اتا پتہ نہ تھا۔کلاس کے طالب علموں نے جوش و خروش کے ساتھ اس میں شرکت کی تھی۔ایک آدھ سینئرز بھی اپنی کلاس کے وقفے کے دوران آکر تعزیت کر گئے تھے۔دعا ختم ہونے کے بعد اُسکا دوست روسٹرام پر آیا،جہاں پیچھے مستقیم کی انلارج تصویر لگی ہوئی تھی۔

''میں مستقیم کا بہت اچھا دوست رہ چکا ہوں اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی اچھا انسان تھا۔''اس کے دوست نے کہنا شروع کیا۔

''مجھے یہ کہہ لینے دیں کہ بے حد مختصر وقت میں وہ ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا تھا۔''اس نے بھرائی ہو آواز میں کہا۔

''وہ ایک بہت۔۔۔بہت۔۔''آنسوؤں کا گولا گلے میں اٹکنے لگا،وہ بات مکمل نہیں کر پایا،حاضرین محفل میں سے بھی بہت سے لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔مقرر نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی۔

''میں کہنا چاہتا تھا کہ مستقیم۔۔۔مستقیم۔۔۔''وہ کہتے کہتے رُکا۔حاضرین ہمہ تن گوش،اور وہ کہ اُسکی آنکھیں باہر آنے کو بیتاب۔۔۔

''مستق۔۔۔مستقیم۔۔۔''اُسکی زبان پر ایک ہی نام اٹک کر رہ گیا تھا۔اب کہ حاضرین بھی بیزار ہونے لگے تھے۔

''مو۔۔۔مس۔۔۔''اُسکی آواز کانپ رہی تھی اور وہ مسلسل دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''اس آواز پر تمام طلبہ و طالبات کی نظریں پیچھے کی جانب گئی تھیں۔اور جو جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔

''یہ تو۔۔۔یہ تو۔۔۔''مقدم کی زبان لڑکھڑائی۔

''یہ تو مستقیم ہے؟''سب سے پہلے رضا کا سکتا ٹوٹا۔

''ہاں! میں مستقیم ہی ہوں،اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟''وہ بیچارہ سمجھ نہیں پایا کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

''تم تو مر گئے تھے۔''پتہ نہیں سوال تھا یا اطلاع؟

''میں کیوں مرنے لگا؟''لیکن اُسکے کچھ کہنے سے قبل ہی پورے آڈیٹوریم کا سکتا ایک ساتھ ٹوٹا تھا اور پھر جسکو جس دروازے سے جگہ ملی،وہ وہیں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ مستقیم بیچارہ جسکو بھی روکتا وہ اُسی سے جان بچا کر چیختا چلاتا بھاگ نکلتا۔

''رکو اِدھر''اس نے پاس سے بھاگتے ایک دُبلے پتلے سے لڑکے کا بازو پکڑ کر اُسے روکا۔

''چھوڑو مجھے بھوت۔۔۔۔امی۔۔۔امی بھوت۔۔۔''وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہونے لگا۔

''میں بھوت نہیں ہوں، مستقیم ہوں۔''اس نے لڑکے کے سر پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''تم مستقیم کے بھوت ہی ہو کیونکہ تم مر گئے ہو۔''اس نے اُسے باور کروایا۔

''ہیں؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میں کیوں مروں گا؟ میں زندہ ہوں، تمہاری آنکھوں کے سامنے۔''

''جھوٹ مت بولو تم مر چکے ہو۔''لڑکا بضد تھا۔

''ایک لگاؤں گا گھما کر۔۔۔کس نے کہا ہے یہ؟''اُسکا ضبط جواب دے گیا۔

''حسین نے کہا تھا،اس نے خود تمہاری لاش دیکھی تھی۔''لڑکے نے کہا تو اس نے بے یقینی سے اُسکا بازو چھوڑا۔

''حسین نے؟''

''ہاں! حسین نے۔۔۔''لڑکا کہتے ہوئے وہاں سے سرپٹ بھاگا تھا۔

''حسین۔۔۔۔۔۔''اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔بے یقینی کی جگہ اب غصّے نے لے لی تھی۔بس نہیں چل رہا تھا کہ حسین کو کچّا چبا جائے۔

----------+----------+----------

''اپنی خیر مناؤاب، مستقیم پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈھتا پھر رہا ہے تمہیں۔''وہ پانچوں اُسکے سر پر کھڑے تھے۔ مستقیم نے بڑی مشکل سے سب کو یقین دلایا تھا کہ اُسے ایمرجنسی میں ہوسٹل چھوڑ کر گاؤں جانا پڑا تھا اور اُسکے پاس کوئی فون وغیرہ بھی نہ تھا، حسین سامنے نظر آیا تو وہ اُسے ہی بتا کر چلا گیا کہ اُسے فوراً گاؤں پہنچنا ہے اور حسین کلاس کے سی آر کو اطلاع دے دے۔ اور اس بدتمیز نے اطلاع بھی دی تو کیا؟ ساری بات جاننے کے بعد جہاں کچھ لوگوں کو غصّہ آیا تھا، وہیں کچھ لوگوں کے لیے ہنسی روکنا محال ہو گیا تھا۔

''یار! بچالو مجھے اس بدروح سے۔۔پلیز!''حسین نے مصنوعی خوف سے کہا۔

''سدھر جاؤ تم۔''نوید نے اُسکے کان کھینچے تھے۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ معلوم بھی ہے کہ سب لوگ کتنے سنجیدہ ہو گئے تھے۔''رضا نے ملامتی انداز میں کہا تھا۔

"دیکھو! میں نے تو مذاق میں کہا تھا، سوچا تھا ابھی بتادونگا لیکن اس سے پہلے ہی اُسکے دوستوں نے اُسکا قل رکھوادیا۔ میں کیا کرتا؟''

''تو اسکا قل ہونے سے پہلے بتادیتے۔''مقدم نے کہا۔

''سب اتنا سنجیدہ ہو چکے تھے کہ مجھے لگا، کہ اگر اب بتادیا تو مستقیم تو بعد میں مارے گا، پہلے یہ سارے مل کے مجھے کچّا چبا جائیں گے۔''

''ایک بار مار کھانا تو بنتا ہے تمہارا، ایسے نہیں سدھر سکتے تم۔''علی نے کہا۔

''تم میرے دوست ہو کہ دشمن؟''اس نے گھورا تھا۔

''یہ آخری بار تھا حسین، دوبارہ ایسا مذاق نہ کرنا۔''عمر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا میرے بھائیوں! نہیں کرونگا دوبارہ، ابھی کے لیے ساتھ دے دو۔ میں آج کی کلاس تو نہیں لے سکتا ورنہ مستقیم مار دے گا، لہٰذا مجھے کیفے میں ہی بیٹھے رہنے دو۔ اور مقی تم، میری پراکسی لگوادینا بھائی!''اس نے اُنہیں کلاس کے لیے اٹھتا دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا دماغ خراب ہے کیا؟ پکڑا گیا نا تو تمہارے ساتھ میں بھی کلاس سے باہر ہونگا۔''

''آج کے لیے کردو، دوبارہ نہیں کہونگا۔''اس نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

''آخری بار ہے یہ۔۔۔''مقدم نے وارن کرنے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے پھر، ہم جا رہے ہیں۔ کلاس کے بعد ملاقات ہوتی ہے۔'' وہ لوگ چلے گئے تو حسین وہاں اکیلا رہ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر بھی سکون سے نہ گزری تھی، کہ کسی نے اُسکے سر پر زور سے تھپڑ رسید کیا تھا۔

''جنگلی ہی رہنا ہمیشہ۔'' حسین نے چڑے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا کارنامہ انجام دیا ہے تم نے؟ میں نے تو جب سے سنا ہے میری ہنسی ہی نہیں رک رہی۔ مطلب کیسے کر لیتے ہو؟'' حور عین نے اُسکے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سن کر مزا آیا ہے، میں نے تو دیکھا ہے۔۔۔۔ہاہاہا!''

''بہت غلط بات ہے ویسے یہ۔'' پاس بیٹھی ایمان کو بھی اُسکا کارنامہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔

''قسم لے لو مجھ سے میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا یہ۔''

''اور تم یہ اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ تمہارے وہ ٹیم میٹس کدھر ہیں؟'' ایمان کو اچانک ہی خیال آیا۔

''وہ کلاس لینے گئے ہیں۔'' اس نے سکون سے بتایا۔

''تم نے کیوں بنک کی کلاس؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں کرتا تو مستقیم جان سے مار دیتا۔''

''مار بھی دینا چاہیے تمہیں۔'' حور عین نے کہا۔

"حسین تمہارا آخری سال ہے، کلاسز مت چھوڑا کرو پلیز!'' ایمان نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''تم فکر نہ کرو ایمان! میں بنا کلاس لیے بھی حور عین سے زیادہ مارکس لاتا ہوں۔''

''کیا کیا کیا؟ کب لائے مجھ سے زیادہ مارکس؟ جھوٹے نہ ہو تو۔'' سٹرا سے شیک پیتی حور نے تڑپ کر کہا۔

''میں ہمیشہ تم سے زیادہ ہی رہا ہوں نمبرز کے معاملے میں، یاداشت کا علاج کرواؤ اپنی۔'' اس نے انگلی سے اُسکا سر بجایا۔

''تمہیں تو میں ابھی بتاتی ہوں۔'' اس نے حسین کو مارنے کے لیے فائل اٹھائی تھی۔

''بس کر دو تم دونوں، ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ میں سوچتی ہوں کہ اپنے دادا کے گھر میں تم لوگ اتنا عرصہ ساتھ کیسے رہے تھے؟'' کچھ سال پہلے تک حسین کے تمام تایا چچا جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے، پھر سب کے بچے بڑے ہو گئے، تو دادا نے سب کو گھر الگ کرنے کہہ دیا۔ اب دادا ہر بیٹے کے پاس کچھ ماہ رہتے تھے۔ اور دیکھا جائے تو یہ ضروری تھا کہ دادا کا گھر سب کے لیے ناکافی ہو گیا تھا لہٰذا بنا کسی جھگڑے کے دادا نے خود ہی سب کو الگ کر دیا۔

''بس نہ پوچھو ایمان! کیسے جھیلا ہے میں نے پورا بچپن اس پچھل پیری کو؟'' دکھی دل سے اپنی داستان سنائی۔

''اپنا منہ دیکھا ہے بن مانس!'' اس نے حساب برابر کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میری کلاس ہے میں چلتی ہوں، تم ہی برداشت کرو اسے ایمان!'' وہ کہہ کر جانے لگی۔

''جاؤ جاؤ، اچھا ہے، میں اور ایمان کچھ دیر سکون کا سانس لیں گے۔'' اس نے حور عین کو چڑایا، وہ بھی اسے انگوٹھا دکھاتی وہاں سے چلی گئی۔

''کیوں تنگ کرتے ہو اسے؟'' ایمان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''مزا آتا ہے۔''

''مجھے تو تنگ نہیں کرتے تم۔''

''کیونکہ تم اتنی اچھی اور ڈیسنٹ لڑکی ہو، دل ہی نہیں کرتا تمہیں چھیڑنے کا۔'' اس نے کہا تو ایمان کے چہرے پر پیاری سے مسکان آئی تھی۔

''اچھا سنو! آج بابا نہیں آئیں گے تو تم مجھے واپسی پر گھر چھوڑ دینا۔''

''جو آپکا حکم!'' اس نے تابعداری سے کہا تو ایمان ہنس پڑی۔

----------+----------+----------

یہ اُنکے گریجویشن کے آخری سال کی بات تھی، وہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے، کتاب چہرے کے سامنے کیے پڑھ رہا تھا۔ تب ہی اُسکے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے، چھوٹے سے فریج کے اوپر رکھی الارم کلاک میں وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے کچھ اچھنبے سے اٹھتے ہوئے دروازہ کھولا، سامنے ملازم کھڑا تھا۔

''رضا بھائی! بڑے صاحب آپکو بلا رہے ہیں۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں جی! شاید کوئی کام ہے۔''اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''اس وقت کیا کام ہے؟''وہ مزید حیران ہوا تو ملازم نے کندھے اچکا دیئے۔

''ٹھیک ہے، میں آتا ہوں۔''اس نے کہا تو ملازم چلا گیا۔

وہ اپنا سامان سمیٹ کر کوارٹر کا دروازہ بند کر کے باہر آیا، لان سنّاٹا پڑا تھا۔ لائٹس کی روشنی لان کے بیچ میں بنے سوئمنگ پول پر پڑتیں، ماحول کو سحر انگیز سا تاثر بخش رہی تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز لان پار کر کے بنگلے میں داخل ہوا۔ باہر کی طرح اندر بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لاؤنج کے ساتھ بنے اسٹڈی روم کی لائٹس روشن تھیں، وہ یقیناً وہیں تھے۔ اس نے اسٹڈی روم کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔ وہ سامنے ہی میز پر مختلف کاغذات بکھیرے بیٹھے تھے۔ اُسے نظر اٹھا کر ناگواری سے دیکھا۔

''آؤ!''انہوں نے کہا۔

''آپ نے بلایا ماموں؟''رضا نے پوچھا۔

''تم نے اپنے باپ کو فون کیا تھا؟''انہوں نے بنا تمہید کے بات شروع کی تھی۔ لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔

''ہاں!''اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ یہ سخت لہجے سہنے کا عادی تھا۔

''کیوں؟''

''جب آپکو یہ پتہ چل گیا ہے کہ میں نے انکو کال کی تھی، تو یہ بھی پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ کیوں کی تھی؟''چبھتا ہوا طنز کیا۔

''کیا ثابت کرنا چاہتے تھے تم اپنے باپ پر؟ ہم نے بہت برے حال میں رکھا ہوا ہے تمہیں؟ بائیک چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے۔''

''کیوں؟ آپ نے مجھے اپنے پیسوں سے خرید کر دینی تھی؟ جس کے پیسوں سے بائیک آنی تھی، اُسی کو فون کرنا مناسب سمجھا میں نے، اور کونسے اچھے حالات کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کتنے اچھے حال میں ہوں میں، وہ اس گھر کے ملازموں کو بھی نظر آتا ہے۔''اُسکے اطمینان میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔

''بکواس مت کرو، تم خود اس خراب کوارٹر میں رہتے ہو۔ ہم نے نہیں کہا تمہیں وہاں رہنے کو۔'' وہ ٹیبل پر ہاتھ مارتے، کھڑے ہوئے۔ وہ اور رضا اب آمنے سامنے تھے، درمیان میں بس میز حائل تھی۔

''کہا نہیں، مجبور کیا۔ اپنی زبانوں سے نہیں اپنے عمل سے۔''

''ہم نے کچھ برا نہیں کیا۔ تم ہی ہو بد زبان اور بد تمیز۔ ہم نے تمہیں اپنی سگی اولاد کی طرح رکھا ہوا ہے۔'' انکی بات پر رضا ہلکا سا ہنسا۔

''میں نے بائیک کا مطالبہ تب بھی کیا تھا، جب یونیورسٹی شروع ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی خراب بائیک پکڑا دی جو کہ آئے روز بند ہو جاتی ہے۔ اور میرے باپ کے بھیجے گئے پیسوں سے اپنے بیٹوں کو عیاشی کروا رہے ہیں۔'' اِس وقت کوئی رضا کو دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔ یہ زہر خند لہجہ اُسکی شخصیت کا خاصہ تو نہ تھا۔

''جس باپ کا نام لے کر بہت اچھل رہے ہو، اُسی باپ سے پوچھنا تھا نا، کہ کیوں نہیں رکھا ہوا اپنے ساتھ تمہیں؟ کہو اس سے کہ لے کر جائے نہ تم کو ساتھ اپنے۔'' انہوں نے طنزیہ کہا۔

''یہ آپکا مسئلہ نہیں ہے۔ آئندہ میرے باپ کے پیسوں پر عیاشی کرنے سے پہلے سوچ لیجئے گا کہ میں اب میں مزید برداشت نہیں کرونگا۔''

''ہونہہ! خود غرض باپ کی خود غرض اولاد، تم لوگوں کو صرف لوٹنا آتا ہے۔'' وہ پھنکارے۔

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ گھٹیا، ذلیل اور لالچی جیسے الفاظ آپکے اور آپکے خون کے لیے ہی تو بنے ہیں۔ جتنے بدصورت چہرے اتنے بدصورت اعمال۔'' پر سکون لہجے میں کہتا وہ، انکو آگ ہی لگا گیا۔

''تمہاری ماں بھی میرا ہی خون تھی۔ اُسکے بارے میں کیا خیال ہیں؟'' اس بار انہوں نے بھی سکون سے کہا تھا۔ رضا کا سکون پل بھر میں غائب ہوا، تن بدن میں مانو آگ ہی لگ گئی تھی۔

''میری ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں؟'' سرخ آنکھوں کے ساتھ رضا نے اُنہیں وارن کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''کیا کر لوگے ورنہ؟ گھر چھوڑ دوگے؟ کہاں جاؤگے گھر چھوڑ کر؟ اپنے باپ کے پاس؟'' انہوں نے استہزائیہ انداز میں کہا تو رضا نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا سارا سامان گرا دیا تھا۔

''آگ لگا دونگا میں ساری دنیا کو۔۔۔'' حلق پھاڑ لہجے میں کہتا وہ ایک لمحے کے لیے اپنے ماموں کو بھی سن کر گیا تھا۔

''تباہ کر دونگا سب کو۔۔۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔

''پہلے خود کو آگ لگا لو، اس دنیا کا ناکارہ وجود ہو تم جسکی نہ کسی کو چاہ ہے نہ ضرورت۔'' اپنے پیچھے رضا کو انکا زہر آلود لہجہ سنائی دے رہا تھا پر وہ رکا نہیں، اور اسی طرح چلتا ہوا بنگلے سے باہر آ گیا۔ لان پار کر کے اپنے کوارٹر میں جانے کے بجائے، وہ سیدھا مرکزی دروازے سے باہر نکل آیا اور گلیوں میں بے وجہ پھرنے لگا۔ یہ تو تہہ تھا کے آج رات وہ گھر واپس نہیں جائے گا۔

----------+----------+---------

''اللہ پوچھے تمہیں حور! تمہاری وجہ سے آج پیدل گھر جانا پڑ رہا ہے۔'' حسین غائبانہ اپنی بچپن کی حریف کو کوستے ہوئے جا رہا تھا۔

''اِتنا سنسان راستہ، اوپر سے سردی، مر مرا گیا نا میں، تو حور عین صاحبہ میری موت کی ذمے دار ہونگیں۔'' وہ اکیلا ہی اکیلا بونگیاں مار رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس سنسان سڑک پر اُسے شدید ڈر لگ رہا تھا۔ گریجویشن کا آخری سال تھا۔ تقریباً روزانہ ہی رات کو دوستوں کے ساتھ اکھٹے بیٹھ کر اپنے فائنل ایئر پروجیکٹ پر کام کرنا پڑتا تھا۔ صبح اُسکا کسی بات پر حور عین صاحبہ سے ٹاکرا ہو گیا تھا، جسکا بدلہ اس نے حسین سے غدّاری کی صورت میں لیا تھا۔ اور جا کر اپنے چچا یعنی حسین کے والد کو اُسکے پچھلے ہفتے ہونے والے، بائیک کے حادثے کی خبر نشر کر دی تھی، جو کہ سراسر حسین کی ہی لاپرواہی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ نتیجتاً اُسکے ابّا نے نہ صرف بائیک اور گاڑی دونوں ضبط کی تھیں، بلکہ اُسکے دوستوں کو بھی باری باری فون کھڑکا دیا کہ خبر دار! جو موصوف کو پک اینڈ ڈراپ دینے کی کوشش کی، تین چار دن پیدل گھر آئیگا تو احساس ہو گا کہ پیسے کتنی محنت سے کمائے جاتے ہیں۔ اور ایسے وقتوں کا تو دوست انتظار کرتے ہیں۔ ایسے ایسے فرمانبردار نکل کر سامنے آتے ہیں کہ کیا ہی اپنے ماں باپ کے ہوں۔ عمر کے اندر تھوڑی بہت انسانیت جاگی تھی، جسے علی نے ڈپٹ کر سلا دیا تھا کہ

''انکل نے کہا ہے نو پک اینڈ ڈراپ تو اسکا مطلب ہوتا ہے نو۔۔۔'' اُسکے بعد مابدولت حسین صاحب اپنے دوستوں کو ٹھیک ٹھاک برا بھلا کہہ کر پیدل ہی سفر پر روانہ ہو گئے، کہ گھر تو واپس جانا ہی تھا۔ اور سارے بے شرم، ذلیل دوست کھڑے ہنستے رہیں۔ اُن چاروں کو جی بھر کر کوسنے کی بعد اب وہ غائبانہ ہی حور عین کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ جس سڑک پر وہ تھا، وہ باقی سڑکوں کے نسبت زیادہ سنسان تھی کیونکہ اُسکی ایک جانب قبرستان تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، آگے کا راستہ پھر بھی پر رونق تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا، اُسکی دائیں طرف قبرستان کی لمبی دیوار تھی۔

''لاحول ولا قوۃ۔۔۔'' زیر لب پڑھتا وہ غلطی سے بھی دائیں جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں اُسے ایک ہیولہ نظر آیا۔

''یا اللہ خیر! استغفرُاللہ!'' پڑھنے میں تیزی آئی، وہ ہیولہ مزید آگے بڑھتا ہوا سٹریٹ لائٹ کی روشنی کے نیچے پہنچا تو حسین چونک اٹھا۔ وہ رضا تھا۔ آج ایف وائی پی (فائنل ائیر پروجیکٹ) پر کام کرنے کیلئے، اس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر وقفہ لیا تھا۔ لہٰذا صرف وہی پانچوں، آج مقدم کے گھر جمع ہوئے تھے۔ اور اب وہاں سے واپسی پر اُسے، وہ یہاں راستے میں نظر آیا تھا۔ رضا نے اُسے نہیں دیکھا تھا بلکہ خاموشی سے چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا تھا۔ اُس نے حیرت سے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، جو رات کے ایک بجا رہی تھی۔

''رات کے اِس وقت یہ قبرستان میں کیا کرنے گیا ہے؟'' اُس نے خود کلامی کی۔

''کہیں یہ۔۔۔ چلہ تو نہیں کاٹ رہا آج کل؟'' اس نے سوچا اور اگلے ہی لمحے جھرجھری لی۔

''توبہ استغفراللہ! کیسی باتیں کر رہا ہوں میں بھی؟''خود کو سرزنش کرتا آگے بڑھا۔اب ہر صورت اُسے رضا کے پیچھے جانا تھا۔خوف سارا اُڑن چھو ہو چکا تھا۔وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا قبرستان میں داخل ہوا۔ گُھپ اندھیرے میں بھی اُسے رضا ایک قبر کے پاس دونوں زانو بیٹھا دکھائی دیا،وہ آہستہ سے اُسکے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

''آخر یہ کیوں آیا ہے یہاں؟''وہ حیران تھا۔رضا قبر کی مٹّی پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اُسکے پیچھے کھڑا حسین بالکل خاموش تھا۔

''امی!''سنّاٹے میں رضا کی آواز گونجی۔

''امی! میری پیاری امی!''اس نے پھر کہا۔

''امی آپ۔۔۔''وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز بھرا گئی۔حسین کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو،کی مصداق ساکت کھڑا رہ گیا۔

''آپ۔۔کیوں چلیں گئی؟۔۔۔سب''وہ سسکا۔حسین کو قدموں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

''سب چلے جاتے۔۔۔بے شک،پر آپ تو نہ جاتیں۔''وہ رو رہا تھا،قبر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔کسی نے کہا تھا کہ جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں لڑکے روتے نہیں ہیں،کوئی پوچھنے والا چاہیے۔

بس کوئی پوچھنے والا،جسکے آگے دل کھول کر رکھا جا سکے۔

اور وہ تو بس ماں ہی ہوتی ہے۔

ماؤں کے لاڈلے،پوری دنیا سے لڑ کر۔

سب سے ہار کر۔

اور زندگی سے تھک کر۔

وہیں تو آتے ہیں،اُسکے پاس جو بن پوچھے ہی دل کا حال جان لیتی ہے۔

اور اُسکے دل کا حال پوچھنے والی تو منوں مٹی تلے تھی۔

وہ پھر بھی اُنکے پاس آیا تھا۔اپنی ماں کے پاس۔

تو کیا ہوا جو وہ بول نہیں سکتی؟

اُسے گلے نہیں لگا سکتی؟

پر اُسے سن تو سکتی ہیں نا؟ یقیناً دیکھ بھی سکتی ہیں۔

حسین سن سا کھڑا رہا گیا۔ رضا کو اس نے سب سے بہترین پایا تھا، لیکن اتنا ہی پر اسرار، سیپ میں قید موتی کی طرح۔۔۔ حسین کو روتے ہوئے کو تسلی دینا نہیں آتی تھی، اُسے چپ کروانا، منانا کچھ بھی تو نہ آتا تھا۔ وہ تو بس ہنستے کھیلتے زندگی گزارتا تھا، لیکن اس نے رضا کو دوست بنایا تھا۔ اور دوستی کا تقاضا تھا کہ اُسے دلاسہ دینا تھا۔ کیا ہوا جو اُسکی ماں نہیں تھی۔ پر دوست تو تھا نا؟ ماں کا نعم البدل نہ تھا۔ لیکن ایک اچھا سامع تو بن سکتا تھا۔ ایک مرد ہی تو مرد کو سمجھ سکتا ہے۔

وہ اُسکے برابر آ بیٹھا، خاموشی سے، رضا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آنسوؤں کے بوجھ سے پلکیں گرنے کو تھیں۔ حسین نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس سے پہلے کے وہ کچھ کہتا، رضا خود ہی اُسکے گلے لگ کر رو پڑا۔

رضا رو رہا تھا۔۔ اور حسین ساکت۔۔

اُسے توقع نہ تھی کے وہ ایسے بکھر جائے گا۔ حسین اُسکا کندھا سہلاتا رہا۔ اس وقت اُسے نہ قبروں سے خوف آ رہا تھا نہ سنّاٹوں سے وحشت۔ رو رو کر جب وہ تھک گیا تو اس سے الگ ہوا، لیکن حسین نے دوبارہ اُسے ساتھ لگا لیا۔

''اٹھو! یہاں سے چلتے ہیں۔ بہت رات ہو چکی ہے۔'' اُس نے اُسکا بازو سہلاتے ہوئے کہا تو، اُس نے آنسو صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ حسین نے اُسے ہاتھ دے کر اٹھایا اور پھر اُسکے کندھے میں بازو ڈالے اُسے قبرستان سے باہر لے کر آیا۔ وہ اُسے خود سے الگ نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے رضا نے اپنے کندھے سے اُسکا ہاتھ ہٹایا اور **''مجھے اکیلا چھوڑ دو''** کہتا دوسری جانب چل دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''کیوں چھوڑ دوں؟ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟'' حسین ایک ہی جست میں اُسکے سامنے آیا۔

''تم جاؤ جہاں جا رہے تھے، مجھے گھر جانا ہے، میں خود چلا جاؤں گا۔'' رضا نے اب کے لہجے کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''تو آؤ ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' اُس نے پھر سے کندھے میں بازو ڈال کر، اُسے ساتھ لگانا چاہا تو اب کی بار وہ بپھر گیا۔

''کہا نا! نہیں ضرورت ہے کسی کی۔'' وہ غصّے سے کہہ کر اب مخالف سمت مڑ گیا۔

''لیکن مجھے تو ہے، دیکھو مجھے اس سنسان سڑک پر ڈر لگ رہا ہے، ایسا کرو تم مجھے گھر تک کمپنی دے دو۔'' حسین نے اُسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس کسی کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔''اُس نے بنامڑے، بنار کے جواب دیا۔

''تو چلو احسان ہی کر دو میری ذات پر۔''وہ بھی بنار کے اُسکے پیچھے آرہا تھا۔

''میں نے کہانا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

''کیوں اکیلا چھوڑ دوں؟ انسان اکیلا رہنے تو نہیں آیا دنیا میں۔''سنسان سڑک پر اپنے سے آگے آگے چلتے رضا کو، وہ بڑی فرصت سے جواب دے رہا تھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اُسکے پیچھے آتے، حسین نے یہ ٹھان لی تھی کہ آج تو نہیں چھوڑے گا اُسے۔۔۔

''میں اکیلا ہی رہنے آیا ہوں اس دنیا میں، میں اکیلا آیا تھا اور اکیلا ہی چلا جاؤنگا، کسی کی بھی ضرورت نہیں مجھے۔''رضا نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ہاں! ہم تو مجمع لیکر آئے تھے اُس دنیا میں، اور بارات ساتھ لیکر واپس جائینگے، بس ایک تم ہی اکیلے آئے ہو۔''حسین اپنی ہی کہے جارہا تھا۔ بلآخر رضا رکا اور مڑ کر اُسے ناراضگی سے دیکھا۔

''مسئلہ کیا ہے؟''حسین اُسکے بالکل قریب آگیا تھا۔

''مجھے کیا مسئلہ ہوگا بھلا؟ سوائے اسکے کہ مجھے بھوک لگی ہے اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔ اب تم بے شک دنیا میں اکیلے آئے ہو، لیکن میں تو دس پندرہ لوگوں کے ساتھ آیا ہوں نا! مجھ سے تو اکیلے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔''حسین نے لفظ اکیلے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آخر تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔''رضا نے تھک کر درخواست کی۔

''کھانا کھالو پھر چھوڑ دونگا۔''حسین نے اُسکا بازو پکڑتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ گھسیٹا تھا۔ اب کے رضا خاموش رہا، وہ، اُسے لیے پر رونق علاقے کی طرف آیا، یہاں ہلکی پھلکی گھما گہمی تھی۔ پھر ایک ریسٹورنٹ جانب بڑھا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔''رضا نے ریسٹورنٹ کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔

''چپ کر کے چلتے رہو۔''حسین نے اُسے آنکھیں دکھائیں اور گھسیٹتا ہوا ریسٹورنٹ کے اندر لے گیا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اکا دکا عوام نظر آرہی تھی۔ رضا کو ایک میز پر بٹھا کر وہ کھانے کا آرڈر دینے چلا گیا۔ آرڈر دے کے وہ واپس اُس کے پاس آبیٹھا۔

''حسین! مجھے واقعی بھوک نہیں ہے۔''رضا نے اُسے دیکھ کر بیچارگی سے کہا۔ رونے کی وجہ سے اُسکی ناک سرخ ہو چکی تھی۔

''مجھے تو ہے، اور میرا ساتھ دینے کے لیے تم بھی تھوڑا کھا لینا۔''اس نے بے نیازی سے کہا، اب کے رضا خاموش رہا۔ کافی لمحات اسی خاموشی میں سرک گئے۔ پھر رضا نے نظریں اٹھا کر حسین کو دیکھا، وہ ہتھیلی کی مٹھی بنائے، اُسے ہونٹوں پر ٹکائے، اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رضا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر جیسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہنا ہے؟ دو تین بار اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا آواز ساتھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟''حسین نے نرمی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''رضا! جو بھی بھرا ہوا ہے نا اندر، اُسے باہر نکالو، جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔ اس فرسٹیشن (چڑچڑاپن) کو ختم کرو۔''حسین نے کہا۔ جبکہ رضا کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

''تم نے کبھی نہیں بتایا کہ تمہاری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ بھی نہیں بتاتے کے باقی گھر والے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کچھ تو بتاؤ رضا! کچھ اپنے بارے میں، شاید میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔''وہ سنجیدہ تھا۔

''کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''اگر کچھ نہ بھی کر سکوں، تب بھی تمہارا دل تو ہلکا ہو گا۔''

''بہت بوجھ ہے اس دل پر، ایسے ہلکا نہیں ہو گا۔''وہ تلخی سے ہنسا اور گلاس وال سے باہر دیکھنے لگا۔ سڑک پر اکا دکا ٹریفک تھی۔

''تو اِس بوجھ کو بانٹ لو، کچھ کم تو ہو گا۔''حسین نے اُسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔ یہ کہیں سے وہ حسین نہیں لگ رہا تھا، جو سارا دن الٹی سیدھی حرکتوں میں ملوث پایا جاتا تھا۔ رضا چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا

''تم کیا کرو گے سن کر؟''حسین گہری سانس لے کر، پیچھے ہو بیٹھا۔

''میں سن کر وہ نہیں کر سکتا، جو تم کہہ کے کر سکتے ہو۔ میرے دادا کہتے ہیں، کہ انسان مٹّی سے بنا ہے۔ جس طرح مٹّی کا غبار ہمیشہ بارش کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور مطلع صاف ہو جاتا ہے، پھر ہر شے روشن اور صاف دکھنے لگتی ہے۔ اسی طرح مٹّی کے بنے انسان کے دل کا غبار بھی جب بڑھ جائے، تو اُسے روکے، کبھی کہہ کے تو کبھی لڑ کے ہی صحیح، لیکن یہ غبار نکال دینا چاہیے۔ پھر دل بھی صاف ہو جاتا ہے اور ذہن بھی۔''پتہ نہیں کیوں پر حسین کو سننا اُسے اچھا لگ رہا۔

''ماں یاد آتی ہے، ہر گھڑی، بلکہ وہ تو کبھی بھولتی ہی نہیں۔ لیکن جس طرح تم رات کے اس وقت انکی قبر پر آئے ہو، کچھ تو غلط ہوا ہے جو اتنی رات کو تمہیں وہ یاد آئی ہیں۔ وہ بھی اس شدت سے کہ تم وقت کا لحاظ کیے بغیر ہی انکے پاس چلے آئے۔''حسین کے کہنے پر اُسے پھر سے کچھ گھنٹوں قبل ہونے والا اپنا اور

ماموں کا جھگڑا یاد آیا تھا، وہ اب بھی خاموش رہا۔ جب حسین کو یقین ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں بولے گا تو وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے باہر دیکھنے لگا۔ ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔

''میری امی۔۔۔۔'' رضا کی آواز نے فضاء میں چھایا سکوت توڑا، حسین پھر سے سیدھا ہوا۔

''میری امی، میری پیاری امی۔۔۔ وہ بہت پیاری اور بہت خوبصورت عورت تھیں۔ وہ دنیا کی سب سے حسین عورت تھیں۔ لیکن شاید۔۔۔۔ ایسا بس مجھے لگتا تھا، میرے ابّو کو نہیں۔ وہ ساری عمر اُنکو یہی کہتے رہے کہ تم اتنی کالی اور کم صورت ہو کہ میرا تمہیں دیکھنے تک کو بھی دل نہیں کرتا۔'' وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں بول رہا تھا۔ آنکھیں اُسکی دور خلا میں موجود ماضی کو تلاش رہی تھیں۔ ماضی قریب آ رہا تھا اور وہ اُسے واضع دیکھ رہا تھا۔

----------+----------+----------

''اتنی دیر سے کیوں گھر آئے ہو؟'' رضا کی دادی نے واصف صاحب سے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کام تھا۔'' انہوں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ تمہارا روز روز کا تماشا کب ختم ہو گا؟ تمہاری بیوی روزانہ کھانے پر انتظار کرتی ہے اور تم اتنی اتنی رات گئے گھر آتے ہو اور کھانا بھی باہر کھا کر آتے ہو۔ کیوں کر رہے ہو ایسا؟''

''کس لیے گھر آؤں؟ اس بدصورت عورت کے لیے؟ اُسکی کالی شکل دیکھنے کے لیے گھر آؤں؟ اُسکا خیال آتے ہی میرا گھر ہی آنے کا دل نہیں کرتا۔'' جاہلوں کی طرح بولتے اس وقت وہ کہیں سے بھی پڑھے لکھے نہیں لگ رہے تھے۔

''وہ سادہ مزاج، معصوم عورت ہے، اور تم اُسے بدصورت کہہ رہے ہو؟ آنکھوں پر سے پٹّی اُتار کر دیکھو۔ کتنے خوبصورت نین نقوش ہیں اُسکے۔ بس رنگت سانولی ہے اور وہی تو اُسے پرکشش بناتی ہے۔'' انہوں نے برہمی سے کہا۔

''ایک منٹ۔۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے یا آپکی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، اِس اُجڈ عورت نے؟ ہونہہ۔۔۔ پرکشش۔۔۔'' انہوں نے اپنی ماں کے پیچھے کھڑی اپنی بیوی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ نم آنکھیں لیے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آپ لائی تھیں نا اسے؟ آپ ہی کھایا کریں اسکے ساتھ کھانا۔'' وہ غصّے سے کہتے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گئے۔

''بیٹی! وہ یقیناً کسی بات پر پریشان ہو گا ورنہ ایسی باتیں کبھی نہیں کرتا۔۔'' رضا کی دادی نے اپنی بہو کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں خالہ! مجھے پتہ ہے۔''انہوں نے نرمی سے انکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔اس سارے منظر کو رضا ڈرائنگ روم کے پردے کے پیچھے سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔وہ تقریباً روزانہ ہی اپنے باپ کو ایسی بدزبانی کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔بس فرق صرف اتنا تھا، کہ آج پہلی بار وہ اُسکی دادی کے سامنے بھی یہ ساری بات کہہ گئے تھے۔وہ اٹھتے بیٹھتے رضا کی ماں کو انکے کالے رنگ کا طعنہ دیتے تھے۔اور وہ بیچاری چپ کر کے سب سہتی جاتی کہ میکے کے نام پر ایک ہی بھائی تھا اور وہ بھی انکے حال سے بے نیاز۔۔۔۔

اُس دن کے بعد سے واصف صاحب، اپنی ماں کے سامنے بھی رضا کی ماں کو انکی شکل وصورت کا طعنہ دینے لگے۔ ایک دن صبح ناشتے پر انکی ماں نے کہا کہ

''واصف! بہو کو آفس جاتے ہوئے اُسکے بھائی کے گھر چھوڑ دینا۔بہت دنوں سے نہیں گئی ہے یہ۔''دادی نے برتن سمیٹتی رضا کی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمم۔۔۔''اُنہوں نے فقط اتنا ہی جواب دیا۔رضا کو اُسکی امی، آملیٹ کے ٹکڑے کر کے دے رہی تھیں۔

''میں پندرہ منٹ بعد نکل جاونگا۔''انہوں نے رضا کی امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بس پانچ منٹ دیں، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''اُنہوں نے عجلت میں کہا۔

''تیار ہونے سے کونسا فرق پڑ جائے گا تمہیں۔''اُنکی طنزیہ انداز میں کہے جملے سے اُنکا سارا جوش ماند پڑ گیا، اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔چھے سالہ رضا انکے پیچھے پیچھے کمرے میں آیا، جہاں وہ آنسو صاف کرتے ہوئے، اپنا پرس کندھوں پر لٹکا رہی تھیں۔وہ آکر انکے پیروں سے لپٹ گیا۔

''رضا! کیا ہوا بیٹا؟''وہ پریشان ہوئی۔

''امی!''وہ روتا رہا۔

''مجھے بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟ کسی نے ڈانٹا ہے؟''وہ پنجوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھیں۔

''امی! آپ بہت پیاری ہیں۔۔۔آپ بہت ساری پیاری ہیں۔''وہ روتے ہوئے معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''آپ بہت پیاری ہیں۔آپ رویا مت کریں۔''وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انکے آنسو پونچھنے لگا۔وہ بھونچکا رہ گئیں۔حتٰی کہ یہ چھوٹا سا بچہ انکا دکھ، اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا، اور ایک اسکا باپ تھا۔اُنہیں لگا کسی نے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔ انہوں نے رضا کو خود میں بھینچ لیا۔

''میں جارہاہوں۔'' باہر سے واصف صاحب کے چلانے کی آواز آرہی تھی، مگر اب اُنہیں کوئی پروانہ تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور رضا کا ہاتھ تھامے باہر چل پڑیں۔

----------+----------+----------

وہ ایک خوفناک رات تھی۔ رضا نے اس رات سے پہلے کبھی اپنی ماں کو شوہر سے اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا۔ ہمیشہ اُسکا باپ ہی چیختا چلاتا تھا، لیکن اس رات اُسکی ماں اور باپ میں شدید جھگڑا ہو رہا تھا۔ رضا لاؤنج کے صوفوں کے پیچھے چھپا بیٹھا سب سن رہا تھا۔ جھگڑے کی وجہ سمجھ میں نہ آرہی تھی۔ اُسکی دادی کے انتقال کو دو ماہ ہو چکے تھے اور انکے جانے کے بعد تو واصف صاحب جیسے اور شیر ہو گئے تھے۔ رضا کی ماں کا اکلوتا حامی بھی جا چکا تھا۔ اُنکی موت کے بعد سے وہ بات بے بات اپنی بیوی کو ذلیل کرتے، حتٰی کہ اب وہ گالم گلوچ پر بھی اتر آئے تھے۔ وہ خاموشی سے سب سہتی رہتی، پر کچھ نہ کہتی۔

پر نہ جانے آج ایسا کیا ہوا تھا؟ جو وہ اس طرح اُن سے لڑ پڑی تھیں۔ دونوں کی آوازیں کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ رضا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جھگڑوں کی آواز میں تیزی آنے لگی، پھر ایکدم ہی چٹاخ کی آواز سنائی دی، پھر اُسکی ماں کے رونے کی آواز آئی۔

''زبان دراز عورت! تُو روکے گی مجھے؟ تُجھے دیکھ کر تو جانور نہ رکنا چاہے تیرے پاس، اس قدر بدصورت شکل کے ساتھ کیسے مجھے روک رہی ہے تُو؟'' رضا کا باپ اُنہیں مارتا جارہا تھا۔ نہ جانے وہ اُنہیں کس کام سے روکنا چاہتی تھیں؟ بہر حال، یہ احتجاج اُنہیں بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ لاتیں، گھونسے، تھپڑ سب مار رہے تھے۔ اور رضا کی ماں کی چیخیں آسمان چھو رہی تھیں۔ وہ کمزور تھیں، آگے سے کچھ کر بھی نہ پا رہی تھیں۔ اس ساری صورتحال میں رضا دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے رو رہا تھا۔ اُن آوازوں سے بچنے کے لیے اُس نے کان بند کر لئے تھے لیکن سب بے سدھ۔۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور واصف صاحب تن فن کرتے گھر سے باہر نکل گئے۔ انکے جانے کے بعد رضا ڈرتے ڈرتے اٹھا اور انکے کمرے میں آیا، اُسکی ماں فرش پر بے دم سی پڑی سسک رہی تھیں۔ اُن میں تو رونے کی ہمت بھی نہ بچی تھی۔

''امی! امی! میری پیاری امی!'' رضا بھاگتے ہوئے آیا اور اُن سے لپٹ گیا۔ انکے رونے میں تیزی آگئی۔

''امی! میری پیاری امی!'' وہ روتا جاتا اور کہتا جاتا تھا۔ وہ پوری رات اُن ماں بیٹے نے روتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ رات رضا کی زندگی کی خوفناک ترین رات تھی، لیکن اس رات کے بعد آنے والا دن اُس سے بھی کہیں زیادہ بدترین تھا۔ اگلے دن صبح اُسکی ماں نے اُسے اسکول کے لیے تیار کیا، وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ماں سے بحث بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیے خاموش رہا۔ اُسکی ماں نے اُسکے لیے لنچ تیار کر کے بیگ میں رکھا اور اُسے بہت سارا پیار کر کے وین میں بٹھایا۔ عموماً وہ اُسے وین میں بٹھانے کے بعد گھر کے اندر چلی جاتی تھیں۔ لیکن آج اندر نہیں گئی، بلکہ دروازے پر ہی کھڑی وین کو دور جاتا دیکھتی رہیں۔ رضا انکو ہاتھ ہلاتا رہا اور وہ رضا کو یہاں تک کہ وین انکی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

----------+----------+----------

''امی بہت شرارتی تھیں۔'' رضا بولتے ہوئے اچانک ہی مسکرایا۔ نظریں اُسکی اب بھی گلاس وال کے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ویٹر کچھ دیر قبل ہی کھانا میز پر رکھ کر گیا تھا۔

''اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کسی پردے کے پیچھے، تو کسی دروازے کے پیچھے چھپ جاتیں اور مجھے جب کافی دیر وہ نظر نہ آتی تو میں اُنہیں ڈھونڈتا، جب وہ مجھے کہیں نہ ملتی، تو میں رونے لگ جاتا، یہاں تک کہ مجھے روتا دیکھ، وہ ہنستے ہوئے باہر نکل آتی۔ کبھی جب میں اُنہیں بہت تنگ کرتا تھا، تب وہ اچانک سے نیچے گر جاتی اور آنکھیں بند کر کے مرنے کی اداکاری کرتیں، میں اُنہیں اٹھاتا پر وہ نہ اٹھتیں، جب بار بار اٹھانے پر بھی وہ نہ اٹھتیں، تو میں پھر رونا شروع کر دیتا۔ اور وہ ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔ وہ ایسے ہی سارا دن میرے ساتھ کھیلتیں، شرارتیں کرتی تھیں۔ وہ بہت پیاری تھیں۔'' وہ خواب سی کیفیت میں کہہ رہا تھا، جبکہ حسین بالکل خاموش تھا۔ کھانا پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا، پر دونوں میں سے کسی نے اس پر نظر تک نہ ڈالی تھی۔

''اُس دن بھی میں نے اُنہیں اٹھایا تھا، کئی بار۔۔۔ مجھے لگا۔۔۔ مجھے لگا وہ مذاق کر رہی ہیں۔۔ پر'' اُسکی آواز بھرا رہی تھی۔

''میں رویا۔۔۔ مجھے لگا ابھی اٹھ جائینگی۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ نہیں اٹھیں۔۔۔'' وہ بے ربط سی گفتگو کر رہا تھا۔ حسین کچھ کچھ بات سمجھ رہا تھا۔ رضا نے اذیت سے آنکھیں میچیں، وہ جیسے پھر سے وہی بچہ بن گیا تھا۔ وہی چھے سال کا بچہ، وہ پھر اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔

----------+----------+----------

اُس روز اسکول میں اُسکا کچھ بھی کرنے کو دل نہ کیا تھا۔ وہ کلاس کا سب سے تیز اور ذہین بچہ تھا۔ اُسکی خاموشی اور غائب دماغی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔ تقریباً ہر ٹیچر نے ہی اُس سے سبب جاننے کی کوشش کی تھی، پر چھے سال کی عمر میں بھی وہ جانتا تھا کہ گھر کا پردہ رکھنا ہے، اس نے کسی سے رات والے واقعے کا ذکر نہیں کیا، بس چپ رہا۔ دوپہر کو چھٹّی کے بعد جب وین اُسے لینے آئی، تو اُسکا حقیقی معنوں میں گھر جانے کا دل نہیں چاہا تھا۔ وہ بچہ تھا، اپنی بے چینی کو رات والے واقعی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ بہر حال گھر تو اسے جانا تھا، سو وین میں بیٹھ گیا۔ پورے راستے بچے وین میں ہلا گلہ کرتے رہے، پر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ چپ تو وہ ہمیشہ سے رہتا تھا، مگر آج تو ارد گرد کا جیسے ہوش ہی نہ تھا۔

''رضا بیٹا! آپکے گھر کے باہر رش کیوں ہے؟'' وین ڈرائیور نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا، تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گھر کے دروازے پر محلے والے کھڑے تھے۔ وہ ناسمجھی سے اُنہیں دیکھتا ہوا وین سے اُترا۔ اتنے سارے لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کافی لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ اگر کوئی بات بھی کر رہا تھا، تو اتنے آہستہ آواز میں کے آواز صرف اُن دو کے درمیان ہی رہے۔ وہ بچہ تھا، اپنی عمر کے

باقی بچوں کے نسبت اُسکی سمجھ بوجھ زیادہ تھی۔اُسے یاد تھا کہ ایسا رش آج سے دو ماہ قبل دادی کے انتقال پر بھی ہوا تھا۔لیکن اس سے آگے وہ سمجھ نہیں پایا کیونکہ اُسکے ماموں نے اُسے دیکھ لیا تھا،اب وہ تیزی سے اس تک آرہے تھے۔

''آگئے بیٹا؟ چلو اندر آؤ۔''وہ پیار سے اُسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''السلام وعلیکم!''اس نے ماموں کو سلام کیا۔

''''ولی بیٹے!رضا کو اسکی پھوپھو کے پاس لے جاؤ۔''انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔اب جا کر رضا نے دیکھا تھا کہ وہاں صرف ماموں نہیں بلکہ اسکے اور بھی رشتے دار موجود تھے،ماموں کا بڑا بیٹا اُسکا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانے لگا،اُسکی آنکھوں سے لگتا تھا کہ ابھی ابھی رو کر آیا ہوں۔

''ولی بھائی!آپکو کسی نے ڈانٹا ہے؟''رضا نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں!کسی نے نہیں ڈانٹا۔''اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ رو کیوں رہے ہیں؟''ولی اُسکے مشاہدے پر حیران رہ گیا۔خود وہ رضا سے آٹھ سال بڑا تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات ہے۔''وہ جلدی سے کہتے ہوئے،اُسے اُسکی پھوپھو کے پاس لے آیا۔اُسے دیکھتے ہی اُسکی پھوپھو نے اُسے گلے لگایا،گھر میں اور بھی بہت سارے لوگ موجود تھے،ایسے بھی جنہیں رضا جانتا تھا اور ایسے جنہیں اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

''پھوپھو!امی کہاں ہیں؟''رضا نے اُن سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بھوک لگی ہوگی نا میرے بچے کو؟ جاؤ کپڑے بدل لو،میں کھانا لے آتی ہوں۔''یہ اُسکے سوال کا جواب نہیں تھا۔

''پہلے امی کے پاس جانا ہے۔''

''بیٹا!تم جا کر کپڑے بدلو،کھانا تمہیں کمرے میں مل جائے گا۔کھا کر سو جانا جب تک ہم نہیں بلائے باہر نہ آنا۔''پیچھے سے اُسکے ماموں کی آواز آئی۔

''پر ماموں!میری امی؟''اس نے پھر پوچھا۔

''بیٹا!امی باہر گئی ہیں تمہاری،تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔چلو اب تم جاؤ۔''اُنہوں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا،اب کے وہ خاموش ہو گیا۔کمرے میں جا کر بھی اُسے سکون نہیں آیا۔وہ سو سکا نہ ہی کھانا کھا سکا۔وہ اپنی امی کے بنا کبھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔باہر سے وقتاً فوقتاً رونے کی اور کبھی کبھی بین کرنے کی آوازیں آنے لگتی۔وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا،لیکن کمرے سے باہر نہیں جاتا کہ اُسے ماموں نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔اسی طرح بہت سا وقت گزر گیا،اُسے نیند

آنے لگی تو وہ سو گیا۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر سویا ہو گا؟ اُسکی آنکھ اُسکی پھوپھو کی بیٹی کی آواز پر کھلی تھی۔ اُسکی اٹھائیس سالہ پھوپھو زاد اُسے اٹھا رہی تھی۔ اپنی امی کے بعد اگر رضا کو کوئی پسند تھا تو وہ یہی تھیں، وہ رضا سے بہت پیار کرتی تھیں۔

''کیا ہوا عائشہ جی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ اُنہیں عائشہ باجی کہنے کے بجائے ''عائشہ جی'' کہتا تھا کہ بچپن میں اُسکے منہ سے لفظ باجی ادا نہ ہوا تھا، پھر اُسکی عادت ہی بن گئی۔

''اٹھو رضا! تمہاری امی آگئی ہیں۔'' انکی آواز بھرائی تھی، لیکن رضا نے محسوس نہیں کیا۔

''امی آگئیں۔'' وہ خوشی سے چہک اٹھا، اور وہ سسکی، اس نے اب بھی محسوس نہ کیا بلکہ بستر سے اچھل کر اترا اور ننگے پاؤں باہر بھاگا۔

''رضا! رضا کو!'' عائشہ جی اُسکے پیچھے بھاگیں۔

''امی! امی کہاں ہیں آپ؟'' وہ بھاگتے ہوئے خوشی سے اُنہیں آوازیں دے رہا تھا۔ باہر بیٹھے اور کھڑے لوگوں نے دکھ سے اُسے دیکھا۔

''امی! میری پیاری امی!'' وہ پورے گھر میں بھاگتا، اُنہیں ڈھونڈ رہا تھا اور عائشہ جی اُسکے پیچھے پیچھے، اُسے روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ گھر کے ہر کونے میں اُنہیں ڈھونڈتا جاتا، دیکھنے والے ساکت کھڑے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر اُسے روکتا۔ بلآخر وہ خود ہی رکا۔ عائشہ جی ہانپتے ہوئے اُسکے پاس آئیں۔

''عائشہ جی! امی کہاں ہیں؟'' اس نے کچھ بے چینی سے پوچھا، تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے اُسکے قریب آئیں۔ اُسکا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

''رضا! تمہاری امی اب نہیں آئیں گی۔ اُنہیں اللہ نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولیں۔

''نہیں! نہیں مجھے میری امی چاہیے، عائشہ جی! میری امی کہاں ہیں؟ مجھے میری امی چاہیے۔'' وہ اُنکا ہاتھ جھٹک کر پہلے چیخا، پھر وہ رویا، اللہ کے پاس جانے کا مطلب اُسے پتہ تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔۔۔'' وہ اُسکا ہاتھ تھام کر اُسے وہاں لے گئیں، جہاں اُسکی ماں کی لاش کچھ دیر قبل ہی لا کر رکھی گئی تھی۔

''وہ رہی تمہاری امی، انکو آخری بار دیکھ لو۔ پھر اُنہیں جانا ہے۔'' وہ رضا کو لاش کے قریب لے آئیں۔

''امی! میری پیاری امی!'' وہ بھاگتے ہوئے کھاٹ کے قریب گیا۔اُسکی ماں ہمیشہ ایسے مذاق کرتی تھیں، لیکن یہ اتنے جلدی سچ کیسے ہو گیا؟ صبح تو وہ رضا کو پیار کر رہی تھیں، اُسکا لنچ بنا رہی تھیں، اُسکی کتابیں بیگ میں رکھ رہی تھیں، اُسکے بال بنا رہی تھیں تو اب کیا ہوا؟ اب اچانک سے کہاں چلیں گئی؟ وہ چپ کیوں تھیں؟ وہ بول کیوں نہیں رہی تھیں؟ اُنکی آنکھیں بند کیوں تھیں؟

سفید کفن میں لپٹی اُسکی ماں اس وقت کتنی پر سکون لگ رہی تھی۔ رضا سارا رونا دھونا بھول گیا۔ اور یک ٹک انکے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔۔ ساکت سا۔۔۔ حیران سا۔۔۔ اتنا پیارا چہرہ۔۔۔ اتنا پر نور چہرہ۔۔۔

یہ اُسکی ماں کا تھا؟

کیا مرنے کے بعد لوگ اتنے پیارے ہو جاتے ہیں؟

وہ انکے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہاں کھڑا ہر وجود مجسم حیرت تھا۔ کچھ لمحوں پہلے اسکو قابو کرنا مشکل تھا۔ اور اب وہ اتنا پر سکون کیسے ہو گیا؟ جیسے کوئی غم ہی نہ لگا ہو۔

اُسکی ماں کے چہرے کا سارا سکون اُسکے دل میں اتر رہا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگوں میں جنبش ہوئی، اب رخت سفر باندھنا تھا۔ رضا خاموش۔۔۔

لوگ آگے بڑھے، مردے کو لیکر جانا بھی تھا۔۔۔

اُسے اب رخصت ہونا تھا۔۔۔ لیکن رضا کا وجود بے حس و حرکت۔۔۔۔

چلو اب اسے الوداع کہہ دو، ایک آخری الوداع۔۔۔ کسی نے رضا کے کان میں کہا۔

کسی نے آگے بڑھ کر چہرے پر کفن ڈال دیا، اُسکی ماں کا خوبصورت چہرہ چھپ گیا۔

شور تھا ہر جانب، اب رضا کا باپ بھی لاش کو کندھا دے رہا تھا۔ مگر رضا ساکت۔۔۔ نہ کچھ کہا۔۔۔ نہ رویا۔۔

''رو لو بیٹا! رو لو، تمہاری ماں اب نہیں آئیگی۔''

وہ اب خوابوں میں ملیں گی۔۔۔

وہ تصویروں میں نظر آئیں گی۔۔۔

وہ جا رہی تھیں، دروازے سے جنازہ باہر جا رہا تھا۔ رضا دیکھ رہا تھا، خالی خالی نظروں سے، کیا وہ گھر واپس نہیں آئینگی؟

ہاں! وہ نہیں آئینگی، اب وہ کبھی نہیں آئیں گی۔ وہ قبر میں کیسے رہیں گی؟ رضا کی باتوں کا جواب کہاں سے دیں گی؟ وہ اُنہیں کہاں ڈھونڈے گا؟

اور جنازہ چلا گیا۔ اب وہ کہیں نہیں تھیں۔ نہ کچن میں نہ کمرے میں، نہ گھر کے صحن میں۔۔

وہ دنیا میں کہیں نہ تھیں۔۔۔۔

''امی! میری پیاری امی!'' ایک آخری سسکی لبوں سے نکلی، اور وہ بے دم سا فرش پر ڈھے گیا۔

حسین کو اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی، اُسکی آنکھوں سے آنسو خود بخود باہر آرہے تھے۔ رضا ویسے ہی ریسٹورانٹ کے شیشے سے باہر نظر آتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''جب امی چلیں گئی، تو مجھے پتہ تھا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی لیکن۔۔۔'' اس نے شیشے کی جانب سے چہرہ موڑ کر حسین کو دیکھا۔

''لیکن؟'' حسین نے آہستہ سے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج وہ سب کچھ کہہ دے۔ سب کہہ کر وہ اپنا دل ہلکا کرلے مگر آج کے بعد خود پر اتنا بوجھ لے کر نہ گھومے۔ سارا نہ صحیح کچھ تو غم ہلکا کرلے اپنا۔

''لیکن حسین، میں چھوٹا تھا۔ بہت چھوٹا۔۔۔ بچہ تھا میں، کہیں نہ کہیں مجھے لگتا تھا کہ سب جھوٹ ہے۔ امی واپس آجائیں گی۔ میں اکیلے گھر میں چلا چلا کہ روتا کہ شاید۔۔۔ شاید وہ کسی پردے کے پیچھے سے نکل آئیں گی، اور ہنستے ہوئے کہیں گی کہ وہ مذاق کر رہی ہیں، پر ایسا نہیں ہوتا۔ میں روتے روتے خود چپ ہو جاتا۔ پھر اگلے دن دوبارہ وہی سب کرتا کہ شاید امی آجائیں۔ میں تو بچہ تھا، لیکن لوگ دن بدن مجھے پاگل سمجھنے لگے۔ مجھے روز روز ایسے چلا چلا کر روتے دیکھ، ایک دن عائشہ جی، نے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ قبرستان، امی کی قبر پر بھیج دیا۔ اس دن میں نے یہ تسلیم کرلیا کہ امی مر چکی ہیں'' وہ کچھ دیر خاموش ہوا پھر بولا۔

''جب میں نے سمجھوتہ کرلیا کہ اسی غم کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے، تب میرا باپ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' وہ رکا۔

''کیوں؟'' حسین نے پوچھا، وہ رضا کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا، ماں کا ذکر کرتے ہوئے جو دکھ وہاں تھا، باپ کا ذکر کرتے ہوئے وہ نفرت میں بدلنے لگا۔

----------+----------+----------

چار دن، فقط چار دن لگائے تھے اُسکی باپ نے دوسری شادی کرنے میں، یقیناً اُسی عورت سے، جس کی خاطر اُسکی ماں اُسکے باپ سے اُس رات لڑی تھی۔ پہلی اور آخری بار۔۔۔

شادی ہو گئی، نئی آنے والی کو اپنا سوتیلا پن دکھانے کا موقع بعد میں ملا، اس سے پہلے ہی اُسکے اپنے باپ نے اُسے، اُسکے ماموں کے گھر چھوڑ دیا۔ وہ بھی اپنی ماں کا ہی بیٹا تھا۔ کوئی سوال، کوئی شکایت نہ کی۔ خاموشی سے انکے گھر چلا آیا۔ وہاں سب کچھ مناسب ہی تھا۔ چھٹیوں پر وہ اُسے واپس گھر لے آتے۔ جہاں رضا، کسی کونے میں سامان کی طرح پڑا رہتا۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ ایک رات، جب وہ اپنے باپ کے گھر رہنے آیا ہوا تھا، تب اس نے اپنی سوتیلی ماں کو باپ سے بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ اپنے بیٹے سمیت کینیڈا ہجرت کرنے کا کہہ رہیں تھی اور رضا کے باپ کو اُسکی فکر تھی۔

''آپ اُسکا سالانہ خرچہ دے دیا کیجیئے گا، پھر تو اُن لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ رہنے دیں اُسے وہیں۔''

''پر وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔'' انہوں نے بیچارگی سے کہا تھا۔ شاید اُنہیں زندگی میں آج پہلی بار یاد آیا تھا، کہ اپنی ماں کے جیسے کھڑے نین نقش لیکن ہو بہو ماں کی جیسی ہی رنگت رکھنے والا رضا، انکا بھی بیٹا ہے۔

''پر میرے بھائی کا وہ کچھ نہیں لگتا۔ میرے بھائی نے مجھے اور میرے بیٹے کو سپانسر کیا ہے اور آپ میرے شوہر ہیں تو ساتھ میں آپکو بھی شہریت مل جائیگی، مگر رضا کے لیے آپکو انتظار کرنا ہو گا۔ اور میں اتنا اچھا موقع نہیں جانے دے سکتی۔ اُسکے ننھیال والوں کی بھی تو ذمے داری ہے۔ وہ رکھیں اُسے۔''

''مگر۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، پر انکی بیگم نے بات کاٹ دی۔

''اگر مگر کچھ نہیں، اگر آپ نہیں آئے تو میں اپنے بیٹے کو لے کر اکیلے چلی جاؤں گی۔'' رضا بوجھل قدموں سے واپس پلٹ گیا۔ جانتا تھا کہ یہ آخری دھمکی کتنی اثر رکھتی ہے اُسکے باپ پر۔ رضا کو اس گھر سے نکال کر اپنے ماموں کے گھر چھوڑنے پر بھی اسی دھمکی نے اُسکے باپ کو آمادہ کیا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جسکی اُمید تھی۔ وہ چلے گئے، اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ، جاتے ہوئے وہ رضا کو اُسکے ماموں کے گھر چھوڑنے آئے تھے، ہمیشہ کے لیے۔ پورے راستے وہ خاموش رہا لیکن جب وہ اُسکا سامان گاڑی سے ماموں کے گھر کے سامنے اُتار رہے تھے تب۔۔۔

''ابو! مجھے آپکے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے مت چھوڑیں یہاں۔'' اس نے پر امید لہجے میں کہا۔ اُسکے باپ نے ایک نظر اُسے دیکھا اور خاموشی سے واپس چہرہ موڑ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب کچھ بھی کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بہت خوددار تھا، اس نے دوبارہ اپنے باپ سے کچھ نہیں کہا۔

اس دن رضا نے تیسرا جنازہ دیکھا تھا۔ اُسکے باپ کا جنازہ۔ وہ بھی تو اُسے چھوڑ کر ہی جا رہے تھے۔ ہمیشہ کے لیے، کبھی نہ واپس آنے کے لیے، رضا کے لیے اُسی دن انکی موت بھی ہو گئی تھی۔

وہ چلے گئے تھے۔۔۔

اُسکے ماموں کے گھر تو وہ پہلے ہی دو سال سے رہ رہا تھا۔ لیکن اب وہ مستقل وہاں کا رہائشی بن گیا تھا۔ کب تک ؟اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا، ماموں اور انکے گھر والے جنکا رویّہ پہلے اُسکے ساتھ اچھا نہ سہی تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ پر اب وہ کھل کر سامنے آئے تھے۔ جب اُسکے ابّو نے کینیڈا جا کر پہلی بار رضا سے بات کرنے کے لیے فون کیا، تو اس نے انکار کر دیا۔ اُسکے بعد سے جتنے بھی فون آتے، رضا کے علم میں لائے بغیر ہی انکار کر دیا جاتا۔ وہ بچہ تھا، کچھ دن کا غصّہ تھا اُسے، پر اپنے باپ کی ضرورت رکھتا تھا۔ لیکن اُسے ہر بار بتایا جاتا کہ تمہارا باپ وہاں جا کر بھول گیا ہے تمہیں۔ کچھ حد تک یہ بات درست بھی تھی۔ کینیڈا سے فون کا سلسلہ چند مہینوں میں بتدریج کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا۔ البتہ پیسے ہر ماہ باقاعدگی سے آتے اور رضا کے علم میں لائے بنا ہی استعمال ہو جاتے۔

کچھ عرصے بعد اُسکے ماموں نے اپنا گھر کرائے پر دے دیا اور رضا کے ابّو کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ جو اُسکے باپ کے جانے کے بعد سے خالی پڑا تھا۔ اس گھر میں آ کر اُسے کچھ اچھا محسوس ہوا تھا، وہ اُسکی ماں کا گھر تھا۔ رضا اپنا سامان لے کر اپنے کمرے میں گیا لیکن۔۔۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اُسکے کزن نے ناگواری سے اس سے پوچھا۔

''میں اپنے کمرے میں آیا ہوں؟''

''تمہارا کمرہ؟'' وہ حیران ہوا اور پھر غصّے سے اپنی امی کو آوازیں دینے لگا۔

''امی، امی! یہاں آئیں جلدی۔'' رضا بیچارہ تو بوکھلا گیا تھا۔

''ارے! کیا ہوا؟''

''یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اسکا کمرہ ہے۔'' اس نے شکایت کی

''کیا مطلب اس بات کا؟ یہ میرے بیٹے کا کمرہ ہے۔'' اُنکی تیوری پر بل پڑے۔

''کوئی بات نہیں مامی! میں کسی دوسرے کمرے میں رہ لونگا۔'' وہ ممانی کو غصّے میں دیکھ کر گھبرا گیا۔

''ہونہہ۔۔۔'' انہوں نے اتنا ہی کہا۔ پر رضا کو نہیں معلوم تھا کہ اس گھر کے کسی دوسرے کمرے تو کیا، کسی کونے میں بھی اُسکی جگہ نہیں ہے۔ پہلی رات ہی اُسے کوارٹر بھیج دیا گیا تھا۔ کہا گیا کہ گھر میں کچھ رنگ وروغن کے کام کی وجہ سے جگہ نہیں بن پا رہی تو آج رات وہ یہاں گزار لے، بھلا ایک چھوٹے سے بچے کو کتنی جگہ چاہیئے تھی گھر میں؟ وہ رات اس نے کس طرح ڈر ڈر کے گزاری تھی؟ بس وہ ہی جانتا ہے۔ ساری رات وہ اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا۔ اُس رات کے بعد کسی رات بھی اُسے گھر کے اندر جگہ نہ ملی، شروع میں وہ کہتا تو وہ لوگ بہانہ بنا دیتے۔ پھر جیسے اُسے عادت ہوتی چلی گئی۔

سالوں گزر گئے پر اُسکے کے حالات میں تبدیلی نہ آئی، اُسے ایک ایک چیز کے لیے ترسایا جاتا۔ اُسکے باپ کے پیسوں پر عیاشی کرنے والے اُسے یہ احسان جتاتے کہ اُسکا خرچہ وہ لوگ اٹھا رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے سب سنتا۔ کبھی اف تک نہ کرتا۔۔۔ پتہ نہیں اتنا صبر کہاں سے لایا تھا وہ؟ شاید اپنی ماں کی طرح ہی صابر تھا۔ ایک مرتبہ وہ سلینڈر پر چائے رکھ کر باہر لان میں آیا تھا۔ یہ اُسکی قسمت تھی کہ سلینڈر اُسی وقت پھٹا تھا۔ پورے کوارٹر میں آگ لگ گئی۔ اُسکے بعد بھی کسی کو احساس نہ ہوا۔ اُسی خستہ حال کوارٹر کو رنگ کر کے رضا کے حوالے کر دیا گیا۔ نئی گیس کی لائن ڈالی گئی نہ ہی دروازوں اور کھڑکیوں کو بدلا گیا۔ رضا تب بھی خاموش۔۔۔۔

لیکن آج اس نے اپنے باپ کا نمبر کسی طرح حاصل کر لیا۔ وہ انکے آفس کا نمبر تھا انکی سیکریٹری نے فون اٹھایا۔ اس کے کہنے کے مطابق ہر ماہ ایک خطیر رقم رضا کے نام پر اُسکے ماموں کے اکاؤنٹ میں بھیجی جاتی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ اُسکا دماغ ہی گھوم کر رہ گیا۔ آج اُسکا صبر جواب دے گیا تھا۔ کتنے چہرے تھے ان لوگوں کے؟ وہ غصّے میں اپنے ماموں سے بھڑ گیا تھا اور جواب میں جو باتیں انہوں میں اُسے سنائی تھیں وہ رضا کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ مزید کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہتا تو کسی گستاخی کا مرتکب ہو جاتا۔ اسی لیے گھر سے نکل آیا۔ لیکن اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ کسی کے آگے نہیں جھکے گا۔ اپنے حق پر کسی کو غاصب بننے نہیں دے گا۔

گھر سے غصّے میں نکلا وہ چلتے چلتے قبرستان آ گیا، وہ اکثر ایسے ہی قبرستان آ جاتا تھا۔ اپنی ماں کے پاس آ کر اُسے سکون ملتا تھا۔ مگر آج وہ رو پڑا تھا۔ ایسے میں نامعلوم حسین کہاں سے آ گیا تھا؟ وہ زبردستی اُسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ جو باتیں اُس نے کسی سے نہ کہیں تھیں۔ وہ آج حسین سے کہہ ڈالیں۔ وہ تھک گیا تھا، اپنے اندر رکھ رکھ کر، اُسے بھی کوئی سامع چاہیے تھا۔ وہ بھی اس طوفان کو باہر نکالنا چاہتا تھا۔

کھانا کب کا سامنے رکھا ٹھنڈا ہو گیا تھا، پر دونوں نے ہی ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اب رضا چپ تھا۔ حسین کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ اُسکی کس کس بات پر اُسے تسلی دے؟

"کچھ کھا لو رضا!" کافی دیر بعد اس نے رضا کو مخاطب کیا۔ خلاف توقع اس نے بنا کسی بحث کے کھانا شروع کر دیا تو حسین نے سکھ کا سانس لیا۔ خود بھی خاموشی سے کھانا کھاتے حسین نے کئی بار رضا کو دیکھا تھا۔ وہ پھر ویسا ہی ہو گیا تھا، گم صم سا، خاموش سا، اپنے خول میں بند۔

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" حسین نے اچانک ہی پوچھا تو منہ میں چمچ کی مدد سے نوالہ ڈالتے اُس کا ہاتھ رکا اور اس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میرا مطلب، ظاہر ہے تم نے اُن خود غرض لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا لیکن پہلے اپنے پیروں پر کھڑا بھی تو ہونا ہے۔"

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا؟" اس نے پلیٹ میں چمچ واپس رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مطلب؟''حسین سمجھ نہیں سکا۔

''مطلب یہ کہ مجھے ان لوگوں سے واسطہ رکھنا ہے، دشمنی کا، انتقام کا۔اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونا ہے ہی مجھے، لیکن۔۔۔ان سے سب کچھ واپس لینا ہے۔یہ گھر جس میں یہ لوگ رہتے ہیں، میری دادی نے میری ماں کے نام کیا تھا۔اور وہ میرا ہے، مجھے ان سے وہ گھر واپس لینا ہے۔اور وہ تمام پیسہ جو میرے باپ سے یہ لوگ میرے نام پر بٹورتے رہے ہیں، وہ سود سمیت واپس لینا ہے مجھے ان سے اور وہ بھی ایک ساتھ، یہ کیسے واپس کرتے ہیں وہ میرا مسئلہ نہیں۔میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔نہ ماموں کو نہ انکے بیوی بچوں کو، سب سے باری باری بدلا لونگا، اور اس فہرست میں میرے باپ کا نام سب سے پہلے ہے۔کیونکہ وہ میری ماں کا قاتل ہے۔''بہت آہستہ، اور بہت سرد مہری سے کہتا وہ حسین کے رونگھٹے کھڑے کر گیا تھا۔وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا منصوبہ تھا اُسکے دماغ میں؟ کیا کرنے والا تھا وہ؟ اسکا جواب حسین کے پاس نہیں تھا البتہ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ رضا سچ کہہ رہا ہے۔اُسکی آنکھوں میں انتقام کی جو آگ تھی وہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم جو کرنا چاہتے ہو ضرور کرنا، پر ابھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔کچھ وقت کے لیے بھول جاؤ اُن سب کو، کم از کم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک۔''حسین نے آرام سے سمجھایا۔

''ہاں! ابھی تو میں کچھ بھی نہیں کرونگا، پہلے مجھے اپنے لیے کچھ کرنا ہے، چاہئے اُسکے لیے مجھے خود غرض کیوں نہ بننا پڑے۔''وہ سختی سے کہتا اب پلیٹ میں رکھے چاولوں کو یہاں وہاں کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تمہارا حق بھی ہے۔لیکن ابھی غصّہ ٹھنڈا کرو اور گھر جاؤ۔اور پلیز، گھر جا کر اُن سے کوئی بحث مت کرنا۔''حسین نے اُسکا غصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ہمم۔۔۔''اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔حسین نے سکھ کا سانس لیا۔اُسکے ارادوں سے وہ خود بھی ڈر گیا تھا۔

----------+----------+----------

''کیا تم میری جان نہیں چھوڑوں گے؟''ریسٹورنٹ سے واپسی گھر آتے ہوئے بھی حسین اُسکے ساتھ ساتھ تھا۔رضا نے آج تک کسی سے نہ اپنا راز بانٹا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں میں سے کسی کو گھر لایا تھا۔''غصّہ کیوں کر رہے ہو اتنا؟''تاریخ گواہ تھی کہ حسین کو کسی بات سے کبھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

''غصّہ نہیں کر رہا، میرا گھر آگیا ہے تو اب تم جاؤ۔''وہ جھنجھلایا۔پوسٹ اوور شیئرنگ گلٹ، جذبات میں آکر سب بتا تو دیا لیکن اب اپنے آپ پر غصّہ آرہا تھا۔

''کیا مطلب؟ میں نے تمہیں کھانا کھلایا ہے، تم مجھے چائے بھی نہیں پلاؤ گے؟'' دنیا بھر کی معصومیت اور مسکینیت چہرے پر طاری کی، رضا دانت کچکچا کر رہ گیا۔ جانتا تھا کہ وہ جان نہیں چھوڑے گا۔ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، جب حسین نے سننا ہی نہیں ہے تو روکنے کا کیا فائدہ؟

لان پار کر کے وہ اپنے کوارٹر تک آیا اور رک کر پیچھے دیکھا، ایک اُمید کہ شاید وہ چلا گیا ہو، لیکن وہ بھی فرصت سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ سر جھٹک کے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ پھر دروازے پر رک کر بولا۔

''میں اندر نہیں بلاؤں گا تمہیں، اتنی قابل ذکر جگہ نہیں ہے یہ۔'' تلخی سے کہا۔

''تم سے اجازت کس نے مانگی ہے؟'' اسکو پیچھے دھکیلتے ہوئے خود ہی اندر داخل ہوا۔ رضا بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

اس قید خانے جیسے کمرے میں واقع کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔ لیکن حسین بڑے آرام سے پاؤں پسارے، اُسکے پلنگ پر ڈھیر ہوا۔

''چلو شاباش! جس چیز کا وعدہ کیا تھا وہ دو مجھے۔۔۔''

''میں نے کون سا وعدہ کیا؟'' رضا نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''چائے پلانے کا۔'' وہ بھی سکون سے بولا۔

''مفت میں نہیں ملتی چائے، سلینڈر میں گیس بھرنی پڑتی ہے۔'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنی گیس خرچ ہو جائیگی آخر؟'' وہ بھی بڑا ڈھیٹ تھا۔ رضا بیزاری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس سے بحث کرنا واقعی فضول تھا۔ جتنی دیر میں اُس نے چائے تیار کی، اتنی دیر حسین کچھ نہ کچھ بک بک کرتے اُسکا دماغ کھاتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنی پریشانی بھول بھال گیا۔

''تمہاری چائے۔'' اب کے ذرا تمیز سے بات کی تھی۔ چائے کی پیالی بھی، اس کوارٹر جیسے حالات پیش کر رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہوا لیکن حسین نے بڑے آرام سے کپ لیا اور چائے کے گھونٹ بھرے۔

''آدمی اچھے ہو تم، بس دماغ کے ٹیڑھے ہو۔'' حسین نے شرارت سے کہا۔

''سوری! دماغ گھوما رہتا ہے آج کل۔'' اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوا تو بولا۔

''بس کرو یہ مظلوم ہیروئن والی حرکتیں، میرے سامنے تو بالکل یہ شکل مت بنانا ورنہ ایک جھانپڑ لگا کر سیدھا کر دوں گا۔'' رضا ہنس پڑا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

''اب فضول باتوں کو ذہن سے نکال کر صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ بدلہ لینے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔''اُس نے پھر سمجھانا چاہا۔ رضا نے بس سر ہلا دیا تھا۔ اُسکے بعد کافی دیر وہاں بیٹھے، اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، جب اُسے لگا کہ اب رضا پہلے سے کافی بہتر ہے، تو جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ فجر ہونے والی تھی، رضا اُسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ باہر آتے ہوئے اُسکی نظریں لان میں فون کان سے لگائے، ٹہلتے ہوئے ماموں پر پڑیں تو چہرے کے تاثرات میں واضح ناپسندیدگی در آئی۔

''یہ تمہارے ماموں ہیں؟''حسین نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بڑی ہی کوئی خبیث چیز ہیں ویسے۔۔۔''حسین کے برجستہ تبصرے پر وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

''اب میں پیدل گھر جاؤں؟''اُسکا موڈ بہتر دیکھ کر اُس نے دنیا جہاں کی معصومیت چہرے پر سمو کر پوچھا۔

''آؤ چھوڑ دوں تمہیں۔''رضا نے بائیک کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ ویسے بھی کچھ دیر گھر سے دور رہنا چاہتا تھا، یہ اچھا طریقہ تھا۔

اُس روز رضا کے دل میں حسین کا مقام اور مرتبہ مزید بلند ہو گیا تھا۔

----------+----------+----------

دن تیزی سے گزر رہے تھے، اُنہوں نے گریجویشن مکمل کر لی تھی۔ ماسٹرز کے لیے عمر نے اپنی فیلڈ تبدیل کرتے ہوئے ملٹی میڈیا آرٹس کا انتخاب کیا تھا۔ کچھ مصروفیات کے باعث وہ داخلہ فارم لینے نہ جا سکا، تو اُسکا فارم بھی علی اپنے ساتھ ہی لے آیا، لیکن جمع کروانے اُسے خود ہی جانا تھا۔ لہٰذا وہ مقدم کے ساتھ آج جامعہ آیا ہوا تھا۔ گھنٹے بھر کی محنت کے بعد وہ فارم جمع کروانے میں کامیاب ہو پایا۔ اِس تمام عرصے میں مقدم اُسے کمپنی دیتا رہا تھا۔ اب دونوں سر درد کے باعث کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''تمہیں یاد ہے؟ پچھلے دنوں ہم نے سیلاب متاثرین کی امداد کے فنڈز اکھٹے کیے تھے۔''مقدم نے اچانک ہی پوچھا۔ تو عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سب سے زیادہ امداد رضا کی طرف سے آئی تھی اُس روز۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''عمر کو سمجھ نہ آیا کہ وہ اُسے یہ بات کیوں بتا رہا تھا؟

''اچھی بات تو ہے، لیکن تم جانتے تو ہو کہ اُسکی فیملی اُسے سپورٹ نہیں کرتی۔ وہ خود ہی اپنے اخراجات اٹھاتا ہے۔ اتنے زیادہ پیسے دینا، اُسکے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں پوچھ بیٹھا کہ یہ صرف تمہارے پیسے ہیں یا کسی اور نے بھی ساتھ بھیجے ہیں۔ تو معلوم ہے اس نے کیا کہا؟''وہ رکا۔

''کیا؟''

''اس نے مجھے بتایا کہ وہ آٹھویں جماعت سے پیسے جمع کر رہا ہے اور اُن پیسوں کو اُس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نے پوچھا کس لیے جمع کیے تھے؟ تو کہنے لگا کہ میں ایک گھر بنانا چاہتا ہوں، جہاں میں اُن بچوں کو رکھوں گا، جنہیں اُنکے ماں باپ disowned (مطرود) کر دیتے ہیں یا جو اپنے کسی رشتے دار کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، اور وہ لوگ بس مجبوری میں اُنہیں اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہوں۔ میں ایسے لوگوں کو کہونگا کہ نہ کریں اُن بچوں پر یہ احسان، مجھے دے جائیں، میں پال لونگا اُنہیں۔ کم از کم آپکے گھر میں رہتے ہوئے، روزانہ جو انکی خودداری، انا اور عزت نفس مجروح ہوتی ہے، وہ تو نہ ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ یعنی تم یتیم خانہ کھولنا چاہتے ہو؟ تو کہنے لگا نہیں! یتیم خانے تو بہت ہیں، میں انکے لیے گھر بنانا چاہتا ہوں۔ اس گھر میں وہ سب فیملی کی طرح رہیں گے۔ اپنی مرضی سے زندگی گزاریں گے، اپنی پسند کا پہنیں گے۔ لوگوں کی اُترن یا بھیک پر نہیں پلیں گے وہ بچے۔'' اس نے ساری بات بتائی تو عمر حیرت زدہ رہ گیا۔ رضا ایسا سب کچھ سوچتا تھا؟ اور کتنا گہرا تھا وہ؟ کتنا؟ اتنا کہ شاید اُسکی گہرائی میں اتارنا ناممکن تھا۔

''پتہ ہے عمر اس نے مجھ سے کیا کہا؟ کہنے لگا کہ مجھے نہیں معلوم یہ کام کرنے میں کتنا عرصہ لگے؟ شاید بیس سال یا تیس سال لیکن یہ میں اپنے پیسوں سے، اپنی کمائی سے کرونگا کسی کی امداد یا صدقات سے نہیں۔ وہ پیسے جو میں نے جمع کیے تھے، اُسکا ایک حصہ میں نے یہاں دے دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو دوبارہ جمع ہو جائیں گے۔ لیکن یہ میں ضرور کرونگا۔'' مقدم نے آہستہ سے اُسکے الفاظ دہرائے۔ رضا کے لیے جو عقیدت آج اُسکے لہجے میں تھی، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی عمر نے۔ بہت دیر انکے درمیان خاموشی چھائی رہی، مقدم چائے کے کپ پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ جبکہ عمر کے خیالات کی رو بھٹک بھٹک کر بس رضا پر ہی جا رہی تھیں۔

''آغا!'' اس نے مقدم کو پکارا۔

''ہونہہ۔۔۔'' اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''رضا بہت پراسرار سا نہیں لگتا؟ وہ اپنے گھر والوں کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتا۔ اور کبھی کبھی بہت تلخ ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ایسا ہی رہتا ہے، اُداس سا۔ یعنی۔۔۔ میں سمجھ نہیں پاتا کہ وہ ایسا کیوں ہے؟''

''اسکی باتوں کا ماخذ تو یہی لگتا ہے کہ اُسکی فیملی کا رویہ صحیح نہیں ہے اُسکے ساتھ، تبھی تو وہ اتنا نالاں ہے سب سے، لیکن عمر! ہم اُسے زیادہ کرید بھی نہیں سکتے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔ میں اتنے اچھے انسان کا دوست ہونے کا اعزاز کھونا نہیں چاہتا۔'' آج مقدم کے دل میں رضا کا احترام مزید بڑھ گیا تھا۔

''اللہ، اُسے اُسکے ہر مقصد میں کامیاب کرے۔'' عمر نے دل سے دعا کی تھی۔

''آمین۔''مقدم نے کہا تھا۔

----------+----------+----------

لیلیٰ کی پڑھائی شروع ہونے کے بعد ہی مقدّم کی گریجویشن کا اختتام ہو گیا تھا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ سوات چلا گیا، اپنی دادی کے گھر۔ اب لیلیٰ کی طرف سے اُسکی فکر ذرا کم ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی سادگی اور معصومیت سے مقدم کی ماں اور اپنے تعلقات بہت بہتر کر لئے تھے۔ اور مقدم کو یقین تھا کہ آنے والوں وقتوں میں وہ امّاں کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ جتنا وہ مقدم کے لیے کر رہی تھی، اس سے مقدم کی نظروں میں اُسکی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دل سے اُسکی قربانیوں کا قدر دان ہو چکا تھا۔

دوسری طرف وہ پھوپھو کے گلے شکوے دور کرنے میں بھی کافی حد تک کامیاب ہو رہا تھا۔ سوات سے واپس آنے کے بعد پڑھائی ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی اور اس بار پہلے سے زیادہ محنت طلب تھی۔ اُس نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ درمیان میں پھوپھو نے لیلیٰ کی شادی کا شوشہ چھوڑ دیا۔ انکا کہنا تھا کہ جتنا پڑھنا تھا، پڑھ لیا اتنا اچھا رشتہ آیا ہے اُسکے لیے، وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیں؟ یہ صورت حال کافی پریشان کن تھی۔ لیلیٰ کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

''یار! تم رو تو مت، اتنی مشکلوں سے صحیح، ہم نے اپنے بڑوں کے تعلقات بہتر کر دیے ہیں نا۔ ہم آگے بھی سب ٹھیک کر لیں گے۔''وہ اُسے تسلی دے رہا تھا، لیکن وہ تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''نہیں مقدم! امی نہیں مانیں گی۔ اب کیا ہو گا؟''اس نے روتے ہوئے پوچھا، تو اُس نے سر پیٹ لیا۔

''میں نے کہا تو ہے کہ میں سب ٹھیک کر لونگا۔ بھروسہ رکھو مجھ پر۔''اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، تو وہ سوں سوں کرتی ہوئی چپ ہوئی۔

''دیکھو اب تک میں نے سوائے ابّا کے کسی کو نہیں بتایا تھا گھر میں، یہ میری ہی غفلت ہے، لیکن اب میں امّاں سے بات کرنے لگا ہوں۔ اب تو انکا دل بھی تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔''اس نے دوبارہ سے اُسے تسلّی دی تو وہ کچھ لمحے اُسے یونہی دیکھتی رہی۔

''مانا کے میں بہت ہینڈسم ہوں لیکن اتنا بھی نہ گھورو مجھے کہ نظر ہی لگ جائے۔''اس نے شرارت سے کہا تو لیلیٰ نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔

"ممانی زبان کی تیز ہیں، پر دل کی بری نہیں ہیں۔ پچھلے ایک سال میں، میں نے دیکھا لیا ہے اُنہیں۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے، کبھی مجھ سے میری پسند پوچھ کر میرے لیے کھانا بناتی ہیں۔ کبھی میرے لیے کپڑے سینے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن بس امی سے خار کھاتی ہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھے بہو کے طور پر قبول کرینگی بھی یا نہیں؟''اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہمم۔۔۔۔اسکا حل ہے میرے پاس۔''اس نے پر سوچ انداز میں کہا۔

''کیا؟''

"بس تم ایسے ہی روتی رہو اور امّاں کے آنے تک چپ نہ ہونا۔''

''ہیں؟''وہ حیران ہوئی۔

''بس جو کہا ہے وہ کرو۔''اتنی دیر میں مقدم کی ماں وہاں آ گئیں۔

''آئے ہائے! کیا ہو گیا؟''اُسکی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر وہ چونکی۔

''پھوپھو نے اسے سوات واپس بلایا ہے۔''مقدم نے جواب دیا۔

''ہاں تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ چھٹیاں ہیں، جا کر مل آؤ۔''وہ دوپٹہ سر سے اتارتی، صوفے پر بیٹھیں۔ شاید وہ ابھی ابھی باہر سے آئی تھیں۔

''پھوپھو نے اسکے لیے بہت اچھا رشتہ دیکھ لیا ہے۔ بقول انکے ایسا رشتہ بار بار نہیں ملے گا۔''

''ہیں؟ یہ کب ہوا؟ مجھے تو نہیں بتایا۔''وہ حیران ہوئیں۔

''آپ کو بھلا کیوں بتائیں گی؟ انکو پتہ ہے نا کہ آپ یقیناً مخالفت کرینگی۔''اس نے اصل بات کا آغاز کیا تھا۔

''میں کیوں مخالفت کروں؟ انکا مسئلہ ہے۔''مقدم گڑبڑا گیا۔ لیلیٰ پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔

''ارے میرا مطلب جب آپکو پتہ چلے گا کہ وہ لیلیٰ کی پڑھائی چھڑوا کر اُسکی شادی کروا رہی ہیں، تو آپ تو اس چیز کو غلط کہیں گی نا۔''

''شادی ابھی ہو رہی ہے؟''وہ مزید حیران ہوئیں۔

''ہاں تو اور کیا؟ پھوپھو کا بس نہیں چل رہا، اگلے مہینے ہی رخصت کر دیں اسے۔ کیوں لیلی؟''اس نے لیلیٰ کو بھی گفتگو میں شامل کیا تھا۔ جو رونا دھونا چھوڑ کر اب اُسے ہی گھور رہی تھی۔ مقدم نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''ہائے بیٹی! اب کیا کر سکتے ہیں؟ تمہاری ماں کو کون سمجھائے؟''انہوں نے عام سے انداز میں اُسکی دل جوئی کی۔ اُسی لمحے لیلیٰ نے اچانک ہی نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ بلیو جینز پر ڈارک براؤن شرٹ پہنے وہ واقعی بہت پیارا لگ رہا تھا۔ مزاج میں ہر وقت شرارت گھلی رہتی تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ فخر تو اُسے اس بات پر تھا کہ یہ شخص اُسکا دیوانہ تھا۔ اور جو اگر وہ اُسکا نہ ہو سکا تو؟ وہ اُسکا نہ بھی ہوا لیکن کیا خود وہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار پائے گی؟ یہ خیال آتے ہی

آنکھوں میں آنسو دوبارہ اُمڈ آئے تھے۔ وہ یکدم ہی اٹھی اور روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ مقدم اور اُسکی امّاں جو اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، اُسکے اس طرح اچانک روتے ہوئے جانے پر حیران ہوئے۔

''بیچاری، اتنی اچھی بچی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا تمہاری پھوپھو کی بیٹی ہے۔'' اُسکی ماں نے افسوس سے کہا۔ بس یہی موقع تھا جب مقدم کو لگا کہ اُسے اپنی چال چل ہی دینی چاہیے۔ باقی اللہ مالک ہے۔

''ہاں! ابّا بھی یہی کہہ رہے تھے۔ انہوں نے تو پھوپھو کو سمجھانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پھوپھو نے بس یہی کہا کہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکلنے نہیں دیں گی۔''

''تمہارے ابّا کی تو وہ سنتی ہی کہاں ہے؟ بس اپنی کرتی رہتی ہے۔ ہماری کوئی عزت ہی کہاں اُسکی نظروں میں؟'' انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور نہیں تو کیا؟ ابّا تو سوچ رہے تھے کہ لیلیٰ کا رشتہ مانگ لیں میرے لیے، تاکہ یہ مسئلہ ہی ختم ہو۔ لیکن میں نے ہی منع کر دیا۔'' بڑا ہی خطرناک جوا کھیلا تھا اُس نے۔

''ہیں ہیں؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ کچھ حیران، کچھ پریشان سی بولیں۔

''کل ہی کی بات ہے۔ ابّا نے صرف سوچا تھا یہ، پھر مجھ سے ذکر کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آپ سے مشورہ کرتے میں نے ہی منع کر دیا۔''

''کیوں منع کیا تم نے؟'' مزید حیران ہوئیں۔

''کیا فائدہ امّاں؟ آپکا نام سنتے ہی پھوپھو نے انکار کر دینا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آپکے بیٹے کو اپنا داماد بنائیں؟ وہ کسی چرواہے سے شادی کروا دینگی لیلیٰ کی پر آپکے بیٹے سے نہیں۔'' اُس نے چہرے پر خاصے افسوس ناک تاثرات بھرے۔

''ارے! ایسے کیسے انکار کرے گی؟ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے؟ اکلوتا ہے، اچھی تعلیم حاصل کر رہا ہے، ساتھ ساتھ کماتا بھی ہے۔ روشن مستقبل ہے اُسکا۔'' انکے اندر کی ماں جاگی تھی، اور یہی مقدم چاہتا تھا۔

''ایسا آپکو لگتا ہے۔ ورنہ آپ کہہ کر اپنا منہ خالی کریں گی، وہ صاف انکار کر دیں گی آپکو۔'' اس نے ترپ کا پتہ پھینکا تھا۔ اب بس فیصلہ ہونا تھا۔

''اُسکی مجال مجھے انکار کرے؟ میں آج ہی تمہارے ابّا سے بات کرتی ہوں۔ دیکھتی ہوں، کیسے منع کرتی ہیں تمہاری پھوپھو؟ لیلیٰ تو اب میری ہی بہو بنے گی۔'' وہ عزم سے کہتی اٹھیں اور جلدی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں، تاکہ مقدم کے ابّا سے بات کر سکیں۔

''بس؟ یہ اتنا آسان تھا؟''مقدم حیران بیٹھا تھا۔ واقعی؟ یہ اتنا آسان تھا؟ اُسکے بعد جو اُس نے ہنسنا شروع کیا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُسے یاد آیا تھا کہ لیلیٰ یہاں سے روتے ہوئے گئی تھی۔ وہ جلدی سے اُسکے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔

اُسکے کمرے میں آیا، تو وہاں کوئی موجود نہ تھا، پھر کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ وہ لان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ پاس ہی بہت سارے رنگوں کے مارکر تھے۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی ڈائری کھولے اس میں کچھ لکھ رہی ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے کمرے سے باہر نکلا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو امّاں اور ابّا اپنے کمرے میں کسی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ گفتگو کا موضوع جانتا تھا، لہذا مسکراتا ہوا لان کی طرف بڑھا۔ لیکن اُسی لمحے لینڈ لائن کی گھنٹی بج اٹھی، وہ رکا، پھر ٹیلیفون کے پاس چلا آیا۔ سی ایل آئی پر عمر کا نمبر تھا، وہ مسکرایا۔

''ہاں جی! فرمایئے؟''اس نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''اور لیلیٰ کے مجنوں؟ کیا حال ہیں آپکے؟''عمر کی مسکراتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی تو اُسکی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''بہت اچھے! آپ سنایئے ماسٹرز کیسا جارہا ہے؟''اتنی عزت پر عمر ہنس دیا۔

''بہت اچھا، کافی دنوں سے تم سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ یونیورسٹی میں بھی نہیں مل پاتے تم۔ یہ بتاؤ تم ملنے کیلئے گھر کب آرہے ہو؟''عمر نے شکوہ کن انداز میں کہا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ الگ الگ ہونے کے باعث اب ملاقات کم کم ہی ہو پاتی تھی، اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ماسٹرز میں داخلہ ہونے کے ساتھ، تقریباً اُن سب نے ہی شام کے اوقات میں نوکری کرنا شروع کر دی تھی۔ رضا کوچنگ سینٹر میں پڑھا رہا تھا، نوید ایک سوپر سٹور کا فلور منیجر تھا، علی میڈیکل سٹور میں اسسٹنٹ سیلز منیجر تھا، عمر شام کے اوقات میں آرٹس کلاسز لیتا تھا، خود مقدم ایک بیکرز برانڈ میں ایم ٹی او تھا، جبکہ حسین فلحال اپنے باپ کے ساتھ انکے آفس جارہا تھا۔ اتنی مصروفیات کے دوران، انکے لیے ایک دوسرے سے ملنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مہینوں گزر جاتے تھے، ساتھ مل کر کہیں بیٹھے ہوئے لیکن دوستی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

''اب تو ڈائریکٹ شادی کا کارڈ لے کر آؤنگا۔''اس نے شرارت سے کہا تو عمر اُچھل پڑا۔

''کیا کیا کیا؟''وہ تقریباً چیخا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی جو سن رہے ہو۔۔''اُسکے سکون میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔

''تمہارا مسئلہ حل ہو گیا؟''اُس نے پوچھا۔

''تقریباً آدھے سے زیادہ۔''

''صبح صبح کیا زبردست خبر سنائی ہے۔''وہ حقیقتاً خوش تھا۔

''تمہاری صبح اب ہوئی ہے؟''مقدم نے مشکوک نظروں سے گھڑی کو دیکھا، جو دوپہر کے دو بجا رہی تھی۔

''بس یار! رات بھر پروجیکٹ پر کام کرتا رہا تھا۔ اسی لیے صبح دیر سے اٹھا ہوں۔''اُسکے بعد وہ دونوں کافی دیر بات کرتے رہے اور اگلے ہفتے ملاقات پر اتفاق کر کے ہی فون بند کیا۔ عمر سے بات کرنے کے بعد وہ سیدھا لان چلا آیا، جہاں لیلیٰ اب بھی بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر اُسکے برابر میں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''بس؟ اتنا چھوٹا سا دل ہے تمہارا؟ ذرا سی مشکل میں رونے لگ گئی''اُس نے پوچھا، تو لیلیٰ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ آنکھیں اب بھی سرخ تھیں۔

''اب یہ آنسو بچا کر رکھو اپنی رخصتی پر بہانہ۔''اس نے شرارت سے کہا تو لیلیٰ نے خفگی سے اُسے دیکھا۔

''مجھے تنگ مت کرو۔''وہ رخ پھیر کر ڈائری کے صفحات الٹنے لگی۔ مقدم دیکھ سکتا تھا کہ ڈائری ختم ہونے کے قریب تھی۔

''اچھا بات تو سنو! اب گھر تو جانا ہی پڑے گا۔ لڑکے والے یہاں دیکھنے تھوڑی آئیں گے تمہیں۔''

''بھاڑ میں جاؤ!''وہ غصّے سے کہتی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''رکو!''وہ جلدی سے اُسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو مجھے؟ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''وہ رو دینے کو تھی، مقدم مزید اُسے چھیڑنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے سنجیدہ ہوا۔

''امّاں مان گئی ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''اُسے یقین نہ آیا تو مقدم نے تھوڑی دیر پہلے ہوئی اپنی اور امّاں کی ساری گفتگو اُسکے گوش گزار کر دی۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح اس نے اپنا سوال دہرایا، تو مقدم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''یا اللہ!۔۔ لڑکی! کیسے یقین دلاؤں تمہیں؟''

''تھینک یو مقدم! تھینک یو سو مچ!''اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا، تو وہ بس اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''اب اپنی امی کو راضی کر لینا۔۔''

''ضرور کرلونگی۔'' وہ کہتے ہوئے اندر بھاگی تو وہ خوشی سے ہنس پڑا۔

----------+----------+----------

اور پورے چھ ہفتے بعد جب مقدم اپنی اور لیلیٰ کی بات پکی ہونے خوشی میں مٹھائی لے کر آیا، تو حسین نے اُسے گود میں ہی اٹھالیا تھا۔

''کیا کر رہا ہے بھائی؟ میں صحیح سلامت اپنے نکاح میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔'' وہ چیخ پڑا لیکن حسین صاحب کو کہاں فرق پڑنا تھا؟ باقی سب ہنس رہے تھے۔

''یہ پہلا مجنوں ہے، جسکو اپنی لیلیٰ مل رہی ہے۔'' حسین کی بات پر سب متفق ہوئے۔

"تُجھے قسم ہے، کہ مجھے نیچے اتار دے۔'' اس نے منّت کی تو بلآخر حسین نے اُسے اتار ہی دیا۔ اب باقی سارے ڈیپارٹمنٹ کے باغیچے میں بنی گھاس پر بیٹھے مٹھائی سے انصاف کر رہے تھی۔

"ویسے مقّی! خالی نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ شادی ہی رکھ لیتے۔'' نوید نے پوچھا۔

''نہیں بھائی! ابّا نے کہا ہے کہ رخصتی لیلیٰ کی پڑھائی کے بعد۔''

''تو نکاح رخصتی کے ساتھ ہی رکھ لیتے۔ ابھی صرف منگنی کر لیتے؟'' علی نے پوچھا۔ نکاح چار ماہ بعد، یعنی اُسکے ایم بی اے کے آخری سمسٹر کے بعد تھا۔

''مجھے اپنی امّاں اور پھوپھو کا قطعاً کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اِدھر منگنی ہوئی اور دو سالوں کے درمیان اُن میں کوئی جنگ چھڑ گئی تو پھر واقعی مجنوں والا حال ہوگا میرا۔ اس لیے نکاح رکھوا دیا ہے ابّا نے۔'' اس نے بتایا۔

''بات سنو، پاگل آدمی!'' اس سے پہلے کہ کوئی مزید کچھ کہتا، ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز پر سب کی گردنیں پیچھے مڑیں تھیں، سوائے حسین کے، کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ مخاطب وہی ہے۔ سب نے ایک نظر پکارنے والی کو دیکھا اور شناسا چہرہ نظر آنے پر اطمینان سے دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

"تم سے بات کر رہی ہوں۔ بہرے ہوگئے ہو کیا؟'' وہ تن فن کرتی حسین کے سر پر تھپڑ لگاتی وہیں بیٹھ گئی۔

''کیا ہے؟'' اس نے بیزاری سے اسکو دیکھا۔

''مجھے بتایا کیوں نہیں آج سمسٹر فیس بھروانے کی آخری تاریخ ہے؟'' گھاس پر اپنا بیگ رکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے خود صبح پتہ چلا ہے''

''اب پتہ چل گیا نا؟ جا کے اپنے ساتھ میری بھی بھروا دو۔ شاباش!'' یہ درخواست نہیں حکم تھا۔

''میں نے خود اپنی ایمان سے بھروائی ہے۔''اس نے مزے سے کہا تو حور عین سمیت باقی سب کا بھی منہ کھل گیا۔

''تمہیں شرم نہیں آئی اس سے اپنا کام کرواتے ہوئے؟''اس نے کھینچ کر اُسکے بازو پر مکا مارا تھا، باقی سب اُنہیں نظر انداز کیے دوبارہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

''تمہیں آتی ہے مجھ سے کام کرواتے ہوئے؟''حساب کہاں اُدھار رکھتا تھا۔پلٹ کر اُسکے سر پر بھی تھپڑ لگا دیا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اس نے اپنی فائل اُسکے سر پر دے ماری۔

''بس کر دو، جہاں بیٹھتے ہو لڑنا شروع کر دیتے ہو۔''علی نے دونوں کو ڈپٹا تھا۔پچھلے دو تین سالوں میں، وہ اُنہیں جنگلیوں کی طرح لڑتا دیکھ چکے تھے۔

''میں کیا کروں اب؟میری فیس کون بھرے گا؟''اس نے روہانسی لہجے میں پوچھا۔

''تم خود بھرو گی۔بینک دو قدم پر ہی تو ہے۔''شہر کہ ہر بینک کی شاخ جامعہ میں ہی موجود تھی۔لیکن آج آخری تاریخ ہونے کی وجہ سے تمام بینکوں میں رش کی انتہا تھی۔

''ہاں! لیکن وہاں اتنی لمبی لائن ہے۔''اس نے معصومیت سے کہا، جس کا حسین پر رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔

''مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا، میں نے پہلے ہی ایمان سے اپنا کام کروایا ہے۔''اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

''لاؤ مجھے دو، میں جمع کر دونگا۔مجھے اپنی بھی کروانی ہے۔''رضا نے کہا۔اِس لایعنی بحث کو ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اپنی خدمات پیش کر دے۔

''اوہ! تھنک یور ضا بھائی!''اُس نے خوشی سے فی واؤچر اور پیسے اُسکے حوالے کیے۔

''کوئی بات نہیں!''وہ مسکرایا۔

''یہ مٹھائی کس خوشی میں ہے؟''اب جا کر اُسکی نظر مٹھائی پر پڑی تھی۔

''مقدم کے نکاح کی خوشی میں۔''عمر نے کہا۔

''واقعی میں؟''وہ خوش ہوئی۔

''پہلے آتی تو مل جاتی، اب ختم ہو گئی ہے اس لیے بھاگ جاؤ یہاں سے۔''حسین نے کہتے ہوئی مٹھائی کا پورا ڈبہ قبضے میں کر لیا۔

''اِدھر دو یہ، جب دیکھو سوکنوں کی طرح لڑتے رہتے ہو۔''مقدم نے اس سے ڈبہ واپس لیا، کہ آیا دوبارہ جنگ نہ چھڑ جائے۔

''یہ لو، تمہارے لیے بھی رکھی تھی۔''اس نے مٹھائی کا ڈبہ حور عین کے حوالے کیا، جو اس نے حسین کو منہ چڑاتے لے لیا۔

----------+----------+----------

''آج کل تو لوگوں کو میں نظر ہی نہیں آتا۔''وہ چابی اٹھاتا ہوا، گھر سے نکل رہا تھا۔ جب لان میں اپنے ایک پیٹھی کے بھائی سے ٹاکرا ہو گیا۔ شام کے سات بج رہے تھے اور وہ بھائی صاحب اس وقت بھی ڈمبل لیے مشقیں کرنے میں مصروف تھے۔

''میں تو آتا ہوں تمہارے ساتھ بیٹھنے، تم سے بات کرنے، لیکن تم ہی لگے رہتے ہو ایکسر سائز میں۔''عمر جواب دیتا اسکے پاس ہی چلا آیا۔

''سفید جھوٹ، تمہیں عمارہ کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''غلط، تمہیں اپنے ڈمبلز کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔''اس نے دوبدو جواب دیا۔

''صحیح ہے بھئی، صحیح ہے۔ اب تو میں ہی غلط لگوں گا۔''

''بس کر دو، اس وقت واقعی تم مجھے اپنی پہلی بیوی اور عمارہ کی سوکن لگ رہے ہو۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کہاں ہوتے ہو یار؟ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں ساتھ بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پیئے۔''اس نے شکوہ کیا۔

''سوری یار! بس پڑھائی ہی اتنی مشکل ہو گئی ہے۔ ابھی بھی علی کی طرف جا رہا ہوں، ہمیں ملٹی فنکشن فرنیچر پر پروجیکٹ کرنا ہے ساتھ۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''ہاں! ایک تمہاری پڑھائی ہی مشکل ہے، ہم تو جیسے پڑھتے نہیں ہیں۔''وہ زیادہ ہی تپا ہوا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں آج؟''عمر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا، اور اپنی مشقیں جاری رکھی۔ عمر نے غور سے اُسے دیکھا وہ ناراض ناراض سا نظر آتا تھا۔ اچانک ہی اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''اوہ سوری!۔۔۔ تمہاری کانووکیشن تھی نا آج؟''اُس نے پوچھا۔

''آ گیا یاد تمہیں؟''اس نے پر شکوہ انداز میں اُسے دیکھا تھا۔

''ریئلی سوری! میں پتہ نہیں کیسے بھول گیا؟''عمر نے جلدی سے اُسکا بازو تھاما۔آج اُسکا بھائی آفیشلی گریجویٹ ہوا تھا۔وہ کیسے یہ بات بھول گیا؟جب عمر نے بی بی اے کی ڈگری لی تھی،اس دن خضر نے کتنے بھرپور طریقے سے جشن منایا تھا۔اور ایک وہ تھا،اتنی بڑی بات بھول گیا۔

''سوری یار!''اس نے آگے بڑھ کر اپنے ناراض ناراض سے بھائی کو گلے لگایا۔

''یاد نہیں تھا نہ تمہیں؟''اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

''یاد تھا،بس۔۔۔۔پتہ نہیں کیسے ذہن سے نکل گیا؟معاف کر دے یار آج۔''عمر نے پیار سے اُسکا چہرہ تھاما تو وہ کچھ لمحے اسے گھورتا رہا،پھر ہنستے ہوئے اُسکے گلے لگ گیا۔

''مبارک ہو بہت!''عمر نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ اور اپنا کام ختم کر کے واپس آؤ،کل دونوں بھائی مل کر سیلبریٹ کرینگے۔''

''کل کیوں؟آج ہی کرینگے،میں کام ختم کر کے واپس آؤنگا تم سونا نہیں،دونوں مل کر مووی دیکھیں گے،پزا آرڈر کرینگے۔پارٹی ہو گی آج۔''عمر نے کہا۔

''یہ کی نہ تم نے بات،جلدی سے جاؤ اور واپس آؤ!''وہ خوش ہوا۔

''کونسی پارٹی ہو رہی ہے میرے بغیر؟''دیوار کے اس پار سے عمارہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

''بس اسی کی کمی تھی،کبھی ہمیں اکیلے بھی چھوڑ دیا کرو۔''خضر نے کہا۔

''کیوں چھوڑوں؟تم نے کبھی چھوڑا ہے ہمیں اکیلے؟''اس نے دوبدو جواب دیا۔

''بھابھی جی،وہ میرا بھائی پہلے ہے،آپکا منگیتر بعد میں۔''خضر نے یاد دلایا،اِس ساری گفتگو میں،عمر بس ہنس رہا تھا۔

''اچھا بس کرو اب،ہم دونوں آج خضر کے آفیشلی گریجویٹ ہونے پر پارٹی کرینگے۔اور رات کو کرینگے تو تم تو بالکل بھی نہیں آسکتی۔''عمر نے پہلے ہی ہری جھنڈی دکھادی۔

''ہاہاہا۔۔۔''عمر کے اس جواب پر خضر دل کھول کر ہنسا تھا اور عمارہ "ہونہہ" کرتے ہوئے دیوار کے پیچھے گم ہو گئی۔

''محبوبہ کو ناراض کر دیا۔۔چچ چچ۔۔۔''

''کوئی بات نہیں ایک دن بھائی کے لیے محبوبہ کو ناراض کیا جاسکتا ہے۔''اس نے ہنستے ہوئے کہااور چلا گیا۔

----------+----------+----------

علی کے گھر سے واپسی پر اُسکی گاڑی چلنے سے انکاری ہو گئی، تو اس نے میکینک کو بلایا، میکینک فالٹ ڈھونڈ رہا تھااور اُسے شدید کوفت ہو رہی تھی۔اُس نے خضر سے وعدہ کیا تھا جلدی آنے کا، مزید اُسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

''بس بھائی! دو منٹ اور دیں مجھے، میں فالٹ ڈھونڈ لوں ایک بار، تو کام آسان ہو جائے گا۔''میکینک نے کہا۔

''بس جو بھی کرو جلدی کرو۔''التجائیہ انداز میں کہتے اُسکی نظریں ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔تب ہی اس نے دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی شخص فوٹ پاتھ پر تیز تیز چلتا ہوا جا رہا تھا۔وہ اندھیرے میں بھی اُسے پہچان گیا تھا۔اس نے عمر کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسی طرح آگے بڑھ گیا۔عمر کو کسی کی ٹوہ لینے کی عادت نہ تھی، لیکن اُسکے انداز میں جو پریشانی تھی۔اُس نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔

''کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو؟ مجھے جا کر دیکھنا چاہیے۔''اس نے سوچا، پھر میکینک کو پانچ منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر اُسکے پیچھے چل پڑا۔وہ خاموشی سے سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔اور عمر اُسکے پیچھے پیچھے، ایک بار دل میں خیال آیا کہ اُسے روک کر پوچھے، کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ مگر خاموش رہا۔وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، سٹریٹ لائٹس کی روشنیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔عمر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی سنسان اور اندھیری جگہ پر کرنے کیا آیا ہے؟ پھر اچانک ہی وہ رکا، وہ بھی اس سے کچھ دور رک گیا تھا۔پھر وہ جا کر ایک بینچ پر بیٹھا اور اگلے ہی لمحے فضاء میں اُسکی سسکیوں کی آواز گونجی تھی، وہ رو رہا تھا۔عمر ششدہ رہ گیا۔

''رضا!''عمر نے اُسکا نام لینا چاہا پر آواز نے ساتھ نہ دیا۔وہ درخت کے پاس ہی کھڑا اُسے دیکھے گیا۔وہ رو رہا تھا، بچوں کی طرح، اس طرح ٹوٹتے ہوئے تو اُسے کبھی نہ دیکھا تھا عمر نے، کس نے رُلایا تھا اُسے؟ کس نے یوں توڑا تھا اُسے؟ وہ ہاتھوں کی مٹھی بنائے بینچ پر مارتا، ضبط کی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔اُسکی سسکیوں کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔عمر کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔کتنا اکیلا تھا رضا؟ اس نے رونے کے لیے بھی تنہائی تلاش کی تھی۔جب اُسکے رونے میں کمی نہ آئی تو عمر آگے بڑھا اور اُسکے قریب جا کر رکا۔رضا نے نظریں اٹھا کر بھی اُسے نہ دیکھا، بلکہ ایسے ہی سسکتا رہا۔عمر نے اُسکے گرد بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بس رضا! بس۔''اس نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی، پر وہ روتا رہا۔اُسکی ہچکیاں بندھ گئی تھی۔

''ٹھیک ہو جائے گا سب۔''اس نے اُسکے بال سہلاتے ہوئے کہا۔وہ اسے خضر جتنا ہی پیارا تھا۔کچھ ہی دیر میں اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔اب وہ اور عمر اُسی بینچ پر تھوڑا فاصلہ قائم کیے بیٹھے تھے۔دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔عمر نے اُسکی جانب ٹشو پیپر بڑھایا، جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا۔کچھ دیر مزید خاموشی سے سرکے۔

''گھر جاؤ گے رضا؟''عمر نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''تو اٹھو پھر، چلتے ہیں ہم۔''عمر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھا، پھر دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔پورے راستے دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔پھر وہ اُس کی گاڑی کے قریب پہنچے۔

''اچھے وقت پر آئے ہیں آپ، گاڑی ابھی ابھی ہی ٹھیک ہوئی ہے۔''میکینک نے اُسے دیکھ کر کہا۔

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں رضا!''

''میں چلا جاؤنگا۔''اتنی دیر میں اس نے یہ پہلی بات کی تھی۔عمر نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور رضا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''بیٹھو!''پر وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔

''بیٹھ جاؤ رضا! یہاں سے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی۔''حسین ہوتا تو زبردستی بٹھا لیتا، وہ عمر تھا، قائل کرتا تھا زبردستی نہیں۔اس بات پر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔عمر نے میکینک کو فارغ کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا، پھر ڈیش بورڈ پر رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر اُسکی جانب بڑھائی، اُس نے خاموشی سے تھام لی۔رضا سے گھر کا پتہ پوچھنے کے بعد اس نے گاڑی سٹارٹ کر دی تھی۔دو نفوس کے موجود ہونے کے باوجود بھی گاڑی میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔رضا شیشے پر سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔عمر ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا پر کہتا کچھ نہیں۔اُسکا گھر آ گیا تو وہ عمر کو آہستہ سے شکریہ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا۔وہ واپس اپنے خول میں بند ہو چکا تھا۔جب تک وہ گھر کے اندر نہیں چلا گیا، عمر وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔اس نے وقت دیکھا، رات کے بارہ بج چکے تھے۔اس نے خضر سے وعدہ کیا تھا کہ آج رات وہ جشن منائیں گے۔اُسے اپنا وعدہ ہر صورت پورا کرنا تھا، لیکن رضا کو اس طرح روتا دیکھ کر اُسکا دل عجیب سی اُداسی سے بھر گیا تھا۔وہ اتنا پراسرار کیوں تھا؟ پچھلے چھے سالوں سے اُسکے ساتھ ہونے کے باوجود بھی، وہ اُسکے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔وجہ اُسکی ناراضگی نہ تھی، بس وہ اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ عمر کچھ دیر وہیں کھڑا اُسکے بارے میں سوچتا رہا پھر گہری سانس بھر کر گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

----------+----------+----------

''اچھی بھلی عقل منداور باشعور لڑکی تھی۔مجھے اس سے ہر گز یہ امید نہ تھی۔''علی نے افسوس سے کہا تھا۔

''میں بھی یہ سمجھ نہیں پارہا کہ ایسی کیا مجبوری تھی اُسکی،جواس نے یہ فیصلہ لے لیا؟''مقدم کے لہجے میں بھی افسوس تھا۔

''کس کی بات کررہے ہو تم لوگ؟''عمرابھی ابھی وہاں آیا تھا،وہ سارے کینٹین میں بیٹھے تھے سوائے رضا کے۔

''ایمان کی۔''نوید نے کہا۔

''کیاہواہے اسکو؟''اس نے ایک کرسی پر بستہ رکھااور خود دوسری پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''یہ پوچھو کیا کیاہے اس نے؟''مقدم نے کہا۔

''بتا بھی چکو۔''وہ اس ڈرامے بازی سے بیزار ہوا۔

''منگنی کرلی ہے اُس نے،اپنے حسین سے۔''نوید نے بم پھوڑا۔

''واقعی؟''عمر نے حیرت سے پاس بیٹھے حسین کو دیکھا۔اُس نے اثبات میں سر ہلایا،اُسکا اطمینان قابل دید تھا۔

''پر کیوں؟''اُس نے جس صدمے کی کیفیت میں پوچھا تھا،وہاں زور کا قہقہہ پڑا تھا۔

''کیا مطلب کیوں؟''حسین نے گھورا۔

''ہاہاہا۔۔۔اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی،گھر والوں نے زبردستی کی ہوگی۔''

''ہوگیا تم لوگوں کا؟''حسین نے اُن سب پر ایک نظر ڈالی،جواپنی اپنی ہنسی روکنے کی رتی بھر کوشش بھی نہ کررہے تھے۔

"زبردستی تو میرے ساتھ ہوئی ہے۔وہ تو خوش ہے کہ اتنا ہینڈسم اور خوبرو لڑکا ملا ہے اُسے۔''اُس نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُسکے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی ہے۔

''کیا کہا؟ہینڈسم اور خوبرو۔۔۔ہاہاہا۔۔۔اچھا مذاق تھا۔''مقدم نے کہا۔

''ہاں ہاں!اڑالو میرا مذاق،اب میں بھی کسی کو مٹھائی نہیں کھلا رہا۔''

''مٹھائی کس بات کی بھائی؟اس بات پر تو تعزیت بنتی ہے۔وہ بھی ایمان سے۔''علی نے کہا۔

''رضا کدھر ہے؟''نوید کو یکدم ہی رضا کی کمی محسوس ہوئی تھی۔آج کافی دنوں کے بعد سب ساتھ بیٹھے تھے۔ورنہ علی اور عمر آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں، نوید انگلش میں، جبکہ رضا، مقدم اور حسین بزنس ایڈمنسٹریشن میں ہوتے تھے۔جسکے باعث سب کی ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔ کبھی کوئی موجود نہیں ہوتا تو کبھی کوئی۔۔۔

''پتہ نہیں، کلاس ختم ہونے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔''مقدم نے بتایا۔

''تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ آج ہم ساتھ بیٹھ رہے ہیں۔''نوید نے پوچھا۔

''وہ ملتا تو بتاتا نا، آج کل وہ کلاس میں دیر سے پہنچتا ہے اور کلاس ختم ہونے کے بعد رکتا نہیں ہے، فوراً بھاگ جاتا ہے۔ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہوئے بھی ہماری اس سے کم کم ہی بات ہو پاتی ہے۔''مقدم نے بتایا تو وہ حیران ہوا۔

''میں نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔خاموش تو پہلے ہی رہتا تھا، لیکن اب ذرا بجھا بجھا سا رہنے لگا ہے۔''نوید نے کہا۔

''فون کر لو اسے۔''علی نے مشورہ دیا۔

''نہیں رہنے دو، گھر جا چکا ہو گا وہ، اب واپس تھوڑی آئیگا اتنی دور سے۔''حسین نے کہا۔اس ساری گفتگو کے دوران عمر خاموش ہی رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ اُس رات والے واقعے کے بعد سے، رضا اُسکے سامنے آنے سے کترا رہا ہے۔وہ اپنے خول سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔وہ تو اس رات عمر نے اُسے دیکھ لیا تھا، وہ بھی اُس روپ میں، جس میں رضا کو دیکھنے کا، اُس نے تصوّر بھی نہ کیا تھا۔اب رضا اُسکا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عمر بھی اُسے تنگ نہیں کر رہا تھا، وہ اسے اسپیس دے رہا تھا۔اُسے یقین تھا کہ کچھ دنوں میں وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔اور ہوا بھی ایسا ہی، کچھ ہی دنوں میں وہ خود ہی سب کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔سب ہی نے اُس سے غائب رہنے کی وجہ پوچھی تھی۔اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔اُسکی آنکھوں کے نیچے چھائے گہرے حلقوں اور بجھی بجھی سی طبیعت نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔وہ عمر سے بھی عام سے انداز میں ملا تھا۔

اپنے اور رضا کے درمیان ہونے والے واقعے کا حسین نے بھی، کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔

رضا کے اس طرح غائب رہنے پر سب ہی حیران تھے سوائے عمر اور حسین کے۔ حسین تو جانتا تھا کہ اُسکی زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔البتہ عمر کیوں پر سکون تھا؟اس بارے میں وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔کچھ عرصے منظر سے غائب رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ سب کے ساتھ بیٹھنے لگا، تب اُنہیں شدت سے احساس ہوا کہ، کچھ تھا اس میں جو تبدیل ہو گیا تھا۔کچھ تو ہوا تھا اُسکے ساتھ۔۔۔ صرف اُسکا چہرہ ہی نہیں۔۔اُسکی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ کچھ ایسا تو تھا جو وہ

لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ بہت کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ اُن میں سے کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ حسین نے سوچا تھا کہ ذرا پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو آرام سے اس سے بات کریگا لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اب ایسا وقت کبھی نہیں آنے والا تھا۔

----------+----------+----------

ہر شے مقدّم کی خواہش کے مطابق ہی تو ہوئی تھی۔ اُسکے ماسٹرز کے فائنل پیپرز ہو جانے کے بعد اُسکا اور لیلیٰ کا نکاح ہو گیا۔ سفید رنگ کے کرتا شلوار پر گرے واسکوٹ پہنے مقدم بہت خوش لگتا تھا۔

''دیکھو ایسا ہے کہ تمہیں قبول ہے، قبول ہے بولتا دیکھ مجھے بہت ہنسی آئیگی۔'' حسین نے اُسکے کان میں کہا تھا۔

''عمر! اگر اس آدمی نے میرا فنکشن برباد کرنے کی کوشش کی، تو تم ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی، اسے کمرے میں بند کر دینا'' اُس نے فوراً اپنے جگری یار سے مدد طلب کی۔

''جیسا آپکا حکم!'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور حکم کی تعمیل کے سلسلے میں حسین کی جانب بڑھا۔

''خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ میں کہیں نہیں جا رہا یہاں سے۔'' وہ جا کر رضا کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

نکاح کے بعد سفید گھیر دار فراک میں ملبوس لیلیٰ کو وہاں لا کر بیٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں اتنے پیارے لگ رہے تھے ساتھ کہ نگاہیں ہٹتی نہ تھیں۔

عمر اپنے ہینڈی کیمرے سے دھڑا دھڑ تصویریں بنا رہا تھا، جبکہ حسین نے سب سے پہلے اپنا تعارف کروایا تھا لیلی کو، اور اس سے پہلے کہ وہ مقدم کے تمام کردہ اور ناکردہ کارنامے اُسکے گوش گزار کرتا، نوید اُسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، ہر شے پلان کے مطابق چل رہی تھی۔ لیکن زندگی ہمیشہ ہمارے منصوبوں کے مطابق نہیں چلتی۔

نکاح کے بعد علی صاحب نے اپنی شادی کا بم پھوڑ دیا تھا۔ لیلیٰ تو چھٹیاں گزارنے سوات چلی گئی تھی، اب وہ سب علی کی شادی میں مصروف تھے، جو کہ اُسکے ابّا کے دوست کی بیٹی سے تھی۔ علی اکلوتا تھا، لہٰذا اُسکے بھائی، دوست، کزن سب کا فریضہ وہی پانچوں انجام دے رہے تھے۔ اُنہوں نے ہر کام اتنی ذمے داری سے اپنے سر لیا تھا کہ علی کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا۔

لیکن۔۔۔۔

پھر ایک دن مقدم غائب ہو گیا۔

وہ علی کے ولیمے کا دن تھا۔ صبح سے ہی وہ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے۔ شام ہوتے ہوتے باقی چاروں تو پہنچ گئے، پر مقدم نہ آیا۔ عمر نے اُسے بہت فون کیے لیکن جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

''یار! ایک کام کرو، تم میں سے کوئی جا کر اُسکے گھر دیکھ آؤ۔ کل رات تک تو ہمارے ساتھ ہی تھا ایسے اچانک کیسے غائب ہو گیا؟'' علی کو بھی پریشانی ہوئی تھی۔ اب بس وہ لوگ ہال کے لیے نکلنے ہی والے تھے لیکن وہ نہیں پہنچا تھا۔

نوید اور رضا گئے تھے اُسکے گھر مگر وہاں تالا لگا تھا، مجبوراً وہ لوگ اُسکے بغیر ہی ولیمے میں شریک ہوئے تھے۔ اُسکے بعد اگلے پانچ ماہ، اُن سب نے مقدم کو ہر اس جگہ ڈھونڈا تھا، جہاں اُسکے ملنے کے ذرا بھی امکانات موجود تھے۔ لیکن وہ کہیں نہ ملا تھا۔ اُسکا نمبر بند تھا، گھر پر تالا تھا، جس بینک میں وہ ملازمت کر رہا تھا، وہاں بھی آخری دن وہ تب ہی آیا تھا، جس روز علی کا ولیمہ تھا۔ بینک سے بھی وہ بنا بتائے غائب ہوا تھا۔ یونیورسٹی سے بھی اُسکا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ محلے والے بتاتے تھے کہ ایک رات وہ سب لوگ بہت جلد بازی میں گھر سے نکلے اور پھر کچھ معلوم نہیں کہ کہاں گئے؟ تھک کر انہوں نے بھی اُسے تلاش کرنا چھوڑ دیا، اس امید پر کہ شاید ایک دن وہ خود ہی واپس آ جائے، لیکن اُسے آنا تھا نہ وہ آیا۔ حتٰی کہ باقی سب نے اُسے مردہ خیال کر لیا تھا۔

باقی دن ایسے ہی گزر گئے۔ وہ سب ہی اب پروفیشنل زندگی کی طرف قدم بڑھا چکے تھے۔ کوئی نئی جاب تلاش رہا تھا، کوئی اپنے بزنس پلان پر کام کر رہا تھا، کسی کا نکاح ہو رہا تھا، تو کوئی اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف، عرض زندگی بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ پھر ایک دن اچانک عمر نے اپنے امریکہ جانے کا اعلان کر دیا۔ اس بات کی کسی کو امید نہ تھی۔ نہ اُس کا ایسا کوئی منصوبہ تھا۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ یہاں کیریئر بنانے کے مواقع بہت کم ہیں۔ وہ شاید چار پانچ سالوں تک واپس نہ آنے کا کہہ رہا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمر ایسی باتیں کر رہا ہے؟ اور کیوں کر رہا ہے؟ یہاں بھی تو نوکری کے بہت مواقع ہیں لیکن وہ بھی بضد، کسی طرح بھی رکنے کو تیار نہ تھا۔ اور پھر وہ بھی چلا گیا۔ جانے کے بعد اس نے کسی سے بھی رابطہ نہ رکھا تھا۔ کوئی سمجھ نہ سکا کہ اس نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے لے لیا تھا؟ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ لیکن مقدم کی گمشدگی کی طرح عمر کا ملک چھوڑ جانا بھی ایک معمہ ہی رہ گیا تھا۔

----------+----------+----------

اتوار صبح دس بج کر دس منٹ، مورخہ چھ جنوری:

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک

کمرے میں صرف دو آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ ایک گھڑی کی سوئیوں کی اور دوسری انکی سانسوں کی آواز، علی نے بہت دیر بعد نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی گہری سوچ میں تھا۔ علی کو یاد تھا آج سے چار سال قبل، جب وہ ایک آفس بلڈنگ کی لفٹ میں تھا وہاں اس نے پورے چھ سال بعد اُسے

دیکھا تھا۔اُسکے چہرے پر شناسائی کی رمق اُبھری تھی لیکن اس نے فوراً نظریں پھیر لی تھیں۔ علی نے بھی اُسے پہچاننے کی رتی بھر کوشش نہ کی تھی۔ لیکن وہ کتنے ہی دن اُسکے بارے میں سوچتا رہا تھا۔وہ پاکستان کب آیا تھا؟اور کیوں ؟اُسے تو اپنا کیریئر بنانا تھا۔ پھر عمر اُسے دو سال تک دوبارہ کہیں دکھائی نہ دیا۔وہ بھی بس ایک اتفاقیہ ملاقات تھی بلکہ ملاقات کیا تھی؟وہ تو دو اجنبیوں کی طرح کچھ دیر اس ایلویٹر میں ساتھ کھڑے رہے تھے۔ پھر وہ اُسے بھول گیا۔دو سال قبل اس نے ایک انٹیریئر ڈیزائننگ کے بزنس کے پچاس فیصد شیئرز خریدے تھی۔مالک نے بتایا تھا کہ وہ بقایا پچاس فیصد بھی بیچنے کا ارادہ رکھتا ہے۔اور کچھ عرصے بعد اس نے علی کو بتایا کہ وہ شیئرز کے لیے گاہک ڈھونڈ چکا ہے اور خود یہاں سے جا رہا ہے۔اب یہ بزنس علی اور اُسکے نئے شرکت دار کا تھا۔اب اسے قسمت کہیے کہ اُسکا نیا پارٹنر عمر حفیظ تھا۔اس اتفاق پر دونوں ہی سخت حیران تھے۔ لیکن جلد ہی اُن دونوں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا اور ایک اچھے بزنس پارٹنر کے طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔وہ بہت زیادہ حقیقت پسند ہو چکے تھے۔انکے درمیان جو بات بھی ہوتی وہ کاروبار کے لیے نئے ٹینڈرز پر، نئی بزنس ڈیل پر یا کاروبار کو مزید بہتر بنانے تک ہی محدود ہوتی۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی پرسنل اسپیس (ذاتیات) میں مخل نہیں ہوتا تھا۔یہ جیسے انکے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا۔ایک بات تو طے تھی کہ وہ دونوں دوست نہیں رہے تھے، دونوں ہی نہایت پیشہ وارانہ طریقے سے رہتے تھے۔ کسی نے بھی دوسرے سے گئے وقتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔دو سال اسی طریقے سے گزر گئے تھے۔انکے درمیان یہ خاموش معاہدہ تب چٹخا، جب وہ مقدم سے آڈٹ کے سلسلے میں ملنے گئے تھے۔اس سے ملنے کے بعد بے ساختہ ہی عمر نے اُسکے غائب ہونے کا ذکر چھیڑ دیا تھا اور جواب میں علی نے جس صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا اُسکے بعد عمر نے دوبارہ اس بات کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔انکے درمیان موجود لکیر جو کہیں کہیں سے مٹنے لگی تھی اُسے علی نے پھر سے اپنے درمیان کھینچ دیا تھا لیکن آج جن نظروں سے عمر نے اُسے دیکھا تھا وہ اندر تک ہل گیا تھا۔یہ تو واضع نظر آ رہا تھا کہ زیادہ عرصے وہ لوگ ایک دوسرے سے نظریں نہیں چرا سکتے۔ کسی نہ کسی دن یہ ذکر نکلے گا، کہیں نہ کہیں تو آکر وہ لوگ اس موضوع پر سوال جواب کرینگے۔۔۔اور ایسا تب ہو گا جب جب مقدم سامنے آئیگا، یا یہ کہنا چاہیے کے اُن میں سے کوئی بھی۔۔۔ کیوں کہ پچھلے دس سالوں سے وہ کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا۔

----------+----------+----------

پھر وہ واقعہ ہوا۔۔۔

وہ۔۔۔ جسکا وہ لوگ مر بھی دوبارہ تذکرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

وہ واقعہ جسکے رونما ہونے سے پہلے مقدم پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اور جسکے رونما ہونے کے بعد عمر ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔اور خود رضا؟اس نے کیا کیا تھا؟اس نے اُن سب سے قطع تعلق کر لیا تھا۔اسی شہر میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے آپ کو اُن سب کیلئے مار دیا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے، وہ پہلے ہی اُن سب سے قطع تعلق کا ارادہ رکھتا ہو اور بس موقع کی تلاش میں ہو۔اور وہ موقع اُسے اُس واقعے کی صورت میں مل گیا تھا، اور اُس نے لمحہ بھی نہ لگایا، اُن سب سے دور جانے میں۔ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ کیوں ؟

کیا ہو گیا تھا اُسے اچانک؟

اور آج وہ اُن سب کے سامنے تھا، ایک غیر شناسا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ۔

گئے وقتوں نے اُسکے چہرے پر جتنی سختی چھوڑی تھی، وہ اتنا ہی زیادہ پر کشش ہو گیا تھا۔ آج بھی یقیناً لوگ اُسکی طرف کھینچتے چلے آتے ہونگے۔ اور آج بھی وہ دنیا سے لاتعلق لگتا تھا۔ البتہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں اور بھی زیادہ ماہر ہو گیا تھا۔

ایک ہی کمرے میں بیٹھے چار نفوس۔۔۔

چاروں ایک دوسرے کے لیے بیک وقت شناسا۔۔۔

اور بیک وقت اجنبی بھی۔۔۔

رضا نے نظر اٹھا کر بھی کسی کو نہ دیکھا تھا۔ علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضع نظر آ رہے تھے۔ عمر خاموش تھا۔ اور مقدم حیران۔۔۔۔

جب وہ یہاں سے گیا تھا تو تب سب دوست تھے۔ اُسے یقین تھا کہ شاید آج بھی سب دوست ہوں۔ غائب تو وہ ہوا تھا، باقی سب تو یہیں تھے۔

لیکن اس وقت حالات کسی اور طرف اشارہ کر رہے تھے۔

ایسا کیا ہوا تھا اُسکے پیچھے؟ کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار نہ تھا؟

کیا وہ لوگ ایک دوسرے کے دوست نہ رہے تھے؟

ہزاروں سوالات تھے دل میں مگر جواب کہیں بھی نہ تھا۔

مقدم یہاں سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔

اِس فضاء میں اُسکا دم گھٹ رہا تھا۔ اُسی لمحے، اُسکی نظریں علی کی کلائی میں بندھی گھڑی پر گئی۔ اور اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

----------+----------+--------

تیسرا باب

احوالِ گزشتہ

"A.S"

اور اسکے نیچے کمپنی کا لوگو

مقدم کو یاد تھا کہ آج سے ایک ہفتہ قبل، اُس نے اپنے کلائنٹ کی کلائی میں ایسی ہی گھڑی دیکھی تھی اور اسکے ڈائل پر ایسے ہی الفاظ اور لوگو اوپر نیچے تھے۔ وہ ایک کسٹمائز (خود ساختہ) گھڑی تھی۔ اور جس برانڈ کی تھی، اُسی برانڈ سے مقدم نے اپنے ملازمین کے لیے فرم کے لوگو والی گھڑیاں بنوائیں تھیں۔ اسکو یاد تھا کہ جب، اُس روز اسکی نظریں اپنے کلائنٹ کے ہاتھوں میں سجی اس گھڑی پر پڑی تھیں، تو اس نے چند سیکنڈ کے لئے اُسے غور سے دیکھا تھا۔ یہ اُسکی عادت تھی کہ وہ اپنے پسندیدہ برانڈ کی کوئی نئی کلیکشن یا مصنوعات کسی دوسرے کے پاس بھی دیکھتا، تو چند سیکنڈ کے لئے غور ضرور کرتا تھا۔ یہ کسٹمائز گھڑیاں، برانڈ صرف مخصوص گاہکوں کے لیے ہی بناتا تھا اور اُسے کسی دوسرے گاہک کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر اُسکے کے پاس آنے والا شخص اور علی ایک ہی تھے، تو اس حساب سے علی ہی اس کمپنی کا مالک تھا۔ وہ کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ جب اُس کی ٹیم نے اُس کلائنٹ کا کام کر دیا تھا، تو انکی جانب سے ایک رسمی سا شکریہ کا خط موصول ہوا تھا۔ جو اس نے بنا پڑھے ہی رکھ دیا تھا۔ ایسے خطوط اُسے سال میں پچاس جگہوں سے آتے تھے، اُسکے پاس اُنہیں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔

''یقیناً اُس میں مالک کا نام ہو گا۔'' اس نے سوچا اور موبائل باہر نکالا۔ وہ لیٹر اُسکے ای میل پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس نے میل باکس کھولا، ہزاروں کی تعداد میں میلز پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے پچھلے ہفتے کی تاریخوں میں آنے والی میلز کا جائزہ لیا تو اُسے وہاں شکریہ کا ایک پیغام مل گیا۔ اس نے میل کھولی اور سیدھا پیغام کی آخری سطر پر گیا، جہاں کمپنی کے مالکان کا نام تھا۔

''عمر حفیظ اور علی سفیر!'' اس نے دل میں دہرایا، نام کے نیچے دونوں کے دستخط تھے۔ حیرت کا شدید جھٹکا تھا جو اُس لمحے اُسے لگا تھا۔ وہ دونوں اُسکے آفس آئے، اس سے بات کی اور چلے گئے۔ اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا لیکن مقدم پھر بھی اُنہیں پہچان نہ پایا؟

کیا ہو گیا تھا اُسکی یاداشت کو؟ وہ دونوں بے شک چہرے پر ماسک لگائے ہوئے تھے، پر کیا وہ دس سالوں میں انکی آواز بھی بھول گیا تھا؟ اب اُسے یاد آرہا تھا سب کچھ۔۔۔ کیوں اُسے عمر کی آنکھیں جانی پہچانی لگ رہی تھیں؟ اور کیوں عمر اتنا خاموش سا بیٹھا تھا؟ وہ بھی یقیناً مقدم کو اس طرح اچانک، سامنے دیکھ حیران رہ گیا تھا۔

''لیکن اُن دونوں نے مجھ سے شناسائی ظاہر کیوں نہ کی؟'' اس نے چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر، ایک نظر اُن دونوں کو دیکھا۔ دونوں ہی لاتعلق سے بیٹھے تھے۔

''میرے چہرے پر تو کوئی ماسک نہ تھا۔ تم دونوں تو مجھے پہچانتے تھے؟ تم دونوں نے مجھ سے شناسائی ظاہر کیوں نہ کی؟ ایک بار۔۔ بس ایک بار، میرا نام ہی لے کر یاد کروا دیتے مجھے۔ میں نہ پہچانتا تو کہتے، میں تو بخوشی اپنے دوستوں سے ملتا، پر تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا جان کر مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے؟ تو پھر آج کیوں مجھ سے سلام دعا کی؟ بتانا تک گوارا نہ کیا کہ پہلے مل چکے ہو مجھ سے۔'' وہ دل ہی دل میں ڈھیروں شکوے کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے! اگر مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، تو مجھے بھی کسی کی ضرورت نہیں۔ جہاں دس سال اکیلے گزار لیے ہیں، وہاں باقی زندگی بھی گزر جائیگی'' اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی انہی کی طرح غیر شناسا بن جائیگا۔ لیکن کیوں؟ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ کیا ہو گیا تھا اُن سب کو؟

وہ لب بھینچے فرش پر کسی نادیدہ نقطے کو تلاش کرنے لگا۔ فرش کے چمکتے ٹائلز پر مختلف مناظر بنتے جا رہے تھے۔ اور وہ سب، ایک بار پھر انہی مناظر کا حصہ بن گئے۔

---------+---------+---------

سترہ سال پہلے:

یہ علی کے انٹر کے امتحانات کے بعد کی بات تھی۔

''کیا سوچا تم نے؟'' اس دن بہت عرصے بعد اُسکی اپنے باپ سے ملاقات ہوئی تھی، ورنہ ایک ماہ سے وہ اپنے انٹر میڈیٹ کے امتحانات میں مصروف تھا۔

''کس بارے میں؟'' وہ حیران ہوا۔

''آگے کیا کرنا ہے؟ بی بی اے یا بی کام؟''

''ابّا! میں آپکو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کچھ جھجھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کہو'' اُنہوں نے اخبار طے کر کے رکھا اور اُسکی جانب متوجہ ہوئے۔

''ابّا! میں۔۔۔میں آرٹس پڑھنا چاہتا ہوں۔ ملٹی میڈیا آرٹس۔۔۔''اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''کیوں؟''اُنہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیوں کے میری دلچسپی ہے اس فیلڈ میں۔''اُسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔

''کیا اسکوپ ہے اِسکا؟'' دونوں ہاتھ باہم ملائے، وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

''کافی زیادہ سکوپ ہے۔ الیکٹرونک میڈیا میں سٹوڈیو ڈیزائننگ کی ضرورت پڑتی ہے، اُسکے علاوہ فرنیچر ڈیزائننگ۔۔۔انٹیریئر آرٹ۔۔۔کافی سکوپ ہے اِسکا۔''وہ پرجوش سا بتانے لگا۔

''تو؟ تمہارے کہنے کا مطلب تم فرنیچر رنگو گے؟ لوگوں کے گھروں کو سجاؤ گے؟''انہوں نے طنزیہ پوچھا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ کم از کم اپنے پڑھے لکھے باپ سے تو وہ اِس قسم کی سوچ کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

''نہیں ابّا! یہ مطلب نہیں ہے اِسکا، یہ تو۔۔۔''

''کیا مطلب پھر؟''اُنہوں نے اسکی بات کاٹی۔

''سفیر لودھی کا بیٹا یہ لڑکیوں والی پڑھائی پڑھے گا؟ کیا بتاؤں گا میں لوگوں کو؟ مذاق اڑائیں گے ملنے والے۔ باپ بزنس مین، ماں سرکاری افسر اور بیٹا یہ خواہشات رکھتا ہے دل میں۔ افسوس ہے مجھے تمہاری سوچ پر۔''وہ بولنے پر آئے تو بولتے ہی چلے گئے۔ علی سر جھکائے سنتا رہا۔

''تم وہ ہی کرو گے جو میں چاہوں گا۔ تم میرے اکلوتے بچے ہو۔ مجھے بہت امیدیں ہیں تم سے، اور تم اُن پر اپنی بے جا دلچسپیوں کی وجہ سے پانی نہیں پھیر سکتے۔ تم بزنس ہی پڑھو گے۔''انہوں نے فیصلہ سنایا۔

''پر ابّا! میں نہیں کر پاؤنگا۔''وہ بے بسی سے گویا ہوا۔

''میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔ جو کہا گیا ہے وہ کرو، یہ تمہارا گھر نہیں ہے، جہاں اپنی مرضی کرتے پھرو۔ جاؤ اور جا کر داخلہ ٹیسٹ کی تیاری کرو۔''وہ حکم صادر کر کے چلے گئے اور علی جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اُسے شروع سے ہی آرٹس سے لگاؤ تھا۔ اسکول میں بھی وہ اکثر فن و فنون کے مقابلوں میں یا ورک شاپس میں حصہ لیتا رہتا تھا۔ اُسکی ڈرائنگ بہترین تھی، وہ اکثر پینٹنگ بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن نویں میں داخل ہوتے ہی اُسکے اِس شوق پر ابّا نے پابندی لگا دی تھی۔ انکا کہنا تھا کہ یہ پینٹنگ وغیرہ لڑکیوں کے کرنے کے کام ہیں۔ وہ خاموش ہو گیا، لیکن جب بھی وہ اپنے کسی کاروباری دورے پر

ہوتے، وہ اُن سے نظریں بچا کر اپنا یہ شوق پورا کر لیتا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آگے چل کر انٹیریئر ڈیزائننگ کریگا اور اپنا انٹیریئر آرٹ کا بزنس کھولے گا۔ لیکن ابّا نے اس دن اُسکے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بی بی اے کے لیے انرولڈ ہو گیا تھا۔

---------+---------+---------

سولہ سال پہلے:

آج اُسکا جامعہ میں دوسرا ہفتہ تھا۔ وہ صبح جلدی جلدی اٹھا اور وقت سے کچھ قبل ہی سٹاپ پر جا پہنچا۔ اُسے کسی نے کہا تھا کہ یونیورسٹی کا پوائنٹ لینا ہو تو وقت سے پندرہ منٹ قبل ہی پہنچنا بہتر ہے، تاکہ پوائنٹ پر جگہ مل سکے۔ لیکن اُسکی توقع کے برخلاف، پوائنٹ پچھلے سٹاپ سے ہی نہ صرف کھچا کھچ بھرا ہوا آیا تھا، بلکہ اس میں تو کھڑے ہونا بھی جان جھوکوں کا کام تھا۔ بہت مشکل سے وہ جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ ابھی پوائنٹ کا انجن سٹارٹ ہی ہوا تھا کہ پیچھے سے کسی لڑکے کے چلانے کی آواز آئی۔

''رکو۔۔۔ رکو میں بھی ہوں۔۔۔'' ایک لڑکا پوائنٹ کے پیچھے بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ پوائنٹ میں موجود دیگر لڑکوں نے جب اُسکی آواز سنی تو ڈرائیور کو رکنے کو کہا۔ مگر درمیان میں طلبہ کا جم غفیر ہونے کے باعث ڈرائیور تک آواز پہنچنا ناممکن تھا۔

''ارے رکو۔۔۔'' وہ لڑکا پیچھے بھاگتا ہوا آرہا تھا۔

''بات سنو بھائی! دروازہ بجاؤ زور سے۔'' وہ جو کہ دروازے کے پاس تقریباً لٹک ہی رہا تھا، سامنے کھڑے دو تین لڑکوں کی آواز پر چونکا۔

''مطلب؟'' وہ سمجھ نہیں پایا کہ اُسے ایسے کرنے کو کیوں کہا جا رہا ہے؟

''ارے! مطلب کو چھوڑو، دروازہ بجاؤ جلدی۔'' سب کے تقریباً ساتھ چیخنے پر اس نے گڑبڑا کر دروازہ زور سے بجایا تو پلک جھپکتے میں پوائنٹ رک گیا۔

''اوہ۔۔۔'' تو اسی لیے دروازہ بجانے کہہ رہے تھے سب۔ پیچھے بھاگ کر آنے والا لڑکا تقریباً ہانپتے ہوئے دروازے پر لٹکا اور دروزہ دوبارہ بجا دیا۔ دروازہ بجاتے ہی پوائنٹ پھر سے چل پڑا۔ یہ تکنیک دلچسپ تھی ویسے۔ لڑکا صرف لمبا ہی نہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک لمبا تھا۔

''تمہیں دیر ہو گئی آج، مجھے لگا آؤ گے نہیں شاید!'' طلبہ کے درمیان کچومر بنے ایک لڑکے نے آنے والے لڑکے سے پوچھا۔

''سوا چھ فٹ کا تو ہو گا یہ۔'' علی نے اُسکا معائنہ کرتے، اُسکے قد کا اندازہ لگانا چاہا۔

''بس یار! آنکھ ذرا دیر سے کھلی آج۔'' لڑکے نے کہا پھر علی کو دیکھا، جو اُن دونوں کی ہی گفتگو سن رہا تھا۔

''شکریہ علی! تم نے پوائنٹ روک لیا ورنہ میں آج لیٹ ہو جاتا۔''اس نے خوش دلی سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسے کام کرتا ہے۔''علی نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

''میرا نام نوید عالم ہے۔ تمہاری کلاس میں ہی پڑھتا ہوں۔''اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا جو کہ علی نے تھام لیا۔

''ہاں! میں نے دیکھا ہے تمہیں، مگر نام نہیں معلوم تھا۔''

''ضرور دیکھا ہو گا، بھائی صاحب دور سے ہی نظر آجاتے ہیں۔''پیچھے کھڑے لڑکے نے لقمہ دیا تو وہ ہنس دیا۔

''لگتا ہے پہلی بار پوائنٹ کا سفر کر رہے ہو؟''نوید نے پوچھا تو اس نے کھسیاتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''کوئی بات نہیں! مجھے تو اب اس خواری کی عادت ہو گئی ہے۔''نوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس خواری کی عادت ڈالنے کا قطعاً شوق نہیں ہے، کیونکہ میری بائیک بننے گئی ہوئی ہے۔ ایک دو دن میں واپس آجائے گی، تو میں نے دوبارہ دیکھنا بھی نہیں ہے پوائنٹ کو۔۔۔''علی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہہ تو وہ ہنس پڑا۔

''پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کر لیتے یا کیب سے آجاتے۔''

''پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کی عادت نہیں ہے اور ٹیکسی اس لیے نہیں لے سکتا کیونکہ ابّا اجازت نہیں دینگے۔'' جامعہ آگئی، تو وہ دونوں مرکزی دروازے پر ہی اتر گئے۔ ویسے تو پوائنٹ ڈیپارٹمنٹ تک جاتا تھا، لیکن بہت سے طلباء و طالبات مرکزی دروازے پر ہی اتر جاتے تھے کہ پوائنٹ میں بیٹھ کر اتنے اندر تک جانے کی ہمت باقی نہ بچتی تھی۔ اُن دونوں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی لڑکے اور لڑکیاں وہیں اتر گئے۔

جامعہ کا یہ سب سے بڑا اور واحد آرک تھا، اسکے علاوہ بھی تین اور دروازے مختلف حصوں میں موجود ہیں، مگر اسکی خاص بات یہ ہے کہ یہ آرک جامعہ کی پچیسویں سالگرہ پر تحفتاً بنایا گیا تھا۔ اسی لیے اسے سلور جوبلی گیٹ کہتے ہیں۔ اس آرک کے دائیں جانب خوبصورت سا قد آدم سفید رنگ کا ستون ہے، جس پر سیاہ رنگ سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کا مقولہ درج ہے۔ آرک پر جلی حروف میں جامعہ کا نام لکھا ہوتا ہے، جو کہ بیس فٹ دُور سے بھی باآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس جامعہ نے کتنی ہی علم دوست شخصیت جیسے سید سجّاد علی شاہ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، کتنی ہی اسلامی شخصیات جیسے ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا تقی عثمانی اور فن اور ادب کے ماہرین جیسے حسینہ معین اور وحید مراد جیسی نامور شخصیات کو بنایا تھا۔ وہ بھی انہیں سڑکوں پر چلتے تھے، انہیں ڈیپارٹمنٹ کی جماعتوں میں بیٹھ کر مستقبل کے خواب بنتے تھے۔ ان میں سے بہت سے اپنی زندگیاں اس ملک کی خدمت میں گزار کر جا چکے تھے۔ اور کتنے ہی اب بھی اس ملک کے لیے اپنی جانیں لگا رہے تھے۔

جامعہ کے آرک کے درمیان میں دو بڑے دروازے ہیں، جبکہ اِسی دروازے کی بائیں جانب ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے۔ دایاں دروازہ بند تھا، اُسکے اندر کی جانب گارڈز بیٹھے رہتے تھے۔ جبکہ چھوٹا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا، جو کہ اندر پیدل چلنے والے طویل ٹریک کی جانب کھلتا تھا۔ اس دروازے سے طلباء اور طالبات جوق در جوق اندر داخل ہو رہے تھے۔ بڑے دروازے سے گاڑیاں اندر جا رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی ٹریک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بلاکس سے بنا یہ طویل ٹریک ہرے رنگ کے شیڈ سے ڈھکا ہوا تھا، جو پیدل چلنے والوں کو دھوپ سے محفوظ رکھتا تھا۔ ٹریک کے شروعات میں ایک آدھ بینک اور پبلک ڈیلنگ (عوامی لین دین) کے دفاتر نظر آ رہے تھے۔ اُسکے بعد ٹریک آگے کی طرف درختوں سے گھرا تھا۔ ٹریک کی دائیں طرف دو طرفہ سڑک تھی اور سڑک کی دوسری جانب بھی درختوں کی قطاریں تھیں۔ اتنے طویل ٹریک کے اختتام پر علم و ادب کا ایک جہاں شروع ہوتا ہے۔ یہ جامعہ اپنے آپ میں ایک پورا شہر لگتی ہے۔

''کیوں منع کرتے ہیں والد صاحب تمہارے؟'' اُسکے برابر چلتے نوید نے پوچھا۔

''انکو لگتا ہے میں اغوا ہو جاؤں گا اکیلے میں۔'' اُس نے کچھ جھینپتے ہوئے بتایا۔ شیڈ سے چھن کر آتی، صبح کی روشنی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

''ہیں؟ کیوں بھئی؟'' وہ حیران ہوا۔

''میں اکلوتا ہوں، اس لیے تھوڑے possessive ہیں میرے بارے میں۔ خیر چھوڑو، تم بائیک کیوں نہیں لے لیتے؟'' علی نے اُس سے پوچھا۔

''یار! میرا مسئلہ تھوڑا مختلف ہے۔ بائیک میرے بڑے بھائی کے پاس ہے۔ جب وہ نئی لے لیں گے، تو تب مجھے اُنکی استعمال کرنے کی اجازت ہو گی۔''

''کیوں؟ تم نئی بائیک کیوں نہیں لے سکتے؟'' علی نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ حالانکہ علی کا قد بھی اچھا تھا، لیکن وہ بھی نوید کے کندھوں تک پہنچ رہا تھا۔

''میرے ابّا کو لگتا ہے کہ میں نئی بائیک کہیں لے جا کر مار دونگا، حالانکہ میں نے چھپ کر اپنے دوستوں کے ساتھ چلانی سیکھ لی ہے، مگر ابّا کو کون سمجھائے؟'' نوید نے کندھے اُچکائے ہوئے کہا تو علی بس مسکرا دیا۔ سب کے اپنے اپنے مسئلے تھے۔

ٹریک ختم ہونے کے بعد جامعہ شروع ہو گئی تھی۔ بائیں طرح مختلف بینکوں کی شاخیں قطار میں نظر آ رہی تھیں، اور ساتھ ہی کرکٹ کا بڑا سا گراؤنڈ بھی تھا، جہاں صبح صبح طلبہ و طالبات چہل قدمی کر رہے تھے، تو کچھ صبح ہی صبح کلاس نہ ہونے کے باعث ریکٹ کا میدان سجائے بیٹھے تھے، کچھ بستے اور کتابیں وہیں گھاس پر رکھے بیٹھے میچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جبکہ دائیں طرف قطار در قطار، فن و ادب کے مختلف ڈیپارٹمنٹ تھے، فن و ادب (آرٹس) کے تمام ڈیپارٹمنٹس کی عمارتیں ترچھی (diagonal) کھڑی تھیں۔

کرکٹ گراؤنڈ اور ڈیپارٹمنٹ جہاں ختم ہو رہے تھے، وہاں درمیان میں چار جانب سے سڑکیں آکر ملتی ہیں، جیسے کوئی چورنگی ہو۔ اس جگہ کو کے یو سرکیولر روڈ کہتے ہیں۔ سامنے والی دو طرفہ سڑک پر کچھ نئے ڈیپارٹمنٹ تھے، جو سیدھا جاکر جامعہ کے دوسرے دروازے پر ختم ہوتے تھے۔ اس دروازے کا نام کنیز فاطمہ گیٹ ہے، جو کہ غالباً وہاں کی سوسائٹی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سرکیولر روڈ کی دائیں جانب والی دو طرفہ سڑک کافی طویل تھی۔ یہاں تمام سائنسی ڈیپارٹمنٹ موجود ہیں، جو کہ بہت اندر تک جاکر مختلف بین الاقوامی ریسرچ سینٹرز پر ختم ہوتے ہیں۔ طلبہ کا ایک جم غفیر ہمہ وقت یہاں نظر آتا ہے، وہ دونوں ہی سڑکیں اُنکی منزل نہ تھیں۔ بلکہ اُنہیں بائیں جانب مڑنا تھا۔ بائیں طرف والی سڑک پر مینجمنٹ سائنسز کے ڈیپارٹمنٹ ہیں، اُسکے علاوہ ایک چھوٹی سی مشہور نجی جامعہ آئی بی اے بھی اسی سڑک پر واقع ہے۔ وہ دونوں بائیں طرف والی سڑک پر مڑ گئے۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سڑک کی طرح اس سڑک پر بھی کافی رش تھا۔ اس سڑک کے اختتام پر جامعہ کا تیسرا دروازہ تھا، جسے مسکن گیٹ کہتے ہیں۔ مینجمنٹ سائنسز کی یہ سڑک بھی مسکن کے نام سے مشہور تھی۔ سڑکوں پر بائیک اور گاڑیوں کے علاوہ قابل ذکر چیز رنگ برنگی شٹل سروس تھی۔ جو کہ ویسے تو بلا تفریق جنس سب کے لیے تھیں لیکن اُس پر ہمہ وقت طالبات کا قبضہ نظر آتا تھا۔ لڑکے شاذ و نادر ہی کبھی نظر آتے، وہ بھی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر، پیچھے کے سیٹوں پر بیچارے خود نہ بیٹھتے کہ لڑکیوں کو جگہ مل جائے۔ علاوہ ازیں لڑکے کسی نہ کسی بائیک والے سے لفٹ لیکر بھی آتے جاتے نظر آرہے تھے۔

''تمہاری ہائٹ (قد) کتنی ہے؟'' بلآخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔ نوید ہنس دیا۔

''چھ فٹ چار انچ۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ماشاءاللہ! خاندانی قد ہے یا تم ہی لمبے نکلے ہو؟''

''قد تو سب ہی کا زیادہ ہے گھر میں، پر میں کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہوں۔'' وہ بڑا ہنس مکھ تھا، بات بات پر ہنستا تھا۔ علی کو وہ پسند آیا۔

بائیں طرف کی سڑک پر مڑنے کے بعد کچھ دیر میں وہ لوگ ڈیپارٹمنٹ پہنچ گئے۔ کلاس میں آنے کے بعد دونوں ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ اس دن علی نے یونیورسٹی میں اپنا پہلا دوست بنایا تھا۔

---------+---------+---------

دو روز مزید گزر گئے اور اب تک اُسکی بائیک ٹھیک نہ ہو سکی تھی، اور آج اُسکا پوائنٹ بھی نکل گیا تھا۔ جسکے باعث اُسے سفیر صاحب نے ہی آج یونیورسٹی چھوڑا تھا۔ واپسی پر اُسے لینے کے لیے انہوں نے گاڑی بھیجی تھی، جسکے ڈرائیور کے پاس شناختی کارڈ نہ ہونے باعث گاڑی سلور جوبلی پر ہی روک دی گئی تھی۔ اُسے ابّا نے فون کر کے اطلاع دے دی۔ اب اُسے ڈیپارٹمنٹ سے سلور جوبلی تک پیدل جانا تھا جو کہ کم از کم بھی پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ جی کڑا کر کے وہ پیدل ہی چل پڑا۔ چلتے چلتے اُسکی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ایک تو کوئی شٹل بھی اسے نہیں مل رہیں تھی اور جو شٹل آتی اس میں پہلے سے ہی لڑکیاں قبضہ کر

چکی ہوتی۔ ناچار اُسے پیدل ہی چلنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ جنوری کے آخری دن تھے، لیکن پھر بھی کافی تیز دھوپ تھی۔ کراچی میں سردی بھی بس برائے نام ہی آتی تھی۔

''یہاں آجاؤ۔'' کسی نے اُسے پیچھے سے آواز دی تھی، اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ہاتھوں میں چھتری پکڑے ایک لڑکا چلا آرہا تھا۔ علی نے اُسے دیکھ رکھا تھا۔ وہ اُسکی کلاس میں ہی پڑھتا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مروتاً کہا، حالانکہ اس وقت اُسے چھاتے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لڑکے نے اُسکی بات نہیں سنی اور خود ہی اُسکے قریب آگیا۔ علی کے قریب پہنچ کر لڑکے نے آدھی چھتری اُسکے اوپر کر دی، اس طرح کہ اب وہ دونوں ہی چھتری تلے تھے۔

''بہت شکریہ دوست!'' علی نے خوشدلی سے کہا تھا۔ اُسے واقعی اس وقت کسی سائے کی شدید ضرورت تھی۔

''کوئی بات نہیں، میں دھوپ کے پیش نظر یہ ساتھ ہی رکھ کر نکلا تھا۔''

''تم سلور جوبلی تک جا رہے ہو؟'' علی نے پوچھا۔

''ہاں!''

''تو پھر وہاں سے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ لو گے؟''

''نہیں! میرا بھائی آئے گا مجھے لینے، دراصل میں نے کل ہی اپنی پرانی گاڑی بیچی ہے، آج رات کو ہی نئی لینی ہے۔ تو بس آج کا دن یہ خواری کرنی ہی تھی اور تم؟'' اس لڑکے نے تفصیل سے بتایا۔

''میرے ابو کا ڈرائیور آیا ہے مجھے لینے، میری بائیک خراب ہے ذرا، بننے گئی ہوئی ہے۔ کل تک آجائے گی ان شاءاللہ۔۔۔''

''چلو! یہ تو اچھا ہے۔'' باتیں کرتے وہ دونوں سلور جوبلی تک آگئے تھے۔

''بہت شکریہ تمہارا!'' علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''شکریہ کی کیا ضرورت ہے؟ تم میرے کلاس میٹ ہو۔'' لڑکے نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں، مجھے تمہارا نام نہیں معلوم۔'' علی نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''عمر۔۔۔ عمر حفیظ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور میں علی!''اُس نے اپنا نام بتایا،اور پھر دونوں اپنے اپنے راستوں کی جانب بڑھ گئے۔

''اچھا لڑکا تھا ویسے۔''اِن دو دنوں، میں اُسکا دو لوگوں سے تعارف ہوا تھا۔ایک نوید اور دوسرا عمر، دونوں کے بارے میں ہی اُسکی اچھی رائے قائم ہوئی تھی۔آگے جا کر وہ دونوں ہی اُسکے بہترین دوست بننے والے تھے۔۔۔۔

لیکن اُسکے بعد؟

کسے پتہ؟

---------+---------+---------

تیرہ سال پہلے:

''یہ سمجھاؤ ذرا مجھے۔''مقدم نے ڈھیر ڈھیر کتابیں اُسکے سامنے رکھی۔

''یار رکو ذرا! میں پہلے یہ سوال سمجھ لوں رضا سے۔''وہ خود رضا سے کوئی سوال سمجھ رہا تھا۔

''جلدی کرو، مجھے یہ فائنانس کا اسائنمنٹ سمجھ نہیں آرہا۔''مقدم کرسی گھسیٹتے ہوئے بیٹھا۔رضا نے سر اٹھا کر دیکھا، نوید اور عمر آپس میں کوئی آئیڈیاز شیئر کر رہے تھے۔خود وہ علی کو سوال سمجھنے میں مدد کر رہا تھا۔مقدم کتابوں کے ڈھیر میں سر کھپا رہا تھا۔ایسے میں اگر کوئی انسان فارغ تھا، تو وہ حسین تھا۔وہ مسکرا دیا۔

''تم حسین سے پوچھ لو۔''اُس نے مقدم کو پریشان دیکھا کر کہا۔

''چلو حسین! کل کا لیکچر سمجھا دو اسے۔''اس نے حسین کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''خبردار، یہ پڑھنے لکھنے کی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔''وہ کرنٹ کھاتا ہوا پیچھے ہٹا، جس پر سب نے ہی اُسے سر اٹھا کے دیکھا۔

''تو تم لائبریری میں کرنے کیا آئے ہو؟''نوید نے چڑ کر پوچھا۔

''تم لوگوں کو کمپنی دینے۔''

''حسین! چند ہفتے رہ گئے ہیں امتحان میں، کچھ پڑھنا شروع کر دو اب۔''عمر نے اُسے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔

''نہ۔۔۔۔''اس نے نفی میں سے ہلایا۔

''فیل ہونا ہے تم نے؟'' علی نے پوچھا۔

''پچھلے تین سالوں میں ہوا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''پچھلے تین سال آسان تھے، ابھی پڑھائی زیادہ مشکل ہو گئی ہے اور آگے اس سے بھی زیادہ مشکل ہو گی۔''

''تم نے پچھلے سیمسٹر میں بھی یہی کہا تھا۔'' اس نے ہوا میں اُڑایا۔

''کیا ہو گیا ہے؟ کیوں آوازیں آ رہی ہیں آپ لوگوں کی؟'' لائبریرین کی زوردار آواز پر وہ لوگ واپس اپنے اپنے کاموں کی جانب متوجہ ہوئے کہ حسین کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس نے امتحانات کے دوران ملنے والے وقفے میں ہی پڑھنا ہوتا تھا۔ اس سے قبل کتابوں کو ہاتھ لگانا وہ اپنی توہین سمجھتا تھا۔

---------+---------+---------

''کہاں جا رہے ہو؟'' علی گھر سے نکلنے کے تیاری کر رہا تھا، جب سفیر صاحب نے اُسے آواز دی۔

''دوستوں کی طرف باربی کیو پارٹی ہے آج، وہیں جا رہا ہوں۔''

''مجھ سے اجازت لی تھی؟'' اُنہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میں نے امی کو بتا دیا تھا۔'' اس نے وضاحت پیش کی۔

''بتا دیا تھا؟ واہ! شہزادے صاحب اب پوچھنا گوارا نہیں کرینگے بلکہ اطلاع دینگے۔'' وہ اپنے ازلی انداز میں شروع ہو چکے تھے، جس سے علی ہمیشہ خائف رہتا تھا۔

''ابّا! میرا وہ مطلب۔۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ اُسکی سنتے ہی کہاں تھے؟

''میں نے تمہارا داخلہ پڑھنے کے لیے کروایا تھا یا دوستیاں نبھانے کے لیے؟''

''جانے دیں نا! وہ کب اپنے دوستوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے؟ میں نے ہی آج اجازت دی ہے اسے۔'' علی کی امی درمیان میں بولی تھیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، کل صبح میرے دوستوں کی طرف دعوت ہے۔ وہ تمام لوگ بزنس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ تم ان سے ملو گے۔ تاکہ تمہاری پی آر ابھی سے مضبوط ہو۔''

''لیکن ابّا وہاں تو صبح جانا ہے نا۔'' علی نے کمزور سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں یاروں کے ساتھ بھی گھومنا پھرنا چاہتا تھا، لیکن اُسکے والد نے ابھی سے اُسکے سر پر کاروبار کا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

''تو؟ رات بھر گھر سے باہر رہو گے، تو صبح جلدی کیسے اٹھو گے؟ کوئی ضرورت نہیں باہر جانے کی۔'' وہ اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

''ابّا! میں تین بجے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا۔ صبح بھی چلونگا آپکے ساتھ، ابھی جانے دیں پلیز۔ نوید باہر ہی کھڑا ہے۔'' اس نے منت کی، جو کہ وہ بچپن سے کرتا آرہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ علی!'' اُنکے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُسکی امی بول پڑیں۔

''لیکن۔۔۔۔'' اُنہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''اسکا دوست باہر کھڑا ہے، منع کرنا اچھا لگے گا کیا؟'' اُسکی والدہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو بلانے کو کس نے کہا تھا؟'' وہ سخت برہم ہوئے۔

''بتا تو رہی ہوں آپکو، میں نے ہی کہا تھا، اسی لیے بلایا ہے اس نے۔ اب جانے دیں، صبح میں بھیج دونگی اسے آپکے ساتھ۔'' اُنہوں نے تسلی دی تو اب کے سفیر صاحب نے کچھ نہ کہا، پر وہ تپے ہوئے لگ رہے تھے۔

''جاؤ بیٹا تم! نوید انتظار کر رہا ہوگا۔'' اُنکے اشارہ کرنے پر علی نے ڈرتے ڈرتے اپنے والد کو دیکھا، جو سخت ناراض نظر آرہے تھے، وہ تھک کر باہر نکل آیا۔

''وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، مجھے بہت امیدیں ہیں اُس سے، اور وہ میری اُمیدوں کو برباد کرتا پھر رہا ہے۔'' اُسکے جاتے ہی وہ خفگی سے بولے تھے۔

''کہاں رہ گئے تھے تم؟'' اُسکے انتظار میں پچھلے پندرہ منٹ سے باہر کھڑے نوید نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''سوری یار! بس ابّا نے روک لیا تھا۔'' وہ آہستہ سے کہتا ہوا اُسکی بائیک پر پیچھے بیٹھا۔

''اتنی مشکلوں سے بھائی سے بائیک مانگ کر لایا ہوں۔ صبح سے پہلے پہلے واپس کرنی ہے۔ اب بھائی نئی بائیک خریدے تو یہ کھٹارا میرے حصے میں آئے۔ کہا بھی ہوا ہے کہ مجھے ایک بائیک خرید دیں، اتنی رات گئے بسوں کا سفر۔۔۔۔'' وہ بائیک چلاتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔ اُسکے اپنے ہی مسئلے تھے۔ جبکہ علی خاموش تھا۔

پارٹی میں بھی وہ سارا وقت گم سم سا ہی رہا تھا۔ سب اُس سے پوچھتے رہے اور وہ سر درد کا بہانہ بناتا رہا۔ اُسے صبح کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی کوفت ہو رہی تھی۔ بچپن سے ہی وہ اکلوتے ہونے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ اُسکے ابّا اُسے ایک کامیاب کاروباری شخصیت بنانا چاہتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی، لیکن اس خواہش کے پیچھے وہ اُسکے ساری زندگی اذیت ناک بناتے جا رہے تھے۔ وہ اُسے ہر وقت پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے، ہمیشہ اُسے اپنی عمر کے لوگوں کی محفلوں میں لے جاتے۔ حتیٰ کہ عید و شادی بیاہ کی دعوتوں میں بھی اُسکے کزنز وغیرہ مل کر ہلا گلّہ کر رہے ہوتے اور اُسکے ابّا اُسے اپنے دوستوں اور جاننے والے کاروباری شخصیات کی جھرمٹ میں بٹھا دیتے۔ وہ صرف اُنکی خواہش پر بزنس پڑھ رہا تھا اور کیسے پڑھ رہا تھا؟ اور کتنی ہی مشکل سے وہ ایک ناپسندیدہ پڑھائی میں اچھی جی پی اے بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا؟ یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اُسکے ابّا کو تو اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ نہ صرف علی کی زندگی میں بلکہ اُسکی شخصیت میں بھی کس قدر کڑواہٹ گھول چکے ہیں۔ لیکن آج کے دن اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسکے ابّا تو ویسے ہی اُسکے لیے کیریئر کا چناؤ کر ہی چکے ہیں، لیکن وہ اپنی تعلیم تو کم از کم اپنی مرضی کی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر کاروبار ہی کرنا ہے تو پھر انٹیریئر ڈیزائننگ کا کاروبار کیوں نہیں؟

---------+---------+---------

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اس لائق تھے کہ کوئی بھی لڑکی خوشی خوشی تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے؟''

''میں لائق ہوں یا نہ ہوں، لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کرنے لیے دل سے راضی ہے۔ اُسے مجھ سے بہتر انسان اور کوئی نہیں مل سکتا۔''

''خوش فہمی ہے جناب کی۔''

''کیا تم نے اُسکے چہرے پے چھائی رونق نہیں دیکھی؟''

''بیٹیوں کو ماں باپ کو دکھانے کے لیے خوش رہنا پڑتا ہے۔ تمہارے جیسے انسان کے ساتھ کبھی کوئی خوش نہیں رہ سکتا، وہ تو پھر بھی ایک نرم دل کی لڑکی ہے۔''

''یہ تم نہیں، تمہارے اندر کا حسد بول رہا ہے۔''

''یہ حسد نہیں حقیقت پسندی ہے۔ اور تمہاری خوش فہمی تمہیں یہ تسلیم کرنے سے روک رہی ہے۔''

''نہیں! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے اندر کا حاسد اُسکی خوش قسمتی سے جل رہا ہے۔''

''تم دونوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہے تو کھانا آرڈر کر دیں؟'' رضا نے بیزاریت سے اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب تم نے اب تک کھانا آرڈر نہیں کیا تھا؟'' حسین نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ حور! جا کے کھانا آرڈر کر آؤ۔'' اس نے اپنے سامنے بیٹھی حور عین سے کہا۔

''نہیں نہیں! میں تو حاسد ہوں، کیا پتہ تمہارے کھانے میں زہر ملانے کا آرڈر دے آؤں۔'' اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں حور عین! میں جانتا ہوں کہ تم ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی ہو۔''

''میں نہیں جا رہی، تم مرد ہو، تم جاؤ۔''

''نہ نہ۔۔۔ لیڈیز فرسٹ۔۔۔۔''

''اب اگر تم دونوں میں سے کوئی آرڈر دینے نہیں گیا نہ تو میں اپنا کھانا پارسل کروا کے لے جاؤنگا۔'' رضا نے چڑ کے کہا۔

''اچھا آئیڈیا ہے، میں بھی یہی کرونگا۔'' وہ بھی آرام سے کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا، تو حور منہ بناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ تینوں ایک ریسٹورونٹ میں بیٹھے تھے۔ حسین، رضا کو اپنی منگنی کی خوشی میں لنچ پر لایا تھا لیکن ساتھ میں حور عین بھی زبردستی چلی آئی تھے اور پچھلے آدھے گھنٹے سے اُسے یہ یقین دلانے کے کوشش کر رہی تھی کہ ایمان سے منگنی ہونا اُسکے لیے خوشی کا باعث نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ اُسکے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ حسین جیسے نفسیاتی مریض سے کوئی صحیح الدماغ لڑکی شادی کرنے پر راضی کیسے ہوگئی؟ یقیناً ایمان کو مجبور کیا گیا ہے۔ اور رضا پچھلے آدھے گھنٹے سے بھوکے پیٹ اُنکی بکواسیات سننے پر مجبور تھا۔

''ایک بات پوچھوں حسین؟'' حور کے جانے کی بعد رضا نے حسین کو مخاطب کیا۔

''دس پوچھو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پچھلے کچھ سالوں میں حسین کی رضا سے بہت گہری دوستی ہو چکی تھی۔

''ایمان سے منگنی میں تمہاری مرضی شامل ہے؟''

''کیا مطلب؟ تم بھی حور والی فضولیات پر۔۔۔''

''فنکاریاں بند کرو، میں نے تمہاری بات پوچھی ہے۔'' رضا نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا ورنہ وہ تو سنجیدہ نہیں ہونے والا تھا۔

''ظاہر ہے میری مرضی سے ہی ہوئی ہے۔''

''تمہیں وہ پسند ہے؟''

''کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''تم کبھی اپنی کوئی بات نہیں بتاتے، ایمان سے تم نے منگنی کر لی لیکن پہلے سے اُسے پسند کرتے تھے یا نہیں، کچھ بھی تو نہیں بتایا تم نے۔'' حسین مسکرا دیا۔

''جب کچھ تھا ہی نہیں تو بتاتا کیا؟ وہ اچھی لڑکی ہے، بابا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے رضامندی دے دی۔'' وہ بتا رہا تھا جبکہ رضا کی نظریں دور کاؤنٹر پر کھڑی حور عین پے ٹکی تھیں۔ وہ کیا سوچ رہا تھا بس وہی جانتا تھا۔۔۔۔

---------+---------+---------

اور اپنے فیصلے کی اسے کافی بھاری قیمت چکانا تھی، ماں باپ کی محبت تو بے لوث ہوتی ہے، پھر اولاد کے خود کی خاطر لیے گئے فیصلے کے بیچ میں یہ محبت اپنا خراج کیوں مانگنے لگتی ہے؟

وہ اُسکا بھلا چاہتے تھے، لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتے تھے کے انکا بیٹا ایک جیتا جاگتا انسان ہیں۔ اُسکی بھی تو خواہشات ہیں۔ اور دیکھا جائے تو وہ اب بھی اپنے باپ کی خواہش کا احترام ہی کر رہا تھا۔ وہ اُسے بزنس مین بنانا چاہتے تھے، تو وہ بھی مستقبل میں کاروبار کرنے کا ہی ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن کاروبار وہ جو اُسکی پسند کا ہو۔ اِسی لیے گریجویشن کے بعد اس نے ملٹی میڈیا آرٹس میں ماسٹرز کرنے کے لئے باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ اس نے جھوٹ بولنے سے بہتر جانا کہ وہ سچ سچ اپنے اقدام کے متعلق انہیں آگاہ کر دیا۔

''تم۔۔۔ تم۔۔۔'' حیرت کی زیادتی سے وہ گنگ تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ علی انکے خلاف جا سکتا ہے۔

''تم کر کیسے سکتے ہو ایسا؟'' وہ جیسے بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

''ابّا! میری بات سنیں۔ میں آگے جا کر۔۔۔۔''

''میرا تمہارے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارا جو دل چاہے کرو کیونکہ اب تم اپنے فیصلے خود لے سکتے ہو۔'' انہوں نے اُسکی بات پوری ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ علی نے انہیں ایسے سرد لہجے میں بات کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''تم نے مجھے بہت مایوس کیا، میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا تھا، لیکن تم نے اپنی اِن زنانہ خواہشات کی خاطر میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ مجھے اب نہ تمہارے کیریئر سے مطلب ہے، نہ ہی تمہاری زندگی سے، تم گر بھی رہے ہو گے، تو تمہارا باپ اب تمہیں تھامنے کبھی نہیں آئیگا۔ پتہ تو چلے باپ کے بنا دنیا کیسی ہے؟'' وہ کہہ کر اُسکا جواب سننے کے لیے رکے نہیں تھے۔ علی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''امّاں!''اس نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا۔

''تم پریشان نہ ہو، میں سمجھاؤں گی انہیں۔''انہوں نے اُسکے بال سہلاتے ہوئے تسلی دی۔اور اس دن کے بعد سب کچھ بدل گیا۔وہ چاہے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے، یا کزنز کے ساتھ، چاہے تو جلدی گھر آئے یا دیر رات سے، پاس ہو یا فیل۔۔۔۔سفیر صاحب کو اُس سے کوئی مطلب نہ تھا۔دیکھا جائے تو علی اب اپنے ہر فیصلے میں آزاد تھا لیکن یہ کیسی آزادی تھی؟اس آزادی کی قیمت اُسے اپنی باپ کی ناراضگی کی صورت میں ادا کرنے پڑ رہی تھی۔انہوں نے اس سے بالکل قطع کلامی کر لی تھی۔اور اُسکی زندگی میں کوئی ایسا دن نہ آیا تھا، جب اُسکے باپ نے اس سے بات نہ کی ہو یا اُسکے سلام کا جواب نہیں دیا ہو۔

اور اب انکا علی کو ایسا نظر انداز کرنا، جیسے اُسکا وجود ہی اس دنیا میں موجود نہ ہو، اُسے پاگل کر رہا تھا۔اپنی مرضی کی پڑھائی پڑھنے کے باوجود بھی وہ اندر سے بہت خالی ہو گیا تھا۔ماں باپ بچوں کی ہر خواہش پوری کر کے اُنکی زندگی کی سب سے بڑی خواہشات میں انہیں اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ہمیشہ جلنے اور کڑھنے کیلئے۔۔۔۔وہ خوشی پھر انکے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔

زندگی ایسے ہی ڈگر پر چل رہی تھی، وہ بے انتہا اُداس اور کچھ کچھ چڑچڑا رہنے لگا تھا۔

''وہ تمہارے ہی باپ ہیں، فکر نہ کرو زیادہ عرصے ناراض نہیں رہیں گے تم سے۔''ایسے ہی ایک دن وہ سب ساتھ بیٹھے تھے۔جب مقدم نے اسکو اُداس دیکھ کر تسلی دی تھی۔

''زیادہ عرصہ؟آخری بار انہوں میں مجھ سے ڈیڑھ سال پہلے بات کی تھی۔''اس نے دکھ سے کہا۔وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اُسکے باپ کیلئے وہ گھر میں رکھے سامان جتنی اہمیت کا حامل ہو گا۔اس بات پر کچھ دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔

''انہوں نے نہیں کی، تو تم کوشش کر لو۔''نوید نے کہا۔

''میں نے بہت کوشش کی ہے، انکے پاس بیٹھ کر بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو پہلے تو وہ اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے، لیکن اب تو وہ اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں یا ہوں بھی تو اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں، ایک نظر دیکھتے بھی نہیں ہیں مجھے۔''وہ بے حد مایوس تھا۔

''تم اپنی پڑھائی پر فوکس کرو، اپنا کیریئر بناؤ۔تم کامیاب ہو گئے تو دیکھنا اُنکے شکوے اپنے آپ ہی دم توڑ جائینگے۔''وہ سب ہی کسی نہ کسی طرح اُسکا حوصلے بڑھاتے رہتے تھے، یہ انہی لوگوں کا ساتھ تھا ورنہ اس نے تو شروعات میں ہی سوچ لیا تھا کہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر ایم بی اے میں داخلہ لے لیگا۔لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی بھی اس پڑھائی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، وہ اپنے باپ کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا اور اُسکے لیے اچھے سے پڑھنا ضروری تھا اور پڑھائی جب من پسند ہو گی تبھی تو اچھے سے ہو سکے گی۔

''اگر تم لوگ کچھ دیر مزید یہی دکھی باتیں کرتے رہے، تو میں گھر چلا جاؤں گا۔'' حسین حقیقتاً بے زار ہو رہا تھا۔

''ارے! مجھے یاد آیا تمہاری منگیتر تمہیں ڈھونڈ رہی تھی کچھ دیر پہلے۔'' مقدّم کو ایکدم ہی یاد آیا۔

''مجھے؟ کیوں؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''کہہ رہی تھی کہ حسین یا حورعین میں سے کوئی ملے، تو اُس سے کہنا کہ مجھے آج گھر چھوڑ دے۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو؟'' اُس نے گھورنے پر اکتفا کیا۔

''ابھی آدھے گھنٹے پہلے ہی تو بتایا ہے، کہہ رہی تھی کہ تین بجے تک آف ہے اُسکا۔''

''مجھے ہی جانا پڑے گا، حور تو آئی نہیں آج۔'' وہ مزید بیزار ہوا، بہت عرصے بعد دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا، اتنے جلدی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

''کیوں؟''

''اُسکی بات پکی کی رسم ہے آج، چھوٹی موٹی سی گھریلو تقریب ہے۔ لیکن پھر بھی چھٹی کر کے گھر بیٹھ گئیں میڈم!''

''واقعی؟ مبارک دینا میری جانب سے۔'' اتنے عرصے میں رضا پہلی بار بولا تھا۔

''کس سے ہو رہی ہے؟'' عمر نے پوچھا۔

''چاچو کے کسی دوست کا بیٹا ہے۔ اظہر الدین، بزنس مین ہے، ہے تو حور سے کوئی آٹھ نو سال بڑا لیکن سمجھدار انسان ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بتا رہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، پر تم کیوں اتنے چڑچڑے ہو رہے ہو؟'' علی کو ایکدم ہی احساس ہوا کہ حسین آج تھوڑا اُلجھا اُلجھا سا تھا۔

''ارے! کام ہی اتنے ہیں یار! خیر چھوڑو، مجھے اب جانا پڑیگا۔ آخر پک اینڈ ڈراپ سروس بھی تو مجھے ہی دینی ہے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا، پھر ایک نظر خاموش سے علی پر ڈالی۔ ''بات سنو تم ملکہ جذبات! اگلی بار ملو تو شکل درست کر کے آنا۔'' آخر میں اُسے چھیڑتا ہوا سب کو خدا حافظ کہتا چلا گیا۔ علی نے بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

''تم پریشان نہ ہو، وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائیگا سب۔'' عمر نے اُسے ایک بار پھر تسلی دی تھی۔ جبکہ خاموش بیٹھے رضا کی نظریں دور تلک جاتے حسین پر تھیں۔ دماغ میں اُسی کے الفاظ گونج رہی تھے۔

''حورعین کی بات پکی۔۔۔ آٹھ نو سال بڑا۔۔'' الفاظ ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔

---------+---------+---------

لیکن اسکی نوبت نہ آسکی۔اُسکے باپ نے ایک دن خود ہی اُسے اپنے پاس بلایا۔

''جی ابّا!؟''

''بیٹھو علی!''انہوں نے کتنے عرصے بعد اُسے مخاطب کیا تھا؟وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ہے تو تمہاری زندگی کے حوالے سے لیکن اب چونکہ تم خود مختار ہو گئے ہو تو میں نے سوچا کہ پہلے تم سے اجازت لے لوں، کہیں بعد میں مجھے ہی شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''اُنہوں نے بہت سادے سے انداز میں بات شروع کی تھی۔لیکن وہ چند جملے ہی علی کو زمین میں گاڑنے کے لیے کافی تھے۔

''نہیں ابّا!آپ میرے بارے میں فیصلہ لے سکتے ہیں۔''اُس نے خود کو کہتے سنا۔حالانکہ ایسا بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا اُس نے،لیکن پھر بھی وہ سر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔

''ہونہہ۔۔۔فیصلہ لے لوں اور بعد میں تم اُسے اپنی خواہشات کے بھینٹ چڑھا دو اور مجھے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑو؟''علی نے تڑپ کر اُنہیں دیکھا تھا۔

''ابّا!آپ مجھے ایک کاروباری انسان کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں نا؟آپ ایک بار میرا بزنس پلان تو سن لیں۔میرے آئیڈیاز آپکو ہرگز مایوس نہیں کرینگے۔''اُس نے بے حد دکھ کے ساتھ اپنے باپ سے کہا تھا۔

''میں اپنی بات پر قائم رہتا ہوں علی!جب کہہ دیا کہ تمہارے کیریئر سے میرا کوئی واسطہ نہیں،تو مجھے اپنے آئیڈیاز دکھا کر اپنا اور میرا وقت برباد نہ کرو۔''سفیر صاحب کے لہجے کی کڑواہٹ علی کے اندر تک اتر گئی تھی۔

''آپ اس سے جو بات کرنے آئے تھے وہ کیجئے۔''پاس بیٹھیں علی کی والدہ نے گفتگو کا رخ کسی اور جانب مڑتے دیکھ کر اُنہیں ٹوکا۔

''بنا تمہید کے بات کرتا ہوں۔''وہ سر جھٹک کر دوبارہ گویا ہوئے۔علی کا پورا وجود کان بن گیا۔اُسکے کیریئر میں اُنہیں کوئی دلچسپی نہ تھی تو پھر وہ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟

''میرے ایک دوست شہیر آفندی کی بیٹی ہے فاطمہ،میں چاہتا ہوں کہ تم اس ویک اینڈ اُس سے مل لو۔شہیر تمہیں اور تم اُسکو تو بہت اچھے سے جانتے ہی ہو۔اسی لیے بہتر ہے کہ تم اُسکی بیٹی سے بھی مل لو۔''وہ کہتے جا رہے تھے اور علی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''مجھے کس لیے ملنا ہے اُس سے ؟'' وہ حیران تھا۔

''میں نے اُسے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے ایک بار مل لو، کہیں بعد میں یہ نہ کہو کہ میں نے اپنی پسند تمہارے اوپر تھوپ دی ہے۔'' اُنہوں نے طنز کے بنا بات کرنا سیکھا ہی نہیں تھا جیسے۔ علی ساکت بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس حوالے سے تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، ابھی تو وہ پڑھ رہا تھا۔ اُسے اپنے باپ کو کچھ بن کر دکھانا تھا اور وہ اس پر کونسی ذمے داری ڈال رہے تھے ؟

''تم نے کچھ کہا نہیں بیٹا؟'' اُسکی والدہ نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا تو اس نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا، جو جانچتی نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''کہاں ملنا ہے اُس سے ؟'' علی نے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ شہیر بتا دیگا، تم بس اپنے ویک اینڈ کے سارے پلان (منصوبے) کینسل (ختم) کرو۔ اور اُس سے ملنے کی تیاری کرو۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جو کہ گفتگو برخاست ہونے کی نشانی تھی۔

''میں اور تمہارے ابّا مل آئے ہیں اُس سے، اچھی، پیاری لڑکی ہے۔'' اُسکی ماں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلیں گئی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سفیر صاحب کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رکے اور پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''ایک بات یاد رکھنا علی!'' علی نے سر اٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ ''تمہارے کسی بھی آئیڈیا یا بزنس پلان کو میں ہرگز انویسٹ (سرمایہ کاری) نہیں کروں گا۔ یہ کیریئر تمہاری منشا تھی، اسکے لیے سرمایہ بھی تم اکھٹا کروگے۔'' علی کو لگا، کسی نے اُسے گہرے سمندر میں اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ آج اُسے اپنا باپ خود سے بہت دور لگا تھا۔ وہ کہہ کر چلے گئے اور علی کتنی ہی دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ صرف ایک کیریئر پسند کرنے کی اتنی بڑی سزا دی تھی اُنہوں نے ؟

''کوئی بات نہیں، میں بہت محنت کرونگا۔ اور اپنے پیسوں سے، اپنی کمائی سے انٹیریر آرٹ اور فرنیچر ڈیزائننگ کا بزنس شروع کرونگا۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ میں بھی آپکا بیٹا ہوں ابّا! اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' وہ دل ہی دل میں منصوبے بنا رہا تھا۔ لیکن وہ بھول گیا تھا کہ مقابل اُسکا باپ ہے۔ اُنکی منصوبہ بندی کو علی ابھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

---------+---------+---------

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ شہیر صاحب کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا، اُنکی بیگم کے جوڑوں کے درد اور بجلی کے بل کے رونے سن رہا تھا۔ شہیر صاحب نے اُسے ہفتے کے دن کسی ریسٹورونٹ میں فاطمہ سے ملنے کو کہا تھا، جسے اس نے مناسب الفاظ میں منع کر دیا تھا۔ اُسکے نزدیک، کسی بھی انجان لڑکی سے

اکیلے میں ملنا، وہ بھی گھر سے باہر بالکل نامناسب عمل تھا۔ مناسب یہی تھا کہ وہ اُسکے گھر والوں کی موجودگی میں ہی اس سے مل لے۔ البتہ وہ لوگ کافی آزاد خیال تھے۔

ملاقات کیا ہونی تھی، ایک تکلّف ورسم تھی جو پوری کرنی تھی۔ باقی جواب تو وہ پہلے سے ہی سوچ چکا تھا۔ شہیر صاحب کا گھر ویسا ہی تھا، جیسا کسی بھی اپر کلاس کا ہوتا ہے۔ وہ ایک ملازمت پیش انسان تھے، اور مشہور و معروف کمپنی میں جنرل مینیجر تھے، سہیل صاحب کے بچپن کے دوست ہونے کے ناطے آج تک اُن سے ملنا جلنا تھا۔ علی پہلے بھی اُنکے گھر آیا تھا لیکن کبھی اُنکی عورتوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح اُنکی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے کتنا کہا تھا امی کو کہ ساتھ چلے لیکن انکو ایک سیمینار میں جانا تھا۔ لہذا وہ ساتھ نہ آئیں۔

''بیٹا! شہیر ہوتے، تو وہ ہی تمہیں کمپنی دیتے لیکن وہ فلحال ایک ضروری کام سے گئے ہوئے ہیں۔ جاتے ہوئے تم سے بہت معذرت کرنے کو کہا تھا۔'' اُنہوں نے اُسے خاموش بیٹھے دیکھ کر سمجھا کہ شاید وہ بور ہو رہا ہے۔

''نہیں آنٹی! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اندر سے وہ شدید کوفت کا شکار تھا۔ دل کر رہا تھا کہ بس فاطمہ یہاں آئے اور وہ تکلفات پورے کر کے چلتا بنے۔

''بس بیٹا! فاطمہ آتی ہی ہو گی، اُس نے بینک سے ہاف ڈے (آدھی چھٹّی) لیا تھا تاکہ جلدی آجائے۔'' اُنہوں نے شرمندگی سے کہا۔

''وہ نوکری کرتی ہیں؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔ اُسے لگا تھا کہ شاید وہ پڑھ رہی ہو گی۔

''ہاں بیٹا! تمہیں تمہارے والد نے نہیں بتایا؟'' وہ حیران ہوئی تو علی گڑبڑا گیا۔ فاطمہ کے بارے میں تو اس نے کچھ جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

''نہیں نہیں۔۔ بتایا تھا، بس میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''روبی! یہ سامان پلیٹوں میں نکال دو۔'' ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر سے ایک نسوانی آواز آئی تھی۔

''اوہ۔۔ فاطمہ آگئی۔ میں اُسے یہاں بھیجتی ہوں۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔'' وہ خوشی سے کہتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب علی کمرے میں اکیلا تھا۔ اسکو اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ اچھا بھلا پراعتماد لڑکا تھا، اپنے باپ کے کاروباری حلقے میں کم عمری سے ہی اُسکا اٹھنا بیٹھنا تھا، لیکن کسی بھی لڑکی سے ملنے کا یہ اُسکا پہلا تجربہ تھا۔ شادی بیاہ، گھر بسانا یا لڑکی پسند کرنا، ان سب کے لیے اُسکے پاس نہ کبھی وقت تھا نہ اُس نے ایسے کسی کام میں دلچسپی لی تھی۔ ایسی صورتحال میں کیسے پیش آنا ہوتا ہے، اُسے نہیں معلوم تھا۔

''پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی؟'' علی نے سوچا، اور شاید پہلی ہی بار اُس نے فاطمہ کے بارے میں سوچا تھا۔

''جیسی بھی ہو، مجھے تو ابّا کو ایک ہی جواب دینا ہے۔''اُس نے دل میں کہا۔

''السلام علیکم! سوری مجھے دیر ہو گئی۔ میں نے بینک والوں سے دو دن پہلے سے ہی ہاف ڈے مانگا ہوا تھا۔ لیکن عین وقت پر انکو کوئی ضروری کام یاد آ گیا اور میرے نہ نہ کرنے کے باوجود منیجر نے۔۔۔''ایک خوبصورت سی نازک لڑکی بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے لیکر، صوفے پر بیٹھ کر کشن گود میں رکھنے تک اُسکی زبان فراٹے بھرتی رہی تھی۔ اور علی۔۔۔ وہ سن ہی کہاں رہا تھا؟ نِگاہیں اسکے چہرے پر جو پڑیں تو پلٹنا ہی بھول گئی۔ وہ ہرے رنگ کے سوٹ پر سلیقے سے دوپٹہ ڈالے، میک اپ سے عاری چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟''اُس نے کیا کچھ کہا تھا یاد نہیں، بس یہ آخری جملہ ہی علی کے کانوں میں پڑا۔

''آں۔۔۔ نہیں تو، بالکل نہیں!''حالانکہ اُسے دیر سے آنے والے لوگ ہر گز پسند نہیں تھے اور وہ طے کیے بیٹھا تھا کہ فاطمہ آئیگی تو اُسے جتائے گا ضرور، کہ کب سے اُسکا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اپنے بنائے سارے منصوبے بھول گئے۔

''آپکو مجھ سے جو بھی پوچھنا ہے پوچھ سکتے ہیں۔ میں مزید آپکا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی۔''اُس نے ایکدم ہی سنجیدگی سے کہا تو علی کو یاد آیا کہ وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا۔

''ہاں! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں یہاں کس سلسلے میں آیا ہوں۔''اُس نے پر تکلف انداز میں بات شروع کی ''دیکھیں! میں جھوٹ نہیں کہوں گا آپ سے، شادی میری پلاننگ کا حصہ نہیں رہی کبھی بھی، اسی لیے میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں لیکن اب چونکہ میرے ابّا کی خواہش ہے تو۔۔۔''وہ کہہ کر رکا، چند منٹ پہلے ملی لڑکی کو اپنے اور اپنے باپ کے تعلقات بتانا کہیں کی عقلمندی نہ تھی۔ لیکن اُسے کسی دھوکے میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''میرے کچھ خواب ہے، ابھی میں اُنہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے افسانوی باتیں نہیں ہوتی، میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں۔ چاند تارے توڑنا تو دور کی بات ہے، میں تمہیں وقت بھی شاید نہ دے سکوں۔ یہ سب چیزیں تمہیں اسی لیے بتا رہا ہوں کہ شادی کہ حوالے سے یقیناً تمہاری کچھ خواہشات ہونگی اور میں ہو سکتا ہے کہ وہ پوری نہ کر سکوں۔ اسی لیے تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔''علی کب آپ سے تم پر اُتر آیا تھا اُسے خود اندازہ نہ ہوا تھا۔

''تو تم چاہتے ہو کہ میں انکار کر دوں؟''فاطمہ نے پوچھا۔ لحاظ اور مروت اب اُسکی جانب سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اُسکے چہرے سے کسی بھی قسم کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

''ہر گز نہیں! میں عورت کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلانے والا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے انکار نہیں کرنا اور نہ کروں گا۔ میں بس تمہیں۔۔۔ حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ تم میرے جیسے خشک مزاج انسان کے ساتھ بیزار ہونے لگو۔ بعد میں مجھ سے شکایت کرو، اس سے بہتر ہے کہ تم ابھی ہی سوچ سمجھ کر فیصلہ لو۔'' علی نے بات کے اختتام پر اُسکا چہرہ دیکھا وہ غور سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''گول گپے کھاؤ گے؟'' فاطمہ نے انتہائی غیر متوقع سوال کیا تھا۔ اور اُسکا جواب سنے بنا ہی روبی کو آوازیں دینے لگی۔ روبی دو پلیٹوں میں گول گپے سجائے حاضر ہوئی اور اُسے میز پر رکھ کر چلی گئی۔ علی ہکا بکا سا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''مجھے بہت شدید بھوک لگی ہے۔ اور بھوک میں تو مجھے نارمل باتیں سمجھ نہیں آتی تو تم تو پھر بھی۔۔۔'' وہ اپنے پلیٹ میں گول گپے رکھتے ہوئے رکی۔

''میں تو کیا؟''

''تم نے تو پھر بھی اتنی مشکل باتیں کی ہیں۔ پہلے پیٹ میں کچھ چلا جائے پھر تمہاری باتوں کا جواب دیتی ہوں۔ تب تک تم بھی گول گپے لو۔'' فاطمہ نے اشارہ کیا۔

''نہیں! میں یہ غیر معیاری کھانے نہیں کھاتا۔'' اُس نے کچھ احتیاط سے کہا۔ فاطمہ کے انداز و اطوار اُسکی سمجھ سے بالا تر تھے۔

''کیا مطلب تم نے کبھی یہ نہیں کھائے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''نہیں۔۔۔'' وہ ایسے شرمندہ ہوا، جیسے یہ کوئی بہت ضروری صلاحیت تھی، جو اُسکے اندر نہ تھی۔

''ایک کھا کر دیکھو، آج پسند نہ آئے تو کہنا۔'' فاطمہ نے کہا اور اُسکے جواب کا انتظار کیے بنا ہی ایک اور پلیٹ میں گول گپے پر پانی رکھنے لگی۔

''لیکن میں کیسے۔۔۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں، میزبان جو بھی سامنے رکھ دے کھانا پڑتا ہے۔'' وہ بضد تھی۔ علی نے مجبوراً پلیٹ اٹھائی اور گول گپا توڑنے لگا ہی تھا کہ وہ چیخ اٹھی۔

''ارے! یہ کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔ تم نے تو لگتا ہے واقعی، کبھی یہ نہیں کھائے۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''ایسے نہیں کھاتے اسے۔''

''پھر کیسے کھاتے ہیں؟'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

''یہ دیکھو ایسے۔''فاطمہ نے اپنی پلیٹ سے ایک گپا اٹھایا اور املی والے پانی میں ڈبو کر پورا منہ میں ڈال لیا۔

''ہمم۔۔۔بہت مزے کا ہے۔''وہ گول گپا منہ میں رکھنے کے بعد انگلی اور انگھوٹے کی مدد سے پسندیدگی کا نشان بناتی ہوئی بولی۔ علی حیرت سے مزے لے لے کر گول گپے کھاتی ہوئی فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ہمت کر کے اس نے بھی ایک اٹھایا اور پورا کا پورا منہ میں ڈال لیا۔ دو چار مرتبہ اُسے منہ میں گھمانے کے بعد اُسے اُسکا ذائقہ پسند آیا۔

''نائس!''اُس نے بیساختہ کہا۔

''اچھا لگا؟''فاطمہ نے خوشی خوشی پوچھا۔

''ہاں! اتنا برا نہیں ہے ویسے۔''اُسے یہ عجیب سی حرکت کر کے مزا آیا تھا۔

''کتنا وقت لگا کھانے میں؟''اُسکا اگلا سوال اُسکی فرمائش سے بھی کہیں زیادہ غیر متوقع تھا۔

''مطلب؟''

''بتاؤ نہ، کتنا وقت لگا اس کو کھانے میں؟''

''کچھ سیکنڈز۔''

''اور جتنی دیر میں، میں نے تمہیں قائل کیا، اگر اسکو ملا لو تو کچھ منٹ، ہیں نا؟''

''ہاں!''وہ اُسکی بے سروپا باتیں بالکل نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

''بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے۔''اُسکی اگلے بات پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

''بارشوں میں تھوڑے زیادہ، کیونکہ اس میں پکوڑے بنانے پڑیں گے۔اور ہفتے میں ایک بار میٹھے پان۔۔اتنا کافی ہے؟''

''میٹھے پان؟''وہ حیران ہوا۔

''کیا مطلب؟ تم نے وہ بھی نہیں کھائیں؟''وہ اُس سے زیادہ حیران ہوئی۔

''تم کھلاؤ گی تو کھالوں گا۔''علی نے خود کو کہتے سنا۔وہ مسکرائی اور اُسی لمحے، علی کو یہ مسکراہٹ دنیا کی سب سے دلفریب شے لگی تھی۔

''یہ جتنا بھی وقت تم نے مجھ سے مانگا ہے، اُسکے علاوہ باقی وقت تم کیا کرو گی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا انتظار۔۔۔''بیساختہ جواب دیا گیا، اب کہ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

''کوئی مستقبل کے بارے میں پلانز؟''

''میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے؟ مطلب مجھے ایسا لگتا ہے، کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے، تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ سر پر لوں۔ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔''اُس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''وہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔''

''پکا؟ مطلب تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟''اس نے آنکھیں بڑی کر کے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کیوں اعتراض ہو گا بھلا؟''

''میری سابقہ منگنی اسی بات پر ٹوٹی تھی، اسی لیے تم سے پوچھ لیا۔''

''سوری؟''علی کو لگا اُسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔''تمہاری منگنی؟''اُس نے تصدیق کرنی چاہی۔

''ہاں! میری، کیوں؟ تمہیں نہیں معلوم؟''اپنے جواب پر فاطمہ نے اُسکے ماتھے پر بل پڑتے دیکھے تھے۔ اُس نے گہری سانس لیکر پلیٹ میز پر رکھی اور اُسکی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

''دیکھو! اگر تمہاری بلاوجہ کی غیرت جاگ رہی ہے نا تو اُسے سلا دو، کیونکہ وہ میرا ماضی تھا، ایسا ماضی جس میں تم نہیں تھے، اُس کے لیے میں تمہیں جواب دہ بھی نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی تمہاری تسلی کیلئے میں بتا دوں، کہ وہ منگنی میرے باپ نے کی تھی اور توڑی میرے دادا نے تھی۔ کیونکہ اگلوں کو مجھ سے زیادہ میری جاب میں دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں کما کر اپنا خرچ خود اٹھاؤں اور اُنکے بیٹے کے نخرے بھی۔ خیر، اُس منگنی کے ہونے سے مجھے فرق پڑا تھا نہ ہی ٹوٹنے سے۔ مزید کوئی سوال ہے؟''اُسکے تفصیل سے کہنے پر علی شرمندہ ہوا تھا۔ وہ کب سے اتنا سطحی سوچنے لگا تھا؟ اور وہ بھی اس لڑکی کے لیے جس سے ملے کچھ گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔

''میں نے تو کوئی سوال کیا ہی نہیں۔''اُس نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے وضاحت دی۔

''تمہارے ماتھے پر جتنی لکیریں پڑی تھیں نا، اُسکے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی، تمہیں اپنے تاثرات چھپانے بالکل نہیں آتے۔''وہ بہت ہی آؤٹ سپوکن لڑکی تھی۔ اس جواب پر علی کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔''اُس نے ہنستے ہوئے ہار مان لی۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی علی کا موبائل بج اٹھا۔

''مجھے کافی دیر ہو گئی ہے،اب چلنا چاہئے۔''وہ موبائل دیکھتے ہوئے اٹھنے لگا۔

''گول گپے تو ختم کرو۔''

''اب تو اگلی دفعہ کھاؤں گا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جا رہے ہو بیٹا؟''اُسے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا دیکھ کر فاطمہ کی والدہ بھی وہیں چلی آئیں۔

''جی آنٹی!کافی دیر ہو گئی ہے۔شکریہ آپکا بہت۔''اُس نے احترام سے جواب دیا۔وہ اُسے دروازے تک جبکہ فاطمہ اُسے،اُسکی گاڑی تک چھوڑنے آئی تھی۔

''میرا جواب تمہارے والدین تک پہنچ جائے گا۔''فاطمہ نے اُسکے اندر بیٹھتے ہی شیشے کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تب تک مجھے کیا کرنا ہو گا؟''علی نے پوچھا۔اُسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنا شوخ کیوں ہو رہا تھا۔

''میٹھے پان کھانے کی مشق۔''اُس نے شرارت سے کہا تو علی ہنس دیا۔پھر اُسے خدا حافظ کہتا گاڑی لیکر آگے بڑھ گیا۔

---------+---------+---------

''تمہیں کیا لگتا ہے؟یہ گرے گا؟''حسین اس وقت سرکیولر روڈ پر کھڑا تھا،ساتھ میں رضا،مقدّم اور ہمیشہ کی طرح بن بلایا مہمان بنی حور عین۔۔۔

''خود بھی گرے گا اور اپنے آگے پیچھے والوں کو بھی مروائے گا ساتھ۔''رضا نے تبصرہ کیا۔موضوع گفتگو سرکیولر روڈ سے جوبلی تک جانے والی سڑک پر، ون ویلنگ کرتا وہ لڑکا تھا،جس سے اُنکا نہ تو کوئی واسطہ تھا نہ ہی وہ اُسے جانتے تھے۔بس ایویں۔۔۔خواہ مخواہ کا شغل۔۔۔

''ایک بار تو گرنا چاہئے اسے،تاکہ عقل ٹھکانے آئے اسکی۔''مقدّم نے خواہش ظاہر کی۔

''پتہ نہیں لڑکوں کو کیوں لگتا ہے کہ سیگریٹ پینے یا ایسے فضول سے کرتب دکھانے سے لڑکیاں اُن پر مر مٹتی ہوں گی۔''حور عین نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟''حسین نے پوچھا۔

''ہر گز نہیں!بلکہ ایسی اوچھی حرکتیں کرنے والے لڑکوں کو دل میں اتنی ہزار گالیوں سے نوازتی ہیں لڑکیاں،پوچھو ہی مت!''

''جھوٹ بول رہی ہے یہ۔''حسین نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''لڑکی وہ ہے یا تم؟'' رضا کا سوال معقول تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا مقدّم چیخ اٹھا۔

''ارے! وہ دیکھو۔'' اُسکے اشارہ کرنے پر سب نے سڑک کی جانب دیکھا۔ شیخیاں مارتے لڑکے کی بائیک پھسلی، وہ خود بھی گرا، اور دونوں سڑک پر داستانِ محبت رقم کرتے ہوئے کافی آگے تک گئے، پھر سماج کی دیواروں کی طرح درمیان میں آنے والے درخت نے دونوں کے درمیان ایسی جدائی ڈالی، کہ لڑکا تو وہیں ٹکرا کر رک گیا لیکن اُسکی چیختی بائیک لڑھکتی ہوئی کافی آگے تک گئی تھی۔

''بہت اچھا ہوا اسکے ساتھ۔'' حسین، مقدّم اور حور عین ساتھ چیخے تھے۔

''شرم کرو، اس طرح نہیں کہتے۔'' رضا نے افسوس سے تینوں کو دیکھا۔ تینوں ایک ہی تھالی کے بینگن تھے۔

''کیوں نہیں کہتے؟ اگر آج یہ نہیں گرتا تو کبھی سبق نہ سیکھتا۔ کیا یار مقی؟ کچھ اور نہیں مانگ سکتے تھے؟'' پہلے رضا کو اور پھر مقدّم کو مخاطب کرتے ہوئے حسین نے کہا۔

''قسم سے یار! کوئی دولت شولت ہی مانگ لیتا، فضول میں اپنی دعا ضائع کی۔'' اُسے بھی واقعی افسوس ہوا۔

''ہمیں اُسکی مدد کرنی چاہیے۔'' رضا کو احساس ہوا کہ اُسکے پاس اب طلبہ اکھٹے ہو رہے ہیں، تو اُنہیں بھی مدد کرنی چاہیے۔

''یہ اسکے اندر عمر کی روح کیسے جاگ گئی ہے؟'' مقدّم نے حسین کے کندھے پر بازو ٹکاتے، رضا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں مدد کریں؟ مدد کرنا ایسے لوگوں کو شے دینے کے برابر ہے۔'' حور نے بھی اتفاق کیا تو رضا نے سر جھٹک کر منہ موڑ لیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا اُن سے بحث کرنے کا۔

''اوہ! عمر کی بچھڑی ہوئی روح!'' حسین نے اُسے پُکارا تو اس نے بیزاری سے دیکھا۔

''وہ دیکھو! آ گئی مدد۔'' اُس نے سرکیولر روڈ کی دوسری جانب اشارہ کیا، جہاں سے رینجرز کے اہلکار آ رہے تھے۔ رینجرز والے اُس لڑکے کی جانب بڑھے، لڑکا بیچارہ اُٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اُسکے سر پر رسید کیا۔ پھر اُسکی بائیک اور اُسے، دونوں کو ہی حراست میں لے لیا۔

''مل گیا اسکو سبق۔'' حسین نے کہا۔

''پڑھنے نہیں آتے، تماشا کرنے آتے ہیں۔'' یہ تبصرہ مقدّم کا تھا۔

''تم گھر کیسے جاؤ گی؟'' حسین یکدم ہی اُسکی طرف مڑا۔

''میں گھر نہیں جا رہی آج، اظہر اور اُسکی امی مجھے پک کریں گے۔ پھر ہم وہاں سے شاپنگ کے لیے جائینگے''۔اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''ہمم!۔۔۔''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔''اور تم؟''پھر مقدّم کی طرف مڑا۔

''میں بس نکل رہا ہوں، رضا چھوڑے گا آج مجھے۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، میں بھی جا رہا ہوں پھر۔''وہ کہتے ہوئے بائیک کی طرف بڑھا۔

''ارے کہاں؟ جب تک اظہر نہیں آجاتا میں اکیلے کیا کروں گی یہاں؟''اُسے جاتا دیکھ حور عین چیخ اٹھی۔

''اپنے منگیتر کا انتظار۔''اُسے منہ چڑاتا ہوا وہ زن سے بائیک لے اُڑا۔

''کتنا بد تمیز ہے یہ؟''اُس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، جب تک تم یہاں ہو ہم رک جاتے ہیں۔''رضا نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''اوہ آ گیا اظہر!۔۔۔''کسی گاڑی کو اُسی جانب آتا دیکھ کے وہ بولی۔''بہت شکریہ آپکا رضا بھائی! لیکن میں جا ہی رہی ہوں۔''وہ اُسکا شکریہ ادا کرتے آگے بڑھ گئی۔

''چلو! ہم بھی چلتے ہیں۔''مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ پر اپنی بائیک کھولتے، اُسے سٹارٹ کرتے، اُسکی نظریں تب تک حور عین پر رہیں، جب تک وہ وہاں سے چلی نہ گئی۔

---------+---------+---------

''بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے۔''اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر، فائنل امتحان کی تیاری کرتے، علی کے کانوں میں اچانک ہی فاطمہ کی آواز گونجی تو وہ اپنی بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو روک نہ سکا۔

''تمہارا انتظار کرونگی۔''اُسکا بیساختگی میں کہا گیا جملہ علی کے کانوں میں رس گھول گیا تھا۔

''تمہیں اپنے تاثرات چھپانے بالکل نہیں آتے۔''فاطمہ کے دو دن پہلے کہے گئے جملے، اُسکے چاروں جانب بکھر رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیا واقعی؟ میں بالکل اپنے تاثرات نہیں چھپا پاتا؟''اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے خود سے سوال کیا۔اگلے ہی لمحے اپنی اس احمقانہ حرکت پر ہنستا ہوا واپس پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔

''میرا جواب تمہارے والدین تک پہنچ جائیگا۔'' پتہ نہیں وہ کیا جواب دے؟ کیا معلوم میں اُسے پسند آیا بھی کہ نہیں۔پہلی بار علی ایسی کسی بات کو لیکر ہلکا سا پریشان ہوا تھا۔کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اُسکی امی چلی آئیں۔

''کیا بات ہے؟آج تو بڑے خوش لگ رہے ہو؟''اُنہوں نے اُسکے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا

''نہیں بس،ایسے ہی۔''اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں فاطمہ کیسی لگی؟''اُسکی امی نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔وہ چند لمحے اُنہیں دیکھتا رہا۔

''وہ اچھی لڑکی ہے،مجھے بہت اچھی لگی۔''مختصر سی تعریف دل سے کی گئی تھی۔اُسکی امی مسکرادیں۔

''یہ بات میں تمہارے ابّا کو بتانے جارہی ہوں۔کچھ دیر میں تم بھی نیچے آجانا۔''

''کیوں؟''وہ حیران ہوا

''اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سے تمہارا جواب معلوم کروں،اگر جواب ہاں میں ہو تو پھر وہ ابھی تم سے بات کرینگے۔''یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

کچھ ہی دیر میں علی،سفیر صاحب کے سامنے موجود تھا۔

''تو تم،فاطمہ کے لیے راضی ہو۔''اُنہوں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''جی!''ماں کی طرح،باپ کے سامنے وہ فاطمہ کیلئے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کرسکا تھا۔

''یہ اچھی بات ہے۔فاطمہ نے بھی یہی جواب دیا ہے۔''اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔اس بات نے اُسے خوشی دی تھی۔

''گڈ۔۔۔''پتہ نہیں وہ خوش تھے بھی یا نہیں،لیکن انکا لہجہ عجیب سا تھا۔

''تمہاری پڑھائی ختم ہونے میں کتنا وقت ہے؟''

''اگلے ماہ امتحان ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اگلے ماہ امتحان ہیں۔ شہیر نے شادی کی تیاریوں کے لیے تین ماہ کا وقت مانگا ہے۔ تمہارے امتحان کے دو ماہ بعد ہی تمہاری شادی رکھ لیتے ہے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ علی کو لگا اُسے سننے میں غلطی ہوئی۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں ابّا؟ شادی ابھی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ابھی نہیں تین مہینے بعد۔''

''ابّا! میں اس وقت کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ مجھے ابھی کیریئر بنانا ہے، اور اپنے بزنس کے لیے پیسے جمع کرنے ہیں۔ اور پھر ابھی تو میرے پاس جاب بھی نہیں ہے۔ سیلز مینیجر والی جاب سے تو بس میرے خرچے پورے ہوتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کر سکتا۔'' علی نے پریشانی سے بتایا وہ سکون سے سنتے رہے۔

''تو تم مجھے انکار کر رہے ہو؟'' اُنہوں نے سرد مہری سے پوچھا۔

''نہیں ابّا! میں انکار نہیں کر رہا۔ میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ابھی منگنی کر لیتے ہیں۔ شادی کے لیے مجھے وقت دیں۔''

''کتنا وقت؟''

''کم از کم تین چار سال۔''

''شادی تین مہینے بعد ہی ہو گی، ورنہ تم جو مرضی چاہے کرو جیسے ہمیشہ کرتے ہو۔''

''آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں، میں اس وقت اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔''

''شادی کے سارے اخراجات میں اٹھاؤں گا۔'' وہ سمجھ نہیں رہے تھے یا سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

''شادی کے بعد بھی ہزاروں اخراجات ہوتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ ایک دوسرے فرد کا خرچ نہیں اٹھا سکتا اور جاب ملنے میں بھی وقت لگے گا۔'' علی جھنجھلا رہا تھا۔

''یہ تو تمہیں آرٹس پڑھنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' اُن کے پر سکون لہجے میں کہے گئے جملے نے علی کو اندر تک ساکت کر دیا تھا۔

''اگر تم بزنس پڑھتے تو آج ٹکے ٹکے کی نوکری کرنے کے بجائے، میرے ساتھ آفس جاتے، کام سیکھتے اور امتحانات ختم ہونے کے بعد کمپنی میں اچھے عہدے پر ہوتے۔'' اُنکا ایک ایک لفظ علی کو صدمے اور بے یقینی کے دلدل میں آہستہ آہستہ ڈوبا رہا تھا۔

''تم نے ہی کہا تھا کہ بہت سکوپ ہے اس فضول پڑھائی کا، تو اب مجھ پر ثابت کر کے دکھاؤ۔ اور رہی بات شادی کی تو وہ تو تم تین مہینے بعد ہی کر رہے ہو ورنہ اس بار اپنی مرضی کر کے اپنے باپ کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔ اپنا جواب کل تک مجھے پہنچا دینا۔'' اُسکے کانوں میں قطرہ قطرہ زہر انڈیل کر وہ اٹھے اور علی پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالتے ہوئے جانے کے لیے مڑے، وہ دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے جبکہ صوفے پر بیٹھا علی ہلنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

تم گر بھی رہے ہو گے تو تمہارا باپ تمہیں تھامنے نہیں آئیگا۔

دو سال پہلے کے کہے اُنکے الفاظ علی کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُسکے باپ نے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ گرانے والا بھی تمہارا باپ خود ہو گا۔ کمرے میں اِس وقت صرف سفیر صاحب کے دروازے کی جانب اٹھتے قدموں کی آواز تھی۔

علی اُنہیں سلو موشن میں دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ضدی ہیں لیکن اتنے ہیں، یہ بات وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اُسے کامیاب بزنس مین دیکھنا چاہتے تھے تو وہ بھی تو بزنس ہی کرنا چاہتا تھا، لیکن صرف اس لیے کہ اس نے پڑھائی میں فیلڈ اُنکی مرضی کے خلاف چنی تھی، وہ اب مکمل طور پر اُسے سزا دینا چاہتے تھے۔ علی جو کہ سمجھ رہا تھا کہ سزا تو وہ دو سال سے اپنے باپ کی ناراضگی کی صورت میں بھگت رہا تھا، وہ غلط تھا۔ سزا تو اب شروع ہونے جا رہی تھی۔

میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے؟ مطلب مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ سر پر لوں۔ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔

فاطمہ کے الفاظ اُسے یاد آئیں تھے۔ سفیر صاحب دروازے سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اُسے اب سمجھ آ رہا تھی کہ اُسکے باپ نے فاطمہ کا انتخاب ہی کیوں کیا تھا؟ وہ ہر جانب سے اُسکے راستے بند کرنا چاہتے تھے۔

تمہارے کسی بھی آئیڈیا یا بزنس پلان میں، میں ہرگز انویسٹ نہیں کروں گا۔

سفیر صاحب دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔ وہ اُسے گھٹنوں پر گرانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علی ہر روز اپنے فیصلے پر شرمندہ ہو، پچھتائے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ ہی غلط تھا۔

''ابّا!'' وہ دروازہ کھول کر باہر قدم رکھنا چاہتے ہی تھے کہ علی کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ فرش پر نِگاہیں ٹکائے وہ اُنہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔

''میں شادی کے لیے تیار ہوں۔''

---------+---------+---------

''میں تو سمجھتا تھا کہ مڈل چائلڈ ہونا برا ہے، لیکن یہاں تو اکلوتے ہونے کی سزا بھی کافی زیادہ ہے۔''نوید نے پر مزاح انداز میں کہا تھا۔

''نہ تو مڈل چائلڈ، نہ اکلوتا اور نہ ہی بڑا بچہ سزا بھگتے، اگر جو والدین مساوات قائم رکھیں۔'' علی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ پوری رات اُسکی کانٹوں پر گزر گئی تھی، جب پریشانی حد سے زیادہ بڑی تو صبح نوید سے ملنے چلا آیا۔ ابھی دونوں ہی ڈی ایم ایس کیفے میں بیٹھے تھے۔ جامع میں یہ واحد کینٹین تھی جو کسی چھوٹے سے ریسٹورونٹ کے طرز پر بنی تھی، یہاں کی قیمتیں بھی آسمانوں سے باتیں کرتی تھیں۔ وہ شاید ہی کبھی بھولے بھٹکے سے اِدھر آتے ہوں۔ ابھی علی کو سکون چاہیے تھا، وہ خاموشی میں بیٹھ کر نوید سے بات کرنا چاہتا تھا، اسی لیے، اُسے ساتھ لیے یہیں چلا آیا۔ باقی کینٹینز کی نسبت یہاں کم ہی رش ہوتا تھا۔

''میں اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''نوید نے اس بار سنجیدگی سے پوچھا۔ نوید کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی اُسکے سامنے بیٹھ کر رو بھی رہا ہو، تو وہ بس منہ دیکھنے پر اکتفا کرتا، یا پھر کندھے اچکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا، اور ایسا اس لیے تھا کہ اُسے نہ ہی تسلّی دینا آتی تھی نہ حوصلہ، اُسکا آدھا وقت تو یہی سوچنے میں نکل جاتا تھا کہ اُسے اس صورتحال میں کرنا کیا چاہیے؟

خود چہرے پر پریشانی لاتا تو اُسے لگتا کہ کہیں اُسے پریشان دیکھ کر سامنے والا مزید پریشان نہ ہو جائے، پریشانی نہیں لاتا تو لگتا کہ کہیں سامنے والا اُسے بے حس نہ سمجھنے لگ جائے، روتے ہوئے کو ہنسانا بھی اُسے عجیب لگتا تھا۔ بلآخر وہ یہی فیصلہ کرتا کہ جو رو رہا ہے یا پریشان ہو رہا ہے، اُسے اُسکا شغل جاری رکھنے دو، جب وہ فارغ ہو جائے گا تو پھر اُس سے کسی مسئلے پر بات کرینگے۔

''تم کیا کر سکتے ہو بھلا؟ جو کرنا ہے مجھے خود ہی کرنا ہے۔ لیکن کیسے کرنا ہے یہ سمجھ نہیں آ رہا۔''

''تم نے خود کیا سوچا ہے؟''

''سوچا تو تھا کہ رات والی نوکری چھوڑ دونگا اور صبح اپنی فیلڈ کے حساب سے نوکری کرونگا لیکن اب تو لگ رہا ہے کہ دونوں نوکری کرنی ہو گی۔''

''ایک تنخواہ میں بھی دو لوگوں کا گزارہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو بلاوجہ پریشانی میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

''ہاں! گزارا تو ساری زندگی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے کیریئر کا کیا؟ میرے خوابوں کا اور میرے اُس بزنس پلان کا کیا؟ جسکے لیے میں یہ ساری محنت کرنا چاہتا تھا۔ ابھی میں شادی کرنے کا متحمل نہیں تھا لیکن اب ابّا نے میرے لیے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں۔''

''تو پھر جب تم نے ابّا کا فیصلہ بھی مان لیا ہے اور اپنے خواب بھی پورے کرنا چاہتے ہو تو محنت بھی تمہیں ہی کرنا ہو گی۔'' بنا جذباتی ہوئے، حقیقت پسندانہ انداز میں بات کرنا نوید کا ٹریڈ مارک تھا۔

''میں محنت سے نہیں گھبرا رہا، بس ابّا کے رویے سے دکھی ہوں۔ جو کام میں دس سال میں کر سکتا تھا، اب اُسکے لیے مجھے بیس سال درکار ہوں گے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ابّا کے پیسوں میں میرا بھی حق ہے۔ کبھی بھی ضرورت ہو گی تو اُن سے مانگ سکتا ہوں لیکن انہوں نے وہ راستہ بھی بند کر دیا۔'' وہ سخت دکھی تھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی

''میرے پاس تو ایک ہی مشورہ ہے۔'' کافی دیر بعد نوید نے کہا۔

''کیا؟''

''تم اُس لڑکی سے بات کرو۔''

''کس لڑکی سے؟''

''جس سے تمہاری شادی ہونی ہے۔ ابھی نہیں تو بعد میں کر لینا۔ کیونکہ آگے جتنے بھی مسئلے ہونے ہیں تم دونوں نے ہی برداشت کرنے ہیں۔ تو اُسکے ساتھ کی تمہیں زیادہ ضرورت ہو گی۔ تم اُسے اپنے مستقبل کے بارے میں خبردار کر سکتے ہو۔'' نوید نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اُسے کچھ سمجھانا چاہا۔ علی نے نفی میں سے ہلایا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں ابّا کو انکار کرنے کے لئے اُسکا استعمال کروں؟ جب میں خود اپنے باپ کو انکار نہیں کر سکا تو ایک لڑکی کو کیسے کہوں ایسا کرنے کو؟ اور میں کیا بات کروں اُس سے؟ تم نے ابھی خود کہا کہ دو لوگوں کا خرچہ تو باآسانی پورا ہو سکتا ہے، تو پھر میں کیا کہوں گا اُس سے؟ یہ کہ میرے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے تم بھی نوکری شروع کر دو جبکہ وہ مجھ سے کہہ چکی ہے کہ وہ مرد کو اپنا کفیل سمجھتی ہے اور خود نوکری نہیں کرنا چاہتی۔ اتنی خود غرض حرکت نہیں کر سکتا میں۔''

''تم اس سے کب ملے؟'' ساری باتوں میں نوید نے بس یہی بات سنی تھی جیسے۔

''کچھ دن پہلے، ابّا نے کہا تھا اسی لیے۔'' اُس نے عام سے انداز میں کہا۔

''آخری حل یہ ہے کہ تم یا تو اپنے ابّا سے معافی مانگ کر اُنکا بزنس جوائن کر لو، یا پھر انکو راضی کرنے کی کوشش کرو۔''

''دونوں صورتیں ناممکن ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے، باپ ہیں تمہارے، مان جائینگے۔ کوشش کرو کہ وہ تمہارا بزنس پلان سن لیں ایک بار!'' نوید اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتا تھا بھلا؟

''ابھی تم امتحانات پر توجہ دو، ساتھ میں نوکری کی تلاش بھی جاری رکھو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے؟''

''ہمم۔۔۔ صحیح کہہ رہے ہو۔'' علی نے اتنا ہی کہا بس۔ گو کہ نوید نے اُسے کوئی قابل ذکر تسلی یا مشورہ نہیں دیا تھا، لیکن اُس سے بات کر کے علی کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی باقیوں کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھا۔ نوید اُسے کہتا تھا کہ ''تم میرا ہی ایک حصہ ہو۔''

فاطمہ اور اپنی شادی کے حوالے سے بھی اُس نے صرف نوید کو ہی بتایا تھا۔ باقی سب کو وہ مقدم کے نکاح پر بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ البتہ ایک بات جو اُس نے نوید کو بھی نہیں بتائی وہ یہ تھی کہ فاطمہ کو انکار نہ کرنے میں اُسکی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو علی کو پسند آئی تھی۔

بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے، بارشوں میں تھوڑے زیادہ، کیونکہ اس میں پکوڑے بنانے پڑیں گے۔ اور ہفتے میں ایک بار میٹھے پان۔۔ اتنا کافی ہے؟

فاطمہ کے الفاظ کانوں میں گونجے تو چہرہ متبسم ہو گیا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اُسے پسند آئی تھی۔ اور وہی آخری ہونے والی تھی، کیونکہ اسکے بعد اُسکا عورت نامی مخلوق سے اعتبار اٹھنے والا تھا۔ اُسکو اپنا مستقبل روشن نہ صحیح لیکن فاطمہ کے ساتھ خوبصورت ضرور نظر آ رہا تھا۔ لیکن نظریں وہی دکھاتی ہیں جو ہمارا دل ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔

کیونکہ

دل کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔۔۔

---------+---------+---------

امتحانات ختم ہوتے ہی مقدم کا نکاح تھا، جسکے اگلے دن وہ اُسکے ساتھ ریسٹورونٹ کی پر تعیش فضا میں بیٹھے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دعوت آج مقدم کی طرف سے ہی تھی۔ اندر جانے کے بجائے، اُنہوں نے اوپن ایئر ایریا میں رکھے شاہی طرز کے تخت پر بیٹھنا زیادہ پسند کیا تھا۔

''یہ دعوت میرے شایانِ شان نہیں ہے۔'' حسین نے اعلان کیا تھا۔

''بالکل، حالانکہ تم گھر پر ٹینڈے اور چاول کھانے کے لائق ہو، لیکن چونکہ میں اپنے دوستوں کے درمیان مساوات قائم رکھنا چاہتا ہوں، اسی لیے تمہیں بھی یہاں لے آیا۔'' مقدم نے سٹارٹر سے انصاف کرتے ہوئے مزے سے کہا۔

''میں گھر کے ٹینڈے اور دال چاول کھانے کو تیار ہوں بشرطیکہ گھر تمہارا سوات والا ہو۔'' حسین نے جواب دیا۔

''اور وہ تمہاری شرط کیوں مانے؟'' عمر نے پوچھا۔

''بات میں اس سے کرتا ہوں تکلیف تمہیں کیوں پہنچتی ہے؟'' حسین نے چڑ کر عمر سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ میرا جگر ہے۔'' عمر نے چڑایا۔

''اور ہم کیا ہیں؟ دل، گردے یا پھیپڑے؟'' نوید نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''نہیں تم تو ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح ہو، کاٹ بھی نہیں سکتا اور ساتھ رکھ بھی نہیں سکتا۔'' حسین نے جواب دینے کے بعد داد طلب نظروں سے سب کو دیکھا۔ کسی نے بھی داد دینا ضروری نہ سمجھا۔

''اتنی لمبی تو صرف آنتیں ہو سکتی ہیں۔'' مقدّم نے اُسکے لمبے قد پر چوٹ کی۔ وہ بیٹھا ہونے کے باوجود بھی دور سے نظر آجاتا تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں واقعی گھومنے پھرنے جانا چاہیے، چھ سال ہم نے صرف پڑھنے میں ہی گزار دیے ہیں۔ آگے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ایک بار تو ہمیں کہیں ساتھ جانا چاہیے۔'' عمر نے کہا تو نوید نے زور و شور سے اُسکی تائید کی تھی۔ باقی سب بھی راضی نظر آرہے تھے۔

''یہی بات میں بھی کہہ رہا تھا، لیکن تم لوگوں کو میری بات کبھی پسند ہی نہیں آتی۔'' حسین نے منہ بنایا اور ایک مرتبہ پھر اُسے نظر انداز کیا گیا تھا۔

''میں راضی ہوں، شمالی علاقہ جات چلتے ہیں۔'' مقدّم نے کہا، اب کہ وہ بھی سنجیدہ نظر آتا تھا۔

''میں بھی۔'' عمر نے کہا۔

''میں بھی اور یہ دونوں بھی۔۔۔'' نوید نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دائیں بائیں بیٹھے علی اور حسین کا ہاتھ اٹھا دیا۔

''السلام و علیکم!'' اُسی لمحے رضا وہاں آیا تھا۔ ٹیبل پر موجود حسین اور عمر کے علاوہ سب ہی نے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔

''سٹارٹر ختم ہونے کے بعد پہنچ رہے ہو تم؟'' مقدّم نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سوری! میں بھول گیا تھا کہ یہاں آنا ہے۔ جب یاد آیا تو فوراً ہی نکل گیا۔'' اُس نے سنجیدگی سے وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں تم اپنا مین کورس بھی رضا کو دے دینا۔'' حسین نے مقدّم کو مفت مشورے سے نوازا تھا۔

''میں تو تمہارا والا اِسکو دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''تمہاری یاداشت کو کیا ہو گیا ہے بیٹا؟'' بہت دیر سے خاموش بیٹھے علی نے رضا کی آخری بات پر اُس سے پوچھا۔

''اُسکی یاداشت کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' رضا کے جواب دینے سے پہلے ہی حسین نے علی کی بات اُچک لی۔

''مجھے کیا ہونا ہے؟''علی حیران ہوا۔

''یہ جو تم کھوئے کھوئے بیٹھے ہو اور اچانک اچانک مسکرانے لگتے ہو، راز کیا ہے؟'' بات شروع حسین نے کی تھی پر مکمل مقدّم نے کی تھی۔

''راز نہیں، مجھے نفسیاتی بیماری لگتی ہے۔''حسین نے علی کو جواب دینے نہیں دیا۔

''ویسے تو تم دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، لیکن جہاں دوسروں کی ٹانگیں کھینچنے کا وقت آجاتا ہے، دونوں ایک ہو جاتے ہو۔''عمر نے ایک دم سے اُنکے پارٹی بدلنے پر چوٹ کی تھی۔

''دیکھ مقی! تیرا جگر ہمیں مفاد پرست کہہ رہا ہے۔''حسین نے مقدّم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اوں ہوں۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''مفاد پرست نہیں، موقع پرست کہہ رہا ہے ہمیں!''پھر تصیح کی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے رضا؟''نوید نے خاموش بیٹھے رضا سے پوچھا۔کافی دنوں سے غائب رہنے کے بعد جب وہ آیا تھا تو اس نے اُنہیں یہی بتایا تھا کہ وہ بیمار تھا۔

''بہتر ہے۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''پھر اتنے چپ کیوں بیٹھے ہو؟''

''یہ دونوں کچھ بولنے دینگے تو بولے گا نہ۔''عمر نے جواب دیا۔

''لو بھلا ہم نے کونسا اُسکے بولنے پر ٹیکس لگایا ہے۔'' مقدّم برا مانتے ہوئے بولا۔اُن لوگوں کی زبانیں بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

''چپ کر جاؤ خدا کے واسطے!''نوید نے زِچ ہوتے ہوئے کہا، پھر دوبارہ رضا کی جانب متوجہ ہوا۔''تم اتنے بیمار تھے تو ہم میں سے کسی کو بتا دیتے، تم ویسے ہی اکیلے رہتے ہو، پتہ نہیں اپنا خیال کیسے رکھ رہے ہوگے۔ہوا کیا تھا تمہیں؟''نوید نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایسی بھی بڑی بات نہیں تھی، بس بخار تھا اور اتنی سی بات کے لیے کیا تنگ کرتا تم لوگوں کو؟ اب بہتر ہوں۔الحمد اللہ!''اُس نے آہستہ آواز میں کہا، اُسکا گلا ابھی بھی بیٹھا ہوا تھا۔آواز نکلنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''خیر مجھے تو اب بھی بہتر نہیں لگ رہے۔''نوید رضامند نہیں لگتا تھا۔

''بہتری آجائے گی طبیعت میں جب ہم شمالی علاقہ جات جائینگے۔''حسین نے کہا۔اور کسی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر عمر نے دیکھا تھا کہ حسین نے ایک بار پھر واضح طور پر موضوع بدلا تھا،اور ایسا وہ بار بار صرف تب ہی کر رہا تھا،جب بھی کوئی رضا سے سوال جواب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا مطلب تم سب سنجیدہ ہو؟''مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔وہ سمجھا تھا کہ شمالی علاقی جات جانے والی بات،وہ لوگ ازراہ مذاق کر رہے ہیں۔

''میں تو بالکل ہوں۔''نوید نے جواب دیا۔

''مقّی ہمیں اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا۔''حسین نے دکھی ہونے کی اداکاری کی۔

''صرف تمہیں۔۔''مقدّم نے تصیح کی۔

''تو کب جانا ہے؟''نوید نے اُنہیں پھر سے غیر سنجیدہ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اگلے ماہ چلتے ہیں۔اور کون کون سی جگہ دیکھنی ہے،اِسکا فیصلہ مقدّم کرے گا کیونکہ یہ اُن علاقوں کو بہتر جانتا ہے۔''عمر نے کہا۔کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا رضا کے علاوہ سب ہی نے اپنی پلیٹوں میں کھانا لینا شروع کر دیا تھا۔

''تم کیوں نہیں لے رہے؟''علی نے اسکو ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''لیتا ہوں۔''پھر مختصر سا جواب۔

''اگلے مہینے نہیں،اُسکے اگلے مہینے بھی نہیں اور اُسکے اگلے دو مہینے بھی نہیں۔''نوید نے اچانک ہی کہا۔رضا نے پلیٹ میں چند چمچ چاول نکالے اور اب اُنہیں چمچ کی مدد سے بس یہاں وہاں ہلا رہا تھا۔منہ میں اس نے اب تک ایک لقمہ بھی نہ ڈالا تھا۔

''کیوں بھئی؟ابھی تو بہت اچھل رہے تھے جانے کے لئے؟''حسین بدمزہ ہوا۔

''کیوں کہ اگلے چھ مہینے تک تو علی کہیں نہیں جانے والا اور یہ نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔''نوید نے اعلان کیا۔

''کیوں علی تمہاری بیوی ہے جو اُسکے بنا تمہارا گزرا نہیں؟''حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم کھا کیوں نہیں رہے رضا؟''اُنکی باتوں سے بے نیاز علی کی نظریں رضا پر ہی تھیں۔

''طبیعت کچھ عجیب سی ہے،ٹھیک سے کھایا نہیں جا رہا۔''اُس نے آہستہ لہجے میں کہتے ہوئے پلیٹ پرے کی۔

''تو تمہارے لیے کچھ ہلکا پھلکا منگوا لیتے ہیں۔''علی کو اس پر ترس آیا تھا۔

''بیوی کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ علی کیوں نہیں جائے گا؟''مقدّم حسین سے زیادہ مشکوک ہوا۔

''اسکی شادی ہے نا اگلے مہینے۔''اس سے پہلے کے رضا، علی کو کوئی جواب دیتا نوید کی بات پر وہ جھٹکے سے اُنکی جانب مڑا تھا۔ باقی سب نے اس بات کو مذاق کے پیرائے میں ہی لیا تھا۔

''ارے ہاں! میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ میری شادی ہے دو مہینے بعد۔''اُس نے جتنے آرام سے بم پھوڑا تھا، اتنی ہی تیزی سے وہاں سب کو سانپ سونگھا تھا۔ مقدّم تو باقاعدہ منہ میں چمچ ڈال کر نکالنا ہی بھول گیا تھا۔

''ایسے مت دیکھو مجھے، میں بتانے ہی والا تھا۔''وہ گڑبڑایا۔

''ہاں! اس بیچارے کو تو خود ایک مہینے پہلے پتہ چلا ہے۔''اب کہ نوید نے دوسرا بم پھوڑا تھا۔ علی نے اسکو کُہنی مارنی چاہی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب شدید صدمے کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں پتہ تھا؟''سب سے پہلے حسین کا سکتا ٹوٹا، تو اس نے سنجیدگی سے نوید سے پوچھا۔ اُس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر کھانا کھانا شروع کر دیا جیسے یہی دنیا کا سب سے ضروری کام ہو۔

''تمہیں پتہ تھا؟''اب کہ اس نے مقدّم سے پوچھا۔ اُس نے منہ سے چمچ واپس نکال کے انتہائی دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔ گھورتی نظریں علی پر ہی ٹکی تھیں۔

''اور تمہیں؟''اب کہ وہ عمر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی دوستی پر جہاں صرف ایک کو معلوم ہے اور باقیوں کو رشتے داروں کے طرح اطلاع دی جا رہی ہے۔''حسین نے ملکہ جذبات بنتے ہوئے کہا۔ باقی سب علی کو گھور رہے تھے اور وہ پوری دلجمعی سے کھانا کھاتے نوید کو، رضا اس پوری صورتحال پر بس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

''میں نے اپنے امّاں ابّا کو راضی کرنے سے لیکر بات پکی ہونے تک، اور وہاں سے آگے نکاح ہونے تک ایک ایک عمل، تم سب کو بتایا، اور دیکھو ذرا اس بیغیرت انسان کو!''مقدّم نے تو شدت غم سے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اور وہ ساری باتیں ہم نے کتنی بیزاری سے اور کس قدر حالت مجبوری میں سنی تھی یہ ہم سے پوچھو، بس اسی تکلیف سے تم سب کو بچانا چاہا تھا میں نے۔''علی بھی ڈھٹائی سے بولا تھا۔

''چھوڑو اس بے شرم آدمی کو مقّی! ہم چاروں اسکی شادی پر جانے کے بجائے شمالی علاقہ جات ہی جائینگے۔''حسین نے اُسے گھورتے ہوئے، اُسکی سزا تجویز کی۔

''چاروں سے تمہاری مراد؟''نوید کے کان کھڑے ہوئے۔

''چاروں سے اسکی مراد تم تو بالکل نہیں ہو۔''مقدّم ٹھیک ٹھاک تپا ہوا تھا۔

''اُسکو وضاحت دینے کا موقع تو دو۔''عمر کے اندر کا ہمدرد انسان ہمیشہ کی طرح جاگ گیا تھا۔

''ہمیں کوئی وضاحت نہیں سننی۔''مقدم کچھ سننے پر رضامند ہی نہیں تھا۔

''میں دے بھی نہیں رہا۔''علی بھی انکو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

''تم لوگوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہو تو اُسکی بات بھی سن لو۔''عمر نے ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کو لتاڑا تھا۔

''دیکھو رضا اور عمر!''علی نے صرف اُن دونوں کو مخاطب کیا۔

''میرے ابّا مجھ سے دو سال سے ناراض تھے،اب اُنہوں نے مجھے خود بلا کر مجھ سے بات کی اور کہا کہ انہوں میں میرے لیے لڑکی پسند کی ہے اور وہ امتحانات کے دو ماہ بعد میری شادی کروانا چاہتے ہیں تو میں کیسے منع کرتا؟اور تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتا سکا کیونکہ مجھے خود تین سے چار ہفتوں پہلے یہ بات معلوم ہوئی،تو میں تم لوگوں کو کیسے بتاتا؟''اُس نے صرف اور صرف ان دونوں سے ہی بات کی تھی۔

''جیسے نوید کو بتایا تھا۔''حسین چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''آغا کا نکاح تھا نا یار درمیان میں،اسی لیے نہیں بتایا ہو گا۔''عمر نے اُسکی طرفداری کرنے کی کوشش کی۔

''بہت ہی بھونڈا بہانہ ہے۔''مقدم نے یہ بہانہ بھی رد کیا۔

''دیکھو!میرا کوئی بھائی ہے نہیں،اور کزن بھی کوئی نہیں لہٰذا اب تم تینوں نے ہی میری مدد کرنی ہے۔''علی نے ان دونوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالا تھا۔

''اور یہ دو لوگ نہیں آ رہے کیا؟''عمر نے اشارے سے پوچھا۔

''یہ دو لوگ تو شمالی شمالی علاقہ جات نہیں جا رہے کیا؟''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''صرف ہم دو نہیں،پلان سب کا تھا خصوصی طور پر اس بھائی کا۔''مقدّم نے انگلی سے نوید کی جانب اشارہ کیا۔

''میں نہیں جا رہا۔''اُس نے سب سے پہلے یوٹرن لیا۔

''میں بھی نہیں جارہا۔''مقدّم کے لاکھ گھورنے کے باوجود عمر نے بھی بیان بدلا۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟''اب کہ حسین نے رضا کو بھی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

''میرے پاس فضول پیسے نہیں ہے برباد کرنے کو لہٰذا میں شادی میں ہی آرہا ہوں۔''اُس نے بھی ہری جھنڈی دکھائی۔

''ویسے پیسے تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہے۔''نوید کو ایک اور بہانہ یاد آیا۔

''تمہیں پیسوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟تم اپنا ایک قدم ہی بڑھالو تو اگلے شہر میں ہوگے۔''حسین نے اُسکے قد کو نشانہ بنایا تھا۔

''اب جبکہ سب کا یہی ارادہ ہے تو میں بھی علی کو معاف کرتے ہوئے شادی میں آنے کو تیار ہوں۔''مقدم نے اچانک ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تو اس غدّاری پر حسین نے زوردار تھپڑ اُسکے کندھوں پر جڑا تھا۔

''حالانکہ آنا تم لوگوں نے میری شادی میں ہی ہے۔لیکن فضول کے ڈرامے کرنا ضروری ہے۔''علی نے بیزار ہوتے ہوئے کہا تھا۔حسین ابھی تک روٹھا بیٹھا تھا۔

''چلو یار پریشان نہ ہو،ہم یہ گھومنے کا منصوبہ دو چار مہینے بعد بنالینگے۔''علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو،جنکی شادیاں ہو جاتی ہیں نا پھر وہ کبھی نہیں ملتے۔یہ بھی تم آج آخری بار ہمارے ساتھ بیٹھ رہے ہو۔''

''تمہیں بڑا تجربہ ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوتا،میرا ابھی تو کل ہی نکاح ہوا ہے،دیکھ لو تم سب کے ساتھ ہوں۔''مقدم نے فخر سے اپنی مثال دی۔

''وہ تو لیلیٰ اپنے گاؤں چلی گئی ہے آج صبح ہی،اسی لیے تم یہاں ہو۔''عمر نے دو منٹ میں اُسکا سارا فخر نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''ختم کرو اس موضوع کو اب،ہم سب اس عید کے بعد چلیں گے۔''اب علی کو حقیقتاً غصّہ آگیا تھا۔لہٰذا سب نے فوراً سے حامی بھری اور انسان بن کر بیٹھ گئے پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔

''تو اُسکی نفسیاتی بیماری کی وجہ یہ تھی۔''بالکل اچانک ہی حسین نے کہا تو وہاں قہقہ پڑا تھا۔علی نے دانت کچکچاتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔نوید شادی کی تیاریوں پر بات کر رہا تھا،عمر رضا کو تھوڑی دیر پہلے حسین کی ماری گئی جگت کا مطلب سمجھا رہا تھا،جسے سمجھ کر وہ سر ہلا رہا تھا،مقدّم شمالی علاقے جانے کے سارے منصوبے ابھی سے طے کر رہا تھا۔

فضاء خوشگوار تھی، دوستی مضبوط تھی اور خوشیاں منتظر۔

لیکن ایسا دائمی تو نہیں رہنے والا تھا۔۔۔

وہ دوبارہ ایسے اکھٹے ہونے والے تھے۔۔۔

لیکن ایسے نہیں، اس مقام پر نہیں اور اِن حالات میں نہیں۔۔۔

قسمت میں اُنکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جانا لکھا تھا۔

لیکن ابھی نہیں۔۔۔

اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ کسی اور وقت پر، کسی اور لمحے میں، اُنکی یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔۔۔

لیکن تب نہ وہ ایک دوسرے کے دوست رہنے والے تھا نہ انکو ایسے کسی سفر کی خواہش رہنے والی تھی۔۔۔۔

ایک منصوبہ اُنہوں نے بنایا تھا اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔۔

---------+---------+---------

آج وہ اُسکے سامنے تھا۔ کالے رنگ کے سوٹ پر سلیقے سے سیٹ کیے گھنے بالوں اور چہرے پر چھائے سخت تاثرات کے ساتھ۔

بلکہ آج وہ سب ساتھ تھے۔ یہ وہی لوگ تھے، جو ساتھ ہوتے تھے تو ایک دوسرے کو خاموش کروانے کے لیے باقاعدہ ہاتھ جوڑنے پڑتے تھے اور آج چار لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی کمرے میں موت جیسا سنّاٹا تھا۔

علی نے بلآخر وہ کاروبار بنا لیا تھا جسکا اُس نے خواب دیکھا تھا، پھر اُسکے چہرے پر خوشی کیوں نہ تھی؟ اور رضا کو سامنے دیکھ کر تو اسکے اعصاب ایسے تن گئے تھے جیسے کوئی پرانا دشمن سامنے آ بیٹھا ہو۔ رضا نے اخلاقاً تو دور انسانی تجسس کے طور پر بھی کسی کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔

مقدّم کچھ نہیں جانتا تھا کہ اُسکے پیچھے کیا ہوا تھا؟ لیکن کچھ تو ہوا تھا۔ کچھ ایسا جس نے اُن سب کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

مقدّم جتنا سوچ رہا تھا اتنا الجھ رہا تھا۔ اپنے یہاں ہونے، ایف آئی اے کا اُسے یہاں بلانے سے زیادہ حیرت انگیز اُسکے لیے اُنکا رویّہ تھا۔

کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ کوئی اِسی جانب آرہا تھا۔ آنے والے نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھے۔ جینز پر کالی شرٹ پہنے وہ لڑکا، ڈیل ڈول سے کوئی فوجی لگتا تھا۔ مقدم اُسے پہچان گیا۔ دو دن پہلے یہی لڑکا اُسکے گھر آیا تھا۔ خیر سے کیا بھلا نام تھا اُسکا؟ مقدّم نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''السلام علیکم! میں اے ایس پی شیراز ہوں۔ ڈی آئی جی صاحب آچکے ہیں۔ وہ آپ سب کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔'' اُس نے رک کر اُنکا چہرہ دیکھا۔ جہاں بے چینی ہی بے چینی پھیلی تھی۔

''آپ سب کو میرے ساتھ آنا ہوگا'' اُس نے کہا تو وہ چاروں اُٹھ کر کھڑے ہوئے لیکن اُنہیں حیرت کا شدید جھٹکا تب لگا، جب شیراز باہر جانے کے بجائے پورا کا پورا گول کمرے کے اندر آیا اور رضا کی جانب بڑھتے، اُسکے سامنے آکر رکا۔ وہ ناسمجھی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ذرا جگہ دیجئے گا'' اُس نے اُس کے پاس پہنچ کر کہا تو وہ عجلت میں دوسری طرف ہوا۔ شیراز دیوار کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے اُس نے دیوار کے برابر میں موجود آلے پر کچھ لکھا۔ اور اُن سب نے اپنی آنکھوں سے دیوار کو سلائڈ ہو کر جگہ سے ہٹتے دیکھا تھا۔

''آپ لوگ میرے پیچھے آیئے'' شیراز نے اُن کے حیران پریشان چہروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ دیوار کی جگہ اب نیچے کی جانب اُترتی سیڑھیوں نے لے لی تھی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھے کہ انہیں جانا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ آج کے دن میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اُنکے اعصاب پر بھاری تھا۔

''آجایئے! کیونکہ آگے آپ جن حالات کا سامنا کرنے والے وہ اس سے زیادہ اعصاب شکن اور شاک پہنچانے والے ہوں گے'' شیراز گویا اُنکے چہرے پڑھ رہا تھا۔

''یقین مانیے، ایف آئی اے آپکی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ یہ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں، آپکی زندگیوں کی سلامتی کے لیے ہی ہے'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''اب آپ لوگ میرے پیچھے آیئے'' یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے کے لیے مڑ گیا۔ اُسکے پیچھے سب سے پہلے قدم رضا نے ہی بڑھائے تھے، بنا کسی کی بھی جانب دیکھے۔ پھر باقی سب بھی باری باری اُسکے پیچھے آگئے۔

---------+---------+---------

سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد ایک پورا جہان تھا جو شروع ہو رہا، سفید روشنیوں میں نہایا وہ پورا فلور لکڑی سے بنا تھا۔ مختلف کمروں میں ایف آئی اے کے ملازمین کام کرتے نظر آرہے تھے، کہیں چھوٹے چھوٹے کیبنز میں مختلف لوگ کاغذات میں سر دیے بیٹھے تھے۔ لوگ مختلف سمتوں سے آجا رہے تھے۔

وہ چاروں شیراز کے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک دروازے کے سامنے شیراز رکا۔ دروازے کے اوپر محکمہ مشاہدہ لکھا ہوا تھا۔

یہاں بھی دیوار پر ایک آلہ لگا تھی، جس پر شیر ازنے اپنا کارڈ رکھا، تو وہ دروازہ سلائیڈ ہوتے ہوئے اپنی جگہ سے ہٹا۔ شیر از اُنہیں لیکر اندر داخل ہوا۔

کمرے کے اندر روشنیاں مدھم تھیں۔ کمرہ کیا تھا، وہ پورا ایک آفس تھا، جسکے کناروں پر مختلف سسٹمز رکھے تھے۔ ہر سسٹمز کے سامنے کوئی نہ کوئی بیٹھا سنجیدگی سے کام میں مصروف تھا۔ کچھ لوگوں نے کانوں پر ہیڈ فون لگا رکھے تھے اور مسلسل ایک لینڈ لائن نما ریموٹ سے کسی کو ہدایت دے رہے، تو کبھی لے رہے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک بڑی سی گول میز تھی۔ گول میز کی سربراہی کرسی پر کوئی وجود بیٹھا تھا، جسکی اُنکی جانب پشت تھی۔

''آپ لوگ بیٹھئے''شیر ازنے میز کی جانب اشارہ کیا۔ وہ وجود جو اُنکی جانب پشت کئے بیٹھا تھا، وہ دراصل کسی بڑی سی سکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ لوگ باری باری کرسیوں پر بیٹھے۔ اُنکے بیٹھنے کے بعد بھی بہت سی کرسیاں خالی تھی۔ شیر از سربراہی کرسی کے پاس جاکر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُسی لمحے سربراہی کرسی اُنکی جانب مڑی اور اُس پے بیٹھا وجود اُنکی نظروں کے سامنے واضح ہوا۔ سکرین اب اُسکی پشت پر ہو چکی تھی۔ جبکہ وہ لوگ سکرین کو بدستور دیکھ سکتے تھے۔

وہ ایک ادھیڑ عمر مرد تھے۔ بال سفید اور سرمئی مائل تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ بے حد فٹ انسان لگتے تھے، جیسے کثرت سے ورزش کرتے ہوں۔ چہرے پر ایک رُعب سا قائم تھا۔ اُنہوں نے سنجیدگی سے ایک نظر سب پر ڈالی۔

''میں ایف آئی اے کاؤنٹر ٹیرر ازم ڈیپارٹمنٹ کا ڈی آئی جی ہوں۔ ڈی آئی جی فرّخ''اُنہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ اب تک جو کچھ آپ لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ لوگ یقیناً ان سب صورتحال کو سمجھ نہیں پا رہے ہوں گے۔ میں تمہید نہیں باندھوں گا۔ سیدھا سیدھا مدّعے پر آؤں گا۔ یہ تصویریں۔۔۔''فرّخ صاحب کہتے ہوئے کرسی سے کھڑے ہوئے اور اپنی پشت پر موجود سکرین کی جانب دیکھا۔ سکرین پر اچانک ہی کسی کتاب کے صفحے کی تصویر نمودار ہوئی، اُس صفحے پر کل چھ تصاویر تھیں۔

''یہ تصاویر ہمیں ایک ڈائری سے ملی ہیں۔''فرّخ صاحب نے کہا۔

''ایک سیریل کلر کی ڈائری سے۔۔۔''اُنہوں سنسنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

''واٹ ؟؟''عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ اس سے پہلے کہ فرّخ صاحب کوئی جواب دیتے کمرے کا دروازہ سلائیڈ ہوا۔ دروازے پر کھڑا وجود روشنی سے دور اندھیرے میں نظر آرہا تھا۔ وہ لمبا چوڑا انسان، اس وقت کسی سائے کی مانند لگ رہا تھا، اندھیرے میں بھی وہ دیکھ سکتے تھے کہ اُسکا سر دروازے تک پہنچ رہا ہے۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا کمرے کی مدھم روشنیوں میں اُسکا وجود واضح ہوا۔ اور اُسکا چہرہ آج کے دن میں انکو ملنے والا آخری جھٹکا تھا۔

وہ مضبوط مگر آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ٹیبل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چہرے پر شدید سختی چھائی ہونے کے باوجود بھی ایک عجیب سی کشش تھی اُسکے چہرے میں، اُسے بار بار مڑ کر دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ جدید تراش خراش کی داڑھی کے ساتھ، اُسکے سیاہ اور سفید بالوں نے اُسکی شخصیت کو مزید گریس فل بنا دیا تھا۔ دائیں آنکھ کے کنارے پر بال جتنا باریک لیکن انگلی جتنا لمبا گہرا سیاہ نشان موجود تھا۔ بھنویں سکیڑے، وہ اُنہی سخت تاثرات کے ساتھ سر براہی کرسی کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''ایس ایس پی نوید عالم!'' اُنہوں نے ہاتھ سے نوید کی جانب اشارہ کر کے اُسکا نام بتایا اور بس یہی اُسکا مختصر سا تعارف تھا۔ اُنکی حیران نظریں اس وقت نوید پر تھیں۔ سب سے پہلے کسی نے بڑی مہارت سے اپنے تاثرات چھپائے تھے، تو وہ رضا الٰہی تھا۔ جو ایک ہی نظر اُس پر ڈالنے کے بعد واپس سکرین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ علی کا چہرہ جو رضا کو سامنے دیکھ کر تنا ہوا تھا، وہ نوید کو سامنے پا کر یکدم ہی حزن و غم کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ اُسکے سامنے تھا لیکن اُس سے دور۔۔۔

نوید کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے ایسے بیٹھ گیا تھا، جیسے وہاں بس وہ یا فرّخ صاحب ہوں۔ باقیوں سے اُسکا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

اُسکے بیٹھنے کے بعد فرّخ صاحب نے کیس پر دوبارہ بریفنگ شروع کی تھی۔

نوید بدل گیا تھا۔۔۔ بہت بدل گیا تھا۔۔۔

ایک بات جسکی اُنکے دلوں نے تصدیق کی تھی۔

صرف شخصیت ہی نہیں بلکہ ظاہری اعتبار سے بھی وہ بدل گیا تھا۔۔۔

وہ خوبصورت اور پر کشش مرد تھا لیکن، وہاں بیٹھے اپنے تمام دوستوں سے وہ عمر میں بڑا لگ رہا تھا، وجہ اُسکے چند سفید بال نہ تھے بلکہ اُسکے چہرے کی سختی اور شخصیت کا رعب تھا۔

یہ وہ نوید نہیں تھا جسے وہ جانتے تھے۔۔۔

نوید جو سب سے خوش مزاج تھا۔۔۔

جسکی زندگی میں ایک ہزار ایک مسئلے چلتے تھے اور وہ اُنکا برملا اظہار بھی کرتا تھا۔

لیکن پھر بھی ہر دم ہشاش بشاش نظر آتا تھا وہ۔۔۔

یہ وہ نہیں تھا۔۔۔یہ وہ ہر گز نہیں تھا۔۔۔

سکرین روشن تھی۔کمرے میں موجود لوگ آہستہ آہستہ کر کے منظر سے غائب ہونے لگے تھے۔آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں حتیٰ کہ ڈی آئی جی صاحب بھی وہاں نہیں رہے تھے۔رہ گئے تھے تو خود سے نظریں چُراتے اور اپنے اندر کی آوازوں کو چھپاتے وہ پانچ نفوس۔۔۔وہ پانچ جن کی زندگیوں میں پچھلے دس سالوں سے چھایا جمود آج ٹوٹنے جا رہا تھا۔

قسمت نے اُنہیں بہت عجیب مقام پر دوبارہ ملایا تھا۔۔۔

--------+--------+--------

''مما یہ دیکھیں،ایکٹیویٹی ڈے میں مجھے بھی کوئز ٹیم کا حصہ بنایا گیا ہے۔''وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم خوشی خوشی گھر آ کر اپنی ماں کو بتا رہا تھا۔

''ہاں!ٹھیک ہے۔''اُسکی ماں نے کام کرتے ہوئے مصروف سا جواب دیا۔

''اور اتنے سارے بچوں میں صرف مجھے ہی چنا گیا ہے۔''وہ پر جوش ہو رہا تھا۔

''نوید!یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے؟''اُسکی ماں نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔وہ اس وقت کچن میں کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''اب ٹیم میں حصہ بنا لیا گیا ہے تو جاؤ اور جا کر تیاری کرو۔میرا سر کیوں کھا رہے ہو؟''نوید کا سارا جوش ماند پڑ گیا اور وہ خاموشی سے کمرے میں چلا آیا تھا۔

ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا۔وہ اسی طرح نظر انداز ہوتا آیا تھا۔اُسکی خوشی،اُسکی کامیابی کسی کے لیے معنی ہی نہ رکھتی تھی۔اُسکا چار سال بڑا بھائی،اُسکے ماں باپ کی پہلوٹی کی اولاد،وہ اپنی ماں کا لاڈلا بچہ پہلے ہی یہ سارے کارنامے انجام دے چکا تھا۔جو جوش اور جذبہ اُسکی ماں کا اپنے بڑے بیٹے کے کسی نئے کارنامے پر ہوتا تھا،وہ نوید تک آتے آتے اسی طرح ماند پڑ جاتا تھا،کیونکہ اُنکے لیے پھر وہ شے یا کارنامہ پرانی بات ہو جاتی تھی۔اُس میں نیا جیسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔چاہے پہلی بار پرائمری سے سیکنڈری میں جانا ہو یا سیکنڈری سے کالج میں،اپنے لیے نئے مضامین کا چناؤ کرنا ہو یا سپورٹس ڈے میں حصہ لینا ہو،سائیکل چلانا سیکھنا ہو یا کلاس میں پہلی پوزیشن لینا ہو۔ہر کام اُسکے بھائی کے لیے پہلی دفعہ ہوتا تھا اور نوید کی باری میں وہ کام دوسری دفعہ کے درجے میں آ جاتا تھا لہٰذا پہلی بار جیسا جوش و جذبہ کسی کے پاس نہیں بچتا تھا۔

وہ بھول جاتے تھے کہ بے شک اُن کے لیے یہ نیا نہ ہو،لیکن نوید کے لیے بھی یہ سب نیا تھا اور اُسکی زندگی میں بھی پہلی بار ہی ہو رہا ہوتا تھا۔اگر وہ سائیکل چلا رہا تھا تو وہ اُسکے لیے پہلی بار ہی تھا۔لیکن اُسکی دفعہ میں ماں باپ کی جانب سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ملتی۔

اُسکا باپ، گھر میں جب بھی داخل ہوتا تو برے موڈ کے ساتھ، وہ پورے ہفتے کسی کی بات سننے کا روادار بھی نہ ہوتا تھا اور نہ ہی گھر آتے ساتھ اُسے بچوں کی شکلیں اور آوازیں پسند تھیں۔ البتہ نوید سے آٹھ سالہ چھوٹی بہن اس اصول سے مستثنیٰ تھی۔ وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔

اور نوید۔۔۔ وہ ان سب میں کہاں تھا؟ کہیں نہیں۔۔۔ وہ مڈل چائلڈ تھا اور یہی اُسکی قسمت تھی۔ اُسے نہ گھر کے بڑے بچے جتنی اہمیت حاصل تھی نہ گھر کے چھوٹے بچے جتنا لاڈ اُسکا نصیب تھا۔

وہ جب اپنے باپ کے پاس کچھ سیکھنے جاتا، چاہے ریاضی کے سوالات ہوں یا ریموٹ کنٹرول گاڑی چلانا سیکھنا ہو یا کمپیوٹر چلانا، اُسکے باپ کے پاس ایک ہی جواب ہوتا کہ ''اپنے بڑے بھائی سے سیکھ لو میں اُسے سکھا چکا ہوں۔'' وہ اُنکا وقت چاہتا تھا اور اُنکے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ وہ یہ وقت، اپنے بڑے بیٹے کو، یہ سب چیزیں سکھانے میں پہلے ہی صرف کر چکے تھے۔ اب بھلا اُسکے لیے دوبارہ وقت کیوں ضائع کرتے؟

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کاش اُسکا کوئی نانا، دادا یا دادی ہوتی جن کا وہ لاڈلا ہوتا کیونکہ کہانیوں میں تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے نا، جو کسی کا پسندیدہ نہیں ہوتا اُسکو کوئی ایک تو پسند کرتا ہے، لیکن ایسا بس کہانیوں میں ہوتا ہے۔

اُسکا بھائی اسے پڑھاتا اور ذرا سی غلطی پر اُسے تھپڑ جڑ دیتا، وہ اپنی ماں سے شکایت کرتا تو جواب آتا کہ

''بڑا بھائی ہے مار بھی دیا تو کیا ہوا؟ تمہارے بھلے کے لیے ہی مارا ہوگا۔''

اُسکا کوئی بھی نیا کھلونا، کلر پنسل کا باکس حتیٰ کہ اسکو ملنے والا گفٹ بھی اُسکا بھائی کھولتا۔ اُسکے کھلونے سے پہلے اُسکا بھائی کھیل کر دیکھتا پھر اُسکے حوالے کرتا، اور اُسکے احتجاج کرنے پر ہمیشہ کی طرح ایک ہی جواب ملتا۔

''تم چھوٹے ہو ابھی، تمہیں معلوم نہیں چیزوں کو کیسے استعمال کرنا ہے، وہ بڑا ہے جیسے بتا رہا ہے ویسے کرو۔''

حتیٰ کہ اُسکی ماں نے چاکلیٹ لا کر رکھی تو وہ بھی اُسکا بھائی اسے نکال کر دیتا تھا کہ مجھے زیادہ معلوم ہے کہ تمہیں کب دینی ہے؟ اُسکے دوست کون ہونگے، کون نہیں یہ فیصلہ بھی اُسکا بھائی کرتا۔ وہ جسے خراب کہہ دیتا، اُسکی ماں اُسے، اُس سے ملنے سے منع کر دیتی۔ وہ جسکو اچھا کہتا، اُسکی ماں اُسی سے دوستی کرنے کو کہتی بھلے وہ نوید کو کتنا ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

ایک روز اُسکے بھائی نے اُسے کچھ کام کرنے کو کہا تھا۔ جسے کرنے سے نوید نے منع کر دیا۔ جواباً اُس نے اُسے دھمکی دی کہ اب تم دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اور شام میں جب نوید معمول کے مطابق کھیلنے جا رہا تھا۔ اُسی لمحے اُسکے بھائی نے ماں سے کہہ دیا کہ ''اسے باہر مت بھیجیں، اِسکے یہ دوست بہت برے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، یہ گندی باتیں کرتے ہیں۔'' نوید بھونچکا رہ گیا، وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اور وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اُسکے بھائی کی بات سچ تھی اور اُسکی

جھوٹی، وہ جتنا چیختا چلاتا، اُسکی بات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جو اُسکے بھائی نے کہہ دیا وہی سچ ہوتا تھا۔ اُس روز اُس نے گھر کی کھڑکی سے اپنے دوستوں کو کھیلتے دیکھا تھا اور پورا دن کڑھتا رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کیسے بتاتا کہ یہ اُسکے بھائی نے سازش کی ہے؟ اُسکی بات کا بھلا کون یقین کرتا؟ ایک بار بتانے کی کوشش کی تو جواب آیا۔

''تم یہ کہانیاں پڑھنا چھوڑ دو، اپنے آپ کو اُسی کا مظلوم کردار سمجھنے لگے ہو۔ باہر آجاؤ خیالوں کی دنیا سے۔'' نوید کو کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا وہ ماہانہ رسالے اور کتابیں خریدتا تھا۔ اسی لیے اِسکو یہ طعنہ ملتا۔

ماں باپ بڑے بچوں کو اختیار دے کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بچے ہی ہیں، وہ اپنے اختیارات کا استعمال بچوں کی طرح ہی کرینگے، اپنا مفاد بھی دیکھیں گے اور جھوٹ بھی بولیں گے۔ وہ اتنے ذمّے دار ہوتے نہیں ہے، جتنا ماں باپ اُنہیں سمجھ لیتے ہیں۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے دن بدن اُسکی قوت فیصلہ اور خود اعتمادی ختم ہوتی چلی گئی۔

اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی یہی، ایک آدھ تھپڑ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو مارے تو، اُس روز وہ اپنے باپ سے بری طرح پیٹا تھا۔ اُس دن کے بعد اُس نے دوبارہ اپنی بہن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اُسکو لگتا تھا کہ ہر چھوٹا ایسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ خود ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، اُسکی بہن اکلوتی اور باپ کی لاڈلی ہونے کے باعث ویسی نہیں تھی، جیسے وہ خود تھا۔

وہ سب سے زیادہ اپنی بہن کی ناانصافیوں کا شکار ہوا تھا۔ وہ بے شک چھوٹی بچی تھی، لیکن گھر میں جو دیکھتی رہی وہی سیکھتی تھی۔ وہ وائلنٹ (تشدد پسند) تھی، مار پیٹ بہت کرتی تھی۔ کبھی کوئی چیز اُٹھا کر دے ماری تو کبھی کچھ۔۔ شکایت کرنے پر نوید کو ایک ہی جواب ملتا۔

''تم نے ہی کچھ کیا ہوگا۔''

''تمہاری ہی غلطی ہوگی۔''

''وہ چھوٹی ہے برداشت نہیں کر سکتے؟ ہر وقت چھوٹی بہن سے مقابلہ بازی۔'' اور وہ چپ ہو جاتا۔

اُسکے گھر کے بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ اُسکے ماں باپ تھے۔ باپ بے دھڑک ہاتھ اٹھاتا تھا اور ماں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بدزبان بھی تھیں۔ گالیاں اور طعنے اُنکی زبان پر رہتے تھے۔ غصّہ اترتا تو بڑے پیار سے بلا کر کہتی کہ

''ماں ہوں، ماں باپ تو گالیاں دیتے ہیں۔ اِس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ماں باپ کی گالیاں کھاؤ گے، تو زمانے کی گالیوں سے بچو گے۔''

اُسکی بہن کی سب سے بری عادت جھوٹی شکایت کرنا تھی، وہ جھوٹ بھی کہتی تو اُسکا باپ سچ مان لیتا اور نوید حلف بھی اٹھاتا تو وہ ''جھوٹا'' ہی قرار پاتا۔ بھائی کے کام کے لیے اُسے دوڑایا جاتا کہ بڑا بھائی ہے پانی مانگ رہا ہے لا کر دو، بڑا بھائی ہے کہہ رہا ہے کہ اُسکی الماری ٹھیک کر دو تو کر دو نا۔۔۔

لیکن یہی کام جب وہ اپنی چھوٹی بہن سے کہتا تو مکالمے تبدیل ہو جاتے۔

''اپنے کام خود کرو، نوکر ہے بہن تمہاری؟''

''چھوٹی ہے وہ، کیوں اُسکو کام بول رہے ہو، اُٹھ کر خود کرو۔''

ان سب چیزوں نے اُسکی شخصیت کو باری باری خراب کرنا شروع کیا۔ اُس میں متواتر تبدیلیاں آنا شروع ہوئی تھیں۔

پہلی تبدیل یہ تھی کہ اُس نے اپنے اِرد گرد خیالی کردار بنا لیے، اُسکا ایک خیالی گھر تھا، جس میں اُسکا باپ ہمیشہ اس سے پیار سے بات کرتا تھا، اُسکی بات کو بھی اتنی اہمیت اور توجہ دیتا تھا، جتنی اُسکی بہن کو۔ وہاں اُسکی ایک ماں تھی، جو اس کو خود سے پڑھاتی اور اُسکو فیصلے کا اختیار دیتی تھی۔ چیزیں خراب ہونے پر پیار سے سمجھاتی تھی۔ اپنی ساس نندوں اور شوہر کا غصّہ اُس پر نہیں اتارتی تھی۔

وہاں اُسکا ایک بھائی تھا، جو اُسکا بیسٹ فرینڈ تھا اور اُسکی ایک شرارتی سی بہن جو اُسکی کرائم پارٹنر تھی۔

اپنے اِس خیالی گھر کے ساتھ وہ خوش تھا۔ وہ روزانہ کئی کئی قسم کے خیالی منظر نامے بناتا اور اپنے اس خیالی خاندان کے کرداروں کے ساتھ اُن منظر کو جیتا تھا۔ وہاں سب کچھ اچھا تھا، ہر شے اُسکی مرضی کے مطابق تھی، سب خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ان منظر ناموں میں اتنا گم ہو جاتا کہ اُسے آس پاس کا ہوش ہی نہ رہتا۔ ایسے میں کوئی اُسکے سر پر کھڑا کچھ کہہ بھی رہا ہوتا، تب بھی اُسے آواز نہ آتی۔ یہ تھی دوسری تبدیلی جو اُسکی ذات میں آئی تھی۔ وہ ان خیالی دنیا میں اس حد تک گم رہنے لگا تھا کہ وہ باتیں بھولنے لگتا، جو کام کہا جاتا وہ اُس سے عموماً غلط ہو جاتا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلتا کہ اُسکو پکارا جا رہا ہے یا کچھ کہا جا رہا ہے؟ اُسکے باپ نے اُسے بلب ٹھیک کرنے کو کہا تھا اور اپنی اسی خیالی دنیا میں مگن وہ بھول گیا۔ اُسے اپنے باپ سے ٹھیک ٹھاک مار پڑی۔ اُسکی ماں نے اُسے سامان لانے کو کہا تھا اور وہ ان میں سے کوئی شے بھول گیا اور اُسکی ماں نے ہاتھ میں پکڑا بیلن اٹھا کر اُسکے کندھوں پر دے مارا۔ اور یوں یہ معمول کی بات بن گئی۔ اُس سے جو بھی کام ہوتا وہ غلط ہی ہو جاتا۔ اُس نے خود پر قابو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جیسے اُسکی قسمت ہی خراب تھی۔ اب اُسکی خود اعتمادی، خوف میں تبدل ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے ڈر رہتا کہ وہ جو بھی کام کریگا، اُس سے غلط ہی ہو گا۔ اپنے ماں باپ اور خصوصاً باپ سے بات کرتے ہوئے اُسکے ہاتھ کانپنے لگتے تھے، زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔

اُسکا باپ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا، اور اُسے پانی لانے کو کہا، اُسکے کانپتے ہاتھوں سے پانی چھلک کر اُسکے باپ کے پرنٹ ہوئے کاغذات پر گر گیا۔ اُسکے باپ نے اُس روز اُسے پاس پڑی، اُسکے دادا مرحوم کی یادگار لاٹھی سے بری طرح پیٹا تھا۔ پرنٹ ہوئے پیپرز ہی تھے نا، دوبارہ بھی پرنٹ ہو سکتے تھے؟ لیکن وہ نوید سے زیادہ اہم تھے یقیناً۔

اُس نے ایک روز کرکٹ کھیلتے ہوئے کمرے کا شیشہ توڑ دیا۔ اس غلطی کا اعتراف اُس نے خود اپنے باپ سے کیا۔ ٹوٹا شیشہ دیکھنے پر اُسکے باپ نے وہی کیا جو ہمیشہ کرتا تھا۔ یعنی اسکو پیٹنا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اور اپنی آٹھ سالہ چھوٹی بہن کے سامنے آئے روز مار کھاتا تھا۔ اُس روز نوید نے ایک بات سیکھ لی۔ غلطی کرنی ہے، لیکن بتانا نہیں ہے۔ اُسکے ماں باپ ہمیشہ کہتے سچ بولو، سچ بولنے سے نقصان کم ہوتا ہے اور وغیرہ وغیرہ لیکن سچ بولنے کی جو سزا اُسے ایک بار مل چکی تھی، اُس سے بہتر اُس نے جھوٹ بولنا سمجھا۔ نوید زندگی میں جو کام کرتا وہ صرف مار سے بچنے کے لیے کرتا۔

وہ غلطیاں کر کے چھپا دیتا، استری کرتے ہوئے شرٹ جل گئی، یا گلاس ٹوٹ گیا یا کپڑوں پر تیل گر گیا، یہ سب باتیں وہ جتنا ہو سکتا، اتنا چھپاتا اور جب ان میں سے کوئی ایک آدھ بات پتہ چل جاتی تو وہی ہوتا جسکا اُسے ڈر تھا۔

ایک عمر میں آ کر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک dysfunctional خاندان کا حصہ ہے، اُسکے ماں باپ کی آپس میں بھی کبھی نہیں بنی تھی۔ ایسا لگتا تھا اُنہوں نے اپنا ایک ایک پسندیدہ بچہ بنا لیا تھا، اور وہ اس بچے کو اپنا ہمنوا اور اپنے زوج کا حریف بنا رہے تھے۔ اُسکا باپ اُسکے بھائی کو ڈانٹتا تو ماں بیچ میں آ جاتی تھی، اور ماں بہن کو کچھ کہتی تو باپ لڑ پڑتا تھا، لیکن نوید کے لیے نہ ماں آتی تھی نہ باپ۔

اُس نے توجہ لینے کے لئے نت نئے کام کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بتاتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھنٹوں بیٹھ کر روتا۔ یہ شخصیت کی تیسری تبدیلی تھی، جو اس میں آئی تھی۔ اُس کی ان حرکتوں کی وجہ سے اُسکے گھر والے اس سے عاجز آ گئے، اُنہوں نے اُسکی کسی بھی تکلیف پر توجہ دینی ہی چھوڑ دی۔ نوید بھی ایسا کب تک کرتا آخر؟ کچھ عرصے میں وہ بڑا ہونے لگا تو اس نے بھی یہ عادت چھوڑ دی۔ البتہ ایک عادت جو اُسکے گھر والوں نے نہ چھوڑی، وہ تھی اُسکی غلطیوں کو بار بار یاد کروانے کی۔ اب اُسے حقیقتاً کوئی تکلیف پہنچتی، تو وہ اُسے کہتے کہ ''ڈرامے باز! اسے تو عادت ہے اوور ایکٹ کرنے کی، چھوڑ دو اِسے، توجہ لینے کے لیے ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا جب توجہ نہیں ملے گی۔ یہ تو ہے ہی اٹینشن سیکر'' اور جھوٹے کے بعد یہ دوسرا خطاب تھا جو اُسے ملا تھا ''اٹینشن سیکر''۔ حد تو یہ تھی کہ اگر وہ اپنی چھوٹی بہن کو کسی غلط بات سے روکتا، تو وہ اپنے ہم عمر دوستوں اور کزن کے سامنے بے بانگ دہل کہتی۔

''نظر انداز کرو اِسکو، یہ ایسے ہی فضول میں بولتا رہتا ہے، اٹنشن سیکر!''

ان سب باتوں کے بعد نوید نے اپنے گھر والوں سے خود کو دور کرنا شروع کر دیا۔اُس نے گھر سے باہر دوستیاں کرنا اور دوسروں سے توجہ حاصل کرنی شروع کر دی۔ کوئی اُسے ذرا سی اہمیت دیتا، وہ اُسکا اچھا دوست ہو جاتا اور نوید پھر اُسکے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا۔ یہ اُسکی شخصیت میں آنے والی چوتھی تبدلی تھی۔ کالج کے زمانے میں اس نے ڈھیروں دوست جمع کر لئے تھے۔اور اُن دوستوں نے بھی خوب اُس سے فائدہ اٹھایا۔

اِس صورتحال سے باہر بھی اُسے، اُسکی توجہ لینے والی عادت نے ہی نکلوایا تھا، ورنہ کسی روز وہ بڑا نقصان اٹھا سکتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک بار اُس نے اپنے سارے دوستوں سے ایک ہفتے تک بات نہ کی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی تو اُسکا بہترین دوست ہو گا، جسے اُسکی فکر ہو گی۔ ایک ہفتے سے دو ہفتے اور مہینوں ہو گئے، لیکن کسی کو نوید کے غائب ہونے سے فرق نہیں پڑا۔ اُس دن کے بعد سے اُس نے دوستیاں کرنا بھی چھوڑ دیں۔ اُس نے خود کو اکیلا کر لیا۔ یہ شخصیت کی پانچویں تیز ترین تبدیلی تھی، جو اس میں آئی تھی۔ اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ دوستیاں کرنا چاہتا ہے یا دنیا سے کٹ کر رہنا چاہتا ہے؟

وہ بڑا ہو گیا تو اُسکے بہن بھائی بھی بڑے ہو گئے۔ اُس کا بچپن ختم ہوا تو اُن دونوں کا بھی ختم ہو گیا لیکن اب نوید کی شخصیت تباہ ہو چکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنے بہن بھائیوں سے کوئی تعلق قائم نہیں کر پاتا تھا۔ اب اُسکا بھائی اُس سے بات کرنا چاہتا تو وہ اُٹھ کر چلا جاتا۔ اُسکا بھائی خوشی خوشی اُسے اپنی کوئی کامیابی دکھانے یا کوئی بات بتانے آتا تو وہ بے تاثر سے چہرے کے ساتھ اُس سے کہتا ''تو میں کیا کروں؟'' وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ اُسکی بہن اب اُسکے ساتھ ہنسی مذاق کرنا چاہتی تو وہ اُسے جھڑک دیتا۔ وہ اُس سے ڈر کے مارے کوئی فرمائش کرتی نہ کبھی عیدی مانگنے آتی، جیسے اپنے بڑے بھائی سے کرتی تھی۔ وہ بڑی ہو چکی تھی جھوٹی شکایتیں تو دور اب وہ نوید کی سچی شکایت بھی نہ کرتی تھی۔ بچپن میں جس بھائی کو ڈانٹ پڑتا دیکھ کر وہ خوش ہوتی تھی، اب اس بھائی کو پٹتا دیکھ کر اُسے رونا آتا تھا، باپ کو چیختا چلاتا دیکھ کر اُسے ڈر لگتا تھا اور گھر کے ماحول کو خرابی سے بچانے کے لیے اس نے نوید سے بات ہی کرنی چھوڑ دی تھی۔

ایک دفعہ نوید نے اپنے باپ سے بائیک مانگی، اُنہوں نے پہلی فرصت میں اُسے منع کر دیا کہ ''تم مار دو گے کہیں پر''، ہمیشہ جو بات اُس نے نہیں کی ہوتی تھی، وہ پہلے سے ہی اُسکی ذات سے منسوب کر دی جاتی۔ پھر اُس نے بھی وہی کیا جو اُس نے سیکھ لیا تھا۔ اور وہ تھا چھپ کر اپنی خواہش پوری کرنا۔ اُس نے بنا اجازت اپنے باپ کی غیر موجودگی میں بائیک چلائی۔ ایک بار، دو بار، تین بار اور وہ ہر روز یہی کرنے لگا۔ ایک روز اُسکی چلتی بائیک پھسل کر گر گئی اور ہینڈل ٹیڑھا ہو گیا۔ باپ کی مار کی ڈر سے اُس نے کچھ جمع پیسوں اور کچھ دوستوں سے ادھار لیکر بائیک بنوا دی اور گھر لا کر کھڑی کر دی۔ دو دن سکون سے گزرے، کسی کو کچھ معلوم نہ ہوا لیکن تیسرے دن میکینک نے اُسکے باپ سے پوچھ لیا کہ ''بائیک کا ہینڈل ٹھیک ہے نا اب؟'' اُسکے باپ نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''ہینڈل کو بھلا کیا ہونا تھا؟''

''لگتا ہے آپکے بیٹے نے بتایا نہیں؟''اُس نے ہنستے ہوئے اُنہیں نوید کی کارستانی بتائی۔ وہ تن فن کرتے گھر آئے اور ہمیشہ کی طرح اُسے ڈنڈوں، لاتوں اور تھپڑوں سے مارا۔ اگلے دن اکیس سالہ نوید اپنے بہن بھائیوں کے سامنے پٹنے کے بعد صبح اٹھا بھی اور یونیورسٹی بھی گیا، وہاں سب کے سامنے ہشاش بشاش نظر بھی آیا، اور سب سے اخلاق سے ملا بھی اور اسی طرح واپس گھر بھی آگیا۔ یہ شخصیت کی چھٹی تبدیلی تھی۔

اگلے روز اُسکی پھوپھو اپنے بچوں کے ساتھ ملنے آئیں اور اُنکے سامنے اُسکے ابا نے کسی بات کے جواب میں نوید کی پچھلی رات کی پٹائی کا ذکر نکال دیا۔

''ارے آپا! مار بھی دیا تو کیا ہو گیا؟ یہ بیٹھا ہے نوید، اس سے پوچھیں۔۔۔''ہاتھ سے نوید کی طرف اشارہ کیا''یہ تو مجھ سے ابھی بھی مار کھاتا ہے، کل رات ہی اسے بری طرح پیٹا ہے میں نے۔ بائیک مار دی اور مجھے بتایا ہی نہیں۔ سمجھ رہا تھا کہ باپ بیوقوف ہے''اُسکا باپ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ وہ شدید صدمے کی کیفیت میں اُنہیں دیکھتا چلا گیا۔ اُسکی عزت نفس تو ویسے ہی مار دی گئی تھی، آج گھر کے باہر بھی اُسکی عزت دو کوڑی کی کر دی تھی اُسکے باپ نے۔ اُسکے پھوپھو زاد کھی کھی کر کے ہنس رہے تھے۔ اُسکے بعد تو جیسے یہ معمول بن گیا، اُسکے گھر والوں کے لیے سب سے تفریح موضوع ہوتا تھا کہ ''نوید کو فلاں دن فلاں بات پر مار پڑی۔'' یا''نوید نے فلاں کام کر کے چھپا کر رکھ دیا اور سمجھا ہمیں پتہ نہیں چلے گا۔''اور بہت سے ایسے موضوع جو اُسکی عزت نفس مجروح کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ جب نوید کا چہرہ یہ سب سن کر بگڑنے لگتا، تو اُسکی ماں کہتی کہ ''اب زیادہ غصّہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مذاق ہی کر رہے ہیں ہم، برا تھوڑی کہہ رہے تمہیں۔''

اُس دن کے بعد اُس نے رشتے داروں کے سامنے بھی آنا چھوڑ دیا۔ شخصیت کی آخری تبدیلی جو اُس میں آئی تھی وہ تھی بدزبانی۔۔۔

وہ کوئی، ماورائی مخلوق نہیں تھا، جو ہر چیز سہہ کر بھی بہترین اور مکمل انسان بن جاتا۔ نہ ہی وہ اتنا صابر تھا۔ وہ انسان تھا، ایک بے حد عام انسان۔

اُس پر بھی رویوں کا وہی اثر ہوا تھا، جو کسی بھی عام انسان پر ہو سکتا ہے۔ وہ زبان درازی کرنے لگا تھا، بات بات پر بحث کرنے لگا تھا۔ گھڑی دو گھڑی پر اپنی بہن کو جھڑکنے لگا تھا۔ اُسکا بھائی اسے جو کام کرنے سے منع کرتا، وہ وہی کام کرنے لگا تھا۔

آپ کسی کو کہہ کر دیکھ لیں کہ تمہارا باپ رشوت لیتا ہے، وہ کبھی اپنے باپ کو برا نہیں کہے گا۔ اُسکے پاس ہزاروں جواز ہونگے کہ ''اوپر والے مجبور کرتے ہیں۔''، ''یہ نوکری ہی ایسی ہے، رشوت نہیں لینگے تو اوپر والے نکال دینگے۔''وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ کبھی نہیں مانے گا کہ اُسکا باپ برا ہے۔ اولاد کبھی بھی ماں باپ کو برا نہیں سمجھتی، وہ ہمیشہ ماں باپ کی غلطیوں کا جواز تلاش کرتی ہے۔ پھر یا تو اس جواز سے نفرت کرنے لگتی ہے یا اس جواز کو ختم کرنے کے طریقے سوچنے لگتی ہے۔ اور اگر یہ جواز اُسکے اپنے بہن بھائی ہوں تو یا تو وہ اُسکی نفرت کا شکار ہوتے ہیں، یا پھر اولاد اپنے اُس بہن بھائی کو ماں باپ کی نظروں سے گم کرنے یا اُسے اُنکی نظروں میں گرانے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے اُنکے درمیان حسد اور اور جلن کی داستان، جس میں

سراسر قصور والدین کی ناانصافی اور غیر مساوی سلوک کا ہوتا ہے۔ ورنہ اپنے خون سے نفرت کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔ نوید اور اُسکے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، ماں باپ کے غلط رویوں نے بہن بھائیوں میں دراڑ ڈال دی تھی۔

گھر والے تو گھر والے، خاندان والے بھی نوید سے دور رہنے لگے تھے۔ اُسے اکھڑ، بدتمیز اور کھڑوس جیسے الفاظ سے یاد کرنے لگے تھے۔ لیکن اُسے فرق نہیں پڑتا تھا، کم از کم وہ اُسکے سامنے تو ایسا کہنے کی جرت نہیں کرتے تھے۔ اُسکے بہن بھائی جو آپس میں ہنسی مذاق کر رہے ہوتے، وہ اُسے دیکھ کر ایک دم سے چپ ہو جاتے۔ نوید کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اُسکا باپ اُسے اب بھی مارتا تھا۔ اب بھی۔۔۔ جب کہ وہ ایک یونیورسٹی کا نوجوان طالب علم تھا، لیکن اب وہ اپنے باپ سے بحث برائے بحث کرنے لگا تھا، چیخنے لگا تھا، چلانے لگا تھا۔ جب مار ہی کھانی تھی تو دل کی بھڑاس نکال کر کھانی تھی۔ لیکن دل کی بھڑاس تو پھر بھی نہ نکلتی تھی۔ اُسے فیصلے کا اختیار نہیں دیا گیا تو اب وہ فیصلے کر کے صرف اُنہیں اطلاع دینے لگا تھا۔ شروع شروع میں وہ اُسے بہت لعن طعن کرتے، مارتے پیٹتے اور گالیاں دیتے، لیکن جب وہ ڈھیٹ کا ڈھیٹ بنا رہا تو انہوں نے بھی تھک کر اُسے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ البتہ اب جب وہ آ کر اطلاع دیا کرتا کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے تو وہ آگے سے کہتے ''ہم کیا کریں پھر؟ کرو جا کر جو کرنا ہے۔ لیکن بعد میں رونے کے لیے ہمارے پاس نہیں آنا'' جیسے وہ جو بھی کام کریگا اُسے نقصان ہی ہو گا۔

چوبیس سال کی عمر میں جو آخری خطاب اُسے اپنے ماں باپ کی طرف سے ملا تھا وہ تھا ''نافرمان''

نوید اپنے ماں باپ کی نافرمان اولاد بن گیا تھا۔

---------+---------+---------

بارہ سال پہلے:

''میں یہاں ڈیپارٹمنٹ کے سامنے چلتی ہوئی آؤنگی اور تم لوگوں کو روک کر سوال کرونگی۔ تم لوگوں نے ایسے دکھانا ہے، جیسے تم لوگ اپنے کام سے جا رہے تھے اور میں نے راستے میں روک لیا۔'' حورا اپنے سامنے کھڑے حسین، مقدّم و ایمان کو سمجھا رہی تھی۔ ایمان کو تو سمجھ آ رہی تھی لیکن مقدّم اور حسین کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''اور رضا بھائی! آپ یہ کیمرا ٹھیک سے سنبھال تو لیں گے نا؟'' اب کہ وہ ہاتھوں میں کیمرا تھامے رضا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں اپنا کام ٹھیک طرح سے ہی کرتا ہوں۔ تم بس ان لوگوں کو سنبھالو۔'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حسین اور مقدّم کی جانب اشارہ کیا، جنکی آنکھوں میں شرارت واضع نظر آ رہی تھی۔

''بھئی! ہم سمجھ گئے ہیں، مزید کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''مقدّم نے شرافت سے کہا۔

''جلدی رپورٹنگ شروع کرو پھر کلاس لینے بھی جانا ہے۔ فارغ تھوڑی ہیں۔''حسین نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔ حور عین نے اُسے کسی خاطر میں نہ لایا تھا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! میں جاتی ہوں، رضا تم نے یونیورسٹی کا آرک پورا کور کرنا ہے۔ پہلے ایمان تم نے گیٹ سے چلتے ہوئے آنا ہے۔ میں تمہیں روک کر تم سے سوال کرونگی۔''اُس نے رضا اور ایمان کو بیک وقت ہدایت دی تھی۔ رضا کیمرہ لے کر پیچھے ہوا اور حور عین کو انگھوٹے سے اوکے کا اشارہ کیا۔

''میں تو بہت تھک گیا ہوں یار!''مقدّم کے کندھے پر بازو ٹکائے کھڑے حسین نے کہا۔

''کیا زمانہ آگیا ہے، لوگ کچھ نہ کر کے بھی تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں۔''حور نے اُس پر چوٹ کی۔

''ہمارے پاس بس آدھا گھنٹہ ہے۔''رضا نے یاد کروایا۔ صبح کے نو بج رہے تھے، دھوپ ہلکی مگر خوبصورت لگ رہی تھی، ایسے میں یہ ساری تگ و دو حور عین کے جرنلزم کے پروجیکٹ کے لیے ہو رہی تھی۔ اُسے ''پُرامن جامعہ کے پُرامن طلبہ''پر ایک رپورٹ تیار کرنی تھی۔ اسی لیے آج وہ اُن سب کو یہاں لائی تھی۔ اُن میں سے کوئی بھی اتنا اچھا نہ تھا، کہ فی سبیل اللہ اُسکا ساتھ دینے کے لیے دھوپ میں خوار ہوتا۔ ویسے بھی جامعہ کے آرک تک جانا، اور رپورٹنگ پوری کر کے واپس ڈیپارٹمنٹ آنا، ایک ہوش مند انسان کا کام تو نہ تھا۔ ہاں! اگر اس کام کے بدلے معاوضے کی صورت میں اُن بھوکوں کی فوج کو کچھ کھانے پینے کو مل جاتا تو الگ بات تھی۔ رپورٹنگ کے بعد حور عین کا اُنہیں لنچ کروانے کا ارادہ تھا۔

''اسلام علیکم ناظرین! میں ہوں حور عین مصطفیٰ اور آج کی رپورٹ میں، میں آپکو دکھاؤں گی کہ جامعہ۔۔۔''

''ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا''حور عین کا تعارف مکمل ہونے سے پہلے ہی مقدم اور حسین ہنس ہنس کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ ایمان اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہی تھی جبکہ رضا اور حور سنجیدہ مگر گھورتی نظروں سے اُن دونوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

''ہو گیا تم دونوں کا؟''حور نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم اتنی مضحکہ خیز لگ رہی ہو۔''حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُسکی اس بات پر مقدّم ہنستے ہنستے رکوع میں چلا گیا۔ پہلی بار رضا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی تھی۔

''دفعہ کرو ان دونوں کو، تم دوبارہ شروع کر کے ایمان سے انٹرویو لو۔ میں ریکارڈنگ کر رہا ہوں۔''رضا نے کہا تو حور عین نے دوبارہ شروع کیا۔ اپنا تعارف دینے کے بعد اُس نے کیمرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ

''آج ہم جامعہ کے طالب علموں سے پوچھیں گے کہ اس جامعہ کی پرامن زندگی کے حوالے سے اُنکے کیا تاثرات ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ آرک کے سامنے سے ہٹتے ہوئے چھوٹے گیٹ کے سامنے آئی، جہاں سے کتابوں میں سر کھپائے ایمان باہر آرہی تھی۔

''السلام علیکم!'' اُس نے ایمان کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ رضا مہارت سے دونوں کو کور کر رہا تھا۔

''کیا نام ہے آپکا؟''

''میں ایمان سلیم۔''

''جی! تو ایمان یہ بتایئے کہ کون سے ڈیپارٹمنٹ سے ہیں آپ؟''

''میں وی ایس۔۔۔''

''آپ اس جامعہ کی پرامن زندگی کے حوالے سے کیا کہنا چاہیں گی؟''

''جامعہ کراچی ایک بہت ہی پرامن اور پرسکون ماحول فراہم کرتی ہے۔ یہاں کے طلبہ و طالبات بہت ہی سمجھدار اور سلجھے ہوئے مزاج کے ہوتے ہیں'' ایمان بتا رہی تھی۔ اُن دونوں کا رخ کیمرے کی جانب تھا۔ اتنے میں دو انسان، اُن دونوں کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے۔ ایک نے دوسرے کے سر پر تھپڑ لگایا، تو دوسرے نے پلٹ کر اُسکے منہ پر۔۔۔۔ پھر اُس نے اُسکو مکا مارا تو دوسرے نے اُسکی کمر پر گھوم کر لات ماری۔

''یہاں کہ طلبہ کبھی بھی لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ جیسی سرگرمیوں میں ملوث نظر نہیں آتے۔'' ایمان بتا رہی تھی۔ پیچھے کھڑے آپس میں گتھم گتھا حسین اور مقدم ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے تھے۔ مقدّم نے حسین کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اُسکے منہ پر چپیڑیں مارنے لگا۔

''تو کیا پڑھائی کہ علاوہ بھی سرگرمیاں ہوتی ہیں یہاں؟'' حور عین نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں! یہاں پر مختلف قسم کے کھیل اور ایونٹس وغیرہ ہوتے ہیں، طلباء و طالبات اس میں حصہ۔۔۔'' پیچھے چلتی ریسلنگ نے اچانک ہی پلٹا کھایا اور اب حسین نے مقدّم کو زمین بوس کر کے اُسکی ایک ٹانگ کو گھٹنوں سے پکڑ کر زور سے کہا۔

''ایک۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔۔پن۔۔۔۔'' اُس نے مقدّم کی ٹانگ چھوڑی اور اُٹھ کر دونوں ہاتھ بلند کیے ''میں جیت گیا، میں جیت گیا۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' حور عین نے جھٹکے سے پلٹ کر اُن دونوں کو دیکھا۔ حسین ہاتھ دے کر مقدّم کو اٹھا رہا تھا۔ دونوں کے لباس مٹی مٹی ہو چکے تھے۔ دوسرے دروازے پر بیٹھے گارڈ بھی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

''کیا کر رہے تھے تم دونوں؟'' اُس نے لڑاکا انداز میں کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ریسلنگ۔۔۔'' اُن دونوں نے دانت نکالے۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' اب کہ وہ ان دونوں کو اُنکے حال پر چھوڑ کر رضا کی طرف مڑی۔

''مجھے لگا کہ تم ان دونوں کو ایڈٹ کر کے ہٹا دو گی۔'' رضا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اتنی باصلاحیت ہوتی میں تو تم سب کے ساتھ وقت برباد کرتیں؟'' وہ ٹھیک ٹھاک تپ گئی۔

''تو کس نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ وقت برباد کرو؟ جاؤ اور جا کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ پکڑو۔'' حسین نے جواب دیا۔

''ٹیچر نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹس منع کیے ہیں۔ ورنہ میری جوتی بھی تمہارا احسان نہ لے۔'' وہ پاؤں پٹختی ہوئی پاس رکھی بینچ پر جا بیٹھی۔

''انسانوں والے کام نہیں کر سکتے؟'' رضا نے آگے بڑھ کر حسین کے سر پر چپت لگائی تھی۔

''یار! اب مناؤ اسکو، میں لنچ کے آسرے پر ناشتہ بھی کر کے نہیں آیا تھا۔'' مقدّم نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''میں اکیلا مناؤں؟ تم ساتھ شامل نہیں تھے کیا؟'' حسین نے گھورا۔

''تم مناؤ، میں تمہارا ساتھ دے دونگا۔ میں بھوکا گھر نہیں جانا چاہتا۔'' مقدّم نے کہا تو وہ بدستور اُسے گھورتے ہوئے، منہ بنائے بیٹھی حور عین کے پاس آیا۔

''اچھا اب ناراض نہ ہو، دوبارہ نہیں کروں گا۔ پرامس!'' اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا تو حور عین نے اُسے غصّے سے گھورا۔

''شکل گم کرو اپنی!'' اُس نے کہہ کر رخ پھیرا۔

''جانے دو نہ حور دوبارہ نہیں کریگا یہ۔۔۔'' ایمان نے سفارش کی۔

''یہ لو میں کان پکڑتا ہوں۔'' مقدّم نے کہا اور حسین کے کان پکڑ لیے۔

''میرے کان کیوں پکڑ رہے ہو؟'' وہ جھنجھلایا۔

''کان تو کان ہی ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ہو یا تمہارے؟'' اُسکے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''چلو! ایک مرتبہ پھر شوٹ کرتے ہیں۔'' رضا نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے اوکے۔۔۔'' اس مرتبہ شوٹنگ صحیح سلامت ہو گئی۔ رپورٹ پوری ہونے کے بعد حور عین نے سب کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔

''اب اپنی اپنی کلاسز لینے کے بعد کیمسٹری کینٹین میں ملنا۔'' حور نے کیمرے کو بیگ میں بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب کیمسٹری کینٹین؟ ہم مسکن نہیں جا رہے؟'' مقدم نے حیرت سے پوچھا۔ مسکن گیٹ کے اُس پار دو طرفہ طویل شاہراہ تھی، جسکی دونوں جانب مختلف فوڈ چین کے ریسٹورانٹ بنے تھے۔ جامعہ کے طالب علم زیادہ تر یہیں آتے تھے۔

''کس نے کہا ہم مسکن جا رہے ہیں؟ میں تو بس کیمسٹری لے جا کر فرحان کی بریانی کھلانے والی ہوں۔'' اُس نے مزے سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی غریب ہو۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔ اُسکی اُمیدوں پر بری طرح پانی پھیرا گیا تھا۔

''غریب نہیں مقّی، یہ کنجوس ہے کنجوس۔۔۔'' حسین نے تصحیح کی۔

''میرے ماں باپ نے مجھے یونیورسٹی کے باہر ریسٹورونٹ میں بیٹھنے اور کھانا کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اب لنچ کرنا ہے تو آجانا ورنہ مرضی تمہاری۔ تم دونوں تو آرہے ہو نہ؟'' اُس نے پہلے لٹھ مار انداز میں کہا پھر رضا اور ایمان سے پوچھا۔

''یقیناً۔۔۔'' ایمان نے جواب دیا۔

''ہاں چلو، میں وہیں سے ٹرمینل چلا جاؤں گا، آج بائیک نہیں لایا ہوں۔ پوائنٹ سے جانا ہوگا۔'' رضا کو کیمسٹری کینٹین جانے کا آئیڈیا معقول لگا تھا۔

''اتنی محنت کا یہ صلہ ملا۔۔۔'' مقدّم غائبانہ آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھ چکا تھا۔ ایمان بھی چلنے لگی تھی۔ حور اب بھی ناراض ناراض سی تھی اور حسین اُسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رضا اُنکے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ زندگی ویسی ہی تھی، بے پرواہ اور مطمئن سی۔

لیکن ہمیشہ ایسے رہنے نہیں والی تھی۔۔۔

---------+---------+---------

نہ تو اُسکے کبھی اپنے گھر والوں سے ایسے تعلقات رہے تھے، نہ وہ اتنے دوستانہ مزاج کے حامل تھے کہ وہ اُن سے ایسی بات کرتا۔۔۔

وہ زندگی میں پہلی بار خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ بہن بھائی کوئی بھی تو نہیں تھا، جو اُسکا مقدمہ لڑتا۔ سب ہی سے وہ خود کو دور کر چکا تھا۔ اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات کرے؟

ایک لڑکی تھی۔۔۔

ایک عام سی لڑکی۔۔۔ لیکن نوید کے لیے خاص ہو گئی تھی۔ اُس سے بمشکل چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ بھی بس نوٹس وغیرہ کے لیے، کبھی کبھار وہ میسیج پر اُس سے کسی خاص موضوع کو سمجھنے کے لیے رابطہ کر لیتی اور بس۔۔۔

لیکن وہ مختلف تھی، باقی لڑکیوں سے بے حد مختلف۔۔۔ یا شاید نوید کو ایسا لگتا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے خود کو بے حد مصروف کر چکا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتا، دوپہر کو سوپر اسٹور چلا جاتا، جہاں وہ فلور مینیجر تھا۔ رات کو تھک کر جو سوتا تو صبح ہی اٹھتا۔ رشتے داروں سے ملنا جلنا چھوڑ چکا تھا۔ ویک اینڈ پر سی ایس ایس کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتا۔ گو کہ وہ ابھی سی ایس ایس کے لیے رجسٹرڈ نہیں ہوا تھا، لیکن وہ ابھی سے تیاری کر رہا تھا۔

ایسے میں ایک لڑکی کا زندگی میں آنا اور اُسکے لیے اپنے ماں باپ سے بات کرنا اُسے کسی طور آسان نہیں لگ رہا تھا۔ اُس لڑکی سے بات کرنا مشکل نہ تھا۔ اصل مشکل اپنے والدین سے بات کرنا تھا۔

وہ رات بھر سوچتا رہا کہ ماں سے بات کرے یا باپ سے؟ یا بھائی کی مدد لے؟ لیکن ان میں سے کسی سے بھی اُسکے ایسے تعلقات تو نہ تھے۔

اپنی پہلی کمائی اُس نے آدھی اپنی ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھی تھی، آدھی تنخواہ وہ اپنی بچت کے پیسوں میں جمع کر رہا تھا جس سے وہ بائیک لینا چاہتا تھا۔ ماں نے اُسکے کمائی کو دوپٹے کے پلو میں باندھتے ہوئے کہا

''اللہ بھلا کرے تمہارے بھائی کا، اُس نے جب کمانا شروع کیا تھا تو پہلی تنخواہ پوری کی پوری میرے ہاتھوں پر لا کر رکھی تھی۔ بس یہی فرق ہے تم میں اور اُس میں۔'' پہلی بار اُسکا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے دل کے ساتھ خاموشی سے وہاں سے اُٹھ گیا۔

اب بھی وہ اپنے ماں باپ کے ممکنہ جوابات سوچ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیسا ردعمل دیں؟ کیا کہیں؟ اُسے طعنہ ماریں؟ یا اُسکا مذاق اڑائیں؟ یا ہمیشہ کی طرح اُسکا موازنہ اُسکے بڑے بھائی سے کریں کہ ''بڑا بھائی زیادہ کماتا ہے، ویل سیٹل ہے لیکن اب تک اس نے اپنے لیے کوئی لڑکی پسند نہ کی اور یہ جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے کماتے ہوئے، گھر بسانے کا سوچنے لگے۔''

اُسے اپنے بہن بھائیوں کا نہیں معلوم، لیکن گھر بسانے کی سب سے زیادہ خواہش اُسکی تھی۔اُسکے کیریئر اور مستقبل سے بھی اوپر اُسکے لیے اُسکا گھر تھا۔ایک ایسا گھر جہاں کا ماحول ویسا ہی جیسا وہ اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ایک ایسا گھر جہاں ویسے ہی لوگ بستے ہوں، جیسے اُس نے اپنی خیالی دنیا میں بسائے ہوئے تھے۔اُس گھر کی خواہش وہ کب سے اپنے دل میں لیے پھر رہا تھا۔

بی بی اے مکمل ہونے کے بعد اُس نے سب سے پہلے بہت زیادہ ہمت جمع کر کے اپنی ماں سے بات کی، خلاف توقع اور خلاف اُمید اُسکی ماں نے تحمل سے اُسکی بات سنی اور جواب دیا۔

''میں تمہارے باپ سے بات کر کے بتاتی ہوں۔'' وہ حیران رہ گیا۔ پھر اگلے دن جو ردّ عمل اُسکے باپ نے دیا وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خلاف توقع تھا۔وہ جو کہ سمجھتا تھا کہ اُسکی اس خواہش کا مذاق اڑایا جائے گا۔ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ جو اُسکے باپ نے کہا تھا وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ ڈراونا تھا۔

''میں خود بھی تمہاری شادی کروانا چاہتا ہوں۔ تمہارے دماغ ٹھکانے لگانے کا ایک یہی طریقہ ہے۔'' اُنہوں نے حسب عادت بے عزتی سے بات شروع کی تھی۔

''لیکن میں بشریٰ سے ہی تمہاری شادی کروں گا۔'' اُنہوں نے فیصلہ صادر کر دیا تھا۔بشریٰ اُنکی بہن اور نوید کی پھوپھو کی بیٹی تھی۔

''ابو! میں بشریٰ سے شادی نہیں کروں گا۔'' اُس نے تحمل سے کہا۔

''تو پھر کسی سے بھی شادی کرنے کے لیے گھر والے ہونا ضروری ہے۔ ہمارے بنا کون ماں باپ تمہیں بیٹی دینگے؟'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''ابّو! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں ہمیشہ؟ آپ ایک بار مل تو لیں اُس سے، اچھی لڑکی ہے اور۔۔۔'' وہ پہلی بار بے بسی محسوس کر رہا تھا۔

''ہو گی اچھی، میں نے کب کہا بری ہے۔'' اُنہوں نے کندھے اُچکاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''میں تو بس یہ بتا رہا ہوں کہ میں اپنی بہن سے وعدہ کر چکا ہوں، اب اُسکے علاوہ کسی اور کو اپنی بہو نہیں بناؤں گا۔''

''تو یہ وعدہ پورا کرنے کے لیے میں ہی ہوں؟ بھائی بھی تو ہے۔'' اُس نے دبے دبے غصّے سے کہا۔

''بس، معلوم تھا مجھے جواب یہی آنے والا ہے۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھی اُسکی ماں نے بلند آواز سے کہا تھا۔

''یہ اس حد تک جلتا ہے نا اپنے بھائی سے کہ میں کیا کہوں؟ بھلا کوئی سگے بھائی کہ ساتھ بھی ایسا کرے گا۔'' نوید بھونچکا رہ گیا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ میں تو مسئلہ کا حل بتا رہا ہوں۔'' اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''یہ جانتا بھی ہے کہ ہم کل وحید کے لیے اُسکی کو لیگ کا رشتہ لیکر جائینگے، پھر بھی ایسی بات کہہ رہا ہے۔ جان کے، کر رہا ہے یہ سب''ایک اور الزام۔۔۔ ہمیشہ کی طرح وہی ٹھہرا تھا مورد الزام۔۔

لیکن دکھ اُسے اس بات کہ تھا کہ اُسکے اپنے سگے بھائی کا رشتہ لیکر کل سب جانے والے تھے اور اُسے خبر بھی نہیں تھی۔ اسی لیے آج صبح سے اُسکی بہن اپنے کپڑے استری کر رہی تھی، اپنے زیورات اور جوتے وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ تو اُسے ہی بے خبر رکھا گیا تھا؟ اُسے اتنا لاتعلق کر دیا گیا تھا کہ بتایا بھی نہیں گیا؟ وہ صدمے اور شدید تکلیف کے عالم میں اُنہیں دیکھ رہا۔

''جب مجھے معلوم ہی نہیں تو میں جان کر ایسا کیوں کہوں گا''اُس نے خود کو وضاحت دیتے ہوئے سنا تھا۔

''اسی گھر میں رہتے ہو، پتہ تو چل ہی گیا ہو گا۔ ورنہ آج ہی کے دن تم یہ بات کرنے کیوں آتے؟ جبکہ کل ہم وحید کا رشتہ لیکر جانے والے ہیں۔'' وہ اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں؟ نوید اُس روز ختم ہو گیا تھا۔ ساری خواہشات دل میں دبا کر وہ وہاں سے اُٹھ گیا تھا۔ کمرے میں جاتے ہوئے جو آخری آواز اُس نے سنی تھی وہ اُسکے باپ کی تھی۔

''ہم وحید کے ساتھ ساتھ تمہاری بات بھی بشریٰ سے طے کر دیں گے۔ فضول کے خیالات اپنے دل سے نکال دو۔ ہم ماں باپ ہیں، تمہارا برا نہیں سوچیں گے۔''

اُس روز کے بعد اُس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اُسکے بھائی کی بات طے ہو گئی اور تاریخ بھی پکی ہو گئی، وہ مبارک باد بھی دینے نہ گیا۔ بشریٰ سے اُسکی منگنی ہو گئی، اُس نے کسی کو بتایا بھی نہیں۔ اُس نے خود کو زندگی کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں لے جانا چاہے لے جائے۔ البتہ اس نے اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ خوش نظر آنے کا خول۔۔۔

کوئی اُسکے حالات نہ جان جائے، اس خوف سے وہ ہر وقت ہشاش بشاش اور خوش اخلاق نظر آنے کی کوشش کرتا تھا اور کامیاب بھی ہوتا۔

البتہ گھر والوں کے ساتھ اُسکا رویّہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اب اُن سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کرنا چاہتے کرتے رہتے، وہ پوچھتا بھی نہیں تھا۔

اُسکے دوست سمجھتے تھے کہ رضا اپنے خول میں بند ایک پراسرار انسان ہے۔ وہ اُنکے لیے ایک پہیلی کی طرح تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ نوید اُس سے کہیں زیادہ پراسرار اور اُس سے کہیں زیادہ بڑی پہیلی تھا۔

رضا اپنے راز بانٹتا نہیں تھا، لیکن اُسکی شخصیت جس جمود کا شکار تھی، وہ لوگوں کو بتانے کے کی کافی تھی کہ اُس کے اندر کئی راز ہیں۔ لیکن نوید کی ایک سے زائد شخصیت نے کبھی یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے اندر کیسے کیسے راز رکھے گھوم رہا ہے۔ وہ حالات اور لوگوں کے اعتبار سے اپنی مرضی کی شخصیت کے ڈھانچے میں ڈھل جاتا۔ گھر والوں کے سامنے وہ بدزبان اور نافرمان تھا، رشتے داروں کے سامنے چڑچڑا اور مغرور تھا، دوستوں کے سامنے خوش اخلاق اور خوش مزاج جبکہ آفس والوں کے سامنے اپنے کام سے کام رکھنے والا مگر سنجیدہ اور بردبار۔۔۔

وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا اور ان الجھنوں کو وقت پر نہ سلجھانے کے وجہ سے وہ اپنی زندگی کو بہت خطرناک موڑ پر لا کھڑا کرنے والا تھا۔ بشریٰ میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور کوئی اُسے یہ احساس دلانے والا نہ تھا کہ مستقبل میں وہ پھر سے اپنے ماں باپ جیسا گھر تو نہیں بنانے جا رہا ہے؟

اور رہی بات اُس لڑکی کی، جسے وہ پسند کرتا تھا۔۔۔

اُس سے دوبارہ اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ کبھی جان سکی کہ نوید کے دل میں اُسکے لیے کیا ہے؟

لیکن۔۔۔ بہت جلد وہی لڑکی اُن سب کے درمیان دراڑ کا سبب بننے والی تھی۔ اُسکا اُنکی زندگیوں میں بس اتنا کردار تھا کہ وہ اُن سب کی جدائی کا کردار ادا کرنے والی تھی۔۔۔

اور وہ نوید جس نے اس قصے کو دفنا دیا تھا، اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس بری طرح اُٹھ کر سامنے آئے گا۔

کس بری طرح۔۔۔۔

---------+---------+---------

اور آج وہ ان سب کے سامنے تھا ایک اور نئی شخصیت کے ساتھ۔۔۔ بے حد سخت اور انجان سا۔۔۔ کسی غیر شناسا سا۔۔۔۔

''پچھلے ماہ، ایف آئی اے کے سی ٹی ڈی ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھ ایک کیس لگا ہے۔ ایک ایسا کیس جس نے ہماری نیندیں اڑا دی ہیں۔ ہم نے ایک منشیات فروش کو گرفتار کیا تھا اور ہماری توقع کے بالکل برخلاف وہ ایک سیریل کلر نکلا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ فرار ہو چکا ہے۔'' فرّخ صاحب نے رک کر اُنکے چہرے دیکھیں۔ وہ سب دم بخود سے اُنہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

''اُس تک پہنچنے کے لیے پچھلے ایک ماہ سے ہم بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ یہ ڈائری اُسی بھاگ دوڑ کا پہلا نتیجہ ہے۔'' اُنہوں نے ڈائری کے صفحات کی تصاویر اپنے سامنے کھولی۔ سکرین پر اب وقتاً فوقتاً مختلف صفحات کی تصاویر سامنے آ رہی تھیں۔

''یہ جتنے بھی لوگوں کی تصویریں آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ان سب کو قتل کیا جا چکا ہے۔اور یہ قتل اس طرح سے ہوئے ہیں کہ دنیا کی کوئی عدالت اسے قتل ثابت نہیں کر سکتی۔''وہ جتنے ٹھنڈے لہجے میں کہہ رہے تھے،اتنے ہی ٹھنڈے پسینے اُنکے ماتھوں اور ہتھیلیوں پر نمودار ہو رہے تھے۔

''ان میں سے کسی نے خودکشی کی، کسی کی موت دوائی بروقت نہ ملنے سے ہوئی، کوئی سمندر میں سرفنگ کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا، کوئی ہائیکنگ کے دوران اپنے اسکواڈ سے پیچھے رہ گیا اور پاؤں پھسلنے سے کھائی میں جا گرا، کسی کی گاڑی کا بریک فیل ہونے پر اُسکی گاڑی درخت سے جا ٹکرائی اور موت کا سبب بنی حتیٰ کہ ایک حاملہ خاتون دوران پیدائش چل بسیں۔''وہ سانس لینے کو رکے۔

''پچھلے دس سالوں سے یہ اور ان جیسی تمام اموات بظاہر حادثاتی یا کسی غفلت کا نتیجہ لگتی رہی تھیں۔اور ہمیشہ ایسا ہی رہتا اگر ہمیں اُس مائیکل عرف فرمان نامی شخص کے پاس سے یہ ڈائری نہ ملتی۔''اُنہوں نے سامنے رکھی ڈائری اٹھا کر اُنہیں دکھائی۔

''اس ڈائری نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ تمام لوگ نہ حادثاتی موت مرے تھے اور نہ ہی انکی اموات کسی غفلت کا نتیجہ تھی۔یہ سب قتل کیے گئے تھے۔ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، دنیا کی کوئی عدالت ثابت نہیں کر سکتی کہ یہ قتل تھے۔ہر تصویر کے نیچے ایک تاریخ ہے،اور یہ تمام اموات انہی تاریخوں میں ہوئی ہیں، جو ان تصاویر کے نیچے لکھی ہیں۔''وہاں بیٹھا ہر شخص دم سادھے اُنہیں سن رہا تھا۔نوید البتہ اُن سے مستثنیٰ تھا۔باقی چاروں کو تو اپنے اپنے دماغ ماؤف ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

''اب اسی ڈائری کے آخری صفحے پر تم لوگوں کی تصاویر ہیں۔اور ان تصاویر کے نیچے تاریخ پانچ مہینے بعد کی ہے۔''اُنہوں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا یا اُنہیں اُنکا لہجہ ایسا لگا تھا۔

''مطلب؟''علی نے سن سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''مطلب یہ کہ وہ تم چھ لوگوں کو پانچ ماہ بعد قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

''کیوں؟''مقدّم نے وہ سوال پوچھا جو سب کے لبوں پر تھا۔

''اس کیوں کا جواب اگر ہمیں معلوم ہوتا تو تم لوگوں کو اس طرح پریشان کیوں کرتے؟مسئلہ یہی ہے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم، لیکن ہمیں ہر حال میں جلد از جلد اُس تک پہنچنا ہے۔اور اُس تک ہمیں آپ لوگ ہی پہنچائیں گے۔اب سے لیکر اُس مجرم کے پکڑے جانے تک آپ سب کو ہر حال میں ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ہم جو کہیں وہ ہی کرنا ہو گا۔''وہ رکے پھر اُن چاروں کے چہرے دیکھے۔وہ ابھی بھی شاک کے عالم میں تھے۔

''تم سب پر اور تمہارے ہر قدم پر یقیناً نظر رکھی جا رہی ہے۔ تم لوگ کہاں جاتے ہو؟ کس سے ملتے ہو؟ ہر شے اُنکے علم میں ہے۔'' بند کمرے میں نوید کی آواز گونجی تھی۔ کتنے عرصے بعد اُن سب نے یہ آواز سنی تھی۔ دس سال کا فاصلہ تھا لیکن وہ آواز آج بھی ویسی ہی تھی، البتہ وہ ہر دم ہشاش بشاش مسکراتا لہجہ اب انجانی سی سختی لیے ہوا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو ہمارے یہاں آنے کی خبر بھی ہو گی انہیں، کیا وہ محتاط نہیں ہو جائینگے؟'' اُن سب میں اگر کوئی شخص سب سے پہلے اپنے حواس سنبھالنا جانتا تھا، تو وہ رضا تھا۔ پہلا سوال بھی اُسکی جانب سے ہی آیا تھا۔ اُسکے اس سوال پر شیراز اور فرّخ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''خبر تو تب ہو گی، جب اُنہیں پتہ ہو گا کہ یہ ایف آئے اے آفس ہے؟'' وہ پراسرار انداز میں مسکرائے۔

''کیا یہ نہیں ہے؟'' اب کہ عمر نے سوال کیا۔

''نہیں! تم سے کس نے کہا کہ یہ ایف آئے اے آفس ہے؟'' اُنہوں نے پہلے سے زیادہ پراسرار لہجے میں سوال کیا تھا۔

''مطلب؟''

''کیا یہاں آتے ہوئے تم لوگوں کو احساس نہیں ہوا کہ تم بس ایک عام سے بنگلے میں قدم رکھ رہے ہو؟'' اب وہ سوالات برائے سوالات کر رہے تھے۔

عمر کو کچھ گھنٹے قبل کا منظر یاد آ رہا تھا جب وہ ایف آئے اے کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا تھا۔ اُسے علاقے سے کافی دور، اُسکی گاڑی سے اتروا کر، کسی دوسری گاڑی میں بٹھایا گیا تھا اور اُسکی گاڑی کو کوئی اور ڈرائیو کر کے لے گیا تھا۔ ایسا صرف چند سیکنڈز کے اندر اندر ہوا تھا۔ اگر اُسے لے جانے والے لوگ مہذّب اور شائستہ نہ ہوتے تو وہ یقیناً اسے اپنا اغوا ہی سمجھتا۔ وہ لوگ اسے ایک دروازے کے سامنے اُتار کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ

''یہاں سے آپکو آگے خود جانا ہے۔''

وہ دروازہ کیا تھا بس ایک چیک پوسٹ تھی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا اس چیک پوسٹ کو دیکھ رہا تھا، جہاں اُسکے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُسکے دل میں خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ جائے لیکن نہ اُسکی گاڑی اُسکے پاس تھی اور نہ ہی موبائل پر نیٹ ورک آ رہا تھا۔

''عمر حفیظ۔۔۔'' خاموش فضا میں ایک آواز نمودار ہوئی اور وہ جھٹکے سے مڑا۔

''جناب عمر حفیظ! یہ آواز آپ دروازے پر لگے ایئر پیس سے سن رہے ہیں۔ آپ ہمیں نہیں دیکھ سکتے لیکن ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔'' عمر نے سر گھما کر یہاں وہاں دیکھا، مگر آس پاس کوئی کیمرہ یا اس جیسی شے موجود نہ تھی۔

''آپ اس دروازے سے اندر داخل ہونگے۔ جب آپ اندر داخل ہونگے، تو دائیں جانب ایک چھوٹی سی مشین ہے۔ آپ نے اپنا سامان بشمول موبائل، اس میں رکھ دینا ہے اور آگے بڑھ جانا ہے۔'' آواز پھر سے آئی۔

''لیکن میں اپنا موبائل کیوں رکھوں؟'' وہ ٹھیک ٹھاک قسم کے شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ اب اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اُسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

''آپ فکر نہ کریں، آپکا تمام سامان آپکو واپس کر دیا جائیگا۔ یہ احتیاطی تدابیر کے لیے کیا جا رہا ہے۔'' اُسے تسلی دی گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُسے ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔ وہ چیک پوسٹ سے گزر کر آگے بڑھا۔ اُسکے دروازے سے گزرنے پر وہاں ''ٹوں'' کی آواز آئی تھی۔

''اب آپ آگے بڑھ جایئے، اور جو سڑک نظر آ رہی ہے اُس سے دائیں مڑ جائیں۔'' اب کہ وہ خاموشی سے ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ دو سے تین مزید چیک پوسٹوں سے گزرنے پر، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی پاگل ہے، جو ان ہدایات پر عمل کر رہا ہے۔ ہر چیک پوسٹ پر اُسے ایسی ہی ہدایت دی جاتی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ غصّے سے پھٹ پڑتا کہ چوتھی چیک پوسٹ پر اُسے اپنا موبائل اور سامان رکھے مل گئے۔

''اب آپ کچھ دیر انتظار کیجئے۔ ہمارے آدمی آپکو لے جائینگے'' اتنا تو عمر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پورے علاقے میں اُسکے علاوہ کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ ہر طرف بس جنگلات جیسی جھاڑیاں اور درخت ہی درخت تھے۔ یہ علاقہ ویسے بھی شہر سے دور غیر آباد تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک گاڑی آئی اور اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس دفعہ بھی گاڑی میں وہی دو لوگ تھے جو اسے پہلی چیک پوسٹ پر چھوڑ کر گئے تھے۔

''معافی چاہتے ہیں آپکو زحمت ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب آپکی حفاظت کے لیے ہی کیا جا رہا ہے۔'' گاڑی چلاتے مرد نے معذرت کی۔ اُنکے لباس سادہ سے تھے، لیکن جسامت سے وہ کوئی ایتھلیٹ لگتے تھے، جو اپنی ورزش و جسمانی صحت کا خوب خیال رکھتے ہیں۔

''ہونہہ۔۔۔ میری حفاظت یا اپنی حفاظت؟'' اُس نے دل میں سوچا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

وہ لوگ اسے ایک ایسے علاقے میں لے آئے، جہاں ہر جانب چھوٹے چھوٹے مگر خوبصورت بنگلے بنے تھے۔ اُسکے باوجود بھی قبرستان جیسی خاموشی تھی۔ اُنہوں نے اُسے ایک بنگلے کے سامنے اُتارا جو باہر سے دیکھنے میں عام سا لگتا تھا، جیسے وہاں کوئی چھوٹا موٹا خاندان آباد ہو۔ البتہ جیسے ہی اُسے اندر لایا گیا وہ حیران رہ گیا۔ وہ بنگلہ نہیں بلکہ پورا ایک ادارہ تھا۔ اور اُسکے بعد گول کمرے سے لے کر اب تک جو جو حالات پیش آئے تھے، وہ اُسکے حواس سلب کرنے کے لیے کافی تھے۔ کم و بیش ایسی ہی صورتحال کا سامنا باقی تینوں نے بھی کیا تھا۔

''تم لوگوں کا اگر کسی نے پیچھا کیا بھی ہو گا، تب بھی تمہاری گاڑیوں میں موجود لوگوں نے اُنہیں اب تک بھٹکا دیا ہو گا۔ اُس پر مزید یہ کہ تم چاروں کو الگ الگ راستے سے بلایا گیا تھا۔ تم لوگوں کی گاڑیاں مختلف علاقوں سے لی گئی ہیں۔ تعاقب کرنے والے کبھی مر کر بھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ تم سب ایک ہی جگہ

آرہے ہو۔آگے بھی ایسا ہی ہو گا۔آج جس جگہ تم لوگ آئے ہو آئندہ یہاں نہیں آؤ گے۔یہ ہمارا آفس نہیں خفیہ مقام ہے۔ایسے ہی مختلف خفیہ مقامات پر بریفننگ کے لیے تم لوگوں کو وقتاً فوقتاً بلایا جائیگا۔اور ہر بار اسی قسم کی احتیاطی تدبیر اختیار کرنی ہو نگی۔''اُنہوں نے تفصیل سے بتایا۔عمر کو اب سمجھ آیا تھا کہ یہ سب واقعتاً اُسکی اور باقی سب کی حفاظت کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

''فلحال تو مائیکل کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اُسکے مستقبل میں کیے جانے والے قتل کے بارے میں جان چکے ہیں، کیونکہ ہم اُسے صرف منشیات فروشی کے الزام میں تلاش کر رہے ہیں۔اُس نے یہ ڈائری بہت احتیاط سے چھپا کر رکھی تھی تاکہ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔اور یقیناً وہ اب تک یہی سمجھ رہا ہو گا کہ ہم انجان ہیں۔''اب کہ نوید بول رہا تھا۔اُسکا لہجہ مضبوط مگر بے لچک تھا۔

''اور ہم اُسے، اسی غلط فہمی میں رہنے دینا چاہتے ہیں۔اگر اُسے بھنک بھی پڑی کہ ہم اُسکی کاروائی سے باخبر ہیں تو وہ بنا موقع ضائع کیے قتل کا منصوبہ تبدیل کر سکتا ہے۔اور ہمیں نہیں معلوم کہ اُسکے ساتھ کتنے لوگ اور ملوث ہیں۔ان لوگوں تک پہنچنا ضروری ہے، لیکن اُس سے بھی اہم تم سب کی جانوں کی حفاظت ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوں اور تم سب کو کوئی نقصان پہنچائیں۔'' بات فرّخ صاحب نے مکمل کی تھی۔معاملہ بے حد سنگین تھا۔

''ہمیں کیا کرنا ہو گا؟''اب کے علی نے سوال کیا تھا۔

''تمہیں وقتاً فوقتاً میری جانب سے ہدایات ملتی رہیں گی۔ہمارے پاس اُن لوگوں کو بے نقاب کرنے کا پورا منصوبہ ہے اور وقت آنے پر یہ منصوبہ تم سب کے ساتھ شیئر کیا جائیگا۔البتہ ابھی تم لوگ مجھے یہ بتاؤ گے کہ ماضی یا حال میں تم لوگوں کی کسی سے دشمنی رہی ہو؟ دیکھو ہمارے لیے اس وقت چھوٹی چھوٹی معلومات بھی اہم ہیں۔''فرّخ صاحب نے پوچھا۔اُن سب کے چہرے پر ایک ہی جواب تھا **نہیں**۔اُنکی واقعتاً کسی سے کوئی دشمنی تھی نہ کبھی رہی تھی۔

''ابھی ہم میٹنگ یہی تک رکھتے ہیں۔اگلا لائحہ عمل کیا ہو گا؟ اُس سے جلد تم سب کو آگاہ کر دیا جائیگا۔میری ٹیم ہر وقت تم سب سے رابطے میں رہے گی۔ابھی تم لوگ یہاں سے ویسے ہی جاؤ گے جیسے آئے تھے۔یعنی مختلف راستوں سے، اگلی دفعہ جب تم سب یہاں ہو گے تو مجھے امید ہے کہ حسین مرتضیٰ بھی یہیں ہو گا''سکرین پر حسین کی تصویریں وہ دیکھ چکے تھے۔البتہ وہ یہاں موجود نہیں تھا۔چند ایک مزید معلومات دینے کے بعد فرّخ صاحب نے میٹنگ برخاست کی تھی۔وہ اُنکی ہدایت پر باری باری وہاں سے نکلتے گئے تھے سوائے نوید کے، وہ ویسے ہی ٹانگ پر ٹانگ جمائے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔اُنکے وہاں سے جانے کے بعد فرّخ صاحب نے اُسکی جانب دیکھا۔وہ کسی غیر مرئی نکتے پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

''کیا تم اپنے دوستوں سے ملنا نہیں چاہتے؟''

''وہ میرے دوست نہیں ہیں۔'' بے تاثر سے چہرے کے ساتھ جواب آیا۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ یہ آپ سب کا کوئی مشترکہ دشمن ہے۔'' پوری بریفنگ کے دوران خاموش کھڑے شیراز نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

''اس نہج پر ہم پہلے ہی سوچ چکے ہیں، پچھلے دس سالوں سے ہم نے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو ہمارا کوئی مشترکہ دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟'' نوید جھلّا گیا۔

''دس سال پہلے بھی تو ہو سکتا ہے نہ؟'' سکرین کی طرف نگاہیں مرکوز کیے شیراز نے آہستہ آواز میں کہا تھا۔ نوید ساکت ہوا۔ اُسکی آنکھوں میں پہلے الجھن، پھر شاک اور پھر بے یقینی کی کیفیت نظر آئی تھی۔ شیراز نے سکرین سے نظریں ہٹا کر اُسکی جانب کی۔ اس پوری گفتگو کو سنجیدگی سے سنتے فرّخ صاحب اور نوید کی جانب رخ بدلتے شیراز نے بڑے غور سے اُسکے چہرے کے پل پل بدلتے رنگوں کو دیکھا تھا۔

''عاصم۔۔۔؟'' اُس نے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس کی تھی۔

''لیکن وہ مر گیا تھا۔'' اُس نے خود ہی اپنی بات کی نفی کی تھی۔

''مرا نہیں تھا، مردہ پایا گیا تھا۔'' فرّخ صاحب بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''کیا فرق پڑتا ہے؟ اس بات کو دس سال ہو چکے ہیں۔'' نوید اس بات کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''لیکن اُسے مارنے والا تو زندہ ہے نا؟'' شیراز کسی اور نہج پر سوچ رہا تھا۔

''عاصم۔۔ عاصم مراد۔۔۔ کس نے مارا تھا اُسے، اور کون تھا اُسکے ساتھ؟ اور کون؟'' وہ زیر لب دھرا رہا تھا۔ فرّخ صاحب شیراز ڈیپارٹمنٹ سے عاصم کے کیس کو نکلوانے کا کہہ رہے تھے۔ شیراز سر ہلاتے ہوئے اُنکی بات سن رہا تھا۔ البتہ نوید اس شاک سے ابھی بھی باہر نہیں آ سکا تھا۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم ٹھیک ہو؟'' فرّخ صاحب نے اُسے سن سا بیٹھا دیکھ کر پوچھا تھا۔

''اں۔۔۔ ہاں'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا میں جا سکتا ہوں؟'' اُس نے اجازت چاہی۔

''بالکل۔۔'' اُنہوں نے اُسے اجازت دی تو وہ جھٹکے سے اٹھتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہ گئے تھے۔

چودھویں کی رات تھی، ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ایسے میں سیاہ جینس پر سفید پولوٹی شرٹ پہنے اور اُس پر کالی جیکٹ ڈالے، جسکی زپ سینے سے تھوڑا نیچے تک بند تھی، ہلکے سفید اور سیاہ بالوں والا نوید بھی اسی منظر کا حصہ لگ رہا تھا۔خاموش گہری مگر روشن رات میں وہ مضبوط قدم اٹھائے تیز تیز آگے بڑھ رہا تھا۔اُس نے دو گلیاں پار کی اور پھر سڑک پر آگیا۔سڑک پر ایک آدھ گاڑیاں بمشکل نظر آجاتی تھیں۔اسٹریٹس لائٹ کھلی ہونے کی وجہ سے اب نوید کا چہرہ واضح نظر آرہا تھا۔ہمہ وقت سخت اور سنجیدہ نظر آنے والے چہرے پر اس وقت فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔سڑک کی دوسری جانب قبرستان تھا۔اور وہی اُسکی منزل تھی۔

سڑک پار کر کے وہ قبرستان میں آگیا۔باہر کی نسبت یہاں گھپ اندھیرا تھا۔بہت زیادہ درخت ہونے کی وجہ سے چاند کی روشنی بھی اسے روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔متلاشی نظروں سے یہاں وہاں دیکھتا وہ آگے بڑھتا جارہا تھا۔بلآخر وہ اپنی مطلوبہ قبر پر پہنچ گیا۔وہ ہمیشہ کی طرح وہیں تھی، دو قبروں کے درمیان بیٹھی ایک قبر پر سر ٹکائے اور دوسری قبر ہاتھ پھیرتی ہوئی۔

اُسکی متاعِ حیات۔۔اُسکی بشریٰ۔۔۔

نوید نہ تو اُسکی زندگی میں **نوید** بن کر آیا تھا اور نہ ہی بشریٰ اُسکے لیے **بشریٰ** ثابت ہوئی تھی۔

---------+---------+---------

''ڈرو مت! امی آپکو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔''بشریٰ قبر پر سر ٹکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔اُسکے کپڑے مٹّی مٹّی ہو چکے تھے۔

''میں آپ دونوں کے پاس ہی رہوں گی۔اپنے پیارے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔اب رونا مت ٹھیک ہے۔۔۔میں نظم سناتی ہوں اور تم دونوں سو جانا''وہ کہتی جارہی تھی۔پھر اُس نے ہلکی آواز میں نظم پڑھنی شروع کی۔قبرستان کی موت جیسی خاموشی میں اُسکی سریلی آواز مزید ہیبت پیدا کر رہی تھی۔ناجانے وہ کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہتی، جب کسی نے اُسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تھا۔اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔نوید اُسکے برابر میں ہی بیٹھا تھا۔

''بشریٰ۔۔۔''نوید نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُکارا۔

''ھش۔۔۔آہستہ بولو۔دونوں ابھی سوئے ہیں۔اُٹھ جائینگے تمہاری آواز سے۔''اُس نے خفا انداز میں کہا۔اور دوبارہ سے قبر کو سہلانے لگی۔اُس کے بال گرد آلود ہو رہے تھے۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔''اُس نے اُسکے بالوں سے آہستہ سے مٹّی جھاڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔''وہ سختی سے بولی۔

''اب میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ دونوں رات کو ڈر جاتے ہیں۔''اُس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''تم نے ابھی تو کہا کہ دونوں سو گئے ہیں، جب سو گئے ہیں تو اب صبح ہی اٹھیں گے۔ تمہیں یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُس نے پیار سے اُسے سمجھایا۔ چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح تھا، آنکھوں کے کناروں پر لگا وہ نشان اُسکے چہرے کے خدوخال کا حصہ لگتا تھا۔ چہرے پر ہر لمحے چھائی سختی اس وقت نرمی میں بدل چکی تھی۔

''ہاں لیکن۔۔۔''اُسے خود نہیں سمجھ آیا کہ کیا کہے۔

''میں نہیں جاؤں گی، بس۔۔ نہیں جاؤں گی۔''اُس نے ضدی لہجے میں کہااور دوبارہ قبر سے سر ٹکا دیا۔

''ٹھیک ہے مت جاؤ، لیکن گھر میں جو تمہارے دو اور بچے ہیں۔ وہ کیسے رہیں گے ؟اُنہیں بھول گئی تم ؟''نوید اب دونوں گھٹنوں پر بازو ٹکائے فرصت سے وہیں بیٹھ گیا تھا۔اُسکی اس بات پر بشریٰ نے دوبارہ سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''اُنکے پاس تم چلے جاؤ۔''اُس نے حل پیش کیا۔

''لیکن وہ تو تمہارے بنا نہیں سوتے۔''

''لیکن۔۔''اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری اجازت کے بنا یہاں نہیں آؤ گی، لیکن تم آئی۔ وعدہ توڑا تم نے اپنا۔''وہ لہجے میں سختی سمونے کی کوشش کرتا ناکام ہوا تھا۔ لیکن بشریٰ پھر بھی شرمندہ ہوئی۔

''اب اگر تم میرے ساتھ گھر نہیں گئی تو میں کل دوبارہ تمہیں یہاں نہیں لاؤں گا۔''وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بھی چند لمحے اُسے دیکھتی رہی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔ پھر قبروں کو دیکھا اور بولی

''میں جا رہی ہوں کیونکہ آپکے ابو غصّہ کر رہے ہیں۔ پریشان مت ہونا میں کل دوبارہ آؤں گی۔ ٹھیک ہے ؟''اُس نے کہتے ہوئے مدد طلب نظروں سے نوید کو دیکھا۔اُس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اُسے تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوید نے ایک مرتبہ پھر اُسکے بالوں سے گرد جھاڑی اور اُسکا دوپٹہ سر پے جماتے ہوئے اُسے لیکر آگے بڑھنے لگا۔

''دونوں نے کھانا کھا لیا تھا؟''اب کے اُسے گھر میں موجود اپنے دونوں بچوں کی فکر ہوئی۔

''بڑی مشکلوں سے کھایا تھا، تمہارے بنا نہیں رہتے پتہ تو ہے۔'' وہ بتانے لگا۔ جواب میں بشریٰ کچھ کہہ رہی تھی۔ اسی طرح اُسے باتوں میں لگائے وہ قبرستان سے جیسے ہی باہر آیا۔ اُسے سامنے ہی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے، نظریں جھکائے کھڑا وحید دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر نوید رکا۔

''بھائی؟۔۔۔'' اُس نے حیرت سے وحید کو پُکارا، تو اس نے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر سیدھا ہوا۔ نوید کچھ بھی کہے بنا گاڑی تک آیا۔ وحید نے آگے بڑھ کر پیچھے کا دروازہ کھولا تو اُس نے پہلے بشریٰ کو بٹھایا اور پھر خود بھی پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ وحید نے دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ نوید کے گھر کے سامنے تھے۔ دورانِ سفر اُنکے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ گاہے بگاہے وحید بیک ویو مرر میں نظر آتے نوید کو دیکھ لیتا، جسکی نظریں کھڑکی سے سر ٹکائے باہر جھانکتی بشریٰ پر ہوتی تھیں۔ گھر پہنچ کر نوید نے بشریٰ کو گاڑی سے اتارا تو وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اندر آتے ہی اُس نے اپنے بچوں کے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیئے، وہاں جو دیکھا تو دونوں اپنے اپنے بستر پر سو رہے تھے۔ اُس نے باری باری دونوں کا ماتھا چوما۔

''سوری بیٹا!'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ پھر دروازے کی جانب دیکھا، جہاں دروازے کے قبضے سے ٹیک لگائے، دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑا نوید، اُسی کو دیکھ رہا تھا۔

''میں یہیں سو جاؤں؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، لیکن رات کو اُٹھ کے کہیں جانا مت۔'' اُس نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی کی تھی۔ بشریٰ اپنے چھوٹے بیٹے کے بستر پر اُسکے برابر میں جا کر لیٹ چکی تھی۔

نوید نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں چلا آیا جہاں وحید خاموش بیٹھا کب سے یہ تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔ نوید اُسکے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا۔ کافی دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ نوید صوفے کی میز پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا اور وحید اُس پر۔۔۔

''کیسی حالت ہے اب اُسکی؟'' خاموشی میں وحید کی آواز گونجی تھی۔

''ویسی ہی ہے۔'' مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی بہتری نہیں آئی؟''

''آئی ہے۔'' اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا، نِگاہیں اب بھی میز پر ہی تھیں۔

''پہلے کمرے میں بند رہتی تھی، اب گھر کے کاموں اور دیگر چیزوں میں توجہ دینے لگی ہے۔ قبرستان جانا بھی کم کر دیا ہے، لیکن ختم نہیں ہوا۔ گھر میں بچوں کے ساتھ ہوتی ہے تو اُسے قبرستان بھول جاتا ہے۔ قبرستان جاتی ہے تو یہ بھول جاتی ہے کہ گھر میں بھی اُسکے دو بچے ہیں۔'' پہلی بار اُس نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔ اب کہ وحید خاموش ہی رہا۔ خاموشی کا یہ وقفہ کافی طویل ہو گیا تھا۔ دونوں اپنی پہلے والی پوزیشن میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

''آپ کیسے آئے؟'' اس بار نوید نے خاموشی کو توڑا تھا۔

''مائیکل والے کیس کی اطلاع ملی مجھے۔ تم سے تصدیق کرنے آیا تھا۔ گھر پر نہیں ملے تو قبرستان چلا آیا۔'' اُس نے بنا کسی تمہید کے کہا۔

''سچ ہے۔'' اُس نے تصدیق کر دی۔ وحید کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''میرے لیے معمول کی بات ہے۔'' اُس نے مشورہ رد کیا تھا۔ دونوں کے درمیان دوبارہ خاموشی چھا گئی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئے۔ وحید کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے تو اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چلتا ہوں۔ میری اگلی پوسٹنگ نارووال میں ہے، کل چلا جاؤں گا صبح۔''

''نارووال میں کب تک کے لیے؟'' نوید نے اُسکے ساتھ ہی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا، آنکھ کے برابر زخم کے نشان پر درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

''ایک آپریشن ہے، واپسی اُسکے مکمل ہونے پر ہی منحصر ہے۔'' اُس نے گھر سے باہر آتے ہوئے کہا۔ گاڑی تک پہنچ کر وہ نوید کی جانب مڑا جو اُسکے ساتھ ساتھ باہر آیا تھا، پھر بولا

''کوئی ضرورت ہو تو بتانا۔'' نوید نے بس سر ہلا دیا، جاتے ہوئے اُس نے نوید کا گال تھپتھپایا اور کہا

''اپنا خیال رکھنا!''

پھر جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ نوید خاموشی سے اُسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔ وہ تو اسے خیال رکھنے کو بھی نہ کہہ سکا تھا۔

اُسکے جانے کے بعد بھی وہ ایسے ہی کھڑا رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات دماغ میں گھوم رہے تھے۔

تم سب کا مشترکہ دشمن

''عاصم۔۔۔'' اُس نے زیر لب دہرایا۔

میں تم سب سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا آج نہیں تو کسی اور وقت پر، مگر چھوڑوں گا نہیں ایسے۔۔۔

مرنے سے پہلے عاصم کے کہے گئے الفاظ اُسکے کانوں میں گونجے۔

''عاصم مر چکا ہے۔۔''اُس نے ایک بار پھر خود کو تسلی دی۔

لیکن اُسے مارنے والا تو زندہ ہے نہ؟

شیراز کے الفاظ اُسکے ہر طرف گھوم رہے تھے۔ سر کا درد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

---------+---------+---------

چوتھا باب

آخری پیشی

کچھ گھنٹے قبل، ایف آئی اے آفس کے باہر:

صبح وہ یہاں آئے تھے، اور اب دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج سروں پر چڑھ آیا تھا۔ جنوری کا مہینہ ہونے کے باعث دھوپ میں بھی ہلکی ہلکی ٹھنڈک تھی۔ وہ چاروں اُس چبوترے جیسے بنے فوٹ پاتھ پر ایک دوسرے سے دور کھڑے تھے۔ اُنکے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا۔ شیراز اُنہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گیا تھا۔ یہاں سے مختلف گاڑیوں میں اُنہیں واپس جانا تھا۔ جسکے بعد وہ سب الگ الگ مقامات پر موجود اپنی ذاتی گاڑیاں حاصل کر کے اپنی اپنی منزلوں پر جا سکتے تھے۔

اس وقت وہ چاروں ایک ساتھ ایک ہی جگہ کھڑے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے آج صبح اُس گول کمرے میں بیٹھے تھے۔ اور اب بھی موت جیسا سنّاٹا اُنکے بیچ چھایا ہوا تھا۔

مقدّم حیران تھا، اُنکے آپسی رویوں پر۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا، تب سب دوست تھے۔ اسے لگا تھا آج بھی وہ دوست ہی ہوں گے، لیکن اُنکے رویے کوئی اور ہی داستان سنا رہے تھے۔ کالے تھری پیس سوٹ میں ملبوس علی کا چہرہ سخت اور اعصاب تنے ہوئے تھے، نِگاہیں سامنے درختوں کے جھنڈ پر مرکوز تھیں۔

بلیک جینز پر سفید شرٹ پہنے اور اُس پر کائی رنگ کا کیجوال کوٹ ڈالے رضا، سب سے دور ایک پول سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ چہرہ سپاٹ اور نِگاہیں اپنے سفید جوگرز پر مرکوز کیے، وہ بیزار لگتا تھا۔

رضا سے ہوتی مقدّم کی نظریں عمر پر آ ٹھہریں تھیں۔ غم زدہ، اُداس سا چہرہ خاموش تھا۔ نِگاہیں گم صم سی کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔ اُسکا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس سے بات کرے، جب وہ غائب ہوا ہو گا، تو یقیناً اُس نے اُسے ڈھونڈا ہو گا، اور آج اُسے سامنے دیکھ کر، اُسے بھی مقدّم سے ڈھیروں شکوے ہوں گے۔ مقدّم اُس کے سارے شکوے سننا چاہتا تھا، اُسکی ناراضگی بجا تھی لیکن فلوقت اُنکے چہرے، اُسکی ہمت ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ خاموشی سے اُنکی حرکات و سکنات نوٹ کرتا رہا، پر کوئی بھی اندازہ لگانے سے وہ قاصر ہی رہا۔

تھوڑی دیر میں وہاں بیک وقت کالے شیشوں والی چار گاڑیاں آئیں تھیں۔ساتھ میں شیراز بھی تھا۔ایک تو وہ جاتا کہاں سے تھا اور آتا کہ Zاں سے ؟ سمجھ سے باہر تھا۔

شیراز نے انکو باری باری اُنکی گاڑیوں کی جانب بھیجا۔بیٹھنے میں پہل رضا نے کی تھی، جیسے وہ بس یہاں سے نکلنے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔اُسکے بعد علی بھی اپنی بتائی گئی گاڑی میں جا بیٹھا۔آخر میں عمر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے بیٹھنے ہی لگا تھا کہ اُسکی نظریں مقدّم پر گئی۔وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا، آنکھوں میں ڈھیروں سوالات تھے، شکوے تھے، حکایات تھیں۔اُسکی بہت کچھ کہتی آنکھوں نے عمر کو منجمد کر دیا۔اگلے ہی لمحے مقدم نظریں پھیرے گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔عمر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''آغا۔۔۔''اُس نے زیر لب دہرایا تھا۔

''سر! چلنا نہیں ہے ؟''ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے اُسکی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔وہ گہری سانس لیتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

قسمت نے کس موڑ پر لا کر ملایا تھا؟اور ملایا بھی تھا تو کیسے ؟اُن میں سے ہر ایک کو اُسکے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

جو کچھ ہو رہا تھا، اُس پر اب عمر نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔اُسکا ذہن فلوقت کسی بھی نہج پر سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

رہ رہ کر سب کے چہرے یاد آ رہے تھے۔علی کے ساتھ وہ پچھلے دو سالوں سے تھا لیکن کسی اجنبی کی طرح، مقدّم کی سوال کرتی آنکھیں، رضا کی مغرورانہ شخصیت اور نوید۔۔۔

نوید نے تو اُسے حیران ہی کر دیا تھا۔کس قدر تبدیلی آ گئی تھی اُسکی ذات میں۔آنکھیں موند کر اُس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''اُمید ہے حسین مرتضیٰ بھی ہمارے ساتھ ہو گا۔''ڈی آئی جی فرّخ کی آواز کانوں میں گونجی تو آنکھیں دوبارہ وا کرتے اُس نے کھڑکی سے باہر دوڑتے درختوں کو دیکھا۔

حسین کو تو وہ بھول ہی گیا تھا۔وہ جانے کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ کیسا تھا؟اور قسمت نے دوبارہ اُس سے ملنا لکھا بھی تھا یا نہیں؟ مختلف سوچیں دماغ میں گھر کر رہی تھیں۔وہ اُن سے جان نہیں چھڑا پا رہا تھا۔تھک کر اُس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

---------+---------+---------

''آپ بچوں کو وقت پر سلاد دیجیے گا، میں پناہ گاہ نہیں آسکوں گا ابھی، شاید دیر رات سے آؤں۔'' اپنے اپارٹمنٹ کے ٹیرس پر کھڑے، وہ فون کان سے لگائے کسی کو ہدایت دے رہا تھا۔ دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

''نہیں نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ بس کچھ کام ہیں۔'' اُس نے تسلّی دینے والے انداز میں کہا اور تھوڑی دیر بعد فون بند کر کے پاس رکھی ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک ہاتھ میں جلتا سگریٹ لیے، دونوں کہنیاں ریلنگ پر رکھے وہ آگے کو ذرا جھک کر ٹیرس میں کھڑا تھا، سامنے ہی ٹھاٹھیں مارتا سمندر واضح تھا۔ کون اُسے مارنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ کس لیے؟ اور آخر تھا کون جو اُنکی دشمنی میں اتنا پاگل تھا کہ اُنکے لیے پورا مرڈر پلان کر رہا تھا اور وہ بھی دس سالوں سے؟ دماغ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

وہ خود کو جتنا لاتعلق ظاہر کر سکتا تھا، اُس نے کیا تھا۔ صبح سے وہ بے نیازی کا خول خود پر چڑھائے حالات کا سامنا کرتا رہا تھا۔ لیکن اب اُسکی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ تھک کر میز کے ساتھ رکھی سفید کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً ختم ہوتی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر، سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

ایک ایک چہرہ اُسکی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ اُن سب کو سامنے دیکھ کر وہ جتنی بے نیازی دکھا سکتا تھا اُس نے دکھا دی تھی۔ عمر، مقدّم، نوید اور علی۔۔۔

''علی!!!'' اُس نے زیر لب دہرایا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اُسکا حلق تک کڑوا کر دیا ہو۔

''تم کتنے بڑے منافق ہو، میں بہت اچھے سے جانتا ہوں۔'' کرسی پر آگے کو ہو کر جھکے، دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور دونوں ہاتھوں کو باہم پھنسا کر، اپنے ہونٹوں کو اُس پر ٹکائے، رضا نے غائبانہ علی کو مخاطب کیا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

ٹیرس کے اس حصے کا تمام فرنیچر سفید تھا، جبکہ دیواریں اور فرنیچر پر رکھے تکیے اور فوم وغیرہ نیلے رنگ کے تھے۔ سفید ٹراؤزر پر، سفید زیپر ہائی نیک پہنے وہ بھی منظر کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ اُسکا ڈریسنگ سینس کمال کا تھا۔

''رضا؟ ہونہہ۔۔۔'' کسی کی استہزاء کرتی ہنسی اُسکے کانوں میں گونجی تو چہرہ سرخ ہوا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کریگا؟'' دس سال پہلے کہے گئے، علی کے الفاظ، آج اُسکے کانوں میں زہر گھولنے لگے تھے۔ اُس نے اذیت سے آنکھیں میچی تھیں۔

''تمہارے ایک جملے نے میری پوری زندگی برباد کر دی تھی علی! میں خود کو تباہی کے دہانے پر لے آیا تھا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔'' علی کو سامنے دیکھ کر جو کچھ وہ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ زیادہ سوچنے سے کنپٹی میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ماتھا مسلا اور تھک کر کرسی پر گرنے والے انداز میں پیچھے ہو گیا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ سر کا درد بڑھتا ہوا کاندھوں اور کمر تک جا پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسکے ہاتھ اور پاؤں

بھی سن ہونے لگے۔ دھندلی ہوتی آنکھوں سے اُس نے دیکھا کہ کوئی ہیولا اُسکے ٹیرس کے دروازے پر کھڑا، اپنی انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے ہی گھور رہا ہے۔ وہ چیخنا چاہتا تھا پر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ہیولا آہستہ آہستہ اُسکی جانب بڑھ رہا تھا۔

''وہ قاتل۔۔۔۔''، کھلتی بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اُسکے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ ہیولا اُسکے قریب ہو رہا تھا، وہ اُٹھ نہیں پا رہا تھا، ہل نہیں پا رہا تھا، حتیٰ کہ آنکھیں کھولنا بھی مشکل محال تھا۔ ہیولا اُسکے سر پر پہنچ گیا، اُسکی سرخ انگارہ آنکھیں رضا کو نظروں ہی نظروں میں نگلنا چاہتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُس ہیولے نے اُسکا گلا دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ آس پاس دیکھا پر وہاں کوئی نہ تھا۔۔۔

ٹیرس کے پردے سمندر کی جانب سے آتی ہواؤں سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ سارا فلیٹ سنسان تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا، جسم میں عجیب سی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوا دروازے تک آیا، لاک اپنی جگہ پر ہی تھا، اُس نے کنڈی بھی لگا دی، پھر واپس ٹیرس پر آیا اور کرسی پر گر گیا۔ سر کا درد ناقابل برداشت ہوا تو اُسی طرح کرسی پر گرے ہوئے، اپنے ٹراؤزر کی جیب میں سے ایک دوا نکال کر آنکھوں کے سامنے کی۔

Benzodiazepines

بڑی مشکل سے پانی کے ساتھ یہ دوائی پھانکی۔ ڈاکٹر نے اُسے کسی بھی ناگزیر صورتحال کے علاوہ یہ گولی کھانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ وہ اس دوا کو ہمیشہ جیب میں لیے پھرتا، ایکسپائر ہو جاتی تو نئی خرید کر جیب میں رکھ لیتا لیکن کھاتا نہیں تھا، آٹھ سالوں میں آج دوسری بار یہ موقع آیا تھا، جب اُس نے یہ دوائی نکالی تھی۔ اُن لوگوں کا منظر عام پر آنا اُسے کس نہج پر لے آیا تھا؟

''مجھے اُن میں سے کسی کے سامنے نہیں آنا، اگلی بار میں کسی بریفنگ یا مشاورت میں شامل نہیں ہوں گا۔ کسی کو میری جان بچانی ہے تو مجھ تک خود آئیگا۔ مجھے خود بچائے گا، میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ مرنا قسمت میں لکھا ہے تو اس قاتل کے ہاتھوں ہی مر جاؤں گا۔ لیکن ان کے سامنے دوبارہ آکر خود کو اس طرح پل پل نہیں مار سکتا۔'' اُسکے کندھوں کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا تھا۔ سر کے درد میں کمی آئی تو وہ غنودگی میں جانے لگا۔ اسی عالم میں وہ خود سے جانے کون کون سے وعدے کر رہا تھا؟ ساتھ رکھا فون بج رہا تھا، لیکن اٹھانے کی ہمت اُسکے ہاتھوں میں نہ تھی۔

''میں کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔۔ کسی کے بھی۔۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''اُمید ہے، حسین مرتضیٰ بھی ہمارے ساتھ ہو گا'' آنکھیں بند ہونے سے پہلے یہ آخری الفاظ تھے جو اُسکے کانوں میں گونجے تھے۔

---------+---------+---------

دس سال پہلے

سانحہ سے چند گھنٹے قبل:

''کدھر رہ گیا ہے یہ؟آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔''مقدّم نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا تھا۔

''آجائیگا،صبر رکھو!''اپنے کیمرے کے ساتھ مصروف عمر نے تسلی دی۔

''پچھلے آدھے گھنٹے سے وہی کر رہا ہوں۔''

''یار!بیچارے کے ہزار مسئلے ہیں۔پہلے اپنے بھائی کے گھر آنے کا انتظار کرے گا،وہ آجائیں گے،تواُنکی منت کر کے بائیک لے گا۔پھر آئیگا۔''علی نے اپنے جگری یار کی طرفداری کی۔

''اُسکے بھائی کراچی آئے ہوئے ہیں؟''عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!بتا رہا تھا کل،کہ بھائی کے یونٹ میں چھٹیاں ہیں۔''

''تو تم میں سے کوئی پک کر لیتا نا اُسے۔''حسین نے کہا۔

''پوچھا تھا میں نے،لیکن اُس نے سختی سے منع کر دیا کہ خود آؤنگا۔اور اب تک آیا نہیں۔''مقدّم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔وہ سب اِس وقت اپنی گریجویشن والی کلاس کے لڑکوں کی طرف سے رکھی گئی،باربی کیو پارٹی میں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔اُنہیں مقدّم کے گھر سے ساتھ نکلنا تھا،لیکن نوید اب تک نہیں آیا تھا۔

''رضا بھی چلتا تو کتنا اچھا رہتا۔''علی کو اچانک ہی رضا یاد آیا تھا۔وہ اُنکے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔

''اُسکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے دو تین روز سے۔''حسین نے جواب دیا۔

''وہ آج کل کلاس میں بھی ہمیں نہیں ملتا۔''مقدّم نے حسین کو جتایا تھا۔وہ تینوں ساتھ ہی ایم بی اے کر رہے تھے۔

''ہاں!اُس نے آج کل ہم سے ملنا جلنا کم کر دیا ہے۔مجھے بھی وجہ سمجھ نہیں آتی۔''علی نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا،کافی دیر سے کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔اپنے کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے عمر کے ہاتھ تھمے۔وہ لوگ مقدم کے گھر کے لان میں تھے۔اس سے پہلے کے عمر کوئی جواب دیتا،گارڈ نے دروازہ کھولا اور اُسی وقت پورچ میں ایک بائیک داخل ہوئی۔وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگے تھے۔

ہرے اور سفید رنگ کی لشکارے مارتی بائیک کے ہم رنگ اپر اور ہیلمیٹ میں ملبوس نوید نے بائیک روک کر ہیلمیٹ اُتارا۔

''سوری! دیر ہو گئی مجھے۔''ہیلمیٹ اپنے سامنے رکھتے ہوئے، بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔

''کس کی چوری کر کے لائے ہو؟''حسین کا سکتہ سب سے پہلے ٹوٹا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے وہی اُسکے پاس آیا تھا۔

''اپنی طرح سمجھ رکھا ہے؟''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔اُسکا چہرہ بھی آج خوشی سے چمک رہا۔ باقی سب بھی اب وہیں آنے لگے تھے۔

''یہ سی بی آر ہے نا؟''علی نے بائیک کے ہینڈل کو تھامتے ہوئے کہا۔وہ سب اب اُسکی بائیک کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے۔

''ہاں! وہی ہے۔'' وہ بائیک پر ہی بیٹھا رہا۔

''بھائی نے نئی بائیک لے لی تمہارے؟''مقدّم نے پوچھا۔

''اُوں ہوں۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ میری اپنی ذاتی بائیک ہے''

''سچ بتاؤ۔''عمر کو یقین نہ آیا۔

''حد ہے بھئی! میں نے اپنے ڈھائی سال کی محنت سے کمائے گئے، حلال پیسوں سے خریدی ہے۔''اب کہ وہ برا مان گیا۔

''ڈھائی سال میں تم نے سی بی آر کے پیسے جمع کر لئے؟''حسین کو پکا یقین تھا کہ اُسکی بائیک چوری شدہ ہے۔

''ظاہر ہے، سیکنڈ ہینڈ (استعمال شدہ) ہے، اصل قیمت سے کئی گنا کم میں ملی ہے۔''

''اگر یہ سیکنڈ ہینڈ ہے تو بہت اچھی حالت میں ہے۔''عمر نے تعریف کی تھی۔

''ہاں! صرف آٹھ ہزار کلو میٹر ہی چلی ہوئی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''تو جو کمایا تھا اسی پر لگا دیا؟''حسین نے پھر تفتیش کی۔

''نہیں نہیں! کچھ بچے بھی تھے۔اُن سے یہ اپر اور ہیلمیٹ خریدا ہے۔''اُس نے مزے سے کہا۔

''اماں ابّا نے کچھ کہا نہیں تمہارے؟''علی مشکوک ہوا۔

''تم لوگوں کی تفتیش ختم ہو گئی ہو تو مبارک باد ہی دے دو مجھے۔''اُس نے چڑ کر کہا تھا۔ویسے ہی گھر والوں سے، وہ اپنی ساری کمائی اس پر لگا دینے پر، اٹھتے بیٹھتے خود غرض ہونے کے طعنے سن رہا تھا۔

''مبارک ہو یار!''عمر نے آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

''اس پر دعوت تو بنتی ہے۔''مقدّم اور حسین کی زندگیوں کا بس یہی مقصد تھا۔

''میں نے اپنے سارے پیسے اس پر خرچ کر دیئے ہیں، حتیٰ کہ پیٹرول ڈلوانے کے لیے بھی بھائی سے ادھار لیا ہے۔ لہٰذا یہ دعوت نامی شے سے مجھے دور رکھو۔''

''دفع کرو اِن دونوں کو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''علی نے یاد دلایا۔

''تم لوگ جاؤ، میں نوید کے ساتھ آؤنگا۔''حسین نے سی بی آر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہر گز نہیں! میں تو علی کو ساتھ لیکر جا رہا ہوں؟''وہ فوراً پیچھے ہو کر بیٹھا کہ کسی دوسرے کے بیٹھنے کی جگہ ہی نہ رہی۔

''کیوں علی تمہاری بیوی ہے؟''حسین نے ہمیشہ کا سوال دہرایا۔

''تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھتے رہو، میں تو علی کو ہی لیکر جاؤنگا۔''اُس نے بے مروتی کی انتہا کی۔

''دیکھ یار اِسکو! ساری زندگی ہم نے اِسکو پک اینڈ ڈراپ دیا اور اس نے تو آنکھیں ہی پھیر لیں۔''حسین نے مقدّم کو دیکھ کر دکھی لہجے میں کہا۔

''مجھے ساری زندگی علی نے پک اینڈ ڈراپ دی ہے۔''اس نے تصیح کی۔

''ختم کرو اس فضول بحث کو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''علی کو اب غصّہ ہی آگیا تھا۔

''میں واپسی پر یہیں آؤنگا، تاکہ اپنی بائیک یہاں سے لیتے ہوئے جاؤں۔''نوید بلآخر سی بی آر سے اترتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟ تم اس پر نہیں جا رہے؟''عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ پیٹرول اتنا زیادہ نہیں ہے۔ میں علی کی گاڑی میں ہی جاؤنگا۔''

''ابھی تو کہہ رہے تھے کہ علی کو ساتھ لیکر جاؤنگا۔''

''وہ تو میں اسکو چھیڑ رہا تھا۔''اُس نے حسین کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ حسین نے اُسکا وہی ہاتھ پکڑ کے پیچھے موڑ دیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''تو پھر سی بی آر کس خوشی میں ساتھ لائے تھے؟''مقدّم نے چڑ کے پوچھا۔

''تم لوگوں کو دکھانے۔''اُس نے اپر اتارتے ہوئے دانت نکالے۔

''چلو جلدی کرو۔''مقدّم کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔نوید اپنا اپر تہہ کر کے،ہیلمیٹ میں ٹھونس رہا تھا۔حسین اُسے ناراضگی سے گھور رہا تھا۔نوید اُسے آنکھ مارتا آگے بڑھ گیا۔

اُسکے گریجویشن کے بیچ نے ڈیپارٹمنٹ والوں سے اجازت لیکر،وہیں گارڈن میں بورن فائر رکھا تھا۔اُسکے لیے اُنہیں یونیورسٹی جانا تھا۔لیکن یونیورسٹی کی آج کی رات اُنکی زندگی میں آنے والی بے شمار تاریک راتوں میں سے ایک ہونے والی تھی۔

--------+-------+------

سانحے سے کچھ منٹ قبل:

''ٹھیک ٹھاک قسم کی ظالم انتظامیہ ہے یہاں کی۔''رات کے تین بجے وہ لوگ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔یہاں آکر اُنہیں معلوم ہوا کہ ڈیپارٹمنٹ میں آنے والوں کی پارکنگ کا انتظام ایڈمن بلاک میں تھا۔اُسکے علاوہ اُنہیں کہیں سواریاں کھڑی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ایڈمن بلاک سے چل کر،کے یو بی ایس تک جانا،اور پھر واپس آنا جان جھونکوں کا کام تھا۔آتے وقت بھی حسین نے انتظامیہ کو ٹھیک ٹھاک کوسا تھا،اور اب ایڈمن بلاک کی طرف واپس جاتے ہوئے بھی وہ انتظامیہ کو کوس ہی رہا تھا۔

''مجھے اس حرکت کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی ویسے،وہ ڈیپارٹمنٹ میں بھی پارکنگ رکھ سکتے تھے۔بلکہ کے یو بی ایس کے سامنے تو ویسے بھی اچھا خاصا بڑا میدان ہے۔وہاں بھی پارکنگ رکھی جاسکتی تھی۔''مقدّم بھی چڑا ہوا تھا۔

''اُس جگہ آئی بی اے والوں کا ہاسٹل ہے،ظاہر ہے حساس جگہ پر پارکنگ نہیں رکھی جاسکتی۔''نوید کے ساتھ آتے عمر نے کہا تھا۔

''ہم تو اپنی گاڑیوں میں بم رکھ کر لا رہے تھے نا۔''مقدّم نے منہ بنایا تھا۔

''پہلے نکل جاتے تو سب کے ساتھ آتے،اب اس اندھیرے میں اکیلے آنا پڑ رہا ہے۔''علی نے بیزاری سے کہا تھا۔اُسکی کلاس کے سارے طلبہ تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے ہی نکل چکے تھے،بس وہ لوگ میزبان لڑکوں کے ساتھ رک گئے تھے اُنکی مدد کے غرض سے،کیونکہ وہ پوری ذمے داری کے ساتھ سارا سامان سمیٹ کے ہی واپس جاتے،وجہ صبح ہونے والی کلاس تھی۔

''اسکو جو شوق ہے نا،ہر جگہ امداد کے لیے پہنچ جاتا ہے۔''حسین نے اندھیرے میں عمر کو گھورا۔

''یار!وہ دو اکیلے لڑکے سب کچھ کرتے،ہم دعوت میں تو شریک رہے لیکن جب سب کچھ صاف کرنے کی باری آئی تو بھاگ جاتے؟کتنی غلط سی بات ہے۔''اُس نے وضاحت دی۔

''ہاں! اور وہ دولڑکے میزبان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بائیک توڈیپارٹمنٹ لے آئے تھے، اور اُس پر چلے بھی گئے۔ اب ہم اکیلے آرہے ہیں۔'' علی کو رات کے اس وقت جامعہ سے خوف آرہا تھا۔ وہ درخت جو دن کی روشنی میں جامعہ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے، رات کے اندھیرے میں اِسے مزید خوفناک بنارہے تھے۔ پتہ نہیں ہاسٹل والے کیسے رہتے تھے؟

''پانچ لوگ اکیلے نہیں ہوتے۔'' مقدّم نے تصیح کی تھی۔

''اچھا ہوا رضا نہیں آیا، اتنے بخار میں بیچارہ پیدل کیسے چلتا؟'' حسین کو اچانک ہی اُسکا خیال آیا تھا۔

''اُسے بخار ہے؟'' جیبوں میں ہاتھ ڈالے نوید نے پیچھے مڑ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ چلتے چلتے حسین سے آگے آگیا تھا۔

''ہاں! بتاتو یہی رہا تھا۔'' حسین نے کہا۔

''یار! آج مجھے بتا ہی دو کہ اُسکے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' سرکیولر روڈ پر رکتے ہوئے مقدّم نے پوچھا تھا۔

''بیمار ہے وہ۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ باقی سب بھی وہیں رک گئے۔

''پچھلے چھ مہینوں سے میں یہی سن رہا ہوں کہ وہ بیمار ہے۔ بالکل اچانک ہی وہ ہم سب کے درمیان سے غائب ہو جاتا ہے، ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا، بلانے پر بھی نہیں آتا اور تم ہر بار یہی کہہ دیتے ہو کہ وہ بیمار ہے۔'' مقدّم کی آج برداشت جواب دے گئی تھی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔'' اُس نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''لیکن تم یہ تو بتا سکتے ہو نا کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ بیمار ہے تو بیماری کی نوعیت کیا ہے؟ اُسے کسی مدد کی ضرورت ہے تو ہم ہیں ساتھ۔۔۔ لیکن ہمیں معلوم تو ہو کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟'' اب کہ نوید نے بھی پوچھا۔ سنسان جامعہ میں اُنکی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''یار! تم لوگ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں اُسکے ساتھ رہتا ہوں۔'' حسین چڑ گیا۔

''ہاں! کیونکہ تم ہی ہو، جو ہمیں یہ بتاتے رہتے ہو کہ وہ بیمار ہے، اُسے بخار ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم میں سے کوئی بھی اُس سے سوال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو تم موضوع بدل دیتے ہو۔ کچھ تو ہے جو تمہیں معلوم ہے لیکن تم ہمیں بتانا نہیں چاہتے۔'' علی بھی اُسکے سامنے آتے ہوئے بولا۔ وہ آج اُسے چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ جب بات نکل ہی گئی تھی تو اب اسے حل کرنا ضروری تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اُس نے تحمل سے کہا۔

''کیا ہم اُسکے دوست نہیں ہیں؟'' مقدم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہو؟''

''تو پھر ہم سے کیوں چھپا رہے ہو کہ اُسکے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟'' بات نوید نے مکمل کی۔

''کیونکہ اگر وہ بتانا مناسب سمجھتا تو خود بتا دیتا۔'' حسین کا ضبط جواب دے گیا تو وہ چیخ اٹھا۔ اُن لوگوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ یعنی وہ صحیح تھے؟

''یعنی کوئی مسئلہ ہے۔ اور تم ہم سے چھپا رہے تھے اب تک۔'' علی کو غصّہ آیا۔

''میں نے کہا تو ہے کہ وہ بتانا چاہے گا تو خود بتا دیگا۔'' اُس نے تھک کر ہار مان لی، اور سڑک کے ساتھ بنے ڈپارٹمنٹ کے جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''حسین! کیا معلوم کہ ہم کچھ کر سکتے ہوں؟ کیا معلوم ہمیں بتا دینے سے، ہم اُسکے مسئلے کا کوئی حل نکال سکیں؟'' نوید نے سمجھانا چاہا۔

''اگر مجھے لگتا کہ تم لوگ کچھ کر سکتے تو میں تم لوگوں کے پوچھنے سے پہلے بتا دیتا۔ جس دن مجھے لگے گا کہ تم میں سے کوئی اُسکے لئے کچھ کر سکتا ہے تو میں خود بتا دوں گا۔'' وہ یہ بات ختم کرنا چاہتا تھا پر کر نہیں پا رہا تھا۔

''اور تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ ہم اُسکے لئے کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں یہ فیصلہ ہمیں کرنے دو۔ ہم اُس سے خود سوال کرنا چاہتے ہیں تو تم وہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ ہم اُسکے دوست ہیں حسین!'' علی کو اُسکی بات پسند نہیں آئی۔

''رضا نے منع کیا ہے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ایسا بھی کیا ہو گیا ہے کہ ہم جان نہیں سکتے؟'' مقدّم زچ ہو گیا تھا۔

''کچھ بہت برا ہوا ہے اُسکے ساتھ، مت تنگ کرو اُسے۔ اُسے صحیح لگے گا تو خود بتا دے گا۔'' اِس ساری گفتگو میں پہلی بار حصّہ لیتے، عمر نے اُن سب کو حیران کیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' حسین نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔ عمر کو کیا معلوم تھا آخر؟

''میں نے اُسے کچھ ماہ پہلے سڑک کنارے بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بہت بری طرح رو رہا تھا مقدم! میں نے اُس دن سے پہلے اور اُس دن کے بعد کبھی اُسے اُسطرح کی حالت میں نہیں دیکھا۔'' عمر بول رہا تھا اور باقی سب سن رہے تھے۔ پھر اُس نے انہیں اُس رات والا واقع بتا دیا۔

''یا اللہ! کیا چھپا رہے ہو آخر تم تینوں۔'' نوید نے کہا تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ اُس نے مجھے واقعی کچھ نہیں بتایا تھا۔'' عمر نے کہا۔

''تمہیں پوچھنا چاہیے تھا اُس سے۔''علی کو دکھ ہوا۔

''اور تم کیوں کچھ نہیں بتاتے؟''مقدم کو ایک بار پھر حسین پر غصہ آیا تھا۔

''میں نہیں بتا سکتا۔ میں نے وعدہ کیا ہے اُس سے۔۔۔''وہ بے بس ہوا۔

''وہاں کیا ہو رہا ہے؟''اِس سے پہلے کوئی کچھ کہتا، علی یکدم ہی بولا۔ وہ لوگ سرکیولر روڈ کی اِس جانب تھے۔ سرکیولر روڈ کی دوسری جانب سنگ مرمر کے چکور ستون پر انگریزی میں "فارمیسی" لکھا ہوا تھا۔ یہ فارمیسی کی پرانی عمارت تھی۔ اس ستون کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی، اندھیرے میں لڑکی کا چہرہ غیر واضع تھا۔ لڑکی کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی گاڑی تھی جو کہ دو نوجوان لڑکوں کے ملکیت نظر آ رہی تھی۔ ایک کا چہرہ واضح نظر آ رہا تھا، کیونکہ وہ گاڑی سے باہر تھا اور اُسکے چہرے پر ہیڈ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ جبکہ دوسرا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا، چہرے پر رومال بندھا ہونے کی وجہ سے اُسکا چہرہ واضح نہیں تھا۔

''یہ تو عاصم ہے۔''مقدّم نے پہچانتے ہوئے کہا۔ عاصم کسی سیاسی طلباء تنظیم کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔

''یہ کر کیا رہا ہے آخر؟''عمر نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ ایک تو وہ لوگ سڑک کی دوسری جانب تھے اور اُس پر سے اندھیرے میں کھڑے ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔

''صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ لڑکی کو حراساں کر رہا ہے۔''حسین نے کہا۔

''کچھ بھی واضع نہیں ہے، ہمیں نہیں پتہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔''نوید نے حقیقت پسندی سے بات کی تھی۔

''لیکن ہمیں جا کر پوچھنا چاہیے۔''علی نے کہا۔

''ہاں! اگر وہ سچ میں لڑکی کو حراساں کر رہا ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں دیکھ کر بھاگ جائے۔''عمر نے تائید کی۔ اس سے پہلے کہ کوئی بھی ایک قدم آگے بڑھاتا لڑکی کی دلسوز چیخ سنائی دی اور اُسی لمحے عاصم نے کھینچ کر لڑکی کو گاڑی کے اندر کیا۔ گاڑی کا دروازہ بھی پوری طرح بند نہیں ہونے پایا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا لڑکا اُنکی آنکھوں کے سامنے سے گاڑی زن سے لے اُڑا تھا۔

''ارے!''وہ ہکا بکا رہ گئے، پھر اگلے ہی لمحے کچھ بھی سمجھے بنا گاڑی کے پیچھے دوڑے لیکن وہ بہت تیزی سے نکلا تھا۔

''نمبر پلیٹ کی تصویر لو۔''نوید چیخا۔ عمر نے تندہی سے کیمرے سے تصویر کھینچی، صد شکر کہ کیمرہ اُسکے ہاتھوں میں ہی تھا۔

''شٹ۔۔۔ تصویر غیر واضع ہے۔''عمر نے تصویر دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''میں نے نمبر پلیٹ یاد کر لیا ہے۔''حسین نے فوراً کہا۔

''ہمیں انتظامیہ کو خبر کرنی چاہیے، لڑکی اغوا ہوئی ہے۔''مقدّم نے کہا۔

''انتظامیہ کو اگر ہوش ہوتا تو ایسا ہوتا ہی نہیں۔''علی نے غصّے سے کہا تھا۔ وہ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ خاموش فضا میں اُنکی آوازیں گونج رہی تھی۔

''کاش پہلے وہاں پہنچ جاتے۔''عمر کو افسوس ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک لڑکی کو اغوا ہوتے دیکھا اور کچھ کر نہ سکے تھے۔ بے بسی کی انتہا تھی۔

''پہلے پہنچ کر بھی کیا کر لیتے؟ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا ہے۔''نوید نے کہا۔

''ہمیں کم از کم پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔''علی نے کہا تو باقی سب نے بھی تائید کی تھی۔ ایڈمن بلاک پہنچ کے اُنہوں میں اپنی گاڑیاں لیں اور سب سے پہلے قریبی تھانے پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے آنکھوں دیکھا سارا حال بیان کیا، گاڑی کا نمبر پلیٹ بھی بتایا لیکن پولیس والوں نے ایف آئی آر نہیں کاٹی تھی۔

''نہ آپکو لڑکی کا نام معلوم، نہ اُسکا حلیہ معلوم صرف شک کی بنا پر کیسے ایف آئی آر کاٹ دیں؟''کانسٹیبل نے بیزاری سے کہا۔

''ہم آپکو اُس لڑکے کا نام اور اُسکی گاڑی کا نمبر بتا رہے ہیں، آپکو اُسکا پیچھا کرنا چاہئے، لڑکی اُسی گاڑی میں ہے اور اُسکے ساتھ کچھ برا بھی ہو سکتا ہے۔''عمر نے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اُس لڑکے عاصم پر الزام لگا رہے ہو۔''پولیس والے نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

''آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپکو اُس لڑکی کو تلاش کرنا چاہیے۔''علی نے غصّے سے کہا۔

''تم لوگ اتنا کیوں پریشان ہو رہے ہوں؟ بہن لگتی ہے تمہاری؟''پولیس والے نے خباثت سے کہا تو علی کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔''علی کی آواز بلند ہوئی۔

''ہم نے تمہاری بات سن لی ہے، کوئی اطلاع ملے گی تو بتا دیں گے۔ ہمیں ہمارا کام مت سکھاؤ۔''کانسٹیبل نے درشتی سے کہا۔

''چلو علی! صاف نظر آ رہا ہے یہ ایف آئی آر کاٹنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔''نوید نے اُسکے سینے پے ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے ہٹایا تھا۔ کانسٹیبل ویسے ہی سکون سے بیٹھا رہا۔ وہ سب تھک کر باہر آ گئے۔

''کس قسم کے بے حس لوگ ہیں؟ کسی اور ملک کا ادارہ ہوتا تو اب تک اس گاڑی کا پیچھا کرنے نکل چکا ہوتا۔''عمر نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔اس وقت اپنی بے بسی پر رونے کو دل کر رہا تھا۔سامنے کھڑے ہو کر بھی وہ لوگ کچھ نہیں کر پائے تھے۔

''یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔''مقدّم نے افسوس سے کہا تھا۔

اُس رات وہ لوگ گھر تو آ گئے، پر رکے نہیں۔ علی نے اپنے باپ سے مدد مانگی، خلاف توقع اُنہوں نے نہ صرف مدد کی بلکہ اپنے تعلقات کا استعمال کر کے ایف آئی آر بھی درج کروادی۔ایف آئی آر درج کروانے کے اگلے ہی دن جو سب سے بڑا دھچکا اُنہیں ملا تھا وہ یہ کہ ،جو نمبر پلیٹ اُنہوں نے بتایا تھا،اُس نمبر پر کوئی گاڑی رجسٹرڈ نہیں تھی۔وہ جعلی نمبر پلیٹ تھا۔

''نہ تو اس لڑکی کے گھر والوں میں سے کوئی آیا،نہ کسی نے رپورٹ لکھوائی۔اوپر سے نمبر پلیٹ بھی غلط ہے۔مجھے تو لگتا ہے آپ لوگوں کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔رات کا وقت تھا،ویسے بھی جامعہ کراچی میں جن جنّات گھومتے ہیں۔آپ لوگوں کے ساتھ بھی ہو گیا ہو گا کوئی ایسا ہی واقعہ جسے سچ سمجھ بیٹھے ہیں۔''پولیس انسپکٹر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔وہ اُنکی آنکھوں دیکھے حالات کو غلط فہمی کا نام دے رہا تھا۔مزید وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔

کتنے ہی دنوں تک یہ واقعہ اُنکے ذہنوں سے نہ نکلا تھا۔

جب بہت مشکلوں سے جب وہ اپنے ذہن سے اِس حادثے کو نکالنے میں کامیاب ہوئے،تب قسمت نے اُنکے ساتھ ایک بہت بڑا کھیل کھیلا۔۔۔

تقدیر اُنکا امتحان لینے آ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔

---------+---------+---------

سانحے کے ڈیڑھ ماہ بعد

وہ مقدم کے نکاح کی خوشی میں دی گئی دعوت سے واپس آیا تھا۔آتے ہوئے اُسے دیر ہو گئی تھی،لہٰذا اُسے یقین تھا کہ سب گھر والے سو گئے ہونگے۔ لیکن۔۔۔

وہ گھر آیا تو تقریباً سب ہی،گھر کے واحد ٹی وی کے سامنے جمے بیٹھے تھے۔

''یہاں کیا چل رہا ہے؟''وہ حیران ہوتا اندر داخل ہوا۔کسی نے بھی اُسکے آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ٹی وی پر نیوز چینل لگا ہوا تھا۔کوئی بوڑھا آدمی کیمرے کے سامنے آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ

''ڈیڑھ ماہ ہو چکے ہیں، میری بیٹی کا کچھ پتہ نہیں۔ پولیس والے ایف آئی آر نہیں کاٹتے۔ کہتے ہیں کہ بھاگ گئی ہو گی کسی کے ساتھ۔۔۔ایسی نہیں ہے میری بیٹی۔۔۔ایسی نہیں ہے۔'' وہ شخص کہتے ہوئے رو دیا تھا۔

''آپ یہ بتائیں کہ آخری بار آپ کی اُس سے کب اور کیا بات ہوئی تھی؟'' رپورٹر نے مائیک اُسکے منہ کے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تو گاؤں میں رہتے ہیں، اور وہ شہر میں جامعہ کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ آخری بار اپنی روم میٹ کی بہن کی مایوں میں جانے سے پہلے مجھ سے بات کی تھی، ہاسٹل والوں سے اجازت بھی لی تھی اُس نے، اُسکے بعد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔''

''اُسکی دوست یا ہاسٹل والوں سے کوئی بات ہوئی؟'' رپورٹر نے پوچھا۔

''دوست سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی، اور ہوسٹل والے اب اپنی بات سے مکر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اُسے کوئی اجازت نہیں دی تھی۔ حالانکہ مجھ سے خود ہاسٹل کی وارڈن نے کال کر کے پوچھا تھا کہ میری بیٹی مجھ سے پوچھ کر جا رہی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہاں! مجھے بتا کر جا رہی ہے۔ اب وہ اِس بات کا سرے سے انکار کر رہے ہیں۔ کوئی مجھے انصاف نہیں دلوا رہا۔ میں کیا کروں؟ میری بچی واپس لا دو کوئی۔۔۔'' وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ نوید بھی اپنا لباس تبدیل کیے وہیں آ بیٹھا تھا۔

''ہماری عوام سے پرزور گزارش ہے کہ ہر صورت میں اس مجبور باپ کی آواز حکومت تک پہنچائی جائے اور اُسکی بیٹی کو گھر لایا جائے۔ ہمیں صنوبر کاشف کے لیے انصاف چاہیے۔'' رپورٹر اب چلا چلا کر بول رہا تھا۔ جبکہ نوید کا سانس لڑکی کے نام پر رکا تھا۔

''صنوبر کاشف، ایک غریب ڈرائیور کی بیٹی، جسکے بڑے بڑے خواب تھے اور وہ اپنے خوابوں کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ اپنے علاقے اور خاندان کی پہلی لڑکی جو کالج سے یونیورسٹی تک پہنچی تھی۔ آج وہی صنوبر پچھلے ایک ماہ سے لاپتہ ہے اور متعلقہ ادارے کسی بھی قسم کا تعاون کرتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' اب نیوز کاسٹر گلا پھاڑ کر خبر پڑھ رہی تھی۔ اور نوید مٹّی کا مجسمہ بنا ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اب لڑکی کی کچھ تصاویر بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس چہرے کو بھلا وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ کانوں میں ایک ہی آواز کی بازگشت تھے۔

''**صنوبر کاشف**''

---------+---------+---------

''صنوبر؟''علی حیرت سے کنگ ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔ہر نیوز چینل پر صرف یہ ہی خبر چل رہی تھی۔چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر ملک کی سب سے زیادہ کوریج والی خبروں میں آگئی تھی۔صنوبر کی گمشدگی،وہ کون تھی؟کونسی جامعہ میں پڑھتی تھی؟اُسکے کتنے دوست تھے؟غرض ہر چینل پر بس صنوبر نامہ ہی چل رہا تھا۔

''ابّا!''اگلے ہی لمحے علی الٹے قدموں اپنے باپ کے کمرے کی جانب بھاگا تھا۔

صنوبر کاشف،اُسکے باپ کے سب سے پرانے اور وفادار ڈرائیور کی بیٹی۔۔۔۔

---------+---------+---------

گمشدگی کی خبر کے ایک ہفتے بعد:

''ہم آپ کو یہاں بتاتے چلے کہ صنوبر گمشدگی کیس نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔پولیس حکام اور ایف آئی اے کی مشترکہ کارروائی کے بعد،پولیس کو جامعہ کراچی کے عملے سوسائٹی کے خالی پڑے گھروں کے پاس سے ایک لڑکی کی تشدّد زدہ لاش ملی ہے۔لاش کو فرانزک کے لیے سول ہسپتال پہنچادیا گیا ہے۔مزید برآں کہ لاپتہ ہونے والی لڑکی صنوبر کے والد کو بھی شناخت کے لیے ہسپتال بلایا گیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ لاش صنوبر ہی کی ہے؟اور اگر یہ صنوبر کی لاش نکلتی ہے تو پھر کیا ہوا اُسکے ساتھ؟کیسے مری وہ؟طبعی موت یا قتل؟دشمنی یا کوئی اور راز؟بے شمار سوالات جنم لیں گے اِس ایک لاش کے ساتھ۔۔۔ہم آپکو لمحہ بہ لمحہ۔۔۔''پرجوش سی نیوز کاسٹر صنوبر کے کیس میں آنے والے اِس نئے موڑ پر اطلاع دے رہی تھی۔نوید ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے اُسکا یہی معمول تھا۔وہ دن رات ٹی وی کے آگے بیٹھے،بس صنوبر کی خبریں سنتا رہتا۔اُسکے گھر والے بھی بیزار ہونے لگے تھے۔مگر وہ تو جیسے کھانا پینا سب بھول گیا تھا۔پچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل صنوبر کی صحیح سلامت گھر واپسی کی دعا کر رہا تھا۔لیکن ابھی ابھی ملنے والی اس لاش کی خبر نے جیسے اسکو کسی گہری کھائی میں اٹھا کر پھینک دیا تھا۔وہ صوفے سے اُٹھ گیا اور بے چینی سے یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔کسی طور سکون نہیں آرہا تھا۔

کسے بتاتا؟

کس سے کہتا؟

اُس کی ہر شے اپنے اندر رکھنے والی عادت نے اُسے آج اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا،لیکن کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔

صنوبر۔۔۔

اُسکی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی جسے اُس نے پسند کیا تھا۔

وہ پہلی لڑکی جس کی خواہش اپنے ماں باپ سے کی تھی۔

اور انہوں نے نام تک سننا ضروری نہ سمجھا اور انکار کر دیا تھا۔

جو گھنٹوں اُسکے ساتھ بیٹھ کر شیکس پیئر اور اگاتھا کرسٹی کے ناولز پر بحث کرتی تھی۔

جسکو وہ اپنے اسائنمنٹ اور اپنی پریزنٹیشن کے مواد بخوشی دے دیتا تھا۔

جسکے ساتھ اُس نے اپنے خوابوں کا گھر بنانے کی خواہش کی تھی۔

صنوبر جسے وہ بھول جانا چاہتا تھا، لیکن ٹی وی پر چلتی اُسکی موت کی خبر نے اُسے اپنا آپ ہی بھلا دیا تھا۔

---------+---------+---------

گمشدگی کی خبر سے ڈیڑھ ہفتے بعد:

جو بات وہ سننا نہیں چاہتا تھا وہ ہو گئی تھی، جس شے سے وہ نظریں چرا رہا تھا وہی سامنے آئی تھی۔

تین دن پہلے ملنے والی لاش صنوبر کی ہی تھی۔

''صنوبر کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اُسے تشدد کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ ملزمان نے جامعہ کراچی کے ہاسٹل میں رہنے والی صنوبر کاشف کو قتل کرنے کے بعد پاس ہی جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ کچھ لوگوں کی نشان دہی پر، تین دن پہلے ملی گی لاش صنوبر کاشف کی ہی نکلی ہے۔ ہم آپکو بتاتے چلیں کے صنوبر کاشف کیس نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا ہے۔ ''ہر چینل پر بس یہی خبر تھی۔ صنوبر بے دردی سے قتل ہو چکی تھی۔ یہ خبر ٹاپ ریٹیڈ بنتی جا رہی تھی۔

نوید دو روز سے کمرے میں بند تھا۔ نہ آفس گیا، نہ کھانا کھانے کے لیے کمرے سے باہر آتا۔ علی کی شادی قریب تھی۔ پر وہ بیچارہ سب چھوڑ چھاڑ، صنوبر کے باپ کی اس کیس میں ہر ممکن مدد کر رہا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ علی کا باپ بھی اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اِسی چیز نے اُسکے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ وہ ہر صورت میں صنوبر کو انصاف دلوانا چاہتا تھا۔

لیکن نوید؟ نوید کا تو دل ہی مردہ ہو چکا تھا۔ پاس پڑا موبائل چیخ چیخ کر بند ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح بستر پر چاروں شانے چت لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ موبائل ایک مرتبہ پھر بجا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی۔ گردن موڑ کر پاس رکھے موبائل کو دیکھا۔

عمر کی کال تھی۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''کہاں گم ہو گئے ہو بھئی؟ صبح سے سب تمہیں کال کر رہے ہیں۔ سب خیریت ہے نا؟'' عمر نے ایک ہی سانس میں سارے سوالات کر ڈالے۔

''ہاں!'' اُس نے مختصراً اپنی خیریت بتائی۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنی پیشانی کو مسل رہا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اب کہ اُس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں بالکل، بس آفس میں تھوڑا کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مصروف تھا۔'' اس نے صاف جھوٹ بولا۔

''کیا تم مجھے آج رات مل سکتے ہو؟''

''آج رات؟ کیوں؟'' وہ اُٹھ بیٹھا۔ عمر کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اُسے مشکوک کیا تھا۔

''بس کچھ بہت ضروری ہے، تم میرے گھر پہنچ جانا۔'' اُس نے عجلت میں کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ نوید حیران ہوا تھا۔

اُس وقت نہ نوید اور نہ ہی عمر جانتا تھا کہ حالات انکو کس رخ پر لیکر جانے والے ہیں؟

وہ ذہنی طور پر بہت تھک چکا تھا، اُسکے اندر جو کچھ چل رہا تھا، وہ اُسے نکال نہیں پا رہا تھا۔ اور یہ چیز اُسے بری طرح توڑ رہی تھی۔ رات کو وہ کافی مشکلوں سے عمر کے گھر پہنچا۔ وہاں رضا سمیت سب ہی موجود تھے، بس اُسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ اُن سب کے موجود ہوتے بھی، وہاں ایک گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، خلاف توقع حسین اور مقدّم بھی خاموش بیٹھے تھے۔

''السلام و علیکم!'' وہ اندر داخل ہوتے مقدّم کے برابر بیٹھا۔ سب نے سلام کا جواب دیا۔

''کیا ہوا ہے؟ اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا اور کچھ بتایا بھی نہیں؟'' اُس نے عمر سے پوچھا۔

''فون پر کرنے والی بات نہیں تھی نا۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم لوگوں کو یاد ہے کہ یونیورسٹی کی بارن فائر والی رات ہم نے عاصم کو دیکھا تھا؟ جو ایک لڑکی کو زبردستی اغوا کر کے لے گیا تھا۔'' عمر نے پوچھا۔ بھلا وہ کیسے بھول سکتے تھے؟

''وہ لڑکی صنوبر تھی۔'' عمر نے آہستہ سے کہا تھا۔ نوید کو اپنے پیروں تلے زمین نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

''تو یعنی۔۔۔ تم لوگ اس واقعے کے چشم دید گواہ ہو؟'' رضا نے پوچھا۔

''ہاں! تمہارے علاوہ ہم پانچ بندے جانتے ہیں کہ مجرم عاصم ہے۔''عمر نے کہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''علی صدمے سے کہہ رہا تھا۔

''ہم نے جس لڑکی کو دیکھا وہ صنوبر تھی اور دیکھو ہم کچھ بھی نہیں کر سکے۔''اُسے بے انتہا افسوس ہوا تھا۔ صنوبر اُسکے سامنے بچپن سے پلی بڑھی تھی۔ پہلے وہ لوگ اُنکے کوارٹر میں رہتے تھے۔ پھر جب صنوبر کے والد کو فالج کا اٹیک ہوا، تو انہوں میں ڈرائیونگ چھوڑ دی اور گاؤں چلے گئے، علی کے ابّا اُنکا بہت خیال رکھتے تھے۔ ماہانہ خرچہ بھی دیتے تھے۔ اُن دنوں صنوبر جامعہ میں داخلہ لے چکی تھی، لہٰذا وہ گاؤں جانے کے بجائے ہاسٹل منتقل ہو گئی تھی۔

''اُس وقت ہمارے بس میں جو کچھ تھا، وہ ہم نے کیا۔ اُس وقت ہم اُس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اب ہم کر سکتے ہیں۔''عمر نے کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟''مقدّم نے پوچھا۔

''ہم چشم دید گواہ ہیں، ہم مجرم کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔''حسین نے جواب دیا تھا۔

''بالکل! ہم کر سکتے ہیں اور ہم یہ کرینگے۔''عمر نے کہا۔

''لیکن کیا وہ ہماری بات سنیں گے؟ اور وہ ہمارا ساتھ دیں گے؟''حسین نے تشویش کا اظہار کیا۔

''انکو دینا پڑیگا، یہ ایک ہائی پروفائل کیس ہے۔ اگر حکومت نہیں دے گی، تو ہم میڈیا کا سہارا لیں گے۔''رضا نے کہا۔ اس تمام معاملے میں وہ براہِ راست شامل نہیں تھا، لیکن وہ خود کو اس سے الگ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

''لیکن ہمیں کرنا کیا ہے؟''حسین نے پوچھا۔

''مجھے کل تک کا وقت دو، میں ابّا سے اس بارے میں بات کرتا ہوں۔ اُنکے پاس یقیناً کوئی نہ کوئی حل ہو گا۔''علی نے سب کو تسلی دی تھی۔ اس سارے معاملے میں نوید دم سادھے بیٹھا تھا۔ سب ہی نے یہ بات نوٹ کی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟''عمر نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہونہہ!''اُس نے چونکتے ہوئے اُسے دیکھا۔ نظریں خالی خالی تھیں۔

''طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟''مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔''اُس نے کہا پھر رک کے ایک نظر سب کو دیکھا۔وہ اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔اُسے توجّہ کا مرکز بننا پسند نہیں تھا۔اُسے کبھی توجہ نہیں ملی تھی، لہٰذا وہ اسکا عادی بھی نہیں تھا۔اگر سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہوتیں تو اُسکا دم گھٹنے لگتا تھا۔

''مجھے کام ہے کچھ، میں چلتا ہوں۔''وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا سب حیرت سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔''کوئی پیش رفت ہو اس معاملے میں تو مجھے بتا دینا، اللہ حافظ!''اپنی بات مکمل ہونے کے بعد وہ کسی کا جواب سننے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟''عمر نے سوالیہ انداز میں علی کو دیکھا۔

''ظاہر ہے، صنوبر والی بات پر پریشان ہو گا۔میں پوچھوں گا اس سے، فکر نہ کرو۔''علی نے تسلی دی لیکن نوید کے رویّے سے وہ خود بھی پریشان تھا۔

دوسری طرف گھر سے باہر نکلتے نوید کے اندر غصّے کا اُبال اُٹھ رہا تھا۔وہ اتنا مشتعل تھا کہ اُسکا بس نہیں چل رہا تھا، عاصم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔صنوبر اُسکے سامنے تھی، اُسکی آنکھوں کے سامنے اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔کچھ بھی نہیں۔۔۔وہ واقعی کسی کام کا نہ تھا۔آج اُسے حقیقتاً اپنا آپ بیکار اور ناکارہ لگا تھا۔دو مرتبہ اُسکی بائیک پھسلی تھی۔اُسے خراشیں آئی تھیں۔لیکن اُسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

جو آگ اُسکے اندر لگ چکی تھی، اُس سے وہ ساری دنیا کو جلا دینا چاہتا تھا، لیکن یہ آگ اب اُسے کتنا جلانے والی تھی، اِس بات سے وہ بے خبر تھا۔

---------+---------+---------

سانحے کے دو مہینے بعد:

وہ پانچوں اس وقت وکیل استغاثہ کے سامنے بیٹھے تھے۔یہ وکیل سفیر صاحب نے صنوبر کے کیس کے لئے ہائر کیا تھا۔اس وقت وہ اُنہیں وکیلِ دفاع کے سوالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔

''یہ کیس صنوبر اور عاصم کا نہیں رہا، بلکہ حکومت اور اپوزیشن کی جنگ بن چکی ہے۔حکومت صنوبر کے کیس کو صرف اس لیے اوَن (سرپرستی) کر رہی ہے، کیونکہ عاصم اُنکے مخالفین کی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔وہ پوری کوشش کریں گے یہ الزام لگانے کی کہ تم سب حکومت کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہو، اور اُنہیں برا بنانے کے لئے اُنکے پارٹی ورکر پر الزام لگا رہے ہو۔''وکیل استغاثہ اُنہیں سمجھا رہے تھے۔

''ہم تو بس ایک مظلوم کو انصاف دلانا چاہتے ہیں۔ہم نے تو اس وقت بھی ایف آئی آر درج کروانے کے لیے سر توڑ کوششیں کی تھی، جب ہمیں معلوم بھی نہ تھا کہ وہ لڑکی صنوبر ہے۔''عمر نے کہا۔

''ہاں! لیکن سیاست ایک بہت گندا کھیل ہے۔اور بد قسمتی سے تم سب بھی اسکا حصّہ بن چکے ہو۔ابھی تک ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ میڈیا کی کوریج نہ ملے تم سب کو،اگر میڈیا کے پاس تم سب کی تصاویر یا نام غلطی سے بھی پہنچ گئے،تواُسکے بعد نہ صرف تم سب بلکہ تمہارے خاندان کی جانوں کو بھی خطرہ ہوگا۔تم لوگوں کو ہر صورت میڈیا سے دور رہنا ہے اور کیس پر توجہ دینی ہے۔''

''ہمارا کیس مضبوط ہے یا کمزور؟''علی نے پوچھا۔

''کمزور ہے،کیونکہ ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔البتہ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ عاصم کا جسمانی ریمانڈ منظور کروالیں۔اُمید ہے کہ شاید وہ زبان کھول دے۔ابھی ہمارا پہلا کام جسمانی ریمانڈ لینا ہے۔پہلی پیشی پرسوں ہے۔پرسوں جمعہ ہے،جبکہ فرانزک رپورٹ اتوار تک آئیں گی۔''

''اُس سے کیا ہوگا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''فرانزک سے ہمیں عاصم کے فنگر پرنٹس وغیرہ مل سکتے ہیں۔اگر ایسا ہوا تو ہمارا کیس مضبوط ہو جائیگا۔ابھی فلحال تم لوگوں نے وکیل صفائی کے آگے ہار نہیں ماننی۔''وہ سمجھا رہے تھے۔عاصم زیر حراست تھا لیکن منہ نہیں کھول رہا تھا۔معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ان سب میں اب ہوسٹل کی وارڈن اور صنوبر کی وہ دوست جو اسے اپنی بہن کی شادی پر لے گئی تھی،دونوں کو ملوث قرار دیا گیا تھا۔

وہ لوگ بھی اپنی اپنی زندگیوں کو پس پشت ڈالے،ڈٹ کر کھڑے تھے۔علی پہلے دن کا دولہا تھا۔لیکن وہ بھی وہیں تھا۔کل اُسکا ولیمہ تھا اور پرسوں اس کیس کی پہلی پیشی۔اُسکے باوجود بھی اُنکے ارادوں میں کوئی کمزوری نہیں آرہی تھی۔

لیکن یہ اُنکی بھول تھی کہ وہ حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

---------+---------+---------

''مقّی کہاں ہے؟اب تک آیا کیوں نہیں؟''تھری پیس میں ملبوس کھڑا علی،عمر سے پوچھ رہا تھا۔

''اُسے ہی کال کر رہا ہوں۔پر وہ اٹھا نہیں رہا۔''نیوی بلیو رنگ کے کوٹ پینٹ میں ملبوس عمر نے جواب دیا۔بلاشبہ وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔اِس وقت وہ لوگ علی کے گھر موجود تھے۔

''میرا شام سے اُس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے۔''نوید نے کہا تھا۔

''بہت دیر ہو چکی ہے،تمہارے ابّا بار بار نکلنے کا کہہ رہے ہیں۔''حسین نے کہا۔

''کیا کریں اب؟'' علی پریشان ہوا۔

''تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں، اتنا لاپرواہ تو نہیں ہے وہ، کل رات دیر تک جاگتے رہے ہیں ہم سب ہی، کیا معلوم وہ سو رہا ہو؟'' عمر نے بودی سی تاویل پیش کی تھی۔

''ایسے تو نشہ کر کے بھی نہیں سویا جاتا، رات کے نو بج رہے ہیں۔'' حسین اُسے جواب دیا۔

''ایک کام کرو، تم میں سے کوئی اُسکے گھر دیکھ آؤ۔ نہ جانے کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' علی نے تجویز پیش کی۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ میں اور نوید اُسکے گھر جا کر دیکھ آتے ہیں۔ تم لوگ ہال پہنچو، ہم اُسے لیکر وہیں آجائیں گے۔'' رضا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُسکے بعد وہ دونوں مقدّم کی طرف اور باقی سب ہال کے لیے نکل گئے تھے۔

جب وہ مقدّم کے گھر پہنچے تو وہاں دروازے پر تالا تھا اور باقی سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

''یہ کہاں چلا گیا ہے آخر؟'' نوید نے حیرت سے پوچھا۔ اب وہ حقیقتاً پریشان ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''اب تو واقعی میں فکر ہو رہی ہے مجھے۔'' رضا نے کہا۔

''لیلیٰ سے کوئی رابطہ ہے تمہارا؟ کیا پتہ اُس سے کچھ معلوم ہو جائے۔'' نوید نے اُمید سے پوچھا۔

''میرا بھلا لیلیٰ سے رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' رضا نے جواب دیا

''کیا کرنا چاہیے اب؟ عمر کی کال آرہی ہے بار بار۔۔۔'' نوید جھنجھلا گیا تھا۔

''کیا کر سکتے ہیں بھلا؟ ابھی فنکشن میں شامل ہوتے ہیں، اُسکے بعد دیکھتے ہیں۔'' رضا نے کہا تو نوید نے اُسکی تائید کی۔ فلحال کے لیے تو وہ لوگ ولیمے کی تقریب میں شامل ہو گئے، لیکن اندر سے وہ سب ٹھیک ٹھاک پریشان تھے۔

اگلے دن پیشی تک اُنہوں نے کئی بار جا کے مقدّم کے گھر میں دیکھا لیکن تالا ویسے ہی لگا تھا۔ کل تک تو اُسکے موبائل پر بیل جا رہی تھی، لیکن اب اُسکا نمبر بھی بند ہو چکا تھا۔

استغاثہ نے کیس اچھے سے لڑا۔ اُن چاروں کو ہر صورت میڈیا سے دور رکھا گیا تھا، لیکن پھر بھی یہ خبر آگئی کہ ایک گواہ پیشی کے وقت غائب تھا۔ عاصم کا ریمانڈ لے کر اُسے پولیس فورس کے حوالے کر دیا گیا۔

اُسکا اگلا دن مزید پریشانی لے کر آیا، صنوبر کی رپورٹس آگئی تھی، اُسکے جسم پر عاصم کے فنگر پرنٹس ملے تھے۔ وہ ہر طرح سے مجرم ثابت ہو رہا تھا۔ جس پارٹی کا وہ ممبر تھا وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ہر شے اُنکی مرضی کے مطابق تھی۔

لیکن۔۔۔۔

وہ خوش نہیں تھے۔ کوئی شے اُنہیں بری طرح کھٹک رہی تھی۔

مقدّم کی گمشدگی کے بعد سے وہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ نوید کو تو صنوبر کی موت نے توڑ دیا تھا، لیکن وہ چاہ کر بھی کسی سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ رضا ویسے ہی غائب رہنے لگا تھا، کئی ہفتوں بعد اُن میں سے کسی کو خیال آتا تو اُسے فون کر کے پوچھ لیتا۔ عمر، مقدّم کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا، جہاں ممکن تھا وہاں مقدّم کو تلاش کر رہا تھا لیکن اُسکی ہر کوشش بیکار جا رہی تھی۔ علی ہر صورت صنوبر کو انصاف دلانا چاہتا تھا، درحقیقت وہ صنوبر کے لیے بھائی جیسے جذبات رکھتا تھا۔ حسین اس سارے معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوا تھا۔

مقدّم کے جاتے ہی جیسے ہر شے پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ اور خاموشی کسی بڑے طوفان کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

---------+---------+---------

سانحے کے چار ماہ بعد:

پچھلے دو ماہ میں فقط دو پیشیاں ہو سکی تھیں۔ ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا تھا۔ شہر کی ہر چھوٹی اور ہر بڑی جامعہ کے طلبہ و طالبات سڑکوں پر نکل کر صنوبر کے حق میں احتجاج کر رہے تھے۔

اس سانحے کو چار ماہ گزرنے کے باوجود بھی یہ میڈیا پر اب بھی پہلے دن کی طرح تازہ تھا۔ مقدّم کو غائب ہوئے بھی دو ماہ ہو چکے تھے۔

دوسری پیشی پر عاصم مجرم ثابت ہو گیا تو استغاثہ کیس بند کروانا چاہتے تھے، لیکن علی اِس پر راضی نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح اُس دوسرے شخص کا نام سامنے لایا جائے، جو اُس رات عاصم کے ساتھ ملوث تھا۔ مزید یہ کہ علی ہر صورت جامعہ سے طلبہ تنظیموں کا خاتمہ چاہتا تھا جو سیاست کی آڑ میں اس طرح کے غلیظ فعل میں ملوث تھیں۔ علی کو اپنے باپ کی مکمل حمایت حاصل تھی اور ایسا شاید پہلی اور آخری بار ہوا تھا۔

البتہ استغاثہ نے اُس روز اُن سب کو جمع کیا تھا۔ رضا نہیں آیا تھا، بس وہ چاروں ہی تھے۔

"تم لوگ صنوبر کو انصاف دلانا چاہتے تھے۔ الحمدُللہ! ہم اِس میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگلی پیشی میں عاصم کو پھانسی کی سزا ہو جائیگی۔ مبارک ہو تم سب کو۔" وکیل استغاثہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا لیکن جواباً وہ سنجیدگی سے بیٹھے رہے تھے۔ علی کے ابّا سفیر صاحب بھی وہیں تھے۔

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجرم صرف عاصم تھا؟''سفیر صاحب نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''دیکھیں! جو مجرم تھا اسکو سزا مل گئی، اب اُسکے ساتھ کون کون تھا؟ اِسکے پیچھے جائیں گے تو سوائے نقصان کے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب سیاسی کھیل ہیں۔ یہ سیاست دان کسی کے نہیں ہوتے، آپ دیکھ لیں جو کل تک عاصم کے لیے لڑ رہے تھے جیسے ہی جرم ثابت ہوا، اُسکو اکیلا چھوڑ دیا۔''وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں بہت کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں، عاصم تو مہرہ تھا۔ اُس مہرے کو سزا دے دینے سے کیا ہو جائے گا؟ اُس مہرے کو چلانے والے ہاتھ ڈھونڈھنے ہوں گے، اُسے پکڑنا ہوگا۔''سفیر صاحب نے کہا۔

''کیسے پکڑیں گے آپ؟''وکیل استغاثہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ تو آپ بتائیں۔''

''یہ میرا کام نہیں ہے۔ اور نہ مجھے ان مسائل میں پڑنا ہے۔ اور بالفرض، میں آپکا ساتھ دے بھی دوں، تب بھی ہم عدالت میں کچھ ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ دو سیاسی پارٹیوں کی جنگ تھی جو کہ ختم ہو گئی ہے، لیکن اب اگر آپ اس آگ کو دوبارہ بھڑکانا چاہیں گے تو نقصان آپکا ہی ہوگا۔''

''اس بات کا کیا مطلب؟''علی کو اب غصّہ آنے لگا تھا''ہم نے جو دیکھا اُس پر آنکھیں بند کر لیں؟ وہ اصل مجرم تو اب تک آزاد ہے۔ اور نہ جانے وہ اور کس کس کے ساتھ یہی سب کرے؟''

''بیٹا! یہ تو تم کہہ رہے ہو۔ اپنے دوستوں سے پوچھو ایک مرتبہ، کیا وہ بھی یہی چاہتے ہیں؟ تمہارا ایک دوست تو غائب بھی ہو چکا ہے۔ ذرا سوچو! کہ آخر کیا ہوا اُسکے ساتھ، جو وہ پہلی پیشی سے پہلے ہی اپنے پورے خاندان کے ساتھ راتوں رات غائب ہو گیا؟''علی نے مڑ کر ایک نظر اپنے دوستوں کو دیکھا۔ سب کے سب خاموش تھے۔ اُنکی خاموشی سے وہ کچھ اخذ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کیوں، لیکن اب وہ لوگ اس کیس میں علی جیسی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ اُسکے دل کو کچھ ہوا تھا یہ دیکھ کے۔ اگلے کئی گھنٹوں تک وکیل استغاثہ اُنہیں یہی سمجھاتے رہے کہ اُنہیں اب اس کیس میں مزید نہیں پڑنا چاہیے لیکن علی اور اُسکے ابّا بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

''اگلی پیشی پر آپکا مطالبہ بھی جج کے سامنے رکھوں گا۔ لیکن میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسکا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''جاتے جاتے وکیل استغاثہ کہہ گئے تھے۔ اُنکے جانے کے بعد عمر اور نوید بہت خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ علی کو اُنکے رویّے سخت حیران کر رہے تھے۔ حسین جانے سے پہلے اُسکے پاس آیا۔

''دیکھو! یہ کیس ایک اعصابی جنگ ہے، اُس پر سے مقدّم کا غائب ہونا، اُس سے بڑی پریشانی ہے۔ ہم سب ہی ذہنی طور پر تھک چکے ہیں۔ مجھے باقی سب کا تو نہیں معلوم البتہ میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جو کر رہے ہو۔۔ صحیح کر رہے ہو۔'' حسین نے اُسکا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتیں کر دیتا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا وہ حسین ہو۔

وہ جا چکا تھا اور علی تنہا کھڑا آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید مستقبل میں اسے ایسے ہی کھڑا رہنا تھا۔۔۔

تنہا۔۔۔

---------+---------+---------

سانحے کے پانچ ماہ بعد:

فون کی گھنٹے نہ جانے کتنی دیر سے بج رہی تھی۔ وہ بھی برابر نظر انداز کر رہا تھا۔ مختلف جگہوں پر سی وی دینے کی وجہ سے اُسے روزانہ ہی کہیں نہ کہیں سے انٹرویو کی کال آتی تھیں۔ کچھ سے وہ معذرت کر لیتا تو کچھ کو اسی طرح نظر انداز کر دیتا، جو باوُہ بھی پلٹ کے دوبارہ کال نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ کون تھا جو مسلسل اُسے چوتھی مرتبہ کال کر رہا تھا؟

''کون ہے آخر؟'' انگریزی کی کتاب بند کرتے نوید جھنجھلا گیا تھا۔ آج کل وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا۔ ویسے ہی عاصم اور صنوبر کے کیس میں اُسکا خاصا وقت برباد ہوا تھا۔

''کون بات کر رہا ہے؟'' نوید نے فون کان سے لگاتے ہو پوچھا تھا۔

''تمہاری موت۔۔۔۔'' وہ جو بھی تھا، ایسے پھنکارا تھا، جیسے فون سے باہر نکل کر نوید کا قتل کر دے گا۔

''سوری؟'' اُسے لگا کسی نے اُسکے ساتھ بیہودہ مذاق کیا ہے۔

''اب معافی تلافی کا وقت گیا نوید! اگلی پیشی پر جج میری موت کے پروانے پر دستخط کر دے گا۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں، میں تو مر جاؤنگا لیکن تمہارے لیے ایسا گڑھا کھود کر جاؤنگا کہ نہ تو مردہ اور نہ ہی زندہ اُس میں دفن ہو سکو گے۔'' نا سمجھی سے شاک اور شاک سے بے یقینی میں پل پل بدلتے تاثرات کے ساتھ نوید اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''عاصم۔۔۔؟'' اُسکی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

''ہاں! وہی عاصم جس کو برباد کرنے میں تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' عاصم جیل میں تھا، اُسکے پاس فون کہاں سے آیا اور وہ کال کیسے کر رہا تھا اُس کو؟ اسکو نوید کا نمبر کس نے دیا اور سب سے بڑا سوال کہ نوید اُسکی کال سن کیوں رہا تھا؟ اُسے کال کاٹ دینی چاہیے تھی۔ وہ کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔

''عدالت میں، میں ضرور یہ بات اٹھاؤں گا کہ وہ صنوبر۔۔۔ وہ تمہاری معشوقہ تھی۔'' زہر خند لہجے میں بولتا عاصم اُسکے پیروں تلے زمین نکال گیا تھا۔

''صنوبر کے موبائل سے تمہارے سارے میسج مل جائیں گے۔ پوری جامعہ میں تم ایک ہی لڑکے تھے جس سے وہ بات کرتی تھی۔ اُس دوسرے شخص کا نام جاننا چاہتا ہے نا تمہارا دوست؟'' وہ نوید کو کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''میں بتاؤں گا انہیں اُس دوسرے شخص کا نام۔۔۔ تم۔۔۔ تم ہو وہ دوسرے شخص۔۔۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ چاہ کر بھی چلا نہ سکا۔ آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی شاید۔

''ہاں! تم ہی ہو وہ دوسرے شخص اور تمہارے دوست تمہیں بچانے کے لیے میرے سر پر سارا ملبہ ڈال رہے ہیں، یہ چال میں تمہارے سروں پر الٹوں گا۔ تم اب اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے۔''

''جج۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ میرا کوئی تعلق نہیں ان سب سے۔'' اُس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس بری طرح پھنسایا جا سکتا ہے۔ جس بات کو اُس نے سب سے چھپا کر رکھا وہ بات ایک مجرم کے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ اُسے، اُسی کے خلاف استعمال کرنے والا تھا۔

''تم نے کیا سمجھ رکھا تھا کہ عاصم کوئی بیکار شے ہے؟ جسے تم لوگ موت کے دہانے پر لے آؤ گے اور وہ تمہیں کچھ نہ کہے گا؟ تم دیکھنا! سب سے پہلے تم پھنسو گے اور پھر تمہارے دوستوں کو تمہاری پشت پناہی کے جرم میں سزا ہو گی۔ میں تم سب سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا آج نہیں تو کسی اور وقت پر، مگر چھوڑوں گا نہیں ایسے۔۔۔'' وہ پتہ نہیں اور کیا کیا کہہ رہا تھا؟ لیکن نوید نے فون بند کر دیا تھا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اُسے شدید خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ اس حد تک خوف زدہ تھا کہ یہ بھی بھول بیٹھا کہ اُس نے کبھی بھی صنوبر سے کام کی بات کے علاوہ کوئی بات نہ کی تھی۔ اُسکے میسجز سے کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ صنوبر سے اُسکی دلی وابستگی تھی۔ لیکن اس وقت اُسکا دماغ مثبت سوچنا چھوڑ چکا تھا۔ اُسے یہ سب باتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اب کیا ہو گا؟ اگر اُس نے سارا ملبہ نوید کے سر پر ڈال دیا تو؟ وہ تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور اُسکا باپ؟ اُسے اپنے باپ کی مار اور ماں کی گالیاں یاد آ رہی تھیں۔ وہ وہی چھوٹا نوید بن گیا تھا، جو ہر وقت اپنے ماں باپ سے خوف زدہ رہتا تھا۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اگلی پیشی پر ہر صورت میں عاصم کو پھانسی کی سزا ہو گی اور وہ ہر صورت کیس کا رخ نوید کی جانب موڑ دے گا۔ وہ کیسے بھول

گیا کہ سیاسی جماعتیں اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی؟اُس نے پہلے کیوں نہ سوچا؟کیوں نہ سوچا جب مقدّم راتوں رات غائب ہو گیا تھا؟کیوں اُس نے ان سب چیزوں کو اتنا آسان سمجھ لیا تھا؟وہ اتنا بیوقوف کیسے ہو سکتا تھا؟

اپنے کمرے کے عین وسط میں کھڑا نوید اِس وقت ہر ہر نہج پر سوچ رہا تھا۔مقدّم کی گمشدگی،اس عام سے کیس میں میڈیا اور حکومت کا شامل ہو جانا؟کیوں نہیں سوچا اُس نے کہ وہ اپنے آپ کو کس دلدل میں پھنسا رہا ہے؟پوری رات کانٹوں پر گزارنے کے بعد وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچا تھا۔

وہ مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیگا۔

---------+---------+---------

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''علی بے یقینی کی سی کیفیت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔آخری بار اُن سب کے چہرے دیکھنے پر اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ یہ وقت اُس پر جلد ہی آنے والا ہے۔لیکن اتنی جلدی؟

''جو تم نے سنا۔''نوید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔اُس وقت وہ علی کے گھر پر تھا۔گھر میں اُن دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''کیوں نوید؟کیا تم سب نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟''علی کی آواز بلند ہوئی۔

''کیا تھا،لیکن علی میری بھی زندگی ہے۔جو ان سب میں ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔''وہ پرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے اس موقعے پر اکیلا چھوڑنے کی بات کرو گے؟دو ہی پیشیاں ہوئی ہیں نوید!اور اگلی پیشی پر عاصم کو پھانسی ہو جائے گی۔تم اس وقت پیچھے ہٹنے کی بات کر رہے ہو؟''علی نہ جانے اُسے کیوں سمجھا رہا تھا؟حالانکہ اُسکے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ حتمی فیصلہ کر کے آیا ہے۔

''اگلی پیشی؟تم واقعی اگلی پیشی پر کیس ختم کرنے والے ہو؟تمہیں تو اُنکی جڑوں تک پہنچنا ہے،اُنکی بنیادیں ہلانی ہیں۔تم کہاں عاصم کی پھانسی پر راضی ہو گے؟''تلخی سے کہتا نوید،اُسکے اوسان خطا کر رہا تھا۔

''نہیں نوید!تم ایسا نہیں کر سکتے۔''وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔''کچھ اور بات ہے۔تم کچھ چھپا رہے ہو نہ مجھ سے؟مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟''وہ جیسے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔مقدّم جا چکا تھا اور اس کیس کا دوسرا اہم گواہ بھی جانے کی باتیں کر رہا تھا۔کچھ تو گڑبڑ تھی۔

''میں کیا چھپاؤں گا تم سے؟میرا کیریئر ہے،میری ایک فیملی ہے۔اور ہر کسی کا باپ تمہارے باپ کی طرح ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔''وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔علی نرم پڑا۔

''دیکھو! میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اب بیزار ہو چکے ہو، اِسی لیے میں تم میں سے کسی نہیں کہہ رہا کہ وہ آگے بھی اس کیس سے زبردستی جڑا رہے۔ وہ میں اور میرے ابّا دیکھ لیں گے۔ لیکن کم از کم عاصم کو سزا ہونے تک تو ساتھ دو۔'' علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ملتجی لہجے میں کہا۔ نوید کا دل دکھا لیکن وہ مجبور تھا۔ چاہ کر بھی اُسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ کس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ دوست کے ساتھ غدّاری صحیح لیکن وہ اپنے ماں باپ کی نظروں میں مزید نہیں گرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ابھی کمزور پڑ گیا تو مزید کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ اُسے آنے والے خطرے کے مقابلے میں علی کی ناراضگی قبول تھی۔

اُس نے اُسکے ہاتھ جھٹک، تو وہ حیران رہ گیا۔ عمر اُسی وقت اندر داخل ہوا تھا۔ اُسے نہیں معلوم یہاں کیا ہو رہا تھا لیکن اُس نے نوید کو علی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر وہیں رکا۔

''علی! بس بہت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بار بار سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن تم سمجھ نہیں رہے۔ میرے گھر والے ہیں، ایک چھوٹی بہن ہے۔ تمہیں سمجھ کیوں نہیں آ رہی یہ بات؟ میں اُن سب کی زندگیاں نہیں برباد کر سکتا وہ بھی ایک مری ہوئی لڑکی کے لیے۔'' اُس نے کیسے صنوبر کو مری ہوئی لڑکی کہا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ علی نفی میں سر ہلاتا پلٹ گیا، کچھ قدم آگے بڑھ کر اُس نے پہلے اپنے چہرے پر بے دردی سے ہاتھ پھیرا، پھر دوبارہ نوید کی جانب پلٹا تو اُسکی آنکھوں میں غصّہ واضح تھا۔

''مجھے پہلے ہی تم میں سے کسی کی مدد نہیں لینی چاہیے تھی۔ جسے تم مری ہوئی لڑکی کہہ رہے ہو، وہ بھی کسی کی بیٹی تھی، بہنوں جیسی تھی میرے لیے، وہ بھی کبھی زندہ تھی۔ تم سب ایف آئی آر کٹوانے تک تو بخوشی میرے ساتھ تھے، لیکن جب مقدمے کی بات آئی تو دو پیشیوں میں ہی تم لوگوں کی ہمت جواب دے گئی؟'' وہ غصّے میں سب کو ایک ہی ترازو میں ناپ رہا تھا۔ عمر اندر آ چکا تھا اور ناسمجھی سے اُن دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔۔۔ اُسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا جب مقدّم یہاں سے فرار ہوا تھا۔'' اُس نے ٹھیک ٹھاک غصّے سے کہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اِس آواز پر اُن دونوں نے ہی رک کر دیکھا، عمر وہیں تھا۔ اُنہیں اُسکے آنے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔

''اپنے ہی دوست کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کس طرح کر سکتے ہو تم؟'' عمر نے سختی سے کہا تھا۔ اب کہ رضا اور حسین بھی دروازے سے داخل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

''دوست؟'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''میں نے دیکھ لیں ساری دوستیاں۔ اب مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ مقدّم اس کیس کے ڈر سے ہی یہاں سے فرار ہوا ہے۔'' اُس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ غصّے میں اپنے الفاظ پر غور نہیں کرتا تھا۔

''اب اگر تم نے دوبارہ یہ لفظ استعمال کیا تو جان سے مار دوں گا تمہیں۔'' اُسے گریبان سے پکڑتے ہوئے عمر حلق کے بل چیخا تھا۔ علی تو کیا، وہاں کھڑا ہر شخص اُسکے، اِس جارحانہ انداز پر، جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''کیا ہی، کیا ہے تم نے مقدّم کے لیے؟ ایک بار بھی اُسے ڈھونڈھنے کی کوشش کی اب تک؟'' وہ چیخ رہا تھا۔

''گریبان چھوڑو میرا!'' علی نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اُسے دیکھا تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم دونوں؟ پاگل ہو چکے ہو کیا؟'' حسین نے عمر کو اور نوید نے علی کو پکڑ کے پیچھے ہٹایا تھا۔

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہارا دوست، اپنے خاندان سمیت پچھلے چار ماہ سے گمشدہ ہے؟ کیا تم نے سوچا کہ اُسکے ساتھ کیا ہوا؟'' حسین اُسے پیچھے دھکیل رہا تھا لیکن وہ اُسی طرح چلا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کبھی عمر کا یہ روپ بھی دیکھنے کو ملے گا۔

''جتنا وقت تم نے اس مری ہوئی لڑکی کے لیے لگایا ہے، اتنا اپنے زندہ دوست کی تلاش میں لگایا ہوتا تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتا۔'' وہ علی کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

''خاموش ہو جاؤ عمر!'' حسین اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب اگر تم میں سے کسی نے بھی، اُسے مری ہوئی لڑکی کہا، تو میں بھول جاؤں گا کہ تم لوگ میرے دوست ہو۔'' اب کہ علی بھی چیخا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، لیکن نوید نے اُسے روک رکھا تھا۔ اُسکا خون کھول رہا تھا۔

''یہ تمہیں مقدّم کو مفرور کہنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' عمر آج جیسے رکنے والا نہیں تھا۔

''بس کرو دونوں، ہو کیا گیا ہے آخر؟'' رضا نے بلآخر اُن سب سے بھی زیادہ تیز آواز میں کہا تھا۔ اُنکی آوازیں اتنی بلند تو تھیں کہ یقیناً محلے والوں تک بھی باآسانی پہنچ رہی تھیں۔

''علی! بس بہت ہو چکا ہے۔ تم غصّے میں یہ بھی نہیں دیکھ رہے کہ کیا کہہ رہے ہو؟'' نوید نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے انگارے برساتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے نا!۔۔۔'' وہ رک کے اُسے دیکھنے لگا۔ ''پھر تمہارا کوئی کام نہیں یہاں۔ تم جا سکتے ہو۔'' اُس نے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو نوید ساکت رہ گیا۔ وہ اُسے اپنے گھر سے نکلنے کو کہہ رہا تھا۔

تو بس اتنی ہی اوقات تھی اُسکی؟ ہمیشہ کی طرح جب وہ کسی کی امیدوں پر پورا نہیں اُتر سکے گا، تو اسے ایسے ہی ذلیل کیا جائیگا؟ اُسکے نصیب میں ہی اتنی تذلیل کیوں تھی؟ کیا وہ اتنا غیر اہم تھا؟ کیا کبھی کوئی اُسے سمجھنے کی کوشش بھی کریگا؟ اُسکا دل کر رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ ایسی تذلیل تو اُسکے باپ نے بھی اُسکی نہیں کی تھی۔ اگلے ہی لمحے اُس نے لب بھینچتے ہوئے اپنی بائیک کی چابی میز سے اٹھائی اور کچھ بھی کہے بنا وہاں سے نکل گیا۔

''نوید۔۔۔'' رضا نے پیچھے سے اُسے آواز دے کر روکنا چاہا پر وہ نہیں رکا تھا۔

''''تم کر کیا رہے ہو آخر؟ تم نے کھڑے کھڑے اپنے دوست کو گھر سے نکال دیا؟'' حسین کا ضبط اب جواب دے گیا تھا۔

''میں نے ٹھیک کیا۔'' وہ بالکل شرمندہ نہیں تھا۔

''صرف اپنی ضد کے آگے تم اپنے دوستوں کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو؟ افسوس ہے تم پر۔۔۔'' عمر بس اتنا ہی کہہ سکا اور وہ بھی وہاں سے جانے کے لیے مڑ گیا۔

''ایک مظلوم انسان کو انصاف دلانا تم لوگوں کو میری ضد لگ رہا ہے؟'' علی نے پیچھے سے اُسے جواب دیا لیکن عمر رکا نہیں بلکہ وہاں سے نکل گیا۔

''مجھے کسی کی بھی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلے ہی کر لوں گا جو ضروری ہوا۔'' وہ میز کو ٹھوکر مارتا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ اب وہاں بس حسین اور رضا ہی باقی رہ گئے تھے۔ رضا ویسے ہی کافی عرصے بعد اُن سے ملنے آیا تھا۔ علی کے جانے کے بعد اب اُنکا وہاں کوئی کام تو بچا نہ تھا، لہٰذا وہ بھی خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔

یہ اُنکی دوستی میں آنے والی پہلی اور سب سے گہری دراڑ تھی۔ اسکے بعد تو دوستی اور وفاداری کی یہ عمارت بہت جلد زمین بوس ہونے والی تھی۔

---------+---------+---------

اس جھگڑے کے بعد کسی نے بھی کسی سے بات نہ کی تھی، پورا ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ آخری پیشی جس میں عاصم کو پھانسی کی سزا سنائی جانی تھی، وہ بھی کسی وجہ سے موخر ہو گئی تھی۔ نوید کی تو جیسے سانسیں ہی اس آخری پیشی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ راتوں کو نیند نہ آتی، آ جاتی تو خواب میں وہ خود کو صنوبر کے قاتل کے طور پر ہر جگہ بدنام ہوتے دیکھتا، تو کبھی دیکھتا کہ اُسکا باپ اُسے مارتے ہوئے گھر سے نکال رہا ہے۔ وہ شدید اینزائٹی (اضطراب) کا شکار ہو رہا تھا۔ اب تک اس مقدمے میں اُسکے چشم دید گواہ ہونے پر، خلاف توقع اُسکے گھر والے خاموش رہے تھے۔ یا تو وہ اُسے اتنی سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے، یا پھر انہوں نے نوید کے معاملات میں بولنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کب تک؟ اگر بدنامی اُسکے حصے میں آتی تو کیا تب اُسکے گھر والے خاموش رہ سکے گے؟

پچھلے ایک ہفتے سے وہ بار بار علی کے بارے میں سوچتا، اُسکا ملتجی لہجہ یاد آتا تو شرم سے زمین میں گڑنے لگتا۔ وہ کس مجبوری میں اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ آیا تھا، صرف وہی جانتا تھا۔ پھر اُسکا نوید کو گھر سے نکالنا یاد آتا تو نئے سرے سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتا۔ اس کشمکش نے اُسکے اعصاب بری طرح توڑ دیے تھے۔ وہ سلِپ پیرالائز کا شکار ہونے لگا تھا۔

کئی مرتبہ سوچتا کہ جا کر علی کو سب سچ بتادے۔ لیکن نہیں بتا پاتا، وہ اپنے رازوں سے کسی کو آشنا نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ لیکن کیا سچ میں ایسا ہی ہونا تھا؟

اِسی کشمکش میں کچھ دن اور سرکے، اُس روز وہ سی ایس ایس کا اسکریننگ ٹیسٹ دے کر گھر آیا تھا۔ جب اُسکے موبائل پر آنے والے میسج نے اُسکے حواس صحیح معنوں میں سلب کر دیئے تھے۔ یہ اُسکے اعصاب پر پڑنے والے تمام حملوں میں سب سے بھاری حملہ تھا۔

''عاصم کمال جیل میں مردہ پایا گیا تھا۔''

--------+--------+--------

سانحے کے چھ ماہ بعد:

عاصم مر چکا تھا۔ اب میڈیا کی دلچسپی صنوبر کے بجائے عاصم کے قاتلوں پر چلی گئی تھی۔ پچھلے ایک ماہ میں اُسکے تمام پوسٹ مارٹم اور فرانزک رپورٹ اُسکی طبعی موت کی نشان دہی کر رہے تھے۔ سوتے میں اُسکا دل بند ہوا تھا۔ لیکن میڈیا کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ قتل ہے۔ جو بات علی چاہتا تھا وہی ہو گئی تھی، اب میڈیا بھی چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ عاصم کے ساتھ کوئی اور بھی ملوث تھا۔ اور اُسی نے خود کو چھپانے کے لئے عاصم کو مارا ہے۔

نوید کو اب نیا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ آخری بار عاصم نے اُسی سے بات کی تھی۔ اگر اُسکی کال ٹریس کر لی گئی تو؟ اگر عاصم کے قتل میں اُسے ہی گرفتار کر لیا گیا تو؟ وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا؟ دن بدن وہ نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔

''اگر یہ سب ایسے ہی چلتا رہا تو کسی دن میرا دل بند ہو جائیگا۔'' اُس نے سوچا اور پھر ایک فیصلہ کیا۔ وہ تھک چکا تھا ان سب حالات سے۔ اُسکا ذہن ہر بار اُسے، اُس نہج پر لے جاتا تھا جو شاید کبھی بھی نہیں ہونے والا تھا، اور وہ اُس کبھی بھی نہ ہونے والے انجام کو سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہا تھا۔ ایسے میں یہی ٹھیک تھا کہ وہ علی کو سب بتادے۔ اپنے اور صنوبر کے بارے میں، اُسکی اور عاصم کی آخری گفتگو کے بارے میں۔ اُسے نہیں معلوم کہ اُسکے بعد کیا ہو گا؟ لیکن کم از کم وہ اس بوجھ سے تو آزاد ہو گا۔

اُس نے اُن سب کو میسیج کیا اور علی کے گھر آنے کو کہا۔ سب نے ہی مناسب جواب دیا خصوصاً عمر نے، وہ جیسے انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔ نوید نے بائیک کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

پیچھے اُسکے گھر والے، آنے والی عید پر بشریٰ کو دیا جانے والا تحفہ تیار کر رہے تھے۔ لیکن اُسے ان سب میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلآخر وہ لوگ ایک ماہ بعد اکھٹے ہونے جا رہے تھے۔

لیکن شاید آخری مرتبہ۔۔۔۔

---------+---------+---------

''تم نے اچانک سے یہ کیسا فیصلہ کر لیا؟ مجھے نہیں یاد کہ تمہاری کبھی ایسی کوئی خواہش رہی تھی۔'' وہ لوگ اِس وقت علی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ حسین، عمر سے سوال کر رہا تھا۔ علی بے تاثر سے چہرے کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میری ہمیشہ سے ہی یہی خواہش تھی لیکن میں نے کبھی تمہیں بتایا نہیں، کیونکہ مجھے خود کنفرم نہیں تھا، کہ ایسا کب تک ہو گا؟ لیکن کیونکہ اب ایسا ہو چکا ہے تو میں نے سوچا تم لوگوں کو بتا دوں۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

''کب جا رہے ہو؟'' نوید نے پوچھا۔

''کل۔۔۔''

''کل جا رہے ہو اور ہمیں اب بتانے آئے ہو؟'' حسین نے شکوہ کیا۔

''پہلے بتا دیا ہوتا تو تم لوگ سمجھتے کہ مقدّم کی طرح میں بھی فرار ہو رہا ہوں۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوا۔ علی نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے اُسے دیکھا اور دوبارہ رخ میز کی جانب کر دیا۔

''تو کب تک واپس آؤ گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، میرا کنٹریکٹ پانچ چھے سالوں پر محیط ہے۔ اور میرا واپس آنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ مجھے ویسے بھی اپنا مستقبل اس ملک میں نہیں بنانا۔'' اُس نے کہا تو حسین نے اُسے غور سے دیکھا۔ ملک سے باہر جانے کا منصوبہ ایک دن میں نہیں بن جاتا۔ کچھ مسئلہ تھا اُسکے ساتھ، وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ اُسکی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے پڑے تھے۔ وزن بھی کافی گھٹ گیا تھا۔

''حیرت ہے، تم نے کبھی کہا نہیں کہ تم اپنا مستقبل باہر کے ملک میں بنانا چاہتے ہو؟'' اُسے، اُسکا ایسے اچانک جانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ خیر ہضم تو یہ بات کسی کو بھی نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ لوگ خاموش تھے۔ حسین کو احساس ہوا کہ وہ اکیلا ہی بول رہا ہے۔ آخری بار جو دراڑ اُنکے درمیان آئی تھی، وہ اُسے بھر نہیں

پار ہے تھے۔اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔نوید اضطراب کا شکار لگ رہا تھا، علی کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھائی تھی اور رضا کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا،وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''آج کل ہر شے حیرت انگیز ہی ہو رہی ہے۔''علی نے اتنی دیر میں پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔اور یہ واضح طنز کس پر تھا؟کوئی سمجھ نہ سکا۔عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔پھر بلآخر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چلتا ہوں اب،پیکنگ بھی رہتی ہیں کچھ،اور رات کی ہی فلائٹ ہے۔''اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو باقی سب بھی خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

''کہا سنا معاف کرنا۔''اُس نے آگے بڑھ کے رسمی انداز میں رضا اور حسین کو باری باری گلے لگایا اور پھر نوید کو بھی،اُسکے بعد وہ علی کی طرف بڑھا۔

''میں غصّے میں زیادہ کچھ کہہ گیا تھا،معاف کر دینا مجھے۔۔۔''شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ، علی کو گلے لگانے آگے ہی بڑھا تھا کہ اُس نے اُسکا دایاں ہاتھ پکڑ کر اُس سے مصافحہ کیا۔اور عمر۔۔۔وہ وہیں رک گیا۔صاف ظاہر تھا کہ وہ اُس سے گلے بھی نہیں ملنا چاہتا تھا۔

''خیریت سے جاؤ۔''اُس نے بس سنجیدگی سے اتنا ہی کہہ تھا۔

''خدا حافظ۔۔۔''سر ہلاتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔مقدم جا چکا تھا اور وہ جا رہا تھا۔ساتھ گزارے دوستی کے لمحات اب یاد بننے جا رہے تھے،دوستی اب ختم ہونے جا رہی تھی،وہ چھے،ساڑھے چھے سال۔۔۔اب قصّہ ماضی بننے جا رہے تھے۔وہ بالآخر الگ ہو رہے تھے۔رضا اور حسین، عمر کو باہر تک چھوڑنے ساتھ گئے تھے۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے؟''اُنکے جانے کے بعد علی نے اچانک ہی نوید سے پوچھا تھا۔

''ہاں!''وہ ویسے بھی بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا وضاحت دینا چاہتے ہو؟''وہ آج بے حد سنجیدہ تھا۔اُسکی یہ سنجیدگی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

''علی!میں تمہیں اس طرح اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔''وہ رکا، جیسے الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔اپنا آپ کھول کر کسی کے سامنے رکھنا آسان نہیں ہوتا۔

''لیکن؟'' علی نے اُسے بولنے پر اکسایا۔

''لیکن میں مجبور ہو گیا تھا۔''وہ بے بسی سے بولا تھا۔

''کیا مجبوری تھی تمہاری؟''اُس نے اگلا سوال کیا۔

''تم اس طرح کیوں بات کر رہے ہو مجھ سے ؟''نوید اُسکے انداز پر ٹھٹکا تھا۔

''کس طرح بات کروں اب تم سے ؟میں بہت اچھے سے جانتا ہوں کہ اب تم کیا کہنے والے ہو؟اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کو مجبوری کا نام مت دو۔'' جتنے تلخ لہجے میں وہ بولا تھا،نوید حیران رہ گیا تھا۔

''تم اس کیس سے صرف اسی لیے پیچھے ہٹے ہو کہ کہیں دنیا کو پتہ نہ چل جائے کہ تمہارا صنوبر سے کیا تعلق تھا؟''اُسکے سر پر کسی نے پہاڑ لا کر گرا دیا تھا۔یہ اُسکے کانوں نے کیا سنا تھا؟یہ ابھی ابھی علی نے کیا کہا تھا؟اُسے لگا اُسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''اور کتنا بیوقوف بناؤ گے مجھے ؟کس قسم کے انسان ہو یار تم؟جس لڑکی کے لیے اتنے جذبات رکھے تھے دل میں،آج ضرورت پڑنے پر اُسی سے منہ موڑ لیا؟کہ کہیں تم بدنام نہ ہو جاؤ۔تمہارا نام ان سب میں نہ شامل ہو جائے۔''وہ غصّے سے ایسے پھنکار رہا تھا،جیسے آج اِسی مقصد کے لیے یہاں بیٹھا ہو۔

''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟''نوید جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بکواس نہیں سچ ہے یہ۔''علی بھی کھڑا ہوا۔

''اب تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟''وہاں داخل ہوتے حسین نے بیزاری سے پوچھا تھا۔رضا ساتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''علی!ہم کسی اور وقت یہ بات کریں گے۔ابھی تم غصّے میں ہو اور کچھ بھی بولتے جا رہے ہو۔''نوید نے حسین کو وہاں دیکھ کر بات ختم کرنی چاہی تھی۔

''نہیں نوید!یہ بات آج ہی ہو گی۔اس کیس سے پیچھے ہٹنے میں تمہاری مجبوری نہیں خود غرضی ہے۔تم کسی کے نہیں ہو سکتے،تم صرف اپنے آپ کے ہو۔ شکر ہے کہ صنوبر زندہ نہیں ہے۔ورنہ تم تو بیچ راستے میں اُسے چھوڑ کر بھاگ سکتے تھے۔''

''علی!''حسین جیسے ہوش میں آیا تھا۔''خاموش رہو!یہ کوئی کرنے کی بات ہے اس وقت؟''اُس نے علی کو ڈانٹتے ہوئے آنکھیں دکھائی تھی۔نوید نے جھٹکے سے پلٹ کر پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

اُسکے لہجے میں تو حیرت ہونی چاہیے تھی نا؟پر وہاں تنبیہ تھی،حیرت کا تو شائبہ تک نہ تھا۔تو کیا وہ بھی جانتا تھا؟اُس لمحے نوید پر ادراک ہوا کہ جو بات وہ خود سے بھی چھپائے پھر رہا تھا،اُسکا اشتہار تو پہلے ہی ساری دنیا میں لگا ہوا تھا۔ایک وہ ہی بیوقوف تھا۔انکشاف کا یہ مرحلہ اُس پر بھی شاق گزر رہا تھا۔

''یہی کرنے کی بات ہے حسین!میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص اتنا گر سکتا ہے صرف اپنی ذات کے لئے۔''

''حد میں رہو علی! بہت بکواس کرلی ہے تم نے۔۔۔''نوید کی آواز بلند ہوئی تھی۔

''مجھے میری حد بہت اچھے سے معلوم ہے۔حدود تو تم نے پار کی ہیں اپنی۔اور سچ تو یہ ہے کہ وہ لڑکی تمہارے لیے کبھی اہم تھی ہی نہیں، تم بس وقت گزار رہے تھے اُسکے ساتھ۔۔۔''علی کے الفاظ سلگتی سیخ کی مانند اُسکے دل میں پیوست ہوئے تھے۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔''حلق کے بل چیختے نوید کا ہاتھ بلند ہوا تھا اور علی کے چہرے پر زناٹے کے ساتھ پڑا تھا۔وہ لڑکھڑا کے پیچھے کی جانب ہوا تھا۔ حسین تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو کی مانند وہاں کھڑا تھا۔اُسکا دماغ ابھی ابھی دیکھے گئے منظر کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

''تم میری کردار کشی کر رہے ہو؟ہاں؟''نوید نے اُسکا گریبان پکڑ کے اُسے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔

''تمہارا کردار کتنا ہے، میں بہت اچھے سے جان چکا ہوں۔لہٰذا یہ دوغلا پن میرے سامنے تو مت ہی کرو۔''نوید اُس سے لمبا تھا، لیکن اِسکے باوجود علی نے اُسے پوری قوت سے دھکّا دیا تھا، جبکہ اُسکے الفاظ نوید پر کسی کاری ضرب کی طرح پڑ رہے تھے۔

''بس کرو خدا کے واسطے۔۔۔بس کر دو!''اِس سے پہلے کے نوید کچھ کرتا، حسین دونوں کے بیچ میں آیا تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے علی؟کیوں کر رہے ہو ایسے؟''حسین نے اُسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟مجھے؟''وہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''تم لوگوں نے بیچ راستے میں مجھے چھوڑا ہے۔پہلے مقدّم، پھر نوید اور آج عمر بھی۔۔۔''علی کی آواز میں دکھ تھا۔

''کبھی جاننے کی کوشش بھی کی ہے کہ تمہارے دوست کیوں گئے؟مقدّم کیوں غائب ہوا؟عمر کیوں بنا بتائے چلا گیا؟کبھی اپنی ضد اور جنون سے باہر آ کر اپنے دوستوں کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے؟''نوید نے دھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دیکھو علی! سب کی اپنی مرضی ہے، اگر کوئی تمہارا ساتھ دینا نہیں چاہتا تو تم زبردستی نہیں کر سکتے۔لیکن میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں۔اور اگر رضا اس کیس کا حصّہ ہوتا تو وہ بھی آخر تک تمہارا ساتھ دیتا۔''حسین اُسے رسانیت سے سمجھا رہا تھا۔

''رضا؟ہونہہ۔۔۔''وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کریگا؟''وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔حسین تو اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''تم پاگل ہو چکے ہو علی! یہ کیس تمہارے حواسوں پر سوار ہو چکا ہے۔ ہم جتنا تمہارا ساتھ دے سکتے تھے ہم نے دیا، لیکن تم ہم سب کے بارے میں اس طرح سوچتے ہو گے، میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔''حسین نفی میں سر ہلاتے صدمے سی کیفیت میں کہتا پیچھے ہٹ رہا تھا۔

''میں ایسا نہیں سوچتا، اور نہ میں نے ایسا کبھی سوچا تھا۔ لیکن تم لوگوں کے رویّوں نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ مقدّم غائب ہوا۔ ٹھیک ہے، مان لیا اُسکے غائب ہونے کا کیس سے تعلق نہیں ہو گا۔ لیکن عمر؟ آج کے دن سے پہلے تک تو کبھی اُس نے ذکر بھی نہیں کیا تھا کہ وہ ملک چھوڑنا چاہتا ہے۔ کیوں گیا وہ آخر؟''علی سوال کر رہا تھا۔ اپنے دوستوں کا عین راستے میں چھوڑ جانا، اُسکا دل ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہم سب تمہیں جواب دہ ہیں؟ کیا ہماری زندگیاں نہیں ہیں؟ یا تم نے خرید لیا ہے ہمیں؟''اس آواز پر تینوں نے گردنیں گھما کر دیکھا تھا۔ رضا دروازے پر کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ چلتے علی کی جانب آ رہا تھا۔

''ہر شخص کو حق ہے اپنی زندگی کے فیصلے لینے کا، کیا ہم تمہارے پابند ہیں کہ تمہاری مرضی اور تمہاری اجازت کے بنا اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے؟''رضا اُسکے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کر رہے ہو تم یہ؟ میں پہلے ہی ان دونوں کو اتنی مشکلوں سے سمجھا رہا ہوں۔ اب تم کیوں شروع ہو گئے ہو؟''حسین کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی پاگل خانے میں آ گیا ہے، جہاں ہر کسی کو ایک دوسرے سے لڑنے کا بہانہ درکار تھا۔

''میں پچھلے کئی مہینوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح اس نے سب کی زندگیاں تباہ کر کے رکھ دی ہیں۔''انگلی سے علی کی طرف اشارہ کرتے اُس نے حسین کو جواب دیا تھا۔ اور علی تو جیسے پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔

''ہر کسی سے جواب طلب کر رہے ہو نہ تم؟ چلو اب تم بتاؤ۔ کیوں اہم ہے وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا؟''رضا نے سینے پر بازو باندھتے سکون سے اُس سے پوچھا تھا۔

''وہ میرے ڈرائیور کی بیٹی۔۔۔''علی لب بھینچے جواب دینے ہی لگا تھا کہ رضا نے اُسکی بات کاٹی۔

''ڈرائیور کی بیٹی؟ واقعی؟''اُس نے طنزیہ انداز میں بھنویں اچکائی تھیں۔

''صرف ڈرائیور کی بیٹی کے لیے کوئی اتنا نہیں کرتا کہ دوستی، انسانیت اور اخلاق سب کچھ بھلا دے۔ تم ہی بتاؤ کہ آخر اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے؟ جس تعلق کی قیمت تم ہم سے مانگ رہے ہو۔''زہر میں ڈوبے رضا کے الفاظ صرف علی کو ہی نہیں بلکہ نوید کو بھی چھلنی کر گئے تھے۔ جس لڑکی کو اس نے گھر میں بسانے کے خواب دیکھے تھے، جسے زندگی میں لانے کی خواہش کی تھی، اُس لڑکی کا ذکر وہ لوگ کس عامیانہ طریقے سے کر رہے تھے؟

''اپنی اوقات میں رہو رضا!''خونخوار لہجے میں کہتے علی نے اُسے جیسے دھمکی دی تھی۔

''میں اپنی اوقات میں ہی ہوں۔ تمہیں کیا لگ رہا ہے یہ صرف میرے الفاظ ہیں؟ ہم میں سے ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ تمہارے لیے آخر وہ اتنی اہم کیوں تھی؟ لیکن شاید باقی سب میں اتنی اخلاقیات تو تھیں کہ بنا تم سے کوئی سوال کیے ہی چلے گئے۔ لیکن تم ہم سب کو کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہو۔''رضا یہ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ اسے اُسکی اپنی ہی نظروں میں بری طرح گرا رہا تھا۔

''خاموش ہو جاؤ رضا۔۔۔خاموش ہو جاؤ!''بلآخر نوید پھٹ پڑا تھا۔

''تم ایک مری ہوئی، بے دردی سے قتل ہوئی لڑکی کے لیے یہ الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ کچھ تو خیال کرو وہ بھی کسی کی بیٹی ہی تھی۔''نوید نے جیسے التجا کی تھی۔

''اوہ۔۔۔میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہاں ایک نہیں دو دو شکار ہیں۔''رضا نے تو آج انتہا کر دی تھی۔ نوید تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج ہی کے دن میں وہ اس طرح ذلیل ہو گا۔ صرف حسین ہی نہیں رضا بھی یہ بات جانتا تھا۔ تو ایک وہ ہی گدھا تھا؟''تم دونوں ایک کام کیوں نہیں کرتے؟ اپنے آپس کے مسئلے خود حل کرو اور بخش دو ہم سب کو۔''وہ ہاتھ جوڑ کے کہتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا، حسین اُسکے پیچھے دوڑا تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر علی اور نوید باقی رہ گئے تھے۔ علی کے ماں باپ گھر پے نہیں تھے۔ اور فاطمہ اپنے کمرے میں تھی۔ نا معلوم اُس نے بھی یہ آوازیں سنی تھی یا نہیں؟

''میں نے اُسکے لیے تب بھی آواز اٹھائی تھی، جب میں جانتا بھی نہ تھا کہ اُس رات اغوا ہونے والی لڑکی صنوبر ہے۔''علی کو لگا کہ وہ رو دے گا۔ اپنے دوستوں کا یہ سلوک اور خصوصاً رضا کا لگایا گیا، الزام اُسکے لیے نا قابل برداشت تھا۔ نجانے کیوں اُس نے نوید کو وضاحت دی تھی؟ نوید چند لمحے اُسے دیکھتا رہا اور پھر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ علی تھک کے وہیں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اُسکے گال پر نوید کے مارے گئے تھپڑ کا نشان واضح تھا۔ فاطمہ وہاں آ کر اُسکے برابر بیٹھی تھی۔

''علی! کیا ہوا ہے یہاں؟ مجھے کچھ بتاؤ پلیز۔۔۔''وہ اُسکا بازو تھامے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ اُنکی آوازیں اُس نے بھی سنی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی۔

نہ حسین اندر واپس آیا، نہ رضا اور نہ ہی نوید۔ اُس رات علی کو اُسکے دوستوں نے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔

---------+---------+---------

''رضا!۔۔۔رکو رضا!''علی کے گھر سے نکلنے کے بعد حسین اُسکے پیچھے آیا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر رکا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم ہاں؟ اور کیوں؟''حسین اُسکے پاس آ کر رکا اور اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کیا ہے میں نے؟''اُس نے بے نیازی سے کہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''یہ جو اندر تم کر کے آئے ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے سمجھ نہیں آیا؟ تم تو جیسے لڑنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔اور آج یہ موقع تمہیں مل گیا تو تم نے اُسے غنیمت جانتے ہوئے،اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ہاں؟''اُس نے ایک لمحے کے لیے رضا کو حیران کر دیا تھا۔وہ اُسے اُسکی سوچ سے بھی زیادہ جانتا تھا۔اگلے ہی لمحے رضا نے خود کو کمپوز کیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، میں نے وہ کیا جو ضروری تھا۔''

''کیوں کیا تم نے ایسا آخر؟''حسین نے اُسکا بازو پکڑ کے اُسے جھنجھوڑا تھا۔

''کیوں تم ہم سب سے لاتعلق ہونے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے؟اور آج تم نے اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا۔کیوں رضا؟ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا؟ کم از کم مجھے تو بتاؤ یار! میں تمہارا بھائی ہوں۔''حسین کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ رضا نے اپنے بازو سے اُسکا ہاتھ ہٹایا اور سرد لہجے میں بولا۔

''میرا کوئی نہیں ہے،اور مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال بے تاثر لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ سمجھ گیا۔''حسین سر ہلاتے پیچھے ہوا۔آج وہ ہمیشہ کی طرح اُس پر دھونس نہیں جما سکا تھا۔''سمجھ گیا میں! میں آج سے اُس وقت تک تم میں سے کسی سے بھی نہیں ملوں گا،جب تک کہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے نہیں آ جاتیں۔''وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتا،مڑتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ اُنکی دوستی کی آخری رات تھی۔

اگر حسین ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تو اُسے نظر آتا،رضا آنکھوں میں ڈھیروں آنسوں لیے اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔اُس نے آج ایسا کیوں کیا تھا؟ صرف وہی جانتا تھا۔صرف وہی۔۔۔۔

---------+---------+---------

آخری پیشی

اُس رات کے بعد نوید کسی رات سکون سے نہ سو سکا،ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اب میڈیا پر اُسکا نام آئے گا،اب اچانک ہی پولیس کو پتہ چلے گا کہ عاصم نے آخری بار اُس سے بات کی تھی یا اب معلوم ہو گا کہ صنوبر سے اُسکا بھی کوئی تعلق تھا۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔آخری پیشی والے دن اُن میں سے کوئی نہیں آیا تھا علی کا ساتھ دینے،سوائے حسین کے۔۔۔

اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ وہاں آیا بھی تھا اور جج سے مطالبہ بھی کیا تھا کہ اُس دوسرے شخص کو تلاش کیا جائے، جو اُس رات عاصم کے ساتھ تھا۔ لیکن گواہ مضبوط نہ ہونے اور ثبوت ناکافی ہونے کی وجہ سے عدالت نے یہ کیس تاحیات بند کر دیا تھا۔ علی کو معلوم تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ وہ حسین سے ملے بنا وہاں سے نکل گیا تھا۔

نیوز چینل پر ہر جگہ کیس بند ہونے کی خبر آ رہی تھی۔ نوید کو ایک اطمینان سا محسوس ہوا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اپنی اس خود غرضی پر اُسے شرمندگی نے آگھیرا تھا۔ کئی مرتبہ سوچتا کہ جا کر علی سے ملے لیکن پھر اُسکے وہ الزامات یاد آتے جو اُس نے اس پر لگائے تھے۔ اُس رات کے بعد زندگی ایک ہی ڈگر پر چلنے لگی تھی لیکن پھر بھی، کچھ بھی نارمل نہیں رہا تھا۔ وہ دوستوں سے ملنا، ساتھ بیٹھنے کے منصوبے بنانا، پھر سب کو اکھٹے کرنا۔ سب کہیں کھو گیا تھا۔ مقدّم واپس نہیں آیا، عمر نے پلٹ کر کوئی رابطہ نہ کیا۔ حالانکہ وہ باہر جا کر اُن سے رابطہ رکھ سکتا تھا لیکن اُس نے ایسی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ علی سے تو شاید وہ اب مر کے بھی بات نہ کرتا۔۔۔ زندگی یکدم سے بہت خالی سی ہو گئی تھی۔

اُس رات کے بعد حسین نے رضا سے ملنے کی کوشش کی تو اس پر ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ رضا آخری بار جھگڑے والی رات ہی اپنے گھر سے نکلا تھا لیکن واپس نہیں آیا۔ اُسکے ماموں نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے پاس کینیڈا چلا گیا ہے۔ اگر حسین کے سامنے اُس نے اپنا آپ کھول کے نہ رکھا ہوتا، تو وہ شاید آسانی سے اس بات پر یقین کر لیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اُسے اپنے باپ سے کتنی نفرت تھی۔

ان سب کے باوجود بھی وہ رضا کو تلاش نہ کر سکا تھا۔ وہ رات اُنکی دوستی کے ساتھ ساتھ کئی راز لیکر فنا ہو گئی تھی۔

اور آج دس سالوں بعد ایک انجان قاتل نے اُنہیں پھر سے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

ایک قتل۔۔۔

جس نے اُنہیں جدا کیا تھا۔

اور ایک قتل۔۔۔

جس نے اُنہیں پھر سے اکھٹا کیا تھا۔

قسمت اب کیا چاہتی تھی؟

---------+---------+---------

موجودہ رات میں:

گھر خاموش تھا،اُسکابیٹااحمداور سفیر صاحب سو چکے تھے۔لیکن نیند اُسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔اپنے کمرے کی بالکنی میں آکر اُس نے ایک نظر سنان پڑی سڑک کو دیکھا۔آس پاس کچھ بھی مشکوک نظر نہ آیا،لیکن دل پھر بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔کوئی اُسکے قتل کا منصوبہ بنارہا تھا،وہ بھی نہ جانے کب سے؟یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔

علی نے بالکنی کی طرف کھلتے دروازے کو اچھی طرح بند کیااور اُسے لاک کرکے پوری تسلی کی۔دروازہ شیشے کا تھا۔اگر کسی نے اِسے توڑنے کی کوشش کی تو؟ دل میں ایک بے تکاسا خیال کوندا،وہ مزید خوفزدہ ہوا۔پھر اُس نے باری باری گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھے سے بند کیں۔

''مجھے گھر میں سی سی ٹی وی کی تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا،اور دروازے پر مسلح چوکیدار بھی رکھنا چاہیے۔''وہ دل ہی دل میں خود کو مطمئن کرنا چاہتا تھا پر کر نہیں پارہا تھا۔

آج خوف کی پہلی رات تھی،اور خوف کی پہلی رات ہمیشہ ایسی ہی گزرتی ہے۔

---------+---------+---------

''گھر کے آس پاس کسی بھی قسم کا کوئی بھی مشکوک انسان نظر آئے تو مجھے فوری اطلاع دینا،اور کوشش کرنا کی ہر گزرنے والے شخص پر نظر رکھو۔''لان میں کھڑا مقدّم اپنے تینوں چوکیداروں کو سمجھارہا تھا۔آج اُسکے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح نظر آرہے تھے۔شدید ٹھنڈ کے باوجود بھی ماتھے پر آتے پسینے کے قطروں کو بار بار پونچھتا وہ شدید مضطرب تھا۔

''صاحب!سب خیریت ہے نا؟''ایک چوکیدار نے پوچھا۔

''کیااسے بتاناچاہیے؟''اُس نے سوچا۔حالانکہ گارڈ پرانااور بھروسے کا تھا لیکن آج ملنے والی خبر نے،اُسکااپنے سائے پر سے بھی بھروسہ اٹھادیا تھا۔

''مسئلہ کوئی نہیں ہے۔مجھے معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں ساتھ والی گلی میں ڈکیتی کا واقعہ ہوا ہے۔تو میں احتیاطی تدابیر کرنا چاہتا ہوں بس۔''اُس نے جواب دیا۔

''اب تم لوگ جاسکتے ہو۔''تینوں سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔اُس نے چہرہ گھما کر گھر کا جائزہ لیا۔دیواریں بہت اونچی نہیں تھیں،کوئی بھی باآسانی پھلانگ سکتا تھا۔

''دیواروں پر بجلی چھوڑنے والے جنگلے لگوانے ہونگے۔''اُس نے دل میں سوچا۔آج سے پہلے ایسی ضرورت پیش نہیں آئی تھی،پر آج کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

''آخر کون مارنا چاہتا ہے مجھے ؟اور کیوں ؟اور مارنے والا ہے کون ؟ بھلا اُس نے مجھے مارنے کے لیے کس قسم کا منصوبہ بنایا ہو گا؟ کیا وہ مجھے گولی مار کر قتل کرنا چاہتا ہے ؟ یا نیند میں گلا دبا کر ؟ یا کچھ اور ؟''وہ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا؟اُسے احساس ہوا کہ اُسکے پاؤں کانپ رہے ہیں۔یہ سب اتنا آسان نہیں تھا،ایک شخص سے اُسکی جان کا تحفظ چھین لیا جائے،تو اُسکے لیے دنیا کی ہر شے بے معنی ہو جاتی ہیں۔اُسکا سیکریٹری اُسے اگلے دن ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات بھیج رہا تھا۔پر اُسکا دل ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں اب کیا ہونے والا تھا؟

---------+---------+---------

اپنے گھر کے کچن میں کھڑا عمر فریج میں منہ دیے کھڑا تھا۔شاید وہ کھانا کھا کر اُسے ڈبوں میں بند کر کے فریج میں رکھ رہا تھا۔تب ہی اچانک اُسے اپنے کمرے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔وہ رکا،پھر سیدھا ہو کر فریج بند کیا۔

''یہ کیسی آواز تھی؟''دل میں سوچا۔کافی دیر کھڑا سوچتا رہا پر آواز دوبارہ نہ آئی۔

''وہم ہو گا میرا۔''خود کو تسلی دی۔پھر لاؤنج میں رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندی تو مقدّم کی شکوہ کرتی آنکھیں یاد آئیں۔دل اُداسی سے بھر گیا۔وہ پچھلے ماہ علی کے ساتھ اُسکے آفس گیا تھا۔تب نہیں جانتا تھا کہ سامنا مقدّم سے ہو گا۔

''پتہ نہیں،اُسے یہ بات معلوم بھی ہے کہ نہیں ؟''اُس نے سوچا۔اُس روز مقدّم نے اُنہیں واقعی نہیں پہچانا تھا۔

اور آج ایف آئے اے کے دفتر جاتے ہوئے اُسے اندازہ نہیں تھا کہ رضا اور نوید سے بھی سامنا ہو جائیگا۔

''کتنا بدل گئے ہیں سب ؟''ساتھ گزارے ماضی کے کچھ گمشدہ لمحے،مُبہم سے انداز میں ذہن میں گھومنے لگے۔وہ اسی طرح سر ٹکائے بیٹھا رہتا اگر جو چھناکے کے ساتھ شیشہ ٹوٹنے کی آواز نہ آتی۔آواز اوپر والے کمرے سے آئی تھی۔وہ الرٹ ہوتا سیدھا ہو بیٹھا۔

''کون ہے اوپر ؟''اُس نے خود سے سوال کیا۔

''وہ قاتل ؟''ذہن نے جواب دیا۔اُسکا دل زور سے دھڑکا۔اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور پاس رکھا بھاری مجسمہ ہاتھوں میں اٹھا لیا۔پھر وہ آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے کمرے کے دروازے کے باہر آ رکا،اُس نے یہاں وہاں دیکھا پر کوئی نہ تھا۔

''کیا مجھے اندر جانا چاہیے ؟ یا کسی کو بتانا چاہیے ؟''اُس نے سوچا۔

''لیکن اگر اندر کوئی نہ ہوا؟ اور یہ صرف میرا وہم ہوا تو؟'' اُس نے تھوک نگلتے ہوئے دروازے پر ہاتھ رکھا اور اگلے ہی لمحے اُسے جھٹکے سے کھولتا اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا، لیکن شیشے کا شوکیس نیچے گر کر چور چور ہو چکا تھا۔ کمرے کی سڑک کی جانب کھلتی کھڑکی بھی کھلی تھی۔ وہ اسی طرح آہستہ سے قدم بڑھاتے باتھرُوم تک گیا اور اُسے بھی کھول کر دیکھا، پر وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ابھی وہ باتھرُوم کے دروازے پر ہی تھا کہ اُسے کسی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ جیسے کوئی کچھ گھسیٹ رہا ہو۔ اُسکا دل اُچھل کر حلق میں آیا۔ سہم کر پیچھے دیکھا، اگلے ہی لمحے اُسکی جان میں جان آئی تھی۔ وہ ایک بلی تھی، جو پیروں میں کوئی تھیلا گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ شوکیس بھی اُسی نے گرایا تھا، اور وہ یقیناً کھلی کھڑکی سے اندر آئی تھی۔ اُس نے سکون کا سانس خارج کیا۔ پھر بلی کو گود میں اٹھاتے ہوئے کھڑکی کو سختی سے بند کیا۔ اور کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر ایک پیالے میں تھوڑا سا دودھ نکالا، اور مرکزی دروازے کے باہر رکھتے ہوئے بلی کو وہیں چھوڑ دیا۔ پھر دروازے کو بھی اچھی طرح بند کرتے ہوئے اندر آیا۔ آیت الکرسی اور دیگر سورتیں پڑھ کر گھر کے ہر کونے میں اچھی طرح دم کیا پھر واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُسکا دل ابھی بھی بے قابو ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے اُسکے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔

یہ صورتحال اُسکی زندگی میں آنے والی تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اعصاب شکن ثابت ہو رہی تھی۔

---------+---------+---------

وہ اپنے ذاتی آفس میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ کل جو کچھ ہوا تھا، اُسے قبول کرنے میں اُسے پوری رات لگ گئی تھی۔ اور اب صبح سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ کسی نے اُسکے آفس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آ جاؤ!'' اُس نے کرسی سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھول کر عمر اندر داخل ہوا تھا۔ علی حیران ہوا۔ وہ کم ہی اُسکے آفس آتا تھا۔ زیادہ تر وہ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات، اُس کمرے میں کرتے تھے جو اُنکا اسٹوڈیو اور مشترکہ آفس تھا۔ وہ خاموشی سے اُسکے سامنے والی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان اب میز حائل تھی۔ عمر میز پر کوئی فائل رکھے اُسکے صفحات آگے پیچھے کر رہا تھا۔

''یہ دیکھو! ہمارا جنرل منیجر آفاق، پچھلے دو سال سے کمپنی میں غبن کر رہا تھا۔ اور یہ سب وہ اتنی صفائی سے کر رہا تھا کہ اُس پر شک بھی نہ جا سکے۔'' عمر اُسے بتا رہا تھا۔

''یہ اُسکی ٹرانزیکشن (لین دین) ہے، جو وہ کمپنی کے اکاؤنٹس سے کرتا رہا ہے۔'' اُس نے فائل کا مطلوبہ صفحہ کھول کے، اُسے علی کی طرف بڑھایا۔ اُس نے اُسے لیکر مطالعہ شروع کیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا کرنا چاہیے ہمیں اسکے ساتھ؟'' علی نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''لیگل ایڈوائزر نے تو کہا ہے کہ اُس سے ڈیمیجیز (جرمانہ) لیکر اُسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ حالانکہ اس پر جیل تو بنتی ہے۔'' عمر نے بتایا۔

'' صحیح کہہ رہا ہے وہ، فلحال ہم کسی دشمنی میں نہیں پڑ سکتے۔ پہلے ہی جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہی کافی ہے۔ باقی تم جیسا بہتر سمجھو۔'' اُس نے اپنی رائے دی تھی۔

''میری بھی یہی رائے ہے، ہم اُس سے جرمانہ لیکر چھوڑ دیتے ہیں۔'' عمر نے بھی تائید کی تھی۔ دونوں ہی متفق ہو گئے تو، اُس نے علی سے فائل لیکر واپس بند کی تھی۔ کافی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، پھر عمر اٹھنے ہی لگا تھا کہ علی نے اچانک ہی اُسے مخاطب کیا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ کون یہ سب کر سکتا ہے؟'' وہ واپس بیٹھا اور نا سمجھی سے اُسے دیکھنے لگا۔

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اُسی کی، جسکی وجہ سے ہم کل ایف آئی اے کے آفس میں موجود تھے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں تو کل خود پوری رات جاگتا رہا ہوں۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ کس کو ہم سے اتنی گہری دشمنی ہو سکتی ہے؟'' گفتگو کا رخ نہ چاہتے ہوئے بھی کل کی طرف مڑ رہا تھا۔

''جو بھی ہے، معاملہ خطرناک ہے۔ ہماری فیملیز بھی ہیں۔ اگر ہماری جان خطرے میں ہے، تو اللہ نہ کریں اُنکی بھی۔۔۔'' علی نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اب کیا ہو گا؟ خیر میں چلتا ہوں، دوپہر میں ہماری لیگل ایڈوائزر سے میٹنگ ہے۔'' عمر بس اتنا ہی کہہ سکا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

علی اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کتنے عرصے؟ کتنے عرصے بعد اُن دونوں نے آپس میں کام کے علاوہ کوئی بات کی تھی؟ کتنے عرصے بعد اُن دونوں نے کسی شناسا کی طرح گفتگو کی تھی؟ تو کیا دس سال پہلے آئی دراڑ، بھرنا شروع ہو چکی تھی؟

ذہن کے پردے پر فلم کی طرح تمام مناظر چل رہے تھے۔ عمر اور اُسکا جھگڑا، وہ آخری رات جب وہ یہاں سے گیا تھا، وہ دن جب علی نے چھ سال بعد اُسے لفٹ میں دیکھا تھا اور وہ حیرت انگیز صبح، جب وہ آفس میں اُسکے نئے شراکت دار کے طور پر آیا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا وہ اُسکے بارے میں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ کل رات سے اُسے کسی پل چین نہیں آیا تھا۔ نوید کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ اپنے زہر میں بجھے وہ آخری الفاظ یاد آتے تھے جو اُس نے نوید سے کہے تھے۔ تھک کر اُس نے دوبارہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

وہ اُسے کیسے بتاتا؟ کہ پچھلے دس سالوں سے وہ اپنے کہے ایک ایک لفظ پر پچھتا رہا تھا۔

---------+---------+---------

پانچواں باب

واپسی

وہ ڈری سہمی اپنی تین سالہ بیٹی کو اپنے ساتھ چمٹائے، دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ خوفزدہ نظریں سامنے کھڑے اُس قبیح شخص پر جمی تھیں۔

''میں تمہاری ہر بات مانوں گی، اللہ کے واسطے میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ پلیز تقی!۔۔۔ پلیز'' تقی سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اور فاطمہ اپنی بیٹی کے ساتھ اُسکے قدموں میں ڈھیر، روتی ہوئی، اُس سے منت سماجت کر رہی تھی۔ اُسے روتا دیکھ کر اُسکی بیٹی بھی ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔ کچھ دیر قبل ہی اُسے تقی نے بیلٹ سے پیٹا تھا۔

''میری بچی معصوم ہے، اُسکے ساتھ ایسے مت کرو۔۔۔'' اُس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''مجھے معلوم تھا تم ایسا ہی کرو گی۔ اسی لیے اسکا حل میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔'' وہ سکون سے کہتا اُٹھ کھڑا ہوا تو، فاطمہ سہم کر پیچھے ہٹی۔

''ویسے بھی تمہاری بیٹی میں مجھے رتی برابر دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے پاس رکھی دیوارِ گیر الماری کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اُسے دم سادھے دیکھ رہی تھی۔

''تمہاری بیٹی کی ویسے بھی کوئی خاص قیمت نہیں مل رہی تھی مجھے، البتہ صرف تمہارے اوپر ترس کھا کر میں اپنے عربی کلائنٹ (گاہک) کو تمہاری بیٹی دے رہا تھا۔'' وہ الماری سے کوئی کاغذات نکال کر اُسکی طرف بڑھنے لگا۔ اُسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُسکی کوئی بات فاطمہ کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔

''لیکن تم اس لائق نہیں ہو کہ تم پر ترس کھایا جائے۔'' اُسکے قریب پہنچ کر اُسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُسکی گردن میں درد کی ٹیس اٹھی تھی، بیٹی روتے ہوئے اُس سے چپک گئی۔

''میرے عربی کلائنٹ نے تو مجھ سے تمہارا مطالبہ کیا تھا، لیکن صرف تم پر ترس کھا کر میں نے بدلے میں تمہاری بیٹی کی ڈیل کی تھی۔ لیکن۔۔۔'' فاطمہ کی سانسیں رکیں۔

''جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ تم ترس کھانے کے لائق نہیں ہو۔ اسی لیے اب تم ہی اُس کے پاس جاؤ گی، ویسے بھی تمہاری وہ کروڑوں میں قیمت ادا کر رہا ہے۔'' زہر خند لہجے میں کہتے اُس نے اُس کا سر دیوار پر دے مارا تھا۔ چوٹ سے زیادہ تکلیف اُسکے الفاظ سے ہوئی تھی۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟اپنی ہی بیوی کا سودا کرو گے ؟کتنے غلیظ انسان ہو تم۔''وہ چیخی تھی۔

''چچ چچ چچ۔۔۔تم سے کس نے کہا کہ تم میری بیوی ہو؟''اُسکے ہنسنے پر وہ لمحوں میں ساکت ہوئی۔۔۔

وہ کیا کہہ رہا تھا؟

''یہ دیکھو!''اُس نے وہ لفافہ جو کچھ دیر قبل وہ الماری سے نکال کر لایا تھا،اُس کے حوالے کیا۔اُس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ وہ لفافہ کھولا۔جبکہ وہ مکروہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔اُس نے کاغذات باہر نکالے۔

''طلاق نامہ؟''کاغذ ہاتھوں میں کانپ گیا۔وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تت۔۔۔تم مجھے طلاق دے رہے ہو؟''

''اوں ہوں۔۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''دے نہیں رہا، تین ماہ پہلے دے چکا ہوں۔ذرا غور سے تاریخ پڑھو۔''اُسکے سکون سے کہنے پر فاطمہ نے کاغذات کو پورا باہر نکالا۔وہ اُسے قانوناً طلاق دے چکا تھا۔لیکن کب؟ پچھلے چار ماہ سے تو وہ دبئی میں تھا۔آج ہی وہ واپس آیا تھا اور آتے ہی اُس نے فاطمہ کے سر پر یہ دھماکہ کیا تھا۔اُس پر تشدد تو وہ پہلے ہی کرتا تھا۔البتہ آج وہ اپنی بیٹی کے لیے اُسکے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی، جسکی سزا اب بھگتنا تھی۔

''اب تم میری بیوی نہیں ہو، چلو جلدی! تیاری پکڑ لو۔۔۔کل تمہاری شادی اُس عربی سے ہے۔اور تم اُسکے ساتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گی۔''وہ اُسکے ہاتھوں سے کاغذات واپس جھپٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں نہیں۔۔۔نہیں پلیز۔۔۔ایسا مت کرو۔تم مجھے مار و پیٹو۔لیکن ایسا نہیں کرو۔خدا کے لیے مت کرو۔''وہ روتے روتے اُسکے پیروں میں پڑ گئی تھی۔تقی نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک ٹھوکر اُسے دے ماری۔وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔وہ جانے کے لیے مڑا، پھر دروازے پر رکا اور اُسکی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے جانے کے بعد تمہاری بیٹی کی ذمے داری میری نہیں ہو گی، لہٰذا اُسے میں مار دوں گا۔''سرد لہجے میں کہتے وہ دروازہ بند کرتے باہر نکل چکا تھا۔

فاطمہ کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔جو گناہ وہ کر بیٹھی تھی،اُسکا خمیازہ وہ پچھلے تین سال سے بھگت رہی تھی۔لیکن اُسکی بیٹی؟اُسکی اُس معصوم بیٹی کا بھلا کیا قصور تھا؟اُسکے کیے کی سزا اُسکی بیٹی کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔

اُسکے سامنے سارے دروازے بند تھے، لیکن ایک دروازہ کھلا تھا۔۔

صرف ایک دروازہ۔۔۔

وہ جو کبھی بند نہیں ہوتا۔۔۔۔

فاطمہ آفندی اٹھی اور اپنے لہولہان وجود کو گھسیٹتی باتھ رُوم کے جانب بڑھی تھی۔ وضو کر کے وہ واپس آئی تو کمرے میں کوئی ایسی شے نہ ملی جسے مصلے کے طور پر بچھایا جاسکتا۔ وہ زمین پر ہی سجدہ ریزہ ہو گئی۔

''یااللہ!۔۔۔ یااللہ۔۔۔'' کتنی ہی دیر تک تو وہ بس اللہ کے نام کا ورد کرتی رہی، اُسے پکارتی رہی لیکن اُس سے آگے کچھ بول ہی نہ پائی۔

''یااللہ، میرے باپ نے۔۔۔ جس ہستی کے نام پر میرا نام رکھا تھا۔ میں اُنکے نام کی کبھی لاج نہ رکھ سکی۔ اُنہوں نے تو کہا تھا کہ میرا جنازہ رات کے وقت نکالنا، تاکہ کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔ اور میں۔۔۔ میں تو اللہ۔۔۔ دن کی روشنی میں اپنے سارے پیاروں کی عزت کو پامال کرتی، سارے اصول توڑتی۔۔۔ حرام حلال کا فرق کیے بنا گھر سے نکل گئی تھیں۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔'' وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر رہی تھی۔

''یااللہ! وہ جنّتی عورتوں کی سردار ہیں، حضرت فاطمۃ الزہرہؓ، اگر روزِ محشر اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ۔۔۔ میرے نام کی اتنی وقعت بھی نہ تھی تمہارے نزدیک؟ تو میں کیا کروں گی؟'' وہ روتی جا رہی تھی۔

''اللہ! میرے کیے کی سزا میری بیٹی کو نہ دیں۔۔۔ میری بیٹی کو یہاں سے نکال دیں میرے اللہ۔۔۔ میری بیٹی کو بچالیں۔'' وہ بس اپنی بیٹی کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ یقین تھا کہ بس وہی کر سکتا ہے۔ اور بس اسی کی ساری بادشاہت ہے، اُسی کا سب کچھ ہے۔ وہی کر سکتا ہے۔۔۔ بس وہی۔۔۔

گنہگار کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

کافر کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

بھٹکے ہوؤں کا سہارا بھی اللہ۔۔۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

---------+---------+---------

''اپنے بھائیوں کو بتا دیا ہوتا تو وہ آ جاتے۔ دونوں فارغ ہی تو تھے۔ اب بلاوجہ اتنے بھاری بھاری سامان یہاں وہاں گھسیٹنے پڑ رہے ہیں۔'' جزا کی ماں نے اُسے ٹیبل گھسیٹتے ہوئے دیکھ کر تاسف سے کہا۔ یہ ایک جملہ وہ صبح سے ڈیڑھ ہزار مرتبہ کہہ چکی تھیں۔ اُنہوں نے آج ہی اپنا گھر تبدیل کیا تھا، اور تبادلے کے سارے مراحل جزا نے اکیلے ہی طے کیے تھے۔ بنا کسی کی مدد کے۔

''آپکے بیٹے فارغ نہیں ہیں، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چھٹیاں منا رہے ہیں۔ اور ویسے بھی اُنہی کی وجہ سے ہم اس حال میں ہیں۔'' وہ ہمیشہ ایسے ہی صاف گوئی سے کام لیتی تھی۔

''جب دیکھو اپنے بھائیوں کے خلاف زہر اگلتی رہتی ہو۔'' اُنہوں نے ناراضگی سے کہا تو وہ چپ ہی رہی۔

''اب یہ جھاڑو کہاں ہے؟ مجھے کمرے کی صفائی کرنی ہے۔'' اُس نے جھنجھلا کے یہاں وہاں دیکھا۔

''جھاڑو ساتھ لانی تھی کیا؟'' اُسکی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب امی؟ آپ جھاڑو اُسی گھر میں چھوڑ آئی ہیں؟''

''جانے دو نہ، کل ماسی صفائی کرنے آئے گی تو وہ دیکھ لے گی۔'' اُنہوں نے معصومیت سے بات بدلی تھی۔

''امی یار!'' وہ بیزار ہوئی۔

''یار مت کہا کرو مجھے، کتنی مرتبہ کہا ہے؟'' وہ پھر سے غصّہ ہوئی تھیں۔

''مجھے اپنا کمرہ آج ہی سیٹ کرنا ہے۔ سارا دن پڑا ہے، اب میں ماسی کے انتظار میں ضائع تو نہیں کر سکتی۔''

''تو اب کہاں سے لاؤں جھاڑو؟ کہہ تو رہی ہوں کہ بھول آئی ہوں وہیں پر۔'' اب کہ انہوں نے بھی بیزاری سے کہا۔

''ایک کام کرتی ہوں، آس پڑوس میں کسی عورت سے مانگ لیتی ہوں۔''

''اے ہے۔۔۔ پاگل ہو گئی ہے کیا؟ اب محلے والوں سے جھاڑو مانگتی اچھی لگو گی کیا؟ ویسے بھی یہ ہمارے پرانے محلے جیسا علاقہ نہیں ہے۔ ہر طرف بنگلے ہیں، پتہ نہیں لوگ کیا سوچیں گے؟''

''ہاں تو یہ امیروں کا علاقہ بھی آپکے بیٹے نے ہی ڈھونڈا ہے۔ میرے اوپر بھروسہ کرتیں نہ تو اپنے ہی جیسے کسی علاقے میں گھر لیتیں، کم از کم لوگ تو اپنے جیسے ہوتے۔'' اُسکا پسندیدہ موضوع اپنے بھائیوں کی برائی کرنا تھا۔

''اتنا اچھا تو گھر ہے، اتنا صاف ستھرا علاقہ ہے۔ اور کون سا کرایہ تمہاری جیب سے جا رہا ہے؟ بھائی ہی دے رہا ہے تمہارا۔'' وہ سخت بدمزہ ہوئیں۔ گفتگو کا رخ پھر اُنکے بیٹوں کی جانب مڑ چکا تھا۔

''تو احسان نہیں کر رہا کوئی، اس حال میں ہم آئے بھی اُن دونوں کی وجہ سے ہی ہیں۔ خیر۔۔'' وہ کہتے کہتے رکی، اپنی ماں کے چہرے پر غضبناک تاثرات دیکھ چکی تھی۔

''میں جاتی ہوں، پڑوس سے جھاڑو لیکر آتی ہوں۔ میں نے ایک بزرگ خاتون کو دیکھا تھا صبح وہاں۔''

''پاگل ہو گئی ہو؟ کیوں پہلے دن ہی پینڈوؤں والی حرکت کرنا چاہتی ہو؟'' اُسکی ماں اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔ لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ اس بنگلے کو اُسکے بڑے بھائی نے اُنہیں کرائے پر لے دیا تھا۔ بنگلے کی اوپر والی منزل بند تھی۔ اُنکی رسائی بس نیچلی منزل تک ہی تھی۔ مالک مکان بھی اس ملک میں نہیں رہتا تھا۔ لان کی دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئی تھیں۔ وہ اس بنجر لان کو دیکھتی، مستقبل کیلئے اسکا حل سوچتی گھر سے باہر آئی۔ پھر پڑوس میں بنے اس خوبصورت سے گھر کو دیکھا اور بیل بجادی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا۔ وہی بزرگ خاتون جسے اُس نے صبح یہاں دیکھا تھا، دروازے پر تھیں۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' اُنہوں نے اتنی نرمی سے سوال کیا کہ وہ تو کھڑے کھڑے ہی اُنکی پرستار ہو گئی۔ خود وہ دھوپ کے مخالف کھڑی تھی، اُسکا چہرہ خاتون کو ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

''جی میں! صبح ہی پڑوس میں شفٹ ہوئی ہوں، اصل میں۔۔۔''

''باہر ہی کھڑی ہو کر بات کرو گی؟ اندر آؤ!'' اُسکی بات پوری ہونے سے پہلے ہی خاتون نے دروازہ پورا وا کرتے ہوئے کہا اور خود کنارے ہو گئیں تاکہ وہ اندر آ سکے۔ جزاتذبذب کا شکار کھڑی رہی، ایسے ہی کسی انجان کے گھر کیسے چلی جاتی؟

''آ جاؤ! اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔'' اُنہوں نے ایک بار پھر نرمی سے کہا تو وہ جھجھکتے ہوئے اندر آئی۔ خاتون نے اُسکے پیچھے دروازہ بند کیا اور اُسکی جانب مڑیں۔

''اصل میں نا! میرے پاس پورا دن پڑا ہے۔ اور مجھے گھر کی صفائی بھی کرنی ہے۔ لیکن کیا کروں میری امی بھی جھاڑو پرانے گھر چھوڑ آئی ہیں۔ اوپر سے گھر بھی اتنا گندا۔۔۔'' وہ اب دھوپ کے مقابل کھڑی اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔ صبح نو بجے کی چمکتی ہلکی دھوپ میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو خاتون اُسے دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئیں۔ سانولی رنگت پر سجی بے حد سیاہ آنکھیں، کھڑے اور بالکل برابر نین نقش، جیسے قدرت نے پرکار سے ناپ کر بنائے ہوں۔ چھوٹی سی پتلی اور کھڑی ناک، جس پر چمکتی لونگ ایسے تھی جیسے بنی ہی اسکے لیے ہو۔ پتلے اور چھوٹے سے ہونٹ، مسکراتی تو چیک بونز نمایاں ہوتی تھیں۔ لہروں کی

مانند بل کھاتے گھنگریالے بال کیچر میں مقید تھے۔بے حد سیاہ آنکھوں میں بھر بھر کر لگایا گیا کاجل اُسکی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔خاتون کو ماننا پڑا کہ اُنہوں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں کاجل اتنا جچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، جتنا اُس پر جچ رہا تھا۔وہ سانولی رنگت والی لڑکی بلاشبہ بے انتہا خوبصورت اور پرکشش تھی۔

جیسے مرہٹ کی کوئی گمشدہ شہزادی۔۔۔

یا دیواروں میں چنوائی گئی، سلیم کی انارکلی۔۔۔

کتنی ہی دیر وہ یک ٹک اُسے دیکھے گئی تھیں۔وہ اتنی پرکشش تھی کہ مقابل کو چند لمحوں کے لیے آس پاس بھلادے۔خوبصورتی کی زندہ مثال۔۔۔

''آنٹی؟آپ سن رہی ہیں نا؟''وہ بے خیالی سے جزا کو دیکھے جا رہی تھیں کہ اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹی! سن رہی ہوں، تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں جلدی ہے تو اسی لیے آج اندر نہیں بلا رہی۔میرا ملازم تمہیں مطلوبہ سامان دے جائیگا۔دوپہر کو جب بچے آئینگے تو میں اُنہیں بھی تمہاری مدد کے لیے بھیج دوں گی۔''

''بچے؟''

''ہاں! میرے بچے، ابھی اسکول گئے ہوئے ہیں۔''

''نہیں نہیں آنٹی! بچوں کو تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں کرلوں گی خود۔''

''پریشان نہ ہو، میرے بچے خوشی خوشی تمہاری مدد کو راضی ہوں گے۔پھر جب تمہارا گھر سیٹ ہو جائے تو میرے گھر آنا ناشتے پر، امی کو بھی لانا۔''

''شکریہ آنٹی آپکا۔''وہ مشکور ہوتی جانے کے لیے مڑی۔

''عائشہ۔۔۔''اُنہوں نے کہا۔

''جی؟''اُس نے رک کر ناسمجھی سے اُنہیں دیکھا۔

''عائشہ نام ہے میرا، بچے مجھے عائشہ جی کہتے ہیں۔تم بھی مجھے عائشہ جی کہو تو اچھا لگے گا۔''اُنہوں نے نرمی سے کہا تو جزا کو حیرت ہوئی کہ اُنکے بچے اُنہیں امی کہنے کے بجائے عائشہ جی کیوں کہتے ہیں؟

''جی ٹھیک ہے۔''وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔اُن سے رخصت ہو کر وہ باہر آئی۔اور گھر کے باہر لگی اس تختی کو دیکھا جس پر گھر کا نام جلی حروف میں لکھا تھا۔

''پناہ گاہ''

---------+---------+---------

آج کل کام بہت زیادہ تھا،اُسکی تین بڑی ٹیموں میں سے دو تو اب تک کام کے لیے گئی ہوئی تھیں،جب کہ تیسری ٹیم آفس میں ہی اندرونی کام سرانجام دے رہی تھی۔اُسکی مصروفیات بھی کافی زیادہ تھیں۔

بلیو جینز پر آف وائٹ شرٹ پہنے اور اُس پر نیوی بلیو جیکٹ ڈالے،وہ اس وقت بھی فائلوں میں سر کھپائے بیٹھا تھا۔ٹیبل پر رکھی چائے کا بڑا سا مگ کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

''سر!میں اندر آجاؤں۔''دروازے پر کھڑے اُسکے سکریٹری نے دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی تھی۔اُس نے چہرہ اٹھایا،کام کی زیادتی اور بوجھ سے اُسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ہاں!آجاؤ۔''

''سر!میرا کام ہو گیا ہے۔میں جا سکتا ہوں؟''اُس نے پوچھا تو مقدّم نے حیران ہوتے ہوئے ہاتھ میں بندھی گھڑی دیکھی۔

''سات بج گئے؟باقی سب کہاں ہیں؟''وہ حیران ہوا۔کام میں اتنا مصروف تھا کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔

''سب تقریباً جا چکے ہیں،ایک دو رہ گئے ہیں وہ کام مکمل کر رہے ہیں۔''

''ٹیم آگئی؟''

''ٹیم احتشام کا کام مکمل ہو گیا ہے،راستے میں ہے آدھے گھنٹے تک پہنچ جائیگی۔ٹیم بدر ابھی تک کلائنٹ کے آفس میں ہی ہے۔''اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''ہمم۔۔۔ہمارے آفس میں جو لوگ اوور ٹائم کر رہے ہیں،اُن میں خواتین کتنی ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''پانچ لوگ اوور ٹائم کر رہے ہیں،دو خواتین ہیں۔''

''خواتین سے کہو کہ لیپ ٹاپ لیکر گھر چلی جائیں اور رات تک کام مکمل کر کے بھیج دیں۔مرد اگر رکنا چاہیں،تو رک کر کام مکمل کر لیں ورنہ وہ بھی گھر سے کام کر سکتے ہیں۔''اُس نے حکم دیتے ہوئے واپس فائل میں سر جھکایا۔

''ٹھیک ہے سر!میرے خیال سے آپ کو بھی گھر جانا چاہیے۔''سیکریٹری نے کہا۔

''کیوں؟''

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔''اُس نے مقدّم کا سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

''نہیں! میں ٹھیک ہوں، کچھ چیزیں مکمل کرلوں پھر چلا جاؤں گا۔ تم بھی جا سکتے ہو۔''اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے!'' وہ چلا گیا۔

مقدّم نے بھی کچھ دیر میں اپنا کام مکمل کیا اور گردن سیدھی کرنے کے لیے کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ چھت اُسکے سامنے تھی اور وہ کل کے واقعات کو سوچ رہا تھا۔ رضا، عمر، علی اور نوید کو سوچ رہا تھا۔ اُنکی بے اعتنائی یاد کر رہا تھا۔ عمر کی گم صم نظروں کو یاد کر رہا تھا۔

اُنہیں کون قتل کرنے والا تھا؟ کون اُسکا دشمن تھا؟ اس سب سے زیادہ حیران کن اُسکے لیے اُن سب کا رویّہ تھا۔ کیا ہوا تھا آخر اُن سب کو؟ کیوں اس طرح کھڑے تھے جیسے جانتے تک نہ ہوں؟ چلو مقدّم کے بنا بتائے جانے پر اگر وہ صرف اُسکے ساتھ ہی ایسا رویہ رکھتے تو کوئی بات بھی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ وہ اسطرح کیوں کر رہے تھے؟ اُسے نہیں یاد تھا کہ کبھی وہ اپنے دوستوں میں کھڑا ہوا اور اُسے اس حد تک گھٹن محسوس ہوئی ہو۔ کل جب تک وہ وہاں رہا، اُسکا دل کیا کہ وہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

''آخر کیا ہوا تھا میرے جانے کے بعد؟''سوچ سوچ کر دماغ پک رہا تھا۔ چھت پر نِگاہیں ہنوز مرکوز تھیں۔ میز پر رکھا فون بج اٹھا، اُس نے سیدھے ہو کر سکرین پر نظر آتے نام کو دیکھا۔

''اخلاق کالنگ''نام دیکھ کر یکلخت ہی اُسکی پریشانی غائب ہوئی تھی۔ چہرے پر عقیدت مندانہ مسکراہٹ در آئی۔ فون اٹھا کر کان سے لگایا اور دوبارہ کرسی پر گر گیا۔

''یاد آگیا کہ تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟''اُس نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

''ابھی پرسوں ہی بات کی تھی تم سے۔''دوسری جانب اخلاق ہلکے سے ہنسا۔

''اور کل؟''وہ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

''اوہ خدا!۔۔۔بچوں کی طرح کرتے ہو تم کبھی کبھی، یاد کرو! کل جناب خود مصروف تھے۔ میرے میسیج کا جواب بھی رات کو دیا تھا۔ اب بتاؤ ذرا، تم کہاں تھے کل سارا دن؟''

''میں؟''وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے بتائے یا نہ بتائے؟ وہ پریشان ہو جائیگا۔

''ہاں ہاں! تم۔۔۔''وہ برا پھنسا تھا۔

''میں نے کہاں ہونا ہے؟کام اتنا زیادہ ہوتا ہے آج کل،اُسی میں مصروف ہوتا ہوں۔ابھی بھی آفس میں ہی ہوں۔''اُس نے اصل بات چھپانا مناسب سمجھا تھا۔

''اچھا چلو! تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔''اُسکے آسودہ لہجے پر مقدّم سیدھا ہو بیٹھا۔

''تم کراچی آرہے ہو؟''

''نہیں بھائی!۔۔۔تمہاری تان ہمیشہ میرے کراچی آنے پر ہی کیوں ٹوٹتی ہے؟''وہ اُسکے بچپنے پر ہنسا تو وہ بیزار ہو کر واپس کرسی پر ڈھے گیا۔

''کیونکہ میری تو ایک ہی خوشی ہے کہ تم کراچی آؤ اور آکر ابا کی فرم سنبھالو تاکہ میرا بوجھ کچھ کم ہو۔''

''نہ۔۔۔میں اپنی سیاحت میں خوش ہوں۔یہ بوجھ تمہیں مبارک!''

''پھر کونسی خوشخبری سنانے کو فون کیا ہے؟''اُس نے جل کے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا نہ کہ مکرم کے لیے کیئر گیور(caregiver)کا انتظام کر دوں۔''کچھ ماہ سے مقدّم اپنے بیٹے کے لیے کیئر گیور کی تلاش میں تھا اور مکرم کے لیے وہ کسی پر اتنی آسانی سے بھروسہ بھی نہیں کرتا تھا۔اسی لیے اخلاق کو کہا تھا۔

''ہاں! تو کیا مل گئی؟''

''یہی سمجھ لو،وہ کیئر گیور تو نہیں لیکن مکرم کی ذمے داری بانٹنا چاہتی ہیں۔''

''کس کی بات کر رہے ہو؟کھل کر بتاؤ۔''

''شیریں کی بہن،جو ڈاکٹر بن رہی تھی۔وہی ملی تھی پچھلے دنوں مجھ سے۔''

''شیریں کی بہن؟وہ تو کافی چھوٹی نہیں تھی؟''مقدّم کو یاد آیا۔

''اب ساری زندگی چھوٹی تو نہیں رہے گی نہ؟ڈاکٹر بن گئی ہے۔ہاؤس جاب بھی مکمل کر لی ہے اُس نے،اب کراچی کے کسی نجی ہسپتال میں نوکری لگی ہے اُسکی تو اسی لیے کراچی شفٹ ہو رہی ہے۔مجھ سے مکرم کے سلسلے میں ہی ملنے آئی تھی۔''وہ تفصیل سے بتا رہا تھا۔

''مجھے اُسکا نام بھول گیا ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا

''مقدّس۔۔۔ مقدّس نام ہے اُسکا۔''

''ہمم۔۔۔ لیکن میں اس کو مکرم کی ذمے داری کیوں دوں؟ اور اُس پر بھروسہ ہی کیوں کروں؟'' اس سوال پر دوسری جانب خاموشی چھائی رہی تھی۔

''یہ تم پوچھ رہے ہو؟ تم جانتے ہو کہ وہ مکرم کی خالہ ہے۔ سگی خالہ۔۔۔'' کافی دیر بعد اخلاق سنجیدگی سے بولا تھا۔

''ہاں لیکن! کیا تم بھول گئے کہ اُن لوگوں نے پچھلے دو سالوں سے اُسکی کوئی خبر نہیں لی ہے؟ اب میں کیسے اپنے بچے کے لیے اُن کا احسان لوں؟''

''وہ مکرم سے ملنا چاہتی ہے۔ خالہ ہے اُسکی، دل میں محبت تو ہو گی نا۔''

''اور تم نے اُسے پوری ذمے داری ہی دے دی؟'' وہ ناراض ہوا۔

''اِس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم کسی غیر پر بھروسہ کرو، اُس سے اچھا نہیں کہ مکرم کے خون پر ہی بھروسہ کر لو؟ وہ کسی بھی کیئر گیور سے زیادہ خیال رکھے گی اُسکا۔ اور ویسے بھی خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے۔'' وہ رسانیت سے سمجھا رہا تھا۔

''پچھلے دو سالوں سے میں نے اُسے اکیلے پالا ہے۔ اُن لوگوں نے پوچھا تک نہیں، اب میں کیسے مان لوں کہ اچانک سے اُسکی یاد آ گئی؟ مجھے بھروسہ نہیں ہے اُس پر۔۔۔'' اُس نے قطعی لہجے میں کہا تو اخلاق نے گہری سانس لی پھر گویا ہوا۔

''بے شک تم بھروسہ نہ کرو، لیکن تم اُسے مکرم سے ملنے سے روک تو نہیں سکتے نا؟ وہ اُسکی سگی خالہ ہے۔''

''اگر وہ خالہ ہے تو میں بھی۔۔۔'' وہ تیزی سے کہتے کہتے رکا اور پھر رکا ہی رہ گیا۔

''میں تمہیں یہی سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ کوئی بھی مکرم کو تم سے نہیں چھین رہا۔ مقدّس بھی مجبور تھی ان روایتوں کی وجہ سے، اسی لیے نہیں آ سکی کبھی ملنے، لیکن اب اس کے پاس موقع ہے۔ اور دیکھو! وہ بس ملنا ہی تو چاہتی ہے۔ میں نے کب کہا کہ کیئر گیور کے طور پر رکھ لو اُسے، پہلے دیکھو، پرکھو اور اگر ٹھیک لگے تو سو بسم اللہ۔۔۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میرا کوئی حق نہیں مکرم پر؟'' ساری باتوں سے اس نے یہی اخذ کیا تھا بس۔

''تم اتنا غلط کیوں سوچتے ہو؟ میں نے کب کہا کہ تمہارا حق نہیں ہے؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم اُسکے باپ نہیں ہو۔'' سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ مقدّم کو بھی اس وقت وہ کڑواہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''کب تک آئیگی وہ؟'' اُس نے بہت ہی سنجیدہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''کل یا پرسوں تک۔''اخلاق نے گہری سانس بھرتے ہوئے بتایا۔یقیناًوہ روٹھ چکا تھا۔

''تمہارا ایڈریس دے دیا ہے، پہنچ جائیگی۔تم پہچان تو لوگے نا؟''

''معلوم نہیں،اُسے جب دیکھا تھا تو وہ بہت چھوٹی تھی۔خیر !آئیگی تو مل لوں گا۔ابھی مجھے کچھ کام ہے۔پھر بات کروں گا تم سے۔''سنجیدگی سے کہتے وہ فون رکھنے لگا۔

''ناراض ہو گئے؟''دوسری طرف سے پوچھا گیا تو وہ رکا۔

''بعد میں بات کرتے ہیں۔''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔

''ٹھیک ہے،خیال رکھنا اپنا۔''اُس نے بھی فون کاٹ دیا۔

وہ ٹیبل پر فون پھینکتے ہوئے ماتھا مسلنے لگا تھا۔مکرم اُسکا بیٹا نہیں تھا۔یہ بات وہ کیوں بھول جاتا تھا؟

---------+---------+---------

میک اپ آرٹسٹ نے بڑی مہارت سے اُسکے چہرے پر آئے زخم اور آنکھوں کے نیچے چھائے حلقے چھپائے تھے۔سفید میسکی پر گلابی رنگ کا دوپٹہ ڈالے وہ تیار تھی۔اُسکی بیٹی پاس ہی بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔

وقت قریب آرہا تھا،اور اُسکا دل ڈوبتا جارہا تھا۔

مت کرو فاطمہ !دیکھو احمد کتنا چھوٹا ہے۔کیسے رہے گا تمہارے بنا؟

کسی کے التجا کرتے الفاظ کانوں میں گونجے۔بڑے غلط وقت پر علی یاد آیا تھا۔

میں تمہاری ہر غلطی معاف کر دوں گا، کبھی بھول کے بھی ذکر نہیں کروں گا ماضی کا، لیکن یہ مت کرو۔واپس چلو میرے ساتھ۔تمہارا بیٹا برباد ہو جائیگا

کتنی تڑپ تھی اُسکی آواز میں؟لیکن فاطمہ تب اندھی، بہری، گونگی سب ہو گئی تھی۔اُسکے سر پر تو شیطان سوار تھا۔ وہ کیسے اُسکی بے لوث محبت کو پہچانتی۔ لیکن اب کیا فائدہ تھا پچھتانے کا؟

''اب کیوں رو رہی ہو؟یہ تو یہاں آنے سے پہلے سوچنا تھا نا''اُسے تیار کرنی والی آرٹسٹ نے کہا تو وہ ساکت ہوئی۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟''اُس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''میں سب جانتی ہوں، میں بھی اسی آدمی کے جال میں پھنسی تھی کبھی، بعد میں بہت پچھتائیں، لیکن کیا فائدہ؟اب میں نے اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔تم بھی کر لو۔'' وہ بیگانگی سے کہہ رہی تھی۔

''میں اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر لیتی لیکن میں اپنی بیٹی کا کیا کروں؟ جسے یہ آدمی بیچ دے گا یا مار دیگا۔''اُس نے دکھ سے کہا تو اس عورت نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہاری بیٹی بھی ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں!۔۔اور میرے کیے کی سزا اب وہ بھگتے گی۔''وہ سر جھکائے ہچکیوں سے رو دی۔وہ عورت کچھ دیر اُسکی بیٹی کو دیکھتی رہی، پھر گویا ہوئی۔

''یہاں سے ہلنا مت میں ابھی آرہی ہوں۔''وہ آہستہ سے کہتی باہر نکل گئی، جبکہ خود وہ سر جھکائے روتی رہی، کچھ ہی دیر میں وہی عورت واپس آگئی۔

''یہ لو، اسے پہنو اور جب تک میں نہ کہوں یہاں سے باہر مت آنا۔''اُس نے ایک کالے رنگ کی شے اُسکی جانب بڑھائی تو وہ حیران ہوتی اُس چیز کو کھولنے لگی۔وہ ایک عبایا تھا۔

''یہ؟''اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''میں تمہاری بیٹی کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں یہاں سے نکالنا میرا کام ہے۔اور یہاں سے آگے اپنی اور اپنی بیٹی کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔''اتنا کہہ کر وہ دوبارہ باہر چلی گئی۔تو کیا اللہ کی مدد آگئی تھی؟اتنی جلدی؟فاطمہ نے سوچا۔

باہر آتے ہی پہلے اُس نے گارڈ کو دیکھا۔وہ جانتی تھی کہ اس وقت تقی گھر پر نہیں ہے۔

''وہ بھاگ گئی۔۔۔وہ بھاگ گئی۔۔''عورت نے اچانک ہی باآواز بلند چیخنا شروع کر دیا۔گارڈز اسکو چلاتا دیکھ کر حرکت میں آئے۔

''وہ پیچھے والے دروازے سے بھاگی ہے، تمام گارڈز کو جمع کرو اور اُسکے پیچھے جاؤ۔ تقی صاحب کے آنے سے پہلے اُسے ڈھونڈو، ورنہ ہم مارے جائیں گے۔'' چلا چلا کر بولتی وہ اُن سب کے چھکے چھڑا رہی تھی۔گارڈز تیزی سے پیچھے کے دروازے کی جانب دوڑے تھے۔فاطمہ کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔

''جلدی کرو، وہ زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔''وہ مزید بلند آواز میں بولی۔جب تقریباً سارے گارڈز ہی پیچھے کی طرف چلے گئے تو وہ اندر آئی۔فاطمہ عبایا پہنے تیار کھڑی تھی۔

''جلدی کرو، وہ سب اس وقت حواس باختہ ہیں۔اسی لیے تمہیں ڈھونڈنے نکل گئے ہیں۔اب اسی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر تم سامنے سے نکل جاؤ۔جلدی کرو۔۔۔''وہ کہہ کر اُسے باہر دھکیلنے لگی۔اُسکی بیٹی اُسکی گود میں تھی۔

''اور تم؟''فاطمہ نے رک کر اُسے دیکھا۔

''میری فکر نہ کرو۔ابھی میرا وقت نہیں آیا۔لیکن تم اپنی بیٹی کو بچالو۔''وہ اُسے باہر کی طرف لے جانے لگی۔

''رک جاؤ، مجھے سامنے والے دراز سے اپنے طلاق کے کاغذات چاہیے۔''فاطمہ نے ایک کمرے کی جانب رک کر اشارہ کیا۔یہ کمرہ اور اُسکے دراز ہمیشہ لاک رہتے تھے۔لیکن آج سب کھلا تھا۔اُس نے اپنے رب سے مانگا تھا،اُسکے رب نے ہر شے اُسکے لیے آسان کر دی تھی۔اُس نے وہ سب کر دیا تھا،جو ناممکن لگتا تھا۔اسباب اُسکے محتاج ہیں،وہ اسباب کا محتاج تھوڑی ہیں؟

''جاؤ جلدی لیکر آؤ۔''عورت نے کہا تو فاطمہ بھاگ کر اندر گئی۔اور سب کچھ آسان کرنے والے اُسکے رب نے یہ بھی آسان کر دیا۔پہلے ہی دراز میں سب سے اوپر طلاق کے کاغذات رکھے تھے۔وہ کاغذات لیکر جلدی واپس آئی اور وہ لوگ پورچ میں پہنچے،وہاں گارڈز نہیں تھے۔

''فوراً نکلو یہاں سے،اور پلٹ کر مت دیکھنا۔''

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔اپنا نام بتادو۔''اُس نے عورت کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''چلی جاؤ۔۔۔جاؤ یہاں سے،جاؤ۔۔''وہ چلاتے ہوئے اُسے دھکیلنے لگی۔فاطمہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگتی ہوئی چلی گئی۔پتہ نہیں کیسے لیکن کسی گارڈ کی نظر اُس پر پڑ گئی۔اُس نے اُسے پہچان لیا حالانکہ وہ عبایا پہنی ہوئی تھی۔

''وہ بھاگ رہی ہے۔۔۔۔پکڑو اُسے۔۔۔۔گاڑیاں نکالو وہ بھاگ نہ جائے۔''تقی کے حوارین چلا چلا کر سب کو مطلع کر رہے تھے۔رات کے اس وقت اُس ولا میں کہرام مچ گیا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو لیکر بھاگ رہی تھی۔نہ راستے کا پتہ نہ منزل کا تعین۔۔۔بس پرواہ تھی تو یہ کہ اپنی بیٹی کی جان بچانی ہے،یا جان دے دینی ہے۔

''امی پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔''اُسکی تین سالہ بیٹی نے کراہتے ہو کہا۔

''بس تھوڑی دیر بیٹا!''

''نہیں میں اور نہیں بھاگوں گی۔''اُسکی بیٹی نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔اُس نے رک کر اپنی بچی کو دیکھا۔وہ واقعی اتنا نہیں بھاگ سکتی تھی۔پھر اُس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا۔اُن کے تعاقب میں آنے والوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔

اُس نے بچی کو لیکر دوڑ ناشروع کیا، کافی دیر چھپتے چھپاتے وہ بلآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی، جہاں خانہ بدوشوں کی پوری خیمہ بستی آباد تھی۔اُس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایااور اُس بستی میں جا گھسی۔کچھ دیر وہ ایک پرانی چادروں سے بنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی رہی، جب اُسے احساس ہوا کہ اُسکے تعاقب میں آنے والے آگے چلے گئے ہیں، تواُس نے سکھ کا سانس لیا۔

''کون ہو تم؟''ابھی وہ سکون سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔وہ ڈر کر اچھلی۔

''کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟دیکھنے میں تو کسی اچھے خاندان کی لگتی ہو۔کس سے بھاگ کر اس گندی بستی میں آئی ہو؟''بوڑھی عورت نے پے در پے سوالات کیے تھے۔

''میں مجبور ہوں، میری مدد کرو۔وہ میری بیٹی کو مار دینگے۔''اُس نے روتے ہوئے کہا۔

''کون مار دینگے؟''بوڑھی عورت اُسکے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''وہ۔۔۔میرا شوہر۔۔۔اور اُسکے آدمی۔وہ میری بیٹی کو امیر آدمی کو بیچنا چاہتے ہیں۔میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔یا تو وہ اسے بیچ دینگے یا مار دینگے۔''

''میں تو سمجھتی تھیں کہ یہ قباحتیں ہم غریبوں میں ہیں۔امیر بھی اسی گندگی کا حصہ ہیں۔خیر!تم فکر نہ کرو۔یہاں چھپی رہو، جب تک تمہیں اُسکا خوف ہے۔آگے میرا خیمہ ہے، میرے ساتھ میری پوتی ہوتی ہے۔''وہ کھڑی ہوئی اور ان دونوں ماں بیٹی کو پیچھے آنے کا کہا۔

''ہم دونوں گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔لیکن تم پریشان نہ ہو۔آنے والا اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔''بوڑھی عورت اُسکے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مختلف خیموں کے درمیان سے ہوتے ہوئے وہ اُسے ایک پرانے گندے سے خیمے میں لے آئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''اُس نے خیمے کے آگے رک کر اُس سے پوچھا۔

''فاطمہ۔۔۔فاطمہ آفندی۔''اُس نے اپنا نام بتایا۔

''اندر آجاؤ۔''وہ عورت اُسے اندر لے آئی۔اُسکے بعد ایک ہفتہ فاطمہ، اُس عورت کے پاس رکی رہی۔وہ روکھی سوکھی جو کھانے کو دیتی وہ صبر شکر سے کھا لیتی، یہاں تک کہ اُسکی بیٹی بھی خاموشی سے فاقے کر رہی تھی۔ایک وقت دودھ مل جاتا تو پی کر سو جاتی۔یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی اُسکے سابقہ شوہر کا گھر تھا لیکن وہ اُسے ڈھونڈھنے میں ناکام تھا۔اُس نے بس ایک بار اللہ سے مدد مانگی تھی اور اللہ نا جانے کہاں کہاں سے اُسکے لیے وسائل بنا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اللہ تھا، پوری کائنات اُسکی تھی تو یہ چھوٹے موئے مسئلے کیا بیچتے تھے اُسکے آگے؟

پورے ہفتے بعد جب اُسے لگا کہ اُسکی تلاش ختم ہو گئی ہے، تو اس نے بوڑھی عورت سے جانے کی بات کی تھی۔

''میں تمہیں یہاں کے مقامی لباس میں کل صبح تانگے والوں کے ساتھ بھیج دوں گی۔''

''تانگے والے کے ساتھ؟''

''ہاں! صبح یہاں کی ساری عورتیں و بچے تانگے پر نکلتے ہیں اور کام کے لیے شہر کی طرف جاتے ہیں، تم بھی ساتھ بیٹھ جانا۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔''
وہ علاقہ شہر کے مضافات میں تھا۔ ایک جانب پوش آبادی تھی تو دوسری جانب یہ خانہ بدوش بستی تھی۔ وہ ان محسنوں کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ اگلے دن اُس نے وہی کیا جو بوڑھی عورت نے کہا تھا۔ اُنکا مقامی لباس پہنے، چادر سے چہرہ ڈھانپے، وہ تانگے میں سوار تو ہو گئی لیکن اب جہاں وہ جا رہی تھی، پتہ نہیں وہ لوگ اُسے قبول بھی کرنے والے تھے یا نہیں؟

---------+---------+---------

آج وہ کافی دنوں بعد اپنی پرانے معمول کے مطابق گھر آیا تھا۔ ورنہ پچھلے کئی روز سے اُسے ڈیوٹی پر آدھی آدھی رات گزر جایا کرتی تھی۔ سنسان پورچ سے ہوتا وہ گھر میں داخل ہوا تو لاؤنج بھی خاموش پڑا تھا۔ کچن سے البتہ غیر معمولی طور پر کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ وہیں چلا آیا۔

''سلام صاحب!'' اُسے دیکھ کر سرکاری ملازمہ نے اُسے سلام کیا۔ بشریٰ پاس ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی، اُسکے دونوں بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مسکرائی جواباً، وہ بھی نرمی سے مسکرا دیا۔

''تم جلدی آ گئے؟'' اُس نے پلیٹیں اٹھا کر ملازمہ کو دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کام کم ہے آج کل۔''

''کھانا کھاؤ گے؟''

''ہاں!'' مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم منہ ہاتھ دھو لو۔'' وہ سر ہلاتے جانے لگا۔

''صاحب میں جاؤں؟'' ملازمہ کی آواز پر وہ رکا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

''ٹھیک ہے جاؤ!''اُسے اجازت دیتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔کالی کاٹن کی جیکٹ اُتار کر بستر پر رکھی، گھڑی اور والٹ رکھنے کے بعد جینز کی بیلٹ میں رکھی اپنی گن نکال کر دراز میں ڈالی اور واشروم چلا گیا۔کچھ دیر بعد وہ اُسی سفید پوری آستینوں والی پولو شرٹ پہنے، دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ کچن میں موجود تھا۔جہاں بشریٰ اُسکا کھانا گرم کر کے میز پر رکھ چکی تھی، اور اب بچوں کو کچھ سمجھا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''اُس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی سردی ہے، اور دونوں آئس کریم کھانے کی ضد کر رہے ہیں۔''اُس نے خفگی سے کہا تھا۔نوید نے ایک نظر اپنے بچوں کی دیکھا اور بولا۔

''تمہیں گھر میں آئس کریم لا کر رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی، اب بچے فریج میں دیکھیں گے تو ضد تو کریں گے۔''اُس نے پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا۔ بشریٰ کو اُسکا رویّہ بچوں کے ساتھ لاتعلق نہ صحیح لیکن لاڈ پیار والا بھی نہ لگتا تھا۔

''تو مجھے کیا معلوم تھا کہ اُنکی نظریں فریج تک پہنچ جائیں گی۔''وہ چڑ کر بولی۔

''خیر! اب ضد کر ہی رہے ہیں تو دے دو۔یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟''اُس نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔بچوں کے موضوع پر وہ اتنی ہی دلچسپی دکھاتا تھا بس! بشریٰ کو برا لگنے لگا۔

''کھا لیا تھا ان دونوں کو کھلاتے ہوئے۔''وہ بیزاری سے کہتے ہوئے فریج تک گئی اور آئس کریم نکال کے سلیب پر رکھی، پھر دو الگ الگ پیالوں میں سکوپ کی مدد سے آئس کریم نکالنے لگی۔اتنی دیر میں وہ بھی کھانا ختم کر کے برتن سنک میں ڈال چکا تھا۔وہ آئس کریم کے پیالے لیکر بچوں کے پاس آئی۔دونوں اپنے اپنے کھلونوں میں مگن تھے۔اُنکے سامنے پیالے لیے کھڑی رہی اور پھر کچھ سوچ کر اُس کی جانب مڑی۔

''آج تم ان دونوں کو آئس کریم کھلاؤ۔''اُس نے نوید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں!''مختصر سا جواب آیا۔وہ کچھ دیر سوچ میں پڑا رہا، پھر اٹھ کر بچوں کے پاس آ گیا۔اُس کے ہاتھوں سے دونوں پیالے لیے اور خاموشی سے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اُنہیں آئس کریم کھلانے لگا۔وہ غور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔بے حد سیاہ بالوں کے درمیان سے سرمئی مائل اور کچھ سفید بال جھانک رہے تھے۔چہرہ اس وقت بے تاثر تھا، اتنے سال اُسکے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ اُسکا رویہ سمجھنے سے قاصر تھی۔وہ بچوں کے ساتھ ویسا پیار اور ویسی محبت نہیں دکھاتا تھا، جیسا پیار اور محبت ایک باپ کا ہونا چاہیے۔اُنہیں آئس کریم کھلانے کے بعد اُس نے خاموشی سے پیالے اٹھا کر سنک میں ڈال دیئے۔وہ بھی نیپ کن سے دونوں کا منہ صاف کرنے لگی۔

''چلواب بس کرو، دونوں کے سونے کا وقت ہو چکا ہے۔''نوید نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''آج تم انہیں سلادو۔''وہ اُسے دیکھتا ہی رہ گیا، آج وہ انوکھی انوکھی فرمائشیں کر رہی تھی۔

''پلیز!''اُس نے التجا کی تو وہ گہری سانس لیتا جھکا پھر اُن دونوں کو گود میں اٹھائے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ بس اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ وہ نوید کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ جتنا وہ اُسے بچوں کے قریب لانے کی کوشش کرتی تھی، اُسکی ایک فیصد کوشش بھی وہ خود سے نہیں کرتا تھا۔ بھلا کوئی اپنی سگی اولاد سے بھی اتنا بیگانہ رویہ رکھ سکتا ہے؟ وہ جتنا سوچتی اتنا اُلجھتی جاتی تھی۔

--------+--------+--------

رات کے دس بج رہے تھے، کام تو سات بجے ہی ختم ہو چکا تھا لیکن وہ آج بھی اپنی ٹیم کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا، اسی لیے آفس میں رہا۔ نو بجے اُسکی ٹیم واپس آئی اور اُسے مختصراً تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد، تمام کام سمیٹ کر تمام لوگ باری باری چلے گئے، آفس تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اب وہاں صرف وہ ہی بچا، آخری آخری چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

کرسی کے برابر میں کھڑے، ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے وہ اُنہیں اپنے شیلف میں ڈال رہا تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ!''سرمئی پینٹ پر آف وائٹ شرٹ پہنے مقدّم نے بنا سر اٹھائے جواب دیا، پینٹ کا ہم رنگ کوٹ کرسی کی پشت پر پھیلا تھا۔ کالر کا بٹن کھلا تھا اور ٹائی غائب تھی، شرٹ کی آستینوں کے بٹن کھول کر اُسے کہنیوں سے ذرا نیچے کر کے، اُلٹا موڑ رکھا تھا۔ شکل سے کافی تھکا ہوا لگتا تھا۔ کاغذات اندر رکھتے اُسے اچانک ہی احساس ہوا کہ آفس میں وہ اکیلا تھا، تو پھر دستک کس نے دی؟ اگلے ہی لمحے اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور ساکت رہ گیا۔

ایک لمحے کو سانسیں تھمیں تھیں۔ وہ جہاں تھا وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔ یقین نہ آیا کہ وہ یوں اُس سے ملنے چلا آئیگا۔ بلیک پینٹ پر نیلی شرٹ پہنے، سینے پر بازو باندھے، اُسکے سامنے کھڑے عمر حفیظ کے چہرے کے تاثرات بھی مقدّم جیسے ہی تھے۔

''عمر!''حیرانگی سے اُسکا نام لیا۔

''تم یہاں؟''کل جب اُسے دیکھا تھا تو بہت دل کیا تھا اُس سے بات کرنے کو، لیکن کر نہیں پایا تھا۔

''کیسے ہو؟''سینے پر بندھے ہاتھ کھول کر جیبوں میں ڈالتا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ مقدّم کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ درمیان میں اب بس ایک میز تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم۔۔۔ تم بیٹھو۔''اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ سر ہلاتا ہوا عمر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مقدّم بھی اپنی جگہ سنبھالتے، اُسکا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ سر جھکائے، میز کو دیکھ رہا تھا۔ بتانے کو بہت کچھ تھا، لیکن کہنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ؟ کیا پوچھے اور پوچھے بھی تو کیسے؟

''تم نے بتایا نہیں؟''جب کافی دیر وہاں خاموشی رہی تو مقدّم نے خود ہی پوچھا۔ اُس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''یہی کہ تم اس وقت کیسے آئے؟''حتی الامکان لہجے کو پر سکون رکھا۔

''پتہ نہیں۔۔۔''گم صم سے لہجے میں کہتے وہ مقدّم کو نارمل نہیں لگا تھا۔

''میرا دل کیا تم سے ملنے کو، تو بس آ گیا۔''عام سے لہجے میں کہتے وہ اُسے حیران کر گیا تھا۔ اور اسی لمحے وہ اُسے پرانا والا عمر لگا تھا۔ جو لمبی لمبی باتیں نہیں کرتا تھا۔ یہ وہ بھی نہیں تھا، جو مہینے بھر پہلے اُسکے سامنے بیٹھا تھا اور وہ اُسے پہچان بھی نہ پایا تھا۔

اُس میں آج شناسائی آ گئی تھی، پرانا تعلق آ گیا تھا، دوستی آ گئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو عمر؟''وہ چاہ کر بھی اجنبیت نہیں برت سکا۔ اس ایک انسان سے وہ زیادہ دیر اظہارِ لاتعلقی کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''ہاں!''مختصر جواب دیتے اُس نے مقدّم کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں اس دن یہاں آیا تھا، علی کے ساتھ اور۔۔''وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔''اُس نے بات کاٹی''میں تم دونوں کو ہی پہچان نہیں سکا، شاید میرے تصوّر میں بھی نہیں تھا کہ سامنے تم لوگ ہو گے، اسی لیے۔۔۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تم دونوں تھے۔''شروعات ہو رہی تھی، وضاحتیں دی جا رہی تھیں، دراڑ بھرنے لگی تھی۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں پہنچانا عمر؟ تم مجھے بتا سکتے تھے۔ میرا نام لے سکتے تھے۔''شکوے بھی ہونے لگے تھے۔ عمر حیران سا اُسے دیکھے گیا۔ ہاں! وہ شکوہ کر سکتا تھا۔ وہ دیوار گرانے میں پہل کر سکتا تھا۔ کیوں کہ جب جھگڑا ہوا تھا، تب وہ یہاں نہیں تھا۔ اُسکے لیے ہر شے آج بھی وہیں تھی۔ اُسکے لیے یہ آسان تھا۔

''مجھے لگا شاید تم مجھ سے بات نہ کرنا چاہو۔''عجیب سی وضاحت تھی۔

''اور تمہیں ایسا کیوں لگا؟''مقدّم واقعی بھول بیٹھا کہ وہ اس شخص سے دس سال بعد مل رہا ہے۔ اس نے اتنے سالوں کا فاصلہ چند لمحوں میں پاٹا تھا۔ اس بات کا جواب وہ نہیں دے سکا۔

''علی نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔ اور جواباً وہ اب بھی خاموش تھا۔

''ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں کہ میں بنا بتائے چلا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر کسی کی خبر نہ لی لیکن تم سب کو کیا ہوا ہے؟ میں پچھلے دو دنوں سے تم لوگوں کے رویّے سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے تم سب کا؟'' عمر نے سر اٹھا کے اُسے دیکھا۔ یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے؟ اُسکے نزدیک وہ لوگ آج بھی وہیں ہونے چاہیے تھے، جہاں وہ آخری بار چھوڑ کر گیا تھا۔ عمر نے گہری سانس لی۔

''تم ہمیں کتنے سال بعد ملے ہو؟'' سوال غیر متوقع تھا۔

''ہاں؟'' وہ سمجھ نہیں سکا۔

''مقدّم! جتنے سالوں میں نے تمہیں دیکھا ہے، اتنے ہی عرصے بعد دوسروں کو بھی۔ بلکہ درحقیقت، ہم سب ہی قریباً ایک دہائی بعد کل ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ یہ ملاقات بالکل غیر متوقع تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا تو وہ سنّاٹوں میں گھر ا رہ گیا۔ پھر بے چینی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اُسکے آفس کی سیٹنگ کچھ اس طرح تھی کہ اُسکی مرکزی میز کے ایک جانب اُسکی سربراہی کرسی تھی، جبکہ میز کی دوسری جانب ایک اور چھوٹی میز تھی، جسکے دونوں سروں پر ایک ایک کرسی رکھی تھی۔ اُس سے ملنے آنے والے آفیشلز اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ درمیان میں رکھی چھوٹی میز چائے اور ریفریشمنٹ پیش کرنے کے کام آتی تھی۔ عمر اُنہی میں سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

''یعنی؟'' مقدّم اُسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''یعنی۔۔۔ تمہارے جانے کے بعد سب ختم ہو گیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اب میرا دوست نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور ایسے ہوئے کہ دہائی گزر گئی اور دوبارہ کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔'' مقدّم اُسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھا۔ اُسکے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''کیوں؟'' وہ پریشان ہوا۔

''ایسا بھی کیا ہو گیا تھا عمر؟'' عمر نے اُسے دیکھا، وہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ جاننا اُسکا حق تھا۔ وہ اُسے مختصراً سب کچھ بتاتا چلا گیا۔ وہ سنتا رہا، شاک، دکھ اور بے یقینی سی چہرے پر چھاتی چلی گئی۔ تمام باتوں میں اس نے مقدّم کے لیے استعمال کیے جانے والے علی کے الفاظ حذف کر دیے تھے۔ دوستی بلاشبہ باقی نہیں تھی، لیکن پرانے تعلق کے ناطے ہی سہی، یہ اُسکا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اُسے علی سے بدگمان نہ ہونے دے۔

''اور میرے جانے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ مجھے خضر سے پتہ چلا تھا۔'' اُس نے گفتگو سمیٹی۔

''خضر سے؟''

''ہاں! کیس بند ہونے کے کچھ عرصے بعد حسین کی اُس سے ملاقات ہوئی تھی، اُس نے ہی خضر کو بتایا جو کچھ میرے جانے کے بعد وہاں ہوا تھا۔'' حسین کی خضر سے کیوں ملاقات ہوئی؟ یہ بات اُس نے نہیں بتائی۔ وہ سر تھامے بیٹھا رہا۔

''اتنا کچھ ہو گیا؟ ایک ذرا سی بات ہی تو تھی۔ اُس پر اتنا واویلا؟''

''ایک ذرا سی بات نہیں تھی آغا!'' عمر نے کہا تو لمحے کو وہ تھما۔ کتنے عرصے بعد اُس نے اُسکی زبان سے اپنا یہ نام سنا تھا۔

''جو آج ذرا سی بات لگ رہی ہے۔ اُس وقت وہ ہمارے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔''

''یا شاید تم لوگوں کو معاملہ سنبھالنا نہیں آیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہاں! شاید یہ بھی ہے۔'' اُس نے تھک کر پیچھے کی جانب ٹیک لگائی۔ کوئی بھی وضاحت بیکار تھی۔

''ہم کم عمر، ناتجربہ کار تھے۔ حالات سے لڑنا اور معاملہ سنبھالنا نہیں جانتے تھے۔ اتنے سمجھدار بھی نہ تھے، غلطی ہم سب سے ہوئی تھی۔'' اُس نے ہار مان لی۔ دس سال پہلے وہ نوجوان لڑکے تھے۔ آج اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب اور سمجھدار مرد۔۔۔

اور آج ایک دہائی بعد اس سمجھدار مرد نے ہار مان لی۔ دس سالوں سے وہ الزام وقت اور حالات پر ڈال کر بری الزمہ ہو جاتا تھا، پر آج وہ ایسا نہیں کر سکا۔ آج کے عمر نے، گزرے کل کے نوجوان اور ناسمجھ عمر کی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ مقدّم نے اُسے دیکھا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور خاموش سا تھا۔ کوئی حزن سا اُسکی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔

''جو ہوا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اس سے زیادہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آ گیا تھا۔

''کیا تمہارا ملک چھوڑنے کا ارادہ ہمیشہ سے تھا؟'' خاموشی میں مقدّم کی آواز گونجی۔ عمر چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکا۔ وہ نہیں کہہ سکا کہ میرا ارادہ ہمیشہ سے تھا یا میں تو ہمیشہ سے کیریئر باہر بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ اس ایک شخص کو وہ کبھی جھوٹ نہیں بول پایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید سوال کرتا اور اُسکا بھرم ٹوٹ جاتا، وہ اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔

''دیر ہو گئی ہے، مجھے چلنا چاہیے۔ تمہیں اتنے عرصے بعد دیکھا تو سوچا مل لوں۔'' وضاحت در وضاحت، ٹوٹے تعلق کو جوڑنے کی پر مشقت سی کوشش۔

مقدّم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا اور کہہ بھی نہیں پا رہا تھا۔ اُس سے مصافحہ کر کے وہ جانے کے لیے مڑا۔

''عمر!'' پیچھے سے پُکارا گیا۔ وہ رکا اور دوبارہ پلٹا۔

''تمہارا جب دل چاہے، تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔ رابطہ بھی کر سکتے ہو۔'' جانے اُس نے ایسا کیوں کہا؟ اُس نے سر ہلا دیا۔

''خدا حافظ!''

جب پرانے ٹوٹے تعلق دوبارہ جڑنے لگتے ہیں تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا، دیوار گر بھی جائے تب بھی درمیان میں ایک فاصلہ سا آ جاتا ہے، ایک خلا سا ہمیشہ کے لیے قائم رہ جاتا ہے۔ دیوار گرانا مشکل نہیں ہوتا، اس خلا کو بھرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے، فاصلہ طے کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی واپسی کی منزل کی پہلی سیڑھی پر آ چکے تھے۔

واپسی کی منزل کے پہلے دو مسافر۔۔۔

مقدّم اور عمر۔۔۔

دیوار گرا دی گئی تھی، لیکن فاصلہ اب بھی قائم تھا۔

--------+--------+--------

کل رات سے صبح تک اُسکی حالت کافی خراب تھی۔ صبح بھی وہ پناہ گاہ نہیں جا سکا تھا۔ عائشہ جی نے کال کر کے پوچھا تو اس نے شام کو آنے کا کہہ دیا۔ دوا کے اثر سے وہ ایسا سویا تھا کہ اُسے کہیں کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ بچے ساری رات اُسکا انتظار کرتے رہے۔ اب اُسے ہر حال میں پناہ گاہ پہنچنا تھا۔ وہ کل والے سفید ٹراؤزر اور ذیپر سویٹر میں ملبوس جب پناہ گاہ پہنچا تو شام کے چھ بج رہے تھے۔

اُسکی گاڑی گھر میں داخل ہوتی دیکھ کر جو بچہ جہاں کہیں بھی تھا، وہ سب چھوڑ چھاڑ کر وہیں آ گیا۔

''بھائی آپ کہاں تھے؟ مجھے آپکو اپنے مارکس دکھانے تھے۔''

''بابا پتہ ہے؟ مرتضیٰ نے میری کلر پینسل گم کر دی۔''

''میں نے سوری بھی بول دیا تھا۔''

کوئی اُسے بھائی کہہ رہا تھا تو کوئی بابا، ایک تین سالہ بچی اُسکے پاس آئی۔

''رجا۔۔۔ رجا۔۔۔ میلی کلپ (رضا۔۔ رضا۔ میری کلپ)'' وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اُسے پکارتی اپنی کلپز دکھا رہی تھی۔ اُس نے اُسے گود میں اٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے اُن سب کی باتیں سننے لگا۔ اُنکے پاس سنانے کے لیے پورے چوبیس گھنٹوں کی روداد تھیں۔ اُسکا غصّہ، پریشانی اور تکالیف یکلخت غائب

ہو گئیں۔ وہ اُنکے حصار میں چلتا، اُنکی باتیں سنتا، مسکراتا ہوا لان میں رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔ قریب ہی چند ماہ کا بچہ واکر میں تھا۔ اُسے دیکھ کر ہمک ہمک کر اُسکی جانب بڑھنے لگا۔ اب کے اُس نے گود میں اٹھائی ہوئی بچی کو پاس کرسی پر بٹھایا اور اُسے گود میں لے لیا۔

''بابا! عبدالرافع کو بلی نے کل پنجہ مار دیا۔'' ایک آٹھ سالہ بچے نے کہا۔

''اوہ! کہاں ہے عبدالرافع؟'' وہ پریشان ہوا۔

''میں یہ رہا۔'' شرارتی سا چھ سالہ بچہ پیچھے سے نمودار ہوا۔ اُسے دیکھ کر وہ ہنس دیا۔ بازو واکر کے اُسے اپنے قریب کیا اور ماتھا چوما۔

''کہاں زخم لگے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔ بچے نے پاؤں آگے کر دیئے۔ لمبا سا زخم آیا تھا۔

''کہا بھی ہے بلیوں سے دور رہا کرو، وہ ویکسینیٹڈ نہیں ہے۔'' پیار بھری ڈانٹ پر اُس نے منہ بسورا۔

''شیزا آپی نے ڈیٹول ٹیوب لگا دی تھی۔''

''شاباش! میری سمجھدار بچی ہے شیزا۔'' اُس نے قریب کھڑی تیرہ چودہ سالہ لڑکی کی تعریف کی تو خوشی سے اُسکی باچھیں کھل گئی۔ اُسی لمحے پورچ کا دروازہ کھلا اور پانچ لڑکے اندر داخل ہوئے۔ اُنکی عمریں سولہ سے اٹھارہ کے درمیان تھیں۔ ہاتھوں میں کرکٹ کا سامان لیے وہ اندر داخل ہوئے تو رضا پر نظر پڑتے ہی اُسکے پاس آ گئے۔

''شکر اللہ کا بھائی کہ آپ آ گئے۔ میری ایک میتھس پرابلم (ریاضی کا سوال) مجھے کل سے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اب آپ آ گئے ہیں نا تو مجھے پڑھا دیجئے گا، ورنہ میں تو کل سے پریشان تھا کہ کس سے سمجھوں؟'' اُسکے قریب آتے سب میں نسبتاً لمبے لڑکے نے کہا۔

''سوری بیٹا! مجھے ذرا کام تھا اسی لیے نہیں آیا۔ لیکن مجھے ذرا یہ بتاؤ۔۔۔'' اُس نے گود والے بچے کو واپس واکر میں ڈالا اور قریب منتظر کھڑی ایک ڈیڑھ سالہ بچی اور اُسکے برابر گول گول آنکھوں سے اُسے دیکھتے تین سالہ بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

''یہ تم لوگ مغرب کی اذان کے پندرہ منٹ بعد کیوں آ رہے ہو؟'' ہاتھوں میں پہنی گھڑی کی جانب اشارہ کرتے، بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''بس آخری اوور رہ گیا تھا۔'' ایک اور لڑکے نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا تو اس نے بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

''جاؤ نماز پڑھو جا کر!'' اُس کے حکم پر پانچوں اندر بھاگے۔

''باقی بچے کہاں ہیں؟'' اُس نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے شیزا سے پوچھا۔

''وہ اندر ہیں۔''

''چلو پھر اندر ہی چلتے ہیں۔'' وہ باقی دونوں کو گود سے اُتارتے آگے بڑھا ہی تھا کہ اندر سے ایک اور سال بھر کی بچی بھاگتی ہوئی آئی۔

''مومنہ گڑیا!'' رضا نے اُسے بھی گود میں اٹھاتے ہوئے پیار کیا۔ پیچھے سے آتے بچے کا واکر بھی وہ ساتھ ساتھ گھسیٹ کے لا رہا تھا۔ اندر تو بچوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ کوئی ڈرائنگ کر رہا تھا، کوئی کھلونوں سے کھیل رہا تھا، پاس ہی دو تین بچوں کا گروپ پورے انہماک سے کارٹون دیکھ رہا تھا۔ ایک اور تیرہ چودہ سالہ لڑکی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی اپنا جرنل پھیلائے کام میں مصروف تھی۔ رضا کو اندر آتا دیکھ کر ایک بار پھر سے وہی ہوا جو لان میں ہوا تھا۔ بچے اُسکے آس پاس رنگوں کی طرح بکھر گئے تھے۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی تھی سنانے کو اور سب کے سب پہلے سنانے کیلئے بے تاب۔۔۔

''میں سب کی بات سنوں گا، لیکن پہلے سب جلدی جلدی اپنے کام مکمل کریں، پھر ہم ساتھ رات کا کھانا کھائیں گے۔'' اُس نے اعلان کیا تو سب بچے خوشی سے بھاگتے ہوئے اپنا اپنا بقایا کام مکمل کرنے لگے۔ لڑکے بھی نماز پڑھ کے آ چکے تھے۔ اب ساتھ بیٹھ کے اپنا اسائنمنٹ مکمل کر رہے تھے۔

''رضا!'' اس آواز پر اُس نے مڑ کے دیکھا۔

''عائشہ جی، اسلام علیکم!'' چہرے پر عقیدت مندانہ مسکراہٹ در آئی۔

''وعلیکم السلام! تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔'' وہ بولیں تو اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟'' اُسے خاموش دیکھ کر وہ پریشان ہوئیں۔ Benzodiazepines کا اثر اُسکے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔'' ایک ہاتھ سر کے پیچھے کیے، گردن کو دائیں سے بائیں اور پھر واپس بائیں سے دائیں جانب جھٹکا دیتے ہوئے اُس نے کہا۔ بچوں کے درمیان وہ جو کچھ دیر کے لیے سب بھول گیا تھا، اب کل کا سارا واقعہ نئے سرے سے دماغ میں تازہ ہو گیا۔ سر میں درد پھر اٹھنے لگا ہی تھا کہ نظریں سامنے بیٹھی سات سالہ بچی پر گئیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھی تھی۔

''ارمینے!'' اُس نے پیار سے اُسے پُکارا تو بچی نے نظریں اٹھا کے اُسے دیکھا۔ پہلے ناپسندیدگی و غصّہ، پھر ڈر و خوف اور پھر آنسو اُسکی آنکھوں میں واضع ہوئے۔

''یہاں آؤ میرے پاس۔'' رضا نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اُسے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''ارمینے!'' رضا اور عائشہ جی دونوں نے ہی اُسے ساتھ پکارا۔ لیکن وہ اندر کمرے میں جا گھسی۔

''جب سے یہاں آئی ہے، ڈری سہمی رہتی ہے۔'' عائشہ جی نے افسوس سے کہا۔

''وقت دیں اُسے، ٹھیک ہو جائیگی آہستہ آہستہ۔'' اُس نے تسلی دی۔

''رضا بھائی! دروازے پر کوئی خاتون آئی ہیں۔۔'' تیرہ سالہ علیزے نے اندر آکر اطلاع دی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں جا کر'' عائشہ جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی۔ رضا ارمینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ توجہ بھٹک کر پھر سے ایف آئی اے کے آفس کی جانب جانے لگی تھی۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا پر سوچ رہا تھا۔

''بتاؤ مجھے، کون سا بچہ تھا ان میں سے؟'' عائشہ جی کی آواز کانوں میں پڑی تو اس نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کھڑی تھیں۔ جبکہ وہ لڑکی تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس بچوں کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ رخ بدل کر واپس موبائل میں مصروف ہو گیا۔

''اتنے سارے بچے؟'' اُسکی شکل دیکھ کر عائشہ جی کو ہنسی آئی۔

''جی! تم بتاؤ کس بچے نے تمہارے گھر کا شیشہ توڑا ہے؟'' عائشہ جی کے سوال پر رضا کے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ کوئی سات آٹھ سال کا بچہ تھا۔ بہت بد تمیز سا تھا۔'' اُس لڑکی نے کہا تو وہ جھٹکے سے اُٹھا اور وہاں آیا۔

''ایک منٹ محترمہ! آپ نے میرے بچے کو بد تمیز کہا؟'' کوئی اُسکے گھر کے بچے کیلئے ایسے الفاظ استعمال کرے، یہ اُسکے لیے ناقابل قبول تھا۔ محترمہ نے حیرت سے بے حد سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ سانولی رنگت پر کاجل بھری وہ سیاہ آنکھیں سامنے کھڑا بندہ ختم کرنے کے لیے کافی تھیں۔

''یہ ہماری پڑوسن ہیں۔۔ جزا نام ہے انکا، کل صبح ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں اور۔۔۔'' عائشہ جی کچھ بتا رہی تھیں لیکن رضا سن کہاں رہا تھا؟

''دیکھیے! میں کرائے دار ہوں، پہلے ہی شفٹنگ میں میرا بہت خرچہ ہوا ہے، اوپر سے آپکے بچے نے اتنا بڑا شیشہ فٹبال مار کر توڑ دیا۔ اور جب میں نے اُسے ڈانٹنا چاہا تو مجھے منہ چڑا کر بھاگ گیا۔'' وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔ سانولی رنگت غصّے کی وجہ سے سرخ پڑ رہی تھی۔

''نہیں نہیں بیٹا! میرے گھر کے بچے ایسے بد تمیز نہیں ہیں، آپکو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' عائشہ جی وضاحت دے رہی تھیں۔ رضا خاموش۔۔

''میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے آپکے گھر آتے دیکھا ہے۔ دیکھیں! شیشہ ٹوٹنا قابل قبول ہے لیکن یہ بد تمیزی میں برداشت نہیں کروں گی۔'' اور بس، رضا جیسے ہوش اور حواس میں واپس آیا تھا۔ اُس لڑکی نے دوسری مرتبہ اُسکی بچے کو بد تمیز کہا تھا۔

''محترمہ! میرے بچے کیلئے دوبارہ ایسے الفاظ نہیں استعمال کیجئے گا۔'' اُس نے وارن کرنے والے انداز میں کہا تو اس کا پارہ چڑھا۔

''تواور کیا کہوں میں آپکے بچے کو؟ میں آپکو شکایت کر رہی ہوں اور آپ اُسی کی وکالت کر رہے ہیں؟''

''کونسا بچہ تھا مجھے بتائیں؟''اُس نے ضبط سے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ کوئی سات آٹھ سال کے قریب عمر کا بچہ تھا۔''

''اس عمر کے بہت سارے بچے ہیں میرے، آپ حلیہ بتایئے۔''

''کیا مطلب؟ کتنے بچے ہیں آخر آپ کے؟''اُس نے طنز سے پوچھا۔

''اٹھائیس۔۔۔آپ کو کونسا مطلوب ہے؟ یا تو حلیہ بتائیں یا اپنا اور میرا وقت مزید برباد نہ کیجئے۔''اُس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔عائشہ جی پریشان کھڑی تھیں جبکہ جزا تو اُسکے بچوں کی تعداد سن کر ہی سکتے میں آگئی تھی۔

''کیا محلے کے بچوں کو بھی اپنا بچہ کہتے ہیں؟''مزید طنز، اس سے پہلے کے رضا کا ضبط جواب دیتا عائشہ جی نے کہا۔

''یہ سارے بچے اسی گھر کے ہیں اور ہمارے ہیں۔''اُسی لمحے وہاں عبدالرافع بھاگتا ہوا آیا۔

''بابا! یہ دیکھیں۔''وہ رضا کو کچھ دکھانا چاہتا تھا۔

''یہی تھا۔''اُسے دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔

''عبدالرافع!''رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔وہ بیچارہ سٹپٹا گیا۔

''تم نے انکا شیشہ توڑا ہے؟''

''نہیں نہیں! اس نے نہیں توڑا۔''اُس سے پہلے ہی جزا نے جواب دیا۔اب تو صحیح معنوں میں رضا کا دماغ گھوم گیا۔

''محترمہ چاہتی کیا ہیں آپ؟ کبھی کچھ کہہ رہی ہیں کبھی کچھ۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس بچے کے ساتھ ہی تھا، جس نے شیشہ توڑا اور جب وہ مجھے منہ چڑا کر بھاگا تو اسی نے اسکو گھر کے اندر چھپایا تھا۔''اُس نے بتایا۔

''آپ نے ایسا کیا تھا؟''رضا نے پوچھا تو عبدالرفع نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کون تھا وہ بچہ؟''اُس نے خفگی سے پوچھا۔بھلا بتاؤ، اتنی دیر سے صاحبزادے کا مقدمہ لڑ رہا تھا اور وہی مجرم کا پشت پناہ نکلا۔

''وہ ذکریا تھا۔''اُس نے پڑوس والے بچے کا نام لیا تو رضا کی سانس بحال ہوئی۔ شکر گھر کا کوئی بچہ ملوث نہیں تھا۔

''اور اب وہ کہاں گیا؟''

''اپنے گھر۔۔'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

''جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ میرے گھر کے بچے ایسے نہیں ہیں۔ ذکریا پڑوسیوں کا بچہ ہے۔ آپ اُن کے پاس شکایت لیکر جاسکتی ہیں۔''اُس نے بات سمیٹی۔

''لیکن آپکے بچے نے بھی اسکو، چھپانے میں مدد کی تھی۔''وہ شرمندگی چھپاتے ہوئے بولی۔

''معافی مانگو عبدالرافع!''رضا نے اُسے مخاطب کیا۔ لہجے میں سختی کہیں نہ تھی، بس تنبیہ تھی۔

''سوری آنٹی!''وہ گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

''اٹس اوکے!''اُس نے کہا۔ اب بچے نے معافی مانگ لی تھی تو مزید کیا کہتی؟

''معذرت! آپکو زحمت ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے سے مسئلہ نہیں ہے مجھے، بس بچے کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔''رضا کو مکمل نظرانداز کرتے ہوئے اُس نے عائشہ جی سے معذرت کی۔

''میرے بچے کبھی بھی ایسا نہیں کرتے، اور بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں! اچھا کیا بتادیا آئندہ احتیاط کرینگے۔''اپنے ازلی نرم لہجے میں جواب دیتی عائشہ جی نے اُسے مطمئن کیا۔ وہ اُن کو خدا حافظ کہتی رضا کو مزید نظرانداز کرتی وہاں سے چلی گئی۔ اپنی خفت بھی تو چھپانی تھی۔

''سوری بابا!''عبدالرافع اُسکی ناراضگی سے پریشان ہوا۔

''کوئی بات نہیں آئندہ ایسا مت کرنا۔''اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے رضا نے پیار سے کہا پھر عائشہ جی کو دیکھا۔

''کون تھی یہ انارکلی؟''جزا کے لیے اس خطاب پر وہ ہنس دی۔

''بتایا تو تھا کہ ساتھ والے گھر میں شفٹ ہوئی ہے کل۔''

''کب بتایا؟''وہ حیران ہوا۔

''ارے! ابھی اُسکے سامنے ہی تو تعارف دیا تھا۔''وہ مزید حیران ہوئیں۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ رضا فوراً کی کہی ہوئی کوئی بات بھولا ہو۔

''اچھا!۔۔ میں نے سنا نہ ہو شاید۔''کندھے اُچکاتا وہ اُنہیں حیران چھوڑتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''اٹھائیس بچے؟بھلا اٹھائیس بچے کیسے ہو سکتے ہیں کسی کے؟''گھر سے باہر آتی جزا،پڑوسیوں کے گھر شکایت کرنے کیلئے جانے کے بجائے،اپنے ہی گھر کی طرف چلی آئی۔اتنے کم عمر سے مرد کے اتنے سارے اور ہر عمر کے بچے اُسے ہضم نہ ہو رہے تھے۔

''اُس پر سے عائشہ جی کہہ رہی تھیں کہ اُنکے بچے ہیں،پھر وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ اُسکے بچے ہیں۔کیا ان دونوں کے ہیں یہ؟''گھر آکر بھی اُسکا دماغ وہیں تھا۔

''نہیں نہیں!ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟کم از کم بھی بیس تیس سال بڑی ہوں گی وہ اس سے۔''خود ہی اپنے خیالات کی تردید کرتی وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کیے جا رہی تھی۔

''مجھے کیا؟جسکے بھی بچے ہوں۔۔''جب کچھ نہ سمجھ آیا تو کندھے اُچکاتے ہوئے اپنے کل کے انٹرویو کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

---------+---------+---------

اگلی صبح رضا اپنے اسکول کے ہیڈ آفس میں تھا۔آج اُسے وہاں کے اساتذہ کے ساتھ اہم مشاورت کرنی تھی۔

''چھٹی کے بعد مجھے سارے استاد میٹنگ روم میں چاہیے۔زیادہ نہیں بس پندرہ منٹ کی مشاورت ہے۔ایک اہم معاملے پر آپ سب کا مشورہ چاہیے''اُس نے پرنسپل صاحبہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے،میں گروپ پر میسج کر دیتی ہوں۔''پرنسپل صاحبہ اثبات میں سر ہلاتی چلی گئیں۔اس وقت گیارہ بج رہے تھے،بچوں کا وقفہ چل رہا تھا۔وہ اپنے آفس کے دروازے کے پار گراؤنڈ میں دوڑتے بھاگتے،گرتے پڑتے اور ایک دوسرے پر ہنستے اُن معصوم بچوں کو دیکھ رہا تھا۔محبت سے،پیار سے،شفقت سے۔۔۔

اُسے نہیں معلوم کہ اللہ نے اُسکے دل میں بچوں کے لیے اتنی محبت کیوں رکھی تھی؟وہ کئی کئی گھنٹے بھی بچوں کو شرارتیں کرتا دیکھتا گزار دیتا،تو بھی اُسکا دل نہ بھرتا۔شور شرابے سے ہمیشہ دور،تنہائی پسند رضا پر بچوں کا شور کبھی بھی گراں نہ گزرتا تھا۔پھر چاہے وہ کسی کے بھی بچے ہوں۔زندگی کی فکروں سے آزاد وہ معصوم چہرے اُسکا دل موہ لیتے تھے۔

جب کبھی وہ کسی چینل میں بچوں کے مرنے،اُنکے جنگوں میں زخمی ہونے یا بھوک اور فاقے کرنے کی خبر سنتا تو اسکو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوتا۔کتنے ہی دن اُس سے کھانا نہ کھایا جاتا۔دل کرتا دنیا کے سارے پریشان،غم زدہ اور دکھوں کے مارے بچوں کو وہ پناہ گاہ لا کر بسا دے،اُن کا بچپن تباہ ہونے سے بچا لے،اس بے رحم دنیا سے اُنہیں چھپا لے۔اس دنیا کی بے رحمیوں میں بچوں کا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔لوگوں کی نفرتوں کا مرکز بچے ہر گز نہیں ہونے چاہیے۔وہ صرف پیار کے مستحق ہیں۔

کاش بچے نہ مرا کرتے۔۔۔

کاش جب جنگ چھڑتی

تو وہ آسمان کی طرف اٹھا لیے جاتے۔۔۔

بس کچھ وقت کے لیے، جب تک جنگ ختم نہ ہو جائے۔۔۔

پھر وہ اپنے گھروں کو سلامتی سے لوٹ آتے۔۔۔

اور جب انکے والدین ان سے پوچھتے تم کہاں چلے گئے تھے؟

تو وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔۔۔

"ہم تو بادلوں میں کھیل رہے تھے۔۔۔"

کاش بچے نہ مرا کرتے،

کاش وہ بڑے ہو کر۔۔۔۔جوان بنتے،

کاش وہ ہنستے کھیلتے رہتے۔۔۔ہمیشہ،

کاش ان کے نصیب میں امن کی صبح ہو،

ایسا آسمان ہو جہاں کوئی جنگی جہاز نہ اڑے،

اور ایسی زمین ہو جہاں قبریں نہ ہوں۔

(منتخب)

کبھی کی پڑھی ہوئی یہ نظم رضا کو بہت پسند تھی، نہ جانے کس نے لکھی تھی؟ مگر ایسا لگتا تھا کہ اُس کے دل کی بات لکھ دی ہو۔

''سر! اساتذہ مشاورت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔'' پرنسپل کی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔ وقت دیکھا تو ایک پینتالیس ہو رہے تھے۔ گہری سانس لیتا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مشاورتی کمرے میں چلا آیا، جہاں مصروف سا شور سنائی دیتا تھا، تمام اساتذہ اُسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر آ بیٹھا تو پرنسپل صاحبہ بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب؟''اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے ایک نظر تمام اساتذہ کو دیکھا،اور اُسی لمحے نِگاہیں آخری کرسی پر بیٹھی لڑکی پر گئی تو پلٹنا بھول گئی۔

''میں آپکو بتانا بھول گئی، ہمارے ساتھ دو مزید ٹیچرز ہیں،اصغر صاحب جو کل اپوئنٹ ہوئے ہیں اور جزا صاحبہ جنہوں نے آج ہی ہمیں جوائن کیا ہے۔'' پرنسپل صاحبہ نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جلدی سے تعارف کروایا۔ جزا کے چہرے پر تو حیرانگی ہی حیرانگی تھی، جبکہ ادھیڑ عمر اصغر صاحب اُسے اپنا مکمل تعارف دے رہے تھے۔

''میری طرف سے آپ دونوں کو خوش آمدید!''اُس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔چوبیس گھنٹے میں یہ دوسری بار تھا کہ جب وہ اُس لڑکی کو دیکھ کر ساکت ہوا تھا۔ سر جھٹک کر سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''آپ سب کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہماری چالیس شاخیں ہیں اور تقریباً ہر اسکول میں تین سے پانچ سال تک کی عمر کے بچوں کے داخلے کیلیے درخواستیں آرہی ہیں۔آپ سب جانتے ہیں کہ ہم پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کا اسکول میں داخلہ نہیں لیتے۔لیکن اتنی زیادہ درخواستیں ہیں۔آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے اُن سب کو دیکھا۔

''آپ پانچ سال تک کہ بچوں کا داخلہ کیوں نہیں لیتے؟''پہلا سوال جزا کی جانب سے آیا تھا۔

''کیونکہ ہمیں یہ لگتا ہے کہ پانچ سال تک کے بچے کی اصل جگہ اُسکی ماں کی آغوش ہے۔جو کچھ بچہ وہاں سیکھ سکتا ہے، وہ اسکول میں نہیں سیکھ سکتا۔'' پرنسپل صاحبہ نے وضاحت دی۔

''جی! اسی لیے ہم ایسے والدین کو منع کر دیتے ہیں کہ اپنے بچوں کو گھر پر ہی رکھ کر اُنکی تربیت کیجئے۔اسکول میں کتابوں کا بوجھ، ہوم ورک، ٹیسٹ اور ایگزام،ان سب بوجھ سے بچے کو ابھی آزاد رکھیں۔''ایک اور سینئر ٹیچر نے مزید وضاحت دی۔

''تو کیا آپکو یقین ہے کہ وہ آپکی بات مان لیتے ہیں؟''جزا کے اس سوال پر وہاں خاموشی چھائی۔

''یعنی؟''رضا نے اُسے وضاحت دینے کا موقع دیا۔

''یعنی یہ کہ آپ جب داخلہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو کیا وہ اپنے بچوں کو گھر بیٹھا لیتے ہونگے؟اس شہر میں ہزاروں اسکول ہیں جو تین تو کیا ایک سال تک کے بچے کو بھی اپنے اسکول میں داخل کرنے کو تیار ہیں، وہ والدین یقیناً وہاں کا رخ کرتے ہونگے۔بچے پر آپ نے کیا ہی احسان کیا؟''

''تو ہم اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟''ایک خاتون استاد نے بیزاری سے کہا۔

''آپ اُن بچوں کو اپنے اسکول میں داخل کر سکتے ہیں۔'' جزا کے جواب پر تقریباً سب ہی نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا، سوائے رضا کے۔

''آپ تفصیل سے بتائیں کہ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' رضا نے پوچھا تو اُسے حوصلہ ملا، آج اُسکی شخصیت کا رعب جزا پر بھی چھانے لگا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپکے پاس آنے والے والدین میں سے ایک یا دو ہی آپکی بات پر عمل کرتے ہونگے، بقیہ اپنے بچے لیے کوئی نہ کوئی دوسرا اسکول تلاش کر لیتے ہونگے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم والدین کے سامنے دو صورتیں رکھیں ایک تو وہ، جو آپ سب والدین سے کہتے ہیں اور دوسری صورت میں ہم اُنہیں ایڈمشن دینگے لیکن اپنی شرائط پر، ان بچوں کے لئے پری اسکول کے نئے سیشن کا آغاز کرنا چاہیے۔ اُن کے اوقات صبح دس سے بارہ بجے تک ہوں، تاکہ اتنے چھوٹے بچوں کو مائیں صبح چھ بجے اٹھا کر وین میں ٹھونس کر، نیند میں جھولتے ہوئے سکول نہ بھیج دیں۔ یہ سیشن، بیگ فری ہونا چاہیے، یعنی ان بچوں کی کتابیں کم سے کم ہوں اور جو ہوں وہ بچوں کی متعلقہ استاد کے پاس سکول میں جمع رہیں گی، تاکہ اتنے چھوٹے بچے بیگ کے بوجھ سے آزاد رہیں۔ تیسری اور آخری بات، اس سیشن میں ٹیسٹ اور امتحانات نہیں ہونگے، ہر بچے کو اُسکی ذہنی قابلیت کے حساب سے پڑھایا جائے گا۔'' مدلل لہجے میں اپنی بات پوری کرتی وہ رضا کو حیران کر گئی تھی۔ کل تک وہ اُسے بچوں سے بیزار مغرور لڑکی سمجھ رہا تھا، لیکن آج بچوں کے لیے فکر مند ہوتی وہ ایک نئے روپ میں سامنے تھی۔

''ایسا ہے کہ، مجھے یہ بات بے حد پسند آئی ہے۔ ہم اس پر کام شروع کرتے ہیں۔ تین ماہ بعد ہم ایسے بچوں کا اسی سیشن میں داخلہ لینگے۔ کورس اور کریکلم جزا صاحبہ بنائیں گی۔'' اب وہ سب کو ہدایت دے رہا تھا۔

''فیض صاحب! آپ ایچ آر کے ساتھ مل کر اس نئے سیشن کے لیے ٹیچرز کی بھرتیاں شروع کر دیں، اور پرنسپل صاحبہ یہ آرڈرز تمام شاخوں میں بھجوا دیں۔'' وہ سب کو ذمے داریاں سونپ رہا تھا۔

''یہ بات واضح رہے کہ اس سیشن کا مطلب بچوں کا داخلہ لینا ہرگز نہیں ہے، بلکہ ہمارا پہلا مقصد والدین کو یہ احساس دلانا ہے کہ چھوٹے بچوں کو اسکولوں سے آزاد کر کے گھر کا ماحول دیں، اگر وہ راضی نظر نہ آئے تب اُنکے سامنے یہ آپشن رکھیں۔ آج کی میٹنگ ختم ہوئی۔'' نہایت پیشہ وارانہ لہجے میں گفتگو سمیٹ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے پرنسپل صاحبہ اور فیض، جزا سے اس نئے پروجیکٹ پر بات چیت کر رہے تھے۔ رضا اُس سے متاثر ہوا تھا۔ اُس نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اُسکے اپنے اسکول میں بچوں کا داخلہ نہ لینے سے کیا والدین واقعی بچوں کو گھر بٹھا لیں گے؟ کیا وہ اُسکی بات سر جھکا کر تسلیم کر لیں گے؟ گھر کی طرف جاتے ہوئے اب اُسکے ذہن میں نئے سیشن کے لیے مختلف آئیڈیاز آ رہے تھے۔

---------+---------+---------

زندگی کا کام چلنا ہے اور وہ چلتی رہتی ہے۔اس واقعے کے ایک ہفتے بعد اُنہیں فرّخ صاحب نے دوبارہ ایف آئی اے کے آفس بلایا تھا۔آخری بار رضا یہ سوچ کر گیا تھا کہ وہ اب ایسی کسی بریفننگ کا حصہ نہیں بنے گا۔وہ اُن میں سے کسی کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن۔۔۔

وہ وہاں موجود تھا،آج پھر وہ سب ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ماحول میں کوئی فرق نہ تھا۔چہروں پر وہی اجنبیت اور لاتعلقی تھی۔البتہ پچھلی بار ملنے والی حیرانگی کی جگہ اب مستقبل کی فکر نے لے لی تھی۔نہ جانے فرّخ صاحب نے کیوں بلوایا تھا آج؟

شیراز اُنہیں باری باری محکمہ مشاہدہ کے آفس میں بٹھا کر گیا تھا۔پچھلی بار کے مقابلے میں آج نوید وہاں پہلے سے ہی موجود تھا،سامنے کوئی ڈائری نما فائل کھول رکھی تھی،اُنکے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا یا پھر جان کر نظرانداز کرتا رہا،معلوم نہیں؟فرّخ صاحب آچکے تھے اور بریفننگ شروع ہو چکی تھی۔رضا آج جس کے لیے آیا تھا وہ چہرہ اُسے کہیں نظر نہ آیا۔

''ایک اچھی خبر ہے،تم سب کو بتانا ضروری ہے۔مائیکل عرف فرمان،جو کہ پس منظر سے غائب ہو گیا تھا،کل وہ ایک خلیل نامی شخص سے ملا ہے۔خلیل کا سارا بائیوڈیٹا ڈیپارٹمنٹ نے اکھٹا کر لیا ہے۔''فرّخ صاحب کے پیچھے ایک کھچڑی بالوں والے شخص کی تصویر تھی۔رضا کو اُس پر شناسائی کا گمان ہوا۔

''خلیل وہ واحد شخص ہے،جو ہمیں مائیکل تک پہنچا سکتا ہے،اس وقت خلیل۔۔۔''وہ بہت کچھ بتا رہے تھے۔نہ جانے کیا کیا؟رضا کی نِگاہیں سکرین پر نظر آتے چہرے پر ٹکی رہ گئیں۔دماغ بار بار سگنل دے رہا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے۔لیکن یاداشت اس وقت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''سر!حسین مرتضیٰ کا یہاں ہونا ناگزیر ہو گیا ہے۔''نہ جانے گفتگو کس رخ پر تھی کہ درمیان میں شیراز نے کہا تھا۔رضا کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔

''میری معلومات کے مطابق تو اُسے پچھلے ہفتے تک پاکستان آجانا چاہیے تھا۔لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے مجھے اب تک۔''نوید کی بھاری سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی تھی''کیا کرنا چاہیے تب تک؟''اُس نے سوال کیا تھا۔

''خلیل کے پکڑے جانے تک رک جاؤ،ابھی اُسے اطلاع دے کر پریشان یا خوفزدہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔کیا معلوم تب تک وہ پاکستان آجائے؟''فرّخ صاحب نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ پھر سے کچھ بتانے لگے۔رضا کا دماغ پھر کہیں اور اٹک گیا تھا۔اُس بار توجہ کا مرکز حسین تھا۔

حسین۔۔۔جسکے لیے اس نے خود کو آج یہاں آنے پر راضی کیا تھا۔

حسین۔۔۔جس سے وہ واقعتاً ملنا چاہتا تھا۔

حسین۔۔جو اُسکا دوست نہیں بلکہ اُسکا محسن تھا۔

--------+--------+--------

گاڑی مرکزی شاہراہ پر رواں دواں تھی، گاڑی چلاتے اُسکا دماغ بار بار بھٹک کر ایف آئی اے آفس کی پارکنگ میں جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ لوگ بریفنگ میں موجود تھے، تب بار بار اُسکی نگاہیں نوید کی جانب اٹھتی تھیں۔ اُسکے سیاہ، سرمئی و سفید بال پیچھے کر کے سیٹ کیے ہوئی تھے، آنکھوں کے برابر وہ کٹ بہت گہرا لگتا، یقیناً ماضی میں بہت شدید چوٹ لگی ہو گی اُسے۔ پچھلی بار کے مقابلے آج اُسکا چہرہ بے تاثر سا تھا۔ بریفنگ ختم ہونے کے بعد وہ ایسے ہی اجنبیت برتتا وہاں سے اُٹھ کر جا چکا تھا۔ باقی چاروں میں سے باہر نکلنے میں پہل خود علی نے کی تھی، بنا کسی کی بھی جانب دیکھتے وہ جب پارکنگ میں آیا تو یاد آیا کہ گاڑی تو ابھی پہنچی ہی نہیں ہے۔ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ اُنکا سامنا کرنا اُسکے اعصاب پر بھاری پڑتا تھا۔ اُسکے پیچھے عمر اور مقدّم باہر آئے تھے۔ اُسے یکسر نظر انداز کرتے وہ دونوں دوسری جانب کھڑے آہستگی سے کوئی گفتگو کر رہے تھے۔ رضا باہر نہیں آیا، یا آیا بھی تھا تو علی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ اُسکے بعد جب تک وہ وہاں کھڑا رہا، وہ کہیں نظر نہ آیا جبکہ مقدّم اور عمر گاڑیاں آنے تک آپس میں محو گفتگو رہے تھے۔ اُسے نہیں یاد کہ پچھلے دو سالوں میں عمر نے کبھی بھی علی سے اتنی لمبی گفتگو کی ہو گی۔ حالانکہ اُس کا عمر سے روز کا ہی ملنا تھا۔ ایک ہی آفس میں ہوتے ہوئے، ایک ہی کمپنی کے شراکت دار ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اور اُس کے درمیان دس سال پہلے آئی دیوار کو گرا نہ سکا تھا نہ ہی اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش کی تھی۔ لیکن اتنے جلدی اُسکے اور مقدّم کے تعلقات کیسے بحال ہوئے تھے؟ دل میں کہیں آگ سی لگ رہی تھی۔ آج بھی یاد تھا کہ وہ دونوں کس طرح بیچ راستے میں اُسے چھوڑ کر فرار ہوئے تھے۔

دس سال پہلے کی وہ آخری ملاقات پوری جزئیات کے ساتھ اُسکی نظروں کے سامنے گھوم گئی تھی، اپنی ذات پر لگائے گئے رضا کے وہ فاش الزامات آج بھی اُسکا سکون تباہ کرنے پر پہلے دن کی طرح قادر تھے۔ لب بھینچے وہ اور تیز ڈرائیو کرنے لگا تھا۔

گھر پہنچ کر اُس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی، اور گھر کے اندر داخل ہوا۔ لائٹ جلی ہوئی تھی۔ یقیناً سفیر صاحب جاگ رہے تھے۔ اُنکی آواز باہر لاؤنج تک سنائی دے رہی تھی۔

وہ کہاں بیٹھے تھے؟ کس سے بات کر رہے تھے؟ اُسے، ان سب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُنکا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی خیریت معلوم کرنے کی عرض سے فون کر دیتا تھا۔ سردی کی وجہ سے پہنے گئے لانگ کوٹ کے بٹن کھولتا، وہ سیڑھیاں چڑھنے ہی لگا تھا کہ کانوں میں پڑتی اگلی آواز نے اُسکے قدم زنجیر کر دیئے۔

وہ پتھر ہوا، کروڑوں ہوں یا اربوں۔۔۔ اس ایک آواز کو وہ مجمعے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ آواز دوبارہ نہیں آئی تھی۔ اُسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، تیز ہوتی دھڑکن کو گہری سانس لیکر نارمل کرتے وہ دوبارہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ وہی آواز دوبارہ سنائی۔

''نہیں۔۔۔یہ میرا وہم نہیں ہے۔''اُس نے خود کو کہااور واپس اُترااور ڈگمگاتے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھنے لگا، جہاں سے یہ آوازی آرہی تھی۔آواز اب مسلسل سنائی دے رہی تھی۔اور اُسکے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ برابر تھا۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ ہٹایااور اندر کا منظر دیکھ کر اُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

---------+---------+---------

''کیا مطلب امی، اُنکا بیٹا۔۔نہ اُسکی تعلیم ہے، نہ شخصیت اور تواور وہ گٹکا کھاتا ہے۔آپ کیسے ایسے لوگوں کو میرے لیے گھر بلا سکتی ہیں؟''جزاسخت طیش کے عالم میں چلارہی تھی، لیکن اُسکی ماں کو مطلق پرواہ نہ تھی۔وہ ہمیشہ ایسے ہی شور شرابا کرتی لیکن اُسکی ماں کے پاس ہزاروں جواز ہوتے تھے اُسے چپ کروانے کو۔

''مرد کی شکل اور تعلیم کون دیکھتا ہے؟اور گٹکا ہی کھاتا ہے نہ۔۔۔شراب تو نہیں پیتا۔تم جب اُسکی بیوی بنو تو چھڑوا دینا۔''اُسکی ماں نے اطمینان سے کہا۔

''میں اُسکی بیوی بنوں ہی کیوں؟''وہ چیخی۔

"بس بہت ہوا۔۔۔میں کونسا تمہاری شادی کروارہی ہوں، صرف ملنے ہی تو کہا ہے۔اب گھر آنے والوں کو منع کردوں؟''

''بعد میں بھی منع ہی کرنا ہے تو ابھی کریں۔جب ہاں نہیں کرنی ہے تو میں کیوں تیار ہو کر اُنکے سامنے بیٹھوں؟''

''خاموش رہو، وہ مجھ سے بات کر چکے تھے فون پر، اب کیسے منع کردوں کہ نہ آئے۔''

''نہیں! اصل بات یہ ہے، کہ آپکے ذہن میں کہیں نہ کہیں اقرار ہے جب ہی آپ منع نہیں کر رہی، آپ کیسے اپنی بیٹی کے لیے ایسی شخصیت کے حامل انسان کا ساتھ سوچ سکتی ہیں؟''وہ رو دینے کو تھی۔آگے سے اُسکی ماں کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ آنکھوں میں آنسو لیے چپ بیٹھی تھی۔ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔۔۔ہمیشہ۔۔۔

اور کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ تیار ہوئی کچھ آنٹیوں کے سامنے تھی، جو سر سے پاؤں تک اُسکا ایکسرے کر رہی تھیں۔بات بات پر اپنے مہنگے گھر اور پیسوں کی زبانی نمائش بھی جاری تھی۔

''میری بیٹی الحمدللہ! بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے۔''اُسکی ماں نے بات شروع کی۔

''بہن! پڑھائی لکھائی کا کیا ہی کرنا، آپ نے فضول میں اتنا پڑھایا لڑکی کو۔ہم تو کبھی نہ آتے کسی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ لیکر، ویسے ہی اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔''لڑکے کی ماں نے کہا۔

''تو پھر کیوں آئیں آپ؟''اب کہ اُسکی ماں کو بھی برا لگا۔

''بھئی! سمجھا کریں آپکی بیٹی ذرا ادب سے رہے گی، ہمارے سامنے سر نہیں اٹھائے گی۔''اُنہوں نے بات گھمائی۔

''ابھی آپ نے کہا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں چاہیے، کیونکہ اُنکے دماغ آسمانوں پر ہوتے ہیں۔اب آپ کہہ رہی ہیں کہ ادب سے رہے گی۔آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟میں سمجھ نہیں پائی۔''اُسکی ماں نے کہا۔

''ارے! بیشک پڑھی لکھی ہے لیکن ہے تو کالی نہ، رنگ گورا ہوتا تو پھر تو میرے بیٹے کو غلام ہی بنا لیتی، بس اسی وجہ سے آئے ہیں۔ہمیں بھابھی ایسی چاہیے جو بھائی کو ہم سے دور نہ کرے۔''لڑکے کی بہن ظالمانہ حد تک صاف گو تھی۔اُس نے شاک کی کیفیت میں اپنی ماں کو دیکھا جو بغلیں جھانک رہی تھیں۔

''رشتے والی بتا رہی تھی کہ رنگ کالا ہونے کی وجہ سے آپکی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوا اب تک، عمر بھی پچیس چھبیس سال ہے۔اب ہم تو اللہ کی خاطر آئے ہیں کہ کسی کا بھلا ہو جائے ورنہ ہمارے بیٹے کو کونسی کمی ہے؟اب آپکی بیٹی کا رنگ کم ہے تو آپکو اُسکی شادی کروانے کے لئے کچھ دینا دلانا۔۔۔''لڑکے کی ماں ہمدردی کے لبادے میں چھپا کر وہی باتیں کر رہی تھی، جو باقی لوگ بھی یہاں سے کر کے جاتے تھے۔

وہ اٹھی اور اپنی ماں اور مہمانوں کی سامنے سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔روتے ہوئے۔۔۔سسکتے ہوئے۔۔۔پیچھے اُسکی ماں اب کیا کہہ رہی تھی اُسے پرواہ نہ تھی۔ دماغ میں بس ایک ہی لفظ تھا۔

''کالی''

---------+---------+---------

وہ گھر کے قریب بنے سوسائٹی کے پارک میں آگئی تھی، دماغ کڑھ رہا تھا اور دل جل رہا تھا۔پارک میں اچھی خاصی رونق تھی۔اُسے زہر لگتے تھے وہ لوگ جو اُسکے رنگ کو کوئی عیب یا بد نما داغ سمجھتے تھے۔وہ کبھی بھی اپنے رنگ کے لیے احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئی تھی۔بلکہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانہ میں تو وہ کافی حد تک مغرور مشہور تھی، لڑکیاں اُسکے نین نقش کی تعریف کرتی تھیں، کتنی ہی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے پسندیدگی دیکھی تھی لیکن وہ کبھی بھی کسی کو حد سے باہر نہ جانے دیتی، وہ اچھے سے جانتی تھی کہ نہ صرف اُسکی شکل بلکہ اُسکی شخصیت بھی سحر انگیز اور پر کشش ہے۔لیکن یہ سارا غرور تب دھرا کا دھرا رہ گیا، جب اُسکی ماں نے اُسکے لیے رشتے دیکھنے شروع کیے۔پہلا اعتراض اسکے رنگ پر ہوتا، دوسرا اُسکے بالوں پر پھر لمبے قد پر، غرض ہر وہ شے جسے جزا اپنی خوبصورتی کا حصہ سمجھتی تھی، وہ ان لوگوں کو اُسکا عیب اور خامی لگتی۔حد تو یہ تھی کہ ایک مرتبہ گھر آنے سے پہلے جب اُسکی ماں نے لڑکے والوں کو صاف لفظوں میں کہا کہ

''بہن! دیکھ لیجئے، میری بیٹی کا رنگ گورا ہر گز نہیں ہے، تو آپ پہلے ہی بتادیں بعد میں آپکو اعتراض نہ ہو۔''

''نہیں نہیں! پھر آپ رہنے دیں۔'' یہ کہتے ہوئے خاتون نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور فون کاٹ دیا۔

جزا کبھی بھی ان سب باتوں سے پریشان نہیں ہوتی تھی، اُسے اصل مسئلہ اپنی ماں سے تھا، جو یہ سب سلسلہ روکنے کے بجائے، اُسے ہر دوسرے دن تماشہ لگانے کے لیے ایسے لوگوں کے سامنے بٹھادیتیں۔ اُنکو لگتا تھا کہ بس شادی ہونی چاہیے، پھر چاہے جیسے بھی انسان سے ہو۔ پھر جب وہ انکار کر کے چلے جاتے تو اُسکی ماں کے پاس سیدھا سا جواب ہوتا کہ

''ہاں تو اب لڑکے والے ہیں، اُنکی مرضی انکار کریں یا اقرار۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' وہ انکو دیکھ کر رہ جاتی، یعنی لڑکی والوں کی کوئی اوقات، کوئی حیثیت ہی نہیں؟ لڑکی کی ماں ہونا اتنا برا ہے کہ سر جھکائے اُنکی ہر غلط بات سنی جائے؟

سامنے بچے کھیل کود میں مشغول تھے، پاس بیٹھی مائیں، گھاس پر چادر بچھائے اُنکے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کر رہی تھیں۔ اُسے اپنا باپ یاد آیا جو آج زندہ ہوتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔ بھائیوں کو تو اُس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ ماہانہ خرچہ بھیج کر اپنا فرض پورا کر دیتے اور اُسکی ماں اتنے میں ہی اُنکا راگ الاپتی نہ تھکتیں۔

کافی دیر وہاں گزارنے کے بعد بلآخر وہ واپس گھر کی جانب چل پڑی، دروازے پر ہی اُسے اپنی ماں کھڑی نظر آئیں۔ جزا قریب آئی تو وہ دل پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔

''جز۔۔ جزا۔۔۔'' اُنکا سانس پھول رہا تھا۔

''پارک تک گئی تھی میں بس'' اُسے لگا کہ وہ شاید اُسکے گھر سے غائب ہونے پر پریشان ہیں۔

''جزا۔۔۔ مجھ سے سانس۔۔۔'' وہ تیز تیز سانس لیتیں اُسکا ہاتھ پکڑے بولیں تو اُس کے دماغ نے ریڈ سگنل دیا۔

''امی! کیا ہو رہا ہے آپکو؟ امی؟'' وہ تیزی سے اُنکا ہاتھ سہلانے لگی۔

''امی کچھ بولیں! خدا کے لیے۔'' وہ اُنہیں ساتھ لگاتے ہوئے تقریباً چیخنے لگی تھی۔ اُسکا موبائل پاس نہیں تھا۔ حواس باختہ ہوتی جزا کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ اتنے میں اُسکے بالکل ہی برابر ایک گاڑی آکر رکی۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' شیشہ نیچے کرتے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص پریشانی سے بولا تھا۔

''معلوم نہیں! مجھے نہیں پتہ کیا ہو رہا ہے؟''اُس نے تو جیسے ہاتھ پیر ہی چھوڑ دیے تھے۔اُسکی حالت سمجھتا، رضا تیزی سے گاڑی سے اتر کر اُن تک آیا، اور پھر انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا۔

''ہمیں انہیں ایمر جنسی میں لیکر جانا ہو گا۔''اُس نے عجلت میں کہتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، جزا اپنی ماں کے ساتھ پیچھے بیٹھی اُنکا ہاتھ سہلا رہی تھی۔ تیزی سے گاڑی دوڑاتے وہ اُنہیں ہسپتال لے آیا۔اُنہیں ایمر جنسی میں داخل کیا گیا تھا۔بی پی شوٹ کرنے کی وجہ سے انکی یہ حالت ہوئی تھی، دواؤں سے لیکر ڈاکٹر سے بات کرنے تک سب کچھ رضا ہی دیکھ رہا تھا، وہ تو بس پریشان حال اپنی ماں سے لگی بیٹھی، دل ہی دل میں اُن لڑکے والوں کو کوس رہی تھی، جنکی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔

دو سے تین گھنٹے تک تو انکو مختلف نوعیت کی ڈرپ لگتی رہی، پھر کہیں جا کر اُنکی طبیعت سنبھلی تھی۔ڈاکٹر نے ابھی ڈسچارج نہیں کیا تھا، کچھ دوائیں ابھی باقی تھی جو ڈرپ کے ذریعے دی جا رہی تھیں۔اس دوران وہ صرف ایک ہی بار اندر آیا اور اُس سے حالات پوچھ کر باہر چلا گیا۔باقی وقت وہ باہر ہی کوریڈور میں بیٹھا رہا تھا۔جب وہ پر سکون ہو کر سو گئیں تو جزا کو کچھ حوصلہ ہوا۔دماغ کا بوجھ کم ہوا تو پہلا خیال اُسی کا آیا۔ہاتھ میں پہنی گھڑی دیکھی جو رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔اُٹھ کر باہر آئی تو وہ دھیمے لہجے میں ڈاکٹر سے بات کرتا دکھائی دیا۔وہ پریشان سی قریب چلی آئی۔

''کیا ہوا ہے؟امی ٹھیک ہیں نہ میری؟''اُسکے سوال پر رضا اور ڈاکٹر دونوں نے ہی چونک کر اُسے دیکھا۔

''آپکی امی بالکل ٹھیک ہیں، میں بس کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا۔آپ انکو بتا دیجیے گا مجھے اب راؤنڈ پر جانا ہے۔''پہلے جزا اور پھر رضا کو مخاطب کر کے ڈاکٹر نے کہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟''اُس نے پریشانی سے اُس سے پوچھا، انداز ایسا تھا کہ بس ابھی رو دے گی۔

''شی از الرائٹ۔۔۔ریلیکس (وہ ٹھیک ہیں۔۔۔پر سکون ہو جائیں)''اُس نے تسلی دی۔پرسوں وہ اُس سے جھگڑ کے گئی تھی، کل صبح وہ بردباری کے ساتھ، اپنی ذہانت سے اُسے متاثر کر رہی تھی اور آج عام لڑکیوں کہ طرح پریشان سی اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ چھپانے کی کوشش میں ناکام ہوتی، اُس کے سامنے تھی۔

''وہ اُنہیں کسی بھی قسم کی ٹینشن، تیل والی اور بھاری غذا سے دور رکھنے کو کہہ رہا تھا۔اگر خدانخواستہ دوبارہ ایسا ہوا تو دماغ کی رگیں متاثر ہو سکتی ہیں۔''

''میں گھر سے باہر تھیں، پتہ نہیں وہ کب سے اس حالت میں تھیں؟''وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

''ایسی حالت میں حواس باختہ نہیں ہوتے، اگر آپ پینک (خوفزدہ) کریں گی، تو مریض کی طبیعت اور بگڑے گی، آئندہ اگر ایسا ہو تو سب سے پہلے اپنے حواس بحال رکھ کر ایمبولینس کو کال کریں، پھر مریض کو ابتدائی طبّی امداد دیں۔'' وہ اُسے سمجھا رہا تھا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا نا!'' آنسوؤں سے بھری سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھتے ہوئے بیچارگی سے کہا، اور رضا ڈوب گیا۔ پورے کا پورا۔۔۔۔

''میں کوشش بھی کروں، تب بھی ایسی حالت میں میرے اپنے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں، دماغ جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے'' وہ مزید بیچارگی سے کہہ رہی تھی۔

''تمہارا بہت شکریہ! تم نہ آتے تو میری امی کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔'' اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے خاموش ہے تو فوراً ہی اُسکا شکریہ ادا کرنا مناسب سمجھا۔ اُس نے گہرا سانس لیکر سر جھٹکا۔ ایک تو یہ لڑکی۔۔۔

''شکریہ اُسکا کیا جاتا ہے جو احسان کرتا ہے، اور ماؤں پر احسان نہیں کیا جاتا۔'' سنجیدگی سے کہتے اُس نے جزا کو حیران کیا تھا۔

''میری والدہ ہوتی تو میں اُنکے لیے بھی یہی کرتا، لیکن وہ میرے بچپن میں اِنتقال کر گئی تھیں۔'' پتہ نہیں اُس نے کیوں بتایا تھا؟ شاید وہ اُسے تسلی دینا چاہتا تھا یا اُسکے سر پر کوئی احسان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''تو کیا عائشہ جی تمہاری والدہ نہیں ہیں؟'' پچھلے دو دنوں میں وہ اُن دونوں کے آپسی رشتے کے متعلق یہی اندازہ لگا سکی تھی، اور اب وہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔

''نہیں! وہ میری بڑی بہن ہیں۔ لیکن میری ماں جیسی ہی ہیں'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لہجے میں عقیدت و احترام تھا۔

''اوہ! اور وہ بچے کس کے ہیں؟''

''بتایا تو تھا کہ میرے ہیں، کیوں؟ تمہیں یقین نہیں آیا اب تک؟'' رضا نے شرارت سے پوچھا۔ اپنے لہجے پر اُسے خود بھی حیرت ہوئی تھی۔

''آپکو گھر جانا چاہیے، بہت رات ہو گئی ہے۔ باقی میں سنبھال لوں گی'' گڑبڑاتے ہوئے بات بدلی، ''تم'' سے واپس ''آپ'' تک آئی۔ بھلا وہ کیوں اس بارے میں پریشان تھی کہ بچے اُسکے ہیں یا کسی اور کے؟ کیا سوچتا ہو گا وہ بھی؟ دو دن نہیں ہوئے ملے ہوئے اور تفتیش کرنے بیٹھ گئی۔

''تمہاری والدہ کچھ دیر میں ڈسچارج ہو جائینگی، پھر ساتھ ہی چلیں گے۔''

''مگر۔۔'' اُس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔

''چائے پیو گی؟'' اُس نے رک کر یکدم ہی پوچھا۔

''ہاں؟''وہ حیران ہوئی۔

''ٹھیک ہے،ابھی لاتا ہوں۔''اُسکے سوال کو اقرار سمجھتا،اُسکا جواب لینے کے لئے رکا نہیں تھا۔

وہ حیرت سے اُسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

---------+---------+---------

''میں یہاں کبھی نہیں آتی،مجھے آپ سے کوئی مدد بھی نہیں چاہیے۔میں بس۔۔۔''

سردی کی وجہ سے پہنے گئے لانگ کوٹ کے بٹن کھولتا وہ سیڑھیاں چڑھنے ہی لگا تھا کہ اُسکے کانوں میں پڑتی اس آواز نے اُسکے قدم زنجیر کیے تھے۔

وہ پتھر ہوا،کڑوڑوں ہوں یا اربوں۔۔۔اس ایک آواز کو وہ مجمعے میں بھی پہچان سکتا تھا۔آواز دوبارہ نہیں آئی تھی۔اُسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی،تیز ہوتی دھڑکن کو گہری سانس لیکر نارمل کرتا وہ دوبارہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ

''میں بس احمد سے ملنا چاہتی ہوں۔ایک بار،صرف ایک جھلک دکھادیں اُسکی۔میں دوبارہ یہ مطالبہ نہیں کروں گی۔''وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''نہیں۔۔۔یہ میرا وہم نہیں ہے۔''علی نے خود سے کہا اور واپس اُترتا،ڈگمگاتے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھنے لگا،جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔

''حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ میں اس قسم کے کسی بھی مطالبہ کے لائق نہیں ہوں۔لیکن آپ احسان کردیں مجھ گنہگار پر۔''آواز اب مسلسل سنائی دے رہی تھی۔اور اُسکے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھی۔ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ برابر تھا۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے پردہ ہٹایا اور اندر کا منظر دیکھ کر اُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔اُسے دیکھ کر وہ دونوں بھی کھڑے ہوگئے۔

اور۔۔۔

پورے چار سال بعد،

فاطمہ آفندی،علی سفیر کے سامنے کھڑی تھی۔کالا عبایا پہنے،چہرے کے گرد کاٹن کا کالا دوپٹہ لپیٹے،وہ اُسکے باپ کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔

''علی!یہ۔۔۔''سفیر صاحب کو فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا کہیں؟

''میں بس احمد سے ملنے آئی۔''وہ خود ہی وضاحت دینے لگی۔

''نام بھی مت لینا میری اولاد کا۔''تیز ہوتے تنفس کے ساتھ وہ دھاڑا تھا۔فاطمہ تو فاطمہ،سفیر صاحب بھی ایک لمحے کے لیے گھبرا گئے۔

''ہمت کیسے ہوئی تمہاری یہاں آنے کی؟''لہولہو ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا، وہ اُس کی جانب بڑھا، وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''میری بات سنو علی!''سفیر صاحب کوئی وضاحت دینے لگے۔

''میں بس اپنے بیٹے سے۔۔۔''کانپتے لہجے کے ساتھ وہ سسکی تھی۔

''میرا بیٹا۔۔۔میرا بیٹا ہے وہ۔''اُسے بازو سے جھنجھوڑتے ہوئے علی نے اُسے باور کروایا تھا۔

''اور کس حق سے میرے بیٹے سے ملنے آئی ہو؟ بولو؟''اُسے دوسری بار جھٹکا دیا۔بس نہیں چل رہا تھا گلا ہی دبا دے اُسکا۔

''علی! چھوڑو اُسے۔''سفیر صاحب اُسے پیچھے ہٹانا چاہتے تھے۔

''علی پلیز!''وہ رو رہی تھی۔

''بھول گئی جاتے ہوئے کیا کہہ کر گئی تھی یہاں سے؟ ہاں؟ یا میں یاد کرواؤں؟''اُسے ایک اور بار جھٹکا دیتے وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔

''بس کر دو علی! بس کر دو۔''اُسے دھکا دیتے ہوئے سفیر صاحب نے فاطمہ کو اپنے پیچھے کیا تھا۔

''ابّا! آج آپ بیچ میں نہیں بولیں گے۔آپ نے اسکو اندر آنے ہی کیسے دیا؟ یہ دو کوڑی کی عورت، میرے منہ پر مجھے ذلیل کر کے گئی تھی۔نکلو! میرے گھر سے۔۔۔چلو!''وہ دوبارہ فاطمہ کی طرف بڑھنے لگا، اس سے پہلے کے وہ اُسکو دھکّے دے کر گھر سے نکالتا سفیر صاحب چیخ اٹھے۔

''میں نے بلایا تھا اسے یہاں، میرے کہنے پر آئی ہے۔میں چاہتا تھا کہ احمد اپنی ماں سے ملے۔''وہ ساکت ہوا۔

''میں چاہتا تھا کہ۔۔۔''وہ مزید کچھ کہہ رہے تھے لیکن اپنا کانپتا ہاتھ اٹھا کر علی نے دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پھولے ہوئے تنفس کے ساتھ بولا۔

''ابھی اور اسی وقت۔۔۔یہاں سے دفع ہو۔ورنہ میں۔۔۔میں شوٹ کر دوں گا تمہیں۔''اُسکی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے! میں جا رہی ہوں۔جا رہی ہوں میں۔۔۔''وہ پرس اٹھاتی تیزی سے باہر نکلی۔علی کا اٹھا ہاتھ اُسکے پہلو میں گرا تھا۔سرخ آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا؟''

''علی! ایک دفعہ آرام سے بیٹھ کر۔۔۔''

''میں نے پوچھا کیوں؟''حلق کے بل چلاتے اُس نے میز پر رکھا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا، سفیر صاحب ساکن رہ گئے۔اتنے جلال میں تو وہ تب بھی نہیں آیا تھا، جب اُس نے فاطمہ کو طلاق دی تھی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیا لگا تھا اُس دو ٹکے کی عورت کو؟ میرے بیٹے کو چھین لے گی مجھ سے؟''سفیر صاحب ساکت ہوئے، وہ کیا سوچ رہا تھا؟

''نہیں بیٹا! تمہاری اولاد کو کوئی تم سے نہیں چھینے گا۔ تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''وہ نرم پڑے۔

''آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔بس''وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔

''کیوں کہ وہ ماں ہے اُسکی، حق ہے اُسکا اپنی اولاد سے ملنے کا، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو تم ایک ماں سے اُسکا حق نہیں چھین سکتے۔ایک بیٹے کے دل سے اُسکی ماں کی محبت نہیں نکال سکتے۔''بلآخر وہ پھٹ پڑے تھے۔

''اور میرے حقوق؟''اب کے وہ بولا تو آواز بھرا گئی تھی۔

''میرے حقوق ابّا؟ میرا حق نہیں تھا میری بیٹی پر؟ جسے اُس نے قتل کر دیا۔کیا وہ میری اولاد نہیں تھی؟''آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو وہ اندر دھکیلتے سوال کر رہا تھا۔وہ چپ رہ گئے۔

''بہر حال۔۔۔''خود پر قابو پاتے اُس نے لہجہ دوبارہ سخت کیا۔

''وہ دوبارہ اس گھر میں نہیں آئے گی، نہ احمد سے ملے گی۔میرے جیتے جی تو کم از کم ایسا نہیں ہوگا۔''اپنا فیصلہ سناتے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل چکا تھا، یہ دیکھے بنا کہ دروازے کے پیچھے سے چھپ کر اُسے دیکھتے، اُسکے بیٹے کی آنکھوں میں کچھ تھا۔کچھ ایسا جو علی ایک بار دیکھ لیتا تو شاید فنا ہو جاتا۔

---------+---------+---------

ہسپتال میں اب کم لوگ نظر آرہے تھے، دونوں کوریڈور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔چائے کی پیالیاں دونوں کے ہی ہاتھوں میں تھیں۔خاموشی دونوں کے درمیان ٹھہری ہوئی تھی، جزا کے دماغ میں بہت سارے سوالات تھے۔لیکن ہر بار جھجھک کر چپ ہو جاتی۔رضا اُسکی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ بلآخر اپنی پیالی کرسی کے کنارے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''اسکول کا اؤنر (مالک) میں ہی ہوں، عائشہ جی میری پھوپھو زاد بہن ہیں اور بیوہ ہیں۔اور وہ سارے بچے جو پناہ گاہ میں ہیں، اُن سے میرا یا عائشہ جی کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔وہ یتیم، لاوارث بچے ہیں، یا وہ جنہیں اُنکے اپنے گھر والوں نے ہی بھوک، افلاس یا دنیاوی تقاضوں سے تنگ آکر بے گھر کر دیا ہے۔''اُس نے فرصت سے وضاحت دی تھی۔

''میں نے کب پوچھا؟'' وہ گڑبڑا گئی۔

''میں نے بتادیا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ اگلے کئی دن تک تمہیں نیند نہ آتی۔'' مسکراہٹ دباتے اُس نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔

''اب ایسا بھی کچھ نہیں ہے، آپ کسی کو بھی بتائیں گے کہ آپکے اٹھائیس بچے ہیں تو وہ حیران تو ہوگا۔'' اُس نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر جیسے کوئی خیال آیا تو کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ

''وہ بچے مجھے مختلف جگہوں سے ملے ہیں، اب سب کی تفصیل میں جانے کا اس وقت، وقت نہیں ہے۔'' کمال مہارت سے مسکراہٹ چھپاتے سنجیدگی سے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں پوچھا، بلکہ میں تو یہ کہہ رہی تھیں کہ کل اسکول نہیں آسکوں گی۔ امی بہتر ہو جائیں تو پرسوں سے دوبارہ جوائن کروں گی۔'' اُس نے سٹپٹا کر سنجیدگی سے بتایا، جیسے وہ بس یہی سوال پوچھنا چاہتی تھی۔

''بالکل بالکل۔۔۔ تم یہی پوچھ رہی تھی۔'' اُس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے! کل تم چھٹی کر سکتی ہو، لیکن پلیز پرسوں ضرور آجانا۔ پیر کا دن ہے نہ۔۔ کام زیادہ ہوتا ہے۔'' اف!۔۔ جزا نے آنکھیں میچی، وہ اب کی بار مسکراہٹ چھپا نہ سکا۔

''اب کچھ نہیں بولوں گی میں۔'' دل میں عہد کیا۔ ''لیکن میں بول ہی کہاں رہی ہوں؟'' یہ تو خود ہی اندازے لگائے جا رہا ہے۔'' سر اٹھا کر اُسے ایسے دیکھا جیسے کہیں وہ پھر اُسکے خیالات نہ سن رہا ہو۔ جبکہ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا، سنجیدگی سے۔

''تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟ یعنی کوئی اور قریبی رشتے دار؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو اُس نے گہری آہ بھری۔

''دو بڑے بھائی ہیں میرے۔''

''تو کہاں ہیں وہ؟ اُنہیں اطلاع دی؟'' اُس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ضرورت نہیں ہے اُنکی۔'' سختی سے کہتی وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ چہرے پر بہت ساری داستانیں رقم تھی۔ رضا نے مزید سوال نہیں کیا۔

''آپ آنٹی کو دیکھ لیں، اگر ڈرپ ختم ہو گئی ہو تو ہم اُنہیں گھر لے جاتے ہیں۔'' ہاتھ میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتی کھڑی ہوئی۔

''جزا!۔۔۔'' وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اُس نے اتنے عرصے میں پہلی بار اُسے نام سے پکارا تھا۔

''آنٹی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے، تو کل تم پناہ گاہ آسکتی ہو بچوں سے ملنے ؟''

''میں ؟''اس غیر متوقع مطالبے پر وہ حیران ہوئی۔

''ہاں ! بچوں کا کوئی رشتے دار نہیں ہے، اگر کوئی باہر سے اُن سے ملنے آجاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔''اِس بات پر اُس کے دل کو کچھ ہوا۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔

''میں کوشش کروں گی۔''اب اگر اُس نے احسان کیا ہی تھا تو چکانا اُس کا فرض بھی تو تھا، اسی لیے حامی بھرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

---------+---------+---------

گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کیے، بونٹ سے ٹیک لگائے، سینے پر بازو باندھے وہ سڑک کے اُس پار بنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ دس سال پہلے وہ اس دروازے پر اکثر آیا کرتا تھا۔ گئے وقتوں میں گھر کا رنگ اور روپ کافی حد تک بدلا تھا، لیکن ظاہری طور پر وہ ویسا ہی تھا۔ کوئی یاد سی اُسکے دماغ میں چبھنے لگی۔ نہ جانے وہ کیوں یہاں آیا تھا؟ آیا تھا بھی تو یہاں آکر کھڑا کیوں ہو گیا تھا؟ آج کل دل کی حالت عجیب سی ہونے لگی تھی، زندگی پر چھایا جمود ٹوٹنے لگا ہو جیسے۔ وہ سر جھکائے جوتے کی نوک سڑک پر رگڑ رہا تھا کہ اچانک ہی اُس گھر کا دروازہ کھلا۔ اور سیاہ ٹراؤزر پر سیاہ ٹی شرٹ پہنے عمر باہر آیا، اُسے دیکھ کر مقدّم سیدھا ہوا۔ یہ تو اُسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس طرح اُس سے سامنا ہو جائیگا۔ ہاتھوں میں موبائل لیے وہ دروازے پر کھڑا کسی کو کال کر رہا تھا۔ مقدّم شش و پنج میں تھا کہ یہاں سے چلا جائے یا اس سے بات کرے ؟ اُسے تو خود آنے کی وجہ معلوم نہ تھی، اُسے کیا بتاتا؟ فون کان سے لگائے عمر کی نظریں اُس پر پڑیں۔ آنکھوں میں پہلے نا سمجھی، پھر شناسائی اور پھر حیرت نے باری باری ڈیرہ جمایا، نہ جانے وہ کس کو فون کر رہا تھا؟ کال کاٹ کر اُسکے پاس چلا آیا۔

''مقدّم ؟''اُسکے پاس آکر رکا اور حیرت سے اُسکا نام لیا۔

''تم یہاں ؟''

''تم سے ملنے آیا تھا۔''اپنے یہاں ہونے کا کوئی جواز تلاش کرنے میں ناکام مقدّم نے تھک کر ہار مان لی۔

''مجھ سے ؟''وہ مزید حیران ہوا۔''سب خیریت ؟''

''پتہ نہیں ؟''اُس نے کندھے اُچکا دیے۔

''تم ٹھیک ہو ؟''عمر اُسکی باتوں سے پریشان ہوا۔

''ہاں! میں تو ٹھیک ہوں، لیکن پچھلے ہفتے جب تم میرے آفس آئے تھے، تب تم مجھے ٹھیک نہیں لگے تھے، تو سوچا ملاقات کرلوں۔ آج ایف آئی اے آفس میں بھی تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں پوچھ نہیں سکا۔'' اُسکی فکر کرتا وہ، آج اُسے پہلے جیسا لگا تھا۔

''آؤ! اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' عمر نے اُسے گھر آنے کی دعوت دی۔

''اندر؟ نہیں خواہ مخواہ تمہاری فیملی ڈسٹرب ہو گی۔ ویسے ہی بہت رات ہو گئی ہے۔ میں تو بس ایسے ہی بلا ارادہ چلا آیا تھا۔'' اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''میری فیملی؟'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا، مقدّم سمجھ نہیں سکا۔

''اچھا چلو! کہیں باہر بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بات بھی کرنی تھی'' اُس نے اصرار کیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ مان گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک سٹریٹ ریسٹورانٹ میں بیٹھے تھے، چائے کی پیالیاں دونوں کے سامنے رکھی تھیں۔ اُسکے ساتھ آتو گیا تھا، لیکن آج دونوں کے پاس ہی بات کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ وہ زمانے گزر چکے تھے، جب اُنکی گفتگو ناختم ہونے والی ہوتی تھیں۔ یا شاید آج بات کرنے کے لیے تھا تو بہت کچھ، لیکن درمیان میں موجود خلا ابھی بھرا نہیں تھا۔ پریشانی سے ہونٹ کاٹتا وہ چائے کی پیالی کے کناروں پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عمر اُسکی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ وہ یقیناً کسی بات پر پریشان تھا۔

''پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' خاموشی میں عمر کی آواز گونجی تو اس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ پھر سیدھا ہوا۔

''پوچھنا کو کیا رہ گیا ہے؟ تم نے بتا تو دیا سب۔'' وہ اُداسی سے مسکرایا تھا۔

''مجھے لگا کہ جو کچھ یہاں ہوا تھا، وہ سب جاننا تمہارا بھی حق تھا۔ اسی لیے بتا دیا، کیا میں نے غلط کیا؟'' اُس نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! ٹھیک کیا تم نے، تم نہ بتاتے تو سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹ جاتا کہ تم سب کو آخر ہو کیا گیا ہے؟'' اُسکے جواب پر وہ چپ ہوا۔

''بہت بدل گئے ہو یار تم سب۔'' اُس نے تھک کر کہا۔ عمر کے چہرے پر اُداسی چھائی ''تم، علی، نوید کوئی بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ اور رضا۔'' اس نام پر عمر نے نظریں اٹھا کر دیکھا ''رضا کو دیکھ کے لگا بھی نہیں جیسے وہ کبھی کسی زمانے میں ہمیں جانتا ہو۔ اتنی اجنبیت؟ اتنی بڑی تو بات بھی نہیں تھی عمر! بعد میں معاملہ حل کیا بھی جا سکتا تھا۔'' گفتگو کا رُخ پھر اُسی جانب چلا گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی ماضی سے نہیں نکل پا رہا تھا، کیونکہ اُسکے لیے یہ ایک ہفتے پہلے ہوا انکشاف تھا، جس سے نکلنا اُسکے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اور رہی بات عمر کی، تو کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا یا ویسا بھی۔۔ یہ تمام مراحل وہ دس سال پہلے طے کر چکا تھا۔

''کیا ہم پہلے جیسے نہیں ہو سکتے؟'' عمر کا سوال غیر متوقع تھا، کتنے ہی لمحوں کے لیے مقدّم کچھ بول ہی نہ سکا۔

''ہمارے درمیان تو کچھ نہیں ہوا تھا نہ آغا! پھر ہم اپنے درمیان اتنا بڑا خلا کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ جیسے تم اور میں بس کوئی پرانے شناسا ہی تھے۔ دوستی جیسا کوئی تعلق تو تھا ہی نہیں۔'' وہ خاموش رہا۔

''جب ہم دوبارہ پہلے جیسے نہیں ہو پا رہے تو باقی سب کے بدلنے پر کیا سوال کرنا؟'' یہ اُسکے سوال کا جواب تھا، یہی وہ بات تھی جو وہ اُسے سمجھانا چاہتا تھا۔

''دس سالوں میں ہم نے بہت لمبا سفر کر لیا ہے، بہت آگے آ چکے ہیں ہم، واپس پہلے جیسے مقام پر نہیں جا سکتے ہیں، البتہ۔۔۔'' وہ رکا، مقدّم سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''امکان ہے کہ چیزیں پہلے جیسی ہونے لگے، لیکن اس میں وقت لگے گا۔'' اُس نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا اُسے۔

''ہم ہو سکتے ہیں۔'' ان ساری باتوں کے جواب میں اُس نے یہی کہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

''تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔'' پہلے تو وہ سمجھ نہ سکا لیکن جب سمجھ آیا تو ہنس دیا۔ ماحول پر چھایا سکوت یکدم ہی ٹوٹا تھا۔

''رات کے بارہ بج گئے، مجھے اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔'' مقدّم نے اچانک ہی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسکی عجلت دیکھ کر عمر مسکرایا۔

''شادی شدہ آدمی کو ویسے بھی گھر جلدی ہی جانا چاہیے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تم سے کس نے کہا میں شادی شدہ ہوں؟'' وہ مسکرایا۔ دونوں اب ریسٹورونٹ سے باہر آ چکے تھے۔ عمر کا گھر سامنے ہی کچھ قدموں کے فاصلے پر تھا۔

''نکاح شدہ تو دس سال پہلے ہی تھے، اب تک تو ایک دو بچوں کا والدین بھی ہونا چاہیے تمہیں اور لیلیٰ کو۔۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا۔ مقدّم ہنستا رہا، پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔

''چلو پھر، خدا حافظ۔ آئندہ میں تمہیں ایسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' گاڑی میں بیٹھتے اُس نے عمر سے کہا تھا۔

''آج ایسے ہی جا رہے ہو، اگلی بار گھر بھی آنا۔'' اُس نے بھی جواباً یاد دلایا کہ اس نے، اُسکی گھر آنے کی دعوت قبول نہیں کی تھی۔ وہ مسکرا کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا تو وہ دروازے سے پیچھے ہٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔ گاڑی سٹارٹ کر کے، اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے، اس نے رخ موڑ کر عمر کو دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔

''لیلیٰ میری زندگی میں نہیں ہے۔''عمر کی مسکراہٹ سمٹی،اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا مقدّم اُسے ''خدا حافظ'' کہتے گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

یہ وہ کیا کہہ گیا تھا؟لیلیٰ اُسکی زندگی میں نہیں تھی؟مقدّم کی زندگی میں؟

وہ بے یقینی سے اُس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے اُسکی گاڑی کھڑی تھی۔

شکووں کے بعد کچھ رازوں کا افشا ہونا۔۔۔

واپسی کی منزل کی دوسری سیڑھی یہی تھی۔۔۔

اُس دوسری سیڑھی کے دوسروں پر کھڑے وہ دو مسافر۔۔۔

ابھی بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔

وہ رات اُن دونوں پر ہی بہت بھاری گزرنے والی تھی۔

ٹیکسی کے شیشے پر دھند چھائی ہوئی تھی،بارش کی بوندوں کے باعث شیشہ گدلا ہو رہا تھا۔سردی بڑھ چکی تھی،پر اُسکے اندر کا موسم اُس سے بھی زیادہ سرد تھا۔آنکھیں اُن بارش کی بوندوں سے زیادہ نم تھیں۔آنسو اُسکے چہرے کے گرد لپٹا دوپٹہ بھگو رہے تھے۔فاطمہ آفندی کے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔وہ اپنے ہی رچائے ہوئے کھیل میں بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔

''دو کوڑی کی عورت۔۔۔''اپنے لیے علی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے،ورنہ شوٹ کر دوں گا تمہیں۔''یہ وہ شخص تھا،جس نے کبھی اُس سے اونچے لہجے میں بات بھی نہ کی تھی۔اور آج اُسکی آنکھوں میں کتنی نفرت اور کتنی حقارت تھی فاطمہ کے لیے۔بھیگتے چہرے کو صاف کرتے اُس نے شیشے سے سر ٹکا دیا۔اب کوئی شے جگہ پر نہیں آنے والی تھی۔

لیکن ایسا سوچتے ہوئے وہ بھول گئی کہ۔۔۔

ایک سال پہلے جب اُس نے تقی کا گھر چھوڑا تھا،تو اُسے لگا تھا وہ اُسے ڈھونڈتے ہوئے واپس آئے گا،یا تو اُسے یا اُسکی بیٹی کو جان سے مار دیگا۔لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔نہ وہ واپس آیا نہ اُس نے دوبارہ اُس سے ملنے کی کوشش کی۔جب تانگے پر بیٹھ کر وہ اپنے باپ کے گھر آئی تھی،تب بھی اس نے یہی سوچ تھا کہ اُسکے گھر والے اُسے قبول نہیں کریں گے۔کوئی شے پہلے جیسی نہیں ہو گی۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔اُسکے باپ نے اُسکے منہ پر دروازہ ضرور بند کیا تھا،لیکن رات بھر بیٹی

کو اپنی نواسی کے ساتھ دروازے پر بیٹھا دیکھ کر اُسے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ پچھلے ایک سال سے وہ وہیں تھیں۔ بے شک وہ اور اُسکی بیٹی، اُسکے بھائی اور بھابھیوں کے سامنے تیسرے درجے کے شہری جیسی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن کم از کم اُسکی بیٹی محفوظ تھی۔

وہ ذات جس سے فاطمہ نے پناہ مانگی تھی، وہ ہر شے پر قادر ہے۔

وہ تواب ہے۔۔۔

وہ رحمان ہے۔۔۔

--------+--------+--------

سردی بڑھ گئی تھی، اور ہر ذی روح اپنے اپنے گھروں میں دبکی بیٹھی تھی۔ بارش نے ماحول اور زیادہ سرد کر دیا تھا۔ ایسے میں سیاہ جینس پر سیاہ شرٹ ٹک ان کیے، اس پر سیاہ کاٹن کا جیکٹ ڈالے، چہرے پر چھائی اپنی ازلی سختی کے ساتھ، نوید گاڑی چلاتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُسکی بائیں جانب سمندر تھا۔ سامنے سٹریٹ لائٹ کی پیلی روشنیوں میں جگمگاتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ آج کل ڈیوٹی سے آتے ہوئے اُسے پھر سے دیر ہونے لگی تھی۔ خلیل کی نشان دہی کرنا، مائیکل کو ڈھونڈھنے سے زیادہ آسان تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ اس بار کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت محتاط تھے، اُنکی ایک بھی غلطی اُسے خبردار کر سکتی تھی۔ اور مائیکل کی طرح خلیل بھی ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

پر سکون انداز میں ڈرائیو کرتے اُسکی نظریں اچانک ہی سامنے نظر آتے فوٹ پاتھ پر پڑیں۔ بائیں جانب جہاں سمندر تھا، اُس سے پہلے ریلنگ لگی تھی۔ ریلنگ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے رکھی سنگی بینچوں میں سے ایک پر وہ بیٹھا تھا۔

سرمئی کوٹ پینٹ پر، سیاہ رنگ کا لونگ کوٹ ڈالے، سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح تھا۔ نوید دور سے بھی اُسے پہچان سکتا تھا۔ اُسکا پیر آپ ہی آپ بریک پر گیا اور گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ وہ کچھ دیر اندر بیٹھا اُسے دیکھتا تھا پھر جانے کیا سوچ کے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

کچھ ہی دور بینچ پر بیٹھا علی، اُسکی آمد سے بے خبر تھا، اپنے خیالوں میں محو، چہرہ پر ملال، حزن اور یاس کی تصویر بنے۔ نظریں سامنے نظر آتے سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں اس حد تک گم تھا کہ نوید بینچ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا لیکن اُسے تب بھی احساس نہ ہوا۔

نہ جانے اُسے کیا ہوا تھا؟ پچھلے دو ہفتوں سے خود کو اپنے خول میں بند رکھے نوید، آج اُسکی حالت دیکھ کر خود کو اس سے بات کرنے پر مجبور محسوس کر رہا تھا۔

''علی!'' آہستہ آواز میں پُکارا۔ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی آواز میں، اُسکی آواز کہیں دب گئی تھی۔ اُسکے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

''علی!'' اب کہ ذرا زور سے پُکارا تو وہ لمحے بھر کو چونکا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی نوید کھڑا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس کی خیریت دریافت کرتا آج وہ اُسے حیران کر رہا تھا۔

''میں؟''عجیب سے انداز میں سوال کیا۔نوید کو اُسکی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگی تھی۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟اتنی رات گئے؟''وہ آنکھوں میں ڈھیروں حیرت سموئے اُسے دیکھنے لگا۔ نوید جیسے اب ہوش میں آیا تھا،وہ کون ہوتا ہے اس سے ایسے سوال کرنے والا؟کیا لگتا ہے علی اُسکا؟وہ بھول گیا کہ دس سالوں کا فاصلہ ہے اُنکے درمیان؟

''میرا مطلب، تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''خود ہی سمجھ نہ آیا کہ کیا وضاحت دے؟علی اُسے ہی دیکھتا رہا۔۔۔یک ٹک۔۔

''میں گزر رہا تھا یہاں سے،تو تم پر نظر پڑی،سوچا کہ محتاط رہنے کو کہہ دوں۔''وضاحت در وضاحت، علی اپنی سابقہ پوزیشن میں برقرار۔۔۔

ایکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ صرف وہی بولے جا رہا ہے۔

''میں چلتا ہوں،خدا حافظ!''کہہ کر جانے کے لیے مڑا،کیا ضرورت تھی رک کر اُس سے بات کرنے کی؟وہ تو اسے پہچاننے کا روادار بھی نہیں تھا۔دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

''تم مجھے پہچانتے ہو؟''نوید کے قدم تھمے۔رخ موڑ کے دیکھا تو علی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔لانگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے،قدم قدم اٹھاتا اُسی کی جانب آ رہا تھا۔

''پچھلی دو ملاقاتوں میں تو مجھے لگا تھا کہ شاید تمہاری یادداشت جا چکی ہے۔تمہیں تو میں یاد بھی نہیں تھا۔''اُس نے تو شکوہ کیا تھا،لیکن نوید کو طنز ہی لگا۔چہرے پر سختی در آئی،دونوں ہاتھ جینز کی جیب میں ڈال کر لب بھینچے،اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔دونوں کے درمیان قائم دیوار جو شاید چٹخنے لگی تھی،ایک مرتبہ پھر وہیں آ کھڑی ہوئی۔

''کیا مجھے تمہیں پہچاننا چاہیے تھا؟''سوال تھا،لیکن اب کہ علی کو یہ جوابی طنز لگا تھا۔جو وہ اُسکے ساتھ کر چکا تھا،کردار کشی،الزام تراشی اور اُسکی ذات پر اُچھالے گئے کیچڑ کے بعد،کیا واقعی اُسے علی کو پہچاننا چاہیے؟

''تو آج کیوں شناسائی ظاہر کی؟آج بھی گزر جاتے اجنبیوں کی طرح،میری جان کی فکر نہ کرو۔''نوید کے ماتھے پر بل پڑے،شکوے اور شکایتیں درمیان میں آنے لگی تھیں۔وضاحتیں باقی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔''مختصر جواب دے کر وہ جانے کے لیے مڑا۔

''نوید!'' پیچھے سے پُکارا تو وہ دوبارہ رکا، پلٹ کے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔ جاؤ تم!'' سر جھٹک کے کہتا وہ واپس اپنی جگہ پر جا کے بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحوں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر مڑ کے اپنی گاڑی تک آیا۔ کتنی آسانی سے کہہ رہا تھا وہ کہ ''میری جان کی فکر نہ کرو'' اتنا آسان تھا کیا؟ جبکہ نوید اس کیس کو اُن سب سے زیادہ قریب سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اگر معاملے کی سنگینی کا سب سے زیادہ احساس تھا تو وہ وہی تھا۔ ایسے میں اُسے کسی بھی خطرے کے آگے چھوڑ دینا اتنا آسان تھا کیا؟ گاڑی کے دروازے پر رکھا نوید کا ہاتھ ڈگمگایا۔

ایک لمحہ۔۔۔

بس ایک لمحہ تھا اُسکے پاس۔

وہ اپنے اور علی کے درمیان ڈولتی اس دیوار کو گرا سکتا تھا۔ پھر باقی رہ کیا جانا تھا؟ بس ایک خلا؟ ایک ذرا سا فاصلہ۔۔

فاصلے تو طے ہو جاتے ہیں۔ خلا بھی بھر جاتا ہے۔

سر اٹھا کر علی کو دیکھا، وہ واپس اپنی سابقہ حالت میں بیٹھ چکا تھا، چہرہ سخت اضطراب لیے ہوئے تھا۔ اتنی رات گئے وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ آس پاس کوئی سواری بھی نہ تھی۔ کیا وہ پیدل یہاں تک آیا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی اُسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا اپنے ساتھ؟ ڈھیروں سوال تھے، اور جواب صرف سامنے بیٹھے اُس شخص کے پاس تھا۔ گہری سانس لیتے اُس نے ہینڈل چھوڑ دیا۔

وہ واپس پلٹا، بھلا اس شخص کو یہاں چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا؟ ماضی میں ایک بار چھوڑ دیا تھا، اب نہیں کر سکتا تھا۔

اُسکے پاس آیا، کتنے ہی لمحے کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر برابر میں ہی کچھ فاصلہ رکھ کے بیٹھ گیا۔ علی نے حیرت سے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ سامنے نظر آتے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر خفگی صاف ظاہر تھی۔

آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ اُسے چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔

ایس ایس پی نوید عالم نے دیوار گرا دی تھی۔

واپسی کی منزل کی پہلی سیڑھی۔۔

پہلی سیڑھی پر کھڑے وہ دوسرے دو مسافر

نوید عالم اور علی سفیر۔۔۔

---------+---------+---------

''یہ کیا کر دیا تم نے؟ صاحب نے آخری بار کہا تھا کہ باجی گھر سے نہیں نکلنی چاہیے۔''

''میں کیا کروں؟ دوسرا گارڈ آج آیا نہیں اور میں بس تھوڑی دیر کے لیے باتھ رُوم گیا تھا۔''

''تو جا کر ڈھونڈ نہ۔۔۔ پتہ نہیں کب سے نکلی ہے گھر سے۔''

''میں دیکھ آیا ہوں ہر جگہ، اب کیا کروں۔ صاحب تو گولی مار دے گا مجھے۔''

''قبرستان دیکھا؟ میں نے سنا تھا وہیں جاتی ہے۔''

''دیکھ آیا وہاں بھی، اتنا بڑا قبرستان ہے۔ کہاں ڈھونڈوں؟ مجھے تو نہیں معلوم کہاں چلی گئی۔''

خوف سے کانپتے، ایس ایس پی نوید عالم کے وہ دونوں ملازم، اس وقت اپنی موت سامنے دیکھ رہے تھے۔ اُنکے صاحب کی بیوی گھر سے غائب تھی۔

---------+---------+---------

چھٹا باب

شک

بینچ پر اُسکے برابر بیٹھے نوید کا چہرہ سمندر کی جانب تھا، خاموشی کا طویل وقفہ دونوں کے درمیان حائل ہوا۔ پچھلی دو ملاقاتوں میں وہ نوید سے مخاطب ہونا چاہتا تھا، لیکن اُس سے بات نہ ہو سکی، اور آج وہ ساتھ بیٹھا تھا لیکن پھر بھی بات کرنے کو الفاظ نہ مل رہے تھے۔ ذہن پہلے ہی بھٹکا ہوا تھا، انجان قاتل، موت کا پیغام، فاطمہ کی آمد اور احمد سے ملنے کا مطالبہ، ہر شے گڈ مڈ ہو رہی تھی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ذہن بھٹک کے پھر سے فاطمہ آفندی کے گرد گھومنے لگا۔

''کیا کرتا میں؟ تمہیں دیکھتے ہی گلے لگا کر خیر مقدم کرتا تمہارا؟'' علی چونکا۔ وہ اُسکے شکوے کا جواب دے رہا تھا۔ چہرہ ہنوز سمندر کی جانب تھا۔

''میں نے شکایت تو نہیں کی؟ بس جاننا چاہتا تھا کہ آج کیا وجہ ہوئی کہ تم مجھے دیکھ کر رک گئے؟'' آہستہ آواز میں وضاحت دی۔

''تمہارا اسطرح رات کے وقت بنا کسی احتیاط کے باہر پھرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، گو کہ۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''کہ؟''

''کچھ نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں گھر جانا چاہیے۔'' بات بدلی۔

''چلا جاؤں گا۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ نوید نے گردن موڑ کے غور سے اُسے دیکھا، کوئی شے تو تھی، جو اُسے تنگ کر رہی تھی۔

''کس طرح جاؤ گے؟ پیدل؟''

''ہاں!''

''میں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''میں نے کہا ہے نا۔۔۔ میں چلا جاؤں گا خود ہی۔''

''تو پھر جاؤ ابھی، یہ بھی کوئی وقت ہے اس قسم کے نظارے کرنے کا۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے خفگی سے سمندر کی جانب اشارہ کیا تو وہ اُسکے انداز پر مسکرا دیا، اس پاگل کو آج بھی تسلی دینی نہیں آئی تھی۔

''تمہاری جان کو خطرہ ہے، احتیاط کرنی چاہیے تمہیں، میں چھوڑ دیتا ہوں نا!'' اُسے مسکراتا دیکھ، نوید کو اُسکی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا، اسی لیے دوبارہ پوچھا۔

''میری جان کی فکر کیوں کر رہے ہو؟ کیا میں وہ نہیں ہوں، جس نے تمہاری کردار کشی کی تھی؟'' بڑا غیر متوقع سوال تھا۔ یکدم ہی اُسکے ماتھے پر بل پڑے اور چہرے پر دوبارہ سختی در آئی۔ علی جانچتی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ آنکھوں میں سختی لیے کھڑا ہو گیا۔

''تم جانتے ہو تم سب کے پیچھے اس وقت سی ٹی ڈی کے کتنے جوان گھوم رہے ہیں؟'' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چہرے پر اجنبیت طاری کیے اُس نے سوال کیا۔

علی ناسمجھی سے اُسے دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''تم، اور تمہارے ساتھ باقی تمام لوگوں کے پیچھے کم از کم بھی سی ٹی ڈی کے تین تین جوان، عام لباس میں گھوم رہے ہیں۔ جنہیں تم پہچان بھی نہیں سکتے۔ صرف اس لیے کہ تم سب کی حفاظت کو یقینی بنایا جاسکے۔ تمہاری ایک غلطی علی۔۔۔ صرف ایک غلطی، کئی زندگیاں برباد کر سکتی ہیں۔'' اس وقت وہ اُس سے چند قدم دور ہونے کے باوجود کئی گنا فاصلے پر نظر آرہا تھا۔ شناسائی، پرانے تعلق کی ایک جھلک، سب پل میں ہی چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ اب وہ صرف ایک سی ٹی ڈی آفیسر تھا، جو علی کی لاپرواہی کو ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری فکر کرنا میرا ذاتی مفاد نہیں ہے، بلکہ اس ملک کے ہر شہری کی حفاظت کرنا میرے فرائض میں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایسی لاپرواہی دوبارہ نہ کرو۔''

اُسے تنبیہہ کر کے نوید نے دوبارہ اُسے ساتھ چلنے کی پیشکش نہ کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا جا کر گاڑی میں بیٹھا، اور یہ جا وہ جا۔۔۔

علی نے گہری سانس لی اور جانے کیلئے پلٹ گیا۔

دیوار بے شک گر گئی تھی، لیکن ان دونوں کے درمیان آیا خلا بہت گہرا تھا۔

بہت زیادہ۔۔۔

-------+--------+--------

علی سے ہونے والی گفتگو نے پہلے ہی اُسکا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا، جو بات وہ نہیں کرنا چاہتا تھا وہ وہی بات نکالے بیٹھ گیا تھا۔ اُس پر سے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک نئی پریشانی اُسکی منتظر تھی۔

اُسکے ملازمین چہرے پر مسکینیت طاری کیے اُسکے سامنے کھڑے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اُس نے حیرت سے اُن سب کو قطار میں کھڑے دیکھا۔

''صاحب وہ۔۔۔'' گارڈ نے تھوک نگلا، اُسکے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کے دماغ نے سارا حساب کتاب کر کے نتیجہ برآمد کر لی۔

''بشریٰ۔۔۔'' غصّے کا اُبال اُسکے اندر اٹھا تھا۔ وہ الٹے قدموں باہر کی جانب بھاگا تھا۔

''صاحب میں ساتھ آؤں؟'' گارڈ نے تیزی سے اُسکے پیچھے آتے ہوئے پوچھا

''شٹ اپ۔۔۔ تم سے میں اُسکا حساب آکر لوں گا۔'' اُسے دھمکی دیتا، وہ گاڑی لے اُڑا تھا۔

اس گھر کے ملازمین کو اُس نے کبھی یہ پتہ نہیں چلے دیا تھا کہ بشریٰ رات کو قبرستان چلی جاتی ہے۔ اُسکے ہزار دشمن تھے، کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ گو کہ ملازمین کی پوری جانچ پڑتال کر کے گورنمنٹ اُسکے حوالے کرتی تھی، لیکن پیسوں کی لالچ کسی کو بھی ایمان بیچنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

جب پہلی بار بشریٰ گھر سے غائب ہو کر قبرستان آ کر بیٹھی تھی، تب وہ حقیقتاً پریشان ہوا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں جب اُسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف قبرستان ہی جاتی ہے، تو اس نے اُسے جانے دیا۔ وہ اُسکے پیچھے گھر سے نکلتی تو ملازمین کو یہی لگتا کہ صاحب کی بیگم کسی کام سے جا رہی ہیں۔ گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارتے اور دیگر کام کاج کرتے جب وہ باہر جاتی تو ملازمین کو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کہاں جا رہی ہو گی۔ لہٰذا ملازمین کو اُس کی آمد و رفت پر نظر رکھنے کیلئے کہنے سے بہتر تھا کہ نوید اُسے قبروں پر جانے دیتا، اور واپسی اُسے خود لیکر آتا۔ ایسا ہر روز نہیں ہوتا تھا، لیکن جب بھی ہوتا ملازمین یہی سمجھتے کہ وہ کسی کام سے باہر گئی ہے۔

البتہ مائیکل والے واقعے کے بعد سے وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اُس نے پہلی بار ملازمین کو کہا کہ گھر سے کسی کو جانے نہ دے، یہ میرا حکم ہے۔ لیکن پہلی بار میں ہی ٹھیک ٹھاک نااہلی کا مظاہرہ ہوا تھا۔

قبرستان پہنچ کے وہ اپنے بچوں کی قبروں کے پاس آیا تو بشریٰ وہاں نہیں تھی، آس پاس دیکھا۔ اندھیرا بہت زیادہ تھا۔

''بشریٰ! میں جانتا ہوں تم یہیں ہو۔'' قبرستان کی خاموشی میں اُسکی بھاری آواز گونجی تھی۔

''ٹھیک ہے، اگر تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اُس نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ جیسے یقین ہو کہ وہ وہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔

''اور جب ہم دونوں ہی گھر نہیں جائینگے، تو ہمارے بچے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیں گے۔ اچھا لگے گا تمہیں یہ؟'' اُس نے ہمیشہ کا آزمودہ حربہ استعمال کیا۔

''تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔'' اپنے پیچھے سے آتی آواز پر وہ جھٹکے سے پلٹا۔ وہ ایک اونچے درخت کے پیچھے سے برآمد ہوئی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نوید نے سکھ کا سانس لیتا اُسکے پاس آیا۔

''کیوں کرتی ہو تم ایسا؟ کیوں پریشان کرتی ہو مجھے؟ منع بھی کیا تھا تمہیں کہ میرے بنا گھر سے باہر مت نکلنا۔'' وہ جیسے تھک گیا تھا۔

''میں کیا کروں؟ میرے بچے مجھے بلاتے ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی تھی۔

''گھر چلو۔'' اُس نے اسکے دونوں ہاتھ تھامے۔

''نہیں۔۔ آج میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔ بس!'' وہ نفی میں سر ہلاتی رونے لگی تھی۔

''چلو!'' اُس نے نظر انداز کرتے ہوئے اُسے ساتھ گھسیٹا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ چیخ اُٹھی تو نوید کے قدم تھمے۔

''کہیں نہیں جاؤں گی میں۔'' وہ اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہوتی اُسکے بازو پر تھپڑ مارتی چیخ رہی تھی۔ آج پورے چھ ماہ بعد اُس نے وہی ردعمل دیا تھا۔

''بشریٰ! کیا ہو گیا ہے؟ ہم گھر نہیں جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟'' اُس نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔

''نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔۔۔میرے بچے۔۔اکیلے۔۔۔''وہ ہچکیوں سے روتی چیخ رہی تھی۔

''بشریٰ! ہوش کرو۔''نوید نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔وہ تھک کر نیچے بیٹھتی چلی گئی،وہ بھی اُسکے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔

''بشریٰ۔۔۔بشریٰ۔۔''اُسکے گال تھپتھپاتے ہوئے پریشانی سے چلایا تھا،لیکن وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

اُسے بازوں میں اٹھاتے،گاڑی میں ڈال کر گھر لاتے اور بیڈ روم تک لیجاتے،وہ اشتعال انگیز انداز میں ملازمین کو ڈاکٹر بلانے کیلئے کہہ رہا تھا۔گھر کے تمام ملازمین خوف سے کانپ رہے تھے۔اُنہوں نے یقیناً بڑی غلطی کی تھی۔

اُسے دورہ پڑا تھا،ڈاکٹر نے فوراً اُسے Haloperidol اور Promethazine کا انجکشن دیا تاکہ دماغ کو وقتی طور پر پر سکون کیا جا سکے۔اُسے ضروری احتیاط کی ہدایت دیتا ڈاکٹر واپس جا چکا تھا۔اُسے سکون سے سوتا چھوڑ کر نوید نے پہلے اپنے بچوں کے کمرے میں جھانکا،دونوں کمبل میں لپٹے سو رہے تھے۔جانے سے پہلے وہ یہ اطمینان کر کے گئی تھی کہ دونوں بچے سو رہے ہوں۔ریکنگ سے نیچے جھانکا تو گراؤنڈ فلور کے لاؤنج میں سارے ملازمین قطار میں کھڑے تھے۔غصّہ ایک بار پھر عود آیا۔جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے،چہرے پر سختی لیے وہ نیچے اترتا،اُنکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اس نااہلی کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟''سنجیدگی سے پوچھا۔

''صاحب! میں بس تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔''

''وہ گھر سے باہر گئی تو مجھے فون کیوں نہ کیا؟ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کچھ بھی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دو؟''ملازم کی بات کاٹتے اُس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں نے جان بوجھ کر۔۔۔''

''کہا تھا یا نہیں؟''وہ دھاڑا تھا۔

''کک۔۔کہا تھا۔''اُنکے چہرے خوف سے سفید ہو رہے تھے۔

''تو پھر یہ غلطی کیسے ہوئی؟''آنکھوں میں غیظ و غضب لیے وہ اُنکے اوسان خطا کر رہا تھا۔سب سہمے کھڑے تھے۔

''صاحب! میں نے سوچا تھا کہ۔۔کہ آپکے آنے سے پہلے تک انکو ڈھونڈ کر لے آؤنگا۔میں قبرستان۔۔۔''ملازم کوئی وضاحت دینے ہی لگا تھا کہ نوید نے اپنی جگہ سے ہلے بنا اُسکا گریبان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے اپنے قریب کیا۔

''جب میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ مجھے فوراً اطلاع دو،تو تم کون ہوتے ہو اپنی سوچ استعمال کرنے والے؟ ہاں؟''اُسکا چہرہ جبڑے سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''میرے آتے تک اگر کچھ ہو جاتا تو؟ بولو؟''

''معاف کر دیں صاحب! غلطی ہو گئی۔''وہ منمنایا۔

''اُسکا حساب کل تم سب ڈیپارٹمنٹ کو دو گے،مجھے ایسے نااہل ملازم نہیں چاہیے۔''اُسے چھوڑتے ہوئے سرد لہجے میں کہا اور ان سب کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔وہ سر جھکائے خاموشی سے وہاں سے چلے گئے تو وہ تھک کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتا،سر پیچھے کیے کنپٹی مسلنے لگا۔

''اسے کیسے پتہ کہ بشریٰ قبرستان جاتی ہے؟''اچانک ہی یاد آیا تو سیدھا ہو بیٹھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ان میں سے کوئی بھی ملازم نہیں رکھنے والا تھا۔

-------+--------+--------

وہ گھر آیا تو احمد جاگ رہا تھا اور سفیر صاحب لاؤنج میں پریشانی سے ٹہل رہے تھے۔ وہ اُسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر تیزی سے اُسکے پاس آئے۔

''تم ٹھیک ہو علی؟''

''تم کیوں جاگ رہے ہو اب تک؟''اُس نے اُنہیں نظر انداز کر کے احمد سے پوچھا۔ وہ ڈر کے کھڑا ہوا۔ وہ ویسے بھی علی سے خائف ہی رہتا تھا۔

''بچہ پریشان ہو گیا تھا۔''

''میں نے پوچھا کہ سوئے کیوں نہیں اب تک؟''اُسے بازو سے پکڑ کر سفیر صاحب، فاطمہ، نوید اور دنیا جہاں کا غصّہ اُسی پر اتارا تھا۔

''سوری بابا!''اُس نے آنسوؤں سے نم آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہمیشہ کا کہا ہوا جملہ دھرایا۔

''رونا مت۔۔۔ بالکل نہیں پسند مجھے لڑکوں کا رونا۔''اُس نے مزید ڈانٹا تو احمد نے سر جھکا لیا کہ اُسکے آنسو اُسکے باپ کو نظر نہ آئیں۔

''مت ڈانٹو اُسے علی! بچہ ہے وہ۔''سفیر صاحب نے دکھ سے کہا تو اس نے ایک شکوہ کناں نظر اپنے باپ پر ڈالی۔

''فوراً جا کر سو، بے شک کل اتوار ہے لیکن تم ہر حال میں صبح آٹھ بجے اٹھو گے۔''اُس نے سختی سے کہا تو وہ جلدی سے اندر بھاگا۔ علی اپنے باپ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پچھلے چار سال سے اُسکا اپنے بیٹے سے یہی رویہ تھا۔ سفیر صاحب تھک کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

اُنکے پاس پچھتانے کے لیے بہت کچھ تھا، لیکن سب سے زیادہ دکھ اُنہیں اس بات کا تھا کہ علی کے اندر اُنہیں اب اپنا آپ نظر آنے لگا تھا۔

-------+--------+--------

اور وہ سامنے کھڑی تھی، رضا نے اُسے ایسے ہی آنے کو کہہ دیا تھا، پر وہ واقعی آچکی تھی۔

''تم نے کہا تھا کہ بچوں سے مل لوں، تو اسی لیے آگئی۔''اُسے حیرت سے خود کو دیکھتا پا کر خجالت سے بولی۔

''تمہارا بہت شکریہ کہ تم آئی، آنٹی کیسی ہیں؟''

''الحمدُاللہ! طبیعت کافی بہتر ہیں اب۔ ابھی ہماری پھوپھو کی طرف گئی ہیں، اُن سے ملنے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ تم بیٹھو! میں تمہیں بچوں سے ملواتا ہوں۔''پتہ نہیں وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ جزا کے آنے کی خوشی تھی یا اس بات کی کہ وہ اُسکی بات مان کر آگئی تھی۔ وہ اُسے وہاں چھوڑ کے اندر کی جانب کسی کمرے میں چلا گیا، وہ چہرہ گھما کر یہاں وہاں دیکھنے لگی، اچانک ہی اپنے بازو پر سرسراہٹ کا احساس ہوا، چہرہ گھما کے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئی۔ سرسراہٹ دوبارہ ہوئی تو اب کہ رخ پھیر کر دیکھا۔ اب بھی کوئی نہیں تھا، وہ پریشان ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ایک ننھا سا ہاتھ برآمد ہوا اور صوفے کے ہاتھ پر کچھ تلاشنے کے سے انداز میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اُس نے ذرا

ساسر آگے کر کے نیچے جھانکا تو پہلے رنگین کلپوں والا سر، اور پھر گول گول آنکھوں سے اُسے دیکھتا معصوم سا چہرہ نمودار ہوا۔ جو صوفے کے پیچھے سے چھپ کر اُسے چھیڑ رہا تھا۔

''اوہ۔۔ تو یہ آپ تھیں؟'' اُس نے بچی کی ناک دبائی، وہ شرما کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپانے لگی تو اُسے، اُس پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ اُس نے اُسے گود میں اٹھالیا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' وہ سال ڈیڑھ سال کی بچی، اُسکی گود میں آنے کے بعد بھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئی تھی۔

''آ۔۔۔ کیوٹو'' جزا نے اُسے قریب کر کے اُسکے ماتھے سے اپنا ماتھا ٹکرایا۔ اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیکر کمرے میں داخل ہوتا رضا، اُن دونوں کو دیکھ کر تھما تھا۔ مومنہ کے ساتھ کھیلتی جزا، منظر سے غائب ہو رہی تھی۔ اُسکی جگہ رضا کی ماں نے لے لی تھی، مومنہ کی جگہ رضا آ گیا تھا۔ وہ سانولے چہرے اور پر کشش نقوش والی اُسکی ماں، اُسے پیار کر رہی تھی۔

''بھئی! یہ تو بہت شرمیلی ہے۔'' جزا نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ہوش میں واپس آیا۔

''کوئی نہیں! بہت شرارتی ہے۔ بس ابھی ایسے ہی ڈرامے بازیاں کر رہی ہے۔'' مومنہ اُسکی گود سے اُتر کر رضا کے پاس آگئی تھی۔ رضا نے ایک سال سے لیکر چار سال تک کے پانچ چھّ بچے جزا کے سامنے لا کھڑے کیے۔

''بچوں! ان سے ملو، یہ ہماری پڑوسن ہیں۔'' اُس نے تعارف کروایا۔ بچے دلچسپی سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''ہیلو!'' جزا نے انکو دیکھ کر ہاتھ ہلایا، تو بچے ہنسنے لگے۔ واکر میں بیٹھا بچہ اُسے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں ہمکنے لگا۔ اُس نے اُسے گود میں لے لیا۔ اب وہ اُسکے کانوں میں لٹکتے بندے چھیڑ رہا تھا۔

''اسکا نام محمد ہے، یہ مومنہ ہے، یہ مناہل اور اسکا نام ولید ہے۔ یہ والا۔۔۔'' وہ ایک ایک بچے کا تعارف کروا رہا تھا۔ جزا باری باری سب سے مل رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اور بچے آجاتے اور اُس سے مل کر جاتے۔ رضا ساتھ ساتھ اُنکا تعارف بھی دے دیتا۔

''ماشاءاللہ! بہت سمجھدار بچے ہیں۔'' اُس نے تعریف کی تو وہ مسکرایا۔ عائشہ جی دونوں کے لیے چائے اور ناشتے کے لوازمات لے آئیں۔

''زحمت کی آپ نے۔''

''ارے زحمت کیسی؟'' وہ وہیں بیٹھ گئیں۔

''ان بچوں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' جزا نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے جاننا چاہا۔

''مختلف حالات ہیں سب کے۔۔۔۔ سب کی تفصیل میں تو ابھی نہیں جاسکتا، لیکن کچھ کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔ یہ محمد ہے، اِسے اِسکے ماں باپ ابھی کچھ دن پہلے ہی یہاں چھوڑ کے گئے ہیں۔''

''سگے ماں باپ؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! سگے ماں باپ۔۔۔اسکوڈاؤن سنڈروم ہے۔اسکے ماں باپ بیمار بچے کو نہیں پالنا چاہتے تھے،اسی لیے یہاں چھوڑ گئے۔میری ایک اسکول ٹیچر کے کزن تھے،اُنہوں نے ہی بچے کو یہاں لانے کا کہا۔''جزا کو اپنے دل میں تکلیف محسوس ہوئی۔کوئی ماں باپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟

''مومنہ کا باپ مر گیا تھا،ماں دوسری شادی کر کے باہر ملک چلی گئی تھی۔جانے سے پہلے اسے میرے حوالے کر گئی۔ویڈیو کال کر کے بات کرتی رہتی ہیں۔ وہ بچہ عبدالرافع، جس کی تم شکایت لیکر آئی تھی۔اُسکے ماں باپ نے ساری زندگی سڑکوں پر ہی گزار دی تھی۔ایک رات اسی طرح وہ سڑک کنارے سوئے ہوئے تھے،جب ان پر ایک ٹرالر چڑھ کر چلا گیا۔بچہ حادثے میں محفوظ رہا تھا۔اُسے میں یہاں لے آیا۔''وہ ایک ایک کر کے سب کی تفصیل دے رہا تھا۔

''اور وہ؟ وہ کون ہے؟''اُس نے دروازے کے پیچھے چھپی ایک بچی کی جانب اشارہ کیا۔رضا نے تعاقب میں دیکھا تو اُسکی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''وہ۔۔وہ ارمینہ ہے۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''شرمیلی ہے ذرا۔۔۔''عائشہ جی نے کہا۔ارمینہ سب کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔رضا کی نظروں نے دور تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔

''تم ان بچوں کے لیے کسی ادارے کی مدد لیتے ہو یا کوئی فنڈز وغیرہ۔''جزا نے ذرا سنبھل کر سوال کیا تھا،پر عائشہ جی نے دہل کر اُسے دیکھا۔کیونکہ یہ وہ سوال تھا جو رضا کو بھڑکا دیتا تھا،اُسے احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط بول گئی ہے،لیکن وہ ہنس دیا۔

''یہ میرے بچے ہیں جزا! یہ اپنے حصے کا رزق کھاتے ہیں،یہ گھرانکا ہے۔نہ یہ یتیم خانہ ہے نہ ہی خیراتی ادارہ۔۔۔''اُس نے ٹھہر ٹھہر کے جواب دیا۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی،بھلا اتنے سارے بچوں کی ضروریات،خواہشات اور اخراجات بنا کسی فنڈز کے کیسے پورے ہو رہے تھے؟لیکن مزید سوال نہ کیا۔

''تمہاری امی کیسی ہیں؟''عائشہ جی نے پوچھا تو وہ اُنکی جانب متوجہ ہو گئی۔لیکن ذہن وہیں بھٹک رہا تھا۔

کائی رنگ کے ٹراؤزر پر ہم رنگ زپر سویٹر پہنے رضا،اُسکے تاثرات سے محظوظ ہوتا چائے پی رہا تھا۔زندگی یکدم ہی پر سکون لگنے لگی تھی۔وہ اُسکے بلانے پر آئی تھی،بچوں سے ملی تھی۔اُس نے رضا کی بات مان لی تھی۔

جاتے وقت کچھ چھوٹے بچے بھی رضا کے ساتھ اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے تھے۔وہ اُسکے ساتھ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''اب مجھے بتاؤ گے کہ تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟''دروازے پر کھڑی جزا کے سوال نے اُسے حیران کر دیا۔اُسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنے جلدی جان جائے گی۔

''حیران مت ہو!،ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔مجھے وہ وجہ جاننی ہے بس۔''براؤن اور بلیک امتزاج کے سوٹ میں،دروازے سے منسلک کیاری کے پاس کھڑی،اس وقت وہ بھی منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔سانولی رنگت سرما کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔رضا نے گہرا سانس لیا۔

''میں تمہیں بطور بچوں کی استاد ہائر کرنا چاہتا ہوں۔''اُس نے مدّعا بیان کیا۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھو! ان بچوں کو پڑھانے اور گھر میں انکی اخلاقی تربیت کرنے لیے ایک ٹیچر آیا کرتی تھیں، بچے بھی کافی اٹیچ تھے اُنکے ساتھ، لیکن پھر وہ اسلام آباد منتقل ہو گئیں تو دوبارہ کسی کو ہائر نہیں کر سکا، کیونکہ بچے کافی اُداس تھے اور کسی سے گھل مل بھی نہیں رہے تھے۔ اور دیگر ٹیچرز بھی بس پیسوں کے لیے ہی آنے کو تیار تھے۔ مجھے ایسا استاد چاہیے جو انہیں اپنا بچہ سمجھ کر اُنکی تربیت کرے، اُس دن اسکول کی میٹنگ میں اور آج بچوں کے ساتھ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمہارے اندر وہ قابلیت اور صلاحیت ہے۔ اگر تم روز شام میں چند گھنٹے ان بچوں کو دے دو، تو انکے لیے اچھا ہو گا۔ اینڈ آئی ول پے فار دیٹ (اور میں اسکا معاوضہ دونگا)۔'' اُس نے تفصیلاً مدعا بیان کیا۔ اس دوران جزا کی نظریں گھاس کی طرف تھیں، اُسکا دماغ سارے حساب کتاب کر رہا تھا۔ نوکری کی ضرورت تو اُسے ویسے بھی تھی، صرف اسکول کی تنخواہ سے گزرا نہیں ہوتا تھا اور مجبوراً بھائیوں سے خرچ لینا پڑتا تھا۔ اگر وہ یہ نوکری کر لے تو اُسی کا فائدہ ہے۔ اور برابر میں ہی گھر ہونے کی وجہ سے امی کی طرف سے پریشانی بھی نہیں رہے گی نہ بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیگا۔

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟'' اُسے خاموش دیکھ کر رضا نے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ستواں ناک میں سجی لونگ شام کی جاتی دھوپ میں چمکی تھی۔

''ٹھیک ہے! میں کل سے آجاؤں گی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اُس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

''تمہارا بہت شکریہ۔''

''شکریہ اُن کو کہتے ہیں جو احسان کریں، اور بچے احسان کے نہیں، پیار کے مستحق ہیں۔'' اُسی کے انداز میں، اُسی کا جواب اُسی کو لٹاتی، وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ رضا حیران سا، اُسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

-------+--------+--------

''یہ دیکھیں! میرے بیٹے کو پولیو ویکسین ابھی چند دن قبل ہی لگی ہے، لہٰذا اسے قطروں کے ضرورت نہیں ہے۔'' مقدّم نے میڈیکل ریکارڈ دروازے پر کھڑی پولیو ور کر کے سامنے کیا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے رجسٹر میں کچھ لکھنے لگی۔

''معذرت سر کہ آپکو زحمت ہوئی، لیکن کیا کریں؟ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔'' خاتون نے پیشہ وارانہ طریقے سے کہا۔

''کوئی بات نہیں!'' اُس نے معذرت قبول کرتے ہوئے دروازہ بند کیا تھا۔ گلی گلی پولیو مہم چل رہی تھی، اور وہ مکرم کو پہلے ہی ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ویکسین لگوا چکا تھا۔ لیکن اُنکے پاس رکارڈ موجود نہیں تھا۔ صبح سے اب تک وہ دو مرتبہ انکے ساتھ سر کھپا چکا تھا لیکن وہ بار بار آجاتے، اور یہی کہتے کہ ہم تک ریکارڈ نہیں پہنچا۔ پھر جب وہ میڈیکل ریکارڈ دکھاتا تو معذرت کرتے ہوئے چلے جاتے۔ ابھی بھی یہی ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹا، باغ کراس کر کے وہ گھر کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ مرکزی دروازہ پھر سے بج اٹھا۔

''اب کون ہے؟'' وہ جھنجھلاتا ہوا دوبارہ دروازے تک آیا۔

''السلام علیکم! میں۔۔۔'' دروازہ کھولا تو سامنے نیلے رنگ کے عبایا میں سکارف لپیٹی ایک لڑکی کھڑی تھی، کندھے پر بیگ ٹانگ رکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر مقدّم کا دماغ گھما تھا۔

''مس کمیونیکیشن اور مس مینجمنٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔'' اُسکی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ بولا۔ نووارد حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''آپکی ٹیم لیڈ اور ورکرز کو صبح سے دو مرتبہ میں بتا چکا ہوں کہ میں اپنے بچے کو پولیو ویکسین لگوا چکا ہوں۔ آپکی ٹیم لیڈ، رجسٹرڈ بھی کر چکی ہیں لیکن پھر بھی۔۔'' وہ سخت تپا ہوا تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' لڑکی نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اب یہ آپ کو آپ کی ٹیم لیڈ سمجھائیں گی۔ کم از کم اُنہیں پوری ٹیم کو مطلع کرنا چاہیے کہ اس گھر کے بچے کو پولیو دیا جا چکا ہے۔ نہیں تو دیوار پر لکھا ہوا نمبر ہی پڑھ لیں، لیکن نہیں! اپنی عقلیں استعمال ہی نہیں کرنی۔'' رکھائی سے کہتا وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔ اگلا ہی لمحے پھر بیل بجی اور اس زور سے کے اُس کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

''کیا مسئلہ۔۔۔'' سامنے کھڑی اُسی لڑکی کو دیکھ کر وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ اس بار لڑکی نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے چڑھائی کر دی۔

''انسان کے اندر اتنی تمیز اور اتنے اخلاقیات تو ہونی چاہیے کہ پہلے وہ آنے والے کا تعارف لے، نہ کہ اپنی قیاس آرائیاں شروع کر دے۔ اس بد تمیزی کا حساب آپ سے بعد میں لوں گی، ابھی مجھے میرے بھانجے سے ملوایئے۔'' اگلی نے بھی حساب بے باک کیا۔

''کیا مطلب؟'' اُس نے نا سمجھی سے دیکھا اور اگلے لمحے اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''شیریں کی بہن۔۔ مکرم کی خالہ۔۔'' اُسکی یاداشت نے کام کرنا شروع کیا۔

''اوہ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ مقدّس ہیں۔ آئی ایم ریئلی سوری۔۔ میں۔۔۔'' اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اپنی بد تمیزی کی وضاحت کیسے دے؟

''جی! آگئی آپ کی یاداشت واپس؟'' مقدّس نے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ مزید شرمندہ ہوا۔ پتہ نہیں اتنا چڑچڑا کب سے ہو گیا تھا؟

''آپ اندر آیئے۔'' ایک طرف ہوتے اُسے راستہ دیا۔ وہ چہرے پر خفگی لیے اندر آگئی۔ مقدّم نے خود کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے، دروازہ بند کیا۔

آخری بار جب اُسے دیکھا تھا تو سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ دو چٹیاں باندھ کر ہر وقت آنکھوں پر چشمہ لگائے، پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔

''کہاں ہے مکرم؟'' اندر داخل ہوتے ہی پوچھا، اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی نظریں صوفے پر بیٹھے مکرم تک گئی۔ آنکھیں لبریز ہوئیں، دل محبت سے بھر گیا، آگے بڑھ کر اُسے سینے میں بھینچ لیا۔ خلاف توقع وہ رویا نہیں بلکہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

''میرا گڈا۔۔۔ کتنا پیارا ہے یہ۔'' اُسے چٹاچٹ چومتے ہوئے بولی۔ مقدّم کے دل کو کچھ ہوا، بھلا باہر سے آکر نہ ہاتھ دھوئے نہ sanitizer کا استعمال کیا۔ ایسے ہی اُس کے بچے کو پیار کرنا شروع کر دیا۔ دل تو کر رہا تھا کہ مکرم کو اُسکی گود سے چھین لے، لیکن تھوڑی دیر قبل جو بد تمیزی وہ کر چکا تھا، اُسکے بعد خود کو قابو میں رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اب دل پے پتھر رکھے اُسے صوفے پر بیٹھے مکرم کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ رہا تھا۔

''ایسے نظرانداز کر رہی ہے، جیسے میں یہاں ہوں ہی نہیں۔''اُسے مسلسل مکرم سے باتیں کرتا دیکھ،اُس نے کوفت سے سوچا۔اپنے ہی گھر میں ایسا سلوک ناقابل برداشت تھا۔ملازم چائے رکھ کر چلا گیا۔

''آپ کا بہت شکریہ کہ اتنے عرصے اسکا اتنا خیال رکھا۔'' بالکل اچانک ہی اُس نے مقدّم کو مخاطب کیا۔چہرے پر چھائی خفگی غائب ہو چکی تھی۔اُس کے دماغ نے ریڈ سگنل دیا تھا۔

''کیا مطلب شکریہ ؟مکرم میرا بیٹا ہے اور آگے بھی میں ہی اُسکا خیال رکھوں گا۔''چبا چبا کے جواب دیا۔اخلاق پر شدید غصّہ آیا، جس نے اِس لڑکی کو یہاں بھیجا تھا۔

''ہاں !لیکن ہمارا ابھی تو خونی رشتے ہے نہ اور اب سے میں بھی۔۔۔''وہ اپنی دھن میں کہہ رہی تھی۔

''اُسکے خونی رشتے اتنے سال سے کہاں تھے ؟جواب حق جتانے آگئے ہیں۔میری بات ذہن نشین کر لو مقدّس ! میں اپنے بیٹے کو یہاں سے لے جانے کی اجازت کسی کو نہیں دوں گا۔''سختی سے کہا۔

''کیا تمہیں ایسے ہی قیاس آرائیاں کرنے کا شوق ہے ؟''پھر سے خفا ہوئی۔

''میں یہاں صرف اور صرف اپنے بھانجے سے ملنے آئی ہوں۔اُسکے ساتھ اچھا وقت گزارنا چاہتی ہوں۔یہ میری بہن کی نشانی ہے۔اور تم بھول گئے ؟ قانونی طور پر مکرم تمہاری کسٹڈی میں ہے۔کوئی بھلا کیسے اسے تم سے چھین سکتا ہے ؟''اُس نے خفگی سے کہا تو وہ خاموش ہوا۔البتہ یقین ابھی بھی نہ آیا تھا۔چہرے سے واضح تھا کہ اُسکے یہاں آنے سے ناخوش ہے۔

''دیکھو ! میں بھی اپنی قبائیلی رسم و رواج کے آگے اتنا ہی مجبور تھی، جتنا کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔لیکن اب حالات بدلنے لگے ہیں۔میری نانی اور ماموں نے میری حمایت کی ہے، جسکی وجہ سے مجھے شہر میں نوکری کرنے کی اجازت ملی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ مجھے میرے بھانجے کا خیال نہ تھا،بس میں بھی روایتوں اور رسموں میں جکڑی ہوئی تھی۔''اُس نے اُداسی سے کہا تو مقدّم شرمندہ ہوا۔پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا اور کیوں ؟

''میرے پاس تم سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔کراچی آنے سے پہلے اخلاق بھائی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے تمہارا ایڈریس دیا۔یہ ملاقات بھی خفیہ تھی کیوں کہ تم جانتے ہو خاندان میں اخلاق بھائی سے ملنا کتنا بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔''وہ مزید شرمندہ ہوا۔خواہ مخواہ ہر بندے پر شک کرنے لگا تھا۔

''آئی ایم سوری ! میں بس ذرا شبہات کا شکار تھا''وضاحت دی گئی، جو فوراً قبول کر لی گئی۔

''نہ نہ۔۔۔کوئی بات نہیں۔۔''مُسکراتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی۔مکرم تو اُسکی گود سے ایسا چپکا تھا جیسے مقدّم کو جانتا ہی نہ ہو۔

''معلوم ہے ؟میری ہاؤس جاب مکمل ہونے کے بعد ابّا نے تو مجھے گھر ہی بیٹھا دیا تھا۔وہ تو نانی اور ماموں نے میری لیے اسٹینڈ لیا کہ ڈاکٹر بنا کے بھی گھر ہی بٹھانا ہے تو کیا فائدہ ؟خیر بڑی مشکلوں سے مانے وہ، آج کل نانی کے گھر پر ہی رہ رہی ہوں۔ماموں بیچارے طلاق یافتہ ہیں تو آج کل، میں اور نانی اُنکے لیے

رشتہ تلاش رہی ہیں'' اُسے قطعاً یہ جاننے میں دلچسپی نہ تھی کہ اُسکے ماموں طلاق یافتہ ہیں یا رنڈوے، وہ بس یہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد مکرم سے ملاقات ختم کرے اور یہاں سے چلتی بنے۔ لیکن مقابل بھی فرصت سے بیٹھی تھی۔

''آپ کیا کرتے ہیں ویسے؟'' مقدّم کی صفر دلچسپی دیکھ کر اُسے بھی گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

''اخلاق نے بتایا نہیں؟'' اتنا بد اخلاق تو وہ کبھی نہ رہا تھا۔

''ہاں! بتایا تھا کہ آپ والد صاحب کی اوڈیٹر زاینڈ لیگل ایڈوائزر فرم کو کافی وسیع کر چکے ہیں اور بہت محنت کر رہے ہیں۔ کام کے ساتھ مکرم کی دیکھ بھال مشکل ہوتی جا رہی ہے اسی لیے آپکو کیئر گیور کی اشد ضرورت ہے۔ تو میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ اور وہ بھی مفت۔۔۔'' کتنے آرام سے وہ اُسے گھما پھرا کر اپنے مطلب کی بات پر لائی تھی۔

''اور میں مکرم کی ذمے داری تمہیں کیوں دوں؟'' دانت کچکچا کر سوال کیا۔ یہ لڑکی اسکا وقت ضائع کر رہی تھی۔

''کیونکہ میں اسکی خالہ ہوں۔''

''یہ کوئی جواز نہیں ہے۔''

''مقدّم!'' اُس نے جیسے ہار مانتے ہوئے مکرم کو گود سے اتار کے برابر میں بٹھایا۔

''میں جانتی ہوں کہ میرے والدین کے رویّے کو لیکر تمہارے دل میں بہت خدشات ہیں۔ لیکن یقین جانو کہ اس سب میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ جب تم دو سال پہلے مکرم کو لینے آئے تھے، اگر میں اُس وقت وہاں ہوتی تو آخری وقت تک اسکے لیے لڑتی۔ لیکن میں ہاؤس جاب کے لیے دوسرے شہر میں تھی۔ ان سب سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اپنی بہن کی نشانی کو گلے سے لگانے کے لیے کتنا تڑپی ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' پہلی بار اُسکی باتوں میں اُسے صداقت محسوس ہوئی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

''اور اگر تمہیں یہ خوف ہے کہ، میں تمہاری غیر موجودگی میں اسے اپنے ماں باپ کے پاس لے جاؤں گی۔ تو مجھ سے حلف لے لو۔۔۔ میرے ماں باپ آج بھی مکرم کی شکل سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں، جتنی دو سال پہلے کرتے تھے، تو میں بھلا اُنکے پاس اس معصوم کو لیکر کیوں جاؤں گی؟'' آس بھری نظروں سے اُسے دیکھا کہ شاید وہ مان جائے۔

''میں اس بارے میں سوچوں گا۔ ابھی بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تم جب چاہو اس سے ملنے آسکتی ہو۔ اور جہاں تک ذمے داری لینے کی بات ہے، جب مجھے مناسب لگے گا، میں خود کہہ دوں گا۔'' اس بات پر اُسکا چہرہ کھلا۔ چلو وہ اتنے پر تو راضی ہوا۔

''میری نائٹ ڈیوٹی ہے، میں آرام سے دن کے وقت مکرم کو سنبھال سکتی ہوں۔'' اُس نے کہا۔ جواباً مقدّم نے سر ہلایا۔

''سوات کا موسم اتنا اچھا ہے، اور ایک کراچی ہے۔ جنوری میں بھی اتنی تیز دھوپ، وہاں تو ہر شے برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ میرا تو آنے کو دل ہی۔۔۔۔'' وہ بولتی گئی اور بولتی ہی چلی گئی، سوات کا موسم، وہاں کے حالات، اُسکی کولیگ ماریہ جو اُسکے ساتھ سوات آنا چاہتی ہے، اُسکی نانی کی پڑوسن جو اپنی شاطر بہن

کی شادی، اُسکے ماموں سے کروا کر جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں، اُسکے سینئر زڈاکٹر جو سارے کام کا بوجھ ینگ ڈاکٹرز پر ڈال دیتے ہیں، مریض کے گھر والے جو ڈاکٹر کو قصائی سمجھتے ہیں۔ العرض، ہر وہ بات جس سے مقدّم کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا اور جسے جاننے میں اُسے رتّی بھر دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف بولتی تھی، اُس کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ اُسے مطلق پرواہ نہیں تھی کہ وہ اس گفتگو کا حصّہ بننا چاہتا ہے یا نہیں، لیکن چونکہ وہ اُسی سے مخاطب تھی تو وہ چاہے یا نہ چاہے، وہ اُسے گفتگو کا حصّہ بنا چکی تھی۔ اُسکا دل کر رہا تھا کہ اپنا سر دیوار پر دے مارے۔

''تمہاری ڈیوٹی کب سے شروع ہوتی ہے؟'' بلآخر اُس کا ضبط جواب دے گیا۔

''رات آٹھ بجے۔ آج پہلا دن ہے نا تو ذرا جلدی جاؤں گی۔ نروس بھی بہت ہوں۔''

''تو تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں جانا چاہیے۔'' اتنا منہ پھٹ تو وہ کبھی نہیں رہا تھا۔ مقدّس نے گھڑی دیکھی اور سر پر ہاتھ مارا۔

''صحیح کہہ رہے ہو، مجھے چلنا چاہیے'' اُس نے مکرم کو سینے سے بھینچ کر خوب سارا پیار کیا اور اُسے بلآخر مقدم کے حوالے کیا۔

''تمہارا کافی وقت لیا، بہت معذرت!'' چلو اُسے احساس تو ہوا۔

''میں کل آؤں گی۔ انشاءاللہ!''

''کیا مطلب کل پھر آؤ گی؟'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے خفگی سے اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب تم مصروف ہوتی ہو گی، روز روز آنے کے لیے کیسے وقت نکالو گی؟'' شرمندہ ہوتے وضاحت دی۔

''آپ فکر نہ کریں، جب تک آپ مجھے ذمے داری دینے کا فیصلہ نہیں کرتے، میں اپنے چھوٹو سے ملنے آتی رہوں گی۔''

''چھوٹو؟''

''ہاں!!''

''اُف! مکرم نام ہے اُسکا۔''

''میرا بھانجا ہے، میری مرضی جس بھی نام سے پکاروں۔'' لٹھ مار انداز میں کہتی وہ جا چکی تھی۔ پیچھے کھڑا مقدّم سر پکڑ کر رہ گیا۔

''اچھی مصیبت ہے۔''

-------+--------+--------

''تم آخر گھور کیوں رہے ہو مجھے؟'' دبے دبے لہجے میں سوال کیا ہے۔

''تم میری جیبیں خالی کرتی رہو اور میں گھوروں بھی نہ؟'' دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا گیا۔

''کیا ہے؟ گھر کا ضروری سامان ہی تو خرید رہی ہوں۔'' ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی، یقیناً اس سے مزید بحث میں نہیں الجھنا چاہتی تھی، لیکن وہ بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا؟ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''بالکل ! یہ ہیئر ماسک، یہ چار کول ماسک، یہ طرح طرح کے فوڈ کلرز، کیک کے مختلف اقسام کے سانچے، یہ نیل پینٹس کے پیکٹس یہ گھر کے سامان، میں اور بچے ہی تو استعمال کرتے ہیں اور یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟'' سامان گنتے گنتے وہ ٹھٹکا، وہ اُسے نظر انداز کرتی ریک میں رکھے سامان اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''ھدا بیوٹی؟ یہ بھلا کیا شے ہے؟'' وہ اس عجیب سی شے کو الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔

''سر! یہ آئی شیڈو پیلیٹ ہے۔'' پاس کھڑی سیلز گرل نے مشکل آسان کی تھی۔

''یہ۔۔۔ یہ آئی پیلیٹ ہے؟ سولہ ہزار روپے کا؟'' اُس نے آنکھیں پھاڑ کے قیمت دیکھی۔

''جی سر! یہ تو رعایتی قیمت ہے۔ بالکل اوریجنل پیس ہے۔'' سیلز گرل نے دانت نکالتے ہوئے کہا، وہ اُسے نظر انداز کرتا آگے کھڑی اپنی بیوی کے سر پر پہنچا۔

''یہ گھر کا سامان ہے؟ سولہ ہزار روپے کا مطلب بھی پتہ ہے؟''

''اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہے ہو؟ یہ سب چیزیں اتنی ہی مہنگی ہوتی ہیں۔'' اُسکی بیوی نے حتی الامکان آواز آہستہ رکھی، پاس کھڑی سیلز گرل کی نظریں جو اُن پر تھیں۔

''تم مجھے کنگلا کرنے پر تلی ہو اور میں ری ایکٹ بھی نہ کروں؟'' ریک کی دوسری جانب کھڑا نوید یہ آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔ صبح بشریٰ کو اٹھا کر اُسے ناشتہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیتے اور اُسے دوائیں کھلاتے اُس نے ہر طرح سے اُسے نظر انداز کیا تھا۔ اُسکے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ قبرستان گئی تھی۔ اب ناراضگی دکھانا اُسکا حق تھا۔ اور رہی بات بشریٰ کی تو اُسکی رات والی حالت اب کافی سنبھل گئی تھی۔ اور اب اُسے مکمل احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے کتنی سنگین غلطی کی تھی۔ ناشتے کے بعد اُس سے کوئی بھی بات کیے بنا وہ مارٹ چلا آیا تھا۔ صبح کا وقت تھا، رش بھی زیادہ نہیں تھا۔ وہ سکون سے گھر کی ضروری اشیاء خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن۔۔۔ ریک کی دوسری جانب سے مسلسل آتی آوازوں نے اُسکے سکون میں ٹھیک ٹھاک خلل ڈالا تھا۔ وہ دونوں جو کوئی بھی تھے، گفتگو سے میاں بیوی لگتے تھے۔

''میں بتا رہا ہوں بیگم صاحبہ! آپ کی ان شاہ خرچیوں سے میں بہت جلد سڑک پر کھڑا چندہ جمع کر رہا ہوں گا۔'' بہت عرصے بعد نوید کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ اُبھری تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی وہ اس گفتگو سے محظوظ ہوا تھا۔ اُن سے آہستہ آواز میں بات کرنے کی درخواست والے، اپنے تھوڑی دیر پہلے کے ارادے کو ترک کرتا وہ اس حصے باہر نکلا۔ اور اُسکی ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

قسمت بھی کیا عجیب شے ہے؟ جب نہیں ملانا تھا تو دس سال نہ ملایا اور جب ملانے پر آئی تو اُن میں سے ہر ایک کو بہانے بہانے سے اُسکے سامنے لا کھڑا کر رہی تھی۔ ورنہ پہلے بھی یہی شہر تھا۔۔۔ اور وہ اسی شہر کے رہنے والے۔ پہلے تو اس طرح کسی سے سامنا نہ ہوا تھا۔

سامنے اپنی بیوی سے نوک جھونک میں مصروف وہ شخص، جسکی آواز وہ نہ جانے کیوں نہیں پہچان سکا تھا؟ وہ حسین تھا۔ حسین مرتضیٰ۔۔۔

اُسکی بیوی اُس سے پیلیٹ چھین کر واپس ٹرالی میں ڈال کر بلنگ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پیچھے وہ مصنوعی خفگی چہرے پر سجائے آرہا تھا، اسی اثناء میں کسی بزرگ چچا نے کوئی جملہ کسا تھا، غالباً وہ بھی اُسکی گفتگو سن رہے تھے۔ بزرگ کی بات سن کر وہ بیساختہ ہنسا تھا، جبکہ اُسکی بیوی کینہ توز نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گہرے گڑھے پڑتے تھے۔ زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی، اور وہ آج بھی وہیں تھی۔ حسین نہیں بدلا تھا۔۔ بالکل نہیں بدلا تھا۔

بلنگ کاؤنٹر پر کھڑے اپنی بیوی کو بار بار تنگ کرتے، حسین کی نظریں ایک مرتبہ بھی نوید پر نہیں پڑی تھیں۔

''یہ پیسے لو، اور بل ادا کر کے سامان لے آؤ۔ میں گاڑی میں ہوں۔'' نوید نے جیب سے کچھ نقد رقم نکال کے پیچھے کھڑے ملازم لڑکے کو دی اور ٹرالی بھی اُسے پکڑا دی، پرانے ملازمین میں یہ لڑکا واحد تھا، جسکی جگہ برقرار تھی۔ وجہ اُسکا کل چھٹّی پر ہونا تھا۔

مطلوبہ رقم اُسے پکڑانے کے بعد ایک نظر اپنے اِرد گرد سے بے نیاز حسین پر ڈالی اور گہری سانس لیکر، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگاتے وہ مارٹ سے باہر نکل گیا۔

اور اپنی سروس کے آٹھ سالوں میں پہلی بار۔۔۔۔

ایس ایس پی نوید عالم ڈر گیا تھا۔

وہ حسین کی بھرپور شخصیت، اُسکی معصوم مسکراہٹ اور اُسکی خوشحال زندگی سے ڈر گیا تھا۔

وہ اُسکے مستقبل میں آنے والے خطرے سے ڈر گیا تھا۔

اور ایس ایس پی نوید عالم اُس سے نظریں چرا گیا تھا۔

-------+--------+--------

سردی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی، گہرے نیلے اور آف وائٹ رنگ کے سوٹ پر لمبا سویٹر پہنے وہ اس وقت بچوں کو اپنے گرد اکٹھا کیے کوئی کہانی سنا رہی تھی۔ سب اتنی دلچسپی سے سن رہے تھے کہ پورے گھر میں بس جزا کی ہی آواز گونج رہی تھی۔

''تو پھر صبر کیا ہوتا ہے؟'' کہانی مکمل کر کے اس نے بچوں سے سوال کیا۔ لمبے بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی۔ ایک آدھ لٹیں چہرے کے ارد گرد جھول رہی تھیں۔

''جب آپکو تکلیف ہو تو آپ نہ شکایت کریں نہ غصّہ کریں۔ صرف اللہ سے دعا مانگے اور شکر ادا کریں۔'' ایک تیرہ سالہ بچی نے کہا۔

''بالکل۔۔'' اُس نے تائید کی۔

''مس! اگر کوئی تکلیف میں روئے تو کیا وہ بھی بری بات ہے؟'' ایک نو دس سالہ بچے نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''رونا گناہ نہیں ہے، بلکہ رونا تو اللہ کی طرف سے رحمت ہے۔ اگر انسان روئے گا نہیں، تو وہ سخت دل ہو جائے گا۔ انسان کو بین نہیں کرنا چاہیے۔ بین کرنا یعنی چیخنا چلانا، بال نوچنا، منہ پر تھپڑ مارنا۔ یہ سب گناہ ہے۔''

''جب مجھے تکلیف پہنچی تھی تب میں بھی بس رویا تھا۔ میں نے بین نہیں کیا تھا۔ تو کیا میں نے بھی صبر کیا؟'' اُس بچے نے سمجھداری سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' جزا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھتے ہوئے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''عثمان۔''

''تم نے صبر کیا عثمان! اللہ تعالیٰ تم سے بہت خوش ہوں گے۔'' اُس نے پیار سے جواب دیا۔

''چلو بچوں! اب باری باری باغبانی کا سامان لیکر لان میں جمع ہو، ہم پودے لگائیں گے۔'' اُس نے کہا تو بچے خوشی سے شور مچاتے ہوئے باہر بھاگنے لگے۔ وہ اُنہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ ہاتھوں میں چائے کا مگ پکڑے رضا چلا آیا۔ اُسے دیکھ کر مسکرایا تو جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر کھڑے، لان میں جمع ہوتے بچوں کو دیکھنے لگے۔

''عثمان جب آٹھ سال کا تھا، تب مجھے برن وارڈ میں ملا تھا۔'' رضا کی آواز پر اُسکی مسکراہٹ سمٹی، رخ موڑ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ بلیک ٹراؤزر پر وائٹ ہڈی پہنے، جسکا ہڈ پیچھے گرایا ہوا تھا، اُسکی نظریں کھڑکی سے نظر آتے، لان میں جمع ہوتے بچوں پر تھیں۔

''برن وارڈ؟''

''ہاں! تھرڈ ڈگری برننگ تھی۔'' ایک اور جھٹکا۔ جزا کا دل ڈوب کر اُبھرا۔

''کیسے جلا تھا؟'' ہمت کر کے پوچھا۔

''ماں باپ کے مرنے بعد، تایا اُسے اپنے پکوان سینٹر لیکر جاتا تھا۔ کام غلط ہونے پر اُسے بہت مارتا تھا۔ لاتوں سے۔۔۔ گھونسوں سے۔'' وہ اب بھی باہر ہی دیکھ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر کوئی اذیت رقم تھی۔ وہ دم سادھے اُسے سن رہی تھی۔

''ایک دن ایسی ہی کسی غلطی پر اسکے تایا نے اُسے مارا اور غصّے سے دھکا دیا۔ پیچھے دیگ چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔'' رضا کا اور رخ پھیر کر اُس کی جانب دیکھا۔

''وہ دیگ سے جا کر ٹکرایا اور کھولتے سالن کی دیگ اُس پر الٹ گئی۔'' جزا کو لگا کسی نے اُسکا دل آری سے چیرا ہو۔

''اللہ کی مرضی کے اُسکا چہرہ بچ گیا، باقی سارا جسم جھلس گیا تھا۔ اُسکا تایا اُسے سرکاری ہسپتال کے برن وارڈ میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بعد میں جب اُسے گرفتار کر کے سی سی ٹی وی فوٹیج نکالی گئی تو اس سے صاف واضح ہو گیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اُسے جلانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا لاپرواہی میں ہی ہوا۔ لیکن اتنے چھوٹے بچے کو اس بری طرح مارنا بھی جرم ہے۔ لہٰذا اب وہ اپنی سزا کاٹ رہا ہے۔'' بات مکمل کر کے جزا کو دیکھا۔ سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ سانولا چہرہ

ضبط کی شدت سے لال ہو رہا تھا۔اُس نے فوراً چہرہ موڑ کر عثمان کی جانب دیکھا جو بچوں کے ساتھ چہکتا، کھیلتا کہیں سے بھی اس اذیت سے گزرا ہوا نہ لگتا تھا۔

ہاں !اُس نے واقعی صبر کیا تھا۔رضا کو اُسے دیکھ کر دکھ ہوا۔اُسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔

''باغبانی نہیں کرنی؟''اُس نے اچانک سے پوچھا تو جزا نے آنسو اندر دھکیلتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''اپنا گارڈن خراب کرنے کی اجازت دے رہے ہو مجھے؟''

''بچے روز ہی کرتے ہیں۔تم بھی کر لو گی تو کیا ہو جائیگا؟''مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔ناک میں چمکتی لونگ اُس پر اتنا جچتی تھی کہ کوئی حد نہیں۔۔۔

''بچوں کی توڑ پھوڑ اور چیزیں خراب کرنے سے تمہیں کوفت نہیں ہوتی؟''اُس نے جانچتی نظروں سے پوچھا۔

''نہیں، بچے چیزیں خراب نہیں کرینگے تو کون کریگا جزا؟اگر بچے بڑوں کی طرح سلیقہ مند اور نفاست پسند ہو گئے تو پھر وہ بچے تو نہ رہے۔وہ سیکھتے ہیں اور سیکھنے کے عمل میں غلطیاں ہوتی ہیں۔''جزا نے دیکھا تھا کہ بچوں کے موضوع پر وہ گھنٹوں بات کر لیتا تھا۔

''بچے انتظار کر رہے ہیں۔''وہ جانے لگی تو پیچھے سے رضا نے کہا۔

''میں جامعہ کراچی اور مختلف نجی جامعات کی وزٹنگ فیکلٹی میں شامل ہوں۔اُسکے علاوہ میرے اسکول کی چالیس برانچز اس شہر میں ایکٹو ہیں۔''

''تو؟''اُس نے ناسمجھی سے رک کر اُسے دیکھا۔بھلا وہ کیوں اُسے بتا رہا تھا؟

''تم کل سوچ رہی تھی نہ کہ بنا فنڈز اور خیرات کے ان بچوں کے اخراجات کیسے پورے ہو رہے ہیں؟اسی لیے سوچا کہ تمہیں اپنا ذریعہ آمدنی بتا دوں۔''

سنجیدگی سے جواب دیتے چائے کا کپ منہ سے لگایا کہ کہیں اُسکی مسکراہٹ نہ دیکھ لے۔

''اف!!''ساری مسکراہٹ اُڑن چھو ہوئی تھی۔''میں ایسا کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔''

''اچھا!!''اچھا کو ذرا لمبا کھینچا''مجھے تو کچھ ایسا ہی لگا تھا۔''مزید تپانے والی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''جو بھی تمہیں لگے اُس پر یقین مت کر لیا کرو۔''غصّے سے پاؤں پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تو وہ ہنس دیا۔

-------+--------+--------

آگ تھی۔۔۔ہر طرف آگ تھی۔اُسکے آگے بھی۔۔۔اُسکے پیچھے بھی۔۔۔

آگ اُسکے آس پاس کی ہر شے جلا کر راکھ کر رہی تھی،انسانی وجود خاک کر رہی تھی۔۔۔

لیکن اس آگ سے وہ کیوں نہیں جل رہا تھا؟۔۔۔

آگ اُسے کیوں نہیں جلا رہی تھی؟۔۔۔

وہ چیخنا چاہتا تھا۔۔۔پر چیخ نہیں پا رہا تھا۔۔۔

بھاگنا چاہتا تھا۔۔۔پر ہل بھی نہ پا رہا تھا۔۔۔

اگلے ہی لمحے ایک جھٹکا لگا اور اُسکی آنکھ کھل گئی۔ بشریٰ اُسکے سر پر پریشان حال سی کھڑی تھی۔ سر تکیے سے اٹھا کر آس پاس دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔

''الارم کب سے بج رہا ہے۔ تم اُٹھ کیوں نہیں رہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''اُٹھ رہا ہوں، تم جاؤ۔'' سر واپس تکیے پر گرایا۔ بشریٰ نہیں گئی، بلکہ وہیں کھڑی رہی۔ نوید کو اُسکی وہاں موجودگی کا احساس ہوا تو اُٹھ بیٹھا۔

''اب کیا ہوا؟''

''تم اب تک ناراض ہو؟'' دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''نہیں ہونا چاہیے؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ پچھلے دو روز سے وہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اور یہ اب تک کی سب سے لمبی ناراضگی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں، دوبارہ ایسا نہیں کروں گی۔'' وہ اُسکے سامنے ہی آ کر بیٹھ گئی۔

''ایسے وعدے تم پہلے بھی بہت مرتبہ کر چکی ہو۔''

''سوری کہہ تو رہی ہوں۔'' اُسے کچھ سمجھ نہ آیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ وہ نرم پڑا۔

''بشریٰ! میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن اب بتانا ناگزیر ہے۔'' اُسکے دونوں ہاتھ تھام کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''سب خیریت ہے؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''میرے کچھ دشمن ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں۔ دیکھو میں نے ملازمین کو بھی پتہ نہیں چلنے دیا کہ تم قبرستان جاتی ہو۔ لیکن پھر بھی اُنہیں خبر ہو گئی۔ اگر کسی کو بھی تمہارے آنے جانے کی خبر ہوئی تو وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے لیے محفوظ جگہ گھر ہے۔ اور گھر سے باہر تمہیں میرے ساتھ ہی جانا چاہیے۔''

''میں آئندہ احتیاط کروں گی۔'' اُس نے یقین دلایا۔ اس ساری گفتگو میں اُسکی فکر صرف اور صرف بشریٰ تھی، بچوں کا کہیں ذکر ہی نہ کیا۔

''لیکن تم؟'' اُس نے پریشانی سے نوید کو دیکھا۔

''میری فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اپنا خیال رکھو۔'' آرام سے کہتے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو جاؤ! ناشتہ لیکر آؤ میرے لیے۔۔۔ دو دن سے اپنے ہاتھوں سے بنا رہا ہوں۔ آج تم ناشتہ بناؤ'' چپل میں پاؤں ڈالتے ہوئے اُسے کہا۔

''ارے! میں تو بچوں کے لیے دودھ چڑھا کر آئی تھی چولہے پر۔'' سر پر ہاتھ مارتی وہ باہر بھاگی تھی۔ نوید اُسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

دکھ سے۔۔۔

حزن سے۔۔۔

اذیت سے۔۔۔

-------+--------+--------

صبح صبح دروازے کی گھنٹی بجی، وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ لگاتے وہ دروازے پر آیا۔ دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔

''السلام وعلیکم!'' سلام کرنے کے بعد مقدّم کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور اندر داخل ہو گئی۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

''تم اتنی صبح صبح؟'' دروازہ بند کر کے اُسکے پیچھے پیچھے آیا جواب اندر آ چکی تھی۔

''ہاں! تم آفس جاؤ گے تو مکرم کی ذمے داری میری ہوئی نا۔'' سکون سے جواب دیا۔

''لیکن میں نے تمہیں ابھی اسکی ذمے داری نہیں دی ہے۔'' اُس نے جتایا۔

''لیکن میں نے تو لے لی۔'' مقدّس نے بھی جتاتے ہوئے اپنے بیگ سے بہت سارا سامان نکالا جو وہ غالباً مکرم کے لیے لائی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مکرم اُسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے اچھل رہا تھا اور اُسکی گود میں آنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

''چھوٹو نے ناشتہ کر لیا؟'' اسکو گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''مکرم!!'' گھورتے ہوئے تصیح کی۔

''نہیں! ابھی ہی اٹھا ہے۔ میں بس اُسکا دودھ ہی بنانے ہی جا رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے! میں بنا دیتی ہوں۔'' ایک بار پھر اُسکے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ کچن میں جا کھڑی ہوئی۔ اب ایک ایک شے اُلٹ پلٹ کر مطلوبہ چیزیں تلاش کر رہی تھی۔ مقدّم ضبط کیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر کے فون اٹھایا اور اخلاق کو کال ملائی۔

''شکر! تم نے فون کیا۔ ورنہ مجھے لگا تھا تمہیں منانے کے لیے کراچی آنے پڑے گا۔'' فون اٹھاتے ہی اخلاق کی آواز سنائی دی۔

''منانے کے لیے؟ میں کب ناراض تھا تم سے؟'' وہ حیران ہوا۔

''کیا مطلب؟ تم مجھ سے ناراض نہیں تھے؟'' وہ اُس سے بھی زیادہ حیران ہوا۔

''چھوڑو یار اس بات کو، یہ بتاؤ۔۔۔ کس نمونی شے کو بھیج دیا ہے تم نے؟'' مقدّم نے چڑ کر پوچھا۔

''مقدّس کی بات کر رہے ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''کل فون آیا تھا اُسکا۔۔۔ تمہاری تعریف کر رہی تھی۔'' اُس نے شرارت سے کہا۔

''میری تعریف؟ حالانکہ ایسا کوئی متاثر کن تاثر نہیں چھوڑا میں نے۔'' وہ حیران ہوا۔

''وہی تو۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی اخلاق بھائی! آپکے بھائی کا نام بداخلاق ہونا چاہیے۔۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو اُس نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ٹھاک جینا حرام کیا ہوا ہے اُس نے کل سے''

''تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ وہ مکرم کا خیال صحیح سے رکھ رہی ہے نا؟ اب ذمے داری دی ہے تو برداشت بھی کرو۔''

''میں نے ذمے داری دی ہے کہاں ہے ؟اُس نے خود ہی لے لی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ پھر اخلاق سے دو ایک باتیں کرنے کے بعد وہ نیچے چلا آیا۔ وہاں وہ قالین پر بیٹھی ڈھیروں کھلونے پھیلائے مکرم کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ شدید صدمے کے عالم میں اپنے قالین کو دیکھتے ہوئے وہ وہیں چلا آیا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے ؟مکرم ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔۔۔'' اُسے دیکھتے ہی بولی۔

''اخلاق کا فون آ گیا تھا۔ اُسی سے بات کر رہا تھا۔'' ناچاہتے ہوئے بھی جواب دیا۔

''ایک بات پوچھوں ؟'' اُسکی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا اور ہمیشہ کی طرح جواب کا انتظار کیے بنا بولی۔

''تمہیں اور اخلاق بھائی کو کبھی ساتھ دیکھا نہیں۔ تم دونوں کی مائیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں۔ پھر اچانک سے اتنا بھائی چارہ کہاں سے آ گیا؟''

اُس نے سوال کر کے مقدّم کو دیکھا، جسکے چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

''اچھا اچھا! میں سمجھ گئی۔ اتنا ذاتی سوال نہیں پوچھنا چاہیے۔'' وہ اُسکے بولنے کا انتظار کرتی ہی کب تھی ؟ ملازم اُسکا ناشتہ لے آیا، تو وہ ناشتہ کرنے لگا۔

''تم نے انٹیریر کس سے کروایا؟'' اُس نے چند لمحے بھی چپ نہ رہنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ مقدّم نے آبرو اچکا کے اُسے ناسمجھی سے دیکھا۔

''یعنی تمہارے لاؤنج کی سیٹنگ بہت اچھی ہے۔ نائس چوائس'' اُس نے داد دی۔

''گھر سجانا بھی ایک فن ہے ویسے، اب میری نانی تو بوڑھی ہو چکی ہیں۔ گھر سجانے کا اُنہیں کوئی شوق رہا نہیں ہے۔ ماموں کی چوائس اتنی خراب ہے کہ توبہ۔۔۔ بلیک اور براؤن تھیم ہے نانی کے ڈرائنگ روم کی، اور ماموں سفید رنگ کے کارنرز اٹھا کے لے آئیں۔''

''اچھا!'' اُس کو سمجھ نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے ؟

''تم نے بتایا نہیں انٹیریر کس سے کروایا؟'' اُس نے پھر سوال کیا۔

''کسی کمپنی سے کروایا تھا۔ اب یاد نہیں آ رہا کہاں سے کروایا تھا؟ باقی سیٹنگ تو میں خود ہی کرتا ہوں۔'' وہ سکون سے ناشتہ کرنا چاہتا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔

''اور تمہارے آفس کی سیٹنگ ؟ وہ بھی تم نے خود کی ہے ؟'' ایک اور سوال۔

''نہیں، آفس اتنا بڑا ہے کہ میں اُسکی سیٹنگ خود نہیں کر سکتا۔''

''کتنا بڑا ہے تمہارا آفس ؟'' ایک اور سوال۔

''پتہ نہیں ! میں نے ناپا نہیں کبھی۔'' وہ بیزار ہوا۔

''میرا مطلب کتنے ایمپلائیز ہیں ؟''

''دو سو!'' مختصر جواب دیا۔

''اچھا میں کیا سوچ رہی تھی کہ۔۔۔'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مقدّم نے فوراً اُسکی بات کاٹی۔

''میں مکرم کے دن بھر کے کھانے پینے،اور سونے کی ٹائمنگ تمہیں میسیج کر دوں گا۔اسے اُسی حساب سے کھلانا پلانا۔اور اُسکے سیر یلز کا نام بھی بتادوں گا۔''

اُس نے کہاتو وہ خوش ہوئی،یعنی وہ اُسے ذمے داری دینے پر راضی ہو گیا تھا۔

''اُسکی ضرورت نہیں ہے۔مجھے معلوم ہے اسکو کیا کھلانا ہے اور کب۔''

''اور تمہیں کیسے معلوم؟''اُس نے پوچھا۔

''میں چائلڈ سپیشلسٹ ہوں شاید۔۔۔''اُس نے یاد دلایا۔

''مجھے یہ بات ابھی ابھی معلوم ہوئی ہے۔''اُس نے بھی جتایا۔

''تمہیں کتنی دیر میں نکلنا ہے؟''سوالات کرنا اُسکا پسندیدہ کام تھا۔

''تم ایک کام کرنا کل سے یہاں مت آنا۔''غیر متوقع جواب پر مقدّس پہلے حیران ہوئی اور پھر اُسے برا لگا۔ لیکن مقدّم نے نوٹس نہیں کیا۔

''تمہارا روز میرے گھر آنا ٹھیک نہیں ہے۔کل سے میں مکرم کو ناشتہ کروا کے،اُسکے ضروری سامان کے ساتھ خود اُسے تمہارے گھر چھوڑتے ہوئے آفس جاؤں گا۔اور واپسی پر لے لوں گا۔''اُس نے اپنی بات مکمل کی۔اچھا!تو وہ یہ کہہ رہا تھا۔خوامخواہ برا مان رہی تھی وہ، صحیح تو کہہ رہا تھا۔اُسکے بعد جتنی دیر مقدّم وہاں رہا وہ اسی طرح اُسکا دماغ کھاتی رہی۔یہاں تک کہ اُس دن وہ آدھے دماغ کے ساتھ آفس گیا تھا۔کم از کم اُسے تو ایسا ہی لگتا تھا۔

-------+--------+--------

''ہمیں جتنا جلدی ہو مائیکل تک پہنچنا ہے۔خلیل کے لیے ہماری کارروائی تیز ہو چکی ہے۔''ڈی آئی جی صاحب اس وقت نوید کے ساتھ بیٹھے تھے۔

''ہم جلد بازی میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے۔تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔''نوید نے کہا۔

''حسین مرتضیٰ بھی اب تک پاکستان نہیں آیا۔''اس بات پر وہ چونکا۔

''نہیں!حسین پاکستان میں ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''وہ حیران ہوئے۔

''میں نے کل صبح اُسے اپنی بیوی کی ساتھ مارٹ میں دیکھا تھا۔وہ وہاں خریداری کر رہا تھا۔''

''اگر وہ کل صبح تمہیں مارٹ میں دکھا ہے تو اسکا مطلب اُسے آئے ہوئے بھی تین چار دن ہو چکے ہیں۔اور ڈیپارٹمنٹ والوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی؟''وہ برہم ہوئے۔

''ہو سکتا ہے وہ کل ہی آیا ہو۔''نوید نے وضاحت دینی چاہی۔

''کون شخص وطن واپس آتے ہی پہلے مارٹ پہنچ جاتا ہے؟ذرا سوچو!''اُنکی بات ٹھیک تھی۔ نوید خاموش ہوا۔اُنہوں نے اے ایس پی فیصل کو بلوایا۔پہلے تو اُسے اطلاع نہ دینے پر سرزنش کی پھر بولے۔

''مجھے ہر حال میں آج ہی حسین سے ملاقات کرنی ہے۔ یہ معاملہ مزید ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔''

''سر! آج فوراً؟ ابھی تو اُنھیں اطلاع دینی ہو گی، پھر ملاقات کیلئے بلانا ہو گا۔ جلد بازی کی تو وہ خوفزدہ ہو سکتے ہیں۔''فیصل نے کہا۔

''ڈیٹس ناٹ مائی پرو بلم (یہ میرا مسئلہ نہیں ہے)۔ تم آج شام تک ہی میری حسین سے ملاقات رکھو گے، اس طرح کہ وہ خوفزدہ نہ ہو۔ کیسے کرتے ہو؟ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔''اُنہوں نے سختی سے کہا۔

''اور ہاں! ڈیپارٹمنٹ والوں کو بتا دینا کہ اس نااہلی کا حساب میں ضرور لوں گا۔''اُنہوں نے سختی سے کہہ کر اُسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ ڈی آئی جی صاحب کا خوف تھا کہ شام تک واقعی حسین اُنکے سامنے تھا۔ اب فیصل نے یہ کیسے کیا؟ یہ وہی جانتا تھا۔

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی مجھے مارنے والا ہے؟''ساری گفتگو سننے کے بعد اُس نے پہلا سوال کیا تھا۔

''کسی نے تمہیں مارنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اور یہی سچ ہے۔''اس جواب پر وہ ہنسا۔ اس ہنسی کا کوئی مقصد سمجھ نہ آ سکا۔

''مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور ہم ایسا کیوں کریں گے؟''اُنہوں نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور میں آپ کی بات پر یقین کیوں کروں؟''

''تمام شواہد دیکھنے کے بعد بھی؟'' اُنکے سوال پر اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کوئی مجھے کیوں مارنا چاہے گا؟''وہ ڈنائیل فیز میں تھا۔ جو کچھ وہ سن رہا تھا اُس پر یقین کرنا آسان بھی نہ تھا۔ فرّخ صاحب نے پانی کا گلاس اُسے تھمایا۔ اُس نے چند گھونٹ لیے اور گلاس رکھ دیا۔ پھر متفکر چہرے سے اُنہیں دیکھا۔

''میری کسی کے ساتھ، کسی بھی قسم کی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے تو آج تک کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔''وہ بے بسی سے بولا تھا۔ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر یہ ساری گفتگو سنتے نوید کا دل کٹا تھا۔ یہی تو وہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ حسین کو بے بس، لاچار اور خوفزدہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن زندگی میں سب کچھ ویسے نہیں ہوتا جیسے ہم چاہتے ہیں۔

''تمہیں اس بات کو قبول کرنا ہو گا۔ اگر تم ہی تسلیم نہیں کرو گے تو ہم معاملے کی تہہ تک کیسے پہنچیں گے۔ ابھی گھر جاؤ۔ تھوڑا وقت لو، سوچو کہ ماضی میں کبھی کسی سے دشمنی رہی ہو؟ کوئی بھی چھوٹی بات۔۔۔ میں جب دوبارہ بلاؤں تب تک اُمید ہے کہ تم حالات قبول کر چکے ہو۔''اُنہوں نے سمجھایا۔

''میرے دو بچے ہیں، بہت چھوٹے۔۔۔ میری ایک فیملی ہے۔ میں کیسے اُنہیں یہ بتا دوں کہ کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے؟''نوید نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ آدمی کی زندگی کا محور بس یہی شے ہوتی ہے۔ اُسکے بیوی بچے اور اُسکے ماں باپ۔۔۔

''مت بتاؤ اُنہیں، وقت آنے پر بتا دینا۔ ابھی سے پریشان نہ کرو۔ اور یقین کرو ہم تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ ان شاءاللہ!''

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ مجھے مارنے والا میرے گھر والوں کو نقصان نہ پہنچائے یہ کیسے مان لوں میں ؟'' حقیقت تسلیم کرنے کے بعد پہلی فکر اُسے اپنے گھر والوں کی ہی ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہو گا ایسا، ہم یہاں ایسے ہی نہیں بیٹھے۔ اس کیس کو بہت قریب سے مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' فرّخ صاحب کے مضبوط لہجے پر وہ خاموش ہوا۔ کچھ دیر اُس سے مزید باتیں کرنے کے بعد انہوں میں اُسے جانے۔ نوید چاہ کر بھی اُسکے سامنے نہیں جا سکا تھا۔ لیکن اُس نے دیکھا تھا۔ وہ جن قدموں سے آیا تھا۔ اُن قدموں سے واپس نہیں جا رہا تھا۔

یہ وہ حسین نہیں رہا تھا جسے کل اُس نے مارٹ میں دیکھا تھا۔

اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا۔۔

اسی چیز سے وہ کل ڈر گیا تھا۔۔۔

-------+--------+--------

گاڑی گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اُسکے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ شاید اُسکے ابّا اپنی موٹر سائیکل اندر کھڑی کر رہے تھے۔ کھلے دروازے سے اُسکے دونوں بچّے لان میں کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ اُسکی بیوی قریب کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ ایک مکمل منظر تھا۔

کیا اُسے اندر جانا چاہیے ؟

کیا اُسے اپنے گھر والوں کو اُس خطرے سے آگاہ کرنا چاہیے ؟

کیا اُسے ان مسکراتے چہروں سے خوشی چھین لینی چاہیے ؟

کیا حسین ایسا کر سکتا تھا؟

اُسکے ابّا گاڑی پارک کر چکے تھے۔ اُسکی بیوی اب دروازے کے پاس آ کر اُسے بند کر رہی تھی۔ حسین کی گاڑی گلی کے کونے پر تھی، جہاں سے وہ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اسی لیے وہ اُسے دیکھ نہ سکی۔ یا شاید وہ ہمیشہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ چیزوں پر اتنا دھیان نہیں دیتی تھی۔

حسین نے اُسی لمحے فیصلہ کیا کہ وہ ان سب معاملوں میں کسی کو بھی شامل نہیں کریگا۔ یہ مسئلہ اُسکا تھا اُسے اکیلے جھیلنا تھا۔

وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔ اپنی بیوی کو بھی نہیں۔

اُسکی بیوی۔۔۔ اُسکی چہیتی بیوی۔۔۔

حور عین مصطفیٰ۔۔۔

جسکی ہنسی ہر طرف جلترنگ بکھیر دیتی تھی۔۔۔

جسکی شرارتیں حسین کا دل موہ لیتی تھی۔۔۔

جواُسکے ہر غم بھلا دیتی تھی۔۔۔

جواُسکے سکھ دکھ کی ساتھی تھی۔۔۔

حور عین مصطفیٰ۔۔۔

حسین کی حور۔۔۔

-------+--------+--------

''احمد! احمد۔۔۔''لاؤنج میں داخل ہوتا علی اپنے بیٹے کو آوازیں دیتا صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ٹیبلیٹ پر کوئی خبر دیکھتے سفیر صاحب نے ایک نظر اُسے دیکھا، چہرہ ہمیشہ کی طرح غصّے سے تپ رہا تھا۔وہ جانتے تھے کہ احمد کی یقیناً شامت آنے والی ہے۔حالانکہ وہ اتنا خاموش مزاج بچہ تھا، طبیعت میں کوئی شرارت نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ ہر دوسرے دن علی کی ڈانٹ پھٹکار کا شکار ہوتا تھا۔سفیر صاحب کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے کیونکہ وہ بہت پہلے ہی اُنہیں یہ باور کرواچکا تھا کہ ''میرے اور میرے بیٹے کے معاملات سے دور رہیں''۔دروازے سے گھبرایا ہوا احمد داخل ہوا۔

''کہاں تھے تم؟ معلوم ہے کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں؟''اُس نے سختی سے پوچھا تو وہ سہما۔

''اِدھر آؤ!''علی نے اشارے سے اُسے پاس بلایا۔وہ سر جھکائے اُسکے پاس آیا۔

''فار گاڈ سیک (خدا کے واسطے)! چپل تو اُتار کر آؤ۔''وہ چیخا تو احمد نے ہڑبڑا کے چپلیں اتاریں۔وہ ڈر کے چپلوں سمیت ہی قالین پر چڑھ گیا تھا۔

''چھوٹے بچے ہو تم؟ ایک ہی بات کتنی دفع بتانی پڑے گی؟ سارا قالین گندا کر دیا۔''حالانکہ وہ چھوٹا بچہ ہی تھا۔

''یہ کیا ہے؟''اُس نے اپنا موبائل اُسکے سامنے کیا، تو اس نے ایک نظر موبائل کی سکرین کو دیکھا۔ایک نظر دیکھنے پر ہی اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اُس نے کیا کر دیا ہے۔اسی لیے واپس نظریں جھکا دیں۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں۔کیا ہے یہ؟''وہ دھاڑا تو سفیر صاحب نے خائف نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میرے اسیسمنٹ کا رزلٹ (نتیجہ)۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''اور کیا نتیجہ آیا ہے تمہارا؟''اُس نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کم ہے۔''وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''صرف کم ہے؟ باسٹھ فیصد لائے ہو تم، دن بہ دن تمہاری کارکردگی خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔آخر کر کیا رہے ہو تم؟''

''سوری بابا!''

''واٹ سوری؟ میں اتنی فیسیں تمہارے اسکول اور ٹیوشن کی اس لیے بھر رہا ہوں کہ تم یہ مارکس لاؤ؟''وہ سر جھکائے اُسکی ڈانٹ سنتا رہا۔

''آج سے اگلے اسیسمنٹ تک نہ تم فٹبال کھیلو گے، نہ سائیکلینگ کرو گے اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ کھیلو گے۔اب تم مجھے صرف اور صرف پڑھتے ہوئے نظر آنے چاہیے ہو۔''اُس نے فیصلہ صادر کیا تواُس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ایک امید تھی کہ شاید باپ کو ترس آجائے، شاید رحم آجائے یا شاید وہ بھی کبھی اُس سے محبت سے بات کرلے۔شاید کبھی۔۔۔

''منع کیا ہے نہ کہ مت رویا کرو میرے سامنے۔''علی جھنجھلایا تو وہ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے گہری سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔آج ہی اُسکے موبائل پر پرنسپل نے رپورٹ کارڈ بھیجی تھی۔اُسے دیکھ کر دماغ ہی گھوم گیا تھا اُسکا، وہ جتنی اُس پر محنت کر رہا تھا، اتنا ہی وہ ہر شے خراب کر رہا تھا۔سپورٹس سے لیکر پڑھائی تک ہر جگہ اُسکی کارکردگی صفر تھی۔

''اُسکے ساتھ اس طرح کا سلوک کرو گے، تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔''سفیر صاحب نے ناچاہتے ہوئے بھی کہا۔

''میں تو ہو گیا۔''شرٹ کی آستینیں فولڈ کرتے، اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''صرف پیسے کمانا کامیابی نہیں ہوتی۔''

''آپکی نظر میں تو وہی ہوتی ہے۔''اس طنز پر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔وہ صوفے سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہیں بیٹھ گیا۔

''صبح اسکول جاتا ہے، گھر آئے کچھ گھنٹے نہیں ہوتے کہ ٹیوشن چلا جاتا ہے، پھر آتا ہے تو آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور قاری صاحب آجاتے ہیں۔اُسے کچھ وقت باقی بچوں کی طرح بھی رہنے دو۔''اُنہوں نے ہمّت نہ ہاری۔

''اُسکے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔''

''اتنا سخت رویہ رکھنے میں اُسکی کیا بھلائی ہے؟''

''تاکہ اُسے سختیاں جھیلنا آئے۔اُسے پیروں پر کھڑا کر رہا ہوں ابّا! کیونکہ اِس زمانے میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا، باپ بھی نہیں۔''اُس نے اُنکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔کرب اور اذیت کا سایہ سا اُنکے چہرے پر لہرایا تھا۔

''جو غلطی میں نے کی ہے، وہ تم نہ کرو علی!''وہ ہار مانتے ہوئے بولے۔

''مجھے پتہ ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''وہ اُن سے مزید بحث کرنے کے بجائے اُٹھ کر باہر آگیا۔زندگی اُسکے لیے پہلے ہی بدمزہ ہو چکی تھی، اُسکی اپنی خواہشات تو کب کا مر چکی تھیں۔اب صرف وہ اپنے بیٹے کو اُسکے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتا تھا۔اُسے زمانے کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا۔لیکن وہ بھول جاتا تھا کہ وہ بچہ ابھی ان تجربات سے گزرنے کے لیے بہت چھوٹا ہے۔اُسے زمانے کا نہیں بلکہ صرف اپنے باپ کا تلخ رویّہ نظر آتا ہے، اور یہ رویّہ اُسے روز مارتا ہے۔ کبھی کبھی علی کو اپنے رویے کا احساس ہوتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں اُسکی ہر غلطی پر وہ اُسے پہلے سے زیادہ ڈانٹ دیتا تھا۔

باہر آکر بھی سکون نہ ملا تو گاڑی لیکر انجان راستوں پر نکل گیا۔بہت دیر سڑکوں پر پھرتا رہا اور بلآخر ایک چائے کے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔اندر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔بس ایسے ہی رک گیا تھا۔تب ہی اُسکی نظریں سامنے ٹیبل پر بیٹھے دو افراد پر گئی۔اُس نے آنکھوں پر سے گوگلز ہٹا کر دوبارہ دیکھا، اُس نے

غلط نہیں دیکھا تھا۔ وہ رضا ہی تھا۔ بلیو جینز پر ہلکی براؤن رنگ کی ہائی نیک پہنے اور اُس پر گہرے براؤن رنگ کا کوٹ ڈالے وہ ہر طرح سے رضاالٰہی ہی تھا۔

لیکن حیران وہ اُسکے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھ کر ہوا تھا۔ ایف آئی اے آفس میں ہوئی آخری بریفنگ نظروں میں گھوم گئی۔

مائیکل عرف فرمان، جو کہ پس منظر سے غائب ہو گیا تھا کل وہ ایک خلیل نامی شخص سے ملا ہے۔ خلیل کا سارا بائیو ڈیٹا ڈیپارٹمنٹ نے اکھٹا کر لیا ہے۔

فرّخ صاحب کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ کھچڑی بالوں والا شخص، جسکے ساتھ اس وقت رضا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ اور کوئی نہیں بلکہ وہی خلیل تھا، جسکی تصویر پچھلے ہفتے فرّخ صاحب نے اُنہیں دکھائی تھی۔ جسکے ذریعے مائیکل تک پہنچا جا سکتا تھا۔

بھلا رضا اسکے ساتھ کیا کر رہا تھا؟ اور کیوں؟ اور جتنے سکون سے اُسکے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پرانے تعلقات ہوں۔

اُسکا دماغ کسی خطرے کا الارم بجا رہا تھا۔

''کیا مجھے نوید کو بتانا چاہیے؟ یا فرخ صاحب کو؟'' اُس نے سوچا اور پھر موبائل نکال کر دور سے اُسکی اور خلیل کی تصویر اس انداز میں لی کہ وہ دونوں واضح نظر آ رہے تھے۔ پھر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔ رضا سے ہزار شکوے صحیح لیکن اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس حد تک گر جائیگا۔

وہ دشمن سے تعلقات رکھ سکتا ہے؟ اور اگر اُسے جانتا بھی تھا تو بتایا کیوں نہیں؟ وہ سب موت کے دہانے پر کھڑے تھے اور رضا ہر شے جانتے ہوئے بھی چھپا رہا تھا؟

ایک قدرے سنسان جگہ پر اُس نے گاڑی روکی اور موبائل باہر نکالا۔ تھوڑی دیر پہلے کی لی گئی تصویر نکال کے دیکھی۔ سمجھ نہیں آیا کیا کرے؟ نوید کا نمبر اُسکے پاس نہیں تھا۔ ایف آئی اے آفس جانا چاہیے یا نہیں؟

''پہلے مجھے اپنے طور پر رضا کی معلومات اکھٹی کرنی ہو گی۔ آخر وہ کر کیا رہا ہے؟'' کچھ سوچ کر اُس نے موبائل واپس ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔

اُسے یاد آ رہا تھا۔۔۔ رضا کا ماضی۔۔۔ اُسکا پرانا بوسیدہ سا گھر، اُسکی کسم پرسی میں گزاری گئی زندگی۔۔۔ اُسکے برے حالات۔

اور پھر رضا کا موجودہ حال۔۔۔

اُسکی ہر شے سے ٹپکتی امارت، اُسکا متکبرانہ انداز، کوئی اتنے جلدی اتنا امیر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً رضا جیسا شخص، جسکے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔ جسکے سر پر نہ باپ ہو اور نہ جسکے پیچھے جائیداد۔۔۔

ہر سوال کا ایک ہی جواب علی کے پاس تھا۔

رضا یقیناً ان سب میں ملوث تھا۔

-------+--------+--------

سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے وہ بلا ارادہ وہاں آ کر رک گیا۔ نظر اٹھا کر اس خوبصورت مسجد کو دیکھا۔ نمازی جا چکے تھے، اوپر والے فلور پر حفاظ طلباء کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ گاڑی بند کرتا مسجد میں داخل ہوا۔ اس مسجد کا صحن خالی تھا۔ اندر جانے کے بجائے وہ صحن میں بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ شدید سردی

کی وجہ سے سیڑھیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ ہر احساس سے عاری بیٹھا تھا۔ ذہن منتشر تھا اور دل خالی، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے؟ نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب کسی نے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''حسین!'' اُس نے سر اٹھا کے دیکھا، مسجد کے پیش امام صاحب کھڑے تھے۔

''ماموں!'' وہ اُنہیں دیکھ کر کھڑا ہونے لگا لیکن انہوں نے اشارے سے روک دیا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مختصر سا جواب دے کر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ اُسکے برابر میں ہی بیٹھ گئے۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ پریشان ہو؟'' اُنہوں نے پیار سے پوچھا تو اُس نے اُنہیں خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں ماموں! سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں؟ کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کوئی سبیل نہیں دکھتی۔'' وہ غیر واضع باتیں کر رہا تھا۔

''ایمان کیا ہے؟'' اُنہوں نے غیر متوقع سوال کیا۔

''جی؟'' اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ایمان سے تم کیا مراد لیتے ہو بیٹا؟''

''اللہ پر یقین!'' اُس نے جواب دیا۔

''مرحوم ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ جب راستہ نظر نہ آئے، تب اللہ پر یقین کرنا ایمان ہے۔ جب کوئی منزل نظر نہ آئے، تب اللہ پر یقین کرنا ایمان ہے۔ جیب میں پیسے ہوں اور دل میں اطمینان ہو تو بھروسہ کس پر ہوا؟ پیسوں پر؟ جب وسائل اور ذرائع نہ ہو تب یقین ہو کہ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے، اسباب اُسکے محتاج ہیں۔'' اُنہوں نے مرحوم اسرار صاحب کے الفاظ دہرائیں۔

''میرے نبی ﷺ نے کبھی اپنی جان کے لیے کسی انسان پر بھروسہ نہیں کیا۔ پورا مکّہ خالی ہو چکا ہے، گھر کے باہر مشرکین مکہ کے سرداران موجود ہیں، لیکن آپ ﷺ اُنکے سامنے سے اُنکے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے چلے گئے۔ بھروسہ کس پر تھا؟ اللہ پر۔۔۔'' حسین نے تو انہیں کچھ نہیں بتایا تھا، پھر وہ کیسے سمجھ گئے کہ وہ اپنی جان کے لیے پریشان ہے؟

''حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: **کہ اگر ساری کائنات بھی اکھٹی ہو جائے، تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے، تو نہیں پہنچا سکتی مگر صرف تب، جب اللہ چاہے۔ اور اگر ساری کائنات اکھٹی ہو جائے کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا دے، نہیں پہنچا سکتی مگر اتنا ہی جتنا اللہ چاہئے۔** مومن کسی کی دھمکیوں میں نہیں آتا۔ کھلائے گا بھی اللہ، پہنائے گا بھی اللہ اور جان بھی وہی بچائے گا۔ یہ سارے کام اُسکے ہیں، تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اللہ کے کام، اُسی کو کرنے دو۔'' کتنی پیاری بات کہی تھی اُنہوں نے۔

''تم نے پہلے بھی تو کتنے دکھ دیکھے تھے، لیکن تم کبھی پریشان نہیں ہوئے۔ تو اب کیوں ہوتے ہو؟ انسان تھک جاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں! وہ انسان ہے، فرشتہ تو نہیں، تھک جانا برا نہیں ہے، ایمان نہ ڈگمگائے کبھی۔'' حسین کے دل سے منوں بوجھ سرکا تھا۔ منتشر ذہن یکدم ہی پرسکون ہو گیا، دل میں اطمینان اُتر آیا کہ زندگی اللہ نے دی ہے تو لے گا بھی وہی، یہ کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں کہ وہ اُسکی موت کا وقت لکھ دے۔

''شکریہ ماموں! آپ ہمیشہ مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔'' اُس نے احتراماً کہا تو وہ مسکرا دیئے۔

''چلو اب گھر جاؤ! پریشان ہو رہے ہوں گے سب۔'' اُنہوں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اُسے گھر واپس جانا تھا بالکل ویسے ہی، جیسے وہ روز جاتا تھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ۔۔۔

-------+--------+--------

''میں نے تمہیں جس شخص کی تصویر اور معلومات دی ہیں۔ اسکا ڈیٹا چاہیے مجھے۔''

''کس قسم کا ڈیٹا؟''

''یہ کیا کرتا ہے، پہلے کیا کرتا تھا؟ اسکا ذریعہ آمدنی، اُسکا حلقہ احباب، یہ کن کن لوگوں سے ملتا ہے اور۔۔۔'' علی رکا۔

''اور؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''اور اسکا کوئی کرمنل ریکارڈ؟'' علی کو خود نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جو وہ کہہ رہا تھا اُس پر یقین کرنا اُسکے لیے خود بھی مشکل تھا۔ لیکن یہ پانچ زندگیوں کا سوال تھا۔ ہاں! پانچ زندگیاں۔۔۔ کیونکہ رضا کو تو وہ اس سب میں ملوث سمجھتا تھا۔

''ٹھیک ہے، ہو جائیگا۔ کام مشکل ہے اسی لیے تھوڑا وقت لگے گا۔ لیکن میں تمہارے لیے یہ کر دونگا۔'' دوسری جانب سے یقین دلایا گیا۔

''دیکھو! کسی کو خبر نہ ہو کہ میں نے تمہیں یہ سب کرنے کو کہا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو، تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں تمہارا کام پوری رازداری سے کروں گا۔'' دوسری طرف سے یقین دلایا گیا تو اُس نے سر ہلاتے ہوئے فون رکھ دیا۔

''تم کیا کر رہے ہو رضا؟'' نفرت اُسکے انگ انگ سے جھلک رہی تھی۔ رضا کا اپنی ذات پر لگایا گیا الزام، اُسے آج تک نہیں بھولا تھا۔

-------+--------+--------

C-189

''یہی نمبر تھا شاید!'' اُس نے گھر پر لگی تختی پڑھتے ہوئے کہا۔ پھر گاڑی سے اتر کر بیل بجا دی۔ دروازہ چند سیکنڈ میں کھول دیا گیا تھا۔

''السلام علیکم! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' مقدّس کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ جواباً وہ بھی مسکرایا اور پلٹ کر گاڑی سے مکرم کو نکالنے لگا۔

''تم اندر نہیں آؤ گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔''اُس نے معذرت کی۔

''واپسی کب ہو گی تمہاری؟''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''واپسی پر تو وقت ہو گا نا تمہارے پاس، نانی سے مل کر جانا۔''

''ٹھیک ہے۔''مکرم کو اُسکے حوالے کرتے ہوئے حامی بھری۔

''میرا چھوٹو!''اُس نے مکرم کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے پیار کیا۔

''مکرم!''وہ تصیح کرتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھا۔

''تمہارا آفس کہاں ہے؟''اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتا اُس نے ایک اور سوال پوچھا۔

''اسی شہر میں۔''اُس نے جان چھڑانی چاہی۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے، لیکن کس علاقے میں؟''

''ڈیفنس!''مختصر جواب دیا۔

''کون سے فیز میں؟''

''تم نے کیا کرنا ہے؟''

''کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

''نمبر دے چکا ہوں میں تمہیں، اور میرا گھر بھی معلوم ہے تمہیں۔''

''کبھی ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فون نہ اٹھاؤ اور گھر پر بھی نہ ہو تب؟''

''مقدّس! آج کے بعد سے تم ایک دن میں، مجھ سے صرف دس سوال پوچھو گی۔''اُس نے اچانک ہی کہا۔

''ہیں؟اِسکا کیا مطلب؟''وہ حیران ہوئی۔ گود میں لٹکا مکرم، آنکھیں گھما گھما کر دونوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

''اِسکا مطلب کہ تمہارا آج سے دس سوالات کا کوٹہ ہو گا، دس سوال پورے ہونے پر میں ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ تمہارے پاس نو سوال بچے ہیں۔''

''ارے ایسے کیسے؟ ابھی شروع کب ہوا تھا؟''وہ ہڑبڑائی۔

''جب تم نے پہلا سوال کیا تب، اب تمہارے پاس آٹھ سوال بچے ہیں۔''کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے لگا۔

''مگر۔۔۔'' اُس نے کچھ بولنا چاہا۔

''ایک بھی سوال اور کیا تو سات سوال بچیں گے۔'' دروازہ بند کرتے ہوئے اللہ حافظ کہا۔اور گاڑی لے اُڑا۔

''تمہارا باپ واقعی بہت بداخلاق ہے۔'' اُس نے مکرم کو کہا تو وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔وہ اُسے پیار کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔یعنی اب اُس سے سوچ سمجھ کر سوال پوچھنا پڑیگا۔

-------+--------+--------

خاموش گھر، ویران راتیں اور اُداس صبحیں۔یہی زندگی وہ پچھلے کئی سالوں سے جی رہا تھا۔دل دکھی تھا۔

اور گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔وہ خاموشی سے چلتا عمائمہ کے کمرے میں چلا آیا۔گلابی اور سفید امتزاج کا یہ کمرہ، اُس نے بہت پیار سے عمائمہ کے لیے سجایا تھا۔اس کمرے کی ایک ایک شے سے محبّت ٹپکتی تھی۔ایک باپ کی محبت۔۔۔۔

دو ماہ سے عمر نے اپنی بیٹی کی آواز نہیں سنی تھی، اُسکا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔دل تڑپ رہا تھا اُس سے ملنے کے لیے۔روز سوچتا کہ عمارہ کو فون کرے، پھر رک جاتا کہ اگر وہ فون نہیں اٹھائے گی تو؟ لیکن آج دل اتنا بے چین تھا کہ اُسے کال ملا ہی دی۔بیل جاتی رہی، جاتی رہی۔۔۔اور جب اُسے لگا کہ وہ فون نہیں اٹھائے گی۔تب اُس نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو!'' عمر کی سانسیں بھی سماعت بن گئی۔

''کیوں فون کیا ہے؟'' رکھائی سے پوچھا۔

''میں عمائمہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' بے بسی سے کہا۔

''تم سے دور لے جانے کے لیے ہی میں اُسے یہاں لائی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ وہ تمہیں بھول جائے اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری اُس سے بات کروادوں؟'' اُس نے ایسے کہا جیسے اُس کی ذہنی حالت پر شک ہوا ہو۔

''میں نہیں رہ سکتا اُسکے بنا عمارہ!، اُسکی آواز ہی سنا دو مجھے۔'' اُس نے منت کی کہ شاید اُسے ترس آجائے۔

''وہ سو رہی ہے۔کل بات کروادوں گی۔''

''تم اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہو عمارہ؟'' اُسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

''اپنے کیے گئے ظلم کیوں بھول جاتے ہو عمر؟ ہمیشہ خود کو مظلوم کیوں سمجھتے ہو؟'' وہ چیخی تھی۔وہ چپ کا چپ رہ گیا۔اُسکی کوئی بھی وضاحت اُسکے اپنوں کا دل صاف نہیں کر سکتی تھی۔نہ عمارہ کا، نہ اسکے ماں باپ کا۔۔۔

''لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔کل ویڈیو کال پر بات کروادوں گی اُس سے۔۔۔خدا حافظ!'' اُسکا جواب سنے بنا ہی فون رکھ دیا۔صاف ظاہر تھا کہ اس سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

عمر تھک کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔بیڈ پر کچھ کپڑے رکھے تھے۔جاتے ہوئے جب عمارہ پیکنگ کر رہی تھی تو سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے اس نے بہت کچھ ایسے ہی یہاں چھوڑ دیا تھا۔وہ چیزیں اب تک وہیں رکھی تھیں۔عمر نے ہاتھ بڑھا کر عمائمہ کے فراک اٹھالی۔یہ فراک وہ اُسکی پہلی سالگرہ پر لایا تھا۔ اُسے پہن کر، چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی وہ کوئی گڑیا ہی لگ رہی تھی۔اُس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔دوڑ دوڑ کر اُس کے پاس آتی تھی۔

اب وہ کہیں نہیں تھی۔۔۔نہ اُسکے ننھے قدموں کی چاپ تھی۔۔۔نہ اُسکی معصوم آواز تھی۔۔۔

وہ اُسکے لباس کو آنکھوں سے لگتا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

کچھ غلطیوں کی سزا بہت بڑی ہوتی ہے۔انسان کو ساری زندگی بھگتنی پڑتی ہے۔وہ بھی وہی سزا بھگت رہا تھا۔

-------+--------+--------

شام کا وقت تھا، کراچی میں سردی کی بارش شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھی۔لیکن جب ہوتی تھی دل موہ لیتی تھی۔یہ بھی ایک ایسی ہی خوش قسمت شام تھی۔جب ہلکی ہلکی بارش نے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔اپنے آفس میں بیٹھا مقدّم شیشے کے پار برستی بوندوں کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔پچھلے دنوں اتنا کام تھا کہ فرصت نہیں ملتی تھی، اور اب کام نہ ہونے کے برابر۔اب وہ بس آفس کے اوقات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔نظریں گھما کے اپنے آفس کو دیکھا۔ کالے اور سرمئی رنگ کے امتزاج کا یہ آفس دراصل اُسکی نہیں، لیلیٰ کی پسند تھی۔ اُسکے گھر کی گہری نیلی اور آف وائٹ تھیم بھی درحقیقت لیلیٰ کے مزاج کے مطابق ہی تھی۔اُسے رنگوں سے محبت تھی، اپنی ڈائری میں بھی رنگ برنگے مارکر اور پوائنٹر پین سے نہ جانے کیا کیا لکھتی رہتی؟ مقدّم کو اُسکی ہر ادا پیاری تھی۔

لیلیٰ یاد آئی تو آنکھوں میں کرچیاں چبھنے لگیں۔ہاتھ بڑھا کر میز کا دراز کھولا اور اُس سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔وہ لکڑی کا چھوٹا سا ڈبیا نما باکس تھا۔مقدّم نے اُسے کھولا، جانتا تھا اندر کیا ہے۔اُسکی اور لیلیٰ کی خون آلود تصویر اور اُسکے دو عدد جھمکے۔۔۔

اُس نے وہ تصویر نکالی، جابجا خون کے دھبوں کے باوجود بھی لیلیٰ کا چہرہ واضح تھا۔

شہد رنگ بڑی بڑی غزالی آنکھیں، ایسے لگتا تھا جیسے اُسے ہی دیکھ رہی ہو۔

''تمہاری چوائس بہت خراب ہے مقدّم! میں جب اس گھر میں آؤں گی نہ، اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی سب کچھ۔'' کبھی کا کہا ہوا اُسکا جملہ کانوں میں گونجا۔ تصویر واپس رکھ کر اُسکے جھمکے نکال لیے۔

''ہمیشہ کیوں پہنے رکھتی ہو انہیں؟'' مقدّم نے پوچھا تھا۔

''کیوں کہ تم نے دیئے ہیں۔'' مسکرا کے کہتی وہ اُسے اپنی اپنی لگی تھی۔

''اور خراب ہو گئے تو؟''

''تم اور لا دینا۔'' فوراً سے جواب آیا تھا۔

دل درد کر رہا تھا، لیلیٰ نہیں تھی۔

دنیا میں کہیں نہ تھی۔۔۔

کسی کونے میں نہ تھی۔۔۔

اُسکی آواز نہ تھی۔۔۔

اُسکی باتیں نہ تھی۔۔۔

سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ اُس نے سامان ڈبیا میں ڈال کر واپس دراز میں رکھ دیا۔ کیا فائدہ خود کو اذیت دینے کا؟ وقت دیکھا تو ابھی بھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ تھک کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ واپسی پر مکرم کو بھی لینا تھا، مقدّس کی نانی سے بھی ملنا تھا۔ زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی، اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔ رک جاتی اگر مکرم نہ ہوتا۔

شہد رنگ بڑی بڑی غزالی آنکھوں والا مکرم نہ ہوتا تو شاید اُسکی زندگی بھی رک جاتی۔

اُسکی آنکھیں ہی تھیں جو مقدّم کو زندہ رکھے ہوئی تھیں۔

-------+--------+--------

''بابا! بابا!''احمد چلاتا ہوا تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا، اُسکے ہاتھوں میں علی کا موبائل تھا۔ سکون سے اپنے بستر پر لیٹ کے، ٹی وی پر کوئی ضروری ٹاک شو دیکھتے علی نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے اندر آنے کا؟''

''بابا آپکا فون!''اُس نے مسلسل بجتا ہوا موبائل اُسکے سامنے کرنا چاہا۔

''پہلے میری بات کا جواب دو، کیا تمہیں دستک دے کر نہیں آنا چاہیے تھا؟''اُسے موبائل کی مطلق پرواہ نہ تھی۔

''جی!''ہمیشہ کی طرح سر جھکا کے یہی کہا۔ موبائل بج بج کے خاموش ہو چکا تھا۔

''دو موبائل۔''ہاتھ بڑھا کے موبائل مانگا، احمد کے ہاتھ کانپے اور موبائل نیچے گر گیا۔

''کیا کر رہے ہو؟''وہ جھنجھلایا''کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔''وہ گھبرا کے موبائل اٹھانے لگا۔ صد شکر کے وہ قالین پر گرا تھا۔

''جاؤ اب یہاں سے۔''اُس نے موبائل اُسکے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کے علی موبائل آن کرتا کال دوبارہ آنے لگی۔ نمبر دیکھ کر وہ سیدھا ہوا۔

''ہیلو! کیسے ہو علی؟''فون کی دوسری جانب سے آواز آئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیا اطلاعات ہیں؟''

''کام مکمل ہو گیا ہے۔رضاالٰہی کی معلومات اکھٹی ہو گئی ہیں۔میں تمہیں بھیج رہا ہوں دیکھ لینا۔''

''کوئی مشکوک بات تو معلوم نہیں ہوئی؟''اُس نے جاننا چاہا۔

''کرمنل ریکارڈ تو کوئی نہیں ہے اُسکا،سب کلیئر ہے۔البتہ۔۔۔''وہ رکا

''البتہ؟''وہ بے چین ہوا۔کچھ گڑبڑ تھی۔

''وہ ماضی میں rehab سینٹر میں رہ چکا ہے۔نشے کے علاج کے لیے۔۔۔''

''واٹ؟''اُس کو جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں!کافی لمبا علاج چلا ہے اِسکا،عادی نشئی تھا یہ،اور یہ جو تصویر تم نے مجھے بھیجی ہے۔اس میں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے،اُسکا نام خلیل ہے۔یہ ایک چھوٹا موٹا ڈرگ ڈیلر ہے۔رضاالٰہی اسی سے ڈرگز خریدتا تھا۔کافی پرانے تعلقات ہیں ان دونوں کے۔''وہ تفصیل سے بتا رہا تھا۔اور علی کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔

-------+--------+--------

ساتواں باب

کچھ یار پرانے

یونیورسٹی میں آج کل کام بہت زیادہ تھا، وہ بہت تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ سامنے لان میں بچے باغبانی کر رہے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر تھکن جاتی رہی، وہ وہیں چلا آیا۔

''بچوں۔۔۔''قریب پہنچ کر پکارا، اُسے دیکھ کر سارے بچے بھاگ کے آئے اور اُس سے لپٹ گئے، وہ نیچے ہی بیٹھ گیا۔

''میرے جگر کے ٹوٹوں!''اُس بچوں کو پیار سے بھینچے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔ اُس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ نیوی بلیو رنگ کے لباس میں بل کھاتے بالوں کی پونی بنائے، پھولوں کے درمیان بیٹھی جزا، خود بھی ایک پھول ہی لگ رہی تھی۔

''انار کلی!''دل ہی دل میں اُسے خطاب دیا۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''تمہارے لان کی توڑ پھوڑ کا آج آخری دن تھا۔''مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

''سارے پھول لگ گئے؟''وہ بچوں کو موسم کی مناسبت سے پھول اور پودے لگانا سکھا رہی تھی۔ بچے بھی پوری دلجمعی سے یہ کام کر رہے تھے۔

''جی، سب ہو گیا۔''وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اُٹھ کر پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھی، رضا بھی وہیں آ گیا۔

''بابا! یہ دیکھیں۔''ایک بچی نے اُسکے پاس آ کر اپنی رپورٹ کارڈ اُسکے سامنے کی۔ رضا نے اُسکے ہاتھ سے رپورٹ کارڈ لے لی۔

''اڑسٹھ فیصد مارکس۔ ہمم۔۔۔۔ بہت اچھے، تم نے پہلے سے اچھی کارکردگی دکھائی ہے رمشاء!''اُس نے اُسکے بال بگاڑتے ہوئے پیار سے کہا۔

''اگلی بار اس سے زیادہ لاؤں گی۔''اُس نے یقین دلایا۔

''ان شاءاللہ کہو۔''جزا نے فوراً ٹوکا۔

''ان شاءاللہ!''اُس نے جلدی سے کہا اور اندر بھاگی تاکہ جلد از جلد رپورٹ کارڈ اندر رکھ کر آئے تو باقی بچوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو سکے۔

''تم اچھی تربیت کر رہی ہو بچوں کی۔''اُس نے تعریف کی۔

''شکریہ!''وہ مسکرائی۔ مسکراتی تھی تو اُسکی سیاہ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ سر جھکائے بچوں کا ہوم ورک دیکھنے لگی۔

''جزا!''اس نے اچانک ہی اُسے مخاطب کیا۔ایسے ہی۔۔۔بلاوجہ۔۔۔بات کرنے کی عرض سے۔۔۔

''ہوں؟''سر جھکائے جھکائے ہی، مصروف سے انداز میں کہا۔

''ایک بات پوچھنی تھی۔''اُس نے کہا۔

''پوچھو!''کاجل سے بھری سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔۔۔اور وہ بات ہی بھول گیا۔۔۔

''کہو؟ کیا کہنا تھا؟''اُس نے دوبارہ پوچھا تو وہ ہوش میں آیا۔

''کیا کہنا تھا مجھے؟''سر سہلاتے ہوئے یاد کرنا چاہا۔وہ واقعتاً بھول گیا تھا۔

''ہاں! یاد آیا۔۔۔میں پوچھ رہا تھا کہ تم نے تعلیم کس چیز میں حاصل کی ہے؟''آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا، گویا دوبارہ اپنی بات نہ بھول جائے۔

''اسپیشل ایجوکیشن!''مختصر سا جواب دیا تو رضا نے سر ہلایا۔

''شروع سے ٹیچر بننے کا شوق تھا۔بچپن میں اپنے دوستوں کی استاد بن کر اُنہیں پڑھانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔پھر جب وہ تنگ آکر مجھے چھوڑ کر چلے جاتے تب میں اپنے کھلونوں کو اپنا سٹوڈنٹس بنالیتی تھی۔''وہ ہنستے ہوئے بتانے لگی۔رضا مسکراتے ہوئے اُسے سننے لگا۔وہ اپنے بچپن کا قصہ بڑے ذوق و شوق سے سنا رہی تھی۔جاتی سردی کے دن آگئے تھے،وہ سوٹ کے ہم رنگ شال کندھوں پر پھیلائے بیٹھی تھی۔

بات کرتے ہوئے عادتاً چلتے ہوئے ہاتھ۔۔۔

مسکرانے پر چھوٹی ہوتی آنکھیں۔۔۔

کبھی رضا کے کسی سوال پر اٹھتی کاجل سے لبریز گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔

دھوپ میں چمکتی سانولی رنگت۔۔۔۔

اور بس۔۔۔رضا ختم

''اب حقیقت میں استاد بن کر معلوم ہوا کہ اتنا آسان کام نہیں ہے یہ، جتنا بچپن میں لگتا تھا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی،وہ بس مبہوت سا دیکھتا رہا۔

''تم نے رمشاء کو کم مارکس آنے پر کچھ کہا کیوں نہیں؟''اُس نے اچانک ہی سوال کیا۔

''کچھ کہنا چاہیے تھا کیا؟''اُس نے الٹا سوال کیا۔

''میرا مطلب، استاد یا والدین تو کم نمبر آنے پر کافی شدید ردعمل دیتے ہیں۔''

''بچے ہمارا شدید ردعمل سہنے کے لیے نہیں ہوتے جزا! صرف اس لیے کہ وہ ہماری اُمیدوں پر پورا نہیں اتر سکے۔ نمبرز تو ویسے بھی کسی کی قابلیت کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بڑوں کو بچوں پر اپنی نہ ختم ہونے والی اُمیدوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔''

''لیکن کیا والدین بچوں کے بھلے کیلئے نہیں کرتے یہ سب؟''

''کیا بچوں کی بھلائی اس میں ہے کہ اُنہیں کولھو کا بیل بنا دیا جائے اور صرف اپنی خواہشات کے پیچھے ہانکا جائے؟''اُس نے پوچھا تو جزا نے نفی میں سر ہلایا۔

''بچوں کی بھلائی زیادہ نمبر زلانے میں نہیں ہے۔ اُنکی بھلائی ایک اچھا اور بااخلاق انسان بننے میں ہے۔ اور اگر ہر بچہ ڈاکٹر اور انجینئر بن جائے گا تو وکیل کون بنے گا؟ پروڈیوسر کون بنے گا؟ نیوز اینکر کون بنے گا؟ ہر بچہ اپنی قابلیت کے حساب سے کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ بڑوں کو چاہیے کہ بچوں کی صلاحیتوں کو نکھاریں، نہ کہ اُنہیں نمبروں کے پیچھے بھگایا جائے۔''

''تم بہت مختلف سوچتے ہو۔''تمام باتوں کے جواب میں اُس نے بس اتنا ہی کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''مختلف مطلب؟''اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی تم انہیں کسی بھی بات پر ڈانٹتے نہیں ہو، غصّہ نہیں کرتے۔''

''کس نے کہا کہ میں غصّہ نہیں کرتا؟''اُس نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ کرتے ہو کیا؟''وہ حیران ہوئی۔ اُسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ کوئی بچہ دروازہ کھولنے جا چکا تھا۔

''کرتا ہوں، بس بچوں پر نہیں کرتا۔''اُس نے چہرہ گھما کر بچوں کو دیکھا۔

''جزا! پتہ ہے اللہ کے نبی ﷺ نے بچوں کو ریحان اللہ یعنی اللہ کا پھول کیوں کہا تھا؟ کیونکہ بچے واقعی جنت میں رکھنے کی شے ہیں۔ یہ اتنے معصوم ہیں کہ یہ دنیا انکے لائق نہیں لگتی مجھے۔ انکے لیے صرف جنت ہی ہونی چاہیے۔ اسی لیے اگر نابالغ بچہ مر جائے، تو وہ جنت میں ہی جاتا ہے، بنا کسی حساب کتاب کے۔''وہ محبت پاش نظروں سے بچوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''رضا بھائی!''ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا وہاں آیا۔

''ہاں کہو!''وہ اُسکی جانب متوجہ ہوا۔

''فریحہ آنٹی آئی ہیں۔''اُس نے اطلاع دی۔

''کہاں؟''وہ حیران ہوا۔اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک طرحدار اور خوبصورت خاتون وہاں داخل ہوئی تھی۔بلیو جینز پر ریڈ شرٹ پہنے، بالوں کا میسی سا جوڑا بنائے، چہرے کے گرد آتی لٹوں کو کرل کیا ہوا تھا۔کانوں میں بڑے بڑے سے گول آویزے لٹکائے وہ جو کوئی بھی تھی، بلاشبہ بہت ہی خوبصورت تھی۔

اُسے دیکھ کر رضا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔اور جزا نے دیکھا تھا، اُس عورت کو وہاں دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشگوار حیرت پھیلی تھی۔

''ہیلو رضا! کیسے ہو؟''اُس نے ٹیبل پر اپنا پرس رکھتے ہوئے کہا۔اخلاقاً اُسے بھی سلام کیا اور دوبارہ رضا کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کافی دنوں بعد نہیں آئی تم؟''رضا نے شکوے کے سے انداز میں کہا۔

''مت شرمندہ کیا کرو مجھے، جانتے تو ہو کتنی مجبور ہوں میں۔''اُس نے کہا تو رضا کے چہرے پر افسوس جیسے تاثرات آئے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔''اُس نے دکھ سے کہا۔اُن کے درمیان کافی سے زیادہ شناسائی لگتی تھی۔

''اچھا مجھے تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی تھی۔''فریحہ نے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ جزا! کیا تم اندر سے ولید کو لے آؤ گی؟''اُس نے پہلے فریحہ کو جواب دیا پھر جزا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ولید کو؟''اُس نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! ولید کو۔''اُس نے دہرایا

''ٹھیک ہے۔''وہ سنجیدگی سے کہتی اُٹھ گئی۔اُسکے جانے کے بعد وہ دونوں آہستہ آواز میں کچھ بات کرنے لگے۔صاف ظاہر تھا کہ جزا کو وہاں سے ہٹانا چاہتے تھے۔پتہ نہیں اُسے کیا برا لگا تھا؟ رضا کا اُسے وہاں سے جانے کو کہنا یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اُس عورت کی طرف متوجہ ہو جانا؟ وہ خاموشی سے اندر آ گئی۔

---------+---------+--------

''مجھے روٹیاں لینے جانا ہے۔اور اس وقت میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں۔''وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا موبائل استعمال کر رہا تھا، جب اُسکے بھائی نے اُسکے پاس آ کر کہا۔

''تو مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''موبائل سے نظریں ہٹائے بنا پوچھا۔

''پیسے چاہیے ہیں مجھے۔''اُس نے اُسکے سر پر کھڑے ہو کر زور سے کہا تو حسین نے اُسے گھورا۔

''نہیں ہیں میرے پاس۔''

''یار! کس قدر کنجوس انسان ہو تم؟ واپس کر دوں گا میں۔'' اُسکے بھائی نے لتاڑا۔

''قسم لے لو مجھ سے، ایک روپیہ نہیں ہے۔ چاہو تو میرا والٹ دیکھ لو۔''حسین نے بیچارگی سے کہا۔اُسکے بھائی نے واقعی اُسکا بٹوہ اٹھالیا۔

''ارے! اس میں تو سچ میں پیسے نہیں ہیں۔''اُسکا خالی بٹوہ دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''میں نے فارسی زبان میں کہا تھا؟ میں نقد رقم رکھنا چھوڑ چکا ہوں۔''اُس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''حور کی وجہ سے۔''جواب آیا۔کچن میں اپنے بچے کے لیے دودھ گرم کرتی حور عین کے کان کھڑے ہوئے۔

''حور کی وجہ سے؟ کیوں؟''اُسکا بھائی حیران ہوا۔

''میری جیب میں ایک روپیہ نہیں چھوڑتی یہ عورت، پہلے تھوڑے سے پیسے غائب ہوتے تھے، میں سمجھتا تھا کہ شاید میرے حساب کتاب میں گڑبڑ ہے۔ پھر پورے کے پورے پیسے غائب ہونا شروع ہوئے، تو تب معلوم ہوا کہ کہاں جا رہے ہیں سارے پیسے؟''اس الزام پر تو حور عین بلبلا اٹھی۔سب چھوڑ چھاڑ اُسکے سر پر پہنچی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ رکھتے ہی کتنا ہو تم اپنی جیبوں میں؟''

''جتنا بھی رکھتا ہوں حور عین بی بی، لیکن وہ آپ کے لیے ہر گز نہیں ہوتا تھا۔''ہاتھ نچا نچا کے لڑاکا عورتوں کی طرح کہا تو اُسکے بھائی نے اپنی ہنسی ضبط کی۔

''میں نے مشکل سے ایک آدھ بار ہی نکالا ہو گا۔اور دیکھو ذرا اِسکو! ایسے رو رہا ہے جیسے پتہ نہیں گردہ نکال کے بیچ دیا ہو اِسکا۔''

''وہ دن بھی دور نہیں ہے جب تم میرا گردہ نکال کر بیچ رہی ہو گی، وہ بھی اپنے کسی آنلائن آرڈر کیے ہوئے پارسل کی پاداش میں۔''

''ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد پہلا کام یہی کروں گی۔''اُس نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''شرم تو نہیں آ رہی ہو گی؟ میری عیدی بھی یہ کھا جاتی ہے ساری۔''اُسکے دکھ ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔

''جی نہیں! تم خود ہی اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتے ہو۔''اُس نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے کہا۔اب شکل سے چوری صاف ظاہر تھی تو چھپانا بھی تو تھا نہ۔۔۔

''اپنے گھر کے ڈریسنگ ٹیبل پر یا دراز میں رکھنے کو تم یہاں وہاں رکھنا کہتی ہو؟ اظفر چچا کی سلامی میں دی گئی رقم بھی نہیں ملی آج تک مجھے، وہ بھی یہ کھا گئی۔ اور تو اور، ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہوا تھا کہ عید پر بچوں کو ملنے والی عیدی کو آدھا آدھا بانٹیں گے۔ لیکن وہ بھی اس نے ساری کی ساری رکھ لی۔'' اُسکی داستان واقعی دکھ بھری تھی۔

''میں جارہا ہوں روٹی لینے، تم دونوں کرتے رہو یہ حساب کتاب۔'' اُسکا بھائی اُکتا کر کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''ذرا سی۔۔۔'' حسین کے قریب آتے ہوئے ہاتھوں کی چٹکی بنا کر اُسکے چہرے کے سامنے کی ''ذرا سی تم اپنے گھر والوں کے سامنے، میری عزت نہیں رکھ سکتے۔''

''میرے گھر والوں کو تمہاری اصلیت پتہ ہے۔'' منہ موڑ کر دوبارہ موبائل میں مصروف ہو گیا۔

''اچھا سنو! نیچر لز سیریز کا ایک اور پارٹ آگیا ہے۔'' اُس نے رازداری سے بتایا۔

''واقعی میں؟ مجھے کیوں نہیں پتہ چلا؟'' وہ حیران ہوا۔

''تمہیں دیکھنا ہے؟''

''آف کورس! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟''

''ٹھیک ہے، پھر تم برگر آرڈر کر دو۔ میں ابھی بچوں کو سلا کر آتی ہوں۔'' وہ اُسے آرڈر دے کر یہ جا وہ جا ہو گئی۔

''مجھے کسی دن سچ میں اپنے گردے بیچنے پڑیں گے۔'' پیچھے سے اُس نے ہانک لگائی جسے وہ سنی ان سنی کرتی اندر جا چکی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے موبائل نکال کر برگر آرڈر کرنے لگا۔

---------+---------+--------

''کیا ہو رہا ہے؟'' خاکی پینٹ پر کالی شرٹ ٹک ان کیے نوید کچن میں داخل ہوا تھا۔

''تم کیوں آگئے؟'' اُسے دیکھ کر بشریٰ چیخ اٹھی۔

''کیا مطلب کیوں آگیا؟'' وہ حیران ہوا۔

''میں نے تمہارے لیے ناشتہ سرپرائز رکھا تھا۔ تم نے سب خراب کر دیا۔'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب، تم میرے لیے کچھ خاص بنا رہی تھیں۔''وہ خوش ہوا۔

''ہاں! اب تو تم نے خراب کر دیا۔''وہ ناراض ناراض سی بولی۔

''تو مجھے معلوم تھوڑی ہے کہ تم نے کیا بنایا ہے؟ سرپرائز تو اب بھی برقرار ہے۔'' اُس نے اُسکی ناراضگی کم کرنی چاہی۔

''ایسے نہیں! میں ٹیبل پر اچھے سے سجانے والی تھیں۔ تم کسی دن دیر سے نہیں اُٹھ سکتے۔الو کی طرح صبح صبح اٹھ کر بیٹھ جاتے ہو۔''ناراضگی سے بولتی آج وہ برسوں پرانی بشریٰ لگ رہی تھی، نوید کو وہ اچھی لگی۔

''آپکی اطلاع کے لیے الو صبح نہیں جاگتا، رات کو جاگتا ہے۔اور چلو میں آنکھ بند کر لیتا ہوں تم میز سجالو۔''اُس نے مشورہ دیا تو بشریٰ نے اُسے گھورا۔

''اچھا اچھا! جیسے تمہیں صحیح لگے ویسے کر لو۔''مسکراتے ہوئے صلح جو انداز میں کہا۔ تو وہ پلٹ کر پلیٹوں میں ناشتا لگانے لگی۔

''ویسے کیا بنایا ہے تم نے میرے لیے؟''وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''حلوہ پوری، اور سالن!''اُس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''صبح صبح اتنی محنت کس خوشی میں بیگم صاحبہ؟''اُس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے لیے۔''اُس نے ٹیبل پر ناشتہ لگاتے ہوئے کہا۔نوید نے غور سے اُسے دیکھا، باوجود اسکے کہ وہ نوید سے چند سال ہی چھوٹی تھی۔ لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ کم عمر لگتی تھی، چہرے پر معصومیت ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔

لیکن یہ معصومیت نوید کو چار سال پہلے تک کیوں نظر نہ آتی تھی؟ یہ چہرہ اُسے پہلے کیوں اچھا نہ لگتا تھا؟

ان سوالات کے ذہن میں آتے ہی اُسکی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور وہ آگے نکل چکے تھے۔ چاہ کر بھی واپس نہیں لوٹا جا سکتا تھا۔ بشریٰ مگن سی میز پر ناشتہ لگا رہی تھی یہ دیکھے بنا کہ نوید کے چہرے پر حزن، کرب اور پچھتاوے کا ایک جہاں آباد ہے۔

قسمت، مقدر اور تقدیر۔۔۔

ان تین لفظوں سے بنے دائرے کے گرد ہی انسان کی زندگی گھومتی رہتی ہے۔انسان جو چاہتا ہے ویسا ہوتا نہیں، جو سوچتا ہے وہ کر نہیں پاتا اور جو تصوّر بھی نہیں کیا ہوتا، وہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

حسین مرتضیٰ بھی قسمت کے ایسے ہی کھیل کو اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی دوڑ دھوپ میں جن لوگوں کو اُس نے یاد بنا کر بھلا دیا تھا، وہ اُسکے سامنے تھے۔ سب کے سب۔۔۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

گزرے وقتوں میں دل میں یہ خیال کئی بار جاگا تھا کہ اپنے یاروں کو اکھٹا کرے، اُنکے شکوے ختم کرے، ناراضگیاں دھودے اور پھر سے دوست بنالے۔

دوست اکھٹے ہو گئے تھے۔ حسین مرتضیٰ کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہو چکی تھی۔ لیکن جنہیں وہ ناراضگیاں سمجھ رہا تھا کیا وہ واقعی ناراضگی ہی تھی؟ دلوں میں شکوے ہی تھے یا نفرتیں ڈیرہ جما چکی تھیں؟

یہ ملاقات اُسکے لیے متوقع تھی۔ پرسوں فرّخ صاحب نے پچھلے تمام واقعات کی تفصیل اُسکے گوش گزار کر دی تھی۔ ہر شے اسکے لیے پہلے سے بڑھ کر ناقابل یقین تھی۔ آج کے بارے میں بھی وہ جانتا تھا کہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ لیکن دس سال بعد اپنے دوستوں کو سامنے دیکھنے پر اُسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ اُسکے دوست بدل گئے تھے۔۔۔ بہت بدل گئے تھے۔

ہاں! حسین اُنہیں اب بھی دوست ہی سمجھتا تھا۔ گزرے ماہ و سال میں اُس نے جب بھی انہیں یاد کیا تھا، دوست کہہ کر ہی یاد کیا تھا۔ اور اب وہ انہیں ایسے نہیں دیکھ پا رہا تھا، اُنکے ساتھ ہوتے بھی جو موت جیسی خاموشی یہاں چھائی ہوئی تھی، اُسے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ عمر جس کا چہرہ ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا، آج اُس سے تھوڑے فاصلے پر، چہرے پر گہرا کرب و دکھ لیے بیٹھا تھا۔ وہ مقدّم جو کبھی اُسکے ساتھ مل کر محفل کشت زعفران بنا دیتا تھا، وہ زمانے بھر کی تھکن خود میں سموئے چپ تھا۔ وہ نوید جو سب سے خوش اخلاق تھا، چٹانوں جیسی سختی کے ساتھ کسی فائل کی ورک گردانی کر رہا تھا۔ وہ علی، جو جذباتی تھا، آج اتنی نفرت لیے کسے دیکھ رہا تھا؟ علی کی نظروں کے تعاقب میں اُس نے دیکھا۔ سامنے رضا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں اُسے دیکھ کر چہرے پر عجیب سی مسکان کیوں آئی تھی؟ مسکراتے ہوئے اُسکے چہرے پر گڑھے پڑے تھے۔ رضا کو جس حالت میں وہ چھوڑ کر گیا تھا، وہ ویسا بالکل بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے جانچنے کے لیے بس ایک نظر ہی کافی تھی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔

سفید ٹراؤزر پر سفید پوری آستینوں کی شرٹ پہنے اور اُس پر سفید رنگ کا شرگ ڈالے جسکے کنارے پر کالی پٹی لگی تھی، کہنیوں تک آستینیں چڑھائے، سر جھکائے بیٹھا حسین مرتضیٰ، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں بیٹھے ہر شخص کی اُسکے بارے میں ایک ہی رائے تھی۔

حسین نہیں بدلا تھا۔۔۔ بالکل نہیں بدلا تھا۔ اُسکی ہنسی آج بھی اتنی ہی معصوم تھی، جتنی دس سال پہلے، اُسکا چہرہ آج بھی ویسا ہی کھلتا ہوا تھا، جیسا کہ دس سال پہلے۔ پہلے وہ نوجوان لڑکا تھا، پر چہرے پر ہلکی داڑھی رکھے، بال سیٹ کیے، آنکھوں پر ریم لیس گلاسز لگائے، آج وہ ایک ڈیسنٹ مگر بھرپور مرد تھا۔

سر جھکائے بیٹھے حسین کو اچانک ہی کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ علی آنکھوں میں نفرت لیے بھلا کسے دیکھ رہا تھا؟ اُس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

وہ دنیا جہاں کی نفرت چہرے پر سجائے رضا کو براہ راست دیکھ رہا تھا۔اُسکی نظریں عجیب سی تھیں، حسین کو لگا کہ وہ اکیلا ہی ہے جس نے ایسا محسوس کیا تھا لیکن ایسا نہ تھا۔

مقدّم اور عمر بھی اس وقت نا سمجھی سے علی کو ہی دیکھ رہے تھے۔رضا موبائل میں ہی مصروف تھا، لیکن اُسکے اضطرابی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی اُس کی چبھتی نظریں خود پر محسوس کر رہا ہے۔اس سارے معاملے میں اگر کوئی واقعی لاعلم تھا تو وہ نوید تھا، وہ حقیقتاً اُس وقت بہت غور سے کسی فائل کو پڑھ رہا تھا۔

مقدّم نے عمر کی جانب دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟اُس نے نا سمجھی سے کندھے اُچکائے۔

تم ہی بتاؤ کہ آخر اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے؟ جس تعلق کی قیمت تم ہم سے مانگ رہے ہو۔

رضا کی آواز علی کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ ماضی میں rehab سینٹر میں رہ چکا ہے، نشے کے علاج کیلئے۔۔۔

الفاظ اُسکے ارد گرد بھنورے کی طرح چکّر کاٹ رہے تھے۔

ڈرائیور کی بیٹی؟ واقعی؟۔۔۔ہر کسی سے جواب طلب کر رہے ہو نہ تم؟ چلو اب تم بتاؤ! کیوں اہم ہے وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا؟

رضا کے زہر میں ڈوبے الفاظ آج بھی اُسکا جگر چھلنی کرنے پر قادر تھے۔

کافی لمبا علاج چلا ہے اسکا، عادی نشئی تھا یہ۔۔۔

اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہاں ایک نہیں دو دو شکار ہیں۔

رضا الٰہی اس سے ڈر کر خریدتا تھا۔کافی پرانے تعلقات ہیں ان دونوں کے۔۔۔

ہر شے گڈمڈ ہو رہی تھی۔ علی کی نظریں اُس پر تھیں لیکن دماغ مسلسل پرانی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

بلآخر رضا نے موبائل بند کر کے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے براہ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا، علی کے انداز میں کوئی فرق نہ پڑا۔

"کوئی کام ہے مجھ سے؟" سیدھا سیدھا سوال کیا۔

''ہاں! بہت ضروری۔۔۔'' چباچبا کے جواب دیا گیا تھا۔ وہاں بیٹھے ہر فرد کی سانسیں اٹکی تھیں۔ اُن دونوں کا انداز ہی کچھ ایسا تھا جیسے پرانے حریف سامنے بیٹھے ہوں۔ نوید نے اب کہ فائل سے سر اٹھا کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن دونوں کو دیکھا۔

''میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔'' زہر خند لہجے میں کہتے طنز میں ڈوبی مسکراہٹ اُسکی طرف اچھالی تھی۔ ماحول عجیب سے تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ یہ جو بھی گفتگو اُنکے درمیان ہو رہی تھی، اُسے اُن میں سے کسی کا دماغ اب تک پروسیس نہیں کر سکا تھا، اُنکے لیے یہ حیران کن تھا۔

''تم واقعی میرے کسی کام نہیں آسکتے۔'' اُس سے بھی زیادہ زہر خند لہجے میں جواب دیا گیا۔ رضا نے مزید طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آبرو اُچکائے تھے، جیسے اُس سے اسی جواب کی اُمید ہو۔

''لیکن تم مجھے یہ ضرور بتاؤ گے کہ تم اس مجرم خلیل کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟'' علی کے اگلے جملے پر جہاں رضا کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی، وہیں نوید ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے اُسے کرنٹ لگا ہو۔

''کیا کہہ رہے ہو یہ تم؟'' رضا کے بجائے سوال نوید کی جانب سے آیا تھا۔

''یہ تم اس سے پوچھو۔ جب تم اس قاتل کو ہر جگہ تلاش کر رہے تھے، تب یہ اُسکے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔'' اس بات پر رضا کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا تھا۔

''بہتر نہیں ہوگا کہ تم اپنی بکواس بند رکھو'' اُس نے غصّے سے کہا۔ علی بھی کرسی دھکیلتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ اُن دونوں کو اس طرح آمنے سامنے دیکھ باقی تینوں بھی تقریباً کھڑے ہو چکے تھے۔ نوید موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے دونوں کے درمیان آیا۔

''ایک سیکنڈ۔۔۔ رک جاؤ علی!۔۔۔ تمہیں یقیناً کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔'' نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے، لیکن تم سب ضرور بیوقوف بن رہے ہو۔ تصاویر دیکھ سکتے ہو تم۔'' اُس نے کہا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، رضاالٰہی پرسوں ایک ریسٹورونٹ میں خلیل سے ملے تھے۔ یہ تصاویر بھی مجھے دی ہیں انہوں نے۔ فلحال میں اس پر تفتیش کر رہا ہوں۔'' پیچھے کب سے خاموش کھڑے شیراز نے جواب دیا، تو اب کہ ہر شخص نے بے یقینی سے رضا کو دیکھا تھا، جو ماتھے پر بل ڈالے خاموش ہی کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہے! تم جاؤ یہاں سے۔'' نوید نے شیراز کو اشارہ کیا تو وہ اپنی ٹیم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کمرے میں اب بس وہ چھ تھے۔

''کیا تم اُس سے ملے تھے رضا؟'' نوید نے تحمل سے پوچھا۔

''کیا میں تمہیں جواب دہ ہوں؟'' اُس نے بڑے ہی سکون سے پوچھا تھا۔ نوید کے تو سر پر لگی تلوؤں پر جا بجھی۔

''تم ہم سب کو جواب دہ ہو رضا! وہ ہمارا مشترکہ مجرم ہے۔'' سخت غصّے کے باوجود بھی نوید نے بہت ضبط سے اُس سے پوچھا تھا۔

''یہ موضوع جس نے شروع کیا تھا، جواب بھی اُسی سے طلب کرو۔''اُسکے سکون میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

''نہیں بتائے گا یہ۔۔۔ تمہیں پوچھنا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ ایک مجرم کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا اور اِس بات سے ہمیں بے خبر رکھنا، بذات خود ایک جرم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''زہر خند لہجے میں کہتے علی کے الفاظ پر رضا ہنسا تھا۔اُسکی یہ ہنسی سوائے طنز کے اور کچھ نہ تھی۔

''علی رکو! ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے اُس سے ملا ہو۔''عمر نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔

''اگر کوئی وجہ ہے تو اُسے بتانی چاہیے، ہم اِس پر شک نہیں کر رہے لیکن، جاننا ہمارا حق ہے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا، جواباً وہ بھی ڈھیٹ بنا خاموش کھڑا رہا۔

''شک؟ ہم شک کر بھی نہیں سکتے، علی کو بھی تھوڑا تحمل سے بات کرنی چاہیے۔''مقدّم کو اُسکا انداز بھی برا لگا تھا۔اِس سارے معاملے میں اگر کوئی خاموش کھڑا تھا تو وہ حسین تھا۔

''اگر تم یہ بات جانتے کہ یہ شخص اپنے شوق کے لیے اُس مجرم سے نشہ خریدتا تھا۔تو کبھی بھی میرے شک کو غلط نہ سمجھتے۔''اُس کے نفرت میں ڈوبے الفاظ پر وہاں سکتا چھایا تھا۔نوید جھٹکے سے اُس کی جانب گھوما اور اُسکے سینے پے ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔

''علی! خاموش رہو۔''اُسکی آنکھوں میں کچھ تھا۔کوئی تنبیہ! جیسے وہ کچھ جانتا ہو۔رضا نے جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے اور براہ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ علی آج کس حد تک جا سکتا ہے؟ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اُسکی نفرت میں کتنا گر سکتا ہے۔کتنا؟

''کیوں؟ کیا تم ایسے آدمی پر بھروسہ کرنا چاہتے ہو جو ڈرگ ایڈکٹید (عادی نشئی) ہے؟ جسکے مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔''رضا اُسی طرح سخت تاثرات کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔نشہ، ڈرگز، مجرم۔۔۔ تمام الفاظ ہتھوڑے کی طرح اُسکے دماغ پر لگ رہے تھے۔اُس نے آج اُسکی ذات کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔

''خاموش ہو جاؤ علی!''نوید نے سختی سے کہا، گفتگو اب غلط سمت جا رہی تھی۔وہ رضا کی جانب مڑا۔''ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔''نوید نے فلوقت معاملہ رد دفع کرنا چاہا تھا۔

''ہم اس بارے میں ابھی ہی بات کریں گے نوید! اور سب کے سامنے''اس آواز پر جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔چہرہ موڑ کر سب نے دروازے کی جانب دیکھا۔ قدم قدم چلتے فرّخ صاحب اُنہی کی طرف آ رہے تھے۔اُن سب پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اپنی سربراہی کرسی پر بیٹھ گئے۔پیچھے شیراز بھی اپنی ٹیم کے ساتھ واپس آ چکا تھا۔

''بیٹھ جاؤ!''اُنہوں نے اشارے سے کہا تو سب اپنی اپنی نشستوں پر واپس بیٹھے۔

''رضا، خلیل سے ملا تھا۔۔۔میرے کہنے پر۔۔۔''یہ وہ بم تھا جو رضا کے علاوہ ہر شخص پر گرا تھا۔ حتیٰ کہ نوید پر بھی۔

---------+---------+--------

آخری بریفنگ کی رات:

بریفنگ ختم ہو چکی تھی، وہاں سے نکلنے میں پہل علی نے کی تھی۔اُسکے پیچھے عمر اور مقدّم بھی وہاں سے نکل گئے تھے، نوید کسی دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔رضا بھی بس نکلنا چاہتا ہی تھا کہ

''رکو رضا!''فرّخ صاحب نے اُسے روکا۔

''جی؟''وہ حیران ہوا۔

''بیٹھو! تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''اُنہوں نے اشارہ کیا تو وہ واپس بیٹھ گیا۔

''تم اس شخص کو جانتے ہو؟''اُنہوں نے پیچھے سکرین پر نظر آتے خلیل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایسا لگ تو رہا ہے کہ میں اِسے جانتا ہوں لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا۔''اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''میری بات تحمل سے سننا۔تم لوگوں کے بارے میں تمام معلومات ڈیپارٹمنٹ والوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ماضی میں تم خلیل سے ملتے رہے ہو۔ڈرگز کے سلسلے میں۔۔۔''آخری جملہ اُنہوں نے سرسری سے انداز میں کہا تو رضا کے پیروں تلے زمین نکلی۔وہ اُسکا چہرہ غور سے دیکھ رہے تھے، وہاں عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''وہ میرا ماضی تھا۔''آہستہ آواز میں بس اتنا ہی کہا۔کسی کو بھی اپنی ذات کے حوالے سے وضاحت دینا بہت مشکل کام تھا۔

''میں جانتا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک ذمے دار شہری ہو۔تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد کچھ اور ہے۔''وہ رکے، رضا کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''ہم خلیل کے ذریعے مائیکل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔اور اس میں تمہاری مدد درکار ہے۔''

''میری؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں! تمہیں اُس سے ملنا ہو گا۔''اُنہوں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر رضا کو تفصیل سے سب بتانے لگے۔

---------+---------+--------

دو دن پہلے:

''تُو تو بدل گیا ہے یار! کپڑے دیکھ اپنے۔۔۔صاحب لگنے لگا ہے۔ کہاں سے کمایا اتنا مال؟'' اُسکے سامنے بیٹھا خلیل اُسکی رعب دار شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ رضا بس مُسکرا کر رہ گیا۔

''میں تو پہچان بھی نہیں سکا تُجھے، سچ سچ بتا، حرام کا پیسہ ہے نہ؟ کہاں سے کمایا تُو نے؟'' خلیل کی بات پر رضا کا دل کیا کہ اُسکا منہ نوچ لے لیکن فلحال اُسے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔

''تم کمانا چاہتے ہو اتنے پیسے؟'' اُس نے اُسکی کمزوری پر وار کیا۔

''کون نہیں کمانا چاہتا؟ اور میں تو ویسے بھی آج کل بڑا غریب چل رہا ہوں۔''

''تو پھر وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھو! میرے پاس بہت مال ہے۔ لیکن اُسے بیچنے کے لیے کلائنٹ (گاہک) نہیں ہے۔'' رضا نے آگے ہوتے ہوئے رازداری سے کہا۔

''مال؟'' پہلے تو وہ سمجھا نہیں، لیکن جب سمجھ آیا تو وہ بھی سیدھا ہو بیٹھا۔

''اوہ اچھا! وہ مال، تو تم ڈرگز بیچنا چاہتے ہو؟'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں! اور میرے پاس اس مرتبہ کافی مہنگا مال ہے۔ یہ عام سے سڑک چھاپ چرسیوں کے لیے نہیں ہے، کروڑوں کا مال ہے۔ مجھے ایک گاہک چاہیے جو اسکی زیادہ سے زیادہ قیمت لگا سکے۔''

''گاہک تو بہت ہیں ایسے، لیکن تم مجھے کیا دو گے؟''

''ساری کمائی کا چالیس فیصد۔''

''چالیس فیصد؟'' اُسکی رال ٹپکی۔

''ہاں! اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم مجھے کتنا مہنگا گاہک لا کر دیتے ہو۔ جتنا زیادہ منافع ہو گا اتنا ہی زیادہ تمہیں فائدہ ہو گا۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔ وہ تھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

''ایک بندہ ہے، جسکے لیے میں کام کرتا ہوں۔ بہت امیر انسان ہے۔ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ امیر، وہ یہی سارے کام کرتا ہے۔''

''کون؟''

''نام تو میں نہیں جانتا لیکن اُسکا اسسٹنٹ مجھ سے ہمیشہ ملتا ہے۔ فرمان نام ہے اُسکا۔''

''فرمان؟'' رضا نے آنکھیں چھوٹی کر کے سوچنے والے انداز میں دیکھا۔

''یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔'' صاف جھوٹ بولا۔

''وہ اپنے مالک کے لیے کروڑوں تو کیا، اربوں کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اگر میں اُسے تمہارا سارا مال دوں تو وہ بخوشی خریدنے پر راضی ہو گا۔'' اُس نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں اُس سے خود ملنا چاہوں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''فکر مت کرو تمہارے پیسے کہیں نہیں جائیں گے۔ تم سے جسکا وعدہ کیا ہے، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ لیکن اُس فرمان سے میں خود ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن وہ ہر کسی سے نہیں ملتا۔''

''تو پھر چھوڑ دو، مجھے نہیں کرنا یہ سودا۔'' وہ کھڑا ہونے لگا۔

''اچھا رکو! میں فرمان سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔ اگر وہ ملنے پر راضی ہو گیا تو پھر تمہیں اُسکی بتائی ہوئی جگہ پر آنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے! جلد از جلد اُس سے بات کر کے مجھے بتاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔'' رضا نے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ پیچھے بیٹھا خلیل فون نکال کر فرمان کو کال کرنے لگا۔ آس پاس کی ٹیبل پر گاہکوں کی صورت میں موجود سی ٹی ڈی کے جوان اُسکی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

--------+---------+----------

''رضا نے کامیابی حاصل کی، اگلے ہی دن خلیل نے اُسے فون کر کے فرمان سے ملاقات کا وقت اور جگہ طے کی اور اب ہم اسی جگہ سے دونوں کو گرفتار کریں گے۔ بہت جلد۔۔۔'' فرّخ صاحب نے گفتگو سمیٹی۔ رضا ویسے ہی سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سامنے بیٹھا نوید بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔ علی ساکت تھا۔ باقی سب کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

''آپ نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟'' نوید نے پوچھا۔

''تم کب سے مجھ سے سوال کرنے لگے نوید؟''اُنہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ شرمندہ ہوا۔

''سوری!''

آج کی بریفنگ ختم ہوتی ہے۔اگلی مرتبہ مجھے اُمید ہے کہ، ہم کسی منطقی انجام تک پہنچ چکے ہوں گے۔''وہ کاغذات سمیٹتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے چلے گئے۔نوید نے چہرہ موڑ کر رضا کو دیکھا، کچھ کہنا چاہتا تھا شاید! لیکن وہ کچھ بھی کہے، سنے بنا خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔علی فلحال کسی سے بھی نظریں ملائے بنا اپنی چیزیں اٹھا رہا تھا۔حسین کی برداشت جواب دے گئی، تو اُسکے پاس آیا۔علی نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا، وہ شرگ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظروں میں بہت کچھ لیے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''لے لیا تم نے اپنا انتقام؟''سوال تھا یا خنجر؟ علی کو اپنے دل کے آر پار محسوس ہوا۔

''اب اُسے تنگ مت کرنا۔''یہ کہہ کر حسین وہاں رکا نہیں تھا، بلکہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔عمر نے اُسکی طرف دیکھا بھی نہیں، مقدّم نے ملامتی نظروں سے اور نوید نے اسے افسوس سے دیکھا تھا۔اور سب ہی باری باری باہر نکل گئے۔وہ وہاں اکیلا رہ گیا، حسین کے ایک جملے نے اُسے جیسے بھرے بازار میں برہنہ کر دیا تھا۔اسکے ایک جملے نے وہاں کھڑے ہر شخص کو یہ باور کروایا تھا کہ یہ سب اس نے رضا سے انتقام لینے کے لیے کیا تھا۔

''ہاں! لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ وہ ڈر گزلیتا تھا۔''اُس نے خود کو جھوٹی تسلی دینی چاہی، دماغ نے رضا کو پھر سے مجرم دکھانا چاہا۔لیکن دل اس بار ساتھ نہیں دے سکا۔

''علی کو ہو کیا گیا ہے آخر؟ جو اُس نے آج کیا اُسے ہر گز نہیں کرنا چاہیے تھا۔''مقدّم کو ٹھیک ٹھاک غصّہ آیا ہوا تھا۔وہ پارکنگ میں آچکے تھے۔

''پتہ نہیں!''عمر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ذہن اُلجھا ہوا تھا کہ رضا ڈر گزلیتا رہا تھا مگر کیوں؟

''وہ بیچارہ اپنی جان خطرے میں ڈالے اُس مجرم سے ملنے گیا، ہماری خاطر۔۔۔اور اُسے اِس طرح ذلیل کر کے رکھ دیا اُس نے۔۔۔''مقدّم کا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔رضا اور حسین اُن سے پہلے باہر نکلے تھے، لیکن پارکنگ میں نظر نہیں آرہے تھے، نہ اُنکی گاڑیاں کہیں تھیں۔اس مرتبہ اُن سب کی گاڑیوں کو پہلے سے ہی پارکنگ میں لا کھڑا کیا گیا تھا، اور اُنہیں اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ خود ہی چلے جائیں۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا علی باہر آیا اور اُن دونوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھتا، وہاں سے چلا گیا۔

''یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے میری سمجھ سے باہر ہے۔ہر شے میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہے۔''عمر بے بسی سے بولا۔خاکی پینٹ پر بلیک شرٹ پہنے نوید بھی اُس لمحے پارکنگ میں آیا اور رضا کو ڈھونڈھنے لگا، غلطی اُسکی بھی تھی۔اُس نے بھی اُس پر شک تو کیا تھا، لہٰذا اب اس سے معذرت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

''یقیناً جا چکا ہے۔''اُس نے سوچا اور تاسف سے سر ہلایا۔ مقدّم اور عمر اب تک وہیں تھے۔اُس سے کچھ فاصلے پر کھڑے دونوں آپس میں محو گفتگو تھے۔نوید کا فون بجنے لگا۔

''بولو شیراز!''وہ فون کان سے لگائے آگے بڑھا۔

''کچھ مشکوک لوگوں کو آفس کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔''شیراز نے کہا۔

''واٹ؟ کب؟''اُسکے قدم تھمے۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی۔۔۔آپ اپنے دوستوں کو جلد از جلد وہاں سے نکالیں۔''معاملہ گڑبڑ تھا۔

''ٹھیک ہے!''اُس نے موبائل جیب میں رکھا اور تیزی سے اُن دونوں کی جانب بڑھنے لگا۔اُن سے کچھ دور ہی ہوگا کہ فضا میں گولیوں کی تیز آواز سنائی دی تھی۔ایک لمحے کو تو کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔اگلے ہی پل نوید تیزی سے آگے بڑھا اور مقدّم کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلتے ہوئے چیخا۔

''نیچے بیٹھو!''وہ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ گاڑی کی اوٹ لیکر نیچے بیٹھے تھے۔نوید نے بیٹھے بیٹھے کمر سے اپنی گن نکالی اور ذرا سا باہر کی طرف جھانکتے ہوئے فائر کیا اور فوراً پیچھے ہوا۔گولیوں کی آواز اب بہت زیادہ ہونے لگی تھی۔وہ تینوں ہی گاڑی کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''مقدّم نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ مشکوک لوگ اندر گھس آئے ہیں۔ابھی یہ نہیں معلوم کہ کون ہیں؟اور کس مقصد سے آئے ہیں؟''نوید نے جواب دیا۔

''یہ۔۔۔یہ خون کہاں سے آرہا ہے؟''یکدم ہی عمر کی نظریں زمین پر بہتے خون پر پڑیں۔اُسکی نظروں کے تعاقب میں مقدّم نے بھی دیکھا،اور اُسی لمحے اُن دونوں کی نظریں نوید کے بازو تک گئی تھی۔

''تمہیں گولی لگی ہے۔۔۔''وہ دونوں ساتھ ہی چیخے تھے۔

''پریشان مت ہو کچھ نہیں ہوا۔''مقدّم کو جس گولی سے اُس نے بچایا تھا وہی گولی اُسکے بازو پر لگی تھی۔

''رکو!''عمر نے بیٹھے بیٹھے گاڑی کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔

''عمر! کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو چکے ہو؟''نوید اُسکی اس حرکت پر چیخا تھا۔لیکن وہ گاڑی سے ایک لمبا کپڑا نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''یہ باندھو اسکے بازو پر۔''اُس نے کپڑا مقدّم کی جانب بڑھایا کیوں کہ اُسکے اور نوید کے درمیان وہی بیٹھا تھا۔اُس نے کپڑا لیا اور نوید کا بازو تھاما۔

''فار گاڈ سیک! میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جھنجھلایا۔

''شٹ اپ!'' مقدّم نے اتنا ہی کہا اور اپنا کام جاری رکھا۔ نوید بس اُسے گھور کر رہ گیا تھا۔

''فائرنگ کی آواز آنا بند ہو گئی ہے؟'' اچانک ہی عمر کو احساس ہوا۔

''شش!'' نوید نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور اوپر بلڈنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلی منزل پر، ایک پلر کی اوٹ میں کوئی شخص کھڑا تھا۔

''فیصل!'' نوید کے لب ہلے۔ فیصل نے محتاط انداز میں نوید کو دیکھا اور پہلے گاڑی کے پیچھے اشارہ کیا اور پھر ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر وی کا نشان بنایا جسے سمجھ کر اُس نے سر ہلایا اور اپنی جگہ سے ذرا سا کھسکا۔

''تم دونوں۔'' چہرہ موڑ کر اُن کی جانب دیکھا ''اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت۔'' اس سے پہلے وہ دونوں کچھ سمجھتے ایک ہی جست میں نوید کھڑا ہوا، اُسکے کھڑے ہوتے ہی دوسری جانب سے فائرنگ شروع ہوئی اور وہ اُسی کے درمیان میں کھڑا، اپنے زخمی بازو سے گن پکڑے مسلسل فائر کرتا، اُن دونوں شر پسندوں کو جہنّم واصل کر چکا تھا۔ اُنہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اُس نے مڑ کر فیصل کو دیکھا اور سب کلیئر ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن فیصل نے اُسی لمحے اپنی گن اٹھائی اور نوید کی جانب کر کے ٹرِگر دبا دیا۔ گولی اُسکے برابر سے ہوتی اُسکے پیچھے نمودار ہوتے ایک اور شر پسند کے دماغ پر جا کر لگی تھی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوا اور پھر بگڑ کر فیصل کو دیکھا۔ ڈرا دیا تھا اس نے تو۔۔۔

''سوری!'' اُس نے وہیں سے چلا کر کہا۔

''تم دونوں اندر جاؤ جلدی۔'' اُس نے مقدّم اور عمر کو کہا تو وہ دونوں تیزی سے اندر کی طرف گئے، لیکن وہ ساتھ نہیں آیا، اندر افراتفری مچی ہوئی تھی۔

''پریشان نہ ہو! کچھ شر پسند عناصر نے ہم پر حملہ کرنے کی جرات کی تھی، لیکن اب سب کلیئر ہے۔ دو زندہ پکڑے گئے ہیں اور تین مارے گئے ہیں۔'' شیراز نے اُن کے پاس آتے ہوئے تسلی دی۔

''نوید کو گولی لگی ہے۔'' اس ساری بات کے جواب میں عمر نے پریشانی سے بس یہی کہا تھا۔

''کوئی مسئلے کی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ پانی پیئیے۔'' اُس نے گلاس آگے بڑھایا تو اُنہیں اچھنبا ہوا۔

''اُسے گولی لگی ہے، وہ زخمی ہے۔'' مقدّم نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کس کو گولی لگی ہے؟'' اُسی لمحے فرّخ صاحب وہاں داخل ہوئے۔

''نوید کو۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''ابھی کہاں ہے؟''اُنہوں نے آرام سے پوچھا۔ مقدّم نے حیرت سے عمر کو دیکھا،وہ حیران تھا، بھلاایک شخص کو گولی لگی تھی اور وہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''وہ بلڈ نگ کا چکر لگانے گیا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ کہیں کوئی چھپا ہوا نہ ہو۔''جس کو گولی لگی تھی،اُسے خود بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔بتاؤ ذرا؟

''پریشانی کی بات نہیں ہے۔کچھ نہیں ہوا ہے اُسے۔نوید سب کلیئر ہونے کا اشارہ کر دے تو تم لوگ جا سکتے ہو۔''اُنہوں نے اُنکی پریشان صورت دیکھ کر کہا۔اور نوید واقعی کچھ دیر میں وہاں آ چکا تھا۔بازو پر باندھا گیا کپڑا خون آلود ہو چکا تھا۔

''سب کلیئر ہے،لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ آخر تم سب کر کیا رہے تھے؟پانچ آدمی آفس کے احاطے میں داخل بھی ہو گئے اور ہمیں معلوم بھی نہ ہوا؟''آتے ساتھ ہی وہ وہاں کھڑے تمام ٹیم ممبرز پر بگڑا تھا۔

''سوری!''ایک جونیئر آفیسر نے کہا۔

''واٹ سوری؟تم لوگوں کی اس نااہلی کی وجہ سے آج کتنا بڑا نقصان ہو سکتا تھا؟ہاں؟''اُسکے ٹیم ممبرز سر جھکائے اُسکی جھاڑ سن رہے تھے۔فرّخ صاحب ہر شے کو یکسر نظر انداز کیے اپنے سسٹم میں سر دیے بیٹھے تھے۔شیراز اُن دونوں کے پاس آیا۔

''آپ دونوں جا سکتے ہیں۔ہمارے سکیورٹی گارڈز آپکے ساتھ جائیں گے۔''اُس نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ایک نظر نوید کو دیکھا جو اب ایک کرسی پر بیٹھے اپنے بازو پر بندھا کپڑا کھول رہا تھا،اُسکے پاس کچھ اور آفیسرز بھی تھے۔

اُس نے مقدّم کی جان بچائی تھی،اور اُسے اس حالت میں دیکھ کر اُن دونوں کا دل دہل گیا تھا۔

پس ثابت ہو گیا تھا،دلوں میں نفرت نہیں آئی تھی۔۔۔

دیواریں گرا دی گئی تھیں۔۔۔

فاصلے اب بھی باقی تھے۔۔۔

واپسی کی منزل کے وہ مسافر۔۔۔

بہت جلد اپنی منزلوں پر پہنچنے والے تھے۔۔۔

---------+---------+--------

ڈرگ ایڈکٹیڈ۔۔۔ مجرم۔۔۔ نشہ

زہر میں ڈوبے، اُسکی ذات کے پرخچے اڑاتے علی کے الفاظ، اُسکے دماغ پر برس رہے تھے۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسی لیے۔۔ اسی لیے وہ اُن سب کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''آج تم نے میرے ساتھ دوسری دفعہ یہی کیا ہے۔'' گاڑی چلاتے رضا نے لب بھینچے سوچا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بیچ چوراہے پر اُسکا راز اس طرح افشا کرے گا۔ قطع تعلق اپنی جگہ لیکن ماضی میں کوئی تو تعلق تھا نہ اُنکا؟ اُس تعلق، اُس دوستی کا ہی پاس رکھ لیتا وہ۔

''لیکن اُسے یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟'' یکایک ہی اُسے خیال آیا۔ لیکن اس سوال کا جواب اُسکے پاس نہیں تھا۔ بلاوجہ، انجان راستوں پر گاڑی دوڑاتے بلآخر وہ تھک کر پناہ گاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ گاڑی سے اترا تو خلاف توقع لان خالی تھا۔ بچے یقیناً جزا کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں گے۔ آج کل وہ بچوں کو قرآنی سورتیں یاد کروا رہی تھی اور ساتھ ہی نماز پڑھنا بھی سکھا رہی تھی۔ بڑے بچے ان سب میں اُسکی بہت مدد کرتے تھے۔ اُس نے اکیلے اتنے بچوں کو سنبھال لیا تھا کہ کبھی کبھی رضا بھی حیران ہو جاتا۔

اُسکا خیال آیا تو دل عجیب سا ہوا۔ بھلا وہ کیسے بھول گیا تھا کہ اُسکا ایک ماضی تھا؟ دل پر بھاری بوجھ آن ٹھہرا تھا۔ اندر جانے کے بجائے وہ لان میں ہی رکھی کرسی پر آ بیٹھا اور پشت پر سر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ علی کے الفاظ، اُسکی نفرت بھری نظریں بار بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ چند لمحے بھی سکون سے نہ گزرے تھے کہ اُسے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ آنکھیں کھول کر یہاں وہاں دیکھا، پر کوئی نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا، سسکیاں دوبارہ سنائی دیں۔ وہ ایکدم ہی الرٹ ہو بیٹھا۔

''ارمینہ؟ ارمینہ یہ تم ہو؟'' وہ اپنے بچوں کی آہٹ بھی پہچانتا تھا۔ سسکیاں رک گئی۔ اُس نے بے چینی سے اُٹھ کر لان میں تلاشنا شروع کیا اور اگلے ہی لمحے وہ اُسے کیاری اور گملے کے بیچ چھپی ہوئی نظر آئی۔

''ارمینہ!'' وہ پنجوں کے بل اُسکے پاس بیٹھا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح خوف کا سایہ اُسکے چہرے پر لہرایا تھا۔

''اِدھر آؤ گڑیا!'' اس نے ہاتھ بڑھایا پر وہ اُسکا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اُٹھ کر بھاگ گئی۔

''ارمینہ۔۔۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسی لمحے جزا بھی لان میں آئی تھی لیکن وہ اُسے بھی دھکا دے کے اندر بھاگتی چلی گئی۔

''ارمینہ۔۔۔'' جزا نے بھی پیچھے سے آواز دی۔

''جانے دو اُسے جزا!''رضا نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''یہ ایسی کیوں ہے؟''اُس نے الجھ کے رضا کو دیکھا

''ایسی یعنی؟''

''یعنی ہر وقت ڈری سہمی رہتی ہے۔بچوں سے بات بھی نہیں کرتی نہ کسی کھیل کود میں حصہ لیتی ہے۔''

''اُسے یہاں آئے ہوئے ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔سب کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔تھوڑا اسپیس دو اُسے۔''رضا نے کہا۔

''ٹھیک ہے!اچھا مجھے آج ذرا جلدی جانا ہے۔''اُس نے زیادہ کریدا نہیں تھا۔

''سب خیریت؟''

''کچھ کام ہے؟''اُس نے مختصر جواب دیا۔رضا نے غور سے اُسے دیکھا،اُسکے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار نظر آرہے تھے۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے پوچھا۔اپنی پریشانی تو وہ بھول بھال گیا تھا۔

''وہ۔۔دراصل۔۔''وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی۔

''کہو!میں سن رہا ہوں۔''

''میں اکثر مارکیٹ جاتی ہوں گھر کا سامان وغیرہ لینے۔سوسائٹی کے آخر میں جو پولیس والے کھڑے ہوتے ہیں۔وہ پچھلے دو دنوں سے مجھے آتے جاتے تنگ کر رہے ہیں۔''رضا کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔

''واٹ؟اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟تمہیں مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔''جزا کے چہرے پر تعجب اُبھرا۔

''میں اُن سے ڈرتی نہیں ہوں۔دو منٹ لگیں گے مجھے اُنہیں اُنکی اوقات میں واپس لانے میں۔۔۔''اُسکے انداز پر تو وہ حیران ہی رہ گیا۔

''میں بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟اُنہیں وارن کرنا چاہیے یا اُنکی کمپلین کرنی چاہیے'' اُس نے وضاحت کی۔

''جزا!میں مانتا ہوں کہ تم ان سے ڈرتی نہیں ہو گی۔لیکن تمہیں خود سے کوئی اقدام نہیں لینا چاہیے۔یہ معاملہ میرے اوپر چھوڑ دو اور کچھ دن تک باہر آنا جانا نہ کرو۔کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ۔۔۔''

''ایکسکیوزمی؟''اُس نے بات کاٹتے ہوئے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈر کے گھر میں بیٹھ جاؤں؟ میں نے اپنے بھائیوں کو اسی لیے نہیں بتایا کہ وہ بھی مجھے یہی مشورہ دیتے۔ تمہیں اس لیے بتایا کہ تم شاید کوئی معقول حل بتاؤ، لیکن تم بھی وہی باتیں لیکر بیٹھ گئے؟'' وہ ٹھیک ٹھاک تپ گئی تھی۔ غصّے سے چہرہ لان میں لگے گملوں کی طرف کر لیا، رضا جو اُسکے انداز دیکھ حیران تھا، بیساختہ مسکرایا۔

''میں یہ ہر گز نہیں کہہ رہا کہ تم ڈر کر گھر بیٹھ جاؤ، لیکن احتیاط کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں۔'' اُسکے آخری جملے پر جزا نے نظریں اٹھا کے اُسے دیکھا۔ اور اُسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ بھلا ایسا کب ہوا تھا کہ وہ جھکی نظریں اٹھا کے اُسے دیکھے اور وہ نارمل کھڑا رہ سکے؟

''جا رہی ہوں میں گھ۔ر'' غصّے سے چباچبا کے بولتی وہ پاؤں پٹختی وہاں سے جانے لگی۔

''جب غصّہ اُتر جائے تب بات کرینگے ہم۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے پیچھے سے کہا لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ غصّے میں ہے، وہ ہنوز مسکراتا رہا۔ یہ لڑکی اُسکی زندگی میں کسی اینٹی ایئر کرائٹ پل کی طرح کام کرتی تھی، وہ سب بھلا کر بس مسکرائے جا رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر چہرہ گھما کے ناراضگی سے اُسے دیکھا وہ چاہ کر بھی اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ اُسے ہنستا دیکھ کر غصّے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

اور اُسی لمحے رضاالٰہی کی تمام تر مسکراہٹ سمٹی تھی، دروازہ کھل کے بند ہونے کے درمیان جو منظر اُس نے دیکھا تھا، اُس نے اسے حیرت کا شدید جھٹکا دیا تھا، وہ ہنسنا ہی بھول گیا۔۔۔۔ ایک بھی لمحہ مزید ضائع کیے بنا وہ تیزی سے دروازے تک آیا اور جھٹکے سے اُسے کھول دیا۔

جزا جا چکی تھی، اور وہ بالکل اُسی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ سفید ٹراؤزر اور شرٹ پر، کمر تک آتا مردانہ شرگ پہنا ہوا تھا، جسکے کنارے پر باریک سی کالی پٹّی لگی ہوئی تھی۔ ریم لیس گلاسز سے جھانکتی مسکراتی آنکھیں اُسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ پیر سفید جاگرز میں مقید اور شرگ کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

رضا آگے بڑھنا چاہتا تھا، مگر بڑھ نہیں سکا۔۔۔ کچھ کہنا چاہتا تھا، پر کہہ نہیں سکا۔۔۔ قدم سست پڑ گئے تھے، ہر شے ساکت ہو گئی۔ وہ نجانے کب سے یہاں کھڑا تھا؟ اُس کو کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ کتنے لمحات خاموشی سے گزر گئے۔ اُسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے؟ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اُسے دیکھتا حسین سر جھکاتے ہوئے ہلکے سے ہنسا، اُسکے گالوں پر پڑتے گڑھے واضح ہوئے۔

پھر سیدھا ہوتا آگے بڑھا۔۔۔

اُسکے پاس آیا۔۔۔

اُسکے سامنے رکا۔۔۔

اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔

اور آگے بڑھ کر اُسکے گلے لگ گیا۔

رضا ہل بھی نہ سکا۔۔۔

حسین مرتضیٰ نے فاصلہ ایک جست میں پاٹا تھا۔ وضاحتیں، شکوے، شکایتیں سب چھوڑ کر اُس نے واپسی کی منزل پر براہِ راست قدم رکھ دیا تھا۔ اور ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔ رضا کی آنکھوں میں نمی آن ٹھہری۔ اتنے دنوں سے دل پہ چھایا بوجھ کہیں ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اُس سے الگ ہوتا حسین، اُسکی نظروں میں دھندلا گیا۔

''گدھے ہو تم!'' اُس نے پوچھا تھا یا بتایا تھا؟ پر رضا کچھ بھی کہہ نہ سکا۔

''اتنی تیز گاڑی کون چلاتا ہے؟ کتنی بار تمہیں فالو کرنے کے چکّر میں، راستہ بھٹک گیا میں، وہ تو قسمت اچھی تھی کہ یہاں تک پہنچ گیا۔'' وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

''باہر ہی کھڑا رکھو گے؟'' ماتھے پر بل ڈالے خفگی سے پوچھا۔ اب کہ رضا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تمہیں اندر آنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی؟'' اور حسین کا قہقہہ بیساختہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حوالہ کس بات کا دیا گیا ہے؟

''پہلے کی بات اور تھی، اب تم بدل گئے ہو۔'' عام سے انداز میں کہا۔ لہجے میں کوئی تلخی نہ تھی۔

''تم تو نہیں بدلے۔'' رضا نے مسکرا کر کہا۔ حسین رکا۔۔۔ ٹھہرا۔۔۔ اور ٹھہرا ہی رہ گیا۔ ہاں! وہ کب بدلا تھا؟

''آؤ! اندر آؤ۔'' رضا نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

پندرہ سال پہلے کی ایک رات حسین زبردستی اُسکا مہمان بنا تھا۔ وہ آج بھی خود ہی اُسکا مہمان بن گیا تھا۔ وہ واقعی نہیں بدلا تھا، وہ مسکراتے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ اُسے لیے سیدھا لاؤنج میں داخل ہوا۔ حسین کے قدم تھمے۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔ ہر سائز، ہر عمر اور ہر نسل کے بچے وہاں موجود تھے۔ یہاں سے وہاں اچھلتے کودتے، شرارتیں کرتے، بات بات پر ہنستے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، دل لبھاتے معصوم چہرے۔۔۔

''رک کیوں گئے؟'' اُسے دہلیز پر ہی جما دیکھ کر رضا نے پوچھا۔ وہ اپنی حیرت چھپاتا اندر داخل ہوا۔ رضا اُسکی نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اُسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اُسکے برابر ہی بیٹھ گیا۔ بچے آ رہے تھے، کوئی حسین سے ہاتھ ملا کر جا رہا تھا، کوئی رضا کے کندھوں سے لٹک کر کوئی بہت ہی راز کی بات اُسکے کانوں میں بتا کر گیا تھا، کسی نے اپنا تعارف خود ہی کروانا شروع کر دیا تھا اور کچھ تو رضا کے گود میں چڑھ بیٹھے تھے۔ حسین حیرت سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا، وہ مسکراہٹ ضبط کیے اُسکے تاثرات سے محظوظ ہوا۔

''کتنی شادیاں کر رکھی ہیں تم نے؟''بلآخر جب اُس سے رہا نہیں گیا تو پوچھ لیا۔

''ایک بھی نہیں۔''آنکھوں میں شرارت لیے جواب دیا۔

''استغفر اللہ! میں کچھ غلط نہیں سوچنا چاہتا۔''اپنے ازلی انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا تو رضا نے الٹا ہاتھ اُسکے کندھے پر مارا، وہ ہنس دیا۔ جب حسین ساری سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ کر واپسی کی منزل پر آچکا تھا تو اب پرانی باتیں بیکار تھیں۔ کچھ لوگ برف کی طرح ہوتے ہیں، اپنے آس پاس موجود ہر تپش کو اپنے اندر جذب کر کے ماحول کو فرحت بخش ٹھنڈک عطا کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھا۔

''یہ میرا وہ خواب ہے، جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔''رضا نے آہستگی سے بتایا۔

''میں سمجھ گیا تھا۔''اُس نے نرمی سے جواب دیا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا چائے لے آیا تھا۔ عائشہ جی کسی کام سے بچیوں کو لیکر بازار گئی ہوئی تھیں۔ اسی لیے لڑکوں کے ذمّے یہ کام تھا۔

''کام کیا کرتے ہو تم؟''اچانک ہی یاد آیا تو پوچھا۔

''ڈر گزتو بالکل نہیں بیچتا۔''اس جواب پر دونوں ہی دل کھول کر ہنسے تھے۔ بچے حیران تھے، اُنہوں نے کبھی بھی رضا کو کسی باہر کے انجان شخص کے ساتھ اتنا ہنس کر بات کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔

''نظر انداز کر دو اُسے۔''اُس نے کچھ سمجھانا چاہا۔

''میں اُسکا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا، بات علی کی تھی۔

''اوکے۔ چائے تو بہت اچھی ہے لڑکے!''حسین نے چائے بنانے والے لڑکے کی طرف دیکھ کر تعریف کی۔۔۔ صاف، بات بدلی۔

''شکریہ!''لڑکا شرمیلا تھا۔

''شہباز! ذرا انکو بتاؤ تم کیا کرتے ہو؟''اپنے بچوں کو لوگوں سے ملوانا اُسے بہت پسند تھا۔

''ہمارا شہباز، انڈر سکسٹین کرکٹ ورلڈ کپ کے لیے ٹیم میں سیلیکٹ ہو چکا ہے۔''اُسکے بجائے دوسرے لڑکے نے جواب دیا، شہباز جھینپ گیا۔

''ارے! میں مستقبل کے سلیبرٹی کے سامنے بیٹھا ہوں یعنی؟''حسین کے کہنے پر وہ مزید شرما گیا۔

''انکا تعارف تو کروائیں۔''اب کے لڑکوں نے حسین کے بارے میں جاننا چاہا۔

''ان سے ملو، یہ میرے دوست ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔'' رضا کے تعارف کروانے کے طریقے پر وہ محظوظ ہوا۔

''آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ آپکے کوئی دوست بھی ہیں؟''

''اور وہ بھی اتنے اچھے۔'' لڑکے پتہ نہیں کیوں خوش ہو رہے تھے؟

''انکی یاداشت کبھی کبھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔'' حسین نے چوٹ کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک لڑکا وہاں بھاگتا ہوا آیا۔

''بھائی! رضا بھائی!'' اُسکا سانس پھول رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اُسے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

''وہ ارمینہ۔۔۔ ارمینہ۔۔۔''

''کیا ہوا ارمینہ کو؟'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُس نے خود کو زخمی کر لیا ہے۔'' اگلے ہی لمحے رضا بھاگ کر وہاں پہنچا، جہاں ارمینہ تھی۔ حسین بھی پیچھے آیا تھا۔ وہ اسٹور روم میں ایک پرانے پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی تھی۔ یہ لوہے کا پلنگ ٹوٹ چکا تھا، اُس نے اسے سٹور روم میں رکھوا دیا تھا اور اُسکی جگہ بچوں کے کمرے میں نیا پلنگ ڈلوا دیا تھا۔ اُسکا ارادہ تھا کہ اسے مرمت کیلئے بھیج دے گا لیکن اب تک موقع نہیں مل سکا۔ وہ پنجوں کے بل پلنگ کے پاس بیٹھا اور نیچے جھانکا۔ وہ سمٹی، سکڑی بیٹھی تھی۔ پلنگ کے ٹوٹے لوہے سے اُسکا پیر زخمی ہو چکا تھا۔

''ارمینے!۔۔۔ باہر آؤ بیٹا'' اُس نے پچکارتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

''ارمینے!۔۔۔'' اُس نے اُسکا خوف کم کرنا چاہا لیکن پیچھے ہونے کے چکّر میں اُسکا پاؤں مزید زخمی ہو گیا۔ وہ سسک اٹھی۔۔۔

''ارمینہ! کیا کر رہی ہو؟ چوٹ لگ جائیگی، آؤ۔۔۔ باہر آؤ۔'' وہ مسلسل اُسے باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف گھسیٹنا چاہا تو اب کہ وہ اتنی زور سے چیخی کہ وہ بھی بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔

''کیا کریں اب؟'' ایک لڑکے نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں اسی طرح اُسے کھینچ کر باہر نکالوں گا، عظیم! تم فرسٹ ایڈ باکس لے آؤ۔ تمہیں اسکا زخم صاف کرنا ہے۔'' اُس نے لڑکوں کو ہدایت دی۔

''وہ ڈر رہی ہے رضا!'' حسین کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''اب بھلے وہ جتنا بھی ڈرے، یہی آخری حل ہے۔''اُس نے عجلت میں کہا۔ پھر ایک ہاتھ ارمینہ کے سر پے رکھا، جو پلنگ کے لوہے سے ٹکرا رہا تھا۔اور دوسرے ہاتھ سے اُسے باہر کھینچ لیا۔اُس کے اس طرح کرنے پر وہ جس دلخراش انداز میں چیخی تھی، حسین سمیت سب ہی گھبرا گئے تھے۔وہ بھی بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اُسے مارنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس مرتبہ رضا نے اسکو قابو کر لیا اور بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔وہ چلا چلا کر رو رہی تھی، اُسے نکالنے میں وہ اپنا ہاتھ بھی زخمی کر چکا تھا۔

''اسکا زخم صاف کرو جلدی!''اس نے عظیم کو کہا۔وہ اُسکا پاؤں پکڑے جلدی سے خون صاف کرنے لگا۔وہ اچھا خاصا پاؤں زخمی کر چکی تھی۔اُسکی چیخیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں، ناخن سے جا بجا رضا کے بازو پر نوچا تھا۔لیکن وہ بھی اُسی طرح اُسے خود میں بھینچے بیٹھا رہا۔وہ بچی تھی جتنی مزاحمت کر سکتی تھی کر چکی تھی۔بلآخر جب تھک گئی تو بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔رضا نرمی سے اُسکا سر سہلاتا رہا۔عظیم اُسکا زخم صاف کر کے پٹّی کر چکا تھا۔رضا نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔اس بار اُس نے مزاحمت نہیں کی، بس اُسکی گود میں روتی رہی۔وہ اُسے لیے باہر آ گیا، بچے بیچارے ڈر گئے تھے۔

''جاؤ تم سب آرام کرو۔میں اسکے ساتھ ہوں پریشان نہ ہو۔''اُس نے بچوں سے کہا تو وہ باری باری وہاں سے چلے گئے۔ارمینہ کا رونا اب سسکیوں میں بدل گیا تھا۔

''یہ جو کچھ بھی ہوا اُسکے لیے معذرت۔''حسین پر نظر پڑی تو شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''معذرت کیوں کر رہے ہو؟میں تو پریشان ہوں کہ اتنی سی بچی اس قدر خوف زدہ کیوں ہے؟''حسین نے دکھ سے رضا کی گود میں منہ چھپائے روتی ارمینہ کو دیکھا۔

''اسکے ماں باپ، بہن بھائیوں کو ایک رات اسکے چچا نے تیز دھار آلے سے قتل کر دیا تھا۔اسکو بھی قتل کرنا چاہتا تھا، پر یہ ڈر کر کسی صندوق میں چھپ گئی تھی۔البتہ اس نے اپنے گھر والوں کی اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا ہے۔''وہ اُسکی گود میں سو چکی تھی۔

''کیوں کیا اسکے چچا نے ایسا؟''

''جائیداد۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔پھر سوئی ہوئی ارمینہ کو صوفے پر لٹا کر، اُسے کمبل اوڑھا دیا۔

''تم نے کیسے سنبھال لیا اسے؟''اُس نے پوچھا، موبائل پر کوئی نوٹیفکیشن آیا تھا۔اُس نے سرسری سی نگاہ ڈالی۔۔۔

''یہاں آنے والے سب ہی بچے ایسے ہوتے ہیں، ڈرے سہمے، ضدی، کچھ تو وائلنٹ بھی ہوتے ہیں۔''

''بہت بڑی ذمے داری نبھا رہے ہو تم۔''اُسکا فون دوبارہ بجا تھا۔اُس نے موبائل باہر نکال ہی لیا۔کسی نیوز چینل کا نوٹیفکیشن بار بار آ رہا تھا۔اُس نے چینل سبسکرائب کیا ہوا تھا شاید۔

''بچے صرف ایک ہی زبان سمجھتے ہیں۔پیار اور محبت کی۔۔۔اس شے سے دنیا کا ہر بچہ قابو ہو سکتا ہے۔''موبائل دیکھتا حسین اُسکی بات سن کر مسکرایا۔لیکن اگلے ہی لمحے اُسکی مسکراہٹ سمٹی۔ وہ چونک کے کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟''رضا حیران ہوا۔

''رضا!''حسین نے چہرے پر پریشانی لیے اُسے دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے اُس نے جو بتایا تھا اُسکے بعد وہ دونوں سب چھوڑ کر وہاں سے باہر نکلے تھے۔

---------+---------+--------

ہسپتال کی راہداری مصروف سی تھی،وہ دونوں تیز قدم اٹھاتے،مطلوبہ کمرے کے باہر پہنچے۔دروازہ کھلا تھا،کمرے کے اندر پلنگ پر بیٹھا نوید،بازو پر ارم سیلنگ چڑھائے سامنے کھڑے مقدّم اور عمر کو دیکھ کم اور گھور زیادہ رہا تھا۔دونوں ہی اُسے مکمل نظر انداز کیے ڈاکٹر کی ہدایات سننے میں مصروف تھے۔ شیراز باہر راہداری میں کھڑا کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔بیزاری سے چہرہ گھماتے نوید کی نظریں دروازے سے داخل ہوتے حسین اور رضا پر پڑیں تو اُسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم دونوں؟''اُسکی آواز پر مقدّم اور عمر نے بھی دیکھا۔

''یہ ٹھیک ہے؟''حسین نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے عمر کے پاس آکر پوچھا۔

''تم نے بتایا؟''نوید نے عمر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!''لیکن وہ مشکوک نظروں سے اُسے گھورتا ہی رہا۔

''میرے پاس اسکا نمبر ہی نہیں ہے تو کیسے بتاؤں گا؟''اُس نے وضاحت دی۔

''گولی کیسے لگی تمہیں؟''رضا نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا،اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''ہو جاتا ہے ایسا!کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''ہاں!کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔گولی تو تم صبح شام کھاتے ہی رہتے ہو۔عجیب آدمی ہو یار تم۔''مقدّم اُسکی بات پر تپا تھا۔

''پچھلے دو گھنٹے سے یہی کہہ رہا ہے۔''اب کہ اُس نے اُن دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے خفگی سے بتایا۔

''یہ کافی مضبوط اعصاب کے مالک ہیں،واقعی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''اب کے ڈاکٹر نے بھی تائید کی۔

''جی! لوہے کے بنے ہیں۔''وہ مزید تپا۔

''تم دونوں کو کیسے معلوم ہوا؟''نوید کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''نیوز آئی تھی حسین کے پاس۔''اُس نے بتایا۔

''میں ٹھیک ہوں! تم لوگ خوامخواہ ہی پریشان ہو رہے ہو۔''اب کہ اُس نے ذرا تحمل سے کہا۔

''آپ لوگ باہر جائیں، مجھے ذرا ان سے کچھ بات کرنی ہے۔''ڈاکٹر اچانک ہی بولا تھا، وہ لوگ چونکے۔

''سب خیریت ہے؟''عمر پریشان سا بولا تو نوید نے ٹھنڈی آہ بھر کے سر جھکا دیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا ان لوگوں کو سمجھانے کا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے بس کچھ بات کرنی ہے اِن سے۔''ڈاکٹر نے تسلی دی تو وہ لوگ سر ہلاتے باہر کی طرف بڑھے۔

''رضا!''ابھی دروازے پر ہی تھے کہ نوید نے آواز دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو رضا رک گیا اور باقی تینوں باہر آ گئے۔

''وہ ٹھیک ہے نا؟''باہر آ کر حسین نے مقدّم سے پوچھا۔ اندر وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ نوید کو دیکھتا رہا پر مخاطب نہیں کیا تھا۔

''گولی بازو میں لگی تھی، ڈاکٹر نے نکال لی ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے ویسے۔''عمر نے بتایا۔

''گولی چھو کر گزری ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ گولی گھس گئی ہے بازو میں اور کہہ رہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔''حسین بڑبڑایا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، کچھ نہیں ہوا ہے اُنہیں۔''پاس کھڑے شیراز نے کہا۔ تینوں نے ہی اُسے گھورا تھا، بار بار اس ''**کچھ نہیں ہوا اُسے**''کی تکرار سے بیزار ہو گئے تھے۔

''اُسے گولی لگی ہے۔ تم نے ہمیں بھی وہاں سے جانے کا کہہ دیا تھا، ہم چلے بھی جاتے لیکن اُسکے بازو سے اتنا خون بہہ رہا تھا کہ رہا نہیں گیا۔''مقدّم نے کہا۔ شیراز کے کہنے کے باوجود اُنکو تسلی نہیں ہوئی تھی، لہٰذا دونوں ساتھ ہی ہسپتال آ گئے تھے۔

''حالانکہ آپ دونوں کا آنا بنتا نہیں تھا۔''شیراز نے بے نیازی سے کہا۔ رضا بھی کمرے سے اُسی وقت باہر آیا تھا۔

''یہ سب ہوا کیسے؟''آتے ہی عمر سے پوچھا۔ کتنے سال بعد عمر کو مخاطب کیا تھا اُس نے؟

پوری دہائی بعد۔۔۔

''ہم پارکنگ میں تھے اور اچانک۔۔۔''اُس کی جگہ مقدم نے تفصیل سے سارا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔

''اُسے آرام کرنا چاہیے اب۔''اس بات پر چاروں متفق تھے۔لیکن شیراز نے نظریں اٹھا کر اُنہیں دیکھا اور مسکرایا۔

''ابھی وہ ڈاکٹر سے اپنے ڈسچارج ہونے کے متعلق بات کر رہے ہونگے۔اُسکے بعد آفس جائینگے، پھر وہاں سے گھر جائینگے اور پھر صبح آفس بھی اپنے وقت پر آئینگے۔آپ لوگ حقیقتاً فضول میں پریشان ہو رہے ہیں۔''شیراز نے کہا۔

''لیکن وہ پہلے آفس کیوں جائیگا؟''عمر نے اچھنبے سے پوچھا۔

''اپنی گاڑی وہیں چھوڑی ہے نا اُنہوں نے،اُسی میں گھر جانا ہے۔''اُس نے سکون سے اطلاع دی تو وہ بھونچکا رہ گئے۔

''وہ اس حالت میں خود ڈرائیو کریگا؟''رضا نے تصدیق چاہی تو اس نے سر ہلاتے ہوئے تصدیق کر دی۔

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ نوید ذہنی مریض ہے؟''حسین نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''نہیں نہیں!ایسا نہیں کہا میں نے۔''شیراز ہڑبڑایا۔

''مطلب تو یہی ہے تمہاری باتوں کا۔''

''نوید سر!اپنی سروس کے دوران ایک بار اغوا ہو گئے تھے۔جس شخص کو ہم نے گرفتار کیا تھا اُسکے خاندان والے کافی اونچا ہاتھ رکھتے تھے۔ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے اُنہیں اغوا کر لیا اُن لوگوں نے،ایک ہفتے تک اُنکی قید میں رہے وہ۔''شیراز نے قریب دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

''پھر کیا؟محبت جتانے کے لیے تو لیکر نہیں گئے تھے اُنہیں، تشدد کیا اُن پر بہت۔''وہ چپ ہوا۔

''تو وہاں سے واپس کیسے آیا؟''مقدّم نے پوچھا۔انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ جلدی بکو پھر کیا ہوا؟

''بھاگ گئے تھے وہ۔۔۔لیکن انہوں نے اُنکا پیچھا کیا پھر۔۔۔''

وہ ایک اندھیری رات تھی،نوید بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔لیکن وہ لوگ اُسکے پیچھے تھے، جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن اُسے فلحال یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔اندھیرے میں اُسکا سایہ بھی نہ پا کر اُن لوگوں نے اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔وہ ہر طرح سے خود کو بچا رہا تھا لیکن۔۔۔

اچانک اُس کا پاؤں جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا، گولی کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دی، ایک تیز، کڑک دار، بجلی جیسی آواز، جو لمحے بھر کے لیے وقت کو منجمد کر گئی۔

اُسے پہلے تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ جیسے جسم لمحہ بھر کے لیے سن ہو گیا ہو۔ پھر جیسے نیچے سے کوئی تیز آنچ چڑھتی ہے، ویسی ہی ایک جلن، تڑپ، اور پھر درد، ایسا درد جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھا، ہاتھ فوری ٹخنے کی طرف گیا جہاں سے خون کی لہر نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پوری طرح گرا نہیں، نہ ہی فوراً چیخا، بلکہ ایک عجیب سی توانائی، ایک ہنگامی طاقت اُس کے بدن میں دوڑنے لگی تھی، جیسے اندر سے کوئی بیدار ہو گیا ہو، جیسے اندر ایک زہر ہو جو وقتی طور پر دوا بن گیا ہو۔ اُس کے دماغ نے ایک پرانا، مانوس الارم بجایا۔

ایڈرینالین۔۔۔۔

(Adrenaline)

وہ قدرتی کیمیکل جو انسان کے جسم میں اچانک خطرے یا صدمے کے وقت خارج ہوتا ہے۔ یہ وقتی طور پر درد کو کم کرتا ہے، دل کی دھڑکن تیز کرتا ہے اور جسم کو لڑنے یا بھاگنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اُسی کے زیرِ اثر وہ تکلیف کے باوجود خود کو سنبھالے کھڑا رہا، حالانکہ اُسکا جسم لہو سے بھیگنے لگا تھا۔ سانسیں بھاری ہوئیں، دل کی دھڑکن کانوں میں دھڑکنے لگی، اور سارا جسم جنگی مشین میں بدل گیا۔ زخمی ٹخنے کے ساتھ بھی وہ بھاگتا رہا اور اگلے ہی لمحے قریب نظر آتی کھائی میں خود کو گرا لیا۔

دشمنوں کی چیخیں، تعاقب کی آوازیں، سب پس منظر میں دب گئیں۔ اسے صرف ایک چیز نظر آ رہی تھی۔۔۔ آزادی۔۔۔ خون کا ہر قطرہ، ہر نبض اور ہر دھڑکن اُسے بھاگنے پر اکسا رہی تھی۔

چند منٹوں میں وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ دشمن اُسے ڈھونڈتے رہے لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

''جب وہ ہمیں ملے، تو اُنکے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر تشدد نہ کیا گیا ہو۔ وہ اٹھارہ گھنٹے اُسی حالت میں کھائی میں پڑے رہا، ٹخنے پر گولی لگنے کے باوجود بھی وہ بھاگتے رہا تھے۔ اُنکے ہاتھوں کے ناخن اُن لوگوں نے اُکھاڑ دیے تھے، جسم پر جابجا راڈ سے مارے جانے کے نشان تھے۔ اُنکے سر پر بھی اسی راڈ سے وار کیا گیا تھا۔ اُنکی آنکھوں کے پاس جو نشان ہے وہ اُسی تشدد کا ہے۔'' وہ دم سادھے کھڑے تھے۔

''آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ ٹخنوں پر چوٹ لگنا کیسا ہوتا ہے؟ اُسے تو گولی لگی تھی، ٹخنے پر لگنے والی گولی گوشت میں گھس گئی تھی۔ صد شکر کے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اُنہیں آٹھ سے دس ماہ لگ جائیں گے دوبارہ ٹھیک سے چلنے میں، لیکن ایس ایس پی صاحب نے دو ماہ بعد ہی دوڑ لگا کر سب کو حیران کر دیا۔'' آخری جملہ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''شروعات میں وہ سٹک کے سہارے آفس آتے تھے، حالانکہ فرّخ صاحب منع بھی کرتے تھے۔ جس نے اس تکلیف میں بھی گھر بیٹھنا گوارہ نہیں کیا، وہ اس ذرا سی چوٹ پر کیوں پریشان ہوگا؟'' ہاں! بالکل۔۔۔ جس نے اتنی اذیت ناک تکالیف سہی ہوں، اُسکا بھلا ایک گولی کیا ہی بگاڑ سکتی ہے؟

''اب آپ سب دیکھیے گا، تھوڑی دیر میں وہ ڈسچارج بھی ہونگے، پھر گاڑی ڈرائیو کر کے گھر بھی جائیں گے۔ میری مانیے! تو آپ لوگ بھی گھر جائیں۔ اُن کو ابھی ڈاکٹر کو راضی کرنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو لگے گا۔'' اُس نے کہا تو عمر نے ایک نظر نوید کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تھا۔

''فکر نہ کریں، میں آپکو اُنکا نمبر دے دوں گا۔ رات تک خود ہی میسیج کر کے پوچھ لیجیے گا۔'' اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے شیراز نے اُسے تسلی دی تو اس نے سر ہلا دیا۔

نوید نے اتنی اذیت کیسے سہہ لی تھی؟ دل میں سوچا، پھر نِگاہیں موڑ کر رضا کو دیکھا، پچھلے تین ہفتوں میں ہونے والی تمام ملاقاتوں میں آج پہلی بار رضا اُنکے ساتھ کھڑا بات کر رہا تھا۔ وہ زیادہ نہیں بول رہا تھا، پر بات کر رہا تھا یہی بہت تھا۔ نہ جانے نوید نے اُسے کیوں روکا تھا؟ اور روک کر کیا کہا ہوگا؟

وہ چاروں راہداری میں تھے، اور نوید کمرے میں۔۔۔

وہ ساتھ تھے، اور ماحول کا تناؤ اب کہیں بھی موجود نہ تھا۔۔

صرف ایک شخص کی غیر موجودگی میں وہ لوگ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر برتاؤ کر رہے تھے۔۔

صرف ایک شخص۔۔۔ علی سفیر۔۔۔

---------+---------+--------

دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اُسکی چیخ ہی نکل گئی۔

''چلا کیوں رہی ہو؟ اُس نے اچھنبے سے اُسے دیکھتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''یا اللہ مقدّم!'' وہ منہ پر ہاتھ رکھے آنکھیں بڑی کیے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہو گیا سب خیریت ہے؟'' اب کہ وہ بھی گھبرا گیا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تمہاری شرٹ پر اتنا سارا خون لگا ہے۔ اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ سب خیریت ہے؟'' مقدّم نے حیرت سے اپنی آستین کو دیکھا۔ جسے وہ اتنا سارا خون کہہ رہی تھی، وہ فقط تھوڑے سے چھینٹے ہی تھے۔ اُسکی غلطی کہ وہ کوٹ پہننا بھول گیا۔

''تم ٹھیک ہو نہ؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' وہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھی۔

''پانی مل سکتا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ اُسکے سوالات سے بچنے کا یہی طریقہ تھا۔

''اوہ، سوری! تم اندر آؤ۔'' سائیڈ پر ہوتے ہوئے اُسے جگہ دی۔ وہ بھی گلی میں کھڑا کر کے اُس سے تفتیش کر رہی تھی۔ وہ اندر آ گیا۔ اُس کی نانی سامنے ہی بیٹھی تھیں، مکرم اُنکی گود میں تھا۔

''السلام علیکم!'' اُس نے اُنہیں سلام کیا اور فوراً اُنکے سامنے بیٹھ گیا۔ اب مقدّس کے سوالات کا کون جواب دے؟

''وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا؟'' وہ تو اسے دیکھ کر نہال ہو گئی تھیں۔ کافی دیر اُس سے اُسکی مصروفیات کے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔ وہ بھی پوری دلجمعی کے ساتھ اُن سے محو گفتگو رہا، جبکہ مقدس پہلو پر پہلو بدلتی رہی۔

''بیٹا کھانا کھا کر جاؤ۔'' باتوں کے دوران انہیں یاد آیا۔

''نہیں نانی! بس مکرم کو لیکر اب گھر جاؤں گا۔'' وہ تھک چکا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے، میں نے کھیر بنائی تھی کم از کم وہ تو ساتھ لیتے جاؤ۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔

''کیوں زحمت کر رہی ہیں؟'' وہ شرمندہ ہوا۔

''کوئی زحمت نہیں ہوتی مجھے۔'' وہ اُسے ڈپٹتی ہوئی چلیں گئی۔ اُس نے نظریں موڑ کر مقدّس کو دیکھا تو وہ مشکوک نظروں سے اُسے ہی گھور رہی تھی۔

''بہت تیز نظریں ہیں تمہاری، دیکھو نانی نے تو دھیان بھی نہیں دیا۔''

''سچ سچ بتاؤ! کس کو ٹھونک کر آ رہے ہو؟'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھونک کر؟'' وہ حیران ہوا۔

''یعنی کس سے مار پیٹ کر کے آ رہے ہو؟''

''میں کیوں کسی سے مار پیٹ کروں گا؟''

''تو یہ خون کیسا ہے؟'' اُسکے دھونس بھرے انداز پر وہ پل پل حیران ہو ہی رہا تھا، پر مزید حیرت اپنے آپ پر تھی کہ وہ خود اُسکو کچھ کہہ کیوں نہ رہا تھا؟

''تم سے کس نے کہا یہ خون ہے؟''

''تو پھر کیا ہے؟''

''ریڈ انک (لال روشنائی)۔۔۔آفس میں ضرورت پڑتی ہے کبھی کبھار۔''

''سفید جھوٹ۔''وہ ماننے کو تیار نہ ہوئی۔

''ارے بھئی! کسی انسان کا خون نہیں ہے۔''

''دیکھا دیکھا! کیسے بیان بدلا تم نے۔''

''میں نے کب بیان بدلا؟''وہ انجان بنا۔

''مان لیا نہ آخر کہ خون ہی ہے۔''

''انسان کا نہیں ہے۔''اپنی بات پر زور دیتے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

''ہے تو خون نا۔''

''ایک بلی کا بچہ گاڑی کے آگے آگیا تھا۔اسے ابتدائی طبّی امداد دی تھی،بس! اسی کا خون لگ گیا۔''نوید کو''بلی کا بچہ''کہنے پر خود پر افسوس ہوا۔

''کہاں ہے بلی کا بچہ اب؟''

''ہسپتال میں۔''اب تک تو بلی کا بچہ ہسپتال سے فارغ بھی ہو گیا ہو گا۔دل میں سوچا۔۔۔

''تمہیں دیر اسی لیے ہوئی ہے آج؟''

''کوٹہ ختم آج کا۔''اُس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اچانک ہی کہا۔

''کیا مطلب؟''اُس نے نا سمجھی سے دیکھا۔

''تمہارے سوالات کا کوٹہ پورا ہوا اب تم اگلی ملاقات میں دس سوال پوچھ سکتی ہو۔''کہہ کر سکون سے صوفے سے ٹیک لگالی۔وہ جو کہ کوٹہ والی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی،اُسے گھورنے لگی۔

''تم سیریس (سنجیدہ) ہو؟''اُس نے کندھے اچکا لیے۔جیسے کہہ رہا ہو کہ کوٹہ ختم۔۔۔بات ختم۔۔

''یہ کیا بچوں والی حرکت ہے؟''وہ جھنجھلائی۔مگر وہ بھی ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

کچھ ہی دیر بعد نانی کھیر پیک کر کے لے آئیں تو وہ مکرم کو لیکر اُنہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

''بد تمیز!''ناک چڑھا کے اُسے خطاب دیا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

---------+---------+--------

شیراز کے کہے کے مطابق وہ واقعی اگلے ایک گھنٹے میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر آفس آ چکا تھا۔اسکی گاڑی وہیں تھی اسی لیے گھر بھی وہیں سے جانا تھا۔وہ شیراز کے ساتھ پہنچا تو وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟''اُسے دیکھ کر فیصل قریب آیا۔

''ہاں!''وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟''اُس نے اُسکی پریشان شکل دیکھتے ہوئے پوچھا تو فیصل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''خلیل۔۔۔خلیل اپنے گھر میں مردہ پایا گیا ہے۔''اُس نے نوید کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔

---------+---------+--------

رات سے اعصاب بھاری تھے، صبح اٹھتے اٹھتے بھی دیر ہو گئی تھی۔ناشتہ کرنے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا، بنا ناشتہ کیے ہی آفس چلا آیا۔حیرت کا شدید جھٹکا اُسے تب لگا، جب عمر بھی اس کے ساتھ ہی آفس میں داخل ہوا۔

''آج میں بھی لیٹ ہو گیا۔''سمجھ نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کرے؟

''ہونہہ!''عمر نے بس اتنا ہی کہا۔اُنکا جنرل منیجر اندر آ گیا تو دونوں کی توجہ اس پر چلی گئی۔

''ہمارا آج کا وزٹ کینسل ہو گیا ہے۔ہوٹل پارک ویو والوں کے یہاں آج کوئی تقریب ہے جسکی وجہ سے انہوں نے معذرت کی ہے اور وزٹ آگے بڑھانے کو کہا ہے۔''

''اُنہیں، اگلے ہفتے کی کوئی تاریخ دے دو۔''علی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔''وہ چلا گیا۔

''اُنکی ڈیمانڈز کیا ہیں ویسے ؟''عمر نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''ہمارا پورٹ فولیو دیا تھا، اُنہیں وہی انٹیریر پسند آیا ہے، جو آخری بار ہم نے ہائی اسکائی ہوٹلز کا کیا تھا۔ تھوڑا مختلف ہو مگر تھیم ویسی ہی مانگی ہے۔ اب جا کر ہی دیکھنا ہو گا کہ اُنکی کنسٹرکشن کیسی ہے۔ پھر اُسی حساب سے بتا سکتے ہیں''اُس نے تفصیلاً جواب دیا تو عمر نے سر ہلا دیا۔ پھر دونوں ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو گئے۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی، پھر عمر نے نِگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ گہری خاموشی میں اپنے ٹیبلٹ پر پین کی مدد سے ایک خاکہ مکمل کر رہا تھا۔ اس کی اسکرین پر پیرامیٹرک بینچ پروٹوٹائپ

(Parametric bench prototype)

کے آرگینک کروز(organic curves)ابھر رہے تھے۔

''تم fluid جیومیٹری پر کام کر رہے ہو؟''عمر نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''یہ صرف جیومیٹری نہیں، یہ موومنٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بینچ جگہ نہ لے، بلکہ جگہ کو ڈیفائن کرے۔''اُس نے نظریں اسکرین سے ہٹائے بغیر جواب دیا۔

''تو پھر تم نے جوئنری میں کیا سوچا؟spline interlock رکھ رہے ہو یاhidden dowels؟'' اُس نے جاننا چاہا۔

''Hidden dowels۔۔۔ وزیبل جوائنٹ تھوڑا واضح ہو جاتے ہیں۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔ وہ واقعے اپنے کام میں بہت ماہر تھا۔ خاموشی ایک بار دوبارہ چھا گئی۔ عمر پر سوچ نظروں سے سکرین پر اُبھرتی آرگینک کروز اور مہارت سے حرکت کرتی، اُسکی انگلیوں کو دیکھتا رہا۔

''ہم کل رات کافی دیر ہسپتال میں رہے، صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اسی لیے دیر ہو گئی آج۔''اُسکے یکدم کہنے پر علی نے سر اٹھا کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کون ہسپتال میں تھا؟''وہ سمجھ نہیں سکا۔

''نوید۔۔۔ اُسے گولی لگی تھی۔''اُس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''اُس نے حیرت کی زیادتی سے گنگ ہوتے اُسے دیکھا۔

''کب ؟اور کیسے ؟''وہ پریشان ہوا۔

''جب تم سب چلے گئے، تو میں اور مقدّم پارکنگ میں کھڑے تھے۔ تب ہی وہاں اچانک سے۔۔۔''وہ مختصراً سب بتاتا چلا گیا۔

''تم مجھے اب بتا رہے ہو؟''وہ سخت ناراضی سے بولا تھا۔

''تو کب بتانا چاہیے تھا مجھے؟''سینے پر ہاتھ باندھتے اُس نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے کل رات بھی بتا سکتے تھے۔''

''میں نے مناسب نہیں سمجھا۔''سکون سے جواب دیتے اُس نے واپس کرسی گھمائی اور اپنے کام میں سر جھکا دیا،اِس جواب پر تو وہ تلملا کر رہ گیا۔

''کیا تم وضاحت کرو گے کہ تم نے کیوں مناسب نہیں سمجھا؟''اسکو برا لگا تھا۔

''رضا بھی تھا وہاں۔۔۔میں نہیں چاہتا تھا کہ جو تم نے اُسکے ساتھ کیا ہے،اُسکے بعد تم دوبارہ اُس کا سامنا کرو۔''اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اور یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟''اُسکے کاٹ دار لہجے پر اُس نے لب بھینچے اور ایک بار پھر کرسی اُسکی طرف گھمائی۔معاملہ بگڑ سکتا تھا لیکن آج وہ رکنا نہیں چاہتا تھا،بھاڑ میں گیا اُن دونوں کا ایک دوسرے کی ذاتیات میں مخل نہ ہونے والا معاہدہ۔۔۔جہنّم میں گئی یہ لاتعلقی۔۔۔

''میں تمہارا اور اُسکا پرانا دوست ہوں۔وہ پرانا دوست جسے تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے چھوڑ چکے ہو۔''اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا،علی بھونچکا رہ گیا۔اس جواب کی توقع نہیں تھی اُسے۔۔۔ہرگز نہیں تھی۔

''اور تم ایک بار پھر وہی غلطی کر رہے ہو۔تم نے کل پھر وہی کیا ہے علی!جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''میں نے جو کیا وہ غلط فہمی تھی۔میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی۔۔۔''سلگ کر کوئی وضاحت دینی چاہی۔

''وہ یہ نہیں کرتا۔۔۔ہرگز نہیں کرتا۔''اُسکی بات کاٹتا وہ بلند آواز میں بولا تھا۔علی شاکٹ رہ گیا۔

''تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ پہلے نوید سے رابطہ کرتا،یا فرّخ صاحب سے۔۔۔لیکن تم اپنی طرف سے اُسکی کوئی غلطی ڈھونڈھنا چاہتے تھے۔اسی لیے تم نے اُسکی جاسوسی کی،اُسکے بعد بھرے مجمعے میں صرف شک کی بنا پر اُسکی کردار کشی کی۔تم نے بہت غلط کیا۔۔۔بہت غلط۔''

''اور آج تم بھی وہی کر رہے ہو جو تم نے دس سال پہلے میرے ساتھ کیا تھا۔تم میں سے کسی نے اس دن بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''وہ ٹیبلٹ میز پر پٹختا کھڑا ہوا تھا۔بات کل کی تھی لیکن حوالہ دس سال پہلے کا دیا گیا تھا۔

''تم کیوں چاہتے ہو کہ ساری دنیا تمہیں سمجھے؟تم نے کبھی کسی کو سمجھنے کی،کسی کی جگہ پر آ کر اُسکے حالات جاننے کی کوشش کی ہے؟تمہاری دنیا صرف تمہارے گرد ہی کیوں گھومتی ہے؟''اُنکی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ سیکریٹری بھاگتا ہوا وہاں آیا تھا۔

''سر!کیا ہوا ہے؟''اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

''باہر جاؤ!''اُسے انگلی سے باہر جانے کا اشارہ اس سختی سے کیا گیا تھا کہ وہ بنا کوئی مزید سوال کیے واپس پلٹا۔

''دروازہ بند کر کے جاؤ!''عمر نے کہا تو اس نے دروازہ بند کر دیا پھر وہ کھڑا ہوا۔

''میں نے کبھی کوئی کام اپنی ذات کے لیے نہیں کیا، کل جو ہوا اُسکے پیچھے میری نیت تم سب کو کسی بڑے نقصان سے بچانا تھی۔ ٹھیک ہے وہ غلط فہمی تھی، لیکن مجھے یہ غلط فہمی کیوں ہوئی؟ یہ جاننے کی کوشش کی ہے؟''علی کا لہجہ سخت مگر بے بس سا تھا۔ وہ ساری زندگی کسی کو بھی اپنی بات سمجھا نہیں سکا تھا۔ نہ اپنے باپ کو، نہ دوستوں کو، نہ بیوی کو اور نہ ہی اولاد کو۔

''کیوں کہ تم نے یہ جان لیا تھا کہ وہ ماضی میں ڈر گزلیتا تھا، تو تم نے اُسے ہی مجرم مان لیا؟ لیکن نہیں، یہ جاننے سے پہلے بھی تم اُسے مجرم مان چکے تھے۔ تمہارا ذہن اُسے ایک مجرم، قبول کر چکا تھا۔ تم بس ثبوت چاہتے تھے۔ تم نے اتنے لوگوں کے سامنے اُسکی عزت نفس پر حملہ کیا۔ کیا تم دوست ہونے کے ناطے ہی اُسکا پردہ نہیں رکھ سکتے تھے؟''دو ماہ پہلے جب وہ مقدّم سے اتفاقیہ ملے تھے، تب تقدیر نے لکھ دیا تھا کہ اُنکے درمیان حائل یہ دیوار بہت جلد گرے گی۔ موضوع نکلے گا، پرانی باتیں ہونگی، وضاحتیں ہونگی، شکوے ہوں گے، غلط فہمیاں ہونگی۔۔۔ لیکن وہ زیادہ دیر اس موضوع سے نظریں نہیں چرا سکیں گے۔

اور آج وہ کھڑے تھے۔۔۔ایک دوسرے کے سامنے۔۔۔ بات رضا سے شروع ہوئی تھی اور دس سال پیچھے پہنچ چکی تھی۔

''تم نے نوید کی دوستی کا بھرم بھی نہیں رکھا تھا، دس سال پہلے تم نے اُسکے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟''علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ دس سال پہلے کے اس واقعے میں وہ تو وہاں موجود نہیں تھا، پھر اُسے، اُسکی اور نوید کے درمیان ہوئی گفتگو کا علم کیسے ہوا؟

''تم اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟''بولتے بولتے اُسکا گلا رندھ گیا تھا۔

''عمر! جذباتیت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے میں نے۔ دوستی، انسانیت، رشتے، یہ سب بے معنی ہو چکے ہیں میرے لیے، میرے نزدیک اُس وقت، رضا میرا دوست نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسکا ماضی قابل اعتراض تھا۔ مجھے فرق نہیں پڑتا اُسکے ماضی سے، لیکن اُسکے ایڈکٹیڈ (عادی نشئی) ہونے کی وجہ سے ہی تو وہ خلیل کو جانتا تھا۔ یہ بات اہم تھی۔ میں نے پریکٹیکل بن کے سوچا تھا اُس لمحے، جذبات و احساسات سے نہیں، اور پریکٹیکل بن کر ہی سوچتا ہوں میں اب، مجھے تم لوگوں نے ہی تو یہ سکھایا ہے۔''سنجیدگی سے کہتے اُسکے ہر ہر لفظ کے پیچھے ایک داستان رقم تھی۔ عمر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی آسانی سے تو بالکل نہیں۔۔۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا، کرسی کھینچ کر قریب کی اور اُسے اشارہ کیا۔

''بیٹھو!''علی نے چند لمحے اُسے دیکھا اور پھر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ عمر نے میز کے پاس جا کر گلاس میں پانی نکالا، پھر اُسکے پاس آیا۔ پانی کا گلاس اُسکی جانب بڑھایا جو کہ اُس نے خلاف توقع خاموشی سے تھام لیا۔

عمر اُسے دیکھ رہا تھا، اور وہ چپ سا، سر جھکائے پانی کے گلاس کو۔ مسئلہ اُسکے ساتھ بھی تھا، پریشان وہ بھی نظر آتا تھا۔ عمر اندھا نہیں تھا، اس شخص کے ساتھ اُس نے چھ سال گزارے تھے، وہ اُسکا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ زندگی نے کچھ اچھا اُسکے ساتھ بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ اس طرح اُسے ساری دنیا سے بدلا لینے کے لیے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ اُسے غلط فیصلے کرنے، غلط راہ پر چلنے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اُسکا دوست تھا۔۔۔ہاں! دوست۔۔۔اور دوستی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اُسکے غلط کو غلط کہے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اُسکے سامنے آ بیٹھا۔

''دس سال پہلے ہم کم عمر تھے علی! ناسمجھ تھے، حالات کو سنبھالنا نہیں جانتے تھے۔''اُس نے بولنا شروع کیا۔ اب کہ اُسکی آواز آہستہ تھی۔ علی نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ڈھیروں شکوے تھے اُسکی نگاہوں میں۔۔۔

''جو ہوا میں اُسکی وضاحت نہیں دے رہا، اُسکی کوئی وضاحت ہو بھی نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی وضاحت ہے بھی تو اب دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم سب نے تمہیں اکیلے چھوڑا تھا، اور اسکی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ایک دہائی گزر گئی اور ہم نے ایک دوسرے کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟''اُس نے پوچھا، وہ خاموش رہا۔

''ہم نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا، غلط کیا۔ لیکن اُسکا بدلہ اسطرح مت لو۔ ہم امیچور تھے، تم تو نہیں ہو۔ اب انتقام لینے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''اس بات پر علی تلخی سے مسکرایا۔

''انتقام؟ بدلہ؟ تمہیں لگتا ہے میں نے بدلہ لینے کے لیے کیا ایسا؟''وہ حد سے زیادہ بدظن تھا۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں پرانی باتوں کو بھول کر تحمل سے کام لینا چاہیے تھا۔''اُس نے وضاحت دی۔ اُس نے خاموشی سے رخ پھیرا۔

''علی! کوئی بھی انسان نشے کا استعمال ایسے ہی نہیں کر لیتا، خصوصاً رضا جیسا انسان۔۔۔تم سوچو تکلیف کی وہ کونسی انتہا ہوگی، جس میں اُس نے، اِس قبیح شے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب کے حصے کی کوئی نہ کوئی کہانی ہے علی! تمہیں کسی کے بھی ماضی کو ادھیڑنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''نرمی سے کہتے اُس نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اُس نے گلاس منہ سے لگایا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں ختم کیا۔ دونوں ہی کافی دیر خاموش رہیں۔

''جو ہوا، وہ اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اسکے پیچھے میری کوئی انتقامی کارروائی نہیں تھی۔ میں تم سب کو بھلا چکا ہوں۔ میں کوئی پرانی بات یاد بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ تو کسی پرانی بات کا بدلہ کیوں لوں گا؟''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ واقعی بہت پریکٹیکل ہو چکا تھا۔ جب ڈیڑھ دو ماہ پہلے وہ مقدّم سے ملے تھے، تب بھی اس نے حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے پیشہ ورانہ طریقے سے اُس سے بات کی تھی۔ اُسکے برعکس عمر کو اپنے احساسات چھپانے میں کھلی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''کیا تم نے اُسکا دل نہیں دکھایا؟ اُسکی عزت نفس پر حملہ نہیں کیا؟ بے شک بھلا دو ہمیں، مت مانو اپنا دوست، لیکن کم از کم انسان ہونے کے ناطے ہی تمہیں اس بات کا احساس کرنا چاہیے۔'' کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا اُس نے کہ میں تم سب کو بھلا چکا ہوں۔ کتنی آسانی سے؟ عمر کا دل دکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں معذرت کر لوں گا اُس سے، ختم کرو اس بات کو۔'' اُس نے بیزاری سے کہا۔ وہ بہت بد گمان تھا۔

''تمہیں معذرت کرنے کو کس نے کہا؟ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہو سکے تو اپنا دل صاف کر لو۔ ورنہ تم بھی سکون میں نہیں رہو گے۔'' وہ ایک دہائی بعد اس بات کو تسلیم کر رہا تھا کہ وہ اُسے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ لیکن اب اسکا کوئی فائدہ تھا بھلا؟

''سوچنا اس بارے میں۔'' اُسے مستقل خاموش دیکھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا، اپنا سامان اٹھایا، ایک نظر اُسے دیکھا، اور آفس سے نکل گیا۔

علی خاموش بیٹھا رہا تھا۔

وہ کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ جو کر رہا تھا، کیا صحیح کر رہا تھا؟

عمر نے اُسکے دماغ کی کوئی کھڑکی کھول دی تھی۔ ہر شے اب پہلے سے واضع نظر آ رہی تھی۔ دھند میں لپٹا اُسکا دماغ اب کچھ کچھ صاف ہونے لگا تھا۔

اُس نے رضا کو پانچ لوگوں کے سامنے نشئی کہا تھا۔ اُسکا ماضی جو نہ جانے اُس نے کتنی مشکل سے چھپا کر رکھا ہو گا، وہ بیچ چوراہے پر موضوع گفتگو بنایا تھا۔ لیکن رضا نے کیا کیا؟ اُس نے پلٹ کے اُسے کچھ نہیں کہا۔۔۔ نہ کوئی وضاحت دی، نہ اُسے برا بھلا کہا، نہ کوئی پرانی بات نکالی۔

علی کون ہوتا تھا اُسکے لیے میدان حشر لگانے والا؟

اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ دل و دماغ اب اسکو، اُسی کا سب سے بد صورت چہرہ دکھانے لگے تھے۔

اُس نے تھک کر سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

''کل رات اتنی دیر سے کیوں آئے تم؟'' وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب وہ اُسکے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ نظریں اٹھا کر، کمر پر ہاتھ رکھے مشکوک نظروں سے گھورتی اپنی زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

''تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' حسین نے واپس چہرہ ٹی وی کی طرف کیا۔

''کیوں نہیں بتا سکتے ؟''وہ مزید مشکوک ہوئی۔

''تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا۔''مصنوعی دکھ سے کہا۔

''شرافت سے بتادو ورنہ۔۔''دھمکی دیتی حور عین اُسکے برابر بیٹھی۔

''ورنہ کیا؟''

''تایاابّا کو بتادوں گی تمہاری مشکوک سرگرمیاں۔''اُس نے کہاتو حسین تیزی سے سیدھا ہوا۔

''ایسامت کرناحور ! دیکھو میرے پیر کانپ رہے ہیں۔ڈر گیا میں تو۔۔''خوفزدہ انداز میں کہااور پھر ہنستے ہوئے سر صوفے کی پشت سے لگادیا۔ حور عین سنجیدگی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیا ہے ؟''وہ اُسکی گھورتی نظروں سے بیزار ہوا۔

''تم مجھے بتاؤ گے نہیں تو میں بھی یہاں سے نہیں ہلوں گی۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی تو وہ ہار مانتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔کافی دیر سنجیدگی سے میز پر نظریں ٹکائے خاموش رہا، جیسے فیصلہ نہ کر پارہا ہو کہ اُسے بتائے یا نہیں ؟

''کیا ہوا ہے حسین ؟''وہ پریشان ہوئی۔اتنا سنجیدہ تو وہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

''ایک بات ہے جو میں نے تمہیں نہیں بتائی۔لیکن مجھے لگتا ہے کہ بتادینی چاہیے۔''اُس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

''کیا بات ہے ؟''وہ مزید پریشان ہوئی۔

''میں نے۔۔۔میں نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔بس اسی کے پاس تھا رات کو۔''جتنی سنجیدگی سے اُس نے کہا تھا اتنی ہی تیزی سے حور عین نے کشن کھینچ کر اُسے مارا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔میری تمہارے علاوہ بھی ایک بیوی ہے۔''وہ ہنستے ہوئے پیچھے ہوا۔

''سچ بتادو کہاں تھے ؟''وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

''اتنا بھروسہ مت کرو مجھ پر۔۔۔''

''بھروسہ تم پر نہیں دنیا کی باقی عورتوں پر ہے۔کم از کم ہر عورت میری جتنی اندھی نہیں ہو سکتی۔''

''چلو تم نے مانا تو کہ تم اندھی ہو۔''

''اب تم سے تایا ابّا ہی حساب لیں گے۔'' وہ دھمکاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جانتی تھی کہ وہ نہیں بتائے گا کبھی۔۔۔

''رضا ملا تھا کل، اُسی کے ساتھ تھا۔'' حور کے قدم تھمے۔ تیزی سے پلٹ کر واپس آئی۔

''رضا الٰہی؟'' اُس نے تصدیق کرنی چاہی، تو حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہیں کہاں ملا وہ؟ اور کیسے؟'' وہ پرجوش ہوئی تھی۔

''آں۔۔۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم جاؤ، میں اور میری بیٹی اب سوئیں گے۔'' اُس نے اپنی ڈیڑھ سالہ بیٹی کو سینے پر لٹاتے ہوئے جمائی لی۔

''حسین کیوں تنگ کر رہے ہو؟ بتاؤ نا۔'' اُسے غصّہ آنے لگا۔

''اگر ایک آدھ رس ملائی مل جاتی تو میری نیند بھاگ سکتی تھی۔ لیکن کیا کروں؟ ابھی تو نیند آ رہی ہے بہت۔'' معصومیت سے کہتا حور کو وہ زہر لگا۔ پیر پٹختی وہاں سے جانے لگی، اب پوری بات جانے بنا رہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔

''میری پیاری حور!'' حسین کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچے کہہ رہا تھا۔

اُسکی اور حور عین کی بیٹی حوریہ۔۔

جیسکا نام حسین نے حوریہ رکھا تھا اور پیار سے اُسے حور کہتا تھا۔

بدتمیز! حور کا نام لیکر تعریف کرتا اور پوچھنے پر ہمیشہ کہتا کہ میں تو اپنی بیٹی کی تعریف کر رہا ہوں، تم کیوں خوش ہو رہی ہو؟

مجال ہے جو وہ کبھی اُسے خوش ہونے دے؟

---------+---------+--------

آفس جانے سے پہلے مکرم کو چھوڑنے کیلئے جب وہ مقدّس کے گھر آیا تو دروازہ اُسکی نانی نے کھولا، وہ حیران ہوا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے مکرم کو اُس سے لے لیا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ وہ شاید اُسے اندر آنے کا کہیں، لیکن وہ بھی دروازے پر کھڑی اُسے دنیا جہاں کے قصے سنا رہی تھیں۔

''مجھے جانا ہے آنٹی!'' بلآخر اُس نے احساس دلایا۔

''ارے ہاں! تمہیں تو دیر ہو رہی ہو گی۔ چلو تم جاؤ، کوئی بات نہیں۔''اب بھی اندر آنے کو نہیں کہا۔ چار و ناچار وہ گاڑی کی طرف بڑھا ایک آدھ بار مڑ کے کھڑکیوں اور بالکونی کی جانب دیکھا کہ شاید کہیں نظر آ جائے۔ پر وہ کہیں نہ دکھی، بس اُسکی نانی ہی دانت نکالے دروازے پر کھڑی تھیں۔

''مقدّس نظر نہیں آ رہی، کہاں ہے؟''جب رہا نہ گیا تو پوچھ ہی لیا۔

''مقدّس؟ وہ تو اندر ہی بیٹھی ہے۔ بلاؤں کیا؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''نہیں نہیں! میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''گڑبڑا کر وضاحت دی، پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نانی بھی اندر چلی گئیں۔ لیکن وہ نہ آئی جسکا اُسے انتظار تھا۔ بلآخر تھک کے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

مقدّس نے جب سے مکرم کی ذمے داری سنبھالی تھی، تب سے اُسکے لیے بہت آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اُسے نہ مکرم کے کھانے کی، نہ ہی سونے کی فکر کرنی پڑتی تھی اور نہ ہی آفس میں بار بار اُسکا خیال آتا تھا۔ ایک سکون تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

شروع میں جتنا وہ اخلاق کے فیصلے سے خائف تھا اب اتنا ہی ممنون ہو رہا تھا۔ اگر وہ بروقت مقدّس کو نہ بھیجتا تو اُسکی مشکلات میں اتنی کمی نہ آتی۔ مکرم بھی بہت خوش تھا اُسکے ساتھ۔۔۔

''مجھے اُسکا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟''دل میں سوچا۔

''یقیناً کرنا چاہیے، کیونکہ وہ حقیقتاً تمہارا بہت بڑا بوجھ بانٹ چکی ہے۔''دل نے احساس دلایا۔

اب کیا کیا جائے؟ شکریہ کیسے ادا کروں؟ آج تو وہ آئی بھی نہیں۔ ناراض تو نہیں ہو گئی کہیں؟

لیکن مجھے اُسکی ناراضگی کی فکر کیوں ہو رہی ہے؟ خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دے رہا تھا۔

اپنی کیفیت خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آفس آ کر بھی دماغ وہیں رہا۔

اسکو پتہ تو تھا کہ میں مکرم کو چھوڑنے آیا ہوں، پھر اٹھ کر باہر کیوں نہ آئی؟

موبائل اُٹھا کر دیکھا، دوپہر ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ روزانہ اُسے میسیج کر کے بتاتی تھی کہ مکرم نے کھانا کھا لیا ہے اور اب وہ سو گیا ہے۔ کبھی کبھی اُسکی کسی شرارت کی ویڈیو بنا کر بھیج دیتی۔

لیکن آج موبائل بھی خاموش تھا۔ آدھا گھنٹہ، ایک گھنٹہ، ڈھائی گھنٹے حتیٰ کہ شام ہو گئی مگر اُسکا کوئی میسیج نہ آیا۔ بار بار موبائل اٹھا کر دیکھتا، کبھی سوچتا کہ خود میسیج کر دوں۔ پھر رک جاتا۔

سارا دن اسی کشمکش میں وہ بھول گیا کہ آج پورا دن اُس نے صرف مقدّس کی فکر میں گزارا ہے۔

بلآخر اس نے واٹس ایپ کھولا اور سرچ بار میں مقدّس کا نام سرچ کرنے لگا، اور یکدم اُسکی انگلیاں تھمیں۔ اُسکے اور مقدّس کے ناموں کی سپیلنگ میں بس ایک حرف کا فرق تھا، یہاں تک کہ اردو میں بھی دونوں کی ہجّے میں بس ایک ہی حرف کا فرق تھا۔ یہ ایک نہایت ہی بچکانہ سا خیال تھا لیکن اُسکے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔ اُسکا نمبر کھولا تو اُس نے ڈی پی پر مکرم کی تصویر لگا رکھی تھی۔ ہاتھوں میں چمچ پکڑے، گود میں آئس کریم کا پیالا رکھا تھا۔ چہرے پر جا بجا آئس کریم کے نشانات کے ساتھ وہ سامنے کے دو دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ وہ تصویر واقعی بہت پیاری تھی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اُسے نے اُسکو ایک لفظی پیغام لکھا اور موبائل رکھ دیا۔

اپنے گھر میں مکرم کے ساتھ کھیلتی مقدس کی موبائل کی سکرین روشن ہوئی۔ اُس نے توجہ نہ دی۔ روشن ہوتی سکرین پر مقدّم کے نمبر کے ساتھ ایک لفظی پیغام بھی نظر آ رہا تھا۔

''شکریہ!''

-------+-------+-------

عثمان کی خواہش پر نہ جانے عظیم اور شہباز کہاں سے ایک بکری کا بچہ لے آئے تھے؟ اب وہ معصوم سا کیوٹ سا بکری کا بچہ، پناہ گاہ کے بچوں کی دلچسپی کا محور بن گیا تھا۔ سارے بچے مجمع لگائے اُس پر تبصرے کر رہے تھے۔ کسی کو اُسکی آنکھوں کی فکر ہو رہی تھی، کسی کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ کچھ کھا کیوں نہیں رہا؟ کسی کو اس بات کی فکر تھی کہ اُسکے امی ابّو ساتھ کیوں نہیں ہیں؟ کوئی بڑی سمجھداری سے باقی بچوں کو دور رہنے کا کہہ رہا تھا کیونکہ بقول اُسکے بکری کا بچہ اتنے سارے بچوں کو دیکھ کر ڈر رہا تھا۔

قریب ہی کرسی پر رضا بیٹھا تھا، بازو سے ارمینہ چپکی تھی، جسے وہ چمچ چمچ کر کے دلیہ کھلا رہا تھا۔ خلاف توقع وہ بڑے سکون سے اُسکے ساتھ لگی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ باقی بچوں پر بھی نظر ڈال لیتا۔ قریب ہی محمد چلنے کی کوشش کرتا، لڑھک کر نیچے گر جاتا۔ تیرہ سالہ علیزے اُسکے ساتھ ہی تھی، اُس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا لہٰذا اب چلنا، لڑھکنا اور گرنا اُسکا روز کا معمول بن گیا تھا۔

''دور ہٹ جاؤ، یہ تمہارا ہاتھ کھا جائیگا۔'' عبدالرفع نے چھ سالہ منال کو پیچھے ہٹایا، وہ ہاتھ میں پتے لیے بکری کے بچے کو کھلا رہی تھی۔

''وہ ہاتھ نہیں کھاتا، گھاس کھاتا ہے۔'' ایک بچی نے جواب دیا۔

''میں تو چاول بھی کھاتا ہوں، یہ کیوں نہیں کھاتا؟'' کسی بچے کو دکھ ہوا۔

''ارے تو تم بکرے تھوڑی ہو۔''کسی اور بچی نے معصومیت سے بتایا تو باقی بچے ایسے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے جیسے بہت ہی کوئی بہترین لطیفہ سنایا گیا ہو۔

رضا مسکرایا، وہ لوگ ایسے ہی بے تکی باتوں پر قہقہے لگا لگا کر ہنستے تھے۔ رضا نے اپنے بچپن میں نہ کوئی عید منائی تھی، نہ رمضان کا اہتمام کیا تھا، نہ باقی لڑکوں کی طرح کبھی کسی بقرہ عید پر منڈی کے چکّر لگائے تھے۔ لیکن اپنے بچوں کے لیے وہ سب کرتا تھا، اُنکی ہر خواہش پوری کرتا تھا، وہ جو مانگتے تھے، اُنہیں فوراً مہیا کرتا تھا۔ یہ دکھوں کے مارے بچے تھے، وہ انکو ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔

کھانا ختم ہو گیا تو اُس نے ارمینہ کو پانی پلایا، پھر دونوں ہاتھوں سے اُسکے بال سنوارے۔

''تمہیں بکرا دیکھنا ہے؟''اُس نے رضا کو دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو جاؤ، سب کے ساتھ جا کر دیکھو۔''وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتے آگے بڑھی، پھر رک گئی۔ مڑ کے رضا کو دیکھا۔ اُس نے اشارے سے اُسے آگے بڑھنے کو کہا تو وہ ہمّت کرتی بلآخر بچوں کے پاس پہنچ گئی۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اُنکے ساتھ کھیل رہی تھی۔

آج پورے مہینے بعد رضا نے اُسکے چہرے پر ہنسی دیکھی تھی، اُسکے دل سے منوں بوجھ ہٹا، اُس نے کرسی سے سر ٹکا دیا۔ پچھلے ایک مہینے سے وہ اُسے خوف کے سائے سے باہر نکالنے اور نارمل بچوں کیطرح زندگی گزارتے دیکھنے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا تھا۔ بلآخر آج اُسے کامیابی مل گئی تھی۔

اُسکا ذہن کہیں اور پہنچنے لگا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، ہسپتال کے یخ بستہ ماحول میں بدلنے لگے۔ وہ ہسپتال کے کمرے کے دروازے پر تھا۔ اُسکے قدم باہر کی طرف تھے کہ تب کسی نے پُکارا۔

''رضا!''وہ رکا، پلٹا اور نوید کو دیکھا۔ باقی تینوں باہر نکل گئے۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''نوید نے کہا تو وہ حیران ہوتا اُس تک آیا۔ ڈاکٹر دوسری جانب ہو کر ایکس رے رپورٹ دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟''سنجیدگی سے پوچھا۔ جانتا تھا کہ اسکو کیا بات کرنی ہو گی۔

''آج جو ہوا اُسکے لیے معذرت چاہتا ہوں۔''اُسکے کے لہجے میں شرمندگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''تم کیوں معذرت کر رہے ہو؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''شک تو میں نے بھی کیا تھا تم پر؟''

''وہ تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم مجھے خلیل کے ساتھ دیکھتے تو اس طرح کا تماشا لگانے کے بجائے مجھ سے اکیلے میں پوچھ لیتے۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔'' وہ جتنی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، اتنا ہی نوید شرمندگی کے دلدل میں دھنس رہا تھا۔ علی نے غلط کیا تھا۔۔۔ بہت غلط۔۔

''علی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اُسے۔۔'' وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ شاید اُسکی کی طرف سے بھی معذرت کرنا چاہتا تھا کہ اچانک ہی رضا نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسکی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' پھر اُسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر چلا گیا، وہ دکھی ہوا۔

رضا نے حقیقتاً بہت ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اُسے جواب دے سکتا تھا، مگر اس نے نہیں دیا۔ اُسکے پاس اچھا موقع تھا، چاہتا تو اُسی لمحے اُسکی تذلیل کر سکتا تھا مگر چپ رہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اُس نے دس سال پرانی دوستی کا پاس رکھ لیا تھا۔ اور یہ وہ شے تھی جو علی کو نظر نہیں آئی تھی۔ پر نوید کو نظر آگئی تھی۔ پچھلی تین ملاقاتوں میں اُس نے جو اجنبیت اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی، آج وہ اجنبیت کہاں گئی؟ کیسے وہ صرف ایک خبر سن کر، ہسپتال دوڑا چلا آیا تھا۔ وہ آیا تھا۔ اور صرف نوید کے لیے آیا تھا۔

''یہ بالکل آپ کے جیسا ہے۔ دیکھو اسکی بھی آپکی جیسی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں ہیں۔ چھوٹی سی ناک ہے اور کیوٹ بھی آپکے جتنا ہے۔'' جزا کی آواز پر وہ ماضی سے باہر آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ تین سالہ ولید کو گود میں لیے بکری کے بچے کے قریب پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔ ولید اُس سے ڈر رہا تھا شاید، تو وہ اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کتنا بے ضرر اور معصوم ہے۔ رضا کو یہ منظر بڑا پیارا لگا۔

''لیکن اُسکی ناک بڑی ہے۔'' ولید کو اعتراض ہوا تو وہ ہنس پڑی۔ اُسے یاد آیا کہ پچھلی بار وہ یہاں سے ناراض ہو کر گئی تھی۔ لہٰذا اُٹھ کر اُسی کے پاس چلا آیا۔

''اچھا! لیکن اسکے دانت تو آپکے جیسے ہیں، چھوٹے چھوٹے سے۔'' بات کرتے ہوئے اُسکے نظریں گھاس پر سفید جو گرز میں مقید پیروں سے ہوتی اُسکے سر پر کھڑے، مُسکراتے ہوئے رضا تک گئیں۔ آج وہ گھر پر تھا، اسی لیے فورمل حلیے کے بجائے بلیو جینز پر بلیک ہڈی پہنے کھڑا تھا، ہڈ کندھوں پر تھا۔ جزا نے اسکو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

''محترمہ جھانسی کی رانی! کیا آپ سے بات ہو سکتی ہے؟'' شرافت سے پوچھا تو اس خطاب پر اُس نے سلگ کر اُسے دیکھا۔

''کیا ہے؟'' لٹھ مار انداز میں کہتی کھڑی ہوئی۔

''پولیس والوں نے دوبارہ تو تنگ نہیں کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں۔'' مختصر جواب دیا۔ ظاہر کیا کہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے، بہتر ہو گا کہ وہاں سے چلتا بنے۔

''چلو اچھا ہوا، یقیناً تم سے ڈر گئے ہوں گے۔'' وہ بھی ٹک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

''میں وہاں سے گزری نہیں ہوں اب تک، اسی لیے ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔'' اُس نے جتایا۔

''دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ کچھ دن اُس راستے سے نہ گزرو۔'' جزا کے تو سر پر لگی تلوؤں پر بجھی۔

''میں اسی لیے وہاں سے نہیں گزری کہ مجھے فلحال کوئی کام نہیں تھا وہاں، لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں وہ راستہ استعمال نہیں کروں گی۔ ڈر کر گھر بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' سختی سے جواب دیا۔

''جزا!'' اب کہ وہ بھی سنجیدہ ہوا۔ ''تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کچھ معاملات مصلحت کے تحت حل کیے جاتے ہیں۔'' وہ سمجھانا چاہ رہا تھا لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''تم۔۔۔'' اس سے پہلے وہ کچھ کہتی بیل بجی، عائشہ جی نے دروازہ کھولا تو وہی عورت اندر داخل ہوئی جو کچھ دنوں پہلے بھی یہاں آئی تھی۔

''فریحہ!'' دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رضا اُسے دیکھ کر سیدھا ہوا۔ پرپل رنگ کے ٹو پیس سوٹ میں جسکے سر سے بازو ہی نہیں تھے، اسٹیپس کٹنگ بالوں کو کھلا چھوڑے وہ دروازے سے ہی ہاتھ ہلاتی اندر داخل ہوئی تھی۔ جزا نے چہرہ گھما کے رضا کو دیکھا۔ آج پھر اُسکے چہرے پر خوشگوار حیرت نظر آئی تھی۔ وہ گفتگو درمیان میں چھوڑ کر آگے بڑھا اور اُسکے پاس چلا آیا۔ جزا سے معذرت بھی نہیں کی، اُسے ساتھ آنے کو بھی نہیں کہا۔ اب وہ دونوں ہی اُسے کچھ دور ایک دوسرے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اُسکے چہرے پر ناگوار سا تاثر اُبھرا، اُنکی طرف سے چہرہ موڑ کر رخ پاس کھیلتے بچوں کی جانب کر دیا۔

''جزا!'' اُسی لمحے عائشہ جی اُسکے پاس آئیں۔

''جی؟''

''بیٹا ذرا ولید کو مجھے دینا۔ فریحہ کے پاس لیکر جانا ہے۔'' اُنہوں نے کہا تو اس نے نا سمجھی سے ولید کو اُنکے حوالے کر دیا۔ پچھلی بار بھی جب آئی تھی، تو ولید سے ملی تھی۔

''کون ہے یہ خاتون؟ اور ولید سے کیوں ملتی ہے؟'' اُس نے آہستگی سے پوچھا۔ رضا اب سنجیدگی سے فریحہ کی کوئی بات سن رہا تھا۔

''یہ ولید کی ماں ہے۔'' اُنہوں نے جیسے انکشاف کیا۔

''سگی ماں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں!''

''تو ولید کو یہاں کیوں چھوڑا ہوا ہے؟''

''ولید کا باپ مر گیا تھا، فریحہ کے باپ بھائیوں نے اُسکی شادی زبردستی ایک امیر آدمی سے کروادی۔ اب نہ وہ آدمی ولید کو ساتھ رکھنے پر تیار ہے نہ فریحہ کے گھر والے۔ بیچاری بہت مجبور ہے، پچھلے تین سالوں سے اپنے شوہر کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ بھی ڈھیٹ آدمی ہے مان کر ہی نہیں دیتا۔ جب کبھی کسی بزنس ٹرپ (کاروباری دورے) پر ملک سے باہر جاتا ہے تو یہ بیچاری اپنی ممتا ٹھنڈی کرنے اسے اپنے گھر لیجاتی ہے۔ پھر شوہر کی واپسی سے پہلے اُسے واپس یہاں چھوڑ جاتی ہے۔ بہت روتی ہے اپنے بچے کے لیے۔۔۔'' وہ دکھی لہجے میں بتا رہی تھیں۔

''تو یہ شادی شدہ ہے؟'' جزا نے ساری باتوں کے جواب میں بس اتنا ہی کہا۔

''ابھی تک تو۔۔۔'' اُنکے جواب پر وہ چونکی۔

''مطلب؟''

''اس نے کچھ کاروبار اپنے نام پر بھی شروع کیا ہے، اب اپنے بچے کے لیے اپنے شوہر پر انحصار نہیں کرتی۔ کہہ رہی ہے کہ اس بار یا تو اپنے شوہر کو راضی کریگی یا طلاق لے لے گی۔ لیکن اب ولید کو مزید خود سے دور نہیں رکھے گی۔'' اُنہوں نے بتایا تو پتہ نہیں کیوں؟ پر یہ بات اُسے بری لگی تھی۔

رضا نے عائشہ جی کو بیٹھے بیٹھے اشارہ کیا تو انہوں نے سر ہلایا اور ولید کو لیے آگے بڑھ گئیں۔ فریحہ اب اپنے بچے سے مل رہی تھی۔ عائشہ جی بھی انہی کے ساتھ، پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ جزا کو اپنا آپ وہاں اضافی لگنے لگا تو خاموشی سے اندر چلی آئی۔

اُسے بنا کسی وجہ کے ہی فریحہ سخت بری لگی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ جس طرح کے حالات عائشہ جی نے اُسکے بتائے تھے، اپنے چہرے سے تو وہ کہیں سے بھی ایسے حالات کی ماری عورت نہیں لگتی تھی۔ اللہ جانے وہ سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ؟

وہ خاموشی سے بچوں کی کاپیاں لیکر بیٹھ گئی۔ اب اُسے کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

---------+---------+--------

لان میں رکھی میز کے گرد عائشہ جی، رضا اور فریحہ بیٹھے تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ ولید فریحہ کی گود میں تھا۔ رضا کی نظریں بار بار بھٹک کر گھر کے دروازے تک جاتیں جہاں سے جزا اندر گئی تھی پر دوبارہ باہر نہیں آئی۔ لاشعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ وہ خود یہاں آئے اور اُس خالی رکھی چوتھی کرسی پر بیٹھے، فریحہ سے ولید کے متعلق بات کرے۔ آخر کو وہ اُسکی استاد تھی۔ لیکن اُسے نہ آنا تھا وہ نہ آئی۔

''رضا! تم سے ایک بات کہنی تھی۔''فریحہ نے اُسے مخاطب کیا تو وہ اُسکی جانب متوجہ ہوا۔

''کہو!''

''میں اپنے شوہر کو راضی کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ شاید اس بار وہ مان جائے۔ جیسے ہی وہ راضی ہو جائیگا میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گی ولید کو لینے میں۔۔۔اس لیے اگر تم۔۔''وہ رکی، رضا سمجھ گیا۔ فوراً عائشہ جی کی جانب چہرہ کیا اور کہا۔

''عائشہ جی! فریحہ جس وقت بھی ولید کو لینے آئے۔ چاہے میں یہاں ہوں یا نہ ہوں، ولید کو اُسکے حوالے کر دیجئے گا۔ مجھے بس اطلاع کر دیجئے گا۔ اس بات کی پرواہ مت کیجئے گا کہ میں نے فون اٹھایا یا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ فضول کی فورمالیٹی (رسومات) کی وجہ سے کوئی ماں اپنی اولاد سے دور رہے۔''

''ایسا ہی ہو گا رضا!''عائشہ جی نے یقین دلایا۔

''تمہارا بہت شکریہ! اللہ تمہیں اسکا بہت اجر دیگا۔ تم نے میری بہت مدد کی ہے۔''وہ نم آنکھوں سے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

---------+---------+--------

''ویسے ناشتا کیوں نہیں کیا آج؟''عمر نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بس آج دل نہیں کر رہا تھا بنانے کو۔''

''کیا مطلب؟ تم خود ناشتا بناتے ہو؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں!''

''کیوں؟ اکیلے رہتے ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سولہ سال پہلے کی ایک صبح، جب اُس نے رضا سے یہ سوال کیا تھا، وہ اُنکی دوستی کا آغاز تھا۔

''اتنا اُداس کیوں رہتے ہو؟''عمر نے اس سے پوچھا تھا۔

''کون میں؟''

''ہاں!''

''نہیں نہیں۔۔۔میری فطرت ہی ایسی ہی شاید۔''اس نے ہنستے ہوئے اسکی غلط فہمی دور کرنی چاہی تھی۔

آوازیں یاد بن کے اُسکے کانوں میں گونجی تھیں۔زندگی کتنی خوبصورت تھی؟دل کرتا تھا کوئی ہوا چلے اور اٹھا کے اُسے ماضی میں چھوڑ آئے۔وہ وہیں رہے اور مستقبل کبھی نہ آئے۔

ہاتھوں میں موبائل لیے عمر،شیراز کا میسیج دیکھ رہا تھا۔اپنے کہے کے مطابق اُس نے رات ہی اُسے نوید کا نمبر بھیج دیا تھا۔لیکن چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی عمر اُس سے کچھ نہ پوچھ سکا تھا۔نظریں نوید کے نمبر پر تھیں اور ذہن کے نہاں خانوں میں رضا کی باتیں گونج رہی تھیں۔وہ تب بھی اُسے جان نہ سکا تھا اور آج بھی۔۔۔

آج کل اُسے اپنے دوست بہت یاد آتے تھے،پرانی باتیں،ساتھ گزارے ہوئے تمام لمحات یاد آتے تھے۔دس سالوں میں جن لوگوں کو اُس نے ماضی کا حصّہ بنا کے یادوں کے صندوق میں بند کر دیا تھا،وہ اب اُسکے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے،وہ ماضی سے پھر حال بن گئے تھے۔اُنہیں سامنے دیکھ کر،اُن سے مل کر اب وہ خود ماضی سے باہر نہیں آ پا رہا تھا۔پتہ نہیں تقدیر کیا چاہتی تھی؟

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے بلآخر نوید کو اپنا نام میسیج کیا۔پھر اگلے میسیج میں اُس سے اُسکا حال پوچھا۔اگر ایک دہائی پہلے اُسے نوید کو میسیج کرنا ہوتا تو وہ کبھی بھی اتنی سوچ بچار نہ کرتا۔لیکن آج ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔خلا باقی تھا۔

اُسے میسیج کیے منٹ بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ وہاں سے فوراً ہی جواب آیا۔

''جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔میں بالکل ٹھیک ہوں اور آفس میں ہوں۔بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے ہو۔''اُسکے تسلی دینے کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہنس پڑا۔

''مجھے معلوم ہے۔''اُس نے بس اتنا ہی لکھا۔پھر کچھ سوچ کر دوبارہ میسیج ٹائپ کرنے لگا۔

''تم سے ایک کام تھا۔''

''بولو!''

''رضا کے گھر کا ایڈریس مل سکتا ہے؟''

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میرے پاس اُسکا ایڈریس ہو گا؟'' سوال معقول تھا۔

''ایف آئی اے آفیسر ہو،معلوم تو کر سکتے ہو۔'' اُسکا جواب بھی کافی معقول تھا۔

''تم بھی علی کی طرح شک کر رہے ہو اُس پر؟'' اُس نے پوچھا تو عمر مسکرایا۔

''نہیں! ملنا چاہتا ہوں اُس سے'' اور اگلے ہی لمحے رضا کا ایڈریس اُسکے پاس آ چکا تھا۔

''تھینکس ا'' شکر ادا کرنا ضروری تھا۔ اُس نے جواب نہیں دیا اور آف لائن ہو گیا۔ اب وہ صوفے سے ٹیک لگائے لوکیشن سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

---------+---------+--------

فریحہ ولید کو ایک ہفتے کے لیے ساتھ لے گئی تھی۔ ولید پچھلے تین سال سے اُسکے ساتھ تھا، جب فریحہ اُسے رضا کے پاس چھوڑ کر گئی تھی تب وہ چار ماہ کا تھا، وہ پناہ گاہ میں آنے والے اب تک کے تمام بچوں میں سب سے کم عمری میں یہاں آیا تھا۔ رضا کو وہ بہت پیارا تھا۔ جب بھی فریحہ اُسے اپنے ساتھ لیکر جاتی، وہ اُسے بے انتہا یاد کرتا تھا۔ لیکن وہ خود کو اس جدائی کا عادی بنا رہا تھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ولید اپنی ماں کے پاس واپس چلا جائیگا۔ فریحہ ولید کو لے گئی تو وہ باہر آ گیا۔ بنا کسی وجہ کے وہ سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ جزا بھی اس سے ملے بنا ہی چلی گئی تھی، پتہ نہیں وہ اتنا ناراض کیوں تھی؟

جزا کا خیال آیا تو آپ ہی آپ مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی۔ آج وہ پیازی رنگ کا گھیر دار فراک پہنے ہوئی تھی۔ لباس کی ہم رنگ شال کندھوں پر ڈالے وہ ٹھیک ٹھاک ٹپی ہوئی تھی۔

''اُن پولیس والوں کا کچھ کرنا ہو گا۔'' دل میں سوچا۔ ذہن میں یاداشت کے گھوڑے دوڑائے اور ہر وہ تعلق یاد کرنا چاہا جو اس وقت اُن پولیس والوں کی عقل ٹھکانے لگانے کے کام آ سکتا تھا۔ بہت لوگ تھے جو اُسکے لیے یہ کام کر سکتے تھے۔ ایک رہائشی علاقے میں سڑک کنارے اُس نے گاڑی روک دی اور جیب سے موبائل نکالا کر اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے، کانٹیکٹ لسٹ کھنگالنے لگا۔ ابھی اُسکی تلاش جاری ہی تھی کہ خاموش فضا میں کسی عورت کے رونے اور مرد کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اُسکی انگلیاں تھمی، چہرہ اٹھا کر اچھنبے سے آس پاس دیکھا، اور اُسی گلی کے آخری گھر کے دروازے پر جو منظر اُسے نظر آیا تھا، اُس نے اُسکے حواس سلب کر دیئے تھے۔ موبائل اُسکے ہاتھوں سے ڈیش بورڈ پر گرا تھا۔

وہ مرد اپنی بیوی کو برا بھلا کہتا، چن چن کر غلیظ الفاظ استعمال کرتا اُسے بازوں سے پکڑے دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔ یہ سوچے بنا کہ آس پاس کے کچھ گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں پر لوگ کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ مرد کے قریب ہی سات آٹھ سال کا بچہ، ڈرا سہما، خوفزدہ سا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

وہ عورت اُسکے پاؤں پر گر گئی، بچہ گھبرا کر عورت سے چپک گیا۔ مرد نے اُسے خود سے پرے کیا اور بچے کو تقریباً اُس سے چھینتے ہوئے اندر کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ عورت دروازے پر ہی بیٹھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اپنے اپنے گھروں سے جھانکتے لوگ بھی اب افسوس کرتے اندر چلے گئے تھے۔ کوئی بھی اُس سے ہمدردی کرنے نہیں آیا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور عورت کی سسکیاں پورے علاقے میں گونج رہی تھیں۔

رضا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھی کرنے کے بارے میں سوچتا، اُسی گھر کا دروازہ دوبارہ کھلا، اور ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ اُس نے عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر لے گیا۔ اور اُسکے بعد ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ رضا کا دم گھٹنے لگا تھا۔

وہ جانتا تھا اُس مرد کو۔۔۔ اچھے سے جانتا تھا۔

لیکن وہ ایسا نکلے گا؟ یہ اُمید نہ تھی اُسے۔

سرد موسم ہونے کے بعد بھی اُس نے گاڑی کا اے سی آن کر دیا تھا۔

بچے کی آنکھوں میں طاری خوف۔۔۔ یہ خوف اُسے شناسا سا لگا تھا۔ کیسے نہ لگتا؟ اُسکی ماں بھی تو ایسے ہی روتی تھی، اُسکا باپ بھی تو ایسے ہی غلیظ الفاظ اُسکے لیے استعمال کرتا تھا۔ اور وہ بھی تو اسی طرح اپنی روتی بلکتی ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اُسکی دادی بھی تو ایسے ہی آ کر اُسکی ماں کی دلجوئی کرتی تھیں، جیسے اُس بوڑھے آدمی نے آ کر اُس عورت کی، کی تھی۔ کہانی وہی تھی، کردار بدل گئے تھے۔

تو کیا تقدیر ایک اور رضا کو پروان چڑھانے والی تھی؟

---------+---------+--------

صبح کے بعد اُسکا عمر سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ آفس سے بھی وہ اُس سے ملے بنا ہی نکل آیا تھا، ذہن منتشر تھا۔ اپنے اوپر چڑھایا ہوا حقیقت پسندی کا خول چٹخنے لگا تھا۔ گھر آیا تو عمر کا میسج موبائل سکرین پر جگمگاتا نظر آیا، کھول کر دیکھا تو اس نے نوید کا نمبر بھیجا تھا۔ کہا کچھ بھی نہیں، لیکن علی سمجھ گیا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ وہ نوید سے خود ہی بات کر لے۔

لیکن کیسے کرے؟ کس طرح؟

تم نے نوید کی دوستی کا بھرم بھی نہیں رکھا تھا، دس سال پہلے تم نے اُسکے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟

عمر کے الفاظ یاد آئے۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا وہ، جو کچھ اس نے نوید کے ساتھ کیا تھا، کیا اُسکے بعد بھی وہ اتنے آرام سے اُسے کال کر کے اُسکا حال احوال دریافت کر سکتا تھا؟ کیا اتنا آسان تھا؟ پھر جس طرح کل حسین نے پوچھا تھا کہ **"لے لیا تم نے اپنا انتقام؟"** وہ تو وہیں زمین میں گڑ گیا تھا۔ وہاں کھڑے ہر شخص نے اُسکے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟ کیا سمجھا ہو گا اُسے؟ ایک انتقام کی آگ میں اندھا شخص؟ لیکن وہ تو اُنھیں بھلا چکا تھا نہ؟ تو اُسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ اُسکے بارے میں جو بھی سوچیں؟ لیکن اُسے فرق پڑ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔

ذہنی طور پر وہ اس حد تک تھکا ہوا تھا کہ اُس نے کپڑے بھی تبدیل نہ کیے، آفس والے لباس میں ہی صوفے سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا۔ اُس نے صبح ناشتہ نہیں کیا تھا، دوپہر میں لنچ بھی نہیں کیا اور اب گھر آ کر رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے بھوکا پیاسا گھوم رہا تھا، ذہن منتشر تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ جب اُسے بیل بجنے، اور دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اُسکے بعد خاموشی سی چھا گئی۔ جب بہت دیر اسی طرح خاموشی سے گزرے، تو اُسے کسی ان ہونی کا احساس ہوا۔ وہ کھڑا ہوا، اپنا کوٹ اُتار کے صوفے پر پھینکا اور آستینیں موڑتا باہر آیا۔ اور وہی ہوا، جسکا اسے ڈر تھا۔ اُسکے بدترین خدشے کی تصدیق ہو چکی تھی۔

فاطمہ سامنے تھی اور احمد کو اپنے ساتھ لگائے اُسے چوم رہی تھی۔ حیرت اُسے اس بات کی تھی کہ احمد بھی اُسکے گلے لگا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سب سے پہلے سفیر صاحب کی نظریں اُس پر پڑیں، اُنکے ہاتھ کانپے، دِل لرزہ۔۔۔

''آ۔۔ علی۔۔۔ وہ۔۔ میں نے۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ فاطمہ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا وہ لہو رنگ آنکھوں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر کھڑی ہوئی۔

''ذلیل عورت! میں نے منع کیا تھا نا تمہیں؟'' فاطمہ کا چہرہ سرخ ہوا۔ وہ قدم قدم اٹھاتے اُسکی طرف بڑھ رہا تھا۔

''علی! میری بات سنو! میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' سفیر صاحب بیچ میں آنا چاہتے تھے لیکن وہ فاطمہ کا بازو دبوچ چکا تھا۔

''منع کیا تھا نا میں نے، کہا تھا نا دور رہو میرے بیٹے سے۔'' وہ حلق کے بل چیخا تھا۔

''علی! علی میں۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''نام مت لو اپنی غلیظ زبان سے میرا۔'' وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے چیخا تھا۔

''میں بس اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ میری بھی اولاد ہے۔ میں نے پیدا کیا ہے اسے، ماں ہوں میں اِسکی۔'' بلآخر وہ چیخ اٹھی۔ علی کے تو دماغ پر لگے تھے اُسکے الفاظ۔ احمد سہم کر کبھی ماں کو تو کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''ایسے نہیں سمجھو گی تم، تمہارے جیسی آوارہ عورتوں کو عزت کی زبان راس نہیں آتی۔'' فاطمہ کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے علی اُسے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لیجانے لگا۔

''نہیں!۔۔۔ نہیں علی! میری بات سنو! ایک مرتبہ سن لو پھر جو چاہے کرنا۔'' وہ اُسکے ساتھ گھسیٹتی منت کر رہی تھی۔ پر وہ سن کہاں رہا تھا؟

''علی! ایک مرتبہ اُسکی بات سن لو، اُسکے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ ہے۔'' سفیر صاحب بھاگتے ہوئے اُسکے پیچھے آ رہے تھے۔

''آپ بیچ میں نہیں آئینگے۔''لہورنگ آنکھیں اٹھا کے اُس نے اپنے باپ کو دیکھا۔

''بابا! نہیں۔۔۔بابا پلیز!''اُسکا بیٹا بلک بلک کر روتا اُسکے پاؤں سے لپٹا تھا۔

''اندر جاؤ تم۔۔۔''اُس نے چیختے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلا۔رات کے اس پہر اچھا خاصا شور شرابہ مچ چکا تھا۔

''علی! نہیں۔۔۔تمہیں میری بات سننی ہو گی۔''وہ چیخ رہی تھی۔لیکن وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے مرکزی دروازے تک لایا، پاس رکھے گملے پر اُسکا پاؤں لگا اور وہ ٹوٹ گیا۔علی نے پرواہ نہ کی اور اسی طرح اُسے گھسیٹتے ہوئے دروازے سے باہر دھکا دیا۔گملے سے اُسکا پاؤں زخمی ہوا تو وہ سسک اٹھی تھی۔

''علی! خدا کے لیے رک جاؤ بیٹا!''سفیر صاحب دل پر ہاتھ رکھے رو دیئے تھے۔احمد منع کرنے کے باوجود باہر آ گیا تھا۔

''تمہارے جیسی پنچ قماش کی عورت کی یہی اوقات ہے۔''اُسے دروازے سے باہر تقریباً پھینکتے ہوئے وہ چیخا تھا۔اُسکے حواس ساتھ دیتے تو اُسے کچھ احساس ہوتا کہ وہ اپنے ہی گھر کا تماشا محلے میں لگا چکا ہے۔

''علی! ایک بار سن لو، ایک بار۔۔۔ایک بار میری بات سن ل!و''وہ اُسکے پاؤں پڑی تھی۔اُس نے اپنے پاؤں پیچھے کیے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے، اپنا مکروہ چہرہ لیکر اُنہی لوگوں کے پاس جاؤں، جن کے پیسوں پر مرتی رہی ہو۔''اس بات پر وہ ساکن ہو گئی۔احمد روتا ہوا کب وہاں آیا اور کب اُسکے گلے لگا؟ اُسے معلوم نہ ہو سکا۔

''امی۔۔۔امی!''وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔اور علی ٹھہر گیا۔یہ کیسے ہوا تھا؟ اُسکا بیٹا اس عورت کو اپنی ماں کیسے کہہ رہا تھا؟ اگلے ہی لمحے نفرت کا اُبال اٹھا تھا اُسکے اندر، اس نے احمد کو جھپٹ کر اُس سے الگ کیا اور اندر گھسیٹتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''نہیں! مجھے امی کے پاس جانا ہے۔امی۔''وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔خود کو چھڑوانے کی جتنی کوشش کر سکتا تھا کر رہا تھا۔

''نہیں ہے وہ تمہاری ماں۔''اُس نے ایک زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر جڑ دیا تھا۔اور ایسا آٹھ سالوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ اُس نے احمد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے گرا، سفیر صاحب بھاگ کر اُسکے پاس آئے اور اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ لگایا۔

''پاگل ہو گئے ہو علی؟ کیوں مار رہے ہو بچے کو؟''

''ہاں! ہو چکا ہوں میں پاگل۔۔۔مجھے پاگل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے آپ سب نے۔''وہ چیختے ہوئے بولا تھا۔اُسکی ذہنی حالت اس وقت ابتر ہو رہی تھی۔

''آپ نے بلایا نا اُسے ؟ کیوں کیا ایسا؟ کیوں ؟'' اگلے ہی لمحے سفیر صاحب اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ اُسکے چہرے پر دے مارا۔ شاک صدمہ، اور شدید بے یقینی سے اُس نے اُنہیں دیکھا تھا۔ اُسکی زندگی میں بھی یہ پہلی بار ہی تھا جب اُسکے باپ نے اُسکے اوپر ہاتھ اٹھایا تھا اور وہ بھی اُسکی اولاد کے سامنے۔

''اب میری بات کان کھول کر سنو، میں اُسے اندر لیکر آرہا ہوں۔ تمہیں اُسکی بات سننی ہو گی۔ اُسکے بعد وہ دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیگی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔'' آج بہت عرصے بعد انہوں نے اُسی سخت لہجے میں اُس سے بات کی تھی، جیسے وہ کسی زمانے میں اس سے کیا کرتے تھے۔ اُسکے بعد وہ اُسکے سامنے ہی دروازے تک گئے، فاطمہ کو اٹھایا اور اندر لے کر آئے۔ وہ اُسی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ فاطمہ کو اندر آتا دیکھ کے احمد بھاگتے ہوئے اُسکے پاس گیا اور اس سے لپٹ گیا۔

''امی !'' علی نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

''میرا بیٹا ! میرا احمد۔۔۔'' وہ روتے ہوئے اُسے پیار کر رہی تھی۔ اُس کی برداشت جواب دے گئی تو وہ اُسکی جانب مڑا۔

علی ! دیکھو۔۔۔ مجھے میرے بیٹے سے ملنے دو۔ بدلے میں میرے پاس تمہیں۔۔۔'' اُسے اپنی جانب دیکھتا پا کر فاطمہ نے دوبارہ اُس سے منت کرنے کی کوشش کی۔

''احمد ! کیا تم اس عورت کے ساتھ رہنا چاہتے ہو ؟'' اُس نے فاطمہ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ ڈر کر فاطمہ کے پہلو میں چھپا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے ؟ بابا کے ساتھ رہنا ہے یا اسکے ساتھ ؟'' سفیر صاحب کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے احمد کی آواز اس گھر میں گونجی تھی۔ اور پچھلے آٹھ سالوں میں اس بچے نے پہلی بار اس طرح تیز لہجے میں کوئی بات کہی تھی۔

''مجھے امی چاہیے۔۔۔ صرف میری امی۔'' علی کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''احمد ! کیا تم بابا کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ؟ اگر تمہیں امی چاہیے تو پھر تمہیں بابا کو اور اس گھر کو چھوڑنا ہو گا۔ اپنا روم، اپنی چیزیں چھوڑنی ہو گی۔'' وہ آٹھ سال کے بچے کو فیصلے کا اختیار دے رہا تھا۔ بے بس ہو رہا تھا۔۔۔ بے یقین ہو رہا تھا۔۔۔

''علی ! کیسی بات کر رہے ہو ؟ بچہ ہے وہ۔'' سفیر صاحب اُسے روکنا چاہتے تھے۔

''میں کچھ پوچھ رہا ہوں احمد !'' وہ دھاڑا۔

''نہیں رہنا چاہتا میں آپکے ساتھ۔۔۔ نہیں چاہیے آپ مجھے۔۔۔ آپ گندے ہیں، بہت برے ہیں آپ۔'' وہ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُسکا سانس رک گیا ہو۔

''مجھے میری امی چاہیے بس، مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا۔ آپ اچھے نہیں ہیں۔'' وہ بولے جا رہا تھا اور وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔ یہ آخری شے تھی، جو وہ تصوّر کر سکتا تھا۔ اُسکے لیے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔

''امی! مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ پلیز'' اب وہ بلک بلک کے فاطمہ کی گود میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ علی نے آنکھوں میں آئی نمی کو اندر دھکیلا اور گہرا سانس لیکر خود کو کمپوز کیا۔

''میں جا رہا ہوں۔ میرے واپس آنے تک اپنا سامان پیک کر لو۔ میں واپس آؤں تو تم دونوں ہی گھر پر نہیں ملنے چاہیے ہو مجھے۔'' یہ بات اُس نے اپنے بیٹے کے لیے کہی تھی۔ اپنی اولاد کے لیے۔۔۔ اور کہہ کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔

یہ آخری خنجر تھا، جو قسمت نے پوری قوت کے ساتھ اُسکے دل میں گھونپا تھا۔ اُسکی ایک اولاد کو فاطمہ نے قتل کیا تھا اور دوسری کو آج وہ خود چھوڑ آیا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ علی سفیر سے کوئی محبت نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔۔ کوئی ایک بھی نہیں۔۔۔

وہ محبت کے قابل ہی نہ تھا، وہ کسی کو اپنا نہیں بنا سکا تھا۔ نہ باپ، نہ دوست، نہ بیوی اور نہ ہی اولاد۔

اُس کی قسمت میں کڑھنا تھا، گھٹنا تھا اور ایک دن ایسے ہی گھٹ گھٹ کر مر جانا تھا۔

وہ ساری رات علی سفیر نے سڑکوں پر گزاری تھی، آج اگر نوید کہیں سے آ کر اُسے کہتا کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو تو وہ شاید زندگی ہی ختم کر دیتا۔

ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو کسی کام کی نہ تھی؟

---------+---------+--------

خلیل مر گیا تھا یا اپنے گھر میں مردہ پایا گیا تھا۔ اُسکی موت کا کوئی سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ فرمان تک پہنچنے کا ایک وہی راستہ تھا، اس بار اُنہوں نے ہر طرح کی احتیاط کی تھی۔ لیکن سب بے سود۔۔۔

''سر! آپ نے جو کہا تھا وہ ٹھیک نکلا۔'' وہ سوچوں میں غرق تھا جب شیراز نے اُسکے پاس آتے ہوئے اطلاع دی۔ لمحوں میں اُس نے اُسکی بات کا مفہوم سمجھا تھا۔

''کیا مطلب سچ ہے؟ تم نے کیا کیا پھر؟'' اُسکے ماتھے پر بل پڑیں۔

''اُنکی جانب سے دوبارہ کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ دوبارہ کچھ ہو تو اطلاع دینا۔'' شیراز نے کہا۔

''ہونہہ۔۔''اُس نے سر ہلایا پھر قریب بیٹھے فیصل کو دیکھا۔

''فیصل!''اُسے اپنے پاس بلایا۔

''جی؟''وہ قریب آیا۔

''تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ایک آدمی ہے اُس پر نظر رکھنی ہے تمہیں۔''نوید نے کہا۔

''کس بندے پر؟''اُس نے پوچھا۔

''تفصیل تمہیں شیراز بتادیگا۔تم نے کرنا یہ ہے کہ اُسکے کسی بھی غلط قدم سے پہلے مجھے اطلاع دینی ہے۔''نوید کی بات سن کر اُس نے سر ہلایا اور پھر شیراز کے ساتھ اُسکی ٹیبل پر جا کھڑا ہوا۔

وہ دونوں تفصیل سے گفتگو کر رہے تھے،اُنہیں دیکھتے نوید کا ذہن اس وقت بھٹک کے کہیں اور جا چکا تھا۔

''اُس نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟کیوں؟''ایک ہی سوال دماغ میں گونج رہا تھا۔

---------+---------+--------

وہ آج پھر پناہ گاہ نہیں گیا تھا۔دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی،تو اپنے فلیٹ چلا آیا۔سرد موسم کے باوجود اُسے اتنی گرمی لگ رہی تھی کہ ہڈی اُتار کے پاس رکھی میز پر رکھ دی اور خود کاؤچ پر گر گیا۔گھٹن کم نہ ہوئی تو پنکھا بھی چلا دیا۔پھر جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی اور منہ سے لگالی۔

اُسے علی ناپسند تھا۔شدید ناپسند۔۔۔لیکن اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے اس طرح کے روپ میں دیکھے گا۔اُس روپ میں جس میں اُس نے کبھی اپنے باپ کو دیکھا تھا۔وہ عورت اُسکی بیوی ہی تھی،رضا کو اُسکا چہرہ یاد آ گیا تھا۔اور وہ بچہ؟یقیناً وہ اُسکا بیٹا تھا۔

یہ اُسکی آنکھوں میں چھپا خوف نہیں تھا جس نے رضا کے دل میں آگ لگائی تھی،یہ اُسکی آنکھوں میں نظر آتی نفرت تھی،جس نے اُسے حیران کیا تھا۔اُس نے اس بچے کی آنکھوں میں وہی نفرت دیکھی تھی،جو اپنے باپ کے لیے اُسکی آنکھوں میں ہوا کرتی تھی۔

آج اُسے علی پر غصّہ نہیں ترس آیا تھا۔کیا بن گیا تھا وہ؟وہ کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُسکے حصے میں بھی اولاد کی نفرت آ رہی ہے؟

ایک اور گھر وہی بن گیا تھا یا بننے جا رہا تھا؟کیا وہ بچہ بھی رضا جیسی قسمت پائے گا؟کیا اُسکا مستقبل بھی اُسکے جیسا ہو گا؟دنیا کے دکھوں میں بچوں کا حصّہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔کبھی نہیں۔۔۔رضا نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہی بنایا تھا کہ کوئی بچہ اُسکے جیسا بچپن نہ گزارے۔اور اب ایک بچہ اُسکے سامنے تھا لیکن وہ

اُسکے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بے بسی کا احساس رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹے ٹکروں سے بھر گیا تھا۔ وہ سگریٹ بہت پیتا تھا، کبھی سڑک پر کبھی اپنے فلیٹ پر، لیکن اسکول، یونیورسٹی اور پناہ گاہ میں وہ مر کر بھی اسکا تصوّر نہیں کرتا تھا۔

ایک آگ سی اُسکے اندر بھر گئی تھی، ساتھ ہی وہ لوگ یاد آئے جو اُسکی زندگی جہنّم بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے اُس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنا موبائل باہر نکالا۔۔۔

جو فیصلہ اُس نے کیا تھا، وہ اُسکی نفرت کی انتہا تھی۔ اور اس نفرت میں وہ سب کو جلا کر راکھ کرنے والا تھا۔

---------+---------+--------

رات ٹھنڈ اچانک سے بڑھ گئی تھی، جیکٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے مقدّم نے بیل پر ہاتھ رکھا تو ہٹانا جیسے بھول گیا۔ دروازے کی کنڈی کھولنے کی آواز آئی تو اُس نے بیل سے ہاتھ ہٹایا۔

''سردی دماغ پر لگ گئی ہے؟'' جسکا صبح سے انتظار تھا، دروازہ اُسی نے کھولا تھا۔ اُسے دیکھ کر جہاں مقدّم کے چہرے پر خوشگوار حیرت اُبھری تھی، وہیں اُسکے چہرے پر خفگی در آئی۔

''باہر واقعی سردی بہت ہے۔'' اُس نے جتایا، دوسرے لفظوں میں کہا کہ میں تو جم جاؤں گا لہٰذا مجھے اندر آنے دیا جائے۔

''ہاں! سردی تو ہے، تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گی۔ ابھی لیکر آتی ہوں مکرم کو۔'' وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

''بھاڑ میں گئی اخلاقیات۔۔۔'' وہ سارے اخلاق بالائے طاق رکھتے ہوئے اندر آ گیا۔ ویسے انتہائی نامعقول حرکت تھی لیکن صد شکر کے صحن میں ہی نانی مل گئی۔

''ارے بیٹا تم۔۔۔ مقدّس نے بتایا ہی نہیں کہ تم آئے ہو۔'' وہ اُسکے پاس آئیں۔

''آپ اتنی سردی میں صحن میں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ اس بوڑھی خاتون کو اتنی ٹھنڈ میں صحن میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

''موسم انجوائے کر رہی تھی۔ خیر چھوڑو اس بات کو، تم اندر آؤ۔'' اُسکا ہاتھ پکڑ کر اسے لاؤنج میں ہی لے آئیں۔ وہ اس بوڑھی خاتون کی زندہ دلی پر حیران تھا۔

''آج تو تم چائے پی کر ہی جاؤ گے۔'' اُسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ قریب ہی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ایک خوش اخلاق سا مرد بیٹھا تھا۔ اُسکے سر پر ایک بھی بال نہ تھا، بالکل صاف شفاف کسی چٹان جیسا سر۔۔۔ مقدّم کو دیکھ کر مسکرایا تو اس نے بھی سلام جھاڑا۔

''چائے کی ضرورت نہیں ہے نانی! میں بس مکرم کو لے کر نکلوں گا۔''اُس نے معذرت کرنی چاہی،اُسی لمحے مکرم کو گود میں لیے مقدّس بھی وہیں آئی تھی۔اُسے دیکھ کر ٹھٹکی، پھر رکی۔یہ نانی بھی نا!

''ارے ایسے کیسے ؟مقدّس بنائے گی چائے،اور تمہیں پینی پڑے گی۔''یہ جواب اُس گنجے صاحب نے دیا تھا۔

''آپ کا تعارف؟''اُس نے ادب سے پوچھا۔

''میں مقدس کا ماموں۔''اُنہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے! آپ وہی ماموں ہیں؟''حیران ہوتے ہوئے کہا(جو طلاق یافتہ ہیں؟)۔

''وہی مطلب؟''وہ سمجھے نہیں۔

''وہی مطلب۔۔۔''وہ گڑبڑایا۔

''مقدّس نے میرے بارے میں کچھ ایسا ویسا بتایا ہے؟''وہ مشکوک ہوئے۔

''نہیں نہیں! میں نے کچھ نہیں بتایا۔''اُسکی حالت سے لطف اندوز ہوتے مقدّس نے فوراً وضاحت دی۔

''اگر مقدّس پلائے گی تو میں چائے پینے کو تیار ہوں۔''اُس نے فوراً سے کہااور ٹک کے صوفے پر بیٹھ گیا۔جتنی دیر وہ چائے بناتی رہی،اُسے گھورتی رہی۔۔۔ اتنی دیر اُسکے ماموں مقدّم کو کمپنی دیتے رہے۔اچھے خوش اخلاق لوگ تھے سب ہی۔

''چائے۔''اُسکے سامنے کپ رکھااور نیچے قالین پر مکرم کے ساتھ بیٹھ گئی۔نانی نجانے کہاں چلی گئی تھیں؟ماموں کچھ دیر بیٹھے رہے پھر اُنکے پاس کسی کی کال آئی تو وہیں بیٹھے بیٹھے فون پر بات کرنے لگے۔ایسے ہنس ہنس کر،اور چلا چلا کر بات کر رہے تھے جیسے وہاں اکیلے بیٹھے ہوں۔کئی بار تو مقدّم کو کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے۔

''تم سب کیا ایسے ہی ہو؟''اُس نے پریشان ہو کر مقدّس سے پوچھا۔

''ایسے سے تمہاری مراد؟''بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''ایسے یعنی تھوڑے عجیب سے۔۔۔''سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اور تم بھی ہمیشہ سے ایسے ہی ہو؟''اُسی کے انداز میں پوچھا گیا۔

''ایسے سے تمہاری مراد؟''اُس نے بھی اسی کے انداز میں پوچھا۔

''ایسے یعنی پورے عجیب سے۔''اب کہ وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکا۔

''کیا عجیب حرکت کی میں نے؟''مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جو مشکوک حرکتیں تم کر رہے ہو، عجیب نہ کہوں تو کیا کہوں؟''

''مشکوک؟''وہ حیران ہوا۔

''اُس دن خون آلود شرٹ کے ساتھ گھر آئے، آج صبح مجھے الٹے سیدھے میسیج کر رہے تھے۔''

''الٹے سیدھے؟''تڑپ کر اُسے دیکھا۔اُسکے انداز پر مقدّس نے مسکراہٹ دبائی۔

''شکریہ کا میسیج تھا بس!''چبا چبا کر کہا۔

''ہاں تو؟ ویسے تو میرے کسی میسیج کا جواب نہیں دیتے۔ صرف ری ایکٹ کر دیتے ہو۔اور آج بلاوجہ ہی شکریہ لکھ کے بھیج رہے ہو۔''بات معقول تھی۔

''وہ میسیج، میں اخلاق کو کر رہا تھا۔ غلطی سے تمہیں چلا گیا۔''

''اچھا!''ذرا لمبا کھینچا۔''کس بات کا شکریہ ادا کر رہے تھے اُسکا؟''

''مکرم کی خالہ کو بھیجنے کا شکریہ کر رہا تھا۔''اُسکے جواب پر وہ ٹھہری۔۔۔اور ٹھہری ہی رہ گئی۔وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''یہ شکریہ تم مجھے بھی کہہ سکتے ہو۔''جتایا گیا۔

''تمہیں کس لیے شکریہ؟ تم تو خالہ ہو، تمہاری تو ذمے داری ہے۔''اُسی کی بات اُسی کو یاد دلائی۔

''بد تمیز!''جل کے سوچا اور رخ پھیر لیا۔

''کیا بات ہو رہی ہے؟''ماموں نے فون رکھتے ہوئے اُن دونوں کو دیکھا۔

''میں مقدّم کو بتا رہی تھی کہ اگلے ہفتے آپکی شادی ہے۔''اُس نے بتایا تو جواباً ماموں ایسے شرمائے کہ اُنکی چمکتی ٹنڈ بھی لال ہو گئی۔

''ارے ماشاءاللہ! مبارک ہو۔ کہیں پڑوسن سے تو نہیں کر رہے شادی؟''پورے دس سال بات آج مقدّم کی زبان ویسے ہی پھسلی تھی، جو کسی زمانے میں اُسکا خاصا تھی۔اس بات پر ماموں نے آنکھیں پھاڑ کے اُسے دیکھا تھا۔یکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ شاید اس نے کچھ غلط بول دیا ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتا ماموں بول اٹھے۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''اب کہ حیران ہونے کی باری مقدّم کی تھی۔

''اس نے بتایا ناسب؟''مقدّس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''ماموں میں سوچ رہی ہوں کہ مکرم کی شاپنگ بھی کل کر لوں۔آخر کو یہ شہہ بالا بنے گا نہ؟''اُس نے صاف بات بدلی۔

''کیا مطلب مکرم بھی شادی میں جائیگا؟''وہ مزید حیرت سے بولا۔

''صرف مکرم کیوں؟اُسکا باپ بھی جائیگا۔''نانی پتہ نہیں کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔

''نہیں نانی! میرا آنا تو مشکل ہو جائیگا۔''وہ پریشان ہوا۔

''آنا تو پڑیگا،اور شاپنگ کے لیے کل تم مقدّس کو لے جاؤ گے؟اصل میں مجھے اپنی منگیتر کے ساتھ جانا ہے۔''اُنہوں نے شرمانے کی انتہا کر دی۔مقدّس آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں منع کرنے لگی، لیکن وہ اُسکی سنتے کہاں تھے؟

''اسے ابھی یہاں کے بارے میں اتنا معلوم نہیں ہے، تم ساتھ جاؤ گے تو ہمیں بھی تسلی رہے گی۔''نانی نے بھی کہا۔

''ٹھیک ہے! میں کل آفس سے جلدی آجاؤں گا۔''اُس نے حامی بھر لی۔مقدّس نے شرمندہ ہو کر اُسے دیکھا لیکن وہ کچھ پریشان سامیز کی جانب دیکھ رہا تھا۔

---------+---------+--------

دو راتیں، دو دن۔۔۔کیسے گزرے اُسے معلوم نہ ہوا۔پوری رات سڑکوں پر گزار کر جب وہ گھر واپس آیا تو گھر خالی تھا۔اُسکی زندگی بھی خالی اور اُسکا دل بھی خالی۔۔۔

سارا دن وہ سڑکوں پر احمد کو یاد کرتا رہا، کبھی وہ سائیکل چلاتا نظر آتا، کبھی ننھے قدموں سے اُسکی جانب آتا احمد یاد آتا۔وہ کبھی اُسے گلے نہیں لگا سکا، کبھی اُسے پیار نہیں کر سکا۔اب دل کر رہا تھا کہ وہ سامنے آجائے تو اُسے گلے لگا لے۔

دو روز سے سڑکوں پر گھومتے اُسے کئی بار خیال آیا کہ اُس نے احمد کو فاطمہ کے حوالے کیسے کر دیا؟ وہ تو اپنے مقصد کے لیے اُسکی اولاد کو قتل کر چکی تھی، تو کیا معلوم اب بھی اُسکا کوئی مقصد ہو؟ یہ خیال دل میں آیا تو اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا، کیوں احمد کو اُسکے ساتھ جانے دیا؟ جب برداشت جواب دے گئی تو گھر آکر سفیر صاحب سے فاطمہ کے نمبر پر رابطہ کروایا۔ احمد سے بات کروانے کو کہا تو کافی دیر تک وہ لائن پر نہیں آیا۔ جب وہ لائن پر آیا تو علی کچھ بول نہیں سکا، کتنی ہی دیر ضبط کیے کھڑا رہا۔ پھر کافی دیر بعد بولا تو آواز بھرا گئی۔

''گھر آجاؤ بیٹا!'' آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''مجھے آپکے ساتھ نہیں رہنا۔ آپ گندے ہیں۔'' اُس کے دل پر کسی نے آرا چلا دیا۔ اس سے زیادہ وہ نہیں سن سکا اور فون رکھ دیا۔

اُسکے بعد وہ اپنے کمرے میں جو بند ہوا تو پھر باہر ہی نہ آیا۔ سفیر صاحب دروازہ پیٹتے رہے لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلآخر پریشان ہو کر اُنہوں نے لاک تڑوا دیا۔ وہ شدید بخار میں تپ رہا تھا، حالت ایسی تھی جیسے ابھی سانسیں رک جائیں گی۔ اُنہوں نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلوایا۔

''شدید اسٹریس اور مسلسل بھوکے پیاسے رہنے کی وجہ سے انکی یہ حالت ہوئی ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ آپ نے صرف انکے ہوش میں آتے ہی انہیں کچھ کھلانا پلانا ہے۔'' ڈاکٹر ہدایت دے کر چلا گیا۔ سفیر صاحب ساری رات ڈرپ سے قطرہ قطرہ گرتے انجکشن کو دیکھتے رہے تھے۔

صبح جا کر اُسے ہوش آیا تھا، بخار بھی کچھ کم ہوا تو سفیر صاحب اُسکے لیے دلیہ لے آئیں۔ سوچا تھا کہ وہ یقیناً کھانا اٹھا کے پھینک دے گا۔ لیکن خلاف توقع اُس نے خاموشی سے کھانا کھا لیا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب ہو۔'' اُسے خاموش دیکھ کر اُنہوں نے کہا۔

''میں بات نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے آہستگی سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر مزید گزرے، پھر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔ زندگی سے ہر وہ شخص دور ہو گیا تھا، جسے اُس نے بے انتہا چاہا تھا۔

اسی طرح دوپہر گزری، پھر رات بھی آگئی۔ اس بار سفیر صاحب نے ملازم کے ہاتھوں کھانا بھیج دیا، خود اُسکا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا۔ رات اُسکی حالت کچھ خراب ہوئی تھی۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، کروٹ تک لینا محال ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے کسی کو نہیں بلایا، کسی کو آواز نہ دی۔ اپنے آپ سے جتنی نفرت کر سکتا تھا اس وقت کر رہا تھا۔

احمد کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔ اب کس کے لیے اتنی محنت کرے؟ کس کے لیے پیسے کمائے؟ اُسکا مستقبل کیا تھا بھلا اب؟ اکیلے انسان کی کیا خواہش ہوتی ہے؟ جب ضبط جواب دے گیا تو پاس رکھا تکیہ اٹھا کے چہرے پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُسکے دروازے پر

خاموشی سے کھڑے سفیر صاحب بے بسی سے واپس چلے گئے۔اُنہوں نے علی کو ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا،وہ کبھی نہیں روتا تھا۔لیکن اس بار وہ بری طرح ٹوٹا تھا۔وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔لیکن ایسا ہو گیا تھا،کاش وہ ایک بار فاطمہ کی بات سن لیتا۔گھر تو جیسے قبرستان بن گیا۔

وہ دن اور اُسکا اگلا دن بھی ایسے ہی گزر گیا۔سفیر صاحب پورے گھر میں بولائے بولائے پھرتے رہے۔علی بستر کو لگ گیا تھا اور یہ بات اب اُنکی جان پر بن رہی تھی۔

جب تیسرا دن آیا تو عمر بھی پریشان ہو گیا۔دو دن سے نہ علی آفس آیا تھا نہ اُس نے اُسکا کا فون اٹھایا تھا اور نہ ہی اُسکے میسیج دیکھے تھے۔ایسا پہلی بار ہوا تھا،ورنہ وہ ہمیشہ اُسے بتا دیا کرتا تھا۔

''کہیں وہ اس روز والی بات کا برا تو نہیں مان گیا؟''دل میں خیال آیا۔اور یہی سچ بھی لگا۔

''لیکن آفس تو آنا چاہیے۔''کچھ سوچ کر موبائل نکالا اور اُسکے گھر کے لینڈ لائن پر کال کی۔یہ نمبر علی نے ہی دیا تھا کہ کبھی ضرورت کی صورت میں وہ فون نہ اٹھائے تو اس نمبر پر کال کر لے۔صرف آفس کی ضرورت۔۔۔

دو سالوں میں آج پہلی بار عمر نے اس نمبر پر فون کیا تھا۔کافی دیر بیل جاتی رہی،جب اُسے لگا کہ فون بند ہو جائے گا تب ہی فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو!''فون سفیر صاحب نے اٹھایا تھا۔

''السلام علیکم انکل!میں عمر بات کر رہا ہوں۔علی کے آفس سے۔''اُس نے تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

''عمر!تم علی کے یونیورسٹی کے دوست ہو نا؟''وہ حیران ہوا۔اُنہیں وہ یاد تھا؟

''جی انکل!میں وہی ہوں۔علی سے بات ہو سکتی ہے؟''

''علی بہت بیمار ہے بیٹا،دو دن سے۔''

''اوہ!سب خیریت؟''

''شدید بخار ہے اُسے،کمزوری اتنی ہے کہ بستر سے اُٹھ بھی نہیں پا رہا۔''

''ایسے اچانک بیمار کیسے ہوا؟ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''دیکھایا تھا بیٹا!ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اُسے شدید اسٹریس ہے۔''وہ ساکت رہ گیا۔کیا اُسکی بات کا اتنا اثر لے لیا تھا اُس نے؟کیا یہ سب اُسکی وجہ سے ہوا تھا؟بھلا اسٹریس کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی؟اُسکو شرمندگی نے آگھیرا۔

''تم اُسکے پرانے دوست ہو، اُس سے بات کرو، اُسے سمجھاؤ۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا۔'' وہ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

''سمجھاؤں؟ کیا سمجھانا ہے اُسے؟ کس بارے میں؟'' وہ محتاط ہوا۔

''اُس نے تمہیں نہیں بتایا؟'' وہ حیران ہوئے۔ وہ بیچارے اُسے ابھی بھی علی کا دوست ہی سمجھ رہے تھے۔

''میں آپکی بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' اس نے نپے تلے الفاظ میں سوال کیا تاکہ انکو شک نہ ہو۔

''فاطمہ اور علی کی چار سال پہلے طلاق ہو گئی تھی۔ دونوں کا بیٹا احمد، وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ تین دن پہلے ہی وہ فاطمہ کے ساتھ چلا گیا ہے۔'' عمر کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ علی کی طلاق ہو گئی؟ کب اور کیسے؟ سفیر صاحب بہت کچھ بتا رہے تھے۔ لیکن اُسکا دماغ لفظ طلاق پر اٹک گیا تھا۔ جب کافی دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوا تو پوچھا۔

''کیا وہ اُسے زبردستی لے گئی ہے؟'' اُسے عمارہ یاد آئی۔ کیا ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟

''نہیں! احمد خود ہی گیا ہے اُسکے ساتھ۔۔۔ لیکن بیٹا! علی تب سے کمرے میں بند ہے۔ کسی سے بات نہیں کر رہا، کچھ کھا پی بھی نہیں رہا۔ بہت دل دکھا ہے اُسکا بیٹا! بہت زیادہ۔۔۔ تم آجاؤ کچھ دیر، اُسکے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں نے تو تین دن سے اُسکی آواز بھی نہیں سنی۔'' وہ رو دیے تھے۔ اُسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

علی پریشان تھا، یہ بات وہ جانتا تھا۔ لیکن پریشانی کی نوعیت اتنی شدید ہو گی اُسے معلوم نہ تھا۔ کاش! کہ اُسے معلوم ہوتا، وہ کچھ دن رک جاتا، بعد میں سمجھا دیتا اُسے۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا تھا اُس روز؟ اب اُسے شدت سے افسوس ہو رہا تھا۔ گھر ٹوٹنا چھوٹی بات نہیں ہوتی، انسان ختم ہو جاتا ہے۔ اوپر سے اُسکا بیٹا بھی اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا حالت ہو گی اُسکی؟

''میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں انکل! آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اُسے بتانا مت کہ میں نے تمہیں آنے کو کہا ہے۔'' اُنہوں نے کچھ سمجھانا چاہا۔

''ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں۔'' اُس نے اُنہیں تسلی دے کر فون رکھ دیا۔

لیلیٰ میری زندگی میں نہیں ہے۔

کچھ دن پہلے کے مقدّم کے کہے الفاظ اُسکے کانوں میں گونجے۔ وہ لیلیٰ کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا لیکن نوید والے واقعے کی وجہ سے وہ پوچھ نہیں سکا تھا۔

لیلیٰ مقدم کی زندگی میں نہیں تھی، علی کی طلاق ہو گئی تھی اور عمارہ اُسے چھوڑ گئی تھی۔ زندگی اُن سب پر اتنی ظالم کیوں ہو گئی تھی آخر؟

دوستی،انسانیت،رشتے۔۔۔یہ سب بے معنی ہو چکے ہیں میرے لیے۔

علی کی ہر ہر بات کا مطلب اب سمجھ آ رہا تھا۔

تم لوگ کس دن میرے بارے میں ٹھیک سوچنا شروع کرو گے ؟

اُسے اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ اتنا تلخ کیوں ہو گیا تھا؟ وہ اُسے کہتا رہا کہ تم رضا کی طرف کی کہانی جاننے کی کوشش کرو لیکن خود اُس نے کیا کیا؟ اُس نے بھی تو علی کو جاننے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اُسکا غصّہ رضا پر نہیں تھا، غصّہ فاطمہ پر بھی نہیں تھا۔ غصّہ زمانے پر تھا، زندگی پر تھا، قسمت پر تھا۔ پوری دنیا پر تھا۔

کاش! وہ اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا۔

---------+---------+--------

جسم شدید دکھ رہا تھا، لیکن اس حالت میں بھی وہ سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر سویا رہا؟ جب سر کا درد بڑھنے لگا تو آنکھیں خود بہ خود کھل گئیں۔ بستر سے اٹھنے کی کوشش میں کراہ اٹھا۔

''آرام سے۔'' کسی نے سہارا دے کر اُسے بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ حیران نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ عمر تھا۔

''تم؟''

''میں بنا بتائے آ گیا، معذرت!'' اُس نے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے وہ کب سے یہاں تھا؟

''نہیں! کوئی بات نہیں۔'' تکلیف آواز سے بھی جھلکتی تھی۔

''میری غیر موجودگی میں تمہیں پریشانی اٹھانی پڑی ہو گی۔'' علی نے بات کا آغاز خود ہی کیا۔

''نہیں! بلکہ میں تمہارے اس طرح اچانک غائب ہونے پر پریشان تھا۔ اسی لیے ملنے چلا آیا۔'' جواباً وہ خاموش رہا۔

''ابھی کیسی طبیعت ہے؟'' اُس نے علی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تین روز میں، اُس میں زمین آسمان کا فرق آ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے ہلکے پڑ گئے تھے، چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

''نارمل بخار ہے، ٹھیک ہو جائے گا کچھ روز تک۔۔۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے، تب تک آرام کرو۔ میں آفس دیکھ لوں گا۔''

''شکریہ!''وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''علی!''

''ہاں؟''سر اٹھا کے اُسے دیکھا۔

''اُس دِن میں نے جو بھی کہا،اسکے لیے میں شرمندہ ہوں۔مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔''وہ اپنی طرف سے اُسکی تکلیف کم کرنا چاہتا تھا۔

''میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ہاں!ہم کرینگے۔لیکن۔۔۔''اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اُسے کیسے تسلی دے؟کیا کہے؟کیا نہ کہے؟اور کہے بھی تو کیسے؟

''لیکن؟''علی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں!تم آرام کرو،میں چلتا ہوں۔''وہ کھڑا ہوا۔

''خدا حافظ!''وہ چلا گیا۔علی اُسے جاتا دیکھتا رہا۔وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا تھا۔اُس نے بھی اُسے نہیں روکا،اس وقت وہ کچھ بھی نہ سننا چاہتا تھا نہ بات کرنا چاہتا تھا۔

پر۔۔۔

اُسے علی کی فکر ہوئی تھی۔وہ اُسکے لیے آیا تھا،اُس سے ملنے آیا تھا۔وہ مہربان دوست۔۔۔آج بھی مہربان تھا۔علی نے تھک کر سر تکیے پر گرا دیا۔

-------+-----------+--------

تین روز،پانچ دنوں میں اور پانچ روز ہفتے میں تبدیل ہو گئے۔لیکن وہ آفس نہیں گیا۔عمر نے بھی حتیٰ الامکان اُسے آفس کے معاملات سے دور رکھا ہوا تھا۔بس کسی وقت میسیج کر کے اس سے حال احوال دریافت کر لیتا اور پھر اُسے آرام کرنے کی تلقین کر دیتا۔بخار اب اُتر چکا تھا،لیکن کمزوری اپنی جگہ تھی۔ایک ہفتے سے اپنے گھر میں بند رہ رہ کر تھک گیا تو باہر نکل گیا۔گاڑی ساتھ لی نہ بائیک۔۔۔ایسے ہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔سگریٹ پیتا رہا اور چلتا رہا،دل خالی تھا،دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔سردی ہونے کے باوجود فقط ایک شرٹ میں ہی وہ چلتا چلتا نہ جانے کہاں سے کہاں چلا آیا؟ہوش تو تب آیا جب کسی گاڑی نے اُسکے قریب آ کر ہارن دیا۔وہ رکا اور ایک کنارے ہو گیا لیکن گاڑی والا آگے نہیں بڑھا،بلکہ اسی طرح ہارن دیتا رہا۔اب کہ علی نے بگڑ کر اُسے دیکھا،تو پہلے شناسائی،پھر حیرت اور پھر الجھن اُسکی آنکھوں میں یکے بعد دیگرے نمودار ہوئی تھیں۔وہ حسین تھا۔لیکن وہ اُسکے پیچھے کیا کر رہا تھا؟ اُس نے علی کی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔

''کیا آپ اپنی رفتار کم کر سکتے ہیں؟ وہ کیا ہے نہ میری گاڑی میں اتنی سکت نہیں ہے۔ بیچاری آپکے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل نہیں پا رہی۔''

''تو میں نے کہا ہے کہ میرے پیچھے آو؟ جاؤ اپنے راستے۔۔۔'' بداخلاقی کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے علی نے اُسے جانے کا راستہ دکھایا اور پھر خود آگے بڑھ گیا۔ لیکن حسین بھی اپنے نام کا ڈھیٹ تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' گاڑی بڑھاتا پیچھے آیا۔

''جہنّم میں۔۔۔'' زہر لگ رہی تھی ساری دنیا اس وقت۔۔۔

''آؤ ساتھ چلتے ہیں۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' بلآخر تھک کے پوچھا۔

''تمہیں گھر ڈراپ کر دوں، یا جہاں تم جانا چاہو؟'' اس مرتبہ اس نے نرمی سے کہا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

''آجاؤ اندر، اغوا نہیں کروں گا تمہیں۔'' اُسکی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو ناچار بیٹھ گیا۔ جانتا تھا وہ پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں آج کل اُسکے بچھڑے دوستوں کو اُسکی اتنی زیادہ فکر کیوں ہونے لگی تھی؟ کبھی نوید تو کبھی عمر اور اب حسین۔ جتنا اُن میں سے کسی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اتنا وہ لوگ پتہ نہیں کہاں کہاں سے نکل کر آ رہے تھے؟

''جہنّم کا راستہ مجھے معلوم نہیں ہے، اگر گھر کا راستہ بتا دو تو وہیں ڈراپ کر دوں۔'' خاموشی کو حسین کی آواز نے توڑا، وہ اپنی بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو روک نہیں سکا۔

''سیدھا چلتے رہو بتا دوں گا۔'' چہرے پر دوبارہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اُس دن جو میں نے کہا اُس کے لیے میں معذرت کرتا ہوں۔'' حسین نے یکدم ہی کہا۔

''یہ آج کل تم لوگوں کو معذرت کرنے کا نیا دورہ پڑا ہے؟'' اُس نے کافی سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرے علاوہ کس نے معذرت کر لی تم سے؟'' وہ حیران ہوا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا۔ ایک بار پھر سے گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

''یہاں سے بائیں۔'' کافی دیر بعد اُس نے کہا تو سر ہلاتے بائیں جانب گاڑی موڑ دی۔

''ایک بات پوچھوں تم سے؟'' اُس نے علی کو مخاطب کیا۔

''تم اجازت کب لیتے ہو؟''اُسکے کے جواب پر وہ ہنس پڑا۔رضا نے بھی یہی کہا تھا۔اور گدھے سمجھتے تھے کہ دوستی ختم۔۔۔

''تم مجھ سے کس بات پر ناراض ہو؟''سوال غیر متوقع تھا۔

''میں تم سے کیوں ناراض ہوں گا؟بھلا میں ہوں ہی کون ناراض ہونے والا؟''جواب غیر متوقع بالکل نہیں تھا۔

''ایسے ڈائیلاگ میری بیوی کے بڑے پسندیدہ ہیں۔''اب کہ وہ چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہیں کر سکا تھا۔یہ آدمی ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے میں ماہر تھا۔اُس نے اچانک ہی گاڑی روک دی تو علی نے سوالیہ نظروں سے حسین کو دیکھا۔وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟گاڑی کیوں روک دی؟''ناسمجھی سے پوچھا۔

''میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا تھا علی!۔۔۔میں تو آیا تھا۔آخری پیشی پر میں آیا تھا۔میں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔پھر تم مجھ سے کیوں خفا ہو اتنے سالوں سے؟''علی ساکت ہو گیا۔وہ شکوہ کر رہا تھا؟یا وضاحت دے رہا تھا؟لیکن وہ ماضی ادھیڑ رہا تھا۔

''کیس اُس روز ختم نہ ہوتا،تو میں تب تک تمہارا ساتھ دیتا،جب تک وہ کیس چلتا۔''وہ درست کہہ رہا تھا۔علی خاموشی سے اُسے دیکھے گیا۔کیوں تھا وہ ایسا؟ ایک ہی جست میں سارے فاصلے مٹاتا تھا،دل میں آتا تھا اور آباد ہو جاتا تھا،نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں چھوڑتا تھا۔کہ وہ حسین تھا۔

''چھوڑ کے تو تم لوگ گئے تھے مجھے۔میں نے تو کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا اُس روز،میں نے تو کسی کو کوئی الزام نہیں دیا تھا۔پر اکیلا تو مجھے کیا تھا تم لوگوں نے؟ بتاؤ میرا کیا قصور تھا؟''اگر حسین شکوہ کر رہا تھا تو اُسکے لہجے میں نفرت،غصّہ یا ناراضگی کیوں نہ تھی؟وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے کچھ سمجھانا چاہتا ہو۔علی نے نظریں ونڈ سکرین پر جما دیں۔اُسکے کسی سوال کا جواب نہیں تھا اُسکے پاس،اُس نے اِس رخ پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

''تم باتوں کو دل میں کیوں رکھتے ہو علی؟مجھے دیکھو،میں نے تو کسی بات کا شکوہ نہیں کیا۔تم کیوں نہیں بھول جاتے؟مان کیوں نہیں لیتے جو ہو گیا،اُسے اب بدلا نہیں جا سکتا۔''وہ جیسے اُسکا دماغ پڑھ رہا تھا۔

''تم لوگ کیوں بار بار دس سال پہلے پہنچ جاتے ہو؟آج کی،ابھی کی بات کیوں نہیں کرتے؟کیوں پرانی باتیں نکالتے ہو؟''وہ چڑ چڑا ہو رہا تھا۔

''لوگ؟اب تم بتا ہی دو کہ میرے علاوہ اور کس نے یہ سب باتیں کی ہیں؟''اُس نے چڑ کے پوچھا۔

''تم سب وہی باتیں کرتے ہو،جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے وہ بات وہیں سے شروع کرتا ہے۔''اُس نے اب بھی نہیں بتایا۔

''تو ہم اور کس بارے میں بات کریں گے علی؟''حسین نے اُسے لاجواب کر دیا تھا۔وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''ہم چھ لوگ آخری بار جس نوٹ پر الگ ہوئے تھے۔ زندگی بے شک نہیں رکی تھی، لیکن ہماری دوستی کو وہاں پاؤز لگ گیا تھا۔ اب چاہے ہم ابھی ملیں یا مزید دس سال بعد، بات وہیں سے شروع ہو گی جہاں پر رکی تھی۔ ہم چاہے جتنی بھی کوشش کریں، بات دس سال پہلے ہی جائیگی، اور تب تک۔۔۔ جب تک ہم اُس مسئلے کو حل نہیں کر لیتے۔ کیوں کہ تم مانو یا نہ مانو، ایک دہائی پہلے ہوا وہ مسئلہ آج بھی غیر حل شدہ ہے۔ اور جب تک مسئلہ حل نہ کیا جائے وہ ختم نہیں ہوتا۔'' وہ بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔ علی کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

''کیا تم مجھے گھر چھوڑو گے؟'' اُس نے بیزاری سے پوچھا۔

''نہیں!''

''کیا مطلب نہیں؟''

''گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔''

''کیا؟ کب؟''

''جب میں نے گاڑی روکی تھی۔'' اُس نے مزے سے کہا۔

''مجھے لگا کہ تم نے مجھ سے بات کرنے کے لیے گاڑی روکی ہے۔'' وہ تلملا گیا۔

''اب ایسے بھی اہم نہیں ہو تم کہ گاڑی روک کر بات کرتا میں۔'' علی اُسے گھورتا ہوا سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ رکو!'' اُسکا بازو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے روکا اور اگلے ہی لمحے چونک اٹھا۔

''تمہیں بخار ہو رہا ہے؟'' اُس نے اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''موسمی بخار ہے۔''

''یہ رہائشی علاقہ ہے، پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی یہاں پر، نیٹ ورک بھی ٹھیک نہیں آ رہا یہاں، تو آنلائن ٹیکسی بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے چپ کر کے بیٹھو میں ٹائر لگا رہا ہوں۔'' اُسے ڈانٹنے والے انداز میں کہتا وہ ٹائر لگانے اُتر گیا۔

کبھی علی نوید سے، تو کبھی نوید رضا سے، کبھی عمر علی سے، تو کبھی مقدّم عمر سے، کبھی حسین رضا سے اور کبھی علی سے۔۔۔۔

شکوے، شکایتیں، ناراضگیاں، حکایتیں۔۔۔

دل کی باتیں۔۔۔

کچھ دل میں کچھ زبان پہ۔۔۔

تعلقات جڑنے لگیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پرانی باتیں نکلتی ہیں۔ وضاحتیں بھی ہوتی ہیں، ناراضگیاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی مناتا ہے تو کوئی روٹھا رہتا ہے۔ کوئی غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے تو کوئی اُسکے مداوے کے لیے آتا ہے۔

انہی دائروں میں وہ لوگ پچھلے دو ماہ سے گھوم رہے تھے۔ آگے کیا ہونا تھا؟

اسکا فیصلہ قسمت کے ہاتھوں میں تھا۔

---------+---------+--------

آٹھواں باب

ہجر

وہ تھر تھر کانپتا بوڑھا آدمی، اپنی دو جوان بیٹیوں اور کمزور بیوی کے ساتھ تقریباً اُسکے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اُسکے آس پاس چند پولیس والے ہاتھوں میں گن لئے کھڑے تھے۔

''مجھ پر رحم کرو، میں کہاں جاؤں گا اس وقت ؟ میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے رہنے کو۔'' اُس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ سامنے کرسی پر بیٹھا شخص مکروہ چہرے کے ساتھ مُسکرایا تھا۔

''تم کہاں جاؤ گے۔۔۔۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے تم اس گھر میں نہیں چاہیے۔'' ڈارک براؤن تھری پیس سوٹ میں ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ سفاکی سے بولا۔

''میری بیٹیاں ہیں، تم مجھے ایک رات کا ہی وقت دے دو۔ اس وقت میں کہاں جاؤں گا؟'' وہ بے بس اور سامنے والا بے حس۔۔۔

''سات سال پہلے میں تمہیں کہہ کر گیا تھا کہ واپس آؤنگا۔ تم نے تب ہی اپنا بندوبست کیوں نہیں کیا؟ ایک رات میں کیا اُکھاڑ لوگے تم؟ پولیس والے تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں، اس سے پہلے ہی یہاں سے نکل جاؤ۔'' سگریٹ کا کش لیکر فضا میں دھواں چھوڑتے وہ بولا تھا۔

''چلو جلدی کرو، شاباش۔'' سکون سے کہہ کر صوفے سے ٹیک لگائی اور مزید دھواں ہوا میں چھوڑا۔

''رضا! کیا میں تمہارا ماموں نہیں؟ کیا میں وہ نہیں جس نے اتنی عرصے تمہیں پالا تھا؟'' وہ چیخ اٹھے تھے۔ اُنکی بات پر رضا نے استہزایہ انداز میں ہنستے ہوئے اُنہیں دیکھا۔

''میں بھی آپکا بھانجا ہونے کا ہی ثبوت دے رہا ہوں۔'' تمسخر اڑاتے انداز میں کہا گیا۔ سگریٹ کی بو سارے میں بس چکی تھی۔

''مت کروایسا! تمہیں، تمہاری ماں کا واسطہ!'' اگلے ہی لمحے رضا بھرپور اشتعال میں سیدھا ہوا اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی اُنکی طرف جھکا اور اُنہیں گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے سامنے کیا۔

''میری ماں کا ذکر بھی مت کرنا۔۔۔ ہرگز نہیں!'' وہ دھاڑا تھا۔ اُنکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بس بہت ہو گیا۔'' وہ اُسکا گریبان چھوڑتے چیخا ''مجھے یہ آدمی مزید ایک منٹ اور اس گھر میں نہیں چاہیے۔ فوراً باہر نکالو اسے! مزاحمت کرے تو تم بھی اسکی عمر کا لحاظ مت کرنا۔'' ان الفاظ پر پولیس کے لباس میں ملبوس وہ گن مین حرکت میں آئے اور، اُسکے ماموں کی جانب بڑھے پھر اُنہیں دونوں بازوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

''ابّا! ابّا! روکو انہیں رضا۔۔۔ خدا کے لیے۔'' اُنکی بڑی بیٹی چیختے ہوئے آگے بڑھی اور رضا کا بازو پکڑ کر منت کرنے لگی مگر اُسے کوئی فرق نہ پڑا۔

''میں نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا یہاں سے۔'' وہ بھی پورا زور لگا رہے تھے۔ لیکن ان کے اندر اب اتنی طاقت نہ بچی تھی۔ وہ گھسیٹتے ہوئے اُنہیں گھر سے باہر لے گئے۔

''رضا پلیز!'' وہ اُسکے قدموں میں بیٹھ گئی۔ لیکن اُس نے دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ ایک اور سگریٹ جیب سے نکال کر سکون سے سلگائی اور ہونٹوں سے لگالی۔

''ابّا!'' رضا پر اپنی بات کا کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ وہ اُسے وہیں چھوڑ کر باہر بھاگی تھی۔ اُس کے چہرے پر سخت تاثرات آئے اور اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھتا باہر کی جانب بڑھا تھا۔

''مت کرو، مت کرو ایسا۔۔۔ اللہ کا خوف کرو۔'' اُسکی مامی بھی اب منت کرنے لگی تھیں۔ محلے والے اُسکے دروازے پر جمع ہو چکے تھے۔ لیکن پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ آگے آئے۔

''رضا! کیوں کر رہے ہو بیٹا ایسے؟ تم تو ایسے نہیں تھے۔'' محلے کے کسی بزرگ نے اُسے وہاں دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ تب بھی ایسے ہی کھڑا رہا جیسے اُسکے کان ہوں نہ آنکھیں۔۔۔۔

''تم ٹائر لگا رہے ہو یا بنا رہے ہو؟'' علی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کھڑا تھا۔ حسین سے اب تک ایک ٹائر لگ کے نہیں دے رہا تھا۔

''مدد نہیں کر سکتے تو طنز بھی مت کرو۔'' وہ جھلّایا۔

''خود ہی لائے تھے ساتھ، اب برداشت کرو۔۔۔'' علی نے بھی کرارا جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اُسکی نظریں گلی کے کونے تک گئیں، جہاں اچھا خاصا رش لگا تھا۔

''وہاں کونسا لنگر بٹ رہا ہے؟'' اُسکی نظروں کے تعاقب میں علی نے بھی دیکھا۔

''میرے خیال میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ظاہر ہے، لیکن مسئلہ کیا ہوا ہے وہاں؟'' حسین اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''چلو دیکھ کر آتے ہیں۔''حسین آگے بڑھا تو علی نے فوراً ہی اُسکا بازو تھام کر اُسے روکا۔

''کیا ضرورت پڑی ہے پرائے جھگڑوں میں گھسنے کی، تم ٹائر لگاؤ۔''

''میں تو جاؤں گا، کیا معلوم کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔ چلو شاباش! اتنے بے حس مت بنو۔''وہ اُسے بھی اپنے ساتھ کھینچتا کھانچتا لے آیا۔

''تم کتنے ظالم ہو۔ کیسے انسان ہو تم؟ ہمارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔ کچھ تو رحم کھاؤ۔''ماموں کی بیٹی چلا رہی تھی پر اُسکے سکون میں رتی بھر بھی فرق نہیں آرہا تھا۔ مرکزی دروازے کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا وہ ایک اور سگریٹ جلا چکا تھا۔

مجمع میں کھڑے حسین اور علی تو کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو کی مصداق فق ہوتے چہروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ پولیس والے اب اُنکا سامان گھر سے باہر پھینکنے لگے۔

''اللہ تمہیں برباد کرے رضا! تم برباد ہو۔''اُسکے ماموں کی بیٹی چیختے ہوئے اُسکی طرف بڑھی، ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑا۔ اور اُسی لمحے رضا سیدھا ہوا۔

''چھوڑو اُسے۔''اُسکی دھاڑ پر پولیس والے نے فوراً اُسکی کزن کو چھوڑا تھا۔ اُسکے ماموں کے خاندان سمیت پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔

''دوبارہ ہاتھ مت لگانا اسے۔''سرخ آنکھوں کے ساتھ اُسے وارن کیا۔

''جی صاحب!''وہ شرمندہ ہوتا پیچھے ہٹ گیا۔ رضا اپنی ماموں کی بیٹی کی طرف گھوما۔

''تمہارے اور تمہارے باپ کے پاس صرف دو مہینے ہیں، ان دو مہینوں میں اپنے رہنے کا بندوبست کرو ورنہ اگلی بار رحم نہیں کروں گا۔ اور جب تک یہاں ہو، تم سب سرونٹ کوارٹر میں رہو گے۔ گھر میں داخل ہونے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' اُسے انگلی اٹھا کر وارن کرتا، وہ جواب سننے کے لیے رکا نہیں تھا، بلکہ مجمع کو چیرتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

''یہ کس قسم کی گھٹیا حرکت ہے؟''علی کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی، اس سے پہلے کے وہ اُسکے پیچھے جاتا حسین نے فوراً اُسکا بازو پکڑا۔

''رک جاؤ علی! تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہے ہو۔''علی نے بے یقینی سے اُسکو دیکھا۔

''تم اب بھی اُسکی وکالت کر رہے ہو، اب بھی؟ اتنے بے حس مت بنو۔''اُسی کے الفاظ اُسی کو لوٹاتا، اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اُسکے پیچھے گیا۔

''یار!''سخت کوفت سے کہتا حسین اُسکے پیچھے بھاگا۔ اس وقت وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔

رضا پیدل ہی تھا لیکن دوسری گلی میں داخل ہو چکا تھا، وہاں کوئی اور مخلوق نظر نہیں آ رہی تھی۔

''رضا!'' علی کی سخت مگر دھاڑتی ہوئی آواز اپنے پیچھے سنائی دی تو مڑ کر دیکھا۔ وہ گلی کے کونے پر تھا، اور رضا گلی کے بیچ میں۔

''بس اسی کی کمی تھی۔'' اُسے دیکھ کر بیزار سا منہ بنایا اور پاس کھڑی گاڑی سے ٹیک لگا لی۔ جیسے اُسکا انتظار کر رہا ہو۔ جتنی دیر میں علی اُس تک پہنچا وہ جیب سے سگریٹ کا ڈبہ نکال چکا تھا۔

''کس قسم کے انسان ہو تم؟ تھوڑی سی بھی انسانیت باقی نہیں رہی کیا تم میں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس حد تک بھی گر سکتے ہو۔'' وہ انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسکے قریب آتے ہوئے پھنکارا تھا۔ رضا نے سکون سے سگریٹ منہ سے لگائی پھر لائٹر آن کر کے اسے سلگانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے قریب ہی کوئی جانور بھونک رہا ہو اور اُسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اتنی دیر میں یہ اُسکی چوتھی سگریٹ تھی۔ علی اندر تک سلگ اٹھا۔

''کچھ تو شرم کر لو رضا! کیسے تم لوگوں پر اتنا ظلم کر سکتے ہو؟ کیسے؟'' وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

''علی! رک جاؤ، ہم یہ بات بعد میں کریں گے۔ ابھی چلو یہاں سے۔'' حسین بھی وہیں آ گیا تھا اور آتے ساتھ ہی اُسے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ رضا اُن دونوں کو نظر انداز کیے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا، اپنے آس پاس کی فضا دھواں دھواں کر چکا تھا۔ اُسکا رخ سامنے نظر آتے گھروں کی جانب تھا، اُن دونوں کو تو وہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ علی کو اس وقت وہ شدید زہر لگا۔

''تم وہی نہیں ہو، جس کے پاس رہنے کو جگہ تک نہ تھی؟ آج اگر تمہارے پاس دولت اور طاقت ہے تو تمہارا بس کمزوروں اور عورتوں پر ہی چل سکا؟ ساری دنیا میں کسی غریب کا تماشہ لگا کر کیا ملا؟'' وہ نفرت سے بولا تھا۔

''علی! بس۔۔۔'' حسین کی آواز بلند ہوئی تھی۔ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا رضا سیدھا ہوا اور مسکراتے ہوئے اُسے براہ راست دیکھا، ویسی ہی طنزیہ مسکراہٹ جو اُس روز ایف آئے اے کے آفس میں اُسکا ہر الزام سنتے، اُسکے چہرے پر تھی۔ وہی تمسخر اڑاتا انداز۔۔۔

''کیا تم وہی نہیں ہو جس نے پچھلے ہی ہفتے رات کے گیارہ بجے اپنی بیوی کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر نکالا تھا؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو علی کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔

''ساری دنیا میں، اپنی ہی بیوی کا تماشہ لگا کے کیا ملا؟'' اُسی کا سوال اُسی کے منہ پر مارتا وہ سکون سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ حسین کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں کھڑا تھا۔

''میں نے تو پھر بھی ایک عورت کا لحاظ کیا، تم نے تو ایک عورت کو ہی گھر سے نکال دیا تھا۔ اور ہاں! کیا الفاظ استعمال کر رہے تھے تم اس رات؟'' اُس نے جیسے سوچنے کی کوشش کی، علی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔

''اپنے الفاظ یاد ہیں؟ جو تم پورے محلے کے سامنے اپنی بیوی کے لیے استعمال کر رہے تھے؟ یا میں یاد دلاؤں؟'' اُسکا تو دماغ ہی کام کرنا چھوڑ گیا تھا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ آج بال رضا کے کورٹ میں تھی، وہ جیسے چاہے پھینک سکتا تھا۔ اور وہ یہی کر رہا تھا۔

''رضا! ہم بعد میں بات کریں گے۔ تم جاؤ ابھی۔'' اب کہ حسین نے اُسے چپ کروانا چاہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پھر دس سال پیچھے پہنچ گیا ہے۔ اُسی رات میں، جس رات وہ اپنے دوستوں کو جھگڑنے سے روک نہیں سکا تھا۔۔

''جا رہا ہوں حسین! جا ہی رہا ہوں۔'' علی کی آنکھوں میں نفرت سے دیکھتے جواب حسین کو دیا تھا۔ علی نہ نِگاہیں ہٹا پا رہا تھا نہ کچھ کہہ پا رہا تھا۔

''اپنے گناہوں پر پردہ ڈال کر علی سفیر ساری دنیا کے گناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ جیسے کہ باقی لوگ تو جانتے ہی نہیں وہ کتنے پارسا ہیں؟'' تمسخر اڑاتی ہنسی کے ساتھ حسین سے کہا۔ حسین نے ضبط کیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے چپ ہو جانے کو کہا۔ یہ وہ رضا نہیں تھا جس سے وہ پناہ گاہ میں ملا تھا۔

بڑا کاری وار کیا تھا اُس نے۔۔۔ علی کا دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''کیا میں نے اس روز تمہارے معاملے میں مداخلت کی؟ نہیں نہ؟ تو تم بھی میرے معاملات میں مخل مت ہو، پہلے اپنے اعمال درست کرو، پھر یہ نیکی کا چولا اوڑھنا۔'' نفرت سے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوا کہا اور سگریٹ منہ سے لگا تارخ موڑ کے چلا گیا۔ علی بھی جھٹکے سے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا، مزید وہاں رکتا تو دماغ پھٹ سکتا تھا۔

بیچ گلی میں کھڑا حسین دو سمتوں میں جاتے اپنے دونوں دوستوں کو دیکھ رہا تھا، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کس کے پیچھے جائے؟ کس کو اس وقت تسلی کی زیادہ ضرورت ہے؟

''رضا سے بعد میں بات کروں گا۔'' بلآخر ایک نتیجے پر پہنچ کر وہ علی کے پیچھے دوڑا تھا۔

---------+---------+--------

وہ نہا کر باہر آیا تو بشریٰ بچوں کو سلانے جا چکی تھی، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک نظر اپنے بازو پر دکھائی دیتے زخم پر ڈالی۔ گولی کا زخم اب بھر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں اور مرہم دیئے تھے، جنکا استعمال وہ باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ اپنی ذات سے لاپرواہی اپنی جگہ، لیکن صحت کا خیال وہ ہمیشہ رکھتا تھا۔ کیونکہ اُسکی صحت تھی تو ہی اُسکی نوکری برقرار رہ سکتی تھی۔

''نوید!''وہ آئینے کے سامنے ہی کھڑا تھا جب بشریٰ کمرے میں داخل ہوئی۔ جلدی سے آستینیں نیچے کیں، کہیں اُسکی نظر نہ پڑ جائے۔

''کیا ہوا؟''خود کو کمپوز کرتے پوچھا۔

''وحید بھائی آئے ہیں۔''اُس نے اطلاع دی۔

''کہاں؟''وہ حیران ہوا۔

''نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم سو جاؤ، میں جا کے ملتا ہوں اُن سے۔''اُس نے بشریٰ سے کہا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اُس نے سر ہلا دیا۔ جانتی تھی کہ جب وحید اکیلے آتا تھا تو اُسے نوید سے کوئی ضروری بات ہی کرنی ہوتی تھی۔ ایسے میں اُسے کسی قسم کی مہمان نوازی وقت بربادی کے سوا کچھ نہ لگتی۔ لہٰذا چائے پانی پوچھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

وہ نیچے چلا آیا، سامنے ہی ڈرائنگ روم کے دروازے سے وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا نظر آ رہا تھا، چہرہ تنا ہوا تھا۔ نوید نے گہری سانس لیکر قدم اندر کی جانب بڑھا دیئے، جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

اُسے سلام کرتے اُسکے سامنے ہی صوفے پر جا بیٹھا، وحید نے اشارے سے جواب دیا۔ نوید سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ سخت نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ جب کافی دیر اسی طرح گزر گئی، تو نوید نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ اب تک اُسے ہی گھور رہا تھا۔

''اتنی بڑی بات نہیں تھی بھائی!''اُس نے وضاحت دینے والے انداز میں بات شروع کی۔

''اچھا؟''ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، اوہ اچھا، مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔

''بھائی! میں سچ کہہ رہا ہوں، ایسا کچھ۔۔۔۔''وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''بات بے شک بڑی نہ ہو۔ لیکن کیا میں اتنا بھی اہم نہیں کہ تم مجھے بتا دیتے؟''لہجہ سخت، انداز پُر شکوہ۔۔۔

''آپکو پتہ چل تو جاتا ہے۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''اگر میرے اپنے تعلقات نہ ہوتے، یا میں آرمی میں نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ مجھے بھی پتہ نہ چلتا۔ اوپر سے نیوز چینل پر خبر بھی کچھ لمحوں کے لیے آئی اور اُسکے بعد غائب ہو گئی۔ خبر بھی چھپا دی تم لوگوں نے؟''وہ ناراض ہوا۔

''بس بازو پر ہی گولی لگی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ پریشان ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم خود کو ہم سے اتنا دور کیوں کر رہے ہو نوید؟'' بلآخر اُس نے تھک کر پوچھا۔ بچپن کے شکوے بچپن میں ہی ختم ہو گئے تھے۔ نہ اب وہ بچپن والا وحید تھا، جو ہر وقت اُس پر حکم چلاتا تھا، نہ اب وہ وہی نوید تھا جو اُس سے نالاں رہتا تھا۔ بہت کچھ وقت کے ساتھ بدل گیا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' مختصر جواب دیا۔

''کم از کم مجھے تو بتا سکتے تھے۔ مجھے اپنے بھائی کے بارے میں ہمیشہ دوسروں سے پتہ چلتا ہے۔'' اُس نے تاسف سے کہا۔

''اگلی بار بتا دوں گا۔''

''شٹ اپ!'' اُس نے دہل کر کہا، تو وہ مسکرا دیا۔ وحید کے چہرے پر خفگی صاف ظاہر تھی۔

''پچھلی بار تم اغوا ہو گئے تھے اور مجھے تمہارے بازیاب ہونے کے بعد یہ خبر ملی۔ کیوں کرتے ہو اس طرح؟'' وہ بے بس ہو گیا تھا جیسے۔۔۔

''کہہ تو رہا ہوں کہ صرف پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے نہیں بتایا۔'' اس بار وحید نے کچھ نہیں کہا۔ بس خفگی سے اُسے دیکھتا ہی رہا جبکہ وہ سر جھکائے قالین پر پیر رگڑ رہا تھا۔

''بشریٰ کیسی ہے؟'' کافی دیر بعد استسفار کیا گیا، تو اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''کوئی تبدیلی آئی اُسکی حالت میں؟'' مزید پوچھا۔

''ہاں! قبرستان نہیں گئی، کافی دنوں سے۔۔۔ گھر پر توجہ دے رہی ہے۔ مختلف کاموں میں مصروف رہتی ہے۔'' تفصیلاً بتایا۔

''یہ اچھی تبدیلی ہے ویسے۔''

''ہاں! آخری بار اُسکی حالت بگڑ گئی تھی کافی، مجھے لگا تھا کہ ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ لیکن بہت بہتری آئی ہے اُس رات کے بعد۔''

''ہمم!'' وحید نے سر ہلایا پھر دروازے کی طرف محتاط انداز میں دیکھتا ذرا آگے کی طرف ہوا۔

''اسکو کچھ یاد آیا؟'' آہستہ سے پوچھا۔ اُس نے ایک نظر دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلاتے چہرہ جھکا دیا۔

''ان شاءاللہ! بہت جلد اُسے سب یاد آئیگا۔''

''آجائیگا بھائی! ضرور یاد آجائیگا لیکن۔۔۔'' کرب سے کہتے اُس نے سر اٹھایا۔

''جس دن اسکو سب یاد آئیگا، اُس دن میرا کیا ہوگا؟'' پہلی بار وحید نے اُسکی آنکھوں میں خوف دیکھا۔ اُسکا دل کٹا۔

''کچھ نہیں ہوگا، پہلے تو تم خود کو قصوروار ٹھہرانا چھوڑ دو۔ کیونکہ جب تم خود ہی اپنے آپ کو قصوروار سمجھو گے، تو اُسکے سامنے اپنا دفاع کیسے کرو گے؟ جو بھی ہوا نوید! اُس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تمہارا ہرگز۔۔ ہرگز کوئی قصور نہیں تھا۔'' ایک ایک لفظ پر زور دیتے اُسے باور کروایا۔

''مجھے نہیں معلوم کیا ہوگا؟ لیکن میں خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار نہیں کر پا رہا۔'' وہ بے بسی سے بولا تھا۔

''تو تیار کرو خود کو، اگر ابھی سے ہار تسلیم کر کے بیٹھ جاؤ گے تو خسارہ صرف تمہارے حصے میں آئیگا۔''

''پہلے کیا کم خسارے ہیں میرے حصے میں؟'' تلخی سے کہا۔ وحید گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ دوبارہ اُس نے کچھ نہیں پوچھا، نہ نوید نے کچھ کہا۔ دونوں کے بیچ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''میں دو دن کے لیے آیا ہوں۔ پرسوں واپسی ہے۔ جانے سے پہلے تم سے مل کر جاؤں گا۔'' اُس نے بتایا۔

''ایسے وقت پر آنا جب میں ڈیوٹی پر نہ ہوں۔''

''میں تمہاری ڈیوٹی پر بھی تم سے ملنے آسکتا ہوں۔'' جتایا گیا تو وہ ہلکے سے ہنسا۔

''تمہارا زخم کیسا ہے اب؟''

''بہت بہتر ہے۔''

''دکھاؤ مجھے۔۔۔'' اُٹھ کر اُسکے پاس آیا۔

''کہہ تو رہا ہوں کہ بہتر ہے۔'' اُس نے کوفت سے کہا۔

''تمہاری کسی بات کا بھروسہ نہیں ہے مجھے۔'' وحید نے گھورتے ہوئے کہا اور اُسکے برابر آ بیٹھا۔

''اب آپ ہی بھروسہ نہیں کر رہے مجھ پر تو بشریٰ کیا کریگی؟''

''میرے سامنے مت جھاڑا کرو یہ ڈائیلاگ۔'' یہ تو طے تھا کہ اُس پر نوید کی بات کا کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا۔ اب وہ اُسکے بازو کا زخم دیکھ رہا تھا، جہاں کچھ دنوں پہلے ہی گولی لگی تھی۔ نوید بیزار سا بیٹھا تھا لیکن اُسکو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

نہ اب باپ سر پہ تھا، نہ ماں دیکھنے کے لیے وہاں تھیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں؟ نوید آج بھی اپنے بھائی کے حکم کے آگے کچھ بول نہیں پاتا تھا۔ اب تو کسی بات کا خوف نہیں تھا؟ اب کیوں؟ اس سوال کا جواب خود نوید بھی نہیں ڈھونڈ پایا تھا۔

---------+---------+--------

کسی نہ کسی طرح حسین نے علی کو اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کر لیا تھا۔ اُسکا بخار بڑھ چکا تھا، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ ضبط کیے خاموش بیٹھا رہا۔ پورے راستے حسین سے اُسکی کوئی بات نہ ہوئی۔ پچھلی دو ملاقاتوں میں اُسے ایک بات تو سمجھ آگئی تھی کہ علی اور رضا کے درمیان معاملات عام نوعیت کے نہیں تھے، اُنکے معاملات ٹھیک ٹھاک بگڑے ہوئے تھے۔

خلا، فاصلے، دیوار۔۔۔ یہ سب تو بہت چھوٹے الفاظ تھے۔ اُنکے درمیان تو کوئی تعلق ہی باقی نہ رہا تھا۔ واپسی کی منزل اُن دونوں کے لیے تو ہرگز نہ تھی، واپسی کی پہلی سیڑھی تو کیا، وہ تو اُسکے آس پاس بھی نظر نہ آ رہے تھے۔

اُسکے گھر کے سامنے گاڑی روکی، اور چہرہ گھما کر اُسکی طرف دیکھا۔

''کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟''

''کیا پوچھو گے تم؟ یہی کہ جو رضا کہہ رہا تھا کیا وہ سچ ہے؟ مت پوچھو مجھ سے کچھ بھی، جو کچھ رضا نے کہا ہے اُسے مان لو۔ میں واقعی بہت ظالم، بے حس اور سنگدل انسان ہوں۔'' سنجیدگی سے اُسکی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''میں نے کہا، کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟'' اُس نے بھی لفظ کہہ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ علی خاموش رہا۔

''میں نہیں جانتا کہ تمہارے اور رضا کے درمیان جو بات ہوئی وہ کس حوالے سے تھی؟ مجھے کسی ایک بات کا مطلب اور مفہوم سمجھ نہیں آیا۔ لیکن جو مجھے سمجھ آیا وہ یہ کہ رضا تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا تھا۔ جو وہ تمہیں سمجھانا چاہتا تھا اُسے سمجھو۔'' حسین کی بات پر اُس نے سوالیہ انداز میں اُسے دیکھا۔

''یعنی۔۔۔ ضروری نہیں کہ ہمیں جو غلط نظر آ رہا ہو وہ غلط ہی ہو، کبھی کبھار معاملے کی تہہ تک پہنچا جاتا ہے۔ تم نے رضا کو جو کرتے دیکھا، ٹھیک ہے کہ وہ غلط تھا۔ لیکن علی! تمہیں نہیں لگتا کہ پہلے ہمیں اُس سے پوچھنا چاہئے تھا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ مسئلہ یہ ہے کہ ہم غلط کرتے ہیں تو اپنی غلطی کے ہزار جواز ڈھونڈ لیتے ہیں، لیکن دوسرے کو ایسا کوئی مارجن نہیں دیتے۔ ہمارے ہر عمل کی ہمارے پاس کوئی نہ کوئی توجیہہ ہوتی ہے۔ لیکن دوسروں کو ہم ہر حال میں گنہگار ہی سمجھتے ہیں۔'' اُس نے آدھے ادھورے لفظوں میں مکمل اور جامع بات سمجھائی تھی۔

''اللہ حافظ!'' علی نے بس اتنا ہی کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ حسین نے بھی سر کے اشارے سے جواب دیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

علی خاموشی سے اندر چلا آیا۔ سفیر صاحب آج بھی پریشان سے اُسکے منتظر تھے اور وہ آج بھی اُنہیں یکسر نظر انداز کرتا اپنے کمرے میں آکر بند ہو گیا تھا۔

بخار ایک بار پھر بڑھ گیا تھا، پورا بدن درد کر رہا تھا۔ پاس رکھے کاؤچ پر گرنے کے سے انداز میں ڈھے گیا۔

اپنے گناہوں پر پردہ ڈال کر علی سفیر ساری دنیا کے گناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ جیسے کہ باقی لوگ تو جانتے ہی نہیں وہ کتنے پارسا ہیں؟

رضا کا تمسخر اڑاتا لہجہ کانوں میں گونجا تو کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

تم ہی بتاؤ کہ آخر اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے؟ جس تعلق کی قیمت تم ہم سے مانگ رہے ہو؟

کچھ سالوں پہلے بھی تو رضا نے ایسے ہی اُسکی ذات پر الزام لگایا تھا۔ تو کیا میں اُس سے اسی الزام کا انتقام لے رہا ہوں؟ یکدم ہی آنکھیں کھول دیں۔ کیا واقعی وہ رضا سے انتقام لینا چاہتا تھا؟ کیا سچ میں اُسکے الفاظ اُسے ہی واپس لٹانا چاہتا تھا؟ کیا وہ بار بار موقع ڈھونڈھتا تھا؟ خود احتسابی کا کڑا وقت اُس پر اچانک آیا تھا۔

تم سوچو تکلیف کی وہ کونسی انتہا ہو گی جس میں اُس نے، اس قبیح شے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہو گا؟ سب کے حصے کی کوئی نہ کوئی کہانی ہے علی۔۔

عمر نے بھی تو یہی کہا تھا جو آج حسین اُسے سمجھا کر گیا تھا۔ وہ عمر کی بات کیوں بھول گیا؟ کیوں؟ کیوں رضا کو سامنے دیکھتے ہی اُسکے اندر انتقام کا لاوا اُبلنے لگتا تھا؟ اور وہ اُنکی سمجھائی ہوئی ہر بات بھولنے لگتا تھا؟

تم نے اتنے لوگوں کے سامنے اُسکی عزت نفس پر حملہ کیا۔ کیا تم دوست ہونے کے ناطے ہی اُسکا پردہ نہیں رکھ سکتے تھے؟

علی نے سر تھام لیا۔ اگر وہ سچ میں غلط کو غلط کہنا چاہتا تھا تو اس نے رضا کی نشہ کرنے والی بات کا ذکر کیوں کیا؟ اور سب کے سامنے ہی کیوں؟ کیونکہ بدلہ بھی تو سود سمیت لینا تھا۔

اگر فاطمہ کو دس غیر مردوں کے سامنے گھر سے باہر نکال کر بھی وہ شرمندہ نہ تھا تو رضا کا اپنے ماموں کو گھر سے باہر نکالنا اُسکو برا کیوں لگا؟ اگر وہ اپنے آپ کو صحیح قرار دے سکتا تھا تو پھر رضا بھی صحیح تھا۔ وہ اپنی سابقہ بیوی کو گالیاں دے سکتا تھا، اُسکی تذلیل کر سکتا تھا کیونکہ اس نے اُس کے ساتھ بہت برا کیا۔ تو پھر رضا کا اپنے ماموں سے بدلہ لینا اسکو برا کیوں لگا؟ وہ نوید کے کردار پر کیچڑ اچھال کر بھول بیٹھا تو رضا کے خود پر لگائے گئے الزام کیوں بھول نہیں سکا تھا؟ ہر ہر زاویے سے اپنا آپ ہی غلط نظر آیا تھا۔

باوجود اسکے کہ اپنی آخری غلطی کے بعد سب کی نظروں میں برا وہی بنا تھا، لیکن نہ عمر نے اس سے منہ پھیرا تھا نہ حسین نے اُسے چھوڑا تھا۔

اُسے کیا ہو گیا تھا؟ کیا بن گیا تھا وہ؟ کیوں وہ کسی کے کیے کا بدلہ کسی اور سے لے رہا تھا؟

اپنا جائزہ لینا مشکل ہو گیا۔اپنی اصل شخصیت تو وہ کہیں گم کر بیٹھا تھا۔دوسروں کی دی گئی نفرتیں سہتے سہتے اپنی خوش اخلاقی کھو چکا تھا۔لیکن اب اُسے نفرتوں کے درمیان میں چھپی اپنی اصلی شخصیت واپس لانی تھی۔

اور اسکے لیے اُس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ایک ایسا فیصلہ جسکی قیمت اُسکی انا اور عزت نفس کی قربانی تھی۔

---------+---------+--------

''آج شام مجھے کچھ کام ہے۔اسی لیے دوپہر کا وقت چنا ہے۔''مال میں اُسکے ساتھ چلتے مقدّم نے وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں! میں نے کونسا اپنی شاپنگ کرنی ہے؟بس مکرم کی خریداری کر کے سیدھا گھر واپس۔۔۔ویسے بھی رات میں فنکشن ہے۔''وہ دکان پر ٹنگی بچوں کی شیروانی دیکھنے لگی۔مقدّم خاموشی سے کھڑا رہا۔

''یہ والی اچھی ہے نا؟''ایک کالے رنگ کی شیروانی اٹھا کے اُسے دکھائی تو مکرم خوشی سے مقدّم کی گود میں ہی اچھلنے لگا۔

''اب جب چھوٹو نے اوکے کر دیا ہے تو یہی والا فائنل کر دیتے ہیں۔''خود ہی جواب بھی دیا۔مقدّم اب تک خاموش تھا۔پھر اُسکے لیے ایک تھری پیس سوٹ پسند کیا اور آخر میں جب کلمے کی جانب بڑھی تو اُسے جیسے ہوش آیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''وہ چیخ پڑا۔

''کیا کر رہی ہوں؟''اُس نے اچھنبے سے پوچھا۔

''یہ فضول کا بوجھ ہے،بیچارہ اتنا سا بچہ ہے نہیں پہن سکے گا اسے۔''

''تو تھوڑی دیر کے لیے پہناؤں گی۔''

''تھوڑی دیر کے لیے بھی کیا ضرورت ہے؟'' اُسے کوفت ہو رہی تھی بچوں کا یہ کلاہ دیکھ کے۔

''میری بات سنو! تم یہاں صرف نانی کی مرضی سے آئے ہو،شاپنگ میری مرضی سے ہو گی۔''جتاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی۔وہ خاموشی سے گیٹ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''بل لا دیں۔''ریسیپشن پر کھڑے لڑکے سے کہا۔

''بل پے ہو چکا ہے میم۔''

''کس نے پے کیا؟''حیرت سے سوال کیااور اگلے ہی لمحے جھٹکے سے مڑی اور اسے دیکھا۔اُس نے کندھے اچکائے اور دروازہ کھولتے باہر نکل گیا۔

''آپ یہ کریڈٹ کارڈ رکھ لیں۔''لڑکے نے مقدّم کا کارڈ اُسے پکڑایا،وہ جلدی سے سامان اٹھاتی اُسکے پیچھے پیچھے آئی۔

''یہ کیابد تمیزی ہے بھلا؟میں تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لائی تھی کہ بل تم بھرو۔''اُسکے ساتھ چلتے خفگی سے کہا۔

''اپنی خریداری کرتی تو کبھی بھی نہ بھرتا۔مکرم میری ذمے داری ہے۔''سنجیدگی سے کہا۔

''تم کیوں بھول جاتے ہو کہ میں بھی اُسکی خالہ ہوں؟میرا بھی حق ہے۔'' اُسے برا لگا تھا۔

''مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میرے ہوتے مکرم کے اخراجات میں کوئی اور حصّہ ڈالے۔''اس بار جواباًوہ خاموش رہی۔مقدّم بھی خاموشی سے ساتھ چلتا رہا۔ اُنکا رخ مال کے خارجی راستے کی طرف تھا۔

''تم آج کل اتنے سنجیدہ کیوں رہنے لگے ہو؟''بڑا غیر متوقع سوال تھا،زیادہ دیر خاموش بھی تو نہیں رہ سکتی تھی۔

''تم نے مجھے غیر سنجیدہ کب دیکھا؟''وہ حیران ہوا۔

''اتنا سنجیدہ بھی نہیں دیکھا۔''اپنی بات پر قائم رہی۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

''میں دیکھ رہی ہوں جب سے ماموں کی شادی کی بات ہوئی ہے،تب سے تم تھوڑے سنجیدہ اور پریشان ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا!تو پھر کیا بات ہے؟اُس خون والی بات پر تو پریشان نہیں ہو؟''اچانک ہی جیسے کچھ یاد آنے پر اُسکی جانب مڑی۔''اُس دن کچھ ہوا تھا نا؟مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا۔''ریلنگ کے پاس رکتے ہوئے کمر پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''ناٹ اگین!(دوبارہ نہیں)میں نے بتایا تو تھا کہ بکری کا بچہ آگے آگیا تھا۔''وہ بھی بیزاری سے رک گیا۔

''بکری کا بچہ؟''بھنویں اٹھا کر اُسے دیکھا''تم نے اس دن بلی کا بچہ کہا تھا۔''انداز ایسا تھا کہ دیکھا پکڑے گئے نا؟وہ گڑبڑایا۔

''میرا مطلب وہی تھا۔''وضاحت دی۔

''جھوٹ!''وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

''اوکے !''اُس نے سر ہلایا اور اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔

''ایک خطرناک گینگ میرے پیچھے ہے،اُس نے کرائے کا قاتل ہائر کیا ہے تاکہ مجھے سال کے چھٹے مہینے قتل کر سکے،اُسی سلسلے میں ایف آئے آفس گیا ہوا تھا کہ ہم پر کچھ شر پسند عناصر نے حملہ کر دیا۔ہر طرف سے گولیاں چلیں اور اُس میں ایک ایس ایس پی زخمی ہو گیا، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی تھا اس لیے مجھ پر بھی خون کے چھینٹے آئے تھے۔''وہ سنجیدہ تھا،بے حد سنجیدہ۔۔۔

''بلی کا بچہ ہی ہو گا۔''وہ بھی سنجیدہ تھی۔مقدّم ہنس پڑا۔اُس نے **ہونہہ** کر کے قدم آگے بڑھا دیئے تو وہ ہنستا ہوا اُسکے پیچھے آیا۔

''تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتی؟''

''اب کر لیا۔''اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا مکرم اُسکی گود سے مقدّس کے پاس جانے کے لیے مچلنے لگا۔اُس نے مکرم کو اُسکے حوالے کیا اور شاپنگ بیگ اُسکے ہاتھ سے لے لیے۔

''تم نے اپنے لیے کچھ نہیں لینا؟''

''لینا ہے،لیکن تمہارے ساتھ نہیں۔''لٹھ مار انداز میں کہا۔

''تو میں کونسا تمہاری پیمنٹ کر رہا ہوں؟''بے نیازی سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پسند کے اپنے ذاتی کام کے لیے کسی کا وقت لوں۔''اُسی کے انداز میں جواب دیتی وہ مال سے باہر آ گئی۔ اب کہ وہ خاموش رہا۔گاڑی نکالتے اور گھر کے راستے پر ڈالتے بھی خاموشی رہی۔

''تمہاری فرم کا نام کیا ہے ویسے؟''اُس نے پوچھا۔ظاہر ہے زیادہ دیر خاموش رہنے جیسا مشکل کام کیسے کر سکتی تھی؟

''فیئر مارک۔''مختصر جواب دیا۔

''اور تمہارے علاوہ کتنے سی ای او ہیں؟''

''اخلاق ہے،لیکن فلحال کمپنی کے معاملات نہیں دیکھ رہا۔''

''اوہ!۔۔اخلاق بھائی یہاں کیوں نہیں آتے؟میرا مطلب تمہارے ساتھ کام کیوں نہیں کرتے؟''

''اخلاق کی مرضی۔''وہ ڈرائیونگ پر دھیان رکھنا چاہتا تھا۔

''اُنہوں نے کیا پڑھائی کی ہے؟''

''مقدّس۔۔۔''

''ہاں؟''

''تمہارے پاس صرف ایک سوال کی گنجائش بچی ہے۔''اُسکا منہ کھلا، پھر سمجھ آنے پر لب بھینچے اور باہر دیکھنے لگی۔اُس نے سکھ کا سانس لیا۔ چلو اب چپ تو رہے گی۔ لیکن یہ اُسکی بھول تھی۔

''اچھا آخری سوال، اُسکے بعد کچھ نہیں بولوں گی۔'' بے چینی سے اُسکی طرف مڑی تو اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''پوچھو!''

''تم ماموں کی شادی پر مدعو ہونے پر پریشان ہو نا؟''اس سوال پر وہ حیران ہوا پر بولا کچھ نہیں۔

''دیکھو! میں جانتی ہوں کہ تم نہیں آنا چاہتے لیکن مقدّم! تم اس طرح سارے خاندان سے کٹ نہیں سکتے۔''وہ کیسے جان گئی تھی بھلا؟

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے، میں مکرم کو اُن لوگوں کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ خاندان والوں کی وجہ سے پریشان ہو۔''

''اُسکی فکر تم نہ کرو، شادی اپنی جگہ ذمّے داری اپنی جگہ۔''اُس نے مسئلے کا حل پیش کیا۔اُس نے گہری سانس لیکر گاڑی روک دی۔گھر آ گیا تھا اُسکا۔۔۔

''خاندان میں میرے بارے میں جو باتیں مشہور ہیں، کیا وہ سنی نہیں ہیں تم نے؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں! اور میں سننا بھی نہیں چاہتی۔''پر اعتماد لہجے میں کہتی وہ اُسے حیران کر گئی۔

''تم بھلے نہیں سننا چاہتی لیکن لوگ کہیں گے۔اور میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹے تک یہ باتیں پہنچے۔''

''یہ ابھی بہت چھوٹا ہے اور میں۔۔۔''

''مقدّس پلیز!''ہاتھ اٹھا کر اُسکی بات کاٹی۔''میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا تو اب بات کو یہیں ختم کرو۔''وہ خاموش ہوئی۔آج رات اُسکے ماموں کی مایوں تھی۔

''ٹھیک ہے! میں تمہیں فورس نہیں کروں گی۔ لیکن ایک بار سوچنا ضرور کہ اس طرح اُن سے چھپ کر تم اُنکی باتوں کو سچ ثابت کر رہے ہو۔''سنجیدگی سے کہہ کر وہ اُسکا جواب سننے کے لئے رکی نہیں تھی۔ دروازہ کھول کر شاپنگ بیگ باہر نکالتے اور مکرم کو گود میں لیکر اندر کی طرف بڑھتے اُسے یقین تھا کہ مقدّم اُسکی بات سمجھ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، وہ اُسکے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہی وہاں سے چلا گیا۔

''مقدّم نہیں آیا؟''ماموں نے اُسے اندر آتا دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں ماموں! اُسے ضروری کام ہے کچھ، رات کو ایونٹ پر بھی نہ آئے شاید۔''

''اچھا! چلو کوئی بات نہیں۔ شادی پر تو آئے گا نا؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں!۔''کندھے اُچکاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

شام ہوئی تو تیاریاں عروج پر پہنچ گئی۔ دونوں گھروں کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ مکرم کو تیار کرنے کے بعد چوڑیاں پہنتے ہوئے اُسکی نظریں بار بار موبائل کی جانب اٹھتی تھی۔ اُمید تھی کہ شاید اُسکا کوئی میسیج آئے۔ حتیٰ کہ ہال جانے کا وقت ہو گیا، فنکشن میں پہنچ کر بھی نگاہیں بھٹک بھٹک کر دروازے کی طرف جاتیں لیکن اُسے نہ آنا تھا وہ نہ آیا۔

''یہ شیریں کی بہن ہے ن وہ بوفے کے پاس کھڑی، گود میں مکرم کو لیے دوسرے ہاتھ سے ڈسپنسر سے اپنے لئے گلاس میں پانی نکال رہی تھی کہ کانوں میں کسی عورت کی سرگوشی نما آواز آئی۔ اُس نے اپنا رخ نہیں پھیرا۔

''ہاں! ہے تو وہی لیکن گود میں کس کا بچہ ہے؟''دوسری عورت نے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم؟ عبیر کا بیٹا ہے یہ۔۔''پہلی عورت نے جواب دیا۔

''عبیر کا وہی بیٹا، جسے شفیق بھائی کے بیٹے مقدّم نے گود لیا ہے؟''دوسری عورت کی آواز میں حیرت تھی۔ مقدّس کی اُنکی جانب پیٹھ تھی، لیکن دھیان اُنکی باتوں پر ہی تھا۔

''شفیق بھائی کا بیٹا تو سنا تھا نفسیاتی ہو گیا تھا، پھر ایک بچے کو بھلا کیسے پال رہا ہے؟''ایک اور عورت نے پر تجسس انداز میں پوچھا۔ مقدّس کا خون کھولا۔

''کیا واقعی؟''

''ہاں ہاں! ذہنی مریض تھا، شفیق بھائی اور بھابھی تو اسکے غم میں ہی دنیا سے چلے گئے تھے۔ جب پاگل پن کے دورے پڑتے تھے تو چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا تھا، چیختا چلاتا تھا۔ میں اتفاقاً ایک بار چلی گئی تھی بھابھی سے ملنے، کیا بتاؤں آپا، کیسے وحشیوں کی طرح کر رہا تھا؟ میں تو اُسکی شکل دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔'' عورت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''برا مت ماننا! لیکن مجھے تو پاگل پن سے زیادہ آسیب واسیب کا معاملہ لگتا ہے۔ میں نے بھی دیکھا تھا ایک بار، شفیق بھائی کے سوئم میں اُس پر باقاعدہ حاضری آئی تھی۔ آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں۔ میں نے تو تب بھی کہا تھا کہ اسکو کسی پیر فقیر کو دکھاؤ لیکن اُسکا وہ سوتیلا بھائی ہے نا اخلاق؟ اُس نے منع کر دیا۔'' مقدّس سے مزید کھڑے رہنا محال ہو گیا تو مکرم کو لیکر برائیڈل روم میں آ گئی۔ اُسے شدید غصّہ آ رہا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ کر بھی نہ سکتی تھی۔

''اچھا ہوا مقدّم نہیں آیا، اور اُسے آگے بھی نہیں آنا چاہیے۔'' دل میں سوچا۔ اب اُسے مقدّم کے نہ آنے کی وجہ سمجھ آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں یہ خاندان والے اُسکا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ تھے؟

---------+---------+--------

''تو تمام باتوں کا ماخذ یہ۔۔۔۔ کہ خلیل مر چکا ہے۔ یعنی! ہمارے ایک ایک قدم پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ ہم سے پہلے ہی وہ قاتل خلیل تک پہنچ گیا۔ بظاہر تو اُسکی موت گھر میں ہی پاؤں پھسل کر گرنے اور سر پھٹنے سے فوری طور پر واقع ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہے۔'' شیراز سکرین کے پاس کھڑا بریفنگ دے رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح کمرے میں آج بھی خاموشی تھی۔

''جسے آپکے ہر قدم کی اطلاع ہے، وہ ہمیں نقصان کیوں نہیں پہنچا رہا؟'' سوال معقول تھا اور مقدّم کی جانب سے آیا تھا۔

''گیم!۔۔۔'' فرّخ صاحب نے جواب دیا۔ ''وہ ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ ہمیں اس طرح اُلجھا کر وہ اس کھیل کو انجوائے کر رہا ہے۔''

''اب کیا کریں گے آپ؟'' حسین نے پوچھا۔ سب ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ سوائے علی اور رضا کے۔۔۔

وجہ یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے برابر میں بیٹھے تھے۔ رضا کو آنے میں دیر ہو گئی تھی، جب تک وہ پہنچا تو ایک ہی نشست خالی بچی تھی اور وہ بھی علی کے برابر میں۔ کتنی دیر تو وہ شش و پنج میں کھڑا رہا، پھر بلآخر وہیں بیٹھ گیا۔ اب دونوں ہی خاموش تھے۔ رضا کے تاثرات ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور سپاٹ تھے۔ البتہ علی آج کسی گہری سوچ میں تھا۔ اُسکی صحت میں واضح تبدیلی نظر آ رہی تھی، چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے ہلکے گہرے ہو چکے تھے۔

''ایک آخری کوشش۔۔۔ مائیکل تک پہنچنے کی، اگر وہ ہاتھ نہ آیا تو پھر ہمارے پاس ایک پلان بی ہے۔ کسی بھی ناگزیر صورتحال میں اس منصوبے پر عمل کیا جائیگا۔ لیکن فلحال یہ منصوبہ اِس وقت کی ضرورت نہیں ہے۔'' فرّخ صاحب نے تفصیلاً بتایا۔ کچھ دیر تک وہ مزید بریفنگ دیتے رہے۔ پھر میٹنگ برخاست

ہوئی تو وہ اور شیراز کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ لوگ بھی باری باری کھڑے ہونے لگے۔ اُنکے انداز میں آج نہ تیزی تھی، نہ پہلے کی طرح کسی کو بھی وہاں سے فرار ہونے کی جلدی تھی۔

رضا اٹھا، کرسی پیچھے دھکیلی اور مڑا تاکہ باہر جا سکے۔ اور اُسی لمحے کچھ ایسا ہوا جو آنے والے دنوں کا فیصلہ کرنے والا تھا۔

''رضا!'' علی نے بیٹھے بیٹھے پکارا۔ جو جہاں تھا وہیں رکا رہ گیا۔ رضا کے قدم تھمے، نوید نے حیرت سے دیکھا، حسین نے آنکھیں میچیں، مزید کوئی جھگڑا نہیں پلیز!

رضا پلٹا اور علی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا باقی رہتا ہے؟

علی نے اُسے دیکھا، مشکل مرحلہ تھا یہ۔ ایک لفظ معافی۔۔۔

فقط ایک لفظ۔۔۔ معافی۔۔۔

دنیا کا مشکل ترین کام۔۔۔

زبان سے ادا ہونے میں انسان کی پوری قوت کا تقاضا تھا۔

انا کا سودا۔۔۔

عزت نفس کی قربانی۔۔۔

لیکن بے حد مشکل تھی یہ اعلیٰ ظرفی۔۔۔۔

''میں نے اس دن جو بھی کیا۔۔۔'' وہ رکا۔ منتظر سماعتیں بے چین ہوئیں ''میں اُسکے لیے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری غلطی تھی۔'' الفاظ ادا ہو گئے۔ سماعتیں بے یقین ہو گئیں۔ اُس نے معافی مانگ لی، انا قربان کر دی۔ سودا گھاٹے کا تھا، فائدہ چاہتا بھی کون تھا؟

اپنی بات مکمل کر کے سنجیدگی سے خود کو دیکھتے رضا کو دیکھا۔ اگر جو اُس نے پوچھ لیا کہ کس دن کے لیے معافی مانگ رہے ہو؟ اُس روز والے واقعے کے لیے یا کل والے؟ اور کل کا ذکر نکلا تو ذکر تو علی کے گھر تک جائیگا، اور آج رضا کی جگہ وہ خود، بیچ چوراہے میں ذلیل ہو جائیگا۔

''کس بات کی معافی؟'' اُس نے پوچھا۔ علی کا دل رکا ''مجھ سے سوال کرنے کی؟ یا میرا ماضی اُدھیڑنے کی؟'' اُس نے کل کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں ہاتھوں کو پیچھے باندھے وہ سنجیدگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے علی کو ذلیل نہیں کیا۔

''تمہارا اُس مجرم سے تعلق جس بنا پر تھا۔'' پھر رکا، وضاحت دینا مشکل ہو گئی جیسے۔ ''بس! اُس کا ذکر کیا تھا میں نے۔ لیکن۔۔۔ شاید میرا طریقہ غلط تھا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ آج اُسکے انداز میں نہ وہ جارحیت تھی نہ وہ غصّہ، وہ تھک گیا ہو جیسے، باقی سب سانس روکے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''تم سوال کر سکتے تھے، میں جواب دہ نہیں تھا پھر بھی جواب دے دیتا۔ تمہارا ایک قرض تھا۔'' علی کی آنکھوں میں حیرت اُتری۔ بھلا کون سا قرض؟

''جو میں نے کیا تھا تمہارے ساتھ، اُسکا بدلہ مجھے کبھی نہ کبھی ادا کرنا ہی تھا لیکن۔۔۔'' بات دس سال پیچھے چلی گئی۔ صحیح کہا تھا حسین نے، بات جب بھی ہو گی وہیں سے ہو گی جہاں پر رکی تھی۔

''لیکن تمہیں کوئی حق نہ تھا کہ تم مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں سوال کرتے، تمہیں کوئی حق نہ تھا کہ تم جو بات جان گئے تھے، اُسکا اشتہار اسطرح لگاتے۔'' اُسکا لہجہ سخت ہوا۔

''ہاں! میں کرتا تھا نشہ۔۔۔ لیتا تھا میں ڈر گز۔'' آواز اُسکی بلند تھی، لیکن لہجے میں زمانوں کے دکھ پنہاں تھے۔ آج سب چپ تھے اور وہ بول رہا تھا۔ وہ جو ہر ملاقات میں خود پر خاموشی کا خول چڑھائے رکھتا تھا جیسے کہ وہ گونگا ہو۔

''لیکن اُسکے لیے میں تمہیں یا کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہوں۔ میں نے کسی کا نقصان نہیں کیا لیکن صرف اپنا۔۔۔ میں نے جو کیا اپنے ساتھ کیا، میں نے برباد کیا تو خود کو۔۔۔ اور اُسکے لیے نہ کوئی ذمے دار ہے اور نہ میں کسی کو جواب دہ۔'' ایک ایک لفظ پر زور دیتے، وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ گیا۔ علی ساکت سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ مزید وہاں نہیں رکا، کسی کو دیکھنے کے لیے نہیں رکا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اُنکے چہروں کو کوئی دیکھ لیتا تو اس جگہ کو میت گاہ تصور کر لیتا۔ وہ کیا کہہ کر گیا تھا؟ کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی سب بتا کر گیا تھا۔ اُس نے خود کو برباد کیا، پر کس لیے؟ اُس نے اپنا نقصان کیا بھی تو کیوں؟ وہ ایسا نہیں تھا، پر ایسا ہو گیا تھا۔ کیوں؟ ہزاروں **کیوں** تھے اُنکے پاس، جواب ایک کا بھی نہیں۔

کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، ہلتا بھی تو کیسے؟ رضا نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا کہاں تھا؟ علی شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا تھا۔ اُس نے ذکر نہیں کیا، اُس نے کل کے واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ اُس نے علی کا پردہ رکھ لیا۔ ہاں! اُس نے ڈوبتی ہوئی ہی صحیح، پر اپنی پرانی دوستی کا بھرم رکھ لیا تھا۔ حسین دروازے کی طرف بڑھنے لگا، رضا کے پیچھے جانا چاہتا تھا شاید۔۔۔

مقدّم کے وجود میں جنبش ہوئی، وہ علی کے قریب تھا۔ اُسکے پاس آیا اور اُسکے سامنے کھڑا ہوا۔ علی کا جھکا سر اٹھا اور اُس نے خالی خالی نظروں سے مقدّم کو دیکھا۔ اب کیا کہے گا وہ؟ ہاں! بس وہی تو رہ گیا تھا جس نے اب تک اس معاملے پر اسے کچھ نہ کہا تھا۔

''لیلیٰ مر چکی ہے علی!'' بالکل غیر متوقع بات کہی۔ جو کسی کے تصوّر میں نہ تھی، جو کسی کے خیال میں بھی نہ گزری تھی، جو کسی نے تصور بھی نہ کی، وہ بات کہی تھی اس نے۔

سانسیں چلنے سے انکاری ہو گئیں، دنیا ساکن ہو گئی اور حواس سلب ہو گئے۔ الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ؟ دروازے سے باہر نکلتے حسین کے قدم تھمے، وہ پلٹا۔۔۔ یہ اُسکے کانوں نے کیا سنا تھا ابھی؟ آج کا دوسرا جھٹکا، جس نے وہاں کھڑے کسی بھی شخص کو کچھ بھی کہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔

''لیلیٰ مر گئی تھی، اور میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ جب تک ہوش آیا تب تک اُسکا سوئم بھی گزر چکا تھا۔'' متوازن مگر دھیمے لہجے میں وہ بتا رہا تھا، پر وہ یہ کیوں بتا رہا تھا؟

''اُسکے بعد جتنی دوائیں مجھے ڈاکٹرز نے دی تھیں، وہ اتنی بھاری تھیں کہ میں چوبیس گھنٹوں میں سے چند گھنٹے جاگتا تھا، باقی کے گھنٹوں میں چاہ کر بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ چلنے کے لیے قدم رکھتا تھا تو پاؤں لڑکھڑاتے تھے، بات کرتا تھا تو زبان ہکلاتی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر ہر شخص نے یہی اندازہ لگایا کہ میں نشہ کرتا ہوں۔ میرے خاندان میں آج بھی یہی مشہور ہے کہ میں عادی نشئی تھا اور میرے ماں باپ میرا علاج کراتے کراتے مر گئے۔ تم اُن سے ملو گے تو وہ تمہیں یہی بتائیں گے۔ بلکہ اس بھی زیادہ یہ کہ میں ذہنی مریض تھا اور چند ایک تو یہ بھی بتا دیں گے کہ مجھ پر جنّات کا سایہ تھا۔'' آخر میں وہ ہنسا۔ پتہ نہیں کس پر؟ اپنے خاندان والوں پر یا اپنی بے بسی پر؟ سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ بات کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ پر سمجھنا کون چاہتا تھا؟ ذہن تو وہیں اٹک گیا تھا، جہاں اُس نے لیلیٰ کی موت کی خبر دی تھی۔

''ضروری نہیں کہ جو تمہیں دوسروں سے پتہ چلے وہی سچ ہو۔ جو تمہیں معلوم ہوا وہ ایک طرف کی بات تھی، دوسری طرف کی بات جاننے کی کوشش بھی کرنی چاہیے تھی تمہیں۔ خبر اتنی تیزی سے نہیں پھیلتی، جتنی تیزی سے افواہ پھیلتی ہے۔ بنا تصدیق کہ جب تم کسی کا ماضی، موضوع گفتگو بناتے ہو، تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی کے زخم اور اُسکی تکلیفیں تازہ کر دو۔ تمہیں اس بات کا خیال کرنا چاہیے تھا۔'' ساری باتوں کا ماخذ وہی تھا جو اُسے عمر، حسین اور خود رضا سمجھانا چاہتا تھا۔ لیکن آج تصویر کا کوئی اور رخ دیکھا تھا۔

دروازے پر رک کے کھڑا حسین مزید وہاں نہیں ٹھہر سکا۔ وہ جانے کے لیے پلٹا۔۔

یہ پہلا مجنوں ہے جسے اپنی لیلیٰ مل گئی ہے۔

کسی زمانے میں اس نے کہا تھا، آج اپنے کہے الفاظ کانوں میں گونجے تو دل بیٹھ سا گیا، قدم من من بھر کے ہو گئے۔ آج کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی، وہ رضا کے پیچھے بھی نہیں گیا۔

مقدّم کی بات مکمل ہو چکی تھی، وہ مزید وہاں نہیں رکا۔ عمر نے ایک نظر علی کو دیکھا اُسکے جھکے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ دوسری نظر نوید پر ڈالی تو الجھ گیا۔ وہ سنجیدہ تھا لیکن چہرے پر کوئی حیرانگی نہ تھی۔ وہ سنجیدہ مگر لاتعلق سا کھڑا تھا۔ وہ اُلجھا۔۔۔ جس روز علی نے رضا کے ڈر گزوالی بات کا ذکر کیا تھا اُس روز بھی نوید کے چہرے کا تاثر ایسا تھا جیسے وہ پہلے سے یہ بات جانتا ہو، آج بھی اُسکے چہرے پر کچھ اسی قسم کے تاثرات رقم تھے۔ سر جھٹک کے آگے بڑھا، علی کے سامنے رک کے اُسے دیکھا۔ اُسکا بیٹا اُسے چھوڑ گیا تھا لیکن اُس نے پھر بھی ہمت کی۔ اُس نے معافی مانگی، یہ وہ کام تھا جو اُن میں سے کوئی نہ کر سکا، پر علی نے کر لیا۔ کچھ بھی کہے بنا وہ باہر نکل گیا۔

علی نے بھی خاموشی سے جانے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ کسی نے اُسکا بازو تھاما۔ چہرہ موڑ کے دیکھا تو اِس سارے معاملے میں لاتعلق کھڑا نوید اُسکے سامنے تھا۔

''میرے ساتھ آؤ! تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُسکا بازو چھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گہری سانس لیتا اُسکے پیچھے چل دیا۔

ایک قاتل۔۔۔۔

جس نے اُنہیں جدا کیا۔۔۔

ایک قاتل۔۔۔۔

جس نے اُنہیں پھر سے اکھٹا کر دیا۔۔۔

ایک جھگڑا۔۔۔

جو اُنکے بیچ دراڑ کا سبب بنا۔۔۔

ایک جھگڑا۔۔۔۔

جو شاید۔۔۔

دراڑ بھرنے والا تھا؟

---------+---------+--------

رضا جا چکا تھا، پارکنگ میں اب عمر، مقدّم اور حسین کھڑے تھے۔ علی باہر نہیں آیا تھا۔

''میں رضا کو ڈھونڈھنے آیا تھا لیکن شاید وہ جا چکا ہے۔''حسین نے کہا۔اُسکی گاڑی نے آج پھر کوئی مسئلہ کر دیا تھا، جسے وہ درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر اور مقدّم اسے گاڑی کا بونٹ اٹھائے،اُس میں سر دیئے کھڑا دیکھ اُسکے پاس ہی آ گئے۔ لیکن خاموشی پھر بھی چھائی رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے مقدّم نے جو انکشاف کیا تھا،اُسکا اثر زائل کرنے کے لیے حسین نے بلاوجہ ہی وضاحت دی تھی۔

''ہاں! اُسے نکلے کافی دیر ہو گئی ہے۔''عمر نے بھی بات کرنے کے غرض سے کہا۔ خاموشی پھر چھا گئی۔ حسین سر جھکائے اپنی گاڑی کے تار جوڑنے میں مصروف رہا۔

''میری سمجھ نہیں آیا کہ ان دونوں کو اچانک سے ہو کیا گیا تھا آج؟''خاموشی کو مقدّم کی آواز نے توڑا۔

''علی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا بس!''عمر نے کہا۔اُسے یقین تھا کہ جتنا اس روز اُس نے علی کو سمجھایا تھا،اُسکا کچھ تو اثر ہوا ہو گا۔

''ہاں! کل بھی دونوں کا جھگڑا ہوا تھا،اُسکے بعد میں نے سمجھایا تھا اُسے، شکر ہے سمجھ گیا۔''حسین نے بونٹ زور سے بند کرتے ہوئے بتایا۔اُسکا کام ہو گیا تھا شاید۔۔۔

''کل؟''دونوں ہی حیران رہ گئے۔

''ہاں کل! مجھے اتفاقیہ علی مل گیا تھا تو میں اُسے گھر چھوڑنے ساتھ جا رہا تھا۔ لیکن راستے میں میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ہمیں کچھ دیر رکنا پڑا تو وہاں پر۔۔۔۔''وہ مختصراً سب بتاتا چلا گیا۔وہ دونوں جیسے بے یقین سے رہ گئے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ علی! اپنی بیوی کو اس طرح گھر سے نکال سکتا ہے؟ ہو کیا گیا ہے اُسے؟''مقدّم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بیوی نہیں، سابقہ بیوی۔''عمر نے سنجیدگی سے تصحیح کی،اب حیران ہونے کی باری باقی دونوں کی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''علی کی چار سال پہلے ہی طلاق ہو چکی ہے۔اُسکی بیوی نے کسی اور سے شادی کر لی تھی لہٰذا دونوں کا بیٹا، علی کے پاس تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ زبردستی اپنے بیٹے کو چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔اور اب پچھلے ہفتے وہ اپنے بیٹے کو ساتھ بھی لے گئی ہے۔ شاید اسی لیے گھر سے نکالا ہو۔''عمر نے تفصیلاً بتایا۔ حسین تو خاموش رہا لیکن مقدّم کو یہ جواز پسند نہیں آیا۔

''بے شک سابقہ بیوی ہو، لیکن ایک عورت کو خصوصاً ایک ماں کو جو اپنے بچے سے ملنا چاہتی ہے،اس طرح گھر سے نکالنا علی کو زیب نہیں دیتا۔''وہ متفق نہیں تھا۔

''رضا کو ایک بوڑھے آدمی کو اُسکی جوان بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ گھر سے نکالنا زیب دیتا ہے؟'' تلخی سے کیے گئے اس سوال پر گاڑی کا دروازہ کھولتے حسین نے رک کر اُن دونوں کو دیکھا۔ مقدّم حیران ہوا۔

''وہ رضا کا ماموں تھا، اور تم جانتے ہو کہ وہ کن حالات میں رہا ہے، یقیناً وہی وجہ ہونگے ان سب کی۔'' اُس نے وضاحت دینی چاہی۔

''تو وہ بھی اُسکی سابقہ بیوی تھی، جو اُس سے اُسکا بیٹا چھیننے آئی تھی۔'' عمر نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''تم لوگ رضا کی غلطیوں کا جواز ڈھونڈ لیتے ہو لیکن علی کی نہیں۔۔۔ جب رضا کو غلطی کرنے کا مارجن دے سکتے ہو، تو علی کو کیوں نہیں؟''

''ان سب میں پہل علی نے ہی کی تھی۔'' اُس نے جتایا۔

''معافی مانگنے میں بھی اسی نے پہل کی ہے۔''

''آخر تم میرے سامنے علی کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟'' اُس نے چڑ کر پوچھا۔

''کیونکہ اُسکے سامنے تمہاری بھی کی تھی۔'' مقدّم لاجواب ہو گیا۔

یہی وجہ تھی کہ عمر نے اُسے جھگڑے والی بات پوری نہیں بتائی تھی، نہیں بتایا تھا کہ علی نے اُسے مفرور کہا تھا۔ البتہ یہ ضرور بتایا تھا کہ وہ تمہارے غائب ہونے کی وجہ سے پریشان تھا اور یہی بات جھگڑے کا سبب بنی، اور اب عمر دیکھ سکتا تھا کہ بس اتنی سی بات پر ہی وہ علی سے کتنا بدظن ہو گیا تھا؟

''اب تم دونوں تو نہ لڑو۔'' حسین نے کہا۔

''لڑ نہیں رہا میں، بس سمجھانا چاہتا ہوں کہ علی بھی پریشان ہے۔ گھر ٹوٹنا آسان بات نہیں ہوتی، پھر اُسکا بیٹا بھی اس سے دور ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے! جو اُس نے کیا وہ اُسے نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب اس نے معافی مانگ لی نہ؟ تو ختم کرو اس بات کو۔'' عمر نے آرام سے سمجھایا۔

''میں جا رہا ہوں۔'' مقدّم نے اطلاعی انداز میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ ناراض ہو گیا کیا؟'' حسین نے عمر سے آہستہ سے پوچھا۔

''میرا نہیں خیال۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''کچھ دیر چھوڑ دو اُسے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' حسین کو جواب دیتے وہ بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ چکا تھا۔

چیزیں آہستہ آہستہ جگہ پر آنے لگی تھیں۔

---------+---------+--------

ایس ایس پی نوید عالم

کمرے کے دروازے پر لگی خوبصورت سی تختی پر نوید کا نام جگمگا رہا تھا۔اُس نے دروازہ کھولا اور علی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔اُسکے اندر آتے ہی نوید نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے کسی کو پانی لانے کو کہا اور ساتھ کچھ مزید ہدایات دیں جو علی سن نہ سکا، پھر اُسے بند کرتا ہوا اندر آ گیا۔

خوبصورت فرنیچر اور جدید آرکٹیکٹ سے آراستہ آفس پہلی نظر میں ہی آنکھوں کو متاثر کرتا تھا۔آفس کے درمیان میں رکھی میز پر بھی ایک تختی تھی، جس پر اُس کا نام جگمگا رہا تھا۔میز کے ساتھ رکھی ریوالونگ چیئر کے پیچھے دیوار گیر ریکس تھے۔کچھ میں اُسکی سروس کے دوران لی جانے والی تصاویر تھیں، تو کچھ میں اُسکے ایوارڈز وغیرہ۔باقی ریکس میں شوپیس وغیرہ رکھے تھے۔ان سب میں جو شے توجہ کا مرکز تھی، وہ عین وسط میں رکھا ستارہ شجاعت تھا۔جو اُسے چار سال قبل غیر معمولی بہادری کی بنا پر ملا تھا۔میز کی دونوں جانب پاکستان کے بڑے سائز کے دو جھنڈے نصب تھے۔

علی ایک نظر کمرے پر ڈالتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔کھڑا ہونا تو دور اب بیٹھنا بھی محال ہو رہا تھا۔نوید ریوالونگ چیئر گھسیٹ کر اُسکے قریب لے آیا، بیٹھنے سے پہلے ہی دروازہ بجا تو وہ دروازے تک چلا گیا۔پھر ہاتھ میں ٹرے لیکر دروازہ دوبارہ بند کرتے ہوئے علی کے پاس واپس آیا اور ٹرے اُسکے سامنے رکھ دی۔اُس نے دیکھا، ٹرے میں پانی کا گلاس، چائے کی پیالی اور بسکٹ، ساتھ ایک پیراسیٹامول کا پتہ بھی رکھا تھا۔

''کھاؤ اسے!''اُسکی طرف دوا بڑھاتے ہوئے خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیوں؟''اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''تمہیں بخار ہے، پہلے دوا لو پھر بات کرتے ہیں۔''وہ حیران ہوا، اُسے کیسے پتہ چلا؟ بہر حال اس نے بس پانی کے ساتھ دوا لی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔نوید نے اس پر کچھ نہیں کہا۔

''تمہارا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا رضا سے؟''نوید نے سنجیدگی سے سوال کیا تو اُس نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں معلوم تو ہے، میں نے اُسے خلیل کے۔۔۔''

''میں کل کی بات کر رہا ہوں۔''اُس نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

''کل؟''اُسے یقین نہ آیا کہ نوید کو یہ بات معلوم تھی۔

''ہاں! کل۔۔۔تم دونوں کس بات پر بیچ سڑک پر جھگڑ رہے تھے؟''ریوالونگ چیئر کو دائیں سے بائیں ہلکا سا گھماتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا کہ تم لوگوں کے پیچھے سی ٹی ڈی کے جوان ہیں۔تمہاری ہر خبر مل جاتی ہے ہمیں۔''اُس نے جتایا۔

''پھر تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''اُس نے طنزیہ کہا۔نوید کے چہرے کی سختی سے خائف تھا وہ۔

''ہاں! لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''طنز خاطر میں نہیں لایا گیا۔

''میں بتانا نہیں چاہتا۔''علی نے کہا۔ نوید کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لیتا ہوا آگے ہوا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے علی؟تم تو ایسے نہیں تھے۔کیوں اتنے نیگیٹیو(منفی)ہو چکے ہو تم؟کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ مجھے بتاؤ۔''آہستہ سے کیے گئے اس سوال پر علی کا دل بھر آیا۔کسی نے تو اس سے پوچھا کہ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟

''مجھے کچھ اہم کام ہے،میں جا سکتا ہوں؟''اُس نے رخ پھیرتے ہوئے پوچھا،مبادا چہرہ نہ پڑھ لے۔

''نہیں! جب تک تم بتا نہ دو کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟تب تک تو تم کہیں نہیں جا رہے۔''علی نے حیران ہوتے اُسے دیکھا۔بھلا وہ اتنے حق سے اُس سے یہ کیسے کہہ رہا تھا؟

''جب میں نے تمہارے ساتھ یہی سب کیا تھا تب بھی مسئلہ کیا میرے ساتھ ہی تھا؟'' تلخی سے پوچھا۔نوید کے ماتھے پر بل پڑے پر بولا کچھ نہیں۔

''مان لو کہ برا میں ہی ہوں۔کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے ساتھ،میں ہوں ہی غلط۔'' پتہ نہیں اتنا برا بھلا کیوں کہہ رہا تھا خود کو؟نوید گہری سانس لیتا پیچھے ہوا۔

''تم غلط دس سال پہلے بھی نہیں تھے،غلط ہم بھی نہیں تھے۔بس وہ وقت صحیح نہیں تھا۔''اور وہی ہوا جو ہوتا آ رہا ہے۔بات جب نکلتی دس سال پیچھے ہی پہنچ جاتی تھی۔

''جب تم رضا کی ڈر گز لینے والی بات نکال رہے تھے،میں نے تمہیں تب بھی روکنا چاہا تھا۔میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہا لیکن علی! مجھے تب بھی سمجھ آ گیا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے اور اُس روز بھی جب تم رات کو مجھے ملے تھے۔''وہ تمہید باندھ رہا تھا یا اُسے بولنے پر اکسا رہا تھا؟

''تم جانتے تھے کہ رضا ڈر گز لیتا ہے؟''علی کا سوال غیر متوقع تھا۔

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا بیٹا تمہاری سابقہ بیوی کے ساتھ چلا گیا ہے۔''نوید کا جواب بھی اتنا ہی غیر متوقع تھا۔ کوئی پہاڑ ٹوٹا تھا اُسکے سر پر۔۔۔ کتنے لمحے وہ بے یقینی سے اُسے دیکھتا رہا پھر اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جاؤ علی!''نوید نے اُٹھے بنا ہی کہا۔ پر وہ نہیں بیٹھا۔''پلیز!''اس مرتبہ درخواست کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

''جب تم لوگ پہلی بار یہاں آئے تھے تو اس سے ایک روز پہلے ہی مجھے تم سب کی معلومات مل گئی تھیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ لیلیٰ مر چکی ہے، یہ بھی کہ رضا ماضی میں ڈرگ اڈکٹید (عادی نشئی) تھا اور بھی بہت کچھ۔۔۔ یہ میرا پیشہ ہے۔''سنجیدگی سے وضاحت دی۔ جس روز اُس نے مارٹ میں حسین کے ساتھ حور عین کو دیکھا تھا، اُس روز بھی وہ حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حور عین اُسکی بیوی ہے۔

''تمہارے اس رویے کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ مجھے بتاؤ، کیا معلوم میں کچھ کر سکوں؟''اُس نے پہلی بار اپنائیت سے کہا تھا۔

''کیا کر سکتے ہو تم؟ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔ دل کے زخم تازہ ہونے لگے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ دس سال پہلے بھی میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکا تھا۔ لیکن کیا معلوم اب آ جاؤں؟''علی رکا۔۔۔ حیران ہوا۔۔۔ پریشان ہوا۔ وہ لوگ کیوں ایسا سمجھ رہے تھے کہ وہ ابھی تک اُن سے ایک دہائی پہلے کے مسئلے پر خفا ہے؟ زندگی میں اُس سے بڑے بڑے واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ایسے میں وہ مسئلہ بھلا کیا اہمیت رکھتا تھا؟

''تم میرا بیٹا واپس لا سکتے ہو؟''اس سوال پر نوید تھما۔

''کیا تم میرے باپ کی نظروں میں مجھے کوئی مقام دلوا سکتے ہو؟ میرے بیٹے کے دل سے میرے لیے نفرت نکال سکتے ہو؟ میرا ٹوٹا گھر واپس بسا سکتے ہو؟'' وہ پھٹ پڑا۔ نوید نے دکھ سے اُسے دیکھا۔

''تو تم کیسے کہہ رہے ہو کہ تم میرے کام آ سکتے ہو؟''آواز رندھ گئی، لہجہ بھرا گیا، آنکھیں سرخ ہوئیں۔ کون کہتا ہے مرد کو درد نہیں ہوتا؟ مرد کو سہارا بھی چاہیے ہوتا ہے، اسکو تسلی کے دو بولوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی انسان ہوتا ہے۔ ایک جیتا جاگتا انسان۔ نوید نے پانی کا گلاس اٹھا کر اُسے دیا۔ اُس نے لیا اور پی گیا، خود کو رونے سے بمشکل روکے، وہ گہری سانس لیکر خود کو کمپوز کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

''تم عدالت سے اپنا بیٹا واپس لا سکتے ہو۔''نوید نے حل پیش کیا۔

''میرا بیٹا میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتا، کیا فائدہ پھر؟''خود پر قابو پانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟''اُسکی اپنی آواز نے ہی ساتھ نہیں دیا۔

''ایسا ہی ہے! میں کسی انسان کے دل میں جگہ نہیں بنا سکا۔ کسی ایک انسان کے بھی نہیں۔۔۔۔'' تھک کر سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ آنسو بہہ نکلے، مزید ضبط کرنے کا حوصلہ نہیں بچا تھا۔ نوید سن سا بیٹھا رہ گیا، اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح رو دیگا۔

جب اُس سے الگ ہوا تھا، تو مر کر بھی تصوّر نہیں کیا تھا کہ زندگی میں دوبارہ اُس سے ملاقات ہو گی، تو وہ اس حال میں ملے گا۔ وہ شاید رو رہا تھا، اتنے دنوں کا بوجھ آج نکلا تھا۔ نوید کا دل پسیجا۔

وہ اُسکا دوست تھا، اُسکا بہترین دوست۔۔۔ اُسکا جگری یار۔۔۔

اور وہ رو رہا تھا تو کیا نوید سکون سے بیٹھا رہ سکتا تھا؟ اُسے تسلی دینی نہیں آتی تھی، اور وہ آج بھی نہیں آئی تھی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا، لیکن تسلی دینے کے لیے الفاظ نہ ملے۔

علی نے چہرہ اٹھا کر آنسو صاف کیے، نم آنکھیں فرش پر ٹکی رہیں، آج برداشت ختم ہو گئی تھی اُسکی۔ نوید اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسکے پاس آیا، اُسکے کندھے پر بازو پھیلا کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

خلا بھرنا ہی تھا، دراڑ ختم ہونی ہی تھی۔

وہ آج ہی صحیح۔۔۔۔

---------+---------+--------

''سفیر لودھی کا بیٹا ٹکے ٹکے کی ملازمت کر رہا ہے۔ باپ کا کاروبار ہوتے ہوئے بھی اپنے فضول شوق کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہے۔'' دس سال پہلے کی ایک صبح اُسکے باپ نے فاطمہ کے سامنے بیٹھ کر یہ بات کہی تھی۔ ہمیشہ کہتے تھے، کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن نیا یہ تھا کہ آج فاطمہ کے سامنے بھی یہی سب ہوا تھا۔

'' جسے آپ ٹکے ٹکے کی ملازمت کہہ رہے ہیں وہ میرا رزق ہے، حلال کمائی ہے میری۔'' اُس نے ضبط سے کہا۔

''ساری زندگی بھی کماتے رہو گے تو بھی اپنا کاروبار کھڑا نہیں کر سکتے۔'' وہ چپ ہو گیا۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ سفیر صاحب صحیح کہہ رہے تھے، وہ دو دو نوکریاں کر رہا تھا۔ ایک تنخواہ سے اپنا اور فاطمہ کا خرچ اٹھاتا اور دوسری تنخواہ بینک میں رکھوایا کرتا تاکہ اپنے کاروبار کے لیے سرمایہ اکھٹا کر سکے۔ لیکن یہ اب بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔

''تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اگر تم کہو تو میں جاب کرنے کو تیار ہوں۔'' اُسے پریشان دیکھ کر فاطمہ کہتی۔

''نہیں فاطمہ ! تم نے مجھ سے کبھی کوئی خواہش نہیں کی، کبھی کچھ نہیں مانگا۔ صرف ایک بار کہا تھا کہ تم نوکری نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے شوق کے لیے تمہیں تکلیف میں نہیں ڈالوں گا۔ یہ میرا امتحان ہے، مجھے ہی دینا ہے۔'' وہ اُسے منع کر دیتا۔ سچ تو یہ تھا کہ فاطمہ نے اس سے واقعی کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ وہ جو بھی لا کر دے دیتا، اُسی میں خوش رہتی۔ اُس سے کبھی فرمائشیں نہیں کرتی، کبھی مہنگے مہنگے تحفے نہیں مانگتی۔ ایسے میں علی اُس سے کبھی بھی یہ احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی اُسکی بے لوث محبت پر مشکور ہوتا اُسکا ہاتھ تھام کر کہتا۔

''آج نہیں تو کل، جب میں اپنا کام شروع کر دوں گا، تو دیکھنا سب سے پہلا منافع تمہارے ہاتھ پر رکھوں گا۔''

''اور میں اُسکا کیا کروں گی؟'' وہ ہنس دیتی۔

علی کی مصروف زندگی میں صرف ایک ویک اینڈ ہوتا تھا، جب وہ فاطمہ کے ساتھ واک پر جاتا، اُسکے پاس کرنے کے لیے دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں اور وہ بس مسکراتا اُسے سنتا رہتا۔ راستے میں وہ کبھی میٹھے پان خریدتے، کبھی گول گپے کھاتے تو کبھی علی گجرے خرید کر اُسے پہنا دیتا۔ یہ چند گھنٹے اُسکی پورے ہفتے کی تھکن دور کر دیتے اور وہ نئے سرے سے خود کو محنت کرنے کے لئے تیار کرتا۔ فاطمہ اُسکی زندگی میں بہار تھی، وہ ساتھ ہوتی تو دل کھول کر ہنستا۔ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور اُسکے لیے ہی دل و جان سے محنت کرتا۔

پھر اُسکی زندگی میں احمد آیا۔ اپنی اولاد کو گود میں لینا اُس سے بھی کہیں بڑھ کر خوبصورت احساس تھا۔ دونوں نے بڑے پیار سے اُسکا نام رکھا تھا۔ اب فاطمہ کی توجہ کا مرکز احمد ہوتا تھا۔ وہ اپنی خواہشات تو مار لیتی تھی لیکن اب اپنے بیٹے کے لیے اُسکا دل نئی نئی چیزیں خریدنے کو مچلتا۔ کوئی نیا کھلونا دیکھتی تو چاہتی کہ احمد بھی اس سے کھیلے۔

شروعات میں وہ اپنی جیب خرچ سے احمد کے لیے چیزیں لیتی، علی کو معلوم بھی نہ ہوتا۔ لیکن پھر اُس نے علی سے فرمائشیں کرنی شروع کی۔ پہلے پہل تو اُس نے پورے جوش و خروش سے اُسکے لیے ہر چیز لا کر دی، لیکن جب اُسکی ساری تنخواہیں اور بینک میں رکھے پیسوں تک میں ہاتھ لگنے لگا تو اُسے پتہ چلا کہ بچہ پالنا کتنا مشکل کام ہے؟ اُسکا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، سفیر صاحب بھی چلتے پھرتے کچھ ایسا کہہ دیتے کہ اُسکا دماغ گھوم کر رہ جاتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ فاطمہ بھی اب اس سے روز کوئی نہ کوئی نیا مطالبہ کرنے لگی تھی۔

''علی! کیا ہم اپنے بچے کی سالگرہ نہیں کریں گے؟'' اُس نے احمد کی پہلی سالگرہ پر پوچھا تھا۔

''نہیں، ہم کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟'' اُس نے صاف جواب دیا۔

''پلیز! دیکھو بس پہلی سالگرہ ہی تو ہے۔'' اُس نے منت کی۔

''فاطمہ! سالگرہ آسان بات نہیں ہے۔ ہزاروں خرچے ہوتے ہیں اور میں اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔''اُس نے سمجھایا۔

''علی! تم بینک میں پیسے رکھتے تو ہو نا! اگر اُس میں سے تھوڑے۔۔۔''

''ہر گز نہیں! پہلے ہی تمہاری فرمائشوں کی وجہ سے اُن پیسوں میں ہاتھ لگ چکا ہے۔ میں اُسے ان سب میں ضائع نہیں کر سکتا۔''اس نے سختی سے کہا تو پہلے فاطمہ نے صدمے سے اُسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ پوری رات علی نے پریشانی میں گزاری، اپنے لہجے اور الفاظ کا احساس ہوا تو شرمندگی نے آگھیرا۔ فاطمہ نے بھلا نے کب اپنے لیے کوئی فرمائش کی تھی؟ ہمیشہ اپنے بیٹے کا ہی تو سوچتی تھی۔ اور علی بھی تو اپنے بیٹے کو ہی سب کچھ دینا چاہتا تھا اور اُسکے بہتر مستقبل کے لیے ہی تو کر رہا تھا اتنی محنت۔ بلآخر اُس نے صبح تک فاطمہ کو منا لیا اور سالگرہ کی ایک چھوٹی سی تقریب رکھ دی۔ بینک میں رکھے پیسوں کو ہاتھ لگانے کے بجائے اپنی ماں سے ادھار لیا۔ اُنہوں نے خوشی خوشی دے دیا۔ ساتھ میں وعدہ بھی لیا کہ ابّا کو نہ بتائیں۔

سالگرہ بخیر و خوبی ہو گئی، لیکن اُس پوری تقریب میں وہ خاموش سا رہا۔ اُسکے ذہن میں بیک وقت ہزاروں مسائل چل رہے تھے۔ ٹھیک ہے یوٹیلیٹی بیلز وہ نہیں دیتا تھا لیکن گھر کا راشن اُسکے پیسوں سے ہی آتا تھا۔ احمد کے ہزاروں خرچے تھے، امّاں کو کبھی پیسے دیئے نہ تھے، لیکن آج اُن سے مانگتے ہوئے شدید شرم آئی تھی، وہ بھی ایک فضول سی تقریب کے لیے۔

''تم پورے فنکشن میں اس طرح منہ لٹکا کر کیوں کھڑے تھے؟''رات فاطمہ نے اس سے پوچھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی کانوں سے بندے اُتار رہی تھی۔ علی اُسے آئینے میں ہی بستر پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

''سر میں درد تھا۔''مختصر جواب دیا۔

''علی! تم اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش نہیں ہو؟''بندے دراز میں ڈالتے ہوئے، جانچتی نظریں، آئینے میں نظر آتے اُسکے عکس پر ڈالیں۔

''بیٹے کی خوشی؟ اُسے تو یہ یاد بھی نہیں رہے گا۔ خوشی اُسکی نہیں تمہاری تھی۔''وہ سخت لہجے میں بولا۔

''میری خوشی؟''پلٹ کر حیرت سے دیکھا۔''میری خوشی کا سوچا ہی کب ہے تم نے؟ ہمیشہ اپنے خوابوں، اپنے کاروبار اور اپنے شوق کو اہمیت دی ہے۔ میں پورا ہفتہ انتظار کرتی ہوں تمہارے پاس بات کرنے تک کو وقت نہیں ہوتا، پہلے ہم ویک اینڈز پر باہر جاتے تھے۔ اب کتنے مہینوں سے تم میرے ساتھ کہیں باہر بھی نہیں گئے؟ میں نے کبھی شکایت نہیں کی، لیکن آج اپنے بیٹے کے لیے کہا تو تمہیں یہ میری خوشی لگی؟''وہ پھٹ پڑی۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا، شادی سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں تمہاری خواہشات پوری نہیں کر سکوں گا۔ اس سے پہلے کہ تم بیزار ہونے لگو ابھی انکار کر دو۔ کہا تھا نا؟''اُس کا لہجہ بھی تیز ہوا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ میں انکار کر سکتی تھیں ؟جب تم مرد ہو کر نہیں کر سکے تو میں کیسے کرتیں ؟''وہ چیخ اٹھی۔ علی بھونچکا رہ گیا، یہ کیا کہہ رہی تھی وہ؟

''آج کے بعد میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں نے تم سے جو مانگا اپنے بیٹے کے لیے مانگا۔ لیکن اب سے وہ بھی نہیں کہوں گی۔ احمد کے لیے مجھے ملازمت کرنی پڑی تو وہ بھی کر لوں گی۔''وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھ گیا۔ یہ اُنکا پہلا جھگڑا تھا۔ لیکن آخری نہیں۔۔۔

اُس روز تو اس نے فاطمہ کو منا لیا، وہ ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ یہ لڑکی جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اُسے کبھی بھی در در کی ٹھوکریں کھانے نہیں دیگا، اُس سے کیا ہوا وعدہ توڑ دے۔

وہ بھی جلدی مان گئی۔ علی نے اُسکا ہاتھ خرچ بڑھا دیا، اور اپنے اخراجات کم کر دیئے۔ لیکن بینک کے پیسوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اُسے کاروبار کرنا تھا اور ہر صورت کرنا تھا، سفیر صاحب کو کچھ بن کے دکھانا تھا۔

اُسکی زندگی دن بہ دن مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ جتنی محنت کرتا پیسے اُس سے کہیں زیادہ خرچ ہوتے۔ کبھی کبھار سوچتا کہ اگر اکیلا ہوتا تو کب کا اپنا خواب پورا کر چکا ہوتا۔ وہ چڑچڑا ہونے لگا، احمد کے لیے بھی اُسکے پاس وقت نہ ہوتا۔ چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے محنت کرتا اور باقی چھ گھنٹے سوتا تو اُسکو احمد اپنے آس پاس بھی نہیں چاہیے ہوتا تھا۔

اُسکے اور فاطمہ کے اختلافات بھی دن بہ دن بڑھنے لگے تھے۔ بات معمولی بحث سے بڑے جھگڑے تک چلی جاتی۔ اُسے لگتا کہ فاطمہ اُسے نہیں سمجھ رہی اور بالکل ایسا ہی فاطمہ کو بھی لگتا کہ وہ اُسے نہیں سمجھنا چاہ رہا ہے۔

زندگی خوبصورتی سے بدصورتی کی راہ پر چل پڑی تھی۔

---------+---------+--------

اُس روز فاطمہ تین سالہ احمد کے ساتھ اپنی یونیورسٹی کے زمانے کی دوست کے گھر آئی تھی۔ اُسکے بیٹے کی سالگرہ تھی اور اس نے تمام دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ اچھی خاصی مہنگی تقریب تھی۔ تھیم جنگل کے جانوروں پر تھی، کیک بھی ویسا ہی تھا۔ ریفریشمنٹ کے نام پر ہی اتنا کچھ رکھ دیا تھا اور سب کا سب تھیم کے حساب سے، کھانا تو ابھی سرو بھی نہ ہوا تھا پتہ نہیں اُس میں کتنے آئٹمز رکھے ہونگے ؟بچوں کے لیے مختلف گیمز تھے، گڈی بیگز الگ اور ساتھ ہی ایک شعبدہ باز جو مختلف قسم کے کرتب دکھا رہا تھا۔

اور ایک احمد کی تقریب تھی، روکھی پھیکی سی۔ صرف کیک کٹا اور مہمانوں کو کھانا کھلا کر رخصت کر دیا۔ فاطمہ دل مسوس کر رہ گئی۔ علی کی کنجوسی پر غصّہ آیا۔ دکھ سے باقی بچوں کے ساتھ کھیلتے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ ایک ہی سالگرہ ہوئی تھی اُسکی اور وہ بھی اتنی بورنگ۔۔۔ بیچارہ۔۔۔ اپنے بچے پر جی بھر کر ترس آیا۔

قریب ہی اُسکی سہیلی اپنی دوستوں کے گروپ کے ساتھ فوٹو سیشن کروا رہی تھی۔ اُسے بھی بلایا پر وہ اُٹھ کر نہیں گئی۔ اُنکے برانڈڈ لباس، مہنگے زیورات اور قیمتی موبائل فونز نے اُسے شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

''فاطمہ!۔۔۔ فاطمہ آفندی'' وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی، جب ایک مردانہ آواز اُسکے کانوں سے ٹکرائی۔ اُس نے نظریں اٹھا کے دیکھا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اُسکا پورا وجود ساکن ہو گیا۔

''تقی۔۔۔ تم یہاں؟'' وہ حیرت سے کھڑی ہوئی۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ خوش گوار حیرت سے بولا۔

''جی وہ، ملائکہ میری دوست ہے۔'' اُس نے میزبان کا نام لیا۔ تقی کی یہاں موجودگی اُسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

''اور میری کزن ہے۔ ویسے تو میں اس قسم کی تقریبات میں نہیں جاتا لیکن میرا خاندان ملک میں نہیں ہے، اسی لیے اپنی ماں کے پر زور اصرار پر اُنکی طرف سے آ گیا۔'' وہ ہنستے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

''کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو!'' بات تو ایسے بے تکلفی سے کر رہا تھا جیسے پرانا دوستانہ ہو۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔

''اور کیا کر رہی ہو آج کل؟'' اُس نے مزید دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ اس سوال پر فاطمہ کی خود اعتمادی کہیں کھو گئی۔ یہاں موجود ہر عورت ورکنگ ویمن تھی۔ کوئی ملازمت کر رہی تھی تو کسی کا اپنا برانڈ تھا، کوئی اپنے شوہر کے بزنس میں سرمایہ لگانے والی تھی۔ غرض اُن سب کے پاس جو بھی باتیں تھیں، وہ پیسوں سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ اُن سب میں بس فاطمہ ہی ایک ہاؤس وائف تھی۔

''میرا آپ سے ایسا تعلق کب سے ہو گیا کہ آپ مجھ سے ایسے سوال کریں؟'' اپنی خفت چھپانے کے لیے درشتی سے کہا۔

''تعلق تو تھا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ آواز میں دکھ بولا تھا۔

''صرف چند مہینے رہنے والی منگنی کو آپ تعلق کا نام نہیں دے سکتے۔'' اُس نے جتایا۔

''وہ چند ماہ میرے لیے پوری زندگی تھے۔'' نرمی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی احمد امی، امی کرتے اُسکے پاس آیا۔

''یہ تمہارا بیٹا ہے؟''اُس نے احمد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''سکون سے کہتے اُسکے چہرے کو دیکھا۔کچھ ٹوٹا تھا وہاں۔

''اوہ۔۔۔تو تم نے شادی کر لی؟''اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''کیوں؟نہیں کرنی چاہیے تھی کیا؟''

''میں نے اب تک نہیں کی۔''مسکراتے ہوئے کہتا وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔فاطمہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔

یہیں سے شروع ہوتا ہے شیطان کا پہلا وار۔۔۔۔

---------+---------+--------

واپسی پر اُسے علی نے پک کر لیا تھا۔سخت تھکا ہوا لگتا تھا،لیکن پھر بھی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے؟میری دوست ملائکہ اپنا ڈیزائنر برانڈ لانچ کر رہی ہے۔اُس سلسلے میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔''وہ خوشی سے بتانے لگی۔

''ہونہہ۔۔۔''وہ اُسکی باتوں پر آج کل،بس اتنا ہی ردعمل دیتا تھا۔

''کیا ہونہہ؟تمہیں بھی بلایا ہے اُس نے۔۔۔''وہ چڑ گئی۔وہ اُسکے انداز پر ہنس پڑا۔

''آپکو معلوم تو ہے بیگم صاحبہ کہ میں کتنا مصروف ہوتا ہوں؟تم خود چلی جانا اور میری طرف سے معذرت کر لینا۔''اُسکے جواب پر وہ خفا ہوئی۔

''ہمیشہ یہی کرتے ہو تم،خاندان سے لیکر دوستوں تک کہیں بھی کوئی دعوت ہو مجھے اکیلا چھوڑ دیتے ہو۔''

''تم آج کل بہت شکوے نہیں کرنے لگی ہو؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو تم میرے شکوے دور کیوں نہیں کرتے؟''وہ لڑنے کے موڈ میں تھی۔

''میں تھکا ہوا ہوں فاطمہ،پلیز!سکون سے ڈرائیو کرنے دو۔''چڑ کر کہتے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔دوبارہ اُن دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔

رات کو فاطمہ کی نظروں کے سامنے بار بار ملائکہ کے گھر کا منظر گھوم جاتا۔جب اُسکے دوست وغیرہ جانے لگے،تو اُس نے فاطمہ کو درخواست کر کے کچھ دیر کے لیے روک لیا کہ اُس سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔پھر جب سب چلے گئے تو وہ اُسکے پاس آئی۔

''اوہ گاڈ فاطمہ!تم نے بتایا کیوں نہیں کبھی کہ تم تقی کی منگیتر رہ چکی ہو؟''وہ اتنا خوش کس بات پر تھی؟فاطمہ سمجھ نہ سکی۔

''اس میں بتانے والی کیا بات تھی؟''اُس نے اچھنبے سے پوچھا۔

''یار! تقی کے بارے میں پورا خاندان جانتا ہے کہ اُسکی منگنی ہوئی تھی اُسکی پسند سے،اور اُس لڑکی کے گھر والوں نے تقی کی کسی بات پر ناراض ہو کر منگنی توڑ دی تھی،وہ بیچارہ کوشش کرتا رہا کہ لڑکی سے بات کرے لیکن قسمت میں نہیں تھا۔اُس دن کے بعد سے ہم نے تقی کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔وہ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ لڑکی تم ہو۔''ملائکہ کے لہجے میں عجیب سا جوش تھا۔

''ہماری منگنی بس تین چار ماہ رہی تھی اور اس دوران میری اُس سے بمشکل ایک یا دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ایسا کچھ نہیں تھا ہمارے درمیان۔''اُس نے وضاحت دی۔

''لیکن اُسکے دل میں تو تھا نہ فاطمہ!''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟میں شادی شدہ ہوں۔''اُس نے غصّے سے کہا۔

''ہاں! میں جانتی ہوں۔میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ ایک بار اُس سے مل کر ساری باتیں کلیئر کر لو۔ورنہ وہ ساری زندگی اسی طرح اکیلے رہے گا۔تم ہی اُسے سمجھا سکتی ہو۔''وہ بڑی اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔ فاطمہ غصّے سے وہاں سے اُٹھ کر جانے لگی۔

''وہ تم سے آج بھی محبت کرتا ہے فاطمہ۔۔۔''اُس نے پیچھے سے کہا تھا لیکن وہ رکی نہیں۔

اور اب نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔دل میں عجیب عجیب سے وسوسے سر اٹھانے لگے۔اگر وہ مجھے پسند کرتا تھا تو اس وقت مجھے ایسا کیوں نہیں کہا؟اور ایک ہینڈسم،امیر کبیر مرد جسکو کوئی بھی لڑکی مل سکتی ہے،وہ آج بھی اُسکے پیچھے خود کو خوار کیوں کر رہا تھا؟اُسے یاد آیا کہ کیسے اُسکی شادی کے بارے میں جان کر اُسکے چہرے پر کرب کے آثار اُبھرے تھے۔اپنا آپ اچانک ہی بہت مغرور لگنے لگا۔

اور یہی شیطان کا اگلا وار ہوتا ہے۔۔۔

اپنی زندگی میں آنے والے اس تمام طوفان سے بے خبر علی سکون سے سویا ہوا تھا۔یہ نیند اب شاید اُسکی زندگی کی آخری پر سکون نیند ہونے والی تھی۔

---------+---------+--------

اگلی صبح وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا جب فاطمہ کا موبائل بجا۔ملائکہ کی کال تھی۔

''ہیلو!''

''فاطمہ کیا آج تم گھر آسکتی ہو؟ مجھے آج کچھ شاپنگ کرنے جانا ہے۔ تم ساتھ ہو گی تو وقت اچھا گزرے گا۔'' ملائکہ نے کہا تو اس نے ایک نظر آئینے کے سامنے تیار ہوتے علی پر ڈالی۔

''ٹھیک ہے، کب آنا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ پھر دوسری طرف کی بات سن کر کال کاٹ دی اور کام میں مصروف ہو گئی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر تھی کہ علی اُس سے پوچھے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ لیکن اُسکے پاس وقت ہی کہاں تھا؟ جب ناشتہ کرنے تک وہ کچھ نہ بولا تو بلآخر خود ہی مخاطب ہوئی۔

''کیا تم کل چھٹّی لے سکتے ہو؟''

''چھٹّی؟ کس لیے؟'' اُس نے اچھنبے سے دیکھا۔

''تمہیں یاد نہیں؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسا بھی کیا ہے کل؟'' علی نے ذہن پر زور ڈالنا چاہا مگر کل کی تاریخ میں کوئی خاص واقعہ یاد نہ آیا۔

''کل احمد کا اسکول میں ایڈمشن کروانا ہے۔'' اُس نے افسوس سے کہا۔

''اوہ۔۔ میں بھول گیا تھا۔'' فوراً ہی یاد آیا۔

''احمد کے متعلق کوئی بات تمہیں یاد کہاں رہتی ہے؟'' چبھتا ہوا طنز تھا لیکن وہ نظر انداز کر گیا۔

''اتنے چھوٹے بچے کو اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟'' وہ اُسکے اتنے جلدی اسکول جانے کے خلاف تھا۔

''میں اپنے جیب خرچ سے بھر دوں گی اُسکی فیس۔'' اُس نے پلیٹ میں چمچ پٹختے ہوئے کہا۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا؟ میں نے ایسا کب کہا؟'' وہ حیران ہوا۔

''مطلب تو یہی تھا نا؟ میں تو جیسے جانتی نہیں کہ کتنا بھاری لگ رہا ہو گا تمہیں اُسکا خرچ اٹھانا۔''

''فار گاڈ سیک فاطمہ! میری بات کا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔'' وہ دبی آواز میں چیخا۔ امّاں ابا تک آواز نہیں پہنچنے دینا چاہتا تھا۔

''تو تم کل چھٹّی لیکر میرے ساتھ ایڈمشن کے لیے چلو گے۔'' اب کے اُس نے آرام سے کہا۔

''کل میری بہت اہم میٹنگ ہے۔ میں نہیں آسکوں گا، تم خود چلی جانا۔'' اُس نے تحمل سے سمجھانا چاہا تو وہ ہنس پڑی۔ ہنسی کیا تھی۔۔۔ سیدھا سیدھا طنز تھا۔

''معلوم تھا مجھے، یہی جواب آئیگا۔''

''میں صبح صبح تم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔''سنجیدگی سے کہتے ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ فاطمہ لب بھینچے وہیں بیٹھی رہ گئی۔

اُسی روز شام میں وہ احمد کے ساتھ ملائکہ کی طرف چلی آئی۔ وہ اُسے لیکر شہر کے مہنگے مال آئی تھی، جہاں ملک کے نامور برانڈز کے آؤٹ لیٹس تھے۔ ملائکہ نے چند ہی گھنٹوں میں لاکھوں کی شاپنگ کر ڈالی تھی، پھر وہ فوڈ کورٹ چلی آئیں۔

''سوری یار! اپنے ساتھ تمہیں بھی تھکا دیا۔''جوس کا سپ لیتی ملائکہ نے اس سے معذرت کی۔

''نہیں نہیں! میں بالکل نہیں تھکی بلکہ تمہارے ساتھ یہاں آکر میں اچھا محسوس کر رہی ہوں۔''اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ جبکہ سچ تو یہ تھا کہ اتنے اونچے طبقے کے برانڈز کو دیکھ کر وہ پھر سے احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگی تھی۔

''فاطمہ! مجھے ذرا ایک کال کرنی ہے۔ میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ اوکے؟''یکدم ہی وہ اپنا موبائل لیتی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُسکا جواب سنے بنا عجلت میں وہاں سے چلی گئی۔ وہ کندھے اچکا کر احمد کو فرائیز توڑ کے دینے لگی کہ تب ہی کوئی کرسی گھسیٹ کر سامنے آبیٹھا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سانسیں اٹک گئی۔ اپنی شاندار شخصیت کے ساتھ تقی سامنے تھا۔

''تم؟ یہاں کیوں آئے ہو؟''وہ دبی آواز میں غرائی۔

''مجھے ہی یہاں آنا تھا، کیوں کہ میں نے ہی تمہیں یہاں بلوایا ہے۔''ہونٹوں پر ہاتھوں کی مٹھی جمائے، اُسکے تاثرات سے محظوظ ہوتا وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ فاطمہ کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''تو ملائکہ نے اس لیے مجھے یہاں بلایا تھا۔''غصّے سے کہتی وہ سامان سمیٹنے لگی۔ اپنی دوست پر غصّہ آنے لگا۔

''کیا تم صرف ایک بار میری بات نہیں سن سکتی؟''اُسکے لہجے میں اتنا دکھ اور اس قدر التجا تھی کہ اُسکے ہاتھ تھمیں۔

''کیا کہنا چاہتے ہو آخر؟''سنجیدگی سے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرا مطالبہ سن کر ایک ہی بار میں منگنی توڑ دی۔ ایک بار وضاحت کا موقع تو دیتی۔''وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

''اب ان سب باتوں کا فائدہ؟''چاہ کر بھی لہجہ سخت نہ رکھ سکی۔

''مجھے فائدہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل سے اپنے لیے غلط فہمی نکال کر میں پر سکون ہو جاؤں۔''اُسکی بات پر وہ ناسمجھی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''میں چاہتا تھا کہ تم جاب کرو، اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے تمہارے خرچے اٹھوانے تھے۔ مجھے دیکھو! باپ دادا کی اربوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہوں۔ بھلا تم سے نوکری کروا کر مجھے کیا ملنا تھا؟ میں بس چاہتا تھا کہ میری بیوی پر اعتماد ہو۔ وہ جب میرے حلقہ احباب میں جائے تو اُسکی اپنی ایک پہچان ہو۔ وہ

میرے نام سے نہ جانی جائے۔ میں تمہیں اپنی بات سمجھا نہ سکا تھا شاید! اور تم نے بھی مجھے وضاحت کا موقع دیئے بنا ہی منگنی توڑ دی۔'' کتنے دکھ تھے اُسکے لہجے میں۔۔۔

''تم جاب کرتی تو کیا میں ساری زندگی تمہیں ٹکے ٹکے کی نوکریاں کرنے دیتا؟ ہرگز نہیں۔۔۔ میں اپنی بیوی کو اُسکے نام پر بزنس کھول کر دیتا، میں اپنا سارا سرمایہ لٹا دیتا تمہارے لیے فاطمہ! تم اہم تھی۔۔۔ بہت اہم تھی۔'' وہ ساکت سی اُسے دیکھ رہی تھی۔

''اور آج بھی ہو۔'' اُس نے آہستہ سے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں اب شادی شدہ ہوں اور خوش ہوں اپنے گھر میں۔'' اُسکا لہجہ کپکپا گیا۔

''خوش ہو تو لگتی کیوں نہیں ہو؟'' اس سوال نے اُسکی زبان سلب کر دی۔

''میں چاہتا تھا کہ تم میرے قدم سے قدم ملا کر چلو، سر اٹھا کر جیو۔ بس یہی میری غلطی تھی۔ تم خود کو دیکھو، کیا کمی ہے تم میں؟ پھر کیوں اتنی اُداس ہو؟ تمہارا شوہر کیا تمہیں وہ خوشیاں نہیں دے سکا جسکی تم حقدار تھی؟'' وہ تو جیسے اُسکے غم میں پاگل تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اس بار اُسکے لہجے نے ساتھ نہ دیا۔

''مجھے تم خوش کیوں نہیں دکھتی؟'' اُسے لگا کہ وہ مزید اُسکے سوالات کا جواب نہیں دے سکے گی۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' جلدی سے اپنا سامان اٹھاتی، اُٹھ کھڑی ہوئی۔ احمد کو گود میں اٹھایا اور ایک آخری نگاہ اُس پر ڈالی۔

''میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں۔'' اُس نے بے بس سے لہجے میں کہا تھا، پر وہ رکی نہیں۔

گھر آئی تو دماغ جیسے جگہ پر ہی نہ رہا، وہ ہر بات بھول جا رہی تھی۔ نہ احمد کو دیکھ رہی تھی نہ گھر پر توجہ۔ علی کو احساس ہوا تو اُسکے پاس آیا۔

''مجھے پتہ ہے کہ تم ناراض ہو، میں نے کل کی میٹنگ کینسل کروا دی ہے۔ اور کل تمہارے ساتھ سکول بھی جاؤں گا۔'' اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، اُسکا عہدہ اب اونچا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے میٹنگ کینسل کروا سکتا تھا۔ وہ بس سر ہلاتی وہاں سے ہٹ گئی۔ اُسکی خاموشی کو ناراضگی گردانتا علی جانتا ہی نہیں تھا کہ اُس نے اپنے شوق اور خوابوں کے بدلے کتنا بڑا خسارہ خرید لیا ہے۔

---------+---------+--------

پہلی ملاقات دوسری اور دوسری ملاقات، کئی ملاقاتوں میں بدل گئی۔ فاطمہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے سوچنے لگی، علی کا چڑچڑا پن دیکھتی تو اُسکا نرم لہجہ یاد آتا۔ وہ وقت نہ دیتا تو تقی کا ہر لمحے آنے والا میسیج اُسے آسمان پر پہنچا دیتا۔

''تم تو آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہو۔'' آخری ملاقات میں اُس نے اُسکی تعریف کی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ علی نے آخری بار کب اُسکی تعریف کی ہو گی؟ جب اُنکی شادی کو چند ماہ ہوئے تھے۔ شاید تب؟ وہ لوگ ڈرائیو پر تھے تو اس نے ایسے ہی علی سے پوچھ لیا۔

''کیا پہلی ملاقات میں، میں تمہیں پسند آئی تھی؟''

''یہ کیسا سوال ہے؟'' گاڑی چلاتا علی اس غیر متوقع سوال پر چونکا تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے، تم مجھے انکار کرنے آئے تھے۔''

''انکار کرنے تو نہیں آیا تھا مگر چاہتا تھا کہ تم خود ہی مجھے ناپسند کر دو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر کر دیتی تو؟'' اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے پوچھا۔

''لو بھلا اتنے ہینڈسم انسان کو کون منع کرتا؟'' اُس نے بھنویں اچکا کر مصنوئی حیرت سے کہا۔

''میں کرتی، بلکہ کرنے والی تھی۔ جتنی تم کھڑوس شکل بنا کر بیٹھے تھے نا، میں کرنے ہی والی تھیں۔'' علی نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''میں کھڑوس تھا؟'' صدمے سے پوچھا تو اس نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر منع کیوں نہیں کیا؟'' منہ بنا کر پوچھا۔

''تم نے گول گپے کھا لیے تھے نا، اسی لیے میں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا مناسب سمجھا۔''

''اوہ! تو وہ گول گپے میرا امتحان تھے۔ اگر میں نہ کھاتا تو؟''

''تو بھی ہاں کر ہی دیتی۔ اب ہیرو جیسے تو لگتے ہو تم۔'' اس بات پر وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

''اور تم تو انکار کا ارادہ کیے آئے تھے۔ منع کیوں نہیں کیا؟'' سوال اپنی جگہ برقرار تھا۔

''اب اتنی پیاری لڑکی کو کون انکار کرتا؟'' یہ شاید آخری بار تھا، جب اُس نے فاطمہ کی تعریف کی تھی۔ پھر تو جیسے اُسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ پیاری ہے یا خوبصورت؟ اور تقی، وہ تو ہر ملاقات میں اُسکی تعریف کرنا نہ بھولتا تھا۔ وہ بار بار علی کا موازنہ تقی سے کرتی اور ہر جگہ تقی اُس سے اوپر نظر آتا۔

یہاں تک کہ فاطمہ آفندی ہر طرح سے شیطان کے بہکاوے میں بہہ گئی۔ تقی اُسکے لیے نت نئے تحفے لاتا اور وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ اپنے آپ پر فخر ہوتا کہ ایک ایسا انسان اُسے چاہتا ہے۔ علی کو دیکھتی تو وہی فخر پچھتاؤں میں بدلنے لگتا، بھلا اس شخص کو کیسے ہاں کر دی تھی اس نے؟ اس جیسے خود غرض اور مطلب پرست انسان کو کیسے زندگی میں شامل کر لیا اُس نے؟

اور ایک دن اُس نے اپنے اس پچھتاوے کا اظہار ملائکہ سے کر دیا۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا، تقی آج بھی تمہارا منتظر ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اُسکا دل دھڑکا۔

''مجھ سے کہا تھا اُس نے، کہ اگر فاطمہ خلع لے لیتی ہے۔ تو میں اُسکا ساتھ دوں گا اور میں شادی کروں گا اُس سے، پاگل ہے وہ تمہارے لیے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ کہیں تم ناراض نہ ہو۔''

اور اُس روز فاطمہ نے اٹل فیصلہ کر لیا کہ وہ اب علی کے ساتھ نہیں رہے گی۔ وہ تقی جیسے انسان کے لیے ہی بنی تھی۔ جو اُسے شیشے کی طرح سنبھال کر رکھے نہ کہ علی جیسے انسان کے لیے۔

---------+---------+--------

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ علی سے کیسے بات کرے؟ کیونکہ اس فیصلے میں اُسکے میکے والے تو ہرگز اُسکا ساتھ نہ دیتے۔ لیکن قدرت نے اُسے خود ہی موقع فراہم کر دیا۔

اُس روز علی تن فن کرتا گھر میں داخل ہوا تھا۔ اور سیدھا کمرے میں آ کر اُسے بازو سے جکڑا۔

''کس کے ساتھ تھی تم؟'' آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ وہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا گئی۔

''کیا کر رہے ہو علی؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' اُس نے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔

''آج ریسٹورونٹ میں کس مرد کے ساتھ تھی تم؟'' وہ دھاڑا۔ اُس کے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''مجھ سے چھپ کر کس سے ملتی پھر رہی ہو؟ اور کب سے چل رہا ہے یہ سب؟'' علی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گلا ہی دبا دے اُسکا۔ اور اگلے ہی لمحے فاطمہ کے اندر کے شیطان نے اُسے راضی کر لیا۔ وہ کرنے پر جو وہ پورے ہوش و حواس میں ہوتی تو کبھی نہ کرتی۔ لیکن وہ حواسوں میں تھی ہی کہاں؟

''تقی۔۔۔میرا سابقہ منگیتر، اگر تم نہ ہوتے تو اسی سے شادی کرتی میں اور ایک پر سکون زندگی گزارتی۔''اُسکا ہاتھ جھٹکتے ہوئے نفرت سے چیخی، علی جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''اُسے اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔ یہ آخری شے تھی جو وہ تصوّر کر سکتا تھا۔

''بکواس نہیں سچ ہے یہ، شادی کرنا چاہتی ہوں میں اُس سے، ابھی مجھے آزاد کرو تاکہ۔۔۔''علی کے زناٹے دار تھپڑ نے اُسکی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔''اُس نے پاس رکھا شیشے کا گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا تو وہ سہم کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ پوری رات علی نے کانٹوں پر گزاری، یقین نہیں آتا تھا کہ جو اُسکی آنکھوں نے دیکھا، جو اُسکے کانوں نے سنا وہ سچ تھا۔ فاطمہ وہ آخری عورت ہو سکتی تھی، جس سے وہ ایسے شدید دھوکے کی اُمید رکھ سکتا تھا۔ دل کرتا دیوار پر اپنا سر دے مارے، زہر کھالے یا کسی اونچی جگہ سے خود کو گرالے۔ خود کو گم کرلے لیکن جو سنا تھا اُسے فنا کر دے۔ پوری رات جاگ کر گزارنے کے بعد جب اٹھا تو ایک نئی خبر اُسکی منتظر تھی۔

فاطمہ گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔

---------+---------+--------

دو ہفتے وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھاڑ کر کمرہ بند کر کے بیٹھا رہا۔ جو ہوا، اُسکی اطلاع سفیر صاحب کو بھی مل گئی تھی، مگر فلحال اُنہوں نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ اُسکی زندگی کا ایک مشکل ترین دن تھا۔ فاطمہ کے گھر سے آنے والی کال نے اُسکے پیروں تلے زمین کھینچ لی۔ وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تھا تو اُس نے رو رو کر طوفان کھڑا کیا ہوا تھا، اُسکی ماں اور بھابھی اُسے سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ روتے روتے اُسکی نظریں علی پر پڑیں تو ایک لمحے رکی اور اگلے ہی لمحے جیسے کوئی جنون سوار ہوا تھا اُس کے سر پر۔

''تم۔۔۔تم ہی ہو میری اولاد کے قاتل، تمہاری وجہ سے میرا بچہ مر گیا۔ وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی مر گیا۔''اُسکا گریبان پکڑتے اُسی پر چیخی۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں بھلا اپنی اولاد کا قتل کیوں کروں گا؟''اُس نے اپنے گریبان سے اُسکے ہاتھ جھٹکے۔

''تم نے مجھے اس حد تک اسٹریس دے رکھا تھا کہ آج یہ دن دیکھنا پڑا، تم نے کبھی میرا یا میری صحت کا خیال نہیں رکھا۔ تم نے کبھی نہیں پوچھا کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟ تم کبھی میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے۔ تمہیں تو اپنے پہلے بچے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو اس سے کیوں ہوتی۔''وہ چلا چلا کر بول بولتی اپنے باپ کی طرف مڑی۔

''بابا! اس شخص نے اپنی خواہشات اور اپنے خوابوں کے بھینٹ چڑھادیا ہمیں، ایک ایک شے کے لیے ترسایا اس نے مجھے اور میرے بیٹے کو، یہ تو خوش ہو گا کہ اسکے سر سے ایک بوجھ کم ہوا۔'' وہ اپنے باپ کو روتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہاں کھڑے ہر شخص کی ملامتی نظریں علی پر ہی تھیں۔ بلآخر فاطمہ آفندی اپنے گھر والوں کی ہمدردی حاصل کر کے اُنہیں علی کے خلاف کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

علی وہاں سے کچھ بھی کہے بنا واپس آ گیا، فاطمہ ساتھ نہیں آئی۔ اُس نے افسوسناک خبر اپنے ماں باپ کو سنائی اور ایک بار پھر سے کمرے میں بند ہو گیا۔

اپنے محاسبہ کا کڑا وقت آ گیا تھا۔ اگر وہ اپنے خوابوں کو پورا کرنا چاہتا تھا تو اس کو فاطمہ سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی، اور اگر کر لی تھی تو اُسے نبھانا بھی چاہیے تھا۔ نبھا نہیں سکتا تھا تو اُسی لمحے انکار کر دیتا، جس لمحے سفیر صاحب نے اُسے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا؟ وہ ساری عمر اُس سے بات نہ کرتے، تو پہلے کونسا کر رہے تھے؟ وہ اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دیتے تو اب تک کونسا وہ اُنکی جائیداد میں سے کوئی حصّہ لیتا رہا تھا؟ کم از کم اپنی جدوجہد میں کسی اور لڑکی کو تو نہ شامل کرتا۔

''لیکن میں نے اس سے پوچھا تھا، بتایا تھا اُسے کہ میں اسے ویسی زندگی نہیں دے سکوں گا۔'' خود کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فاطمہ نے اس سے اُسکا وقت مانگا، توجہ مانگی اور ہر مرتبہ علی نے اپنے کاروبار اور مستقبل کا رونا رویا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے لیے توجہ مانگی تو اس نے جھڑک دیا۔ جب یہ سب چیزیں وہ اپنی بیوی کو نہ دے سکا تو اُس نے کسی اور سے یہ سب لینا شروع کر دیں۔

غلطی دونوں کی ہی تھی، دو ماہ اسی کشمکش میں گزر گئے۔ احمد کو اُسکی دادی سنبھال رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ پوری پوری رات روتا، دن بہ دن اُسکی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اُسکی حالت علی سے دیکھی نہ جاتی، بلآخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ فاطمہ کو ایک موقع اور دیگا، اپنی غلطیوں کو سدھارے گا، اگر اُسکے نصیب میں اپنا کاروبار کھڑا کرنا نہیں لکھا تو نہ صحیح پر وہ اپنا گھر خراب نہیں ہونے دیگا۔

اگلے دن وہ فاطمہ کے سامنے تھا۔ اپنی غلطیاں تسلیم کرتا، اپنے خوابوں اور خواہشات سے دستبردار ہوتا، اُسے ایک اور موقع دیتا۔

''میری اولاد مر گئی تمہاری وجہ سے اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ واپس چلوں اور سب کچھ پھر سے شروع کروں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ اب مجھے تم سے طلاق چاہیے بس۔'' اُسکا جواب واضح تھا۔

''ایسے کون سے خواب دکھا دیئے ہیں اُس غیر مرد نے جو تم اپنا ہنستا کھیلتا گھر برباد کرنے پر تلی ہو؟'' علی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''ہنستا کھیلتا؟'' وہ ہنسی ''گھر نہیں قبرستان ہے وہ، میری خوشیوں، خواہشوں اور خوابوں کا قبرستان۔ وہاں صرف تم ہوتے ہو اور تمہارے خواب ہوتے ہیں۔ ساری دنیا صرف تمہارے گرد گھومتی ہے وہاں۔ اور رہی بات تلقی کی، تو اس شخص نے مجھے خواب نہیں دکھائے بلکہ مجھ پر ثابت کر کے دکھایا ہے کہ وہ تم سے کئی گنا بہتر ہے۔'' علی کو لگا کہ اُسے کسی نے زندہ دفنا دیا ہے۔ اُسکی بیوی اُسکے سامنے کتنے آرام سے ایک غیر آدمی کا ذکر کر رہی تھی۔

''فاطمہ!۔۔۔''سخت صدمے میں ڈوبی اس آواز پر دونوں نے ہی مڑ کر دیکھا تو دروازے پر فاطمہ کے والد شہیر صاحب کھڑے تھے۔آنکھوں میں بے یقینی اور ملامت کا جہاں آباد تھا۔

''بابا۔۔۔''اُسکی سانسیں رکی۔علی نے ایک نظر اُن دونوں کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہاں سے نکل گیا۔

''تم۔۔تم بے شرم۔۔۔۔بے حیا عورت!''اگلے ہی لمحے شہیر صاحب نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔وہ اُسے برا بھلا کہتے جاتے اور مارتے جاتے۔بڑی مشکلوں سے گھر والوں نے اُنہیں وہاں سے ہٹایا۔

''اسے اسکے گھر چھوڑ کر آؤ،یہ واپس علی کے پاس جائیگی،ورنہ یہاں بھی نہیں رہے گی۔''اُنہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں کہیں نہیں جاؤنگی،چاہے آپ مجھے مار ہی کیوں نہ دیں۔''وہ چیختی ہوئی،وہاں سے بھاگتی،اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ کتنی ہی دیر تک اُسکے ماں باپ اُسے کوستے رہے۔آخر میں اُسکے باپ نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ رات تک وہ علی سے معافی مانگ کر واپس جائیگی یا وہ خود اُسے چھوڑ آئینگے۔

اور رات ہونے سے پہلے وہ اپنا سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ہاں! وہ چلی گئی،پر علی کے ساتھ نہیں بلکہ تقی کے ساتھ۔اُس روز اُسکے گھر والوں نے اُس سے سارے ناطے ختم کر لیے۔علی کو بھی فون کر کے بتا دیا۔جب اُسے معلوم ہوا کہ فاطمہ، تقی کے ساتھ ملائکہ کے گھر چلی گئی ہے تو اُسکا دل کیا دیواروں پر سر مار مار کر روئے۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر وہ لمحوں میں مجھے طلاق دے دیگا۔لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا،پھر میں نے اپنے بچے کے مرنے کا الزام اُسے دیا تب بھی اس نے مجھے طلاق نہیں دی۔اور حد تو یہ کہ وہ آج مجھ سے صلح کرنے آگیا۔اُس نے تو میری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔''ملائکہ کے گھر میں اُسکے اور تقی کے سامنے بیٹھی وہ مایوسی سے کہہ رہی تھی۔

''بڑا ہی کوئی بیغیرت انسان ہے تمہارا شوہر،اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے ساتھ دیکھ کر بھی صلح کرنے آگیا۔'' تقی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے اُسے حیران کر دیا۔ایک لمحے کے لیے اُسکی آنکھوں پر بندی پٹی اترنے ہی لگی تھی کہ اُس نے فاطمہ کی نظریں خود پر محسوس کرتے فوراً اپنے لہجے کو نرم کیا اور بولا۔

''وہ یقیناً تمہیں لٹکائے رکھنا چاہتا ہے۔وہ کبھی بھی تمہیں اتنی آسانی سے آزاد نہیں کرے گا،کون شوہر چاہتا ہے کہ اُسکی بیوی اُسے چھوڑ کر کسی اچھے انسان کے ساتھ زندگی گزارے۔لیکن تم فکر نہ کرو میں خلع کے معاملے میں تمہاری ہر قسم کی قانونی مدد کرونگا۔''نرم لہجے میں کہتا وہ ایک بار پھر اُسے اپنے جال میں پھنسا چکا تھا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''اُس نے پریشانی سے کہا۔

''میں جارہاہوں، کل آؤنگاوکیل کے ساتھ۔''وہ کہتاہواچلاگیا۔وہ پرسکون ہوگئی۔ تقی اُسکے ساتھ تھا،اُسے ہر محاذ آسان لگ رہاتھا۔اگلے دن اُس نے فاطمہ کی طرف سے خلع کا کیس دائر کردیا۔جب علی کو یہ نوٹس ملاتواُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی۔اُسکے خواب،اُسکی خواہشات،اُسکے شوق سب کہیں پس منظر میں رہ گئے۔یادرہاتوبس یہ کہ اُسکاگھرتباہ ہورہاہے۔اوروہ یہ نہیں ہونے دے سکتاتھا۔وہ پورادن جلے پیر کی بلی کی مانند یہاں سے وہاں پھرتارہا، بار بار فاطمہ کوکال کرتارہالیکن اُس نے فون نہ اٹھایا۔اُسکاگھرٹوٹ رہاتھا،وہ پاگل ہورہاتھا۔

صرف ایک خواب ہی تو تھا؟

ایک خواب جسکی قیمت اُسکے باپ کی ناراضگی۔۔۔

اوراُسکی بیوی کی بے وفائی تھی۔۔

ایسے خواب پراُس نے ہزار مرتبہ لعنت بھیج دی تھی۔۔۔

آج احساس ہواکہ ہر شے سے زیادہ اُسکے لیے اُسکاگھراہم تھا۔۔۔

خوابوں سے زیادہ فاطمہ عزیز تھی۔۔۔

لیکن شایداب دیر ہوچکی تھی۔

---------+---------+--------

کورٹ میں فاطمہ اُسکے سامنے تھی،وہ اپنی دوست ملائکہ اوراُس شخص کے ساتھ آئی تھی۔دونوں ہی گاڑی میں بیٹھے رہے،کمرہ عدالت میں بس فاطمہ اکیلے تھی۔جج نے دنوں کواکیلے میں بات کرنے کاموقع دیا۔

''فاطمہ! واپس چلومیرے ساتھ،میں اپنی ہر غلطی تسلیم کرتاہوں۔دوبارہ تمہیں شکایت کاموقع نہیں دوں گا۔بس تم ضد چھوڑکرمیرے ساتھ واپس چلو۔''اُس نے ٹوٹے بکھرے لہجے میں ایک آخری کوشش کرنی چاہی۔

''کیوں چلوں واپس؟ پھرسے وہی جہنّم جیسی زندگی گزارنے کے لیے۔''اُس نے تڑخ کرکہاتوعلی کادل ٹوٹا۔

''میں کہہ تورہاہوں، جیسے تم چاہوگی ویسے ہی ہوگااب۔''متلجی لہجے میں کہا۔

''اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی، تم نے ہمیشہ اپنے مستقبل کاسوچا۔اب میرا بھی حق ہے کہ میں صرف اپناسوچوں۔مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔''اُسکے منہ کوپیسہ لگ چکاتھا،بھلااب کیوں واپس جاتی؟

''مجھے ہے۔۔۔مجھے صرف تمہاری ہی ضرورت ہے۔میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی عورت نہیں ہے۔میں کیسے رہوں گا تمہارے بنا؟میں مر جاؤں گا فاطمہ!''اُسکی نم آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کو اُسکا دل پگھلا۔وہ سب کچھ جو کبھی وہ اُس کے منہ سے سننا چاہتی تھی،وہ اب کہہ رہا تھا۔جب اُسے ضرورت نہ رہی تھی۔

''مجھے تم سے مزید کوئی بات نہیں کرنی۔میرا تمہارے ساتھ اب گزارا ممکن نہیں ہے اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''مقابل کو فرق نہیں پڑتا تھا۔

''مت کرو فاطمہ!دیکھو احمد کتنا چھوٹا ہے۔کیسے رہے گا تمہارے بنا؟''اُس نے التجا کرتے اُسکے ہاتھ تھام لیے۔

''میں تمہاری ہر غلطی معاف کر دوں گا،کبھی بھول کے بھی ذکر نہیں کروں گا ماضی کا،لیکن یہ مت کرو۔واپس چلو میرے ساتھ۔تمہارا بیٹا برباد ہو جائیگا۔"کتنی تڑپ تھی اُسکی آواز میں لیکن فاطمہ اندھی،بہری،گونگی سب ہو چکی تھی۔اُس نے علی کا ہاتھ جھٹکا،یہ شخص اُسکی سوچ سے زیادہ ڈھیٹ تھا۔بلآخر اُس نے ایک فیصلہ کیا۔ایک ایسا فیصلہ جسکے بعد علی نے دوبارہ اُس کی منت نہیں کی۔

''میرا بچہ حادثاتی طور پر نہیں مرا تھا،میں نے خود اُسے مارا تھا تاکہ تم سے جلد جان چھڑا سکوں۔''سفاکی سے کہتے اُس نے علی کے دل پر آرا چلا دیا تھا۔وہ کتنی ہی دیر بے یقینی سے اُسے دیکھتا رہا۔اُسکے کان بہرے کیوں نہ ہو گئے؟وہ مر کیوں نہ گیا؟وہ نفی میں سر ہلاتے پیچھے ہٹنے لگا،جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو۔

''میں نے تمہیں۔۔۔کیا سمجھا تھا۔۔۔اور تم کیا نکلی؟''اُس نے صدمے سے کہا،بس ایک لمحے کو فاطمہ کا دل ڈوبا تھا۔اور اُسکے بعد علی نے اُسے طلاق دے دی اور اُسکی شادی محض چھے سالوں میں ختم ہو گئی۔پورا دن وہ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا رہا۔آنکھوں کے سامنے وہ منظر بار بار آتا جب عدالت سے باہر نکل کر فاطمہ،ملائکہ اور تقی کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے گئی تھی۔

سفیر صاحب اُسے کال پر کال کرتے رہے لیکن اُس نے ایک فون نہیں اٹھایا۔بلآخر اُسکی ماں نے اُسے فون کیا۔

''علی گھر آ جاؤ بیٹا!مت کرو ایسے۔۔۔مت کرو۔۔۔میں مر جاؤں گی۔''اُسکی ماں کے روتے لہجے نے اُسے گھر واپس آنے پر مجبور کیا،گھر آیا تو حالت دیوانوں کی سی تھی۔سفیر صاحب دوڑ کر اُسکے پاس آئے۔

''تم ٹھیک ہو علی؟کچھ ہوا تو نہیں تمہیں؟''اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھتے وہ بے چینی سے اُس سے پوچھنے لگے۔پیچھے اُسکی ماں کھڑی سسک رہی تھیں۔''تم کہاں تھے بیٹا؟مجھے بتاؤ تو کیا ہوا عدالت میں؟''وہ تڑپ رہے تھے۔علی نے خالی خالی نظروں سے اُنہیں دیکھا اور پھر اُنکا ہاتھ جھٹکا۔

''کیا ہونا تھا؟کیا ہونا تھا بھلا ابّا؟''وہ چیخا تو سب کے سب ساکت ہو گئے۔

''برباد ہو گیا میں، تباہ ہو گیا میرا گھر۔۔۔ صرف آپکی وجہ سے۔۔۔ صرف اور صرف آپکی وجہ سے۔''اُنہوں نے شاک کے عالم میں اُسے دیکھا، وہ حلق کے بل چیخ رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو یہ تم؟ میری وجہ سے کیوں؟''اپنی آواز کپکپاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ایک دوڑ میں لگا دیا آپ نے مجھے، اُسکے پیچھے بھاگ بھاگ کر میں نے اپنا سب کچھ تباہ کر دیا۔ ایک پڑھائی ہی تو تھی ابا! ایسا بھی کیا کر دیا تھا میں نے کہ آپ نے ایسا بدلا لیا مجھ سے؟ آپکی انا نے میری زندگی تباہ کر دی۔''وہ چیخ رہا تھا، پاگل ہو رہا تھا، مر رہا تھا، فنا ہو رہا تھا۔

''علی! میری بات سنو۔۔ میں''وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کوئی وضاحت دینا چاہتے تھے۔

''آپ کی وجہ سے میں نے اپنے گھر کو گھر نہیں بنایا، صرف پیسے کمانے کی دھن میں لگا رہا۔ دیکھا بھی نہیں کے میری بیوی کیا کرتی رہی ہے میرے پیچھے؟ صرف آپ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ آپ نے میری فاطمہ سے شادی کروائی، آپ نے مجھے اس نہج پر پہنچایا۔ اب خوش ہیں آپ؟ اب سکون مل گیا آپکو؟ جیت گئے آپ۔۔۔ صحیح تھے آپ۔۔۔ میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔۔۔ صحیح کہتے تھے آپ۔۔۔ صحیح تھے آپ۔۔''
روتے روتے وہ فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ سفیر صاحب تو جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

''نہیں میرا بچہ۔۔۔ ایسے نہیں کرو۔''اُسکی ماں نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے ہی تڑپ تڑپ کر روتا رہا۔ اُسکا غم بہت بڑا تھا۔

اُس روز کے بعد سفیر صاحب ڈھے گئے، اپنی غلطیاں اب نظر آنے لگی تھیں۔ رہی صحیح کسر علی کی حالت نے پوری کر دی تھی۔ اُس نے اپنی دونوں نوکریاں چھوڑ دیں، خود کو کمرے میں بند کر دیا۔ نہ کسی سے ملتا نہ کسی سے بات کرتا۔ جب بے چینی حد سے بڑھنے لگتی تو اپنی ماں کے پاس چلا آتا۔ اُنکے پاس بیٹھ کر گھنٹوں روتا، لیکن چین کسی طور نہ آتا۔ اب اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ فاطمہ سے کتنی شدید محبت کرتا تھا۔ وہ واقعی اُسکے بنا ایک لمحہ نہیں گزار پا رہا تھا۔ احمد کی پوری ذمے داری اُسکی ماں نے لی ہوئی تھی۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ علی کی دن بہ دن گرتی حالت دیکھ کر اُسکی ماں بستر سے جا لگیں۔ اور ایک روز نیند میں ہی اس دنیا سے چلی گئیں۔ یہ دوسرا صدمہ تھا جس نے اُسے بری طرح توڑا تھا۔

وقت کا کام گزرنا ہے، سو گزر جاتا ہے۔ اُس نے دوسری جگہوں پر ملازمت کے لیے سی وی دینی شروع کی لیکن ایک سال کے وقفے اور پچھلی نوکری بنا نوٹس پریڈ ادا کیے چھوڑنے کی وجہ سے اُسکا ریکارڈ خاصا خراب ہو گیا تھا۔ اُسے کہیں بھی نوکری نہ مل سکی۔ اسی دوران اُسے خبر ملی کہ فاطمہ نے تقی سے شادی کر لی اور دبئی چلی گئی ہے۔ وہ حیران ہوا کہ بھلا جس آدمی سے شادی کرنے کے لیے اس نے علی سے طلاق لی تھی، اس سے شادی کرنے میں ایک سال کا وقت کیوں لیا؟ یہ تو وہ جانتا تھا کہ وہ طلاق کے بعد سے ملائکہ کے گھر ہی رہ رہی ہے، پر شادی کرنے میں اتنا وقت؟ اُسے تو لگا تھا کہ وہ فوراً تقی سے شادی کر لے گی۔ جب اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو دوبارہ سمیٹنے کی کوشش کی تو اس جان لیوا حقیقت کا ادراک ہوا کہ فاطمہ نے اُسے دھن دولت کے لیے چھوڑا تھا۔

بہر حال جب کہیں سے بھی کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پورے ایک سال بعد اپنے باپ سے بات کرنے کی ٹھانی۔ اُس روز وہ اُنکے پاس آیا۔ بے حد سنجیدہ۔۔۔ موت جیسی خاموشی لیے، ویران چہرے کے ساتھ۔

''مجھے پیسے چاہیے۔۔۔'' بنا تمہید کے کہا۔

''سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ جتنے چاہیے لے لو۔'' اُنکے جواب پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، پھر کچھ دیر رکا رہا۔

''میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ باقی کچھ آپ دے دیں، مجھے اپنا بزنس شروع کرنا ہے۔ جب پیسے کمانے لگوں گا تو آپکو واپس کر دوں گا۔'' سنجیدگی سے مدعا بیان کیا۔ واپس کرنے والی بات پر اُنکا دل کٹ گیا، پر خاموش رہے کہ فلوقت اُس سے کوئی بدمزگی نہیں چاہتے تھے۔

''ٹھیک ہے! میرا کارڈ لے لو، جتنی ضرورت ہے اتنے لے لو۔ نقد رقم چاہیے تو گھر کے سیف میں رکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔'' مختصر جواب دے کر وہ وہاں سے اُٹھ گیا۔ پھر علی کی زندگی کا ایک ہی مقصد بن گیا۔ پیسہ کمانا اور صرف پیسہ کمانا۔ یہ وہ چیز تھی جسکے لیے اُسکے باپ نے اُسے ذلیل کیا، اُسکی بیوی نے اُسے چھوڑا تھا تو اب اُسے ہر صورت یہی شے چاہیے تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اُسے فاطمہ ملے تو اُسے کامیاب انسان دیکھ کر پچھتائے کہ اُس نے کیسا ہیرا گنوا دیا۔ اور کامیابی کیا تھی؟ علی کے لیے تو بس پیسہ تھی۔ پیسہ اب اُسکی ضد تھا۔

ایک ماہ تک بزنس کے مختلف مواقعوں پر غور کرنے کے بعد بلآخر اُس نے ایک چھوٹا سا آفس کھولا، آٹھ بندوں پر مشتمل ٹیم رکھی، ساتھ سے آٹھ ماہ تک اپنا وقت اسی کام کو دیا، نقصان نہ ہوا پر منافع بھی نہ کما سکا، آہستہ آہستہ اُسکے ٹیم ممبرز اُسے چھوڑ کر چلے گئے تو اُسے کاروبار بند کرنا پڑا۔

لیکن وہ رکا نہیں، اس بار اپنی جمع پونجی کے ساتھ ساتھ اپنی گاڑی، اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں خریدی گئی مہنگی گھڑی، اور کچھ زیورات جو اُسکی ماں نے شادی پر اُسے دیئے تھے۔ سب کچھ بیچنے کے بعد ایک انٹیریئر ڈیزائنر کمپنی کے پچاس فیصد شیئرز خرید لیے، سفیر صاحب اُسے اس طرح سب کچھ لٹاتا دیکھ کر اندر ہی اندر سینکڑوں آنسو بہاتے۔ جتنا پیسہ وہ چیزیں بیچ کر اکھٹا کر رہا تھا، اُس سے دس گنا زیادہ سفیر صاحب اُسے کھڑے کھڑے دے سکتے تھے۔ لیکن وہ اُنکے پچھلے دیئے پیسوں کو ہی قرض سمجھتا تھا تو اب مزید کیوں لیتا؟ فاطمہ نے اُسے بری طرح توڑا تھا۔ اور فاطمہ بھلا کس کا انتخاب تھی؟ یہاں آکر اُنکا سانس رک جاتا، دم گھٹنے لگتا۔ اگر یہی فاطمہ، علی کا انتخاب ہوتی تو یقیناً آج اُنہیں پچھتاوے نہ ہوتے، بلکہ وہ تو یقیناً اُس کو صبح شام رات اُسکے غلط انتخاب پر لتاڑتے رہتے۔ آج جب علی کا حال دیکھتے تو سوچتے کہ اب کس کو موردِ الزام ٹھہرائیں؟ فاطمہ تو اُنکا انتخاب تھی، مجبور تو اُنہوں نے کیا تھا علی کو۔۔۔

بہر حال! نئے سرے سے پورا کاروبار کھڑا کرنے سے بہتر تھا کہ وہ چلتے ہوئے کاروبار میں سرمایہ لگائے۔ عمر پہلے سے ہی پچاس فیصد کا مالک تھا یوں اُن دونوں نے اس کاروبار کو مزید ترقی دے کر کافی بلندی پر پہنچا دیا۔

بلآخر اُس نے وہ سب کمالیا، جو وہ چاہتا تھا لیکن اب سفیر صاحب کی آنکھوں میں نظر آتے پچھتاؤوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی، فاطمہ کی دوسری شادی کے تین سال بعد طلاق ہو گئی، یہ بات بھی اُسے سفیر صاحب سے معلوم ہوئی، لیکن اُسے جان کر نہ کوئی خوشی ہوئی نہ کوئی سکون ملا۔

وہ جیسے روبوٹ ہو گیا تھا جسکے نہ کوئی احساسات تھے نہ کوئی جذبات۔۔۔

---------+---------+--------

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں

جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا، میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا

جو چمن خزاں میں اُجڑ گیا، میں اسی کی فصل بہار ہوں

پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں؟ کوئی چار پھول چڑھائے کیوں؟

کوئی آکے شمع جلائے کیوں؟ میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جان فزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا؟

میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

نوید اُسے دیکھ رہا تھا، دکھ، کرب اور تکلیف سے۔ سب کچھ کہہ کر اب اُسکا چہرہ ساکت تھا۔ پلکوں پر نمی اب بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ نِگاہیں فرش پر مرکوز تھیں۔ اُسکا دل ہلکا ہوا یا نہیں مگر نوید کا دل ضرور بھاری ہو گیا تھا۔ اُسکے مشکل وقت میں وہ اُسکے ساتھ نہیں تھا، اب اس پچھتاوے سے کیسے نکالے گا خود کو؟

''جب میں نے رضا کے بارے میں معلومات اکٹھی کی تھیں، تب کہیں نہ کہیں میرے لاشعور میں انتقام ضرور تھا۔ شاید اُسی انتقام نے مجھ سے یہ غیر اخلاقی حرکت کروائی۔ مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔'' تکلیف سے پھٹتی، بھاری آواز میں اعتراف کیا۔

''تم نے معافی مانگ لی نا؟ اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے بھلا؟'' نوید کو تسلی دینے کے لیے الفاظ کم پڑ رہے تھے۔

''میں نے تم سے تو معافی نہیں مانگی اب تک۔'' اُس نے سر اٹھا کر نوید کو دیکھا۔ اُس نے پھر وہی بات نکالی تھی۔ لیکن ہر بار کی طرح اس بار وہ اپنے ماتھے پر بل اور چہرے پر ناگواری نہیں لا سکا۔

''بھول جاؤ پرانی باتوں کو، اُس معاملے میں ہم سب برابر کے قصوروار تھے۔ اور رہی بات رضا کی، تو یقیناً اُسے برا لگا ہے۔ پر وہ جلد ہی اس بات کو بھلا دیگا۔ تم پریشان نہ ہو۔'' علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر گیلی سانس اندر کھینچتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں گھر چلتا ہوں اب، کافی دیر ہو گئی ہے۔'' نوید بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہیں اپنے بیٹے کو واپس لانے کے لیے کوئی مدد چاہیے تو مجھے ضرور بتانا۔'' اُس نے ہمدردی سے کہا۔

''اُسکی کسٹڈی میرے پاس ہی ہے۔ لیکن جب وہ میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتا تو میں زبردستی ساتھ رکھ کر کیا کروں گا؟'' علی نے دکھ سے کہا۔

''علی! بچہ یہ نہیں دیکھتا کہ غلطی کس کی تھی؟ ماں کی یا باپ کی؟ بچہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ میرے ماں باپ نے بطور سنگل پرنٹس میرے لیے کیا کیا قربانیاں دیں؟ وہ بس اپنی محرومی دیکھتا ہے۔ اور زندگی کے کسی بھی حصے میں اُسے اپنی محرومی پوری کرنے کا موقع ملے تو وہ کر لیتا ہے۔ آج وہ تمہیں چھوڑ کر گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد اُسے تمہاری کمی محسوس ہو گی، تب وہ تمہارے پاس آنا چاہے گا۔'' اُس نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''تب مجھے اُسکی ضرورت نہیں ہو گی۔'' اُس کے سخت لہجے پر ایک لمحے کے لیے وہ بھونچکا رہ گیا۔

''اولاد سے انتقام نہیں لیتے علی!'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے جانا ہے، بعد میں بات کریں گے اس بارے میں۔'' وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نوید نے سر ہلا کر خدا حافظ کہا اور اب دور تلک اُسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

زندگی میں فاصلے بہت آ گئے تھے لیکن۔۔۔۔

اُس نے آج نوید سے اپنا دکھ ویسے ہی بانٹا تھا جیسے دس سال پہلے بانٹا کرتا تھا۔۔۔

پس، ثابت ہوا۔۔۔۔

دوستی لمحوں میں ختم نہیں ہو جاتی۔۔۔۔

اتنی آسانی سے تو بالکل نہیں۔۔۔۔

اور اگر ہو بھی جائے۔۔۔

تو احساس نہیں مرتا۔۔۔

---------+---------+--------

گول میز کے گرد بچے کتابیں پھیلائیں بیٹھے تھے، رضا باری باری سب کا ہوم ورک چیک کر رہا تھا۔ جن بچوں کا کام ہو چکا تھا وہ قریب ہی ٹی وی کے سامنے بیٹھے کارٹون دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے بچے کھلونوں میں مصروف تھے۔ لڑکے سارے ایک گروپ کی صورت میں اپنے اپنے نوٹس لیے بیٹھے پڑھائی میں مصروف تھے۔ ویسے یہ سارے کام جزانے اپنے ذمے لیے ہوئے تھے، لیکن آج وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے پناہ گاہ نہیں آ سکی تھی۔ لہٰذا رضا یہ سب کر رہا تھا۔

''شاباش! میتھس (ریاضی) تو بڑی زبردست ہے تمہاری، ماشاءاللہ سارے جواب درست ہیں۔'' اُس نے کتاب بند کرتے ہوئے ایک بچے کو شاباشی دی تو وہ خوشی سے لال ہو گیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ایک اور بچے کی کاپی اٹھالی، کاپی کی ورق گردانی کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آٹھ نو سالہ بچی چلی آئی۔

''رضا بھائی! یہ دیکھیں میری ڈرائنگ۔'' اُس نے ایک اے فور سائز کے کاغذ پر بنی مصوری کو اُسکے حوالے کیا۔ اپنا کام چھوڑ کر رضا نے وہ کاغذ تھام کر دیکھا۔

''بہترین! میری ڈرائنگ تو کبھی اتنی اچھی نہیں رہی۔'' اُس کی بھی تعریف کی، پھر کاغذ کو باقی بچوں کی جانب گھماتے ہوئے پُکارا۔

''بچوں! یہ دیکھو، صفیہ نے کتنی پیاری پینٹنگ کی ہے۔'' بچوں نے تالیاں بجا کر اُسے داد دی۔

''میرے کلرز ختم ہو گئے ہیں۔'' کاغذ واپس تھامتے ہوئے بچی نے اطلاع دی۔

''کل آجائیں گے نئے۔'' جواب دیتے ہوئے گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ نو بج گئے تھے۔

''چلو بچوں! نو بج گئے ہیں، جلدی جلدی سامان سمیٹ کے سونے جاؤ۔''اُس نے بچوں کو مخاطب کیا۔ بڑے بچوں کو دس بجے تک جاگنے کی اجازت تھی، لہٰذا وہ سکون سے بیٹھے تھے، البتہ چھوٹے بچے جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے۔

''اور تم کہاں بھاگ رہے ہو عثمان؟''اُسکی نظریں عثمان پر پڑیں۔

''آپ نے ہی تو کہا تھا کہ نو بج گئے۔اب سونے جارہا ہوں۔''آنکھیں گھماتے ہوئے معصومیت سے کہا تو رضا نے اُسے گھورا۔

''دودھ ختم کیے بنا کہیں نہیں جارہے تم۔''

''لیکن نو بج گئے۔۔۔''اُس نے جتایا۔

''کوئی بات نہیں تم دودھ ختم ہونے تک جاگ سکتے ہو۔''اُس نے کہا تو وہ منہ بناتے ہوئے واپس آیا اور اپنا گلاس اٹھا کر دودھ پینے لگا۔

''ارمینہ بیگ پیک کر لیا کل کے لیے؟''

''جی بھائی!''

''گڈ، جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

''رضا بھائی یہ کوم پرامس کونسا لفظ ہے اور اسکے کیا معنی ہیں؟''شہباز نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''کوم پرامس؟ یہ کیسا لفظ ہے بھلا؟''وہ حیران ہوا۔

''یہ دیکھیں میری انگلش کی کتاب میں لکھا ہے۔''سولہ سالہ شہباز اپنی کتاب لیے پریشان سا اُسکے پاس آیا۔

''دکھاؤ۔۔۔''اُس سے کتاب لیتے ہوئے رضا نے غور سے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اُسکا دماغ گھوما۔

''یہی ہوتا ہے، جب انسان پورے سال اپنی کتابیں نہیں کھولتا۔ کمپرومائز لکھا ہے گدھے۔۔۔''اُسکے سر پر چپت لگاتے ہوئے خفگی سے کہا تو وہ کھسیا گیا۔ بڑے لڑکوں سے اُس کی چھوٹی موٹی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

''ان لوگوں سے پوچھا بھی تھا، انہوں نے کہا کوم پرامس لکھا ہے۔''منہ بسورتے ہوئے کہا، پیچھے بیٹھے اُسکے دوست ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ یہ اُنکی بے ضرر سے شرارت تھی۔ اُنہیں دیکھتے ہوئے رضا مسکرایا۔

میں نے اس دن جو بھی کیا۔۔۔میں اُسکے لیے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ جو ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری غلطی تھی۔

مسکراہٹ سمٹی۔۔۔آنکھوں کے سامنے کچھ پرانے منظر لہرائے۔۔۔ بڑے غلط وقت پر علی یاد آیا تھا۔

لیکن۔۔شاید میرا طریقہ غلط تھا۔

اُسکی شرمندہ آواز کانوں میں گونجی، وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹتا اپنے کمرے کی جانب چلا آیا۔ لڑکوں کی باتوں کی آوازیں آرہی تھی۔ وہ بستر کے سامنے رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔ علی نے اس سے معافی مانگی تھی، وہ شرمندہ تھا۔ اس سے زیادہ کیا کرتا وہ؟ اور جواباً رضا نے کیا کیا؟

''کیا ضرورت تھی مجھے اتنی بکواس کرنے کی؟ معافی ہی تو مانگ رہا تھا بیچارہ۔۔۔''دل ہی دل میں خود کو کوستے جیب سے موبائل نکالا۔ اور اگلے ہی لمحے رکا۔۔ ٹھہرا۔۔۔اور ٹھہرا ہی رہ گیا۔ یہ اُس نے کیا سوچا تھا ابھی؟ وہ جو منافق تھا، آج بیچارہ کیسے ہو گیا؟ جسکی شکل سے بھی چڑ ہوتی تھی، اُسکی شرمندگی میں آج صداقت کیوں نظر آنے لگی؟

موبائل واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ باہم پھنسائے سنجیدگی سے پچھلے دنوں کے واقعات سوچنے لگا، دماغ بار بار ایک دہائی پیچھے لے جا رہا تھے۔

پہل در حقیقت کس نے کی تھی؟ کون تھا جس نے الزامات لگائے تھے؟ علی یا رضا؟

''ہاں! لیکن میں اُسی وجہ سے اُس روز اُسکے سامنے خاموش رہا۔''خود کو بودی سی دلیل پیش کرنے کی کوشش کی۔

''اس نے معافی مانگنے میں وقت نہیں لیا۔ پر تم تو ایک دہائی گزرنے کے بعد بھی اپنی غلطی پر شرمندہ نہیں ہو رضا!''دل نے دلیل رد کرتے ہوئے آئینہ دکھایا۔ تھک کر سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

--------+---------+----------

بستر سے کمر ٹکائے، دونوں گھٹنوں کو جوڑے وہ سر پیچھے گرائے بے آواز رو رہی تھی۔ گلا درد سے پھٹ رہا تھا لیکن وہ ضبط کر رہی تھی۔ سرخ و سپید رنگت کملا کر زرد ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے چھائے ہوئے تھے۔ اُسکے پیچھے ہی بستر پر احمد بے سدھ سویا ہوا تھا۔

فاطمہ آفندی کی سزا تو اُسی روز شروع ہو گئی تھی، جس روز وہ طلاق لیکر تقی کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اُسکے دل پر ایسا بھاری بوجھ آن پڑا تھا جیسے کوئی بہت ہی بڑا جرم کر آئی ہو۔ ملائکہ اور تقی پورے راستے اُسے مبارک باد دیتے رہے لیکن وہ مسکرانے سے زیادہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

ملائکہ کے گھر ہی اُس نے اپنی عدت پوری کی، اُسکی خود بھی اپنے شوہر سے علیحدگی تھی۔ اس دوران تقی انگلینڈ چلا گیا۔ ایک سال تک وہ اُسے وہاں سے ہر ہفتے تحفے تحائف بھیجتا۔ روزانہ کال کرنا بھی نہ بھولتا، اُسے احساس دلاتا رہتا کہ وہ کتنی اہم ہے؟ اور وہ ہر حال میں اُسکے ساتھ ہے۔ جب وہ اتنے وثوق سے دعوے کرتا تو اُسے اپنے خدشے بیکار محسوس ہوتے۔ پھر ایک سال بعد تقی نے اس سے نکاح کر لیا۔

جس طرح اُس نے کہا تھا کہ وہ فاطمہ کے عشق میں پاگل ہے اور آج تک شادی نہیں کی اور جب وہ اس سے شادی کریگا تو دنیا دیکھے گی وغیرہ وغیرہ، ویسا کچھ نہ ہوا۔ بس چار لوگوں کی موجودگی میں نکاح ہو گیا۔ جب فاطمہ نے پوچھا تو اس نے بڑے پیار سے کہا کہ

''میرا پاکستان میں ہے ہی کون؟ سارا کاروباری حلقہ احباب، خاندان وغیرہ سب دبئی میں ہی ہیں۔ وہیں جا کر دھوم دھام سے شادی کریں گے۔'' وہ مان گئی۔ ایک ہفتے تک وہ ہواؤں میں اڑتی رہی۔

پھر ایک ہفتے بعد جب وہ دبئی پہنچی۔۔۔۔ تب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کیا کر چکی ہے؟ بھلا اُس سے بڑا بیوقوف بھی کوئی ہو گا؟ جس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی تباہ کی، اپنا ہنستا کھیلتا گھر اجاڑا۔۔۔ ہاں! ہنستا کھیلتا گھر، جو تب اُسے جہنم لگا تھا۔

وہ تقی جو اُس سے محبت کے دعوے کرتا تھا، فاطمہ اُسکی پہلی نہیں، دوسری نہیں بلکہ تیسری بیوی تھی۔ اُسکی پہلی بیوی در حقیقت اُسکی خاندانی بیوی تھی، جو اُسکے حلقہ احباب میں جانی جاتی تھی۔

اُسکی دوسری بیوی اُسکے لیے عورتوں کو بھلا پھسلا کر نشہ فراہم کرتی تھی۔ اور یہی کام وہ فاطمہ سے بھی چاہتا تھا۔ جب اُس نے غصّے میں ملائکہ کو فون کرنا چاہا تو اس نے موبائل چھین کر توڑ دیا۔

''بات سن خبیث عورت!۔۔۔ تُو اب یہیں رہے گی۔ اور تب تک جب تک مر نہیں جاتی یا میرا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہو جاتی۔ بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ وہ سلوک کروں گا جو خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا۔'' تقی کا بت چھنّاکے سے ٹوٹا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی، ایسا حرام کام نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے صاف منع کر دیا۔ نتیجتاً بیلٹ، ڈنڈے اور ہر قسم کے تشدد سے اُس پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ ایک دو بار اُس نے تھک کر حامی بھر لی اور تقی کے کہنے پر کسی یونیورسٹی میں ایم فل کے لیے انرول ہو گئی۔ وہاں کی معصوم لڑکیوں کو نشہ بیچا اور کچھ کو تو بھلا پھسلا کر اُسکے پاس بھی لائی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ ناکامی کی صورت میں وہ اُس سے مزید مار کھاتی۔ اُسکے ماں باپ نے تو پھر کبھی پلٹ کر اُسے پوچھا ہی نہیں۔ اُس نے تشدد سہہ لیا لیکن دوبارہ یہ کام نہیں کیا۔ بلآخر تھک کر تقی نے اُسے بیچنے کا ارادہ کر لیا تو اُسے اللہ نے وہاں سے نکال لیا۔

روتے روتے اُسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ احمد اور اُسکی بیٹی اُٹھ نہ جائیں، اس ڈر سے اُس نے ضبط کرتے ہوئے منہ پر رومال رکھا۔ کھانس کھانس کر سانس رکنے لگا تھا۔ بے حال سی ہوتی اُس نے منہ سے رومال ہٹایا تو خون کے تین دھبّے وہاں نظر آئے۔ روتے ہوئے رومال موڑا اور دوبارہ سر بستر سے ٹکا دیا۔

''میں نے کتنا برا کیا تمہارے ساتھ علی! لیکن یقین جانو؟ میں احمد کو تم سے چھیننا نہیں چاہتی تھی، میں بس مرنے سے پہلے اُس سے ملنا چاہتی تھی۔'' درد سے تڑپتے، سسکتے دل میں علی کو مخاطب کیا۔

''میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ، اور سب سے بڑا ظلم تو۔۔۔''کچھ یاد آنے پر آنسوؤں سے نم چہرہ اٹھا کر بستر پر سوئی اپنی چار سالہ بیٹی کو دیکھا۔

''مجھے مرنے سے پہلے ایک غلطی تو سدھارنی ہے۔''دل ہی دل میں عزم کیا۔ پھر خود کو گھسیٹتی، لڑھکتی ہوئی، سائیڈ ٹیبل تک آئی۔ ایک کاغذ اور قلم نکال کر ٹیبل کے اوپر رکھا، پھر موبائل کا ٹارچ کھول کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔ کچھ ایسا جو آنے والے دنوں میں اُسکی اور علی کی زندگی کا نیا باب لکھنے والا تھا۔

---------+---------+--------

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ وہاں سے جلد از جلد گزر جانا چاہتی تھی، لیکن اپنے پیچھے آتی سیٹی کی آوازوں نے اُسکے قدم منجمد کیے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ تینوں پولیس والے اپنی پولیس موبائل سے ٹیک لگائے کھڑے، خباثت سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''اتنے دنوں سے کہاں تھی حسینہ؟ نگاہیں ترس گئی تھی تمہیں دیکھنے کے لیے''۔ ایک نے بے شرمی سے کہا تو باقی دونوں ہنسنے لگے۔ اگلے ہی لمحے جزا اُن تک آئی اور رکھ کے ایک تھپڑ اُسکے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گیا۔

''بے غیرت، ذلیل انسان۔۔۔ تم ملک کے محافظ ہو یا عزتوں کے لٹیرے؟ شرم نہیں آتی، آتے جاتے لڑکیوں کو آواز کستے ہوئے؟''جزا کی آواز اس حد تک بلند تھی کہ گھروں کے اندر موجود لوگ بھی باہر آ گئے۔ پولیس والا گڑبڑا گیا۔

''معاف کیجئے گا، ہم مذاق کر رہے تھے۔''ایک پولیس والے نے لوگوں کو جمع ہوتا دیکھ معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔ مجمع میں موجود لوگوں کے ہاتھ میں موبائل تھے، معاملہ بگڑ سکتا تھا۔

''مذاق؟۔۔۔ تمہارا دماغ تو درست ہے؟ عورتوں کو حراساں کرنے کو تم مذاق کہتے ہو؟''جزا نے اُسکا گریبان پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی معافی مانگ لی نہ، اب آپ زیادہ فساد نہ پھیلائیں۔''پولیس والا غصّے سے بولا تھا۔ جزا کا دماغ مزید کھول گیا۔

''تم اوقات میں رہو اپنی۔''اس سے پہلے کے جزا مزید ایک آدھ تھپڑ اُسے مارتی، کچھ مردوں نے اس پولیس والے کو پکڑ لیا اور اب مل کر اُسکی درگت بنانے لگے۔ بڑی مشکلوں سے وہ پولیس والے اپنی جان بچا کر بھاگے تھے۔

لیکن۔۔۔

جاتے جاتے وہ جزا کو سرخ آنکھوں سے دیکھتا یہ دھمکی دے گیا تھا کہ

''اُسکا بدلہ تم سے ضرور لوں گا۔''

---------+---------+--------

کل رات پورے ایک ہفتے بعد اُسے نیند آئی تھی۔ صبح صبح بیل کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سے اُسکی آنکھ کھلی۔ موبائل اٹھا کر وقت دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔

''کون آ گیا اس وقت ؟''بستر سے اٹھتے آنکھیں ملتے وہ دروازے تک آیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ تقریباً بھی چار سال بعد وہ اُسکے دروازے پر کھڑے تھے۔

''آپ ؟۔۔''علی کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے ؟

''تمہاری امانت تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔''اُنہوں نے کہا۔

''امانت ؟''وہ سمجھا نہیں۔

''ہاں ! یہ ہے تمہاری امانت۔۔۔''سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا تو اُنکے پیچھے چار پانچ سالہ بچی کھڑی نظر آئی۔ چھوٹے بالوں کی آدھی پونی بنائے، آدھے بال کھلے رکھے تھے۔ گلابی رنگ کی فراک پر ہم رنگ سویٹر پہنے، کندھے پر ننھا سا بیگ لٹکائے، ماتھے پر کٹے بینگز میں کھڑی وہ جو کوئی بھی تھی، شکل سے ہی شرارتی لگتی تھی۔

''کون ہے یہ ؟''اُس نے شہیر صاحب سے پوچھا۔

''تمہاری بیٹی۔۔۔ نشمیہ۔۔۔ نشمیہ علی''علی تو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

---------+--------+--------

نواں باب

طفل

اس دنیااور اُس دنیا کے لوگوں میں رابطے کا ایک ذریعہ۔۔۔

قبر۔۔۔

اہل قبور کو معلوم کہ ملاقات آئی ہے۔۔۔

اہل زمین کو ایک سکون کہ میرا اپنا یہاں ہے۔۔۔

اپنے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی قبروں پر کھڑا نوید بھی آج اسی لیے یہاں آیا تھا۔ موسم ابر آلود تھا، ہلکی ہلکی بوندا باندی ساتھ ساتھ جاری تھی۔ سیاہ جینز پر، سیاہ شرٹ پہنے، اُسکی نظریں بھی سیاہ۔۔۔ اُسکا نصیب بھی سیاہ۔۔۔ اور اُسکا دل بھی۔۔۔

اگر وہ روتا نہیں تھا تو کیا اسے احساس نہیں تھا؟ اگر وہ بشریٰ کے لیے، اور صرف اور صرف بشریٰ ہی کے لیے خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھا، تو کیا اُسکا دل نہیں دکھتا تھا؟ کیا اُسے نہیں تکلیف ہوتی تھی؟

اُسکے دل کے ٹکڑے، اُسکے جگر گوشے، اُسکے وجود کا حصہ، اُسکی اولادیں کتنی کم عمری میں یہاں آ گئے تھے۔ اُسے اُنکی قلقاریاں یاد آتی تھیں۔ اُنکے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھ کر نوید تک آنا یاد آتا تھا۔ دل ٹوٹا جاتا تھا، پر خاموش رہتا۔ بھلا مرد بھی کبھی روتا ہے؟

مرد کو اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو شاید وہ اپنا دل کھول کر رکھ دے۔ شاید وہ بتائے کہ آؤ دیکھو۔۔۔

دیکھو! کہ کتنا درد بھرا ہے اس دل میں۔۔۔

دیکھو! اس دل میں کتنے سوراخ ہیں، اور ہر سوراخ سے قطرہ قطرہ خون رستا ہے۔

دیکھو! کہ میرے زخم روزِ اول کی طرح تازہ ہیں اور تاحیات رہیں گے۔

"علی کل رو رہا تھا۔" قبر کی نم مٹی پر نظریں جمائے اُسے دوست یاد آیا تو جیب میں رکھا موبائل نکالا۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ یہاں سے اُسکے گھر کا راستہ پندرہ منٹ کا تھا، وہ باآسانی جا کر اُسکا حال احوال دریافت کر سکتا تھا۔ ویسے ہی کل رات سے اُسکی وجہ سے کافی پریشان تھا۔

جیب میں موبائل ڈال کر ایک نظر قبروں پر ڈالی، پھر گہری سانس کھینچتا پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی اُسے علی کی طرف جانا تھا۔ آخری بار وہ اپنی نظروں میں گر کر، ذلیل ہو کر، رسوا ہو کر اور اپنے کردار پر بے شمار الزامات سہہ کر اُسکے گھر سے نکلا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ دوبارہ اُسکے گھر میں قدم نہیں رکھے گا لیکن پتہ نہیں کیوں؟ اُسکی کل کی حالت دیکھ کر عجیب سا دھڑکا لگا ہوا تھا دل کو، کہیں ڈپریشن میں نہ چلا جائے۔ کہیں کچھ کر نہ لے اپنے ساتھ۔

خود سے کیے سارے وعدے بھلائے اور ہزاروں خدشے دل میں لیے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا، یہ جانے بنا کہ۔۔۔۔

علی کی زندگی میں آئے طوفان اب تھمنے والے ہیں، اُسکی ڈوبتی کشتی کو کوئی کنارے لگانے والا ہے۔ کوئی اُسکے دل سے رستے خون کو اپنی محبت سے صاف کرنے والا ہے۔

---------+---------+--------

(مجھے نہیں معلوم کہ اپنی بیٹی کو سامنے دیکھ کر تم کیا کرو گے؟ تم مجھے مزید برا سمجھو گے یقیناً۔۔۔ سمجھنا بھی چاہیے کیونکہ میں اسی لائق ہوں۔)

علی کے ہاتھ میں وہ کاغذ تھا جس پر طے شدہ ہونے کی وجہ سے لکیریں پڑ چکی تھیں۔ اُسکے سامنے فاطمہ کے والد اور اُسکے سابقہ سسر بیٹھے تھے، اور اُنکے بالکل برابر میں پاؤں جھلاتی، ڈبے والا جوس پیتی، ہر شے کو غور سے دیکھتی نشمیہ۔۔۔

(مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم اسے میرے دوسرے شوہر کی بیٹی سمجھو گے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ تمہاری بیٹی ہے، تمہاری وہی بیٹی جسکے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اُسے قتل کر چکی ہوں۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، میں چاہتی تھی کہ تم مجھے جلدی طلاق دے دو۔ تم سے طلاق لینے کے سات ماہ بعد یہ پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر چند ماہ مزید گزرنے کے بعد میں نے تقی سے شادی کر لی تھی۔ اور ایک سال قبل وہ بدبخت تمہاری بیٹی کو ایک شخص کو بیچنا چاہتا تھا۔)

''تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میری بیٹی ہے؟'' علی نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور آپکو لگتا ہے کہ میں اس بکواس پر یقین کر لوں گا؟ کیا میں نہیں جانتا کہ آپکے دوسرے داماد نے اُسے طلاق دے دی ہے۔ تو اب اُسکی اولاد کو مجھ سے منسوب کر کے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ لوگ؟'' اُسکا لہجہ کاٹ دار تھا۔

''دیکھو!'' اُسے دیکھتے وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ ''تم اسے اپنی بیٹی ماننا چاہتے ہو تو مانو، نہیں ماننا چاہتے تو مت مانو۔ لیکن میرا اب اِس بچی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ فاطمہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے، اور جانے سے پہلے یہ خط اور اپنی بیٹی مجھے امانتاً دے گئی ہے کہ تم تک پہنچا دوں۔'' اُنکے جواب پر علی کا خون کھولا۔

(اُس نے میرے ساتھ کیا کیا؟ وہ میں نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ وہ سب میری سزا تھی۔ لیکن تمہاری بیٹی اس کی مستحق نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں، لیکن تمہاری امانت تمہیں لوٹا کر جا رہی ہوں۔ میں جیسی بھی ہوں، اپنی اولاد کی قاتل نہیں ہوں علی! نہ میں کبھی ایسا کر سکتی تھی۔ وہ سب میں نے تم سے طلاق لینے کے لیے کہا تھا۔)

''میں کبھی قبول نہیں کر سکتا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ جھوٹ بول رہی ہے وہ عورت۔'' وہ چیخا تھا۔ قریب بیٹھے سفیر صاحب نے اُسے تاسف سے دیکھا۔

''تم بے شک یقین نہ کرو! لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اس بچی کو اب نہیں رکھوں گا۔ یہ فاطمہ کی اولاد تھی، اور وہ اب جا چکی ہے۔ اُسکے بعد یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ تم اگر نہیں رکھنا چاہتے تو اسے یتیم خانے چھوڑ دو۔'' گھر کی بیل بجی تو سفیر صاحب اُٹھ کر وہاں سے گئے۔

''تو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی چھوڑ آتے یتیم خانے۔'' اُس نے تڑخ کر کہا۔

''میں ایسا کر سکتا تھا، لیکن نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں تمہیں یہ بات معلوم ہو اور تم مجھ سے شکوہ کرو کہ میں نے تمہاری اولاد کو یتیم خانے کیوں چھوڑ دیا؟'' سفیر صاحب کے پیچھے نوید وہاں داخل ہوا تھا۔

''بار بار اسے میری اولاد کہنا بند کریں۔'' اُس نے پھر ضبط کیا تھا۔

(میں نے تمہاری بیٹی کو تمہارے حوالے کر کے اپنا ایک فرض تو پورا کر دیا۔ اگر تم سے تمہارا بیٹا لیا تو تمہاری بیٹی بھی تمہیں واپس کر رہی ہوں۔ اب یہ تم پر ہے کہ اسے اپنی بیٹی مانو یا یتیم خانے چھوڑ آؤ۔ اس سے زیادہ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا، معافی بھی نہیں مانگنی کہ اُسکے میں لائق نہیں۔)

''میرا کام ختم ہوا، اب تم اگر اس بچی کو یتیم خانے چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہو، تو کم از کم میرے سر کوئی بوجھ نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں نے تمہاری بیٹی کو تم تک باحفاظت پہنچا دیا ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، ایک نظر علی کو دیکھا، پھر ایک نظر نشمیہ پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

''ارے ایسے کیسے؟ آپ اسے یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتے، میں کیا کروں اسکا آخر؟'' علی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پر وہ رکے نہیں۔

''یہ کس قسم کا مذاق ہے؟'' اُسکا دماغ کھول رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے علی؟'' نوید نے قریب آتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ کچھ کچھ بات تو اُسے بھی سمجھ آ رہی تھی۔

''یہ۔۔'' فاطمہ کا دیا خط اُسکے سامنے کیا تو نوید نے لیکر پڑھنا شروع کیا۔ سفیر صاحب جا کر نشمیہ کے پاس بیٹھے۔

''دور رہیں اس سے ابا! آپکی کچھ نہیں لگتی یہ، ہمیں نہیں معلوم کہ اسکی ماں کیا کھیل کھیل رہی ہے؟'' اُس نے اُن سے کہا پر اُنہوں نے سنی ان سنی کر دی۔

''تم کیا کرو گے اب؟'' خط پڑھنے کے بعد نوید نے اس سے پوچھا۔

''کیا کرنا ہے ؟ یتیم خانے ہی چھوڑ کر آؤں گا اسے۔۔۔'' نفرت سے جواب دیا۔

''اور اگر یہ تمہاری بیٹی ہوئی تو؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''خدا کا واسطہ ! اب تم یہ نہ کہو۔'' وہ چڑا۔

''اگر یہ تمہاری ہی بیٹی ہوئی تو؟''اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''اُسکا برتھ سرٹیفکیٹ ہے میرے پاس۔'' سفیر صاحب نے درمیان میں کہا۔

''برتھ سرٹیفکیٹ کی صداقت پر کون بھروسہ۔۔۔'' عجلت میں کہتا علی تھما۔اور رک کر اُنہیں دیکھا۔

''آپکے پاس؟''حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ! جس دن فاطمہ یہاں آئی تھی، تو وہ صرف احمد سے ملنے نہیں بلکہ مجھے یہ بات بتانے بھی آئی تھی۔''اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''اور آپ اُسکی ہر بات پر ایمان لے آئے؟''اُس نے طنزاً کہا۔

''ہاں !''اُنکے سکون میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ علی نے خون کا گھونٹ بھرا، نوید کے سامنے وہ اُن سے کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

''میری بات مانو ! ابھی اسے یتیم خانے نہ چھوڑو۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ تلخ ہو رہا تھا۔

''غور سے سنو علی ! اگر یہ واقعی تمہاری بیٹی ہوئی تو؟ تم ساری عمر اسے یتیم خانے چھوڑنے پر پچھتاتے رہو گے۔ بہتر ہے کہ ابھی اسے گھر میں رکھو اور ڈی این اے ٹیسٹ کرواؤ۔ ٹیسٹ سے سچ سامنے آجائیگا۔''اُس کی بات ٹھیک تھی۔

''لیکن آج تو میری میٹنگ ہے اور پھر سائٹ پر بھی جانا ہے، ایک ہفتے سے میں آفس بھی نہیں گیا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ٹیسٹ کل بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہونہہ۔۔''اُس نے سر ہلایا، پھر رک کر اُسے دیکھا''تم سے تو پوچھا ہی نہیں میں نے کہ صبح صبح یہاں کیسے آئے؟ سب خیریت تھی؟''

''میں بس تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔''سفیر صاحب کی موجودگی کی وجہ سے کہہ نہیں سکا کہ کل رات والی تمہاری حالت سے پریشان تھا۔

''میں ٹھیک ہوں اب، تم بیٹھو!''اُسے احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے کھڑا ہے۔

''نہیں میری ڈیوٹی کا وقت ہو چکا ہے۔ مجھے نکلنا ہو گا۔''فاطمہ کا دیا ہوا کاغذ علی کی طرف واپس بڑھاتے ہوئے کہا''تم مجھے بتانا اگر کسی بھی شے کی ضرورت ہو۔''

''شکریہ تمہارا۔۔''پھر علی باہر تک اُسے چھوڑنے گیا۔ دروازہ بند کر کے اندر آتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ پر نظر پڑی، تو اندر غصّے کا اُبال اٹھا، اُسی کاغذ کو توڑ مڑوڑ کر ٹیبل پر پھینکتا وہ صوفے پر بیٹھی نشیہ پر ایک نگاہِ غلط بھی نہ ڈالتے ہوئے، اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اپنا کوٹ پہنتے، ہاتھ میں لیپ ٹاپ بیگ لیے وہ اُسی تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ سفیر صاحب کی نگاہیں گولا بنے اس کاغذ پر تھیں جو وہ ابھی میز پر پھینک کر گیا تھا۔

''بات سنیں۔۔۔''جوس کا سٹرا منہ سے نکال کے نشیہ نے سفیر صاحب کو مخاطب کیا۔

''ہاں بیٹا! بولو۔''اُنہوں نے اُسکی طرف جھکتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''یہ اتنے ڈراؤنے کیوں ہیں؟''اُس نے رازداری سے مرکزی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، جہاں سے علی ابھی ابھی گیا تھا۔ وہ ہنس دیئے۔

''وہ بس غصّے میں ہے۔'' اُنہوں نے سمجھانا چاہا۔

''مجھے بھی غصّہ آتا ہے، پتہ ہے ایک بار۔۔۔''وہ جذباتی انداز میں کہتی صوفے پر ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اُسکی باتیں سننے لگے تھے۔

---------+---------+--------

جزا اپنے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ بنی دیوار گیر صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ صفحہ سفید رنگ کا تھا، ساتھ میں انڈے کی شکل کا چٹائی سے بنا جھولا بھی رکھا تھا۔ کمرے کو نقلی پودوں اور اصلی بوگین ویلا سے سجایا ہوا تھا۔ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کیے اپنے سامنے لیپ ٹاپ کھولے وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھی، جب اُسکا فون بج اٹھا۔ ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر سکرین کو دیکھا پھر فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہیلو!''باؤل سے چپس کھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''جزا یار! کیا غضب کا کارنامہ انجام دے دیا ہے تم نے، میں تو فین ہو گئی ہوں تمہاری۔''بنا کسی سلام دعا کے اُسکی کولیگ نے کہا۔

''ہیں؟ کس بارے میں بات کر رہی ہو؟''وہ حیرت سے سیدھی ہوئی۔

''ارے تم نے جو کل پولیس والوں کی دُرگت بنائی ہے۔ واہ آئرن لیڈی۔۔۔واہ۔''وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''سوسائٹی کا فیس بک گروپ نہیں دیکھا؟ ہر جگہ تمہاری ویڈیو آرہی ہیں۔ کیسے تم نے اُن پولیس والوں کی بینڈ بجائی ہے۔ زبردست۔۔۔''اُسکی بات پر جزا سکتے میں آئی۔

''کیا ویڈیو وائرل ہو گئی؟''

''ابھی تک صرف فیس بک گروپ پر ہے۔ مگر میری تو دعا ہے ہو جائے وائرل تاکہ اعلیٰ حکام تک اُن پولیس والوں کے کارنامے پہنچیں''

''تم ایک کام کر سکتی ہو؟''

''ہاں! بولو۔۔۔''

''تم مجھے وہ ویڈیو سینڈ کر دو گی؟''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟''اور کچھ ہی دیر بعد جزا کو وہ ویڈیو موصول ہو چکی تھی۔ ویڈیو ایسے بنائی گئی تھی کہ اُس کے ساتھ ساتھ وہ تینوں پولیس والے بھی واضع نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے یہ ویڈیو اپنے تمام جاننے والے گروپوں میں پھیلا دی تھی۔

''اب دیکھو میں کیا کرتی ہوں تم سب کے ساتھ؟''اُس نے سکون سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ لیکن اُسکی یہ حرکت اُسے کافی مہنگی پڑنے والی تھی۔

---------+---------+--------

''ارے! آپ؟''حسین کو پناہ گاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھ شہباز خوش ہوا۔ وہ کوچنگ سینٹر سے واپس آرہا تھا۔

''تمہارے بھائی سے ملنے آیا تھا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''ابھی ابھی ہی تو آیا ہوں۔''

''اوہ اچھا اچھا! آئیں نا اندر۔۔''شہباز نے چابی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اور اُسے اندر لے آیا۔ حسین تو لان میں ہی رک گیا جبکہ وہ بھاگتا ہوا اندر گیا۔

''رضا بھائی! رضا بھائی!۔۔۔ آپکے اس دن والے دوست آئے ہیں۔''اُس نے ہانپتے ہوئے اُسکے سر پر پہنچ کر کہا۔

''ہیں؟ اُس دن والے مطلب؟''بچوں کو گود میں بٹھائے ٹی وی دیکھتا رضا حیران ہوا۔ پھر یکدم ہی اُسے یاد آیا۔''تم حسین کی بات کر رہے ہو؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہی۔۔۔''

''کہاں ہے؟''

''یہ تو رہے میرے ساتھ۔۔۔''جلدی سے کہتے ہوئے مڑ کے پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

''ارے! کہاں گئے یہ؟''وہ سر کھجانے لگا۔

''تم اسکو پکڑو! میں دیکھتا ہوں۔''رضا نے محمد کو اُسکی گود میں دیا اور اُٹھ کر باہر آیا۔وہ سامنے ہی کھڑا تھا، سفید جینز پر سبز رنگ کی پوری آستینوں والی اونی ٹی شرٹ پہنے، آنکھوں پر ریم لیس چشمہ لگائے وہ اِرد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔رضا اُسکے پاس چلا آیا۔لیکن حسین اُسے نظر انداز کیے لان میں لگے پودوں کو گھورنے میں مصروف رہا۔

''کیسے آنا ہوا؟''اُس نے گلا کھنکھارتے ہوئے پوچھا۔

''دروازے سے۔۔۔''مختصر جواب دیا گیا تو اُسکے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''میرا مطلب کون سی وجہ آپ کو یہاں کھینچ لائی؟''رضا نے ذرا گھما کر وہی سوال دہرایا۔

''تمہیں کب سے پھولوں اور کلیوں کا شوق ہو گیا؟''سوال نظر انداز کر کے پوچھا گیا۔

''جب سے زندگی میں بہار آئی ہے۔''اس بیساختہ جواب پر حسین تو حسین، خود رضا بھی حیران رہ گیا۔بھلا یہ کیا نکل گیا اُسکی زبان سے؟

''بہار؟''بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا، رضا گڑبڑایا۔

''اس بہار کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''آنکھوں میں شرارت لیے چہرے پر سنجیدگی سجائے پوچھا۔

''بہار۔۔۔یعنی میرے بچے۔۔۔یہ سب اُنہی کا شوق ہے۔''دانت کچکچاتے ہوئے جتایا۔اب کور بھی تو کرنا تھا۔اور بھلا کونسی بہار ہو سکتی ہے اُسکی زندگی میں؟

''آں ہاں۔۔۔میں سمجھ گیا۔بالکل سمجھ گیا۔''اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا سمجھ گئے؟''وہ مشکوک ہوا۔

''یہی کہ تمہاری ناراضگی دور ہو گئی۔''بات بدلنے میں تو یہ انسان ماہر تھا۔

''میں ناراض تھا کیا؟'' رضا نے اس سے زیادہ خود سے پوچھا۔ اچھا ایسا بھی تھا؟ مجھے کیوں نہیں معلوم؟

''کیا مطلب؟ تم ناراض نہیں تھے؟'' حسین بھی خوب اداکار تھا۔

''میں کسی سے بھی ناراض نہیں تھا۔'' اب کے زرا سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر یہیں کھڑے کھڑے تواضع کروگے میری؟''

''تمہاری تواضع بھی کرنی تھی؟'' مزید حیرت سے پوچھا، بڑی انوکھی بات کی تھی اُس نے جیسے۔

''علاج کرواؤ اپنا۔'' منہ بناتے ہوئے کہا اور اُسکا انتظار کیے بنا ہی لان میں رکھی کرسیوں پر جا بیٹھا۔ رضا ہنس دیا، پھر اُسکے پاس ہی چلا آیا۔

''تمہاری فنکاریاں کبھی ختم نہیں ہوں گی نہ؟'' کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں محبت جتاتا ہوں اور لوگوں کو فنکاریاں لگتی ہیں۔'' منہ بنا ہی رہا، اُس نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''تمہاری محبت بھی تو اچانک اچانک سے جاگتی ہے۔'' اب کے حسین ہنس پڑا۔

''تم سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن پچھلی دو دفعہ سے جو کچھ ہوا۔ تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔'' ذرا سنبھل کر اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ پرانی بات نکال کر اُسکا اچھا بھلا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میں کل رات تمہارے پیچھے آیا تھا، لیکن تم جا چکے تھے۔'' حسین نے بتایا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے، اسی لیے پارکنگ میں تمہارا انتظار کیا تھا میں نے، لیکن پتہ نہیں تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو حسین حیران رہ گیا۔ عائشہ جی نے اندر سے چائے کے ساتھ کچھ لوازمات بھجوا دیئے تھے۔

''تم میرا انتظار کر رہے تھے؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں!'' اُس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو تھوڑا صبر نہیں کر سکتے تھے؟ آ ہی جاتا میں کچھ دیر میں۔۔۔'' حسین نے اُسے لتاڑا۔

''اتنا وقت نہیں تھا میرے پاس۔۔۔'' رضا نے منہ چڑاتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھالی۔

''مقدّم نے کچھ ایسا بتایا تھا کل رات، کہ میں وہیں رک گیا۔'' اُسکا لہجہ سنجیدہ ہوا۔

''مقدّم نے؟''اُس نے حیرت سے چائے کی پیالی میز پر واپس رکھی۔

''ایسا کیا کہہ دیا اُس نے؟''

''لیلیٰ یاد ہے تمہیں؟''یکدم ہی پوچھا۔

''لیلیٰ کون؟''پہلے تو اُسے واقعی یاد نہیں آیا۔پھر خیال آیا کہ ذکر مقدّم کا تھا۔

''اوہ لیلیٰ۔۔۔مقدّم کی منکوحہ؟''اُس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں! وہی۔۔۔اُسکا انتقال ہو گیا ہے۔''آہستہ سے کہے گئے، حسین کے الفاظ نے رضا کا چہرہ پل بھر کے لیے سیاہ کر دیا تھا۔وہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔لیلیٰ کے لیے مقدّم کی محبت، اُسکے لیے پل پل پریشان ہونا، اُسکا والہانہ پن، اُس سے نکاح کی خوشی۔۔۔سب ایک لمحے میں اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

''پر۔۔۔کیسے؟''اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''موت کی وجہ تو اس نے نہیں بتائی البتہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔''جواباً حسین سب بتاتا چلا گیا۔رضا اندازہ کر سکتا تھا کہ لیلیٰ کی موت نے مقدّم پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے؟اور جو کچھ وہ بتا رہا تھا وہ بالکل اُسکے اندازے کے مطابق ہی تھا۔

''لیکن یہ سب اس نے کیوں بتایا؟''ایف آئی اے کے آفس میں اِس موضوع کے نکلنے کی وجہ وہ سمجھ نہ سکا۔

''علی کو سمجھانا چاہتا تھا، شرمندہ کرنا چاہتا تھا اُسے، کہ جو کچھ اُس نے تمہارے ساتھ کیا وہ شدید غلط فہمی کی بنا پر تھا۔''اُس نے بتایا تو نہ جانے کیوں، پر یہ بات رضا کو ناگوار گزری اور وہ اپنی ناگواری چھپا بھی نہ سکا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''اُسکے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سوال کیا۔

''میں نے اپنا حساب برابر کر لیا تھا علی سے، پھر اُسے مزید شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟معافی مانگ تو چکا تھا وہ، بات ختم کر دینی چاہیے تھی۔''حسین نے پوری آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''کیا؟''اُسے خود کو گھورتا پا کر رضا نے کوفت سے پوچھا۔حسین ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں۔''وہ سنجیدہ تھا۔

''تم لوگ ایک دوسرے کی غائبانہ وکالت کرتے ہوئے کتنے پیارے لگتے ہو۔''اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلائیں ہی لیے لے اُسکی۔۔۔کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔

''اور کس نے کس کی وکالت کی؟''اُس نے وضاحت چاہی۔

''مقدّم تمہاری وکالت کر رہا تھا، تم علی کی کر رہے ہو۔اور عمر، کل رات علی کے لیے مقدّم سے بحث کر رہا تھا، جبکہ کسی زمانے میں اُسکے لیے علی سے لڑ پڑا تھا۔واللہ! تم لوگ میری سمجھ سے باہر ہو۔''رضا نے کچھ نہ کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا عمر؟''اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''آپ علی کے بارے میں جاننے کے لیے متجسس ہیں؟''اُس نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔آنکھوں میں ناچتی شرارت دیکھ، رضا نے خون کے گھونٹ بھرے۔

''میری بلا سے جو بھی کہا ہو۔میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''اُس نے کندھے اچکاتے ہوئے ازلی بے نیازی سے کہا۔

''چلو چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ وہ بچی کیسی ہے اب؟''حسین نے بھی مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

''کونسی بچی؟''اُس نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''وہی۔۔۔کیا نام تھا اُسکا؟ارمینہ تھا شاید!''اُس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ارمینہ ٹھیک ہے اب، بچے جلدی بہل جاتے ہیں''اُس نے جواب دیا تو حسین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، کانٹے کی مدد سے کیک کا ٹکڑا توڑنے لگا۔رضا کچھ دیر تک ضبط کرتا رہا، اور وہ سکون سے کیک سے انصاف کرنے میں مصروف رہا۔

''بک بھی دو کیا کہا تھا عمر نے۔۔۔''بلآخر جب صبر جواب دے گیا تو چیخ کر بولا۔

''سوری! آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟''اداکاری تو ختم تھی اُس پر۔۔۔ رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا تو وہ ہنس دیا۔

''دراصل! علی کافی پریشان ہے۔عمر بتا رہا تھا کہ۔۔۔''مختصراً کل رات پارکنگ والا واقعہ بھی کہہ سنایا۔ پتہ نہیں کیوں؟پر یہ سب سن کر رضا کا دل مزید خراب ہوا تھا۔زندگی اُس پر تنگ تھی تو اُن پر بھی قسمت کوئی مہربان نہ تھی۔

''یہ سب عمر کو کیسے معلوم؟''

''وہ دونوں کاروباری شراکت دار ہیں۔''

''ہمم!۔۔۔''وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ماحول میں عجیب سا بوجھل پن اُتر آیا تھا۔اتنی پریشانی کے بعد بھی علی نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس سے معافی مانگی تھی،اتنے ہی لوگوں کے سامنے جتنے لوگوں کے سامنے اُسکی عزت نفس پر حملہ کیا تھا۔کیا تھا جو رضا خاموشی سے سن لیتا؟اُس پر سے مقدّم نے بھی اُسے ٹھیک ٹھاک شرمندہ کر دیا تھا۔اب اس کو افسوس ہو رہا تھا۔اُس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ دل بھی علی کی طرف داری کریگا۔پتہ نہیں کیوں؟پر ایسا ہو رہا تھا۔

''ہاں! یاد آیا، تمہیں کچھ دکھانا تھا۔''ماحول کے بوجھل پن کو حسین کی آواز نے توڑا تھا۔

''اب کیا دکھانا ہے؟''وہ چونکا۔

''میرا بیٹا، سوچا تھا اُسکی تصویر دکھاؤں گا تمہیں۔''اُس نے محبت پاش لہجے میں کہتے ہوئے موبائل کھولا تاکہ اُسے تصویریں دکھا سکے۔رضا اُسکے انداز پر مسکرایا۔

''تمہارا بیٹا بھی ہے؟''سوال عجیب تھا۔

''میری ایک بیٹی بھی ہے۔''جواب جتاتا ہوا تھا۔

''ماشاءاللہ۔۔۔''اُس نے خوشی سے کہا۔سچی خوشی۔۔۔

''عمریں کیا ہیں دونوں کی؟''اُس نے پوچھا۔

''بیٹا چار سال کا ہے، بیٹی ڈیڑھ سال کی۔۔۔یہ دیکھو!''مطلوبہ تصویر ملنے پر وہ موبائل اُسکی جانب بڑھانے ہی لگا تھا کہ بیل بج اٹھی۔

''اس وقت کون آ گیا؟''وہ حیران ہوا۔سارے بچے تو گھر پر تھے، جزا بھی اندر ہی بچوں کو پڑھا رہی تھی۔حسین سامنے نہ ہوتا تو اُسی کو گمان کرتا۔

''میں دیکھتا ہوں ذرا۔۔''وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔حسین نے سر ہلاتے ہوئے موبائل پیچھے کر لیا۔

---------+---------+--------

آج کا دن خاصا مصروف تھا، علی پورے ہفتے بعد آفس آیا تھا، لیکن پھر بھی عمر اُس سے بات نہیں کر پایا۔آفس آتے ہی دونوں کو کلائنٹ سے ملنے جانا پڑا، پھر اپنی ٹیم کے ساتھ سائٹ پر جا کر کام دیکھنا تھا۔وہاں سے واپس آتے آتے رات ہو گئی تھی۔لہٰذا اُن دونوں کی کوئی بات نہ ہو سکی۔واپسی پر عمر، مقدّم کے آفس چلا آیا۔

''تم ناراض ہو؟''اُس سے ملتے ہی پہلا سوال یہی پوچھا تھا۔

''تم نے کوئی غلط بات کی تھی؟''خاکی پینٹ پر آف وائٹ شرٹ پہنے، چہرے پر سنجیدگی لیے مقدّم نے سوال کیا۔

''نہیں!''اُسکا جواب واضح تھا۔

''تو پھر میں کیوں ناراض ہوں گا؟''نرمی سے کہتے اُسکے سارے خدشے دور کیے۔ عمر نے سکھ کا سانس لیا۔

''تم مصروف ہو؟''اگلا سوال پوچھا۔

''فلحال تو نہیں۔۔۔''

''تو پھر چلو، تمہیں کہیں لیکر جانا ہے۔''مقدّم حیران ہوا۔

''اس وقت؟''گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔

''تم چلو بس۔۔۔''وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ مقدّم حیران ہوتا اُسکے پیچھے چل پڑا۔

''بتاتو دو کہ کہاں لے جا رہے ہو؟''گاڑی میں اُسکے برابر بیٹھتے سیٹ بیلٹ لگاتے ہوئے کہا۔

''اغوا نہیں کروں گا تمہیں۔۔۔''اُس نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ایسا بھی کیا ہے آخر؟''ٹھیک ٹھاک برا سا منہ بناتے ہوئے کہا کہ دیکھ لو میں اس فضول سے سرپرائز سے بیزار ہو رہا ہوں۔ مگر اُسے بھی فرق نہ پڑا، درحقیقت وہ لیلیٰ کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے کرے؟ بلآخر اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ کر، فلحال وہ اُسے وہاں لے جا رہا تھا جہاں اتنے دن سے خود جانا چاہتا تھا پر جا نہیں سکا۔

''میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا تھا۔''راستے میں یکدم ہی مقدّم نے وضاحت دی تھی۔

''میں نے کب کہا کہ تم کسی کی طرف داری کر رہے تھے؟''ڈرائیو کرتے عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا نا کہ ہم رضا کو ہر غلطی کا مارجن دیتے ہیں تو علی کو کیوں نہیں؟ بات علی یا رضا کی نہیں ہے۔ بات عورت کی ہے۔ اس معاشرے کے نوّے فیصد طلاق یافتہ مردوں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو لائق تحقیر سمجھتے ہیں۔ اُنہیں لگتا ہے کہ جس عورت کو اُنہوں نے چھوڑ دیا، یا جس عورت نے اُنہیں چھوڑ دیا، وہ اب عزت کے قابل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ اور مجھے بس اسی بات پر غصّہ آیا تھا۔ عورت تو اپنے سابقہ شوہر کو گالیاں نہیں دیتی، اُسکے دروازے پر جا کر تماشہ نہیں لگاتی۔ زیادہ سے زیادہ رو دھو لیتی ہے یا بد دعائیں دے لیتی ہے۔ لیکن مرد کی انا یہ گوارہ ہی نہیں کرتی کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو عزت کے ساتھ رہنے دے۔ وہ اگر محفل میں بھی اپنی سابقہ بیوی کا ذکر کرتا ہے تو حقارت سے۔''اُسکی بات درست تھی، عمر جواباً خاموش رہا۔

''تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں جو بات ایک بار کہہ دی، اُسکی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ جیسے میں کسی زمانے میں سوچتا تھا کہ اللہ نے مردوں کو کیوں کہا کہ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، تو پھر نہ اُنہیں زبردستی روکو، نہ اُنکا حق مہر دینے میں دیر کرو اور نہ ان پر کوئی ظلم کرو۔ میرے نزدیک تو یہ بالکل اوبویس (حتمی) بات تھی کہ جب طلاق دے دی تو اب کیوں اُس عورت کو تنگ کرنا؟ لیکن اللہ کو تو معلوم ہے۔۔۔۔ اُسے معلوم ہے کہ مرد کبھی بھی اُس عورت کو عزت نہیں دیگا، جسے وہ چھوڑ چکا ہے۔ اس لیے مسلمان مرد کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنی سابقہ بیویوں کے ساتھ برا سلوک نہ کریں۔ اور ویسے بھی جب ایک عورت کو طلاق دے دی، تو اب وہ نامحرم ہو چکی۔ اور کسی غیرت مند مرد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی غیر عورت کے بارے میں بات بھی کرے۔'' اُسکا ایک ایک لفظ دل میں اترا تھا۔

''تمہاری ہر بات سے اتفاق ہے لیکن۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟''

''لیکن علی ایسا نہیں ہے۔ میں اُسکے کسی عمل کی جسٹیفکیشن (وضاحت) نہیں دے رہا۔ جو بھی اُس نے کیا، یقیناً غلط کیا۔ لیکن وہ اتنا گھٹیا انسان بھی نہیں ہے۔ پچھلے دو سالوں میں اُس نے مجھے کبھی پتہ بھی نہیں چلنے دیا کہ اُسکی طلاق ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اُس واقعے کے بعد، میں اُس سے ملنے اُسکے گھر گیا، تب بھی اس نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ چاہتا تو دل کھول کر اپنی سابقہ بیوی کی برائی کر سکتا تھا، پر نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب رضا اُسے، اُسی بات کا حوالہ دے رہا تھا، وہ اُس وقت بھی اپنی سابقہ بیوی کے خلاف ٹھیک ٹھاک الفاظ استعمال کر کے اپنی پوزیشن کلیئر کر سکتا تھا۔ پر اُس نے اِن میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ اُس روز جو بھی ہوا، وہ اُس نے سابقہ شوہر ہونے کے ناطے نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ صرف ایک باپ تھا جسکا بچہ چھیننے کے لیے اُسکی ماں آئی تھی۔ اور بس۔۔۔ ہاں! لیکن میں مانتا ہوں کہ اُس نے جو کیا وہ اُسے ہر گز نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' عمر اپنے نظریے سے بات کر رہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا، اپنے پیاروں کی ہر غلطی کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا تھا۔

''اور میں رضا کی غلطی کو بھی صحیح نہیں کہہ رہا۔ اُسے بدلا لینا ہی تھا تو اپنے ماموں سے لیتا۔ اس طرح اُنکے گھر کی عورتوں کا تماشا محلّے میں لگانا اُسے بھی زیب نہیں دیتا۔'' اب کہ مقدّم نے رضا کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی۔

''پتہ نہیں ان دونوں کی شخصیات اتنی مسخ کیسے ہو گئی ہیں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دونوں اس طرح کا رویہ بھی رکھ سکتے ہیں۔'' وہ دونوں سے ہی نالاں نظر آ رہا تھا۔

''ہم سمجھائیں گے دونوں کو۔'' عمر نے اُمید سے کہا تو اس نے حیرت سے دیکھا۔

''ہم سمجھائیں گے؟''

''ہاں! ہم۔۔۔''اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تواُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ پتہ نہیں وہ اُسے کہاں لیکر جا رہا تھا؟

ڈرائیو کرتے اُس نے سگنل پر گاڑی روکی، تو برابر میں چنگچی رکشہ آرکا۔اُس میں ایک دن بھر کا تھکا ہارا مزدور اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا نظر آرہا تھا۔ چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ نرمی اور مسکراہٹ نمایاں تھی۔ مقدّم نے غور سے دیکھا تو برابر میں ایک عورت بیٹھی تھی، غالباً اُسکی بیوی، وہ مسکراتے ہوئے، ہاتھ ہلاتے اُسے یقیناً دن بھر کی روداد سنا رہی تھی۔اور وہ شخص محبت پاش نظروں سے بڑی محویت کے ساتھ اُسکی گفتگو سن رہا تھا۔ سگنل پر ہی ایک بچہ ہاتھوں میں گجرے لیے متلاشی نظروں سے اپنا مطلوبہ گاہک ڈھونڈھ رہا تھا۔ یکدم اُسکی نظریں چنگچی پر پڑیں، تو جلدی سے اُس تک آیا۔ پھر چند منٹ، اُس مزدور سے کوئی بات کرنے کے بعد، اُسے گجرے نکال کر دینے لگا۔اُس شخص نے اپنی جیب سے دن بھر کی کمائی نکالی، پھر مڑے تڑے نوٹوں کے درمیان سے ایک خستہ حال نوٹ بچے کی جانب بڑھایا اور اُس سے گجرے لیکر خاتون کو پہنا دیئے۔ سب کچھ تھا اس آدمی کے پاس، ساری دنیا کی دولت تھی اُسکی زندگی میں، سارے جہاں کی خوشی تھی اُسکے چہرے پر۔۔۔۔

اور مقدّم؟ دنیاوی اعتبار سے ایک پر کشش زندگی تھی اُسکی، پر کیا وہ اُسکے لیے پر کشش تھی؟ اُسکے پاس دولت نہ ہوتی، گاڑی نہ ہوتی، پہچان نہ ہوتی۔ بس لیلیٰ ہوتی۔۔۔۔

وہ بھی ایسے ہی کسی رکشے پر بیٹھا لیلیٰ کی ساری باتیں سنتا، اُسے گجرے خرید کر دیتا۔ لیکن اُسکے پاس سب تھا، نہیں تھی تو وہ ہی نہیں تھی، جسکے دم سے زندگی تھی۔

کوئی نئی دنیا کے نئے رنگوں میں خوش رہتا ہے

کوئی سب کچھ پا کے بھی یہ من ہی من کہتا ہے

کہنے کو ساتھ اپنے ایک دنیا چلتی ہے

پر چپکے اس دل میں تنہائی پلتی ہے

پتہ نہیں کون منچلا یہ گانا لگائے اُنکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا؟ مقدّم کی نس نس کی آواز تھی ان اشعار میں، سگنل کب کھلا؟ گاڑی کب چلی؟ اُسے معلوم نہیں ہوا۔ ذہن وہیں کہیں رہ گیا، اُس شخص کے چہرے پر چھائی سچی خوشی نے اُسے اُداس تو کیا تھا، پر دل سے وہ اُسکی دائمی خوشی کی دعا کر رہا تھا۔

''آ گئے ہم۔۔''گاڑی جھٹکے سے روکتے عمر نے کہا تو وہ خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ نظریں گھما کر آس پاس دیکھا تو کوئی پوش رہائشی علاقہ نظر آیا۔

''تمہیں یاد ہے؟ایک بار تم نے مجھے بتایا تھا کہ رضا اپنے ایک خواب کے لیے تنکا تنکا کر کے پیسے جمع کر رہا ہے۔''اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے عمر نے اُسے مخاطب کیا۔مقدّم کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا،اور پھر جیسے اُسے سب یاد آنے لگا،کچھ بھولی بسری سی باتیں،کچھ نوجوانی کے قصے،کچھ وقت کی گردش میں گم ہوئے یار۔۔۔چہرے پر اُداس سی مسکان آئی۔

''ہاں! یاد ہے۔''سر ہلاتے،مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو جاننا نہیں چاہو گے کہ اُس نے اپنا وہ خواب پورا کیا یا نہیں؟''عمر نے مسکراتے ہوئے اُسے حیران کیا۔

''یقیناً! جاننا چاہوں گا۔''

''وہ دیکھو! رضا کا خواب۔''اپنے سامنے نظر آتے،بوگین ویلا سے ڈھکے خوبصورت سے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟''اُس نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں! اُس نے اپنا خواب نہ صرف پورا کیا بلکہ بہت ذمے داری سے نبھا بھی رہا ہے۔''اُس کے لہجے میں عجیب سا فخر تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''میں ایک بار آیا تھا یہاں،رضا کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا،دور سے۔۔۔لیکن اُس سے ملے بنا چلا گیا۔پھر کل جب تم ناراض ہو کر چلے گئے تھے،تب میں نے اس بات کا ذکر حسین کے سامنے کیا،تو اس نے مجھے تفصیل سے رضا کے بارے میں بتایا۔''

''تم جب یہاں آئے تھے تو اُس سے ملے بنا کیوں چلے گئے؟''اُس نے پوچھا۔

''ہمت نہیں ہوئی۔۔۔''مختصر جواب دیا۔مقدّم نے ایک نظر اُس دروازے کو دیکھا،جسکی تختی پر بڑا بڑا سا پناہ گاہ لکھا نظر آ رہا تھا۔

''تو پھر آج ہمت کر لو۔''اُس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایسے کیسے چلے جائیں؟اگر وہ۔۔۔''عمر نے کچھ کہنا چاہا۔

''وہ کیا؟گھر سے تو نہیں نکال دیگا نا!''اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور گاڑی سے باہر آ گیا۔اب اُسکے قدم پناہ گاہ کی جانب تھے،عمر کو بھی ناچار اُسکے پیچھے آنا پڑا۔

---------+---------+--------

شیراز کسی ضروری کام میں مصروف تھا جب فیصل تیزی سے اُسکے پاس آیا۔

''کیا ہوا؟''اُسے حواس باختہ دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''سر نے جس آدمی پر نظر رکھنے کہا تھا، اُسکی جانب سے پیش رفت ہو رہی ہے۔''

''تو یہ بات نوید کو بتاؤنا!''شیراز بگڑا۔

''سر نوید فون نہیں اٹھا رہے، کیا کروں؟''وہ بھی جھلّایا۔

''ٹھہرو! میں کرتا ہوں۔''شیراز نے اپنے نمبر سے اُسے فون کیا۔

آفس سے تھوڑا دور گاڑی چلاتے نوید کا موبائل بجا۔اُس نے ڈیش بورڈ پر پڑے موبائل پر ایک نظر ڈالی، سکرین پر شیراز کالنگ کے الفاظ نمایاں تھے۔

''اب یہ کیوں فون کر رہا ہے؟''اُس نے کوفت سے سوچا۔گاڑی چلانے کے دوران وہ فون استعمال نہیں کرتا تھا۔اور شیراز کی کال آنے کا مطلب تھا کہ کوئی ضروری بات ہے۔

''پانچ منٹ کی دوری پر رہ گیا ہے آفس، اب میں پہنچ کر ہی بات کروں گا۔''اُس نے سوچا اور موبائل کو بجتا چھوڑ دیا۔

''اب کیا کریں؟''دوسری جانب اُسکے فون نہ اٹھانے پر فیصل شدید پریشان تھا۔

''تم ایک کام کرو، نفری تیار رکھو۔ہم نوید سر کا انتظار نہیں کر سکتے۔''اُس نے عجلت میں اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! تم تب تک سر کو تمام صورتحال، وائس نوٹ میں بتا دو۔''فیصل کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

''اُسکا رخ کس جانب ہے؟''شیراز نے پوچھا تو وہ رکا۔

''پناہ گاہ کی جانب جا رہا ہے وہ۔۔۔''جواب دیتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔جبکہ شیراز جلدی جلدی نوید کو وائس نوٹ بھیجنے لگا۔

---------+---------+--------

کچھ لمحے کو تو رضا کو واقعی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرنا ہے؟وہ ہرگز توقع نہیں کر رہا تھا کہ دروازے پر مقدّم اور عمر ہوں گے۔

''کیا ہم دروازے پر ہی کھڑے رہیں؟''مقدّم نے سادگی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں! آؤ۔۔اندر آؤ۔''ہڑ بڑا کر جلدی سے راستہ چھوڑا۔ عمر شرمندہ سا جبکہ مقدّم پوری ڈھٹائی سے اندر آیا تھا۔ حسین بھی اُسے دروازے پر جما دیکھ کر وہیں آرہا تھا لیکن ان دونوں کو دیکھ کر قدموں کو بریک لگا۔

''تم لوگوں کو میرے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا؟''دروازہ بند کر کے اُنکی جانب آیا۔

''مجھے تو عمر لایا ہے یہاں۔''سکون سے کہہ کر عمر کو ہکا بکا چھوڑ، خود وہ حسین کی طرف مصافحہ کرنے بڑھ گیا۔

''میں نے نوید سے لیا تھا۔''اُس نے گڑ بڑا کر وضاحت دی۔

''اور اُسکے پاس کہاں سے آیا؟''یہ سوال حسین نے کیا۔

''چھوڑو جہاں سے بھی آیا ہو۔''رضا نے بات ختم کی۔''سب خیریت ہے؟''اتنے سالوں بعد اُس طرح ملنے پر کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا پوچھے؟

''مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا ہے تو سوچا تمہیں مبارک باد دے دوں۔''بہت رسمی سے انداز میں کہا۔رضا مسکرا دیا۔

''مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم یہاں مل جاؤ گے''دوسری جانب مقدّم نے حسین کو آہستہ سے مخاطب کیا۔

''اُمید تو رضا کو بھی نہیں تھی، لیکن ایسا ہے کہ اسکے بچے اتنے پیارے پیارے ہیں کہ بار بار ملنے کا دل کرتا ہے۔''

''بچے تو سب کے پیارے ہی ہوتے ہیں۔''رضا نے درمیان میں کہا۔

''معذرت چاہتا ہوں تمہیں بنا بتائے اس طرح آ گیا۔''عمر سخت شرمندہ تھا۔

''کوئی بات نہیں، لوگ تو زبردستی بھی گھس جاتے ہیں۔''رضا نے حسین پر چوٹ کی، وہ ہنس دیا۔ عمر حیران ہوا، آج رضا کا رویہ پچھلی تمام دنوں کی نسبت حیران کن تھا۔

''میں بچوں سے ملواتا ہوں، تم لوگ بیٹھو۔''وہ کہہ کر قریب کھڑے لڑکے کی جانب مڑا''اسلم! جاؤ بچوں کو لیکر آؤ۔''اسلم سر ہلاتے اندر چلا گیا۔

''تم تو اس دن عمر سے ناراض ہو کر نہیں گئے تھے۔''حسین نے کافی رازداری سے مقدّم سے پوچھا۔

''اُس نے منا لیا۔''خاصی سنجیدگی سے مذاق کیا گیا تھا۔

''ویسے مجھے نوید کی حرکتیں کچھ مشکوک لگنے لگی ہیں۔ بھلا اُسکے پاس رضا کا ایڈریس کہاں سے آیا؟''اب کہ حسین نے کافی غیر متوقع بات کی تھی۔

''وہ ایف آئی اے آفیسر ہے۔''عمر نے تصیح کی۔

''اور۔۔۔ کیا کر رہے ہو تم آج کل؟''مقدّم نے رضا کو مخاطب کیا۔ جواباً رضا اُسے اپنے پیشے کے بارے میں بتانے لگا۔

''جزا آپی!''اسلم نے اندر آ کر اُسے مخاطب کیا۔

''ہاں! کہو۔۔۔''بچوں کو پڑھاتی جزا نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''رضا بھائی، بچوں کو باہر بلوا رہے ہیں۔ اُنکے دوست آئے ہیں کچھ۔۔۔''

''تم نے دوست کہا؟''پاس بیٹھی کسی کتاب کی ورق گردانی کرتی عائشہ جی نے حیرت سے سر اٹھا کر پوچھا۔

''بتایا تو یہی تھا اُنہوں نے۔''اُس نے کان سہلاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ رضا نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا، اُس نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ عائشہ جی کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اُنہوں نے رضا کی زبان سے کبھی کسی کے لیے دوست کا لفظ نہیں سنا تھا۔

''پھر تو اُنھیں انتظار نہیں کروانا چاہیے۔''اُنہوں نے جزا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے کتاب بند کی اور ایک نظر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لان میں رضا اپنے ہم عمر مزید تین مردوں کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔

''بچوں! آپ نے شور نہیں مچانا، اور بہت ادب کے ساتھ جا کر مہمانوں سے ملنا ہے۔ اُنکی خیریت دریافت کرنی ہے اور اُن پر ثابت کرنا ہے کہ آپ بہت اچھے میزبان ہیں۔''اُس نے بچوں کو سمجھایا اور پھر اچھے سے اُنہیں باری باری کر کے باہر بھیجنے لگی۔

رضا کو بچوں کو نئے لوگوں سے ملوانے کا بہت شوق تھا، وہ ہر آنے جانے والوں سے اُنکا تعارف کرواتا، کچھ دیر بچوں کو اُنکے پاس بیٹھا رہنے دیتا تاکہ وہ بھی میزبانی کے آداب سیکھیں اور خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھیں۔ ابھی بھی وہ بڑے شوق سے اُنہیں مقدّم اور عمر سے ملوا رہا تھا۔ مقدّم تو پنجوں کے بل ہی بیٹھ گیا، بچے بھی اُس سے مل کر خوش ہو رہے تھے۔

مسکراتے، معصوم چہرے اس بات سے انجان تھے کہ وہ دکھی دلوں پر پھوار بن کر برستے تھے۔ اُنکے غم اتنے بڑے تھے کہ اُسکے آگے اپنی ہر تکلیف ہیچ لگتی۔ رضا کا گھر، گھر نہیں زمین پر جنت تھا، اور اس جنت میں فرشتے بستے تھے۔

گاہے بگاہے رضا کی نظریں مقدّم کی طرف چلی جاتیں، اُس نے ابھی ہی تو جانا تھا کہ مقدّم لیلیٰ کو کھو چکا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنا دکھ کتنے آرام سے چھپا لیا تھا، آنکھوں میں پوشیدہ غم جھلکتا ضرور تھا لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

''یہ کون ہیں؟''آٹھ رمشا نے پر تجسس لہجے میں رضا سے پوچھا۔

''مہمان ہیں میرے۔۔۔''وہ دوست نہ کہہ سکا، عمر اُداسی سے مسکرا دیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا، بیل ایک بار پھر بجی تھی، پر اس بار جو بھی تھا وہ ہاتھ رکھ کے بھول گیا تھا۔ رضا سے پہلے عظیم دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اگلا شخص اُسے دھکا دیتے ہوئے اندر آیا تھا۔ عظیم گرتے گرتے بچا۔

''ارے۔۔۔'' رضا اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر آگے بڑھا لیکن آنے والے کو دیکھ کر اُسکے قدم تھمے۔

وہ ایک باوردی پولیس والا تھا، اُسکے پیچھے مزید اہلکار اور دو لیڈی کانسٹیبل اندر داخل ہوئی تھیں۔

''کون ہیں آپ لوگ؟ اور اندر کس سے پوچھ کر آرہے ہیں؟'' وہ پولیس اہلکار کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''آئے تو ہم پڑوس میں تھے لیکن مطلوبہ ملزمہ آپکے گھر میں موجود ہے۔ آپ اُسے ہمارے حوالے کر دیں، ہم چلے جائیں گے۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ یہاں کوئی ملزم نہیں ہے۔'' وہ سمجھا اُنہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

''ملزم نہیں ملزمہ'' پولیس والے نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''مس جزائے خیر۔۔۔ آپکے گھر میں موجود بچوں کی ٹیچر، اُنہیں ہی حراست میں لینے آئے ہیں ہم۔'' رضا کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔ باقی تینوں بھی کچھ حیران پریشان سے وہیں آئے تھے۔

''ایک منٹ! آپ ایسے کیسے کسی کو حراست میں لے سکتے ہیں؟ کوئی وجہ، کوئی جرم بتائیں اُسکا۔''

''پولیس والوں پر تشدد کرنا، اُنکی ویڈیو بنانا اور وائرل کر دینا۔ یہ جرم کیا ہے اُنہوں نے، آپ اُنہیں بلا رہے ہیں یا میں خود جاؤں۔'' وہ بدتمیزی سے کہتا آگے بڑھنے لگا۔

''ایک منٹ! اندر نہیں جا سکتے آپ۔'' اُس نے بازو سے پکڑ کر پولیس اہلکار کو پیچھے کیا۔

''دیکھیں! آپ ایک معزز انسان ہیں، میں نہیں چاہتا کہ آپکو بھی ساتھ ہی حراست میں لے لوں۔'' اُس نے اُسے تنبیہہ کی۔

''حد میں رہو اپنی۔۔۔ عظیم! جزا کو بلا کر لاؤ۔'' پہلے پولیس والے کو پھر عظیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اُسے بلا ضرور رہا ہوں، لیکن میری اجازت کے بنا تم میرے گھر سے کسی کو بھی نہیں لے جا سکتے۔'' اُس نے لہو رنگ ہوتی آنکھوں سے اُسے دھمکی دی۔

''دیکھیں رضا صاحب! ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔'' اُسی لمحے جزا وہاں آئی، عائشہ جی ساتھ تھیں۔

''کیا کام ہے مجھ سے؟'' بے خوف آنکھیں، بے جگری سے پوچھتے، ایک لمحے کو بھی لہجہ نہ کانپا تھا۔

''آپکو گرفتار کرنے آئے ہیں محترمہ۔۔۔'' جزا کو دیکھ کر اُسکے چہرے پر خباثت چھائی تھی۔ رضا غیر محسوس انداز میں اُسکے اور پولیس والے کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

''گرفتاری کے وارنٹ دکھاؤ۔'' اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے سکون سے کہا۔

''ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں، جو کہا ہے وہ کرو۔ گرفتار کرو اُسے۔۔۔'' اُس نے بدتمیزی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ رضا اُسکا منہ توڑ دیتا، جزا آگے بڑھی اور اگلے ہی لمحے زناٹے دار تھپڑ اہلکار کے منہ پر دے مارا۔

''حرام خور!۔۔۔ میرے باپ کے بارے میں تمیز سے بات کرو۔'' اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چبا چبا کہا تھا، اُسکے لبوں سے جھڑتے پھولوں نے وہاں کھڑے ہر شخص کو حیران کر دیا تھا۔ اہلکار کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی بدتمیزی کرتا عمر نے پولیس والے کو روکا۔

''آپ اس طرح بنا وارنٹ کسی کے گھر میں نہیں گھس سکتے۔۔۔''

''بہت ہو گیا، منہ کیا دیکھ رہے ہو گرفتار کرو اسے۔'' اُس نے اپنے دیگر اہلکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جزا تو ٹس سے مس نہ ہوئی لیکن رضا نے پورا ارادہ کیا ہوا تھا کہ آج ایک آدھ کی ہڈیاں تو توڑ دے گا، لیکن جزا کے قریب بھی نہیں آنے دیگا اُنہیں، پر مسئلہ یہ تھا کہ جزا کی طرف لیڈی کانسٹیبل بڑھی تھیں۔ اُس کو بالکل سمجھ نہیں آئی کہ اب کیا کرے؟

''رکو۔۔۔'' اُسی لمحے کھلے دروازے سے کوئی دھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ وہاں کھڑے ہر شخص کی نظریں میکانکی انداز میں دروازے سے اندر داخل ہوتے وجود پر پڑی تھیں۔

سیاہ جینز پر، سیاہ شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ جیکٹ ڈالے نوید، آنکھوں میں خون لیے اُس اہلکار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُسکے پیچھے فیصل اور شیراز مختصر سی نفری کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ نفری دروازے پر ہی رک گئی۔ محلے میں بھی ٹھیک ٹھاک تماشا لگ چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

وہ قدم قدم اٹھاتے اہلکار کے پاس آ رکا۔

''سلام صاحب!۔۔۔'' اُس نے گھبرا کر سلام جھاڑا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟'' آواز آہستہ، آنکھیں لہو رنگ، لہجہ خطرناک حد تک سرد۔۔۔ جسم میں لہو جماتا ہوا، رگوں میں سنسنی سی دوڑاتا ہوا۔

''صاحب! اس خاتون کو گرفتار کرنے کا حکم ہے، وہی کرنے آئے ہیں۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''وارنٹ ہے تمہارے پاس؟''اُسی لہجے میں پوچھا۔سب اُسے ہی دیکھ رہے تھے اور وہ اہلکار کو۔۔۔

''صاحب!اس خاتون نے پولیس والے پر تشدد اور۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''وارنٹ ہے یا نہیں؟''اُسکی بات کاٹتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔لہجہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا،عائشہ جی نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا،بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔ اور ان سب میں اگر جو رضا اپنے پیچھے کھڑی جزا کا چہرہ دیکھ لیتا،تو اس پر یقیناً کوئی نیا انکشاف ہوتا۔وہ لڑکی جو خود کو گرفتار کرنے آئی ہوئی پولیس کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی،نوید کو سامنے دیکھ کر اُسکا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑا تھا،آنکھیں خوف سے ایسی ہو گئی تھیں،جیسے سارا خون خشک ہو گیا ہو۔

''صاحب!مجھے تو اوپر سے حکم۔۔۔''وہ منمنا رہا تھا۔

''ہاں یا نہیں؟''وہ چیخا نہیں تھا۔حلق کے بل دھاڑا تھا۔اُسکی دھاڑ تھی یا اُسکے چہرے پر چھائی سختی،وہاں سب کو سانپ سونگھا گیا۔

''نہیں۔۔۔''اگلے ہی لمحے نوید نے بائیں ہاتھ کا تھپڑ،اِس شدت سے اُسکے منہ پر رسید کیا کہ وہ لڑکھڑاتے ہوئے نیچے گرا اور اُسکا سر پاس رکھے گملے سے جا ٹکرایا۔اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا شیراز نے گریبان سے پکڑ کر اُسے نوید کے سامنے دوبارہ کھڑا کر دیا۔ماتھے سے بہتے خون نے اُسکا چہرہ لال کر دیا تھا۔رضا نے پریشانی سے لان میں کھڑے بچوں کو دیکھا تھا۔وہ اس لمحے اُنہیں اندر بھی نہیں بھیج پا رہا تھا۔البتہ بڑے بچے غیر محسوس انداز میں چھوٹے بچوں کے سامنے آ کر کھڑے ہونے لگے تھے۔

''وارنٹ نہیں تھے تو کس کی اجازت سے یہاں آئے؟''نوید کا لہجہ ایک بار پھر سرد ہوا۔آنکھوں میں اترا خون ہی مقابل کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔

''مجھے حکم دیا گیا تھا کہ مس جزا کو کانسٹیبل فضل کے سامنے حاضر کروں۔''اتنی ہی شدت کا دوسرا تھپڑ پھر اُسکے منہ پر پڑا،ایک بار پھر وہ گملے پر گرا اور ایک مرتبہ پھر شیراز نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا تھا۔

''وہ ہے کون ایسے حکم نافذ کرنے والا؟''نوید نفرت سے پھنکارا۔

''صاحب معاف کر دیں،میں تو غلام ہوں۔''ایک اور تھپڑ اُسکے منہ پر رسید کیا تو اب کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

''اٹھاؤ اسے اور گاڑی میں ڈالو۔''نفری کو حکم دیتے اُس نے شعلہ بار نظروں سے،براہ راست جزا کو دیکھا تھا۔جس کے ہاتھ لمحے بھر کو کانپے تھے۔

''تم گھر آؤ فوراً۔۔۔''لہجے کو حتی الامکان آہستہ رکھتے،چبا چبا کے اُسے حکم دیتا وہ وہاں کھڑے دوسرے کانسٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔اس حکم پر رضا نے شدید حیرت سے جزا کو دیکھا تھا،آنکھوں میں سوال واضح تھا۔نوید کون ہے؟

''سر! رضا صاحب کا، اور خاتون کا بیان لینا ہو گا۔'' کانسٹیبل نے بہت زیادہ محتاط انداز میں اُس سے پوچھا۔

''رضا کا بیان یہیں لے لو، جزا کی طرف سے میں بیان دوں گا۔'' اُس نے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''سر! اسٹیشن بھی تو کسی کو آنا۔۔۔''

''جتنا کہا ہے اتنا کرو، اسٹیشن میں خود جاؤں گا۔'' اُسکی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا، کانسٹیبل نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جزا نے ایک نظر سوال کرتی رضا کی حیران آنکھوں میں دیکھا، پھر کانسٹیبل سے بات کرتے نوید کو۔۔۔ اگلے ہی لمحے رضا کو دوبارہ دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

''میرا بھائی۔۔۔'' یہ جواب نہیں تھا، ڈیڑھ سو کلو کا بم تھا، جو اُس نے رضا کے سر پر بڑی شان سے پھوڑا تھا۔

''تم سب کے سب مجھے علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ملو، ایک بھی کم نہیں ہونا چاہیے۔۔۔'' اُس نے اہلکار کے ساتھ آئی نفری کو حکم دیا اور دوبارہ جزا کی طرف رخ کیا۔

''تمہیں کچھ کہا ہے میں نے۔۔۔'' اُسے ٹس سے مس ہوتا نہ دیکھ، اس بار وہ اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

''جی بھائی!۔۔۔'' اُسکے لہجے سے خائف ہوتی وہ بنا اپنا سامان لیے ہی، سیدھا گھر کی طرف بھاگی تھی۔ نوید کسی پر بھی نگاہِ غلط ڈالے بنا باہر نکلا، باہر آیا تو وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول رہی تھی۔

''میں اسٹیشن سے واپس یہیں آؤں گا، پھر بات کرتا ہوں تم سے۔۔۔'' چبا چبا کر کہتے وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

''آپکو جو تکلیف اٹھانی پڑی اُسکے لیے معذرت چاہتے ہیں، بس یہاں جو ہوا اُس بارے میں بتا دیجیے۔ مزید آپکو تنگ نہیں کیا جائیگا۔'' دوسری طرف شیراز، رضا سے معذرت کر رہا تھا، جبکہ اسکو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

زندگی نے آج کل انکشافات اور دھچکوں کا چولا اوڑھ لیا تھا۔

---------+---------+--------

''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اُس کانسٹیبل فضل کی طرف سے کوئی بھی پیش رفت ہو تو مجھے اطلاع دینا؟'' وہ پولیس اسٹیشن کے راستے پر تھے۔ جب نوید نے اپنے برابر بیٹھے فیصل سے پوچھا۔

''سر! جزا صاحبہ نے اُسے تھپڑ مار دیا تھا تو مجھے لگا بات ختم۔۔۔''

''کس قسم کی بھونڈی وضاحت ہے یہ؟''اُس نے جھاڑا۔

''تمہارا کام فضل کی حرکتوں کی اطلاع مجھے دینا تھا اور تم نے کیا کیا؟''اُسکو شدید غصّہ چڑھا ہوا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔''اُس نے غلطی تسلیم کی۔

''تمہاری معذرت کا کیا کروں میں؟ حد ہوتی ہے نااہلی کی۔۔۔''اب کہ فیصل خاموش رہا۔اُسکا غصّہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔گاڑی پولیس اسٹیشن پر رکی تو اس نے خود کو نارمل کرنا چاہا لیکن غصّے کا پیمانہ مزید بڑھ گیا۔

جس وقت اُس نے زخمی اہلکار اور اُسکے ساتھیوں کو لے جا کر، کانسٹیبل فضل کے سامنے پٹخا تھا، اُس وقت وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر اٹھا تو سامنے کھڑے نوید کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

''سلام سر!۔۔۔''

''کس کے گھر بھیجا تھا اسے؟''بنا کسی تمہید کے، زمین پر زخمی پڑے اہلکار کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔

''اسے تو میں نے۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

''جواب دو۔۔۔''نوید دھاڑا تو وہ دہل کر سیدھا ہوا۔

''سر! میں نے اسے محترمہ جزائے خیر کے گھر۔۔۔''

''میرے گھر بھیجا تھا تم نے اسے۔''حلق کے بل چیختے وہ اُسکے اوسان خطا کر گیا۔کانسٹیبل کو اُسکی بات سمجھنے میں دیر لگی تھی۔بھلا اس نے کب نوید کے گھر نفری بھیجی؟ اتنی جرات تو وہ خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی، میں نے تو اسے۔۔''

''جزا عالم، میری۔۔۔یعنی نوید عالم کی بہن ہے۔''اُسکی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔اب فضل کو اپنی موت سامنے کھڑی نظر آئی تھی۔

''میں۔۔۔میں نہیں۔۔۔غلطی ہو گئی سر!''خوف سے الفاظ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔

''گرفتار کرنے گئے تھے نہ اُسے، پھر ایف آئی آر بھی درج کی ہو گی۔ذرا دکھاؤ مجھے کہاں ہے؟''اُسکے اور کانسٹیبل کے درمیان میز تھی، وہ ایک قدم آگے بڑھ کر میز کے قریب آیا اور اُسکی طرف جھکتے ہوئے مزید سرد انداز میں پوچھا۔

''سر! میں آپ سے کہہ رہا ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی۔''

''ایف آئی آر کہاں ہے؟''ایک بار پھر اُسکی دھاڑنے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔

''معاف کر دیں سر!''وہ منمنایا تھا اور اگلے ہی لمحے نوید نے اُسے گریبان سے پکڑ کر، بنا اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے، اپنی طرف کھینچا۔اس طرح کے اُسکا آدھا دھڑ میز پر تھا اور آدھا نوید کے سامنے، دوسرے ہاتھ سے نوید نے اُسکا جبڑا جکڑا۔

''میرے گھر، میری ہی بہن کو گرفتار کرنے کیلئے، نفری بھیجنے کی جرات کیسے کی تم نے؟ وہ بھی اس لیے کہ تم حرام خوروں کو اُسکی اوقات یاد دلادی تھی اُس نے؟''فضل کو لگا کہ اُسکا جبڑا ٹوٹ جائیگا آج۔۔۔

''وردی پہن کر تم قانون کی حفاظت کرنے کے بجائے اُسکی دھجیاں اڑاتے ہو؟ ہاں؟''انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے جبڑا مزید دبایا تو اُسکے منہ سے خون نکل پڑا۔

''مم۔۔۔معاف کر دیں۔''اُسکی زبان سے اور کوئی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

''تم اور تمہارے وہ بیغیرت دوست اپنی نوکری سے تو برخاست ہوں گے ہی، لیکن جو کیا ہے اُسکی قیمت ادا کیے بنا تمہاری لاش بھی نہیں جائیگی یہاں سے۔''جھٹکے سے اُسے چھوڑا تو وہ منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔

''میری والدہ کے گھر کے باہر سیکیورٹی کا انتظام کرو، میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔۔۔اور میرے آنے تک اسکا اور اسکے ساتھیوں کا حساب ہو جانا چاہیے۔''شیراز کو حکم دیتا وہ فیصل کی جانب مڑا

''یہ اسٹیشن کس کے زیرِ نگرانی آتا ہے؟ فوراً معلوم کرو۔اور پھر میری بات کراؤ اُس نالائق سے۔۔۔''فیصل کو بھی حکم دیتا وہ وہاں رکا نہیں تھا۔

اختلاف اپنی جگہ، لیکن اپنی بہن پر نظر اٹھانے والوں کی آنکھیں نکال سکتا تھا وہ۔۔۔

''تم نے آخر مجھے کیوں نہیں بتایا جزا! میں انتظار کرتا رہا لیکن تم نے مجھے نہیں بتایا۔''گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اُسکا دماغ اسی جگہ اٹکا تھا کہ جزا نے اس سے یہ سب کیوں چھپایا؟ اب اس سے حساب کا وقت آ گیا تھا۔

---------+---------+--------

''کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ نوید کی بہن ہے؟''

''میرے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا۔''

''اب کیا کرو گے ؟''

''میری غلطی ہے،اُس نے مجھے بتایا تھا کہ پولیس والے تنگ کر رہے ہیں اُسے، میں پہلے کوئی اقدام لے لیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔''

''لیکن کیا تب بھی نوید کو معلوم نہیں ہوتا؟''سوال معقول تھا۔ عمر اور مقدّم جا چکے تھے، بچوں کو بھی ڈھیروں تسلی دینے کے بعد اب وہ حسین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ حسین نہیں گیا تھا۔

''اُسے یقیناً سب معلوم ہوتا اور اب بھی سب معلوم ہو گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جزا کو اس محلے میں آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں نے نوید کو کبھی یہاں آتا نہیں دیکھا۔''رضا کا دماغ اب تک ماؤف تھا۔

''مصروف ہوتا ہو گا۔''

''ماں رہتی ہے اُسکی یہاں۔''بھلا ماں سے ملنے کوئی کیوں نہیں آئیگا؟

''خیر ! تم پریشان نہ ہو، اب تک تو نوید پورا پولیس اسٹیشن اُنکے سروں پر گرا کر آ چکا ہو گا۔''حسین نے ہلکے پھلکے انداز میں تسلی دی۔

''میں نے تو تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اس حد تک خوفناک تشدد کر سکتا کسی پر۔''رضا کے لہجے میں بے یقینی تھی، ذہن میں خوش اخلاق سے، ہر دم مسکرانے والے نوید کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

''کسی پر نہیں، ایک باوردی مجرم پر۔''حسین نے تصحیح کی۔

''ہاں ! لیکن۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔''اُس نے آرام سے کہا تو رضا نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میں اور تم جس نوید کو جانتے تھے، وہ ایک اسٹوڈنٹ تھا، ایک نوجوان لڑکا اور ابھی جسے تم دیکھ رہے ہو، یہ اُسکا پیشہ ہے۔ میں نے اور تم نے تو اُسے آج دیکھا ہے، نہ معلوم اپنی سروس کے اتنے سالوں میں کتنے مجرمین کو ایسے تشدد کا نشانہ بنایا ہو گا اُس نے ؟ اُسکا غصّہ مجرم پر تھا اس لیے تم چل (chill) کرو۔۔۔'' اُسے تسلی دے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''جزا پر بھی غصّہ تھا وہ۔۔۔''بڑبڑاتے ہوئے کہا تو حسین نے بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو لبوں پر ہی روکا، تو اُسکی پریشانی کی وجہ یہ تھی۔

''اُسکی بہن ہے، جیسے بھی بات کرے۔ تمہیں کیا؟''چہرے پر سنجیدگی طاری کیے سوال کیا۔

''میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا''ہاں واقعی ! اُسے کیا؟

''خون خرابہ دیکھ کر بچے پریشان ہو گئے ہیں۔'' رضا نے بات بدلی۔

''تمہیں اس وقت بچوں کے پاس ہونا چاہیے۔ میں بھی چلتا ہوں بس۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے کی نسبت آج اُس نے کافی لمبا وقت رضا کے ساتھ گزارا تھا۔ اُس نے بھی اُٹھ کر مصافحہ کیا اور دروازے تک اُسکے ساتھ آیا۔

''تم آرام کرو اب، زندگی میں ویسے ہی آجکل بہت کچھ ہو رہا ہے۔'' حسین نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اب تو سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت گم ہونے لگی ہیں۔'' رضا نے تائید کی۔

''ویسے تم نے بتایا نہیں۔۔۔'' مرکزی دروازے پر یکدم ہی رک کر وہ رضا کی جانب مڑا۔

''کیا؟'' وہ حیران ہوا۔

''کونسی بہار آئی ہے تمہاری زندگی میں؟'' غلطی ہو گئی تھی رضا سے۔۔۔ اب اُسکے پیٹ میں آخر تک مروڑ اٹھتے رہنے تھے۔

''میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔'' چبا چبا کر کہا۔

''مجھے یقین نہیں ہے۔'' حسین نے آہستہ سے کہا۔

''میرے خیال سے تمہیں اب جانا چاہیے۔'' حسین ہنستا ہوا پیچھے ہوا۔

''اگلی بار پوچھوں گا تم سے۔۔۔'' وہ کیوں باز آتا؟ وہ تو حسین تھا۔

رضا بس اُسے گھور کر رہ گیا۔۔۔

---------+---------+--------

سارا دن مصروف رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو تکلیف دہ باتیں یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ سارا دن کام کر کے جب علی گھر پہنچا تو اس حد تک تھک چکا تھا کہ بس نہا کر سونا چاہتا تھا۔ البتہ شدید بھوک نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ باورچی خانے میں رکھے فریج میں جھانکا، ملازم نے کھانا گرم کر کے میز پر پہلے ہی لگا دیا تھا، وہ پینے کے لیے کوئی سوفٹ ڈرنک ڈھونڈ رہا تھا۔ سوفٹ ڈرنک تو نہ ملی، پر کولار کھا نظر آیا۔ کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، تو اُسے ہی باہر نکال کے گلاس میں ڈالنے لگا۔

''یہ نہیں پینی چاہیے، گندی ہوتی ہے۔'' بڑی سمجھداری سے کہتی ہوئی بچکانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو ایک پل کو دماغ کام نہ کیا۔ پر جب میز کے ساتھ ہی رکھی کرسی پر بیٹھی بچی کو دیکھا تو ذہن میں جھماکا ہوا، صبح والا واقع پوری جزئیات کے ساتھ نظروں کے سامنے آ گیا۔ علی کا سارا حلق کڑوا ہو گیا۔ وہ جانے

کب سے وہاں بیٹھی تھی؟اُسے کیوں نظر نہ آئی یا اُسکے دماغ میں سرے سے اُسکی موجودگی کا تصوّر ہی نہ تھا؟ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ بھوک نہ لگی ہوتی تو بیٹھتا بھی نہ یہاں۔وہ کرسی سے اتر کر اُسکے قریب آئی، پھر اُسکی کرسی کے ہینڈل پر ننھے ننھے ہاتھ ٹکائے۔پلیٹ میں حرکت کرتی علی کی انگلیاں تھمیں۔اتنی چنی سی تو تھی وہ، آدھی کرسی جتنا قد تھا اُسکا، چہرہ اٹھا کر علی کو دیکھ کم اور اُس پر غور و خوص زیادہ کر رہی تھی۔اُسکی موجودگی سے وہ ٹھیک ٹھاک خائف ہوا۔

''یہ گندی ہوتی ہے۔''ایک بار پھر اُسے بتایا کہ وہ اپنا کتنا نقصان کر رہا ہے؟ علی نے جھک کر اُسے سختی سے دیکھا،یقین تھا کہ وہ ڈر جائے گی اور دوبارہ اُسے مخاطب نہیں کرے گی لیکن۔۔۔

''آپ اتنے ڈراؤنے کیوں لگتے ہیں؟''آنکھیں پٹپٹا کر سوال کیا تو اُس نے ضبط کا گھونٹ بھرا۔

''آپ بچوں سے بات نہیں کرتے کیا؟''اُسکی مسلسل خاموشی سے یہی نتیجہ اخذ کیا، وہ اب بھی چپ رہا تو وہ بیزار ہو کر دوبارہ کرسی پر اچھل کر جا بیٹھی۔کمر تک آتے بال، ماتھے پر بینگز کی صورت میں کٹے ہوئے تھے،اُسکی عمر کے حساب اُسکے بال کافی لمبے تھے۔نیلے رنگ کے چھوٹے بازو والے فراک میں پیر جھلاتی وہ علی کو گھورنے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھی۔اُسکی مسلسل گھورتی نظروں سے خائف ہوتے، بڑی مشکلوں سے کھانا ختم کیا۔پھر پلیٹ سینک میں ڈالتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا۔

''یہ یہاں کر کیا رہی ہے؟اور ابّا کہاں ہیں؟''ذہن میں خیال کوندا تو قدم رکے، پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔اتنا بے ضمیر تو وہ نہیں تھا، ناچار اُسکے پاس واپس آیا۔

''بات سنو!''اُسے مخاطب کیا۔اُس نے جواب نہیں دیا۔

''تم سے بات کر رہا ہوں بچی!''اُسکا کندھا ہلایا۔تو بچی نے نظریں اٹھا کر سخت ناراضگی سے اُسے دیکھا۔پھر کرسی پر ہی کھڑی ہوئی، کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے اور بھنویں چڑھا کر اُسے دیکھا۔

''میرا نام نشمیہ ہے۔''برائے مہربانی اسی نام سے پُکارا جائے اُسے۔۔۔

''جو بھی نام ہے تمہارا، یہاں کیوں بیٹھی ہو تم؟اور ابّا کیوں نہیں ہیں تمہارے ساتھ؟''بالکل اُسی کے انداز میں بھنویں چڑھائے پوچھا۔اور ایسا اُس نے عادتاً کیا تھا، جان کر نہیں۔۔۔

''ابّا کیا ہوتا ہے؟''اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ابّا یعنی بابا، مطلب باپ۔۔''اُس نے سمجھانا چاہا۔

''اوہ۔۔۔''اُس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ شکر اُسکی سمجھ آئی۔

''تو مجھے بتاؤ میرے ابّا کہاں ہیں؟''

''آپکے ابّا؟ وہ کون ہیں؟''علی نے خود کو کوسا، بھلا چار سال کی بچی کو رشتوں کا کیا پتہ؟

''چھوڑو ان سب باتوں کو، تم کیا کر رہی ہو یہاں بیٹھ کر؟''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''وہ دھپ سے کرسی پر واپس بیٹھی۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا؟''وہ حیران ہوا۔

''صبح کھایا تھا۔''مختصر جواب دیا تو اُس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بچی صبح سے بھوکی بیٹھی تھی، اور سفیر صاحب بھلا کہاں تھے آخر؟

''اچھا ٹھہرو! میں تمہیں کھانا نکال دیتا ہوں۔''وہ فریج کی طرف بڑھا۔

''اور پانی بھی۔۔۔''اُس نے حکم صادر کیا تو اُس نے بس سر ہلا دیا۔

''بھلا یہ کتنا کھاتی ہو گی؟''پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے سوچا۔ پھر ایک اندازے سے تھوڑا سا کھانا نکال کر اُسکے سامنے رکھا۔

''یہ لو، ختم کرو جلدی۔''پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''کھاؤ!''اُس نے ایک نظر پلیٹ کو دیکھا پھر دوبارہ علی کو، پر بولی کچھ نہیں۔

''اب کھا کیوں نہیں رہی؟''اُس نے کوفت سے پوچھا۔

''مجھے خود سے کھانا نہیں آتا۔''منہ بسورتے ہوئے مسئلہ بیان کیا۔

''اس میں کیا مشکل ہے؟ چمچ سے اٹھاؤ اور منہ میں ڈال لو۔''اُس نے حل پیش کیا۔

''مجھے نہیں آتا نا!''غصّے اور اُکتاہٹ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا گیا۔

''تو میں کیا کروں پھر؟''وہ بھی جھنجھلا گیا۔

''آپ کھلا دیں۔''تجویز تھی، حکم یا مشورہ؟

''میں کیوں کھلاؤں؟''اس فرمائش پر تو وہ حیران ہی رہ گیا۔

''کیونکہ مجھے کھانا نہیں آتا۔''ایک ہی بات بار بار بتانی پڑ رہی تھی اس آدمی کو۔۔۔

''اف۔۔''علی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟اُس نے کبھی احمد کو اپنے ہاتھ سے نہیں کھلایا تھا۔

''تم کوشش کرو ورنہ بھوکی ہی رہو۔''چڑ کر کہا تو پہلے نشمیہ نے اُسے حیرت سے دیکھا،اور پھر سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو نمودار ہونا شروع ہوئے۔

''یااللہ!اب رونا مت بالکل،ہرگز نہیں پسند مجھے رونا۔''اُس نے اُسے ڈانٹنا چاہا۔اُسکے آنسو دیکھ کر چڑ ہوئی تھی۔مگر جواباً اُس نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے آخر؟چپ کر جاؤ پلیز۔۔''وہ گڑبڑا گیا،پر وہ چپ نہ ہوئی تو وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''اچھا!ٹھیک ہے،میں کھلا دیتا ہوں تمہیں،پر تم رونا بند کرو۔''ہار مانتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔۔۔''تمام آنسو ایک لمحے میں غائب ہو گئے۔وہ حیران ہی رہ گیا،دیکھو تو ذرا اس ڈیڑھ فٹ کی فنکارہ کو۔۔۔

اب وہ چیچ کے ذریعے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اُسکے منہ میں ڈال رہا تھا۔کبھی وہ اُسے نوالہ چھوٹا کرنے کو کہتی،کبھی کرسی پر کھڑی ہو جاتی،تو کبھی کوئی بات یاد آنے پر دوبارہ سے دھپ کر کے بیٹھتی اُسکا دماغ کھاتی،اُسے ٹھیک ٹھاک بیزار کر رہی تھی۔اُسکی اس اچھل کود سے تنگ علی،ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا دل ہی دل میں خود کو ایک ہی بات یاد کروا رہا تھا۔

''بس کل تک کی بات ہے۔۔۔کل تک کی۔''خود کو تسلی دیتے اُس نے گلاس میں پانی نکالا۔

''اتنا سارا۔۔۔''وہ چیخ اٹھی تو گلاس میں پانی انڈیلتے اُس نے رک کر اُسے دیکھا۔

''میں تھوڑا سا پانی پیتی ہوں۔''انگلی سے تھوڑے سے پانی کی مقدار بتاتے ہوئے کہا۔علی نے لب بھینچتے ہوئے پانی جگ میں واپس ڈالا اور واقعی تھوڑا سا پانی گلاس میں چھوڑ کر اُسکی جانب بڑھا دیا۔

''ہاں!اتنا۔۔''گلاس منہ سے لگایا،آدھا پانی پیا،آدھا کپڑوں پر گرایا۔

''اب ان گیلے کپڑوں میں جا کر سوؤ گی؟''اُس نے ناگواری سے پوچھا۔

''نہیں!''نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''کپڑے بھی بدلنے آتے ہیں یا نہیں؟''

''آتے ہیں۔''زور وشور سے سر ہلایا۔

''جلدی جلدی ختم کرواسے۔''عجلت میں کہتے وہ پھر سے نوالے بنا کر اُسے دینے لگا۔آدھ کھلے دروازے کی دراڑ سے جھانکتے، یہ منظر دیکھتے سفیر صاحب حیرت زدہ سے تھے۔

---------+---------+--------

''خود کو اتنا عقلمند سمجھنے کا نتیجہ دیکھا تم نے؟''کمر پر ہاتھ باندھے وہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہا تھا۔قریب ہی جزا سر جھکائے کھڑی تھی، چہرے پر ذرا بھی شرمندگی نہ تھی اور اُسکی ماں کچھ حیران اور کچھ پریشان سی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

''تم مجھے بتا سکتی تھی، بھائی کو بتا سکتی تھی۔لیکن تم نے اپنی ناقص عقل کو استعمال کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔آخر کب ہم دونوں تمہاری طرف سے بے فکر ہونگے؟ہمیشہ یہی فکر رہتی ہے کہ تم کہیں کوئی تماشہ نہ لگادو۔''لب بھینچے کھڑی جزا اب بھی خاموش تھی۔

''بیٹا! تم معاف کردو اسے، پروحید کو نہ بتانا۔وہ بہت ناراض ہوگا۔''نوید نے اچھنبے سے اُنہیں دیکھا، اُسکی ماں کو اب بھی بیٹے کی ہی فکر تھی۔بیٹی کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ رونما ہو جاتا، انکو پرواہ ہی نہ تھی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ بھائی کو معلوم نہیں ہوگا؟میں اُن سے اپنے بارے میں کچھ نہیں چھپا پاتا یہ کیسے چھپاؤں گا؟''

''مگر بیٹا۔۔۔''اُنہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

''مگر کیا امی؟آپکو اس پر نظر رکھنی چاہیے، یہ کیا کرتی ہے؟کہاں جاتی ہے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے آپ کو۔آپ اسکی طرف سے اتنی لاپرواہی کیسے برت سکتی ہیں؟''

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں نے سچ میں کوئی جرم کر دیا ہو۔دو مرد مجھے چھیڑ رہے تھے تو کیا اس میں میری غلطی ہے؟''اُس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''دو مرد تمہیں چھیڑ رہے تھے تو کیا تمہارے گھر کے مرد مر گئے تھے؟''وہ چیخا۔

''ہاں! مر گئے تھے۔''وہ اُس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخی تھی۔

''جزا!۔۔''اُسکی ماں نے دہل کر اُسے دیکھا۔

''میرے گھر کے مرد مر گئے تھے۔اسی دن جس دن اپنی اپنی زندگیاں گزارنے کے لیے، مجھے اور میری ماں کو اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ جس دن باپ کے مرتے ہی اپنا اپنا حصہ لیکر الگ ہو گئے تھے۔ مر گئے تھے اُس دِن جب میری ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔''نوید نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔اب وہ بے خوفی سے اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

''میں تم سے کسی قسم کی کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا جزا!''وہ اُسکے سامنے سے ہٹا۔اور اپنی ماں کے پاس آیا۔

''آج سے یہ کسی غیر ضروری کام سے باہر نہیں جائیگی۔''جزا کے تو سر پر لگی تلوؤں پر جا بجھی۔

''کیا بکواس کر رہے ہیں؟میں گھر میں بند۔۔''

''خاموش رہو!''اُسکی بات کاٹتے ہوئے وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ وہ ایک لمحے کو سہم گئی۔

''تمہیں ہر بار ہم نے چھوڑا ہے، لیکن اس بار نہیں۔۔۔ کبھی تم کسی کا سر پھاڑ آتی ہو، کبھی بلاوجہ محلّے میں کسی سے الجھ پڑتی ہو۔ میں تمہارے روز روز کے تماشوں سے تنگ آچکا ہوں۔اس بار تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔''اُسکو ڈانٹا ہوا وہ اپنی ماں کی طرف مڑا۔

''امی!گھر کے کاموں کے لیے میں ملازم بھجوادوں گا، باہر سیکیورٹی گارڈ کھڑے ہیں اُن میں سے ایک جزا کو اسکول چھوڑنے اور گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیگا۔اگلی بار اگر مجھے ایسی کوئی بھی شکایت ملی تو نہ صرف بھائی کو اطلاع دوں گا، بلکہ اس کی نوکری بھی چھڑوا کر گھر بٹھادوں گا۔''وہ جانتا تھا یہ دھمکی کتنی کارآمد ہے۔

''واہ واہ!زمانے کے ڈر سے اپنی عورتوں کو چھپالو،اُن سے جینے کا حق چھین لو۔ مگر جو مجرم ہے اُسے آزاد چھوڑ دو۔اور پھر خود کو مرد کہو۔''استہزائیہ انداز میں کہتے اُس نے زہر اگلا تھا۔نوید کی کنپٹی کی رگ اُبھر کر معدوم ہوئی، چہرے پر موجود زخم کا نشان ایک لمحے کو واضح ہوا اور پھر چھپ گیا۔وہ قدم قدم چلتا اُسکے قریب آیا۔

''تم پر یہ پابندیاں اس لیے نہیں لگائی کہ تم مجرم ہو۔ تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم نے ہمیں بے خبر رکھا۔اور یہ غلطی تم جب جب کرو گی،تب تب میں تمہیں اس سے کڑی سزا دوں گا۔ یہاں تک کہ تم یہ سیکھ لو کہ ہر کام جذبات سے نہیں بلکہ کچھ حکمت سے بھی کیے جاتے ہیں۔''اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔اس وقت وہ کتنی مشکلوں سے خود پر قابو کیے ہوئے تھا، یہ وہ ہی جانتا تھا۔ورنہ تو اُسکا خون کھول رہا تھا۔

''تمہیں احساس ہی نہیں ہے کہ تمہاری بیوقوفی کا خمیازہ ایک شریف گھرانے نے بھگتنا ہے۔''اس بات پر اُس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''پولیس تمہاری وجہ سے آئی، لیکن کس کے گھر؟رضاالٰہی کے گھر۔پورے محلے کو یہ معلوم ہے کہ پولیس رضا کے گھر آئی ہے۔لوگ اُس سے سوال کریں گے تم سے نہیں۔''

''لیکن اس میں میرا قصور۔۔۔''پہلی بار اُس نے شرمندہ ہوتے کوئی وضاحت دینا چاہی۔

''تمہارا ہی قصور ہے۔''اُسکی بات کاٹتے ہوئے وہ چیخا۔''تمہارا ہی قصور ہے جزا! کیا تم نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ بیچ راستے میں اپنی وردی کا فائدہ اٹھا کر، تم پر آوازیں کس سکتے ہیں۔ وہ اپنے عہدے کا فائدہ اٹھا کر تمہارے گھر تک بھی آ سکتے ہیں؟ تمہیں ایسی نوبت آنے سے پہلے مجھے بتانا چاہیے تھا۔''اُسکا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''بیٹا! جانے دو اس بار، اب سے میں نظر رکھوں گی اس پر، بلکہ وہ جو عورتیں اسے دیکھنے آئی تھیں نا! وہ پسند کر کے گئی ہیں اسے، میں لگے ہاتھوں اسے رخصت کرتی ہوں۔''اس بات پر جہاں جزا کا دل رکا تھا، وہیں نوید نے بھی ناگواری سے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔

''امی! میں اُس ان پڑھ اور گٹکا کھانے والے لالچی انسان سے شادی نہیں کروں گی۔''اُس نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اُسکی ماں نے آگے بڑھ کر اسکے بال کھینچے۔

''امی!۔۔ کیا کر رہی ہیں آپ۔''نوید نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُنہیں روکا''چھوڑیں اُسے۔۔''اُس نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔

''کیا کر رہی ہیں آپ یہ؟'' اُس نے اپنی ماں کو صوفے پر بٹھایا۔

''جب تک میرا باپ زندہ تھا، کسی کی ہمت نہیں ہوئی میرے ساتھ یہ سب کرنے کی۔ آج وہ نہیں ہیں، تو گھر ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہو چکی ہوں میں۔'' سرخ آنکھوں سے کہتی وہ وہاں سے باہر نکلی اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

''آپ اس پر ہاتھ کیسے اٹھا رہی ہیں امی؟ بچی نہیں ہے وہ۔۔۔''اُس نے ناراضگی سے ماں کو دیکھا۔

''تو کیا کروں؟ اُسکی حرکتیں نہیں دیکھیں؟ میرا غصّہ بڑھا کر رکھ دیتی ہے ہر بار۔''

''غصّہ مجھے بھی آ رہا ہے، لیکن کیا میں ہاتھ اٹھا رہا ہوں اُس پر؟''اب کہ اُسکی ماں چپ رہی۔

''میں نے جو کہا ہے آپ اُسکا خیال رکھیں بس۔۔۔''وہ کہہ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''میں کل ہی بلاتی ہوں اُن لوگوں کو، اور نبٹاتی ہوں اسے، پتہ نہیں کہاں کی حور پری سمجھتی ہے خود کو؟ گٹکا کھانے والے سے شادی نہیں کروں گی۔۔۔ ہونہہ۔۔''وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔ نوید نے تاسف سے اُنہیں دیکھا، پر کہا کچھ نہیں۔۔۔

''میں جا رہا ہوں۔ دروازہ لاک کر دیجئے گا۔''وہ کہہ کر چلا گیا، پر وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھتے نوید نے جیب سے موبائل نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔

''ہیلو بھائی! کیسے ہیں آپ؟''اُس نے پوچھا۔ پھر دوسری طرف سے حال احوال جانے کے بعد بولا۔

''آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے۔ جزا کے حوالے سے۔۔۔''

نوید کے جانے کے بعد اُسکی ماں نے، دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی، پر اُسکے کچھ ہی دیر بعد دوبارہ کھلنے کی آواز آئی، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

''یااللہ!۔۔۔یہ پھر باہر نکل گئی؟ میں کیا کروں اس کا؟''اُنہوں نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

---------+---------+--------

اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا رضا کچھ پریشان سا تھا۔ پڑوس والے گھر سے مسلسل لڑنے کی آوازیں اُبھر کر معدوم ہو رہی تھیں۔ نوید کے غصّے کا اب اُسے کوئی بھروسہ نہ رہا تھا، نہ جانے وہاں کیا ہو رہا ہو گا؟ اُس نے سوچا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو یہاں سے وہاں ٹہلنے لگا، جزا کے گھر کے باہر اب تین عدد سکیورٹی گارڈ ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔ یہ اقدام یقیناً نوید نے ہی لیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے وہ اسی طرح اپنی بالکونی میں ٹہلتا رہا، پھر اُس نے نوید کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا، کچھ دیر تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتا رہا، پھر وہاں سے چلا گیا۔ اُسکے جاتے ہی، اُس نے جزا کو دروازے سے نکلتے اور غصّے سے پیدل کہیں جاتے دیکھا تھا۔ تینوں گارڈ کے چہروں پر پریشانی واضح نظر آئی تھی۔

''یہ اب کیا کر رہی ہے؟''اُس نے سوچا۔ پھر گھر کی چابی اٹھاتے باہر نکل گیا۔

خاموشی سے اُسی سمت سفر کرتے، جس سمت اُس نے جزا کو جاتے دیکھا تھا، اُسے یقین تھا کہ نوید کے گارڈ کم از کم اُس کو مشکوک نہیں سمجھیں گے۔

اُسے زیادہ نہیں ڈھونڈھنا پڑا، قریب ہی فوٹ پاتھ پر بنی ایک بینچ پر بیٹھی جزا اُسے فوراً نظر آ گئی۔ سٹریٹ لائٹ کی پیلی روشنی اُسکے اوپر روشن تھی۔ وہ شاید رو رہی تھی، اُس کے اٹھتے قدم تھم گئے۔

ایسی ہی ایک پرانی رات نظروں کے سامنے آن ٹھہری۔ جب وہ بھی ایسے ہی غصّے میں گھر سے نکلا تھا، ایسے ہی کسی سڑک کنارے بینچ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ تب کوئی آیا تھا اُسکے پاس۔۔۔

اُسے تسلی دینے، اُسے یہ بتانے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔یہ جانے بنا کہ اُسکا مسئلہ کیا تھا۔

بھلا کون تھا وہ مہربان شخص؟

اپنا وہ رحم دل اور مہربان دوست اچانک ہی یاد آ گیا تھا۔

آج کیا وہ عمر بن سکتا تھا؟ کیا کچھ لمحوں کے لیے وہ بھی عمر جیسا مہربان، اُسکے جیسا شفیق دل لا سکتا تھا؟

یقیناً۔۔۔وہ کر سکتا تھا۔

عمر کو ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا، پر ایسا کر نہ سکا۔ آج وہ اُسکے سامنے آیا تھا، لیکن کتنا تکلف تھا اُسکے انداز میں۔ کیسے بار بار شرمندہ ہو رہا تھا؟ بار بار اپنے بنا بتائے آنے کی وضاحت دیتا عمر، رات کے اس وقت اُسے شرمندگی کے گڑھے میں ڈال گیا تھا۔ بھلا کوئی اپنے محسن کے ساتھ ایسا کرتا ہے؟ ایسا رویہ رکھتا ہے کہ وہ آپ سے بات کرتے ہوئے بھی شرمندہ ہو۔

اپنے رویے پر افسوس کرتا وہ خاموشی سے اُسی بینچ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھا، جس پر جزا بیٹھی تھی۔

اُس نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا، تو اپنے برابر میں رضا کو پایا۔ اس طرح کے دونوں کے درمیان کم از کم بھی دو انسانوں جتنا فاصلہ تھا۔ وہ بینچ کی ایک جانب تھی، تو وہ دوسری جانب۔۔۔

وہ اُسے دیکھ رہی تھی، پر وہ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

لاشعوری طور پر اُسکے کچھ کہنے کی منتظر جزا، اُسکے یہاں آنے پر حیران تھی۔ اور وہ خاموش۔۔۔

جب بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولا تو اس نے سر جھٹک کر چہرہ واپس سامنے نظر آتے درختوں کی جانب کر دیا۔ سوسائٹی کی سڑک پر ویسے بھی اتنا ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ کافی دیر اسی طرح خاموشی چھائی رہی۔

''فریحہ اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے رہی، اور اگر لے بھی لیتی ہے، تب بھی نہ وہ مجھ سے شادی کر رہی ہے نہ میں اُس سے۔۔۔'' سنّاٹے کو رضا کی آواز نے چیرا تھا۔ اُس نے جھٹکے سے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ بھلا اُس نے کب ایسا کچھ پوچھا؟ اور وہ کیوں بتا رہا تھا اُسے؟

''تو؟'' لہجے کو عام سا بنانے کی ناکام کوشش کی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ میں کیا کروں پھر؟

''تو یہ کہ فریحہ صرف میری دوست ہے۔ ایک بے بس ماں، ایک لاچار عورت۔۔۔ جسے اس معاشرے کی سختیوں نے اُسکی اولاد سے دور کر دیا ہے۔ اور میں ماؤں کی عزت کرتا ہوں۔ دکھی بچے اور بے بس مائیں، ان کے لیے میں جو کچھ کر سکتا ہوں، وہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور۔۔۔'' رک کر چہرہ موڑا اور جزا کو دیکھا۔

''اور؟'' منتظر سماعتیں بے چین ہوئیں۔

''اور بس۔۔۔''کندھے اچکا کر عام سے لہجے میں کہا۔

''مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

''ایسے ہی! مجھے لگا کہ تمہیں بتا دینا چاہیے۔ورنہ دیر نہ ہو جائے۔''جزا کو دیکھتی آنکھیں چمکیں، چہرہ متبسم ہوا۔ جزا نے رخ پھیر لیا، دل زور سے دھڑکا۔

''تمہارے بھائی نے، کچھ کہا تمہیں؟''فکر مند انداز میں کہتے، اُس نے جاننا چاہا۔

''میں اُسکے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔''چہرے پر یکلخت ناگواری اُتر آئی۔

''کیوں؟اپنے خون سے اتنی بیزاری کیوں؟''

''اپنا خون کبھی ایسا نہیں کرتا، کبھی نہیں۔۔۔''وہ تلخی سے بولی۔

''کیا کیا اُس نے؟ تمہیں اُن لٹیروں سے وقت پر بچانے آ گیا۔ تمہاری حفاظت کی، سارے معاملے سے تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا؟''

''تم کچھ نہیں جانتے''نم آنکھوں کے ساتھ، دبی دبی آواز میں چیخی۔

''میں جاننا چاہتا ہوں۔''نرمی سے پوچھا۔

''میرے باپ کے مرتے ہی، میرے دونوں بھائیوں نے گھر بیچ دیا اور اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا۔ وہ گھر۔۔۔ وہ گھر جو میرے باپ نے بنایا تھا، جس میں، میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔''

''تو؟ تمہیں تمہارا حصّہ نہیں دیا؟''

''دیا۔''

''تو اس بات پر ناراض ہو؟''وہ واقعی نہیں سمجھا۔

''تو کیا یہ ناراض ہونے والی بات نہیں ہے؟''

''میرے نزدیک، بالکل نہیں!''وہ حیران تھا۔

''تم پاگل ہو گیا؟ میرے باپ کی عمر بھر کی محنت کا اُنکے مرتے ہی حصے بخرے کر لئے۔ یہ کیسے بیٹے ہیں؟ بھلا باپ کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی اور اُنہوں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا، اُنکی محنت کی کمائی سے۔ اُس گھر میں میری پوری زندگی گزری تھی۔'' وہ رو دینے کو تھی، لیکن کمال مہارت سے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ آنکھیں، ناک اس کوشش میں سرخ ہو چکی تھیں۔

''تم اپنے بھائیوں سے اس بات پر ناراض ہو کہ اُنہوں نے وہ کام پورا کیا، جس کام کا اللہ نے اُنہیں حکم دیا تھا؟'' رضا کے سنجیدگی سے کیے گئے سوال پر وہ ساکت ہوئی۔

''میں نے ایسا نہیں کہا، میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ میرے باپ کے مرتے۔۔۔''

''مردے کے مرتے ہی وراثت تقسیم کی جاتی ہے جزا!'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''وراثت کی تقسیم کا یہی شرعی طریقہ ہے۔ مردے کے مرتے ہی، اُسکا جنازہ ہونے کے فوراً بعد، اُسکا ترکہ تقسیم کر دیا جائے تو یہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر ورثاء وراثت تقسیم کرنے میں دیر کرتے ہیں، تو اسکا وبال اُنہی کے سر ہے۔'' رضا نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرے بھائیوں کو کون سا پیسوں کی کمی تھی جو۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ رضا نے گہرا سانس لیا۔

''ہمارا مسئلہ معلوم ہے کیا ہے؟ ہم نے حلال کو حرام، اور حرام کو حلال بنا دیا ہے۔ ہم نے اپنی روایات اور نظریے کو اللہ کے قانون سے بڑا مان لیا ہے۔''

''نعوذ باللہ!'' اُس کا دل دہلا۔

''ہاں! نعوذ باللہ۔۔۔ لیکن ایسا ہی ہے۔ وراثت کی تقسیم یہ نہیں دیکھتی کے کس بھائی کے پاس کتنا پیسہ ہے؟ وراثت سب کو برابر حق دیتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ورثہ کو اُس وراثت کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اگر کوئی باخوشی اپنا حق چھوڑ دیتا ہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم کسی کو صرف اس بنا پر، کہ اُسکے پاس ہم سے زیادہ پیسہ ہے، وراثت میں اُسکے حق سے محروم نہیں کر سکتے، نہ ہی اُسے برا کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ظالم ہم ہوں گے۔'' مدلل انداز میں کہتا وہ اُسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ جواباً وہ خاموش تھی۔

''تم جانتی ہو کہ اللہ نے یہ قانون کیوں رکھا ہے؟'' اُس نے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ بتانے کے لیے کہ یہ مال ہمارا نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہم اسے قبر میں اپنے ساتھ نہ لیجاتے؟ حتیٰ کہ ساری عمر محنت سے کما کر پائی پائی جمع کر کے جائیداد بنانے والا باپ بھی اپنی اولاد کو وراثت سے محروم نہیں کر سکتا۔ عاق کرنے جیسا کوئی شرعی حق اللہ نے انسان کو نہیں دیا۔ بھلے اولاد نافرمان ہو، بدکردار خواہ کافر۔۔۔ یہ مال ہمارا نہیں ہے جزا! تو اس پر رونا کیسا؟''

''مجھے بس اپنے باپ کے گھر سے جذباتی وابستگی تھی۔''اب کہ وہ بولی تو آواز آہستہ تھی۔

''اُس گھر میں تم نے کون سا ساری زندگی رہنا تھا؟ بیٹیاں تو ویسے ہی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے دادا، پردادا نے بھی ایسے ہی گھر بنائیں ہوں گے، یہ سوچ کر کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، اور اُنکی آنے والی نسلیں اس کو آباد رکھیں گی۔ لیکن کیا ہوا؟ آج وہ گھر کہاں ہے؟ یہی قانون ہے جزا! ہر شے فانی ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں رہنا۔ اور تمہارے بھائیوں نے تو تمہیں تمہارا پورا حق دیا، اگر تمہارا حصہ مار کھایا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی ناراض ہونے والی۔۔۔'' نرمی سے کہتے وہ اُسے، وہ باتیں سمجھا چکا تھا جو شاید وہ ساری زندگی بھی نہ سمجھ پاتی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''اُس نے مان لیا۔ یہ اچھی بات تھی۔

''اور تمہاری جذباتی وابستگی، تمہارے باپ کے بنائے اینٹوں کے گھر سے نہیں بلکہ تمہارے باپ کے خون، اُنکے بیٹوں سے ہونی چاہیے۔''

''لیکن میں اپنے بھائیوں سے اور بھی دیگر باتوں پر ناراض ہوں۔''فوراً سے لہجہ بدل کر کہا۔

''اتنا برا بھی نہیں ہے تمہارا بھائی!''اُسکے انداز پر وہ مسکرایا۔

''تم اُسے جانتے ہی کتنا ہو؟ ابھی ہی تو دیکھا ہے۔''منہ بناتے ہوئے کہا۔ اور رضا ہنس پڑا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔''ہنستے ہوئے کہا۔

''تم مذاق اُڑا رہے ہو میرا؟ تمہیں معلوم بھی ہے کتنی بری طرح ڈانٹ کر گئے ہے مجھے؟ بلاوجہ کی پابندیاں لگادیں مجھ پر، کہہ رہے تھے، تمہاری وجہ سے ایک معزز انسان کے گھر پولیس آئی اور۔۔۔''وہ جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔

پیلی روشنی میں چمکتی سانولی رنگت۔۔۔

اُس رنگت پر جچتا سیاہ لباس۔۔۔

شدت ضبط سے سرخ ہوتی، کاجل میں ڈوبی سیاہ آنکھیں۔۔۔

اُن سیاہ آنکھوں میں بار بار امڈتے آنسو۔۔۔

اور اُنہیں بہنے سے پہلے ہی صاف کرتے چوڑیوں بھرے ہاتھ۔۔۔

اور بس۔۔۔رضا برباد۔۔۔

''نوید کی بہن ہے رضا!'' دماغ نے یاد دلایا پھر باز رہنے کو کہا۔ ''ساری دنیا میں اسی کو نوید کی بہن ہونا تھا؟'' دل نے دہائی دی۔

''تمہارا پورا نام جزائے خیر ہے؟'' یکدم ہی پوچھا تو، مسلسل بولتی جزا کی زبان کو بریک لگا۔

''ہاں!'' رک کر نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''میرا پورا نام رضائے الٰہی ہے۔'' پتہ نہیں اسکو کیوں بتایا؟

''اچھا نام ہے، ویسے پورا نام جزائے خیر عالم ہے میرا۔''

''اچھا نام ہے۔'' اُسی کے انداز میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

''تم رضا الٰہی کیوں کہتے ہو پھر؟'' اُس نے پوچھا۔

''نام میرا رضائے الٰہی ہی ہے۔ بس! لوگوں نے آسانی کے کی رضا الٰہی کر دیا ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''تمہیں گھر جانا چاہیے، ورنہ تمہارے دروازے پر کھڑے گارڈاب تمہارے پیچھے آجائیں گے۔'' پھر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ گھر جانے کے نام سے جزا کی کوفت ہوئی تھی پر ناچار کھڑی ہو گئی۔ اب وہ دونوں گھر کے راستے پر گامزن تھے۔

کچھ ان کہی سی، کچھ ان سنی سی کہانیاں لیے۔۔۔

کچھ سمجھ کر نہ سمجھتے۔۔۔

کچھ نہ سمجھ کر سب سمجھتے۔۔۔

وہ دونوں۔۔۔

دو میں سے ایک نے گھر کی اس رہ پر چلتے دعا مانگی۔۔

اُس نے جزائے خیر مانگی۔۔۔

اب رضائے الٰہی کہ اُسے مل جائے۔۔۔

---------+---------+--------

رات کے اس پہر جب دنیا تھک کر سکون سے سونا چاہتی ہے، تب اس گھر کے لاؤنج میں ایک خوبرو مرد کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے سنجیدہ نظروں سے چہرہ جھکائے اُسے گھور رہا ہے۔ بھلا کسے غور رہا ہے؟

اپنے سامنے کھڑی اُس ڈیڑھ فٹی چوزی کو، جو کمر پر ہاتھ رکھے بالکل اُسی کے کے انداز میں اُسے ہی گھور رہی تھی۔

''میرا راستہ کیوں روکا ہے؟'' سنجیدہ لہجے میں علی نے اُس سے پوچھا۔

''میں نے کپڑے بدل لیے۔''

''تو؟''

''مجھے سونا ہے۔''

''تو سو جاؤ جا کے، میں نے منع کیا ہے کیا؟''

''کہاں سوؤں؟'' اصل مسئلہ تو یہ تھا۔ علی کچھ دیر سوچتا رہا۔

''آؤ میرے پیچھے۔۔۔'' اُسی طرح کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے چل پڑا، اور وہ اُسکے پیچھے پیچھے۔۔۔ پھر اُسے لیے احمد کے کمرے میں چلا آیا۔ ہر شے ویسی ہی تھی جیسے احمد چھوڑ کر گیا تھا۔ آٹھ سالوں میں پہلی بار اس کمرے کو خالی دیکھ کر اُسکے دل کو ایک لمحے کے لیے دھکا لگا۔

''یہاں سوؤں؟'' اُسکے پیچھے سے چہرہ نکال کر پوچھا تو وہ چونکا۔

''ہاں! سامنے بیڈ پر سو جاؤ جا کر۔'' انگلی سے بستر کی جانب اشارہ کر کے جانے لگا۔

''آپ جا رہے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!''

''کیوں؟'' اس سوال پر وہ حیران ہوا۔

''میں نہیں سوؤں؟'' اُسے بھلا اور کس زبان میں سمجھاتا؟

''یہاں سوئیں۔'' بستر کی طرف اشارہ کر کے حکم صادر کیا۔

''میں یہاں نہیں سوتا۔'' ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں سوتے ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔۔۔''اس سوال جواب سے وہ تنگ تھا۔

''مجھے بھی وہیں سونا ہے۔''ایک اور فرمائش۔

''کیوں؟''وہ حیران ہوا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''وجہ معقول تھی۔

''تو میں کیا کروں؟''وہ جھنجھلایا۔اور بس۔۔۔نشمیہ صاحبہ نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرے اور رونا شروع۔۔۔

''رو کیوں رہی ہو اب؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''روتے ہوئے کہا۔

''تو اب میں کیا کروں؟میں تو یہاں نہیں سو سکتا نا!''وہ بے بسی سے بولا۔

''تو میں کہاں سوؤں؟''دونوں ہاتھوں کو آگے کر کے نچانچا کے پوچھا۔

''میرے باپ کے کمرے میں۔۔۔''چبا چبا کر کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''اس سوال پر علی نے بیزار منہ بنایا۔

''چلو!''کمرے کی لائٹ بند کر کے اُسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ سفیر صاحب کے کمرے کے باہر پہنچ کر لاک پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ

''یہ والا کمرہ؟''نشمیہ نے جذباتی انداز میں پوچھا تو اس نے لاک چھوڑ کر اُسے گھورا۔

''آہستہ بولو! ابّا سو رہے ہیں۔''اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا اور دوبارہ دروازہ کھولا۔کمرے کی لائٹ بند تھی اور وہ بستر پر سکون سے سوئے ہوئے تھے۔

''اندر آؤ۔''آہستہ آواز میں کہتے اُسے اپنے پیچھے اندر لایا۔خاموشی سے سفیر صاحب کے برابر میں جگہ بنائی اور پھر اُسے لیٹنے کا اشارہ کیا۔خلاف توقع وہ خاموشی سے لیٹ گئی تو وہ بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے جانے لگا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''یکدم ہی وہ چیخی تو وہ دہل کے پیچھے مڑا۔ایک نظر سفیر صاحب کو دیکھا، صد شکر کہ وہ سو رہے تھے۔پھر اُسکے قریب آیا۔

''تم سے کہا ہے نہ کہ آہستہ بولو۔''

''میں کیا کروں مجھے سردی لگی ہے؟''معصوم سامنہ بنا کر آہستہ آواز میں کہا۔ اس نے سر جھٹک کر اُسے چادر اوڑھادی۔

''اب تمہاری آواز نہیں آنی چاہیے۔چپ کر کے سو جاؤ۔''اُسے وارن کرتا وہ باہر آ گیا۔کچھ دیر دروازے پر ہی کھڑا رہا، پھر دوبارہ دروازہ کھول کر دیکھا تو چادر کے اندر آنکھیں بند کیے وہ پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑا رہی تھی؟لیکن صاف ظاہر تھا کہ کچھ دیر میں سو جائے گی۔ سکون کا سانس لیکر دروازہ پھر بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھے گیا۔اتنا زیادہ تھک چکا تھا کہ کچھ دیر میں ہی اُس پر غنودگی چھانے لگی۔اچھا بھلا وہ نیند کی وادیوں میں جا رہا تھا کہ کہیں سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔اُس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی لیکن آواز پر دھیان نہ دیا۔آواز دوبارہ آئی تو اُسکی آنکھیں کھلی۔چہرہ گھما کر یہاں وہاں دیکھا پر کوئی نہ تھا۔ اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ سونے ہی لگا تھا کہ آواز دوبارہ آئی،اب کہ وہ اُٹھ بیٹھا۔وہ جو کوئی بھی تھا،اُسکا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ۔وہ کچھ حیران، تھوڑا پریشان سا دروازے پر آیا اور جیسے ہی دروازہ کھولا،وہاں کسی کو نہ پایا۔اس سے پہلے کہ دروازہ واپس بند کرتا،اپنے دائیں گھٹنے پر کسی چیز کا احساس ہوا۔ گردن جھکا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑی تھی،اُسکے گھٹنے پر ہاتھ مارتی اُسے اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔

''تم؟''حیرت کی شدت سے آنکھیں بڑی ہو گئیں،ابھی تو سلا کر آیا تھا اسے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے وہاں نہیں سونا۔''ایک اور حکم صادر فرمایا۔

''کیوں؟''اس فیصلے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''وہ بہت شور مچا رہے ہیں۔''

''کون؟ابّا؟''وہ حیران ہوا۔بھلا سفیر صاحب کیوں شور مچائیں گے؟

''ہاں!اتنی دیر سے آوازیں۔۔۔نکالے جا رہے ہیں۔۔۔نکالے جا رہے ہیں۔۔۔چپ ہی نہیں ہو رہے۔''تیز تیز بولتی وہ ہانپ گئی۔

''ہیں؟''اُسے سمجھنے میں وقت لگا کہ وہ سفیر صاحب کے خراٹوں کو شور مچانا کہہ رہی تھی،جب سمجھ آیا تو پچھلے ڈیڑھ ہفتوں میں پہلی بار وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ لیکن اُسکا ہنسنا سامنے والی کو سخت ناپسند آیا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔''برائے مہربانی ہنسنے کا شغل بعد میں کیا جائے اور میرا مسئلہ پہلے حل کیا جائے۔

''تو اب میں کیا کروں؟''وہ دوبارہ سنجیدہ ہوا۔جواباً وہ آنکھیں پٹپٹائے اُسے دیکھتی رہی بولی کچھ نہیں۔بڑے تم ہو،مسئلہ بھی تم حل کرو۔

''اوکے!اندر آؤ۔''ناچار دروازے سے ہٹ کر اُسے جگہ دی تو وہ اندر آ گئی۔

''واؤ! اتنا پیارا روم؟'' علی کا نفاست سے سیٹ ہوا کمرہ دیکھ کر وہ تعریف کیے بنا رہ نہ سکی۔

''یہ میرا کمرہ ہے۔'' علی نے جتایا۔

''تو؟'' لٹھ مار انداز میں کہتی وہ اچھل کر بستر پر چڑھ گئی۔

''تو یہ کہ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ جسکے لیے جلدی سونا ضروری ہے لہٰذا مجھے تمہاری ذرا سی بھی۔۔۔ ذرا سی بھی آواز نہیں آنی چاہیے۔'' اُسکے پاس آکر انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے چٹکی بنا کر، اُسے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''واؤ! یہ کیا ہے؟'' اُسے نظر انداز کیے، سائیڈ ٹیبل پر رکھا پیپر ووڈ اُسکی نگاہوں کا مرکز بنا تو فوراً سے اُٹھا لیا، علی نے لپک کر وہ اُس سے واپس لیا اور جگہ پر رکھا۔

''لیٹو۔۔۔'' اب کہ سختی سے کہا۔ سمجھ گیا تھا کہ اُسے آرام سے کی گئی بات سمجھ نہیں آتی۔ وہ لیٹ گئی، پھر علی نے اسے چادر اوڑھائی، اتنی دیر وہ کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔

''کتنا بڑا روم ہے آپکا۔'' وہ خوش ہوئی۔

''آنکھیں بند کرو!'' علی نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو جلدی سے ننھی ننھی آنکھیں بند کر لی۔

''اب آواز نہ آئے تمہاری۔۔۔'' اُسے دھمکی دیتا دوسری جانب آکر بیٹھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی اور کچھ ہی دیر میں بے سدھ سو گئی۔ علی اُسے دیکھتا رہا۔

''یہ دن بھی آنا تھا کہ میں اپنی سابقہ بیوی کے دوسرے شوہر کی بیٹی پالوں گا؟'' دل میں نفرت ایک مرتبہ پھر بھرنے لگی ہی تھی کہ

اگر وہ تمہاری بیٹی ہوئی تو؟

نوید کے الفاظ کانوں میں گونجے۔

''لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ فاطمہ نے اُسے مار دیا تھا۔'' دماغ نے کہا۔

''اگر مار دیا تھا تو تقی سے فوراً شادی کیوں نہ کی؟ ایک سال کیوں لیا؟'' دماغ نے مخالفت کی۔ اُس نے تھک کر سر تکیے پر رکھ دیا۔ ایک نظر برابر میں مست سوئی نشمیہ کو دیکھا۔ اب تک اس بچی سے جو نرمی وہ برت رہا تھا، اُسکی وجہ صرف یہی تھی کہ نوید کے الفاظ نے اُسے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ

پہلی فرصت میں اُسے یتیم خانے چھوڑ آتا۔ فاطمہ کے جھوٹ، اُسکے دھوکے، نوید کے الفاظ، اپنی زندگی، سب کچھ ذہن میں گڈ مڈ ہونے لگے، نیند نے ایک بار پھر اُس پر غلبہ حاصل کر ہی لیا تھا کہ

''سنیں!''چھوٹے چھوٹے ہاتھ اُسکے بازو پر رکھ کر اُسے ہلات ہوئے، ایک بار پھر بھرپور طریقے سے اُسکی نیند میں خلل ڈالا گیا۔

''کیا ہوا؟''وہ ہڑبڑا کر چیخا۔

''واشروم جانا ہے۔''مسکین شکل بنا کر کہا۔

''کیا؟''اُسکا دماغ فوراً سے اس بات کو ڈی کوڈ نہ کر سکا۔

''مجھے واشروم جانا ہے جلدی۔۔۔''وہ چیخی۔

''تو جاؤ نا!''وہ ٹھیک ٹھاک جھنجھلایا تھا۔

''کہاں جاؤں؟''دونوں ہاتھ آگے کر کے پوچھا۔

''وہ رہا سامنے دروازہ۔۔۔جاؤ!''بیت الخلا کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا!''وہ جلدی سے اتر کر واشروم کے دروازے کی طرف گئی۔ لاک کافی اوپر تھا، لہٰذا اچھل اچھل کر اُسے کھولنے کی کوشش کی، پر ہاتھ نہ پہنچ سکا تو پلٹ کر مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ یہ ساری کاروائی دیکھتا علی بیزار ہوا۔

''یار!۔۔۔کیا مصیبت ہے۔''روتی شکل بنا کر تکیے پر سر پٹخا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ واشروم کا دروازہ کھول کر لائٹ کھولی۔

''دروازہ بند مت کرنا۔''کہتے ہوئے اُسے اندر کیا۔

''کیوں؟''ایک تو اُسکے سوالات۔

''اندر بند ہو جاؤ گی تو دروازہ توڑوں گا کیا؟''ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''اچھا اچھا۔۔''سمجھ کر سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔ پیچھے علی نے دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑا اور واپس بستر پر آ کر ڈھیر ہوا۔ دو منٹ گزرے، وہ باہر نہ آئی۔ پھر پانچ منٹ اور جب دس منٹ گزر گئے تو وہ پریشان ہوتا دروازے پر آیا۔

''کیا کر رہی ہو تم اندر؟''دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پوچھا۔

''ایک منٹ۔۔۔''اندر سے آواز آئی۔ پھر اُس نے دروازہ کھول کر منہ باہر نکالا۔

''کیا کر رہی ہو اتنی دیر سے اندر؟''سر جھکا کے اُسے دیکھا۔

''پانی نہیں آرہا۔''اُس نے کہا۔

''ہیں؟''علی کو اُسکی بات سمجھ نہ آئی، پانی تو آرہا تھا۔

''ہٹو آگے سے۔''اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے دروازہ وا کرتے، اندر داخل ہوا۔اندر کے حالات دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے جنگ کر کے آرہی ہو۔شاور نیچے گرا ہوا تھا، ہینڈ واش زمین پر بہہ رہا تھا، اور بالٹی الٹی کر کے بیسن کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''واشروم کا یہ حال دیکھ کر اُسکا دماغ گھوما۔

''میرا ہاتھ نہیں جا رہا تھا۔''اُس نے بالٹی الٹی رکھنے کی وضاحت دی۔

''تو تم اس پر چڑھی تھی؟''اُس نے پوچھا تو جواباً اُس نے زور زور سے سر ہلایا جیسے بہت بہترین کارنامہ انجام دیا ہو۔ اُسے گھورتے ہوئے علی بیسن کے پاس آیا اور نلکا کھولا۔پانی پوری تیزی سے آرہا تھا۔نل واپس بند کر کے اُسے دیکھا۔

''آتو رہا ہے پانی۔''

''مجھ سے نل نہیں کھلا۔''اپنی غلطی کی خود ہی وضاحت دی۔اُس نے آگے بڑھ کر نل دوبارہ کھولا۔

''دھو ہاتھ۔۔۔''وہ جلدی سے بالٹی پر چڑھی، علی نے ضبط سے اُسے دیکھا۔پھر اُس نے سکون سے ہاتھ دھوئے، دھوئے اور دھوتی ہی چلی گئی۔

''بس کر دو! ہو گیا ہے۔''اُس نے چڑ کے نل بند کیا تو وہ نیچے اتری۔

''تولیہ؟''ملکہ عالیہ کو ہاتھ پونچھنے تھے۔اُس نے پاس لٹکا تولیہ اُسے دیا، اُس نے ہاتھ پونچھ کر واپس کیا اور باہر نکل گئی۔واشروم پر ایک آخری تاسف بھری نظریں ڈالتے لائٹ بند کی اور دروازہ لاک کرنے کے بجائے تھوڑا سا کھلا چھوڑ کے اپنے بستر پر آ گیا۔

''دروازہ کھلا ہے واشروم کا، دوبارہ جانا ہو تو میری نیند خراب مت کرنا۔''اُسے سمجھاتا ہوا وہ لیٹ گیا۔

''پر میں نل کیسے کھولوں گی؟''ایک اور مسئلہ۔

''جیسے میں نے کھولا تھا۔''

''میں نے دیکھا نہیں تھا۔''چہرے پر مسکینیت طاری کی۔

''سو جاؤ چپ کر کے۔''تنگ آ کر کہا اور کروٹ بدل لی۔

''بات سنیں!''اُس کی آواز دوبارہ آئی۔

''اب کیا ہے؟''وہ روہانسا ہو گیا۔کب سے سونا چاہتا تھا اور اس نے عجیب دھینگا مشتی لگا رکھی تھی۔

''پانی پینا ہے۔''

''کیوں؟''جھنجھلایا۔

''پیاس لگی ہے۔''یہ بھی کوئی سوال تھا پوچھنے والا، بھلا پانی کیوں پیتے ہیں؟

''یہ کونسا وقت ہے پیاس لگنے کا؟''وہ اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا۔یہ بچی اُسکے ضبط کا امتحان لے رہی تھی۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔''اگلے ہی لمحے اُس نے رونا شروع کر دیا۔

''اب رو کیوں رہی ہو؟''

''آپ ڈانٹ رہے ہیں مجھے۔۔۔''روتے ہوئے ہی رونے کی ہی وجہ بیان کی۔

''یااللہ! مجھے صبر دے۔''اُس کا دل کر رہا تھا اپنے بال نوچ لے۔رات کے اس پہر وہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔

''دے رہا ہوں پانی چپ کر جاؤ تم۔''بس اتنی سی بات،اور میڈم کے سارے آنسو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب۔۔۔

وہ لب بھینچتا اٹھا اور آدھا گلاس پانی اُسے پکڑایا۔جیسے ہی اُس نے منہ سے لگانے کی کوشش کی یکایک علی کو ڈائننگ ٹیبل کا منظر یاد آیا۔اور اگلے ہی لمحے اُس نے گلاس اُسکے ہاتھوں سے واپس لیا۔

''رک جاؤ! میں پلا رہا ہوں تمہیں،ورنہ سارے کپڑے گیلے کر لو گی۔''اُسکے سوال کرنے سے پہلے ہی کہا اور گلاس اُسکے منہ سے لگایا۔کچن میں اُسے پانی کے مقدار پر لیکچر دینے والی یہ چوزی اس وقت آدھا گلاس پانی غٹا غٹ پی گئی تھی۔

''اور۔۔''مزید پانی مانگا تو اس نے لب بھینچ کر مزید آدھا گلاس اُسے پلایا۔

''اور۔۔۔''

''بس۔۔۔''علی نے آنکھیں دکھائی''اتنا پانی پیو گی پھر کہو گی واشروم جانا ہے۔''اسکو ڈپٹتے ہوئے پانی کا جگ اور گلاس واپس رکھا۔

''اب سو جاؤ! اور خدا کے لیے خود بھی سوؤ اور مجھے بھی سونے دو۔''باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ اچھے بچوں کی طرح سر ہلاتی لیٹ گئی۔ وہ بھی تھک کر اپنی جگہ آیا۔

''ایک بات بتائیں۔۔۔''

''چپ۔۔۔''وہ کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ علی نے گھرکا۔

''اوکے''جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بیچارہ بھی ایسا تھکا کہ دوبارہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا

---------+---------+--------

اندھیری رات میں وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔اُسکے پیچھے فیصل اور شیراز اور اُنکے بھی پیچھے،اُنکی پوری نفری تھی۔ہاتھوں میں پستول تھامے، جسکا رخ آسمان کی جانب تھا،وہ دیوار سے چپکتا چل رہا تھا۔دروازے کے برابر رک کر اُس نے پیچھے دیکھا۔فیصل پیچھے تھا،اُسے اشارہ کیا تو وہ آگے آیا۔پھر پنجوں کے بل دروازے کے لاک کے سامنے بیٹھا اور کچھ ہی لمحوں میں لاک کھول دیا،پر دروازہ نہ کھلا۔

''کیا ہوا؟''سرگوشی نما آواز میں اُس سے پوچھا۔

''کنڈی لگی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے!۔۔۔''اُس نے رک کر کچھ دیر سوچا۔پھر شیراز کی جانب دیکھا۔

''تم آدھی ٹیم لے کر جاؤ،اور اطراف میں دیکھو اگر کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا ملے،میں فیصل کے ساتھ باقی ٹیم لیکر جاتا ہوں۔''نوید نے اُسے حکم دیا۔

''اوکے سر!''وہ باقی ٹیم کے ساتھ دوسری سمت چلا گیا۔اُسکے جانے کے بعد نوید بھی بقیہ ٹیم کے ساتھ قدموں سے بنا آواز کیے،آگے بڑھ رہا تھا۔کچھ دیر ٹٹولنے کے بعد اُسے ایک کھڑکی کھلی ملی۔

''میں اندر جاتا ہوں پہلے۔''فیصل نے آگے بڑھنا چاہا۔

''نہیں! میں اندر جا کر دیکھوں گا پہلے۔''اُس نے اُسے روک دیا۔پھر ایک ہی جست میں کھڑکی پر چڑھا۔وہ کسی لیونگ ایریا جیسے کمرے کی کھڑکی تھی،اندر صرف ایک زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔وہ بنا آواز پیدا کیے اندر کود گیا۔پھر کتابوں کے ایک ریک کے پیچھے اوٹ لیکر چھپا۔اگلے ہی لمحے اپنی پستول آگے کرتا تیزی سے باہر آیا،کمرہ خالی تھا۔

''سب کلیئر ہے، تم لوگ اندر آ سکتے ہو۔اوور!''اپنے ٹرانسیور میں کہتے وہ آگے بڑھا۔اس لیونگ روم نما کمرے میں مزید تین کمروں کے دروازے تھے، دو کھلے تھے اور ایک بند تھا۔اُسکی نگاہوں کا مرکز بند دروازہ تھا۔اُسکے پیچھے فیصل باقی نفری کے ساتھ کودا اور اُس تک آیا۔

''یقیناً اس کمرے میں کوئی ہے۔''اُس نے آہستہ آواز میں بتایا۔

''اس دروازے پر بھی کنڈی لگی ہوئی ہو تو؟''فیصل نے ممکنہ خدشہ ظاہر کیا۔

''پھر ہمارے پاس اسے توڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہوگا۔البتہ اس سے پہلے ہمیں ایک بار پورے گھر کی تلاشی لینی ہے، کہیں کوئی اور نہ۔۔۔''اُسکی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دوسری طرف کی کھڑکی پر کھٹکا ہوا۔نوید نے فوراً اپنی پستول کا رخ کھڑکی کی جانب کیا، نفری الرٹ ہو گئی۔اُسی لمحے کھڑکی کھلی، اور کوئی اندر کودا۔

''ہاتھ اوپر۔۔۔''نوید نے پستول کا رخ اُسکی جانب کیا۔

''میں ہوں سر!''شیراز نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

''حد ہے۔۔۔''اُسے گھورتے ہوئے دوبارہ رخ دروازے کی جانب موڑا۔

''ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں، تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں، فوراً پورے گھر کا جائزہ لیکر آؤ۔''اُس کے حکم پر فیصل اپنے ساتھ دو بندے لیے فوراً وہاں سے نکلا۔

''کیا آپکو اس کمرے پر شک ہے؟''شیراز نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ مائیکل یہیں ہے۔''اُس نے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوتے کہا۔

''تم لاک دیکھو، اگر یہاں بھی کنڈی لگی ہو گی تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔''اُسکے حکم کے مطابق شیراز پنجوں کے بل بیٹھا لاک دیکھنے لگا۔کچھ ہی دیر میں فیصل بھی سارے گھر کا معائنہ کر آیا۔

''سر! سب کلیئر ہے۔پورا گھر خالی ہے۔''نوید نے اثبات میں سر ہلایا۔شیراز نے بھی کچھ ہی دیر میں لاک کھول لیا تھا۔

''میں اندر جاؤں گا۔تم لوگ میرے پیچھے رہو۔''دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر نوید نے پستول پر گرفت مضبوط کی۔پھر انگلیوں سے تین کا اشارہ کیا، پھر دو اور پھر ایک کہتے ہی اُس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور پستول سامنے کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

اُسکے قدم تھمے، اتنے عرصے میں پہلی بار اُسکے ہاتھ کانپے، آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں۔ اُسکے پیچھے آنے والی نفری بھی ساکت کھڑی رہ گئی۔ پستول اٹھایا ہوا نوید کا ہاتھ پہلو میں جا گرا۔

مائیکل عرف فرمان کمرے میں موجود تھا۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ انکی نظروں کے سامنے تھا۔

---------+---------+--------

آج کی صبح بڑی چمکیلی تھی، دھوپ میں گزشتہ دنوں کے مقابلے میں تیزی آگئی تھی، گرم کپڑے اور چادریں اب اندر جانے کی تیاریاں پکڑ چکی تھیں۔ کچن میں آنے سے پہلے اس نے ایک نظر اُس چھوٹے طوفان پر ڈالی تھی، جو رات بھر اُسکی نیند خراب کر کے اب مست پڑی سو رہی تھی۔ اُسے سوتا چھوڑ کر وہ ناشتہ بنانے کچن میں چلا آیا۔ سفیر صاحب بھی وہیں آگئے، ہمیشہ کی طرح دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔

فریج سے مایونیز باہر نکال کر رکھا، پھر ڈبل روٹی کے کنارے کاٹ کر اُسے ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ اب وہ چھری کی مدد سے مایونیز ڈبل روٹی پر لگا رہا تھا۔ مگن سے انداز میں کام کرتے اُسکی توجہ صرف اور صرف ڈبل روٹی پر ہی تھی۔ سینڈوچ مکمل ہوا تو اس نے اُسے پلیٹ میں رکھا اور تب ہی بالکل اچانک سے اُسکی نظریں کاؤنٹر پر نمودار ہوتے دو ننھے ننھے ہاتھوں پر گئی۔ قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے چہرہ وہاں تک نہیں پہنچ سکا، علی نے جھک کر اُسے دیکھا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' اُس نے پوچھا۔ سفیر صاحب نے اخبار کا کنارا موڑ کے اُنہیں دیکھا۔

''بھوک لگی ہے۔'' کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش میں ناکام ہوتے، علی کو جواب دیا۔

''برش کیا ہے؟'' پتہ نہیں اُس نے کیوں پوچھا؟ اُس نے جواب نہ دیا بلکہ کسی طرح اچھل کر کرسی پر جا بیٹھی۔

''کیا پوچھا ہے میں نے؟'' وہ بیزار ہوا۔

''کیا پوچھا ہے؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''دانت صاف کیے ہیں یا نہیں؟'' اُسکے چہرے پر غصّے کے اثرات نظر آنے لگے۔

''نہیں!'' نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''بھول گئی تھیں۔''

''پہلے دانت صاف کر کے آؤ، پھر ناشتہ ملے گ۔ا'' اُس نے دوسرا سینڈوچ تیار کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں جانا۔'' وہ بضد ہوئی۔

''میں کیوں اتنی بحث کر رہا ہوں اس سے؟'' بڑبڑاتے ہوئے سینڈوچ کی پلیٹ اسکے آگے رکھ دی۔

''مجھے نہیں کھانا یہ۔۔'' علی کا منہ تک سینڈوچ لے جاتا ہاتھ رکا۔

''کیوں؟'' آبرو اچکا کر پوچھا۔

''میں ناشتے میں آملیٹ کھاتی ہوں۔'' خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''تو میں کیا کروں؟'' اُس نے پوچھا۔

''مجھے آملیٹ بنا کے۔'' اس حکم پر جہاں وہ حیران ہوا تھا، وہیں سفیر صاحب نے اخبار دوبارہ منہ کے آگے کر لیا۔

''کیوں؟'' ضبط سے پوچھا، دل تو کر رہا تھا کہ کہہ دے کیا میں تمہارا نوکر ہوں؟

''کیونکہ مجھے آملیٹ کھانا ہے۔'' اب کہ وہ جھنجھلائی۔ اس آدمی کو ہر بات اتنی مرتبہ کیوں سمجھانی پڑتی تھی؟

''مجھے آملیٹ بنانا نہیں آتا۔'' اب کہ اُس نے تحمل سے کہا۔

''آپ کو آملیٹ بنانا نہیں آتا؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''آپ تو اتنے بڑے ہیں؟'' آنکھیں بڑی کر کے پوچھا۔ جیسے فقط یہ ایک کام نہ آنے سے علی کی تمام صلاحیتیں بیکار چلی گئیں ہوں۔

''تمہیں آتا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''نہیں!'' نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''میں تو چھوٹی ہوں نا!'' وضاحت دی۔

''دیکھو! مجھے آملیٹ بنانا نہیں آتا، اب تم یہی سینڈوچ کھاؤ۔'' اب کہ اُس نے ذرا سختی سے کہا۔

''میں نہیں کھاؤں گی، مجھے آملیٹ ہی چاہیے۔'' وہ بپھر گئی۔

''مجھے غصّہ مت دلاؤ، کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکی رہو۔''اُس بار اُس نے غصّے سے ڈانٹا۔اُسکا چہرہ لال ہوا، پھر آنکھیں سرخ ہوئی اور اگلے ہی لمحے پورے گھر میں اُسکا باجا بجنا شروع ہو چکا تھا۔

''اف۔۔''علی نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا۔

''مجھے نہیں آتا نا آملیٹ بنانا، میں کیا کروں؟''اُس نے بیچارگی سے پوچھتے ہوئے سفیر صاحب کو دیکھا۔اُنہوں نے کندھے اچکا دیے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟

''یوٹیوب سے دیکھیں۔''رونے کے درمیان تجویز پیش کی۔

''تم ہر بات پر رونا کیوں شروع کر دیتی ہو؟''وہ عجیب بے بسی کا شکار تھا۔

''آپ ہر بات پر ڈانٹتے کیوں ہیں؟''سوں سوں کرتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو! اگر تم ابھی سینڈوچ کھالو گی، تو میں وعدہ کرتا ہوں دوپہر میں تمہاری پسند کا لنچ تمہیں ملے گا۔''اتنی دیر میں پہلی بار اُس نے نشمیہ کو بچوں کی طرح پچکارا تھا۔

''آملیٹ تو آپکو بنانا نہیں آتا، لنچ کیسے بنائیں گے؟''بھنویں چڑھا کر ناراضگی سے کہتی وہ سفیر صاحب اور علی دونوں کو بھونچکا کر گئی۔

''زبان دیکھیں ذرا اسکی۔''اُسے تو یقین ہی نہیں آیا۔سفیر صاحب نے مسکراہٹ ضبط کی، پس ثابت ہو گیا کہ اُس سے بچوں کی طرح بات کرنے کا فائدہ نہ تھا۔

''کھالو اسے، لنچ باہر سے منگوا دوں گا۔''علی نے ایک آخری کوشش کی، صد شکر کہ اس بار وہ مان گئی۔اب آنسو پونچھتی، برے برے منہ بناتی سینڈوچ کھا رہی تھی۔

''ناشتہ جلدی ختم کرو، پھر ہم نے کہیں جانا ہے۔''ناشتہ مکمل کر کے اپنی کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے علی نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہم کہاں جائینگے؟''اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس! جانا ہے کہیں۔''وہ لاؤنج میں آ کھڑا ہوا۔نشمیہ بھی اُسکے پیچھے پیچھے آئی۔

''کیا ہم اسکول جا رہے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''اسکول؟ تم اسکول جاتی ہو؟''علی نے رک کر اُسے دیکھا۔

''ہاں!''زور وشور سے سر ہلایا۔

''نہیں ہم وہاں نہیں جارہے۔''

''لیکن مجھے تو اسکول جانا ہے، مجھے ٹیچر کو آج پویم (نظم) سنانی ہے۔''اُس نے ایک بار پھر ضد کی۔ علی نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، تیوری پر بل چڑھائے، بھنویں اچکائیں اور جھک کے اُسے دیکھا۔

''تم اسکول نہیں جارہی۔''اپنا حتمی فیصلہ سنادیا۔

چھوٹی چوزی نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے، بھنویں چڑھائیں اور سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''مجھے جانا ہے۔''اُس نے بھی اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

''کہانا! نہیں جانا۔۔۔''علی نے ڈپٹا۔اور بس! اُسکا رونا شروع۔

''یارب! صبر دے مجھے۔۔۔صبر دے۔''وہ ٹھیک ٹھاک کوفت کا شکار ہوا۔وہ غصّہ کرتا تھا تو وہ اُس سے زیادہ غصّہ کرتی تھی، وہ ڈانٹتا تھا تو محترمہ رونا شروع کردیتی تھیں۔

''مجھے کیا معلوم تم کون سے اسکول میں پڑھتی ہو؟''وہ ایک بار پھر جھنجھلایا۔

''مجھے نہیں پتہ، مجھے اسکول جانا ہے۔ورنہ ٹیچر مجھے ڈانٹیں گی۔''وہ روتی رہی۔

''اسکول کا بیگ ہے؟''ناچار وہ راضی ہوا۔

''ہاں!''جلدی سے سر ہلایا۔

''لیکر آؤ۔''وہ بھاگ کر گئی اور چند منٹ میں ہی بیگ لے آئی۔ علی نے اُسکا بیگ دیکھا تو، کتاب کے نام پر سوائے ایک ڈائری کے اور کچھ نہ تھا۔اُس نے آئی ڈی کارڈ نکال کر اسکول کا نام دیکھا۔گھر سے قریب ہی تھا، اوقات دس سے بارہ بجے تھے، اور ابھی سوا نو ہو رہے تھے۔

''کتابیں کہاں ہیں؟''

''ٹیچر کے پاس۔''

''صرف دو گھنٹے کیلئے اسکول جاتی ہو؟''علی کو اسکول کے اوقات دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟''بھلا اُسے گھنٹوں کا کیا معلوم؟اُسے تو بس یوٹیوب معلوم تھا۔

''چھوٹے بچوں کے یہی اوقات کار ہوتے ہیں۔''اس بار سفیر صاحب نے جواب دیا تھا۔

''یونیفارم ہے؟''علی نے پوچھا۔

''وہ بڑے والے بیگ میں ہے۔''اُس نے اپنے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

''جا کر نکالو،اور جلدی تیار ہو کر آؤ۔''اُسے حکم دیتا وہ صوفے پر جا بیٹھا۔

''کیسے نکالوں؟مجھ سے بیگ نہیں کھلتا۔''ایک اور مسئلہ بیان کیا۔

''رات کو کیسے نکالے تھے؟''وہ بھی چار سال کی بچی سے برابری سے لڑ رہا تھا۔

''وہ تو ابّا نے نکال کر دیئے تھے۔''اُس نے سفیر صاحب کی طرف اشارہ کیا،اُن دونوں کا قہقہہ بیساختہ تھا۔اُسکا سفیر صاحب کو ابّا کہنا اُنہیں مزا دے گیا،اور اس گھر کے در و دیوار نے ایک لمبے عرصے بعد دونوں باپ بیٹے کو اس طرح ہنستے ہوئے سنا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس بیچاری کو ہنسنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''کچھ نہیں!تم اپنے ابّا سے ہی یونیفارم نکلواؤ اور جلدی تیار ہو کر آؤ۔میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا۔''

''اوکے!''وہ بھاگتے ہوئے بیگ کے پاس گئی۔سفیر صاحب بھی اُسکے پیچھے ساتھ گئے۔

پورے پندرہ منٹ بعد وہ یونیفارم پہنے اُسکے سامنے تھی،بالوں کو جیسے تیسے کر کے کلپ لگا دی تھی۔

''آپ نے رات کو اسے کپڑے نکال کر دیے تھے؟''اُس نے سفیر صاحب کو مخاطب کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو جب یہ کھانے کے انتظار میں کچن میں تھی،تب آپ کہاں تھے؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''شاید میں نماز پڑھ رہا تھا۔''اُنہوں مختصراً جواب دیا۔

''ہمم۔۔۔''وہ سر ہلاتے باہر آیا۔اُسکا سامان گاڑی میں رکھا اور خود اسکو بھی۔سیٹ بیلٹ لگانے کی کوشش کی مگر محترمہ نے کھول دی۔وہ سر جھٹک کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔سارے راستے وہ کبھی سیٹ پر کھڑی ہو جاتی،کبھی بیٹھ جاتی،کبھی ڈیش بورڈ پر رکھی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی۔علی کو نہیں یاد کہ کبھی احمد نے اُسے اتنا تنگ کیا ہو،پتہ نہیں کیوں وہ بار بار احمد سے اُسکا موازنہ کرنے لگتا تھا؟

''اُترو!''اسکول کے سامنے گاڑی روکی اور اُتر کر اُسکی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔وہ اُتر گئی، پھر علی نے اُسکا بیگ اُسکے حوالے کیا۔

''آپ کون ہیں؟''دروازے پر کھڑا گارڈ علی کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''میں؟''اُسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا تعارف دے اپنا۔

''نشمیہ کو تو اُسکی والدہ ہمیشہ چھوڑنے آتی ہیں۔آپ کون ہیں؟''

''میں دراصل۔۔۔''

''یہ میرے بابا ہیں۔''اُس سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔وہ جہاں تھا،وہیں کھڑا رہ گیا۔کتنے سکون سے اُس نے علی کا تعارف اپنے باپ کے طور پر کروایا تھا؟ اُسکے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''اوہ اچھا اچھا۔۔۔تو واپسی پر بھی آپ ہی آئیں گے؟''گارڈ نے پوچھا تو علی نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ مطمئن ہوتا پیچھے ہٹ گیا۔

''بات سنو بچی!''گارڈ کے جانے کے بعد علی نے اُسکی طرف جھکتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''نشمیہ نام ہے میرا۔''اُسے باور کروایا۔

''جو بھی ہو۔''اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔''میں واپسی پر آؤں گا،اور تمہیں لیکر کہیں جاؤں گا۔مجھے کسی قسم کی کوئی ضد نہیں چاہیے۔اوکے؟''اُسے بھلا کہاں کچھ سمجھ آئی تھی۔جلدی جلدی سر ہلا کر اُسے یقین دلایا کہ کوئی ضد نہیں کریگی،اور فوراً اندر بھاگ گئی۔

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

---------+---------+--------

اُمید تو تھی کہ وہ اُسکے شادی پر نہ آنے پر ناراض ہو گی،لیکن جب اُس نے بھرپور خوش اخلاقی سے اُسکا استقبال کیا تو وہ حیران رہ گیا۔

''آج تو تم بڑے اچھے وقت پر آئے ہو،میں نے لزانیہ بنایا ہے،کھا کر جانا۔''مقدّس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے بنایا ہے تو ضرور کھاؤں گا۔''مسکراتے ہوئے کہتا وہ صوفے پر بیٹھا اور مکرم کو گود سے اتار کر اپنے برابر میں بٹھا دیا۔

''تمہیں پتہ ہے،تمہارے لڑکے نے تو میری ناک کٹوا دی شادی پر،جہاں کوئی لڑکی دیکھتا،اچھل اچھل کر اُسکی گود میں جانے کی ضد کرنے لگتا،اور جیسے ہی کوئی لڑکا اپنے پاس بلا لیتا،موصوف ایسا رونا شروع کرتے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔بہت دل پھینک ہے یہ۔''میز پر سامان لگاتی وہ مزے سے بتا رہی تھی۔

''ہاں بھئی ؟ایسا کیا تھا تم نے ؟''اُس نے اپنے برابر میں ٹکے مکرم کو دوبارہ گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

''اور نہیں تو کیا؟ابھی سے نظر رکھو اس پر، بہت رنگین مزاج ہے یہ۔''وہ بس مسکرا دیا۔

''لو! کھا کر بتاؤ کیسا لگا؟''گرم گرم لزانیہ کی پلیٹ اسکے حوالے کی۔ اُس نے پلیٹ لی۔صورت تو اچھی ہی نظر آ رہی تھی۔

''میں کیا سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ مکرم کو سامنے والے پارک لے جاؤں؟بہت سے بچے آتے ہیں کھیلنے، سارا دن میرا منہ دیکھ دیکھ کر بور ہو گیا ہے بیچارہ، اچھا ہے اپنی عمر کے بچوں میں بھی کھیل لے گ''

''ٹھیک ہے۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا بات ہے مقدّم ؟تم پریشان ہو؟''اُس نے یکدم ہی سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ٹھہر گیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر اتنا چپ چپ کیوں ہو؟''وہ اُسکی خاموشی کو نوٹ کر رہی تھی۔

''میں بس سوچ رہا تھا کہ۔۔۔''وہ رکا اور جانچتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''کہ ؟''

''تمہیں تو مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

''کس بات پر ؟''وہ حیران ہوئی۔

''تمہارے مدعو کرنے پر بھی میں شادی میں نہیں آ سکا۔''

''میں نے شکایت کی ؟''آنکھوں میں نرمی لیے سوال کرتی وہ اُسے حیران کر گئی۔

''نہیں ! لیکن میں نے تو غیر اخلاقی حرکت کی نا۔''

''تم مجھے اپنے نہ آنے کی وجہ بتا چکے تھے۔پھر غیر اخلاقی حرکت کیسے ہوئی ؟''اُسکے کھاتے سے سارے قصور نکال دیے۔

''آئی ایم سوری۔''اُسکے دل کو تسلی نہ ہوئی۔

''اچھا کیا تم نہیں آئے، پورا خاندان آیا تھا۔''وہ معافی مانگتا اچھا نہ لگا۔

''کیوں؟پورے خاندان نے میرے بارے میں کچھ کہا کیا؟''اُس نے خالی پلیٹ واپس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں تو بس ویسے ہی کہہ رہی تھی۔''وہ گڑبڑائی۔

''میں سمجھ گیا۔''وہ اُداسی سے مسکرادیا۔مقدّس کو افسوس ہوا،کیا ضرورت تھی بتانے کی؟

''ایک بات پوچھوں؟''اُس نے مقدّم کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے اجازت دی۔

''اگر میں سچ میں ناراض ہوتی تو؟''

''تو؟''وہ سمجھ نہیں سکا۔

''تو؟''بھنویں اچکا کر پوچھا،سوال میں نے کیا ہے جواب تم دو۔

''تو کیا؟معافی مانگ لیتا۔''

''کیوں؟''اس سوال پر وہ رک گیا۔

''کیوں؟''خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''معلوم نہیں!''کندھے اچکا کر کہا تو وہ مسکرائی۔

''میری ناراضگی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ پلیٹ سمیٹتے کہنے لگی۔

''ضرورت ہے۔''اُسکی زبان سے بے ساختہ پھسلا۔

''کیوں؟''اب کہ حیرت سے آنکھیں وا کیے پوچھا۔

''کیونکہ۔۔۔۔''اس کیوں کا جواب تو اُسکے پاس بھی نہیں تھا۔

''کیونکہ میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔''آہستگی سے کہا تو مقدّس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

''کیوں؟''مسکراتی آنکھوں سے پوچھا۔

''تمہارا کوٹہ پورا ہو گیا۔''لمحوں میں فسوں ٹوٹا۔

''ہیں؟''فوری طور پر وہ سمجھ نہ سکی۔

''کوٹہ پورا ہو گیا باقی سوال کل۔''وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ابھی بھی اُس فضول سے گیم کو کھیل رہے ہو؟''وہ چڑ گئی۔اپنا سوال ادھورا رہ جانے کا دکھ الگ تھا۔

''گیم نہیں! کوٹہ۔۔۔''اُسے باور کراتے دروازے تک آیا۔

''ہونہہ۔۔۔آئندہ میں بھی ایسے ہی کروں گی۔''اُسکے پیچھے آتی،وہ سچ میں ناراض ہو گئی۔

''لیکن میں تو سوال کرتا ہی نہیں۔''چہرے پر ڈھیروں معصومیت سجا کر کہا۔

''جاؤ جلدی! مجھے دروازہ بھی بند کرنا ہے۔''اُسے دروازے پر ٹکا دیکھ،لٹھ مار انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے،لیکن کیا اس بار میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟''مزید معصومیت سے اُسے دیکھا۔

''نہیں!''اُس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''صرف ایک۔۔''مسکراتے ہوئے درخواست کی۔

''پوچھو!''پھر سے لٹھ مار انداز میں کہا۔

''تم اتنا ناراض کس بات پر ہو رہی ہو؟سوال ہی تو تھا۔''اس سوال پر وہ ساکت سی رہ گئی۔

''اوکے! بعد میں ملتے ہیں۔''وہ مسکراہٹ ضبط کرتا باہر نکل گیا۔وہ ویسے ہی کھڑی رہی،اس بات کا تو واقعی کوئی جواب نہ تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھتے ایک نظر اُسے دیکھا پھر سر تک ہاتھ لیجا کر اُسے سلام کہا اور گاڑی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔

''بدتمیز!''ہمیشہ کی طرح اُسے خطاب دیتی،پیر پٹختی اندر چلی گئی۔

---------+---------+--------

کل رات بھر اُنہوں نے سائٹ پر کام کیا تھا،لہٰذا آج سارے آفس کو چھٹی دی تھی۔اسی لیے عمر بھی آج آفس میں نہ تھا۔وہ نشمیہ کو اسکول چھوڑ کر آفس ہی چلا آیا،اب خالی آفس میں اکیلے بیٹھے،کسی کاروباری میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔گھڑی صبح کے سوا دس بجا رہی تھی،اُس نے موبائل پر پونے بارہ بجے کا

الارم سیٹ کیا کہ کہیں نشمیہ کو اسکول سے لینا نہ بھول جائے۔ میگزین کے صفحے پلٹتے ایک جگہ آ کر اُسکے ہاتھ تھم گئے۔ آنکھوں میں امڈتی حیرت کے ساتھ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

آغا مقدّم شفیق کا انٹرویو چھپا تھا، صفحے پر اُسکی معتدد تصاویر تھیں۔ کہیں وہ اپنے آفس میں بیٹھا میز بان کے سوالات کے جوابات دیتا نظر آ رہا تھا، کہیں اپنی ٹیم کے ساتھ ''بزنس آف دی ایئر'' کا ایوارڈ لیے کھڑا تھا۔ درمیان میں اُسکا انٹرویو موجود تھا۔ یہ انٹرویو اُسکے کاروبار کو مسلسل تیسری بار ایوارڈ ملنے پر لیا گیا تھا۔

علی کو ایک انجانی سے خوشی محسوس ہوئی، ایک عجیب سا فخر۔۔۔

وہ دلچسپی سے اُسکا انٹرویو پڑھنے لگا، کاروبار کے حوالے سے اُسکا مشاہدہ، اُسکا تجربہ نہ صرف قابلِ ستائش تھے، بلکہ کافی کارآمد بھی تھے۔ علی کو نہیں یاد کہ اُس نے کبھی کسی کاروباری شخصیت کا انٹرویو اتنی دلجمعی سے پڑھا ہو۔ تقریباً تمام سوالات اُسکی جدوجہد، کاروباری سمجھ بوجھ اور اُسکی فرم کے حوالے سے تھے۔ آخر میں چند دوستانہ سے سوالات اُسکی ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی تھے۔

''آپ نے بزنس کی دنیا میں تو بڑا نام کما ہی لیا ہے، لیکن یہ بتائیے کہ ذاتی زندگی میں مقدّم کیسا ہے؟ ایسا ہی سنجیدہ سا یا ہنس مکھ اور شرارتی سا۔'' میز بان نے سوال کیا تھا۔

''شرارتیں کرنے کی اب عمر تو نہیں ہے بالکل بھی، البتہ ورک لائف (کاروباری زندگی) اور پرسنل لائف (ذاتی زندگی) میں فرق تو ہوتا ہی ہے۔'' اس نے بڑا نپا تلا جواب دیا تھا۔

''تو آپ شادی شدہ ہیں؟'' میز بان کا دوسرا سوال۔

''نہیں۔۔''

(لیلیٰ مر چکی ہے علی!۔۔۔)

''تو زندگی میں کوئی ہے؟ یا ورک لائف (کاروباری زندگی) نے اس طرف سوچنے کا موقع نہ دیا۔'' میز بان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس جواب پر مقدّم مسکرایا، میگزین میں تو یہی لکھا تھا۔ لیکن علی کو یقین نہیں تھا کہ وہ مسکرایا ہو گا۔

(لیلیٰ مر گئی تھی، اور میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا، جب تک ہوش آیا تب تک اُسکا سوئم بھی گزر چکا تھا)

''فلحال تو ایسا کچھ نہیں ہے، میرا سارا وقت فرم کی کامیابی کے لیے، مزید بہترین سے بہترین اسٹریٹیجیز پر کام کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ ابھی تو ہم نے بہت آگے جانا ہے۔ لہٰذا اسکے علاوہ اور کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں ہے۔''

(اُسکے بعد جتنی دوائیں مجھے ڈاکٹرز نے دی تھیں، وہ اتنی بھاری تھیں کہ میں چوبیس گھنٹوں میں سے چند گھنٹے جاگتا تھا باقی کے گھنٹوں میں چاہ کر بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ چلنے کے لیے قدم رکھتا تھا تو پاؤں لڑکھڑاتے تھے، بات کرتا تھا تو زبان ہکلاتی تھی۔)

مقدّم کا جواب اُس میزبان کے لیے تو عام سا ہوگا، لیکن علی جیسا انسان جو اُسے قریب سے جانتا تھا۔ اُسکے لیے یہ جواب عام نہ تھا۔ اس جواب میں پوشیدہ گہرائی میں وہ باآسانی اُتر رہا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا، وہ اپنا سارا وقت کاروبار کی ترقی میں نہیں، ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے لگا رہا تھا۔ اس سے زیادہ اُس سے نہ پڑھا گیا۔ اُس نے رسالہ بند کر دیا، پھر جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے جلا کر منہ سے لگائی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

کیا ہوا تھا لیلیٰ کو؟ ایسے اچانک کیسے مر گئی؟ اچانک مری یا کچھ اور؟ اُس نے اس ایک انسان کا والہانہ پن دیکھا تھا۔ ایک دور میں وہ دیوانوں کی سی محبت رکھتا تھا لیلیٰ سے، لگتا تھا کہ اگر وہ نہ ملی تو سچ میں مر جائیگا۔ اور آج؟ آج وہ زندہ تھا۔ زندگی نہیں رکتی کسی کے لیے، اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔ خود علی بھی تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ فاطمہ کے بغیر مر جائیگا۔ لیکن وہ زندہ تھا، فاطمہ تو کیا احمد بھی جا چکا تھا لیکن زندگی تب بھی چل رہی تھی۔ زندگی نہیں رکتی۔۔۔ کسی کے لیے نہیں رکتی۔۔۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ تین سگریٹ پی گیا تھا۔ کمرہ سارا دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

اُسکا موبائل بج اٹھا تو وہ چونکا، الارم چیخ چیخ کر پونے بارہ کا وقت بجا رہا تھا۔ اُس نے الارم بند کیا اور اپنا سامان لیکر اُٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی نہیں رکتی۔۔۔۔

اُسکی بھی نہیں رکی تھی۔۔۔

---------+---------+--------

''وہ بچی میرے ساتھ آئی تھی ناصبح؟'' اسکول کے دروازے پر کھڑا وہ گارڈ کو بتا رہا تھا۔

''جی جی! مجھے یاد ہے، نشمیہ کی بات کر رہے ہیں آپ۔'' وہ سمجھ کر سر ہلاتا واپس اسکول کے دروازے پر گیا۔ علی اب تک نشمیہ کو اُسکے نام سے مخاطب نہیں کر سکا تھا۔

''مس! نشمیہ علی کو بھیج دیں'' گارڈ نے ٹیچر کو مخاطب کیا تو وہ ششدر کھڑا رہ گیا۔ نشمیہ علی؟ اُسکا نام نشمیہ علی تھا؟ فاطمہ نے یہ کیوں کیا تھا؟ کس لیے؟ تین سال اُسکے دوسرے شوہر کے ساتھ رہ کر بھی وہ بچی اُسے باپ کیوں کہہ رہی تھی؟ علی کا خون کھولنے لگا پر اُس نے ضبط کیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اچھلتی کودتی اُسکے سامنے آئی۔

''میں آگئی۔'' آتے ساتھ ہی اپنے آنے کی اطلاع بھی دے دی۔ علی نے بنا کچھ کہے دروازہ کھولا اور اُسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میرا بیگ؟''بھلا بیگ کے ساتھ کیسے اندر بیٹھوں؟اُس نے بیزار سی شکل بنا کر اُسکا بیگ اُتارا۔وہ چڑھ کر اندر بیٹھ گئی۔اُس نے اُسکا بیگ پیچھے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر گھوم کر اپنی طرف آ بیٹھا۔

اب اسکا رخ بلڈ ٹیسٹنگ لیب کی جانب تھا۔شہر کی مشہور و معروف لیب کے آگے گاڑی روک کر اُس نے نشمیہ کو اتارا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''اُسکا پہلا سوال۔

''ہے ایک جگہ،تم بس چپ کر کے اندر چلو۔''اُسے اپنے ساتھ لیکر اندر آیا اور انتظار گاہ میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا دیا۔

''السلام علیکم!''کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے کو مخاطب کیا۔

''وعلیکم السلام!کیا مدد کر سکتے ہیں آپکی؟''اُس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''مجھے ڈی این اے،فیٹر نٹی ٹیسٹ کروانا ہے۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''اور بچہ؟''اُس نے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ بچی ہے۔''پیچھے مڑ کر اشارہ کیا اور دھک سے رہ گیا۔نشمیہ وہاں نہیں تھی۔

''یہ کہاں گئی؟''پریشانی سے یہاں وہاں دیکھا،وہ قریب رکھے ایکویریم کے پاس کھڑی نظر آئی تو اُس نے سکون کا سانس خارج کیا،پھر غصّے سے اُسکے پاس آیا۔

''میں نے تمہیں وہاں بٹھایا تھا نہ؟''اُسکے سر پر جا کے پوچھا۔

''یہ دیکھیں،کتنی ساری فش(مچھلی)ہیں؟''اُس نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔وہ کیسے بھول گیا تھا کہ وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والی مخلوق نہیں تھی۔اُسے بازو سے پکڑ کر کاؤنٹر تک لایا۔

''یہ ہے بچی۔۔۔''

''ٹھیک ہے!آپ اندر آ جائیں۔''وہ اُسے لیے اندر گیا۔جہاں ٹیسٹ کے لیے نمونے لیے جاتے تھے۔

''آپ ڈاکٹر ہیں؟''وہ اپنی آستین بازو تک پیچھے کر رہا تھا تاکہ خون دے سکے،پاس کھڑا اسسٹنٹ تمام چیزیں سیٹ کر کے رکھ رہا تھا،جب نشمیہ نے اُسکے سفید اوورال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔''اسسٹنٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہم ہاسپٹل آئے ہیں؟''دوسرا سوال علی کے لیے تھا۔

''کیا تم کچھ دیر کے لیے خاموش رہ سکتی ہو؟''اُس نے پوچھا

''نہ۔۔''نفی میں سر ہلایا تو علی نے اپنا غصّہ جبکہ اسسٹنٹ نے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ علی کے نمونے لینے کے بعد اُسکی باری آئی۔ انجکشن کی سوئی دیکھ کر ہی اُس نے وہ وبال مچایا کہ بیچارہ اسسٹنٹ بھی گھبرا گیا۔

''ایسا کرتے ہیں، ہم اُسکے لعاب کے نمونے لے لیتے ہیں۔ وہ زیادہ آسان ہو گا۔''اسسٹنٹ نے حل پیش کیا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ وہ بھی کرنے دے گی۔''علی نے بے چارگی سے کہا۔

''نشمیہ! پیاری سی گڑیا!''اسسٹنٹ نے اُسے پیار سے مخاطب کیا تو پیاری سی گڑیا سرخ ہو گئی۔

''آپ لولی پاپ کھائیں گی؟''اُس نے فوراً سے سر ہلایا۔ بھلا لولی پاپ بھی کوئی منع کرنے والی شے تھی؟

''چلو پھر آنکھیں بند کر کے منہ کھولو۔''اسسٹنٹ نے کہا۔

''میں آنکھیں نہیں بند کروں گی۔''وہ ایک بار پھر بَھپر گئی۔

''کیوں؟''

''آپ آنکھیں بند کر کے سوئی لگا دیں گے۔''اسسٹنٹ تو حیران ہی رہ گیا۔ علی فرصت سے سینے پر ہاتھ باندھے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھگت لیا، اب تمہاری باری۔۔۔

''اچھا! آنکھیں بند نہ کرو، ایسے ہی منہ کھول لو۔''اُس نے حل پیش کیا، اس پر وہ راضی ہو گئی۔

''آں۔۔۔''اُس نے بڑا سا منہ کھولا تو پہلے اسسٹنٹ نے جلدی سے ایک اسٹیک نما چیز پر روئی لگا کر اُسکے منہ میں ڈالی اور اُسکا لعاب لے لیا۔

''لولی پاپ؟''چوزی کو اُسکا کھانا نہیں ملا۔ اس سے پہلے کو وہ مزید وبال کھڑا کرتی، اسسٹنٹ نے اُسے واقعی لولی پاپ پکڑا دی۔

''یہ رپورٹ کتنے دنوں میں آجائے گی؟''ساری کاروائی مکمل ہونے کے بعد علی نے اس سے پوچھا۔

''سر! سات سے دس دن۔۔۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں، کیا مجھے کل پرسوں میں نہیں مل سکتی؟''

''آپ ارجنٹ چاہتے ہیں تو بھی تین دن لگیں گے۔اُس سے کم نہیں۔۔۔''

''ٹھیک ہے! ارجنٹ کر دیں۔''اُس نے نقد رقم جمع کرواتے ہوئے کہا، پھر باہر آ گیا۔

گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے اُسکا موبائل بجا۔اُس نے سکرین کھولی تو واٹس ایپ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ کسی نے گروپ بنایا ہے اور اُسے بھی اُس گروپ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اُسکے علاوہ پانچ میمبر تھے اُس گروپ کے، ایک تو عمر کا نمبر تھا،، باقی چاروں نمبر اُسکے پاس محفوظ نہ تھے البتہ پروفائل پر سب کے نام واضح تھے، گروپ ایڈمن کی پروفائل پر نوید عالم کا نام لکھا تھا۔وہ حیران ہوا، نوید کا نمبر پچھلے دنوں عمر نے اُسے بھیجا تھا، اُس نے محفوظ کر لیا تھا پر بات نہ ہو سکی۔پر اب جس نمبر سے گروپ بنایا گیا تھا یہ وہ نہ تھا۔ گروپ کا نام **مائیکل کیس** تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اس گروپ کا مقصد سمجھتا، وہاں نوید کا ایک تصویری پیغام موصول ہوا۔

اُس نے تصویر کھولی، ایک مردہ شخص، جسکے سر سے خون بہہ رہا تھا اپنے پلنگ پر پڑا ہوا نظر آیا۔لیکن اُسکے ہوش نیچے لکھے میسیج نے اڑائے تھے۔

''مائیکل مر چکا ہے''

---------+---------+--------

دسواں باب

روگ

''پورے علاقے کی چھان بین کرو، سوسائٹی کے دروازوں پر ناکہ لگادو۔اِس علاقے میں جتنے سی سی ٹی وی کیمرے موجود ہیں اُنکا ڈیٹا نکالو۔فوراً۔۔۔''نوید ہدایات پر ہدایات دے رہا تھا۔اُسکے ساتھ آئی نفری اب تیزی سے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔مائیکل عرف فرمان کی لاش سامنے رکھی تھی۔اُسکے سر پر کوئی بھاری شے مار کر اُسے قتل کیا گیا تھا۔

''لاش کا کیا کرنا ہے؟''فیصل نے پاس آتے ہوئے پوچھا تھا۔وہ صبح فجر ہونے سے کچھ دیر قبل یہاں آئے تھے۔اب اِس بات کو بھی چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ سورج پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا۔

''فرانزک ٹیم کو بلا لیا ہے۔لاش وہی لیں گے۔''نوید نے جواب دیا۔اِس وقت حقیقتاً اُسکے اعصاب بھی شل ہو چکے تھے۔اِس نوعیت کا کیس اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔اُنکا دشمن اُن سے کہیں زیادہ شاطر تھا۔

''یہ معاملہ تو دن بہ دن مزید پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ہم اب اصل مجرم تک کیسے پہنچیں گے؟''شیراز بھی پریشان تھا۔

''ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرے گا۔ہمیں اُسکی غلطی کو ڈھونڈنا ہے۔''نوید نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

''فرّخ صاحب کو خبر کرنی ہے؟''فیصل نے پوچھا۔

''میں نے کر دی ہے،اُنہوں نے کہا کہ باقی پانچوں کو بھی اِس واقعے کی اطلاع ملنی چاہیے۔مجھے اُنہیں فوراً مطلع کرنے کا حکم دیا ہے۔''

''تو آپ نے بتایا؟''

''نہیں! کچھ دیر میں بتادوں گا سب کو۔۔۔''اُس نے سر ہلایا۔

''اِس طرح تو وہ لوگ ڈر نہیں جائینگے؟''شیراز کو فوراً اطلاع کرنے والی بات سمجھ نہ آئی۔

''میں نہیں جانتا،مجھے اُنہوں نے جو کرنے کو کہا وہ میں کر دونگا۔اور ویسے بھی،ڈرنے کا وقت اب گزر چکا ہے۔''اُسکے چہرے کے تاثرات اب بھی سخت تھے۔

''تم نے عاصم والے کیس کی فائل کھلوائی؟''اُس نے شیراز کو مخاطب کیا۔

''ساری چھان بین کرلی ہے۔اُسکی موت دل کے بند ہو جانے سے ہوئی تھی اور یہی بات تمام سرکاری کاغذات میں موجود ہے۔اُسکے علاوہ وہ جب تک جیل میں رہا سوائے اُسکے وکیل کے کوئی اُس سے ملنے نہیں آتا تھا۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''اور تم نے اِس بات پر یقین کر لیا؟''نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہر گز نہیں! لیکن ہمارے پاس نہ کوئی واضح دلیل ہے نہ ہی ثبوت۔''شیراز کے جواب پر وہ خاموش رہا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ خلیل اور مائیکل کی موت جتنی پراسرار ہے، اُتنی ہی عاصم کی بھی ہے۔''فیصل نے شیراز کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اِنکا آپس میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟''شیراز نے پوچھا۔

''کچھ تو ہے، جو ہم نظر انداز کر رہے ہیں، یا پھر کچھ ایسا جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔''نوید سنجیدگی سے کہتے لاش کا معائنہ کرنے جھک گیا۔

نہ معلوم اب کیا ہونے والا تھا؟

---------+---------+--------

علی کتنی ہی دیر ساکت بیٹھا رہا تھا۔وہ اچھے سے جانتا تھا کہ مائیکل وہ آخری سیڑھی تھا، جو اُنہیں مجرم تک پہنچا سکتا تھا۔

پر اب؟اِس اب کے آگے ایک نہ نظر میں آنے والی گہری کھائی تھی۔اب ایف آئی اے کی طرف سے کسی بھی دن اُنہیں بلایا جانا تھا۔ذہنی طور پر وہ تیار تھا، لیکن آخر کون اُنکی تصاویر دس سال سے جمع کر رہا تھا؟

ایک آخری کوشش۔۔۔مائیکل تک پہنچنے کی، اگر وہ ہاتھ نہ آیا تو پھر ہمارے پاس ایک پلان بی ہے۔کسی بھی ناگزیر صورتحال میں اس منصوبے پر عمل کیا جائیگا۔لیکن فلحال یہ منصوبہ اِس وقت کی ضرورت نہیں ہے۔

ایف آئی اے کے دفتر میں ہوئی آخری ملاقات میں فرخ صاحب نے کچھ کہا تھا۔اُسے یاد آیا۔وہ کسی پلان بی کی بات کر رہے تھے۔دل کو یک گونہ تسلی ہوئی کہ وہ لوگ ہر ممکن طریقے سے اِس کیس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔

''بابا!''وہ خیالوں میں گم گاڑی چلا رہا تھا کہ جب کسی نے اُسے پکارا۔ایک لمحے کو اُسے لگا کہ احمد ہے۔

''بابا!''اُس نے دوبارہ کہا تو علی کے پاؤں یکدم ہی بریک پر پڑے اور چڑ کی آواز کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ اُس نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے برابر بیٹھی نشمیہ کو دیکھا۔وہ اُسے ہی پکار رہی تھی، باہر کی طرف اشارہ کر رہی تھی، اُسے کچھ دکھا رہی تھی۔پر وہ نہ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔

ساکت، جامد۔۔۔یک ٹک۔۔۔اُسے دیکھتا۔۔۔۔بے یقین ہوتا۔۔بے قرار ہوتا۔

''آپ سن کیوں نہیں رہے؟''اُسے مسلسل پکارتی نشمیہ بے زار ہوئی۔

''تم نے مجھے کیا کہا؟''وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھا۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ باہر دیکھیں کتنے پیارے۔۔۔''وہ کچھ اور بتانے لگی تھی۔

''تم نے مجھے بابا کہا؟''اُس نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں؟''زور وشور سے سر ہلایا گیا۔

''کیوں؟''

''میری امی نے کہا تھا کہ آپ میرے بابا ہیں۔''اور اگلے ہی لمحے وہ ہوش میں آیا۔وہ فاطمہ کی بیٹی تھی۔وہ کیسے بھول گیا کہ وہ اُسکے خلاف سازش کر رہی ہے؟

''میں تمہارا بابا نہیں ہوں۔ سمجھ آئی؟''غصے کا اُبال اُٹھا تھا اُسکے اندر۔

''تو پھر میں آپکو کیا کہوں؟''دونوں ہتھیلیاں سامنے کر کے ہاتھ نچانچا کر پوچھا۔

''علی کہو مجھے۔''دانت پیستے ہوئے کہا۔

''بڑوں کا نام نہیں لیتے۔''سمجھ داری سے بتایا۔

''جو بھی کہو،بس بابا مت کہو مجھے۔''وہ جھنجھلایا۔

''اُف!''چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچیں۔ علی نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔

''آپ میرا نام کیوں نہیں لیتے؟''ایک اور سوال،وہ حیران ہوا۔اتنی سی بچی نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ چاہ کر بھی اُسکا نام نہیں لے پاتا تھا۔ اُس نے جواب نہیں دیا۔

''میری دوست بھی میرا نام نہیں لیتی،میرا نام مشکل ہے نا!''اُسکو یہی وجہ سمجھ آئی۔وہ اب بھی خاموش رہا۔

''اوہ! یاد آیا۔''وہ اچھل کر سیٹ پر کھڑی ہو گئی۔اُس نے کوفت سے اُسے دیکھا۔

''آپ میرا نِک نیم (چھوٹا نام) لے لیں۔ مجھے سب پیار سے نشمی کہتے ہیں۔ میری دوست بھی یہی کہتی ہے۔'' وہ پُر جوش سی کہہ رہی تھی۔

''تم خاموش بیٹھ سکتی ہو؟'' اُس نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔'' اب تو اُسے علی کے غصّے سے بھی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

''اوہ! گول گپّے۔'' وہ دوبارہ چیخی۔

''وہ دیکھیں! گول گپّے، مجھے کھانے ہیں۔'' اُس نے خوشی خوشی کہا۔ اُس نے لب بھینچے، کوئی یاد ذہن میں آسمائی تھی۔

''بالکل نہیں! گلا خراب ہو جائیگا۔'' اُس نے آنکھیں دکھائیں۔

''نہیں ہوتا، میں کھاتی ہوں۔'' اُس نے یقین دلانا چاہا۔

''نہیں۔۔۔'' وہ بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ گول گپّے والا پیچھے رہ گیا۔

''آپ نے کہا تھا، آپ دوپہر کو میری پسند کا لنچ دیں گے۔'' وہ غصّے سے چیخ اُٹھی۔

''کہا نا نہیں۔۔۔'' اِس بار وہ دھاڑا تھا۔ نشمیہ سہم گئی۔ آنکھوں میں یکدم ہی آنسو بھر گئے، لب بھینچ گئے۔ اور وہ چپ کر کے بیٹھ گئی۔ علی نے اُسے مڑ کر دیکھا، وہ اِس بار دھاڑے مار کر رونے کی بجائے خاموشی سے سسک رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو امڈ امڈ کر باہر آ رہے تھے۔

''یار!۔۔۔'' جھنجھلا کر گاڑی روکتے، سر سیٹ کی پشت پر پٹخا۔

اور کچھ ہی دیر بعد۔۔۔

وہ سینے پر بازو باندھے، اُسے دیکھ کم گھور زیادہ رہا تھا۔ بیٹھنے کی کہیں جگہ تو تھی نہ، لہذا اُس نے اُسے گاڑی کے بونٹ پر ہی بٹھا دیا تھا۔ اب وہ اپنے برابر میں پلیٹ رکھے مزے سے گول گپّے کھا رہی تھی۔

''مجھے تو بڑا کہہ رہی تھی کہ کوک نہیں پینی چاہیے، یہ تو جیسے بڑی صحت مند غذا ہے نا؟'' اُس نے چڑ کر کہا، سامنے والی نے بھی بڑی فرصت سے نظر انداز کیا تھا۔ ایک تو وہ اُس سے بات کرتے ہوئے، پتہ نہیں کیوں بھول جاتا تھا کہ وہ ایک بچی ہے۔ فقط ایک چار سال کی چھوٹی بچی۔۔۔

''آپ بھی کھائیں۔'' بڑی فراخ دلی سے اُسکی جانب بھی اپنا من پسند کھانا بڑھایا۔ جواباً اُس نے گھورا تو وہ ''اوکے'' کہہ کر دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گئی۔

''ہمم۔۔۔مزے کا ہے۔''چھوٹے سے منہ میں گول گپّہ ٹھونسے،وہ انگوٹھے اور اُنگلی کی مدد سے پسندیدگی کا نشان بنا رہی تھی۔ علی تھم گیا۔اُسکی یہ ادا بالکل اُسکی ماں جیسی تھی۔چار سال میں وہ اُسے بھلانے کی ہر کوشش میں ناکام ہوا تھا۔وہ اُسکی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی،وہی آخری تھی اور وہی واحد تھی۔ کبھی اِن راستوں پر چل کر وہ فاطمہ کے ساتھ ایسے ہی گول گپّے کھایا کرتا تھا۔

''بس کردو! ختم کرواِسے جلدی۔''یادوں سے پیچھا چھڑانے کا واحد حل اُسے ہی خاموش کروانا تھا،جواِس یاد کا سبب بن رہی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی ڈھیٹ تھی۔اُسے نظرانداز کئے کھانے میں مشغول رہی۔

''دوادھر!''اُسکے ہاتھ سے پلیٹ چھینتے ہوئے ٹھیلے والے کو واپس کی۔اور اُسے گاڑی سے نیچے اُتار کر کھڑا کیا۔ اِس بار وہ خوشی خوشی خود ہی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔وہ بس اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

---------+---------+--------

گھر کے سامنے گاڑی روکے اُس نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔دن کے بارہ بج چکے تھے،موبائل اُٹھا کر پہلی فرصت میں ایک واٹس ایپ گروپ بنایا اور فرمان کی موت کی خبر اُس میں ڈال کر موبائل مکمل بند کر دیا۔وہ اُنکے سوالات کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔یہ حکم فرخ صاحب کا تھا تو اب وہی اُنکے سوالوں کے جواب دیں۔

گاڑی بند کر کے،وہ گھر میں داخل ہوا۔سامنے بشریٰ کچن میں کچھ کرتی نظر آ رہی تھی۔اُس نے خاموشی سے،شرٹ کی جیب سے اپنا دوسرا موبائل نکالا اور اُسے وائبریشن پر لگا دیا۔یہ موبائل اُسکے دفتری کاموں کے لئے تھا،گھر سے باہر ہر شخص کے پاس اُسکا یہی نمبر موجود تھا،لیکن نہ جانے کیوں اُس نے آج واٹس ایپ گروپ اپنے ذاتی نمبر سے بنا دیا تھا۔ایسا اُس نے دانستہ نہیں کیا تھا۔

خیر اب تو یہ ہو گیا تھا،لہٰذا ایک موبائل کو بند کئے،دوسرے کو وائبریشن پر ڈالے وہ کچن کی طرف بڑھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے مسلسل ڈیوٹی پر رہنے کے بعد وہ آج کا دن بشریٰ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''اُسکے پیچھے آ کر آہستہ سے پکارا۔

''تم؟''اُس نے پورا گھوم کر دیکھا۔

''جی میں!''مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہاں تھے اب تک؟''کمر پر ہاتھ رکھے دوسرے ہاتھ میں کفگیر پکڑے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''خادم نے آپکو بتاتو دیا تھا کہ دیر سے آئیگا۔''دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اُس نے جھک کر ادب سے کہا۔ مگر وہ ہنوز گھورتی رہی۔

''خادم نے یہ نہیں کہا تھا کہ پورے چوبیس گھنٹے بعد گھر آئیگا۔''وہ چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔نوید کے سوا چھے فٹ سے نکلتے ہوئے قد کے آگے وہ بہت چھوٹی لگتی تھی،حالانکہ قد اُسکا بھی اچھا تھا۔

''خادم سزا بھگتنے کو تیار ہے۔''سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔کوئی دیکھ لیتا تو غش کھا کر گر پڑتا۔وہ سختی جو اُسکے چہرے کا خاصہ تھی،بشریٰ کے سامنے نرمی میں بدل جاتی تھی۔

''ناشتہ نہیں ملے گا تمہیں۔''ناراضگی سے کہتی سامنے سے ہٹ گئی۔

''میں ناشتہ کر چکا ہوں۔''منہ چڑاتی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے اُسکے پیچھے آیا۔وہ ناراضگی سے کام میں مصروف رہی۔ نوید نے چولہے پر رکھے پتیلے کا ڈھکن اُٹھایا۔

''بریانی؟تم نے بنائی؟''خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''نہیں میرے فرشتوں نے بنائی۔''چڑ کر کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''تھینکس۔۔۔''وہ آہستہ سے بولا،تو اُس نے ناراضگی سے دیکھا۔

''پتہ ہے پورا دن انتظار کیا تھا میں نے۔۔۔''اب وہ شکایت کرنے لگی۔

''سوری!''اُس نے جواب دیا۔

''رات کے کھانے پر بھی انتظار کیا،پر تم نہ آئے۔''

''سوری۔''

''ناشتہ پر بھی انتظار کیا میں نے۔''

''سوری۔''

''ہونہہ۔۔۔''مزید ناراضگی دکھائی۔

''اب دوپہر کا کھانا کھالو میرے ساتھ۔''مسکینیت بھری التجا کی تو وہ چند لمحے گھورتی رہی پھر ہنس دی۔

''میں لگاتی ہوں تم بیٹھو۔''اُس نے کہا، پھر ملازمہ کو آواز دینے لگی۔

''جی باجی!''وہ دوڑی دوڑی آئی۔

''تم بچوں کے پاس ہی ہو نا؟''

''ہاں باجی! وہ کھیل رہے ہیں۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے تم اُن کے پاس ہی رہو، ورنہ وہ چیزیں اُٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں۔''وہ جی اچھا کہتی واپس چلی گئی۔

''صورت تو بہت بھلی نظر آرہی ہے اِس کی۔''نوید نے پلیٹ میں نکلی بریانی دیکھتے ہوئے کہا۔

''سیرت بھی اچھی ہے۔''اُس نے ساتھ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہاری طرح؟''اُس نے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

''نوید!''پھر اُس نے اچانک ہی پکارا۔

''ہوں؟''چاول کا چمچ منہ میں ڈالتے سر کے اشارے سے پوچھا۔

''تم ایک کام کر دو گے۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''آپ حکم کریں۔''رغبت سے کھاتے ہوئے جواب دیا۔ کھانا واقعی مزے کا تھا۔

''وہ۔۔۔مجھے۔۔۔''وہ رکی۔''مجھے بچے یاد آرہے ہیں۔ تم مجھے اُنکے پاس لے جاؤ۔''نوالہ نوید کے گلے میں اٹکا، وہ اُسکا مطالبہ سمجھتا تھا۔

''صرف تھوڑی دیر کے لئے۔''اُس نے التجا کی کہ کہیں وہ منع نہ کر دے۔ اُس نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ سارے کھانے کا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔

''دیکھو! میں تمہارے منع کرنے کے بعد دوبارہ نہیں گئی۔''وہ منت پر اُتر آئی۔

''بشریٰ! میں تھک گیا ہوں آج، آرام کرنا چاہتا ہوں۔''آخری بار قبرستان جانے پر اُسکی حالت کافی خراب ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اُسکی اجازت لے رہی تھی، یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

''ٹھیک ہے۔''وہ مایوس ہوئی۔ نوید نے اُسے غور سے دیکھا، وہ اداس ہو چکی تھی۔

''میں تمہیں کل لے جاؤں گا۔''تھک کر ہار مان لی۔

''کیا سچ میں ؟''وہ خوش ہوئی۔

''ہاں !''اُس نے گم صم سے لہجے میں کہا۔

''تم بہت اچھے ہو نوید !''وہ چہک اُٹھی۔وہ اُداسی سے مسکرا دیا۔

''بچوں کی آواز آرہی ہے شاید۔''اُس نے اچانک ہی کہا۔

''نہیں تو۔۔۔''نوید کو واقعی آواز نہیں آئی تھی۔

''نہیں !آرہی ہے۔میں دیکھ کر آتی ہوں۔''وہ کہتی ہوئی کھڑی ہوئی اور بچوں کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔اُسکے جاتے ہی نوید نے جیب سے اپنا وہ موبائل جسے وہ وائبریشن پر لگا چکا تھا، باہر نکالا۔پھر واٹس ایپ کھولے کوئی نمبر تلاشا، مطلوبہ نمبر مل جانے پر اُسکی چیٹ کھولے کچھ دیر سوچتا رہا۔کمرے سے بشریٰ کی آواز آرہی تھی، وہ بچوں کو کچھ کہہ رہی تھی شاید۔

''سلام !آپ نے کہا تھا کہ بشریٰ کی حالت میں کوئی تبدیلی آئے تو بتانا۔تو پچھلے تین ہفتوں سے۔۔۔''وہ بشریٰ کے ڈاکٹر کو اُسکی موجودہ حالت لکھ کر دے رہا تھا۔میسج مکمل ہونے کے بعد اُس نے موبائل واپس رکھ دیا۔

''تم بہت اچھے ہو نوید !''اُسکی آواز کانوں میں گونجی تو زمانے بھر کی تھکن وجود میں سما گئی۔کرب سے آنکھیں میچتے اُس نے کرسی کی پشت پر سر گرا دیا۔

---------+---------+--------

نوید کا کیا گیا میسج سب ہی کو موصول ہوا تھا۔البتہ جواب کسی نے نہیں دیا تھا۔وہ صدمے اور بے یقینی کا شکار تھے۔سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے ؟

رضا کو باقی سب کے جواب نہ دینے کی وجہ معلوم نہ تھی، البتہ خود اُس نے میسج کا جواب اِس لئے نہیں دیا کہ وہ جانتا تھا کہ اُسے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملنے والا، ابھی تو وہ خود قتل کی وجہ تلاشنے میں مصروف ہوں گے۔جب وجہ مل جائیگی تو یقیناً انہیں مطلع کرنے کیلئے ملاقات رکھ لی جائیگی۔اُس نے موبائل واپس رکھ دیا۔

نیلی جینز پر پوری آستینوں والی کریم رنگ کی ٹی شرٹ پہنے، وہ لان میں اکیلا بیٹھا تھا۔کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے، اُس پر سر رکھے، نگاہیں آسمان پر ٹکی تھیں۔سردی مکمل ختم ہو چکی تھی۔لیکن موسم اچھا تھا۔

پتہ نہیں علی کیسا ہو گا؟ دل میں اچانک خیال آیا۔ پتہ نہیں کیوں آیا؟ اس خیال پر وہ خود بھی حیران ہوا۔ آخری بار اُس سے جھگڑا ہوا تھا، اُس سے پچھلی بار بھی اور سے پچھلی بار بھی۔

رضا کو یکدم ہی احساس ہوا کہ اُسکے اور علی کے معاملات کافی حد تک پیچیدہ ہو چکے تھے۔ وہ دونوں جب ملتے تھے، سوائے جھگڑنے کے اور کچھ نہیں کرتے۔ وہ دونوں یا تو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرنا چاہتے، یا پھر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے بغض بھر گیا تھا۔

رضا؟ وہ پہلے خود کو تو سنبھال لے۔

دماغ نے یاد دلایا کہ غلطی علی کی تھی۔ ''پر میں نے بھی تو اُسکے کردار کو نشانہ بنایا تھا۔'' دل نے تردید کر دی۔ نگاہیں ہنوز آسمان پر ٹکائے، وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔

اُسے مقدم یاد آیا۔ چہرے پر مسکراہٹ آئی، کوئی بھولی بھٹکی سی۔۔۔ گمشدہ سی۔۔۔ اداس مسکراہٹ۔ اسکی بار بار پھڑکنے والی حس مزاح یاد آئی۔ اُسکی لیلیٰ کے لئے دیوانگی یاد آئی۔ اُس نے یہ صدمہ کیسے برداشت کر لیا تھا بھلا؟ اور وہ اُس رات کہاں گیا تھا؟ وہ اتنے عرصے نگاہوں سے اوجھل کیوں رہا تھا؟ اُسے عمر یاد آیا۔ انجان رات میں اُسکے دکھوں پر اُسکے ساتھ رونے والا وہ مہربان شخص یاد آیا۔ اور وہ آج بھی ایسا ہی تھا، دوسروں کا سوچنے والا۔ وہ باہر کیوں چلا گیا تھا؟ اُس نے یکدم ہی یہ فیصلہ کیوں لیا تھا؟

وہاں تنہا بیٹھے اُسے اپنا ہر دوست یاد آیا تھا۔ ہاں! اُسکے دوست۔۔۔ انکے ساتھ گزارے لمحے یاد آئے، وہ فکروں سے آزاد محفلیں یاد آئیں۔ اور پورے دس سالوں میں آج رضا کا شدت سے دل کیا کہ اُسکے دوست پھر سے اکھٹے ہو جائیں، پھر سے وہی محفلیں سجائیں، پھر سے اپنی حس مزاح سے ہر محفل کشت زعفران بنائیں۔ اپنے دل کی اِس خواہش پر وہ حیران رہ گیا۔

اُسے ہر دم مسکرانے والا نوید آیا۔ کل رات اُسکا کیا گیا تشدد یاد آیا۔ وہ یاد آیا تو ساتھ میں اُسکی بہن بھی یاد آ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

چہرہ گھما کر آس پاس دیکھا، وہ کمرے کی کھڑکی سے اندر بیٹھی، بچوں کو پڑھاتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور اندر چلا آیا۔ کمرے کے دروازے پر کمر ٹکائے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا ہو گیا۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں، کندھوں کے گرد پرپل رنگ کی کشمیری کڑھائی والی چادر لپیٹے وہ آج اُسے مکمل نظر انداز کر رہی تھی۔ رضا نے بے ساختہ امڈتی مسکراہٹ ضبط کی۔

''آج کا موضوع مکمل ہو گیا، اگر کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا ہو، تو مجھ سے پوچھ سکتا ہے۔'' اُس نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا، پر اُنہیں کچھ نہیں پوچھنا تھا۔

''اب ہم لان میں کھیل سکتے ہیں؟'' مومنہ نے پوچھا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟'' مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ بچے خوشی سے اچھلتے کودتے جانے لگے۔ کتابیں وغیرہ سمیٹ کر وہ مڑی تو اُسے سر پر کھڑا پایا۔

''تم نے کہا کہ کچھ سمجھ نہ آئے تو پوچھ لو۔مجھے کچھ۔۔۔بلکہ بہت کچھ سمجھ نہیں آرہا۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟''آنکھوں میں شرارت سموئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔۔''مختصر جواب دیتی،اُسکے برابر سے ہوتی باہر نکلی۔وہ بھی فرصت سے اُسکے پیچھے پیچھے آیا۔بچوں کو پڑھانے کے بعد وہ روزانہ اِس وقت چائے پیتی تھی۔کبھی عائشہ جی اُسے بنا کر دے دیتیں،کبھی وہ خود بنا لیتی۔آج بھی وہ خود ہی کچن میں چلی آئی تھی۔اور جناب دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکائے اُسکے سامنے۔

''چائے مل سکتی ہے۔''ہاتھوں کی مٹھی بنائے،اُس پر چہرہ ٹکائے،اُس سے فرمائش کی۔آج کل ہر شے اچھی لگنے لگی تھی۔

''بنا رہی ہوں۔''وہ مختصر جواب دیتی کام میں مشغول رہی۔

''میں اُن پولیس والوں کو اچھا سبق سکھانے کا ارادہ رکھتا تھا،لیکن میری غلطی کہ یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔''اُس کی بے وقت وضاحت پر جزانے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔خفگی سے۔۔۔ناراضگی سے۔۔۔۔

''اتنی غیر اہم بات تھی تمہارے لئے کہ بھول گئے۔''وہ جو اُسکی خفا نظروں میں اپنی بات،اپنا حال،اپنا آپ سب بھلا بیٹھا تھا،چونک اٹھا۔

''مطلب؟''سماعتوں کو یہ یقین کرنے میں وقت لگا کہ وہ شکوہ کر رہی تھی۔اُس سے۔۔۔رضا الٰہی سے۔۔۔وہ جسے کوئی اپنا نہیں سمجھتا تھا،وہ جو خود کو ان چاہا وجود سمجھتا تھا۔وہ جس نے بچوں میں اپنی دنیا بسا کر خود کو دنیا سے لاتعلق کر لیا تھا۔اُس رضا سے کوئی شکوہ کر رہا تھا؟اپنی اہمیت پوچھ رہا تھا؟اُس پر حق جتا رہا تھا؟

''میں نے تمہیں وہ بات کیوں بتائی تھی؟کیونکہ میں چاہتی تھی کہ تم میری مدد کرو۔اور تم نے کہا بھی تھا کہ کرو گے۔پر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔''وہ شکایت کر رہی تھی۔

اور رضا ساکن۔۔۔

جامد۔۔۔

ساکت۔۔۔

بے حس و حرکت کھڑا۔۔۔

اُسے دیکھتا۔۔۔

مبہوت ہوتا۔

''اگر تم میری مدد کر دیتے تو بھائی تک یہ بات نہ پہنچتی۔''ناراضگی سے کہتی وہ پیالیوں میں چائے نکالنے لگی۔

''سوری!''اُس نے خود کو کہتے سنا۔''میرے لئے تم سب سے اہم ہو، مجھے ہر شے سے مقدم تمہیں رکھنا چاہیے تھا۔''اُس نے کہہ دیا۔وہ کہہ دیا جو خود سے بھی نہ کہہ سکا۔

نظریں، نگاہیں، سماعتیں۔۔۔بے یقین ہو گئیں۔

احساسات، جذبات، محسوسات۔۔۔سب ساکت ہو گئے۔

چائے اُسکے ہاتھوں سے چھلک کر کاؤنٹر پر گر پڑی۔

''مم۔۔۔میرا وہ مطلب نہیں تھا''وہ گڑبڑائی۔

''میرا تو یہی مطلب تھا۔''پورے دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔جب کہنے میں دیر نہیں کی تو پھر ماننے میں دیر کیوں کرتا؟

''تمہاری چائے۔''اُسے چائے کی پیالی پکڑاتی، اپنی کشمیری چادر سنبھالتی باہر آئی۔اور اپنا دل بھی۔۔۔

اور وہ ہاتھوں میں دل، دھڑکن، جگر۔۔۔اپنا پورا آپ لئے پھر سے اُسکے پیچھے۔

''اب کیا ہے؟''چڑ کر پوچھا۔

''ایک سوال پوچھا تھا کچھ دیر پہلے۔''فرصت سے سامنے رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔

''کیا؟''اُسے نہیں یاد کہ کوئی سوال بھی پوچھا تھا۔

''یہی کہ مجھے بہت کچھ سمجھ نہیں آرہا، تم سمجھا دو گی؟''معصومیت سے پوچھا۔اُس نے دیکھا، سانولی رنگت اور پرکشش نین نقش والا وہ مرد واقعی بہت خوبرو تھا۔

''کیا سمجھ نہیں آرہا؟''سنجیدگی سے پوچھا۔

''آج کل سب اچھا لگنے لگا ہے، دشمن بھی پیارے لگنے لگے ہیں (**علی کو یاد کیا**)، ڈر میں بھی خوف نہیں آتا (**براہو مرنے والے مائیکل اور خلیل کا**)، برائی بھی بری نہیں لگتی (**برائی کا نام محترمہ کا بھائی تو نہیں؟**) اور۔۔۔اور۔۔۔'' وہ رکا، سامنے بیٹھی ملکہ اب بھی سنجیدگی سے اُسے گھور رہی تھی۔ ''اور بس، زندہ رہنے کا دل کرنے لگا ہے۔ لمبی عمر کی خواہش جاگنے لگی ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟'' دنیا جہان کی بے بسی چہرے پر سموئے پوچھا۔

''یہ ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے، تمہیں علاج کی اشد ضرورت ہے۔'' وہ سنجیدہ تھی۔ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ۔۔۔ رضا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ رک گئی۔۔۔ ٹھہر گئی۔۔۔ تھم گئی۔ اُسے اسطرح ہنستے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''محترمہ! اِس بیماری کا علاج بھی بتا دیں تو مریض کو کچھ افاقہ ہو جائے۔'' مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ کھڑی ہوئی، چادر کو اپنے گرد کسا، اُسے گھورا اور بولی۔

''نفسیات کے ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔'' اور ہونہہ کرتی وہاں سے چلی گئی۔ رضا ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ اُسکی ہر ادا پیاری تھی۔ پناہ گاہ کے در و دیوار نے آج اِس شخص کو جیتے ہوئے دیکھا تھا۔

اُس کے دل نے ایک خواہش کی تھی۔۔۔

ایک یاد و؟

کہ اُسکے سارے دوست اکھٹے ہو جائیں۔۔۔

پھر سے دوستوں کی محفلیں سجائیں۔۔۔

اور محفلوں کو کشتِ زعفران بنائیں۔۔۔

خواہش ایک کی تھی۔۔۔

کیا معلوم دعائیں دو قبول ہو جائیں۔۔۔

اُسے کیا معلوم کہ۔۔۔

آج قبولیت کا لمحہ کہیں ٹھہرا ہو؟

کیا معلوم کہ۔۔۔۔

آج رضائے الٰہی سے اُسے جزائے خیر مل جائے؟

اُسے بھلا کیا معلوم۔۔۔۔

---------+---------+--------

گھر آیا تو اُسے گاڑی سے اُتارا، ابھی بیگ اسے دینے کا ارادہ رکھتا ہی تھا کہ وہ اچھلتی کودتی بھاگ نکلی۔

''ارے رکو۔۔۔''علی پیچھے سے چیخا۔پر وہ جا چکی تھی۔

''حد ہے۔''ناچار اُسکا بیگ ہاتھ میں لئے ہی گاڑی بند کی اور اندر چلا آیا۔

''ابّا! میں آگئی۔''اُس نے زور و شور سے اپنے آنے کی اطلاع سفیر صاحب کو دی۔

''وہ تو مجھے بھی دکھ رہا ہے۔''انہوں نے پر تبسم لہجے میں کہا۔اُسکا آنا دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا، خزاں میں بہار جیسا، تپتے صحرا میں اچانک چلتے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں جیسا۔

''آپکو پتہ ہے کہ ڈاکٹر نے، بابا کو اتنی بڑی ی ی ی۔۔۔۔سی سوئی لگائی؟''وہ اُنکے قریب آکر رازداری سے بولی۔

''تمہیں نہیں لگائی؟''اُنہوں نے بھی اتنی ہی رازداری سے پوچھا۔

''نہیں! مجھے تو لولی پاپ دی تھی۔''وہ ہنس دیئے۔اُسی لمحے علی وہاں داخل ہوا، اُسے دیکھ کر رکا۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟ جا کر نہاؤ فوراً۔''اُس نے اُس کا بیگ صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے کپڑے نہیں ہیں۔''ہمیشہ کی طرح اُس کے نا ختم ہونے والے مسئلے۔

''تمہارے سوٹ کیس میں نہیں ہیں کیا؟''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''اُس نے سر کھجایا اور علی نے سر پیٹا۔

''تمہارے بڑے بیگ میں تمہارے اور کپڑے بھی تو ہیں۔''اِس بار سفیر صاحب نے کہا۔

''ہاں!''اُس نے زور و شور سے سر ہلایا۔''ابّا! آپ میرے کپڑے نکال دیں گے؟''تاریخ گواہ تھی کہ اتنے پیار سے اُس نے علی سے بات کبھی نہ کی تھی۔

''یہ میرے ابّا ہیں۔''علی کے تو سر پر لگی تلوؤں پر جا بجھی۔

''میرے بھی ہیں۔پ''سنجیدگی سے بتایا۔سفیر صاحب نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''تمہارے نہیں ہیں، میرے ہیں۔اور تم انہیں ابّا نہیں کہو گی۔'' دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، بھنویں سکیڑے، وہ سر جھکائے ایک بچی سے برابری سے لڑ رہا تھا۔فقط ایک چار سال کی بچی سے۔۔۔

''پھر کیا کہوں؟'' ہمیشہ کی طرح دونوں ہتھیلیوں کو نچا نچا کر پوچھا۔

''انکل کہو۔'' اُس نے مسئلے کا حل پیش کیا۔ سفیر صاحب دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''میں تو ابّا ہی کہوں گی۔'' کمر پر ہاتھ ٹکائے چھوٹی چوزی اِس بار ڈٹ گئی تھی۔

''وہ اسکول سے آئی ہے ابھی، اُسے کپڑے تو بدلنے دو۔'' بلآخر سفیر صاحب نے علی کے کچھ بھی بولنے سے پہلے اس بحث کو ختم کیا، تو وہ ہونہہ کرتا پیچھے ہٹ گیا۔

''ہونہہ۔۔۔'' نشمیہ بھی اُسی کا انداز اُسی کو واپس لوٹاتی چلتی بنی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ چیز کیا ہے آخر؟'' وہ سر پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سفیر صاحب ہنسی ضبط کرتے، اُسکے کپڑے نکالنے جا چکے تھے۔

آپ میرا نام کیوں نہیں لیتے؟

اُسکا گھنٹے بھر پہلے کیا گیا سوال یاد آیا، تو دل میں کوئی ہوک سے جاگ اُٹھی۔ وہ اُسے کیسے بتاتا؟ کیسے بتاتا کہ وہ کیوں چاہ کر بھی اُسکا نام نہیں لے پاتا؟ وہی تو تھا جس نے یہ نام رکھا تھا، پر اپنی بیٹی کا۔۔۔

جب اُسے اور فاطمہ کو معلوم ہوا کہ وہ دوبارہ والدین بننے والے ہیں تب علی نے اُس سے کہا تھا کہ

''اگر میری بیٹی ہوئی تو میں اُسکا نام نشمیہ رکھوں گا۔''

''کتنا خوبصورت نام ہے۔ کیا معنی ہیں اسکے؟'' فاطمہ نے پوچھا تھا۔ لیکن انداز میں ذرا دلچسپی نہ تھی۔

''پھولوں کا باغ۔'' اُس نے بتایا۔

''اور اگر بیٹا ہوا تو؟'' اُس نے پوچھا۔

''تو تم نام رکھ لینا۔'' وہ کہتا ہوا دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو چکا تھا، لیکن دل کو نشمیہ کا انتظار تھا۔ وہ دن گن رہا تھا، بیٹے کا باپ بننا الگ احساس ہے لیکن بیٹی کا باپ بننا الگ احساس تھا۔ فاطمہ کو اس خبر سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس وقت وہ علی کی زندگی سے نکلنے کی پوری تیاری کر چکی تھی، ایسے میں یہ اُسکے لیے ایک اضافی بوجھ تھا۔ اُسکی راہ کی رکاوٹ۔

''آخر تم نے اِسکا نام نشمیہ کیوں رکھا؟''اُس نے دل میں فاطمہ سے سوال کیا تھا۔وہ عورت اُسکی سمجھ سے باہر ہوتی جارہی تھی۔وہ کیا کررہی تھی؟کیا چاہتی تھی؟کچھ بھی تو سمجھ نہ آرہا تھا۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔''نشمیہ کان کے پاس چیخی تو وہ ہڑبڑا اٹھا۔پھر گھور کر اُسے دیکھا۔

''حد کرتی ہو تم؟ایسے بات کرتے ہیں کسی سے؟''اُس نے ڈانٹا۔

''تو کیسے کرتے ہیں؟''وہ بھی بڑی ڈھیٹ تھی۔

''اور تم۔۔۔تم۔۔۔تم چپل پہن کر قالین پر چڑھ گئی؟''وہ تڑپ اٹھا۔

''تو کیا ہوا؟''وہ قالین پر خود کو پری سمجھے گول گول گھوم گئی۔

''تم جاؤ میز پر بیٹھو،میں کھانا لگاتا ہوں۔''اُس نے ضبط سے کہا،قالین کا حال دیکھ کر تو دل بند ہونے کے قریب تھا۔

''جلدی کریں بھوک لگی ہے۔''وہ چیخ اٹھی۔

''جارہا ہوں،جارہا ہوں۔''اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔''پوری پلیٹ گول گپے کی کھا کر بھی بھوک لگ رہی ہے اِسکو۔''وہ بڑبڑاتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔جہاں ملازم نے تازہ تازہ کھانا بنا کر میز پر رکھا ہوا تھا۔

---------+---------+--------

وہ سٹور میں کھڑا کچھ خریداری کررہا تھا،جب کسی نے سیٹی بجا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حسین تھا۔

''ارے!تم؟''اُسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''یہ آج کل تم لوگ اتفاقاً اتنا زیادہ کیوں نظر آنے لگے ہو؟ہر راستے،ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ٹکرا جاتا ہے''حسین گود میں اپنی بیٹی کو سنبھالے اُسکے پاس آیا۔

''میرے علاوہ اور کون ملا ہے؟''مقدّم نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''لمبی کہانی ہے،چھوڑو!تم بتاؤ کیا کررہے ہو یہاں؟''

''رات کا کھانا کھا رہا ہوں۔''وہ سنجیدہ تھا،بے حد سنجیدہ۔حسین ہنس پڑا۔

''بھلا سٹور میں اور کیا کرنے آئینگے؟''اُس نے پوچھا تھا۔

''تمہارا کیا بھروسہ بھائی! تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔'' کہہ بھی کون رہا تھا بھلا؟ وہ دونوں بلنگ کاؤنٹر تک آ گئے۔ اپنی اپنی ادائیگی کرنے کے بعد دونوں ساتھ ہی باہر آئے۔

''میں تم سے ٹھیک سے مل نہیں سکا تھا، اُس روز بھی تم ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ پھر کل جو رضا کے گھر ہوا وہ بھی عجیب سی صورتحال تھی۔'' پارکنگ میں رک کر حسین نے کہا۔

''ہم آج کل جب بھی مل رہے ہیں کوئی نہ کوئی عجیب سی صورتحال کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگلی بار نہ جانے کیا ہو؟'' مقدّم نے کہا۔ پھر اُسکی نظریں حسین کی گود میں کھیلتی اُس ننھی سی پری پر پڑیں۔

''یہ تمہارا کارنامہ ہے؟'' بڑے عرصے بعد اُس کی زبان ویسے ہی چلی تھی، جو کبھی اُسکا ٹریڈ مارک ہوا کرتی تھی۔ حسین پوری جان سے ہنسا تھا۔

''میرا مطلب۔۔۔'' اُسے احساس ہوا کہ وہ کیا بول گیا ہے۔ لیکن مقابل بھی حسین تھا، یہی تو اُسکا خاصا تھا کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو اپنے مطابق ڈھال لیتا تھا۔

''ہاں جی! میرا ہی ہے۔'' اُس نے حوریہ کو گود سے اتار کر سڑک پر کھڑا کیا۔

''ہیلو!'' مقدم نے اُسکی جانب جھکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا، اُس نے مسکراتے ہوئے اسکو دیکھا پھر اپنا ننھا سا ہاتھ اُسکے ہاتھوں میں دے دیا۔

''کیا نام ہے اسکا؟'' اُس نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کے سے انداز میں ہلایا۔

''حوریہ'' اپنا نام سن کر وہ مسکرائی، اُسکے دونوں گالوں میں گہرے گڑھے پڑتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی ہی بیٹی تھی۔

''بہت پیاری ہے یہ۔۔۔ ماشاءاللہ! دل کر رہا ہے گھر لے جاؤں۔'' اُس نے اُسکے گال کھینچے۔

''تم ایسے پیارے پیارے کارنامے ذاتی طور پر انجام دے لو، میری بچی کو کیوں چھیننا ہے؟'' اُس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''شٹ اپ۔۔۔'' اُس نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

''واہ بھئی! تم کرو تو سب ٹھیک ہے، ہم کریں تو شٹ اپ؟'' وہ موڈ میں تھا آج۔

'' تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔'' اُس نے افسوس سے کہا۔

''تم بھی۔۔۔'' اور دونوں ہنس پڑے۔ پھر یکدم ہی حسین آگے بڑھا، اور اُسکے گلے لگ گیا، مقدّم ساکت۔۔۔ حیران۔۔۔ بے یقین

یہ کوشش تواب تک عمرا تنی ملاقاتوں کے باوجود بھی نہ کر سکا تھا۔ خود وہ بھی تواب تک چاہ کر بھی اُسے گلے نہ لگا سکا تھا۔ لیکن حسین نے یہ کر لیا؟ کیسے ؟تو ثابت ہوا کہ حسین کو فاصلے مٹانے آتے تھے۔

''کہاں چلے گئے تھے یار تم ؟ایک تم ہی تو تھے جسکے ساتھ میری اچھی بنتی تھی۔''اُس سے الگ ہوتے ہوئے دکھ بھرا شکوہ کیا تھا۔ مقدّم تو کچھ بولنے لائق ہی نہیں رہا تھا۔ جو سوال کوئی نہ کر سکا وہ اِس نے کر لیا تھا، اور وہ بھی اتنی اپنائیت سے۔ یہ آدمی ہیرا تھا، ایسے دوست کو کھونا سوائے بیوقوفی کے اور کیا تھا؟

''کبھی ہمت ہوئی تو بتاؤں گا کہ کہاں چلا گیا تھا۔ ابھی نہیں۔۔۔۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔ حسین نے بس سر ہلا دیا، وہ اُسکی حالت سمجھتا تھا۔

''لیکن ایک بات بتاؤں ؟میں جہاں بھی رہا، اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ تمہیں یاد کیا۔''مقدّم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''میری خوش قسمتی۔''حسین نے سینے پر ہاتھ رکھے جھکتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن تم سب بہت بدل گئے ہو یار !''شکوہ زبان سے پھسلا۔

''لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔''مقدّم نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ میری بیوی چوبیس گھنٹے یہی کہتی ہے کہ تم بدل گئے ہو حسین !''دکھی لہجے میں کہا تو وہ ایک مرتبہ پھر ہنس دیا۔ حسین نے اپنی بیٹی کو واپس گود میں اٹھالیا۔

''اگر تم مصروف نہیں ہو تو کہیں بیٹھ کر بات کریں ؟''مقدّم نے اچانک ہی پوچھا۔ کچھ باتیں تھیں، جو وہ اب بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ لیکن چلو ! آج تمہارے سارے سوالات کا جواب بھی دے دینگے۔''حسین کہا۔

''میں بس ! تم لوگوں کے رویوں پر پریشان ہوں۔ گو کہ مجھے عمر نے تقریباً سب بتا ہی دیا ہے، لیکن میں اب بھی بہت سی چیزیں نہیں سمجھ پایا۔''وہ اُسکے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب اُنکا رخ کسی کیفے کی جانب تھا۔

''میں پچھلے دس سالوں میں نہیں سمجھ پایا تو تم چند ہفتوں میں کیسے سمجھو گے ؟''اُس نے کہا۔ مقدّم خاموش رہا۔

''نوید نے صبح کسی گروپ میں شامل کیا ہے ہمیں، تم نے دیکھا؟''کیفے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ! مائیکل کی موت کی خبر تھی۔''دونوں نسبتاً خاموش گوشے میں جا بیٹھے۔ حوریہ کو اُس نے اپنے برابر میں دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔

''تمہاری نوید سے اس بارے میں کوئی بات ہوئی؟''مقدّم نے پوچھا۔

''نہیں ! اور تمہاری؟''

''میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟''

''لیکن اُسکا رویہ، اتنا سرد اور اتنا سختی لیے ہوئے ہے کہ میں پہلے کی طرح اُس سے کھل کر بات نہیں کر پا رہا گو کہ اُس نے میرے ساتھ کوئی سرد مہری نہیں دکھائی لیکن۔۔۔ پھر بھی۔''

''اُسکے کل کے کارنامے کے بعد رضا کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔'' حسین نے کہا۔

''تم نے کیوں نہیں پوچھا اُس سے؟''

''کیا فائدہ؟ کوئی نئی بات سامنے آنی ہو گی تو وہ ہمیں خود بلا لیں گے۔ جیسے خلیل کی موت کے بعد بلایا تھا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ مقدّم نے اُسے غور سے دیکھا، وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لیے کھوئے کھوئے سے انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ ویٹر چائے کے دو کپ اور ایک آئسکریم رکھ کر چلا گیا تھا۔

''تم پریشان ہو؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''میں شروعات میں بہت زیادہ پریشان تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ خود کو حالات قبول کرنے پر راضی کر لیا ہے میں نے، اور اب میں قبل از وقت کسی بات پر پریشان نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چار ماہ بعد کیا ہو گا؟ مجھے صرف اپنے بچوں کی فکر ہے۔ میں اُنہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے آئسکریم کا پیالا حوریہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ مقدّم کو دکھ ہوا، ہر آدمی کی طرح اُسکی پریشانی بھی اپنے گھر والوں کے لیے ہی تھی۔

''پریشان نہ ہو، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو گا۔'' اُس نے اسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ۔۔۔'' اُس نے سر ہلایا۔

''منہ ٹھیک کرو، ایسے ملکہ جذبات بنے اچھے نہیں لگ رہے۔'' اُس نے کہا تو وہ ہنس دیا۔ گالوں پر پڑنے والے گڑھے واضح ہوئے۔

''تم بتاؤ! کیا پوچھنا چاہتے تھے؟'' اُس نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے عمر سے تمام بات معلوم ہوئی۔ اُس نے مجھے جھگڑے والی ساری بات بتائی لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ یعنی، بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جس پر ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا جاتا۔ اور جھگڑا تو نوید اور علی کا تھا نہ؟ تو آخر رضا نے معاملہ خراب کیوں کیا؟ حالانکہ اگر دو لوگ جھگڑ رہے تھے تو تم لوگوں کو صلح کروانی چاہیے تھی۔'' حسین نے ساری بات خاموشی سے سنی۔

''تمہیں یہ عمر نے بتایا؟'' اُس نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''حالانکہ جھگڑے والے روز وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ تو علی اور نوید کے جھگڑے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ تو اُسے کیسے معلوم؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''اُس نے کہا کہ اُسے خضر نے بتایا تھا، اور خضر کو تم نے۔'' اس بات پر حسین نے سر ہلایا۔ جیسے کچھ سمجھا ہو۔۔۔

''ہاں! خضر مجھے سے آج سے چار سال پہلے ملا تھا۔ ظاہر ہے میں نے اُسے تمام بات نہیں بتائی تھی۔ اسی لیے اس نے بھی عمر کو اتنا ہی بتایا ہو گا جتنا اُسے مجھ سے معلوم ہوا تھا۔'' وہ رکا۔

''معاملہ واقعی اتنا بڑا نہیں تھا، علی کو تمہارے اور عمر کے جانے اور پھر نوید کے کیس سے پیچھے ہٹ جانے پر غصّہ تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ خراب رضا نے کیا تھا۔ اور مقدّم! اُس نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا۔''

''کیا مطلب اس بات کا؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں مقدّم! اُس نے یہ سب جان کر کیا تھا۔ وہ اُس واقعے سے بھی کئی مہینے پہلے سے ہی کوئی ایسا موقع ڈھونڈ رہا تھا، کہ وہ ہم سے الگ ہو سکے۔ اس جھگڑے کی صورت میں اُسے وہ مل گیا تھا۔ معاملہ ٹھیک ہو سکتا تھا، ہم ثالثی کا کردار ادا کر سکتے تھے۔ لیکن میں اکیلا کیا کرتا؟ میں نے بعد میں رضا کو ڈھونڈا تھا، لیکن وہ اپنا گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ مجھے نہیں معلوم، میں نے اُسے ڈھونڈا پر وہ کہیں نہ ملا۔ علی کی خاطر میں مقدمے کی آخری پیشی پر بھی گیا تھا۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا تھا پر وہ مجھے نظر انداز کر کے چلا گیا۔ میں نوید سے بھی ملنے گیا، پر وہ مجھ سے نہیں ملا، اُسکے ابّا نے مجھ سے کہا کہ نوید نہیں ملنا چاہتا کسی سے۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے شادی کر لی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ اُس نے مجھے بتایا تک نہیں، کچھ سالوں بعد میں نے اُس سے دوبارہ ملنا چاہا کہ کم از کم اُسکے اور علی کے معاملات ہی حل کر سکوں، اُن دونوں میں صلح کروا سکوں، کیونکہ تم، رضا اور عمر تو پس منظر سے غائب ہو چکے تھے۔ لہٰذا جو دوست سامنے تھے، اُنکو واپس جوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا کہ وہ سی ایس ایس پاس کر کے ٹریننگ کے لیے چلا گیا ہے۔ میں اُسکے بھائی کو اپنا نمبر دے آیا کہ نوید کو دے دیں تاکہ جب وہ واپس آئے تو مجھ سے رابطہ کر لے۔ پر اُس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ تم لوگوں کے رویوں نے میرا دل بہت دکھایا تھا، بہت زیادہ۔۔۔ یہاں تک کہ میں نے صلح کی تمام کوششیں ترک کر دیں۔ حالانکہ میرا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا مقّی!'' وہ بول رہا تھا اور مقدّم سن تھا۔ حسین ہر بار اُنہیں حیران کرتا تھا، اُسکا ایک ایک شکوہ بجا تھا۔

''میں نے پھر بھی دل میں کسی کے لیے بغض نہیں رکھا۔ میں رضا سے بھی خود ملنے گیا، علی سے بات کرنے میں، میں نے پہل کی۔ تم سے بھی میں خود ملا۔ ہاں! لیکن۔۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''لیکن نوید سے میں نہیں ملوں گا۔اُس شخص نے مجھے اپنے گھر کے دروازے سے لوٹایا تھا،وہ مجھ سے مل سکتا تھا۔لیکن اُس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ دروازے سے واپس لوٹائے جانے کے بعد بھی میں اُس سے ملنے دوبارہ گیا،رابطے کے لیے نمبر بھی دے کر آیا۔لیکن وہ پھر بھی مجھ سے نہیں ملا۔میں نہیں بھول سکتا۔۔۔کبھی نہیں۔۔۔''مقدّم کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کن الفاظ میں اُس سے معذرت کرے۔اس جھگڑے میں اگر کسی کی مخلص دوستی کا امتحان ہوا تھا تو وہ یہی شخص تھا۔

''مجھے۔۔۔مجھے معاف کر دو۔میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔بالکل نہیں۔۔۔''بہت دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوا تو فقط یہی کہہ سکا۔

''تم کیوں معذرت کر رہے ہو؟مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں ہوتے تو یقیناً میں کبھی بھی اکیلا نہ پڑتا۔ہم دونوں مل کر اپنے دوستوں میں صلح کروا لیتے۔'' مسکراتے ہوئے کہتے اُس نے حوریہ کا منہ ٹشو سے صاف کیا۔

''تمہیں یونیورسٹی کی بون فائر والی رات یاد ہے؟جس دن وہ لڑکی ہماری آنکھوں کے سامنے سے اغوا ہوئی تھی؟''مقدّم نے پوچھا۔

''بھلا وہ بھی کوئی بھولنے والی رات ہے؟وہیں سے تو سب خراب ہوا تھا۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں!لیکن اُس رات تم ہمیں رضا کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔تم نے کہا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو رضا نے تمہیں بتائی ہے لیکن تم ہمیں تب تک نہیں بتاؤ گے،جب تک رضا نہیں اجازت دے گا۔یا شاید ایسا ہی کچھ۔۔۔''حسین حیران رہ گیا۔اُسے اتنی پرانی بات پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھی؟جبکہ وہ خود بھول گیا تھا۔

''وہ پرانی بات ہو گئی ہے،اب اُسے بھول جاؤ۔''اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میں ٹوہ لینا نہیں چاہتا،مسئلہ یہ ہے کہ مجھے رضا کے رویے کے پیچھے وہی بات نظر آتی ہے۔وہ جھگڑے سے پہلے،بلکہ اس سانحے سے بھی کافی پہلے سے ہم سب کے درمیان سے غائب رہنے لگا تھا۔''وہ کڑی سے کڑی جوڑ رہا تھا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں؟''حسین نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''اُس نے رک کر ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''میں چار سال قبل خضر سے ملا تھا،بلکہ یوں کہو وہ مجھے ڈھونڈھتا ہوا مجھ تک آیا تھا۔اور جانتے ہو اُس نے مجھے کیا بتایا؟''اُسکا لہجہ پراسرار سا تھا۔

''کیا؟''

''وہ مجھ سے اِس لیے ملا تھا کیونکہ ہماری طرح عمر نے چھے سال تک اپنے گھر والوں، حتیٰ کہ ماں باپ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔اُسکے گھر والوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ بیرونِ ملک کیوں گیا؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟''وہ سمجھ کر بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

''مطلب یہ کہ عمر کے باہر جانے کا فیصلہ،اُسکے گھر والوں لیے بھی اتنا ہی حیران کن تھا جتنا کہ ہمارے لیے،اور بیرونِ ملک جانے کے بعد اُس نے صرف ہم سے ہی نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔خضر میرے پاس اسی لیے آیا تھا۔وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے عمر کیا کہہ کر گیا تھا؟اُسے لگتا تھا کہ شاید اس نے اپنے دوستوں کو بتایا ہو کہ وہ اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کر رہا ہے؟لیکن پھر میں نے اُسے بتایا کہ اُس روز کیا ہوا تھا۔ جھگڑے والی بات بھی بتائی اُسے۔اور یہ بھی کہ رضا نے علی کو کافی برا بھلا کہہ کر معاملہ خراب کر دیا تھا۔البتہ ایک بات جو میں نے اُسے نہیں بتائی وہ یہ تھی کہ ان سب سے بھی پہلے علی نے نوید پر بہت ہی گھناؤنا الزام لگایا تھا۔''

''کیسا الزام؟''

''صنوبر کے حوالے سے۔۔۔''اُس روز ہونے والے جھگڑے کے حوالے سے حسین نے سب کچھ اُسکے گوشِ گزار کر دیا۔مقدّم کو ٹھیک ٹھاک افسوس ہوا تھا۔کاش وہ اُس دن وہاں ہوتا تو شاید معاملات مختلف ہوتے۔اور عمر کیوں ایسے چلا گیا تھا؟اُس نے مقدّم کو اپنے غائب ہونے متعلق تو کچھ نہیں بتایا۔ ڈھیروں سوالات اُسکے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔اُسکے دوست پر اسرار تھے۔

لیکن ایک بات جو مقدّم نے نظر انداز کر دی۔۔۔

وہ یہ کہ۔۔۔

دس سال بعد بھی حسین نے رضا کے متعلق کیے جانے والے سوال پر۔۔۔۔

گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا۔۔۔

موضوع بدل دیا تھا۔۔۔

سوال گول کر دیا تھا۔۔۔

اُس نے ایک بار پھر رضا کا راز چھپا لیا تھا۔۔۔۔۔

---------+---------+--------

سیاہ ٹراؤزر پر، سفید پولو شرٹ پہنے، وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھا، پیر کراس کی صورت میں سامنے رکھی میز پر دھرے، اُن پر لیپ ٹاپ رکھے کام میں مصروف تھا۔ سکرین پر نگاہیں ٹکائے، ٹھک ٹھک چلتی انگلیاں روک کر اُس نے صوفے کے ہتھے پر رکھا چائے کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ پھر پاس رکھا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ صبح بارہ بجے کے قریب اُس نے نوید کو میسیج کیا تھا۔ نو گھنٹے گزر جانے کے باوجود بھی اُس کی جانب سے کوئی جوابی پیغام موصول نہیں ہوا تھا۔ اُس نے موبائل واپس رکھ کر میز پر رکھی سگریٹ اُٹھا کر جلائی اور منہ سے لگاتے دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' کوئی اُسکے کان کے بالکل قریب چیخا تو اُس نے دہل کر دل پہ ہاتھ رکھا۔ پھر گھور کر اُس اچانک آنے والی آفت کو دیکھا۔

''یہ کونسا طریقہ ہے بات کرنے کا؟ آرام سے بات نہیں کر سکتی؟'' اُس نے اپنے برابر صوفے پر چڑھ کر کھڑی، نشمیہ کو آنکھیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے۔۔۔ نیند۔۔۔ نہیں۔۔۔ آ۔۔۔ رہی'' اب کے اُس نے رک رک کر آرام سے کہا۔ لو! ہو گئی تمہاری تسلی؟

''کیوں؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے اکیلے۔'' سر پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے یاد دلایا۔

''جا کر ابا کے ساتھ سو جاؤ۔'' اُسکے ہزار مسائل کے علی کے پاس دس ہزار حل تھے۔

''ابّا کے پاس نہیں سونا۔'' اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے نروٹھے انداز میں کہا۔

''انکل۔۔'' اُس نے تصحیح کرتے سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑا۔

''نہیں! ابّا۔۔۔'' اُس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''اُف!۔۔۔ نہیں سونا تو یہیں بیٹھی رہو۔ لیکن میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں آ سکتا مجھے کام ہیں بہت۔''

''ٹھیک ہے! پھر میں کارٹون دیکھ لوں گی۔'' وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''صبح اسکول نہیں جانا تمہیں؟'' اُس نے ضبط کرتے پوچھا۔

''جانا ہے۔'' زور و شور سے سر ہلایا۔

''تو کارٹون نہیں دیکھنا۔'' اُس نے فیصلہ سنایا۔

''تو پھر کیا کروں؟'' ہاتھ نچا نچا کر پوچھا۔

''جب تک کے لئے صوفے پر سو جاؤ۔''

''میں صوفے پر نہیں سوتی۔''ایک اور مسئلہ۔

''تو چپ کر کے بیٹھی رہو۔ مجھے تنگ مت کرو۔'' جھنجھلا کر کہتا وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

''یہ کیا ہے؟''اُسکے دائیں ہاتھ میں جلتی سگریٹ کو دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔۔۔''

''اس سے بہت گندی بو آ رہی ہے۔''اُس نے کھانستے ہوئے کہا تو اس نے منہ بناتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دی۔اور ایک بار پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''لیپ ٹاپ پر ٹھک ٹھک کرتی اُسکی انگلیاں تھم گئیں۔وہ اُسکے بازو پر اپنا ننھا سا چہرہ ٹکائے بڑے غور سے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہی تھی۔

''اس میں کارٹون آتا ہے؟''

''نہیں۔۔۔''مختصر جواب دیتے خود کو مصروف کرنا چاہا۔اُسے خود سے دور بھی نہیں کر سکا تھا۔

''اس میں گیم ہیں؟''

''نہیں!''

''واؤ! یہ کتنی پیاری ہے۔''اب وہ کلائی میں بندھی اُسکی گھڑی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔اُس نے نظر انداز کیا۔

''آپ بھی اسکول جاتے ہیں؟''اب کے صوفے سے اتر کر اُسکے لیپ ٹاپ سکرین پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

''یہ آپ کا ہوم ورک ہے؟''

''نہیں!''علی نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر لیپ ٹاپ سے دور کیا۔

''واؤ! وہ کیا ہے؟''اب اُسکی توجہ کا مرکز سائیڈ پر رکھا گلدان تھا۔

''اِدھر آؤ! میں تمہیں کارٹون لگا کر دوں۔''یہی آخری حل تھا۔وہ خوشی خوشی صوفے پر آ بیٹھی۔ علی نے ٹی وی کھولا اور پھر یوٹیوب پر کوئی کارٹون ڈھونڈھنے لگا۔

''مجھے باربی ڈریم ہاؤس ایڈونچر دیکھنا ہے۔''پیر جھلاتے فرمائش کی۔ اُس نے مطلوبہ کارٹون لگا دیا۔

''آواز نہیں آ رہی۔''وہ چلائی تو اُس نے اُسے گھورا۔

''کر رہا ہوں نا!''پھر آواز تیز کر کے ریموٹ کنارے پر رکھ دیا۔صد شکر کہ اب وہ پوری دلجمعی سے کارٹون دیکھنے میں مصروف تھی۔وہ گاہے بگاہے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا۔کسی سین پر وہ کھلکھلا کے ہنستی، تو کبھی یکدم پریشان ہو جاتی۔اُسکے پریشان ہونے پر علی نے ٹی وی کی جانب دیکھا۔پر وہاں پریشان ہونے جیسی کوئی بات نظر نہ آئی۔

''تمہیں کیا ہوا؟''نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔اور وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھی۔

''باربی کی بہن کا پپی (کتا) گم ہو گیا ہے۔اور اب وہ مل نہیں رہا۔''اُس نے اُداسی سے کہا۔

''مل جائیگا''علی نے تسلی دی۔

''سچی مل جائیگا؟''وہ حیران ہوئی۔

''ہاں!''

''آپکو کیسے پتہ؟''اُسکا سوال معقول تھا۔

''یہ کارٹون ہے اور کارٹون کے اینڈ (آخر) میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''اُس نے ایک چار سال کی۔۔۔فقط چار سال کی بچی کو منطق سے قائل کرنا چاہا۔

''مطلب پپی مل جائیگا؟''اُسکو اب بھی یقین نہ آیا۔

''ہاں،ہاں! کہہ تو رہا ہوں کہ مل جائیگا۔''

''تو پھر میں باربی کو بتا دوں؟''اُس نے پوچھا۔

''مطلب؟''وہ سمجھا نہیں۔اگلے ہی لمحے وہ ٹی وی کے قریب گئی، جہاں پریشان سی باربی اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

''سنو باربی! تمہارا پپی مل جائیگا۔ بابا کو پتہ ہے۔''تم ایسے ہی اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔ میرے باپ سے پوچھ لیا ہوتا۔ جبکہ اُسکا باپ تاسف سے اُسے ٹی وی کے قریب کھڑا چیختا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''میں نے اسکو بتادیا۔''واپس آکر اُسکے برابر بیٹھتے، مزے سے اپنا کارنامہ بتایا۔

''تمہارے بتانے کا فائدہ؟ وہ تو اب بھی پپی ڈھونڈ رہی ہے؟''اب وہ لیپ ٹاپ سائیڈ پر رکھے بڑی فرصت سے اُس سے مباحثہ کر رہا تھا۔

''تو ڈھونڈنے سے ہی تو ملے گا نا!''اُسکی عقل پر ماتم کیا۔

''اوہ! وہ دیکھیں۔''ہمیشہ کی طرح وہ چلائی تو علی نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

''پپی تمہارے پیچھے ہے باربی، وہ دیکھو!''وہ اشارے سے باربی کو بتانا چاہتی تھی کہ پپی اُسکے پیچھے ہی ایک ٹرک میں ہے۔ لیکن نابینا باربی کو پپی نظر بھی کب آیا؟ جب ٹرک والا ٹرک وہاں سے دور لے جا چکا تھا۔

''ارے یار!''اِس بار دونوں نے اپنا ماتھا پیٹا تھا۔ جی ہاں! دونوں نے۔۔۔ اب دونوں بچے انہماک سے باربی دیکھنے میں مصروف تھے، صرف اور صرف یہ جاننے کے لئے کے آیا پپی ملتا بھی ہے کہ نہیں؟ لیکن ہر بار پپی انکے سامنے آکر چلا جاتا اور وہ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھے بنے رہتے۔

''یار! کیا بکواس ہے۔ ایسے تو کتا کبھی نہیں ملے گا۔''علی جھنجھلایا۔

''کتا نہیں پپی۔''اُس نے تصحیح کی جسے نظر انداز کیا گیا۔

''اب بتاؤ کتنا قریب تھا پپی اِنکے اور یہ لوگ ہر جگہ ڈھونڈ رہے ہیں سوائے اُسکے، جہاں وہ موجود ہے۔''

''اب مجھے غصّہ آرہا ہے۔''نشمیہ نے بھی بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔ اسی طرح کچھ لمحے اور سرک گئے۔

''اوہ! مل گیا۔''اِس بار نشمیہ نہیں بلکہ نشمیہ کا باپ چیخا تھا۔

''دیکھو نشمیہ! مل گیا تمہارا پپی۔''اُس نے رخ موڑتے ہوئے اُسے متوجہ کرنا چاہا پر وہ سو چکی تھی۔ وہ کب سوئی؟ اُسے معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو یقیناً باربی کی بہن کا کتا مل جانے پر خوشی سے ناچ رہی ہوتی۔ اتنے عرصے میں علی پہلی بار مسکرایا۔ وہ کس پر مسکرایا؟ نشمیہ کی معصومیت پر یا اپنی اِس بچکانہ حرکت پر؟ اُسے اندازہ نہیں ہو سکا۔

ریموٹ سے ٹی وی بند کر کے اُس نے اُسے گود میں اُٹھایا اور کمرے میں لا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ نیند میں بڑبڑائی تھی۔ کل رات اُس نے علی کا ٹھیک ٹھاک جینا حرام کیا تھا، صد شکر کہ آج سکون سے سو گئی۔

اُسکی چادر درست کرتے، اپنی جگہ پر آکر لیٹا علی، آج پھر بنا کچھ سوچے، بنا کسی دوا کے، اور بنا کروٹ بدلے، چند ہی لمحوں میں سکون سے سو چکا تھا۔

اور اُسکے برابر میں سوئی وہ ننھی پری، آج اپنی نیند کے ہاتھوں وہ لمحہ گنوا بیٹھی، جس لمحے میں اُسکے باپ نے اُسے، اُسکے نام سے مخاطب کیا تھا۔

---------+---------+--------

اگلی صبح اُس نے نشمیہ کو تقریباً جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا، پھر زبردستی اسکو برش کروا کر، اور منہ دھلوا کر بلآخر ناشتے کی میز پر لانے میں کامیاب ہوا۔ آج ملازم کچن میں موجود تھا۔ آملیٹ کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔

''جتنا تنگ تم سونے میں کرتی ہو، اُس سے زیادہ تو اٹھنے میں کرتی ہو۔'' وہ سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' اُس نے جمائی لیتے ہوئے، کرسی کے ہینڈل پر سر رکھا۔

''سیدھی ہو کر بیٹھو!'' علی نے اُسے اٹھا کر بٹھایا۔ ''رات کو puppy chase دیکھنے کے بجائے وقت پر سو جاتی نہ تو ابھی نیند نہیں آرہی ہوتی۔''

''آپ اندر سو جاتے، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' ساری غلطی اُسکی تھی۔ وہ کیوں باہر بیٹھ کر کام کر رہا تھا؟

''بحث کروالو تم سے۔'' اُس نے پلیٹ میں آملیٹ نکال کر اُسکے سامنے کیا۔

''واؤ! آملیٹ۔'' وہ خوش ہوتی پورا آملیٹ ایک ساتھ اٹھانے لگی۔

''ارے کیا کر رہی ہو؟'' اُسکا ہاتھ پکڑ کے پیچھے ہٹایا۔ پھر کانٹے کی مدد سے انڈے کے ٹکڑے کرنے لگا۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''صبر۔۔۔''

سفیر صاحب حیران تھے۔ اُس بچی نے فقط دو دن میں میں اُنکے بیٹے کو سر تا پاؤں بدل دیا تھا۔ وہ رحمت تھی۔ اللہ کی رحمت۔۔۔

''مجھے اسکول نہیں جانا۔'' ناشتہ کرتے ہوئے اُس نے فیصلہ صادر کیا۔

''کیوں؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' بے نیازی تو دیکھو ذرا!

''کل تو رو رہی تھی اسکول جانے کے لیے۔''

''مس کو پوئم (نظم) سنانی تھی نا کل۔''

''چپ کر کے ناشتہ ختم کرو، اور پھر یونیفارم پہنو جا کر۔'' اُسے آنکھیں دکھاتا ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ صد شکر کے اس بار اُس نے ضد نہیں کی۔ ناشتہ ختم کر کے وہ بھی تیار ہونے چلا گیا۔ نہانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال سیٹ کر رہا تھا کہ تب ہی برش سنگھار میز پر واپس رکھتے ہوئے اُسکی نظریں اپنے موبائل تک گئیں۔ اُس نے موبائل اٹھایا اور نوید کو بھیجا گیا اپنا کل کا پیغام کھولا۔ گو کہ اُس نے صرف مائیکل کے متعلق ہی پوچھا تھا، لیکن نوید نے میسیج دیکھا ہی نہیں۔ حالانکہ اس دوران وہ کئی مرتبہ آنلائن نظر آیا تھا، ابھی بھی اُسکا لاسٹ سین فجر میں دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے علی کا میسیج نہیں دیکھا۔

''مصروف ہو گا۔ حالت اور صورتحال بھی تو ایسی ہیں۔ جب فارغ ہو گا تو رابطہ کر لے گا۔'' دل میں سوچا، پھر موبائل کو دیکھتا ہوا پیچھے مڑا ہی تھا کہ پاؤں سے کوئی ٹکرایا۔ ہڑبڑا کر دیکھا تو محترمہ کھڑی اپنی سرخ ہوتی ناک سہلا رہی تھیں۔

''تم کیا کر رہی تھی یہاں؟'' اُس نے ڈپٹتے ہوئے پوچھا۔

''مجھ سے پونی نہیں بندھ رہی۔'' اُس نے پریشانی بیان کی۔

''تو؟''

''تو آپ باندھ دیں۔'' فرمائش کی۔

''ابّا سے بنوالو۔'' اُس نے ہمیشہ کی طرح حل پیش کیا۔

''وہ کہہ رہے ہیں اُنکو نہیں آتی۔'' ایک تو اُسکے لاکھوں مسائل۔

''تو میں کیا کر سکتا ہوں پھر؟'' مزید جھنجھلایا۔

''آپ باندھ دیں نا!''

''مجھے نہیں آتی نا!'' وہ سچ میں روہانسا ہو گیا تھا۔

''آپ اتنے بڑے ہیں، لیکن آپکو آملیٹ بنانا بھی نہیں آتا، پونی بنانی بھی نہیں آتی۔ آپکو تو کچھ بھی نہیں آتا۔'' ناراضگی سے بھنویں چڑھائے ملامتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں آتے ہیں یہ سب کام؟'' اُس نے بھی حساب برابر کرنا چاہا۔

''میں تو چھوٹی ہوں نا!''اپنے لیے اُسکے پاس ہزار جواز ہوتے تھے۔

''مجھے بال باندھنے نہیں آتے۔ایسے ہی اسکول جاؤ۔''

''میں کل بھی ایسے ہی گئی تھی۔مجھے گرمی لگتی ہے۔''علی نے غور سے اُسے دیکھا۔اُسکے بال کمر تک آتے تھے۔اُسکے لیے سنبھالنا واقعی مشکل تھا۔

''اچھا اِدھر آؤ۔''علی نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر سنگھار میز پر چڑھایا۔پھر بڑی مہارت سے اُسکے بالوں کے دو حصے کیے۔

''پونی ہے تمہارے پاس؟''اُس نے پوچھا تو جواباً اُس نے زور و شور سے ہاں میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے!جب میں مانگوں تو فوراً دینا۔''بڑی مشکلوں سے اُسکی دو پونی بنائی،اور سامنے سے آتے بینگز کی صورت کٹے بالوں کو سمیٹ کر پن کرنے کی غرض سے پیچھے کرنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟''وہ ہمیشہ کی طرح چیخ اٹھی۔

''اب کیا ہوا؟''وہ پریشان ہوا۔

''اسکو ایسے ہی چھوڑ دیں۔''اُس نے اپنے بینگز واپس آگے کیے۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ ایسے ہی رہتے ہیں۔''

''ایسے تو آنکھوں پر آئیں گے۔''

''ہاں!یہ ایسے ہی رہتے ہیں۔فیشن ہے۔''فیشن کا پورا پورا پتہ تھا میڈم کو۔ علی نے تاسف سے سر ہلاتے اُسے نیچے اتارا۔

''دو منٹ میں بیگ لیکر آؤ،میں گاڑی کے پاس ہوں۔''وہ سر ہلاتی وہاں سے بھاگ نکلی۔وہ بھی اپنا سامان لیکر باہر آیا،لاؤنج میں کھڑے سفیر صاحب کو خدا حافظ کہا۔وہ ذرا دیر سے اپنے آفس جاتے تھے۔پھر پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آگیا۔اب جب تک وہ آنہیں جاتی،علی گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔کیونکہ محترمہ کو سیٹ پر بٹھانا بھی پوری جنگ کے برابر تھا۔گھر کے دروازے پر وہ سفیر صاحب کے ساتھ کھڑی تھی،آفس کے لیے آدھا تیار ہوئے سفیر صاحب اُسکا بیگ پہننے میں اُسکی مدد کر رہے تھے۔علی کو نہیں یاد کہ کبھی احمد نے اتنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے کسی کی مدد لی ہو۔بیگ پہن کر اُس نے سفیر صاحب کو اشارہ کیا تو وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھکے،پھر اُس نے اُنہیں پیار کیا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے بھاگی۔

''ابّا!میں جا رہی ہوں۔''گاڑی کے پاس پہنچ کر ایک بار پھر انہیں اطلاع دی۔جواباً انہوں نے ہاتھ ہلا دیا۔علی نے کوفت سے اُسکا بیگ اُتار کر پیچھے رکھا۔

''جب اتارنا ہی تھا تو پہنا کیوں تھا۔'' بڑبڑاتے ہوئے اُسے اُسکی سیٹ پر بٹھایا۔

''کیٹی (بلی) میں جارہی ہوں۔ کوکو (کوا) میں جارہی ہوں۔ فشی (مچھلی) میں جارہی ہوں۔'' جتنی دیر میں اُسے سیٹ پر بٹھا کر، اپنی جگہ پر آتے اُس نے گاڑی سٹارٹ کی تھی، اتنی دیر میں وہ چوہے، بلی، بطخ، مچھلیوں، ہواؤں اور بادلوں تک کو اپنے اسکول جانے کی اطلاع دے چکی تھی۔

''آپ کو کاؤنٹنگ (گنتی) آتی ہے؟'' راستے میں وقت گزارنے کے لیے بات کرنا بھی ضروری تھا۔

''نہیں۔۔'' اُس نے جل کر جواب دیا۔

''آپکو کاؤنٹنگ نہیں آتی؟'' آنکھیں بڑی بڑی کیے وہ سیٹ پر کھڑی ہو گئی۔

''تم سکون سے نہیں بیٹھ سکتی؟''

''آپ اتنے بڑے ہیں پر آپکو تو کچھ نہیں آتا۔'' سوال نظر انداز کرتے افسوس سے کہا۔

''اتنی آسان ہوتی ہے۔ کوئی بات نہیں میں آپکو یاد کروادوں گی۔'' بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''بہت شکریہ آپکا! اسکول آگیا ہے۔ اب اُترو جلدی۔'' ہاتھ بڑھا کر اُسکی طرف کا دروازہ کھولا اور خود بھی اُتر گیا۔ پھر بیگ نکال کر اُسے پہنایا۔

''آپکو ایک بات بتانی ہ۔ے'' اُس نے بیگ پہننے کے بعد اپنے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

''بولو!''

''کان میں بتاؤں گی۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''سیکریٹ (راز) ہے۔'' اُس نے رازداری سے کہا۔

''ایسے ہی بتاؤ۔ کان میں نہیں سنوں گا۔''

''میں کان میں ہی بتاؤں گی۔'' ہمیشہ کی طرح وہ بضد ہوئی۔ اور علی کو معلوم تھا کہ اگر اُسکی ضد پوری نہ ہوئی تو وہ رونا شروع کر دے گی۔ اور کم از کم وہ یہاں اُسکا باجا سننے کا متحمل نہیں تھا۔

''اچھا! بولو جلدی۔'' وہ رکوع میں گیا اور اُسکے منہ کے قریب اپنے کان کیے۔ اگلے ہی لمحے نشمیہ نے اُسکے گلے میں بازو ڈالے اور اُسکے گالوں پر پیار کیا۔

''اللہ حافظ !''اُسے پیار سے کہتی اچھلتی کودتی اسکول کے دروازے کے پیچھے گم ہو گئی۔ علی کسی ٹرانس کی کیفیت میں سیدھا ہوا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی، چاہے علی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ چاہے اُسکی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اور علی؟ وہ اُسے کچھ کہہ بھی نہ پاتا تھا۔ بے یقینی کی سی حالت میں اپنا ہاتھ گالوں پر رکھا، جہاں وہ پیار کر کے گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟ پر اُسے غصّہ نہیں آیا۔ اچھا نہیں لگا تو برا بھی نہیں لگا تھا۔ وہ جیسے اپنی کیفیت خود سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پیچھے سے کسی نے ہارن دے کر اُسے گاڑی ہٹانے کو کہا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ دروازے کی جانب دیکھا تو اُسے گئے ہوئے بھی زمانے بیت چکے تھے۔ پیچھے قطار میں لگی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کو سر کے اشارے سے معذرت کرتا ہوا وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ اُسکی منزل آفس تھی، پر دل و دماغ اُلجھ کر رہ گئے تھے۔

---------+---------+--------

وہ آفس میں داخل ہوا تو تقریباً سارا عملے کام پر موجود تھا۔ سر کے اشارے سے اُنکے سلام کا جواب دیتے وہ اسٹوڈیو میں آ گیا۔ علی اب تک نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر آ بیٹھا۔ میز پر رکھا ٹیبلٹ اٹھایا، اور اُسے کھول کر مطلوبہ ڈیزائن پر کام کرنے لگا۔ پھر پاس رکھے انٹر کام پر چائے لانے کا حکم دیتے اُسکی نظریں برابر میں موجود علی کی نشست تک گئی تو وہ چونک اٹھا۔ اُسکی میز پر رکھا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک کاروباری رسالہ کھول کر الٹا کر کے رکھا ہوا تھا، جیسے کوئی پڑھتے پڑھتے رکھ گیا ہو۔ کل اُنہوں نے تمام سٹاف کو چھٹی دی تھی، خود عمر بھی کل نہیں آیا تھا۔ اگر اُنکا سیکریٹری کسی کام سے کل یہاں آیا بھی ہوتا، تب بھی وہ اُنکے اسٹوڈیو تک نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اسکی چابی صرف اُسکے اور علی کے پاس تھی۔ اور سگریٹ بھی وہ ہی پیتا تھا۔ تو اسکا مطلب کل وہ آفس آیا تھا؟ عمر حیران ہوا۔

اُس پر سے وہ یہ کاروباری میگزین اتنے ذوق و شوق سے پڑھ رہا تھا کہ پڑھتے پڑھتے ایسے ہی چھوڑ گیا۔ حالانکہ وہ بہت سلیقہ مند تھا، چاہے کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو رہی ہو، وہ اپنی ایک ایک چیز سمیٹ کر، اور جگہ پر رکھ کر جاتا تھا۔ کجا کہ ایش ٹرے میں سگریٹ کے جلے ٹکڑے اور میز پر الٹا رسالہ کھلا چھوڑ جائے۔ یہ تمام باتیں بتا رہی تھیں کہ اس وقت اُسکی ذہنی حالت کتنی ابتر ہے۔ اُسے افسوس ہوا، اُسے علی سے اپنے اور اُسکے درمیان ہوئی آخری گفتگو کے متعلق بات کرنی تھی لیکن موقع نہیں مل سکا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر وہ میگزین اٹھائی اور کھلے ہوئے صفحے پر موجود مقدّم کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُسے بالکل اُمید نہیں تھی کہ رسالہ کھولنے پر ایسی کسی چیز سے سامنا ہو جائیگا۔

اب اُسے سمجھ آیا کہ علی رسالہ اتنے ذوق و شوق سے کیوں پڑھ رہا تھا؟ وہ بھی سب کام چھوڑ کر مقدّم کا انٹرویو پڑھنے لگا۔ اور اتنا محو ہوا کہ اِرد گرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش تب آیا جب علی دروازہ کھولتے اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم !کیسے ہو؟''اُسے اندر آتا دیکھ کر رسالہ چھوڑا۔

''وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے ذرا عابد صاحب والی فائل بھیجو میں دیکھوں کہ آخری بار اُنکے آفس کا انٹیریر کیسا کیا تھا؟ اُنکے ہی ایک دوست نے رابطہ کیا ہے اور ملتا جلتا انٹیریر اپنے دفتر کے لیے کرنے کو کہا ہے۔ آج وہ ایک بجے تک ملاقات کے لیے آئینگے۔ تمہیں بتا نہیں سکا کل تھوڑا مصروف تھا۔''
اُس نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا تو عمر نے سر ہلاتے ہوئے مطلوبہ فائل اُسکے موبائل پر بھیج دی۔

''اُنکے آفس کا حدود اربعہ کتنا ہے؟ ویسا انٹیریر ہو پائے گا؟''عمر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں! وہ تو دیکھنے پر ہی پتہ چلے گا۔''اُس نے فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا پھر ایک نظر عمر کو دیکھا۔

''تم مقدّم کا انٹرویو پڑھ رہے تھے؟''اُسکے ہاتھ میں رسالہ دیکھتے ہوئے علی نے پوچھا۔

''ہاں! تمہیں کیسے معلوم؟''

''پڑھا تھا میں نے بھی کل۔۔۔''عمر کچھ حیران ہوا۔ وہ اتنی باتیں نہیں کرتا تھا۔

''تم کل آفس آئے تھے؟''

''ہاں! کچھ کام تھا۔''مختصر جواب دیا۔

''علی!''اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے رسالہ میز پر رکھا۔

''ہوں ھہ؟''اُس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔

''تم پریشان ہو؟''اُس نے ایکدم ہی پوچھا تو اُسکے ہاتھ تھمے۔

''نہیں! کیوں؟''وہ حیران ہوا۔

''اُس دن جب میں تم سے ملنے تمہارے گھر آیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ۔۔۔ تم اُس بارے میں بعد میں بات کروگے۔''

''کس بارے میں؟''اُسے واقعی یاد نہیں تھا۔

''میں نے اُس روز تمہیں کچھ زیادہ ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے تمہاری بات بھی سننی چاہیے تھی۔''وہ شرمندہ تھا۔

''کس روز؟ دو ہفتوں پہلے یا دس سال پہلے؟''لہجہ سادہ تھا، کسی بھی طنز سے پاک۔ لیکن عمر زمین میں گڑ گیا۔

''بھول جاؤ اُن سب باتوں کو۔ تم نے جو کہا ٹھیک کہا تھا۔''علی کا مقصد اُسے شرمندہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔

''تم اعلیٰ ظرف ہو۔ تم نے معافی مانگنے میں پہل کی۔ میں، نوید یا رضا اتنے اعلیٰ ظرف نہیں ہو سکے۔''

''رضا؟ رضا نے کیا کیا؟'' علی متوحش ہوا۔ بھلا رضا والی بات اسے کیسے معلوم؟

''مجھے سب معلوم ہے۔ بے شک میں دس سال پہلے وہاں تھا نہیں۔۔۔ لیکن جو اُس روز ہوا وہ ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' عمر اُسکا سوال باخوبی سمجھ گیا تھا۔

''جانے دو پرانی باتوں کو۔ زندگی میں کرنے کے لئے اور بھی بہت کچھ ہے۔'' اب کہ اُس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے ٹیبلٹ پر نظریں ٹکا دیں، جسکا مطلب تھا کہ وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ دونوں ہی پھر سے اپنے اپنے خول میں بند، پیشہ وارانہ کاموں میں مشغول رہے۔ تب ہی تقریباً پونے بارہ بجے کے قریب علی کا موبائل بج اٹھا۔ پہلے تو اس نے نا سمجھی سے دیکھا، پھر اگلے ہی لمحے جیسے کرنٹ کھا کر کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟'' عمر بھی پریشان ہو گیا۔

''مجھے ابھی فوری کہیں جانا ہے۔ میں پندرہ منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔'' وہ تیزی سے اپنا بٹوہ اور گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔

''لیکن ایک بجے میٹنگ ہے، کلائنٹ آ جائیں گے کچھ دیر میں۔'' وہ پریشان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں زیادہ دور نہیں جا رہا بس پندرہ منٹ میں آ جاؤں گا۔ تم سب سنبھال لینا۔'' وہ عجلت میں کہتے نکل گیا۔ عمر کچھ حیران پریشان سا بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں اچانک اُسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اُلجھا اُلجھا سا کچھ ضروری چیزوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ اپنے کہے کے مطابق جب علی واقعی پندرہ منٹ میں واپس آ گیا تو اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اُسکے جلدی واپس آنے پر نہیں بلکہ اُسکے ساتھ داخل ہونے والی اُس چھوٹی سی بچی کو دیکھ کر۔ اسکول کے یونیفارم میں ملبوس، کندھوں پر بیگ ڈالے، آگے سے بینگز کی صورت کٹے بالوں کی دو پونیاں بنائے وہ اپنی روشن، چمکیلی آنکھوں سے عمر کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کے وہ کوئی سوال کرتا، خاموش اسٹوڈیو میں اُسکی آواز گونجی۔

''ہم کہاں پر آئے ہیں؟'' وہ علی کا ہاتھ تھامے اُس سے سوال کر رہی تھی۔

''ہم میرے آفس آئے ہیں، کچھ دیر ہم یہیں رہیں گے۔ پھر اُسکے بعد گھر چلیں گے۔'' وہ اُسے سمجھا رہا تھا۔

''ہم ابھی گھر کیوں نہیں جا رہے؟'' اب کہ وہ کمر پر ہاتھ ٹکائے علی کے سامنے کھڑی چہرہ اٹھا کر اُس سے سوال کر رہی تھی۔

''کیونکہ مجھے کچھ کام ہے۔'' عمر کی موجودگی کے باعث اُس نے ذرا آہستہ مگر آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''آپکو کام ہے نا! مجھے تو نہیں ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' اُسکا لہجہ ضدی ہوا۔

''کیا تم کسی لمحے۔۔۔ کسی ایک لمحے بھی میری بات مان سکتی ہو؟'' اب کے اُس نے ذرا جھنجھلائے ہوئے لہجے میں جھک کر اُس سے پوچھا۔

''یہ بچی کون ہے؟''اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، عمر نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''میری بیٹی ہے۔''اُس نے بے دھیانی میں کہہ دیا۔

''تمہاری بیٹی؟''وہ حیران ہوا، اور علی ٹھہر گیا۔اُس نے نشمیہ کو اپنی بیٹی کیسے کہہ دیا؟

''آں۔۔۔ہاں!''سمجھ نہیں آیا کیا وضاحت دے؟

''اصل میں ابھی اسکی، اسکول وین نہیں ہے۔دو دنوں سے میں ہی اسے اسکول سے لیکر گھر چھوڑ رہا ہوں۔عابد صاحب کے دوست نے اچانک ہی میٹنگ رکھ دی، تو اب گھر واپس نہیں جاسکتا اسی لیے اسے یہیں لے آیا ہوں۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟اسے اسٹوڈیو میں ہی بٹھادیں گے۔اور سامنے والے کمرے میں میٹنگ رکھ لیں گے۔''

''ہاں! لیکن یہ۔۔۔''وہ رکا۔''یہ تھوڑی شرارتی ہے۔بلکہ تھوڑی سے زیادہ ہی ہے۔''اب کہ اُس نے ذرا آہستہ سے کہتے ہوئے نشمیہ کی جانب دیکھا جو قریب رکھے ایک بنگلے کے تھری ڈی ماڈل سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔علی نے غیر محسوس سے انداز میں اُسے بازو سے پکڑ کر ماڈل سے دور کیا۔

''بچے شرارتی نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟''اُس نے مسکراتے ہوئے اُسکی پریشانی دور کی۔پھر نشمیہ کی جانب متوجہ ہوا۔

''السلام علیکم! کیا نام ہے آپکا؟''مصافحے کے لیے اُسکی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نشمیہ!''اتنے ادب سے جواب دیا کہ علی بھی حیران رہ گیا۔یہ باادب بچی وہی ہے جو گھر میں اُسکا جینا حرام کر کے رکھتی ہے؟

''نائس نیم (پیارا نام)۔اور میں عمر ہوں۔''اپنا تعارف کرواتے ہوئے اُسکے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا۔

''اچھا دیکھو! ابھی ایسا ہے کہ میں اور تمہارے بابا کسی کام سے سامنے جارہے ہیں۔''اُس نے دروازے سے نظر آتے مشاورتی کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، اُسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔علی بیزار کھڑا تھا، وہ ہوتا تو سیدھے سیدھے اُسے انسان بن کر بیٹھنے کی تلقین کرتا اور مشاورتی کمرے میں چلا جاتا۔ لیکن یہ عمر پتہ نہیں کیوں اتنی تمہید باندھ رہا تھا؟

''میں بھی آپکے ساتھ جاؤں گی۔''وہ پرجوش ہوئی۔

''نہیں آپ وہاں نہیں جاسکتیں۔وہاں بچے نہیں جاتے۔آپکو یہاں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرنا ہوگا۔''اُس نے نرمی سے سمجھایا۔

''میں یہاں کیا کروں گی؟''اُس نے منہ بسورا۔

''تمہیں ڈرائنگ کرنا پسند ہے؟''عمر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔اس ساری گفتگو کو غور سے سنتا، علی خاموش کھڑا تھا۔

''ہاں! بہت زیادہ۔۔۔''وہ خوش ہوئی۔یہ انکل یقیناً اُسے کلر پنسل دینے والے تھے۔

''تو میں تمہیں ایک ڈرائنگ بک اور کچھ کلر پینٹ دیتا ہوں۔یہاں بیٹھ کر جب تک ڈرائنگ کر لینا۔ٹھیک ہے؟''

''وہ واٹر کلر ہے،اُس سے یہ یونیفارم خراب کر لے گی۔''علی نے فوراً ٹوکا۔

''کوئی بات نہیں علی! بچے کپڑے خراب کرتے ہیں۔اور میں ویسے بھی اُسے واش ایبل (آسانی سے دھل جانے والے) پینٹ دے رہا ہوں۔''اُس نے جواب دیا۔

''آپ بہت سوئیٹ (پیارے) ہیں۔''نشمیہ نے تعریف کرنا مناسب سمجھا۔بس ایک اُسکا باپ ہی کھڑوس تھا، باقی تو پوری دنیا سوئیٹ تھی۔علی نے جل کر سوچا جبکہ عمر اُسکی تعریف پر ہنس دیا۔

''شکریہ! آپ بھی بہت پیاری ہیں۔''عمر نے اُسکے گال کھینچے تو وہ سرخ ہو گئی۔علی نے تو آنکھیں پھاڑ کے ڈھیر فٹی اداکارہ کو دیکھا تھا۔

''اب تم وہاں جا کر بیٹھو، میں تمہیں ڈرائنگ کا سامان بھجواتا ہوں۔''اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی میز کی جانب اشارہ کیا۔جانتا تھا کہ علی کو اپنی نشست پر کسی کا بھی بیٹھنا پسند نہیں ہے، حتیٰ کہ عمر بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔لیکن وہ بھی پوری ڈھٹائی سے علی کی ہی نشست پر جا کر بیٹھی تھی۔علی ضبط سے لب بھینچ کر رہ گیا۔

''چلو! کلائنٹ آ گئے ہیں۔''وہ علی کو کہتا ہوا باہر نکل گیا۔جبکہ اُس نے ایک کاٹ دار نظر اُسکی کرسی پر بیٹھی، گول گول گھومتی نشمیہ پر ڈالی۔کتنے سکون سے اس نے عمر کی بات مان لی تھی۔جبکہ اُسے تو جب تک ناکوں چنے نہ چبوا لیتی، اُسکی بات نہ مانتی تھی۔

''سر! کلر اور کتاب آ گئی ہیں۔''سیکٹری نے اندر داخل ہوتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''اسے دے دو۔''وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔میٹنگ کے دوران بھی وہ گاہے بگاہے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا۔پتہ نہیں عمر نے ایسا کون سا جادو کیا تھا کہ وہ بڑے سکون سے بیٹھی ڈرائنگ میں مصروف رہی؟ میٹنگ برخاست ہوئی تو عمر کوئی ضروری کال سننے باہر چلا گیا جبکہ خود وہ سب سے پہلے اُسی کے پاس آیا۔پتہ نہیں کیوں؟

''اب ہم گھر جا رہے ہیں۔''اُس نے اُسے مخاطب کیا۔محترمہ نے مکمل نظر انداز کیا۔

''سنا نہیں؟ ہم گھر جا رہے ہیں۔''اُسکے سر پر کھڑے ہوتے ذرا زور سے کہا۔

''میں نہیں جارہی۔''مصروف سے انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''اسے بند کرو! تمہیں گھر چھوڑ کر مجھے واپس بھی آنا ہے یہاں۔''میز پر ہاتھ رکھ کر اُسکی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''آپ یہاں رہیں گے ؟''اُسے واپس آنے والی بات سمجھ نہیں آئی تو سر اٹھا کر پوچھا۔

''مجھے شام تک یہیں رہنا ہے۔''سنجیدگی سے اُسکو اپنا مسئلہ سمجھانا چاہا۔

''میں بھی شام میں جاؤں گی۔''مسئلے کا حل پیش کر کے واپس اپنے سابقہ کام کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اُف!۔۔۔عمر نے کیسے سمجھا لیا تھا اسکو؟''کوفت سے سوچا۔

''میری بات سنو!''اب کہ اُسکی ڈرائنگ بک کو بند کرنے کی نیت سے اُس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔اور اگلے ہی لمحے چونک اٹھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''اُس نے اُسکی مصوری کو اپنی جانب کر کے دیکھتے، حیرت سے پوچھا۔

''ڈرائنگ!''یک لفظی جواب دیا۔اُسے یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔

''یہ تم نے درخت پر بلیو کلر (نیلا رنگ) کیوں کیا ہے؟''اُس نے درخت کے ایک کونے پر نیلا رنگ دیکھ کر پوچھا، وہاں ابھی ابھی رنگ کرنا شروع کیا گیا تھا۔درخت کا یہ حال دیکھ کر اس فن کے دلدادہ کو کچھ ہوا تھا۔دروازے پر آتا عمر ٹھٹک کر رکا۔

''کیونکہ اس میں گرین کلر (سبز رنگ) نہیں ہے۔''اُس نے بتایا۔

''تو گرین نہیں ہوگا تو تم بلیو کر دو گی؟''شدید صدمے سے پوچھا۔

''ہاں!''ڈھیٹ تو وہ اپنے نام کی ایک تھی۔

''ایسے نہیں کرتے۔''

''آپکو کیا پتہ؟آپ کو ڈرائنگ تھوڑی آتی ہے۔''ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''میں آرٹسٹ ہوں۔اور یہ کلر جو تم لیکر بیٹھی ہوئی ہو نا! یہ بھی میرے ہیں۔''اُس نے برابری سے لڑتے ہوئے کہا۔عمر نے شدید حیران نظروں سے اُسے دیکھا۔یہ اُسکا کون سا روپ تھا بھلا؟

''تو اب کیا کروں پھر؟''ہمیشہ کی طرح اُسکے ہزار مسائل۔

''تم گرین کلر بنا بھی تو سکتی ہو۔''

''ہیں؟''اُسے خاک نہ سمجھ آئی۔

''رکو ذرا!''اُس نے عجلت میں عمر کی کرسی کھینچی اور نشمیہ کے برابر میں رکھ کر بیٹھتے ہوئے رنگوں کی ٹرے اپنی جانب کھینچی۔

''دیکھو! اگر تمہارے پاس گرین کلر نہیں ہے۔ تو تم دو کلر کو مکس کر کے گرین بنا بھی سکتی ہو۔''اُس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ پرجوش سی کرسی پر کھڑی ہو گئی، جوتوں سمیت۔۔۔ لیکن وہ فلحال سب کچھ نظر انداز کیے اُسے سبز رنگ بنانا سکھا رہا تھا۔

''یہ کونسا کلر ہے؟''علی نے ٹرے میں تھوڑا سا پیلا رنگ ڈالتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''یلو!''اُس نے کرسی پر ہی اچھلتے ہوئے کہا۔ اُسکا باپ کوئی جادو کرنے والا تھا، اُسکا خوش ہونا تو بنتا تھا۔ دروازے پر کھڑا عمر، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر اُسے پیارا لگا۔

''اور یہ؟''اب کہ اُس نے نیلا رنگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''بلیو!''

''اب ہم ان دونوں کو مکس کریں گے۔''کہتے ہوئے اُس نے برش کی مدد سے پیلے رنگ میں نیلا رنگ ملایا تو چند سیکنڈ میں اُس نے ہرا رنگ اختیار کر لیا۔

''بن گیا گرین۔۔۔''اُس نے مسکراتے ہوئے نشمیہ کو دیکھا۔

''واؤ!۔۔۔ یہ کیسے کیا آپ نے؟''وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

''ابھی تو کر کے دکھایا ہے۔''وہ چڑا۔

''آپ نے میجک (جادو) کیا ہے۔''

''میں نے میجک نہیں کیا ہے۔ کلر مکس کیے ہیں۔''

''آپ تو میجک کرتے ہیں۔''وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ اُسکا باپ جادوگر تھا تو تھا۔

''حد ہے۔''

''میں بھی کروں؟''

''ہاں کرو!''اُس نے باخوشی ٹرے اُسکی طرف بڑھائی۔اب وہ بالکل علی کی طرح رنگوں کو ملانے لگی تھی جبکہ وہ بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے؟جب میں چھوٹا تھا تو میں بھی ڈرائنگ کرتا تھا۔مجھے بھی بہت پسند تھا پینٹنگ کرنا،اسکیچنگ کرنا۔''پتہ نہیں وہ اُسے کیوں بتا رہا تھا۔

''واؤ!آپ کو بھی ڈرائنگ آتی ہے؟''وہ کلر ملانے کا عمل روک کر پر شوق نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''ہاں!وہ دیکھو!وہ پینٹنگ میں نے ہی بنائی ہے۔''اُس نے پیچھے دیوار پر لگی مصوری کی جانب اشارہ کیا۔

''اتنی پیاری؟''وہ چیخ اٹھی۔''یہ آپ نے بنائی؟''اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔علی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔اُسے جتنا شوق تھا کہ احمد بھی ڈرائنگ کرے، وہ اُسے رنگوں کے نام سکھائے،اسکیچنگ کے گر سکھائے۔لیکن اُتنا ہی احمد کو رنگوں سے چڑ تھی۔اُسکی دلچسپی فٹبال،سائیکلنگ اور گاڑیوں میں تھی۔اور وہ بچہ بھی تھوڑا خاموش طبیعت کا تھا۔علی کبھی چاہ کر بھی اُسکے ساتھ اچھا وقت نہیں گزار پایا۔

''لیکن آپ کی ڈرائنگ مجھ سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔''اُسکی بنائی مصوری پر تبصرہ کرتی وہ ہمیشہ کی طرح اُسے دُکھ کی کیفیت سے باہر کھینچ لائی۔

''بالکل نہیں!میری پینٹنگ زیادہ اچھی ہے۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''آپکو تو کلر بھی صحیح سے کرنا نہیں آتا۔''منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

''وہ گھر بھی میں نے بنایا ہے۔''اُس نے بنگلے کے تھری ڈی ماڈل کی طرف اشارہ کیا جسے وہ تھوڑی دیر پہلے چھیڑ رہی تھی۔

''اس سے اچھا تو میں نے اسکول میں بنایا تھا۔''وہ چڑانے سے باز نہ آئی۔عمر نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''تم نے کبھی اپنی زندگی میں اتنی بڑی پینٹنگ بنائی ہے؟'' بھنویں سکیڑ کر ناراضگی سے پوچھا۔

''نہیں!''زور و شور سے نفی میں سر ہلایا۔

''تو؟پھر تمہاری ڈرائنگ زیادہ اچھی ہوئی یا میری؟''برابری سے جھگڑا کرتے وہ کہیں سے بھی دو بچوں کا باپ نہیں لگ رہا تھا۔

''میری!''وہ اچھلتے ہوئے بولی۔

''تم۔۔۔تم جوتوں سمیت میری چیئر (کرسی) پر چڑھ گئی؟''وہ جیسے ہوش میں آیا۔

''تو کیا ہوا؟''اِدھر فرق ہی کس کو پڑ رہا تھا؟

''اُترو۔۔۔فوراً اُترو!''وہ کھڑا ہوتے اُسے اتارنے ہی لگا تو وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپکی چیئر اتنی اچھی ہے۔''وہ ریوالوینگ چیئر کو گول گول گھما رہی تھی۔

''تمہارے اسکول والے بالکل بھی درست تربیت نہیں کر رہے تمہاری۔''وہ جل کے بولا۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟''اب اُسے لفظ ''تربیت'' کے معنی و مفہوم جاننے تھے۔

دروازے پر کھڑا، اُن دونوں کو بحث میں اُلجھے دیکھتا، عمر مسکرا رہا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک رات میں علی کی بیٹی کہاں سے آگئی؟ اگر پہلے سے تھی تو اس روز جب وہ اُسکے گھر گیا تھا تو تب کیوں نہ نظر آئی؟ اور کچھ نہیں تو، کم از کم جب سفیر صاحب اُس سے علی کی طلاق اور اُسکے بیٹے کے اپنی ماں کے ساتھ جانے کے بارے میں بات کر رہے تھے تو انہوں نے اُسکی بیٹی کا ذکر کیوں نہ کیا؟ وہ ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا تو صرف اتنا کہ سامنے کھڑا یہ شخص، جسے وہ پچھلے دو سالوں سے حد سے زیادہ سنجیدہ، اور دنیا سے بد گمان دیکھتا آرہا تھا۔ وہی شخص آج مُسکرا رہا تھا، کسی کو اپنی مصوری دکھا کے خوش ہو رہا تھا، کسی کے ساتھ اتنا مصروف تھا کہ بھول گیا تھا کہ وہ آفس میں ہے، کسی کے ساتھ بچوں کی طرح لڑ رہا تھا۔اور وہ کسی۔۔۔یہی بچی تھی، جسے اُس نے تھوڑی دیر پہلے بیٹی کہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔اندر وہ دونوں اب بھی اپنی اپنی مصوری کو ایک دوسرے سے بہترین ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

---------+---------+--------

کچن میں کھڑی جزا، کمرے سے آتی آوازوں کو بخوبی سن رہی تھی۔اس وقت اُسکی ماں لائیو ویڈیو کال پر وحید سے بات کر رہی تھی۔اُسے بھی بلایا تھا لیکن وہ بہانہ بنائے وہیں کچن میں رہی۔

''امی! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ آپ جزا کے لیے کسی رشتے والوں کو بلا رہی ہیں؟'' باتوں کے درمیان وحید نے یکدم ہی پوچھا۔

''بتا دیا نوید نے؟''ماں ن ناراضگی سے کہا۔

''تو کیا نہیں بتانا چاہیے تھا؟''اُس نے سوال کیا۔

''ارے! نہیں نہیں۔۔۔میں تو خود بتا دیتی۔''وہ گڑبڑا گئیں۔

''لڑکا کیا کرتا ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''کام ہے اپنا۔''اُنہوں نے گول مول سا جواب دیا۔

''ویپ کارنر۔۔۔یعنی ویپ کی دکان ہے اُسکی۔''سکرین پر نظر آتے وحید نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔

''تو بیٹا! ہے تو اپنا کام ہی نہ؟'' اُنہوں نے کمزور سی دلیل پیش کی۔

''وہ شخص ایسا مال بیچتا ہے جو دوسروں کی صحت کو نقصان پہنچائے۔ کیا آپ اس کام کو حلال سمجھتی ہیں؟ اوپر سے تعلیم کیا ہے اُسکی؟ انٹر پاس نہیں، فیل ہے وہ۔ آپ اپنی نازوں پلی، پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ، ایسے گٹکا ماوا کھانے والے شخص کو دینے پر کیسے راضی ہو گئیں؟'' وہ برہم ہوا۔

''ایسی بات نہیں ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کی فکر نہیں۔ میں خود اس لڑکے کو پسند نہیں کرتی، لیکن کیا کروں؟ ساری عمر گھر تو نہیں بٹھا سکتی نہ؟ اگلے سال ستائیس کی ہو جائیگی۔''

''امی! آج آپ میری ایک بات سن لیں۔ جزا کے رشتے کے لیے اب آپ پریشان نہیں ہوں گی اور نہ ہی کسی کو گھر بلائیں گی۔ میرا حلقہ احباب بہت وسیع اور بہترین ہے۔ میں اُسکے لیے ایک سے ایک بہترین انتخاب کر سکتا ہوں۔ لیکن اُسکی مرضی کے بنا کچھ نہیں ہو گا۔ اور آپ تو بالکل نہیں کریں گی۔'' اُسکا لہجہ حتمی تھا۔

''ٹھیک ہے! میں منع کر دوں گی۔'' اُنہوں نے مایوسی سے کہا۔ کچن میں مصروف جزا نے دل میں سکھ کا سانس لیا۔ جانتی تھی کہ ابّو کے مرنے کے بعد سے اس گھر میں وحید کا فیصلہ ہی حرفِ آخر مانا جاتا تھا۔ اب وہ لوگ کسی دوسرے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

''میں جا رہی ہوں امی!'' اُس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالتے کمرے کے دروازے پر ہی کھڑے اُنکو کہا۔

''بھائی سے بات تو کر لو۔'' اُنہوں نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں امی دیر ہو رہی ہے۔'' وہ عجلت میں کہتی چلی گئی۔

''مصروف ہے وہ آج کل۔'' اُنہوں نے بیٹے کو وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں! آپ بس اُسکا خیال رکھیں۔ اُسکا دل نہ دکھایا کریں، اور ہاتھ تو بالکل مت اٹھایا کریں۔ جانتی ہیں نا! ابو کتنا پیار کرتے تھے اُس سے؟'' اُس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

دوسری طرف اُلجھی اُلجھی سی جزا پناہ گاہ آ گئی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وحید کو یہ بات کس نے بتائی؟ اگر نوید نے بتائی تو بھی اُسکے لیے یہ باعث حیرت تھا۔ کیونکہ نوید اُسکے ذاتی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتا تھا۔ یا شاید اُسکے اور نوید کے تعلقات کبھی اتنے اچھے رہے نہ تھے کہ وہ اُسکے متعلق کچھ اچھا سوچتی۔

بہر حال، رشتے والی آنٹیوں کی طرف سے اب وہ بے فکر تھی۔ لیکن دل کچھ عجیب سا تھا۔ اتنے بچے ہونے کے باوجود پناہ گاہ آج خالی خالی لگ رہا تھا۔ شاید وجہ رضاکانہ ہونا تھا۔ آج وہ یونیورسٹی کے کسی کام کی وجہ سے پناہ گاہ میں موجود نہیں تھا۔

لیکن وہ تھا۔۔۔

ہر جانب تھا۔۔۔

ہنستا ہوا۔۔۔۔

شرارت سے اُسے دیکھتا ہوا۔۔۔۔۔

کہیں گم ہوتا ہوا۔۔۔۔۔۔

اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا۔۔۔۔

اُسکی آواز تھی۔۔۔

اُسکے بیساختہ لگائے گئے قہقہہ تھے۔۔۔۔

اُسکی پر شوق نگاہیں تھیں۔۔۔۔

وہ وہاں تھا؟ یا اُسکے دل و دماغ میں تھا؟

''کیا میں اُسے یاد کر رہی ہُوں؟''خود سے سوال کیا۔

''ہر گز نہیں!''خود ہی تردید کی۔

مگر سچ کی تردید کب تک ہوتی ہے؟

کب تک؟

---------+---------+--------

''میری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔''سفیر صاحب کی گود میں چڑھی ٹی وی دیکھتی نشمیہ نے اعلان کیا۔

''اتنے اتنے سے بچوں کو بھی بوڑھوں جیسا درد ہے۔''لیپ ٹاپ پر مصروف علی نے طنز کرنا ضروری سمجھا۔

''یہ اسکول میں بہت بھاگتی دوڑتی ہے۔''سفیر صاحب نے بتایا۔

''مجھے کوئی شک نہیں۔''جو گھر میں چوبیس گھنٹے بھاگتی دوڑتی ہے بھلا وہ اسکول میں ایسا کیوں نہیں کریگی؟

''مجھے سچ میں درد ہو رہا ہے۔''وہ روہانسی ہوئی تو علی نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تم دودھ پیتی ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پسند۔''ناک بھنویں چڑھا کر کہا۔

''جب ہی تو یہ حال ہے۔''وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا، پھر کچن تک گیا اور ایک گلاس میں دودھ گرم کر کے لے آیا۔ سفیر صاحب خاموشی سے اُسکی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔وہ قریب آیا اور اُسے، اُنکی گود سے اٹھا کر فرش پر کھڑا کیا، پھر پنجوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھا۔

''میری بات غور سے سنو! میں دودھ لیکر آیا ہوں۔اور مجھے بنا کسی ضد کے یہ ختم چاہیے۔''اُس نے انگلی اٹھا کر وارن کرنے والے انداز میں کہا۔

''لیکن میں دودھ نہیں پیتی۔''مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔

''چپ کر کے پیو!''اُس نے دودھ کا گلاس اُسکے منہ کی طرف کیا۔

''مجھے نہیں پینا! میں بس اس میں چاکلیٹ ملا کر پیتی ہوں۔''اُس نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس چاکلیٹ نہیں ہے۔ابھی ایسے ہی پیو ورنہ پاؤں کے درد سے چیختی رہو گی۔''اُس نے غصّے سے کہا۔

''آپ نے پھر مجھے ڈانٹا۔''وہ پیر پٹختے ہوئے چیخی۔

''تو تم نے پھر ضد کی نا؟''اُس نے مزید ڈانٹا۔اب کہ اُسکی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرنے لگے۔

''ناٹ اگین (پھر سے نہیں)۔۔۔۔''وہ بیزار ہوا۔اور ادھر اُسکا باجا شروع۔

''مجھے آپ سے بات نہیں کرنی آپ ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے غصّے سے رخ پھیر لیا۔ علی نے بے بسی سے سفیر صاحب کو دیکھا۔

''بچوں سے اس طرح بات نہیں کرتے۔'' اُنہوں نے سمجھانا چاہا۔

''تو اور کس طرح بات کروں؟ آرام سے بات کرتا ہوں تو ضد کرتی ہے۔ڈانٹتا ہوں تو رونا شروع کر دیتی ہے۔''

''بچوں سے بچوں کی طرح بات کی جاتی ہے علی!''اُنہوں نے پھر سے سمجھایا۔

''میں بچی نہیں ہوں۔''رخ پھیرے ہوئے ہی اعلان کیا۔

''دیکھ لیں اسے۔''اُس نے جتایا۔

''نشمی!''اُنہوں نے اُسے پُکارا تو اس نے ناراضگی سے دیکھا۔اس طرز تخاطب پر علی حیران ہوا۔

''اگر تم دودھ پی لو گی، تو میں کل چاکلیٹ سیرپ لادوں گا۔''اُنہوں نے پیار سے کہا۔

''پرومس؟(وعدہ)''اُس نے عہد لینا چاہا۔

''پرومس۔''اُنہوں نے وعدہ کر لیا۔

''دودھ دیں۔''اُس نے علی سے دودھ کا گلاس لے کر برے برے منہ بناتے ہوئے پورا ختم کر ہی لیا۔

''اب چپ کر کے جاؤ،اور سو جاؤ۔اور دانت برش کر کے سونا۔''علی نے خالی گلاس واپس لیتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔

''مجھے باربی دیکھنی ہے۔''نئی فرمائش۔

''نہیں!کل بھی تم نے اتنی دیر کارٹون دیکھا تھا اور پھر صبح اٹھنے پر راضی نہیں تھی۔''ہمیشہ کی طرح اُس نے انکار کیا۔

''کل چھٹی ہے۔''اُس نے یاد دلایا کہ کل ہفتہ تھا۔

''ہو گی۔۔۔لیکن تم پھر بھی جلدی سوؤ گی۔''اُس نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

اور اُسکے بعد؟

اُسکے بعد کیا ہوا؟

اسی گھر کے لاؤنج میں اب تین نفوس بیٹھے باربی اور اُسکی بہنوں کے کارنامے دیکھ رہے تھے۔

---------+---------+--------

فروری کے درمیانی دن شروع ہو رہے تھے۔ تین روز بعد رمضان بھی متوقع تھے۔ آج کے دن وہ رمضان کے لیے کچھ خریداری کرنا چاہتا تھا۔ مکرم کے ساتھ خریداری مشکل تھی لہٰذا مقدس کو پیغام بھیجا کہ کیا آج کے روز وہ اُسے سنبھال سکتی ہے؟ وہ جانتا تھا کہ وہ بھی رمضان کی تیاریوں میں مصروف ہو گی، اور اُسکی مامی کا بھی اُنکے ساتھ پہلا رمضان تھا تو یقیناً مصروفیات زیادہ ہوں گی۔ اسی لیے پوچھنا مناسب سمجھا۔ جواباً وہ بخوشی راضی ہو گئی۔

''تم تو گھر کے دروازے سے ہی واپس چلے جاتے ہو۔'' دروازے پر کھڑی مکرم کو اُس کی گود سے لیتی شکوہ کر رہی تھی۔ آج وہ خاموش تھا نہ جانے کیوں؟

''کبھی گھر بھی آؤ، نانی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔'' اُسے چپ دیکھ کر بولی۔

''آؤں گا کسی دن۔ ابھی تو رمضان کے لیے کافی کام پڑے ہیں۔'' اُس نے بہانہ بنایا۔

''کیا بات ہے مقدّم؟ تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ کیا کوئی پریشانی ہے؟'' اب کہ وہ پریشان ہوئی۔ اُس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، وہ پریشان تھی۔ وہ کیوں پریشان تھی؟ کیا اُسکے لیے؟ وہ شکوے کر رہی تھی۔ کس لیے؟ وہ اُسکا انتظار کرتی تھی۔ کیوں؟

''بتاؤ مقدّم! میں پریشان ہو رہی ہوں

''وہ ڈر گئی۔

''تمہیں لیلیٰ یاد ہے؟'' سوال بے انتہا غیر متوقع تھا۔ وہ ٹھہر گئی۔ پچھلے دو ماہ کے عرصے میں اُس نے پہلی بار اُسکی زبان سے لیلیٰ کا ذکر سنا تھا۔

''بتاؤ نا! تمہیں یاد ہے وہ؟'' اُسکے انداز میں کچھ تھا۔ بچوں جیسا۔۔۔

''ہاں! مجھے یاد ہے۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں یہ یاد ہے کہ وہ کیسے مری تھی؟'' یہ پہلے سوال سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ وہ سن سی کھڑی رہ گئی۔

''تمہیں۔۔۔ تمہیں کیا ہوا ہے مقدّم؟'' اُس کے لہجے میں فکر گھل گئی، آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ ایسے سوال کیوں کر رہا تھا؟ وہ ماضی کیوں کرید رہا تھا؟

''مجھے وہ یاد آتی ہے مقدّس!۔۔۔ بہت یاد آتی ہے۔'' وہ تھم گئی۔۔۔ ختم ہو گئی۔۔۔ فنا ہو گئی۔۔۔

سامنے کھڑے شخص کے لہجے میں جو کرچیاں ٹوٹی تھیں، وہ سیدھا اُسکے دل میں جا کر پیوست ہوئی تھیں۔

''میری زندگی اُسکے بعد ختم ہو گئی تھی۔ میں ختم ہو گیا تھا مقدّس! لیکن۔۔۔ لیکن میں نے خود کو دوبارہ کھڑا کیا۔ پر مقدس! تمہیں ایک بات بتاؤں؟'' وہ ساکت کھڑی تھی۔ سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں آنسو پہلی بار دیکھے تھے۔ اُس نے پہلی بار اُسکے منہ سے جذبات کا اظہار سنا تھا۔ لیکن لیلیٰ کے لیے۔۔۔

''میں لیلیٰ کو کبھی بھول نہیں سکا۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔۔''اُسکی آواز بھرائی، گلا رندھ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ وہ گیلی سانس اندر کھینچتے ہوئے واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔ جانا اُسے مارٹ تھا لیکن اب پتہ نہیں وہ کہاں جا رہا تھا؟ وہ گاڑی سٹارٹ کیے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پیچھے کھڑی مقدّس، آج پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہی ہو چکی تھی۔ وہ اُس بارہویں کھلاڑی کی مانند تھی جس نے کھیل میں حصہ بھی نہ لیا تھا لیکن ہار پھر بھی اُسکا مقدر بنا دی گئی تھی۔

بھلا قیس کی زندگی میں لیلیٰ کے علاوہ بھی کوئی آ سکتا تھا؟

وہ تو گلیوں گلیوں اُسکے لیے بھٹکتے بھٹکتے مر گیا تھا۔

مگر لیلیٰ کے بعد اُسکی آنکھیں دنیا کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

تو بھلا لیلیٰ کی جگہ لینے کی جرات کون کر سکتا ہے؟

ٹوٹے دل اور تھکے قدموں سے مقدّس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ یہ جانے بنا کہ۔۔۔۔

قیس تو مجنوں تھا۔۔۔

لیکن مقدّم نے محبت کی تھی۔۔۔

جنون نہیں۔۔۔

---------+---------+--------

اُسے مارٹ جانا تھا، پر نہیں گیا۔ بھرے دل اور خالی دماغ کے ساتھ اپنے ہی گھر واپس آ گیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟

اس روز بھی اُسے لیلیٰ اچانک یاد آ گئی تھی۔ وہ علی کے سامنے اُسکی موت کا ذکر کر بیٹھا۔ آج وہ مقدّس کو سب سنا بیٹھا۔ لیکن دل اب بھی پر سکون نہ ہوا تھا۔ وہ emotional outburst کا شکار ہو رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتائے کہ لیلیٰ اُس سے چھین لی گئی ہے۔ نہ دکھ کم ہو رہے تھے نہ آنسو۔ سارے زخم پھر سے تازہ ہو رہے تھے۔ اس وقت وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُسکے پاس ہو اور وہ اُسے سب کچھ کہہ سُنائے۔ وہ اُس سے بس لیلیٰ کی باتیں کرے۔ اپنی کیفیت اُسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اور اللہ بھی کبھی انجان ہوتا ہے کہ اُسکا بندہ اکیلا ہے؟ وہ تو جانتا ہے کہ اُسکے بندے کو اس وقت کیا چاہیے؟ اُسی لمحے جب وہ تنہا بیٹھا تھا، اُسکا موبائل بج اٹھا۔ اٹھا کر دیکھا تو عمر تھا۔ اُس نے فون کان سے لگایا۔ جانتا نہ تھا کہ کیا بات کرنی ہے؟

''کیسے ہو آغا؟''اُسکی آواز سنائی دی۔

''پتہ نہیں؟''جواب بہت عجیب سا تھا۔دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''اس وقت کہاں ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں!''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''گھر پہ ہو؟''نحل سے پوچھا گیا۔

''شاید۔۔۔''

''لوکیشن بھیجو۔''اُس نے کہا۔

''کیوں؟''

''میں آرہا ہوں۔''اُس نے فون کاٹ دیا۔مقدّم کتنی ہی دیر موبائل کی اسکرین کو دیکھتا رہا۔وہ کیوں آرہا تھا؟اور مقدّم اسے کیا کہتا؟اس لمحے اُسکا دماغ، واقعی کام نہیں کر رہا تھا۔پتہ نہیں اُسکے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟اُس نے لوکیشن بھیجنے کے بجائے ایک پیغام بھیجا''میں اپنے پرانے گھر میں ہوں''پھر تھک کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔بہت سے لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ گارڈ نے عمر کے آنے کی اطلاع دی،اُسے اندر لانے کی اجازت چاہی پر اُس نے کچھ نہ کہا،ایسے ہی ساکت بیٹھا رہا۔وہ اُسکی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے اُسے اندر لے آیا۔ عمر نے اُسے دیکھا،وہ خاموش تھا۔کچھ ہوا تھا اُسکے ساتھ،لیکن کیا؟اُسے معلوم نہیں تھا۔گارڈ جا چکا تھا،اب وہ دونوں ہی وہاں رہ گئے تھے۔عمر خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''تم؟کب آئے؟''اُس نے حیرت سے پوچھا تو عمر کو اُسکی ذہنی حالت پر شک گزرا۔

''میں ابھی آیا ہوں۔''

''کیوں؟''ایک اور غیر متوقع سوال۔وہ کچھ لمحے اُسے دیکھتا رہا۔کل تک تو وہ ٹھیک تھا۔آج جانے کیا ہو گیا تھا اُسے؟

''کیا ہوا ہے آغا؟''اُس نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں!''اُس نے آہستہ سے کہتے سر جھکا لیا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا تھا،بات کرنا چاہتا تھا۔اس لیے چلا آیا۔'' خود ہی بات شروع کی۔آج وہ اُسے پھر سے بہت فاصلے پر نظر آرہا تھا۔

''کیوں؟''

''میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا تھا آغا! ہر اُس جگہ جہاں تم مل سکتے تھے۔ تمہارے آفس میں، یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ میں۔ کئی کئی روز تمہارے محلّے کے چکر لگاتا رہا کہ کچھ معلوم ہو جائے تمہارے بارے میں۔ پر تم نہ ملے۔ کہاں چلے گئے تھے مقدّم؟'' بلآخر اُس نے کہہ دیا۔ یہ وہ سوال تھا جو کل حسین نے بھی اس سے پوچھا تھا۔ پر وہ جواب نہ دے پایا تھا۔ پر اس وقت سامنے عمر تھا۔

''تمہیں لیلیٰ یاد ہے؟'' بالکل اچانک ہی وہی سوال اُس سے بھی کیا جو مقدّس سے کیا تھا۔ عمر رک گیا۔

''ہاں!'' یک لفظی جواب دیتے اُسے بولنے کا موقع دیا۔

''تمہیں یاد ہے میں نے کیسے اپنی امّاں کو اُسکے لیے راضی کیا تھا؟'' اُس نے اُسے دیکھتے کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں ہی تو گواہ ہوں۔'' اُس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیلیٰ سے متعلق اُسکے تمام مسائل وہی تو سنتا تھا۔ اس جواب پر وہ بہت دیر چپ رہا۔

''مقدّم!'' بلآخر اُس نے پُکارا تو اُس نے دوبارہ چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ''جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔ میں سننے کو تیار ہوں۔'' وہ مہربان تھا۔ ہمیشہ سے۔۔۔

''علی میرا دوست تھا۔ مجھے بہت عزیز تھا۔'' بات لیلیٰ سے شروع ہوئی تھی تو درمیان میں علی کیسے آ گیا تھا؟ وہ اُلجھا ہوا تھا اور اُسے بھی اُلجھا رہا تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا تاکہ وہ بولے۔

''میں کبھی اُسے بیچ راستے میں چھوڑ کر نہیں جاتا۔ چاہے ساری دنیا میرے خلاف کھڑی ہو جاتی میں تب بھی نہ جاتا۔ وہ میرا دوست تھا۔۔۔ بھائی تھا۔۔۔'' وہ رکا۔ عمر سانس روکے سن رہا تھا۔

''میں کبھی نہ جاتا اگر لیلیٰ۔۔۔'' وہ کہہ نہ سکا۔ آواز بھرا گئی تھی شاید۔ وہ بول بھی نہ پا رہا تھا۔ عمر نے دیکھا اُسکے ہاتھ کانپے تھے۔ اُس نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا۔

''کیا ہوا تھا لیلیٰ کو؟'' یہ وہ سوال تھا جسکا جواب ہر شخص جاننا چاہتا تھا۔ بلآخر آج مقدّم ساری گرہیں خود ہی کھولنے بیٹھ گیا تھا۔

دس سال قبل:

''آپ کیسے لیلیٰ کا نکاح اُس مقدّم سے طے کر سکتے ہیں؟ وہ شہر میں رہتا ہے۔ اُس نے اور اُسکے باپ نے روایتوں کو توڑا ہے۔ جانتے نہیں ہیں کیا کہ ماموں نے دونوں شادیاں برادری سے باہر کی ہیں۔'' لیلیٰ کا بھائی عبیر شاہ، اپنے باپ پر چیخ رہا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا متوقع سردار تھا۔ اپنی جاہلانہ رسوم و روایات کو وہ جی جان سے مانتا تھا۔

''تو؟اُسکی ماں بے شک شہر کی رہنے والی ہے لیکن باپ تو ہماری برادری کا ہی ہے نا! تمہاری ماں کا بھائی ہے وہ۔''لیلیٰ کے باپ نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''ابّا! ماموں باغی ہیں۔پہلے اُنہوں نے مقدّم کی ماں سے شادی کی، جو کہ شہر کی رہنے والی ہیں۔پھر دوسری شادی ہمارے دشمنوں سے کرلی۔اپنے ہی بھائی کے قاتل کی بہن سے شادی کرلی اُس نے۔''غصّے سے بولتے بولتے اُسکے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔

''حد میں رہو اپنی! وہ دونوں اُسکی بیویاں اور تمہاری مامیاں ہیں۔اور ویسے بھی اُسکی دوسری بیوی سے خاندان میں کوئی بھی نہیں ملتا۔ونی میں آئی ہوئی عورت کی یہی حیثیت ہے۔لیکن مقدّم کی ماں کو تو اس برادری کے بڑے بزرگوں نے پورے دل سے تسلیم کیا تھا۔پھر تم کون ہوتے ہو ایسے فیصلے صادر کرنے والے؟''

''میں اس قبیلے کا اگلا سردار ہوں۔''اُس نے سرخ آنکھوں سے جتایا۔

''تم سردار ہو تو نہیں نا؟اس وقت تم قبیلے کے موجودہ سردار کے سامنے ہو۔لہٰذا اپنی زبان سنبھال کر بات کرو اور میرے فیصلوں پر سوال اٹھانے کی کوشش بھی مت کرنا۔''اب کہ اُنہوں نے دھاڑتے ہوئے کہا تو وہ تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا۔پر وہ رکا نہیں،اُس نے کچھ پرجوش نوجوانوں کو اپنے باپ کے خلاف اکھٹا کیا۔وہ کسی صورت اپنی بہن کی شادی ایک شہری لڑکے سے ہونے نہیں دے سکتا تھا۔اُس وقت تو قبیلے کے بڑوں نے اُن سب کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلانے کے بعد معاملہ رفع دفع کر دیا لیکن لیلیٰ کے باپ نے اپنے بیٹے عبیر شاہ کو اُسکی بیوی شیریں سمیت عاق کر دیا۔اُس شخص نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی اور باغی کی اُنکی روایات میں یہی سزا تھی۔

اُنہیں لگا تھا کہ جب لیلیٰ کا نکاح ہو جائیگا تو وہ بھی کچھ عرصے بعد انسان بن کر معافی مانگ لے گا۔اور معاملہ ختم ہو جائے گا۔

لیکن یہ اُنکی بھول تھی۔

---------+---------+--------

''تم یہ جھمکے ہمیشہ کیوں پہنے رکھتی ہو؟''نکاح کی تقریب ہو چکی تھی۔مہمان بھی جا چکے تھے۔آج بلآخر لیلیٰ اُسکی ہو چکی تھی۔وہ ساری دنیا کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اُس نے لیلیٰ کو حاصل کر لیا ہے۔نکاح کے اگلے دن اُسے سوات جانا تھا، جسکے لیے اس وقت وہ سامان باندھ رہی تھی،تب ہی مقدّم اُس سے ملنے چلا آیا۔اُسکے کانوں میں جھولتے جھمکے کو دیکھ کر شرارت سے پوچھ بیٹھا۔یہ جھمکے اُس نے اپنی اور لیلیٰ کی بات پکی ہونے کی خوشی میں اُسے تحفتاً دیے تھے۔

''کیوں کہ تم نے دیئے ہیں۔''مسکرا کر کہتی وہ اپنی اپنی سی لگی۔

''اگر خراب ہو گئے تو؟''

''تو تم اور لا دینا۔'' مقدّم ہنس دیا۔

''تم جان مانگو تو وہ بھی لا کر دوں گا۔ ابھی تو فلحال یہ لو۔'' اُس نے ہاتھ میں پکڑے ایک خوبصورت سے پیکٹ میں مقید تحفہ اُسے دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ اشتیاق سے ریپر کھولنے ہی لگی تھی کہ اُس نے روک دیا۔

''رکو! یہ ابھی مت کھولنا۔ گھر جا کر کھولنا۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! لیکن اب جاؤ یہاں سے مجھے جانا بھی ہے۔'' اُس نے وہیں پر ٹکے مقدّم کو تقریباً دھکے مار کر باہر نکالا تو وہ ہنس دیا۔

لیلیٰ اگلی صبح چلی گئی، گھر سے نکلتے ہوئے وہ بار بار مڑ کر مقدّم کو دیکھ رہی تھی۔ دل کو پتہ نہیں ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ دوبارہ اُسکو دیکھ نہ پائے گی۔ اُسکا شرارتی چہرہ نظروں میں سموئے وہ وہاں سے چلی آئی۔ راستے میں اُسکا تحفہ کھول کر دیکھا تو اندر ایک خوبصورت سے کور والی ڈائری موجود تھی۔ وہ کتنا باخبر تھا اُس سے؟ چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتا تھا۔ یہ مقدّم کی طرف سے ملنے والی دوسری ڈائری تھی۔

سوات آتے ہی اُسکے بھائی نے اُسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ روزانہ گھر کے لینڈ لائن پر مختلف نمبروں سے کال کر کے اُس سے مقدّم سے طلاق لینے کا مطالبہ کرتا۔ وہ بیچاری پریشان ہو جاتی۔ پھر اُسکے ابّا اُسے حوصلہ دیتے تو اُسے کچھ سکون ملتا۔ مقدّم روز ہی اُس سے فون کر کے بات کرتا تھا۔ اُس سے جلد واپس آنے کی ضد کرتا تو وہ بس مسکرا دیتی۔ پر اُسے کچھ نہ بتاتی کہ کہیں وہ پریشان نہ ہو جائے۔

دوسری جانب عبیر کی دھمکیوں کا سلسلہ بتدریج کم ہوتے ہوتے بالکل ہی ختم ہو گیا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ خود سے زیادہ اُسے مقدّم کی فکر تھی کہ کہیں بھائی اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا جنونی ہے، یہ تو ابّا کا ساتھ تھا جو وہ اب تک صرف دھمکیاں ہی دے سکا تھا۔

لیکن۔۔۔۔

یہ اُسکی بھول تھی۔۔۔

---------+---------+--------

علی کی بارات کے اگلے دن:

اُسکی صبح سے لیلیٰ سے بات نہ ہوئی تھی، اس وجہ سے وہ کچھ پریشان رہا۔ دوسری جانب صنوبر کے کیس کے سلسلے میں وہ آج استغاثہ کے دفتر میں اُن سب کے ساتھ موجود تھا۔ لیلیٰ کی پریشانی کی وجہ سے وہ ٹھیک سے اُن سے بات بھی نہیں کر سکا تھا۔ ولیمے کے اگلے روز پیشی تھی، جسکے لیے وکیل اُنہیں تیار کر رہا تھا۔

استغاثہ کے دفتر سے واپس آکر وہ سارا دن لیلیٰ کو کال ملاتا رہا، پھوپھو کے گھر کے نمبر پر بھی رابطہ کیا پر کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھا۔ پوری رات اسی طرح گزر گئی حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ اُس روز علی کا ولیمہ تھا، پر اُسکی ساری فکریں بس لیلیٰ کیلئے تھیں۔ صبح جب وہ پریشان سا بیٹھا تھا، تب ہی اُسکے ابّا عجلت میں اُسکے کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیا ہوا ابّا؟'' وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہمیں ابھی اور اسی وقت سوات کے لیے نکلنا ہے۔'' اُنہوں نے پریشانی سے کہا تو اُسکا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ برا ہوا تھا یقیناً۔

''کیا ہوا ہے ابّا؟ لیلیٰ ٹھیک ہے؟''

''نہیں! لیلیٰ کل رات سے لاپتہ ہے۔'' اُنہوں نے اُسکے سر پر پہاڑ توڑا تھا۔

''لاپتہ ہے؟ کیسے؟ کیا مطلب ابّا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' یا تو وہ سمجھ نہیں رہا تھا یا سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''مقدّم! لیلیٰ لاپتہ ہے۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکلنا ہے۔'' اُنہوں نے اُسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ اُسکے بعد جیسے گھر میں افراتفری مچ گئی۔ اُسکی والدہ نے بھی ضد پکڑلی کہ وہ بھی ہر صورت سوات جائیں گی۔ ایک ہی بیگ میں دو جوڑے ٹھونس کر جب وہ جلد بازی میں گھر سے نکل رہے تھے تب ایک لمحے کو اُسے خیال آیا کہ رات کو نہ صرف علی کا ولیمہ ہے، بلکہ کل مقدمے کی پہلی پیشی بھی ہے، اُسکے قدم تھمے۔

''مجھے تو علی کے ساتھ ہونا چاہیے۔'' دل میں خیال آیا۔

''مقدّم! وہاں کھڑے وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ گاڑی میں آؤ۔'' شفیق صاحب چیخے تھے۔ وہ میکانکی انداز میں گاڑی میں آبیٹھا۔ وہ ایک لڑکی پر ہوئے ظلم کا شاہد تھا، اور مقدمے کا اہم گواہ اور وہ جا رہا تھا؟ گاڑی چل پڑی تھی۔ ضمیر عجیب سے انداز میں کچوکے لگا رہا تھا۔

''لیکن وہ لڑکی مر چکی ہے اور لیلیٰ زندہ ہے۔ دنیا کی کسی بھی لڑکی سے زیادہ اہم میرے لیے لیلیٰ ہے۔'' اُس نے ضمیر کو تسلی دی۔

''مجھے علی کو خبر کر دینی چاہیے۔'' دل میں سوچا اور جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ اپنا کی پیڈ موبائل باہر نکال سکے۔

''میرا موبائل؟'' خالی جیب نے اُسے چونکا دیا۔ ''میرا موبائل کہاں ہے؟'' اُس نے دوسری جیب میں اور پھر بیگ میں بھی تلاشی لی پر موبائل نہیں تھا۔ یکدم ہی اسے یاد آیا کہ وہ جلد بازی میں موبائل گھر چھوڑ آیا ہے۔

''ابّا! میرا موبائل گھر پر رہ گیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''ہوش میں آؤ مقدّم! تمہارا موبائل اس وقت ضروری نہیں ہے۔'' گاڑی چلاتے شفیق صاحب نے اُسے جھڑکا تو وہ شرمندہ ہوا۔ دل کو عجیب سی بے چینی نے آگھیرا تھا۔ لیلیٰ نہ جانے کہاں تھی؟ علی اُسے فون کریگا تو وہ کیسے بتائے گا کہ کیا ہوا ہے؟ مختلف سوچیں اُس پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک سے کیا ہو رہا ہے؟

''لیلیٰ مل جائیگی، میں واپس آکر علی سے معذرت کرلوں گا۔'' اُس نے خود کو یہ باور کروایا کہ لیلیٰ سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے اب۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔

---------+---------+--------

''مجھے ٹھیک سے بتاؤ کہ لیلیٰ آخری بار کہاں گئی تھی؟'' اُنہیں سوات پہنچے گھنٹہ گزر گیا تھا۔ جبکہ لیلیٰ کو لاپتہ ہوئے تین راتیں اور دو دن گزر چکے تھے۔ اس وقت شفیق صاحب اپنے بہنوئی کے ساتھ کھڑے لیلیٰ کے ملنے کے ہر ممکن امکانات پر غور کر رہے تھے۔

''وہ کہیں نہیں گئی تھی، وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور اپنے کمرے سے ہی رات کے وقت غائب ہوئی ہے۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ کوئی اُسے، اُسکے کمرے سے اٹھا کر لے گیا اور اتنے بڑے گھر میں کسی کو علم بھی نہیں ہوا؟'' وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔

''تو تمہیں کیا لگ رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' وہ برامان گئے۔

''نہیں! میں ایسا نہیں کہہ رہا۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ کوئی گھر کا قریبی ملوث ہے اس میں۔'' شفیق صاحب نے وضاحت دی۔

''ملازمین سے تفتیش جاری ہے۔'' اُنہوں نے کہا۔ مقدّم ساکت اور جامد سا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ زبان پر تالا لگا تھا لیکن دل میں صرف لیلیٰ کی سلامتی کی دعائیں تھیں۔

''عبیر کہاں ہے؟'' مقدّم کی ماں نے یکدم ہی پوچھا، اُسکی پھوپھو کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

''وہ۔۔۔'' اُنکو سمجھ نہیں آیا کہ کیا جواب دیں؟ عبیر کی حرکتوں اور اُسے عاق کیے جانے کے بارے میں اُنہوں نے مقدّم کے گھر والوں کو نہیں بتایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے۔ لینڈ لائن کی گھنٹی بج اٹھی۔ لیلیٰ کے والد تیزی سے فون تک گئے۔

''ہیلو!۔۔۔'' اُنہوں نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف کی بات سن کر اُنکا چہرہ سرخ ہوا۔

''حرام خور! کیا بکواس کر رہے ہو؟ لیلیٰ کہاں ہے؟'' وہ دھاڑے تھے۔ مقدّم کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی، وہاں کھڑا ہر شخص کچھ نا سمجھی کے عالم میں اُنہیں دیکھنے لگا۔ مقدّم تیزی سے اُن کے پاس گیا۔

''کیا ہوا پھوپھا؟ کون ہے فون پر؟'' وہ اُنہیں جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''عبیر۔۔۔''اُنہوں نے یک لفظی جواب دیا۔اگلے ہی لمحے مقدّم نے اُن سے کریڈل چھینا۔

''عبیر بھائی!۔۔۔بھائی!۔۔۔مجھے بتائیں کیا ہوا ہے لیلیٰ کو؟وہ ٹھیک ہے نا؟''وہ بے قراری سے بولا۔

''لیلیٰ بالکل ٹھیک ہے۔اور وہ میرے پاس ہے۔''اتنی سی خبر نے اُسکے وجود میں خوشی کی لہر دوڑادی تھی،اس لیے وہ عبیر کے لہجے پر غور نہیں کر سکا۔

''اللہ کا شکر ہے بھائی!اللہ کا شکر ہے۔آپ اُسے گھر لے کر آرہے ہیں نا؟کیا ہوا تھا اُسے؟کہاں تھی وہ؟بلکہ اس سے میری بات کروائیں۔''وہ خود ہی خود بولے جارہا تھا۔

''لے آؤنگا،یقیناً گھر ہی لاؤں گا۔لیکن ایک شرط پر۔۔۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ ساری شرطیں منوالیں۔بس میری اُس سے بات کروادیں۔''وہ بیچارہ سمجھ ہی نہ سکا کہ عبیر کیا کرنے والا ہے؟

''لیلیٰ کو طلاق دے دو۔ابھی اور اسی وقت۔۔۔''اُس کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا تانبا؟مقدّم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''کیا۔۔۔کک۔۔۔کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''اُسکے پاؤں کانپے،شفیق صاحب اُسکے پاس آئے اور اسپیکر آن کر دیا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت لیلیٰ کو طلاق دے دو تو میں اسے صحیح سلامت گھر لے آؤں گا۔ورنہ اُسکی لاش بھی نہیں ملے گی تمہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟لیلیٰ نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔تم جھوٹ بول رہے ہو۔''مقدّم سے پہلے ہی لیلیٰ کا باپ فون کے پاس آکر چیخا تھا۔

''چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا والد صاحب!یہ تو آپکو پہلے سوچنا تھا۔اور کیا کہا آپ نے؟میں جھوٹ بول رہا ہوں؟تو یہ لیں۔۔۔سن لیں اپنی بیٹی کی آواز۔''وہ مکروہ ہنسی ہنستا ہوا بولا،وہاں کھڑا ہر وجود ساکن تھا۔

''مقدّم!۔۔۔''لیلیٰ کی آواز اسپیکر پر اُبھری۔۔۔

''لیلیٰ!۔۔۔''وہ بے قرار ہوا۔

''مقدّم!ایسا مت کرنا۔۔۔مجھے طلاق مت دینا مقدّم!میں مر جاؤں گی۔اسکی بات مت سننا یہ کچھ نہیں کریگا مجھے۔بھائی ہے یہ میرا۔۔۔''اُسکی روتی کانپتی آواز اسپیکر سے سنائی دی تو وہ وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''ذلیل انسان!اتنے گر گئے تم کہ اپنی ہی بہن کو اغوا کر لیا؟میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔''لیلیٰ کا باپ حلق کے بل چیخا تھا۔

''تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔ میں دوبارہ فون کروں گا۔ تم اسے طلاق دے دوگے تو ٹھیک، نہیں تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ بہن، غیرت سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔''اتنا کہہ کر اُس نے فون کاٹ دیا۔

''نہیں عبیر! تم ایسا نہیں کروگے۔۔۔۔ عبیر!''مقدّم چیختا رہ گیا پر وہ فون کاٹ چکا تھا۔

''آخر عبیر ایسا کیوں کر رہا ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟''شفیق صاحب کا صبر جواب دے گیا تو وہ گرجے۔

''دراصل۔۔۔''اب وہ پچھلے دنوں کی تمام روداد سنا رہے تھے۔ مقدّم سن ہوتے دماغ کے ساتھ اُنہیں پولیس کو فون کرتے اور عبیر کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے تمام متوقع تعلقات استعمال کر رہے تھے۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا تھا۔ ایسے میں کوئی آہستہ قدموں سے اُسکے قریب آیا۔ پنجوں کے بل اُسکے برابر بیٹھا اور اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''مقدّم! کیا تم ٹھیک ہو؟''وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ اُسکا دماغ تو جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ بھلا کون شخص ہے یہ؟ دماغ میں تصویر تھی پر یاداشت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھے گیا۔

''مقدّم! کیا ہوا ہے یہاں؟''اُسے اُسکی ذہنی حالت ٹھیک نہ لگی تھی۔

''میں۔۔۔؟ لیلیٰ۔۔۔ لیلیٰ کہاں ہے؟''مقدّم بے ربط سی باتیں کر رہا تھا۔ دماغ نے اچانک ہی سگنل دیا کہ وہ یہ چہرہ پہچانتا تھا۔ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ جو نام اُس نے لیا، وہ سب نے سنا تھا۔

''اخلاق؟''

---------+---------+--------

شفیق صاحب شہر پڑھنے آئے تھے اور یہیں کے ہو گئے۔ یہاں اُنہیں مقدّم کی والدہ پسند آئیں اور اُنہوں نے اپنی برادری کے خلاف جا کر اُن سے شادی کر لی۔ البتہ اُنکے رکھ رکھاؤ اور بہترین حسب نسب کی وجہ سے بلآخر سب ہی لوگ نہ صرف راضی ہو گئے بلکہ کھلے دل کے ساتھ اُنہیں اپنی بہو کے طور پر قبول بھی کیا۔ سب کچھ اچھا تھا، مقدّم کی والدہ بھی شہر کے بجائے سوات رہنے لگی تھیں۔ لیکن اصل مسئلہ تب ہوا جب اُنکے دیور، یعنی شفیق صاحب کے چھوٹے بھائی کو کسی دوسرے قبیلے کے شخص نے قتل کر دیا۔ انکے قبیلے والے بھی قصاص لینے پہنچ گئے، تو جرگہ بلایا گیا اور شفیق صاحب کی ہزار مخالفت کے باوجود اُنکا نکاح، قاتل کی بہن کے ساتھ کروا کے اُسے ونی کر دیا گیا۔

اس فیصلے پر مقدّم کی والدہ اس قدر دلبرداشتہ ہوئیں کہ غش کھا کر گر پڑیں۔ ہوش میں آئیں تو سامان باندھ کر سوات چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اُنکی ساس اور نندیں اُنکے راستے میں آ گئیں اور منت سماجت کرنے لگیں۔

''بیٹی! بہو تو تم ہی ہو اس گھر کی، اور بیوی بھی تم ہی ہو شفیق کی۔ ونی میں آئی عورت کی ملازمہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور نہ ہی شفیق اُسے کوئی مقام دے گا۔'' اُنکی ساس نے ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

''ایسا کس نے کہا آپ سے امّاں؟'' شفیق صاحب کے الفاظ نے اُنکے قدم زنجیر کیے۔

''وہ میری بیوی ہے۔ اُسکی وہی حیثیت ہو گی جو میری بیوی کی ہونی چاہیے۔ اُس پر ویسے ہی ظلم ہو چکا ہے۔ اُسکے گھر کے مردوں نے اپنے جرم کی پاداش میں اُسے ونی کیا اور آپ لوگوں نے قبول کر لیا۔ آپ لوگوں نے بے شک یہ غیر شرعی کام کر لیا ہے لیکن مجھ سے ایسی کوئی توقع مت رکھیئے گا۔'' متوازن لہجے میں کہتے وہ سب کے اوسان خطا کر گئے۔

''میں اُسے کبھی اپنی بہو نہیں مانوں گی۔'' اُنکی والدہ نے حتمی فیصلہ سنایا۔

''آپ نے تو میری پہلی بیوی کو بھی بہو تسلیم نہیں کیا تھا۔ فرق کسے پڑا؟ مجھے نہ تب فرق پڑا تھا نہ اب پڑے گا۔ اور اپنی بیوی کو میں یہاں ہر گز نہیں رکھوں گا کہ آپ اُسکے ساتھ نارواسلوک کریں۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر جا چکے تھے۔ مقدّم کی والدہ گھر چھوڑ کر شہر چلی گئیں۔ شفیق صاحب نے اپنی دوسری بیوی کو اُسکے میکے والوں کے حوالے کیا۔

''میں اسے کسی دوسری جگہ بھی رکھ سکتا ہوں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ میرے گھر والے اسکو نقصان پہنچادیں گے۔ میں اسے آپکے حوالے کر کے جارہا ہوں۔ مہینے میں دو بار سوات آؤں گا۔ تو آپکے پاس ہی رہوں گا۔ کیا آپکو یہ قبول ہے؟'' اُنہوں نے اپنے سسرال والوں سے کہا۔ وہ تو اتنا مشکور ہوئے کہ رو رو کر اپنے قاتل بیٹے کی غلطی کی معافی مانگنے لگے۔

قصہ مختصر، شفیق صاحب نے شہر جا کر اپنی پہلی بیوی کو بھی منالیا، اور کچھ عرصے میں قبیلے والے بھی اپنی ناراضگی بھول بھال گئے۔ البتہ وہ اپنے علاقے میں باغی مشہور ہو گئے۔ پھر اُنکی دونوں بیویوں سے اللہ نے اُنہیں دو بیٹے دیے۔ مقدّم اور اخلاق۔ دونوں کی عمروں میں چند ماہ کا ہی فرق تھا۔ دونوں بیویاں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں۔ البتہ شفیق صاحب نے دونوں میں بھرپور انصاف کیا۔ وہ مقدّم کو اپنی والدہ سے اس شرط پر ملواتے کہ وہ اخلاق سے بھی ملیں گی۔ وہ اور بات تھی کہ وہ اس ملاقات میں ساری توجہ صرف اور صرف مقدّم کو ہی دیتی تھیں۔ وہ عید کی نماز پڑھتے تو دونوں بیٹوں کے ساتھ، کیونکہ عید وہ سوات میں گزارتے تھے۔ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو انہوں نے اپنی دوسری بیوی کو شہر لانا چاہا، پر اُنہوں نے سوات میں رہنے کو ترجیح دی۔ شفیق صاحب نے بھی اُنکی خواہش کا احترام کیا۔ لیکن اُنکی اپنی دلی خواہش کہ اُنکے دونوں بیٹے ساتھ رہیں، کبھی پوری نہ ہو سکی۔

البتہ وہ حتّی الامکان کوشش کرتے کہ مقدّم اور اخلاق کی آپس میں اچھی دوستی ہو، اس مقصد کے لیے وہ اکثر مقدّم کو سوات لے جاتے تو کبھی اخلاق کو شہر لے آتے۔ یہاں تک کہ جب اخلاق نے شہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا تو وہ چاہتے تھے کہ وہ کراچی کی یونیورسٹی میں ہی داخل ہو پر اُس نے لاہور کی

پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایک بار پھر اُنکی خواہش ادھوری چھوڑ دی۔نہ جانے کیوں پر مقدّم اور اخلاق نے کبھی ایک دوسرے سے سلام دعا سے زیادہ بات نہ کی تھی؟ وہ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند نہیں کرتے تھے پر اُنکے درمیان بھائیوں جیسے تعلقات بھی نہ تھے۔خاندان والے بھی شفیق صاحب کی دوسری بیوی اور بیٹے سے نہیں ملتے تھے۔

''تم ٹھیک ہو مقدّم؟''اخلاق پنجوں کے بل اُسکے برابر بیٹھے پوچھ رہا تھا۔

''پتہ نہیں!''اُس نے عجیب سے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اخلاق کی یہاں موجودگی پر ضرور غش کھا کر گر پڑتا۔پر اس وقت اُسے کسی چیز کا ہوش کہاں تھا؟

''ابّا کیا ہوا ہے یہاں؟''اب کے اُس نے اپنے باپ سے پوچھا،تو انہوں نے مختصراً تمام معاملہ اُسکے گوش گزار کر دیا۔

''مجھے اُمید ہے کہ وہ صرف دھمکی دے رہا ہے۔ایسا کچھ نہیں کریگا۔''لیلیٰ کے باپ نے پر اُمید لہجے میں کہا۔

''ہاں! وہ اُسکا بھائی ہے،اُسکو نقصان نہیں پہنچائے گا۔''مقدّم نے خود کو تسلی دی تھی۔

''ہاں! ایسا ہی ہو گا۔تم اٹھو! ہمیں لیلیٰ کو ڈھونڈنا ہے۔''اُس نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب اُنہیں ہر حال میں لیلیٰ کو تلاش کرنا تھا۔

---------+---------+--------

''عبیر! مقدّم،لیلیٰ کو طلاق دینے پر راضی ہے۔لیکن اس وقت وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔تم خدارا اُسکے ہوش میں آنے تک کا وقت دے دو۔وہ اُسے ہوش میں آتے ہی طلاق دے دیگا۔''لاؤنج میں اس وقت پولیس کا اضافہ ہو چکا تھا۔اور سب ہی خاموش تھے۔ایسے میں اخلاق پولیس کے کہنے پر عبیر سے مقدّم کی بیہوشی کا بہانہ بنا کر مزید وقت مانگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! صبح تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔صبح ہونے سے پہلے لیلیٰ کو طلاق ہو جانی چاہیے۔''اُس نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔

''وہ جس جگہ سے فون کر رہا ہے،وہ جگہ ہم ٹریس نہیں کر پا رہے۔ہمیں ہر صورت میں صبح ہونے سے پہلے اُس تک پہنچنا ہے۔آپ نے جس جس جگہ اُسکے ہونے کے امکانات ظاہر کیے تھے وہ جگہیں بھی دیکھ لی ہیں۔پر وہاں بھی وہ نہیں ملا۔''پولیس انسپکٹر،شفیق صاحب سے بات کر رہا تھا۔مقدّم اب تک سن بیٹھا تھا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسی نیچ حرکت کرے گا۔ مجھے وہ زندہ مل جائے ایک بار، خدا کی قسم! اپنے ہاتھوں سے اسکو قبر میں اتار دوں گا''۔ لیلیٰ کے والد غضبناک ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ پولیس انسپکٹر کچھ کہتا، ایک کانسٹیبل وہاں دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا ہوا؟'' اُسے دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے۔

''ہم نے عبیر شاہ کے قریبی دوستوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اُن میں سے ایک شخص کو اپنے گھر سے کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر قریبی گھاٹی کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ ہم نے اُسکا پیچھا کیا تو وہ گھاٹی میں بنے ایک چھوٹے سے گھر میں گیا تھا۔ بعد ازاں ہمیں وہاں عبیر شاہ بھی نظر آیا ہے۔ ہماری نفری نے دور سے اُس گھر پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم حملہ کر دیں؟'' کانسٹیبل کے الفاظ اُن کے اندر نئی روح پھونک رہے تھے۔

''نہیں نہیں! ایسے حملہ مت کرنا۔'' یکدم ہی مقدّم چیختے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''وہ لیلیٰ کو مار دے گا۔ وہ اُسے نقصان پہنچا دے گا۔'' وہ رو دیا تھا۔ اُسکی حالت قابلِ ترس ہو گئی۔

''مقدّم! ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اُنہیں اُنکا کام کرنے دو۔'' اخلاق نے اُسے بازو سے پکڑ کر تھاما۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! آپ لوگ ساتھ چل سکتے ہیں، پر کارروائی کے دوران آپ سب دور رہیں گے۔'' انسپکٹر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

قصّہ مختصر، پولیس نے گھاٹی کو گھیرے میں لے لیا۔ اور خاموشی سے عبیر شاہ کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ دوسری جانب اُسکا وہ دوست، جو اُسکے لیے کھانا لینے گیا تھا اُسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اب وہ سب دور سے اُس گھر کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ لیلیٰ اندر ہی ہے۔ جبکہ مقدّم کو یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے عبیر اپنی بہن کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ کچھ ہی دیر میں وہ باہر آتا ہوا دکھائی دیا، پولیس کی نفری اندھیرے کی آڑ لیتے ہوئے اُسکے قریب ہوئی اور اُس پر حملہ کر دیا۔ اُس نے فائر کرنا چاہا پر ایک پولیس والے نے تندہی سے اُسکے ہاتھ سے بندوق چھین کر اُسے قابو کر لیا۔

''لیلیٰ!۔۔۔۔'' اگلے ہی لمحے مقدّم اپنی جگہ چھوڑ کر گھر کی جانب بھاگا۔

''مقدّم رکو!'' اُسکے پیچھے اخلاق، اُسکے ابّا اور پھوپھا دونوں بھاگے تھے۔ پولیس والوں نے روکنا چاہا پر وہ سب کو دھکا دیتا ہوا اُس کٹیا نما گھر میں جا گھسا۔

''لیلیٰ!۔۔۔۔'' اُسکے قدم رک گئے۔ فرطِ جذبات سے۔۔۔ خوشی سے۔۔۔ بے یقینی سے۔۔۔۔

اُسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ پچھلی کئی راتوں کی تھکن غائب ہو گئی۔ لیلیٰ سامنے تھی۔ اُسکی لیلیٰ۔۔۔۔

کرسیوں اور رسیوں سے جکڑی وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھی۔ وہ دیوانہ وار اُسکی طرف آیا۔

''لیلیٰ! لیلیٰ۔۔۔اٹھو۔۔دیکھو میں آگیا۔''اُس نے اُسکے ہاتھ پاؤں رسیوں سے آزاد کرتے ہوئے اُسکے گال تھپتھپائیں۔اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''مق۔۔۔مقدم۔۔''نقاہت کے باعث الفاظ مشکل سے ادا ہوئے تھے۔پر وہ مسکرائی تھی۔

''میں آگیا ہوں لیلیٰ۔۔۔ہم گھر چلیں گے۔''اُس نے نم آنکھوں سے کہا تھا۔وہ ہمت مجتمع کر کے اٹھنے لگی تو باقی سب بھی وہیں آگئے۔ایک جانب سے اُسکے باپ نے اور دوسری جانب سے مقدّم نے اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی! معاف کر دو۔''اُسکے والد نے روتے ہوئے اُسے سینے سے لگایا۔

''ابّا!۔۔۔۔''وہ سسکی۔

''کچھ نہ کہو بیٹی! میں اس خبیث سے ایک ایک شے کا حساب لوں گا۔''وہ روتے ہوئے اپنے بیٹے کو کوس رہے تھے۔کیا اس دن کے لیے لوگ بیٹا مانگتے ہیں؟ وہ لوگ اُسے سہارا دے کر باہر لائے تو پولیس عبیر شاہ کو ساتھ لیے کھڑی تھی۔

''بیغیرت انسان!۔۔۔''اُسے دیکھ کر شفیق صاحب غصّے سے آگے بڑھے۔

''رک جائیں ابّا!''اخلاق نے اُنہیں روکا۔جبکہ خود لیلیٰ کے باپ نے خونخوار نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے اُسکے قدموں میں نفرت سے تھوکا تھا۔یہ تھوک اُسے کسی تازیانے کی طرح لگا تھا۔

''میں نے آپ سے کہا نا! میں لیلیٰ کی شادی اس باغی کی اولاد سے نہیں ہونے دوں گا۔''اتنا کہتے ہی اُس نے اپنے ساتھ کھڑے پولیس والے کو آن کی آن میں دھکا دیتے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹی سی بندوق نکالی اور مقدّم کی طرف کر کے فائر کھول دیا۔یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اخلاق نے میکانکی انداز میں گردن موڑ کر مقدّم کو جبکہ اُس نے اپنے ساتھ زمین پر گرتی لیلیٰ کو دیکھا تھا۔

گولی کس کو لگی تھی؟خون کس کے جسم سے بہہ رہا تھا۔

یہ سمجھنے میں کچھ سیکنڈ لگے تھے۔جب سمجھ آیا تو وہاں صرف اور صرف مقدّم کی دل دہلا دینے والی چیخیں تھیں۔

''لیلیٰ!۔۔۔۔لیلیٰ۔۔۔۔آنکھیں کھولو۔۔۔۔لیلیٰ۔۔''وہ حلق کے بل چیخ رہا تھا۔کون اُسکے قریب آرہا تھا؟

کون لیلیٰ کو جھنجھوڑ رہا تھا؟

کون اُسے اس سے دور کر رہا تھا؟

عبیر کہاں تھا؟

اُسے کس نے پکڑا؟

پکڑا یا مار دیا؟

اُسے کچھ نہیں معلوم۔۔۔وہ بس لیلیٰ کی بند ہوتی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔اُس تصویر کو خون آلود ہوتے دیکھ رہا تھا جو اُسکے لاکٹ میں تھی۔

لیلیٰ بھلا کب اپنے محبوب کے نصیب میں آئی تھی؟

لیلیٰ اپنے قیس کو ایک بار پھر مجنوں کر گئی تھی۔

---------+---------+--------

ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔مقدّم کی زندگی کی پھر کوئی صبح نہ ہوئی۔اُسکا طوفان گزر تو گیا پر اُسے اپنے ساتھ بہالے گیا۔لیلیٰ نے اُسکے بازوؤں میں ہی جان دے دی تھی۔وہ چیختا رہ گیا۔۔۔چلاتا رہ گیا۔۔۔۔پر جسم سے نکلتی اُسکی روح کو روک نہیں سکا۔

آج لیلیٰ کا جنازہ سامنے رکھا تھا۔اُسکی ماں، پھوپھو اور نہ جانے کون کون بیٹھا رو رہا تھا؟لوگ عبیر کو جھولی پھیلا پھیلا کر بد دعائیں دے رہے تھے۔پر وہ کل والے خون آلود لباس میں اب تک ساکت بیٹھا تھا۔نِگاہیں یک ٹک لیلیٰ کے جسد خاکی پر مرکوز تھیں۔اُسکے جسم کا سارا خون بہہ گیا تھا، جسکی وجہ سے چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔اُسکی لیلیٰ۔۔۔

وہ جسے دلہن بننا تھا۔اُسکے گھر آنا تھا،اُسکی زندگی سنوارنی تھی۔وہ مر گئی تھی؟کیا وہ سچ میں مر گئی تھی؟دل ماننے سے انکاری تھا۔یہ تو نہ سوچا تھا اُس نے، یہ تو اُسکے کسی منصوبے کا حصہ نہ تھا۔اُسے نہیں پتہ تھا کہ لیلیٰ کے بغیر کیسے رہتے ہیں۔اب وہ کیسے رہے گا؟کیسے؟

وہ اُسکی آواز کیسے سنے گا؟اُسے کیسے بلائے گا؟وہ کس کا انتظار کریگا؟اُس نے جھک کر اُسکا چہرہ دیکھنا چاہا۔اُسکی آنکھیں بند تھیں۔

کوئی ان آنکھوں کو کھول دے۔اُسے آخری بار اُسکی شہد رنگ آنکھیں دیکھنی تھی۔اُسکی زندہ آنکھیں اب مردہ کیوں پڑی تھیں؟کس نے نظر لگا دی تھی اُسے؟وہ اُسکی آنکھوں کے سامنے مر گئی۔اور وہ کچھ نہ کر سکا۔

وہ ویران آنکھوں سے اُسکے لاشے کو دیکھ رہا تھا۔وہ مر گیا تھا۔۔۔وہیں مر گیا تھا۔کاش! وہ اُسکے ساتھ دفن ہو سکتا۔اخلاق اُسے بڑی مشکلوں سے وہاں سے لیکر گیا تاکہ وہ کپڑے تبدیل کر کے جنازے میں شامل ہو جائے۔وہ تو جیسے کوئی روبوٹ بن گیا تھا۔جو اُسے کہا جا رہا تھا وہ کر رہا تھا۔

اُس نے جنازہ بھی پڑھا، اور اُسے قبر میں اترتا بھی دیکھا۔ پر وہ رویا نہیں۔ اُسکے آنسو جیسے لیلیٰ کے خون کی طرح خشک ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں اُس نے موت کی تکلیف کیسے سہی ہو گی؟ اتنی نازک سی تو تھی وہ۔ مقدّم نے سوچا۔۔۔ ایک لمحے میں وہ ہے سے **تھی** ہو گئی تھی۔ یہی زندگی تھی۔

یہ کچھ نہیں کریگا مجھے۔ بھائی ہے یہ میرا۔۔

کتنا یقین تھا اُسے اپنے بھائی پر، کہ وہ اُسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بیچاری!

اُسکا حلق خشک ہو رہا تھا، گھر آ کر وہ پانی پینا چاہتا تھا، گلاس اُسکے ہاتھوں میں تھا پھر اُسے نہیں یاد کہ کیا ہوا؟ اُسے بس اتنا یاد تھا کہ کوئی شے اُسکے دل کو دھڑکنے سے روک رہی تھی اور اُسکا دماغ کام کرنا بند کر رہا تھا۔ وہ پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔ اخلاق وہیں تھا، دوڑ کر اُسکے پاس آیا۔

وہ چیخ رہا تھا، ایمبولینس بلانے کو کہہ رہا تھا یا گاڑی نکالنے کو؟ مقدّم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اُسکی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اخلاق اُسکا ہاتھ تھامے، اُسکی کلائی سے نبض جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر آخری شے اُس نے اپنے ماں باپ کا چہرہ دیکھا تھا۔

---------+---------+--------

پورے سولہ دن بعد اُسے ہوش آیا تھا۔ اُسکا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ جب تک اُسے ہوش آیا تب تک اُسکے زندگی سے سولہ دن نکل چکے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ ایسے ہی رہا۔ خاموش۔۔۔۔ ساکت۔۔۔ روبوٹ جیسا۔۔۔

اُسکی ماں اُسکے سرہانے بیٹھی روتی رہیں۔ اُسکی سوتیلی ماں اُسکے سر پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں، اخلاق ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا اور شفیق صاحب جیسے زندہ لاش کی مانند بیٹھے تھے۔ اپنی بیویوں اور دونوں بیٹوں کو ساتھ دیکھنے کی اُنکی خواہش پوری ہو گئی۔ لیکن کیسے وقت پر؟

مقدّم کو کچھ عرصے بعد ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ ہر ہفتے اُسکے سائیکالوجسٹ کے ساتھ سیشنز ہوتے۔ اُسکا غم بہت بڑا تھا۔ اس غم کو بھلانے کے لیے اُسے بھاری بھاری مقدار میں نشہ آور ادویات دی گئیں۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ اُسکو پر سکون رکھنے کے لیے ہیں ورنہ وہ خودکشی جیسی نہج پر بھی آ سکتا ہے۔

عبیر کا کیا ہوا؟ اُسکے دوستوں کا کیا ہوا؟ صنوبر کا کیا ہوا؟ اُسے کسی شے کا ہوش نہ تھا۔ وہ سارا سارا دن دوائیں کھائے سویا پڑا رہتا۔ ہوش میں آتا تو پھر کسی نہ کسی دوائی کا وقت ہو چکا ہوتا۔ اسی حال میں چھے ماہ گزر گئے۔ اُسکی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا، آنکھوں کے نیچے ہلکے پڑ گئے، چہرے پر جھائیاں تک پڑ گئیں۔ وہ چلتی پھرتی لاش لگنے لگا تھا۔ اُسکی اس حالت سے سب اتنا پریشان تھے کہ بلآخر اخلاق نے ڈاکٹر سے اُسکی دواؤں کو کم کرنے کے متعلق بات کی، پر ڈاکٹر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر اس نے دوائیں نہ لیں تو وہ خودکشی کر لے گا۔ ڈاکٹر کی اس بات پر اُسے غصّہ تو بہت آیا پر وہ ضبط کر کے گھر واپس آ گیا۔

پر اُس نے ٹھان لی تھی کہ وہ مقدم کو اس حالت سے باہر نکالے گا۔ اگلے دن وہ اُسے زبردستی اٹھا کر ناشتے کی میز تک لایا۔ مقدّم وہاں تک آتو گیا پر دو لقمے سے زیادہ کچھ کھانہ سکا اور جھومتے جھامتے وہیں میز پر ڈھیر ہو گیا، اُسکی یہ حالت دیکھ کر اُسکی ماں تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھیں۔ اُنکا جوان خوبرو بیٹا، جسکا مستقبل کس قدر روشن تھا، آج وہ اس نہج تک پہنچ چکا تھا۔ اُنہیں روتا دیکھ کر اخلاق اپنی جگہ سے اٹھا اور اُنکے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''میرا آپ سے وعدہ ہے بڑی امی! میں مقدّم کو پہلے جیسا کر کے رہوں گا۔ میں آپکو آپکا بیٹا واپس لا کر دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' اُس کے پُر امید لہجے پر وہ بلک بلک کر روتی اُسکے گلے لگ گئیں۔ بہت عرصہ لگا اُنہیں یہ جاننے میں کہ اخلاق بھی اُنکا ہی بیٹا تھا۔

اُسکے بعد وہ تقریباً روزانہ ہی اُسے اُسکے کمرے سے کھینچ کھانچ کر باہر لے آتا۔ اُس سے اِدھر اُدھر کی ڈھیروں باتیں کرتا، کبھی زبردستی اُسے چہل قدمی کے لیے لے جاتا، پر وہ نہ تو چند قدم سے زیادہ چل پاتا اور نہ چند جملوں سے زیادہ بول پاتا۔ اُس پر ہر وقت نیند کا غلبہ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں چھے ماہ مزید سرک گئے۔ لیکن اُسے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

لیلیٰ کی پہلی برسی بھی آگئی اور وہ ہنستا مسکراتا، شرارتی سا مقدّم کہیں گم ہو گیا۔ لوگ ملنے کے لیے آئے تھے اُس روز۔۔۔ وہ اخلاق کے کہنے پر کمرے سے باہر آیا۔ تاکہ لوگوں سے مل سکے لیکن اُسکی سرخ آنکھوں، لڑکھڑاتی چال اور بے ربط سی باتوں نے رشتے داروں کو شک میں ڈال دیا۔ اور کچھ ہی عرصے بعد اخلاق کو یہ معلوم ہوا کہ خاندان میں لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ مقدّم نے لیلیٰ کے مرنے کے بعد نشہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلی بار اخلاق کو اپنے اوپر غصّہ آیا۔ کیا ضرورت تھی اُسے مقدّم کو سب کے سامنے لے جانے کی؟ ان سب باتوں کے بعد اُس نے ایک فیصلہ کیا۔

اُس نے اپنے باپ کی اجازت سے اُسکی دواؤں کی مقدار کم کر دی۔ اُسے اُمید تھی کہ آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جو ہوا وہ اُسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اُس رات اُس نے مقدّم کو دوائی نہیں دی۔ وہ چاہتا تھا کہ آج وہ بنا دوائی کہ سوئے۔

''میری دوا کہاں ہے؟'' وہ اُسکے سر پر آ کھڑا ہوا۔

''تم آج دوا نہیں لوگے۔'' اخلاق نے نرمی سے کہا۔

''میری دوائی دو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' یکدم ہی وہ چیخا تو وہ ساکت ہو گیا۔

''مقدم! وہ دوائیں تمہیں نقصان پہنچا رہی ہیں آج تم۔۔۔۔''

''میری دوائی دو۔۔۔۔'' اُسکی بات کاٹتے وہ حلق کے بل چیخ تھا۔ یہ اُسے کیا ہوا تھا؟ وہ ایسے کیوں کر رہا تھا؟

''میری دوائی دو مجھے۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ میرے جسم میں چونٹیاں رینگ رہی ہیں۔۔۔ دوائی کہاں ہے۔'' وہ سامنے نظر آتی ایک ایک شے اٹھا اٹھا کر پھینکتا جاتا اور چیختا جاتا تھا۔ جبکہ اخلاق کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو کی مصداق ساکت کھڑا تھا۔

''دو میری دوائی۔۔۔''اُس نے ایک دواڈھونڈھنے کے چکّر میں ہر شے تہس نہس کرنا شروع کر دی تھی۔

''مقدّم۔۔۔مقدّم! میری بات سنو۔''اخلاق نے قریب آکر اُسے روکنا چاہا تو اس نے اُسے دھکّا دے دیا۔پتہ نہیں اُس میں اچانک سے اتنی طاقت کیسے آگئی تھی؟

''مجھے میری دوائی دو۔۔۔''اُسکی زبان پر بس ایک ہی جملہ تھا۔وہ اب میز پر سجے شوپیس اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا تھا۔

''مقدّم رکو!''اُس نے اُسے بازو سے پکڑ کر قابو کرنا چاہا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔دوائی۔۔۔''وہ کسی وحشی کی طرح خود کو آزاد کروانے کے لیے چیخ رہا تھا۔اُسکے ماں باپ وہیں آ کھڑے تھے۔بالکل ایسے جیسے کسی نے اُنکے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

''مقدّم رک جاؤ!''اخلاق پوری کوشش کر رہا تھا اُسے قابو کرنے کی اور وہ بھی بھرپور مزاحمت کر رہا تھا۔

''ابّا!اسکی دوائی لائیں۔''اُس نے شفیق صاحب کو چیختے ہوئے کہا تو وہ گھبرا کر اُسکی دوائیں لینے بھاگے۔

''چھوڑو مجھے۔۔۔''

''مقدم!لیلیٰ کے لیے رک جاؤ۔۔۔لیلیٰ کے لیے۔۔۔''اخلاق نے روہانسے لہجے میں کہا تو وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔

''لیلیٰ!۔۔۔''اُسے جیسے یہ نام سنا سنا لگا۔

''لیلیٰ؟۔۔۔''اُس نے رک کر اخلاق کو دیکھا۔

''لیلیٰ کہاں ہے؟''اُس نے پوچھا تو وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟''اُسکی ماں رو پڑیں۔

''لیلیٰ کہاں ہے؟''وہ ایک مرتبہ پھر حلق کے بل چیخا۔

''امّاں!۔۔۔امّاں!میری لیلیٰ کہاں ہے؟''وہ پاگلوں کی طرح چیختے ایک بار پھر سب کچھ تہس نہس کر رہا تھا کہ تب ہی اخلاق نے ایک مرتبہ پھر اُسے قابو کرتے ہوئے،اُسکے بازوؤں پر وہ انجکشن لگا دیا جو اُسے ابھی ابھی شفیق صاحب نے لا کر دیا تھا۔

''لیلیٰ۔۔۔لیلیٰ۔۔۔''وہ روتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''لیلیٰ۔۔۔''روتے روتے وہ فرش پر گر گیا۔

''مقدّم! میرے بھائی!''اخلاق نے اُسے گلے لگا لیا۔اب وہ اُسکے بازو پر سر رکھے ساتھ ساتھ رو رہا تھا۔

''بھائی!۔۔۔''مقدّم اُسکے الفاظ دہرانے لگا۔غالباً وہ غنودگی میں جا رہا تھا۔

''مقدّم!۔۔۔''اخلاق روتے ہوئے اُسکے بال سہلانے لگا۔

''لیلیٰ۔۔۔بھائی۔۔۔''بولتے بولتے وہ نیند میں چلا گیا۔اُس رات وہاں بیٹھے چاروں نفوس اُسکے لیے بلک بلک کر روئے تھے۔

جب کچھ حالت سنبھلی تو اخلاق اُسکے ڈاکٹر کے پاس گیا۔اُسکا کوئی اپائنٹمنٹ نہیں تھا لہذا اسے اندر جانے کی اجازت نہ ملی،وہ ریسیپشنسٹ کو دھکا دیتے ہوئے ڈاکٹر کے کمرے میں جا گھسا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟''ڈاکٹر اُسے دیکھ کر کھڑا ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اخلاق نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اُسکے منہ پر مکا جڑ دیا۔

''کیا کیا ہے تم نے میرے بھائی کے ساتھ؟کس حال میں پہنچا دیا ہے تم نے اسے؟بولو؟''وہ اُسکا گریبان پکڑے چلا رہا تھا۔

''آپ تحمل سے بات کیجئے۔''ڈاکٹر مریضوں کی مشکوک نظریں خود پر دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

''بھاڑ میں گیا تحمل،میرے بھائی کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟بولو۔۔۔''کچھ ہی دیر میں سیکیورٹی گارڈ نے اُسے پکڑ کر وہاں سے باہر نکال دیا۔وہ باہر آ کر گاڑی کو ٹھوکر مارتے بہت زور سے چیخا تھا۔غصّے کا اُبال اٹھ رہا تھا اُسکے اندر۔لیکن اُس نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ وہ مقدّم کو اس حالت سے باہر نکال کر رہے گا۔

اُس نے دوسرے ڈاکٹر سے مقدّم کے بارے میں بات کی۔اُنہوں نے اُسکے کیس کا مکمل مطالعہ کیا۔

''یہ دوائیاں کافی پہلے بند ہو جانی چاہیے تھیں۔مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر نے ایسا کیوں نہیں کیا؟بہر حال!اب یہ ان دواؤں کے عادی ہو چکے ہیں۔آپ نے ایک ساتھ دوائیں بند کر دیں جسکا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا۔ان دواؤں سے چھٹکارا پانا مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں ہے۔ہمیں آہستہ آہستہ اُسکی دواؤں کی مقدار کم کرنی ہو گی۔''ڈاکٹر نے کہا۔

''ہم انہیں ایسی نان ایڈیکٹو دوائیں دیں گے جو جزوی طور پر انکے کیمیکل ریسیپٹرز کو متحرک کر دے گی لیکن نشہ نہیں چڑھائے گی۔''ڈاکٹر نے مزید کہا۔

''ایسے تو وہ اُن دوسری دواؤں کا عادی نہیں ہو جائے گا؟''اخلاق کے خدشات بجا تھے۔

''میں نے آپ سے کہا نا! کہ یہ نان ایڈیکٹو دوائیں ہیں۔ یہ مریض کو اپنا عادی نہیں بناتیں، یہ مریض کو ایسا محسوس کرواتی ہیں کہ جیسے وہ وہی پرانی ادویات لے رہا ہے۔ پر اُسکے Withdrawal symptoms کو ساتھ ساتھ کم کر کے آہستہ آہستہ مریض کو نشے کی سی حالت سے باہر نکال دیتی ہیں۔''

اخلاق کو زیادہ سمجھ تو نہ آیا پر اُسے ڈاکٹر کی باتوں میں صداقت محسوس ہوئی تھی۔

اب اس نے مکمل طور پر مقدم کا علاج اسی ڈاکٹر سے کروانا شروع کر دیا۔

---------+---------+--------

شروعات میں دوائیں اپنا اثر نہیں دکھاتی تھیں۔ اُس رات کے بعد ایک روز اپنے بیٹے کا غم لیے شفیق صاحب دنیا سے چلے گئے۔ اُنکی موت پر اُسے اچانک سے دورہ پڑا تھا، وہ ایسے ہی چیخنے چلانے لگا جیسے پاگل ہو۔ اُسے بہت مشکلوں سے سنبھالا گیا۔ وہاں موجود لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اُس پر کوئی اثر اثرات ہیں۔

اس صدمے کے باوجود بھی اخلاق کے جذباتی سہارے نے اس کو زندہ رکھا۔ اُس نے دوائیں چھوڑ دیں۔ جب طلب محسوس ہوتی تو وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتا۔ اور نئے ڈاکٹر کی دی گئی سکون آور ادویات لیتا۔ دو سال لگے اخلاق کو، مقدّم کو دوبارہ اُسکی زندگی میں واپس لانے میں۔ ان دو سالوں میں اُسکی ماں بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ یہ صدمہ بھی اُسکے لیے کچھ کم نہ تھا۔

''یہاں سے چلے جاؤ مقدّم! کچھ عرصے کے لیے ہی صحیح پر اس ماحول سے باہر نکلو۔'' ایک روز اخلاق نے اس سے کہا۔ اب مقدّم نے دوائیں مکمل طور پر چھوڑ دی تھیں۔ اُسکی صحت بھی بہت بہتر ہونے لگی تھی۔

''کہیں بھی چلا جاؤں، لیلیٰ کو، اور اماں ابّا کو تو نہیں بھلا سکتا نا! اور وہ عبیر۔۔۔ اُسے سزا دلوائے بنا تو میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اس نے جواب دیا۔

''ابھی عبیر کی ماں نے اُسے معاف کر دیا ہے۔ پھوپھا نے بھی مجبوراً کیس واپس لے لیا ہے کہ بیٹی تو چلی گئی، اب بیٹے کو نہیں گنوا سکتے۔'' اخلاق نے کہا۔

''وہ جو چاہے کریں۔ میں لیلیٰ کا شوہر ہونے کی حیثیت سے یہ کیس پھر کھلواؤں گا۔ میں عبیر کو ایسے آزاد گھومنے نہیں دے سکتا۔'' اُس نے سختی سے کہا۔

''بالکل کرنا، لیکن ابھی تمہیں ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ میں نے تمہاری مرضی کے بنا تمہارا داخلہ ملائیشیا کی یونیورسٹی میں کروا دیا ہے۔ تمہارے ڈاکومنٹس وغیرہ جمع ہو گئے ہیں۔ بس انٹرویو دینا باقی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پی ایچ ڈی کر کے واپس آؤ۔ ابھی اپنے دماغ کو ہر شے سے آزاد کرو۔ جب تم واپس آؤ گے تو تب ہم عبیر پر دوبارہ کیس کریں گے۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''تم جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ۔ پر میں کہیں نہیں جا رہا۔'' اُس نے ناراضگی سے کہا۔ اُسکے بعد نا معلوم اخلاق نے اُسے کیسے راضی کیا؟ پر وہ سوات میں اپنا دل، روح اور تکلیف دہ یادیں چھوڑ کر ملائیشیا چلا آیا۔ دو سال وہاں گزار کر اُسکے دماغ پر واقعی اچھا اثر پڑا۔ وہ کافی بہتر ہو گیا تھا۔

پھر وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لیکر پاکستان واپس آیا تو لیلیٰ کے قتل کو پانچ سال گزر چکے تھے۔

---------+---------+--------

فضا میں موت جیسا سناٹا چھایا تھا۔ کبھی کسی زمانے میں وہ بیٹھ کر مقدّم سے اُسکی اور لیلیٰ کی داستان سنا کرتا تھا۔ امّاں ابّا کو راضی کرنے کے لیے اُسے مشورے دیا کرتا تھا۔ سوچا نہ تھا کہ آج وہ اُسکی زبان سے لیلیٰ کی موت کی کہانی بھی سنے گا۔ مقدّم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنکھیں نم تھیں، لیکن طبیعت اب پہلے سے قدرے بہتر تھی۔

''میں۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کہنا چاہیے۔'' بہت دیر بعد عمر کچھ کہنے کے قابل ہوا۔

''جو تم نے کھویا۔۔۔ اُسکی تعزیت کے لیے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ میں بس۔۔۔'' وہ کچھ بھی کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ میں بہت دکھی ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جس وقت میں تمہیں گلی گلی تلاش کر رہا تھا۔ اُس وقت تم اتنی بڑی تکلیف سے گزر رہے تھے۔'' مقدّم نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور اُداسی سے مسکرایا۔

''میں جانتا تھا کہ تم مجھے تلاشتے ہو گے۔''

''تم نے پاکستان آنے کے بعد بھی کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟'' جان کر انجان بن کر نہیں کیا کہ وہ تو خود پاکستان سے باہر تھا۔

''جب میں پاکستان آیا تو میرے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ لیلیٰ کو انصاف اور عبیر کو سزا دلوانا۔''

''کیا تم یہ کرنے میں کامیاب ہوئے؟'' عمر نے پوچھا۔

''ہاں! وقت لگا اس میں، تین سال تک میں نے عبیر کے خلاف انتھک کیس لڑا۔ بلآخر اُسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ گو کہ اب تک سزا پر عمل درآمد نہیں ہوا ہے، پر وہ پچھلے دو سالوں سے جیل میں ہے۔''

جس روز عبیر کو پھانسی کی سزا ہوئی، اُس روز عبیر کے گھر بیٹے کی ولادت بھی ہوئی۔ اُسکی بیوی شیریں جو کہ لیلیٰ کی فرسٹ اور مقدّم کی سیکنڈ کزن تھی، صدمے سے اُسی روز چل بسی۔ وہ دونوں بارہ سالوں سے بے اولاد تھے، یہ اُنکی پہلی خوشی تھی پر عبیر جیل میں تھا اور شیریں مر چکی تھی۔ مقدّم کو ان سب باتوں کی کوئی خبر نہ تھی۔ شیریں کی موت کے چوتھے روز لیلیٰ کے باپ نے اُسے بلوایا۔

''میرا اب کوئی نہیں بچا! میں جانتا ہوں کہ تم بھی میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے پر میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ تم سے ایک درخواست ہے۔ اگر تم میرا ایک کام کر دو۔'' اُنہوں نے تمہید باندھی۔

''آپ کہیں پھوپھا! میں سن رہا ہوں۔''اُس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''اس بچے کو لے جا کر یتیم خانے چھوڑ دو۔''اُنہوں نے چند دن کے بچے کو اُسکی جانب بڑھایا۔

''کس کا بچہ ہے یہ؟''اُس نے پوچھا۔

''عبیر کا۔۔۔اب خاندان میں اسے کوئی نہیں رکھنا چاہتا،اُسکے سگے نانا نانی بھی نہیں۔ہماری روایات ہمیں ایک باغی کی اولاد کو پالنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری زندگی کتنی رہتی ہے۔لیکن میں اسے یہاں رکھ کر ایک اور اخلاق، یا ایک اور عبیر بڑا نہیں کرنا چاہتا۔یہ یتیم خانے میں زیادہ اچھی زندگی گزار لے گا۔میں خود اسے چھوڑنے نہیں جا رہا کہ کہیں اپنا فیصلہ نہ بدل لوں۔اسلیے بیٹا! منع مت کرنا۔تمہیں لیلیٰ کا واسطہ۔''اُنہوں نے اُسکے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

اُنہوں نے لیلیٰ کا واسطہ دیا تھا۔لیلیٰ کے واسطے ہی وہ اُسے، شیریں کے ماں باپ یعنی اُسکے نانا نانی کے پاس لے گیا۔

''ہم نے شیریں کو لیلیٰ کی موت پر ہی کہا تھا کہ اُس باغی سے طلاق لے لے۔پر اُس نے بھی ہم سے بغاوت کی اور اُسکے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔اب اُسکے خون سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔''اُنہوں نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تو اُسے شدید افسوس ہوا۔بلآخر تھک کر وہ اُسے یتیم خانے لے آیا،پر اُس بچے کی آنکھوں نے اُسے روک لیا۔

وہ آنکھیں۔۔۔۔

وہ شہد رنگ نازک سی آنکھیں۔۔۔۔

وہ تو لیلیٰ کی تھیں۔اُس نے قدرتی طور پر اپنی پھپھو کے نین نقش چرائے تھے۔مقدّم اُسے یتیم خانے نہیں چھوڑ سکا۔وہ لیلیٰ کے قاتل کے بیٹے کو گھر لے آیا۔ خاندان بھر نے اُسکی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا پر وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا۔

''کیا تمہیں یہ لیلیٰ کے قاتل کا بیٹا نہیں لگتا؟''ایک روز اخلاق نے اُسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے یہ صرف لیلیٰ کا بھتیجا لگتا ہے۔وہ اگر زندہ ہوتی تو کبھی اسے یتیم خانے نہ چھوڑتی۔''اس جواب پر وہ مسکرایا۔

''اسکا نام کیا رکھو گے؟''اُس نے پوچھا۔

''سوچا نہیں۔۔۔''

''مکرم رکھ لو۔''اُسے نام پسند آیا۔

''خاندان والے میرا ساتھ دینے پر تمہارا بائیکاٹ کر دیں گے۔''اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا تو اخلاق ہنسا۔

''پہلے تو جیسے وہ مجھے بڑا پسند کرتے ہیں نا؟اور اگر کرتے بھی تب بھی تمہارے ہر فیصلے میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''مقدّم کتنی ہی دیر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے پچھلے آٹھ سالوں میں صرف بھائی ہی نہیں، بلکہ اُسکے سرپرست، دوست حتیٰ کہ اُسکے ماں باپ تک کا کردار ادا کیا تھا۔ کسی لمحے اُسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ جب وہ ملائیشیا میں تھا تب بھی روز اُسے فون کرتا۔

''کیا ہوا؟''اُسے خود کو دیکھتا پا کر اُس نے پوچھا۔

''میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں؟''اُس نے نم لہجے میں پوچھا تھا۔

''فرض ادا کرنے پر بھی کسی کو شکریہ کہتے ہیں؟''

''تم نے حقوق و فرائض سے آگے بڑھ کر کیا ہے میرے لیے۔''اتنا کہہ کر وہ اُسکے گلے لگ گیا۔ اُس روز شفیق صاحب کی روح کو سکون نصیب ہوا ہو گا۔ اُنکی دیرینہ خواہش اُنکے مرنے کے بعد ہی صحیح، پر پوری ہو گئی تھی۔ اخلاق نے اُسکا سر سہلایا اور ہنستا ہوا الگ ہو گیا۔

''بچے ہو تم۔''

''چند مہینوں کا ہی فرق ہے ہم دونوں میں۔''اُس نے جتایا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اب تم ابّا کا کاروبار سنبھال لو۔ میں یہاں اپنی ٹورزم کمپنی بھی دیکھ رہا ہوں اور وہاں ابّا کے آفس میں بھی چکّر لگا لیتا ہوں۔ کام اچھا نہیں چل رہا۔ بہتر ہو گا کہ اب تم دیکھو۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! اگلے ہفتے واپس کراچی شفٹ ہو رہا ہوں۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ۔''

''تم بھی کوئی بھولنے والی چیز ہو؟ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اپنے پرانے دوستوں کو ڈھونڈو، اُن سے ملو جلو۔ طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔''اُس نے تو یہ بات ایسے ہی کہہ دی تھی۔ پر مقدّم کے دل کے کسی کونے میں ہوک اٹھی تھی۔

وہ تو بھول گیا تھا کہ اُسکے دوست بھی تھے، اُسکے وقت کی گردش میں گم ہوئے پرانے یار، اُسکے جگری دوست، اُس پر جان چھڑکنے والے۔ اُنہوں نے اُسے کتنا ڈھونڈا ہو گا؟ آٹھ سالوں میں مقدّم نے ایک بار بھی اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تو اب چاہ کر بھی نہیں کر پایا تھا۔

پھر وہ کراچی آ گیا۔ وہ گھر جسے آٹھ سال پہلے ایک رات وہ تالا لگا کر چلے گئے تھے۔ آج اُسی گھر میں وہ مکرم کے ساتھ واپس آیا تھا۔ آٹھ سالوں نے اس گھر کو بھوت بنگلہ بنا دیا تھا۔ پر اُسے وہاں نہ کوئی خوف محسوس ہوا نہ کوئی وحشت۔ ہر شے ویسی ہی تھی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اُسکی الماری، اُس میں رکھے لیلیٰ کے

لیے خریدے گئے وہ تحائف، جو وہ اُسکی سوات سے واپسی پر اُسے دینے والا تھا، اُسکا وہ موبائل جو اُس زمانے میں وہ استعمال کیا کرتا تھا، سب ویسے ہی تھا۔ بس ہر شے پر ریت کی گہرائی تہہ جم چکی تھی۔ محلّے والوں نے اس گھر کو بھوت بنگلہ مشہور کیا ہوا تھا، لہٰذا اب یہاں کسی انسان کو آتا دیکھ کر اُنہیں بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔ پر یہاں آنے والے اس شخص کو گھر کے ہر کونے پر ماضی نظر آ رہا تھا۔ کہیں اُسکی ماں بیٹھی کپڑے سی رہی تھی، ابّا اسی صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، صبح کی دھوپ میں باہر چہل قدمی کر رہے تھے، امّاں ملازموں کے سر پر کھڑی لان کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کروا رہی تھیں، لاؤنج میں کھڑا مقدّم ہنستے ہوئے فون کان سے لگائے کھڑا تھا، اور دور کہیں لیلیٰ بیٹھی اُسے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ جس گھر میں زندگی کبھی اپنے جوبن پر ہوا کرتی تھی۔ آج اُسکے مکین منوں مٹّی تلے جا سوئے تھے۔

اُس نے اپنا موبائل اٹھایا، اُس رات جلد بازی میں اُسے وہ یہیں چھوڑ گیا تھا۔ موبائل کو چارج پر لگایا، اس اُمید پر کہ شاید وہ چل جائے۔ اور وہ حقیقتاً کھل گیا۔ آٹھ سال پہلے کی آئی ہوئی ڈھیروں مس کالز اور میسجز تھے وہاں۔ عمر کے کئی پیغامات، جو فون کھلنے کے بعد دھڑا دھر موصول ہوئے تھے۔

''کہاں ہو؟''

''اب تک آئے کیوں نہیں؟''

''ہم ہال کے لیے نکل رہے ہیں۔''

''ہال؟'' اُس نے کچھ لمحے نا سمجھی سے دیکھا، پھر یاد آیا کہ اُس رات علی کا ولیمہ تھا۔

آگے بھی عمر کے کئی پیغامات تھے، وہ اُسکا نمبر بند ہونے کے باوجود بھی پیغام بھیجتا رہا تھا۔ لیکن پیغامات کا یہ سلسلہ چھے ماہ میں بند ہو گیا۔ اُس نے نہ جانے کیا سوچ کر عمر کے نمبر پر کال ملائی؟ دوسری جانب سے اُسے بتایا گیا کہ اُسکے نیٹ ورک پر بیلنس نہیں ہے۔ اپنی بیوقوفی پر وہ مسکرا دیا۔ پھر اپنے موجودہ نمبر سے اُسکا نمبر ملایا، دھڑکتے دل کے ساتھ۔۔۔ پر دوسری جانب سے نمبر کسی کے استعمال میں نہ ہونے کی اطلاع دی گئی۔ دوسرا نمبر اُسے نوید کا نظر آیا، وہ بھی کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ حتیٰ کہ رضا کا نمبر بھی کسی کے استعمال میں نہ ہونے کی اطلاع ہی ملی تو وہ حیران رہ گیا کہ بھلا آٹھ سال میں سب ہی نے اپنے نمبر بدل لیے؟ اُسکے بعد اُس نے دانستہ علی اور حسین کا نمبر نہیں ملایا۔ کاش! کہ وہ ملا لیتا۔

گھر کی مزید تلاشی لیتے اُسے اپنے کمرے میں رکھا ڈیجیٹل کیمرہ بھی نظر آیا۔ وہ اُداسی سے مسکرا دیا۔ کتنا استعمال کرتا تھا وہ اس کیمرے کو؟ اُس نے کیمرہ اٹھایا اور اُسے کھولا، آخری تصویر علی کی بارات کی تھی۔ وہ پانچوں علی کے ہمراہ اسٹیج پر کھڑے تھے، یہ اُنکی آخری گروپ فوٹو تھی۔ دل بے چین ہوا۔ اب وہ سب کہاں ہوں گے؟ اُسے لگا جیسے یہ سب کل کی بات ہو، وقت رک گیا ہو اور وہ واپس اُس رات کے بعد اگلی صبح میں داخل ہو گیا ہو۔ اُسکے دوست اب بھی اُسکا انتظار کر رہے ہوں۔ پر ایسا نہیں تھا۔ وقت اب لوٹ نہیں سکتا تھا۔

یکدم ہی یاد آیا کہ وہ لوگ صنوبر کا مقدمہ لڑ رہے تھے۔اُس کا کیا ہوا؟اُس نے انٹرنیٹ پر صنوبر کے کیس کو ڈھونڈا۔پورا انٹرنیٹ کھنگالنے کے بعد بھی اُسے بس یہی معلوم ہوا کہ صنوبر کے مقدمے میں عاصم ملوث تھا اور عاصم دل کا دورہ پڑنے سے جیل میں ہی مر گیا تھا۔اُسکے بعد مقدمہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن اُسکے دوست ؟وہ جو عینی شاہد تھے وہ؟اُنکا کہیں سرے سے کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

اُس رات مقدّم نے ماضی کو ایک بار پھر سے جیا تھا۔اُس رات اُسے احساس ہوا کہ وہ کیا کچھ چھوڑ آیا ہے؟اُس رات کے بعد پھر اُسکی ہمت نہ ہو سکی کہ پھر سے اپنے دوستوں سے رابطہ کرے۔

اور جب اس نے اپنے دوستوں کو ماضی کی گمشدہ یاد بنا کر بھلا دیا تو ایک حادثے نے اُنہیں پھر سے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔

اُن چھے کے چھے کو۔۔۔

نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔۔۔

اور وہ بھی اس حال میں کہ اُن میں سے کوئی بھی دوست نہ رہا تھا۔

---------+---------+--------

لمحے ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل گئے تھے۔شام کی روشنی رات کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔لان میں پڑے پھول بھی سوکھ چکے تھے۔وہ پل میں صدیوں کا سفر کر آیا تھا۔عمر کو اُسکا ایک ایک غم اپنے دل پر محسوس ہوا۔یہ قدرت اُن پر اتنی کڑی آزمائش کیوں لے آئی تھی؟اگر لیلیٰ کو جانا ہی تھا تو کم از کم اُسکے دوست تو اُسکے پاس رہتے۔کوئی تو ہوتا اُسکے پاس۔۔۔

''میں تم سے۔۔۔۔''عمر نے کچھ کہنا چاہا پر رک گیا۔الفاظ گم ہو گئے تھے۔

''کہو!''مقدّم نے حوصلہ دیا۔اب وہ قدرے بہتر تھا۔اندر کا لاوا باہر نکل چکا تھا،سکون کے کچھ پل اب میسر آ گئے تھے۔

''میں تم سے۔۔۔معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''مقدّم نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''کس بات کی معافی؟''وہ حیران ہوا۔

''اُس روز میں تمہارے آفس آیا تھا،علی کے ساتھ۔میں تم سے پرانے دوست کی طرح مل سکتا تھا۔پر میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔مجھے پتہ ہوتا کہ تم اپنے پرانے گھر میں ہی ہو تو میں تم سے لوکیشن بھی نہ مانگتا۔''وہ اُداس تھا۔

''میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا ہم دوبارہ دوست نہیں بن سکتے؟''مقدّم کا سوال غیر متوقع تھا۔

''میں نے کہا تھا ہاں!''عمر نے کہا۔

''تو یہ معافی تلافی کس لیے؟ دس سالوں کا فاصلہ تھا۔ تم اُسکے بعد مجھ سے ملنے خود آئے تھے۔''اُس نے ساری رنجشیں مٹادیں۔

''کیا تم کھڑے ہو سکتے ہو؟''یکدم ہی عمر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''وہ حیران ہوا۔

''بس! کھڑے ہو چپ کر کے۔''اُس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ منہ بناتے کھڑا ہوا۔

''ایک تو میں تمہارے وقت بے وقت کے سرپرائزسے۔۔۔۔''وہ بیزار سا کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ عمر نے اُسے گلے سے لگالیا۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''میں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔''وہ اُداس سے لہجے میں کہتے اُس سے الگ ہوا۔

''اتنا وقت لیا تم نے مجھے گلے لگانے میں، حسین سے سیکھو کچھ۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ آنکھیں نم ہوئیں۔۔۔ اُسکے دوست دوبارہ مل گئے تھے۔ بلآخر واپسی کی منزل کے پہلے دو مسافر، اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔

''حسین نے کیا کیا؟''وہ حیران ہوا۔

''راستے میں ملا، بالکل ایسے جیسے کل ہی یونیورسٹی میں ساتھ بیٹھ کر کلاس لی ہو۔ لگا ہی نہیں کہ دس سال بعد ملا ہے مجھے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دونوں واپس اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔

''مجھ سے تو نہیں ملا۔''اُس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''تو تم خود مل لو۔ حسین سے ملنے میں کیسی ہچکچاہٹ؟''وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ واقعی نہیں بدلا۔''وہ بھی مسکرایا۔

''پر نوید بہت بدل گیا ہے یار!''اُسے یکدم ہی نوید آیا۔''وہ نہ صرف سخت مزاج بلکہ سخت جان بھی ہو گیا ہے۔ اُس روز ہسپتال میں جب شیراز اُسکے اغوا کے بارے میں بتا رہا تھا تو میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے تھے۔ بھلا اتنی آسانی سے کوئی اتنی اذیت کیسے سہہ سکتا ہے؟''

''آسانی سے نہیں آغا! تکلیف تو یقیناً اُسے بھی ہوئی ہو گی۔ پر اُس نے خود کو تکلیفوں کا عادی بنالیا ہے۔ اُسکے پیشے کا مطالبہ ہے۔''

''بات پیشے کی نہیں ہے عمر! انسان وہی اتنی اذیت سہہ سکتا ہے جو اس سے بڑی تکلیف سہہ آیا ہو۔ پھر اُس تکلیف کے آگے دنیا کی تمام اذیت ہیچ لگتی ہے۔''
بات اُسکی بھی درست تھی۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ خیر! تم ذرا مجھے مکرم سے تو ملواؤ۔''اُس نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔

''ارے وہ تو۔۔۔۔''اُسے اچانک ہی خیال آیا۔

''وہ تو؟''

''وہ تو اپنی خالہ کے پاس ہے۔ اور مجھے اُسے واپس لینے جانا ہے۔ دیکھو ذرا! میں کتنے آرام سے بھولا بیٹھا ہوں۔''بلآخر وہ نارمل ہو گیا تھا۔ مکرم یاد آیا تو ساتھ میں اُسکی خالہ بھی یاد آئی اور خالہ یاد آئی تو یہ بھی یاد آیا کہ وہ اُسے پتہ نہیں کیا کیا بول آیا ہے؟ بیچاری کیا سوچ رہی ہو گی؟

''اوہ شٹ!۔۔۔''سر پر ہاتھ مارا۔ ابھی ابھی وہاں آئی چائے کی پیالی لبوں سے لگاتا عمر چونکا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں! رمضان کے لیے خریداری کرنی تھی۔ اس لیے مکرم کو اُسکی خالہ کے پاس چھوڑا تھا۔ اور اب خود سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں بیٹھا ہوں۔''

''ویسے اُسکی خالہ کہاں سے آ گئیں؟ ابھی تم نے بتایا کہ اُسکے ننھیال والوں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔''اُس نے پوچھا۔ اب جواباً مقدّم اُسے پچھلے کچھ مہینوں کی روداد مختصراً بتا رہا تھا۔

وہ چھے دوست۔۔۔۔۔

چھے میں سے دو مل بیٹھے تھے۔۔۔۔

چار میں سے ایک نے فاصلے خود مٹا دیئے تھے۔۔۔۔

اور اب وہ بھی دو ہی تھے۔۔۔۔۔

رہ گئے نوید اور علی۔۔۔۔

تو واپسی کی منزل کے یہ دو مسافر۔۔۔

نا جانے کب اپنی منزل پر پہنچیں۔۔۔

--------+---------+----------

دن اتوار تھا، رات چاند رات تھی۔ شہر کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ ہر کسی کو پہلی سحری اور پہلی افطاری یادگار بنانی تھی۔ سڑکیں سج گئی تھیں۔ رویت ہلال کمیٹی چاند کے انتظار میں صبح سے ہی آلات لیے بیٹھ گئی تھی۔

صبح ہی عمر کو یاد آیا کہ جس پروجیکٹ پر وہ کام کر رہا تھا اُسکی فائل اور یو ایس بی دونوں ہی آفس میں رہ گئی ہیں۔ وہ سیدھا آفس پہنچا، جس جگہ وہ دونوں سامان چھوڑ کر گیا تھا، اُس جگہ وہ موجود نہیں تھے۔ اُسے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بھلا اتنی اہم چیز بھی کوئی آفس میں چھوڑتا ہے؟ پریشانی کے عالم میں اُس نے آفس کے گروپ پر میسیج کیا کہ اُسکی فائل اور یو ایس بی کسی نے دیکھی ہے؟ اگلے ہی لمحے علی کی کال اُسکے پاس آئی۔ وہ حیران ہوا۔

''فائل اور یو ایس بی میرے پاس ہے۔ تم میز پر بھول گئے تھے تو میں نے اٹھالی۔'' اُس نے فوراً ہی بتایا۔

''اوہ! شکر ہے۔ پتہ نہیں کیسے غلطی ہو گئی مجھ سے؟'' اُس نے سکون کا سانس لیا۔

''کل آفس میں لے لینا۔''

''لیکن مجھے تو ابھی چاہیے۔ میں پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ کیا تم گھر پر ہو ابھی؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں! گھر پر ہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں کچھ دیر میں۔ تم فائل اور یو ایس بی تیار رکھنا۔''

''ٹھیک ہے! آجاؤ۔'' اُس نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اُسکے دروازے پر تھا، چوکیدار کو اُسکے آنے کی اطلاع تھی شاید، اُسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا تو لان میں علی کھڑا نظر آیا۔ عمر اُسکے پاس ہی آرہا تھا لیکن اُسکے چہرے پر چھائے تاثرات نے اُسکے قدم روکے۔ وہ ایک ستون سے کمر ٹکائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سنجیدگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بھلا کسے دیکھ رہا تھا؟ سامنے کرسی پر الٹی بیٹھی، اُسکی پشت پر منہ چھپائے زار و قطار روتی نشمیہ کو۔۔۔

''علی!۔۔۔'' اُس نے پاس آتے ہوئے پکارا۔

''السلام علیکم!۔۔۔ تمہارا سامان لا رہا ہے ملازم۔'' اُس نے مصافحہ کرتے ہوئے بتایا اور دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن میں کھڑا ہو گیا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' بلآخر عمر نے پوچھ ہی لیا۔ نشمیہ کا باجا پورے گھر میں گونج رہا تھا۔

''صدمہ پہنچا ہے اسے۔۔۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''صدمہ؟ کس بات کا؟'' وہ حیران ہوا۔

''کل اسکی باربی نے ایک بند کلی کو اپنے کمرے میں رکھا تو صبح ہوتے ہی اُس کے اندر سے ایک پری نکلی۔۔۔''

''پری نہیں thumbelina۔۔۔۔'' رونے کا شغل بیچ میں روک کر تصحیح کی گئی۔

''واٹ ایور (جو بھی ہو)۔'' اُس نے بیزاری سے کہا اور دوبارہ عمر کی جانب متوجہ ہوا جو کچھ حیران پریشان سا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر اُس پری نے باہر نکل کر نشمیہ کی باربی کو باربی سے شہزادی بنا دیا۔''

''تو یہ اس بات پر رو رہی ہے؟'' وہ بیچارہ اب بھی نہیں سمجھا۔

''نہیں! دراصل یہی میتھڈ (method) محترمہ نشمیہ نے بھی اپلائی (لاگو) کیا۔ لان سے ایک کلی توڑی اور اُسے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ صبح اٹھی تو کلی مرجھا گئی۔ اب وہ اپنی شہزادی نہ بننے پر رو رہی ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے بتایا تو عمر ہنس پڑا۔

''حالانکہ میں نے اسے بتایا بھی کہ یہ سب جھوٹ ہے، ایسا کچھ نہیں ہوتا لیکن یہ مان ہی نہیں رہی۔'' اب کہ وہ بیزار ہوا۔

''یہ جھوٹ نہیں ہے، thumbelina اُس میں سے نکل کر اُڑ گئی اور میں سوتی رہ گئی۔ آپ کی وجہ سے۔۔۔'' اُس نے روتے ہوئے چہرہ اٹھا کر اُسے غصّے سے دیکھا۔

''میری وجہ سے؟ میں نے کیا کیا؟'' وہ حیران ہوا۔ ملازم عمر کو اُسکا مطلوبہ سامان دے کر جا چکا تھا۔ پر وہ وہیں کھڑا اُن دونوں کی تو، تو میں، میں دیکھ رہا تھا۔

''ہاں! آپ نے مجھے صبح اٹھایا نہیں۔ اور thumbelina چلی گئی۔'' منہ بسورتے ہوئے کہا تو عمر سے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

''تم نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ آج سنڈے ہے اور میں دیر تک سوؤں گی؟'' وہ کمر پر ہاتھ ٹکائے برابری سے لڑا تھا۔

''سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو اُسے ہی قصوروار ٹھہراتی دوبارہ رونے میں مصروف ہو گئی۔

''کیا سارے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں؟'' اُس نے یکدم ہی عمر سے پوچھا۔

''ایسے ہی ہوتے ہیں، بس تمہیں بچوں سے بات کرنی نہیں آتی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھلا بچوں سے کیسے بات کرتے ہیں؟'' اُس نے کندھے اچکا دیئے۔ عمر اُسے دیکھتے ہوئے نشمیہ کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا۔

''کیا تم نشمیہ ہو؟'' اُس نے ایسے پوچھا جیسے حیران ہو۔ نشمیہ نے حیرت سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں!۔۔۔''

''پر مجھے تو تم نشمیہ نہیں لگ رہی۔''وہ مزید حیرت سے بولا۔ علی کو اس گفتگو کی خاک نہیں سمجھ آئی۔

''تو پھر کیا لگ رہی ہوں؟''

''مجھے تو تم کوئی پرنسز (شہزادی) لگ رہی ہو۔''

''کیا سچ میں؟''اُس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو بڑا کر کے حیرت سے پوچھا۔ رونا دھونا سب بھول بھال گیا تھا۔

''ہاں! ورنہ پرسوں ہی تو میں نے تمہیں دیکھا تھا، میں پہچان نہیں لیتا؟ تم پرنسز لگ رہی ہو جب ہی تو میں پہچان نہیں سکا۔''

''پر thumbelina تو آئی نہیں، پھر میں پرنسز کیسے بنی؟''وہ پرجوش سی کرسی سے اُترتی اُسکے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ علی دلچسپی سے ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ صرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ سیکھنے کی کوشش بالکل نہیں کر رہا تھا۔

''وہ آئی ہو گی، تمہیں سوتا دیکھ کر نیند میں ہی پرنسز بنا کر چلی گئی ہو گی۔''اُس نے رازداری سے بتایا۔

''اوہ واؤ! میں پرنسز بن گئی۔''وہ خوش ہوئی۔

''ہاں!۔۔۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ یکدم ہی اُسکے گلے لگ گئی۔

عمر ساکت رہ گیا۔۔۔۔

کوئی زخم مندمل ہوا۔۔۔

کوئی دکھ جیسے کم ہوا۔۔۔۔

اُسکی تڑپتی روح کو کوئی مرہم مل گیا۔۔۔۔

اُس بچی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ اُس لمحے وہ ایک زخمی باپ کے دل پر پھوار بن کر برسی تھی۔

''آپ بہت اچھے ہیں۔''اُس سے الگ ہوتے ہوئے ایک بار پھر اُسے اپنی گڈ بک میں شامل کیا۔

''ہاں! برا تو صرف میں ہوں۔''علی نے ایک مرتبہ پھر جل کر سوچا۔ عمر نے پیار سے اُسکے گال کھینچے۔

''تم بھی بہت پیاری ہو۔''آنکھوں میں امڈتی نمی کو اندر دھکیلتے وہ کھڑا ہوا۔

''میں چلتا ہوں۔'' علی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''خدا کی قسم! اتنے سکون سے یہ میری بات کبھی نہیں سنتی جتنی آسانی سے تمہاری سن لیتی ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عمر نے اُسے پہلی بار مسکراتے دیکھا۔

''تمہاری بھی سن لے گی۔ بشرطیکہ اسے بچی سمجھ کر ہینڈل کرو تو۔'' اُس نے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔ پھر دروازے پر پہنچ کر رکا، واپس پلٹا اور اُسے دیکھا۔

''ایک بات کہوں؟'' اُس نے دروازے پر رکے ہوئے ہی کہا تو علی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اُسکے ساتھ تم کوئی اور علی ہوتے ہو۔ جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں۔

علی سن سا رہ گیا۔ اُس نے میکانکی انداز میں لان میں بلیوں کے پیچھے بھاگتی نشمیہ کو دیکھا۔ وہ اُسکی بیٹی نہیں تھی۔ ڈی این اے رپورٹ آنا ابھی باقی تھی۔ دماغ نے یاد دلایا۔ اُس نے جیب سے موبائل نکالا، بلڈ ٹیسٹنگ لیب کے نمبر پر میسیج کیا۔ آج تیسرا دن ہو چکا تھا۔

''رپورٹ منگل کو آئیگی۔'' وہاں سے جواب موصول ہوا تو اُسے شدید غصّہ آیا۔

''کیوں؟ ارجنٹ رپورٹ تین دن میں آنی تھی۔'' اُس نے پیغام بھیجا۔ غصّے کا گراف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اُسکی بیٹی نہیں تھی، پھر وہ کیوں اُسکی اتنی باتیں مان رہا تھا؟

''سر! دنوں کے حساب میں ہم ویک اینڈ کو نہیں گنتے۔ اس لیے رپورٹ پیر کی رات یا منگل کی صبح کو آئیگی۔'' اُس نے بنا جواب دیئے موبائل میز پر پھینکا۔

''یہ بچی مجھ پر حاوی ہو رہی ہے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ وہ جسکی بچی ہے مجھے اُسکے حوالے ہی کرنی ہو گی۔'' وہ نشمیہ سے پھر **وہ بچی** ہو گئی تھی۔ اُسکے دل نے پہلے سے طے کر لیا تھا کہ ڈی این اے کی رپورٹ نیگیٹیو ہی آئے گی۔ اور اُسے نشمیہ کو واپس اُسکے باپ کے حوالے کرنا ہو گا یا پھر یتیم خانے چھوڑنا ہو گا۔

''مجھے اُسے خود پر حاوی نہیں ہونے دینا۔ مجھے اُسے خود سے اٹیچ نہیں کرنا۔۔۔'' اُس نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔

آج ایک بار پھر اُس نے۔۔۔

اپنی دل کی آواز کو دبا دیا تھا۔۔۔

لیکن یہ آج آخری بار تھا۔۔۔

---------+---------+--------

رات چاند نظر آیا تھا، صبح رمضان کی پہلی کا نور پھوٹ پڑا تھا۔

''مجھے اسکول جانا ہے۔''وہ اُسکے سر پر کھڑی تھی۔

''ہمم۔۔۔''اُس نے مختصراً جواب دیا۔آج اُسکا رویہ ایک بار پھر سے سرد مہر سا تھا۔نہ آج اُس نے نشمیہ کو اسکول کے لیے جگایا،نہ اُسکے ناشتے کے لیے تگ و دو کی،نہ ہی اُسے مخاطب کیا۔یہ تمام کام آج سفیر صاحب نے کیے۔

''کب جائیں گے ؟''اُسے ٹس سے مس ہوتے نہ دیکھ اُس نے پھر کہا۔

''وین آ جائیگی کچھ دیر میں، تم تیار رہو۔''اس بات پر وہاں خاموشی چھا گئی۔

''وین؟تم نے وین لگوادی اسے ؟''سفیر صاحب حیران ہوئے۔

''ہاں ! میرے پاس برباد کرنے کے لئے مزید وقت نہیں ہے۔''آج اُس نے اپنا پرانا روپ دھار لیا تھا۔وہ واپس اپنے خول میں چلا گیا تھا۔سفیر صاحب کو برا لگا۔

''کتنا وقت برباد ہو جاتا ہے تمہارا؟''اُنہوں نے طنزیہ پوچھا۔

''اس پر ضائع کرنے کے لئے ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے میرے پاس۔''اُس نے تلخی سے کہا تو انہیں افسوس ہوا۔

''مجھے وین میں نہیں جانا۔''تمام باتوں سے بے نیاز اُس نے حکم صادر کیا۔

''کیا میں نے تم سے پوچھا؟ جتنا کہا ہے اتنا کرو،مزید کوئی ضد بحث نہیں چاہیے مجھے۔''وہ چیخا نہیں تھا،دھاڑا تھا۔وہ سہم گئی۔اُسکے لب کپکپائے،ناک سرخ ہوئی اور آنکھیں برسنے کو تیار ہو گئیں۔

''رونا مت ! بالکل مت رونا میرے سامنے۔''اس بار وہ اور زیادہ سختی سے بولا۔

''علی !۔۔''سفیر صاحب نے خفگی سے اُسے دیکھا۔

''وین آ رہی ہے اور تم اسی میں جاؤ گی۔''وہ فیصلہ سنا کر آفس کے لیے نکل گیا۔اُسکے پیچھے سفیر صاحب نے بڑی مشکلوں سے روتی ہوئی نشمیہ کو وین میں بٹھایا اور اسکول کے لیے روانہ کیا۔

آفس میں عمر سے بھی زیادہ بات نہیں کی،آج اُسکا رویہ پہلے سے زیادہ سرد مہر تھا۔عمر کو لگا شاید اُسکی کل والی بات کا اثر ہے۔لہٰذا وہ خاموش رہا۔پر وہ نہیں جانتا تھا کہ اوپر سے سخت نظر آنے کی کوشش کرتا علی دل ہی دل میں بے چین ہو رہا تھا۔بار بار نشیمہ کی روتی آنکھیں یاد آتی۔پتہ نہیں کیوں ڈانٹ دیا اُسکو؟

جب گھڑی نے بارہ بجائے تو اُسکی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔اب یقیناً اُسکی چھٹی ہو گئی ہو گی،اب وہ وین میں بیٹھ گئی ہو گی،اب یقیناً گھر پہنچ گئی ہو گی۔وہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ حساب لگاتا رہا۔اُمید تھی کہ سفیر صاحب میسیج کر کے اُسکے گھر آنے کی اطلاع دے دیں گے۔اگر وہ نہیں دیں گے تو وہ خود پوچھ لے گا۔

''نشمیہ تو مجھ سے یقیناً ناراض ہو گی؟''دل میں سوچا۔''مجھے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔اب کیسے مناؤں اُسے؟''اُسے ہمیشہ دیر سے احساس ہوتا تھا۔

''میں اُسکے لیے گول گپّے لے جاؤں گا۔تب یقیناً مان جائے گی۔''اُس نے آج تک احمد کو منانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔پر نشمیہ کے لیے وہ ایسا سوچ رہا تھا۔اُس بچی کے لیے جسے ابھی تک اپنی بیٹی نہیں تسلیم کر سکا تھا۔کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سفیر صاحب کی کال آگئی۔اُس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

''ہیلو ابّا!نشمیہ گھر آگئی؟''اُس نے بنا تمہید کے پوچھا تھا۔

''علی!علی!۔۔۔نشمی گھر نہیں آئی۔وین والا بھی فون نہیں اٹھا رہا۔اُسکے سکول فون کیا ہے تو وہ کہہ رہے ہیں،کہ وہ اسکول میں بھی نہیں ہے۔''اُنکی گھبرائی آواز نے اُسکے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

''کیا؟''وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔اپنے آفس میں بیٹھے عمر نے اُسے پریشان دیکھا تو خود بھی وہیں چلا آیا۔

''علی!نشمی گھر نہیں آئی ہے۔دیکھو جا کر کہ وہ کہاں ہے؟''وہ چیخے تھے۔اُسکا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

''مم۔۔۔میں۔۔۔میں اُسکے اسکول جاتا ہوں۔''اُس نے کہتے ہوئے فون کاٹا اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔

''علی!کیا ہوا؟''عمر پریشانی سے اُسکے پیچھے آیا۔

''نشمیہ گھر نہیں آئی اور اسکول میں بھی نہیں ہے۔وین والا فون بھی نہیں اٹھا رہا۔''وہ تیز تیز کہتے ہوئے پارکنگ میں آیا۔

''تم اُسکے اسکول جا رہے ہو؟''

''ہاں!''عجلت میں کہتے وہ گاڑی وہاں سے لے اُڑا۔

''یااللہ!بچی کی حفاظت کیجئے گا۔''عمر نے دھڑکتے دل سے دعا کی تھی۔

وہ جتنی تیز گاڑی چلا سکتا تھا،اتنی تیز چلاتے ہوئے چند منٹ میں اسکول پہنچ چکا تھا۔راستے میں بار بار وین والے کا نمبر ملاتا رہا اور وہاں سے مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔وہ اُس وقت کو کوس رہا تھا جس وقت اُس نے وین لگوانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''نشمیہ۔۔۔میری بیٹی نشمیہ کہاں ہے؟''ریسیپشن پر پہنچ کر اُس نے بنا تمہید سوال کیا تھا۔اُسکی سانس پھولی ہوئی اور رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

''آرام سے سر!۔۔۔مجھے بتایئے کہ آپکا۔۔۔''ریسیپشن پر بیٹھی خاتون نے پیشہ وارانہ لہجے میں بات شروع کی۔

''میں آرام نہیں کر سکتا، مجھے بتائیں میری بیٹی کہاں ہے؟''وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا تھا۔

''سر!آپکی بیٹی کا نام؟''اب کے ریسیپشنسٹ سنجیدہ ہوئی۔

''نشمیہ۔۔۔نشمیہ علی۔''

''کونسی کلاس میں ہے؟''اس سوال پر وہ ساکت رہ گیا۔اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کون سی کلاس میں ہے وہ؟

''وہ۔۔۔وہ شاید۔۔۔وہ چار سال کی ہے۔بچوں کے سیکشن میں ہو گی۔'' اُسے سمجھ نہیں آیا۔

''ٹھیک ہے میں معلوم کرتی ہوں۔''وہ کہتے ہوئے ٹیلیفون کی طرف بڑھی۔

''جلدی پلیز!۔۔۔''اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ نشمیہ کہیں سے سامنے آجائے بس۔

''سر!نشمیہ علی۔۔۔کڈ سیکشن میں پڑھتی ہیں۔وہ آج گیارہ بجے ہی اسکول سے جاچکی ہیں۔گیارہ بجے کے بعد اُنکی کوئی حاضری نہیں ہے۔''خاتون کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ؟

علی کے سر پر پہاڑ ٹوٹا تھا۔

---------+---------+--------

گیارہواں باب

فرار

رمضان کا پہلا روزہ، ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ گھر بھر میں دوپہر سے افطاری کی تیاریاں جاری تھی۔ تایا نے تمام گھر والوں کو پہلا روزہ ساتھ افطار کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایسے میں طویل راہداری کے درمیان میں بنے، گول کمرے کے دروازے کے کنارے سے لگی، وہ اپنی اونچی ہیلز کی مدد سے، اوٹ سے اندر جھانکنے کی تگ ودو میں تھی۔ کوشش فقط اتنی تھی کہ اندر بیٹھی بزرگ خواتین کا موضوع گفتگو معلوم کر لیا جائے۔ اس کوشش میں وہ کافی دیر سے بالکل روبوٹ بنی ہوئی تھی، ڈر تھا کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ پیچھے سے آتا حسین اُسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔

''یہ کیا کر رہی ہے یہاں؟'' اُس نے بھنویں سکیڑ کر اُسے دیکھا، پھر احتیاط سے چلتے ہوئے اُسکے قریب پہنچا۔ اُسکا کندھا ہلا کر اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

''ہش۔۔۔'' اُس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کو کہا اور دوبارہ دروازے سے اندر کی جانب دیکھنے لگی۔

اُسکے پیچھے کھڑے حسین نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک ماری، پھر اُنہیں آپس میں ملتے ہوئے ہوا میں بلند کیا، اور اگلے ہی لمحے حور عین کو دروازے کے اندر دھکّا دے دیا۔ وہ سنبھل بھی نہ سکی اور لڑکھڑاتے ہوئے سیدھا کمرے کے اندر۔۔۔

اُسکے اچانک نزول پر اندر بیٹھی خواتین نے گفتگو روک کر سر تا پیر اسے گھورا تو اُس نے گھبرا کر دانت نکالے۔

''وہ میں۔۔۔ میں بس۔۔۔ غلطی سے اِدھر آ گئی۔ آپ لوگ۔۔۔ جاری رکھیں۔۔۔ کیری آن پلیز۔۔'' دانت نکالتے ہوئے مزید وضاحت دی پر وہاں بیٹھی خواتین کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی، لہٰذا اُس نے وہاں سے رفوچکّر ہونے میں ہی عافیت جانی۔

دوسری جانب اس تمام کارروائی سے لطف اندوز ہوتے حسین نے اُسے باہر آتا دیکھ کر دوڑ لگا دی۔ حور صاحبہ نے بھی اپنی اونچی ہیل اُتاری اور تاک کر نشانہ لگایا۔ مگر حسین جیسے چابک رفتار کے آگے ہر نشانہ خطا ہو گیا اور حسین صاحب راہداری کے آخر میں بنے دروازے کے پیچھے گم ہو گئے۔

''دوبارہ اپنا منہ نہ دکھانا۔'' وہ وہیں سے چیخی۔ راہداری کے آخر میں بنا دروازہ کھلا اور حسین کا منہ نمودار ہوا۔

''کیوں میرا چہرہ دیکھنے سے تمہیں الرجی۔۔۔'' حور کو اپنی دوسری ہیل اتارتا دیکھ، اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ اُس نے ایک اور بار اُسکے سر کا نشانہ لیا پر اس بار بھی اُس نے برق رفتاری سے دروازہ بند کیا، تو اُسکی ہیل دروازے سے لگتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔

''گول۔۔۔''دروازہ کھولتا حسین خوشی سے چہکا،پر اگلے ہی لمحے اُسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر واپس بھاگ نکلا۔

''تمہیں تو میں چھوڑوں گی نہیں۔''حور عین نے دروازہ کھولنا چاہا پر وہ باہر سے لاک کر چکا تھا۔اب اُسے حسین کے قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''حسین۔۔۔دروازہ کھولو۔۔''وہ چیخی۔

''آپ کون؟''دروازے کی دوسری جانب سے اُسکی آواز سنائی دی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''آج تمہیں شربت میں مرچیں ملا کر دوں گی۔''وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔جبکہ اُسکے ہنسنے کی آواز راہداری میں گونجتی رہ گئی۔

---------+---------+--------

''کیا مطلب؟کیا مطلب اس بات کا؟کیا مطلب۔۔۔''وہ حلق کے بل چیخ رہا تھا۔کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون کا خون خشک ہوا۔

''ہو سکتا ہے کہ آآ۔۔۔آپ کی۔۔۔بیٹی آج اسکول ہی نہ آئی ہو۔''خاتون نے گڑبڑاتے ہوئے بھونڈی سی وضاحت دی۔

''کیا بکواس ہے یہ؟میری بیٹی صبح اسکول آئی ہے۔اُسکی حاضری بھی لگی ہے۔پھر بریک کے بعد اُسکی حاضری کیوں نہیں ہے؟کہاں گئی وہ؟''اُس نے غصّے سے کھولتے ہوئے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا تھا۔

''سر!آپ ایک خاتون سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔''ساتھ کھڑی ٹیچر نے اُسے وارن کرنا چاہا۔یہ نشیمہ کی کلاس ٹیچر تھی اور اسی نے بتایا تھا کہ وہ وقفے کے بعد سے غائب ہے۔

''میری بیٹی غائب ہے۔آپکو اخلاقیات کی پڑی ہے؟مجھے جواب چاہیے۔۔۔کہاں ہے میری بیٹی؟''اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارا اسکول انکے سروں پر گرادے۔

''سر!ہو سکتا ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔آپکی بیٹی آج اسکول آئی ہی نہ ہو۔یا پھر آپکے گھر سے کوئی اُسے پہلے ہی۔۔۔''

''میری بیٹی اسکول کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔وہ یہیں آئی تھی اور اُسے یہیں ہونا چاہیے۔مجھے میری بیٹی چاہیے اور اسکے علاوہ مجھے کچھ نہیں سننا۔''وہ خاتون کی بات کاٹتے ہوئے دھاڑا تھا۔لگ رہا تھا کہ دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی یا دل کام کرنا چھوڑ دے گا۔وہ جو فقط ایک بچی تھی آج ''**میری بیٹی**''ہو گئی تھی۔وہ جسکے ہونے سے چڑ تھی،آج اُسکا نہ ہونا روح نکال رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔بچے اسکول سے کہیں نہیں جا سکتے۔وہ یہی کہیں ہو گی۔ہم اسکول کی تلاشی لیتے ہیں۔''ایک میل ٹیچر نے کہا تھا۔علی کی آواز سن کر اسکول کا بیشتر عملے بھی وہاں آ گیا تھا۔

''مجھے اس بات کا جواب دو کہ بچی پچھلے ایک گھنٹے سے کلاس میں نہیں ہے نہ اُسکی حاضری لگی ہے، تو اتنی دیر سے تم لوگ سو رہے تھے؟''اُس نے باآواز بلند پوچھا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟''شور شرابے میں اس آواز پر کسی کا بھی دھیان نہ گیا۔

''سر! میں کہہ رہا ہوں کہ آپکی بیٹی مل جائے گی، آپ غصّے پر قابو رکھیں۔''مرد استاد نے بھی اس بار غصّہ دکھانا چاہا تھا۔

''اگر میری بیٹی نہیں ملی، میں جان لے لوں گا تم سب کی۔''علی اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟''آنے والا اب کہ بلند آواز میں چیخا تھا۔اس بار سب نے گردنیں موڑ کر اُسے دیکھا۔عملے کو تو اُسے دیکھ کر ہی خوف سے سانپ سونگھ گیا تھا۔جبکہ علی حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

سیاہ جینز پر سرمئی شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ کیجول کوٹ ڈالے وہ وہی تھا۔۔۔

وہ جو اس اسکول کا مالک تھا۔۔

رضاالٰہی

---------+---------+--------

کچن میں بیسن اور تلی ہوئی سبزیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی، یہ سارا سامان افطاری کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔سموسے کی فلنگ تیار کرتی، وہ خود بھی آگ بگولا ہو رہی تھی۔

''بدتمیز۔۔۔آج تو بات ہی نہیں کروں گی اس سے۔۔۔''وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔

''اہم۔۔۔اہم۔۔''کسی نے کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر گلا کھنکھارا تو اُس نے رک کر شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔

''اپنی شکل گم کر لو۔''

''وہ تو میں گم کر لوں گا لیکن کہنا یہ تھا کہ میری بیگم لاپتہ ہو گئی ہیں۔آپ نے کہیں دیکھا ہے اُنہیں؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تمہاری بیگم اپنی آدھی عقل والے شوہر سے تنگ ہے۔اس لیے تم اپنا منہ نہ ہی دکھاؤ اُسے تو اچھا ہو گا۔''تنک کر جواب دیتی وہ رول کی پٹیاں کھول کھول کر رکھنے لگی۔

''حالانکہ خود میری بیگم بنا عقل کے پیدا ہوئی ہے، لیکن نہ جانے غرور کس بات کا ہے؟''اس بات پر اُس نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تمہاری بات نہیں کر رہا، میں تو اپنی دوسری بیوی کا ذکر کر رہا تھا۔''اُس نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

''ہونہہ۔۔۔دوسری''اُس نے مذاق اڑاتے لہجے میں کہا۔

''انڈر اسٹیمیٹ(کم سمجھنا)مت کرو مجھے تم،ایک دن نکل آئیگی کہیں سے تمہاری سوکن،اُس دن احساس ہوگا کہ میں جھوٹا نہیں تھا۔''

''دیکھو!میرا روزہ ہے۔میرا دماغ مت کھاؤ۔''

''میں سڑی ہوئی چیزیں نہیں کھاتا۔اور تم اکیلی روزے سے نہیں ہو۔''

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''اُس نے کاؤنٹر پر چمچ پٹختے ہوئے پوچھا۔

''میرا مسئلہ آپ ہیں حور عین بی بی!میرا پی ایس کہاں چھپایا ہے؟''وہ اصل مدعے پر آیا۔

''تایا ابّا نے کہا تھا کہ تمہیں ہر قسم کے فضول کاموں سے دور رہنا چاہیے اور اب ایک ذمے دار انسان بننا چاہیے۔''

''کہاں چھپایا ہے؟''اُس نے سوال پر زور دیا۔

''مجھے یاد نہیں۔۔۔یاداشت کمزور ہے میری۔۔۔'' اُس نے اداکاری میں اپنے میاں کو مات دینے کا سوچا۔

''تمہاری یاداشت تو واپس آجائیں گی جب میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم افطار کے بعد میری سالگرہ کی ویڈیو دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ہم یعنی پورا گھر اور بچے بھی۔۔۔''

''سالگرہ کی ویڈیو؟''پہلے تو وہ سمجھ نہ سکی۔

''وہ والی۔۔۔۔''حسین نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''وہ۔۔۔اچھا وہ والی؟''اُسے یکدم ہی یاد آیا۔

''ہاں!میری آٹھویں سالگرہ کی ویڈیو جس میں،میں نے تمہیں بال نوچ نوچ کر مارا تھا۔''اُس نے شرارت سے کہا۔

''تم ہو ہی وحشی۔۔۔بچپن سے۔۔۔''اُس نے تپ کر کہا۔ایک تو پتہ نہیں اسکے خاندان والوں کو ہر موقع پر ویڈیو بنوانے کا کیا شوق تھا؟

''اور تم ہو ہی قبضہ مافیا۔بچپن سے۔۔۔''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''میں نے کیا قبضہ کیا؟''

''سالگرہ میری، کیک میرا، دن میرا اور مجھ سے پہلے موم بتیاں بجھانے کی اجازت کس سے لی تھی تم نے؟''اُس نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تو؟ میں اُس وقت ایک پانچ سالہ بچی تھی، تم اتنی سی بچی کا ذرا سا دل نہیں رکھ سکتے تھے؟''اُس نے بچپن والی حور کا دفاع کیا۔

''جو بھی ہو، مزا بڑا آیا تھا۔ بال نوچ نوچ کر مارا تھا میں نے تمہیں۔''وہ جیسے یاد کر کے، ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہنسا تھا۔ حور عین کو آگ ہی لگ گئی۔

''بے شرم نہ ہو تو۔۔۔''

''خیر! اب میں وہ ویڈیو باقی سب کے سامنے چلانے لگا ہوں۔''وہ بول کر جانے لگا، یہ ویڈیو جب چلتی خاندان بھر میں اُس کا مذاق بنتا تھا۔

''دے دوں گی پی ایس۔۔۔''وہ فوراً لائن پر آئی۔

''لیکن میں بھی کھیلوں گی۔''ساتھ شرط بھی رکھی دی۔

''ٹھیک ہے! تراویح کے بعد۔۔۔''ڈیل ہو گئی۔ اُسی لمحے حسین کا فون بج اٹھا۔ اُس نے دیکھا تو سکرین پر رضا کالنگ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

---------+---------+--------

سیاہ جینز پر سرمئی شرٹ پہنے اور اُس پر ہم رنگ کیجول کوٹ ڈالے کھڑا رضا، اُن دونوں کو نا سمجھی اور غصّے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے اشتیاق صاحب؟''اُس نے استاد کو مخاطب کیا۔ علی کو تو اب تک اُسکے یہاں ہونے کا جواز ہی سمجھ نہیں آیا تھا، کجا کہ یہ کہ وہ سب سے سوال بھی کر رہا تھا۔

''سر! یہ کسی بچی کے والد ہیں اور مسلسل عملے کو حراساں کر رہے ہیں۔''اُنہوں نے جواب دیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''اس جھوٹ پر تو علی نے اُسکا گریبان ہی پکڑ لیا۔

''آپ حد میں رہیں اپنی۔۔۔''اشتیاق صاحب کو موقع مل گیا تھا مظلوم بننے کا۔

''علی! چھوڑو اُسے۔۔''رضا نے درمیان میں آ کر اُسے دور ہٹایا۔

''کیا کر رہے ہو تم یہ؟''اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے غصّے سے پوچھا۔ اُسکے انداز پر اسکول کے باقی استاد چونکے، یقیناً رضا اُس بچی کے باپ کو جانتا ہے۔

''سر! یہ مسلسل اسی طرح بدتمیزی۔۔۔''علی سے پہلے اشتیاق صاحب نے بولنا چاہا۔

''میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔'' رضا اُنکی بات کاٹ کر سختی سے بولا تھا۔

''بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے آخر؟'' اب کہ اُسکا صبر جواب دے گیا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں میں؟'' علی بھی جھنجھلائے ہوئے انداز میں چیخا تھا۔ رضا نے خون کے گھونٹ بھرے۔

''کیونکہ میں اس اسکول کا مالک ہوں اور تم میرے اسکول میں یہ تماشا لگا رہے ہو۔'' اُس نے لفظ میرے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو یہ تمہارا اسکول ہے؟'' اُسکے چہرے پر حیرت کی جگہ طنز نے لے لی تھی۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میری بیٹی کہاں ہے؟'' اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ رضا کو ہی پیٹنا شروع کر دے۔

''تمہاری بیٹی؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''ہاں! میری بیٹی نشمیہ، جو صبح اسکول آئی تھی اور گیارہ بجے کے بعد اُسکی کوئی حاضری ہی نہیں ہے۔ اور تمہارے اسکول والے مجھے یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ میری بیٹی کہاں ہے؟'' بولتے بولتے اُسکا سانس پھول گیا تھا۔ رضا کی آنکھوں میں بے یقینی اُتر آئی۔ وہ جھٹکے سے نشمیہ کی ٹیچر کی طرف مڑا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' اُس نے سرد لہجے میں ٹیچر سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''سس۔۔۔ سر! وہ ہو سکتا ہے کہ کوئی لے گیا ہو گھر والوں میں سے۔۔۔'' ٹیچر نے وہی وضاحت دینے چاہی۔

''بچی غائب ہے۔۔۔۔ میرے خدا! بچی اسکول سے غائب ہے اور آپ لوگ اُسے تلاشنے کے بجائے یہاں کھڑے تماشا لگا رہے ہیں؟'' اُسکی ایک دھاڑ پر سب کی بولتی بند ہوئی تھی۔

''اسکول کا ہر کمرہ، ایک ایک کونا دیکھو جا کر، واشروم اور پلے گراؤنڈ بھی دیکھو۔ بچی ہر صورت ملنی چاہیے۔ ورنہ تم سب سے حساب لوں گا۔'' وہ چیخ رہا تھا اور عملے نشمیہ کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔

''نشمیہ نام ہے اُسکا۔۔۔'' علی نے جتایا، رضا نے نظر انداز کیا۔

''اور آپ؟'' اُس نے ٹیچر کو مخاطب کیا۔ ''نشمیہ کی کلاس ٹیچر ہیں نا آپ؟ جب وقفے کے بعد اُسکی حاضری نہیں لگی تو آپ کہاں تھیں؟ آپ نے فوراً انتظامیہ کو خبر کیوں نہیں کی؟''

''سر!۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔''

''دھیان نہیں دیا؟ مذاق کر رہی ہیں آپ؟'' رضا کے بجائے علی بولا تھا۔

''اس غفلت کا حساب میں آپ سے بعد میں لوں گا، تم میرے ساتھ آؤ علی!'' رضا نے پہلے اُسے اور پھر علی کو مخاطب کیا۔

''کہاں؟''

''اسکول کی سی سی ٹی وی دیکھتے ہیں۔ میرے اسکول سے کوئی بچہ باہر نہیں جا سکتا۔ وہ یہیں کہیں ہو گی۔'' اُس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''سر! بچی اسکول میں کہیں نہیں ہے، البتہ اُسکا بیگ اور باقی سامان کلاس میں ہی موجود تھا۔'' وہ لوگ ایڈمن آفس میں تھے، جب کچھ ہی دیر میں عملے مایوس چہروں اور ہاتھوں میں اُسکا بستہ و دیگر سامان تھامے واپس آ گیا، نشمیہ کہیں نہیں ملی تھی۔

''نہیں ہے؟ کیا مطلب نہیں ہے۔'' علی کا تو بس ہی نہیں چل رہا تھا ورنہ اُن سب کو باری باری گولی مار دیتا۔

''علی! ہم کیمرے دیکھ رہے ہیں۔ مل جائیگی نشمیہ۔۔۔ ریلیکس!'' رضا نے اُسے سمجھانا چاہا، چیخ چیخ کر اُس کا چہرہ لال ہو چکا تھا۔

''نہیں کر سکتا میں ریلیکس۔۔۔ میری بچی غائب ہے۔ کیوں سمجھ نہیں آ رہی تمہیں؟'' اُسکا گلا رندھ گیا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اُسکی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، فشار خون الگ بلند ہو رہا تھا۔ رضا نے افسوس سے اُسے دیکھا، ذرا جو یہ شخص تھوڑا صبر سے کام لے لے۔۔۔

''سر! کیا یہ ہے بچی؟'' یکدم ہی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے لڑکے نے پوچھا تو دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ علی نے جھک کر اسکرین میں دیکھا، تو وہ نشمیہ ہی تھی۔ صبح پونے گیارہ بجے کے وقت وہ پلے گراؤنڈ میں بچوں سے الگ تھلگ بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''ہاں! یہی ہے۔''

''ریکارڈنگ پوری چلاؤ۔'' رضا نے فوراً کہا تو اس نے ریکارڈنگ چلا دی۔ اب وہ لوگ سانسیں روکے دیکھ رہے تھے۔ وقفہ ختم ہونے کے بعد ٹیچر میدان سے بچوں کو اکھٹا کرنے لگیں، تب وہ کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔ پھر میدان خالی ہو جانے کے بعد کچھ دیر وہ وہیں بیٹھ کر روتی رہی۔ علی کے دل کو دھکّا لگا۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔

اور ٹھیک گیارہ بجے کے وقت جب گارڈ دروازے پر نظر نہ آیا، تب نشمیہ اسکول کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور پھر اُسے سڑک پر پیدل جاتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اُسکے آگے سی سی ٹی وی کی حد ختم ہو گئی۔ علی کے تو پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ رضا نے حیرت اور بے یقینی سے اپنے عملے کو دیکھا۔

''یہ کس قسم کی غفلت ہے؟ ٹیچر کو بچی کا معلوم نہیں ہے اور گارڈ دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہے۔ آخر آپ لوگ کر کیا رہے تھے؟'' وہ عملے پر حلق کے بل چیخ رہا تھا۔ سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔

''وہ گیارہ بجے اسکول سے نکلی تھی۔۔۔'' علی بڑبڑایا، رضا کی دھاڑتی آواز میں کسی نے اُس پر توجہ نہیں دی۔

''جب تک بچی نہیں مل جاتی، کوئی کہیں نہیں جائے گا۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

''ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔۔۔ وہ کہاں گئی؟'' علی نے خود سے سوال کیا۔ اور اسکے جواب میں سوائے خاموشی کے کچھ نہ سنائی دیا۔ اُسکے پاؤں کانپے، سر ایک لمحے کے لیے گھوما تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب ہوا۔ وہ گر جاتا اگر رضا تیزی سے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے پاس رکھی کرسی پر نہ بٹھا دیتا۔

''علی!۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟'' وہ پریشان ہوا۔ اُس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا، تنفس پھولا ہوا تھا۔

''علی!'' رضا نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''میں کہاں ڈھونڈوں اُسے؟'' اُس نے نظریں اٹھا کر پریشانی سے اُسے دیکھا۔ پہلی بار رضا کو اُس پر ترس آیا۔

''ہم علاقے کی سی سی ٹی وی نکلواتے ہیں، آگے ٹریفک پولیس کا آفس ہے، وہیں چلتے ہیں۔'' رضا نے اُسے کہا۔

''ہاں!۔۔۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ لیکن۔۔۔ لیکن وہ مل جائے گی؟'' علی نے پُر اُمید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! ان شاءاللہ ضرور مل جائیگی۔'' اُس نے یقین دلایا۔

''یہ سب۔۔۔'' وہ رکا، پھر رضا کو دیکھا، آنکھوں میں یکدم ہی غصّہ اترا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ غصّے سے کہتا کھڑا ہوا۔ رضا بھونچکا رہ گیا۔

''میری وجہ سے؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! تمہاری نااہلی اور لاپرواہی کی وجہ سے۔۔۔'' غصّے سے کہتا وہ اسکول سے باہر نکل گیا۔ رضا ہکا بکا کھڑا تھا۔

''اتنا بڑا اسکول کھول رکھا ہے پر چلانا نہیں آتا۔ ایک بچی باہر نکل۔۔۔'' اُسکے بڑبڑانے کی آواز اب بھی آ رہی تھی، رضا نے لب بھینچے۔

''اس آدمی کے ساتھ عزت سے بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔'' دل میں سوچا۔ پھر خونخوار نظروں سے عملے کو دیکھا۔

''اس مجرمانہ غفلت کا حساب میں واپس آ کر لوں گا۔'' علی کا غصّہ اُن پر اُتار کر وہ اسکول سے باہر آ گیا۔ وہ پارکنگ میں کھڑا گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ! میں ٹریفک پولیس کے آفس ہی جا رہا ہوں۔'' اُس نے علی کے پاس آتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''کیوں کہ راستے میں کہیں گاڑی ماردی تو سارا وقت وہیں برباد ہو جائیگا۔ باقی تمہاری مرضی۔۔۔''وہ بھی غصّے سے کہتا اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔ علی کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، جبکہ وہ گاڑی میں بیٹھا اُسے ہی دیکھتا رہا۔ بلآخر علی دروازہ بند کر کے اُسکی گاڑی میں آگیا۔ وہ آگیا تو رضا نے سکھ کا سانس لیتے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''کتنی دور ہے آفس؟''علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

''قریب ہی ہے، جلد پہنچ جائیں گے۔''اُس نے ضبط سے جواب دیا۔

''تیز چلاؤ۔۔۔''

''تمہارا روزہ ہے؟''رضا نے یکدم ہی پوچھا۔

''نہیں! کافر ہوں میں۔''ٹرختا ہوا جواب آیا، تو اب کہ رضا کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

''روزہ ہے تو کم از کم اُسی کا لحاظ کر لو۔ اتنا چیخو گے تو افطار تک پانی نہیں ملے گا۔''اُس نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''میری بیٹی گم ہو چکی ہے۔ تمہیں افطار کی پڑی ہے؟''وہ چیخا۔

''تو تمہاری بیٹی بھی تو اسکول سے خود نکلی ہے، اور وہ بھی پوری پلاننگ سے۔۔۔''اُس کی بس ہو گئی تھی۔

''گاڑی روکو! مجھے تمہارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''رضا نے واقعی گاڑی روک دی۔ اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''تمہارے جتنا بدلحاظ نہیں ہوں۔ آفس آگیا ہے، اترو!''اُس نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا اور دروازہ کھولنے لگا۔ علی بھی لب بھینچ کر تیزی سے گاڑی سے اتر گیا۔

''پتہ نہیں اندر جا کر کیا تماشہ کرے یہ؟ مجھے حسین کو بلانا چاہیے۔''رضا نے سوچا۔ وہ اس آدمی کو اکیلا نہیں سنبھال سکتا تھا اور اس وقت موزوں شخص حسین ہی لگا۔ وہ گاڑی سے باہر آیا اور فون پر حسین کا نمبر تلاشتے علی کے پیچھے چلنے لگا۔ اس سے پہلے کے وہ حسین کو فون کرتا، آگے چلتے علی کا فون بج اٹھا، اُس نے رک کر جیب سے موبائل نکالا تو، رضا بھی اُسکے پاس ہی آرکا۔ سکرین پر عمر کالنگ لکھا نظر آرہا تھا۔ علی نے گھوم کر رضا کو دیکھا اور عجلت میں موبائل اُسکے ہاتھ میں تھماتا بولا۔

''تم بات کرو!''اور تیزی سے آگے بڑھتا اُسکا جواب سننے کے لئے رکا نہیں۔

''میں تو نوکر ہوں اسکا۔''اُس نے جل کر سوچا اور پھر فون ریسیو کر کے کان سے لگایا۔

''ہیلو!''وہ فون کان سے لگائے آگے بڑھنے لگا، علی دور سے اُسے، سی سی ٹی وی مانیٹرنگ ہیڈ سے بات کرتا نظر آرہا تھا۔

''رضا؟''عمر نے لمحوں میں اُسکی آواز پہچانی تھی۔وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں! میں رضا ہی بات کر رہا ہوں۔''وہ ایک ستون کے پاس ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''علی اپنی بیٹی کو لینے اسکول گیا تھا، اب تک آیا نہیں تو میں نے اُسے فون کیا پر۔۔۔اُسکا فون تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟''وہ حیران ہوا۔جواباً اُس نے مختصراً تمام معاملہ اُسکے گوشِ گزار کر دیا۔علی اب اُن سے کچھ بحث کرتا نظر آرہا تھا۔

''یا اللہ! اُسکی بیٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ایسے کہاں جا سکتی ہے بھلا؟''عمر حقیقتاً پریشان ہوا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ہم تلاش تو کر رہے ہیں۔''اُس نے اتنا ہی کہا۔

''علی کیا کر رہا ہے ابھی؟''اُس نے پوچھا۔

''میرے قتل کے سب سے اذیت ناک طریقے پر غور۔۔۔''اُس نے جواب دیا۔عمر مسکرا بھی نہ سکا۔

''وہ یقیناً غصّے میں ہو گا اس وقت۔۔۔تم اُسکی کسی بات کا برا نہ ماننا۔''اُسکی ہمیشہ دوسروں کی فکر کرنے والی عادت۔

''میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔پر میں اُسے اکیلا سنبھال بھی نہیں سکتا۔فلحال تو حسین کو بلا رہا ہوں کیونکہ میری بات تو یہ سنتا نہیں ہے۔''

''میں وہاں آؤں کیا؟''

''یہاں نہیں! اگر نشمیہ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تو اُسکے بعد ہم علی کے گھر جائیں گے۔اس اُمید پر کہ کیا پتہ وہ کسی کو مل گئی ہو اور اُس نے گھر پہنچا دیا ہو۔آس پاس کے علاقوں میں بھی دیکھیں گے۔تم آنا چاہو تو اُسکے گھر ہی آجاؤ۔''اُس نے وہ منصوبہ بتایا جو اُس نے کھڑے کھڑے، خود ہی ترتیب دیا تھا۔علی کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔بھلے سے نہ ہو۔۔۔فرق کسے پڑتا تھا؟

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں۔''اُس نے کہا اور پھر فون کاٹ دیا۔ رضا فون لیکر علی اور ٹریفک پولیس ہیڈ کے پاس آیا۔

''جناب! میں نے کہہ دیا ہے، ریکارڈنگ نکلنے میں وقت لگے گا۔آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔'' ہیڈ شائستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں انتظار نہیں کر سکتا، جلدی کیجئے پلیز!''اُس کا لہجہ ملتجی ہوا۔

''آپ یہاں آنے کے بجائے پولیس اسٹیشن جاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ آپ کے پاس اب بھی وقت ہے، بچی کی تصویر دیں ہم قریبی تھانوں میں بھجوا دیتے ہیں۔ اُسکے علاوہ گشت پر مامور پولیس کو بھی کہہ دیں گے کہ بچی جہاں ملے فوراً آپ سے رابطہ کریں۔'' اُسکی بات درست تھی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم نشمیہ کی تصویر انہیں دے دو تاکہ وہ جلد سے جلد مل جائے۔'' رضا نے فون اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے آفیسر کی بات کی تائید کی۔ علی نے خالی الذہنی سے موبائل تھاما۔ کتنی ہی دیر وہ موبائل ہاتھوں میں تھامے دیکھتا رہا پر بولا کچھ نہیں۔

''علی! تصویر دو انہیں۔'' رضا نے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''میرے پاس۔۔۔ نہیں ہے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا نہیں ہے؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''میرے پاس تصویر نہیں ہے۔'' اُس نے دوبارہ بتایا۔

''نشمیہ کی؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں! ہاں! نشمیہ کی۔۔۔'' وہ جھنجھلایا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ تمہارے پاس تمہاری بیٹی کی ایک بھی تصویر نہیں ہے؟'' رضا کو بھی غصّہ آیا۔

''ہاں! نہیں ہے میرے پاس ایک بھی تصویر۔۔۔ سمجھ آئی تمہیں؟'' وہ غصّے سے بولتا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے آفیسر کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

''آخر اتنی دیر کیوں کر رہے ہو تم؟ صرف گیارہ بجے کی ریکارڈنگ ہی تو نکالنی ہے۔'' وہ اب اس پر چیخ رہا تھا۔ صاف رضا کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا جو مشکوک سا اُسے ہی گھور رہا تھا۔

''سر! خدا کے لیے انہیں کہیں کہ سکون سے بیٹھ جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔'' ہیڈ نے آہستہ آواز میں رضا سے کہا۔

''اُسکی بیٹی لاپتہ ہے، میں اُسے سکون سے بیٹھنے نہیں کہہ سکتا۔ آپ ہی کچھ دیر کے لیے برداشت کر لیں۔'' اُس نے جواب دیا اور ذرا کنارے آکر موبائل پر اپنے اسکول کی انتظامیہ کو نشمیہ کی تصویر بھیجنے کی ہدایت دینے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکول کے ڈیٹا سے اُسکی تصویر مل ہی جائے گی۔ اُنہیں ہدایت دینے کے بعد اُس نے حسین سے رابطہ کیا اور مختصراً اُسے تمام بات بتا دی۔ اُس نے فوراً آنے کے لیے حامی بھری تو اُس نے کال کاٹ دی۔ اُس وقت تک اُسکے پاس نشمیہ کی تصویر آچکی تھی۔ اُس نے ایک نظر غصّے سے بے قابو ہو کر، ٹریفک پولیس پر گرجتے برستے علی پر ڈالی، پھر دوبارہ موبائل پر کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ اب وہ جانتا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔

---------+---------+--------

ایف آئی اے کے آفس میں اِس وقت کافی گہما گہمی مچی ہوئی تھی۔ سائبر کرائم ڈیپارٹمنٹ والوں نے آج ٹھیک ٹھاک آنلائن فراڈیوں اور اسکامرز کو پکڑا تھا۔ اور اُن سے سب کچھ اگلوانے کے لیے سی ٹی ڈی والوں سے مدد مانگی گئی تھی، ایسے دنوں کا تو فیصل اور شیراز انتظار کرتے تھے۔

''اتنا تشدد مت کر دینا کہ وہ زندہ ہی نہ بچے۔'' نوید نے اُن دونوں کو پرجوش دیکھ کر متنبہ کرنا چاہا۔

''نہیں بس! ایک آدھ ہڈیاں ہی توڑنے کا ارادہ ہے۔'' فیصل نے اپنا ارادہ بتایا تو نوید نے تاسف سے دیکھا۔

''اگر وہ سچ بتا دیں تو ہڈیاں بھی توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے پھر ٹوکا۔

''لیکن ان میں سے ایک شخص لڑکیوں کی جعلی تصاویر بنا کر اُنہیں ہراساں کرتا تھا۔ کیا اُسکی ہڈیاں بھی چھوڑ دیں؟'' شیراز نے پوچھا تو نوید کے ماتھے پر بل پڑے۔

''اُسکے علاوہ۔۔۔'' مختصر جواب دیا تو دونوں کا منہ لٹک گیا۔ بھلا ہڈیاں نہ توڑنے میں بھی کوئی مزا ہے؟ نوید نے دونوں کے اترے چہرے دیکھے۔

''کیا ملتا ہے لوگوں پر اتنا تشدد کر کے؟ انسان کو سدھرنے کا موقع دینا چاہیے، اگر اتنا تشدد کر دو گے تو وہ اچھے اعمال کرنے کے لائق ہی نہیں بچے گا۔ بہت غلط بات ہے۔ کسی پر اتنا تشدد نہیں کرنا چاہیے، میں سخت خلاف ہوں اس چیز کے۔۔۔'' آس پاس میزوں پر کام کرتے افسران، مجرموں کو لیجاتے پولیس والے، اپنے کمرے کی سربراہی کرسی پر بیٹھے فرخ صاحب، حتیٰ کے لاک اپ میں عارضی طور پر بند پرانے مجرمین نے بھی رک کر، آنکھیں پھاڑ کر اور پلکوں کو جھپکا جھپکا کر نوید کو دیکھا تھا۔ یقیناً وہ مذاق کر رہا تھا۔

''میں نے یقین کر لیا۔'' شیراز نے مذاق اڑایا، پر نوید کی سنجیدہ شکل دیکھ کر واپس سیدھا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، اُسکا موبائل بج اٹھا۔ اُس نے حیرت سے موبائل اٹھا کر دیکھا، رضا کی کال آ رہی تھی۔ اُن دونوں کو جانے کا اشارہ کر کے اُس نے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو!'' محتاط انداز میں پوچھا۔ پتہ نہیں کیا بات کرنی ہو گی؟

''ہیلو! کیا تم مصروف ہو؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''فارغ بھی نہیں ہوں۔'' جواب بہت عجیب سا تھا۔

''مجھے ایک کام ہے۔'' رضا بھی ڈھیٹ تھا۔

''بولو!''

''علی کی بیٹی صبح گیارہ بجے سے لاپتہ ہے۔اُسے ڈھونڈھنے میں تمہاری مدد درکار ہے۔''اگلے لمحے وہ جھٹکا کھا کر سیدھا ہوا۔

''نشمیہ؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں! تم جانتے ہو؟''رضا حیران ہوا۔

''وہ کیسے لاپتہ ہوئی؟''اُس نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔جواباً رضا نے ساری تفصیل بتادی۔

''ٹھیک ہے! تم اُسکی تصویر بھیج دو، میں پولیس کو الرٹ کرتا ہوں۔ علی کہاں ہے؟وہ کیا کر رہا ہے؟''اُسے بھی پہلی فکر علی کی ہوئی،رضا نے ایک نظر سامنے ٹریفک پولیس آفیسر کے سر پر کھڑے،اُس سے بھڑتے علی کو دیکھا۔

''شدید غصّے میں ہے۔''مختصر جواب دیا۔

''تم پر؟''

''ساری دنیا پر۔۔۔''

''تمہیں وہ کچھ بھی کہے تو نظر انداز کر دینا۔''اُس نے بھی وہی کہا جو عمر نے کہا تھا۔

''اُسکا بس نہیں چل رہا کہ اسکول کی بلڈنگ کو باہر سے تالا ڈال کر آگ لگا دے۔اینڈ ہی ول میک شیور کہ میں بلڈنگ کے اندر ہی موجود ہوں۔(اور وہ یہ تسلی کریگا کہ میں عمارت کے اندر ہی موجود ہوں)''اُس نے سکون سے کہا تو نوید کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''اگر ٹریفک پولیس سے کوئی خاطر خواہ معلومات نہ ملے تو تم اُسے گھر لے جانا، میں وہیں آتا ہوں۔''اُس نے ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے۔''رضا نے فون کاٹ دیا۔پھر اگلے لمحے نشمیہ کی تصویر اُسے بھیج دی۔

''اے ایس پی فیصل!۔۔۔''اُس نے آواز دی۔

''جی سر!۔۔۔''وہ فوراً آیا۔

''میں تمہیں ایک بچی کی تصویر دے رہا ہوں، یہ صبح گیارہ بجے سے لاپتہ ہے۔اسکی تمام ڈیٹیل بھی تمہیں بھیج رہا ہوں۔ جلد سے جلد اس بچی کو ڈھونڈنے کے لیے ٹیم بھیجو۔''

''ٹھیک ہے سر! ٹیم ہی بھیجنی ہے نا؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں! تم بھی ساتھ جاؤ گے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا تو اُسکا چہرہ پھر سے اُتر گیا۔

''کیا یار!''وہ بیزار ہوا۔اچھا بھلا تشدد کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

''جلدی۔۔۔''نوید کہتے ہوئے سامان سمیٹنے لگا تو وہ بھی جانے کے لیے مڑا۔

''اُس ہراسانی کے مجرم کی ہڈیاں، میرے لیے باقی رکھنا۔'' جاتے جاتے فیصل، شیراز کو یاد دلانا نہیں بھولا۔وہ جواباً اُسکا منہ چڑاتا مجرم کے کمرے کی طرف چلا گیا۔جبکہ نوید آفس سے باہر نکل چکا تھا۔

---------+---------+--------

وہ پوش علاقہ تھا۔آس پاس بنے گھر خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔درمیان میں موجود سڑک کشادہ اور صاف ستھری تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سوسائٹی کی صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔گھروں کے باہر کیاریوں میں مختلف اقسام کے قد آور درخت تھے، جو سڑک کی دونوں جانب قطار میں سایہ فگن تھے۔روزہ رکھ کر ساری مخلوق خدا سوئی پڑی تھی، نہ روزے کا مقصد پتہ نہ عبادت کا شوق دل میں۔بس سارا دن سونے کو ہی عبادت سمجھ کر اپنا روزہ پورا کرنے والی مخلوق اس بات سے انجان تھی کہ اس سڑک پر کھڑے دو وجود آپس میں بار بار کیوں اُلجھ رہے ہیں؟ لیکن ان دو کے ساتھ کھڑے باقی تین اچھے سے جانتے تھے کہ ان دو نفوس کا معاملہ اور مسئلہ کیا ہے؟

''اگر سی سی ٹی وی سے کچھ نہیں مل سکا تو اس میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟''بیچ سڑک پر کھڑا رضا جھنجھلایا۔وہ لوگ علی کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔عمر اور مقدّم وہاں پہلے پہنچ چکے تھے، جبکہ حسین ٹریفک پولیس کے آفس سے ہی اُنکے ساتھ آیا تھا۔

''تم بھلا کر ہی کیا سکتے ہو؟ صرف اسکولوں کی برائیاں کھول سکتے ہو لیکن ایک بچی نہیں سنبھال سکتے۔''علی کا غصّہ عروج پر تھا۔

''میں پچھلے کئی سالوں سے اسکول چلا رہا ہوں آج تک کسی بچے نے ایسا نہیں کیا جو تمہاری بیٹی نے کیا ہے۔''رضا بولتے ہوئے اُسکے سامنے سے ہٹا، کوئی فائدہ نہیں تھا اِس سے بات کرنے کا۔

''وہ بچی ہے، صرف چار سال کی بچی ہے وہ۔اُس سے تم اُمید رکھ رہے ہو کہ وہ بڑوں کی طرح ذمے دار ہو؟''علی نے اُسکے پیچھے سے کہا۔

''اچھا! بس کرو تم دونوں۔۔۔اور اسکول کے آس پاس کے علاقوں میں دیکھا ہے؟''مقدّم نے معاملہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''دیکھ لیا ہے، لوگوں سے پوچھ بھی لیا ہے پر کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ہم تصاویر دکھا آئے ہیں اور نمبر بھی دے آئے ہیں تاکہ کسی کو ملے تو فوراً اطلاع دے۔''حسین نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں کہاں ہو گی؟''علی نے بے بسی سے کہتے ہوئے آس پاس نظریں دوڑائیں جیسے وہ یہی کہیں ہو گی اور ابھی اچانک سے سامنے آجائے گی۔

''تم پریشان نہ ہو، مل جائے گی ان شاءاللہ!''عمر نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دینی چاہی۔

''کیسے پریشان نہ ہوں؟ مجھے نہیں پتہ کہاں ہے وہ؟اور کس کے پاس ہے؟''وہ ایک بار پھر چیخا، رضا نے اُسے ناگواری سے دیکھا۔

''چھوڑ دو اُسے اسکے حال پر، اِس نے ساری دنیا سے اپنی بیٹی کے گمشدہ ہونے کا بدلہ لینا ہے۔''رضا نے بیزاری سے عمر کو کہا جو علی کے پاس کھڑا تھا۔اُسکی بات پر عمر نے لب بھینچے، ابھی وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔

''اس کو خاموش کرواؤ ورنہ یہی سب سے پہلے مرے گا میرے ہاتھوں۔''اُس نے کہا عمر سے تھا مگر سنایا جسے تھا، اُس نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''رضا! تم بھی تو نظر انداز کرو نہ!''حسین نے اُسے آہستہ سے سمجھانا چاہا۔

''وہی کر رہا ہوں۔''اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔پھر فون نکال کر کسی کو میسیج کرنے لگا۔اُسے لمحے وہاں ایک جیپ آرکی۔سیاہ جینز پر کاہی رنگ کی ٹی شرٹ، جسکا رنگ اتنا گہرا تھا کہ سیاہی کا تاثر دیتا تھا، اور اُس پر سیاہ شرٹ ڈالے، جسکے بٹن آگے سے کھول رکھے تھے، چہرے پر ازلی سختی، ماتھے پر چھائی شکنوں کا جال، اور آنکھوں پر گوگلز لگائے وہ نوید تھا، جو اُس جیپ سے اترا تھا۔

''مجھے اسکول کے قریب رہائشی علاقے کی ویڈیو ملی ہے، وہاں پر نشیبہ کو دیکھا گیا ہے، ٹیم علاقے کی چھان بین کر رہی ہے، جیسے ہی کوئی پیش رفت ہوتی ہے تمہیں بتا دیا جائیگا۔''اُس نے بنا کسی سلام دعا و تمہید کے بات شروع کی تھی۔

''تو تب تک میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟''علی نے تڑخ کر پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے بھی صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم لوگ۔۔۔''علی کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

''کہاں ڈھونڈو گے اُسے؟ سڑکوں پر؟''نوید نے پیچھے سے پوچھا تو وہ رکا، پھر مڑ کر اُسے دیکھا۔

''ہم اُسے ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں گھر جانا چاہیے۔''اُسکا سرخ چہرہ اور ویران آنکھیں دیکھ کر وہ تھوڑا نرم پڑا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تمہیں اندر جانا چاہیے۔''عمر نے بھی تائید کی۔

''تمہیں سمجھ کیوں نہیں آرہا کہ نشمیہ تین گھنٹوں سے غائب ہے؟ پتہ نہیں۔۔۔ کوئی نقصان نہ پہنچادے اُسے۔'' وہ کہہ نہیں پارہا تھا، بتا نہیں پارہا تھا، سمجھا نہیں پارہا تھا۔ اصل پریشانی یہی تھی کہ اُسکی بیٹی کسی غلط انسان کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس سے آگے نہ اُس سے سوچا جارہا تھا نہ وہ سوچنا چاہتا تھا۔

''آؤ! تم اندر چلو۔'' عمر نے آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں سے پکڑا اور اپنے ساتھ لیکر آگے بڑھنے لگا۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح گھر کے دروازہ کی طرف بڑھنے لگا۔

''لیکن میں۔۔۔ میں اندر کیوں جارہا ہوں؟ میری بیٹی غائب ہے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا رکا تو عمر کو اُسکی ذہنی حالت پر شک گزرا۔

''نہیں! میں نشمیہ کو لیے بنا نہیں جاسکتا۔'' وہ واپس مڑا، اس بار نوید سامنے آگیا۔

''علی! تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا، میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔ تم پلیز! اندر چلو۔'' نوید کے لہجے میں کچھ تھا کہ وہ رک گیا۔

''بچے ایسی حرکتیں اور شرارتیں کرتے ہیں، ہوسکتا ہے اسکول میں ہی کہیں ہو۔'' اس بار حسین نے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

''بچے ایسا کرتے ہیں، لیکن بڑے اگر نااہل اور غیر ذمّے دار نہ ہوں تو ایسا کبھی نہ ہو۔'' وہ سخت لہجے میں بولتے کس طرف اشارہ کررہا تھا؟ سب بخوبی جانتے تھے۔ جسکی طرف اشارہ تھا اس نے ضبط سے لب بھینچے۔

''نشمیہ مل جائے، سب سے پہلے اس بیکار اسکول سے ہی نکالوں گا اسے۔۔۔'' تیز آواز میں بڑبڑاتا وہ خود تو گھر کے اندر چلا گیا، لیکن باقی سب نے بے ساختہ مڑ کر رضا کو دیکھا تھا۔ تپتے چہرے اور بھینچے ہوئے لبوں کے ساتھ وہ کچھ دیر سڑک کو دیکھتا رہا، پھر اگلے ہی لمحے جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے علی کے پیچھے اُسکے گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔

''رضا رکو!۔۔۔'' نوید کو چھوڑ کر وہ تینوں ہی اُسے آوازیں دیتے رہ گئے، پر وہ بھی ڈھٹائی سے اُسکے پیچھے گیا تھا۔

بہت ہوگیا تھا، اُس نے رضا کی محنت سے بنائے گئے اسکول کو بے کار کہا تھا۔ اب واقعی بہت ہوگیا تھا۔۔۔

''باپ اگر غیر ذمّے دار اور نااہل نہ ہو تو واقعی کسی بھی بیٹی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔'' رضا کی چنگھاڑتی آواز پر لان میں سر تھام کر کھڑے علی نے پلٹ کر خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ وہیں تھا، باقی چاروں عجلت میں پیچھے داخل ہوئے تھے۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتا۔'' اُس نے بے زاری سے کہا۔ سفیر صاحب جو اُنکی وہاں موجودگی سے ناواقف تھے، اس شور پر وہ بھی لان میں آگئے۔

''مجھے بھی ایسا کوئی شوق نہیں ہے، لیکن بہتر یہ ہوگا کہ تم پہلے اپنے گریبان میں جھانکو۔ ایک بچی تو سنبھالی نہیں گئی تم سے، اُسکے غائب ہونے میں سب سے بڑا کردار خود تمہارا ہے۔'' رضا کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔ آج اُسکی بس ہوگئی تھی، یہ آدمی ہر چیز کا ذمّے دار اُسے ہی کیوں ٹھہرا دیتا تھا؟

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''وہ اُسکے مد مقابل آ کھڑا ہوا۔ عمر نے آگے بڑھ کر رضا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی درخواست کی۔

''اپنا سچ تمہیں بکواس کیوں لگتا ہے علی؟''اُس نے بڑے اطمینان سے اُسے آگ لگائی تھی۔ سفیر صاحب نے پریشانی سے، مقدّم نے ناگواری سے اور حسین نے بیزاری سے اُن دونوں کو دیکھا تھا۔ جبکہ نوید اس سارے معاملے میں لاتعلق سا، سینے پر ہاتھ باندھے، لان میں بنے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تھا۔ان دونوں کا تو روز کا ہی تھا۔

''بتاؤ کیا نااہلی دکھائی ہے میں نے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔''علی کا بھی دماغ گھوما، وہ ہر بار اُسکے ذاتی مسئلے کیوں نکال لاتا تھا؟ حسین نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا، وہ انکے روز روز کے جھگڑوں سے واقعی تنگ تھا۔

''تم دونوں کسی وقت تو خاموش ہو جایا کرو۔''مقدّم نے جیسے التجا کرنی چاہی تھی، لیکن دوسری جانب اُن دونوں کو ہی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ نوید فون میں مصروف تھا۔

''تم نے نشمیہ کو خود اسکول چھوڑنے کے بجائے وین لگوائی، اور چلو لگوا بھی دی تو اسکول کی آفیشل وین لگوانے کے بجائے کوئی لوکل وین لگوائی، پہلی نااہلی۔۔۔ تمہاری بیٹی رو رہی تھی صبح سے، اسکول میں بھی وہ اُداس تھی، یقیناً وہ گھر سے ہی پریشان آئی تھی۔ تم نے اس حالت میں بھی اُسے اسکول بھیجا یہ تمہاری دوسری نااہلی اور تم سے بڑھ کر نااہل باپ کون ہو گا جس کے موبائل میں اپنی بیٹی کی ایک تصویر تک نہیں ہے؟''موبائل سے سر اٹھا کر نوید نے ناگواری سے دونوں کو دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ موبائل میں مصروف ہو گیا۔ان الزامات پر تو علی کا خون کھول اٹھا۔

''وین ڈرائیور پچھلے چھے سال سے میرے بیٹے کو بھی اسکول لیکر جا رہا ہے، اور نشمیہ کے گم ہونے میں وین والے کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اپنی غلطیاں دوسروں کے سر مت ڈالو۔''اُس نے اپنا لہجہ بلند ہونے سے روکا تھا۔

''اور بچے تو کسی بھی بات پر ضد لگا کر رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں، اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُنہیں گھر سے ہی کوئی پریشانی ہو۔''اب کے عمر نے علی کا ساتھ دیتے ہوئے وضاحت دی۔

''جیسے کہ میں جانتا نہیں کہ یہ کتنا ٹاکسک انسان ہے؟ پتہ نہیں وہ بچی کیسے رہ رہی ہے اسکے ساتھ؟''رضا نے غصّے سے کہا۔ اصل غصّہ اُسے نشمیہ کے رونے پر تھا، وہ بچوں کو روتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور ویسے بھی علی کا رویہ وہ اُسکے بیٹے کے ساتھ دیکھ ہی چکا تھا، لہٰذا بیٹی کے لیے بھی اُسے کوئی اچھے کی اُمید نہیں تھی اُس سے۔

''جسٹ شٹ اپ رضا!۔۔۔''علی کی آواز بلند ہوئی۔

''یو شٹ اپ۔۔۔''رضا نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس کر دو تم دونوں۔۔۔'' پیچھے کھڑا نوید چیخا نہیں تھا، حلق کے بل دھاڑا تھا۔اس دھاڑ پر سب کو لمحے بھر کے لیے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''کسی موقع محل کا لحاظ ہی نہیں رہا ہے تم دونوں کو۔'' وہ سخت مگر بلند لہجے میں کہتا اُن دونوں قریب آیا، پورے لان میں سنّاٹا چھا چکا تھا۔

''تمہارے اس طرح چیخنے چلانے، یا دوسروں کو الزام دینے سے تمہاری بیٹی نہیں مل جائے گی۔'' اُس نے علی کو مخاطب کیا، اور اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی برابر کھڑے رضا کی طرف گھوما۔

''اور تم۔۔۔'' انگارہ آنکھوں سے رضا کو دیکھا، وہ چپ ہی رہا۔ ''اگر وہ پریشان ہے اور کچھ بھی بولتا جا رہا ہے تو کم از کم تم ہی خاموش ہو جاؤ۔'' کوئی اور ہوتا تو رضا، یقیناً اس لہجے میں بات کرنے پر سامنے والے کا منہ توڑ دیتا، پر وہ کچھ روز قبل نوید کو پولیس والے پر تشدد کرتا دیکھ چکا تھا۔ سو چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔اور ویسے بھی اس لمحے اُسکا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا، یقیناً اُسکا پارہ چڑھ چکا تھا۔اُس نے کچھ لمحے غصّے سے اُن دونوں کو گھورا۔

''مجھے اب تم دونوں کی آواز نہیں آنی چاہیے۔'' دونوں کو تنبیہہ کرتے ہوئے وہ اپنے فون پر آنے والی کال کو سننے کے لیے باہر نکل گیا۔رضا خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا، جبکہ علی لان میں رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

''میں بتا نہیں سکتا کہ اِن دونوں کو نوید کی کتنی اشد ضرورت تھی؟'' حسین نے آہستہ سے مقدّم کے کان میں کہا تو اتنی سنجیدہ صورتحال میں بھی وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

علی کا دل بھاری ہو رہا تھا، عجیب عجیب سے وسوسے آ رہے تھے۔خدانخواستہ اُسکے ساتھ کچھ برا ہو گیا تو؟ آج کل جو خبریں آ رہی تھیں، اُس صورتحال میں تو بچوں کو ویسے ہی ہر گز اکیلا نہیں چھوڑا جانا چاہیے، کجا کہ اُس نے وین ہی لگوا دی۔ صحیح تو کہہ رہا تھا رضا، اگر وہ اُسے وین نہ لگواتا تو وہ روتے ہوئے اسکول سے نہ نکلتی۔اب رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔

''علی! میں عمر کے ساتھ جا رہا ہوں، ہم آس پاس کے علاقوں میں دوبارہ دیکھتے ہیں۔'' مقدّم نے اُسکے قریب آ کر کہا۔

''میں بھی ساتھ آؤں؟'' وہ فوراً سیدھا ہوا۔

''نہیں! تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، اُس پر سے اس وقت تمہیں یہاں ہونا چاہیے۔جیسے ہی کچھ پتہ چلے گا، ہم فوراً بتا دیں گے۔'' اُس نے منع کیا تو علی نے سر ہلا دیا۔وہ دونوں چلے گئے، تو وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر کھڑا ہوا اور حسین کو مخاطب کیا۔

''میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔'' وہ کہہ کر اندر جانے کے لیے مڑا، پھر رکا اور ایک نظر لاتعلق سے کھڑے رضا کو دیکھا اور پھر باآواز بلند بولا۔

''اندر آنا ہے تو آجاؤ، باہر بہت دھوپ ہے۔''حسین نے تو باقاعدہ مسکراہٹ ضبط کی تھی، البتہ رضا نے برابر نظر انداز کیا تھا۔ علی دانت کچکچاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ نوید نا معلوم کہاں غائب تھا؟ اُسکے اندر جانے کے بعد حسین، رضا کے پاس آیا۔

''تمہیں اندر آنے کی دعوت دی ہے تمہارے دوست نے۔۔۔''اُس نے شرارت سے کہا تو رضا نے گھوری سے نوازا۔

''تم چلے جاؤ!''چڑ کر کہتا وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''تمہیں غصّہ آرہا ہے تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔''حسین بھی اُسکے برابر آبیٹھا، یہ فقط دو ہی سیڑھیاں تھیں، جو لان کو گھر سے جوڑتی تھیں۔

''میں کہیں نہیں جارہا۔''اُس نے کہا۔ دھوپ تیز تھی، اُسکا چہرہ تپش سے نم آلود ہو رہا تھا۔

''کیوں؟ علی کی اتنی فکر؟''وہ باز نہ آیا۔

''علی کی نہیں، اُسکی بیٹی کی۔ جب تک وہ مل نہیں جاتی میں یہاں سے کہیں نہیں جارہا۔ وہ مل جائے تو میں، اِس سے حساب کتاب پورا کر کے جاؤں گا۔''

''کس سے؟''

''نشمیہ کے باپ سے۔۔۔''رضا نے تپ کر کہا تو وہ مُسکرا دیا۔

''اللہ کرے کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ جائے۔''حسین نے کہا۔

''آمین!''

--------+---------+----------

ظہر کی نماز ادا کر کے اُس نے دعا کی لیے ہاتھ اٹھائے تو نظریں دیوار پر لگی گھڑی تک گئیں۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ نشمیہ کو غائب ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جسم سے روح نکل چکی ہو، پانچ گھنٹوں سے نہ جانے وہ کہاں تھی؟ کس کے ہاتھوں میں تھی؟ ٹھیک بھی تھی یا نہیں؟ صبح اُس نے ناراضگی میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا صحیح سے، یقیناً بھوکی ہو گی۔

''یااللہ! میری بیٹی کو میرے پاس بحفاظت پہنچا دیں۔ میرا وعدہ ہے دوبارہ کبھی نہیں ڈانٹوں گا اُسے، کبھی خود سے دور نہیں کروں گا۔ میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں ہے اللہ! میری بیٹی مجھ سے نہ لیں۔''اُسے یاد بھی نہیں کہ اُس نے کتنے عرصے بعد دعا مانگی تھی؟ اور مانگی بھی تو کس کے لیے؟ جسے وہ کل تک اپنی بیٹی نہیں مان رہا تھا؟ اور آج وہ اُسکی بیٹی ہو گئی تھی۔ کافی دیر دعا مانگ کر بھی جب دل کو تسلی نہ ہوئی تو جائے نماز لپیٹ کر کھڑا ہوا، سنگھار میز پر نشمیہ کی دو پونیاں رکھی نظر آئیں تو دل بھر آیا۔ آگے بڑھ کر اُسے اٹھالیا۔ وہ اُسے کیسے بتاتا؟ کیسے بتاتا کہ وہ در حقیقت اُسے خود سے دور کرنے سے ڈر گیا تھا۔ چند

دنوں میں وہ اُسکا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ یہ سوچ، کہ وہ کہیں فاطمہ کے دوسرے شوہر کی بیٹی نہ ہو، اُسے ڈرا دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اُسے خود سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ پر آج اُسے نہ کسی ڈی این اے کی ضرورت تھی، نہ کسی تصدیق کی۔ وہ ایمان لا چکا تھا کہ وہ اُسی کی بیٹی ہے۔ ایسے کسی غیر کے لیے اُسکا دل تڑپ نہیں سکتا تھا۔ ایسا تو بس اولاد کے لیے ہوتا ہے۔ احمد گیا تھا تو پھر بھی دل کے کسی کونے کو یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہے۔ پر نشمیہ تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا میں ہی کہیں نہ تھی۔

جائے نماز رکھ کر وہ باہر آیا تو سر بھاری ہو رہا تھا، طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی، لگ رہا تھا جیسے زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ نوید بار بار کسی سے کال پر بات کرتا، ہر بار علی اُمید سے اُسے دیکھتا کہ شاید کوئی اطلاع ہو پر وہاں سے کوئی جواب نہ آتا، سفیر صاحب کی الگ حالت خراب تھی۔ عمر اور مقدّم اسکول کے آس پاس کے تمام علاقوں میں لوگوں سے نشمیہ کے متعلق پوچھ رہے تھے، پر اُنکی جانب سے بھی کوئی خبر نہ آئی تھی۔

اسی اثنا میں ڈھائی گھنٹے مزید گزر گئے، عمر اور مقدّم واپس نہ آئے، نہ نشمیہ کی کوئی خبر آئی۔ علی کی طبیعت بد سے بدتر ہو گئی۔ اس دوران وہ کئی مرتبہ رضا سے اُلجھ چکا تھا، البتہ اب اُسکی طبیعت کے پیش نظر رضا اُسے نظر انداز کر رہا تھا۔

''تم ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے۔'' حسین نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔'' اُس نے آہستہ آواز میں کہا تو حسین کو اُس پر ترس آیا۔ اُسی وقت علی کو اپنی ناک کے پاس کسی گیلی چیز کا احساس ہوا، اُس نے فوراً ہاتھ رکھا اور پھر ہتھیلی کو نظروں کے سامنے کیا تو حیران رہ گیا۔ اُسکی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھتا باتھ رُوم کی طرف گیا تھا۔

''علی!۔۔'' حسین نے پریشانی سے پیچھے سے پکارا تھا۔ رضا اور نوید نے علی کو تیزی سے اٹھ کر جاتا دیکھا تو ناسمجھی سے حسین کے پاس آئے۔

''کیا ہوا اسے؟'' رضا نے پوچھا۔

''نوز بلینڈنگ (ناک سے خون) ہوئی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں وہ چہرہ دھو کر باہر آ چکا تھا۔

''تم اپنا بی پی چیک کرو۔'' حصے نے کہتے ہوئے پاس رکھی بلڈ پریشر کی مشین اٹھائی اور علی کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی اُسکے بازو پر لگا دی۔ مشین نے جو اعداد و شمار دکھائے اُسے دیکھ کر تو اُنکے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مشین کے مطابق اُس کا فشار خون اس وقت خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔

علی نے بازو پر بندھی مشین اُتاری اور اٹھا کر فرش پر دے ماری۔ یہ اُسکے اندر ابلتے غصّے کی انتہا تھی۔ پھر تھک کر سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ وہ تینوں اُسکی حالت سمجھ رہے تھے لہٰذا کچھ بھی نہ بولے۔

مساجد سے مغرب کی اذانیں سنائی دینے لگیں پر نشمیہ کی کوئی خبر نہ آئی۔ پورا علاقہ اس وقت تلی ہوئی اشیاء کی خوشبوں سے مہک رہا تھا۔ لوگ پہلی افطاری جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ سفیر صاحب کھجوریں اور شربت لے آئے کہ کم از کم وہ لوگ روزہ تو کھول لیں۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی علی نے ایک کھجور سے روزہ افطار کر لیا تھا۔ باقی تینوں نے بھی یہی کیا تھا۔ روزہ کھولتے بھی علی کے دل میں بس نشمیہ کی صحیح سلامت واپسی کی دعائیں تھیں۔ اُسی لمحے رضا کے موبائل پر کسی کی کال آئی تو وہ اُسے سننے باہر چلا گیا، وہ کافی دیر باہر رہا، نہ جانے کیا بات تھی؟ تقریباً بھی بیس سے پچیس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اُسکے ساتھ نہ صرف مقدّم اور عمر تھے، بلکہ عمر کی گود میں سہمی ہوئی سی نشمیہ بھی تھی۔

''نشمیہ!'' اُسے دیکھ کر علی کے منہ سے بے یقینی سے اُسکا نام ادا ہوا۔ عمر نے اُسے گود سے اتارا۔

''نشمیہ!'' وہ دیوانہ وار اُسکی جانب بڑھا تھا۔

''یہ کہاں ملی؟'' نوید نے مقدّم سے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا، علی کی دھاڑ نے اُنہیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

''کہاں گئی تھی تم؟ کس سے پوچھ کر اسکول سے نکلی تھی؟ ہاں؟'' وہ گھٹنوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھا، اُسے بازو سے پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔ وہ پہلے ہی ڈری ہوئی تھی، مزید خوفزدہ ہو گئی۔ علی کو مطلق پرواہ نہ تھی۔

''کوئی لے جاتا تمہیں تو؟'' اُس نے اُسے جھنجھوڑ ہی دیا تو وہ رونے لگ گئی۔ رضا نے ناگواری سے دیکھتے ہوئے نشمیہ کو اس سے دور کیا۔

''بس کر دو علی! وہ بچی ہے۔'' عمر نے بھی کہا اور پھر نشمیہ کو سفیر صاحب کے حوالے کر دیا۔ علی اب کہ چپ ہی رہا، البتہ اُسکا تنفس پھولا ہوا تھا۔ دن بھر کا غصّہ اور پریشانی نشمیہ پر ہی نکال دی تھی اُس نے۔ سفیر صاحب نشمیہ کو وہاں سے لے گئے۔

''کہاں تھی یہ؟'' علی نے کھڑے ہوتے ہوئے مقدم سے پوچھا۔

''مجھے رضا نے فون کر کے کہا کہ یہ اسکول میں ہے اور میں لے آؤں۔'' مقدّم نے کہا تو علی سمیت باقی دونوں نے بھی بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''پوری بات بتاؤ!'' رضا نے کھا جانے والی نظروں سے مقدّم کو دیکھا تو وہ گڑبڑایا۔

''ہاں! میں پوری بات بتا ہی رہا تھا۔'' اُس نے سر کھجاتے ہوئے کہا، آج کا روزہ کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا۔

''دراصل! ایک بوڑھی خاتون کو نشمیہ ملی تھی، وہ اُسے گھر لے گئیں۔ پھر اُنہوں نے اپنی سی بہت کوشش کی کہ اس سے اُسکے گھر کا کوئی ایڈریس یا نمبر معلوم کر لیں، پر اُسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پھر خاتون خود بوڑھی تھی، اس لیے اپنے بیٹے کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ بیٹا گھر آیا تو اس نے نشمیہ کا یونیفارم

دیکھ کر اسکول پہچان لیا، وہ پہلے نشمیہ کو قریبی برانچ لے گیا، وہاں اُسے اس برانچ کا معلوم ہوا، جہاں یہ پڑھتی ہے تو پھر اُسے وہیں لے آیا۔ اس وجہ سے دیر ہو گئی ورنہ یہ پہلے ہی مل جاتی۔'' مقدّم نے تفصیلاً بتایا۔

''تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ اسکول میں ہے؟'' نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''رضا نے بتایا۔'' اُس نے ایک بار پھر مکمل بات نہیں کی، اب کہ رضا نے خون خوار نظروں سے اُسے گھورا اور بولا۔

''اسکول کی انتظامیہ نے مجھے کال کر کے اُسکے مل جانے کی اطلاع دی تھی، مقدّم اسکول کے قریب ہی تھا تو میں نے اسے ہی کال کی تا کہ یہ نشمیہ کو لے آئے۔'' اُس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ مقدّم بس سر جھکا کر رہ گیا۔ وہ واقعی تھک گیا تھا، یا اُسے سچ میں روزہ لگ رہا تھا، جو آدھی ادھوری بات کر رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئی ہے۔'' حسین نے کہا۔

''ہاں! لیکن گھر سے دور رہ کر وہ ڈر گئی ہے کافی۔'' عمر نے بتایا۔

''خیر! اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' نوید کو جانے کی جلدی تھی۔ اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ایک بار پھر علی کی ناک سے خون آیا تھا۔ وہ بیزار سا منہ بنا کر باتھ رُوم کی طرف بڑھا تھا۔

''اسے کیا ہوا؟'' عمر پریشان ہوا۔

''بی پی ہائی ہے کافی۔'' حسین نے بتایا۔

''اسے ہسپتال جانا چاہیے، اُسکی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔'' مقدّم کو بھی تشویش ہوئی۔

''وہ تو راضی ہو جائیگا جیسے۔۔۔'' حسین نے منہ بنایا۔

''ٹھیک ہے! تم لوگ اسے راضی کرو۔ میں باہر ہوں۔'' نوید حکم صادر کرتے ہوئے، اُنہیں ہکا بکا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ ویسے بھی وہ بہت کم بات کرتا تھا اور کرتا تھا تو بہت مختصر۔

''کیا مطلب کہ ہم راضی کریں؟'' حسین حیران ہوا۔ خیر نہ معلوم کیسے پر علی ہسپتال جانے پر راضی ہو ہی گیا۔ عمر اور نوید اُسے ایمر جنسی میں لے آئے تھے۔ جہاں پہلے تو اُسکا فشار خون اس قدر بلند ہونے پر ڈاکٹر نے اُسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی تھی، پھر اُسے ڈرپ میں دوچار انجکشن دے کر چلا گیا تھا۔ اب ہسپتال کے بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا علی، خاموشی سے اپنے ہاتھ میں لگے کینولا کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں لیٹ جانا چاہیے۔'' عمر نے اُسے مسلسل بیٹھا دیکھ کر کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، یہ ڈرپ ختم ہو تو فوراً گھر جاؤں گا۔''اُس نے مختصراً کہا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہیں صحیح لگے، میں بھی اب چلتا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔''اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ!''اُسکی طبیعت اس قدر خراب تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی عمر کا شکریہ نہیں ادا کر سکا۔

''خدا حافظ!''عمر باہر آ گیا۔ جبکہ نوید اُسکے پاس ہی بیٹھا رہا۔ وہ باہر آیا تو رضا، مقدّم اور حسین کو راہداری میں کھڑا دیکھ کر حیران ہوا۔

''تم لوگ گئے نہیں؟''اس نے پوچھا۔ وہ سمجھا تھا کہ وہ لوگ جا چکے ہوں گے، کیونکہ علی کے گھر سے نکلتے ہوئے یہی طے ہوا تھا کہ صرف نوید اور عمر اُسکے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔ پر اب وہ تینوں بھی یہاں کھڑے تھے۔

''طبیعت کیسی ہے اُسکی؟''رضا نے سنجیدگی سے عمر سے پوچھا۔ ظاہر نہیں کر رہا تھا، پر علی کی فکر ہو رہی تھی اُسے۔

''خود پوچھ لو جا کر۔''جواب مقدّم کی طرف سے آیا تھا۔

''میرے منہ کی بات چھین لی۔''حسین ہنسا تو رضا نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

''اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''بتانا ضروری سمجھا کہ بس مروت کے طور پر علی کی طبیعت پوچھی ہے، ورنہ اُسے کوئی فکر نہ تھی اُسکی۔

''تم ذرا غصّہ کم کیا کرو۔''یہ غیر متوقع ہدایت بھی مقدّم کی طرف سے آئی تھی۔ اب کہ حسین دل کھول کر ہنسا۔ رضا نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا۔

''چلو! میں نکلتا ہوں۔ اب اگر گھر پہنچ کر مکمل افطار نہ کی تو راستے میں ہی شہید نہ ہو جاؤں۔''حسین نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ چاروں وہاں سے جا چکے تھے۔

نوید اپنی مرضی سے علی کے ساتھ رکا تھا، وہی ڈرپ ختم ہونے کے بعد اُسے گھر لے جانے والا تھا۔

---------+---------+--------

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ دائیں طرف کی دیوار مختلف قسم کے اسلحوں سے مزین تھی۔ کمرے کی دوسری جانب کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے، کھڑکی سے منسلک میز پر کچھ پرانے کاغذ اور ایک لال کور والی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ کرسی پر بیٹھا وجود، ڈائری پر جھکا، کمرے کے نیم اندھیرے میں گم ہو رہا تھا۔ میز پر جلتی اسٹڈی بلب کی ہلکی پیلی روشنی میں اُسکا وجود فقط سائے کی مانند نظر آتا تھا۔ سارے کمرے میں روشنی فقط اُسی جگہ تھی، جہاں وہ بلب روشن تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر قلم اٹھایا اور ڈائری کے صفحے پر کچھ لکھنے لگا۔ پیلی روشنی میں اُسکا لکھا گیا جملہ نیم واضع سا ہوا۔

''میں ڈائری نہیں لکھتا۔پر جو میں نے کیا،اُس نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔وہ چھے تصاویر،وہ چھے لڑکے۔۔ وہ جو کبھی دوست تھے، جنہیں میں نے یہیں بیٹھ کر، آخری صفحے پر جمع کیا تھا۔

وہ آخری صفحہ جس نے سی ٹی ڈی والوں کے وجود میں سنسنی دوڑا دی ہے۔جب ہی تو سب کے سب کو اکھٹا کر لیا۔سب کے سب۔۔۔نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔۔''سایہ ہوتا وجود مسکرایا،اُسکی مسکراہٹ دلفریب تھی۔وہ قلم کی مدد سے صفحے پر الفاظ بکھیر رہا تھا،اور الفاظ صفحوں پر صفحے بھرتے جا رہے تھے۔ بلآخر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔اُسکی داستان پوری ہو چکی تھی۔اندھیرے کمرے کی ہلکی پیلی روشنی کے نیچے لکھے گئے،اُسکے گڈمڈ ہوتے نیم واضع الفاظ میں صرف ایک جملہ نظر آ رہا تھا۔

''مجھ تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔''

اب وہ نیچے اپنا نام لکھ رہا تھا۔اور شوقیہ دستخط۔

بس ایک شوقیہ دستخط۔۔۔

وہ چھے تصاویر۔۔۔

ایک ڈائری۔۔۔

اُسکا آخری صفحہ۔۔۔

سایہ ہوتا وجود۔۔۔

اُسکی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔

اور

مورخہ چھے۔۔۔

گھر میں خاموشی کا راج تھا، سفیر صاحب یقیناً نشمیہ کو سلا چکے تھے۔ علی کو نوید کے ساتھ گھر واپس آتا دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئے،اُسکی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔وہ خاموش پڑے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ہاتھ کی پشت پر سنی پلاسٹ بندھی ہوئی تھی۔

''تم نے بس کھجور سے روزہ کھولا تھا، کچھ کھاؤ گے ؟'' سفیر صاحب نے پوچھا۔

''ہسپتال میں کھالیا تھا۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔ پھر چہرہ اٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ نشمیہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا پر پوچھ نہیں سکا۔

''آپ سو جائیں، تھک گئے ہوں گے۔'' اُس نے نرمی سے کہا تو وہ کچھ حیران ہوئے۔ پھر اثبات میں سر ہلاتے کھڑے ہوئے۔

''تمہارا شکریہ بیٹا! تم نے اتنا خیال رکھا علی کا۔'' اُنہوں نے کافی دیر سے خاموش بیٹھے نوید سے کہا۔

''شرمندہ نہ کریں۔'' اُس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ بس اتنا ہی کہا۔ دس سال پہلے اگر اُنہوں نے یہ بات کہی ہوتی تو اُسکا جواب یقیناً مختلف ہوتا۔ ''نہیں انکل! یہ تو میرا فرض تھا'' یا ''علی تو میرا بھائی ہے۔'' جیسا کوئی جملہ۔۔۔ پر اب ایسا نہیں تھا۔ علی اُداسی سے مسکرا دیا، سفیر صاحب چلے گئے۔

''تمہاری ڈی این اے رپورٹ آگئی ؟'' اُنکے جانے کے بعد نوید نے پوچھا تھا۔ یہ وہ سوال تھا جو وہ کب سے کرنا چاہ رہا تھا۔

''نہیں!'' اُس نے فقط یہی کہا۔

''تو پھر۔۔۔'' اُس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

''میں بنا رپورٹ دیکھے بھی جانتا ہوں کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میری سگی بیٹی۔۔۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کیسے ؟''

''اگر وہ میری اولاد نہ ہوتی تو میں کبھی بھی اُسکے لیے اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میرا دل ہی بند ہونے لگا تھا یہ سوچ کر کہ نا جانے کہاں ہو گی ؟ صرف ایک ہفتے پہلے آئی بچی کے لیے میرے یہ جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ یقیناً میری ہی بیٹی ہے۔ یہ گواہی میرے دل کی ہے۔'' اُس نے بلآخر تسلیم کر لیا تھا ، نوید کے پاس کوئی جواب نہیں بچا۔

''چلو! یہ تو اچھی بات ہے لیکن۔۔۔'' سنجیدگی سے کہتے وہ رکا۔ ایک تو اُسکا انداز ہمیشہ ایک سا رہتا تھا۔ وہی سنجیدہ اور لاتعلق سا۔ چہرے سے اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ سوائے غصّے یا سنجیدگی کے اُسکے چہرے پر کوئی تاثر ہی نہ ہوتا تھا۔

''لیکن ؟'' علی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم رضا کے ساتھ ہر بار زیادتی کرتے ہو۔ ان سب میں اُسکا سرے سے کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اسکول انتظامیہ سے ٹھیک ٹھاک حساب لے گا۔ پھر وہ تمہارے ساتھ سارا دن رہا، نشمیہ کی تلاش میں ہر ممکن مدد کی۔ تمہیں اُسکے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔'' وہ معتدل لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ علی شرمندہ ہوا۔

''ہاں! لیکن وہ مجھ سے حساب برابر کر ہی لیتا ہے۔''اُسکا انداز وضاحتی تھا۔

''شروع بھی ہر بار تم ہی کرتے ہو۔''وہ صاف گو تھا۔

''میں پریشان تھا۔ لیکن مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں معذرت کرلوں گا اُس سے۔۔۔''اُس نے ہار مان لی۔

''معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے علی! تم اپنے جذبات پر قابو رکھنا سیکھو، غصّے کے دوران اپنی زبان پر قابو رکھنا سیکھو کیونکہ۔۔۔''وہ رکا تو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیونکہ جو کچھ تم غصّے میں کہہ دیتے ہو، بعد میں معذرت کرنے سے اُسکا اثر زائل نہیں ہوتا علی!''سنجیدگی سے کہتا وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔ علی جہاں تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا۔

''اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ!''اُسکا جواب سننے کے لیے رکے بنا ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔ علی ہل بھی نہ سکا۔ اُس نے کیسے سمجھ لیا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ٹھیک ہو جائے گا؟ اپنے الفاظ کہہ کر وہ خود تو بھول جاتا تھا، پر کیا سامنے والے کے لیے بھی بھولنا اتنا آسان تھا؟ آج جو کچھ ہوا وہ بھی تو اُسکی زبان کا ہی نتیجہ تھا۔ اگر وہ نشمیہ سے وہ سب نہ کہتا تو وہ اتنا شدید ردعمل نہ دیتی، اگر وہ احمد کے ساتھ نرمی کا رویہ رکھتا تو وہ کبھی اس سے دور نہ جاتا۔ آج اُسکے پرانے دوست، اُسکے لیے یہاں آئے، زبانی نہ صحیح پر دوستی کا حق ادا کر گئے، اتنے عرصے اُس سے کوئی تعلق نہ رکھ کر بھی آج تمام تعلق نبھا گئے اور وہ؟ اُس نے کیا کیا؟ کسی ایک کو بھی ڈھنگ سے شکریہ ادا نہیں کیا۔ ایک شکریہ ہی تو کہنا تھا۔ آخر وہ اتنا بدزبان اور بدمزاج کیوں ہو گیا تھا؟ تمام جمع تفریق کے بعد غلط وہ ہی نکلا۔ آج پہلی بار اپنا آپ بہت چھوٹا لگا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے تک آیا۔ نشمیہ سو رہی تھی۔ سارا دن کی پریشانی کے بعد بھی بچے کتنے سکون سے سو جاتے ہیں؟ وہ اُسکے برابر آ بیٹھا۔ اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ نین نقش بالکل فاطمہ جیسے تھے، پر آنکھیں اور مزاج بالکل علی کا۔ وہ مسکرایا۔ سارا دن اسکو ستا کر خود کتنے آرام سے سو جاتی تھی یہ؟ دل کیا اُسے پیار کرے، پر کر نہیں سکا۔ نہ جانے کیوں وہ بہت سے کام چاہ کر بھی نہیں کر پاتا تھا؟ جیسے کوئی شے آڑے آ جاتی تھی درمیان میں۔ تھک کر وہ اُسکے برابر ہی لیٹ گیا، اُسکے موبائل پر کوئی نوٹیفکیشن بجا تھا۔ اُس نے دھیان نہیں دیا۔ سحری کا الارم سیٹ تھا، اُسے اٹھنا بھی تھا، لہٰذا جلدی سونا چاہتا تھا۔ دواؤں کا اثر تھا کہ وہ جلد ہی غنودگی میں چلا گیا۔

سائیڈ ٹیبل پر رکھے اُسکے موبائل کی سکرین روشن ہوئی تھی، وہ گہری نیند میں تھا ورنہ دیکھ لیتا کہ۔۔۔

موبائل سکرین، اُسکی میل پر ڈی این اے کی رپورٹ آنے کی اطلاع دے رہی تھی۔

وہ عمارت کی بیسمنٹ میں کھڑا اپنی گاڑی بند کر رہا تھا۔ سفید رنگ کی روشنی میں نہائے بیسمنٹ میں اور بھی مختلف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس عمارت میں اُسکا ذاتی فلیٹ تھا، جسے وہ کم ہی استعمال کرتا تھا۔ آج بھی کافی عرصے بعد وہ یہاں آیا تھا۔ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ پر شاید قسمت کو منظور نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لفٹ کی طرف بڑھتا، بیسمنٹ کے سنّاٹوں کو چیرتی ایک سفید گاڑی وہاں آ رکی۔ اندر بیٹھے وجود کو دیکھ کر وہ حیران کم اور بیزار زیادہ ہوا تھا۔

''تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟'' حسین گاڑی سے اترا تو رضا نے ماتھے پر بل ڈالے اُسے دیکھا۔

''تمہارا پیچھے کرنے میں جو مزا ہے وہ کسی حسینہ کا پیچھے کرنے میں بھی نہیں آتا۔'' اُس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔

''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' حسین بھی ڈھیٹ تھا، الٹا اُسی سے سوال کیا۔

''تمہارے لیے رشتہ دیکھنے۔۔۔'' بیزاری سے کہتے وہ لفٹ کی طرف بڑھا۔

''ارے واہ! پھر تو تمہیں، مجھے ساتھ لیکر جانا چاہیے۔'' وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''میں تمہیں جہنّم میں بھی ساتھ لیکر نہ جاؤں۔'' اُسکی بیزاری میں کوئی فرق نہ آیا۔

''ہاں! وہاں تمہیں اکیلا چھوڑنے پر میں راضی ہوں۔'' سنسان بیسمنٹ میں بیزار سے رضا کے پیچھے پیچھے چلتا حسین، بڑی فرصت سے اُسے جواب دے رہا تھا۔ آگے آگے چلتا رضا لفٹ کے پاس آ رکا اور مڑ کر اُسے دیکھا۔

''میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔'' اُسے جتایا کہ تمہاری ضرورت نہیں ہے۔

''تو رہو! میں نے کونسا تمہیں شادی کی آفر کی ہے۔'' اُسے رتی بھر فرق نہ پڑا۔ بلکہ لفٹ کے کھلتے ہی وہ پہلے اندر گھس گیا، رضا بھی سر جھٹکتے اندر داخل ہوا، پھر مطلوبہ فلور کا نمبر ڈال کر، دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''تو تم نے بتایا نہیں۔۔۔'' بند لفٹ میں حسین کی آواز گونجی، وہ بھی اُسکے برابر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ لفٹ کے دروازے پر دونوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔

''کیا نہیں بتایا؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''یہی کہ کس کے لیے رشتہ لے جا رہے ہو میرا؟''

''حسین!'' رضا یکدم ہی سیدھا ہوا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''یہاں میرا ذاتی فلیٹ ہے،اور میں یہاں تب ہی آتا ہوں جب مجھے تنہائی چاہیے ہوتی ہے۔''اُس نے بتایا کم جتایا زیادہ۔

''تو؟''مجال ہے جو سامنے والے کو کوئی شرمندگی ہوئی ہو۔لفٹ مطلوبہ فلور پر رک گئی۔

''تو یہ کہ تم میری تنہائی میں مخل ہو رہے ہو۔''چبا چبا کر کہتا وہ لفٹ سے باہر نکلا۔سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا حسین بھی سیدھا ہوا اور اُسکے پیچھے چل دیا۔

''مجھے مخل ہونا پسند ہے۔''ایک بار پھر وہ اُسکے پیچھے پیچھے چل رہا تھا،بے پر کی ہانک رہا تھا۔

''اپنی پسند بدلو۔''راہداری میں رضا کی آواز گونجی۔مختلف اپارٹمنٹ کے دروازے پیچھے رہتے جا رہے تھے۔

''میں کسی کے لیے بھی اپنی پسند نہیں بدلتا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو حسین!''اُس نے مڑے بنا ہی التجا کی۔

''کیوں چھوڑ دوں؟انسان اکیلا رہنے دنیا میں تھوڑی آیا ہے؟''

''میں آیا ہوں۔۔۔میں اکیلا ہی آیا تھا اور اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔''وہ چڑا۔

''ہاں!ہم تو مجمع لیکر آئے تھے اور بارات ساتھ لیکر جائیں گے۔''اُسکی بکواس پر رضا رکا،اُسے خفگی سے دیکھا۔پھر اگلے ہی لمحے دونوں ہنس دیئے۔

''تم کب بڑے ہو گے؟''حسین نے پوچھا۔

''حالانکہ یہ سوال تم سے پوچھا جانا چاہیے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے فلیٹ کے دروازے کا لاک کھولنے لگا۔آج ایک بار پھر حسین اُسکا زبردستی مہمان ہونے والا تھا۔

رضا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا،دروازے کے پاس ہی بنے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر لائٹ جلائی پھر مڑ کر راہداری میں کھڑے حسین کو دیکھا۔

''تمہیں اندر آنے کے لیے دعوت نامہ دوں؟''اُسے وہیں جمے دیکھ کر تپا۔

''نہیں!اجازت نامہ دو۔''

''تم جیسے بڑے اصول پسند ہو نا؟'' وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر بڑھ گیا۔ اندر آ کر مزید لائٹیں جلائیں، کوٹ اُتار کر صوفے پر پھینکا اور کچن میں چلا آیا۔ مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ حسین اندر آیا بھی ہے یا نہیں؟ فریج سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالا، پھر کھڑے کھڑے کافی میکر آن کیا اور دو پیالی کافی جتنا پانی ڈالا۔ یکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ حسین کی آواز نہیں آ رہی۔

''یہ اندر آیا بھی ہے کہ نہیں؟'' وہ مشکوک ہوتا کچن سے باہر نکلا، اپارٹمنٹ خالی نظر آیا تو اُسے پریشانی ہوئی۔ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا، وہ بند تھا۔ اگر حسین نے کیا تھا تو اُسے آواز کیوں نہ آئی؟ اور اگر وہ اندر آ گیا تھا تو کہیں نظر کیوں نہیں آ رہا؟

''یہ واپس تو نہیں چلا گیا؟'' اس خیال کے آتے ہی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، راہداری سنسان پڑی تھی۔

''یہ واپس چلا گیا؟'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ برا مان جائے گا۔ خود پر غصّہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی۔ افسوس کے ساتھ دروازہ بند کیا اور صوفے کے پاس آ کر اپنا کوٹ اٹھا کر جیب سے فون نکالا۔ پھر فون بک سے حسین کا نمبر نکالا تاکہ اُسے فون کر سکے۔

''مجھے کیوں فون کر رہے ہو؟'' وہ اچھل پڑا، موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے پر گرا اور دایاں ہاتھ سیدھا دل پر آ رکا۔ حسین اُسکے پیچھے دانت نکالے کھڑا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ۔۔'' اُس نے سانس بحال کرتے ہوئے اُسے گھورا۔ دل باقاعدہ حلق میں آ گیا تھا۔

''حد ہے! کہاں تھے اتنی دیر سے؟'' اُسے گھورتا ہوا واپس کچن کی جانب چلا آیا۔

''میں تو تمہارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتے لیتے ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ کر رکھی ہے تم نے۔'' وہ کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اپارٹمنٹ واقعی خوبصورت تھا۔ جواباً رضا خاموشی سے پیالیوں میں کافی پھینٹنے لگا۔ بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔ اتنی کہ رضا کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ وہ اُسے ہی جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اب تمہیں کیا ہو گیا؟'' وہ کافی کی پیالیاں کاؤنٹر پر رکھ کر اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے کیوں کیا تھا ایسا؟'' اُسکا سوال وہی تھا، جس سے وہ نظریں چراتا رہا تھا۔

''کیا کیا میں نے؟'' انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ علی نہیں تھا رضا!'' حسین نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''وجہ صرف علی ہی تھا۔'' اُس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نہیں مانتا۔ تم نے اس روز جو بھی کیا تھا، اُسکی وجہ علی نہیں تھا۔ تم نے کچھ چھپایا تھا ہم سے۔'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ وہ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا؟'' اُسکے ماتھے پر بل پڑے۔

''نہیں! لیکن اُس جھگڑے کو ہوا تم نے دی تھی۔'' اُس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تو تم دس سال پہلے کا حساب مانگنے آئے ہو مجھ سے؟'' وہ تلخ ہوا۔

''نہیں! میں صرف جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ جاننا چاہتا ہوں میں بس!''

''کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ مجھے غصّہ آ گیا تھا۔'' اُس نے وضاحت دینا چاہی۔

''تم نے جو الزامات علی پر لگائے تھے وہ بے وجہ نہیں تھے اور نہ غصّے کی وجہ سے تھے۔ تم نے اس روز جو کیا پورے ہوش و حواس میں جانتے بوجھتے کیا۔''

''اگر تمہیں اسی بارے میں بات کرنی ہے تو تم جا سکتے ہو۔'' اُس نے بے مروتی سے کہا تھا۔

''میں یہاں آیا اپنی مرضی سے ہوں تو جاؤں گا بھی اپنی مرضی سے ہی۔'' اُسکی ڈھٹائی کو داد دینے کا دل کیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' رضا نے تھک کر پوچھا تو جواباً وہ خاموش رہا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو رضا کو اپنی بدلحاظی کا احساس ہوا۔

''میں۔۔۔ میں بس۔۔۔ بات نہیں کرنا چاہتا اس موضوع پر۔'' اب کے اُس نے آہستہ سے وضاحت دی۔ وہ اُسکا محسن تھا۔ وہ بھلا اُس سے اس طرح کیسے بات کر سکتا تھا؟

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا رضا! بہت ڈھونڈا تھا۔ ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی اُمید تھی۔۔۔۔'' حسین نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔ رضا کا دل دکھنے لگا، وہ اور اس انسان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ ذہن کے پردے پر وہ خوفناک یاد چلنے لگی۔

وہ سلاخوں کے پیچھے گزاری ہوئی ایک رات۔۔۔۔

وہ جیل کی ٹھنڈے فرش پر اُسکے برف ہوتے پاؤں۔۔۔

وہ عزت نفس کو مجروح کرتی ہنسی۔۔۔

وہ انا پر پڑتی چوٹ۔۔۔

وہ چیخ چیخ کر بیٹھتی ہوئی آواز۔۔۔

وہ بے بس انسان۔۔۔

وہ ایک۔۔۔اکیلا انسان۔۔۔

---------+---------+--------

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا مقدّم! بہت ڈھونڈا تھا۔ ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی اُمید تھی۔۔۔'' الفاظ وہی تھے، جذبات بھی وہی تھے، احساسات بھی وہی تھے، پر منظر بدل گیا تھا۔ مکالمے وہی تھے پر کردار بدل گئے تھے۔ اُسی وقت، اُسی لمحے حسین کی جگہ مقدّم مہمان ہوا تھا، رضا کی جگہ عمر میزبان ہوا تھا۔ فلیٹ کی جگہ عمر کے گھر نے لے لی تھی، وہی پرانا گھر جہاں مقدّم اکثر آیا کرتا تھا۔

دونوں منظر ناموں میں فرق صرف اتنا تھا کہ حسین نے خود کو خود ہی مہمان بنایا تھا، جبکہ مقدّم کو عمر نے باقاعدہ چائے پر مدعو کیا تھا۔ اور اُسکی گمشدگی پر اپنی بے بسی بتانے والا خود عمر تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے مجھے کتنا ڈھونڈا ہوگا؟ پر میرے حالات بھی تو تمہیں معلوم ہو چکے ہیں۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ عمر کا خالی گھر دیکھ کر اُسے عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ وہ اکیلا کیوں ہے؟ یا شاید اُسکے گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں؟ سوال تو بہت تھے پر وہ پوچھنے سے گریزاں تھا۔

''پتہ نہیں یہ سب کیوں ہوا؟ قسمت کے فیصلے کبھی کبھی سمجھ ہی نہیں آتے۔'' کرسی کے ہاتھ پر انگلیاں پھیرتا عمر کچھ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ہر شخص کے پاس اپنی کہانی ہے، سب کی اپنی وجوہات ہیں۔ تم نے مجھے جھگڑے والی بات بتائی۔ پر یہ نہیں بتایا کہ رضا نے علی کو کیا کہا تھا؟'' مقدّم آج شاید تمام ابہام دور کرنا چاہتا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب رضا، نوید اور علی کا جھگڑا ہوا تب میں وہاں نہیں تھا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ نوید کیس سے پیچھے ہٹنا چاہتا تھا اور تم چلے گئے تھے ان دونوں باتوں پر علی بہت غصّہ تھا اور اس نے سب سے کافی بدزبانی کی تھی۔ اُس نے نوید کو خود غرض، مفاد پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا تھا؟ رضا کو بھی اُس پر غصّہ آیا تھا اور اس نے بھی اُسے ٹھیک ٹھاک برا بھلا تھا۔ الفاظ تو میں نہیں جانتا پر جھگڑے کی نوعیت کافی زیادہ تھی، یہ مجھے خضر نے بتایا تھا اور خضر کو حسین نے۔۔۔''

''اور حسین نے خضر کو تمام بات نہیں بتائی تھی۔'' مقدّم نے یکدم ہی کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اُس نے سکون سے جواب دیا تو وہ حیران ہوا۔

''کیا تم تمام بات جانتے ہو؟''

''نہیں! مجھے بس اتنا اندازہ ہے کہ حسین نے خضر کو تمام بات نہیں بتائی ہو گی۔ کیونکہ جب خضر مجھے یہ تمام بات بتا رہا تھا اُسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ جھگڑا اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس پر تعلقات ختم کر دیئے جائیں، اُسکی تمام بات میں بہت سے جھوتھے۔ پھر میں اس نتیجے اور پہنچا کہ یقیناً حسین نے اُسے مکمل بات نہیں بتائی ہے۔'' اُس نے آہستہ سے کہا تو مقدّم گہری سانس لیکر پیچھے ہوا۔

''جب میں نے تم سے جھگڑے والی بات سنی تھی تو میرے لیے بھی یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اتنی سی بات پر اتنا شدید جھگڑا کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے بھی تمہاری کہانی میں جھول محسوس ہوا۔ اسی لیے میں حسین سے ملا۔''

''حسین سے؟'' وہ سیدھا ہوا۔

''ہاں! ملاقات اتفاقیہ تھی پر میں نے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر بات کی جائے، میرے کچھ شبہات تھے جو میں دور کرنا چاہتا تھا۔''

''تو دور ہوئے؟'' وہ جانچتی نظروں سے مقدّم کو دیکھنے لگا جبکہ مقدّم بغور اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''جھگڑے سے متعلق تو تمام شبہات دور ہو گئے اُس نے مجھے تفصیل سے سب بتایا کہ اُس روز در حقیقت ہوا کیا تھا۔''

''کیا بتایا اُس نے؟'' عمر بھی اصل بات سننا چاہتا تھا۔ جواباً اُس نے تمام بات بتا دی۔

''یار! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ان لوگوں نے ایک دوسرے پر اس حد تک گرے ہوئے الزامات لگائے تھے؟'' وہ شاکڈ رہ گیا۔ یہ تو اُسکے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا تھا۔

''میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ اُس نے نوید کو کیس سے پیچھے ہٹنے پر خود غرضی کا طعنہ دیا تھا پر یہ صنوبر والی بات۔۔۔'' اُسے یقین کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

''تمام باتوں کے ذمے دار فقط دو ہی لوگ ہیں۔ ایک علی اور دوسرا رضا۔۔۔'' مقدّم نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں کا حال تو آج بھی ایسا ہی ہے۔ پتہ نہیں کب سدھریں گے؟'' پہلی بار عمر نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دونوں آج بھی ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ معلوم نہیں اتنی عدم برداشت کیوں ہے ان دونوں میں۔'' اُسے دونوں پر ہی غصّہ آ رہا تھا۔ اگر جو دونوں ہی اُس دن تھوڑا تحمل سے کام لے لیتے تو معاملہ یہاں تک نہ آتا۔

''جھگڑے کے متعلق تمام حقائق معلوم ہو گئے پر کچھ شبہات اب بھی ہیں جنہیں صرف تم دور کر سکتے ہو۔'' مقدّم نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تو عمر حیران ہوا۔

''میں؟''

''حسین نے مجھے بتایا کہ اُسے خضر کیوں ملا تھا۔'' وہ توڑ توڑ کر بات کر رہا تھا یا تمہید باندھ رہا تھا؟

''کیا بتایا اُس نے؟'' عمر کو اپنی سانس اٹکتی محسوس ہوئی۔

''یہی کہ باقی سب کی طرح تمہارے گھر والے بھی تمہارے اچانک بیرونِ ملک جانے کی وجہ سے لاعلم ہیں۔ اور یہ کہ۔۔۔۔'' وہ رکا، عمر کا سانس بھی رکا۔

''کہ؟''

''یہ کہ تم نے چار سال تک اپنے ماں باپ سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ کیوں؟''

''ایسی بات نہیں ہے، شاید خضر ٹھیک سے بتا نہیں سکا ہو گا۔'' اُس نے بات گھمائی۔

''خضر کہاں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''خضر اب میرے ساتھ نہیں ہے۔'' اُسکے جواب پر مقدّم نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''عمر! کیا چھپا رہے ہو تم؟ میں کب سے۔۔۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی کوئی سوال کرتا عمر کے اگلے جملے نے اُسے ساکت کر دیا۔

''میں ملک سے باہر کیریئر بنانے نہیں گیا تھا۔ جان بچانے گیا تھا۔''

---------+---------+--------

حالانکہ وہ سحری کا الارم لگا کر سویا تھا پر اُسکی آنکھ الارم بجنے سے پہلے ہی کھل گئی۔ اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے وقت دیکھا پھر اٹھ بیٹھا۔ نشمیہ پاس ہی سکون سے سوئی ہوئی تھی۔ اُس نے گہری سانس لیکر ماتھا مسلا طبیعت اب قدرے بہتر تھی پر سر میں درد ابھی بھی تھا۔ ہاتھ کی پشت پر بندھی سنی پلاسٹ اُتارتے ہوئے اُس نے پاس رکھا موبائل اٹھایا۔ ای میل پر بلڈ ٹیسٹنگ لیب والوں کا پیغام آیا پڑا تھا۔ اُسکا دل دھڑکا، جب اُسے رپورٹ کا انتظار تھا تب آئی نہیں، اور جب انتظار نہیں رہا تو رپورٹ سامنے تھی۔ یہ وہ شے تھی جس سے وہ نظریں چراتا آ رہا تھا۔

اُس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ فائل ڈاؤنلوڈ کی اور اُسے کھولا۔ اندھیرے کمرے میں اگر کوئی شے روشن تھی تو وہ موبائل کی روشنی میں نظر آتا اُسکا چہرہ تھا۔ جو اس وقت فق ہو چکا تھا، کتنے ہی لمحے وہ بے یقینی سے رپورٹ دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے غصّے کا اُبال اٹھا تھا اُسکے اندر، غصّہ بھی ایسا کہ سامنے آئی ہر شے جلا کر

راکھ کر دے۔ جس بات سے وہ ڈرتا آرہا تھا وہ ہو گئی تھی، جس شے سے نظریں چرا رہا تھا وہ سامنے آچکی تھی۔ اب احساس زیاں کا کاری وار دل پر محسوس کیے وہ تن فن کرتا، وقت کا لحاظ کیے بغیر سفیر صاحب کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ جاگ رہے تھے، نہ بھی جاگ رہے ہوتے تو بھی علی آج اُنہیں اٹھا دیتا۔

جو بات وہ کرنے آیا تھا وہ عام نہ تھی۔ اُسے سامنے دیکھ کر وہ حیران کم پریشان زیادہ ہوئے تھے۔ اُسکا چہرہ اور آنکھیں خطرناک حد تک سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ تو برا ہوا تھا یقیناً، اُسکا انداز ایسا تھا جیسے آتش فشاں سے بھرے پہاڑ سے لاوا پھوٹ پڑے۔ اُنکا دل زور سے دھڑکا۔ کیا ہوا تھا آخر؟

''جھوٹ بولا اُس نے ہم سے۔۔۔ بے وقوف بنایا ہمیں۔۔۔'' علی کے جملے بے ربط سے تھے۔ نہیں! آج وہ چیخ نہیں رہا تھا۔ آج اُسکا گلا رندھ رہا تھا، آنسوں اُمڈ اُمڈ کے باہر آرہے تھے۔ یہ چوٹ اب تک کی سب سے گہری چوٹ تھی۔

''کس کی بات کر رہے ہو؟ کس نے بیوقوف بنایا ہمیں؟'' اُنہوں نے کانپتے لہجے میں پوچھا۔

''فاطمہ!۔۔۔ فاطمہ آفندی۔۔۔ آپ کی پسندیدہ بہو۔۔۔ جسے آپ نے میری زندگی برباد کرنے کے لئے چنا تھا۔ جھوٹی تھی وہ۔۔۔ اور ہے۔۔۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ اُس نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا، دھوکہ دیا۔۔۔'' وہ رو رہا تھا۔ اور وہ سن سے بیٹھے تھے۔

''وہ عورت۔۔۔ جسے میرے منع کرنے کے باوجود آپ نے دوبارہ گھر میں آنے دیا۔ اُسے میرے بیٹے کو لیجانے دیا۔ ہاں! وہی عورت ہمیں بیوقوف بناتی رہی ہے۔''

''کاک۔۔ کیا۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ الفاظ ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ کیا ہو رہا تھا آخر؟

''یہ لیں، دیکھیں یہ رپورٹ۔۔۔ یہ ڈی این اے رپورٹ ابّا!'' وہ موبائل اُنکے حوالے کرتا خود فرش پر بیٹھ کر رونے لگا تھا۔

وہ رو رہا تھا۔۔۔

دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔۔۔

ایسے تو وہ فاطمہ کے جانے پر بھی نہیں رویا تھا۔۔۔

اُنہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے سکرین کھولی۔۔۔

اُنکے حواس سلب کرتی۔۔۔

سچ کا پتہ دیتی۔۔۔

اندھیرے میں روشن ہوتی سکرین۔۔۔۔۔

---------+---------+--------

دس سال قبل:

وہ گلیوں میں، کوچوں میں حقیقتاً مارا مارا پھر رہا تھا۔ اُسکی نیندیں ختم ہو گئی تھی، کھانا پینا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ دماغ کو کچھ یاد تھا تو بس یہ کہ اُسکا دوست لاپتہ ہے۔ وہ ہر جگہ مقدّم کو تلاش کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ میں، اُسکے گھر کے باہر چکر لگا کے، اُسکے آفس میں، اُسکے سابقہ آفس حتیٰ کہ اُس کے باپ کے آفس میں بھی۔۔۔

ہر جگہ سے ایک ہی بات معلوم ہوئی، وہ یہ کہ پورا خاندان بنا بتائے غائب ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اُسے غائب ہوئے چار ماہ ہو گئے، پر عمر اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے نہیں تھکا، اُس نے خود کو ہلکان کر لیا، کئی کئی وقت کا کھانا چھوڑ دیا پر اُسکی تلاش نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ نوید اور حسین نے ہی اُسے سمجھایا کہ وہ اپنے ساتھ اس طرح نہ کرے۔ اُسکے گھر والوں کا بھی اُس پر حق ہے، مقدّم کو ملنا ہو گا تو وہ مل ہی جائیگا۔ وہ اُنکی باتیں سنتا پر کہتا کچھ نہیں، سمجھ نہیں آتا کہ خود کو کیسے سمجھائے؟ علی کو تو مقدّم کا کوئی ہوش ہی نہ تھا۔ وہ فقط صنوبر کو انصاف دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

اُس روز خضر نے اُسکے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے بتاؤ عمر! کیا مقدّم مجھ سے زیادہ پیارا تھا تمہیں؟ کیا تم اسی طرح ہمیں اذیت دیتے رہو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اُس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

''تو پھر ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہاری زندگی میں مقدّم سے زیادہ اہم لوگ بھی ہیں۔ میں ہوں، امی ابو ہیں، اور عمارہ کا کیا؟ کیا تم ایک دوست کے لیے ہم سب کو گنوانا چاہتے ہو؟'' اُس نے غصّے سے کہا تو عمر نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''ایسے مت کہو خضر! میرے لیے تم سب دنیا کی کسی بھی شے سے زیادہ اہم ہو۔''

''تو مت کرو پھر ہمارے ساتھ ایسا۔ بھول جاؤ مقدّم کو، تم اُسکے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ قسمت میں لکھا ہو گا تو وہ تمہیں مل جائے گا۔'' اُس نے تھک کر کہا تو عمر کو احساس ہوا کہ وہ واقعی اپنے گھر والوں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ وہ تو ویسے ہی حساس تھا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کا سوچتا تھا۔ اُس روز اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مقدّم کی تلاش اب ختم کر دے گا۔ وہ اپنے گھر والوں کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید میں زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔ اب سے شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ہمیں تم سے شکایت نہیں ہے عمر! ہم سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ایسے نہیں دیکھ سکتے تمہیں۔پلیز! اس کمرے سے باہر نکالو خود کو۔امی ابو، تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنے کا سوچ رہے ہیں، تم اُسکے بارے میں سوچو اور خدا کے لیے! خوش رہنے کی کوشش کرو۔اپنے لیے نہ صحیح ہمارے لیے صحیح۔۔۔''اُس نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا تھا۔خضر، عمر کو مقدّم سے زیادہ پیارا تھا۔اس میں کوئی دو رائے نہیں تھی۔اور وہ اپنے بھائی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔اُس روز اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات کو دوبارہ وہیں سے شروع کریگا، جہاں سے مقدّم کے جانے کے بعد روکا تھا۔

لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ کسی بھی شے کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی، اُسکا حد سے زیادہ حساس ہونا اور اُسکا حد سے زیادہ دوسروں کے بارے میں سوچنا اُسے لے ڈوبنے والا تھا۔

بہت بری طرح۔۔۔۔

--------+---------+----------

اُس روز وہ علی کے گھر آیا تھا، علی یقیناً صنوبر کیس کے متعلق اُن سب سے بات کرنا چاہتا تھا۔اُسکا ارادہ تھا کہ اب وہ کیس پر بھی دھیان دے گا، کب سے علی کو اکیلے ہی سب کچھ دیکھنا پڑ رہا تھا۔وہ ساتھ میں مٹھائی بھی لایا تھا۔اپنی تاریخ طے ہونے کی خوشی میں، اُنہیں لگے ہاتھوں دعوت دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ٹھیک ہے! مقدّم کی کمی ہمیشہ رہنے والی تھی، لیکن اُسکے باقی چاروں دوست تو موجود تھے نا؟

آج کل اُسکا دماغ بھی کم کام کر رہا تھا، وہ مٹھائی کا ڈبہ گاڑی میں ہی بھول کر اندر داخل ہو گیا تھا، اور اُسی لمحے اُس نے دیکھا کہ نوید اور علی کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔اور وہ بھی بہت بری طرح۔۔۔

اُسکے لیے یہ منظر ناقابلِ یقین تھا، کیونکہ نوید اور علی گہرے دوست تھے، جھگڑا تو دور کی بات اُن دونوں میں کبھی تلخ کلامی بھی نہ ہوئی تھی۔علی غصّے کا تیز تھا، اور نوید تحمل مزاج، دونوں کی ہی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔پر آج جس طرح وہ جھگڑ رہے تھے، وہ باعثِ حیرت تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا علی کے کہے اگلے جملے نے اُسکے اندر آگ ہی لگا دی تھی۔ اُس نے موضوع سے بالکل ہٹ کر مقدم کی گمشدگی کو نشانہ بنایا تھا، اور اُسے مفرور کہا تھا۔

وہ نہیں جانتا کہ اُس لمحے اُسے کیا ہوا؟ اُسکی پچیس چھبیس سالہ زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس طرح حلق کے بل چیخا ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے کسی کا گریبان پکڑا ہو اور وہ بھی اپنے دوست کا، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے اتنے برے الفاظ استعمال کیے ہوں۔پر اُس روز ایسا ہو گیا تھا، اُسے خود بھی نہیں یاد کہ وہ اُس روز کیا کیا بول گیا تھا؟ بس ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی آگ تھی اُسکے اندر جو اُس روز باہر نکل گئی تھی۔وہ نرمی سے بات کرنے والا لڑکا اُس لمحے نہ

جانے کیا کچھ کہہ گیا تھا؟اُسے حسین اور رضا نے وہاں سے ہٹایا تھا،وہ غصّے سے باہر نکل گیا۔اُنہیں اپنی شادی کی دعوت بھی نہ دے سکا اور وہاں سے نکل پڑا۔ بے انتہا تیز گاڑی چلاتے،اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

پر اُس لمحے اُسکے ساتھ وہ ہوا جو پچھلے کئی ہفتوں سے ہو رہا تھا،اور وہ نظر انداز کر رہا تھا۔اُسکی آنکھوں کے سامنے چند لمحوں کے لیے گھپ اندھیرا چھایا اور گاڑی درخت سے جا ٹکرائی۔جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا،خضر پاس ہی کھڑا ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا۔

''شکر ہے کہ کوئی خاص چوٹ نہیں آئی لیکن چونکہ یہ بے ہوش ہو گئے تھے۔اس لیے ہم نے سٹی سکین کرنا مناسب سمجھا۔''ڈاکٹر اُسے بتا رہا تھا۔

''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟''خضر فکر مند ہوا۔

''نہیں!نہیں۔۔۔یہ بس ہماری تسلی کے لیے ہے۔''ڈاکٹر چلا گیا تو وہ اُسکے پاس آیا۔

''تم ٹھیک ہو؟''فکر مندی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں!کیا ہوا ہے مجھے؟''اُس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ایکسیڈنٹ اور کیا؟مجھے بتاؤ تم کب سے اتنی تیز گاڑی چلانے لگے؟''اب کہ وہ خفا ہوا۔

''مجھے بس گھر آنے کی جلدی تھی،اتنے کام ہیں کرنے کو۔''اُس نے جھوٹ بولا۔

''جتنے بھی کام ہوں۔کیا میں نہیں تھا گھر پر؟آرام سے گاڑی چلایا کرو عمر!''

''گھر میں تو نہیں بتایا کسی کو؟''اب کے اُسے گھر والوں کی فکر ہوئی۔

''نہیں!ہسپتال سے مجھے ہی کال آئی تھی تو میں بنا بتائے یہاں آ گیا۔بتا دیتا تو تم اگلے کئی دنوں تک مجھے کوستے رہتے کہ کیوں سب کو پریشان کر دیا؟''اس بات پر وہ ہنسا۔

''اچھا چلو!اب گھر چلتے ہیں۔میں ٹھیک ہوں پہلے سے۔''وہ کھڑا ہونے لگا۔

''بالکل ٹھیک نہیں ہو۔دائیں ہاتھ میں موچ آئی ہے۔شکر ہے کوئی فریکچر نہیں ہے۔آرام کرنا ہے تمہیں کچھ دن۔''

''گھر تو جا سکتا ہوں نا؟''

''ہاں! بس ہم چلتے ہیں کچھ دیر میں۔''اور کچھ دیر میں وہ دونوں وہاں سے گھر کی جانب چل پڑے۔اتنے خطرناک حادثے میں اُسکا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔گاڑی خضر نے بننے بھجوادی تھی،خود اُس نے مختصر اًگھر والوں کو حادثے کا بتادیا اور اب مکمل آرام پر تھا۔اُس نے اپنے دوستوں میں سے کسی کو فون نہیں کیا۔اُمید تھی کہ وہ لوگ خود پوچھیں گے،پر اُسے دُکھ تب پہنچا جب اُسکے دوستوں میں سے کسی نے بھی اُسے ایک میسج تک کر کے نہیں پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں غائب ہے؟

اُس روز وہ دونوں ہسپتال سے آتے ہوئے سٹی سکین کی رپورٹ لینا بھول گئے تھے،اور گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے کے باعث کسی نے اس طرف دھیان بھی نہ دیا۔

شادی تو ابھی تین ماہ بعد تھی۔۔۔

پر کیا وہ ہونے بھی والی تھی؟

---------+---------+--------

اُس روز وہ اپنے اور خضر کے مشترکہ کمرے میں تھا جو بہت جلد اب صرف خضر کی ملکیت ہونے والا تھا۔حادثے کے بعد سے وہ اب تک آرام ہی کر رہا تھا۔دوستوں میں سے کسی نے خیر خبر نہ لی تھی۔وہ ٹھیک ٹھاک مایوس تھا کہ تب ہی پاس بجتے موبائل نے اُسکی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

اُس نے دیکھا تو خضر کا موبائل بج رہا تھا۔خود وہ کسی کام سے گھر سے باہر گیا ہوا تھا،اور فون یہیں چھوڑ گیا تھا۔سکرین پر نظر آتا نمبر انجان تھا۔اُس نے نظر انداز کر دیا۔کال دوبارہ آنے لگی۔

''کہاں چلا گیا ہے یہ فون چھوڑ کر؟''وہ جھنجھلایا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی فون اٹھالیا۔

''ہیلو!''

''السلام علیکم! میں ہلال ہسپتال سے بات کر رہا ہوں۔آپ خضر حفیظ ہیں؟''دوسری طرف سے کہا گیا تو ہسپتال کا نام سن کر وہ چونکا۔

''ہسپتال سے؟خیریت؟''وہ پریشان ہوا،بھلا خضر کا ہسپتال میں کیا کام؟

''آپ پچھلے دنوں اپنے بھائی عمر حفیظ کو کسی حادثے کی وجہ سے ہسپتال لائے تھے۔اُنکا سٹی سکین ہوا تھا،جس کی رپورٹ آپ لوگوں نے نہیں لی۔''دوسری طرف کی بات سن کر وہ تھوڑا مطمئن ہوا۔

''ارے وہ رپورٹ؟اُسکی اتنی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو ہم نے۔۔۔''

''ضرورت ہے سر! آپکواُس رپورٹ کی فوراًضرورت ہے۔''دوسری جانب سے اُسکی بات کاٹی گئی تو وہ ساکت ہوا۔

''کیامطلب ضروری ہے؟''اُس نے محتاط انداز میں پوچھا،دل کسی انجانے خدشے کے تحت دھڑکنے لگا۔

''آپ ہسپتال آیئے،بلکہ اپنے بھائی عمر کو بھی ساتھ لے کر آیئے۔اُن کی رپورٹ کے حوالے سے کچھ باتیں آپکو بتانی ہیں،جو آپکا جاننا ضروری ہے۔''وہ اُسے خضر سمجھ رہا تھا۔

''کیاکوئی۔۔۔کوئی مسئلہ والی بات ہے؟''اُس نے یہ سوال پوچھنے کی ہمت کیسے جمع کی تھی وہ ہی جانتا تھا۔

''سر! میں نہیں جانتا،مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ڈاکٹرز کا پینل بیٹھا تھا آپکی رپورٹس کے لیے اور اُنہوں نے ہی آپکو بلوایا ہے۔''اُسکا دل رکا پھر دھڑکا،پھر رکا اور اب کے دھڑکا تو اتنی زور سے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

''مجھے کب تک آنا ہے؟''اُس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔

''آپ ابھی آسکتے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔عمر کو بہت اچھے سے سمجھ آرہا تھا کہ کچھ برا ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے! میں آتا ہوں،لیکن آپ سے ایک گزارش ہے۔''

''جی سر! کہیے؟''

''آپ دوبارہ اس نمبر پر کال مت کیجئے گا۔''اُس نے مختصراً کہا۔ابھی وہ کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''اُس نے کہااور پھر فون رکھ دیا۔عمر نے فوری طور پر خضر کے موبائل سے نمبر اپنے پاس لیااور کال لاگ ڈیلیٹ کر دیا۔پھر گہری گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے لگا۔

''ایک تو ہر کام میرے سر پر ڈال دیے ہیں سب نے،موبائل بھی گھر پر ہی بھول کر چلا گیا تھا میں۔''اُسی لمحے خضر بولتا ہوا اندر داخل ہوا،اُسے دیکھ کر چونکا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''اُسکی اُڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''کک۔۔کچھ نہیں۔۔۔مجھے ذرا علی کی طرف جانا ہے۔''وہ چابی اٹھاتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''ارے! کیوں بھئی؟''

''اتنے دنوں سے ملا نہیں اُس سے۔۔۔''اُس نے جھوٹ بولا۔

''تو اتنے دنوں سے تمہارے دوست کو تم یاد کیوں نہیں آئے؟'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''وہ۔۔۔وہ صنوبر کا کیس چل رہا ہے نا!''اُس نے بہانہ گھڑا۔

''میں نے کہا بھی ہے ابھی ان سب چیزوں سے دور رہو۔''وہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

''بس کر دو! معذور نہیں ہو گیا ہوں میں کہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔''وہ جھنجھلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے! پر جلدی آنا۔''اُس نے ہار مان لی تو عمر بھی خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

زندگی میں کچھ طوفان بنا اطلاع کے آتے ہیں۔۔۔

عمر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔۔۔

بلکہ شاید۔۔۔

اُسکے تمام پیاروں کے ساتھ۔۔۔

---------+---------+--------

جو اُس نے سنا اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

پر جو اُسکے سامنے تھا وہ اٹل تھا۔

جو اُس نے سوچا وہ تو کم تھا، پر

جو ہو گیا تھا وہ اُسکے تصوّرات میں بھی نہ تھا۔

وہ ہسپتال آیا تو ڈاکٹر نے ایم آر آئی کرنے کا کہا، وہ نقد رقم نہیں لایا تھا، پر شکر کے کارڈ تھا اُسکے پاس، اُس نے فوراً ہی ایم آر آئی کروائی، وہ تھوڑا تھوڑا خود کو، آنے والے حالات تسلیم کرنے کے لیے راضی کر رہا تھا۔ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟ اُس نے سچ سچ بتا دیا کہ اُسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ڈاکٹر نے جب سوال کیا کہ ایسا کب سے ہو رہا ہے تو وہ چند لمحوں کو بول نہ سکا، ایسا کافی مہینوں سے ہو رہا تھا اور وہ نظر انداز کر رہا تھا۔

پر جو ڈاکٹر نے کہا اُس نے اُسکے حواس سلب کر دیئے تھے۔کتنے لمحوں تو وہ بول نہ سکا۔ڈاکٹر اُسے پانی کا گلاس آگے بڑھا رہا تھا، کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔پر دماغ میں جیسے آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں۔

Brainstem Glioma

ایک ایسا ٹیومر جو دماغ کے اس حصے میں ہوتا ہے جو سارا جسم کنٹرول کرتا ہے۔یعنی حرام مغز۔۔۔

''آپکا ٹیومر اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اگر اسے نکالا نہ گیا تو اسکے ساتھ آپ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے،اور اسے ایسی سرجری کے ذریعے نکالا گیا تو۔۔۔'' ڈاکٹر رکا،عمر خاموش۔۔۔۔

''تو بھی سرجری کے کامیاب ہونے کے چانسز پانچ فیصد ہیں۔سرجری کے دوران آپکی جان جانے کے امکانات بہت قوی ہیں۔''وہ کیا کہہ رہا تھا؟اُسے موت کی خبر سنا رہا تھا؟وہ کیا بتا رہا تھا؟یہ کہ ہر راستہ موت کی طرف جا رہا ہے؟

''آپ پر سکون ہو جائیں،اور کچھ دیر دماغ کو آرام دیں۔بلکہ میری مانیے تو کچھ دیر کے لیے باہر جائیں،پُر سکون دماغ کے ساتھ تمام باتوں پر غور۔۔۔۔'' پتہ نہیں یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا؟بھلا اب وہ پر سکون ہو سکتا تھا؟

''میری شادی ہے تین ماہ بعد۔۔۔میرے ماں باپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔مجھے ابھی۔۔۔ابھی اپنے دوست کے کیس میں گواہی دینی ہے۔۔یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''وہ بے ربط سی باتیں کر رہا تھا۔ڈاکٹر کو اُس پر ترس آیا۔

''پانی لیجیئے۔''اُس نے گلاس آگے بڑھایا۔عمر نے تھام لیا۔

''کیا۔۔۔کیا کسی قسم کا۔۔۔کوئی علاج نہیں ہے؟''وہ جب بولنے کے قابل ہوا تو یہی پوچھ سکا۔خوف کے بعد اُمید۔۔۔ایک آخری امید۔۔۔

''آپکے یہاں آنے سے پہلے ہم تمام ممکنہ امکانات پر غور کر چکے ہیں۔جو بیماری آپکو ہے اُسکا ایک علاج دریافت ہو چکا ہے۔آپکے پاس وقت کم ہے،لہٰذا اگر آپ ارجنسی لیٹر کے ذریعے فوری ویزا حاصل کر کے جرمنی جاتے ہیں تو آپکا فوری علاج شروع ہو جائیگا۔''ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں بات نہیں کی تھی یا شاید اُسے ایسا لگا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں،ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ علاج نہیں،اب آپ کہہ رہے ہیں کہ علاج ہے۔اور وہ بھی جرمنی میں؟آپ کھل کر کہیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''آپ علاج کروانا چاہتے ہیں؟''ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!کیوں نہیں؟خواہ کتنے ہی پیسے کیوں نہ لگیں۔''اُس نے جلدی سے کہا،ایک مُبہم سی اُمید ملی تھی۔

''پیسے نہیں ہیں،علاج مفت ہے۔''ڈاکٹر کی اگلی بات اُسکے لیے مزید حیران کن تھی۔جہاں تک اُسے یاد تھا کہ جرمنی میں علاج مفت نہیں ہوتا تھا۔پھر؟

''کیا مطلب؟ آپ مجھے اُلجھا رہے ہیں۔'' وہ تنگ ہوا۔

''ہم آپکو، کلینیکل ٹرائل پر بھیجنا چاہتے ہیں۔'' اُسے کسی نے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا تھا، اور وہ بھی اتنی اونچائی سے کہ سمندر کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسکی موت واقع ہو جائے۔

''آپ۔۔۔ آپ مجھے۔۔۔ مجھے تجربے کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں؟'' اُسے اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''ہاں!۔۔۔'' ڈاکٹر نے صاف گوئی سے کہا۔

''مجھے مزید بات نہیں کرنی۔۔۔'' وہ بے یقینی سے سر ہلاتے پیچھے کو ہوا تاکہ جانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

''یہ کامیاب تجربہ بھی تو ہو سکتا ہے عمر!'' ڈاکٹر صاحب کی بات پر اُسکا وجود مجسمہ ہوا۔

''ناکام بھی تو ہو سکتا ہے؟'' اُسے اُمید نہ تھی۔

''دوسری صورت میں بھی تو موت ہی ہے عمر! ایک بار قسمت آزمالو۔ اگر علاج کامیاب ہو گیا تو تم کیا، تمہارے بعد آنے والے دیگر مریضوں کے لیے بھی اُمید کی ایک کرن بن جائے گی۔'' وہ ہل بھی نہ سکا۔

''دیکھو! جرمنی میں بہت دنوں سے اس کے علاج کے لیے ریسرچ جاری تھی، علاج تو دریافت ہو گیا ہے پر تجربہ ابھی باقی تھا۔ ابھی تک کوئی کلینیکل ٹرائل کے لیے تیار نہیں ہوا ہے۔ اُنہوں نے دیگر ممالک میں کلینیکل ٹرائل کے مریضوں کے لیے درخواستیں دی تھیں، جب ہم نے تمہاری رپورٹس دیکھیں تو سوچا کہ۔۔۔''

''سوچا کہ یہ تو بہترین پروڈکٹ ہے تجربے کے لیے، ہے نا؟ مجھے بتائیے کہ کتنے پیسے دے رہی ہے جرمنی کی حکومت آپ کو اس کام کے؟'' اُنکی بات کاٹتے وہ تلخ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اُسکی حالت سمجھ رہے تھے۔

''مجھے اگر پیسے مل رہے ہوتے تو میں تمہیں سچ کیوں بولتا؟ جھوٹ بول کر بھیج دیتا۔ میں نے تمہارے سامنے ایک آفر رکھی ہے۔ باقی مرضی تمہاری ہے۔ گھر جاؤ! اور اس پر غور کرو۔'' اُنہوں نے نرمی سے کہا تو وہ کرسی دھکیلتا اٹھا اور وہاں سے باہر نکل گیا۔

ابھی جو ہوا تھا، ابھی جو زندگی نے اُسکے ساتھ کر دیا تھا۔

اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔۔۔

--------+---------+----------

قدرت نے ہر شے کی ایک حد مقرر کی ہے، اور وہ اسی میں اچھی لگتی ہے۔ ہر شے اپنے مدار میں ہے، کوئی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ سوائے انسان کے۔۔۔۔

جو شے حد سے باہر چلی جائے وہ ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ چاہے وہ ظاہری طور پر کتنی ہی مثبت کیوں نہ ہو۔ عمر حساس تھا، اپنے سے زیادہ دوسروں کا سوچتا تھا۔ یہ دونوں مثبت شے ہیں، پر وہی بات۔۔۔ جب انسانی جذبات بھی حد سے باہر نکل جائیں تو وہ بھی نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔

اگلی تین راتیں اُس نے سوچنے میں لگائیں۔ اُسکے پاس سوچنے کے لیے کم وقت تھا، جب موت سامنے کھڑی ہو، اور انسان کو یقین ہو جائے کہ کسی بھی وقت اگلی سانس اُس سے چھین لی جائیگی، تب چاہے اُسے دنیا جہاں کی دولت دے دی جائے، اُسکی تمام خواہشات پوری کر دی جائیں، اُسے اُن سب سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔

پر عمر نے اگلی تین سے چار راتیں یہ نہیں سوچا کہ میں خود کو مرنے سے کیسے بچاؤں؟ بلکہ اُس نے یہ سوچا کہ یہ خبر اُسکے گھر والوں کے لیے کیا رنگ لانے والی ہے؟ اُسکا باپ کیا یہ خبر برداشت کر سکے گا؟ کیا اُسکی ماں کے لیے صدمہ قابلِ قبول ہو گا؟ وہ لوگ تو جیتے جی مر جائیں گے۔ اور عمارہ؟ عمارہ کا کیا ہو گا؟ وہ لڑکی جو چند دنوں میں اُسکی زندگی میں آنے والی تھی اُسکا کیا؟ وہ کیا ردعمل دے گی؟

''وہ خود کو قربان کر دے گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں مرنے والا ہوں، وہ مجھ سے شادی کر لے گی۔ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی اور میرے خاطر اپنی زندگی برباد کر لے گی۔ اُسکے آگے ایک لمبی زندگی ہے۔ وہ کیسے یہ سب جھیلے گی؟'' اُس نے از خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ عمر کی خاطر اپنی زندگی برباد کر لے گی۔

''میں۔۔۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اپنی بیماری کے بارے میں۔۔۔'' پہلا فیصلہ ہوا۔ لیکن اسکا نتیجہ فوراً ہی نظروں کے سامنے آ گیا۔

''اگر نہ بتایا تو تین ماہ بعد شادی ہو جائے گی۔ نہیں نہیں! یہ صحیح نہیں ہے۔۔۔ مجھے شادی روکنی ہو گی۔ کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ عمارہ میری زندگی میں شامل نہ ہو۔'' وہ بھلا کس طرح شادی روک سکتا تھا؟ پھر اگلے کئی گھنٹے اُس نے اپنی شادی روکنے کے ہر ممکن امکانات پر غور کیا۔ پر کچھ سمجھ نہ آیا۔

آپکے یہاں آنے سے پہلے ہم تمام ممکنہ امکانات پر غور کر چکے ہیں۔ جو بیماری آپکو ہے اُسکا ایک علاج دریافت ہو چکا ہے۔ آپکے پاس وقت کم ہے، لہٰذا اگر آپ ارجنسی لیٹر کے ذریعے فوری ویزا حاصل کر کے جرمنی جاتے ہیں تو آپکا فوری علاج شروع ہو جائیگا۔

یکدم ہی ڈاکٹر صاحب کی آواز کانوں میں گونجی، ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ''جرمنی'' دل نے نام دہرایا۔۔۔ وہ جرمنی جا سکتا تھا، بنا کسی خرچے کے، اُسکا ویزا بھی اُسکی حالت کے پیشِ نظر فوراً آ جانا تھا۔ اُسکے ابّا کے پیسے بھی اُسکے علاج کیلئے خرچ نہیں ہوں گے۔ وہ خاموشی سے یہاں سے چلا جائیگا۔ مرنا تو ہے ہی، تو کیوں نہ ایک بار قسمت آزما کر ہی مرا جائے؟ اور ویسے بھی اس وقت منظر سے غائب ہونے کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہ تھا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے منصوبہ ترتیب دیا۔

زیادہ سے زیادہ کیا ہو جائیگا؟ عمارہ اُس سے نفرت کرنے لگے گی؟ تو کر لے۔۔۔۔ وہ عمر کی یاد میں ساری زندگی برباد کر دے، اس سے لاکھ گنا بہتر ہے کہ وہ اُس سے نفرت کرنے لگے۔ اور اماں ابا؟ اُنکا کیا؟ کیا اُنہیں سچ بتا دوں؟ نہیں نہیں! اُنہیں بتا دیا تو وہ عمارہ کو کبھی نہ کبھی سچ بتا دیں گے، بلکہ اُسکے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگیں گے اور معاملہ پھر سے وہیں پہنچ جائیگا جہاں وہ نہیں چاہتا، اُسے اماں ابا سے بھی چھپانا ہو گا۔

''اور ویسے بھی جب دورانِ علاج میں مر جاؤں گا اور میرا جنازہ پاکستان آئیگا تب سب مجھے معاف کر ہی دیں گے۔ کوئی بات نہیں میں کچھ دنوں کی ناراضگی مول لوں گا۔'' وہ اب حد درجہ بے رحمی سے سوچ رہا تھا۔ بے رحمی جو صرف اُسکے خود کے لیے تھی، اُسکے پیاروں کے لیے نہیں۔۔۔

اُس رات اُس نے تمام حساب کتاب و جمع تفریق کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اُسکا خود کو کلینیکل ٹرائل کے لیے دے دینا ہی سب کے حق میں بہتر تھا۔

اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ اس ملک سے نکلنے کے لئے وہ گھر والوں سے کیا بہانہ بنائے گا؟

---------+---------+--------

''تم مذاق کر رہے ہو؟ اگر یہ کوئی پرینک ہے تو سن لو نہایت ہی بیہودہ ہے۔'' یہ جملہ ادا کرنے والے حفیظ صاحب تھے۔ لاؤنج میں بیٹھے افراد کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ عمارہ، خضر، اُنکے والدین اُسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ اُسکے چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''میں اس قسم کا مذاق کیوں کروں گا؟ میں نے کافی عرصے سے امریکہ کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہاں سے جواب آ گیا ہے اور مجھے ہر صورت میں اگلے ہفتے وہاں پہنچنا ہے۔'' اُسکا جرمنی کے لیے ویزہ لگ گیا تھا، اُس نے باقاعدہ قانونی طریقے سے اپنے کلینیکل ٹرائل کی منظوری دی تھی، ایمبیسی سے اُرجینسی لیٹر کی بنیاد پر فوراً ویزہ بھی مہیا ہو گیا تھا۔

''تو یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' خضر مشکوک ہوا۔

''پہلے مجھے خود نہیں یقین تھا کہ اتنی جلدی ہو جائے گا سب۔''

''مجھے کمپنی کا نام بھیجو اور وہ جاب لیٹر بھی۔'' حفیظ صاحب نے کہا تو اس نے سنجیدگی سے دیکھا۔

''میں تفصیل آپ کو میل کر دیتا ہوں۔'' وہ ساری تیاری کر کے بیٹھا تھا۔

''تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟ ہم اسی ہفتے شادی کر لیتے ہیں۔ پھر تم چلے جانا اور بعد میں عمارہ کو بھی بلا لینا۔'' اُسکی ماں نے فوراً حل پیش کیا۔ عمر کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔

''امی! میں اتنے جلدی اسے نہیں بلا سکتا، وہاں چار پانچ لوگ ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں جو مجھے بھی شیئر کرنا ہو گا۔ اور ابھی اگلے پانچ چھے سال تک تو میں واپس بھی نہیں آسکتا۔ اگر آ گیا تو شادی کا سوچیں گے۔''اُس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ پانچ چھے سال تک میں اپنی بیٹی کو تمہارے انتظار میں بٹھا کر رکھوں گا؟''اتنی دیر میں پہلی بار عمارہ کے والد نے کہا۔ اس طنز پر باقی سب نے پریشانی سے اُنہیں دیکھا۔

''جیسے آپکو صحیح لگے۔'' یہ جملہ اُس نے کیسے ادا کیا تھا وہی جانتا تھا۔ لیکن وہاں موجود لوگوں کے پیروں تلے سے زمین کھسکی تھی۔

''عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''خضر کے لیے یہ سب نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔

''کیا کیریئر عمارہ سے زیادہ اہم ہے؟''اُسکی والدہ نے پوچھا۔

''تو میں نے کب عمارہ کو چھوڑ دیا ہے؟ میں تو بس پانچ چھے سالوں کا وقت مانگ رہا ہوں۔ کونسا عمر نکل جائے گی اسکی؟ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔'' یہ عمر نے کہا تھا؟ عمر نے؟ عمارہ کے لیے؟ سامعین کو اپنی سماعتوں پر شک گزرا تھا۔

''بس بہت ہو گیا، تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''حفیظ صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

''معاف کیجئے گا ابو! پر میں آپکے فیصلوں کا پابند نہیں ہوں۔''اُنہوں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم پاگل ہو چکے ہو کیا؟''بے یقینی کی کیفیت میں الفاظ بھی پورے ادا نہیں ہو سکے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

''اگر تم اس گھر سے کہیں گئے، تو پلٹ کر واپس مت آنا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''اُنہوں نے سخت غضبناک ہوتے ہوئے کہا۔ عمر نے پہلی بار اُنہیں اتنے جلال میں دیکھا تھا، ورنہ وہ نرم مزاج انسان تھے۔

''جیسے آپکی مرضی۔۔۔''وہ سنجیدگی سے کہتا اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

''میں اس سے بات کرتی ہوں۔''عمارہ اُسکے پیچھے دوڑی۔

''نہیں عمارہ رکو!''

''عمارہ! جانے دو اُسے۔۔۔ تمہارا کوئی تعلق نہیں اُس سے۔۔۔''

اُسکے ماں باپ نے اُسے پیچھے سے آوازیں دے کر روکنے کی کوشش کی پر وہ نہ رکی۔

''جانے دیں اُسے انکل! کیا معلوم اُسکی بات سن کر فیصلہ بدل لے۔''خضر نے التجا کی۔حفیظ صاحب تھک کر وہیں بیٹھ چکے تھے۔

''یہ آپ نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔میں نے آپکی خاطر اپنی بہن کو انکار کیا تھا۔یہ اچھا نہیں کیا آپ نے۔۔۔''عمارہ کے والد کہہ رہے تھے اور حفیظ صاحب شرمندگی سے فرش کو دیکھ رہے تھے۔اُنکے فرمانبردار بیٹے نے آج اُنہیں زمین میں گاڑ دیا تھا۔

''عمر! عمر!۔۔۔''وہ لان میں کھڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جب وہ اُسے پکارتی وہاں آئی تھی۔اُس نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔وہ اُسے روتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلنا چاہتا تھا۔

''عمر! تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟ یقیناً کوئی بات ہے نا! تم کچھ چھپا رہے ہو نا؟''اُسے کتنا یقین تھا؟ اور سچا یقین تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا اور کیا چھپاؤں گا میں؟ جو تھا وہ تمہیں بتا دیا۔یہی سچ ہے۔''اُس نے دیوار پر لٹکتی پھولوں کی بیل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری طرف دیکھ کر بتاؤ نا!''اُسے اُسکی نظریں چرانے پر غصّہ آیا۔

''عمارہ! میں اپنا کیریئر نہیں چھوڑ سکتا۔تم میرا انتظار کر سکتی ہو تو کر لو،ورنہ جو تمہارے ابّا کہہ رہے ہیں وہ کر لو۔''اُس نے بے دردی سے کہا۔

''بات وہ کرو جسکی کوئی لاجک (منطق) بھی ہو۔تم جھوٹ بھی ٹھیک سے نہیں بول رہے''وہ رو دی۔عمر کچھ نہ کہہ سکا۔

''تم مجھے سچ بتاؤ عمر! تم ایسا۔۔۔''

''بس کر دو عمارہ! بس کر دو۔۔۔''وہ دھاڑا تھا۔زندگی میں پہلی بار وہ ایسے چیخا تھا،اُس عورت پر جس کو کبھی سختی سے دیکھا بھی نہ تھا۔وہ ساکت رہ گئی۔

''میں یہاں اپنے مستقبل کے لیے پریشان ہوں اور تم ہو کہ عام لڑکیوں کہ طرح رونا دھونا مچا رہی ہو۔اگر کچھ کرنا ہی ہے تو جا کر اپنے باپ کو سمجھاؤ۔باہر جا رہا ہوں مر تو نہیں رہا نہ؟ آجاؤں گا تو ہو جائیگی شادی۔۔۔''عمارہ کتنے ہی لمحے بے یقینی سے اُسے دیکھتی رہی۔یہ شخص تو ملازموں سے بھی چیخ کر بات نہیں کرتا تھا۔تمام آنسو یکدم خشک ہو گئے۔

''میں نے تمہارا بہت انتظار کیا،اپنے ماں باپ کو ہمیشہ تمہارے لیے روک کر رکھا۔میری غلطی تھی جو تم پر بھروسہ کر لیا۔۔۔جاؤ۔۔۔تم اپنا مستقبل بناؤ۔تم نہیں مر رہے پر عمارہ مر گئی تمہارے لیے۔۔۔''وہ روتی ہوئی لان پار کر کے گھر سے نکل گئی۔وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔وہ لان جہاں اُسکا بچپن گزرا تھا وہ خالی رہ گیا،وہ دیوار جہاں سے وہ اکثر جھانکا کرتی تھی وہ سونی رہ گئی۔

اُس روز کے بعد عمر اپنے ماں باپ کی نظر میں نافرمان ہو گیا، ایک ہفتے وہ بڑی مشکلوں سے اُن سے نظریں چرانے میں کامیاب ہوا۔ اُسکی ماں اُسکے سامنے بیٹھ کر روتی رہی اور وہ نظر انداز کرتا رہا، خضر نے تو دوبارہ اُسکا منہ ہی نہیں دیکھا۔ امی سے ہی پتہ چلا کہ عمارہ شدید بیمار پڑ گئی ہے، اُسکا بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں تھا۔ دل کیا کہ جا کر اُسے دیکھ لے پھر یاد آیا کہ اگر ملنے چلا گیا تو پھر باہر نہیں جا سکے گا۔ اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا۔

پھر ہفتے بعد اُس نے اپنا سامان باندھ لیا، خضر اُس سے ملنے نہیں آیا۔ عمر کا بہت دل کیا کہ جانے سے پہلے اُسے گلے لگائے پر وہ اُس سے سخت ناراض تھا۔ وہ جانے سے قبل اپنے دوستوں سے ملنے آیا، آخری بار۔۔۔۔۔ وہ بھی اُسے اتنے ہی پیارے تھے جتنے اُسکے گھر والے۔ پر وہاں کے معاملات ویسے ہی بہت پیچیدہ چل رہے تھے۔ زندگی جیسے یکدم ہی عجیب سی ہو گئی تھی، یا اُسے لگ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت لاتعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا، پر اُسکی آنکھوں کے نیچے چھائے حلقے اور کمزور ہوتی صحت نے سب کو مشکوک ضرور کیا تھا۔ لیکن کسی نے اُس سے سوال نہیں کیا۔

باپ اور خضر کو ناراض کر کے، عمارہ سے بیوفائی کر کے، دوستوں سے منہ موڑ کے اور ماں کو روتا چھوڑ کے وہ جرمنی کے لیے روانہ ہو گیا۔

ہواؤں میں اپنا راستہ بناتے، جہاز میں بیٹھے ہوئے اُس نے کئی بار سوچا کہ جب اُسکی لاش آئے گی تو تب اُسکے ماں باپ اُسے معاف کر دیں گے؟ تب خضر اُسے معاف کر دے گا؟ تب عمارہ اُسے معاف کر دے گی؟ اور اُسکے دوست؟ اُن پر کیا گزرے گی؟ پر اب وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جرمنی کی حکومت اُسکے کلینیکل ٹرائل کے بدلے سارا خرچ اٹھا رہی تھی، اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

---------+---------+--------

سفید روشنیوں کے باوجود بھی کمرہ اندھیرا لگتا تھا۔ آس پاس کھڑے ڈاکٹرز اور نرسیں ہرے رنگ کے لباس میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ اسٹریچر پر لیٹے وجود کے تمام بال کاٹ دیئے گئے تھے۔

''کیا تم مکمل طور پر راضی ہو؟ اگر نہیں ہو تو تم اب بھی فیصلہ بدل سکتے ہو۔ تم پر کوئی زبردستی نہیں ہو گی۔'' مریض کے سر پر کھڑے سرجن نے انگریزی میں پوچھا۔

''میں راضی ہوں۔ لیکن۔۔۔۔'' مریض رکا۔ اُسکی صحت کافی خراب لگ رہی تھی۔ سوکھ کر جیسے کانٹا ہو گیا ہو۔

''میں کچھ وصیت کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے بات مکمل کی۔

''ضرور! تمہاری وصیت کو پورا کیا جائیگا۔ لیکن مجھے اُمید نہیں، بلکہ یقین ہے کہ تمہاری سرجری کامیاب ہو گی۔'' ڈاکٹر نے اُمید دلائی، پر وہ مایوس تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جب تک میں مر نہ جاؤں، میرے گھر والوں کو اطلاع نہ دی جائے۔ جب میں مر جاؤں تو میری ڈائری میں موجود نمبر پر میرے گھر والوں کو میری موت کی اطلاع دی جائے، اور میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے۔ اور میری لاش کو اُنکے حوالے کر دیا جائے۔'' اُس کی آنکھیں نم تھیں، آس پاس کھڑا عملہ اُداس ہوا۔

''تمہاری وصیت پر عمل کیا جائیگا۔ کیا تم تیار ہو؟'' ڈاکٹر نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر ہلایا۔ چند ماہ۔۔۔۔ فقط چند ماہ پہلے ہی کی تو بات تھی۔ اُسکی آنکھوں میں بہت سے منظر گھومنے لگے۔ دیوار پر سے جھانکتی عمارہ، اُسے چھیڑتا خضر، اُسے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر کھلاتی ماں، اُسکے ساتھ قہقہے لگاتے اُسکے دوست۔۔۔۔

زندگی ایک پل میں کیا سے کیا ہو گئی تھی؟ وہاں لیٹے اُس نے اپنی زندگی کے ہر اہم شخص کو یاد کیا تھا، یونیورسٹی کی کلاسیں، سڑکیں اور گلیاں یاد کی تھیں۔ اُنہیں تو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ یہاں اکیلا ہے۔ اُسکے جرمنی آنے کے بعد کسی نے اُس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ اُس سے شدید ناراض تھے۔

انیستھیسیا کے اثر سے غنودگی میں جاتے عمر کو یہی لگتا تھا کہ اُس نے سب کے لیے بھلا سوچا۔ پر وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی اُسے کیا سبق سکھانے والی ہے۔

---------+---------+--------

جرمنی کے اس ہسپتال میں وہ نرس پچھلے چار سالوں سے اس مریض کی خدمت پر مامور تھا جس سے ملنے نہ کوئی آتا تھا اور نہ ہی کوئی اُسکا پوچھتا تھا۔ پچھلے چار سالوں میں وہ مریض اپنی جگہ سے ایک انچ ہلا، نہ اُس نے کبھی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ میل نرس اُسکے ناخن کاٹتا، اُسکی داڑھی مونچھ، اور سر کے بال تک ٹھیک رکھتا، حتیٰ کہ اُسے کروٹ بھی بدلواتا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو یہ مریض گنجا تھا اور اب اُسکے بال کافی زیادہ ہو گئے تھے۔ عملہ بتاتا تھا کہ وہ کلینیکل ٹرائل کا مریض تھا۔ اُسکا آپریشن کامیاب ہوا، پر وہ کومہ میں چلا گیا تھا۔

پر آج چار سالوں بعد کچھ ہوا تھا، کچھ ایسا جس نے ہسپتال میں ہل چل مچا دی تھی۔ ڈاکٹر زبھاگ بھاگ کر وہاں آ رہے تھے۔ وہ صرف آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا۔ نہ ہل رہا تھا نہ بول رہا تھا۔ شاید وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

قصّہ مختصر عمر حفیظ جب ہوش میں آیا تو اُسے پتہ چلا کہ اُسکی زندگی سے چار سال نکل چکے تھے۔ چار سال۔۔۔۔ چھوٹی بات نہ تھی۔ اس انکشاف کو قبول کرنا اُسکے لیے اس قدر مشکل تھا کہ وہ بار بار بے ہوش ہو رہا تھا۔ ہسپتال کا تقریباً آدھا عملہ اُسکے پاس ہمہ وقت موجود تھا، اخباروں میں کامیاب تجربے کی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ پر عمر حفیظ کے لیے یہ انکشاف بہت خطرناک تھا کہ وہ چار سالوں سے سویا ہوا تھا۔

لیکن اُسکے امتحانات یہاں ختم نہ ہوئے، وہ ہوش میں تو آ گیا پر اگلے دو سال وہاں ہسپتال میں ہی رہا، روزانہ اُسکی تھیراپی ہوتی، اُسے چلنا تو دور پاؤں ہلانے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ اُسکی اسپیچ تھیراپی الگ ہوتی تھی اور سائکیٹرسٹ سے روز اُسکے سیشن الگ۔ اُسے مہینوں لگے اس بات پر یقین کرنے میں کہ وہ کومہ میں تھا۔ بات کرنے میں اُس نے آٹھ ماہ اور چلنے میں پورا سال لیا اور وہ بھی سہارے کی مدد سے۔

ایک سال بعد جب وہ بولنے اور لکھنے کے قابل ہوا تو جرمنی کے وزیرِ صحت اُس سے ملنے آئے۔ اُسے مبارک باد دی اور تحفتاً گافی یورو زدے کر گئے، اُس کا بینک اکاؤنٹ بھی حکومت نے اپنی جانب سے کھلوا دیا تھا۔ یہ مہربانی صرف اس لیے تھی کہ اُس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے آنے والوں کے لیے علاج کا راستہ کھول دیا تھا۔ وہ غیر مسلم تھے پر احسان فراموش نہ تھے۔

اُن پیسوں سے اُس نے آنلائن لیپ ٹاپ منگوایا، اور کئی دن یہ سوچنے میں لگائے کہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ پھر اُس کے ذہن میں فرنیچر ڈیزائننگ کا آئیڈیا آیا۔ اُس نے فرنیچرز کے مختلف ویژول امیجز بنانا شروع کیے، یہاں اُسکا بی بی اے بھی کام کر گیا۔۔ اُس نے سوشل میڈیا پر اُسکی پروموشن شروع کی، یہاں تک کہ چند مہینوں میں اُسے صرف فرنیچر کی ویژول امیج بنانے کے آرڈر ملنے لگے۔ یہ کام اُسکے لیے آسان اور آرام دہ تھا، ڈاکٹر نے بھی اُسے اس کام کی اجازت دے دی تھی۔ اب وہ کلائنٹ کی خواہش کے مطابق فرنیچر کی امیج بناتا اور ایک ایک تصویر کے ہزاروں ڈالرز وصول کرتا، اُسے دنیا بھر سے کلائنٹ ملنے لگے تھے۔ اُس نے اپنی ویبسائٹ بنوالی، اُسکا پورٹ فولیو مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ پر اب وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، اُس نے خود پر توجہ دینے اور چلنے پھرنے کی کوششیں تیز تر کر دی تھیں۔ اُسے اپنا گھر، دوست اور ملک یاد آتا تھا۔ پتہ نہیں سب اُسے یاد کرتے بھی ہوں گے یا نہیں؟ یہ پانچ سال اُن پر کیسے گزرے ہوں گے؟ اُسے یاد تھا جب وہ ہوش میں آیا تھا۔ اُسکے لیے ایسا ہی تھا جیسے کل رات وہ سرجری کے لیے گیا اور صبح وہ ہوش میں آ گیا تھا پر ایسا نہیں تھا، اُس رات کے بعد آنے والی صبح چار سالوں پر محیط تھی۔

قصہ مزید مختصر، ایک سال بھرپور محنت کے بعد وہ مکمل صحت یاب ہو کر اُس ہسپتال سے نکلا، اپنا تھوڑا بہت سامان سمیٹا اور پاکستان چلا آیا۔

چھے سال بعد اپنے ملک کی فضاؤں میں سانس لیکر اُس پر عجیب سرشاری کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ وہاں سب ویسا ہی لگتا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اُس نے ہوٹل میں روم بُک کروایا اور رات وہیں ٹھہرا، ارادہ تھا کہ صبح گھر جا کر سب کو سرپرائز دے گا۔ ہاں! سب ناراض ہوں گے، ابو تو منہ بھی نہیں دیکھنا چاہیں گے پر اس بار وہ سب سچ بتا دے گا۔ اُس نے دانستہ عمارہ کے بارے میں نہیں سوچا، چھے سالوں میں اُس نے یقیناً اپنا گھر بسا لیا ہو گا۔ اُسکے بارے میں سوچ کر خود کو اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

پر عمر یہ بھول گیا کہ ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔

قسمت کھیل کھیلنے میں ماہر ہے۔

اور وہ ہمیشہ جیت جاتی ہے۔

---------+---------+--------

ہوٹل میں سامان رکھ کر اُس نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا، بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے۔ بلآخر رینٹ اے کار سے گاڑی کرائے پر لی اور گھر کے لیے نکلا، یہ راستہ اُسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب وہ وہاں پہنچا، گھر کے باہر اترتے اُسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ پورا گھر برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔

''بھلا یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اُس نے سوچا اور دروازے پر پہنچ کر بیل بجائی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے۔ دروازہ چوکیدار نے کھولا۔

''آپ؟۔۔۔'' وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

''میں۔۔۔ میں اصل میں۔۔۔۔'' اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اپنے ہی گھر میں آنے کے لیے کیا تعارف دے؟

''آپ عمر صاحب ہے نا؟ خضر صاحب کے بھائی!'' چوکیدار یکدم ہی پر جوش لہجے میں بولا تو وہ حیران ہوا۔

''ہاں! پر آپکو کیسے پتہ؟''

''ارے! آپ آ گئے۔۔۔ آپ۔۔ آپ اندر آئیں نا! باہر کیوں کھڑے ہیں؟'' وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا، جلدی سے دروازے سے ہٹا اور عمر کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

''بیگم صاحبہ اتنا یاد کرتی ہیں آپکو، ہر وقت آپکا ذکر کرتی ہیں۔ آپکی تصویریں بھی دکھاتی ہیں ہمیں۔ کہتی ہیں کہ جب بھی میرا بیٹا آئے اُسے فوراً اندر آنے دینا۔ میں پتہ نہیں کیوں آپکو پہچان نہیں سکا۔۔۔۔'' وہ بہت باتونی تھا۔ عمر کی آنکھیں نم ہوئیں۔ امی کتنا یاد کرتی ہونگی اُسے؟

''بیگم صاحبہ تو ہر لمحے ذکر کرتی ہیں آپکا، وہ تو بس بڑے صاحب کے ڈر سے۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا پھر چونکا ''ارے! آپ کا سامان کہاں ہے؟''

''میں سامان بھی لے آؤں گا۔ پر ابھی مجھے اندر تو آنے دو۔'' وہ مسکرایا۔ شاید بہت عرصے بعد۔۔۔۔

''ہاں! ہاں! آپ آیئے۔۔۔ معاف کر دیجئے گا صاحب! میں بھی بڑا پگلا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ عمر مسکرایا، لان کی شکل کافی تبدیل ہو چکی تھی پر وہ جگہ آج بھی ویسی ہی تھی، جہاں خضر ورزش کیا کرتا تھا۔ وہ دیوار بھی وہیں تھی، جہاں سے عمارہ جھانکا کرتی تھی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی، ماں باپ کو تو وہ منا لے گا پر عمارہ؟

''گھر میں کام اتنے ہیں کہ کچھ یاد ہی۔۔۔''چوکیدار بولتے بولتے اُسے گھر کے اندر تک لے آیا۔

''صاحب !اب آپ خود اندر جائیں۔میں پگلا پتہ نہیں کیوں یہاں تک آگیا۔آپ مہمان تھوڑی ہیں؟آپکا تو اپنا گھر ہے۔''اس بار بھی وہ بس مسکرا ہی سکا۔ کھلے دروازے سے گھر کا لیوینگ روم نظر آرہا تھا۔پتہ نہیں گھر کے اندر داخل ہو کر اُسکے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز کیوں ہو رہی تھیں؟عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''سنو!۔۔۔''چوکیدار پلٹ کر جانے ہی لگا تھا جب اُس نے روکا۔

''جی صاحب!''

''یہ گھر کیوں سجا ہوا ہے؟''

''آپ کو نہیں پتہ؟''وہ حیران ہوا۔

''کیا نہیں پتہ؟''وہ اُس سے زیادہ حیران ہوا۔

''مجھے لگا آپ تو شادی میں شریک ہونے آئے ہوں گے۔''

''شادی؟کس کی؟''

''خضر صاحب کی۔۔۔''

''خضر کی؟ریئلی؟(واقعی؟)''وہ خوش ہوا۔

''ہاں!ہاں!صاحب۔۔۔کل ہی تو ولیمہ ہوا ہے۔''

''کون آیا ہے؟''یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی اُسکے قدم زنجیر ہوئے۔ماں کی آواز اتنے عرصے بعد کانوں میں پڑی تھی۔آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھوں میں آنے لگے۔چوکیدار پلٹ گیا۔

''کون ہے وہاں؟''اُسکی ماں نے دوبارہ پوچھا تو وہ مزید کھڑا نہ رہ سکا۔اُس نے پلٹ کر دیکھا اور اُسکی ماں جو قدم قدم آگے بڑھ رہی تھیں۔وہ ٹھہر گئیں۔۔۔تھم گئیں۔۔۔مجسمہ ہو گئیں۔۔۔

''عو۔۔۔عم۔۔۔عمر۔۔۔''نام ادا ہو گیا۔۔۔

''میرا عمر؟''اُنہیں یقین نہ آیا۔وہ تیزی سے آگے آیا۔

''امی!۔۔۔''اُنکا ہاتھ تھام کر تڑپتے ہوئے پُکارا۔

''میرا بچہ!۔۔۔۔میرا بیٹا۔۔۔میرا عمر۔۔۔''وہ اُسکے گلے لگ گئیں۔

''عمر!۔۔۔میرا عمر!۔۔۔''تسبیح کی طرح اُسکے نام کا ورد کرتی،اُسکی ماں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔اُن کی آنکھیں ترس گئی تھی،اُسکا منہ دیکھنے کے لیے۔ اسکو گلے لگانے کے لیے۔۔۔

''میرا بیٹا!''وہ رو رہی تھیں۔

''ہاں!آپکا بیٹا!''اُس نے روتے ہوئے اپنی ماں کا ماتھا چوما۔

''کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟''اُنکا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔

''بتاؤں گا۔۔۔سب بتاؤں گا۔''اُس نے آنسو پونچھے۔

''تم واپس تو نہیں جاؤ گے نا؟''اُنکی آنکھوں میں اُمید تھی۔

''نہیں!اگر ابّو ناراض نہیں ہوں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔آپ مجھے معاف کر دیں امی!مجھے معاف کر دیں۔''وہ اُنکی ہتھیلیوں پر ماتھا ٹکائے رو دیا۔

''کیا تم معافی کے قابل ہو؟''اس آواز پر اُس نے سر اٹھایا۔حفیظ صاحب سامنے کھڑے تھے،خضر،اُسکا بھائی۔۔۔اُنکے پیچھے کچھ حیران اور کچھ پریشان سا کھڑا تھا۔چھے سالوں میں وہ کافی بڑا ہو گیا تھا۔

حیران عمر اُنکے الفاظ سے نہیں ہوا تھا،اس رد عمل کی تو اُسے پوری اُمید تھی۔پر جس شے نے اُسے حیرت میں مبتلا کیا،وہ تھا عمارہ کے والدین کا وہاں ہونا،وہ آنکھوں میں نفرت سموئے اُسے دیکھ رہے تھے۔وہ خاندانی دوست تھے،پر اتنی بڑی بات کے بعد اُنکا خضر کی شادی کے لیے موجود ہونا سخت حیران کن تھا۔ اگر وہ شادی میں شریک ہونے آئے تھے تو واقعی اعلیٰ ظرف تھے۔اُن سے معافی عمر پر فرض تھی۔

''ابّو میں۔۔۔''اس سے پہلے کے وہ کوئی وضاحت دیتا،اُسکی نم آلود سرخ نگاہیں اندر سے آتے وجود پر پڑیں۔سفید گھر دار فراک پر نک سک سے تیار،دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر مہندی لگائے،عمارہ وہاں اچانک ہی آئی تھی۔عمر کو دیکھ کر اُسکے قدم سست ہوئے،پر وہ رکی نہیں۔۔۔بے تاثر چہرے کے ساتھ چلتی خضر کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

عمر نے وعدہ پورا کر دیا تھا،اتفاق ہی صحیح پر وہ چھے سال بعد سامنے تھا ،پورے چھے سال بعد،اُس نے تو جھوٹ کہا تھا،پر قسمت نے سچ کر دیکھایا تھا۔

اُس نے کہا تھا کہ چھے سال بعد آئیگا۔۔۔

وہ آگیا تھا۔۔۔

اور عمارہ نے بھی کہا تھا کہ عمارہ مر گئی تمہارے لیے۔۔۔

اُس نے بھی سچ میں مر دکھایا تھا۔۔۔

اُسکے ہاتھوں کی لگی مہندی پر لکھا نام، دور سے بھی پڑھنے لائق تھا۔۔۔

وہ نام جو اُسکا نہیں تھا۔۔۔

وہ جس نے عمر کے پیروں تلے زمین کھینچ لی تھی۔۔۔

وہ تھا۔۔۔

خضر کی دلہن۔۔۔

---------+---------+--------

میں نے اپنے ہی ہاتھوں، سے گنوایا ہے تجھے۔۔۔

آشنا کوئی اور اب بھی ہے تجھے۔۔

یہ اُسکی زندگی کا ایسا سچ تھا جو اُس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اُسکی ہاتھوں کی مہندی دیکھنے کے بعد رکا نہیں تھا، وہ چلا گیا۔ وہ الٹے قدموں پلٹ گیا، اُسکی ماں آوازیں دیتی رہ گئیں، باپ نے سختی سے ماں کو روک دیا۔ پر اُس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔۔۔

عمارہ کسی اور کا گھر بسا چکی ہو گی یہ بات وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکا تھا، پر عمارہ اُسکے بھائی کا گھر بسائے گی، یہ اُس کے لیے نا قابل برداشت تھا۔ اور کتنی بے گانگی تھی اُس کے چہرے پر، جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

کاش! میں ایک ہفتے پہلے آجاتا۔ کاش! دل میں ہوک اٹھی۔

اور اگر ایک ہفتے پہلے آ بھی جاتا تو کیا کر لیتا؟ کیا وہ خضر کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لیتی؟ ہاں! اگر سچ بتاتا تو شاید۔۔۔اُس نے سوچا۔پر اگلے ہی لمحے ضمیر نے ملامت کیا۔ میں ایسا خود غرض کیسے ہو سکتا ہوں؟

مجھے تو ایسا سوچنا ہی نہیں چاہیے،وہ میری بھابھی ہے۔وہ خود کو ملامت کرنے لگا،پر لفظ **بھابھی** پر دل کٹا تھا۔

''مجھے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔مجھے نہیں آنا چاہیے تھا! میرے آنے نے اُنکے لیے کتنی پریشانی کھڑی کی ہو گی؟ میں اب گھر نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں کسی کو سچ نہیں بتاؤں گا،اگر بتا دیا تو کئی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ خضر تو ساری زندگی کے لیے شرمندہ ہو جائے گا اور میں اپنے بھائی پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔''خضر اور عمارہ دونوں ہی اُسے پیارے تھے۔اور وہ دونوں ساتھ تھے،درمیان میں تو وہ تھا۔

وہ دوسروں کا سوچتا تھا۔آج ایک بار پھر اُس نے دوسروں کا سوچا اور اُس لمحے عمر حفیظ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تاحیات اکیلا رہ لے گا،پر کسی کو سچ نہیں بتائے گا۔

---------+---------+--------

''وہ عورت۔۔۔جسے میرے منع کرنے کے باوجود آپ نے دوبارہ گھر میں آنے دیا۔اُسے میرے بیٹے کو لیجانے دیا۔ہاں! وہی عورت ہمیں بیوقوف بناتی رہی ہے۔''وہ لمبا چوڑا مرد فرش پر بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ سفیر صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل کھولا اور رپورٹ دیکھی۔فیٹرنٹی ٹیسٹ پوزیٹو تھا، ڈی این اے ننانوے فیصد میچ کر گیا تھا۔نشمیہ اُسکی بیٹی تھی،صرف اُسکی۔۔۔تو پھر وہ رو کیوں رہا تھا؟ وہ حیران ہوئے۔

''دیکھو علی!۔۔۔وہ تمہاری ہی اولاد ہے۔تمہاری بیٹی۔۔''اُنہوں نے نم آنکھوں سے جیسے خوشخبری سنائی۔

''ہاں ابّا! وہ میری ہی بیٹی ہے۔میری وہ بیٹی جسے میں پیدا ہوتے ہی گود میں نہ لے سکا،وہ بیٹی! جسے میں نے پہلی بار بولتے ہوئے نہیں سنا،اُسے پہلا قدم اٹھاتے نہیں دیکھا۔۔۔صرف اور صرف اس عورت کی وجہ سے۔جس نے مجھے دھوکہ دیا،ایک نہیں کئی بار۔اُس نے مجھ سے جھوٹ کہا کہ میری بیٹی مر گئی ہے۔اُس نے اتنے عرصے میری اولاد کو مجھ سے دور رکھا۔اتنا عرصہ تڑپایا مجھے۔۔۔اتنا عرصہ ابّا!''اُسکا گلا رندھ گیا۔ سفیر صاحب کو لگا کہ اب وہ بھی رو دیں گے۔دکھ احساس زیاں کا تھا۔۔۔تکلیف نارسائی کی تھی۔

''اگر اُسکا شوہر اُسے طلاق نہ دیتا تو شاید!۔۔۔شاید وہ مجھے کبھی نہ بتاتی اور میں۔۔۔میں ساری زندگی بے خبری میں مر جاتا۔میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ابا! میرے ساتھ ہی کیوں؟''وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

اُنہوں نے اُسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔شاید پہلی بار۔۔۔

اس گھر کے در و دیوار نے دونوں باپ بیٹے کو اپنا غم بانٹتے ہوئے دیکھ لیا۔شاید پہلی بار۔۔۔

اور آج اُنکو روتے دیکھ لیا۔۔۔شاید۔۔۔

آخری بار؟۔۔۔۔

---------+---------+--------

آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔لیلیٰ اُسے نہ ملی، یہ بڑا غم تھا۔لیکن اپنی ہی چاہت کو بھابھی کے روپ میں دیکھنا؟ یہ اُس سے بھی بڑا غم تھا۔مقدّم کو سمجھ نہیں آیا کہ اُسے کیا کہے؟

اُسکی بیوقوفی پر اُسے کوسے؟ یا قسمت کی ستم ظریفی پر افسوس کرے؟

وہ واقعی قسمت کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔۔۔شاید تسلی کے دو بول۔۔۔پر الفاظ گم ہو گئے۔۔۔

گم ہو گئے پیچھے خاموشی سے چلتے ٹی وی پر نظر آتی خبر کو دیکھ کر۔۔۔

وہ ساکت ہوا۔۔۔

''عمر!۔۔۔''اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹی وی پر چلتی خبر کو دیکھتے اُسے پُکارا۔عمر نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور اگلے ہی لمحے جھٹکے کھا کر کھڑا ہوا۔فجر کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں، سحری سامنے رکھی تھی،اور نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔

''سی ٹی ڈی آفیسر، ایس ایس پی نوید عالم کی گاڑی کو چاروں جانب سے شدید فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔وہ ڈیوٹی سے گھر کی طرف جا رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔واقعے میں نوید عالم شدید زخمی ہوئے ہیں اور اُنہیں زخمی حالت میں ہسپتال۔۔۔۔''

ٹی وی پر چلتی خبر نے اُنکی سانسیں روک دی تھیں۔

---------+---------+--------

حرف نصف:

نحل میرے مطابق اب اپنا نصف پورا کر چکا ہے، اور یہاں سے اب یہ اپنے اختتام کی جانب سفر کرے گا۔

پچھلے باب میں آپ ڈائری میں تصاویر جمع کرنے والے کی ایک جھلک پڑھ چکے ہیں۔ اب میں آپکو یہاں بتانا چاہتیں ہوں کہ اُس سائیکو کو آپ جانتے ہیں۔ بہت قریب سے۔۔۔۔

اب آپ نے فقط اُس کو ڈھونڈھنا ہے۔ اس باب سے لے کر ہر باب میں آپ کو ایک سے دو کلو (clue) ملیں گے جو آپ کو اُس سائیکو تک لے جائیں گے۔ آپ نے کرنا صرف یہ ہے کہ پہلے جس باب میں سائیکو کا ذکر ہوا ہے، یا آگے جس بھی سین میں ہوگا، اس سین کو غور سے پڑھنا ہے، بار بار پڑھنا ہے تاکہ آپ اس کی خصوصیت کو جان سکیں۔ پھر آگے آنے والے کلوز (clues) میں آپ سے کہیں نہ کہیں وہ خاص شے کسی مقام پر ٹکرا جائے گی۔ اور ہو سکتا ہے آپ اسے پہچان لیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ پہچانیں۔

کلو (clue) کے متعلق بتاتی چلوں کہ آپ کو دو قسم کے کلوز (clues) ملیں گے۔ ایک ہوں گے اصلی جو آپکو حقیقتاً سائکو تک پہنچا دے گے۔ اور ایک ہونگے جھوٹ، جو میں نے خصوصاً اس لیے ڈالے ہیں تاکہ آپ کو گمراہ کیا جا سکے۔ اور اصل سائیکو کے بجائے کسی دوسرے کو قاتل سمجھنے لگے۔

آپ جس کسی کردار کو بھی سائیکو سمجھتے ہیں۔ اُسکی وجہ ضرور بیان کریں۔

اور اگر آپ نہیں ڈھونڈ پاتے، تو انتظار کریں آخری قسط کا۔

ژیلہ ظفر

بارہواں باب

قرض

فجر ہونے میں کچھ ہی لمحات رہ گئے تھے، سارا سال فجر کے وقت سونے والی عوام رمضان میں جوش و خروش سے سحری کر رہی تھی۔ کاؤنٹر پر فقط ڈبل روٹی اور دو پیالی چائے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ ڈبل روٹی بھی آنلائن مارٹ سے آرڈر کی گئی تھی ورنہ تو اس گھر کے فریج میں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی یہاں کم کم آتا ہے۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟'' عام سے حلیے میں بیٹھا رضا، اپنے سامنے بیٹھ کر سکون سے چائے پیتے حسین کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ کیوں پریشان ہو رہے ہوں گے بھلا؟'' اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''ہاں! بھلا وہ تمہارے گھر سے غائب ہونے پر کیوں ہی پریشان ہونے لگے؟ وہ تو تمہاری موجودگی میں پریشان ہوتے ہوں گے۔'' اُس نے احساس دلانا چاہا کہ اب اُسے گھر کی راہ لینی چاہیے۔

''کیا یار! اتنا چبھ رہا ہوں تمہیں؟'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا۔

''ہاں!۔۔۔۔'' اُس نے بھی پوری ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''ٹھیک ہے! اب نہیں آؤں گا، یہ تو بس میں، تمہاری محبت میں آجاتا ہوں۔''

''میری محبت؟'' رضا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تو؟ تمہیں کیا لگتا ہے، میں نفرت کرتا ہوں تم سے؟''

''آہ!'' رضا نے گہری سانس لی۔ ''کیا بتاؤں میں تمہیں کہ تمہاری اِس محبت کو کتنا مس کیا میں نے؟'' اُس نے دل سے کہا، پر حسین نے آنکھیں چھوٹی کر کے بغور اُسے دیکھا۔

''مذاق کر رہے ہو؟''

''بھاڑ میں جاؤ!'' وہ تپا تو حسین ہنس دیا۔ پھر اُس نے کاؤنٹر پر رکھا اپنا موبائل اٹھا کر کھولا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

''یہ دیکھو!۔۔'' اُس نے مطلوبہ شے تلاش کر کے موبائل اُسکی جانب بڑھایا۔ رضا نے موبائل ہاتھ میں لیا اور سامنے کر کے دیکھا، اسکرین پر دو عدد چھوٹے چھوٹے گول مٹول سے پیارے پیارے بچے نظر آ رہے تھے۔ ایک دو سالہ بچی، اور ساتھ میں اُسے گلے سے لگائے کھڑا تین چار سال کا بچہ۔ اُن معصوم چہروں کو دیکھ کر اُس کے لبوں پر یکدم ہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''یہ تمہارے بچے ہیں؟'' اُس نے موبائل پر سے چہرہ اٹھا کر اُس سے پوچھا۔

''شکر ہے کہ تم نے کارنامے نہیں کہا۔'' اُسکا جواب بھی نرالا تھا، وہ ہنس دیا۔

''نام کیا ہیں انکے؟'' اُس نے پوچھا۔

''یہ حوریہ ہے، ڈیڑھ سال عمر ہے اسکی۔''

''ماشاءاللہ! دونوں پیارے ہیں۔ بیٹے کا نام؟'' اُس نے زوم کر کے دیکھا۔ حوریہ تو بالکل حسین کا پرتو تھی۔

''رضا!''

''ہاں! بولو۔۔۔'' اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''رضا۔۔۔ رضا نام ہے اسکا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رضا ساکت رہ گیا۔

''تم۔۔۔ تم نے رضا نام رکھا ہے اسکا؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں!۔۔۔ تمہیں کیا لگتا ہے، میں بھول گیا تھا تمہیں؟'' وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ حسین ہمیشہ ایسے ہی حیران کرتا تھا، وہ دل میں آنے کے تمام راستے جانتا تھا، دل میں بس جانے کے تمام منصوبے اُسکے پاس تھے۔ وہ محبت کرنا جانتا تھا، محبت بانٹنا جانتا تھا اور اُسکے علاوہ کچھ نہ جانتا تھا۔ رضا کو لگا آج پھر وہ سر نہیں اٹھا سکے گا۔ اُس نے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے نظریں دوبارہ موبائل پر کیں اور رضا کی تصویر کو زوم کر کے دیکھنے لگا۔

''یہ۔۔۔ یہ تم سے تو نہیں مل رہا بالکل بھی۔'' اُس نے یکدم ہی کہا۔

''ہاں! بالکل! ذرا جو کوئی ایک چیز ہی مجھ سے لے لی ہو اِس نے۔'' اُس نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ مجھے کسی سے ملتا ہوا لگ رہا ہے۔ جیسے۔۔۔ جیسے یہ۔۔۔'' اُس نے دماغ پر زور دینا چاہا کہ بھلا یہ کس سے مل رہا ہے؟

''ارے ہاں! یہ تمہاری کزن حور عین سے مل رہا ہے۔''اُس نے اچانک ہی یاد آنے پر کہا۔

''تمہیں وہ یاد ہے؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں! اتنے سال تمہیں اُس سے لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''اُسی پر گیا ہے پورا، شکل بھی ویسی ہے اور حرکتیں بھی۔''اُس نے پھر سے منہ پھلایا تو وہ ہنسا۔

''تمہارا بیٹا حور عین پر کیسے چلا گیا؟''وہ ہنستے ہوئے مزید تصویریں دیکھنے لگا، جو حسین آگے بڑھا کر اُسے دکھا رہا تھا۔

''کیسے نہیں جائے گا وہ اُسکی۔۔۔''وہ یکدم ہی کہتے کہتے رکا اور چہرہ گھما کر برابر بیٹھے رضا کو دیکھا۔

''کیا؟''رضا نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''حور عین میری بیوی ہے۔''اُس نے اپنی جانب سے انکشاف کیا۔

''کیا؟''اُسے لگا جیسے اُسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''جی! بیوی ہے وہ میری۔''اُس نے دوبارہ کہا تو اب کہ رضا بے اختیار ہی جو ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔

''ہاہاہا۔۔۔سیریسلی؟''وہ ہنستے ہنستے حالت رکوع میں جا چکا تھا۔

''اتنا بھی کوئی بڑا لطیفہ نہیں ہے۔''اُس نے منہ بنایا۔

''پر لطیفہ تو ہے۔''آج وہ بھی باز نہیں آ رہا تھا۔

''ہنس لو بیٹا! ہنس لو۔تم جانتے نہیں ہو کتنا ظلم ہوا ہے میرے اوپر؟میری سابقہ منگیتر اور حور کے سابقہ منگیتر دونوں نے شادی سے انکار کر دیا تھا، پھر خاندان والوں نے عزت بچانے کے لیے ہم دونوں کو ہی ساتھ باندھ دیا۔''اُس نے دکھ سے کہا۔صاف اداکاری۔۔۔

''تم دونوں کا اور کہیں گزارا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔یو بوتھ ڈیسرو ایچ ادہر (تم دونوں ایک دوسرے کے قابل ہو۔)''وہ بہت عرصے بعد کھل کر ہنسا تھا۔

''خیر! مذاق اپنی جگہ، سچ سچ بتاؤ، یہ شادی ہوئی کیسے؟''اب کہ رضا سنجیدہ ہوا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں؟سچ بتا دیا ہے میں نے۔۔۔''

''تم خوش ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''نظر نہیں آتا کیا؟''

''نظر تو بہت خوش آتے ہو۔ماشاءاللہ!''

''تو تم بھی خوش رہنے کا انتظام کرلو۔''اُس نے مفت مشورہ دیا۔

''ویسے میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔۔''رضا کچھ کہتے کہتے رکا۔

''کہ؟''حسین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔''اُس نے سر جھٹکا۔

''بتادو ورنہ پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگیں گے۔''نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟

''مجھے اپنے بیٹے کا نام حسین تو نہیں رکھنا پڑے گا؟''سنجیدگی سے کیے گئے اِس سوال پر دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

''پہلے بیٹے کی ماں تو ڈھونڈ لو۔''اُس نے چھیڑا تو رضا کے ذہن کے پردے پر سانولا چہرہ لہرا گیا، وہ مسکرایا۔

''خیریت؟اب مسکرا کیوں رہے ہو؟''حسین مشکوک ہوا۔

''کیوں؟میں مسکرا نہیں سکتا؟''

''مسکرا سکتے ہو، بالکل مسکرا سکتے ہو۔پر کوئی وجہ تو ہو،ایسے تو تمہیں پاگل خانے چھوڑنا پڑیگا۔''اُس نے سنجیدہ نظر آنے کی ناکام کوشش کی۔

''حالانکہ جگہ وہ تمہارے لیے مناسب ہے۔''اُس نے دوبدو جواب دیا۔اس شخص کے ساتھ وقت اچھا گزرتا تھا۔

''چلو یار!میں نکلتا ہوں اب۔تم بھی آرام کرو۔''وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''نماز پڑھ لو، پھر چلے جانا۔''رضا بھی کھڑا ہوا۔اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور اگلی بار آنا تو کوئی اچھی کہانی سوچ کر آنا۔''رضا نے شرارت سے کہا۔

''کیسی کہانی؟بھئی!جو سچ تھا وہ بتادیا،ایسے ہی شادی ہوئی تھی میری۔۔۔''اداکاری ختم تھی اُس پر۔

''میں نے کرلیا یقین۔''اُس نے بھی مذاق اڑایا۔

''بھائی!اب اصل کہانی تو تب ہی بتا سکوں گا،جب۔۔۔''وہ رکا۔

''جب؟''اُس نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جب اُس بہار کا نام پتہ چلے گا۔'' برا ہو اُس روز کا جس روز رضا کی زبان پھسل گئی تھی۔

''کونسی بہار؟''اُس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''وہی۔۔۔اُس دن والی بہار۔''وہ بھی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔

''جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔چلو!''وہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''ہاں!ہاں!بدل لو موضوع۔میں خود ہی پتہ لگالوں گا۔''وہ بھی بلند آواز سے کہتے ہوئے پیچھے آیا۔

''چلیں ڈیٹیکٹو(جاسوس)صاحب؟''اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''چلو چلو۔۔۔''وہ بھی ٹہلتے ہوئے پیچھے چلا آیا۔

وہ لمحات امر ہو گئے۔۔۔۔

وہ جو بچھڑ گئے تھے۔۔۔

وہ پھر سے دوست ہو گئے۔۔۔

وہ جو روٹھ گئے تھے۔۔۔

وہ راضی ہو گئے۔۔۔۔

اور تکلیف دہ اوراق۔۔۔۔

سب ماضی ہو گئے۔۔۔۔

---------+---------+--------

آج کی صبح آسودہ تھی،اطمینان دینے والی،پُر سکون کر دینے والی سی۔آج بڑے دنوں بعد دل پر کوئی بوجھ نہ تھا،وجود ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہو جیسے۔وہ ہنس نہیں رہا تھا،پر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔خوش رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔

بلیک ٹراؤزر پر سفید پولو شرٹ پہنے، دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ علی لاؤنج میں رکھے صوفے پر آ بیٹھا، اور پشت پر سکون سے سر گرا لیا۔ کچن مصروف تھا، سارے میں تازہ آملیٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ناشتہ سامنے والے صوفے پر براجمان ملکہ عالیہ کے لیے تھا، کیونکہ باقی دو نفوس توروزے سے تھے۔ اُس نے چہرہ موڑ کر ملکہ عالیہ کو دیکھا۔

لال رنگ کے فراک میں، جس پر پیلے رنگ کے پھول پتے بنے ہوئے تھے، بالوں کو کھول کر بینگز سامنے کیے وہ اُس سے روٹھی بیٹھی تھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور محترمہ آج اسکول جانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ چہرے پر نو لفٹ کی تختی سجائے وہ دیواروں کو دیکھتی پیر جھلاتی رہی، بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ علی مسکراہٹ ضبط کیے اُسے، جبکہ وہ علی کے سوا پورے گھر کو دیکھتی رہی۔

''اہم۔۔اہم۔۔''اُس نے گلا کھنکھار کر اُسے متوجہ کرنا چاہا، اُس نے بھی برابر نظر انداز کیا۔

''محترمہ نشمیہ! کیا آج آپ اسکول نہیں جائیں گی؟''علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مجھ سے بات مت کریں۔''منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''وہ حیران ہوا۔

''میں آپ سے ناراض ہوں۔''اس جواب پر وہ دل سے مسکرایا۔

''ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تم سے۔''

''میں نے کیا کیا؟''واہ رے! انجانہ پن۔

''تم اسکول سے بنا بتائے کیوں نکلی؟ اگر گم ہو جاتی تو؟''اب کے اُس نے ذرا غصّہ دکھانا چاہا پر دکھا نہیں سکا۔

''آپ نے مجھے صبح اتنی زور سے ڈانٹا تھا۔''اُس نے وجہ بتائی۔

''تو؟ اگر میں تمہیں ڈانٹوں گا تو تم اِسکول سے بنا بتائے نکل جاؤ گی؟''اس بات پر وہ خاموش رہی۔ اُسے خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ اُس نے غلط کیا ہے۔

''اور کہاں جا رہی تھی تم؟''

''پارک۔''یک لفظی جواب دیا۔

''پتہ بھی ہے پارک کہاں ہے؟''

''نہیں!''اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیسے جاتی پارک؟''

''میں تو واپس آرہی تھی، پھر میں بھول گئی کہ اسکول کہاں ہے؟''اُس نے معصومیت سے بتایا۔

''آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ پتہ ہے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمہیں؟''

''آپ نے مجھے رات کو بھی ڈانٹا تھا۔''اُسکے اپنے ہی غم تھے۔

''تمہاری حرکت پر غصّہ جو آگیا تھا نا! صبح سے ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''آپ نے صبح بھی ڈانٹا تھا۔''اُس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ کل اُسے دو مرتبہ ڈانٹ چکا ہے۔

''اُس وقت میری غلطی تھی۔ آئی ایم سوری!''اُس نے ہار مان لی۔ بیٹی سے ہارنے میں بھلا کیا غم؟

''میں پھر بھی آپ سے بات نہیں کروں گی۔''اُس نے نروٹھے پن سے کہا۔

''کبھی نہیں کرو گی؟''علی نے پوچھا۔

''ہاں! کبھی نہیں کروں گی۔''

''وعدہ کرو۔''اُس نے شرارت سے کہا تو وہ چڑ گئی۔

''جائیں یہاں سے، میں نہیں بات کرتی آپ سے۔''اُس نے رخ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''حالانکہ اتنی دیر سے مجھ سے ہی بات کر رہی ہو۔''اُس نے چڑایا۔

''اب نہیں کروں گی۔''اُس نے منہ بسورتے ہوئے دوبارہ سینے پر ہاتھ باندھے اور صوفے سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ اتنے چُنے سے قد کے ساتھ وہ صوفے پر بیٹھی کم اور لیٹی زیادہ لگ رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''اِس وقت کون آگیا؟''اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے سوچا۔ ملازم کچن میں تھا، اور سفیر صاحب آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ لہٰذا دروازہ اُسے ہی کھولنا تھا۔ اپنی شہزادی کو ناراض چھوڑ کر وہ دروازے تک آیا، پر اُسے کھولتے ہی اُسکا پورا وجود مجسمہ ہو گیا۔

کوئی کہتا کہ قیامت آگئی ہے، علی مان لیتا۔

کوئی کہتا سورج مغرب سے نکلا ہے، تو وہ مان لیتا۔

پاکستان بھارت سے کرکٹ کا کھیل جیت گیا ہے تو وہ یہ بھی مان لیتا۔

پر رضائے الٰہی اُسکے دروازے پر کھڑا تھا، یہ ماننے سے تو اُسکی آنکھوں، سماعتوں اور عقل و سمجھ نے بھی انکار کر دیا تھا۔

اُس نے دروازے سے ذرا باہر نکل کر آس پاس دیکھا کہ آیا کوئی اسے اپنے ساتھ تو لیکر نہیں آیا؟ پر آس پاس سوائے رضا کے اور کوئی نہ تھا یعنی وہ خود ہی آیا تھا؟ علی سیدھا ہوا اور براہ راست اُسے دیکھا۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے؟ کیا پوچھے؟

کیا کہوں اس سے کہ کس لیے آیا ہے؟ اُس نے خود سے سوال کیا۔ نہیں! بہت نامعقول سوال ہے۔ خود ہی جواب بھی دے دیا۔ حالانکہ رضا کے معاملے میں اُس نے کبھی لحاظ و مروت کا خیال نہیں کیا تھا۔ تو کیا اندر لے آؤں؟ ایک اور سوال۔ پر مجھے کیا معلوم یہ کس نیت سے آیا ہے؟

دوسری طرف رضا بھی بغور اُسکی مشکوک حرکتیں دیکھ رہا تھا، اُسکے تاثرات سمجھنے سے قاصر وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اِس شخص کو اپنے یہاں آنے کا کیا جواز دے؟ اس سے کچھ بعید نہ تھی کہ دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔ کتنے ہی لمحے، لفظوں کی تلاش میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے، وہ دونوں وقت ضائع کرتے رہے۔

''آں اہم۔۔'' پہلے علی نے گلا کھنکھارا۔ ''تت۔۔ تم یہاں؟'' چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ لانے کی ناکام سی کوشش کی۔ رضا نے آنکھوں پر پہنے گوگلز اُتار کر چبھتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا تو اُسکی مسکراہٹ سمٹی۔ کیا ضرورت تھی یہ سوال کرنے کی؟ علی رات کو ہسپتال میں تھا تو یقیناً اُسی کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوگا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

''تم سے ملنے نہیں آیا۔ نشمیہ کی فکر ہو رہی تھی بس!'' رضا نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''نشمیہ کی فکر؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! رات کو تم نے اُسے کافی بری طرح ڈانٹا تھا۔'' اور بس! علی کے تو تن بدن میں ہی آگ لگ گئی۔

''باپ ہوں اُسکا، قتل نہیں کر دوں گا اُسے جو تمہیں فکر ہو رہی تھی۔'' ایک ہی پل میں ساری مروت جھاگ کی طرح بہہ گئی۔

''نشمیہ سے مل سکتا ہوں؟'' اب کے اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ!'' علی بیزاری سے کہتے دروازے سے ہٹا، جسے رضا ذرا بھی خاطر میں نہ لایا اور اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اُسکے برابر آ گیا، اب وہ دونوں ٹریک پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''میں نے آج تک کسی کو نوکری سے نہیں نکالا، پر صبح عملے کو اُسکی نااہلی کی بنا پر نوکری سے فارغ کر دیا ہے۔'' جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے نجانے رضا نے اُسے کیوں بتایا تھا؟

''احسان کیا مجھ پر، شکریہ تمہارا۔'' تڑختا ہوا جواب آیا۔

''نہیں! احسان فراموشوں پر احسان نہیں کرتا میں، یہ تو میرا فرض تھا۔'' دل جلا دینے والی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے، رک کر کہا۔ علی نے آنکھیں چھوٹی کر کے کینہ توز نظروں سے اُسے گھورا، پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اندر بڑھ گیا۔ اُس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی کندھے اُچکاتے، اُسکے پیچھے چلا آیا۔

''نشمی!۔۔۔'' علی نے اندر آ کر اُسے پُکارا۔ اِس طرز تخاطب پر اُس نے پہلے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا، پھر اُسکے ساتھ آنے والے وجود کو، پھر نظریں پھیر لیں۔ صاف ظاہر کیا کہ میں ناراض ہوں مجھ سے بات نہ کی جائے۔

''تم بیٹھو!۔۔۔'' اب کہ ذرا مروت و اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اُسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اُسکے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''السلام علیکم!۔۔۔'' رضا نے نشمیہ کو مخاطب کیا۔ اُدھر سے برابر نظر انداز کیا گیا۔

''کیسی ہو نشمیہ؟'' اُس نے پیار سے پوچھا۔ اس بار بھی جواب ندارد۔

''نشمیہ! انکل کچھ پوچھ رہے ہیں۔'' اب کہ علی کو بھی ذرا شرمندگی محسوس ہوئی۔

''مجھے بات نہیں کرنی۔'' اُس نے نروٹھے انداز میں کہا تو رضا مسکرا دیا۔ باپ بیٹی دونوں کے ہی مزاج نہیں ملتے تھے۔

''وہ تم سے ملنے آئے ہیں۔'' اب کہ اُس نے آنکھیں دکھانی چاہی۔

''کیوں؟'' اُس نے رضا کو سر سے پیر تک گھورا۔

''کیونکہ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کل اسکول سے باہر کیوں نکلی تھیں؟ اور کسی نے آپ کو دیکھا نہیں؟ یعنی گارڈ اُس وقت کہاں تھا؟'' اُس نے ذرا نرمی سے بات کرنی چاہی تاکہ بچی ڈرے نہیں۔

''میں آپکو کیوں بتاؤں؟'' رضا نے ضبط کا گھونٹ بھرا۔

''کیونکہ میں آپکے اسکول کا پرنسپل ہوں۔ تو مجھے یہ پوچھنا پڑیگا کہ آپ کہاں اور کیوں گئی تھیں؟''

''اوہ! آپ وہ ڈراؤنے والے انکل ہیں؟'' اُس نے یکدم ہی اشتیاق سے پوچھا، اس سوال پر رضا تو رضا، علی بھی بھونچکا رہ گیا۔

''واٹ ؟''وہ سمجھ نہیں سکا۔

''ہاں ! میری مس نے کہا تھا، اگر اسکول میں شور کرو گی تو سر رضا آ جائیں گے اور وہ بہت ڈراؤنے ہیں۔''اُس نے پر جوش ہوتے ہوئے بتایا تو علی نے چہرہ نیچے جھکا کر مسکراہٹ ضبط کی۔

''اور یہ کونسی مس نے کہا؟''اب کہ وہ مشکوک ہوا۔

''مس جزا!''اس جواب پر تو اس کا مارے حیرت کے حقیقتاً منہ ہی کھل گیا۔ بتاؤ ذرا! محترمہ اُسکا نام لے لیکر بچوں کو ڈرا رہی تھیں۔ کبھی دوست کی بہن تو کبھی دوست کی بیٹی، رضاالٰہی کی دنیا واقعی گول تھی۔

''نشمیہ ! بڑوں کو ایسے نہیں بولتے، بری بات ہے۔''علی نے اُسے ذرا سنجیدگی سے سمجھانا چاہا تو اس نے ایک بار پھر اُسے یکسر نظر انداز کر کے رضا کو مخاطب کیا۔

''بات سنیں !۔۔۔''

''کہیے ؟''اُس نے ذرا منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے بالکل پسند نہیں آئے۔''اُس نے سکون سے اطلاع دی تو وہ ہنسا۔

''علی کی اولاد !''اس واضع بڑبڑاہٹ پر علی نے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔ پر وہ بھی شان بے نیازی سے بیٹھا رہا۔

''میں نے ابھی کہا ہے نا کہ بڑوں سے ایسے بات نہیں کرتے۔'' اب کہ علی نے ذرا سختی سے تنبیہہ کرنی چاہی۔

''مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔''نشمیہ نے بھی باآواز بلند اعلان کرتے ہوئے رخ بدل لیا۔

''کیوں ؟ کیوں نہیں کرنی؟''وہ سنجیدہ ہوا، جبکہ رضا ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا۔

''کوئی میرا خیال نہیں رکھتا، کوئی مجھے پیار نہیں کرتا، کوئی مجھے آئس کریم لا کر نہیں دیتا، کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا، کوئی میرے ساتھ کارٹون نہیں دیکھتا۔ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔''اُسکے مسائل واقعی بہت بڑے تھے۔

''میں خیال نہیں رکھتا تمہارا؟''اُس نے تڑپ کر پوچھا، بھلا رضا کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ویسے ہی اُسے ایک بہت برا باپ سمجھتا تھا۔

''ہاں !''وہ اچھل کر صوفے پر کھڑی ہوئی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے، جھک کر اُسے دیکھا۔

''آپ گھر آتے ہیں اور ہر وقت غصّہ کرتے ہیں۔ ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں کہ ''اُس نے رک کر آنکھیں اور بھنویں چڑھائیں ''نشمیہ! تم ابھی تک کیوں جاگ رہی ہو؟ تم نے دودھ کیوں نہیں پیا؟ کیا تم نے برش کیا؟ کبھی پیار نہیں کرتے مجھے۔'' کمر پر ہاتھ ٹکائے وہ علی کے بالکل سامنے کھڑی اُسکی نقل اتارتے ہوئے، رضا کو مسکرانے پر مجبور کر گئی، البتہ اتنا لمبا شکایت نامہ سن کر اُسکے باپ کو تو غش ہی آ گیا۔

''بالکل خیال نہیں رکھتے آپ میرا!'' تمام باتوں کا ماخذ بتا کر وہ واپس دھپ سے اپنی سابقہ پوزیشن میں بیٹھ گئی۔

''تم نے میرا خیال رکھا ہے کبھی؟ ہاں؟ گھر آتے ہی کبھی اپنے باپ سے پانی کا گلاس بھی پوچھا ہے؟ جب گھر آؤ تمہاری فرمائشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ میری چاکلیٹ کہاں ہے؟ مجھے آئس کریم کھانی ہے، مجھے گول گپے کھانے ہیں۔ کبھی پوچھا بھی ہے مجھ سے کہ میں نے کھانا کھایا یا نہیں؟'' اُسے تو ہمیشہ چار سالہ بچی سے دوبدو لڑنا ہوتا تھا، سو ابھی بھی وہی کیا۔

''میں تو چھوٹی ہوں نا!'' اُس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''ہاں! اپنی باری آئے تو تم چھوٹی بن جایا کرو، ورنہ زبان چلانے میں تو تم مجھ سے بھی بڑی ہو۔'' اس نے تپ کر کہا۔

''زبان کیسے چلتی ہے؟'' اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔ قریب بیٹھا رضا دلچسپی سے دونوں کو چونچیں لڑاتا ہوا دیکھا رہا تھا، آپس میں لڑتے ہوئے دونوں بہت پیارے لگ رہے تھے۔ نہیں! ایک منٹ!۔۔۔ صرف نشمیہ، علی ہر گز پیارا نہیں تھا۔ اُس نے رک کر تصیح کی، پھر گلا کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو دونوں اُسکی جانب متوجہ ہوئے۔

''آئندہ اسکول سے مت نکلنا نشمیہ! ورنہ مجھے تمہیں اسکول سے سسپینڈ (عارضی طور پر نکالنا) پڑے گا۔'' اس مرتبہ اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب اس بات کا؟'' علی نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا، اُسے یقیناً یہ دھمکی بری لگی تھی۔

''اِس نے اسکول کا اصول توڑا ہے، اور اصول سب کے لیے برابر ہوتے ہیں۔ اگلی بار اُسے وارننگ (تنبیہہ) نہیں دی جائیگی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جانا چاہتا ہے۔ علی بھی سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں بس یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسکول کا گارڈ کہاں تھا اُس وقت؟'' رضا نے کوٹ درست کرتے ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''اس نے ابّا کو بتایا تھا کہ گارڈ اُس وقت سو رہا تھا۔'' علی نے بس اتنا ہی کہا۔ یعنی رضا کو، نشمیہ سے بس بس اسی لیے ملنا تھا تاکہ وہ عملے کی غفلت کی اصل وجہ معلوم کر سکے۔ اور اُس نے ابھی دروازے پر اُسے کیا کہا تھا؟ کہ وہ نشمیہ کے لیے فکر مند تھا کیونکہ علی نے اُسے ڈانٹا تھا۔ بدتمیز! کبھی جو اسکو تپانے کا موقع ضائع جانے دے۔

''گارڈ سے بھی اسکا حساب لے لوں گا۔'' وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔ علی دروازے تک اُسکے ساتھ آیا، دونوں کے درمیان پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ دروازہ پار کر کے وہ گلی میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی تک آیا، پھر جیب سے چابی نکال کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ علی کو لمحے بھر کے لیے وہ یونیورسٹی کے زمانے کا حالات سے ستایا ہوا، خاموش طبع مگر دھیمے مزاج کا رضا یاد آیا۔ وہ لڑکا یاد آیا جسکے کیبن جیسے کمرے میں، فقط چند لمحوں کے لیے ہی کھڑے ہونے پر اُسکا دم گھٹنے لگا تھا۔ اور یہ؟ یہ کون تھا؟ کتنا بدل گیا تھا یہ؟

اس سے پہلے کے وہ گاڑی میں بیٹھتا، وہ غیر محسوس سے انداز میں اُسکے پاس آ کھڑا ہوا۔ رضا نے رک کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''مجھے۔۔۔ مجھے کچھ۔۔۔ کہنا تھا تم سے۔'' اُس نے رک رک کر آہستہ سے کہا۔ صبح کی دھوپ میں اُسکا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ رضا نے گاڑی کا دروازہ بند کر کے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''کہو! اب کونسا الزام لگانا ہے؟'' علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''میں کل پریشان تھا۔ پریشانی میں جو کچھ تم سے کہا، اُسکے لیے شرمندہ ہوں۔'' آج اُس نے پھر معافی مانگنے میں پہل کی تھی۔

''تم واقعی شرمندہ ہو؟'' سوال تھا یا طنز؟ وہ خاموش ہی رہا۔

''میرا اور تمہارا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے شرمندہ ہوں۔'' اُس نے باور کروایا۔

''چلتا ہوں، خدا حافظ!'' سنجیدگی سے کہہ کر وہ گاڑی میں جا بیٹھا جبکہ علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

اس سے پہلے کے وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا، اُسکے فون پر آنے والی کال نے اسکی توجہ اپنی جانب کھینچی۔

حسین کی کال آ رہی تھی، اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اپنے دروازے پر کھڑا علی اب تک اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر فون اٹھایا۔

''تم میری جان نہیں چھوڑو۔۔۔۔۔''

''رضا! نوید کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے۔'' حسین کی پریشان کن آواز پر اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''کیا؟'' وہ چیخا تھا۔ دروازے پر کھڑے علی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''کیا مطلب فائرنگ؟'' وہ اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

''میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ فجر سے کچھ پہلے اُسکی گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی اور وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں ہے۔'' وہ بتاتا جا رہا تھا۔ رضا تیزی سے گاڑی سے باہر آیا۔

''تمہیں کس نے بتایا یہ؟''اُسکی متحیر صورت دیکھ کر علی بھی قریب آیا۔

''مقدّم نے اس گروپ پر میسیج ڈالا ہے جو نوید نے بنایا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں ہے شاید۔''رضا نے پریشان نظروں سے اپنے پاس آتے علی کو دیکھ،اجو سوالیہ چہرے سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''وہ کونسے ہسپتال میں ہے؟''

''اس بارے میں، میں نہیں جانتا۔ لیکن پتہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''تم معلوم کر کے مجھے بھی بتاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔''اُس نے فون کاٹ کر علی کو دیکھا جواب پریشان نظر آرہا تھا۔

''سب خیریت ہے؟ کیا ہوا ہے؟''اُس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''نوید۔۔۔فائرنگ ہوئی ہے اُسکی گاڑی پر، زخمی حالت میں ہسپتال لیجایا گیا ہے۔''اُس نے تیز ہوتے تنفس کے ساتھ بتایا تو علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

''کیا؟''وہ کتنی ہی دیر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔

''کہاں ہے وہ؟''اُس نے پریشانی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں!''

''میں۔۔۔میں نیوز چینل دیکھتا ہوں۔ کیا پتہ وہاں ہسپتال کے متعلق کوئی اطلاع ہو؟''علی تیزی سے اندر کی طرف بڑھا تو رضا بھی اُسکے پیچھے ہی اندر آگیا۔

اُس نے فوری طور پر ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر نیوز چینل لگایا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ٹکر چل رہا تھا۔

''سی ٹی ڈی آفیسر، ایس ایس پی نوید عالم کی گاڑی پر شر پسند عناصر نے اندھا دھند فائرنگ کی ہے، جسکے نتیجے میں اُنکا ڈرائیور موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا ہے، اور اُنہیں زخمی حالت میں ہسپتال منتقل کیا گیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق ایس ایس پی نوید عالم کو چھے گولیاں لگی ہیں۔''

''چھے گولیاں؟''علی کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ہمیں ہسپتال چلنا چاہیے۔''رضا نے فوراً کہا۔

''ہاں! چلو۔''وہ بھی تیزی سے مڑا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں؟''نشمیہ نے اُسے باہر جاتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں اپنے دوست کے پاس جارہا ہوں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''وہ اُسکے سر پر ہاتھ رکھتا ہوا، تیزی سے رضا کے پیچھے ہی باہر نکل گیا۔

---------+---------+-------

کچھ دیر قبل:

صبح پانچ بجے:

وہ اپنی ڈیوٹی پوری کر کے گھر واپسی کے راستے پر تھا۔آج اُسکا گاڑی چلانے کا دل نہیں تھا، بازو میں کچھ درد بھی تھا۔لہٰذا ڈرائیور کو ساتھ لایا تھا۔ابھی آدھا راستہ ہی گزرا تھا کے اُسے اپنے چہرے پر بہت تیز روشنی کا گمان ہوا۔چہرہ اٹھا کر دیکھا تو بیک ویو میرر میں اُسے کوئی گاڑی اپنے پیچھے دکھائی دی، جو ہیڈ لائٹ کو جلا بجھا رہی تھی۔پہلے اُس نے نظر انداز کیا لیکن جب بار بار یہی ہوا تو اُس نے آگے بیٹھے ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔

''اسے راستہ کیوں نہیں دے رہے؟''نوید نے پوچھا۔

''سر! میں کئی مرتبہ راستہ دے چکا ہوں پر یہ ہمارے پیچھے ہی چل رہا ہے اور بار بار فلیش دے رہا ہے۔''ڈرائیور نے بتایا، تو اُس نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''گاڑی کی نمبر پلیٹ نہیں ہے، تم سپیڈ تیز کرو۔جتنی تیز چلا سکتے ہو، اتنی تیز چلاؤ۔''تیزی سے کہتے اُس نے اپنی پستول نکالی اور اُسے لوڈ کیا۔

''سر! کیا یہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں؟''ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز کرتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں!''نوید نے کھڑکی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔پیچھے آنے والی گاڑی نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔

''سر! یہ ایک نہیں تین گاڑیاں ہیں۔''ڈرائیور یکدم ہی بولا۔اُسی لمحے دو مزید گاڑیاں اُنکے دائیں بائیں آگئی۔

''لعنت ہو۔۔۔''اُس نے لب بھینچتے ہوئے کہا۔اگلے ہی لمحے ایک چوتھی گاڑی یکدم ہی اُنکی گاڑی کے سامنے نمودار ہوئی اور ڈرائیور کا پاؤں جھٹکے سے بریک پر گیا، اُسی لمحے دونوں جانب سے گاڑی پر فائرنگ کی گئی تھی۔

''سر نیچے کرو!''اُس نے چیختے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت دی، اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک گولی سیدھا اُسکے ماتھے میں سوراخ کر کے دماغ میں جا گھسی اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔

''یعقوب!'' وہ چلایا، پر ڈرائیور مر چکا تھا۔ اس وقت اگر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہوتا تو کچھ بھی کر کے انکے نرغے سے گاڑی نکال لیتا مگر وہ اس وقت پیچھے والی سیٹ پر تھا۔ چاہ کر بھی آگے نہ جا سکتا تھا، فائرنگ چاروں جانب سے مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ بھی جوابی فائر کر رہا تھا کہ یکدم ہی اُسکے پستول میں موجود گولیاں ختم ہو گئی، پر سامنے والوں کی گولیاں ابھی باقی تھیں۔ اُس نے اپنا سر جھکا کر خود کو بچانا چاہا پر وہ اُن اندھا دھند گولیوں سے خود کو زیادہ دیر نہیں بچا سکا۔ نہ جانے اُسے جسم کے کس کس حصے میں گولی لگی تھی؟ گولیوں کی آواز آنا بند ہو گئی تھی یا اُسکا ذہن کام کرنا چھوڑ رہا تھا؟ اُسے نہیں معلوم تھا۔

بند ہوتی آنکھوں سے اُس نے اُن چاروں گاڑیوں کو وہاں سے جاتے دیکھا تھا۔ اُس لمحے اُسے بشریٰ یاد آئی، وہ یقیناً اُسکا انتظار کر رہی ہو گی۔ اُسے وحید بھائی یاد آئے، وہ تو ابھی اُسکے آخری کارنامے پر ہی اُس پر غصّہ تھے۔ اُسے جزا یاد آئی جو اُس سے ناراض تھی، اپنی ماں یاد آئی جن سے لپٹ کر وہ کبھی پیار نہ کر سکا تھا۔ آخری چیز جو اُسے یاد آئی وہ اُسکے دونوں بچے تھے۔ پھر اُسکی آنکھوں نے کھلا رہنے سے انکار کر دیا۔

گاڑی میں بو تھی۔۔۔

خون اور بارود کی بو۔۔۔۔

---------+---------+--------

''میرے پاس شیراز کا نمبر ہے، اُس نے مجھے نوید کا نمبر بھیجا تھا تو یقیناً میری چیٹ میں اُسکا نمبر محفوظ ہو گا۔ میں اُس سے ہسپتال کے بارے میں پتہ کرتا ہوں، اُسے یقیناً معلوم ہو گا۔'' وہ موبائل کا اسپیکر کان کے قریب کیے گروپ پر آئے، عمر کے صوتی پیغام (وائس نوٹ) کو سن رہا تھا۔

''کیا کہہ رہا ہے وہ؟'' پاس کھڑے علی نے بے چینی سے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے کہ معلوم کر کے بتائے گا کچھ دیر میں۔'' رضا نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

''تب تک ہم کیا کریں گے؟''

''انتظار کریں گے۔'' اس جواب پر تو اُسے غصّہ ہی آ گیا۔

''اُس پر حملہ فجر کے وقت ہوا تھا۔ اور اب اس بات کو پانچ سے چھے گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کسے معلوم کہ وہ کس حال میں ہے؟'' اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر نوید کے پاس پہنچ جائے۔ رضا نے موبائل جیب میں ڈالا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سنجیدگی سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا تم تھوڑی دیر کے لیے چپ رہ سکتے ہو؟''اتنی شرافت سے کی گئی درخواست پر علی نے لب بھینچے اور پاؤں پٹختے ہوئے دور جا کھڑا ہوا۔رضا نے گہری آہ بھری اور گاڑی سے ٹیک لگالی۔کچھ ہی دیر میں گروپ پر عمر کا پیغام موصول ہوا۔وہ ایک فارورڈ پیغام تھا، جس میں نوید کے ہسپتال کا نام اور پتہ موجود تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر علی کو دیکھا، وہ بھی اپنے موبائل پر میسیج دیکھ چکا تھا۔

''اب کیا اسے ساتھ لیکر جانا پڑے گا؟''اُس نے دل میں سوچا۔ علی اب اُسے یکسر نظر انداز کیے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''اُس نے بیساختہ ہی پوچھ لیا۔

''جہنّم میں! ساتھ چلو گے؟''علی نے تڑخ کر جواب دیا۔

''ہاں! میری گاڑی بہتر رہے گی۔ساتھ ہی آجاؤ۔''اُس نے ڈھٹائی سے کہتے ہوئے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ہاتھ سے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔وہ بھی اُسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے گاڑی تک آیا۔

''میں خود بیٹھ سکتا ہوں۔ ''اُسے جتاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ تھام لیا اور اندر بیٹھ گیا، اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتا رضا نے اُس پر ہاتھ رکھ دیا۔اُس نے رک کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے! میں نے تمہیں یہ کہا ہے کہ ہم دونوں کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے شرمندہ ہوں۔لیکن اسکا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تم واقعی شرمندہ ہونے والے کام کرو۔''وہ سنجیدہ تھا۔بے حد سنجیدہ۔۔۔

''تم چل رہے ہو؟ یا میں اپنی گاڑی میں جاؤں؟''علی نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔تو وہ بنا جواب دیئے پیچھا ہٹا اور اپنی طرف آکر بیٹھ گیا۔اُسکے بعد سارے راستے خاموشی چھائی رہی۔نوید سی ایم ایچ میں زیرِ علاج تھا۔اُسکی حالت کے مطابق کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا اب تک۔ ہسپتال کے احاطے میں ہی عمر، مقدّم اور حسین کھڑے دکھائی دیئے تھے۔علی تیزی سے اُتر کر اُن تک آیا۔

''کچھ معلوم ہوا؟''اُس نے بنا تمہید کے اُن سے پوچھا۔رضا پیچھے اپنی گاڑی بند کر رہا تھا۔

''ہاں! اُسکا صبح آپریشن ہو گیا تھا۔الحمدُ اللہ! خطرے سے باہر ہے اور ہوش میں ہے۔''عمر نے بتایا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

''کیا تم لوگ ملے اُس سے؟''پیچھے سے آتے رضا نے سوال کیا۔

''نہیں! اُسے پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کر رہے ہیں، اُسکے بعد مل سکتے ہیں۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''تم دونوں ساتھ آئے ہو؟''ایک شخص کو علی کا رضا کی گاڑی سے اترنا مشکوک کر گیا تھا۔اور وہ شخص یقیناً حسین ہی تھا۔

''کیا تم نے ہمیں الگ الگ آتے دیکھا؟'' یہ سوال رضا نے کیا تھا۔

''نہیں! پر جو دیکھا اُس پر یقین کرنا بھی تو مشکل ہے۔'' اُس نے کندھے اُچکائے۔

''رضا مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تھا، واپسی پر عمر کا میسیج آگیا، پھر اس نے مجھ سے ریکویسٹ (درخواست) کی کہ میں اُسکے ساتھ ہی ہسپتال چلوں تو میں اسکے ساتھ ہی آگیا۔'' علی نے اُسے سنجیدگی سے جواب دیا تو رضا نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''میں نے تم سے ریکویسٹ کی؟'' اُس نے سینے پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔ ''اور میں تم سے ملنے تمہارے گھر ہرگز نہیں آیا تھا۔''

''ہمیں اندر چلنا چاہیے۔'' علی اُسے نظر انداز کیے اندر بڑھ گیا۔ جبکہ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

''میں نے اس سے ریکویسٹ نہیں کی۔'' اُس نے باقی تینوں کو یقین دلانا چاہا جو کافی حد تک مشکوک ہو رہے تھے۔

''تم نے ریکویسٹ کی یا منت وسماجت، ہمیں کیا؟ چلو اندر چلیں۔'' حسین بے نیازی سے کہتا ہوا اندر بڑھ گیا۔

وہ جب وارڈ تک پہنچے تو وہاں فرخ صاحب، شیراز، فیصل اور دیگر عملہ پہلے سے ہی موجود تھا۔

''کیسے ہو تم سب؟'' فرخ صاحب نے اُنہیں سامنے دیکھ کر پوچھا۔

''آپ بتائیں نوید کیسا ہے؟'' عمر نے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ ایک گولی بازو چھو کر گزری ہے، دوسری ٹانگ میں لگی تھی۔ آپریشن کر کے نکال لی گئی ہے۔ خون بہنے کی وجہ سے بیہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا پر اب کافی بہتر ہے۔'' اُنہوں بتایا۔

''پر اُسے تو چھے گولیاں نہیں لگی تھی؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔

''چھے گولیاں؟ یہ کس نے کہا تم سے؟'' وہ اُس سے زیادہ حیران ہوئے۔

''ہم نے نیوز میں دیکھا تھا۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ نیوز والے بھی پتہ نہیں کیا کیا خبر چلا دیتے ہیں؟ اُسے دو ہی گولیاں لگی ہیں۔ باقی گولیاں بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اُسے نقصان نہیں پہنچا سکیں۔'' اُنہوں نے بتایا۔

''کیا یہ سب اُس قاتل کا کیا دھرا ہے؟'' مقدّم نے سوال کیا۔

''نہیں نہیں! یہ نوید کی ذاتی دشمنی کا معاملہ ہے۔''اُنہوں نے کہا۔

''پر تم لوگ پریشان نہ ہو،ایسی گولیاں ہم سال میں ایک دو مرتبہ کھا ہی لیتے ہیں۔یہ چھوٹی موٹی کارروائیاں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ تیں۔''اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا،البتہ چہرے پر اُنکے پریشانی واضح تھی۔ اُسی لمحے ڈاکٹر باہر آ گیا۔

''آپ لوگ مل سکتے ہیں اُن سے۔''وہ اُنہیں اطلاع دے کر چلا گیا۔

''تم لوگ مل لو اُس سے۔''فرخ صاحب نے کہااور قریب ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔وہ لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے،پھر سب سے پہلے علی ہی اندر داخل ہوا،پھر باقی چاروں بھی باری باری پیچھے آئے۔ہاں! چاروں۔۔۔حسین راہداری میں ہی کھڑا رہا۔

ہسپتال کا یہ پرائیویٹ وارڈ کافی کشادہ اور خوبصورت تھا۔بستر پر نوید ٹیک لگائے نیم دراز تھا،ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔چہرے پر ہمیشہ کی طرح سختی و سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔نِگاہیں فرش پر جمائے اُسکی سماعتیں پاس کھڑے اُن دو لوگوں کو سن رہی تھیں،جو اُسکے سر پر کھڑے آپس میں محو گفتگو تھے۔اُن میں سے ایک شخص تو اپنے حلیے سے کوئی وکیل لگتا تھا،جبکہ دوسرے شخص نے آن ڈیوٹی فوجی کی وردی پہن رکھی تھی۔اُسکے سینے پر اُسکا نام واضح تھا۔''میجر وحید عالم''وہ یقیناً نوید کا بڑا بھائی تھا۔اُسکے چہرے پر اتنے ہی سنجیدہ اور سخت تاثرات تھے،جتنے نوید کے چہرے پر تھے۔

''سیدھی سیدھی بات ہے،کہ وہ فرح کے آدمی تھے۔اُنہوں نے یقیناً نوید صاحب کو دھمکانے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔''وکیل نے سنجیدگی سے بتایا۔اس بات پر نوید کے چہرے پر طنزیہ مُسکراہٹ نمودار ہوئی تھی پر اُس نے کہا کچھ نہیں۔

''یہ کر کے اُس نے اپنا کیس خود خراب کیا ہے۔''دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے وحید نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔آپ عدالت میں ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ کام فرح کا ہے۔بلکہ آپ کا کیس مزید کمزور ہوتا جا رہا ہے۔مجھے لگتا ہے کہ اگلی سماعت پر شاید عدالت مقدمہ ہی ختم کر دے۔''وکیل نے جواب دیا۔باقی سب کچھ بھی نا سمجھتے ہوئے،اُنکی گفتگو سن رہے تھے۔نوید کی نظریں اب بھی فرش پر تھیں۔چہرہ بے تاثر اور سپاٹ تھا۔

''تو آپ اسکا کوئی حل نکالے وکیل صاحب،آخر آپکو کس لیے ہائر کیا ہے میں نے؟''وحید نے درشتی سے پوچھا تھا۔

''حل صرف ایک ہی ہے میجر وحید! اور وہ یہ کہ اگر ایس ایس پی صاحب(یعنی نوید)اپنی اہلیہ کو عدالت میں بیان۔۔۔''وکیل کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ نوید اور وحید نے بیک وقت جن نظروں سے اُسے دیکھا بلکہ گھورا تھا وہ گڑبڑا گیا۔

''میرا مطلب۔۔۔میں جتنا کر سکتا تھا اتنا کر چکا ہوں۔''اُس نے وضاحت دی۔

''تو جتنا کر چکے ہیں، اس سے زیادہ کریں۔ اب آپ جا سکتے ہیں، میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' وحید کے سنجیدہ لہجے پر وہ سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔

''میں رات کو واپس جا رہا ہوں، جانے سے پہلے تم سے مل کر جاؤں گا۔ اب تم آرام کرو۔'' وہ نوید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا، باقی کسی کی بھی طرف، ایک نظر بھی دیکھے بنا وہاں سے باہر چلا گیا۔ ظاہری طور پر وہ بالکل نوید جیسا مزاج رکھتا تھا۔ اُسکے جانے کے بعد علی، نوید کے قریب آیا۔

''کیسے ہو تم؟'' اُس نے پوچھا تو نوید نے نظریں اٹھا کر باری باری سب کو دیکھا۔

''تم لوگوں کو ہسپتال کا کس نے بتایا؟'' اِس سوال پر سب ہی بدمزہ ہوئے تھے۔ خود وہ کسی سوال کا جواب دیتا نہیں تھا اور اُن سے تھی کہ تفتیش ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔

''شیراز نے۔'' عمر نے جواب دیا۔

''آئی ول سی ہم (میں اُسے دیکھ لوں گا)۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیوں؟ غلط کیا ہم نے یہاں آ کر؟'' یہ چبھتا ہوا سوال رضا کی طرف سے آیا تھا۔

''نہیں! میں صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ اگر تم لوگ ایسے ہی ہر مرتبہ پریشان ہوتے رہے تو ہر دو تین مہینوں میں ہسپتال میں ہی ملاقات ہو گی۔ یہ میری نوکری کا حصہ ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ہم نے خبر سنی تھی کہ تمہیں چھے گولیاں لگی ہیں تو ہم پریشان ہو گئے۔'' عمر نے بتایا پر اس بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ پر سوچ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

''حسین بھی آیا ہے کیا؟'' اُس نے رضا کی طرف دیکھ کر پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو وہ باہر کیوں ہے؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''اندر آ کر بھی کیا کرتا؟ تم نے یہی کہنا تھا کہ فضول میں وقت برباد کیا یہاں آ کر۔'' یہ جواب مقدّم کی طرف سے آیا تھا جو جانچتی نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری بیٹی کیسی ہے؟'' اُس نے علی سے پوچھا۔ نوید عالم اپنی مرضی کے جواب دیتا تھا، ورنہ سوال ایسے ہی نظر انداز کیا کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا، پھر وہاں خاموشی چھا گئی۔ پانچ لوگوں کی موجودگی میں بھی وہاں خاموشی تھی، وہ لوگ ایک دوسرے سے زیادہ بات نہیں کر پا رہے تھے، یا خلا پر کرنا مشکل تھا لیکن پھر بھی پہلی ملاقات جیسا موت سا سناٹا بہر حال اب نہیں تھا۔ پھر چند لمحے اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں

کر کے ،اُس کو آرام کی تلقین کرنے کے بعد وہ لوگ باہر آ گئے۔البتہ دورانِ گفتگو نوید کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔شاید اُسے حسین کا انتظار تھا،پر وہ اندر نہیں آیا۔وہ باہر کھڑا فرخ صاحب سے محوِ گفتگو تھا۔

''مل لیا نوید سے ؟''اُنہیں باہر آتا دیکھ کر فرخ صاحب نے پوچھا۔

''تم لوگوں نے بلاوجہ زحمت کی،وہ بہتر ہے۔ایک دو دن میں ڈسچارج ہو جائے گا۔''اُنہوں نے وہی کہا جس کی توقع تھی۔

''ہم اپنی تسلی کے لیے آئے تھے۔پتہ ہوتا کہ گولیاں کھانا اُسکا مشغلہ ہے تو کبھی زحمت نہ کرتے۔''یہ تپا ہوا جواب مقدّم نے دیا تھا۔جواباً وہ بس مسکرا دیئے۔

''کیا حملہ کرنے والے اُسکے جانی دشمن ہیں ؟''حسین نے اُن سے پوچھا تھا۔

''ہاں !ایسا ہی سمجھ لو۔''

''اتنی شدید دشمنی کس کو ہے اور کیوں ؟''اُس نے پوچھا۔

''آہ!۔۔۔''وہ گہری سانس لیے اٹھ کھڑے ہوئے،پھر اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔''نوید مجھے بہت عزیز ہے،اُسکی زندگی میں کچھ ایسے مسائل ہیں،جسے میں فلحال زیرِ بحث نہیں لا سکتا۔پر وقت آنے پر ضرور بتاؤں گا۔''اُنہوں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔اُنکے لہجے میں کچھ تھا،کچھ ایسا جس نے اُنہیں سوچ میں ڈال دیا تھا۔

''میرا خیال ہے،ہمیں بھی اب چلنا چاہیے۔''رضا نے بلآخر گفتگو سمیٹی تھی۔اور پھر وہ ان سے مصافحہ کر کے ہسپتال سے باہر آ گئے۔

''نوید تمہارا پوچھ رہا تھا۔''پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے مقدّم نے حسین کے کان میں سرگوشی کی تھی۔عمر اور علی اُن سے آگے تھے،جبکہ رضا سب سے آگے اکیلا چل رہا تھا۔

''نائس جوک !(اچھا مذاق تھا)۔''اُس نے بے نیازی سے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں،منتظر نظروں سے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا کہ تم اب آؤ گے کہ تب۔'' جواباً حسین خاموش رہا۔

''تم نے پچھلی بار بھی ہسپتال میں اُس سے بات نہیں کی تھی اور آج بھی ملے بنا ہی چلے گئے۔تم اس سے ابھی تک ناراض ہو ؟''مقدّم اب سب جان گیا تھا،لہٰذا اُسکا دماغ کھانا اُسکا حق تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالتا حسین رکا تو وہ بھی رک گیا۔

''ہاں! ہوں میں ناراض، اور یہ میرا حق ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے اگر میں ہر بات مذاق میں اُڑا دیتا ہوں تو اسکا مطلب کیا میری عزت نفس نہیں ہے؟ یا میرے اندر انا نہیں ہے؟ اُس نے مجھے دروازے سے واپس لوٹایا تھا۔ اُسے جب تک اِس بات کا احساس نہیں ہوتا میں تب تک اُس کے لیے اپنا دل صاف نہیں کر سکتا۔'' مقدّم نے پہلی بار اُسے اتنا سنجیدہ دیکھا تھا۔

''تو پھر اُس سے ملنے کیوں آتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ناراضگی اپنی جگہ پر دوست تو ہے نہ وہ میرا۔'' وہ کندھے اُچکاتے کہتا آگے بڑھ گیا۔ وہ حیران سا رہ گیا، حسین مرتضیٰ کو واقعی کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پارکنگ میں تین ہی گاڑیاں تھیں۔ عمر اور مقدّم ساتھ آئے تھے، عمر کی گاڑی پر۔ علی، رضا کے ساتھ آیا تھا اور حسین اکیلے آیا تھا۔

''علی! میں آفس ہی جا رہا ہوں، اگر تم چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ، زیادہ اچھا رہے گا۔'' عمر نے گاڑی کے پاس رکتے ہوئے اُسے کہا۔

''ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' اُس نے تائید کی۔

''چلو مقدّم!'' اُس نے حسین کے ساتھ کھڑے مقدّم کو آواز دی۔

''تم جاؤ! میں حسین کے ساتھ جا رہا ہوں۔'' اُس نے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ؟'' اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتا حسین رکا اور حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! تمہارے ساتھ، تم نے ہی تو کہا کہ میرا آفس تمہارے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔'' اُس نے نظروں ہی نظروں میں اُسے کچھ سمجھانا چاہا۔

''آں ہاں! ہاں!۔۔۔ میں نے ہی تو کہا تھا۔ ٹھیک ہے! تم دونوں جاؤ۔ یہ میرے ساتھ آ رہا ہے۔'' اُس نے دانت نکالے تو عمر کندھے اُچکاتے گاڑی میں بیٹھ گیا، پھر وہ اور علی وہاں سے چلے گئے۔ رضا شاید جا چکا تھا، کیونکہ وہ پارکنگ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''کیوں بھائی؟ مجھ سے اتنی محبت کب سے ہو گئی تمہیں؟'' اُنکے جاتے ہیں حسین نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

''تم گاڑی اسٹارٹ کرو، میں تمہیں پوری داستان سناتا ہوں۔'' اُس نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''داستان؟ کس کی؟''

''تم سے محبت کی؟'' اُس نے دوبدو جواب دیا تو اُس نے ہنستے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی، اور وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ اُسکی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔

''کیا ہے یار؟'' دو تین بار کوشش کرنے کے باوجود بھی جب گاڑی نہ چلی تو اُس نے بیزاری سے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہاری گاڑی کو؟اُس دن ایف آئی اے کے باہر بھی بند ہو گئی تھی۔''مقدّم نے پوچھا۔

''یہ بس چاہتی ہے کہ میں اسے بیچ دوں۔''وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

''بیچ ہی دو اسے۔''وہ بھی باہر آ کر اُسکے برابر کھڑا ہوا۔حسین بونٹ کھولے فالٹ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اسکا ہر دوسرے دن کا مسئلہ ہے،اس بار تنخواہ جمع کر کے نئی گاڑی ہی لوں گا۔''وہ واقعتاً چڑ گیا تھا۔

''اس سے تو اچھا تھا کہ میں عمر کے ساتھ ہی چلا جاتا۔''مقدّم نے بونٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ہی سبز قدم کا نتیجہ ہے ورنہ صبح تو اچھی بھلی تھی۔''اُس نے موبائل پر کسی کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''میکینک سے بات کر رہے ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں!اور یہ یقیناً گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو گا۔افطار کے بعد ہی اٹھے گا۔''میکینک نے فون نہیں اٹھایا تو اُس نے بیزاری سے کہتے گاڑی بند کی۔

''پریشان نہ ہو،ابھی کوئی کیب کر لیتے ہیں۔افطار کے بعد میکینک کو لے آنا اور گاڑی لے جانا۔''

''یہی کرنا پڑیگا۔''اُس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے گاڑی بند کی،اُسی لمحے کسی نے زور سے ہارن دیا تو دونوں نے ہی مڑ کر دیکھا۔رضا اپنی گاڑی وہیں لے آیا تھا۔اب اندر سے اُنہیں اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟

''یہ گیا نہیں؟''مقدّم اُسکی موجودگی پر حیران ہوا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ جا چکا ہے۔''حسین بھی حیرت سے کہتے اُسکی گاڑی کے پاس آیا۔

''کیا ہوا؟''رضا نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

''بند ہو گئی،اور کیا؟''

''آؤ بیٹھو!میں ڈراپ (چھوڑ) کر دیتا ہوں۔''اُس نے پیشکش کی۔اور کچھ دیر بعد وہ تینوں اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔

''دو روزے گزر گئے ہیں اور میں ڈھنگ سے نہ گھر میں افطار کر سکا اور نہ ہی سحری۔۔۔''پیچھے بیٹھے حسین نے دکھ سے کہا۔

''دوسرا روزہ ابھی گزرا نہیں ہے۔''رضا کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے مقدّم نے تصحیح کی۔

''ایسے ہی حالات چلتے رہے تو یہ بھی گزر جائیگا۔ قسم سے! جب سے تم لوگ ملے ہو زندگی میں ایڈونچر ہی ایڈونچر چل رہے ہیں۔'' حسین نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

''شکر کرو پھر ہمارا، ورنہ تمہاری زندگی تو جمود کا شکار تھی یقیناً!'' اُس نے مذاق اڑایا۔ رضا خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا البتہ ان دونوں کو وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی موضوع مل ہی جا رہا تھا گفتگو کے لیے، جسکی وجہ سے گاڑی میں کچھ لمحوں کے لیے بھی خاموشی نہیں چھائی تھی۔

''تم کیوں اتنے چپ ہو رضا؟'' یکدم ہی مقدّم نے اس سے پوچھا تو وہ مسکرایا۔

''میں تم دونوں کے درمیان ہمیشہ خاموش ہی رہتا تھا۔'' اس جواب پر وہ دونوں ہی دل سے مسکرائے تھے، اُس کا ایک جملے پر محیط جواب بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کا زمانہ، جہاں اُن تینوں نے چھے سال ساتھ گزارے تھے، ایک ہی کلاس میں ایک ہی بینچ پر پڑھتے ہوئے۔ علی، عمر اور نوید نے تو فیلڈ تبدیل کر لی تھی، پر وہ تینوں بی بی اے کے بعد بھی ساتھ رہے تھے۔ جہاں وہ دونوں اسی طرح بے پر کی ہانکتے رہتے تھے اور رضا اُنکی باتوں پر یا تو سر پیٹتا تھا یا سر دھنتا رہ جاتا تھا۔

''تم سے ایک بات پوچھوں حسین؟'' رضا نے بیک ویو مرر میں اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم اتنے فرمانبردار کب سے ہو گئے؟ اجازت لے کر پوچھ رہے ہو؟'' حسین کے جواب پر اُس نے آئینے میں سے ہی اُسے گھورا تھا۔

''یہ تمہارے نوید سے کون سے تنازعات چل رہے ہیں؟ میں نے نوٹس کیا ہے کہ تم اس سے نہ ملے ہو نہ اب تک بات کی ہے اُس سے۔'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ مقدّم نے چور نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ اُسکا مطلب حسین نے رضا کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔

''یہ میرا اور اُسکا مسئلہ ہے، تمہیں کیوں بتاؤں؟'' اُس نے بھی کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''میرے مسئلوں میں تو تم جوتوں سمیت گھس جاتے ہو۔'' اُس نے تپ کر کہا۔

''ہاں! کیونکہ وہ میرے اور تمہارے مسئلے ہوتے ہیں۔'' اُسکی بے سر و پا باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' اُس نے اتنا ہی کہا تو مقدّم اور حسین ہنس پڑے تھے۔

''نوید کو چھوڑو! یہ بتاؤ کہ تم اپنے جگری دوست کے گھر کیا کر رہے تھے صبح ہی صبح؟'' حسین نے اُسکی سیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے ہوتے ہوئے پوچھا تو مقدّم نے بیساختہ امڈتی ہنسی روکی۔

''وہ میرا دوست نہیں ہے۔'' ناراضگی سے کہا۔

''چلو جو بھی ہے ؟پر صبح ہی صبح اُس سے ملاقات کرنے کی وجہ ؟''اُس نے اپنی تھوڑی کرسی کی پشت پر ٹکاتے ہوئے رضا کو دیکھا۔

''یہ میرا اور اُسکا مسئلہ ہے تمہیں کیوں بتاؤں ؟''اب کہ وہ دونوں قہقہ لگا کر ہنسے تھے۔اُن دونوں کی نوک جھونک میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور حسین کا گھر آ گیا۔

''رمضان نہ ہوتا تو تم دونوں کو چائے پیئے بنا جانے نہ دیتا۔''اُس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''تو کیا بچوں سے ملنے کے لیے بھی رمضان ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑیگا؟''رضا نے پیچھے مڑ کر اُس سے پوچھا تو اُسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

''ہاں !ہاں !کیوں نہیں۔۔۔تم لوگ اندر آؤ۔''وہ خوش دلی سے کہتا گاڑی سے اترا اور گھر کی بیل بجائی،وہ دونوں بھی باہر آئے۔اُسی لمحے گھر کا دروازہ کھلا اور کھولنے والی کی نظریں شاید اُن دونوں پر نہیں پڑی تھیں۔

''یہ تم آج کل کچھ زیادہ ہی آوارہ نہیں ہو گئے ہو ؟نہ سحری نہ افطار کرتے ہو گھر پر۔۔۔سچ سچ بتاؤ کیا گل کھلا رہے ہو آج کل ؟''حور عین کی فر فر چلتی زبان پر جہاں رضا مسکرایا تھا،وہیں مقدّم حیران ہوا تھا۔اُسے اُمید نہیں تھی کہ اُس سے سامنا ہو جائے گا۔

''اِس سے ملو،میری بیوی حور عین۔۔۔''اُسکے سوالات سے بچنے کا اچھا طریقہ یہی تھا کہ اُسے ہی تعارف کے لیے آگے کر دیا جائے۔جہاں حور عین اُن دونوں کو دیکھ کر سٹپٹائی تھی وہیں لفظ بیوی پر مقدّم تو شاک ہی رہ گیا۔

''ارے !تم دونوں ؟''حور عین کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ دس سال بعد اُن دونوں کو دیکھ رہی ہے۔

''یہ تمہاری بیوی ہے ؟''مقدم کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

''ہاں !یہی لکھی تھی قسمت میں اب کیا کر سکتے ہیں ؟''اُس نے بیچارگی سے کہا۔

''ارے نہیں !میرا مطلب تمہاری بیوی تو۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے یکدم ہی رکا۔

''ہاں !ہاں !بولو۔۔۔رک کیوں گئے ؟تم نے اِسکی کوئی اور بیوی دیکھی ہے نا؟''حور عین کے سوال پر وہ گڑبڑایا۔

''نہیں نہیں !میرا وہ مطلب نہیں تھا۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینے لگا۔

''اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے مقدّم !سچ سچ بتاؤ،اِس نے کسی اور عورت کو بھی اپنی بیوی کہہ کر ملوایا ہے نہ تم سے ؟''وہ کمر پر ہاتھ رکھے لڑاکا عورتوں کی طرح پیچھے لگ گئی،مقدّم بیچارہ تو کہہ کر پچھتا رہا تھا،وہ اُسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

''ارے نہیں بھئی !''حسین نے کچھ کہنا چاہا۔

''تم چپ کرو۔''اُس نے حسین کو آنکھیں دکھائیں اور دوبارہ مقدّم کی طرف گھومی۔''تم نے اسکی دوسری بیوی دیکھی ہے نا! مجھے پہلے ہی شک تھا اس پر۔۔۔''

''ارے دوسری تم ہو، اُس نے پہلی دیکھی ہے۔''حسین کے زور سے کہنے پر اُس نے رک کر اُسے گھورا اور پھر دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔

''یہ بیچارہ ڈر گیا ہے، یہی بیوی ہے میری بھائی! اور اسکے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا، دونوں گالوں پر ڈمپل واضح ہوئے تھے۔

''تو یہ مذاق تھا؟''مقدّم کی رکی ہوئے سانسیں بحال ہوئی تھیں۔

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔''کافی دیر سے خاموش کھڑے رضا نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا؟ کہ یہ حسین کی بیوی ہے؟''مقدّم نے پوچھا۔

''نہیں! یہ کہ یہ دونوں تمہارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''آپ کیسے ہیں رضا بھائی؟''اُس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''اُس نے آسودہ سی مسکان کے ساتھ کہا تھا۔

''تم نے دروازے پر کیوں کھڑا کر رکھا ہے ان دونوں کو؟''اب کے اُس نے حسین سے پوچھا۔

''آپ اندر آنے دیں گی، تو دونوں آئیں گے نا!''اُس کہا۔

''اوہ! سوری سوری۔۔۔''وہ جلدی سے دروازے سے ہٹی تھی۔

اب وہ اندر جا رہے تھے، مقدّم نے کوئی جملہ کسا تھا، جسکا حسین نے دوبدو جواب دیا تھا۔ حور عین اس بے تکے لطیفے پر ہنس رہی تھی، رضا ناراضگی سے دونوں کو گھور رہا تھا جن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

سال گزر گئے تھے۔

پر لوگ اتنے بھی نہیں بدلے تھے۔

وقت نے اُن چاروں کو ایک بار پھر اکھٹا کر دیا تھا۔

--------+---------+----------

''آج کل زندگی میں اتنا کچھ ہو رہا ہے کہ روزمرہ کے معمولات تو ڈسٹرب ہو کر رہ گئے ہیں۔''علی اور عمر آفس کے راستے پر تھے جب عمر نے اُسے مخاطب کیا۔

''ہاں! کچھ عجیب سا ہو گیا ہے سب کچھ!''علی نے بھی تائید کی۔

''تمہاری بیٹی کیسی ہے؟''عمر نے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہے بالکل! بس صبح سے ناراض بیٹھی ہے مجھ سے۔''بیٹی کے ذکر پر وہ مسکرایا۔

''رضا واقعی تم سے ملنے آیا تھا؟''عمر کو اب تک یقین نہیں آیا تھا۔اس سوال پر علی ہلکے سے ہنسا۔

''نہیں! وہ نشمیہ سے ملنے آیا تھا۔''اُس نے سچ بتا دیا۔کچھ دیر گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔

''تمہارا شکریہ!''یکدم ہی گاڑی میں علی کی آواز گونجی تو عمر حیران ہوا۔آفس چند لمحوں کی دوری پر رہ گیا تھا۔

''کس لیے؟''اُس نے آفس کی پارکنگ میں گاڑی داخل کرتے ہوئے،اُسکی طرف ناسمجھی سے دیکھا۔

''گو کہ، پچھلے دو سالوں میں ہم نے کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی، لیکن پچھلے دنوں تم نے جو بھی کیا۔اُن سب کے لیے شکریہ!''علی نے سنجیدگی سے کہا۔عمر نے پارکنگ میں گاڑی روک کر اُسے دیکھا۔

''مثلاً؟ کیا کیا میں نے؟''عمر نے نے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

''اگر تم اس روز مجھے نہ سمجھاتے تو شاید مجھے اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس نہ ہوتا۔''اُس نے کہا تو عمر مسکرا دیا۔

''چلو! آفس آ گیا ہے۔''عمر نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔پھر دونوں ہی آفس کی بلڈنگ کی طرف بڑھنے لگے۔بلڈنگ میں داخل ہو کر اپنے مطلوبہ فلور تک پہنچنے تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

''تم نے ایک بات نوٹ کی؟''لفٹ سے باہر نکل کر اپنے آفس کے فلور میں داخل ہوتے ہوئے علی نے یکدم ہی کہا تو عمر نے قدم آہستہ کر کے اُسے دیکھا۔

''کونسی بات؟''

''حسین، نوید سے نہیں ملتا، نہ بات کرتا ہے اور نہ ہی اُسکی طرف دیکھتا ہے۔''عمر نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے رک کر اُسے دیکھا۔

''یہ اُسکی نوید کے لیے ناراضگی ہے۔''اُس نے کہا تو علی تھوڑا حیران ہوا۔

''اُسکی نوید سے کیسی ناراضگی ؟اصولاً تواُسے مجھ سے ناراض ہونا چاہیے۔پر جب وہ مجھ سے مل سکتا ہے تو نوید سے کیوں نہیں ؟''

''تم سے کیوں ؟''عمر کے سوال پر علی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔

''میرے کھاتے بہت سے لوگوں کا قرض ہے۔''اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ اس بات پر عمر خاموش رہا۔

''خیر !نوید سے کیا مسئلہ ہے اُسے ؟''علی نے دوبارہ پوچھا۔

''میں زیادہ کچھ نہیں جانتا پر یہ کہ شاید وہ نوید سے ملنا چاہتا تھا پر اُس نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔اس بات پر ناراض ہے وہ۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ نوید ایسا کر سکتا ہے۔''علی کو یقین نہ آیا۔

''کہا تو اُس نے یہی ہے۔''اُس نے کندھے اچکا دیئے۔ وہ دونوں آفس کے درمیان میں کھڑے محو گفتگو تھے۔

''ہمم !''وہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

''علی !۔۔۔''عمر نے پکارا تو وہ رکا۔

کیبن میں بیٹھے آفس ورکرز اُنہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ گو کہ وہ اُن دونوں کی آوازیں نہیں سن سکتے تھے پر جس طرح وہ دونوں ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے،وہ اُنکے لیے قابل حیرت تھا۔کیونکہ وہ دونوں سوائے میٹنگ کے یا اسٹوڈیو میں کام کرنے کے کبھی ساتھ نظر نہیں آتے تھے۔اور وہاں بھی دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہتی تھی۔

''کیا ہوا؟''علی نے پوچھا۔ عمر چند قدم چل کر اُسکے قریب آیا۔

''جانتے ہو مقدّم یہاں سے کیوں گیا تھا؟''اُس نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جس دن تمہارا ولیمہ تھا۔اُس روز لیلیٰ اغوا ہو گئی تھی۔وہ اُسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔لیکن جب اُسے تلاش کیا تو وہ قتل ہو چکی تھی۔اُسے اُسکے اپنے بھائی نے قتل کیا تھا علی !اور اُسکے بعد۔۔۔۔''عمر رکا۔ علی سانس روکے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''اُسکے بعد ؟''علی نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''اُسکے بعد وہی ہوا تھا،جو اُس نے تمہیں ایف آئی اے کے آفس میں بتایا تھا۔لیکن تم جانتے ہو اُس نے مجھ سے کیا کہا؟''عمر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔اس مسکراہٹ میں بھی دکھ واذیت رقم تھی۔ علی دم سادھے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''اُس نے کہا کہ علی میرا بھائی تھا۔ میں اُسے کبھی چھوڑ کر نہ جاتا، اگر لیلیٰ کو میں اُس سے زیادہ نہ چاہتا۔'' علی کو لگا کہ اس لمحے میں، اس وقت میں وہ شاید رو دے۔

''میں نے تمہارا گریبان پکڑا، اُسکے لیے میں شرمندہ ہوں۔ پر میں نے تمہیں اُس روز اسی لیے روکا تھا، کہ میں تمہیں سمجھا سکوں کہ مقدّم تمہیں چھوڑ کر فرار نہیں ہو سکتا۔'' وہ اُسے شرمندہ نہیں کر رہا تھا۔ بس چاہتا تھا کہ وہ مقدّم کی طرف سے اپنا دل صاف کر لے۔ وہ حقیقتاً ایک سچا دوست تھا۔

''میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ میں غلط تھا۔ میری زبان اور میرے مزاج نے مجھے سوائے پچھتاؤں کے اور کچھ نہیں دیا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں سوائے میرے۔'' اُس آہستگی سے کہا۔ آج بلآخر علی سفیر نے بھی غلطی تسلیم کر لی تھی۔

''غلط میں بھی تھا، غلط نوید بھی تھا اور یقیناً ارضا بھی۔ کسی ایک کی غلطی کا نتیجہ سب کی لاتعلقی نہیں ہوتا۔ ایسا تب ہی ہوتا ہے، جب قصوروار سب ہی ہوں۔'' عمر نے کھلے دل سے اُسکی غلطی بانٹ لی تھی۔ آج ایک دہائی بعد اُنہیں وہ سمجھ آ گیا تھا جو، وہ اُس روز نہ سمجھ سکے تھے۔ اگر سمجھ جاتے تو معاملات یہاں تک نہ پہنچتے۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' عمر نے یکدم ہی پوچھا۔

''ٹھیک ہے اب!'' اُس نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جسکے پاس نشمیہ جیسی بیٹی ہو وہ بھلا کتنی دیر بیمار رہ سکتا ہے؟'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔ عمر بھی مسکراتے ہوئے اپنے آفس کی جانب بڑھ گیا، جبکہ باقی تمام عملے کے لیے بس غش کھا کر گرنا ہی باقی رہ گیا تھا۔ بھلا کب سے اُنکے یہ دونوں باس آپس میں اسطرح مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تھے؟

رمضان کی وجہ سے آفس جلدی بند ہو گیا تھا، عمر اُسے گھر تک چھوڑنا چاہتا تھا پر اُس نے منع کر دیا۔ وہ کیب کر کے بازار آ گیا تھا۔ اُسے کچھ خریداری کرنی تھی، خریداری کیا تھی؟ بس وہ نشمیہ کے لیے اپنے پیسوں سے کچھ چیزیں خریدنا چاہتا تھا، دوسرے لفظوں میں اپنی کمائی اپنی بیٹی پر خرچ کرنا چاہتا تھا۔ اُسکے رزق میں نشمیہ کا حصہ تھا۔ اب تک جن پیسوں پر وہ پل رہی تھی، وہ دوسروں کے تھے، پر اب وہ اُسے اُسکا حق دینا چاہتا تھا۔ شاپنگ مال میں داخل ہوا تو دوسرا روزہ ہونے کے باوجود بھی خریداروں کا جم غفیر اُمڈ آیا تھا۔ اُسے سمجھ نہ آیا کہ کہاں سے شروعات کرے؟ پہلے وہ کپڑوں کی دکان پر آیا۔ ایک اندازے سے نشمیہ کے سائز کے کپڑے خریدے۔ سب ہی اتنے پیارے تھے کہ اُسکا دل کر رہا تھا کہ سارے خرید لے۔ اُسکے لیے کچھ جوتے اور سینڈلز لیے، پھر کچھ کھلونے، بچیوں کا باربی والا کمبل، ایک ڈول ہاؤس اور دو تین باربی ڈول بھی خرید لیں۔ اتنی خریداری کے بعد بھی اُسکا دل نہ بھرا تھا، وہ تو افطار میں ایک گھنٹہ رہ گیا تو اُس نے باقی خریداری بعد کے لیے چھوڑ دی۔ واپسی پر اُسے ایک اسٹال نظر آیا، جہاں چھوٹی بچیوں کے لیے رنگ برنگی پونیاں، کلپز اور

ہیئر بینڈ وغیرہ تھے۔اُسے وہ اچھے لگے، نشمیہ کے بالوں پر وہ واقعی بہت پیارے لگتے،اُس نے وہ بھی خرید لیے۔ اُسکے لیے دل بھر کر خریداری کر کے جب وہ گھر پہنچا تو افطار میں کچھ لمحے ہی باقی تھے۔پر جس شے نے اُسے حیرت میں مبتلا کیا وہ تھی لان میں نشمیہ کی موجودگی۔وہ یقیناً اُسکا انتظار کر رہی تھی۔ علی کو اس پر پیار آیا۔

''نشمی! کیا کر رہی ہو یہاں؟''اُس نے پاس آتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپکا صبح سے انتظار کر رہی ہوں۔''اُس نے ناراضگی سے کہا۔

''کیوں؟''اُس نے رکوع میں جاتے، جھک کر اُس سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں بور ہو رہی تھی اور مجھے کارٹون دیکھنا تھا۔''

''میں کارٹون ہوں؟''اُس نے مصنوعی ناراضگی سے پوچھا۔

''نہیں!۔۔۔ہی ہی ہی۔''وہ دانت نکال کر ہنسی۔

''تو ابّا سے کہہ دیتی، وہ لگا دیتے۔''

''مجھے آپکے ساتھ دیکھنا تھا۔''اُس نے منہ بناتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

''اچھا چلو! ہم افطار کے بعد کارٹون دیکھیں گے۔ٹھیک ہے؟''اُس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہوئی۔

''سچی؟''

''ہاں! چلو اب جلدی اندر چلو۔''

''یہ۔۔''وہ خوشی سے چہکتی اندر بھاگ گئی۔عام بچوں کی طرح اُس نے علی کے ہاتھ میں اتنے سارے شاپنگ بیگز دیکھ کر نہیں پوچھا کہ وہ اُسکے لیے کیا لایا ہے؟ بچے تو متجسس ہوتے ہیں۔یا پھر شاید اُسے کبھی عادت ہی نہیں رہی ہو گی کہ کوئی اُسکے لیے بھی کچھ لیکر آئے گا۔وہ شاپنگ بیگز صوفے پر رکھ کر سیدھا افطار کرنے آ گیا، کچھ ہی دیر رہ گئی تھی، اذان کا وقت قریب تھا۔

''نشمی! چلو میرے لیے دعا مانگو۔''سفیر صاحب نے اُسے مخاطب کیا۔

''کیا مانگوں؟''اُس نے پوچھا۔

''کہ اللہ مجھے صحت دے، اپنے گھر آنے کی دعوت دے۔ اور جو تمہارا دل چاہے، وہ اپنے لیے بھی مانگ لو، اللہ بچوں کی دعا جلدی قبول کرتا ہے۔'' اُنہوں نے پیار سے کہا۔

''اور میں آپکے لیے کیا مانگوں؟'' اُس نے علی کو مخاطب کیا۔

''جو تمہارا دل چاہے۔'' اُس نے پیار سے کہا۔

''کچھ بھی مانگ لوں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!''

''اللہ تعالیٰ مجھے ڈول ہاؤس دے دیں، مجھے بہت سارے کھلونے دے دیں، اور مجھے نوڈلز دے دیں، اور مجھے پرنسز والی فراک دے دیں آآآمین۔۔۔'' آخر میں لمبا سا آمین کہا گیا۔ سفیر صاحب اور علی دونوں ہی ہنس دیئے۔

''یہ تو تم نے سب اپنے لیے مانگ لیا۔'' علی نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

''آپکے لیے ہی تو مانگا۔ اگر مجھے مل جائیگا تو پھر میں آپکو تنگ نہیں کروں گی نا!'' اُس نے کافی عقلمندی سے کہا۔

''اگر تمہاری دعا قبول ہو گئی تو کیا کرو گی؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں خوش ہوں گی۔'' اس جواب پر وہ بس مسکرا دیا، کیونکہ اُسکی دعائیں قبول ہونے والی تھیں۔

افطاری کے بعد اُس نے اُسے پاس بلایا اور اُسے ساری چیزیں دے دیں۔

''یہ لو، تمہاری دعا قبول ہو گئی۔'' اُس نے ڈول ہاؤس اُسکے سامنے رکھتے ہوا کہا۔

''یہ سب میرا ہے؟'' اُس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں!''

''سچ میں میرا ہے؟''

''سچ میں تمہارا ہے۔'' اُس نے یقین دلایا۔

اُسکے بعد کتنی ہی دیر وہ اُن چیزوں کو ہاتھ میں لیکر دیکھتی رہی تھی اور علی محبت پاش نظروں سے اُسے۔ رات وہ اپنی گڑیا اور بھالو کو ساتھ لیکر سو گئی تو وہ لاؤنج میں چلا آیا، کچھ وہ نوید کی وجہ سے پریشان بھی تھا، کچھ اُسے آفس کا کام بھی تھا تو وہ لیپ ٹاپ لیکر وہیں بیٹھ گیا۔ اُسکا دل بوجھل تھا، جس روز اُس نے گاڑی میں نشمیہ کو بابا کہنے پر ڈانٹا تھا، اُس کے بعد سے اُس نے علی کو اب تک بابا نہیں کہا تھا۔ اب جبکہ وہ اُسکے منہ سے اپنے لیے بابا سننا چاہتا تھا تو وہ اُسے **سنیں یا آپ** کہہ کر مخاطب کر لیا کرتی تھی۔ اپنے آپ پر غصّہ بھی آیا اور دل اُداس بھی ہوا۔ سر جھٹک کر دوبارہ کام کرنے لگا پر ذہن اُلجھا ہوا تھا، اُسی لمحے کوئی اُسکے برابر آ بیٹھا۔ اُس نے چہرہ موڑ کر دیکھا تو وہ اُسکے برابر آ کے بیٹھ گئی تھی۔

''نشمی! سوئی کیوں نہیں اب تک؟'' اُسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تو اُس نے جواب نہیں دیا۔

''بھوک لگی ہے تمہیں؟'' اُس نے پوچھا تو جواباً اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا ہوا؟ پاؤں میں درد ہے کیا؟'' اب کہ وہ پریشان ہوا۔

''نہیں!''

''تو پھر کیا ہوا ہے بیٹا؟''

''آپ میرے لیے جو چیزیں لائے ہیں وہ سب میری ہیں؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا تو علی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ اُن چیزوں کے لیے اتنی بے یقین تھی کہ نیند سے اٹھ کر بھی اُس سے وہی پوچھ رہی تھی۔

''ہاں! وہ سب تمہارے ہیں۔''

''کوئی مجھ سے لے گا تو نہیں؟''

''نہیں میری جان! کوئی تم سے تمہاری چیزیں کیوں لے گا؟'' اُس نے اُسکے بال سہلاتے ہوئے یقین دلانا چاہا، پتہ نہیں کیا خوف تھا اُسے؟

''یعنی وریشا میری چیزیں نہیں لے گی؟'' اُس نے اُمید سے پوچھا تو اُسکے بالوں میں چلتی علی کی انگلیاں تھمی۔

''وریشا؟ کون وریشا؟'' وہ حیران ہوا۔

''وریشا میری کزن، وہ میری چیزیں چھین لیتی ہے۔'' اُس نے بتایا۔ فاطمہ کے دو ہی بھائی تھے، وریشا یقیناً اُن ہی میں سے کسی کی بیٹی ہو گی۔

''اور وہ تمہاری چیزیں کیوں لیتی ہے؟'' علی نے غیر محسوس انداز میں اُسے گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں! وہ میری ہر اچھی چیز چھین لیتی ہے۔وہ میرے کھلونے بھی لے لیتی ہے،اور میری پونی بھی اور میرے کلرز بھی۔ماموں نے مجھے بیگ لا کر دیا تھا،اُس نے وہ مجھ سے چھین لیا اور اپنا بیگ مجھے دے دیا۔آپکو پتہ ہے ؟اُسکا بیگ بہت گندا ہے۔''اُس نے دکھ سے بتایا۔

''تو جو بیگ تم لیکر جاتی ہو اسکول،وہ اُسکا ہے ؟''علی نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو تمہاری امی نے وہ واپس نہیں مانگا؟''

''مانگا تھا،پر مامی نے کہا کہ لینے دو،نشمیہ کو اپنا بیگ دے تو دیا اُس نے۔اور امی نے کچھ نہیں کہا۔''یعنی وہ اپنی بچی کا استعمال شدہ سامان دے کر اُسکے نئے سامان پر اپنا حق جتا رہی تھیں۔علی نے سوچا،لمحے بھر کو اُسے بہت غصّہ آیا،پر وہ چپ رہا تاکہ وہ آج اُسے سب بتائے۔

''ایک بار نانا میرے لیے اور اُسکے لیے چاکلیٹ لائے تھے۔وہ میری چاکلیٹ تھی،میری والی اُس نے لے لی۔میں نے اُس کے بیگ سے جا کر نکال لی۔وہ میری چاکلیٹ تھی،اُسکی نہیں تھی۔پھر اُس نے اپنے بابا کو شکایت لگائی اور اُنہوں نے مجھے۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔تھپڑ مارا اور بولا کہ میں۔۔۔۔میں۔۔چور ہوں۔''وہ بولتے بولتے یکدم ہی رو دی۔علی ساکت رہ گیا۔

''میں نے چوری نہیں کی تھی۔میں چور نہیں ہوں،وہ میری چاکلیٹ تھی بابا!۔۔وہ ساری میری تھیں۔''اُسکے بابا کہنے پر علی کا دل کٹ گیا،اُس نے سختی سے اُسے سینے میں بھینچ لیا،وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔اتنی سی بچی کی عزت نفس مجروح ہوئی تھی۔اُسے اپنا ماضی،اپنے ماموں کا تھپڑ نہیں بھولا تھا،اُسے چوری کا الزام نہیں بھولا تھا۔وہ بچی تھی،پر تجربہ اُسکا بچوں سے کہیں زیادہ تھا۔اُس لمحے علی کو ایک بار پھر فاطمہ سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔شدید نفرت۔۔۔

وہی تھی جو اپنی خواہشات کے بدلے اُسکی بیٹی کو اس نہج تک لائی تھی،اگر اُسکی بیٹی اُسکے پاس رہتی تو ایسا نہ ہوتا۔

''کوئی وریشا نہیں ہے یہاں پر،ہر چیز تمہاری ہے بیٹا!کوئی تم سے نہیں لے گا۔کوئی نہیں۔۔۔''وہ اُسکے سر پر پیار کرتے ہوئے اُسے نرمی سے سمجھا رہا تھا اور وہ روتی جا رہی تھی۔

---------+---------+--------

وہ بالکنی میں کھڑا چائے پی رہا تھا،افطار کے فوراً بعد اسی شے کی طلب ہوتی تھی اُسے۔دل آسودہ سا تھا،کوئی پریشانی نہ تھی،اور جو تھیں بھی وہ ایف آئی اے کے سر۔۔۔

چائے کا گھونٹ منہ میں لیتے اُسکی نظریں پڑوسیوں کے گھر تک گئیں۔جزا اپنی والدہ کے ساتھ پریشان کھڑی تھی،سامنے آرمی یا رینجرز کی موبائل کھڑی تھی۔نجانے کیا معاملہ تھا؟رضا چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتا باہر نکلا،پھر گلی میں آ گیا،جہاں وہ دونوں خواتین کھڑی تھیں۔

''امی! وہ کہہ تو رہا ہے کہ بھائی ٹھیک ہیں۔ تو آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟'' جزا نے کہا۔

''مجھے نہیں پتہ! مجھے اُسے دیکھنا ہے۔'' جزا کی والدہ نے کہا۔

''آنٹی! مجھے میجر وحید نے بھیجا ہے، تاکہ آپکو اُنکی خیریت پہنچادوں۔ لیکن اگر آپ پھر بھی جانا چاہتی ہیں، تو میں آپکو ساتھ لے جاتا ہوں، پر آپ زیادہ دیر نہیں رک سکتی وہاں، بس مل کر واپس آجایئے گا۔''

''ٹھیک ہے! میں بس تھوڑی ہی دیر بیٹھوں گی اُسکے پاس۔'' وہ راضی ہو گئیں۔

''آپ جائیں امی! میں یہیں ہوں۔'' جزا نے اُنہیں گاڑی میں بیٹھنے میں مدد کی، اور پھر وہ وہاں سے چلی گئیں۔ جبکہ خود وہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہی۔

''کیا ہوا ہے جزا؟'' رضا نے اُسکے پاس آتے ہوئے پوچھا تو وہ چونکی۔ پھر ایک گہری سانس لیکر بولی کہ۔

''رضا! میرا بھائی یاد ہے تمہیں؟ وہ جو اُس دن تمہارے گھر آیا تھا؟'' اُس نے پریشانی سے نوید کا ذکر کیا تو رضا کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''آں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ پولیس والا؟'' اُس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! وہی، میرے بھائی پر آج صبح حملہ ہوا ہے۔ اُسے چھے گولیاں لگی ہیں، زخمی ہے۔'' اُس نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''اوہو! تم پریشان نہ ہو، ٹھیک ہی ہو گا۔'' اُس نے کہا تو جزا نے اُسے بے یقینی سے دیکھا۔

''میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ اُنہیں چھے گولیاں لگی ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ پریشان نہ ہو؟''

''چھے نہیں، دو گولیاں لگی ہیں اُسے۔'' اُسکے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' اُس نے مشکوک ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ وہ نیوز میں آیا تھا۔'' اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''میں نے تو ایسی کوئی نیوز نہیں دیکھی۔'' وہ مزید مشکوک ہوئی۔

''پر میں نے دیکھی ہے، اسی لیے تو میں یہاں آیا تھا تاکہ تم سے کنفرم کر سکوں۔ ابھی ہی کسی نیوز چینل پر آرٹیکل پڑھا تھا، اُسی میں لکھا دیکھا کہ دو گولیاں لگی ہیں اور اب وہ ٹھیک ہے۔''

''تم میرے بھائی کی خبر کیوں رکھ رہے ہو؟'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو اُس نے تھوک نگلا۔

''وہ۔۔۔وہ اُسکی تصویر نظر آئی تو نیوز کھول کر دیکھ لی، آخر وہ تمہارا بھائی ہے نا!''دل ہی دل میں خود کو کوسا کہ کیا ضرورت تھی اپنی عقل استعمال کرنے کی؟

''ہائے اللہ! اُنکی تصویر بھی آرہی تھی؟ مجھے کیوں نہیں پتہ چلا؟ تم ایک کام کرو وہ آرٹیکل مجھے سینڈ کر دو۔''وہ برا پھنسا تھا۔

''وہاں۔۔۔نجانے کونسے چینل پر آیا تھا؟ میں۔۔۔میں تو بھول بھی گیا۔''اُس نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔ پر وہ اُسے مشکوک انداز میں گھورتی رہی۔

''چھوڑو نا ان سب باتوں کو، یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی پر کس نے اور کیوں حملہ کیا؟''اُس نے بات بدلنی چاہی۔

''پولیس والے ہیں، یہ سب تو ہوتا رہتا ہے اُنکے ساتھ۔''

''ہاں! بیچارے کو کچھ عرصے قبل بھی ایک گولی لگی تھی۔''اُس کی زبان پھر پھسلی۔

''کس کو؟''اُس نے حیرت سے دیکھا۔

''ایک۔۔۔ایک اور پولیس والے۔۔۔کو بھی پچھلے ہفتے گولی لگی تھی۔ نیوز میں دیکھا تھا میں نے، بیچارے! اُنکے ساتھ تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔''بڑی مشکل سے کور کیا۔

''ہاں! لیکن اس بار معاملہ بھائی کی ذاتی دشمنی کا ہے۔''اُس نے دکھ سے کہا۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کے مرکزی دروازوں کے درمیان بنے ستون کے پاس کھڑے تھے۔

''کس قسم کی دشمنی؟ اور اتنی شدید کے اُسے جان سے مارنا چاہا؟''اُس نے کریدنا چاہا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں؟''اُس نے ایک بار پھر مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ گڑبڑایا۔

''آ۔۔۔ایسے ہی۔۔۔ایسے ہی بس!''کچھ سمجھ نہ آیا کیا کہے؟ وہ تو بس نوید کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''وہ میرے بھائی کا راز ہے۔ میں اُسکے رازوں میں خیانت نہیں کر سکتی۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو رضا نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''اوہو! بھائی کی فرمانبردار بہن!''اُس نے چھیڑا۔''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارے اپنے بھائی سے جائیداد کے تنازعے چل رہے ہیں۔''

''اختلاف اپنی جگہ پر امانت اپنی جگہ۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارے بھائی نے اُن پولیس والوں کے ساتھ کیا کیا؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا۔

''کون سے پولیس والے؟ وہ جو مجھے تنگ کر رہے تھے؟''

''ہاں! وہی۔''

''اُنکو تو بھائی نے اتنا مارا، کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا جبڑا ہی توڑ دیا۔'' اُس نے خوشی سے بتایا۔

''ناراضگی اپنی جگہ، پر میرے اوپر نظر رکھنے والوں کی آنکھیں نکال دیتے ہیں میرے دونوں بھائی!'' وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولی، جبکہ رضا نے تھوک نگلا تھا۔

''بڑے خطرناک بھائی پالے ہوئے ہیں تم نے'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں! میں بس یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارا بھائی شروع سے ہی ایسا ہے یا پولیس میں آنے کے بعد ہوا ہے؟''

''یہ تم میرے بھائی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

''تم میں دلچسپی لوں گا تو تم ناراض ہو گی۔'' اُس نے شرارت سے کہا تو اُسکی زبان رکی۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگ گئے ہو؟ پہلے تو زبان نہیں چلتی تھی؟''

''صحبت کا اثر ہے۔'' وہ باز نہ آیا۔

''جا رہی ہوں میں، خدا حافظ!'' وہ لٹھ مار انداز میں کہتی وہاں سے چلی گئی۔ رضا مسکرا کر رہ گیا۔

---------+---------+--------

مقدّس کا ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو گیا تھا، نانی کو خدا حافظ کہہ کر جب اُس نے دروازہ کھولا تو سامنے مقدّم کو کھڑا پایا۔

''رمضان مبارک!'' مقدم نے اُسے دیکھ کر دانت نکالے۔

''رمضان شروع ہوئے دو روز گزر گئے ہیں۔'' اُس نے جتایا۔

''ہاں! تو تم مجھے دو روز قبل نہیں ملی نا!''

''خیر! مکرم نانی کے پاس ہے۔ تم اُن سے جا کر مل لو۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ عجلت میں کہتی، اُسکے برابر سے نکلی۔

''مقدّس!'' مقدّم نے اُسے آواز دی تواُسکے قدم تھمے۔

''ناراض ہو؟'' کتنے دوستانہ لہجے میں سوال کیا تھااُس نے۔ مقدّس کو غصّہ آیاپراس نے ضبط کیا۔

''نہیں! بھلامیں کیوں تم سے ناراض ہوں گی؟'' اُسکی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

''تومجھے اندر تک تو چھوڑ آؤ! اچھا تھوڑی لگتاہے کہ ایسے ہی چلا جاؤں اندر، اب تو تمہاری مامی بھی ہوتی ہیں۔'' اُس نے معصومیت سے کہاتووہ دانت کچکچاتی ہوئی اندر کی جانب بڑھی۔ وہ اُسکے پیچھے پیچھے آیا۔

''تمہاری مامی نے اب تک تمہاری جائیداد پر قبضہ نہیں کیا؟'' چلتے چلتے اُس نے پوچھاتواُس نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''وہ تم اس دن کہہ رہی تھی ناکہ پڑوسن تمہاری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے ماموں کی شادی اپنی بہن سے کروانا چاہتی ہیں؟'' وہ حیران ہوئی، اُسے اتنی پرانی بات یاد تھی۔

''میں غلط فہمی کا شکار تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہاتو مقدّم نے غور سے اُسے دیکھا۔ وہ بولتی تھی تواُسکا دماغ پکا کر رکھ دیتی تھی، اب چپ تھی تووہ چاہتا تھا کہ وہ بولے۔

''تم اتنی چپ کیوں ہو؟'' بلآخر پوچھ ہی لیا۔

''ایسے ہی۔'' اس جواب پر وہ گہری سانس لیتا رک گیا۔

''کیاہوا؟ رک کیوں گئے؟'' اُسے کھڑا دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

''میں نے اُس دن جو بھی کہا، اُسکے لیے معذرت چاہتاہوں۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''معذرت کس لیے؟ تم نے ایسا بھی کیا کہہ دیا مجھے؟'' اُس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''بات کچھ ایسی تو نہیں تھی، لیکن مجھے تم سے نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''تم نے اس دن لیلیٰ کا ذکر کیا۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ وہ تمہاری بیوی تھی اور میری کزن۔ اسکو یاد کرنے پر تم مجھ سے معذرت کیوں کر رہے ہو؟'' سوال تواُسکا درست تھا۔ مقدّم سمجھ نہ سکا کہ اب اس بات کی کیاوضاحت دے؟

''میں اُس روز ایگزاسٹڈ ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا؟ تم بھی کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں؟'' اُس کو یہی وضاحت سمجھ آئی۔

''میں تمہارے بارے میں کیا سوچ سکتی ہوں مقدّم؟''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اتنی سنجیدہ مت بنو۔زہر لگ رہی ہو قسم سے!''اُس نے سنجیدگی سے کہاپر آنکھوں میں ناچتی شرارت اُس نے دیکھ لی تھی۔

''میں تمہیں اچھی لگنا بھی نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟''اُسکے پاس بڑی فرصت تھی آج۔

''بس۔۔۔ایسے ہی۔''وہ گڑبڑائی۔

''دیکھو! تین روز سے میں روزانہ مکرم کو لینے اور چھوڑنے آتا ہوں اور تم مجھے نہیں ملتی، ہر بار نانی یا ماموں کو بھیج دیتی ہو۔میں کیا سمجھوں اسے؟''اب کہ اُس نے چڑھائی کی۔

''مم۔۔میں۔۔۔میں مصروف تھی۔''اُس نے جلدی سے کہا۔

''ناراض تھی۔''اُس نے تصیح کی۔

''نہیں! مصروف تھی۔''

''آوں ہوں۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''تم ناراض تھی۔''

''نہیں تھی ناراض! بس میرا۔۔۔''وہ رکی۔

''کیا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میرا دل دکھا تھا۔''

''کیوں؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیوں؟۔۔۔''مقدّس نے زیرِلب اُسکا سوال دہرایا۔''کیونکہ۔۔۔کیونکہ تم اُداس تھے۔اور تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھے دکھ پہنچا تھا۔بس یہی بات تھی۔اور کچھ نہیں!''اُس نے آہستہ سے کہا پھر یکدم ہی بولی''تمہیں کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے؟فضول میں میرا وقت برباد کر رہے ہو۔''

''اور تمہیں اُداس دیکھ کر مجھے دکھ پہنچا۔بس یہی بات تھی اور کچھ نہیں!''اُس نے بھی اسی کے انداز میں جواب لوٹایا۔مقدّس نے حیرت سے اُسے دیکھا جو سنجیدگی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔اُسے یکدم ہی ڈھیروں غصّہ آیا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟ دل میں تمہارے لیلیٰ ہے اور دکھ تمہیں مجھے اُداس دیکھ کر ہو رہا ہے۔ جو دل میں رہتی ہے اُسکی فکر کرو۔ جہاں میری جگہ نہیں ہے وہاں میں زبردستی نہیں آتی۔'' غصّے میں پتہ نہیں اُسے کیا کیا کہتی وہ جانے کے لیے مڑی۔

''دل کے چار خانے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ!'' اُسکی مسکراتی آواز کانوں سے ٹکرائی تو قدم زنجیر ہوئے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا، چمکتی آنکھوں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی نانی مکرم کو لیے وہی آ گئیں۔ وہ تیزی سے گھر سے باہر نکل گئی۔

~سر طور ہو، سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے

وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی

---------+---------+--------

سرما کے بعد آنے والی بہار نے ہر شے نکھار دی تھی۔ پھول پودے اپنے جوبن پر اُتر آئے تھے، ہوائیں جیسے موسم کے ترانے گانے لگی تھیں۔ اور رمضان تو ویسے ہی فضا میں رحمتیں بکھیر دیتا ہے۔ ہر شے مانو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اُمڈ آئی تھی۔

صبح وہ نشمیہ سے پہلے اُٹھ گیا، اس ملک میں رمضان کی صبح گیس ایسے غائب ہوتی ہے جیسے بچے، بوڑھے وغیر مسلم سب ہی روزے سے ہوں گے۔ خیر! انہی دنوں کے لیے اُس نے الیکٹرک چولہا خرید رکھا تھا۔

''ارے! اتنے موٹے پیاز کون کاٹتا ہے؟ چھوٹا کرو اُسے، آملیٹ بنا رہے ہو یا سالن؟'' کچن میں تورونق لگی ہوئی تھی۔ نشمیہ کے ابّا اُسکے نکمّے باپ کو ایک آملیٹ نہ بنا سکنے پر بے نقط سنا رہے تھے۔

''کر تو رہا ہوں ابّا! لیکن یہ میرے ہاتھوں سے پھسلے جا رہا ہے۔'' اُس نے بیچارگی سے کہا۔

''اِدھر دو! میں ہینڈ بلینڈر میں اسے کاٹ دیتا ہوں۔'' اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ خود کاٹ لیں۔

''ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ میں اُسکے لیے جوس نکالتا ہوں۔'' اُس نے فوراً پیاز اُنکے حوالے کیا۔

''اسے چھوڑو! تم ایسا کرو کہ نشمی کو اٹھاؤ جا کر، وہ اٹھنے میں بھی آدھا گھنٹہ لگاتی ہے۔ یہ جوس اصغر نکال دے گا۔'' اُنہوں نے ملازم کا نام لیا۔

''جی! ٹھیک ہے۔'' وہ ہاتھ دھوتے ہوئے جلدی سے باہر آیا۔ پھر اُسے جگانے کے لیے باقاعدہ جنگ لڑتے ہوئے بلآخر کامیابی سمیٹ کر اُسے باتھ رُوم تک لایا، اُسے برش کروانے کے بعد الماری کھولی، جس میں اُس نے رات ہی اُسکے نئے کپڑے سیٹ کیے تھے۔

''تمہیں اس میں سے کون سا والا پہننا ہے؟'' اُس نے الماری میں لٹکے کپڑے دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''ہونہہ!۔۔۔''چھوٹی چوزی نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچنے جیسے تاثرات بنائے۔

''یہ بلیو والا تو پیارا ہے پر میں نے کل بلیو کلر ہی پہنا تھا تو یہ نہیں۔''اُس نے پہلا فراک مسترد کیا۔

''یہ پرپل والا پیارا ہے پر مجھے آج جینز پہننی ہے۔''اُس نے یہ والا بھی مسترد کیا۔ جبکہ علی سینے پر ہاتھ باندھے اُسکی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

''میں وہ شرٹ پہنوں گی۔''اُس نے ایک آسمانی رنگ کی شرٹ، جسکے اندر ایک سفید رنگ کی جرسی تھی اپنے لیے پسند کی۔

''شکر! اب جاؤ جلدی سے چینج کر کے آؤ۔''اُس نے جینز کے ساتھ اُسکی پسند کی ہوئی شرٹ نکال کر اُسے تھمائی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو علی موبائل میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

''ناشتہ کرنے چلیں؟''وہ اُسکے کان کے پاس آکر چیخی تو اُس نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔

''تم کسی دن ہارٹ فیل کرواؤ گی میرا۔''اُس نے گھورا۔

''بھوک لگی ہے۔''اُس نے شور مچایا۔

''نہیں نہیں رکو! پہلے تمہارے بال باندھیں گے۔''اُس نے موبائل دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپکو تو آتا ہی نہیں ہے۔''اُس نے مذاق اڑایا۔

''ہوں۔۔''علی نے آنکھیں دکھائی۔''میں نے کل رات بیٹھ کر اتنی ویڈیوز دیکھی ہیں۔ آجاؤ! تمہارے بالوں پر تجربہ کریں۔''اُس نے اُسے اٹھا کر سنگھار میز پر بٹھا دیا۔ پھر جیسے جیسے ویڈیو میں نظر آرہا تھا، ویسے ویسے اُسکے بالوں کی دو پونیاں بنائیں اور آدھے بال کھلے چھوڑ دیئے۔ پھر اُسکے لیے لایا ہوا ننھا سا بریسلیٹ اُسے پہنایا۔

''مجھے رنگ (انگوٹھی) بھی چاہیے۔''اُس نے فرمائش کی۔

''مل جائیگی میڈم!''پھر اُسے تیار کر کے نیچے لایا۔

''مجھے تو لگا کہ نشمیہ کو اٹھاتے اٹھاتے خود ہی نہ سو گئے ہو۔''اُنہیں آتا دیکھ کر سفیر صاحب نے کہا۔

''آج ہم اسکول نہیں جائیں گے؟''علی نے اُسے کرسی پر بٹھایا تو اُس نے پوچھا۔

''نہیں! آج ہم شاپنگ کرنے جائیں گے۔''علی نے آملیٹ اُسکے قریب کر کے اُسکے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔

''ہم ڈول ہاؤس خریدیں گے ؟''اُس نے خوشی سے چہکتے ہوئے پوچھا۔حالانکہ کل ہی اُسے ایک نیا ڈول ہاؤس مل چکا تھا۔

''ہاں !''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''ابّا بھی جائیں گے ؟''اُس نے پوچھا۔

''تم کہو گی تو چلا جاؤنگا۔''سفیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ۔۔۔۔''وہ خوشی سے چہکی۔

''اچھا اب جلدی سے ناشتہ ختم کرو۔''علی نے جوس کا گلاس اُسکے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔آج کے دن وہ شہزادی بن گئی تھی۔کیونکہ وہ اپنے باپ کے پاس تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں شاپنگ مال میں تھے۔علی کو نہیں یاد کہ وہ آخری بار کب سفیر صاحب کے ساتھ خریداری کرنے آیا ہوگا؟

''نشمیہ ! یہ دیکھو ! یہ بھالو کتنا پیارا ہے ؟''سفیر صاحب نے ایک دیو قامت بھالو کے سامنے رکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو بابا جیسا ہے۔''اسکو پتہ نہیں کونسے زاویے سے وہ اپنے باپ جیسا لگا تھا؟سفیر صاحب دل کھول کر ہنسے تھے۔ کافی دیر وہ لوگ اُسکی پسند کی چیزیں خریدتے رہے۔پھر علی ایک اسٹیشنری کی دکان میں داخل ہوا۔

''میری کال آرہی ہے،میں ذرا اٹینڈ کر کے آتا ہوں۔''سفیر صاحب نے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔

''جلدی آئیگا ابّا ! اسکے بعد ہم نکلیں گے۔''اُس نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ علی اُسے لیے دکان کے اُس حصے میں آیا،جہاں بچوں کے ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اسکول بیگ رکھے ہوئے تھے۔

''دیکھو نشمیہ ! تمہیں کون سا والا اسکول بیگ اچھا لگ رہا ہے ؟''اُس نے پوچھا۔

''ہم بیگ لیں گے ؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں !''

''پر میرے پاس تو ہے۔''اُس نے کہا تو علی گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے،حالت رکوع میں اُسکی طرف جھکا۔

''وہ تو وریشا کا نہیں ہے ؟''اُس نے بھنویں اُچکاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں! پر اب تو وہ میرا ہے نا!''نشمیہ نے یاد دلایا۔

''نہیں! تم اپنا نیا بیگ لو گی۔ جو تمہیں اچھا لگے گا وہ والا۔''علی نے پیار سے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچی؟''اس نے خوشی سے پوچھا۔

''ہاں!''وہ مسکرایا۔

''تو ہم وریشا والے بیگ کا کیا کریں گے؟''اب اُسے پرانے بستے کی فکر ہوئی۔

''ہونہہ۔۔۔''علی نے سوچنے جیسے تاثرات بنائیں۔''ہم ایسا کریں گے کہ اُسے پھینک دیں گے۔''

''نہیں بابا! ہم اُسے پھینکیں گے نہیں۔ بلکہ جسکو چاہیے ہو گا، اسکو دے دیں گے۔''اُس نے سمجھداری سے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ اتنی سی عمر میں بھی یہ بات جانتی تھی کہ چیزوں کو ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ کسی کے کام آسکتی ہیں۔ علی کو ٹوٹ کر اُس پر پیار آیا اور اس بار اُس نے خود کو نہیں روکا۔ بلکہ گلے لگا کر اُسے پیار کیا۔

''میرا گڈّا!''اُسے بھینچ کر اُسکے گال چومتے ہوئے پیار سے کہا۔

''آں! میرا منہ گندا کر دیا۔''اُس نے منہ بسورا تو وہ ہنس دیا۔ پھر اُسے گود میں اٹھالیا۔ آج پہلی بار اس نے اُسے گود میں لیا تھا۔ وہ خوشی سے ہنسنے لگی۔

''بتاؤ! کونسا بیگ چاہیے؟''اُس نے کیس میں رکھے بستے اُسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ والا۔۔''باربی کی دیوانی نے باربی والا ہی پسند کیا۔ پھر اُسکے لیے دیگر اسٹیشنری کا سامان خریدنے کے بعد جب وہ بلنگ کاؤنٹر پر قیمت ادا کر رہا تھا تو اُس وقت باربی کی دلدادہ کو دکان میں لگا قد آدم آئینہ نظر آگیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور کمر پر دونوں ہاتھ ٹکا کر غور سے خود کو دیکھا اور پھر بولی۔

Mirror mirror on the wall.

Who is the cutest them of all?

Nashmiyah or baba?

(دیوار پر لگے ہوئے آئینے

ان میں سب سے پیارا کون ہے؟

نشمیہ یا بابا؟)

''بابا!'' پیچھے سے علی نمودار ہوتا بولا۔اُس نے سر اٹھا کر آئینے میں اپنے باپ کو دیکھا اور اُسے دیکھنے کے تگ و دو میں اُسے پوری گردن اٹھانی پڑی تو علی فوراً اُسکے ساتھ ہی پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

''نہیں! میں زیادہ پیاری ہوں۔'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے لڑاکا انداز میں کہا۔

''جی نہیں! میں زیادہ پیارا ہوں۔''

''میں آپ سے بھی زیادہ پیاری ہوں۔''

''کیسے؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں چھوٹی ہوں نا! میں چھوٹی بچی ہوں۔'' اُس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں بھی تو بچہ ہوں اپنے ابّا کا۔'' وہ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔دکاندار اُنکی حرکتیں دیکھ کر مسکرایا۔

''نہیں! میں زیادہ پیاری ہوں۔'' اب کہ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''بھئی! دونوں پیارے ہیں۔'' یہ جواب سفیر صاحب کی طرف سے آیا تھا جو کچھ دیر قبل دکان میں داخل ہوئے تھے اور دونوں کو بحث کرتا دیکھ چکے تھے۔

''یہ غیر جمہوری جواب قبول نہیں کیا جائیگا۔'' علی نے فوراً کہا تو وہ ہنسے۔پھر اُس نے جیب سے موبائل نکال کر اُسکے ساتھ آئینے میں سیلفی لی۔ محترمہ نے خوب دل لگا کر پوز بنائے تھے۔

''اگر شاپنگ ہو گئی ہے تو مجھے ذرا آفس تک چھوڑ دینا، کچھ ضروری کام ہے۔'' اُنہوں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہوا، اور اُسکا ہاتھ پکڑا۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔'' دکان سے نکلتے ہوئے اُس نے اعلان کیا۔

''گھر جا کر تمہیں فرائز بنا کر دوں گا۔'' علی نے فوڈ کورٹ بند دیکھ کر کہا۔رمضان کی وجہ سے سب ہی افطار سے کچھ دیر پہلے کھلتے تھے۔

''آپکو تو آملیٹ بنانا نہیں آتا۔'' اُس نے یاد دلایا۔

''تمہیں آتا ہے؟'' اُس نے تپ کر پوچھا۔

''میں تو چھوٹی ہوں نا!'' اُس نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

وہ تینوں باتیں کرتے، ہنستے، مسکراتے، زندگی کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے، اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ نشمیہ، علی اور سفیر صاحب کے درمیان میں تھی۔ وہ اُنکے درمیان واقعی ایک کڑی کی طرح تھی۔

---------+---------+--------

ہسپتال کے کمرے میں وہ بیزار سا تھا۔ بستر پر آدھا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا سخت کوفت کا شکار تھا۔ دل کر رہا تھا کہ جلد سے جلد یہاں سے بھاگ جائے پر ڈاکٹر نے اُسے رات سے پہلے ڈسچارج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی تو وہ ویسے بھی سنتا نہیں تھا، پر وحید بھائی کا حکم تھا کہ جب تک ڈاکٹر نہ کہیں وہ یہاں سے نہیں جائیگا۔ لہٰذا اب بیزار سا بیٹھا موبائل دیکھ رہا تھا۔ بشریٰ کو اُس نے بتا دیا تھا کہ وہ ڈیوٹی سے تین روز تک گھر نہیں آئیگا۔ لہٰذا اُسکی فکر بھی نہ تھی۔ رات جب امی اُس سے ملنے آئی تھیں تو وہ سو رہا تھا۔

چہرے پر بیزاری طاری کیے اُس نے موبائل پر واٹس ایپ کھولا۔ علی کا اسٹیٹس لگا ہوا دکھائی دیا تو بلا ارادہ ہی اُسے کھول لیا۔ وہ اُسکی اور نشمیہ کی مرر سیلفی تھی۔ کل تین تصاویر کا کولاج تھا، علی پنجوں کے بل نشمیہ کے برابر بیٹھا تھا، ایک ہاتھ سے اُسے ساتھ لگائے، دوسرے ہاتھ سے سیلفی لے رہا تھا۔ وہ کسی دکان کا آئینہ تھا کیونکہ پیچھے سامان رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تصویر میں نشمیہ نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر کیوٹ سی شکل بنائی ہوئی تھی، دوسرے میں اُس نے غبارے کی طرح منہ میں ہوا بھری ہوئی تھی اور تیسرے میں وہ علی کو پیار کر رہی تھی۔ باقی دو تصاویر کی نسبت اس والی میں علی دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ نوید نے وہ تصویر زوم کر کے دیکھی۔ کتنا عرصہ ہوا تھا اُسے علی سے ملے ہوئے؟ کوئی تین یا ساڑھے تین ماہ؟ ان تین ساڑھے تین مہینوں میں اُس نے آج پہلی دفعہ اُسے اسطرح ہنستے ہوئے دیکھا تھا، اس طرح خوش دیکھا تھا۔ اُس نے مسکرا کر فون رکھ دیا۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا، علی دروازے پر کھڑا تھا اور نشمیہ اُسکے ساتھ ہی تھی۔ وہ دونوں اسی لباس میں تھے، جس لباس میں نوید نے اُنہیں تصویر میں دیکھا تھا۔ یعنی تصویر آج ہی کی تھی۔

''کیسے ہو؟'' اُس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کل بھی کہا تھا کہ میں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ نشمیہ غور سے اُسکے بازو پر بندھی پٹی کو دیکھ رہی تھی۔

''میں ابّا کو آفس چھوڑنے یہیں قریب میں آیا تھا۔ سوچا تم سے مل لوں۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''ہاں! اچھا کیا، میں ویسے ہی یہاں بور ہو رہا ہوں۔ خیر! تم بتاؤ، کیسے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''الحمدُ اللہ!'' علی نے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سنیں!''نشمیہ نے نوید کو یکدم ہی مخاطب کیا تو اُس نے چونک کر اُسے دیکھا۔''آپ کو کیا ہوا ہے؟''اُس نے نوید کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں!''اُس نے ٹالنا چاہا۔

''آپکو چوٹ لگی ہے؟''اُس نے پھر پوچھا۔

''ہاں! تھوڑی سی۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''آپکو درد تو نہیں ہو رہا؟''اُس نے پھر پوچھا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیا پھر نفی میں سر ہلایا تو وہ مطمئن ہو گئی، پھر اُسے پاس لگا ایکویریم نظر آ گیا۔

''اوہ! فشی (مچھلی)۔''وہ خوشی سے اُچھلی۔

''ھش!''علی نے اُسے چپ رہنے کو کہا۔ وہ یقیناً اُسے سمجھا کر لایا تھا کہ یہاں چپ رہنا ہے۔

''جاؤ دیکھ لو!''یہ اجازت نوید نے دی تھی۔ وہ خوشی سے پاس رکھے ایکویریم کے پاس چلی گئی۔

''اسکی رپورٹ آ گئیں؟''نوید نے اُسے دلچسپی سے مچھلیوں کو دیکھتے ہوئے، دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں!''علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُسے اُسکا جواب مل گیا۔

''میرا خیال ہے تمہیں عدالت سے اُسکی کسٹڈی لے لینی چاہیے۔''اُس نے کہا۔

''مجھے مل جائیگی؟''

''ہاں! تم باپ ہو، تمہارے پاس ثبوت ہے۔ اور پھر اسکی ماں کا خط تمہارے حق میں جائیگا۔''اُس نے سنجیدگی سے بتایا۔

''تم اگر اُس روز مجھے ڈی این اے کا مشورہ نہ دیتے تو میں اسے یتیم خانے چھوڑ آتا۔ اور پھر شاید قیامت تک پچھتاتا۔''علی نے آہستہ سے کہا۔ یتیم خانے کا سوچ کر ہی اُسکا دل کانپا تھا۔

''کوئی نئی بات بتاؤ۔ تم ہمیشہ ہی جذباتی اقدام لیتے ہو اور پھر پچھتاتے ہو۔''نوید ظالمانہ حد تک صاف گو تھا۔ علی خاموش ہی رہا۔ اُسکے پاس واقعی اپنے غصّے میں کئے گئے ہر اقدام پر، سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہ تھا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی تھی۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا تو نوید نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ڈر؟''وہ رکا اور حیران ہوا۔

''موت سے؟یعنی کہنا آسان ہے پر موت سامنے ہو تو ڈر لگتا ہی ہے۔اور پھر تمہیں پچھلی بار بھی گولی لگی تھی اور اس بار پھر۔تمہارے چہرے پر تو خوف کا نام و نشان تک نہیں ہے۔''نوید سنجیدگی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''یعنی۔۔۔اگر کسی کے گھر کے، کسی فرد کے ساتھ بھی ایسا واقع ہو جائے تو کتنی راتیں اُنہیں خوف سے نیند نہیں آتی۔اور تم گولیاں کھا کر اتنی آسانی سے گھوم رہے ہو؟''اُس نے مزید وضاحت دی۔نجانے وہ کیا پوچھنا چاہ رہا تھا؟

''موت جب تک لکھی نہ ہو موت زندگی کی خود حفاظت کرتی ہے۔زندگی سے زیادہ کوئی جی نہیں سکتا اور موت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا۔(حضرت خالد بن ولیدؓ)''اُس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ لاجواب ہو گیا۔کسی زمانے میں وہ رات کو سفر کرنے سے ڈرتا تھا، بار بار حالات کا رونا روتا تھا کہ بائیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کو سفر کرنے سے کتنا ڈرتا ہے، پر اُسکے ابّا بھی اُسکو بائیک نہیں دلا رہے ہیں۔علی اُداسی سے مسکرا دیا۔گئے زمانوں نے اُس پر اپنی پرچھائی بھی باقی نہیں رہنے دی تھیں۔وہ یہاں یہ جاننے کے لیے آیا تھا کہ نوید کو آخر کس سے خطرہ ہے؟یا کون اُسکا جانی دشمن ہے؟پر وہ پوچھ نہیں سکا۔پہلی بار علی کو لگا کہ وہ ایک خول میں بند ہے جسے توڑنا ناممکن ہے۔

---------+---------+--------

اگلے بہت سارے دن بنا کسی خاص واقعہ کے گزر گئے۔رمضان کا بیسواں روزہ اور آخری عشرے کا اختتام تھا۔آنے والا عشرہ اپنے ساتھ مبارک راتیں لیکر آنے والا تھا۔فرمان کی موت کے بعد سے ایف آئی اے نے جیسے چپ سادھ لی تھی۔نہ اُنہیں بلایا گیا نہ ہی کسی قسم کی کوئی اطلاع دی گئی، اگر کوئی پیش رفت ہوئی بھی تھی تو بھی فلوقت اُنہیں اُس سے بے خبر رکھا گیا تھا۔نیز بہت دنوں تک ہر جانب سے ایک جامد خاموشی چھائی رہنے کے بعد آج اُنہیں دوبارہ ایف آئی اے آفس آنے کا پیغام موصول ہو گیا تھا۔آگے کیا ہونے والا تھا؟معلوم نہیں البتہ زندگی پر چھایا ہوا جمود ضرور ٹوٹا تھا۔

آج علی الصباح وہ عدالت آیا ہوا تھا۔کچھ دنوں پہلے نشمیہ کی کسٹڈی کے لیے درخواست دائر کی تھی۔فاطمہ مسلسل نوٹس کر عدالتی اشتہار ک باوجود بھی عدالت میں حاضر نہ ہوئی تھی، لہٰذا مقدمہ یکطرفہ طور پر ہی چلا، اور کسٹڈی علی کو مل گئی تھی۔وہ آج کچھ ضروری کارروائی کے لیے وہاں آیا تھا۔تمام کام مکمل کر کے جب وہ کمرہ عدالت سے باہر نکل رہا تھا، تب ہی اُسکی نظریں راہداری میں کھڑے نوید پر پڑیں۔وہ اکیلا نہیں تھا، اُسکے ساتھ وہی وکیل تھا جو اُس روز ہسپتال میں موجود تھا، اور کچھ مزید لوگ بھی تھے، جن سے وہ بحث میں مشغول نظر آ رہا تھا۔اُسکا عدالت میں ہونا باعث حیرت نہیں تھا کیونکہ اُسکے پیشے کے اعتبار سے اُسکا یہاں آنا جانا تو رہتا تھا۔پر حیرت اُسے، اُس وکیل کو دیکھ کر ہوئی جو اُس روز ہسپتال میں بھی کچھ ناسمجھ میں آنے والی گفتگو کر رہا تھا۔

علی دیوار کے اوٹ لیکر کھڑا ہوا۔

''ایس ایس پی صاحب! آپ کے بھائی سمجھتے کیوں نہیں ہیں کہ یہ کیس مزید آگے نہیں بڑھ سکتا، آج عدالت کا حتمی فیصلہ ہو جائے گا۔'' وکیل صاحب زچ نظر آرہے تھے۔

''بھائی نے جو کہا ہے وہ اُنکے حساب سے غلط نہیں ہیں۔ لیکن میری طرف سے آپ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ میں بہت پہلے سے جانتا ہوں کہ یہ کیس میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں بس، بھائی کا حکم پورا کر رہا ہوں۔'' نوید کی سنجیدہ آواز سنائی دی۔

''میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے۔ پر اب سب کچھ ناممکن ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس فرح کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' وکیل بے بسی سے کہہ رہا تھا، نوید نے فقط سر ہلا دیا۔

''فرح؟ یہ فرح کون ہے؟'' علی نے دل میں سوچا۔ اُس روز ہسپتال میں بھی، اُس نے یہ نام سنا تھا۔

''ہمیں چلنا چاہیے کیونکہ عدالت کی کاروائی شروع ہونے والی ہے۔'' وکیل نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ علی بھی خاموشی سے کچھ لوگوں کے درمیان میں جگہ بنا کر کمرہ عدالت میں داخل ہوا۔ اُسے ٹوہ لینے کی عادت نہ تھی (رضا کے علاوہ) پر اس وقت وہ حقیقتاً جاننا چاہتا تھا کہ آخر نوید کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ نوید سے نظریں بچا کر وہ ایک قدرے تاریک ستون کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، جہاں سے وہ تو عدالت کی کاروائی دیکھ سکتا تھا، پر اُس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ معاملہ اُسکے سر پر سے گزر رہا تھا۔ پر اتنا تو اُسے سمجھ آرہا تھا کہ نوید کے وکیل کے دلائل کمزور ہیں۔

''معزز جج! جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ میرے فاضل دوست، میرے مدعی پر لگائے گئے الزامات ثابت کرنے میں، اب تک ناکام رہے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں کہ اُس روز سفید چادر میں لپٹی خاتون میری موکلہ ہی تھیں یا نہیں؟ یہ مقدمہ آج ختم ہو جائے گا لیکن ایس ایس پی نوید عالم پھر بھی نہیں رکیں گے، وہ بہانے بہانے سے میری موکلہ کو عدالت میں گھسیٹیں گے جبکہ وہ ایک باعزت شہری ہیں۔'' وکیل صفائی نے کہا۔

''او بجیکشن یور آنر!'' نوید کا وکیل کھڑا ہوا۔ ''میرے موکل ایک باعزت گورنمنٹ آفیسر ہیں، جو ہر شہری کی جان کو اپنی جان اور ہر شہری کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اُن کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا نہ صرف اُنکی بلکہ پورے ایف آئی اے کی توہین ہے۔''

''او بجیکشن سسٹینڈ! وکیلِ صفائی غیر ضروری باتوں سے پرہیز کریں۔'' جج صاحب نے اعتراض قبول کیا۔

''یور آنر! میں جانتا ہوں کہ ایس ایس پی نوید عالم ایک ذمے دار سرکاری افسر ہیں، اُنہیں کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ میں عدالت کو یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ نوید صاحب سراسر غلط فہمی کا شکار ہیں۔'' اُس نے پینترا بدلا۔

''کیسے ثابت کریں گے؟'' جج نے پوچھا۔

''میں نوید صاحب سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''اُس نے جج سے اجازت چاہی۔اُنہوں نے اجازت دے دی تو نوید کو کٹہرے میں بلایا گیا۔ علی اب بھی کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''ایس ایس پی نوید عالم! جس روز آفس میں آگ لگی۔اُس روز آپ وہاں موجود تھے؟'' وکیل صفائی نے اُس سے پوچھا۔

''ہاں!''پشت پر ہاتھ باندھے بالکل سیدھے کھڑے نوید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا آپ آفس میں ہی تھے؟''اُس نے سوال دہرایا۔

''نہیں! میں گراؤنڈ فلور پر کچھ دیر کے لیے گیا تھا۔''اُس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

''تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چادر میں لپٹی عورت میری موکلہ ہی تھیں؟''اِس سوال کے جواب میں وہ خاموش رہا۔

''کیا سی سی ٹی وی میں یہ واضح تھا کہ وہ میری موکلہ ہی ہیں؟''اُس نے ایک اور سوال پوچھا۔

''نہیں! کیونکہ اُس عورت کے وہاں آتے ساتھ ہی سی سی ٹی وی نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

''تو آپ نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ میری معزز کلائنٹ ہی ہوں گی؟''نوید اس بات پر کچھ دیر خاموش رہا۔

''میں اس بات کا جواب پچھلی سماعت میں دے چکا ہوں۔''اُس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔

''چلیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کیوں میری موکلہ پر شک کر رہے ہیں؟ کیونکہ اس روز آفس میں آپکی اہلیہ موجود تھیں۔جنکا یہ کہنا ہے کہ چادر میں لپٹی عورت درحقیقت میری موکلہ تھیں۔''علی نے دیکھا تھا کہ وکیلِ صفائی کی اس بات پر نوید کے پشت پر بندھے ہاتھ مٹھیوں میں تبدیل ہوئے تھے۔

''یور آنر! میرے فاضل دوست کے کلائنٹ،اس بات پر بضد ہیں کہ انکی اہلیہ نے جو کہا وہ درست تھا جبکہ انکی اہلیہ دماغی طور مفلوج ہیں۔''نوید نے لب بھینچے۔اُسی لمحے وکیلِ استغاثہ نے پرزور احتجاج کیا۔

''او بجیکشن یور آنر! وکیلِ صفائی کے الفاظ سراسر بدتمیزی اور بداخلاقی پر مبنی ہیں۔''

''او بجیکشن اوور رولڈ! وکیلِ صفائی بات جاری رکھیں۔''جج نے اعتراض مسترد کیا۔

''میں اس عدالت کو بتانا چاہتا ہوں کہ عدالت کسی ذہنی مریضہ کے کہنے پر،ایک باعزت شہری پر کارروائی نہیں کر سکتی۔''

''میری بیوی ذہنی مریضہ نہیں ہے۔''نوید نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا۔وہ اِس وقت جتنا ضبط کر رہا تھا،وہ اُسکی استطاعت سے کہیں زیادہ تھا۔

''کیا آپکی اہلیہ آدھی آدھی راتوں کو قبرستان میں جا کر نہیں بیٹھی رہتیں؟''اُس نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''او بجیکشن یور آنر! او بجیکشن!''

''او بجیکشن اوور رولڈ!''

''معزز جج! ایس ایس پی صاحب کی اہلیہ ذہنی مریضہ ہیں۔اپنی مرضی سے واقعات بناتی ہیں اور اُنہیں سچ مانتی ہیں۔وہ کیا کہتے ہیں اُسے؟''اُس نے ذرا رک کر سوچنے کی اداکاری کی۔''hallucination! ہاں! یہی کہتے ہیں اُسے۔تو انکی اہلیہ کو بھی ہو سکتا ہے کہ اس لمحے ہیلو سینیشن کے دورے پڑے ہوں اور اُنہوں نے اپنی طرف سے کوئی کہانی بنالی ہو؟''

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔''نہایت ٹھنڈے لہجے میں یہ الفاظ نوید نے ادا کیے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کو برا لگ رہا ہے۔لیکن ایک ذہنی مریضہ کے کہنے پر ایک باکردار عورت پر الزام لگانا،اِس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔میں بس عدالت کا وقت بچاتے ہوئے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اس مقدمے کو تاحیات بند کیا جائے۔مجھے مزید کچھ نہیں پوچھنا۔''وکیلِ صفائی نے گفتگو سمیٹتے ہوئے جگہ چھوڑ دی۔نوید بھی متوازن چال چلتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔اُسکے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ محفوظ کرتے ہوئے کارروائی کچھ دیر کے لیے موخر کر دی۔نوید کمرہ عدالت سے باہر نکلا،آنکھوں پر سن گلاسز لگائے اور اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے چلا گیا۔نہ معلوم کہ وہ دوبارہ فیصلہ سننے کے لیے آنے بھی والا تھا یا نہیں؟پر علی کا تو دماغ ماؤف ہونے لگا تھا،لفظ ذہنی مریضہ پر۔

---------+---------+--------

''ہمارے پاس تم سب کو بتانے کے لیے اب کچھ بھی نہیں ہے۔فرمان اُس گمنام مجرم تک پہنچنے کا آخری مہرہ تھا اور اب وہ خاموش موت مارا جا چکا ہے۔فلحال ہمارے پاس اُس مجرم تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''کمرہ اجلاس میں اِس وقت بریفنگ جاری تھی۔نوید کے علاوہ اِس وقت باقی سب ہی وہاں موجود تھے۔فرّخ صاحب اُنہیں تمام حالات گوشِ گزار کر رہے تھے۔

''اب جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ جب حالات ناگزیر ہو جائیں گے تو ہم پلان بی پر عمل کریں گے۔اب وقت آ گیا ہے کہ تم لوگوں کو پلان بی سے آگاہ کر دیا جائے۔''اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔اب وہ پلان بی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔جیسے جیسے وہ بتاتے جا رہے تھے،اُن لوگوں کے چہرے پر اطمینان مگر کچھ کچھ پریشانی کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ مشکل ہے،پر اب اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا۔''اُنہوں نے پورا پلان پیش کرنے کے بعد اُن لوگوں کے چہروں کو باری باری دیکھا۔

''اور اس پر عمل کب سے کرنا ہے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''مورخہ چھے سے ایک ماہ قبل، اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔'' اُنہوں نے کہا تو وہ لوگ اثبات میں سر ہلانے لگے۔ اب ویسے بھی اُنہوں نے اپنی زندگیاں ایف آئی اے کی رحم و کرم پر چھوڑ دی تھیں، لہٰذا وہ آنکھ بند کر کے اُن پر بھروسہ کر رہے تھے۔

''لیکن! اس منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے تم سب نے جو بھی کام مکمل کرنے ہیں، وہ کر لو۔'' اُنہوں نے کہا ''کسی کا کوئی سوال؟''

''یہ منصوبہ ہے کس کا؟'' حسین نے پوچھا۔

''نوید کا!'' اُنہوں نے جواب دیا۔

''اور وہ خود کہاں ہے؟''

''وعدہ لینے گیا ہے۔'' اس جواب پر اُس نے ناسمجھی سے فرّخ صاحب کو دیکھا۔

''وعدہ لینے؟'' اُنکی بات کسی کے بھی سمجھ نہ آئی تھی۔ فرّخ صاحب ہنس دیئے۔

--------+---------+----------

''کوئی ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔'' وہ ریولونگ چیئر کی پشت پر سر گرائے، دونوں ٹانگیں سامنے رکھی میز پر رکھے، آنکھیں موندے پڑا تھا، جب شیراز نے اُسے بتایا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اُس نے آنکھیں موندے ہوئے ہی جواب دیا۔

''کون تھا وہ؟'' شیراز نے پوچھا۔

''وہ جو بھی تھا، اُس سے میں جلد حساب لے لوں گا۔ فلحال! تم یہ بتاؤ کہ تم کیوں اتنے بے چین ہو؟'' اُس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

''میں پریشان نہیں ہوں۔ بس! یہ سوچ رہا تھا کہ وکیلِ صفائی جیسے بندے سے وعدہ لینا صحیح رہے گا؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں کب کسی کی مرضی کے خلاف وعدہ لیا کرتا ہوں شیراز؟'' اُس نے کرسی دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں گھماتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

''ہاں! پر وہ وکیل ہے۔''

''اور میں ایس ایس پی نوید عالم ہوں۔'' اُس نے آنکھیں کھول کر اوپر نظر آتی چھت کو دیکھا۔

''فرّخ صاحب کو پتہ چل گیا تو؟'' وہ مزید پریشان ہوا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا اُنہیں پتہ نہیں چلا ہو گا اب تک؟'' اُس نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں، جبکہ اس بات پر شیراز اچھلا۔

''اُنہیں پتہ ہے؟ پھر تو وہ چھوڑیں گے نہیں!'' وہ پریشانی سے بولا۔

''اگر تم نے اسی طرح ڈرنا تھا تو میرے ساتھ نہیں آنا تھا۔'' اب کہ اُسکے لہجے میں ناگواری اُتری تو شیراز خاموش ہوا۔

وکیلِ صفائی آج مقدمہ جیتنے کی خوشی میں دعوت اُڑا کر گھر واپس آیا تھا، سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ اپنے مخصوص آفس کی جانب بڑھا، جہاں اُسے اپنا سامان رکھنا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبے آفس میں داخل ہو کر اس نے جیسے ہی لائٹ جلائی اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''تت۔۔۔ تم! تم کیا کر رہے ہو میرے گھر میں؟ اور کیسے آئے یہاں؟'' وکیلِ صفائی اپنی پسندیدہ کرسی پر نیم دراز، دونوں پیروں کو اُسکی مہنگی ترین میز پر رکھے لیٹے، نوید کو دیکھ کر بولا۔ نوید نے آنکھیں کھول کر گردن سیدھی کر کے اُسے دیکھا۔

''آؤ آؤ! گھبراؤ مت۔ بیٹھو یہاں آ کر! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایسی مسکراہٹ کے سامنے والا چند لمحوں کے لیے مبہوت ہو جائے۔

''کیا بکواس ہے یہ؟ نکلو میرے گھر سے! ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔'' اُس نے چیختے ہوئے کہا اور اگلے ہی لمحے اُسکے پیچھے دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو شیراز دروازہ بند کیے اُس سے ٹیک لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اُس نے غصّے سے پوچھا۔

''پولیس۔۔۔۔'' اُس نے جتایا۔

''تم دونوں کو تو میں۔۔۔'' اُس نے کچھ کہتے ہوئے موبائل جیب سے نکالا، جسے اگلے ہی لمحے شیراز نے اُچک لیا۔

''کیا وکیل! ڈر کیوں رہے ہو اتنا؟ مہمان ہی تو ہیں ہم۔'' نوید نے میز سے پاؤں نیچے اُتارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ایسی دلفریب مسکراہٹ تو نوید کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

''میں نے کہا، دفع ہو میرے گھر سے۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔

''چچ چچ چچ! کیوں خود کو تکلیف دے رہے ہو؟ جانتے نہیں ہو کہ یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے؟'' نوید نے ہمدردی سے کہا۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' اُس نے چبا چبا کر پوچھا۔

''اب آئے نہ تم کام کی بات پر۔ چلو بیٹھو!''نوید نے آگے کی طرف جھک کر دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائیں اور دونوں ہاتھ باہم ملا کر اُسے سرد نظروں سے دیکھتے، بیٹھنے کا اشارہ کیا پر وہ کھڑا ہی رہا۔

''بیٹھو!''اُس نے دوبارہ کہا۔اگلے ہی لمحے شیراز نے اُسے دھکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تمہاری باعزت اور باکردار موکلہ کو یہ کیس لڑنے کے پیسے کون دے رہا ہے؟اور یہ کہ اور کن کن مقدمات میں تم اُسکی پشت پناہی کر رہے ہو۔بس یہی چاہتا ہوں میں تم سے۔''نوید نے پاس رکھا پیپر ویٹ ہاتھوں میں گھماتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر وکیل ہنسا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہیں بتا دوں گا۔''اگلے ہی لمحے پیپر ویٹ اُڑتا ہوا آیا اور سیدھا اُسکے آنکھ کے برابر لگا،وہ چیخ اٹھا۔

''مم۔۔۔میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں!تم ایک وکیل کو تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتے۔''آنکھ کے برابر سے بہتی خون کی لکیر کو ہاتھوں سے صاف کرتے اُس نے کہا۔

''کون تشدد کا نشانہ بنا رہا ہے تمہیں؟''نوید اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا اُسکے قریب آیا۔

''تم!تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ سب کر کے تم بچ جاؤ گے؟تم بہت برا پھنسو گے۔''وکیل چیخا۔

''اوہ!تو تم مجھے پھنساؤ گے؟چلو!ذرا یہ بتاؤ کہ تم کیسے ثابت کرو گے عدالت میں،کہ میں نے تمہیں تشدد کا نشانہ بنایا؟''اس نے اُسکی کرسی کے سامنے ہی میز پر بیٹھتے ہوئے اُسکی جانب ذرا سا جھک کر پوچھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے گھر کے سی سی ٹی وی جام کر دیئے ہوں گے۔پر اس سوسائٹی کے شروع سے لیکر آخر تک ہر جگہ کیمرے ہیں۔تم سب کو بند نہیں کر سکتے۔''اُس نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''پر سوسائٹی کے کیمروں میں تو بس ایک چادر میں لپٹا وجود تمہارے گھر آتے نظر آ رہا ہے۔تم کیسے ثابت کرو گے کہ چادر میں،میں ہی تھا؟''اُس نے تھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا تو وہ ساکت ہوا۔

''مم۔۔میں۔۔۔میں ثابت کروں گا کہ تم نے مجھ پر تشدد کیا ہے۔''

''کیسے وکیل؟کیسے؟''نوید نے لہجہ دکھی کیا۔''تم تو عادی شرابی ہو۔ایک بار پہلے بھی شراب کے نشے میں خود کو نقصان پہنچا کر اپنا لائسنس عارضی طور پر منسوخ کروا چکے ہو۔بھلا!ایک عادی شرابی کی بات پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔وہ تو نشے کی حالت میں کوئی بھی کہانی بنا سکتا ہے۔وہ کیا کہتے ہیں اُسے؟''نوید نے اُسی کے انداز میں سوچنے کی اداکاری کی۔

''Hallucination !ہاں! یہی کہتے ہیں اسے۔''وکیلِ صفائی کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔

''چلو اب بتاؤ! جلدی نہیں ہے۔ ہمارے پاس پوری رات ہے۔''اُس نے وکیل کا کالر درست کرتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔''اگلے ہی لمحے نوید کا زناٹے دار تھپڑ اُسکے منہ پر پڑا تو وہ کرسی سمیت نیچے جا گرا۔ شیراز نے اُسے کرسی سمیت اٹھا کر دوبارہ نوید کے سامنے کر دیا۔ پانچ دس منٹ کے تشدد کے بعد اُس نے ساری معلومات دے دیں۔ گو کہ وہ معلومات نوید کے لیے فائدہ مند نہ تھی، پر ایف آئی اے کے کام آسکتی تھیں۔

''کیوں ایسے کام کرتے ہو؟ کیوں ایسے لوگوں کی پشت پناہی کرتے ہو؟''نوید نے دکھ سے اُسے دیکھا۔

''میں۔۔۔ میں آئندہ۔۔۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ مجرمین کے پشت پناہی نہیں کروں گا۔''اُس نے خون آلود چہرے اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟''نوید نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! ہاں! بالکل سچ۔۔۔''

''وعدہ کرو!''نوید نے سیاہ دستانے والا ہاتھ آگے کیا تو وہ حیران ہوا۔

''ہاں؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''وعدہ کرو!''نوید نے دوبارہ کہا تو اُس نے جلدی سے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا جسے اُس نے جھٹک دیا۔

''اوں ہوں! وعدہ ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو وکیل نے جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ اُسکے ہاتھ میں دیا، جسے اُس نے کلائی سے پکڑ لیا۔

''وعدہ! وعدہ!''وہ جلدی سے بولا۔

''پکا وعدہ!''نوید مسکرایا اور اگلے ہی لمحے اُسکی ہتھیلی پر پستول رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی کی آواز نے وکیل کی چیخ کو نہیں دبایا تھا، بلکہ یہ شیراز کا بھاری ہاتھ تھا، جس نے اُسکا منہ بند کر کے اُسے چیخنے بھی نہ دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے نوید نے اُسکی کرسی پر لات مارتے ہوئے اُسے نیچے گرایا اور اُسکے منہ پر تھوکا۔

''یہ میری بیوی کی طرف سے۔۔۔ خدا حافظ!''سر تک ہاتھ لے جا کر اُسے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ شیراز نے تکلیف سے چیختے وکیل کے برابر میں اُسکا موبائل پھینکا اور بولا۔

''پولیس تو نہیں آئے گے،ایمبولینس کو بلالینا۔دیر نہ کرنا ورنہ ہاتھ کاٹنا بھی پڑ سکتا ہے۔''پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔

---------+---------+--------

''یہ۔۔یہ وعدہ ہے؟''وہ حیرت کی زیادتی سے گنگ بیٹھے تھے۔

''ہاں!نوید تو ایسے ہی وعدہ لیتا ہے۔''فرّخ صاحب نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکادیے۔

''کتنے لوگوں سے وعدے لے چکا ہے اب تک یہ؟''رضا کو تو ہول ہی اُٹھ رہے تھے۔

''تعداد یاد نہیں!کافی سارے ہیں۔بعض لوگوں سے تو دو تین بار وعدے لے چکا ہے۔اور اسکی پاداش میں وہ اپنے ہاتھوں سے ہی محروم ہوگئے۔''وہ جتنے سکون سے بتارہے تھے،اتنا ہی اُنکا سکون غارت ہورہا تھا۔اتنا وحشی کب سے ہوگیا یہ آدمی؟

''میں نے نوید کو آج عدالت میں دیکھا تھا۔''علی نے یکدم ہی کہا۔

''اور اب تم یہ جاننا چاہتے ہوگے کہ وہ وہاں کیا کررہا تھا؟''اُنہوں نے بنا تمہید کے کہا تو وہ شرمندہ ہوا۔

''چلو!آج تمہیں بتا ہی دیتے ہیں۔میں نے کہا تھا کہ نوید مجھے بہت عزیز ہے۔جن باتوں کی اُسے اجازت ہے،اُن باتوں کی میں دوسروں کو عموماً اجازت نہیں دیتا۔وہ اپنی من مانی کرتا ہے اور میں کرنے دیتا ہوں۔اس شخص نے وطن کو اپنے دو معصوم بچے دیئے ہیں۔اُس شخص نے اپنے بیٹوں کی لاشیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتاری ہیں۔''وہ بول رہے تھے،آج وہ بولنے کے موڈ میں تھے۔

اور باقی سب سانس روکے اُنہیں سن رہے تھے۔

---------+---------+--------

بشریٰ اپنے بیٹے کو سلانے کی کوشش کررہی تھی جو نجانے کب سے شرارتوں میں مشغول تھا۔

''معید!سو جاؤنہ بیٹا۔کیوں تنگ کررہے ہو؟''اُس نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا تو وہ اُسے منہ چڑاتا ہوا بھاگ گیا۔

''ارے!شیطان!رکو اِدھر۔۔''وہ اُسکے پیچھے بھاگی۔''معید!رکو!''وہ اپنے تین سالہ بیٹے کے پیچھے بھاگی جو نوید کے ذاتی اور حساس کمرے میں جا گھسا تھا۔

''معید!باباڈانٹیں گے۔''وہ کمرہ کھول کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اندر داخل ہوئی۔اندر نوید کا نجانے کون کون سا سامان پڑا تھا؟وہ یہاں نہیں آتی تھی، صفائی کروانے بھی نہیں۔کمرہ بند رہتا تھا ہمیشہ،آج نجانے کیسے کھلا رہ گیا؟معید کو ڈھونڈتے اُسکی نظریں یکدم ہی سامنے لگے سوفٹ بورڈ پر لگی تصویر پر پڑی اور اُسی لمحے اُسکی دنیا فنا ہوگئی۔

''فرح خالد!''اُس نے زیرِلب اُس عورت کا نام دہرایا۔اُسکے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے،ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ایک دم ہی منظر بدلنے لگا۔

وہ کمرہ۔۔۔۔

وہ جلتا کمرہ۔۔۔۔

شل ہوتے اُسکے ہاتھ۔۔۔۔

بند ہوتی اُسکی زبان۔۔۔۔

آگ۔۔۔۔اور بس آگ۔۔۔۔

اور اُسکے بچے؟

''میرے بچے؟''وہ بڑبڑائی۔

''میرے بچے!میرے بچے!''وہ تسبیح کے دانوں کی طرح ورد کرنے لگی۔

''میرے بچے تو۔۔۔وہ تو مر گئے تھے۔''اُس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر۔۔۔پھر۔۔۔وہ دونوں کون ہیں؟''اُس نے خود سے سوال کیا۔

''معید۔۔۔۔معید۔۔۔''اُس نے یہاں وہاں دیکھا۔معید کہیں نہیں تھا۔۔۔خالی کمرہ سائیں سائیں کر رہا تھا،وہ تیزی سے بھاگ کر بچوں کے کمرے میں گئی۔وہاں بھی کوئی نہ تھا۔اُسکی روح کسی نے کھینچ کر باہر نکال لی،جب اُسکی نظریں کمبل میں لپٹے تکیوں پر پڑی۔

''میرے تو۔۔۔میرے تو دو ہی بچے تھے۔اور وہ۔۔۔اور وہ مر گئے تھے۔۔۔''اُسے یاد آرہا تھا۔سب یاد آرہا تھا۔اُسکے دو بچے قبر میں تھے اور دو گھر پر۔جو قبر میں تھے وہی خیال بن کر گھر میں تھے۔اُسکے چار نہیں بس دو ہی بیٹے تھے۔جنہیں وہ زندہ سمجھ کر سینے سے لگاتی تھی،وہ اُسکے بچے نہیں تھے۔وہ اُسکا خیال تھے،ایک الوژن۔۔۔۔

تو وہ جو نوید کا رویہ تھا اُسکے بچوں کے ساتھ،وہ اسی لیے تھا۔کیونکہ اُسکے بچے تو سرے سے تھے ہی نہیں۔وہ تو فقط دو چھوٹے تکیے تھے،جنھیں وہ ڈھائی سالوں سے اپنا بچہ سمجھتی رہی تھی۔

اب اُسے یاد آرہا تھا کہ نوید نے بچوں کو آئس کریم نہیں کھلائی تھی۔ وہ آئس کریم رکھے رکھے پگھل گئی، تو اس نے سنک میں بہادی تھی پر اُسکا دماغ اُسے یہ نہیں دکھا سکا تھا۔ وہ اپنی خیالی دنیا میں تھی۔ اُسکے بچے حقیقی دنیا میں کہیں نہیں تھے۔ پر وہ یہ سب نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ ڈھائی سال نوید کو وہ بچوں کے بارے میں بتاتی رہی کہ وہ دن بھر کیا کرتے ہیں؟ کب سوتے ہیں؟ کیا کھاتے ہیں؟ اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ اُنکے لیے شاپنگ کرتی رہی اور وہ چپ رہا۔ ڈھائی سال وہ دھوکے کی زندگی گزارتی رہی اور نوید عالم اُسے دھوکا دیتا رہا۔

''یااللہ!۔۔۔'' وہ اس دلخراش انداز میں چیخی تھی کہ اگر ملازم گھر پر ہوتے تو یقیناً یہی سمجھتے کہ کسی کی موت کی خبر آگئی ہے۔

ہاں! موت کی خبر ہی تو آئی تھی۔ اُسکے مرے ہوئے بچوں کی موت کی خبر۔۔۔

''یااللہ!۔۔۔'' وہ روتے ہوئے، اپنے بال نوچتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

---------+---------+--------

باب تیرہ

مثل قضاء

نوید سی ایس ایس کے انٹرویو میں دوسری مرتبہ فیل ہوا تھا۔ ہر بار امتحانات میں بہترین نمبر لا کر بھی نجانے انٹرویو میں وہ کیوں فیل ہو جاتا تھا؟ لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ تیسری اور آخری مرتبہ سی ایس ایس کی تیاری شروع کر چکا تھا۔ شادی کو دو سال ہو چکے تھے، پر اُس نے اب تک کوئی مستقل نوکری نہیں ڈھونڈی تھی۔ اپنی گریجویشن کی بنیاد پر وہ فقط ایک سٹور منیجر ہی تھا۔ بشریٰ کے خرچے اٹھانے کی وجہ سے اس نے اب گھر میں خرچ دینا کم کر دیا تھا۔ وہ نہ بل بھر سکتا تھا اور نہ ہی راشن لا سکتا تھا۔ جو پیسے کماتا تھا وہ ضروریات میں خرچ ہو جاتے تھے۔ باقی جو چند ہزار بچتے، اُسے خاموشی سے امی کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اور ہر ماہ اتنی معمولی رقم دیکھ کر وہ اُسے طعنے اور وحید کی مثالیں دینا نہیں بھولتی تھیں۔ ابّو کے تو وہ سامنے آنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ وہ بشریٰ کے سامنے بھی اُسے بلا جھجھک گالیاں دیتے تھے۔

وحید کی بیوی بھی آرمی میں ہی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھی، لہٰذا دونوں کی پوسٹنگ آجکل دوسرے شہر میں تھی۔ مگر جب بھی وہ دونوں آتے، اُنکی کسی مشہور شخصیت کی طرح خاطر مدارت کی جاتی۔ اور ان سب میں کام، صرف اور صرف بشریٰ سے لیا جاتا تھا۔ گو کہ وحید کی بیوی ایک اچھی اور سمجھدار عورت تھی، لیکن امی اُسے نہ بشریٰ سے بات کرنے دیتیں اور نہ کبھی بشریٰ کی مدد کرنے دیتیں۔ نوید کو ان سب سے کوئی مطلب نہ تھا۔ بشریٰ سے شادی میں نہ اُسکی مرضی تھی اور نہ اُسکا دل۔ دوستوں سے دُور ہونے کے بعد وہ بے انتہا خاموش اور تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ گھر کے معاملات میں بھی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، بشریٰ کے گھر والے بھی جیسے اُسکی شادی کروا کر اُسے بھول ہی گئے تھے۔ کبھی کبھار ہی اُس سے ملنے آتے۔ نوید کو اس سے بھی کوئی سروکار نہ تھا کہ وہ کس سے ملتی ہے یا کہاں جاتی ہے؟ اُسکی بلا سے وہ کہیں بھی جائے۔ وہ بس اپنی ذمے داری پوری کر رہا تھا۔ اُسکے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

علی کا لگایا ہوا الزام، اُسے اُسکی اپنی نظروں میں گرا گیا تھا۔ اور اُس سے بھی بڑھ کر سچی دوستی کا بت اِس چھناکے سے ٹوٹا تھا کہ دنیا پر سے اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے یقین کر لیا تھا کہ دنیا میں ہر رشتہ مفاد پرستی اور خود غرضی پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اب بس اپنا ایک مقام بنانا تھا۔ اُسے زندگی میں کبھی عزت اور اہمیت نہیں ملی تھی، سو اُسے اب وہی چاہیے تھی۔ اُس کے فیصلوں کو کبھی قبول نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا اُسے اب اپنا ایک مقام بنانا تھا اور اسکے لیے اِس گھر سے الگ ہونا ضروری تھا۔ الگ ہونے کے لیے پیسے چاہیے تھے، اور پیسے کمانے کے لیے اُسکا سی ایس ایس پاس کرنا ضروری تھا۔ سی ایس ایس اب اُسکی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا، اُسکے علاوہ نوید کو اور کوئی راستہ نہ نظر آتا تھا۔

ابّو اُسے جب دیکھتے، اُسکی تذلیل ضرور کرتے۔ بشریٰ ان سب میں خاموش کھڑی رہتی، کبھی نوید کو غصّے میں دیکھ کر اُسکی دل جوئی کے لئے اگر تسلی کے کچھ جملے بول دیتی تو یا تو وہ سرے سے نظر انداز ہی کر دیتا یا اُسے جھڑک دیتا، وہ چپ کر کے رہ جاتی۔ پتہ نہیں کس مٹی کی بنی تھی؟ کبھی کبھار نوید کو اپنے رویے کا احساس ہوتا پر، اِس احساس پر رشتوں کی خود غرضی اور مفاد پرستی غالب آجاتی تو اُسے پھر سے سب ایک دھوکا لگنے لگتا۔ یہ سب اسی طرح چلتا رہتا اگر زندگی میں وہ دن نہ آتا۔

اُس روز وہ ٹھیک ٹھاک تھکا ہارا گھر آیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر نیچے آیا تو کچن خالی دیکھ کر کھانا لینے چلا گیا۔ وہ گھر پر ہوتا یا نہ ہوتا، دونوں صورتوں میں وہ اکیلے ہی کھانا کھاتا تھا۔ اُسکی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی وہ سب کے ساتھ بیٹھ جاتا، تو سوائے طنز و تذلیل کا نشانہ بننے کے اور کچھ نہ ہوتا۔ البتہ بشریٰ پھر بھی گھر والوں کے ساتھ ہی میز پر بیٹھ کر ناشتہ اور کھانا کھاتی۔ نوید کو اُسکے ہونے نہ ہونے سے ویسے بھی فرق نہیں پڑتا تھا، لہٰذا وہ اُسے کچھ نہ کہتا۔ وہ کچن میں آیا تو چکن پلاؤ بنا ہوا تھا۔ بھوک ویسے ہی لگی ہوئی تھی، پلاؤ دیکھ کر مزید بڑھ گئی۔ اُس نے پلیٹ اٹھا کر کھانا نکالنا چاہا تو یکدم ہی اُسکی ماں وہاں آگئی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ کھانا لینے سے پہلے اجازت لی مجھ سے؟''اس سوال پر اُس نے ناسمجھی سے امی کو دیکھا۔

''کیا مطلب؟ اب گھر میں کھانا کھانے کے لیے بھی آپکی اجازت درکار ہو گی؟''اُس نے تلخی سے پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ یہ کھانا وحید کے پیسوں سے بنتا ہے۔ تم نے کبھی راشن ڈلوایا ہے گھر میں؟ گوشت، چاول تو دور کی بات کبھی سبزی بھی لائے ہو گھر میں؟ کب تک وحید تمہارا اور تمہاری بیوی کا پیٹ پالتا رہے گا؟''اس بات پر تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ آج تک اُسے پنکھا چلانے، لائٹ جلا کر پڑھائی کرنے، پیٹرول خرچ کرنے اور کپڑے استری کرنے جیسی چیزوں پر طعنے ملے تھے۔ پر کھانے پینے پر آج پہلی بار طعنہ ملا تھا۔

''میں اپنی تنخواہ میں سے جتنا ہو سکے اتنا دیتا ہوں آپکو۔ ایسا نہیں ہے کہ مفت میں رہ رہا ہوں اس گھر میں۔'' اُس نے لہجے کو پُر سکون رکھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''جو تم دیتے ہو، وہ میں تمہاری ہی بیوی کے حوالے کر دیتی ہوں تاکہ وہ تمہارے اور اپنے لیے کچھ پکا لے۔ یہ کھانا تو خصوصاً وحید کے سسرال والوں کے لیے بنایا تھا۔ اُسکی بیوی نے تاکید کی تھی کہ آج اُسکی بہن اور بہنوئی کی دعوت کر دوں، خود تو وہ یہاں ہے نہیں۔ تمہاری بیوی نے بھی پکایا ہے شاید کچھ۔ بلکہ پکایا کیا ہے؟ کل کا ہی کھانا رکھا ہوا ہے فریج میں۔ وہ بھی تمہاری طرح خود کو مہارانی ہی سمجھتی ہے۔ ایک دن کھانا پکا کر دو دن چلاتی ہے۔'' وہ اور بھی بہت کچھ بولتی جا رہی تھیں۔ نوید نے خاموشی سے چمچ واپس پتیلے میں ڈالا اور پلیٹ رکھتا باہر نکل گیا۔

''اب کھانا تو کھاؤ!۔''اُسکی ماں نے پیچھے سے آواز دی جسے وہ سنی ان سنی کر گیا۔''ہاں! اب بن جانا مظلوم پھر سے۔ کچھ غلط تھوڑی کہا ہے میں نے۔ اگر میں احساس نہ دلاؤں گی تو تم نے تو ساری عمر بھائی کے اوپر ہی بوجھ ڈالے رکھنا ہے۔ حتیٰ کہ کل کو اپنی اولادیں بھی اُسکے سر۔۔۔۔''اُنکی آواز نے کمرے تک

نوید کا پیچھا کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر آ کر ڈھیر ہو گیا۔ بھوک ساری ختم ہو چکی تھی۔ ان لہجوں اور جملوں کا وہ عادی تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُسکا خرچہ وحید اٹھاتا تھا۔ ہاں! یہ سچ تھا کہ اِس گھر کا بل اور راشن وحید کے ذمّے تھا پر نوید نے کبھی اُس سے اپنی بیوی یا اپنی ذات کے لیے پیسے نہیں لیے تھے اور نہ ہی وہ گھر کی کسی شے کو بے دھڑک خرچ کرتا تھا۔

''نوید!'' وہ سوچوں میں گم تھا، جب بشریٰ نے پکارا۔ اُس نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا، وہ کھڑی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اُس نے واپس سر تکیے میں گرا دیا۔

''تمہیں بھوک لگی ہے؟'' بشریٰ نے آہستگی سے پوچھا۔

''نہیں!'' اُس نے آنکھیں بند کئے ہی جواب دیا۔

''تم صبح بنا ناشتہ کئے آفس گئے تھے۔ باہر بھی تم لنچ نہیں کرتے۔ بھوک تو یقیناً لگی ہو گی؟'' وہ اُسکے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔

''بشریٰ! میں نے تم سے کہا ہے نا کہ نہیں ہے مجھے بھوک۔ سونے دو مجھے!'' اُس نے سختی سے کہا اور چہرہ موڑ لیا۔ پھر اُسے کمرے کا دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً چلی گئی تھی۔ وہ خاموش لیٹا رہا، دل نے اب دُکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ پیسے بچانے کے لیے وہ دن میں لنچ نہیں کرتا تھا، کبھی زیادہ بھوک لگی ہوتی تو بسکٹ وغیرہ پر گزارا کر لیا کرتا۔

ابھی کچھ ہی دیر گزرے تھے کہ دروازہ پھر کھلا اور بند ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ بشریٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بھلا! کوئی کیوں اُس سے کمرے میں ملنے آئیگا۔ اتنا اہم تو وہ تھا ہی نہیں۔

''نوید! کھانا کھا لو پہلے۔ پھر سو جانا۔'' بشریٰ کی نرم آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ حیرت سے اٹھ بیٹھا۔ وہ ایک ٹرے میں دو پیالے رکھے، اُسکے سامنے کھڑی تھی۔

''کھانا؟ میں نے تو منع کیا تھا نا؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں نے نوڈلز بنائے ہیں۔ تم نے کل رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ پلیز! تھوڑا سا کھا لو۔'' وہ اُسکے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔ نوید چپ کا چپ رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی کو اُسکے بھوکے رہنے کا احساس ہوا تھا۔

''میں نے بھی نہیں کھایا، تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھی بھوکی سو جاؤں گی۔'' وہ اُسکے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ لہجہ ایسا تھا جیسے کسی بچے کو پچکار رہی ہو۔ اُسکے انداز پر وہ بیساختہ مسکرایا تھا۔ وہ صبح سے بھوکا تھا، اس بات کی بشریٰ کو فکر تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ گھر کا بنا کھانا اب نہیں کھائے گا، اِس لیے وہ نوڈلز بنا کر لائی تھی۔ وہ ظاہر نہیں کرتی تھی پر احساس پورا رکھتی تھی۔ اور اس احساس کی وجہ سے آج پہلی بار نوید کو وہ اچھی لگی۔ اپنی اپنی سی، دل میں نہ صحیح پر دل کے

قریب سی۔اور زندگی میں پہلی بار نوید نے اپنے لیے نہیں بلکہ کسی دوسرے کی خاطر اپنی مرضی کے خلاف کام کیا تھا۔وہ کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا پر صرف بشریٰ کے لیے اُس نے نوڈلز کھا لیے تھے۔

''تم نے دوپہر میں کیا کھایا؟''نوید نے ایسے ہی سوال کر لیا۔ورنہ اُسے اتنی معمولی باتوں میں کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔

''نہیں! دوپہر میں تو کچھ نہیں کھایا تھا میں نے۔''اُس نے جواب دیا تو وہ چونکا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں کھایا تھا؟''اُس نے رک کر بشریٰ کو دیکھا۔

''وہ۔۔۔وہ دراصل۔۔۔میں تھک گئی تھی بہت،اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی،تو آرام کرنے لیٹ گئی تھی۔پھر سو کر اٹھی تو دوپہر کا وقت گزر چکا تھا۔''اس نے جو وضاحت دی وہ نوید کے نزدیک انتہائی بھونڈی تھی۔

''دوپہر میں تو مہمان آئے ہوئے تھے،تم سونے کیسے چلی گئی تھی تب؟''اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔وہ ایسی نہ تھی کہ مہمان موجود ہوں اور وہ آرام کرنے چلی جائے۔

''وہ۔۔۔طبیعت ٹھیک نہیں تھی نا! تو مامی نے کہا کہ جا کر آرام کر لو۔''مزید وضاحت۔

''اور کھانا کس نے بنایا تھا؟''نوید نے ٹرے دوسری طرف رکھتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''میں نے ہی بنایا تھا اور جزا اور مامی نے بھی مدد کی تھی۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! اب سچ بتاؤ۔''نوید کے الفاظ پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں نوید!''اس نے زور دیا۔

''جیسے کہ میں جانتا نہیں ہوں کہ امی تمہیں کبھی کمرے میں آ کر آرام کرنے نہیں دیتیں۔ہمیشہ تمہیں سب کے ساتھ ہی کھانا کھانا ہوتا ہے۔تو پھر آج کیوں؟''اس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے پوچھا۔آج معلوم نہیں اُسے کیا ہوا تھا؟

''نہیں، نہیں نوید! مامی تو چاہتی ہیں کہ سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کریں۔اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلے کمرے میں آ کر کیا کروں گی؟ بلاوجہ پنکھا چلے گا اور بل آئے گا۔تو میں باہر ہی سب کے ساتھ بیٹھی رہتی ہُوں۔''وہ اُسے،اُسکی ماں سے بدظن نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بس کر دو بشریٰ! بس کر دو۔''نوید جیسے بے بسی سے بولا تھا۔

''امی! تمہیں کمرے میں اس لیے نہیں آنے دیتیں کہ تمہارا اکیلے کمرے میں پنکھا چلا لینا انکو کھلتا ہے۔اور اُنہوں نے آج تمہیں آرام کی اجازت نہیں دی بلکہ تمہیں مہمانوں کے سامنے آنے سے منع کیا تھا، کیونکہ نوید کی بیوی کا تعارف کروانا، اُنکے لیے باعثِ شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''اس نے تلخی سے کہا، تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

''کل تم نے دال پکائی تھی تو وہ کہاں گئی؟''اب وہ سوال برائے سوال کر رہا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے کچھ جاننا چاہتا ہو۔

''وہ صبح ناشتے میں کھالی تھی۔''

''تم تو ناشتے میں انڈہ نہیں کھاتی؟''اس سوال پر وہ حیران رہ گئی۔کتنا باخبر تھا وہ؟اور وہ سمجھتی تھی کہ اسے کچھ نہیں معلوم بشریٰ کے بارے میں۔

''وہ انڈے ختم ہو گئے تھے۔''اس نے پھر جھوٹ کہا۔

''صبح انڈے درجن کے قریب میں نے خود دیکھے تھے۔''اس نے جتایا تو وہ سر جھکا گئی۔نوید کو خود پر غصّہ آنے لگا۔بھلا جو لوگ اُسکے کھانے پینے اور بجلی استعمال کرنے پر اُسے طعنہ دے سکتے ہیں، وہ اُسکی بیوی کو کیوں ہی چھوڑتے ہوں گے؟وہ اگر آفس میں لنچ نہیں کرتا تھا تو دوپہر کا کھانا وہ بھی نہیں کھاتی تھی۔وہ اگر طعنے سنتا تھا تو معافی بشریٰ لیے بھی نہ تھی۔

نوید کو یاد تھا کہ گرمیوں میں بشریٰ کو شدید قسم کی الرجی ہو گئی تھی، اُسکے کمرے میں اے سی تو تھا نہیں، پر اکیلے پنکھا بھی وہ نہیں چلا سکتی تھی کہ اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو وہ اُسے ٹھیک ٹھاک برا بھلا کہیں گے۔آج اس نے مہمانوں کے لیے سارا دن لگا کر کھانا بنایا اور وہ کھانا اُسے کھانے کی اجازت نہ تھی، ایسا نہیں تھا کہ کوئی براہِ راست اسے منع کرتا تھا، پر جو طعنے سننے کو ملتے وہ ہی کافی ہوتے تھے پیٹ بھرنے کے لیے۔اور امی نیچے اُسے مہارانی کہہ رہی تھیں۔جبکہ سب کچھ اُس نے ہی کیا تھا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے اگر تم مجھ سے جھوٹ بولو گی، تو میرے دل میں میرے گھر والوں کے لیے کوئی محبت جاگ اُٹھے گی؟تمہارے سچ بتانے سے پہلے بھی میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔''اب نوید نے ذرا نرم لہجے میں سمجھانا چاہا۔

''میں تمہیں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی۔تم پہلے ہی اتنا کچھ برداشت کرتے ہو۔''اس نے پہلی بار سچ بولا۔آنکھوں میں آئی نمی نوید سے چھپی نہ رہ سکی۔ اسکے دل کو کچھ ہوا، ایک لڑکی صرف اور صرف اُسکی بیوی ہونے کی سزا بھگت رہی تھی۔

''بشریٰ!''نوید نے پُکارا تو اُس نے نظریں اٹھا کر دوبارہ اُسے دیکھا۔نوید نے اسکے دونوں ہاتھ تھام لیے۔شاید دو سالوں میں پہلی بار۔۔۔

''اگر تم میری بیوی نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ یہ سب نہ ہوتا۔ اگر تمہارا شوہر وحید بھائی جیسا انسان ہوتا تو تمہاری وہی عزت اور وہی مقام ہوتا جس کے تم لائق ہو۔ لیکن ایسا صرف میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ میرے حصّے کی نفرتیں ہیں، جو تمہارے حصے میں بھی آگئی ہیں۔'' سر جھکائے آہستہ سے کہتے نوید نے آج پہلی بار کسی کے سامنے اپنا دل کھولا تھا۔ اور وہ کسی بھی کون؟ جسے وہ اپنی ذمے داری سے زیادہ کچھ سمجھتا نہ تھا۔

''ایسے مت کہو! تم تو اتنے اچھے ہو۔ تم سے کوئی کیوں نفرت کرے گا؟'' معصومیت سے کہتے اس نے اپنی طرف سے اسکا دکھ کم کرنا چاہا تو وہ ہنس دیا۔

''ایسا تم سمجھتی ہو بس!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ میں بھی دکھ گھلے تھے۔

''لیکن دیکھنا! یہ وقت جلدی گزر جائے گا۔ میں تمہیں اس گھر میں رہنے نہیں دوں گا۔ بہت جلد تمہاری یہ آزمائش ختم ہو جائے گی۔'' اُس کا ہاتھ تھامے یقین سے کہا۔

''تب تک میں صبر کروں گی۔'' اس نے بھی مسکرا کر یقین دلایا۔

''نہیں! تم صبر نہیں کرو گی۔ تم نے جتنا صبر کرنا تھا کر لیا۔ اور وہ بھی میری غلطی تھی کہ میں انجان رہا۔ میں نے اپنے اوپر ہوئی ہر زیادتی برداشت کی ہے۔ پر میں تم پر اب کوئی ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ اس مسئلے کا حل میں بہت جلد ڈھونڈوں گا۔ پر اب تم انکی کوئی بات برداشت نہیں کرو گی۔ کوئی بھی اگر تمہیں کچھ بھی کہے تو فوراً مجھے بتاؤ گی۔ چاہے میں گھر سے باہر ہی کیوں نہ ہوں۔'' نوید اُسے سمجھا رہا تھا اور وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ نوید کیا کرنے والا تھا؟ پر وہ، اتنا سا خیال کرنے پر ہی کھل اٹھی تھی۔

''ایک بات کہوں؟'' اس نے یکدم ہی پوچھا تو نوید نے رک کر اسے دیکھا۔

''کہو!''

''تم بہت اچھے ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا تو وہ بیساختہ ہنس دیا۔

---------+---------+--------

آدمی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر تو سب سہہ لیتا ہے پر جب بات بیوی کی آتی ہے، تو پھر وہ برداشت نہیں کر پاتا۔ علی بھی اِس لیے کاروبار کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ فاطمہ کی ہر خواہش پوری کر سکے۔ اور نوید بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد بشریٰ کو اس جہنّم سے نکال لے۔ اگلی صبح وہ جلدی اٹھا، پہلے جا کر آدھا درجن انڈے خرید کر لایا اور انہیں بشریٰ کے حوالے کیا۔ اس روز وہ پہلی بار ناشتے کی میز پر آ کر بیٹھا، صرف اس لیے کہ بشریٰ کو کوئی کچھ کہہ نہ سکے۔

''تم ناشتہ کر کے آرام کرنا، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی۔'' ناشتے کے میز پر اس نے سب کے سامنے بشریٰ سے کہا تھا، صرف اس لیے تاکہ سب سن لیں۔

''پر بھابھی! آپ تو آج میری دوستوں کی ون ڈش کے لیے پاستا بنانے والی تھیں۔'' اٹھارہ سالہ جزا منمنائی۔

''ہاتھ ہیں نا تمہارے پاس؟ خود بنالو!'' نوید کے سختی سے کہے گئے، جملے پر وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

''ایسا بھی کیا ہو گیا ہے کہ سارا دن آرام کرے گی؟ کھانا اسکے میکے والے بنائیں گے آکر؟'' اُسکی امی نے سخت لہجے میں کہا تو نوید کے باپ نے ناگوار نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''میں نے شاید آپکو ابھی ابھی بتایا ہے کہ وہ بیمار ہے۔ کل بھی وحید بھائی کے سسرال والوں کے لیے سارا کھانا اِس نے بنایا تھا۔ اِسکو بھی آرام کی ضرورت ہے۔'' نوید نے سنجیدگی سے کہا تو اب کہ اسکے باپ نے ہاتھ میں پکڑا چمچ میز پر زور سے پٹخا۔ سب کی توجہ اُنکی طرف گئی۔

''وحید کے سسرال والوں کے لیے کھانا بشریٰ نے کیوں بنایا تھا؟'' یہ سوال انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا تھا، تیوری پر پڑے بل واضح ہوئے۔ نوید نے حیرت سے اُنہیں دیکھا، اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس وقت وہ بشریٰ کے حق میں بولنے والے ہیں۔

''کیونکہ۔۔۔ کیونکہ وہ باہر کا کھانا نہیں کھاتے نا!'' اسکی ماں نے ذرا گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''اگر وہ باہر کا کھانا نہیں کھاتے تو اپنے بیٹے کو بولنا تھا کہ خانساماں بھیجتا، یا تب دعوت رکھتا، جب وہ اور اسکی بیوی یہاں ہوتے۔ میری بھانجی کیا نوکر ہے اسکی؟'' انہوں سخت غصّے میں سوال کیا۔ میز کا سارا ماحول ہمیشہ کی طرح خراب ہو چکا تھا۔

''ہاں! آپکو تو سارے مسئلے میرے بیٹے سے ہی ہیں، جو اکیلا سارے گھر کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اُسکی ایک بات بھی نہ مانوں میں؟'' وہ لڑنے پر آمادہ ہوئیں۔

''اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو خود بنالیتی۔'' ابّو کا لہجہ مزید غصیلہ ہوا تھا۔

''میں بنالیتی؟ میں؟ میں بوڑھی عورت، اس عمر میں بھی یہی سب کرتی رہوں؟ اپنی بیٹی کو کیوں نہیں کہتے؟ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے لیکن ہل کر ماں کی مدد تک نہیں کرتی۔'' اُن دونوں کا یہی مسئلہ تھا، اپنی اپنی لڑائی میں ایک دوسرے کے پسندیدہ بچے کو گھسیٹ لیتے تھے۔

''میری بیٹی چھوٹی ہے اور پڑھ رہی ہے۔ وحید سے کہو اتنا شوق ہے دعوتیں کرنے کا تو خود آئے یہاں۔ کوئی اس گھر میں اسکا نوکر نہیں بیٹھا ہوا۔''

''میرا بیٹا بیچارہ اس گھر کا خرچہ اٹھاتا ہے۔ اور اسکے ساتھ۔۔۔۔'' وہ پھر اسکی طرفداری کرنے لگیں۔

''بس کر دو! کوئی احسان نہیں کرتا وہ۔ میں نے اُسے کبھی نہیں کہا کہ گھر کا خرچ دے۔ تمہیں ہی شوق ہے اس سے پیسے لینے کا۔ میں بڑے آرام سے اس گھر کو چلا سکتا ہوں۔ اور ایک بات میں بتا دوں، اگر اتنا شوق ہے گھر میں دعوتیں کرنے کا تو اپنے اپنے کام خود کرو، میری بھانجی اس گھر میں تمہاری غلام بن کر نہیں آئی ہے۔'' انہوں نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے بشریٰ کی جانب رخ موڑا جو اس سارے معاملے میں فقط سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''بشریٰ!'' انہوں نے پکارا۔ لہجہ پہلے کی نسبت نرم تھا۔

''جی ماموں!'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

''بیٹا ناشتا کر لیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ماموں!'' اس نے اتنا ہی کہا۔

''تو جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی۔'' انہوں نے پیار سے اسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نوید کی ماں نے بھی غصّے سے پاؤں پٹخا اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئیں۔

''اور تم!'' اب کہ اُسکے ابّو نے اُسے مخاطب کیا۔

''جی؟'' نوید نے سنجیدگی سے اُنہیں دیکھا۔

''زندگی میں کچھ کرو یا نہ کرو، لیکن کم از کم اپنی بیوی کا خیال تو رکھو۔'' اُنہوں نے سخت الفاظ میں ڈانٹا تھا۔ اور زندگی میں پہلی بار نوید کو اُنکی ڈانٹ بری نہیں لگی تھی۔

''جی!'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکے باپ کو اس سے کہیں زیادہ ہمدردی اپنے بہن بھائیوں کے بچوں سے ہے، یہ اسٹینڈ انہوں نے کبھی نوید کے لیے نہیں لیا تھا۔ لیکن اس وقت اُس کے لیے یہ کافی تھا کہ کم از کم بشریٰ کا ساتھ دینے والا کوئی تو ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اسکے ماں باپ ایک دوسرے کے خلاف جس شے پر کھڑے ہو جائیں تو پھر اسے ضد بنا لیتے ہیں۔ اور یقیناً اس جھگڑے کے بعد اب وہ بشریٰ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دینے والے تھے۔

بشریٰ کی طرف سے وہ تھوڑا بے فکر ضرور ہوا پر لاپرواہ نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ صبح ابّو کام پر جاتے ہیں اور دوپہر کے بعد گھر آتے ہیں۔ سو، دوپہر کے بعد سے تو اُس کی فکر نہ تھی، پر صبح اُسکی ماں نے یقیناً گن گن کر اپنے شوہر کا بدلہ لینا تھا اور اُسکا جینا حرام کرنا تھا۔ لہٰذا اس مسئلے کا ایک بہت اچھا حل بھی نوید نے نکال لیا۔

''بشریٰ! کیا تم اسکول میں پڑھاؤ گی؟''اس روز چائے پیتے ہوئے نوید نے اُسے مخاطب کیا۔

''اسکول میں؟''وہ اُسکی بات سمجھ نہ سکی۔

''ہاں! یعنی جاب کرو گی؟''اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کرلوں گی۔''ہمیشہ کی طرح اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''ایسا نہیں ہے کہ میں تمہارے اخراجات نہیں اٹھا سکتا، یا تم سے نوکری کروا کر مجھے گھر کا خرچ چلوانا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری اور ابّو کی غیر موجودگی میں تم اس گھر سے دور رہو، امی سے دور رہو، جزا سے دور رہو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہارے ساتھ مزید زیادتی کریں۔ اسکا بہترین حل یہی ہے کہ تم جاب کرلو۔''اس نے اپنائیت سے کہا۔

''نوید! گھر کے کام کرنے سے، یا کسی کی مدد کرنے سے ہم چھوٹے نہیں ہو جاتے۔''اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔ نوید تلخی سے مسکرا دیا۔

''ہاں بشریٰ! کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔ پر اپنا آپ وہاں قربان کیا جانا چاہیے، جہاں قدر کرنے والے بھی ہوں۔ یہ قربانی نہیں ظلم ہے۔ خیر! میں کل تمہیں اپنے ساتھ لیکر جاؤں گا۔ کچھ اسکولوں میں تمہاری سی وی دے دیں گے۔ تم راضی ہو اس پر؟''اُس نے پوچھا۔

''جیسے تم کہو!''وہ ہمیشہ اسی طرح کے جواب دیتی تھی۔

''ایک بات کہوں؟''وہ چائے کے برتن اٹھا رہی تھی، جب نوید نے یکدم ہی پوچھا۔ اس نے رک کر اُسے دیکھا۔

''کہو!''بشریٰ نے کہا۔

''تم بہت اچھی ہو۔''مسکراتے ہوئے اُسی کے انداز میں اُس کی تعریف کی تو وہ بیساختہ ہنس دی۔

---------+---------+--------

اگلے دن اس نے آفس سے چھٹی لی اور بشریٰ کو صبح ہی صبح لیکر نکل کھڑا ہوا۔ مختلف اسکولوں میں اسکی سی وی دیں، ایک جگہ ڈیمو بھی ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں ایک اسکول نے اسکا ڈیمو پسند کر کے اُسے کل سے کام کرنے کی پیشکش بھی کر دی۔ وہ بہت خوش ہوئی، واپسی پر نوید اسے ایک ریسٹورانٹ لے آیا۔ شادی کے دو سال میں آج پہلی مرتبہ وہ اسے کہیں باہر کھانا کھلانے لایا تھا اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔

''آج بہت تھک گئے ہیں ہم، گھر جا کر صرف آرام کرنا ہے۔''نوید نے اسے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر جاتے ہی اسے چولہے کے آگے جھونک دیا جائے۔

''تم ہار مت ماننا نوید! دیکھنا تم بہت جلد کامیاب ہو گے۔ دیکھنا! جو تم چاہتے ہو، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔'' بشریٰ نے بالکل اچانک ہی کہا تو کھانا کھاتے نوید کے ہاتھ تھمے۔ اس نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں ہمت ہار بھی جاتا، پر اب نہیں! اب جو کرنا ہے صرف تمہارے لیے کرنا ہے۔ میں تمہیں، تمہارا اپنا گھر دوں گا۔ جہاں کوئی تمہیں کھانے پینے، یا بجلی خرچ کرنے پر طعنے نہیں دے گا۔ وہاں تم اپنی مرضی سے رہو گی۔ اور جب میں سی ایس ایس کلیئر کر لوں گا، تو تمہیں یہ نوکری کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ تم گھر پر آرام کرنا۔ اور جو چاہے کرنا، اپنی مرضی سے رہنا۔'' آج بلآخر نوید عالم کی آنکھوں نے ایک بار پھر خواب سجا لیے تھے۔ وہی خواب، جو اس نے بچپن سے دیکھا تھا۔ ایک مکمل اور محبت سے بھرے گھر کا خواب۔ اور یہی خواب اب وہ بشریٰ کو دکھا رہا تھا۔ پر کسے معلوم کہ آگے جا کر اس خواب کو کون توڑنے والا تھا؟

وہ گھر واپس آیا تو اسکے ابّو لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ امی بھی ساتھ تھیں۔ اُن دونوں کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر ناگواری سے اُنہیں دیکھا، نوید کو تو مطلق اثر نہیں پڑا پر بشریٰ تھوڑی گھبرا گئی۔

''کام کاج تو ہوتا نہیں ہے ان سے۔ صبح صبح کس سیر اور تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے؟'' امی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ نوید نظر انداز کرتے ہوئے جوتے اتارنے لگا۔

''کچھ پوچھا ہے تم سے؟ کہاں تھے دونوں؟'' اب کہ انہوں نے ذرا بلند لہجے میں بشریٰ سے سوال کیا۔ وہ پریشانی سے اُنگلیاں مروڑنے لگی۔

''بشریٰ کو اسکول لیکر گیا تھا انٹرویو کے لیے۔ کل سے یہ اسکول جایا کرے گی۔'' نوید اُسکے برابر آ کھڑا ہوا اور سکون سے بولا۔ اُسکی ماں کو تو پتنگے ہی لگ گئے۔

''کیا مطلب اس بات کا؟ یہ نوکری کرے گی اب؟ اور کیوں؟'' وہ غصّے سے ہمیشہ کی طرح چلائیں۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آج کے بات کوئی اسے فریج سے دودھ یا انڈہ لینے پر ذلیل کرے۔ یا نوکروں کی طرح اِس سے سارے گھر کے کام لینے کے بعد اسے مہارانی کا لقب دے۔'' اس نے پشت پر ہاتھ باندھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو اسکی ماں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''تو اب ہم بہو سے نوکری کروائیں گے؟ اور یہ نوکری کرے گی تو گھر کون سنبھالے گا؟ عورت تو گھر ہی سنبھالتی اچھی لگتی ہے۔ اسکا کام گھر کے اندر رہے، تمہاری غیرت مر گئی ہے کیا جو بیوی سے نوکری کرواؤ گے؟'' وہ ہمیشہ کی طرح جاہلانہ انداز میں بولی تھیں۔

''تمہارے بڑے بیٹے کی غیرت تو بڑی زندہ ہے نا بیوی سے نوکری کروا کر؟'' اس سے پہلے کہ نوید کوئی جواب دیتا، اُسکے باپ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''آپ اُسکی بات نہ کریں وہ تو ڈاکٹر۔۔۔۔'' وہ کچھ بولنے لگی ہی تھیں کہ وہ انکی بات کاٹتے ہوئے چیخے۔

''کیوں بات نہ کروں اُسکی؟ تمہاری وہ بہو گھر سنبھالتی ہے؟ کیا کبھی ایک پیالی چائے بھی بنا کر دی ہے وحید کی بیوی نے تمہیں؟ الٹا تم ہی اُسکے آگے پیچھے پھرتی ہو۔ وہ تو تمہارے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ تب تمہاری غیرت اور اصول کس قبر میں جا کر سو جاتے ہیں؟''اس سوال پر تو وہ لاجواب ہو گئیں۔

''یہ فیصلہ ان دونوں میاں بیوی کا ہے۔ بشریٰ کی مرضی وہ نوکری کرے یا نہ کرے۔ تمہارے گھر کے کاموں کے لیے پہلے ہی ملازمہ آتی ہے۔ اور پلیز!۔۔۔''انہوں نے اپنی بیوی کو منہ کھولتا دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکا۔''میرے سامنے وحید کے پیسوں کا راگ مت الاپنا۔ تم کرو اُسکی خدمتیں، میری بھانجی اس کام کے لیے نہیں ہے۔''ہمیشہ کی طرح اُن دونوں کی اپنی ہی بحث شروع ہو چکی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی ہمیشہ کی طرح وہاں سے واک آؤٹ کر گئیں۔

''کون سے اسکول میں جاب ملی ہے بیٹا؟''انہوں نے بشریٰ کو مخاطب کیا۔

''ماموں! قریب میں ہی ہے۔''اس نے اسکول کا نام بتایا۔

''اور جانا آنا کیسے کرو گی؟''

''صبح میں چھوڑ دیا کروں گا ابّو!'' نوید نے کہا۔

''اور واپسی؟''انہوں نے پوچھا۔

''واپسی کا ابھی کوئی انتظام نہیں ہوا۔''اس نے آہستگی سے بتایا۔

''ہمم! واپسی پر میں لے لیا کروں گا تمہیں۔''انہوں نے بشریٰ کو کہا۔

''میری دفتر سے واپسی کا وہی وقت ہوتا ہے، تمہیں لیتا ہوا ہی آ جایا کروں گا۔ تم پریشان نہیں ہو اور اپنی مامی کی باتوں پر دھیان مت دو۔''اُنہوں نے کہا تو بشریٰ خوش ہوئی۔ اس سے پہلے کہ نوید انہیں منع کرتا وہ بول اُٹھی۔

''بہت شکریہ آپکا ماموں!''اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو نوید نے پلٹ کر اُسے ناگواری سے دیکھا، پر وہ محسوس نہ کر سکی۔ وہ اُسکے لیے اپنے باپ کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا پر وہ راضی ہو چکی تھی تو وہ خاموش رہا۔

''ٹھیک ہے! اب تم جاؤ، اور نوید تم ذرا رکو۔''انہوں نے باری باری دونوں سے کہا تو وہ وہاں سے چلی گئی۔ اُسکے جانے کے بعد اُنہوں نے نوید کو کہا کہ

''تمہاری وجہ سے میری بھانجی کو جگہ جگہ دھکے کھانے پڑ رہے ہیں۔ جلدی فیصلہ کرو میاں! کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے تو غلطی ہو گئی، اسے تمہاری زندگی میں شامل کر کے۔ تم نہ کام کے نہ کاج کے، اور آج تمہاری وجہ سے اسے اتنا کچھ سہنا پڑ رہا ہے۔''اُنکے لفظ ہمیشہ کی طرح زہر میں بجھے ہوئے تھے، اُنکی

ہمدردی اُسکی بیوی سے نہیں، بلکہ اپنی بھانجی سے تھی۔ کبھی اُسکے باپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے بیٹے! تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں؟ کبھی یہ نہیں کہا کہ تم پریشان نہ ہو، دیکھنا سب ٹھیک ہو گا۔ کبھی نہیں! وہ ترس گیا اُنکے منہ سے دو جملے نرمی کے سننے کے لیے۔ پر ایسا دن کبھی نہ آیا تھا۔ وہ انہیں کوئی بھی جواب دیئے بنا ہی اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اندر آکر دروازہ اِس زور سے بند کیا کہ اپنا سامان سمیٹتی بشریٰ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا نوید؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''تم نے ابّا کے ساتھ واپس آنے کی حامی کیوں بھری؟'' اُس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اُنہوں نے پوچھا تو میں نے۔۔۔''

''مجھ سے پوچھا تھا؟ مجھ سے اجازت لی تھی؟'' وہ کوئی وضاحت دینے ہی لگی تھی کہ نوید اسکی بات کاٹتے ہوئے چیخا۔

''نوید تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ روہانسی ہوئی۔

''کیوں بشریٰ؟ کیا میں اتنا غیر اہم، اتنا بیکار ہوں کہ تم کوئی فیصلہ لینے سے پہلے ایک بار میری طرف دیکھو بھی نہیں؟ میری رائے بھی نہ لو؟'' غصّہ ابھی کا نہیں تھا۔ غصّہ سالوں کا تھا، دکھ اُسکی اجازت لینے کا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بار پھر سے پس منظر میں رہ جانے کا خوف تھا۔

''تم اہم ہو نوید! تم ہی اہم ہو۔'' اُس نے نوید کا ہاتھ پکڑتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی اور اُس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اُسکا توجہ دینا، نرمی سے بات کرنا، مسکرانا سب لمحوں میں ہی ہوا میں تحلیل ہو گیا، وہ پھر سے وہی سرد مہر سا نوید بن گیا تھا۔

''نہیں ہوں میں اہم! کسی کے لیے بھی نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو تم نیچے مجھ سے پوچھتی۔ میں صبح سے تمہارے لیے خوار ہو رہا ہوں اور تم نے ابّو کے ساتھ فیصلہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔'' وہ غصّے سے بول رہا تھا۔ اور بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

''میں نے کوئی فیصلہ تو نہیں کیا نوید! تم کہو گے تو میں ماموں کو کل منع کر دونگی۔'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں! منع کر دو تم۔ منع کر دو تاکہ کل وہ مجھے مزید طعنے دیں کہ میں کتنا خود غرض ہوں۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ اب کہ وہ چپ رہی۔

''مجھے کیا تم جو بھی کرو۔ میں فضول میں اپنا وقت برباد کر رہا تھا۔ تمہارے لیے جو لوگ اہم ہیں تم اُنہی کے ساتھ رہو اور جاؤ! اکیلا چھوڑ دو مجھے۔'' وہ سختی سے کہتا اُسکے سامنے سے ہٹا۔

''میرے ساتھ ایسا مت کرو۔'' بشریٰ کی روتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی تو غصّے کا گراف نیچے آنے لگا۔

''جاؤ بشریٰ!'' اُس نے بنا اُسکی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''میرے ساتھ ایسامت کرو۔پہلے کون سادنیامیں کوئی مجھے عزت دیتاہے؟''اُس نے بلک کر کہااور اگلے ہی لمحے نوید تڑپ کر اسکی جانب پلٹا تھا۔وہ رو رہی تھی،سارا غصّہ جھاگ کی طرح بہہ گیا۔

''اچھا!رومت۔''وہ نرم پڑا۔

''اچھا!آئی ایم سوری!''زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے معافی مانگی تھی۔

''غصّے میں تھااِس لیے ایسا کہہ دیا۔تم رو تومت یار!''جو تھوڑی دیر پہلے غصّہ کر رہا تھا،اب وہ ہی اسے بیٹھ کر منا رہا تھا۔جواباًوہ صرف سوں سوں کر رہی تھی۔

حالانکہ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔نوید خود حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا؟غصّہ ابّو کی بات پر بھی نہیں تھا کہ وہ توانکا معمول تھا۔پھر وہ کیوں اتنا زیادہ ٹریگر ہوا؟لیکن ایک بات جو اسے سمجھ آگئی تھی،وہ یہ کہ اب وہ بشریٰ کو روتے ہوئے،تڑپتے ہوئے حتیٰ کہ کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ پاتا تھا۔

اُسے مناتے ہوئے یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔

پر وعدے کب وفا ہوتے ہیں؟

---------+---------+--------

اگلے روز سے بشریٰ نے اسکول جوائن کر لیا۔اس بات پر نوید کی ماں کو بہت غصّہ تھا پر اب بشریٰ کے حامی اُسکے ماموں بن گئے تھے۔وہ بشریٰ سے ایک لفظ بھی کہتیں تو ماموں آگے سے ہزار باتیں سنا دیتے۔وہ بس تلملا کر رہ جاتیں۔پہلی تنخواہ ملنے پر بھی جب انہوں نے مطالبہ کیا کہ بشریٰ،آدھے پیسے اُنہیں دے تب بھی وہ چپ نہ رہے۔

''وحید کی بیوی کی تنخواہ میں سے بھی پیسے لیتی ہو کیا؟شرم تو نہیں آرہی ہو گی بہو سے مانگتے ہوئے۔کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی مامی کو کچھ بھی دینے کی۔''انہوں نے پہلے اپنی بیوی اور پھر بشریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے،آپکی بھانجی کے پیسوں کی،میں صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ بچی ہے۔اسے نہیں معلوم کہ پیسے کس طرح خرچ کرنے ہیں۔''انہوں نے چبا چبا کر کہا۔

''لیکن تمہیں تو اس عمر میں بھی پیسے خرچ کرنے نہیں آئے۔''اُنہوں نے طنز کیا تو انہیں آگ ہی لگ گئی۔بشریٰ اُن دونوں کو لڑتا چھوڑ کر کمرے میں آگئی۔نوید کے امتحانات قریب تھے،وہ انہی کی تیاری کر رہا تھا۔اس نے اپنی پوری تنخواہ اُسکے ہاتھ پر لا کر رکھ دی۔

''مجھے کیوں دے رہی ہو؟''وہ حیران ہوا۔

''کیونکہ تم بڑے ہو۔''اس نے معصومیت سے کہاتو وہ ہنس پڑا۔

''تم پاگل ہو کیا؟ یہ تمہاری کمائی ہے،اس پر صرف تمہارا حق ہے۔ جیسے چاہو ویسے خرچ کرو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے،نوکری تو صرف تمہیں اس گھر سے دور رکھنے کا بہانہ ہے۔''اس نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا کہ ہر کام تم سے پوچھ کر کروں۔''اس نے یاد دلایا۔

''تواب تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں کتناDominatingاور کنٹرولنگ ہوں؟''وہ یکدم ہی سنجیدہ ہوا۔

''کیاہے نوید؟ ہر بات پر اتنا ناراض کیوں ہونے لگتے ہو؟''وہ بدمزہ ہوئی، عجیب دھوپ چھاؤں سا مزاج ہو گیا تھا نوید کا آج کل۔

''تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔اب پڑھنے دو مجھے۔''وہ سنجیدگی سے کہتا واپس کتاب کھولنے لگا۔

''اچھا! میری پہلی تنخواہ کی خوشی میں تمہارے لیے کچھ اچھا سا بناؤں؟''اس نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!''غالباً اسکا موڈ خراب ہو چکا تھا۔بشریٰ کا منہ اُترا۔

''ہم باہر سے کھانا کھائیں گے بلکہ میں کھلاؤں گا۔''اس نے یکدم ہی مسکراتے ہوئے کہاتو وہ حیران رہ گئی۔

''اب دیکھ کیا رہی ہو؟ جاؤ جلدی تیار ہو کر آؤ۔''نوید نے کہاتو وہ جلدی سے تیار ہونے چلی گئی۔ پھر نوید نے اُسے بہت مہنگے نہیں، مگر اچھے سے ریسٹورانٹ میں کھانا کھلایا۔وہ خوش تھا،زندگی بہتر تھی۔

کھانے کے دوران اسے یاد آیا کہ کچھ روز پہلے بشریٰ نے اُسے کہا تھا کہ **پہلے کون سا دنیا میں کوئی مجھے عزت دیتا ہے؟**نوید کا پاستا کھاتا ہاتھ رکا۔اُس نے لفظ دنیا استعمال کیا تھا۔اس نے یہ نہیں کہا کہ پہلے کونسا اس **گھر** میں کوئی مجھے عزت دیتا ہے۔

اس نے دنیا کیوں کہا؟وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کیوں نہیں جاتی تھی؟اُسکے گھر والے بھی سال میں ایک دو بار ہی چکر کیوں لگاتے تھے؟

''بشریٰ!''اس نے کھانا چھوڑ کر اُسے مخاطب کیا۔

''ہونہہ؟''اس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''کیا تمہارے اپنے گھر والوں کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں؟''اُس نے دونوں ہاتھ باہم پھنسا کر میز پر رکھتے ہوئے،اُس سے براہِ راست سوال کیا۔

''یعنی؟''وہ اس اچانک سوال کا مطلب سمجھ نہیں سکی۔

''یعنی!۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔''تم اچھے سے سمجھ رہی ہو بشریٰ کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو بشریٰ نے چمچ پلیٹ میں رکھا اور اُسکی آنکھوں میں سنجیدگی سے دیکھا۔

''یہ سوال تمہیں آج دو سال بعد کیوں یاد آیا ہے؟''اس نے طنز نہیں کیا تھا، پر اسکا سوال نوید کے دل کے آر پار ہو گیا تھا۔ وہ جیسے کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ اُسے خاموش دیکھ کر بشریٰ گہری سانس لیتی آگے ہوئی۔

''میں اپنے ماں باپ کی ان چاہی اور کچھ حد تک ناپسندیدہ بچی تھی نوید!''اُسکے آہستگی سے کہے گئے جملے پر نوید نے جھٹکے سے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''انکے تین بیٹوں کے بعد بھی انہیں بیٹی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ چوتھا بھی بیٹا ہی چاہتے تھے، اُنکے نزدیک بیٹی صرف بوجھ تھی۔ ایک ایسا بوجھ جسے اپنے سر سے اتار کر کسی کے بھی سر ڈال دیا جائے۔ جسکا جہیز، اُسکے بچپن سے تیار کیا جاتا رہا، پر پھر بھی نہ وہ اپنی مرضی سے کوئی فرمائش کر سکتی تھی، نہ کوئی خواہش۔ اُسے بس اپنے ماں باپ کے گھر میں بڑا ہونا تھا۔ ایک ایسے دن کے لیے، جس دن وہ اسے گھر سے نکال کر خود سکون کا سانس لے سکیں۔''وہ کہہ رہی تھی، دکھ سے، اذیت سے، کرب سے۔ اور نوید سانس روکے سن رہا تھا۔

''میں کچھ بھی کرنا چاہتی تو وہ کہتے کہ شادی کے بعد کرنا۔ میں گہرے رنگ کے کپڑے نہیں پہن سکتی تھیں، میں تیار نہیں ہو سکتی تھی، میں اپنی ناک میں لونگ نہیں پہن سکتی تھی، میں پاؤں میں مہندی نہیں لگا سکتی تھی، ہر کام کے لیے وہ کہتے تھے شادی کہ بعد کرنا کیونکہ کنواری لڑکیاں یہ سب نہیں کرتیں۔ میں ہنس نہیں سکتی تھی، سائیکل نہیں چلا سکتی تھی، دوستوں سے بات تک نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ انہیں شک تھا کہ بیٹی اگر یہ سب کرے گی، تو لوگ اُن پر اُنگلیاں اٹھائیں گے۔ پیدا ہوتے ہی انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ بیٹی ہماری رسوائی کا باعث ہی بنے گی۔ میری ذرا سی غلطی پر مجھے اپنے بھائیوں سے زیادہ سزا ملتی تھی۔ کبھی میں شکایت کرتی تو امی کہتیں کہ تم لڑکی ہو، تمہیں اپنی غلطیاں سدھارنی ہیں کیونکہ معاشرہ تمہاری غلطی نہیں بھولے گا۔ کبھی نہیں!۔''وہ نم آنکھوں اور تکلیف دہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ نوید اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔ یہ کیسا بچپن ملا تھا اُن دونوں کو؟

''جب میں سولہ سال کی تھی، تو انہوں نے میرے لیے رشتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ انٹر میں کر چکی تھی یونیورسٹی میں ایڈمشن لینا چاہتی تھی پر ابّو نے منع کر دیا۔ کہنے لگے کہ بس اتنا پڑھ کر کیا کرنا ہے؟ لڑکی کی شادی ہونا ضروری ہے۔ اگر پڑھنا بھی ہو تو شادی کے بعد پڑھ لینا۔ بتاؤ مجھے نوید! جب ماں باپ ہی بیٹی کو نہیں پڑھا سکتے، تو بھلا کوئی دوسرا کیوں پڑھائے گا؟ میں بہت روئی، اتنا زیادہ کہ میں بیمار پڑ گئی۔ پھر دادا کے کہنے پر مجھے فقط پرائیویٹ بی اے کرنے کی اجازت ملی۔ میں آئی ٹی پڑھنا چاہتی تھی۔ مجھے ٹیکنالوجی کی دنیا کو سمجھنے کا شوق تھا مگر مجھ سے میرا یہ شوق چھین لیا گیا۔''وہ سانس لینے کو رکی۔ چائے کب کی رکھی ٹھنڈی ہو گئی۔ نوید سر جھکائے خاموشی سے میز پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا رہا۔ آج وہ اُسکو بولتے رہنے دینا چاہتا تھا۔

''پھر مجھے دیکھنے کے لیے لوگ آنے لگے، ہر دوسرے ہفتے کوئی نہ کوئی نئی عورت آتی۔ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتی، واپس جا کر میری کوئی خامی نکال کر مجھے ٹھکرا دیتی۔ اُنکے ٹھکرا دینے کے بعد میں اپنے ہی گھر میں مجرم بن جاتی، سب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے ان سب میں میرا قصور ہو۔ وہ جو خامی مجھ میں نکال کر جاتیں، وہی عیب میری امی کو مجھ میں نظر آنے لگتے۔ وہ مجھے اسی بات کا طعنہ دیتیں۔ اگر کوئی رشتے والی یہ کہہ کر ٹھکراتی کہ اسکا تو قد بہت لمبا ہے۔ تو امی اگلے کئی دن تک یہی کہتی رہتیں کہ تاڑ جیسا قد لیکر پیدا ہو گئی ہے، اب کون بسائے گا اسے گھر میں؟ جیسے میں نے اپنا قد خود بنایا ہو۔'' وہ کہتے ہوئے طنزیہ ہنسی۔ نوید کو لگا کہ وہ بشریٰ کے نہیں بلکہ اپنے سامنے بیٹھا ہے۔ الفاظ الگ تھے، پر حالات وہی تھے۔

''کوئی کہتا کہ آپکی بیٹی کی آنکھوں کے نیچے بہت حلقے ہیں تو امی میری کتابیں بند کر دیتیں۔ کہتیں کہ پڑھ پڑھ کر آنکھوں کا سارا نور ختم کر دیا ہے۔ کئی بار تو اُنہوں نے میری پڑھائی ختم کروانے کا فیصلہ ہی کر لیا، پر دادا کی وجہ سے ہر بار وہ رک جاتیں۔ میرا بہت دل کرتا تھا نوید! کہ کسی دن۔۔۔۔ کسی دن تو میری ماں اُن رشتے والی عورتوں کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیں۔ کسی دن مجھ سے کہیں کہ بیٹی تم بری نہیں ہو، برے تو وہ لوگ ہیں۔ پر نہیں! میری خواہش، بس ایک خواب بن کر رہ گئی۔'' وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اگر چہرہ اُٹھا کر دیکھ لیتی تو اُسے احساس ہوتا کہ اِس دُنیا میں ایک شخص اُس کے دکھ پر رویا ہے۔ نوید عالم کی آنکھیں زندگی میں پہلی بار کسی دوسرے کے غم میں چھلک پڑی تھیں۔ اتنا دکھ تو صنوبر کے جانے پر بھی نہیں ہوا تھا، جتنا صرف بشریٰ کے غم سن کر ہوا تھا۔ تو کیا صنوبر بس وقتی پسند تھی؟ اور بشریٰ؟ بشریٰ کے لیے یہ کیسے جذبات جاگ اُٹھے تھے؟ وہ خود نہیں سمجھ سکا تھا۔ بس دل کر رہا تھا کہ وہ اُسے کہیں چھپا کر رکھ دے۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اسے دکھ نہ پہنچا سکے۔

''رشتوں کا یہ سلسلہ چار سالوں پر محیط رہا۔ چار سالوں میں کسی ایک نے بھی مجھے پسند نہیں کیا۔ مسلسل رد کیے جانے، نے ویسے ہی میری ذہنی حالت تباہ کر دی تھی۔ بیس سال کی عمر میں میرے ماں باپ مجھے ایسے دیکھنے لگے تھے، جیسے میں چالیس کی ہو گئی ہوں۔ اُنکو لگنے لگا تھا کہ اب تو میں گھر بیٹھی رہ جاؤں گی۔ چار سالوں میں انکار و یہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ میں اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔ میں ایم اے کرنا چاہتی تھی، پر اس بار دادا کی بھی نہیں چلی۔ سارا دن گھر میں فالتو بیٹھے رہ رہ کر مجھے لگنے لگا کہ میں واقع ایک بوجھ ہوں۔ پھر بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ اس شادی میں پہلی بار مجھے سجنے سنورنے کی اجازت ملی۔ میں خوش ہونا چاہتی تھی پر تب ہی امی میرے پاس آئیں، کہنے لگی کہ خوب اچھی طرح سے تیار ہو۔ ایسی شادیوں میں ہی تو لوگ لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ میرا دل کیا زمین پھٹے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔ کیا میری زندگی کا مقصد بس یہی تھا کہ کوئی مجھے پسند کر لے؟ کیا میری ساری کوشش اور ساری جدوجہد صرف اس لیے ہونی چاہیے تھی کہ کوئی مجھے اپنی بیوی بنانے پر راضی ہو جائے؟ کیا میں کوئی مال تھی؟ جسے بہترین سے بہترین بنا کر گاہکوں کے آگے رکھا جاتا ہے؟'' وہ سوال کر رہی تھی۔ اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''پھر میرا دل ہی نہیں کیا خوش ہونے کو۔ اس دوران ماموں نے اچانک ہی مجھے اپنی بہو بنانے کی سرسری سی خواہش ظاہر کر دی اور اسی نے میرے گھر والوں میں امید کی کرن جگا دی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ماموں مجھے اپنے کس بیٹے کی بیوی بنانا چاہتے ہیں؟ اُنکے لیے یہی کافی تھا کہ انکا بوجھ کسی نے

اپنے سر لینے کا عندیہ دے دیا ہے۔اس بات کے بعد ماموں نے دوبارہ کچھ نہ کہا۔پر سب نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھا،میری خواہشات پوری کی جانے لگیں،رشتے والیوں کے سامنے جانے کا سلسلہ تھم گیا،پر جب سال گزر گیا اور ماموں کی جانب سے خاموشی ہی چھائی رہی،تو میرے گھر والوں کا غصّہ مجھ پر ایسے نکلنے لگا جیسے میں نے ماموں کو رشتہ لانے سے روک دیا ہو۔حتیٰ کہ میں ہر نماز میں ماموں کے آنے کی دعائیں کرنے لگی۔اسی طرح مزید ایک سال گزر گیا اور تب بلآخر ماموں اور مامی میرے لیے باقاعدہ،تمہارا رشتہ لیکر آئے۔اُس روز کے بعد سے گھر والوں نے دوبارہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھالیا۔میرے گھر والوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ تم مجھے پسند کرتے بھی ہو یا نہیں؟تم اس رشتے پر راضی ہو بھی یا نہیں؟حتیٰ کہ تم نہ منگنی پر آئے اور نہ ہی کبھی عیدی دینے ساتھ آئے،ہم جب تمہارے گھر جاتے تب بھی تمہارے رویے سے صاف پتہ چلتا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتے،نہ تم ساتھ بیٹھتے،نہ سیدھے منہ بات کرتے اور نہ ہی شادی کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی دکھاتے،پر میرے گھر والوں کو ان سب پر کوئی اعتراض نہ تھا۔''وہ رکی۔نوید زمین میں گڑ گیا۔

''ایک آدھ بار میں نے اس بات پر اعتراض کرنا چاہا تو مجھے سخت الفاظ میں یہ سننے کو ملا کہ تم لڑکی ہو تمہارا ان سب سے کیا تعلق؟یعنی شادی میری ہے، زندگی مجھے گزارنی ہے۔پر مجھے کچھ بولنے کا حق ہی نہیں۔خیر!پھر میری تم سے شادی ہو گئی۔ابّو نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ نوید جیسا بھی ہو اب تم نے اسکے ساتھ ہی رہنا ہے۔اُسکی ہر بات برداشت کرنی ہے،اِس گھر میں واپس آکر باپ کے کندھے مت جھکا دینا۔مر جانا پر اپنی میت اُسی گھر سے نکلوانا، جہاں تم جا رہی ہو۔اسی لیے میں تمہارے رویے پر چپ رہی۔تم مجھے پسند نہیں کرتے تھے،یہ میں جانتی تھی۔''نوید نے بیساختہ اُسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور آہستگی سے بولا۔

''آئی ایم سوری!ریئلی سوری!''

''باوجود اسکے کہ تم مجھے پسند نہیں کرتے،میں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی کہ جاتی بھی تو کہاں؟گھر جاتی تو وہ لوگ ایک دن سے زیادہ رکنے پر ہی مشکوک نظروں سے مجھے دیکھنے لگتے۔پھر تم فون کر کے پوچھتے تھے نہ ہی لینے آتے تھے۔اُنہیں لگتا کہ میں لڑ کر آئی ہوں۔'' وہ کہے جا رہی تھی۔

''سوری!''نوید نے نم لہجے میں کہا۔اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس آج شدت سے ہو رہا تھا۔

''پر تمہاری ناپسندیدگی کے باوجود بھی ایک اچھی بات یہ تھی کہ تم مجھے طعنے نہیں دیتے تھے،مجھے کسی کام سے روکتے نہیں تھے،میری تذلیل نہیں کرتے تھے۔ہاں!محبت نہیں کرتے تھے،ڈانٹ بھی دیتے تھے پر کوئی بات نہیں!''وہ بولتے بولتے ہنسی۔نوید کا دل دکھا۔

''سوری!''

''میں جب سوچتی کہ آج تمہیں، تمہارے رویے کا احساس دلاؤں گی، تب تمہارے گھر والوں کی تمہارے ساتھ بد سلوکی نظر آجاتی۔ اُنکا تمہارے ساتھ سلوک دیکھ کر میں خاموش ہو جاتی کہ تمہارا ان سب میں کیا قصور؟''

''سوری بشریٰ!''

''کتنی بار سوری کہو گے؟'' اس نے اداسی سے پوچھا۔

''ساری زندگی کہہ لوں گا۔'' اُس نے بیساختہ کہا تو وہ یکدم ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اُسکا ہنسنا تپتے صحرا میں بارش کی پھوار جیسا لگا۔

اس روز نوید اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا، حال دل سننا چاہتا تھا پر نوید عالم اظہار کے معاملے میں بالکل ہی نابلد تھا۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ کس طرح سامنے والے سے دل کا حال کہا جائے؟ پر وہ خاموش رہا اور اُسے لیے گھر آگیا۔ پر اُس روز کے بعد سے، اس نے بشریٰ سے اپنا رویہ مزید اچھا کر لیا۔ وہ کتنے بھی غصّے میں ہوتا پر بشریٰ پر غصّہ نہ ہوتا۔ یہ اسکے نزدیک اپنے سابقہ سلوک کا مداوا تھا۔

---------+---------+--------

نوید کے سی ایس ایس کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ اس دوران اُسکے ابّو کا غصّہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ اُسے ایک جنون کے پیچھے خوار ہوتا دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اس روز بھی وہ امتحان دے کر گھر آیا تو اُن سے سامنا ہو گیا، وہ حسبِ عادت اُسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک تو پہلے ہی وحید اور اسکی بیوی چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ اُسکا دماغ ویسے ہی گرم تھا، وہ اُن سے بحث برائے بحث میں الجھ پڑا، جواباً وہ گالیوں پر اُتر آئے۔

لاؤنج میں ویسے ہی سارا گھر جمع ہو چکا تھا۔ وہ نہ جانے اسے کیا کچھ کہہ رہے تھے کہ نوید نے بھی اونچی آواز میں اُنہیں جواب دینا شروع کر دیا۔ بس اُنکی برداشت یہیں تک تھی۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر کھینچ کر مارا تھا۔ جو جہاں تھا وہ وہیں ساکت رہ گیا۔ نوید نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھا اور اگلے ہی لمحے انہوں نے دوسرا تھپڑ بھی اُسکے گال پر دے مارا۔

''تُو اسی لائق ہے نا ہنجار!'' انہوں نے خونخوار لہجے میں کہا تو وہ لڑکھڑاتے قدم سے پیچھے ہٹا۔ اس نے ہمیشہ اُن سے مار کھائی تھی۔ کبھی مہمانوں کے سامنے، کبھی بہن بھائیوں کے سامنے۔ پر آج انہوں نے اسے اُسکی بیوی اور بھابھی کے سامنے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کے وہ واقعتاً اُسے پیٹنا ہی شروع کر دیتے، وحید نے پیچھے سے آکر انہیں پکڑا۔

''ابّو! کیا کر رہے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے آپکو؟'' وہ چیخا۔ نوید نے جیسے کسی ٹرانس کی کیفیت میں منہ موڑ کر ایک قطار میں کھڑی اپنے گھر کی خواتین کو دیکھا۔ بشریٰ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ اُسی لمحے وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا باہر نکل گیا۔

''دفع ہو جا میری نظروں سے۔بیغیرت! مر کیوں نہیں گیا جس دن پیدا ہوا تھا۔عذاب بن گیا ہے یہ میرے سر پر۔''گھر سے نکلتے ہوئے نوید کو اُنکی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

''ابّو! ہاتھ کیوں اٹھایا آپ نے اس پر؟''وحید نے اُنہیں چھوڑتے ہوئے، ناراضگی سے پوچھا۔

''تم مجھے مت سکھاؤ! میں باپ ہوں اُسکا،الٹا بھی ٹانگ سکتا ہوں اُسکو۔کسی کی ہمت نہیں ہے کہ مجھ سے سوال کرے۔''وہ غصّے سے کہتے کمرے میں چلے گئے۔وحید نے تاسف سے اُنہیں دیکھا، پھر روتی ہوئی بشریٰ کو۔

''وحید بھائی!۔۔۔نوید۔۔۔''اس نے آدھے ادھورے جملے میں وحید کو کچھ کہنا چاہا۔

''تم پریشان نہ ہو بشریٰ! میں جا رہا ہوں اُسکے پیچھے۔''اس نے تسلی دی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے،اسکے پیچھے وقت برباد کرنے کی۔ایسے ڈرامے تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔آ جائے گا خود ہی واپس۔''یہ بات کب سے خاموش کھڑی اُسکی ماں نے کہی تھی۔

''امی! بشریٰ کا خیال رکھیں۔میں آتا ہوں۔''وہ اُنہیں جتاتے ہوئے، قطعی لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

نوید سڑکوں پر پیدل گھوم رہا تھا۔زندگی میں پہلی بار آنکھوں سے آنسو بے اختیاری طور پر رواں تھے۔اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایسے ذلیل ہو گا۔دوست تو کوئی رہا نہیں تھا کہ جسکے پاس جا کر دل ہلکا کر لیتا۔اور ہوتا بھی تو کونسا نوید عالم نے اپنے رازوں میں کسی کو شریک کرنا تھا؟ وہ وہیں سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔وہ رونا چاہتا تھا، پر کھل کر رو بھی نہیں پا رہا تھا۔نہ جانے وہ کتنے لمحے اسی طرح بیٹھا رہا کہ کسی نے اسے کندھوں سے تھاما۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وحید تھا۔

''نوید! تم ٹھیک ہو؟''اس نے نرمی سے پوچھا۔اگلے ہی لمحے نوید نے اسکے ہاتھ جھٹک دیئے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے مجھے۔''اُس نے وحید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔

''نوید رکو!''وحید نے اسکے پیچھے آ کر اُسکا بازو پکڑا۔

''چھوڑو مجھے۔۔۔''اس نے ایک بار پھر اُسکا ہاتھ جھٹکنا چاہا۔

''تم مجھے مار لو۔مجھے گالیاں دے لو۔جتنا غصّہ ہے مجھ پر اُتار لو پر خدارا! میری بات سن لو۔''وحید نے اسکے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''کیا سنانا ہے مجھے؟ ہاں؟ یہی کہ میں کتنا بیکار اور ناکارہ وجود ہوں؟''وہ دھاڑا تھا۔آنکھیں سرخ ہو گئی، آواز رندھ گئی تھی۔

''ساری زندگی گزار دی میں نے کہ کسی دن ابّو یا امی مجھے وہ اہمیت، وہ محبت دیں جو آپکو اور جزا کو دیتے ہیں۔ پر میں ناکام رہا۔ میں کچھ بھی کر لوں اُنکی نظر میں، میں برا ہی رہوں گا۔'' وہ یکدم ہی پھٹا تھا۔

''ایسا نہیں ہے نوید! ابّو تو مجھے بھی۔۔۔'' وحید نے کچھ کہنا چاہا تو وہ اسکی بات کاٹتے ہوئے چیخا۔

''پر آپکے پاس آپکی ماں ہے۔ آپکی ماں جسکے آپ چہیتے بیٹے ہیں۔ میرے پاس کون ہے؟ آپ دھوپ سے تھک کر آئے ہیں، آپ آرام کریں گے، حالانکہ آپکے پاس تو بائیک بھی تھی بھائی! پر میں بسوں میں دھکّے کھا کر، اسٹاپ پر گرمی میں خوار ہو کر گھر آتا تھا، لیکن اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں تھک گیا ہوں، تو میں کام چور ہوں؟ آپکی چیزیں آپکی، پر میری چیزوں پر ساری دنیا کا حق تھا۔ میں آپ سے کچھ مانگ لوں تو میں لالچی، ندیدہ، بھائی کی چیزوں پر بری نظر رکھنے والا۔ پر میں جزا کو اپنی کوئی چیز دینے سے منع کر دوں تو میں خود غرض، چھوٹے دل کا۔'' وہ بچپن اُدھیڑ رہا تھا اور وحید ساکت تھا۔

''میں سو کام کروں اور ایک غلط کر دوں تو سب کو میرا وہ ایک غلط کام یاد رہتا ہے۔ اُسی کے لیے میری تذلیل کی جاتی ہے، پر میرے ننانوے اچھے کام سب کو بھول جاتے ہیں۔ ابّو کو ڈاکٹر کے پاس کب لیکر جانا ہے؟ کب انکا ٹیسٹ کروانا ہے؟ گھر میں سودا کب لانا ہے؟ کب بل بھرنا ہے؟ کون سا سوئچ ٹھیک کروانا ہے اور کون سا نل بدلوانا ہے؟ یہ سب میری ذمّے داری ہے بھائی! آپکی نہیں۔ پر میں ہی سب سے غیر ذمّے دار بیٹا ہوں؟'' اُسکے شکوے ختم ہونا ناممکن نظر آنے لگا، پر وحید نے اسے بولتے رہنے دیا۔

''آپکی کامیابی، آپکی خوشی، ماں باپ کیلئے فخر ہے۔ پر میری کامیابی کوئی نئی بات ہی نہیں!۔۔۔ جزا کے خواب، اُسکی تمام خواہشات، ابّو پر پورا کرنا فرض ہے۔ پر میرے خواب، میری خواہشات بس ایک بے مقصد جنون ہے؟ آپ کی رائے، آپکا فیصلہ سب اہم ہے۔ پر میری رائے، میرا فیصلہ ریت کی طرح ہوا میں اُڑا دیئے جانے لائق ہے؟ آپ جو چاہتے امی سے مانگ لیتے، جزا جو چاہتی ابّو سے ضد کر لیتی۔ پر مجھے ہر شے کے لیے ہزار بار منت کرنی پڑتی ہے، سینکڑوں وضاحتیں دینی پڑتی ہیں۔ ایک بائیک کے لیے کتنے عرصے ابّو سے منت کی؟ پر انہوں نے نہیں دی۔ آخر کیوں میں اتنا ناپسندیدہ ہوں؟'' وہ سوال کر رہا تھا اور وحید اپنے سے چار سال چھوٹے بھائی کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ سڑک پر اکا دکا ٹریفک تھی، عوام تو نہ ہونے کے ہی برابر تھی۔ کوئی ایک آدھ بندہ اِدھر سے گزر جاتا تو رک کر دونوں کو دیکھتا ضرور۔

''آپکی شادی آپکی پسند سے، اور میری ابّو کی مرضی سے۔ آپکی بیوی قابلِ عزت ہے اور میری بیوی کا مقدر صرف ذلت ہے کیونکہ وہ نوید کی بیوی ہے۔ میں کون سا عیاش ہوں؟ میں کب اپنی ذات پر پیسے لگاتا ہوں؟ میں نے کب کمانے سے انکار کیا ہے؟ میں کونسا دوستوں میں پیسے اڑاتا ہوں؟ میں کر تو رہا ہوں بھائی! کوشش کر تو رہا ہوں۔ پر میرے نصیب میں اتنا ہی ہے تو میں کیا کروں؟'' وہ ڈھے گیا تھا۔

''اب آپ مجھے یہ کہنے آئیں ہوں گے کہ میں نے غلط کیا گھر سے یہاں آکر۔ ابو نے دو تھپڑ مارے تھے، تو مجھے انکا دل بھرنے تک وہیں کھڑے رہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میری تو کوئی عزتِ نفس ہے نہیں! میں تو ذلیل، گرا ہوا اور گھٹیا انسان ہوں۔'' وہ اذیت کی اُس انتہا پر تھا، جہاں وہ خود کو گالیاں دے رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے وحید آگے بڑھا،اُسکی گردن پر ہاتھ رکھا،اور اسے قریب کر کے اُسکا سر اپنے کندھوں سے لگالیا۔نوید ہل بھی نہ سکا۔

''نہیں! مجھے تمہیں یہ بتانا ہے کہ تم میرے کتنے پیارے بھائی ہو،اور مجھے کتنے عزیز ہو؟تم میرے بچے ہو،مجھے بہت پیارے ہو۔خود کو تکلیف نہ پہنچاؤ!''وہ اُسکا کندھا سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔نوید نے اس سے دور ہونے کی کوشش کی پر وحید کی گرفت مضبوط تھی۔

''خود کو اس طرح اذیت مت دو۔جو کچھ تمہارے دل میں ہے مجھے کہو۔میں سنوں گا۔پر پلیز! ایسے نہ کرو۔''وہ التجا کر رہا تھا جیسے۔نوید ٹھہر گیا۔وحید نے اسے نہیں چھوڑا۔

بلآخر وہ تھک گیا،وہ جو رونا چاہتا تھا پر رو نہیں پا رہا تھا۔وہ اب بلک بلک کر رو دیا تھا۔وہ وحید کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح رو یا تھا۔وحید اُسکا سر سہلاتا رہا۔نوید دیکھ نہیں سکتا تھا کہ جس بھائی سے اُسے اتنے شکوے تھے،وہ بھی اُسکے ساتھ ہی آنسو بہا رہا تھا۔وہی تو تھا جو اسکے رازوں میں شریک تھا۔وہی تو تھا جسکے سامنے نوید کا پورا بچپن گزرا تھا۔وہی تو سمجھ سکتا تھا اُسے،وہی تو اسکے حالات سے واقف تھا،وہی تو اسکا مداوا تھا۔

اپنے گرد چڑھا یا خول،وحید کے سامنے بری طرح ٹوٹا تھا۔نوید آج بھی وہ بچہ تھا جو توجہ چاہتا تھا،وہ آج بھی وہی بچہ تھا،جسے تسلی کے دو بول چاہیے تھے،جسے محبت بھرے جملے چاہیے تھے۔اور وہ اسے آج اُسکے بھائی نے دیئے تھے۔اور وہ پگھل گیا تھا۔

''اچھا! چپ ہو جاؤ پلیز!''اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے،وحید نے کہا تو اس نے سر جھکاتے ہوئے آنسو صاف کیے۔وہ دونوں سڑک کنارے کھڑے تھے،لہٰذا پہلی فرصت میں وحید اسے قریبی پارک لے آیا تاکہ اُس سے آرام سے بات کر سکے۔ اب دونوں خاموشی سے ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔

''میں اُس گھر میں اب اور نہیں رہ سکتا۔میری عزت نفس ہمیشہ مجروح ہوتی ہے۔میں ہمیشہ برداشت کرتا ہوں پر اب اور نہیں۔''خاموشی کو نوید کی ٹوٹی آواز نے توڑا تھا۔

''ٹھیک ہے! تمہارا حق ہے یہ۔پر ابھی کہاں جاؤ گے؟''وحید نے آرام سے پوچھا۔

''ابھی تو کہیں نہیں جا رہا۔دو تین روز میں گھر ڈھونڈتا ہوں کرائے کا۔زیادہ بڑا نہیں بس دو بندوں کے لائق ہو۔''اُس نے سنجیدگی سے بتایا۔

''اچھا! اب میری ایک بات سنو گے؟''وحید نے تحمل سے پوچھا،تو اس نے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔

''برائے مہربانی! مجھے روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔''اس نے تلخی سے کہا۔

''میں ایسا ہرگز نہیں کرنے والا۔''

''پھر؟''

''تم ان شاءاللہ ! جلد سی ایس ایس کلیئر کر لو گے۔اُسکے بعد تمہیں ٹریننگ پر جانا ہو گا۔اس دوران بشریٰ کو کہاں رکھو گے ؟جس گھر میں عورت اکیلی ہو،اسکو کوئی ملنے نہ آتا ہو اور اسکا شوہر بھی شہر میں نہ ہو۔وہ عورت اور وہ گھر محفوظ نہیں ہوتا۔''

''میں۔۔۔''اس نے کچھ کہنا چاہا تو وحید نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روک دیا۔

''میری بات پوری ہونے دو۔''اُسکی بات پر نوید نے سر جھکایا۔''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ فیصلہ تبدیل کر لو۔سب سے بہترین جگہ اس وقت آرمی کا کنٹونمنٹ بورڈ ہے۔کینٹ میں بنی سویلین سوسائٹی میں ایسے بہت سے گھر ہیں جو چھوٹے اور دو کمروں کے بھی ہیں۔کینٹ ایک محفوظ علاقہ ہے،وہاں تم بشریٰ کی طرف سے بے فکر ہو کر ٹریننگ کے لیے جا سکتے ہو۔اور میری اور ملائکہ کی پوسٹنگ (تبادلہ) کراچی میں ہو چکی ہے۔ہم بھی کینٹ میں ہی شفٹ (منتقل) ہو رہے ہیں۔ہم روز بشریٰ سے مل لیا کریں گے۔پھر جب تمہاری پہلی پوسٹنگ ہو گی تو تم بشریٰ کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے ملے ہوئے گھر میں شفٹ ہو جانا۔یہ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔''اس نے پورا لائحہ عمل ترتیب دیا۔اُسکی ساری باتیں درست تھیں مگر۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں سی ایس ایس واقعی کلیئر کرنے والا ہوں ؟''وہ طنزیہ ہنسا۔

''کیا تمہیں خود پر یقین نہیں ہے ؟''وحید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں !''اس نے صاف گوئی سے کام لیا تو وحید نے گہری سانس لیکر پیچھے ٹیک لگائی۔

''لیکن مجھے ہے۔''اس نے یقین سے کہا تو نوید اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے بھائی ! لیکن کینٹ کا کرایہ کافی۔۔۔''وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ وحید نے اسکی بات کاٹی۔

''کرائے کی فکر نہ کرو۔''اس بات پر نوید نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے ہی لگا کہ ''قرض دے رہا ہوں۔جب سی ایس ایس کر لو تو واپس کر دینا۔''اُس نے اعتراض کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔نوید نے خاموشی سے بلا کس سے بنے ٹریک پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

''اب بتاؤ ! گھر دیکھنے چلو گے کل ؟''اُس نے نوید کو تقریباً رضامند دیکھ کر پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔وحید نے سکھ کا سانس لیا تھا۔اس رات وہ نوید کو کافی سمجھا بجھا کر گھر لایا تو،وہ بنا کسی سے بات کیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔پھر وحید اپنے باپ کے پاس آیا اور بولا۔

''میں کہنا نہیں چاہتا،پر آپ نے آج بہت غلط کیا۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اب تم مجھے صحیح غلط سکھاؤ گے ؟باپ کبھی غلط نہیں ہوتا۔''انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا۔

''کیا یہ ٹھیک تھا کہ آپ اُسکی بیوی کے سامنے اس پر ہاتھ اٹھاتے ؟''وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوا۔

''بس کر دو! کونسا پہلی بار دیکھ رہی ہے وہ اُسے۔ بچپن سے اسکے سامنے ہی تھپڑ لگاتا رہا ہوں اُسے۔ آج کونسی قیامت آگئی؟'' وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔ وحید نے تاسف سے اُنہیں دیکھا۔

''اب وہ دونوں بچے نہیں ہیں ابّو! اور چلیں جانے دیں بشریٰ کو۔ ملائکہ کا کیا؟ وہ بھی تو تھی ناوہاں؟ اسکی بھابھی کے سامنے اس طرح اُسکی تذلیل کرنا ٹھیک تھا؟''

''میاں! نکل آئیں ان فلمی باتوں سے۔ باپ کی مار کھانے سے کسی کی تذلیل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ عزت ہی بڑھتی ہے کہ اس عمر میں بھی ماں باپ نے کیسے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے اپنی اولادوں کو، اور کیسے بچے اف تک نہیں کرتے ماں باپ کی مار پر۔ ہونہہ! خود تو اس گھر سے نکل کر آزادی کی زندگی گزار رہے ہو، نہ کوئی پوچھنے والا نہ کوئی روکنے والا۔ ماں باپ کی روک ٹوک تو بری لگتی تھی نا تمہیں؟ اب جو بچے میرے فرمانبردار ہیں انہیں تو اپنی طرح مت بناؤ۔'' ہٹ دھرموں کی طرح بولتے آج پہلی بار وہ وحید کو سخت برے لگے تھے۔ پر وہ چپ رہا، جان گیا تھا کہ انکے خیالات کبھی نہیں بدل سکتا۔

''یہ آپ ہمیشہ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں لگ جاتے ہیں؟ قصور کیا ہے اِسکا؟ وہ تو اسکی نوکری ہی ایسی ہے، ورنہ کبھی ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ ابھی کراچی پوسٹنگ ہو جائے اِسکی، پھر دیکھئے گا یہ یہیں رہے گا۔'' اُسکی ماں درمیان میں بولی تو اس نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا۔

''ہاں! میں ہی پیچھے پڑ جاتا ہوں۔ کتنا چاہتا تھا میں کہ میری بھانجی کی شادی اِس سے ہو، پر نہیں! تمہاری اولاد کو تو اپنی پسند کی بیوی لانی تھی، اور تم نے بھی پورا ساتھ دیا۔ ورنہ آج میری بھانجی اُس نکھٹو اور نالائق نوید کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوتی۔''

''تو نہ کرواتے اُس نکھٹو اور نالائق سے اپنی بھانجی کی شادی۔ آپ ہی کو تو شوق تھا کہ بہن کی بیٹی ہی آپکی بہو بنے گی۔ خود ہی شرط رکھی تھی کہ وحید کی شادی اُسکی پسند سے تب ہی ہو گی، جب نوید بشریٰ کے لیے راضی ہو گا۔ ''اس بات پر تو وحید نے شدید شاک کے عالم میں اپنی ماں کو دیکھا۔

''امی!۔۔۔امی! آپ نے اِس شرط پر میری شادی ہونے دی تھی؟ اگر ابّو راضی نہ تھے تو مجھے بتاتیں میں راضی کر لیتا۔ میرے بدلے میرے بھائی کو کیوں قربان کیا؟'' اُس نے شدید دکھ سے ماں کو کہا تو وہ گڑبڑائیں۔

''ارے! تو کیا غلط کیا میں نے بیٹا؟ تمہیں اپنے باپ کے آگے بلاوجہ اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے، تو میں نے ایسے ہی راضی کر لیا تمہارے باپ کو اور ویسے بھی نوید کی کونسا کوئی اپنی پسند تھی، اگر ہوتی بھی تو اسکو کس نے اپنی بیٹی دینی تھی؟'' انکے الفاظ پر تو وحید کا دل کیا خود کو گولی ہی مار لے۔ وہ پہلی انسان تھیں، جسے نوید نے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ کتنے دھڑلے سے جھوٹ بول رہی تھیں۔

''بس کر دیں امی! آپ نے تو میرے بھائی کو میرا دشمن ہی بنا دیا۔ آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، میں ابّو کو منا لیتا پر آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پہلی بار اُسکی ماں کو ذرا سی شرمندگی ہوئی۔

''ہونہہ ! منالیتا۔ میں تمہارا نوکر ہوں جو مان جاتا؟ تمہارے ٹکڑوں پر نہیں پلتا میں۔۔۔''اُسکے ابّو نے مداخلت کی۔اُسے لگا کہ وہ مزید وہاں کھڑا رہے گا تو پاگل ہو جائے گا۔غصّے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔

پیچھے اُسکے ماں باپ اب بھی جھگڑ رہے تھے۔

---------+---------+--------

اور فقط تین دن میں ہی نوید اپنا اور بشریٰ کا سامان باندھے جانے کے لیے تیار تھا۔سوائے اسکے کمرے کے سامان کے اور کوئی بڑی شے نہیں تھی جو اسے ساتھ لیکر جانی تھی۔لہٰذا چھوٹی سی سوزوکی میں ہی کام ہو گیا۔اُسکے اس اچانک فیصلے پر اسکے ماں باپ دونوں ہی ہکا بکا رہ گئے۔

''بہت شوق تھا نا بھانجی کو بہو بنانے کا، دیکھ لیا کیسے آج بیٹے کو الگ کر کے لے گئی۔مل گیا ہو گا اب آپکو اور آپکی بہن کو سکون۔''اُسکی ماں پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھیں۔خلاف توقع اُسکے ابّو خاموش کھڑے تھے۔

''یہ بشریٰ کا نہیں ! میرا فیصلہ ہے۔اور میرے گھر سے چلے جانے سے کون سا آپ کا نقصان ہو رہا ہے ؟آپ کے بجٹ پر بھاری دو لوگ ہی تو کم ہو جائیں گے۔''ایک لمحے کو وہاں سب کو سانپ سونگھا تھا۔پھر اگلے ہی لمحے اُسکی ماں دوبارہ چیخیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بڑھاپے میں ماں باپ کو اکیلا چھوڑ جاؤ گے۔اس دن کے لیے پالا تھا تمہیں؟ کیسی نافرمان اولاد دی ہے مجھے اللہ !''وہ اب سر پیٹ کر رونے لگیں۔''کم از کم وحید سے ہی کچھ سیکھ لیتے، جس دن اسکی کراچی پوسٹنگ ہو جائے گی،اس دن ماں باپ کے قدموں سے لگ کر بیٹھے گا یہ۔ایسا فرمانبردار بچہ ہے یہ میرا۔''اُسکی ماں نے فخر سے کہا۔وحید جو کافی دیر سے خاموش تھا اس نے گہری سانس لی۔وہ اپنی ماں کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

''میں آرمی کی طرف سے دیئے گئے گھر میں شفٹ ہو رہا ہوں۔یہیں کراچی میں۔''اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''کیا مطلب؟''اُسکی ماں کو اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''میں اور ملائکہ اپنے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں۔پر آپ سے ملنے روزانہ آیا کریں گے۔''

''تو بیٹا ! اس گھر میں رہنے میں کیا مسئلہ ہے ؟یہ بھی تو تمہارا اور تمہارے بیوی بچوں کا ہی گھر ہے۔''جو لہجہ نوید کے گھر سے جانے کا سن کر زہریلا ہوا تھا، وہی وحید کے لیے روہانسی ہو گیا تھا۔نوید طنزیہ ہنسا۔

''میں اپنے بچوں کو اس گھر میں بڑا نہیں کرنا چاہتا، جہاں ہر وقت گالیوں، کوسنوں اور طعنوں کی آوازیں آتی ہیں۔ جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کو خود سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' وحید کی سنجیدگی سے کہی گئی بات پر اُسکی ماں گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس گھر کو اتنی محنت سے بنایا وہ ایسے ٹوٹ جائے گا۔'' اب وہ باقاعدہ رو رہی تھیں۔

''امی پلیز! آپکا گھر نہیں ٹوٹ رہا۔ ہم بس اپنے اپنے گھروں کو الگ کر رہے ہیں۔ رشتہ تھوڑی ختم ہو گیا آپ سے؟'' اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا مگر وہ جانتا تھا کہ اسکے ماں باپ کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں سمجھا سکتی۔

''ٹھیک ہے! میں جا رہا ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔ اللہ حافظ!'' بالکل اچانک ہی نوید نے کہا، تو اسکے ماں باپ نے ایک ساتھ اُسکی طرف دیکھا۔ پر کہا کچھ نہیں۔۔۔

نوید باہر نکل گیا، بشریٰ نے آخری بار اپنے ماموں کے سامنے سر جھکا کر خدا حافظ کہا۔ انہوں نے نا چاہتے ہوئے بھی اُسکے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔ اور پھر وہ دونوں ہمیشہ کے لیے وہاں سے چلے گئے۔

انکے جانے کے بعد ایک ہفتے تک وحید وہیں رہا۔ اُسکے ماں باپ کو شروع میں نوید پر شدید غصّہ تھا۔

''صرف تھپڑ ہی تو مارا تھا۔ باپ کا تھپڑ اتنا گراں گزرتا ہے اس نسل کو، کہ دیکھو کیسے آن کی آن میں گھر چھوڑ کر چلا گیا؟'' وہ اپنے جاننے والوں سے کہتے پھرتے۔ خاندان والوں کو تو نئی خبر ہاتھ لگ گئی تھی، روز ہی حالات جاننے کے لیے چلے آتے۔ وحید یا تو خون کے گھونٹ بھرتا یا پھر افسوس سے اپنے ماں باپ کو دیکھتا۔

''ساری زندگی پالا، پوسا، بڑا کیا۔ کیا اتنا بھی حق نہیں ہے ماں باپ کا، کہ غصّے میں تھپڑ ہی مار دیں؟'' ایسے موقع پر وحید کا دل کرتا کہ کہہ دے ''ابّو! بات صرف ایک تھپڑ کی نہیں ہے۔ پوری زندگی کی ہے۔'' پر خاموش رہتا کہ آج کل اُسکے ماں باپ اس سے بھی ٹھیک ٹھاک ناراض تھے۔ نوید کا چلے جانا اُنکے لیے پہلے غصّے، پھر دکھ اور آہستہ آہستہ پچھتاوے میں بدلنے لگا۔ وہ اور بات تھی کہ وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھے۔ اور ماں باپ سے غلطی کوئی اولاد منوانا بھی نہیں چاہتی۔

ہفتے بھر بعد وحید بھی اپنے نئے گھر منتقل ہو گیا تو گھر یکدم ہی خالی خالی سا ہو گیا۔ تین لوگوں کی موجودگی میں بھی موت سا سنّاٹا چھایا رہتا۔ اُسکی ماں تو اب گھنٹوں بیٹھ کر روتیں۔ باپ نے الگ خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا، کبھی جو اپنی بیوی کو روتا دیکھ لیتے تو انہیں ٹھیک ٹھاک کوستے۔ وحید تو ملنے آ جاتا پر نوید نہیں آتا۔ وحید سے اُسکی ماں کی ناراضگی چند روز میں مکمل ختم ہو گئی۔ پہلے تو وہ سال میں دو تین مرتبہ آتا تھا، اب کم از کم روز ملنے آتا تو ہے۔

''نوید بھائی کا کوئی دوست آیا ہے۔''ایک روز ملازم بچے نے آکر اطلاع دی۔ یہ لڑکا وحید نے گھر کے کام کاج کے لیے رکھوایا تھا۔ نہ جانے اس لمحے نوید کے باپ کو کیا ہوا تھا؟ وہ طیش کے عالم میں اُٹھے۔

''کون سا دوست ؟ کیسا دوست ؟ جب یہ گھر اُسکا نہیں ہے تو کیوں اپنے دوستوں کو یہاں آنے کی دعوتیں دیتا پھر رہا ہے ؟''ملازم بچہ بیچارہ گھبرا گیا۔

''بتاتا ہوں میں ابھی اسکو۔''وہ پیروں میں چپل پہن کر باہر آئے۔

''کون ہو تم ؟''اُنہوں نے سامنے کھڑے لڑکے کو دیکھ کر پوچھا۔

''انکل ! میں حسین ہوں۔ نوید کا دوست ہوں، کیا وہ گھر پر ہے ؟''حسین نے ادب سے پوچھا۔

''ہاں ! ہے گھر پر وہ، تو ؟''اُنکے لہجے پر ایک لمحے کے لیے حسین پریشان ہوا۔

''آپ بلا دیں اُسے۔''

''وہ گھر پر ہی ہے، پر وہ تم سے نہیں ملنا چاہتا۔اِس لیے دوبارہ یہاں مت آنا۔''انہوں نجانے کس بات کا غصّہ اُتارا تھا؟ اس سے پہلے کہ حسین کچھ سمجھ پاتا، اُنہوں نے اُسے ہکا بکا چھوڑ کر گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ اس واقعی کی خبر نوید کو کافی عرصے تک نہ ہو سکی۔

اس واقع کے بعد نجانے کیوں ؟ پر اُسکے ابّو کو چپ سی لگ گئی۔ انہوں نے بولنا جیسے ترک ہی کر دیا، اب اُنکی بیوی اُنکے سر پر بیٹھ کر اُن سے لڑنے کے بہانے بھی ڈھونڈتیں، تو بھی وہ خاموش رہتے۔ بس جزا سے بات کر لیا کرتے تھے۔ کئی کئی گھنٹے گھر کی دیواروں کو تکنے میں گزار دیتے۔ ایک رات انہیں شدید ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ وحید اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔ جزا نے روتے ہوئے نوید کو ہی فون کیا تو وہ دوڑا دوڑا پہنچا۔ انہیں ہسپتال لیکر گیا، اُنکے سارے انتظامات کیے۔ جو کچھ اُنکے لیے کر سکتا تھا وہ کیا۔ پر انکی حالت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ اپنی موت سے کچھ گھنٹے قبل وہ ہوش میں آئے تھے۔ انہوں نے باری باری سب کو دیکھا تھا۔ وحید کی آنکھیں نم تھیں، جزا نے تو رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور بشریٰ الگ سسک رہی تھی۔ پھر انکی نظریں ایک کونے میں کھڑے نوید تک گئیں۔ وہ خاموش، سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ نہ چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار تھے نہ آنکھیں نم تھیں۔

وہ رو کیوں نہیں رہا تھا؟ کیا اسے باپ سے محبت نہیں تھی ؟ انہوں نے دل میں سوال کیا۔ دل خاموش۔۔۔۔

اُسکا بچپن یاد کرنا چاہا۔ آنکھوں کے سامنے وہ مناظر چلنے آنے لگے، جب وہ انکی توجہ چاہتا تھا اور وہ جھڑک دیتے تھے، جب وہ اُنکے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا اور وہ تھپڑ جڑ دیتے تھے۔ دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ اسے پاس بلانا چاہتے تھے پر بلا نہ سکے۔

ایک بار پھر اُسکی حد سے زیادہ خشک آنکھوں کو دیکھا، کیا اُنہوں نے ان آنکھوں کو کبھی روتے ہوئے دیکھا تھا؟ انہوں نے یاد کرنا چاہا۔ ہاں! جب وہ اُسے فقط ایک کاغذ کا ٹکڑا گیلا ہو جانے پر ڈنڈے سے مار رہے تھے، تب وہ رو رہا تھا۔ جب وہ اُسے بائیک کا ہینڈل ٹیڑھا ہو جانے پر بیلٹ سے پیٹ رہے تھے، تب وہ آنکھیں نم تھی۔ جب وہ اُسے سائیکل سے گر کر کپڑے گندے کر لینے پر سزا کے طور پر دھوپ میں کھڑا رکھے ہوئے تھے، تب بھی وہ رو ہی رہا تھا۔ وہ کاغذ بھی نیا آ گیا، بائیک بھی ٹھیک ہو گئی اور کپڑے بھی دھل کر صاف ہو گئے۔ نہیں صاف ہوا تو نوید کا دل۔۔۔ وہ آنکھیں انہوں نے ہی تو خشک کی تھیں۔

ایک بار پھر دل میں درد کی ٹیس اُٹھی۔۔۔

پر اس بار لگا سانسیں بھی گئیں۔۔۔

وہ اپنے اِس بیٹے کو پہلی بار گلے لگانے کی حسرت دل میں لیے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُنکے جنازے کی رات جب سب چلے گئے۔ اور گھر میں صرف گھر والے رہ گئے، تب وحید نے سب کو لاؤنج میں جمع کیا۔ ماسوائے نوید کے، کہ وہ کچھ وجوہات کی بنا پر جا چکا تھا۔

''امی! یہ گھر ابّو کے نام ہے؟'' اس نے تحمل سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو بات وہ کرنے جا رہا ہے وہ ہے تو شریعت کا حکم۔ پر ہمارے معاشرے میں شریعت کے بہت سے اٹل احکامات کو، ریت رواج کے پردے میں چھپا کر حرام ہی بنا دیا گیا ہے۔

''ہاں!'' انہوں نے جواب دیا۔

''یہ بتائیے کہ ابّو نے کسی قسم کی کوئی وصیت تو نہیں کی تھی نا؟'' اس نے پھر پوچھا۔ سوال تھوڑا تھوڑا سب کو سمجھ آ رہا تھا۔ جزا کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''نہیں کی تھی، پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اصل میں۔۔۔'' وہ رکا، وہ بہت حساس موضوع چھیڑنے جا رہا تھا۔ ''میرا ایک دوست اس گھر کو اچھے داموں میں خریدنا چاہتا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ گھر اسے بیچ دیں تاکہ ابّو کا ترکہ جلد از جلد تقسیم کیا جا سکے۔'' اس نے کہہ دیا۔

''پتہ تھا مجھے۔۔۔ معلوم تھا۔'' یہ آواز جزا کی تھی۔ سب نے حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔ ''میں جانتی تھی کہ میرے باپ کے گھر پر نظر رکھ کر بیٹھے ہیں آپ دونوں۔'' اس نے تلخ مگر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جزا! ہوش میں آؤ۔ یہ جائیداد ہے اور اسے تقسیم ہونا ہی ہے۔ یہی شریعت کا بھی اصول ہے۔'' اس نے آواز حتی الامکان آہستہ رکھی۔

''شریعت تب یاد نہیں آئی تھی، جب میرے بوڑھے ماں باپ کو اکیلا چھوڑ گئے تھے؟'' وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

''کیا کہہ رہی ہو یہ تم؟ ہم نے کب امی ابو کو اکیلا چھوڑا؟'' اُس نے بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھا۔

''آپ نے اور بھائی نے چھوڑ دیا تھا ابّو کو۔ اُنکے آخری وقت میں، میں تھی اُنکے ساتھ۔ اب آپ میرے باپ کے بنائے اِس گھر کو بیچنا چاہتے ہیں؟'' وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

''جزا! جائیداد تقسیم ہونی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ اِس میں اتنا آفینڈ (ناراض) ہونے کی کیا بات ہے؟'' اُس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

''یہ بات آج ہی کرنا ضروری ہے؟ باپ کی قبر کی مٹی تو سوکھنے دو۔'' پہلی بار اُسکی ماں نے بھی اپنی بیٹی کا ساتھ دیا۔

''نہیں امی! قبر کی مٹی سوکھنے جیسا کوئی حکم نہیں ہے شریعت میں۔ ترکہ جلد از جلد تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور جو کام آج ہونا ہے، اُسکے کل ہونے میں کیا بہتری ہے بھلا؟'' اس بات پر وہ خاموش ہی رہیں۔

''میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ وہ نوید بھائی؟ مہمانوں کی طرح ابّو کو قبر میں دفنا کر چلے گئے، وہ اب میرے باپ کے گھر پر نظر رکھ کر بیٹھے ہیں؟ شرم آنی چاہیے اُن۔۔۔۔''

''بس جزا بس!۔۔۔۔'' اُسکی دھاڑ پر سب کو سانپ سونگھا تھا۔

''یہ فیصلہ تم نہیں کرو گی۔ تم نہیں بتاؤ گی ہمیں، کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟ نوید کا حال معلوم ہے تمہیں؟ کتنی تنگ دستی میں گزارا کر رہا ہے وہ؟ میں کوشش بھی کروں، تو وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتا۔ کم از کم ابّو کی جائیداد میں سے اُسے اپنا حق مل جائیگا، تو اسے مزید پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔''

''تو ہم نے کہا تھا انہیں گھر سے جانے کو؟ خود کو شوق تھا نا الگ رہنے کا؟ ہونہہ! آپ سے پیسے نہیں لے سکتے، پر میرے باپ کے مال پر نظریں گاڑ رکھی ہیں۔'' وہ دوبدو بولتی بدتمیزی پر اُتر آئی تھی۔ وحید نے ضبط کا گھونٹ بھرا اور پھر اپنی ماں کو دیکھا۔

''امی! اسکا منہ بند کروا لیجیے، ورنہ اِسکے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے اپنے ماں سے کہا۔ بیٹے کی بات سننا تو اُن پر واجب تھا۔ فوراً جزا کی طرف مڑیں۔

''شرم نہیں آ رہی، باپ کو مرے چند گھنٹے نہیں ہوئے اور اس طرح تماشہ لگا رہی ہو؟'' انہوں نے جزا کو جھڑکا۔

''میں تماشہ نہیں لگا رہی بلکہ یہ۔۔۔۔''

''خاموش رہو! بڑا بھائی جو فیصلہ کر رہا ہے وہ یقیناً صحیح ہوگا۔ تم ہو کون اِن سب معاملات میں مداخلت کرنے والی؟ جاؤ اپنے کمرے میں!'' انہوں نے اُسے بری طرح ڈانٹا، تو وہ غصّے سے وہاں سے چلی گئی۔ اُسکے جانے کے بعد وہ گہری سانس لیتا، خود کو نارمل کرتا بیٹھا۔

''امی! آپ کا، جزا کا، ہم سب کا حصہ ہے اِس گھر میں۔ اور یقین رکھیئے، میں کسی کا حق نہیں ماروں گا۔ کیا آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں؟''

''نہیں بیٹا! اللہ نہ کرے جو میں تمہارے بارے میں ایسا سوچوں۔'' اُنہوں نے دہل کر کہا۔

''میں تو بیٹا! اس بات پر پریشان ہوں کہ اس گھر کو بیچ دیں گے، تو ہم کہاں جائیں گے ؟''انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

''کیا ہو گیا ہے امی؟ کیا میں نہیں ہوں یہاں ؟''اس بات پر وہ خوش ہوئیں۔ ''میں آپکے اور جزا کے لیے اپنے قریب ہی کرائے کا گھر لے رہا ہوں۔ کرایہ، بل اور راشن وغیرہ میری ذمّے داری ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ ابّو کی پینشن ہر ماہ آپکے پاس گھر آجایا کرے گی، آپ کو اسکی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''اُسکی بات پر انکا چہرہ بجھا۔

''کرائے کا گھر کیوں بیٹا؟ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتے ؟''انہوں نے امید سے پوچھا تو وحید کا دل کٹا۔

''کیوں نہیں رہ سکتے امی! پر جزا نہیں رہنا چاہے گی۔ اور دوسری بات یہ کہ میرے گھر میں، گھر کے تمام فیصلے ملائکہ کرتی ہے۔ یعنی گھر کی سیٹنگ کیسی کرنی ہے ؟ کھانا کیا بنانا ہے ؟ کس کو کب گھر بلانا ہے ؟ فرنیچر کیسا لینا ہے ؟ برتن کونسے استعمال کرنے ہیں ؟ یہ سارے فیصلے اُسکے ہوتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں آپ سے یہ اختیار چھین لیا جائے۔ لہٰذا! میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے گھر میں رہیں، اپنی مرضی سے فیصلے کریں، جیسے ہمیشہ کرتی ہیں۔ ان شاء اللہ! جب جزا کی شادی ہو جائے گی، تو تب تو میں ویسے بھی آپکو اپنے پاس لے ہی آؤں گا۔''انہوں نے جواباً بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُسکے بعد گھر جلد از جلد بک گیا، جزا اور اسکی ماں کو نوید نے اپنے سامنے ہی گھر میں منتقل کروا دیا۔ اس فیصلے پر جتنی جزا خوش تھی، وحید جانتا تھا کہ وہ اب اُس کا منہ بھی نہیں دیکھے گی، اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں سے قطع تعلق کر لیا۔ گھر کی مالیت چار کروڑ تھی، نوید کے حصے میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے آئے۔ وحید نے اسکے بینک میں پیسے ٹرانسفر کر دیئے۔

''مجھے اسکی ضرورت نہیں ہے بھائی! اور نہ مجھے یہ چاہیے۔''اس نے فوراً ہی وحید کو فون کیا تھا۔

''مجھے اِس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ تمہیں یہ چاہیے یا نہیں، میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اور ویسے بھی نوید! اپنا حق چھوڑنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ تم قرض لو یا اپنی ضروریات کو روکو، اُس سے کہیں بہتر ہے کہ تم اپنا حق لو اور اسے اُسے استعمال کرو۔''وحید کی بات سولہ آنے درست تھی۔ اُس نے خاموشی سے اپنا حصہ رکھ لیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ سوچتا کہ اُن پیسوں سے کہاں سرمایہ کاری کرنی ہے ؟ اُسکا سی ایس ایس کا رزلٹ آگیا۔ وہ انٹرویو میں پاس ہو گیا تھا۔

اُسے چھ ماہ CTP اور پھر چار ماہ STP کی ٹریننگ کے لیے جانا تھا۔ یعنی کل ملا کر کوئی دس ماہ اُسے گھر سے دور گزارنے تھے۔ جانے سے پہلے اُسے یہ خوش خبری بھی مل چکی تھی، کہ اللہ اُسے اولاد سے نوازنے والا ہے۔ ایسے میں جانا مشکل لگنے لگا، پر پھپھو نے یہ کہہ کر مسئلہ حل کر دیا کہ وہ دس ماہ بشریٰ کے ساتھ ہی رہیں گی۔ اس نے بشریٰ کی خواہش کے مطابق اُسکا پرائیویٹ ایم اے میں داخلہ کروا دیا۔ پھپھو نے اِس پر اعتراض بھی کیا کہ بھلا کیا ضرورت ہے پڑھنے کی ؟

''میں چاہتا ہوں کہ یہ پڑھے۔اور میں آپ سے بھی یہی چاہتا ہوں کہ اِسکی پڑھائی میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ آئے۔''نوید نے حتمی فیصلہ سنادیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔اُنکے یہاں بیٹی سے زیادہ داماد کی بات کو اہمیت دی جاتی تھی۔

جائیداد کے پیسے اُس نے اپنے اور بشریٰ کے جوائنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کر دیئے تاکہ اُسکے پیچھے، بشریٰ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔دس ماہ کا ایڈوانس کرایہ بھی وہ مالک مکان کو دے آیا تھا۔یعنی اپنی طرف سے اُس نے مکمل تیاری کر لی تھی۔جانے سے پہلے وہ امی سے ملنے آیا۔خلاف توقع انہوں نے اسکے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے ترقی کی دعا دی، تو وہ حیران رہ گیا۔جزا اُس سے نہیں ملی۔ایئرپورٹ تک چھوڑنے بھی وحید ہی ساتھ آیا تھا۔

''ابّو کے انتقال کے کوئی دسویں دن، جب میں گھر کی چابیاں نئے مالک کو دے رہا تھا۔تب تمہارا دوست حسین آیا تھا۔'' وحید نے اُسے ایئرپورٹ پر بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔

''اُس نے ابّو کی موت کی تعزیت کی، پھر اپنا نمبر دے کر گیا کہ تمہیں دے دوں۔تمہارا نمبر نہیں مانگا اُس نے، نہ میں نے دیا۔''وحید نے ایک پرچی اُسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔نوید نے خاموشی سے پرچی تھام لی۔

''مجھے بعد میں امی نے بتایا کہ ابّو کی زندگی میں بھی وہ تم سے ملنے آیا تھا، پر وہ تمہارے گھر سے جانے پر اس قدر ناراض تھے کہ اُسے ہی برا بھلا کہہ دیا۔''اُس نے بتایا تو اب کہ نوید کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''کیا؟ پر ابّو نے ایسا کیوں کیا؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''جانتے تو ہو ابّو کو، غصّے میں وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔''

''کیا کہا تھا انہوں نے اُسے؟''اسے شدید دکھ ہو رہا تھا۔

''امی بتا رہی تھیں کہ ابّو نے اُسے کہا کہ تم گھر پر ہی ہو، پر اُس سے ملنا نہیں چاہتے، اس لیے وہ دوبارہ نہ آئے۔''نوید کا پورا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔یہ کیا کر دیا تھا ابّو نے؟ اور وہ بھی حسین کے ساتھ؟ جو بیچارہ، ویسے ہی کبھی کسی سے اِس لہجے میں بات نہیں کرتا۔

فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔لہٰذا وہ وحید سے مل کر چلا گیا۔ ہوا میں اڑتے جہاز میں بیٹھے نوید نے کئی بار پرچی پر لکھا نمبر دیکھا۔

''اب کیا وضاحت دوں گا اُسے؟ کیسے معافی مانگوں گا؟ سچ بتا کر اپنے مرے ہوئے باپ کو شرمندہ کر دوں؟ اور چلو بتا بھی دوں تو پھر مزید یہ بھی بتانا پڑے گا کہ آخر ابّو نے ایسا کیا کیوں؟ اور اپنے راز میں اُس سے نہیں بانٹ سکتا۔''سارے راستے اسی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بلآخر اُس نے سوچا کہ سارا الزام اپنے سر لیکر معافی مانگ لے گا۔حسین دل کا اچھا ہے، یقیناً معاف کر دے گا۔مگر قسمت کو منظور نہ تھا۔جہاز سے اترتے ہوئے، وہ پرچی اُس سے کہیں کھو گئی۔اُسے بہت افسوس ہوا، پر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پھر! دس ماہ ٹریننگ کے دوران اُس نے ہر شے بھلا دی۔ صرف اور صرف ٹریننگ پر دھیان دیا۔ جب وہ ایس ٹی پی کے لیے اسلام آباد میں تھا، تب اُسے اطلاع ملی کے اللہ نے اسے بیٹے سے نوازا ہے۔ ہر طرف سے مبارک باد کے فون آنے لگے۔ بشریٰ سے اس نے ویڈیو کال پر بات کی، بیٹے کو بھی ویڈیو کال پر ہی دیکھ سکا۔ امی اُن دونوں کے پاس ہی تھیں، وقت کے ساتھ ساتھ اُنکی ناراضگی ختم ہو گئی تھی۔ البتہ جس نے ایک میسج کر کے بھی مبارک باد دینے کی زحمت نہ کی، وہ جزا تھی۔ بلاشبہ وہ اپنے بہن بھائیوں کے رویے سے دکھی نہیں ہوتا تھا، پر آج اُسے برا لگا تھا۔ جزا کا اسطرح کرنا اُسے یہ احساس دلا گیا تھا کہ اسکے ساتھ ساتھ اُسکی اولاد بھی غیر اہم ہے۔

ٹریننگ مکمل کر کے جب وہ گھر آیا تو اسکی پوسٹنگ کے آرڈرز آ گئے۔ اسے کوئٹہ تعینات کیا گیا تھا۔ اُسکی قسمت اچھی تھی کہ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح ویٹنگ لسٹ کا انتظار کیے بغیر ہی اُسکے لیے رہائشی کالونی میں گھر مختص کر دیا گیا تھا۔ جسکے بعد وہ، بشریٰ اور اپنے بیٹے معید کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔

---------+---------+--------

''چلو! آج تمہیں بتا ہی دیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ نوید مجھے بہت عزیز ہے۔ جن باتوں کی اُسے اجازت ہے، اُن باتوں کی میں دوسروں کو عموماً اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنی من مانی کرتا ہے اور میں کرنے دیتا ہوں۔ اُس شخص نے وطن کو اپنے دو معصوم بچے دیئے ہیں۔ اُس شخص نے اپنے بیٹوں کی لاشیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتاری ہیں۔'' ایف آئی اے کے آفس میں بیٹھے فرّخ صاحب بتا رہے تھے۔ اور باقی سب سانس روکے اُنہیں سن رہے تھے۔

''دو بیٹے، جنکی عمریں تین سال اور چار ماہ تھیں۔ انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے۔'' اُنکی آواز آہستہ اور لہجہ کرب میں ڈوبا تھا۔ وہاں بیٹھے پانچوں اشخاص کو لگا جیسے کسی نے اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دی ہو۔

''نوید کی پہلی پوسٹنگ کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ اس نے چند ہی سالوں میں اپنی بہادری، شجاعت اور نڈر طبیعت کے باعث کئی بڑے بڑے مگر کامیاب آپریشنز میں اپنی جگہ بنائی۔ پھر اُسے ایک پوری ٹیم کا لیڈ بنا کر بلوچستان کے حساس علاقوں میں بھیجا گیا۔ یہ چند ماہ پر محیط آپریشن آرمی، سی ٹی ڈی اور آئی ایس آئی کی مشترکہ کارروائی تھی۔ اِس کامیاب آپریشن میں غیر معمولی بہادری، اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجرمین تک پہنچنے پر، اُسے حکومت کی طرف سے سول ملٹری ایوارڈ، ستارہءِ شجاعت سے نوازا گیا۔'' اُنکے لہجے میں فخر بول رہا تھا۔

''پھر چار سال قبل نوید کا تبادلہ کراچی میں ہوا۔ ہمیں یہاں منشیات فروشی، اور نوجوان لڑکیوں کے اغوا میں ملوث ایک خطرناک گینگ کو پکڑنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ گینگ کا سربراہ خود یہ کام کرنے کے بجائے، ایک برطانوی شہریت کی حامل پاکستانی عورت، فرح خالد سے یہ سارے کام کرواتا تھا۔ اُس عورت کا ریکارڈ اتنا شفاف تھا کہ جتنا خود ہمارا بھی نہ ہو۔ اسے پکڑنا مشکل تھا۔ اُسکے خلاف ثبوت اکھٹے کرنا ضروری تھا۔ اس کام کا ذمہ نوید کے سر ڈالا گیا۔ نوید کو کسی بھی طرح اس عورت کے قریبی لوگوں میں شامل ہونا تھا اور اسکا بھروسہ جیتنا تھا۔ وہ اس کام میں کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن۔۔۔'' وہ رکے۔ سب دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

''فرح کو نوید پر شک ہونے لگا۔ حالانکہ نوید نے نہایت شفافیت سے اپنا کام کیا تھا، لیکن ہمارے ہی ادارے کے کچھ غدّار تھے، جنہوں نے اسے اطلاع پہنچائی تھی۔ ہم اس دن کے لیے تیار تھے۔ ہم نے اسکی نفسیات کے ساتھ کھیلنے کا منصوبہ بنایا۔ نوید نے اپنے لیے ایک ذاتی آفس لیا۔ اور فرح کے خلاف تمام ثبوت اکھٹے کر کے، اُس آفس میں رکھ دیئے۔ وہ کوئی خفیہ آفس نہ تھا، بلکہ اتنا معمولی تھا کہ اسکے بارے میں ہر کوئی جانتا تھا کہ یہ نوید کا ذاتی آفس ہے۔ ایک مجرم کے خلاف ثبوت، کبھی بھی اتنے معمولی سی جگہ پر نہیں رکھے جا سکتے، لہٰذا فرح جیسی جرائم پیشہ عورت کا دماغ کبھی اِس طرف نہیں جاتا۔ وہ یہی سمجھتی کہ اسکے خلاف ثبوت یقیناً ایف آئی نے کسی حساس جگہ پر رکھے ہونگے، جسکو حاصل کرنے یا مٹانے کے لیے وہ ایڑھی چوٹی کا زور لگاتی۔ پر وہ کبھی بھی ثبوتوں تک نہیں پہنچ پاتی۔'' وہ سانس لینے کو رکے۔

''ہماری طرف سے ہر چیز کا انتظام کر لیا گیا تھا لیکن۔۔۔۔۔ ہمارا دشمن ہم سے کئی ہاتھ آگے نکلا۔ اور اسکا خمیازہ صرف ایک شخص نے بھگتا۔ اور وہ تھا نوید۔۔۔۔'' وہ رکے۔

''اس روز نوید اپنے بیوی بچوں کو آفس لیکر آیا تھا۔ شاید انہیں اپنا آفس دکھانا چاہتا تھا، یا شاید کوئی کام تھا۔ یہ اس نے کبھی نہیں بتایا۔۔۔۔۔''

---------+---------+--------

فی زمانہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ نفسیات ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کو سمجھنے اور حل کرنے کے بجائے دیگر چیزوں پر توجہ دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے کیریئر، پڑھائی اور کاروبار جیسی شے میں تو شاید کامیاب ہو جاتا ہے۔ پر وہ زندگی، رشتے اور معاشرے کے لیے ناسور بن کر نکلتا ہے۔ ہر شخص کو نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانا چاہیے۔ پر وہ یہ نہیں کرتا، بلکہ اپنے ساتھ ساتھ اپنی نسلوں کی زندگی بھی تباہ کر دیتا ہے۔

نوید عالم، بچپن سے مڈل چائلڈ سنڈروم کا شکار تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ نہ میں اپنے ماں باپ کا فخر ہوں اور نہ ہی لاڈلا۔ تو پھر میں ہوں کیا؟ ماں باپ کے غیر مساوی سلوک کی وجہ سے جو سوال بچے کے ذہن میں اٹھتا ہے، وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ہی کیوں؟ اور اگر بچہ اس کیوں کا جواب خود سے تلاش کر لے، تو اس سے زیادہ خطرناک کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ بچے کو مصلحت، حکمت، سمجھوتے جیسے الفاظ سمجھ نہیں آتے۔ اُسکے پاس ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ ''میں ناپسندیدہ ہوں''۔ اگر اُسکی غلط فہمی کو دور نہ کیا جائے، تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُسکے ذہن میں پختہ ہو جاتی ہیں۔ پھر خوف، بے اعتمادی، تنہائی جیسی چیزیں جنم لیتی ہیں۔

نوید کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ وہ شاید ٹھیک ہو جاتا، اگر وہ خود باپ نہ بنتا۔ لیکن اپنی اولاد کو گود میں لیتے ہی اُسکے اندر کا خوف اُمڈ کر باہر آیا تھا۔ اور وقت پر اس خوف کا علاج نہ کرنے کی وجہ سے اُس نے اپنی اور بشریٰ کی زندگی تباہی کے دہانے پر لا کھڑی کی تھی۔

بشریٰ ذرا سا بھی اُسکے بچے کو ڈانٹ دیتی تو وہ گھنٹوں بشریٰ کی کلاس لیتا، وہ مذاق میں اپنے گول مٹول سے بیٹے کو موٹو بھی کہہ دیتی تو نوید کا پارہ آسمان چھو جاتا۔ اسے لگتا کہ وہ بچے کا مذاق بنا رہی ہے۔ یہ خوف کہ کہیں اُسکے بچے کے ساتھ بھی وہ نہ ہو جائے، جو اُسکے ساتھ ہوا تھا۔ اُسے سکون سے رہنے دیتا اور نہ بشریٰ کو۔ حتیٰ کہ معید کسی شے کی ضد کرتا، اور بشریٰ منع کر دیتی تو بھی اُسکے عتاب کا شکار وہ ہی ہوتی۔

''کیا اچھا لگتا ہے کہ چھوٹا سا بچہ، اپنی ذرا سی خواہش کے لیے تمہارے آگے بھیک مانگے؟'' اُسکے الفاظ پر بشریٰ حیران رہ گئی۔

''تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو نوید؟ میں اُسے کسی چیز سے روک رہی ہوں تو اُسکے بھلے کے لیے ہی نا؟'' وہ ششدر کھڑی رہ گئی۔

''رہنے دو! میں جیسے کہ جانتا نہیں ہوں۔ تم عورتوں کو پتہ نہیں کیا شوق ہوتا ہے اولاد کو مُٹھی میں کر کے رکھنے کا؟ انکو ذرا ذرا سی شے کے لیے ترسا کر پتہ نہیں کونسی تسکین ملتی ہے؟'' ویسے تو نوید کا رویّہ بشریٰ کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ پر بچوں کے معاملے میں اُسکی زبان ہمیشہ ایسے ہی زہر اگلنے لگتی تھی۔ بشریٰ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ آخر اُسکا قصور کیا ہے؟

گزشتہ کئی سالوں میں، نوید کے کام نے اُسے بھی مضبوط بنا دیا تھا۔ پہلے پہل، اُسکے کئی کئی دن آپریشن پر جانے کی وجہ سے وہ خوف سے ہلکان ہونے والی بشریٰ، اب پوری بہادری سے اُسکا انتظار کرتی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر سے بھی اُس سے ایک ہی سوال پوچھتا، معید کو ڈانٹا تو نہیں؟ اُسے مارا تو نہیں؟ اُس پر غصّہ تو نہیں ہوئی؟ حد تو یہ ہو گئی کہ جب تین سالہ معید بولنے کے قابل ہوا، تو نوید نے یہ سوال اُس سے بھی شروع کر دیئے۔ وہ اُسے اکیلے بٹھا کر پوچھتا کہ کہیں اُسکی ماں نے اُسکے پیچھے اُسے مار پیٹ یا ڈانٹ ڈپٹ کا نشانہ تو نہیں بنایا ہے؟ نوید کے اس اِس نے بشریٰ کو بڑی طرح توڑا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مجرم بن کر رہ گئی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ ماں نہیں بلکہ بچوں کی آیا ہے، جسے ہر عمل کا جواب دینا ہو گا۔ وہ کئی کئی گھنٹے اکیلے بیٹھ کر روتی تھی۔ پر خاموش رہتی کہ باپ نے کہا تھا کہ نوید کے گھر سے اب تمہاری میّت ہی نکلے گی۔

معید تین سال کا تھا، جب اللہ نے اُسے دوسرا بیٹا دیا۔ بشریٰ بڑے والے کو قریب کنڈر گارڈن میں ڈالنا چاہتی تھی، جہاں معید کھیل کود کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیاں بھی سیکھے، اور دوست بنائے۔ ورنہ وہ سارا دن گھر میں ہی بند رہتا تھا۔

''آخر تم عورتوں کو مسئلہ کیا ہے؟ تین سال نہیں گزرے اولاد کو اٹھا کر اسکول میں پھینک دو۔ اتنا بوجھ ہے میرا بچہ تم پر؟'' نوید نے حسب توقع مخالفت کی تھی۔

''نوید! صرف دو گھنٹے کا اسکول ہے۔ اور میں دو گھنٹے اُسکے ساتھ ہی رہوں گی۔ وہاں مائیں ساتھ آتی ہیں۔'' اس نے تحمل سے سمجھانا چاہا۔

''اور چھوٹا کہاں رہے گا؟''

''آف کورس! میرے ساتھ۔۔۔''

''چند ماہ کے بچے کو تم اسکول میں خوار کرو گی؟''

''وہ چند ماہ کا بچہ میری گود میں رہے گا۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ معید کا کوئی دوست نہیں ہے۔''اُسکا لہجہ اب سخت ہوا۔

''تو تم بنو اُسکی دوست۔ کیوں اپنے بچے کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتی ہو۔ میں اِس چیز کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''نوید تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میرے سر پر اب چھوٹے بچے کی ذمّے داری ہے۔ میں معید کے لیے بہتر ہی سوچ۔۔۔۔''

''اوہ! تو اِس چھوٹے کو توجہ دینے کے لیے بڑے کو منظر سے غائب کر دو؟ واہ!''نوید نے اُسکی بات کاٹی تو وہ حیرت کا مجسمہ بن گئی۔

''کان کھول کر سن لو بشریٰ! میرے گھر میں یہ غیر مساوی سلوک نہیں ہو گا۔ دونوں بچوں کو تم برابر توجہ دو گی۔''

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔''وہ پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ کافی عرصے برداشت کرنے کے بعد بلآخر بشریٰ کی بس ہونے لگی تھی۔ وہ اب نوید سے بحث کرنے لگی تھی، جسکی وجہ سے دونوں ہی کی آوازیں بلند ہونے لگتی، اور گھر ایک میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگتا۔ اپنے تئیں، اپنے بچوں کے لیے بہترین سوچنے والا نوید یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ وہ اپنے گھر کو بھی اپنے ماں باپ جیسا بنا رہا تھا۔

اُس روز وحید بھائی اور ملائکہ بھابھی ملنے آئے ہوئے تھے۔ نوید بھی گھر پر ہی تھا۔ گفتگو کچھ خاص نہ تھی، ملکی حالات اور سیاست سے ہوتے ہوئے بچوں تک پہنچ گئی۔

''یہ بہت شیطان ہو گیا ہے۔ کل ہی جا کر واشروم کے سارے نل کھلے چھوڑ دیے اور اپنے کپڑے سب گیلے کر لیے۔ میں جب پہنچی تو۔۔۔''بشریٰ مزے سے اسکا کوئی کارنامہ بتانے لگی کہ یکلخت ہی نوید کو نجانے کیا ہوا کہ وہ اسکی طرف جھٹکے سے مڑا۔

''کیا سب کے سامنے یہ بتانا ضروری ہے؟ اتنی اہم بات ہے یہ؟''اُس نے سنجیدہ مگر حقارت آمیز لہجے میں کہا تو وہ ساکت ہوئی۔

''میں تو بس بات کر رہی۔۔۔''

''بات کرنے کے لیے تمہیں یہی ملا ہے؟ کہ تم بچوں کی غلطیوں کا مہمانوں کے سامنے اشتہار لگاؤ۔''اُسکا لہجہ سخت ہوا۔

''ریلیکس نوید! ہم مذاق کر رہے تھے۔''ملائکہ نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔

''میرے بچے مذاق اڑانے کے لیے نہیں ہیں بھابھی!''اس نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ بشریٰ کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ کہ تمہاری۔۔۔''وحید نے صورتحال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا اور وہ اِس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ پر بشریٰ کو ایسی چپ لگی کہ وہ ان دونوں کے جانے تک خاموش رہی۔ اُسکی خاموشی نے کچھ ہی دیر میں نوید کو اپنے لہجے کا احساس دلا دیا تھا۔ پر اب دیر ہو چکی تھی۔۔۔۔۔

''بشریٰ!۔۔۔''اُنکے جانے کے بعد وہ اُسکے پیچھے آیا کہ کوئی وضاحت دے۔

''تم ایک نفسیاتی، پاگل اور ذہنی مریض انسان ہو۔''شادی کے چھے سال بلکہ بچپن سے لیکر آج تک کی پوری زندگی میں شاید بار اُس نے بشریٰ کو حلق کے بل چیختے ہوئے سنا تھا۔وہ تھم گیا تھا، پر جو اُس نے کہا، اُس نے تو نوید کو اندر تک لرزا دیا تھا۔

''تمہارے ساتھ رہنا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے پر میں مجبور ہوں۔۔۔۔ مجبور ہوں کہ میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ مر جانا پر شوہر کے گھر سے زندہ واپس مت آنا۔''نوید پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔بشریٰ کی زبان سے یہ سب سننا جلتے کوئلے پر لیٹ جانے جیسے تھا۔

''یہ۔۔۔یہ تم۔۔۔۔تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔بشریٰ؟''اُس نے بے یقینی سے کہا۔

''میں تھک گئی ہوں نوید! میں تمہارا نفسیاتی پن برداشت کر کر کے تھک گئی ہوں۔تم نے مجھ سے میری خوشی، میری عزت نفس، میری انا، سب چھین لی ہے۔''چیختے چیختے وہ ہانپ گئی۔آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی۔

''بشریٰ! میں مانتا ہوں۔۔۔کہ مجھے اِس طرح کے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔پر تم۔۔۔اتنی سی بات پر اتنا غصّہ کیوں کر رہی ہو؟''نوید کی آواز میں نہ وہ رعب تھا، نہ وہ غصّہ۔وہ جیسے کوئی سہما ہوا بچہ تھا، جسے اپنی غلطی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''اتنی سی بات؟ اتنی سی بات ہے تمہاری لیے؟ تم جانتے ہو تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ جانتے ہو؟''بشریٰ پھنکارتی ہوئی، اُسکے پاس آئی اور اُسکا گریبان پکڑ کر اُسے جھنجھوڑا۔نوید ہل بھی نہ سکا۔

''تم نے مجھے میری ہی اولاد کی نظر میں گرا کر رکھ دیا ہے۔تم اُس بچے کے ذہن میں یہ بٹھا چکے ہو، کہ ماں غلط ہے اُسکی۔وہ یہی سمجھتے ہوئے بڑا ہو گا کہ اُسکی ماں کوئی مجرم ہے، کیونکہ اسکا باپ روز آ کر اُس سے تفتیش جو کرتا ہے۔''اُس نے جھٹکے سے نوید کا گریبان چھوڑا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

''وہ بچہ ہے، بعض اوقات اُسے ڈانٹنا پڑتا ہے، اُس پر سختی کرنی پڑتی ہے۔تم کیوں نہیں سمجھتے کہ میں اُسکی دشمن نہیں ہوں؟ میں اُسے کسی شے سے منع کرتی ہوں تو اُسکے بھلے کے لیے، بچہ زہر مانگے تو اُسے زہر نہیں دیا جا سکتا۔اُسے روکا جاتا ہے، ڈانٹا جاتا ہے۔بچہ ضد کرتا ہے، اُسکے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔تم کیوں اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ پر تم نے مجھے میری اولاد کی نظر میں دشمن ہی بنا کر رکھ دیا ہے۔''وہ رو دی تھی۔اور نوید عالم پر اُسکے آنسو کسی بندوق سے نکل کر سینہ چیرتی گولی سے بھی زیادہ گراں گزرتے تھے۔

''بشریٰ! آئی ایم سوری۔۔۔میں بس یہ چاہتا ہوں کہ۔۔۔میرے بچے وہ سب نہ سہیں جو میں نے۔۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینے لگا ہی تھا کہ وہ چیخ اٹھی۔

''اور اِن سب میں تم اپنے باپ جیسے ہی بن گئے ہو۔''وہ سن رہ گیا۔

''تم میں اور ماموں میں کوئی فرق نہیں رہا۔''نوید نفی میں سر ہلاتے آگے بڑھا۔

''نہیں بشریٰ! میں ابّو جیسا نہیں ہوں۔''اس نے خود کو کہتے سنا۔

''ہاں ہو!''وہ دھاڑی تھی۔''تم ہو اُن جیسے۔۔۔۔تم میرے بچوں کی نظر میں مجھے ویسے ہی مجرم بنا دیتے ہو، جیسے کہ وہ تمہیں بناتے تھے۔تم نے آج لوگوں کے سامنے میری تذلیل ویسے ہی کی ہے، جیسے وہ تمہاری کرتے تھے۔تم مجھے اکیلے میں بھی میری غلطیاں سمجھا سکتے تھے مگر نہیں!۔۔۔تمہاری نظر میں تو میں ایک بہت بری ماں ہوں۔ایک بچے کی عزت نفس، اُسکی انا کی پرواہ ہے تمہیں، پر میری نہیں ہے؟ جبکہ تم کیا ہو؟ تم نے کیا ہی کیا ہے، اب تک اپنے بچوں کے لیے؟ ہاں؟''وہ سوال کر رہی تھی۔اُسے آئینہ دکھا رہی تھی۔اور اِس آئینے میں نوید عالم کو فقط اپنے باپ کا عکس نظر آ رہا تھا۔

''میں تمہارے پیچھے کئی کئی مہینے انہیں سنبھالتی ہوں۔یہ کیا کھاتے ہیں؟ کیا پیتے ہیں؟ کب سوتے ہیں؟ یہ سب میں جانتی ہوں تم نہیں!۔میں انہیں آئس کریم نہیں دیتی، اِس لیے نہیں کہ میرے بچوں کی ضد مجھے کوئی تسکین پہنچاتی ہے۔بلکہ اِس لیے کہ وہ انکو نقصان پہنچا سکتی ہے۔معید کو پہلے بھی نمونیا ہو چکا ہے۔تم جانتے ہی کیا ہو اِنکے بارے میں؟ تم نے آج تک اِنکے ساتھ بیٹھ کر کبھی کھیلا ہے؟ کبھی وقت گزارا ہے اِنکے ساتھ؟ نہیں نا؟ لیکن نہیں! ماں تو میں بری ہوں۔''وہ آج ہر بھڑاس نکال دینا چاہتی تھی۔نوید سر جھکائے کھڑا تھا۔

''ایک چھوٹے سے گھر کی خواہش تھی تمہاری۔۔۔۔میری بھی تھی۔۔۔۔پر دیکھو! دیکھو نوید! تم نے تو اِس گھر کو اپنے ماں باپ جیسا گھر بنا دیا ہے۔''یہ تابوت میں آخری کیل تھی جو بشریٰ نے ٹھونک دی تھی۔اُسکے بعد وہ کمرے میں جا کر جو بند ہوئی تو پھر باہر نہ آئی۔حتیٰ کہ بچوں کے لئے بھی نہیں۔

اُس رات نوید نے پہلی بار اپنا مکروہ چہرہ دیکھا۔اُس رات جب وہ معید کو کھلونے کا چھوٹا سا بلاک اٹھا کر منہ میں ڈالنے سے منع کر رہا تھا، تو وہ سن نہیں رہا تھا۔کئی بار منع کرنے پر بھی، جب اُس نے بات نہیں مانی، تو نوید نے جھنجھلا کر اُسے سختی سے گھورا۔

''منع کیا ہے نا میں نے؟''اُسکے ڈانٹنے پر وہ منہ بسورنے لگا، اور نوید ساکت رہ گیا۔اُس نے اپنے بچے کو ڈانٹا تھا؟ تو پھر بشریٰ کی کیا غلطی تھی؟

اُس کے بعد بشریٰ کا رویہ یکدم ہی تبدیل ہو گیا۔وہ سوائے ہاں یا نہ کہ نوید کو کسی بات کا جواب نہ دیتی، نہ اُس سے اُسکے دن کے بارے میں پوچھتی نہ اپنی مصروفیات بتاتی۔اُس کے کام سب کرتی، پر نہ ہنستی نہ مسکراتی۔یہ اُسکی شدید ناراضگی کا اظہار تھا۔اور ایسی ناراضگی نوید نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بشریٰ کی خاموشی اُس کی جان پر بن رہی تھی۔تین دن اسی طرح گزر گئے، تو چوتھی صبح نوید نے اُسے کہیں ساتھ چلنے کو کہا۔اُس نے بس سر ہلا دیا۔کوئی سوال نہیں کیا۔نہ تجسس کا اظہار کیا۔نوید اُسے اور معید کو لیکر اسکول آ گیا۔اسکول آ کر اسے معلوم ہوا جیسا وہ سمجھ رہا تھا ویسا کچھ نہیں تھا۔وہ اسکول دراصل چھوٹے بچوں کا ایک سوشل کلب تھا۔وہاں وہ دوستیاں کرتے، ادب و آداب سیکھتے، اپنی پسندیدہ چیزوں میں دلچسپی دکھاتے اور اپنی ماؤں کے ساتھ گھر واپس آ جاتے۔نوید اسکول سے بہت مطمئن ہوا۔بشریٰ اُسکے رویے پر حیران تو ہوئی پر فلحال اُس نے اپنا رویہ بالکل نہیں بدلا۔وہ جو سمجھا تھا کہ اُسکے اِس عمل کے

بعد بشریٰ کا رویہ تھوڑا تبدیل ہو گا، اُسکی ناراضگی ہنوز برقرار دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اُسے اظہار کرنا نہیں آتا تھا، ورنہ وہ اُسے بتاتا کہ وہ دشمن کی گولی سہہ سکتا ہے پر اُسکی ناراضگی برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ اُسکا کسی کام میں نہ دل لگ رہا ہے اور نہ ہی کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ پر وہی خاموشی۔۔۔۔۔

ایک ہفتہ مزید سرکا تو اُس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو اُسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ پر اُس نے سوچا کہ دیر آئے، پر درست آئے۔ اور ایک سائیکاٹرسٹ کا اپائنٹمنٹ لے لیا۔ یہ مشکل تھا پر اُسے کرنا تھا، وہ اپنے ماں باپ جیسا ایک اور گھر نہیں بننے دینا چاہتا تھا۔

پر ہمیشہ دیر سے آنا درست نہیں ہوتا۔

---------+--------+-------

''میں نے تمہاری تمام بات سنی، اور سمجھ لی ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ تم نے اِس چیز کو سمجھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اور تمہاری بیوی دونوں کو میریج کونسلنگ کی ضرورت ہے۔ اور یقیناً! تمہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا اگلی بار تم اُسے ساتھ لاؤ گے۔'' ایس ایس پی نوید عالم اِس وقت سائیکاٹرسٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ نئی نسل کی یہ بات اچھی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح ضد پر نہیں اڑی رہتی ہے۔ وہ خود کو اور حالات کو بدلنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ نوید نے بھی مان لیا تھا کہ وہ بہت ساری جگہوں پر غلط ہے۔ اُس نے ضد اور ہٹ دھرمی نہیں دکھائی تھی۔

گو کہ نوید نے ڈاکٹر کو سب نہیں بتایا تھا۔ پر وہ اُسے بہت اچھے سے سمجھ گیا تھا بلکہ کئی بار تو نوید کو ایسا لگا، جیسے وہ اُسے اندر تک پڑھ رہا ہے۔

''اب میں تمہیں ایک ڈائری دے رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ایک نئی ڈائری اُسکی جانب بڑھائی تو وہ ہنسا۔

''میں ڈائری نہیں لکھتا۔ اور نہ مجھے اِسکی عادت ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''میں جانتا ہوں! پر تمہیں ڈائری نہیں لکھنی، بلکہ اپنے وہ تمام جذبات، خدشات، اور خوف لکھنے ہیں، جن کا اظہار تم آج تک نہیں کر پاتے۔'' اُس نے ڈائری تھامتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز وہ بشریٰ اور بچوں کو باہر لیکر آیا۔ معید اب باقاعدہ اسکول جانے لگا تھا۔ اصل میں وہ بشریٰ کو بھی اپنے ساتھ ہی سائیکاٹرسٹ کے پاس لیکر جانا چاہتا تھا، پر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے بتائے؟ کلینک جانے سے پہلے کہیں بیٹھ کر اُس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اُسکا گھر دور تھا، اور ڈاکٹر کی کلینک کے قریب اُسکا نیا آفس تھا۔ اسے موزوں جگہ وہی لگی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی اپنے گھر والوں کو اپنے کام کی جگہ نہیں آنے دیتا تھا، پر یہ اُسکی زندگی کی پہلی اور آخری لاپرواہی تھی۔

وہ بشریٰ اور بچوں کو اپنے نئے آفس لے آیا۔ معید تو یہاں وہاں بھاگنے لگا۔ البتہ کاٹ میں سوئے اپنے چار ماہ کے بیٹے کو بشریٰ نے میز پر رکھ دیا تھا۔ آفس کشادہ مگر خوبصورت تھا۔ آفس کے اندر ایک اور دروازہ تھا، جو باہر بالکونی میں کھلتا تھا۔ وہ ابھی بالکونی میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نوید اسکے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

''بشریٰ!''اس نے پکارا تو وہ سنجیدگی سے اُسکی طرف پلٹی۔

''کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتی؟''اس نے نرمی سے پوچھا۔

''کس بات کی معافی؟''پورے ایک ہفتے بعد اُس نے کوئی مکمل جملہ بولا تھا۔

''میں مانتا ہوں کہ میں نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ اور اگر تم احساس نہ دلاتی تو میں ایسے ہی ساری زندگی گزار دیتا۔ دیکھو! میں خود کو بدل رہا ہوں۔''اُس نے آس سے اُسے دیکھا۔ بشریٰ سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''اور یہ بدلاؤ کتنے دن تک کے لیے ہے؟ تم تو ہر بار معافی مانگتے ہو۔ پھر؟''وہ بہت زیادہ ناراض تھی۔

''ہاں! ہر بار میں اپنے لہجے اور اپنے الفاظ کی معافی مانگتا تھا۔ پر آج پہلی بار میں اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے، اُسکی معافی مانگ رہا ہوں۔ میں نے کل ایک سائکیٹریٹ سے ملاقات کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے کونسلنگ کی ضرورت ہے۔''اس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ بشریٰ کا سانس رکا۔ اگلے ہی لمحے اُس نے نوید کو دونوں بازوؤں سے تھاما۔

''نوید!۔۔۔نوید! میں نے ایسا صرف غصّے میں کہہ دیا تھا۔ تم۔۔۔ تم خود کو کوئی ذہنی مریض نہ سمجھو۔۔۔ میں تو پتہ نہیں کیا کیا بول رہی تھی اُس دن۔۔۔ تم میری باتوں کو۔۔۔۔''کچھ دیر قبل اُس سے ناراض بشریٰ اب اُسکے لیے پریشان تھی۔ وہ اسکی معصومیت پر ہنسا۔

''بشریٰ! میں خود کو پاگل نہیں سمجھ رہا۔ اور نہ ہی تھیراپسٹ کے پاس جانے کا مطلب یہ ہے کہ میں نفسیاتی ہوں۔''اس نے بشریٰ کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ میری کچھ ذہنی الجھنیں ہیں۔ جن کا سلجھانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اسکا خمیازہ میرے بچے بھگتیں گے۔ اور تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔ تاکہ وہ تمہارا نظریہ بھی جان سکے۔ اور میں خود کو مزید بہتر بنا سکوں۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو بشریٰ کی آنکھیں نم ہوئیں۔

''مجھے معاف کر دو نوید! میں نے اُس دن نہ جانے کیا کیا کہہ دیا تھا؟''بلآخر دونوں میں صلح ہو گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو منا لیا تھا۔ نوید کا فون بجا تو اُس نے موبائل باہر نکالا۔

''مجھے یہ اہم کال لینی ہے، میں آتا ہوں۔'' وہ عجلت میں کہتا دروازے کی طرف بڑھا۔

''میں باہر بالکونی میں جا رہی ہوں۔ ویوا چھا لگ رہا ہے۔'' وہ پیچھے سے بولی تھی۔ نوید جا چکا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے معید پر نظر ڈالی، جو اپنے باپ کی گھڑی سے کھیل رہا تھا۔ پھر وہ باہر بالکونی میں آ گئی۔ منظر واقعی اچھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے اُسکے مزاج پر اچھا اثر ڈالا، کچھ نوید سے ہونے والی صلح نے بھی اُسکو مطمئن کر دیا تھا۔ ابھی وہ باہر ہی تھی کہ اُسے اپنے پیچھے بالکونی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

''معید!'' وہ سمجھی کہ معید ہے۔ فوراً پلٹ کر دیکھا۔ بالکونی کے شیشے کے دروازے کے پار، ایک عورت کھڑی تھی۔ سفید چادر میں لپٹی، اس عورت کا مکروہ چہرہ واضح تھا۔

''کون ہو تم؟ دروازہ کھولو۔۔۔۔'' بشریٰ نے دروازہ کھولنا چاہا پر وہ لاک تھا۔ اس عورت نے مسکرا کر اُسے دیکھا، اُسکی چادر میں کچھ تھا۔ جو کہ بشریٰ دیکھ نہیں سکتی تھی۔

''دروازہ کھولو میں نے کہا۔ کون ہو تم؟'' اٹھارویں فلور کی بالکونی میں کھڑی بشریٰ کی آواز کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ اور ہاں! وہ تو بھول گئی۔ نوید اپنا آفس ساؤنڈ پروف بنواتا تھا۔

''آخر تم ہو کون؟'' بشریٰ نے دروازہ پیٹ دیا۔ وہ موبائل میز پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ اُس عورت نے اُسکی آنکھوں کے سامنے پردوں پر ایک بوتل سے کچھ چھڑکا۔

''نوید! نوید کہاں ہو تم؟'' وہ چیخی۔ یہ عورت کچھ غلط کرنے جا رہی تھی۔ اُس عورت نے وہ پیلے رنگ کا مادہ سارے میں چھڑکا، پھر آفس کے دروازے تک گئی۔ اور ماچس کی تیلی جلائی۔ اور بس! بشریٰ سمجھ گئی۔

''نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔'' وہ حلق کے بل چیخی تھی۔ عورت نے ماچس کی جلتی تیلی پھینکی اور خود باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

''نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ معید۔۔۔۔ میرا بچہ۔۔۔۔ نوید۔۔۔ میرے بچے کو بچاؤ۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ دروازہ پوری قوت سے پیٹ رہی تھی، اور آگ سارے میں پھیل رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ معید آگ سے خوف زدہ ہو کر یہاں وہاں بھاگ رہا تھا۔

''معید۔۔۔ میری جان۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔۔۔ کوئی مدد کرو۔۔۔'' نوید نے کمرے کے دروازے ایسے بنوائے تھے، جنہیں توڑنا آسان نہیں تھا۔ دیواریں ایسی کہ باہر آواز نہ جائے۔ اور آج یہ احتیاط اُسکی زندگی کا روگ بننے والی تھی۔

''یا اللہ!۔۔ میرے بچوں کو بچا لے۔'' بلک بلک کر روتے اُسکی نظریں بے بی کاٹ پر گئیں۔ بے بی کاٹ کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔''بشریٰ نے اپنے بال نوچ لیے، سینہ پیٹ لیا۔ پر اُسکا بچہ آگ کی نظر ہو گیا۔ ستم یہ کہ ان دیواروں نے اُسے اُسکے بچے کی آہیں بھی سننے نہ دیں تھیں۔

''یااللہ!۔۔۔ میرا بچہ۔۔۔''وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح فرش پر رول گئی۔ پر بچہ آگ کی نظر ہو گیا تھا۔ تب ہی اُسکی نظریں آگ سے بچ کر یہاں وہاں بھاگتے ہوئے تین سالہ معید پر پڑی۔

''معید۔۔۔ معید۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔ معید۔۔۔''وہ شیشہ پیٹنے لگی پر اُسکی آواز اندر نہیں جا رہی تھی۔

''میرے بچے۔۔۔ میرے بیٹے۔۔۔ اِدھر آؤ مما کے پاس۔۔۔''وہ نہیں سن سکتا تھا۔ پر یکدم ہی روتے ہوئے معید کی نظریں دروازے کے اُس پار ماں پر پڑیں۔

''مما۔۔۔''اُسکے لب ہلے۔ پر بشریٰ تک آواز نہیں آئی۔

''میرا بچہ۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔ میرے پاس آؤ۔۔۔''وہ اُسے بلانے لگی۔

نچلی منزل پر کھڑا نوید کسی ضروری شخص سے فوری طور پر ملنے آیا تھا۔ وہ چلا گیا تو نوید لفٹ کی جانب بڑھا۔

''اٹھارویں فلور پر آگ لگ گئی ہے۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔''آس پاس شور اٹھا تو وہ چونکا۔

''آگ لگ گئی ہے۔ اٹھارویں فلور پر۔۔۔''نوید کا سانس رکا۔ اٹھارویں فلور پر تقریباً بھی تیس کے قریب آفس تھے۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو وہ عجلت میں اندر آیا اور بشریٰ کا نمبر ملانے لگا۔ پر اُسکا فون بند جا رہا تھا۔ اُسکا دل بری طرح دھڑکنے لگا، ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے، ہاتھ اور پاؤں جیسے برف کی سل بن گئے۔ نوید بار بار اُسکا نمبر ملا رہا تھا پر ہر بار بند ہی آیا۔ جب وہ اٹھارویں فلور پر پہنچا تو اُسکے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اُسکے آفس کے دروازے سے سیاہ دھواں نکلتے نظر آ رہا تھا۔ لوگ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، پر وہ نہیں ٹوٹ رہا تھا۔

جو خیال تھے نہ قیاس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

میری زندگی کی جو آس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

''بشریٰ۔۔۔۔۔''وہ وہیں سے چیخا اور آفس کی جانب دوڑا۔

''بشریٰ۔۔۔ معید۔۔۔''وہ بری طرح دروازہ پیٹنے لگا جیسے وہ اندر سے جواب دینے والے ہوں۔

جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل، وہی لوگ ہیں میرے ہمسفر

مجھے ہر طرح سے جو راس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

''آگ بجھاؤ، کوئی آگ بجھاؤ۔۔۔'' وہ چیخ رہا تھا، دروازے پر گھونسے برسا رہا تھا، اپنا آپ زخمی کر رہا تھا۔

مجھے لمحے بھر کی رفاقتوں کے عذاب ستائیں گے

میری عمر بھر کی جو پیاس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

''معید۔۔۔ میری جان۔۔۔'' بشریٰ فرش پر پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ معید اپنے دونوں بازو ہوا میں بلند کیے اُسکی طرف آنے لگا۔ جیسے وہ اُسے گود میں اٹھالے گی۔ بشریٰ اپنی بے بسی پر تڑپ تڑپ کر رو دی۔ وہ اپنی ماں کے پاس آچکا تھا پر بیچ میں شیشے کی دیوار تھی، اُسکی ننھی سی آنکھوں سے آنسو کے قطرے بہہ رہے تھے، وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ شیشے پر ٹکائے ماں کو آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بشریٰ شیشے کے دروازے پر اپنا سر مار رہی تھی۔

جنہیں کر سکا نہ قبول میں، وہ شریکِ راہ سفر ہوئے

جو میری طلب میری آس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

نوید چیختے چیختے فرش پر بیٹھ چکا تھا۔

''بشریٰ۔۔۔ بشریٰ۔۔۔ کوئی تو میرے بچوں کو باہر نکالو۔۔۔ کچھ کرو۔۔۔'' لوگ اُسکی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ اُسکا گھر، اُسکی کل کائنات، اُسکا پورا جہاں اندر راکھ ہو رہا تھا۔ اور وہ اُنکے غم میں خاک ہو رہا تھا۔

یہ جو رات دن میرے ساتھ ہیں، وہی اجنبی کے ہیں اجنبی

''یااللہ۔۔۔ میں مر کیوں نہیں گئی؟'' وہ چیخ رہی تھی۔ اندر معید اپنے بازو بار بار بلند کر رہا تھا کہ شاید اُسکی ماں اُسے گود میں اٹھائے گی۔ بشریٰ نے روتے ہوئے سر اٹھایا۔ پھر جھک کر اُس جگہ پیار کیا جہاں معید کا چہرہ تھا۔ پھر وہ ہاتھوں سے اس جگہ کو ایسے پکڑنے لگی جیسے معید کا چہرہ تھام رہی ہو۔

''مما۔۔۔ مم۔۔۔ ما۔۔۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔ اور وہ بے بس ماں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

جو دھڑکنوں کی اساس تھے، وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے

اسی لمحے جب وہ اسکو پیار کر رہی تھی۔ جلتا ہوا پردہ عین معید کے اوپر آ گرا۔ وہ اتنی زور سے چیخی کہ اِس بار دنیا کی کوئی طاقت اُسکی آواز نوید تک پہنچنے سے نہ روک سکی۔

''بشریٰ۔۔۔'' اُسکی دلسوز چیخ سن کر نوید تڑپ اٹھا۔

معید آگ میں جل رہا تھا، قسمت کی ستم ظریفی کہ اُس نے ایک ماں کی آنکھوں کو اُسکی اولاد کو جلتے ہوئے دکھایا تھا۔ اُسکا ہاتھ دل پر گیا اور اگلے ہی لمحے وہ زمین بوس ہو گئی۔

''بشریٰ۔۔۔۔ بشریٰ۔۔۔۔ یہ میری بیوی کی آواز تھی۔۔۔۔ اُسے نکالو۔۔۔۔''

ایس ایس پی نوید عالم اُس روز ختم ہو گیا تھا۔

---------+---------+--------

مر جانا آسان ہے۔

اولاد کے مر جانے سے تو واقعی آسان ہے۔

وہ اُسکے بچے تھے۔ پر نہیں۔۔۔۔

اب وہ فقط دو جھلسی ہوئی لاشیں تھیں۔ اُسکا چار ماہ کا بیٹا تو ایسا جھلسا تھا کہ اُسکی ہڈیاں ہی رہ گئی تھیں۔ معید کا پورا جسم جھلس کر پہچاننے کے قابل نہ رہا تھا۔

جب دروازہ ٹوٹا تو نوید عالم جلتی آگ میں جا گھسا۔ جلتے کمرے میں بچوں کی لاشیں تو مل گئی تھیں۔ پر بشریٰ نظر نہیں آئی۔ ریسکیو والے ساتھ ساتھ تھے۔

میں باہر بالکونی میں جا رہی ہوں

نوید کے کانوں میں اُسکی آواز گونجی۔

''بالکونی۔۔۔۔ بالکونی میں ہے میری بیوی۔۔۔۔'' وہ چیخا تھا۔ آگ پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا تھا۔ بالکونی کا دروازہ اندر سے لاک دیکھ کر وہ شاک رہ گیا۔ پر زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا کیونکہ اُسے دھویں سے سیاہ ہوتے دروازے کے پار بشریٰ گری نظر آ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے ریسکیو ٹیموں نے دروازہ کھولا تو نوید بھاگتے ہوئے بالکونی میں گیا۔ بشریٰ جلی نہیں تھی، کیونکہ آگ وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ پر وہ ہوش میں نہیں تھی۔

اسے ہسپتال لایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شدید صدمے اور ذہنی دباؤ سے اِس حال میں پہنچی ہے۔ جب وہ ہوش میں آئی تو نہ روئی، نہ چیخی نہ منہ سے ایک لفظ بولی۔ بس ساکت اور جامد نظروں سے دیواروں کو دیکھتی رہی۔

نوید کا الگ حال خراب تھا۔ دنیا کے مشکل کام سرانجام دینے والے نوید سے اپنے بچوں کی لاشیں اٹھانا محال ہو گیا تھا۔ وحید اُسے سہارا دے کر چلتا۔ پر اُسے ایسا لگتا کہ وہ چل نہیں پا رہا۔ جنازہ ہو گیا اور ہفتہ بھی گزر گیا۔ پر بشریٰ کچھ نہ بولی۔ وہ ہسپتال سے گھر آئی تو بھی ایسی ہی رہی۔ گھر دیکھ کر نوید کا دل کیا وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ جس گھر میں اسکے بچوں کی قلقاریاں، اُنکی شرارتیں ہوتی تھیں، وہاں اب قبرستان جیسا سناٹا تھا۔

زندگی رکتی نہیں ہے، پر جن پر طوفان آتا ہے، انکے لیے شاید رک جاتی ہے۔ واقع کے ایک ہفتے بعد بشریٰ نے پہلا جملہ بولا۔

''مجھے امی ابّو کے گھر جانا ہے۔''نوید نے ایک لفظ نہ کہا۔ اُسے خاموشی سے اُسکے میکے چھوڑنے چلا گیا۔

''تمہیں لینے کب تک آؤں؟''دروازے پر گاڑی روک کر اُس نے پوچھا۔

''کبھی مت آنا نوید! اب کبھی مت آنا۔۔''اُس نے جو کہا وہ نوید کے کانوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پر وہ کہہ کر جا چکی تھی۔

وہ چلی گئی، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اس نے پلٹ کر نوید کی خبر بھی نہ لی۔

ایف آئی اے نے بھی نوید کو بریک دے دیا۔ وہ اکیلے گھر میں پاگل ہونے لگا۔ امی اور جزا جنازے کے بعد تین دن ساتھ رہیں۔ پھر جزا چلی گئی، وحید نے کہا بھی کہ یہیں رہو پر اسے ضد تھی، کہ جو بھائی میرے ساتھ نہیں رہا، میں بھی اُسکے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اتنے حساس موقع پر اُسکی ہٹ دھرمی پر پہلی بار وحید کا دل کیا کہ اسکے منہ پر تھپڑ لگا دے۔ پر خاموش رہا۔ اُسکی وجہ سے امی کو بھی ساتھ جانا پڑا۔

جب سارا گھر خالی ہو گیا تو نوید کو ہر جانب اپنے بچے دکھائی دینے لگے۔ اور پھر وہ ہوا جو اُس نے سوچا بھی نہ تھا۔ ایک صبح وہ اٹھا، دن کے بارہ بجے کا وقت دیکھا تو عجلت میں گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکلا۔ گاڑی رکی تو خود کو اسکول کے اندر کھڑا پایا۔

''میرے بیٹے معید کو بھیج دیں۔ اُسکی چھٹی ہو گئی ہو گی۔''اس مطالبے پر عملے خاموش کا خاموش رہ گیا۔ جب انہوں نے اُسے بتایا کہ آپکا بیٹا یہاں نہیں ہے، تو وہ چیخنے چلانے لگا۔ بہت مشکلوں سے اُسے یہ جھوٹ بتایا گیا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر جا چکا ہے، تو نوید وہاں سے گیا۔ گھر آیا تو بچے کہیں نہیں تھے، پھر باہر نکل گیا۔ گلی میں موجود ہر گھر کا دروازہ بجاتا اور پوچھتا کہ کہیں اُسکے بچے یہاں تو نہیں آئے؟ گلی والے دکھ اور ہمدردی سے اُسے دیکھتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب بشریٰ اور بچے نہیں ملے تو اُس نے اپنی ماں کے گھر فون کر دیا۔

''امی! بشریٰ اور بچے آپکی طرف ہیں؟''اِس سوال پر انکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''یہ۔۔۔۔یہ کیا۔۔۔کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟''

''امی! میرے بچے کہاں ہیں؟ آپکے پاس ہیں کیا؟ مجھے بتائیں؟ میں لینے آ جاؤں؟''اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''مم۔۔۔میں آ رہی۔۔۔میں آ رہی ہوں بیٹا۔۔۔''وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔

''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ آپ آ جائیں بچوں کو لیکر۔ اور آئندہ ایسے مت لے جایئے گا۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔''انہوں نے روتے ہوئے فون رکھا۔ پھر وحید کے گھر بھاگیں، اُسے ساری صورتحال بتائی اور زندگی میں پہلی بار وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف نوید کے لیے آئی تھیں۔

وہ نوید کے گھر کے اندر چلی گئیں، محلے والوں میں سے کسی نے وحید کو باہر روک لیا۔اور اُسے نوید کی سارے دن کی روداد سنادی،اُسکا دل ڈوبنے لگا۔وہ دوڑ کر اندر آیا تو دیکھا کہ نوید ایک ایک سامان اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخ رہا تھا۔

''میرے بچے کہاں ہیں امی ؟میرے بچے کہاں ہیں ؟''وہ روئے جا رہا تھا۔

''نوید ! میرے بچے۔۔۔ایسے مت کرو۔''وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے وحید نے اُسے سنبھالا اور اُسے یاد دلایا کہ اسکے بچے مر گئے ہیں۔اُس رات نوید عالم اپنی ماں کی گود میں سر رکھے بلک بلک کر رویا تھا۔وحید کا دل کر رہا تھا کہ اُسکے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہو اور وہ سارا منظر تبدیل کر دے۔اگلے روز نوید کی حالت بہتر ہو گئی۔پر فقط ایک رات میں اسکے بالوں میں سفیدی اتر آئی، چہرہ جھریوں زدہ لگنے لگا۔

اسے عارضی ہیسٹریک اٹیک ہوا تھا۔وحید صبح اُسے بچوں کی قبروں پر لے گیا،وہاں جا کر اُسکی طبیعت قدرے سنبھلی۔اُس نے یقین کر لیا کہ ہاں ! اسکے بچے مر گئے ہیں۔

''واپس چلتے ہیں۔''وحید نے کہا تو وہ جانے کے لیے مڑا اور اُسکے قدم تھم گئے۔بشریٰ پیچھے کھڑی تھی۔کچھ انجان، کچھ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔اِس سے پہلے کہ نوید کچھ کہتا وہ واپس پلٹی اور دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

''بشریٰ !''نوید پیچھے سے چیخا پر وہ نہیں رکی۔

''اسے جانے دو۔ابھی گھر چلتے ہیں۔''وحید نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔وحید اسے گھر لایا اور بتایا کہ اُس نے سی سی ٹی وی فٹیج نکلوائی تھی۔آگ لگائی گئی تھی،پر کس نے لگائی یہ معلوم نہیں، کیوں کہ فٹیج میں ایک عورت چادر لپیٹ کر آتی نظر آ رہی ہے اور جیسے ہی وہ آفس کے دروازے پر پہنچتی ہے، کیمرہ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔بلڈنگ کے مختلف کیمروں میں بھی وہ عورت سوائے سفید چادر کے اور کسی طرح نظر نہ آئی اور نہ ہی اسکا چہرہ واضح ہوا۔

''میرے بچے تو مر گئے۔اب کیا فائدہ ان سب کا؟''اس نے کہا۔

''کیا تم اپنے بچوں کو انصاف نہیں دلاؤ گے ؟ کیسے منہ دکھاؤ گے اپنے بچوں کو؟''اس سوال پر نوید چپ کا چپ رہ گیا۔اُسکے بعد اس نے تمام چیزوں پر غور کرنا شروع کیا۔فرح خالد یکدم سے منظر سے غائب ہو گئی تھی،اُسکے خلاف موجود تمام ثبوت جل کر راکھ ہو گئے تھے،اور کمرہ جلانے والی بھی ایک عورت ہی تھی۔

''تو کیا فرح نے ؟''اُسکے دل میں غصّے کا اُبال اٹھا۔ایک ماہ بعد اُس نے واپس سروس جوائن کر لی۔اور اب جب وہ آیا تو اسکا چہرے پہلے سے کئی گنا سخت، بال ہلکے سفید و سرمئی اور آنکھیں سرد مہر ہو چکی تھیں۔وحید ہر طرح سے چاہتا تھا کہ وہ فرح پر کیس کرے۔مگر نوید صرف شک کی بنا پر کیسے کیس کرتا؟اوپر

سے جو ثبوت اُس نے اتنی مشکلوں سے فرح کے خلاف اکھٹے کیے تھے، اب وہ سب بھی باقی نہ رہے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے اُنکے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ وہ ہمت ہار لیتا اگر۔۔۔۔۔

--------+---------+----------

اس واقعے کو دو ماہ گزر گئے تھے۔ وہ روز بشریٰ کے گھر فون کرتا۔ وہ بات نہ کرتی، کبھی سو رہی ہوتی تو کبھی فون کانوں سے لگا کر بھی خاموش رہتی۔ بلآخر تھک کر نوید نے اُسے واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ اُس روز وہ اپنے سسرال آیا۔ اُسے دیکھ کر چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سیدھا اندر آیا اور جو منظر اُسکی آنکھوں نے دیکھا وہ نوید عالم تاحیات نہیں بھلا سکتا تھا۔

بشریٰ لاؤنج کے ایک کونے میں، فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسکے سامنے کھانے کے دو پیالے تھے، جن سے کھانا باہر چھلک کر گرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے سامنے دو چھوٹے چھوٹے تکیوں کو رکھے وہ اُن سے باتیں کر رہی تھی۔

''بس! تھوڑا سا اور کھالو۔ تم کھالو پھر ہم سوئیں گے ٹھیک ہے؟ اور معید! تم بہت تنگ کرنے لگے ہو آج کل۔ ابھی تمہارا کارٹون دیکھنا بند کرتی ہوں۔''

اس روز نوید کو معلوم ہوا کہ پہاڑ سر پر ٹوٹنا کسے کہتے ہیں؟

''ارے! دیکھو پاپا آ گئے۔'' یکدم ہی اسکی نظریں نوید پر پڑیں تو وہ خوشی سے چہک اٹھی۔ نوید زمین پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

''تمہیں کیا ہوا؟ نوید؟'' وہ جیسے کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ نوید نے اسکے سارے گھر والوں کو اکھٹا کر لیا، چیخ چیخ کر پوچھا کہ اسے بشریٰ کی بیماری سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟

''ہم کیوں بتاتے تمہیں؟ اِسکی بیماری کی وجہ سے ہی تو تم اُسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔'' بشریٰ کا بھائی بولا۔

''میں؟ میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا؟'' وہ ساکت ہوا۔

''ہاں! جب سے یہ یہاں آئی ہے، ایسی ہی ہے۔ بنا بتائے قبرستان چلی جاتی ہے۔ چوکیدار نے بتایا تھا کہ تم اسے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔'' وہ لوگ شدید غلط فہمی کا شکار تھے۔ لیکن اُسے حیرت اس بات پر ہوئی کہ جب وہ بشریٰ کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا وہ تب سے ہی ایسی تھی؟ تو اُسے معلوم کیوں نہ ہو سکا؟ اور جس روز اسے وہ قبرستان میں دکھی تھی، بقول اُسکے گھر والوں کے اُس روز بھی وہ اپنی مرضی سے نکل گئی تھی۔ اور ایسا وہ روز ہی کرتی تھی۔

بڑی مشکلوں سے اُسکے گھر والوں کو اپنا یقین دلا کر وہ اُسے اپنے ساتھ لایا، وہ اپنے خیالی بچوں کو رو رو کر ساتھ لے آئی۔ وحید کو بھی نوید نے گھر بلا لیا تھا۔ اُسکی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا لہٰذا وہ جلدی پہنچ گیا۔

بشریٰ گھر آئی تو نہ جانے اُسے کیا ہوا؟ وہ پورے گھر میں یہاں وہاں دوڑتی اپنے بچوں کو آوازیں دینے لگی، کبھی اُنکے کمرے میں، کبھی اُنکے جھولے میں، ہر جگہ بس انہیں پکارتی۔ نوید اُسکی حالت دیکھ کر وہیں زمین بوس ہوا اور وہیں پر ہاتھوں کی مٹھی بنائے، فرش پر مارتے ہوئے رونے لگا۔ اُسکی دنیا اُجڑ گئی تھی۔

''نوید سنبھالو خود کو۔ بشریٰ کا علاج بھی تو کروانا ہے تمہیں۔ پلیز!'' وحید نے اُسے کندھوں سے تھام کر گلے لگاتے ہوئے کہا مگر اُسکا غم بہت بڑا تھا۔ سو وہ چیخ چیخ کر روتا ہی رہا۔ جب بشریٰ کو اپنے بچے کہیں نہ ملے تو وہ واپس وہیں آئی جہاں کچھ دیر قبل اپنے دونوں تکیے وہاں چھوڑ کر گئی تھی۔

''ارے! تم دونوں یہاں ہو؟'' وہ ہنسی۔ اور دونوں تکیوں کو اُٹھا کر سینے میں بھینچ لیا۔ نوید روتے ہوئے اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اُسکی ہچکیاں بندھ گئی۔ تھک کر وحید نے دوبارہ اپنی ماں کو بلوایا۔ وہ بیچاری تو اب بس، اُن دونوں کے ساتھ ساتھ روتی جاتی تھیں۔

''امی! آپ میرے لیے دعا نہیں کرتی نا؟'' روتے ہوئے نوید نے ان سے پوچھا تھا۔ بشریٰ اپنے خیالی بچوں کو لیے کمرے میں جا چکی تھی۔

''نہیں میرے بچے! ایسے نہ کہو۔'' اُنہوں نے اسکا چہرہ تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں نا؟ آپ نے بددعا دی ہے نا مجھے؟'' وہ روئے جا رہا تھا۔

''کون سی ماں ایسا کرتی ہے نوید؟ میں کیوں تمہیں بددعا دوں گی۔ ہاں! میں ناراض تھی بیٹا! پر تم بھی اپنی جگہ صحیح تھے۔ اور ناراضگی کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ماں اپنی اولاد کی بربادی کی دعا کرے؟'' وہ اُسے گلے سے لگاتی ہوئی بولی تھیں۔ نوید نے کبھی خود سے اُنہیں گلے نہیں لگایا، اُن سے توجہ کی خواہش آج کیسے موڑ پر آ کر پوری ہوئی تھی؟

اگلے روز نوید نے ایک نفسیاتی معالج سے رابطہ کیا۔ اُس نے فوری طور پر دونوں تکیوں کو بشریٰ کی نظر سے دور کرنے کو کہا۔ پر ایسا کرنے پر جو ہوا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ بشریٰ نے اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے، اُسے بچے نہ ملے، تو اُس نے خود کو تھپڑ مارنا، خود کو گالیاں دینا تک شروع کر دیں۔ اُسکی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر نوید نے تکیے واپس اُسکے حوالے کر دیئے۔ پھر ڈاکٹر کو اسکی تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ اگلے دن ڈاکٹر گھر آ گیا۔ بشریٰ کی ساری کیفیت ملاحظہ کی۔

Delusional Disorder

''اِس کیفیت میں مریض اپنے کسی قریبی کی موت کو قبول نہیں کر پاتا اور اسکا ذہن اُس غم سے بچنے کے لیے ایک حفاظتی حصار بنا لیتا ہے اور اُسے وہ سب دکھاتا ہے، جو اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اسے ہم عام طور پر delusion یعنی وہم یا hallucination کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر رکا۔

''میں نے ان کی ساری کیفیت ملاحظہ کی اور اِن سے بات بھی کی۔ انہیں اپنے بچوں کی موت کے علاوہ سب یاد ہے۔ انکی شادی کب ہوئی؟ انہوں نے پڑھائی کہاں سے کی؟ آپکی پوسٹنگ کہاں کہاں ہوئی ہے اب تک؟ حتیٰ کہ انکو کھانوں کی ترکیبیں تک یاد ہیں۔ مگر نہیں یاد تو یہ کہ انکے بچے مر چکے ہیں۔ البتہ ایک مسئلہ ہے۔'' وہ پھر رکا۔

''کیا؟'' نوید بے چین ہوا۔

''انکو ساتھ میں یہ بھی لگتا ہے کہ قریب قبرستان میں انکے دو اور بچے بھی ہیں جو دفن ہیں۔ جب میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ مر چکے ہیں؟ تو وہ کوئی جواب نہیں دیتیں۔ یہ ایک خطرناک صورتحال ہے۔ انکا ذہن کہیں نہ کہیں انکو یہ یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اِنکے بچے مر چکے ہیں اور انکا غم انہیں انکار کی کیفیت میں رکھے ہوئے ہے اور اِس طرح انہیں لگنے لگا ہے، جیسے انکے چار بچے ہیں۔''

''تو اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' وحید نے پوچھا۔

''ایسی کیفیت میں مریض روزمرہ کے کام کاج نارمل طریقے سے کرتا ہے۔ فلحال تو آپ نے انکی ہر بات میں، انکی ہاں میں ہاں ملانی ہے۔ جیسے یہ کہیں کہ بچے سو رہے ہیں، تو آپ نے کہنا ہے ہاں! سو رہے ہیں۔ انکی ایسی باتوں میں انکا ساتھ دینا ہے، پر انکو یہ نہیں کہنا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ورنہ ذہنی دباؤ سے انکی دماغ کی رگیں ڈیمیج ہو سکتی ہیں۔ اس کیفیت میں مریض زیادہ دیر نہیں رہتا، انہیں آہستہ آہستہ سب یاد آجائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں اچانک ہی ایک جھٹکے میں سب یاد آجائے۔ لیکن اُس دن تک کے لیے آپکو تحمل سے انتظار کرنا ہوگا، اور مجھے انکی کیفیت بتاتے رہنا ہوگی۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ " Brief Psychotic Disorder ہے جو زیادہ لمبے عرصے نہیں رہتا۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' نوید نے پوچھا۔

''یقیناً!'' ڈاکٹر کے الفاظ نے اسے اُمید دلائی تھی۔

اسکے بعد نوید کی زندگی ویسی ہی ہو گئی جیسے ڈاکٹر نے اسے گزارنے کہی تھی۔ بشریٰ جب روزمرّہ کے کام کرتی تو کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسکا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ گھر کے ملازمین یہ بات ضرور جانتے تھے، پر انہیں سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ایک ملازمہ تھی، جسے بشریٰ نے ضد کر کے بچوں کے لیے رکھا تھا۔ پر درحقیقت وہ ملازمہ نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر کی ہی طرف سے بھیجی گئی نرس تھی، جو اُسکی ہر کیفیت پر نظر رکھے ہوئی تھی۔ یہ سب نوید کی اجازت سے ہو رہا تھا۔ لیکن معاملہ Brief Psychotic Disorder کا نہیں تھا۔ کیونکہ بشریٰ کی کیفیت چند ماہ نہیں بلکہ تین سالوں پر پہنچ گئی تھی تو ڈاکٹر کو اس کیفیت نے حقیقتاً پریشان کر دیا، کیونکہ اسکی نزدیک یہ بیماری جلد ٹھیک ہو جانی چاہیے تھی۔

تین سالوں میں وحید کی پوسٹنگ بھی کراچی سے دوسرے شہروں میں ہونے لگی۔ جزااور اسکی والدہ جس گھر میں تھیں،اُسکے مالک نے دوماہ پہلے گھر خالی کرنے کی درخواست دی، کیونکہ یہ گھر وہ اپنے بیٹے کو دے رہا تھا۔وحید یہاں تھا نہیں، پر اس نے آناًفاناًاپنے جاننے والے کا گھر انہیں کرائے پر دلوادیا جو پناہ گاہ کے برابر میں تھا۔

شروعات میں بشریٰ کی حالت کے پیش نظر نوید کی ماں اُنکے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔

''میں ہر گز نہیں جاؤں گی اُنکے گھر۔آپ کو جانا ہے آپ جائیں۔'' جزانے اِس فیصلے کی مخالفت کی۔

''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے ؟دیکھتی نہیں بھائی کتنا پریشان ہے ؟''وہ غصّہ ہوئیں۔

''بیٹا بیٹا بیٹا۔۔۔بس کر دیں امی! بیٹے کے علاوہ آپ کو کچھ نظر نہیں آتا؟ یاد نہیں کیسے ابّو کو اکیلا چھوڑ کر گئے تھے ؟''

''وہ اُسکا اور اُسکے باپ کا مسئلہ ہے۔تم اپنی حد میں رہو۔''اُسکی امی نے کہا۔

''نہیں ! یہ میرا مسئلہ ہے۔میرا باپ بڑھاپے میں اپنے بیٹوں سے دور ہوا،اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے۔اب دیکھ لیا مکافات عمل ؟اللہ نے کیسے اُنکے بیٹے بھی۔۔۔۔''اپنی ماں سے پڑنے والے زوردار تھپڑ نے اسکی چلتی زبان رکوائی تھی۔

''شرم نہیں آئی یہ بکواس کرتے ہوئے ؟تم کون ہوتی ہو مکافات عمل کا فتویٰ دینے والی ؟تم نے خود کو خدا سمجھ لیا ہے ؟''پہلی بار وہ اتنے پر جلال انداز میں بولی تھیں کہ جزا بھی سہم گئی۔پر دیر ہو چکی تھی،لاؤنج کے دروازے پر ہی نوید کھڑا تھا۔

''ب۔۔۔بھائی !''سب سے پہلے جزا کی نظریں ہی اس پر پڑی تھیں۔اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بہت غلط کہہ چکی ہے۔

''آپ پریشان نہ ہوں امی! بشریٰ کے پاس میں ہوں۔اور اگر آپکو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے گا۔اور ہاں ! آپکو وہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ سنجیدگی سے کہتے جانے کے لیے پلٹ گیا۔جزا اسے روک بھی نہ سکی۔

اس روز نوید عالم کے دل سے اُسکی بہن ہمیشہ کے لیے اتر گئی تھی۔

---------+---------+--------

''سر ! کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔''وکیل کے گھر سے وہ دونوں باہر آچکے تھے،تب ہی شیراز نے اُسکی توجہ ایک سیاہ شیشے والی گاڑی کی جانب مبذول کروائی، جو پارک گاڑیوں کے درمیان اندھیرے میں کھڑی تھی۔

''پیچھا نہیں کر رہا، نظر رکھے ہوئے ہے۔''جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے نوید نے کہا۔

''ہم پر؟''

''نہیں! صرف مجھ پر۔۔۔۔''نوید نے سنجیدگی سے کہتے رک کر اسے دیکھا۔

''پر کوئی آپ پر نظر کیوں رکھ رہا ہے؟ یہ خطرے والی بات ہے سر!''شیراز پریشان ہوا۔

''میں اچھے سے جانتا ہوں کہ یہ کون ہے؟ پر ابھی اِس سے حساب کرنے کا وقت نہیں آیا۔''نوید نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''پر یہ ہے کون؟''شیراز نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جو بھی ہے، مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔اِس لیے تم فکر نہ کرو۔''نوید نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔ کن آنکھیوں سے وہ اِس سیاہ شیشے والی گاڑی کو سٹارٹ ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''سر! یہ وکیل ہمارے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں کھڑا کرے گا؟''راستے میں شیراز کو اچانک ہی خیال آیا۔

''اُسکی اتنی اوقات نہیں ہے۔پر اگر ایسا کیا بھی تو میں سنبھال لوں گا۔ابھی فرّخ صاحب کچھ پوچھیں تو تم کہنا کہ نوید سے بات کرلیں۔''اس نے کہا تو شیراز نے اثبات میں سر ہلادیا

---------+---------+--------

''نوید جب آفس آیا تو وہ بہت بدل گیا تھا۔ ظاہر ہے! اولاد کا غم اچھے اچھوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ہم نے پھر سے فرح کے خلاف ثبوت اکھٹے کرنے کی کوشش کی۔البتہ نوید کا کہنا تھا کہ ایک بار اُس نے اپنی اہلیہ کو فرح کی تصویر دکھا کر پوچھا تھا کہ کیا وہ اسے جانتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں! تب سے نوید کو یہ یقین ہے کہ فرح ہی وہ عورت ہے، جو آفس جلانے آئی تھی۔ پر ہم عدالت میں کچھ ثابت نہیں کر سکتے، اُس پر سے اُسے برطانوی ایمبیسی کا تحفظ حاصل ہے۔ خیر! نوید نے تو یہ صدمہ برداشت کر لیا۔ پر اُسکی اہلیہ آج تک اپنے بچوں کی موت کو قبول نہیں کر سکی۔ وہ ابھی بھی اپنے بچوں کو زندہ تسلیم کرتی ہے۔ نوید اُسکا علاج کروا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ جلد صحت یاب ہو جائے گی۔''فرّخ صاحب خاموش ہوئے۔ کمرے میں اِس وقت ایسا سنّاٹا تھا کہ وہ لوگ اپنے دل کی دھڑکن تک کو واضح سن سکتے تھے۔ کلیجہ سل پر رکھ کر، اس پر خنجر چلانا کیسا ہوتا ہے یہ انہیں آج پتہ چلا تھا۔ ایسا دکھ؟ ایسا درد؟ ایسی موت جیسی آزمائش؟ بھلا کہاں دیکھی؟ اور کہاں سنی اور سوچی تھی؟

وہ ہنستا مسکراتا نوید اِس لیے ایسا خاموش ہو گیا تھا؟ وہ جسکے چہرے پر ہمہ وقت نرمی چھائی رہتی تھی، وہ اس لیے چٹان جیسا سخت ہو گیا تھا؟ اب وہ کس منہ سے اُسکے سامنے کھڑے ہوں گے؟ کس طرح تعزیت کریں گے اُس شخص سے؟ جو کبھی انکا دوست تھا۔ فلحال تو وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے سے بھی قاصر تھے۔

''نوید سے آج کی گفتگو کا ذکر مت کرنا۔''انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔وہ کیا جواب دیتے؟بھلا نوید سے ایسی دوستی باقی ہی کب رہی تھی کہ وہ اُس سے کوئی ذکر بھی کرتے؟بہت دیر بعد وہ سب سست روی سے جانے کے لیے اٹھنے لگے، کہ جانا تو تھا ہی۔اسی لمحے دروازہ کھلا اور نوید سپاٹ چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا،اُسکے پیچھے شیراز بھی تھا۔کمرے میں موجود ہر شخص کی نظریں نوید کے چہرے پر آ ٹھہری تھیں۔

''تم کیا کر کے آرہے ہو؟''فرّخ صاحب نے نوید کو دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''جو کرنا چاہیے تھا۔۔۔''اپنے دستانے اُتارتے ہوئے،اس اُس لٹھ مار لہجے میں کہا تو فرّخ صاحب نے بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھا۔اُسے یکدم ہی احساس ہوا کہ سوال کرنے والے فرّخ صاحب ہیں،اِس سے پہلے کہ وہ اپنے لہجے پر معذرت کرتا اُنہوں نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا اور بولے۔

''کیونکہ آج تمہارا دن خراب تھا،لہٰذا اِس بدتمیزی کا حساب میں تم سے بعد میں لوں گا۔ ''اُن کی بات مکمل ہوئی تو نوید سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔

''اور تم۔۔۔''اُنہوں نے شیراز کو مخاطب کیا جو وہاں سے کھسکنے کے چکروں میں تھا۔

''سر!میرا ابھی آج کا دن بہت خراب تھا۔قسم سے۔۔۔''اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے،وہ چہرے پر بیچارگی طاری کیے بولا۔

''میرے روم میں آؤ۔فوراً!''وہ حکم صادر کر کے وہاں سے چلے گئے۔

''یار!''اس نے بیزار شکل بنائی اور اُنکے پیچھے چل دیا۔باقی لوگ ایک دوسرے سے نظریں ملائے بنا ہی باہر نکل گئے۔ جو انہوں نے جانا تھا،اُسکا اثر زائل ہونے میں وقت لگنا تھا۔

---------+---------+--------

علی گھر آیا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔نشمیہ جاگ کر کارٹون دیکھ رہی تھی۔سفیر صاحب پاس ہی بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے،یا شاید اپنے آفس کا کوئی کام کر رہے تھے۔اُس نے صرف اور صرف نشمیہ کو دیکھا۔

''اوہ!بابا آ گئے۔۔۔''وہ علی کو دیکھتی خوشی سے چہکی۔

''میں نے برش کر لیا ہے۔بس!ابھی تھوڑا سا کارٹون رہ گیا ہے،پھر میں سو جاؤں گی۔''اُس نے چٹکی سے تھوڑے سے کا اشارہ بناتے ہوئے کہا تو علی مسکرایا۔آج اسے نشمیہ کے دیر تک جاگنے پر نہ غصّہ آیا تھا،اور نہ ہی اُس نے اُسے ڈانٹا تھا۔

''ٹھیک ہے!تم دیکھ لو۔''اُس نے نشمیہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہوتی واپس صوفے پر جا بیٹھی۔سفیر صاحب نے کچھ حیران نظروں سے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔وہ انہیں سلام کرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔

آج کا دن جتنا بھی بھاری تھا، رات اُس سے کہیں زیادہ بھاری ہونے والی تھی۔ طبیعت بوجھل تھی، دل بھاری بھاری سا تھا۔ بھلا کوئی شخص اپنے بچوں کے جنازے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ اور وہ اُسکے بعد زندہ ہی کیسے رہ سکتا ہے؟

علی نہا کر آیا اور بنا کھانا کھائے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ دل اُداس تھا، جانے کب آنکھ لگی؟ جب آنکھ کھلی تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ نشمیہ برابر میں سوئی ہوئی تھی، یقیناً سفیر صاحب اسے یہاں لٹا گئے ہوں گے۔ کافی دیر آنکھیں کھولے وہ نشمیہ کو دیکھتا رہا۔ یکدم ہی اُسے لگا جیسے نشمیہ کا چہرہ احمد میں بدل رہا ہو، اور اُسکی جگہ احمد نے لے لی ہو۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ تیز ہوتے تنفس کو بحال کرتے ہوئے، دوبارہ اُسکی جانب دیکھا، وہ اب بھی سوئی ہوئی تھی۔ اُس لمحے نہ جانے کیوں؟ پر اُسے اپنا بیٹا شدت سے یاد آیا۔ اُسکی روتی، التجا کرتی، دکھ بھری آنکھیں یاد آئیں۔ وہ چہرے سے، مکمل علی جیسا تھا۔ پر مزاج میں بے حد تحمل اور خاموشی گھلی تھی۔

اُسکی یاد آئی تو علی نے اپنا موبائل اٹھالیا۔ گیلری کھول کر اُسکی تصویریں ڈھونڈنے لگا۔ پر اُسکی کوئی تصویر نہ مل سکی، بس ایک تصویر اُسکے اینول فنکشن کی تھی، جس میں وہ اسٹیج پر کھڑا، سپورٹس میں اول آنے پر انعام لے رہا تھا۔ عام بچوں کی طرح اُسکے چہرے پر کوئی خوشی یا کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں تھی۔ اُس نے تصویر زوم کرنی چاہی تو احمد کا چہرہ دھندلا گیا۔ اُس نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔ پھر اٹھا اور بلا ارادہ ہی اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ اندھیرے کمرے کے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر لائٹ جلائی، تو ہر شے روشن ہو گئی۔ احمد کی فٹ بال، اُسکا اسکریبل کا ڈبہ، اُسکا پینسل باکس۔ علی ایک ایک شے کو ہاتھوں سے چھو چھو کر دیکھنے لگا۔

وہ اُسکا بیٹا تھا، اُسکی اولاد، اُسکے دل کا ٹکڑا۔ اُس سے دور رہنا آسان کہاں تھا اُسکے لیے؟ علی پہلے کبھی اُسکے کمرے میں نہیں آیا، آتا تھا بھی تو بس یہ دیکھنے کہ اُس نے کمرہ صاف رکھا ہوا بھی ہے یا نہیں؟ نشمیہ کی نسبت وہ بہت سلیقہ مند تھا۔ ہر شے کو بہترین طریقے سے سنوار کر رکھتا تھا۔ علی نے اُسکے پلنگ کے اوپر بنے ریک کو دیکھا جہاں لاتعداد کتابیں رکھی تھیں۔ اُن کتابوں کے درمیان میں اُسے ایک سبز جلد والی نوٹ بک نظر آئی۔ وہ اپنے اسکول کا سامان لے گیا تھا، البتہ صرف فارغ اوقات میں پڑھنے والی کتابیں اُس نے یہیں چھوڑ دی تھیں، اب نوٹ بک یہاں دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ علی نے نوٹ بک باہر نکال لی اور اُسے کھولا۔ وہ خالی تھی، فقط پہلے صفحے پر اُس نے اپنا نام لکھا ہوا تھا۔ علی مسکرا دیا، پھر ایسے ہی بلاوجہ وہ خالی صفحوں کو آگے پیچھے کرنے لگا، تب ہی درمیان میں گزرنے والے صفحے پر اُسے کسی لکھائی کا گمان ہوا۔ اُس نے صفحہ دوبارہ کھولا تو وہاں احمد کی لکھائی میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔

''آئی لو یو بابا۔ بٹ آئی نو، یو ول نیور لائک می۔ (میں آپ سے محبت کرتا ہوں بابا! پر مجھے پتہ ہے کہ آپ مجھے کبھی پسند نہیں کریں گے۔)''

اُس ایک جملے نے علی کو اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ نوٹ بک اُسکے ہاتھوں میں کانپ گئی۔ ہر وہ لمحہ نظروں کے سامنے گھوم گیا، جب وہ احمد کو ذرا ذرا سی باتوں پر ٹھیک ٹھاک سنا دیتا تھا۔ اور وہ خاموشی سے سب سنتا رہتا تھا۔

علی نے نوٹ بک سینے سے لگائی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اولاد کے جانے کے بعد ہی احساس ہوتا ہے کہ وہ واقعی اللہ کی نعمت تھی، جسے ہم نے ٹھکرا دیا۔

---------+--------+--------

وہ رات کسی کی بھی سکون سے نہیں گزرنی تھی، حسین گھر آیا تو نجانے اُسے کیا ہوا کہ وہ اپنے بچوں کو نیند سے اٹھا کر انہیں پیار کرنے لگا۔ حور عین اُسکی کسی حرکت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پر خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔

رضاالٰہی کا دل تو ویسے بھی بچوں کے لیے بنا تھا۔ دو بچوں کے زندہ جلائے جانے پر وہ اُس رات وہ پناہ گاہ کے باہر گلی میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ پھر سوچتا کہ جب اُس سے یہ غم برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے، جبکہ اُن بچوں کو اُس نے دیکھا بھی نہیں۔ تو انکے ماں باپ نے کیسے برداشت کیا ہو گا؟ کیا گزرتی ہو گی نوید کے دل پر جب وہ اپنے بچوں کو یاد کرتا ہو گا؟

عمر نے اُس رات عمارہ کو پھر فون کیا۔

''عمائمہ سے بات کرنی ہے۔'' اُسکے فون اٹھاتے ہی وہ بولا۔

''آخری بار جب اُس نے تم سے بات کی تھی، اُسکے بعد اُسے نارمل ہونے میں کئی ہفتے لگے۔ وہ بار بار تمہارا پوچھتی تھی، روتی تھی، تمہارے پاس جانے کی ضد کرتی تھی۔ میری بیٹی کو بخش۔۔۔۔۔''

''کسے پتہ آج میں آخری بار اُس سے بات کر رہا ہوں؟ زندگی بہت چھوٹی ہے عمارہ۔ کب کس کی موت لکھی ہو؟ اسے تم سے بہتر کون جان سکتا ہے؟'' اُس کے ٹوٹے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ عمارہ ساکت رہ گئی۔ پھر فون ہولڈ پر چھوڑ کر گئی اور واپس آئی تو ویڈیو کال آن کر دی۔ عمائمہ سامنے تھی، پہلے سے تھوڑی بڑی بڑی لگ رہی تھی۔ اُس رات عمر نے دل کھول کر اُس سے بات کی، دل کرتا کہ اُسے گود میں اٹھا لے پر ہائے! بے بسی۔

عمائمہ سے بات کرتے اُسے فجر ہو گئی، رات گزر گئی پر پتہ نہ چلا۔ فون رکھنے کے بعد بھی وہ سو نہیں سکا۔

وہ رات کسی کے لیے آسان نہیں تھی۔ پر ایس ایس پی نوید عالم؟

نوید کا کیا؟

اسکے لیے ایک نیا امتحان گھر میں کھڑا تھا۔

---------+--------+--------

دس سال۔۔۔۔

پورے دس سال بعد آج علی سفیر نے مقدّم شفیق کا نمبر ملایا تھا۔وہ بھی فجر سے کچھ دیر قبل۔

اُس نے آج سے ہر اُس شخص سے تلافی کرنے کا عزم کیا تھا، جس کا اُس نے دل دکھایا ہے۔اور اِس فہرست میں اُس نے اوپر مقدّم کو رکھا تھا۔کیونکہ اُس کا حساب ذرا کم تھا۔

دوسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''السلام علیکم!''علی نے سلام میں پہل کی۔

''وعلیکم السلام!آں۔۔۔۔علی۔۔۔۔سب خیریت؟''اُس نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔یقیناً اُسکا فون آنے پر وہ بھی حیران ہوا ہوگا۔

''ہاں!سب خیریت ہے۔تم بتاؤ کیسے ہو؟''اس نے لہجے کو دوستانہ رکھنے کی کوشش کی پر کافی مشکل پیش آئی۔یہ آسان نہیں تھا۔بالکل آسان نہیں تھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں،پر۔۔۔۔تم واقعی ٹھیک ہو نا؟''اس نے ذرا مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!میں نے بس تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔''علی نے آہستگی سے کہا۔

''میری خیریت؟''دوسری طرف وہ یقیناً اچھلا تھا۔''علی!تمہارا رضا سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا ہے ابھی؟''اِس سوال پر علی بیساختہ ہنسا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا؟''وہ بیچارہ پریشان ہو گیا۔

''تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔اُس روز تم نے نشمیہ کو ڈھونڈنے میں اتنی مدد کی،پھر ہسپتال بھی آئے۔میں ٹھیک سے شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔''اُس نے مشکور لہجے میں کہا تو دوسری طرف مقدّم نے گہری سانس لی۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''کیسی باتیں کر رہا ہوں؟''علی تھوڑا حیران ہوا۔

''کیسی یعنی۔۔۔عجیب سی۔۔۔''اُس نے وضاحت دی۔

''اِس میں کیا عجیب تھا؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کچھ بہکی بہکی سی۔۔۔''مزید وضاحت دی تو وہ ہنسا۔

''شکریہ کہنا عجیب کب سے ہو گیا؟''

''دس سال پہلے میں یہ سب کرتا تو شکریہ ادا کرتے؟''مقدّم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بھول جاؤ دس سالوں کو۔ گزر گئے وہ دس سال۔''علی نے کہا۔

''یہی بھولنا تو آسان نہیں ہے۔''اُس نے آہستگی سے کہا تو علی کا دل دکھا۔

''اور بتاؤ! کیا کر رہے تھے؟''یکدم ہی مقدّم نے ہشاش بشاش لہجے میں پوچھا۔

''بس! سحری کر کے فارغ بیٹھا تھا۔''اس نے بتایا۔

''سیم ہیر (یہاں بھی ایسا ہی ہے)''اس نے کہا۔

''تمہارا انٹرویو پڑھا تھا میں نے پچھلے ماہ۔''علی بات برائے بات کر رہا تھا۔

''کون سا؟ وہ بزنس میگزین والا؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! وہی۔۔۔بہت اچھا تھا۔ میں نے کبھی کوئی انٹرویو اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھا۔''علی نے تعریف کی۔

''آہ! یہ تو تم کہہ رہے ہو۔ حسین نے بھی کچھ روز پہلے یہ انٹرویو پڑھ لیا تھا۔ اور اُسکے بعد وہ اتنی دیر ہنستا رہا کہ مجھے بھی شک ہونے لگا کہ کہیں میں نے میزبان کو کوئی لطیفہ تو نہیں سنا دیا تھا؟''اس بات پر وہ ہلکے سے ہنسا۔ حسین سے کچھ بعید نہیں تھا۔

''اس نے لطیفہ ڈھونڈ لیا ہو گا۔'' یہ جواب علی کا تھا۔ دوسری طرف مقدّم بھی ہنسا تھا۔

''مجھے تم سے معافی بھی مانگنی تھی۔''اُس نے یکدم ہی کہا تو دوسری طرف خاموشی چھائی۔

''میں غصّے میں اکثر بہت لوگوں کا دل دکھا دیتا ہوں۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دینا۔''علی نے آہستگی سے کہا۔

''سر پر پانی وانی ڈالو، ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ پاگل تو نہیں ہو گئے کہیں؟''مقدم کو اُسکی ذہنی حالت پر شک گزرا۔

''کبھی شکریہ کہہ رہے ہو، کبھی معافی مانگ رہے ہو۔''علی ہنسا پر بولا کچھ نہیں۔ اُسکے ہنسنے پر وہ مزید مشکوک ہوا۔

''تمہیں رات جاگنے کی عادت تو نہیں ہے؟''مقدّم نے پوچھا۔

''عادت تو نہیں ہے، پر اکثر نیند نہیں آتی تو جاگتا ہوں۔ کیوں؟''اس نے ذرا نا سمجھی سے جواب دیا۔

''رات مت جاگا کرو، میں کل ہی ایک آرٹیکل پڑھ رہا تھا کہ رات جاگنے والوں میں ایک نئے مرض کی تشخیص ہوئی ہے۔ جس میں مریض آدھی آدھی رات کو بہکی بہکی باتیں شروع کر دیتا ہے، اور عجیب عجیب سے انداز میں ہنستا ہے اور۔۔۔۔'' وہ بولے جا رہا تھا اور علی ہنسے جا رہا تھا۔

بلآخر مقدّم کی طرف سے وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

---------+---------+--------

جب وہ گھر آیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسے اُمید تھی کہ بشریٰ سو چکی ہو گی۔ دروازہ بند کر کے جب وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو کوئی شے اُسکے پیروں سے ٹکرائی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ اور ساری دنیا اُس لمحے میں ساکت ہو گئی۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور جھک کر اُس شے کو اٹھایا۔ وہ تکیہ جسے بشریٰ تین سالوں سے اپنے سینے سے لگائے رکھتی تھی، وہ اِس بے دردی سے نیچے پھینکا ہوا تھا کہ اُسے یقین نہ آیا۔

''ہو سکتا ہے غلطی سے ایسا ہوا ہو۔'' اس نے سوچا اور اٹھ کر نیم اندھیرے لاؤنج کی لائٹ جلا دی۔ اور اگلے ہی لمحے اُس پر ادراک ہوا کہ یہ غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ دوسرا تکیہ بے دردی سے پھاڑ کر، اُسکی روئی پورے لاؤنج میں بکھیر دی گئی تھی۔ اور سامنے ہی بڑے صوفے پر وہ بیٹھی تھی۔ سرخ آنکھوں اور سنجیدہ چہرے سے اُسے دیکھتی۔ ویران نظریں اس پر مرکوز کیے وہ اُس لمحے نوید کو خوفزدہ کر گئی تھی۔

''بش۔۔۔ بشریٰ!۔۔۔'' اُس نے اٹکتے ہوئے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ وہ خاموشی سے اُسے تکتی رہی۔

''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ بشریٰ؟'' وہ لڑکھڑاتی زبان میں کہتا اُسکے قریب آیا۔ وہ اب بھی چپ رہی۔

''یہ کس نے کیا ہے؟'' اُس نے پھر سے پوچھا۔ تو اِس بار اُس نے انگارہ ہوتی آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میرے کتنے بچے ہیں نوید؟'' اِس سوال پر وہ سن ہوا۔

''بتاؤ! کتنے بچے ہیں میرے؟'' وہ چیختی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی، اور نوید کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو کی مصداق کھڑا رہ گیا۔

''دو۔۔۔ صرف دو بچے ہیں میرے۔۔۔ جنہیں اُس عورت نے جلا دیا۔ مار دیا میرے بچوں کو۔۔۔'' وہ چیختے چیختے رو پڑی۔ نوید اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔

''پاگل بناتے رہے تم مجھے اتنے سالوں؟ بلکہ نہیں! تم کیوں مجھے کیوں پاگل بناؤ گے؟ پاگل تو میں ویسے ہی تھی۔ میں پاگل تھی۔ میں اتنے عرصے ان بے جان چیزوں کو اپنی اولاد کہتی رہی۔ اور تم دیکھتے رہے۔'' وہ اپنے بال نوچنے لگی۔

''بشریٰ!۔۔۔'' نوید نے اسے روکنا چاہا۔

''دور ہٹو!۔۔۔تم ہو۔۔۔تم ہو میرے بچوں کے قاتل۔۔۔۔تم ہو۔۔۔''اُس نے نوید کو دھکّا دیا۔

''ایسے مت کہو!اِس میں میرا قصور نہیں ہے۔''اُسکا دل دکھا۔

''تمہارا ہی قصور ہے۔تم ہمیں وہاں لیکر گئے،اور پھر تم ہی ہمیں وہاں اکیلا چھوڑ کر گئے۔آہ!میرے بچے۔۔۔۔میرے بچے۔۔۔۔''وہ روتے روتے فرش پر بیٹھ گئی۔

''یااللہ!میرا کیا قصور تھا؟میرا کیا قصور تھا؟''وہ صوفے پر سر مار مار کر رونے لگی۔

''ایسے مت کرو بشریٰ!پلیز!''نوید نے اُسے تھامنا چاہا تو اُس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

''دور ہو جاؤ مجھ سے۔۔۔۔میں تمہارا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔جاؤ!جاؤ اور جا کر میرے بچے واپس لاؤ۔۔۔جاؤ۔۔۔''وہ حلق کے بل چیخی تو وہ سر جھکائے بے بسی سے رو دیا۔اسی لمحے بشریٰ اُٹھی اور دوڑتی ہوئی کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔

اور نوید عالم ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔۔۔۔

ہمیشہ کی طرح تنہا۔۔۔۔

لیکن کیا معلوم کہ تنہائی کی یہ ساعت آخری ہو؟

---------+---------+--------

باب چودہ

درمان

وہ رات بھی گزر گئی، اور اگلا دن بھی نکل آیا۔ اور پھر دن بھی خاموشی سے اختتام پذیر ہو گیا۔ دن کے اختتام تک ہر شے بوجھل سی ہی رہی۔ رہ رہ کر کل کا واقعہ یاد آتا۔ کوشش کے باوجود بھی کچھ ذہن سے نکلتا نہ تھا۔ رات اپنے معمول کے تمام کام کرنے بعد علی فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ ذہن کے نہاں خانوں میں فقط نوید موجود تھا۔

جو کچھ تم غصّے میں کہہ دیتے ہو، بعد میں معذرت کرنے سے اُسکا اثر زائل نہیں ہوتا علی!

صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھے اُسے کچھ دن قبل کے، نوید کے کہے گئے الفاظ یاد آئے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ، اُسکے صرف معافی مانگ لینے سے اُسکے لہجے کی سختی، اور الفاظ کا اثر زائل نہیں ہونا، اتنی آسانی سے تو کبھی نہیں!

کل رات اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ باری باری اُن تمام لوگوں سے معافی مانگے گا، جن کا دل اُس نے بہت دکھایا ہے۔ اور آج کی رات نوید کے لیے تھی۔ گو کہ اُس سے معافی مانگنا اتنا آسان نہ تھا، اور علی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بات شروع کہاں سے کرے گا؟ لیکن اُسے یہ کرنا تھا۔ اور آج ہی رات۔۔۔

اُس نے موبائل باہر نکالا اور بہت دیر نوید کا نمبر تکتا رہا، پھر یکدم ہی ٹھہر گیا۔ اُس نے آج سے پہلے کبھی نوید کی ڈی پی پر غور نہیں کیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ کالے پس منظر پر، سفید رنگ سے کوئی قول لکھا نظر آتا تھا۔ اُس نے ڈی پی کھول لی، اور اُسکی سانسیں رک گئیں۔

"Smallestcoffinsare theheaviest"

(چھوٹے تابوت، سب سے زیادہ بھاری ہوتے ہیں)

انجان ہونا کتنا اچھا ہوتا ہے؟ کل تک جب وہ نوید کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا، تب وہ یہ ڈی پی دیکھ لیتا تو شاید اُسے کوئی مقولہ سمجھ کر گزر جاتا، پر اب دل رک سا گیا تھا، اب ان لفظوں میں ایک باپ کا دکھ چھپا دکھ رہا تھا۔ وہ خاموش رہتا تھا، پر اس غم نے اُسے سر تا پاؤں بدل دیا تھا۔ صرف مزاج ہی نہیں، اُسکے ظاہر کو بھی پہلے جیسا نہ چھوڑا تھا۔ کاش! کاش کہ صنوبر والا واقعہ نہ ہوا ہوتا۔ وہ لوگ الگ نہ ہوئے ہوتے، وہ دوست ہوتے۔ تو علی اُسکے غم میں اُسکے برابر شریک ہوتا۔ اور صنوبر والا معاملہ ہوا کس کی وجہ سے تھا؟ اِس سوال کے جواب میں علی ہمیشہ شرمندہ ہو جاتا۔ کبھی خود کو تسلی دیتا کہ اُس نے سب کو نہیں

کہا تھا ساتھ دینے کو، یہ تو اُسکے دوستوں کا اپنا فیصلہ تھا۔ پر دل یاد دلاتا کہ کیس سے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ بھی انکا اپنا تھا، تمہیں کوئی حق نہ تھا کہ اُنکے ساتھ زبردستی کرتے۔

گہری سانس لیکر تمام سوچوں کو جھٹکا اور نوید کو فون ملایا، کچھ دیر بیل جاتی رہی۔ پھر فون اُٹھا لیا گیا۔

''ہیلو!'' اِس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، ایسے میں وہ آفس میں تھا یا گھر جا رہا تھا، یا گھر پر ہی تھا؟ علی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

''السلام علیکم! کیسے ہو؟'' علی نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

''وعلیکم السلام!'' اُس نے فقط سلام کا جواب دیا۔

''کیسے ہو نوید؟'' اُس نے پھر پوچھا۔

''سب خیریت؟ اِس وقت اچانک فون کیا؟'' نوید عالم نے ہمیشہ کی طرح سوال نظر انداز کیا تھا۔ علی تھک کر پیچھے ہوا اور صوفے سے ٹیک لگائی۔

''کیا تم مصروف ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''فارغ بھی نہیں ہوں۔'' اِس بے سر و پا گفتگو کا کوئی حاصل نہ تھا۔

''تم سے کچھ کام تھا۔'' اُس نے ذرا جھجھکتے ہوئے کہا۔ آج کل وہ کچھ زیادہ ہی نوید کو تنگ کرنے لگا تھا۔ اپنے ماضی کے کارنامے کے بعد اِس طرح نوید کو ہر بات کے لیے بلا جھجک بلا لینا، اُسے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا پر آج یہ آخری بار تھا۔ اُسے اب نوید سے ہر صورت معافی مانگنی تھی۔ بے شک اُس نے کہا تھا کہ بھول جاؤ دس سال پرانی باتوں کو۔ لیکن علی تو نہیں بھول سکتا تھا نا؟

''کہاں ملنے آؤں؟'' اُس نے سوال کیا۔ علی نے جگہ بتا دی تو اُس نے آدھے گھنٹے میں پہنچنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔ علی کی بھی مزید اُس سے بات کرنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ نوید نے اپنے گرد جو خول کھینچ رکھا تھا، اُسے توڑنا آسان نہ تھا۔

اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

''تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ دل کے کل ملا کر چار خانے ہوتے ہیں۔ کیا آپ اِس بات کا مطلب سمجھ سکی تھیں ڈاکٹر صاحبہ؟'' مکرم کو لینے کے لیے آئے ہوئے، مقدم نے اُسکی خالہ سے سوال کیا۔ وہ تو آج بھی اُس سے بچ کر نکل جانا چاہتی تھی پر وہ بھی ڈھیٹ بنا، اُسکے راستے میں ہی ٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہاں! اِس بات کا سیدھا سیدھا ایک ہی مطلب ہے کہ تم چار شادیاں کرنا چاہتے ہو۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''پہلے ایک تو کرنے دو۔''

''ایک نہیں دوسری۔۔۔''اس نے تصحیح کی، تو وہ ایک مرتبہ پھر ہنسا۔

''چلو دوسری صحیح! لیکن میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

''تو پھر تم چار خانوں میں چار الگ الگ خواتین کو رکھنا چاہتے ہو گے۔''مکرم کو جوتے پہناتے، اُس نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''ایک ہی خاتون کو چاروں خانے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔''وہ ڈٹا رہا۔ مقدّس نے اِس بار کوئی جواب نہ دیا۔

''خیر! یہ بتاؤ، اِس ہسپتال میں تمہارا کنٹریکٹ کب تک کا ہے؟''اُس نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ میں ہسپتال میں کنٹریکٹ پر ہوں؟''وہ حیران ہوئی۔

''ماموں نے بتایا۔۔'' اِس جواب پر مقدّس نے دانت کچکچائیں۔

''تو کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد کیا کرو گی؟''

''واپس چلی جاؤں گی۔''اب کہ مقدّم خاموش ہوا۔

''کنٹریکٹ ری نیو کروالو۔''اُس نے نرمی سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ مشکوک ہوئی۔

''مکرم تمہیں یاد کرے گا۔ عادت ہو گئی ہے اِسے تمہاری۔''وہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

''آج کل بہت خاموش رہنے لگی ہو تم۔''اُس نے پھر سوال کیا۔

''تو؟''اُس نے بھنویں اُچکائیں۔

''تو یہ کہ خاموش رہ کر کیسا لگ رہا ہے؟ دنیا عجیب عجیب سی لگ رہی ہو گی نا؟''اُس نے مذاق اُڑایا تو مقدس نے فقط گھورا تھا۔

''اچھا! میں کیا سوچ رہا تھا کہ۔۔۔۔''

''تمہارا کوٹہ ختم۔۔۔''اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟''مقدّم ہکا بکا رہ گیا۔

''مطلب کہ اب تم مزید سوال نہیں کر سکتے۔''

''پر یہ میرا اُصول تھا، تمہارا اِس سے کوئی۔۔۔۔''اس نے مزید کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

''خاموش!''اُس نے ہاتھ اُٹھا کر روکا اور مقدّم خاموش ہی رہ گیا۔

''نانی نے افطاری میں بریانی بنوائی تھی۔ کھائے بغیر مت جانا۔''

''جیسے آپکا حکم!''اُس نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا۔ اور اُسی لمحے فون بج اٹھا۔

''میں کھانا لگا رہی ہوں۔''وہ کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی، جبکہ مقدّم نے فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف عمر تھا۔

کچن میں کھڑی مقدّس نجانے کیوں مسکراتے ہوئے، کھانا نکالتے اُسے ہی دیکھ رہی تھی؟ جو فون کان سے لگائے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اچھا خاصا خوبرو، اور چھا جانے والی شخصیت کا حامل تھا۔

ٹرے میں بریانی نکال کر وہ میز تک آئی تو مقدّم کی بات مکمل ہو چکی تھی۔ پر چہرے پر سنجیدگی نمایاں تھی۔

''کیا ہوا مقدّم؟''وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''مقدّس!''اُس نے سنجیدگی سے اُسکا نام لیا۔

''کیا ہوا؟''وہ پریشان ہوئی۔

''مجھے معاف کرنا، لیکن مجھے ابھی اور اِسی وقت جانا ہوگا۔''اُس نے شرمندگی سے کہا۔ مقدّس کی مسکان سمٹی۔

''تم ہمیشہ ایسا کیوں کرتے ہو؟''اُس نے آہستہ سے کہا تو مقدّم کو مزید شرمندگی نے آگھیرا۔

''کسی بہت عزیز کو میری ضرورت ہے۔''اُس نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے! میں مکرم کو دیکھ لوں گی۔ تم جاؤ۔''وہ پھر سے سنجیدہ ہو چکی تھی۔

''مقدّس!''اُس نے پھر سے پُکارا۔''آج کے لیے معاف کر دو۔''اُسے احساس تھا کہ وہ ہر بار مقدّس کو دوسرے درجے پر کر دیتا تھا۔ پر اِس بار وہ ایسا جان کر نہیں کر رہا تھا۔

''جاؤ مقدّم! تمہیں دیر ہو جائے گی۔'' وہ مکرم کو گود میں اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ مقدم نے ایک گہری سانس لیکر اُسے جاتا دیکھا۔ اور پھر باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر مقدّس نے پلٹ کر دیکھا، وہ جا چکا تھا۔

''میں تمہارے دل میں ہمیشہ دوسرا درجہ ہی رکھوں گی۔'' اُسکا دل ایک بار پھر سے ٹوٹا تھا۔

--------+---------+----------

خالی گھر۔۔۔۔

اُداس شامیں۔۔۔۔

تنہا راتیں۔۔۔۔

روتا دل۔۔۔۔

اور میں۔۔۔۔

اُسکی زندگی میں اکثر ایسی راتیں آتی تھیں، جب گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ آج کی رات بھی اُن میں سے ایک تھی۔ گھر میں دل وحشت زدہ ہونے لگا تو وہ باہر نکل آیا۔ بے مقصد سڑکوں پر چلتے وہ بلآخر وہاں چلا آیا، جہاں آنا اُسکے لیے بیک وقت پر سکون پر غمزدہ کر دینے والا تھا۔

خاموش قبرستان، جو لوگوں کو خوف میں مبتلا کر دیتا تھا، وہ اُسکے لیے سکون کا باعث تھا۔ یہاں اُسکا کوئی اپنا تھا، کوئی بہت ہی پیارا، جسکی پیاری سی مسکان دیکھے جیسے صدیاں بیت چکی تھیں۔ قبروں کے درمیان سے راستہ بناتے وہ اپنی مطلوبہ قبر تک پہنچ گیا۔ چاند کی روشنی میں قبر ہلکی واضح تھی۔ وہ تھک کر گرنے کے سے انداز میں قبر کے سرہانے آ بیٹھا۔ پھر نم مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگا، اُسکی نصیحت پر گورکن روزانہ ہی قبر کو پانی دے دیتا تھا۔ آنکھوں میں منظر اور کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ وقت جو ساتھ گزارا تھا، وہ ہوا میں کہیں تحلیل ہونے لگا۔ وقت یاد بن گیا تھا، اور اُس یاد میں موجود وجود مٹّی ہو گیا تھا۔ آنسو آبشار بن کر آنکھوں سے بہنے لگے، اُس نے سرخ آنکھیں اُٹھا کر قبر کی تختی کو دیکھا۔

خضر حفیظ

ولد

حفیظ حیات

اِس نام پر عمر نے پیار سے ہاتھ پھیرا، جیسے کبھی خضر کے سر پر پھیرتا تھا۔

کہاں ہوتے ہو یار! کئی کئی دن گزر جاتے ہیں ساتھ بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پیے۔

اُسکی شکوہ کرتی آواز کانوں میں گونجی، نظروں کے سامنے لان میں ورزش کرتا خضر دکھائی دینے لگا۔

آج کل تو لوگوں کو میں نظر ہی نہیں آتا۔

اُسکا دھونس بھرا شکوہ یاد آیا، اُسکا خود کو گلے لگانا یاد آیا، اُسکی شرارتی مسکراہٹ نظروں میں آ ٹھہری۔

''کتنا وقت ہو گیا خضر؟ کب آؤ گے؟ اور کتنے انتظار کے بعد؟'' اُس نے قبر میں سوئے اپنے جان سے پیارے بھائی سے سوال کیا۔ پر اب اُسکی آواز، وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی نہیں سن سکتا تھا۔

''میں نے شام کی چائے پینی چھوڑ دی، تم نہیں ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مجھ سے ناراض ہو جاتے، مجھے مار لیتے، کبھی میرا منہ نہ دیکھتے۔۔۔ یوں تو نہ کرتے میرے ساتھ۔ مجھ سے قطع تعلق کر لیتے، میں چھپ کر صحیح پر تمہارا چہرہ دیکھ لیا کرتا۔ لیکن مجھے ایسے روز روز مرنے کے لیے کیوں چھوڑ گئے خضر؟'' آواز بھرا گئی۔ اُسکا ہنستا کھیلتا، زندگی کو جیتا، ہر لمحے کو یادگار بنانے والا بھائی آج خاموش کیوں تھا؟ وہ اتنی کم زندگی لیکر کیوں آیا تھا؟

کیا مقدّم مجھ سے زیادہ عزیز ہے تمہیں؟

اُسکا سوال کرتا لہجہ یاد آیا۔

''یہ کیسی سزا دی تم نے مجھے؟ ساری دنیا میں تم سے زیادہ تو کوئی عزیز نہ تھا مجھے۔ پھر کیوں ایسے تنہا کر کے چلے گئے مجھے؟ میرے ہر محاذ پر میرے ساتھ تھے تم، میرے ساتھ کھڑے رہتے تھے، میرے دوست تھے، میرے بھائی تھے۔ اب میں اکیلے اِس دنیا کا سامنا کیسے کروں خضر؟ کیسے؟ واپس آ جاؤ میرے بھائی! پلیز! واپس آ جاؤ۔۔۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔ کہیں سے آ جاؤ!'' اُس قبر پر بیٹھا، پھوٹ پھوٹ کر روتا عمر ایک ایسی خواہش کر رہا تھا جو کبھی پوری نہیں ہونے والی تھی۔

نجانے وہ کتنی دیر روتا رہا؟ جب رو رو کر تھک گیا تو خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اجازت نہ تھی ورنہ وہ اُس قبر کی مٹی کو چوم کر جاتا، جہاں اُسکا بھائی دنیا سے منہ موڑے سویا ہوا تھا۔ آنسو صاف کر کے وہ ایک آخری نظر قبر پر ڈال کر باہر آ گیا۔

باہر آیا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ ایک بار پھر سے بے مقصد چلتے وہ سڑک کنارے رکھی بینچ پر آ بیٹھا۔ نم آنکھوں سے فرش کو دیکھتے نجانے وہ کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا؟ دل کسی آتش فشاں سے ابلتے پہاڑ کی طرح بھرا ہوا تھا۔ وہ رات اُس پر بھاری تھی یقیناً!

تمہارا جب دل چاہے، تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔ رابطہ بھی کر سکتے ہو۔

مقدّم کی نرم آواز کانوں میں گونجی تو آنسوؤں میں کمی آنے لگی۔اُس نے جیب میں رکھا فون باہر نکالا اور اُسے فون کیا۔پہلی ہی بیل میں فون اُٹھا لیا گیا۔

''میں آج صبح سے تمہیں ہی یاد کر۔۔۔۔''اُسکی چہکتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا تم میرے پاس آسکتے ہو اِس وقت ؟''اُس کے لہجے کی التجا نے مقدّم کو ساکت کر دیا۔

''تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔''اُس نے وضاحت کی۔

''لوکیشن بھیجو، میں فوراً آتا ہوں''اُس نے کہا تو عمر نے بس سر ہلایا، جیسے مقدّم اُسے ہی دیکھ رہا ہو۔ لوکیشن بھیج کر اُس نے فون واپس رکھ دیا اور بینچ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔اُسکی گردن میں شدید درد اُٹھ رہا تھا، آج کل وہ دواؤں میں لاپرواہی برتنے لگا تھا۔موسم سرد تھا نہ گرم، پر ہوا کے جھونکے ٹھنڈک لیے ہوئے تھے۔اُسکے چہرے سے ٹکراتے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے، اُسے نیند کی وادیوں میں دھکیل رہے تھے، وہ شاید سو ہی جاتا جب کسی نے اُسکا کندھا ہلایا۔ اُس نے نیم غنودگی کے عالم میں آنکھیں وا کرتے آنے والے کو دیکھا۔نیند کی وجہ سے پہلی نظر دھندلا گئی۔

''کیا ہوا ہے عمر؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ؟''مقدّم نے گھبرا کر اُسے جھنجھوڑ ہی دیا۔اِس طرح سڑک کنارے بینچ پر اُسے سوتا دیکھ کر وہ ویسے ہی پریشان ہو گیا تھا۔

''ہاں ! میں ٹھیک ہوں۔''وہ آنکھیں ملتے ہوئے سیدھا ہوا۔سیاہ جینز پر، سفید اور سرمئی امتزاج کی جرسی پہنے وہ رف سے حلیے میں وہاں بیٹھا تھا۔

''نہیں ! تم مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہے۔''مقدّم اُسکے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔عمر بس مسکرا دیا۔

''اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''سامنے والی سڑک پر نظر آتے قبرستان کو دیکھ کر وہ مشکوک ہوا۔

''قبر پر آیا تھا۔''اُس نے آہستگی سے کہا اور آنکھیں ملنے لگا۔نیند کی وجہ سے آنکھیں اب بھی سرخ تھیں، یا شاید رونے کی وجہ سے۔

''کس کی ؟''وہ حیران ہوا۔عمر نے دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے، آگے کی طرف جھک کر نظریں فرش پر مرکوز کیں، پر جواب نہ دیا۔

''عمر!''مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''تم نے مجھے بتایا نہیں، کہ تم کس کی قبر پر آئے تھے ؟اور اُس روز بھی نوید کے حادثے کی وجہ سے بات ادھوری رہ گئی تھی۔''اُس نے نرمی سے پوچھا۔

''اپنے بھائی کی قبر پر۔۔۔''اُس نے مختصر جواب دیا تو مقدّم سن رہ گیا۔

---------+---------+--------

سٹریٹ پول کی پیلی روشنی کے نیچے، نوید آج اُسی بینچ پر بیٹھا تھا، جہاں کچھ ماہ قبل وہ علی سے ملا تھا۔ اُس وقت میں اور اِس وقت میں کافی فرق آچکا تھا۔ سڑک پر نظر آتی اکادکا گاڑیوں پر نظر ڈالتے اُسے بشریٰ یاد آئی، جو دو روز سے اُس سے ہر قسم کی بات چیت بند کیے ہوئے تھی۔ وہ خاموش تھی، ایسے جیسے کسی پتھر کی مورت ہو۔ اور نوید کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ بشریٰ کے معاملے میں قسمت نے اُسے بالکل ہی بے بس کر دیا تھا۔ فرش پر نگاہیں مرکوز کیے، اُسکے کانوں سے قریب آکر رکتی گاڑی کی آواز ٹکرائی۔ پر اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھنا نہ اُسکے وجود میں کوئی جنبش ہوئی۔ نیلی جینز پر ہلکی آسمانی شرٹ پہنے علی گاڑی سے اُترا اور اُسے پہلے سے وہاں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا۔

''تم کب سے آئے ہوئے ہو؟'' گاڑی کا دروازہ بند کر کے، بینچ کے قریب آتے ہوئے علی نے اُس سے پوچھا۔ اُس نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں بندھی گھڑی کی جانب دیکھا، پھر دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے سامنے سڑک پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے بولا۔

''جس وقت تمہیں آنے کا کہا تھا، اُسی وقت سے آیا ہوا ہوں۔'' اِس جواب پر علی خجل ہوتا، اُسکے برابر میں بیٹھ گیا۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم واقعی آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤ گے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی، پر ماحول کی اجنبیت ختم نہیں کر سکا۔ گو کہ وہ اب تک نوید سے کئی بار مل چکا تھا، نوید اُسکے گھر بھی آیا تھا، اُسکے ساتھ ہسپتال میں بھی تھا، نشمیہ والا معاملہ بھی صرف وہ ہی جانتا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود، ہر مرتبہ اُس سے بات کرتے ہوئے نئے سرے سے اجنبیت قائم ہو جاتی تھی۔ یا شاید اُسکا انداز ہی ایسا تھا کہ مقابل اُسکے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا۔

''میں ایسی بات نہیں کہتا جو میں کر نہیں سکتا۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا، علی اب کہ خاموش رہا۔ پھر نوید نے چہرہ اُسکی جانب کیا۔

''تمہیں کیا کام تھا؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں اصل میں فاطمہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' اُس نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ کہاں ہے اِس وقت؟ اصل میں۔۔۔'' وہ رکا۔ ''میں احمد سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُسے گھر واپس لانا چاہتا ہوں۔ اور اُسکے لیے فاطمہ سے ملنا ضروری ہے۔ جہاں وہ ہو گی، وہیں احمد بھی ہو گا۔'' اُس نے وضاحت دی تو نوید غور سے اُسے دیکھتا رہا۔

''کیا ہوا؟'' نوید کو خود کو دیکھتا پا کر اُس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا، علی سمجھ نہیں سکا۔

''تم اپنے بیٹے سے ملنا چاہتے ہو، میں خوش ہوں کہ تم نے بروقت اور اچھا فیصلہ کیا۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا، پر علی کو اُسکا ہر انداز عجیب لگا تھا۔

''خیر! وہ معلومات تو صبح تک مل جائیں گی۔اور کوئی کام؟''اُس نے دوبارہ سے سنجیدہ ہوتے ہوئے چہرہ سڑک کی جانب کر دیا۔علی کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا۔

''بھلا کیسے کریدوں اِسے؟''اُس نے سوچا۔اِس شخص سے بات کرنے سے زیادہ آسان رضا سے بات کرنا تھا۔رضا جو تھا جیسا تھا،اُس سے برابری سے لڑ لیا کرتا تھا۔اِس لیے اُس سے بات کرنا واقعی آسان تھا۔لیکن نوید کا سرد مہر،لاتعلق اور اجنبی سا انداز اُس کی تمام جمع شدہ ہمت فنا کر دیتا تھا۔وہ کچھ نہ کہہ کر بھی،آنکھوں سے بہت کچھ کہہ دیتا تھا۔

''نوید! اصل میں۔۔۔میں۔۔۔''اُس نے دوبارہ ہمت مجتمع کی۔نوید سینے پر ہاتھ باندھے سنجیدگی سے سڑک کو دیکھتا رہا۔اُسکی آنکھ کے برابر نظر آتا باریک سا کٹ جیسا نشان ہلکی روشنی میں واضح ہوا۔

''مجھے تم سے۔۔۔۔''وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''تم کل عدالت میں کیا کر رہے تھے علی؟''نوید کے سوال پر اُس نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے دیکھ رہا تھا۔

''عدالت؟''علی کی آواز نے ہی اُسکا ساتھ نہ دیا۔

''ہاں! عدالت۔۔۔بلکہ کمرائے عدالت۔کیا کر رہے تھے تم وہاں؟''اب کہ اُس نے چہرہ موڑ کر براہِ راست اُسے دیکھا۔

''میں نشمیہ کی کسٹڈی کے سلسلے میں۔۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینے لگا۔

''کرمنل کورٹ میں کسٹڈی نہیں ملتی علی!''اُس نے بات کاٹی۔اُس کے سپاٹ لہجے پر علی خائف ہوا،پر خاموش رہا۔اُسکے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا،بھلا کیا وضاحت دیتا اپنے اِس عمل کی؟سچ تو یہ تھا کہ وہ نوید کو وہاں،اُس وکیل کے ساتھ دیکھ کر متجسس ہوا تھا۔

''میں تمہیں وہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا،تم سے بات کرنا چاہتا تھا پر۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا،پر دے نہیں سکا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں اپنی سابقہ بیوی کی معلومات چاہیے۔اور اِسی بات پر میں ہنسا تھا۔''اُس نے ایک بار پھر اُسکی بات کاٹی تھی،علی خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔اُسکی ہر بات پہلے سے زیادہ پہیلی ہوتی تھی۔

''کیونکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ احمد کے جانے کے بعد،جب تم نے اُسے فون کیا تھا تو فاطمہ کا نمبر اپنے ابّا سے لیا تھا۔تم فاطمہ کو فون کر کے ڈائریکٹ بھی پوچھ سکتے ہو،بلکہ اپنے ابّا سے بھی پوچھ سکتے ہو،اُنکے پاس یقیناً اُن دونوں کا پتہ ہو گا۔''علی ساکت رہ گیا۔نوید اب بینچ پر بازو ٹکائے،بڑی فرصت سے اُسکی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو؟''اب کہ وہ سنجیدہ ہوا۔

''تم نے مجھے عدالت میں دیکھا، پھر تم کمرائے عدالت میں میرے پیچھے آئے، جو کچھ تم نے وہاں سنا، اُسکے بعد تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ بس! یہی بات ہے۔''اُس نے پوچھا نہیں تھا، بتایا تھا کہ سو فیصد یہی بات ہے۔ علی اُسکی ذہانت پر حیران رہ گیا۔ وہ واقعی بے حد چالاک، ہوشیار اور شاطر تھا۔

''بتاؤ! کیا پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے۔۔۔''اُس نے ٹانگ پر ٹانگ ٹکاتے ہوئے پوچھا۔ علی شرمندہ رہ گیا۔ ابھی تو اُسے یہ معلوم بھی نہ تھا کہ فرّخ صاحب اُنہیں نوید کے بارے میں سب بتا چکے ہیں۔ لیکن کیا پتہ اُسے یہ بھی معلوم ہو؟ اِس سوچ کے آتے ہی علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''میں کچھ نہیں پوچھنا چاہتا تم سے۔''اُس نے ہمت کی۔

''تو؟''اُس نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔ علی نے ایک لمحے کو اُسے دیکھا، پھر اگلا لمحہ اُس پر اِس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ جس شخص کے سامنے بیٹھا ہے، وہ اُسکا دوست ہے۔ وہ کیوں اُس سے اتنا جھجک رہا ہے، ڈر رہا ہے اور شرمندہ ہو رہا ہے؟

اگر وہ نوید عالم تھا، تو وہ بھی علی سفیر ہے۔ اپنی بات پوری کیے بغیر وہ معاملہ ختم نہیں کرتا۔ اُس لمحے، اُس نے دل سے سارے خوف، ساری شرمندگی بالائے طاق رکھی اور اُس کو دیکھا۔

''میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا نوید! ہر اُس بات کے لیے جسے میں ٹھیک سمجھتا رہا، اگر اب بھی معافی نہ مانگی تو شاید اسی بوجھ کے ساتھ مر جاؤں گا۔ بے شک! تم معاف نہ کرو۔ پر مجھے معافی مانگ لینے دو۔''وہ کہہ رہا تھا۔ اور اُسکا ایک ایک لفظ سچائی میں ڈوبا محسوس ہوتا تھا۔

---------+---------+--------

''صرف ایک ہفتہ ہے عید میں، اتنی ساری خریداری کرنی ہے، اور دیکھو ذرا اپنے ابّا کو، جو ابھی تک گھر ہی واپس نہیں آئے۔''اپنی ڈیڑھ سالہ بیٹی کو گود میں لیے حور عین نے کہا تو وہ ٹکر ٹکر اُسے دیکھنے لگی۔

''بہت آوارہ ہوتے جا رہے ہیں تمہارے ابّا حضور! آج گھر آنے دو، صحیح سے کلاس لیتی ہوں اُنکی۔''اِس بات پر حور یہ کھلکھلا کر ہنسی، تو حور عین نے اُسے سینے میں بھینچ لیا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتا حسین ٹھہر گیا۔ یہ منظر کتنا مکمل تھا؟ آج سے پہلے شاید اُسے، اِس نعمت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے پاس کتنی بے شمار ایسی نعمتیں ہوتی ہیں، جنکے لیے دنیا ترس رہی ہوتی ہے اور ہمیں اِسکا ادراک نہیں ہوتا۔ اُس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا، اور نوید کی خوشیوں کی دعا مانگی۔

''تم؟''اُسی لمحے حور عین کی نظریں اُس پر پڑیں۔

''کہاں آوارہ گردیاں کرتے پھر رہے ہو تم آج کل؟ہاں؟''اُس نے ایک ہاتھ کمر پر ٹکاتے ہوئے گھور کر اُسے دیکھا۔

''میری پیاری!میری جان حور!''حسین نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے، حوریہ کو اُسکی گود سے لیتے ہوئے پیار کیا۔

''کہاں تھے تم؟اتنی دیر سے کیوں گھر آئے؟''اِس سوال پر حسین نے بدمزہ ہو کر اُسے دیکھا۔

''کیا مطلب تمہارا؟اب میں اپنی دوسری بیوی کو ٹائم بھی نہ دوں؟ہر وقت تمہارے پاس ہی بیٹھا رہوں؟دوسری بیوی کے بھی کچھ حقوق ہوتے۔۔۔''
اُسکی فر فر چلتی زبان کی حور عین کے پھینک کر مارے گئے کُشن نے روکا تھا۔

''جنگلی خاتون!ابھی میری بیٹی کو لگ جاتی تو؟''اُس نے حوریہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے،ڈراما انڈسٹری کے تمام فنکاروں کو مات دیتے ہوئے کہا۔

''تم سے کہا بھی ہے کہ بازار جانا ہے۔''اُس نے کہا۔

''کیوں؟''وہ انجان بنا۔

''تمہاری شادی کی شاپنگ کرنے۔''

''تیسری؟''

''حسین۔۔۔''وہ جھنجھلائی۔

''کیا؟''

''عید کی شاپنگ کرنی ہے یار!''

''تو کرو!میں نے کب روکا ہے؟''

''پیسے دو۔''

''تو اصل مدعا یہ تھا؟''

''ہاں!۔۔۔۔''

''ایک منٹ حور عین بی بی!آپ اب تک عید کی شاپنگ کے نام پر مجھ سے چار مرتبہ پیسے لے چکی ہیں۔یہ کونسی شاپنگ ہے جو ختم ہی نہیں ہو رہی؟''اب کہ وہ لڑاکا عورتوں کی طرح بولا تو حور نے یہاں وہاں دیکھا۔

''وہ۔۔۔وہ بچوں کی شاپنگ کی تھی نا! پھر گھر کے سامان اور پردے وغیرہ۔ میری اپنی شاپنگ تو ہوئی ہی نہیں!''اس نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''وہ دوٹوک انداز میں بولتا پیچھے ہٹا۔

''جھوٹ مت بولو، میں نے خود دوپہر کو تمہارے بٹوے میں بیس ہزار نقد دیکھے تھے۔''اِس بات پر تو حسین کا منہ ہی کھل گیا۔

''تم۔۔۔تم نے میرا بٹوا کھولا تھا؟''حور عین نے زور وشور سے اثبات میں سر ہلایا۔

''شرم نہیں آئی؟''اُس نے تاسف سے پوچھا تو اِس بار زور وشور سے نفی میں سر ہلایا گیا۔

''اور۔۔۔اور بیس نہیں۔۔۔۔پورے پینتیس ہزار تھے۔ کہاں ہیں میرے پندرہ ہزار؟''اب کہ اُس نے حوریہ کو گود سے اتار کر پلنگ پر بٹھایا اور کمر پر ہاتھ رکھے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''مجھے کیا پتہ؟ تم نے خرچ کر دیئے ہوں گے کہیں۔ میں نے تو بیس ہی دیکھے تھے۔''اِس بات پر حسین نے اُسے گھورا۔

''شرم کرو! تمہیں بھی معلوم ہیں کہ بیس نہیں تھے، تم نے پندرہ ہزار نکالے ہیں۔''

''پندرہ کہاں سے ہو گئے؟ پچیس ہزار ہی رکھے تھے وہاں۔''اُسکی زبان پھسلی۔

''دیکھا! دیکھا! پکڑی گئی نہ چوری؟''وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے چیخا۔

''ہاں تو کیا ہوا؟ پانچ ہزار ہی تو تھے۔''مجال ہے جو اُسے کوئی فرق پڑا ہو؟

''اب میرے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں۔''اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''بیوی پر خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔''

''اپنی دوسری بیوی پر خرچ کر کے ثواب کما چکا ہوں۔ اب تم پانچ ہزار پر ہی گزارا کرو۔''اُس نے کہتے ہو دروازے کی جانب دوڑ لگا دی کیونکہ وہ حور کو جوتا اٹھاتے دیکھ چکا تھا۔

حور کو چھیڑتے، ہنستے، اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتے حسین ایک بات بھول گیا تھا۔

کہ اصل امتحان تو وہ پراسرار قاتل تھا۔

---------+---------+--------

سمندر کی لہریں بلند تھیں۔ مہینہ اگست کا تھا۔ان چند مہینوں میں گہرے سمندر میں جانے پر پابندی عائد رہتی ہے۔ صبح سات بجے کا وقت تھااور ساحل پر عوام نہ ہونے کے برابر تھی۔

ایسے میں سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ خوبرو مرد ہاتھوں میں کاغذ کے کچھ ٹکڑے لیے سمندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے سورج کی روشنی کو زمین پر آنے سے روکا ہوا تھا، مونسون کا موسم تھا، بارش کسی بھی لمحے ہو سکتی تھی۔

صبح کی ہلکی نیلی، مگر سیاہی مائل روشنی میں، وہ دلفریب مسکراہٹ والا شخص ساحل پر آ کھڑا ہوا۔اُسکے ہاتھوں میں موجود صفحوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ لگتی تھی۔

اُس نے مسکراہٹ چہرے پر سجاتے، پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے، پہلا صفحہ لہروں کی نذر کیا۔بلند ہوتی لہریں صفحے کو لمحوں میں اپنا مسافر بنائے ساتھ لے گئیں۔اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی، سیاہ سوٹ والے اُس خوبرو مرد نے دوسرا صفحہ بھی پانی کی نظر کیا، پھر تیسرا اور اِسی طرح وہ تمام صفحے لہروں کے حوالے کرتا چلا گیا۔اُسکے آس پاس کی لہروں میں کاغذوں کا ایک سمندر سا بن گیا۔اُس نے آخری صفحہ ہوا میں بلند کر کے دیکھا، اور ہنستے ہوئے اُسے بھی سمندر کے حوالے کر دیا۔آخری صفحے پر موجود اُسکے شوقیہ دستخط آن کی آن میں غائب ہونے لگ گئے۔جب تمام کے تمام صفحات لہروں کے ہم نوا بن گئے تو وہ کھڑا ہوا۔

''میں چاہتا تھا کہ ایف آئی اے مجھ تک پہنچے۔پر وہ نہیں پہنچ سکی۔اور یوں۔۔۔کہانی ختم ہوئی۔''اُس نے ہنستے ہوئے لہروں کو دیکھا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔جہاں آزاد زندگی اُسکا انتظار کر رہی تھی۔سمندر کی بلند ہوتی لہریں، سیاہی مائل، نیلی روشنی میں، منظر کا حصّہ بنتے، اُس سیاہ سوٹ والے کو جیبوں میں ہاتھ ڈالے جاتا دیکھ رہی تھیں۔جسے اب کبھی واپس نہیں آنا تھا۔

---------+--------+--------

چار سال قبل:

عمر اپنے ماں باپ کے گھر سے دلبرداشتہ ہو کر نکلا تھا، اُس روز جب اُس نے عمارہ کے ہاتھ پر خضر کے نام کی مہندی دیکھی تھی، تو وہ بنا کچھ بھی کہے وہاں سے لوٹ آیا تھا۔اُسے ہر صورت اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کی جلدی تھی تاکہ وہ کچھ وقت کے لیے اِس دنیا سے دور ہو سکے۔وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ہوٹل کی لفٹ میں اکیلے موجود، اُسے کیلئے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا محال ہو رہا تھا، ذہن وہیں کہیں تھا۔

درمیان میں کسی فلور پر لفٹ رکی اور کالے سوٹ میں ملبوس ایک مرد اندر داخل ہوا۔عمر کا ذہن حد سے زیادہ اُلجھا ہوا تھا۔وہ اپنی سوچوں میں اتنا محو تھا کہ اُس نے آنے والے کی جانب دیکھا ہی نہیں۔پر اُسکے ذہن کا کوئی گوشہ اُسے بار بار یہ احساس دلا رہا تھا کہ آنے والا اُسے بغور دیکھ رہا ہے، پر اُسکی اُلجھی سوچوں

نے اُسے ،اِس جانب دیکھنے کی مہلت نہ دی۔مزید دو فلور کے بعد لفٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا اور آنے والا باہر نکل گیا۔اُس کے باہر نکلتے وقت، عمر نے فقط ایک جھلک اُسے دیکھا اور اُس ایک جھلک میں اُسے احساس ہوا کہ وہ ایک خوبرو،اور خوش لباس مرد تھا۔سیاہ سوٹ والا مرد باہر نکل گیا،اور لفٹ کی دیوار سے ٹیک لگائے عمر کے ذہن میں یکدم جھماکا ہوا۔وہ اس شخص کو جانتا تھا۔پر اب دیر ہو چکی تھی۔ علی سفیر جا چکا تھا۔

--------+---------+----------

لفٹ میں ہونے والی اُس اتفاقیہ ملاقات کے بعد عمر اگلے دو سال تک علی سے دوبارہ نہیں ملا۔اِس واقعہ کے بعد وہ پلٹ کر اپنے گھر بھی نہیں گیا۔اُسکے پاس کافی پیسے تھے،اور پھر وہ اپنا اور چوئل کا روبار تو کر ہی رہا تھا۔اسی شہر کے ایک پوش علاقے میں اُس نے چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔وہ گھر واپس جا کر خضر اور عمارہ کی زندگیاں تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ڈیڑھ سالوں سے وہ اپنا کاروبار جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ،مزید سرمایہ کاری کے مواقع تلاش کرتا رہا۔اُسکے کلائنٹس اور پروجیکٹس اتنے زیادہ تھے کہ وہ اب باقاعدہ ایک ٹیم کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔پر اُسکے لیے اُسے کافی وقت چاہیے تھا،تو بہتر یہی تھا کہ وہ کسی چلتے ہوئے کاروبار کے شیئرز خرید لے۔

ڈیڑھ سال کسی عجیب سے انداز میں گزر گئے تھے۔اُسکی زندگی ایک جمود کا شکار ہو گئی تھی،ماں سے ملنا چاہتا تھا پر مل نہیں سکتا تھا،جانتا تھا کہ اُن سے ملے گا تو وہ گھر سے ناراضگی مول لیں گی،پر اُسے گھر میں واپس لانے کی ضد کریں گی۔بھائی اسی شہر میں تھا،پر اُسے گلے لگانے کی شدید خواہش کے بعد بھی اُسکے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

اکثر وہ سوچتا کہ نامعلوم وہ زندگی میں کبھی اُن لوگوں سے معافی مانگ بھی پائے گا یا نہیں؟ اور اُسے معلوم نہ تھا کہ اگلے چھے مہینے میں اُسکی زندگی تین سو ساٹھ زاویے پر پلٹنے والی ہے۔

---------+---------+--------

''کیا سوچ رہے ہو خضر؟''اُسے کسی گہری سوچ میں غلطاں دیکھ کر عمارہ نے پوچھا تو وہ چونکا۔

''میں؟کچھ نہیں بس ایسے ہی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے بات ٹالی۔ عمارہ اُسکے سامنے آ بیٹھی۔

''تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کیوں پریشان ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''تم ناراض ہو گی۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میں پہلے کبھی تم سے ناراض ہوئی ہوں؟''اُس نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں! پر اس بات پر ہو سکتی ہو۔''اُس نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہے؟''

''میں۔۔۔میں عمر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''اُس نے بلآخر کہہ دیا۔ایک پل کو عمارہ کا چہرہ سیاہ ہوا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ڈیڑھ سالوں سے یہاں ہے۔وہ تو ملک سے باہر اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا نا! تو پھر وہ واپس کیوں نہیں گیا؟''وہ پر سوچ انداز میں کہنے لگا۔عمارہ خاموش ہوئی، عمر کا ذکر اُسے تکلیف پہنچا رہا تھا، پر وہ خضر کو روکنا نہیں چاہتی تھی۔پچھلے ڈیڑھ سالوں میں خضر ایک بہترین شوہر ثابت ہوا تھا۔اُس نے کبھی بھول کر بھی اُسکے سامنے اپنے بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

''تم اُس سے ملنا چاہتے ہو؟''اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا تو خضر نے رک کر اُسے دیکھا۔

''نہیں! ایسا نہیں ہے میں تو بس۔۔۔۔''وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عمارہ نے گہری سانس لیتے ہوئے اُسکی بات کاٹی۔

''دیکھو خضر! وہ تمہارا بھائی ہے۔میں جانتی ہوں کہ تم اُسے یاد کرتے ہو، اور جب سے وہ پاکستان میں ہے، تمہارا دل اُس سے ملنے کو مچلتا ہے۔میں تمہیں کبھی اُس سے ملنے سے نہیں روکوں گی، کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ تمہارے بھائی کی محبت تمہیں اپنی جانب کھینچے گی۔اگر تم میری وجہ سے رک رہے ہو تو بے فکر رہو۔میں تمہارے اور تمہارے بھائی کے بیچ کبھی نہیں آؤں گی۔تم اُس سے ضرور ملو، ورنہ دل میں کسک ہمیشہ کے لیے رہ جاتی ہے۔ہاں البتہ! میں اُس سے کبھی نہیں ملوں گی اور نہ تم مجھے ایسا کرنے کا کہو گے۔''اُس نے نرمی سے کہا تو خضر کے سر سے منوں بوجھ سرکا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔۔۔''اُس نے کسی خواب کی سی کیفیت میں کہا تو وہ حیران ہوئی۔

''کیا مطلب؟''اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ میری بونگی بیوی اتنی ذہانت سے بھرپور باتیں بھی کر سکتی ہے۔''اِس بات پر وہ بدمزہ ہوئی۔

''اپنے آپ کو دیکھا ہے تم نے؟ جم کر کر کے جسم کی چربی تو اُتار لی ہے پر دماغ کی چربی وہیں کی وہیں ہے۔''وہ دوبدو جواب دیتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دماغ پر تو واقعی چربی جمی ہے میرے، ورنہ بھلا کون عقلمند تم سے شادی کرتا؟''اُس نے منہ چڑایا۔

''تم مان رہے ہو کہ تم بے عقل ہو؟''اُدھر فرق ہی نہ پڑا تھا۔

''ہاں! کم عقل عمارہ کا بے عقل خضر!''وہ ہنسا۔

''بے عقل سے کم عقل بھلا ہے۔''

''یعنی تم نے مان لیا کہ تم کم عقل ہو؟''اُس نے گھما پھرا کر اپنے مطلب کا نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔وہ تلملا کر رہ گئی،اور جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو منہ بناتے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

خضر ہنستے ہوئے اسے جاتا دیکھ کر رہ گیا۔جب عمر اُسے چھوڑ کر گیا تھا تو اُسے سنبھلنے میں پانچ سال سے زیادہ لگ گئے تھے۔وہ ہر دوسرے روز بیمار پڑ جاتی،ماں الگ رو رو کر ہلکان تھیں۔خضر کا دل چاہتا کہ وہ عمر کو فون کر کے لڑے،پر وہ خود سے رابطے کا کوئی ذریعہ چھوڑ کر نہ گیا تھا۔دوست ہونے کے ناطے وہ عمارہ کو سمجھانے جاتا کہ یوں اپنی زندگی نہ خراب کرے،پر اُسے روتا دیکھ کر دل مزید کٹ کے رہ جاتا۔خیر !اُسکے سمجھانے بجھانے کا یہ اثر ہوا کہ عمارہ نے نوکری شروع کر دی اور کافی حد تک اپنے آپ کو مصروف کر لیا،لیکن اُس سے بھی برا یہ ہوا کہ عمارہ کہ گھر والے جنہوں نے اُسکی اور عمر کی شادی سے قبل امیگریشن کے لیے درخواست دائر کی تھی،وہ قبول ہو گئی اور اُنہیں پندرہ دن کے اندر کینیڈا کے لیے نکلنا تھا۔اِس درخواست میں عمارہ کا نام نہیں تھا کیونکہ اُسکی تو عمر سے شادی ہونے والی تھی،چھے سالوں میں گھر والے یہ بات بھول گئے پر جب انکی درخواست قبول ہوئی تو وہ پریشان ہو گئے۔ خضر کے گھر والے الگ شرمندگی کا شکار تھے۔یہ سب اُنکے بیٹے کا کیا دھرا تھا،ایک پورا خاندان اُسکے کیے کی وجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔اگر وہ نہ جاتے تو انکی باقی اولادوں کا مستقبل تباہ ہو جاتا اور یہ موقع دوبارہ نہیں ملتا،اور چلے جاتے تو عمارہ کا کیا ہوتا؟تب خضر نے ایک فیصلہ کیا۔ایک ایسا فیصلہ جو شاید اُن دو خاندانوں کا دکھ کم کر سکتا تھا۔

''ابّو!میں عمارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''اُسکے ایک جملے نے خاندان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی،دوسری جانب عمارہ اپنے ماں باپ کا چہرہ دیکھ کر خاموشی سے راضی ہو گئی،وہ مزید اُنکو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

اپنے نکاح کے روز خضر نے شدت سے اپنے بھائی کو یاد کیا تھا،کیسے نہ کرتا؟بھلا،چوبیس پچیس سال جس شخص کے ساتھ گزارے ہوں،اُسے بھولنا آسان تھا کیا؟وہ اُس روز بہت رویا تھا،عمر اُسکا بھائی نہیں،اُسکا بہترین دوست بھی تھا۔اُسکی یاد تو ہمہ وقت اُسکے ساتھ رہتی تھی۔ اُس رات عمارہ نے بھی عمر کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا۔نہ اچھا نہ برا،کوئی حوالہ اُسکی جانب سے یاد نہ رکھا۔اور یوں دونوں نے ایک دوسرے کو دل سے قبول کیا اور اپنایا تھا۔

پر جب وہ دونوں بخوشی اِس رشتے کو قبول کر چکے تو عمر کہیں سے آ گیا۔وہ کہاں گیا تھا؟کیوں گیا تھا؟اور اچانک کیسے آ گیا؟یہ تمام سوال پھر سے خضر کے ذہن میں تازہ ہو گئے تھے۔پر وہ گھر میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔لہٰذا خاموشی سے خود ہی عمر کے بارے میں جاننا چاہا۔اُس نے بڑی مشکل سے عمر کے دوستوں میں سے حسین کو ڈھونڈا اور اُس سے ملا۔اُسے ایک اُمید تھی کہ شاید وہ عمر کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔پر حسین نے بھی آخری بار اُسے تب ہی دیکھا تھا جب وہ یہاں سے گیا تھا۔مزید یہ کہ خضر کو جھگڑے والی تمام بات بھی بتا دی۔

لیکن اب اُسکا دل اُسے کسی انہونی کا احساس دلا رہا تھا۔

اُس روز وہ عمارہ کے چیک اپ کے لیے ہسپتال آیا تھا۔چیک اپ کے بعد وہ اُسے انتظار گاہ میں بٹھا کر فارمیسی میں چلا آیا تھا۔دوائیں لیکر وہ پلٹ ہی رہا تھا کہ اُسکی نظریں داخلی دروازے سے اندر آتے عمر پر پڑیں۔وہ وہیں تھم گیا،پورے ڈیڑھ سال بعد اُس نے عمر کو دوبارہ دیکھا تھا۔ڈیڑھ سال پہلے بھی وہ چند منٹ سے زیادہ گھر میں نہیں ٹھہرا تھا اور چلا گیا تھا۔آج بھی وہ چند منٹ میں ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔خضر جیسے ہوش میں آیا،اُس نے ایک نظر انتظار گاہ میں بیٹھی عمارہ کو دیکھا جو موبائل میں مصروف تھی،پھر اُس طرف چل پڑا،جہاں عمر گیا تھا۔وہ عمر کی نظروں سے بچتا بچاتا اُسکے پیچھے آنے لگا۔عمر اوپی ڈی کے ریسیپشن کے پاس رک گیا،تو اُس نے بھی ایک ستون کی اوٹ لے لی۔کچھ دیر بعد عمر اُس،سے بنا کسی انتظار کے کسی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے اور پھر دروازے کے پیچھے گم ہوتا نظر آیا تھا۔خضر نے دروازے کے برابر بنی ایل ای ڈی میں چمکتے ڈاکٹر کا نام دیکھا۔**نیورولاجسٹ ڈاکٹر مومن شریف**۔وہ تیزی سے ریسیپشن تک گیا۔

''یہ ڈاکٹر مومن کب تک بیٹھے ہیں؟''اُس نے ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب ابھی دو گھنٹے تک تو یہی ہیں،پھر انکی سرجری ہے۔آپکو اپوائنٹمنٹ چاہیے تو آخری نمبر مل جائیگا۔''

''آپ میرا اپوائنٹمنٹ لگا دیجئے۔میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' وہ واپس آیا تو عمارہ پریشان سی بیٹھی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟''اُس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایک دوست مل گیا تھا،اُس سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ابھی تم چلو! تمہیں گھر چھوڑ کر مجھے کہیں جانا ہے۔''اُس نے باہر آتے ہوئے کہا۔

''پر کہاں؟''

''ارے اُسی دوست کے پاس،بہت عرصے بعد ملا ہے نا!''اُس نے جھوٹ بولا تو وہ مطمئن ہو گئی۔اُسے گھر چھوڑنے کے بعد خضر دوبارہ ہسپتال آیا تو اُسی کا نمبر آنے والا تھا۔عمر یقیناً جا چکا تھا۔خضر کو نہیں معلوم تھا کہ وہ ڈاکٹر سے کیا بات کرنے والا ہے؟اور کیوں؟ پچھلے کئی دنوں سے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ عمر کا اچانک چلے جانا اور واپس آجانا،ان سب کہانی میں بہت سے جھول ہیں۔شروعات میں تو غصّے کی وجہ سے انہوں نے دھیان نہیں دیا۔پر اب اُسے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ عمر نے کچھ تو چھپایا ہے اُن سے۔پزل کا کوئی ٹکڑا جیسے گمشدہ تھا۔

اُسکی باری آئی تو وہ تھوک نگلتے ہوئے اندر بڑھا،اُسے یقین تھا کہ مریض کی معلومات مانگنے پر ڈاکٹر اُسے اُٹھا کر باہر پھینکوا دے گا۔

''جی کہیے؟کیا ہوا ہے آپ کو؟''ڈاکٹر نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اُسے دیکھا،لیکن اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی مسکراہٹ سمٹی جسے خضر نے محسوس کیا تھا۔

''میرا نام خضر ہے۔میں آپ سے کچھ۔۔۔۔کچھ ضروری بات۔۔۔کرنا چاہتا ہوں۔''اُس نے اٹک اٹک کر وضاحت دی۔

''آپکا چہرہ جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے مجھے ؟ کیا میں آپ سے پہلے مل چکا ہوں ؟''ڈاکٹر نے جیسے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے بغور اُسے دیکھا۔

''نہیں ! پر شاید آپ میرے بھائی عمر حفیظ سے مل چکے ہیں۔''

''عمر حفیظ، آپ عمر کے بھائی ہیں ؟''ڈاکٹر جیسے اچھلا تھا۔

''جی !''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''اسی لیے آپکا چہرہ اُن سے بہت مل رہا ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ میرے بھائی کو کیسے جانتے ہیں ؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اگر میں عمر کو جانتا نہ ہوتا تو میں آپ سے ضرور کہتا کہ یہ سوال آپ اپنے بھائی سے پوچھیے۔''اُس نے کہا۔

''کیا مطلب ؟''وہ کچھ سمجھا نہیں۔

''آپ کے بھائی، پچھلے ساڑھے سات سالوں سے میرے مریض ہیں۔ آپ بتائیں کہ آپ اُنکے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں ؟''

''مریض ؟''خضر کو لگا، جیسے ہسپتال کی چھت اُسکے سر پر آ گری ہو۔ اُسکے بدترین خدشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔

''آپ اتنے سالوں سے کہاں تھے ؟ کیوں نہیں تھے اپنے بھائی کے ساتھ ؟ یہ سوالات میں آپ سے نہیں پوچھوں گا۔ کیونکہ ان سب سوالوں کے جواب مجھے آپکے بھائی سے مل چکے ہیں۔ جب میں اُن سے پوچھتا تھا کہ اُنکے ساتھ کوئی فیملی ممبر کیوں نہیں ہے ؟ البتہ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کو بھی اپنے بھائی کے بارے میں مکمل علم ہونا چاہیے۔ تاکہ اب آپ اپنے بھائی کو اکیلا نہ چھوڑیں۔''ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا ؟ اُسکا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ آخری مریض تھا، ڈاکٹر نے قریب پون گھنٹہ لیا، پر اُسے پچھلے ساڑھے سات سالوں کا تمام قصہ کہہ سنایا۔

''جب جرمن میں اُسکا علاج ہو رہا تھا، تب میں مسلسل وہاں کے ڈاکٹرز سے رابطے میں تھا۔ جب وہ کومہ میں تھا، تب میں دو مرتبہ اُسے دیکھنے بھی گیا تھا۔ بعد ازاں، پاکستان آنے کے بعد سے وہ فالواپ کے لیے میرے پاس ہی آتا ہے۔ الحمدُاللہ ! اب وہ مکمل صحتیاب ہے۔ پر اب اُسے اکیلا نہ چھوڑو۔ اُس بچے نے اتنی کم عمری میں، اتنی بڑی بیماری سے مقابلہ کیا ہے اور وہ بھی تنہا۔ اُسے اپنوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔''ڈاکٹر پُر خلوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اُس نے عمر کی ایک ایک رپورٹ، حتیٰ کہ جرمن میں اُسکی سرجری سے پہلے، سرجری کے بعد اور دورانِ کومہ لی گئی تصاویر بھی دکھائیں۔ اُسکے ہوش میں آنے کے بعد اخباروں میں چھپنے والی خبریں تک اُسکو دکھائیں۔ خضر کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر تو اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا۔ پر وہ کچھ سننے اور کہنے کے لائق ہی نہیں بچا تھا۔

وہاں سے نکلنے کے بعد اُسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے؟ وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا، روتا رہا، تڑپتا رہا۔ پر اُسے کسی پل چین نہ آیا۔ کتنے ہی گھنٹے ضائع کرنے کے بعد اُس نے خود کو عمر کے فلیٹ کے باہر کھڑا پایا تھا۔ اِس فلیٹ کا ایڈریس اُس نے کچھ دنوں پہلے ہی ایک دوست سے پتہ کروایا تھا۔ کتنے لمحوں وہ دروازے کے سامنے کھڑا رہا، بیل کو دیکھتا رہا پر اُسے بجا نہ سکا۔ دماغ کی حالت عجیب سی تھی، کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا کر رہا ہے اور کیوں؟ کیا کہنا ہے اور کیسے؟ وہ اِسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا اور عمر موبائل میں سر دیے باہر نکلا، ایک ہاتھ سے موبائل تھامے، دوسرے ہاتھ سے دروازے کا لاک پکڑے اُسکی ساری توجہ اپنے فون پر ہی تھی کہ یکلخت ہی اُسے اپنے قریب کسی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا تو اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

آنکھیں پتھرا گئیں، موبائل پر چلتی اُنگلیاں تھم گئیں، حیرت سے منہ کھلا، شاید خضر کا نام لینا تھا، پر وہ برف کا مجسمہ ہو گیا۔ اسے قطعاً اُمید نہیں تھی کہ وہ یوں اُسکے دروازے پر آ کھڑا ہو گا۔

''خی۔۔۔ خز۔۔۔'' ایک بار پھر اپنے بھائی کا نام لینا چاہا اور ایک بار پھر سے ناکام ہوا تھا۔ خضر سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی وہ آنکھیں چھلکنے کو بے تاب لگتی تھیں۔ اُسکی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے عمر کی نگاہوں کو بھی دھندلا دیا تھا۔ خضر کے لب ہلے، اور سسکتے لہجے میں زیر لب کہا ''عمر۔۔۔''

''عمر!۔۔۔'' اگلے ہی لمحے اُس نے آگے بڑھ کے عمر کو گلے لگا لیا۔ ''میرا بھائی!۔۔۔۔'' وہ رو رہا تھا۔ عمر نے اپنے بازو اُسکے کندھوں کے گرد پھیلا لیے۔ خضر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور ساڑھے سات سال بعد بھی عمر کو یہ ماننا پڑا کہ اُسکا بھائی آج بھی بچہ ہی تھا۔

''مجھے معاف کر دو خضر!'' عمر نے بھرائی آواز میں خود کو کہتے سنا تھا۔

''معاف کر دو۔'' وہ رو دیا، خضر نے خود کو عمر سے الگ کیا۔

''کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟'' اُس نے عمر کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے معاف کر دو۔'' اُس نے روتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''تم اکیلے اتنا سب کیوں سہتے رہے؟ کیوں؟ تمہیں ہمیں بتانا چاہیے تھا نا؟'' اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسے جھنجھوڑا تو، اِس مرتبہ عمر نے جھٹکے سے چہرہ اٹھایا اور حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟'' اُس نے پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔

--------+---------+----------

لاؤنج کی میز پر چائے کی دو پیالیاں رکھی تھیں، جسے چھوا تک نہیں گیا تھا۔ دو نفوس کے ہوتے بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خضر پچھلے آدھے گھنٹے سے وہاں تھا، اور اُسے سب بتا چکا تھا۔ جو ابا عمر نے بھی اپنے تمام خدشات اُسے کہہ سنائے تھے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ کس لیے کیا؟ کیا وجہ تھی اِس سب کی؟ ہر شے اُس نے خضر کو بتا دی۔ اور اب وہاں خاموشی کا طویل وقفہ آن ٹھہرا تھا۔ خضر نے اُسے بتایا کہ وہ اُسکے دوست حسین سے ملا تھا، اُسکے دوست اب ایک دوسرے کے دوست نہیں رہے، پھر اُس نے عمر کو وہ تمام بات کہہ سنائی جو حسین سے پتہ چلی تھی۔ عمر کو حسین کی سنائی کہانی میں جھول محسوس ہوا، جیسے اُس نے کچھ چھپایا ہو یا مکمل بات نہ بتائی ہو۔ پر وہ خاموش رہا کہ فلوقت موضوع کچھ اور تھا۔ پھر وہاں خاموشی چھا گئی۔

''تمہیں شادی کی مبارک باد نہیں دے سکا تھا۔'' خاموشی کو عمر کی آواز نے توڑا۔ چہرے پر مسکان سجائے اُس نے خضر کو دیکھا۔ وہ خاموش رہا۔

''تم خوش ہو؟'' اُس نے عمر کو بغور دیکھتے سوال کیا۔

''تم اپنے لیے مجھے ہمیشہ خوش ہی پاؤ گے۔'' اُس نے خضر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہو دل سے کہا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ تم نے ہمارے ساتھ کتنا غلط کیا ہے؟ ہمیں انجان رکھ کر؟'' اُس نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ عمر نے اُسکے کندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے سر جھکا دیا۔

''میں جانتا ہوں، پر قسمت میں یہ ایسے ہی لکھا تھا۔ میں تم لوگوں کو کسی بڑی تکلیف سے۔۔۔۔''

''بس کر دو عمر!'' اُس نے عمر کی بات کاٹی۔ ''تمہاری بیماری کو جاننے کے بعد ہمیں کیا کرنا تھا اور کیا نہیں، یہ ہمارا فیصلہ تھا تمہارا نہیں۔'' اُس نے نم آنکھوں اور غصّے سے بھری آواز میں کہا تو عمر حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''ہمیں تمہارا ساتھ دینا تھا، یا تمہیں چھوڑ دینا تھا۔ یہ سب ہمارا فیصلہ تھا، پر تم نے ہم سے ہمارے فیصلے کا اختیار چھینا ہے عمر! تم نے ہمارے حصے کے فیصلے خود کر لیے۔ کس نے حق دیا تھا تمہیں اسکا؟''

''خضر میں۔۔۔ میں تو۔۔۔'' وہ کوئی وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''نہیں عمر! تم نے ایسا کر کے ہمیں کسی تکلیف سے نہیں بچایا۔ بلکہ ہمیں مزید اذیت سے دوچار کر دیا ہے۔ تم بیمار ہوتے یا مر جاتے، اُسکے بعد کیا ہوتا یہ سوچنا تقدیر کا کام تھا۔ پر تم نے تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ مجھے بتاؤ، اب ہم اِس سچ کے ساتھ کیسے زندہ رہیں گے؟'' وہ پھر سے رو دیا۔

''نہیں خضر! تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔'' اُس نے فوراً سے پیشتر اُسے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''بہت ہو گیا عمر! اب تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ سچ جاننا ہم سب کا حق ہے۔ اب یا تو تم کل تک گھر آ کر سب کو سچ بتاؤ گے، یا پھر میں یہ کام خود کر دوں گا۔''

''اور اِسکے بعد کیا ہو گا؟ تم نے سوچا ہے اِس بارے میں؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں! اور میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ بعد میں جو ہونا ہے وہ ہماری مرضی سے نہیں ہوتا عمر! اگر ایسا ہوتا تو تم ابھی زندہ نہ بیٹھے ہوتے۔'' عمر لاجواب ہو گیا۔ یہی فرق تھا دونوں میں، عمر دور اندیش تھا اور خضر آج اور ابھی کرنے کا قائل۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم اب مزید ابّو کی ناراضگی سہو، اور مزید امی کو تڑپاؤ۔ مزید ہم سے دور مت رہو عمر! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔''

''اور عمارہ؟ اُسکا کیا؟'' وہ عمارہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا، پر نا چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔ اس سوال پر ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہوا۔

''عمارہ اپنے حصے کا فیصلہ خود کرے گی۔ اگر وہ وہاں نہیں رہنا چاہے گی تو میں اُسے الگ گھر لے دوں گا۔ پر تم میرے بھائی ہو اور ہمیشہ رہو گے، یہ حقیقت کبھی بدل نہیں سکتی، نہ تم سے میرا رشتہ ختم ہو سکتا ہے کبھی۔ مزید ہمیں دکھ نہ دو عمر! پلیز!'' اُس نے عمر کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی تو وہ تڑپ اُٹھا۔

''ایسے مت کہو، میں نے تمہیں اِس طرح کبھی نہیں دیکھا خضر! ایسے مت کرو پلیز!'' اُس نے روکنا چاہا۔

''مجھ سے وعدہ کرو کہ تم امی ابّو کو سچ بتا دو گے۔''

''خضر!''

''پلیز عمر! ساڑھے سات سال سے میں تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں، کیا تم اپنے بھائی کے لیے اتنا نہیں کر سکتے؟'' اور عمر نے ہار مان لی۔

''ٹھیک ہے!'' اُس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''وعدہ کرو!''

''میں وعدہ کرتا ہوں، لیکن پلیز! اِس طرح رو مت میرے سامنے۔ گدھے لگ رہے ہو بالکل!'' آخری بات پر خضر بے ساختہ ہنسا تھا۔

''مجھے جانا ہو گا اب، کافی دیر ہو گئی ہے۔'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ عمر بھی گہری سانس لیکر کھڑا ہوا۔

''خیال رکھنا اپنا! خدا حافظ۔'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''خضر!'' عمر نے پکارا تو وہ رکا اور پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''جو بھی ہوا وہ ایسے ہی لکھا تھا۔ میں کل سب کو سچ بتادوں گا لیکن۔۔۔''اُس نے رک کر خضر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔''لیکن تم خود پر کوئی بوجھ نہیں لوگے۔ جو سزا بھگتنی ہوئی، جو قربانی دینی پڑی وہ میں دوں گا۔ تم نہیں!''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خضر اُسکی وجہ سے ماں باپ سے دور رہے۔ خضر نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اُسے گلے لگالیا۔

''میں اِس بوجھ کے ساتھ اب کیسے زندہ رہوں گا؟''عمر نے اپنے کانوں میں اُسکی آواز سنی۔

''ایسے مت کہو! مت کہو پلیز!''عمر نے اُسکا سر تھپتھپاہوئے کہا۔

اُس روز خضر اُس سے مل کر چلا گیا۔ رات بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ نجانے کیسے وہ کل گھر والوں کو سب بتائے گا؟ اُمید تھی کہ خضر نے گھر والوں کو کچھ حد تک اُسکی آمد پر راضی کر لیا ہوگا۔ پر گھر جا کر خضر نے نہ اُسے کوئی میسیج کیا نہ کال۔ وہ اُسکے میسیج کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

اگلے روز علی الصبح اُسکی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے موبائل ہی دیکھا۔ پر خضر کا کوئی میسج نہ تھا۔ اُس نے خود فون کیا تب بھی نمبر بند جا رہا تھا۔ خیر! دل کڑا کر کے وہ صبح ساڑھے سات بجے کے قریب ہی گھر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

لیکن وہاں پہنچ کر جو اُسکے ساتھ ہوا وہ شاید مر کر دوبارہ بھی واپس آجاتا پر اُس لمحے سے خود کو تا قیامت نہیں نکال سکتا تھا۔

گھر میں لوگوں کا رش تھا، ایسا رش جو موت کے دن ہوتا ہے۔

''امی!۔۔۔''اُسکے لبوں سے بے ساختہ نکلا، پہلا خیال بوڑھی ماں کا ہی آیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ سب کو دھکّا دیتا، مجمع کو چیرتا، دوڑتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔ اُسکے ابّو صوفے پر ڈھے جانے کے سے انداز میں ساکت بیٹھے تھے۔ ماں سامنے رکھے تابوت پر سر رکھے رو رہی تھیں۔ امی، ابّو تو سامنے ہی تھے۔ تو پھر؟ اُسکا دل ڈوبا۔ اُس نے نظریں چاروں جانب دوڑائیں۔ آنے والوں میں خضر کا چہرہ نظر نہ آیا تھا۔ اُسکے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔ اُس نے قدم بڑھانا چاہا پر قدم من من بھر کے ہو گئے۔

''یا اللہ! نہیں! میرا بھائی نہیں۔۔۔''وہ دل میں رب کو پکارتا خود کو بمشکل گھسیٹتے تابوت تک پہنچا۔

''خضر نہیں ہوگا۔ ہاں! وہ نہیں ہوگا۔''خود کو جھوٹی تسلیاں دیتے وہ لاش کے پاس بیٹھا، ماں نے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا، پھر زار و قطار رونے لگیں۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور اُسکا بدترین خدشہ مجسم حقیقت بن کر اُسکے سامنے آن موجود ہوا۔ زندگی نے یہ کیسا بدصورت و تاریک دن دکھایا تھا اُسے؟

''خضر۔۔۔آہ! خضر۔۔۔''وہ پوری قوت سے چیخا تھا۔ اُسکی چیخ نے وہاں کھڑے ہر شخص کا دل دہلا دیا تھا۔

''میرا بیٹا چلا گیا۔۔۔میرا بیٹا!''اُسکی ماں بلک بلک کر روتی جا رہی تھیں۔

''خضر!۔۔''وہ الگ اُسکا چہرہ تھامے رو رہا تھا۔یہ چہرہ کل تک تو بول رہا تھا، کل تو یہ آنکھیں کھلی تھیں۔آج کیا ہو گیا؟

مزید ہم سے دور مت رہو عمر! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔

اُس نے سچ کہا تھا۔اُس نے سچ کہا تھا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔آہ کاش! کاش کہ عمر کو پتہ ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کی بات کر رہا ہے۔ تڑپ تڑپ کر روتا عمر اُسکے چہرے کے ایک ایک نقش کو چھو رہا تھا۔اُس نے ساڑھے سات سال بعد یہ چہرہ دیکھا اور وہ بھی آخری بار۔اور کتنا بدنصیب ہے انسان کہ جان بھی نہیں سکتا کہ کس وقت، کس لمحے، وہ کس شخص سے آخری بار مل رہا ہو؟

کالے ہو جاؤ میری فیزیک سے جل جل کر۔

عمر اُسکی بند آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔اُسکے جملے، اُسکی شرارتیں، دماغ کے پردوں پر گھومنے لگیں۔ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اسی گھر کے لان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے، مووی دیکھا کرتے تھے، راتوں کو پزا آرڈر کر کے صبح امی سے ڈانٹ کھایا کرتے تھے۔وہ اتنی جلدی کیسے چلا گیا؟

''تم سن کیوں نہیں رہے خضر؟ تم اُٹھ کیوں نہیں رہے؟''اُس نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہتے اُسکے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

ہاں! ایک تمہاری پڑھائی ہی مشکل ہے۔ہم تو جیسے پڑھتے نہیں ہیں۔

اسکا اپنائیت بھرا شکوہ یاد آیا۔آج وہ شکوے کیوں نہیں کر رہا تھا؟

میں اِس بوجھ کے ساتھ اب کیسے زندہ رہوں گا؟

اور وہ زندہ نہیں رہ سکا۔وہ سچ میں زندہ نہیں رہ سکا تھا۔وہ اِس بوجھ کو واقعی نہیں سہہ سکا تھا۔

---------+---------+--------

لو شیطان کا نام لیا اور اُسکی خالہ حاضر

عمارہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔آس پاس کوئی نہ تھا۔تو یہ آواز کہاں سے آئی؟

جب سے پیدا ہوئی ہو ہمارے گھر میں ہی پھرتی رہتی ہو، مجھے تکلیف نہیں ہو گی تو اور کس کو ہو گی؟

''خضر! خضر! تم آ گئے؟'' وہ کھڑے ہونے کی کوشش میں لڑکھڑا گئی۔ پر خضر نہیں تھا۔ کہیں نہیں تھا۔ کل ہی تو وہ اُسکے ساتھ ہسپتال گیا تھا، اُسے گھر چھوڑ کر اپنے کسی دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ پھر واپس آیا تو کندھوں پر، خون میں لت پت لاش کی صورت، اُسکی گاڑی کسی ڈمپر سے جا ٹکرائی تھی۔ کاش! کل وہ اُسے کہیں جانے نہ دیتی۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گا تو وہ کبھی اُسے جانے نہ دیتی۔ وہ تھک کر پھر بستر پر بیٹھ گئی۔

تم مجھے نہ ملتی عمارہ تو میں پاگل ہو جاتا۔ جنگلوں میں نکل جاتا اور ہر طرف عمارہ عمارہ پکارتا۔۔۔ لوگ مجھے پتھر مارتے اور میں بس تمہیں یاد کرتا۔

وہ روتے روتے مسکرائی۔

کونسے دو لوگ بھئی؟ آج تک ہم جہاں بھی گئے ہیں، تینوں ساتھ ہی گئے ہیں نا؟ تو پھر آج مجھے کیوں اکیلے چھوڑا؟

اُسکی آوازیں ہر جانب سے آنے لگی تو اُس نے روتے ہوئے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا پر آوازیں نہ رکیں۔

خبردار! میرے اور میرے بھائی کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔ سوکن بن جاؤں گا ورنہ تمہاری۔

بھابھی جی! وہ میرا بھائی پہلے اور آپکا منگیتر بعد میں ہے

کم عقل عمارہ کا بے عقل خضر!

''اللہ!۔۔۔۔اللہ۔۔'' وہ حلق کے بل چیخی اور بستر پر ڈھے گئی۔

~ بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی

ایک شخص سارے شہر کی ویراں کر گیا

---------+---------+--------

عمر نے کیسے اپنے بھائی کی لاش اٹھائی؟ کیسے اُسے قبر میں اتارا؟ یہ صرف وہ جانتا تھا یا اُسکا خدا۔ جب تعزیت کے لیے آنے والے چلے گئے تو اُسکی ماں نے کچھ ایسا کیا جس نے اُسکا دل دہلا دیا۔ وہ اُسکے باپ کے قدموں میں گر گئیں۔

''میرے بیٹے کو میرے پاس رہنے دیں۔ اسکو مجھ سے دور نہ کریں۔'' وہ بلک بلک کے رو دیں۔ حفیظ صاحب ہڑبڑا کر پیچھے ہوئے اور پھر انہیں اٹھایا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' اُنہوں نے روتے ہوئے کہا۔ عمر بس نم آنکھوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''پلیز!''اُنہوں نے التجا کی۔وہ بالآخر مان گئے۔یہی التجا انہوں نے، کچھ عرصے بعد عمارہ کے سامنے بھی کی،اور وہ ایک ماں سے اُسکا دوسرا بیٹا بھی نہیں چھین سکتی تھی۔لہٰذا خاموش رہی۔البتہ اُس نے اپنے ماں باپ کو کہہ دیا کہ جلد از جلد اُسے اسپانسر کر کے اپنے پاس بلالیں۔لیکن تب تک کے لیے اُسے وہیں رہنا تھا۔

خضر کی موت کے دو ماہ بعد اُسکی بیٹی پیدا ہوئی۔اُس کم نصیب یتیم کو دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار ہو گئی تھی۔جس شخص نے سب سے پہلے خضر کی بیٹی کو گود میں لیا وہ عمر ہی تھا۔اِس بچی کا چہرہ پہلی بار دیکھ کر ہی اُسے ایسے لگا جیسے اُسکا دل محبت سے لبریز ہو گیا ہو۔وہ کتنے ہی لمحے اُس ننھی سی پری کو چہرے سے لگائے روتا رہا تھا۔اُسکے پاس سے خضر کی خوشبو آتی تھی۔اُسکا نام اُسکے دادا نے عمائمہ رکھا تھا۔

جب ہسپتال سے عمارہ گھر آئی، تو اُس روز پہلی بار عمر نے اُسے دیکھا تھا۔وہ حتیٰ الامکان کوشش کرتا کہ عمارہ اور اپنے ابّو کے سامنے نہ آئے۔اُسکے ابّو اب بھی اُس سے ناراض تھے۔وہ صرف اپنے کمرے تک محدود رہتا یا پھر اپنی ماں کے پاس بیٹھا رہتا۔

خضر کی موت کے چھٹے ماہ اُس نے بلآخر ایک انٹیریئر ڈیزائننگ فرم کے پچاس فیصد شیئر خرید لیے،اِس طرح وہ اور بھی زیادہ مصروف ہو گیا۔ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اُسکا عمارہ سے بمشکل ایک یا دو بار ہی سامنا ہوا، وہ بھی اُس نے عمر کو سامنے دیکھ کر راستہ بدل لیا تھا۔امی سے ہی اُسے معلوم ہوا کہ عمارہ نے جاب شروع کر دی ہے تاکہ اپنے آپ کو مصروف رکھے۔عمر بھی کوشش کرتا کہ غیر ارادی طور پر بھی اُسکے سامنے نہ آئے۔

لیکن جب عمائمہ نے چلنا سیکھا تو وہ ہمک ہمک کر عمر کے پاس آنے لگی تھی۔عمر اُسکو کو اپنے پاس آنے سے روک نہیں سکا تھا۔نجانے کیوں؟پر ایسا لگتا تھا جیسے اُسے عمر کے پاس سے اپنے باپ کی مہک آتی ہو۔وہ عمائمہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا،اُسکے ہونے سے خضر کے جانے کا غم کچھ کم ہونے لگا۔وہ اُسکی ہر خواہش پوری کرتا، ہر لمحہ اُس سے محبت کرتا، عمارہ دیکھتی، پر اتنا دھیان نہ دیتی کہ اُسکے اپنے غم بہت بڑے تھے۔

پر جب پہلی بار عمائمہ نے عمر کو بابا کہہ کر مخاطب کیا،تب عمارہ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔پر دیر ہو چکی تھی،وہ عمائمہ کو عمر سے دور رکھنا بھی چاہتی تو نہیں رکھ پا رہی تھی،وہ عمر کے بنا اتنا روتی کہ اُسے چپ کروانا مشکل ہو جاتا۔

''امی!آپ نے عمائمہ کو، مجھے بابا کہنا کیوں سکھایا؟''ایک روز عمر نے اپنی ماں کو مخاطب کیا۔وہ دیکھ رہا تھا کہ عمارہ اب اپنی بیٹی کو اُسکے ساتھ دیکھ کر بے چین ہونے لگتی ہے۔

''کیونکہ تم اُسکے باپ کی جگہ ہی ہو۔اور اتنا پیار بھی کرتے ہو اُسکو۔''

''باپ کی جگہ ہوں پر باپ ہوں نہیں میں اُسکا۔''اُس نے سمجھانے کی کوشش کی تو اُسکی ماں نے گہری سانس بھر کر اُسے دیکھا۔

''عمر!'' اُنہوں نے آہستہ سے پُکارا۔

''جی؟''

''کیا تم میری ایک بات مانو گے؟''اُنہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہر بات مانوں گا۔'' اُس نے پیار سے کہا۔

''تم۔۔۔تم عمارہ سے شادی کر لو۔''اِس خواہش پر وہ ہنس پڑا۔دکھ سے، حزن سے، اُداسی سے۔

''میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔''اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

''تو کیا غلط ہے اِس میں؟ وہ پہلے تمہاری منگیتر تھی، تم دونوں پسند کرتے تھے ایک دوسرے کو۔۔۔''

''پہلے کی بات اور تھی امی! پر اب ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ عمارہ ساری زندگی بیوہ تو نہیں رہ سکتی نا؟ اتنی لمبی زندگی ہے اُسکے آگے۔''اُنہوں کہا۔

''ہاں! وہ یقیناً کسی نہ کسی اچھے انسان سے شادی کر سکتی ہے۔پر وہ انسان میں نہیں ہوں گا امی!۔آپ اُسکی اور اُسکے گھر والوں کی اجازت سے اُسکے لیے کسی بہترین انسان کا رشتہ تلاش کر لیں۔''اُس نے کس دل سے یہ بات کہی تھی، وہ ہی جانتا تھا۔

''اور عمائمہ؟ میری پوتی؟ میرے خضر کی نشانی؟ اُسکا کیا؟ اُسکو کیسے خود سے دور کروں؟''اِس سوال پر اُسکا دل ڈوبا۔

''کیسے برداشت کروں گی اُسکی جدائی میں؟''عمر خاموش رہا۔ اُنکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''امی! وہ عمائمہ کی ماں ہے۔ہم اُسے، اُسکی اولاد سے دور نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اپنے دل کے سکون کے لیے عمارہ پر کوئی زبردستی کر سکتے ہیں۔اُس نے پہلے ہی بہت تکلیفیں جھیلی ہیں۔اُسے اُسکا فیصلہ خود کرنے دیں۔''اُس نے تحمل سے سمجھایا تو وہ خاموش ہوئیں، بات اُنکے سمجھ میں آگئی تھی۔

''کاش! کاش تم ایسا نہ کرتے عمر۔''اُنہوں نے دکھ سے کہا تو عمر ساکت رہ گیا۔اُس نے اب تک اپنے ماں باپ کو سچ نہیں بتایا تھا۔اور اب وہ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔

---------+---------+--------

وہ اُسکی زندگی کا ایک اور بدترین دن تھا۔عمارہ اور اُسکی بیٹی دونوں ہی کو اُسکے گھر والوں نے سپانسر کر دیا تھا، جسکی بدولت کل وہ دونوں ہمیشہ کے لیے کینیڈا جا رہے تھے۔عمر کے ماں باپ اِس فیصلے پر خاموش تھے، پر وہ پورے گھر میں جلے پیر کی بلی کی مانند چکراتا پھر رہا تھا۔دکھ عمارہ کے جانے کا نہیں تھا، دکھ عمائمہ کی جدائی کا تھا۔

ماں کو تو اُس نے سمجھا دیا تھا کہ ہمیں برداشت کرنا ہو گا، لیکن اب خود برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو بلآخر اُس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ عمارہ، عمائمہ کا سامان باندھ رہی تھی، جب وہ کمرے میں داخل ہوا اور دروازے پر رک کر کھڑا ہو گیا۔

''عمارہ۔۔۔'' کپڑے تہہ کرتے اُسکے ہاتھ تھمے۔ پورے دس سالوں بعد عمر نے اُسے مخاطب کیا تھا۔ پورے دس سالوں بعد اُسکے کانوں نے اُسکی زبان سے اپنا نام سنا تھا۔ اور اُسکی روح تک جل اُٹھی تھی۔ جلتی آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ عمر نے نظریں جھکا دیں۔ وہ اُسکے بھائی کی بیوہ تھی۔ احترام فرض تھا!

''کیوں آئے ہو؟'' اُس نے ہاتھ باندھتے ہوئے براہِ راست اُس سے پوچھا۔

''میں۔۔۔ میں ایک درخواست کرنے آیا ہوں۔'' اُس نے نظریں جھکائے ہوئے ہی کہا۔

''کیسی درخواست؟''

''تم۔۔۔ مت جاؤ پلیز!'' اُس نے کہہ دیا۔

''اور تم ایسی درخواست کرنے والے ہوتے کون ہو؟'' اِس سوال پر عمر نے سرخ آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''عمائمہ کا باپ۔۔۔'' اِس جواب پر وہ بے ساختہ ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ عمر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''وہ خضر کی بیٹی ہے، اور اُسکا باپ مر چکا ہے۔ میری بیٹی پر کسی قسم کا کوئی حق جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے ہی تم اُسے اپنی جتنی عادت ڈال چکے ہو، میرے لیے اُسے سنبھالنا مشکل ہو گا۔'' اُس نے تلخی سے کہا۔

''میں اُس سے ایک باپ جتنی ہی محبت رکھتا ہوں۔ تم خود مان رہی ہو کہ اُسے میری عادت ہے، اپنی بچی کا سوچو کہ وہ کیسے رہے گی؟''

''میں جانتی تھیں کہ تم میری بیٹی کے ذریعے مجھے کمزور کرنے کی کوشش کرو گے۔ بہت اچھے سے جانتی تھی میں۔'' وہ نفرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو تم سے التجا کر رہا ہوں کہ۔۔۔۔''

''میری بیٹی سے دور رہو عمر! مت حق جتاؤ اُس پر، اُسے تم سے دور کرنے کے لیے ہی لیکر جا رہی ہوں یہاں سے۔ ورنہ کسی روز اپنی کسی ضرورت کے لئے اُسے بھی چھوڑ جاؤ گے، تب کیسے رہے گی وہ؟ اور تم جیسا خود غرض تو یہ ضرور کرے گا۔ جس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کا نہیں سوچا، دوست جیسے بھائی کا نہیں سوچا، میرا نہیں سوچا، وہ میری بیٹی کو کیوں تکلیف نہیں پہنچائے گا؟'' بولتے بولتے اُسکا گلا رندھ گیا۔ عمر خاموش رہا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔ میرے لیے مشکل مت کھڑی کرو۔''

''میری بیٹی کو مجھ سے دور مت کرو۔ میں نہیں رہ سکوں گا۔ پلیز!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تو ایک لمحے کو عمارہ خاموش ہوئی۔

''ہمیں بھی لگتا تھا کہ تمہارے بنا نہیں رہ سکے گے، پر گزار لیے اتنے سال۔ یہ بھی لگتا تھا کہ خضر کے بنا نہیں رہ سکے گے۔ پر رہ رہے ہیں۔ تو تم بھی رہ لو گے۔'' اُس نے حتمی فیصلہ سنایا اور وہاں سے چلی گئی۔ عمر وہیں بیٹھ کر تڑپ تڑپ کر رو دیا۔ اُس رات بس عمارہ نے ایک مہربانی یہ کر دی کہ عمائمہ کو عمر کے پاس رہنے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ کل کے بعد سے وہ کس قدر عمر کے لیے روئے گی، کم از کم آخری بار اُسکی بیٹی ایک باپ کی محبت محسوس کر لے۔ اِس بات کا وہ مانتی تھی کہ عمر اُسکی بیٹی سی باپ جتنی محبت رکھتا ہے، اور وہ اُسے ہمیشہ کے لیے عمر کے حوالے کر کے کوئی مشکل نہیں جھیل سکتی تھی۔

اگلے دن عمر نے ایک آخری التجا کی کہ وہ ایئرپورٹ ساتھ جائے گا۔ وہ راضی نہ ہوتی پر عمائمہ اُسکی گود سے اُترنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ دل پر جبر کر کے راضی ہو گئی۔ اور بلآخر ایئرپورٹ پر آخری بار اُن دونوں کو الوداع کہہ کر وہ وہاں سے لوٹ آیا۔ یہ اُسکی سزا تھی اور اُسے ہی جھیلنی تھی۔

پر اُس روز ایک شخص نے اُسے وہاں سے روتے ہوئے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن عُمر اِس بارے میں نہیں جان سکا۔

اور وہ شخص اُسکا پرانا دوست نوید عالم تھا۔

وہ دن جہاں سے ان سب کی شروعات ہوئی تھی۔

وہ دن جو سب کی قسمت بدلنے کے لیے اُنکی زندگی میں آیا تھا۔

---------+---------+--------

''میں اپنے کہے ایک ایک لفظ پر شرمندہ ہوں نوید!'' سمندر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُسکے بالوں کو بکھیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ دور کہیں کسی مسجد میں ترنم کے ساتھ نعت پڑھی جا رہی تھی۔ رمضان کی آخری ساعتیں تھیں، پھر تو اگلے سال ہی نصیب ہونا تھا یہ بابرکت مہینہ، اور نہ جانے اُس اگلے رمضان میں کون باقی رہے اور کون نہیں؟

''میں تمہاری وضاحت سننا چاہتا ہوں۔'' سنجیدگی سے کہے نوید کے جملے نے علی کو حوصلہ دیا۔

''میں اپنے باپ کی نظروں میں کبھی وہ مقام حاصل نہیں کر سکا جو میں چاہتا تھا، میں کبھی اُنکا اچھا بیٹا نہیں بن سکا۔ میں کبھی وہ بیٹا نہیں بن سکا جس پر وہ فخر کریں۔ میں نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں گزاری نوید! اپنے باپ کے لیے گزاری۔ میری زندگی میں نے نہیں، بلکہ میرے ابّا نے گزاری۔'' وہ کیا بتا رہا تھا اور کیوں؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پر نوید خاموشی سے سن رہا تھا۔

''میں نے کبھی کوئی فیصلہ خود سے نہیں لیا، ہمیشہ ابّا نے میرے فیصلے لیے۔ مجھے کیا پہننا ہے؟ کب سونا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کس کے ساتھ بیٹھنا ہے اور کس کے ساتھ نہیں؟ کس سے بات کرنی ہے اور کس سے نہیں؟ یہ سب فیصلے ابّا کرتے رہے۔ مجھے کبھی کوئی فیصلہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ شاید مجھ پر

بھروسہ ہی نہیں کرتے تھے۔اُنکا بھروسہ جیتنے کے لیے میں نے اپنی آدھی زندگی لگادی اور کچھ حاصل نہ ہوا نوید! میں کبھی اُنکی نظروں میں بہترین نہیں بن سکا۔''اُسکے الفاظ اتنے اپنے اپنے سے کیوں تھے؟ یہ کہانی جانی پہچانی سی کیوں لگی تھی؟ نوید اب بھی چپ رہا۔

''میں نے جب یہ سنا کہ صنوبر کا قتل ہوا ہے،تب مجھے فطری غصّہ آیا،ابّا نے صنوبر کو انصاف دلوانے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا،لیکن جس روز عمر نے آکر بتایا کہ صنوبر ہی وہ لڑکی تھی، جسے ہم نے بورن فائر والی رات دیکھا تھا اور یہ بات جب میں نے ابّا کو بتائی،نوید تب۔۔۔تب ابّا نے پہلی بار مجھے فخر سے دیکھا تھا۔باوجود اِسکے کہ وہ دو سالوں سے مجھ سے ناراض تھے،اُنہوں نے مجھے کہا کہ وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے۔اُنہوں نے پہلی بار میرا ساتھ دیا تھا،پہلی بار اُنہوں نے مجھے میری مرضی کرنے دی اور میرے ہر کام کو کھل کر سپورٹ کیا۔مجھے یہ موقع زندگی نے پہلی بار فراہم کیا تھا نوید! اور میں اُسے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔میں صنوبر کو انصاف دلوا کر اپنے ابّا کی نظروں میں کوئی مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔شاید اِسی لیے،جب تم سب باری باری پیچھے ہٹنے لگے،تب مجھے لگنے لگا جیسے میں ایک بار پھر سے ابّا کی نظروں میں ناقابلِ بھروسہ ہو جاؤں گا۔یہ سچ ہے کہ میں خود غرض ہو گیا تھا،اور اپنی اِس خود غرضی میں،میں نے یہ نہیں دیکھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں،اور کیا کر رہا ہوں؟ مجھے تو اِس بات کی بھی فکر نہیں رہی کہ مقدّم کہاں چلا گیا ہے؟''وہ چپ ہوا۔نوید کو پہلی بار اُس پر افسوس ہوا۔بھلا اُس سے زیادہ کون اِس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ ماں باپ کی توجہ اور تعریف حاصل کرنے کے لیے اولاد کس حد تک چلی جاتی ہے؟

''میری نیت صنوبر کو انصاف دلانے سے زیادہ اپنے باپ کی نظروں میں معتبر ہونے کی تھی۔میری نیت ہی میں کھوٹ تھا،اِس لیے نہ صنوبر کا قاتل ملا اور نہ ہی اُسے کوئی سزا ہوئی۔بے شک عاصم مارا گیا تھا،پر ہم سب جانتے ہیں کہ وہ واحد مجرم نہیں تھا۔''وہ پھر رکا۔

''اُس روز جو ہوا،نہیں ہونا چاہیے تھا۔پر جو میں نے تم سے کہا میں اُسکے لیے۔۔۔۔''

''تم صنوبر کے بارے میں کیسے جانتے تھے؟''اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فضا میں نوید کی آہستہ مگر سرد آواز گونجی،علی نے سر اٹھا کر اُسکے سوال کو نا سمجھی سے سنا۔

''کیا مطلب؟ وہ میرے ڈرائیور کی۔۔۔''

''تم میرے اور صنوبر کے بارے میں کیسے جانتے تھے؟''نوید نے اُسکی بات کاٹی تو وہ تھم گیا۔

''بلکہ تم سب ہی کیسے جانتے تھے؟''نوید نے چہرہ اُسکی جانب موڑا اور بغور اُسے دیکھا۔''جبکہ یہ بات تو میں نے خود سے بھی چھپا کر رکھی تھی۔''وہ سنجیدہ تھا۔علی اُسے دیکھتا رہا،کچھ عجیب سی نظروں سے۔

''تم جانتے ہو؟ جب تم پہلی بار مجھے یہاں، اسی سڑک پر ملے تھے، تب تمہاری آنکھوں میں میرے لیے فکر تھی۔ جب تم نے اُس روز مجھے اپنے آفس میں بلا کر، مجھ سے میرا مسئلہ پوچھا تھا، اُس روز تم پرانے دوست لگے تھے۔ جب میرے ساتھ ہسپتال میں تھے، تب صرف شناسا لگے تھے اور آج پھر سے کوئی اجنبی لگ رہے ہو۔'' آخر میں وہ ہنسا، نوید بس خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''میں تمہارا کوئی انداز نہیں پہچان پا رہا نوید! شاید اِس لیے کہ اب ہم دوست نہیں ہیں۔'' اس آخری بات پر لمحے بھر کو نوید کا چہرہ نرم پڑا۔

''لیکن تب تم میرے دوست تھے، صرف میرے ہی نہیں، بلکہ ہم سب کے۔ ہم تمہیں، تم سے زیادہ جانتے تھے۔ تمہارا ہر ہر انداز پہچانتے تھے۔ تمہارے ساتھ نہ ہو کر بھی تمہارے بارے میں سب جانتے تھے۔ تم نہ بھی کہتے تب بھی ہمیں اچھے سے اندازہ تھا۔ پر ہم خاموش رہے کہ تم ہمیں خود بتاؤ گے، کیونکہ تمہیں اپنے راز بھی بانٹنا نہیں آتا'' اس آخری بات پر نوید کا چہرہ تاریک ہوا، جو علی کی نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔ پر اُس نے بات جاری رکھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے نوید؟ تم ہمارے سامنے ہنستے، مسکراتے اور سب سے زیادہ خوش اخلاق بن کر رہے، تو کیا ہم جانتے نہیں تھے کہ تم کچھ چھپاتے ہو؟'' سولہ سال پہلے وہ دوست بنے تھے اور آج سولہ سال بعد نوید عالم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ ایک بند کتاب کی مانند ہونے کے باوجود بھی اُسکے دوستوں نے اُسے پڑھ لیا تھا۔ آگہی کا یہ لمحہ کڑا تھا، وہ بھونچکا بیٹھا رہا، پہلی بار وہ ساکت نظروں اور حیران چہرے سے علی کو دیکھ رہا تھا۔

''ہم نہیں جانتے تھے کہ تم کیا چھپاتے ہو؟ تمہیں کیا پریشانی ہے؟ کیا دکھ ہے؟ پر اتنا ضرور جانتے تھے کہ تم وہ بالکل نہیں ہو جو تم ہمیں دکھاتے ہو؟ تمہیں پڑھنا رضا کو پڑھنے سے زیادہ مشکل تھا، تمہیں جاننا رضاالٰہی کو جاننے سے زیادہ ناممکن تھا لیکن اِسکے باوجود بھی ہم نے تمہیں جان لیا۔ پر نوید!۔۔۔۔'' وہ رکا، نوید سانس روکے اُسے سنے گیا۔ ''آج کے نوید کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں پڑھ سکتا، نہ جان سکتا ہے۔ آج تم نے خود پر قفل لگا دیا ہے۔ ہم نہ اُسے توڑ پا رہے ہیں اور نہ تم تک پہنچ پا رہے ہیں۔'' پہلی بار، شاید پچھلے دو ماہ میں پہلی بار علی کو لگا کہ اُس نے نوید کی آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی جھلک دیکھی ہو۔ یا شاید اُسکا وہم ہو؟ نوید نے فوراً رخ بدل کر سامنے سڑک کی جانب کر دیا۔ علی نے دکھ سے اُسے دیکھا، اِس شخص کو آج بھی کہنا نہیں آیا تھا۔

''کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم کس تکلیف سے گزر رہے ہو؟'' بلآخر علی نے وہ سوال کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ گو کہ اُسے سب معلوم ہو چکا تھا، پر وہ چاہتا تھا کہ اُسکا دوست آج سب کہہ لے۔

''علی!'' نوید نے اُسکی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ مگر مضبوط آواز میں کہا۔ علی دیکھتا رہا کہ شاید وہ کچھ کہے۔

''میں خاموش ہوں تو مجھے خاموش ہی رہنے دو۔'' فضا میں اُسکی آواز گونجی۔

''میں کہنے پر آیا تو کبھی خاموش نہیں ہو سکوں گا۔'' علی کا دل تھم گیا۔ وہ ایک لفظ بھی مزید کہنے کے قابل نہ رہا۔ وہ ایسا ہی تھا، کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ نوید کو اظہار کرنا نہیں آتا۔ بھلا اِس سے زیادہ وہ اپنے درد کا اور کیسے اظہار کرتا؟ اُسکے ایک جملے نے علی کو کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

''تمہیں کوئی اور بات نہیں کرنی تو میں چلتا ہوں۔'' اپنے خول میں واپس بند ہوتا نوید جانے کیلئے کھڑا ہوا، تو علی بھی خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

''صبح تک تمہیں تمہاری مطلوبہ معلومات مل جائیں گی۔'' پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے نوید سنجیدگی سے بولا۔ دو قدم کا فاصلہ تھا دونوں کے درمیان، پر علی کو لگا جیسے وہ سمندر کے دو سروں پر کھڑے ہوں، وہ ایک کنارے پر ہو اور نوید دوسرے۔ آج وہ اُسے خود سے بہت دور نظر آیا تھا۔

''تمہارا شکریہ!'' علی نے سر جھکائے بس اتنا ہی کہا۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں علی!'' اُس نے یکدم ہی کہا تو علی نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ تو اُسکے جانے کی امید کر رہا تھا، اِس جملے کی توقع نہیں تھی اُسے۔

''بلکہ میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ ناراض ہونا، کسی سے جھگڑنا یا غصّہ ہونا۔ اِن سب کے لیے اب میرے پاس وقت نہیں بچا ہے، نہ میں لوگوں کے رویوں کو سوچتا ہوں اور نہ کڑھتا ہوں۔ مجھے اپنے بہت سے کام ہیں، اور میں اُنہی میں مصروف رہتا ہوں۔ کسی کے کہے جملے کو یاد رکھنے کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ تو اِس لیے، تم یہ سوچنا چھوڑ دو کہ میں ناراض ہوں۔'' اُس کا لہجہ عام سا ہر احساس سے عاری سا تھا۔

''ہاں! میں جانتا ہوں کہ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ سب چیزیں معنی نہیں رکھتی پر نوید!'' علی رکا، نوید سنجیدگی سے اُسے دیکھتا رہا۔ ''مجھے تمہیں یہ بتانا تھا کہ۔۔۔ کہ تم میرے بھائی ہو، دوست ہو اور مجھے بہت عزیز ہو۔ خود کو اکیلا مت سمجھو۔'' نوید تھم گیا، رک گیا، ٹھہر گیا۔

نہیں! مجھے تمہیں یہ بتانا ہے کہ تم میرے کتنے پیارے بھائی ہو، اور مجھے کتنے عزیز ہو؟ تم میرے بچے ہو، مجھے بہت پیارے ہو۔ خود کو تکلیف نہ پہنچاؤ!

کانوں میں وحید کی آواز گونجی۔ کچھ ملتے جلتے الفاظ گونجے۔ جو کئی سال پہلے اُسکے لیے مرہم کا کام کر گئے تھے۔ اور آج علی کے الفاظ۔۔۔

''تمہیں میری ضرورت ہو تو بلا جھجھک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔'' وہ اپنی طرف سے اُسکا دکھ کم کرنا چاہتا تھا۔

''جب ضرورت تھی تب نہیں کہا تو اب کیوں کہوں گا؟'' نوید نے خود کو کہتے سنا، علی اُداسی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُسکا دل صاف کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یا شاید وہ واقعی بے حس ہو چکا تھا۔

''چلتا ہوں اب، خدا حافظ!'' وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔ علی، اُسے خود سے دور ہوتا دیکھتا رہ گیا۔

~ہم کے ٹھہرے اجنبی، اتنی ملاقاتوں کے بعد

پھر بنے گے آشنا، کتنی مداراتوں کے بعد؟

~فیض احمد فیض

---------+---------+--------

''میں سمجھتا تھا کہ شاید میں تقدیر بدل لوں گا۔ اپنوں کو بڑی آزمائش سے بچالوں گا۔ لیکن۔۔۔'' رات خنکی سی ہو گی تھی، مقدّم اپنی گاڑی میں رکھی جیکٹ لے آیا اور عمر کو دے دی، اب وہ اُسکی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھا، کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے بول رہا تھا۔ مقدّم سانس روکے اُسے سن رہا تھا۔

''کاتب تقدیر نے مجھے یہ بتایا کہ خدا وہ ہے، میں نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ گھر چھوڑ جانے سے میں عمارہ کو بیوہ ہونے جیسی تکلیف سے بچالوں گا۔ پر اُسکی قسمت میں بیوہ ہونا لکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا میرے ماں باپ کو اپنے جوان بیٹے کا دکھ سہنا نہیں پڑے گا، اُسکو پل پل مرتے نہیں دیکھنا پڑیگا۔ پر انکو اپنے بیٹے کا دکھ سہنا تھا۔ موت لکھی تھی مقدّم! پر میری نہیں۔۔۔ میرے بھائی کی۔ یہ غم تو میرے پیاروں کے حصے میں لکھا جا چکا تھا۔ کاش! مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں کبھی جاتا ہی نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی بڑی بیماری کے بعد بھی زندہ رہوں گا، تو میں اپنا وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی گزارتا، خضر کے ساتھ اُسکی زندگی کہ وہ آخری دن گزارتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آٹھ سال بعد جب وہ مجھے ملے گا تو وہ میری اُس سے آخری ملاقات ہو گی۔ کاش! میں وہ وقت خضر کے ساتھ گزارتا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے اپنی کون کون سی خوشیاں مار کر اور دل پر کتنا جبر کر کے عمارہ سے شادی کی ہو گی؟ اگر میں نہ جاتا اور سب کو سچ بتا دیتا تو شاید سب کو یہ نہ سہنا پڑتا اور ہو سکتا ہے۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ میرے دوست بھی الگ نہ ہوتے۔ شاید! وہ میری بیماری کی خاطر ہی ایک دوسرے کو نہ چھوڑتے۔ صحیح کہتا تھا خضر، مجھے کوئی حق نہیں تھا دوسروں کے حصّے کے فیصلے لینے کا۔ میں نے دوسروں کی طرف سے تمام فیصلے کر کے اُنکے لیے مزید مشکلات کھڑی کر دیں۔ اُنہیں اپنے اچھے برے ہر فیصلے کا مکمل اختیار تھا۔ پر میں نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لیکر خود کو خدا سمجھا۔ اور دیکھو! میرے ساتھ کیا ہوا؟'' وہ رکا اور گہری سانس لیکر گم صم بیٹھے مقدّم کی طرف دیکھا۔

''خضر کا دکھ نہیں کم ہوتا یار! نہ وہ بھولتا ہے اور نہ واپس آسکتا ہے۔'' سرخ آنکھوں سے کہتے اُسکی آواز بھرا گئی۔ مقدّم نے بے ساختہ ہی اُسے ساتھ لگایا۔

''میں تمہارے لیے خضر نہیں بن سکتا اور نہ میں کبھی اُسکی جگہ لے سکتا ہوں، پر میں تمہارا بھائی تو ہوں نا؟'' وہ اُسکا دکھ واقعی کم نہ کر سکتا تھا پر کچھ تو کہنا تھا۔

''ہاں! تم میرے بھائی ہو۔ ہمیشہ سے ہو۔'' وہ روتے روتے ہنسا۔

''تم نے غلط کیا، میں مانتا ہوں۔ پر تمہاری نیت غلط نہ تھی۔ اب جو ہوا اُسکے لیے خود کو قصوروار نہ ٹھہراؤ۔'' مقدّم نے اُسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ عمر بس سر ہلاتے ہوئے اُس سے الگ ہوا۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے عمر کی نم آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں! اب ہوں۔''اُس نے اتنا ہی کہا۔

''ایک بات کہوں؟'' مقدّم نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہو!''

''تم نے اپنے ماں باپ کو اب تک سچ کیوں نہیں بتایا؟''

''نہیں! بتا سکا۔''

''کیوں؟''

''ایک کو سچ پتہ چلا تھا تو وہ اِس دنیا سے ہی چلا گیا۔ نہ معلوم باقی سب کے ساتھ کیا ہو؟''

''عمر!''مقدّم نے گہرا سانس خارج کیا۔''تم پھر وہی کر رہے ہو؟ سچ جاننا اُنکا حق ہے۔ تم پھر اُن سے یہ حق چھین رہے ہو؟'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں مقدّم! میں اُن سے سچ جاننے کا حق نہیں چھین رہا۔ اور نہ میں اِس بار ایسا کچھ کروں گا۔ میں فلحال اُنہیں کچھ نہیں بتا رہا کیونکہ۔۔۔''وہ رکا۔

''کیونکہ؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا، اس بار مقدّم کو اُسکی آنکھوں میں خوف نظر آیا۔

''خضر کی موت کے بعد سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ سب کچھ جاننے کے بعد اتنا پریشان تھا کہ گاڑی ٹرالر سے ٹکرا دی۔ میں مزید دکھ نہیں جھیل سکتا۔ مجھے کچھ وقت چاہیے، میں پھر سب کچھ بتا دوں گا سب کو۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! پر دیر نہ کرنا۔''مقدّم نے بس اتنا ہی کہا۔ کافی دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔

''میں اپنی تکلیفوں پر بہت کڑھتا تھا، پر جب سے تم لوگوں سے ملا ہوں۔ اپنا غم بھی چھوٹا لگنے لگا ہے۔''مقدّم کی دکھی آواز فضا میں گونجی۔

''علی کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو، گھر ٹوٹنا آسان بات نہیں ہوتی۔ رضا کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ نجانے وہ یہاں تک کن مشکلات سے گزر کر پہنچا ہو گا؟ اور پتہ نہیں وہ دنیا سے اتنا کٹ کر کیوں رہنا چاہتا ہے اور نوید۔۔۔''یہاں آ کر وہ رک گیا۔

''اُسکے ساتھ جو قسمت نے کیا، اُسے تو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔''مقدّم نے آہستگی سے بات مکمل کی۔

''مجھ سے اپنے بھائی کی موت برداشت نہیں ہو پا رہی، میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔''عمر کہتے کہتے رکا، مقدّم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''نوید نے اپنی اولاد کا قتل کیسے برداشت کر لیا؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں برداشت کر پایا۔۔۔نہیں کر سکا وہ۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''اُسکو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے اپنے دو بچوں کو قبر میں اُتارا ہو گا پر میں اور تم۔۔۔جو اُسے جانتے ہیں، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اُسکی شخصیت، اُسکا اندر باہر حتیٰ کہ اُسکا چہرہ تک بدل گیا ہے۔اِس چہرے کو ہم نے کبھی اتنا سخت نہیں دیکھا عمر! ہم کبھی اُس سے بات کرنے سے پہلے اتنا نہیں سوچتے تھے۔ٹھیک ہے! شروع میں ہم ایک دوسرے سے بات کرنے میں بھی ہچکچا رہے تھے، درمیان میں دس سالوں کا فاصلہ تھا، پر آہستہ آہستہ ہماری جھجھک ختم ہو گئی کہ ہم پرانے دوست تھے۔پر نوید سے تو کوئی بھی بات نہیں کر سکا۔''مقدّم نے اُسکے دل کی بات کہہ دی۔

''میں ایک بات بتاؤں تمہیں؟''عمر یکدم کی سیدھا ہوا۔کچھ دیر پہلے والی اُسکی حالت اب بہتر تھی۔

''کیا؟''

''ایک شخص ہے جو اُس سے بات کر سکتا ہے، وہ بھی بنا جھجھکے، ہچکچائے اور بناڈرے۔''عُمر نے کہا۔

''حسین کی بات کر رہے ہو؟''مقدّم سمجھ گیا۔

''ہاں! ایسا مجھے لگتا ہے کہ وہ ہی ہے جو شاید نوید کو مکمل نہ صحیح، پر کچھ حد تک پہلے جیسا بنا سکتا ہے۔پر میں نے اُسے ابھی تک نوید سے بات کرتے نہیں دیکھا۔''عمر نے سوالیہ نظروں سے اُسکی جانب دیکھتے ہو کہا۔''کیا تم جانتے ہو اِس بارے میں کچھ؟''

''ایسا ہے عمر! کہ جھگڑے والے روز نہ میں یہاں تھا اور نہ تم، اُسکے بعد ہم دونوں ہی یہاں سے کئی سال غائب رہے۔درمیان میں کیا کچھ ہوا؟ یہ صرف وہ چاروں ہی جانتے ہیں، اور ہمیں اتنا ہی معلوم ہے، جتنا اُنہوں نے بتایا۔پر میں حسین سے کہوں گا کہ وہ نوید سے بات کرنے کی کوشش کرے۔''اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کی۔

''ہونہہ!۔۔۔''اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم عمائمہ کے جانے پر بہت دکھی ہو؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا تو عمر نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''تم اُسکے جانے پر دکھی ہو؟''اُس نے دوبارہ پوچھا۔

''ظاہر ہے۔''وہ اِس سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔

''خضر کی موت بھی تمہارے لیے تکلیف کا باعث ہے؟''

''ہاں!''وہ اُسکے سوالات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''اپنے باپ کی ناراضگی بھی تمہارے لیے نا قابلِ برداشت ہے؟''

''تم کس طرح کے سوال کر رہے ہو؟''

''کیونکہ تم نے ان سب میں عمارہ کا ذکر نہیں کیا۔''اُس نے کہا تو عمر ساکت رہ گیا۔

''وہ میرے بھائی۔۔۔کی۔۔۔بیوہ۔۔۔''وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر کہہ نہیں پایا۔پھر خاموشی سے سر جھکا گیا، مقدم اُسے دیکھتا رہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ، تم سب سے زیادہ تکلیف میں عمارہ کے جانے سے ہو۔اُسکی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت تم سے دیکھی نہیں جا رہی۔پر تم اُس سے بات کرنے اور اُسے سچ بتانے سے ڈرتے ہو۔ایم آئی رائٹ؟(کیا میں صحیح ہوں؟)''عمر ایک لفظ نہ بول سکا۔مقدّم واقعی اُسے، اُس سے زیادہ جانتا تھا۔

وہ خاموش کا خاموش رہ گیا، عمارہ اُسکی زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت تھی۔اُسکا دیواروں سے جھانکنا، اُسکے لیے اپنے ماں باپ سے بات کرنا، اُس سے منگنی، اُسکے ساتھ گزرے کچھ لمحے ہی صحیح، آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

تیرے سنگ گزرے، میرے جو لمحے

تجھ سے وہ مانگوں۔۔۔۔

اور پھر اُسکے لہجے اور آنکھوں میں موجود عمر کے لیے نفرت۔۔۔۔آہ! تمام غموں سے بڑا تو یہی غم تھا۔کیا بیتی ہو گی عمارہ پر جب وہ اُسے چھوڑ کر گیا ہو گا؟ جیسے اُس نے آج عمارہ سے رک جانے کی التجا کی تھی، ایسی ہی ایک التجا کبھی اُس نے بھی تو عمر سے کی تھی۔تب وہ نہیں رکا تو اب وہ کیوں رکتی؟

میں طلبگار ہوں، تجھ سے تھوڑی مہلت مانگوں۔

تو وہی میں وہی، ہے مگر بے بسی

زندگی کو گزرا اب کیسے کریں؟

مقدّم نے یہ سوال پوچھ کے اُسکے دل میں عمارہ کی یاد ایک بار پھر سے جگا دی تھی۔وہ جسکو عمر نے دل میں کہیں دفن کر دیا تھا، اُسے مقدّم نے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔وہ محبت جس نے سولہ سال پہلے دل پر دستک دی تھی، وہ آج پھر دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

دل کے دروازے پہ، پھر سے تیری دستک مانگوں

تجھ سے ہی پھر اپنی، پہلی سی محبت مانگوں

---------+---------+--------

خاموش سنّاٹے بھری فضّا میں بھاری جوتوں کی آواز گونج رہی تھی۔ سیاہ جینز پر سفید پولو ٹی شرٹ پہنے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا نوید عالم، اُس مخصوص گھر کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں وہ فقط سال میں ایک دو بار آتا تھا۔ گھر کے دروازے پر رک کر لاک میں چابی ڈالتے، اُس نے ایک نظر پلٹ کر پیچھے تاحد نگاہ نظر آتی پارکنگ لاٹ کی جانب دیکھا۔ اتنی ساری بند، اندھیر گاڑیوں کے درمیان بھی اُسے وہ سیاہ گاڑی نظر آگئی، جو نہ جانے کب سے اُسکا پیچھا کر رہی تھی؟ وہ طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے سر جھٹک کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر آکر اُس نے دروازہ اچھے سے لاک کیا اور پھر ایک گہرا سانس بھر کر تائیدی نگاہ گھر پر ڈالی۔ ہر شے پر سکوت طاری تھا۔ اُسکے باپ کے مرنے کے بعد سے وہاں کوئی نہیں آتا تھا۔

ہاں! اُسکے باپ کا گھر، وہ گھر جو وحید نے بیچ دیا تھا۔ وہی گھر نوید عالم نے بہت عرصے بعد دوبارہ خرید لیا تھا۔ گو کہ پچھلے مالکان نے تھوڑا بہت رنگ و روغن کروایا تھا لیکن گھر اب بھی اپنی اصل حالت میں موجود تھا۔

دروازے کے پاس رکھے اسٹینڈ پر اُس نے جوتے اُتار کر رکھ دیئے کہ یہ اُسکے باپ کے گھر کا اصول تھا، اُنہیں گھر میں جوتے، چپل وغیرہ پسند نہ تھے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچن کی طرف بڑھتے، اُسے جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی تو رک کر موبائل باہر نکالا۔ اُسکے ذاتی نمبر پر میسیج آیا تھا۔ اُس نے بے قراری سے سکرین کھولی۔ ایک اُمید تھی کہ شاید بشریٰ ہو۔ پر ایسا نہیں ہوا۔ موبائل نیٹ ورک والوں نے کوئی اشتہاری پیغام بھیجا تھا۔ اُس نے بے زاری سے موبائل کاؤنٹر پر رکھا، اور ڈسپنسر کی جانب بڑھا۔ پاس رکھا پانی کا کین اُٹھا کر اُس پر لگایا اور ڈسپنسر آن کر کے، پانی ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اُسی لمحے اُسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ جھٹکے سے پلٹا۔ اِس سے پہلے کہ اُسکا ذہن کچھ سمجھ پاتا یا وہ کوئی ردعمل دیتا کسی نے زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر مارا تھا۔ تھپڑ اِس قدر شدت سے پڑا تھا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔ اگلے ہی لمحے سامنے کھڑے شخص نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا اور دیوار کے ساتھ اُسکی پشت لگاتے ہوئے، اُسے جبڑوں سے پکڑا۔

"کیا سمجھا تھا تم نے؟ میں بیوقوف ہوں؟" ایک بازو اُسکے گلے پر رکھ کر اُسے مزاحمت سے روکے ہوئے، اُس شخص نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے پوچھا تھا، پر----

نوید عالم مزاحمت کر ہی کب رہا تھا؟

---------+---------+--------

نوید سے ملاقات کے بعد وہ گھر آیا تو کافی دیر ہو گئی تھی، رمضان کے بالکل آخری دن تھے تو رات بھر سڑکوں پر رش رہتا تھا، اوپر سے ٹریفک اتنا کہ پندرہ منٹ کا راستہ ایک گھنٹے میں طے کیا جائے۔ گھر آیا تو سارے گھر میں نشمیہ کے تڑپ تڑپ کر رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ گھبرا کر سفیر صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا۔ جانے سے پہلے وہ اُسے ابّا کے ساتھ ہی سلا کر گیا تھا۔ کمرے میں پہنچا تو سفیر صاحب اُسے سینے سے لگائے، اُسکا سر کندھوں پر رکھے اُسے چپ کروانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔ علی تیزی سے اُسکی طرف بڑھا، پر نشمیہ کے اگلے جملے پر اُسکے قدم تھمے۔

''امی! مجھے امی کے پاس جانا ہے۔ امی کو بلائیں۔'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' ہمت کر کے سفیر صاحب سے پوچھ ہی لیا۔

''کچھ نہیں بس! نیند میں ڈر گئی ہے۔'' اُنہوں نے بتایا تو وہ سر ہلاتے اُنکے پاس آیا اور نشمیہ کو اُنکی گود سے لے لیا۔

''کیا ہوا تمہیں؟'' اُسے گود میں لیکر پوچھا۔

''بابا!'' ننھے ننھے ہاتھوں سے دونوں آنکھیں ملتے ہوئے سوں سوں کیا۔

''ہاں! میں سن رہا ہوں۔'' اُس نے پیار سے پوچھا۔

''مجھے امی چاہیے۔'' اُس نے مدّعا بیان کیا تو علی نے بیچارگی سے سفیر صاحب کو دیکھا۔

''نشمیہ کہانی سنو گی؟'' سفیر صاحب نے اُسکا دھیان بٹانا چاہا۔

''نہیں! آپکی کہانی بورنگ ہوتی ہے۔'' اُس نے برا سا منہ بنا کر کہا تو وہ ہنس پڑے۔

''چلو تو پھر آج میں تمہیں کہانی سناتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟'' علی نے پیشکش کی۔

''آپکو کہانی آتی ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''انڈہ بنانا نہیں آتا پر کہانی آتی ہے۔'' اُس نے شرارت سے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''تو سناؤں کہانی؟''

''ہاں!'' وہ فوراً چہکی تو علی اُسے گود میں لیے بیٹھ گیا۔

''بتاؤ! کیا سنو گی؟'' اُس نے پوچھا۔

''اوں۔۔۔''وہ تھوڑی پر چھوٹے سے ہاتھ رکھے سوچنے لگی۔

''اِسنووائٹ!''اُس نے فرمائش کی۔

''تو سنو! ایک لڑکی تھی اسنووائٹ۔اُسکی سوتیلی ماں ایک ملکہ تھی،جواُسکو مارنا چاہتی تھی،تو اسنووائٹ اپنے محل سے بھاگ گئی اور اپنے دوستوں کے پاس آگئی۔''

''سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے؟''اُس نے بڑی بڑی آنکھیں وا کر کے پوچھا۔

''جو اصلی امی نہیں ہوتیں۔''علی نے رک کر بتایا تو اُس نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا،پر نجانے اُسے سمجھ آیا بھی کہ نہیں؟

''خیر! وہ اپنے سات چھوٹے چھوٹے دوستوں کے ساتھ رہتی تھی۔اُسکے چھوٹے دوست روزانہ کام پر جاتے اور وہ اُنکے لیے کھانا بناتی۔پر ایک دن اُسکی سوتیلی ماں نے ایک جادو گرنی کو بھیجا،اُس نے سیب میں ایک ایسا زہر ملایا جسے کھا کر وہ مر جاتی۔''

''اوہ!''اُس نے بڑا سا منہ کھولا۔ علی نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''پھر وہ اپنا روپ بدل کر اسنووائٹ کے پاس آئی اور اُسے وہ سیب دیا اور کہا کہ یہ سیب کھانے کے بعد تم جو دعا مانگو گی وہ پوری ہو گی،پھر سسنووائٹ نے وہ سیب لے لیا۔''

''پر اُس میں تو زہر تھا۔''وہ پریشان ہوئی۔

''ہاں! اُس نے وہ سیب لیکر جادو گرنی کو شکریہ کہا اور دروازہ بند کر دیا۔لیکن پتہ ہے کیا نشمیہ؟اسنووائٹ نے وہ سیب نہیں کھایا بلکہ اُسے ضائع کر دیا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ہیں؟''نشمیہ سے زیادہ اُسکے ابّا حیران ہوئے تھے۔

''ہاں! کیونکہ اُسے دو باتیں معلوم تھیں۔ایک تو یہ کہ کسی بھی انجان شخص،یعنی جسے آپ جانتے نہ ہوں اُس سے چیز لیکر نہیں کھاتے۔اور دوسرا یہ کہ آپکی دعائیں اللہ قبول کرتا ہے کوئی سیب نہیں۔ سمجھ آئی؟''اُس نے حیران نظروں سے خود کو دیکھتی نشمیہ سے پوچھا۔

''ہاں! میں سمجھ گئی۔کسی اسٹرینجر(اجنبی)سے چیزیں نہیں لینی چاہیے اور اگر لے لیں تو اُسے کھانا نہیں چاہیے۔''اُس نے سمجھداری سے کہا۔

''یو گوٹ دا پوائنٹ(تم نے بات سمجھ لی)''وہ خوش ہوا۔

''مجھے راپنزل بھی سنائیں۔''اُس نے ایک اور فرمائش کی۔

''راپنزل جب چھوٹی تھی تواُسے ایک چڑیل اپنے ساتھ لے گئی تھی۔اوراُس نے راپنزل کوایک ایسے محل میں قید کر دیا، جسکا کوئی دروازہ نہیں تھا،اور وہ بہت اونچا تھااتناکہ کوئی اُس سے کود کر بھاگنے کی کوشش کرتاتووہ گر کر مر جاتا۔لیکن چڑیل اُس سے روز ملنے آتی۔راپنزل بے چاری اُسے اپنی ماں سمجھتی تھی۔''

''کیاوہ بھی سوتیلی تھی؟''اُس نے پوچھا۔

''کہہ سکتے ہیں۔خیر!کیونکہ کوئی دروازہ نہیں تھاتوراپنزل کھڑکی سے اپنے بال لٹکادیتی،اُسکے بال بہت لمبے تھے، محل جتنے لمبے۔۔۔۔چڑیل اُسے پکڑ کر اوپر آتی،اوراُسے پکڑ کرنیچے جاتی۔''

''پھر؟''

''پھرایک دن چڑیل کسی دوسرے شہر چلی گئی،اور راپنزل نے اپنے بالوں کوکاٹ دیا۔اُس نے اپنے بالوں کی لمبی سی رسّی بناکراُسے کھڑکی سے باہر لٹکایااور خودنیچے اُترگئی اور ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئی۔کیونکہ اُسکے پاس کامن سینس تھی۔''اِس بارتوسفیر صاحب پہلے سے زیادہ حیران ہوئے تھے، جبکہ نشمیہ کو کہانی دلچسپ معلوم ہورہی تھی۔

''ایک آخری کہانی سنادیں۔''اُس نے پھر فرمائش کی۔

''یہ آخری ہوگی پھر تم سوجاؤگی۔''

''آئی پرامس!(میں وعدہ کرتی ہ۔''وہ راضی ہوگئی۔

''چلواب تمہیں سنڈریلا کی کہانی سناتاہوں۔وہ ایک غریب لڑکی تھی، جواپنی سوتیلی ماں اور بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔وہ ہر وقت اُسے مارتیں اوراُس سے بہت سارے کام کرواتی تھیں۔لیکن سنڈریلا کے پاس ایک اِسکل (صلاحیت) تھی۔وہ کپڑے بہت اچھے سیتی تھی۔اُس نے ایک روزاپنے لیے ایک بہت اچھاڈیزائنرزڈریس سیااوراُسے چپکے سے پہن کراپنی دوست کی دعوت میں چلی گئی۔وہاں اُسے ایک بڑی ڈیزائنر نے دیکھااوراُسکے ڈریس کو پسند کرلیا۔اور اُس نے سنڈریلا کو کہا کہ وہ اُسکے لیے بھی ایسا ہی بنادے۔پھرسنڈریلانے ڈریس بنادیاتواُس عورت نے سنڈریلا کو نہ صرف بہت سارے پیسے دیے، بلکہ اپنے بوتیک پر کام کے لیے رکھ لیا۔یوں سنڈریلانے اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے ذریعے اپنااالگ گھر بنایااور سکون سے رہنے لگی۔''

''یہ تمہاری کہانیوں میں شہزادے کہاں گئے بیٹا؟''سفیر صاحب سے رہانہ گیاتوپوچھ لیا۔

''کسی بھی لڑکی کو شہزادے کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہناچاہیے، جب کہ وہ خود بھی اپنے لیے بہت کچھ کرسکتی ہے۔یہ کہانیاں مجھے ہمیشہ سے ہی ناپسند رہی ہیں۔بھلا!جو کام لڑکیاں خود کرسکتی ہیں،اُسکے لیے شہزادے کاانتظار کیوں؟اصل زندگی میں آپکی مدد کرنے کوئی نہیں آتا، برامت مانیے گا!پرماں باپ بھی

کام نہیں آتے۔ آخر میں جو کام آتا ہے وہ ہمارا اللہ پر یقین، اور ہماری صلاحیتیں آتی ہیں۔ ہماری ذہانت ہی ہے، جو ہمیں ہر مشکل سے باہر نکالتی ہے۔'' اُسکی سوچ پر سفیر صاحب حیران رہ گئے۔ بات کرتے اُس نے یکدم ہی نشمیہ کی طرف دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔

''میں اسے لٹا کر آتا ہوں۔'' وہ آہستہ سے کہتے اُسے لیکر اُٹھ کھڑا ہوا، اور وہاں سے چلا گیا۔ سفیر صاحب اُسے جاتا دیکھتے رہ گئے۔

برامت مانیے گا! پر ماں باپ بھی کام نہیں آتے۔

ابھی بہت سے حساب باقی تھے۔

---------+---------+--------

عمر سے مل کر جب وہ واپس مکرم کو لینے مقدّس کے گھر پہنچا۔ وہ ڈیوٹی پر جا چکی تھی، لہٰذا سوتے ہوئے مکرم کو اُسکی نانی نے مقدّم کے حوالے کیا۔ وہ تکلیف کے لیے معذرت کرتا ہوا گھر آ گیا۔ گھر آیا تو یاد آیا کہ مقدّس نے اُسے کھانے پر روکا تھا اور وہ اچانک ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔ لہٰذا اُس سے معذرت کرنا تو بنتا تھا۔ اُس نے فون اُٹھایا تا کہ اُسے پیغام بھیج سکے۔ پر اتفاق سے اُسی کا کچھ لمحوں پہلے کا ایک پیغام آیا ہوا تھا۔

''کل میری ایوارڈ سیریمنی (تقریب انعامات) ہے۔ کل میں مکرم کو نہیں دیکھ سکوں گی۔ کیا کل تم اُسے، اپنے پاس ہی رکھ سکتے ہو؟'' اُس نے پیغام پڑھا، پھر کچھ سوچ کر جوابی پیغام لکھنے لگا۔

''ہاں! کیوں نہیں۔ آج تم نے مکرم کا وقت سے زیادہ خیال رکھا ہے، تو کل میری باری ہے اصولاً۔'' پیغام لکھنے کے بعد وہ کچھ دیر متن کو دیکھتا رہا۔ ''نہیں! نہیں! ایسے تو وہ برا مان جائیگی۔ کہے گی کہ میں اُسے مکرم کی خالہ کے بجائے کوئی آیا سمجھ رہا ہوں۔'' دل میں سوچا اور پیغام مٹا دیا۔ پھر دوبارہ لکھا۔ ''ہاں! کیوں نہیں؟'' اور جواب بھیج دیا۔ وہاں سے فوراً دیکھ لیا گیا پر کوئی جواب نہ آیا۔ مقدّم کچھ دیر انتظار کرتا رہا، پھر یاد آیا کہ اُس نے کسی تقریب کا ذکر کیا تھا۔

''کس قسم کی تقریب؟'' اُس نے پیغام بھیجا۔

''ہسپتال والوں کی طرف سے ڈاکٹرز، او پی ڈی پینل، نرسنگ عملے اور دیگر عملے کو بہترین کارکردگی پر سالانہ انعامات دیئے جاتے ہیں۔ وہی تقریب ہے۔'' اُسکا جواب آیا۔

''کیا تم بھی نومینیٹڈ (نامزد) ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں! دو کیٹیگری میں۔ ایک سب سے زیادہ بہترین کارکردگی دکھانے والی ینگ ڈاکٹرز، اور دوسرا عملے کی پسندیدہ ڈاکٹرز میں۔''

''واؤ! کہاں ہو رہی ہے تقریب؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہسپتال سے منسلک یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں۔''

''کیا آؤٹ سائیڈرز (غیر متعلقہ افراد) کو آنے کی اجازت ہے؟''اُس نے یوں ہی پوچھ لیا۔ بہت دیر تک پیغام دیکھ لینے کے بعد بھی جواب نہ آیا۔ چند لمحوں بعد پیغام آیا کہ

''آپ آؤٹ سائیڈر نہیں ہیں۔''

اور مقدّم مجسمہ ہو گیا۔

تاحیات۔۔۔

تاعمر۔۔۔

تاقیامت۔۔۔

---------+---------+--------

''کیا سمجھا تھا تم نے؟ میں بیوقوف ہوں؟''ایک بازو اُسکے گلے پر رکھ کر اُسے مزاحمت سے روکے ہوئے، اُس نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے پوچھا تھا، پر نوید عالم مزاحمت کر ہی کب رہا تھا؟

''تین روز سے میں تمہیں فون کر رہا ہوں، میسیج کر رہا ہوں؟ تم فون کیوں نہیں اُٹھا رہے؟ ہاں؟''وحید نے اُس پر تقریباً چیختے ہوئے کہا تھا۔ جواباً وہ چپ کھڑا رہا۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔۔۔''وہ دھاڑا۔

''سوری۔۔۔''اُس نے فقط اتنا ہی کہا۔

''کیا سوری؟ کیس مکمل بند ہو گیا، تم نے اِس بارے میں بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کیوں؟''وہ پھر چیخا۔

''میں نے۔۔۔ ضروری نہیں سمجھا۔''اُس نے ضبط سے کہا۔

''کیا کہا تم نے؟ دوبارہ بولو؟''وحید نے اُسے چھوڑتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب۔۔۔کہ میں آپکو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''وحید کے سامنے وہ آج بھی وہی بچہ بن جاتا تھا، جسے اُسکی غلطیوں پر وحید بے نقط جھاڑ پلایا کرتا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتا تھا۔

''میں یہاں تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں،اور تم۔۔۔تم نے مناسب نہیں سمجھا؟''وہ پھر چیخا۔اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ دو چار تھپڑ اور جڑ دے اُسکے۔

''میں نے کہا کہ میں آپکو پریشان۔۔۔۔''

''پانی لاؤ میرے لیے۔۔۔۔''وہ اُسکی بات کاٹتا، حکم صادر کرتے صوفے پر جا بیٹھا۔نوید گہرا سانس لیکر گلاس میں پانی نکالنے لگا۔جب تک وہ گلاس لیکر آیا تب تک وحید خود کو گہری گہری سانس لیکر نارمل کر چکا تھا۔ نوید نے گلاس اُسکے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''کھڑے کیوں ہو اب؟بیٹھو!''اُسے کھڑا دیکھ کر وہ بولا اور پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

''یہ کس نااہل شخص کو میری جاسوسی پر لگایا ہے آپ نے؟ایسے نظر رکھتے ہیں کسی پر؟پہلے ہی دن سے نظر آ گیا تھا مجھے وہ۔''نوید نے بیٹھتے ہوئے کہا۔جیسے تھوڑی دیر پہلے تو کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''جلدی میں جو میسر تھا،اُسی سے رابطہ کر لیا،ویسے بھی تمہارا ہی جونیئر ہے وہ۔'' وحید نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر تو شرم کا مقام ہے میرے لیے۔''اُس نے تاسف سے کہا۔

''اُسکی غلطی نہیں ہے۔تم کچھ زیادہ ہی شاطر ہو۔''

''ایسا نہیں ہے،وکیل کے گھر سے واپسی پر شیراز نے بھی دیکھ لیا تھا اُسے۔''

''یہ تم وکیل کے گھر کرنے کیا گئے تھے؟''اُس نے بھنویں اچکاتے پوچھا۔

''وعدہ لینے۔۔۔''اُس نے سکون سے جواب دیا۔

''تم یہ جو کچھ کرتے پھر رہے ہو نا! تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ میں اِس سے زیادہ کر سکتا ہوں۔پر میں نے تمہیں قانون ہاتھ میں لینے سے منع کیا تھا نا؟''

''کون سا قانون بھائی؟اِس انصاف کے انتظار میں میرے بچوں کا خون رائیگاں چلا جائے گا۔''

''تو پھر جاؤ،فرح خالد کو مارو۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مار بھی دیتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہے؟اور فلحال اُسکا پتہ لگانے کے لیے میرے کوئی بھی تعلقات کام نہیں آرہے۔''وحید سیدھا ہوا اور غور سے اُسے دیکھا۔

''نوید! یہ دنیا نامکمل ہے۔یہاں کسی کو بھی انصاف نہیں ملتا۔اگر مل بھی جائے تو سکون نہیں آتا دل کو،اگر فرح پکڑی بھی گئی،اور اُس کے جرائم ثابت ہو بھی گئے،تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو جائے گا؟اُسے پھانسی ہو گی اور بس۔کیا فقط ایک پھانسی مل جانے سے تمہارے بچوں کو انصاف مل جائیگا؟نہیں نا؟جب ہی تو اللہ نے آخرت بنائی ہے۔اگر کوئی عدل کر سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے۔''

''تو عدالتیں تو ہونی ہی نہیں چاہیے پھر۔ہر شخص آخرت کے انتظار میں بیٹھا رہے۔آخر ہمیں دنیا میں کس لیے بھیجا ہے اللہ نے؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو،پر میں بعض معاملات کی بات کر رہا ہوں۔جہاں ہمیں خاموشی اختیار کر کے معاملہ وقت پر چھوڑ دینا چاہیے۔''

''میں تو خاموش ہی تھا،آپ ہی نے فرح پر کیس کروایا تھا۔مجھے تو کوئی شوق نہیں تھا عدالتوں کے چکر لگانے کا۔''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگائی۔

''ہاں! خاموش رہ کر جو تم کرنے والے تھے نا!اِس سے کہیں بہتر تھا کہ عدالتوں کے لایعنی چکر کاٹ لو۔''اُس نے سر جھٹکا۔

''خیر! دفعہ کریں ان سب باتوں کو۔یہ بتائیں کہ آپ کیسے آئے یہاں؟''اُس نے موضوع بدلا۔

''تین دن کی چھٹی ہے۔کل صبح امی سے ملنے جاؤں گا۔پھر ایک دن گھر اور اگلے دن واپسی۔''

''ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانے تو؟''نوید نے اچانک ہی پوچھا۔

''پوچھو!''

''شرم نہیں آئی میری جاسوسی کرواتے ہوئے؟''

''تمہیں آئی تھی جزا کی جاسوسی کرواتے ہوئے؟''وحید نے دوبدو جواب دیا۔

''جزا کی حرکتیں بھی تو ایسی ہیں۔''

''تمہاری کون سی مختلف ہیں؟''اِس بات پر وہ بے ساختہ ہنسا۔

''ویسے تم آج مجھے بتا ہی دو۔۔۔''

''کیا؟''نوید نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''یہ گھر کیوں خریدا؟''

''کھانا کھائیں گے ؟'' اُس نے پھر اپنی مرضی کا موضوع نکالا۔

''باہر سے آرڈر کر لیں گے۔ تم نے گھر کیوں خریدا؟''وہ وحید تھا،اُسے نوید گھما نہیں سکتا تھا۔

''یہ گھر ہی وہ وجہ ہے کہ جسکی وجہ سے جزا، مجھ سے اور آپ سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ میں یہ اُسے اُسکی شادی پر تحفتاً دے دوں گا۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''سیدھے سیدھے کہو، کہ اُسکے منہ پر ماروں گا۔''سامنے والا بھی اُسکا ہی بھائی تھا۔ سفاکی کی حد تک صاف گو۔

''گھر ہی منہ پر ماروں گا، آپکی طرح تھپڑ تو نہیں !''وہ بھی ڈھیٹ تھا۔اِس جواب پر وحید ہنس دیا۔

''ویسے یہ ہم تینوں کی لو لینگو تیج (پیار کی زبان) ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تینوں نہیں دونوں، میں نے کبھی ایسا پیار نہیں جتایا۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم نے پیار ہی کب جتایا ہے ؟''اب کہ نوید بے ساختہ ہنسا تھا۔ وحید چپ سا اُسے دیکھتا رہا۔

''کیا ہوا؟''نوید نے اُسے خود کو دیکھتا پا کر پوچھا۔

''مجھے ابھی ابھی خیال آیا کہ۔۔''وہ رکا۔

''کہ ؟''

''تم نے ہنسنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ مسکرایا کرو نوید ! مسکرانا سنت ہے۔''

''دل نہیں کرتا بھائی !''اُس نے آہستگی سے کہتے سر جھکایا۔

''اب تم مجھے وہ بات بتاؤ۔''وحید نے یکدم ہی کہا تو اُس نے سر اٹھا کر نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''کونسی بات ؟''

''وہ بات جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔''وہ اُسے اندر تک پڑھ لیا کرتا تھا۔

''کوئی بات نہیں ہے بھائی!''آواز نے ساتھ نہ دیا۔

''مجھ سے جھوٹ مت بولا کرو۔''اُس نے حتمی انداز میں کہا۔نوید سر جھکائے رہا۔

''بشریٰ کو سب یاد آگیا ہے۔''خاموشی میں اُسکی آواز گونجی۔ وحید سیدھا ہوااور جلدی سے اُٹھ کر اسکے برابر آبیٹھا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔کیسی ہے وہ اب؟''

''اچھی بات تو ہے،پر اُسے یہ بھی یاد آگیا ہے کہ ان سب کا ذمے دار میں ہوں۔''وہ تلخی سے ہنسا۔

''کیا کہتی ہے وہ؟''وحید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔بس خاموش ہے اُس دن سے۔''

''نوید! وہ ماں ہے،اُسکی اولاد۔۔۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کچھ کہنا چاہا۔

''میں بھی تو باپ ہوں۔میں بھی تو دل رکھتا ہوں بھائی!''اُسکی بات کاٹتے ہوئے وہ یکدم ہی چیخا تو وحید ساکت رہ گیا۔

''میرے بھی تو بچے جھلس کر مرے ہیں،میں نے بھی تو انکی لاشوں کو اپنے ہاتھوں سے دفنایا ہے۔میری بھی تو روح چھلنی ہے،میرا بھی تو دل مر گیا ہے میں کس سے کہوں؟''چیختے چیختے اُسکا گلا رندھ گیا۔

''نوید!''وحید نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے کچھ کہنا چاہا۔

''میں کس کو الزام دوں؟میں کس کو برا بھلا کہوں؟میرا کون ہے؟میرا قصور کیا ہے؟میں بچپن سے آج تک وضاحتیں دے دے کر تھک گیا ہوں بھائی!۔ ابّو کو،جزا کو،بشریٰ کو اپنے دوستوں کو۔کیا میں ساری زندگی یہی کرتا رہوں گا؟کیا ساری زندگی میں لوگوں کی خود سے وابستہ توقعات پر پورا نہ اُتر سکنے کا خمیازہ بھگتتا رہوں گا؟کوئی مجھ سے بنا کسی اُمید،بنا کسی ڈیمانڈ(مطالبے)کے،بے لوث محبت نہیں کر سکتا؟کیا میں اتنا برا،اتنا ناپسندیدہ ہوں؟''وہ سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔وحید خاموش رہا۔

''میں انسان ہوں بھائی! میں کب تک لوگوں کو اپنی صفائیاں پیش کرتا رہوں؟کب تک؟میرا قصور کیا ہے بھائی؟میں تو کبھی اپنے بچوں کو ٹھیک سے پیار بھی نہ کر سکا۔کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے؟میں کبھی انہیں گلے بھی نہ لگا سکا۔اور جب لگا سکا تب تک وہ مر چکے تھے۔''وہ آستینوں سے آنسو صاف کرتے بولا،زخم کا پرانا نشان اُبھر کر معدوم ہوا۔ وحید خاموش رہا،اور وہ روتا رہا۔اُسکے سامنے وہ رو لیا کرتا تھا،وہ جو دنیا کے سامنے

نہیں تھا، وہ، وہ وحید کے سامنے تھا۔ وحید نے اُسکے کندھوں کے گرد بازو پھیلا کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ روتا رہا، روتا رہا یہاں تک کہ جب رو رو کر تھک گیا تو خود ہی اُس سے الگ ہو گیا۔

''آخری بار کھانا کب کھایا تھا؟'' وحید نے اُسکا سر سہلاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''افطاری کی تھی۔''

''جانتا ہوں کہ سوائے چند کھجوروں کے کچھ نہیں کھایا ہو گا۔'' اُس نے کہا تو وہ خاموش رہا۔

''کھانا آرڈر کر رہا ہوں میں، چپ چاپ کھا لینا۔'' وہ کہہ کر موبائل کھولے، کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ پھر آرڈر مکمل ہونے پر موبائل رکھ کر اُسکی جانب مڑا۔

''ابّو مر چکے ہیں، مردے سے شکوے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بشریٰ کا رویہ تمہیں تکلیف پہنچا رہا ہے پر کیا تم نے اب تک خود جا کر اُس سے بات کی؟'' اِس سوال پر نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔

''نہیں نا؟ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری طرف سے پہل کی منتظر ہو؟ دیکھو! تمہارا دکھ تین سال پرانا ہے۔ جبکہ بشریٰ کے لیے یہ سب ابھی ہوا ہے، کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے تو وہ اپنے بچوں کو زندہ سمجھ رہی تھی۔ اُسکے ماں باپ ہیں نہیں، بھائیوں کو اُس سے کوئی سروکار نہیں۔ صرف تم ہی ہو جو اُسے زندگی کی طرف لا سکتے ہو۔ دیکھو! آج اُسے سب یاد آ گیا نا؟ جب کہ کل تک یہ ناممکن سا لگتا تھا۔ تو کچھ دنوں میں وہ صدمے سے باہر بھی آ جائے گی۔ فوری طور پر جو ردعمل اُس نے دیا، وہ وقتی ہے۔ بہت جلد اُسے خود احساس ہو گا کہ اُس نے جو کہا وہ صحیح نہیں تھا۔ بس تم اُسکے ساتھ اپنا رویہ مت بدلو۔ جیسے پہلے اُسکا خیال رکھتے تھے، ویسے ہی اب بھی رکھو، بے شک وہ بات نہ کرے، لیکن اگر تم اُسے اکیلا چھوڑ دو گے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پہلی والی حالت میں واپس چلی جائے۔''

اِس بات پر نوید چونکا، یہ تو اُس نے سوچا نہیں تھا۔

''کیا اُسکی بیماری پلٹ سکتی ہے؟'' اُس نے خوف زدہ سے انداز میں پوچھا۔

''نہیں! لیکن اگر اُسے اکیلا چھوڑ دیا جائے، تو غالب امکان ہے کہ وہ دوبارہ ڈیپریشن میں چلی جائے اور پھر سے خیالات کی دنیا میں جینے لگے۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو تمہیں اُسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے، گھر پر ہو تو اُس کے ساتھ رہو، باہر ہو تو پل پل اُس سے رابطے میں رہو۔'' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نوید کو یکدم ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''اور رہی بات تمہارے دکھوں کی، تو اُسے سمجھنے والا میں ہوں نا! مجھ سے کہو، میں بنا کسی الزام کے تمہاری ہر بات سنتا ہوں اور ہمیشہ سنوں گا۔ اور رہی جزا! تو میں نے اُسے ابّو کی موت کے غم کی وجہ سے بہت ڈھیل دے دی ہے۔ اب اُسکی عقل ٹھکانے لگانے کا وقت ہے۔''

''میری طرف سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے اُسے۔''نوید نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔''اُس نے قطعی لہجے میں کہا۔ اُسی لمحے گھر کی بیل بج اُٹھی۔

''کھانا آگیا ہوگا۔ جاؤ دیکھو جا کر!'' وحید نے کہا۔

''میں؟''

''نہیں تو کیا میں؟''وہ بگڑا۔

''باہر آپکا جاسوس کھڑا ہے۔''

''فکر نہ کرو، مجھ سے زیادہ تم سے ڈرتا ہے۔''وحید نے کہا تو وہ سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُس سے تو میں اچھا حساب لوں گا جلد ہی۔''وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

---------+---------+--------

عمر گھر آیا تو ابّو جاگ رہے تھے۔اُسے دیکھ کر کسی قسم کا کوئی رد عمل نہیں دیا۔وہ دل کو ہمت دیتا، آہستہ آہستہ چلتا اُنکے قریب آ کھڑا ہوا۔

''ابّو!''اُنکے وجود میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔

''ابّو!''اُس نے پھر پکارا،اِس بار بھی نظر انداز کیا گیا۔

''مم۔۔۔میں آپکو۔۔۔کچھ بتانا چاہتا۔۔۔''

''نہ میں تمہارا باپ ہوں،اور نہ میں کچھ سننا چاہتا ہوں۔تم یہاں صرف اپنی ماں کی وجہ سے ہو،ورنہ میرا صرف ایک ہی بیٹا تھا،جو تمہاری وجہ سے مر گیا۔''لہجہ سرد مگر سخت، آواز بے لچک اور فیصلہ حتمی۔

''میری وجہ سے؟''عمر کا سانس تو اسی جملے پر اٹک گیا۔اب کہ اُنہوں نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔طنزیہ نظروں سے۔۔۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں کہ آخری بار خضر تم سے ملنے گیا تھا؟''

''آپ۔۔۔آپ کو۔۔۔کیسے۔۔۔''وہ الفاظ ادا نہیں کر پا رہا تھا۔

''حادثے سے پہلے اُس نے آخری کال مجھے ہی کی تھی۔اور کہا تھا کہ تم سے مل کر آرہا ہے اور کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔پر وہ آنہیں سکا۔نجانے تم نے میرے بیٹے سے ایسا کیا کہا کہ وہ گاڑی ٹھیک طرح سے چلا بھی نہ سکا اور حادثے کا شکار ہو گیا؟تم ہو ان سب کے ذمّے دار عمر۔۔۔تم ہو۔چلے گئے تھے،تو پھر واپس نہ آتے۔تم نے سب برباد کر دیا،سب چھین لیا اِس بوڑھے آدمی سے۔۔۔تم نے۔۔''نجانے وہ کیا کیا کہہ رہے تھے؟عمر کے لیے قدموں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔وہ بے جان وجود کے ساتھ خود کو گھسیٹتا اپنے کمرے میں آ گیا۔

پتہ نہیں،وہ اِس زندگی میں اُنہیں سچ بتا بھی سکے گا یا نہیں؟

---------+--------+--------

آج اسکول کا آخری دن تھا۔پھر عید تک کے لیے چھٹی تھی۔نشمیہ صبح ناشتہ کر رہی تھی،علی پاس ہی بیٹھا آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔آج نشمیہ کو سفیر صاحب اسکول چھوڑنے والے تھے۔

''ناشتہ جلدی ختم کرو نشمی!تم نے تیار بھی ہونا ہے۔''جوتا پاؤں میں ڈالتا علی مصروف سے انداز میں بولا۔آج وہ چپ چپ سی تھی۔

''بابا!''اُس نے کچھ سوچتے ہوئے علی کو مخاطب کیا۔

''ہونہہ؟''

''سوتیلی ماں گندی ہوتی ہے؟''کام کرتے علی کے ہاتھ تھمے۔اُس نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''ضروری نہیں ہے۔لیکن اصلی ماں جیسی نہیں ہوتی۔''اُس نے سمجھانا چاہا۔

''تو سنڈریلا،راپنزل اور سنو وائٹ کی اصلی امی کیوں نہیں تھیں؟''اُس کا دماغ رات کی کہانیوں سے باہر نہیں آیا تھا۔

''کیونکہ وہ کہیں چلی گئی تھیں۔''وہ بھلا اور کیا جواب دیتا؟

''میری امی بھی چلی گئی ہیں،تو کیا میری بھی سوتیلی امی آئیں گی؟مجھے مارنے اور مجھ سے کام کروانے؟''وہ حیرت زدہ رہ گیا۔وہ بھلا کیا سوچ رہی تھی؟

''نہ تو تمہاری سوتیلی امی ہیں اور نہ کبھی آئیں گی۔کیونکہ تمہارے پاس بابا ہیں۔اب فضول سوال بند کرو اور جا کر تیار ہو فوراً!ابّا کو دیر ہو جائے گی تمہاری وجہ سے۔''اُس نے کہا تو وہ سر ہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

علی یونہی کچھ دیر صوفے پر بیٹھا رہا۔کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اُسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔پلٹ کر دیکھا تو صوفے کے پاس نشمیہ کھڑی اُسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ہمیشہ کی طرح شور مچاتے اُس نے علی کو ڈرایا نہیں تھا۔

''کیاہوا ہے تمہیں؟ کیاسوچ رہی ہو تم؟''علی نے بازو سے تھام کر اُسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

''مجھے امی چاہئیں، مجھے امی کے پاس لے جائیں۔''اُسکے الفاظ علی کے کان میں پگھلا سیسہ بن کر اُترے تھے۔

''کیوں؟ بابا نہیں ہیں تمہارے پاس؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہیں۔۔۔''

''تو پھر؟ کیوں چاہیے امی تمہیں؟''اُسکا لہجہ ناچاہتے ہوئے بھی سخت ہوا۔

''کیونکہ مجھے میری امی بھی چاہئیں، وہ مجھے یاد آرہی ہیں۔ آپ مجھے اُنکے پاس لے جائیں۔''وہ ضدی لہجے میں بولی۔

''جاکر جوتے پہنو! ہم جارہے ہیں۔'' اُس نے ضبط سے کہا۔

''امی کے پاس؟''وہ چہکی۔

''نہیں! اسکول جارہی ہو تم۔''اُس نے ڈانٹا تو نشمیہ نے اُسکے ہاتھ جھٹکے۔

''مجھے اسکول نہیں جانا، مجھے امی کے پاس لیکر جائیں۔ مجھے امی چاہیے۔۔۔امی چاہیے۔۔''وہ احتجاج کرنے لگی۔

''بس نشمیہ! بہت ہو گیا۔''بہت عرصے بعد علی آج اُس پر پھر دھاڑا تھا۔ وہ سہمی۔

''دوبارہ تمہارے منہ سے نہ سنوں میں۔''اُس نے سختی سے کہا تو وہ سر جھکائے سسکنے لگی۔

''کیاہو گیا ہے علی؟ کیوں چیخ رہے ہو اِس پر؟''شور سن کر سفیر صاحب باہر آئے۔

''کچھ نہیں! فضول کی ضد کر رہی ہے۔ آپ اسکول لے جائیں اسے۔''اُس نے کہا تو وہ کچھ نہ بولے۔

علی اُسے روتا چھوڑ کر آفس کے لیے نکل گیا۔

---------+---------+--------

صبح ہو چکی تھی، وحید دروازے پر کھڑا جانے کے لیے تیار تھا۔ نوید سامان سمیٹ کر اُسے خدا حافظ کہنے آیا تو وحید چپ سا اُسے دیکھتا رہا۔

''آپکا آپریشن کب تک مکمل ہو جائے گا؟''اُسے خاموش دیکھ کر نوید نے پوچھا۔

''معلوم نہیں!''اُس نے مختصر سا جواب دیا، پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔اُسکی گاڑی آنے میں بارہ منٹ تھے،یعنی اُسکے پاس بھی اتنا ہی وقت تھا،اپنی بات کہنے کے لیے۔

''نوید!''اُس نے پکارا۔

''جی؟''نوید نے دیکھا۔

''جب میں تمہارے تحفے تم سے پہلے کھول لیتا تھا،جب میں تمہیں پڑھاتا تھااور مارتا تھا،جب میں تمہارے دوستوں اور باہر آنے جانے کا فیصلہ کیا کرتا تھا، جب میں تمہارے ہر فیصلے خود لیتا تھا،میں جانتا ہوں کہ تب میں تمہیں صرف برا نہیں،بلکہ بہت برا لگتا تھا۔تمہیں یقیناً مجھ سے نفرت محسوس ہوتی ہو گی۔''وہ تمہید باندھ رہا تھااور نوید کچھ نا سمجھی اور کچھ حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میں ایسا جان کر نہیں کرتا تھا۔میں مانتا ہوں کہ میں غلط تھا،پر جو میں اپنے سے بڑوں کو کرتے دیکھتا،وہی سیکھتا تھااور وہی کرتا رہا۔اور میں قبول کرتا ہوں کہ میں غلط تھا۔''سانسیں،ہوائیں،نگاہیں سب ساکت تھیں۔آنکھیں،وجود اور روح تک سماعت بن گئی تھیں۔فضا میں صرف وحید کی آواز تھی۔

''میں بچہ تھا۔عام بچوں کی طرح رہنا چاہتا تھا،پر جانتے ہو کیا؟میں نے بڑا بیٹا،بڑا بھائی ہونے کا خمیازہ بھگتا۔میں اپنا ہوم ورک کر کے کھیلنا چاہتا تھا،پر میرے سر پر تمہاری ذمے داری ڈال دی جاتی۔میرے دوست مجھے بلا رہے ہوتے اور میں تمہیں پڑھا رہا ہوتا تھا۔میں اسکول میں اپنے دوستوں کے ساتھ لنچ کرنا چاہتا تھا،پر میرا کام تھا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تمہارے ساتھ لنچ کروں تاکہ کوئی بچہ تمہیں تنگ نہ کرے۔چھٹی ہوتی تو بچے کھیلتے کودتے،ہنسی مذاق کرتے باہر آتے اور مجھے تمہاری کلاس میں پہنچنے کی جلدی ہوتی کہ کہیں تم گم نہ ہو جاؤ۔میں اپنے سائیکل چلانے کے اوقات میں تمہیں سائیکل چلانا سکھاتا تھا۔مجھ سے امی ابّو دونوں کو بہت توقعات تھیں،وہ چاہتے تھے کہ میں چھے سال کی عمر میں ہی ایک بڑا اور ذمے دار بھائی بن جاؤں۔جسے ہر وقت اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر کرنی ہے۔حالانکہ یہ میری ذمّے داری نہیں تھی،شادیوں میں دعوتوں میں میرا کام تمہارے پیچھے بھاگنا ہوتا تھا کہ کہیں تم یہاں وہاں نہ گر جاؤ،کہیں تم چوٹ نہ لگالو۔ابّو اپنے تئیں تمہاری ذمّے داری میرے سر ڈال کر پر سکون ہو گئے تھے۔تم سے کوئی غلطی ہوتی تو پہلی پوچھ مجھ سے ہوتی تھی۔''ہمیشہ اُس نے نوید کی سنی تھی،پر آج وہ اپنا دل کھول رہا تھا۔نوید خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔وحید کی طرف کی کہانی جاننے کی تو کبھی کوشش ہے کہ کی تھی اُس نے۔

''ہاں!یہ سچ ہے کہ مجھے بچانے کے لیے امی ساتھ تھیں۔پر نوید!میں اپنا بچپن،بچوں کی طرح نہیں گزار سکا۔میں وقت سے پہلے بڑا بن گیا اور اِس بڑے بننے میں،میں نے تمہارے ساتھ بہت ناانصافی بھی کی۔میں کبھی کبھار تمہیں رشک سے دیکھتا کہ تم کتنے آرام سے یہ سب کام کر لیتے ہو،تم پر کیوں کوئی ذمے داری نہیں ہے؟اور یہ رشک شاید حسد میں بدل گیا۔میں نے سوچا کہ جب میں نہیں کھیل سکتا تو تم کیوں؟جب میں اپنے دوستوں میں نہیں جا سکتا تو تم کیوں؟اور میں نے تمہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔پر جب میں بڑا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ میری طرح تمہارا بچپن بھی اتنا اچھا نہیں رہا۔اگر ہمارے ماں

باپ انصاف اور مساوات سے کام لیتے تو شاید ہم اِس طرح نہ بڑے ہوتے۔ خیر! کم از کم میں تو تم سے اپنے کیے کی معافی مانگ سکتا ہوں نا؟'' اُس نے بات مکمل کی، تو لفظ معافی پر نوید تڑپ اُٹھا۔ اُسے دنیا کا آخری انسان ہونا چاہیے جسکی وجہ سے اُسکے بھائی کا سر جھکتا۔

''بھائی!'' نوید نے اُسے ایک نظر دیکھا اور نظریں جھکا دیں۔ اُس ایک نظر میں عزت، احترام، عقیدت و تقدس کے سارے تاثرات یکجا ہو گئے۔

''میں ابّو کی بات جبراً اور خوف کے سائے میں مانتا تھا۔ پر آپکی ہر بات میں بنا کسی خوف کے بنا کسی جبر کے مانتا ہوں۔ آپ مجھے تھپڑ مارے تو میں اپنا دوسرا گال بھی حاضر کر دوں۔ جانتے ہیں کیوں؟'' اُس نے آہستہ سے سوال کیا، یہ وہ سوال تھا، جسکا جواب خود وحید بھی جاننا چاہتا تھا کہ اُسکا وہ بھائی جو کسی کی نہیں سنتا تھا، وہ اُسکی ہر بات سر جھکا کر کیسے مان لیا کرتا تھا؟

''احترام۔۔۔ احترام کرتا ہوں میں آپکا۔ مجھے سکھایا آپ نے، مجھے پڑھایا آپ نے، میرا اچھا برا آپ نے سوچا۔ میرے تک آنے والی مصیبت کو پہلے آپ نے اپنے تک لینا چاہا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی بار اپنی ذاتی بندوق ملی تھی، اُسے مجھ سے پہلے آپ نے چلا کر دیکھا تھا کہ کوئی نقصان ہو تو میرا نہ ہو، بلکہ آپکا ہو۔ مجھے ابّو سے منتیں کر کے بھی جو نہیں ملتا تھا، وہ آپ خاموشی سے دے دیتے تھے۔ آپ، ابّو سے ضد کر کے مجھے بائیک چلانے کی اجازت دلوا دیتے تھے، اپنے پیسوں سے پاکٹ منی دے دیتے تھے، پیٹرول ڈلوا دیتے تھے۔ بے شک میں اُدھار سمجھ کر لیتا رہا پر بھائی! آپ سے میں پورے حق سے ہر شے مانگ لیا کرتا تھا کیونکہ مجھے آپ نے یہ احساس دلایا کہ دنیا میں کوئی انسان ہے جسے میری فکر ہے۔ جسکے لیے چیزوں سے زیادہ اہم میں ہوں۔ آپ نے میری غلطیوں پر میری تذلیل نہیں کی، مجھے ڈانٹا، ڈپٹا، پر اکیلے میں۔ دنیا کے سامنے مجھے رسوا نہیں کیا۔ میری باتوں کو میرے فیصلوں کو ہمیشہ اہمیت دی۔ مجھ سے کوئی ملنے آئے یا نہ آئے، پر آپ ہمیشہ مجھ سے ملنے، میری خبر گیری کے لیے آتے ہیں۔ جز! مجھے کبھی ایک میسیج بھی نہیں کرتی، پر آپ ڈیوٹی پر سے بھی کال کر کے مجھ سے میرا حال پوچھتے ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ۔۔۔۔'' وہ رکا، پھر نظریں اُٹھا کر اُسے نم آنکھوں سے دیکھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں نے آپ میں ایک باپ کو دیکھا ہے۔ اِس لیے میں آپکے سامنے کبھی سر بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ جو آپ نے بچپن میں کیا، اُس میں آپکا قصور نہ تھا، جس اولاد کے ساتھ ماں باپ حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں، بات بات پر جھڑکتے ہیں۔ باقی بہن بھائیوں کے دل میں بھی اُس اولاد کے لیے عزت باقی نہیں رہتی۔ پر جو آپ نے میرے لیے بعد میں کیا وہ آپکا فرض نہیں تھا پر آپ نے اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ تو آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے ذلیل نہ کریں۔'' اُس نے وہ کہا جو کبھی کہہ نہیں سکا تھا۔ اُس نے کہنے کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔ اُسے اظہار نہیں آتا تھا، پر وحید کے سامنے اُس نے اپنی عقیدت و احترام کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وحید نے کچھ نہ کہا بلکہ آگے بڑھ کر اُسکے گلے لگ گیا، جیسے ہمیشہ لگتا تھا۔

''میرے بچوں سے بھی پہلے مجھے تم پیارے ہو، کیونکہ تم میرے پہلے بچے ہو۔'' اُس نے الگ ہوتے ہوئے کہا تو محبت کے اِس مظاہرے پر نوید کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تھپڑ زور کا تھا کیا؟'' وحید نے اچانک ہی پوچھا تو نوید بیساختہ ہی ہنس پڑا۔

''اتنا نازک سمجھا ہے مجھے؟''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں امی سے ملنے جارہا ہوں۔ وہاں سے واپسی گھر جاؤں گا۔ اور کل سے پھر ڈیوٹی پر۔ جانے سے پہلے ملنے آجانا مجھ سے۔''وحید نے کہا، ''اور ہاں! جو میں نے سمجھایا ہے اُس پر عمل کرتے رہنا۔''اُس نے کہا تو نوید نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اُسے رخصت کرنے باہر تک آیا۔ وحید کے جانے کے بعد وہ اپنے گھر آگیا۔ چند گھنٹے گھر پر گزارنے کے بعد اُسے ڈیوٹی پر بھی جانا تھا۔ سوچا بشریٰ سے بات کرے گا۔ وحید کی کہی بات کا اثر تھا کہ وہ لائبریری میں خاموشی سے بیٹھی بشریٰ کے پاس آیا۔

''بشریٰ!''اُسکے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے پکارا تو اُس نے ویران آنکھیں اُٹھا کر نوید کو دیکھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟''اُس نے پوچھا، بشریٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ناشتہ کیا تم نے؟''اُس نے ہمت نہ ہاری۔

''روزہ ہے۔''یہ پہلی بات تھی جو اُس نے کی تھی اور وہ بھی اتنی آہستہ کہ نوید بمشکل ہی سن سکا۔

''کیوں رکھ لیا روزہ؟ طبیعت خراب تھی، آج نہ رکھتی۔''اُس نے فکر مندی سے کہتے ہاتھ بڑھا کر اُسکے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینے چاہیں پر بشریٰ نے اُسکے ہاتھ جھٹک دیئے۔

''فکر نہ کرو! مر نہیں جاؤں گی۔ مرنے والی ہوتی تو کب کا مر چکی ہوتی۔''اتنا کہہ کر وہ جھٹکے سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ نوید بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

---------+---------+--------

رضا آج اسکول کے کسی کام سے کیمپس آیا ہوا تھا، وہاں کے متعلق کچھ شکایات موصول ہوئی تھیں۔ آج ویسے بھی اسکول کا آخری دن تھا، پھر عید کے بعد ہی اسکول کھلنا تھا۔ لہٰذا وہ تمام کام مکمل کر کے ہی جانا چاہتا تھا۔ وہ مصروف سا اپنے آفس میں تھا کہ جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے حسین دانت نکالے کھڑا تھا۔

''تم؟ یہاں؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں ہیڈ ماسٹر صاحب! بچوں کے داخلے کے سلسلے میں آیا ہوں۔''وہ مذاق میں کہتا کرسی گھسیٹ کر اُسکے سامنے بیٹھا۔

''داخلہ؟ تمہارے بچے تو بہت چھوٹے ہیں۔''اُس نے پانی کا گلاس اُسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اتنے بھی چھوٹے نہیں ہیں۔ بیٹا چار سال کا ہے۔ اُسکا داخلہ کروانا تو بنتا ہے، پر آپکی پرنسپل نے انکار کر دیا ہے داخلہ لینے سے۔''اُس نے بتایا تو رضا مسکرایا۔

''ہاں! میں اپنے اسکول میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کا ایڈمشن نہیں لیتا۔ میرے نزدیک وہ بچے گھر میں، ماں کی آغوش میں تربیت پانے کے مستحق ہیں۔''

''تو کیا تمہارے انکار کر دینے سے ماں باپ بچوں کو کہیں اور داخل نہیں کریں گے؟''اُس نے غور سے دیکھا۔

''اِسکا حل نکال لیا ہے، ہماری ایک قابل ٹیچر نے۔''اُس نے کہا۔

''کیا؟''پھر رضا نے جزا کی بنائی تمام پالیسی اُسکے گوش گزار کر دی۔

''بہترین!''وہ متاثر نظر آنے لگا۔''واقعی قابلِ ستائش اقدام ہے۔''اُس نے تعریف کی۔

''تو اب تمہارا کیا خیال ہے؟''رضا نے پوچھا۔

''میں پانچ سال کے بعد ہی داخل کروں گا رضا کو اسکول میں۔''

''میں تو بھول ہی گیا کہ تمہارے بیٹے کا نام رضا ہے۔''اُس نے سر پر ہاتھ مارا۔اِس سے پہلے کہ حسین کچھ کہتا ایک اُستانی بھاگی بھاگی، گھبرائی ہوئی سی وہاں آئیں۔

''کیا ہوا؟''دونوں نے ہی پریشانی سے اُستانی کو دیکھا تھا۔

''سر! وہ نشمیہ۔۔۔''اُنہوں نے جو کہا، اُسے سن کر دونوں ہی تیزی سے باہر بھاگے تھے۔

---------+---------+--------

علی آفس آیا تو موڈ آف ہی تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہیں؟ نشمیہ پر غصّہ کرنا نہیں چاہتا تھا پر کر چکا تھا۔اُسکی روتی آنکھیں الگ یاد آ رہی تھیں۔

''آخر میرے بچے مجھ پر ہمیشہ اپنی ماں کو ہی فوقیت کیوں دیتے ہیں؟''دکھ سے سوچا۔

بچہ یہ نہیں دیکھتا کہ اُسکے ماں باپ نے بطور سنگل پیرنٹ اُس کے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں؟ وہ صرف اپنی محرومی دیکھتا ہے اور زندگی کے کسی بھی حصے میں اُسے اپنی محرومی پوری کرنے کا موقع ملے، تو وہ کر لیتا ہے۔

نوید کے کہے الفاظ جو وہ تب نہیں سمجھ سکا تھا، وہ اب سمجھ آ رہے تھے۔پہلے احمد اپنی ماں سے دور رہا، تو جیسے ہی اُسے ماں ملی، اُس نے ماں کے ساتھ جانے کو فوقیت دی۔اب نشمیہ ماں سے دور تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی کسی روز علی کو چھوڑ جائے۔اِس خیال کے آتے ہی اُسکی کنپٹی میں درد اٹھنے لگا۔

لیکن میں بھی تو احمد سے دور ہوں۔ کیا اُسے میں یاد آ رہا ہو نگا؟ دل میں خود سے سوال کیا۔ کیا معلوم شاید اُسے مجھ سے دور رہ کر میرا احساس ہو؟

آج وہ تمہیں چھوڑ کر گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد اُسے تمہاری کمی محسوس ہو گی تو وہ دوبارہ تمہارے پاس آنا چاہے گا۔

نوید کی بات درست تھی، اور اِسکے جواب میں اُس نے کیا کہا تھا؟ کہ تب مجھے اُسکی ضرورت نہیں ہو گی۔ اور نوید نے کہا تھا کہ اولاد سے انتقام نہیں لیتے۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا اُس نے، بچے ہمارے انتقام کا حصہ بننے کے لیے نہیں ہوتے۔ اولاد ضرورت کے لئے نہیں پالی جاتی۔

وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ نظریں ٹیبلٹ پر تھیں پر ذہن کہیں اور۔ بلآخر اُس نے ٹیبلٹ میز پر رکھ کر چہرہ اُٹھایا اور خود کو ریلکس کرنا چاہا۔ گردن کو آرام دینے کے لیے چہرہ یہاں وہاں گھمایا تو نظریں برابر والی میز پر اپنی نشست سنبھالے عمر پر پڑیں۔ وہ آج بالکل خاموش اور کھویا کھویا سا بیٹھا تھا۔ نجانے کیا بات تھی؟

''عمر!'' اُس نے عمر کو پکارا۔

''ہاں؟'' اُس نے چونک کر دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' پچھلے دو سالوں میں پہلی بار اُس نے عمر سے خیریت دریافت کی تھی۔

''ہاں! کیوں؟'' اُس نے مختصر سا جواب دے کر سوال پوچھا۔

''مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''نہیں بس! ایسے ہی، نوید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' اُس نے سر جھٹک کر کہا۔

''ملا تھا میں اُس سے کل رات۔'' اُس نے بتایا۔ یقیناً نوید کا اصل جان کر سب ہی پریشان تھے۔

''کیا کہا اُس نے؟'' عمر نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کہنے لگا کہ مجھے چپ رہنے دو۔ میں بولنے پر آیا تو پھر خاموش نہیں ہوں گا۔'' عمر چپ کا چپ رہ گیا۔

''اللہ اُسے صبر دے۔'' علی نے خود ہی کہا۔

''آمین! پر صبر بھی آسان کہاں ہوتا ہے؟'' عمر نے دل میں سوچا۔

''جو گزر گیا اُسے ہم بدل نہیں سکتے۔ تم پریشان نہ ہو۔'' علی نے ایک مرتبہ پھر کہا، اِس سے پہلے کہ عمر کوئی جواب دیتا علی کا فون بج اُٹھا۔ نمبر دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''ہیلو!'' اُس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف رضا تھا۔

''کیا ہوا؟'' علی نے پوچھا۔

''ابھی؟ کیوں؟'' وہ فون کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ''کیا۔۔۔۔؟ نشمیہ نے؟'' وہ تقریباً چیخا تھا۔ عمر نے پریشان ہو کر اُسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔'' وہ فون کاٹتے ہوئے تیزی سے کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا علی؟'' عمر بھی پریشانی سے کھڑا ہوا تھا۔

''نشمیہ کے اسکول سے فون تھا۔ اُس نے کچھ مسئلہ کر دیا ہے۔''

''کیا میں آؤں؟''

''نہیں نہیں! پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں بس کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔'' وہ عجلت میں کہتا باہر نکل گیا۔ عمر کچھ پریشانی اور کچھ نا سمجھی سے اُسے دیکھے گیا۔

نجانے اب اُسکی بیٹی نے کیا کر دیا تھا؟

---------+---------+--------

کافی دیر بشریٰ کو منانے کی کوشش میں ناکام ہوتا نوید، بلآخر ڈیوٹی پر آفس آچکا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے اُسے یاد آیا کہ کل رات علی نے اُسے ایک کام کہا تھا۔ فوراً ہی شیراز کا نمبر چیک کیا تو معلوم ہوا وہ تو رات کو ہی فاطمہ کی تمام معلومات اُسے بھیج چکا تھا۔ وہ کسی ''ملازمت پیشہ خواتین کے ہاسٹل'' کا پتہ تھا۔ اُس نے علی کو میسیج فارورڈ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آگیا کہ علی سے کل اُس نے کس انداز میں بات کی تھی۔ اپنے لہجے پر کچھ دیر کے لیے شرمندگی ضرور ہوئی پر اُسکا معذرت کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اندر داخل ہوا تو ہر جانب گہما گہمی تھی۔ وہ مصروف سا چلتا اپنے آفس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ راستے میں کھڑے شیراز پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ شیراز کمر پر ہاتھ باندھے، شیشے کی دیوار کے اُس پار بنے فرّخ صاحب کے آفس کی طرف یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا اُسکے قریب آیا اور اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

اندر سربراہی کرسی پر فرّخ صاحب سر جھکائے، دونوں ہاتھ باہم پھنسائے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھی خاتون کی بات سن رہے تھے۔ وہ نیلے لباس میں ملبوس تھی، چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ شیراز تو ایسے کھڑا تھا جیسے پتھر کا بت۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''نوید کے سوال پر وہ جسے اُچھلنا چاہیے تھا۔ خاموشی سے اُسکی طرف مڑا۔

''آپ کب آئے؟''آہستگی سے پوچھا۔

''ابھی ہی آیا ہوں۔ اندر کیا ہو رہا ہے؟''اُس نے شیشے کی دیوار کے اُس پار دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لڑکی مجھے قرآن کی تعلیم دینے والے استاد کی بیٹی ہے۔ اِسے میں ہی یہاں لایا ہوں، بہت عرصے سے انصاف کے لیے بھٹک رہی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو پہلے یہاں لے آتا۔''اُس نے دکھ سے کہا تو موبائل پر کچھ لکھتے نوید نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے اِسکے ساتھ؟''

''رشتے سے انکار پر، ایک شخص نے اسکے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ آدھا چہرہ جل گیا ہے، باقی آدھا سلامت ہے۔''اِس بات پر نوید نے فوراً مڑ کر دیکھا، دوپٹے سے چھپے ہونے کے باوجود بھی اُسکا آدھ جلا چہرہ نظر آ رہا تھا، شاید نوید نے اُس وقت غور نہیں کیا تھا۔

''تو کون شخص ہے وہ جسکے خلاف اب تک کارروائی نہیں ہو سکی؟'' اُس نے سوال کیا تو شیراز نے گہرا سانس لیکر اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔

''ایس ایچ او سمیر۔''اِس جواب پر نوید کا منہ کھلا۔

''اوہ! وہ رشوت خور خبیث؟''نوید نے لب بھینچے ہوئے پوچھا تو شیراز نے اثبات میں سر ہلایا۔''تبھی اُسکے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوئی اب تک۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''اسی لیے میں اسے فرّخ صاحب کے پاس لایا ہوں۔ اُمید ہے کہ جلد انصاف مل جائے۔''

''اچھا کیا تم نے۔ اُسکا علاج تو فرّخ صاحب کر لیں گے۔ یہ بتاؤ فیصل کہاں ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''چھٹّی پر ہے۔''اس نے مختصر جواب دیا تو وہ سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا جبکہ شیراز اپنی سابقہ حالت میں واپس کھڑا ہو گیا۔

---------+---------+--------

اسکول کے احاطے میں اِس وقت جزا پنچوں کے بل نشمیہ کے سامنے بیٹھی تھی جو دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے، چہرے پر غصّے کے واضح تاثرات لیے کھڑی تھی۔ جزا کے پیچھے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر رضا بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جبکہ حسین دیوار سے ٹیک لگائے، اُسے پنڈولم کی طرح دائیں، بائیں چکر کاٹتے دیکھ رہا تھا۔

''نشمیہ! کیوں کیا تم نے ایسا؟'' جزا مسلسل اُس سے جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پر اُس نے نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

''مجھے تم سے ہر گز یہ امید نہیں تھی۔'' جزا نے ناراضگی سے کہا۔

''لیکن مجھے اِس سے یہی اُمید تھی۔ پورے سو فیصد!'' پیچھے سے رضا کی آواز سنائی دی جسے جزا نے نظر انداز کیا تھا۔

''تم تو ایسی بچی نہیں ہو؟'' جزا نے آخری کوشش کی۔

''کیونکہ تم اِسکا پچھلا کارنامہ نہیں جانتی، اِس لیے یہ کہہ رہی ہو۔'' رضا کا تو سانس ہی پُھول رہا تھا۔

''رضا!'' جزا نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ ''اِس بچی کو کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے۔'' اُس نے جیسے سمجھانا چاہا۔

''کاؤنسلنگ کی ضرورت اِسکو نہیں، اِسکے باپ کو ہے۔'' رضا نے اُسی طرح چکر کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ اِسکے باپ نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟'' اُسی لمحے وہاں اُسکے باپ نے انٹری دی تھی۔ اور آتے ہی جو آواز اُسکے کانوں میں پڑی وہ اُسکے روایتی حریف کے اُسکی شان میں کہے گئے توصیفی کلمات تھے، لہٰذا سوال کرنا تو بنتا تھا۔

''آہ! تمہارا ہی انتظار تھا۔ اب اِس سوال کا جواب تم اپنی بیٹی سے ہی لو۔'' وہ بھی دوبدو بولا تھا۔ حسین مسکراتا ہوا سیدھا ہوا، مقابلہ اب مزیدار ہونے والا تھا۔ اُسکے نزدیک۔۔۔۔۔

علی کو دیکھ کر جزا وہاں سے ہٹی۔

''کیا ہوا ہے نشمیہ؟'' اُس نے نشمیہ کو دیکھ کر پریشانی سے پوچھا جو بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ لیکن اُسی لمحے اُسکی نظریں پاس کھڑے بچے پر پڑیں اور اُسکی تو آنکھیں ہی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ نشمیہ کی ہی عمر کا بچہ تھا، جسکے ماتھے پر پٹّی تھی اور سفید شرٹ پر خون کے واضح دھبّے تھے۔ اُس نے پہلے بچے کو اور پھر بے یقینی سے اپنی اولاد کو دیکھا۔

''یہ۔۔۔ یہ تم۔۔۔ تم نے کیا؟'' اُس نے اٹکتے ہوئے پوچھا کہ شاید اُسکا شک غلط ہو۔ نشمیہ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔

''یقیناً! اِسکے علاوہ اور کون کر سکتا ہے؟'' پیچھے پنڈولم کی طرح چکر کاٹتے رضا نے جواب دیا۔ علی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

''نشمیہ ؟ مجھے بتاؤ یہ تم نے کیا ہے ؟''اُسے یقین نہ تھا۔

''ہاں !''وہ پھٹ پڑی۔

''کیوں ؟''اُس نے صدمے سے پوچھا۔

''کیونکہ مجھے غصّہ آرہا تھا۔''

''واہ !اِس سے بہترین وجہ تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔''رضا نے دوبارہ کہا،اُسے دوبارہ نظر انداز کیا گیا۔

''کیا مطلب غصّہ آگیا تھا؟ کیوں آگیا غصّہ ؟''وہ جیسے یقین کرتے ہوئے بھی یقین نہیں کر پارہا تھا۔

''کیونکہ آپ نے مجھے ڈانٹا تھا۔''اُس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

''ڈانٹا تھا؟ تو اسکا مطلب تم یہ کرو گی ؟ میں تمہیں ڈانٹوں گا تو تم اسکول سے نکل جاؤ گی ؟ میں تمہیں ڈانٹوں گا تو تم کسی کا سر پھاڑ دو گی ؟''اُس کی آواز بلند ہوئی۔

''اگلی بار ڈانٹا تو یہ میرے اسکول کو آگ لگادے گی۔''رضا کے نہ ختم ہونے والے جملے۔

''نشمیہ جواب دو مجھے ! کیوں اتنی وائلنٹ ہو تم ؟ کیوں اتنا غصّہ آتا ہے تمہیں ؟''علی نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو ذرا ! یہ سوال کر کون رہا ہے ؟''رضا نے کہا۔

''ول یو پلیز شٹ اپ ؟(کیا تم مہربانی کر کے اپنا منہ بند کرو گے ؟)''علی کا صبر جواب دے گیا تو اُس نے پلٹ کر رضا سے کہا۔

''نو آئی وانٹ (نہیں ! میں نہیں کروں گا)۔''اُس نے بھی دوبدو جواب دیا تو علی نے گھور کر اُسے دیکھا۔''اِس بچے کا باپ آنے والا ہے،اُسے کیا کہنا ہے یہ تمہارا مسئلہ ہے۔''رضا نے رک کر اُسے جتایا تو اُس نے لب بھینچ کر نشمیہ کو دیکھا۔ اور اُسی لمحے بچے کا باپ تن فن کرتا اسکول میں داخل ہوا۔

''ارقم ! یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا میرے بیٹے کے ساتھ یہ ؟ کہاں ہے انتظامیہ ؟''وہ آتے ساتھ ہی گرجا تھا۔ علی خاموشی سے اُٹھ کر نشمیہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''بچوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا،تو ایک بچی نے غصّے میں اپنا سٹیل کا تھرماس اِسکے سر پر مار دیا۔ شکر ہے کٹ زیادہ گہرا نہیں ہے،مرہم پٹی سے ہی خون رک گیا۔''جزا نے وضاحت دی۔

''کون ہے وہ نفسیاتی بچی؟'' بچے کا باپ چیخا تو علی نے غیر محسوس انداز میں نشمیہ کو اپنے پیچھے کیا۔

''میری بیٹی ہے اور میں اِسکی طرف سے آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔'' اُس نے ذرا آہستہ لہجے میں کہتے نشمیہ کو گھورا تھا۔ اُسکی اولاد نے تو اُسے ذلیل کروا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا مطلب معذرت چاہتا ہوں؟ میرے بیٹے کا سر پھاڑ دیا ہے اِس نے۔۔۔'' آدمی کا غصّہ عروج پر تھا۔

''تو کیا کروں؟ بچی کو پولیس کے حوالے کر دوں؟ معذرت کر تو رہا ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' علی نے ذرا ضبط سے کہا۔

''آئندہ ایسا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ رضا صاحب! میں درخواست کرتا ہوں کہ اِس بچی کو اسکول سے نکالا جائے، اِسکا یہاں ہونا باقی بچوں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔'' اُس آدمی نے، سینے پر ہاتھ باندھے سنجیدگی سے ساری گفتگو ملاحظہ کرتے رضا کو دیکھ کر کہا۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میری بیٹی خدانخواستہ کوئی قاتلہ ہے۔ بچوں میں ایسے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔'' اب کہ علی کو بھی غصّہ آیا۔

''کسی بھی بچے کو اسکول سے ایسے نہیں نکالا جا سکتا۔ اُسکے لیے کمیونیٹی بیٹھتی ہے، معاملہ دونوں طرف کا سنا جاتا ہے۔ اگر نشمیہ نے ہاتھ اُٹھایا تو یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہو گی کہ اُس نے ایسا کیا کیوں؟ کیوں کہ آپکے بیٹے کو پہلے بھی دوسرے بچوں کو bully کرنے کے جرم میں ایک ہفتے سسپینڈ کیا گیا تھا۔'' رضا نے اُس آدمی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا۔

''دیکھیں! آپ پرانی باتیں نہ نکالیں۔ ابھی کی بات کریں۔'' آدمی نے پھر سے چڑھائی کرنے کی کوشش کی۔

''ابھی کی بات یہ ہے کہ دونوں طرف کی بات سنی جائے گی۔'' رضا نے حتمی انداز میں کہا اور نشمیہ کی جانب رخ موڑا۔

''نشمیہ! مجھے بتاؤ تم نے کیوں مارا اسے؟'' اُس نے پوچھا۔

''کیونکہ اِس نے کہا تھا کہ تمہاری امی بچّی ہیں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''وِچ؟'' اُسکے لگا شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''وِچ نہیں بچّی کہا تھا اِس نے، یہ میرے کلرز نہیں واپس کر رہا تھا، میں نے کہا دو تو اِس نے کہا نہیں دوں گا تم نیا لے لو۔ میں نے کہا میری امی نے دیا ہے تو اِس نے کہا تمہاری امی۔۔۔'' وہ بتانے لگی۔

''بس ٹھیک ہے!'' رضا نے اُسے مزید بولنے سے روکا اور ارقم کی طرف گھوما۔

''یہ بچی جھوٹ بول رہی ہے۔'' اِس سے پہلے کہ رضا کچھ کہتا، بچے کا باپ فوراً بولا۔

''میری بیٹی جھوٹ نہیں بولتی،اُس نے بچے کو مارا ہے،تواُس نے فوراً قبول بھی کر لیا۔''علی نے فوراً کہا۔

''ارقم!کیا تم نے ایسا کہا تھا؟''رضا نے دونوں کو نظر انداز کر کے ارقم سے پوچھا،بچہ خاموش کھڑا رہا۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ میرے بچے کو گالی آتی بھی نہیں ہے،بچی نے اپنی طرف سے کوئی بات بنالی۔۔۔''آدمی وضاحت دینے ہی لگا تھا کہ اُسی لمحے بچہ بول اٹھا۔

''نہیں بابا!بچّے گالی نہیں ہوتی ہے۔آپ بھی تو مما کو کہتے ہیں۔''اِس جملے پر جہاں رضا،علی،حسین اور جزا نے حیرت سے بچے کے باپ کو دیکھا تھا،وہیں باپ نے صدمے سے اپنے بیٹے کو دیکھا،جواُسکی پول کھول کر خود کو بڑا فطین ثابت کر رہا تھا۔

''ارقم!''اُس نے اپنے بیٹے کو آنکھیں دکھانی چاہیں۔

''تو آپ اپنے گھر میں،اپنے بچے کے سامنے اپنی اہلیہ کو گالیاں دیتے ہیں؟''رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں!ایسی بات نہیں ہے۔کبھی مذاق میں کہہ دیا ہوگا تو اِس نے سن لیا ہوگا۔''وہ وضاحتیں دینے لگا۔

''پر آپ تو روز مما کو ایسا کہتے ہیں۔''بچے نے پھر معصومیت سے کہا تو باپ نے تھوک نگلا۔

''شکل اور حلیے سے تو مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں آپ۔افسوس ہے آپ پر!''رضا نے نفرت سے کہا تھا۔

''ایک بات میری آپ دونوں سن لیں،بچے وہی سیکھتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔اسکول چاہے لاکھ تربیت کر لے،اگر گھر میں گالیاں دی جائیں گی تو بچہ وہی سیکھے گا۔''رضا بچے کے باپ کو دیکھتے ہوئے بولا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے علی کی جانب دیکھا۔''اور اگر گھر کے بڑے اپنے غصّے پر قابو رکھنا نہیں جانتے ہوں گے تو بچے بھی وہی سیکھیں گے۔''اُس نے جتایا۔جواباً علی خاموش رہا۔

''آپکے بیٹے کو یہ آخری تنبیہہ ہے،اگلی بار اِس نے کسی کو bully کیا یا کسی کو گالی دی تو اسے گھر لے جایئے گا۔''اُس نے پھر ارقم کے باپ سے کہا،اور دوبارہ علی کی طرف گھوما۔

''یہ نشمیہ کو بھی آخری تنبیہہ ہی ہے۔اگر اب اِس نے اسکول کا کوئی اُصول توڑا یا دوبارہ کسی بچے پر ہاتھ اُٹھایا تو اِسے بھی اسکول سے نکال دیا جائے گا۔''علی نے لب بھینچے۔

''اور مس جزا آپ!کہاں تھی آپ جب یہ ہو رہا تھا؟''اب کہ وہ جزا کی جانب مڑا جسے بالکل اُمید نہ تھی کہ وہ اُس سے بھی باز پرس کرے گا۔

''مم۔۔۔میں ذرا کچھ کام سے۔۔۔۔باہر گئی تھی۔مگر دو منٹ میں ہی واپس۔۔۔۔''وہ جلدی سے وضاحت دینے لگی۔

''دو سیکنڈ کے لئے بھی کلاس خالی نہیں چھوڑنی تھی آپ کو۔اِس لاپرواہی کا نتیجہ دیکھا؟''جزاالب کہ خاموش رہی۔رضاالٰہی نے ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانکا تھا۔

جزااُسے سوری کہتی واپس کلاس میں چلی گئی۔بچے کے باپ نے بھی دوبارہ کسی بحث میں پڑنے سے بہتر وہاں سے نکلنا سمجھا،جبکہ علی نے تاسف سے ایک نظر سر جھکائے کھڑی نشمیہ کو دیکھا،پھر اُسکا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف بڑھنے لگا۔راستے میں کھڑے حسین کو سر کے اشارے سے سلام کرتا وہ دروازے تک آیا تو اپنے پیچھے رضا کی آواز سنائی دی۔

''ہمیشہ اُسے ڈانٹا ہی ہے یا کبھی پوچھا بھی ہے کہ اِسے مسئلہ کیا ہے؟''ایک لمحے کو علی کے قدم رکے۔لیکن وہ پیچھے نہیں مڑا،بلکہ بنا کوئی جواب دیئے باہر نکل گیا۔

''میں سابقہ جنم پر یقین نہیں رکھتا،ورنہ کہتا کہ تم دونوں پہلے ضرور سوکنیں تھی۔''حسین نے جملہ کسنا ضروری سمجھا تھا۔رضا سر جھٹک کر رہ گیا۔

---------+---------+--------

نشمیہ کو لیکر وہ اپنے آفس کے باہر رکا تو فون کی روشن ہوتی اسکرین پر نظریں پڑیں۔اُس نے فون اُٹھا کر دیکھا تو نوید کا پیغام تھا۔اُس نے فاطمہ کا ایڈریس بھیجا تھا۔اُس نے خاموشی سے فون رکھ کر ایک نظر برابر میں چپ چاپ بیٹھی نشمیہ کو دیکھا۔پورے راستے علی نے اُس سے کوئی بات نہ کی تھی۔یہ اسکی شدید ناراضگی کا اظہار تھا۔وہ گاڑی سے اُتر کر اُسکی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اُسے بھی اُتارا۔

''ہم گھر نہیں جائیں گے؟''اُس نے علی سے پوچھا۔علی نے جواب دینے کے بجائے جیب سے سیگریٹ نکال کر سلگائی اور منہ سے لگالی۔

''ابّا نے کہا تھا کہ یہ گندی ہوتی ہے۔اِسے پھینک دیں۔''نشمیہ سے علی کی سیگریٹ ہضم نہیں ہوئی۔

''تم خاموش رہو گی؟''اُسکا ضبط جواب دے گیا تو بولا۔

''نہیں!''وہ بھی ڈھیٹ تھی۔''یہ گندی ہوتی ہے،مجھے اِسکی بو لگتی ہے گلے میں۔۔۔''وہ کمر پر ہاتھ رکھے لڑاکا انداز میں بولی۔

''میں تمہاری بات کیوں مانوں؟ہاں؟تم میری کوئی بات مانتی ہو؟''علی نے ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ ہوئی۔

''آئی ایم سوری!میں آئندہ نہیں کروں گی۔''اُس نے سر جھکائے کہا۔

''چپ کر کے اندر چلو۔''علی نے اُسکی معذرت کو قبول نہ کرتے ہوئے اندر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ منہ بسورتی دروازے کی جانب چل پڑی۔

وہ اُسے کے پیچھے ہی اندر آیا، پر ہاتھ میں پکڑی سیگریٹ نہ چھوڑی، نہ ہی منہ سے لگائی۔ بس اسی طرح چٹکی میں پکڑا رہا۔ اپنے آفس آیا تو عمر کچھ پریشان سا بیٹھا تھا، اُسے دیکھا تو فکر مندی سے اُسکی طرف آیا۔

''سب خیریت تھی؟'' عمر نے قریب آتے ہوئے پوچھا لیکن اُسکے جواب دینے سے پہلے نشمیہ نے چہکتے ہوئے عمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟'' اُس نے عمر سے پوچھا تو علی نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ یہ ادب و آداب والی اولاد اُسی کی تھی؟

''وعلیکم السلام! میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟'' عمر نے جھک کر اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، پر بابا غصّے میں ہیں۔'' اُس نے رازداری سے کہا تو عمر نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے علی کو دیکھا، جس نے یہ ساری گفتگو بخوبی سنی تھی۔ اُس نے گہرا سانس لیکر میز پر رکھی ایش ٹرے میں سیگریٹ مسلی اور پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر عمر کو دیکھا۔

''سر پھاڑ کر آرہی ہے اپنے کلاس میٹ کا۔'' علی نے سکون سے اُسکا کارنامہ بتایا تو عمر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تم۔۔۔سچ کہہ رہے ہو؟'' اُسے یقین نہ آیا تھا۔

''ہاں! بچہ ٹھیک ہے الحمدللہ! لیکن بچے کا باپ اور۔۔۔۔'' وہ رکا اور نشمیہ کو دیکھا۔ ''اِسکے اسکول کے اؤنر (مالک) نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''نشمیہ!'' عمر نے دکھ سے اُسے دیکھا۔ ''کیوں کیا تم نے ایسا؟''

''مجھے غصّہ آگیا تھا۔'' اُس نے ذرا شرمندگی سے کہا۔

''غصّے میں کسی پر ہاتھ تو نہیں اٹھاتے بیٹا!'' عمر نے نرمی سے کہا۔ علی جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، اگر وہ عمر کی زبان سمجھتی تھی تو اُسے ہی نشمیہ کو سمجھانا چاہیے۔

''میں کیا کرتی؟ اُس نے میرے کلرز رکھ لیے تھے۔''

''تو اپنی ٹیچر کو بتاتی۔''

''ٹیچر کلاس میں نہیں تھیں۔''

''تو اُنکے کلاس میں آنے کا انتظار کرتی، نہیں تو اپنے بابا کا انتظار کرتی۔ لیکن تمہیں خود سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ غلط بات ہے۔'' اُس نے پیار سے سمجھایا۔

''میں آئندہ نہیں کروں گی۔''اُسکو بات سمجھ آگئی تھی۔

''نجانے یہ تمہاری بات کیسے سن لیتی ہے؟''علی نے حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھا، عمر ہنسا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر اپنی میز کی دراز سے ایک چھوٹا سا بریسلیٹ نکالا اور دوبارہ نشمیہ کے سامنے بیٹھتے اُسکی کلائی میں پہنا دیا۔

''یہ میری طرف سے تمہارا تحفہ۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واؤ! اتنا پیارا؟''وہ خوش ہوئی۔''تھینک یو!''اُس نے ایک بار پھر عمر کو گلے لگایا تھا۔ایک بار پھر عمر کے پیار سے دل کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔

''اِسکی کیا ضرورت تھی؟''علی نے کہا۔

''تحفے ضرورت کے تحت نہیں دیئے جاتے۔''وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا، پھر اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ صوفے پر بیٹھی نشمیہ دلچسپی سے اپنے بریسلیٹ کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

''میں نے اپنی بیٹی کے لیے لیا تھا۔اُسکو تو دے نہیں سکا۔ سوچا تمہاری بیٹی کو دے دوں۔'' اُس نے نشمیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بیٹی بھی ہے؟''علی نے حیرت سے پوچھا۔ گزرے ڈھائی سالوں میں اُس نے پہلی بار عمر کے منہ سے اُسکی بیٹی کا ذکر سنا تھا۔

''ہاں! اِس سے چھوٹی ہے، پر اِسکو دیکھ کر مجھے وہ ہی یاد آتی ہے۔''اُس نے بتایا، آنکھیں نشمیہ پر ہی ٹکی تھیں پر اُن آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی دکھ، کوئی حزن، کوئی ملال سا۔ کچھ کھو جانے جیسا۔

''کیوں؟ وہ تمہارے ساتھ نہیں رہتی؟''علی نے نجانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا؟

''نہیں! اُسکی ماں اُسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔''اُس نے آہستگی سے بتایا تو علی جیسے ایک لفظ بھی کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اُسے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی، ہر سوال کا جواب مل گیا تھا۔ دونوں ایک ہی جیسے حالات سے گزر رہے تھے۔

''اور مجھے اِسکو دیکھ کر نوید یاد آتا ہے۔''اُس نے بات بدلنے کی عرض سے کہا۔

''کیوں؟''عمر حیرت سے اُسکی طرف پلٹا۔

''دونوں ایک ہی جیسے وائلنٹ ہیں۔''اُس کے منہ بنا کر کہنے پر عمر بیساختہ ہنسا تھا۔

''صحیح کہہ رہے ہو، تم تو یونیورسٹی کے زمانے میں بھی ایسے نہیں تھے۔''عمر کو اپنی جامعہ کا دور یاد آیا۔

''یونیورسٹی کے زمانے میں تو نوید بھی ایسا نہیں تھا۔ خیر! پتہ نہیں کس پر چلی گئی ہے یہ؟'' علی ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہو مسکرایا تو عمر بھی مسکرا دیا۔

''یہ آپکے لیے۔۔۔'' اُسی لمحے نشمیہ نے ایک خوبصورت سا جیل پین عمر کی جانب بڑھایا۔

''میرے لیے؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! آپکا گفٹ۔۔۔'' وہ مسکرائی۔

''اوہ! بدلا؟'' عمر نے پوچھا تو وہ ہنسی۔

''پر تمہارے پاس یہ آیا کہاں سے؟'' اُس نے دوبارہ پوچھا۔

''اِسکے پاس ایسے بہت سارے ہیں۔ میرے ساتھ جا کر خریدے تھے اِس نے، اپنے پسندیدہ لوگوں کو گفٹ کرتی ہے۔'' علی نے بتایا تو عمر کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''یعنی میں اپنے آپکو تمہاری گڈ بک میں سمجھوں؟'' اُس نے نشمیہ سے پوچھا۔

''وہ کیا ہوتی ہے؟'' اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''جس میں تمہارا باپ نہیں ہے۔'' یہ جلا کٹا جواب علی نے دیا تھا، عمر ایک بار پھر ہنس پڑا۔

''ہاں تو اور کیا؟ اِس نے ابّا کو، پڑوسیوں کے بچوں کو، ہمارے ملازم کو حتیٰ کہ گھر کے باہر آنے والی بلی کو بھی پین گفٹ کیا مگر مجال ہے؟ جو مجھے پوچھا بھی ہو اِس نے۔'' اُس نے حقیقتاً شکایت کی تھی، عمر ہنستا ہی چلا گیا۔ باہر آفس میں بیٹھے ملازمین اُن دونوں کے اِس اچانک تبدیل ہونے والے رویے پر شدید حیران تھے۔

''آپکو پسند آیا؟'' نشمیہ نے اپنے باپ کو نظر انداز کرتے ہوئے عمر سے پوچھا۔

''اٹس نائس!'' اُس نے جیل پین کو ایک خالی کاغذ پر چیک کرنے کی غرض سے چلاتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو! ہو سکتا ہے نشمیہ تمہیں کچھ بڑا گفٹ کرنا چاہتی ہو۔'' کاغذ پر پین سے اپنے دستخط کرتے ہوئے عمر نے علی کو تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

''قطعاً اُمید نہیں ہے مجھے۔۔۔'' علی نے جواب دیتے نشمیہ کو دیکھا جو بریسلٹ سے کھیل رہی تھی، پھر ایک نظر عمر کو، جو کاغذ پر دو تین جگہ اپنے دستخط کر چکا تھا۔ علی عموماً کسی بھی نئے قلم کو چیک کرنے کے لیے اپنا نام لکھ کر دیکھتا تھا اور عمر دستخط کیا کرتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

---------+---------+--------

نمرہ قائم خانی وہ لڑکی جس پر تیزاب پھینکا گیا تھا، اُسکا کیس نوید کے حوالے کیا گیا تھا۔ تمام چھان بین کے بعد بڑی آسانی سے ایس ایچ او سمیر مجرم ثابت ہو رہا تھا۔ اُسکے پاس بھاگنے کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا لیکن بد بخت نے عدالت سے پیشگی ضمانت لے رکھی تھی۔ لہٰذا فلحال تو نوید اُسے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ ڈی آئی جی فرّخ نے یقین دھیانی کروائی تھی کہ ایک بار عدالت میں اُسے مجرم ثابت کر دیا جائے تو وہ عدالت سے اُسکا جسمانی ریمانڈ لینے کی پوری کوشش کریں گے۔

سمیر کو جب معلوم ہوا کہ اُسکا کیس کسی ایس ایس پی نوید عالم کے ہاتھوں میں ہے، تو اُس نے طاقت کے زعم میں، بنا کسی تحقیق کے اپنے چیلوں کو حکم دیا کہ جا کر اُسکے گھر کی کسی عورت کو اُٹھا لائیں، جسکے بل پر وہ نوید کو دھمکی دے سکے۔ کیونکہ ان نامردوں کو سوائے عورتوں پر زور چلانے کے اور آتا ہی کیا تھا؟

اسکول کے بعد جزا ویسے ہی تپی ہوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی، طب ہی آس پاس کچھ گاڑیاں آ کر رکیں، گاڑیوں میں بیٹھے نقاب پوشوں کو دیکھ کر وہ لمحے بھر کو خوف زدہ ہوئی تھی۔ پر اگلے ہی لمحے اُسکے دماغ نے تیزی سے کام کیا اور اُس نے دروازہ کھول کر خود کو اندر بند کر لیا۔

''اب کیا کریں؟'' ایک نقاب پوش نے پوچھا۔

''گھر میں کود جاتے ہیں۔ سمیر صاحب کا حکم ہے کہ ہر صورت اِسکو اُٹھانا ہے۔'' دوپہر کا وقت تھا، اِس پوش علاقے کے لوگ ساری رات جاگنے کے بعد اِس وقت سوئے پڑے تھے۔

''ٹھیک ہے!'' اُن میں سے ایک نے سر ہلاتے ہوئے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اُسی لمحے رضا کی گاڑی وہاں آ رکی۔ اُن نقاب پوشوں کو دیوار پر چڑھتا دیکھ کر وہ آن کی آن میں باہر آیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' وہ گاڑی سے نکلتے ہوئے چیخا ہی تھا کہ اُن میں سے ایک نقاب پوش نے گولی چلا دی، وہ تو رضا سیکنڈ کی ہزارویں حصے میں اپنی جگہ سے ہٹا تھا ورنہ گولی اُسی کو لگ جاتی۔ اُس پر گولی چلا کر وہ لوگ تیزی سے وہاں سے نکلے تھے، البتہ دیوار پر چڑھنے والے نقاب پوش کو اُنہوں نے پیچھے ہی چھوڑ دیا جو اب رضا کے ہاتھ آ چکا تھا۔ اُس نے نقاب پوش کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی بھرپور مزاحمت کر رہا تھا۔ آس پاس گھروں کے لوگ نجانے کونسا نشہ کر کے سوئے تھے جو فائرنگ کی آواز سے بھی نہ اُٹھے، البتہ جزا تیزی سے باہر آئی تھی۔ اُسکے ہاتھ میں ایک خالی گملہ تھا اور وہ اُس نے بنا وقت ضائع کیے نقاب پوش کے سر پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔

''کون ہے یہ؟'' رضا نے پھولی ہوئی سانسوں کے دوران پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم؟ لیکن یہ شاید مجھے اغوا کرنے آئے تھے۔'' وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

''مجھے نوید کو بتانا چاہیے۔''رضا نے تیزی سے کہتے ہوئے فون جیب سے نکالا اور نوید کو کال ملائی۔

''ہاں! اُنکو بتانا ضروری ہے کیونکہ۔۔۔۔''گھبراہٹ میں بولتے بولتے وہ رکی اور مڑ کر حیرت سے رضا کو دیکھا۔پر وہ فلحال ہر شے سے بے خبر نوید کے فون اُٹھانے کا انتظار کر رہا تھا۔دوسری طرف سے جیسے ہی فون اٹھایا گیا رضا فوراً بولا۔

''نوید! کچھ لوگوں تمہارے گھر پر حملہ کیا ہے،وہ جزا کو اغوا کرنے آئے تھے۔پر اب بھاگ گئے ہیں لیکن میں نے ایک کو پکڑ لیا ہے۔''اُسکے الفاظ نے ایک لمحے کو نوید کو سن کیا تھا۔

''کیا؟''وہ یقیناً اُچھلا تھا۔''جزا کہاں ہے؟وہ ٹھیک ہے؟''پہلی فکر بہن کی ہوئی۔

''ہاں! وہ ٹھیک ہے۔تم جلدی آجاؤ پلیز!''اُس نے کہا۔

''رضا! تم اُس آدمی اور جزا کو لیکر فوراً گھر کے اندر جاؤ۔وہ لوگ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔میں بس دو منٹ میں آرہا ہوں۔''اُس نے کہہ کر فون کاٹا۔

''نوید کہہ رہا ہے ہمیں فوراً اندر جانا چاہیے،وہ لوگ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔''اُس نے فون رکھ کر خود کو مشکوک نظروں سے گھورتی جزا کو دیکھ کر کہا۔

''چلو اِسے جلدی سے اُٹھاؤ۔اندر لیکر جانا ہے اِسے۔''رضا نے اُس شخص کے ہاتھ،اُسی کے جوتوں کے تسموں سے باندھتے ہوئے کہا۔

''میں اٹھاؤں؟اتنے بڑے آدمی کو؟''وہ اُچھلی۔

''اُٹھانا نہیں ہے،بس گھسیٹنے میں مدد کردو میری۔''اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''میں کیوں کروں؟میں تو لاپرواہ ہوں نا؟''اُس نے کہا تو رضا نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''جزا! اِس وقت نہ کرو یار!''اُس نے التجا کی۔

''خود ہی کرو اپنا کام!''وہ اُسے ہکا بکا چھوڑتی اندر چلی گئی۔وہ لب بھینچے بڑی مشکلوں سے اُسے گھسیٹتے ہوئے جزا کے گھر کے اندر لایا اور دروازہ بند کر دیا۔

''جان سے ہی تو نہیں مار دیا اِسے؟اُٹھ ہی نہیں رہا یہ۔''رضا نے بے سدھ پڑے نقاب پوش کو دیکھ کر پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔

''اُسے چھوڑو! یہ بتاؤ کہ میرے بھائی کا نمبر تمہارے پاس کیسے آیا؟اور تم نے نہ اپنا تعارف دیا نہ کچھ اور کہا،فون اٹھاتے ہی ڈائریکٹ میرے بارے میں بتایا اور یہاں آنے کا حکم دے دیا۔کیسے جانتے ہو تم اُنہیں؟''وہ کمر پر ہاتھ رکھے تفتیشی انداز میں بولی تو رضا گڑبڑایا۔

''وو۔۔۔وہ۔۔۔آں۔۔۔۔اصل میں۔۔۔''اُسے فوری طور پر کوئی جھوٹ نہیں سوجھا۔

''ہاں! ہاں! اصل میں؟ آگے؟'' وہ ہمہ تن گوش تھی۔

''اُس دن تمہارا بھائی آیا تھا نا! جس روز وہ پولیس والا تمہیں گرفتار کرنے آیا تھا، تو اُس روز۔۔۔''

''اب یہ مت کہنا کہ اُس روز تم نے اُسکا نمبر بھی لے لیا اور تمہاری دوستی بھی ہو گئی؟ کیونکہ اُس روز تو بھائی تم سے ملے بھی نہیں تھے۔ اور وہ اتنے جلدی نہ کسی سے دوستی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اپنا نمبر دیتے ہیں۔'' اُس نے رضا کی بات کاٹی۔

''تو میں نے کب کہا اُس روز؟ اُس روز کے بعد ایک اور روز۔۔۔'' رضا نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''ایک اور روز تمہارے بھائی نے مجھے بیان دینے کے لیے اسٹیشن بلایا تھا۔ اُسی روز اُس نے مجھے اپنا نمبر بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے فوراً بتا دینا۔'' جھوٹ مکمل ہوا۔

''میں نہیں مانتی اِس کہانی کو!'' اُسے نہیں یقین تھا کہ اُسکا بھائی اتنا فراخ دل بھی ہو سکتا ہے۔

''تو مجھے یہ بتاؤ کہ اپنا کونسا نمبر دیا ہے اُنہوں نے تمہیں؟ یقیناً وہ ہی دیا ہو گا جو وہ اپنے کام کے لیے رکھتے ہیں۔ انجان لوگوں کو وہ اپنا ذاتی نمبر نہیں دیتے۔''

''مجھے کیا پتہ کونسا نمبر دیا ہے؟'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نوید کہاں رہ گیا تھا آخر؟

''تو مجھے دکھاؤ! میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔'' وہ چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ ہونہہ! ایس ایس پی کی بہن!

''بس کر دو! آخر اور کیا ہی تعلق ہو سکتا ہے میرا تمہارے بھائی سے؟'' وہ بگڑا۔ اِس سے پہلے کہ جزا کچھ بھی کہتی یکدم ہی دروازہ دھاڑ سے کھلا، اور چونکہ رضا دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا لہذا اُسکا منہ تباہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ لیکن آنے والے کو اِسکی مطلق پرواہ نہ تھی۔

''کون ہے وہ حرام خور؟'' اُس نے آتے ہی جزا سے پوچھا تھا۔

''یہ۔۔۔'' اُس نے زمین پر پڑے نقاب پوش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا اسے؟'' اُس نے رضا سے پوچھا۔

''تمہاری بہن نے سر پر گملا مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔'' رضا نے بتایا تو وہ سنجیدگی سے اُسے دیکھتا نیچے بیٹھا اور نقاب پوش کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر اُسکی ناک اور منہ کو ہاتھ سے بند کیا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ ہوش میں آ گیا۔ نوید نے اُسکا منہ چھوڑ کر اُسے گریبان سے پکڑ کر بٹھایا۔

''ایک بار پوچھوں گا؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟'' نوید نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے پوچھا۔

''کسی نے نہیں، ہم پیشہ ورڈ کیت ہیں۔'' اُس نے کراہتے ہوئے کہا۔ نوید نے لب بھینچ کر چہرہ نیچے کیا جیسے بہت ضبط کیا ہو۔ پھر دوبارہ اُسے دیکھا۔

''میں نے کہا تھا کہ ایک ہی بار پوچھوں گا۔''اُس نے چبا چبا کر کہا اور اگلے ہی لمحے اپنے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا، اور باریک سا کیل کے سائز کا خنجر اُسکے کندھے میں گھونپ دیا۔اُسکی چیخ فضا میں گونجی تھی، جبکہ جزا نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا ورنہ وہ بھی ساتھ ہی چیختی۔اُسکی ماں وحید سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ورنہ تو آج اُنکا دل ہی بند ہو جاتا۔

''بتاؤ!''نوید نے کیل یا خنجر، اُسکے کندھے میں گھمایا۔رضا نے تو چہرہ ہی دوسری طرف کر لیا۔

''بھائی! یہ کسی سمیر کا ذکر کر رہے تھے۔''جزا نے فوراً کہا کہ آیا اُسکا بھائی مزید وحشی پنا نہ دکھا دے۔نوید کے ہاتھ یہ سن کر رکے۔

''سمیر؟''اُس نے آبرو اُچکا کر نقاب پوش کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔''ایس ایچ او سمیر؟''اُس نے پوچھا۔پر آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''جواب دو!''نوید نے خنجر دوبارہ گھمایا۔

''ہاں! ہاں!''وہ چیخ اُٹھا۔نوید نے خنجر کھینچ کر باہر نکال لیا۔اور اب کہ اُسکی چیخوں سے شاید محلّہ جاگ ہی جاتا پر نوید نے اُسے تھپڑ مار کر خاموش کر دیا۔ پھر اُسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا ہوا اور کسی سامان کی طرح گھسیٹتا باہر نکلا۔

''رضا۔۔۔رضا! تم بھائی کے ساتھ جاؤ نہ پلیز!''جزا نے اُس کو دیکھ کر کہا۔

''پریشان نہ ہو تمہارے بھائی کو کچھ نہیں ہوتا۔''اُس نے کہا۔

''ارے اِس لیے نہیں! تم جا کر یہ دیکھو کہ یہ لوگ تھے کون؟ ورنہ بھائی تو مجھے کبھی نہیں بتائیں گے۔''جزا کی بات پر اُس نے تاسف سے اُسے دیکھا۔

''جاؤ نا پلیز!''اُسے کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔رضا اُسے گھورتا ہوا باہر آیا جہاں نوید اُس آدمی کی اچھی خاصی دھلائی کرنے کے بعد اُسے گاڑی میں پھینک چکا تھا اور اب اپنے ساتھ آئے پولیس کے دو اہلکاروں کو گھر کی حفاظت یقینی بنانے کی ہدایت دیتا، اپنی جانب کا دروازہ کھولنے لگا۔

''نوید!۔۔۔''رضا نے اُسکے قریب آتے ہوئے پکارا۔

''تمہارا شکریہ رضا!''اُس نے بنا اُسکی بات سنے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں؟''نوید نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تم غصّے میں ہو، تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''وہ جزا کے لیے ایسا نہیں کر رہا تھا۔سچ تو یہ تھا کہ اُسے واقعی نوید کی فکر تھی۔

''میرے کاموں میں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔''اُس نے بے مروتی سے کہااور اپنی طرف کا دروازہ کھولنے لگا۔رضا نے اُسی لمحے اُسکا بازو پکڑا تو وہ رکا۔

''میں تمہیں اکیلے جانے نہیں دوں گا۔''اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں اِس وقت شدید غصّے میں ہوں رضا! میرا دماغ مزید خراب مت کرو۔''اُس نے چباچبا کر کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ کہیں تم مار ہی نہ دو کسی کو۔''رضا نے اُس سے زیادہ غصّے سے کہا تھا۔نوید نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔اتنی جرات تو ابھی تک کسی نے بھی نہیں کی تھی۔

''میں ساتھ آرہا ہوں۔''اُس نے حتمی لہجے میں کہااور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر پورے حق سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔نوید اِس وقت اُس سے کسی بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا تھا، فلحال تو سمیر نے اُسکی غیرت کو للکار دیا تھا اور وہ بیان نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اِس وقت کس انگاروں پر جل رہا ہے؟ خو مخواہ رضا اُسکے عتاب کا شکار ہو جاتا۔ سو! وہ بنا کسی بحث کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اُس نے گاڑی اتنی تیز چلائی تھی کہ رضا کو یقین ہو گیا کہ اُسکی پناہ گاہ آج تو یتیم ہو ہی جائے گی۔نوید نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر گاڑی روکی اور فوراً ہی پیچھے والے بندے کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔رضا جلدی سے اُتر کر اُسکے پاس آیا۔

''نوید! آرام سے بات کرنا پلیز!''اُس نے سمجھانا چاہا۔

''بیغیرت نہیں ہوں میں!''اُس نے سرد لہجے میں کہااور ادھ موئے ہوئے آدمی کو ایک بار پھر سے گھسیٹتا ہوا سمیر کے آفس میں آیااور آدمی کو اُٹھا کر اُسکی میز پر پٹخ دیا۔

''کیا بد تمیزی۔۔۔۔''وہ بولتے ہوئے کھڑا ہوا، پر نوید کو سامنے دیکھ کر اُسکی سٹی گم ہوئی۔

''سر آپ؟''اُس نے کہا۔

''کیا سوچ کر کیا تھا یہ؟''نوید نے دونوں ہاتھ جیب میں ڈالتے سرد لہجے میں پوچھا۔اُسے چند سیکنڈ لگے تھے بات سمجھنے میں۔ اُس نے یقیناً بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔اُسے پہلے تحقیق کر لینی چاہئے تھی۔

''سر! میں نہیں جانتا تھا کہ وہ آپکی بہن ہیں۔میں معذرت چاہتا ہوں۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو یہ معذرت نوید کی غیرت پر کسی تازیانے کی طرح لگی تھی۔

''کیا سوچ کر کیا یہ؟''نوید نے سوال دہرایا۔وہی خون جماتا، ہڈیوں میں سنسنی دوڑاتا سرد لہجہ۔

''میں نے معذرت کرلی ہے، غلط فہمی ہوگئی تھی۔''وہ بھی بڑا ڈھیٹ بندہ تھا۔ نوید سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

''میں نے کہانا! غلط فہمی ہوگئی تھی؟اب مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے، بعد میں بات ہوگی۔''وہ کہہ کر نوید کے برابر سے نکلنا چاہتا تھا، لیکن اُسی لمحے نوید نے اُسکے سینے پر ہاتھ رکھا اور اُسے اتنی زور سے دھکّا دیا کہ وہ پیچھے دیوار پر جا گرا تھا۔ نوید دوبارہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔

''میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔''اُس نے اُسی سرد لہجے میں کہا۔ رضا اُسے روکنا چاہتا تھا پر جو خون نوید کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا، اُس نے اُسکے قدم بھی منجمد کر دیئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اُسے روک نہیں پا رہا تھا۔

''تم سے کہانا میں نے کہ غلطی فہمی تھی؟ بات سمجھ نہیں آرہی کیا؟''سمیر نے اٹھتے ہوئے چباچبا کر کہا۔ اُس نے نوید کا ضبط آزمایا تھا۔ اور اُس نے غلط کیا، اُس نے واقع غلط کیا۔

''میں نے پوچھا، کیا سوچ کر کیا یہ؟''نوید نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔ اب کہ سمیر کی بھی برداشت ختم ہوگئی۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اُس نے آگے بڑھ کر نوید پر حملہ کرنا چاہا پر نوید نے اُسکا وہی ہاتھ پکڑ کر اِس بری طرح موڑا کہ ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز آس پاس کھڑے دیگر پولیس والوں نے بھی سنی تھی، پر کسی کی ہمت نہ تھی آگے بڑھ کر اُسے روکنے کی۔

''آہ۔۔۔''سمیر بری طرح چیخا۔ پر نوید کا غصّہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ اُس کے بعد جو نوید نے کیا وہ دیکھ کر رضا کے لیے قدموں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ نوید عالم نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکالا اور ہاتھ میں پکڑا وہ کیل نما خنجر سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں سمیر کی بائیں آنکھ کے اندر پیوست کر دیا۔

''بزدل کی آنکھیں کبھی نہ سوئیں۔(حضرت خالد ابن ولیدؓ)''نوید نے سرد لہجے میں کہا۔ خون کے چھینٹے اُڑ کر اُسکے چہرے پر آئے، سمیر کی دلخراش چیخوں نے سارا اسٹیشن آسمان پر پہنچا دیا۔ آس پاس کے لوگوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ وہ یہ منظر دیکھ نہ سکیں، رضا الٰہی تو پاس رکھی کرسی پر گر سا گیا تھا۔

میرے اوپر نظر رکھنے والوں کی آنکھیں نکال دیتے ہیں میرے دونوں بھائی!

جزا ٹھیک کہہ رہی تھی، وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ رضا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوید کو دیکھا جو اب سمیر کے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑے اُسکا چہرہ اوپر کر چکا تھا۔

''اب اپنی واحد آنکھ کا استعمال حد میں رہ کر کرنا۔''اُس نے اُسے نصیحت کرنے والے انداز میں کہا اور جھٹکے سے اُسے نیچے پھینک دیا۔ سمیر خاموش ہو چکا تھا، نجانے بیہوش ہوا تھا یا مر گیا؟ نوید کو اِس سے مطلب نہیں تھا۔ وہ اُسے زمین پر پڑا چھوڑ کر باقی سب کی جانب مڑا۔

''یہاں جو ہوا وہ تم میں سے کسی نے دیکھا؟''اُس نے باقیوں کی جانب دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''بالکل نہیں!''اُن سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''سی سی ٹی وی کا کام کون دیکھتا ہے۔''اُس نے ٹشو سے چہرے پر لگے خون کے چھینٹے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''مم۔۔۔میں سر!''ایک لڑکا ہکلاتا ہوا بولا۔

''تمام کے تمام ثبوت مٹ جانے چاہئیں۔نہ میں یہاں آیا تھا اور نہ تم میں سے کسی نے مجھے دیکھا۔ازاٹ کلیئر؟(کیا یہ واضح ہوا؟)''اُس نے پوچھا۔

''یس سر!''اُن سب نے کہا۔

''ٹھیک ہے!اِسے ہسپتال پہنچاؤ۔''ایک کانسٹیبل کو حکم دیتے،خون والا ٹشو مسل کر ڈسٹ بن میں ڈالتے،وہ باہر کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ نظریں رضا پر پڑیں۔رضا اب تک ساکت سا بیٹھا فرش پر اوندھے گرے سمیر کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا تمہیں گھر واپس نہیں جانا؟''اُس نے رک کر سنجیدگی سے پوچھا تو رضا نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔یہ نوید نہیں تھا،یہ اُسکا دوست نہیں تھا،یہ وہ ہر وقت مسکراتا ہوا لڑکا بھی نہیں تھا۔درندہ تھا یہ درندہ!

''اِس طرح مت دیکھو مجھے!جس ملک میں انصاف سڑکوں پر بکتا ہو،وہاں کی عوام اپنی عدالت خود لگاتی ہے۔ورنہ گندم کے کیڑوں کی طرح سب پیس دیئے جاتے ہیں۔''اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''عوام تو اب بھی پس رہی ہے۔عدالت تو تمہارے جیسے طاقت والے لگاتے ہیں۔''رضا نے نجانے کیسے کہہ دیا تھا؟کچھ پولیس والوں نے خوفزدہ نظروں سے رضا کو دیکھا،وہ یقیناً نوید سے ایک تھپڑ کھانے والا تھا۔

''کم از کم طاقت والا اپنا حق تو لے لیتا ہے۔''وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا۔

''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''رضا مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ڈرائیور سے کہتا ہوں۔چھوڑ دے گا تمہیں۔۔۔''وہ بے تاثر لہجے میں کہتا وہاں سے نکل گیا۔رضا سر تھام کر بیٹھ چکا تھا۔

---------+---------+--------

WORKINGWOMENHOSTEL

علی،نشمیہ کا ہاتھ تھامے اِس بوسیدہ سی عمارت کے احاطے میں کھڑا تھا۔جہاں سینکڑوں کمپارٹمنٹ نما کمرے باہر سے ہی دکھائی دیتے تھے۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' دوپہر کی دھوپ نشمیہ کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی، اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے عمارت کو دیکھتے ہوئے علی سے پوچھا۔ علی نے اُسے دیکھا، اور اُسکی جانب جھکا۔

''اگر میں تمہیں تمہاری امی سے ملوادوں؟؟ تو کیا تم رونا، غصّہ کرنا اور ضد کرنا چھوڑ دو گی؟'' علی نے پوچھا تو اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''ہم امی کے پاس آئے ہیں؟'' اُس نے خوشی سے چہکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! تمہارے لیے جان بھی قربان ہے نشمی!'' اُس نے سر ہلاتے ہوئے دل سے کہا، تو وہ خوشی سے چھلانگیں لگانے لگی۔ علی مسکراتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا۔ صرف نشمیہ کے لیے اُس نے ہار مان لی تھی۔ ایک بات تو وہ جان ہی چکا تھا کہ وہ جتنا اپنے بچوں کو ماں سے دور کرے گا، وہ اُتنا ہی اُسکے پیچھے جائیں گے۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اُسے اپنی ماں سے ملنے دیتا، وہ مزید اپنی اولاد کی نظروں میں برا نہیں بننا چاہتا تھا۔

''چلو! اندر چلتے ہیں۔'' وہ اُسکا ہاتھ پکڑے اُسے اندر لے آیا۔ ریسیپشن پر فاطمہ کے حوالے سے بتا کر وہ انتظار گاہ میں کھڑا ہو گیا۔ کرسیاں ٹوٹی پھوٹی اور دیواریں سیلن زدہ تھیں۔ علی نے افسوس سے آس پاس دیکھا، اِس جگہ انسان رہتے تھے؟

فاطمہ کو امید نہیں تھی کہ اُس سے ملنے کوئی آسکتا ہے، اور علی کا نام سن کر تو اُسے لگا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔

''احمد سے ملنے آیا ہو گا شاید!'' اُسے خوشی ہوئی، کہ کم از کم علی کے دل سے احمد کے لیے ناراضگی کم ہوئی۔ وہ بستر کے برابر میں کرسی پر بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کرتے احمد کی جانب متوجہ ہوئی۔

''احمد! ذرا میرے ساتھ باہر تک چلو۔'' اُس نے کہا۔

''جی امی!'' وہ زیادہ سوال نہیں کرتا تھا۔ جو فاطمہ کہتی سر جھکائے سن لیتا۔ فاطمہ کے پاس اتنے پیسے تو نہ تھے کہ وہ اُسے اچھے اور مہنگے اسکول میں پڑھا سکتی، وہ ایک چھوٹے سے اسکول میں ایچ آر کی نوکری کر رہی تھی، وہیں احمد کا داخلہ کروا دیا تھا۔ اُسکے وہاں کام کرنے کی بنا پر احمد کی فیس سے رعایت مل گئی تھی۔ لہٰذا باقی پیسوں سے وہ ہاسٹل کا کرایہ اور روز کا کھانا پینا کرتی تھی۔ جب باپ کے ساتھ رہ رہی تھی، تو بھلے جیسے بھی حالات تھے، پر اُنہوں نے نشمیہ کا داخلہ اچھے اسکول میں کروا دیا تھا۔ پر بھائیوں کے رویے نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ گھر چھوڑ دے۔ احمد بھی بڑا صابر اور سمجھدار بچہ تھا، اِتنی ٹپ ٹاپ زندگی گزارنے کے باوجود نہ فاطمہ سے کوئی فرمائش کرتا نہ کسی بات پر منہ بناتا۔ جو ملتا خاموشی سے کھا لیا کرتا۔ ایک کمرے میں بستر پر جگہ بھی نہ ہوتی، رات کو مچھر کاٹتے، پنکھا اتنی آواز کرتا کہ اُسکی آواز سے نیند میں خلل پڑتا رہتا، پر وہ ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر نہ لاتا۔ فاطمہ ہر کام کے لیے اُسے اپنے ساتھ لیکر جاتی۔ آٹھ سال کا تھا لیکن اُسکے کندھوں تک آنے لگا تھا، بچہ تھا لیکن اُسکے ہونے سے تحفظ کا احساس ہوتا۔ البتہ نشمیہ جو رونق لگائے رکھتی تھی، وہ اب نہیں تھی۔ جب سے وہ گئی تھی ہر طرف خاموشی کا راج ہو گیا تھا۔

اُسے نہیں معلوم تھا کہ علی نشمیہ کے ساتھ کیا کرے گا؟اُسے قبول کرے گا یا نہیں۔ پر جب اُسکی کوئی خبر نہ آئی تو دل کو خدشات لاحق ہونے لگے۔ علی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اُسے واقعی یتیم خانے چھوڑ آتا۔دل بیٹی کی یاد میں بے چین رہنے لگا تھا۔

جب سفیر صاحب نے اُسے فون کر کے حالات سے آگاہ کیا۔اُس رات وہ سکون کی نیند سوئی،اُسکی بیٹی کو اُسکا اصلی گھر مل گیا تھا،اور کیا چاہیے تھا اُسے ؟بس اب وہ چاہتی تھی کہ علی،احمد سے بھی اپنی ناراضگی دور کر کے اُسے بھی ساتھ لے جائے۔وہ احمد کو بھی روزانہ اُسکے باپ کی اچھائیاں گنواتی،وہ کچھ نہ کہتا، بس خاموشی سے اُسکی ہر بات سنتا رہتا۔فاطمہ کی آخری خواہش بس یہی تھی کہ اُسکے دونوں بچے باپ کے ساتھ ہوں تو وہ کم از کم سکون سے مر تو سکے گی۔

علی انتظار گاہ میں کھڑا انتظار کر رہا تھا،نشمیہ تو ماں سے ملنے کے لئے پر جوش تھی۔ علی کے پاس بھیجنے سے پہلے فاطمہ نے اُسے ایک لمبے عرصے تک یہ امید دلائی تھی کہ وہ جلد اپنے باپ کے پاس جانے والی ہے،پر فاطمہ وہاں نہیں جا سکتی اُسے اکیلے ہی جانا ہو گا۔وہ اُسے علی کی تصاویر دکھا کر بتاتی رہی کہ یہی اُسکا باپ ہے،اور بلآخر جب وہ دن آ گیا تو وہ خوشی خوشی اپنے باپ کے پاس جانے پر راضی ہو گئی۔

قدموں کی آواز پر علی نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔سیاہ چادر میں خود کو چھپائے فاطمہ چلی آ رہی تھی،سامنے سنجیدگی سے آتا احمد بھی تھا۔ علی کی سانسیں منجمد ہوئیں۔ مہینے بھر بعد دیکھا تھا اُس نے احمد کو،پر لگتا تھا جیسے صدیوں بعد دیکھ رہا ہو۔

''امی!!!''نشمیہ چیختی ہوئی فاطمہ سے جا کر لپٹ گئی۔ علی بس احمد کو دیکھتا رہا،جو اُسے دیکھنے کے بعد خاموشی سے ہاتھ باندھے ایک کنارے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ نشمیہ کی طرح چیخ مارتے ہوئے اپنے باپ سے ملنے نہیں آیا تھا۔فاطمہ اپنی بیٹی کو ساتھ لپٹائے چوم رہی تھی،وہ بھی احمد کے ساتھ یہی کرنا چاہتا تھا پر اُس نے جیسے دیوار قائم کر دی تھی۔ لیکن یہ دیوار تو خود علی کی کھڑی کی ہوئی تھی۔ علی سرخ اور نم آنکھوں کے ساتھ اُسکی جانب بڑھا،احمد دو قدم پیچھے ہوا۔پر علی اُسکے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

''احمد!''بھرائی ہوئی آواز سے بیٹے کو پکارا۔اُسکی پہلی اولاد،اُسکی پہلی خوشی،جس نے اُسے بتایا کہ باپ کیا ہوتا ہے۔وہ اُس سے منہ پھیرے کھڑا تھا۔

''احمد!''آج علی نے اُس بچے سے کوئی انا کا کھیل نہیں کھیلا۔اُسکی ہزار ناراضگی کے باوجود اُسے آگے بڑھ کر سینے میں بھینچ لیا۔احمد کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی،وہ اُسی طرح بے حس و حرکت،پتھر کی مورت بنا رہا۔

''میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔''علی نے اُسکا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔پھر اُسکا چہرہ تھامے اُسے دیکھا۔باپ کی اِس شفقت اور اِس محبت کے لیے وہ کب سے تڑپ رہا تھا تو پھر آج جب وہ محبت مل گئی تھی تو خاموش کیوں کھڑا تھا؟ علی کے دل کو دکھ پہنچا،پر وہ جانتا تھا کہ بچے زیادہ دیر ناراض نہیں رہتے۔

''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''علی نے اُسکا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''بابا کو معاف کر دو۔''اُس نے روئی روئی آنکھوں سے التجا کی تو احمد نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا،اُسکا باپ رو رہا تھا؟اُسکے دل کو کچھ ہوا۔ پھر اُس نے اپنی ماں کو دیکھا جو نشمیہ کو گود میں لیے اُن دونوں کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔پہلی بار علی کو اپنے بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔وہ اُس سے ناراض بھی تھا پر بتا کر باپ کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔وہ اپنی بہن سے ایک سوا سی زاویے مختلف تھا۔ پتہ نہیں وہ کس پر چلی گئی تھی؟ علی نے مڑ کر نشمیہ کو دیکھا، پھر بازو وا کر کے اُسے پاس بلایا،وہ دوڑی چلی آئی۔ علی نے اُسے اپنے ساتھ لگایا اور پھر احمد کو۔اُسکی کائنات مکمل تھی اور شاید فاطمہ کی بھی۔وہ بس اُن تینوں کو ساتھ دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ منظر اُسکے لیے کافی تھا،وہ خاموشی سے اُٹھ کر جانے لگی۔

''فاطمہ!''

پیچھے سے پکارتی آواز۔۔۔

کسی ڈاکیے کی نوید سناتی صدا جیسی۔۔۔

دیکھو۔۔۔۔

جس چٹھی کا تمہیں انتظار تھا۔۔۔۔

وہ میرے ہاتھ میں ہے۔۔۔

کتنے عرصے بعد علی کی پکار اُس نے سنی تھی۔وہ پلٹتی نہ تو پتھر ہی رہ جاتی۔

وہ مڑی، علی کھڑا ہوا۔۔۔

وہ چلتی اُسکے پاس آنے لگی۔۔۔۔

علی کھڑا ہی رہا۔۔۔۔

وہ چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔۔۔

علی کا چہرہ بدل گیا۔۔۔۔

وہ نرمی جو بچوں کو دیکھ کر آئی تھی،اب وہ دوبارہ سختی میں بدل گئی۔فاطمہ نے نظریں جھکا دیں۔

''تو اِس جگہ رکھا ہوا ہے تم نے میرے بچے کو؟''اُس نے سیلن زدہ دیواروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی ہی استطاعت ہے۔''اُسکا جواب مختصر مگر جامع تھا۔

''تو لیکر کیوں آئی تھی؟''**جب اوقات نہیں تھی**،دل میں کہا۔

''یہ تمہارا فیصلہ تھا۔''علی لاجواب ہوا۔

''میری بیٹی کو مجھ سے چھپا کر رکھا،اُسکا کیا جواب ہے؟''اُسکے حساب بہت زیادہ تھے۔

''سارے جواب خط میں لکھ دیئے تھے۔مزید کچھ نہیں کہنا۔''علی نے لب بھینچے۔

''تم احمد کو ساتھ لے جاؤ۔''یہ جملہ احمد اور نشمیہ دونوں نے سنا تھا۔

''وہ تو میں یقیناً لیکر ہی جاؤں گا۔'' اُس نے جتایا،فاطمہ کے مرجھائے بیمار چہرے پر مسکراہٹ آئی۔احمد غیر محسوس انداز میں فاطمہ کے ساتھ آ لگا۔

''بابا!امی ہمارے ساتھ نہیں جائیں گی؟''نشمیہ نے ڈھیروں خدشات دل میں لیے سوال کیا۔اور علی بہت اچھے سے جانتا تھا کہ اگلی فرمائش کیا ہو گی؟اُس نے تمام لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا۔وہ ایک مکمل اور حتمی فیصلے کے ساتھ یہاں آیا تھا،وہ اب پچھتانا نہیں چاہتا تھا۔

''تمہاری امی۔۔۔۔''علی رکا،اور نشمیہ کو دیکھا۔''ہمارے ساتھ ہی جائیں گی۔''فاطمہ نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔وہ اپنے بچوں کو دیکھتا مسکرا رہا تھا۔

وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟

---------+---------+--------

آج کی افطار ہسپتال والوں کی جانب سے تھی۔ابھی فلحال تقسیمِ انعامات کی تقریب جاری و ساری تھی۔مقدس نے کہا نہیں تھا،پر اُسے شدت سے مقدّم کا انتظار تھا۔تقریب شروع ہوئے کافی وقت گزر گیا،یہاں تک کہ انعامات تقسیم ہونے کا وقت بھی آ گیا،پر مقدم کہیں نظر نہ آیا۔اُسکی نظریں مسلسل دروازے پر ہی ٹکی رہیں۔

''کیا کسی نے آنا ہے؟''اُسکے ساتھ بیٹھی نانی نے پوچھا۔

''ہاں؟''وہ چونکی۔''نہیں نہیں!کسی نے نہیں آنا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔پر دل ایک بار پھر ٹوٹا۔

''جب آنا نہیں تھا تو پوچھا کیوں تھا کہ آؤٹ سائیڈرز کو آنے کی اجازت ہے یا نہیں؟''اُس نے دل میں سوچا۔

''مجھے کیا؟ نہ آئے بھلے سے۔۔۔''دل میں کہتی وہ دوبارہ اسٹیج کی جانب متوجہ ہوئی حالانکہ اندر ہی اندر وہ اُسکی منتظر تھی۔

انعامات کا سلسلہ چلتے چلتے اُس کیٹیگری تک پہنچا جس میں وہ نامزد تھی۔اُسکے کان، آنکھیں، دماغ سب سماعت بن گئے۔میزبان نے پہلی کیٹیگری کا نام لیا، پھر تمام نامزد اکٹرز کا۔اُسکا دل زور سے دھڑکا۔اور پھر میزبان نے بلند اور پرجوش آواز میں اُسکا نام لیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی اور اسٹیج پر گئی۔انعام لیتے ہوئے رک کر اُسکی تصویر لی گئی۔اِس دوران چند تالیاں بجتی رہیں۔انعام ہاتھ میں تھامے، تصویر کے لیے کھڑی مقدّس کی نگاہیں اُسی لمحے سب سے آخری قطار میں، ملازمین کے ساتھ بیٹھے، گود میں مکرم کو بٹھائے مسلسل تالیاں بجاتے مقدم پر گئیں۔پہلے تو اُسکا منہ حیرت سے کھلا۔مقدم نے دور سے اُسے انگوٹھا اُٹھا کر مبارک باد دی تو اُسکی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔وہ انعام لیکر نیچے آنے لگی، تالیاں ایک بار پھر بجنے لگیں۔

اسٹیج سے اتر کر پہلے وہ نانی کی پاس آئی۔پھر اُن سے دعائیں لیکر وہ مقدم کے پاس آئی۔

''تم کب آئے؟ میں اتنی دیر سے دیکھ رہی تھی پر تم مجھے تو کہیں نہیں دکھائی دیئے۔''اُس نے حیرت سے کہا۔

''تم میرا انتظار کر رہی تھی؟''تمام باتوں میں اُس نے جیسے یہی ایک بات سنی تھی۔

''نہ۔۔نہیں تو!''وہ گڑبڑائی۔

''جھوٹ نہ بولو، اب تو منہ سے نکل گیا۔''مقدّم نے چڑایا۔

''ہاں! کر رہی تھی، تو؟''کمر پر ہاتھ رکھے وہ اپنے اصلی روپ میں واپس آئی تو وہ ہنس دیا۔

''قسمت بڑی برباد ہے یار! جب تم سے کوئی وعدہ کیا ہوتا ہے، اُس روز ہی کوئی نہ کوئی گڑبڑ نکل آتی ہے۔آج چھٹی کر کے، مکرم کو تیار کر کے، صبح ہی گھر سے نکل گیا کہ وقت پر پہنچوں گا، پر راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔دوسرا ٹائر بھی نہیں تھا میرے پاس، اچھا خاصا وقت برباد ہو گیا۔لیکن شکر! میں پہنچ گیا۔''اُسکی وضاحت پر پہلی بار مقدس کو خوشی محسوس ہوئی۔وہ اہم تھی، یقیناً!

''تو نہ آتے، کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''اُس نے دل سے کہا، بیچارے کو واقعی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔

''نہیں بھئی! مزید تمہیں ناراض نہیں کر سکتا تھا۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔مقدّس مسکرا دی۔

''اُس دن تمہاری بریانی نہیں کھا سکا تھا۔آج افطار میں کھلا دو۔''مقدم نے اُسے ہنستا دیکھ کر فرمائش کی۔

''آج چاہتے ہو تو میرے ہاتھ کی نہیں ملے گی۔''اُس نے کہا۔

''وہ پھر کسی دن کھالیں گے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو! پھر نانی کو بتاتی ہوں۔''وہ کہہ کر نانی کی پاس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو نانی ساتھ تھیں۔ پھر مقدّم اُن سب کو لیے اپنے پسندیدہ ریسٹورانٹ آگیا۔افطار کا وقت قریب تھا،اور اُنہیں روزہ کھولنے کے لئے پہلے سٹارٹر پیش کر دیا گیا تھا۔

''بیٹا! ایک بات پوچھوں؟''نانی نے سرتاپاؤں بغور مقدّم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ضرور پوچھیں!''وہ مسکرایا۔

''ساری زندگی کنوارے ہی گزارو گے؟ شادی وادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟''وہ اپنے مخصوص انداز میں بولیں، مقدّس کو بلاوجہ ہی کھانسی آئی تھی جبکہ وہ مسکرایا۔

''ارادہ تو ہے نانی! لیکن ایک مسئلہ ہے۔''اُس نے مقدّس کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مسئلہ ہے مجھے بتاؤ! میں حل کروں گی۔''وہ پرجوش ہوئی۔ مقدّس نے خون کا گھونٹ بھرا، یہ نانی بھی نا!

''مجھے اصل میں چار شادیاں کرنی ہیں۔ کیسے کروں؟''اُس نے معصومیت سے کہا۔

''اے! باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ مقدّس کے ماموں کا حال نہیں دیکھا؟ دوسری کی باری آتے آتے گنجا ہو گیا ہے بیچارہ!''مقدّم کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹا تھا۔

''نانی! آپ بہت مزے کی خاتون ہیں۔''اُس نے تعریف کی۔

''میں تو پتے کی بات بتا رہی ہوں تمہیں، ایک ہی کرو اور خوش رہو۔''وہ اپنے موقف سے نہ ہٹیں۔

''یہ۔۔۔ مقدّس کے نانا مرحوم! اُنکو بھی بڑا شوق تھا چار کرنے کا۔''اُنہیں اچانک ہی یاد آیا۔

''پھر؟''اُس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پھر کیا؟ پہلی کے بعد مرحوم زندہ ہی نہیں رہے۔''مقدّم ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔اُس نے اتنی زندہ دل نانی کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

''اذان کا وقت ہو رہا ہے۔ براہِ مہربانی دعا کر لیں۔''مقدّس نے یاد دلایا، تو دونوں نے سر ہلاتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

واپسی پر مقدّم انہیں گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔گھر کے باہر گاڑی روکی تو نانی نے ایک بار پھر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''اگر تمہارا واقعی شادی کا ارادہ ہے تو مجھے بتاؤ! میں لڑکی ڈھونڈوں گی تمہارے لیے۔''اُنہوں نے کھلے دل سے پیشکش کی۔ مقدّس کے کان کھڑے ہوئے، کہیں نانی واقعی نہ ڈھونڈ لیں کوئی۔

''مجھے ذرا عید تک کا وقت دیں، اگر میں نہ ڈھونڈ سکوں تو پھر آپ کے حوالے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈن!''نانی نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنسا تھا۔

''آج مکرم میرے ساتھ رہے گا، صبح سے اِسکو نہیں دیکھا میں نے۔''درمیان میں مقدّس نے کہا، تو اُس سے پہلے ہی مکرم خوشی سے اچھلنے لگا جیسے اُسے بات سمجھ آگئی ہو۔

''چلو ٹھیک ہے!''مقدم راضی ہو گیا۔ پھر اُس نے نانی کو اتارا، وہ اُسے دعائیں دیتی اندر چلی گئیں تو مقدم پیچھے والی سیٹ سے مکرم کا سامان نکالنے لگا۔ سامان نکال کر اُس نے مقدّس کے حوالے کیا۔

''یہ تنگ کرے تو مجھے فوراً بتانا۔''اُس نے مکرم کو پیار کرنے کے بعد، اُسکی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے بالکل تنگ نہیں کرتا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اندر نہیں آؤ گے؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں! کچھ کام ہے۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ!''وہ بولی۔

''پوچھو!''

''کل تم نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی عزیز نے پکارا ہے۔ یہ کون سا عزیز تھا؟''اُسکے سوال پر مقدّم نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''یہ پوچھو کہ تھا یا تھی؟'' اُس نے سنجیدہ لہجے اور شریر آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''مجھے کیا؟ جو بھی ہو۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔''اپنے ازلی لٹھ مار انداز میں کہا، جیسے اُسے کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔ مقدّم ہنس دیا۔

''دوست ہے میرا ایک، بہت اچھا۔ اُسکو ضرورت تھی۔''اُس نے آرام سے بتایا تو اُسکی سانس بحال ہوئی۔ شکر! کوئی زنانہ دوست نہیں تھی۔

''اچھا ایک اور بات بتاؤ۔''

''پوچھو!''

''تم واقعی چار شادی کروگے؟'' مقدّم نے ہنسی روکی۔

''ہو بھی سکتا ہے۔''

''گنجے ہو جاؤ گے، ماموں کی طرح۔۔۔''اب کہ اُسکا قہقہہ بیساختہ تھا۔

''پہلے ایک تو ہونے دو۔۔۔میرا مطلب دوسری!''اُس نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ایک اور بات پوچھوں؟''

''تمہارا کوٹہ پورا ہوا۔''اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔

''میں نے تین ہی سوال پوچھے ہیں۔''اُس نے احتجاج کیا۔

''تین سوال دس کے برابر تھے۔''

''اچھا ایک آخری سوال۔۔۔''

''نہیں! تمام سوالات کل!''

''پلیز! ایک آخری۔۔۔''اُس نے ضد کی۔

''اچھا پوچھو!''اُس نے ہنستے ہوئے اجازت دے دی۔

''تم مجھ سے شادی کروگے؟''اُس نے جلدی سے پوچھا۔ مقدّم نے پہلے سنا، پھر غور کیا، پھر حیران ہوا اور پھر۔۔۔۔

کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔۔۔

''ابھی مت بتاؤ! کل بتادینا۔''اُس نے نانی کی نواسی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ چہرہ چراغ کی مانند روشن ہو رہا تھا۔

''یہ سوال تو میرے کرنے کا تھا۔''اُس نے خود کو کہتے سنا، نگاہیں مقدّس اور اُسکی گود میں کھیلتے مکرم سے نہ ہٹیں۔

''کوئی بات نہیں! اس سے پہلے کہ تم **ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں** کی عملی تفسیر بن جاتے، میں نے کہہ دیا۔''وہ بڑی ڈھیٹ تھی ویسے، لیلیٰ معصوم تھی شرمیلی سی۔۔۔۔یہ شوخ تھی، چنچل سی۔۔۔وہ مسکرایا۔ تھیں تو دونوں ہی اُسے پیاری۔

''پھر مجھے ایک رات دو۔ تاکہ میں لیلیٰ کو کم از کم اپنے دماغ سے نکال دوں۔ اور پورے خلوص سے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کروں۔'' اُس نے دل سے کہا تو وہ ایسے مُسکرائی جیسے اِحرام مصر میں چھپے راز اُسکے ہاتھ لگ گئے ہوں۔

''مجھے منظور ہے۔'' اُس نے بھی دل سے کہا۔

''خیال رکھنا! کل ملتے ہیں۔'' اُس نے ایک نظر اُن دونوں کو دیکھا۔ اُسکی کائنات مکمل ہو سکتی تھی۔ وہ مسکرا دیا، اور دل سے مسکراتا ہوا وہاں سے گیا۔

گاڑی میں بیٹھا، گاڑی سٹارٹ کی، شیشہ نیچے کر کے اُسے دیکھا۔ مسکراہٹ دونوں طرف گہری ہوئی۔

''نانی سے کہنا کہ لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں، آخر باقی دو شادیاں بھی تو کرنی ہیں۔'' مقدّس کی مسکراہٹ سمٹی، اور وہ زن سے گاڑی لے اڑا۔

''بد تمیز!'' اُس نے پیر پٹخ کر خطاب دیا اور پھر مکرم کو دیکھا جو ہمیشہ کی طرح کھلکھلا رہا تھا۔ وہ ہنس دی۔

چاند کہیں نہ تھا۔۔۔

پر رات روشن تھی۔۔۔

---------+---------+--------

جب تک وہ گھر پہنچا۔ افطار کا وقت گزر چکا تھا۔ سفیر صاحب نے گھبرا کر اُسے فون کیا تو اُس نے بس اتنا ہی کہا کہ احمد سے ملنے آیا ہوں۔ افطار کر کے آؤں گا۔ اُنہیں اِس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ پر اب جو اُنکی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اُسے قبول کرنا واقعی ناممکن تھا۔ علی، نشمیہ اور احمد کو لیکر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس سے کچھ قدم پیچھے، سیاہ چادر میں لپٹی، مرجھائے چہرے والی وہ فاطمہ ہی تھی۔ ملازم کچھ سوٹ کیس اُٹھاتے ہوئے لا رہا تھا۔ سفیر صاحب نے پلکیں جھپکا جھپکا کر یہ منظر دیکھا تھا۔

''السلام علیکم!'' فاطمہ نے اُنہیں دیکھ کر آہستہ آواز میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام!۔۔۔'' اُنہوں نے بڑی مشکل سے جواب دیا، پھر علی کو دیکھا۔ وہ اُنکی آنکھوں میں چھپا سوال اچھے سے پڑھ رہا تھا۔

''اوپر والا گیسٹ روم سیٹ کرو! یہ سامان وہاں پہنچاؤ، اور اِن کو بھی اوپر لے جاؤ۔'' اُس نے فاطمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازم سے کہا۔

''جی!'' وہ سر ہلاتا سامان اٹھانے لگا۔

''آپ میرے پیچھے آئیں۔'' ملازم نے اُس سے کہا تو وہ مسکرائی، چہرہ جھکا تھا اِس لیے کوئی مسکراہٹ دیکھ نہ سکا۔ اِس گھر کا تو ایک ایک نقشہ اُسے ازبر تھا۔ لیکن چلو! جیسے علی کہے۔ وہ ملازم کے پیچھے چل دی۔

''دادا!''احمد سب سے پہلے سفیر صاحب کی طرف بڑھا۔

''میرا بچہ!''اُنہوں نے نم آنکھوں سے اُسے گلے لگایا۔

''دادا نہیں! ابّا!''نشمیہ نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

''ابّا نہیں! دادا ہیں یہ تمہارے۔''احمد نے اُسے کہا۔

''پر انکا نام ابّا ہے۔''اُس نے زور دیا تو علی ہنسا۔

''تو تم بڑوں کا نام لیتی ہو؟''احمد نے خفگی سے دیکھا۔

''تو پھر کیا کہوں؟''اُس نے دونوں ہتھیلیاں آگے کر کے پوچھا۔

''دادا کہو نا!''اُس نے بتایا۔ علی دونوں بہن بھائیوں کو گفتگو کرتا دیکھ مُسکرا رہا تھا۔ کتنا مکمل منظر تھا؟

''اِسے ابّا ہی کہنے دو، مجھے اِسکے منہ سے پیارا لگتا ہے۔''سفیر صاحب نے کہا۔

''ہاں! میرے تو یہ۔۔۔ابّا ہی ہیں۔ ''وہ خود کو پری سمجھے گول گول گھومنے لگی۔

''چوٹ لگ جائے گی۔''احمد پریشان ہوا۔ اُسکی بہن بہت عجیب سی مخلوق تھی۔

''نہیں لگتی۔''وہ مزے سے گھومتی بولی، پھر کچھ یاد آنے پر رکی۔''اوہ! میں تم کو کیا کہوں؟''اُسے پھر پریشانی لاحق ہوئی۔

''بھائی کہو۔''علی نے بیچ میں کہا۔

''اوکے!''اُس نے مان لیا، پھر یکدم ہی احمد کا ہاتھ پکڑا۔

''آؤ بھائی! تمہیں اپنا ڈول ہاؤس دکھاؤں۔''

''میں ڈول ہاؤس دیکھ کر کیا کروں گا؟''وہ بیچارہ پریشان ہوا۔ سفیر صاحب اور علی ہنس رہے تھے۔

''تم اُس سے کھیلنا۔''نشمیہ نے اُسکی عقل پر ماتم کیا۔

''وہ لڑکیوں کے کھیلنے کا ہوتا ہے۔''

''لڑکے بھی کھیلتے ہیں۔''

''پر۔۔۔''

''چلے جاؤ بیٹا! وہ ہر کسی کو اپنا ڈول ہاؤس نہیں دکھاتی۔'' سفیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب چلو بھی!'' وہ اُسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گئی۔ علی نے یہ منظر اپنی آنکھوں میں قید کر لیا۔

''علی!'' سفیر صاحب نے پکارا۔

''بیٹھیں ابّو!'' وہ صوفے پر بیٹھا اور اُنہیں بھی بیٹھنے کا کہا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ اُسکے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔

''پڑوس میں جو انکل آنٹی اکیلے رہتے ہیں، اُنکے پینٹ ہاؤس میں مقیم کرائے دار عید کے بعد گھر خالی کر دیں گے۔ میں نے اُن سے بات کی ہے۔ چھوٹا سا دو کمروں کا پینٹ ہاؤس ہے، پر اچھا ہے۔ عید کے بعد فاطمہ وہیں منتقل ہو جائے گی۔ کرایہ میں دے دوں گا۔ بس تب تک کے لیے کیا آپ اُسے یہاں رہنے کی اجازت دے رہے ہیں؟'' اُس نے تحمل سے کہا۔ وہ کیا پوچھ رہے تھے اور وہ کیا بتا رہا تھا؟ رویے کے اِس بدلاؤ پر سفیر صاحب حیران ضرور تھے، پر دل کے کسی کونے میں ساتھ اطمینان بھی اُتر رہا تھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''میں جب تک نیچے والے کمرے میں رہ لوں گا۔ فاطمہ نوکری کرتی ہے، تو میرا اُس سے سامنا بھی نہیں ہو گا۔ میں کوشش کروں گا کہ آفس سے آ کر کمرے میں ہی رہوں۔'' اُس نے بتایا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔ پر یہ سب کرنے کی وجہ؟'' اُنہوں نے پوچھا تو علی نے بغور اُنہیں دیکھا، پھر ایک گہرا سانس لیا۔

''ابّا! میں نے جان لیا ہے کہ میں کچھ بھی کر لوں۔ بچوں کو نہ اُنکی ماں سے دور کر سکتا ہوں، اور نہ ہی اُنکے دل سے اُنکی ماں کی محبت اور طلب نکال سکتا ہوں۔ وہ جیسی بھی ہے، پر ہے اُن دونوں کی ماں۔ وہ بار بار اُسکے پاس جانا چاہیں گے۔ اور جیسے اُسکے حالات ہیں، نہ وہ میرے بچوں کو رکھ سکتی ہے اور نہ ہی میں اپنے بچوں سے دور رہ سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں اُسے پڑوس میں گھر دلوا دوں۔ اِس طرح بچے اُس کے ساتھ روزانہ وقت گزار لیا کریں گے، اور مجھے بھی اُن کی فکر نہیں رہے گی۔ پھر میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ جب سے نشمیہ گھر آئی ہے، آپ آفس ٹھیک سے نہیں جا پا رہے۔ یا تو آپ اُسے ساتھ رکھتے ہیں، یا مجھے اُسے دیکھنا ہوتا ہے۔ اب جب تک ہم دونوں گھر میں نہیں ہوں گے۔ تب تک وہ اپنی ماں کے پاس رہیں گے۔'' مدلل انداز میں کہتے، اُس نے سفیر صاحب کے لیے کوئی سوال نہ چھوڑا۔ وہ جانتے تھے کہ فاطمہ کا یہاں رہنا علی کے لیے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف تھا، پر وہ خود پر صرف بچوں کے لیے جبر کر رہا تھا۔

''تم نے اچھا فیصلہ کیا۔ لیکن۔۔۔''وہ رکے۔

''لیکن؟''

''فاطمہ کیسے راضی ہوئی؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''جیسے میں راضی ہوا ابّا!۔ میں نے ایک چیز دیکھ لی ہے، کہ اُسے بھی بچوں سے اُتنی ہی محبت ہے جتنی مجھے ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ واقعی احمد کو لینے نہیں آئی تھی، مجھے اُس روز اُسکی بات سن لینی چاہیے تھی۔ راضی تو وہ نہیں تھی! پر جب بچوں کی بات آئی تو مان گئی۔''اُس نے بتایا۔ سفیر صاحب مزید حیران ہوئے، اُسکی یہ تبدیلی تھی تو مثبت لیکن بہت حیران کن بھی۔

''چلو! ٹھیک ہے۔''سفیر صاحب نے بس اتنا ہی کہا۔ وہ جانتے تھے کہ فاطمہ نے حامی کیوں بھری ہے؟ پر خاموش رہے۔

علی بھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا، تو اُنھوں نے گہرا سانس لیا۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنا عرصہ جیوں گی؟ پر مجھے مرنے سے پہلے میرے بیٹے سے ملنے دیں۔

آخری ملاقات میں فاطمہ کے کہے گئے لفظوں نے اُنہیں فکر میں ڈال دیا تھا۔

--------+---------+----------

دن گزر گیا، رات بھی آگئی۔ رمضان جانے میں فقط پانچ یا چھے دن رہ گئے تھے۔ صبح سے وہ گھر پر اکیلی تھی، جو صبح ہوا اُسے بُھلانے میں تھوڑا وقت لگا پر شکر کے ذہن اب پر سکون تھا۔ دروازے کی بیل بجی تو دل ایک مرتبہ پھر دھڑک اُٹھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے تک آئی۔ باہر سے امی اور وحید بھائی کی آوازیں آرہی تھیں۔ جزا نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

''السلام علیکم!''وہ سلام کرتی واپس اندر جانے لگی۔

''جزا!''امی نے پکارا تو وہ رکی۔

''یہ پولیس کیوں باہر کھڑی ہے؟''اُس کی ماں نے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ نوید بھائی کھڑی کر کے گئے ہیں۔''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم!''اُس نے کندھے اُچکا دیئے۔

''چھوڑیں امی! کسی وجہ سے کھڑے کر دیئے ہونگے۔آپ مجھے کڑھی پیک کر کے دے دیں جلدی۔پھر میں نکلوں۔''وحید نے کہا،وہ اُنہیں چھوڑنے آیا تھا،امی نے گھر میں کڑھی بنائی تھی،تو اُس نے فرمائش کر دی کہ اُسکا حصّہ بھی اُسے دیا جائے۔

''ہاں! ہاں! میں لاتی ہوں۔جزا! تم بھائی کے پاس کھڑی رہو تب تک۔''وہ جزا کو حکم دیتی چلی گئیں۔ وہ بیزار منہ بناتی وہیں کھڑی ہو گئی۔

''تو تم پڑوسیوں کے بچوں کو پڑھاتی ہو؟''وحید نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے اُسے سنجیدگی سے دیکھا،انداز عجیب سا تھا،وہ سمجھ نہ سکی۔

''ہاں! اور خیال بھی رکھتی ہوں۔''اُس نے جیسے جتایا۔

''بچے پسند ہیں نا تمہیں؟''اُس نے پوچھا،پتہ نہیں وہ ایسے سوال کیوں کر رہا تھا؟

''ہاں!''

''جو آگ میں جل کر مرے تھے نا۔وہ بھی بچے ہی تھے،بلکہ تمہارا ہی خون تھے،تمہارے سگے بھائی کی اولاد۔۔۔''وحید کے اگلے جملے پر وہ ساکت ہوئی۔

''تت۔۔۔تو؟''اُس نے اٹک کر پوچھا۔

''تو یہ کہ،یہ وہ موضوع ہے،جس پر میں نے کبھی بات نہیں کی،لیکن جزا! اب بہت ہوا۔میں تمہاری خود غرضی،خود پرستی اور سنگ دلی سے تنگ آچکا ہوں۔کیا تمہارے دل میں اپنے بھتیجوں کے لیے ذرا سی۔۔۔ذرا سی بھی محبت نہیں تھی؟ کیا تمہیں اُنکی موت کا ذرا دکھ نہیں ہے؟ صرف اِس لیے کہ وہ نوید کے بچے تھے؟''وہ آج اُسکی عقل ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔

''آپ یہ کس قسم کی بات کر رہے ہیں؟ مجھے کیوں دکھ نہیں۔۔۔''

''تو تم کہاں تھی جب وہ بچے مرے تھے؟ تم مہمانوں کی طرح جنازے میں شرکت کر کے چلی گئی؟''وہ اُسکی بات کاٹ کر چیخا تھا۔یہ وہ موضوع تھا،جس سے جزا کب سے نظریں چرائی ہوئی تھی۔

''کہاں تھی تم جب تمہارا بھائی گلیوں میں اپنے مرے ہوئے بچوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا؟ جب وہ اُنہیں آوازیں دے رہا تھا؟ کہاں تھی تم جب اُسکی بیوی نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا؟ کہاں تھی تم جب وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا؟ اُسکی آواز،اُسکی چیخیں میرا کلیجہ پھاڑ رہی تھیں جزا! پر تم؟ تمہیں اِتنا سا۔۔۔''انگلی اور انگوٹھے سے تھوڑے کا اشارہ بنایا۔''اتنا سا بھی احساس نہیں ہوا؟ اتنی نفرت جزا؟ اتنی؟ صرف ایک اینٹوں سے بنے گھر کے لیے؟''زمین پھٹ گئی اور وہ اُس میں دفن ہو گئی۔

''کیا تم کچھ دنوں کے لیے اپنے بھائی سے نفرت کم نہیں کر سکتی تھی؟ جب میں نے کہا کہ امی کو اُسکے گھر رہنا چاہیے کیونکہ اُس وقت اُسے امی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو تم نے ساتھ جانے سے انکار کر کے اُسکے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دیا۔ خوش ہو گی نا اپنے بھائی کو تکلیف میں دیکھ کر؟'' بولتے بولتے وحید کی آواز بیٹھ گئی۔ جزا کی آنکھوں سے آنسو باڑ توڑ کر بہہ نکلے۔

''کیا برا کیا ہے اُس نے تمہارے ساتھ؟ کیا؟ کیا اُس نے تمہیں مارا؟ تمہیں گالی دی؟ تمہارا حق کھا لیا؟ تمہیں جینے کی آزادی نہیں دی؟ بلکہ ان سب کے باوجود جزا وہ ہر بار تمہارے لیے آیا، تمہیں پولیس والوں سے بچانے، تمہیں اُن رشتے والیوں سے بچانے ہمیشہ وہی آیا۔ آج بھی تو وہ ہی آیا نا جزا!'' اِس بات پر اُس نے نم آنکھیں اُٹھا کر کچھ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! مجھے معلوم ہے۔ تمہاری ہزار نفرت کے باوجود ہم دونوں بھائی تمہاری ہر خبر رکھتے ہیں۔ تمہاری جاسوسی کرنے کے لیے نہیں! بلکہ تمہاری حفاظت کرنے کے لیے۔ پر تم نے کیا کیا؟ بولو؟'' جزا نے نظریں واپس جھکا دیں۔

''اُسکا جو بھی معاملہ تھا وہ تو ابّو سے تھا۔ تمہارا اِن سب سے کیا تعلق تھا؟ کیا ابّو تمہیں وصیت کر کے گئے تھے کہ میری جگہ تم نوید کو سزا دینا؟ کیا تم اکیلے ابّو کی اولاد تھی؟ یا اکیلی تم ہی اُن سے محبت کرتی تھی؟ ہاں؟'' اُسکے کسی سوال کا جزا کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ آئینہ دکھا رہا تھا۔ اور آئینہ اُسے اُسکا قبیح چہرہ۔۔۔۔

''اور جس گھر کے لیے تم نے یہ کیا، وہ گھر نوید نے خرید لیا ہے۔ تمہیں تمہاری شادی پر تحفتاً دینے لیے۔۔۔'' یہ آخری وار تھا۔ اور جزا فنا ہو گئی۔

''آج پہلی اور آخری بار تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ زندگی بہت چھوٹی ہے، کون کب مر جائے؟ ہمیں نہیں معلوم، پچھتانے سے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ابھی سدھار لو۔ ورنہ وقت واپس نہیں لوٹتا۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ جزا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

''ارے! یہ کہاں گیا؟'' اندر سے کھانا لاتی امی نے وحید کو جاتے دیکھ لیا تھا۔

''پتہ نہیں!'' جزا نے کچھ نہیں کہا۔

''ضرور تم نے ہی کچھ کہا ہو گا، بھائیوں کو کبھی خوش نہیں دیکھ سکتی، پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے تمہارے۔۔۔۔'' وہ بولتی جا رہی تھیں اور جزا مرے مرے قدموں سے اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔

--------+---------+----------

نجانے وہ کب سے وہاں بیٹھی تھی؟ بیٹھے بیٹھے اُسکی آنکھ لگ گئی۔ نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے دل بند کر دیا ہو، سانس لینے میں دشواری ہوئی تو ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''نوید!''نیند سے جاگتے ہی جو پہلا لفظ بشریٰ کی زبان سے ادا ہوا وہ نوید کا نام تھا۔گھر اندھیرا پڑا تھا، صرف لیونگ روم کی لائٹ جلی نظر آرہی تھی۔اور وہ بھی بشریٰ نے خود ہی جلائی تھی، یعنی نوید گھر نہیں آیا تھا۔

''نوید!''اُس نے پھر پکارا۔طبیعت بہت خراب محسوس ہو رہی تھی۔

اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر موبائل اُٹھایا تو نوید کے ڈھیروں پیغامات تھے۔آج وہ صبح سے اُسے وقفے وقفے سے میسیج کر رہا تھا۔جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔لیکن وہ اپنی ناراضگی کے سبب اُسے جواب نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے صبح کے پیغامات اب جا کر کھولیں۔

''میں گھر نہیں آؤں گا، روزہ مت رکھنا اور ناشتہ کر لینا۔''

''ناشتا کر لیا؟''

''دوائی لی؟''

''کھانے میں کیا کھاؤ گی؟ کچھ آرڈر کر دوں؟''

''طبیعت کیسی ہے؟''

''مجھے دیر ہو جائے گی، تم سو جانا۔''

باوجود اِسکے کہ بشریٰ نے ایک بھی پیغام کا جواب نہیں دیا تھا، اُسکے تسلسل میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اتنے دنوں سے چھائی مردنیت کہیں غائب ہونے لگی، ذہن کو یاد آنے لگا کہ گزشتہ تین سالوں سے اگر کوئی اُسکا خیال رکھ رہا ہے تو وہ نوید ہے۔اُسکی ذہنی حالت غیر مستحکم ہونے کے باوجود بھی جس شخص نے ایک لمحے بھی اُسکا ساتھ نہیں چھوڑا وہ بھی نوید ہی ہے۔ پچھلے دو روز سے وہ مستقل اُسے ڈاکٹر سے چیک اپ کروا رہا تھا۔ڈاکٹر نے سب ٹھیک ہونے کا سگنل دے دیا تھا۔اور کہا تھا کہ اُسے دوبارہ ڈپریشن میں نہیں جانا چاہیے، وہ خطرناک ہو سکتا ہے۔تب سے نوید بہت پریشان بھی تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اُس کو اکیلے نہ چھوڑے اور اگر چھوڑے تو اُس سے مستقل رابطے میں رہے۔

بشریٰ نے وقت دیکھا۔رات کے بارہ بج رہے تھے، اُس نے بنا کچھ سوچے ہی نوید کو کال ملا دی۔اور وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھا تھا، پہلی ہی بیل میں فون اُٹھا لیا۔

''بشریٰ! تم ٹھیک ہو؟''اُسکی پریشان کن آواز آئی۔

''گھر آجاؤ نوید! میری طبیعت صحیح نہیں ہے۔''بس! اتنی سی بات تھی، اور نوید ساری دنیا چھوڑ کر آنے کو تیار۔

''میں آرہا ہوں۔''اُس نے کہا اور فون رکھنے لگا۔

''فون مت رکھو! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھ سے بات کرتے رہو۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! مجھے یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟''اُس نے بے حد نرمی سے پوچھا۔ پیچھے سامان سمیٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے وہ نکلنے کی تیاری کر رہا ہو۔

''تم آؤ گے تو کھاؤں گی۔''اُس نے کہا۔

''مجھے بس دس منٹ لگیں گے۔''اب اُسکے تیز تیز چلنے کی آواز آنے لگی۔

''نوید! میرا کوئی نہیں ہے تمہارے علاوہ۔۔۔''وہ بے ربط سی باتیں کر رہی تھی۔ لیکن نہیں! وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''میں جانتا ہوں! اور میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ کبھی بھی!''وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

''بھلے میں تم پر کتنے الزام لگاؤں؟ بھلے میں تمہیں کتنا برا بھلا کہوں؟''اُس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم الزام نہیں لگاتی، ٹھیک کہتی ہو۔ برا بھلا نہیں کہتی، حقیقت بتاتی ہو۔''اُس کے آنسو بہہ نکلے، وہ یقیناً راستے میں تھا۔

''ایسے نہ کہو! میں جانتی ہوں کہ میں بہت بری ہوں۔''اُس نے کہا۔

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔''اِس بات پر وہ ہنس پڑی۔ کتنے دنوں بعد وہ ہنسی تھی؟ روتے ہوئے ہنستی کتنی پیاری لگ رہی ہو گی؟ نوید نے چشمِ تصوّر میں اُسے دیکھا۔

''پر میں کیا کروں؟ میں تو ماں ہوں۔ میری برداشت بس اتنی ہی تھی۔ لیکن مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ تم بھی تو باپ ہو، تم نے بھی تو وہی غم سہا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا؟ تمہارے ساتھ اپنا غم بانٹنے کے بجائے تمہیں ہی قصوروار ٹھہرا دیا۔ میرے سامنے بس تم تھے، اسی لیے میرا سارا غصّہ، بے یقینی، چڑچڑاپن سب تم پر ہی نکل گیا۔ لیکن تم میری باتوں کو سچ مت سمجھنا، میں نے جو کہا اُس میں سے آدھی باتیں تو خود مجھے بھی نہیں یاد! تو وہ سچ کیسے ہوں گی؟ وہ بس۔۔۔ بس غصّہ تھا۔۔۔ یا شاید۔۔۔ بے بسی!''بات مکمل کر کے وہ نوید کی جانب سے کچھ کہے جانے کی منتظر تھی۔ پر اُس نے کچھ نہ کہا۔

''نوید!۔۔۔''اُس نے پکارا، پھر موبائل سامنے کر کے اسکرین دیکھی۔ وہ فون کاٹ چکا تھا۔ اِس سے پہلے وہ کچھ سمجھتی دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو وہ سامنے تھا۔ وہ آ گیا تھا، دس منٹ پورے ہونے سے بھی پہلے۔۔۔

وہ کھڑی ہو گئی۔۔۔

نوید اُسکے سامنے چلا آیا۔۔۔

بشریٰ کی آنکھوں سے آنسو آبشار کی صورت رواں تھے۔۔۔

اور نوید کا دل چیر رہے تھے۔۔۔

کسی بندوق سے نکلی سینا چیرتی گولی سے زیادہ۔۔۔

نوید نے ہاتھ بڑھایا، اور اُسکے آنسو پونچھے۔۔۔

''یہ ظلم مت کیا کرو میرے اوپر!'' اُس نے التجا کی۔

''آئی ایم سوری!'' اُس نے مزید شدت سے روتے ہوئے کہا، اور اُسکے گلے لگ گئی۔

آج وہ اُسے پہچانتی تھی۔۔۔۔سب جانتی تھی۔۔۔۔

نوید اُسکے لیے آج نویدِ صبح بن کر آیا تھا۔۔۔۔

اور بشریٰ اُسکی زندگی میں واقع بشریٰ بن کر۔۔۔

وہ دونوں خوشی کی خبر تھے۔۔۔۔

اور خوشی اُنکی منتظر۔۔۔۔

نوید عالم کو بس بشریٰ چاہیے تھی۔۔۔

اس جہان میں بھی۔۔۔

اُس جہاں میں بھی۔۔۔۔

اور ایسے ہزاروں جہاں ہوئے تو۔۔۔

اُن جہانوں میں بھی۔۔۔۔

--------+---------+----------

رمضان ختم ہونے میں یا تو دو روزے باقی تھے یا ایک۔۔۔۔

علی آج بچوں کو لیے عید کی خریداری کرنے گیا تھا۔ نشمیہ نے تو اپنی پسند کا ڈھیروں سامان خریدا، پر احمد وہاں بھی متلاشی نظروں سے اپنی ماں کے لیے ہی سامان ڈھونڈتا رہا۔ لیکن علی سے کہنے میں ہچکچا رہا تھا۔ وہ سمجھدار تھا، جانتا تھا کہ ماں اور باپ میں طلاق ہو چکی ہے۔ علی اُسکی نظروں کا مفہوم اچھے سے سمجھ گیا۔ اُس نے کچھ بھی کہے بنا اُسکی نگاہوں میں سمائی چیزیں خرید لیں اور تمام شاپنگ بیگز اُسکے حوالے کر دیئے۔

''اپنی امی کو دے دینا۔'' اُس نے پیار سے کہا۔

''تھینک یو!'' علی ہنس دیا۔ وہ باپ کو شکریہ کہہ رہا تھا، جبکہ بچے تو ایسے نہیں ہوتے۔

گھر آیا تو نشمیہ ہمیشہ کی طرح بھاگ کر ابّا سے لپٹ گئی اور ایک ہی سانس میں اُنہیں اپنی خریداری کی ساری روداد سنا دی۔ احمد اپنا اور فاطمہ کا سامان لیکر اُسکے کمرے میں چلا آیا۔

''امی!'' اُس نے مسکراتے ہوئے فاطمہ کو پکارا، جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر اُٹھی تھی۔

''کر لی شاپنگ؟'' فاطمہ نے اُسکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہاں! اور یہ دیکھیں، یہ میں آپکے لیے لایا ہوں۔'' اُس نے دو بیگز فاطمہ کے حوالے کیے۔

''میرے لیے؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''ہاں! آپ فکر مت کریں، بابا سے پوچھ کر لیے ہیں۔ اور آپ پلیز! منع مت کیجئے گا۔'' کہنے کو وہ آٹھ سال کا تھا، پر سمجھ اُسکی بڑوں جتنی تھی۔

''ٹھیک ہے!'' اُس نے بیٹے کا دل نہیں توڑا۔

''امی! آپ عید پر مہندی لگائیں گی؟'' وہ عجیب عجیب سی فرمائشیں کر رہا تھا۔ وہ ہنس دی۔

''تم اب جا کر سو جاؤ! کل تم بھی روزہ رکھو گے نا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ان شاءاللہ!'' اُس نے کہا اور سونے چلا گیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی، ایک مرتبہ بھی علی کے سامنے نہیں گئی تھی، جب وہ گھر پر نہیں ہوتا تو بچوں کے لئے کھانا بناتی، اُنہیں پڑھاتی۔ پر جیسے ہی اُسکے گھر میں داخل ہونے کی آواز آتی فوراً کمرے میں چلی جاتی۔ سحری اور افطار اپنے کمرے میں کرتی، منع کرنے کے باوجود احمد اُسکے ساتھ آ جاتا۔ یہ چند دن اُسکی زندگی کے بہترین دن تھے، آنکھیں بار بار نم ہوتیں، یہ سوچ کر کہ اُس نے کتنی بہترین زندگی کو لات ماری تھی؟ لیکن سچ تو یہ تھا، کہ عید کے بعد اُسے یہاں سے بھی چلے جانا تھا۔ لیکن کم از کم بچے اُس سے دور نہیں ہوں گے اور نہ ہی بری زندگی گزاریں گے۔

احمد کے جانے کے بعد اُس نے شاپنگ بیگز کھول کر دیکھے۔ایک نفیس سے کام والا، آف وائٹ رنگ کا جوڑا تھا، جسکا بنارسی دوپٹہ مہرون رنگ کا تھا۔حالانکہ اُس نے فاطمہ کو یہ رنگ پہنتے نہیں دیکھا تھا، پر پتہ نہیں کیا سوچ کر لے آیا تھا؟اُسے جوڑا پسند آیا۔اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی، اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو یقین نہیں آیا۔سامنے علی کھڑا تھا، سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ، وہ سوٹ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''ابّا گھر پر نہیں ہیں، ورنہ میں نہ آتا۔ تمہیں ضروری بات بتانی تھی۔''چہرہ جھکائے بے تاثر لہجے میں تمہید باندھی۔

''میں سن رہی ہوں۔''

''پڑوس والوں کے کرائے دار وقت سے پہلے چلے گئے ہیں۔گھر میں کچھ ضرورت کا سامان ابّا کل تک ڈلوا دیں گے۔تم عید کے بعد وہیں شفٹ ہو جاؤ گی۔''

''عید کے بعد کیوں؟میں کل ہی چلی جاؤں گی۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں! بچوں کے ساتھ عید کر لو۔ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔باقی تمہاری مرضی!''وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑ گیا۔

''علی!''اُس نے پیچھے سے آواز دی۔علی رک گیا۔پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''پتہ نہیں! زندگی دوبارہ موقع دے یا نہ دے؟پر مجھے تم سے معافی مانگنی ہے۔''

''کیوں؟''دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں ڈالے اُس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا، فاطمہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔

''کیونکہ میں نے سب سے زیادہ تکلیف تمہیں پہنچائی ہے۔تمہارے خلوص، تمہاری وفاداری کا بہت برا صلہ دیا ہے تمہیں۔دھوکہ دیا تمہیں، جھوٹ بولا تم سے، فریب کیا تمہارے ساتھ۔اور اِسکے بدلے مجھے جو بھی سزا ملے وہ کم ہے۔''

''بہت جلدی خیال نہیں آ گیا تمہیں اپنے جھوٹ، دھوکے اور فریب کا؟''اُس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا۔

''تم مجھے معاف نہیں کرو گے، تو چاہے میں کچھ بھی کر لوں، اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔''اِس بات پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''اب میں تمہارے کسی دھوکے میں نہیں آؤں گا۔''اُس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور فاطمہ زمین میں گڑ گئی۔علی اُسکو چبھتی نظروں سے دیکھتا پلٹ گیا، وہ مزید کچھ بھی کہنے کے لائق نہ رہی۔

اُس کی تمام باتوں پر کڑھتا اور خود کو وہاں جانے پر کوستا وہ نیچے اتر رہا تھا کہ سفیر صاحب سامنے لاؤنج میں کھڑے دکھائی دیئے۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''تم نے تو کہا تھا کہ اوپر نہیں جاؤ گے؟''اُن کے لہجے میں طنز نہیں تھا، پر اِس سوال پر ہی وہ بڑی طرح شرمندہ ہوا۔

''ضرورت نہ ہوتی تو کبھی نہ جاتا۔''اُس نے اتنا ہی کہا تو اُنہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

''علی!''سفیر صاحب کی آواز پر وہ رکا۔

''اُس نے اپنے کیے کی سزا اٹھالی ہے،اُسکا سابقہ شوہر ایک اسمگلر،شرابی اور جواری تھا۔اُسے مارتا تھا،پیٹتا تھا۔حتیٰ کہ اُسے بیچنے والا تھا۔اُس نے اپنے کیے کی بہت بڑی سزا اُٹھالی ہے۔اب اُسے معاف کر دو،معاف کر دو کہ کم از کم وہ سکون سے مر سکے۔''علی جو اُنکی باتیں بیزاری سے سن رہا تھا،اُنکے آخری جملے پر چونکا۔

''مر سکے؟''اُس نے بیساختہ ہی کہا۔

''بس!معاف کر دو!''اِتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔علی اُنہیں روک بھی نہیں سکا۔ اُسکا دماغ ایک ہی جملے پر اٹک گیا تھا۔

کم از کم وہ سکون سے مر سکے۔

---------+---------+--------

عید آنے میں دو یا ایک روزہ تھا،لہٰذا کچھ ضروری کام کی بنا پر رضا آج اپنے فلیٹ آیا تھا۔اپنے ضروری کاغذات،نقد رقم اور دیگر اشیاء وہ اسی فلیٹ پر رکھتا تھا۔وہ جلد از جلد کام مکمل کر کے پناہ گاہ واپس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ بچوں کے ساتھ کچھ رہ جانے والی عید کی خریداری کر سکے۔وہ خریداری کے لئے بچوں کے گروپ بنا کر مارکیٹ جایا کرتا تھا،ہر گروپ اپنی باری کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتا تھا۔

جزا کے اغوا والے واقعے کے بعد سے اُسکا جزا سے بھی سامنا نہیں ہوا تھا،وہ خود ہی اُسکے سامنے نہیں آ رہا تھا ورنہ وہ اُس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی کہ نوید کون ہے؟اور رضا اُسے کیسے جانتا ہے؟وغیرہ۔اُسے سوچ کر مسکرایا ہی تھا کہ دروازے پر اُسی لمحے دستک ہوئی، وہ چونکا۔اُسکے فلیٹ پر اُسے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔

''شاید حسین ہو؟''اُس نے سوچا،پھر اگلے ہی لمحے اپنے خیال کی تردید کی کہ حسین کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں ہے؟وہ کام چھوڑ کر دروازے پر آیا اور اسپائی ہول سے جھانکا،کوئی چہرہ موڑے کھڑا تھا۔اُس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔وہ جو کوئی بھی تھا چہرہ موڑے ہی کھڑا رہا۔

''جی؟کس سے ملنا ہے؟''رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اپنی مرحومہ بیوی کے بیٹے،رضائے الٰہی سے۔۔۔۔''وہ شخص اُسکی جانب پلٹتے ہوئے مسکرایا اور رضا الٰہی کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔وہ اُسکا باپ تھا،وہ باپ جو اُسے آٹھ سال کی عمر میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''اب۔۔۔ابّ۔۔۔ابّو؟''بہت مشکل سے الفاظ ادا کیے۔

''کیسے ہو؟''وہ پھر مسکرائے۔

''کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟''اُس نے چبا چبا کر پوچھا۔

''اندر نہیں بلاؤ گے؟''اُنہوں نے آس پاس دیکھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔راہداری میں کھڑے اِکا دکا لوگوں نے ذرا نا سمجھی سے دیکھا۔ رضا اپنی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا، ضبط سے دروازہ وا کیا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آئے ہی تھے کہ اُس نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور اُنکی جانب مڑا۔

''کیوں آئے ہیں آپ اور کس لیے؟''اُس نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''تو تم سیدھے سیدھے مدعے پر آنا چاہتے ہو؟''واصف صاحب نے مزید طنزیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! مدعا بیان کریں اور جائیں۔ویسے ہی جائیں، جیسے ستائیس سال پہلے چھوڑ گئے تھے۔''اس نے لڑکھڑاتے لہجے پر قابو پانا چاہا، پر ناکام ہوا۔

''میں یہاں کوئی میلو ڈراما دیکھنے نہیں آیا۔''اُنہوں نے بیزاری سے کان مسلا، کچھ چھن سے ٹوٹا تھا رضا کے اندر۔ اُسے تو کسی وضاحت کی امید تھی۔

''میری مرحومہ ماں نے اپنا بنگلہ تمہاری ماں کے نام کر دیا تھا۔اب وہ یقیناً تمہاری جاگیر ہو گا۔''وہ دو قدم آگے آئے اور اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔''عزت کے ساتھ وہ گھر میرے نام کر دو، ورنہ۔۔۔۔''اُنہوں نے بات ادھوری چھوڑی۔رضا کے اندر چھپا وہ معصوم بچہ، جسے اپنے باپ کی واپسی کا تا عمر انتظار رہا، آج واصف صاحب نے اُسے بری طرح قتل کر دیا تھا۔

''ورنہ۔۔۔؟''اُس نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''ورنہ بے عزت کر کے تم سے لوں گا تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہو گے۔''اُنہوں نے سرد، برفیلے لہجے میں کہا۔

''کیسے؟ کیسے بے عزت کریں گے آپ مجھے؟ ذرا مجھے بھی تو بتائیں!''اُس نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُنہیں دیکھا۔

''لاعلمی بڑی نعمت ہے رضائے اِلٰہی! چلو آج تم سے یہ نعمت چھین لیتے ہیں۔''اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو رضا کو کچھ انہونی کا احساس ہوا۔

''تمہاری ماں! سُنبل مروان۔میری خالہ کی بیٹی تھی۔وہ بیٹی، جسے کسی زمانے میں پورا ملک جانتا تھا۔مشہور رقاصہ سے اُس نے اپنا کیریئر شروع کیا تھا، پھر ماڈلنگ، پھر ایکٹنگ۔۔۔دنیا پاگل تھی اُسکے پیچھے۔لیکن یہاں تک آنے کے لیے اُس نے پہلے ایک ڈائریکٹر، پھر پروڈیوسر اور پھر ایک ایکٹر سے شادی کی۔

تب کہیں جا کر مشہور ہوئی۔ لیکن اُسکی پے در پے شادیوں نے اُسکی ساکھ خراب کر دی۔ اُسے کام ملنا کم ہو گیا اور یوں اُسکے کیریئر کا زوال ہو گیا، اور میں یعنی واصف الٰہی، اُسکا چوتھا شوہر تھا۔ جسے اُس نے اپنی۔۔۔۔۔''

''بس!۔۔۔۔بس کر دیں!'' رضا حلق کے بل چیخا تھا۔ جلتے کوئلوں پر لیٹنا کیسا ہوتا ہے؟ اُسے آج معلوم ہوا تھا۔

''میری ماں کی زندگی میں اُنہیں اتنی تکلیف پہنچائی آپ نے؟ اب اُنکے مرنے کے بعد بھی الزام لگانے سے باز نہیں آ رہے؟ اُس نیک عورت نے آپکا بگاڑا کیا ہے آخر؟ گھر ہی چاہیے نا؟ ایسے ہی مانگ لیں مجھ سے میں ہزاروں گھر اپنی ماں کے لیے قربان کر دوں گا۔ پر ایسے ایک پاک دامن عورت پر اتنے گھٹیا الزام لگانے کی اجازت میں آپ کو نہیں دوں گا۔'' اُس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ واصف صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

''نیک؟ پاک دامن؟'' وہ پھر ہنسے۔

''سنبل مروان ایک۔۔۔۔''

''کون سنبل مروان؟ بر جا نام ہے میری ماں کا۔'' رضا کو لگا وہ پاگل ہو جائیگا۔

''چچ چچ۔۔۔۔اصلی نام تک تو پتہ نہیں ہے تمہیں اُسکا، چلے ہو ماں کے کردار کی گواہی دینے۔'' وہ ہنسے۔

''سنو! تمہاری ماں کے عروج کے فقط چھے سال تھے، پھر اپنے آئے روز کے اسکینڈل سے تنگ آ کر اُس نے سب کچھ چھوڑ دیا اور گمنامی کی زندگی گزار دی۔ اپنا نام بدل کر بر جا کر دیا۔ اُس عورت کی قسمت اچھی تھی کہ وہ انٹرنیٹ کے عروج کا دور نہیں تھا، لہٰذا اُسکی تصاویر یا ڈرامے تمہیں نہیں ملیں گے۔ لیکن یہ دیکھو! میں لایا ہوں۔۔۔'' اُس نے موبائل آگے کیا، رضا کو نہیں معلوم کہ وہ اس آدمی کی بکواس کیوں سن رہا تھا؟ پر وہ سن رہا تھا۔

''میں پورا انٹرنیٹ اور پرانے تمام اخبارات کھنگال کر تمہاری ماں کی زندگی پر لکھے تمام آرٹیکل اور اُسکے آئے روز کے اسکینڈل ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ یہ دیکھو! تمہاری ماں ایک آوارہ اور بد کردار عورت تھی۔ دیکھو غور سے۔۔۔۔''

''اگر وہ ایسی تھیں تو کیوں کی اُن سے شادی؟'' اُس کا ضبط جواب دے گیا۔

''میری ماں نے مجبور کیا تھا مجھے، اُس نے میری ماں پر نجانے کون سا جادو کر دیا تھا؟ کہ مجھے ماننا ہی پڑا۔'' وہ بھی جواباً چیخے تھے۔

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں، آپکو گھر چاہیے نا۔۔۔لے لیں مجھ سے۔۔۔ابھی اور آج ہی لے لیں۔ خدارا! میری ماں کو بخش دیں۔'' اُس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ٹھیک ہے! دو روز میں گھر میرے نام کر دو، ورنہ میں بر جا اسکول کے مالک رضائے الٰہی کے نام کے ساتھ اُسکی ماں کا حوالہ لگاؤں گا، ملک کے ہر بڑے خبر نامے میں۔۔۔''

''میری ماں کا حوالہ میرے لیے عیب نہیں ہے۔ آپ جھوٹے ہیں اور آپکی یہ کہانی بھی۔۔۔''

''تم جانتے ہو، تمہیں میں نے کیوں یہاں چھوڑا تھا؟'' اِس سوال پر رضا رکا اور انہیں دیکھا۔ ''کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم میری اولاد نہیں ہو، اُس عورت کے اتنے افئیرز تھے، ہو گے اُن میں سے کسی۔۔۔''

''دفع ہو جائیں میرے گھر سے۔۔۔ ابھی۔۔۔'' رضا نے پاس رکھا شو پیس اُٹھا کر دیوار پر دے مارا، ایک لمحے کو واصف صاحب بھی رک گئے۔

''جا رہا ہوں۔۔۔ جا ہی رہا ہوں۔ لیکن تم میری بھتیجی عائشہ سے ضرور تصدیق کر لینا۔ سنا ہے کہ تم آجکل تمہاری کفالت میں ہے وہ۔ اُمید ہے کہ وہ تم سے جھوٹ نہیں بولے گی۔'' وہ آخری وار کر کے باہر نکل گئے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ رضا اپنے بالوں کو تقریباً نوچتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

''میں نے کیوں سنی اُنکی اتنی باتیں؟ کیوں؟'' اُس نے خود کو کوسا۔ پھر نجانے کس خیال کے تحت موبائل باہر نکال کر انٹرنیٹ پر بر جا واصف لکھ کر سرچ کیا۔ کچھ بھی سامنے نہیں آیا۔

''سنبل مروان۔۔۔'' اُسکو نام یاد آیا تو کانپتے ہاتھوں سے لکھا۔ ''نہیں! میری ماں ایسی نہیں تھیں، وہ ایک نیک عورت تھیں۔ ابّو جھوٹ بول رہے تھے۔'' وہ خود کو تسلی دیتا نتائج دیکھنے لگا۔ بہت سی تصاویر میں ایک پرانے دور کی تصویر پر اُسے اپنی ماں کا گمان ہوا۔ اُس نے تصویر کھولی اور موبائل ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ ماڈل، یقیناً اُسکی ماں ہی تھی، وہی سانولا اور پرکشش چہرہ، میک اپ اور کیمرے کی آنکھ میں مزید پرکشش ہو گیا تھا۔ رضا نے اُنہیں اپنی زندگی میں کبھی اتنا تیار نہیں دیکھا تھا۔

جانیے! اپنے دور کی مشہور ماڈل اور اداکارہ سنبل مروان کے ساتھ کیا ہوا؟

تصویر کے نیچے لگے تھمب نیل پر کلک کیا تو ایک آرٹیکل سامنے کھل گیا، آرٹیکل آج سے پندرہ سال پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ اور اُس میں وہی باتیں موجود تھیں جو اُسکا باپ کہہ کر گیا تھا۔ بس! اُسکی ماں کی اُسکے باپ سے شادی اور نام بدل کر بر جا رکھنے کا قصّہ موجود نہ تھا۔

''نہیں! یہ سب جھوٹے ہیں۔ یہ آرٹیکل بھی میرے باپ نے لکھوایا ہو گا۔ سب جھوٹے ہیں۔۔۔'' اُس نے خود کو کہتے ہوئے موبائل دیوار پر دے مارا۔

''جھوٹے ہو تم سب۔۔۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔ ''جھوٹے ہو سب۔۔۔'' وہ گھٹنوں میں سر دیے رونے لگا۔

لیکن تم میری بھتیجی عائشہ سے ضرور تصدیق کر لینا۔ اُمید ہے کہ وہ تم سے جھوٹ نہیں بولے گی

کانوں میں باپ کو آواز گونجی۔

''عائشہ جی؟'' بہتے ہوئے آنسو یکدم تھم گئے۔ ''ہاں! عائشہ جی مجھے سچ بتادیں گی۔ یقیناً! یہ سب جھوٹ ہوگا۔'' وہ پرامید لہجے میں کہتا کھڑا ہوا اور گاڑی کی چابی اُٹھاتا باہر نکل گیا۔ اب اُسے ہر صورت عائشہ جی کے پاس جانا تھا۔

---------+---------+--------

''میرا جنازہ رات کے وقت نکالنا، تاکہ کسی نامحرم کی نظریں نہ پڑے۔'' (خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا)

وہ بار بار یہ ایک جملہ پڑھے جارہی تھی۔ آنسو تواتر سے اُسکی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔

''یارب۔۔۔'' وہ سسکی۔

''یاتوّاب!'' وہ تڑپ تڑپ کر روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

آج آخری طاق رات تھی، یا تو کل چاند نکلتا یا پرسوں۔ علی اِس آخری طاق رات عبادت کر کے درمیان میں پانی پینے اٹھا تو بچوں کا خیال آیا۔ جب سے فاطمہ آئی تھی بچے اُسکے ساتھ سونے لگے تھے۔ وہ اور بات تھی کہ نشمیہ اپنی مرضی کی مالک تھی دل کرتا تو علی کے ساتھ، کبھی اپنی ماں کے ساتھ اور کبھی کبھار شور مچانے والے اپنے ابّا کے ساتھ سو جاتی۔

وہ اوپر جانا نہیں چاہتا تھا، پر پتہ نہیں دل میں کیا خیال آیا کہ سوچا اوپر کا ایک چکر لگا آئے۔ کیا خبر بچوں کو ضرورت ہو؟ وہ خاموشی سے اوپر آیا تو کسی کی سسکیاں کانوں میں سنائی دیں۔ اُسکے قدم رک گئے۔

''میرا نام جس عظیم ہستی کے نام پر رکھا گیا تھا، میں نے۔۔۔ میں نے تو اُن کے نام کی لاج بھی نہ رکھی۔'' اپنے کمرے میں جائے نماز بچھائے فاطمہ آفندی، رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''میں کیا کروں گی؟ کیا کروں گی اگر محشر میں، میری سردار نے مجھ سے پوچھ لیا کہ فاطمہ! کیا میرے نام کی تمہارے نزدیک اتنی سی وقعت نہ تھی۔ اتنی سی بھی۔۔۔ کہ تم میری وصیت سے ہی کوئی نصیحت حاصل کرتی؟'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ علی ساکت ہوا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسے رونے پر وہ فاطمہ کو فنکارہ اور اُسکے آنسوؤں کو اداکاری کا لقب دے دیتا۔ پر اِس لمحے اُسکا روم روم اُسکی صداقت کی گواہی دینے لگا تھا۔

''میں کیسے سامنا کروں گی اُنکا؟ جب وہ مجھ سے پوچھیں گی کہ کیا میرے بابا ﷺ کا دین اتنا مشکل تھا؟ اتنا کہ تم کچھ دیر کو بھی صبر نہ کر سکی؟ کہ تم محرم اور نامحرم کی تمیز بھول گئی؟ میں کیا جواب دونگی؟ کیا جواب دونگی اُنکو؟'' رات کے اِس پہر فاطمہ آفندی خود احتسابی کی کڑی منزلیں طے کر رہی تھی، یہ جانے

بغیر کہ علی اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔اُسکی پیٹھ علی کی جانب تھی اِس لیے وہ دیکھ نہ سکی۔وہ خاموشی سے نیچے واپس آگیا۔اِس عورت پر ذرا یقین نہیں کرنا چاہتا تھا پر پتہ نہیں کیوں،دل بار بار اُسکے سچ بولنے کی گواہی دے رہا تھا۔

اُسکا سابقہ شوہر ایک اسمگلر،شرابی اور جواری تھا۔اُسے مارتا تھا،پیٹتا تھا۔حتیٰ کہ اُسے بیچنے تک والا تھا۔اُس نے اپنے کیے کی بہت بڑی سزا اُٹھالی ہے۔

''وہ اُسے مارتا تھا؟اُس عورت کو جس پر میں نے کبھی ہاتھ بھی نہیں اٹھایا؟''دل میں غصّے کی لہر اُٹھی۔کس کے لیے؟اُس عورت کے لیے؟جس سے اُسے نفرت تھی؟اُسے غصّہ کیوں آیا؟اُسکا سابقہ شوہر اُسے مارے یا جان سے مار دے؟وہ اُلجھ رہا تھا۔

''مارا تو میں نے بھی تھا اُسے؟ایک بار جب اُس نے مجھ سے طلاق مانگی تھی۔''دل نے یاد دلایا۔

''پر تب میں غصّے میں تھا۔''دماغ نے وضاحت دینی چاہی۔

''اور اُس روز جب وہ احمد سے ملنے آئی تھی،تب بھی تم نے اُسے گالیاں دے کر گھر سے نکالا تھا۔''دل نے پھر یاد دلایا۔

''ہاں!لیکن وہ میرا بچہ چھیننے آئی تھی۔''دماغ نے پھر وضاحت دی۔

''چھیننے نہیں ملنے،اور تم بھی گئے تھے اپنے بچے سے ملنے،کیا اُس نے تمہیں ہاتھ پکڑ کر گالیاں دیکر باہر نکالا؟''دل راضی نہ ہوا۔

''اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔''اپنے عمل کی وضاحت دینا مشکل ہو گیا۔

''تو ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنے دوسرے شوہر کو بھی دھوکا دیا ہو اور اُسکا شوہر بھی غصّے میں ہو؟''

''ایسا نہیں ہو سکتا؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''کیونکہ وہ شرابی و جواری تھا۔''

''تو؟''اِس تو کے آگے جواب نہ تھا۔

ہمارے ہر عمل کی ہمارے پاس کوئی نہ کوئی توجیہہ ضرور ہوتی ہے۔پر دوسروں کو ہم ہر حال میں گنہگار ہی سمجھتے ہیں۔

حسین ٹھیک کہتا تھا،علی اپنے ہر گناہ کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ لیتا تھا،اپنی نظر میں وہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تھا۔پر دوسروں کو وہ ہر حال میں گنہگار اور سزا کا حق دار ہی گردانتا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔آج کل اپنی ہر غلطی پوری جزئیات کے ساتھ نظر آتی تھی۔

کم از کم وہ سکون سے مر سکے۔

اُس نے چہرہ اُٹھایا۔ ''ابّا نے ایسا کیوں کہا؟'' پر اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پہلی بار دل کسی خدشے کے تحت دھڑکا تھا۔

---------+---------+--------

آج وہ پناہ گاہ آیا تو نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی، نہ آنکھوں میں نرمی۔ نہ بچوں کو پاس بلایا نہ پیار کیا۔ دروازہ دھاڑ سے کھولا اور سیدھا لیونگ روم میں آگیا۔ عائشہ جی اُسے دیکھ کر کھڑی ہوئیں۔

''رضا! کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' اُنہوں نے پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''عائشہ جی!'' اُس نے اُنکا نام لیا۔ اُسکی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ عائشہ جی پریشان ہوئیں۔

''بولو بیٹا! بلکہ تم بیٹھو، مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' اُنہوں نے کہا، وہ نہیں بیٹھا۔

''سنبل مروان کون تھی؟ آپ جانتی ہیں اُسکو؟'' اِس سوال پر عائشہ جی جہاں تھیں، وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے۔۔۔ ہو؟'' اُنہوں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ رضا نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ اُنہیں تو اِس نام پر لاعلمی کا اظہار کرنا چاہیے تھا نا؟ وہ ایسے حیران کیوں ہوئیں جیسے مردے کو زندہ دیکھ لیا ہو؟

''مجھے جواب دیں عائشہ جی!'' وہ اتنی زور سے بولا کہ بچے سہم گئے۔

''رضا! تمہیں کیا جاننا ہے آخر؟ کیوں پوچھ رہے ہو اپنی ماں کے بارے میں؟'' اُنکی زبان سے بیساختہ پھسلا اور رضا ہنستے ہوئے پیچھے ہوا۔

''تو وہ میری ماں ہی تھیں؟''

''رضا! میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ پہلے تم بیٹھو تو۔۔۔'' وہ گھبرائیں۔ بچے الگ ڈرے کھڑے تھے، اُنہوں نے رضا کو سوائے نرمی کے اور کسی لہجے میں بات کرتے نہ دیکھا تھا۔

''کیا بتائیں گی؟ کہ میری ماں ایک ماڈل تھی؟ ایک رقاصہ؟ ایک اسکینڈل سے بھری زندگی گزارنے والی؟ چار شادیاں کرنے والی اداکارہ؟'' اُس نے روتی آنکھوں اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ وہ خاموش کھڑی رہیں۔

''بتائیں! بتائیں مجھے کیا یہ سچ ہے؟'' اُس نے اُنہیں خاموش دیکھ کر بے تابی سے پوچھا۔ ایک آخری اُمید کہ شاید وہ نہ کہہ دیں۔

''یہ سچ ہے کہ تمہاری ماں نے چار شادیاں کی تھیں اور یہ بھی کہ وہ ایک اداکارہ اور ماڈل تھیں۔ لیکن رضا ہر بات کہ پیچھے ایک وجہ ہوتی ہے۔'' اُنکے الفاظ نے رضا کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا رہ گیا۔

''رضا تم تحمل سے میری پوری بات سنو!''

''تو میرا باپ، اِس لیے اُنہیں کالے چہرے والی کہتا تھا۔ وہ اُنکے چہرے نہیں اُنکے کردار کو کالا کہتے تھے۔ وہ دھوکے باز اور فریبی تھیں؟ وہ جھوٹی تھیں؟'' رضا نفی میں سر ہلاتے کہنے لگا۔

''رضا!'' عائشہ جی نے پہلی بار سخت لہجے میں اُسے روکنا چاہا پر وہ سن ہی کب رہا تھا؟

''یعنی مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ میرے سگے باپ بھی ہیں یا۔۔۔۔''

''رضا۔۔۔'' اُسکی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک زناٹے دار تھپڑ عائشہ جی نے اُسکے منہ پر جڑ دیا تھا۔ بچے تو یہ منظر دیکھ کر کانپنے ہی لگ گئے تھے۔

''تم نے اگر آدھی بات سنی ہے تو، تمہارا فرض ہے کہ باقی آدھی بات بھی سنو اور تم سنو گے۔'' اُنکے لہجے میں نجانے کہاں سے جلال اُتر آیا تھا؟ رضا نے چہرہ جھکا دیا۔

''وہ حالات کی ستائی مجبور عورت تھیں۔ تمہاری ماں، تمہارے باپ کی خالہ زاد تھیں جو چھے سال کی عُمر میں اغوا ہو گئی تھیں۔ اُنکی ماں اپنی بیٹی کا غم سینے سے لگائے اِس دنیا سے چلی گئیں۔ میری نانی یعنی تمہاری دادی، نے اُنہیں بہت ڈھونڈا، کہ یہ اُنکی بہن کی آخری وصیت تھی۔ اُسی زمانے میں فلم انڈسٹری میں ایک سولہ سالہ ماڈل کے چرچے ہونے لگے۔ وہ ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتی آگے بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ اُسکے اسکینڈل بھی سامنے آنے لگے۔ جب میری نانی نے پہلی بار انہیں اخبار میں دیکھا تھا وہ دنگ رہ گئی، کیونکہ تمہاری ماں بالکل اپنی ماں کا عکس تھیں۔ اُس وقت اُنکی عمر بائیس سال تھی۔ نانی اپنی بھانجی کو پہچان گئیں اور کسی طرح اُنکی شوٹنگ کے مقام پر پہنچ گئی۔ نانی کو یقین تھا کہ بر جا ممانی انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیں گی۔ پر جانتے ہو رضا؟ جب نانی اُن سے ملی تو وہ اپنی خالہ کو پہچان گئیں۔ انکا حافظہ اچھا تھا، انہیں چہرے یاد تھے۔ اُنہوں نے روتے ہوئے بتایا کہ جن لوگوں نے انہیں اغوا کیا اُنہوں نے انکو ایک امیر عورت کو بیچ دیا۔ امیر عورت نے پہلے اُنہیں ماڈلنگ میں لایا، پھر فلم میں لانے کے لیے زبردستی ایک ڈائریکٹر سے شادی کروادی۔ وہ اُس آدمی کے ساتھ بھی خوش رہتیں، پر فلم مشہور ہونے کے بعد اُس آدمی نے انہیں طلاق دے دی۔ اور یہ سب اُس عورت کے حکم پر ہی ہوا تھا جس نے انہیں پالا تھا۔ پھر اُس نے مزید شہرت کے لیے اُنکی شادی ایک مشہور بوڑھے پروڈیوسر سے کروادی اور وہی چند سال بعد اُس سے بھی طلاق۔ اور پھر تیسری شادی ایک اداکار سے۔۔۔ تمہاری ماں صرف ایک کٹھ پُتلی تھی، جسکی ڈور اُس عورت کے ہاتھ میں تھی۔ تمہاری ماں کا کوئی قصور نہ تھا، وہ ایک مجبور لڑکی تھی جسے یہ سب کرنا تھا ورنہ وہ جان سے جاتی۔ خیر! میں نہیں جانتی نانی نے یہ کیسے کیا؟ نانا نانی نے کہاں سے اتنے تعلقات لائے؟ لیکن وہ ممانی کو اُس چنگل سے نکال

لائے۔ ممانی کا وہاں سے نکل آنا، دنیا کی طرح ہمارے لیے بھی ایک راز رہ گیا۔ یہاں آنے کے بعد نانی نے اُنکا نام تبدیل کر دیا اور اُنکی شادی ماموں یعنی تمہارے ابّو سے کروادی۔ ماموں اِس شادی پر راضی نہ تھے، انہیں نانی نے قسمیں دے کر راضی کیا تھا۔ وہ ساری زندگی مامی کے کردار پر شک ہی کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ۔۔۔۔۔۔'' بات مکمل ہونے سے پہلے وہ رکیں اور دھواں دھواں ہوتے اُسکے چہرے کو دیکھا۔

''حتیٰ کہ وہ مجھے اپنی اولاد بھی نہیں مانتے تھے؟ یہی کہنا چاہتی تھیں نا آپ؟'' وہ آہستہ سے بولا۔ عائشہ جی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور میں نے اُس شخص کے لیے اپنی مری ہوئی ماں پر شک کیا، جو ساری زندگی مجھے اپنی اولاد نہیں مانتا رہا۔'' وہ ملامتی انداز میں کہتا پیچھے ہوا۔

''اور وہ پیسے؟ وہ پیسے جو ہر ماہ وہ میرے ماموں کو بھیجتے تھے؟ میرے خرچے کے لیے؟'' اُسے جیسے یاد آیا۔

''تمہارے باپ کی طرح تمہارا ماموں بھی ایک بےغیرت انسان تھا۔ وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اُسکی بہن ایک اچھی عورت ہے۔ میں گواہ ہوں کہ تمہاری ماں کس طرح راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے ہر گناہ کی معافی مانگتی تھیں۔ انہیں شاید اللہ نے تو معاف کر دیا ہو گا پر دنیا نے انہیں جینے نہ دیا۔ تمہاری ماں مر گئیں اپنے گھر کے مردوں کو اپنے کردار کی صفائیاں دیتے دیتے، پر وہ اپنا ماضی صاف نہ کر سکیں۔ تمہارے ماموں نے بھی تمہاری ماں کو کبھی قبول نہ کیا، تمہاری ماں کے مرنے کے بعد تمہارے ماموں نے تمہارے باپ کو دھمکی دی، کہ وہ سنبل مروان کی گمشدگی دوبارہ سے ساری دنیا کے سامنے لے آئے گا اور ساتھ اُسکا نام بھی لگائے گا۔ اُس وقت تمہارے ابّو ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک پورے خطّے کا چیف فائنانس آفیسر تھے۔ لہٰذا وہ اپنی ساکھ کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے، تمہارے ماموں کا منہ بند رکھنے کے لیے وہ ہر ماہ رقم بھیجتے تھے۔ وہ رقم۔۔۔۔ وہ رقم رضا تمہارے لیے ہرگز نہ تھی۔ اُس آدمی نے تمہیں کبھی اپنی اولاد مانا ہی نہیں۔۔۔۔''

''جس باپ کے انتظار میں، میں ستائیس سال تڑپتا رہا۔ وہ باپ مجھے اپنی اولاد نہیں مانتا تھا۔'' رضا اذیت سے کہتے ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔

''رضا! یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ انہیں بھول جاؤ!'' عائشہ جی اُسکی حالت سمجھ رہی تھیں۔

''جس ماموں کے گھر میں یتیموں کی طرح پڑا رہا، اُس نے انسانیت کے ناطے بھی کبھی مجھ پر ترس نہیں کھایا۔'' وہ چند قدم مزید پیچھے ہوا۔

''رضا۔۔۔''

''دوستوں نے مجھے چھوڑا۔۔۔۔'' وہ مزید پیچھے ہوا۔

''پر جس ماں نے بےلوث محبت کی اُسی ماں پر آج شک کر گیا میں۔۔۔۔ میں مر کر اپنی ماں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

''رضا! ایسے مت سوچو! انسان ہو تم، غلط فہمی ہو جاتی ہے۔'' عائشہ جی نے سمجھانا چاہا۔

''نہیں عائشہ جی! نہیں!۔۔۔۔''وہ نفی میں سر ہلاتے پیچھے ہٹنے لگا۔''آج میں بھی اپنی ماں پر الزام لگانے والے مردوں میں شامل ہو گیا۔ مجھے۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔مر جانا چاہیے مجھے۔۔۔''وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔

''رضا نہیں! رضا رک جاؤ!۔۔۔''عائشہ جی نے اُسکے پیچھے جانا چاہا پر وہ تیز نہیں چل سکتی تھیں۔حال ہی میں انکے گھٹنوں کا آپریشن ہوا تھا۔

''رضا۔۔۔تمہیں بچوں کا واسطہ!۔۔۔''لان میں آتے رضا کو اپنے پیچھے اُنکی آواز سنائی دے رہی تھی۔اُسی لمحے دروازے سے جزا داخل ہوتی دکھائی دی۔

''اوہو! تمہیں کیا لگا تھا، تم مجھ سے چھپ جاؤ گے؟''رضا کو دیکھ کر وہ دروازے سے ہی بولی۔''اب شرافت سے بتا دو کہ میرے بھائی کو کیسے جانتے۔۔۔۔''وہ مزے سے کہتی اُسکے پاس آئی پر اُسی لمحے رک گئی۔رضا کی آنکھیں۔۔۔۔کوئی اور ہی داستان سنا رہی تھیں۔

''تم۔۔۔۔تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا ہے رضا؟''وہ دو سیاہ آنکھیں اُسکی فکر میں گھل گئیں۔رضا نے ایک آخری بار اُن آنکھوں میں دیکھا۔وہ خواب چکنا چور ہوتے دیکھا جو اُس نے چپکے چپکے دیکھا تھا۔بھلا وہ اپنا ماضی کیسے بھول گیا؟ اُسے کس نے حق دیا ایسے خواب سجانے کا؟

''میں جا رہا ہوں جزا!''اُس نے بھرائی آواز میں کہا۔وہ مزید پریشان ہوئی۔

''کہاں جا رہے ہو؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

''میں دوبارہ واپس نہ آؤں کبھی تو۔۔۔۔تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر نکل گیا۔

''رضا۔۔۔۔رضا۔۔۔۔''وہ اُسکے پیچھے بھاگی۔

''رضا رکو!۔۔۔۔جزا! اُسے روکو! اُسے جانے مت دو۔''عائشہ جی لان میں داخل ہوتی چیخی تھیں۔جزا کو نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ پر وہ اندھا دھند دوڑتی اُسکی گاڑی کے پاس آئی اور شیشہ بجانے لگی۔پر وہ گاڑی لاک کر چکا تھا۔گاڑی گلی میں کھڑی تھی، جزا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اُسکی گاڑی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تم ایسے نہیں جاؤ گے۔''وہ اُسکے بونٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔لیکن اُسکو جھٹکا تب لگا جب رضا تیزی سے گاڑی پیچھے کر کے، گلی سے الٹی طرف سے نکل گیا۔

''رضا۔۔۔۔''وہ چیختی رہ گئی۔

''جزا! جزا۔۔۔۔''عائشہ جی اُس تک ہانپتی ہوئی پہنچی۔

''عائشہ جی! کیا ہوا ہے مجھے بتائیں کچھ، خدا کے لیے!''اُس نے انکا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''جزا! اُسے روکو! کچھ کرو جزا! وہ کچھ کرلے گا اپنے ساتھ۔۔۔اُس نے پہلے بھی۔۔۔۔''اِس سے آگے جزا نے کچھ نہ سنا۔اُس نے موبائل نکالا اور اُسے پاگلوں کی طرح فون ملانے لگی۔اُسکا نمبر بند آرہا تھا۔اُس نے دوسرے نمبر پر فون کیا تو بیل جارہی تھی پر فون نہیں اُٹھایا جارہا تھا۔

''اللہ! میں کیا کروں؟''اُس نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

''جزا کچھ کرو۔۔۔''عائشہ جی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

''آپ۔۔۔آپ اندر جائیں۔۔۔۔بچے پریشان ہو جائیں گے۔میں کچھ کرتی ہوں۔''اُس نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے نوید کو فون ملایا۔نجانے کتنے عرصے بعد؟پر اِس وقت اگر کوئی رضا کا پیچھا کر کے اُسے روک سکتا تھا تو وہ نوید ہی تھا۔

''بھائی!۔۔۔۔''نوید نے فون اٹھایا تو اُس نے کہا۔لہجے پر قابو رکھنے کے باوجود بھی آواز لڑکھڑا گئی۔

''کیا ہوا ہے جزا؟سب ٹھیک ہے؟''اُسکی آواز سن کر وہ پریشان ہوا۔

''بھائی!رضا۔۔۔رضا۔۔۔۔''پتہ نہیں کیوں؟پر اُسکی آواز بھرانے لگی۔

''کیا ہوا ہے رضا کو؟بتاؤ مجھے!''وہ شاید چیخا تھا۔

''بھائی!وہ کہیں نکل گیا ہے۔وہ کہہ کر گیا ہے کہ دوبارہ واپس نہیں لوٹے گا۔مجھے نہیں پتہ۔۔۔۔مجھے نہیں پتہ کہ اُسے کیا ہوا ہے پر۔۔۔۔بھائی!اُسکی بڑی بہن نے کہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کچھ کرلے گا۔''وہ روتی ہوئی بولی۔

''اُسکی گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟''نوید نے تحمل سے پوچھا۔

''نہیں!''

''اُسکا نمبر ٹرائی کیا؟''

''ایک بند ہے،دوسرا اُٹھا نہیں رہا۔''

''دوسرا والا مجھے بھیجو۔اور اُسکے بچوں کے پاس جاؤ۔میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''کیا مطلب تھوڑی دیر میں بھائی؟اُس نے آپکی بہن کی جان بچائی تھی،آپ کو ہر صورت اُسکو بچانا ہے۔''اُس نے ضدی لہجے میں کہا اور دوسری طرف سے فون کاٹ دیا گیا۔وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین کھود کر رضا کو یہاں لا کھڑا کر دے۔

دوسری جانب نوید نے فقط دو ہی میسیج کیے تھے۔ایک جزا کو اور ایک مائیکل والے گروپ پر۔

''رضا لاپتہ ہے۔میں پناہ گاہ جارہا ہوں۔'' گروپ پر بھیجا جانے والا میسیج۔

''رضا میرا پرانا دوست ہے۔تم سے زیادہ مجھے اُسکی فکر ہے۔'' جزا کو کیا جانے والا میسیج یقیناً اُسکے پیروں سے زمین نکال چکا ہوگا۔پر نوید کو فلوقت رضا کی فکر تھی۔

---------+---------+--------

عمر آخری تراویح پڑھنے کے بعد کچھ دیر کے لیے بازاروں میں بے مقصد گھومتا رہا تھا،گھر آیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔موبائل پر نوید کا آدھے گھنٹے پہلے کا پیغام آیا پڑا تھا۔

علی کچھ دیر قبل فاطمہ کو روتا دیکھ کر خاموشی سے نیچے آیا بیٹھا،اُسکے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ موبائل پر نظریں پڑیں۔نوید کا پیغام آیا ہوا تھا۔

مقدّم مسکراتا ہوا،لائیو ویڈیو کال پر مقدّس اور اُسکی نانی کی،کی گئی شاپنگ دیکھ رہا تھا،جو انہوں نے مکرم کے لیے کی تھی۔ اُسی لمحے سکرین پر پاپ اپ نوٹیفکیشن بجی،وہ اُسے ہٹانا چاہتا تھا پر اوپر نظر آتا نام دیکھ کر رک گیا۔نوید کا پیغام آیا ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں بیٹھا حسین،مُسکراتا ہوا حور عین کو دیکھ رہا تھا جو اپنے بچوں کو دعا مانگنا سکھا رہی تھی۔وہ اِس کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ اُس پراسرار قاتل کے بارے میں حور کو بتائے یا عید گزرنے کا انتظار کرے؟اُسی لمحے اُسکا موبائل بجا۔نوید کا پیغام آیا ہوا۔

جو جہاں بھی تھا،اُسی لمحے اُس نے اپنا کام کاج وہیں چھوڑا اور سیدھا پناہ گاہ کے لیے نکلا۔علی کو پناہ گاہ کا مطلب تک نہیں معلوم تھا،پر یہ ضرور معلوم تھا کہ اِس وقت نوید تو جواب دے گا نہیں،لہٰذا موزوں بندہ عمر لگا۔اُس نے پہلا میسیج عمر کو ہی کیا،اُس نے پتہ بھیج دیا۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ سب پناہ گاہ کے لیے نکل چکے تھے۔پہلا اور واحد خیال جو سب کے دماغ میں آیا وہ یہی تھا کہ کہیں رضا کو اُس قاتل نے تو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو؟

---------+---------+--------

کوٹ کہاں تھا؟اُسکا موبائل کہاں رہ گیا تھا؟گاڑی کہاں تھی؟بلکہ وہ خود کہاں تھا؟اُسے نہیں معلوم۔وہ سڑکوں پر بے مقصد چلتا جارہا تھا،چلتا جارہا تھا۔پر سڑک بھی جیسے طویل ہوگئی تھی۔چلتے چلتے وہ رکا۔

''میری ماں کی زندگی برباد کرنے والے مردوں میں آج میں بھی شامل ہو گیا، میں نے اُنکی روح تک تڑپا دی ہو گی آج۔اب معافی تو مر کے ہی ملے گی۔'' وہ پھر چلنے لگا۔دکھ ماں پر الزام لگانے کا تھا؟ یا اِس بات کا تھا کہ جس باپ کا وہ انتظار کرتا آیا تھا، سوچا تھا کہ جب وہ ملیں گے تو ہزار ناراضگی کے باوجود وہ اُن کو معاف کر دے گا۔اُس باپ نے تو اُسکو کبھی اولاد ہی نہیں سمجھا تھا۔معلوم نہیں دکھ کس بات کا زیادہ تھا؟

''امی! میری پیاری امی! پتہ نہیں آج آپکو کتنی تکلیف پہنچی ہو گی؟'' دل ہی دل میں اپنی ماں سے مخاطب نجانے وہ کہاں آ گیا تھا؟ یہاں نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔۔

اُسکا دماغ اِس وقت کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔اُسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ گاڑی کہاں چھوڑ آیا ہے؟

''یہ جگہ کونسی ہے؟'' اُس نے غائب دماغی سے آس پاس دیکھا۔بائیں طرف سمندر تھا، قریب لنگر انداز ہوئے جہاز تھے، جن پر بڑے بڑے کنٹینر رکھے ہوئے تھے۔کچھ کرین بھی تھیں، پر اندھیرے کے باعث سب واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔اور اگلے ہی لمحے جیسے اُسکے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔وہ شہر کی بندرگاہ پر آ گیا تھا۔اب اُسے اچھے سے معلوم تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے؟

سڑک کی دوسری جانب کوئی سایہ سا تھا، جو اُسے سمندر کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

---------+---------+--------

پولیس موبائل سے اتر کر نوید تیزی سے پناہ گاہ میں داخل ہوا تھا، جزا وہیں لان میں کھڑی تھی، کچھ بڑے بچے بھی پریشان سے اُسکے ساتھ تھے۔عائشہ جی کو شیز اطبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اندر لے گئی تھی۔ نوید کا فون کان سے لگا تھا، وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔بات کرتے ہوئے ہی جزا کے پاس آ کر رک گیا۔

''ٹھیک ہے! گاڑی کا نمبر معلوم ہو گیا ہے تو گاڑی اور اُسکا موبائل ٹریس کرو جلد سے جلد۔۔۔'' اس نے ہدایت دے کر فون رکھا۔

''مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' اُس نے جزا سے پوچھا۔

''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم، اُس نے بس اتنا کہا کہ۔۔۔میں جا رہا ہوں۔۔۔۔لوٹ کر واپس نہ آؤں تو بچوں کا خیال رکھنا۔'' اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔اُس وقت تو جذبات میں بتا دیا تھا سب، اب بھائی کے سامنے سب کہتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔اوپر سے وہ اُسکا دوست تھا، کیسے تھا پتہ نہیں؟ پر یہ تو اُسے معلوم تھا کہ نوید جھوٹ نہیں بولتا۔

''کیا اُسکے علاوہ کچھ نہیں معلوم؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں! بس عائشہ جی جو اُسکی بڑی بہن ہیں، وہ کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔''اُسی لمحے کھلے دروازے سے حسین اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

''کہ؟''نوید نے پوچھا۔

''کہ وہ اپنے ساتھ کچھ کرلے گا، اُسے روکو۔ بچے کہہ رہے تھے کہ اُسکی عائشہ جی سے کوئی لڑائی ہوئی تھی، اُنہوں نے اُسے تھپڑ بھی مارا تھا۔ بس! اتنا ہی معلوم ہے۔''اُسے جو معلوم تھا اُس نے بتادیا۔

''حسین! تمہیں کچھ معلوم ہے؟''نوید نے نجانے کیوں حسین سے پوچھا تھا؟ جزا نے رک کر حیرت سے دیکھا۔اِس آدمی کو تو وہ دو تین بار پناہ گاہ میں اور ایک بار اسکول میں رضا کے ساتھ دیکھ چکی تھی، اُسی لمحے عمر، مقدم اور علی بھی باری باری وہاں آئے۔

''میں نہیں جانتا نوید! لیکن اگر عائشہ جی کہہ رہی ہیں کہ وہ کچھ کرلے گا۔ تو اُسے ڈھونڈو۔۔۔ جلدی ڈھونڈو۔۔۔اِس سے پہلے کہ وہ واقعی کچھ کرلے۔'' حسین کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

''کیا ہوا ہے نوید؟''یہ سوال عمر نے پوچھا تھا۔ جزا حیران و پریشان تھی، وہ جانتی تھی کہ اِن میں سے دو بندے تو رضا کے دوست تھے، وہ اُس روز بچوں سے ملنے آئے تھے، جس روز پولیس والے اُسے گرفتار کرنے آئے تھے، ایک نشمیہ کا باپ تھا جو چند روز قبل اسکول آیا تھا۔ تو کیا وہ بھی نوید کو جانتے تھے؟ کیا وہ سب بھی آپس میں دوست تھے؟ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اُسکا دماغ سمجھنے سے قاصر تھا؟

''تم اندر جاؤ! اور عائشہ جی کو باہر بھیجو۔ میں اندر نہیں آرہا ورنہ بچے پریشان ہوں گے۔''اُس نے عمر کو جواب دینے سے پہلے جزا کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی اندر چلی آئی اور عائشہ جی کو صورتحال سے آگاہ کر کے باہر بھیجا۔ بڑے بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہی اندر لے آئی۔

''میں کچھ نہیں جانتا کہ کیا ہوا ہے؟ جو بھی ہوا ہے وہ عائشہ جی ہی بتا سکتی ہیں۔''نوید نے عمر کو مختصر جواب دیا۔ عائشہ جی وہاں آئیں تو پہلا سوال اُس نے رضا کے حوالے سے ہی پوچھا تھا۔

''کیا ہوا تھا یہاں؟ آپ کو مجھے ہر شے سچ سچ بتانی ہو گی ورنہ ہم اُسے نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔''نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔ بچوں کی پڑھائی والے کمرے سے لان کا منظر صاف نظر آتا تھا، اور سب سنائی بھی دیتا تھا۔ جزا خاموشی سے کھڑکی کے برابر جا کھڑی ہوئی۔

''تم لوگ کون ہو؟''

''ہم رضا کے دوست ہیں۔ اُسے بہت اچھے سے جانتے ہیں۔ آپ بس اتنا بتادیں کہ ہوا کیا ہے؟''حسین نے بے تابی سے کہا۔

''کیا تم لوگ اُسکے ماں باپ کے بارے میں جانتے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''ہاں!'' یہ جواب حسین نے دیا تھا۔ باقی سب خاموش رہے۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' عائشہ جی نے سب بتانا شروع کیا۔ وہ ایک ایک بات بتا رہی تھیں اور وہ کچھ حیرت، کچھ دکھ اور کچھ بے یقینی سے سن رہے تھے۔ وہ جو پورا یونیورسٹی کا زمانہ اِس معمے کو حل نہ کر سکے کہ رضا اپنے آپ میں گم سم سا، سب سے الگ تھلگ سا، رشتوں سے اتنا نالاں کیوں تھا؟ وہ معمہ آج سولہ سال بعد حل ہوا تھا۔

حسین کو تو اُس نے سب بتایا تھا۔ پر جو آج ہوا، وہ تو یقیناً تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا ہو گا۔ پردے کے پیچھے کھڑی جزا ساکت تھی، آنکھوں سے آنسو خود بخود بہہ رہے تھے۔ تو وہ جو کبھی کبھی سوچتی تھی کہ رضا بچوں کے لیے اتنی محبت کیوں رکھتا ہے؟ اُسکی وجہ یہ تھی؟ وہ ان بچوں میں اپنا بھیانک بچپن دیکھتا تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہو؟ کچھ دیر میں واپس آ جائے؟ ہمیں صبح تک کا انتظار کرنا چاہیے۔'' نوید نے تحمل سے کہا۔

''نہیں! ہم صبح کا انتظار نہیں کر سکتے۔'' یکدم ہی حسین چیخا۔ ہر شخص نے رک کر اُسے دیکھا۔

''حسین! پریشان نہ ہو وہ۔۔۔'' علی نے اُسے کچھ سمجھانا چاہا پر وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے مزید زور سے چیخا تھا۔

''نہیں نہیں نہیں! تم لوگ نہیں سمجھ رہے۔ اُسے ایک بار پہلے اپنے باپ کے بارے میں پتہ چلا تھا تو اُس نے خود کو تباہ کر لیا تھا۔ اُس نے سڑکوں کو مسکن بنایا تھا، نشے میں سکون تلاش کیا تھا۔ اور۔۔۔ اور بس خود کو بربادی کے دہانے پر لے آیا تھا۔ پتہ نہیں اب وہ کیا کرے؟'' حسین بولتے بولتے ہانپ گیا تھا۔ پہلی بار نوید کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔ تم سب الگ الگ جگہ جا کر ڈھونڈو، جیسے ہی کسی کو کوئی بھی اطلاع ملے فوراً گروپ پر میسیج کرے۔'' نوید کہتا ہوا باہر نکلا تھا۔

''میں رضا کے فلیٹ پر دیکھتا ہوں۔'' حسین باہر نکلا۔

''میں بھی ساتھ آ رہا ہوں۔'' مقدّم اُسکے پیچھے گیا۔

''ہم قبرستان میں دیکھتے ہیں، اُسکی والدہ کی قبر کس قبرستان میں ہے، میں جانتا ہوں۔'' عمر نے گم صم سے کھڑے علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، تو وہ سر ہلاتے ہوئے اُسکے ساتھ نکلا، رضا کیلئے استعمال کیے گئے الفاظ، اُس پر لگائے گئے الزامات، اُسکے ساتھ کیا گیا اپنا ہر سلوک یاد آ رہا تھا۔

دوسری جانب رضا کے فلیٹ کے راستے پر جاتا حسین، اُسکے فلیٹ پر گزاری وہ آخری رات یاد کر رہا تھا، جس میں رضا نے اُسکے سامنے اپنا آپ ایک بار پھر کھول کر رکھ دیا تھا۔

---------+---------+--------

ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی لہریں کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بندرگاہ سے دور وہ اُس کنارے پر آچکا تھا، جہاں سمندر گہرائی لیے ہوا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی یاد کر رہا تھا۔

اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔۔۔

ماں کا سسکتے سسکتے گزر جانا یاد آیا۔۔۔۔۔

دوسرا آگے کیا۔۔۔۔۔

باپ کا چھوڑ دینا یاد آیا۔۔۔۔۔

مزید قدم آگے کیے تو سمندر کے مزید قریب ہو گیا۔۔۔۔

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گزاری وہ رات یاد آئی۔۔۔۔

سمندر کنارے پر پہنچا۔۔۔۔

تو ماموں کی بے اعتنائی یاد آئی۔۔۔۔۔

دنیا اُس پر تنگ تھی اور آج جیسے اُسکے لیے ختم ہو گئی تھی۔۔۔۔

ایک قدم اور بڑھایا۔۔۔۔

علی کے لگائے گئے الزامات، اُسکا حقارت آمیز لہجہ یاد آیا۔۔۔۔

اگلا قدم آگے بڑھایا اور پاؤں ہوا میں معلق رہ گیا۔۔۔

زمین پیروں کے نیچے ختم ہو گئی۔۔۔۔

---------+---------+--------

نوید کا میسیج ملتے ہی سب کے سب اُسکی بھیجی گئی لوکیشن پر پہنچے۔ رضا کی گاڑی ٹریس کر لی گئی تھی۔ پر وہاں پہنچتے ہی جو منظر اُنہوں نے دیکھا، اُنکی روح تک فنا گئی۔ پولیس اُنکے ساتھ ساتھ ہی تھی۔

اُسکی گاڑی الٹی پڑی تھی، کچھ دور اُسکا موبائل، بٹوہ اور دیگر سامان زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ ظاہری طور پر اُسکی گاڑی کسی شے سے ٹکرا کے الٹی ہوئی تھی۔ وہ لوگ پاگلوں کی طرح اُسے آس پاس تلاش کرنے لگے، اِدھر اُدھر کے لوگوں سے پوچھنے لگے۔

''یہ گاڑی۔۔۔اِس گاڑی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ پلیز کچھ بتائیں ہمیں۔۔۔''حسین نے ایک شخص کو پکڑ کر کہا۔

''یہ گاڑی درخت سے ٹکرا کر الٹی ہو گئی تھی۔ اندر کوئی آدمی تھا۔ وہ معجزاتی طور پر محفوظ رہا۔'' یہ سن کر اُنکی جان میں جان آئی۔

''کہاں ہے وہ؟''نوید نے پیچھے سے آتے ہو پوچھا۔ آس پاس اور لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔

''ہم نے اُسے گاڑی سے باہر نکالا، پر وہ عجیب سی حرکتیں کرنے لگا۔ پہلے تو اُس نے ہم سب کو دھکّا دیا، پیچھے رہنے کو کہا اور پھر اپنا سارا سامان زمین پر پھینک کر پیدل ہی نکل گیا۔ کوئی سر پھرا امیر زادہ لگتا تھا۔''اُس نے بتایا۔

''وہ کس طرف گیا تھا؟''نوید نے پوچھا۔

''اُس طرف۔۔۔''اُس نے اشارہ کیا۔

''یہ سڑک تو بندرگاہ کی طرف جاتی ہے۔''نوید کے ساتھ کھڑے ایک پولیس والے نے بتایا۔

''ہمیں بندرگاہ تک جانا ہو گا۔ وہاں سے کچھ معلوم نہیں ہوا تو مزید آگے تلاش کریں گے۔''نوید تیزی سے ہدایت دیتا پولیس موبائل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لوگ بھی بندرگاہ کی طرف نکلے۔

بندرگاہ پہنچ کر آس پاس دیکھا پر نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔۔۔

''فوراً ہر جانب تلاش کرو۔''نوید نے پولیس والوں کو حکم دیا۔ ہر کوئی آس پاس تلاش کرنے لگا، پر کوئی ہوتا تو ملتا نا؟

''کہاں ڈھونڈے اُسے؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''مقدم نے رک کر کہا۔ آس پاس تلاش کر کے وہ سب واپس ایک ہی جگہ آ گئے تھے۔ حسین کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

''اُسکے پاس تو موبائل بھی نہیں ہے۔ ہم رابطہ بھی نہیں کر سکتے۔''علی نے پریشانی سے کہا۔ اِس سے پہلے نوید کچھ کہتا، پولیس والا ایک سڑک چھاپ فقیر کو کہیں سے پکڑ لایا۔

''سر! یہ آدمی کہتا ہے کہ اِس نے یہاں ایک آدمی کو کچھ دیر پہلے دیکھا ہے۔''پولیس والے نے اُس لمبی داڑھی اور پھٹے لباس والے شخص کو نوید کے آگے کیا۔

''کیا تم نے کسی کو دیکھا؟''نوید نے اُس سے پوچھا۔

''ہاں! دیکھا نا۔۔۔ایک امیر سا خوبصورت سا آدمی تھا۔۔۔''

''خاموش رہو!''نوید نے جھڑکا۔

''خود ہی تو پوچھا۔''وہ خفا ہوا۔نوید نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکالی۔

''کیا یہ شخص تھا؟''اُس نے رضا کی تصویر آگے کی۔اتنے شارٹ نوٹس پر اُسکے پاس تصویر کہاں سے آئی؟یہ سوچنے کا فلحال کسی کے پاس وقت تھا نہ کسی نے دھیان دیا۔

''ہاں! یہی تو تھا۔یہ وہاں سمندر کنارے گیا۔۔۔جہاں لہریں تیز ہوتی ہیں اور پانی گہرا ہوتا ہے۔''

''تو؟''حسین چیخا۔

''تو بس پھر کیا؟اُس نے چھلانگ لگا دی۔مر گیا ہو گا اب تک تو۔۔۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''اُسکا گریبان پکڑتا حسین چیخا۔

''حسین چھوڑو اُسے۔۔۔''عمر نے اُسے پیچھے ہٹانا چاہا۔

''میں نے تو جو دیکھا وہ تم کو بتایا۔''فقیر بولا۔

''تم نے دیکھا تو اُسے روکا کیوں نہیں؟''حسین حلق کے بل چیخا تھا۔

''یہاں سالانہ دسیوں لوگ خودکشی کرتے ہیں۔کس کس کو روکوں میں؟''حسین کے ہاتھ ڈھیلے پڑے تھے،وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہوا۔

تو کیا رضا الٰہی کی کہانی اتنی ہی تھی؟

---------+---------+--------

باب پندرہ

اجنبی مسافر

فضاء میں فقط دو ہی آوازوں کا شور تھا۔ایک ساحل سے ٹکراتیں، ٹھاٹھیں مارتی سمندر کی لہروں کا شور اور دوسرا ریسکیو ٹیموں کے مسلسل بجتے سائرن کا شور۔ علاقہ چاروں جانب سے پولیس کے گھیرے میں تھا۔ گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی اور ریسکیو آپریشن پچھلے ڈھائی گھنٹے سے جاری وساری تھا۔

سیاہ جینز پر سیاہ جیکٹ پہنے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اونچائی پر کھڑا نوید ساکت نظروں سے نیچے ریسکیو ٹیم کو مسلسل جدوجہد میں مصروف دیکھ رہا تھا۔ آنکھ کے کنارے لگے پرانے زخم میں آجکل درد اٹھنے لگا تھا۔ نظروں کا زاویہ تبدیل کیا تو بائیں جانب اونچائی پر ہی قطار میں رکھے بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک پر حسین بیٹھا ہوا تھا۔ عمر اُسکے پاس کھڑا اُسے کچھ کہہ رہا تھا، سمجھا رہا تھا یا تسلی دے رہا تھا؟ معلوم نہیں۔ علی چہرے پر دکھ کے تاثرات لیے کھڑا کچھ دور نیچے ساحل کنارے، ریسکیو آپریشن میں مصروف ٹیم کو دیکھ رہا تھا، جبکہ مقّدم بے چینی سے دائیں بائیں چکّر کاٹ رہا تھا۔ نوید نے کلائی اوپر کر کے گھڑی دیکھی جو صبح کے چار بجا رہی تھی، سحری کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے گہری سانس لیکر قدم اُس جانب بڑھا دیئے، جہاں وہ چاروں تھے۔ یہ تو طے تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی آج گھر واپس نہیں جائے گا۔

اِس بات کو تین گھنٹے گزر چکے تھے، جب اُس سڑک چھاپ نے بتایا تھا کہ رضا نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ حسین کو اگر وہ لوگ روکتے نہیں تو شاید وہ خود ہی سمندر میں ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ آدھا گھنٹہ ریسکیو ٹیموں کو آنے میں لگا، اُس وقت سے اب تک رضا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اُسکا سامان نوید نے اُٹھا کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ ماہر غوطہ خور سمندر میں بھی اُترے تھے، لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے واپس آ گئے۔

آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا نوید، اُس پتھر کے قریب پہنچا، جس پر حسین بیٹھا تھا۔ اُسکے پیچھے پولیس موبائل کھڑی تھی۔

''شیراز!'' نوید نے پولیس موبائل سے ٹیک لگائے کھڑے، شیراز کو آواز دی تو حسین نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔

''یس سر!'' شیراز اُسکے قریب آیا۔ حسین نے پر اُمید نظروں سے اُن دونوں کو دیکھا کہ شاید کوئی خبر آئی ہو۔

''رضا کے فلیٹ کی سی سی ٹی وی نکلوائی؟'' نوید نے پوچھا۔

''سی سی ٹی وی مل گئی ہے۔ اُس میں ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص کو دیکھا گیا ہے، جو آخری بار اُن سے ملنے آیا تھا۔'' شیراز نے بتایا۔

''ہونہہ۔۔۔''نوید نے سر ہلایا۔''وہی اُسکا باپ ہے۔ جلد از جلد اُسے گرفتار کرواور اُسے کہو کہ اگر۔۔۔''وہ رکا اور ایک نظر حسین کو دیکھا، پھر دوبارہ شیراز کی جانب متوجہ ہوا۔''اگر رضانہ ملا، یا اُسے کچھ بھی ہوا، تو سارا جرم اُس شخص کا ہوگا کیونکہ آخری بار وہی رضا سے ملا تھا۔''

''اِس سے کیا ہوگا؟''پاس کھڑا مقدّم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''فقط ایک رات بھی جیل میں گزارنا، اُسکی ساکھ کو اتنا نقصان پہنچادے گا کہ وہ دوبارہ رضا کو تنگ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔''نوید نے کہا تو شیراز سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

''وہ سب بعد کی باتیں ہیں نوید! ابھی رضا کو ڈھونڈنا ضروری ہے۔''حسین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں حسین!''اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔اُسی لمحے ریسکیو آفیسر نے اشارہ کیا، جسے سمجھ کر نوید سر ہلاتے ہوئے اُسکی جانب بڑھ گیا۔

''کیا ہوا؟ کچھ پتہ چلا؟''پتھروں میں سے راستہ بنا کر نیچے ریسکیو آفیسر کے قریب آتے ہوئے نوید نے پوچھا۔

''جناب اندھیرا بہت ہے، اس وجہ سے لاش ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ہمیں صبح کی روشنی کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''لاش؟''نوید کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ہاں! لاش۔۔۔اتنے گہرے سمندر میں چھلانگ لگانے کے بعد کوئی نہیں بچ سکتا، خصوصاً جب اتنا وقت بھی گزر چکا ہو۔ اگر لاش آج نہ ملی، تو ایک دو دن میں خود ہی کنارے آجائے گی، کیونکہ سمندر اِس موسم میں اتنا چڑھا ہوا نہیں ہوتا۔''اُسکا رضا کو بار بار لاش کہنا نوید کا دل دہلا رہا تھا۔

''وہ زندہ بھی تو مل سکتا ہے۔''حالانکہ جو بات وہ کہہ رہا تھا، اُس پر اُسے خود بھی یقین نہ تھا، لیکن فقط ایک اُمید۔۔۔

''ناممکن!''آفیسر نے نفی میں سر ہلاتے، اُسکی آخری اُمید بھی توڑ دی۔اُس نے چہرہ موڑ کر اونچائی پر کھڑے اپنے دوستوں کو دیکھا۔ وہ آس بھری نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔اُنہیں بتانا ہی تو سب سے مشکل کام تھا۔

''ٹھیک ہے! آپ تلاش جاری رکھیں۔''نوید نے کہا اور واپس اوپر آیا۔چاروں نے ڈھیروں سوالات نظروں میں لیے اُسے دیکھا، وہ رک گیا۔کہنے کے لیے الفاظ نہ ملے۔

''کیا ہوا نوید؟''عمر نے خدشوں بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اندھیرا ہونے کی وجہ سے۔۔۔''وہ رکا، تیز سمندری ہوا اُسکے بال اُڑا رہی تھی۔

''ڈیڈ باڈی (لاش) تلاش کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔''اِن الفاظ پر پانچوں نے تڑپ کر اُسے دیکھا تھا، پر اُس نے بات جاری رکھی۔''ہمیں انتظار کرنا ہو گا حتیٰ کہ سمندر خود ڈیڈ باڈی ساحل پر پھینک دے۔''اُس نے کتنی مشکل سے یہ سب کہا تھا، صرف وہ ہی جانتا تھا۔

''میری بات سنو۔۔۔''حسین کو نجانے کیا ہوا؟ اُس نے یکدم ہی اُسکا گریبان پکڑا تھا، نوید خاموش کھڑا رہا۔

''تم اُسے بار بار ڈیڈ باڈی کیوں کہہ رہے ہو؟ ہاں؟''وہ چیخا نہیں تھا، دھاڑا تھا۔

''حسین! رکو! بات سنو۔۔۔''مقدّم نے اُسے پیچھے ہٹانا چاہا پر اُس نے اُسکا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تم نے اُسے ایک بار بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی؟ وہ گمشدہ ہے، مرا نہیں ہے۔۔۔''حسین نے سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھا، سمندری ہوا اُسکے بال اُڑا کر ماتھے پر لے آئی تھی۔

''حسین! میں نے تمہیں وہی بتایا جو مجھے معلوم ہے۔ اُس نے یہاں سے چھلانگ لگائی ہے اور۔۔۔'' نوید نے ضبط کرتے ہوئے، اُسے سمجھانا چاہا۔

''ایک سڑک چھاپ نشئی کی بات پر کیسے یقین کر سکتے ہو تم؟''حسین نے اُسکا گریبان جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے تاسف سے کہا۔ نوید نے لب بھینچ کر اُسے دیکھا۔

''حسین! تم یہاں آؤ۔۔۔''عمر نے اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹانا چاہا، پر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

''تم نے اب تک اُسے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے نوید! جیسے علی نے مقدّم کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''وہاں کھڑے کسی بھی شخص کو کم از کم حسین سے اِس جملے کی توقع نہ تھی۔ وہ واحد شخص تھا، جس نے نہ اب تک کسی کو الزام دیا تھا، نہ دس سال پہلے کا حوالہ۔ پر آج یہ بھی ہو گیا تھا۔

''تو تمہیں کیا لگ رہا ہے کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں اتنی دیر سے؟''بلآخر نوید کی برداشت بھی جواب دے گئی، تو اُس نے سختی سے پوچھا۔

''وقت برباد کر رہے ہو بس!''وہ غصّے سے کہتا آگے بڑھا، اُسکا چہرہ ضبط کی شدت سے لال ہو رہا تھا، تنفس پھول رہا تھا۔

''میں اپنے حواس بحال رکھتا ہوں حسین! ہم خالی سڑکوں پر رضا کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔''نوید نے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے روکنا چاہا، جسے اُس نے جھٹکے سے چھڑوایا تھا۔

''ایک جگہ کھڑے رہنے سے بھی وہ نہیں مل سکتا، تمہیں آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے۔''وہ ماننے کو تیار نہ تھا، باقی تینوں خاموشی سے کھڑے، یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''تو کہاں ڈھونڈوں اُسے ؟زمین کھودوں یا آسمان میں سیڑھی لگاؤں ؟جہاں اُسے آخری بار دیکھا گیا ہے، وہیں سے مل سکتا ہے ناوہ۔۔۔''نوید کی آواز بلند ہوئی تھی۔

''بس کردو تم دونوں۔۔۔خدا کے لیے۔۔۔''مقدّم حلق کے بل چیخ اُٹھا۔

''تم لوگ ہر مشکل گھڑی میں، ہر پریشانی میں ایک دوسرے سے لڑنے، اور ایک دوسرے کو الزام دینے کیوں کھڑے ہو جاتے ہو؟''اُس کا ضبط شاید جواب دے گیا تھا۔ فجر کی اذانیں سنائی دینے لگی تھیں، آج وہ سحری کے بنا ہی روزہ رکھنے والے تھے۔

''اِس طرح کرنے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، نہ پہلے ہوا ہے اور نہ اب ہو سکے گا۔''اب کہ اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو دونوں خاموش ہوئے۔

''یہ لو! پانی پیو۔''علی نجانے کہاں سے پانی کی بوتلیں لے آیا تھا؟اُس نے دونوں کی جانب بڑھائی۔ نوید نے لے لی جبکہ حسین نے اُسے دیکھا۔

''اذان ہو رہی ہے۔۔۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ابھی شروع ہوئی ہے، تم پانی پی سکتے ہو۔''علی نے نرمی سے کہا، تو اُس نے بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ چیخ چیخ کر حلق خشک ہو چکا تھا۔

تم عقّے میں ہو، تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔

میں تمہیں اکیلے جانے نہیں دوں گا۔

میں ساتھ آرہا ہوں۔

نوید کو اپنی اور رضا کی آخری ملاقات یاد آئی۔ ہزار اجنبیت، ہزار ناراضگی، اور ہزار شکوؤں کے باوجود وہ اُسے تنہا چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ تو کیا نوید اُسے تنہا چھوڑ سکتا تھا؟

اُس نے آپکی بہن کی جان بچائی تھی، آپ کو ہر صورت اُسکو بچانا ہے۔

جزا کی آواز کانوں میں گونجی، احسان تو واقعی کیا تھا اُس نے نوید پر۔ وہ خاموشی سے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ صبح کی روشنی پھوٹنے لگی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔

عدالت تو تمہارے جیسے طاقت والے لگاتے ہیں۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔۔۔اگر نوید کے پاس طاقت تھی تو وہ اُسے ڈھونڈ سکتا تھا، وہ کیوں دیر کر رہا تھا؟ کیا اُس نے یہ یقین کر لیا تھا کہ رضا مر چکا ہے؟

پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے حسین کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

''میں آگے جا کر دیکھوں گا۔'' وہ یکدم ہی کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''حسین! رک جاؤ۔۔۔'' عمر نے اُسے روکنا چاہا۔

''وہ مل جائے گا عمر! اُسے کچھ نہیں ہوا ہو گا۔'' اُس نے عمر سے زیادہ خود کو یقین دلانا چاہا تھا۔

''ریسکیو ٹیم ڈھونڈ رہی ہے اُسے، دیکھو! اب تو روشنی بھی ہونے لگی ہے۔ تھوڑی دیر میں غوطہ خور بھی آ جائیں گے۔'' اب کہ مقدّم نے اُسے تسلّی دینی چاہی، جبکہ تسلی دینا ہی بے حد مشکل تھا۔ حسین اس وقت حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

''اُس کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔رضا کے ساتھ نہیں۔۔۔ایسا نہیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اپنے آپ سے کہتا ہوا پتھر پر ڈھے سا گیا۔

''حسین!'' عمر اُسکے قدموں میں بیٹھا، دور سے یہ منظر دیکھتا نوید بیساختہ سیدھا ہوا اور پھر اُنکی طرف بڑھا۔

''اُس نے مجھے بتایا تھا۔۔۔وہ اتنے عرصے ری ہیبیلیشن سینٹر میں رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنی زندگی میں کچھ بن سکا تھا۔۔۔اُسکے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ بول رہا تھا۔ اور سب سن رہے تھے، اُسکی بے ربط باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں، پر وہ کچھ بتا رہا تھا۔

وہ رات اُنکے درمیان آ ٹھہری۔۔۔

خاموش کچن کا کاؤنٹر۔۔۔۔

چائے کی ختم ہوتی دو پیالیاں۔۔۔

آنلائن مارٹ سے منگوائی گئی ڈبل روٹی۔۔۔

سامنے بیٹھے وہ دو نفوس۔۔۔۔

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گزاری گئی رات۔۔۔۔

اور اُس رات کے قصّے کو زبان بخشتا وہ قصہ گو۔۔۔۔

رضائے الٰہی۔۔۔

---------+---------+--------

سانحے سے چھے ماہ قبل:

ایم بی اے کا آخری سال تھا، وہ ایک کوچنگ سینٹر میں ٹیچر کی نوکری کر رہا تھا۔ تنخواہ بہت زیادہ نہ تھی، لیکن اتنی ضرور تھی کہ اُسکو ضرورت کے لئے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑتے تھے۔ البتہ اُسکی یونیورسٹی کی فیس ماموں ہی بھرتے تھے اور جو پالتا ہے وہ احسان جتانا نہیں بھولتا، یہی دنیا کا دستور ہے۔ کافی عرصے سے وہ مختلف کمپنیوں میں اپنی گریجویشن کی بنا پر نوکری کے لئے درخواستیں دے رہا تھا۔ اُس روز اُسے ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی سے انٹرویو کے لیے کال آئی تو وہ بے انتہا خوش ہوا۔ سب سے پہلے اُس نے حسین کو فون کیا اور اِس بارے میں بتایا، اُس نے دل بھر کر اُسے دعائیں دیں اور بہت ساری نصیحتوں کے بعد پورے اعتماد سے انٹرویو دینے کی تلقین کی۔

اگلی صبح وہ اُٹھا تو انٹرویو میں اچھا دکھنے کے لئے، الماری کھول کر کچھ پہننے کو تلاشنے لگا۔ لیکن الماری میں چند جرسیوں اور جینز، یا کچھ پرانی شرٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اُسکا دل دکھا، جو کپڑے اُسکے پاس تھے، وہ کسی طور اتنی بڑی فرم میں پہن کر جانے کے لائق نہ تھے۔ اِس وقت اُسکے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ جا کر فوری طور پر کوئی پر تکلف سا لباس خرید سکتا، جبکہ ایچ آر کی جانب سے فراہم کردہ معلومات میں واضح لکھا تھا کہ فارمل لباس پہن کر آنا ہے۔ اُس پر عجیب مایوسی کی سی کیفیت طاری ہونے ہی لگی تھی کہ اُسکے کوارٹر کا دروازہ بجا، وقت دیکھا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اُس نے انٹرویو دینے کے لئے جامعہ کی چھٹّی کی تھی۔

''اِس وقت کون آ گیا؟'' اُس نے سوچا، اگر ماموں بلا رہے ہوں گے تو وہ کسی صورت نہیں جائے گا۔ وہ ایسے ہی اُسے وقت بے وقت کسی نہ کسی کام کے لیے بلا لیتے تھے۔ اُس نے کوارٹر کا دروازہ کھولا تو سامنے چوکیدار کھڑا تھا، اُسکے ہاتھوں میں ایک گتّے کا ڈبہ تھا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ پارسل آیا ہے آپکے لیے۔۔۔'' چوکیدار نے ڈبہ اُسکی جانب بڑھا دیا۔

''میرے لیے؟'' اُس نے حیران ہوتے ڈبہ تھاما۔ چوکیدار لاعلمی سے کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔ رضا ڈبہ لیکر حیران سا اندر آیا اور اُس پر لگا ٹیپ اُتار کر اُسے کھولا۔ اندر موجود سامان دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ تین عدد پیک کی ہوئی شرٹ ساتھ میں تین عدد پینٹ، ایک پیک شدہ جوتے کا ڈبہ اور سامان کے نیچے رکھا ایک عدد لفافہ۔ وہ ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ بھلا کون اس وقت فرشتہ بن کر آیا تھا؟ اُس نے جلدی سے لفافہ اُٹھا کر کھولا۔

''جانتا ہوں کہ تم یہ تحفہ دیکھنے کے بعد مجھے ٹھیک ٹھاک گالیوں سے نوازو گے۔ لیکن پہلے انٹرویو ضروری ہے، اِس لیے گالیاں انٹرویو کے بعد گھر آ کر دے لینا۔''

تمہارا ڈھیٹ دوست

حسین مرتضیٰ

پی.ایس: رائل کلرز تم پر اچھے لگتے ہیں۔

وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں میں وہ رقعہ تھامے ساکت اور جامد بیٹھا رہا۔ پہلی بار کسی کا خیال رکھنا، اُسے خود ترسی یا احسان مندی کی کیفیت میں نہیں لے گیا تھا۔ پہلی بار کسی کے دیئے گئے سامان نے اُسکی عزت نفس اور اُسکی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اُس نے نم آنکھوں سے شرٹوں کو دیکھا، نجانے اُسے کیسے معلوم ہوا کہ رضا کو اِسکی ضرورت ہو گی؟ اگر اندازہ بھی لگایا تو اتنا درست اندازہ؟ ایک شرٹ گہرے میرون رنگ کی تھی، دوسری شرٹ نیوی بلیو اور تیسری گہری جامنی۔ سب کے ساتھ تھوڑے ہلکے شیڈ کی پینٹیں تھیں، رنگوں کا امتزاج بہت ہی بہترین تھا۔ وہ تمام رائل کلرز تھے۔ رضا مسکرایا، اُسے پہلی بار کسی نے تحفہ بھیجا تھا، اور بھیجنے والے نے محبت اور خلوص کا سمندر بہا دیا تھا۔ اُسکی دھونس بھری محبت پر رضا کو پیار آیا۔

عجیب انسان تھا حسین۔۔۔

خیال رکھتا تھا اور جتاتا بھی نہیں تھا۔۔۔۔

احساس کرتا تھا، پر محسوس بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔۔۔۔

ہنساتا تھا، پر آنکھوں میں نمی لے آتا تھا۔۔۔۔

پتہ نہیں کس مٹّی سے بنا تھا؟

--------+---------+----------

نو بجے کے قریب رضا کمپنی پہنچا اور اپنے بارے میں مطلع کر کے انتظار گاہ میں آ بیٹھا۔ اگر اُسے ذرا دنیا کی پرواہ ہوتی، یا وہ ذرا آس پاس نظریں ہی ڈال لیتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ سانولی رنگت اور کھڑے نین نقش والے اُس پرکشش نوجوان کو کتنی ہی آنکھوں نے ستائش سے دیکھا تھا۔ بہت سوں نے تو پہلی کے بعد دوسری اور تیسری نظر بھی اُس پر ڈالی تھی۔ وہ ہر نگاہ کا مرکز تھا پر ارد گرد سے عادتاً بے نیاز بھی۔۔۔

انتظار گاہ میں پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھے وہ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اسی لمحے وہاں ایک عجیب سی ہل چل مچی، آس پاس کام کرتے ملازمین اپنی جگہ سے کھڑے ہونے لگے اور مینیجر نے بھاگ کر آفس کا بڑا دروازہ کھولا۔ یقیناً کوئی بڑی شخصیت آ رہی تھی۔

بلیک سوٹ میں کروفر کے ساتھ چلتے، تنی گردن کے ساتھ سیدھا اپنے آفس کی جانب بڑھتے وہ اور کوئی نہیں، بلکہ واصف الٰہی تھے۔ اُنکے پیچھے ملازمین انکا بیگ اور سامان اُٹھائے آرہے تھے۔ نہیں! رضا کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ اُسکا باپ ہی تھا، جسے شاید اُسکی یہاں موجودگی کا علم بھی نہ ہو۔

اُسے بالکل توقع نہیں تھی کہ سترہ سال بعد اُسے، اِس فرم میں اپنا باپ نظر آسکتا ہے۔ اُنکے انداز سے تو لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اور اچھے عہدے پر ہیں۔ اُسکی نظروں کے سامنے سے ہی وہ بے نیازی سے چلتے اپنے آفس کے دروازے کے پیچھے گم ہوگئے۔ وہی بے نیازی جو رضا نے اُن سے ورثے میں پائی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھتا، رضا یکدم ہی کھڑا ہوا، آس پاس لوگوں نے اُسے مڑ کر حیرت سے دیکھا، پر خود کو بمشکل گھسیٹتا وہ ریسیپشن تک آیا۔

''جی کہیے؟'' ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی جو کب سے اُسے پُر ستائش نظروں سے دیکھے جارہی تھی، اُسکے وہاں آنے پر خود کو سیدھا کرتی خوش اخلاقی سے بولی۔

''ي۔۔۔یہ۔۔۔یہ کون تھے۔'' اُس نے بمشکل واصف صاحب کے آفس کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔

''واصف الٰہی! ہماری کمپنی کے چیف فائنانس آفیسر۔'' اُس نے خوشی خوشی بتایا۔

''پر۔۔۔میں نے تو سنا تھا کہ۔۔۔یہ کینیڈا میں تھے۔'' اُس نے ذرا سنبھل سنبھل کر کہا۔

''کینیڈا میں تو وہ آج سے پندرہ سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ پندرہ سال سے واصف صاحب کمپنی کے اِس خطے میں سی ایف او ہیں۔ اور پاکستان میں ہی ہیں۔'' وہ پہلے ہی رضا کی شخصیت سے مرعوب تھی، بنا کچھ سوچے سمجھے ہی اُسے سب بتانے لگ گئی۔ اور رہا رضا۔۔۔ تو اُسکے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے مفلوج ہوچکی تھیں۔

پندرہ سال۔۔۔پندرہ سال وہ اِس دھوکے میں زندگی گزارتا رہا کہ اسکا باپ اُس سے سات سمندر دور ہے۔ پندرہ سال وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا رہا کہ شاید اُسکا باپ اُسے دیارِ غیر میں بلا نہیں سکتا۔ جبکہ وہ تو یہیں تھے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے وہ اسی ملک، اسی شہر میں تھے۔ لیکن اپنی سگی اولاد سے بے خبر۔۔۔ تو کیا وہ اتنا غیر اہم تھا؟ کیا اُنکا ایک بار بھی دل نہیں چاہا کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ ہی لیں؟

اُسے نہیں معلوم وہ کمپنی کی بلڈنگ سے کب نکلا؟ اُسکے وہاں سے بنا انٹرویو دیئے آجانے سے اُسکا کیا تاثر گیا؟ اُسے کسی بات کی نہ کوئی فکر تھی نہ ہی کوئی خبر۔۔۔ جب دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو اُس نے خود کو اپنے گھر میں، ماموں کے کمرے کے سامنے کھڑا پایا، وہ یقیناً اندر تھے۔ اُس نے نہ کوئی دستک دی نہ اجازت لی۔ دروازہ دھاڑ سے کھولا اور اندر چلا آیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ محو گفتگو ماموں نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''ابّو کا ایڈریس (پتہ) اور انکا نمبر چاہیے مجھے۔ فوراً!'' اُس نے درخواست نہیں کی تھی، حکم دیا تھا۔

''کیا؟ کیا کہا؟ دوبارہ کہنا ذرا!'' اُنہوں نے اداکاری کی تھی۔

''ابّو پچھلے پندرہ سالوں سے پاکستان میں ہیں، کراچی میں ہیں۔ اور آپ یقیناً اُنکا ایڈریس جانتے ہیں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت، اُنکا نمبر اور پتہ چاہیے۔'' اُس نے ضبط سے کہا۔ قریب بیٹھا اُسکا کزن اُسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُسکی نظریں رضا کو مذاق اڑاتی محسوس ہوئی تھیں۔

''اور میں ایسا کیوں کروں؟'' ماموں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اُسے دیکھا۔ رضا کو وہ دونوں اس وقت شدید زہر لگ رہے تھے۔

''میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں ماموں!'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''اچھا چلو! میں تمہیں اُنکا نمبر اور پتہ دے دیتا ہوں، ٹھیک! لیکن تم وہ لیکر کیا کرو گے؟ اُنکے پاس جا کر، اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیگ مانگو گے؟'' اِس بات پر پاس بیٹھا اُنکا بیٹا ہنسا تھا۔ رضا کی کان کی لوئیں تک لال ہو گئی تھیں۔ اُس نے ضبط کیا، پھر میز پر دونوں ہتھیلیاں جماتے ہوئے اُنکی جانب جھکا۔

''ہمیشہ آپ بھیگ مانگتے آئے ہیں، آج میں مانگ لوں گا تو کیا ہوا؟'' اُس نے اُن سے بھی زیادہ استہزائیہ انداز میں کہا تو دونوں باپ بیٹے کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

''حد میں رہو اپنی۔۔۔'' اُنہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''آخری دفعہ۔۔۔۔ صرف آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ مجھے انکا ایڈریس چاہیے۔''

''ذلیل ہونے کا شوق ہے تمہیں؟ تمہارا باپ تمہیں نہ تو گلے لگائے گا اور نہ ہی تمہیں دیکھ کر اُسکا دل بھر آئے گا۔'' وہ جیسے اُسے کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔

''میرے اور میرے باپ کے بیچ یہ فاصلے پیدا کرنے والے آپ ہی ہیں۔ پہلی بار جب اُنہوں نے مجھے فون کیا تھا، تو میں نے بات کرنے سے انکار کیا تھا۔ پر اُس کے بعد سے، میرے علم میں لائے بغیر ہی آپ نے انہیں، میری طرف سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے انکے دل میں میرے لیے، اور میرے دل میں انکے لیے نفرت ڈالی ہے۔ پر آج میں آپکا کوئی حربہ کام نہیں آنے دوں گا۔'' وہ ہنسے۔۔۔ دل کھول کر ہنسے۔ اور رضا کو یہ ہنسی اپنے دل کے آر پار محسوس ہوئی۔

''کن احمقوں کی جنت میں رہتے ہو تم؟ اتنی خوش فہمی؟ پہلی بار بھی اُس نے یہ جاننے کے لیے فون کیا تھا کہ کہیں اُسکی ماں، یعنی تمہاری دادی نے مرنے سے پہلے تمہیں اپنی کچھ چیزیں، کچھ زیورات وغیرہ چھپا کر دے تو نہیں دیئے؟ جیسے کہ یہ گھر اُنہوں نے اپنی بہو کے نام کر دیا تھا۔ تم اِس خوش فہمی سے نکل آؤ کہ تمہارے باپ کو تمہاری یاد ستا رہی تھی۔'' اُنہوں نے اُسکی ذات کے بخیے اُدھیڑ دیئے تھے۔ رضا کی برداشت یہاں ختم ہو گئی۔ اُسے بہت اچھے سے یقین

تھا کہ اُسکے ماموں، اُسکے باپ اور اُسکے درمیان غلط فہمیاں ڈالنے کے لیے یہ کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ جو پیسے وہ رضا کے باپ سے بٹورتے ہیں اُسکا سلسلہ رکے۔ وہ ہر صورت رضا کو اُن سے ملنے سے باز رکھیں گے۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ واقعی احمقوں کی جنت میں رہتا تھا!

اگلے ہی لمحے رضا نے پاس رکھا شو پیس اٹھایا اور برابر میں بیٹھے اپنے کزن کے سر پر دے مارا۔

''رضا!'' ماموں ہڑبڑا کر اٹھے۔ رضا اُن کے بیٹے کا سر پھاڑنے کے بعد رکا نہیں، بلکہ گریبان سے پکڑ کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔

''رضا چھوڑو اُسے۔۔۔'' ماموں اُسے بیچ میں چھڑوانے آئے پر اُس نے اُنہیں دھکا دے دیا۔

''مجھے جو چاہیے وہ دے دیں، ورنہ آج اسکا حشر کر دوں گا۔'' اُس نے ماموں کے بیٹے کو گردن سے پکڑ کر اُسکا چہرہ میز پر لگایا اور اُن سے دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے۔۔۔ میں دے رہا ہوں۔'' اُنہوں نے جلدی سے ڈائری کھولی اور ایک صفحے پر لکھا ایڈریس اور نمبر پھاڑ کر اُسکے حوالے کیا۔ رضا نے کاغذ لیکر اُنکے بیٹے کو جھٹکے سے چھوڑا، وہ بیچارہ ادھ موا ہو چکا تھا۔ اُسکے بعد وہ کسی کو بھی دیکھے بنا ہی باہر نکل گیا۔

''میرا بیٹا!'' ماموں نے اپنے بیٹے کو سہارا دے کر اُٹھایا۔

''میں اسکا بدلہ ضرور لوں گا رضا!'' اُنہوں نے اپنے بیٹے کے ماتھے سے خون صاف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

---------+---------+--------

وہ گھر نہیں تھا۔۔۔ محل تھا۔ وہ محل جس میں اُسکا باپ پچھلے پندرہ سالوں سے مقیم تھا۔ اور اُسکا ولی عہد پچھلے سترہ سالوں سے ایک دڑبے جیسے کوارٹر میں زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے اپنے ابّو کو فون نہیں کیا تھا، بلکہ سیدھا اُنکے پتے پر پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فون پر اُسکی آواز سن کر وہ شاید فون کاٹ دیں کہ ماموں نے اُن دونوں باپ بیٹوں کے درمیان بہت بڑی دیوار کھڑی کر دی تھی، اور اِس میں غلطی رضا کی بھی تھی کہ اگر شروع میں ہی وہ اپنے باپ سے ملنے کی ضد کر لیتا، تو آج ایسی زندگی نہ گزارنی پڑتی۔ وہ اُن ملنے سیدھا گھر آیا تھا، یقین تھا کہ وہ دروازے سے تو اُسے واپس نہیں لوٹائیں گے۔ وہ واقعی خوش فہم تھا!

اُس نے اُنکے گھر کے باہر بیٹھ کر سارا دن انتظار کیا، جانتا تھا کہ وہ آفس میں ہیں۔ شام کے تقریباً پانچ بجے اُسے ایک گاڑی گھر میں داخل ہوتی نظر آئی، جس میں پیچھے اُسکا باپ بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر گاڑی تک جانا چاہتا تھا، پر راستے میں آنے والی دو اور گاڑیوں کی وجہ سے اُسے رکنا پڑا اور اتنی دیر میں واصف صاحب اندر چلے گئے۔ رضا سڑک پار کر کے دروازے تک آیا۔

''ابّو!۔۔۔'' نجانے کیا سوچ کر اُس نے دروازے کے باہر سے ہی آواز دی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے لڑکے ؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''اُسکی اِس حرکت پر چوکیدار اُسے ڈانٹتا ہوا اُسکے پاس آیا۔

''کیا کر رہے ہو یہ ؟''اُس نے رضا کو غصّے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں واصف صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''واصف صاحب ہر کسی سے نہیں ملتے۔''

''مگر وہ مجھ سے ملیں گے۔''اس نے کہا۔وہ واقعی خوش فہم تھا!۔۔۔احمقوں کی جنت میں رہتا تھا!

''کیوں ؟تم اُنکے باس لگتے ہو ؟''

''میں انکا بیٹا ہوں۔رضاالٰہی۔۔۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں !اور میں انکا دادا ہوں۔''چوکیدار نے مذاق اڑایا۔''چلو جاؤ یہاں سے۔۔۔پتہ نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں ؟''اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ رضا نے کافی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جیب سے ایک پرچی نکالی۔

''میں اُنکا بیٹا ہوں،اور جب انہیں معلوم ہو گا کہ تم نے اُنکے بیٹے کو دروازے پر کھڑا رکھا ہے،تو تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو گا؟''وہ کہتے ہوئے اُس پرچی پر لکھے نمبر کو فون میں لکھنے لگا۔ وہ خوش فہم تھا!۔۔۔حد سے زیادہ خوش فہم !

''تم جو بھی ہو،میں انکی اجازت کے بنا کسی کو اندر آنے نہیں دے سکتا۔''اب کہ چوکیدار تھوڑا مذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔رضا نے فقط سر ہلاتے ہوئے واصف صاحب کو فون ملا دیا۔بیل جاتی رہی،اُسکا دل دھڑکتا رہا۔اور پھر فون اُٹھا لیا گیا۔

''ہیلو !کون ؟''سترہ سال بعد بھی وہ اِس آواز کو پہچان گیا تھا۔

''اب۔۔۔ابّ۔۔۔''الفاظ اُسکے گلے میں اٹکنے لگے۔''ابّو !''اور پھر ادا ہو گئے۔

''کون بات کر رہا ہے ؟''اور سترہ سال بعد وہ اسکی آواز نہیں پہچان سکے۔

''ابّو !میں۔۔۔رضا۔۔۔''اپنی پہچان کروانی چاہی،آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔چوکیدار تھوڑا مشکوک ہونے لگا۔

''رضا؟''وہ حیران ہوئے تھے یقیناً!

''میرا نمبر کہاں سے آیا تمہارے پاس؟''اُنکی آواز میں سختی تھی۔اُس کی ساری خوش فہمی ہوا ہونے لگی۔

''ابّو! میں ملنا چاہتا ہوں آپ سے۔۔۔آپ کے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔''ایک اور امید۔۔۔ایک اور آس۔۔۔۔شاید وہ اندر بلا لیں گے۔

''تم باہر کھڑے ہو؟''وہ جیسے مزید حیران ہوئے تھے۔

''ذرا ایک منٹ رکو!''اُنہوں نے کہا اور فون کاٹا،رضا کو ایک پل کی خوشی ملی،اُسکا باپ اُسکے لیے آرہا تھا۔

''آرہے ہیں وہ۔۔۔''اُس نے نم آنکھوں اور خوشی بھرے لہجے سے چوکیدار کو بتایا کم اور جتایا زیادہ۔وہ اب بھی مشکوک سا کھڑا تھا۔اسی لمحے۔۔۔۔بالکل اُسی لمحے،دروازے کے پاس بنے اسپیکر میں سے آواز اُبھری۔

''اجمل خان!''یہ اُسکے باپ کی آواز تھی۔

''جی سر!''چوکیدار گڑبڑایا،اُسے رضا کی باتوں کی صداقت پر بھروسہ نہیں تھا۔پر اب وہ ڈر گیا۔

''دروازے پر کوئی لڑکا کھڑا ہے کیا؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''کوئی لڑکا؟''رضا کی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

''ہاں سر!آپکا بیٹا۔۔۔''چوکیدار جلدی سے بتانے لگا ہی تھا کہ۔۔۔

''فار گاڈ سیک!تمہیں کس نے کہہ دیا کہ وہ میرا بیٹا ہے؟''اُنکی جھنجھلائی ہوئی آواز اُبھری اور رضا کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا۔

''اُس لڑکے نے کہا کہ۔۔۔''چوکیدار وضاحت دینے لگا۔

''تمہیں کوئی کچھ بھی کہے گا اور تم مان لوگے؟''اُنہوں نے ڈانٹا۔

''وہ لڑکا میرے رشتے دار کا بیٹا ہے۔پیسے ویسے مانگنے آیا ہوگا،تمہارے پاس ابھی کچھ نقد رقم ہے تو اُسے دے کر چلتا کرو۔مجھ سے بعد میں لے لینا۔''رضا کے پاس اختیار نہ تھا،ورنہ وہ اِس لمحے خود کو سماعتوں سے محروم کر لیتا۔اپنی یداشت گم کر لیتا۔پر جو ابھی ہوا،اُسے سنتا نہ کبھی یاد رکھتا۔۔

''جی سر!ٹھیک ہے۔''چوکیدار نے کہا اور رضا کی جانب متوجہ ہوا۔اُسکی نظروں نے رضا کو زمین میں گاڑ دیا تھا۔وہ بیزاری سے جیب میں ہاتھ ڈالتے کچھ نوٹ نکالنے لگا۔

''یہ پکڑو!اور دوبارہ مت آنا تنگ کرنے۔''اُس نے پیسے اُس کو دیئے نہیں تھے۔اُسکے منہ پر پھینکے تھے۔جیسے روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اُنکے در پر بھیک مانگنے آتا ہو۔

''اب چلو! جاؤ یہاں سے۔۔۔۔'' وہ ساکت نظروں سے زمین پر بکھرے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ ذلت کے کئی رنگ دیکھے تھے پر یہ نیا تھا۔ نفرت کے کئی روپ دیکھے تھے پر یہ سب سے برا تھا۔ وہ پتھرائی آنکھوں، اور ساکت ہوتے جذبات کے ساتھ خود کو گھسیٹتا واپس مڑا۔

''اوہ ہیرو! پیسے تو لیتے جاؤ۔ یہ کم ہیں کیا؟'' پیچھے سے چوکیدار کی استہزاء کرتی آواز آرہی تھی پر وہ خود کو گھسیٹتا ہوا چلتا رہا۔

''نخرے دیکھو انکے۔۔۔'' وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ پر رضا کا نہیں۔ وہ خوش فہم تھا تو اسکی خوش فہمی آج ہزاروں ٹکڑوں میں ختم ہوئی تھی۔ خود وہ ٹوٹا تھا، ریزہ ریزہ ہوا تھا، ذرہ ذرہ بکھرا تھا۔ اپنے بکھرے وجود کے ساتھ وہ جہاں سے گزرتا اسے لگتا لوگ اُسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ کتنی اُمید سے گیا تھا اپنے باپ کے پاس؟

''یقیناً! ابّو کے پاس اُنکی بیوی بیٹھی ہونگی۔ اُنکی وجہ سے اُنہوں نے ایسا کہا ہوگا۔ وہ مجبور ہوں گے۔ اور وہ مجھ سے اکیلے ملنے آئیں گے۔'' وہ خود کو پھر کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ پر اس بار اُسے ایسا لگا، جیسے پوری دنیا اُسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی ہے، اُسکا مذاق اڑا رہی ہے۔ اُس پر ہنس رہی ہیں۔ ہر نظر تمسخر اُڑاتی، ہر آواز دل جلاتی محسوس ہو رہی تھی۔

تم وہ لیکر کیا کروگے؟ اُنکے پاس جاکر، اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیگ مانگوگے؟

اُسکے ماموں نے اگر اُسے بھکاری سمجھا تھا تو باپ نے اُسے واقعی بھکاری بنا دیا تھا۔

وہ محبت کا بھوکا تھا۔ وہ محبت لینے ہی تو گیا تھا۔ پر ہر شخص اُسے رسوا کیوں کر دیتا تھا؟

آج پھر اُسے ماں یاد آئی تھی۔

اِس سے زیادہ ذلت اور کیا ہوگی کہ صبح جس گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ باپ کے پاس جارہا ہوں، واپس اُسی گھر آنا پڑا۔ سر جھکائے، خاموشی کے ساتھ۔ لیکن آنے والا وقت اُس سے بھی کڑا تھا۔

گھر پہنچا تو ماموں اور ماموں کا بیٹا دروازے پر ہی کھڑے تھے، وہ حیران ہوا۔ اُنکی وہاں موجودگی پر نہیں! بلکہ ساتھ کھڑے پولیس والوں کو دیکھ کر۔

''یہی ہے انسپکٹر صاحب! اسی نے میرے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ گرفتار کرلیں اسے۔'' ماموں نے اُسے دیکھتے ہی اُسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، پولیس والوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا، جیسے وہ کوئی بہت ہی بدنام زمانہ مجرم ہو۔

''مم۔۔۔ میں نے۔۔۔۔ کچھ نہیں کیا۔'' ساری دنیا سے بے نیاز رہنے والے، اور ہر بات سوچ سمجھ کر کرنے والے رضا کی آواز، زندگی میں پہلی بار آنے والے وقت کے خوف سے کانپی تھی۔ محلّے والے بڑے ذوق و شوق سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

پولیس والے آگے بڑھے اور اُسکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی۔

''ماموں! ماموں! انہیں روکیں۔۔۔۔میں معافی مانگتا ہوں آپ سے۔۔۔۔۔''وہ ذلت اور رُسوائی کی آخری سیڑھی تھی۔وہ بدنامی نہیں چاہتا تھا،اُسکی ایک زندگی تھی،بے شک جیسی بھی تھی لیکن صاف ستھری تھی۔وہ جانتا تھا کہ اُسکا کوئی نہیں ہے،کوئی نہیں ہے جو اُسے بچائے گا۔اپنی عزت نفس کو کچل کر اُس نے معافی مانگنا بہتر سمجھا۔لیکن آج تک کس نے اُسکی سنی تھی؟پولیس والے اُسے وین میں ڈالنے لگے تو اسکی برداشت کی حد ہو گئی۔

''چھوڑو مجھے! گرفتار کرنا ہے تو انہیں کرو۔۔۔ان فرعونوں کو کرو۔۔۔میرے حق پر غاصب بن کر بیٹھے ہیں یہ لوگ۔۔۔یہ میرا گھر ہے۔۔۔میری ماں کا گھر ہے۔۔۔۔اِس پر قبضہ کر کے بیٹھے ہیں یہ۔۔۔۔''وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔پولیس والے اُسے زبردستی وین میں ڈال کر وہاں سے لے گئے۔۔۔پر اُسکی آسمان گرا دینے والی،عرش کو ہلا دینے والی آواز پورے محلّے نے سنی،اب ہر شخص مشکوک نظروں سے اُسکے ماموں کو دیکھ رہا تھا۔اُنہوں نے گھر کے اندر واپس جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

--------+---------+----------

''کھولو دروازہ۔۔۔۔میں نے کچھ نہیں کیا۔وہ لوگ جھوٹے ہیں۔۔۔غاضب ہیں۔۔۔۔میں نہیں۔۔۔''لاک اپ کی سلاخوں کو تھامے وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔اور پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ یہی کر رہا تھا۔

''چپ کر جاؤ ئے!دماغ خراب کر کے رکھا ہے کب سے۔''میز پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے،پولیس والے نے تنگ کر کہا۔

''نہیں ہوتا میں چپ!۔۔۔مجھے نکالو یہاں سے۔۔۔اُس نے میرے گھر پر۔۔۔میرے حصے پر قبضہ کیا ہے۔۔۔نکالو مجھے۔۔۔''چیخ چیخ کر اُسکا گلا بیٹھ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے؟''اُسکی چیخنے کی آواز سن کر بلآخر سب انسپکٹر وہاں آ گیا۔

''سر!اِس لڑکے نے تنگ کر کے رکھا ہوا۔''اُسے دیکھ کر کانسٹیبل سیدھا ہوا تھا۔

''ذرا اِسکا منہ بند کرواؤ!نہیں چپ ہوتا تو زبردستی چپ کرواؤ۔پر مجھ تک اِسکی آواز نہیں آنی چاہیے۔''وہ حکم دیتا واپس چلا گیا۔اُسکے بعد اُس کانسٹیبل سمیت مزید تین پولیس والے اُسکی جیل کی طرف بڑھے،انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر رضا کا دل لرزہ ضرور تھا۔لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔لاک اپ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے،آس پاس قید دیگر قیدیوں نے اٹھ کر اُسکی طرف دیکھا۔کچھ خوف سے،کچھ فکرمندی سے۔پولیس والوں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔

''بہت غصّہ چڑھا ہے نا تیرے دماغ میں۔۔۔۔ابھی نکالتے ہیں۔رک ذرا!''اُسکے بعد وہ چاروں اُس پر پل پڑے۔اُسے اپنے جوتوں سے، گھونسوں سے اور ڈنڈوں سے اِس قدر مارا کہ وہ زمین بوس ہو گیا۔وہ چار تھے اور وہ اکیلا، انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔وہ اُسے مارتے رہے مارتے رہے، یہاں تک کہ جب مار مار کر تھک گئے تب اُسے چھوڑا۔رضا جیل کے ٹھنڈے فرش پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔

''عزت راس نہیں آرہی تھی نہ تیرے کو؟''کانسٹیبل نے جوتے سمیت اُسکے منہ پر پاؤں رکھا، پر اُس لمحے رضا کی ساری عزت نفس، انا اور سارا وقار پارہ پارہ ہو چکا تھا۔وہ کچھ محسوس کرنے کے لائق نہیں رہا تھا، اپنے دل میں کوئی جذبات محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

''اب پڑا رہ تُو یہاں!''اُس نے جوتے سے اُسکا چہرہ مسلا اور اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔

فرش پر بے سدھ پڑا رضا نجانے کتنی دیر اسی حالت میں رہا؟ بہت دیر بعد کچھ ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو ہر شے دھندلی سی نظر آئی۔کوئی آیا تھا لاک اپ میں۔۔۔نجانے کون تھا؟اُس نے آنکھیں جھپکانی چاہیں۔منظر سمجھ آیا پر چہرہ واضع نہ ہوا۔آنے والا وجود اُسکے پاس پنجوں کے بل بیٹھا۔اُسکے سر پر ہاتھ رکھا، نرمی سے، پیار سے، محبت سے۔۔۔۔ پھر اُسکے بال سہلائے۔اب کہ اُس نے پوری آنکھیں وا کر کے آنے والے کو دیکھا۔

''امی!''اُسکے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

''میری پیاری امی!''اُس نے پھر کہا، آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر بہا۔

''اُٹھ جاؤ رضا! صبح ہو گئی ہے۔اسکول نہیں جانا؟''ماں پیار سے بال سہلاتی اُٹھا رہی تھیں۔پر آج وہ اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔وہ ایسے ہی لیٹے رہنا چاہتا تھا، اُن سے لاڈ کروانا چاہتا تھا۔

''امی!''اُس نے دوبارہ کہا۔پر ماں کا ہیولا غائب ہونے لگا، جگہ جگہ سے مٹنے لگا۔رضا نے نقاہت زدہ ہاتھ اٹھایا تاکہ وہ اس ہیولے کو فنا ہونے سے روک سکے پر اُسکا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا اور ماں کا وجود پانی ہو گیا۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

''اُٹھ جا اوئے! تجھے کوئی لینے آیا ہے۔''کسی نے پانی کی ٹھنڈی بالٹی اُس پر الٹی تھی تاکہ وہ اٹھ جائے۔اور وہ واقعی ہوش میں آگیا، سارا جسم درد کر رہا تھا۔اُٹھ کر بیٹھا تو بالوں سے ٹپکتے پانی نے چہرہ بھی بھگو دیا۔

''اُٹھ کر باہر آجا۔تُو واپس جا رہا ہے۔''پولیس والا اطلاع دیکر چلا گیا۔اور جیل کے ٹھنڈے فرش پر، اپنے گیلے کپڑوں اور کرچی کرچی وجود کے ساتھ بیٹھے رضا نے شدت سے اپنی ماں کے پاس لوٹ جانے کی دعائیں مانگی تھیں۔

پولیس والے اُسے زبردستی اُٹھا کر سہارا دیکر باہر لائے۔ باہر ماموں اور ساتھ محلے کے ایک دو بزرگ کھڑے تھے۔ ماموں اُسے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھے، اور جلدی سے اُسے سہارا دیا۔

''تم لوگوں نے مارا ہے اسے ؟ کیوں ؟ ہاتھ کیسے لگایا اسے ؟'' وہ چیخے تھے۔ رضا خاموش رہا۔

''دیکھا! نہیں آیا نہ تمہارا باپ تمہیں بچانے کے لئے ؟'' اُنہوں نے رضا کو کہا، لیکن انداز ایسا تھا جیسے ڈانٹ رہے ہوں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''ارے میں نے تمہیں اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ ٹھیک ہے ! بیٹے کا خون دیکھ کر اور بیوی کا رونا سن کر تم پر غصّہ آ گیا تھا، پر تمہیں یہاں بھیج کر میں بھی سکون سے نہیں رہ سکا۔ اپنے بیٹے اور بیوی سے ناراضگی مول کر یہاں آیا ہوں تمہیں چھڑانے۔ آخر تم بھی تو میرے بیٹے ہو۔'' وہ اُسکا چہرہ تھامے جذباتی لہجے میں بولے، رضا نے ٹوٹی نگاہیں اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہترین اداکار تھے۔ داد کے مستحق۔۔۔۔

محلے والوں کی نظر میں وہ تھوڑے اونچے ہو گئے، رضا کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ اُسے لیے گھر آئے تو وہ خاموشی سے اپنے کوارٹر آ گیا۔ راستے بھر اُسکے محلّے کے بزرگ اُسے سمجھاتے رہے، دوسرے لفظوں میں اُسکے ماموں کی عظمت کے قصیدے اُسے سناتے رہے۔ اور اُسے اُنکا فرمانبردار، اطاعت گزار رہنے کی تلقین کرتے رہے کہ انکی نظر میں اُسکے ماموں سے اچھا کوئی انسان ہی نہ تھا۔

کوارٹر میں آیا تو ٹوٹے پھوٹے سے آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ حسین کے بھیجے گئے کپڑے اب بھی اُسکے وجود کا حصہ تھے، پر اب انکا حال برا ہو چکا تھا۔ اُس نے خاموشی سے جا کر کپڑے بدلے۔ ماموں نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ جو کہ ملازم اُسکے بستر پر رکھ کر چلا گیا تھا۔ وہ پہلے چپ چاپ ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال تو آنسو کا ایک قطرہ آنکھوں سے بہہ نکلا۔

دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال نی

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

اُس نے خاموشی سے بیٹھ کر ذلت کی روٹی کھائی۔ اُسی لمحے کوارٹر کا دروازہ کھلا۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو ماموں کھڑے تھے۔

''آج اپنی اوقات اچھے سے سمجھ آ گئی ہو گی تمہیں ؟ اسی گھر میں تمہارے لیے پناہ ہے اور یہیں تم نے مرنا ہے۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو بچانے نہیں آؤں گا۔ پڑے سڑتے رہنا وہیں۔'' وہ اندر بھی نہیں آئے کہ اِس قید خانے میں قدم رکھنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ دروازے سے ہی اُسے اُسکی اوقات یاد دلا کر وہ چلے گئے۔ مزید نوالے حلق سے نیچے نہ اُترے تو کھانا وہیں چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا، جس محلے میں اُسکی تھوڑی بہت عزت تھی، آج وہ وہاں بھی ذلیل ہو گیا تھا۔

تھک کر پاس رکھی بینچ پر آ بیٹھا۔ تنہائی میں بیٹھے دن بھر کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ماموں کی بے حسی، باپ کی نفرت، چوکیدار کا منہ پر پیسے مارنا، پولیس والوں کا تشدد۔۔۔ دن بھر کا غبار باہر نکلنے لگا۔ وہ سسکا، پھر رویا اور بلآخر آنسوؤں کو راستہ مل گیا۔ وہ روتا رہا۔۔۔ روتا رہا۔۔۔

پھر کوئی آیا۔۔۔ کوئی رحم دل شخص۔۔۔ کوئی مہربان دوست۔۔۔

وہ عمر تھا، نجانے اُس نے رضا کو وہاں کیسے ڈھونڈا؟ پر اُس نے ایک لفظ پوچھا نہ کوئی سوال کیا۔ اُسے اپنے ساتھ لگائے، اُسے تسلی دیتا رہا، اُسکا سر سہلاتا تھا۔ اور رضا کو اسی شے کی ضرورت تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بنا، بے آواز روتا رہا۔

یہ پہلی بار تھا جب کسی نے اُسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ کچھ بھی پوچھے بغیر، کچھ بھی جانے بغیر۔۔۔

عمر حفیظ نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

--------+---------+----------

رمضان کا پہلا روزہ اور دوسری سحری والی رات:

''میں تو تمہارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتے لیتے ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ کر رکھی ہے تم نے۔'' وہ کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اپارٹمنٹ واقعی خوبصورت تھا۔ جواباً رضا خاموشی سے پیالیوں میں کافی پھینٹنے لگا۔ بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔ اتنی کہ رضا کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ وہ اُسے ہی جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اب تمہیں کیا ہو گیا؟'' وہ کافی کی پیالیاں کاؤنٹر پر رکھ کر اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے کیوں کیا تھا ایسا؟'' اُسکا سوال وہی تھا، جس سے وہ نظریں چراتا رہا تھا۔

''کیا کیا میں نے؟'' انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ علی نہیں تھا رضا!'' حسین نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''وجہ صرف علی ہی تھا۔'' اُس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نہیں مانتا۔ تم نے اس روز جو بھی کیا تھا، اُسکی وجہ علی نہیں تھا۔ تم نے کچھ چھپایا تھا ہم سے۔'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ وہ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا؟'' اُسکے ماتھے پر بل پڑے۔

''نہیں! لیکن اُس جھگڑے کو ہوا تم نے دی تھی۔''اُس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تو تم دس سال پہلے کا حساب مانگنے آئے ہو مجھ سے؟''وہ تلخ ہوا۔

''نہیں! میں صرف جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ جاننا چاہتا ہوں میں بس!''

''کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ مجھے غصّہ آ گیا تھا۔''اُس نے وضاحت دینا چاہی۔

''تم نے جو الزامات علی پر لگائے تھے وہ بے وجہ نہیں تھے اور نہ غصّے کی وجہ سے تھے۔ تم نے اس روز جو کیا پورے ہوش و حواس میں جانتے بوجھتے کیا۔''

''اگر تمہیں اسی بارے میں بات کرنی ہے تو تم جا سکتے ہو۔''اُس نے بے مروتی سے کہا تھا۔

''میں یہاں آیا اپنی مرضی سے ہوں تو جاؤں گا بھی اپنی مرضی سے ہی۔''اُسکی ڈھٹائی کو داد دینے کا دل کیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''رضا نے تھک کر پوچھا تو جواباً وہ خاموش رہا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو رضا کو اپنی بدلحاظی کا احساس ہوا۔

''میں۔۔۔ میں بس۔۔۔ بات نہیں کرنا چاہتا اس موضوع پر۔''اب کے اُس نے آہستہ سے وضاحت دی۔ وہ اُسکا محسن تھا۔ وہ بھلا اُس سے اس طرح کیسے بات کر سکتا تھا؟

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا رضا! بہت ڈھونڈا تھا۔ ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی ذرا سی بھی اُمید تھی۔''حسین نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔ رضا کا دل دکھنے لگا، وہ اور اس انسان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ ذہن کے پردے پر وہ خوفناک یاد چلنے لگی۔

''رضا!۔۔۔۔''حسین نے اسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا، کوئی خوف سا اُسکی آنکھوں میں لہرایا تھا۔

''کیا وہ جیل والی بات اتنی بڑی تھی کہ تم نے دوستوں سے الگ ہونا ضروری سمجھا؟''حسین نے نرمی سے پوچھا۔

''میں ذلیل ہو گیا تھا حسین! میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔''اُس نے پہلی بار کھل کر کہا۔

''کیوں؟ تمہارا تو کوئی قصور نہ تھا۔'' حسین اُسے سمجھانا چاہتا تھا۔

''ہاں! پر مجھے اُس وقت ایسا ہی لگتا تھا کہ اگر کسی کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ میں تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ اِس لیے میں نے سب سے الگ ہونا شروع کر دیا۔ ہاں! میں بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ تم سب سے الگ ہونے کا۔ اور وہ بہانہ اُس جھگڑے کی صورت مل گیا۔ حسین! میں ساری دنیا سے الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ در حقیقت میں۔۔۔۔''وہ رکا۔

''کیا؟''

''میں۔۔۔میں مر جانا چاہتا تھا۔اکیلے کہیں کسی ایسے کونے میں جا کر، جہاں کسی کو میری لاش بھی نہ ملتی۔''اُس نے آہستہ سے کہا، حسین کا دل دکھنے لگا۔ جب یہ واقعہ ہوا تھا تو حسین وہ واحد شخص تھا، جسے رضا نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

اُس روز حسین نے اُسے فون کیا تا کہ اُسکے انٹرویو کے بارے میں اُس سے پوچھ سکے۔جواباً وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اُسے سب کہہ سنایا۔وہ دوڑا دوڑا اُسکے پاس آیا۔اُس روز رضا نے پہلی بار حسین کو غصّے میں دیکھا تھا۔اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُسکے ماموں کی دنیا تہہ و بالا کر دے۔پر رضا نے منع کر دیا تھا۔

''میں گھر سے باہر نکلتا تھا تو محلے والے عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے تھے،ماموں کے بچوں کی نظروں میں میرے لیے حقارت اور استہزاء ہوتا تھا۔مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔میں نے اِس لیے خود کو سب سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔''

''میں جانتا تھا رضا!اِس لیے میں نے کچھ روز تمہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔تم یونیورسٹی نہیں آتے تھے،ہم سے ملتے نہیں تھے۔میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ میں تمہیں اسپیس دے رہا تھا۔میں چاہتا تھا کہ تم کچھ وقت اکیلے رہو اور جب واپس آؤ تو سب بھول چکے ہو۔پر شاید میں نے غلط کیا۔مجھے تمہیں اکیلا نہیں رہنے دینا چاہیے تھا۔''حسین کو پچھتاوے گھیرنے لگے۔رضا نے اُس واقعے کے بعد خود کو سب سے بہت دور کر لیا تھا۔وہ شدید ڈپریشن کا شکار رہنے لگا تھا،راتوں کو اُسے نیند نہ آتی،پڑھائی میں دل نہ لگتا۔دوستوں کے بہت اصرار پر اُنکے ساتھ بیٹھ جاتا تو بھی دھیان کہیں اور رہتا۔اُن دنوں اُسکا دل کرتا تھا کہ بس خود کو ختم کر لے۔حسین بار بار اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا،اِس لیے اُسے کچھ وقت کے لیے اکیلا چھوڑ دیا،پر یہی اُسکی غلطی تھی۔اکیلے رہ رہ کر وہ اور پاگل ہونے لگا۔سوچیں اُسکا دماغ خراب کرنے لگیں،کوئی تھا ہی نہیں جو اُسے کسی تھیراپسٹ کے پاس لے جاتا،اُسکا علاج کرواتا۔وہ اور زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگا۔

''تمہاری غلطی نہیں ہے حسین!میں ہی غلط تھا۔میرے پاس دوست تھے،اللہ نے مجھے پر خلوص دوست دیئے تھے۔مجھے انہیں بتانا چاہیے تھا۔شاید اس طرح میرا دل تھوڑا ہلکا ہو جاتا۔پر جیل والے واقعے کے بعد سے مجھے لگنے لگا تھا جیسے۔۔۔جیسے کسی نے مجھے ساری دنیا کے سامنے برہنہ کر دیا ہو۔کوئی عزت نہیں رہی تھی میری،اور بس!سارا دن یہی سوچ سوچ کر میں اور زیادہ منفی ہو گیا۔اور اُس رات علی نے جو کچھ میرے بارے میں کہا وہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔''اُس نے کھل کر بتایا۔

''علی نے جو جھگڑے والی رات کہا تھا کیا تم نے وہ سن لیا تھا؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''یار رضا!۔۔۔تمہیں مجھے تو بتانا چاہیے تھا نا!میں کان سے پکڑ کر لاتا علی کو تمہارے پاس۔''پہلی بار حسین کو افسوس ہوا۔کاش!وہ پوچھ لیتا۔

''نہیں حسین! مسئلہ علی نہیں ہے۔اُس نے جو کہا، یہ حقیقت ہے کہ مجھے اُس پر بہت غصّہ آیا تھا۔ لیکن میں نے اُسی وقت اُس سے بدلا لے لیا تھا۔ میں نے جو الزامات اُس پر لگائے، وہ اُس سے کہیں زیادہ تھے جو اُس نے کہے۔ مجھے اُس سے معافی مانگنی چاہیے تھی پر میں آج تک نہیں مانگ سکا کیونکہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔اُس روز جب ایف آئی اے آفس میں وہ مجھ پر الزام لگا رہا تھا، میں نے نہ اُسے مارا، نہ گالیاں دیں نہ اُس پر چیخا۔ غصّہ آیا تھا پر میں باز رہا، صرف اسی لیے کہ کہیں نہ کہیں میں نے بھی اُسکا دل دکھایا ہے۔ لیکن میں اپنے دوستوں سے الگ اِس لیے ہوا، کیونکہ مجھے اپنا آپ ہی برا لگنے لگا تھا۔''اُس نے آج سب کہہ دیا۔

''اور جب اگلے دن میں تم سے ملنے آیا تو تم جا چکے تھے۔ تمہارے ماموں نے کہا کہ تم اپنے ابّو کے ساتھ گئے ہو۔ میں نے اس بات پر یقین نہیں کیا۔ پر تم اُس رات کے بعد مجھے کہیں نہیں ملے رضا! کہاں چلے گئے تھے تم؟''حسین نے تھک کر پوچھا تھا۔اس سوال کے جواب میں رضا کی آنکھوں میں ڈھیروں داستان آکر سمانے لگی تھیں۔

''مم۔۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے نشہ شروع کر دیا تھا حسین!''الفاظ تھے کہ بم۔۔۔۔ حسین ششدر رہ گیا۔

اُس رات ایک بار پھر رضا نے اپنا آپ کھول کر اسکے سامنے رکھ دیا تھا کہ حسین ہمیشہ سے اُسکا راز دان تھا۔

---------+---------+--------

دس سال قبل، جھگڑے والی رات:

وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا، خصوصاً عمر سے تو باقاعدہ نظریں چرا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب اُسے اکیلا چھوڑ دیں۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔

دوست اُس سے اُسکے غائب ہونے کی وجہ پوچھتے پر وہ ہر بار بیماری کا بہانہ بنا دیتا۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ حقیقتاً بیمار رہنے لگا تھا۔ کھانا پینا کم ہو گیا تھا، کچھ کھانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا، رات بھر جاگ جاگ کر آنکھوں تلے حلقے پڑ گئے تھے۔ اُسے اکثر بخار رہنے لگا تھا۔ پر وہ جتنا اپنی ذات سے لاپرواہی برت سکتا تھا، اتنی برت رہا تھا۔

اسی دوران صنوبر والا واقعہ ہو گیا۔ وہ براہِ راست اِس واقعے کا گواہ نہیں تھا، پر اِس حادثے نے کچھ وقت کے لیے اُسکی توجہ تکلیف دہ باتوں سے ہٹا دی تھیں۔ پر اُسکے بعد مقدّم غائب ہو گیا اور اُسکے غائب ہونے پر جو ردِ عمل اُسکے دوستوں نے دیا، وہ سمجھ گیا تھا کہ اب یا تو یہ جھگڑا کسی بڑے جھگڑے میں تبدیل ہو گا یا پھر اُن سب کی جدائی میں۔۔۔۔ پہلے جھگڑے کے بعد ایک ماہ تک کسی نے کسی سے بات نہ کی، بس حسین کبھی کبھار اُس سے حال احوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ اِس ایک ماہ وہ کچھ ذہنی سکون میں رہا، اُسکا وہ خود ساختہ خوف کہ اُسکے دوستوں کو سب پتہ چل جائے گا اور وہ بھی اُسے بری نظروں سے دیکھیں گے، وہ زائل

ہونے لگا۔اور اُسے یہ یقین ہونے لگا کہ اِس خوف اور ڈپریشن کو ختم کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ وہ ان سب کو چھوڑ دے۔اور ایسی جگہ چلا جائے، جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو۔چاہے کسی کی گاڑی صاف کرے یا کسی کے گھر کا ملازم بن جائے، پر یہاں سے دور ہو جائے۔

جھگڑے والی رات جب عمر اِس ملک سے جانے کے لیے تیار تھا، اُس روز پہلی بار وہ تھوڑا بہت سنجیدہ ہوا۔وہ اور حسین، عمر کو چھوڑنے باہر تک آئے تھے۔ البتہ علی اُن سب پر شدید خفا تھا۔وہ عمر کو آخری بار خدا حافظ کہہ کر مڑے تو اُسکا فون بجنے لگا۔کسی انجان نمبر سے فون تھا۔حسین اندر چلا گیا اور وہ وہیں کھڑا فون سننے لگا۔

''رضاالٰہی! آپکا کل انٹرویو ہے۔کیا آپ کل صبح آسکتے ہیں؟''کسی کمپنی میں اُس نے درخواست بھیجی تھی، وہیں سے کال تھی۔

''ٹھیک ہے! کس وقت اور کہاں آنا ہے؟''اُس نے پوچھا۔پھر نام اور جگہ جاننے کے بعد اُن سے کل آنے کا وعدہ کر کے اندر کی جانب بڑھا، پر اندر کا منظر دیکھ کر اسکے قدم دروازے پر رک گئے۔

''دیکھو علی! سب کی اپنی مرضی ہے، اگر کوئی تمہارا ساتھ نہیں دینا چاہتا تو تم زبردستی نہیں کر سکتے۔لیکن میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں اور اگر رضا اس کیس کا حصہ ہوتا تو وہ بھی آخر تک تمہارا ساتھ دیتا۔''حسین علی کو سمجھا رہا تھا۔

''رضا! ہونہہ۔۔۔۔''وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کرے گا؟''الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ؟۔۔۔۔

رضاالٰہی اپنے دوستوں سے ایسی اُمید نہیں رکھتا تھا، اُسکے بعد اندر کیا ہوا؟اُسے نہیں معلوم۔۔۔پر رضا زمین میں دھنس گیا۔اُس لمحے اُسکے سارے احساسات، تمام جذبات منجمد ہو گئے۔علی کے لہجے میں اُسے وہی حقارت محسوس ہوئی، جو اپنے ماموں، اپنے باپ اور باقی تمام لوگوں کے لہجوں میں تھی۔ وہی ذلت اُسکا مقدر بنی جو ہمیشہ سے تھی۔

نجانے اُس لمحے اُسے کیا ہوا؟وہ اندر گیا اور پھر علی کے ایک جملے کے جواب میں اُس پر اتنے گھناؤنے الزام لگا گیا کہ جس کے بعد نجانے وہ کتنے عرصے تک خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

علی تو علی اُس نے نوید کو بھی نہیں بخشا، جسکا اس سارے معاملے میں سرے سے کوئی قصور بھی نہ تھا۔لیکن نہیں! ایسا نہیں تھا کہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔اُس نے یہ سب جان کر کیا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ اُسکے دوست اُس سے نفرت کریں اور جب وہ یہاں سے غائب ہو جائے تو وہ اُسکے پیچھے نہ آئیں۔لیکن حسین سمجھ گیا۔۔۔وہ اُس روز بھی سمجھ گیا کہ رضا نے یہ جان کر کیا ہے۔پر اس وقت حسین بھی ذہنی طور پر اتنا تھک چکا تھا کہ وہ رضا کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔آخر وہ بھی انسان تھا، اُسکی برداشت کی بھی کوئی حد تھی۔لیکن اُس نے غلط کیا۔کم از کم اُس رات اُسے رضا کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔

---------+---------+--------

وہ پیدل چلتے چلتے ایک مصروف سی شاہراہ پر آ گیا۔ گاڑیوں کا شور اُسکے اندر کا شور کم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ فلائی اوور کے نیچے بنے فٹ پاتھ پر بہت سے نشئی اور فقیر سوئے پڑے تھے، وہ ہر شے کو نظر انداز کرتا پاس رکھی بینچ پر آ بیٹھا۔ گاڑیاں پاس سے تیزی سے گزر رہی تھی، ہر ایک کی زندگی دوڑ رہی تھی پر اُسکی جیسے رک چکی تھی۔ چوکیدار نے اُسکے منہ پر پیسے مارے، ماموں کے بیٹے نے اُسکا مذاق بنایا، پولیس والوں نے اُسے مارا اور آج علی نے اُسکی ذات کو نشانہ بنایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کیونکہ اُسکا باپ اُسے یتیموں کی طرح چھوڑ گیا تو ساری دنیا کو ہمت ہو گئی تھی اُس پر بات کرنے کی؟ اُس پر کیچڑ اچھالنے کی؟

اُسے نہیں پتہ وہ وہاں کیوں تھا؟ وقت گزرتا گیا اور گاڑیوں کا شور مدھم پڑتا گیا۔ وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ نجانے رات کتنی ہو چکی تھی؟ کسی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا تو وہ چونکا۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو سب سے پہلے بدبو کا ایک بھبکا نتھنوں سے ٹکرایا۔

''کیا ہے؟ کون ہو تم؟'' رضا نے اُس میلے کچیلے، بدبودار وجود والے شخص کو بیزاری سے دیکھا۔

''تمہیں نیند نہیں آ رہی؟ یہ لے لو۔۔۔ اس سے آ جائے گی۔۔۔'' وہ تھیلے میں لپٹی کوئی شے اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ رضا کا دماغ جاگ اٹھا، وہ اُسے نشہ پیش کر رہا تھا۔ اُس نے جھٹکے سے اُسکا ہاتھ پیچھے کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' وہ اس چرسی کو غصّے سے کہتا جانے کے لیے مڑ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ بات تو سنو!'' چرسی پیچھے سے بولا پر اُسکی اتنی ہمت نہ تھی کہ رضا کے پیچھے آ سکتا۔

وہ تیز تیز چلتا کسی رہائشی علاقے کی طرف آ گیا، جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ چرسی اُسکا پیچھا نہیں کر رہا تو ایک خالی عمارت کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ گھر جا سکتا تھا، پر نہیں گیا۔ خاموش اور تاریک عمارت کے سامنے بیٹھے اُس نے پوری رات گزار دی۔ فجر کی اذان نے صبح کی نوید بھی سنا دی پر وہ وہیں بیٹھ رہا۔ وہ تھک گیا تھا۔۔۔ اور تھک جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ سونا چاہتا تھا۔۔۔ بلکہ وہ زندگی سے تھک گیا تھا۔۔۔ جینے سے تنگ آ گیا تھا۔

صبح ہوئی تو جیب میں رکھا موبائل بجنے لگا، بھلا کس کو اسکی فکر ہونے لگی تھی؟ اُس نے فون نکال کر دیکھا تو جس جگہ اُسے انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ اُس جگہ سے فون آیا تھا۔ اُس نے فون نہیں اُٹھایا۔ کچھ دیر بعد فون دوبارہ بجا، اس مرتبہ حسین فون کر رہا تھا۔ کافی دیر وہ اسکرین کو دیکھتا رہا۔ پھر پوری قوت سے موبائل پاس بہتے نالے میں پھینک دیا۔ اُسے اس دنیا کے کسی فرد سے رابطہ نہیں رکھنا تھا۔ کسی سے بھی نہیں۔۔۔۔۔

صبح دوپہر میں تبدیل ہو گئی اور دوپہر شام میں۔۔۔۔ پر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ وہاں بیٹھ کر اور اکیلے رہ کر جو سکون اُسے مل رہا تھا، وہ کسی کے ساتھ رہ کر بالکل نہیں مل سکتا تھا۔ شام ہوئی تو بھوک ستانے لگی۔ وہ چوبیس گھنٹوں سے بھوکا پیاسا بیٹھا تھا، اور پچھلے چوبیس گھنٹوں سے وہ سویا بھی نہیں تھا۔ طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں رہتی تھی اوپر سے بھوک کی وجہ سے حالت اور عجیب ہونے لگی تھی۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ سڑک کے پار ایک گاڑی آکر رکی، سیاہ رنگ کی بڑی اور خوبصورت سی گاڑی دور سے ہی اپنی جاہ و حشمت کا پتہ دیتی تھی۔ اُس گاڑی کا وہاں آنا حیران کن نہیں تھا بلکہ اُسکے آتے ہی گاڑی کے آس پاس مختلف فقیروں کا جمع ہونا حیران کن تھا۔ وہ نجانے کہاں کہاں سے نکل کر آرہے تھے؟ کل سے رضا یہاں تھا، تب تو کوئی ذی روح نظر نہ آئی تھی۔ یا شاید وہ اپنے آس پاس سے ٹھیک ٹھاک بے خبر بیٹھا تھا۔ گاڑی سے کوئی شخص اُترا، کلف لگے سفید شلوار کرتے میں، چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ سجائے۔ ساتھ ایک دو اور لوگ تھے، حلیے سے ملازم لگتے تھے۔ گاڑی سے اتر کر اُس نے ڈگی کھولی تو ایک دیگ رکھی نظر آئی۔

''اوہ! تو اس لیے یہ لوگ یہاں جمع ہو رہے تھے؟'' اُس نے سوچا۔ آدمی نے لوگوں کو ایک قطار میں جمع کیا اور تھیلیوں میں کھانا ڈال ڈال کر انہیں باری باری دینے لگا۔ رضا خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جسے کھانا مل جاتا وہ وہیں کہیں آس پاس بیٹھ جاتا اور کھانا شروع کر دیتا۔

''سن!۔۔۔'' کسی نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''کیا؟'' رضا نے ناسمجھی سے پاس کھڑے فقیر کو دیکھا۔

''تُو نہیں کھائے گا؟'' اُس نے تھیلی میں رکھی بریانی اُسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ رضا کو پہلی بار برا لگا۔

''تمہیں میں حلیے سے لنگر کھانے والا لگتا ہوں؟'' اُس نے سخت تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں! حلیے سے تو، تُو کسی بڑے گھر کا لگتا ہے۔ پر کل رات سے یہاں بیٹھا ہے، بھوک نہیں لگی تُجھے؟'' اُسکے سوال پر وہ حیران ہوا؟ وہ لوگ رات سے یہاں تھے، اور اُسے دیکھ رہے تھے؟ کہاں چھپے تھے بھلا وہ؟

''نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے بھی چل پڑا۔ فقیر کندھے اُچکاتے وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ رضا نے رک کر، ایک نظر اُسے دیکھا۔ وہ تھیلی زمین پر رکھے اُسی میں سے کھا رہا تھا۔

''یہ کیسی نیکی ہے؟ کیا کھانا کسی ڈبّے میں؟ یا کسی پلیٹ میں نہیں دیا جا سکتا؟ اِس استحصال کو لوگ نیکی کیسے کہہ لیتے ہیں؟'' اُس نے سوچا اور واپس مڑ گیا۔ دل کچھ مزید دکھ گیا۔ یہ دنیا کچھ مزید بری لگنے لگی۔ کمزوری کے سبب زیادہ چلنے کی ہمت نہ تھی تو تھک کر پھر کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ سڑک کے پار کوئی فوڈ سٹریٹ تھی، مختلف قسم کے ہوٹل اور ریسٹورانٹ نظر آرہے تھے۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے پوری فضا مسحور کن کی ہوئی تھی۔ مغرب ہوتے ہی وہاں کی روشنیاں اور رونقیں عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ لوگ دور دور سے فقط صرف کھانے پینے کے لیے آرہے تھے۔ وہ خاموشی سے اُنہیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سنا تھا اِس شہر میں کوئی غریب بھوکا نہیں سوتا۔ ہاں! غریب تو واقعی بھوکا نہیں سوتا۔ وہ بیچارہ تو اپنی عزت نفس قربان کر کے بھیک میں ملا

کھانا کھالیا کرتا ہے۔پر سفید پوش؟ سفید پوش کیا کرے؟ رضا کو کبھی اچھا کھانے کی چاہ نہ رہی۔پر اللہ کے کرم سے وہ کبھی بھوکا بھی نہیں سویا تھا، سوائے کل رات کے۔

رات ہوتے ہوتے حالت مزید غیر ہونے لگی، اس سے پہلے کے وہ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی کے آگے ہاتھ پھیلا لیتا، اُس نے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔اپنا بٹوہ وہ ماموں کے گھر کے کیبن میں ہی چھوڑ آیا تھا، بٹوہ پاس ہوتا تو کم از کم ایک ہفتے تو وہ گزارا کر لیتا بھلے سے ایک وقت کھانا کھاتا۔

خود کو گھسیٹتے وہ نجانے کب ماموں کے بنگلے کے سامنے آ کھڑا ہوا؟ گھر کی تمام بتیاں روشن تھیں۔اندر یقیناً سب رات کا کھانا کھا رہے ہوں گے۔کسی کو اُسکی فکر بھی نہیں ہو گی۔

''جو روٹی مجھے اس گھر میں ملتی ہے، وہ بھی تو ذلت کی ہی ہے۔اور ذلت کی روٹی کھانے سے اچھا ہے کہ میں بھیک میں ملا کھانا کھالوں۔'' وہاں کھڑے اُس نے آخری فیصلہ یہی کیا اور مڑ گیا۔اُس روز کے بعد وہ دوبارہ اس دروازے پر نہیں آیا۔

مایوسی کفر ہے۔۔۔

اور رضا اُس وقت مایوسی کی تمام حدیں پار کر چکا تھا۔۔۔

اگر جو وہ مایوسی سے باہر نکل کر تھوڑا ذہن استعمال کرتا، تو اُسے اپنے سامنے ایک روشن مستقبل نظر آتا۔ایک اچھی نوکری اُسکی میز پر رکھی تھی، کچھ عرصے صبر کر کے اگر وہ ذلت کی روٹی کھا بھی لیتا تو کونسا ساری زندگی اُس نے وہیں رہنا تھا؟ پر۔۔۔

اُس نے مایوسی کو چنا۔۔۔

اُسے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں تھا۔۔۔

اُسے رب کی جزا پر یقین نہیں تھا۔۔۔۔

اُس نے سوچا کہ بس زندگی ختم۔۔۔

اور مایوسی اسی لیے کفر ہے۔۔۔۔

---------+---------+--------

چوبیس گھنٹے چھتیس گھنٹوں میں بدل گئے۔اُسکی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔وہ دوبارہ اُسی خالی عمارت کے پاس آ بیٹھا۔آج پتہ نہیں کہاں سے اور بہت سے دیگر فقیر بھی اُسے وہاں نظر آنے لگے تھے؟ شام ہوئی تو وہاں پھر ایک گاڑی آ رکی۔پر آج نا صرف گاڑی مختلف تھی بلکہ اُس گاڑی سے اُترنے والا بھی

مختلف تھا۔اُس نے بھی وہی کیا جو کل والے شخص نے کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا لوگ اس جگہ اکثر لنگر دینے آتے ہیں۔ فقیر آس پاس سے اُٹھ اُٹھ کر گاڑی کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔اُسی لمحے رضا نے کچھ ایسا کیا، جو شاید اُسکے تصور میں بھی کہیں نہ تھا۔ کل جس فقیر نے اُسے کھانے کی پیشکش کی تھی، رضا نے اُسکا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''کیا ہے؟ دیکھ نہیں رہے، کھانا ختم ہو جائے گا۔'' فقیر اُسکے روکنے پر جھنجھلایا۔

''مم۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔مجھے بھی۔۔۔''الفاظ ادا کرنا مشکل تھا۔''مجھے بھی تھوڑا کھانا لا دو۔''اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاتا۔۔۔وہ ایک بندے کو ایک ہی تھیلی دیتا ہے۔ جاؤ! جا کر خود لو۔'' فقیر ہاتھ چھڑاتا تیزی سے قطار میں جا لگا۔رضا بے بس ہو گیا۔ کیسے لوگ تھے؟ نیکی بھی کرتے تھے اور گنتی بھی۔۔۔ بھوکوں کو کھلاتے بھی تھے اور نوالوں کا حساب بھی رکھتے تھے۔

''آجا آجا! کھانا ختم ہو جائے گا۔'' فقیر نے دور سے اُسے آواز دیکر پکارا، تو اُس نے پہاڑ جیسا پتھر اپنے دل پر رکھا اور خود کو گھسیٹتا قطار کی طرف بڑھنے لگا۔

رضا؟ وہ پہلے خود کو تو سنبھال لے

علی کی استہزائیہ آواز کانوں میں گونجی۔ خود کو گھسیٹتے گھسیٹتے قطار تک پہنچا۔ وہ پہنچنے والوں میں آخری تھا۔ لہٰذا اُسکی باری بھی آخر میں آنی تھی۔

تم وہ لیکر کیا کرو گے؟ اُنکے پاس جا کر، اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیگ مانگو گے؟

قطار میں کھڑا رضا الٰہی، جسے اُسکی ماں نے نوالے بنا بنا کر ہاتھوں سے کھلائے تھے۔ آج صرف بھیک میں ملے کھانے کا منتظر تھا۔

تمہارا باپ تمہیں نہ تو گلے لگائے گا اور نہ ہی تمہیں دیکھ کر اُسکا دل بھر آئے گا۔

اسکی باری آئی تو کسی نے اُسے تھیلی پکڑا دی۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے تھیلی کو کسی جھولی کی طرح اُس شخص کے آگے پھیلایا۔ سر کچھ مزید جھک گیا۔

اوہ ہیرو! پیسے تو لیتے جاؤ۔ یہ کم ہیں کیا؟

چوکیدار کا استہزاء کرتا لہجہ یاد آیا۔ دینے والے نے کھانا پھر بھی عزت سے دیا تھا، منہ پر مارا نہیں تھا۔ کھانا لیکر اُس نے تھیلی کا منہ بند کیا اور پلٹ گیا۔

لڑکا میرے رشتے دار کا بیٹا ہے۔ پیسے ویسے مانگنے آیا ہو گا، تمہارے پاس ابھی کچھ نقد ہے تو اُسے دے کر چلتا کرو۔ مجھ سے بعد میں لے لینا۔

کون تھا اسکا دنیا میں؟ ماں ہوتی تو شاید اُسکے خاطر زندہ رہ لیتا۔ پر اب کس کے لیے زندہ رہے؟ اپنے لیے تو ہرگز نہیں۔۔۔

آج اپنی اوقات اچھے سے سمجھ آگئی ہو گی تمہیں؟

قریب بینچ کے پیچھے چھپ کر، کہ دکھیں نیا دیکھ نہ لے، اُس نے زمین پر تھیلی رکھ کے کھولی۔ اُسکے اندر ہاتھ ڈالا اور پہلا نوالہ نکال کر منہ میں ڈالا۔ دل بھر آیا، آنسو بہہ نکلے۔

''عزت راس نہیں آرہی تھی نہ تیرے کو؟'' کانسٹیبل نے جوتے سمیت اُسکے منہ پر پاؤں رکھا،

دوسرا نوالہ منہ میں ڈالا تو سسک اٹھا۔ پر بھوک انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ ابھی چند لقمے ہی کھائیں تھے کہ کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو کھانا دینے والا پاس کھڑا اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً اُسکے حلیے پر حیران ہوگا۔ وہ شرمندہ ہوا، مگر تھوڑا سا۔ بھوک نے فلحال ساری شرمندگی مٹادی تھی۔

''تم۔۔۔ تم کون ہو؟ کسی اچھے گھر کے لگتے ہو۔'' اُس آدمی نے اُسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ اور بس! رضا نے کھانا وہیں چھوڑا اور کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟ کھانا کیوں نہیں۔۔۔۔'' آدمی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے بھاگ گیا۔

''ارے رکو!۔۔۔'' آدمی نے پیچھے سے اُسے آواز دی۔ پر وہ نہیں رکا۔ مزید کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔۔۔ مزید کسی کا احسان نہیں۔۔۔۔ یہ دنیا احسان کر کے جتاتی ہے۔

اور یہ دنیا ہمدردی بھی اچھے لباس میں لپٹے، بیچارے سے کرتی ہے۔ ورنہ وہاں اور بھی تو لنگر کھانے والے تھے۔

وہ شخص کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ پر یہ اُسکی رضا سے آخری ملاقات نہیں تھی۔

---------+---------+--------

آج وہ پھر سے اُسی فلائی اوور کے نیچے آبیٹھا تھا۔ وہ دنیا سے چھپ جانا چاہتا تھا، اپنی شناخت تک مٹالینا چاہتا تھا۔ مرنا چاہتا تھا پر مرنے کے لئے بھی ہمت نہیں تھی۔

''سن!'' وہ چرسی آج پھر اُسکے پاس آگیا۔ رضا نے آج پھر اُسے نظر انداز کیا تھا۔

''یہ دنیا تجھے سکون سے رہنے نہیں دے گی۔ ہمیں بھی بڑا تنگ کیا دنیا نے۔۔۔'' چرسی اُسکے پاس ہی آبیٹھا۔

''پھر ہمیں یہ مل گئی۔'' اُس نے چرس کی تھیلی اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''بہت سکون ہے اس میں، سب بھلا دیتی ہے یہ۔۔۔ نہ بھوک پیاس لگتی ہے اور نہ دنیا نظر آتی ہے۔ بس میں ہوتا ہوں میری دنیا۔ تُو بھی لے کر دیکھ۔'' چرسی نے چرس بھری سیگریٹ اُسکے حوالے کی۔ اُس نے کچھ نہ کہا۔

''چل کوئی بات نہیں! جب دل کرے تب پی لینا۔'' وہ سیگریٹ اُس کے پاس رکھ کر ہی اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ رضا نے دیکھا کہ کچھ دیر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی چادر کے اندر چھپ کر چرس سونگھتا رہا، پھر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

وہ نجانے کتنی راتوں کا جاگا ہوا تھا؟ اُنہیں سوتا دیکھ کر اُسے رشک آیا۔

بہت سکون ہے اس میں، سب بھلا دیتی ہے یہ۔۔۔ نہ بھوک پیاس لگتی ہے اور نہ دنیا نظر آتی ہے۔

رضا نے سیگریٹ کو دیکھا، پھر اُن سب کو، دماغ سن ہو رہا تھا، اُسکے اندر کوئی شے اُسے یہ احساس دلا رہی تھی کہ اُسے یہ لے لینی چاہیے۔ پھر اُس نے آس پاس دیکھا، رات بہت ہو چکی تھی، اس لیے لوگ اکا دکا ہی نظر آ رہے تھے اور ہوتے بھی تو کونسا اس شہر میں کسی کو کسی سے مطلب تھا؟ رضا نے خاموشی سے چرس بھری سیگریٹ اٹھائی اور پاس پڑی ماچس سے اُسے جلا لیا۔

پھر نفس جیت گیا۔۔۔

شیطان جیت گیا۔۔۔

اور بندہ ہار گیا۔۔۔۔۔

اور اس ہارنے میں بندے کا ہی نقصان ہے۔۔۔

---------+---------+--------

رات بھر خواب میں ماں کو دیکھتا رہا، باپ کی محبت سمیٹتا رہا، عیاشی کی زندگی گزارتا رہا۔ وہ دنیا واقعی خوبصورت تھی۔ اس کی من پسند دنیا۔۔۔

صبح اُٹھا تو سر بھاری تھا، اُسے لگا کہ صبح ہو رہی ہے پر درحقیقت، اُس بینچ پر سوئے ہوئے اسے رات سے اگلی شام ہو چکی تھی۔

''کیا ہوا تُجھے؟'' اُسی چرسی نے پوچھا۔

''سر درد کر رہا ہے۔'' رضا نے پہلی بار جواب دیا۔

''پہلی بار لی ہے نا؟ چل پریشان نہ ہو؟ یہ لے اور پی۔۔۔ درد چلا جائے گا۔'' اُس نے سیگریٹ اُسکی جانب بڑھائی۔

''اِس سے۔۔۔ درد چلا جائے گا؟'' اُس نے کانپتے ہاتھوں سے سیگریٹ لیتے پوچھا۔ چرس بھری سیگریٹ۔۔۔

''ہاں!۔۔۔''اور رضا نے وہ حرام شے دوبارہ منہ سے لگالی۔اور ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو گیا۔اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا، صبحیں شاموں میں، اور شامیں راتوں میں بدلتی گئیں اور وہ جگہ اُسکا مسکن بن گئی۔جو سکون اُسے نشے میں ملا تھا، وہ کہیں نہیں تھا۔نشے کی حالت میں وہ اپنی من چاہی زندگی جی کے آجاتا، وہ اپنی دنیا میں ہوتا۔اِس دنیا سے اُسے کوئی غرض نہ رہتی تھی۔کھانا کوئی دے جاتا تو کھالیتا، ورنہ نشہ کافی تھا۔

دو ماہ میں اسکی داڑھی بڑھتی چلی گئی، بال بے ترتیب اور حلیہ بد ترین ہو گیا۔اپنے لباس پر اُڑتی دھول بھی نہ پڑنے دینے والا رضاالٰہی، آج دھول مٹّی سے اٹا وجود ہو گیا۔پاکی ناپاکی کا کوئی خیال اُسے نہ رہا، ماضی بھی اُسے یاد نہ رہا اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا پر نشہ اُسے وہ سکون دینے لگا، جو دنیا میں کسی نے نہ دیا تھا۔

دو مہینے اسی طرح گزر گئے، ایک رات اُسے نشہ نہ ملا۔جو فقیر چرسی، اسے روز نشہ فراہم کرتا تھا، آج وہ بھی اُس کے پاس نہ آیا۔رضا لڑکھڑاتے قدموں اور ہلتے ہوئے دماغ کے ساتھ اُسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔

''اے۔۔۔۔''رضا نے اُسے ہلایا، پر اُس نے نہ سنا۔

''اے۔۔۔سن۔۔۔۔''اُس نے اُسے لات ماری۔

''کیا ہے؟''چرسی نے بیزاری سے کہا۔

''سیگریٹ دے مجھے۔۔۔''اُس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

''کیوں؟ کیوں دے تیرے کو؟ مفت عیاشی کروادی نا اتنے عرصے؟ جا جا کر پیسے لیکر آ، پھر خرید نا مجھ سے۔۔۔''چرسی نے منہ پھیر لیا۔

''دے مجھے۔۔۔۔ورنہ ماروں گا۔''رضا نے اُسکے بال کھینچے، پر اُسکو کوئی فرق نہ پڑا۔

''دے نہ۔۔۔۔''پھر رضا نے اُسکو مارنا شروع کر دیا۔اُس نے چند ہی مکّوں میں اُسکو گرا کر بیہوش کر دیا۔پھر اُسکی جیب سے چرس اور پیسے دونوں نکال لئے۔

اُسکے بعد وہ وہ ایک کنارے آ گیا، اِس سے پہلے کہ وہ چرس پیتا اسے خلیل نظر آیا۔خلیل وہ شخص تھا، جو ان چرسیوں کو چھپا کر چرس بیچتا تھا۔رضا جلدی سے اٹھ کر اُسکے پاس آیا اور چند سو کے نوٹ جو اُس نے ابھی ابھی اپنے ساتھی سے چرائے تھے، خلیل کو دیے۔

''یہ کیا ہے؟ اتنے کم پیسوں میں نہیں آتا یہ۔۔۔''خلیل نے پیسے دیکھ کر کہا۔

''جتنا آتا ہے اتنا دے دے۔۔۔''رضا نے کہا۔خلیل نے منہ بناتے ہوئے تھوڑی سی چرس ایک کاغذ میں لپیٹ کر اسکے حوالے کی۔ اُسکے پاس اب دو دن کی چرس تھی۔اُس نے جیب میں چھپالی۔

اگلے روز جب اسکا نشہ اُترا تو وہ کھڑا ہوا۔ پاس بنے نل کا گندا پانی منہ لگا کر پیا۔ ابھی پی کر مڑا ہی تھا کہ سامنے وہی چرسی اپنے ساتھ چار عدد مزید ساتھی لیکر اُسکا راستہ روکے کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' رضا نے پوچھا۔

''پیسے دے مجھے۔۔۔'' اُس چرسی نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس نہیں ہے۔'' رضا کہتے ہوئے جانے لگا۔ اُس نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

''چھوڑ مجھے۔۔۔'' رضا نے بازو چھڑوانا چاہا پر مزید دو تین چرسیوں نے اُسے پکڑ لیا۔

''چھوڑ۔۔۔'' رضا چیخا پر اُس چرسی نے اُسکی جیب سے کل کی خریدی ہوئی چرس نکال لی۔ باقی چرسیوں نے جو چرس دیکھی تو اُسے چھوڑ کر وہ بھی اپنے ساتھی کے پاس آئے۔ رضا گرتے پڑتے اُسکے قریب پہنچا کہ اسکے ہاتھ سے چرس چھین کر بھاگ سکے لیکن چرسی نے اسکا ارادہ بھانپ کر چرس کا ساشے دوسرے کی طرف اچھال دیا۔ دوسرے نے سرعت سے اُسے پکڑا۔

''اے۔۔۔ یہ میری ہے۔۔۔'' رضا لڑھکتے ہوئے اُسکے پاس آیا تو اُس نے ہنستے ہوئے چرس تیسرے کی جانب اچھال دی۔

''آلے۔۔۔ لے آ کر!'' تیسرا چرسی اُسکو ساشے دکھا کر ہنستا رہا۔

''دے مجھے۔۔۔ دے یہ میرا ہے۔۔۔'' وہ پوری قوت مجتمع کر کے چیخا تھا۔ لیکن اُس نے بھی وہ کسی اور کی طرف اچھال دیا، وہ سب اُسکا مذاق اُڑاتے اُسکے ساتھ کھیلنے لگے۔ رضا کا دماغ گھومنے لگا۔ آس پاس گزرتے لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی کہ یہ تو ان چرسیوں کا روز کا معمول تھا۔ اُسی لمحے نجانے اُس کے لاغر وجود میں کہاں سے اتنی طاقت آئی کہ اُس نے کس کے ایک مکا پہلے والے چرسی کو جڑ دیا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ اِس منظر کو دیکھ کر باقی چرسیوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا۔ مار کھاتا رضا بھی وہیں گر پڑا، وہ سارے مل کر اُس پر پل پڑے تھے، وہ بے ہوش ہو گیا۔

''چھوڑو اسے۔۔۔ ہٹو یہاں سے۔۔۔'' کسی بھلے آدمی نے پتھر مار کر انہیں وہاں سے ہٹایا تو وہ سب بھاگ نکلے۔ پھر وہ بھلا مانس رضا کی جانب بڑھا۔

''جانے دیں بھائی! یہ سب چرسی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ رات کو سارے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔'' قریب ہی ایک نرسری کا مالی کھڑا تھا، اُس نے آدمی سے کہا تو وہ رک گیا۔ پھر کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔ رضا وہیں گرا پڑا رہ گیا۔

اُس نے خدا پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنے لیے خود یہ زندگی چنی تھی۔۔۔

مالی نے صحیح کہا تھا۔ اگلے روز وہ سارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ البتہ آج بھی رضا کو نشہ نہیں ملا تھا۔ نشہ نہ ملنے کی وجہ سے اُسکی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اتنے میں ایک لڑکا اُسکے پاس آیا۔

''پیسے چاہییں؟'' اُس نے رضا سے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔چاہیے۔۔۔چاہیے۔۔۔'' رضا نے جلدی سے کہا۔

''یہ بوری پکڑ اور میرے ساتھ راستے سے ردّی چن لے۔۔۔ پھر اسکو بیچ کر دونوں پیسے کمائیں گے اور پھر نشہ خریدیں گے۔ کرے گا یہ کام؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہ۔۔۔ہے۔۔۔ہاں ہاں ہاں۔۔۔ کروں گا۔۔۔ کروں گانا۔'' اُس نے سر ہلا کر کہا تو لڑکے نے اُسے ایک بوری پکڑائی اور اپنے ساتھ لیکر چل پڑا۔ یہ دونوں راستے سے کچرے میں سے کچھ ردیاں اور سوکھی روٹیاں چنتے جاتے۔ رضا سے چلانہ جاتا، لباس سے بدبو کا بھبکا اٹھتا، آنکھیں دھندلانے لگتی پر وہ بس نشے کی طلب میں خود کو گھسیٹتا رہتا۔ شام تک انہوں نے اچھی خاصی روٹیاں اور ردیاں جمع کر لیں۔

''چل اب اسے بیچ کر آتے ہیں۔'' لڑکا اُسے لیے ایک چوک پر آ گیا۔ وہ ایک مصروف شاہراہ کی سڑک تھی۔

''تُو یہاں بیٹھ، میں یہ مال بیچ کر آتا ہوں۔'' لڑکا اُسکو چوک پر بیٹھنے کا کہہ کر سامنے دکان میں چلا گیا۔ رضا نے اُسکو اپنی بوری بھی دے دی تھی۔ اب وہ بیٹھا اُسکے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسکی نظریں ایک آدمی پر پڑیں، یہ آدمی چوک پر پرندوں کے کھانے کے لیے بھر بھر کر پکے ہوئے سفید چاول ڈال کر گیا تھا۔ جیسے ہی وہ آدمی وہاں سے گیا رضا جلدی سے اٹھ کر اُس جگہ آیا، جہاں وہ آدمی چاول ڈال کر گیا تھا۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور فٹ پاتھ سے چاول اُٹھا اُٹھا کر منہ میں ڈالنے لگا۔ بھوک میں یہ چاول بھی غنیمت لگ رہے تھے۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

دھواں دُھکھے میرے مرشد والا جاں پھولاں تے لال نی

سُولاں مار دیوانی کیتا برہوں پیا ساڈے خیال نی

دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال نی

وہ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا کہ اُسکی نظریں دکان سے نکلتے اپنے ساتھی پر پڑیں، وہ اُس سے نظریں بچا کر بھاگنے کے چکروں میں تھا۔ رضا نے ہاتھ میں پکڑے چاول پھینکے اور تیزی سے اُٹھ کر اسکی جانب بھاگا، بھاگتے ہوئے اُسے سڑک سے گزرتی گاڑیوں کا خیال بھی نہ تھا، وہ چلتی گاڑیوں کے نیچے آتے آتے

بچا۔ کتنے ہی لوگوں نے رک کر اُسے گالیاں دی تھیں۔ پر وہ اُس لڑکے کے پیچھے دوڑ رہا تھا جو اُسکے پیسے لیے بھاگ رہا تھا۔ کافی مشکلوں سے ہی صحیح لیکن رضا نے اُسے جالیا پھر اُسے مار پیٹ کر اُس سے اپنے پیسے چھینے۔ پیسے چھیننے کے بعد اُس نے انہیں گننا شروع کیا۔

''سو۔۔دو سو۔۔۔سو۔۔۔''اُسے گنتی بھولنے لگی۔ اُس نے ذہن پر زور ڈالا کہ دو سو کے بعد کیا آتا ہے پر یاد نہیں آیا۔

''سو۔۔۔سو۔۔۔''وہ پھر گننے کی کوشش کرنے لگا۔ کہ ایک چھوٹا سا پتھر اُسکے سر پر آکر لگا۔ اُسکا سر جھنجھنا اُٹھا۔ مڑ کر دیکھا تو کچھ شرارتی بچے کھڑے تھے۔

''پاااگل۔۔۔۔پاااااگل۔۔۔''بچے اُسے دیکھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔

''بھاگو یہاں سے۔۔۔''رضا نے چیخنے کی کوشش کی۔

''دیکھو دیکھو! پاگل۔۔۔دیکھو یہ پاگل ہے۔''بچے ایک دوسرے کو بتا کر ہنسنے لگے۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔۔نہیں ہوں۔۔۔''اُس نے جنونی انداز میں کہتے وہی پتھر اُٹھایا اور فضا میں بلند کیا، بچے ہنستے ہوئے بھاگنے لگے، رضا کا ارادہ انہیں مارنے کا تھا کہ اُسی لمحے بچوں کے قہقہوں نے اسکا شعور لمحے بھر کو جگایا۔

''بچے۔۔۔۔''اُسکا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔ بچے، پیارے پیارے ہنستے مسکراتے بچے۔۔ذہن میں کوئی یاد سمانے لگی۔ وہ ڈبہ جس میں وہ بچوں کے لئے پیسے اکٹھے کرتا تھا۔ تاکہ اُنکے لیے گھر بنائے۔ وہ سب کہاں گیا؟ وہ کہاں کھڑا تھا؟ کیوں کھڑا تھا؟

پر اُسی لمحے، اُسکی نظریں دور کھڑے خلیل پر پڑیں اور اُسکا شعور واپس سو گیا۔ وہ پتھر زمین پر پھینک کر جلدی سے خلیل کے پاس گیا۔

''پیسے۔۔۔۔پیسے ہیں۔۔۔میرے پاس۔۔۔''اُس نے سارے نوٹ جلدی سے خلیل کے سامنے کر دیئے۔

''ارے واہ! کہاں ہاتھ مارا ہے آج؟''خلیل خباثت سے بولتا ہنسا۔ پھر ایک پیکٹ میں بھری چرس اور کچھ سیگریٹ اُسکے حوالے کر دیں۔ رضا اُسے لیے آج ایک تنہا گوشے میں آگیا کہ آج اُسکا نشہ کوئی چھین نہ لے۔

---------+---------+--------

کچھ دن اُس نے اُسی چرس پر گزارا کیا، کچرا چننے والا لڑکا بھی دوبارہ نہیں آیا۔ جب نشہ ختم ہو گیا تو رضا دوبارہ بوری اُٹھا کر چل پڑا، اس بار اُسکے لاغر وجود میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ گلیوں گلیوں پھرتا لہٰذا ایک ہوٹل کے سامنے بیٹھ گیا۔ فٹ

پاتھ پر بیٹھے رضا کو فقیر سمجھ کر کتنے ہی لوگ پیسے دینے لگے، ہوٹل میں آنے والوں، اور مہنگا ترین کھانا کھانے والوں کے پاس دینے کے لئے بس چند سکے ہی تھے۔ وہ بھی پھینک پھینک کر اُسکے سامنے جا رہے تھے۔ وہ ہاتھوں سے ایک ایک سکّہ اٹھا کر دیکھتا پھر اُسے جیب ڈال لیتا۔ وہ بڑے انہماک سے سکوں پر سکے اکھٹے کر رہا تھا کہ کسی نے اُسکی کمر پر زور دار لات ماری۔ اُس نے بلبلا کر دیکھا تو دو چار پیشہ ور بھکاری وہاں کھڑے تھے۔

''اے! یہ ہماری جگہ ہے۔ تُو کس سے پوچھ کر آیا ہاں؟'' ایک بھکاری، جس نے ہاتھ کو اندر موڑ کر خود کو معذور بنایا ہوا تھا بولا۔ رضا نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا، کچھ دیر اُنہیں دیکھتا رہا پھر چہرہ واپس جھکا دیا۔

''ابے او! سمجھ نہیں آئی کیا؟ یہ ہمارا علاقہ ہے، چل دے یہ پیسے۔۔۔'' ایک نے آگے بڑھ کر اُس سے پیسے چھیننے چاہے۔

''نہیں دوں گا۔۔۔ یہ میرے ہیں۔'' رضا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کیا۔

''دے اِدھر۔۔۔''

''نہیں دوں گا۔'' وہ اُنکو دھکا دیکر اُٹھا اور بھاگنے کے لیے دوڑا ہی تھا کہ کسی سے ٹکرا کر بری طرح گرا۔ جس شخص سے وہ ٹکرایا تھا اُس نے جھک کر اُسے کندھوں سے تھاما اور اُٹھایا۔ رضا کی حالت غیر تھی، وہ وہیں بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

''تم۔۔۔؟'' آنے والے نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ اور رضا وہیں بے دم ہو کر گر پڑا۔

اسکی ماں کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ گیا تھا۔۔۔

---------+---------+--------

Once an addict, always a recovering addict

(ایک بار نشہ کرنے والا تا عمر نشے سے لڑتا رہتا ہے)

''اس بات کا مطلب؟'' ایڈووکیٹ ہارون نے سنجیدگی سے ڈاکٹر کو دیکھا، جس نے ابھی ابھی یہ جملہ کہا تھا۔

''مطلب یہ کہ تین سے چار ماہ میں یہ نشے سے صحت یاب ہو جائے گا۔ لیکن یہ ہمیشہ نشے سے لڑتا رہے گا۔ نشے کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہے، یہ کبھی بھی relapse (دوبارہ لگنا) ہو سکتا ہے۔ پر یہ اُسی صورت میں ممکن ہے اگر اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اور تنہائی میں گلٹ (شرمندگی)، اسٹریس (ذہنی دباؤ) یا چڑچڑاپن عود آتے ہیں، جو اسے دوبارہ اسی کیفیت میں لے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ اِس نے بہت مختصر عرصے نشہ کیا ہے لیکن اسکے نشہ کرنے کے دوران وقفہ نہیں تھا، ایک نشہ اترتا تھا تو یہ دوسرا کر لیتا تھا۔'' ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا تو ایڈووکیٹ ہارون نے گہرا سانس خارج کیا۔

''ابھی وہ کیسا ہے؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''پچھلے ایک ماہ سے وہdetoxاورwithdrawlفیس میں تھا۔یہ ایک ماہ اُس پر بہت کڑا گزرا ہے،اسے ساتوں دن اور چوبیس گھنٹے کی نگرانی میں رکھا گیا ہے۔وہ بہت چیختا تھا،خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔نشے کی طلب اُسکے اندر بہت زیادہ تھی۔لیکن اب شکر ہے کہ وہ اس خطرناک مرحلے سے باہر آگیا ہے۔اس مرحلے میں ہم نے اُسکا جسم بچایا تھا،جو نشے کا عادی ہو گیا تھا۔اب اسکا دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔اسے phase stabilization کہتے ہیں۔اس مرحلے میں ہم اسکا ذہن بچائیں گے۔آج سے اسکی تھیراپی ہو گی،ہم نے اسکے اندر سے شرمندگی،ذہنی دباؤ اور اچانک اٹھنے والی نشے کی طلب کو ذہنی طور پر مارنا ہے۔آج سے ہم اسکی روٹین بنانا شروع کریں گے۔''ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔

''اُسے میں گھر کب لے جا سکتا ہوں؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''تین ماہ تک تو بالکل نہیں،اس مرحلے کے بعد اسکے دو مزید مرحلے باقی ہیں۔البتہ اِس مرحلے کے دوران تم اُسے کچھ دیر چہل قدمی کی لیے باہر لے جا سکتے ہو۔''

''بہت شکریہ آپکا۔میں مطمئن ہوں۔''ایڈوکیٹ صاحب نے خوش اخلاقی سے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔اب انکا رخ اُس کمرے کی طرف تھا،جہاں رضا پچھلے ایک ماہ سے زیرِ علاج تھا۔

رضا کو ہارون صاحب نے پہلی بار تب دیکھا تھا،جب وہ غریبوں میں لنگر تقسیم کرنے آئے تھے۔رضا کو تھیلی میں کھانا دیتے ہوئے وہ چونک اُٹھے۔اُس وقت اُسکا حلیہ کہیں سے بھی کسی فقیر کا نہیں لگ رہا تھا۔وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب لڑکا تھا،نجانے اُسے کیا مجبوری تھی،جو ایسے سڑک پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا؟انسانی ہمدردی کے تحت وہ اُسکے پاس گئے تو اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا،اور اسکی آنکھیں،اُسکی دنیا سے ستائی آنکھیں ہارون صاحب کو ہمیشہ یاد رہ گئیں۔وہ وہاں سے بھاگ گیا،پر وہ بار بار اُسکے بارے میں سوچتے رہے۔اگلے دن وہ دوبارہ وہاں آئے تاکہ اُسکے بارے میں معلوم کر سکے پر وہ انہیں نہ ملا۔اور ایک ماہ قبل جب وہ کسی دوست سے ملنے ریسٹورانٹ کی طرف جا رہے تھے،تب وہ اچانک ہی اُن سے ٹکرا کر گر گیا۔وہ اُسے کوئی چرسی سمجھ رہے تھے۔پر اُسکی آنکھیں۔۔۔اُن آنکھوں سے اسکی شناخت ظاہر ہو گئی۔وہ اُسے اس حالت میں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔انہیں یقین نہ آیا کہ جس لڑکے کو انہوں نے اچھے لباس میں دیکھا تھا،آج وہ انہیں فقیروں سے بھی بدتر ملے گا۔وہ انسانی جذبے کے تحت اُسے ہسپتال لے آئے۔جب ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ عادی نشئی ہے،تب یہ بات انسانی جذبے سے آگے نکل گئی۔پھر وہ اُسے علاج کے لیے rehab سینٹر لے آئے،جہاں وہ پچھلے ایک ماہ سے Detoxification کے مرحلے میں تھا۔اور آج ڈاکٹر نے یہ خوشبری سنائی کہ وہ اس مرحلے سے آگے بڑھ کر دوسرے مرحلے میں آچکا ہے۔

ہارون صاحب اُسکے کمرے میں آئے تو وہ خاموش بیٹھا، کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ نے اُسکا چہرہ روشن کر رکھا تھا۔ اُس نے انکے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

''کیا تم کچھ دیر کے لیے باہر چلو گے؟'' ہارون صاحب نے پوچھا، اس نے یکسر نظر انداز کیا۔ پچھلے ایک ماہ سے اسکا یہی رد عمل تھا، وہ ہارون صاحب کو ایسے ہی نظر انداز کیا کرتا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو اُسکے شروع کے دس روز بہت زیادہ خطرناک تھے، وہ بار بار خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا، چیختا، چلاتا، گالیاں دیتا، آخر میں رو رو کر نشہ مانگتا۔ دس روز بعد بلآخر detoxification کا اثر آہستہ آہستہ نظر آنے لگا۔ اُسکے چیخنے چلانے میں کمی آنے لگی۔

''ہم باہر چہل قدمی کریں گے۔ ڈاکٹر نے اسکی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اگر۔۔۔۔'' ہارون صاحب نے دوبارہ کہنا چاہا۔

''میں چلوں گا۔'' اُنکی بات کاٹتے ہوئے وہ اچانک ہی بولا تو وہ کچھ لمحوں کے لیے حیران رہ گئے۔ اُس نے آج پہلی بار انہیں کسی بات کا جواب دیا تھا۔ ہارون صاحب خوش ہوئے۔ اُسے سہارا دیکر اُٹھایا اور rehab سینٹر کے باغ میں لے آئے۔ کچھ دیر وہ اُنکے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا، وہ اُس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ یکدم ہی رضا نے ایک انوکھی فرمائش کی۔

''کیا وہ قلفی والا ہے؟'' اُس نے سینٹر کے باہر کھڑے ایک ریڑھی والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کیا تمہیں کھانی ہے؟'' اُنہوں نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا، انہیں خوشگوار حیرت نے آگھیرا۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ چند لقموں کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھا پا رہا تھا۔

''سنو! ریڑھی والے سے ایک قلفی خرید لاؤ۔'' ہارون صاحب نے اپنے ساتھ چلتے ملازم سے کہا۔ نجانے وہ کتنے امیر تھے؟ اپنے ساتھ دو اسلحہ بردار چوکیدار ہمہ وقت لیے پھرتے تھے۔

''میں بھی وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' اُس نے ایک اور فرمائش کی۔ پر اس بار ہارون صاحب تھوڑا ہچکچائے کہ ڈاکٹر نے اُسے ہسپتال کے احاطے سے باہر لے جانے سے منع کیا تھا۔

''کیوں؟'' اُنہوں نے ٹالنے کی غرض سے پوچھا۔

''میرا دل کر رہا ہے۔'' اُس نے اتنی معصومیت سے کہا کہ ہارون صاحب مان گئے، پھر اُسے سہارا دے کر ریڑھی تک لائے۔ انکا ملازم قلفی خریدنے کے لئے قطار میں کھڑا تھا۔ رضا وہیں ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ اُنہوں نے آس پاس نگاہ دوڑائی تو دیکھا کافی گہما گہمی تھی، لوگوں کے درمیان آنا یقیناً رضا کے لیے خوش آئند تھا۔ اُنہوں نے نظریں دوبارہ گھمائیں پر یہ کیا؟ وہ وہاں نہیں تھا۔

''ارے! وہ لڑکا کہاں گیا؟'' وہ چیخ اُٹھے۔ ملازم اور چوکیدار جو کچھ دور کھڑے تھے بھاگ کر آئے۔ اُنہوں نے پریشانی سے آس پاس دیکھا اور اگلے ہی لمحے رضا انہیں سڑک پر کسی درخت کی آوٹ لیکر آگے بڑھتا نظر آیا۔ اُسکا دماغ ابھی اتنا بہترین نہیں ہوا تھا کہ وہ سوچ سکتا، کہ جس جگہ سے وہ چھپ کر جا رہا ہے، وہاں سے وہ باآسانی نظر آجائے گا۔ ہارون صاحب نے سکون کا سانس خارج کیا۔

''جاؤ! اُسے پکڑ کر لاؤ جلدی۔۔۔'' اُنہوں نے چوکیدار کو حکم دیا تو وہ دونوں کچھ ہی لمحوں میں اُسے پکڑ لائے۔ لیکن اس بار رضا نے مزاحمت کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ چیخ بھی رہا تھا، خود کو چھڑوا بھی رہا تھا، پر کچھ کر بھی نہیں پا رہا تھا کہ اُس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ ہارون صاحب تو اُسکے رد عمل پر حیران رہ گئے۔ بڑی مشکلوں سے اُسے قابو کر کے اندر لایا گیا۔ پھر ڈاکٹروں نے اُسے اپنی انتہائی نگہداشت میں لے لیا۔

''یہ کس قسم کی لاپرواہی ہے ہارون؟'' ڈاکٹر ہارون صاحب پر ہی برہم ہوا، وہ انکا پرانا دوست بھی تھا۔

''مجھے لگا اب وہ بہتر ہے۔'' وہ پشیمان ہوئے۔

''کیسے بہتر ہے؟ جبکہ میں نے کہا بھی ہے کہ ابھی کم از کم اُسے تین ماہ مزید درکار ہیں۔ وہ صرف پہلے مرحلے سے کامیابی سے نکلا ہے، لیکن اگر ذرا لاپرواہی کی گئی تو دوبارہ اُسی پوزیشن میں پہنچ جائے گا۔'' ڈاکٹر سخت ناراض تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اُنہوں نے شرمندگی سے کہتے شیشے کی دیوار کے پار نظر آتے رضا کو دیکھا جو اب دواؤں کے زیرِ اثر پرسکون تھا۔

---------+---------+--------

''میں تمہارا نام نہیں جانتا، کیونکہ تم نے مجھے اب تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اگلے روز وہ کچھ بہتر ہوا تو ہارون صاحب اُس سے ملنے آئے۔ اُنکے ہاتھوں میں کوئی شے تھی۔ رضا خاموش بیٹھا رہا۔

''میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟ پڑھے لکھے لگتے ہو، اچھے مہذب بھی ہو، پھر کیوں خود کو اس نہج پر لے آئے؟ کیا ایسی زندگی تمہارا خواب تھی؟'' اُنہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مجھے کسی کا احسان نہیں چاہیے۔'' جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں چاہیے؟'' اُنہوں نے پوچھا، کیا معلوم اسی بہانے وہ کچھ بولے۔

''احسان کرنے والے جتاتے ہیں، ناخدا بن جاتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ ذلت کی روٹی دیتے ہیں اور خود کو بہترین سمجھتے ہیں۔'' اُسکی باتیں اتنی سوجھ بوجھ والی تھیں کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ ایک ماہ پہلے وہ ہارون صاحب کو ایک عادی نشئی کے طور پر ملا تھا۔ یہاں تک کہ اسکے لباس سے پیشاب کی بو تک آ رہی تھی۔

''میں احسان نہیں کر رہا تم پر، بلکہ تم احسان کرو گے مجھ پر۔ اور میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر یہ احسان کر دو۔'' اُنکے لہجے میں کچھ تھا، رضا نے کچھ حیران نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''یہ دیکھو!۔۔۔'' انہوں نے ہاتھوں میں پکڑا فریم رضا کی جانب بڑھایا، اُس نے کوئی توجہ نہ دی تو انہوں نے اُسے اُسکی گود میں رکھ دیا۔ رضا نے ایک نظر فریم کو دیکھا، وہاں کوئی چوبیس پچیس سالہ خوبصورت سا نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس نے سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور یہ اُسکی آخری تصویر ہے۔'' انہوں نے کہا تو وہ اب بھی خاموش رہا۔

''بہترین تعلیمی قابلیت اور ایک روشن مستقبل تھا اسکے آگے۔ سب کچھ کر سکتا تھا، سب کچھ پا سکتا تھا لیکن جانتے ہو اِس نے کیا کیا؟'' وہ رکے، اب کہ رضا منتظر سماعتوں سے اُنہیں سننے لگا۔

''اِس نے صبر نہیں کیا۔ اِس نے اپنے رب پر بھروسہ نہیں کیا۔ اسے لگا کہ ساری دنیا، ساری کائنات کا نظام چلانے والا اسلحہ مالک، اِسکے حال سے بے خبر ہے اور وہ اُسے ایسے ہی چھوڑ دے گا۔'' اُنکے الفاظ پل بھر کو رضا کو ساکت کر گئے۔

''یہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ چھوٹا تھا تو پیار ابھی بہت تھا مجھے، اس نے ایک جگہ پیسہ لگایا اور وہ کاروبار نقصان میں چلا گیا، اس نے دوسری جگہ پیسہ لگایا وہاں بھی یہی ہوا۔ میرے ابّو اسے اٹھتے بیٹھتے پیسے برباد کرنے پر رسوا کرتے، دوست یار بھی اُسے چھوڑ گئے تھے۔ یہ قرضوں میں ڈوب گیا۔ اُس وقت میں بیرونِ ملک، بیرلیسٹری پڑھنے گیا ہوا تھا۔ کاش! میں یہاں ہوتا۔'' انکا لہجہ بھیگا تھا۔

''اُس نے ایک روز ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیا۔ پھر کبھی نہ لوٹا۔ ابّا کو لگا کہ کہیں پیسے ہی اُڑا رہا ہو گا، جب ختم ہو جائیں گے تو واپس آ جائے گا، انہوں نے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں وطن واپس آیا تو مجھے اس واقعے کی خبر ملی، میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ چھے ماہ کی ان تھک محنت کے بعد وہ مجھے اس حال میں ملا کہ نشہ کرنے کی وجہ سے اُسکی یادداشت تک جا چکی تھی۔ میں اُسے لیے یہیں آیا، لیکن اُسکی حالت کافی خراب تھی۔ مجھے لگا تھا کہ میں اسکا علاج کروا لوں گا لیکن۔۔۔ اُس نے انتہائی نگہداشت کے باوجود بھی یہیں، اسی سینٹر میں خودکشی کر لی۔ میں اُسے بچانا چاہتا تھا پر اُس پر مایوسی اس حد تک سوار تھی کہ اُس نے حرام موت کو قبول کر لیا۔ اب میں سوائے روز اللہ سے اُسکی مغفرت مانگنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ روز سوچتا ہوں کہ کاش میں پہلے آ جاتا تو کچھ کر پاتا۔'' وہ رکے، رضا دم بخود سا انہیں سن رہا تھا۔

''تمہیں دیکھا تو اپنا بھائی یاد آیا، سوچا تمہیں بچالوں تو شاید دل کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ تم اگر اپنا علاج کروالو، تو یقین مانو کہ تم میری ذات پر احسان کروگے، اس آدمی کو شرمندگی سے باہر نکال لوگے اور یہ احسان تمہارا میں کبھی نہیں بھولوں گا۔''اُس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

''میں چلتا ہوں۔''وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ اب بھی کچھ نہ بولا تو وہ مایوسی سے جانے کے لیے مڑ گئے۔

''رضا نام ہے میرا۔۔۔رضائے الٰہی۔۔۔''اُس کی آواز پر اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا، اب وہ خاموشی سے اپنے برابر میں رکھا کھانا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ آج اُسکا انداز کچھ پر سکون سا تھا۔

''بہت پیارا نام ہے۔''وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

---------+---------+--------

رضا کا دوسرا مرحلہ بھی باخیر وخوبی مکمل ہو گیا، وہ اب بنا سہارے کے چلنے لگا تھا، ہلکی پھلکی بات کر لیا کرتا تھا۔ کتابیں پڑھنے لگا تھا، کچھ دیر ٹی وی دیکھ لیتا۔ اب اصل طور پر اُسکی rehabiliation کا وقت تھا۔ تیسرے مرحلے میں اسکی انفرادی تو کبھی گروپ کی شکل میں تھیراپی ہوتی۔

انفرادی تھیراپی میں اُس نے بولنے میں بہت وقت لیا، کافی وقت وہ تھیراپسٹ کے سامنے منہ بند کیے، دیواریں تکنے میں گزار دیتا۔ آہستہ آہستہ اُسے سب یاد آنے لگا تھا، اُسکی مایوسی اب غصّے میں بدلنے لگی تھی۔ نشہ کرنے پر ندامت اندر ہی اندر سر اٹھانے لگی۔

''میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟''

''میں نے یہ کیا کر دیا؟''

ایسے سوالات اب ہر وقت ستاتے رہتے، یہ تیسرا مرحلہ جسے therapeutic phase کہتے ہیں، یہ دراصل اپنے آپ سے جنگ لڑنے کا مرحلہ تھا، یہ خود کو پہچاننے اور خود کو سمجھنے کا مرحلہ تھا۔ ایک روز بلآخر اُس نے اپنا سارا دکھ، سارا ماضی تھیراپسٹ کے سامنے کہہ سنایا۔ اُس روز ہارون صاحب دوسرے کمرے میں بیٹھے سب سن رہے تھے، اُسکی کہانی سن کر بے شک انکا بھی دل دکھا لیکن کہیں نہ کہیں اِس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ وہ اب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا تھا۔ جب اُس نے سب کہہ سنایا تو اپنا آپ کچھ کچھ بہتر لگنے لگا۔ لیکن ساتھ خود پر غصّہ آنے لگا، کہ آخر اُس نے یہ اپنے ساتھ کیا ہی کیوں؟ وہ کیوں اتنا مایوس ہو گیا؟ اتنی اذیت سہہ کر اسکی ماں نے کبھی مایوسی اختیار نہیں کی، تو وہ اُس ماں کا بیٹا ہو کر ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ اِس سے پہلے کہ وہ احساسِ ندامت کی وجہ سے دوبارہ ڈپریشن میں جاتا، اُسکی گروپ تھیراپی شروع ہو گئی۔

وہ تو فطرتاً بھی سب سے الگ تھلگ رہنے والا انسان تھا، گروپ تھراپی میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایک لفظ نہ بولتا۔ ڈاکٹر بھی اُسے کچھ نہ کہتے، اُسکی خاموشی کو ہی اسکی طرف سے participation (حصّہ ڈالنا) سمجھا جاتا۔ وہ کوئی رد عمل نہ دیتا پر سنتا سب تھا۔ اُنکی کہانیوں نے اُسے احساس دلایا کہ وہ اِس جنگ میں اکیلا نہیں ہے۔ اُن سب لوگوں کی داستان سن کر اپنے اوپر آیا غصّہ جانے لگا، خود کو قصوروار ٹھہرانے کی بجائے، خود کو بدلنے کی امید جاگنے لگی۔ وہ پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا۔ آخر میں ڈاکٹروں نے اُسے relapse سے بچنے کے تمام طریقے سکھائے۔ لیکن ایک شے، جس نے ہارون صاحب کو پریشان کیا، وہ تھا رضا کا سیگریٹ پینا۔

گروپ تھراپی کے دوران کسی مریض سے رضا نے سیگریٹ لے لی تھی اور اب وہ کبھی کبھار پیتے ہوئے نظر آنے لگا تھا۔ اُس سے بھی زیادہ اور شدید حیرت اس بات کی تھی کہ ڈاکٹر اِس چیز کو نظر انداز کر رہے تھے یا جان کر کچھ نہیں کہہ رہے تھے؟ rehab سینٹر میں اکثر مریض سیگریٹ پیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہارون صاحب پریشان تو تھے پر خاموش رہے۔

جب اُسکا تیسرا مرحلہ مکمل ہوا تو ڈاکٹر نے اُنہیں بلوایا۔

''اب رضا گھر جا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی۔

''پر آپ نے تو چوتھے مرحلے کا کہا تھا۔'' وہ حیران ہوئے۔

''یہی چوتھا مرحلہ ہے۔ اور یہ مرحلہ ساری زندگی رہے گا۔ اسے aftercare کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں رضا اپنی عملی زندگی شروع کریگا لیکن فالواپ (وقتاً فوقتاً جانچ) کے لیے آتے رہنا ہو گا۔ ایک آدھ دوائیں بھی چلیں گی۔ اُسکے علاوہ اسے کرونیک مائیگرین کا مسئلہ بھی ہے۔ جب کبھی اسکی حالات بہت زیادہ بگڑے اور ایسا لگنے لگے کہ اُسکے ہاتھ پیر سن ہو رہے ہیں تو فوراً ہسپتال لائیں، اگر ہسپتال لانا ممکن نہ ہو تو ایک دوا میں نے رضا کو دی ہے، جو اُسے ساری زندگی اپنے پاس رکھنی ہے، لیکن کسی ناگزیر صورتحال کے علاوہ اُسے استعمال نہیں کرنا۔'' وہ تمام تفصیل بتاتے رہے اور ہارون صاحب سنتے رہے۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن رضا۔۔۔'' وہ ذرا رکے، ''وہ سیگریٹ پینے لگا ہے۔'' اُنہوں نے پریشانی سے کہا۔

''ہاں! میں جانتا ہوں، اکثر مریض پیتے ہیں۔'' اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''تو آپ منع نہیں کرتے؟'' وہ حیران ہوئے۔

''یہ بھی علاج کا طریقہ ہے، کچھ مریضوں کے لیے ہمیں یہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے ہم ہارم ریڈکشن اپروچ (نقصان کم کرنے کی حکمتِ عملی) کہتے ہیں۔ یہ دماغ کو فعال رکھنے کے لئے ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ سیگریٹ اچھی شے ہے، مگر فلحال، نشے کی طرف واپس پلٹنے سے بہتر سیگریٹ ہے۔ ہم ہر شے کو ایک ساتھ ختم نہیں کر سکتے، کچھ باتوں پر فلوقت سمجھوتہ کرنا پڑے گا، اگر وہ کم نقصان دہ ہوں۔ ڈرگز اور الکوحول سیگریٹ سے سو گنا زیادہ نقصان دہ ہے۔ اور

ہمیں یقین ہے جو نشہ چھوڑ سکتا ہے وہ سیگریٹ بھی چھوڑ ہی دے گا۔ اگر سیگریٹ اُسے واپس وہاں جانے سے روکے رکھتا ہے توفی الحال یہی بہتر انتخاب ہے، لیکن تم ابھی اُسکے ساتھ کوئی زبردستی نہ کرنا۔'' ہارون صاحب کو بات سمجھ آگئی۔ وہ پر سکون ہوتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رضا آخری بار تمام ڈاکٹروں، اپنے ساتھی مریضوں سے اچھے سے مل کر ہارون صاحب کے ساتھ آگیا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کریگا؟ ابھی اُس نے اپنا مستقبل نہیں سوچا تھا لیکن اُسکو ایک بات معلوم تھی کہ اب وہ دوبارہ کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ کیونکہ قسمت بار بار مہربان نہیں ہوتی۔ یہ بھی شاید اُسکی مرحوم ماں کی دعائیں تھی جو وہ اُس کڑے وقت سے نکل آیا ورنہ تو وہ اپنی زندگی برباد کر ہی چکا تھا۔

ہارون صاحب پہلے اسے ایک اچھے سے مردانہ سیلون میں لے آئے۔ اُسکے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی انہوں نے اسکو سیلون والے کے حوالے کر دیا، اُس نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر رضا کا مرجھایا چہرہ نکھار دیا۔ پھر وہ اُسے لیے ایک اچھے سے ریسٹورانٹ آئے، وہاں اُسکے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اُسے اپنے گھر لے آئے۔

---------+---------+--------

وہ اُنکے گھر تو آگیا تھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ بے چین سا ہے، یقیناً انکا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُسے آئے چوتھا روز تھا، جب اُنہوں نے ایسے ہی اُس سے اُسکی تعلیم کے بارے میں پوچھ لیا۔

''ایم بی اے کیا ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے اپنے پاس منیجر کی ضرورت ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو۔۔۔۔''

''میں مزید آپکا احسان نہیں لینا چاہتا۔ مجھے خود سے کچھ کرنا ہے۔ لیکن۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟''

''میرے پاس میرے کسی قسم کے کوئی ڈاکومنٹس (کاغذات) یا ڈگری وغیرہ نہیں ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیسے لوں؟'' اُس نے پریشانی سے کہا۔

''اُسکی فکر نہ کرو، وہ میں کر دیتا ہوں۔ ابھی مجھے یہ بتاؤ، جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سب کیا، کیا تم اُن سے بدلا نہیں لوگے؟ کیا انہیں ایسے ہی چھوڑ دو گے؟'' انکا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''کیا مطلب؟'' اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''اُس روز جب تم تھراپسٹ کو سب بتا رہے تھے تب میں بھی وہیں تھا، مگر دروازے کے پیچھے۔۔۔ خیر! یہ تو ثانوی باتیں ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا تم اُن سے انتقام لینا نہیں چاہتے؟''

''کیسے؟ کیسے لے سکتا ہوں میں انتقام؟ میرے پاس تو خود کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔'' اُس نے تلخی سے کہا۔

''تمہارے باپ کی جائیداد میں تمہارا حق ہے، میں ایک وکیل ہوں، بہت آسانی سے تمہارے باپ کو تمہیں اٹھارہ سال تک خرچہ اور مالی تعاون فراہم نہ کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔'' اُنہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹھے تھے، موسم خوشگوار تھا۔

''مجھے اُنکے پیسوں میں سے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔'' اُس نے حتمی انداز میں کہا، تو ہارون صاحب خاموش ہوئے۔ پھر یکدم ہی رضا سیدھا ہوا۔

''کیا آپ جائیداد کے تنازعے پر کیس لڑتے ہیں؟'' اُس نے اچانک ہی پوچھا۔

''ہاں! میں فیملی لائر ہوں، یہ میرا کام ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اگر باپ کی جائیداد کے لیے پوچھ رہے ہو تو وہ ابھی زندہ ہیں اور۔۔۔''

''میں انکی بات نہیں کر رہا۔'' رضا نے انکی بات کاٹی۔

''پھر؟'' اُنہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بغور اُسے دیکھا۔

''میرا ننھیال و ددھیال، دونوں ہی مالی طور پر بہت مستحکم تھے۔ بلکہ نانا نانی تو کافی رئیس تھے۔ اپنی کئی زمینیں اور مکان وغیرہ تھے اُنکے، مجھے اچھے سے یاد ہے کہ دادی بتاتی تھیں کہ نانا نانی نے اپنے ترکے میں کئی زمینیں چھوڑی تھیں، جن میں سے امی کے حصے میں دو تھیں، یا شاید تین۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں! دادی اکثر امی کو کہتیں کہ وہ زمینیں واپس لے لیں، کیونکہ وہ ماموں نے قبضہ کر رکھی تھیں۔ پر امی کہتیں کہ کوئی فائدہ نہیں، وہ زمینوں کے لیے کیس کر بھی لیں، اور وہ مل بھی گئیں، تو اُس پر میرے ابّو قبضہ کر لیں گے۔ اُسکے علاوہ ایک گھر جس میں میری زندگی گزری، اور جس میں اب ماموں لوگ رہتے ہیں وہ بھی دادی نے امی کے نام کیا تھا۔ پر اُس پر بھی ماموں کا قبضہ ہے۔'' اُس نے یاد کر کے بتایا۔

''بہترین! تمہاری ماں کے مرنے کے بعد یہ سب تمہارا ہے رضا! تمہارے ماموں کا اس پر کوئی حق نہیں۔'' اُنہوں نے کہا۔

''پر میں کیسے وہ سب واپس لوں؟ اگر مجھے میرا حصّہ مل جائے تو مجھے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا، اور نہ ہی کسی کا احسان لینا پڑے گا۔ کیا آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟'' اُس نے پوچھا، اتنے عرصے میں پہلی بار وہ پُر اُمید اور پُر جوش نظر آیا تھا۔ ہارون صاحب خوش ہوئے۔

''ہاں! مجھے ایک ہفتے کا وقت دو، میرا ایک دوست تمہارے تمام ڈاکومنٹس کی کاپی نکال لے گا۔ بس اسکے لیے کل تمہیں نادرا چلنا ہوگا، تمہارے انگوٹھے کے نشان کے ذریعے ہم تمہارے تمام کاغذات نکلوا لیں گے۔ پھر میں عدالت میں تمہارے ماموں پر دعویٰ کروں گا۔'' اُنہوں نے اپنا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

''مجھے میرا حق مل جائیگا نا؟''اُس نے پوچھا،ہارون صاحب اُسکی آنکھوں میں جلتے اُمید کے دیے بجھانا نہیں چاہتے تھے۔

''بالکل مل جائے گا،میرا وعدہ ہے تم سے رضا! میں واپس لاؤں گا۔''انہوں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہاتو پہلی بار وہ مسکرایا،احسان مندی سے۔کچھ لوگ بہت ہی عجیب دل لیکر پیدا ہوتے ہیں،بے لوث،بے غرض اور مخلص۔وہ اللہ کی مخلوق سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اُن پر فرشتے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ہارون صاحب بھی انہی میں سے تھے۔اور حسین؟ رضا کو یکدم ہی اپنا دوست یاد آیا۔اور اسکے اِس طرح اچانک یاد آنے پر وہ خود بھی حیران رہ گیا۔اُس نے سوچوں و یادوں کو جھٹکنے کیلئے سیگریٹ نکال کر جلائی۔

''تم یہ پینا نہیں چھوڑو گے؟''اُسے سگریٹ جلاتا دیکھ کر ہارون صاحب نے پوچھا۔

''Once an addict, always a recovering addict''

اُس نے ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یاد دلائے تو وہ ہنس دیئے۔

---------+---------+--------

ہارون صاحب واقعی اپنے پیشے کے بہت ماہر تھے،جب اُنہوں نے رضا کے ماموں کو عدالت کی طرف سے نوٹس بھجوایا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا۔بھلا آٹھ نو ماہ سے لاپتہ رضا اچانک سے واپس کیسے آگیا؟اور اُس پر سے اُسکے پاس اتنے پیسے کہاں سے آگئے کہ وہ اُن پر دعویٰ کرے؟پہلی سماعت پر تو انہوں نے عدالت آنے کی زحمت ہی نہ کی۔دوسری سماعت پر اُنکی گرفتاری کے وارنٹ نکل آئے۔ تب جا کر انہیں احساس ہوا کہ معاملہ پیچیدہ ہے۔وہ اپنی ضمانت کروانے کے بعد ایک اچھا وکیل کر کے عدالت حاضر ہوئے۔

کئی ماہ تک عدالتوں کا چکر لگتا رہا۔ہارون صاحب بڑے منجھے ہوئے وکیل تھے،نجانے کہاں کہاں سے اُنکا پورا شجرہ نسب نکال لائے تھے؟

رضا کو تو ٹھیک سے معلوم نہ تھا،لیکن حکومتی ریکارڈ کے ذریعے تمام باتیں سامنے آگئیں۔اُسکے نانا نانی کی چھوڑی گئی جائیداد میں سے تین زمینیں رضا کی ماں کی تھیں،جو یقیناً اب رضا کی ہونی چاہیے تھیں،اسی طرح وہ بنگلہ جس میں وہ رہتے تھے،وہ بھی اُسکی ماں کے نام تھا۔ہر سماعت پر رضا کے ماموں بری طرح ناکام ہوتے اور بلآخر وہ یہ کیس ہار گئے۔عدالت نے فوری تمام زمینیں رضا کے حوالے کرنے کا حکم دیا تھا۔بنگلے پر انہیں ایک سال کا اسٹے مل گیا تھا۔

''اُن میں سے ایک زمین پر میرا کاروبار چلتا ہے۔میں وہ کیسے واپس کروں؟''اُنہوں نے چہرے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو قبضہ کرنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' قاضی کا تبصرہ دوٹوک تھا۔

''پر وہ تو میری بہن نے خود مجھے دی تھیں کہ وہ یہ سب نہیں سنبھال سکتی تھی۔''اُنہوں نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ اس ایک بات کو ثابت کرنے کے لیے پورا مقدمہ لڑ چکے ہیں لیکن پھر بھی ثابت نہ کر سکے، اُسکے بعد بھی پھر وہی جھوٹ؟'' قاضی صاحب کو غصّہ آ گیا تھا۔

''مم۔۔۔ میں اُس زمین کی قیمت ادا کر دوں گا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟'' وہ سچ مچ پریشان ہوئے تھے۔

''وہ آپ دونوں فریقین کا آپسی مسئلہ ہے، اگر بیٹھ کر، بات چیت کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے تو عدالت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' مقدمے کی سماعت ختم ہو گئی۔

کمرہ عدالت کے باہر یہ معاملہ حل کر لیا گیا کہ وہ رضا کو تین میں سے دو زمینیں واپس کر دیں گے، جبکہ تیسری زمین، جس پر انکا کاروبار کھڑا تھا، اُسکی قیمت ادا کر دیں گے۔ اُنکی پوری کوشش تھی کہ زمین کی کم سے کم قیمت ادا کریں۔ لیکن ہارون صاحب کے آگے اُنکی ایک چالاکی کام نہ آئی۔

''بنگلے پر ملنے والا اسٹے کافی لمبا ہے، مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اُس کی بھی قیمت لے لینی چاہیے تھی۔ یہ آدمی بعد میں بھی اُسے نہیں چھوڑے گا۔'' جب تمام معاملات حل ہو گئے، رضا کو زمین کی قیمت، ایک خالی پلاٹ اور ایک پوش علاقے میں بنا بنگلہ جسے اُسکے ماموں نے کرائے پر دیا ہوا تھا، مل گیا۔ تب ہارون صاحب نے ایک روز اُس سے پوچھا۔

''بنگلے کا معاملہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ کچھ چیزوں کو وقت پر چھوڑ دینا چاہیے، ابھی آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اُس نے پیسوں اور زمینوں کے متعلق اُن سے مشورہ لینا چاہا۔

''بنگلہ کرائے پر رہنے دو، اُسکا کرایہ ٹھیک ٹھاک آتا ہے۔ تمہارا ماہانہ گزر بسر اچھے سے ہو گا۔ پلاٹ کے بارے میں میری رائے تو یہ ہے کہ تم کوئی کاروبار شروع کر لو۔'' آج کل، ہارون صاحب کی بدولت اُسے کچھ ٹیوشن مل گئے تھے۔ وہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے لگا تھا۔

''میں اُس بنگلے کو فلحال خالی نہیں کروا رہا۔ لیکن کچھ عرصے بعد میں خود وہیں منتقل ہوں گا۔ پلاٹ کے بارے میں میری خواہش ہے کہ میں وہاں اسکول بنوا لوں۔ ماموں نے زمین کی جو قیمت ادا کی ہے، اُس سے اسکول کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے نا؟'' اُس نے جاننا چاہا۔

''بالکل! اسکول کی تعمیر اُن پیسوں سے باآسانی کی جا سکتی ہے، بلکہ رقم اچھی خاصی ہے، تم اسکول کا فرنیچر اور دیگر کام بھی باآسانی کر سکتے ہو۔'' اُنہیں رضا کی بات پسند آئی۔ اگلے دن سے رضا نے اسکول کی تعمیر کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اُسے مسلسل محنت میں جتا دیکھ ہارون صاحب کو تسلی ہوتی، وہ وقتاً فوقتاً اُسکی رپورٹ ڈاکٹر کو دیتے رہتے۔ اُسکی اس خوش آئند تبدیلی کو ڈاکٹر بہترین قرار دے رہے تھے۔

سال بھر بعد اُسکا اسکول نہ صرف مکمل تعمیر ہو گیا، بلکہ رضا نے اُس میں اچھا خاصا فرنیچر، بہترین انٹیریئر اور اسکول کی ٹھیک ٹھاک مارکیٹنگ بھی کروائی تھی۔ یہ تمام کام وہ بنگلے سے آنے والے کرائے سے کرتا تھا۔ اپنا گزر بسر وہ ٹیوشن کے پیسوں سے کر لیتا، ہارون صاحب سے ایک روپیہ نہ لیتا۔ وہ بھی اسکی

خوداری کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے، لہٰذا اُسے کچھ نہ کہتے۔ سال بھر بعد جب اسکول فعال کرنے کا وقت آیا تو، اُسکے کرائے دار اپنے آپ ہی گھر خالی کر کے چلے گئے۔ اُنکے جانے کے بعد رضا اسی گھر میں منتقل ہو گیا۔ بنگلہ پرانا تھا، کافی جگہ سے خستہ حال بھی تھا۔ رنگ وروغن کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن فلحال اُسے ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے صرف اسکول کے فعال ہونے کا انتظار تھا۔ لیکن اسکی اُمید کے برعکس، کوئی داخلہ نہ آیا۔ اُس پر سے اُس نے اساتذہ کرام کے لیے بھی آسامیاں بھرتی کرنی شروع کر دی تھی، ابھی اسکول صرف پرائمری تک تھا لیکن پھر بھی عملے کی ضرورت تو تھی۔ کرائے داروں کے جانے کے بعد اُسے یہ پریشانی ہونے لگی کہ اگر بچے نہ آئے تو وہ عملے کو کیسے تنخواہ دے گا؟ ابھی بھرتیاں شروع نہیں ہوئی تھیں، لیکن دو ماہ بعد سے اُسے باقاعدہ پڑھائی شروع کروانی تھی۔ لیکن داخلے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر کوئی آتا بھی تو بس اسکول کے متعلق معلومات لیکر چلا جاتا۔ اِس صورتحال نے اُسے ٹھیک ٹھاک پریشان کر دیا تھا۔ ہارون صاحب کو الگ فکر لاحق تھی کہ اگر اسکول نہیں چلا تو کہیں وہ دوبارہ مایوسی کا شکار نہ ہو جائے۔

''تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی۔ اب سب اللہ پر چھوڑ دو۔'' وہ اُسے تسلی دیتے تو وہ کچھ نہ کہتا۔

کیا کہتا؟ اللہ کے سامنے جانے سے تو وہ ڈرنے لگا تھا۔ اپنی حرکت کے بعد سے دعا مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اسی طرح پریشان سا ایک روز وہ باہر نکلا، ارادہ سیگریٹ خرید کر پینے کا تھا۔ خاموش سنسان سڑک پر وہ پیدل چل رہا تھا، جب اسے کسی بچے کی رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ اِس سنسان سڑک پر بھلا کوئی بچہ کیوں موجود ہو گا؟ لیکن رونے کی آواز مستقل آتی رہی۔ وہ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا، اور تب ہی اسکی نگاہ ایک درخت کے نیچے کھڑی اُس بچی پر پڑی، جو گلابی رنگ کا کاٹن کا فراک پہنے کھڑی، درخت کو خوف زدہ انداز میں تھامے رو رہی تھی۔ رضا ششدر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے بچی کے پاس آیا۔

''کون ہو بیٹا آپ؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اُس نے بچی کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تو وہ ڈر کر پیچھے ہوئی۔

''او کے او کے۔۔۔ ڈرو نہیں!'' رضا نے فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔

''مجھے بتاؤ! آپ کون ہو؟ اور کیا کر رہی ہو یہاں؟ امی ابّو کہاں ہیں؟'' اُس نے آرام آرام سے پوچھا۔ بچی عمر میں تقریباً پانچ چھے سال کی لگتی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا، بس روتی رہی۔

''بھوک لگی ہے؟ کچھ کھاؤ گی؟'' رضا نے مزید پوچھا تو اسکے رونے میں کمی آئی، آنسو بھری معصوم آنکھوں سے اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا! یہ دیکھو! میرے پاس سینڈوچ ہے۔ تم کھاؤ گی؟'' وہ سیگریٹ لینے گیا تھا لیکن پاس بیکری سے ایک سینڈوچ بھی خرید لیا تھا۔ وہی اُسکی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے پہلے رضا کو دیکھا، پھر سینڈوچ کو۔ پھر درخت کو چھوڑ کر ہاتھ آگے بڑھایا اور سینڈوچ لے لیا۔ رضا نے سکھ کا سانس لیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' جب بچی کا خوف کچھ کم لگنے لگا تو اُس نے پوچھا۔

''شیزا!''اُس نے جواب دیا۔

''شیزا!امی ابّو کہاں ہے آپکے؟''اُس نے پیار سے پوچھا۔وہ بڑی رغبت سے سینڈوچ کھا رہی تھی۔پتہ نہیں کتنے وقت کی بھوکی تھی؟

''امی ابّو۔۔۔نہیں ہیں۔''اس نے منہ میں بڑا سا نوالہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہیں مطلب؟کہاں ہیں؟''وہ سمجھا نہیں۔

''مر گئے،اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔''اُس نے بتایا تو وہ ساکت رہ گیا۔

''تت۔۔۔تو۔۔۔تو تم یہاں کیسے آئی بیٹا؟''اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''چاچو نے مجھے مارا،اور پھر یہاں چھوڑ گئے۔''بولتے بولتے اُسکی آنکھوں میں پھر سے آنسو نمودار ہونے لگے،رضا کا دل کٹا۔ بہت دیر وہ چپ چاپ شیزا کو دیکھتا رہا جو سینڈوچ ختم کر کے اب گم صم سی بیٹھی تھی۔ پھر گہری سانس لیتا کھڑا ہوا۔

''آپ جا رہے ہیں؟''رضا کو کھڑا ہوتا دیکھ وہ پھر سے خوفزدہ ہوئی۔

''نہیں!ابھی نہیں جا رہا،تمہارے چاچا آجائیں تو پھر تمہیں انکو دے کر چلا جاؤں گا۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔وہ مجھے مارتے ہیں۔''وہ پھر سے رونے لگی تو اُس نے دکھ سے بچی کو دیکھا۔بھلا اُسکا چچا اگر اسے لینے آنے والا ہوتا تو یہاں چھوڑ کر جاتا ہی کیوں؟اُسے سمجھ نہیں آیا کیا کرے؟شیزا کو یہاں چھوڑ کر جانے پر بھی دل راضی نہیں ہو رہا تھا۔بلآخر اُس نے شیزا کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اُسے لیے اپنے گھر آگیا۔گھر میں کھانے پینے کی کوئی شے موجود ہی نہ تھی۔وہ اکیلا آدمی تھا،کبھی سینڈوچ تو کبھی ڈبل روٹی پر ہی گزارا کر لیتا،کبھی کبھار باہر سے دو روٹیاں لے آتا اور بس۔راشن نام کی کوئی شے تو گھر میں تھی ہی نہ۔ بچی بیچاری تھکی ہوئی تھی،سونے کی جگہ میسر آئی تو صوفے پر ہی سو گئی۔رضا اسے لے تو آیا تھا،پر اب اُسکے کھانے پینے اور رہنے کے متعلق فکر مند تھا۔

پاس رکھی کرسی سے سر ٹکائے،وہ پیسوں کے بارے میں سوچنے لگا،اُسکے پاس ابھی اتنی رقم موجود تھی کہ وہ اس بچی کے لیے کچھ سامان اور دس پندرہ دن کا راشن خرید سکتا تھا۔ٹیوشن کی فیس آنے میں ابھی ایک مہینہ پورا تھا۔جب تک گھر کرائے پر تھا،اسے پیسوں کی پریشانی نہ تھی،لیکن اب ہونے لگی تھی۔ ہارون صاحب اُس سے اکثر ملنے آتے تھے،وہ سب ٹھیک ہے کی رپورٹ انہیں دیتا،کبھی اپنے حالات نہ بتاتا کہ مزید انکا احسان نہیں چاہتا تھا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے شیزا کو ساتھ لیے بازار گیا، اُسکے لیے کچھ ضروری سامان، جیسے کہ ٹوتھ برش، کچھ کپڑے، پونیاں اور کنگھی وغیرہ لیں۔ پھر گھر کے کھانے پینے کا سامان لیکر جب وہ واپس آیا تو دن کے بارہ بج چکے تھے۔ اُس نے پہلی بار خود سے کھانا پکایا پھر شیزا کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ بہت دن بعد اُسے لگا کہ دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے۔ خیر! اُس روز بھی وہ اسکول کے بارے میں سوچتا رہا۔ پر کچھ حاصل نہ ہوا۔

اگلے روز وہ اسکول آیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، انتظار گاہ میں والدین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ سب داخلے کے لیے وہاں موجود تھے۔

اگلے پندرہ روز تک ناقابلِ یقین حد تک داخلے ہوئے تھے۔ وہ جو مشکل سے پچاس بچوں کا داخلہ ہی سوچے بیٹھا تھا، اب اُسکے اسکول میں ساڑھے تین سو بچے انرول ہو چکے تھے۔ ہارون صاحب کے نزدیک یہ معجزہ تھا، جبکہ اسکے نزدیک یہ شیزا کی قسمت تھی۔ وہ اپنے نصیب کا رزق ساتھ لائی تھی۔

اسکول سے آنے والے پیسوں کو اُس نے محفوظ کرنا شروع کر دیا۔

''تم جو پیسے جمع کر رہے ہو، میرے خیال سے تم اُس سے نئی برانچ کھول لو۔'' ہارون صاحب نے اُسے ایک دن مشورہ دیا تھا۔

''ابھی نئی برانچ کے لیے پوری ٹیم ہائر کرنی پڑے گی۔ اتنے پیسے نہیں ہو سکے گے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھو! اچھے خاصے والدین اپنے بچوں کا داخلہ سیکنڈری میں کروانا چاہتے تھے، پر تمہارا اسکول پرائمری تک ہی ہے۔ تم اگلے بیچ میں پرائمری اور سیکنڈری دونوں میں داخلے لینا، جگہ اور فرنیچر دونوں ہی ہیں تمہارے پاس، دیکھنا تمہاری آمدنی کیسے بڑھے گی۔''

''آمدنی بڑھے گی تو خرچہ بھی تو بڑھے گا۔'' اُس نے کہا۔

''اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم ان پیسوں کو انویسٹ کر دو۔'' رضا کو اُنکی بات معقول لگی، اُس نے اللہ کا نام لیکر اسی علاقے میں ایک اور بنگلہ کرائے پر لے لیا، اُسے نئے سرے سے تعمیر کروانے کی بجائے، اُس نے اسکی رنوویشن کروانا مناسب سمجھا تھا۔ شیزا کو وہ اپنے ساتھ اسکول لیکر جاتا تھا۔ ذہین بچی تھی، خوشی خوشی پڑھتی تھی۔

ایک روز اسکول سے واپسی پر ایک پرانے سے گھر کے باہر بیٹھی ایک خاتون پر اُسے شناسائی کا گمان ہوا تو وہ رکا۔ اور اگلے ہی لمحے ٹھہر گیا، وہ عائشہ جی تھیں۔ اُسکی پھپھو کی بیٹی، جو اُسے بچپن سے ہی بہت پسند تھیں۔ وہ اُسے بالکل اپنی ماں کی طرح مہربان لگتی تھیں۔ پر وہ یہاں کیا کر رہی تھیں؟ اُس نے چہرہ اُٹھا کر گھر پر لگا بل بورڈ دیکھا۔ وہ ایک دارالامان تھا۔

''عائشہ جی یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ سوچتے ہو گاڑی سے اترا اور انکے پاس چلا آیا۔

''عائشہ جی!'' وہ کچھ اور بوڑھی خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں، حالات بہت اچھے نہیں تھے پر چہرے پر نور ہی نور سمایا ہوا تھا۔

''تم؟''اُنہوں نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔

''تم۔۔۔۔تم رضا ہو نا؟واصف ماموں کے بیٹے؟''اُنہوں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ بھلا اُسکے علاوہ کون اُنہیں عائشہ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا؟

''ہاں! میں رضا ہی ہوں۔آپ یہاں کیسے ؟اور کیوں؟''وہ پنجوں کے بل اُنکے قدموں میں بیٹھ گیا۔شیز اساتھ ہی کھڑی حیرت سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے بیٹا؟خاندان والے تو کہتے تھے کہ تم گھر سے بھاگ گئے۔''اُنہوں نے اسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں بس۔۔۔۔تھا کہیں۔۔۔آپ بتائیں! کیا کر رہی ہیں یہاں؟''

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں بے اولاد ہوں۔شوہر کا انتقال ہو گیا تو کوئی وارث نہیں بچا۔جیٹھ نے گھر پر قبضہ کر کے مجھے یہاں چھوڑ دیا۔''رضا کا دل دکھا۔یہ دنیا مال و دولت کے لیے اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی کہ آخرت ہی بھول چکی تھی؟

وہ عائشہ جی کو راضی کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ لے تو آیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ اُن سب کی کفالت کیسے کرنی ہے؟بس اللہ پر بھروسہ کر کے اُس نے ہر کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔اور پھر شاید! اللہ بھی اُس کی آزمائش کرنا چاہتا تھا،اسے متفرق واقعات میں چار مزید بچے ملے تھے،کوئی بچہ دکان پر کام کرتا ملا،جسے اُسکا مالک مار رہا تھا،رضا اُسے قانون سے ڈرا دھمکا کر بچے کو لے آیا۔کوئی بچہ سڑک پر اکیلے سوتا ملا،تو کوئی بچپن میں اغوا ہو گیا اور اب سڑکوں پر بھیک مانگ رہا تھا۔اس طرح کر کے اُسکے پاس مزید چار بچے ہو گئے،ایک شیز ا اور ایک عائشہ جی۔کل ملا کر چھے لوگوں کی کفالت کی ذمّے داری اُسکے سر پر آ گئی تھی۔عائشہ جی بخوشی بچوں کو سنبھال رہی تھیں،جس سے رضا کو کافی آسانی ہو گی تھی۔

انہی دنوں گرمیوں کی چھٹیاں قریب آنے لگیں،پہلے سال اُس نے جون جولائی کی فیس معاف رکھی تھی۔وہ annual چارجز بھی نہیں لیتا تھا۔پر اب اُسکے پاس پیسوں کی کمی ہونے لگی تھی۔اسکول کی دوسری برانچ،جس میں اُس نے کام شروع کروایا تھا،اُسے عارضی طور پر روکنا پڑا کہ بچوں کی کفالت اور عملے کو تنخواہ دینا زیادہ ضروری تھا۔

''تم چاہو تو میں ان میں سے کچھ بچوں کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔''ہارون صاحب نے اپنی طرف سے اسکا بوجھ کم کرنا چاہا۔

''نہیں ہارون بھائی! میں ان بچوں کو خود پالنا چاہتا ہوں۔''

''تو تم کسی این جی او یا کسی ادارے کی مدد۔۔۔۔''

''ہارون بھائی!''رضا نے سیدھے ہوتے ہوئے اُنکی بات کاٹی۔

''میں ان بچوں کو اپنے پیسوں پر پالنا چاہتا ہوں، یہ میرے بچے ہیں۔ یہ کسی کی خیرات یا زکوۃ پر نہیں پلیں گے۔''اُس نے نرمی سے سمجھایا تو ہارون صاحب مسکرا دیئے۔

''اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔''اُنہوں نے دعا دی۔

دن کچھ مزید سرکے تو اُسے حقیقتاً پیسوں کی تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کے بل، اور بچوں کے خرچے الگ تھے۔ وہ اور عائشہ جی تو ایک وقت کھانا کھا کر بھی گزارا کر سکتے تھے۔ پر بچے نہیں! یہ بچے پہلے ہی بہت برے حالات کا سامنا کر چکے تھے، انہوں نے پہلے ہی فاقہ کشی کی زندگی گزاری تھی۔ اب اور نہیں!

اُس روز عائشہ جی نے اسے پریشان دیکھ کر پاس بلایا۔

''یہ کچھ زیورات ہیں میرے پاس، تم انہیں لے لو۔''اُنہوں نے ایک پوٹلی میں بند کچھ کڑے اور کچھ چین لاکٹ وغیرہ اُسکے حوالے کیے۔

''میں یہ نہیں لے سکتا عائشہ جی!''اُس نے گھبرا کر کہا۔

''یہ برے وقتوں کے لیے تھا بیٹا، پر برے وقتوں میں یہ میرے کسی کام نہ آئے۔ ان بچوں کے کام آجائے یہ میرے لیے زیادہ خوشی کی بات ہو گی۔''

''پر یہ آپکے شوہر کی نشانی ہیں۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''شوہر ہی نہیں رہے تو نشانی رکھ کر کیا کروں گی؟''انکا جواب حتمی تھا۔ رضا نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ زیور لے لیے۔ وہ اتنے زیادہ نہ تھے پر ایک ماہ کا راشن اور بچوں کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ وہ زیور بیچ کر انکا سامان اور راشن لے آیا۔ پر اسے اگلے مہینے کا نہیں معلوم تھا۔ اسکول کھلنے میں دو ماہ تھے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرے گا؟

آخر ایک رات بے بس ہو کر وہ رو پڑا۔ اُسے اپنے گناہ یاد آئے، وہ حرام کام یاد آئے جو وہ مایوسی کی حالت میں کر چکا تھا۔

''یا اللہ! آپ نے مجھے ان بچوں کا کفیل بنایا ہے، تو انکا رزق بھی مجھ تک پہنچا دیں۔ میں بنا کسی بے ایمانی کے ان تک پہنچاؤں گا۔ اللہ! آپ ان معصوم بچوں کی خاطر میرے گناہ معاف کر دیں۔ میرے کیے کی سزا انکو نہ ملے۔ یا اللہ! میں بہک گیا تھا، گمراہ ہو گیا تھا۔ میں دنیا کی زندگی کو ہی سب سمجھ بیٹھا تھا، یہاں کی ناکامیوں کو آخر سمجھ بیٹھا تھا۔ میں بعد کی زندگی کو بھول گیا تھا یارب! مجھے معاف کر دے۔''اُس رات اُس نے رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ اُس رات وہ اتنا پریشان تھا کہ اسے ایک بار پھر سے شدید مائیگرین اٹھنے لگا، اُس رات حالت بگڑنے پر اُس نے پہلی بار Benzodiazpines لی تھی، ورنہ اُسکی حالت کافی خراب تھی۔

اگلی صبح اُٹھا تو اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اُسکی تنگدستی و پریشانی کا آخری دن ہو گا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اسکول آ گیا، نجانے کیا سوچ کر وہ اسکول آیا تھا؟ بس ایسے ہی وہاں آ کر بیٹھا رہا، کچھ غیر ضروری کاغذات دیکھتا رہا۔ دوپہر ہونے سے پہلے کچھ لوگ اُس سے ملنے آئے۔ رضا نے نہ پہلے انہیں کبھی دیکھا تھا، نہ وہ انہیں جانتا تھا۔

''جی کہیے؟ کیا مدد کر سکتا ہوں آپکی؟'' اُس نے انہیں اپنے آفس میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم آپکا اسکول کرائے پر لینا چاہتے ہیں۔'' وہ کل چار آدمی تھے، حلیے سے تو مہذب لگتے تھے۔

''کیا مطلب؟ میرا اسکول کرائے پر دینے کے لیے نہیں ہے۔'' اُسے اُنکی بات سمجھ نہ آئی۔

''میں سمیر باری ہوں، ایس بی پروڈکشنز کا مینیجر۔ ہم ملک کے مشہور اور معروف نجی ٹی وی چینلز کے لیے ڈرامے پروڈیوس کرتے ہیں۔ ہمارے مشہور ہونے والے ڈراموں کی تعداد بہت زیادہ ہیں۔'' وہ اپنا تعارف دیتے ہوئے بولا۔

''ہمم۔۔۔'' رضا نے سر ہلایا۔

''ہم اپنے ایک ہائی بجٹ ڈرامے کی شوٹنگ کرنے والے ہیں۔ ڈرامے کی کہانی اسکول کے اندر ہی گھومتی ہے لہٰذا ہمیں شوٹنگ کیلئے ایک بہترین اسکول چاہیے تھا۔ آپکا اسکول ایک اچھی لوکیشن (مقام) پر ہے۔ اور اسکے علاوہ آپ نے مینٹین (دیکھ بھال) بھی کافی اچھا کر رکھا ہے۔ لہٰذا ہم یہیں پر شوٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''بہت شکریہ آپ کا، پر اِس سے بچوں کی پڑھائی متاثر ہو گی۔'' اُس نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم شوٹنگ ابھی سے شروع کر دیں گے، گرمیوں کی چھٹیوں کے اختتام سے پہلے ہمارا ریپ اپ (شوٹنگ کا اختتام) ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایک آدھ سین بعد میں کرنے بھی پڑے تو ہم ویک اینڈ پر کر لیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہمارے پاس ایک اچھی پیشکش ہے۔''

''کس قسم کی پیشکش؟'' رضا نے پوچھا۔

''کرایہ ہم آپکو دیں گے ہی اور شوٹنگ کے دوران استعمال ہونے والی تمام بجلی و گیس کا بل بھی ہم بھریں گے، یہ تو اصولی بات ہے۔ البتہ پیشکش یہ ہے کہ، چونکہ ڈرامے کی کہانی اسکول کے گرد گھومتی ہے اور اس میں اسکول کا ذکر بہت زیادہ ہو گا، تو ہم آپکے اسکول کا اصل نام استعمال کر سکتے ہیں، لیکن اسکے لیے پھر آپکو بھی ہماری ایک بات ماننی پڑے گی۔''

''میں سننا چاہوں گا۔'' رضا کو پیشکش اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

''کرایہ ہماری مرضی کا ہوگا۔''

''مثلاً کتنا؟'' رضا نے پوچھا، اور جتنا کرایہ اُس نے بتایا وہ رضا کی سوچ سے کہیں زیادہ تھا۔ اُس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ وہ لوگ بخوشی اُسے اپنا نمبر دے کر چلے گئے۔ اگلے روز اُس نے ہارون صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد انہیں ہاں کر دی۔

شوٹنگ پر آنے سے ایک روز قبل ہی انہوں نے اُسے پہلے مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔ وہ لوگ واقعی بہت پیشہ ور قسم کے لوگ تھے۔ اُس نے پیسوں سے نہ صرف اگلے دو ماہ کا راشن ڈلوایا، بلکہ دوسری برانچ کے رکے ہوئے کاموں کو دوبارہ سے شروع کروا دیا۔

دو ماہ بعد جب شوٹنگ مکمل ہوئی تو اسکے پاس کافی خطیر رقم تھی۔ چند ماہ اچھے سے گزرے، پھر دوسرے بیچ کے داخلے سے پہلے ہی برانچ مکمل تعمیر ہو گئی اور وہاں فرنیچر بھی آ گیا۔ لیکن جس چیز نے رضا کو حیرت میں مبتلا کیا، وہ تھا داخلوں کا نہ رکنے والا سلسلہ۔ پہلی برانچ میں پری پرائمری سے لیکر سیکنڈری تک چار سو بچے داخل ہوئے تھے۔ پرانے والوں کو ملا کر یہ تعداد سات سو ہو گئی تھی۔ رضا کی یہ پہلی برانچ ٹھیک ٹھاک بڑی تھی۔ لہٰذا یہاں آرام سے سات سو بچے آ گئے تھے۔ باقی آنے والے داخلے اُس نے دوسری برانچ میں بھیجنے شروع کر دیئے، دوسری برانچ کے لیے ٹیم بھی جلد سے جلد بھرتی کی گئی۔ لیکن داخلوں کا نہ رکنے والا سلسلہ اتنا زیادہ ہو گیا کہ اسے مجبوراً **ایڈمشن کلوزڈ** کا بورڈ لگانا پڑا۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ ایس بی پروڈکشن کا ڈرامہ ملک بھر میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا، اور لوگ رضا کے اسکول کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر آنے لگے تھے۔

اسکی آمدنی چند مہینوں میں ہی اتنی زیادہ ہو گئی کہ اُسے اکاؤنٹنٹ، منیجر، اور اپنے ذاتی کاموں کے لیے سیکریٹری تک کو رکھنا پڑ گیا۔ وہ حیران رہ گیا کہ چند ماہ پہلے تک اُسکے پاس اگلے ماہ کے راشن کے پیسے نہیں تھے اور اب اُس سے اپنے اکاؤنٹس بھی نہیں سنبھل پا رہے تھے۔ یقیناً اسکا رب صرف ایک معافی پر ہی اتنا نواز دیتا ہے۔

اُس نے داخلوں کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے تیسری برانچ پر کام شروع کروا دیا، پہلی برانچ کو اسکول کے ہیڈ آفس کا درجہ دے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسے جیسے یتیموں کی کفالت کے لیے چن لیا تھا، اسے مزید بچے کفالت کے لیے ملنے لگے، کچھ لوگ خود دے جاتے، کچھ اُسے خود ملتے۔ ہر بچے کی آمد کے ساتھ اُسکی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہی چلا جاتا، یہاں تک کہ وہ ششدر رہ جاتا۔ اُس نے اپنے بنگلے کی رنوویشن شروع کروا دی، گھر کو جدید چیزوں سے آراستہ کیا، ہر طرح کی آسائش بچوں کے لئے مہیا کی اور اسے پناہ گاہ کا نام دے دیا۔ اُسکے اسکولوں کی دھڑا دھڑ برانچیں کھلنے لگی تھیں، ہر برانچ پچھلی برانچ سے زیادہ پیسہ کما کر دینے لگی تھی۔ اُس نے چار سالوں میں ترقی کی تمام منازل طے کر لی تھیں۔ دولت اللہ نے اتنی دے دی تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلے، پر وہ بھی مغرور نہ ہوا۔ جتنا اللہ نوازتا وہ اتنا عاجز و انکسار بنتا چلا گیا۔ اپنے سے غریبوں کو وہ اپنے ساتھ ہی بٹھاتا، اسکول کے چپڑاسی، چوکیدار اور صفائی والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا، اُنکے مسائل سنتا، کبھی کبھار اُنکے ساتھ ہنستا بولتا بھی نظر آتا۔

ایک روز وہ عائشہ جی کے پاس آیا اور انہیں ایک فائل دی۔

''یہ کیا ہے؟'' اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جو آپ نے میرے لیے کیا، اُسکا بدلہ میں کبھی نہیں اُتار سکتا۔ بس یہ چھوٹا سا تحفہ ہے آپکے لیے۔ قبول کر لیجئے۔'' اُس نے سر جھکائے کہا تو عائشہ جی نے فائل کھولی اور حیران رہ گئیں۔ وہ کسی فلیٹ کے کاغذات تھے۔

''رضا؟'' انہوں نے حیرت سے گنگ لہجے میں اسکا نام لیا۔

''یہ بس ایک فلیٹ ہے عائشہ جی، تاکہ آئندہ آپ کبھی بے گھر نہ ہوں۔ چاہیں تو اسے کرائے پر دے دیں، میں کرائے داروں کو ڈھونڈنے کا بندوبست کر دوں گا۔ اس طرح آپکے پاس اپنی ماہانہ آمدنی آتی رہے گی۔''

''پر جو تم ہر ماہ مجھے دیتے ہو؟ وہ کافی تو ہے بیٹا!''

''وہ آپکا حق ہے عائشہ جی! کوئی احسان نہیں کرتا میں۔'' اُس نے کہا تو اُنکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بچہ اُنکے ایک بار مسکرا کر دیکھنے کو، بچپن میں اُس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والی اپنی اس پھپھو زاد کو نہیں بھولا، تو اگر اسکا باپ اس سے محبت کرتا تو یقیناً یہ اپنا سب کچھ اُس پر وار دیتا۔ عائشہ جی کو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ بدنصیب وہ تھا یا اُسکا باپ؟

---------+---------+--------

وہ بہت مصروف رہنے لگا تھا، ان اس مصروفیات میں بھی وہ ہارون صاحب کے پاس آنے کا وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اُس روز بھی وہ اُن سے ملنے آیا ہوا تھا۔

''میں کبھی کبھار حیران ہوتا ہوں، تم اس وقت چوبیس بچوں کی کفالت کر رہے ہو۔ اور انکے لیے نہ کسی سے قرض لیتے ہو، نہ کوئی فنڈز۔ جو کام کرتے ہو اُسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہو۔ پارس ہو تم پارس۔۔۔'' ہارون صاحب نے کہا تو وہ ہلکے سے ہنسا۔

''یہ رزق کا نظام بہت انوکھا ہے ہارون بھائی! ہر انسان کے نصیب کا رزق اللہ نے لکھا ہے اور وہ اُسے پہنچاتا کر ہی رہتا ہے۔ چاہے وہ اُسے براہ راست پہنچائے یا اُسکے لیے وہ کسی بھی انسان کو ذریعہ بنا دے۔ اور جس انسان کو وہ ذریعہ بناتا ہے اُسکے پاس ہی، اُس شخص کا رزق آتا ہے جو اُسکے زیرِ کفالت ہے۔ یہ سب ان بچوں کا نصیب ہے، یہ انکے حصے کا رزق ہے جو مجھ تک آ رہا ہے۔ اِس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔'' اُس نے عاجزی سے کہا۔

''کمال تو ہے۔ ایک ساتھ اتنے بچوں کی زندگی بدل دینا، اُنکو گھر جیسی محبت اور فضا میسر کرنا، یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے؟'' اُنہوں نے کہا۔

''اور ایک ایسے لڑکے کی زندگی بدلنا، جس نے بس خود کو تباہ کر ہی لیا تھا، اسے کیا کہتے ہیں؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ بیساختہ ہنسے۔

''میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔''وہ بھی عاجز بندے تھے۔

''آپ خضر بن کر آئے ہیں میری زندگی میں،ایک مسیحا بن کر۔آپکا احسان تو میں کبھی نہیں اُتار پاؤں گا۔اگر آخرت میں اعمال میں کمی بیشی ہو،تو میں اپنے تمام نیک اعمال آپکو دینے پر تیار ہو جاؤں گا ہارون بھائی!کہ یہ سب سے کم ہے جو میں آپکے لئے کر سکتا ہوں۔''اُس نے عقیدت سے اُنکا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''یہ سب نہ کرو،بس جب تم کسی شخص کو بربادی کے دہانے پر دیکھو،تو جیسے میں نے تمہاری مدد کی،تم بھی اسکی مدد کرنا۔یقین مانو!مجھے اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے۔''اُنہوں نے بتایا تو رضا نے اس بات کو گرہ سے باندھ لیا۔

''اوہ ہاں!ایک ضروری بات بتانی تھی تمہیں۔۔۔''انہیں اچانک ہی یاد آیا تو سر پر ہاتھ مارا۔

''کیا؟''

''وہ تمہارے ڈاکٹر صاحب ہے نا؟اُنکے بھائی جامعہ کراچی کے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرپرسن ہیں۔انہیں فوری طور پر وزیٹنگ ٹیچر چاہیے۔شاید کمیونیکیشن یا مارکیٹنگ کا۔پر اُسکی تعلیم ایم بی اے ہو۔انہوں نے مجھے کہا،اور مجھے تم یاد آئے۔''

''لیکن،مجھے نہیں معلوم میں پڑھا بھی سکوں گا یا نہیں؟''وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''انٹرویو دینے میں کیا حرج ہے؟''اُنہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے!دیکھتا ہوں۔''اُس نے حامی بھری۔

''میں تمہیں نمبر دے دیتا ہوں،تم بات کر لینا۔جب وہ انٹرویو کے لیے بلائے،جانا ضرور۔''اُنہوں نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔پھر کچھ دیر اُنکے پاس ہی بیٹھا رہا،اُسکے بعد پناہ گاہ آ گیا۔

--+---------+---------+-------

''میں پہچان گیا تمہیں،تم شاید سن دو ہزار دس یا دو ہزار گیارہ کے بی بی اے کے بیچ میں تھے نا؟''اُسکا انٹرویو لینے کے بعد چیئرپرسن نے کہا۔

''ہاں!پھر میں نے ایم بی اے بھی کیا تھا،اسی ڈیپارٹمنٹ سے۔''اُس نے بتایا۔

''تو رضا!کیا تم اگلے مہینے سے ہمیں بطور وزٹنگ فیکلٹی جوائن کر سکتے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''ہاں! بالکل۔۔۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں اگلے ہفتے تک آفر لیٹر میل کر دوں گا۔''اُنہوں نے کہا، پھر رضا اُن سے مصافحہ کر کے باہر نکلا۔

وہ صبح آٹھ بجے یہاں آیا تھا۔ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور اس وقت سنسان پڑے تھے۔ سیمسٹر شروع ہونے میں ایک ماہ تھا، لیکن نجانے کیوں؟ اسے لگا جیسے جامعہ بھری ہوئی ہو؟ کاریڈور سے گزرتے خالی کلاسوں کی خالی کرسیاں، جن پر کھڑکیوں سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ پڑ رہی تھی، یکدم ہی طلبہ وطالبات سے بھری بھری لگنے لگی تھی۔

استاد صاحب بورڈ پر کھڑے ہو کر کچھ پڑھا رہے تھے۔سال دو ہزار دس کی تاریخ بورڈ پر لکھ رکھی تھی۔راہداری میں کھڑے رضا نے کلاس کے پیچھے والے دروازے کی جانب دیکھا۔وہاں وہ چھے وجود کھڑے آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔وہ کلاس میں پہنچنے میں لیٹ ہو چکے تھے۔اب اندر جانے کے طریقے پر غور وخوص کر رہے تھے۔

جب یاد کا قصّہ کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

میں گزرے پل جو سوچوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

''حسین! وہاں کیا کر رہے ہو؟''استاد صاحب کی نظریں حسین پر پڑ گئیں۔اب حسین حیلے بہانے بنا رہا تھا۔اور استاد صاحب بھی بڑی فرصت سے اسکا ہر ایک بہانہ رد کر رہے تھے۔کلاس کے باقی سٹوڈنٹس لطف اندوز ہوتے ہنس رہے تھے، رضا مسکرایا تھا۔

اور یکدم ہی استاد صاحب کا عکس ہوا میں تحلیل ہوا پھر ایک ایک کر کے سب غائب ہونے لگے۔اُس نے چہرہ گھما کر دوبارہ دیکھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ راہداریاں خاموش تھیں، کلاس خالی اور اُسکا دل بھی خالی۔۔۔وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا، اور راہداری سے باہر نکل آیا۔

باہر باغ میں بنے ریمپ کے پاس پھر سے مجمع لگنے لگا تھا۔ حسین صاحب جماعت کے لڑکوں کو ارد گرد کھڑا کیے، انکا ہاتھ دیکھتے اُنکے مستقبل کی پیشن گوئیاں کر رہے تھے۔ پاس بیٹھا رضا بیزار ہو رہا تھا۔

''یہ تم سب کو بیوقوف بنا رہا ہے، کوئی ہاتھ دیکھنا نہیں آتا اسے۔۔۔''کہیں سے علی نمودار ہوتا اسکے دھندے پر پانی پھیر چکا تھا۔

''ہم جانتے ہیں، ہم بھی وقت گزاری کر رہے ہیں۔''کسی لڑکے نے جواب دیا تھا۔

''میری صلاحیتوں کو تم نے وقت گزاری کہا؟ چلو نکلو یہاں سے۔۔۔''حسین نے تڑپتی ہیروئن جیسا منہ بنا کر کہا تھا۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

باغ خالی ہونے لگا، منظر مٹنے لگے، یادیں گم ہونے لگیں۔ رضا پھر سے اکیلا رہ گیا۔ اُس نے خود کو گہری سانس لیکر پر سکون کیا اور تیزی سے اپنی نئی گاڑی کے پاس پہنچا تاکہ جلد از جلد یہاں سے نکل سکے۔ لیکن ایسا ناممکن لگ رہا تھا۔ وہاں پارکنگ میں اُسکا خود کا عکس اپنی تباہ حال بائیک کو سٹارٹ کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ قریب کھڑا عمر اُسکی ہر ممکن مدد کر رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا، اصولاً تو اسے مسکن گیٹ سے نکل جانا چاہیے تھا، لیکن وہ نجانے کیوں سلور جوبلی کے راستے پر چل نکلا؟ اُس پر سے مزید برآں وہ سائنس والی سائڈ آگیا۔ سیمسٹر بریک ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ دکھ رہے تھے، زیادہ تر پی ایچ ڈی والے یا وہ جنہیں اپنے کاغذات کے حوالے سے کوئی کام تھا، وہی آئے ہوتے۔ وہ سست روی سے گاڑی چلاتے ایک ایک کو نہ دیکھ رہا تھا، ایسے جیسے کہیں سے اسکے دوست نکل آئیں گے۔ وہ تو نہ تھے پر اُنکے عکس نظر آرہے تھے۔ روڈ پر بھاگتی شٹل کو دیکھ کر حسین آہیں بھر رہا تھا کہ اُس میں ہمہ وقت لڑکیوں کا قبضہ رہتا تھا، عمر یہیں کہیں کسی انجان طالب علم کی مدد کر رہا تھا۔ سامنے کیمسٹری کینٹین میں بیٹھے وہ لوگ، صبح کا ناشتہ کرنے کے انتظار میں تھے، بحث اس بات پر ہو رہی تھی کہ کون جا کر آرڈر دے گا؟ عمر اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے پر تول رہا تھا لیکن مقدم اُسے ہر بار آنکھیں دکھا کر چپ کروا دیتا۔ نوید بھاگ کر سڑک پار کر رہا تھا، اُسکی منزل بس ٹرمینل تھا، تاکہ وہ اپنے علاقے کے پوائنٹ میں اپنی سیٹ پر قبضہ کر سکے۔

وہ گاڑی موڑ کر سلور جوبلی جانے والی سڑک پر آگیا، راستے میں آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ تھے، ایم بی اے کے آخری سالوں میں وہ لوگ علی، عمر اور نوید سے ملنے یہاں آتے تھے، آرٹس لابی میں بیٹھتے تو کبھی ایسے ہی درختوں کے نیچے قیام کرتے وقت گزر جاتا، پھر اپنی کلاسیں شروع ہونے کا احساس ہوتا تو اندھا دھند بھاگتے۔ غرض اس جامعہ کے کونے کونے پر یادوں کا انبار تھا جو شاید کبھی ختم نہیں ہونے والا تھا۔ پتہ نہیں سب لوگ کہاں ہوں گے؟ کس حال میں ہوں گے؟ کسی کی کچھ خبر نہ تھی۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے۔

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

انہیں سوچتے ہوئے وہ جامعہ سے باہر آگیا لیکن ابھی ایک اور امتحان باقی تھا۔

آج اسے اپنے گھر جانا تھا، وہ گھر جہاں اُسکا بچپن اور اسکا لڑکپن گزرا تھا۔ جہاں کب سے ماموں کا قبضہ تھا۔ ماموں کو عدالت کی جانب سے ایک سال کا اسٹے ملا تھا، لیکن اب اس میعاد کو پورے ہوئے بھی ڈیڑھ سال گزر چکے تھے، وہ ڈھائی تین سالوں سے اُس گھر میں مقیم بیٹھے یہ سمجھے تھے کہ رضا بھول گیا ہوگا۔ پچھلے دو سالوں میں اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ وہاں جا نہ سکا تھا، لیکن بھولا کچھ نہ تھا۔ اُس نے پولیس کو فلحال فون نہیں کیا تھا، لیکن اُسکا پورا ارادہ

تھا کہ اگر یہ لوگ ذرا بھی ڈانوں ڈول ہوئے تو وہ پولیس کے ذریعے انہیں دھکّے مار کر باہر نکلوائے گا جیسے اُنہوں نے اسے گرفتار کروایا تھا، وہ کسی پر رحم نہیں کھائے گا۔ یہ اُسکا قانونی حق تھا۔

---------+---------+------

آج اس محلّے میں قدم رکھتے ہوئے اسے کوئی ڈر نہ تھا۔ یہ دنیا پیسے والوں کی عزت کرتی ہے اور پیسہ اب اُسکے پاس تھا۔ گاڑی سے اتر کر دروازے کی بیل بجاتے ہوئے نہ اسے کوئی خوف تھا نہ شرمندگی۔ بیل کی آواز پر چوکیدار نے دروازہ کھولا، وہی پرانا چوکیدار تھا۔ رضا کو اچھے سے پہچانتا تھا۔ بنا کسی سوال و جواب کے اور بنا ایک لمحہ بھی سوچے، اُس نے فوراً دروازہ وا کیا اور اسے اندر جانے دے دیا۔

اندر آیا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا، گھر کی آدھی سے زیادہ لائٹیں بند تھیں، صرف لاؤنج کی لائٹ کھلی تھی، جہاں ماموں وہیل چیئر پر بیٹھے تھے، اگر انہیں اُسکی آمد کی اطلاع ہوتی تو وہ یقیناً اسے ڈرامے بازی قرار دینے والا تھا۔

''رضا؟ تم۔۔۔۔'' اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ ماموں کی چھوٹی بیٹی پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہاتھوں میں کھانے کا پیالہ تھامے وہ انہیں اس میں رکھی شے چمچ کے ذریعے کھلا رہی تھی۔

کک۔۔۔۔ کیسے آنا ہوا؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''کیا آپ نہیں جانتے میں کیوں آیا ہوں؟ بہت رہ لیا میرے گھر میں، اب اسے خالی کریں۔'' ابتدائی حیرت اب ختم ہو چکی تھی، لہٰذا وہ نفرت سے گویا ہوا۔ ویسے بھی وہ حیرت ہی تھی، ہمدردی تو نہیں۔۔۔۔ رضا کو تو ایسا ہی لگتا تھا۔

''میرا بیٹا۔۔۔ وہ میرا کاروبار بیچ کر۔۔۔ ملک سے فرار ہو گیا ہے۔ اور مجھے یہاں تنہا چھوڑ گیا ہے۔'' کہتے ہوا اُنکا لہجہ بھرایا۔ ''میں اب اپنے گھر سے آنے والے کرائے سے ہی گزر بسر کر رہا ہوں۔ بہت مشکل میں ہوں میں۔'' انہوں نے بتایا۔

''تو؟'' رضا کے جوتوں کو بھی فرق نہ پڑا تھا۔

''ابّا کو ہارٹ اٹیک آیا ہے رضا! اسکے بعد انہیں عارضی طور پر فالج ہوا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گے مگر وقت لگے گا۔''

''تو؟'' اس بار اُس نے چبا چبا کر بلند لہجے میں کہا۔

''تو ہمیں۔۔۔۔ ہمیں تھوڑا سا وقت دے دو۔'' اُس نے ہچکچاتے ہو کہا۔

''ڈھائی سال کافی نہیں ہیں؟'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

''میں جانتا ہوں، پر اس وقت میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ میری ہر شے پر میرے بیٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔'' ماموں نے التجائیہ انداز اپنایا۔ رضا گہرا سانس لیکر سامنے رکھے صوفے پر بیٹھا، دائیاں بازو صوفے کی پشت پر پھیلایا، اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔

''تو کیا ہوا؟ ہمیشہ آپ قبضہ کرتے تھے؟ اب اُن دونوں نے آپ کی روایات کو برقرار رکھ لیا تو کیا برا کیا؟'' اُسکا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا تھا۔

''میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں گھر واپس نہیں دونگا، بلکہ۔۔۔۔''

''آپ یہ کہہ بھی نہیں سکتے۔'' اُس نے اُنکی بات کاٹی۔

''ہاں! میں یہ کہہ بھی نہیں رہا، میں بس مہلت مانگ رہا ہوں۔'' آج اُنکے لہجے میں نہ رعونت تھی، نہ اکڑ۔۔۔ بس التجا تھی۔

''اور میں کیوں دوں'' اُس نے سکون سے کہا۔

''میں اپنے پرانے گھر چلا تو جاؤں پر، پھر کرایہ نہیں آئیگا تو میں کیسے گزارا کروں گا؟''

''آپ کے مسائل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا گھر خالی کریں، چاہیں جا کر اپنے پرانے گھر میں رہیں یا سڑک پر۔''

''رضا! تمہارے پاس تو اتنی دولت ہے، اگر تم یہ گھر کچھ روز میرے پاس رہنے دو گے، کہ میری بیٹیوں کی شادیاں ہو جائے، تو تمہیں کیا فرق پڑ جائے گا؟'' انہوں نے لجائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسکے لباس، اُسکی شخصیت، اُسکی ایک ایک شے سے چھلکتی امارت اُسکی دولت کا پتہ دے رہی تھی۔

''میں آپکے لئے آسانی کیوں کروں؟ میری ذات کو واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن آپکو ذلیل ہوتا دیکھنا میری خواہش ہے۔'' وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ذرا آگے کو ہو کر گویا ہوا۔ اُسی لمحے اُسکی نظریں اپنی ماموں کی بیٹی پر پڑیں، وہ لمحے بھر کو ساکن ہوا۔ اُس سترہ سالہ لڑکی کی آنکھوں میں رضا کے لیے وہی نفرت سر اُٹھا رہی تھی، جو کبھی اُسکی اپنی آنکھوں میں ماموں کے لیے ہوتی تھی۔ اس بچی کی جگہ اسے اپنا آپ بیٹھا نظر آیا، تو کیا وہ ایک اور رضا کو پروان چڑھانے والا تھا؟ کیا وہ کسی اور کی زندگی برباد کرنے کا سبب بننے والا تھا؟

''تم مجھے اپنی ماں کے واسطے یہاں رہنے دے دو۔'' ماموں کی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔

''اپنی ماں کے واسطے یہاں۔۔۔'' وہ بولتے بولتے رونے لگے۔ رضا کو کوئی فرق نہ پڑا، کوئی دکھ نہ ہوا، کوئی ہمدردی دل میں نہ جاگی۔

''اپنی ماں کے واسطے۔۔۔۔ اور صرف اور صرف اپنی ماں کے ہی واسطے، میں آپکو فقط چند سالوں کا وقت دے رہا ہوں۔ اتنا وقت جتنے وقت میں آپکی بیٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اُسکے بعد اگر آپ یہاں سے نہیں گئے، تو میں واپس آؤں گا۔ اور دھکّے مار کر باہر نکالوں گا۔'' اُسکے لہجے میں اِس سے زیادہ رحم نہیں آسکتا تھا، وہ بھی اس آدمی کے لیے۔

''ابھی جانے سے پہلے میں گھر دیکھوں گا۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''بیٹی! جاؤر ضابھائی کو گھر دکھادو۔'' اُنہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، گھر میں رہنے کی مہلت جو مل گئی تھی۔

''مجھے میرے گھر کے تمام راستے معلوم ہیں، میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے درشتی سے جواب دیا تو اُنکا منہ اُتر گیا۔

وہ لاؤنج سے ہوتا اندر کی جانب بڑھا، اس گھر سے اسکی کوئی اچھی یادیں تو نہ جڑی تھیں، پر جیسی بھی تھیں، تھی تو یادیں ہی۔۔۔۔

اندر کی جانب اُسکی پہلی نظر ڈائننگ ہال میں پڑی۔ کھانے کی میز خاموش پڑی تھی، لیکن اب وہاں اُسکے ابو، امی اور دادی بیٹھے تھے۔ اُسکے ابّو ہمیشہ کی طرح اُسکی ماں کو دل دکھاتے، چبھتے جملے بول رہے تھے، اور اسکی دادی اُسکی ماں کا دفاع کر رہی تھیں۔ اُسکی ماں ہمیشہ کی طرح خاموشی سے ناشتہ میز پر لگا رہی تھیں، جیسے وہ روبوٹ ہوں۔

یہیں پہ تھا میرا بچپن، یہیں کہیں پہ تھا

یہیں ہنسا تھا، یہیں کہیں پر رویا تھا

وہ ڈائننگ حال سے منسلک باورچی خانے میں آگیا، جہاں چولہے کے سامنے کھڑی اُسکی سانولی صورت اور مہربان مسکراہٹ والی ماں کھڑی پکوڑے تل رہی تھیں۔ چار سالہ رضا اُنکے پیروں سے لپٹا، ہاتھوں میں انکے دوپٹے کا آنچل دبوچے کھڑا تھا۔ ایسے جیسے وہ اُسے چھوڑ کر کہیں چلی جائیں گی۔

یہیں درختوں کے سائے میں، تھک کر سویا تھا

باورچی خانے کا پچھلا دروازہ کھول کر وہ لان میں آگیا۔ درخت اور پودے سوکھ چکے تھے، گھاس پر بکھرے پتے اسی کی طرح اپنی کم مائیگی کی داستان سنا رہے تھے۔ پر تھوڑا دور کھڑا وہ درخت آج بھی ہرا بھرا تھا، یا شاید رضا کو ایسا لگ رہا تھا۔ اُسی درخت کے نیچے رکھی مسہری پر اُسکی ماں پاؤں پھیلائے بیٹھی تھیں، اُنکی گود میں چھے سالہ رضا سر رکھے لیٹا کہانیاں سن رہا تھا۔

یہیں پہ جگنو سے اپنی بات چلتی تھی

وہ ہنسی جو ہر پل ساتھ چلتی تھی

درخت سے ہوتے اُسکی نظریں اس پرانے کوارٹر پر گئیں، جو آج بھی خستہ حال تھا۔ لیکن اب اپنے مکین کے نہ ہونے پر کسی آسیب زدہ گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اُسکے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ کوارٹر تک گیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ خود ہی کھل گیا۔

یہیں پہ تھا وہ لڑکپن، یہ کہیں پر تھا

وہ کوارٹر کے اندر آیا تو ہر شے مٹّی کی دبیز تہہ کے ساتھ ویسی ہی تھی جیسی وہ چار سال قبل چھوڑ کر گیا تھا۔اُسکے جانے کے بعد کسی نے اس قید خانے کو دیکھنا بھی پسند نہ کیا تھا۔اُسکا ٹوٹا پھوٹا سا بستر، ساتھ میں رکھی چھوٹی سی الماری، بوسیدہ سی چادر، چھوٹا سا سلنڈر جس پر وہ کبھی کھانا بنایا کرتا تھا سب اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔وہ آہستہ سے اپنے بستر پر آ بیٹھا، یہ پلنگ اُسکے برے وقتوں کا ساتھی تھا۔اُس نے مٹی میں اٹا تکیہ اٹھالیا۔اس تکیہ نے اُسکے کتنے آنسو اپنے اندر جذب کیے تھے ؟رات جب وہ اپنی ماں کو یاد کیا کرتا تھا، تب یہ تکیہ ہی اسکو گلے سے لگاتا تھا۔

یہیں پر ماں مجھ کو سینے سے لگائے رکھتی تھی

یہیں پہ تھا وہ لڑکپن یہیں کہیں پہ تھا

اُس نے اٹھ کر الماری کھول دی۔اُسکے پرانے کپڑے ویسے ہی رکھے تھے، اُسکی کتابیں، اُسکا بیگ۔۔۔وہ ایک ایک شے نکال کر دیکھ رہا تھا۔اُسکے کاغذات جسکی اب اسے ضرورت نہ رہی تھی کہ ہارون صاحب نے اسے ڈپلیکیٹ نکلوا دیے تھے۔ہر شے کو دیکھتے اُسکی نظریں یکدم ہی اُس گتے کے ڈبّے پر گئیں۔ بھلا یہ کیا ہے ؟اُس نے دل میں سوچا اور ڈبہ باہر نکال دیا۔

پلنگ پر ڈبہ رکھ کر غور سے دیکھا، پھر اسے کھولا۔جیسے ہی اندر رکھے سامان پر نظریں پڑیں ذہن کو ایک جھماکے سے سب یاد آ گیا۔اندر دو عدد پیک شدہ شرٹ اور پینٹ تھیں۔اسے یاد آ گیا، اچھے سے یاد گیا کہ یہ کس نے دی تھیں ؟ان کپڑوں میں سے ایک جوڑا وہ انٹرویو والے روز پہن کر گیا تھا۔پر اُس روز جو ہوا اسکے بعد رضا کو باقی جوڑوں کو ہاتھ لگانے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔اُسکے چہرے پر اُداس سی مسکان آ گئی۔

ہاتھ بڑھا کر کپڑے باہر نکالے، ساتھ وہ پرچی بھی نکالی، جسے حسین نے رقعے کے طور پر بھیجا تھا۔اُسکی لکھائی آج بھی واضح تھی۔

رائل کلرز تم پر اچھے لگتے ہیں۔

یہ ایک جملہ اسے ہمیشہ یاد رہ گیا تھا۔اور رضا الٰہی اُسکے بعد سے لاشعوری طور پر زیادہ تر رائل کلرز ہی پہنتا تھا۔اُس نے رقعہ کسی متاع حیات کی طرح سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔اور وہ ڈبہ بھی ساتھ اٹھالیا۔اس گھر سے صرف یہی ایک شے تھی جو وہ لیکر جا رہا تھا کہ وہ اُسکے ایک عزیز کی نشانی تھی۔اُسکے پیارے دوست حسین کا تحفہ۔۔۔۔

اس دن کے بعد سے اُس نے اپنے ماموں کو تنگ کرنا نہیں چھوڑا، ہر پانچ چھے مہینے میں وہ انہیں یاد دلانا نہیں بھولتا کہ وہ جلد واپس آئیگا اپنا گھر لینے، بہتر ہے کہ وہ انتظام کر لیں۔

ہارون صاحب کی نصیحت کو پلو سے باندھے، اُس نے ان دو چرسیوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جن میں سے ایک نے اسے ایک رات سوکھی روٹی کا ٹکرا لا کر دیا تھا، یہ وہی تھا جس نے اسے نشے میں لگایا تھا۔دوسرا وہ جس نے اسے ایک روز بوری لا کر دی تھی تاکہ وہ روٹیاں اور ردی چن کر کچھ پیسے کما لے۔چار سال

بعد جب وہ آیا تو یقیناً وہاں بیٹھے کسی چرسی نے اسے پہچانا نہیں تھا، کچھ چہرے پرانے تھے اور کچھ نئے۔ اُس نے ان سب سے اسی چرسی کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو پتہ لگا کہ اُسکا سر پھٹ گیا تھا، کسی نے اسکا علاج نہیں کروایا تو وہ اسی زخمی سر کے ساتھ کئی ماہ زندہ رہا۔ اُسکے زخم کو کیڑے کھانے لگے تھے، اس میں سے خون بھی رستا تھا۔ جب کیڑوں کے کھانے سے اُسے تکلیف اٹھتی تو وہ پاگلوں کی طرح چیختا یہاں تک کہ نشہ ہی اسے خاموش کرواتا تھا۔ اور ایک روز وہ اسی اذیت کے ساتھ مر گیا۔ کوئی نہیں آیا، نہ حکومت کا کوئی کارندہ، نہ کوئی ریسکیو والا۔ بس ایدھی والوں نے اسکی لاش پر رحم کھایا اور غسل وتدفین کر دی۔ اس روز رضاالٰہی وہاں بیٹھ کر دھاڑے مار مار کر رویا تھا۔ اس ایک چرسی کے غم میں، جس سے اسکا کوئی رشتہ نہ تھا۔ پر اسکو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اُسکے لیے کچھ کر نہ سکا۔ اُس روز وہ سمجھ گیا کہ ہارون صاحب کیوں اُس کو چھوڑنے پر راضی نہ تھے؟ وہ بھی اسی شرمندگی سے نکلنا چاہتے تھے، جس میں آج رضا گھر گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہی ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور وہاں بیٹھے تمام چرسیوں کو، جو تعداد میں پانچ یا چھے تھے، انہیں بھلا پھسلا کر نشے کے علاج کے لیے ادارے میں داخل کروادیا۔

بہت مشکلوں سے ہی صحیح پر وہ اس ردی چننے والے کو ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گیا، اور بلآخر اسے بھی علاج کے لیے داخل کروادیا۔ ان سب کا علاج رضا سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ کوئی دورانِ علاج چل بسا، کسی نے خود کو نقصان پہنچایا، لیکن آہستہ آہستہ وہ اُن سب کو نارمل زندگی پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ کے گھر والے مل گئے اور ساتھ لے گئے، کچھ کے اندر جینے کی امنگ جاگ اٹھی تو کچھ نے چھوٹی موٹی مزدوری یا کام شروع کر دیا، جس میں رضا اور ہارون صاحب نے انکی بھرپور مدد کی تھی۔

''اگر آپ میرا علاج نہ کرواتے تو آج میں ان سب کا علاج کروانے کے قابل نہ ہوتا۔ یہ سب آپکے لئے صدقہ جاریہ بنیں گے ہارون بھائی!'' جس روز اُس نے روٹی چننے والے آدمی کو مکمل علاج کے بعد اپنے اسکول کی ایک برانچ میں صفائی ستھرائی کے لئے رکھا اور اسے خوش دلی سے کام کرتے، پھر وضو کر کے نماز کے لیے جاتے دیکھا، اُس روز اس نے ہارون صاحب کو میسیج کر کے دل سے یہ کہا تھا۔

''میں نے تو بس تمہارا ہی علاج کروایا تھا، پر تم نے اتنے ساروں کی زندگی بدل ہے۔ یہ صرف میرے لیے نہیں، بلکہ تمہارے لیے بھی صدقہ جاریہ ہیں رضا!'' انہوں نے جواب دیا تھا۔

اسکی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی، وہ اور ہارون صاحب سالانہ ایک نشہ کرنے والے کے علاج کا پیسہ اُس سینٹر میں دیتے اور انہیں کہتے کہ اُنکے بدلے وہ کسی سڑک چھاپ چرسی یا نشئی کو اٹھا کر اُسکا خود علاج شروع کر دیں۔ اُسکی زندگی بس وہ لوگ اور پناہ گاہ کے بچے ہوتے تھے۔ دس سالوں میں پناہ گاہ کا سب سے بڑا بچا جو اسے چودہ سال کی عمر میں ملا تھا، اب وہ تعلیم حاصل کرنے اسکالرشپ پر بیرون ملک جا چکا تھا۔ رضا کو ویڈیو کال کر کے بات کرنا وہ آج بھی نہیں بھولتا تھا۔ ایک بچی جو اسے تب ملی تھی جب وہ خود سولہ سال کی تھی، آج دس سال بعد امریکا میں بیٹھی انسانی نفسیات کے ریسرچ اسٹوڈنٹ میں شامل

تھی۔ وہ آج بھی جب اپنا کوئی سامان یہاں وہاں رکھ کر بھول جاتی تو گھبرا کر پہلا فون رضا کو کرتی، پھر عائشہ جی بیچاری اسے ہر وہ ممکنہ جگہ بتاتیں، جہاں وہ اپنی اہم چیز رکھ کر بھول چکی تھی۔

اس نے ان ٹوٹے دلوں میں اپنی دنیا بسائی تھی، اُن مایوس لوگوں کو مایوسی سے نکالا تھا۔ وہ اپنے رب کی مخلوق کو نہیں بھولا تو بھلا مخلوق کا خالق اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

اس نے مخلوق سے محبت کی تھی۔۔۔

اور خالق نے یقیناً اس سے۔۔۔

---------+---------+--------

رمضان کا پہلا روزہ اور دوسری سحری والی رات:

حسین کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے، وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے، کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکائے بیٹھا تھا۔

''بس! معلوم بھی نہ ہوا اور زندگی کے اتنے سال نکل گئے۔'' رضا نے بات مکمل کر لی تھی۔ حسین خاموش تھا۔

''حسین؟'' اُس نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' حسین نے اُسکے ہاتھ جھٹکے تو وہ دکھی ہوا۔

''حسین! میں نے جان کر ایسا نہیں کیا تھا۔'' اُس نے کوئی وضاحت دینا چاہی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔

''میں اب بہتر ہوں، اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔'' اسے خاموش دیکھ کر اُس نے دوبارہ کہا۔

''تو؟ کیا کروں پھر میں؟'' وہ جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اب کہ رضا چپ رہا۔

''یعنی میں گدھا تھا جو اتنے عرصے تمہیں دوست سمجھتا رہا، تم نے تو مجھے کسی لائق ہی نہ سمجھا۔ مجھ سے کیا بدگمانی تھی تمہاری؟ مجھے تو بتا سکتے تھے؟ میں اتنا غیر اہم تھا؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنی دوستی ثابت کرنے میں ناکام رہا۔'' اُس نے بھیگے لہجے میں کہتے آنسو صاف کیے۔

''ایسی بات نہیں ہے، تم ہی میرے دوست ہو۔''

''غلط! نہیں ہوں میں تمہارا دوست، نہ کبھی تھا۔ ورنہ تم میرے اوپر بھروسہ کرتے۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی۔ علی کا اِس جھگڑے میں کوئی قصور نہیں ہے، سراسر قصور میرا ہے۔ میں نہ کرتا ایسا تو ہم بعد میں علی اور نوید کو سمجھا لیتے، عمر کو بھی نہ جانے دیتے بلکہ اُسے بٹھا کر اُسکا مسئلہ پوچھتے کہ اُس نے ایسا فیصلہ کیوں کر لیا؟ لیکن میں نے سب خراب کر دیا۔'' وہ شرمندہ تھا۔

''کاش! میں تمہیں اس رات اکیلا نہ چھوڑتا تو ایسا نہ ہوتا۔'' حسین کو افسوس ہوا۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔''

'' صحیح بات ہے، میرا قصور واقعی نہیں ہے۔ تم ہی عقل سے پیدل ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اُس نے ناراضگی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''ہنسو مت! میرا شکریہ ادا کرو کہ میری وجہ سے تم آج یہاں تک پہنچے ہو۔'' اُس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''تمہاری وجہ سے؟'' رضا نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''ہاں! اگر میں اُس روز تمہیں اکیلا نہ چھوڑتا تو تم چرسی نہ بنتے اور نہ ہی ہارون صاحب تمہیں ملتے اور نہ تمہاری جائیداد تم حاصل کر سکتے۔ تو بلآخر ان تمام باتوں کا سہرا میرے سر۔'' اس نے فخر سے گردن تانی۔

''تالیاں۔۔۔۔'' رضا نے مصنوئی شاباشی اسے دی تھی۔

وہ رات گزر گئی۔۔۔۔

اس رات کا قصّہ گو خاموش ہو گیا۔۔۔

اور وہ منظر آج میں بدل گیا۔۔۔۔

سورج نکل آیا تھا، روشنی بھی سارے میں پھیل چکی تھی۔ صبح کی ہلکی دھوپ میں سمندر چمک رہا تھا۔ حسین خاموش ہو چکا تھا، لیکن نجانے کتنے ہی وجود کو انجانے پچھتاؤں میں ڈال گیا تھا؟

اگر تم یہ بات جانتے کہ یہ شخص اپنے شوق کے لیے اُس مجرم سے نشہ خریدتا تھا تو کبھی بھی میرے شک کو غلط نہ سمجھتے۔

اگر علی سفیر کے اختیار میں ہوتا تو وہ زمین کی سات تہوں میں خود کو دفن کر لیتا۔ اُس نے کتنے آرام سے اسکا تکلیف دہ ماضی موضوع گفتگو بنایا تھا، کتنے آرام سے؟

کیا تم ایسے آدمی پر بھروسہ کرنا چاہتے ہو جو ڈرگ ایڈکٹیڈ (عادی نشئی) ہے۔

اپنی آواز اب ہر جگہ سنائی دے رہی تھی۔ اپنا زہر میں ڈوبا لہجہ اب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ بعد میں پچھتاتا تھا، وہی اُسکا مقدر تھا۔ لیکن پچھتاوا ابھی کا نہیں، پچھلے دس سالوں کا تھا۔ اگر وہ صنوبر کے واقعے کو جنون کی حد تک سر پر سوار کرنے کے بجائے، تھوڑی دیر تحمل سے اپنے دوستوں کی بات بھی سن لیتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ پر اب وہ کس سے کہتا؟ کیسے مداوا کرتا؟ رضا تو تھا ہی نہیں؟ دنیا میں تھا بھی یا شاید؟ اس سے آگے اس سے سوچا نہیں جا رہا تھا۔

گیارہ سال بعد آج عمر حفیظ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ رات رضا جیل میں گزار کر، خود پر تشدد سہہ کر آیا تھا۔ کاش! اس روز عمر اُس سے پوچھ لیتا، کاش! وہ زبردستی ہی اس سے پوچھ لیتا۔ پر اب کیا فائدہ؟

اُس جگہ کھڑے رضا الٰہی کے پانچوں دوست الگ الگ پچھتاؤں کا شکار تھے۔ پر رضا اب اُن سب کی ہی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، بندرگاہ سے دور وہ اس کنارے پر آ گیا تھا، جہاں سمندر گہرائی لیے ہوئے تھا۔ اُس لمحے وہ اپنی پوری زندگی یاد کر رہا تھا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔۔۔

ماں کا سسکتے سسکتے گزر جانا یاد آیا۔۔۔

دوسرا آگے بڑھایا۔۔۔

باپ کا چھوڑ جانا یاد آیا۔۔۔

مزید قدم آگے کیے تو سمندر کے مزید قریب ہو گیا۔۔۔۔

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گزاری وہ رات یاد آئی۔۔۔

سمندر بس کنارے پر ہی تھا۔۔۔

ماموں کی بے اعتنائی یاد آئی۔۔۔

دنیا اس پر پہلے ہی تنگ تھی پر آج جیسے ختم ہو گئی تھی۔۔۔

ایک اور قدم آگے بڑھایا۔۔۔

علی کے لگائے گئے الزامات، اور حقارت آمیز لہجہ یاد آیا۔۔۔

اگلا قدم آگے کیا تو پاؤں ہوا میں معلق رہ گیا۔۔۔

پیروں کے نیچے سے زمین ختم ہو گئی۔۔۔۔

بس اب ایک قدم کی اور بات تھی اور وہ سمندر کی بے رحم موجوں کی نظر ہو جاتا۔۔۔

اس دنیا سے گم ہو جاتا۔۔۔

کبھی کسی کو یاد بھی نہ آتا۔۔۔۔

یہ موجیں کتنی ہی بے رحم کیوں نہ ہوتی۔۔۔

اسکی زندگی سے تو کم ہی ہوتیں۔۔۔۔

''رضا!۔۔۔۔''دور کہیں کسی نے پکارا تھا۔اُسکا دوسرا قدم جو اٹھنے سے پہلے کانپ رہا تھا۔وہ وہیں ٹھہر گیا۔آواز دور تھی، غیر واضح سی۔

''رضا!۔۔۔''اب کہ سمندر کا شور بھی غائب ہو گیا، تمام آوازیں خاموش ہو گئیں، اُس لمحے میں اور کوئی آواز باقی نہ رہی۔بس وہی پکار تھی۔وہی نرم و مہربان پکار۔۔۔اُسکی ماں کی آواز۔

''رضا! سورۃ الشرح پڑھو۔''پس منظر میں یا شاید اُسکے لاشعور میں کہیں یہ آواز گونج رہی تھی۔

''سورہ الشرح پڑھو، اسے سمجھو۔مایوسی تم پر ڈورے نہیں ڈالے گی۔''امی کہہ رہی تھیں۔وہ اُسے مایوسی کے عالم میں سورۃ الشرح معہ ترجمہ پڑھاتی تھیں۔

کیا نہیں کھول دیا ہم نے، تمہارے لیے تمہارا سینہ؟

اُسے یاد آیا کہ وہ اپنی کلاس کا ٹاپر تھا۔جو شے سٹوڈنٹ سمجھنے میں کئی کئی دن لیتے تھے، وہ ایک لمحے میں سمجھ لیا کرتا تھا۔ وہ جو کام کرتا وہ بہترین انجام کو پہنچتا۔

اور ہم نے کم کر دیا تم سے، تمہارا بوجھ

اس نے ہوا میں معلق پاؤں پیچھے کیا، تو یاد آیا کہ جیل میں گزاری وہ رات جو اُس پر سب سے بھاری تھی، آج وہ کسی کو یاد نہ تھی۔اسے خود بھی وہ رات بھول چکی تھی، بچوں نے اُس رات کا غم اُسے بھلا دیا تھا۔اس نے دوسرا قدم بھی پیچھے کیا۔

وہ بوجھ کہ جس نے جھکا رکھی تھی تمہاری کمر

وہ دو قدم اور پیچھے ہوا، آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔ وہ محلہ جہاں وہ بڑا ہوا، آج اس محلے میں جاتے نہ اسے کوئی خوف آتا تھا نہ شرمندگی ہوتی تھی، جبکہ کبھی وہاں سے گزرنے میں بھی اسکا سر جھکنے لگا۔

اور ہم نے تمہارے لیے بلند کیا، تمہارے ذکر کو

جامعہ کراچی میں ایک بار ایک مضمون پڑھانے کے بعد سے وہ مختلف نجی جامعات میں پڑھانے لگا تھا۔ وہ مزید قدم پیچھے ہونے لگا، سمندر بھی دور ہونے لگا۔ مختلف ایوارڈ وصول کرنے کے مناظر اُسکی آنکھوں کے سامنے آنے لگے، کبھی بیسٹ ٹیچر کا، کبھی بہترین اسکول چلانے کا، کبھی بچوں کی بہترین تربیت کرنے والے اسکول کا، تو کبھی بہترین کورس ڈیزائن کا۔ وہ مختلف سیمینار میں بطور مہمان بلایا جانے لگا۔ لوگ اُسکی عزت کرتے تھے، قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بھلا کیا کمی کی تھی اُسکے رب نے اسے؟ کیا کبھی ان میں سے کسی ایک نعمت کا بھی اُس نے شکریہ ادا کیا تھا؟ قدم پیچھے سرکاتے وہ وہیں آرکا تھا، جہاں سے اب بس سمندر کی لہریں ہی نظر آرہی تھیں۔

پس بے شک! ساتھ ہے مشکل کے آسانی

آنسو اُسکی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے۔ وہ نشہ کرنے لگا تھا، سڑکوں پر رہنے لگا تھا، راستوں سے کچرا اور ردی چننے لگا تھا، سڑک سے کھانا اٹھا کر کھانے لگا تھا۔ لیکن یہ وقت اور بہت سے ایسے برے وقت گزر گئے تھے۔ گزرنے والے تمام برے وقت اُسکے لیے بہترین زندگی لائے تھے۔ اُسکے رب نے اسکے لیے دنیا کی نعمتیں کھول دی تھیں، اپنے خزانوں میں سے بے حساب دیا تھا۔ پھر کیوں وہ زمین اور زندگی خود پر تنگ سمجھتا تھا؟

بے شک! ساتھ ہے مشکل کے آسانی (سورۃ الشرح ۱-۶)

وہ گرنے کے سے انداز میں وہیں بیٹھ گیا۔ وہ پھر سے غلط قدم اٹھانے جارہا تھا؟ وہ پھر سے اپنے رب سے مایوس کیسے ہو گیا تھا؟ کیا اسے اپنے رب پر بھروسہ نہیں تھا؟

اپنی پیاری وصابر ماں کا بیٹا۔۔۔

بھلا حرام موت کیسے مر سکتا تھا؟۔۔۔

---------+---------+--------

''میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''سمندر کی تیز ہوا میں وہ قریب رکھی سنگی بینچ کے کنارے پر ٹیک لگائے، مٹّی پر بیٹھا ہوا تھا۔جب کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا۔اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک باریش بزرگ کھڑے تھے۔اِس لمحے اُسے کسی کی مداخلت پسند نہیں آرہی تھی، لیکن بزرگ کے چہرے پر چھایا نور اُسے جواب دینے پر مجبور کر رہا تھا۔

''جی!''اُس نے بس اثبات میں سر ہلا کر اجازت دی اور دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔

''بسم اللہ!''وہ برابر میں بیٹھے اور اُسے نظر انداز کیے، اپنے تھیلے نما بستے سے کوئی شے نکالنے لگے۔رضانہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دیکھنے لگا۔

''آج خدا نے کھانے کو روٹی نصیب کی ہے۔''اُنہوں نے ایک نان نکال کر توڑتے ہوئے جانے خود سے کہا تھا یا اُس سے؟

''یہ لو، تم بھی کھاؤ۔''اُنہوں نے نان کا ٹکڑا اُسکی جانب بڑھایا اور مسکرائے۔

''میں نہیں کھانا چاہتا۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''جانتا ہوں تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔لیکن میری طرف سے مہمان نوازی سمجھ لو۔''اتنی نرمی سے کہا کہ وہ بری طرح شرمندہ ہوا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔بس!اِس وقت طبیعت عجیب سی ہے۔''اُس نے وضاحت دی۔

''مسلمان اور کافر کے روزوں میں صرف سحری کا ہی فرق ہے۔ایسا میں نے نہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے کہا ہے۔کھالو، بنا سحری کے روزہ رکھنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔''اُنہوں نے کہا تو رضا نے روٹی کا ٹکڑا تھام لیا۔وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ سحری کا وقت ہے۔

''شاید آج آخری روزہ ہو۔آج آخری طاق رات ہے۔اللہ سے کچھ مانگنا نہیں چاہو گے؟''یکدم ہی انہوں نے پوچھا۔

''مانگنے لائق نہیں سمجھتا خود کو۔''اُس نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے بیساختہ ہی جواب دیا، تو وہ مسکرائے۔

''بھلا کون اِس دنیا میں مانگنے کے لائق ہے؟ پھر بھی مانگتے ہیں، کیوں کہ ہمارا دینے والا مانگنے سے خوش ہوتا ہے۔''انہوں نے کہا۔پھر پانی کی بوتل اُسکی جانب بڑھائی۔

''اذان ہونے والی ہے۔پانی پی لو، اور وضو کر لو، میرے پاس زائد پانی ہے۔پھر میں نماز پڑھاتا ہوں۔''وہ کہہ کر کھڑے ہو گئے۔رضا نے اُٹھ کر خاموشی سے وضو کیا، اتنی دیر میں اُنہوں نے اقامت کہی۔اُنکی اقامت ہی اتنی خوش الحان تھی کہ اگر اذان دیتے تو نجانے کتنی مسحور کن ہوتی؟ وہ اُنکے پیچھے کھڑا ہو گیا۔نماز مکمل ہوئی تو بزرگ نے اُسے دیکھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''اُنہوں نے رضا سے پوچھا۔

''میں بس! گھر چلوں گا۔ آپ کا بے حد شکریہ۔''

''کیا تم راستہ بھٹک گئے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''شاید!''اُس نے عجیب سا جواب دیا۔

''چلے جانا گھر بھی۔۔۔۔ابھی میرے ساتھ چلو۔ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' انہوں نے اتنی اپنائیت سے کہا جیسے اُسے بہت پہلے سے جانتے ہوں۔

''پر میں آپکو نہیں جانتا۔''وہ اب کہ پریشان ہوا۔

''ہمیشہ جاننا ضروری نہیں ہوتا، کیا یہ بے ضرر آدمی تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟''انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، اتنی خوبصورت مسکراہٹ اُس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے، پر میں کافی دیر ہوئی، گھر سے دور ہوں۔ گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اُس نے ذرا آہستہ سے وضاحت دی، وہ برا نہ مان جائیں اس بات کا ڈر بھی تھا۔

''کچھ دیر کے لیے آ جاؤ۔ میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتا ہوں۔''وہ کہہ کر اُسکا جواب سننے کے لئے رکے نہیں، بلکہ آگے بڑھ گئے اور رضا کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں اُنکے پیچھے چلنے لگا۔ نجانے وہ اُسے کہاں لیکر جا رہے تھے؟ اور نجانے وہ کیوں اُنکے پیچھے چل رہا تھا؟ وہ راستے بھر نعتیہ اشعار پڑھتے رہے۔ اور رضا مسحور سا، اُنہیں سنتا اُنکے پیچھے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کہ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو گیا اور وہ اُسے ایک بستی میں لے آئے۔

---------+---------+--------

وہ سڑکوں پر جھاڑو دینے والا سرکاری ملازم تھا۔ کافی دیر ہوئی، وہ غور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ریسکیو ٹیمیں چاروں جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ غوطہ خور ناکام واپس لوٹ آئے تھے۔ صبح کے بعد سے اب اِس جگہ پر فلحال عوام کو داخلے سے روکنے کے لیے، **ڈونٹ کراس** کا پیلا ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ اُسکے پیچھے ہی رضا کی متعدد تصاویر لگی تھیں، جنکے نیچے ''مسنگ''(گمشدہ) کا لفظ جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ لوگ یہیں تھے۔

''تم لوگوں کو گھر جانا چاہیے، کوئی بھی پیش رفت ہو گی تو میں پہلے تم سب کو ہی بتاؤں گا۔''نوید انہیں پچھلے کئی گھنٹوں میں کئی مرتبہ گھر واپس جانے کا کہہ چکا تھا پر کوئی بھی وہاں سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ افطار ہونے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے باقی تھے۔

''کچھ تو معلوم ہو جائے رضا کے بارے میں، کوئی تسلی ہو جائے تب ہی واپس جا سکتے ہیں ہم!''مقدّم نے جواب دیا تھا۔

''مقدم! مجھے حسین ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کم از کم اُسکا ہی سوچ لو۔''نوید نے حسین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے اُسے کہا۔ مقدّم نے بھی چہرہ موڑ کر چٹان کا سہارا لیے کھڑے حسین کو دیکھا، اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اتنا زیادہ خاموش تھا کہ اُس پر قوت گویائی سے محروم ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ کتنی ہی دیر سے وہ چپ چاپ کھڑا ایک ٹک سمندر کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ چپ تھا تو اب دنیا قبرستان لگ رہی تھی، اُسے خاموش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم حسین کو نہیں۔۔۔۔

''وہ میری بات نہیں مانے گا۔ لیکن چلو! میں کوشش کرتا ہوں۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔اِس سے پہلے کہ نوید کوئی جواب دیتا، میٹروپولیٹن کارپوریشن کا لباس پہنے وہ شخص جس نے ہاتھوں میں جھاڑو پکڑ رکھی تھی، رضا کی تصویر والے پوسٹر کے قریب ہوا۔ اُسکے چہرے پر سوچ کے جالے بچھے تھے۔ وہ رضا کی تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ مقدم سے بات کرتے نوید کی نظریں اُس پر پڑیں۔

''کیا کام ہے؟ عوام کا داخلہ ممنوع ہے اِس طرف۔''نوید نے اُسے آواز دی تو مقدم نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹیپ کو پار کر کے اِس طرف آیا تھا۔

''آپ اس آدمی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟''اُس نے نوید کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تمہیں کیا کام ہے؟''اُس نے ضبط سے پوچھا۔

''کیا ہوا اسے؟''اُس نے پھر رضا کی تصویر کی جانب دیکھا۔ اب کہ نوید کو غصّہ آیا۔

''اِس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ ہم اس لیے تلاش کر رہے ہیں اسے۔۔۔''نوید کے کچھ بھی بولنے سے پہلے مقدم نے سنجیدگی سے جواب دیا، وہ نوید کے چہرے پر ناگواری دیکھ چکا تھا۔

''کیا کل رات کو؟ یہی کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب؟''اُس ملازم کا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''کافی دیر سے خاموش عمر بھی سیدھا ہوا۔ علی اور حسین نے بھی پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''ارے! میں یہیں پر تھا۔ کل میری رات کو کچرا اٹھانے کی ڈیوٹی تھی، میں ساحل سے کوڑا سمیٹ کر واپس آ رہا تھا تو۔۔۔''

''سیدھے سیدھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟''نوید کا ضبط جواب دے گیا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں۔''وہ ناراض ہوا۔

''اُس نے چھلانگ لگا دی تو تم نے کچھ کیا نہیں؟ کیا روکا بھی نہیں اُسے؟ کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں بلایا؟''حسین کی برداشت اب جواب دے رہی تھی۔ اُس نے درشتی سے پوچھا تھا۔

''ارے بھائی! مجھے بتانے تو دو، اِس نے چھلانگ نہیں لگائی۔ میں وہیں تھا۔''اُس نے بیزاری سے کہا۔ لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُس نے وہاں کھڑے ہر انسان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

''وہ سمندر میں نہیں کودا تھا؟ کیا تم نے واضح دیکھا؟ وہ یہی آدمی تھا؟''علی نے اتنی دیر میں پہلی بار پوچھا تھا۔

''ہاں! ہاں! وہ یہی تھا۔ سمندر کے کنارے کھڑا تھا، اتنے کنارے کے مجھے لگا کہ اب کود جائے گا۔ لیکن پھر خود ہی پیچھے ہٹ گیا اور دور جا کر بیٹھ گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا تا کہ اگر وہ دوبارہ ایسی کوئی کوشش کرے تو میں اُسے روک سکوں۔ لیکن پھر کوئی بوڑھا باریش آدمی اُسکے پاس آیا، کچھ دیر اُسکے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر دونوں نے فجر کی نماز پڑھی اور وہ آدمی اُسے اپنے ساتھ کہیں لے گیا۔ بس! اتنا ہی معلوم ہے مجھے۔ لیکن اِس نے چھلانگ نہیں لگائی ہے۔''کوئی پہاڑ تھا جو سینے سے سرکا تھا۔

''مجھے بتاؤ وہ لوگ کہاں اور کس طرف گئے تھے؟''نوید نے اب کہ ذرا آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''میرے خیال سے وہ لوگ یہاں سے مزید آگے کی طرف گئے تھے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مزید میں اور کچھ نہیں جانتا۔''اُس نے کہا۔

''دیکھو! ہم کل سے بہت پریشان تھے۔ اگر ہماری بات بری لگی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ تمہارا شکریہ، تم نے بہت مدد کی ہے ہماری!''نوید نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بھائی! میں سمجھ سکتا ہوں۔''اُس نے خوش دلی سے کہا۔

''شیراز!''نوید نے دور کھڑے شیراز کو آواز دی۔

''جی سر!''اُس نے وہیں سے پوچھا۔

''ریسکیو ٹیم کو لیکر میرے پیچھے آؤ! ہم آگے جا رہے ہیں۔''نوید نے کہا اور پھر باقی سب کی طرف مڑا۔

''تم لوگ میرے ساتھ آؤ! اُمید ہے رضا مل جائے۔''وہ اُن سے کہتے ہوئے موبائل کی جانب دیکھتے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

جزا کا کوئی میسیج نہیں آیا تھا، نوید نے اُسے کہا ہوا تھا کہ اگر رضا گھر آ جائے تو وہ نوید کو اطلاع دے دے۔ یعنی وہ ابھی تک گھر بھی نہیں آیا تھا۔

---------+---------+--------

''کیا تم تھک گئے ہو؟''بستی کے داخلی دروازے پر رک کر اُنہوں نے رضا کو دیکھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''معاف کرنا،اس بوڑھے نے تمہیں اتنا چلایا۔ ''عجیب ہی انسان تھے، بات بات پر مسکراتے تھے۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔بلکہ مجھے اچھا محسوس ہو رہا ہے۔''اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

''آؤ!''اُنہوں نے ایک گھر کے دروازے کی جانب اشارہ کیااور اسے اندر آنے کی دعوت دی،وہ خاموشی سے اندر آ گیا۔کسی گاؤں کے کچے مکان جیسا یہ گھر نامعلوم کس کا تھا؟رضا نے اُنکی دیکھا دیکھی چپل باہر اُتاری،اور اندر آیا۔مکان کچا ہونے کے باوجود اندر سے سادگی مگر خوبصورتی سے سجا تھا۔یقیناً سجانے والے کا کمال تھا۔

''بیٹی!کیا سمیر اندر ہے؟''انہوں نے کمرے کے اندر بنے دوسرے دروازے کے پردے کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی۔

''جی ابّو!''پردے کے پیچھے سے زنانہ آواز سنائی دی۔

''میرے ساتھ ایک مہمان ہیں،اُس سے ملنے آئے ہیں۔''اُنہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابّو!آپ انہیں پانچ منٹ بعد اندر لا سکتے ہیں۔''اندر سے جواب آیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اُسکے پاس آئے۔

''یہ میری بیوہ بیٹی کا گھر ہے۔اُسکا بیٹا اور میرا نواسہ سمیر،اُسے لوگوں سے ملنا بہت پسند ہے۔پر لوگ اُس سے ملنا نہیں چاہتے۔اِس لیے میں نے سوچا کہ تم اِس سے مل لو۔''اُنہوں نے رضا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

''لوگ ملنا نہیں چاہتے؟پر کیوں؟''اسے حیرت ہوئی۔

''اندر آ جاؤ!''اُنہوں نے جواب دینے کے بجائے کمرے کا پردہ ہٹایا اور اُسے اندر لے آئے۔رضا اندر آیا اور اُسے لگا جیسے کسی نے اسکا دل مُٹھی میں جکڑا ہو۔وہاں ایک چار سے پانچ سال کا بچہ بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا،ناک میں آکسیجن کی پائپ لگی تھی،جبکہ ہاتھوں میں مختلف نوعیت کی ڈرپس وغیرہ۔وہ کمزور اور لاغر سا بچہ اپنے بازوؤں میں ایک ننھا سا بھالو پکڑے ہوئے تھا۔

''سمیر!دیکھو تو ذرا،مہمان آئے ہیں۔''انہوں نے بھالو سے کھیلتے سمیر کو مخاطب کیا تو اُس نے رک کر بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے رضا کو دیکھا۔پھر اُسکے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''دوست؟''اُس نے اپنے نانا سے پوچھا۔

''آپ انہیں دوست بنا سکتے ہیں۔''نانا نے پیار سے کہا تو وہ ہنسا،پھر رضا کو دیکھا اور زبان نکال کر شرارتی انداز میں اُسکا منہ چڑھایا۔رضا بیساختہ مسکرایا تھا، یکدم ہی اُسکا دل اِس بچے کی محبت سے لبالب بھرنے لگا۔وہ اُسکے قریب آیا،اور باوجود ڈرپ کے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

''تم کتنے پیارے ہو؟اور کتنا پیارا نام ہے تمہارا۔''رضا نے کہا۔

''اُسے ہیپاٹائیٹس سی ہے،اسکا جگر خراب ہو چکا ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری پھیلنے والی ہے۔اپنے بچوں کو اِسکے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے،ملنے بھی نہیں دیتے۔اِسکو سارا دن اسی کمرے میں گزارنا پڑتا ہے۔''انہوں نے بتایا تو اُسکا دل کٹا۔پتہ نہیں اللہ نے اُسکے دل میں بچوں کے لیے اتنی محبت کیوں رکھی تھی؟اُسکی تکلیف رضا کو اپنے دل پر محسوس ہونے لگی۔

''آپ میرے ساتھ کھیلیں گے؟''اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں!کیوں نہیں؟کیا کھیلنا چاہو گے تم؟''رضا نے پوچھا۔

''میں لوڈو کھیلوں گا نانا!''اُس نے اپنے نانا کو مخاطب کیا۔

''لوڈو ہے تمہارے پاس؟''رضا نے پوچھا۔

''ہاں!اِسکی ماں،اِسکی خوشی کی خاطر سارے کھلونے لا کر رکھتی ہے۔پر کوئی ہے نہیں اِسکے ساتھ کھیلنے والا۔''انہوں نے بتایا۔

''میں کھیلوں گا نا تمہارے ساتھ۔''اُس نے بچے کو بستر پر بٹھایا اور خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''پر مجھے نہیں آتا۔''اُس نے پریشانی سے بتایا۔

''کوئی بات نہیں،میں سکھا دوں گا۔''اُس نے پیار سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔شاید خوشی سے۔۔۔

اُسکے نانا اُسکا لوڈو لے آئے۔رضا اُسکے ساتھ بیٹھ کر اُسے کھیلنے کا طریقہ سکھانے لگا۔درمیان میں وہ اِس بچے کا جوش اور خوشی دیکھتا تو آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگتے۔لوگ کیوں کرتے ہیں بچوں کے ساتھ ایسا؟وہ بیمار تھا تو اُس میں اُسکا قصور تو نہ تھا۔

اسے یکدم ہی اپنے بچے یاد آئے۔وہ بھی تو کل سے کتنے پریشان ہوں گے؟یکدم ہی اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔دل کیا اُڑ کر واپس چلا جائے۔وہ تو چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا ہو جہاں صرف وہ ہو،اور بچے ہوں۔جہاں کوئی بیماری ہو،نہ غم،نہ دکھ اور نہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے والا۔آہ!وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟

--------+---------+----------

کتنے گھنٹے گزر چکے تھے؟معلوم نہیں!معلوم تھا تو بس یہ کہ رضا اب تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔بچے الگ پریشان تھے۔رات بھر رو رو کر دعا کرتے رہے تھے۔جزا کچھ دیر کے لیے گھر گئی تھی،لیکن پھر دل گھبرانے لگا تو پناہ گاہ واپس آ گئی۔بچوں کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر اُسے دکھ ہونے لگا تھا،لیکن اِس وقت اُسکے اپنے پاس تسلی کے لیے الفاظ نہ تھے۔

وہ ہر آہٹ پر چونکتی کہ شاید رضا واپس آ گیا ہو، ہر بار فون کی گھنٹی پر بے قرار ہو کر دیکھتی کہ شاید نوید کی طرف سے اُسکی خیریت کی اطلاع آئی ہو۔ بار بار رضا کے نمبر پر فون کرتی لیکن ہر بار **نمبر بند ہے** کی آواز سنائی دیتی۔

عائشہ جی الگ جائے نماز پر بیٹھی کل سے اُسکی واپسی کی دعائیں کر رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ پر وہ کیسے روتی؟ کس حق سے؟ فقط ایک شخص کا جانا سارے گھر کو موت جیسی خاموشی میں مبتلا کر گیا تھا۔

میں دوبارہ واپس نہ آؤں کبھی تو۔۔۔۔ تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔

یہ بھی اُسی کے آخری الفاظ تھے کہ وہ چاہ کر بھی یہاں سے واپس نہیں جا رہی تھی۔

''آہ رضا! کاش کہ تم کچھ دیر مجھے بھی سن لیتے، کاش! کہ مجھے ہی بتا دیتے۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔ پر اب کوئی فائدہ نہ تھا، وہ کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔۔۔۔۔

---------+---------+--------

سمیر کھیلتے کھیلتے تھک گیا، پر رضانہ تھکا نہ اُسکے ماتھے پر شکن آئی۔ یہاں تک کہ سمیر تھک کر سو گیا۔ جس وقت وہ سویا اُس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔

''رمضان نہ ہوتا تو تمہارے لیے ظہرانے کا انتظام کرتا۔'' انہوں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں! بس اب میں چلوں گا۔''

''نماز نہیں پڑھو گے؟'' اُنہوں نے پوچھا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ خاموشی سے جا کر وضو کیا اور انکے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وہ تلاوت کرنے لگے۔ اُنکی تلاوت اتنی خوبصورت تھی کہ وہ بیٹھا سنتا رہا۔۔۔ سنتا رہا۔۔۔ یہاں تک کہ جب تلاوت ختم ہوئی تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔

''کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔'' وہ اب حقیقتاً پریشان ہونے لگا تھا۔

''چلے جانا، چلے جانا۔'' بزرگ نے قرآن پاک کو جزدان میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے یہ بتاؤ،'' اُنہوں نے رک کر رضا کو دیکھا۔ ''یہ زندگی کیا تمہاری ہے، جو اسے ختم کرنے چلے تھے رضا؟'' اور اُس لمحے۔۔۔۔ اُس وقت۔۔۔۔ وہ ساکت رہ گیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ زندگی دینا اور زندگی لینا، دونوں اللہ کے اختیار میں ہے؟ کیا تم اللہ کے اختیار میں مداخلت کرنے جا رہے تھے؟'' وہ سوال جتنی نرمی سے پوچھا گیا تھا، اتنی ہی بری طرح اُسکے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بس ساکت آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''جب ہم ناحق کسی کی جان لینے کی، یا اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو در حقیقت ہم وہ دعویٰ کرتے ہیں، جو نمرود نے کیا تھا۔ وہ بھی تو یہی کہتا تھا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور میں ہی مارتا ہوں۔ ہم کون ہوتے ہیں مارنے والے؟ چاہے خود کو یا چاہے کسی اور کو۔'' وہ ٹھہرے، پر وہ ایسے ہی بیٹھا رہا۔

''میں۔۔۔ میں بس۔۔۔۔ بھٹک گیا تھا۔'' اُس نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

''انسان ہی بھٹکتے ہیں، پر جو سر جھکا دے وہ انسان ہے، جو اکڑ جائے وہ شیطان۔ جو تکلیفیں زندگی میں آتی ہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ ہمیں اسی کے ساتھ جینا ہے۔ ورنہ خودکشی حرام کیوں ہوتی؟'' اُنکے کسی سوال کا جواب اُسکے پاس نہیں تھا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔'' دروازے پر دستک ہوئی تو وہ کھڑے ہو گئے۔ پھر پردے کے پاس گئے، وہاں یقیناً اُنکی بیٹی تھی، جس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کپڑے میں لپٹا سامان انکو دیا، وہ اُسے لیے رضا کے پاس آئے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''تمہارا سفر لمبا ہے، راستے میں روزہ کھولنے کے لئے یہ میری طرف سے قبول کرو۔'' اُنہوں نے ایک چھوٹا سا تھیلا اُسکی طرف بڑھا دیا۔ وہ شرمندہ ہوا۔

''آپکو بہت زحمت ہوئی۔ میں سمیر کے لیے۔۔۔'' اُس نے کہتے ہوئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے تاکہ اُنکی کچھ امداد کر سکے، لیکن یاد آیا کہ وہ اپنا موبائل وغیرہ کہیں پھینک آیا ہے۔ اپنی حرکت پر اسے جی بھر کر افسوس ہوا۔

''جو اللہ سے لیتا ہے، وہ بندوں کا محتاج نہیں ہوتا۔'' اُسے شرمندہ دیکھ کر انہوں نے کہا۔

''میں سمیر کے لیے کچھ تحفتاً دینا چاہتا تھا۔'' اُس نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی۔

''تم نے سمیر کو اپنا وقت دیا ہے۔ یہی سب سے بڑا تحفہ ہے اُسکے لیے۔'' اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں پھر آؤں گا۔'' اُس نے انکا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان شاءاللہ!'' اُنہوں نے بس اتنا ہی کہا۔ پھر رضا انہیں خدا حافظ کہہ کر پیدل ہی گھر کے راستے پر نکل پڑا۔ اُسکے پاس گاڑی نہیں تھی، کوئی موبائل بھی نہ تھا۔ سوچا تھا راستے سے کسی سے مدد لے لے گا۔ پر فلحال تو کوئی آدم نہ آدم زاد نظر آ رہا تھا۔

''میں نے بزرگ کا نام تو پوچھا ہی نہیں؟'' یکدم ہی اُسے یاد آیا تو تیزی سے واپس اسی راستے پر پلٹا جہاں انکا گھر تھا، لیکن وہ بستی کا راستہ بھٹک گیا۔ وہ بار بار کوشش کرتا لیکن ہر بار مرکزی شاہراہ پر آ جاتا۔ پر اسے بستی کا راستہ دوبارہ نہ مل سکا۔ بلآخر تھک کر وہ شاہراہ کے کنارے پر چلنے لگا۔ اُسکا راستہ واقعی لمبا تھا۔

اُسے کم از کم اُس جگہ تک تو پہنچنا تھا، جہاں اُسے کوئی انسان نظر آجاتا، تو وہ کوئی ٹیکسی کر لیتا، یا لفٹ لے لیتا۔ لیکن فلحال تو کسی ذی روح کے آثار نہ تھے۔ روزے کی وجہ سے اُسکی طبیعت بھی خراب ہونے لگی تھی۔ بلآخر جب وہ آبادی کے قریب پہنچا تو مغرب کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

''کیا قسمت ہے! جب آبادی میں پہنچا ہوں تو افطار کا وقت شروع ہو گیا ہے۔'' اُس نے سوچا اور سڑک کے برابر بنے فٹ پاتھ پر آیا، جہاں لوہے کی ریلنگ کے پیچھے سمندر تھا، اور ریلنگ کے اِس طرف بینچ رکھی تھی۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا کھانا بینچ پر رکھا اور اسے کھولا، اندر ساگ اور روٹی تھی۔ پانی کی ایک بوتل بھی بزرگ نے ہی اُسے دی تھی۔ وہ کھانا سامنے رکھے اذان کا انتظار کر رہا تھا۔

''باجی! افطاری دے دو۔۔۔۔ افطاری دے دو۔۔۔۔ اے بھائی! افطاری دے دو۔۔۔'' وہ بینچ پر بیٹھا اذان کا منتظر تھا کہ تب ہی دس سے بارہ غریب بچوں کا ٹولہ آوازیں لگاتا اُسی طرف آنے لگا۔ اُنکے کپڑے میلے تھے، وہ چھوٹے بڑے ہر عمر کے تھے۔ کسی نے کندھوں پر تھیلا لٹکا رکھا تھا، تو کوئی خالی ہاتھ تھا۔ اِس لمحے جب سب، اپنے گھروں میں ہوتے ہیں، وہ رضا کو باہر بیٹھا دیکھا کر اُسکے پاس آ گئے۔

''بھائی! افطاری دے دو!'' اُن میں سے نسبتاً سب سے چھوٹے بچے نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے دیکھ کر مسکرایا۔

''میرے پاس بہت زیادہ تو نہیں ہے، پر آؤ ہم سب مل کر کھاتے ہیں۔'' اُس نے تمام بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس سموسے ہیں، وہ پیچھے والی ایک آنٹی نے دیے تھے۔'' ایک بلوچی لباس پہنی، سر پر اپنے قد سے لمبی چادر ڈالی معصوم سی بچی بولی۔

''اور میرے پاس حلوہ ہے۔ میری ایک باجی نے دیا مجھے۔''

''جسکے پاس جو بھی ہے وہ یہاں رکھ دے ہم مل کر افطاری کریں گے۔'' اُس نے کہا تو بچے خوش ہو گئے۔

--------+---------+----------

اذان ہو چکی تھی، اُنہوں نے راستے میں سوائے پانی کے اور کسی شے سے روزہ افطار نہ کیا تھا۔ عید کا چاند نکلا یا نہیں اسکی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ نوید گاڑی چلا رہا تھا، حسین اُسکے برابر میں سڑکوں پر متلاشی نظروں سے صرف رضا کو ڈھونڈ رہا تھا، پیچھے عمر بیٹھا تھا، گاڑی اُسکی تھی پر چلا نوید رہا تھا۔ مقدم اور علی پیچھے والی گاڑی میں ساتھ آ رہے تھے۔ اُن کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

''کیا وہ گھر نہیں آیا اب تک؟'' عمر نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں! گھر سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔'' بیک ویو مرر میں دیکھتے نوید نے جواب دیا۔

''کس کے ساتھ چلا گیا ہے؟ کیوں کر رہا ہے ایسا؟'' وہ دکھ کی کیفیت میں بولا۔

''وہ ہم سب سے دور رہنا چاہتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن اُسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔''پیسنجر سیٹ پر بیٹھے حسین نے جواب دیا تھا، پھر یکدم ہی وہ سیدھا ہوا، اور آنکھیں چھوٹی کر کے سامنے سڑک کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا حسین؟''نوید نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، تو دور ایک بینچ پر بہت سارے بچے نظر آئے۔

''و۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ رضا ہے نا؟ ہاں؟''وہ یکدم ہی چیخا تو دونوں ہی چوکس ہوئے۔

''کہاں پر حُسین؟ مجھے تو صرف بچے دکھائی دے رہے ہیں؟''نوید کو سمجھ نہیں آیا۔ وہ جس بینچ کی جانب اشارہ کر رہا تھا وہ اُن سے کافی دور تھی، اور ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ اوپر سے مغرب کی اذان ہوئے آدھے گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا لہٰذا روشنی بھی اب ہلکی ہلکی باقی رہ گئی تھی۔

''وہ رضا ہے، میں نے بچوں کے ساتھ ہی اسکی جھلک دیکھی ہے۔ ابھی شاید نظر نہیں آ رہا۔ ''حسین بے چین ہوا تو نوید نے گاڑی کی رفتار تیز کی تاکہ جلد از جلد وہاں پہنچ سکے۔

''یہ میرا دوست ہے، لیکن مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔''بینچ پر بیٹھا رضا اُن ننھے بچوں کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ افطار کر چکے تھے، کچھ ابھی بھی کر رہے تھے۔ رضا نے چند لقموں کے علاوہ کچھ نہ لیا۔ باقی سب بچوں کو ہی دے دیا تھا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو بھئی اِسکو؟''رضا نے مصنوئی غصّے سے دوسرے بچے کی طرف دیکھا۔

''دوست ہے نا میرا۔۔۔اسکو تنگ نہیں کروں گا تو کس کو کروں گا؟''اُس نے جواب دیا تو سارے بچے ہنسنے لگے۔ ایسے ہی۔۔۔۔بلاوجہ۔۔۔۔رضا اُنکی معصوم ہنسی پر مسکرایا۔

''آپکی انگوٹھی کتنی پیاری ہے؟''ایک چھوٹے سے بچے نے جو اسکے پیروں کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا، اُس نے گھٹنوں پر رکھا رضا کا ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اُسکی عقیق کے پتھر جڑی انگوٹھی اُسے بہت پسند آئی تھی۔

''تمہیں چاہیے؟''رضا نے اُس سے پوچھا۔ قریب کوئی گاڑی آ کر رکی تھی، پر اُس نے دھیان نہ دیا۔

''نہیں! یہ تو اتنی بڑی ہے۔''اُس نے اپنی معصوم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلا اور حسین اُس میں سے اُترا۔۔۔سب سے پہلے وہی اُترا۔۔۔ اور سامنے بیٹھے سانولی رنگت والے پرکشش مرد کو دیکھ کر جیسے کوئی رکی سانس بحال ہوئی تھی۔

''تو جب بڑے ہو جاؤ تو تب پہن لینا۔''رضا نے ہنستے ہوئے اپنی انگوٹھی اُتاری، بچے اشتیاق سے اُسے دیکھنے لگے۔

گاڑی سے باقی لوگ بھی اُتر گئے۔اور اس کو صحیح سلامت دیکھ کر سب ہی کی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔وہ آج بھی بچوں میں گھرا تھا، پتہ نہیں کیسے ؟پر بچے اُسکے پاس بھنوروں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔وہ محبت بانٹنا جانتا تھا۔اور وہ محبت کے بھوکے ہوتے تھے۔وہ آنکھوں میں نمی لیے اُسے ہی دیکھ رہے تھے، اور وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنے ننھے دوستوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

''لاؤ! ہاتھ دو اپنا۔''رضا نے اُس بچے کا ہاتھ تھاما پھر اسکی ننھی سی انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا دی۔اسکے چھوٹے سے ہاتھ پر وہ بڑی سی انگوٹھی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔بچے ہنسنے لگے۔رضا الٰہی ہو اور اسکے ارد گرد بچے ہنستے نہ ہوں۔۔۔ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''رضا!۔۔۔''کسی نے زور سے پُکارا تھا۔اِس پکار میں زمانوں کی تڑپ تھی، دکھ تھا، پچھتاوے تھے، وہ پہچان گیا۔اِس ایک آواز کو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا، پلٹ کر دیکھا تو آنکھوں کو یقین نہ آیا۔وہ سارے آئے تھے۔۔۔سب کے سب۔۔۔اُسکے لیے۔وہ حیران سا کھڑا ہوا۔

کل سے اب تک اُس نے صرف ایک ہی بات سوچی تھی، کہ بچے گھر میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔عائشہ جی پریشان ہونگی۔پر اِن سب میں اُس نے اپنے دوستوں کو تو سوچا ہی نہ تھا۔اُس نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اُسکے لیے پریشان ہوں گے۔اُسے ڈھونڈ رہے ہونگے بلکہ ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔

جب یاد کا قصّہ کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

میں گزرے پل جو سوچوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

وہ حسین کو گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑتے اپنی طرف تیزی سے آتے دیکھ رہا تھا۔اُسکے قدم تیز تھے، پر اس لمحے رضا الٰہی کی دنیا رک رک کر چلنے لگی۔۔۔آہستہ آہستہ۔۔۔کسی سلو موشن سین کی طرح۔۔۔

اُس رات بھی تو وہ غائب ہو گیا تھا۔اُس رات بھی تو وہ خود کو تباہ کرنے نکلا تھا۔اُس رات اُسکے دوست پریشان کیوں نہ ہوئے ؟اُس رات کوئی کیوں نہ آیا؟ دس سال قبل وہ لوگ اُسے ڈھونڈ لیتے تو شاید وہ اتنے پچھتاوے لیے نہ کھڑا ہوتا۔

اب جانے کس نگری میں آباد ہیں جا کر مدتوں سے

میں رات گئے تک جاگوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

حسین اُسکے پاس آ کر رکا نہ تھا، نہ اسے دیکھا، نہ کوئی سوال کیا۔بس سیدھا اُسکے گلے لگ گیا۔رضا ایک قدم پیچھے ہوا پر حسین کی گرفت مضبوط تھی، ایسے جیسے اُس نے آج رضا کو چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔باقی چاروں میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، یا شاید اُنکی ہمت ہی نہ ہوئی۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے۔

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

رضا نے ایک بات جو خود سے بھی چھپا کر رکھی تھی وہ ایک بات اُسے آج سمجھ آگئی۔ وہ یہ کہ دس سال پہلے بھی اُسے اپنے دوستوں کا انتظار تھا۔ اسے اُمید تھی کہ شاید وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ جائیں گے کہ رشتوں کے نام پر بس! دوستی ہی مخلص لگنے لگی تھی اُسے۔۔۔۔

اور آج اُسے ایک بار پھر دوستی مخلص لگی تھی۔ آج ان سب کو خود کے لئے پریشان دیکھ کر یقین آیا تھا کہ کسی کو اسکے نہ ہونے سے بھی پریشانی ہو سکتی ہے۔ اسے صحیح سلامت دیکھ کر کسی کو سکون آتا ہے۔ اُس نے اپنے بازو اٹھائے اور حسین کے گرد پھیلاتے اسے تھام لیا، آج اُس نے دوستی کا ہاتھ نہیں ٹھکرایا۔ پھر اسی کے کندھوں پر سر رکھ کر وہ رو دیا۔

وہ پل بھر کی ناراضگیاں، اور مان بھی جانا پل بھر میں

اب خود سے جب بھی روٹھوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

غم بہت سارے تھے، ماں کا، باپ کا، ماموں کا، ہر شے کا۔۔۔ اتنے غم آج ایک ساتھ نکل گئے تھے۔ وہ روتے روتے زمین پر بیٹھا، حسین اُسکے ساتھ بیٹھ گیا۔ باقی چاروں جو سن سے کھڑے بس آگے بڑھنے کی ہمت کر رہے تھے، اُسے ہچکیوں سے روتا دیکھ کر وہ ہمت بھی جانے لگی۔ وہ یونیورسٹی کے زمانے کا حالات سے ستایا لڑکا، جسکو وہ کرید کرید کر تھک گئے کہ شاید اب وہ کچھ کہہ دے۔ اُس لڑکے نے آج اپنا خول توڑ دیا تھا۔

سولہ سال لگے انہیں اُسکا بھروسہ جیتنے میں۔۔۔۔

سولہ سال۔۔۔۔۔

سولہ سال بعد یہ چھپن چھپائی کا کھیل ختم ہوا تھا۔۔۔۔

اور اُس نے جان لیا کہ سامنے کھڑے ان پانچوں سے چھپنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ اُسکے دوست تھے، اُن سے بھلا کیا چھپنا؟ حسین نے اسے اب بھی نہیں چھوڑا، آج وہ اُسے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک بار وہ یہ غلطی کر چکا تھا پر آج نہیں۔۔۔

علی جو پچھلے کئی گھنٹوں سے خاموش تھا، وہ بس اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا، لیکن منظر بار بار دھندلا رہا تھا۔ وہی تو تھا اِن سب کا ذمہ دار، اُسکی ایک ضد نے سب کو اس نہج پر لایا تھا۔ کم از کم اسکو تو اپنا آپ ہی ذمہ دار لگتا تھا۔ اُس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

وہ جو کبھی برا نہیں مانتے تھے، کسی بات کا بھی نہیں۔۔۔۔ وہ کیسے اتنا ناراض ہو گئے کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ یہ کیسا قطع تعلق تھا؟ جس نے ایک دوسرے کے حال سے بے گانہ ہی کر دیا تھا۔ اتنی بے حسی کیسے آگئی تھی اُن سب میں؟ بلآخر! عمر نے ہمت کی اور پانی کی بوتل لیکر آگے بڑھا۔

''تم نے کل سے پریشان کر رکھا ہے۔ پاگل ہیں کیا ہم جو سارے کام کاج چھوڑ کر تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟ اور تم یہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو۔'' اُس سے الگ ہوتا حسین اُسے ڈانٹ رہا تھا۔ وہ دونوں اب بھی زمین پر ہی بیٹھے تھے۔ رضا کا چہرہ جھکا ہوا تھا، آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ حسین اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھے اُسے اب بھی ڈانٹ رہا تھا۔ عمر اب پنجوں کے بل بیٹھا اُسکی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ مقدم نے بھی ہمت کر لی تھی۔ وہ عمر کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لیکر کھول رہا تھا۔ تاکہ رضا کو دے سکے۔ واپسی کی منزل کے مسافر، واپس آ چکے تھے۔

جب یاد کا قصّہ کھلوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں۔۔۔

پر دو لوگ اب بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکے تھے۔ ایک کی شرمندگی اسے اب سر بھی اٹھانے نہ دے رہی تھی۔ وہ علی سفیر تھا۔

اور دوسرا؟ دوسرا خود نہیں جانتا تھا کہ اسکے قدم منجمد کیوں ہو رہے ہیں؟ وہ چاہ کر بھی قدم آگے کیوں نہیں بڑھا پا رہا؟

ایس ایس پی نوید عالم کو واپسی کی منزل طے کرنے کے لیے وہ قدم ہی نہ مل سکے تھے۔ جو ایک واپسی کی چاہ رکھنے والے کے پاس ہونے چاہئیں۔

یا شاید۔۔۔۔

اُسے بھی ایک حسین جیسے دوست کی ضرورت تھی، جو اسے کھینچ کر منزل پر لے جاتا۔

سولہواں باب

سلجھتی گرہیں

''خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ اچھا بھلا تو بیٹھا ہوا ہوں میں۔۔۔''حسین نے تقریباً گرو ہانسا ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''ہر گز نہیں! بی پی ہائی ہے اِسکا، ابھی چلتے چلتے دو بار لڑھکا ہے۔۔۔''مقدّم نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''جوان آدمی ہو، اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے تمہیں۔''ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''اِس نے کل سے ٹھیک سے افطار کی ہے، نہ سحری۔ شاید اسی لیے ایسا ہوا ہوگا۔''عمر نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔

''دیکھا! یہی سمجھانا چاہ رہا ہوں میں کب سے؟''اُس نے تشکر آمیز نظروں سے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی؟ کونسے غم لاحق ہیں تمہیں، جو بنا کھائے پیے روزے رکھ رہے ہو؟''ڈاکٹر صاحب موڈ میں تھے۔

''آہ! لوگوں نے پریشان اتنا کر رکھا ہے۔''اُس نے دوسرے صوفے پر خاموش بیٹھے رضا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

رضا کو لیکر حسین نے پناہ گاہ آنا تھا، لیکن اُس نے اِس حالت میں بچوں کے سامنے جانے سے انکار کر دیا تو حسین اُسے اُسکے فلیٹ لے آیا، مقدم بھی ساتھ ہی تھا لیکن فلیٹ کے نیچے حسین کی اپنی طبیعت ہی بگڑ گئی، چہرہ سرخ ہونے لگا اور سر بھی گھومنے لگا۔ اُسکی حالت دیکھ کر مقدم کو تشویش ہوئی تو اُس نے عمر کو فون کیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو لے آئے، وہ اپنے ساتھ علی اور ڈاکٹر کو بھی لے آیا۔ نوید بھی خاموشی سے ساتھ آگیا تھا۔ اب وہ سب رضا کے فلیٹ پر اکھٹے تھے، جبکہ حسین ڈاکٹر کو یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔

''کسی خاتون واتون کا چکر تو نہیں ہے؟''ڈاکٹر صاحب نے رازداری سے پوچھا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ! شادی شدہ ہوں میں۔''حسین نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا تو ڈاکٹر کے چہرے پر بیساختہ مُسکراہٹ آئی تھی۔

''تو یقیناً دوسری کا چکر ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحب بھی باز نہیں آرہے تھے۔

''کیوں اِسکا گھر تباہ کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''مقدّم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر ایسی حالت کیوں بنا رکھی ہے؟''

''یہ میری اولادوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کیا کروں؟ پورا رمضان ایسے ہی گزرا ہے، افراتفری میں۔''اُس نے ایک نظر اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو نوید اور رضا کے علاوہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اب میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں، تمہیں کوئی میڈیکل ایشو تو نہیں ہے؟''اب کہ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں نے بس اپنی دواؤں میں کوتاہی برتی ہے، شاید اس لیے ایسا ہوا ہے۔ ورنہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''وہ روانی میں بول گیا۔ پہلی بار رضا نے بھی چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔

''کونسی دوائیں؟''ڈاکٹر نے پوچھا۔

''آں۔۔۔''وہ گڑبڑایا۔

''جلدی بتاؤ!''ڈاکٹر صاحب کو غصّہ آیا۔

''اصل میں۔۔۔ میرا ایک گردہ نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھنے میں تھوڑی بداحتیاطی ہو رہی ہے دو روز سے، اِس لیے ایسا ہو گیا ہے۔''اُس نے ذرا رک رک کر مگر مسکراتے ہو وضاحت دی تھی، وہاں جامد سناٹا چھا گیا۔ سانسیں جیسے رک سی گئی تھیں۔

''اوہ! تو یہ کیسے ہوا؟ اور کب؟''ڈاکٹر صاحب نے افسوس سے پوچھا۔

''چار سال ہو گئے ہیں۔ بس! کوئی انفیکشن ہوا تھا، اور وہ بگڑ گیا، پھر گردہ فیل کروا کر ہی گیا۔ لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دس سالوں میں کیا کیا ہو گیا تھا؟ یہ ایک دہائی تھی یا ایک صدی؟

''ہاں! ایک گردے کے ساتھ بھی ساری زندگی نکالی جا سکتی ہے۔ بس! خیال رکھا کرو اپنا۔ اور ابھی کوئی ہلکی پھلکی غذا کھاؤ۔''وہ ہدایت دیتے اُٹھ کھڑے ہوئے، عمر انہیں باہر تک چھوڑنے گیا تھا۔

''ہونہہ! ہلکی پھلکی غذا۔۔۔ میں تو ابھی پوری پلیٹ بریانی کھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''حسین نے اُنکے پیچھے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارا ایک گردہ نہیں ہے؟''علی حیرت کے جھٹکے سے ابھی ابھی باہر آیا تھا۔

''کیا میں نے اتنی دیر یہاں فارسی بولی تھی؟''اُس نے مقدّم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو علی نے گھورا۔

''پر یہ اچانک کیسے ہوا؟'' مقدّم کے لہجے میں بھی پریشانی در آئی۔

''بس! آئی فون کی ضرورت تھی تو سوچا بیچ دوں۔'' اِس آدمی سے کوئی سنجیدہ بات کرنا واقعی بیکار تھا۔

''تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔'' عمر نے واپس آتے ہو کہا تھا۔

''احتیاط؟ یہ بریانی کھانے کی باتیں کر رہا ہے۔'' مقدّم نے اُسے جواب دیا تھا۔

''بریانی کھانے سے کون سا میرے واحد گردے کو کوئی فرق پڑ رہا ہے؟'' وہ بیزار ہوا۔ اپنے مسائل وہ ایسے ہی ہنستے کھیلتے نظر انداز کرتا تھا۔

''چپ کر کے بیٹھے رہو! اور جو گھر میں پڑا ہے وہ کھاؤ۔'' مقدّم نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''اِسکے گھر میں چوہوں کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا، میں تو پھر انسان ہوں۔'' اُس نے رضا پر چوٹ کی پر وہ اب بھی خاموش ہی رہا۔

''ٹھیک ہے! میں چلتا ہوں اب۔'' یکدم ہی کافی دیر سے خاموش بیٹھا، نوید کھڑا ہوا تو سب نے ایک ساتھ اُسے دیکھا۔

''اللہ حافظ!'' وہ کسی کو بھی دیکھے بنا، سنجیدگی سے کہتا باہر نکل گیا۔

''دیکھو ذرا اِس ناہنجار کو! نہ ہی دھیان رکھنے کو کہا، نہ خیال رکھنے کو۔ بس اپنے جانے کی اطلاع دیتا نکل گیا۔'' حسین نے صدمے جیسی کیفیت سے کہا تو علی بیساختہ ہنسا تھا۔

''وہ ایس ایس پی ہے۔ بہت کام ہوتے ہیں اُسے۔'' اُس نے جتایا۔

''ہاں! اور ہم فارغ ہیں۔'' اُس نے منہ بنایا۔ پھر یکدم ہی بولا ''تمہیں معلوم ہے؟ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے اِس وقت؟''

''بریانی کھانا؟'' سوال مقدم نے کیا تھا۔

''نہیں! جناب ایس ایس پی نوید عالم کو کم از کم۔۔۔'' چٹکی بنا کر کم از کم کا اشارہ کیا۔ ''کم از کم بھی مسکراتے ہوئے دیکھنا۔'' اُس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

''تم لطیفہ سنا دیا کرو نا اُسے۔'' مقدّم نے مفت مشورہ پیش کیا۔

''میں جوکر ہوں؟'' اُس نے ناراضگی سے پوچھا تو مقدّم نے سر تا پاؤں اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ ہم اُسے کبھی ہنستا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔'' علی نے دکھ بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی رضا کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ احساس ندامت میں مبتلا ہو۔

''لگتا تو مجھے بھی نہیں ہے، پر میں نے ہنسنے کی نہیں، مسکرانے کی بات کی ہے۔''حسین نے تصحیح کی۔

''آہ! یہ تو مسکرانا بھی بھول چکا ہے۔''عمر نے اُداسی سے سرد آہ بھری تھی۔

''اور انسانوں کی طرح برتاؤ کرنا بھی بھول چکا ہے۔جب دیکھو مار دھاڑ!''یہ اچانک بڑبڑاہٹ رضا کی تھی، سب نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کیا مطلب اِس بات کا؟''مقدم نے پوچھا تو وہ سیدھا ہوا، ایسے جیسے کسی سوچ سے، یا کسی خول سے اچانک ہی باہر آیا ہو۔

''تمہیں معلوم ہے اِس نے ایک پولیس والے کی آنکھ میں کیل گھونپ کر اُسکی آنکھ پھاڑ دی ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''آنکھ پھاڑ دی؟نوید نے؟''عمر کو یقین نہ آیا۔

''ہاں! نوید نے۔۔۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''علی نے پوچھا۔

''ارے! یہ دو تین دن پہلے کسی نے میرے گھر پر بچوں کی ٹیچر پر حملہ کیا تھا۔اُسی روز جس دن تمہاری بیٹی نے اسکول میں ایک بچے کا سر پھاڑ دیا تھا۔''اُس نے روانی میں کہا تو علی کی ساری دلچسپی ہوا ہوئی۔

''یہ بکواس کرنی ضروری تھی؟''اُس نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

''اُسی روز میں جب گھر واپس آیا۔۔۔''رضا نے اسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی تھی۔اُسکے انداز میں اچانک آنے والی تبدیلی ایسی تھی، جیسے کوئی صدیوں کسی ملبے تلے دبے رہنے کے بعد زندہ باہر نکال لیا گیا ہو۔جیسے زمین پھاڑ کر، کوئی کونپل پوری قوت سے پھوٹ پڑی ہو۔جیسے آج پینتیس سالوں کا بوجھ یکبارگی ہی اُتر گیا ہو۔

تیرہویں فلور سے ایلیویٹر لینے کی بجائے سیڑھیوں سے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُترتا نوید، عمارت کے باہر یکدم ہی رکا۔عمارت کے نیچے فوڈ اسٹریٹ تھی۔آج عید کا چاند نہیں نکلا تھا اور کل تیسواں روزہ تھا۔عوام بڑے جوش و خروش سے آخری روزے اور عید کی تیاری میں مصروف تھی۔نیچے موجود فوڈ سٹریٹ بھی بھری پڑی تھی۔

''اِس قوم کی زندگی کا مقصد صرف کھانا ہی ہے۔''اُس نے بیزاری سے سوچا اور آگے بڑھنے لگا۔لیکن اچانک ہی اُسکی نظریں مشہور زمانہ ریسٹورانٹ کے بل بورڈ پر پڑیں تو اُسکے قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔

''میں۔۔۔میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا یہ۔۔۔۔مطلب۔۔۔کیسے ؟''مقدّم کے منہ سے الفاظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔رضا انہیں نوید کا کچھ روز قبل کا کارنامہ سنا چکا تھا۔

''وہ پولیس والا ہے،اُسکا کام ہے یہ۔''عمر نے اُس سے زیادہ خود کو باور کروایا تھا۔

''دنیا میں اور بھی پولیس والے ہوتے ہیں،لیکن ایس ایس پی صاحب کچھ زیادہ ہی وحشی ہیں۔''یہ جواب حسین کی طرف سے آیا تھا۔

''یعنی !اُس نے آنکھوں کے اندر پورا خنجر ہی گھونپ دیا؟میرا تو سوچ کے ہی دل کانپ رہا ہے،اور اُس آدمی کا ہاتھ بھی نہیں کانپا؟''مقدّم نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔اُسی لمحے فلیٹ کی بیل بجی۔

''اِس وقت کون آ گیا؟''حسین نے رضا کو دیکھا۔

''یقیناً پڑوس والی آنٹی ہوں گی۔''اُس نے اندازہ لگایا۔

''کیوں ؟''

''وہ مجھے جب بھی اپارٹمنٹ میں دیکھتی ہیں تو اکثر رات کا کھانا بھیج دیتی ہیں۔میرے منع کرنے کے باوجود۔''اُس نے کہا۔

''تم بیٹھو میں دیکھ لیتا ہوں،ویسے بھی مجھے اب جانا ہی ہے۔''عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''شکریہ یار !اگر پڑوس سے کوئی ہو تو معذرت کر لینا۔''اُس نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکلا۔

''یہ تمہارے پڑوسیوں کو کچھ زیادہ ہی ہمدردی نہیں ہے تم سے ؟''حسین کے ذو معنی جملے کو صرف وہی سمجھ سکا تھا۔ لہٰذا نظر انداز کرنے پر ہی اکتفا کیا۔

''اب تمہیں کیا ہوا؟''مقدّم کی نظریں خاموش کھڑے،کسی گہری سوچ میں مبتلا علی پر پڑیں تو پوچھا۔

''مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ نوید اتنا وحشی بھی ہو سکتا ہے ؟مطلب اتنی درندگی ؟اتنا خون خرابہ ؟مجھے تو اب اُسکے انسان ہونے پر بھی شک ہونے لگا ہے۔حد ہوتی ہے یار ! مطلب ہو کیا گیا ہے اِس آدمی کو؟''علی کی چلتی زبان کو فلحال مقدّم کی اشارہ کرتی آنکھیں،نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''یہ ساری باتیں تم اُسکے سامنے تو کہہ کر دیکھو!''حسین نے مسکراتے ہوئے،آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے،ذرا معصوم چہرہ بناتے ہوئے،اُسے دیکھا۔

''میں ڈرتا نہیں ہوں اُس سے اوکے ؟میں تو بس !اُسکی حرکتوں سے پریشان ہوں۔پتہ نہیں اپنی سروس میں اُس نے،اس وحشیانہ طریقے سے کتنے لوگوں کا قتل کیا ہو گا؟ کبھی کسی کی آنکھ پھاڑ دیتا ہے، کبھی کسی کا سر،تو کبھی کسی سے وعدہ لیکر اُسکا ہاتھ اُڑا دیتا ہے۔مطلب آدمی ہے کہ زومبی؟ مجھے تو شک ہونے لگا

ہے کہ مرحوم مائیکل کی طرح ایس ایس پی نوید عالم کی بھی ایک ڈائری ہو گی، جس میں اُس نے اپنے ہاتھوں معذور ہوئے انسانوں کی تصاویر جمع کر رکھی ہوں گی۔ سائیکو پیتھ ہے وہ پورا، سائیکو!'' علی کا تو خاصا ہی یہی تھا کہ جب بولتا تھا۔ بنا سوچے سمجھے، اور بنا آگے پیچھے دیکھے بولتا تھا۔

''اور اگر وہ تمہارے پیچھے کھڑا سب سن رہا ہوا تو؟'' حسین نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مقدّم سر جھکائے اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہا تھا، جبکہ رضا یہاں وہاں دیکھتے کان کھجا رہا تھا۔

''تم دو بچوں کے باپ ہو حسین! اب تمہیں یہ ٹین ایجر والے مذاق زیب نہیں دیتے۔'' اُس نے بیزاری سے کہا۔

''اچھا!'' حسین نے اچھا کو ذرا لمبا کھینچا۔ ''ذرا! پیچھے تو دیکھو!'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی کو اب غصّہ آیا۔

''کیا ہے پیچھے؟ کیا۔۔۔'' اور اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ نوید عالم واقعی پیچھے کھڑا تھا۔ بالکل اُسکے پیچھے۔۔۔ دو قدم کے فاصلے پر، دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، سنجیدہ مگر سپاٹ چہرے کے ساتھ اُسے دیکھتا بلکہ نظروں سے سالم نگلتا ہوا۔ اُسکے پیچھے عمر سینے پر بازو باندھے، سر نیچے جھکائے کھڑا تھا، آیا علی اُسکی مسکراہٹ دیکھ نہ لے۔

''تت۔۔۔ تم؟۔۔۔ تم واپس کیسے آ گئے؟'' اُس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''کیوں؟ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟'' نوید کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''سب خیریت؟ تم تو جانے کا کہہ کر گئے تھے؟'' گھر رضا کا تھا، لہٰذا میزبانی کے آداب بھی اُسی پر واجب تھے۔ فوراً نوید سے پوچھا۔ اُس نے گہری سانس لیکر ایک ہاتھ آگے کیا، اور ہاتھوں میں پکڑا لفافہ، حسین کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے لیے۔۔۔'' بے تاثر چہرے کے ساتھ حسین کو مخاطب کیا۔

''میرے لیے؟'' اُس نے حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ شہادت کی انگلی سینے پر رکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''ہاں! تمہیں بھوک لگی تھی۔ مجھے راستے میں ملا تو لے آیا۔'' بس! اِس سے زیادہ وضاحت نوید کے بس کی بات نہیں تھی۔

''راستے میں پڑا ہوا ملا؟'' یہ سنجیدہ سوال مقدّم کا تھا۔ اب کہ عمر نے اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی تھی، نوید نے نظر انداز کیا۔ حسین نے براؤن لفافہ کھول کر دیکھا، تو اُس میں ڈسپوزیبل باکس میں پیک ہوئی بریانی تھی۔ اور ایک نہیں تین ڈبّے تھے۔ وہ یقیناً رضا اور مقدّم کے لیے بھی لایا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں پہلے ہی آج رات رضا کے ساتھ رکنے کا اعلان کر چکے تھے۔ اُسکی مرضی کے بغیر۔۔۔

''یہ تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟''حسین نے ذرا ڈرنے کی اداکاری کی، نوید سنجیدگی سے اُسے دیکھتا رہا۔اِس وحشی آدمی کو آج تک اظہار کرنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا۔وہ واقعی گدھا تھا!

''نہیں میرا مطلب! قصائی کو جب مرغی ذبح کرنی ہوتی ہے، تو وہ اُس پر، ایسے ہی مہربانیاں کرتے دیکھا جاتا ہے۔تم۔۔۔کہیں۔۔۔اگلا وعدہ مجھ سے تو نہیں لینے والے؟''نوید نے ایک نظر بے پر کی ہانکتے حسین کو دیکھا، پھر سر جھٹک کر علی کی طرف رخ کیا۔

اور اس ایک رخ بدلنے کے دوران۔۔۔

اُس ایک لمحے میں۔۔۔۔

فقط پلک جھپکنے میں۔۔۔

ہر شخص کو یہ گمان گزرا کہ نوید عالم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

بس ایک ذرا سی مسکراہٹ۔۔۔

جو اُس نے پلک جھپکنے میں ہی غائب کر دی تھی۔وہ مُسکرایا تھا؟ یا یہ اُنکی نظروں کا دھوکا تھا؟ پر نہیں! اتنی نظریں ایک ساتھ دھوکا نہیں کھا سکتیں۔حسین کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا تھا، پانی پیتے ہوئے مقدّم سر کا اور کھانسا تھا، جبکہ نوید نے سب کو یکسر نظر انداز کر کے علی کو دیکھا۔

''کیا تم گاڑی میں آئے ہو؟''یہ سوال انتہائی بے تکا تھا۔کیونکہ نوید بہت اچھے سے جانتا تھا کہ علی گاڑی میں ہی آیا ہے، بلکہ خود وہ بھی، ابھی علی کی ہی گاڑی میں یہاں تک آیا تھا۔درحقیقت! وہ مرکزِ نگاہ نہیں بننا چاہتا تھا، اُسے توجہ نہیں ملی تھی، اِس لیے توجہ اُسے آج بھی زہر لگتی تھی۔توجہ کا مرکز بننے سے اُسے آج بھی وحشت ہوتی تھی۔توجہ۔۔۔اُسکا دم گھٹاتی تھی۔

''ہاں!''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔

''مجھے گھر تک چھوڑ دو، میں پیدل آیا ہوں۔''اُس نے پوچھا نہیں تھا، حکم دیا تھا۔

''مم۔۔۔میں؟''علی نے مصنوئی مسکراہٹ کے ساتھ تھوک نگلا۔

''ہاں!'' نوید نے کندھے اُچکاتے رُخ بدلا تاکہ دروازے کی طرف جا سکے۔

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، تمہارا گھر میرے راستے میں ہی ہے۔''عمر نے علی کی مشکل آسان کرنی چاہی۔

''تمہیں میرا گھر کیسے معلوم؟''اب کہ سنجیدگی سے عمر سے سوال کیا گیا۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔علی نے بتایا تھا۔''اب کہ عمر بھی گڑبڑا گیا۔

''میں نے کب بتایا؟''علی نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''اور علی کو میرا گھر کس نے بتایا؟''نوید نے علی کو سنجیدگی سے دیکھا۔خالص پولیس والا انداز۔۔۔۔

''وہ۔۔۔وہ شیراز نے۔۔۔اُسی نے دیا تھا ایڈریس۔۔۔''دفاع کا اصول نمبر پندرہ! جو موقع پر موجود نہ ہو، قصور اُسی کے سر ڈال دو۔

''پر شیراز کو میرا گھر نہیں معلوم!''اُسکے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔ایک تو یہ ایس ایس پی بھی نا! تفتیش سے باز نہیں آتا کبھی۔

اب کہ وہاں نہایت ہی نامناسب سی خاموشی چھا گئی تھی۔انگریزی میں جسے کہتے ہیں

Awkward silence

''مجھے علی سے کچھ ضروری کام ہے۔اسی لیے تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔''نوید نے عمر کو جواب دیتے اُسکی پیشکش مسترد کی۔علی کا خون ہی خشک ہو گیا، کبھی جو وہ زبان چلانے سے پہلے سوچ لے۔

''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔اپنا خیال رکھنا حسین!''عمر نے اُن سب کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل گیا۔

''میں باہر ہی ہوں۔''نوید، علی کو کہتا ایک نظر سب پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

''کہا بھی تھا کہ پیچھے دیکھ لو! مگر نہیں۔۔۔میں تو ڈرتا نہیں ہوں نوید سے۔۔۔''حسین نے ہنستے ہوئے کہا تو علی نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اللہ حافظ!''اُس نے بیزاری سے منہ بناتے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

''علی!''یکدم ہی رضا نے اسے پکارا تو وہ پلٹا۔

''ہاں؟''

''اللہ کی امان میں۔۔۔''اُس نے کہا تو سنجیدگی سے تھا پر حسین اور مقدم قہقہ لگا کر ہنسے تھے۔علی منہ بناتا باہر نکل گیا، نوید سے تو بس اللہ کی امان ہی بچا سکتی تھی۔

اور انہیں محسوس بھی نہ ہوا کہ۔۔۔

خلا بھرنے لگا۔۔۔

دراڑ بند ہونے لگی۔۔۔

فاصلے سمٹ گئے۔۔۔۔

جو مسافر تھے واپسی کے۔۔۔

وہ منزل سے پہلے ہمسفر ہو گئے۔۔۔

---------+---------+--------

علی نے سیٹ بیلٹ لگاتے ہوئے، چور نظروں سے پسینجر سیٹ پر بیٹھے، موبائل میں مصروف نوید کو دیکھا۔

''جیبیں خالی ہیں، کوئی خنجر و نجر نہیں دکھ رہے۔''اُس نے خود کو تسلی دیتے گاڑی اسٹارٹ کی۔

''بیلٹ کے پاس بھی کوئی گن وغیرہ نہیں ہے۔گاڑی کا لاک کھلا رکھتا ہوں۔اگر اِس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو یہیں سے چھلانگ لگا دوں گا۔'' گاڑی چلاتے اُس نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا۔

''دو پسٹل میرے بوٹس میں ہوتی ہیں۔ایک کمر میں پیچھے۔اور ایک آستین میں رکھتا ہوں، چھوٹی سی ہوتی ہے۔''علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔اُسکے چہرے پر خطرناک حد تک سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''تت۔۔تو؟''اُس نے تھوک نگلا۔

''تم ہی دیکھ رہے تھے غور سے۔اسی لیے بتا دیا۔''اُس نے موبائل جیب میں ڈال کر، سامنے نظر آتی سڑک پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔علی بری طرح شرمندہ ہوا۔ کافی دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔

''تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا نا؟''علی نے نوید سے پوچھا۔

''مجھے؟ نہیں تو!''اُس نے اتنی حیرت سے کہا کہ علی کو اُسکی یاداشت پر شک گزرا۔

''تم نے ابھی اندر نہیں کہا تھا عمر سے، کہ تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟''اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں! یہی کام تھا۔گھر جانا تھا مجھے پر گاڑی نہیں تھی۔''اُسکی سنجیدگی میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہی کام تھا؟''اُسے یقین نہ آیا۔نوید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو عمر کے ساتھ ہی چلے جاتے۔''اُس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا تو نوید نے رخ موڑ کر اُسے بغور دیکھا۔

''عمر نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے بھائی ہو، دوست ہو، مجھے بہت عزیز ہو۔''گاڑی میں نوید کی سنجیدہ اور بھاری آواز گونجی۔''اُس نے نہیں کہا تھا کہ تمہیں میری ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔''اُسکو اُسی کے الفاظ واپس لوٹاتا نوید خاموش ہوا۔علی بھونچکا رہ گیا۔یا اللہ! یہ آدمی!

اور وہ آدمی کندھے اُچکاتا سنجیدگی سے سامنے دیکھنے لگا تھا۔

''میں نے تمہاری ڈرائیوری کرنے کے لئے وہ سب نہیں کہا تھا۔''علی بھی تمام لحاظ بلائے طاق رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''میں نے تو یہی سمجھا تھا۔''کمال بے نیازی تھی بھئی!

''تمہیں میرے گھر کا ایڈریس کیسے معلوم؟''ایس ایس پی صاحب، کبھی بھی، کہیں بھی، کسی بھی مقام پر تفتیش شروع کر سکتے تھے۔یہ آپکا کام تھا کہ آپ تیار رہیں۔ ہر وقت۔۔۔ہر لمحہ۔

''میں نے فرّخ صاحب سے ہسپتال میں لیا تھا۔''اُس نے کہا،اب وہ فرخ صاحب سے تو جا کر سوال نہیں کرنے والا۔

''فرّخ صاحب ایسے ہی کسی کو بھی میرا ایڈریس نہیں دیتے۔''اُس نے بڑے سکون سے کہا تھا۔اب کہ علی کے پاس کوئی جواب نہیں بچا۔

''ہونہہ۔۔۔یہیں روک دو۔''سوسائٹی کے دروازے کے قریب نوید نے کہا تو علی نے گاڑی روک دی۔ نوید نے سیٹ بیلٹ کھولی، پھر دروازہ کھولا لیکن اُترا نہیں۔بلکہ پلٹ کر علی کو دیکھا جو اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں نے اُس رات تمہیں جو بھی کہا، اگرچہ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرے الفاظ سخت تھے۔تمہیں برا لگا ہو تو آئی ایم سوری!''معذرت بھی دھونس جما کر کی تھی اِس آدمی نے۔علی کو اپنی سماعتوں پر لمحوں کے لیے شک گزرا۔اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے بغور دیکھا۔

''جو کچھ تم غصّے میں کہہ دیتے ہو، بعد میں معذرت کرنے سے اُسکا اثر زائل نہیں ہوتا۔''اِس بار بھونچکا ہونے کی باری نوید کی تھی، جبکہ اُسکے الفاظ اُسے ہی واپس لوٹانے کے بعد علی مزے سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میرے ایک دوست کے سنہری الفاظ ہیں۔سوچا تمہیں بھی بتا دوں۔''اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ہونہہ۔۔۔حُسین کا دوست!

نوید کچھ لمحے حسین کے دوست کو سنجیدگی سے دیکھتا رہا، پھر آنکھیں چھوٹی کیں، آنکھ کے برابر میں لگا زخم کا نشان گہرا ہوا۔

''میں اتنا گدھا نہیں ہوں کہ کوئی میرا پیچھا کرے اور مجھے معلوم نہیں ہو۔''اور۔۔۔ علی سفیر۔۔۔۔بہت اچھے سے اِس جملے کا مطلب سمجھتا تھا۔آخری ملاقات کے بعد اُس نے خاموشی سے نوید کا پیچھا کیا تھا، جانتا تھا کہ وہ اپنا گھر نہیں بتائے گا۔پر وہ اُسکا گھر جاننا چاہتا تھا، کہ کبھی جا کر اُس سے مل لے۔ کبھی یعنی۔۔۔۔جب اُنکے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہو۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے عمر کو نوید کے گھر کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔اُسے کیسے معلوم ہوا؟ اب یہ تو وہ ہی جانتا تھا۔

''خدا حافظ !''نوید نے جتاتے ہوئے انداز میں خدا حافظ کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔پیچھے بیٹھا علی دل سے مسکرایا تھا۔

---------+---------+--------

''آہ! ایس ایس پی صاحب کو اللہ جنت کی حوریں نصیب کرے۔آمین!''بریانی سے لطف اٹھاتے حسین نے بڑے دل سے اُسے دعا دی تھی۔

''یہ کیسی دعا ہے؟''مقدّم ہنسا۔

''مجھے ایسی ہی دعائیں آتی ہیں۔''اُس نے کندھے اچکاتے کہا۔

''ویسے نوید سے مجھے ایسی مہربانی کی امید ہر گز نہ تھی۔''مقدّم نے چمچ کی مدد سے بریانی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب اُس نے مہربانی کر ہی دی ہے، تو تم بھی اُس سے اپنے تنازعے حل کر لو۔''میز پر سے کوک کا کین اُٹھا کر منہ سے لگاتے رضا نے حسین سے کہا تھا۔میز کا وہی حال تھا، جو کسی بھی دوستوں کی محفل میں ہو سکتا ہے۔بریانی کو پلیٹوں میں نکالنے کی زحمت ہر گز نہیں کی گئی تھی۔لہٰذا تینوں ڈسپوزیبل ڈبّے میں ہی کھا رہے تھے۔کوک کے کئی کین درمیان میں الٹے سیدھے پڑے تھے، جو مقدم نے منگوائے تھے۔

''کیسا تنازعہ؟''اُس نے بھی لاعلمی کی انتہا کر دی۔

''مجھ سے تو کہہ رہے تھے کہ میری بھی عزت نفس ہے، میرے اندر بھی انا ہے۔جب تک نوید معافی نہیں مانگے گا میں بات نہیں کروں گا۔''مقدّم نے اُسکی نقل اُتاری تو رضا بیساختہ ہنسا تھا۔''ایک بریانی کی پلیٹ کی خاطر تم نے اپنی انا کا سودا کر دیا حسین؟ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''مقدّم نے بات جاری رکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''وہ آئی فون کی خاطر اپنا گردہ بیچ سکتا ہے تو انا کیا چیز ہے؟''یہ چوٹ رضا نے کی تھی۔اچھا ہوا جو وہ دونوں ساتھ رک گئے، ورنہ رضا الٰہی اکیلے ہوتا تو ساری رات ایک نیا ڈپریشن اپنے لیے تیار کر چکا ہوتا۔

''کھانے کے معاملے میں میری کوئی انا نہیں ہوتی، نہ میں کسی کا ہوتا ہوں اور نہ کوئی میرا۔ لہٰذا کھانے کے بعد میری انا واپس آ جائے گی۔'' حسین تو تھا ہی ڈھیٹ۔

''نوید نے علی کی ساری بکواس سن لی تھی۔'' رضا کو یکدم ہی یاد آیا۔

''اسی لیے تو ساتھ لیکر گیا ہے اُسے۔ اب تک تو ٹھکانے بھی لگا چکے ہوں گے ایس ایس پی صاحب اُسے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پر تمہیں علی کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے؟'' کھانا ختم کر کے، ڈبہ میز پر رکھتا حسین مشکوک ہوا۔

''میں کیوں فکر کروں گا اُسکی؟ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ علی کو ذرا! اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیے۔ نوید برا بھی مان سکتا ہے۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''دوست ہو گا، تو برا نہیں مانے گا۔'' مقدّم نے کہا تو رضا ساکت ہوا۔ دوست تو برا نہیں مانتے۔۔۔۔ واقعی نہیں مانتے۔

''تم پناہ گاہ جاؤ گے؟'' حسین نے پوچھا۔

''نوید کہہ رہا تھا کہ اُس نے جزا کو اطلاع دے دی ہے۔ میں ابھی بچوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا۔ صبح جاؤں گا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''جزا کون؟'' مقدم نے بس یہی لفظ سنا تھا جیسے۔

''وہ خاتون جو اِسکے بچوں کی ٹیچر ہیں۔'' حسین نے یاد دلایا۔

''وہ جنہیں پولیس گرفتار کرنے آئی تھی؟'' اُسے یاد آیا۔

''ہاں!'' حسین نے کہا۔

''اچھا اچھا!'' اُس نے سر ہلاتے کوک کا کین منہ سے لگایا۔

''ایس ایس پی صاحب کی سگی بہن ہے وہ۔۔۔'' اگلے ہی لمحے کوک فوارے کی صورت اُسکے منہ سے باہر آئی تھی۔

''کیا کر رہے ہو؟'' رضا نے پیچھے ہوتے جھنجھلا کر کہا۔ حسین تو اپنے تئیں انکشاف کر کے مُسکرا رہا تھا۔

''ایس ایس پی کی بہن اِسکے گھر میں کیا کر رہی تھی؟'' مقدّم کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ابھی بتایا ہے اُس نے کہ بچوں کی ٹیچر ہے وہ۔'' رضا چڑا تھا۔

''اچھا جبھی نوید نے اُس پولیس والے کی آنکھیں پھاڑی ہیں۔'' مقدّم کو اب سمجھ آیا تھا۔

''ہاں ٹیوب لائٹ! تو تم کیا سمجھے تھے؟''حسین نے پوچھا۔

''میں تو سمجھا کہ شاید رضا نے شکایت کی ہو گی تو اُس نے غصّے میں ایسا کیا۔ وہی میں سوچ رہا تھا کہ بھلا ایک ہی لڑکی کے لئے نوید نے دو بار اتنا غصّہ کیوں کیا؟''اُسے اب سمجھ آ رہا تھا۔

''ظاہر ہے، بہن ہے اُسکی۔''رضا نے کہا۔

''تمہیں معلوم تھا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''جس دن سے معلوم ہوا ہے، اُس دن سے ہی تو بیچارہ اتنا ڈرا ہوا ہے۔''رضا کے بولنے سے پہلے حسین نے جواب دیا تھا۔

''میں کیوں ڈروں گا؟ میں نے کونسا ایس ایس پی کی بہن پر آواز کسی ہے؟ عجیب!''رضا نے روانی میں کہا تھا۔ لیکن آج اُسکا انداز اتنا ہلکا پھلکا تھا جتنا کبھی یونیورسٹی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟''اُس نے دونوں کو سنجیدگی سے گھورا۔

''تمہارے منہ سے ایس ایس پی سن کر اتنا اچھا لگا کہ بس!''مقدّم نے کہا۔

''اچھا بھلا نام ہے بیچارے کا، کب سے دونوں ایس ایس پی کیے جا رہے ہو۔ میری زبان پر بھی چڑھا دیا ہے۔''وہ بڑبڑایا تو ایک بار پھر دونوں ہنسے تھے۔ آج اُسکے دوست نہ ہوتے تو شاید پچھلے دنوں کے واقعات کے اثر سے نکلنے میں اسے صدیاں لگ جاتیں۔

کاش! دس سال پہلے بھی وہ اپنے دوستوں کو سب بتا دیتا۔ بتا دیتا تو اتنے کاش نہ ہوتے اُسکی زندگی میں۔

---------+---------+--------

علی گھر میں داخل ہوا تو نشمیہ سامنے کھڑی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''نشمی!''وہ اسے روتا دیکھ کر گھبرایا۔

''بابا!''وہ روتے ہوئے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اُسکی جانب بڑھی تاکہ وہ اُسکو گود میں لے لے۔ علی نے تیزی سے اُسے گود میں اُٹھایا۔

''کیا ہوا نشمیہ؟ کیا ہوا بیٹا؟''وہ اُسکا چہرہ صاف کرتے پریشانی سے بولا اور آس پاس دیکھا۔ نہ سفیر صاحب نظر آ رہے تھے اور نہ ہی فاطمہ۔

''بابا! امی کو چوٹ لگ گئی۔''اُس نے روتے روتے کہا۔

''چوٹ لگ گئی؟''اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ابّا کہاں ہے؟''وہ پریشان ہو رہا تھا۔

''امی کے پاس۔۔۔''علی اُسے گود میں لیکر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔اوپر سے کسی کی بری طرح کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔آواز ایسی خطرناک تھی جیسے کسی کا حلق تک چھل گیا ہو۔ وہ بنا کچھ سوچے سمجھے فاطمہ کے کمرے تک گیا پر کمرے کے باہر اُسکے قدم رک گئے۔

فاطمہ بستر پر لیٹی بری طرح کھانس رہی تھی۔اسکے پاس دو عدد خاتون نرس کے لباس میں موجود تھیں۔ایک اُسکا سر سہلا رہی تھی،دوسری اُسکے برابر آکسیجن ماسک لیے کھڑی تھی، برابر میں ہی درمیانے سائز کا آکسیجن سلینڈر رکھا تھا۔قریب ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا اُسکے ہاتھوں پر ڈرپ لگا رہا تھا۔یقیناً وہ ڈاکٹر تھا۔سفیر صاحب پریشان صورت کے ساتھ کمرے کے دوسرے کنارے پر کھڑے تھے،احمد اُنکی ٹانگوں سے لپٹا رو رہا تھا۔

اُسی لمحے کھانستے کھانستے فاطمہ لیٹے ہوئے سے اٹھی،تو ایک نرس نے جلدی سے سٹیل کا پلیٹ نما برتن اُسکے سامنے کیا۔اور اُس لمحے علی سفیر کے قدموں کے نیچے سے دنیا سرکی تھی۔

اُس نے دیکھا تھا،اُسکی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔فاطمہ آفندی نے اُس برتن میں خون تھوکا تھا۔نرس نے اُسکے منہ پر رومال رکھا اور اُسے دوبارہ لٹا دیا۔اُس نے اتنی گہری سانس لی جیسے کب سے سانس رکی ہوئی ہو۔پھر دوسری نرس نے اُسکی ناک میں آکسیجن کی نلکی لگا دی۔وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔اُس لمحے علی سفیر کو یاد نہ رہا کہ سامنے لیٹی عورت سے وہ شدید نفرت کا دعویدار ہے۔

''فاطمہ!۔۔۔۔فاطمہ۔۔۔کیا ہوا ہے اِسے۔''وہ تیزی سے وہاں آیا۔پر فاطمہ نہ کچھ کہنے نہ کچھ سننے کے لائق تھی۔اُسکی حالت اتنی بدتر ہو رہی تھی کہ وہ بس کھانسی روکنے کی تگ ودو میں تھی۔علی کی گود میں نشمیہ بری طرح رو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے اسے۔''اِس سے پہلے کہ وہ ڈاکٹر کو جھنجھوڑ دیتا سفیر صاحب نے اُسکا بازو پکڑ لیا۔وہ جھٹکے سے مڑا اور اگلے ہی لمحے اُنکے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر وہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آیا تھا۔

وہ تو اُسکی مطلقہ تھی نہ؟

اُسکو دھوکا دینے والی عورت؟

---------+---------+--------

''چلو اُٹھو! یہ سامان کچن میں رکھ کر آؤ!''رضا نے میز پر پھیلے سامان کی جانب اشارہ کرتے،آڑھے ترچھے لیٹے حسین کو کہا۔

''میں بیمار ہوں۔''اُس نے ہری جھنڈی دکھانی چاہی۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں۔اُٹھو اور تھوڑا چلو پھرو۔''رضا نے اُسے زبردستی بازو سے پکڑ کر اُٹھایا تو وہ برے برے منہ بناتا، سامان لیکر کچن کی جانب بڑھا۔اوپن کچن سامنے ہی تھا۔ حسین سامان رکھنے لگا۔

''حور عین دیکھ لے مجھے ایسے کام کرتے ہوئے۔یقین مانو! تمہاری بلائیں ہی لے لے گی۔''اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک کام کرو! سامان کچرے کے ڈبے میں ڈال دو۔ایسے سلیب پر ہی پڑا مت چھوڑ دینا۔''رضا نے خاصی سنجیدگی سے حکم دیا تھا۔

''بات سنو!''وہ تیوری پر بل چڑھائے، سامان چھوڑ کر واپس سے اُسکے سامنے آیا اور ناراضگی سے اُسے دیکھا۔''اگر تمہاری محبت میں، میں تمہارے ساتھ آگیا ہوں نا! تو اِسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم مجھے ملازم سمجھ لو۔اُٹھو اور جا کر چائے بناؤ! بہت آرام کر لیا تم نے کل سے اور بہت خوار کروالیا تم نے کل سے ہمیں۔''وہ مقدم کے برابر صوفے پر ڈھیتے ہوئے بولا۔

''گیس نہیں ہوتی اِس وقت شہر میں۔''اُس نے یاد دلایا۔

''تمہارے پاس الیکٹرک کیٹل ہے۔تم نے اُسی میں پچھلی بار چائے پلائی تھی مجھے۔ تمہیں معلوم ہے نہ تمہاری ہاتھوں کی چائے مجھے کتنی پسند ہے؟ چلو اُٹھو شاباش!''اُس نے شرارت سے کہا۔وہ جب بھی رضا کا بن بلایا مہمان ہوا تھا، ہمیشہ اُس سے زبردستی چائے ضرور بنوائی تھی۔وہ برے برے منہ بناتا کچن کی جانب آیا۔جانتا تھا اُس سے بحث کا کوئی حاصل حصول نہ تھا۔

''یہ دوبارہ کچھ غلط تو نہیں کریگا۔''کاؤنٹر پر کھڑے رضا کی پیٹھ پر نظریں جمائے مقدّم نے سرگوشی کے سے انداز میں حسین سے پوچھا۔

''جس رات صنوبر اغوا ہوئی تھی۔اُس رات تم مجھ سے رضا کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''حسین نے بڑی ہی غیر متوقع بات کہی۔

''ہاں! اور تم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔''اُسکا شکوہ بجا تھا۔

''کاش! میں بتا دیتا۔میری غلطی تھی کہ میں نے سوچا کہ اگر سب کو بتا دوں گا تو رضا کے ساتھ خیانت ہو گی۔میں اکیلے ہی سارا معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔ لیکن میں غلط تھا۔اگر سب کو معلوم ہوتا تو سب مل کر اُسے سنبھال لیتے۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''میں عمر کے بارے میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اگر وہ یہاں سے بھاگنے کے بجائے، سب کو بتا دیتا تو شاید ہم سب مل کر، اُسکو غلط فیصلہ لینے سے روک پاتے۔''اُس نے افسوس سے کہا۔

''عمر؟''حسین حیران ہوا۔''کیا تم نے عمر سے پوچھا؟''وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''ہاں! میں نے اُسے بتایا کہ تم خضر سے ملے تھے۔''اُس نے سرگوشی نما انداز میں کہا۔

''اگر اب میرے کانوں تک سرگوشیوں کی آواز آئی، تو میں دونوں کو گھر سے نکال دوں گا۔انسانوں کی زبان میں بات کرو۔''یکدم ہی رضا کی بلند آواز لاؤنج میں گونجی تھی۔

''اوہو! کوئی ہماری آواز سننے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے؟''حسین کیوں باز آتا؟

''محفل کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔''رضا نے بھی کس کو غیرت دلانی چاہی تھی؟

''غیبت کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ جسکی کی جا رہی ہو، اُس تک نہیں پہنچنی چاہیے ورنہ وہ غیبت کیسے ہو گی؟''اُس نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!''اپنا تکیہ کلام دہراتے اُس نے میز پر چائے رکھی تو دونوں اُسکے انداز پر ہنس پڑے۔

''تم عمر کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟''حسین نے ایک بار پھر سے سنجیدہ ہوتے ہوئے مقدّم سے پوچھا۔سامنے صوفے پر بیٹھتے رضا نے بھی دیکھا۔

''عمر کو ٹیومر ہو گیا تھا، اور۔۔۔''اُسکے بعد وہ سب بتاتا چلا گیا۔اُنکے لیے ہر شے پہلے سے زیادہ ناقابلِ یقین سی تھی۔

''خضر؟ خضر کا انتقال ہو گیا؟''حسین کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''کاش! اُس وقت ہم ایک دوسرے سے اپنے معاملات ڈسکس کر لیتے۔''مقدّم نے آہستہ سے کہا۔

''ہم سب اِس وقت ریگریٹ (پچھتاوے) سے گزر رہے ہیں۔پہلے ہم ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔اب سب کو لگ رہا ہے کہ وہ ہی جھگڑے کا سبب تھا۔''حسین نے اُسکا دکھ بانٹنا چاہا۔

''میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ سینے سے غم لگا کر پھرنے سے اچھا تھا، اپنے دوستوں کو سب بتا ہی دیتا۔لیکن نجانے ہم سب کو اچانک سے کیا ہو گیا تھا؟''مقدّم نے اُداسی سے کہا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔اب ہم اُسے ماضی میں جا کر بدل نہیں سکتے۔''حسین نے نرمی سے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔پھر وہاں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''مقدّم!''مقدّم موبائل میں کچھ دیکھنے لگا ہی تھا کہ کافی دیر سے خاموش رضا نے یکدم ہی اُسے مخاطب کیا۔

''ہمم!''اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔''اُس نے جھجکتے ہوئے بات کا آغاز کرنا چاہا۔

''لیلیٰ اغوا ہو گئی تھی، اِس لیے مجھے آناً فاناً سوات کے لیے نکلنا پڑا تھا۔''رضا کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے اُس موبائل رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ رضا کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

''اغوا ہو گئی تھی یعنی؟''حسین نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! اُسے، اُسکے بھائی نے اغوا کر لیا تھا، پھر قتل کر دیا تھا۔ بس! اُسکے بعد جو ہوا وہ تو تمہیں معلوم ہے۔''اُس نے اُداس سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''پر کیوں؟''رضا نے پوچھا۔

''قبائلی عصبیت۔۔۔''اُس نے کندھے اُچکائے۔ لیلیٰ کا ذکر آج بھی دل چیرنے پر قادر تھا۔ وہ لوگ خاموش ہوئے۔

''چاند تو نکلا نہیں! آخری روزہ میں سکون سے گھر میں افطار کرنا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی کل کوئی اور چاند مت چڑھا دینا تم لوگ۔''حسین نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ درحقیقت موضوع بدلا تھا۔

''اگر تم سکون سے گھر چلے جاؤ! تو یقین مانو تم صرف افطاری ہی نہیں بلکہ سحری بھی گھر پر ہی کرو گے۔''رضا نے خاصی سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔

''دیکھ رہے ہو اسے؟ کیسے ہمیں گھر سے نکالنے پر تلا بیٹھا ہے۔''حسین نے مصنوئی دکھ سے مقدّم کو کہا تھا۔

''ہمیں نہیں، صرف تمہیں۔۔۔''مقدّم نے تصحیح کی تھی۔

''یقین مانو! اب تو حور بھی شک کرنے لگی ہے مجھ پر، کہ میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہوتا ہوں۔''اب کہ اُس نے بیچارگی سے کہا تو دونوں ہنس دیئے تھے۔

---------+---------+--------

''یہ کافی عرصے سے پلمونری ٹی بی کا شکار ہے، جس نے اِسکے پھیپڑوں پر اثر ڈالا ہے۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے ٹھیک سے علاج نہیں کروا سکی۔ مرض اب بگڑ گیا ہے۔''لیونگ روم میں اِس وقت فقط تین نفوس موجود تھے۔ آواز صرف سفیر صاحب کی تھی یا پھر علی کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کی۔ نشمیہ کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی کہ وہ علی کی گود میں سر رکھ کر صوفے پر ہی سوئی ہوئی تھی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اُسکا سر سہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فاطمہ دواؤں کے زیر اثر اب پر سکون ہو کر سو چکی تھی، جبکہ احمد اب تک اپنی ماں کے سرہانے بیٹھا تھا۔

''اُسکی طبیعت تین روز سے کافی زیادہ خراب تھی، میں نے اُسے منع بھی کیا تھا کہ آج اسکول نہ جائے لیکن آج اُسکی تنخواہ کا چیک آنا تھا۔ خراب طبیعت میں بھی وہ چلی گئی۔''

میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی، ٹھیک ہے؟ مطلب میرا ماننا یہ ہے کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ اپنے سر لوں؟ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔

ایک زندہ دل لڑکی کا چہکتا لہجہ اُسکی سماعتوں میں گونجا۔ یاداشت کے کسی کونے نے جیسے اب جاگنا شروع کیا تھا۔

''علاج ممکن ہے اُسکا لیکن۔۔۔'' سفیر صاحب رکے۔

''لیکن؟'' اُس نے پہلی بار چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔

''اُس کے اندر سے جینے کی امنگ ختم ہو چکی ہے۔ قوت مدافعت بھی کمزور ہو چکی ہے، وہ تنہائی کا شکار ہے۔ اِس لیے وہ اپنے دونوں بچوں کو تمہارے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ اُس روز بھی وہ صرف نشمیہ کو تمہیں لوٹانے اور احمد کو آخری بار دیکھنے آئی تھی لیکن شاید تمہیں سمجھا نہ سکی۔'' اُنہوں نے آہستہ سے کہا۔ علی نے کچھ نہ سنا۔۔۔ علی سفیر نے واقعی کچھ نہ سنا، اُس کی دنیا بس لفظ **آخری بار** پر ہی رک گئی تھی۔ اُس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

پتہ نہیں! زندگی دوبارہ موقع دے یا نہ دے؟ پر مجھے تم سے معافی مانگنی ہے۔

تو وہ اس لیے ایسا کہہ رہی تھی؟ اُسے اپنے زندہ رہنے کی کوئی اُمید تھی نہ چاہ۔

''اُس نے اپنا علاج روک دیا تھا۔ پہلے وہ جو کماتی تھی، اُس سے ہاسٹل کا کرایہ، کھانا پینا اور اپنی دوائیں خریدا کرتی تھی۔ پر اب دو ماہ سے اُسے احمد کا خرچہ بھی اُٹھانا پڑ رہا تھا۔ تو اُس نے اپنی دوائیں روک دی تھیں۔'' زندگی میں ایسے کتنے ہی لمحات آئے تھے، جب اسکا دل کیا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائے۔ آج بھی ایسا ہی ایک اور لمحہ، علی سفیر کا مقدر رہا تھا۔ وہ اپنے کیے پر بعد میں پچھتاتا تھا، سو اب وہی کر سکتا تھا۔

''ابّا! آپ احمد کا خرچہ بھیج دیتے۔ آپ کا تو رابطہ تھا نہ!'' اُس نے ٹوٹے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ احمد کو اُسکی ماں کے ساتھ بھیج کر علی نے اُس سے تمام تعلقات ختم کر لیے تھے، حتیٰ کہ اُسکے اخراجات دینا بھی بند کر دیئے تھے۔ یہ سوچے بنا کہ اُسکا بیٹا کیسے رہ رہا ہو گا؟

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا؟'' اُنہوں نے اُسے دیکھا۔ ''میں نے فاطمہ سے رابطہ کیا تھا تاکہ اُسکے اکاؤنٹ میں پیسے بھیج سکوں۔ پر اُس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کسی قسم کی کوئی رقم یا مدد مجھ سے نہیں لینا چاہتی تھی۔ جب نشمیہ اُسکے پاس تھی، تب وہ اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی تھی

اور نشمیہ کا سارا خرچہ اُسکے نانا اُٹھاتے تھے۔اور ظاہر ہے، جو احسان کرتا ہے وہ جتاتا بھی ہے۔''اُنہوں نے کہا تو علی نے بیساختہ اپنی گود میں سوئی نشمیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اب اُسے معاف کر دو، معاف کر دو کہ کم از کم وہ سکون سے مر سکے۔

سفیر صاحب کے الفاظ یاد آئے تو انہیں دیکھا۔

''ابّا!''اُس نے پکارا۔

''ہونہہ ؟''اُنہوں نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''کیا۔۔۔کیا وہ۔۔۔مر جائے گی ؟''اُس نے کیسے پوچھا تھا وہ ہی جانتا تھا۔

''اگر علاج ہو جائے گا، تو ہر گز نہیں !''اُنہوں نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اُسکا علاج کروانا ہو گا۔''اُس نے یکدم ہی کہا۔

''کون کروائے گا؟''اب وہ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''ہم۔۔۔ہم کروائیں گے۔''

''تو کیا تم اُس عورت کا علاج کرواؤ گے جس نے تمہیں دھوکا دیا؟اور کیا وہ ایسے آدمی کا اپنے علاج کے اخراجات اُٹھانا قبول کریگی، جو اُسکا سابقہ شوہر ہے ؟''نہیں ! وہ طنز نہیں کر رہے تھے۔وہ سوال کر رہے تھے۔وہ واقعی جاننا چاہتے تھے کہ علی کیا ایسا کرنے کی ہمت رکھتا ہے ؟اور علی سفیر اِس بات کے جواب میں خاموش رہ گیا۔

''خیر ! میں اِسکے گھر والوں سے بات کرتا ہوں۔جو بھی ہو جائے، فاطمہ اِنکی اولاد ہے۔اُسکی حالت کے بارے میں جاننا انکا حق ہے۔اور فرض بھی !''وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔پھر ایک نظر علی کو دیکھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

علی نے آہستہ سے نشمیہ کو گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لا کر لٹا دیا۔جب سے فاطمہ آئی تھی، وہ اپنی مرضی سے جہاں دل کرتا وہاں سو جاتی۔ کبھی فاطمہ کے پاس تو کبھی اپنے بھائی احمد کے ساتھ تو کبھی علی کے ساتھ۔وہ ویسے بھی اپنی مرضی کی مالک تھی۔ علی نے مسکرا کر اُسکا سر سہلایا، پھر اسے سوتا چھوڑ کر باہر آ گیا۔

کمرے سے باہر آ کر ایک نظر سفیر صاحب کے بند کمرے کی جانب دیکھا، اور پھر اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب۔ پھر خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ فاطمہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ احمد اُسکے سرہانے سر رکھے سو گیا تھا، خود وہ اب تک دواؤں کے زیرِ اثر تھی۔ علی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا اور احمد کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ایک نظر فاطمہ پر ڈالی، اور وہ ایک نظر دھندلا گئی۔

اُسکے سفید دوپٹے پر خون کے دھبّے ابھی بھی موجود تھے۔ بند آنکھوں کے باوجود حلقے واضح نظر آ رہے تھے، چہرہ ہلدی جیسا پیلا ہو رہا تھا، جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ یہ وہ فاطمہ تو نہیں تھی جو اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔

اُسکا سابقہ شوہر ایک اسمگلر، شرابی اور جواری تھا۔ اُسے مارتا تھا، پیٹتا تھا۔

کیا حال کر دیا تھا اُس بدبخت نے اِسکا؟ علی نے نظریں جھکا دیں۔ پھر احمد کے سر پر ہاتھ رکھا، وہ نیند کا کچا تھا۔ فوراً گھبرا کر آنکھ کھولی تو علی نے اشارے سے اُسے پر سکون رہنے کو کہا۔

''چلو بیٹا! اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔'' اُس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

''نہیں!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں امی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' اُس نے حتمی انداز میں کہا پھر علی کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں سے آہستگی سے ہٹائے۔

''آپ سو جائیں، آپ کو آفس جانا ہے۔ میں اپنی امی کا خیال رکھ سکتا ہوں۔'' اُس نے بدتمیزی نہیں کی، پر بہت ادب سے واضح کر دیا کہ اُسکے لیے کون زیادہ اہم ہے؟ علی نے بس نرمی سے مسکرا کر سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

باہر آ کر وہ رکا اور پلٹ کر ایک نظر پھر کمرے میں دیکھا۔ احمد دوبارہ فاطمہ کے سرہانے پر سر رکھ چکا تھا۔ باپ کے ہاتھوں کو خود سے دور کر کے، اپنی ماں کے سرہانے بے آرام ہونے والے، اِس بچے نے ایک لمحے کو اُسکے قدم منجمد کر دیئے۔

رضاالٰہی۔۔۔۔ کیا یہ رضاالٰہی کا بچپن تھا؟ کیا علی سفیر معاشرے کو ایک اور رضا دینے والا تھا؟ کیا وہ اپنے گھر میں رضا جیسے ایک اور بچے کا بچپن برباد کر رہا تھا؟

کہیں علی سفیر بھی وہ ظالم باپ تو نہیں تھا؟

کہیں۔۔۔۔ کہیں واصف الٰہی کی طرح۔۔۔ اُسکے حصّے میں بھی اولاد کی نفرت تو نہیں آ رہی تھی؟

اور اِس ایک سوال نے علی کی روح تک فنا کر دی تھی۔

---------+---------+--------

''بارہ بج گئے؟'' صبح آنکھ کھلتے ہی اُس نے آنکھیں مل کر وقت دیکھا تو چیخ اُٹھی۔

''میں اتنی دیر تک کیسے سو گئی؟'' تیزی سے اُٹھ کر پیروں میں چپلیں ڈالیں اور کمرے سے باہر آئی۔ کچن سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ حیران سی کچن کاؤنٹر کے پاس آئی تو اندر کا منظر دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی۔

سیاہ ٹراؤزر پر، سیاہ ٹی شرٹ پہنے۔ اُس پر نیلی جینز کے کپڑے کا ایپرن ڈالے، نوید کاؤنٹر پر کھڑا سبزیاں کاٹ رہا تھا۔ سرمئی و سفید امتزاج کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور بھی دیگر سامان جیسے مسالے، ساوسز وغیرہ آس پاس رکھے تھے۔ پھر بھی کچن میں کوئی گندگی نہ تھی۔ وہ اپنا کام نفاست سے کرنے کا عادی تھا۔ چہرے پر ازلی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''اُٹھ گئیں آپ؟'' گرائنڈر میں سبزیاں ڈال کر اُنہیں چھوٹا کرنے کی غرض سے سلیب کے پاس جاتے ہوئے نوید نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''تم گھر کب آئے؟'' اُس نے بھی ایس ایس پی نوید عالم کی بیوی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

''سحری سے پہلے آ گیا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''تو مجھے کیوں نہیں اُٹھایا سحری میں؟ میرا روزہ رہ گیا۔'' وہ ناراض ہوئی تو پہلی بار اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ بشریٰ خوش قسمت تھی، جو دن میں کئی بار اُسے مسکراتا ہوا دیکھتی تھی۔

''تم نے کل روزہ رکھا تھا، آج آرام کرو۔ تم جانتی ہو ابھی ڈاکٹر نے تمہیں دواؤں میں ناغہ کرنے سے منع کیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''اتنے روزے قضاء ہو رہے ہیں میرے۔'' اُس نے افسوس سے کہا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھی اب۔

''بلا عذر تو قضاء نہیں ہو رہے۔'' وہ پھر مُسکرایا، اور سبزیاں نکالتے کاؤنٹر پر آ گیا۔ اب وہ اور بشریٰ آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں کاؤنٹر تھا۔

''تم کیا کر رہے ہو صبح صبح کچن میں؟'' اُس نے پوچھا۔

''افطاری بنا رہا ہوں۔ میری چھٹی ہے آج، اور کل عید ہے۔ تو بس آج تمہیں اپنے ہاتھوں کی بنی افطاری کرواؤں گا۔'' اُس نے دونوں ہتھیلی کاؤنٹر پر جماتے، اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ہاتھوں کی رگیں تن کر اُبھری تھیں۔

''افطار میں بہت وقت پڑا ہے ایس ایس پی صاحب!'' اُس نے بھی سینے پر بازو باندھتے جتایا تو وہ چہرہ نیچے کرتے ہنسا (چشم بدور!)۔ اُسکا ہر ہر انداز نوید کو پیارا تھا۔

''میں ایک نہایت ہی غیر پیشہ ورانہ قسم کا باورچی ہوں، تو مجھے کام کرنے میں اتنا ہی وقت درکار ہو گا۔'' اُس نے کھلے دل سے تسلیم کیا۔

''تم رات کو کہاں تھے ؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا تو اب کہ وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔اللہ نظر نہ لگائے ایس ایس پی صاحب کو ! ہنستے ہوئے پیارے لگتے تھے بہت۔

''تم خالص ایک پولیس والے کی بیوی ہی لگ رہی ہو اِس وقت۔''اُس نے کچن سے باہر آ کر اُسکے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بات نہیں بدلو !''وہ خفا ہوئی۔

''ڈیوٹی تھی بشریٰ !''اُس نے بتایا۔

''جلدی آیا کرو نا نوید ! مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔''اُس نے کہا تو نوید نے چند لمحوں اُسے دیکھا۔ہاں ! وہ اب واقعی اکیلی تھی،اُسکے بچے اب اُسکے ساتھ نہیں تھے۔

''افطار کے بعد باہر چلیں گے۔''اُس نے بشریٰ کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کہاں ؟اور کس لیے ؟''وہ حیران ہوئی۔

''تمہیں مہندی لگوانے۔''اُس نے کہا۔اللہ اللہ ! ایس ایس پی صاحب اور اُن کے شوق !

''نہیں بھئی ! چاند رات کو بہت رش ہوتا ہے۔''اُس نے منہ بنایا۔

''کوئی نہیں ! ہم تمہارے لیے پہلے ہی مہندی آرٹسٹ بک کر چکے ہیں۔تم نے بس جانا ہے اور لگوا کر واپس آ جانا ہے۔''

''پر نوید۔۔۔۔''وہ زچ ہوئی۔

''چلو جا کر آرام کرو ! مجھے بہت کام ہیں ابھی۔تمہارا ناشتا بھی لیکر آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔''وہ اُسے باہر چھوڑتا واپس کچن میں آ گیا جو اِس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ اپنی بات منوا کر ہی رہے گا۔بشریٰ بس مسکرا دی۔

---------+---------+--------

عمر جلدی جلدی لیپ ٹاپ پر اُنگلیاں چلا رہا تھا۔آفس میں بھی آج بہت گہما گہمی سی تھی۔کل عید تھی اور پھر چار روز کی چھٹی تھی۔ہر کوئی جلد از جلد اپنا کام نمٹانا چاہتا تھا۔وہ بھی بس اپنے آخری آخری فرنیچر ماڈل کی نوک پلک سنوار رہا تھا۔اُسکے برعکس علی کا انداز آج بہت سست سا تھا۔اِسکے علاوہ وہ خاموش بھی بہت تھا۔عمر بھی کام کے باعث اُس سے صحیح سے بات نہیں کر سکا۔وہ آج سٹوڈیو بھی نہیں آیا تھا۔خاموشی سے اپنے آفس میں ہی بیٹھا رہا تھا۔عمر نے اپنا کام ختم کیا اور کچھ سوچ کر اُسکے آفس کے باہر آیا۔اندر علی ابھی بھی کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔عمر نے دروازہ بجایا تو اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''آجاؤ عمر!''اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہاتو وہ اندر آگیا۔

''تمہارا کام مکمل ہو گیا؟''اُس نے علی کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یار! تھوڑا رہتا ہے۔ سوچ رہا ہوں عید کے بعد ہی مکمل کروں۔''اُس نے گردن پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''نوید نے زیادہ کلاس لے لی تمہاری؟''عمر نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

''نہیں! پوچھ رہا تھا کہ تمھارے پاس اُسکے گھر کا ایڈریس کہاں سے آیا؟''علی نے ازراہ مذاق کہا۔

''میں تو سمجھا وہ اپنے پرانے والے گھر میں رہتا ہے، اِس لیے پیشکش کر دی تھی۔ وہ تو جب اُس نے پوچھا کہ مجھے اُسکا گھر کیسے معلوم تو جو منہ میں آیا بول دیا۔'' اُس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''خیر ہے! اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اُس سے۔''نہیں نہیں! وہ آدم خور ہر گز نہیں ہے۔

''چلو پھر تم کام کرو!''وہ کہہ کر اُٹھنے ہی لگا تھا۔

''عمر!''علی نے اُسے اچانک ہی پکارا تو وہ رکا۔

''ہاں؟''سوالیہ نظروں سے کسی گہری سوچ میں مبتلا علی کو دیکھا۔

''اگر کسی شخص نے آپکو بہت شدید قسم کا دھوکا دیا ہو، اور اب وہ شرمندہ ہو۔ اپنے کیے پر نادم بھی ہو، تو کیا اُس پر دوبارہ بھروسہ کرنا چاہیے؟''عمر نہیں جانتا تھا کہ اُس نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟ پر اُسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اپنے دوست کی مشکل حل کرنا اُس پر فرض ہے۔

''نہیں! دوبارہ بھروسہ کرنا بیوقوفی ہے۔ لیکن۔۔۔''وہ کہتے ہوئے دوبارہ بیٹھا۔

''لیکن؟''

''لیکن اگر وہ اپنے کیے پر نادم ہے، تو اُسے ایک موقع دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''پر معاف کرنا آسان تو نہیں ہے''علی نے کہا تو اُس نے گہری سانس بھر کر پیچھے ٹیک لگائی۔

''میں نے کب کہا معاف کرو؟ پر موقع تو دو۔ دیکھو! ایک ایسا شخص جو اپنے کیے کا برا نتیجہ بھگت چکا ہو، جس نے آپکو دھوکا دے کر نقصان اُٹھالیا ہو، وہ دوبارہ یہ غلطی نہیں کرے گا۔ جسے ایک بار قدر آجائے وہ دوبارہ ناقدری نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تو ٹھوکر کھا کر سنبھلا ہوا انسان زیادہ قابلِ بھروسہ ہے۔

کیونکہ اب وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے گا۔ لیکن اگر پھر بھی بھروسہ نہ کرو تو کم از کم ایک موقع دو۔ ہم سب اپنی غلطیوں کے لیے ایک نہیں کئی کئی بار مواقع چاہتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے نہیں! تم نہیں جانتے علی! غلطی کرنے والا صرف ایک موقعے کے لیے کتنا ترستا ہے؟'' آخر میں اسکے لہجے میں کچھ ٹوٹا تھا۔ علی نے غور ضرور کیا پر کچھ کہا نہیں۔

فلحال وہ کسی گہری سوچ میں تھا، اور وہ کیا سوچ رہا تھا؟ وہ ہی جانتا تھا؟

---------+---------+--------

جزا خاموش نظروں سے اِس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ رضا الٰہی واپس آ گیا تھا۔ پناہ گاہ کی رونقیں بھی لوٹ آئی تھیں۔ بچے اُس سے چمٹے ہوئے تھے، اور وہ ہر بچے کا شکوہ سنتے اُس سے معذرت کر رہا تھا۔ ہر ایک کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔

جزا نے مسکرا کر دیکھا اور قریب آئی، وہ پنجوں کے بل بیٹھا بچوں کے گلے لگ رہا تھا۔ پرسوں رات سے وہ بہت پریشان تھے۔ اُس نے چہرہ اٹھا کر جزا کو دیکھا پھر کھڑا ہوا۔

''تم نے بچوں کا بہت خیال رکھا۔ تمہیں اب گھر جانا چاہیے۔'' اُس نے سنجیدہ سے چہرے کے ساتھ کہا تو جزا کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ یہی کہنا تھا اُسے؟ اُس نے غور سے دیکھا، رضا نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ کیوں چھپ رہا تھا؟ اور کس سے؟ بھلا اِس سب میں اُسکا کیا قصور تھا؟ بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر اِس میں جزا کا کیا قصور تھا؟

''ہاں! مجھے بہت کام ہیں۔'' اُس نے جتاتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل گئی۔ رضا اُسکے انداز پر حیران رہ گیا۔ اسے اُمید نہ تھی کی وہ واقعی ایسے چلی جائے گی۔

''ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اُسے میرے ساتھ، میری حقیقت جو معلوم ہو گئی ہے اُسے۔ بھلا اب میں کہاں اُسکے قابل رہا ہوں گا؟'' رضا نے دکھ کی کیفیت میں سوچا تھا۔

غلط فہمی یہاں بھی تھی۔

اور غلط فہمی وہاں بھی تھی۔

کہاں تھی تم جب تمہارا بھائی گلیوں میں اپنے مرے ہوئے بچوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا؟ جب وہ اُنہیں آوازیں دے رہا تھا؟ کہاں تھی تم جب اُسکی بیوی نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا؟ کہاں تھی تم جب وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا؟ اُسکی آواز، اُسکی چیخیں میرا کلیجہ پھاڑ رہی تھیں جزا!

اپنے گھر آ کر بستر پر ڈھنے کے سے انداز میں لیٹی جزا کو وحید کے الفاظ یاد آئے۔اُسکی آنکھوں سے آنسو جھرنوں کی طرح بہنے لگے تھے۔

اتنا سا بھی احساس نہیں ہوا؟اتنی نفرت جزا؟اتنی؟صرف ایک اینٹوں سے بنے گھر کے لیے؟

یہ اینٹوں سے بنے گھر کے لیے نہیں تھا بھائی! یہ نفرت نہیں تھی۔کاش! آپ مجھے بھی بولنے کا موقع دیتے۔

میں تمہاری خود غرضی،خود پرستی اور سنگ دلی سے تنگ آ چکا ہوں۔کیا تمہارے دل میں اپنے بھتیجوں کے لیے ذرا سی محبت نہیں تھی؟کیا تمہیں اُنکی موت کا ذرا دکھ نہیں ہے؟صرف اس لیے کہ وہ نوید کے بچے تھے۔

غلط فہمی یہاں بھی تھی۔۔۔

ہر جانب تھی۔۔۔۔

وہ کس کس کا دل صاف کرتی؟

اور کیسے؟

---------+---------+--------

افطار کے بعد سے باہر ہر جانب گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔اِس ملک میں چاند رات ایک الگ ہی تہوار ہوتا تھا۔بازار سج گئے تھے،سڑکیں اپنی رونقوں کے قصے سنائے دیتی تھیں،عورتیں بچیاں رنگوں سے دنیا سجا رہی تھیں۔

ایسے میں اُسکے گھر میں ہر طرف گہرا سکوت سا چھایا ہوا تھا۔اُسکے اندر بھی،اور اُسکے باہر بھی۔ عمر سے بات کر کے وہ گھر آیا تو خاموش ہی رہا۔افطار کے وقت بھی ایک جامد خاموشی چھائی رہی۔یوں بھی اُس نے افطار اکیلے ہی کی تھی۔سفیر صاحب،احمد اور نشمیہ،فاطمہ کے پاس اُسکے کمرے میں تھے۔فاطمہ کی اُسے کوئی خبر نہ تھی۔کل کے بعد سے اُس نے اب تک اُسے نہ دیکھا تھا۔افطار کر کے وہ چپ چاپ سالیونگ روم کے صوفے پر آ بیٹھا تھا۔اور اب اُسے وہاں بیٹھے گھنٹہ گزر چکا تھا۔ذہن نجانے کہاں بھٹکا ہوا تھا؟

''آپ کیا کر رہے ہیں؟''ہمیشہ کی طرح نشمیہ اُسکے کانوں کے پاس آ کر چلائی تھی۔پر اب وہ دہل کر نہیں دیکھتا تھا،اُسے عادت ہو گئی تھی اِس پٹاخے کی۔

''کچھ نہیں!''اُس نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''آپ کو مہندی لگاؤں؟''اُس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا، تو علی نے حیرت سے اُسے دیکھا،اُسکے ہاتھ میں مہندی کی کون تھی۔

''یہ کہاں سے آئی؟''وہ حیران ہوا۔

''ابّا نے لا کر دی۔''اُس نے بتایا۔

''تمہیں لگوانی ہے؟''علی نے اُسے گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! مجھے کسی کو لگانی ہے۔''وہ نشمیہ تھی، وہ کیوں سیدھے کام کرتی؟ علی ہنسا۔

''میں نے ابّا کو کہا، اُنہوں نے منع کر دیا، پھر بھائی کو کہا اُس نے بھی منع کر دیا۔امی بھی بیمار ہیں نا! تو وہ بھی نہیں لگائیں گی۔ میں کیا کروں؟''اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ہمیشہ کی طرح اُسکے ہزار مسائل۔

''چلو تم میرے ہاتھ پر لگا دو۔''اُس نے ہنستے ہوئے ہتھیلی آگے کر دی۔

''سچی؟''اُس نے ننھی ننھی آنکھیں وا کرتے ہوئے، اُس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں!''اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گئی۔ پھر اُس نے دل بھر کے علی کے ہاتھوں پر نقش و نگار بنائے، اُس نے بھی ماتھے پر ایک شکن بھی لائے بنا اپنے ہاتھوں کو گندا ہونے دیا۔جب اُسکا دل بھر گیا تو خود ہی مہندی کی کون رکھ کر اپنے لیے کوئی اور دلچسپی ڈھونڈلی۔ علی نے سامنے رکھا وائپ اٹھایا، اور اُس سے ہتھیلی صاف کرنے لگا۔مہندی پرانی نہیں ہوئی تھی، پھر بھی اُسکی ہتھیلی پر رنگ آ گیا تھا۔ عجیب و غریب قسم کی چیزیں اُسکی ہتھیلی پر لگا کر وہ یقیناً بہت خوش تھی، وہ خوش تھی تو علی کو اور کیا چاہیے؟

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میری بھی ایک بیٹی ہوتی، تو شاید میرے مزاج میں اتنی سختی نہ ہوتی۔''وہ اپنی ہتھیلی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا، جب سفیر صاحب یکدم ہی کہتے ہوئے اُسکے برابر میں آ بیٹھے۔ علی نے کچھ نہ کہا، بس خاموشی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔

''جانتے ہو علی؟ جیسا میں تھا۔ویسے ہی میرے اپنے والد صاحب بھی تھے۔ سخت اور جاگیر دار قسم کے۔''وہ پتہ نہیں آج کیا قصّے لیکر بیٹھ گئے تھے؟

''اُنہوں نے مجھ پر ویسی ہی سختی کی جیسی میں نے تم پر۔ مجھے لگا کہ شاید باپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جلاّد جیسا، اِس لیے شاید میں کبھی شفقت دکھا ہی نہیں سکا۔ مجھے کبھی میری مرضی نہ کرنے دی گئی تو میں نے اپنی مرضی تم پر چلائی۔ میں اپنی زندگی نہ جی سکا تو میں نے تمہاری زندگی کو جینا شروع کر دیا۔ میں اپنے خواب پورے نہ کر سکا تو میں نے اپنے خوابوں کو تم میں دیکھنا شروع کر دیا۔جب تم نے اُنکے خلاف جانے کی ٹھانی تو مجھے لگا جیسے میرے خواب ایک مرتبہ پھر توڑ دیئے گئے ہیں۔''علی سن سا انہیں دیکھ رہا تھا۔اُن باپ بیٹے کے درمیان یہ پہلا موقع تھا، جب وہ اُس سے اپنا کوئی دکھ بانٹ رہے تھے۔

''میں نے غلط کیا۔۔۔بہت غلط کیا۔اِس غلطی کا احساس مجھے اُس روز ہوا، جس روز تم فاطمہ سے طلاق لیکر آئے تھے۔میں پچھتایا علی! پر اُسکے بعد میرے پاس سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہ رہا۔میں چاہتا تھا کہ تم میرے جیسے نہ بنو۔پر جب تم احمد سے وہی سخت رویہ رکھتے تو مجھے تم میں اپنا آپ،اور میرا اپنا باپ نظر آتا۔لیکن میں شکر کرتا ہوں کہ تم جلد سمجھ گئے۔تم نے اِس نسل در نسل چلنے والے ٹراما کو توڑ دیا۔مجھے فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔''اُنہوں نے اُسے فخر سے دیکھا تھا۔اور علی کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اُتر آئے۔یہ وہ جملہ تھا جسے سننے کے لیے اُس نے پینتیس سال لگا دیئے۔جسے سننے کے لیے اُس نے کتنے ہی غلط فیصلے لیے، جس کے لیے کتنے ہی رشتے خراب کیے۔اُس نے ضبط سے لب بھینچے اور چہرہ جھکایا۔

''تمہاری زندگی برباد کرنے میں زیادہ ہاتھ میرا ہے۔مجھے۔۔۔۔یعنی اپنے اِس بوڑھے باپ کو معاف کر دینا۔''انکا لہجہ بھیگا تو علی نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔

''ابّا!''وہ تڑپ کر کھڑا ہوا، پھر اُنکے قدموں میں بیٹھ گیا۔''کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہیں؟''اُس نے انکے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے نم لہجے میں کہا۔

''ایسے مت کہیں۔آپ بہت اچھے باپ ہیں۔آپ نے مجھے ایک بہترین زندگی دی ہے، بہترین اور قابل انسان بنایا ہے۔کوئی بات نہیں! بڑوں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''اُس نے اپنے باپ کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

''میں شکر ادا کرتا ہوں کہ تم نے خود کو یہ غلطی کرنے سے روک لیا۔''اُنہوں نے شاید زندگی میں پہلی بار اُسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اِس میں کمال صرف میری بیٹی کا ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ کاش! میری بھی ایک بیٹی ہوتی۔''سفیر صاحب نے کہا۔''بیٹوں پر غصّہ کرنا آسان ہوتا ہے، پر بیٹیوں پر ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔''اُنہوں نے کہا۔

''ذرا نہیں! پورا مشکل۔''اُس نے تصحیح کی تو وہ ہنس دیئے۔

''میں جانتا ہوں کہ جس روز وہ اِس گھر میں آئی تھی، اُس روز آپ جاگ رہے تھے، آپ نے جان کر اُسے کچن میں چھوڑا تھا۔میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ نے جان کر اُسے میرے پاس سونے کے لیے بھیجا تھا، اور یہ بھی کہ آپ اُسکے بال باندھ سکتے تھے۔پر آپ ایسا صرف اِس لیے کرتے تھے کہ وہ میرے قریب رہ سکے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو سفیر صاحب حیران رہ گئے۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ یہ میرا اور میری پوتی کا سیکریٹ (راز) ہے۔''اُنہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''آپ کی پوتی فقط ایک آئس کریم کی لالچ میں سارے راز اُگل دیتی ہے۔''اِس بار وہ دونوں ہنسے تھے۔

''ابّا!''اُسے یکدم ہی کچھ یاد آیا تو فوراً اُٹھ کر اُنکے برابر میں بیٹھا۔

''ہاں؟''اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے۔۔۔۔میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' اُس نے ذرا جھجھکتے ہوئے کہا تھا۔

---------+---------+--------

''امی!آپ کو پانی دوں؟''وہ پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی،جب احمد نے پوچھا۔

''ہاں!دے دو۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔کھانس کھانس کر گلا بیٹھ چکا تھا۔

''جی!''وہ سر ہلاتے کہتا اُٹھا اور پاس رکھے گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔فاطمہ نے غور سے اُسے دیکھا۔وہ علی جیسا تھا،بلکہ اُسکا ہی چھوٹا سا ورژن۔لیکن مزاج میں بہت ٹھہراؤ اور انداز میں بہت سکون ہوتا تھا۔

فاطمہ کے لیے اِس گھر میں آنا بہت اذیت ناک تھا،جس روز اُسے معلوم ہوا کہ اُسے ٹی بی ہے اور وقت گزرنے پر بھی علاج نہ ہونے کے باعث مرض بگڑ چکا ہے۔اُس روز سے اُسکی فقط ایک ہی خواہش تھی۔کہ اُسکی بیٹی اپنے باپ کے پاس چلی جائے۔وہ جانتی تھی کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے پر وہ پھر بھی علی سے بات کرنے آئی۔لیکن وہ شدید غلط فہمی کا شکار تھا،اوپر سے احمد نے اپنی ماں کے ساتھ جانے کا کہہ کر معاملہ مزید خراب کر دیا۔پھر اُسکو وہی کرنا پڑا جو مجبوری تھی۔پہلے اُس نے نشمیہ کو علی کے پاس بھیجا،پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ علی نے نشمیہ کو نا صرف قبول کر لیا ہے،بلکہ اُسے وہ بہترین زندگی دے رہا ہے جو فاطمہ چاہتی تھی،تو اُس نے احمد کو بھی اُسکے پاس بھیجنے کا سوچا۔پر اُس سے پہلے ہی علی خود ہی آ گیا۔

اور جب اُس نے احمد اور نشمیہ کو گلے لگایا تو فاطمہ کو لگا کہ اُسکا کام مکمل ہو گیا۔اُسکے دونوں بچوں کو انکا گھر مل جائے،باپ کا پیار مل جائے،معاشرے میں ایک اچھی زندگی مل جائے،اور اُسے کیا چاہیے؟ویسے بھی اب اپنے لیے اُسے زندگی سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔عزت نفس،انا،خواب و خواہشات سب مر چکی تھیں۔وہ احمد کو دیکھ رہی تھی،اُسکے نین نقش دیکھتے ہی دیکھتے علی میں تبدیل ہونے لگے۔منظر بدل گیا،وہ پارک میں موجود تھی،علی اُسکی دائیں طرف والی بینچ پر تھا اور دونوں کے درمیان کئی لکڑیوں کے تختوں سے بنی میز تھی۔

''بہت سے طلاق یافتہ ماں باپ،اپنے بچوں کا معاملہ کورٹ میں لے جانے کے بجائے آپس میں حل کر لیتے ہیں۔کیونکہ اُنہیں اپنے بچوں کی ذہنی صحت، اپنی انا سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔مجھے بھی ہے اور یقیناً تمہیں بھی ہو گی۔''اُس روز ویمن ہوسٹل کے پارک میں بیٹھے علی نے اُس سے کہا تھا۔نشمیہ وہاں موجود بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی،احمد بس بڑے بھائی کی طرح اُس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔اور وہ دونوں اِس طرح بیٹھے تھے کہ دونوں کی نظریں سامنے اپنے بچوں پر تھیں۔

''میں بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتی،اور تم بھی نہیں چاہو گے کہ تمہارے بچے اِس حال میں رہیں۔''فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ باتیں بچے نہیں سمجھتے، وہ تمہارے ساتھ رہنے کی ضد کریں گے۔''اُس نے کہا تو فاطمہ نے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ اُسکا آدھا چہرہ دیکھ سکتی تھی، دونوں کے درمیان کم از کم بھی تین آدمیوں جتنا فاصلہ تھا۔ یا شاید صدیوں کا!

''میں کبھی کبھار ملنے آسکتی ہوں۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میرے پاس ایک پیش کش ہے۔ صرف اور صرف میرے بچوں کے لئے۔''اُس نے کافی سرد مہر سے انداز میں کہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

''پیش کش؟''

''ہاں!''اور پھر علی نے اسے تمام لائحہ عمل بتا دیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ بچوں کی پڑھائی، اُنکی ذہنی صحت یا انکا کسی بھی قسم کا کوئی نقصان ہو۔ بہتر ہے کہ تم کہیں قریب ہی رہو، تاکہ وہ تمہیں دیکھ سکیں، تم سے مل سکیں اور میں بھی اُنکی طرف سے بے فکر رہوں۔''اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے! جب تمہارے پڑوس والا گھر خالی ہو جائے، تو میں آجاؤں گی۔''اس نے دوبارہ چہرہ سامنے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تم نہیں آؤ گی تو احمد بھی نہیں آئے گا۔ اور میں اب احمد کو اِس حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ عید میں بہت دیر ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی چلو!''اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''امی!''احمد نے اُسکا کندھا ہلایا تو وہ واپس حال میں آئی۔ وہ پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

''پانی پی لیں۔''اُس نے کہا۔

''شکریہ بیٹا!''اُس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھاما اور منہ سے لگا لیا۔ پانی پیتے اُسکی نظریں دروازے پر گئیں اور پتھر ہو گئیں۔ علی سامنے ہی کھڑا تھا، چہرہ سنجیدہ تھا پر نہ نظروں میں آج حقارت تھی، نہ چہرے پر نفرت۔ نجانے وہ کب سے وہاں تھا؟ اور کیا سوچ رہا تھا؟ فاطمہ نے احمد کو گلاس واپس دیا۔ علی آہستہ سے قدم اٹھاتے اندر آیا۔ اور اُسکے پلنگ کی پائنتی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ سیاہ ٹراؤزر پر ہلکے سبز رنگ کی پولو ٹی شرٹ پہنے، اُس نے دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ وہ شکل سے کافی مضطرب لگ رہا تھا، اُسکی وہاں آمد کا مقصد فاطمہ کو سمجھ نہ آرہا تھا۔

''احمد!''اُس نے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے، مخاطب احمد کو کیا تھا۔

''جی بابا؟''اُس نے باپ کو دیکھا۔

''تم ابّا کے پاس جاؤ، مجھے تمہاری امی سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اب کہ علی نے احمد کو سنجیدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ اور اُس نے دیکھا تھا، کہ اِس مطالبے پر احمد کے چہرے پر خوف کے سائے لہرائے تھے۔ اُس نے گھبرا کر اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ علی کا دل ڈوبا، وہ دو مرتبہ اپنے باپ کو ماں پر چیختے، اُسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکالتے دیکھ چکا تھا۔ اب وہ اپنی ماں کو باپ کے ساتھ اکیلے نہیں چھوڑ سکتا تھا، وہ جیسے فاطمہ کا محافظ تھا۔

''احمد! میں صرف بات کروں گا۔'' علی نے نرمی سے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، جیسے اُسکا خوف سمجھ گیا ہو۔ وہ اب بھی نہیں گیا، بلکہ اپنی ماں کو ہی دیکھتا رہا۔ اُسے علی پر بالکل بھروسہ نہیں تھا، علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔ فاطمہ نے اُسے آنکھوں سے سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا تو اُس نے چہرہ جھکایا پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ علی کافی دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور فاطمہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی کہ شاید اب وہ اُسے اپنے آنے کا مقصد بتائے گا۔ وہ شاید الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''میں نے اُس روز تمہیں گھر سے نکالا۔۔۔ تمہیں گالیاں دیں۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ!۔۔۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' کمرے کی خاموش فضا میں اُسکی آواز گونجی تو فاطمہ کی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت اُتر آئی۔

''مجھے تمہاری بات سننی چاہیے تھی۔ مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ میں ایک عورت کے ساتھ ایسا سلوک کر چکا ہوں۔'' اُس نے بات مکمل کی۔ وہ واقعی فاطمہ کو اس بری طرح گھر سے نکالنے، اور گالیاں دینے پر اب تک شرمندہ تھا۔

''میرے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تم سے پرانے حساب کتاب لوں، اور نہ ہی مجھے اب ایسی کسی بھی شے میں دلچسپی ہے۔ میں بس۔۔۔۔'' بولتے بولتے وہ رکا، پھر گہری سانس لی۔

''میں صرف اپنے بچوں کو اچھی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ میں اُنہیں محبت اور عزت والی زندگی دینا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہ فکروں سے آزاد بچپن گزاریں اور پر سکون فضا میں پروان چڑھیں۔ میں۔۔۔ میں ایک اور علی کو بڑا نہیں کرنا چاہتا۔'' **اور ایک اور رضا کو بھی۔**

''میں بھی یہی چاہتی ہوں، اِس لیے یہاں آئی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ذہنی سکون میں رہے۔ اِس لیے جتنی بھی زندگی باقی ہے، میں بچوں کے لیے۔۔۔۔''

''فاطمہ!'' علی نے پہلی بار چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ اُسکا نام لیا تھا۔ اور۔۔ اور فاطمہ یہ لہجہ پہچانتی تھی۔ اِس لہجے میں موجود تڑپ کو وہ جانتی تھی، جیسے وہ اُسکی بات مکمل نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ جیسے وہ یہ سب سن نہیں سکتا تھا۔ وہ حیرت زدہ سی اُسے دیکھنے لگی۔ یہ اُسے آج کیا ہوا تھا؟

''میں۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر کہہ بھی نہ پا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر گہرا سانس بھر کر خود کو پُر سکون کیا، اور جیبوں سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھ لئے۔ یہ اُسکی شدید اضطرابی حالت کی نشانی تھی۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مہندی کا رنگ نظر آ رہا تھا، عجیب و غریب سے نقش و نگار۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر لو۔'' الفاظ ادا ہو گئے۔ سماعتیں بے یقین ہو گئیں۔

''ہاں؟'' فاطمہ کو لگا کہ اُسے سننے میں کوئی شدید غلطی ہوئی ہے۔ علی نے یقیناً کچھ اور کہا تھا۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔۔ سمجھی نہیں؟'' اُس نے اٹکتے ہوئے کہا تو علی نے پاس رکھی کرسی گھسیٹی، دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہاتھوں کو باہم پھنسا کر ذرا آگے کی جانب جھک کر بیٹھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسکے لیے یہ فیصلہ کتنا مشکل تھا۔

''میں اپنے بچوں کے لیے، یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر لو۔ تاکہ تم اس گھر میں رہ سکو، تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع بھی نہ ملے، اور تاکہ بچوں کو ماں اور باپ دونوں مل جائیں۔'' اُس نے ایک بار پھر سر جھکائے اپنی بات کو واضح کیا۔ پر اب اُسکا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''پر میں۔۔۔'' فاطمہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''دیکھو فاطمہ! مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں کہ تم نے ماضی میں کیا کیا تھا؟ اور کیا نہیں؟ میں نے کہا نا! میں اب حساب کتاب سے آگے بڑھ کر صرف اور صرف اپنی اولاد کا سوچ رہا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے اور میرے مسائل کو پرے رکھ کر صرف بچوں کا سوچو۔ اگر تم راضی ہو تو میں کل ہی نکاح کرنے کو تیار ہوں۔'' کمرے میں اسکی مستحکم اور ٹھوس آواز گونجی تو جیسے اُسکے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ آج وہ اُسکا نام لے کر بات کر رہا تھا۔ وہ **اُس عورت** سے پھر فاطمہ ہو گئی تھی۔

''میں سوچنے کا وقت چاہتی ہوں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''وقت ہی تو نہیں ہے فاطمہ!'' علی نے تیزی سے کہا تو وہ ساکت ہوئی۔ یہ جملہ تو اُسے کہنا چاہیے۔ وقت تو اُسکے پاس کم تھا۔

''تم مجھے جانتی نہیں ہو کیا؟ پھر بھی سوچنا ہے؟'' اُس نے کہا تو فاطمہ نے چہرہ جھکا دیا۔ علی کو اپنے جملے کا احساس ہوا، وہ اُس پر اپنا فیصلہ ایسے تھوپ نہیں سکتا تھا۔ خود کو بہت بدلنے کے باوجود بھی جذباتی پن، اُس میں ابھی بھی کہیں کہیں باقی تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ، اب اتنا آسان نہیں ہے تمہارے لیے۔'' اب کہ وہ بولا تو لہجہ آہستہ تھا۔ ''اگر تم صرف بچوں کا سوچو تو ہاں کہہ سکتی ہو، پر اگر تمہیں مجھ سے مسئلہ ہے تو ہاں! تمہارے پاس انکار کا حق ہے۔ میں خدانخواستہ کوئی زبردستی نہیں کر رہا بس۔۔۔۔ مجھے بچوں کے لیے یہی بہتر لگا تو تم سے کہہ دیا۔ باقی جب تم سوچ لو، تو مجھے بتا دینا۔'' وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا، پھر جانے کے لئے مڑ گیا۔ ابھی دروازے پر ہی تھا کہ

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔۔'' فاطمہ کی آہستہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو جیسے دل سے منوں بوجھ سرکا۔

''شکریہ!'' اُس نے بنا مڑے ہی ہلکے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ابھی سیڑھیاں اُتر ہی رہا تھا کہ لیونگ روم میں بے چینی سے ٹہلتے سفیر صاحب پر نگاہ پڑی۔ احمد پاس ہی صوفے پر خاموشی سے بیٹھا تھا، برابر میں نشمیہ ساری دنیا سے بے گانہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں پر لگی تازہ مہندی کو پھونکے مارنے میں مصروف تھی۔ سفیر صاحب نے اپنے ملازم کی بیٹی کو چاندرات پر اُسے مہندی لگوانے کے لیے بلالیا تھا۔ اِس طرح اُسکی بھی کچھ کمائی ہوگئی اور نشمیہ کو مہندی بھی لگ گئی۔ چاندرات مکمل تھی!

''آں بھائی۔۔۔'' احمد ذرا سا ہلا تو وہ چیخ اُٹھی۔

''میری مہندی خراب ہو جائے گی۔'' مہارانی صاحبہ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔ اب جا کر علی نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر بھی مہندی لگائے، انہیں اپنے بھائی کی گود میں رکھے بیٹھی تھی تاکہ مہندی خراب نہ ہو۔ شوق تو دیکھو اِس ڈیڑھ فٹی چوزی کے!

''میں نے کیا کیا؟'' احمد نے گھبرا کر پوچھا۔

''تم میری مہندی خراب کر رہے ہو بھائی!''

''اب میں ذرا سا ہلوں بھی نہیں؟'' وہ جھنجھلایا۔

''نہیں!'' اُس نے حکم نافذ کیا تو وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔ علی بیساختہ ہنسا تھا۔ اُسکے ہنسنے پر سفیر صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو وہ آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے اُسکے پاس آئے۔

''کیا کہا فاطمہ نے؟'' اُنہوں نے پوچھا۔ علی تھوڑی دیر قبل ہی اُنہیں اپنے فیصلے کے متعلق آگاہ کر چکا تھا۔

''وہ راضی ہے۔'' اُس نے آسودہ سے لہجے میں کہا تو خوشی سے انکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں انتظام کرتا ہوں۔'' اُنہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ دوسری جانب احمد نے بڑے آہستہ سے نشمیہ کے پاؤں اُتار کر صوفے پر رکھے اور اُسکے شور مچانے کے باوجود علی کے پاس آیا۔

''میں امی کے پاس چلا جاؤں؟'' اُس نے اجازت چاہی۔

''ہاں! بالکل۔۔۔'' اُس نے مسکرا کر اجازت دی۔

''بابا! بھائی نے میری مہندی خراب کر دی۔'' چھوٹی فنکارہ نے بھی روتے ہوئے وہاں انٹری دی تھی۔

''بالکل خراب نہیں ہوئی ہے۔ پوری سوکھ چکی ہے۔'' احمد نے فوراً کہا۔

''بھائی میری بالکل بات نہیں سنتا۔''اُس نے منہ بسورتے ناراضگی سے شکایت کی تو احمد بھونچکارہ گیا۔

''میں نے کب تمہاری بات نہیں سنی؟''اُس نے خفا خفا سے انداز میں پوچھا۔

''تم میری کوئی بات نہیں سنتے!''وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ علی پنجوں کے بل بیٹھا اور اپنی ناراض ناراض سی بیٹی کو اپنے ساتھ لگایا۔

''پہلے تو نشمی! بھائی کو تم نہیں آپ کہا کرو۔ اور تم بھی کبھی کبھی بھائی کی بات مان لیا کرو نا۔ ہمیشہ اپنی بات نہیں منواتے، کبھی کسی کی مانتے بھی ہیں۔''اُس نے پیار سے سمجھایا۔

''ہاں! لیکن آپ تو میری کوئی بات نہیں مانتے۔''اُسکے اپنے ہی غم تھے۔

''کوئی علاج نہیں ہے تمہارا!''وہ ہنسا۔

''دادا!''سیڑھیوں پر کھڑے احمد نے اپنے دادا کو اچانک ہی مخاطب کیا جو مسکراتے ہوئے نشمیہ کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں بیٹے!''اُنہوں نے پوچھا۔

''کیا مہندی والی باجی چلی گئی ہیں؟''اُس نے پوچھا۔اِس سوال پر سفیر صاحب کے ساتھ ساتھ علی نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔

''نہیں! وہ ابھی اپنے کوارٹر میں ہی ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں کیا۔۔۔امی کو بھی۔۔۔مہندی لگوا سکتا ہوں؟''اُس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل! لیکن پہلے اپنی امی سے پوچھ لو۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے بتانا میں فوراً بھجوا دوں گا۔''انہوں نے کہا۔

''میں اُنکو منالوں گا۔''اُس نے چہکتے ہوئے کہا اور تیزی سے اوپر بھاگا تو علی بے یقینی سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ احمد نے کبھی ایسے بچوں جیسی خوشی نہیں دکھائی تھی، وہ کبھی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش نہیں ہوا تھا، نہ ہی اُس نے کبھی کوئی جلد بازی دکھائی تھی۔ پر اپنی ماں کے لیے وہ سب کچھ تھا۔ لڑکے اپنی ماں کے لیے واقعی بچے ہوتے ہیں۔ علی مسکرا دیا، پھر چہرہ موڑ کر اپنے کندھے سے لگی، ہاتھوں پر لگی مہندی کو کسی متاع حیات کی طرح دیکھتی نشمیہ کو دیکھا۔ اُسکے ننھے ننھے ہاتھوں پر مہندی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اُس نے بیساختہ ہی اُسکے ہاتھوں کو چوما۔

''آں۔۔۔آپ لوگ کیوں میری مہندی خراب کر رہے ہیں؟''اِس بے وقت پیار پر وہ مزید جھنجھلائی۔ ایک تو سارا گھر مل کر اُسکی مہندی خراب کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''اب اسے دھونے کا وقت آ گیا ہے نشمیہ صاحبہ!'' علی نے اُسے گود میں لیکر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں صبح دھوؤں گی۔'' مجال ہے جو وہ ایک بار میں کوئی بات سمجھ لے؟

علی اُسے لیے باتھ رُوم کی طرف بڑھ گیا تا کہ اُسکے ہاتھ پاؤں دھلوا سکے۔ جبکہ پیچھے کھڑے سفیر صاحب آنے والے وقت کی خوشیاں محسوس کر رہے تھے۔

پر جو وہ نہیں جانتے تھے۔۔۔۔

وہ مورخہ چھے کو ہونے والا ممکنہ سانحہ تھا۔۔۔

لاعلمی۔۔۔

بڑی نعمت ہے۔۔۔۔

---------+---------+--------

رمضان اپنی برکتیں سمیٹتا واپس چلا گیا۔ اور اپنے پیچھے خوشیوں بھرا انعام عید دے گیا۔

عید کی صبح۔۔۔

برکتوں والی۔۔۔ رحمتوں والی۔۔۔

انعام والی۔۔۔ پیام والی۔۔۔

ہلکے جامنی رنگ کے جوڑے میں، بل کھاتے بالوں کو کیچر میں مقید کر کے آدھا کھلا چھوڑے، جزا نک سک سے تیار اپنے گھر کے کچن میں کھڑی کھیر کو پیالوں میں نکال رہی تھی۔ ستواں ناک پر چمکتی لونگ اُسکی سانولی رنگت پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وحید کی بیوی اور بچے آئے ہوئے تھے، خود وہ اِس سال عید پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی خاطر گھر پر نہ تھا۔

کھیر کے پیالوں کو ٹرے میں رکھ کر جب وہ لاؤنج میں آئی تو وحید کے دونوں بچوں نے اُسے گھیر لیا۔

''پھپھو آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں۔'' وحید کی بیٹی نے اُسے دیکھ کر چہکتے ہوئے کہا تو وہ ہنسی، پھر ٹرے میز پر رکھ کر پنجوں کے بل بیٹھی اور اُسکے گلے لگ گئی۔

''عید مبارک میری جان!'' اُس نے بھتیجی کو گلے لگاتے ہوئے کہا، پھر اُسکے بھائی کو بھی گلے لگایا۔

''پھپھو میری عیدی!''اُس نے فوراً ہاتھ آگے کیے تو سب لوگ ہنس دیئے۔

''وہ میں کمرے میں ہی بھول گئی۔ابھی لیکر آتی ہوں۔''وہ جلدی سے اُٹھی اور ہنستے ہوئے کمرے میں آگئی۔پھر میز پر رکھے سامان میں سے وہ لفافے تلاش کرنے لگی جو اُس نے اپنے بھتیجوں اور پناہ گاہ کے بچوں کے لئے بنائے تھے۔تب ہی اُسکی نظریں،اُس کاغذ پر گئیں جسکے نیچے ڈاک کا لفافہ رکھا تھا۔اُسکے ہاتھ تھمے۔اُسے یاد آیا کہ کل رات وہ اُسے لکھتے لکھتے سو گئی تھی۔اُس نے کاغذ اُٹھالیا۔

''عید مبارک وحید بھائی!

آپ ڈیوٹی پر ہوں گے،جب یہ خط آپکو ملے گا،عید گزر چکی ہو گی۔آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ڈیوٹی پر پہلی بار بہن کا خط کیسے آگیا؟بھائی! مجھے جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا،شاید ہم تینوں بہن بھائیوں کو ہی نہیں آتا۔

آپ اُس روز مجھے اتنا کچھ کہہ کر چلے گئے،مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا،نہ کوئی وضاحت دینے دی نہ ہی معافی مانگنے دی۔ جذبات کے اظہار کے لیے قلم ایک اچھی شے ہے،سوچا آپکو لکھ کر ہی بھیج دوں۔

بھائی!نہ میں ظالم ہوں،نہ ہی اتنی بے حس کہ اینٹوں سے بنے ایک گھر کے لیے اپنے مردہ بھتیجوں کو بھول جاؤں۔ایسا بھی نہیں ہے،کہ میرے دل میں اُنکے لیے محبت نہیں تھی۔بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ اُنکے بچے پیارے ہیں لیکن۔۔۔۔پھر وہی بات کہ مجھے اظہار نہیں آتا۔

کہاں سے شروع کروں؟وہاں سے جب ابّو نوید بھائی کو مارتے تھے اور میں مزید جھوٹی شکایت لگا کر انہیں مار پڑواتی تھی۔میں بری تھی،بہت بری۔۔۔پر میں بچی تھی۔مجھے لگتا تھا کہ بھائی کوئی بہت ہی برا انسان ہے،جب ہی تو ابّو اُسکے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ورنہ ابّو برے ہوتے تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے۔ابّو برے نہیں تھے بھائی،برا نوید بھائی بھی نہ تھا،برا بس زمانہ تھا،وہ ٹراما تھا جو نسل در نسل چلتا چلا آیا تھا۔مجھے دکھ اِس بات کا ہے کہ میرے بھائیوں کو یہ تو یاد رہا کہ میں اُنکی جھوٹی شکایت کرتی تھی،پر یہ یاد نہ رہا کہ جب میں بڑی ہوئی اور مجھے سمجھ آیا کہ یہ غلط ہے،تو میں نے اُنکی کتنی ہی غلطیوں اور کتنی ہی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔

بھائی!ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے بھائی سے محبت نہیں ہے۔ہے!بہت ہے۔۔۔آپ یاد کریں بھائی کہ میں نوید بھائی سے بات کرنا چاہتی تھی،اُنکے ساتھ ہنسی مذاق کرنا چاہتی تھی،میں چاہتی تھی کہ وہ میرے ساتھ ویسے ہی رہیں جیسے اور بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔پر وہ مجھے جھڑک دیتے تھے۔وہ مجھے بہت بری طرح ڈانٹ دیتے تھے۔جو میں نے بچپن میں کیا وہ مجھے یاد نہیں،میں نے کہا نا!میں بچی تھی۔لیکن کیا مجھ سے بڑے اور سمجھدار بھائیوں کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ مجھے میرے بچپن کے گناہوں کی سزا نہ دیتے،میری بچپنے میں کی گئی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے؟کیا ضروری تھا کہ جب میں بڑی ہو گئی تو وہ مجھ سے بچپن کا بدلہ لیتے؟بھائی کے اِس مستقل رویے نے میرے دل میں اُنکے خلاف بغض بھر دیا۔اور مجھے وہ برے لگنے لگے۔

پھر جب بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے، تو وحید بھائی! آپ نہیں جانتے۔۔۔آپ نہیں جانتے کہ ابّو کس کرب سے گزرے تھے۔آپ نہیں جانتے کہ وہ ساری ساری رات روتے تھے۔بھائی! کیاماں باپ کو غلطیوں کی سزا دینی چاہیے؟ کیاانہیں معاف نہیں کرنا چاہیے؟ کیااُنکے ساتھ در گزر نہیں کرنا چاہیے؟ گھر سے جانے کے بعد آپ توابّو سے ملنے آ بھی جاتے تھے پر نوید بھائی نے پلٹ کر ایک بار نہیں پوچھا۔میں انتظار میں رہی کہ شاید وہ کسی روز آجائیں۔۔۔ کسی روز آجائیں تو ایک بار ابّوانہیں گلے لگا سکیں۔لیکن وہ نہیں آئے۔اُنکے اِس رویے نے میرے دل میں اُنکے لیے نفرت بھر دی۔یہاں تک کہ ابّو اُنکی راہ تکتے تکتے دنیا سے چلے گئے۔جس روز ابو کا انتقال ہوا،اُس روز بھی ابّو بھائی کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔پر وہ آگے نہیں بڑھے، کیا تھا جو وہ ایک بار ابّو کے پاس آجاتے؟

ہاں! میں مانتی ہوں کہ میں بہت غلط ہوں، بہت زیادہ۔۔۔پر بھائی میرے اِس رویّے کے پیچھے ابّو کی بے تحاشا محبت تھی۔مجھے لگتا تھا کہ ابّو بھائی کے جانے کے غم میں مرے ہیں، وہی ذمّے دار ہیں اُنکی موت کے۔

ہاں! یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ گھر، جس میں میرے باپ کی یادیں تھی، اُسے آپ نے بیچنے کی بات کی تو میرا دل مزید متنفر ہو گیا تھا۔مجھے لگا کہ ایک بھائی نے مجھ سے میرا باپ چھینا اور ایک نے میرے باپ کا بنایا گھر۔میں اپنے غصّے میں اندھی ہو گئی تھی۔لیکن بھائی! میرے صرف ایک سوال کا جواب دیں۔جب بھائی اِس گھر کو چھوڑ کر گئے، تو بے شک اُنکے ابّو سے جو بھی مسائل تھے، وہ مجھ سے تو رابطہ کر سکتے تھے نا؟ کیا اُنکی اکلوتی بہن نے انکا انتظار نہیں کیا تھا؟ کیا اُنکی مجھ سے کوئی دشمنی تھی؟ کیا تب تک میں نے اُن سے قطع کلامی کی تھی؟ میں نے تین ماہ تک انتظار کیا کہ شاید بھائی کو میری یاد آئے، وہ کم از کم مجھے ایک بار میسج تو کریں، پر نہیں! اُنہوں نے ابّو کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی قطع تعلق کر لیا۔اب بتائیں بھائی! پہل کرنے والا کون تھا؟ میں یا نوید بھائی؟

میں اِس وقت حساب کتاب نہیں کر رہی۔نہ یہ کہہ رہی ہوں کہ میں صحیح تھی اور بھائی غلط۔غلط میں بھی تھی، اور صحیح بھائی بھی تھا۔ہم سب ہی کہیں نہ کہیں ظالم ہوتے ہیں۔جب بھائی کے بچوں کا انتقال ہوا، تو ہاں! میں آئی تھی اور میں وہاں رہی بھی تھی۔پر کیا آپ جانتے ہیں میں کیوں واپس چلی گئی؟ میں نوید بھائی کو اِس حال میں دیکھ کر بھی انکو گلے نہیں لگا سکی تھی۔میں اپنے بھائی کو تسلی کے دو لفظ بھی نہ بول سکی تھی۔اور اِس شرمندگی کو چھپانے کے لیے میں واپس آگئی، میں اُنہیں اِس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔کہا نا! مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔پر میں چاہتی تھی کہ امی وہاں رہے۔

اور آج میں آپکو ایک سچ بتانا چاہتی ہوں، ایک ایسا سچ جو میں نے اِس لیے چھپا کر رکھا کہ میں اپنی ماں کو آپکی یا بھائی کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتی۔وہ یہ کہ جب امی انتقال کے گھر سے واپس آگئیں، تو اُنہوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ تم وہاں سے کیوں آئی؟ اس لیے کہ تمہیں نوید سے نفرت ہے؟ تمہاری وجہ سے مجھے بھی یہاں آنا پڑا اور وحید اِس بات پر بہت غصّہ ہے۔خدا کی قسم بھائی! یہ غلط اندازہ میرے بارے میں اُنہوں نے خود ہی لگایا تھا، اور وہی اُنہوں نے آپکو بھی بتا دیا۔حالانکہ میں اُس وجہ سے وہاں سے نہیں آئی تھی، اور میں آپکی اور بھائی کی غلط فہمی دور بھی نہ کر سکی کہ میرے اور آپ دونوں کے درمیان اتنے فاصلے آچکے تھے کہ میں کچھ ٹھیک نہیں کر سکی۔

ہاں! ایک جگہ میری غلطی ہے، اور اُسے میں تسلیم کرتی ہوں، گو کہ اب تسلیم کرنے سے کچھ نہیں بدل سکتا پھر بھی۔ وہ یہ کہ ابّو کی محبت مجھ پر زیادہ غالب رہی ہے ہمیشہ، اور کبھی کبھی تنہائی میں اُنہیں یاد کرتے ہوئے مجھ پر پھر سے اپنے بھائیوں کا رویہ گراں گزرنے لگتا اور مجھے ایسا لگنے لگتا کہ اُن ہی کی وجہ سے میرے ابّو مرے ہیں۔ اُس پرسے میں جب بھی امی کو دیکھتی تو مجھے وہاں ایک ایسی ماں نظر آتی، جو ہر بار آس بھری نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھتی ہے کہ شاید وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھ لے، پر ہر بار وہ بیٹا، انہیں کرائے کے گھروں میں چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں اپنے بیٹے ہی زیادہ پسند ہیں، مجھے کبھی امی کی نظر میں وہ مقام نہیں مل سکا جو اُنکے بیٹوں کا تھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر کر میرے دل میں آپ دونوں کے لیے نفرت پھر سے سمانے لگتی اور شرمندگی کا عنصر مٹنے لگتا۔ میں بہت کنفیوز رہنے لگی تھی بھائی! صحیح اور غلط کی کشمکش نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا، میں شدید اسٹریس میں تھی، اور جب امی نے مجھ سے کہا کہ ہمیں نوید بھائی کے گھر جا کر رہنا ہے تو نجانے میں نے کیا کیا کہہ دیا؟ ہوش تب آیا، جب میں نے دروازے پر نوید بھائی کو کھڑا دیکھا۔ آپکی طرح اُنہوں نے بھی مجھے وضاحت کا موقع نہیں دیا۔ اور اُس روز سے لیکر آج تک میں پچھتا رہی ہوں کہ میں نے وہ سب کیوں کہا؟ میں کیوں اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکی؟ میں کیوں اپنے بھائیوں کو بتا نہیں سکی کہ وہ اہم ہیں؟ میں آج تک شرمندہ ہوں بھائی اور میری یہی شرمندگی مجھے نوید بھائی کے سامنے نہیں آنے دیتی۔ اُسکے پیچھے نہ انا ہے اور نہ ہی اینٹوں سے بنے گھر کی محبت۔

پر ہاں! اب سے میں خود کو بدلوں گی، اب سے میں ہی پہل کروں گی۔ لیکن فقط ایک گزارش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بھائی بھی تو مجھے سمجھیں۔

آپکی بہن

جزائے خیر عالم۔''

اُس نے خط کو تہہ کیا، اور پھر اُسے لفافے میں ڈالنے کے بعد اپنے پرس میں رکھتے باہر آئی۔ ارادہ تھا کہ بچوں کو عیدی دے کر پناہ گاہ جائے گی۔ پر لاؤنج میں بیٹھے نوید اور بشریٰ کو دیکھ کر اُسکے قدم منجمد ہو گئے۔ یہ پہلی بار تھا، جب نوید بشریٰ کے ساتھ عید ملنے آیا تھا اور وہ بھی بنا کسی دعوت کے۔ امی تو خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ بشریٰ کے ہاتھوں پر مہندی سجی ہوئی تھی، آنکھیں غم زدہ سی پر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ وحید کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ جزا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی لاؤنج میں آئی۔

''تم کہیں جا رہی ہو؟'' امی نے اُسکے کندھوں پر پرس دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں! کہیں نہیں۔'' نوید کے سامنے کہہ نہیں سکی کہ پناہ گاہ جانا ہے۔ ابھی پرسوں ہی تو بتایا تھا اُس نے کہ وہ رضا کا دوست ہے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پر ہے۔

''عید مبارک بھابھی!'' اُس نے آگے بڑھ کے بشریٰ کو کہا تو وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی اور اُسکے گلے لگی۔ عید تو اپنوں کو گلے لگانے کا ایک بہانہ ہے بس!

''آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔''اُس نے بشریٰ کو دیکھتے ہوئے کہاتو وہ مُسکرائی۔وہ مسکرائی تو نوید بھی مسکرایا۔ کچھ دیر وہ لوگ وہاں بیٹھے رہے۔پھر نوید کا فون بجا۔

''علی کالنگ'' کے الفاظ واضح ہوئے۔

''میں آتا ہوں۔''وہ کال لینے کے لیے اٹھا۔

''بشریٰ تیار رہو، میں تمہیں تمہارے بھائی کے گھر چھوڑ دوں گا۔''وہ اُسے کہتا ہوا گھر کے لان کی طرف آیا۔ جزا نے اُسکو لان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔اُسے یقیناً بشریٰ کے ساتھ اُسکے میکے بھی جانا تھا، وہ اِن سب تکلفات میں نہیں پڑتا تھا لیکن بشریٰ کی حالت کے پیش نظر اب وہ سب کر رہا تھا۔ جزا کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتی رہی، پھر یکدم ہی اُٹھی۔

''میں آرہی ہوں۔''وہ سب کو کہتی ہوئی لان میں آئی۔نوید فون کان سے لگائے بات کر رہا تھا، جزا کی جانب اُسکی پیٹھ تھی۔وہ اُس سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے! مجھے دو گھنٹے لگیں گے۔میں آتا ہوں اُسکے بعد۔''وہ فون پر کہہ رہا تھا، جبکہ جزا بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

''بشریٰ تم کیا۔۔۔''وہ فون رکھ کر، اپنے پیچھے موجودگی کا احساس کر کے مڑا تو سمجھا شاید بشریٰ ہو گی، پر جزا کو دیکھ کر چونکا۔پھر سر جھٹک کر موبائل میں کچھ لکھنے لگا۔ جزا کی رہی سہی ہمت بھی ہوا ہونے لگی۔

''بب۔۔۔بھائی!''اُس نے پکارا۔

''ہونہہ؟''اُس نے موبائل سے سر اٹھائے بنا ہی کہا۔

''عید مبارک!''اُس نے کہا۔اور نوید نے شدید حیرت سے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں؟''بھنویں اچکا کر اُسے سوالیہ نظروں سے ایسے دیکھا جیسے سمجھ نہ آیا ہو۔

''میں نے کہا عید مبارک!''اب کہ اسکی ہمت بحال ہونے لگی۔

''آں۔۔۔ہاں ہاں! عید مبارک! تم بشریٰ کو بھیج دو۔''اُس نے کہتے ہوئے دوبارہ موبائل میں سر جھکا دیا۔نجانے کس سے بات کر رہا تھا؟ جزا نے نہایت ہی برا منہ بنایا اور جی اچھا کہتی جانے کے لیے مڑی۔

''رضا پناہ گاہ آگیا ہے؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا تو وہ حیرت سے مڑی، اُسکی نظریں اب تک موبائل پر ہی تھی۔

''آپکا دوست ہے، آپکو نہیں معلوم؟''اُس نے چڑ کر کہا تو نوید نے آنکھیں اٹھا کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا، دوسرے لفظوں میں گھورا۔

''آ گیا تھارات کو۔''جزا نے خائف ہوتے کہا۔

''ٹھیک ہے! بشریٰ کو بھیج دو۔''اُس نے ایک مرتبہ پھر موبائل میں چہرہ دیا۔

''بھائی!''اب کہ جزا نے جی کڑا کر کے اُسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔

''بولو!''اُسکا انداز ویسا ہی مصروف سا تھا۔

''میری عیدی؟''یہ سوال کرنا جتنا مشکل تھا، نوید کے لیے ہضم کرنا اُس سے کہیں زیادہ مشکل۔ موبائل پر ٹائپ کرتی اُنگلیاں روک کر اُسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا کہا؟''پوچھا ایسے جیسے اُسکی دماغی صحت پر شک گزرا ہو۔

''میری عیدی تو دیں۔''اُسکی ہمت بڑھنے لگی۔

''میں۔۔۔ میں نے لفافہ بنایا نہیں ہے۔''نوید عالم پہلی بار گڑبڑایا۔

''ایسے ہی دے دیں۔ بنا لفافے کے۔''اُس نے دھونس بھرے انداز میں کہا تو وہ مزید حیران ہوا۔ وہ آج اسے چونکا رہی تھی۔

''میرے پاس نقد رقم موجود نہیں ہے اِس وقت۔''اُس نے بہانہ بنایا۔

''دس بیس روپے ہی دے دیں۔ ایسی بھی کیا کنجوسی!''اُسکے مان بھرے لہجے پر نوید عالم لمحے کو ساکت ہوا۔ کیا اُس نے کبھی جزا کا ایسا لہجہ اور انداز دیکھا تھا؟ ہاں! دیکھا تھا۔ بالکل دیکھا تھا۔

وہ سولہ سال کا تھا، اور جزا آٹھ سال کی۔ عید کے دن غرارے اور نیٹ کے چھوٹے سے دوپٹے کو گلے میں ڈال کر اُسکے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

''بھائی میری عیدی دیں!''اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں آگے کر کے جزا بولی۔

''مجھے تنگ مت کرو!''ہمیشہ سے بیزار نوید نے کہا۔

''عیدی دے دیں پھر تنگ نہیں کروں گی۔''اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے، دھونس بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں دوں؟''اُس نے غصّے سے پوچھا۔

''بھائی دیتے ہیں بہن کو۔''اُس نے سمجھداری سے بتایا۔

''نہیں ہو تم میری بہن! تم نے ہمشہ مجھ سے بد تمیزی کی ہے، ہمیشہ میری جھوٹی شکایتیں کی ہیں۔ تم بہت بری ہو۔''صبح صبح اُسکی کسی بات پر کلاس ہوئی تھی، وہ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ لہٰذا غصّہ اُسی پر نکال دیا۔ اُسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آنے لگے، نوید کی عید خراب ہوئی تھی تو اب وہ اپنے آس پاس موجود ہر انسان کی عید خراب کر دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی منتقل ہوتے ہیں جنریشنل ٹراما۔

''میں نے کیا کیا بھائی؟''اُس نے ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے، بھیگے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! جاؤ اور جا کر ابّو کو میری شکایت کر دو۔ تمہیں یہی تو آتا ہے۔''اُسکا غصّہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''باہر سے ابّو کی بلند آواز سنائی دی۔

''کچھ نہیں ابّو! میں کھیل رہی ہوں یہاں!''جواب جزا نے دیا تھا۔ پھر وہاں سے بھاگ گئی، اُس نے اپنے بھائی کی شکایت نہیں کی۔ پر اُس روز کے بعد وہ دوبارہ کبھی اُس سے عیدی مانگنے نہ آئی۔

''کیا دس بیس روپے بھی نہیں ہیں؟''اُسکی آواز نے نوید کو ماضی سے باہر کھینچا۔ چھوٹی سی جزا اب بڑی ہو گئی تھی۔ اور آج بھی ہاتھ پھیلائے ایسے ہی کھڑی تھی۔ نوید نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اندر سے ایک خوبصورت سا لفافہ نکالا، اس پر جزا کا نام سنہرے مارکر سے لکھا ہوا تھا۔

''یہ لو!''اُس نے لفافہ اُسکی جانب بڑھایا تو اُس کا مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا۔

''ابھی تو کہہ رہے تھے کہ لفافہ نہیں ہے۔''اُس نے لفافہ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں ہر سال بناتا ہوں۔ پر تمہیں دے نہیں پاتا۔''اُس نے آہستہ سے کہا تو وہ حیران سی اُسے دیکھنے لگی۔

''بشریٰ کو بھیج دو!''وہ کہہ کر تیزی سے جانے کے لیے مڑ گیا۔ اس سے زیادہ جذبات کا اظہار وہ نہیں کر سکتا تھا۔ جزا کی طرح اُسکا بھائی بھی اظہار کے معاملے میں چور تھا۔ وہ ہنسی، اور پھر ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔ اُسکی ہنسی گاڑی کا دروازہ کھولتے نوید نے باخوبی سنی تھی۔ وہ اُسکے بچپنے پر بیساختہ مسکرا کر رہ گیا۔

غلطی ہمشہ ایک جانب سے نہیں ہوتی۔

غلطیاں۔۔۔۔

دونوں جانب سے ہوتی ہیں۔۔۔

لہٰذا سدھارنا بھی دونوں کو ہی چاہیے۔۔۔

---------+---------+--------

مکرم کو اپنے جیسا ہی لباس پہنا کر، پھر اُسے تیار کر کے مقدّم عید کی نماز کے لیے نکل رہا تھا۔ ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر لمحے کے لیے حیران کھڑا رہ گیا۔

''اخلاق؟''مقدم چیخا اور اگلے ہی لمحے اُسکے گلے لگ گیا۔ ننھا مکرم، آنکھیں کھولے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے مقدّم نے گھاس پر کھڑا کر رکھا تھا۔

''تم کیسے آ گئے؟''اُس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سرپرائز!''احلاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عید کے دن کا بہترین آغاز ہوا ہے۔''اُس نے کہا۔

''نماز ہو گئی ہے کیا؟''اخلاق نے سوٹ کیس لان کی دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! چلو! نماز پڑھنے ساتھ ہی چلتے ہیں۔''مقدّم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں!''اُس نے جھک کر مکرم کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔

''تم نے کیا جواب دیا مقدّس کو؟''راستے میں اخلاق نے اُس سے پوچھا۔

''میں نے اُس سے تمہارے کراچی آنے تک کا وقت مانگا تھا۔ آج جواب دے دوں گا۔''گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مقدّم نے جواب دیا۔

''میرا انتظار؟ کس لیے؟ بھئی خود فیصلہ کرو۔''اخلاق نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میری فیملی میں تمہارے علاوہ ہے ہی کون؟ اب تم سے مشورہ بھی نہ کروں؟''اُس نے کہا۔

''میں نے فون پر ہی مشورہ دے دیا تھا تمہیں کہ جو تمہارا فیصلہ ہو گا، میں اُس میں خوش ہوں۔''اُس نے کہا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ مقدّس چاہتی ہے کہ میں اُسکے ماں باپ سے ملوں اور خود رشتہ مانگوں۔ اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ انکار کر دیں گے۔''وہ کچھ پریشان تھا۔

''کیوں انکار کر دیں گے؟''

''تم نہیں جانتے؟ جب میں انکے پاس مکرم کو لیکر گیا تھا تو اُنھوں نے اُسے ایک باغی کی اولاد کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی فضول کی روایات میں اتنا جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی کی خوشیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' وہ تلخی سے گویا ہوا۔

''اگر وہ انکار دیں گے تو پھر تم کیا کرو گے؟'' اخلاق نے اُسے غور سے دیکھا۔

''اسی لیے تو تمہیں یہاں آنے کو کہا تھا۔ تم ہی مجھے مشورہ دے سکتے ہو کہ میں کیا کروں؟'' وہ حقیقتاً پریشان تھا۔

''کیا تم جانتے ہو میں آج یہاں کیوں آیا؟'' اخلاق نے اچانک ہی پوچھا۔

''مجھ سے ملنے۔''

''ہاں! پر آج ہی کے دن کیوں؟''

''چھٹی ہو گی تمہاری۔۔۔''

''نہیں! یہ وجہ بھی نہیں ہے۔''

''خود ہی بتا دو۔'' وہ جھنجھلایا۔

''مسئلہ یہ کہ کل مقدّس کے اماں اور ابّا مجھ سے ملنے میرے آفس آئے تھے۔ پہلی بار۔۔۔'' اُس نے انکشاف کیا تو مقدّم نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کیوں؟''

''تمہارے بارے میں بات کرنے۔ کہنے لگے کہ مقدم کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ نشہ وغیرہ کرتا تھا، ہم اپنی بیٹی کیسے دیں؟ میں نے کہا اگر نشہ کرتا تو وہ آپکے نواسے کو نہ پال رہا ہوتا اتنے عرصے سے۔ اِس بات پر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ وہ عید کے روز کراچی پہنچیں گے تاکہ تم سے مل سکیں۔ مجھے بتانے سے منع کیا تھا کہ وہ خود مقدّس کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ اِس لیے میں بھی یہاں آ گیا، تاکہ جو بات ہو سب کے سامنے ہو۔'' اِس نے تفصیل سے بتایا۔

''اوہ! یعنی مقدّس کو بھی یہ نہیں معلوم؟'' اُس نے اندازہ لگایا۔

''ہاں! اُسے بھی اِس بات کی خبر نہیں ہے۔''

''کیا لگتا ہے وہ انکار کر دیں گے؟'' عید گاہ کے قریب گاڑی روکتے ہوئے اُس نے پوچھا تو اُسکے انداز پر اخلاق مسکرایا۔

''مجھے نہیں لگتا۔اب نہ اُن میں وہ رعب رہااور نہ وہ دبدبہ۔بیٹی کے مرنے،اور نواسے کو خود سے دور کرنے کے بعد سے وہ خود بھی بہت پچھتاؤں کا شکار ہیں۔اِس لیے پہلی بار مقدّس کو نوکری کرنے کے لیے خود سے اتنا دور بھیجنے پر بھی راضی ہو گئے،حالانکہ خاندان میں اِس بات پر سب اُن سے ناراض ہیں۔ تھوڑی تھوڑی انہیں بھی عقل آرہی ہے۔اور اگر انکار ہی کرنا ہوتا تو پہلے مجھ سے،اور پھر یہاں تم سے ملنے کیوں آتے؟سیدھا فون پر ہی منع کر دیتے۔یعنی اُنکے دل میں بھی کہیں اقرار ہے۔بس!انکے کچھ خدشات ہیں۔''اخلاق نے کہاتو اُسکے دل سے منوں بوجھ سرکا۔

''چلو!نماز شروع ہو جائے گی۔''مقدّم نے مسکراتے ہوئے کہاتو وہ بھی اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

---------+---------+--------

عیدالفطر کی نماز ادا کرنے وہ،احمد اور ابّا کے ساتھ گیا تھا۔نماز مکمل کر کے وہ سفیر صاحب سے گلے لگ کر عید ملا۔شاید ایک لمبے عرصے بعد وہ اس طرح اُن سے عید ملا تھا۔پھر احمد کی باری آئی،دادا سے تو اُس نے بخوشی گلے ملا،پر باپ سے ملنے آگے نہیں بڑھا۔علی گھٹنوں کے بل بیٹھا،پھر خود ہی اُسکے گلے لگ گیا۔

نماز ادا کر کے جب وہ گھر پہنچا،تو احمد تیزی سے اندر بھاگا،یقیناً اپنی ماں سے ملنے کی جلدی تھی۔جبکہ علی ابھی لان میں ہی تھا کہ اُسکے کانوں میں نشمیہ کی چہکتی آواز ٹکرائی۔

''بابا!عید مبارک۔۔۔''وہ زور زور سے بولتی مرکزی دروازے کی چند سیڑھیاں اُترتی لان میں داخل ہو رہی تھی۔علی اُسے دیکھ کر تھم گیا۔آف وائٹ رنگ کے لمبے انگرکھا فراک میں،جسکی بیلیں لال رنگ کی تھی،اُس پر بیل کا ہم رنگ دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ ننھے ننھے قدم بڑھاتی اُسکے پاس آرہی تھی۔ آج اُسکے لمبے بالوں کو خوبصورتی سے باندھا گیا تھا،کانوں میں چھوٹی چھوٹی سی بالیاں اور مہندی لگے ہاتھوں میں پیاری پیاری سی چوڑیاں پہنے وہ اُسکے پاس آرہی تھی۔آج یقیناً اُسے اُسکی ماں نے تیار کیا تھا۔

کیا عید اتنی خوبصورت بھی ہوتی ہے؟علی نے اُسے دیکھ کر سوچا۔وہ قریب پہنچی تو وہ بیساختہ پنجوں کے بل بیٹھا۔پر وہ رکی نہیں،بلکہ اسی طرح بھاگتی اُسکے گلے لگ گئی۔

''بابا!عید مبارک۔۔۔''وہ چلا چلا کر علی کو کم اور محلے والوں کو زیادہ عید کی مبارک باد دے رہی تھی۔علی نے اُسے گود میں بھینچ لیا۔آنکھوں میں تشکّر آمیز نمی اُتر آئی۔خدا بھی کیسے کیسے مہربان ہوتا ہے؟

''میری جان!میری شہزادی!میرے دل کا ٹکڑا!''اُسے من پسند ناموں سے پکارتے علی نے اُسکے مہندی لگے معصوم سے ہاتھ چومے،پھر اُسکا ماتھا۔

''بابا!میں پیاری لگ رہی ہوں نا؟''خود کو پری سمجھتے گول گول گھومتے ہوئے پوچھا۔

''میری نشمیہ تو ہے ہی پیاری۔'' علی نے اُسے گود میں لیکر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

''امی کی طرح؟'' اُس نے پوچھا تو وہ رکا، پھر مُسکرایا۔ اور آہستہ سے بولا ''ہاں!''

''میری عیدی؟'' اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ! عیدی؟ نشمیہ کو پتہ ہے کہ عیدی کیا ہوتی ہے؟'' اُس نے مصنوئی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! بہت سارے پیسے ہوتے ہیں۔'' اُس نے زور و شور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور تم بہت سارے پیسوں کا کیا کرو گی؟'' علی نے بہت سارے پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں۔۔۔۔ میں تو ڈول ہاؤس خریدوں گی۔'' ڈول ہاؤس کی بھرمار کرنے کے بعد بھی اُسکا دل نہیں بھرا تھا۔

''کیسے خریدو گی؟ تمہیں پتہ ہے کہ کہاں ملتا ہے؟''

''دکان میں!''

''دکان کیسے جاؤ گی؟''

''میں آپکو پیسے دے دوں گی۔ آپ لا کر دے دیجئے گا۔'' اُس نے سمجھداری سے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں تمہیں عیدی دوں گا۔ پھر تم وہ مجھے واپس دو گی تاکہ میں ڈول ہاؤس لا سکوں؟'' علی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے زور زور سے سر ہلایا تو اُسکی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میرا معصوم بچہ!'' اُس نے ایک بار پھر اُسے سینے میں بھینچا تھا۔

''علی! تمہیں اپنے گواہان بلانے تھے نا؟'' اُسی لمحے سفیر صاحب نے وہاں آتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے! میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔'' اُس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ پھر نشمیہ کو گود سے اُتارا۔

''نشمی! جاؤ جا کر اپنے ابّا سے بھی عیدی لو، اور پھر مجھے دے دو تاکہ میں ڈول ہاؤس لا سکوں۔'' اُس نے شرارت سے کہا۔

''یہ کونسی کرپشن (بدعنوانی) چل رہی ہے۔'' سفیر صاحب نے اُسے گھورا۔

''کرپشن نہیں، یہ میرے اور میری بیٹی کے درمیان ڈیل (معاہدہ) ہوئی ہے۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہااور پھر لان میں رکھی کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ سفیر صاحب نشمیہ کو لیکر اندر چلے گئے۔

علی نے سب سے پہلی کال نوید کو کی تھی۔

''السلام علیکم! عید مبارک!''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خیر مبارک!''نوید کی ازلی سنجیدہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا تم آج مصروف ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''فارغ بھی نہیں ہوں۔''اُسکی توقع کے عین مطابق جواب آیا تو وہ ہنسا۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تم میرے فیصلے کو کس نظر سے دیکھو گے؟ پر میں نے یہ اپنے بچوں کے لیے کیا۔ اور اُن کے مستقبل کا سوچتے ہوئے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔''اُسکی باتیں یقیناً نوید کو سمجھ نہیں آرہی تھیں، پر وہ خاموش تھا۔

''میں نکاح کر رہا ہوں۔ فاطمہ سے۔۔۔''اُس نے آہستہ سے بتایا۔ دوسری جانب کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم نے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی، مبارک ہو تمہیں۔''اِس بار اُسکا لہجہ واقعی مسکراتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''کب کر رہے ہو نکاح؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں! یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ آج ہی ہے، ظہر سے پہلے۔ اور۔۔۔ اگر تم گواہی دو تو مجھے اچھا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے! مجھے دو گھنٹے لگیں گے۔ میں آتا ہوں اُسکے بعد۔''اُس کہا اور پھر فون رکھ دیا۔ دوسرا فون اُس نے عمر کو ملایا تھا۔

''عید مبارک علی! کیسے ہو؟''اُس نے فون اٹھاتے ہی کہا تھا۔

''عید مبارک! الحمدُ اللہ! تم سناؤ۔ کیا کر رہے ہو عید کے دن؟''اُس نے پوچھا۔

''میں نے کیا کرنا ہے؟ نماز پڑھ کر گھر آگیا ہوں۔ اب فارغ ہوں۔''اُس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا۔

''میرا آج نکاح ہے۔''اُس نے آہستہ سے بتایا۔

''کیا واقعی؟''دوسری طرف وہ حیران ہوا۔

''ہاں! کل رات ہی فیصلہ کیا ہے۔''اُس نے بتایا۔

''ایسے اچانک؟''عمر تھوڑا حیران ہوا۔

''ہاں! اپنے بچوں کے لیے، میں نے اور فاطمہ نے دوبارہ نکاح کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''اُس نے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

''میں خوش ہوں بہت! تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔''وہ واقعی خوش تھا۔اُس کو اب سمجھ آیا تھا کہ کل علی نے اُس سے کیوں مشورہ مانگا تھا؟

''تو کیا تم آ سکتے ہو، نکاح کی گواہی کے لیے؟ ظہر سے پہلے ہے۔''اُس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ میں بالکل آ جاؤں گا۔''اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارا بہت شکریہ!''علی نے کہا۔پھر کچھ مزید باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔اب وہ اندر جا رہا تھا۔تاکہ بچوں کو عیدی دے سکے۔

---------+---------+--------

گھر کے بڑے کمرے میں سارا خاندان جمع تھا۔آج حسین کے گھر میں اُسکے والدین کی جانب سے اُسکے تمام دد ھیال کو عید کی دعوت تھی۔خوشیوں بھرے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

''ارے حور بیٹا! ادھر آؤ۔''بڑے صوفے پر بیٹھی چھوٹی تائی نے، ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس، گود میں اپنے روتے، چڑچڑے ہوتے بیٹے کو اٹھائی پھرتی حور عین کو بلایا۔

''جی تائی!''وہ کمر پر لٹکے بیٹے کو کس کر پکڑتی اُنکے پاس آئی۔

''یہ لو بیٹا تمہاری عیدی۔''اُنہوں نے لفافہ اُسکی جانب بڑھایا۔''اور یہ حسین کہاں ہے؟''لفافہ اُسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

''شکریہ تائی! حسین تو کہیں مردوں میں بیٹھا ہو گا، آپ ایسا کریں۔اُسکی عیدی بھی مجھے ہی دے دیں۔''اُس نے بڑے ادب سے کہا تو تائی نے حسین کا لفافہ بھی اُسے دے دیا۔لفافہ لیکر اُس نے باقی سب لوگوں کی جانب رخ کیا۔

''باقی لوگ بھی حسین کی عیدی مجھے دے دیں۔''وہ اعلانیہ انداز میں کہتی پلٹی ہی تھی کہ پیچھے سینے پر ہاتھ باندھے، سنجیدگی سے گھورتے حسین کو کھڑا پایا۔

''ارے! تم یہیں تھے۔''اُس نے دانت نکالے۔باقی سب ہنسنے لگے۔

''اِدھر دو میری عیدی!''اُس نے سنجیدگی سے ہاتھ آگے کیے۔

''تم کہاں رکھتے پھروگے اتنے لفافے ؟میں پرس میں رکھ لیتی ہوں نا!گھر جا کر تمہیں بحفاظت دے دوں گی۔''اُس نے معصومیت سے کہا۔

''تاریخ گواہ ہے کہ جو شے تمہارے ہاتھ لگ جائے وہ کبھی بحفاظت مجھ تک نہیں پہنچتی،اور میرے پاس رکھنے کے لیے جیبیں ہیں نا!تم ہر گز پریشان نہ ہو۔''حسین نے اُسکی ساری چالاکی پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔

''لو!''اُس نے منہ بسورتے ہوئے لفافہ واپس کیا۔''تمہارا بھلا ہی سوچ رہی تھی۔''اُس نے جتایا۔

''چالاک عورت۔۔۔''اُس نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

''تمام افراد متوجہ ہوں۔''پھر وہ یکدم ہی باآواز بلند بولا تو دوسرے کمروں میں موجود لوگوں نے بھی مڑ کر دیکھا۔

''کوئی بھی مظلوم، معصوم اور شریف انسان اپنی شرافت کی وجہ سے میری عیدی (ہاتھ سے حورعین کی جانب اشارہ کیا)اِس خاتون کو ہر گز نہ دے۔اگر میں موجود نہ ہوں،تو میرا انتظار کریں،لیکن اِسکو نہ دیں ورنہ آپکی امانت مجھ تک کبھی نہیں پہنچے گی،اور آپکی عیدی قبول بھی نہیں ہو گی۔''اُس نے خاصی سنجیدگی سے کہا تھا۔گھر میں موجود تمام افراد ہنس رہے تھے۔

''ہیں؟عیدی ہے کہ زکوٰۃ جو قبول نہیں ہو گی؟''کسی نے لقمہ دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے،پر میرے بچوں کی عیدی کہاں ہے حسین؟''اُسکے بڑے بھائی نے پوچھا۔

''پہلے میرے بچوں کے عیدی دیجئے!''اُس نے بڑے ہی ادب سے جواب دیا۔

''بچوں کی عیدی مجھے دی جائے گی۔''حورعین نے پہلے ہی اعلان کر دیا۔

''ایک کام کرتا ہوں،جو عیدی تم نے میرے بچوں کو دینی ہے،وہ تم رکھ لو اور میری طرف سے اپنے بچوں کو دے دو۔اور میں تمہارے بچوں والی،اپنے بچوں کو دے دیتا ہوں۔''اُسکے بھائی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اِس طرح تو بڑے بھیّا کا نقصان ہو گیا،کیونکہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی تو انہی کے بچے ہیں سارے۔''کسی نے جملہ کسا تو وہاں قہقہہ پڑا۔بڑے بھائی کے آدھا درجن بچوں پر چوٹ کی گئی تھی۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے آج عید کا دن گزرنا تھا،لیکن اِس ہنسی مذاق کے دوران لمحوں کے لیے حسین کی نظریں حورعین پر گئیں۔اُسکی گود میں اب حوریہ تھی، جبکہ بیٹا اُسکے قدموں سے لپٹا کھڑا تھا۔وہ ہنستے ہوئے کسی سے بات کر رہی رہی۔دونوں گالوں پر پڑنے والے گڑھے واضح تھے۔

حسین کی ساری مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

ایف آئی اے کی آخری بریفنگ۔۔۔۔

پلان بی۔۔۔۔

اور وہ پراسرار قاتل۔۔۔۔

ہر شے گڈمڈ ہونے لگی تھی۔۔۔

---------+---------+--------

رضا بچوں میں عیدی بانٹ رہا تھا۔ چھوٹوں کو اُس نے عیدی کی جگہ تحفے دیئے تھے۔ جبکہ بڑوں کو اُس نے اجازت دی ہوئی تھی کہ وہ عیدی سے جو چاہے خریدیں۔ ابھی بھی وہ سب کو عیدی بانٹ کر فارغ ہوا تھا کہ دروازے سے داخل ہوتی جزا پر نظریں پڑیں۔

''عید مبارک!'' اُس نے وہیں آتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''خیر مبارک!'' اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''تم نے کل میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے نا! میں ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔'' اُس نے جتاتے ہوئے کہا پھر اُسے ہکا بکا چھوڑ کر بچوں کے پاس آ گئی۔

سب سے پہلے اُس نے ننھے محمد کو گلے لگایا، ابھی اُسے خود سے الگ بھی نہ کیا تھا کہ ولید چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا آیا اور اُسکے گلے لگا، پھر اُسکی دیکھا دیکھی، ارمینہ، رمشا اور دیگر چھوٹے بچے، اُس سے لپٹتے گئے یہاں تک کہ وہ ہنستے ہنستے فرش پر پوری بیٹھ گئی۔ منظر پیارا تھا لیکن رضا ایک بار پھر نظریں چراتے ہوئے باہر آ گیا۔ سر میں درد اُٹھنے لگا، سگریٹ پینے کا شدت سے دل چاہ رہا تھا لیکن پناہ گاہ میں وہ اِس شے سے پرہیز کرتا تھا۔

''تمہیں نظریں چرانے کا کوئی نیا مرض لاحق ہوا ہے؟'' سر تھامے کھڑے رضا کو اپنے پیچھے آواز سنائی دی تو پلٹا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے، کڑے تیوروں کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی۔ ناک میں پہنی لونگ صبح کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

''میں کیوں نظریں چُراؤں گا؟ بلکہ۔۔۔'' وہ رکا۔

''بلکہ؟'' اُس نے بھنویں اچکائیں۔

''اب تو تمہیں سب پتہ چل ہی گیا ہو گا میرے بارے میں۔ یقیناً اسی لیے تم کل مجھ سے کوئی بھی بات کیے بنا چلی گئی۔'' وہ اُداسی سے مسکرایا۔ اِس الزام پر تو وہ بھونچکا رہ گئی۔

''تم نے ہی تو کہا تھا جانے کو؟'' وہ حیران ہوئی۔

''میں نے کہا تھا تو ضروری تو نہ تھا کہ تم چلی ہی جاتی۔ پر شاید تم اب مجھ سے۔۔۔۔'' وہ مزید کچھ کہہ رہا تھا۔

''یہ خالصتاً زنانہ ڈائیلاگ ہیں رضاالٰہی!'' وہ سنجیدگی سے بولی تو اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب۔۔۔''

''بھاڑ میں گیا تمہارا مطلب، تم نے کہا جاؤ تو میں چلی گئی۔ دو روز تمہارے انتظار میں پناہ گاہ کا خیال رکھا، اُسکے جواب میں کوئی تشکر آمیز جملہ کہنے کی بجائے، تم نے مجھ سے کہا جاؤ۔ واقعی؟'' وہ شکوے کے سے انداز میں پوچھنے لگی تو اُسے شرمندگی ہوئی۔

''اور اُس پر سے مجھے ہی کہہ رہے ہو کہ میں تمہارے بارے میں یہ سوچوں گی، اور وہ سوچوں گی۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔ یہ فریحہ کیوں اِس طرف آرہی ہے؟'' بات کرتے کرتے اُس نے یکدم ہی ناگواری سے کہا تو رضا نے حیرت سے دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے وہ داخل ہوتی نظر آرہی تھی۔

''وہ ولید کو لینے آئی ہو گی۔'' رضا نے وضاحت دی۔

''تو ولید تو اندر رہی ہے، یہ ہماری طرف کیوں آرہی ہے؟''

''مجھ سے ملنے آرہی ہو گی۔''

''کیوں؟ اُسے نظر نہیں آرہا کہ میں تم سے بات کر رہی ہوں؟ کوئی اخلاقیات نہیں ہے اُس کے اندر؟'' اُسکے دھونس بھرے انداز پر رضا نے مُسکراہٹ ضبط کی۔ اتنی دیر میں فریحہ بھی وہاں پہنچ گئی۔

''عید مبارک رضا!'' قریب آکر خوش دلی سے کہا۔

''عید مبارک! اِن سے ملو، یہ جزا ہیں۔ ولید کی ٹیچر!'' اُس نے فوراً تعارف کروایا۔

''اوہ! تو آپ ہیں۔ رضا بہت تعریف کرتا ہے آپ کی۔'' اُس نے کہا تو جزا زبردستی مسکرائی۔

''ولید اندر ہے فریحہ!'' رضا نے کہا۔

''ہاں! لیکن مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے پہلے'' اُس نے جواب دیا۔

''میں ابھی جزا سے کچھ ضروری بات کر رہا ہوں۔ تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔''اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ فوراً اثبات میں سر ہلاتی اندر چلی گئی۔ جزا کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آئی ایم سوری! میں سمجھا کہ تم اب میرے بارے میں اچھا نہیں سوچتی ہو گی۔''اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

''اپنے چھوٹے سے دماغ پر اتنا زور مت دیا کرو۔''اُس نے ناراضگی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''اچھا! میرا ایک کام کر دو گے؟''جزا نے یکدم ہی یاد آنے پر پوچھا۔

''آپ حکم کریں۔''وہ فرمانبرداری سے بولا تو جزا نے اپنے پرس کے اندر سے ایک لفافہ باہر نکالا۔

''کیا عیدی دے رہی ہو؟''اُس نے شرارت سے پوچھا۔

''بالکل نہیں!''اُس نے آنکھیں دکھاتے کہا۔''یہ خط پوسٹ کروا دو گے؟''اُس نے لفافہ رضا کی جانب بڑھایا۔

''اب کہ دور میں کون خط لکھتا ہے؟''اُس حیران ہوتے لفافہ تھاما۔

''میں لکھتی ہوں۔ ویسے میں خود ہی پوسٹ کر دیتی پر بھائی نے غیر ضروری باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔''بھائی کی فرمانبردار بہن نے جھوٹ بولا۔

''تو اپنے بھائی سے ہی کہتی پوسٹ کرنے کو۔''اُس نے ازراہِ مذاق کہا۔

''نہیں کرنا تو منع کر دو۔''اُس نے برا مانتے ہوئے کہا۔ اب بھائی کے ہاتھ خط لگتا تو پوسٹ مارٹم ہونے سے قبل کبھی خط ارسال نہ ہوتا۔

''مذاق کر رہا ہوں۔''

''اچھا سنو! ایک بات تو بتاؤ۔''جزا نے یکدم ہی سنجیدہ ہوتے رازداری سے کہا۔

''پوچھو!''رضا نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھتے ہوئے تابع داری سے کہا۔

''یہ تم میرے بھائی کے پرانے دوست ہو؟ ہیں نا؟''اُس نے آنکھیں چھوٹی کرتے ہوئے پوچھا تو رضا حیران ہوا۔

''تمہیں کس نے کہا؟''اُس نے پوچھا۔

''بھائی نے خود بتایا۔''

''جھوٹ مت بولو!''رضا کو یقین نہ آیا۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گی؟ میسیج دیکھو بھائی کا۔''اُس نے فوراً موبائل کھول کر نوید کا میسیج اُسکے سامنے کیا۔

رضا میرا پرانا دوست ہے۔تم سے زیادہ مجھے اُسکی فکر ہے۔

میسیج پڑھ کر رضا کے چہرے پر ایک اُداس سی مسکان نمودار ہوئی۔

''آ گیا یقین؟''اُس نے موبائل اُسکے ہاتھ سے واپس لیا۔''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم بھائی کو جانتے ہو۔''ایسے کہا جیسے دیکھا! پکڑی گئی ناچوری؟

''وہ سب چھوڑو! یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے بھائی کو ایسا کیا کہا جو وہ تم سے کہہ رہا تھا کہ اُسے تم سے زیادہ میری فکر ہے؟''رضا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ گڑبڑائی۔

''بات مت بدلو! کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے کہ تم بھائی کے دوست ہو؟''اُلٹا اُسی پر چڑھائی کی۔

''ہم یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔پھر کام کے سلسلوں میں الگ ہوئے تو لمبے عرصے تک ملاقات نہ ہوئی۔بس اُسی روز دوبارہ ملا مجھے، جس روز تمہیں پولیس والوں سے بچانے آیا تھا۔''اُس نے آدھا ادھورا سچ بتایا۔

''اور وہ باقی سارے لوگ؟جو تمہیں ڈھونڈتے یہاں تک آئے تھے؟اُن میں سے ایک تو نشمیہ کے فادر (والد) تھے؟''

''ہاں! وہ سب بھی، یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔''

''کیا مطلب ساتھ پڑھتے تھے؟وہ تو کہہ رہے تھے کہ تم پرانے دوست ہو؟اور مزید یہ کہ کام کے سلسلے میں کوئی دوستوں سے الگ نہیں ہوتا۔سچ سچ بتاؤ! کیا کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا تھا تم سب کا بھائی سے؟''وہ کریدنے کے چکروں میں تھی۔

''ایک کام کیوں نہیں کرتیں آپ جزائے خیر؟اپنے بھائی سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟''اُس نے بڑے ادب سے کہا تو جزا کو آگ ہی لگ گئی۔

''تم بتا دو گے تو کیا ہو جائے گا؟''وہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔

''وہ میرے دوست کا راز ہے، تمہیں کیوں بتاؤں؟''رضا نے اُسے، اُسی کا کبھی کا کہا گیا جملہ لوٹایا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''اب میں جا رہا ہوں، فریحہ انتظار کر رہی ہو گی۔''وہ مسکراہٹ ضبط کرتے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!''اُس نے سلگ کر کہا تھا۔

بھلا اب کیسے معلوم ہو گا اُسے کہ نوید اور رضا آپس میں دوست کیسے ہیں؟

---------+---------+--------

چنے سے قد کے ساتھ کھڑی وہ چھوٹی سی چوزی اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔اُسکی ماں آج اُسے کسی شہزادی سے کم نہ لگ رہی تھی۔

''امی!آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ میں کیا بتاؤں؟''نشمیہ نے اپنے مخصوص انداز میں آئینے کے سامنے کھڑی، سلیقے سے اپنا دوپٹہ سر پر جماتی فاطمہ کو دیکھ کر تعریف کی۔

''پر میں نشمیہ سے زیادہ پیاری نہیں لگ رہی۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔وہ احمد کا لایا ہوا سوٹ ہی پہنی ہوئی تھی، جو اُس پر خوب جچ رہا تھا۔ ہلکے پھلکے میک اپ کے بعد بھی آنکھوں کے نیچے حلقے اب بھی واضح تھے۔ہاتھوں میں احمد کی خواہش پر تھوڑی سی مہندی بھی لگوائی تھی۔اتنی سادگی کے باوجود بھی وہ احمد اور نشمیہ کو دنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگ رہی تھی۔

''امی!آپ اب کبھی نہیں روئیں گی نا؟''نشمیہ نے اسکے گھٹنوں سے لگتے یکدم ہی سوال کیا تو وہ ساکت رہ گئی۔یہ کیا پوچھا تھا اُس نے؟

''میں کیوں روؤں گی؟''اُس نے نشمیہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مت رویا کریں، ورنہ مجھے بھی رونا آتا ہے۔''اُس نے روہانسی لہجے میں کہا تو فاطمہ دھک سے رہ گئی۔وہ سمجھتی تھی کہ وہ اکیلے راتوں کو روتی ہے تو نشمیہ سو رہی ہوتی ہو گی، مگر اِس انکشاف پر اُسکا دل دکھا تھا۔

''اب امی کبھی نہیں روئیں گی، کیونکہ میں امی کے پاس ہوں۔''اِس آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا تو احمد مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

''ہاں! بالکل۔۔۔''فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور بازو وا کیے تو احمد بھی اُسکے ساتھ آ لگا۔اُسکی دنیا مکمل تھی۔

''امی مجھے نیچے اُتاریں۔جلدی!''یکدم ہی نشمیہ نے شور مچایا۔

''کیا ہوا؟''وہ گھبرا گئی۔

''اتاریں نا!''فاطمہ نے اُسے فوراً نیچے اتارا تو وہ اپنا دوپٹہ گلے میں پیچھے ڈالتے ہوئے، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اپنے سے لمبے بھائی کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''بھائی میری عیدی دو۔''فوراً فرمائش کی۔

''ہیں؟''وہ بیچارہ تو اِس مطالبے پر حیران رہ گیا۔فاطمہ ہنسنے لگی۔

''میں کہاں سے دوں؟''اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''جیب سے دو۔''خاصی عقلمند تھی نشمیہ!

''میری جیب میں عیدی نہیں ہے۔''اُسکی بہن نے جب سے اُسکی زندگی میں قدم رنجافرمائے تھے،تب سے ہی اُس بیچارے کا ایسے ہی جینا حرام کیا ہوا تھا۔

''جیب میں ہوتی ہے۔''اُس کے باپ کی جیب میں عیدی تھی،دادا کی جیب میں بھی عیدی تھی تواُسکے بھائی کی جیب میں بھی ہونی چاہیے۔ہر حال میں!

''میری جیب میں نہیں ہے۔''

''بھائی!تم اتنے بڑے ہو؟تمہاری جیب میں عیدی نہیں ہے؟''اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں بڑا نہیں ہوں۔''احمد نے تڑپ کر اُسکو دیکھا۔

''پر تم مجھ سے بڑے ہو۔''نشمیہ سے کون جیت سکتا تھا؟

''یہ لو احمد!نشمیہ کو دے دو۔''پیچھے سے فاطمہ نے چند سو کے نوٹ احمد کو تھماتے اُسکی مشکل آسان کی تواُس نے تشکّر آمیز نظروں سے پہلے ماں کو دیکھا،پھر نوٹوں کو۔

''پر یہ تو اتنے پیسے گم کر دے گی۔''اُسے بہن کی فکر ہوئی۔

''نہیں!میں بابا کو دے دوں گی۔''اُس نے سمجھداری سے کہا تو احمد نے عیدی اُسکے حوالے کی۔

''تم تیار ہو بیٹا؟''اسی لمحے سفیر صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جی ابّا!''فاطمہ نے ادب سے جواب دیا۔

''بیٹا!میں چاہتا تھا کہ تمہاری طرف سے ولی،شہیر(فاطمہ کا باپ)خود ہو۔میں نے اُسے رات کو کافی کالز کی تھیں،پھر میسیج بھی چھوڑا کہ وہ فارغ ہو کر دیکھ لے۔پر نہ اُس نے میسیج کا جواب دیا نہ پلٹ کر کال کی۔''اُنہوں نے بتایا تو فاطمہ کا دل اور اداس ہوا۔

''وہ مجھ سے ناراض ہیں۔''اس نے آہستگی سے کہا۔

''پر بیٹا تم تو ایک سال سے اُسکے ساتھ ہی رہ رہی تھی نہ؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''ہاں!وہ اجازت بس نشمیہ کی وجہ سے تھی،پر اُنہوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''چلو تم اُداس نہ ہو۔ میں آج تمہارا ولی ہوں۔ ایک نہ ایک دن شہیر بھی تمہیں معاف کر دے گا۔'' اُنہوں نے امید دلاتے لہجے میں کہا تو وہ بس مسکرا ہی سکی۔

''میں تھوڑی دیر میں تمہاری رضامندی لینے اور نکاح نامے پر سائن کروانے آؤں گا۔ ٹھیک ہے!'' اُنہوں نے بتایا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''احمد! تم بابا کے پاس نہیں جاؤ گے؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''نہیں! میں امی کے ساتھ ہی رہوں گا۔'' اُس نے آرام سے کہا۔

''میں جا رہی ہوں بابا کے پاس۔'' اُنکے کچھ بھی کہنے سے قبل نشمیہ اعلان کرتی ہوئی بھاگ نکلی۔

''نشمی! سیڑھیوں پر آہستہ سے چلنا۔'' پیچھے سے فاطمہ نے تلقین کی تھی۔ ماں کی تلقین سن کر اُس نے قدم آہستہ کیے، پھر آرام آرام سے سیڑھیاں اترتی نیچے آنے لگی۔ لاؤنج میں علی، عمر سے عید مل رہا تھا۔ اُنکے خاندان کے کچھ قریبی لوگ بھی موجود تھے۔ کچھ بچے مگوئیاں بھی چل رہی تھیں، پر علی کو مطلق پروانہ تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم آئے۔'' علی نے عمر سے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے بلایا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بابا! میں تھک گئی۔'' آدھی سیڑھیوں پر کھڑی نشمیہ نے باآواز بلند پکارا تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

''اتنی سی سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہی تم تھک گئی؟'' اُس نے وہیں سے پوچھا۔

''میں چھوٹی ہوں نا!'' اُس نے اپنا مسئلہ بیان کیا تو عمر ہنسا۔ علی جا کر اُسے گود میں اٹھا کر لے آیا۔

''عید مبارک انکل!'' نشمیہ نے عمر کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔

''عید مبارک! کیسی ہو نشمیہ؟'' عمر نے پیار سے پوچھا۔

''میں اچھی ہوں۔'' اُس نے زور و شور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو تم بالکل ہو۔'' وہ ہنسا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا۔ ''یہ لو! تمہاری عیدی۔'' اُس نے لفافہ نشمیہ کی جانب بڑھایا۔

''تھنک یو!'' اُس نے لفافہ لیتے ہوئے کہا، پھر علی کی جانب بڑھایا۔

''یہ لیں بابا! یہ والا بھی آپ کا۔''اُس نے کہا۔

''اوہ! کرپشن؟''عمر نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں! یہ میں نشمیہ کو واپس کر دوں گا۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں! واپس نہیں کریں گے۔ بابا نے کہا ہے کہ میں ساری عیدی بابا کو دے دوں۔ پھر وہ مجھے ڈول ہاؤس لا کر دیں گے۔''اُس نے فوراً باپ کا راز فاش کیا۔

''نشمی! ایک بات تو بتاؤ۔''علی نے اُسے گود سے اتارتے ہوئے صوفے پر بٹھایا، اور خود اُسکے سامنے بیٹھا۔ عمر بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''تمہارے پاس زبان کتنی ہے؟''علی نے اُس سے پوچھا۔

''ون (ایک)!''اُس نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے بتایا۔

''اور کان کتنے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''ٹو (دو)!''اب کہ دوسری انگلی بھی اُٹھا دی۔

''کبھی تم نے سوچا ہے کہ تمہارے پاس ہر چیز دو ہیں، یعنی دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، دو ہونٹ، دو نوسٹریلس (نتھنے) لیکن زبان ایک ہی ہے؟ کیوں؟''علی نے پوچھا۔

''کیوں؟''اُسے بھلا کیوں معلوم ہو گا؟

''جو چیز ہمارے پاس زیادہ ہوتی ہے نا، ہم اُسکا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ پر جو چیزیں ہمارے پاس کم ہوتی ہیں، اُسکا استعمال کم کرتے ہیں تاکہ وہ جلدی ختم نہ ہوں۔ تو تمہارے پاس کان دو اِس لیے ہیں تاکہ تم کانوں کا استعمال زیادہ کرو، اور زبان ایک اِس لیے ہے تاکہ زبان کا استعمال کم کرو۔ تو تم سنو زیادہ اور بولو کم۔''اُس نے پوری سنجیدگی، اور خاموشی کے ساتھ اپنے باپ کا لیکچر سنا۔ عمر دلچسپی سے اُسکے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''ہاں پر میری زبان میرے دونوں کانوں سے زیادہ بڑی ہے۔''معصومیت سے دیئے گئے اِس جواب پر جہاں علی بھونچکا رہ گیا تھا، وہیں عمر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''کہیں سے لگتا ہے کہ یہ میری اولاد ہے؟''علی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ نشمیہ لطیفہ سنانے کے بعد ایسے ہنس رہی تھی جیسے اُسے بڑا سمجھ آیا ہو کہ اُس نے کیا بولا ہے؟ پر جب عمر ہنس رہا تھا تو اُسکا ہنسنا بھی بنتا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب نوید آتا دکھائی دیا۔ سفید شلوار کرتے میں، سیاہ پشاوری سینڈل پہنے، سر مئی و سیاہ بالوں کو سلیقے سے سیٹ کیے، وہ ابھی دروازے سے داخل ہی ہو رہا تھا کہ عمر کے منہ سے بیساختہ ماشاءاللہ نکلا۔ اُسکی آواز صرف علی ہی سن سکا تھا۔ نوید آگے آنے کے بجائے دروازے پر ہی رک گیا، اب وہ سفیر صاحب سے سلام دعا کر رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے حسین یہاں ہوتا تو کیا کہتا؟'' علی نے نوید کو نظروں میں رکھتے ہوئے، عمر سے پوچھا۔

''وہ کہتا کہ ایس ایس پی صاحب فضول میں پولیس کی نوکری میں وقت برباد کر رہے ہیں، انکو تو ماڈلنگ کرنی چاہیے۔'' عمر نے جواب دیا تو دونوں دل کھول کر ہنسے۔ اُنکے ہنسنے پر نوید نے دور سے بھنویں اُچکا کر سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ اُسکے لمبے قد، کسرتی جسامت پر سفید شلوار کرتا جچ رہا تھا، چہرے پر چھائی بلا کی سنجیدگی کے باوجود، لاؤنج میں کھڑے ہر شخص نے چہرہ موڑ موڑ کر اُسے دیکھا ضرور تھا۔ نظر نہ لگے ایس ایس پی صاحب کو، ماشاءاللہ!

سفیر صاحب سے مل کر وہ اُن دونوں کے پاس آیا۔

''السلام علیکم!'' اُس نے دونوں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! عید مبارک نوید!'' عمر نے کھڑے ہو کر اُسے گلے لگایا۔ اُسکے بعد علی بھی اُس سے عید ملا۔

''عید مبارک!'' نوید کے چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔ کچھ دیر بعد نکاح کی کارروائی کے لیے تمام لوگ جمع ہوئے تو نشمیہ نے رونا ڈال دیا کہ وہ علی کے ساتھ ہی بیٹھے گی۔

''تم میرے ساتھ آجاؤ نشمیہ!'' عمر کی پیشکش تو وہ فوراً قبول کرتی تھی۔ آخر کو وہ اُسکی گڈ بک میں جو تھا۔ فوراً اُسکے پاس آگئی تو عمر نے جگہ کی کمی کے باعث اُسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

''آپ بہت سوئیٹ ہیں۔'' اُس نے تعریف کرنا ضروری سمجھا تو وہ ہنسا۔

''آہ! کاش کہ کبھی میں بھی اپنے لیے یہ جملہ سن لوں۔'' ساتھ بیٹھے علی کے کان اِدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ سو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا ضروری سمجھا۔

سفیر صاحب فاطمہ کی رضامندی لے آئے تھے۔ احمد کسی سمجھدار بڑے کی طرح تمام وقت فاطمہ کا بایاں ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ جب رضامندی دینے کے بعد فاطمہ کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہوئے تو اُس نے انہیں اپنے ہاتھوں سے پونچھا تھا۔

''مت روئے امی! اب آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔'' وہ ماں کو معصومیت سے تسلی دے رہا تھا۔ کتنا سمجھدار تھا نہ وہ؟ فاطمہ نے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

دوسری جانب دورانِ نکاح، نشمیہ مستقل عمر کا سر کھاتی رہی تھی اُسے ہر بات، اور ہر عمل کا مطلب جاننا ضروری تھا۔ عمر بھی بناماتھے پر شکن لائے اُسے آہستہ آواز میں بچوں کی طرح سمجھاتا رہا تھا۔ علی گاہے بگاہے ایک آدھ نظر اُن دونوں پر ڈال لیتا۔ خطبے کے دوران بھی عمر نے اُسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کے انداز میں اُٹھا لیے۔

''اب تم دعا مانگو۔ مگر آہستہ آواز میں۔''عمر نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''کیا ڈول ہاؤس مانگوں؟''ایک تو یہ ڈول ہاؤس کی دیوانی!

''جو دل چاہے مانگو۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ علی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

کیوں؟ وہ (عمر کی بیٹی) تمہارے ساتھ نہیں رہتی؟

نہیں! اُسکی ماں اُسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔

وہ عمر کے چہرے پر موجود ایک تڑپتے باپ کا انتظار دیکھ سکتا تھا۔ گواہان تو اور بھی ہو سکتے تھے، پر اُس نے عمر کو بلایا ہی اِس لئے تھا تاکہ وہ نشمیہ سے مل سکے۔ جب سے اُس نے بتایا تھا کہ نشمیہ کو دیکھ کر اُسے اپنی بیٹی یاد آتی ہے۔ تب سے اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نشمیہ کو عمر سے ملواتا رہے گا۔

لیکن۔۔۔

وہاں ایک ہی تڑپتا باپ نہیں تھا۔۔۔

کوئی اور بھی تھا، جسکا چہرہ تو سنجیدہ تھا۔۔۔

پر آنکھوں میں چھائی باپ کی شفقت صرف نشمیہ کے لیے تھیں۔۔۔۔

وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

کچھ محبت سے۔۔۔۔

کچھ حسرت سے۔۔۔۔

نوید عالم بھی تو ایک باپ تھا۔۔۔

---------+---------+--------

دن ہفتوں میں، اور ہفتے مہینوں میں کیسے بدلتے ہیں؟ کبھی کبھار پتہ بھی نہیں چلتا۔

عید گزرے ڈیڑھ ہفتہ ہونے والا تھا۔ چاند آج پوری آب وتاب سے روشن تھا۔ آفس کی عمارت کے احاطے میں بنے باغ میں بیٹھا اے ایس پی شیراز، گھٹنوں پر گٹار رکھے، دونوں بازو اُسی پر ٹکائے، چاند کو دیکھ رہا تھا۔ دل عجیب اُداس سا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر گٹار کی تاریں چھیڑیں تو فضا میں خوبصورت سا ساز بکھیر گیا۔

ہاتھوں میں چائے کی ڈسپوزیبل پیالی پکڑے، عمارت کی کھلی راہداری سے گزرتا نوید عالم اِس دھن پر ٹھٹک کر رکا۔ دھن بجانے والا رک چکا تھا، پر نوید عالم کی نگاہوں نے عمارت کی کھلی راہداری میں کھڑے کھڑے ہی اُسے تلاشا تھا۔ اور پھر وہ اُسے باغ کے کسی کونے میں بیٹھ کر گٹار کو پر سوچ نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔ نوید نے گہری سانس لیکر ستون سے ٹیک لگائی اور چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے اُسے دیکھنے لگا۔

''ہمم م م م۔۔۔'' اُس نے ایک مرتبہ پھر گٹار پر دھن چھیڑی اور اِس مرتبہ ساتھ میں خود بھی گنگنانے کی کوشش کی۔ پر دھن ساز کو اپنی دھن پسند نہ آئی تو دوبارہ رک گیا۔

''اِسکو کونسے دورے پڑے ہیں اب؟'' نوید بڑبڑایا۔

''عشق ہوا ہے تازہ تازہ!'' جواب برابر سے آیا تو اُس نے چونک کر دیکھا۔ اے ایس پی فیصل وہیں کھڑا تھا۔

''تم واپس کب آئے؟'' پچھلے ایک ماہ سے وہ ٹانگ ٹوٹنے کے باعث چھٹی پر تھا۔ لہٰذا اب اُسے سامنے دیکھ کر نوید کا حیران ہونا بنتا تھا۔

''آج ہی سے دوبارہ جوائن کیا ہے۔'' فیصل نے مُسکراتے ہوئے کہا تو اُس نے بغور اُسے دیکھا، پھر اپنی چائی کی پیالی اُسکی طرف بڑھائی۔

''اسے پکڑو ذرا!'' اُس نے کہا تو فیصل نے پیالی تھامی۔

''اِس میں موجود چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں گرنا چاہیے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا، اِس سے پہلے کہ فیصل اِس مطالبے کو سمجھ پاتا، نوید نے اُسکا بایاں بازو پکڑا اور موڑ کر اُسکی پیٹھ کے پیچھے لا جکڑا۔

''آہ۔۔۔'' اِس اچانک افتاد پر فیصل کی چیخ نکلی۔

''چائے نہیں گرنی چاہیے میری!'' نوید نے حکم دیا تو بیچارے نے کراہتے ہوئے دائیں ہاتھ میں تھامی پیالی کو سنبھالا۔

''سر! میں نے کیا کیا ہے آخر؟'' وہ منمنایا۔

''ٹانگ ٹوٹنے کا تو بہانہ تھا، ایک مہینے سے میری جاسوسی کر رہے تھے؟ تمہیں کیا لگا میں گدھا ہوں جو مجھے معلوم نہیں ہو گا؟''نوید نے اُسکا ہاتھ کچھ اور مروڑتے ہوئے پوچھا۔

''آہ سر۔۔۔اللہ کی قسم میری ٹانگ ٹوٹی تھی، جاسوسی تو بس ایک ہفتے ہی کی تھی۔''اُس نے کراہتے ہوئے وضاحت دی۔راہداری سے گزرتے دیگر عملے نے یا تو مسکرا کر دیکھا تھا، یا نظر انداز ہی کیا تھا۔

''ایک ہفتے بھی کیوں کی؟''نوید چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔

''سر! آپکے بھائی نے کہا تھا۔''اُس نے بلآخر سچ اگل دیا تو نوید نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔وہ بازو جھٹکتے پیچھے ہوا۔

''چائے دو!''نوید نے حکم دیا تو اُس نے پیالی اُسکے حوالے کی۔

''اتنی بری جاسوسی؟ مجھ سمیت شیراز کو بھی پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا۔اس طرح کرتے ہو تم دشمنوں کی جاسوسی؟''نوید نے گھرکا۔

''آپ میرے دشمن نہیں ہے نا!''اُس نے بازو سہلاتے ہوئے وضاحت دی۔اُسی لمحے، دور، اِس تمام کارروائی سے انجان بیٹھے شیراز کی مترنم آواز فضا میں بلند ہوئی تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔وہ کوئی بالی ووڈ کا گانا گا رہا تھا۔

''لگتا ہے اِسکی عقل بھی ٹھکانے لگانی پڑے گی۔''نوید نے تاسف سے کہتے کاریڈور سے اتر کر باغ کی گھاس پر قدم رکھے۔باغ میں بیٹھا شیراز گٹار کی دھن پر ترنم کے ساتھ گا رہا تھا۔

ذرا کبھی میری نظر سے خود کو دیکھ بھی

اپنے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی فاطمہ آنکھوں میں تشکّر آمیز جذبات لیے علی کو دیکھ رہی تھی، جو ہر شے سے انجان ابھی ابھی اُسکے کمرے میں آیا تھا تاکہ اُسکی دوائیں وغیرہ رکھ سکے۔

اُسکی ہزار کوتاہیوں، خطاؤں اور غلطیوں کے باوجود، علی سفیر نے ماضی کا ایک لفظ بھی نہ دہرایا تھا۔وہ باقاعدگی سے اُسکا علاج کروا رہا تھا۔احمد، فاطمہ کے ساتھ ہی رہتا تھا، علی روز آفس سے آکر ایک چکر اُسکے کمرے کا لگاتا، احمد سے پوچھتا کہ اُسکی ماں نے اپنے کھانے پینے اور دواؤں کا خیال رکھا؟ وہ سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دیتا تو علی مطمئن ہو کر واپس چلا جاتا۔فاطمہ کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔اب وہ لوگ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، ایک ہی میز پر، ایک خاندان کی طرح۔اور فاطمہ کو یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی، کہ اِس میں کہیں نہ کہیں علی کی اعلیٰ ظرفی بھی شامل تھی۔

ہے چاند میں بھی داغ پر، نہ تجھ میں ایک بھی

چاند کو بغور دیکھتا شیراز ارد گرد سے بے نیاز گا رہا تھا۔ نوید قدم قدم اٹھاتے اُسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اپنے گھر میں، اسٹڈی روم کی میز صاف کرتی نوید کی بیوی، میز پر رکھی اُسی کی تصویر کو ہاتھ میں لیے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساری دنیا نے اُسے چھوڑ دیا، پر اس شخص نے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ذہنی مریضہ بن چکی تھی، پاگل ہو چکی تھی۔ پر نوید نے اُسے تب بھی نہ چھوڑا، اُسے احساس بھی نہ ہونے دیا۔ اُس نے اپنی وفاداری کا پورا پورا ثبوت دیا تھا۔ اُس نے ہر قدم اُسے سہارا دیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی نوید نے اُسے ایک سماجی ادارے میں سماجی کارکن کے طور پر بھرتی کروا دیا تھا۔ وہ وہاں چھوٹے چھوٹے یتیم اور بے سہارا بچوں کے ساتھ دن کے کچھ گھنٹے گزارتی تھی۔ اُسکی صحت پر بہت اچھا اثر پڑ رہا تھا۔ اُسے یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی کہ اسکا شوہر ایک اعلیٰ ظرف انسان تھا۔

خود پے حق میرا، تیرا حوالے کر دیا۔

شیراز گانا ختم کرنے ہی والا تھا کہ کوئی اُسکے سر پر کھڑا ہو کر زور سے کھنکارا تھا۔ وہ یہ آواز بہت اچھے سے پہچانتا تھا لہٰذا گانا ختم کرنے سے پہلے ہی اِس بری طرح ہڑبڑایا کہ گٹار گرتے گرتے بچا۔

''سر آپ؟'' وہ جلدی سے گٹار تھامے کھڑا ہوا۔

''مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تم اتنا اچھا گاتے ہو؟'' نوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس مسکراہٹ سے شیراز بخوبی آگاہ تھا، فوراً تھوک نگلا۔

''بس سر! ایسے ہی وقت گزارنے کے لیے۔۔۔'' اُس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

''ڈیوٹی آورز (کام کے اوقات) کے دوران اے ایس پی شیراز وقت گزرای کیا کرتے ہیں۔ واہ!'' اُس نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا تو شیراز نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

''اچھا ذرا یہ تو بتاؤ! میں نے تم سے کہا تھا کہ آسیہ کھوکھر کی فائل اسٹڈی کر کے اُسکے کی پوائنٹس بناؤ، میرے لیے۔۔۔ تو کیا تم نے بنائے؟'' اب کے نوید نے سنجیدگی سے پوچھا تو شیراز کی ہوائیاں اُڑی۔

''سس۔۔۔ سر وہ میں۔۔۔ بس کرنے ہی والا تھا۔۔۔''

''ہاں! یقیناً۔۔۔ تم کرنے ہی والے تھے، لیکن سوچا پہلے تھوڑی وقت گزاری کر لوں؟ ہیں نا؟'' اب کہ شیراز نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ نوید چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر ہاتھوں میں تھامی چائے کی پیالی کو اُسکے سر پر رکھا۔

''اِس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں گرنا چاہیے۔'' اُس نے پیالی کی طرف اشارہ کر کے کہا، پھر کلائی میں بندھی گھڑی کی جانب دیکھا۔

''ڈیڑھ منٹ ہیں تمہارے پاس، ڈیڑھ منٹ کے اندر فرّخ صاحب کے کمرے میں آؤ، گٹار سمیت!''

''سر آئی ایم سوری!'' وہ منمنایا۔

''انہیں بھی تو معلوم ہو کیسے کیسے ہیرے چھپائے ہوئے ہیں انہوں نے۔'' وہ اپنی ہی کہتے آگے بڑھ گیا۔

''سر۔۔۔'' شیراز نے روکنا چاہا۔

''چائے گرنی نہیں چاہیے۔'' اُسکی آواز کانوں میں پڑی تو ہاتھ مل کر رہ گیا، دور کھڑا فیصل اُسکی دُرگت بنتے دیکھ ہنس رہا تھا۔

شیراز بخوبی جانتا تھا کہ اگر وہ ڈیڑھ منٹ میں فرّخ صاحب کے کمرے میں نہیں پہنچا تو اُسکا حال برا ہو گا، اور اگر چائے گری تو بھی۔۔۔

---------+---------+--------

ڈیڑھ ماہ اتنی تیزی سے گزرے کے معلوم ہی نہ ہوا۔ حج کا مہینہ قریب تھا۔ مقدّم نے مقدّس کے ماں باپ سے ملاقات کر کے اُنکے تمام خدشے دور کر دیئے تھے۔ وہ نہ صرف بخوشی راضی ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے اُسکی اور مقدّس کی منگنی بھی کر دی تھی۔ مقدّم نے جب یہ خبر عمر کو دی تو در حقیقت خوشی سے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں بتا نہیں سکتا کہ میں تمہارے لیے کتنا خوش ہوں؟'' عمر نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ تم ہمیشہ ہی میرے لیے خوش ہوتے ہو پر عمر۔۔۔'' مقدّم رکا۔

''کیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''تم اپنے ماں باپ کو سب سچ بتا دو۔ پلیز! اب بتا دو۔'' مقدّم نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہا۔

''تم جانتے ہو کہ جلد ہی ایف آئی اے پلان بی پر عمل درآمد کرنے والا ہے۔ کسی بھی وقت ہمیں بلا لیا جائے گا۔'' مقدّم نے کہا۔

''میں بتانا چاہتا ہوں۔ بس میرے لیے دعا کرنا۔'' اُس نے سر جھکاتے ہو کہا۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہمیشہ ہیں۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ پھر اُس سے مل کر وہ گھر کے راستے پر نکل پڑا۔ سارے راستے وہ خود کو تیار کرتا رہا، کہ وہ کس طرح اور کس وقت اپنے ماں باپ کو سچ بتائے گا؟

پر نہ کوئی سرا ہاتھ آیا، نہ کوئی حل سمجھ آیا اور نہ ہی ہمت ہو سکی۔ بلآخر گھر کے باہر گاڑی روکتے ہوئے، وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایف آئی اے کے پلان بی پر عمل درآمد سے ایک روز قبل وہ والدین کو سب سچ بتا دے گا۔

گاڑی سے اتر کر ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا کہ جیب میں موجود موبائل بجا۔ یہ مخصوص ٹون اُس نے مائیکل والے گروپ کے لیے لگائی ہوئی تھی، تاکہ کوئی بھی فوری اطلاع اُس سے رہ نہ جائے۔

جیب سے موبائل نکالا تو گروپ پر حسین کا میسیج نظر آ رہا تھا۔ وہ میسج کھولتا، موبائل پر نگاہ رکھے آگے بڑھنے لگا۔

''لوگ شادیاں کر رہے ہیں، منگنیاں کر رہے ہیں، اور ہمیں جھوٹے منہ پوچھ بھی نہیں رہے۔'' حسین کا میسیج تھا، ساتھ بیزار سا منہ بنائے، آنکھیں اوپر چڑھائے ہوئے ایموجی بھی تھا۔ میسیج پڑھ کر عمر مسکرایا، جانتا تھا کہ طنز کا نشانہ کس کس کو بنایا گیا ہے۔

''میرا معاملہ اچانک تھا۔ اس لیے معذرت!'' علی کا معذرت خواہانہ جواب موصول ہوا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رکا اور لان میں بنے چند اسٹیپس پر ہی بیٹھ گیا۔

''معذرت قبول نہیں ہے۔'' حسین کا روٹھا روٹھا سا جواب۔

''میں نے مناسب نہیں سمجھا۔'' یہ منہ چڑاتا جواب مقدّم کا تھا۔ عمر ہنسا، پھر یہی ہنسی والا ردعمل اُسکے میسیج پر بھی دے دیا۔

''نہ قبول کرو۔'' یہ مزید تپانے والا جواب، علی نے اُسکے پچھلے میسیج پر دیا تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' حسین نے لکھا اور اگلے ہی لمحے گروپ لفٹ کر دیا۔ عمر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اُس نے واقعی گروپ لفٹ کر دیا تھا۔

''اِس نے گروپ لفٹ کر دیا؟'' عمر نے میسیج ٹائپ کیا۔

''ڈرامے کر رہا ہے۔'' کافی دیر سے غائب رضا نے جواب دیا تھا۔ یعنی وہ بھی تمام میسیج پڑھ رہا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے ایک اور نوٹیفکیشن موصول ہوئی۔

"Naveed Aalam added Hussain Murtaza"

(نوید عالم نے حسین کو گروپ میں شامل کیا ہے)

عمر ہنسا، یعنی نوید بھی ساری بکواس پڑھ رہا تھا؟

''اب تم لوگ اتنی معذرت کر ہی رہے ہو تو میں قبول کرتا ہوں۔ جاؤ معاف کیا۔'' غالباً حسین کا غصّہ اُتر چکا تھا۔

''احسان کرنے کا شکریہ!'' یہ جواب علی کا تھا، جبکہ مقدّم نے فقط منہ چڑاتے ایموجی بنا کر بھیجے تھے۔

عمر مسکرایا، فضا میں دوستی کی مہک پھر سے زندہ ہونے لگی تھی۔ زندگی میں کمیاں پھر سے پوری ہونے لگی تھیں۔

ہر شے آہستہ آہستہ جگہ پر آ رہی تھی۔۔۔

یا زندگی نئے امتحان کے لیے تیار کر رہی تھی؟

---------+---------+--------

علی الصبح وہ تیار ہو کر آفس پہنچا تو اسکے انداز میں نہ کوئی عجلت تھی نہ جلد بازی۔ سکون کے ساتھ وہ اپنے کل کے ادھورے کاموں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ عمر دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا۔

''علی!'' اُس نے اپنی میز کا سامان یہاں وہاں کرتے عجلت میں اُسے پکارا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے رک کر حیرت سے دیکھا۔

''ہماری پورٹ فولیو کی فائل کہاں ہے؟'' اُس نے درازیں کھنگالتے ہوئے پوچھا۔

''سامنے ریک میں رکھی ہے۔ پر تمہیں کیا ہو گیا اچانک؟'' علی نے کہتے ہوئے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔ وہ ریک کی طرف آیا اور فائل ڈھونڈے لگا۔

''یار! صبح میری ایک جاننے والے سے بات ہوئی ہے۔ وہ اپنے آفس کا انٹیریئر کروانا چاہتے ہیں اور بس فوراً ہی آ رہے ہیں ملنے کے لیے۔'' اُس نے فائلیں ڈھونڈتے ہوئے بتایا۔

''ارے ایسے کیسے آ رہے ہیں؟ وہ بھی اچانک؟ کوئی اپائنٹمنٹ ہی نہیں لیا تو پھر میٹنگ کیسی؟'' علی کو اس اچانک افتاد کی سمجھ نہ آئی، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یار! وہ میرے توسط سے آ رہے ہیں، اُنہوں نے بہت درخواست کی اِس لیے میں نے منع نہیں کیا۔'' عمر کو مطلوبہ فائل مل گئی تو وہ اُسے کھولتے ہوئے قریب آیا۔

''پر عمر! نہ ہماری کوئی تیاری ہے؟ نہ ہمیں انکا کچھ معلوم؟'' علی کو فکر ہونے لگی۔

''تم فکر نہ کرو، میں دیکھ لوں گا۔'' اُس نے تسلی دی۔

''تو پھر خود ہی دیکھو، مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' علی نے تڑخ کر کہا تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تمہارے بغیر تو کوئی ڈیل نہیں ہو سکتی۔'' وہ جانتا تھا کہ اُسکا یہی رد عمل آنے والا ہے۔

''میرے بنا بلا چکے ہو، تو ڈیل بھی کر لو۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہتے کرسی گھسیٹی اور واپس بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ مجھے تم سے پوچھ کر، یا کم از کم تمہارے علم میں لا کر میٹنگ (مشاورت) رکھنی چاہیے تھی، پر یہ سب بہت عجلت میں ہوا اور میں اُنہیں آنے سے منع نہیں کر سکا۔'' عمر نے وضاحت دی پر علی غالباً ناراض ہو چکا تھا۔ اُسکا ناراض ہونا بنتا بھی تھا، اُس نے آج تک عمر کے علم میں لائے بنا کسی کلائنٹ کو مشاورت کے لیے نہیں بلایا تھا۔

''سر! کلائنٹ پہنچ گئے ہیں۔'' اِس سے پہلے کہ عمر کچھ کہتا، اُنکے سیکریٹری نے آکر اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے!'' عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''علی! ریسیو (لینے) کرنے تو چلو نا!'' اُس نے منت آمیز لہجے میں کہا تو وہ بیزار منہ بناتا کھڑا ہو گیا۔

عمر نے سکھ کا سانس لیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس نے اب مشاورت کے دوران ایک لفظ نہیں بولنا، لیکن کم از کم وہ ساتھ آنے پر راضی ہو گیا یہی بہت تھا۔

کلائنٹ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور اُسکے جوان سالہ بیٹے پر مشتمل دو لوگ تھے۔

''السلام علیکم! آپ کو آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' عمر نے انہیں مشاورتی کمرے کی جانب لے جاتے ہوئے پوچھا، علی کے چہرے پر سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

''نہیں میں آرام سے لوکیشن پر پہنچ گیا، لیکن میں بڑا شرمندہ ہوں کہ اس طرح جلد بازی میں آپکو تنگ کیا۔'' آدمی نے خوش اخلاقی سے معذرت کی، پھر ایک نظر خاموش کھڑے علی کو دیکھا۔

''انکا تعارف؟'' اُس نے علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو فائل دیکھنے میں مصروف تھا۔

''یہ میرا دوست ہے علی سفیر! اور میرا پارٹنر بھی ہے۔ کاروبار کا پچاس فیصد شیئر ہولڈر۔'' عمر نے سنجیدگی سے تعارف کروایا، تو علی نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا جو کلائنٹ سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

''اچھا اچھا! آپ نے بتایا تھا انکے بارے میں۔ کیسے ہیں آپ علی صاحب؟'' اُنہوں نے علی سے پوچھا۔

''الحمدُ اللہ! ابھی میں آپکے آفس کی فائل کا مطالعہ ہی کر رہا تھا فرقان صاحب! جگہ تو کافی اچھی ہے۔'' اُس نے یکدم ہی خوش اخلاقی کے تمام ریکارڈ توڑے تو عمر نے حیرت سے اُسکو دیکھا۔ اُسکے بعد مشاورت کے دوران بھی اُس نے بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیا کہ کلائنٹ نہ صرف خوش ہو کر گئے بلکہ ڈیل بھی فائنل ہو گئی۔ دونوں انہیں چھوڑنے کے لئے پارکنگ تک آئے۔ حالانکہ وہ ایسا کرتے نہیں تھے لیکن کلائنٹ چونکہ عمر کا شناسا تھا، لہٰذا اس طرح کیا گیا۔

''میں کیا سوچ رہا ہوں کہ اِس سے پہلے کہ ایف آئی اے ہمیں بلائے، میں ایک ٹیم کو فرقان صاحب کے کام کے لیے مختص کر دوں۔'' اُنکے جانے کے بعد عمر نے پارکنگ میں اپنے ساتھ کھڑے علی سے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ انکا کام بھی آسان ہے، ٹیم سمجھ جائے گی۔'' علی نے تائید کی۔

''ایک بات بتاؤ!'' عمر نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم تو مجھ پر غصّہ نہیں تھے ابھی؟'' اُس نے یاد دلایا۔

''بالکل تھا۔'' علی نے تردید نہیں کی۔

''تو یہ اچانک سے غصّہ کہاں گیا؟''

''اُتر گیا۔'' وہ مُسکرایا۔

''کب؟''

''جب تم نے مجھے دوست کہا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے عمر کو دیکھا اور پھر اُسے حیرت زدہ سا چھوڑتے کندھے اُچکاتا عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

عمر چند لمحے منہ کھولے اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر یکدم ہی مُسکرا دیا۔

---------+---------+--------

جو وہ دیکھ رہی تھی وہ ایک نیا منظر تھا۔ اُسکی بتیس سالہ زندگی کا پہلا منظر۔۔۔

جو وہ سن رہی تھی اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم مذاق کر رہے ہو نا کوئی؟ ہے نا؟'' اسے اپنے سوال پر خود بھی یقین نہ تھا۔ حسین نے سرخ آنکھیں اور سنجیدہ چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ یہ منظر حور نے اپنی بتیس سالہ زندگی میں واقعی پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اتنا تو کبھی بھی نہیں۔

''اِس بار میں مذاق نہیں کر رہا حور عین!'' اُس نے آہستگی سے کہا۔ وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ حور عین تیزی سے اُٹھی اور اسکے سامنے رکھی میز پر بیٹھ گئی۔

''حسین! کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے نا؟ کوئی تمہیں کیوں مارنا چاہے گا؟ تم نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، تمہاری تو کبھی کسی سے دشمنی رہی ہی نہیں۔'' وہ ماننے سے انکاری تھی۔

''غلط فہمی نہیں ہے۔ پر تم پریشان نہ ہو۔ مجھے ایف آئی اے پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔'' حسین نے اُس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔

''میں سمجھتی رہی۔۔۔ کہ شاید۔۔۔ شاید تمہیں اپنے دوست مل گئے۔۔۔ پر یہاں تو۔۔۔'' دکھ اور بے یقینی کی وجہ سے اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ہاں! یہ تو سچ ہے، اُس نکمّے قاتل نے مجھے میرے دوستوں سے ملوا دیا۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا۔

''نہیں! حسین۔۔۔ حسین مجھے تایا ابّو کو بتانا ہو گا۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''نہیں حور! تم خاندان میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ نہ اپنے والدین کو نہ میرے ابّو کو۔'' اُس نے سختی سے کہتے اسے روکا۔

''پر حسین۔۔۔'' اُس نے مخالفت کرنی چاہی۔

''حور! اِس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، وہ الٹا پریشان ہو جائیں گے۔ دیکھو! میں چار ماہ سے اِس حقیقت کے ساتھ جی رہا ہوں۔ مجھے ایف آئی اے پر بھروسہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کرو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ پلیز حور! میرا ساتھ دو اِس مشکل وقت میں۔ جلد وہ پراسرار انسان پکڑا جائے گا، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا، اور وہ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

پر۔۔۔۔

ابھی تو اُسے۔۔۔۔

ایف آئی اے کا پلان بی نہیں معلوم۔۔۔

---------+---------+--------

ایف آئی اے کی عمارت میں بنے مشاورتی آفس میں بیٹھا نوید اس وقت کسی گہری سوچ میں تھا، فیصل برابر میں رکھی چھوٹی سی میز پر بیٹھا، سسٹم پر کچھ کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھ تو شیراز دروازے پر تھا۔ نوید نے اُسے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔

''سر! آپکے دوست پہنچ چکے ہیں۔'' اُس نے اطلاع دی تو نوید نے دائیں بھنویں اُٹھا کر اسے دیکھا پر کچھ کہا نہیں۔

''اور آپ سے ایک بات بھی کرنی تھی۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے گویا ہوا۔

''کہو!'' نوید نے کاغذات میں سر دیتے سنجیدگی سے کہا۔ شیراز کے کندھوں کے پیچھے نظر آتے دروازے سے، وہ پانچوں اندر داخل ہوتے اور اپنی اپنی نشستیں سنبھالتے دکھائی دے رہے تھے۔

''وہ۔۔۔ میری شادی ہے کل۔'' اُس نے دانت نکالے۔

''تو؟'' نوید کے سنجیدہ سوال پر اُسکی بتیسی اندر گئی۔

''وہ چھٹّی چاہیے تھی۔''

''چھٹّی میں دیتا ہوں یا ڈیپارٹمنٹ؟'' نوید نے صفحات پلٹتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''شادی یکدم ایمرجنسی میں ہو رہی ہے، ڈیپارٹمنٹ سے چھٹّی منظور کروانے کے لیے کم از کم ایک ماہ پہلے درخواست دینی ہوتی ہے۔ اب اتنے شارٹ نوٹس پر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے آپ ہی مجھے رخصت دے دیں۔'' اُس نے بلآخر اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''کتنے دنوں کی رخصت چاہیے؟'' اُس نے چہرہ اٹھا کر اُسے گھورا۔

''ویگ۔۔۔ گیارہ۔۔۔ گیارہ دن۔'' اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' اُس نے بھنویں اُچکاتے پوچھا۔

''ابھی تو بتایا سر! شادی ہے میری۔''

''کونسی شادی گیارہ دنوں تک چلتی ہے؟'' اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے فرصت سے اُسے دیکھا۔ جواباً شیراز خاموش رہا۔

''تین دن کی رخصت ہے تمہیں!'' وہ حتمی انداز میں کہتا واپس کاغذات کی جانب جھکا تو شیراز کا منہ کھل گیا۔

''سر! تین دن تو بہت کم ہیں۔'' وہ منمنایا۔

''ٹھیک ہے! دو دن۔۔۔''

''سر پانچ کر لیں۔۔''

''ایک دن۔۔۔''

''رہنے دیں چھٹّی کو میں نکاح یہیں کرلوں گا۔''اس نے تپ کر کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہیں بہتر لگے۔''

''مجھے شادی ہی نہیں کرنی!''وہ منہ بناتے کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''فیصل!''اُسکے جانے کے بعد نوید نے قریب بیٹھے فیصل کو مخاطب کیا۔

''جی سر!''

''شیراز پندرہ دن کے لیے چھٹیوں پر جائیگا، تو تم اُسکے حصّے کی ڈیوٹی پوری کروگے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''پندرہ دن؟''وہ بھونچکا رہ گیا۔

''جب تم ایک مہینے سے میری جاسوسی کرنے کے لیے چھٹّی پر تھے، تب تمہارے حصے کی ڈیوٹی اُسی نے دی تھی۔''نوید نے بتایا کم اور جتایا زیادہ تھا۔

''میری ٹانگ ٹوٹی تھی۔''وہ یہ وضاحت ہزار مرتبہ دے چکا تھا پر کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''کیا سارے گورنمنٹ آفیسر ایسے ہی ہوتے ہیں؟''قریب اپنی نشست پر بیٹھے حسین نے مقدم کے کان میں سرگوشی کی۔

''ایسے یعنی؟'' اُس نے پوچھا۔

''ایسے یعنی، میرے اسکول کی کھڑوس پرنسپل جیسے۔۔۔''اُس نے کہا۔

''پرنسپل کھڑوس نہیں ہوتے۔وہ بس ذمے دار ہوتے ہیں۔''رضا کے کان کھڑے ہوئے تھے، لہٰذا فوراً تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''ویسے یہ اتنی ایمرجنسی میں شادی کیوں کر رہا ہے؟اور کس سے؟''اُنکی بکواس سے بے نیاز نوید نے فیصل سے جیسے یاد آنے پر پوچھا۔

''اُسکے مولوی صاحب کی بیٹی نمرہ قائم خانی سے، اسکی شادی اچانک ہی طے پائی ہے۔''

''وہ جسکے چہرے پر سمیر نے تیزاب پھینک دیا تھا؟''نوید نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہی۔۔۔''فیصل نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔اِس سے پہلے کے وہ کوئی جواب دیتا، مشاورتی کمرے کا دروازہ کھلا اور فرّخ صاحب داخل ہوتے دکھائی دیے۔

''السلام علیکم!''اُنہوں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تم سب کو آج یہاں بلانے کا مقصد پلان بی کے حوالے سے آگاہ کرنا ہے۔ تم سب مئی کی تین تاریخ کو یہاں آؤ گے، بلکہ لائے جاؤ گے۔''اُنہوں نے بات کا آغاز کیا۔

''جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ قاتل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ پہلے خلیل اور پھر اِس کیس کا مرکزی کردار مائیکل، ہمارے پاس اب کوئی ایسی شے نہیں بچی، جس سے ہم اُس پُراسرار قاتل تک پہنچ سکیں۔ لہٰذا اب ہمارے پاس فقط پلان بی ہے جو ہمیں یا تو مجرم تک پہنچائے گا، یا نہیں۔ لیکن۔۔۔''اُنہوں نے رک کر سب کے چہرے دیکھے۔

''یہ تو طے ہے کہ تم میں سے کسی کو بھی، میں اُس مجرم کا نشانہ نہیں بننے دوں گا۔ ہم پلان بی کی شکل میں ایک بہت بڑا رسک لے رہے ہیں۔ کیا تم سب اِسکے لیے تیار ہو؟''اُنہوں نے پوچھا تو باقی سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے! تم سب نے تیار رہنا ہے۔ تین مئی کی رات گیارہ بجے۔۔۔''وہ تمام لائحہ عمل اُنہیں بتاتے جا رہے تھے۔ مشاورت سوا گھنٹے تک جاری رہی۔ اُنکے تمام خدشات کو دور کرنے اور تمام سوالات کے جواب دینے کے بعد بلآخر وہ مشاورت برخاست کر کے چلے گئے۔

''کسی کا کوئی سوال؟''نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں! کیا تم بھی اِس سارے لائحہ عمل کا حصہ ہو؟''حسین نے پوچھا۔(اِس آدمی نے قسم نہیں کھائی تھی کہ نوید کو مخاطب نہیں کریگا؟)

''کیوں؟ کیا میری تصویر اُس ڈائری میں نہیں ہے؟''وہ سوال کے جواب میں بھی سوال ہی کرتا تھا۔ حسین بدمزہ ہوا۔

''پر تم تو ایس ایس پی ہو نا!''مقدّم نے بات مکمل کی۔

''میں پاکستان کا اکیلا ایس ایس پی نہیں ہوں۔''اُسکی سنجیدگی میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

''یار! میری تلاشِ گمشدہ والی تصویر انٹرنیٹ پر کس نے لگائی تھی؟''رضا نے یکدم ہی برا سا منہ بنا کر پوچھا تھا۔

''میں نے ڈالی تھی، جب تم غائب ہو گئے تھے۔ کیوں؟''نوید نے پوچھا۔

''جب میں مل گیا ہوں تو اُسے اب ہٹوا بھی دو۔ مذاق بن گیا ہے میرا اسٹوڈنٹس میں۔۔۔''اُس نے جس لہجے میں بتایا تھا، سب بیساختہ ہنسے تھے۔

''اچھا سبق مل گیا ہے تمہیں۔''حسین نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

دور بیٹھا شیرازا نہیں منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔

یہ لوگ موت کے دہانے پر کھڑے ہنس رہے تھے۔

عجیب لوگ تھے بھائی!

---------+---------+--------

مورخہ تیس اپریل

(تین مئی کی شام سے، ایف آئی اے کے جوانوں کا تمہیں تمہارے گھروں سے لینے کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اگر کسی نے تم پر نظر رکھی بھی ہے، تو وہ نہیں جان سکتا کہ گاڑی میں کون آیا، اور واپسی پر گاڑی میں کون کون گیا۔ تم سب نے آنے والی گاڑی کو گھر کے نسبتاً سنسان حصّے میں پارک کروانا ہے۔ گھر کو اندھیرا رکھنا ہے اور کم سے کم سامان لیکر گاڑی میں بیٹھ جانا ہے۔ اُسکے آگے نوجوان کا کام تمہیں محفوظ طریقے سے ایف آئی اے پہنچانا ہے۔ یاد رہے کہ گیارہ بجے آنے والی گاڑی آخری ہوگی۔ ہم مغرب کے بعد سے گاڑیاں بھیجیں گے۔ تم پانچوں کے گھروں میں مختلف اوقات میں گاڑیاں پہنچیں گی تاکہ کسی کو شک نہ گزرے۔ بظاہر ایسا لگے گا جیسے کوئی مہمان ملنے آیا اور چند گھڑی ملنے کے بعد واپس چلا گیا۔)

رضا نے آج جزا کو خصوصاً بلوایا تھا۔ وہ اُس سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا۔ چہرہ ٹھیک ٹھاک سنجیدہ تھا۔

''میں ایک سے ڈیڑھ ماہ کے لیے کہیں جارہا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ میں ایسی جگہ جارہا ہوں، جہاں سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اِس دوران میں پناہ گاہ کی ذمّے داری تمہیں سونپ کر جارہا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے بتایا تو جزا کا چہرہ فق ہوا۔

''رضا! تم پھر سے۔۔۔۔'' اُس نے انجانے خدشے کے تحت کہنا چاہا۔

''نہیں!'' رضا نے اسکی بات کاٹی۔ ''میں پھر سے کوئی غلط قدم اُٹھانے نہیں جارہا۔ مجھے واقع ایک ذاتی نوعیت کا کام ہے۔ میں جس جگہ جارہا ہوں، وہاں سگنلز کا ایشو بھی بہت زیادہ ہے، اس لیے رابطہ مشکل رہے گا۔ پر میں کوشش کروں گا بات کرنے کی۔'' اُس نے آرام سے سمجھانا چاہا۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟ مجھے سچ بتادو رضا!'' جزا کو یقین نہ تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں جو سچ ہے۔ میں بس تم سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

''کہنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ میرے بھی بچے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ غالباً اسے رضا کا آدھی ادھوری بات بتانا برا لگا تھا۔ پر وہ بتا نہیں سکتا تھا۔

(ایف آئی اے پہنچنے کے بعد، ایک دوسرا شخص، تم لوگوں کی ذاتی گاڑیوں کو تمہارے گھروں سے لیکر نکلے گا۔اس طرح کہ وہ تم پر نظر رکھنے والے ممکنہ شخص کو بھٹکا سکے۔ یہاں سے تم سب کو مورخہ چھے جون تک کے لیے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے گا۔اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔اس دوران تم میں سے کوئی بھی اپنے گھر والوں سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔ میں جگہ اور مقام تمہیں نہیں بتا رہا۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں، مجبوراً تم سب اپنے کسی قریبی، یا کسی بھروسے کے شخص کو بتا سکتے ہو۔اور ہم یہ حساس معلومات کسی کو نہیں دے سکتے۔)

''ابّو! امی!'' سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا عمر آج اپنے ماں باپ کو اپنی بات سننے پر قائل کر چکا تھا۔ماں تو پہلے ہی سننے کو بے تاب تھیں۔البتہ آج ابّو بھی راضی ہو گئے تھے۔

''میں آپکو آج وہ حقیقت بتانا چاہتا ہوں جو میں دس سالوں سے اپنے دل میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ میں اب اِس راز کا بوجھ اور نہیں اُٹھا سکتا۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔آنکھیں آبشار کی صورت آنسو بہا رہی تھیں۔وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔یہ اُسکے چہرے پر واضح تھا۔

''مجھے۔۔۔مجھے ٹیومر ہو گیا تھا۔ایک مہلک اور جان لیوا ٹیومر۔۔۔۔'' وہ سب بتاتا چلا گیا اور تین نفوس موجود ہونے کے باوجود وہاں موت جیسا سنّاٹا چھایا رہا۔جب سب کچھ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو اسکے ماں بال پتھر کی مورت بنے بیٹھے نظر آئے۔

''ام۔۔۔عمر۔۔'' حفیظ صاحب کی زبان سے اسکا نام ادا نہ ہو سکا تھا۔وہ یہ کیسے بھول گئے کہ انکا یہ فرمانبردار بیٹا کتنا حساس تھا؟

''مجھے معاف کر دیں ابّو! میں نے بہت غلط کیا۔بہت زیادہ۔۔۔۔میں نے غلط فیصلہ کیا، میں اتنے عرصے خضر سے دور رہا۔ میں اِس غم سے کیسے نکلوں گا؟ میں ساری زندگی نہیں نکل سکتا۔'' وہ رو رہا تھا۔بہت بری طرح۔۔۔

(ہم مجرم کا منصوبہ اُسی پر الٹ دیں گے۔اُس سائیکو پیتھ نے قتل کے لیے چھے تاریخ ماہ جون کا مہینہ چنا ہے۔ اس دوران تمہارے گھر والوں کی اطلاع ہم تمہیں پہنچاتے رہیں گے۔'' فرخ صاحب نے بات مکمل کی تھی۔

''پر ہم وہاں کریں گے کیا؟'' یہ سوال علی کا تھا۔

''وہ تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد بتایا جائے گا۔ یہ کیس کا اہم موڑ ہے، ہر بات یہاں نہیں بتائی جا سکتی۔'' اُنہوں نے سنجیدگی سے کہا۔)

''تم روز ایک نیا انکشاف کرتے ہو حسین! اور چاہتے ہو کہ میں تایا ابّو کو کچھ نہ بتاؤں؟'' آج حور عین ہتے سے اُکھڑ گئی تھی۔

''حور! میں نے تم سے کہا نا! میرا ساتھ دو اس مشکل وقت میں۔۔۔'' حسین نے سمجھانا چاہا۔

''کیسے ساتھ دوں؟ مجھے کچھ بتاؤ تو۔۔۔ کیا مجھ پر اتنا بھروسہ نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اور کب واپس آؤ گے؟'' وہ رو رہی تھی۔

''حور!'' حسین نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔'' اگر ایف آئی اے نے مجھے بتایا ہوتا کہ ہم کہاں جارہے ہیں تو میں تم سے کیوں چھپاتا؟ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ کہاں جارہا ہوں۔''

''یہ اندھا بھروسہ ہے حسین!'' اُس نے بے بسی سے کہا۔

''میں اکیلا نہیں ہوں، ہم چھے لوگ ہیں۔ اور بھروسہ صرف اللہ پر ہے مجھے۔ یہ میرا راز ہے حور! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے راز کی حفاظت کرو۔'' وہ اُسے راز رکھنے کو کہہ رہا تھا اور وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ مشکل مرحلہ سر ہو گیا تھا۔

(تم سب نے اپنے تمام کام مکمل کر کے رکھنے ہیں۔ سامان کم سے کم رکھنا ہے۔ موبائل کے علاوہ کسی قسم کا کوئی گیجٹ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ موبائل بھی تم سب گھر سے نکلتے ہی پاور آف کر دو گے۔

''آپ نے کہا کہ ہماری گاڑیاں ممکنہ جاسوس کو بھٹکاتی رہیں گی۔ لیکن کب تک؟ آخر جب ہم اُسے اپنے روزمرہ کے معمولات نمٹاتے نظر نہیں آئیں گے، تو اسے شک نہیں ہو گا؟'' عمر نے پوچھا۔

''بالکل! لیکن تب تک تم لوگ محفوظ مقام پر منتقل ہو چکے ہو گے۔ ویسے ہمیں مکمل یقین ہو چکا ہے کہ کوئی بھی تمہارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ ہم نے پچھلے چار ماہ میں باریک بینی سے تم سب پر نظر رکھی، ہمیں تم لوگوں کے آس پاس کوئی مشکوک حرکت ہوتی نظر نہیں آئی ہے۔ ایسا لگتا ہے قاتل نے ایک تاریخ ڈیسائڈ کر لی ہے، اور وہ اسی تاریخ کو کارروائی کرے گا۔ اِسی لیے ہم نے پلان بی ترتیب دیا۔ اُسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ چھے تاریخ کو تم اُسے دنیا کے کسی کونے میں نہیں ملو گے۔ پھر ہم پہنچیں گے اصل مجرم تک۔''

''اور ہمارے گھر والے؟'' حسین نے سب کے منہ کی بات چھینی۔

''اُنکی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔ ظاہری طور پر تمہارے گھر والوں سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسے تم لوگوں سے مطلب ہے، لیکن پھر بھی ہم تمہارے گھر والوں کی ہر ممکن حفاظت کریں گے۔)

''تو یہ اب تک کی صورتحال ہے۔ تمہیں سمجھ آ گیا ہو گا کہ میں نے تم سے دوبارہ نکاح کیوں کیا؟ میں چاہتا ہوں کہ میرے پیچھے میرے دونوں بچے پریشان نہ ہوں۔ خصوصاً نشمیہ۔۔۔ انہیں یہی بتانا ہے کہ میں ضروری کام سے شہر سے باہر ہوں۔ اور ابّا کو میں سمجھا دوں گا۔'' علی نے مستحکم لہجے میں فاطمہ کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا تھا۔ اُسکی طبیعت میں کافی بہتری آ رہی تھی۔ وہ گنگ سی اُسے دیکھے گئی۔

''تم آرام کرو!'' تمام بات بتانے کے بعد وہ اُسکا ردعمل دیکھنے کیلئے رکا نہیں تھا۔ فاطمہ پر جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا۔

مورخہ چھے کے ساتھ اب ان تمام لوگوں کی سانسیں جڑ چکی تھیں۔

---------+---------+--------

مورخہ ایک مئی:

''آپ نے مجھے بلایا بھائی؟'' نوید آج ملنے آیا تھا۔ آتا تو وہ کبھی کبھار امی سے ملنے تھا۔ پر آج وہ خصوصاً جزا سے ملنے آیا تھا۔ جزا کو بلانے کا کہہ کر وہ لان میں ہی بیٹھ گیا۔ لان کی کھلی چھت سے پناہ گاہ کی بالکونی نظر آ رہی تھی۔ فلحال وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ بالکنی کو غور سے دیکھ رہا تھا جب جزا لان میں آئی۔

''ہاں! تم سے کام تھا۔ بیٹھو!'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔ دل الگ دھڑک رہا تھا، پتہ نہیں کیا پوچھنے والا ہے؟

''کچھ لوگ ہیں، جو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، پڑوس میں نظر آتی بالکونی کی جانب نگاہ رکھتے ہوئے بنا تمہید کے بات شروع کی۔

''قتل؟'' جزا کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی کے لاتعداد دشمن ہیں۔

''اور رضا کو بھی۔۔۔'' بالکنی سے نظریں ہٹائے بنا کہا تو اُس کا سانس رکا۔

''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا مطلب؟'' وہ ہکلائی۔

''ایک گینگ۔۔۔ مافیا۔۔۔ یا جو بھی کہہ لو۔ وہ مجھے اور میرے دوستوں، بشمول رضا کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ انکا منصوبہ ہمیں ایک ساتھ جون کی چھے تاریخ کو قتل کرنے کا ہے۔ ہم انہیں دھوکا دینے کے لیے ایک محفوظ مقام پر منتقل ہو رہے ہیں۔ عارضی طور پر۔۔۔'' وہ رکا اور بالکنی سے نظریں ہٹا کر فق چہرے کے ساتھ خود کو دیکھتی جزا کو دیکھا۔

''نہ ہم کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں اور نہ درمیان میں آ سکتے ہیں۔ یہ پلان کا حصّہ ہے۔ تب تک کے لیے مجھے۔۔۔۔'' وہ رکا۔ ''مجھے تمہاری ضرورت ہے جزا!'' آخر میں اسکی آواز آہستہ ہوئی۔

''میں نے بشریٰ کو کچھ نہیں بتایا، بتاؤں گا بھی نہیں۔ امی کو بھی نہیں بتانا ہے۔ صرف تمہیں اِس لیے بتا رہا ہوں کہ۔۔۔۔'' وہ پھر رکا۔ ''تم میری بہادر بہن ہو۔ تم حالات کا سامنا کر سکتی ہو۔ تم اُن دونوں کو سنبھال سکتی ہو۔ تم سنبھال لو گی نا؟'' اُس نے پُر امید لہجے میں پوچھا تو جزا کا سر اپنے آپ ہی اثبات میں ہلا۔

''تمہارا شکریہ ! میں کل بشریٰ کو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ تم نے میرے راز کی حفاظت کرنی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔اِس سے زیادہ وہ بات نہیں کرتا تھا، اتنا بھی بہت تھا۔ کھڑے ہو کر اُس نے ایک مرتبہ پھر پناہ گاہ کی اوپری منزل پر بنی بالکنی کو دیکھا۔ جزا بھی کھڑی ہو چکی تھی،اب گم صم سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں کل صبح چھے بجے آؤں گا۔''اِس بات پر جزا نے حیرت سے اُسکو دیکھا۔

''چھے بجے ؟''

''ہاں ! کچھ کام ہے۔''

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟''اُس نے پریشانی سے پوچھا۔

''مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔''اُس نے ایک مرتبہ پھر پڑوسیوں کی خالی پڑی بالکونی کو دیکھا، پھر دوبارہ جزا کو۔''کل ہی بتاؤں گا کہ کیا کام ہے۔''اُس نے ہمیشہ کی طرح اتنی ہی بات بتانی ضروری سمجھی، جتنی اسے مناسب لگی۔

''خُدا حافظ !''وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

''بھائی !''جزا نے یکدم ہی پکارا تو وہ پلٹا۔

''کیا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے۔۔۔کچھ کہنا تھا۔''یہی صحیح وقت تھا۔اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کا۔

''تمہیں تو کہنا نہیں آتا، تم تو خط لکھتی نا؟''سوال تھا کہ ہزار واٹ کا بجلی کا جھٹکا۔اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''وہ تو۔۔۔وحید بھائی کو۔۔۔''حیرت کی زیادتی سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔نوید کندھے اُچکاتا اسے بھونچکا چھوڑے سکون سے چلا گیا۔

آخر اِس آدمی کو سب پتہ کیسے چل جاتا تھا؟

---------+---------+--------

وہ پناہ گاہ سے نکل رہا تھا اور وہ اپنے گھر سے۔دونوں کا اپنے اپنے گھروں کے دروازوں کے درمیان بنے ستون کے سامنے، آمنا سامنا ہوا۔

''السلام علیکم !''رضا اُسے سلام کر کے، نظریں چراتے جانے لگا پر وہ راستے میں آ گئی۔

''تو تمہیں ذاتی نوعیت کا کام تھا؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو رضا نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔ سیاہ سوٹ پر، کشمیری کام والی لال رنگ کی چادر سر پر ڈالے وہ سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تم کس بارے میں بات کر رہی ہو؟''وہ نہیں سمجھا۔

''تم نے کل مجھے کہا کہ تمہیں ذاتی نوعیت کا کام ہے۔ جبکہ تم کسی انجان قاتل سے اپنی جان بچانے کے لیے جا رہے ہو؟''وہ دبے لہجے میں چیخی تو رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''تم مجھے بتا بھی سکتے تھے۔ تم نے بھروسہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں نے بار بار پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ پر تم نے مجھے اس لائق ہی نہیں سمجھا۔''وہ آواز آہستہ رکھنے کے باوجود بھی لہجے کی سختی چھپا نہیں پا رہی تھی۔ رضا دم سادھے اُسے دیکھنے لگا۔

''جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے ہر شے سے زیادہ مقدم ہوں، تو مجھے لگا تم سچ بول رہے ہو۔ مگر تم جھوٹے ہو، تم ہر بات مجھ سے چھپاتے ہو۔ تم مجھے اِس لائق ہی نہیں سمجھتے۔''وہ شکوہ کرنے لگی۔ اور رضا ساکت، جامد سا اُسکی آنسوؤں بھری آنکھوں کو دیکھنے لگا۔

''جواب دو! چپ کیوں کھڑے ہو؟''وہ سوں سوں کرتی، ناک رگڑتی بولی۔

''رحم کھاؤ مجھ پر۔۔۔''اُس نے التجا کی۔

''ہاں؟''وہ اِس مطالبے کا مقصد سمجھ نہ سکی۔

''یعنی! اگر تمہارے بھائی نے اِس طرح بیچ سڑک پر تمہیں روتے دیکھ لیا نا! تو جائے وقوعہ پر میری موجودگی کی بنا پر وہ مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے ہوئے، پہلے مجھے زمین میں آدھا دفن کریگا، پھر باقی آدھے وجود پر ٹرک چلا کر میرے پرخچے اُڑا دے گا۔''اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔ جیسے بیچ برسات میں دھوپ نکل آئی ہو۔

دنیا میں قتل ہونے کے ہزار طریقے تھے۔۔۔۔

پر رضا الٰہی نے اپنے لیے، کاجل بھری اُن دو سیاہ آنکھوں کو چنا تھا۔۔۔۔

''میری بات کا جواب دو۔''آنسو پونچھ کر وہ فوراً موضوع پر واپس آئی۔

''تمہارے بھائی نے ہی بتانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ ورنہ میں تو پہلے تمہیں ہی بتانے والا تھا۔''دفاع کا اصول نمبر پندرہ۔۔۔

''بھائی نے مجھے بتادیا ہے۔''اُس نے جتایا کہ دیکھ لو، میں کتنی اہم ہوں۔رضا مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھے گیا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم دونوں بہن بھائی کے امریکہ وروس جیسے تعلقات ہیں۔''اُس نے شرارت سے کہا۔

''جزا!''اوراِس سے پہلے جزا کچھ کہتی،اُسکے نام کی پکار سنائی دی۔

رضاالٰہی کے پاس اگر کوئی ان دیکھی ماورائی قوت ہوتی، تووہ کو خود اِس لمحے دنیا سے غائب کرلیتا۔وہ غیر مرئی ہو جاتا،وہ انجان ہو جاتا۔کیونکہ پکارنے والا موصوفہ کا بھائی تھا۔کاش وہ تھوڑی دیر پہلے کچھ اور بات کرلیتا، یہ اُسی کی منحوس زبان کا نتیجہ تھا۔

''جی بھائی!''جزانے رضا کی پیٹھ کے پیچھے سے جھانکا تووہ چلتا ہوا آرہا تھا۔وہی سنجیدہ مگر سپاٹ چہرہ۔یہ بھلا اچانک کہاں سے نمودار ہوا تھا؟رضانے توپلٹ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی۔کہیں پتھر ہی نہ ہو جائے۔نوید قریب پہنچا،ایسے کہ وہ دونوں کے درمیان،دونوں کو بیک وقت دیکھ سکتا تھا۔رضانے تھوک نگلا۔

''السلام علیکم!''اُس کو کچھ نہ سوجھا تو مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔نوید نے سنجیدگی سے دیکھتے ہاتھ ملایا۔

''میں بس!مس جزا سے پناہ گاہ کی کچھ ذمہ داریاں ڈسکس کررہا تھا۔تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمیں جانا ہے۔''اُس نے فوراً وضاحت دی۔اور زندگی میں پہلی بار اُس نے بنا پوچھے کسی کو وضاحت دی تھی۔

''تو؟''ایس ایس پی نوید عالم کا سنجیدہ جواب اُسکا حلق خشک کر گیا۔اُس نے بیساختہ اُسکے دونوں ہاتھ دیکھے۔دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں تھے۔اگر جو اِس میں خنجر ہوا؟اور اُس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں نکالا،اور رضا کی آنکھ۔۔۔۔۔

بس!اس سے آگے وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔فوراً جھرجھری لیکر سوچوں کو جھٹکا۔اُسکی اِس ابنارمل سی حرکت پر دونوں بہن بھائیوں نے اُسے سرتاپاؤں گھورا تھا۔

''تمہیں جو ڈسکس کرنا تھا وہ کرلیا؟''نوید نے خصوصاً دونوں دروازوں کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے پوچھا۔ایسے جیسے کہہ رہا ہوں کہ بات کرنے کی یہ کونسی جگہ ہے؟اب وہ کیا بتاتا کہ جناب ایس ایس پی کی بہن نے ہی یہ جگہ پسند کی تھی۔رضا کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''آں۔۔۔ہاں!۔۔۔ہاں!کرلی بات۔''اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا مگر مجال ہے جو ایس ایس پی صاحب کی سنجیدگی میں رتی بھر بھی کوئی فرق آیا ہو۔

''تو جاؤ!''لحاظ مروت تو کسی قسم کی رکھتا نہ تھا وہ۔ جزا کے کندھے پر بازو پھیلاتے اُسے اپنے ساتھ لگایا اور بولا۔''مجھے ذرا میری بہن، سے بات کرنی ہے۔'' لفظ میری بہن پر زور دیتے، بتایا کم اور جتایا زیادہ تھا۔ جزا نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔ اتنے مثالی تعلقات کب سے ہو گئے اُن دونوں کے ؟ نوید اب بھی سنجیدہ چہرے کے ساتھ رضا کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ میں چلتا ہوں۔''وہ تیزی سے واپس پناہ گاہ میں داخل ہو گیا حالانکہ اُسے جانا کہیں اور تھا۔ لیکن اِس وقت کوئی رسک نہیں۔۔۔

''تم اندر آؤ ذرا!''اُسکے جانے کے بعد نوید نے جزا سے الگ ہوتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ اُس کا تو کلیجہ حلق میں آ چکا تھا۔ کیا ضرورت تھی بیچ سڑک پر روک کر بات کرنے کی؟ خود کو دل میں کوستی وہ اندر آئی۔

''جی بھائی! آپ اچانک ؟''اُس نے دروازہ بند کرتے لان میں کھڑے نوید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چونکہ تم نے بشریٰ اور امی کو سنبھالنے کی حامی بھری ہے تو میں ایک مرتبہ پھر تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں ہے، اگر تم انکار کرنا چاہو تو میں بشریٰ کو سب بتا دوں گا۔''اُس نے کہا۔

''بھائی! میں صبح آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں آپکے پیچھے سب سنبھال لوں گی۔ آپ بھروسہ رکھیں مجھ پر۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! یہ بشریٰ کی دواؤں کی ترتیب ہے۔ وہ خود یاد نہیں رکھ پاتی، میں چاہوں گا کہ تم امی کے ساتھ ساتھ اُسکی دواؤں کے بارے میں بھی ایک بار اُس سے پوچھ لیا کرو۔ اور اُسکی ڈاکٹرز سے سیشن کی آنے والی تمام تاریخیں بھی لکھ دیں ہیں۔ تم دیکھ لینا!''نوید نے ایک صفحہ اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے صفحہ تھام لیا۔

''آپ بے فکر رہیں بھائی!''وہ خوش ہوئی۔ بلآخر اُسکا بھائی اُس پر بھروسہ کر رہا تھا۔ بشریٰ کو یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا، شاید وہ اُسکے دل میں اپنا کھویا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ واقعی خوش تھی۔

---------+---------+--------

مورخہ دو مئی:

''ان سب باتوں پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ مجھے کیا ردعمل دینا ہے؟''مقدّم کے سامنے، اخلاق ٹھیک ٹھاک پریشان تھا۔

''میں نے تمہیں سچ بتا دیا ہے۔ کیونکہ تم سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔''مقدّم نے کہا۔

''ٹھیک ہے! پر مقدّس؟ اُسکو کیا کہو گے ؟''

''میں اُسکو فلحال سچ بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔''اس نے آہستگی سے کہا۔

''پر جب تم سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکے گا، تو وہ سوال تو کرے گی نا؟ پریشان بھی ہو گی۔ تب؟''

''میں نے اُسے یہ کہا ہے کہ میں اپنی ٹیم کے ساتھ، حساس ادارے کے لیے کام کرنے جا رہا ہوں۔ ادارے کو اپنی اندرونی بے ضابطگیوں کا پتہ لگانے کے لیے ہماری مدد درکار ہے۔ کنفیڈنشل (خفیہ) معلومات ہیں لہٰذا اسے نہیں بتا سکتا۔''

''اُس نے یقین کیا؟''

''معلوم نہیں کتنا یقین کیا۔ پر اُس نے دوبارہ اِس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ غالباً وہ مطمئن ہو چکی ہو۔''

''مقدّم! یہ سب سن کر میں بہت پریشان ہوں۔ ڈر لگ رہا ہے مجھے۔''اخلاق بہت پریشان تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ ابھی تک نہیں ہوا تو آگے بھی نہیں ہو گا۔ ان شاءاللہ!''اُس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

''ان شاءاللہ!''اخلاق نے بس اتنا ہی کہا۔

''میرے پیچھے کمپنی تم دیکھو گے۔ اور جب میں واپس آؤں گا تو دونوں مل کر کام کریں گے۔''اُسے اپنے واپس آنے پر پورا یقین تھا۔ پتہ نہیں کیسے؟ پر تھا۔

''مکرم کس کے پاس رہے گا؟''اُس نے پوچھا۔

''مقدّس کے پاس ہی رہے گا۔''اُس نے جواب دیا تو اخلاق نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

---------+---------+--------

جامعہ میں سمسٹر کے امتحانات چل رہے تھے۔ اُسکے بعد چھٹیاں تھیں۔ رضا آج کل صبح کے اوقات میں فارغ تھا، لہٰذا صبح صبح اسکول چلا جاتا تھا۔ کسی قسم کے شور شرابے کی آواز پر اُسکی آنکھیں کھلی، تو پہلے اُس نے کسلمندی سے اُنہیں ملتے وقت دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اسے نو بجے اسکول پہنچنا تھا۔ شور کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جیسے کوئی مشین چل رہی ہو، یا پھر کوئی دیوار ٹھونک رہا ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھا اور نا سمجھی سے یہاں وہاں دیکھا۔ آواز گھر کے باہر سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور جمائی لیتا بالکنی کے بند دروازے پر آیا۔ پردے گرے ہوئے تھے، اُس نے پردے ہٹا کر دیکھا تو لان خالی تھا۔ اپنے لان سے ہوتی نظریں پڑوسیوں کے لان تک گئیں اور وہ ششدر رہ گیا۔

پڑوسیوں کے لان میں لوہے کے لمبے لمبے پائپ نصب کیے جا چکے تھے۔اب اُن پر سبز رنگ کا دبیز شیڈ لگ رہا تھا۔بیک وقت کئی مزدور کام کر رہے تھے۔ اور یقیناً کافی پہلے سے کر رہے تھے،جب ہی صبح آٹھ بجے تک آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔گھر کے دروازے کے پاس،ایک کونے میں کرسی ڈالے،اپنے دیو قامت قد کے ساتھ ٹک کر بیٹھا نوید موبائل دیکھ رہا تھا۔گاہے بگاہے ایک آدھ نظر مزدوروں پر بھی ڈال لیتا۔

''یہ ہو کیا رہا ہے؟''رضا کو اس اچانک اقدام کی وجہ سمجھ نہ آئی۔اگلے ہی لمحے نوید نے چہرہ اُٹھا کر براہِ راست اُسکی بالکنی کی طرف دیکھا تو اُس نے سکینڈ کے ہزارویں حصّے میں پردے گرائے اور اندر کی طرف ہوا۔

''اُس نے مجھے دیکھ لیا؟''دل اُچھل کر حلق میں آیا۔

''ایسے جھانکنے کا کیا جواز دوں گا میں اُسے؟''شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا اُسکے لیے۔

''کہیں میری وجہ سے ہی تو نہیں لگوا رہا شیڈز؟''یہ خیال دل میں آتے ہی نوید کا کیل نما خنجر،اور ایس ایچ او کی آنکھیں یاد آئیں۔تھوک نگلتے چور نظروں سے بالکنی کے شیشے کے بنے دروازے کی جانب دیکھا،اور اگلے ہی لمحے یاد آیا کہ دروازہ کالے رنگ کا تھا،جس سے اندر کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔یکدم ہی سینے سے سکون کا سانس خارج ہوا۔

''شکر میں دروازہ کھول کر بالکنی میں نہیں گیا تھا۔''اُس نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔بال بال بچا تھا وہ بھی۔

کچھ دیر خود کو پر سکون کرنے کے بعد اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا،پھر تیار ہونے چل دیا۔اُسے آج اسکول میں اہم کام نمٹانے تھے۔پھر واپس پناہ گاہ آکر بچوں کو ہر شے کے حوالے سے تیار کر کے،انہیں ذمّے داریاں سونپنی تھیں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اُسکے پیچھے پُر سکون رہیں۔

واپس آکر اسے اپنا سامان بھی باندھنا تھا۔

--------+---------+----------

علی نے گاڑی سے اتر کر نشمیہ کو اتارا۔پھر اسے اسکول کا بستہ پہنایا۔اتنی دیر میں احمد خود ہی اتر چکا تھا۔وہ اتنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ویسے بھی کسی کی مدد نہیں لیتا تھا۔

''اللہ حافظ بابا!''نشمیہ کو بھاگنے کی جلدی تھی،آج اُسکا ٹائیکونڈو کا پریڈ تھا۔اُسے وہاں جلد سے جلد پہنچنا تھا۔

''رکو ذرا!''علی نے جھک کر نشمیہ کو پیار کیا۔تو وہ کھلکھلا کر ہنسی۔پھر وہ احمد کی جانب جھکے ہوئے ہی بڑھا تو وہ بے ساختہ ہی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔علی ساکت رہ گیا۔

''اللہ حافظ بابا!''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ علی نے اسکا داخلہ بھی اسی اسکول میں کروادیا تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ نشمیہ کے ساتھ ہی اسکول جارہا تھا۔

''اللہ حافظ !اپنااور بہن کا خیال رکھنا۔''اُس نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہاتووہ سر ہلاتے اسکول کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ نشمیہ اچھلتی کودتی اندر جاتی دکھائی دے رہی تھی جبکہ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدگی سے چلتااندر جاچکا تھا۔

علی گہری سانس لیتے سیدھاہوا، پھر پشت پر کھڑی اپنی گاڑی سے ٹیک لگاکر، دور ہوتے اپنے دونوں بچوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں عجیب بے چینی سی تھی۔

''تمہاری بیٹی پڑھنے میں بہترین ہے۔ ذہین بھی ہے، دماغ بھی آرٹسٹ کا ہے۔''اِس آواز پراُس نے چونک کر دیکھا۔ رضاالٰہی نجانے کب وہاں آیا تھا؟اب اُسی کی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا، سامنے اسکول کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جس سے اب بھی کئی بچے اندر داخل ہورہے تھے۔ علی نے بھی چہرہ واپس موڑ لیا۔ فضامیں نمی بہت زیادہ تھی، گرمی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔

''جبکہ احمد پڑھائی میں صرف ایوریج سٹوڈنٹ (اوسط طالب علم) ہے۔ لیکن اسکی دیگر صلاحیتیں مجھے حیران کردیتی ہیں۔ وہ فٹبال کا بہترین کھلاڑی ہے۔ کبھی کبھاراپنی ٹیم کی جانب سے گول کیپر بھی بنتاہے، اوراسکی موجودگی میں آج تک مخالف ٹیم گول نہیں کرسکی۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال کا ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے سے بڑے لڑکوں کی ٹیم کا حصہ ہے۔''رضانے بتایا۔

''وہ نو سال کا ہوجائے گا اگلے ماہ۔''علی نے تصحیح کی، جسے رضانے نظرانداز کیا۔

''وہ اسکریبل کا بہترین کھلاڑی ہے، آتے ساتھ ہی، اسکول کا چیمپیئن بن چکا ہے پچھلے ماہ۔ ہم اس سال اُسے سالانہ آل پاکستان اسکریبل کمپیٹیشن میں بھیجنے کاارادہ رکھتے ہیں۔ وہ چیس (شطرنج) میں بھی اچھاہے۔''علی کے چہرے پر کرب کے سائے لہرارہے تھے۔ آنکھوں میں گولگز تھے، ورنہ رضانمی ضرور دیکھ لیتا۔ جو باتیں اسے خود معلوم ہونی چاہیے تھیں۔ وہ اُسے رضابتارہا تھا۔ وہ کتنا انجان تھااپنی اولاد سے ؟اور رضافقط دوماہ میں احمد کو اتنے اچھے سے جان گیا تھا۔

''کیامیں ایک برا باپ ہوں؟''اُس نے اسمبلی کے لیے باغ میں جمع ہوتے بچوں کو دیکھتے آہستگی سے پوچھا۔

''بہت برے۔''بڑی فرصت سے جواب دیا گیا تھا۔ پراس بار علی نے برا نہیں مانا، بس اُداسی سے مسکرادیا۔

''نشمیہ اوراحمد کے مزاجوں میں بہت فرق ہے۔ وہ زور زبردستی سے اپنی بات منوانا جانتی ہے۔ جبکہ احمد خاموش ہوجاتاہے۔''علی نے گولگز اُتارتے ہوئے آہستگی س کہا۔ رضاخاموشی سے اسکی بات سننے لگا۔

''میں کبھی اُسکے ساتھ اچھا وقت نہیں گزار سکا۔ یقیناً! غلطی میری بھی ہے۔ پر اب۔۔۔۔ جب میں چاہتا ہوں کہ اپنی غلطیاں سدھاروں، تو وہ مجھ سے ہاں یا نہ سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔ میں اُسے گلے لگانا چاہتا ہوں پر وہ میرے پاس نہیں آتا۔ کیا وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے؟'' اُس نے رضا کو دیکھتے پوچھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو رضا، اُسے اُسکی ساری کوتاہیاں یاد دلا کر بتاتا کہ تم اسی لائق ہو۔ پر فلحال اُسکے سامنے ایک بے بس باپ کھڑا تھا، جو خود کو بدلنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے مایوس نہیں کر سکتا تھا۔

''بچے نفرت نہیں کرتے، کسی سے نہیں کرتے۔ ماں باپ سے تو بالکل نہیں۔ وہ نفرت کرنے کے لئے بنے ہی نہیں ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''پر وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔'' وہ مایوس ہوا۔

''تو تم کرتے رہا کرو۔ میں نے تمہیں بتایا کہ احمد کو کیا پسند ہے؟ کیوں؟ تاکہ تم اُسکے لیے وہی سب کرو۔ تم نشمیہ کے لیے بھی تو کرتے ہو، اُسکے لیے وہ سب کرتے ہو جو وہ کہتی ہے۔ ایک دن اپنی کلاس ٹیچر کو خوش ہو کر بتا رہی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کو مہندی لگائی ہے۔'' اِس بات پر علی سامنے دیکھتا ہنسا۔

''تم احمد کے لیے بھی یہی سب کرو۔ اُسکے ساتھ فٹبال کھیلو، اُسکے ساتھ اسکریبل کا میچ رکھو۔ بچے صرف محبت اور توجہ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ جلدی مان جاتے ہیں۔ احمد بھی مان جائے گا۔''

''یہ سب کرنے کے لئے اب وقت نہیں رہا۔ کل ہمیں نکلنا ہے۔'' اُس نے ایک بار پھر مایوسی سے کہا۔

''واپس آ کر کر لینا۔ بہت وقت ہے ابھی!'' رضا نے تسلی دی۔

''اگر ہم زندہ واپس آئے تو۔۔۔۔'' اُس نے کہا تو رضا نے اُسے دیکھا۔

''تمہارا پتہ نہیں، پر میں تو زندہ واپس آنا چاہتا ہوں۔'' اِس بات پر علی نے بھنویں اُچکا کر اپنے برابر کھڑے رضا کو دیکھا۔

''تم تو خودکشی کرنے نہیں گئے تھے؟'' اُس کی زبان کبھی بھی نہیں رکنے والی تھی۔

''میں کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتا تھا بس! پتہ نہیں کس گدھے نے تم لوگوں کو کہا کہ میں خودکشی کرنے گیا ہوں۔'' رضا نے خفگی سے جواب دیا۔

''ہاں واقع! گدھے ہی ہیں ہم! فضول میں اپنا وقت برباد کیا تھا اُس روز۔'' علی نے باز نہیں آنا تھا۔

''چلو تم نے یہ تو تسلیم کیا کہ تم گدھے ہو۔'' وہ بھی بڑے سکون سے اُسے آگ لگاتا، کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔

''احمق!'' پیچھے کھڑا علی دانت کچکچا کر رہ گیا۔

---------+---------+--------

کھڑکیوں کے پردے برابر تھے۔ لیکن سورج کی روشنی ہلکی ہلکی اندر آنے کا راستہ بنا چکی تھی۔ نیم اندھیرے کمرے کی کرسی پر عمر خاموش سا ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ چہرہ کمرے کی چھت کی جانب اور آنکھیں ویران تھیں۔ وہ دو روز سے اسی طرح کمرے میں بند تھا۔ امی آکر اُسکے پاس بیٹھتیں، گھنٹوں روتی، اسکو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں، وہ انہیں یقین دلاتا رہتا کہ وہ اب ٹھیک ہے، مکمل صحت مند۔ پر انکو تسلی نہ ہوتی۔ ابّو اب تک نہیں آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُنہوں نے اسکی بات پر یقین نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنی ایک ایک رپورٹ، پوری میڈیکل ہسٹری ثبوت کے طور پر دے چکا تھا۔ پر انکی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔ دو روز سے وہ آفس بھی نہیں گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی پر اُس کے وجود میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ خیال تھا کہ امی ہی ہوں گی۔ پر کسی نے آکر سر پر ہاتھ رکھا۔ یہ امی کا ہاتھ نہیں تھا۔ اُس نے چونک کر دیکھا تو حفیظ صاحب کھڑے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''ابّو!'' وہ گھبرا کر سیدھا ہوا۔

''تم بتا بھی تو سکتے تھے۔ کیا ضروری تھا کہ خود کو اور ہم کو اتنی اذیت دیتے؟'' اُنہوں نے پوچھا تو اسکی آنکھیں بھر آئیں۔

''معاف کر دیں ابّو! غلطی کر دی میں نے بہت بڑی۔'' اُنہوں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ ماں باپ تو معاف کر دیتے ہیں۔ اُنہوں نے بھی کر دیا۔

جب رو رو کر دل کچھ ہلکا ہو گیا تو عمر نے انہیں اپنے سامنے بٹھایا اور انکا ہاتھ تھاما۔

''ابّو! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپکا بیٹا واپس نہیں لا سکتا۔'' وہ شرمندہ تھا۔

''میں نے غصّے میں کہا تھا بیٹا! خضر کی موت میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ اُس سے زیادہ شرمندہ تھے۔

''آپ روئیے مت!'' اُس نے انکے آنسو صاف کیے۔

''عمر! تم عمارہ کو بتا دو۔ اُسکا بھی حق ہے سچ جاننا۔'' اُنہوں نے یکدم ہی کہا تو وہ ساکت ہوا۔

''تم بتا دو اُسے، کیا معلوم وہ واپس آجائے۔ میں بھی اپنی پوتی کو دیکھ لوں گا۔'' عمر کو اب سمجھ آیا کہ اُنہوں نے یہ مطالبہ کیوں کیا؟ اُسکی طرح وہ بھی عمائمہ کو بہت یاد کرتے تھے۔

''ابّو!'' اُس نے پکارا۔ ''آپ مجھے ڈیڑھ ماہ کا وقت دیں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔ قسمت نے ایک مرتبہ پھر اُسے دس سال پیچھے لا کھڑا کیا تھا۔

''کیوں؟ڈیڑھ مہینے بعد بتانا ہی ہے تو اب بتادو۔''اُسکے پاس جواب نہ تھا۔کیا بتاتا؟ایک قاتل سے چھپ رہا ہے؟ایک انجان قاتل سے؟یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ بچ بھی سکے گا یا نہیں؟اُسکے ماں باپ ایک بیٹا کھونے کے بعد کیا یہ صدمہ برداشت کر سکیں گے؟

آج ایک بار پھر وہ سچ بتانے اور نہ بتانے کے درمیان پھنس گیا تھا۔۔۔

آج ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جارہی تھی۔۔۔۔

''ابّو!میں ایک کام کے سلسلے میں شہر سے دور جارہا ہوں۔ایک ایسی جگہ جہاں سے رابطہ بھی نہیں ہو سکے گا،سگنلز کے ایشوز ہیں وہاں۔''اُس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا تو وہ بھونچکا رہ گئے۔

''تم۔۔۔تم کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔جھوٹ بول رہے ہو نہ تم؟پھر کچھ چھپا رہے ہو؟پھر غلط بیانی کر رہے ہو؟کیا ہوا ہے عمر؟''وہ تقریباً چیخ اٹھے تھے۔اُنکے اس شدید ردعمل پر وہ حیران رہ گیا۔

''مجھے سچ بتاؤ عمر!سچ بتاؤ!''

''ابّو!میں اور علی کام کے سلسلے میں پہلے بھی شہر سے باہر گئے ہیں۔اِس بار ہم ایک حساس ادارے کے آفس کے لیے انٹیریئر کرنے جارہے ہیں۔جگہ اور ادارہ کیونکہ حساس ہے،تواِس لیے ہمیں اجازت نہیں ہے موبائل استعمال کرنے کی۔آپ پریشان نہ ہوں۔علی میرے ساتھ ہی ہوگا۔''اُسے نہیں معلوم اِس جھوٹ پر اُنہوں نے کتنا یقین کیا؟پر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا تو اسکے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''ہاں!''اُس نے بمشکل کہا۔

''کب جانا ہے؟''

''کل شام تک نکل جاؤں گا۔''اِس جواب پر اُنہوں نے بس اثبات میں سر ہلایا۔

اسکے بعد وہ جتنی دیر وہاں رہے،یا تو اچانک سے رونے لگتے یا پھر پریشان ہونے لگتے۔عمر اُنکی ہر کیفیت کو تحمل سے دیکھتا رہا۔پھر جب اُنہیں کچھ تسلی ہوئی تو اُسکے ماتھے پر بوسہ دیتے وہ وہاں سے چلے گئے۔

عمر کو نہیں سمجھ آرہا تھا کہ ماں باپ سے معافی ملنے کے بعد اُسے خوش ہونا چاہیے؟یا ایک بار پھر انہیں دھوکا دینے پر شرمندہ ہونا چاہیے؟ضمیر الگ کچوکے لگا رہا تھا۔مگر دل انہیں سچ بتانے پر بھی تیار نہ تھا۔

زندگی نے اُسے عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

---------+---------+--------

''سامان تیار رکھنا اپنا، کل صبح تم این جی او خود چلی جانا، واپسی پر میں پک کر لوں گا۔ تمہیں وہاں سے ڈائریکٹ امی کی طرف ہی چھوڑ دوں گا۔'' رات کے کھانے کی میز پر نوید نے بشریٰ سے کہا تھا۔

''تم پہلے بھی اتنے آپریشنز پر گئے ہو۔ میں ہمیشہ اکیلے رہی ہوں، یہاں تک کہ۔۔۔۔'' وہ رکی۔ نوید پوری توجہ سے اُسکی بات سننے لگا۔

''یہاں تک کہ ؟'' اُس نے کھانے کا چمچ ٹیبل پر رکھا، دونوں بازو باہم ملائے، میز پر ٹکا کر اُسے دیکھا۔

''یہاں تک کہ جب میں ذہنی طور پر صحت یاب نہیں تھی، تب بھی میں تمہارے پیچھے اکیلے رہتی تھی۔ اب کیا ہو گیا جو تم مجھے مامی کے گھر چھوڑنا چاہتے ہو؟'' اُسے اِس احتیاط کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''کیونکہ پچھلے چار سالوں سے میں کسی بھی ایسے آپریشن پر نہیں گیا، جو تین دن سے زیادہ پر محیط رہا ہو۔ اب مجھے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے لیے جانا ہے۔ تو میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی پریشانی ہو۔'' اُس نے وضاحت دی۔ سامنے بیٹھی عورت اور ایک وحید بھائی کے علاوہ وہ کسی کو وضاحت نہیں دیتا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ مجھے وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی؟'' اُس نے طنز نہیں کیا تھا۔ سادہ سے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ تم بھی میرا یقین کرو۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! تم کہہ رہے ہو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہو گے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن ہوا۔ پھر وہ کافی دیر اُس سے یہاں وہاں کی باتیں کرتی رہی۔ کچھ کام کے حوالے سے، کچھ گھر کے حوالے سے۔ نوید خاموشی سے، پر پوری توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ یہاں تک وہ اپنے اور اُسکے لیے چائے بنا کر لے آیا، تب بھی وہ مسلسل کچھ نہ کچھ بولتی رہی تھی۔ وہ مُسکراتے ہوئے اُسکے ساتھ بیٹھ گیا۔

''تم مجھے یاد کرو گے ؟'' اُس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اچانک ہی پوچھا تو نوید نے مسکراتی آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے دیکھا، پھر بولا۔

''نہیں!'' بدتمیز نہ ہو تو۔

''میں بھی نہیں کروں گی۔ اتنے کام ہوتے ہیں۔ بھلا یاد کرنے کا وقت کس کے پاس ہو گا؟'' وہ بھی نروٹھے انداز میں بولی تو وہ ہنسا۔

''میں بھلا کیسے یاد کروں گا تمہیں؟ تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہو گی۔'' اِس بات پر اُس نے حیران نظروں سے نوید کو دیکھا۔

''یہاں ہو گی۔'' پہلے دل پر شہادت کی انگلی رکھی، پھر وہی انگلی دماغ کے مقام پر رکھی۔ ''اور یہاں بھی۔ تو پھر یاد کیسے کروں؟'' دل و دماغ میں اُسکا مقام بتا کر اب وہ چائے پیتے، آنکھوں میں شرارت لیے، منہ کھولے خود کو تکتی بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ ڈائیلاگ کہاں سے سیکھے ایس ایس پی صاحب نے؟'' اُس نے ذرا مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''ایس ایس پی صاحب کیا انسان نہیں ہیں؟'' اُس نے مصنوئی خفگی سے پوچھا۔

''تھوڑے تھوڑے سے ہیں۔'' اِس بات پر دونوں ہنس دیئے۔

---------+---------+--------

''تمہاری کوئی بات میرے سمجھ نہیں آ سکی ہے۔ کل سے لیکر میں نے اب تک خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔'' وہ مکرم کو ڈیڑھ ماہ کے لیے مقدّس کے پاس چھوڑ کر جا رہا تھا۔ لہٰذا آج مکمل طور پر اُسکا سامان اور خود اُسے بھی اُسکی خالہ کے حوالے کرنے آیا تھا۔

''تو پھر کیا تم نے یقین کیا؟'' لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے مقدّم نے سوال کیا۔

''کر لیا! گو کہ میرا دماغ یہ بات نہیں مان رہا کہ اِس دور میں کسی شخص کو کام کے لیے بلایا جائے اور اُسے کچھ لمحوں کے لیے بھی اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن تم کہہ رہے ہو تو میں نے مان لیا ہے۔'' اپنی گود میں بیٹھے مکرم کے ہاتھوں سے کھیلتی مقدّس نے جواب دیا۔

''حساس ادارے ایسے ہی کام کرتے ہیں۔'' اُس نے وہی جھوٹ دہرایا۔ ''تم پریشان نہ ہو، میں جلد واپس آؤنگا۔ تب تک تم آرام سے شادی کی تیاریاں کرو۔'' اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ بس خاموش رہی۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ سیدھا ہوتے اچانک بولا۔

''کیا؟''

''تم نے مجھے بالکل اچانک کیسے پرپوز کر دیا؟ یعنی۔۔۔ مجھے تو یہ لگتا تھا کہ شاید میرا امیج تمہاری نظروں میں کافی خراب ہو گا۔'' اُس نے اُسکا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا تھا؟'' اُس نے پوچھا۔

''کیونکہ میں نے جان کر نہیں! پر ہمیشہ تمہیں سیکنڈ priority (دوسرا درجہ) دی ہے۔ تمہیں یقیناً برا تو لگتا ہو گا؟'' اُس نے جانچنا چاہا۔

''مقدّم!''وہ گہری سانس لیکر سیدھی ہوئی۔''میں خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتی۔نہ میں اُن لڑکیوں میں سے ہوں جنہیں ہر وقت پرنسز ٹریٹمینٹ (شہزادیوں جیسی دیکھ بھال) چاہیے ہوتی ہے۔دنیا بہت مشکل ہے،سب کی زندگی میں ہزاروں کام ہوتے ہیں۔یہاں کوئی بھی شخص چوبیس گھنٹے آپکے لیے دستیاب نہیں رہ سکتا۔ہمیں دوسروں کو سمجھنا چاہیے،انکو اسپیس دینی چاہیے۔ہر وقت کسی کے سر پر سوار رہنے سے آپکی اپنی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ہاں! مجھے کچھ وقت کے لیے تمہارا،مجھے دوسرے درجے پر رکھنا برا لگا تھا۔پھر میں نے سوچا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟میں کب سے ایسا سوچنے لگی ہوں؟تم بے شک! دیر سے آتے تھے،پر آجاتے تھے۔تم میری کہی کسی بات کو بھولتے بھی نہیں تھے،بھول جاتے تو معذرت بھی کر لیتے تھے۔آدمی معذرت اُسی سے کرتا ہے،جو اُسکے لیے اہم ہو۔اور ویسے بھی،میرا ماننا ہے کہ اگر کسی شخص میں کوئی ایک برائی ہو،پر سو اچھائیاں بھی موجود ہوں،تو ہمیں اُسکی ایک برائی کو نظر انداز کرنا چاہیے۔میں نے سوچا کہ تم شاید کبھی نہ کہہ سکو،میں کیوں وقت ضائع کروں؟تم سوچنے میں وقت لیتے ہو،میں تو نہیں! میں زیادہ سوچنے میں موقع نہیں گنواتی۔لہٰذا! میں نے یہ موقع بھی نہیں گنوایا۔''اُس نے مدلل انداز میں اپنی بات مکمل کی۔جبکہ وہ حیرت کا بت بنے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنی سنجیدہ گفتگو بھی کر سکتی ہے۔

''اگر میں انکار کر دیتا تو؟''اُس نے مذاق کی غرض سے پوچھا۔

''تو کیا؟تمہارے پاس انکار کا حق محفوظ ہے۔میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتی۔''آج وہ اُسے حیران کر رہی تھی۔

''میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسی سوچ رکھنے والی لڑکی ملی ہے۔''اُس نے دل سے کہا تو وہ مسکرائی۔

''مجھے اب جانا چاہیے۔''مقدّم نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

''میرا انتظار کرنا۔''مقدّم نے کہا۔

''ہمیشہ کروں گی۔''اُس نے کہا تو وہ مسکرایا اور جانے کے لئے پلٹ گیا۔وہ پلٹا تو ساری مُسکراہٹ سمٹ گئی۔

ایک بار ایسے ہی لیلیٰ بھی جا رہی تھی۔۔۔

ایک بار ایسے ہی اُس نے کہا تھا کہ واپس آؤ گی تو ہم شادی کریں گے۔۔۔۔۔

ایک بار ایسے ہی وہ بھی لیلیٰ کا انتظار کرنے کو تیار تھا۔۔۔

اور آج۔۔۔

زندگی پھر اُسی موڑ پر لا رہی تھی۔۔۔

آج کیا پھر کہانی خود کو دہرانے لگی تھی؟

---------+---------+--------

''تو آج ہم نے کیا سیکھا؟'' کتاب بند کر کے علی نے نشمیہ سے پوچھا۔

''کیا سیکھا؟'' اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''کہ ہمیں وقت پر سونا چاہیے، اور بڑوں کی ہر بات ماننی چاہیے۔'' علی نے اپنے برابر میں لیٹی نشمیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے سونے سے پہلے کہانی سنا رہا تھا۔

''یہ تو مجھے پہلے سے معلوم تھا۔'' اُس نے بتایا۔

''تم اب چپ کر کے سو جاؤ۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔'' علی نے اُسکا بک بک کرنے کا موڈ دیکھتے ہوئے، فوراً کمبل اُسکے منہ تک ڈالتے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''میں دس تک گنتی کر رہا ہوں۔ مجھے تم سوتی ہوئی نظر آنی چاہیے ہو۔'' علی نے کہا اور کمرے کی بالکنی کے پاس آ گیا۔

''میں دس سیکنڈ میں آ کر دیکھوں گا۔'' نشمیہ کو یاد دھانی کرواتے وہ بالکنی میں آیا۔ کل کے لیے سامان وہ باندھ چکا تھا۔ دل عجیب اُداس سا تھا۔ بچوں کو چھوڑ کر ایک انجان سفر اور ایک انجان منزل کی طرف جانا بہت مشکل تھا۔ بالکنی میں کھڑا وہ، جیبوں میں ہاتھ ڈالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ستارے خوب چمک رہے تھے۔ آسمانوں سے ہوتے اُسکی نظریں گھر کے لان تک گئیں۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں وہ فاطمہ ہی تھی۔ سینے پر بازو باندھے، نظریں فرش پر ٹکائے وہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ علی نے کچھ سوچ کر پیچھے سوئی نشمیہ کو دیکھا۔ وہ واقعی سو چکی تھی۔ پھر بالکنی کا دروازہ بند کر کے وہ بھی کمرے سے باہر آ گیا۔ سفیر صاحب احمد کو لیکر بازار گئے ہوئے تھے۔ اُسے فٹبال کے حوالے سے کچھ چیزیں خریدنی تھی۔ علی کو بھی ساتھ چلنے کو کہا پر اُس نے منع کر دیا کہ اُسکی موجودگی میں احمد بلاوجہ ہچکچاتا رہے گا۔

وہ آہستہ قدم اٹھاتے لان میں آ گیا، قدموں کی آواز پر فاطمہ رکی، نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

وہ رک گیا۔۔۔ تھم گیا۔۔۔ ٹھہر گیا۔۔۔

مستقل علاج سے اُسکی صحت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ بھرنے لگا تھا، آنکھوں کے نیچے سے حلقے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ جلد پر ایک شادابی سی آ گئی تھی۔ وہ سادگی میں بھی غضب ڈھانے لگی تھی۔

وہ علی کو دیکھ رہی تھی۔۔۔

اور علی اُسے۔۔۔۔

درمیان میں فاصلہ آٹھ دس قدموں کا تھا۔ یا شاید آٹھ دس سالوں کا!

وہ دونوں رک گئے تو وقت بھی رک گیا۔ ہوائیں بھی رک گئیں اور سانسیں بھی۔۔۔

پھر وقت چلا۔۔۔

چلا اور دونوں کو دس سال پیچھے لے گیا۔۔۔

اسی گھر کا لان تھا۔ ایسے ہی فاطمہ لان میں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ علی آفس کے کاموں میں مصروف ہوتا تو وہ یہاں وقت گزارتی پھر وہ کام مکمل کر کے یہیں آ جاتا۔ پھر اُسے دیکھ کر پوچھتا۔

''میرا انتظار کر رہی تھی؟'' وہ آج بھی سامنے کھڑا تھا۔ وہ خاموش تھا تو یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ کیا ماضی آس پاس کہیں گونج رہا تھا؟ یا اُنکے دل و دماغ میں؟

''نہیں! میں تو صرف میٹھے پان کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ نخرہ دکھاتے کہتی۔ وہ آج بھی سامنے تھی، خاموش تھی۔ تو پھر اُسکے جملے کانوں میں کیسے گونج رہے تھے؟

''میں ہمیشہ تمہیں انتظار کرواتا ہوں۔'' علی کو احساس ہوتا تو کہتا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ سنجیدہ ہو گیا تھا۔۔۔ سمجھدار ہو گیا تھا۔۔۔ بردبار ہو گیا تھا۔۔۔۔

''گول گپوں اور میٹھے پان کے لیے اتنا انتظار کر سکتی ہوں۔'' وہ اُسے چڑاتی۔ وہ بھی سامنے کھڑی تھی۔ پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ خود مختار ہو گئی تھی۔۔۔ خوددار ہو گئی تھی۔۔۔۔ باوقار ہو گئی تھی۔۔۔۔

اُن دونوں میں فاصلے کہاں سے آئے تھے؟ مسائل اتنے کیسے ہو گئے تھے؟ غلطی کس کی تھی؟ خود غرض کون ہوا تھا؟ علی یا فاطمہ؟ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ علی قدم بڑھا کر قریب آیا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

''میں نے لان میں صبح اسپرے کروایا ہے۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔'' وہ فکرمند ہوا۔

''میں اندر چلی جاتی ہوں۔''اُس نے سر جھکاتے ہوئے سعادت مندی سے کہااور اُسکے برابر سے ہوتی آگے بڑھ گئی۔ علی بھی اُسکے پیچھے خاموشی سے اندر آیا۔ فاطمہ کے قدم سیڑھیوں کی جانب تھے، علی رکا۔

''فاطمہ!''اُس نے آواز دی تو وہ رکی۔ پھر پلٹی اور اُسے دیکھا۔

''تم سے بات کرنی ہے۔''اُس نے آہستہ آواز میں کہاتو وہ سر ہلاتی وہیں آ کھڑی ہوئی جہاں علی تھا۔ مگر تھوڑا فاصلے پر۔

''میں نے تمہیں سچ بتادیا تھا، ابّا کو بھی سچ بتادیا ہے کل۔''اُس نے ابّا کو کل رات ایک ایک بات سچ سچ بتادی تھی۔ کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئے تھے۔ علی نے اُنہیں مضبوط رہنے کو کہا تھااور ساتھ تاکید کی تھی کہ بچوں کا خیال رکھیں۔

''ہمم!''اُس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میں بچوں کو اللہ کے بعد تمہارے حوالے کر کے جارہا ہوں۔''اُس نے کہاتو فاطمہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ کیا وہ اُس پر بھروسہ کر رہا تھا؟

''کیا۔۔۔کیا تم نے۔۔۔تم نے مجھے معاف کر دیا؟''اُس نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''میں انسان ہوں فاطمہ! مجھے ناخدا مت بناؤ۔ بار بار معافی نہ مانگو مجھ سے۔''علی کے لہجے میں دکھ تھا۔ اُس نے انکار کیا تھا نہ اقرار۔

''میں خود غرض ہوں علی! اب بھی چاہتی ہوں کہ آخرت میں سزا نہ ملے۔ اِس لیے بار بار تم سے معافی مانگتی ہوں۔''اُس نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ نمی دونوں طرف تھی۔ علی نے نظریں چرالیں۔

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک بار پھر تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ اِس اُمید پر کہ۔۔۔کہ اِس بار تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔ میرے پیچھے میرے بچوں کا خیال رکھو گی۔''اُس نے سر جھکائے ہی کہاتو پہلی بار فاطمہ مسکرائی۔

''میں تمہارا بھروسہ نہیں توڑوں گی۔''علی نے اسکی آواز سنی تو فرش پر نگاہیں ٹکائے ہی سر ہلادیا۔ وہ دوبارہ اُسکی آنکھوں میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ علی نے چہرہ اُٹھا کر اُسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ اُسکی نگاہوں نے آخر تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔

پورچ میں گاڑی کی آواز آرہی تھی۔ شاید سفیر صاحب آگئے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ نشمیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟

اللہ معاف کر سکتا ہے، تو بندہ کیوں نہیں؟

---------+---------+--------

مورخہ تین مئی:

دو روز سے وہ آفس نہیں گیا تھا۔ بیچارہ علی ہی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا آج وہ ہر صورت آفس جانا چاہتا تھا۔ تیزی سے ناشتہ کر کے وہ گھر کے گیراج میں آیا اور گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول کر اپنا لیپ ٹاپ اندر رکھا، پھر دروازہ بند کر کے مڑا تو پیچھے کھڑے حفیظ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نجانے کب وہاں آئے تھے؟

''ابّو! طبیعت ٹھیک ہے آپکی؟'' عمر نے انہیں خود کو خاموش نظروں سے تکتا پا کر پوچھا۔

''اپنا موبائل دینا۔'' انہوں نے کہا تو عمر حیران ہوا۔

''کیوں؟''

''اب سوال کرو گے مجھ سے؟'' وہ ناراض ہوئے۔

''نہیں! ہرگز نہیں! آپ لے سکتے ہیں۔'' اُس نے موبائل اُنکے حوالے کیا۔ اُنہوں نے اُسکا موبائل جیب میں ڈالا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''ابّو! آپ اندر کیوں بیٹھ گئے؟ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟ کہیں جانا ہے آپکو؟'' اُس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر پریشانی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ تمہارے آفس جاؤں گا۔'' اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''میرے آفس؟'' وہ مزید حیران ہوا۔

''ہاں! میں تمہارے دوست علی سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں بھی دیکھوں کہ تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟'' عمر کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''پر ابّو میں نے آپکو کل بتایا تو تھا۔'' وہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر اُنہیں ہو کیا گیا تھا؟

''میں علی سے سننا چاہتا ہوں۔'' اُنکے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔

''آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟'' اُس نے افسوس سے کہا۔

''نہیں!'' انہوں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا تو وہ خاموش رہ گیا۔

''جلدی بیٹھو گاڑی میں، دیر ہو رہی ہے۔'' انہوں نے اُسے سر جھکائے کھڑا دیکھ کر کہا تو وہ چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھا۔ پھر اُس نے گاڑی سٹارٹ کی اور آفس کے راستے پر ڈال دی۔ وہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھا۔ ابّو نے اُسے موقع ہی نہیں دیا تھا، ورنہ وہ علی سے رابطہ کر کے اُسے صورتحال سے آگاہ کر دیتا۔ پتہ نہیں علی انہیں کیا بتائے گا؟ سوچ سوچ کر اُسکا دل بیٹھ رہا تھا۔

''ابّو! ٹھیک ہے آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہے۔ پر میرا موبائل تو دے دیں۔'' راستے میں اُس نے کہا۔

''تاکہ تم اپنے دوست کو میرے آنے کی پیشگی اطلاع دے دو؟'' وہ بھی آخر اُسکے باپ تھے۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ ہی نہیں کر رہے تو میں کیا کہوں؟ حالانکہ میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔'' آخر میں اُسکی اپنی آواز نے اُسکا ساتھ نہیں دیا۔

''اگر جھوٹ نہیں بولا تو پھر پریشان کیوں ہو؟'' اُنہوں نے کہا۔

''نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔'' اُس نے لہجہ سنجیدہ رکھتے ہوئے کہا۔ آفس آ چکا تھا، جبکہ اُسکے ماتھے پر پسینے کے قطرے واضح تھے۔ وہ دونوں آفس کی عمارت میں داخل ہوئے اور لفٹ کے ذریعے اپنے مطلوبہ فلور پر پہنچے۔ پورے راستے عمر کو امید تھی کہ علی یہیں کہیں مل جائے تو وہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ ہی کر دے۔ پر وہ نظر نہ آیا۔ یا تو پہلے ہی آفس پہنچ چکا تھا یا آیا نہیں تھا اب تک۔

بلآخر جب وہ دونوں آفس میں داخل ہوئے تو ملازمین کے کیبنز کے آخر میں بنے کمرے میں، شیشے کے دروازے کے پار اپنی کرسی پر بیٹھا علی نظر آ گیا۔ وہ کام میں مصروف تھا۔ عمر نے تھوک نگلا۔

''کیا وہ ہے علی؟'' حفیظ صاحب نے اُسکی طرف اشارہ کر کے عمر سے پوچھا تو اُس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ وہ عمر سے بھی پہلے اُسکے آفس کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی۔ وہ اُسکے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔

''آ جائیں!'' علی نے سر اٹھائے بنا ہی اجازت دی۔ عمر نے دانت کچکچا کر اُسے دیکھا۔ کیا تھا جو چہرہ اُٹھا لیتا؟ اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہوئے تو علی نے چہرہ اٹھایا، اور اگلے ہی لمحے اُسکی آنکھوں میں تحیر اُمڈ آیا۔

''انکل آپ؟'' وہ جلدی سے کھڑا ہوا اور احتراماً اپنی کرسی چھوڑ کر اُنکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اُس نے اُنکی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو بیٹا؟'' اُنہوں نے سنجیدگی سے جواب دیتے عمر کو دیکھا جو علی کو ہی اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اُنکو خود کو دیکھتا پا کر سر جھکا گیا۔

''کیا کچھ ہوا ہے؟'' علی نے اُن دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''معاف کرنا بیٹا! تمہیں اسطرح تنگ کیا۔ پر میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اُنہوں نے کہا۔

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں انکل! آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔ بیٹھیں!'' اُس نے شرمندگی سے کہتے کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے، عمر بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جبکہ علی نے اپنی نشست سنبھالنے کی بجائے، سامنے صوفے پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ یہ بڑوں کا احترام تھا، حفیظ صاحب اُسکی تربیت سے بڑا متاثر ہوئے۔ وہ اِس طرح بیٹھے تھے کہ گاہے بگاہے عمر پر بھی نظر ڈال لیتے۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ عمر نے مجھے بتایا کہ وہ ڈیڑھ ماہ کے لیے کہیں جا رہا ہے۔ اب میں تم سے جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کہاں جا رہا ہے؟'' اُنہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں پوچھا تو علی نے عمر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''اُسکی طرف نہ دیکھو! مجھے بتاؤ جو تم جانتے ہو۔'' اُنکے لہجے میں ایک رعب تھا۔

''انکل! یہ اکیلا نہیں جا رہا ہم دونوں ہی جا رہے ہیں۔ ایک کلائنٹ ہیں، جنکے لیے ہمیں انٹیریر کرنا ہے۔ کام زیادہ ہے اِس لیے وقت بھی زیادہ لگے گا۔'' اُس نے آہستگی سے کہا تو عمر نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تو یہ کیسا کام ہے کہ تم لوگ ہم سے رابطہ نہیں کر سکتے؟'' انکا لہجہ تفتیشی تھا۔ عمر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''ہم حساس ادارے کے لیے کام کرنے جا رہے ہیں۔'' ویسے تو یہ جھوٹ بہت ہی بودا تھا۔ کیونکہ جس انسان کو حساس ادارے کے بارے میں ذرا بھی معلومات ہوں، وہ باآسانی جان سکتا ہے کہ ایسے ادارے یوں ہی کسی کو بھی کام کے لیے دعوت نہیں دے دیتے۔ پر فلوقت یہی جھوٹ مناسب لگا۔ عمر نے دیکھا تھا کہ علی کا جواب سن کر وہ کچھ مطمئن ہوئے ہیں۔

''کیا آپکو عمر نے نہیں بتایا تھا؟'' علی نے پوچھا۔

''بتایا تھا! پر مجھے بھروسہ نہیں تھا۔'' اُنہوں نے بنا کسی لگی لپٹی کے کہا۔

''اچھا؟ وہ کیوں؟'' وہ مسکرایا اور عمر کی جانب دیکھا جسکا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔

''کیونکہ اِس نے پہلے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ اِس نے ہمیں کہا تھا کہ یہ کیریئر بنانے بیرونِ ملک جا رہا ہے۔ حلانکہ یہ وہاں اپنی موت سے لڑنے گیا تھا۔ ہم سب سے جھوٹ بول کر۔'' اِس بات پر جہاں عمر نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا تھا وہیں علی کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔

''کک۔۔۔ کیا مطلب؟'' اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم؟اسے ٹیومر ہو گیا تھا۔اور اِسکا علاج تقریباً ناممکن تھا،اگر سرجری ہو جاتی تو زندہ رہنے کی امید کم تھی۔یہ ہم سے جھوٹ بول کر اور اپنی بیماری چھپا کر یہاں سے چلا گیا تھا۔اِس نے سرجری کروائی،اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا،چار سال کومہ میں رہا۔اور ہم سب یہاں اِس سے نفرت کرتے رہے کہ شاید یہ خود غرض ہو گیا ہے۔مجھے لگا شاید یہ ایک بار پھر یہی کر رہا ہے۔اِس لیے تم سے تصدیق چاہی۔''وہ رو دیئے تھے۔عمر کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں۔جبکہ علی۔۔۔۔علی کو لگا کہ آفس کی چھت اُسکے سر پر آ گری ہو۔

وہ آخری پیشی سے پہلے ہونے والی ملاقات۔۔۔۔

وہ آخری ملاقات۔۔۔۔

وہ آخری جھگڑا۔۔۔

سب نظروں کے سامنے گھوم گیا۔اُس نے جانے سے پہلے علی سے کہا تھا کہ کہا سنا معاف کرنا۔وہ اُس کو گلے لگانے آگے بڑھا تھا،پر علی نے اُس سے گلے ملنا تک گوارہ نہ کیا تھا۔اپنے اندھے جنون میں اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اُسکے دوست کو اچانک سے کیا ہو گیا ہے؟اُس نے اُس سے پوچھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔زندگی نے جیسے قسم کھائی تھی کہ وہ روزانہ علی سفیر کو آئینہ دکھائے گی۔اور وہ روزانہ زمین میں گڑے گا۔وہ کتنوں کا دل دکھانے کا سبب بنا تھا؟

اُسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ مسلسل عمر کو دیکھ رہا ہوں ع،جسکا چہرہ جھکا ہوا تھا۔جبکہ حفیظ صاحب اُسے مزید بھی کچھ بتا رہے تھے۔

''نہیں انکل!اِس بار یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔''علی نے خود کو کہتے سنا۔حالانکہ اِس بار بھی وہ جھوٹ ہی بول رہا تھا۔پر ایک باپ کو وہ مزید تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

''میں کیا کروں بیٹا؟میں اپنا ایک بیٹا کھو چکا ہوں۔مجھے ڈر لگتا ہے۔''یہ ایک اور انکشاف تھا۔یا اللہ!وہ کیا کچھ سہہ چکا تھا؟اور علی یہ سمجھتا رہا کہ وہ اُسے بیچ راہ میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔بیچ راہ میں تو علی نے اُسے چھوڑا تھا۔وہ جا رہا تھا تو علی نے اُسے جانے دیا تھا؟اُسے روکا نہیں،اُس سے پوچھا نہیں۔۔۔نہیں پوچھا کہ کیا ہوا تھا اُسے؟

''انکل!''علی نے اُنکا ہاتھ تھاما۔

''عمر میرا بھائی ہے۔''عمر جو کب سے نم آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔اِس جملے پر اُسکی سانسیں رکی۔سماعتیں بے یقین ہوئیں۔

''اِسکی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔یہ جیسے جا رہا ہے،میرا وعدہ ہے کہ میں اِسے اپنے ساتھ ویسے ہی واپس لیکر آؤں گا۔آپ بے فکر رہیں۔''اُس نے اُنہیں یقین دلاتے ہوئے کہا تو انہیں یقین آ گیا۔

''تمہارا شکریہ بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ جبکہ عمر کی سماعتیں تو لفظ **میرا بھائی** پر ہی رک گئی تھیں۔

''آپ کس طرح جائیں گے؟ کیا میں ڈرائیور سے کہہ کر آپکو ڈراپ کروادوں؟'' علی اب اُن کو کھڑا ہوتا دیکھ پوچھ رہا تھا۔

''شکریہ بیٹا! پر میرا ڈرائیور آچکا ہے۔ میں اُسے یہاں آنے کا کہہ کر آیا تھا۔'' انہوں نے کہا۔

''میں آپکو پارکنگ تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' اتنی دیر میں عمر پہلی دفعہ بولا۔

''نہیں تم بیٹھو! میں چلا جاؤں گا۔'' اُنہوں نے اشارے سے منع کرتے ہوئے اُسکا موبائل اُسے واپس کیا۔ پھر علی نے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ کیا اور وہ چلے گئے۔ اُنکے جانے کے بعد کمرے میں بس وہ دونوں رہ گئے، عمر کھڑا ہوا اور اُسے دیکھا۔ آنکھیں نم تھیں۔

''میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا، اگر۔۔۔'' عمر کہتے کہتے رکا۔ علی نے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ دیا، آگے بڑھا اور اُسکے گلے لگ گیا۔ عمر کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر نکلا، اور اُسکے کندھے میں جذب ہو گیا۔

''تم لوگوں نے میری دوستی کا صحیح امتحان لیا ہے۔ نہ نوید نے اپنے خدشے بتائے، نہ مقدّم نے جانے سے پہلے اطلاع دی، نہ رضا نے کچھ کہا اور نہ تم نے۔'' عمر نے اپنے کانوں میں اُسکی آواز سنی۔

''آئی ایم سوری!'' اُس نے بس اتنا ہی کہا تو علی اس سے الگ ہوا اور ناراضگی سے اُسے دیکھا۔

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ چاہئے زبردستی ہی کیوں نہ پوچھتا۔ پر میں اپنے جنون میں اندھا ہو گیا تھا۔'' علی نے اُسے کندھوں سے تھام کر، زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے اعتراف کیا۔ دل میں گڑی آخری پھانس بھی آج نکل گئی۔ اُسکے دوستوں نے اُسے چھوڑا نہیں تھا، وہ سب اپنی اپنی جنگ لڑنے کے لیے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''مجھے بتانا چاہیے تھا۔ پر شاید میں اتنا سمجھدار نہیں تھا۔'' اُس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ''پر میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔'' پھر اسکو دیکھ کر کہا۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس ایک دن کو زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیتا، کوئی اسے کبھی یاد نہ کرتا۔ بھول جاؤ اُس بات کو، سب سے زیادہ قصور میرا تھا۔'' علی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر آج ختم کرتے ہیں اس بات کو۔'' بلآخر صلح کے لیے پہلی کوشش ہو گئی۔

''بالکل! پر تم مجھے پہلے یہ بتاؤ ہے کہ تمہیں کیا ہوا تھا؟''اُس نے پوچھا تو عمر اثبات میں سر ہلاتے بیٹھ گیا۔ پھر وہ ہر شے اسے بتاتا چلا گیا۔ اُسے سن کر علی کو مزید شرمندگی نے آگھیرا۔ جتنے عرصے وہ اسے دھوکے باز اور بے مروت دوست سمجھ کر یاد کرتا رہا، اتنے عرصے وہ زندگی، موت اور رشتوں کی جنگ لڑتا رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں ایک بار پھر اُن سے جھوٹ بول رہا ہوں۔'' بات مکمل کر کے اُس نے آہستہ سے کہا۔

''بعض چیزیں وقت کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اس وقت تم اُنہیں سچ بتاؤ گے تو وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور تمہارا جانا بھی مشکل ہو جائیگا جو کہ اس وقت بہت ضروری ہے۔ تم اس بار مرنے نہیں جا رہے عمر! اپنی جان بچانے جا رہے ہو۔'' اُسکے برابر بیٹھے علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دینے والے لہجے میں کہا تو اُس نے سر ہلایا۔ پھر چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں نے بھی ابّو سے یہی جھوٹ بولا ہے۔'' اُس نے پوچھا۔

''کیونکہ آخری بار ایف آئی اے کے آفس میں حسین نے سب کو یہی جھوٹ بولنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے کیا کہا ہو گا؟ پر مجھے فوری طور پر یہی سمجھ آیا تھا۔'' وہ مُسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

''تمہارا شکریہ!'' عمر نے کہا۔

''شکریہ کس بات کا؟'' وہ انجان بنا۔

''جو بھی تم نے میرے لیے کیا، اُسکے لیے۔''

''اب تم نے دوست کہا ہے تو اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔'' علی نے کندھے اُچکاتے اُسے حیران کیا تھا۔ اُس نے علی کو دوست کہا تھا، تو اُس نے بھی تو اُسے بھائی کہا تھا۔

---------+---------+--------

''میں جلدی نہیں آسکوں گی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ آج این جی او میں ایک غیر ملکی وفد آرہا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔'' ایف آئی اے کی بلڈنگ میں نوید عالم فون کان سے لگائے بشریٰ کی بات سن رہا تھا۔ سیاہ جینز پر سیاہ پولو ٹی شرٹ پہنے، وہ دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔

''اِس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟'' اُس نے نرمی سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا نا کہ آج تم مجھے پک کرو گے، اور مامی کی طرف چھوڑو گے۔ جب وفد واپس جائیگا، تب تک تو تمہاری میٹنگ شروع ہو جائے گی شاید!'' وہ اُداس ہوئی۔ وہ آخری بار نوید کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ اگر میٹنگ شروع ہو بھی گئی تو میں ڈرائیور بھیج دوں گا۔ نہیں بلکہ رکو!'' وہ یکدم بولا۔ ''وحید بھائی بھی آج ملنے آئیں گے، انہیں فرّخ صاحب سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ انہیں کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں اپنے ساتھ ہی لے آئیں۔ پھر میٹنگ کے بعد میں تمہیں امی طرف خود چھوڑ دوں گا۔'' اُس نے منصوبہ ترتیب دیا۔

''تمہارے آفس؟'' اُسکی پوری آنکھیں کھلی تھیں۔

''ہاں! میرے آفس!'' وہ پھر مسکرایا۔ ''تم آؤ! میں تمہیں اپنا ذاتی آفس بھی دکھاؤں گا۔ تم وہیں انتظار کر لینا۔''

''چلو! جیسے تمہیں ٹھیک لگے۔'' وہ بولی، لہذا چہکا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر تم بھی اپنے وفد کو وقت دو، میں وحید بھائی کو بتاتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔ پھر اُس سے بات کرنے کے بعد وہ وحید کو پیغام بھیجنے لگا۔ اُسکی دو دن پہلے ہی کامیاب آپریشن سے واپسی ہوئی تھی۔ ابھی وہ چھٹی پر تھا۔

''سر!'' دروازے پر دستک ہوئی، تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ فیصل سامنے تھا۔ شیراز نیا نیا دلہا تھا۔ آج ہی چھٹیوں سے واپس آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ چہرے کی نرمی دوبارہ غائب ہو چکی تھی۔

''سر! آپکے دوستوں میں سے تین آ چکے ہیں۔ باقی دو کو بھی منصوبے کے مطابق تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جانا ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''ہونہہ۔۔۔'' اُس نے موبائل پر پیغام لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں سر ہلایا۔

''سر! گاڑی مطلوبہ مقام کے لیے یہیں سے نکلے گی۔ آپ کو بھی ساتھ ہی جانا ہے۔''

''میرا سامان گاڑی میں رکھ دینا۔ میں ساتھ نہیں جا رہا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''مطلب؟'' فیصل حیران ہوا۔

''اردو سمجھ نہیں آتی؟'' اُس نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔

''میرا مطلب! آپ ساتھ کیوں نہیں جا رہے؟'' اُس نے ذرا سنبھل کر پوچھا۔

''مجھے کچھ کام ہے۔وہ مکمل کر کے میں مطلوبہ مقام تک پہنچ جاؤں گا۔''اُس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے!''وہ چلا گیا تو نوید اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں باقی تمام لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔جب فرخ صاحب آئے تو اُن سب کو مشاورتی کمرے میں بلایا گیا۔نوید بھی پہنچ گیا۔ راستے اور مقام کے حوالے سے کچھ ہدایات تھیں،جو وہ ساتھ بیٹھے ایک انجان چہرے کو دے رہے تھے۔یہی شخص انہیں لیکر جانے والا تھا۔

''یہ غزنوی ہے۔''انہوں نے درمیان میں انجان چہرے کا تعارف کروایا۔''یہ بھی ایف آئی اے کا قابل نوجوان ہے۔یہ جگلوٹ تک تم سب کو ساتھ لیکر جائے گا۔جگلوٹ کے آگے suv نہیں جائیگی،وہاں سے آگے کا راستہ نوید کے ذمّے ہے۔''اُنہوں نے کہا۔

''جگلوٹ پہنچ کر سب کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا کیونکہ میں بعد میں آؤں گا۔''نوید کی سنجیدہ آواز گونجی۔

''تم ساتھ نہیں جا رہے؟''فرخ صاحب نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''مجھے کچھ بہت ضروری کام ہے،جو مکمل کر کے آؤں گا۔''وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔

''ٹھیک ہے!پر جلدی پہنچنا۔''اور وہ اُسے اپنی مرضی کرنے دیتے تھے۔

''کیا اب ہم جان سکتے ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''حسین نے پوچھا۔

''ابھی تو جگلوٹ!اُس سے آگے نوید کی مرضی کہ وہ کہاں سے لیکر جاتا ہے۔''انہوں اب بھی منزل کا پتہ نہیں دیا۔حسین نے نہایت ہی برا منہ بنایا تھا۔

''چلو غزنوی!تم گاڑی میں سامان لوڈ کرواؤ،تب تک فیصل!تم ان سب کو لیونگ ایریا میں بٹھاؤ۔''انہوں نے پہلے غزنوی پھر فیصل کو مخاطب کیا تھا۔ اُنکے حکم کے مطابق سب اُٹھ گئے۔نوید وہیں بیٹھا رہا۔اسے فرّخ صاحب سے کچھ بات کرنی تھی۔

فیصل انہیں لیونگ ایریا میں لے آیا۔یہاں مختلف آفس کے دروازے کھلتے تھے،یہ انتظار گاہ نہیں تھی۔پر ایف آئی اے کے افسران اکثر یہاں بیٹھ کر اپنا کوئی نہ کوئی کام کرتے، کبھی آرام کرتے تو کبھی کھانا پینا کھاتے نظر آتے تھے۔انہیں بھی وہاں بٹھا دیا تھا۔ویسے تو عام آدمی کو وہاں رسائی حاصل نہ تھی،پر فرّخ صاحب کا حکم تھا۔انہیں خُفیہ طریقے سے عمارت سے نکلنا تھا۔بنا کسی کی نظروں میں آئے۔

''جگلوٹ سے آگے تو استور آتا ہے۔یا تو ہم گلگت جا رہے ہیں یا اسکردو۔ ''یہ اندازہ مقدّم نے لگایا تھا۔وہ انہی علاقوں میں پلا بڑھا تھا۔

''میری گاڑی جب ایف آئی اے والے لے کر جا رہے تھے۔تب ابّو مشکوک ہو گئے تھے، میں نے انہیں کہا کہ سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ میری گاڑی لیکر جا رہا ہے، ڈرائیور ہے۔ مجھے مقام پر پہنچا کر یہ گاڑی گھر واپس چھوڑ جائے گا۔''عمر نے علی کو بتایا تھا۔ رضا گھوم پھر کے پورے لیونگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیونگ روم تھا تو خوبصورت، دیواروں پر مختلف آپریشنز، یا حکومتی ارکان کی طرف سے ملنے والے اعزازات کی تصاویر لگی تھیں۔

''میں نے بھی کم و بیش ایسا ہی بہانہ بنایا ہے۔''جواب مقدّم نے دیا تھا۔ اتنی دیر میں اُنہوں نے دائیں طرف والے کمرے میں نوید کو آتے دیکھا۔ وہ لیونگ روم سے نہیں آیا تھا، بلکہ اپنے کمرے کے پیچھے والے دروازے سے داخل ہوا تھا۔ اب وہ اُسے اپنی میز پر رکھے کچھ اہم کاغذات میں سر دیئے بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ لیونگ روم میں الگ گہما گہمی ہو رہی تھی۔ اب نوید کسی سے فون پر بات کرتا نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک اسکی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، بس لب ہلتے نظر آ رہے تھے۔

''اے بات سنو!''حسین نے پاس سے گزرتے، خوشبو اڑاتے، ہنستے مُسکراتے، خوش باش سے شیراز کو مخاطب کیا۔

''جی فرمایئے!''اُس نے ادب سے پوچھا۔ اب نوید کے کمرے میں عام سے لباس میں، کسرتی ڈیل ڈول والے اُسکے بھائی اور ساتھ میں ایک سنجیدہ مگر معصوم چہرے والی خاتون کو داخل ہوتے دیکھا جا سکتا تھا۔

''کیا تم نے کبھی اپنے ایس ایس پی صاحب، جناب نوید عالم کو ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟''حسین نے پوچھا تو آپس میں محو گفتگو عمر، علی اور مقدّم نے رک کر انہیں دیکھا۔ سارے لیونگ روم کا چکر کاٹنے کے بعد رضا بھی اُدھر ہی آ گیا۔

''ہنستے ہوئے تو نہیں۔۔۔۔''جواب دیتے شیراز کی نظریں نوید کے کمرے تک گئیں۔''پر ہاں! مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔''اُس نے کہا۔ نوید اپنے سامنے بشریٰ کو دیکھ کر بیساختہ کھڑا ہوا۔

''ہم نے تو نہیں دیکھا۔''حسین نے مایوسی سے کہا۔

''اب دیکھ لو!''یہ کھوئی کھوئی سی آواز مقدّم کی تھی، جس کی حیران نظریں نوید کے کمرے کی جانب تھیں۔ کم و بیش ایسی ہی حالت باقی سب کی بھی تھی۔ حسین نے بھی اُسی جانب دیکھا اور اُسکا پورا کا پورا منہ ہی کھل گیا۔

ایس ایس پی نوید عالم مسکرا رہا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اُسکی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں، اُسکا چہرہ بھی مسکرا رہا تھا۔ انداز میں نرمی نجانے کہاں سے اُمڈ آئی تھی؟

وحید، فرخ صاحب سے ملنے جا چکا تھا۔ بشریٰ ہر ایک شے کی جانب اشارہ کر کے نوید سے کچھ نہ کچھ سوال کر رہی تھی، وہ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے پوری توجہ سے اُسکی بات سنتا، پھر اُسے جواب دیتا۔ وہ اُسکی ریک میں رکھی تصاویر اور اعزازات اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہی تھی، جسے ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔

نوید کے چہرے سے مُسکراہٹ جدا نہ ہو رہی تھی، نظریں تھیں کہ بشریٰ کے چہرے کا طواف کرتیں، وہاں سے ایک پل ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ انداز میں ایک عقیدت اور ایک احترام سا تھا۔

''دیکھو ذرا۔۔۔۔ دیکھو اِس آدمی کو!'' حسین کے منہ سے تو الفاظ ہی نہیں ادا ہو رہے تھے۔

''دیکھ ہی رہے ہیں اتنی دیر سے۔'' رضا نے تپ کر کہا تھا۔

''میں یہاں اِسکو مسکراتا دیکھنے کے لیے ترس گیا اور یہ ہے کہ کیسے ہنس ہنس کر ان خاتون سے بات کر رہا ہے۔'' حسین کے اپنے ہی غم تھے۔

''اور کتنی عزت سے۔'' مقدّم نے کہا۔

''ہاں! ہمیں تو گھورتا ہی ایسے ہے، جیسے نظروں سے ہی سالم نگل لے گا۔'' حسین اور اُسکے نہ ختم ہونے والے دکھ!

''ویسے یہ خاتون ہیں کون؟'' علی نے سب کی زبانوں کا سوال چھینا۔

''نوید صاحب کی پسندیدہ عورت!'' یہ جواب شیراز نے دیا تھا۔ سب نے پلٹ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں نے نوید صاحب کو سوائے اُنکی اہلیہ کے، کسی کے ساتھ مسکراتے نہیں دیکھا۔'' شیراز نے مسکراتے ہوئے بتایا تو اب ایک بار پھر سب نے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔

''اُسکی بیوی جو اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی؟'' علی نے صرف سوچا، پر کہا کچھ نہیں۔ نوید کے لیے دل میں عزت کچھ اور بڑھی۔

''آپ لوگ آجائیں!'' لیونگ روم کا دروازہ کھول کر غزنوی نے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''چلیں ہمیں نکلنا ہے۔'' شیراز نے انہیں کہا تو سب سر ہلاتے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اپنے کمرے میں نوید ابھی بھی بشریٰ کو اپنی چیزیں پوری خوشی سے دکھا رہا تھا۔

---------+---------+--------

''نوید! تم مجھ سے روز بات کرو گے نا؟'' وہ آنکھوں میں آس لیے اُس سے پوچھ رہی تھی۔ پہلے بھی نوید جب کبھی آپریشنز پر گیا تو اُس سے بات کیے اُسے کئی کئی ہفتے اور بعض دفعہ مہینہ ہو جاتا۔ اُسکا دل ایسا خالی ہو جاتا جیسے اُس میں کچھ نہ ہو۔ وہ جلے پیر کی بلی کی مانند اُسکا انتظار کرتی تھی۔ لیکن تب بچے تھے، تو وہ خود کو مضبوط بنا لیتی۔ پر اب؟ اب وہ کیا کرے گی؟

''میں تم سے روز بات کروں گا۔ میرا وعدہ ہے!'' وہ اپنی من مانی کرتا تھا، اور فرخ صاحب اُسے کرنے دیتے تھے۔ ہاں! وہ بشریٰ سے رابطہ کر سکتا تھا۔

اِس وقت وہ دونوں نوید کی والدہ کے گھر میں موجود تھے، بشریٰ کے لیے مختص کیے گئے کمرے میں وہ سامان رکھنے آیا تھا۔ جب اُس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے؟ یہاں برابر میں ایک گھر ہے۔ پناہ گاہ نام ہے اُسکا، جزا وہاں ٹیچر ہے۔ اُس گھر میں ایک شخص ہے، جس نے تقریباً تیس کے قریب یتیم اور لاوارث بچوں کو ایڈاپٹ کیا ہوا ہے۔ وہ بچے ہر عمر کے ہیں، چھوٹے اور بڑے بھی۔ تم بھی جانا وہاں جزا کے ساتھ، تمہیں اچھا لگے گا۔'' نوید نے کہا۔

''کیا وہ کوئی یتیم خانہ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''اوں ہوں!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ بس ایک شخص ہے، جس نے ان بچوں کو اپنے خاندان کی طرح رکھا ہے۔ وہ انکا فوسٹر فادر ہے۔'' اُس نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نوید اُسکا سامان سیٹ کرنے لگا تو وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''اب میں نکلوں گا۔ امی وحید بھائی کی طرف ہیں، جبکہ جزا یہیں ہے۔ تم پریشان نہ ہونا، میں پہنچ کر تمہیں اطلاع دے دوں گا۔'' اُس نے کہا۔

''تم چپ کیوں ہو؟'' نوید نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا تو، اُس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔

''تم واپس آؤ گے نا؟'' وہ کیا سوچ رہی تھی؟

''بشریٰ!'' اُس نے اسکے دونوں ہاتھ تھامے۔

''میں کیوں واپس نہیں آؤں گا؟''

''واپس ضرور آنا نوید! میرے لیے آنا۔ میرا کوئی نہیں ہے تمہارے علاوہ!'' نوید کا دل دکھا، اُسکے آنسو گراں گزرے تھے۔

''تمہارے لیے ضرور واپس آؤں گا۔'' اس نے کہا تو وہ سر جھکائے رو دی۔ پہلے وہ ایسے نہیں کرتی تھی۔

''میں ضرور آؤنگا۔ صرف تمہارے لیے۔۔۔'' اُس نے اُسکے آنسو صاف کرتے تسلی دی۔

''اب رو تو مت، ورنہ میرے لیے جانا مشکل ہو گا۔ مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کیا کرو۔'' اُس نے مسکراتے لہجے میں کہا تو وہ آنسو پونچھتی ہنسی۔

''اب جاؤ! خیریت سے جاؤ! اور سلامتی سے واپس آؤ۔'' اُس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ مسکرایا۔ پھر وہ اُسے چھوڑنے کے لئے باہر تک آئی۔

نوید نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک بار پھر اُسے دیکھا۔ وہ دروازے پر اُداس سی کھڑی تھی۔ اُس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو تھوڑی کے قریب لے جا کر مسکرانے کا نشان بنایا اور ساتھ خود بھی مسکرایا۔ اسکے اُداس چہرے پر مسکراہٹ بکھیر ہے۔ پھر نوید نے سینے پر ہاتھ رکھا، اور سر جھکا کر اُسے خدا حافظ کہا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بشریٰ نے دروازہ بند کر دیا تو وہ تسلی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

---------+---------+--------

دس سال قبل (مقدّم کے نکاح کے بعد)

''تم اتنے بیمار تھے تو ہم میں سے کسی کو بتا دیتے، تم ویسے ہی اکیلے رہتے ہو، پتہ نہیں اپنا خیال کیسے رکھ رہے ہو گے۔ ہوا کیا تھا تمہیں؟'' نوید نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایسی بھی بڑی بات نہیں تھی، بس بخار تھا اور اتنی سی بات کے لیے کیا تنگ کرتا تم لوگوں کو؟ اب بہتر ہوں۔ الحمد اللہ!'' رضا نے آہستہ آواز میں کہا، اُسکا گلا ابھی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ آواز نکلنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''خیر مجھے تو اب بھی بہتر نہیں لگ رہے'' نوید رضامند نہیں لگتا تھا۔

''بہتری آجائے گی طبیعت میں، جب ہم شمالی علاقہ جات جائینگے'' حسین نے کہا۔

''کیا مطلب تم سب سنجیدہ ہو؟'' مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ سمجھا تھا کہ شمالی علاقی جات جانے والی بات، وہ لوگ از راہ مذاق کر رہے ہیں۔

''میں تو بالکل ہوں'' نوید نے جواب دیا۔

''مقّی ہمیں اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا۔'' حسین نے دکھی ہونے کی اداکاری کی۔

''صرف تمہیں۔'' مقدّم نے تصحیح کی۔

''تو کب جانا ہے؟'' نوید نے اُنہیں پھر سے غیر سنجیدہ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اگلے ماہ چلتے ہیں۔ اور کون کون سی جگہ دیکھنی ہے، اِسکا فیصلہ مقدّم کرے گا کیونکہ یہ اُن علاقوں کو بہتر جانتا ہے'' عمر نے کہا۔ کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا رضا کے علاوہ سب ہی نے اپنی پلیٹوں میں کھانا لینا شروع کر دیا تھا۔

''تم کیوں نہیں لے رہے؟'' علی نے اُسکو ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''لیتا ہوں۔'' پھر مختصر سا جواب۔

''اگلے مہینے نہیں، اُسکے اگلے مہینے بھی نہیں اور اُسکے اگلے دو مہینے بھی نہیں۔'' نوید نے اچانک ہی کہا۔ رضا نے پلیٹ میں چند چمچے چاول نکالے پھر اُنہیں چمچ کی مدد سے بس یہاں وہاں ہلانے لگا۔ منہ میں اُس نے اب تک ایک لقمہ بھی نہ ڈالا تھا۔

''کیوں بھئی ؟ ابھی تو بہت اچھل رہے تھے جانے کے لئے ؟'' حسین بدمزہ ہوا۔

''کیوں کہ اگلے چھ مہینے تک تو علی کہیں نہیں جانے والا اور یہ نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔'' نوید نے اعلان کیا۔

''کیوں علی تمہاری بیوی ہے، جو اُسکے بنا تمہارا گزارا نہیں ؟'' حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم کھا کیوں نہیں رہے رضا؟'' اُنکی باتوں سے بے نیاز علی، رضا کو بغور دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

''بیوی کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ علی کیوں نہیں جائے گا؟'' مقدّم، حسین سے زیادہ مشکوک ہوا۔

''اِسکی شادی ہے نا اگلے مہینے۔'' رضا سے بات کرتا علی، نوید کی بات پر جھٹکے سے اُنکی جانب مڑا تھا۔ باقی سب نے اِس بات کو مذاق کے پیرائے میں ہی لیا تھا۔

''ارے ہاں ! میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ میری شادی ہے دو مہینے بعد۔'' اُس نے جتنے آرام سے بم پھوڑا تھا، اتنی ہی تیزی سے وہاں سب کو سانپ سونگھا تھا۔ مقدّم تو باقاعدہ منہ میں چمچ ڈال کر نکالنا ہی بھول گیا تھا۔

''ایسے مت دیکھو مجھے، میں بتانے ہی والا تھا۔'' وہ گڑبڑایا۔

''ہاں ! اِس بیچارے کو تو خود ایک مہینے پہلے پتہ چلا ہے۔'' اب کہ نوید نے دوسرا بم پھوڑا تھا۔ علی نے اسکو کُہنی مارنی چاہی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب شدید صدمے کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں پتہ تھا؟'' سب سے پہلے حسین کا سکتہ ٹوٹا، تو اس نے سنجیدگی سے نوید سے پوچھا۔ اُس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر کھانا کھانا شروع کر دیا جیسے یہی دنیا کا سب سے ضروری کام ہو۔

''تمہیں پتہ تھا؟'' اب کہ اُس نے مقدّم سے پوچھا۔ اُس نے منہ سے چمچ واپس نکال کر انتہائی دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔ گھورتی نظریں علی پر ہی ٹکی تھیں۔

''اور تمہیں ؟'' اب کہ وہ عمر کی جانب متوجہ ہوا۔ اُس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی دوستی پر جہاں صرف ایک کو معلوم ہے اور باقیوں کو رشتے داروں کے طرح اطلاع دی جارہی ہے۔'' حسین نے ملکہ جذبات بنتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں علی کو گھور رہے تھے اور وہ پوری دلجمعی سے کھانا کھاتے نوید کو، رضا اس پوری صورتحال پر بس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

''میں نے اپنے امّاں ابّا کو راضی کرنے سے لیکر بات پکی ہونے تک، اور وہاں سے آگے نکاح ہونے تک ایک ایک عمل، تم سب کو بتایا، اور دیکھو ذرا اس بیغیرت انسان کو!'' مقدّم نے تو شدت غم سے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اور وہ ساری باتیں ہم نے کتنی بیزاری سے اور کس قدر حالت مجبوری میں سنی تھیں یہ ہم سے پوچھو، بس اسی تکلیف سے تم سب کو بچانا چاہا تھا میں نے۔'' علی بھی ڈھٹائی سے بولا تھا۔

''چھوڑ دو اس بے شرم آدمی کو مقّی! ہم چاروں اسکی شادی پر جانے کے بجائے شمالی علاقہ جات ہی جائینگے۔'' حسین نے اُسے گھورتے ہوئے، اُسکی سزا تجویز کی۔

''چاروں سے تمہاری مراد؟'' نوید کے کان کھڑے ہوئے۔

''چاروں سے اِسکی مراد تم تو بالکل نہیں ہو۔'' مقدّم ٹھیک ٹھاک تپا ہوا تھا۔

''اُسکو وضاحت دینے کا موقع تو دو!'' عمر کے اندر کا ہمدرد انسان ہمیشہ کی طرح جاگ گیا تھا۔

''ہمیں کوئی وضاحت نہیں سننی۔'' مقدم کچھ سننے پر رضامند ہی نہ تھا۔

''میں دے بھی نہیں رہا۔'' علی بھی انکو خاطر میں نہ لا رہا تھا۔

''تم لوگوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہو تو اُسکی بات بھی سن لو۔'' عمر نے ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کو لتاڑا تھا۔

''دیکھو رضا اور عمر!'' علی نے صرف اُن دونوں کو مخاطب کیا۔

''میرے ابّا مجھ سے دو سال سے ناراض تھے، اب اُنہوں نے مجھے خود بلا کر مجھ سے بات کی اور کہا کہ انہوں میں میرے لیے لڑکی پسند کی ہے اور وہ امتحانات کے دو ماہ بعد میری شادی کروانا چاہتے ہیں، تو میں کیسے منع کرتا؟ اور تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتا سکا، کیونکہ مجھے خود تین سے چار ہفتے قبل یہ بات معلوم ہوئی، تو میں تم لوگوں کو کیسے بتاتا؟'' اُس نے صرف اور صرف اُن دونوں سے ہی بات کی تھی۔

''جیسے نوید کو بتایا تھا۔'' حسین چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''آغا کا نکاح تھا نہ یار درمیان میں، اسی لیے نہیں بتایا ہو گا۔'' عمر نے اُسکی طرفداری کرنے کی کوشش کی۔

''بہت ہی بھونڈا بہانہ ہے۔''مقدم نے یہ بہانہ بھی رد کیا۔

''دیکھو! میرا کوئی بھائی ہے نہیں، اور کزن بھی کوئی نہیں لہٰذا اب تم تینوں نے ہی میری مدد کرنی ہے۔''علی نے ان دونوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالا تھا۔

''اور یہ دو لوگ نہیں آرہے کیا؟''عمر نے اشارے سے پوچھا۔

''یہ دو لوگ تو شمالی علاقہ جات نہیں جارہے کیا؟''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''صرف ہم دو نہیں، پلان سب کا تھا خصوصی طور پر اس بھائی کا۔''مقدّم نے انگلی سے نوید کی جانب اشارہ کیا۔

''میں نہیں جارہا۔''اُس نے سب سے پہلے یوٹرن لیا۔

''میں بھی نہیں جارہا۔''مقدّم کے لاکھ گھورنے کے باوجود عمر نے بھی بیان بدلا۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟''اب کہ حسین نے رضا کو بھی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

''میرے پاس فضول پیسے نہیں ہیں برباد کرنے کو، لہٰذا میں شادی میں ہی آرہا ہوں۔''اُس نے بھی ہری جھنڈی دکھائی۔

''ویسے پیسے تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہیں۔''نوید کو ایک اور بہانہ یاد آیا۔

''تمہیں پیسوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ تم اپنا ایک قدم ہی بڑھالو تو اگلے شہر میں ہوگے۔''حسین نے اُسکے قد کو نشانہ بنایا تھا۔

''اب جبکہ سب کا یہی ارادہ ہے تو میں بھی علی کو معاف کرتے ہوئے شادی میں آنے کو تیار ہوں۔''مقدم نے اچانک ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تو اِس غدّاری پر حسین نے زوردار قسم کا تھپڑ اُسکے کندھوں پر جڑا تھا، وہ بلبلا اُٹھا۔

''حالانکہ آنا تم لوگوں نے میری شادی میں ہی ہے۔ لیکن فضول کے ڈرامے کرنا ضروری ہے۔''علی نے بیزار ہوتے ہوئے کہا، پھر حسین کو دیکھا جو ابھی تک روٹھا بیٹھا تھا۔

''چلو یار پریشان نہ ہو، ہم یہ گھومنے کا منصوبہ دو چار مہینے بعد بنالینگے۔''علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو، جنکی شادیاں ہو جاتی ہیں نا پھر وہ کبھی نہیں ملتے۔ یہ بھی تم آج آخری بار ہمارے ساتھ بیٹھ رہے ہو۔''

''تمہیں بڑا تجربہ ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوتا، میرا ابھی تو کل ہی نکاح ہوا ہے، دیکھ لو تم سب کے ساتھ ہوں۔'' مقدم نے فخر سے اپنی مثال دی۔

''وہ تو لیلیٰ اپنے گاؤں چلی گئی ہے، آج صبح ہی، اسی لیے تم یہاں ہو۔'' عمر نے دو منٹ میں اُسکا سارا فخر نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''ختم کرو اس موضوع کو اب، ہم سب اس عید کے بعد چلیں گے۔'' اب علی کو حقیقتاً غصّہ آ گیا تھا۔ لہٰذا سب نے فوراً سے حامی بھری اور انسان بن کر بیٹھ گئے، پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

''تو اُسکی نفسیاتی بیماری کی وجہ یہ تھی۔'' بالکل اچانک ہی حسین نے کہا تو وہاں قہقہ پڑا تھا۔ علی نے دانت کچکچاتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔ نوید شادی کی تیاریوں پر بات کر رہا تھا، عمر رضا کو تھوڑی دیر پہلے حسین کی ماری گئی جگت کا مطلب سمجھا رہا تھا، جسے سمجھ کر وہ سر ہلا رہا تھا، مقدّم شمالی علاقے جانے کے سارے منصوبے ابھی سے طے کر رہا تھا۔

فضاء خوشگوار تھی، دوستی مضبوط تھی اور خوشیاں منتظر۔۔۔

لیکن ایسا دائمی تو نہیں رہنے والا تھا۔۔۔

وہ دوبارہ ایسے اکھٹے ہونے والے تھے۔۔۔

لیکن ایسے نہیں، اس مقام پر نہیں اور اِن حالات میں نہیں۔۔۔

قسمت میں اُنکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جات جانا لکھا تھا۔

لیکن ابھی نہیں۔۔۔

اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ کسی اور وقت پر، کسی اور لمحے میں، اُنکی یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔۔۔

لیکن تب نہ وہ ایک دوسرے کے دوست رہنے والے تھا نہ انکو ایسے کسی سفر کی خواہش رہنے والی تھی۔۔۔۔

ایک منصوبہ اُنہوں نے بنایا تھا اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔۔

---------+---------+--------

ایک منصوبہ انہوں نے بنایا تھا، اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔

قسمت میں انکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جات جانا لکھا تھا۔۔۔۔

آج، ابھی، پورے دس سالوں بعد۔۔۔۔

اس بار بھی منصوبہ نوید کا تھا۔۔۔

وہ جا رہے تھے۔۔۔۔

عید کے بعد ہی جا رہے تھے۔۔۔۔

اور علی کی شادی کے پورے دو ماہ بعد۔۔۔۔

مقدّم کی شادی سے پہلے۔۔۔۔

قدرت نے انکی خواہش حرف باحرف پوری کی تھی۔۔۔۔

قسمت اُنکی خواہش پر، دس سال پہلے ہنسی ضرور تھی۔۔۔۔

---------+---------+--------

سترہواں باب

اجنبی راستوں کے مسافر

مورخہ پانچ اگست:

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ کمرے کی ایک کونے کی دیوار پر سجے اسلحوں کے نیچے رکھی میز پر ایک ڈائری اور کچھ صفحات بکھرے پڑے تھے۔ میز پر رکھے پیلے اسٹڈی بلب کی روشنی میں صفحات واضح تھے۔ ڈائری مکمل ہو چکی تھی، لیکن اسکی کہانی نہیں! لہٰذا وہ اب کورے صفحوں کا استعمال کر رہا تھا۔ آدھوں پر کام ہو چکا تھا اور آدھوں پر، وہ سیاہ لباس میں، نیم اندھیرے کمرے میں گم ہوتا وجود، جھکا ہوا بقایا کام مکمل کر رہا تھا۔ اُس نے صفحہ مکمل کر کے ایک مرتبہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔

وہی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔۔

مقابل کو مبہوت کر دینے والی۔۔۔

پھر اُس نے وہ صفحہ بقیہ صفحات کے اوپر رکھ دیا۔ اب وہ نیا صفحہ کھولے بقیہ کام مکمل کرنے لگا۔ میز کے پیلے بلب کی روشنی میں اُسکا تھوڑی دیر قبل مکمل کیا گیا صفحہ واضح ہو رہا تھا۔ اُسکی خوبصورت لکھائی میں لکھے الفاظ اب نظر آنے لگے تھے۔

اور پھر مئی کی تین تاریخ کو ایف آئی اے اُنہیں چھپتے چھپاتے شہر سے دور لے گئی۔ ایف آئی اے کہتی ہے کہ انہیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے اُن چھے لوگوں پر نظر رکھی ہو، وہ ٹھیک کہتی ہے۔ بھلا! میں کسی پر نظریں کیوں رکھواتا؟ جبکہ میں اُنکے سایوں سے بھی زیادہ اُنکے قریب تھا۔ میں ہر ہر لمحہ باخبر تھا۔ چاہتا تو کہہ دیتا، پر نہیں! ایسے تو کھیل میں مزا نہ آتا۔

تھوڑا اُن لوگوں کو مجھ سے چھپنے دو۔ تھوڑا اپنا دماغ چلانے دو، لیکن جتنا دماغ چلا لیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں جان سکتا کہ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور کہاں سے اُنہیں دیکھ رہا ہوں؟ آہ۔۔۔ اس کھیل میں مزا بہت آیا تھا۔

پھر وہ لوگ پہنچ گئے۔ اپنی جان بچاتے، مجھ سے چھپتے چھپاتے وہ لوگ اُس پرانی حویلی پہنچ گئے۔

مجھ سے چھپتے۔۔۔ آہ۔۔۔ میں ہنسنا چاہتا ہوں۔

وہ مجھ سے چھپ رہے تھے۔ جبکہ میں تو سب جانتا تھا۔ پر کھیل جاری رہنے دیا کہ اصل مزا تو کھیلنے میں آرہا تھا۔

---------+---------+--------

ٹائر چرچرائے اور گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی۔ رضا نے آنکھیں مل کر یہاں وہاں دیکھا۔ اُسکے برابر والی نشست پر عمر پشت سے سر ٹکائے بے خبر سو رہا تھا۔ علی سامنے والی نشست پر موبائل ہاتھوں میں لیے کچھ دیکھ رہا تھا۔ رضا کو ہڑبڑا کر اُٹھتا دیکھ، اُس نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر دیکھا، پھر دوبارہ اپنے سابقہ کام میں مشغول ہو گیا۔

مقدّم گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر اتر چکا تھا، اور ساتھ میں اُسکا بہترین دوست حسین بھی۔ رضا نے ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ لوگ تین روز سے مستقل سفر میں تھے۔ اور آگے بھی سفر باقی تھا۔ درمیان میں صرف ایک رات کے لیے اسلام آباد میں قیام کیا تھا۔

اُس نے ایک نظر علی کو دیکھا، پھر suv کا دروازہ کھول کر خود بھی باہر آ گیا۔ بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی۔

''ہمارا ڈرائیور کہاں ہے؟'' رضا نے اُن دونوں کے قریب آتے جمائی روکتے ہوئے پوچھا۔ ایک طرف کھائی تھی، تو دوسری جانب دیو قامت پہاڑوں کے درمیان بنی سڑک کے کنارے، چھوٹے چھوٹے سے ڈھابے۔ کرسیوں پر اکادکا فیملیز کھانا کھاتے یا آرام کے عرض سے کچھ دیر قیام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی دور بہت سی جیپ قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں پہاڑوں سے زیادہ خوفناک کوئی شے نہ لگتی تھی۔

''وہ ایس ایچ او غزنوی ہے۔ ہمارا ڈرائیور نہیں!'' حسین نے تصحیح کی۔ وہ لوگ جس غزنوی کو ایف آئی اے کے آفس میں سنجیدہ اور خاموش شخص سمجھے تھے، اُس شخص نے پورے راستے اپنا شجرہ نسب بتا کر انکا ٹھیک ٹھاک دماغ کھایا تھا۔ بتانے کا مقصد فقط یہی تھا کہ میں ایک ایس ایچ او ہوں، ایسے ہی کسی کی ڈرائیوری کرنے نہیں آ جاتا۔ یہ تو کیس بہت اہم ہے اِس لئے یہاں ہوں۔ ہونہہ! ڈرائیور نہ سمجھا جائے مجھے۔

''تو وہ ہے کہاں؟'' رضا نے سوال دہرایا۔

''سامنے چائے لینے گیا ہے۔'' مقدّم نے بتایا۔

''کیا ہم چائے پینے رکے ہیں؟'' اُس نے گاڑی سے ٹیک لگاتے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اچنبھے سے پوچھا۔ اُسکو اِس وقت یہاں، فقط چائے پینے کی غرض سے رکنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔

''نہیں! ہمیں یہاں ایس ایس پی نوید عالم کا انتظار کرنا ہے۔ وہ کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔'' حسین نے کہا۔ نوید، بشریٰ کو گھر چھوڑنے کے بعد ایک اہم کام نمٹانے گیا تھا۔ اور پھر اُن سے تقریباً بھی نو گھنٹوں بعد وہ جگلوٹ کے لیے نکلا تھا۔ چونکہ اُس نے راستے میں کہیں قیام نہیں کیا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ ہی دیر میں جگلوٹ پہنچنے والا تھا۔ یہاں سے آگے غزنوی کا کام ختم تھا۔

''تم نے اِس آدمی سے اتنی دیر گپ شپ کی، پر ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' حسین نے یکدم ہی مقدم سے پوچھا۔

''تمہیں میں بیوقوف لگتا ہوں؟'' وہ برا مان گیا۔ ''میں نے اُس سے دو چار راستوں کے متعلق پوچھا ہے، اور مجھے اُسی سے اندازہ ہوا ہے کہ ہماری منزل اسکردو کے آس پاس ہی ہے۔'' اُس نے بتایا، وہ یہاں کے راستوں کو زیادہ بہتر جانتا تھا۔

''آہ!۔۔۔ خدا کی قسم یہ غیر متوقع ٹور مجھے اس وقت قطعاً پسند نہیں آرہا ہے۔'' حسین نے کہا۔

''مجھے بھی۔۔۔'' رضا نے بھی بیزاری سے کہا۔ وہ لوگ مستقل سفر سے تنگ آ گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے رضا کو ہلکا سا دھکا لگا تو وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

''کیا ہے؟ دیکھ کر دروازہ نہیں کھول سکتے؟'' اُس نے بگڑ کر علی سے کہا، جس نے وہی دروازہ کھولا تھا، جس پر وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''تمہیں کھڑے ہونے کے لیے یہی جگہ ملی ہے؟'' وہ بھی دوبدو کہتا گاڑی سے باہر آیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' رضا بحث کو طول نہیں دینا چاہتا تھا، لہٰذا اپنا تکیہ کلام دہراتے ایک جانب ہو گیا۔

''میری طرف سے تم بھی۔'' علی بھی کہاں حساب رکھتا تھا؟

''خدارا! اِن دونوں میں سے کسی ایک کو تو کھائی سے نیچے پھینک دو۔ تاکہ باقی راستہ کچھ سکون سے گزرے۔'' مقدّم نے بیزاری سے درخواست کی تھی۔ راستے بھر دونوں کسی نہ کسی بات پر ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے تھے۔ وہ اب واقعی اُن دونوں سے تنگ آ چکا تھا۔

''آنے دو ذرا ایس ایس پی کو! وہی دیکھے گا انہیں۔'' حسین نے امّیوں کی طرح دھمکی دی۔

''کیوں؟ وہ باپ ہے ان دونوں کا؟'' مقدّم کا سوال معقول تھا۔

''نوید آیا نہیں ویسے اب تک؟'' اُن دونوں کی بکواس کو نظر انداز کرتے علی نے پوچھا تھا۔

''پوچھ رہے ہو یا بتا رہے ہو؟'' حسین نے کہا۔

''سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آیا کیوں نہیں اب تک؟'' اُس نے کہا۔

''وہ بڑے لوگ ہیں، کام ہوتے ہیں انہیں بہت۔ ہمارے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔'' مقدم نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

''چائے آگئی آپ لوگوں کی۔'' اتنے میں پیچھے سے غزنوی کی آواز آئی۔ وہ ہاتھوں میں چائے کی دو پیالیاں پکڑے آرہا تھا۔ جبکہ اسکے پیچھے ایک چھوٹا لڑکا بھی ساتھ ہی آرہا تھا، جس نے مزید چار پیالیاں ایک ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

''شکریہ!'' علی نے کہتے ہوئے ٹرے سے چائے کی ایک پیالی اٹھالی۔

''آگے کہاں کا قصد ہے اب؟'' سوال حسین کی طرف سے آیا تھا۔

''یہ تو نوید سر ہی بتائیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے؟'' غزنوی نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں؟ تمہیں آگے کا رستہ نہیں معلوم؟'' رضا نے پوچھا۔

''معلوم ہے، پر مجھے اجازت نہیں ہے آپکو بتانے کی۔'' اُس نے سکون سے کہا۔

''حد ہے! اب تو مجھے خود اپنا آپ ہی مجرم لگ رہا ہے۔'' علی نے کہا تھا۔ اس بات پر رضا کے منہ میں کوئی بڑا ہی زبردست قسم کا جواب آیا تھا، پر وہ خاموش رہا۔

''یہاں سے آگے دو راستے ہیں اور دونوں اسکردو جاتے ہیں۔ اگر سیدھا اور عام روٹ لیا جائے تو ہم چلاس سے جائیں گے۔ دوسرا راستہ دشوار اور لمبا ہے۔ میرے خیال سے ہم بذریعہ چلاس ہی اسکردو جائیں گے۔'' مقدّم نے اندازہ لگایا، غزنوی اِس بات پر خاموش ہی رہا تھا۔

''میں بھول گیا تھا کہ تمہارا آبائی گھر سوات میں ہے۔ یاد دلانے کے لیے شکریہ!'' علی نے کہا تو وہ ہنسا۔

''عمر کدھر ہے؟'' اُس کو اچانک ہی عمر کی کمی محسوس ہوئی تو پوچھا۔

''سو رہا ہے۔'' علی نے بتایا۔

''ابھی تک؟'' اُسے حیرت ہوئی، کیونکہ گاڑی رکنے کے بعد سب ہی جاگ گئے تھے۔

''وہ کل رات سے سویا نہیں ہے شاید! کل اسلام آباد میں بھی میں نے اُسے ساری رات گیسٹ ہاؤس کے لیوینگ روم میں بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر جب میں صبح اٹھا تو وہ تب بھی وہیں تھا۔'' اِس بات پر سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا۔ جان تو سب ہی گئے تھے اُسکی بیماری کے بارے میں، لہذا کچھ کچھ پریشانی نے آگھیرا تھا۔

''پریشانی کی بات نہیں ہے، بعض اوقات نئی جگہ نیند نہیں آتی ہے تو ایسا ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ طویل سفر کی وجہ سے بھی دماغ متحرک ہو جاتا ہے اور تھکن کے باوجود بھی نیند نہیں آتی۔'' یہ جواب غزنوی نے دیا تھا۔ اُسکے بعد بھی وہاں کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''کیا ہمیں اب بھی کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' حسین نے اچانک ہی پوچھا۔

''نہیں! آپ منزل پر پہنچنے تک اپنے موبائل کو ایئر پلین موڈ سے ہٹا نہیں سکتے۔ آپکی لوکیشن ٹریس کی جاسکتی ہے۔ احتیاط لازم ہے۔'' اِس بات پر اُسکا منہ بنا تھا۔ فرّخ صاحب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ سب اپنے لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ وغیرہ ساتھ رکھ کے لائے تھے۔ اُسی لمحے قریب ایک جیپ آکر رکی تو سب کی توجہ اسی جانب گئی۔ جیپ میں سے سیاہ جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے، اور اُس پر سیاہ لیدر کا جیکٹ ڈالے نوید اُترا تھا۔ سیاہ بالوں کے درمیان ہلکے سفید و سرمئی بال اندھیرا ہونے کے باوجود، اُسکی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔ جینز کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اُنہی کے پاس آرہا تھا۔ وہ اُن سے نو گھنٹے بعد سفر شروع کرنے کے باوجود بھی اُن تک جلدی پہنچ گیا تھا، یقیناً اُس نے راستے میں قیام نہیں کیا تھا۔

''تمہارا کام مکمل ہو گیا ہے، تم جا سکتے ہو۔'' سلام نہ دعا، آتے ساتھ ہی چائے پیتے غزنوی کو مخاطب کیا تھا۔ علی نے تاسف سے اُسے دیکھا۔ بداخلاق، بدلحاظ، بے مروت آدمی!

''جی سر! بس آپکا ہی انتظار تھا۔ جیپ والوں سے میں نے بات نہیں کی ہے۔ آپ خود دیکھیں گے یا میں کسی کو راضی کروں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں! میں دیکھ لوں گا۔'' اُس نے کہا۔

''عمر کہاں ہے؟'' نوید نے رک کر ایک نظر سب کو دیکھا، اور عمر کو سب کے درمیان موجود نہ پا کر پوچھا۔

''گاڑی میں ہی ہے، سو رہا ہے شاید!'' علی نے بتایا۔

''اُسے جگا دو، ہم آگے کا سفر شروع کریں گے، غزنوی واپس جائیگا، باقی لوگ اپنا سامان نکال لیں، جب تک میں جیپ والوں سے بات کرتا ہوں۔'' اُس نے کہا تو وہ لوگ سر ہلاتے گاڑی کی جانب بڑھے۔

''سر! جیپ راضی کرنا مشکل ہے۔'' غزنوی نے اُسکے کان کے پاس آکر سرگوشی کی۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' اُسکا جواب دوٹوک تھا۔

''اُٹھو عمر! ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔'' گاڑی کا دروازہ کھول کر علی نے عمر کا کندھا ہلایا پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم جیپ کیوں لے رہے ہو؟ہم suv سے بھی جا سکتے ہیں، چلاس کا راستہ بہتر ہے۔''دوسری جانب مقدّم کچھ مشکوک نظروں سے نوید کو دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

''ہم چلاس نہیں !استور جا رہے ہیں۔''یہ پہلی بار تھا، جب نوید نے کسی بات کا مکمل جواب دیا تھا۔مقدّم کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا۔جبکہ نوید اُسے سراپا حیرت چھوڑے آگے بڑھ گیا۔

''استور یعنی؟''وہ استور کا مطلب بہت اچھے سے جانتا تھا۔فوراً اُسکے پیچھے لپکا۔

''عمر!''علی نے دوبارہ عمر کا کندھا ہلایا پر وہ اب بھی نہ ہلا تو اُس نے پریشان ہو کر برابر میں کھڑے،اپنا سامان نکالتے رضا کو دیکھا۔وہ بھی چہرے پر تشویش لیے آگے آیا۔

''کیا ہوا اسے؟''اُس نے علی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں !اُٹھ نہیں رہا۔''علی نے پریشانی سے کہا۔اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔حسین کہیں سے نمودار ہوا،اور علی کو پیچھے ہٹاتے عمر کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔

''اُٹھ جاؤ بھائی !کونسا نشہ کر کے سوئے ہو؟''اِس سے پہلے کہ اُسکی اِس حرکت پر رضا اُسے دو تھپڑ رسید کرتا،عمر نے مندی مندی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔سرخ آنکھیں اُسکی گہری نیند سے جاگنے کا پتہ دے رہی تھیں۔رضا سر جھٹک کر واپس اپنا سامان نکالنے چلا گیا،علی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ڈرا ہی دیا تھا اِس نے تو!

''کیا ہے حسین؟سکون نہیں ہے تمہاری زندگی میں؟''آنکھوں پر بازو ٹکاتے عمر نے پہلی بار چڑ چڑے پن سے کہا تھا۔

''سکون تو اب کسی کی بھی زندگی میں نہیں ہے۔ہم دوسری گاڑی میں شفٹ کر رہے ہیں،اٹھ جاؤ جلدی!''حسین نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر تقریباً زبردستی بٹھایا تو جیسے اُسکا دماغ جاگا۔

''استور؟تم استور جانے کی بات کر رہے ہو؟اِس وقت؟کیا استور ہماری منزل ہے؟''دوسری جانب مقدّم تیزی سے نوید کے پیچھے آیا تھا۔

''نہیں !استور ہماری منزل نہیں ہے،ہم آگے جائیں گے۔''جیبوں میں ہاتھ ڈالے نوید بھی آج بڑی فرصت سے جواب دے رہا تھا۔رات کے اِس پہر سردی رگ وپے میں سرایت کر رہی تھی۔دونوں کا رخ قطار میں کھڑی جیپوں کی طرف تھا۔

''اُس سے آگے یعنی چلّم چوکی؟''اُس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''ہاں!''نوید نے سر اثبات میں ہلایا۔

''اور اُس سے آگے دیوسائی؟''اُس نے تصدیق چاہی۔

''بالکل!''نوید نے تصدیق کر دی۔

''پھر اسکردو؟''اُس کو اپنے سوال پر خود بھی یقین نہ تھا۔

''ہاں! ہماری آخری منزل!''اُس نے اِس بات بھی سکون سے جواب دیا تو وہ اُسے بے یقینی سے دیکھتا رکا۔

''میں تمہارا سامان اُتار دیتا ہوں۔''عمر کو آنکھیں ملتے، گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر رضا نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''نہیں! میں کر لوں گا۔ تمہارا شکریہ!''اُس نے مختصر جواب دیا۔ آواز بھاری تھی، جیسے فلو ہو رہا ہو۔ رضا خاموش ہو کر ایک جانب ہٹ گیا تاکہ وہ اپنا سامان اُتار لے۔

''تم پاگل ہو گیا؟ تمہیں اسکردو جانے کے لیے یہی راستہ ملا ہے؟''مقدّم بیساختہ چیخا، اُسکی آواز اِس قدر بلند ضرور تھی کہ suv کے پاس کھڑے باقی چاروں نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''آسان راستے پر کوئی بھی پیچھا کر سکتا ہے۔ یہ راستہ محفوظ ہے۔''نوید کو پہلے کب فرق پڑا تھا جو اب پڑتا۔ باقی چاروں کچھ سمجھنے اور نہ سمجھنے کی کیفیت میں اپنا اپنا سامان لیکر اُنکے قریب پہنچنے لگے۔

''محفوظ؟ وہ سب سے خطرناک، دشوار اور سب سے غیر محفوظ راستہ ہے۔ اوپر سے تم رات کے وقت سفر کرنے کی بات کر رہے ہو؟ ہمیں مارنے کا پلان بنایا ہے کیا؟''اس بات پر نوید بیساختہ ہنسا تھا۔

وہ واقعی بیساختہ ہنسی تھی۔۔۔۔فقط چند سیکنڈ کی۔

پر لمحوں کو سب رک گئے۔ وہ ہنسا تھا؟ وہ واقعی ہنسا تھا؟ بالآخر دس سالوں بعد نوید عالم بیساختہ ہنسا تھا۔ اُسکی ہنسی دلکش تھی، دلفریب سی، مبہوت کر دینے والی۔

پر سوال یہ تھا کہ اتنی سخت صورتحال میں وہ کیوں ہنسا تھا؟ ایسا کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا مقدّم نے اُسے۔ پل بھر کی ہنسی، نوید نے پل بھر میں غائب بھی کر دی، کہ وہ اِس میں ماہر تھا۔

''میں تمہیں سیدھے راستے سے لے جاؤں، پر وہاں بھی کوئی تمہیں مارنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہو سکتا ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر تمہیں جانا ہے تو دن کے وقت چلو نوید! رات کے وقت ان راستوں پر سفر کرنا خطرناک ہے۔'' مقدم ان راستوں کو اُس سے کئی گنا بہتر جانتا تھا۔ باقی سب تو بس خاموشی سے دونوں کو بحث کرتا دیکھ رہے تھے۔

''ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے، اور نہ رکنے کے لیے کوئی جگہ!'' اُس نے سنجیدہ مگر سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی جیپ والا اِس وقت جانے کو راضی نہیں ہوگا۔'' مقدّم نے کہا اور جا کر پہاڑ کی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا جیسے کہہ رہا ہو جاؤ جو کرنا ہے کرو!

''جیپ والے کو تم راضی کرو!'' وہ بھی مقدّم کے برابر ٹیک لگائے سکون سے حکم صادر کرتا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، پھر لب بھینچے۔

''میں تمھارا نوکر ہوں؟'' اُس نے تپے لہجے میں سوال کیا۔ اتنی دیر میں نوید جیب سے لائٹر نکال چکا تھا، کیوں؟ یہ یقیناً اُسے ہی معلوم تھا۔

''زیادہ منتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ مانے تو دو تھپڑ لگا کر راضی کر لینا۔'' وہ اپنی مرضی کے جواب دیتا تھا، سو اب بھی وہی کیا۔

''ہر مسئلہ مار پیٹ سے حل نہیں ہوتا، تمیز اور اخلاق سے بھی بات کی جا سکتی ہے۔'' حسین کو اُسکی بات بری لگی تھی۔ مار دھاڑ کے سوا آتا ہی کیا تھا اِس آدمی کو؟

''جاؤ کر لو تمیز سے بات۔'' اس نے سکون سے کہتے دوسری جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور لبوں سے لگا لی۔ نوید اور سگریٹ؟ سب نے حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھا۔ آج تو وہ ایک کے بعد ایک عملی انکشافات کر رہا تھا۔

''چلو مقدّم! ہم جیپ والوں سے بات کرتے ہیں۔'' حسین اُسے کھینچتا ہوا ساتھ لے گیا۔ رضا نے اُسے سگریٹ پیتے دیکھا تو یکدم ہی اپنے اندر بھی سگریٹ کی شدید طلب محسوس کی۔ بیگ ایک جانب رکھ کر وہ بھی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا اور جیب سے سگریٹ نکال لی۔ نوید نے بنا کچھ کہے اپنا لائٹر اُسکی جانب بڑھا دیا، جسے اُس نے تھام لیا، پھر سگریٹ جلا کر فضا میں دھواں چھوڑا۔ عمر نے تاسف سے دونوں کو دیکھا، پھر تیسرے شخص علی کو! جسکے چہرے پر واضح لکھا تھا کہ وہ بھی اس محفل کا حصّہ بننا چاہتا تو ہے، پر فلحال خود کو باز رکھے ہوئے ہے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ علی ٹھیک ٹھاک قسم کا سموکر ہے، دن بھر میں، آٹھ دس تو وہ چلتے پھرتے پھونک دیا کرتا تھا۔ پر اِس وقت وہ کیوں سگریٹ نہیں پی رہا؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ حالانکہ موقع بھی تھا اور دستور بھی۔۔۔۔

رضا کو اُس نے پہلے بھی سگریٹ پیتے دیکھا تھا، پر نوید جیسے بہترین فزیک کے انسان سے اُسے یہ امید نہ تھی۔ اُس نے ایک بار پھر افسوس سے اُن تینوں کو دیکھا۔ اُسکی نفاست پسند طبیعت کو اس خراب شے کی بو سخت گراں گزرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا شوق تھا اُنہیں اپنی صحت سے کھیلنے کا؟

''السلام علیکم بھائی! ہمیں ذرا اسکردو تک جانا ہے۔'' مقدّم نے قطار میں لگی جیپوں میں سے ایک جیپ کے اندر لیٹے ڈرائیور کو دیکھ کر کہا۔

''لے جائیں گے۔''اُس نے آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''بذریعہ استور!''اُس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''لے جائیں گے وہاں بھی، پر ذرا صبح ہو جانے دو۔''اُس نے کہا۔

''نہیں بھائی! ہمیں ابھی ہی جانا ہے۔''حسین نے کہا۔

''تو چلاس کے راستے لے جاتے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''نہیں نہیں! ہمیں استور سے ہی جانا ہے۔''اب کہ ڈرائیور نے سر تا پاؤں اُسے گھورا۔

''تمہارے جیسے بہت سر پھرے آتے ہیں، ایڈونچر کے شوقین ہوتے ہیں۔ پھر خو مخواہ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ہمارا بھی۔ جاؤ لالہ! فضول میں دماغ نہ کھاؤ! جا کر کوئی اور ڈھونڈ لو جو رات کو اسکردو لیجانے پر راضی ہو جائے۔ وہ بھی استور سے۔''اُس نے ہاتھ جھلاتے کہا اور واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں لیٹ گیا۔ اُسکے بعد مقدّم اور حسین نے تقریباً ہر جیپ والے سے بات کی، پر رات کے وقت کوئی بھی استور سے جانے کو راضی نہ تھا۔ بالآخر دونوں فاتحین واپس لوٹے۔

''دیکھا! میں نے کہا تھا کہ کوئی نہیں جائے گا۔''مقدّم نے فخر سے ٹیلے کے پاس کھڑے نوید کو دیکھ کر کہا۔

''پہلے بتانا تھا، suv واپس بھیج دی ہے۔ اب تو ہم رات بھی یہاں نہیں گزار سکتے۔''نوید نے سگریٹ منہ سے نکالتے دھواں فضا میں چھوڑتے کہا، عمر ناگواری سے اُن دونوں کو دیکھتا وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اِس جواب پر مقدّم نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''تم پاگل ہو؟ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم نہیں جا سکتے پر تم بضد تھے، suv کو بھیجنے سے پہلے کم از کم میرے واپس آنے کا انتظار کر لیتے، اب ہم کہاں انتظار کریں گے؟ وہ بھی اِس سامان کے ساتھ؟'' اس لہجے پر نوید نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

''کہاں جانا ہے تم کو؟ ہم کو بتاؤ! ہم لیکر جائیگا تم کو۔''اُن سب نے مڑ کر دیکھا تو جس جیپ میں نوید یہاں تک آیا، وہی جیپ والا پیچھے کھڑا تھا۔

''تم گئے نہیں؟''نوید نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''نہیں! بنا سواری کے خالی جیپ لیجاتا کیا؟ اپنا نقصان کر لیتا ہم؟''وہ ناراض ہوا۔

''تو تم استور چلو گے؟''نوید نے اسکردو کا ذکر نہیں کیا۔

''لے جائے گا، پر پیسہ زیادہ لگے گا۔''

''کتنے ؟''نوید نے پوچھا۔

''بیس ہزار !''اِس بات پر مقدّم ہنسا۔

''تمہیں ہم پاگل دکھتے ہیں ؟''مقدّم نے پوچھا۔

''پاگل ہی تو ہے تم ! اتنارات کو کون جاتا ہے استور ؟''وہ صاف گوئی سے بولا۔

''دیکھیں ! ہمارا جانا ضروری ہے۔ آپ بہت زیادہ قیمت مانگ رہے ہیں۔''پہلی بار عمر نے حصّہ لیا تھا۔ وہ اِس بلاوجہ کی بحث سے تنگ آرہا تھا۔ نوید بڑی فرصت سے ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے، اُنکی گفتگو ملاحظہ کرتا سگریٹ کا دھواں سارے میں چھوڑ رہا تھا۔

''بیس ہزار سے ایک روپیہ کم نہیں لے گا۔''وہ اڑ گیا۔

''اتنے میں تو دو جیپ بک کرلوں گا میں۔''مقدّم نے کہا۔

''تو کرلو ! ویسے بھی تم چھے لوگ اور سامان بھی ساتھ ہے۔''

''اس جیپ میں بعض دفعہ آٹھ لوگ بھی آتے ہیں، بلکہ تمہاری والی سیون سیٹر ہے، اِس میں تو ہم سوات میں دس بیٹھ جایا کرتے ہیں۔''وہ بھی ڈٹ گیا۔

''بھائی جان ! ہم نے تم کو اپنا قیمت بتادیا ہے۔ رات کے وقت استور اتنے میں ہی جائے گا ہم۔ اور بس !''وہ صرف استور کے بیس ہزار مانگ رہا تھا، اِس سے آگے چلّم اور دیوسائی کی تو ابھی بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی زیادہ قیمت پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

''یار ! تم تو ہمارے پٹھان بھائی ہو، ایسا کروگے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ؟''حسین نے ذرا لجاجت سے کہا۔

''کون سا وطن کی بات کرتا ہے تم ؟ کون پٹھان ہے ادھر ؟ ہم افغانی ہے افغانی۔۔۔۔ ہمارا وطن بھی افغانستان ہے۔ ہمارا طرف سے یہ وطن اور اسکا لوگ، سب بھاڑ میں جائے۔''اگلے ہی لمحے نوید سگریٹ پھینکتا ہوا اُٹھا اور بنا کسی کو بھی سوچنے کا موقع دیئے، اُس نے ڈرائیور کا ہاتھ پکڑ کر موڑا اور اُسکی کمر پر بند کرتے ہوئے، اُسکا سر جیپ کے بونٹ پر پٹخ دیا۔ اس اچانک افتاد پر تو وہ بوکھلا گیا۔

''کیا بکواس کی تم نے ؟''اُسکے لہجے میں جو جلال تھا، اُس پر وہاں کھڑے ہر شخص کو سانپ سونگھا تھا۔

''بھائی ! ارے ! ہم مذاق کر رہا تھا۔۔۔۔ ہم جاتا ہے نا ! تم جہاں بولے گا، وہاں جائے گا۔''وہ فوراً لائن پر آیا تھا۔

''پہلے جواب دو بکواس کیا کی ہے تم نے ابھی؟''اُسکا دماغ ٹھیک ٹھاک گھوما تھا۔

''معاف کر دے بھائی جان! ہمارا توبہ جواب ایسا کچھ بولے۔''اُس نے منت کی۔

''چھوڑ دو نوید اُسکو!''عمر نے اُس سے التجا کی تو اُس نے جھٹکے سے اُسے چھوڑا۔

''چلو! جیپ اسٹارٹ کرو فوراً۔''نوید نے بیلٹ میں لگی پسٹل نکالتے کہا اور اُسے سامنے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر تو وہ سیدھی شرافت سے مان گیا۔ صحیح کہہ رہا تھا وہ، بعض دفعہ دو تھپڑ لگانے کے بعد ہی بات بنتی ہے۔

وہ لوگ جب اپنا سامان جیپ میں لوڈ کر رہے تھے، تب ڈرائیور نظریں بچا کر عمر کے پاس آیا۔

''سنو ہمارا بھائی! تم ہمارا ساتھ آگے بیٹھ جانا۔''اُس نے عمر سے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا، غالباً وہ نوید سے ٹھیک ٹھاک ڈر گیا تھا۔ تمام سامان لوڈ ہونے کے بعد وہ لوگ اللہ کا نام لیکر جیپ میں بیٹھنے لگے۔

''عمر!''نوید نے عمر کو آگے والی نشست کی جانب بڑھتا دیکھ کر پکارا۔

''ہاں!''اُس نے رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔''اِس بات پر اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے ڈرائیور کو دیکھا، جسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

---------+---------+--------

''پہنچ گئے استور، چلو اب ہمارا پیسہ دو اور اترو!''رات کے نجانے کس پہر اُس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا تھا۔

''تم سے گاڑی روکنے کو کہا؟''نوید نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔

''لالہ! تم ہی تو بولا تھا کہ استور جانا ہے، اب پہنچ تو گیا ہے۔ تو اب اُترو!''اُس نے حیرت سے کہا۔ پیچھے والوں کی تو سانسیں، سماعتیں، آوازیں سب بند تھیں۔ رات کے اِس جامد سناٹے اور اندھیرے میں، ان خطرناک راستوں پر سفر نے اُنکی ہوائیاں اڑائی ہوئی تھیں۔

''گاڑی چلاؤ! ہم چلّم جائیں گے۔''نوید نے اُسکے سر پر بم پھوڑا تھا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

''چلّم؟ تم چلّم بولتا ہے؟''اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''ہاں!''نوید نے سر ہلایا۔

''بات سنو بھائی جان! ہمارا دماغ خراب نہیں ہوا ہے ابھی! تم کو جانا ہے تم جاؤ!'' وہ صاف مکر گیا۔

''پھر سے بولنا ذرا!'' نوید کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ اُسکی ساری ہمت ہوا ہوئی۔

''لالہ! تم ہم کو بیس ہزار میں استور آنے کا بولا تھا صرف!'' وہ منمنایا۔

''پیسے مل جائیں گے۔'' نوید نے گویا یقین دلایا۔

''بات صرف پیسوں کا نہیں ہے۔'' اُس نے کہا۔

''پھر؟''

''اصل میں ہم کو ابھی نیند آرہا ہے۔ اور ہم نیند میں گاڑی نہیں چلا سکتا۔''

''چلّم پہنچ جائیں پھر سو جانا۔'' نوید نے کہا۔

''پر ہم کو تو ابھی نیند آرہا ہے نا۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، نیند میں کس طرح گاڑی چلائے گا؟ ویسے ہی اتنا خطرناک راستہ ہے۔ خدانخواستہ! کوئی حادثہ ہو گیا تو؟'' عمر نے پہلی بار تائید کی۔

''تو ہم یہاں سڑک پر اِسکے سونے اور جاگنے کا انتظار کریں گے؟'' سوال حسین نے کیا تھا۔

''نہیں! ہم انتظار نہیں کر سکتے، چلّم پہنچنے تک تو ہر گز نہیں!'' نوید سنجیدہ تھا۔

''نوید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ جگہ رکنے لائق نہیں ہے۔'' مقدّم نے کہا تو سب نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، اِس حد تک گہرا اندھیرا تھا، اُس پر سے ہزاروں فٹ گہری کھائی پر مشتمل کچی سڑک، جس پر صرف جیپ کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ہی کچھ سمجھ آجاتا تھا۔ اُنکے علاوہ یہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد، رضا کو تو باقاعدہ خوف آرہا تھا۔ باقیوں کے علاوہ یہ صرف اُسکا شمالی علاقہ جات کی طرف پہلا سفر تھا۔ اُسکو پہاڑوں کا دن میں کوئی تجربہ نہ تھا، کجا کہ رات کو۔ ایسے میں جب ایک دو بار سامنے سے کسی دوسری جیپ کی کراسنگ ہوئی تو اس نے تو فاتحہ ہی پڑھ لی تھی۔

''پر نوید! یہ کہہ رہا ہے کہ اِسے نیند آرہی ہے۔ ایسے میں ڈرائیو کروانا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔'' علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''دیکھو کتنا صحیح بولتا ہے یہ بھائی! اور یہ اِسے کیا ہوتا ہے؟ راشد خان نام ہے ہمارا!'' راشد صاحب علی کو اپنا ہمنوا پا کر خوش ہوئے۔

''چلم زیادہ دور نہیں ہے، اور اتنی بھی کوئی نیند نہیں آرہی اِسے۔ اب وقت برباد کرنے کے بجائے گاڑی چلاؤ۔'' نوید نے پہلے علی کو اور پھر راشد کی مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اُس نے منہ بناتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کر دی۔

''ایک منٹ رکو! ہمارا بھتیجا ہے یہاں، اُسکو بھی ساتھ لینا ہے۔'' اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے کسی کو بھی سوچنے کا موقع دیئے بنا دروازہ کھولا اور اتر گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' نوید پیچھے سے چیخا۔

''صبر!'' اُس نے دور سے کہا، اندھیرے میں وہ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ پھر پانچ منٹ بعد اُسکی واپسی ہوئی تو ساتھ پانچ چھے سال کا بچہ بھی تھا۔

''یہ کون ہے؟'' نوید نے پوچھا۔

''ابھی تو بتایا، ہمارا بھتیجا ہے۔'' اُس نے بچے کو زبردستی نوید کے برابر میں بٹھا دیا۔ پھر گاڑی چلا دی۔ اُنہیں سمجھ نہیں آیا کہ اُسکا بھتیجا اچانک کہاں سے نمودار ہوا تھا؟ پر خاموش رہے کہ اُسکی حرکتیں ویسے بھی نہ سمجھ میں آنے والی ہی تھیں۔ کچھ دیر خاموشی سے سر کے۔

گھونگھٹ کی آڑ سے دلبر کا

دیدار ادھورا رہتا ہے۔۔۔

بیچ راستے میں اچانک ہی راشد نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ تمام کے تمام افراد نے اس بے وقت کے کنسرٹ پر حیرت و اچھنبے سے پہلے اُسے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

جب تک نہ پڑے عاشق کی نظر

سنگھار ادھورا رہتا ہے

اب کہ راشد، موسیقار کے ساتھ خود بھی چلا چلا کر گا رہا تھا۔ نوید نے پہلے سخت کوفت سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، (گویا خود کو شدید طیش میں آنے سے باز رکھا) پھر غصّے سے ہاتھ مار کر کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟ ہم گانا سن رہا تھا۔'' وہ سخت ناراض ہوا۔

''کیوں تمہارا ولیمہ ہے؟'' نوید کی بس ہو گئی تھی۔ اتنا اُسے زندگی میں کسی نے تنگ نہیں کیا تھا، جتنا اِس شخص نے چند گھنٹوں میں کر دیا تھا۔

''توبہ توبہ! ہم کو ایسا گنہگار سمجھ رکھا ہے کیا؟ چار شادیاں کر چکا ہے ہم، اب کونسا ولیمہ؟'' اُس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میری بات سنو! اپنی بکواس اور یہ کیسٹ بند کر کے گاڑی چلاؤ!''نوید کی آواز بلند ہوئی۔

''لالہ! ہم نہیں جائیگا تمہارا ساتھ۔ بہت ہو گیا!''اُس نے بھی غصّے سے کہتے گاڑی روک دی۔

''کیا ہے یار!''اب کہ سب ہی بیزار ہوئے تھے۔

''میری بات سنو! میں تمہارے کسی قسم کے نخرے برداشت نہیں کروں گا۔ چپ کر کے جیپ اسٹارٹ کرو، ورنہ بہت برا ہو جائیگا اب۔''نوید کا صبر جواب دے چکا تھا، لہٰذا اُسے دھمکایا۔

''تم کیا ہمارا شوہر ہے جو ہم تم کو نخرے دکھائے گا۔''اب کہ وہ بھی ناراض ہو گیا۔ پیچھے بیٹھے افراد نے اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''لاحول ولا قوۃ!''نوید بڑبڑایا، پھر اُسے غصّے سے گھورا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ بالکل انسان بن کر جیپ چلاؤ! ورنہ۔۔۔''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ اب نرمی نہیں کروں گا تمہارے ساتھ۔''اُسکی دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ منہ بناتے ہوئے گاڑی چلانے لگا۔ کچھ دیر جیپ میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے راشد کو واقعی نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔

''مقی سنو!''اُس نے مقدّم کا کندھا ہلاتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''کیا؟''اُس نے بھی آہستہ سے پوچھا۔ صورتحال اتنی کشیدہ تھی کہ وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ علی نے اُسے دس سالوں بعد اُسکے، اُسی نام سے مخاطب کیا ہے، جو کسی زمانے میں یار دوستوں نے مل کر رکھا تھا۔

''مجھے لگ رہا ہے، اِسکو واقعی نیند آ رہی ہے۔'' اُس نے کہا تو مقدّم نے بغور راشد کو دیکھا۔

''مجھے نہیں لگتا۔ یہ لوگ بیس بیس گھنٹے بنا سوئے گاڑی چلا لیتے ہیں، انکو عادت ہے۔ کبھی کبھار نیند کے جھونکے آ ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی چلّم زیادہ دور نہیں رہ گیا۔''اُس نے علی سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

''اور اگر اِسکے بیس گھنٹے پورے ہو گئے ہوں تو؟''رضا نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا۔ سوال اُسکا معقول تھا، مقدم جواباً خاموش رہا۔

''مجھے رات کے اِس وقت، ان سڑکوں پر سفر کرنا ویسے ہی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ اتنا کچا راستہ ہے، اوپر سے کھائی۔۔۔۔ پھر اندھیرا ایسا ہے کہ نظر بھی نہیں آرہا کہ کھائی کدھر ہے اور سڑک کدھر مڑ رہی ہے؟ ذرا آگے پیچھے ہوئے تو گاڑی کھائی کی نذر ہو گی۔'' عمر نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ لوگ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔

''اللہ نہ کرے!'' حسین نے دہل کر کہا۔ کم خوفزدہ وہ بھی نہ تھا۔

''دیکھو! اندھیرے اور کھائی کی فکر نہ کرو۔ یہ جیپ والے یہیں کے رہائشی ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بھی ان راستوں پر گاڑی چلا سکتے ہیں۔ یہاں جتنے بھی حادثے ہوتے ہیں، وہ زیادہ تر کسی نہ کسی مسافر کوچ یا پھر عام گاڑیوں کو پیش آتے ہیں۔ یہاں پر جیپ چلانے والے کو شاذ و نادر ہی کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ البتہ مجھے فکر صرف اِس بات کی ہے کہ اِسے نیند نہ آجائے۔'' مقدم نے کن انکھیوں سے نیند کے جھونکوں کو جھٹکتے راشد کو دیکھا، اُس کے الفاظ آدھے حوصلہ افزا اور آدھے حوصلہ شکن تھے۔ اِس سے قبل کہ کوئی جواب دیتا، راشد نے ایک مرتبہ پھر گاڑی روک دی۔

''اب کیا ہوا؟'' موبائل میں کچھ دیکھتے نوید نے ماتھے پر بل ڈال کر اُسے گھورا۔

''دیکھو بھائی جان! ابھی تک ہم نے تمھارا سارا بات مانا۔ جو تم نے بولا وہ ہم نے کیا۔ کیا کہ نہیں؟'' اُس نے تمہید باندھی۔

''جو کہنا ہے سیدھی طرح کہو!'' نوید نے بیزاری سے کہا۔

''بھائی جان! ابھی ہم کو آرہا ہے نیند۔ ٹھیک ہے!۔ ابھی ہم کو کہیں چائے بھی نہیں ملے گا؟ اوپر سے تمہارا یہ دوست شوست بھی آدم بیزار ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی ہلا گلا مچاؤ تاکہ ہمارا نیند بھاگے۔ تم سارا لوگ، اتنا خاموش بیٹھا ہے کہ ہم کو نیند اور زیادہ آرہا ہے۔'' اُس نے مدعا بیان کیا۔

''تو کیا کریں؟ تمہارے لیے محفل لگائیں اِدھر؟'' حسین برا مان گیا۔

''محفل نہ لگاؤ! ہم کو ہمارا گانا سننے دو۔ ہم گانا سنتا رہے گا تو ہمارا دماغ جاگتا رہے گا۔ پھر ہمارا گارنٹی ہے کہ ہم تم کو چلّم تک پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔'' بالآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔

''یہ سارا بہانہ تم اِس گانے کے لیے کر رہے ہو؟'' نوید نے گھورا۔ عجیب ہی مخلوق مل گئی تھی انہیں بھی۔

''ہم بہانہ نہیں کر رہا۔ ہمارا توبہ جو ہم جھوٹ بولے تم سے!'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''سننے دو یار گانے اُسے، میں اب بنا کہیں رکے چلّم پہنچنا چاہتا ہوں۔'' مقدّم نے پیچھے سے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو نوید نے لب بھینچ کر راشد کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے! سن لو۔''اُس نے منہ بناتے ہوئے اجازت دی تواُسکی باچھیں کھل گئی۔پہلے اُس نے بڑی فرصت سے پلیئر آن کیا، پھر اُس میں سے دو چار گانوں کو چلانے اور مسترد کرنے کے بعد اپنا مطلوبہ گانا لگایااور بالآخر جیپ اسٹارٹ کر دی۔اب کہ نوید کڑے تیوروں کے ساتھ، ضبط کیے اُسے دیکھتا رہا، پر کہا کچھ نہیں۔اِس تمام صورتحال میں اُسکا اچانک نمودار ہونے والا بھتیجا، بس آنکھیں کھولے پٹر پٹر اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

میں سہرا باندھ کے آوں گا، میرا وعدہ ہے

میں تیری مانگ سجاؤں گا، میرا وعدہ ہے

راشد لہک لہک کر گانے لگا۔ حسین اور مقدّم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ عمر نے تو باقاعدہ سر ہی تھام لیا تھا۔ بھلا رات کے اس پہر کون ایسے گانے سنتا ہے؟ اللہ اللہ کر کے ایک گانا ختم ہوا، پھر دوسرا شروع ہو گیا۔پہلے تو ڈیڑھ منٹ تک میوزک بجتا رہا، میوزک بتاتا تھا کہ یقیناً نوّے کی دہائی کا ایک اور بالی ووڈ گانا لگایا گیا ہے۔ پھر گانا شروع ہوا۔

مجھ سے محبت کا اظہار کرتی

کاش کوئی لڑکی مجھے پیار کرتی

سر پیٹنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا تھا اِس پر؟ نوید نے ہتھیلی سے ماتھا مسلا، پھر جیسے ہمت ہارتے ہوئے چہرہ کھڑکی سے باہر کی جانب موڑ دیا۔ حالانکہ اُسکی جانب سے سوائے پتھریلے پہاڑ کے اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا، پر راشد کا منہ دیکھ کر خون جلانے سے بہتر پہاڑوں کو دیکھنا تھا۔

''مجھے کراچی کی تمام بسیں یاد آ رہی ہیں۔'' یہ تبصرہ رضا نے کیا تھا۔ باقی چاروں بیساختہ ہنسے تھے۔ پھر رضا نے کانوں میں ہیڈ فون ٹھونسا، اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اللہ جانے وہ کیا سن رہا تھا ہیڈ فون میں؟ پر وہ کچھ ہی دیر میں واقعی سو گیا تھا۔

علی نے رشک سے اُسکو دیکھا تھا جو بڑے مزے سے کان لپیٹے سو چکا تھا، البتہ وہ تو چلّم پہنچنے سے پہلے ہر گز سونے نہیں والا تھا۔

خوف بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

چلم چوکی سے کچھ دور، کھائی کے قریب جب سورج نے اپنا چہرہ ٹھیک سے نہ دکھایا تھا، اور آسمان پر نیلاہٹ چھائی ہوئی تھی۔ عین اُسی لمحے جیپ بے قابو ہوئی اور اُسکا رخ سیدھا کھائی کی طرف ہو گیا۔اِس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، جیپ آپے سے باہر ہو کر سیدھی کھائی میں چلی گئی۔ جیپ میں چیخ و پکار مچ گئی،

موت سامنے نظر آئی، حسین نے تو گھر میں اپنی میت پہنچنے تک کا منظر بھی دیکھ لیا۔ لیکن اللہ نے ابھی موت نہ لکھی تھی۔ فقط ایک پتھر۔۔۔۔ رب چاہے تو ایک پتھر بھی جان بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

وہ بھی ایک پتھر ہی تھا۔ کبھی کی ہوئی لینڈ سلائیڈ میں، سڑک کی کھائی والی طرف آکر ایسے ٹک گیا تھا، جیسے کوئی ستون ہو۔ پہاڑی پتھر تھا، لہٰذا تھا بھی بھاری بھر کم۔ صرف اُس ایک پتھر نے جیپ کو کھائی کے بالکل دہانے پر ایسے روک دیا کہ پتھر نہ ہوتا تو یقیناً وہ دس ہزار فٹ سے بھی زیادہ گہری، اُس کھائی کی بھینٹ چڑھ چکے ہوتے۔ جیپ کے ٹکرا کر رُکتے ہی وہ سب تیر کی تیزی سے باہر آئے تھے۔ نوید نے راشد کے بھتیجے کو بھی کھینچ کر باہر نکالا، اُس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

''یا اللہ! یہ کیا تھا؟'' عمر کا تو دماغ اب تک ماؤف ہو رہا تھا۔

''تم پاگل ہو کیا؟ مارے جاتے ابھی ہم سب؟'' نوید چیخا تھا۔ چلم چوکی آگے ذرا اونچائی پر نظر آ رہی تھی، کچھ لوگوں نے یہ حادثہ دیکھا تو تیزی سے نیچے اُتر کر انکی جانب آنے لگے۔

''ہم کو نہیں معلوم کیا ہوا تھا؟ جیپ ہمارا قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ نہ بریک لگ رہا تھا نہ گیئر کام کر رہا تھا۔'' اُس نے خوفزدہ انداز میں کہا تھا۔ وہ واقعی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

''میرے خیال سے گاڑی گرم ہو گئی ہے۔'' رضا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، لیکن آواز اُسکی بھی ہانپ رہی تھی۔ باقی سب بھی اپنے ہاتھ پاؤں باقاعدہ کانپتے ہوئے محسوس کر سکتے تھے۔ وہ حادثہ ٹھیک ٹھاک خوفناک تھا۔

''آپ لوگ ٹھیک ہیں؟'' چوکی سے اتر کر آنے والے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا تھا۔ کچھ وہاں کے رہائشی تھے، کچھ کیمپنگ کے لیے آنے والے لوگ تھے۔

''ہاں! اللہ کا شکر ہے، کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''آپ لوگ سائیڈ پر ہو جائیں، ہم جیپ کو سڑک پر لیکر آتے ہیں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔ پھر وہ لوگ کسی طرح دھکا لگا کر جیپ کو بیچ سڑک پر لے ہی آئے، پھر مزید دھکا لگاتے ہوئے اُسے ایک کنارے پر کھڑا بھی کر دیا، تاکہ پیچھے آنے والوں کو مشکل نہ ہو۔ اتنی دیر میں سورج بھی نکل آیا تھا۔ پہاڑوں پر پڑنے والی صبح کی کرنوں نے ہر منظر خوابناک بنا دیا تھا۔ قدرت کی ساری رعنائی یہیں سمٹ آئی تھی۔ رات کو خوفناک دکھنے والے دیو قامت پہاڑ، سورج کی پہلی کرنوں میں اپنے تمام تر حسن کے ساتھ جلوہ گر تھے، نیچے بہت دور دریائے استور بہتا ہوا آ رہا تھا۔

''گاڑی گرم ہو گئی ہے، اسے یہیں چھوڑ دیجئے اور چوکی تک پیدل آ جائیں۔'' ایک لڑکے نے اُنہیں کہا تو نوید نے سر ہلایا۔

''چلو! ہم اوپر چلتے ہیں، اپنا ضروری سامان ساتھ رکھ لو، حفاظت کے طور پر۔''نوید اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہتا آگے بڑھ گیا۔ چلم یہاں سے کچھ اونچائی پر تھا، اُسکی فقط لکڑی کے کیبن نما چوکیاں ہی یہاں سے واضح تھیں۔ وہ لوگ اپنا اپنا سامان لیکر اوپر کی جانب بڑھے، پتھریلے راستے پر چلنا جیپ میں جانے سے زیادہ خوفناک تھا، ایک قدم بھی غلط پڑتا تو بندہ نیچے جاتا، اور ابھی ابھی وہ حادثہ دیکھ کر آئے تھے۔ سوائے مقدّم کے سبھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے، اور وہ پیدائشی پہاڑی آدمی! کھائی کے کنارے کنارے بڑے سکون سے چلتا، اُن سے پانچ منٹ پہلے ہی چلّم چو کی پہنچ گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ لوگ بھی ہانپتے ہانپتے چڑھائی چڑھ گئے۔ نوید بھی آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا پر وہ ہانپ نہیں رہا تھا۔

چو کی پار کی تو تاحد نگاہ نظر آنے والی خوبصورتی نے سانسیں روک دی۔ وہ حسن تھا کہ جنت؟ خدا بھی کیسا باریک بین ہے۔ کتنی تراش خراش سے دنیا بنائی ہے۔ صبح کی نیلی اور سنہری روشنی پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھی۔ کچی سڑک کے کنارے دو تین چھوٹے سے چائے کے ڈھابے تھے، جن کی چھتوں سے دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اندر مٹی کے چولہے پر اُبلتی چائے اور پراٹھے کی خوشبو سرد ہوا میں گھل مل رہی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب پہاڑوں کے درمیان کہیں نیچے، دریائے استور کا پانی بہتا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر کم آرہا تھا، مگر اُس کی آواز مسلسل پس منظر میں موجود تھی۔ یہاں جو چیک پوسٹ تھی، اُس میں چند سپاہی گرم کوٹ پہنے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے لکڑی کی بیرکیں اور رکاوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی جیپ یا لینڈ کروزر آ کر رکتی تو مسافر گاڑی سے نکلتے، سرد ہوا کے جھونکے سے کانپتے ہوئے ہاتھ ملتے، اور پھر چائے کے کپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ یہ جگہ عجیب تھی۔ نہ مکمل آبادی، نہ مکمل ویرانی۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے یہ مقام پہاڑوں کے درمیان سفر کرنے والوں کی عارضی پناہ گاہ ہو۔

وہ لوگ بھی خوبصورتی کو روح میں محسوس کرتے ایک ڈھابے کے باہر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کی تازہ خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ راشد بھی اپنے بھتیجے کو کسی کے حوالے کر کے اُنکے پاس آیا، غالباً اُسے یہیں کسی کے پاس چھوڑنے کی غرض سے ہی راستے سے لیا تھا۔

''ہم کو سونا ہے، ورنہ خدا کی قسم! ہم مر مرا جائے گا۔''اُس نے وہاں پہنچتے ہی شور ڈال دیا تھا۔

''لالہ! تم ادھر آجاؤ!''ایک دکان والے نے اُسے قریب رکھے تخت پر سونے کی پیشکش کی تھی۔

''تمہارا شکریہ بچے! اور تم لوگ سن لو۔ ہم کو کوئی چار گھنٹے سے پہلے نہ اٹھائے۔''وہ پہلے بچے اور پھر اُن لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا تھا۔ نوید نے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ تیزی سے تخت پر جا کر ڈھیر ہوا اور فقط چند سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔

''آپ لوگ کیا لینا پسند کرے گا؟''ایک پٹھان ڈھابے والے نے انکے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے بس چائے!''نوید نے موبائل پر کچھ لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

''مجھے بھی صرف چائے!''مقدّم نے بھی کہا۔رضااور حسین نے بھی چائے ہی طلب کی تھی۔باقی دونوں نے چائے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ڈھابے کا مالک اُنکے منع کرنے کے باوجود چائے کے ساتھ گرم پراٹھے،اور کچھ خشک میوہ جات کی پلیٹ لے آیا۔

''لمبا سفر ہے،ہمارا طرف سے یہ سوغات سمجھو!''مالک نے اپنائیت سے کہا تو دل نہ ہوتے ہوئے بھی اُن لوگوں کو کھانا پڑا تھا۔البتہ نوید نے ایسی کوئی زحمت نہ کی تھی،اُس نے چند ہی گھونٹ میں چائے ختم کی اور کھڑا ہو گیا۔

''میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔''وہ انہیں اطلاع دیکر چوکی سے واپس نیچے کی طرف اُتر گیا،اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''یہ کہاں گیا اب؟''حسین سب سے پہلے مشکوک ہوا۔

''اُس نے بتایا نہیں ہے کہ کہاں گیا؟''مقدم نے چڑ کر جواب دیا۔

''ہاں!اطلاع دے دی اُس نے،احسان ہے اُسکا۔''حسین کو بھی برا لگا۔

''یہ تم دونوں ہاتھ دھو کر اُسکے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''رضا نے دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ ہم یہاں اُسکے آسرے پر ہیں اور وہ ہمیں چھوڑ کر نجانے کہاں چلا گیا ہے؟اوپر سے بتایا بھی نہیں!کوئی مسئلہ ہو گیا تو؟''حسین کی بات میں دم تھا۔

''ہم بچے ہیں؟کوئی مسئلہ ہو بھی گیا تو ڈرائیور سامنے ہے،اور جیپ چوکی سے نیچے کھڑی ہے،ہم اُسے یہیں چھوڑ کر اسکردو چلے جائیں گے۔''یہ مفت مشورہ علی نے دیا تھا۔

''اور جائیں گے کہاں؟''رضا کو اُسکا مشورہ پسند نہ آیا۔ٹھنڈ سے اُسکی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

''کہیں بھی چلے جائیں گے،خالی جیب تو ہیں نہیں ہم!''علی نے جواب دیا۔

''ہاں!اور یہ جو سارا منصوبہ ایف آئی اے نے بنایا ہے،اُسکا کیا؟''رضا کو اختلاف کرنا ضروری تھا۔

''یہ اُسکا مسئلہ ہے،اُسکو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔''حسین نے جواب دیا تھا۔

''آجائے گا تھوڑی دیر میں،ویسے بھی راشد چار گھنٹے سے پہلے اُٹھنے نہیں والا،اور جیپ کو بھی ٹھنڈا کرنا ضروری ہے۔تب ہی ہم آگے سفر کر سکتے ہیں۔''رضا نجانے اُسکی طرف داری کیوں کر رہا تھا؟

''چار گھنٹے ھوں یا پانچ گھنٹے،اُسے یہیں رہنا چاہیے تھا۔نہیں تو کم از کم بتا کر جانا چاہیے تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟''مقدّم اور حسین ہمیشہ ایک پیج پر ہوتے تھے۔

''کیا وہ تمہارا دوست ہے؟'' اتنی دیر میں پہلی بار عمر نے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اور اِس سوال پر لمحے کو سب خاموش ہوئے۔

''نہ تو وہ خود کو ہمارا دوست سمجھتا ہے، نہ ہم کسی فرینڈز ٹرپ پر آئے ہیں کہ اُسکے، اِس طرح بنا بتائے چلے جانے پر برا مانیں۔ وہ ہمیں یہاں لایا ہے، ہم اُسکی ذمّے داری ہیں تو وہ اپنی ذمّے داری پوری بھی کرلے گا۔ اُسکے کسی بھی عمل کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عمر نے بہت صاف گوئی سے کام لیا تھا، حتیٰ کہ وہاں بیٹھے کسی شخص کو اُس سے اِس حد تک صاف گوئی اور تلخ بات کی امید نہ تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اُسکی مرضی ہے، وہ جہاں جانا چاہے جائے۔'' رضا نے سب سے پہلے اُسکی تائید کی اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گیا۔

تین گھنٹے مزید خاموشی سے سرک گئے۔ نوید واپس نہیں آیا، نہ اُنکے درمیان دوبارہ کوئی بات ہوئی۔ مقدّم اور حسین چلّم کے آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے، رضا نے بھی تھوڑی دیر بعد اُنہیں جوائن کر لیا۔ جبکہ عمر ایک مرتبہ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہی سو چکا تھا۔ علی دوبارہ موبائل میں اپنی کل کی ڈاؤنلوڈ کی ہوئی ڈاکیومنٹری دیکھنے لگا تھا۔ اِس سفر سے اب وہ لوگ کچھ کچھ بیزار بھی ہو رہے تھے۔

مقدّم، حسین اور رضا اِدھر اُدھر مٹر گشتی کے بعد واپس کرسیوں کی جانب پہنچے تو دیکھا کہ ڈھابے کا مالک اپنی زبان میں کسی آدمی سے بحث کر رہا ہے۔ بحث، تلخ کلامی میں اور تلخ کلامی آہستہ آہستہ ہاتھا پائی میں تبدیل ہونے لگی تو آس پاس کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کروالیا۔ دوسرا آدمی اپنی زبان میں ڈھابے کے مالک کو دھمکی دیتا ہوا چلا گیا۔ مالک بھی تیزی سے اندر گیا اور دو چار لوگوں کو اکٹھا کر کے کوئی اہم مشاورت کرنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ دوسرا شخص واپس آیا، اِس بار اُسکے ساتھ دو چار اور لوگ تھے، سب کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں۔ دوسری جانب ڈھابے کا مالک بھی اپنے مشاورتی لوگوں کے ساتھ باہر آیا اور اِس بار اُنکے ہاتھوں میں بھی بڑی بڑی بندوقیں موجود تھیں۔ یہ سارا منظر نامہ دیکھ کر انکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ صورتحال کچھ یوں تھی کہ دونوں گروپ چلّم چوکی سے نیچے اترنے والے راستے پر تھے، جبکہ خود وہ لوگ نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ پیچھے۔

دونوں گروپ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے، پھر ڈھابے کے مالک نے گولی چلائی، اور پوری تسلی کی کہ گولی سامنے والے کو نہ لگے۔ غالباً یہ صرف دھمکانے کے لیے تھا، جواباً دوسرے فریق نے بھی فقط دھمکانے کے لیے ڈھابے کی لکڑی کی کھڑکی پر گولی چلادی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' فائرنگ کی آواز سن کر عمر گھبرا کر اٹھا تھا۔

''ہم کیا کریں اب؟'' علی نے بھی پریشانی سے مقدّم سے پوچھا۔

''انکا ذاتی معاملہ لگ رہا ہے، تم لوگ یہاں سے ہلنا مت ورنہ خوامخواہ کوئی نقصان نہ ہو جائے۔'' مقدّم نے کہا تو سب نے اُسے ایک ساتھ گھورا تھا۔

''یہاں بیٹھے رہے تو بھی کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جائیں گے۔'' رضا نے چبا چبا کر کہا۔

اِس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، چوکی کے سپاہیوں نے آکر معاملہ رفع دفع کیا۔ دوسرا شخص جو لڑنے آیا تھا وہ گیا تو نہیں، البتہ غصّے میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے قریب ہی میز پر بیٹھ گیا۔

''یہ نوید آخر آ کیوں نہیں رہا؟'' علی کو حقیقتاً خوف محسوس ہوا تو بولا۔

''نوید کونسا اِنکا باپ ہے، جو انہیں دو تھپڑ لگا کر سیدھا کر دے گا؟'' رضا کو اُس سے اختلاف ضروری تھا۔

''یہ ہماری طرف کیوں آ رہا ہے؟'' حسین کی آواز پر سب نے پہلے اُسکا فق ہوتا چہرہ دیکھا، پھر اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہاں سے ڈھابے کا مالک آتا دکھائی دیا۔

''یہ ہمارے پاس نہیں، پیچھے بیٹھے شخص کے پاس آ رہا ہے۔'' عمر نے اندازہ لگایا، دوسرا شخص اُنکے پیچھے والی میز پر ہی بیٹھا تھا۔

''اگر ان دونوں نے یہاں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں تو؟'' حسین نے پریشانی سے پوچھا۔ اتنی دیر میں ڈھابے کا مالک اُنکے پاس پہنچ کر رکا۔

''بچہ لوگ! تم لوگ ٹھیک تو ہے نا؟'' اُس نے اتنی نرمی سے پوچھا کہ اُنکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آپ۔۔۔ آپ ہم سے۔۔۔ پوچھ رہے ہیں؟'' حسین نے تصدیق چاہی۔

''ہاں! ہاں! تم لوگوں سے ہی پوچھ رہا ہے۔ تم لوگوں کا چہرے پر ایسا بارہ کیوں بج رہا ہے؟ جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا تو اُنہیں اُسکی دماغی حالت پر شک گزرا۔

''وو۔۔۔ وہ آپ۔۔۔ ابھی فائرنگ کر رہے تھے نا! تو ہم بس پریشان ہو گئے تھے۔'' مقدم نے ذرا سنبھل کر کہا کہ آیا چچا جی کو کوئی بات بری نہ لگ جائے۔

''ارے بچہ! اس میں پریشانی کی کیا بات؟ یہ تو ہم لوگوں کا چھوٹا موٹا بحث تھا۔ روز ہی ایسا ہو جاتا ہے۔ پریشان نہ ہو۔'' چچا جی نے تو انکے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ یہ چھوٹی موٹی بحث تھی تو پھر پوری لڑائی میں یہ کیا کرتے ہوں گے؟

''اے زرولی!۔۔۔'' چچا نے یکدم ہی پیچھے بیٹھے اپنے حریف کو مخاطب کیا تو، اُنکی تو باقاعدہ سانس ہی رک گئی۔

'' اوس څه ستونزه ده؟ (اب کیا مصیبت ہو گئی ہے؟)'' اُس نے تڑخ کر پوچھا۔

''دا بناریان زمور مېلمانه دي، دا غریبانان ستاسو د کړنو له امله خپه شوي دي. راشئ، راشئ او له دی نه معافی اوغواړے څخه بخښنه وغواړئ!"(۔(یہ شہری ہمارے مہمان ہیں، تمہاری حرکتوں کی وجہ سے غریب پریشان ہو گئے ہیں۔ آؤ! آؤاور ان سے معافی مانگو۔)''اُس نے اپنی زبان میں کوئی جواب دیا تو اُس کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ تیزی سے اُٹھا۔اُسے اٹھتا دیکھ کر انکی رہی سہی ہمت بھی فنا ہو گئی۔

''اوہ پاگل کا بچہ ! بندوق تو وہیں رکھ۔''ڈھابے کے مالک نے ڈانٹا تو اُس نے جلدی سے بندوق میز پر چھوڑی اور اُنکے پاس آیا۔چہرے پر شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

''آپ لوگ ہمارا وجہ سے پریشان ہو گیا ہے۔ہم کو معاف کر دو ! ہم تو ایسے ہی اِس سے لڑتا رہتا ہے۔''اُس نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ انہیں اپنی سماعتوں پر شک گزرا۔کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر چل کیا رہا ہے؟

''معافی مانگو ! مہمان ناراض ہو گیا ہے۔''چچا نے مزید ڈانٹا تو اب کہ اُس نے کان ہی پکڑ لئے۔

''معاف کر دو نہ بھائی جان ! خدا کا قسم ! دوبارہ ایسا نہیں کرے گا۔''اُس نے کان ہی پکڑ لیے۔

''نہیں نہیں ! کوئی بات نہیں۔ہم نے برا نہیں مانا۔''عمر نے جلدی سے معاملہ رفع دفع کیا۔

''تم لوگ آرام سے بیٹھو۔کچھ چاہیے ہو تو ہم کو کہنا۔''چچا نے فراخ دلی سے کہا۔اُسی لمحے نوید بھی وہیں آیا۔

''آپ لوگ ابھی تو دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے۔اب کیا ہوا؟''مقدّم کو ہمت ملی تو پوچھ لیا۔

''دشمن؟ یہ ہمارا داماد ہے،ایسا چلتا رہتا ہے اِسکے ساتھ۔''وہ ہنستے ہوئے کہہ کر چلے گئے۔

''راشد کہاں ہے؟''اُنکے جانے کے بعد نوید نے سوال کیا۔جیسے اُسے یہاں ہوئے واقعہ سے کوئی سروکار نہ ہو۔اس سوال پر سب نے گردن موڑ کر اُس تخت کو دیکھا،جہاں راشد سویا ہوا تھا۔وہ اللہ کا بندہ اتنے شور شرابے کے باوجود ایک انچ بھی نہ ہلا تھا۔

''کیا نیند ہے بھئی؟''علی نے قابلِ رشک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''کوئی اسے اٹھاؤ بھائی ! میں آج کی تاریخ میں مزید کسی ایڈونچر کا متحمل نہیں ہو سکتا اب۔''یہ بے بس سی التجا حسین نے کی تھی۔

''میں اسے اٹھاتا ہوں۔تم لوگ چلنے کی تیاری کرو۔''نوید نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا اور راشد کی طرف بڑھا۔امید تھی کہ وہ لوگ کوئی جواب دیں گے مگر کسی نے کوئی ردعمل نہ دیا۔نوید نے تخت کے پاس آکر سوئے ہوئے راشد کو ہلایا۔تو اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھا،پھر نہایت ہی برا منہ بنا کر بولا۔

''اب کیا قیامت آ گیا ہے ؟''

''چار گھنٹے پورے ہو گئے ہیں، چلو اُٹھو شاباش !''نوید نے کہا نہیں تھا، بلکہ کندھوں سے پکڑ کر اُسے بٹھا دیا تھا۔

''ماڑا! تم کو بھی چین نہیں ہے ویسے۔۔۔''اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''جیپ لیکر آؤ اوپر، ہم دیوسائی جائیں گے۔''

''تم ہم کو ایک مرتبہ کیوں نہیں بتا دیتا کہ کہاں جانا ہے ؟ ہر تھوڑا دیر بعد ہم کو ایک نیا منزل بتاتا ہے۔ایسا کرتے کرتے تم پورا پاکستان نہ گھما دینا ہم کو۔۔۔'' اُس نے بے پر کی ہانکی تھی۔نوید نے اُسے سنجیدہ نظروں سے گھورا تو وہ شرافت سے کھڑا ہو گیا۔

''جا رہا ہے ! جا رہا ہے۔ہر وقت ہم کو ایسے گھورتا مت رہا کرو۔ ہمارا بیوی یاد آ جاتا ہے ہم کو، وہ بھی ایسا ہی۔۔۔''وہ با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے چوکی سے نیچے کی جانب بڑھ گیا۔نوید دوبارہ اُن لوگوں کے پاس آیا جو جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

''وہ جیپ لیکر آ رہا ہے۔''اُس نے اطلاع دی۔ اس بار بھی کسی نے کوئی خاص رد عمل نہ دیا تو اُس نے بھنویں سکیڑ کر کچھ اچھنبے سے اُنہیں دیکھا۔ کیا انہیں اُسکا بتائے جانا برا لگا تھا؟ اُس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اندازہ لگا لیا تھا۔اب کہ وہ بھی خاموشی سے وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔کچھ ہی دیر میں راشد جیپ لیے واپس چوکی سے اوپر کی جانب آ گیا۔

''آ جاؤ بیٹھو !''اُس نے جیپ کے اندر سے جھانکتے ہوئے کہا تو وہ لوگ باری باری اندر بیٹھنے لگے۔

''سچ بتاؤں تو مجھے اب اِس جیپ سے ڈر ہی لگ رہا ہے۔''حسین نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''لگ تو مجھے بھی رہا ہے، لیکن اب کیا ہی کر سکتے ہیں ؟''علی نے بھی اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا نام لو، سفر کی دعا پڑھو۔اور بس ! صحیح سلامت پہنچنے کی امید رکھو۔ مجھے اب خود بھی اِس آدمی اور اِسکی جیپ پر بھروسہ نہیں ہے۔''مقدّم نے کہا۔

''نوید کو چاہیے تھا کہ وہ یہاں سے ڈرائیور اور جیپ تبدیل کر لیتا۔''عمر نے کہا۔

''نوید کی مرضی بھئی ! ہم کون ہوتے ہیں مشورہ دینے والے ؟''حسین زیادہ ہی تپا ہوا تھا۔

''تم دے سکتے ہو، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔اور اگر پہلے یہ مشورہ دے دیتے تو میں چار گھنٹے سونے میں برباد کرنے کے بجائے کوئی نئی جیپ تلاش کر لیتا۔''اُسی لمحے جیپ کا سامنے والا دروازہ کھلا اور نوید نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ سب کو لمحوں کے لیے سانپ سونگھا۔

''تم سو رہے تھے؟''علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے سر ہلایا۔راشد جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔

''کہاں؟''یہ سوال سب کے لبوں پر تھا۔

''جیپ میں!''مختصر جواب دیا۔

''اوہ ماڑا!۔۔۔جبھی ہم کہہ رہا ہے کہ جیپ میں کس کا پرفیوم کا خوشبو آرہا ہے،اتنا دیر سے؟''یہ تبصرہ راشد نے کیا تھا،نوید نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

''تو تم یہ بات بتا کر بھی جا سکتے تھے۔''حسین نے بالآخر کہہ دیا۔حالانکہ کچھ گھنٹوں قبل ہی عمر نے اسے ٹھیک ٹھاک سبق پڑھایا تھا۔پر نہیں!وہ بھی حسین تھا۔

''مجھے لگا کہ تم اتنے عقلمند تو ہو گے کہ خود ہی سمجھ جاؤ۔''اُس نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔یہ جواب تھا یا بے عزتی؟حسین نے دانت کچکچائے۔

''لالہ!تم ہم کو ایک بات بتاؤ!''یکدم ہی راشد نے نوید کو مخاطب کیا۔

''کیا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم کیا کوئی غنڈا ونڈا ہے؟''اِس سوال نے نوید کے علاوہ سب کے لبوں پر بیساختہ تبسم بکھیرا تھا۔

''ہوا بھی تو تم کیا کر لو گے؟''یہ سوال مقدّم نے پوچھا تھا۔

''ہم کیا کرے گا بھلا؟ہم تو شریف آدمی ہے۔اور شریف تو تم لوگ بھی لگتا ہے۔بس یہ غنڈا آدمی پتہ نہیں تمہارا ساتھ کیا کر رہا ہے؟کہیں اغوا و غوا تو کر کے نہیں لے جا رہا تم لوگوں کو؟''اُس نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔

''کیا تم خاموشی سے گاڑی چلاؤ گے؟''نوید کے سوال نے اُسے چپ کروایا۔کچھ دیر وہ خاموش رہا،پھر زبان میں دوبارہ کھجلی ہوئی تو بولا۔

''بات سنو!''چونکہ نوید اُسکے برابر میں تھا لہٰذا ہمیشہ اُسکا مخاطب وہی ہوتا تھا۔ اُس نے کوفت سے راشد کو دیکھا۔

''کیا ہم گانا چلا سکتا ہے؟''

''نہیں!''اُس نے قطعی لہجے میں کہا۔

''پر ہم کو مزا نہیں آتا بنا گانے کے۔''اُس نے منہ بنایا۔

''سفر میں گانے سننے کے بجائے اللہ کو یاد کرو، ابھی پیچھے مرنے والے تھے نا ہم؟ گانا سنتے مر گئے تو کیا منہ دکھاؤ گے اللہ کو؟'' یہ جواب رضا نے دیا تھا۔ رضا سے اِس جواب کی کسی کو توقع نہ تھی، غالباً وہ بھی تنگ آ گیا تھا اُسکے گانوں سے۔

''تم خود کیا سن رہے تھے ہیڈ فون میں؟'' علی نے سیدھا طنز کیا۔

''سورۃ رحمٰن!'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خجل ہوا۔

''وہ چپ ہوتا ہے تو یہ دونوں شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا خاموشی سے سفر نہیں کر سکتے؟'' مقدّم نے منہ بناتے کہا تھا۔ پھر وہاں حقیقتاً خاموشی چھا گئی۔

---------+---------+--------

دیوسائی، دیو کی سرزمین۔ جب جیپ دیوسائی میدان کی سرحد میں داخل ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئے ہوں۔

سامنے ایک بے حد وسیع میدان پھیلا ہوا تھا، اتنا وسیع کہ آنکھ اس کا کنارہ تلاش کرتے کرتے تھک جائے۔ ہوا یہاں صاف اور ٹھنڈی تھی۔ جیپ کے شیشوں سے باہر نظر آتے گھاس کے لمبے نرم پتے ہوا کے ساتھ لہروں کی طرح جھوم رہے تھے۔ کبھی بادل نیچے آ جاتے اور چند لمحوں کے لیے پورا میدان دھند کی سفید چادر میں چھپ جاتا، پھر اچانک سورج کی کرنیں بادلوں کے بیچ سے نکل کر زمین پر سنہری روشنی بکھیر دیتیں۔ دور کہیں پانی کی باریک دھاریں گھاس کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی بہہ رہی تھیں۔ ان کے کنارے چھوٹے چھوٹے جنگلی پھول کھلے تھے۔

وہاں کھڑے ہو کر اُنہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ زمین کتنی وسیع ہے اور انسان اُس کے مقابلے میں کتنا چھوٹا؟ یہاں ہر شے پہلے سے زیادہ حسین تھی، اور جس شے نے دلوں کو کچھ دیر کے لیے ساکت کر دیا وہ تھی شیوسر جھیل۔

شیوسر جھیل دیوسائی کی سب سے مشہور اور خوبصورت جھیل ہے۔ یہ جھیل دیوسائی نیشنل پارک کے عین وسط میں واقع ہے اور سطحِ سمندر سے تقریباً 4142 میٹر (13,589 فٹ) کی بلندی پر ہے۔

جھیل کا پانی حیرت انگیز طور پر صاف اور نیلا تھا۔ ہوا بالکل ہلکی سی بھی چلتی تو اس کے پانی میں آسمان کے بادل لرزتے ہوئے دکھائی دینے لگتے۔ کبھی کبھی پانی اتنا پرسکون ہوتا کہ دور کھڑے پہاڑ اس میں مکمل عکس کی طرح نظر آتے۔ جھیل کے گرد گھاس کے وسیع میدان پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے، جو ہلکے پیلے، سفید اور بنفشی رنگوں سے زمین کو سجا رہے تھے۔ موسم صاف تھا، یہاں سے دنیا کے عظیم پہاڑوں میں سے ایک، نانگا پربت کی برفانی چوٹی بھی دور آسمان کے کنارے دکھائی دے رہی تھی۔

''دیوسائی میدان دراصل صرف ایک میدان نہیں بلکہ ایک محفوظ قدرتی علاقہ ہے جسے دیوسائی نیشنل پارک کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان کے بلند ترین نیشنل پارکوں میں سے ایک ہے اور تقریباً 4100 میٹر (13,500 فٹ) کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے 1993 میں نیشنل پارک قرار دیا گیا تاکہ یہاں کے نایاب جانوروں اور ماحول کو محفوظ رکھا جا سکے۔'' وہ لوگ جھیل کے کنارے بیٹھے تھے۔ راشد نے دیوسائی پہنچ کر پھر سے سونے کا شور مچا دیا۔ اِس بار نوید نے بنا کسی اعتراض کے اُسے دو گھنٹے آرام کی اجازت دے دی تھی۔ وہ وہیں گھاس پر اپنی شال کو گول مول کر کے سر کے نیچے رکھے سو گیا۔ اِس بار کسی کو بھی قیام کرنے پر اعتراض نہ تھا۔ سفر انسان کی صحت پر اچھا اثر ڈالتا ہے، رضا جیسے آدم بیزار انسان کو بھی دیوسائی کی خوبصورتی نے مسمرائز کر دیا تھا۔ یہ جگہ اتنی خوبصورت تھی، کہ دل کرتا تھا یہاں رک کر اُسے دل میں سمو لیا جائے۔ اگر وہ یہاں رکے بنا چلے جاتے تو یقیناً تاعمر پچھتاتے۔ اِس لیے وہ بھی جھیل کے کنارے بیٹھ گئے۔ مقدّم اُنہیں، اُنکی مرضی کے بنا ہی دیوسائی کے متعلق تمام معلومات فراہم کرنے لگا۔ نوید البتہ خاموشی سے ادھر اُدھر ٹہلتا، اپنے موبائل میں مسلسل کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ یقیناً وہ فرّخ صاحب سے رابطے میں تھا، اور انہیں ہی پل پل کی خبر دے رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ نظریں اٹھا کر اُنہیں بھی دیکھ لیتا۔

''دیوسائی کا سب سے مشہور جانور ہمالیائی بھورا ریچھ ہے۔ کسی زمانے میں یہ ریچھ تقریباً ناپید ہونے کے قریب تھا، لیکن نیشنل پارک بننے کے بعد اِس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ عموماً گرمیوں میں دیوسائی کے میدانوں میں خوراک تلاش کرتا ہے اور سردیوں میں غاروں میں چلا جاتا ہے۔ یہ یہاں سب سے زیادہ نظر آنے والا جانور ہے۔ پھر ہمالیائی مارموٹ، یہ گلہری کی بڑی قسم ہے۔ یہ زمین میں بل بنا کر رہتا ہے اور اکثر گھاس کے میدانوں میں سیدھا کھڑا ہو کر سیٹی جیسی آواز نکالتا ہے۔ اِسکے علاوہ یہاں نایاب شکاری جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے برفانی چیتا، یہ بہت کم نظر آتا ہے، کیونکہ یہ زیادہ تر اونچے پتھریلے پہاڑوں میں رہتا ہے، اِسکے علاوہ یہاں سنہری عقاب، سرخ لومڑی، ہمالیائی آئبیکس، مختلف جنگلی پرندے اور بطخیں بھی ہیں۔ گرمیوں میں یہاں سینکڑوں اقسام کے جنگلی پھول بھی کھلتے ہیں، جس سے پورا میدان رنگین ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ تم ابھی دیکھ سکتے ہو۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہاں پر ریچھ اور چیتے بھی ہوتے ہیں؟'' حسین کو صرف یہی سمجھ آیا تھا۔

''ہاں!''

''اور وہ بھی کھلے ہوئے؟ مطلب کبھی بھی یہاں آ سکتے ہیں؟''

''بالکل! اسی لیے اسے نیشنل پارک کہتے ہیں۔'' اُس نے زور و شور سے سر ہلاتے کہا۔

''اور اگر یہاں کوئی ریچھ آ گیا؟ یا کوئی چیتا؟''

''چیتا عموماً یہاں نہیں آتا، وہ پہاڑوں پر رہتا، ہاں! ریچھ وغیرہ رات کو آ سکتے ہیں۔ اس لیے کیمپنگ والوں کو کافی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''بہت شکریہ! میری معلومات میں اضافے کے لیے، اب ذرا اپنی زبان کو آرام دو، تھک گئے ہو گے اتنا بول کے۔'' حسین نے فراخ دلی سے کہا تو اُس نے فقط گھورنے پر اکتفا کیا۔

''میں نے اتنی خوبصورت جگہ پہلی بار دیکھی ہے۔'' رضا نے بیساختہ تعریف کی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار شمالی علاقہ جات کا سفر کر رہا تھا۔ پہلے اُسکے پاس اتنے وسائل نہیں تھے اور جب وسائل آئے، تو وقت ہی نہ ملا کبھی شہر سے باہر جا کر گھومنے پھرنے کا۔

''میں نے بھی۔'' حسین کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور رضا کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر نجانے اُس سے کونسے راز و نیاز کرنے لگا؟ علی بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' مقدّم نے اپنے برابر پاؤں پسارے بیٹھے عمر سے آہستگی پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں اب، سفر کی وجہ سے تھکن تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں سوچ رہا تھا، اگر میں کبھی ایسے ہی آتا، گھومنے پھرنے کی نیت سے، تو یقیناً اس جگہ کیمپنگ کرتا۔'' عمر نے سامنے نظر آتے تاحد نگاہ پھیلی، رنگ برنگی سرزمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پر اس وقت ہم اپنی جان بچانے کے لیے یہاں آئے ہیں۔'' مقدّم کہہ کر خود ہی ہنسا۔

''یہ ریئلٹی چیک مجھے اس وقت ہرگز پسند نہیں آیا۔'' عمر نے کہا۔'' پر میں خوش ہوں کہ زندگی میں کم از کم تمہارے ساتھ تو ہوں۔'' پھر مسکراتے ہوئے بولا تو مقدّم بھی مسکرا دیا۔

''اِس بات کی مجھے بھی خوشی ہے کہ تم مجھے مل ہی گئے اس زندگی میں۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اب شاید کبھی ملاقات نہ ہو۔'' مقدّم نے کہا۔

''اور مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں کا رومانس پھر سے شروع ہو چکا ہے۔'' پیچھے سے حسین اچانک ہی نمودار ہوتا دونوں کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ اس بات پر کافی دیر سے محو سوچ علی بیساختہ ہی ہنسا۔ حالانکہ اُس نے یقیناً عمر و مقدّم کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی تھی۔ مگر حسین کا تبصرہ اُسے ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔

''حسین!'' عمر نے سنجیدگی سے اُسے پکارا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''شٹ اپ!'' اُس نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا تو اب کہ مقدّم اور حسین دونوں ہنس دیئے۔

''دوسرے لفظوں میں یہاں سے دفع ہو، کباب میں ہڈی نہ بنو۔'' حسین نے خود ہی ترجمہ کیا تو عمر نا چاہتے ہوئے بھی مسکرایا۔

''ویسے لفظ غلط استعمال کیا ہے تم نے، برومانس کہتے ہیں اسے۔''مقدّم نے لگے ہاتھوں تصحیح کی۔

''یہ محبت ہم سے تو نہ جتائی تم نے کبھی؟''زماں و مکاں کا اثر تھا، قدرت کے حسن نے انکے اندر بھی ایک عجیب سی طمانیت بھر دی تھی۔وہ بھی پریشانیاں بھلائے عجیب و غریب گفتگو میں وقت برباد کرنے لگے۔

''محبت دو طرفہ عمل ہوتی ہے۔اب میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟''اُس نے کندھے اچکاتے کہا۔

''ایک طرفہ بھی ہو سکتی ہے اگر کوئی کرنا چاہے تو۔۔۔''حسین نے جتایا۔

''کیا تم لوگوں کے پاس بات کرنے کے لیے موضوعات ختم ہو چکے ہیں؟''رضا نے وہاں آتے ہوئے کہا۔

''تم دے دو کوئی اہم موضوع۔۔۔''اُس نے کھلی پیشکش کی۔

''تم نے پھر گھوم پھر کر اپنے مطلب کے ہی موضوع پر آ جانا ہے۔''وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''تو پھر مشورے نہ دو۔''حسین نے ڈھٹائی سے کہا تو اُس نے گھورا۔

''بھاڑ میں جاؤ!''پھر منہ جھیل کی طرف کر کے بیٹھ گیا۔

''تم کیوں اتنا خاموش ہو؟''یکدم ہی عمر نے علی کی خاموشی کو نوٹ کیا تو پوچھا۔

''سر میں بہت درد ہے۔''اُس نے گردن دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں جھٹکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! سفر کی وجہ سے۔''عمر نے اندازہ لگایا۔

''معلوم نہیں! اور یہ سفر بھی تو ختم ہی نہیں ہو کر دے رہا۔میں اب سکون سے ایک جگہ سونا چاہتا ہوں۔''علی نے بیزاری سے کہا۔ یہ سفر تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا تھا۔

''فکر نہ کرو! یہ آخری اسٹاپ ہے۔اگلی منزل اسکردو ہے۔''اس آواز پر سب نے چونک کر دیکھا تو نوید اُنکے سروں پر کھڑا تھا۔سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔اُس نے پہلی بار گفتگو میں خود حصّہ لیا تھا۔

''تو چلو پھر اگلی منزل، میں اب یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔''علی نے کہا۔حالانکہ باقی چاروں تو پورا دن بھی یہاں بیٹھنے کو تیار تھے، پر علی کے سر کا درد اُسے کسی طور بھی چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

''ڈیڑھ گھنٹے ہو گئے ہیں، آدھا گھنٹہ اور رک جاؤ پھر میں راشد کو اٹھاتا ہوں۔''اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے کہا، پھر دوبارہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔اب کہ وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔

گردن کو ہاتھ سے دباتے علی کی نظریں رضا پر گئیں۔وہ خاموشی سے سامنے نظر آتے پہاڑ کو دیکھتا نجانے کیا سوچ رہا تھا؟ علی اُسے بغور دیکھنے لگا۔وقت کچھ پیچھے ہونے لگا، گھڑی کی سوئیاں الٹی چلنے لگی، دیوسائی رضا کے اسکول کی دیواروں میں تبدیل ہو گیا۔اب رضا اپنے اسکول کی انتظار گاہ میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا، ساتھ میں احمد بھی تھا۔

علی اُس وقت نشمیہ کو لینے وہاں آیا، تو احمد کو رضا کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رکا۔پھر ستون کی آڑ لیکر کھڑا ہو گیا۔احمد پرائمری میں تھا لہٰذا اُسکا ابھی لنچ بریک تھا، البتہ نشمیہ کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا علی اُسے ہی لینے آیا تھا۔

''تمہیں فٹبال بہت پسند ہے؟''رضا نے احمد سے پوچھا۔

''ہونہہ۔۔۔''اُس نے بس سر ہلا دیا تو رضا مسکرایا۔وہ خاموش طبع تھا، پر چہرے پر معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''تم کسی سے دوستی کیوں نہیں کرتے؟''اُس نے پھر پوچھا۔

''دل نہیں کرتا۔''اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔ستون کے پیچھے کھڑے، اُنکی تمام گفتگو بخوبی سنتے علی کو اِس سوال وجواب کا مقصد سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''کیوں دل نہیں کرتا؟''رضا نے کریدنا چاہا۔

''بس! نہیں کرتا۔''اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''گھر پر کھیلتے ہو فٹبال؟''رضا نے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''کوئی کھیلتا ہی نہیں ہے۔''اس بات پر علی کا دل کٹا۔

''کیوں؟ تم اپنی بہن کے ساتھ کھیل لیا کرو نا!''

''وہ لڑکی ہے، وہ میرے ساتھ فٹبال نہیں کھیلتی، اسکو ڈول ہاؤس پسند ہے۔''رضا کو بچوں سے بات کرنے کا ہنر آتا تھا، ورنہ اتنی بات تو احمد نے کبھی کسی سے نہیں کی، وہ جلد گھلنے ملنے والا بچہ تھا ہی نہیں۔

''تو اپنے بابا کے ساتھ کھیل لو، وہ تو لڑکی نہیں ہیں۔'' اس بات پر وہ بیساختہ ہنسا۔ معصوم سی۔۔۔ پیاری سی ہنسی۔ آخر وہ تھا تو بچہ ہی۔ علی نے ٹھہر کر اپنے بیٹے کو دیکھا، جسکی ہنسی سنے اسے زمانے ہو گئے تھے۔

''تو بابا کے ساتھ کھیلا کرو نا! پریکٹس ہو گی تمہاری۔'' اُس نے اپنی بات دہرائی تو وہ ایک مرتبہ پھر سنجیدہ ہوا۔

''وہ میرے ساتھ کھیلنا، مجھ سے بات کرنا، اور میرے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔'' اُس نے شکوہ کیا، شاید پہلی بار کسی سے شکوہ کیا۔

''اور یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتے؟'' اس سوال کا اُسکے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''کیا اُنہوں نے تم سے کہا کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتے؟'' رضا نے اُسے بولنے پر اُکسایا۔

''نہیں! پر وہ مجھے بہت ڈانٹتے ہیں۔ ہر وقت غصّہ کرتے ہیں۔'' اُس نے دکھ سے کہا تو رضا نے بغور اسے دیکھا۔ علی جیسی آنکھیں، ویسا ہی چہرہ، وہی روٹھا روٹھا انداز۔ وہ اپنے باپ کا منی ورژن تھا۔ وہ مسکرایا۔ دوست سے اپنائیت الگ ہوتی ہے، پر دوست کی اولاد سے انسیت اپنی جگہ ہوتی ہے۔

''تم بھی تو غصّہ کرتے ہو۔'' اِس بات پر اُس نے آنکھیں پھاڑ کر رضا کو دیکھا۔

''میں؟ میں کب کرتا ہوں؟''

''کرتے ہو۔'' رضا اپنی بات پر قائم تھا۔ ''جب کوئی تم سے زبردستی بات کرنا چاہتا ہے، تو تم ڈانٹ دیتے ہو۔ جب کوئی تمہیں کھیلنے بلاتا ہے، تو تم جھنجھلا کر وہاں سے چلے جاتے ہو۔ جب کوئی تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے، تو تم اسے جھڑک کر اپنے آپ سے دور ہٹا دیتے ہو۔ جب تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی تو دوسروں کو برے لگتے ہو گے۔'' وہ حیران ہوا، رضا نے کتنے جلدی اُس پر غور کر لیا تھا۔

''پر۔۔۔ پر وہ تو۔۔۔۔'' اُس سے کوئی بہانہ نہیں بنا۔

''ہاں! میں سن رہا ہوں۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''وہ میری پرسنل اسپیس (ذاتیات) ہے۔ میں ان کمفرٹیبل (غیر آرام دہ) فیل (محسوس) کرتا ہوں۔''

''تمہارے بابا کی بھی تو کوئی پرسنل اسپیس ہو سکتی ہے، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ڈیسیپلینڈ (نظم و ضبط کے پابند) ہوں۔ اُنہیں تمہاری بہت سی باتیں پسند نہ آتی ہوں۔ وہ بھی تو ان کمفرٹیبل ہو سکتے ہیں نا!'' احمد چپ کا چپ رہ گیا۔ علی سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا، سمجھانے کا کتنا پیارا انداز تھا۔ رضا نے کہاں سے سیکھا؟

''کیا تم نے کبھی اپنے بابا سے جا کر پیار سے بات کرنے کی کوشش کی؟ کیا تم نے کبھی انہیں گلے لگایا؟ کیا تم نے کبھی اُن کو بتایا کہ تم اُن سے کتنا پیار کرتے ہو؟''

''نہیں!'' اُس نے دھیرے سے کہا۔

''کیوں؟''

''مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے، وہ مجھے ڈانٹ دیں گے۔'' رضا مسکرایا، یعنی وہ اپنے باپ کو یہ سب کہنا چاہتا تھا، پر ڈرتا تھا۔ علی مسکرا بھی نہ سکا۔

''کیوں ڈانٹ دیں گے؟ کیا وہ جلاد ہیں جو ہر وقت ڈانٹتے ہی رہیں گے؟'' اِس سوال پر وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوا۔

''کیا وہ تمہاری بہن کو بھی ڈانٹتے ہیں؟ وہ تو بہت ڈھیٹ ہے، روز صبح تمہارے بابا کو پیار کر کے، گلے لگا کر خدا حافظ کہتی ہے۔''

''آپ سب دیکھتے ہیں؟'' اس سوال پر رضا کا قہقہہ بیساختہ تھا۔

''وہ تم سے بھی بہت پیار کرتے ہیں احمد! تمہارے ساتھ کھیلنا بھی چاہتے ہیں، تم سے بات بھی کرنا چاہتے ہیں۔ پر تم بھی تو کوشش کرو نا! اگر تم خود اپنے بابا سے جا کر کہو گے کہ تم اُن سے پیار کرتے ہو، اُنکو گلے لگاؤ گے تو وہ کیوں تمہیں ڈانٹے گے؟ وہ نشمیہ کو تو نہیں ڈانٹتے۔'' علی کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔

''ڈانٹ اُسے بھی پڑتی ہے، پر وہ برا نہیں مانتی۔'' اس بار احمد نے خود ہی کہا۔

''ہاں! پر کیا وہ اُسے پیار کرنے پر بھی ڈانٹتے ہیں؟ وہ تم سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تمہاری بہن سے۔''

''آپ کو کیسے پتہ؟''

''کیونکہ۔۔۔'' وہ رکا، علی کا پورا وجود سماعت بن گیا۔ ''کیونکہ تمہارے بابا میرے دوست ہیں۔ بہت پرانے۔۔۔ جب ہم خود اسٹوڈنٹ تھے، پڑھتے تھے، ٹیچر سے ڈانٹ سنتے تھے۔ تب سے۔۔۔'' اِس بات پر علی سن سا رہ گیا، جبکہ اُسکے بیٹے کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

''کیا وہ آپکے دوست تھے؟ کیا وہ آپ پر بھی غصّہ کرتے تھے؟'' اسے یقین نہ آیا۔

''کرتے تھے، مگر تھوڑا تھوڑا۔ بلکہ وہ ہنستے زیادہ تھے، ہم کھیلتے بھی تھے، تمہارے بابا کو کرکٹ پسند تھی۔ وہ اچھے باؤلر تھے۔'' وہ یاد کر کے بتا رہا تھا۔ اسے علی کے متعلق ہر شے یاد تھی، جبکہ علی ساکت سا اسے سن رہا تھا۔

''وہ اچھے آرٹسٹ تھے، وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مجھے ایک کیلیگرافی تحفے میں دی تھی۔ وہ میرے پاس آج بھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ کبھی غصّہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو ہمارے ساتھ بہت ہنستے تھے۔'' رضا کو نجانے کیوں؟ پر وہ یونیورسٹی کے زمانے کا ہنستا مسکراتا علی یاد آ گیا تھا۔ جبکہ اس سے دور کھڑے علی کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

''تو وہ اب ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' وہ شاید اپنے باپ سے بہت زیادہ مایوس تھا۔

''دیکھو بیٹا! بڑے لوگوں کی زندگی میں بہت سی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ اِس لیے وہ تھوڑا ایسے ہو جاتے ہیں۔ ہاں! اُنہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، پر ایسا ہو جاتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم بھی اپنے بابا کے دوست بن جاؤ، اُن سے انکی پریشانی پوچھو۔ اُن کو گلے لگاؤ، اُن کو بتاؤ تم اُن سے کتنا پیار کرتے ہو۔ وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو گے نا؟''

''میں کوشش کروں گا۔'' اُس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو رضا مطمئن ہوا۔

''اور سنو!'' اس نے یکدم ہی کہا۔

''کیا؟''

''ہر گز اپنے باپ کو مت بتانا کہ یہ میں نے تم سے کرنے کو کہا ہے۔'' اس بات پر علی کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ بکھری۔

''کیوں؟ وہ آپکو بھی ڈانٹیں گے؟'' اُس نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔ شاید پہلی بار۔۔۔ رضا حیران ہوا۔

''اُسکی مجال کہ مجھے ڈانٹے؟''

''تو آپ اُن سے ڈر کیوں رہے ہیں؟'' رضا تو رضا پیچھے کھڑا علی بھی حیران رہ گیا۔ اب احمد کی آنکھیں بھی شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''میں کیوں ڈرنے لگا؟''

''آپ ڈرتے ہیں نا!'' شرارت اُسکے آنکھوں سے اُسکی مسکراہٹ تک پہنچ گئی۔

''اوہو۔۔۔ تو تم پر بھی اپنی بہن کا اثر ہو گیا ہاں!'' رضا نے اسکو گدگدایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ اُسکی ہنسی نے علی کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ اگر اُسکے اور رضا کے درمیان فاصلوں کی اتنی دیواریں نہ ہوتی تو شاید وہ اُسکو گلے لگا لیتا۔ اُس نے اُسکے بیٹے کو ہنسایا تھا، اُسکے اندر کا کھویا ہوا بچہ باہر نکال دیا تھا۔

''لنچ ٹائم ختم ہو گیا ہے، چلو بھاگو یہاں سے اپنی کلاس میں۔۔۔ جلدی!'' رضا نے اُسے اُسکی پیٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے اپنی کلاس کی طرف بھاگ گیا۔۔ وہ بچہ ہی تھا۔۔۔ ایک چھوٹا سا معصوم بچہ۔۔۔ اسے فقط توجہ و محبت کی ضرورت تھی۔

علی کچھ بھی کہے بناواپس پلٹ آیا، باہر آکر گارڈ سے نشمیہ کو بلوانے کی درخواست کی اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ نم آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا، پھر گہری سانس لیکر خود کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کی۔

آخر کیوں تھے اُسکے دوست ایسے ؟ کوئی تعلق نہ رکھ کر بھی تمام تعلقات نبھا جاتے تھے ؟ اُسکی ہزار غلطیوں، ہزار کوتاہیوں کے باوجود اُسکا بھرم رکھ لیتے تھے۔ نشمیہ اُس سے نہیں سنبھلتی تھی، پر عمر اُسے سنبھال لیا کرتا تھا۔ احمد کو جو بات وہ نہ سمجھا سکا، وہ رضا نے سمجھا دی۔

''ہم نکل رہے ہیں۔'' نوید کی آواز پر وہ حال میں واپس آیا۔ رضا اب اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ باقی لوگ بھی کھڑے ہو چکے تھے۔ اُس نے بھی گہرا سانس لیا اور کھڑا ہو کر جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

''یہ تم کل ہنسے کس بات پر تھے ؟'' جیپ کی طرف بڑھتے مقدّم نے اچانک ہی نوید کو جا لیا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے نوید نے بنا رکے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

''کس بات پر ؟''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کس بات پر ؟''

''میرا مطلب میں کس وقت ہنسا تھا؟'' وہ تو ایسے حیران ہوا کہ مقدّم کو اُسکی یاداشت پر شک گزرنے لگا۔

''انگلیوں پر گن کر تو تم ہنستے ہو، تمہیں خود معلوم ہونا چاہیے کہ تم کب ہنسے تھے ؟'' اُس نے کہا تو نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی رک گیا۔

''پہلیاں نہ بجھواؤ!'' سنجیدگی سے کہا۔

''جب میں نے کہا تھا کہ مارنے کا پلان بنایا ہے ہمیں ؟ تب۔۔۔'' اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں تو! میں یہاں تم لوگوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں، ایسے میں تم کہو گے کہ میں مارنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں تو میں ہنس ہی سکتا ہوں۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ مقدّم بھی اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

''تم نے ایک چیز نوٹ کی ؟'' حسین نے اُسے سرگوشی میں مخاطب کیا۔

''کیا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''اپنی مرضی کا جواب دینے، اور ہر سوال کو نظر انداز کرنے والے ایس ایس پی صاحب نے تمہیں وضاحت دی ہے۔ وہ بھی مکمل اور جامع۔۔۔''

''ہاں! یہ تبدیلی میں نے بھی نوٹ کی۔''اس نے تائید کی۔

''یہ تم دونوں آخر نوید کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''عمر نے دونوں کو لتاڑا۔

''خوبصورت آدمی کے پیچھے دنیا ہوتی ہے۔''جواب منطق سے خالی تھا۔پر دینے والا بھی حسین تھا۔ نوید دروازہ کھول کر اپنی نشست پر بیٹھا تو وہاں خاموشی چھا گئی۔ اور اب کہ خاموشی کا دورہ مستقل ہو گیا۔اِس بار راشد نے بھی تنگ نہ کیا۔نہ دوبارہ باقی سب کے درمیان کوئی بات ہوئی۔سب ہی کسی نہ کسی خیال میں کھوئے خاموش سے بیٹھے تھے۔کھڑکی سے باہر نظر آتے پہاڑوں کو دیکھتے علی کا ذہن بھٹکنے لگا۔اور بھٹکتے بھٹکتے پھر تین روز پیچھے پہنچ گیا۔

وہ اپنا سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا۔آخری بار سفیر صاحب سے ملا، پھر نشمیہ سے۔

''اگر تم روؤ گی نہیں! تو میں واپس آ کر تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔''اُس نے نشمیہ کو خود میں بھینچتے ہوئے کہا۔جانتا تھا کہ وہ رو رو کر خود کو ہلکان کر لے گی۔

''آپ نہیں جائے نا!''اُس نے آنکھیں ملتے، منہ بسورتے کہا تو اُس نے جھک کر اُسکے گالوں پر پیار کیا۔

''میرا دل کا ٹکڑا! بابا کو کام ہے نا! ورنہ نہیں جاتا میں کبھی بھی۔۔۔''سچ تو یہ تھا کہ نشمیہ کو چھوڑ کر جانے پر اُسکا دل بھی راضی نہ تھا۔پر حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔

''اچھا اب رونا بند کرو!''علی نے کہتے ہوئے اُسے خود سے الگ کیا پھر اُسکے چہرے سے آنسو صاف کیے۔

''تمہارا ڈرائیور کچھ کہہ رہا ہے۔میں دیکھتا ہوں!''سفیر صاحب لان کی طرف دیکھتے باہر گئے۔

''اپنا خیال رکھنا احمد!''اُس نے قریب کھڑے احمد کو دیکھتے پیار سے کہا۔

''بابا!''اُس نے ہچکچاتے ہوئے علی کو پکارا تو اُس نے احمد کو دیکھا۔وہ اب بھی گھٹنوں کے بل نشمیہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''ہاں! کہو!''علی نے نرمی سے کہا۔

''مجھے۔۔۔مجھے کچھ کہنا تھا۔۔۔''وہ کوشش کر رہا تھا۔

''کہو!''علی نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے ساتھ لگایا تو اُسکی آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے۔

''بابا! میں آپکو مس کروں گا۔''اُس نے کہا، اور اگلے ہی لمحے علی کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو دیا۔

''اح۔۔مد۔۔۔''علی گڑبڑا گیا۔

''کیا ہوا بیٹا؟''اُس نے نشمیہ کو چھوڑ کر اُسے خود میں بھینچا، پھر اُسکی پیٹھ سہلاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔وہ روتا نہیں تھا، ایسے تو کبھی نہیں۔۔۔

''میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔''اُس نے روتے ہوئے کہا۔''آپ واپس آئیں گے تو ہم کرکٹ کھیلیں گے۔''اُس نے کرکٹ کہا، فٹبال نہیں۔۔۔یقیناً رضا کا پڑھایا سبق تھا۔پر اُس نے اپنے اوپر اپنے باپ کی پسند کو ترجیح دی۔ علی ہنسا، پھر اُسکا سر چوما۔

''کرکٹ کیوں؟ہم فٹبال کھیلیں گے۔''اُس نے پوچھا۔تو احمد نے اُسکے کندھے سے سر اٹھاتے ہوئے آنسو صاف کیے اور بولا۔

''آپ کو فٹبال نہیں آتی نا!''علی دل کھول کر ہنسا۔

''تم سکھا دینا نا مجھے۔''اُس نے کہا تو وہ بھی ہنسا، علی کو اُس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔''اُس نے ایک بار پھر احمد کو ساتھ لگایا۔

''پر آپ مجھ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔''نشمیہ کو یکدم ہی احساس ہوا کہ اسکا باپ اُسکی موجودگی بھول گیا ہے، تو فوراً یاد دلانا ضروری سمجھا۔ علی نے ہنستے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے بھی اپنے ساتھ لگایا۔

''نہیں! میں دونوں سے پیار کرتا ہوں۔''اُس نے باری باری دونوں کا ماتھا چومتے کہا۔اُسکی کائنات مکمل تھی۔۔۔شاید دور کھڑی فاطمہ کی بھی۔۔دونوں کو سمجھا بجھا کر وہ کھڑا ہوا تو دور کھڑی فاطمہ پر نگاہیں پڑی۔دل تڑپا۔۔۔

چاہا کہ اُسے بھی پاس جا کر تسلی دے، پر نہیں کر سکا۔۔۔فاصلے بہت تھے۔

''اپنا خیال رکھنا، ڈاکٹر کے پاس فالواپ کے لیے جاتی رہنا، دوائیں وقت پر لینا۔اور۔۔''وہ اُسے کہتے کہتے رکا۔

''اور؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''اور میرا مان مت توڑنا!''اُس نے کہا تو فاطمہ نے نم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔وہ اُسے خدا حافظ کہہ کر، ایک آخری بار بچوں کو چوم کر جانے کے لیے پلٹ گیا۔

وہ ماضی کی دنیا سے باہر آیا تو پہاڑوں پر شام اتر چکی تھی۔نوید کے مطابق اندھیرا ہونے تک وہ لوگ اپنی منزل تک پہنچنے والے تھے۔ہر کوئی خاموش تھا، سفر کے اس آخری مرحلے میں جیسے ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔ایسی جامد خاموشی اُتر آئی تھی کہ سانسوں کی آوازیں اور دل کی دھڑکنیں تک سنائی دیں۔اس بار تو راشد بھی مکمل خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

سامنے والی نسشت پر بیٹھا نوید باہر دیکھ رہا تھا۔ پہاڑوں کا سفر آدمی کو جہاں تر و تازہ کرتا ہے، وہیں ایک عجیب سی اُداسی بھی دل میں بھر دیتا ہے۔ ان اونچے، دیو قامت پہاڑوں کو دیکھ کر جہاں دل قدرت کی رعنائیوں کا متعارف ہوتا ہے، وہیں ایک عجیب سی وحشت بھی دل میں اترنے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے شہر کی رونقیں، شور شرابے، مصروف سی زندگی کوئی خواب ہو گئی ہو۔ اب فقط ہم ہوں اور یہ پہاڑ ہوں۔ ٹھنڈی ہوائیں ماتھے پر آئے نوید کے بال بکھیر رہی تھی۔ اُسکے دل و دماغ اس وقت بشریٰ کی یاد سے پر تھے۔ اُسکی روتی آنکھیں، سسکتا وجود، وہ اب بھی اپنے آس پاس محسوس کر سکتا تھا۔ اُسکی خاموش التجا، جیسے کہہ رہی ہو کہ نہ جاؤ۔ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اُس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ پہلی بار اُسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اُس نے یہاں آنے کا فیصلہ غلط کیا ہو۔ اسے بشریٰ کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ کوئی اور طریقہ بھی نکال سکتا تھا۔

پر اب یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔۔۔

اب تو وہ اُسے دور چھوڑ کر آ چکا تھا۔۔۔

نوید کا سر درد کرنے لگا تو آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ بشریٰ اُسکے ساتھ نہ ہو کر بھی ہمیشہ ساتھ ہوتی تھی۔

منزل اب کچھ دور ہی رہ گئی تھی۔۔۔

بالآخر یہ طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔۔۔

اختتام؟ یا یہ آغاز تھا۔۔۔۔

---------+---------+--------

دھپ کی آواز کے ساتھ بیگ زمین پر رکھا گیا تھا۔ بیگ کے نیچے بہت سے سوکھے پتّے چرچرا کر خاموش ہوئے اور کچھ اُنکے قدموں کے نیچے بھی۔ مغرب ہو چکی تھی، اندھیرا چار سو چھانے لگا تھا، کوئی روشنی تھی بھی تو بس آسمان پر نیلاہٹ کی شکل میں اور اِس اندھیرے میں انکے سامنے وہ حویلی پوری شان سے کھڑی تھی۔ ساروں نے سامان زمین پر رکھ کر، اُس آسمان کو چھوتی اندھیری حویلی کو دیکھا تھا۔

اسکردو پہنچ کر نوید نے راشد کو فارغ کر دیا تھا اور وہ تو جیسے بھاگنے کے ہی چکر میں تھا۔ پیسہ لیتے ہی یہ جا وہ جا۔ پھر نوید اُنہیں حویلی تک پیدل لایا، یہ بطور احتیاط تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈرائیور کو بھی انکے قیام کی جگہ معلوم ہو۔ حویلی آبادی سے ہٹ کر کافی اونچائی پر تھی۔ اُسکے لیے انھیں ٹھیک ٹھاک چڑھائی چڑھنی پڑی تھی۔ دل ہی دل میں نوید کو کوستے اور خود کو یہ یقین دلاتے کہ یہ آخری دشواری ہے اِسکے بعد وہ اپنی منزل پر ہونگے، اُن سب نے پہاڑ چڑھ ہی لیا۔ اور اب وہ حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔

''ہم اُس قاتل سے بچ کر اس آسیب زدہ بنگلے میں رہنے آئے ہیں؟'' حسین نے کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے، ہانپتے ہوئے حویلی کو دیکھا تھا۔

''تم سے کس نے کہا کہ یہ آسیب زدہ ہے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''اِسکو دیکھ کر ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔''

''ہم باہر کیوں کھڑے ہیں؟'' علی نے حویلی کے قدیم شاہی طرز کے محرابی دروازوں پر، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے نوید کو دیکھتے پوچھا۔ ہوا اب الٹی سمت سے چلتی، اُسکے بال بکھیر رہی تھی۔ اِس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا، کندھوں پر رومال ڈالے اور سر پر نماز کی ٹوپی لگائے بھاگتا ہوا آیا۔

''معاف کرنا بھائی! مجھے دیر ہو گئی۔ مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا۔'' لڑکے نے آتے ہی کہا اور جیب سے چابیوں کا گچھا باہر نکال کر دروازے پر لگا بڑا سا تالا کھولنے لگا۔ نوید ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا، ہواؤں کے جھکڑ تیز ہونے لگے تھے۔ مٹی کا طوفان آنے والا تھا شاید۔ لڑکے نے تالا کھولنے کے بعد بڑی سی کنڈی کو زور لگا کر کھولا، پھر دروازے کو دھکّا دیا تو وہ دیو قامت دروازہ، جسکے دو پٹ تھے، زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ اُسکی آواز سارے میں گونجی اور ساتھ آسمان پر کہیں ہلکی سی بجلی بھی چمکی تھی۔

''آپ لوگ آجائیں اندر، میں لائٹ جلاتا ہوں۔'' وہ اُنہیں کھلے دروازے سے اندر جانے کا بول کر خود حویلی کے پیچھے کی جانب چل دیا۔

''کیا ہمیں اندر جانا چاہیے؟'' عمر نے دروازے سے اندر نظر آتی، اندھیرے میں ڈوبی حویلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں آجاؤ! وہ لائٹ کھول دے گا اتنی دیر میں!'' نوید نے جواب دیتے موبائل کا ٹارچ جلایا اور اندر کی طرف قدم رکھے، اُسکے پیچھے وہ لوگ بھی باری باری اندر کی طرف بڑھے۔ باقیوں میں سے بھی ایک دو نے موبائل کا ٹارچ جلا لیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں حویلی کے اندر رکھے قدیم طرز کے فرنیچر عجیب ہیبت ناک سے لگ رہے تھے۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم کسی ہارر موویز کی طرح یہاں پھنسنے والے ہیں۔'' آس پاس ٹارچ کی روشنی مارتے حسین نے پوچھا۔ نوید خاموشی سے کھڑا ٹارچ کی روشنی میں آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ہاں! جیسے اس گھر میں انگریزوں کے زمانے میں خوب قتل و غارت گری ہوئی ہو اور پھر تب سے یہ گھر آسیب زدہ بن گیا ہو۔'' مقدّم نے ازراہِ مذاق اُسکا جملہ مکمل کیا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' گھر کا جائزہ لیتے نوید نے رک کر اچھنبے سے پوچھا تو سب کو سانپ سونگھا۔

''کک۔۔۔کیا مطلب؟''علی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہاں واقعی قتل وغارت گری ہو چکی ہے؟''کافی دیر سے خاموش رضا نے تشویش سے پوچھا۔

''انگریزوں کے دور میں ایسا بہت سے خاندانوں کے ساتھ ہوا ہے۔کوئی نئی بات نہیں ہے۔''اُس نے کندھے اُچکاتے ایسے کہا جیسے واقعی کوئی بات ہی نہ ہو۔اُنکے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''میں واپس جارہا ہوں۔''حسین نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے بیگ واپس کندھوں پر ڈالا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

''جنات کے ہاتھوں مرنے سے اچھا ہے، میں اُس پراسرار قاتل کے ہاتھوں مارا جاؤں۔''وہ ابھی دروازے سے تھوڑا دور ہی تھا کہ ہوا کا زوردار جھکڑ چلا اور اس مرتبہ رفتار اتنی تیز تھی کہ نہ صرف آس پاس رکھا کچھ سامان نیچے گرا تھا، بلکہ دیو قامت دروازے بھی پوری قوت کے ساتھ دھاڑ سے بند ہوئے تھے۔ عمر نے دہل کر دروازے کی جانب دیکھا، حسین خوفزدہ انداز میں اُلٹے قدموں واپس آیا، رضا نے بیساختہ اپنے برابر میں کھڑے شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔اسی اثنا میں باہر زوردار بجلی چمکی، جس نے حویلی کی کھڑکیوں سے اندر آنے کا راستہ بنایا اور لمحے کو گلابی روشنی نے سارا گھر روشن کیا، اور پھر معدوم ہو گئی۔

''یار! یہ بندہ لائٹ آن کرنے گیا تھا، کہاں چلا گیا ہے؟''مقدّم نے گھبرا کر پوچھا۔بادل باہر زور سے گرج رہے تھے۔

''تم لوگ اِتنا اوور ریکٹ کیوں کر رہے ہو؟ طوفان ہی ہے بس!''نوید کی بیزار آواز کانوں میں پڑی تو سب نے اندھیرے کے باوجود اُسکی طرف منہ موڑا۔

''اوور ریکٹ؟ تم نے ہمیں یہاں اس آسیب زدہ، انگریزوں کے دور کا خونریزی کا مرکز، جنات کے ڈیرے والے گھر میں لا کھڑا کیا ہے۔اور ہم اوور ریکٹ کر رہے ہیں؟''حسین نے صدمے سے کہا تھا۔ہوائیں تیز ہو رہی تھیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔

''کچھ بھی نہیں ہے اس گھر میں ایسا، یہاں کے مکین سالانہ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں اور مہینے دو مہینے قیام کرتے ہیں۔ کبھی کچھ نہیں ہوا۔''نوید نے اب کہ اُسے سمجھانا چاہا تھا۔

''تمہیں یہی جگہ ملی تھی چھپنے کے لیے؟''عمر نے پہلی بار اعتراض کیا تھا۔آسمان پر دھماکہ ہوا تھا جیسے۔۔۔

''یہ جگہ میں نے نہیں! فرّخ صاحب نے چنی ہے۔''اُس نے پہلی بار وضاحت دی۔اسی لمحے بجلی کھول دی گئی۔ بجلی کا کھلنا تھا کہ ساری کی ساری حویلی روشنی میں نہا گئی۔سب نے آنکھیں پھاڑ کر آس پاس دیکھا تھا۔وہ لوگ حویلی کے لاؤنج کے عین وسط میں کھڑے تھے۔

لاؤنج کسی قدیم محل کے مرکزی ہال کی مانند تھا، ہلکے سنہری اور بھورے سنگِ مرمر کے فرش پر نقش ونگار بنے تھے۔عین وسط میں ایک گول، نفیس لکڑی کی میز رکھی تھی، جس پر نقلی پھولوں کا بڑا سا گلدستہ سجا ہوا تھا۔ہال کی دونوں جانب سے دو عظیم الشان سیڑھیاں، نیم دائرے کی شکل میں اوپر کی طرف اٹھ

رہی تھی۔ سیڑھیوں کی ریلنگ سیاہ لوہے سے بنی تھی، جس پر نفیس بیل بوٹوں کی کاریگری کی گئی تھی، اوپر کی منزل پر ایک کشادہ بالکونی سیڑھیوں کے دونوں سروں کو آپس میں جوڑ رہی تھی، جس کی ریلنگ بھی اسی طرز کی کاریگری سے مزین تھی۔ اس بالکونی کے پیچھے طویل راہداری نظر آ رہی تھی۔ چھت بلند اور لکڑی کی نفیس تراش خراش سے بنی تھی، جس کے عین وسط میں لٹکتے شاندار فانوس کی روشنی پورے ہال کو گرم اور مدھم سنہری روشنی سے بھر رہی تھی۔ دیواروں پر لگے کلاسیکی طرز کے دیوار گیر چراغ، اس روشنی میں مزید اضافہ کر رہے تھے، یہ حویلی اندھیرے میں جتنی ہیبت ناک تھی، روشنی نے اُسکے حسن میں اتنا ہی اضافہ کر دیا تھا۔ اور یہ تو فقط ہال تھا۔ نامعلوم باقی حویلی کیسی شاہکار تھی؟ وہ لوگ مبہوت سے اُس ہال کی خوبصورتی کو دیکھ رہے تھے کہ اُسی لمحے دیو قامت محرابی دروازہ جو ہوا سے بند ہو گیا تھا، وہ تیزی سے کھلا۔ سب نے چونک کر اُس جانب دیکھا تو وہی لڑکا اندر آ رہا تھا۔

''سوری بھائی! اندھیرا ہونے کی وجہ سے فیڈر کھولنے میں وقت لگ گیا۔'' اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو سب جیسے کسی سحر سے باہر آئے۔ حویلی کی خوبصورتی نے واقعی طلسم سا طاری کر دیا تھا۔ رضا نے چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھا تو خود کو علی کا بازو پکڑے پایا۔ اندھیرے میں گھبرا کر اُس نے اپنے برابر کھڑے جس شخص کا سہارا لیا تھا وہ علی ہی تھا۔ جلدی سے اُسکا بازو چھوڑ کر ایسے دور ہوا جیسے کسی نے دیکھ لیا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے؟ خیر کوئی کیا ہی دیکھتا؟ خود علی نے اِس وقت کچھ بھی محسوس نہ کیا کہ وہ پہلے خوف، پھر ہال کی خوبصورتی ملاحظہ کرنے میں محو تھا۔ دیکھ لیتا تو یہاں ایک نئی جنگ چھڑ چکی ہوتی یقیناً!

''کوئی بات نہیں! تم باقی چیزیں دیکھ کر بتا دو۔'' نوید نے اُسے سنجیدگی سے دیکھتے کہا۔

''اوپر والے بیڈ روم کے دروازے کھلے ہیں، میں نے صبح ہی صفائی کروا دی تھی، باورچی خانے میں مہینے کا راشن اور کھانے پینے کا سامان بھی موجود ہے۔ باقی سامان میرے گھر کے فریج میں ہے، کیونکہ یہاں کا فیڈر بند ہونے کی وجہ سے فریج نہیں چل رہا تھا۔ میں کچھ دیر میں لے آؤں گا۔ رات کا کھانا بھی میری والدہ نے بنایا ہوا ہے آپ لوگوں کے لیے۔ میں وہ بھی ساتھ میں لیتا آؤں گا۔ گیزر چل رہا ہے، اسلیئے پانی بھی گرم ہے۔ آپ لوگ جب تک اپنا سامان وغیرہ رکھ کر تازہ دم ہو جائیں۔'' اُس نے بڑے ادب سے تمام تفصیلات بتائی تھیں۔ بہت ہی مہمان نواز اور باادب لڑکا تھا۔

''تمہارا نام؟'' نوید نے اُسکا نام پوچھا۔

''اکرم!''

''شکریہ اکرم!'' اس نے نرمی سے اُسکا شکریہ ادا کیا تو وہ خوش ہو گیا۔

''شکریہ کس بات کا جی؟ یہ تو میرا کام ہے۔ آپکو مزید کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا، میں پیچھے انیکسی میں رہتا ہوں۔ یہ میرا نمبر رکھ لیجئے۔'' اُس نے ایک کاغذ آگے بڑھاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ایک بات تو ماننے والی تھی کہ یہاں کہ لوگ بے حد مہمان نواز اور پر خلوص تھے۔ پیچھے چلّم چوکی کے پاس جب جیپ کو حادثہ پیش آیا تھا، تب بھی لوگوں نے بنا کسی جان پہچان بہت مدد کی تھی، ڈھابے کے مالک نے بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور

اب یہ لڑکا۔ نوید نے اثبات میں سر ہلاتے اُس سے کاغذ لے لیا اور موبائل میں نمبر فیڈ کرنے لگا، جبکہ اکرم جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ باہر طوفان زور وشور پر تھا، ساتھ بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ پر بجلی بحال ہونے کے بعد خوف کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔

''اوپر تین کمرے ہیں، بقیہ کمرے استعمال کرنے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔'' ہال میں نوید کی سنجیدہ آواز گونجی۔

''یعنی دو لوگوں کو ایک کمرے میں رہنا ہے۔ وہ پہلا دروازہ جو سامنے ہی سیڑھیوں کے اختتام پر نظر آرہا ہے۔ وہ پہلا کمرہ ہے، اُس سے آگے راہداری میں مزید کمرے موجود ہیں۔'' اُس نے دائرے کی صورت اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سب نے بیساختہ اوپر کی جانب دیکھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر جو بالکنی تھی، اُس سے اندر طویل راہداری جاتی دکھائی دے تھی، راہداری کے شروعات پر پہلا دروازہ تھا، اُس سے آگے بقول نوید کے مزید بھی تھے۔ وہ یقیناً اس حویلی کے بارے میں پہلے سے معلومات رکھتا تھا۔

''پہلا کمرہ، عمر اور مقدّم تم دونوں کا ہے۔'' اُس نے کہا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''درمیان میں کچھ کمرے چھوڑ کر ایک کمرہ اور کھلا ہے، پھر مزید کمرے چھوڑ کر آخر میں ایک کمرہ ہے، جو میں نے اپنے لیے رکھا ہے، کیونکہ وہاں سے میں باہر کے راستے پر نظر رکھ سکتا ہوں۔ حسین اُس کمرے میں میرے ساتھ ہی رہے گا۔'' اُس نے سکون سے کہا۔ سب نے اُسکی بات کو غور سے سنا، سمجھا اور پھر ردعمل کے طور پر سب کی نظروں نے ایک ساتھ علی اور رضا کا رخ کیا۔ جبکہ وہ دونوں خود نوید کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''اِس بات کا کیا مطلب؟'' علی نے اچھنبے سے پوچھا۔

''اتنی آسان بات کا بھی کوئی مطلب ہوتا ہے؟'' نوید نے اُس سے بھی زیادہ اچھنبے سے پوچھا تھا۔

''یعنی میں تمہارے ساتھ کیوں رہوں؟ علی کو یہ پیشکش کیوں نہیں کر رہے تم؟'' بقیہ سوال حسین نے مکمل کیا تھا۔ نوید نے گہرا سانس بھر کر براہِ راست حسین کو دیکھا۔

''کیونکہ میں تمہیں اپنی من مانیاں کرنے کے لیے گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بہتر ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے ہی رہو۔'' اس جواب پر جہاں حسین کا منہ کھلا تھا، وہیں مقدّم اور عمر نے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ علی اور رضا تو ابھی پہلے صدمے سے ہی باہر نہیں نکلے تھے۔

''کیا مطلب من مانیاں؟ تمہارے خیال میں کیا کرنے والا تھا میں یہاں؟'' حسین نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''اپنے اپنے سامان لیکر کمروں میں آجاؤ! اکرم رات کا کھانا لیکر تھوڑی دیر میں آجائے گا۔''ایس ایس پی صاحب نے ایک مرتبہ پھر سوال نظر انداز کیا اور سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔ پیچھے حسین نے دانت کچکچائے، کتنا زبردست منصوبہ بنایا تھا اُس نے رات کو اٹھ کر حویلی کا جائزہ لینے کا، مگر ایس ایس پی صاحب اُسکی سوچ سے زیادہ شاطر تھے۔

''یہ ہے کون ہمارے متعلق فیصلہ کرنے والا؟''پہلی بار رضا کو تپ چڑھی تھی۔ حسین کا بڑی شدت سے تمہارا سالہ کہنے کو دل کیا، پر اُس نے خود کو باز رکھا۔

''تمہارے متعلق تو اُس نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ہاں مگر۔۔۔''مقدّم کہتے کہتے رکا تو حسین نے اس غدّاری پر اُسے گھورا۔

''مگر؟''عمر نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ان دونوں میں سے صبح تک کوئی ایک ہی زندہ بچے گا۔''اُس نے رضا اور علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اِس بار عمر اور حسین نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش ہر گز نہیں کی تھی۔ جبکہ علی نے اُسے سنجیدہ نظروں سے گھورنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''آہ! زندہ بچنے والے میں، میں تو ہر گز نہیں ہو سکتا۔''رضا نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھوں پر ڈالتے ہوئے سرد آہ بھری۔

''کیوں؟ میں قاتل ہوں تمہارے خیال میں؟''علی نے طنزیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''نہیں! تم قاتل نہیں ہو۔ لیکن چونکہ میں عادی نشئی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ رات کو اپنے شوق کے لیے نشہ کر کے سو جاؤں، تو مجھے بھلا کیا ہی خبر کہ کون مجھے قتل کر رہا ہے اور کون نہیں؟''اُس نے کہاں کا بدلا کہاں نکالا تھا؟ جہاں علی کا چہرہ تاریک ہوا تھا وہیں باقی تینوں کے چہروں سے بھی مسکراہٹ اُڑن چھو ہوئی تھی۔ جبکہ رضا اُسی طرح مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا، کسی کا بھی رد عمل دیکھے بنا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا، علی کے چہرے پر الگ شرمندگی در آئی تھی۔

''میں بھی جا رہا ہوں۔''عمر نے اُس غیر آرام دہ سی خاموشی سے بچنے کے لیے آہستگی سے کہا اور وہ بھی اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اُسکے پیچھے مقدّم اور حسین بھی چلے گئے۔ جبکہ علی نے سب سے آخر میں اپنا سامان اُٹھایا تھا۔

جو ابھی ابھی رضا کہہ کر گیا تھا، اُسکے بعد اُسکا سامنا کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔

---------+---------+--------

''تمہارا شکریہ!''عمر نے کھانے کی ٹرے اکرم کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کیسا؟ یہ میرا کام ہے۔''ہمیشہ کی طرح وہ مسکرایااور آگے بڑھ گیا۔ کیونکہ راہداری میں پہلا کمرہ عمراور مقدّم کا تھااِس لیے پہلے وہ اُنہیں ہی کھانا پہنچانے آیا تھا۔ یہ مہربانی صرف آج رات کے لیے تھی، کیونکہ آج وہ لوگ تھکے ہوئے تھے اور سامان بھی سیٹ کرنا تھا، لہٰذا آج نوید کے حکم پر سب کو کمرے میں ہی کھانا پہنچادیا گیا تھا۔ کل سے ایسی کوئی عیاشی نہیں ہونی تھی۔

''آجاؤ! کھانا کھالو۔''عمر نے کمرے میں رکھی چھوٹی سی میز پر ٹرے کو رکھتے ہوئے مقدّم کو مخاطب کیا، جو اپنے بیگ کا سارا سامان اپنے پلنگ پر پھیلائے یہی سوچ رہا تھا کہ اُسے ترتیب کیسے دے؟

''ہاں! تم شروع کرو میں آتا ہوں۔''اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ عمر نے شروع کرنے بجائے اسکا انتظار کرنا مناسب سمجھا، لہٰذا پاؤں پسارے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ جتنا مبہوت وہ لوگ ہال کو دیکھ کر ہوئے تھے، راہداری اور کمرے میں آکر معلوم ہوا کہ وہ تو فقط ابتدائی مہمان نوازی جیسا ایک ٹریلر تھا۔ اصل خوبصورتی تو یہاں تھی۔

جس راہداری میں یہ کمرے بنے وہ کافی طویل تھی۔ سفید رنگت کے دیوار سے ذرا سا اُبھرے ہوئے ستون پر منقش سنہری نقش و نگار اور اِن دیواروں کے سینے پر بڑے بڑے سنہری فریموں میں جڑی تصویریں آویزاں تھیں، سپید و سیاہ رنگوں کی یہ پورٹریٹ ان لوگوں کی تھیں، جو یقیناً کبھی اس محل یا حویلی کا غرور رہے ہوں گے۔ ایک تصویر میں ایک باوقار شخصیت، شاید کوئی بلند مرتبہ فوجی افسر، اپنے تمغوں اور وردی کے ساتھ ایستادہ تھے، اس کے پہلو میں دوسری تصویر خوبصورت خاتون کی تھی، اور ایسے ہی بہت سے پوٹریٹ ایک قطار میں راہداری کے آخر تک جارہے تھے۔

دیواروں پر نصب برقی قندیلوں (Sconces) کی سنہری روشنی سے ماحول میں ایک پراسراریت پیدا ہورہی تھی۔ روشنی اور سائے کا یہ کھیل تصویروں کے چہروں کو ایسا تاثر دے رہا تھا، جیسے وہ ابھی فریم سے باہر نکل کر اپنی داستانِ حیات سنانے لگیں گے۔ لکڑی کے چمکدار فرش پر پڑتی مدھم Sconces کی روشنی نے فرش کی چمک دمک میں اضافہ کردیا تھا۔

راہداری سے اندر عمر اور مقدّم کے کمرے میں آؤ تو وہ اُسکی دیواریں گہرے رنگ کی نفیس لکڑی سے آراستہ تھیں، جن پر باریک نقش و نگار تراشے گئے تھے۔

کمرے کے ایک طرف دو خوبصورت سنگل بیڈ ایک دوسرے کے متوازی رکھے ہوئے تھے۔ بستر پر گہرے خاکی اور بھورے رنگ کی چادریں بڑی ترتیب سے بچھی ہوئی تھیں، ہر بستر کے پاؤں کی جانب ایک چھوٹی سی upholstered بنچ رکھی تھی، جس پر نرم کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ دونوں بستروں کے درمیان ایک چھوٹی مگر نفیس لکڑی کی سائیڈ ٹیبل تھی، جس پر ایک کلاسیکی طرز کا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا، عمر نے لیمپ کے برابر میں ہی کھانے کی ٹرے رکھ دی تھی۔

کمرے کی دوسری سمت ایک بڑی اور بلند محرابی کھڑکی تھی، جس کے شیشوں سے باہر برستی بارش واضح نظر آرہی تھی۔ کھڑکی پر بھاری اور گہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے، جو آدھے سرکائے گئے تھے۔ کھڑکی کے برابر میں ہی اسی طرز کی دو الماریاں رکھی تھیں۔

کھڑکی کے نیچے ایک پرانے طرز کا ریڈی ایٹر لگا ہوا تھا، جبکہ ساتھ ہی ایک لکڑی کی میز بھی تھی، جس پر چند سجاوٹی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے فرش پر پالش شدہ لکڑی کی تختیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ہر چیز میں ایک ترتیب، ایک سکون اور ایک قدیم وقار جھلکتا تھا۔ اس حویلی کے انٹیریئر نے عمر کو بے انتہا متاثر کیا تھا، وہ اس نوعیت کا فن اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایک آرٹسٹ کی نظروں سے اِس پورے کمرے اور راہداری کا جائزہ لیا تو وہ اِس شاہکار کو تخلیق کرنے والے اُن کاریگروں کو داد دیئے بنا نہ رہ سکا، جنہوں نے اس باریک بینی سے اسے تخلیق کیا تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی نقص یا کمی بیشی نہیں مل رہی تھی۔ اِس قسم کے انٹیریر اور فرنیچر کا وہ پرستار تھا۔

''لگتا ہے تمہارے اندر کا انٹیریئر ڈیزائنر جاگ گیا ہے۔'' اپنے کپڑوں کو ترتیب سے تہہ کرتے، مقدّم نے اُسکا دماغ پڑھا تو وہ ہنسا۔

''ہاں! میں نے اس قسم کے ڈیزائنز کے بارے میں پڑھا تو بہت ہے، پر آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا ہے۔''

''تو کیا کہتے ہیں اس ڈیزائن کو؟'' وہ کپڑے پلنگ پر چھوڑ کر میز کی جانب والی طرف آکر بیٹھ گیا، اس طرح کے عمر اب اُسکے سامنے تھا۔

''تم اندازہ لگاؤ۔'' عمر نے ٹرے پر سے سامان الگ الگ کر کے اٹھاتے ہوئے، اُس سے پوچھا۔

''میں بھلا مانس آڈیٹر ہوں، بھلا مجھے ان سب چیزوں سے کیا لینا دینا؟ لیکن میرے دماغ میں اسکا ایک نام آرہا ہے۔'' اُس نے پلیٹ میں رکھے چاولوں کو چمچ کی مدد سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''ہیری پوٹر کا ہوگوارٹس۔۔۔'' اس بات پر وہ دل کھول کر ہنسا۔ ڈارک براؤن لکڑیوں سے بنا انٹیریئر اور اُس میں سنہری روشنیاں ہوگوارٹس جیسی ہی تھیں۔

''ویسے کچھ کچھ تم نے صحیح کہا۔'' عمر نے نوالہ منہ میں ڈالتے کہا۔ ''یہ انٹیریئر روکوکو (rococo) اسٹائل کا ہے، جبکہ فرنیچر وکٹورین یعنی انیسویں صدی کے برطانوی اسٹائل کے ہیں، جبکہ یہ کھڑکیاں اور دروازے گوتھک روائیول (GothicRevival) طرز کے ہیں۔ کل ملا کر یہ تین قدیم طرز تعمیر کا شاہکار ہیں۔ آج کل یہ اسٹائل ناپید ہو چکے ہیں۔'' عمر نے تفصیلاً بتایا۔

''کھانا اچھا ہے۔''اُسکا جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔ عمر ایک بار پھر ہنسا۔

''سیدھے سیدھے کہو تم بور ہو رہے ہو۔''

اُن دونوں کو کھانے میں مشغول چھوڑ کر باہر راہداری میں آئیں تو وہ اس وقت سنسان پڑی تھی۔ دیواروں پر لگے پوٹریٹ میں موجود لوگ جیسے آنے والوں کو ہی گھور رہے تھے۔ عمر اور مقدّم کے کمرے کے دروازے کو چھوڑ کر راہداری میں تھوڑا آگے کی طرف بڑھا جائے تو درمیان میں تین مزید دروازے بند پڑے تھے، اُنہیں چھوڑ کر چوتھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں رضا اپنا سامان الماری میں سیٹ کر رہا تھا۔ دوسری جانب فن کا دلدادہ علی سفیر کمرے کے ایک ایک کونے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''قدیم روکوکو اسٹائل کا انٹیریر، وکٹورین طرز کا فرنیچر اور گوتھک ریوائیول کی جھلک۔۔۔ انگریزوں کا فن تعمیر بھی بڑا خوبصورت ہے ویسے۔''ٹراؤزر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے علی نے سامنے دیوار پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ اُسکی واضح بڑبڑاہٹ پر رضا نے ایک نظر اُس پر ڈالی پھر الماری بند کر کے واپس اپنے پلنگ کی جانب آیا۔ علی اُس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا، پر مل نہیں رہا تھا۔ نہیں وہ شرمندہ نہیں تھا۔۔۔ نہیں وہ اُسکو دوست بھی نہیں مانتا تھا۔۔۔ لیکن اب اِس شخص کے ساتھ ایک ماہ گزارنا تھا تو بات کرنا بھی ضروری تھا۔ جبکہ اِس گھر میں فلحال انٹرنیٹ کی سہولت بھی نہ تھی، تو وقت گزارنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔

''کیا کہوں اسے؟''وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ رضا کے مقابلے میں اُس نے اپنا کام جلدی کر لیا تھا، وہ ویسے بھی تھوڑا نفاست پسند طبیعت کا مالک تھا۔ جب تک ایک ایک شے اچھے سے نہ رکھ لیتا سکون نہ آتا، اس لیے پہلے اپنا کام مکمل کر لیا۔ البتہ رضا نے پہلے گھوم پھر کر راہداری میں نظر آنے والی ہر تصویر کا بغور جائزہ لیا، پھر کمرے کا کونا کونا دیکھا اور جب دل بھر گیا تو آخر میں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ اور اب وہی کام کرنے کی باری علی کی تھی، لہٰذا وہ زور و شور سے کر رہا تھا۔

''میں نے ایسا انٹیریئر آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا۔''علی نے ایک مرتبہ پھر با آواز بلند کہا۔

''اپنا علم یہاں مت جھاڑو!''اپنے پلنگ کے برابر رکھی سائڈ ٹیبل پر سے کتابیں ہٹا کر، وہاں نجانے کس شے کے لیے جگہ بناتے، رضا نے سکون سے کہا تو علی نے جھٹکے سے پلٹ کر اُسکو دیکھا۔

''ایکسکیوزمی! آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟''اُس نے بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھا۔

''یہاں تم ہی اپنا علمِ تعمیرات و تزئین و آرائش جھاڑ رہے ہو۔ یقین مانو! مجھے اِس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''(واہ! کیا اردو تھی) رضا اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹا۔ البتہ علی کا پارہ حسبِ توقع چڑھ چکا تھا۔

''کیا میں نے تمہیں یہ سب بتایا؟''اُس نے اُس کے بستر کے پاس آتے ہوئے پوچھا۔حالانکہ وہ بتااُسے ہی رہا تھا۔

''اوہ! کیا تم نے مجھے نہیں بتایا؟''اُس نے بے انتہا حیرت سے پوچھا تو علی نے ضبط کے گھونٹ بھرے۔

''نہیں! ہر گز نہیں! بلاوجہ خوش فہمی نہ پالو کہ میں تم سے مخاطب تھا۔''اُس نے چبا چبا کر کہتے اُسکی غلط فہمی دور کرنی چاہی۔ رضا ہاتھ میں پکڑی آخری کتاب کو کھڑکی کے نیچے رکھی میز پر رکھ کر پلٹا،اور ذرا مشکوک انداز میں اُسے سر تا پاؤں گھورا۔

''تمہیں ہمیشہ سے اکیلے بات کرنے کی بیماری تھی یا یہاں آکر کوئی اثر اثرات ہو گئے ہیں؟''اُس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا تھا۔علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔وہ بیماری کی جگہ عادت کا لفظ بھی تو استعمال کر سکتا تھا نا؟ مگر نہیں! تپانے کا موقع کیوں ضائع کرتا وہ؟ بدتمیز آدمی!

''میری بات سنو! میں اکیلے اکیلے بات کروں،اکیلے اکیلے ہنسوں یا اکیلے اکیلے ناچوں، تمہیں اُس سے کیا؟''اُس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔غالباً رضا اُسکا موڈ غارت کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''آف کورس! مجھے اُس سے کیا؟''وہ کندھے اُچکا کر کہتا، کھانے کی ٹرے کے پاس آیا،جو اکرم ابھی ابھی کھڑکی کے نیچے والی میز پر رکھ کر گیا تھا۔''مگر جب لوگ میرے معاملات،میری ذاتیات،اور میرے ماضی میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے ہیں،تب وہ یہی سوال بھول جاتے ہیں کہ اُنہیں ان سب سے کیا؟''مزے سے کہتا وہ اپنی پلیٹ لیکر، فق ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑے علی پر ایک نظر ڈالتا اپنے پلنگ پر آبیٹھا۔اب وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بھنویں سکیڑے، سنجیدہ چہرے کے ساتھ خود کو دیکھتے علی کو بڑی فرصت سے دیکھتا کھانا کھا رہا تھا۔

''میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں،وہ بھی سب کے سامنے۔''اُس نے آہستہ مگر سنجیدہ آواز میں کہا اور میز پر رکھی اپنی پلیٹ کی جانب بڑھا۔

''پر میں نے معاف نہیں کیا تھا۔''اُس نے بھی بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ علی پلیٹ اٹھا کر اپنے پلنگ کی جانب آیا، پھر رک کر اُسے دیکھا۔

''پر میں نے تمہیں بنا معافی مانگے ہی معاف کر دیا ہے رضا!''جواب تھا یا کمان سے نکلا زہر آلود تیر۔رضا کے چہرے سے تمام تر مسکراہٹ غائب ہوئی،نوالہ حلق سے اترنا دوبھر ہو گیا۔جبکہ علی کسی بھی قسم کے طنز سے پاک چہرے کے ساتھ اب پوری رغبت سے کھانے سے انصاف کر رہا تھا۔پر رضا اب کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔اُس نے خاموشی سے آدھ کھائی پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس (صنوبر) سے، جس تعلق کی قیمت تم ہم سب سے مانگ رہے ہو؟

اپنے ہی چھوڑے ہوئے طنز کے نشتر اب اُسکے آس پاس گونج رہے تھے۔اُس نے جو غلیظ الزام علی پر لگایا تھا، وہ بھی سب کے سامنے۔ کیا وہ اُسکی معافی مانگ سکا تھا اب تک ؟اپنے حصّے کے حساب تو سب کو یاد تھے، پر علی کے حساب تو سب نے بھلا دیئے تھے۔اور وہ بھی سب کو حساب دیتے دیتے، اپنے حصّے کے قرض واپس لینا تو بھول ہی گیا تھا یا شاید۔۔۔۔۔اُس نے اپنے تمام قرض معاف کر دیئے تھے۔

ان دونوں کے کمرے سے باہر راہداری ایک مرتبہ پھر خاموش پڑی تھی۔اُنکے ساتھ مزید چار کمرے قطار میں بند پڑے تھے۔یہ راہداری بھی شیطان کی آنت جتنی لمبی تھی۔آخری کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

''آہ!اس سفر میں تو میں ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا تھا۔'' کھانے کی پلیٹ خالی کر کے حسین نے اُسے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تو اپنا سامان ترتیب سے رکھتے نوید نے تاسف سے اُسے دیکھا، جسکا تمام سامان ایک کونے میں بے ترتیب سا بکھرا پڑا تھا۔

نوید کے سامان میں موجود چیزیں بھی عجیب ہی تھیں۔عجیب عجیب سے اسلحے، پتہ نہیں کون کون سے گیجٹس، جن کے شاید نام بھی حسین کو معلوم نہ ہو۔وہ ہر شے کو سلیقے سے میز پر سیٹ کر کے، پھر اُس میں انٹرنیٹ کنیکٹ کرنے کے بعد اُنہیں آن کر رہا تھا۔

''میں نے سوچا ہے کہ آج صرف آرام کروں گا۔باقی کام کل۔۔۔'' حالانکہ نوید صرف اور صرف اپنے کام میں ہی مصروف تھا، لیکن حسین بھی صرف اور صرف اُس سے ہی مخاطب تھا۔نوید نے اُسے نظر انداز کیا۔

''ویسے تم چاہتے تو علی یہاں رہ سکتا تھا، اور تم دوسرے کمرے سے بھی میری تمام تر نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتے تھے۔'' حسین نے اُسکے لیپ ٹاپ کی سکرین میں جھانکتے ہوئے کہا جس پر حویلی کے اندرونی و بیرونی مناظر واضح تھے۔یعنی وہ سی سی ٹی وی مانیٹر کر رہا تھا۔

''حسین!''اس نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! کہو!''

''کیا تم خاموش رہو گے ؟''

''نہیں!'' دوٹوک جواب دے کر حسین اُٹھا اور الماری کی جانب بڑھا، جسکے پٹ ابھی کھلے ہوئے تھے، غالباً نوید کو اپنا بقیہ سامان رکھنا تھا۔اُس نے لب بھینچ کر حسین کو دیکھا۔

''مجھے یہاں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔تم خاموش رہو تو مہربانی ہو گی تمہاری۔۔۔'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''تو کرو! میں نے کون سا روکا ہے ؟'' اُس نے الماری میں ترتیب سے رکھے نوید کے کپڑوں پر نظر ڈالتے بے نیازی سے کہا۔

''ایک بات بتاؤ نوید!''اب کہ حسین نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔نوید نے بے بسی سے منہ پر ہاتھ پھیرا۔میٹنگ شروع ہونے میں فقط چار منٹ تھے۔

''تمہارے پاس انٹرنیٹ کیسے آرہا ہے؟ہمیں تو سگنلز تک نہیں ملے۔''

''ڈیوائس سے۔''اُس نے ضبط سے وائرلیس وائی فائی ڈیوائس کی جانب اشارہ کیا،جس پر ایف آئی اے کا لوگو نصب تھا۔

''یعنی میں نہ ہی سمجھوں پھر؟''اُس نے لوگو دیکھتے افسوس سے کہا۔

''اسکا پاسورڈ صرف گیجٹس میں فیڈ ہے۔میرے اپنے موبائل پر بھی انٹرنیٹ نہیں چل رہا۔صرف سرکاری کاموں کے لیے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔''پتہ نہیں اُس نے وضاحت کیوں دی؟

''اچھا ایک اور بات بتاؤ!''حسین نے پوچھا تو نوید نے خون کے گھونٹ بھر کر اُسے دیکھا،دو منٹ باقی تھے میٹنگ میں۔

''تم یہ بیواؤں کی طرح ہر وقت کالا اور سفید رنگ پہن کر کیوں گھومتے ہو؟''اِس بات پر نوید نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔پھر دروازے کی طرف بڑھا،اور راہداری میں جھانکتے ہوئے آس پاس دیکھا۔

''ایک منٹ یہاں آنا ذرا!''اُس نے حسین کو اِس طرح بلایا جیسے کوئی بہت اہم کام ہو۔

''کیا ہوا؟''اُس نے دروازے کے پاس آتے ہوئے پوچھا اور باہر جھانکا۔

''وہ دیکھو!وہ رضا ہے کیا؟''اُس نے اشارہ کیا۔

''کہاں؟مجھے تو کہیں نہیں دکھ رہا۔''وہ ذرا دروازے سے باہر کی جانب ہوا۔

''اب جب تک میٹنگ ختم نہیں ہو جاتی،باہر ہی رہو۔''اِس سے پہلے کہ حسین کچھ بھی سمجھتا نوید نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے نوید؟''اُس نے غصّے سے دروازہ کھٹکھٹایا،پر جواب ندارد۔

''دیکھ لوں گا تمہیں میں!''اُس نے پلٹتے ہوئے کہا،پر سنسان راہداری اور دیواروں پر لگی تصاویر دیکھ کر اُسکی تمام تر ہمت ہوا ہوئی۔

راہداری کے درمیان میں علی اور رضا کے کمرے کے بند دروازے کے اندر نظر ڈالیں،تو دونوں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔بارش باہر زور و شور سے جاری تھی،ساتھ میں بجلی بھی زوردار انداز میں کڑک رہی تھی۔محرابی کھڑکیوں سے بجلی کی کڑکتی روشنیاں اندر آرہی تھیں۔ٹھنڈ بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔جیکٹ اور موزے پہننے کے باوجود بھی علی نے سر تک لحاف ڈالا اور ایک نظر سیدھا لیٹے،چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رضا پر ڈال کر اسکی

جانب سے کروٹ بدل لی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، نئی جگہ پر نیند تو ویسے آنا مشکل ہی تھا، پر تھکن وجود پر الگ سوار تھی۔ وہ بھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سر کا درد بڑھ گیا تھا۔

''میں تمہارے جتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔'' کمرے میں رضا کی آواز گونجی تو اُس نے پٹ سے آنکھیں کھولی۔

''کیا یہ اِس نے مجھے کہا ہے؟'' خود سے سوال کیا۔ پر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''جب مجھ میں اتنی اعلیٰ ظرفی آئی، تو میں بھی تم سے سب کے سامنے معافی مانگ لوں گا۔ فلحال! میں کم ظرف ہوں۔'' اُس نے تسلیم کیا تو اپنے لحاف کے اندر علی مسکرایا۔ رضا نے گردن موڑ کر اسکی جانب دیکھا۔ وہ اتنی جلدی سو نہیں سکتا تھا، پر جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے چہرہ واپس چھت کی جانب کر دیا۔

''وہ تو تم ہو۔'' علی کی آواز کمرے میں گونجی تو رضا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اب بھی اُسی کروٹ لیٹا تھا۔

''پر تمہیں معلوم ہے؟ احمد نے مجھے گلے لگایا۔ خود سے۔۔۔'' اِس بات پر رضا نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔ اب کہ علی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تو؟'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تو یہ کہ۔۔۔'' وہ رکا اور مسکرایا۔ ''تمہارا شکریہ! تم اتنے کم ظرف بھی نہیں ہو۔'' اُس نے کہا تو رضا چپ کا چپ رہ گیا۔

اِس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا، آسمان پر زوردار دھماکے کی صورت بادل گرجے اور اُسی لمحے بجلی چلی گئی۔

''شٹ!'' علی کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ارے یار!'' اپنے کمرے میں مقدّم کا سامان ترتیب سے رکھنے میں اُسکی مدد کرتے عمر نے بیساختہ سر پر ہاتھ مارا تھا۔

بجلی ایک مرتبہ پھر کڑکی، راہداری کی آخر میں ایک اور محرابی کھڑکی تھی، بجلی کی کڑک سے پیدا ہوتی نیلی چمک، راہداری میں لگے پورٹریٹ پر پڑی تو حسین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بجلی کی چمک میں انسانی پورٹریٹ عجیب خوفناک قسم کے لگ رہے تھے۔

بادل ایک بار پھر گرجے اور اس بار اتنی زور سے کہ لگا کان کے پردے پھاڑ دیں گے۔ رضا نے دہل کے لحاف منہ تک تانا اور خود کو گم کر لیا۔ علی نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔ کیا وہ گرج چمک سے ڈرتا تھا؟

''نوید! ایس ایس پی نوید عالم۔۔۔ بات تو سنیں ایس ایس پی صاحب۔۔۔'' حسین دروازہ پر کھڑا اُسے آوازیں دے رہا تھا۔ یکدم ہی دروازہ کھلا۔

''میٹنگ ختم ہونے میں پندرہ منٹ ہیں۔انتظار کرو!''نوید نے منہ نکال کر کہااور دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

''ارے! مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے باہر۔۔۔میں تو جم جاؤں گا۔''اُس نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا۔دروازہ دوبارہ کھلا۔۔۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''اُس نے منہ نکال کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں! میری تو جوتی بھی نہیں ڈرتی کسی سے۔''حالانکہ ڈر لگ رہا تھا اُسے۔

''یہ لو پھر! اور باہر ہی رہو!''اُس نے پورے کا پورا لحاف حسین کو تھماتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔''دل ہی دل میں اُس سے بدلہ لینے کا مذموم ارادہ کر کے وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔سوچا تھا کہ رضا کے کمرے میں چلا جائیگا پر اُسکے کمرے کے درمیان چار کمروں کا فاصلہ تھا،اور وہ بھی اتنا کہ وہاں تک جانے میں ہی حسین کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ لحاف کو اپنے گرد اچھے سے لپٹ کر وہیں بیٹھ گیا۔

---------+---------+--------

بادل زور و شور سے گرج رہے تھے،اور علی کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔پر نیند نہیں آ رہی تھی۔ حلق الگ خشک ہوا پڑا تھا۔ بجلی بھی اب تک بھی آئی تھی۔ تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا جگ اُٹھایا تو وہ خالی پڑا نظر آیا۔

''کیا مصیبت ہے یار؟''اُس نے کوفت سے خالی جگ کو دیکھا۔کمرے میں میز کے درمیان میں پرانے دور کا لینٹرن رکھا تھا۔ جسے لائٹ جانے پر اُس نے جلا دیا تھا۔اب اُسکی پیلی روشنی میں وہ واقعی کوئی آسیب زدہ کمرہ لگ رہا تھا۔

''اب اسے کہاں سے بھروں؟''اُس نے بڑبڑاتے ہوئے برابر والے پلنگ پر محوِ خواب رضا کو عالمِ رشک میں دیکھا۔کتنے سکون سے سویا ہوا تھا وہ؟ پھر اچانک ہی اُسے یاد آیا کہ اُس نے ہال میں ڈسپنسر رکھا دیکھا تھا۔اکرم جاتے وقت اُس میں پانی کا کین لگا کر گیا تھا۔ہال کا سوچ کر ہی اُسے خوف آیا۔

''اب نیچے کیسے جاؤں؟''پریشان ہو کر سوچا۔دل میں خیال آیا کہ صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے ہیں،انتظار کر لینا چاہیے۔پر حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا، صبح تک تو وہ پیاس سے مر ہی جاتا۔ بڑی ہمت کر کے وہ اُٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔راہداری گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

راہداری کے آخر میں بنی محرابی کھڑکی سے آتی آسمانی بجلی کی چمک یہاں تک ہلکی ہلکی پہنچ رہی تھی۔اس نے ماحول کو الگ ہیبت ناک بنایا ہوا تھا۔اُس نے گھبرا کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

''اب کیا کروں؟''ایک مرتبہ پھر پریشانی سے رضا کو دیکھا۔

''کیا اسے اٹھاؤں؟'' دل میں سوچا۔ پھر خیال آیا کہ اسے جگانے کے بعد کیا جواز دے گا؟ اپنے ڈرنے کا بتا کر مذاق نہیں بنوا سکتا تھا۔ لہٰذا خود ہی اپنے خیال کی تردید کی۔

''مرد بنو علی! تمہیں تو کم از کم ڈرنا نہیں چاہیے۔'' خود کو شرم دلاتا وہ میز کے پاس آیا اور لینٹرن اُٹھا لیا۔ اُسکی جگہ اپنے موبائل کا ٹارچ آن کر کے اُسے وہیں رکھ دیا تاکہ اگر رضا نیند سے جاگے تو اندھیرا دیکھ کر پریشان نہ ہو جائے۔ پھر جی کڑا کر کے وہ لینٹرن اور جگ لیے باہر آیا۔ لینٹرن کی روشنی میں راہداری میں قدم رکھا اور آگے بڑھنے لگا۔ پیچھے آخری سرے پر لحاف لپیٹ کر بیٹھے حسین کی نظریں علی کے ہیولے پر پڑیں تو آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے دیکھا۔

''لگتا ہے کوئی ہے، کیا معلوم رضا ہو؟'' اُس نے سوچا۔ پھر لحاف کو اپنے سر سے پاؤں تک لپیٹ کر کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ اُسکے پیچھے جانے لگا۔ دوسری جانب اندھیری راہداری میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا علی، اپنے پیچھے حسین کی آمد سے بے خبر تھا۔ بالکنی سے پہلے جہاں راہداری کی دیوار شروع ہو رہی تھیں، وہاں غلطی سے اُسکے لینٹرن کی روشنی شلوار سوٹ اور قائداعظم والی ٹوپی پہنے اُس آدمی کی پورٹریٹ پر پڑی تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا چچا اپنی خوفناک آنکھوں سے اُسے ہی گھور رہے ہیں۔

''واپس چلا جاؤں؟'' بالکنی کی ریلنگ سے نیچے نظر آتے نیم اندھیرے ہال کو دیکھتے سوچا۔ راہداری کی نسبت ہال میں زیادہ تعداد میں کھڑکیاں ہونے کے باعث وہاں کچھ کچھ روشنی تھی۔

''اب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو پانی بھی لے ہی لیتا ہوں۔'' خود کو ہمت دلاتا وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آنے لگا۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی۔ البتہ بجلی اب بھی ویسے ہی کڑک رہی تھی۔ وہ گول دائرے کی صورت اُترنے والی دائیں طرف کی سیڑھی سے اُتر رہا تھا، یکدم ہی اُسے لگا جیسے بائیں طرف والی سیڑھی پر بھی کوئی ہے۔ اُس نے فوراً لینٹرن کا رخ اُس جانب کیا پر اُسی لمحے تیز رفتار ہوا کے جھونکے سے لینٹرن بجھ گیا۔

''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔۔۔'' اُس نے دہل کر جو دعائیں آتی تھیں پڑھنی شروع کر دیں۔ بائیں اور دائیں طرف والی سیڑھی کے درمیان پورا ہال موجود تھا۔ بجلی کی چمک میں ایک بار پھر پورا ہال روشن ہوا، پر اس بار اُسے کوئی ہیولا نظر نہ آیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ حقیقتاً کسی ہارر موویز کے اندر آ چکا ہے، بس! ابھی ہی کہیں سے کوئی مخلوق نکل کر آئیگی اور اُسے گدی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گی اور اندر سکون سے سوئے اُسکے دوستوں کو اُسکی وحشت ناک موت کی خبر بھی نہ ہو سکے گی۔

ڈسپنسر سامنے ہی تھا، اُس نے پلٹ کر اوپر بالکنی کی طرف دیکھا۔ اندھیری بالکنی دیکھ کر یقین نہیں آیا کہ ابھی ابھی وہیں سے آیا ہے، اور اب یہیں سے واپس بھی جانا ہے۔ اور اب تو لینٹرن بھی بجھ چکی تھی۔ واپسی کا سوچ کر ہی اُسے جھرجھری آئی۔

کیا تھا جو موبائل کا ٹارچ آن کر کے ساتھ لے آتا؟ کیا تھا جو رضا کو ہی اُٹھا دیتا؟ زیادہ سے زیادہ اُسکا مذاق ہی بنتا۔ بلکہ کیا ہی تھا اگر جو وہ صبح تک صبر سے کام لے لیتا؟ سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے اُس نے خود کو حقیقتاً گوسا تھا۔ پر پیاس خوف پر غالب آنے لگی تو وہ محرابی کھڑکیوں سے اندر آنے والی روشنی میں ہی اندازے سے ڈسپنسر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا، بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہو، اور اُسکے پیچھے مڑتے ہی اُسکے دل میں خنجر پیوست کر کے اُسکا کام تمام کر دے۔ برا ہو اُن موویز کا جو اُس نے آج تک دیکھی تھیں۔ نہ دیکھی ہوتیں، تو پھر بھی اتنے خوفناک خیالات نہ آتے۔

''آجاؤ اندر!'' دوسری جانب میٹنگ ختم ہونے پر نوید نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا تھا۔ پر جواب ندارد۔۔۔

''حسین!'' کوئی جواب نہ پا کر وہ راہداری میں آیا۔

''حسین کیا تم یہاں ہو؟'' اُس نے ٹارچ آن کر کے یہاں وہاں دیکھا۔ پر راہداری خالی تھی۔ آگے علی کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا۔

''کیا یہ اُنکے کمرے میں ہے؟'' اُس نے سوچا، پھر آگے بڑھا۔

''تم کتنے سست ہو مقدّم؟'' اُسکا آخری آخری سامان الماری میں رکھتے عمر نے تاسف سے کہا تھا۔

''میں بہت ایکٹو اور آرگنائزڈ انسان ہوں، بس یہ الماریاں سیٹ کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے۔'' مقدّم نے بستر پر ڈھتے ہوئے کہا۔ وہ تو عمر اُسکی مدد کرنے آ گیا تھا ورنہ اُس نے ساری رات اسی کام میں گزار دینا تھی۔

نیچے ہال میں آیت الکرسی کا ورد کرتے علی نے جگ میں پانی بھرا۔ لینٹرن وہ ہاتھ خالی کرنے کی عرض سے ڈسپنسر کے برابر میں رکھ چکا تھا۔ جگ بھر کر وہ پیچھے مڑا اور کسی سے بری طرح ٹکرایا۔ اسی لمحے بجلی زور سے کڑکی اور ہال گلابی روشنی میں نہا گیا۔ اِس پل بھر کی روشنی میں علی نے اُس سرتاپاؤں لحاف پہنے وجود کو اپنے قریب کھڑا دیکھا، اُسکے ہاتھ سے جگ چھوٹ کر نیچے گرا۔ اگلے ہی لمحے اُسکی، اور سامنے کھڑی مخلوق کی چھت پھاڑ چیخوں سے پوری حویلی گونج اٹھی تھی۔

آواز پر عمر اور مقدّم نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور اگلے ہی لمحے تیزی سے راہداری میں آئے، چیخوں کی آواز سن کر رضا کے دروازے پر رکتا نوید چونکنا ہوا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ آگے بڑھتے ہی عمر اور مقدّم سے سامنا ہوا۔ چیخیں تھیں کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' عمر نے نوید کو سامنے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

''ہال سے آواز آ رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' وہ تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے وہ دونوں بھی نیچے آئے۔ اندھیرے میں جو وجود نوید کو سیڑھیوں کے پاس ملا اُسے ہی، اُس نے کس کر بازوؤں میں جکڑا۔

''چھوڑو مجھے! بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔''لحاف کے اندر سے وہ وجود دبی دبی آواز میں چیخا۔پر نوید نے اُسکی آواز نہ سنی۔

''ہلنامت ورنہ جان سے ماردوں گا۔''نوید نے اُسے قابو کرتے سختی سے کہا۔

''ارے! کیوں ماردوگے بھائی؟''وہ چیخا۔

''خاموش۔۔۔''نوید نے اُسکی بولتی بند کروانے کے لیے بازو اُسکے گلے کے گرد لپیٹا۔

دوسری طرف علی الگ چلا رہا تھا۔اُسی لمحے قسمت کو رحم آیا اور بجلی واپس بحال ہوگئی۔بجلی آنے کے بعد منظر کچھ یوں تھا کہ علی دل تھامے ڈسپنسر کے سامنے زمین بوس تھا، عمر اور مقدّم کچھ نا سمجھی کے عالم میں کھڑے تھے، جبکہ نوید کسی لحاف میں لپٹے وجود کو جکڑے ہوئے تھا۔

''علی! کیا ہوا؟''عمر تیزی سے اُسکے پاس آیا۔

''جج۔۔۔جن۔۔۔''اُس نے لحاف لپیٹی خود کو نوید کے شکنجے سے آزاد کروانے کی کوشش کرتی، اُس مخلوق کی جانب اشارہ کیا۔

''چھوڑ بھی دو مجھے۔۔۔انسان ہوں میں یار!''حسین چیخا تو نوید کی گرفت ڈھیلی پڑی۔وہ آواز پہچان گیا۔

''حسین تم؟''نوید نے اُسے چھوڑتے ہوئے اچھنبے سے کہا۔اُس نے لحاف سر سے گرایا اور جھٹکے سے نوید سے دور ہونے کے چکر میں خود بھی زمین بوس ہو گیا۔

''تم؟ یہ تم تھے؟''پہلے ہی دل پر ہاتھ رکھے فرش نشین علی نے اُسے دیکھ کر آنکھیں وا کرتے پوچھا۔

''ہاں! میں ہی ہوں، چیخنے سے پہلے پوچھ تو لیتے کہ کون ہے؟''اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''تو تم لحاف پہن کر کیوں گھوم رہے ہو؟ اور وہ بھی میرے پیچھے؟''علی نے بھی غصّے سے پوچھا، خوف کا اثر کم ہوا تو صورتحال اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی۔ مقدّم نے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔نوید نے تاسف سے دونوں کو دیکھا، جبکہ عمر نے ہاتھ کا سہارا دے کر علی کو اٹھایا۔

''تم نیچے کرنے کیا آئے تھے؟'' عمر نے اُس سے پوچھا۔

''پانی لینے آیا تھا۔پیاس لگ رہی تھی۔مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میرے پیچھے گھوم رہا ہے اور وہ بھی اِس حلیے میں۔۔۔''اُس نے چڑ کر کہا۔

''میں تمہارے پیچھے نہیں گھوم رہا تھا۔میں نے فقط ایک عجیب سی مخلوق کو لینٹرن لیکر گھر میں گھومتے دیکھا تو سوچا جا کر دیکھ لوں۔مجھے کیا معلوم کہ تم ہو۔'' وہ بھی نوید کا سہارا لیکر کھڑا ہوا۔لحاف اُس نے البتہ ابھی بھی نہیں اتارا تھا۔

''لینٹرن لیکر؟ کہاں ہے لینٹرن؟'' مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔اب عمر بھی اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔

''وہ ہوا سے بجھ گیا۔'' علی نے ذرا شرمندگی سے کہا۔خوف ختم ہوا تو اپنی بزدلی پر شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہا۔

''تم اِس حلیے میں گھوم کیوں رہے ہو؟'' اُس نے شرمندگی چھپانے کے لیے ایک مرتبہ پھر حسین پر چڑھائی کی۔

''ٹھنڈ لگ رہی تھی،اور کیا کرتا؟'' اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''ٹھنڈ لگ رہی تھی تو یہ پہن کر گھومنے کا کونسا طریقہ ہے؟'' علی نے گھورا۔

''تمہارے جگری یار نے کمرے سے دیا نکال دیا تھا،اور ساتھ میں لحاف پکڑا دیا ٹھنڈ سے لڑنے کے لیے۔'' اِس بات پر تینوں نے حیرت سے نوید کو دیکھا۔وہ اپنے آپ میں خجل ہوا۔

''چلو تم !اِس لیے تمہیں میں نے اپنی نظروں کے سامنے رکھا ہوا ہے۔'' اِس سے پہلے کہ کوئی بھی نوید سے سوال کرتا،وہ حسین کو کھینچتا کھانچتا اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔پیچھے کھڑے علی نے اُن دونوں کا منہ دیکھا،جنکے چہرے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہے تھے۔

''ڈرتا نہیں ہوں میں،بس۔۔۔وہ۔۔۔صورتحال ہی ایسی ہو گئی تھی۔'' اُس نے وضاحت دی۔پر اگلے ہی لمحے اُن دونوں کو قہقہہ لگا کر ہنستا دیکھ،اُس نے غصّے سے جگ اٹھایا اور اوپر کی طرف بڑھ گیا۔

''پانی تو لے جاتے۔۔۔'' عمر نے کہا۔

''نہیں پینا اب۔۔۔'' اُس نے بنا مڑے ہی تنک کر جواب دیا تو اب کہ مقدّم ہنستے ہنستے رکوع میں چلا گیا۔

''لینٹرن بھی یہیں رہ گیا ہے۔'' اِس بار اُس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ راہداری میں گم ہو گیا۔پیچھے مقدّم اور عمر کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔دوسری جانب اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر علی بھی بیساختہ مسکرا دیا۔

---------+---------+--------

''تم اب ہلے نہ یہاں سے۔۔۔پھر دیکھنا۔'' نوید نے حسین کو کمرے میں لا کر چھوڑتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں نہیں ہلا تھا یہاں سے،تم ہی تھے جس نے اس قدر ٹھنڈ اور اندھیرے میں مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔'' اُس نے اپنا ریم لیس چشمہ اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے خفگی سے کہا تو نوید نے کوئی جواب نہ دیا۔

''عجیب غنڈہ گردی مچائی ہوئی ہے تم نے،اب تم نکال کر دکھاؤ مجھے کمرے سے!''وہ بھی اُس کو دھمکا تا لحاف لپیٹ کر سونے لیٹ گیا۔نوید نے تاسف سے اُسے دیکھا پھر میز پر رکھی اپنی کھانے کی پلیٹ اٹھالی، جسے وہ میٹنگ کی وجہ سے کھا نہیں سکا تھا۔

''کیا تم نے اگا تھا کرسٹی کا ناول پڑھا ہے؟''ابھی اُس نے پہلا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ حسین نے یکدم ہی چہرے سے لحاف ہٹا کر اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اگا تھا کرسٹی نے سینکڑوں ناول لکھے ہیں۔''نوید نے سنجیدگی سے جتایا۔

"AND THEN THERE WERE NONE "

(اور پھر وہاں کوئی نہ رہا)

حسین نے ناول کا نام بتایا،تو نوید نے کھانا روک کر سرتاپاؤں اُسے گھورا۔

''نہیں!اور میں اُسکے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔''اُس نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''آں۔۔۔''اُس نے مسکراتے ہوئے ایسے سر ہلایا جیسے کچھ سمجھ میں آیا ہو۔''تم نے پڑھ رکھا ہے۔پر تم بتانا نہیں چاہتے۔''وہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے اُسے دیکھنے لگا۔

''حسین!''نوید نے اُسے تنبیہہ کرتے انداز میں کہا۔

''اوکے!میں سو رہا ہوں۔''اُس نے دوبارہ لحاف تان لیا تو نوید نے سکھ کا سانس خارج کیا۔

دوسری طرف اپنے کمرے میں واپس آکر جگ میں موجود تھوڑے سے پانی کو پیتے علی نے ایک بار پھر رشک سے رضا کو دیکھا تھا۔اتنے شور شرابے کے باوجود بھی،وہ ایک انچ نہیں ہلا تھا۔کاش!ایسی نیند اُسکی بھی ہوتی۔کچھ سر کے درد کی وجہ سے بھی وہ نہیں سو پا رہا تھا۔

پانی زیادہ نہیں تھا،فقط پیندے میں موجود تھا۔اتنے کم پانی سے اُسکی تسلی ضرور ہوگئی پر پیاس نہ بجھی۔اچھا بھلا عمر کہہ بھی رہا تھا کہ پانی لے جاؤ،اب دوبارہ تو وہ مر کر نہیں جانے والا تھا۔بے شک بجلی بحال ہوگئی ہو۔ خالی جگ رکھ کر وہ اپنے پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔

''امم۔۔۔امی۔۔۔''اس آواز پر اُس کے قدم تھمے۔اُس نے پلٹ کر دیکھا تو رضا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''رضا!''اُس نے بھنویں اچکا کر نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے امی!''وہ پھر بڑبڑایا۔اُسکی بڑبڑاہٹ نیم واضح سی تھی۔

''کس سے ڈر لگتا ہے؟''علی نے اُسکے قریب آکر پوچھا۔

''امی۔۔۔کہاں ہیں؟''وہ پھر بولا،غالباًوہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔

''رضا!تم ٹھیک ہو؟''علی نے اسے کندھے سے ہلایا تو نیند میں بھی اُسکے چہرے پر کرب ناک قسم کے تاثرات آئے۔

''امی کے پاس جانا۔۔۔''وہ کہتے ہوئے کسمسا کر کروٹ بدل گیا۔وہ وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا،اب وہ نہیں بڑبڑا رہا تھا۔اُسے کچھ دکھ،کچھ افسوس سے دیکھتے، علی کی نظریں دونوں بستروں کے درمیان رکھی سائیڈ ٹیبل پر گئیں۔جہاں سے کچھ دیر پہلے رضا نے کتابیں ہٹائی تھیں۔وہاں اب کافی ساری دواؤں کے ڈبّے رکھے تھے۔اُس نے حیرت سے دیکھتے ایک دوا کا ڈبہ اٹھا کر دیکھا،فارمولا پڑھ کر اُسے کچھ خاص سمجھ نہ آیا کہ دوا کس مرض کی ہے؟

اُس نے ایک نظر گہری نیند سوئے رضا کو دیکھا۔پھر دوا کا ڈبہ کھول کر اندر سے کمپنی کی جانب سے فراہم کردہ معلوماتی پرچہ باہر نکالا اور پڑھنے لگا۔پہلے اُس نے ایک دوا کے متعلق پڑھا،پھر دوسری،پھر تیسری اور ایسے کر کے اس نے تمام دواؤں کے متعلق پڑھ ڈالا۔جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا،اُسکے چہرے پر سایہ سا گزر رہا تھا۔

وہ سب اینٹی اینزائٹی،اینٹی ڈپریسنٹ،نیند کی دوا،اور کچھ کم ڈوز کی سکون آور ادویات تھیں۔ایک دوا مائیگرین کے لیے بھی تھی۔اُس نے خاموشی سے تمام دوائیں واپس رکھ دیں اور چپ چاپ سا اپنے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔اُسکی خاموش نظریں رضا پر ہی تھیں،جو اُسکی جانب پیٹھ کر کے سویا ہوا تھا۔

یونیورسٹی کے زمانے کا رضا اس لمحے اُسے شدت سے یاد آیا تھا۔اپنا وہ ذہین اور کلاس ٹاپر دوست یاد آیا۔وہ حالات سے ستایا خاموش طبع لڑکا یاد آیا۔کیا حال کر لیا تھا اس لڑکے نے اپنا؟یا یہ کہنا چاہیے کہ کیا حال کر دیا تھا قسمت نے،زمانے نے اور رشتوں نے اُسکا۔چاہتا ہی کیا تھا وہ بھلا؟فقط محبت۔۔۔توجہ۔۔۔جو اُسکا حق تھیں۔ اور کیا دیا اُسے دنیا نے بدلے میں؟دھتکار۔۔۔ذلت۔۔۔بلاوجہ کی نفرت۔ کیا یہ ذہین و دنیا تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھنے والا لڑکا،ان سب کا مستحق تھا؟اُس نے افسوس سے اُسکی آدھ کھائی پلیٹ کو دیکھا۔علی نے ظاہر نہیں کیا تھا،پر وہ جانتا تھا کہ اُس کے اُس ایک جملے کے بعد ہی رضا نے کھانا خاموشی سے رکھ دیا تھا۔خود پر افسوس ہوا۔اُسی لمحے کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ چونکا۔

پھر حیران سا اُٹھ کر دروازے پر آیا اور اُسے کھولا۔سامنے عمر ہاتھوں میں پانی کی بوتل لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''تمہیں پیاس لگی تھی۔''اُس نے بوتل اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا شکریہ!پر یہ کہاں سے ملی؟''علی کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''کچن سے،اور کچن ڈھونڈنے میں مجھے اور مقدّم کو آٹھ منٹ لگ گئے۔اس لیے دیر ہو گئی ورنہ پہلے لے آتا۔''اُس نے بتایا۔

''سوری! میری وجہ سے اتنی پریشانی ہوئی تمہیں۔ میں جگ نیچے چھوڑ آتا تو اُسے ہی بھر لیتے۔'' علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں! ایسی بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی بہانے تھوڑی سی حویلی دیکھ لی۔'' اُس نے بھی مسکرا کر کہا۔

''چلو اب تم سو جاؤ۔'' عمر نے کہا۔

''تمہارا ایک بار پھر شکریہ!'' علی نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ علی اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

اسکے دوست واپس لوٹ رہے تھے۔۔۔۔

وہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ سر کا درد کم ضرور ہوا تھا، پر ختم نہیں ہوا تھا۔ ساری رات کروٹ بدلتے بدلتے بالآخر فجر سے کچھ دیر قبل ہی اُسے نیند آئی تھی۔

دروازے پر ہونے والی زوردار دستک سے اُسکی آنکھ کھلی تو لحاف چہرے سے ہٹا کر آنکھیں ملتے ناسمجھی سے آس پاس دیکھا۔ جیسے سمجھ نہ آیا ہو کہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ رضا نے بھی نیم وا آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

''دروازے پر کوئی ہے شاید!'' رضا نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہتے کروٹ بدلی اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

''تو؟'' علی نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تو جا کر دیکھو کون ہے؟'' اُس نے آنکھیں موندے ہی جواب دیا تو اُس کو آگ ہی لگ گئی۔

''میں نوکر ہوں تمہارا؟'' اُس نے تڑخ کر پوچھا۔ اِس سے پہلے کہ رضا کوئی جواب دیتا دروازہ ایک مرتبہ پھر پیٹا گیا۔ علی نے پلٹ کر پہلے دروازے کو، پھر ایک مرتبہ دوبارہ رضا کو دیکھا، جس نے لحاف میں چہرہ چھپاتے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔ وہ اُسے گھورتا ہوا اُٹھ بیٹھا، پھر لحاف پرے کرتا کھڑا ہوا اور دروازے پر آیا۔ یہاں تک آتے آتے ہی اُسکے دانت بج گئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو سامنے نوید کو کھڑا پایا۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت؟'' اُسے سامنے دیکھ کر وہ پریشان ہوا۔

''صبح ہو چکی ہے، نیچے ناشتہ لگ چکا ہے۔ جلدی آؤ!'' اُس نے کہا تو مارے حیرت کے اُسکا منہ کھلا۔

''ابھی؟'' اُس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''ناشتہ صبح ہی کیا جاتا ہے؟'' نوید نے جتایا۔

''پر ابھی تو صرف سات بجے ہیں؟''اُس نے پیچھے دیوار پر لگے گھڑیال کو دیکھتے کہا۔

''صبح فجر کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔''ایک مرتبہ پھر جتایا گیا۔

''میں فجر سے پون گھنٹہ قبل ہی سویا تھا،اس لیے نماز قضا ہو گئی۔''اُس نے شرمندہ ہوتے وضاحت دی۔

''خیر! ناشتہ تیار ہے، حسین نیچے ہی ہے، تم بھی آ جاؤ۔اور اسکو بھی اُٹھاؤ!''وہ رضا کی طرف اشارہ کر کے حکمیہ انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا۔ علی نے صبر کے گھونٹ بھر کر اُسے جاتے دیکھا، پھر پیچھے سوئے ہوئے رضا کو۔ پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آیا۔

''آرڈر تو سن ہی لیا ہو گا تم نے،اب خود ہی اُٹھ جاؤ!''وہ تپے ہوئے لہجے میں کہتا، دراز میں سے اپنا برش نکالنے لگا۔رضا نے کوئی جواب نہ دیا پر بیزار منہ بنا کر اُٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر، بال تمیز سے سیٹ کیے، راہداری کے اختتام پر بنی بالکنی میں پہنچا تو نیچے ہال میں عمر، مقدّم اور حسین کو پہلے سے ہی موجود پایا، ساتھ اکرم بھی تھا۔ عمر ہال کی محرابی قد آدم کھڑکیوں سے باہر کا خوابناک منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔ مقدّم اور حسین ہال کے صوفے پر بیٹھے آپس میں محو گفتگو تھے۔

''السلام علیکم!''علی کو سیڑھیاں اُتر کر آتا دیکھ اکرم نے سلام کیا، وہ سر کے اشارے سے جواب دیتا نیچے آیا۔اُسے سامنے دیکھ کر مقدّم کو رات والا واقع یاد آیا تو مسکراہٹ نے پھر اُسکے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ علی اُسے نظر انداز کرتا ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سیڑھیوں کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''رضا کہاں ہے؟''حسین نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''میں جب کمرے سے نکل رہا تھا تو وہ برش کر رہا تھا۔ باقی مجھے نہیں معلوم!''اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''جان سے تو نہیں مار دیا اُسے رات کو؟''اِس سوال کے جواب میں علی نے فقط اُسے سنجیدگی سے گھورا ہی تھا۔

''مجھے اتنی صبح صبح اُٹھنا سخت زہر لگ رہا ہے۔''مقدّم نے اچانک ہی اعلان کیا۔

''صبح اٹھنا صحت کے لیے اچھا ہے،اور تم ذرا باہر دیکھو! کتنا پیارا منظر ہے۔''عمر نے پاس آتے ہوئے کہا۔

''میں بچپن سے یہی منظر دیکھتے بڑا ہوا ہوں۔''اُس نے جمائی لیتے صوفے کے ہاتھ پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''نوید نظر نہیں آ رہا؟''علی نے آس پاس دیکھتے کہا۔

''ہمیں اسکے حوالے کر کے خود نجانے کہاں گیا ہے؟''مقدّم نے اکرم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''رات کو اتنی چیخ وپکار مچ گئی، پر رضا کی نیند میں کوئی فرق نہیں پڑا۔''عمر کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔

''اُس نے نیند میں راشد ڈرائیور کو بھی مات دے دی ہے۔''مقدّم نے تبصرہ کیا۔

''مجھے تو اب مکمل یقین ہو گیا ہے کہ یہ رات کو ہی رضا کا قصّہ تمام کر چکا ہے۔اگاتھا کرسٹی کے ناول کی طرح!''حسین کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

''نہیں! میں نہیں مانتا کہ علی ایسا کر سکتا ہے۔''مقدّم نے یکدم ہی کہا۔

''وہ کیوں؟''حسین نے ذرا اچھنبے سے پوچھا۔(صاف اداکاری!)۔علی سنجیدگی سے دونوں کو گھور رہا تھا۔

''اِسکے پاس اتنا دماغ نہیں ہے۔''مقدّم نے واضح سرگوشی کی تو حسین اُسکے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا تھا۔بہت عرصے بعد۔۔۔دوستوں کی طرح۔۔۔اگر یہ دو لوگ نہ ہوتے تو شاید دوستی پھر سے تازہ ہونے میں صدیاں لگ جاتیں۔علی نے بھی برا نہیں مانا۔نجانے کیوں؟پر وہ بھول بیٹھا کہ ان سب سے تعلقات پہلے جیسے نہ رہے تھے۔یا شاید اس نے جان کر بھلا دیا۔

''رضا کچھ دوائیں لیکر سویا تھا۔اِس وجہ سے شاید وہ اتنی گہری نیند سویا ہوا تھا۔''علی نے آہستگی سے کہا تو تینوں نے اُسے دیکھا۔

''دوائیں؟کیسی دوائیں؟''اب کہ مقدّم نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سکون آور ادویات تھیں شاید! ساتھ کچھ اور بھی تھیں۔''اُس نے بتایا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟''عمر حیران ہوا۔

''میں نے اُسکی دوائیں دیکھنے کی کوشش کی تھی،اتنا ہی سمجھ سکا کہ۔۔۔''

''ضروری نہیں وہ دوائیں ہی ہوں۔''رضا اُسکی بات کاٹتے سیڑھیاں اُترتے نیچے آیا۔چہرہ تر و تازہ تھا۔علی ہڑبڑا کر ریلنگ سے دور ہٹا۔

''پھر کیا تھیں؟''حسین نے مشکوک انداز میں اُسے دیکھا۔

''برانڈڈ ڈرگس بھی ہو سکتی ہیں۔''وہ مزے سے جواب دیتا،اُسکے برابر آ بیٹھا۔جہاں علی نے اس جواب پر دانت کچکچائے تھے،وہیں باقی تینوں بیساختہ مسکرائے تھے۔

''آپ لوگ باورچی خانے میں آ جائیں۔''اکرم نے ایسے کہا جیسے اُسے رضا کے آنے کا ہی انتظار ہو۔

''باورچی خانے میں؟ کیاناشتہ بھی ہم سے بنواناہے؟'' رضانے حیرت سے پوچھا۔

''بھی سے کیامراد؟ تم نے اور کونساتیر ماراہے؟'' مقدّم نے اُس سے زیادہ حیرت سے پوچھا۔

''سامان خود اُٹھاکرلایاہوں، کمرہ خود سیٹ کیاہے۔ اتناکافی نہیں ہے؟'' وہ کہتے ہوئے کھڑاہوا۔

''کتنااحسان کیاتم نے ہماری ذات پر؟'' حسین طنزیہ انداز میں کہتاآگے بڑھا۔

''ویسے سوال میرا بھی یہی ہے کہ کچن میں ہماراکام کیاہے؟'' علی نے اکرم کو دیکھتے پوچھا، جواُن سے آگے آگے چل رہاتھا۔ ہال کی دائیں جانب والی سیڑھیوں کے برابر میں ایک دروازہ تھاجو کھلاہواتھا، دروازے کے اندر ایک طویل راہداری نظر آرہی تھی۔

''فکرنہ کرو ناشتہ نہیں بنواناتم سے، ڈائننگ ہال کچن سے منسلک ہے، اس لیے وہیں بلوارہاہے۔'' اکرم کے بجائے عمر نے جواب دیاتھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' رضاحیران ہوا۔

''رات کو میں اور عمر آئے تھے کچن ڈھونڈتے ہوئے، تو دیکھ کر گئے تھے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''لیکن تم دونوں رات کو کچن ڈھونڈ کیوں رہے تھے؟'' رضانے مشکوک ہوتے پوچھا۔

''ارے ہاں! تمہیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ رات کو کیاہواتھا؟ نشہ کرکے جو سوئے تھے۔'' حسین نے مزے سے کہاتو رضانے اُسے گھوراجبکہ علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی تھی۔ اب مقدّم اور حسین مل کر اُسے رات والاواقعی سنارہے تھے۔ علی اُنکی بکواس سے بچنے کے لیے راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ اس گھر کی باقی جگہوں کی طرح راہداری دیکھ کر بھی اُسکامنہ کھلاہی تھا۔

راہداری لمبی، کشادہ اور دور تک سیدھی پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر چمکتے ہوئے لکڑی کے تختے نہایت صفائی اور ترتیب سے جڑے ہوئے تھے، جن کے بیچوں بیچ ایک لمبا قالین بچھاہواتھا۔ راہداری کی ایک پوری دیوار بلند و بالا شیشے کی کھڑکیوں پر مشتمل تھی۔ یہ کھڑکیاں فرش سے تقریباً چھت تک پھیلی ہوئی تھیں، ان کھڑکیوں سے باہر وسیع پیمانے پر پھیلے سرسبز باغ اور پیچھے موجود بلند و بالا پہاڑوں کا منظر صاف نظر آرہاتھا۔ اتناخوبصورت منظر کہ راہداری میں کھڑے ہو کر ہی پورادن گزار دیاجائے۔ ان شفاف شیشوں سے چھن کر آتی صبح کی نرم گرم دھوپ لکڑی کے فرش پر سنہری دھاریوں کی صورت بکھر رہی تھی۔ ہر کھڑکیوں کے درمیان میں نفیس لکڑی کی میزیں رکھی ہوئی تھیں، جن پر سفید پھولوں سے بھرے گلدان سجے تھے۔ ان گلدانوں کے قریب سنگِ مرمر سے تراشے گئے انسانی مجسمے ایستادہ تھے۔ ان مجسموں کے چہروں پر ایک عجیب سی خاموش و سنجیدگی تھی، علی رک کر مجسموں کا جائزہ لینے لگا، اُسکے پیچھے آتے عمر کا بھی یہی حال تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے بنانے والے کی صلاحیتوں کا منہ بولتاثبوت تھے۔

''تم لوگوں نے اگاتھا کرسٹی کا ناول پڑھا ہے؟'' پیچھے آتے حسین کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کونسا؟'' رضا نے پوچھا۔

''اینڈ دین دیئر ورنن!''

''بچپن میں کبھی پڑھا تھا، اب کہانی بھول گئی ہے۔ میں نے اگاتھا کرسٹی کے بہت سے ناول پڑھے ہیں، ذرا یاد دلانا یہ کونسا والا ہے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''جس میں ایک پُراسرار قاتل دس لوگوں کو ایک جزیرے پر جمع کرتا ہے، اور باری باری سب کا قتل کرتا ہے، کچھ اِس طرح کے کوئی بھی نہ قاتل کو ڈھونڈ پاتا ہے اور نہ قتل کے وقت موجود ہوتا ہے۔ اور قاتل انہی میں سے ایک ہوتا ہے۔'' حسین نے کہانی کا خلاصہ پیش کیا۔

''اوہ! وہی والا جس کے آخر میں جج ورگریو قاتل نکلتا ہے؟'' مقدّم کو یکدم ہی یاد آیا، اور اِس سے پہلے کہ حسین مزید کچھ کہتا ایک زوردار قسم کا تھپڑ مقدّم کو اُسی لمحے اپنے سر پر پڑا تھا۔

''آہ۔۔۔'' وہ چیخا اور پلٹ کر رضا کو دیکھا، جس نے ابھی ابھی یہ کارروائی کی تھی اور اب اُسے دانت پستے گھور رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ سر سہلاتے چیخا تو راہداری میں اُسکی آواز گونجی۔

''میں نے وہ ناول آدھا پڑھا تھا، رات کو مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن تمہیں اپنی زبان چلانا ضروری تھا؟'' رضا نے خفگی سے کہا۔

''مجھے کیا پتہ تم وہ پڑھ رہے تھے؟'' اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ عمر نے کچھ حیرت سے اُن تینوں کو دیکھا تھا۔ چلو مقدّم اور حسین تو آپس میں جلدی گھل مل گئے تھے، پر رضا؟ کبھی یونیورسٹی کے زمانے میں بھی اُن تینوں کا یہی حال ہوا کرتا تھا۔ وہ کچھ حیران، کچھ خوشگوار سا یہ منظر دیکھتے واپس راہداری میں محو ہوا۔

''اب تو اسپوئیل ہو ہی گیا ہے، تو یہ بھی سن لو کہ اُس نے یہ کیا کیسے؟'' حسین نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ رضا کو دیکھا۔

''خبردار! ایک لفظ بھی نہ بولنا۔'' اس نے اُنگلی اُٹھا کر اُسے تنبیہہ کی تو حسین اور مقدّم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

''اتنا بھی اسپوئیل نہیں ہوا ابھی۔ میرے مطابق تو جج ورگریو وہ چھٹا بندہ تھا، جو اُس قاتل کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے، پر اُس نے یہ کیسے کیا؟ اور باقی سب کو کیسے مارا۔ یہ میں تمہارے منہ سے ہرگز نہیں سننا چاہتا۔'' اُس نے حتمی لہجے میں کہا۔

راہداری کی چھت باقی گھر کی چھت کی طرح ہی بلند اور نہایت نفیس آرائش سے مزین تھی۔ چھت سے لٹکتے شاندار فانوس قطار در قطار آویزاں تھے، جن کے شفاف کرسٹل کے ٹکڑوں سے جب دھوپ ٹکراتی تو چھوٹے چھوٹے عکس دیواروں اور فرش پر بکھر جاتے۔ علی تو راہداری کے حسن میں کھو سا گیا تھا، پاس کھڑا عمر بھی مسحور سا ہر شے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''ایک تو یہ دونوں آرٹسٹ!'' حسین نے دونوں کو ارد گرد محو دیکھ کر کہا تھا۔ اکرم راہداری پار کر کے کب کا جا چکا تھا۔ جبکہ وہ لوگ وہیں ٹکے ہوئے تھے۔

''کم از کم اِن کے پاس کرنے کو کوئی کام تو ہے، ہم تو یہاں سارا دن فارغ بیٹھنے والے ہیں۔'' مقدّم نے کہا۔

''کوئی نہیں! میں تو باہر گھومنے پھرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' حسین نے کہا۔

''اُس سے پہلے ایک بار نوید سے ضرور نمٹ لینا۔'' مقدّم نے جتایا۔

''کیوں؟ وہ میرا باپ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''تم دونوں یہ سوال ایک مرتبہ نوید سے ہی کیوں نہیں کر لیتے؟'' رضا نے چڑ کر کہا تھا۔

''یہاں آ جائیں پلیز! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اُسکے کچھ بھی کہنے سے قبل ہی اکرم نے راہداری کے آخری سرے سے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

''چلو! ناشتہ کرتے ہیں۔'' علی کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

راہداری کے اختتام پر ڈائننگ ہال کا دروازہ تھا، اندر پورا ہال موجود تھا، وہی ایک جانب قد آدم شیشے کی دیوار، جس سے باغ کا منظر واضح تھا۔ لکڑی سے بنا انٹیریر اور درمیان میں قریب چوبیس کرسیوں والا ڈائننگ ٹیبل۔ شیشے کی دیوار سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ میز پر رکھے ناشتے کے برتنوں پر پڑ رہی تھیں۔ ڈائننگ ہال کے اندر، بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ باورچی خانہ بھی باقی گھر جیسا ہی تھا، وسیع اور کشادہ، لکڑی کے خوبصورت نقش و نگار والا۔

وہ لوگ باری باری کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھنے لگے۔ نوید سر براہی کرسی پر، سیاہ ٹراؤزر پر سیاہ گول گلے والی شرٹ پہنے، اور اُس پر سیاہ رنگ کا ہی جیکٹ ڈالے بیٹھا تھا۔ جیکٹ سامنے سے کھول رکھی تھی، ایک ہاتھ کی مٹھی بنا کر اُسے ران پر رکھے، دوسری کہنی کو میز پر رکھ کر ہاتھوں کی مٹھی ہونٹوں پر ٹکائے، وہ سنجیدگی سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔

جب سب بیٹھ گئے تو اکرم نے پیالیوں میں چائے نکالنی شروع کر دی۔تازہ سینکی ہوئی ڈبل روٹی، ساتھ آملیٹ اور مکھن و جیم وغیرہ رکھے تھے۔کچھ پھل بھی کٹے ہوئے تھے۔اتنا زیادہ کچھ نہ تھا، لیکن جو بھی تھا پورے اہتمام کے ساتھ تھا۔اُن لوگوں نے ناشتہ شروع کیا تو بھی نوید عالم اسی پوزیشن میں بیٹھا اُنہیں دیکھتا رہا۔وہ اور بات ہے کہ کسی نے بھی اُسکی طرف دھیان نہ دیا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں۔۔۔''ناشتے کے دوران مقدّم کو یاد آیا تو حسین سے پوچھا۔

''کیا؟''وہ ذرا حیران ہوا۔

''یہی کہ تمہیں اگاتھا کرسٹی کا ناول کیوں یاد آیا؟''اِس بات پر ہونٹوں پر مُٹھی جمائے بیٹھے نوید نے بھنویں سکیڑ کر حسین کو دیکھا۔

''تھوڑے تھوڑے حالات ہمارے بھی ویسے ہی بن رہے ہیں۔''اُس نے دانت نکالے۔

''تمہارے میں منہ میں خاک،اِس حساب سے تو ہم سب مارے جائیں گے۔''مقدّم نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''اور مارنے والا ہم ہی میں سے کوئی ہو گا۔''رضا نے بات مکمل کی۔

''میں تو شریف آدمی ہوں، تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''حسین نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''بات سنو! میں عادی نشئی ضرور ہوں۔پر عادی قاتل نہیں ہوں۔''رضا نے برا مناتے ہوئے کہا تو ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے گھورا تھا، جسے برابر نظر انداز کیا گیا تھا۔

''عادی نشئی ہونا کافی ہے۔''حسین نے آہستہ آواز میں سرگوشی کی۔

''بھاڑ میں جاؤ!''وہ چبا چبا کر کہتا واپس چائے کی جانب متوجہ ہوا۔

''ناشتے کے لیے تمہارا شکریہ اکرم!''عمر نے آملیٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اکرم کا شکریہ ادا کیا تو اُس نے کچھ عجیب سے انداز میں مسکرا کر پہلے نوید کو دیکھا، پھر دوبارہ اُسکو۔

''شکریہ کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔پر یہ ناشتہ میں نے نہیں بنایا ہے۔''اِس بات پر سب نے ہی رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو پھر کس نے بنایا؟''علی نے پوچھا۔

''وہ۔۔۔نوید بھائی نے۔''اُس نے نوید کی جانب اشارہ کیا تو سب کی گردنیں ایک ساتھ سربراہی کرسی کی جانب مڑی تھیں۔جبکہ نوید نے ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گہری سانس لی اور خالی پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔اب سب اُسکی جانب متوجہ تھے اور وہ ناشتے کی جانب۔

''یہ مہربانی کس لیے؟''حسین نے تھوڑا مشکوک ہوتے پوچھا۔آیا وہی جج ور گریو کی طرح قاتل نکلے اور اُنہیں ناشتے میں زہر ملا کر دے دے۔

''اکرم کا کام صفائی کرنا اور کپڑے وغیرہ دھو کر استری کرنا ہے۔کھانا بنانا نہ اسے آتا ہے اور نہ یہ اِسکی ذمّے داری ہے۔کل اِسکی والدہ نے مہمان نوازی کے طور پر رات کا کھانا بھیج دیا تھا،پر روزانہ ایسا نہیں ہو سکتا۔''ڈبل روٹی کے آدھے حصّے پر مکھن لگاتے نوید نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ اِس گفتگو کا مقصد اُنہیں سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''تو؟''علی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تو یہ کہ آج میں نے ناشتہ بنا دیا ہے۔کل سے ناشتے اور کھانے کے لیے باریاں لگے گی۔'' اس بات پر سب کا منہ کھلا تھا۔آدھے حصے پر مکھن لگانے کے بعد بقیہ آدھے پر جیم لگاتا نوید بے حد سنجیدہ تھا۔

''اِس بات کا مطلب؟''مقدّم نے سنبھل کر پوچھا۔

''آسان زبان میں بات کی ہے میں نے۔''اُس نے بھنویں اُچکا کر مقدّم کو دیکھا،چہرہ نہیں اٹھایا،بس آنکھیں اٹھائی تھیں۔

''مہینہ ڈیڑھ مہینہ یہاں رہنا ہے تو کام برابری سے کرنا ہوگا۔راشن ہمارے پاس محدود ہے،ختم ہونے کی صورت میں اکرم کو شہر جانا پڑتا ہے اور شہر جانے کے لیے سڑک،موسم اور دیگر عوامل کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔لہٰذا ہر شخص اپنے لیے الگ الگ کھانا،ناشتہ تیار نہیں کر سکتا۔ایک ہی بندے کو سب کے لیے ناشتہ اور کھانا بنانا ہوگا۔اِس لیے سب باری باری یہ کام کریں گے۔''یہ نیا انکشاف تھا۔اسکے بعد تو حلق سے نوالہ اُترنا دوبھر ہو گیا تھا۔جبکہ خود وہ سکون سے اپنا ناشتہ کرتے تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔اُنکی مرضی اور دلچسپی کے بغیر!

''یعنی!مجھے بندوں کا کھانا اور ناشتہ بنانا ہوگا؟''حسین نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔

''ہاں!آج میں ناشتہ بنا چکا ہوں،لہٰذا تم لوگ فیصلہ کر لو کہ کھانا کس نے بنانا ہے؟''چائے کا کپ لبوں سے لگاتے نوید عالم نے شاید آج پہلی بار اتنی لمبی گفتگو کی تھی۔

''ناشتہ صبح سات بجے کرنا ضروری ہے؟''علی نے سنبھل کر پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ یہاں گیس صبح چھے بجے آتی ہے اور گیارہ بجے چلی جاتی ہے۔ ناشتے اور کھانے کا انتظام گیس جانے سے پہلے کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ دوبارہ گیس شام ساڑھے چھے بجے آتی ہے۔'' اب کہ اکرم نے جواب دیا تھا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اُس سائیکو کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔'' حسین نے معصومانہ سی خواہش کا اظہار کیا۔ اِس بات پر نوید نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''کبھی منہ سے اچھی بات بھی نکال لیا کرو۔'' رضا نے اُسے گھرکا تھا۔ وہ ڈھیٹ بھی مسکراہٹ ضبط کرتے ناشتے کی جانب متوجہ ہوا۔

''تو پھر؟ کون آج کے کھانے کی ذمّے داری لے رہا ہے؟'' یہ سوال اکرم کی طرف سے آیا تھا۔

''صبر کر لو بیٹا! کم از کم ناشتہ تو سکون سے کرنے دو۔'' مقدّم نے جل کر کہا تھا۔

''میرے سر میں دو روز سے بہت درد ہے۔'' علی نے ماتھا مسلتے ہوئے کہا۔ یعنی اُسے تو کام سے دور ہی رکھا جائے۔

''آہ! مجھے صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہم سے کھانا بنوانے والا ہے۔'' رضا بڑبڑایا تھا۔

''کاش! تم اُس وقت کوئی اچھی بات کہہ لیتے۔'' حسین نے سرد آہ بھرتے ہوئے اُسے لتاڑا۔

''میں آج کے لیے یہ ذمّے داری لیتا ہوں۔'' عمر نے فوراً پیش کش کی تھی۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' مقدم نے اسے تشکّر آمیز نظروں سے دیکھا تو وہ ہنسا۔

''اسکی مدر ٹریسا بننے کی عادت گئی نہیں اب تک؟'' حسین نے چوٹ کی تھی تو عمر نے رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں مدر ٹریسا کے بارے میں کچھ معلوم بھی ہے؟'' اُسکا سوال عجیب سا تھا۔

''سوائے اسکے کہ وہ غریبوں کے لیے دردمند دل رکھتی تھی، اور بہت خدا ترس عورت تھی۔'' حسین نے اُس سے زیادہ حیرت سے بتایا۔

''نہیں! مدر ٹریسا وہ ہرگز نہیں تھی جو وہ دکھاتی تھی۔'' اِس بات پر سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پر اِس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا نوید اچانک ہی کھڑا ہوا تو تمام نظریں اپنے آپ ہی اُسکی جانب اٹھی تھیں۔

''ہمارے پاس یہاں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے سوائے کھانا اور ناشتہ بنانے کے لیے۔ تم لوگ اپنے لیے کوئی مصروفیات ڈھونڈنا چاہو تو ڈھونڈ سکتے ہو۔'' اُس نے کہتے ہوئے برتن سمیٹ کر ایک جگہ اکھٹے کیے، پھر اُن کی جانب دیکھے بنا ہی راہداری کے دروازے کی جانب بڑھا۔

''انٹرنیٹ ہے نہیں یہاں، بھلا کیا ہی مصروفیات ڈھونڈیں اپنے لیے؟'' یہ دکھی الفاظ حسین کے تھے۔ راہداری کے دروازے پر پہنچ کر نوید رکا اور پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''جج ور گریو نے قتل نہیں کیا تھا۔ بلکہ قاتلوں کو سزا دی تھی۔'' سنجیدگی سے کہتے وہ کسی کا بھی جواب سنے بغیر راہداری میں گم ہو گیا۔

''تم سب کیوں چاہتے ہو کہ میں ناول مکمل نہ کروں؟'' رضا نے بیزاری سے چمچ پلیٹ میں پٹخا تھا۔

''آخر یہ جج ہے کون؟'' علی نے بالآخر تنگ آ کر پوچھا تھا۔

''تمہیں کیا معلوم؟ تم نے کبھی رنگوں کی دنیا سے باہر نکل کر جاسوسی ناول پڑھے ہوں تو معلوم ہوتا۔'' حسین نے جواب دیا۔

''حالانکہ جاسوسی صلاحیتیں بہترین ہیں اِسکی۔۔۔'' یہ واضح بڑبڑاہٹ رضا کی تھی۔ علی اُسے کوئی جواب نہ دیتا اٹھ کھڑا ہوا، ویسے بھی اُسکے سر میں کافی درد تھا۔

''چھوڑو اُس فراڈیے جج کو! مجھے یہ بتاؤ تم کیا بنا رہے ہو کھانے میں؟'' مقدّم نے پہلے اُسے پھر برتن سمیٹ کر کھڑے ہوتے عمر کو مخاطب کیا تھا۔

''دیکھتے ہیں کہ کیا بنایا جا سکتا ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ باقی سب بھی ناشتہ مکمل کر کے اٹھنے لگے تھے۔

''میں آپ کو کچن اور سامان وغیرہ دکھا دیتا ہوں۔'' کافی دیر سے رضا کو خاموشی سے گھورتے اکرم نے یکدم ہی کہا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں؟'' عمر اُسکے ساتھ چل پڑا۔ البتہ رضا کو اکرم کی نظریں خود پر محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک شے جو شاید کسی نے محسوس نہ کی۔۔۔

یا کر کے بھی نظر انداز کر دی۔۔۔

وہ ایف آئی میں اکھٹے ہونے والے دوست نہ رہے تھے۔ جنکی موجودگی میں بھی موت جیسا سناٹا رہتا تھا۔۔۔

وہ پھر وہی ہونے لگے تھے۔۔۔ کہ جنکی موجودگی میں خاموشی لمحے کو بھی نہ ٹھہر پاتی تھی۔۔۔

تو کیا دوستی پھر سے انکے درمیان میں چلی آئی تھی؟

کیا واپسی کی منزل کے مسافر، اپنی منزلوں کو پہنچ گئے تھے؟

---------+---------+--------

''انڈے، پیاز، ٹماٹر، آلو اور لہسن کے پیسٹ کی ضرورت ہے مجھے۔''عمر نے باورچی خانے کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔ قدیم انٹیریئر اور جدید چیزوں سے آراستہ پیراستہ باورچی خانہ بھی اپنے آپ میں خوبصورت تھا۔

''اتنے بڑے گھر کی صفائی تم اکیلے کرتے ہو؟''کاؤنٹر کے پاس بلاوجہ کہنیاں ٹکائے کھڑے علی نے اکرم کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں تمام سامان آپکو لا کر دے دیتا ہوں۔''اکرم نے پہلے عمر کو جواب دیا، پھر علی کی جانب گھوما۔''اکیلے ہی کرتا ہوں۔ مگر چونکہ گھر استعمال نہیں ہوتا لہٰذا مہینے میں ایک بار تفصیلی صفائی کے بعد چیزوں پر چادریں ڈال کر رکھ دیتا ہوں۔ کھڑکی دروازے بھی بند رہتے ہیں تاکہ ریت اندر نہ آئے۔ اُسکے علاوہ جب مالکان رہنے آتے ہیں، تب ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو اتنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ابھی بھی جو کمرے آپ لوگوں کے زیرِ استعمال ہیں، صرف اُنکی صفائی ہی روز ہو گی۔''اُس نے تفصیل سے جواب دیا۔ پھر رضا کو دیکھا جو فریج میں منہ ڈالے نجانے کیا تلاش کر رہا تھا؟ عمر اتنی دیر میں پیاز اُٹھا لایا تھا، اب اکرم کے دیئے گئے کٹنگ بورڈ پر رکھ کر اُسے کاٹ رہا تھا۔

''میں کچھ مدد کروں؟''رضا نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! میں کر لوں گا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اکرم اُسکا مطلوبہ سامان نکال لایا، اور کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ پھر دوبارہ رضا کو دیکھا، جو دونوں ہتھیلیاں کاؤنٹر پر ٹکائے ذرا آگے کو جھک کر اکرم کا لایا سامان دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے چیزوں پر غور و خوص کرنے کی کیا عادت تھی؟

''باقی تینوں کہاں ہیں ویسے؟''علی کو آدھے افراد کی کمی محسوس ہوئی تو پوچھا۔

''مقدّم اور حسین تو کہیں باہر گئے ہیں۔ نوید کا معلوم نہیں!''جواب رضا نے دیا تھا۔

''صبح صبح اُٹھا دیا اِس آدمی نے۔ اتنا لمبا دن۔۔۔ کیسے گزرے گا یہاں؟''علی نے دروازے سے جھانک کر، ڈائننگ ہال میں نظر آتے گھڑیال کو دیکھتے ہوئے کہا جو صبح کے نو بجا رہا تھا۔

''کہا تو ہے اُس نے کہ اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈ لو۔''عمر نے کٹے ہوئے پیاز اُٹھا کر بڑی کڑھائی میں ڈالے تھے۔

''تم بنا کیا رہے ہو ویسے؟''رضا نے تھیلے میں رکھے انڈوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُبلے ہوئے انڈوں کا سالن!''اُس نے جواب دیا۔

''اُسے ہمارے گھر میں انڈے آلو کا سالن کہتے ہیں۔''علی نے بتایا۔

''ہمارے یہاں بھی یہی کہتے ہیں، میں نے بس تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔''اُس نے چولہے پر کڑھائی رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔'' رضا نے یکدم ہی پوچھا تو چولہے کے پاس کھڑے عمر نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ فریج کے پاس خاموش کھڑے اکرم کی نظریں اب بھی رضا پر ہی تھیں۔

''پوچھو!'' اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا، علی نے اتنی دیر میں آلو اٹھا کر اسے چھیلنا شروع کر دیا تھا۔

''تمہیں واقعی کھانا بنانا آتا ہے نا؟'' رضا کا لہجہ کچھ مشکوک سا تھا۔ عمر ہنس پڑا۔

''اب جیسا بھی آتا ہے، تمہیں کھانا تو یہی پڑے گا۔'' چھیڑنے والے انداز میں کہتا وہ ٹماٹر کاٹنے لگا۔

''خیر! جیسا بھی ہوگا، پرچرس اور نشے سے تو بہتر ہی ہوگا اُسکا ذائقہ۔'' اُس نے سکون سے کہا تو آلو چھیلتے علی نے لب بھینچے، اور نظریں اُٹھا کر رضا کو دیکھا۔ جو اُسکو آگ لگانے کے بعد سکون سے انڈوں کو ابالنے کی خاطر، اکرم کی ہی دی گئی پتیلی میں پانی بھر رہا تھا۔ عمر نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اِس سے پہلے کے علی کوئی تپا ہوا سا جواب دیتا، اسی لمحے اکرم کی آواز کچن میں گونجی۔

''آپکا نام رضائے الٰہی ہے نا!'' اس بات پر انڈے پتیلے میں سجاتے رضا نے رک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ عمر اور علی کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

''ہاں! تمہیں کیسے معلوم؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں جامعہ کراچی میں پڑھتا ہوں، وہاں مارکیٹنگ کے حوالے سے ایک سیمینار ہوا تھا، آپ اسپیکر تھے اُسکے۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو۔'' اکرم پرجوش ہو کر بتانے لگا۔ رضا کو خوشگوار حیرت ہوئی، اُسے امید نہیں تھی کہ اکرم پڑھتا لکھتا بھی ہوگا۔

''اچھا! تو کیا پڑھتے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تو ڈی پی اے میں ہوتا ہوں۔'' اُس نے بتایا۔

''اچھی بات ہے، اچھے سے پڑھو اور بہترین انسان بنو!'' رضا نے خوشی سے کہا۔

''پر آپ ابھی نشے کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟'' اُس نے کچھ پریشان کن لہجے میں پوچھا، تو رضا کی مسکراہٹ سمٹی تھی، جبکہ علی کی مسکراہٹ اُمڈ کر باہر آئی تھی۔ جسے اُس نے چہرہ نیچے کر کے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ عمر اس تمام صورتحال میں ہکا بکا سا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''شٹ!'' رضا نے زیرِ لب کہا، پھر بولا۔ ''وہ دراصل! ہم آپس میں کچھ مذاق کر رہے تھے۔'' اُس نے دانت نکالتے ہوئے سمجھایا تو اُس نے فقط سر ہلا دیا۔

''اچھا میں صفائی کر کے آتا ہوں، آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیجیے گا۔'' صد شکر کہ اُس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اُسکے جانے کے بعد علی دل کھول کر ہنسا تھا۔ رضا اُسے کینہ توز نظروں سے گھورتا واک آؤٹ کر گیا۔

اب بھلا اس میں علی کی کیا غلطی تھی؟

---------+---------+--------

''آج مجھے احساس ہوا کہ اگر انٹرنیٹ نہ ہو تو اِس شے کی کوئی وقعت نہیں ہے۔'' پہاڑ کے کنارے، جہاں سے نیچے پوری وادی نظر آرہی تھی، کھڑے حسین نے موبائل ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔'' سامنے کے مناظر کو اپنے ڈی ایس ایل آر میں مقید کرتے مقدّم نے تائید کی۔ رات کے اندھیرے میں یہ دیو قامت پہاڑ اور خاموش وادی جتنی خوفناک لگتی تھی، دن کے وقت اُتنی ہی خوبصورت تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ اگر انٹرنیٹ نہیں ہوا تو ہم کریں گے کیا؟ یعنی۔۔۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہے، جب میں کراچی سے نکلا تھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔'' کیمرے کی آنکھ سے سامنے نظر آتی بلند و بالا چٹان کو دیکھتا مقدّم رکا، پھر پلٹ کر اُسے بغور دیکھا۔

''فرّخ صاحب نے کہا تو تھا کہ وہ ہم تک ہمارے گھر والوں کی خیریت پہنچا دیں گے۔'' اُس نے کہا۔

''لیکن پہنچائی تو نہیں!'' وہ اُداسی سے بولا۔

''فکر نہ کرو پہنچا دیں گے۔'' اُس نے تسلی دی پر حسین چپ ہی رہا۔

''منہ سیدھا کرو اپنا!'' اُس نے اُسکے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ گہری سانس لیکر سیدھا ہوا۔

''مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ میں تم سے ناراض تھا کسی بات پر۔۔۔'' وہ اپنی پرانی ٹون میں واپس آیا۔

''مجھ سے؟ میں نے کیا کیا؟'' مقدّم حیران ہوا۔

''منگنی کر لی، پر نہ بتایا، نہ بلایا۔''

''تم نے معاف کر تو دیا تھا۔'' اُس نے واٹس ایپ گروپ والی گفتگو کی جانب توجہ دلائی۔

''علی کو کیا تھا صرف۔۔۔'' اُس نے یاد دلایا۔

''آں۔۔۔ ایسا ہے کہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔'' مقدم نے کان کھجاتے کہا۔

''میں ٹریٹ لوں گا اسکے بدلے۔''

''اس وقت ؟''وہ حیران ہوا۔

''ہاں !اب جب کھانا بنانے کی ذمّے داری ہم سب پر آ ہی گئی ہے، تو تم کچھ اچھا سا بنا کر کھلا سکتے ہو مجھے۔''حسین نے مفت مشورہ دیا۔

''مجھے اپنے ہاتھ کے ذائقے پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔''

''پر مجھے ہے۔''

''روکھی سوکھی بھی کھلا دوں تو چلے گا؟''اُس نے چھیڑا۔

''تم پیار سے جو کچھ بھی کھلا دو چلے گا۔''

''زہر چلے گا؟'' اس معصومانہ سوال پر حسین نے اُسے سر تا پاؤں گھورا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے واپس چلتے ہیں اب !''مقدّم نے ہنستے ہوئے کہا اور حویلی کی جانب بڑھ گیا۔

---------+---------+--------

''آخر یہ دونوں گئے کہاں ہے ؟''ہال میں اِس وقت صرف اور صرف ایس ایس پی نوید عالم کی آواز گونج رہی تھی۔ صوفے پر آدھا لیٹا رضا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اپنا ناول مکمل کر رہا تھا، گاہے بگاہے نظر اُٹھا کر پنڈولم کی طرح دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹتے نوید کو بھی دیکھ لیتا۔ ہال میں لگا گھڑیال، دن کے بارہ بجا رہا تھا۔ عمر اپنا کام مکمل کر کے، نہانے جا چکا تھا۔ اس قدر سرد موسم میں علی کا تو کوئی ارادہ نہ تھا نہانے کا، لہٰذا وہ بھی ہال میں ہی ڈھیر ہو گیا۔ خود عمر بھی فقط اِس لیے نہانے گیا تھا تاکہ اپنے کپڑوں میں سمائی پیاز لہسن کی مہک سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔

''کیا تم میں سے کسی کو بتا کر نہیں گئے یہ دونوں ؟''اُس نے ایک مرتبہ پھر بے نیازی سے بیٹھے رضا اور علی کو دیکھا تھا۔

''نہیں !''

''تو تم لوگوں نے پوچھا کیوں نہیں ؟''اُسکا غصّہ سوا نیزے پر پہنچا ہوا تھا۔ رضا نے کتاب ذرا کی ذرا چہرے سے نیچے کر کے اُسے دیکھا۔

''کیا ہم نے تم سے پوچھا کہ تم ناشتے کے بعد سے کہاں غائب تھے ؟''رضا کا سوال سیدھا سیدھا تھا۔

''میری بات الگ ہے ؟''اب کہ نوید کا لہجہ پہلے سے آہستہ ہوا۔

''کیوں ؟تم سمجھدار انسان ہو ؟اور وہ ناسمجھ ؟''وہ بحث برائے بحث میں اُلجھا۔ نوید نے لب بھینچ کر اُسے دیکھا۔

''کام ڈاؤن نوید! بچے تھوڑی ہیں دونوں، آجائیں گے واپس۔۔۔'' علی نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''بچے نہیں ہیں وہ دونوں، لیکن اتنی سی بات سمجھ نہیں آرہی کہ اس حویلی سے باہر کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔تب تک۔۔۔جب تک کہ لیے ایف آئی اے کی طرف سے کوئی کلیئرنس نہیں آجاتی۔'' اصل وجہ یہ تھی۔اگلے ہی لمحے مقدّم اور حسین ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دکھائی دیے تو نوید نے سکھ کا سانس لیا، پھر سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

''کہاں تھے تم دونوں؟'' اُس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اور دونوں کو سرتاپاؤں دیکھا۔

''ذرا تازہ ہوا میں سانس لینے گئے تھے۔'' جواب مقدّم نے دیا۔

''کس سے پوچھ کر؟'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تو دونوں رکے۔

''ایکسکیوزمی؟'' حسین نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔مقدم کو بھی اِس سوال کی امید نہ تھی۔

''تم دونوں کو اِس طرح بنا بتائے، بنا کسی سے پوچھے حویلی سے باہر جانے کی اجازت کس نے دی؟ مذاق ہے کیا تمہارے لیے؟'' اُس نے جیسے غصّہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ہال کی سیڑھیوں سے نیچے آتے عمر نے کچھ حیرت سے رک کر نوید کو دیکھا جو انہیں ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا رہا تھا۔

''تم کس سے پوچھ کر جاتے اور آتے ہو؟'' یہ دوبدو سوال حسین نے کیا تھا۔

''میں فرّخ صاحب کے حکم سے ہی آتا جاتا ہوں۔اپنے شوق کے لیے یا سیر سپاٹے کے لیے نہیں!'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔اُسکا انداز وہاں موجود ہے شخص کو ناگوار گزرا تھا۔

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' حسین کو اب واقعی غصّہ آرہا تھا۔''تم ہمیں یہاں حفاظت کے لیے لائے ہو یا قید کرنے کے لیے؟''

''ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم سے پوچھ کر یہاں سے باہر نکلنا ہے۔آئندہ خیال رکھیں گے۔'' مقدّم نے دونوں کو ایک دوسرے سے اُلجھتا دیکھ کر فوراً صلح جو انداز میں کہا۔

''پوچھ کر نہیں! پر اطلاع تو دے دو کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں تم سے رابطہ نہیں کر پا رہا صبح سے۔'' اب کہ نوید نے اپنے لہجے پر قابو پایا۔درحقیقت وہ پریشان تھا۔

''کیسے رابطہ کرو گے؟ تم نے ہی یہ نیٹ ورک اور انٹرنیٹ پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔'' حسین عجیب سے انداز میں کہتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔غالباً وہ ناراض ہو چکا تھا۔

''یہ سب صرف تم لوگوں کی حفاظت کے لیے ہے۔ ہو سکتا ہے ایک دو دنوں میں انٹرنیٹ استعمال کرنے کی، اور گھر والوں سے بات کرنے کی اجازت مل جائے۔''نوید نے وہاں موجود باقی لوگوں کو دیکھتے ہوئے وضاحت دی، آواز حسین تک بھی گئی تھی اور وہ بنا کوئی جواب دیئے جا چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں! ہم سمجھتے ہیں۔''مقدّم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ نوید نے سر ہلاتے اوپر نظر آتی راہداری کو دیکھا تھا۔ نجانے حسین کو اچانک سے کیا ہوا تھا؟ وہ تو اتنی جلدی ہر بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ یا شاید وہ صرف نوید کی ہی باتوں کا برا ماننے لگا تھا۔

صبح صبح ناشتہ کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ بھوک جلدی لگ گئی۔ دوپہر ایک بجے کے قریب اکرم نے کھانا لگا دیا تھا۔

''تم صبح کچھ کہہ رہے تھے؟''کھانے کے دوران علی نے عمر کو مخاطب کیا تھا۔ اب خاموشی اُنکے لیے مشکل ہو گئی تھی۔ بنا مخاطب کیے گزرا نہ رہا تھا۔ خاموشی اُنہیں خیر آباد کہہ چکی تھی شاید۔

''میں؟ کیا کہہ رہا تھا؟''اُسے یاد نہ آیا۔

''تم مدر ٹریسا کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟''اُس نے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں! تمہیں واقعی مدر ٹریسا کے بارے میں نہیں معلوم حسین؟''اُس نے خاموشی سے کھانا کھاتے حسین کو مخاطب کیا۔ اس مرتبہ سربراہی کرسی کے بجائے، علی کے برابر والی کرسی پر بیٹھے نوید نے بھی بغور اُسے دیکھا تھا۔

''نہیں! میں بھلا اور کیا ہی جانوں گا آنٹی ٹریسا کے بارے میں؟''اُس نے کندھے اچکاتے اپنے ازلی انداز میں کہا۔

''مدر ٹریسا نے اپنے اداروں میں کتنے ہی بیمار لوگوں کی تیمارداری کی، لیکن کبھی کسی کا علاج نہیں کروایا۔ حالانکہ وہ لاکھوں ڈالر فنڈز، اُنکے علاج کی مد میں لوگوں سے وصول کرتی تھی۔ وہ انکا علاج نہ کروانے کی ایک ہی وجہ دیتی تھی، کہ بیمار افراد کو یسوع مسیح کی طرح دکھ اور تکلیفیں برداشت کرتے رہنا چاہیے۔ اُس نے کولکتہ کے کتنے ہی ہندوؤں کو بلیک میل کر کے عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا، وہ اُنہیں کہتی تھی کہ تم عیسائیت قبول کرو گے تو جلد ہی شفا پاؤ گے۔ اُسکے پاس موجود ہزاروں مریض ایسے تھے جو قابل علاج تھے، مگر ٹریسا نے انکو زبردستی تکلیفوں اور اذیتوں میں رکھ کر اپنا عقیدہ اُن پر تھوپا۔ اُسکے نزدیک انسان جتنا زیادہ تکلیف میں ہو گا اتنا زیادہ خدا سے قریب ہو گا، اِس لیے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شیطانی ہتھکنڈے کے ذریعے مدر ٹریسا نے نہ صرف بھارت سمیت دنیا بھر میں ہزاروں لوگوں کو عیسائی بنایا بلکہ اس نے خاص طور پر ہندو مذہب کو شدید نقصان پہنچایا کیونکہ اس کے شکار کی اکثریت ہندو تھی۔''یہ انکشاف بہت خوفناک تھا۔

''کیا اُسکی زندگی میں اُس پر یہ تنقید ہوئی تھی؟''علی نے پوچھا۔

''ہاں! اور اُن تمام تنقیدوں کے جواب میں، مدر ٹریسا نے کہا کہ غریبوں کا اپنا دکھ قبول کرتے ہوئے، مسیح کے جذبے کی طرح دکھ جھیلنا ایک خوبصورت احساس ہے۔ دنیا ان کے دکھوں سے بہت کچھ حاصل کرتی ہے۔ البتہ، جب اپنی تکلیف کی بات آئی تو اُس نے بالکل مختلف موقف اختیار کیا۔ جب اُسے دل کے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا، تو اس نے ایک جدید امریکی ہسپتال میں اپنا علاج کروایا۔ یہ ٹریسا کی تضحیک اور جھوٹ کی ایک اور مثال ہے، جو سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوئی۔'' عمر نے مزید بتایا۔

''تو لوگ اُسے فنڈز دیتے ہی کیوں تھے؟ اور وہ اُن معصوم لوگوں تڑپا تڑپا کر مار کے کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟'' رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مدر ٹیرسیا کی شیطانیت کی داستان بہت لمبی ہے، اُسکو پیسہ دینے والے زیادہ تر حکومت اور امرا طبقے کے شدید کرپٹ لوگ تھے۔ مسیحیت کا راگ الاپنے والی ٹیرسیا نے اِس تنقید کا جواب بھی اس طرح دیا کہ مجھے کسی کی کمائی کے ذرائع سے مطلب نہیں ہے، مجھے غریبوں کے لیے امداد کی ضرورت ہے۔ جبکہ جرمن میگزین سٹرن کی 1991 کی ایک رپورٹ میں یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ اسے ملنے والے لاکھوں ڈالر میں سے صرف سات فیصد خیراتی کاموں کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔''

''کل تعداد کا صرف سات فیصد؟'' اُنکے منہ حیرت سے کھلے تھے۔

''بالکل! دنیا کبھی نہیں جان سکی کہ وہ پیسے کہاں گئے؟ اُسکو پیسے دینے والوں کی اکثریت انسانیت سوز حرکات میں ملوث بھی تھی۔ بہت سی ادارہ صحت کی رپورٹوں میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ ٹیرسیا کے یہاں صحت اور علاج کا نظام انتہائی ناقص تھا، کچھ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ علاج کے دوران ایک ہی سرنج کا استعمال کئی لوگوں پر کرتی تھی، بستر گندے اور اکثر دوائیں سرے سے موجود نہیں ہوتی تھیں۔ حالانکہ جتنے اُسکے فنڈز تھے، اُسکا ادارہ سب سے زیادہ جدید ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ کچھ کچھ جیفری ایپسٹین جیسا ہے۔'' کافی دیر سے خاموش نوید نے کہا تھا۔ اس تبصرے پر سب نے اُسے حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ گفتگو میں کم ہی حصہ لیا کرتا تھا۔

''وہ کیسے؟'' عمر نے سب کی زبانوں کا سوال اُس سے کیا۔

''ایپسٹین کیا کرتا تھا؟ انسانوں کی قربانیاں دے کر اپنے کسی شیطان بعل کو خوش کرتا تھا، اُسی کو پیسے بھی دیا کرتا تھا۔ اُسکو پیسے دینے والے دنیا کے نامور لوگ تھے۔ تم غور کرو تو ٹریسا نے بھی تو یہی کیا ہے۔ اُس نے معصوم لوگوں کو مرنے دیا، اور اُسے پیسے دینے والے اپنے وقت کے مشہور ترین کرپٹ لوگ تھے۔ اور اُن پیسوں کا کوئی حساب بھی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ سمپل! یہ سب شیطان کے پیروکار ہیں۔'' اُس نے ایک بالکل ہی الگ نوعیت پر بات کی تھی۔ پر بات اُسکی کچھ کچھ درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسے بات کر رہے تھے، جیسے دس سال اُنکے درمیان کبھی آئے ہی نہ تھے۔

''یہ سب تو رونگٹے کھڑے کر دینے والے انکشافات ہیں۔''مقدّم نے جھرجھری لی تھی۔

''آج سے میں تمہیں عبدالستار ایدھی کہوں گا۔''حسین نے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسا۔

''اُنکے جیسے لوگ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔''رضا نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا تو سب نے تائید کی۔

''کھانا اچھا تھا ویسے!''مقدّم نے عمر کی تعریف کرنا ضروری سمجھا۔وہ بس مسکرا دیا۔

--------+---------+----------

سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔کھانا ختم ہونے کے بعد اکرم اپنی خوشی سے سب کے لیے اپنے گھر سے چائے بنا لایا تھا۔اُسکے پاس سلینڈر تھا لہٰذا اُسکے لیے چائے بنانا مشکل نہ تھا۔چائے پینے کے بعد نوید پھر کہیں غائب ہو چکا تھا۔جبکہ باقی پانچوں ہال میں موجود تھے۔

''یہ کہاں آتا جاتا ہے آخر؟''مقدّم،نوید کی غیر موجودگی پر مشکوک تھا۔

''بڑے لوگ ہیں وہ،بتا کر تھوڑی جاتے ہیں۔ساری پابندیاں تو بس ہمارے لیے ہی ہیں۔''صوفے پر آڑھا ترچھا لیٹا حسین بیزاری سے بولا تھا۔

''چھوڑو ان سب باتوں کو،یہ بتاؤ کہ کیا ہم یوں ہی فارغ بیٹھ بیٹھ کر اگلا ایک ماہ گزاریں گے؟''عمر نے موضوع بدلنا چاہا۔

''ہم بھلا کیا ہی کر سکتے ہیں یہاں؟فارغ بیٹھنے کے علاوہ!''علی نے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے پوچھا۔اُسکے سر میں ایک بار پھر درد اُٹھ رہا تھا۔

''گھر کی صفائی شروع کر دیں؟''حسین نے مفت مشورہ دیا،اُسکے برابر بیٹھا رضا جیب سے سگریٹ نکال کر جلا چکا تھا۔

''ہاں!اُسکے بعد کپڑے بھی دھوئیں گے اور پھر لان کی کانٹ چھانٹ بھی کر لیں گے۔''مقدّم نے اُسکا جملہ مکمل کرتے،ایک نظر سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے رضا کو دیکھا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی؟''مقدّم نے سنجیدگی سے اُس کو مخاطب کیا۔

''ہرگز نہیں!''رضا اچھے سے اُسکا سوال سمجھ گیا تھا،اِس لیے ڈھٹائی سے بولا۔

''اِس طرح سب کے درمیان بیٹھ کر سگریٹ پینا بالکل نامناسب عمل ہے۔''اُس نے احساس دلانا چاہا۔

''تم کھڑے ہو کر پی لو۔''حسین نے ایک اور مشورہ دیا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔

''سگریٹ فقط عورتوں، بچوں اور بزرگوں کے درمیان بیٹھ کر پینا نامناسب عمل ہے۔اب تم بتاؤ کہ تمہیں ان میں سے کس کیٹیگری میں رکھوں؟'' رضا نے سنجیدگی سے پوچھا تو عمر اور مقدّم نے تاسف سے اُسے دیکھا تھا۔

''یہ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی ہے۔'' عمر نے بھی سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میرے علم میں اضافے کے لیے شکریہ! مجھے یہ بات آج پتہ چلی ہے۔'' اُس نے سگریٹ کا ایک اور کش لیتے ہوئے کہا۔

''خاموش نہیں رہ سکتے کچھ دیر کو، میرے سر میں بہت درد ہے۔'' کافی دیر سے چپ بیٹھا علی یکدم ہی بولا تھا۔

''اتنا درد کیوں ہے تمہارے سر میں کل سے؟'' عمر کو تشویش لاحق ہوئی۔اِس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، رضا نے اچانک ہی سگریٹ کا ڈبہ اپنی دائیں جانب بیٹھے علی کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''پیو گے؟'' اِس دوستانہ پیشکش پر جہاں سب کا منہ کھلا تھا، وہیں علی نے سر تا پاؤں اُسے گھورا تھا۔

''نہیں!'' وہ جواب دیتا واپس اپنا ماتھا مسلنے لگا۔

''بھری ہوئی نہیں ہے۔'' اُس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تو حسین بیساختہ ہی ہنسا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' علی نے لب بھینچتے ہوئے کہا۔

''میں نے نشمیہ سے وعدہ کیا ہے کہ میں سگریٹ نہیں پیوں گا۔بس اِس لیے منع کیا۔'' اُس نے مزید وضاحت دی تو اُس نے کندھے اُچکاتے پیشکش واپس لے لی۔

''یہ تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا۔'' عمر خوش ہوا تھا۔

''تم بھی کوئی سبق حاصل کر لو۔'' مقدّم نے ایک بار پھر رضا کو شرم دلانا چاہی۔

''پہلے ایس ایس پی نوید عالم کو سبق دو جو یہی کام کرنے کے لیے باہر لان میں موجود ہے۔'' اُسے بھلا کیا فرق پڑنا تھا؟

''اوہ! تو وہ یہ کام کرنے گیا ہے؟'' علی حیران ہوا۔

''کم از کم سب کے درمیان بیٹھ کر تو نہیں پی رہا۔'' مقدّم نے ایک مرتبہ پھر اُسے طنز کا نشانہ بنایا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں بچہ سمجھتا ہو؟'' رضا نے طنز خاطر میں نہ لایا۔

''یا پھر بزرگ؟''حسین نے لقمہ دیا۔

''یا پھر؟۔۔۔''اس مرتبہ رضا اور حسین دونوں نے ایک ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ کر مقدّم کو دیکھا۔

''شٹ اپ!''اُس نے خجل ہوتے ہوئے کہا تو دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے۔

مقدّم دانت کچکچا کر رہ گیا۔

--------+---------+----------

رات کے کھانے پر نوید نہیں آیا، بلکہ ہال میں اپنے دو عدد لیپ ٹاپ، اور کچھ فائلز وغیرہ کھول کر بیٹھا رہا، کسی نے اُسے بلانے کی زحمت بھی نہ کی، عمر میں تھوڑی انسانیت جاگی تھی پر مقدّم نے اُسے یہ کہہ کر سلا دیا کہ

''رات کے کھانے کے بارے میں سب کو علم ہے، دعوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ بھی خاموش ہو گیا۔

خلاف توقع حسین بھی نہیں آیا تھا میز پر، رضا کو حیرت ہوئی تو جا کر پوچھ آیا۔اُس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا۔رضا اُسکا انکار کبھی نہ سنتا پر اُس لمحے اُسکا چہرہ واقعی سرخ اور انداز عجیب سست سا تھا۔لہٰذا وہ واپس آ گیا۔

''تم کھانے کے بعد سونے جا رہے ہو؟''کھانے کے دوران عمر نے علی سے پوچھا تھا۔

''جاگ کر کرنا بھی کیا ہے؟''علی نے گہری سانس لیتے ہوئے برتن اُٹھایا۔

''چلو! تمہیں حویلی کی لائبریری دکھاؤں، میں نے اور مقدّم نے شام میں ہی دریافت کی ہے۔''اُس نے کہا تو علی حیران ہوا۔

''حویلی میں لائبریری بھی ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''حویلی میں جم بھی ہے۔''مقدّم نے اُسکے علم میں اضافہ کیا۔

''تو تم لوگوں نے حویلی گھوم بھی لی؟''علی مزید حیران ہوا۔

''ابھی کہاں؟ ابھی تو حویلی کا ایک حصّہ ہی دیکھا ہے، اکرم بتا رہا تھا کہ حویلی کے اندر اپنی ذاتی مسجد بھی موجود ہے۔''مقدّم نے بتایا۔حویلی تھی کہ پورا قصبہ؟

''آج سر میں درد ہے کافی، کل نیند بھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔اِس لیے آج کے لیے معذرت !کل تمہارے ساتھ لائبریری دیکھ لوں گا۔''علی نے عمر سے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں !''اُس نے خوش دلی سے قبول کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے،نوید اپنے مختلف کیسسز کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کو پڑھ کر اُسکے کچھ پوائنٹس وغیرہ بنانے کے بعد اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھا اور ایک نظر اوپر ریلنگ سے نظر آتی راہداری کو دیکھا، پھر ہال کا دروازہ اچھے سے بند کرنے کے بعد وہ بھی اوپر آ گیا۔راہداری سے گزرتے،اُس نے ایک اچٹتی سی نگاہ باقی دو کمروں پر ڈالی، مقدم اپنے بستر پر بیٹھا، اپنے کیمرے کے ساتھ مصروف تھا،ساتھ میز پر عمر اپنا ٹیبلیٹ لیے یقیناً اپنے ڈیزائن پر کام کر رہا تھا۔آگے والے کمرے میں رضا اپنا بقیہ ناول مکمل کر رہا تھا۔جبکہ علی سر تک لحاف تانے لیٹا تھا۔نوید اپنے کمرے میں پہنچا تو ٹھنڈ بڑھ چکی تھی۔ حسین لحاف سینے تک ڈالے،آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔نوید کو آتا دیکھ کر اُس نے ذرا کی ذرا بازو آنکھوں سے ہٹا کر اُسے دیکھا، پھر دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن میں لیٹ گیا۔نوید نے کمرے کا دروازہ بند کر کے، لیپ ٹاپ الماری میں رکھا،اور کمرے میں لگا ہیٹر چلا دیا۔پھر اپنا سیاہ جیکٹ اُتار کر پلنگ کے سرہانے رکھتا خود بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ حسین اُسی طرح آنکھوں پر بازو ٹکائے بے حس و حرکت پڑا رہا،ہیٹر چلنے کی وجہ سے ماحول کچھ بہتر لگنے لگا تھا۔

''تم نے رات کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟''نوید کی آواز کمرے میں گونجی تو حسین کے وجود میں حرکت ہوئی وہ لحاف ہٹاتے اُٹھ بیٹھا۔

''کیا مجھے سونے جاگنے، باہر آنے جانے، کھانا کھانے یا نہ کھانے،اپنے ہر عمل کے لیے تمہیں جواب دینا پڑیگا؟''اُسکا لہجہ تیز اور تلخ تھا۔آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں،نوید حیران سا اُسے دیکھے گیا۔

''کیا اسی طرح ہر بات پر سوال جواب کرو گے تم؟''اُس نے ناراضگی سے کہا۔نوید خاموش رہا، حسین نے اُسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا اور چہرے تک لحاف ڈال کر کروٹ بدل کر دوبارہ لیٹ گیا۔نوید لب بھینچے اُسے دیکھتا رہا، حسین غصّہ نہیں کرتا تھا،پر آجکل اُسکا غصّہ، چڑچڑا پن،بیزاری سب ایک ساتھ نکل کر باہر آ رہا تھا۔اور اِسکا نشانہ صرف ایک ہی شخص بن رہا تھا،وہ تھا نوید عالم !

حسین کو اس چیز کا احساس تھا،وہ احساس کرنا جانتا تھا۔لیکن اُسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟نوید کو دیکھ کر بلاوجہ ہی غصّہ آنے لگتا تھا۔یکدم ہی کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اُس نے لحاف چہرے سے ہٹاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔دروازہ بند تھا،اور نوید کمرے میں کہیں نہیں تھا۔اُسے افسوس ہوا، کیا ضرورت تھی اتنا کچھ بولنے کی؟اُس نے سر پر ہاتھ رکھ کر انگلیوں سے ماتھا مسلا اور سیدھا لیٹ گیا۔شام سے ایسے ہی کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا،پر کسی طریقے سے آرام نہیں آ رہا تھا۔سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔نجانے کیا ہوا تھا؟صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔وہ اپنی کیفیت پر غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور وہ واپس اندر آیا۔ہاتھ میں کھانے کی دو عدد پلیٹیں تھیں،اندر داخل ہو کر اس نے جوتے کی نوک سے دروازہ بند کیا اور میز پر دونوں پلیٹیں رکھ کر براہِ راست حسین کو دیکھا،جو اُسکی تمام کاروائی خاموشی سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

''میں نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا ہے، آجاؤ! ساتھ کھالیتے ہیں۔''اُس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، جیسے حسین سے کتنا پرانا یارانہ ہو۔ خیر یارانہ تو تھا!

''مجھے نہیں کھانا!''اُس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے بیزاری سے کہا۔

''میں نے کھانا یہیں رکھ دیا ہے، موسم ٹھنڈا ہے خراب نہیں ہوگا یہ، تمہیں جس وقت بھوک لگے کھالینا۔''نوید نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔ وہ خاموش ہی رہا، نوید کا ہر انداز اُسکی سمجھ سے بالاتر تھا۔

کمرے کے باہر راہداری ہمیشہ کی طرح خاموش پڑی تھی، پیلی روشنیوں میں نہائی راہداری آج بہتر لگ رہی تھی، محرابی کھڑکی کے باہر باغیچہ بھی خاموش تھا۔ لیکن نوید کے ساتھ والے چار کمرے چھوڑ کر آگے علی اور رضا کا کمرہ اتنا خاموش ہر گز نہ تھا جتنی راہداری۔

''میں تمہارے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔''اپنے پلنگ پر بیٹھا پیکٹ والی مونگ پھلی سے انصاف کرتا علی مزے سے کہہ رہا تھا۔

''تم تو سو نہیں رہے تھے؟''اگاتھا کرسٹی کے ناول سے نظریں اٹھا کر رضا نے اُسے گھورا، ناول اختتام کی طرف تھا۔ اور اس وقت وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔

''نیند تو آرہی ہے، پر کہا نا! تمہارے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔''حالانکہ وہ اپنے سر درد کی وجہ سے اٹھ بیٹھا تھا۔ پر سامنے موجود شخص کو چڑانے اور تپانے کا موقع بار بار کہاں ملتا تھا؟

''تم نے کل ہی اعتراف کیا تھا کہ میں اعلیٰ ظرف ہوں۔ اِس لیے میں نے مزید اعلیٰ ظرفی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''رضا نے کتاب کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟''علی حیران ہوا، رضا نے اُس سے بھی زیادہ حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں نے کہا تھا کہ تم اتنے کم ظرف بھی نہیں ہو۔ یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ تم اعلیٰ ظرف ہو۔''اُسے خود کو گھورتا پا کر علی نے مزید تپایا۔

''ایک ہی بات ہے۔''اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''دو مختلف باتیں ہیں۔''اُس نے انکار کیا۔

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھے معاف کر چکے ہو۔''اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں! کہا تھا پر تم نے بھی کہا کہ تم سب کے سامنے مجھ سے معافی مانگو گے تو میں نے پیشگی معافی کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔''وہ موڈ میں تھا۔

''میں نے بھی اعلیٰ ظرفی کا ارادہ ترک کر دیا ہے، لہٰذا تم منہ بند کر کے سو جاؤ اور مجھے کتاب پڑھنے دو۔''اُس نے چڑے ہوئے انداز میں کہا تو علی نے مزید تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ پیکٹ والی مونگ پھلی اُسکی جانب بڑھائی اور آنکھ کے اشارے سے لینے کی پیشکش کی۔

''نہیں!''رضا نے پیشکش ٹھکرا دی۔

''زہر نہیں ہے اس میں!''اُس نے یقین دلاتے انداز میں کہا تو رضا نے اُسے سنجیدگی سے گھورا۔اُس نے کندھے اچکاتے پیشکش واپس لے لی۔

بدلہ پورا ہوا!

کمرے سے باہر راہداری ایک مرتبہ پھر خاموش تھی، راہداری کے شروع میں بنا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ مقدّم اپنا کام مکمل کرنے کے بعد عمر کے ٹیبلیٹ میں جھانکتے، اُسکا سر کھانے میں مصروف تھا۔یہ ڈیزائن کیا ہے؟ یہ کونسا سوفٹویئر ہے؟ یہ کیسے کیا تم نے؟ اُسکے ڈھیروں سوالات تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

''تم چائے پیو گے؟''اُسکی بک بک سے تنگ آ کر عمر نے پوچھا۔

''ہاں! بلکہ میں بناتا ہوں تمہارے لیے۔''اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''چلو! میں بھی ساتھ آتا ہوں۔یہاں گیس گیارہ بجے جاتی ہے۔''عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''ہاں! کراچی میں تو دس بجے چلی جاتی تھی۔ خیر کراچی تو اب بھی جاگ رہا ہو گا، اور یہاں آدھی رات کا سا سماں ہے۔''پہاڑوں میں گھرے مقدم کو شہر کی رونقیں یکدم ہی یاد آئی تھیں۔دونوں ایک دوسرے سے محو گفتگو باورچی خانے تک آئے۔کمرے سے باورچی خانے تک آنے میں چھے سے سات منٹ لگتے تھے۔

''کسی اور سے بھی پوچھ لینا چاہیے؟''عمر نے کہا کہ شاید کسی اور کو بھی چائے کی طلب ہو۔

''اس وقت میں یہاں سب کی چائے بنانے نہیں آیا۔''کیتلی چولہے پر چڑھاتے مقدّم نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی، عمر نے تاسف سے اُسے دیکھا پر کہا کچھ نہیں۔

''ایک بات پوچھوں؟''عمر نے اسے بغور دیکھتے پوچھا۔

''سو باتیں پوچھو!''وہ کیتلی میں پتی ڈالتے بولا۔

''ہم جب ایف آئی اے میں ملے تو ایسے تھے جیسے بہت سے اجنبی ساتھ بیٹھے ہوں۔اور آج؟''اُس نے سوال دانستہ ادھورا چھوڑا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' مقدم نے اُسکی جانب رخ کرتے ہوئے سلیب سے ٹیک لگائی اور سینے پر بازو باندھتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''علی نے مجھ سے معافی مانگی، مجھے خود گلے لگایا اور مجھے بھائی کہا۔'' عمر نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''پر کیا باقی سب بھی؟ یعنی۔۔۔ میرا مطلب ہم نے بیٹھ کر وہ معاملہ حل نہیں کیا اب تک، تو پھر ہر شے اپنی جگہ پر کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

''بعض معاملات بیٹھ کر حل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہونا کافی ہوتا ہے۔ حسین نے پہل کرنے میں سب سے پہلے قدم بڑھائیں تھے۔ کیونکہ وہ ایسا ہی ہے، ہمیشہ سے۔ میں نے جان کر سب کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر کیے ہیں۔ کیونکہ اس جھگڑے کے دوران میں موجود نہیں تھا۔ میرے لیے تم سب ہمیشہ سے میرے دوست تھے۔ تم نے کبھی نہ چاہا تھا کہ تمھارے دوستوں میں جھگڑا ہو، اس لیے تم نے ناراضگی کبھی نہ دکھائی، بس خاموش رہ کر سب کے پلٹ آنے کا انتظار کرتے رہے۔ علی نے زبانی نہ صحیح پر دل میں کہیں نہ کہیں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ غلطی اُسکی زیادہ تھی۔ لہٰذا وہ چیزوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور رہی بات رضا کی۔ تو رضا نے ایک لمبے عرصے کھل کر سانس نہیں لی تھی۔ اس نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن اور اپنی جوانی ہمیشہ ایک خوف کے سائے میں گزارے ہیں، کہ کہیں اُسکا بچپن کسی کو پتہ نہ چل جائے، کہیں لوگ اُسے لعن طعن نہ کریں، اُسکے بارے میں الٹا سیدھا نہ سوچیں۔ پر اس دن اُسکا یہ سالوں کا خوف ختم ہو گیا۔ اُس نے جان لیا کہ اسکے بارے میں سب جان کر بھی دنیا میں کچھ لوگ موجود ہیں، جو اس سے محبت کرتے ہیں، اُسکے تکلیف دہ ماضی کے باوجود۔ لہٰذا اُسکا سالوں پرانا خوف ختم گیا۔ وہ بھی انسان ہے، ہماری طرح کا ایک عام انسان۔ خوش رہنا اُسکا بھی حق ہے۔ اور اُس نے اپنا حق پہچان لیا ہے۔ اُس نے جان لیا ہے جو لوگ اُس سے محبت کرتے ہیں، اُنہیں کھونا بیوقوفی ہے۔ لہٰذا وہ بھی تعلقات بہتر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب کا اپنا اپنا انداز ہے، زبان سے کوئی نہیں کہہ رہا پر سب ہی دوستی زندہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور چیزیں بہتر اچانک سے نہیں ہوئیں عمر! ہر شے آہستہ آہستہ ہوئی ہے۔ پچھلے چھے ماہ میں قدرت ہمیں بار بار سامنے لائی ہے۔ ہماری دوستی ری نیو (دوبارہ نئی) کرنے کے لیے۔ ہم نے تب ہی اپنے درمیان دیوار گرا دی تھی جب نوید کو گولی لگی تھی، جب علی کی بیٹی لاپتہ ہوئی تھی، جب ہمیں نوید کے بارے میں پتہ چلا تھا اور جب ہم سمجھے تھے کہ رضا نے خود کو ختم کر لیا۔ وہ ہمارے درمیان ناراضگی کی آخری رات تھی۔ ہم اسی دن سمجھ گئے تھے کہ اگر ہم میں سے کسی کو کچھ ہوا تو کوئی ایک بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔ اتنا آسان نہیں ہوتا چھے سالوں پر محیط تعلق ختم کرنا اور سب بھلا دینا۔'' مقدّم نے نرمی سے تمام باتیں کہیں تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''اور نوید؟ نوید کا ذکر نہیں کیا تم نے؟'' عمر نے بغور اسے دیکھتے پوچھا۔

''نوید اظہار کے معاملے میں ہمیشہ سے چور رہا ہے عمر! اور جتنی اذیت وہ سہہ چکا ہے، سنجیدگی اب اُسکا خاصا بن چکی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسے ہماری فکر نہیں ہے۔ اُسے ہے، بس وہ کہنا نہیں جانتا۔'' وہ اپنے دوستوں کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔ اُس نے کہہ کر کیتلی کی جانب دوبارہ رخ کیا، پھر ابلتی ہوئی چائے میں دودھ ڈالنے لگا۔ عمر بھی چھت کی جانب دیکھنے لگا۔

''یہ حویلی کتنی خوبصورت ہے؟''اُس نے کچن کی چھت پر بنے نقش و نگار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے، میرے دادا کا گھر سوات میں تھا۔ میرے دادا لیلیٰ کے بھی رشتے میں نانا لگتے تھے۔ دادا کا گھر ایسا ہی تھا بالکل، وہ بھی اسی قسم کا فن تخلیق تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت سحر انگیز سا۔ سب سے خوبصورت تو انکا باغ تھا۔ ہزاروں ایکڑ پر مشتمل۔۔۔۔ میں اور لیلیٰ اس میں بہت کھیلتے تھے۔''اس نے غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے کہا تھا۔ چائے اُبلنے لگی تو اس نے آنچ کم کی۔ پتی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو سارے میں پھیلنے لگی۔

''بھول جاؤ اُسے، دل میں کسی اور کو رکھ کر کسی اور کے ساتھ زندگی شروع نہیں کی جاتی۔''عمر نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''یاد کرنے میں حرج بھی نہیں ہے۔'' اُس نے ہلکے پھلکے سے لہجے میں کہتے کندھے اچکائے۔ عمر اب کہ کچھ نہ بولا۔

''یہ بتاؤ! جس رات ہم اسلام آباد میں رکے تھے، اُس رات تم لیونگ روم میں بیٹھے کیا کرتے رہے تھے؟ وہ بھی ساری رات؟''ٹرے میں چائے کے دو عدد بڑے مگ رکھتے ہوئے مقدم نے پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی تھی تو باہر آکر بیٹھ گیا تھا۔''اُس نے کہا۔

''کیوں نیند نہیں آرہی تھی؟''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ایک بار پھر سلیب سے ٹیک لگائی اور اُسے دیکھا۔

''پریشان تھا میں، امی ابّو کو سب سچ بتا کر بھی ایک بار پھر اُن سے جھوٹ بولا ہے۔ وہ الگ میرے لیے فکر مند ہونگے۔ بس! یہی سب سوچ رہا تھا اور زیادہ سوچنے سے سر میں درد اٹھنے لگتا ہے۔''اُس نے سچ بتایا۔

''تم سب لوگ بھی مریض بن چکے ہو پورے، علی الگ سر درد کا رونا رو رہا ہے کل سے، رضا کے بارے میں معلوم ہوا کہ نیند کی دوائیں لیے بنا وہ سوتا نہیں ہے۔ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟''مقدّم نے تھوڑے دکھ سے کہا، عمر کچھ کہنے کے لیے منہ کھول ہی رہا تھا کہ اُسی لمحے باورچی خانے کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ دونوں نے ایک ساتھ دیکھا تو سامنے رضا تھا۔

''اوہو! بیڈ ٹائم ٹی؟''وہ مقدّم کو چائے بناتے دیکھ کر چھیڑتا ہوا بولا اور چولہے کے قریب آکر کچھ تلاشنے لگا۔ آج کل اُسکے انداز بھی نرالے تھے، حیران کرتے ہوئے سے۔

''تم پیو گے؟''مقدّم نے کھلے دل سے پیشکش کی تو عمر نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا، ابھی تو کہہ رہا تھا کہ اور کسی کے لیے نہیں بناؤں گا۔

''نہیں! میں رات کو چائے نہیں پیتا۔''رضا دراز یں کھولتا مصروف سے انداز میں بولا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو آخر؟''مقدّم نے اُسکی تلاش سے تنگ آکر پوچھا۔

''ماچس!''اُس نے کیبنٹ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''یقیناً! سگریٹ پینی ہو گی؟''عمر نے افسوس سے اُسے دیکھا۔

''بالکل!''اُسے پہلے کب فرق پڑا تھا جواب پڑتا۔

''کیوں اپنی صحت کے ساتھ کھیل رہے ہو؟ چھوڑ دو اس بیکار شے کو!''عمر بھی اُسے نصیحت کرنا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ رضا نے کیبنٹ بند کرتے ہوئے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''یہ نصیحتیں تم نے اپنے بزنس پارٹنر (کاروباری شراکت دار) کو کتنی بار کی ہیں اب تک؟''اِس سوال پر عمر نے اپنا کان کھجایا۔

''وہ۔۔۔وہ میری بات سنتا نہیں ہے نا!''اس نے وضاحت دی۔

''تو میں کونسی سنتا ہوں؟''رضا نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

''تم لوگوں کو سمجھانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔''بالآخر وہ بھی ہار مانتے سلیب سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''مل گئی۔''رضا نے چولہے کہ برابر رکھی ماچس اٹھاتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''شرم تو نہیں آ رہی ہو گی؟''مقدّم نے پیچھے سے کہا۔

''بالکل نہیں!''وہ بنا مڑے کہتا راہداری میں گم ہو گیا تھا۔

---------+---------+--------

الارم کی چنگھاڑتی آواز سے اُسکی آنکھ کھلی تو وہ فوراً اُٹھ بیٹھا، صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ الارم بند کر کے اس نے چہرہ موڑ کر ساتھ والے بستر پر سوئے حسین کو دیکھا۔ وہ ساری رات بے چین رہا تھا، پر اب پر سکون سا سویا ہوا تھا۔ نوید بنا آواز پیدا کیے اٹھا اور واشروم کی طرف بڑھ گیا۔ پھر وضو کر کے باہر آیا، نماز ادا کرنے کے بعد وہ اتنی ہی آہستگی سے باہر آ گیا۔ باہر راہداری سنسان پڑی تھی، کوئی بھی نہیں جاگا تھا اب تک۔ پتہ نہیں آج ناشتہ بنانے کی ذمہ داری کس نے اپنے سر لی تھی؟ اور جس نے بھی لی تھی، وہ اٹھنے بھی والا تھا یا نہیں؟ نوید کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ بتا چکا تھا آج ناشتہ وہ نہیں بنائے گا، تو جو بھی ذمہ داری لے، یہ اُسکا دردِ سر نہیں تھا۔

خاموش راہداری سے گزرتے وہ راستے میں آتی تمام بتیاں بجھاتا چلا گیا کہ فجر ہو چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں روشنی ہو جاتی۔یہی عمل اُس نے نیچے ہال میں بھی دہرایا۔پھر باورچی خانے کے پیچھے والا دروازہ کھول کر باہر باغیچے میں آ گیا۔باغیچے میں بنے ٹریک پر کھڑے ہو کر اُس نے پہلے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی اسٹاپ واچ آن کی اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔اب جب تک پچاس منٹ پورے نہیں ہو جاتے وہ رکنے نہیں والا تھا۔

دوسری جانب علی بھی ٹھیک چھے بجے اُٹھ کر کچن میں پہنچ چکا تھا۔کل دوپہر میں ہی اُس نے ناشتہ بنانے کی ذمّے داری اپنے سر لی تھی،بدلے میں کھانا بنانے کی ذمّے داری اُس نے رضا کے سر ڈال دی تھی،اُسکی مرضی کے بغیر!

نوید حویلی کے تین چکر لگانے کے بعد رکا تو پچاس منٹ پورے ہو چکے تھے۔اُس نے ایک نظر حویلی پر ڈالی اور لوہے کے دروازے کو کھولتا باہر بنی کچی سڑک پر آ گیا۔کچھ دیر وہ اکیلے رہنا چاہتا تھا۔

ٹخنوں سے اوپر آتے سیاہ ٹراؤزر پر سفید زیپر ہڈی پہنے وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیدھا چلتا کھائی کے پاس پہنچا،اور کنارے رکھے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔نیلے آسمان پر صبح کے سورج کی کرنیں پھیلنے لگی تھی،اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سورج کی پہلی کرن میں الگ سے چمک رہی تھیں۔منظر خوبصورت تھا،اُس نے گہری سانس لیکر فضا میں موجود ٹھنڈک اپنے اندر اُتاری۔ پھر ہڈی کی جیب میں موجود دایاں ہاتھ باہر نکالا،تو ساتھ میں وہ شے بھی باہر آ گئی جسے وہ ہمیشہ ساتھ لیے گھومتا تھا۔اُس نے سنجیدہ نظروں سے ہتھیلی پر موجود اُس ڈائل کو دیکھا۔

وہ گھڑی کا ڈائل۔۔۔۔

کلائی میں باندھنے والی گھڑی کا جلا ہوا ڈائل۔۔۔۔

جسے اُسکا بیٹا معید بہت پسند کرتا تھا۔جب بھی نوید کے ہاتھ میں دیکھتا،اُس سے زبردستی اتروالیتا اور پھر اُسکے ساتھ کھیلتا رہتا۔جس روز وہ جل کر مرا تھا،اُس روز بھی نوید نے اُسے اپنی گھڑی اُتار کر دے دی تھی تاکہ وہ اُس سے کھیلتا رہے۔

نوید نے انگوٹھے کی پور سے گھڑی کے ڈائل کو چھو کر دیکھا۔بایاں ہاتھ اب بھی جیب میں تھا۔اُسکے جلے ہوئے آفس میں اس گھڑی کا ٹوٹا پھوٹا ڈائل ہی بچا تھا۔اُسکی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے،اس بار اُس نے روکا نہیں اور ایک قطرہ بند توڑ کر گالوں پر پھسل گیا۔پر اُسکی محویت میں کوئی کمی نہ آئی۔

یہ کسٹمائز گھڑی اُسے بشریٰ نے تحفے میں دی تھی۔جب بشریٰ نے نوید کے کہنے پر جاب شروع کی تھی،اور جب وہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے اُسکا خیال رکھنے لگا تھا۔تب اُس نے اپنی تنخواہ جمع کر کے اُسکے لیے یہ مہنگی گھڑی خریدی تھی۔نوید کو ان گھڑیوں،یا کف لنکس وغیرہ کا کوئی شوق نہ تھا،پر بشریٰ اُسکے لیے ہمیشہ تحفتاً یہی سب خریدتی تھی اور اُسکے لیے وہ پہن بھی لیا کرتا تھا۔

اُس نے گالوں پر آئی نمی کو آستینوں سے صاف کیا،اور ایک مرتبہ پھر ڈائل کو سامنے کر کے دیکھا۔اس بار بشریٰ یاد آئی۔دل کچھ مزید دکھا۔پتہ نہیں کیا کر رہی ہو گی اِس وقت ؟اب کہ اُس نے ڈائل واپس جیب میں رکھااور دوسرا ہاتھ باہر نکالا تواُس میں موبائل تھا۔فون کا وائی فائی آن کیااور واٹس ایپ کھولا۔رات کو وہ اسے اپنا حال احوال بتا کر،شب بخیر کہہ کر سو گئی تھی تو دوبارہ میسیج نہیں کیا تھا۔ اُس نے موبائل سامنے کیااور دونوں ہاتھوں سے پیغام لکھنے لگا۔

''کیسی ہو؟ جاگ رہی ہو؟''اُس نے پیغام بھیجا،دوسری جانب سے چند سیکنڈ میں ہی دیکھ لیا گیا۔

''ہاں! نماز پڑھ کر سونے لیٹی تھی،پر نیند نہیں آ رہی تو جاگ رہی ہوں۔تم کیسے ہو؟ناشتہ کیا؟''اُس نے پوچھا تو نوید مسکرایا۔

''نہیں!اب کروں گا،پھر ڈیوٹی پر جانا ہے۔دوبارہ بات نہیں ہو سکے گی اس لیے ابھی میسیج کر دیا۔''اُس نے وہی جھوٹ بولا جو پچھلے ایک ہفتے سے بولتا آ رہا تھا،اور جو آگے پورا مہینہ بولنا تھا۔

''میں نے تو سینڈوچ کھالیا!''اُس نے مسکراتا ہوا ایموجی بھیجا تو نوید کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔تھوڑی دیر پہلے کی کیفیت کا اثر زائل ہونے لگا۔ اُس سے چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد اسے سونے کی تلقین کرتا وہ کھڑا ہوا۔موبائل کا انٹرنیٹ بند کر کے،اُس نے چہرہ واپس ویسا ہی کر لیا،سخت اور سپاٹ۔ہر احساس سے عاری۔۔۔ پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے واپس حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

--------+---------+----------

''تمہیں ایک آملیٹ بنانا بھی نہیں آتا؟کیا تیر مارا ہے تم نے اتنے سال؟ سوائے رنگوں سے کھیلنے کے؟''کاؤنٹر پر دونوں بازو ٹکائے مقدّم نے علی کو عجیب و غریب طریقے سے پیاز کاٹتا دیکھ کر لتاڑا تھا۔

''اتنا برا لگ رہا ہے تو آ کر خود کاٹ لو۔''اُس نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔ایک تو اُسکی آنکھیں جل رہی تھیں،اوپر سے اِسکے نخرے ختم نہیں ہو رہے۔

''کیوں؟تمہارا کام ہے خود کرو!''وہ صاف ہری جھنڈی دکھا گیا۔

''تو پھر چپ کر کے کھڑے رہو۔''اُس کا صبر بھی جواب دے رہا تھا۔

''لاؤ میں کاٹ دوں۔''عمر کے اندر کی ہمدردی جاگ اٹھی۔

''اسکو لیکر جاؤ یہاں سے۔''مقدّم نے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے رضا کے حوالے کیااور رضا نے بھی سچ مچ اُسے پاس رکھی کرسی پر زبردستی بٹھا دیا۔

''اب دیکھو!میں کروں کسی کی بھی مدد سبزیاں کاٹنے میں۔''اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔

کچن اس وقت مصروف تھا، علی صبح چھے بجے اٹھ گیا تھا اور اُس نے پوری تسلی کی تھی کہ وہ اکیلا نہ اٹھے بلکہ اتنا شور تو ضرور مچائے کہ ساتھ والے بستر پر سویا رضا نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھے۔ اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ ہر بار کمرے کی کوئی شے نیچے گرا دیتا پھر رضا کا سڑا ہوا منہ دیکھ کر کہتا ''اوہ! سوری! میں نے جان کر نہیں کیا۔'' پھر باتھ روم کا دروازہ زور سے بند کرتا، پھر الماری کا پٹ بھی، پھر لائٹ جلا دیتا یا پاؤں زور زور سے پٹخ کر چلتا اور یہی جملہ دہراتا رہتا، یہاں تک کہ رضا تنگ آ کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ اُٹھا تو اُس نے علی کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی، اور وہ بھی کیوں کر اپنی غلطی مانتا؟ اُس سے دوبدو بحث میں اُلجھ گیا، یہاں تک کہ تین کمروں کے فاصلے پر موجود عمر جو راہداری میں کسی کام سے آیا تھا وہ بھی وہاں آ گیا، اور پھر مقدّم بھی اٹھ ہی گیا۔ اُن تینوں کی نیند برباد کرنے کے بعد وہ سکون سے کچن میں آ گیا تاکہ ناشتہ بنا سکے، پر کچھ ہی دیر میں باقی چاروں بھی باورچی خانے میں اُسکا ضبط آزمانے پہنچ چکے تھے۔ حسین کو بھی رضا اپنے ساتھ لے آیا تھا، اُسکی طبیعت کچھ عجیب سی تھی، لہٰذا وہ خاموش سا ایک کنارے بیٹھ گیا۔ اُسکا خاموش ہونا سب ہی نوٹ کر رہے تھے، پر فلحال کسی نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا۔

''جلدی ناشتہ بناؤ! اُسکے بعد رضا کو کھانا بھی بنانا ہے، پھر گیس چلی جاتی ہے۔'' مقدّم نے ایک مرتبہ پھر لتاڑا تو عمر کے سر پر کھڑے، اُسکی پہریداری کرتے اور علی کی حالت سے حظ اٹھاتے رضا کی مسکراہٹ سمٹی۔

''کھچڑی بناؤ گا بیٹا میں!'' اُس نے جتایا۔

''جو بھی بناؤ! بنانا تو تمہیں ہی ہے۔'' مقدّم نے بھی چڑایا۔

''تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟'' عمر نے اُنکی بے مقصد گفتگو سے تنگ آ کر خاموش بیٹھے حسین کو مخاطب کیا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اُس نے کچھ بیزار سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کل صبح تک تو ٹھیک ٹھاک تھے۔'' اب کہ مقدم کا رخ اُسکی جانب ہوا۔

''صبح ٹھیک ہونے کا، ابھی ٹھیک نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟'' اُس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ اتنا سنجیدہ تو وہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مقدم کوئی جواب دیتا باورچی خانے کے دروازے پر کوئی آ کر رکا، سب کی گردنیں ایک ساتھ مڑیں۔ وہاں نوید اپنی ہڈی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کچھ حیران سا کھڑا اُن سب کو دیکھ رہا تھا۔

''تم لوگ سب یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اُس نے اپنی حیرت کو زبان دی۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ وہ ''سب'' یہاں کیا کر رہے تھے؟

''علی کی مدد کر رہے تھے۔'' رضا کے بیساختہ جواب پر جہاں مقدّم اور عمر ہنسے تھے، وہیں علی نے منہ کھول کر اور آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''سب ایک ساتھ مدد کر رہے تھے؟''اُس نے آبرو اُچکا کر ذرا مزید حیرت سے اُن سب کو دیکھا، جن کو دیکھ کر واضح نظر آ رہا تھا کہ سب کیا شغل فرما رہے ہیں۔

''اب اس بات پر بھی جواب طلبی ہو گی؟''یہ طنزیہ جملہ حسین کی جانب سے آیا تھا۔ سب نے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا سوائے نوید کے۔ اُسکا چہرہ اس بات پر سنجیدہ ہوا تھا۔

''میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''اُس نے ضبط کے ساتھ سنجیدہ لہجے میں وضاحت دی۔ شاید پہلی بار!

''آپ لوگوں کو کوئی مدد درکار ہے؟''اچانک ہی نوید کے پیچھے سے اکرم نمودار ہوا۔

''ارے! تم اتنی جلدی کیوں آ گئے؟''علی نے معصومیت کی انتہا کرتے ہوئے کہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''میں آتا ہوں فریش ہو کر۔''نوید سنجیدگی سے کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''یہ کہاں تھا اتنی دیر سے؟''اُسکے جانے کے بعد مقدّم نے ذرا مشکوک سے انداز میں پوچھا۔

''صبح سے حویلی کے تین چکر کاٹنے کے بعد کہیں باہر گیا تھا۔ میں نے یہاں لان کے دروازے سے دیکھا تھا اُسے۔''علی نے بتایا۔

''چکر کاٹنے سے مراد؟''عمر سمجھا نہیں۔

''مراد جاگنگ کر رہا تھا، اور تم آ ہی گئے ہوئے تو یہ پیاز ہی کاٹ دو۔''علی نے پہلے عمر اور پھر اُسکے پیچھے کھڑے اکرم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اکرم سر ہلاتے کاؤنٹر کے پاس آیا اور اُس سے پیاز لے لیں، جسکا وہ بیڑا غرق کر چکا تھا۔

''اور اُسکے بعد وہ حویلی سے باہر گیا تھا؟''حسین کی سوئی تو بس یہیں آ کر اٹکی تھی۔

''ہاں!''علی نے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''مجھے بتا کر نہیں گیا تھا۔''اُس نے چڑ کر کہا۔

''ہاں! وہ تھوڑی ہمیں بتانے کا پابند ہے، ہم ہی قید ہیں یہاں!''حسین کا لہجہ ایک بار پھر تلخ ہوا۔

''تمہیں آخر برا کیا لگا ہے؟ اُسکا بتا کر نہیں جانا یا تم سے سوال کرنا؟''رضا نے بالآخر اُس سے براہِ راست سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں!''وہ کرسی گھسیٹتا کھڑا ہوا اور ڈائننگ ہال میں جا کر کرسی نکال کر اُس پر ڈھیر ہو گیا۔

''اسکو ہوا کیا ہے؟''عمر پریشان ہوا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید!''مقدّم نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا ہے اُسے، ٹھیک ہے وہ!''یہ جواب رضا نے دیا تھا۔

''کیا مطلب اِس بات کا؟''علی نے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔وہ بیمار تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوا اُسے۔

''مطلب یہ کہ تم اُس پر توجہ دینے کے بجائے جلدی ناشتہ بناؤ! مجھے کھانا بنانے کے لیے کچن خالی چاہیے۔''اُسے تپاتا ہوا وہ بھی ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔علی بس گھور کر رہ گیا تھا اُسے۔

--------+---------+----------

اُس روز رضا نے واقعی کھچڑی بنائی تھی، جسے سب نے صبر و شکر سے کھا تو لیا پر بعد میں مقدّم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہا کہ آئندہ کھانا نہ بنائے۔وہ بھی ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔کھانے کے بعد علی اپنے وعدے کے مطابق عمر کے ساتھ لائبریری میں چلا آیا۔ہال میں موجود دائرے کی صورت اوپر اٹھتی دونوں سیڑھیوں کے برابر میں نیچے دو دروازے تھے، ایک تو دائیں طرف والی سیڑھیوں سے منسلک تھا، جسکے آگے راہداری، باورچی خانہ اور ڈائننگ حال تھا۔ بائیں طرف والی سیڑھی سے بھی بالکل ایسا ہی ایک دروازہ منسلک تھا۔اُس دروازے سے بھی ایک لمبی راہداری جا رہی تھی، جو اس گھر کی باقی راہداریوں کی طرح ہی طویل، خاموش اور سجاوٹ سے بھرپور تھی۔اُس کے اختتام پر ایک اور ہال تھا، اور یہ ہال باہر والے ہال سے چار گنا بڑا تھا۔یہاں پر کئی دروازے تھے، ہر دروازے کے پیچھے کوئی نہ کوئی کمرہ تھا، یا مزید کوئی راہداری جو آگے کے حصوں کو حویلی سے جوڑ رہی تھی۔ہال کی چھت محرابی تھی، درمیان میں کھڑے ہو تو پہلی منزل پر دائرے کی صورت پوری ریلنگ تھی، جس سے پہلی منزل پر موجود مزید دروازے اور راہداریاں نظر آ رہی تھیں۔غالباً اِس حویلی کو اسطرح سے بنایا گیا تھا کہ پہلی منزل پر کھڑے ہو کر پورا ہال نظر آ جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اصل حویلی تو یہاں ہے، وہ تو شروعات تھی۔''دوسرے ہال میں کھڑے علی نے عمر کو کہا تھا۔

''ہاں نا! اگر تم صرف حویلی ہی گھومنے نکلو تو اچھا وقت گزار سکتے ہو یہاں۔خیر! میں نے تمہارے لیے تمہارے مطلب کی جگہ ڈھونڈی ہے۔''عمر اُسے ہال کے ایک دروازے کی طرف لایا اور اُسے کھول دیا۔علی اُسکے پیچھے اندر آیا تو اُسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بلند و بالا محرابی چھتیں پتھر کے مضبوط ستونوں پر ٹکی ہوئی تھیں، چاروں طرف دیواروں کے ساتھ فلک بوس الماریاں بنی ہوئی تھیں، جن میں کتابیں نہایت ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ چھے فٹ سے اوپر کے شیلف کو الگ منزل بنا دیا گیا تھا۔ جنکے آگے بنی، لکڑی کی بالکونی نما گزرگاہیں، اوپر کی سطحوں کو آپس میں جوڑ رہی تھیں۔ اوپر تک پہنچنے کے لیے ایک نفیس گھومتی ہوئی سیڑھی نصب تھی۔

کمرے کے وسط میں لمبی لکڑی کی کافی ساری میزیں رکھی تھیں، جن پر چھوٹے چھوٹے لیمپ نصب تھے۔ لیمپ کی مدھم سنہری روشنی ماحول کو پراسرار اور دلکش بنا رہی تھی۔

اور اس وسیع و عریض کتب خانے کی سب سے منفرد بات اس کی ترتیب تھی، ہر علم، ہر موضوع، اپنے الگ حصے میں واضح طور پر مرتب تھا۔ ایک طرف ناولوں کا سیکشن تھا، تو دوسری جانب سفر ناموں کی قطاریں تھیں، ایک گوشے میں ہارر کتابیں رکھی تھی، تو دوسرا ڈاکیومنٹری اور تاریخ کا حصہ تھا۔ ایک علیحدہ حصہ پولیٹکس کے لیے تھا، قریب ہی ایجوکیشن اور سائنسی علوم کا سیکشن بھی تھا، جن میں سائنس فکشن، ارضیات، حیاتیات، فلکیات اور دیگر مضامین اپنی اپنی جگہ سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تسلسل میں ایک گوشہ مارکیٹنگ اور اکاؤنٹس جیسے عملی علوم کے لیے مخصوص تھا، جبکہ ایک نہایت نفیس اور فنکارانہ حصّہ آرٹ کے لیے تھا، جو انٹیریئر آرٹ، اسلامک آرٹ اور خطاطی (کیلیگرافی) کی کتابوں سے مزین تھا۔ علی کی نگاہوں کا مرکز بھی یہی حصّہ بنا تھا۔

''مقدّم نے اِس حویلی کو ہوگوارٹس کا نام دیا تھا۔'' کیلیگرافی کی کتابیں نکالتے اُسکے کانوں سے عمر کی آواز ٹکرائی تو وہ مسکرایا۔

''صحیح نام دیا ہے اُس نے۔'' وہ کتاب کھولتے ہوئے ہنسا۔

ہر شیلف کے اوپر واضح اور خوبصورت انداز میں اُس حصّے کا نام درج تھا۔ عمر اور علی کو تو آرٹ پر ایسی ایسی کتابیں مل گئی تھیں، جن کے بارے میں اُنہوں نے صرف سنا تھا۔ حویلی کے مالک کا شوق بہترین تھا۔

''میرا اچھا وقت گزرے گا یہاں!'' علی نے کہا۔

''اس لیے تو میں تمہیں یہاں لایا تھا۔'' عمر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ واقعی اُس جگہ پر پورا دن بنا بیزاری کے گزار سکتا تھا۔

--------+---------+----------

دو تین روز لگے اُنہیں وہاں ایڈجسٹ ہونے میں۔ پر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ اُنکو وہاں پانچواں روز تھا، حسین پچھلے چار دن سے مسلسل کمرے میں بند تھا، بہت زیادہ ہوتا تو ناشتے یا کھانے کی میز پر آجاتا، بعض دفعہ وہ بھی نہ کھاتا، انکار کر دیتا۔ آج بھی نوید صبح اٹھا تو حسین عجیب بے دم سا پڑا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''نوید نے قریب آکر پوچھا۔

''ٹھیک ہوں میں!''وہی بیزار سا جواب۔

''تم ناشتے پر نہیں آئے آج پھر، کم از کم کھانے پر تو چلو میرے ساتھ۔۔۔۔کمرے سے باہر نکلو! باہر باغیچے میں چہل قدمی کرو۔اس طرح بند پڑے رہو گے تو طبیعت اور خراب ہو گی۔''پچھلے پانچ ماہ میں شاید پہلی دفعہ نوید نے اُس سے اتنی نرمی سے بات کی تھی۔انداز فکر مند سا تھا۔

''تم ہی تو چاہتے ہو کہ ہم یہاں بند رہیں۔''وہ پتہ نہیں اتنا تلخ کیوں ہو رہا تھا؟

''اپنے لیے کوئی ایکٹیویٹی ڈھونڈو! باقی سب بھی تو کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔''نوید کے لہجے کی نرمی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم جاؤ! میرا دل کرے گا تو میں آجاؤں گا۔''اُس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔نوید نے ہاتھ بڑھا کر اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ماتھا انگارہ ہو رہا تھا۔

''تمہیں بخار بھی ہے، میں کل سے کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلو! یا میں یہیں بلوا لیتا ہوں۔''وہ فکر مند ہوا۔

''نوید! میری فکر چھوڑ دو۔اور جا کر اپنا کام کرو۔''وہ اپنے لہجے میں آیا غصّہ چھپا نہ سکا۔نوید اثبات میں سر ہلاتے پیچھے ہٹا۔

''ٹھیک ہے! تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔''وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔حسین اسی طرح لیٹا رہا۔آج کل وہ بہت زیادہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔کسی سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

نوید نیچے آیا تو وہ سارے ہال میں موجود، دوپہر کے کھانے پر حسین کے منتظر تھے۔پچھلے تین چار روز سے وہ لوگ کوشش کر کے تھک چکے تھے، پر حسین کو نہیں آنا ہوتا تو وہ نہ آتا۔نوید سنجیدہ چہرے کے ساتھ دائیں طرف والی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور عمر کے پاس آیا۔

''حسین کو بخار ہے۔رات کو بھی تھا، میں دو روز سے کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر کے پاس چلو، پر وہ راضی ہی نہیں ہے۔''نوید نے پریشانی کا اظہار کیا۔

''ہو سکتا ہے کہ یہاں کا موسم راس نہ آرہا ہو اُسے؟''عمر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا اُسے، ٹھیک ہے وہ!''رضا نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا تو سب ہی نے ناگواری سے اُسے دیکھا تھا۔

''اُسکی طبیعت اتنی خراب ہے اور تم دو روز سے یہی راگ الاپ رہے ہو کہ کچھ نہیں ہوا اُسے۔''علی کو برا لگا تھا۔

''میری بات سنو! عام آدمی ہے وہ، ایک ہیلدی لائف (صحتمند زندگی) گزارنے والا عام آدمی! اُس نے زندگی میں نہ اتنے مسائل دیکھے ہیں، نہ ہی اتنی پریشانیاں جتنی تم لوگ دیکھ کر آرہے ہو۔نہ ہی وہ اپنے گھر والوں سے اتنا لمبا دور رہا ہے۔ایک ہفتے سے اوپر ہو چکا ہے، وہ اپنے گھر والوں سے میسیج پر بھی

بات نہیں کر سکا تو ظاہر ہے، اُسکا چڑچڑا ہونا بنتا ہے۔ اِسکے برعکس اگر وہ اپنی فیملی سے ایک آدھ بار بھی بات کر لیتا تو بہتر ہوتا۔ ہوم سک ہو رہا ہے وہ بس!'' رضا نے اپنی بات کی وضاحت دی، اُس کی بات درست تھی۔ حسین کا چڑچڑا پن دراصل اُسکے گھر والوں سے دوری کی وجہ سے ہی تھا۔

''فرّخ صاحب سے بات کی ہے میں نے، کہہ رہے تھے کہ ایک دو روز میں مزید کوئی مشکوک سرگرمی نظر نہ آئی تو وہ انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دے دیں گے۔'' نوید نے بتایا۔

''تب تک کیا کریں؟'' علی نے پریشانی سے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے؟ ہم سب باریاں لگا کر کھانا بنا چکے ہیں اور وہ پانچ دن سے بیماری کے نام پر کمرے میں بند ہے۔ میرے حوالے کر دو، کل اُسی سے ناشتہ بنواؤں گا۔ دو گھنٹے میں دماغ و طبیعت دونوں درست ہو جائے گی اُسکی۔'' صوفے پر آلتی پالتی مارے براجمان رضا نے مشورہ دیا تو نوید نے بھنویں سکیڑ کر ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''اُسے تین روز سے بخار ہے، تم اُس سے ناشتہ بنوانے کی بات کر رہے ہو؟'' اُس نے کہا۔

''اے تم نا! اپنے آپ کو ہمارا باپ دادا، چچا سمجھنا بند کرو، تم ہمارے والدین ہو نہ ہم تمہاری اولادیں۔ جا کر اپنا کام کرو، ہم کر لیں گے جو کرنا ہے۔'' رضا سے پہلے ہی مقدّم نے ٹھیک ٹھاک بیزار کن لہجے میں نوید کو جواب دیا تو وہاں کھڑے ہر شخص نے ذرا آنکھیں وا کر کے اُسے دیکھا۔ باقی سب تو کافی حد تک نارمل ہونے لگے تھے، پر نوید سے بات کرنے میں وہ اب بھی تھوڑا لحاظ رکھ رہے تھے، پر مقدّم نے اس لمحے تمام لحاظ بلائے طاق رکھ دیئے تھے۔ کونسا ایس ایس پی؟ کہاں کا ایس ایس پی؟

''جو کرنا ہے کرو!'' نوید نے سنجیدگی سے کہا اور دائیں طرف والی راہداری کی طرف مڑ گیا۔

''ظاہر ہے وہی کریں گے۔'' اُس نے بھی پیچھے باآواز بلند کہا پر نوید بنا کوئی جواب دیے راہداری میں گم ہو گیا۔

''اِس آدمی کو ایسی دو چار ڈوز روزانہ صبح و شام دیا کرو۔ یقین مانو! اِسکو اشد ضرورت ہے اسکی۔'' علی نے اُسکے عمل کو لائق تحسین سمجھتے ہوئے داد دی تو وہ ہنسا۔

''میں اکیلا کیوں؟ تم سارے مل کر دو تو کچھ بات بنے۔ یاداشت کمزور ہو گئی ہے اِسکی، بھول گیا ہے کہ ہمارے ساتھ ہی پڑھ لکھ کر بڑا ہوا ہے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''ہاں! کتنی بار تو میں نے اِسے پک اینڈ ڈراپ سروس دی ہے، بائیک نہیں تھی اِسکے پاس۔ اور دیکھو اِس احسان فراموش کو!'' رضا نے کہا۔

''کتنی بار پک اینڈ ڈراپ دیا ہے تم نے اُسے؟ بمشکل دو سے تین بار؟ میں تو چھے سال بنا چوں چراں یہ فریضہ انجام دیتا رہا ہوں۔ پر مجھے اُس نے جانتے ہو کیا کہا؟'' علی نے پہلے رضا کو پھر باقی دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا؟'' عمر نے پوچھا۔

''جب ضرورت تھی، تب نہیں کہا تم سے تو اب کیوں کہوں گا؟'' علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اور یہ اُس نے تمہیں کس بات کے جواب میں کہا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ سکتے ہو۔'' اُس نے بتایا۔

''تمہارے ساتھ تو اُس نے بالکل صحیح کیا۔'' یہ تبصرہ رضا کی جانب سے آیا تھا۔

''کیا تم سے کسی نے رائے مانگی؟'' علی حسب توقع تپا تھا۔

''چپ کرو یار تم دونوں! ابھی اِس آدمی کے بارے میں بتاؤ، جسے ہم اتنے سال پک اینڈ ڈراپ دیتے رہے ہیں اور یہ ایس ایس پی بن کر ہمیں ہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔'' مقدّم نے ٹوکا۔

''اُسکی نوکری نے اُسے ایسا بنا دیا ہے۔ تم لوگ فضول میں اتنا ڈرنے لگے ہو اُس سے، دوست ہی تو تھا یہ ہمارا۔'' عمر نے کہا۔

''تم لوگ کون؟ میں تو بالکل نہیں ڈرتا اُس سے۔'' رضا نے کروفر سے کہا۔

''میں بھی!'' مقدم ہمنوا ہوا۔

''تم لوگ کھانا نہیں کھاؤ گے؟'' اِس آواز پر سب نے اچھل کر دائیں طرف والی سیڑھیوں کی جانب دیکھا، جسکے برابر دروازے پر نوید کھڑا تھا۔ سب کی سانسیں رکی، اُس نے سن تو نہیں لیا کہیں؟

''ہم بس! آ ہی رہے تھے۔'' عمر نے گڑبڑاتے ہوئے وضاحت دی۔

''تو جلدی آؤ! میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہتے اُنہیں حیرت میں ڈالا۔ وہ کب سے کسی کا انتظار کرنے لگا؟ اُن پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتا نوید جانے کے لیے مڑا، اُنہوں نے رکا سانس بحال کیا۔ وہ رکا، پھر پلٹ کر دوبارہ اُنہیں دیکھا۔

''میں اکثر پیٹرول بھروا دیا کرتا تھا۔'' سنجیدگی سے کہتا نوید ایک بار پھر راہداری میں گم ہو گیا۔ سب کا منہ ہکا بکا رہ گئے۔

''یہ۔۔۔۔یہ جھوٹ ہے۔میں نے کبھی اِس سے پک اینڈ ڈراپ کے لیے پیٹرول نہیں لیا۔سراسر جھوٹ!''مقدّم نے سب سے پہلے وضاحت دی۔

''میں نے بھی!''عمر نے بھی کہا۔

''جیسا کہ علی نے بتایا کہ میں نے گنتی کے دو تین بار ہی اُسے یہ سروس دی ہے،تو میں نے تو کبھی مر کر بھی ایسا نہیں سوچا۔''رضا نے بھی کہا۔اب کہ تینوں نے ایک ساتھ علی کی جانب دیکھا۔

''خدا کی قسم!ایک بار کے علاوہ کبھی پیٹرول نہیں ڈلوایا،اُس نے میری بائیک میں۔''علی گڑبڑایا۔

''تو تم نے ایک بار بھی ایسا کیوں کیا؟''مقدم کا انداز لتاڑتا ہوا تھا۔

''ایک بار وہ میری بائیک اُدھار لیکر گیا تھا اور اُس نے خود ہی پیٹرول ڈلوادیا تھا۔دوسری مرتبہ ہم دونوں کو ہائی وے ٹول پلازہ کے پار جانا تھا،تو ہم باری باری بائیک چلا رہے تھے،اپنی باری میں اُس نے مجھ سے پوچھے بنا ہی پیٹرول ڈلوادیا تھا۔''اُنکی ملامتی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر اُس نے وضاحت دی۔

''تم نے ابھی ایک مرتبہ کہا تھا۔''مقدّم چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔

''ہاں تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا،اب سولہ سال پرانی باتیں ہوگئی ہیں یہ سب۔''

''بس دو ہی بار؟''رضا نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ایک مرتبہ میں نے پیٹرول پمپ پر اُس سے کھلے پیسے مانگے تھے کیونکہ میرے پاس ایک ہی نوٹ تھا۔تو اُس نے وہ پیسے واپس نہیں لیے،میرے ہزار بار کہنے کے باوجود بھی۔''اُس نے کان کھجاتے کہا۔

''لعنت ہو تم پر!''مقدّم نے دل میں ہر گز نہیں رکھا۔

''میں نے کہا نا! صحیح کرتا ہے وہ اِسکے ساتھ۔''رضا نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسا صرف دو تین بار ہی ہوا ہے اور وہ بھی اتفاقیہ! باقی میں نے اُس سے کبھی پیسے نہیں لیے۔کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟''علی نے بے بسی سے کہتے عمر کو دیکھا۔وہ ٹھیک کہہ رہا تھا،اُس نے اتفاقیہ ایک دو مرتبہ کے علاوہ کبھی نوید سے پیسے نہیں لیے تھی،پر وہ بد تمیز آدمی اُسکا کردار مشکوک کر کے چلا گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے،یہ لوگ صرف مذاق کر رہے ہیں۔''عمر نے تسلی دی۔

''ہمارا بھلا کوئی مذاق ہے؟''اب کہ وہ ناراض ہوا۔

''چلو! تم لوگ کھانے پر جاؤ، میں حسین کو لیکر آتا ہوں۔'' رضا نے کہا۔

''ابھی تو نوید نے کہا کہ وہ نہیں آئیگا۔'' عمر نے کہا۔

''اُسکے تو اچھے بھی آئیں گے۔'' رضا نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم لوگوں کو اس طرح نوید کی برائی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' عمر کو اچانک ہی یاد آیا کہ تھوڑی دیر قبل وہ لوگ کافی غیر اخلاقی حرکت کر رہے تھے۔

''برائی کب کی ہم نے؟ ہم تو اُسکی حقیقت بیان کر رہے تھے۔'' رضا نے سیڑھیوں پر رک کر ڈھٹائی سے کہا۔

''آئندہ میں ایسی کسی زنانہ محفل کا حصّہ نہیں بنوں گا۔'' عمر نے خفگی سے کہا۔

''زنانہ؟''

''یہ گوسپ عورتوں کا ہی کام ہے۔'' اُس نے جتایا تھا پر وہاں فرق کسے پڑ رہا تھا؟

--------+---------+----------

اُسکی طبیعت ابھی ابھی ہی کچھ بہتر لگنے لگی تھی، جسم کو کچھ آرام آیا تو نیند آنے لگی۔ ابھی وہ نیم غنودگی میں ہی تھا کہ کسی نے اُسکے بازو پر دستک دی۔ اُس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے رضا کا چہرہ نظر آیا۔

''کیا ہے؟'' حسین نے بیزاری سے کہا۔

''دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے ہیں، سونے کا نہیں کھانے کا وقت ہے یہ۔ اٹھو! نیچے چلو میرے ساتھ!'' اُس نے حسین کو زبردستی اٹھانے کی کوشش کی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے، جب لگے گی تو کھالوں گا۔'' اُس نے کوفت سے کہتے لحاف منہ پر ڈالنا چاہا پر اگلے ہی لمحے کسی نے اُسکا لحاف کھینچ لیا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ جھنجھلایا، اب کہ سامنے مقدم کھڑا نظر آیا، رضا اُسکے پیچھے۔

''بعد میں کھانا ختم ہو جائیگا، ایس ایس پی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے کڑھی بنائی ہے۔'' مقدم نے کہا تو اُس نے گھورا۔

''ہاں! اور تمہارے انتظار میں اب تک کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔'' اِس تیسری آواز پر حسین نے گردن اٹھا کر دیکھا تو میز سے ٹیک لگائے کھڑا علی بھی نظر آیا۔

''شٹ اپ!'' اُس نے چڑے ہوئے انداز میں کہا اور اُٹھ بیٹھا۔ تینوں مسکرائے۔

''کہاتو ہے کہ بھوک نہیں ہے۔''اُسے اپنے لہجے کا احساس ہوا تو ذرا خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہم تو نہیں جا رہے تمہارے بغیر!''رضا نے حتمی انداز میں کہا۔

''جانے دو یار! میرے خیال سے اُسکی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔''اس چوتھی آواز پر حسین سمیت سب نے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر عمر کھڑا نظر آیا۔ وہ نوید کو بتانے گیا تھا کہ ہم حسین کو لیکر آ رہے ہیں، وہ چاہے تو انتظار کر لے چاہے تو کھانا کھا لے، اور اب دروازے پر موجود تھا۔

''نیچے ایک آدمی کو بتایا ہے نا ابھی، کہ خود کو ہمارا باپ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔اب تمہیں بھی وہی کہوں؟''مقدّم نے اُسے آنکھیں دکھاتے کہا تو وہ بس گہری سانس لیکر رہ گیا۔

''نیچے کس کو بتایا؟''حسین کی دلچسپی اچانک ہی بیدار ہوئی۔وہ چاروں صرف اُسے کھانے پر بلانے کے لیے آئے تھے، فقط اتنی سی بات سے ہی اُسکی بیزاری یکلخت ہی غائب ہونے لگی تھی۔

''نوید کو!۔۔۔''مقدم کہتے ہوئے پلنگ پر اُسکے سامنے بیٹھا۔''اُسکو میں نیچے بتا کر آیا ہوں کہ ہم تمہاری اولادیں نہیں ہیں اور نہ تم ہمارے باپ، اِس لیے انسان بن کر رہو، اور اپنے کام سے کام رکھو۔''اُس نے مزے سے بتایا۔

''کیا واقعی تم نے ایسا کہا؟''حسین کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''اور ساتھ میں اُسکی برائیاں کرتے ہوئے پکڑے بھی گئے ہو، یہ بھی بتاؤ۔''عمر نے جتایا۔

''برائی نہیں کر رہے تھے ہم۔''رضا نے ٹوکا۔

''اور اُس نے واقعی سن لیا؟''حسین کی دلچسپی بڑھی۔

''ہاں! اور ان لوگوں کی ہوا بھی نکل گئی تھی، اُسے سامنے دیکھ کر۔''علی نے طنزیہ کہا۔

''اور اُس نے جواباً دلیل بھی آپ ہی کو کیا تھا۔''رضا نے تپانے والی مُسکراہٹ کے ساتھ اُسے جواب دیا۔اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں آپس میں دوبارہ اُلجھ پڑتے عمر فوراً بولا کہ

''اچھا اب جلدی نیچے آؤ! کھانا ٹھنڈا ہو جائیگا۔''

''میں منہ دھو کر آتا ہوں۔''حسین بالآخر لحاف پرے کرتا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نیچے کھانے کی میز پر پہنچے تو نوید سفید ٹراؤزر پر سفید زیپر ہائی نیک پہنے، دونوں بازو سینے پر باندھے بے تاثر چہرے کے ساتھ آج ایک بار پھر سے سر براہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ البتہ آنکھیں براہِ راست اُن پانچوں کو گھور رہی تھیں۔ پہلے وہ اُنہیں بلا کر آیا تو وہ اُسکی غیبتوں میں لگ گئے، پھر دوبارہ بلا کر آیا تو وہ حسین کو بلانے چلے گئے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اُنکے انتظار میں یہاں وقت برباد کر رہا تھا۔ وہ بھی داد طلب ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے، اُسے نظر انداز کرتے، کھانے میں مشغول ہو چکے تھے۔ البتہ نوید اب تک لب بھینچے اُنہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''یہ اِس طرح کیوں گھور رہا ہے ہمیں؟'' علی نے پوچھا۔ وہ پانچوں آمنے سامنے، نوید سے اتنا فاصلہ ضرور رکھ کر بیٹھے تھے کہ اُنکی سرگوشیاں اُس تک نہ پہنچے۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے اُس سے؟'' رضا کیوں موقع گنواتا؟

''ہرگز نہیں!'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''پر دیکھنے کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے۔'' مقدّم نے گفتگو میں حصّہ لیا۔

''یہ اُسکی برائی کرنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' عمر نے کہا۔

''ہم نے حقیقت بیان کی تھی۔'' رضا نے ایک مرتبہ پھر تصحیح کی تو اب کہ عمر نے سر تا پاؤں اُسے گھوری سے نوازا۔

''ہاں بالکل! اگر تم نے اپنی لالچ میں آکر اُس سے پیٹرول کے پیسے نہ لیے ہوتے، تو آج یہ ہمیں ایسے نہ گھور رہا ہوتا۔'' مقدّم نے علی کو مخاطب کر کے کہا تو پانی پیتے اُسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ عمر نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''میں یہ قصہ سننا چاہوں گا۔'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کھانے کے بعد!'' مقدم نے وعدہ کیا تو علی نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اِسکی کسی بات پر کان مت دھرنا۔'' علی نے حسین کو کہا۔ وہ کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ نوید کرسی گھسیٹ کر اٹھا، سب کی نظریں بیساختہ اُسکی طرف گئیں۔ وہ اٹھا اور سنجیدگی سے علی کی طرف بڑھا۔ اُسکے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ لوگ اپنے ہاتھ، سانسیں، آوازیں سب روک اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ علی کے پاس آکر رکا، پھر تھوڑا جھک کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ علی نے تھوک نگلا، اور پھر اُس نے میز پر رکھا کڑھی کا ڈونگا اٹھایا اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

اوہ! تو وہ اِس لیے انہیں گھور رہا تھا؟ اور اُن میں سے کسی نے زحمت بھی نہ کی کہ کھانا آگے بڑھا دیں۔ اب کہ وہاں غیر آرام دہ سی خاموشی چھا گئی۔ انگریزی میں جسے کہتے ہیں۔

Awkward silence

''جب میں نے تمہیں کھانے پر بلایا تو تم نے آنے سے منع کر دیا تھا۔'' پلیٹ میں موجود چاولوں پر کڑھی ڈالتے نوید نے براہِ راست حسین کو مخاطب کیا۔ وہی کڑھی جسکے پکوڑے اور گریوی اکرم نے بنائی تھی، پر نام ایس ایس پی صاحب کا ہوا تھا کہ انہوں نے فقط مدد کر دی تھی۔

''ہاں! کیا تو تھا۔'' حسین نے کندھے اچکاتے جواب دیا۔

''تو پھر اب کیوں آ گئے؟'' اُس نے ڈونگا واپس رکھتے بھنویں اچکا کر سوال کیا۔

''بلانے والوں کا فرق تھا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو نوید نے سر جھٹکا۔ وہ بولتا تو باقی سب خاموش ہو جاتے تھے۔

''یہاں فون بوسٹر زاتنے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اکثر سم کے نیٹورکس نہیں آتے۔ فرّخ صاحب نے کہا ہے کہ کل سے تم لوگ اپنے گھر والوں سے بات چیت کر سکتے ہو۔ وائی فائی آن کر دیا جائیگا کل۔ کوشش کرنا کہ گھر والوں کے علاوہ اور کسی سے بات نہ ہو، اور نہ ہی اپنی لوکیشن کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا، تو باقی سب نے کوئی خاص رد عمل نہ دیا۔ نوید نے ذرا اچھنبے سے اُن سب کو دیکھا۔

''تم لوگ میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟'' یہ پہلی بار تھا، جب اُس نے جھنجھلا کر کوئی سوال کیا تھا۔

''تم بات کرتے ہی کب ہو؟'' یہ حیرت میں ڈوبا سوال علی کی جانب سے آیا تھا۔

''تو تمہارے خیال میں، میں ابھی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا؟'' اُس نے ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے پوچھا۔

''تم نے بتایا اور ہم نے سن لیا، بھلا اس بات کا اور کیا جواب دیں اب؟'' مقدّم نے کہا۔ اب کہ نوید نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ سر جھٹک کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ باقی سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر مسکراہٹ چھپاتے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

---------+---------+--------

رات حسین کو دوبارہ ہلکا سا بخار آیا تو اُس نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھا لیا، اس مرتبہ کسی نے بھی اُسکے ساتھ زبردستی نہ کی۔ البتہ اُسکی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ جب نوید اپنے معمول کے مطابق حویلی کا جائزہ لیکر واپس آیا تو حسین بستر پر نیم دراز اپنے موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھتے نوید

نے ایک نظر میں ہی جان لیا کہ وہ اپنے موبائل میں اپنے بچوں کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔ حسین نے اُسکے آنے کا اتنا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔ نوید نے اپنی گھڑی اُتار کر دونوں بستروں کے درمیان والی میز پر رکھی اور براہِ راست اسکو دیکھا۔ وہ اُسکی نظریں خود پر محسوس کرتے ہوئے بھی انجان بنا رہا۔

''میں نے تمہیں اپنے دروازے سے واپس نہیں لوٹایا تھا حسین! میں اپنے کسی دوست کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔'' کمرے میں اُسکی آہستہ آواز گونجی تو موبائل پر تصویریں آگے بڑھاتی حسین کی انگلیاں تھمی۔ اُس نے کچھ حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے گھر چھوڑ دیا تھا، میرے ابو مجھ سے اِس بات پر ناراض تھے۔ وہ میرا نام بھی نہیں سننا چاہتے تھے۔ گھر چھوڑنے کے بعد میرے نام پر اکثر پارسل، گورنمنٹ نوٹس اور دیگر چیزیں ابّو کے گھر ہی آتی تھیں۔ وہ ہر ایک کو واپس لوٹاتے تھے۔ مجھے اعتراض نہیں تھا، وہ انکا غصّہ تھا اور وہ حق بجانب تھے۔ پر جس روز تم مجھ سے ملنے آئے، اُس روز جو اُنہوں نے کیا، بلاشبہ اُنکو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پر وہ غصّہ میرے لیے تھا، جو تم پر اُتر گیا۔ مجھے اِس واقعہ کا کوئی علم نہیں تھا، اُنکے انتقال کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اُنہوں نے ایسا کیا ہے۔ تم انہیں اِس چیز کے لیے معاف کر دو۔ میرے جانے کے بعد، وہ چڑچڑے ہو گئے تھے، ورنہ وہ ایسے ہر گز نہیں تھے۔'' وہ رکا، خشک لبوں پر زبان پھیری، کسی کو وضاحت دینا سب سے مشکل کام تھا۔ ''اگر میں وہاں ہوتا تو کبھی تمہارے ساتھ ایسا نہ ہونے دیتا۔'' آہستگی سے کہتے اُس نے بہت لمبی چوڑی وضاحت دی تھی، اپنے باپ کا بھرم بھی رکھ لیا تھا، اور اُسے منانے کی کوشش بھی کر لی تھی۔ حالانکہ وہ منانے کے معاملے میں بالکل چور تھا۔ (بشریٰ کی بات الگ تھی!)۔ حسین موبائل رکھ کر اٹھ بیٹھا اور اسے بغور دیکھا۔

''اس کے باوجود بھی میں دوبارہ آیا تھا، تمہارے بھائی سے تمہارا نمبر مانگا تھا پر اُس نے نہیں دیا۔ اپنا نمبر دے کر آیا، اِس اُمید پر کہ شاید تم اپنے رویے کی وضاحت کرو۔ پر تم نے بات تک نہیں کی۔'' اُسکا شکوہ بجا تھا۔

''مجھے بھائی نے تمہارا نمبر دیا تھا۔ تب میں اسلام آباد کے لیے فلائٹ پر جا رہا تھا۔ سوچا تھا پہنچ کر تم سے بات کرونگا، پر وہ کاغذ مجھ سے گم ہو گیا۔'' اُس نے پھر وضاحت دی۔

''بات صرف کاغذ کی نہیں تھی، تم چاہتے تو تم بنا کسی نمبر کے بھی مجھے ڈھونڈ سکتے تھے۔ بہت طریقے تھے مجھ تک پہنچنے کے، اگر تم چاہتے تو۔'' اُسکے شکوے نا ختم ہونے والے تھے۔

''ہاں! پر میں شرمندہ تھا۔ وقت گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اب کوئی وضاحت تمہارا دل صاف نہیں کر سکے گی اور نہ میں اب کوئی وضاحت دے سکوں گا۔'' اُسکے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔

''تم بھی تو ڈھونڈ سکتے تھے مجھے۔'' نوید نے اچانک ہی پوچھا۔

''ہاں! ڈھونڈ سکتا تھا۔ پر پہلے جتنی کوششیں کی، اُس پر تم لوگوں کے رویوں سے میرا دل بہت دکھا تھا، اُسکے بعد میں نے صلح کی ساری کوششیں ترک کر دیں۔'' اُس نے صاف گوئی سے کہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم کل اپنے بچوں سے بات کر سکتے ہو۔'' اُس نے موضوع بدلا۔

''میں نے سن لیا تھا نیچے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر سے بیزار ہوا۔

''میں نے تمہیں کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ اُسکے لیے بھی معذرت چاہتا ہوں۔'' اُس نے ایک بار پھر کہا۔

''پورے چھے دن بعد تم نے اُس بات کے لیے مجھ سے معذرت کر ہی لی۔ شکریہ!'' حسین نے جتایا اور پھر منہ بناتے دوبارہ نیم دراز ہوا۔

''معذرت کر لی نا میں نے!'' اچانک ہی نوید کی تیز آواز گونجی تو اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو؟'' اُس نے اچھنبے سے پوچھا۔

''تو اپنا منہ سیدھا کرو!'' وہ جھنجھلایا۔ کہہ نہیں پا رہا تھا کہ تم اتنے خاموش اور سنجیدہ اچھے نہیں لگ رہے، پر کیا کریں؟ اِس آدمی کو کہنا ہی تو نہیں آتا تھا۔ حسین نے بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو چہرے پر ہی روکا۔

''تم نے معذرت کی اور میں نے سن لی، ضروری تو نہیں کہ میں فوراً قبول بھی کروں؟'' اُس نے مزے سے کہتے دوبارہ موبائل کھول لیا۔ نوید نے سر جھٹکتے پاؤں بستر کے اوپر کیے اور اپنا لیپ ٹاپ کھول کر پیروں پر رکھ لیا۔ حسین نے چہرہ موڑ کر ایک نظر اُسے دیکھا پھر میز پر پڑی اُسکی گھڑی کو۔

''تمہیں کب سے رسٹ واچ (کلائی پر باندھنے والی گھڑی) کا شوق ہو گیا۔'' حسین نے پوچھا۔

''ٹائم دیکھنا ہوتا ہے۔'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''وہ تو موبائل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔'' حسین صاحب اپنی جون میں واپس آ چکے تھے۔

''موبائل میں ہر وقت ہاتھ میں رکھ کر نہیں گھومتا۔'' اُس نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بنا ہی جواب دیا۔

''یہی بات۔۔۔۔ یہی بات ہم تمہیں یونیورسٹی میں بھی کہا کرتے تھے، جب کہ اسمارٹ فون کا زمانہ بھی نہ تھا۔ پر تم تب بھی گھڑیاں نہیں پہنتے تھے کہ تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اب وقت کی قدر ہو گئی؟'' اُس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو لیپ ٹاپ پر حرکت کرتی، نوید کی اُنگلیاں تھمی۔ اُس نے مڑ کر حسین کو، پھر گھڑی کو دیکھا۔ چہرے پر نہ سختی تھی، نہ سنجیدگی، آنکھوں میں کچھ بے نام سا تاثر تھا۔

''میرا بیٹا کھیلتا تھا میری گھڑی سے۔''اُسکی آہستہ آواز پر حسین کی مسکراہٹ سمٹی۔

''جب کبھی میں رسٹ واچ کے بغیر اُسے گود میں لیتا تھا تو وہ میرے ہاتھوں میں ڈھونڈتا تھا۔اِس لیے پہنے رہتا ہوں۔''اُس نے نرمی سے کہتے گھڑی سے نگاہیں ہٹائی،اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ حسین ہل بھی نہ سکا۔دل عجیب طرح سے ڈوبا تھا۔وہ تو اپنے بچوں کو یاد کر کے اُنکی تصویریں دیکھ کر یہ سوچ لیا کرتا تھا کہ ابھی وہ سو رہے ہونگے،ابھی کھیل رہے ہونگے اور ابھی کھانا کھا رہے ہوں گے۔اُسے تو کل کا انتظار تھا تاکہ وہ اپنے بچوں کی آوازیں سن سکے۔پر نوید؟اُسکے پاس تو سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا،اُسکی زندگی میں تو ایسا کوئی کل نہیں آنے والا تھا۔یاد کرنے کے لیے کوئی اچھی یاد بھی نہیں! سننے کے لیے کوئی آواز بھی نہیں!اور وہ سوچتے تھے کہ نوید کیوں بدل گیا ہے؟

نوید لب بھینچے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔پر ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی معصوم سی آواز گونج رہی تھی۔آنکھوں میں روشن آنکھوں والا وہ چہرہ گھوم رہا تھا۔کوئی اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُسکی خالی کلائی پر مار رہا تھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

''دیکھو بشریٰ!یہ میری گھڑی ڈھونڈ رہا ہے۔''وہ ہنستے ہوئے بشریٰ کو بتا رہا تھا۔معید نے بڑی بڑی روشن آنکھیں اٹھا کر اُسکو دیکھا۔پھر اپنے لب سکیڑ کر کچھ الفاظ ادا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''بب۔۔۔با۔۔۔با۔۔۔بّ۔۔با''وہ اُسے بابا بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔نوید مسکرا کر اُسے دیکھ رہا تھا۔

منظر بدلنے لگا،لیپ ٹاپ پر کوئی نوٹیفکیشن بجی تو وہ حال میں واپس آیا۔ حسین ابھی تک اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔آج اُس نے وضاحت دی تھی،اُس نے معذرت کی تھی،پھر اُس نے کچھ دکھوں کا اظہار بھی کیا تھا۔وہ آج کچھ کچھ بدلنے لگا تھا۔خول چٹخنے لگا تھا،یا شاید ٹوٹنے لگا تھا۔

واپسی کی منزل کے مسافر۔۔۔۔

اپنے اس دوست کو واپس لانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔۔۔۔

خود پر حسین کی نظریں محسوس کر تا نوید سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا۔پر اُن ننھے قدموں کی چاپ کو کیسے نظر انداز کرتا جو ہر طرف سنائی دے رہی تھیں۔اُن آوازوں کو کیسے جھٹکتا جو ذہن میں گونج رہی تھیں۔

''باب۔۔۔با۔۔۔بابا!''

---------+---------+--------

''تم نے زندگی میں کیا ہی کیا ہے، سوائے ڈرامے بازیوں کے ؟ایک پراٹھا نہیں بیلا جا رہا تم سے ؟'' صبح صبح باورچی خانے میں جیسے طوفان آگیا تھا۔ مقدّم کاؤنٹر پر ہاتھ جمائے، پراٹھے بیلتے حسین کو لتاڑ رہا تھا، جس پر پراٹھے بیلنے کا حکم رضا نے زبردستی تھوپا تھا۔

''تم کر لو نا آکر، کھڑے ہو کر بک بک کرنے کی بجائے۔ ''وہ اچھا خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔ صبح صبح بچوں سے بات کر کے، حورعین کو اپنی خیر خیریت پہنچا کر جو موڈ خوشگوار ہوا تھا، اُسے اب یہ چاروں مل کر برباد کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔

''میں کیوں کروں ؟کام تمہارا ہے نا؟''

''تو جیسا مل رہا ہے نا، ویسا ہی کھاؤ صبر و شکر کے ساتھ۔ جانا اس نے پیٹ میں ہی ہے۔''

''پھوہڑ ہونے کی یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی ؟ ''چائے کی کیتلی میں پانی رکھتے علی نے کہا۔ اُسکی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر وہ لوگ اُسکی مدد کرنے کھڑے تھے۔

''تم تو جیسے بڑے سگھڑ ہو۔ اپنا آملیٹ دیکھا تھا، سالن جتنے بڑے پیاز تھے اُس میں۔'' رضا پر جواب دینا واجب تھا۔

''دیکھو آج میں تم سب کو ایک بات بتا رہا ہوں۔ اگر یہ میرے ہاتھوں مر مرا جائے تو مجھ سے شکایت مت کرنا۔'' علی نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا۔ اشارہ روایتی حریف کی جانب تھا۔

''میں بالکل شکایت نہیں کروں گا۔'' حسین نے سب سے پہلے جواب دیا۔

''تم فلحال پراٹھے بنانے پر توجہ دو، گیس جانے کا وقت شروع ہو جاتا ہے یہاں۔'' رضا نے علی کو نظر انداز کر کے اُسے کہا۔

''نوید کہاں ہے ؟'' عمر نے پوچھا۔

''روز کی طرح جاگنگ کر کے غائب ہو گیا۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''یہ کہاں گیا ہوتا ہے ؟اِس سے کوئی سوال کیوں نہیں کرتا؟'' حسین نے پوچھا۔

''تم کر لینا آج !'' ماچس کی ڈبیا اٹھا کر، کاؤنٹر سے دور ہٹتے، باغیچے کا دروازے کھولتے رضا نے کہا۔

''تم پھر سگریٹ پینے جا رہے ہو؟'' مقدّم کا صرف ایک ہی کام تھا، دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنا اور وہ یہ کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔

''ہاں !'' اُس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے سکون سے کہا۔

''ناشتے سے پہلے سگریٹ، ناشتے کے بعد سگریٹ، سونے سے پہلے، جاگنے کے بعد، رات کے کھانے سے پہلے پھر اُسکے بعد۔۔۔۔ کسی وقت تو چھوڑ دو اِس خراب چیز کو۔'' پیاز کاٹتے عمر نے تاسف سے کہا۔

''یار! تم لوگ تھوڑا آہستہ بولو، میرے سر میں درد ہو رہا ہے بہت۔'' چائے کی پیالیاں ٹرے میں سجاتے علی نے چڑ کر کہا۔

''تمہارے سر کا درد جا کیوں نہیں رہا؟'' عمر کو تشویش ہوئی۔

''پتہ نہیں! بار بار اٹھ رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میں نے تو سگریٹ آفر بھی کی تھی، تم نے ہی منع کر دیا۔'' دروازے کے باہر کھڑے رضا نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''سر درد کا سگریٹ سے کیا تعلق ہے؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تعلق ہے۔'' وہ ٹریک کے پاس رکھے ڈسٹ بن میں سگریٹ کا بچا حصّہ ڈالتے ہوئے واپس اندر آیا۔

''دیکھو! جب میں اپنے شوق کے لیے نشہ کرتا تھا، تب میں اُسکا بہت عادی ہو گیا تھا۔'' اُس نے بات شروع کی، تو علی نے لب بھینچ کر، اور باقی سب نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''کیا تم اپنی بکواس بند کر سکتے ہو؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ارے سنو تو!'' وہ پاس رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھا۔ ''میں نے جب نشہ چھوڑا تو وہ اتنا آسان کام نہیں تھا، اُسکے ٹھیک ٹھاک سائیڈ ایفیکٹس تھے۔ جیسے تم سر درد کا شور مچا رہے ہو، ایسے میں پورے جسم میں درد کا شور مچاتا تھا۔ اب سگریٹ بھی ایک قسم کا نشہ ہی تو ہے۔ اور اُسے پینے والا نشئی! تم نے اِسے اچانک سے چھوڑ دیا ہے تو سر میں درد ہونا تو بنتا ہی ہے نا! ایک چیز کی تمہارے جسم کو عادت ہے، اب اسے اچانک ہی چھوڑ دو گے، تو اسکے اثرات تو آئینگے ہی۔ اس لیے ایسی چیزوں کو اچانک سے چھوڑنے کے بجائے آہستہ آہستہ کم کرنا چاہیے یا عارضی طور پر کوئی متبادل ڈھونڈ لینا چاہیے، جو ایڈیکٹو نہ ہو۔ میں اپنے تجربے سے بتا رہا ہوں۔ اب میری طرح تم اپنے شوق کے لیے تھوڑی سگریٹ پیتے تھے، لہٰذا تم تھوڑا بہت مقدار کم کر کے پیو تو سر درد کچھ بہتر ہو سکتا ہے۔ یا کوئی متبادل ڈھونڈ لو!'' رضا نے بڑے مزے سے اپنا تجربہ اسے سنایا تھا، پر وہ بالکل متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ حسین اور مقدّم ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ وہ کوئی موقع نہیں چھوڑ رہا تھا۔

''تم سے بات کرنا دنیا کا انتہائی فضول کام ہے۔'' علی نے سنجیدگی سے اُسکی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اور فضول آدمی فضول کام ہی کرتا ہے۔''اُس نے حساب برابر کیا تو علی سر جھٹکتے واپس چائے کی ٹرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ باقی تینوں اب تک ہنس رہے تھے۔

---------+---------+--------

رات کا آخری پہر تھا، عمر کی آنکھ کھلی تو پیاس کا احساس شدت سے جاگا۔ وہ اُٹھ بیٹھا، میز پر نظر پڑی تو جگ خالی ہو چکا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور پانی کا جگ لیکر باہر راہداری میں آ گیا۔ حویلی خاموش پڑی تھی۔ وہ بھی ریلنگ پر آیا اور نیچے ہال میں جھانکا۔ ہال کی دھیمی لائٹیں جلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ میں خالی جگ تھامے دوسرے ہاتھ سے جمائی روکتا وہ بائیں طرف والی سیڑھیوں سے اُترتا نیچے آنے لگا۔ نیم اندھیرے ہال کی محرابی کھڑکیوں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر ہی تھا کہ اُسے محرابی کھڑکی کے شیشے کے باہر کوئی وجود کھڑا محسوس ہوا۔ اُسکے قدم منجمد ہوئے۔ اُس نے رک کر بغور دیکھا تو کوئی سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے فوراً ہٹا۔ عمر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اُسکا وہم ہرگز نہیں تھا۔ اُس نے میکانکی انداز میں دروازے کی طرف دیکھا۔ نوید سارے دروازے سونے سے پہلے اندر سے بند کر دیا کرتا تھا۔ وہ اب بھی بند تھے۔ عمر اُلٹے قدموں واپس پلٹا اور تیزی سے اوپر آیا۔ راہداری میں پہلا کمرہ اُسکا ہی تھا۔ پر وہ سیدھا آخری کمرے تک آیا اور دروازہ بجایا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ جہاں نوید ہاتھ میں خالی جگ پکڑے کھڑے عمر کو دیکھ کر حیران ہوا تھا، وہیں عمر بھی اُسے ہاتھ میں گن تھامے دیکھ کر ساکت ہوا تھا۔ پیچھے حسین بھی کچھ سوئی جاگی کیفیت میں بیٹھا نا سمجھی سے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ۔۔۔ مجھے لگا۔۔۔ جیسے میں نے حویلی کے باہر کسی کو دیکھا ہے۔''اُس نے نوید کو پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

''تمہیں ایسا لگا نہیں ہے، بلکہ حویلی کے احاطے میں واقع کوئی ہے۔ اکرم کو میں نے فون کر کے پوچھا ہے پر وہ انیکسی میں ہی ہے۔ حسین کو میں نے اٹھا دیا ہے، تم باقی سب کو جگاؤ اور ہال نمبر دو میں جمع کرو۔ میں حویلی کے باہر دیکھتا ہوں۔ جلدی!''وہ اُسے تفصیلاً بتاتا باہر نکلا۔ عمر نے خالی جگ وہیں چھوڑا اور تیزی سے دوسرے کمرے کی جانب بڑھا، حسین بھی اُٹھ کر باہر آیا۔ پیچھے نوید کے لیپ ٹاپ پر سی سی ٹی وی کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ جہاں حویلی کے احاطے میں کوئی بنا چاپ پیدا کیے سیاہ لباس میں سیاہ پی کیپ پہنے ایک ایک کھڑکی چیک کر رہا تھا۔

دوسری جانب نوید ہال کے بجائے باورچی خانے میں آیا اور وہاں موجود باغیچے کا دروازہ کھول کر بنا چاپ کے قدم اٹھاتا باہر نکلا۔ وہ اجنبی شخص نوید کے سامنے تھا، اور نوید اُسکے پیچھے۔ وہ نوید کی آمد سے بے خبر ایک ایک کھڑکی چیک کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ نوید نے اُسکی پیٹھ کا نشانہ لیکر گن تان لی۔

''ہلنا مت! ورنہ جان سے مار دونگا۔''نوید کی خوفناک حد تک سرد آواز فضا میں گونجی تو سامنے والا وجود جھٹکا کھا کر مڑا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اُس نے اپنا گن والا ہاتھ نوید پر تان لیا۔ یہ اُسکا فوری دفاع تھا۔

چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو ٹریگر پر انگلی رکھے نوید عالم نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''تم؟'' اُس کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''کیوں ڈر گئے مجھے دیکھ کر؟'' پی کیپ کے نیچے چہرہ مسکرایا تھا۔ گن دونوں نے اب بھی ایک دوسرے پر تان رکھی تھیں۔

ایک حیران تھا

اور دوسرا محظوظ!

--------+---------+----------

اٹھارواں باب

یارِ گمشدہ

''ہلنامت! ورنہ جان سے مار دونگا۔''نوید کی خوفناک حد تک سرد آواز فضا میں گونجی تو سامنے والا وجود جھٹکا کھا کر مڑا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، اُس نے اپنا گن والا ہاتھ نوید پر تان لیا۔ یہ اُسکا فوری دفاع تھا۔

چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو ٹریگر پر انگلی رکھے نوید عالم نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''تم؟''اُس کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''کیوں ڈر گئے مجھے دیکھ کر؟''پی کیپ کے نیچے چہرہ مسکرایا تھا۔ گن دونوں نے اب تک ایک دوسرے پر تان رکھی تھیں۔

ایک حیران تھا

اور دوسرا محظوظ!

''تم کیا کر رہے ہو یہاں؟''نوید نے چہرہ سیدھا کر کے حیرت سے پوچھا۔ گن اب بھی اُس پر تانے رکھی۔

''فرّخ صاحب نے بھیجا ہے، کچھ اہم اطلاعات اور کچھ اہم معلومات آپ تک پہنچانی تھی۔''شیراز مسکرایا۔''سچ بتائیں! ڈرا دیا نا میں نے آپ کو؟''اُس کے شرارتی لہجے پر نوید نے سنجیدہ نظروں سے اُسے گھورا۔

''گن نیچے کرو!''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو شیراز نے جلدی سے گن نیچے کی۔

''اس طرح جاسوسی کرتے ہیں؟ ہاں؟ تمہیں تمام کیمروں میں دیکھا جا سکتا ہے، اُس پر سے میں تمہارے پیچھے کھڑا ہوں اور تمہیں خبر بھی نہیں؟''گن نیچے کرتا نوید اب اُسکی جاسوسی صلاحیتوں پر اُسے لتاڑ رہا تھا۔

''میں کیمروں میں جان کر آیا تھا سر! میں چاہتا تھا کہ آپ مجھے دیکھ لیں۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! اندر آؤ!'' وہ گن کمر میں اڑستا باورچی خانے کے دروازے کی طرف آیا، ساتھ شیراز بھی پیچھے تھا۔ باورچی خانے سے نکل کر راہداری پار کر کے جب وہ دونوں ہال میں پہنچے تو سب سامنے تھے۔ حالانکہ اس نے اُنہیں ہال نمبر دو میں اکھٹے ہونے کو کہا تھا، پر اُن میں سے کوئی اُسکی بات کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہیں تھا۔ سنتے سب تھے، پر کرتے اپنی مرضی تھے۔ اُس نے لب بھینچ کر اُنہیں دیکھا، جن کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔

''فکر نہ کرو! شیراز تھا۔'' اُس نے کسی کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے جواب دیا۔

''اسلام علیکم!'' شیراز نے دانت نکالتے اُنہیں سلام کیا۔

''تو یہ ایسے چوروں کی طرح کیوں آ رہا تھا؟'' حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''وہ خاموشی سے مجھ سے مل کر جانا چاہتا تھا۔ پر اسکا کام خاموشی سے ہوتا نہیں ہے کبھی!'' نوید نے شیراز کو گھورتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ پھر سب کی جانب دیکھا۔

''تم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ، کوئی مسئلے والی بات نہیں ہے۔ اور تم میرے ساتھ آؤ!'' نوید نے پہلے ان سب کو اور پھر شیراز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، پھر ہال نمبر دو کی طرف جاتی راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

اُنہوں نے بھی سکھ کا سانس لیتے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی، شیراز نے تو جان نکالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

---------+---------+--------

''آپ کے گھر کے آس پاس کچھ مشکوک لوگوں کو دیکھا گیا ہے، اور کچھ مشکوک سرگرمیاں بھی ہو رہی ہیں۔'' شیراز نے کچھ کاغذات اُسکے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ھمم! فرخ صاحب نے بتایا تھا مجھے اس بارے میں۔'' نوید نے فائل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کچھ اہم نکات ہیں، اور کچھ آگے لیے جانے والے اقدامات ہیں، جو میں نے لکھ دیئے ہیں۔ تم یہ فرخ صاحب کے حوالے کر دینا۔'' نوید نے کچھ کاغذات اُسکی جانب بڑھائے، جو اُس نے تھام لیے۔

''سر! آپکو یہاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں! پر تم یہاں صرف اتنے سے کام کے لئے آئے تھے؟'' اُس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''ہرگز نہیں! میں یہاں **تین چوٹی** والی آپریشن ٹیم کے ساتھ آیا ہوں۔ تو فرخ صاحب نے کہا کہ یہ کام بھی کر دوں۔ اُسکے علاوہ ایک اور بات بھی بتانی تھی آپ کو۔'' وہ رکا۔

''کیا؟''

''اگلے دو دنوں کے لیے آپ لوگ حویلی میں نہیں رہ سکتے۔آپ لوگوں کو کھرپوچو قلعے کے پاس ایک گھر ہے،وہاں قیام کرنا ہوگا۔گھر کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔''

''پر کیوں؟''وہ مشکوک ہوا۔

''گھر کی کل فیومیگیشن ہوگی۔''اُس نے کان سہلاتے کہا۔نوید کی تیوری پر بل پڑے۔

''کیا فیصل کو یہی وقت ملا تھا فیومیگیشن کے لیے؟''اُس نے سختی سے پوچھا۔

''اس میں فیصل کا کوئی قصور نہیں ہے۔فیومیگیشن کی بکنگ دو مہینے پہلے سے ہی تھی،اور پھر اُسکے خاندان والے جون کے آخر میں رہنے آتے ہیں،تو اُس سے قبل ہمیشہ فیومیگیشن ہو جاتی ہے۔''اب وہ بھلا کیا ہی کہتا؟ یہ حویلی اے ایس پی فیصل کی خاندانی حویلی تھی۔جو سالہا سال بند رہتی تھی،فقط گرمیوں کی چھٹیوں پر جب اُسکے خاندان والے بیرونِ ملک سے پاکستان آتے،تب اُنکے یہاں قیام کے لیے کھلتی تھی۔ فرّخ صاحب کو اِس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں لگی تھی اُنکی حفاظت کے لیے،اُس نے بھی بخوشی اجازت دے دی،کیونکہ اپنے خاندان والوں میں سے صرف وہ ہی پاکستان میں مقیم تھا،لہٰذا چابیاں بھی اُسکے پاس ہوتی تھیں۔البتہ اپنے خاندان والوں کو اُس نے کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی۔

''کیا وہ یہ کام بعد میں نہیں کروا سکتا؟''

''سر!دراصل یہ کام اُسکے چچا کے پرانے دوست دہائیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں،اگر اُس نے منع کر دیا تو وہ اُسکے چچا کو خبر کر دیں گے اور پھر اُسکے پاس بنانے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ہوگا۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے!جانا کب تک ہے؟''نوید نے بیزار کن لہجے میں پوچھا۔

''آپکی حفاظت کے لیے کھرپوچو قلعے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر لیا ہے۔آپ لوگ کل کا دن گزارنے کے بعد پرسوں صبح چار بجے حویلی چھوڑ دیں گے۔پرسوں یہاں فیومیگیشن کا عمل ہوگا۔پرسوں کے بعد آپ لوگ صبح وہاں سے نکل جائینگے تو اگلے دن یہاں واپس پہنچ چکے ہونگے۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''ٹھیک ہے۔''نوید نے فقط اتنا ہی کہا پھر اُس سے گھر کے متعلق مزید معلومات لینے لگا۔

ابھی تو باقی سب کو بتانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر نوید عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ سوچتا رہا کہ اگر ان سب کو بتا دیا تو پتہ نہیں کیسا ردعمل دیں؟ خیر! اللہ اللہ کر کے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو اُس نے سب کو مخاطب کیا۔

''کل شیراز نے کچھ اہم معلومات دی ہیں۔'' اُس نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا تو سب نے اُسے دیکھا۔

''کیسی معلومات؟''

''مورخہ چھے قریب ہے، تم سب کے گھر والے خیریت سے ہیں، کوئی مسئلے کی بات نہیں ہے۔ البتہ میرے اپنے گھر کے پاس کچھ مشکوک سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایف آئی اے اُن پر نظر رکھے ہوئی ہے۔'' اُس نے کہا۔

''سب خیریت رہے گی ان شاءاللہ! کس قسم کی مشکوک سرگرمیاں تھیں؟'' عمر نے تشویش سے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں بتایا گیا ہے۔ ضروری ہوگا تو معلوم ہو جائیگا۔ ابھی فلحال کام کی بات یہ ہے کہ ہمیں دو روز کے لیے عارضی طور پر حویلی چھوڑنی ہے۔''

''کیوں؟'' مقدم نے پوچھا۔

''ضروری ہے، میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جان لو کے اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں کر لو، ہم آج رات چار بجے حویلی چھوڑ دیں گے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''پر جائیں گے کہاں؟'' علی نے پوچھا۔

''یہاں سے تھوڑا اوپر ایک مقام ہے۔ کھرپوچو قلعہ کہتے ہیں اُسے۔'' اُس نے کہا تو سوائے مقدّم کے باقی سب نے کوئی خاص ردعمل نہ دیا۔ وہ البتہ آنکھیں پھاڑے نوید کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیسا عجیب سا نام ہے؟ کھرپوچو؟'' حسین نے ہنستے ہوئے رضا کو کہا۔

''قلعوں کے نام عموماً ایسے عجیب سے ہی ہوتے ہیں۔'' اُس نے کہا، وہ لوگ اپنی ہی گفتگو میں مشغول تھے، اِس لیے دیکھ نہ سکے کے نوید نے کھانے کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے، ایک نظر مقدم کو دیکھا اور پھر اُسے نفی میں سر ہلا کر آنکھوں ہی آں کھوں میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے کے بعد مقدّم کا منہ تو بند ہو گیا پر نوالہ حلق سے اُترتا دوبھر ہو گیا۔

''تو وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ مطلب اور کتنا اوپر جانا ہوگا؟'' عمر نے نوید کو مخاطب کیا تو اُس نے پہلے پانی کا گھونٹ بھرا، پھر اُن سب کو دیکھا جو منتظر نظروں سے جبکہ مقدّم تاسف سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔بس پانچ چھے۔۔۔۔''اُس نے بات ادھوری چھوڑی۔

''پانچ چھے کیا؟چھے فٹ اوپر؟یہ تو کم ہے،اتنی چڑھائی تو چڑھ ہی سکتے ہیں۔''علی نے خود ہی اخذ کر لیا تھا۔جواباً وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا،صد شکر کہ کسی نے دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔البتہ مقدّم نے اپنی گھورتی نظریں اس پر مرکوز ہی رکھیں۔وہ صرف خاموش اس لیے تھا کہ دس سالوں میں پہلی بار نوید نے اُس سے کوئی فیور مانگا تھا،انداز ایسا ہی تھا جیسا کبھی اُنکی دوستی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔صرف اس ایک دوستانہ سے فیور کے لیے مقدّم چپ رہا،ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ چلا چلا کر کہہ دے کہ صرف چھے فٹ کی بات نہیں ہے۔

صبح چار بجے تک سب نے فقط ضروری سامان کا ایک ایک بیگ ساتھ رکھا اور حویلی چھوڑ دی،حسین البتہ رات بھر نوید کا دماغ کھاتا رہا کہ آخر اُنہیں کیوں یہاں سے لے جایا جا رہا ہے؟تنگ آ کر نوید نے اسے بتا ہی دیا کہ فومیگیشن کروانی ہے۔

''تو ہم باہر لان میں بھی رہ سکتے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''رات بھی وہیں گزارو گے؟''نوید نے چڑ کر پوچھا۔

''ہاں!یہ بات تو ہے۔''اس نے کہا۔''چلو خیر ہے!اس بہانے باہر تو نکلیں گے اس حویلی سے۔''اُس نے خوشی سے کہا تو نوید چپ ہی رہا۔

حویلی چھوڑتے ہوئے بھی کسی کو شک نہ ہوا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔انکا پر سکون انداز،اور مقدّم کی ملامتی نظریں دیکھ دیکھ کر نوید دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا۔پر کیا کرتا؟جانتا تھا کہ اگر سچ بتایا تو وہ لوگ یہیں ٹک کر بیٹھ جائیں گے،پر جائیں گے کہیں نہیں!سفر شروع ہونے سے قبل،ان سب کو بوٹ اور ایک عدد ہائیکنگ اسٹیک پکڑا دی گئی،جسکا مطلب اِس وقت وہ لوگ ہر گز نہیں سمجھ سکے۔پر دو گھنٹے گزرنے کے باوجود بھی جب پہاڑ ختم نہ ہوا اور پو پھوٹنے کا وقت ہو گیا،تو رضا نے اپنا بیگ زمین پر پٹخا اور پہاڑ کی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟''اُس کی اِس حرکت پر نوید نے رک کر دیکھا۔باقی تینوں کی بھی بس ہو گئی تھی،لہٰذا وہ بھی باری باری وہیں بیٹھنے لگے۔

''تم نے چھے فٹ اوپر آنے کو کہا تھا،میرے خیال سے میں چھے سو فٹ چڑھائی چڑھ چکا ہوں اب تک۔''رضا نے مبالغہ آرائی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

''اور کتنا دور رہ گیا ہے نوید؟''عمر نے بھی تھک کر پوچھا۔

''چھے میں سے دو گھنٹے گزر چکے ہیں،بس چار گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔''نوید نے ذرا سنبھل کر کہا تو سب نے سنا،غور کیا،سمجھا،پھر سمجھ آنے پر مارے صدمے کے سب کا منہ ہی کھل گیا،البتہ مقدّم ابھی تک نظریں چرائے ہوئے تھا۔

''تم۔۔۔تم نے۔۔۔تم نے چھے فٹ نہیں کہا تھا؟''عمر نے آنکھیں پھاڑے پوچھا۔

''نہیں! میں نے تو تجھے سے آگے کچھ کہا ہی نہیں تھا، تم لوگوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ تجھے فٹ ہے۔''نوید نے بے نیازی سے کہہ کر کندھے اچکائے۔

''تو تم ہمارے اندازے کو غلط ثابت کر دیتے نا!''رضا نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم لوگ میری کوئی بات مکمل سنتے ہو؟ سن لیتے تو میں بتا دیتا۔''واہ! کیا بے نیازی تھی۔

''میں واپس جا رہا ہوں۔''حسین نے کندھوں پر بیگ ڈالا اور ہائیکنگ اسٹک زمین میں گاڑ کر کھڑا ہو کر اعلان کرتے، جانے کے لیے پلٹا۔ نوید اُسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔

''واپس جانے میں دوبارہ دو گھنٹے لگیں گے۔ اس سے اچھا ہے چار گھنٹے لگا کر چڑھائی ہی چڑھ لو۔''مقدّم نے اُسکا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ تھا؟''حسین الٹا اُسکے سر ہوا۔

''نہیں!''وہ گڑبڑایا۔

''جھوٹ مت بولو!''

''میں سوات میں رہتا ہوں، اسکردو میں نہیں جو یہاں کے راستے معلوم ہوں۔''اُس نے صاف جھوٹ بولا۔ معلوم اُسے سب تھا۔

''واللہ! میں ایس ایس پی نوید عالم سے تنگ آ چکا ہوں۔''حسین نے باآواز بلند کہا اور منہ بناتے ہوئے واپس آ گیا۔ چار و ناچار اُنہیں آگے بڑھنا ہی پڑا تھا۔

کچھ دور مزید چلنے کے بعد بالآخر انہیں ایک چھوٹا سا چائے کا کیبن نظر آیا، جسکے آگے کرسیاں لگی تھیں۔

''ناشتہ کر لیتے ہیں پہلے!''نوید نے کیبن کے پاس رکتے ہوئے کہا تو باقی سب تو جیسے انتظار میں ہی تھے۔ فوراً اپنا سامان رکھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سورج کی کرنیں پڑنے لگی تھیں، جو ابھی مکمل نہیں نکلا تھا۔

''السلام علیکم بھائی! کیا لیں گے؟''کیبن کے مالک نے کھڑکی سے منہ نکال کر پوچھا۔

''چائے اور کچھ بسکٹ بس!''نوید نے کہا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رضا بیٹھنے کی بجائے کھائی کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ کسی نے بھی اُس پر دھیان نہیں دیا۔

''نوید!''حسین نے اُسے یکدم ہی پکارا تو اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیا ہم میں سے کسی نے یونیورسٹی کے زمانے میں تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا تھا؟ تمہارا حق مارا تھا؟ یا تمہیں bully کیا؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا تو باقی سب نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا۔ یہ بھلا کیسا سوال تھا؟ نوید البتہ سنجیدہ تھا۔

''تم کر بھی نہیں سکتے تھے۔''جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''ایگزیکٹلی! ہم ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم تھے ہی شریف!''اُس نے اپنی مرضی کا مطلب نکالا۔اس بے مقصد گفتگو کا کوئی مقصد سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی سب کی توجہ حسین پر ہی تھی۔

''تو؟''نوید نے بازو سینے پر لپیٹے ہوئے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھا۔کیبن کا مالک چائے میز پر رکھ کر گیا تو سارے میں دودھ پتی کی خوشبو رچ بس گئی۔چائے کی پیالی اٹھاتے علی کی نظریں دور کھائی کے پاس کھڑے رضا پر گئیں،تو اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو پھر تم ہم سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو؟''حسین نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا تو نوید کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں،چہرے پر کچھ ایسے تاثرات آئے جیسے لگا کہ وہ ابھی مسکرائے گا۔پر وہ مسکرایا نہیں!وہ واقعی انگلیوں پر گن کر مسکراتا تھا۔

''کیا کیا ہے میں نے؟''اُسکا لہجہ سنجیدہ،البتہ آنکھوں میں دوستانہ سا تاثر تھا۔

''یہ جو تم ہمارے ساتھ کر رہے ہو،پچھلے پندرہ سولہ دنوں سے۔۔۔کیا اُسے مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟''یہ حیرت میں ڈوبا سوال مقدّم کی جانب سے آیا تھا۔علی کا آدھا دھیان اس طرف اور آدھا رضا کی جانب تھا۔

''مجھ سے سیدھی بات کیا کرو۔''ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے کہا گیا۔

''تم کرتے ہو کبھی سیدھی بات؟بلکہ تم تو بات ہی نہیں کرتے۔اپنی مرضی کا حکم دیتے ہو اور چلے جاتے ہو،پھر واپس آتے ہو،اپنی پسند کے سوالوں کے جواب دیتے ہو،ورنہ نظر انداز کر دیتے ہو۔اور پھر چلے جاتے ہو۔''حسین نے اُسکی شخصیت کا نقشہ کھینچا تو اُسکی آنکھوں میں تبسّم سا بکھرا،البتہ چہرے پر اُس نے اب بھی کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

''ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا میرے پاس!''سیدھی بات،نو بکواس!

''کیوں تم نے ملک چلانا ہوتا ہے؟''یہ غیر متوقع سوال عمر کی جانب سے آیا تھا۔کسی کو امید نہ تھی کہ عمر اِس گفتگو میں حصّہ لینے والا ہے۔علی کی نظریں اب بھی دور کھائی کے پاس کھڑے رضا پر تھیں،اس لیے وہ گفتگو میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔

''ہاں!''بندہ ڈھیٹ ہو تو پھر اتنا۔

''سیدھے سیدھے کہو،تم ہم سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔''مقدّم نے بھی سیدھی سیدھی بات کی۔

''سیدھے سیدھے کہہ دوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔اس لیے خود ہی سمجھ لیا کرو!''اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔بدلحاظ،بداخلاق،بے مروت آدمی!

''ہمیں کیوں برا لگے گا بھلا؟ ہمیں کیا۔۔۔ تم ہم سے بات کرنا پسند کرو یا نہ کرو!'' حسین نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ علی نے، سر جھکائے کھائی کی طرف مزید آگے ہوتے، رضا کو پریشانی سے دیکھا۔ وہ کر کیا رہا تھا آخر؟

''ہاں! دن میں چار مرتبہ مجھے یہ جتا کر، کہ میں بات کرنا پسند نہیں کرتا، یا بات ہی نہیں کرتا، میرے پیچھے میری برائیاں کر کے بھی، تمہیں مجھ سے کیا؟'' نوید نے کندھے اُچکاتے، ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے اُنہیں حیران کیا۔

''تم اتنے اہم نہیں ہو۔ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو۔'' مقدّم نے جتانا ضروری سمجھا۔ نوید نے بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو لبوں پر روکا۔

''میں نے تو وہ کہا جو میں نے دیکھا۔'' آج بڑی فرصت تھی، ایس ایس پی صاحب کے پاس شاید!

''دفع کرو!'' حسین نے موضوع سمیٹنا چاہا۔

''نہیں! پہلے مجھے سیدھے سیدھے بتاؤ کہ میں کیا کر رہا ہوں پچھلے پندرہ سولہ دنوں سے تمہارے ساتھ؟'' نوید نے آگے ہوتے ہوئے کہا، وہ آج چھوڑنے کے موڈ میں نہ تھا۔

''رہنے دو! مذاق کر رہے تھے دونوں۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔'' عمر نے اُسکی طرف سے جواب دے کر بات ختم کرنی چاہی۔

''کیوں تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' اُس نے عمر کے بجائے حسین سے پوچھا۔

''میں؟ اور تم سے ڈروں گا؟ ایسا کیا ہے تم میں ڈرنے والا؟'' حسین نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''بات شروع کی ہے تو ختم بھی کرو پھر! کب تک میرے پیچھے ہی میری برائیاں کرتے رہو گے؟'' اس بات پر لمحے کو علی کے کان کھڑے ہوئے، اس نے چور نظروں سے نوید کو دیکھا۔ توجہ رضا کی جانب سے منتقل ہو گئی۔

''میری ایک بات تم غور سے سنو!'' مقدّم نے یکدم ہی آگے کی طرف ہوتے ہوئے نوید کو مخاطب کیا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی تم سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو بس!۔۔۔'' وہ رکا۔

''وہ تو؟'' نوید نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''وہ تو تم نے اپنا اورا (aura) ہی ایسا بنا رکھا ہے کہ بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے، پتہ نہیں کب کس بات کا کیا مطلب نکال لو؟'' بات مکمل علی نے کی تھی، جسکی دلچسپی اس گفتگو میں اچانک ہی بیدار ہوئی تھی۔

''اورا؟'' نوید نے بھنویں اُچکاتے ناسمجھی سے پوچھا۔

''کیاایس ایس پی؟اورابھی نہیں پتہ تمہیں؟''حسین بدمزہ ہوتے ہوئے اپنے ازلی انداز میں بولا۔

''تومیں نے کیاتم میں سے کسی کو براابھلا کہا؟کسی کو مارا پیٹا؟کسی سے بدتمیزی کی؟کیا کر دیا ہے میں نے ان پندرہ سولہ دنوں میں؟''نوید نے اب کہ سنجیدگی سے پوچھا۔اول الذکر دو سوالوں کے بعد والے سوال پر کوئی متفق نہیں تھا۔

''نہیں!پر تم بہت سنجیدہ ہو گئے ہو۔بہت زیادہ!تم سے بات کرتے ہوئے بہت اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔اس لیے آسان نہیں لگتا تم سے کچھ بھی کہنا، حالانکہ تم ایسے نہیں تھے۔''عمر نے آرام سے کہاتواُس نے ایک نظراُسے دیکھا۔

''کیونکہ کسی ایک کو سنجیدہ رہناپڑتا ہے۔اگر میں بھی تم لوگوں کی طرح ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا،تو ہم سب اس قاتل کے ہاتھوں بے خبری میں مارے جائیں گے۔''اُس نے سکون سے جواب دیاتو دو لوگوں کو تو آگ ہی لگ گئی۔

''کیامطلب ڈھیلے؟''مقدّم نے بھنویں سکیڑ کر خفگی سے پوچھا۔

''مطلب لاپرواہ،غیر ذمہ دار،غیر سنجیدہ۔''بندہ منہ پھٹ ہو تو پھر اتنا!

''یہی وہ وجہ ہے کہ تم سے بات کرنے سے پہلے سو چناپڑتا ہے۔بتاؤ کیااس طرح کسی کی برائی کرتے ہیں؟''حسین نے برامناتے ہوئے سب سے پوچھا۔

''ہاں!اسی طرح کرتے ہیں۔۔۔منہ پر،پیٹھ پیچھے نہیں!''اُس نے پہلی بار ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔(تالیاں ہو جائیں ایس ایس پی صاحب کے لیے!)۔اس بار چاروں نے اُسے ایک ساتھ دیکھا۔کتنے عرصے بعد اُسکا ایسا موڈ دیکھا تھا۔جیسے کبھی وہ یونیورسٹی کے زمانے میں جان کر دوسروں کو چھیڑا کرتا تھا،اُنکو چڑانے اور تپانے کا موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُسکا موڈ خراب ہو۔

''تو تمہیں ہم اتنے بڑے بڑے،پانچ عدد مرد لاپرواہ اور غیر ذمّے دار نظر آرہے ہیں؟''مقدّم نے ایک مرتبہ پھر خفگی سے پوچھا،نوید مسکراتا ہوا اُسے سنتا رہا۔''کون ہے غیر ذمّے دار؟یہ؟(ہاتھوں سے برابر بیٹھے عمر کی جانب اشارہ کیا)جو پورا کاروبار اکیلے چلاتا ہے؟''

''آدھا!''علی نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا جسے نظرانداز کیا گیا۔

''یایہ(اب کہ علی کی جانب اشارہ کیا)جو خود دو بچوں کا باپ ہے؟یامیں(اپنی جانب اشارہ!)جو پوری فرم اکیلے چلا رہا ہوں۔یایہ(حسین کی طرف اشارہ کیا)ہاں!یہ تو ہے۔''اس سے پہلے کہ حسین کچھ کہتااُس نے فوراً دور کھڑے رضا کی جانب اشارہ کیا۔

''یاوہ۔۔۔جو چھبیس بچوں کا باپ۔۔۔''وہ بولتے بولتے یکدم رکا۔

''یہ کیا کر رہا؟''اُسکی نظریں،سر جھکائے کھائی کے بالکل کنارے کھڑے رضا پر گئیں تو وہ چونکا۔

''میں بھی اتنی دیر سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ یہ وہاں کر کیا رہا ہے؟'' علی نے بھی کہا، اچانک ہی سب کی توجہ کا مرکز رضا بن گیا تھا، جسکی اُن سب کی جانب پیٹھ تھی۔

''یہ آگے کیوں بڑھ رہا ہے؟ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟'' حسین نے اُسے مزید ایک قدم آگے بڑھاتا دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''حسین۔۔۔ کہیں یہ۔۔۔ یہ خودکشی تو نہیں کر رہا؟'' علی کو اپنی آواز خود کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس بات پر نوید جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

''تم لوگ خاموش رہو، میں اسے وہاں سے ہٹاتا ہوں۔'' نوید نے سنجیدگی سے کہا اور آہستگی سے رضا کی جانب بڑھا، جسکا دایاں پاؤں بالکل کھائی کے دہانے پر تھا، بس ذرا سا آگے بڑھنے کی دیر تھی اور وہ کھائی کی نذر ہوتا۔ وہاں خوف سا چھا گیا۔ یہ رضا کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟ وہ اچھا بھلا تو تھا۔ نوید آہستگی سے اُسکے پیچھے گیا۔

رضا کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اُس نے جھکے چہرے کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور اگلے ہی لمحے نوید نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

''ارے! کون ہے؟'' وہ چیخا، پر نوید نے اُسکی چیخ کو نظر انداز کیا اور اسی طرح، اُسے بازوؤں میں جکڑے پیچھے گھسیٹا۔

''ارے! چھوڑو مجھے! پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' وہ چیخ رہا تھا، جبکہ دوسری جانب باقی چاروں خوفزدہ نظروں سے، اُن دونوں کو آپس میں گتھم گتھا دیکھ رہے تھا۔

''چھوڑو مجھے!'' نوید اُسے پیچھے گھسیٹ رہا تھا، اور وہ بھی واپس کھائی کے کنارے جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو رضا!'' نوید نے پوری قوت سے اُسے پیچھے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔'' اُس نے بھی نوید کو دھکّا دینے کی کوشش کی، پر ایس ایس پی صاحب کے آگے کس کی چلتی ہے؟

''ارے! میرا ڈرون۔۔۔۔۔'' اس بار وہ پوری قوت سے چیخا اور نوید کو پیچھے دھکّا دے ہی دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے پتھریلی سطح سے ٹکرایا، اور اگلے ہی لمحے رضا کے ہاتھ میں تھا ماڈرون کیمرے کا ریموٹ، سب کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اُس نے تیزی سے ڈرون کو کنٹرول کیا، جو بس کریش لینڈنگ کرنے ہی والا تھا، اور اب کہ ڈرون بھی نظر آ گیا۔

صد شکر کہ کریش ہونے سے پہلے ہی رضا نے اُسے قابو کر لیا اور وہ سیدھا اُسکے ہاتھوں میں آیا، جسے اُس نے سرعت سے پکڑا۔ پہلے تو اُس نے ڈرون الٹ پلٹ کر تسلی کی کہ اُسے کچھ ہوا تو نہیں ہے؟ پھر غضبناک ہو کر نوید کو دیکھا، جو اپنا بازو سہلاتا، لب بھینچے علی کو گھور رہا تھا۔ جبکہ علی نظریں چراتا یہاں وہاں دیکھنے میں مصروف تھا۔ حسین، مقدّم اور عمر نے منہ کھولے رضا کو دیکھا، پھر پلٹ کر بیساختہ علی کو، جو فلحال کسی سے بھی نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

''کیا کر رہے تھے تم؟ پاگل ہو گئے تھے کیا؟'' رضا چیخا۔۔۔ایس ایس پی نوید عالم پر؟

''تم۔۔۔تم کھائی کے کنارے کیا کر رہے تھے؟'' نوید گڑبڑایا۔ شاید پہلی بار!

''سورج طلوع ہونے کا منظر کیپچر (قید) کر رہا تھا کیمرے میں۔'' اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ شکر آس پاس اُن لوگوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ کیبن کا مالک بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔

''اوہ! تو تم ویڈیو بنا رہے تھے؟ ہمیں لگا کہ۔۔۔'' علی نے بیساختہ کہا اور پھر رکا۔

''کہ؟ کہ کیا؟ آگے بولو؟ یہی لگا نہ کہ میں خودکشی کر رہا تھا؟'' اُس نے کینہ توز نظروں سے سب کو دیکھا۔

''ہمارا قصور نہیں ہے، ہمیں تو علی نے کہا تھا۔'' مقدّم نے فوراً سارا ملبہ اُسکے سر ڈالا۔

''خدا کی قسم! یہ آدمی کبھی میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔'' رضا نے چڑ کر کہا، اس ساری صورتحال میں علی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

''کچھ نہیں تو مجھ سے پوچھ ہی لیتے کہ میں وہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں؟ آتے ہی حملہ کر دیا۔'' اب کہ اُس نے نوید کو دیکھ کر کہا۔

''کیسے پوچھ لیتا؟ مجھے تو یہی لگا کہ تم خودکشی کر رہے ہو۔'' نوید بھی جھنجھلایا ہوا تھا۔

''کیوں لگا تم لوگوں کو ایسا؟ پاگل ہوں کیا میں؟ بیٹھے بیٹھے خودکشی کے شوق چڑھتے ہیں مجھے؟ علی کی بات پر تو یقین ہی نہ کیا کرو۔'' وہ ٹھیک ٹھاک تپ گیا تھا۔

''کیوں؟ میں نے کیا کر دیا ہے ایسا؟'' اُسکے کان کھڑے ہوئے تو فوراً پوچھا۔ حالانکہ اُسکا یہ سوال کرنا بنتا نہیں تھا۔

''تم نے اُس رات جو حرکت کی تھی، اُسکے بعد تمہارا بھروسہ کیا بھی نہیں جا سکتا۔'' اتنی دیر سے خاموش عمر نے اُسکی گمشدگی والی رات کا ذکر کیا۔ جبکہ باقی دونوں اب دانت نکالے ہنس رہے تھے۔

''کیا حرکت کر دی تھی میں نے؟ کچھ دیر اکیلا ہی تو رہنا چاہتا تھا، اگر انتظار کر لیتے تو واپس آ ہی جاتا۔'' رضا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے ڈرون نکالا کب تھا؟'' مقدّم نے بھی بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جب تم لوگ فضول گفتگو میں وقت ضائع کر رہے تھے۔''اُس نے منہ بنایا۔ گھورتی نظریں اب بھی علی پر ہی تھیں۔ نوید بھی وہاں آیا اور ایک نظر علی کو دیکھا۔

''تم بھی سوچ سمجھ کر بولا کرو۔''اُس نے علی کو سنجیدگی سے کہا پھر باقی سب کو دیکھا۔

''اب اپنا اپنا سامان اُٹھاؤ اور اٹھو! ہمیں آگے چلنا ہے۔''نوید نے کہا۔

''چائے تو پینے دو۔''رضا نے کہہ کر چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔

--------+---------+----------

''یہ گھر ہے؟''اپنا بیگ اُس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر کے، چھوٹے سے صحن میں رکھتے ہوئے حسین نے پوچھا۔ یہ گھر کھرپوچو قلعے سے تھوڑا فاصلے پر بنا تھا۔ گھر کے دروازے سے قلعے کی لمبی اور مضبوط اینٹوں سے بنی دیوار نظر آتی تھی۔ صحن کی کھلی چھت سے آس پاس کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

''ہاں! یہی ہے۔''نوید نے کہا۔ صحن کی بائیں جانب واش بیسن لگا ہوا تھا۔ اُسی کے برابر میں باورچی خانے کا دروازہ تھا۔ دائیں جانب، ایک بیت الخلا، اور ایک غسل خانہ تھا۔ سامنے کی جانب دو دروازے تھے، جو دراصل دو کمرے تھے۔

''یہ؟ اتنا چھوٹا سا؟''مقدّم کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

''اب ہر مرتبہ انگریزوں کے دور کی حویلی تو نہیں مل سکتی نا؟''عمر نے اُسے جواب دیا۔

''یہاں بھلا کیسے رہیں گے؟''حسین نے ہاتھوں کا چھجّا بناتے ہوئے کہا، دوپہر ایک بجے کی دھوپ اُنکی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔

''تم نے یہاں ساری زندگی نہیں گزارنی، بس آج کا دن ہے۔ ہم کل صبح ہی واپسی کے لیے نکل جائیں گے۔''نوید نے کہا اور اپنا بیگ صحن میں رکھے تخت پر رکھ دیا۔

''تم لوگ اندر جا سکتے ہو۔ دو کمرے ہیں۔ اسی میں سب کو رات گزارنی ہے۔''اُس نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ کمرہ سادہ سا تھا۔ چاروں جانب کشن رکھے تھے، درمیان میں قالین بچھا تھا ، جسکے عین اوپر چھت کے درمیان ایک چوکر سا روشن دان تھا، جس سے صبح کی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ باری باری منہ ہاتھ دھونے کے بعد جسکو جہاں جگہ ملی، وہ وہیں پڑ گیا۔ چھے گھنٹے کی چڑھائی نے اُنکا جو حال کیا تھا، اُسکے بعد وہ، سوائے نوید کو دل ہی دل میں کوسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ علی کا تو پاؤں ہی سوج گیا تھا، لہٰذا وہ اُسے سیدھا کر کے، قریب ہی کشن پر ڈھیر ہو گیا۔ رضا خود اپنے پاؤں کا مساج کر رہا تھا جبکہ نوید تاسف سے اُن لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کا حال ہی برا ہو چکا تھا۔ صرف مقدّم ہی تھا جو سکون سے بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آہ! میرا پاؤں!''حسین نے دہائی دی تھی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم لوگ اتنے نازک نکلو گے۔اتنی سی چڑھائی چڑھ کر یہ حال ہے۔''نوید سے ضبط نہ ہوا تو بول پڑا۔

''اتنی سی؟''سب نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''اتنی ہی سی تھی۔تم لوگوں سے زیادہ تو یہاں کے بچے چلتے ہیں دن بھر۔اور تم سب یہاں بوڑھوں کی طرح رو رہے ہو۔مرد بنو!''نوید نے لتاڑا۔اُسکے انداز و مزاج میں آہستہ آہستہ رونما ہونے والی تبدیلی کو سب ہی نوٹ کر رہے تھے۔نوید کا اسطرح اپنے خول سے آہستہ آہستہ باہر آنا،خوش آئند تھا۔

''تم نا۔۔۔بولا ہی مت کرو تو اچھا ہے۔جب بولتے ہو کچھ زہر ہی اگلتے ہو۔''حسین کو اس وقت اُسکی نصیحت بالکل پسند نہیں آ رہی تھی۔

''تم نے ہی کہا تھا کہ بولا کرو۔''اُس نے جواب دیا۔یعنی اب بھگتو!

''بولنے اور زہر اگلنے میں فرق ہوتا ہے۔''حسین نے جتایا۔

''وہ دونوں چپ ہوتے ہیں تو یہ دونوں شروع ہو جاتے ہیں۔''مقدّم نے بیزاری سے کہا۔واقعی رضا اور علی کے بعد حسین اور نوید کی کوئی نہ کوئی کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کا انتظام اُنکے لیے وہاں کے ایک رہائشی نے کر دیا تھا۔رات اُنہوں نے صرف پھلوں پر گزارا کرنا تھا۔ ویسے بھی رات ہوتے ہوتے یہ گھر برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ علی نے تو ڈبل جیکٹ پہن لی تھیں۔پر سردی تھی کہ ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ آس پاس اتنا سنّاٹا تھا کہ عجیب وحشت طاری ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اب تو کمرے سے نکل کر صحن میں بنے باتھروم تک جانے کی ہمت بھی نہ تھی۔

''حسین!ایک بات تو بتاؤ!''مقدّم نے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔جانتا تھا رات کسی نے بھی نہیں سونا۔

''پوچھو!''سیب کی قاش منہ میں رکھتے حسین نے پوچھا۔پھر دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے تمہاری منگنی تو تمہاری کسی کزن سے ہوئی تھی۔کیا نام تھا اُسکا؟''مقدّم نے ذہن پر زور دینا چاہا۔

''ایمان نام تھا اُسکا۔''حسین نے کہا۔

''تو پھر یہ حور عین سے تمہاری شادی کیسے ہو گئی۔''اس بات پر رضا کے کان کھڑے ہوئے۔اس سوال کا جواب حسین نے اُسے بھی نہیں دیا تھا۔

''لمبی کہانی ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں سننے کو تیار ہوں۔ بہت لمبا وقت ہے صبح ہونے میں۔''اُس نے دلچسپی سے کہا۔

''دیکھو! ابّا نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟ میں نے کہا نہیں! تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہاری منگنی ایمان سے کر رہا ہوں۔ میں نے کہا جیسے آپکی مرضی۔۔۔''

''یہاں تک تو ہمیں بھی معلوم ہے۔''رضا نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ پر مسئلہ تب کھڑا ہوا جب۔۔۔''

---------+---------+--------

''تم نے ایمان سے شادی کے لیے ہاں کر دی؟''حسین اپنے سے ایک سالہ بڑے بھائی کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا، جب حور عین تن فن کرتی وہاں آئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز، چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ ایک ہی پلیٹ میں سے فرائیز کھاتے حسین اور اُسکے بھائی نے حیرت سے اُسے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا تھا اسکو؟

''ہاں! تو؟''حسین نے کہا۔

''کیوں؟''وہ تقریباً چیخی تھی۔ آنسو آنکھوں سے چھلک کر گالوں پر بہہ نکلے۔

''کیا مطلب کیوں؟''حسین نے آنکھیں پھاڑ کر اور منہ کھول کر اُسے دیکھا۔ اُسکے بھائی نے غیر محسوس انداز میں فرائیز کی پلیٹ اُسکے ہاتھوں سے لے لی۔

''کیوں مطلب کیوں ہی ہوتا ہے حسین!''اُس نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

''اب اس کیوں کا کیا جواب دوں؟ ابّا نے پوچھا اور میں نے ہاں کر دی۔ بس!''اُسے اس سوال کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا تھا، اُسکا بھائی فرائیز سے انصاف کرتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ صد شکر کہ حسین کی توجہ اُسکی جانب نہ تھی۔

''تو تم منع نہیں کر سکتے تھے؟''اس نئے مطالبے پر تو اس کا دماغ ہی گھوم گیا۔

''کیوں منع کر دیتا؟''اُس نے مزید حیرت سے پوچھا۔

''کیوں؟ پسند کرتے ہو اُسے؟''ایک اور عجیب سوال۔

''ناپسند بھی نہیں کرتا۔''اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! جاؤ کر لو شادی، میں بھی ابّو کو اظہر کے لیے ہاں کر رہی ہوں۔'' وہ پیر پٹختی جانے کے لیے مڑی۔

''وہ تو میں کروں گا ہی۔ پر تمہیں کیا ہوا ہے اچانک؟ تم سے مشورہ نہیں لیا اِس لیے رو رہی ہو؟'' اپنے پیچھے اُسے حسین کی آواز سنائی دی پر وہ رکی نہیں۔

''یہ کیا پاگل ہے؟'' حور کے جانے کے بعد اُس نے اپنے بھائی کو دیکھ کر پوچھا جو پوری پلیٹ چٹ کر چکا تھا۔

''پاگل وہ نہیں! پاگل تم ہو۔ سیدھی سیدھی بات سمجھ نہیں آئی تمہیں؟'' اُسکے بھائی نے کہا۔

''مطلب؟'' اُسے واقعی سمجھ نہیں آئی۔

''مطلب یہ کہ تم گھاس کھاؤ!'' وہ پلیٹ اُسکے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔

''میری فرائیز!'' وہ خالی پلیٹ دیکھ کر صدمے سے چیخا تھا۔

--------+---------+----------

اور جب تک حسین کو سمجھ آئی۔ اُسکی اور ایمان کی منگنی کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ سمجھ آنے پر اُس نے پہلے اپنا سر پیٹا، پھر حور عین کی عقل پر ماتم کیا، جو اُسکی دوستی کا مطلب غلط نکال کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ اور بات ہے کہ اگر ابّا اُس سے حور عین کے لیے پوچھتے تو بھی وہ انکار نہ کرتا، ایمان سے بھی اُسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مختصر لفظوں میں وہ ابّا کی پسند پر راضی تھا، اُسکی اپنی کوئی خاص پسند نہ تھی۔ اور ایسا بس اُسے لگتا تھا، پر اپنے اندازے کے غلط ہونے کا اُسے تب احساس ہوا، جب اُسے حور عین اور اظہر کے رشتے کی اطلاع ملی۔

''تم پاگل ہو کیا؟ تم نے اظہر کے رشتے کے لیے ہاں کیوں کر دی؟'' آج وہی سوال حسین اُسکے سر پر کھڑا کر رہا تھا۔ اور کیوں کر رہا تھا؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

''کیوں کا کیا مطلب؟'' صوفے پر بیٹھ کر ناخنوں کو فائلر سے رگڑتی حور عین نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور سکون سے جواب دیا۔

''تم ایسا ضد میں کر رہی ہو نا؟'' وہ بے بسی سے بولتا اُسکے سامنے والے صوفے پر بیٹھا۔ وہ پہلی بار اتنا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''کونسی ضد؟ ضد کہاں سے آ گئی اس میں؟'' وہ حیران ہوئی۔ یا حیران ہونے کی اداکاری کی۔

''حور! وہ تم سے عمر میں بہت بڑا ہے۔ اور تم دونوں کے مزاجوں میں بھی بہت فرق ہے۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''کیا میں نے تم سے مشورہ مانگا؟''

''میں نے کب تمہیں کوئی امید دلائی؟ یا تم سے کوئی وعدے کر لیے جو تم اسطرح کر رہی ہو؟''وہ جھنجھلایا،اُسے خود بھی نہیں پتہ کہ کیوں؟

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟''اب کہ اُس نے بھی بیزاری سے فائلر میز پر پٹخا۔

''یہ تو تم بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم خوش نہیں رہو گی اُسکے ساتھ۔روبوٹ ہے وہ آدمی۔۔۔روبوٹ!''

''تمہیں کیا میں روبوٹ سے شادی کروں یا خلائی مخلوق سے؟ تم نے تو ایمان سے شادی کر لی نا؟''وہ ایک مرتبہ پھر روہانسی ہوئی۔حالانکہ وہ اس طرح بات بات پر رونے والی لڑکی نہیں تھی۔وہ رلانے پر یقین رکھتی تھی۔اُسکا مشہور زمانہ مقولہ تھا کہ جو جینا حرام کرے،اُسکا مرنا حرام کر دو۔

''شادی نہیں منگنی ہوئی ہے۔اور منگنی ختم بھی کی جا سکتی تھی۔اگر تم یہ فضول اقدام نہ لیتی تو۔''حسین کی زبان سے بیساختہ پھسلا تھا۔اُسے خود بھی پتہ نہ چلا کہ یہ اُس نے کیسے کہہ دیا؟

''کیا مطلب؟ تم۔۔۔تم منگنی ختم کر دیتے؟''وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔حسین کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔وہ یہاں اُسے امید دلانے نہیں آیا تھا۔

''نہیں!ایسی بات نہیں ہے۔میرا مطلب۔۔۔تمہیں مجھ سے اچھا اور مجھ سے بہترین کوئی انسان مل جائیگا۔تم اظہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد مت کرو۔'' اُس نے سکون سے سمجھانا چاہا۔

''تم کیوں نہیں؟''وہ ضدی ہوئی۔

''کیونکہ میں تمہیں صرف دوست سمجھتا ہوں۔بیوی کی حیثیت سے نہیں سوچتا تمہیں۔''اُسکی بات پر حور عین کا چہرہ تاریک ہوا۔

''حور!تم چاچو کی اچھی بیٹی ہو،ابّا کی بھی چہیتی ہو،اگر میں تمہاری ضد کے آگے جھک بھی جاؤں،تو ابّا اور چاچو تو شاید بخوشی راضی ہو بھی ہو جائیں،لیکن مجھے بتاؤ!ان سب میں ایمان کا کیا قصور؟اُس بیچاری نے میرا یا تمہارا کیا بگاڑا ہے؟اگر تم پہلے یہ سب کہتی تو میں شاید ابّا سے خود بات کرتا،پر اب نہیں!کیونکہ اب ان سب میں صرف ایک انسان کو تکلیف پہنچے گی۔اور وہ ہے ایمان۔اور اُسکا دل دکھا کر ہم دونوں خوش نہیں رہ سکتے۔''اُس نے دونوں کہا۔تم نہیں کہا۔ حور عین کے آنسو یکدم تھمے۔

''میں جانتا ہوں تم کسی کا دل دکھانے والی انسان نہیں ہو۔تم کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔صرف اپنی خوشی کے لیے ہم دونوں کسی کا دل نہیں دکھائیں گے۔ٹھیک ہے؟''اُس نے پھر دونوں کہا۔وہ بار بار کچھ نہ کہہ کر بھی سب کہہ رہا تھا۔

''پلیز! اس بات کو اب یہیں ختم کرو۔ ہم دونوں دوبارہ اِسکا ذکر نہیں کریں گے، اور ویسے ہی رہیں گے جیسے رہتے ہیں۔ تم بھی سب بھول جاؤ اور اظہر کے لیے انکار کر دو۔''اُس نے حتمی انداز میں کہا۔

''اب نہیں کر سکتی، کل وہ لوگ رسم کے لیے آ رہے ہیں۔ ابّو خوش ہیں بہت، اور میں اُنکا سر نہیں جھکا سکتی۔''اُس نے آہستگی سے کہا تو حسین افسوس کے ساتھ اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

--------+---------+----------

حسین اوپر سے جتنا لاابالی تھا، پر اندر سے وہ اتنا ہی سمجھدار، اور ذمہ دار تھا۔ وہ احساس کرنا جانتا تھا۔ اُس نے نہ صرف حور عین کو سمجھا لیا، بلکہ خود کو بھی حتیٰ الامکان اُس سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ پر حور عین پھر بھی پہلے کی طرح ہی اُس سے بات کرتی تھی۔ معلوم نہیں وہ راضی ہو گئی یا نہیں۔ پر اُس نے دوبارہ حسین سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ ویسے بھی حسین کو ایسا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا اُس سے۔ ایسا صرف اُسے لگتا تھا۔

اُسکی منگنی تک وہ چڑچڑا ہونے لگا تھا۔ حالانکہ جب وہ خوش نظر آنے لگی تھی تو اُسے بھی خوش اور مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، پر وہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ اظہر جیسے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے والے بندے کو دیکھتا، تو چاچو پر غصّہ آتا کہ کیا سوچ کر اپنی لاڈوں پلی بیٹی اُسکے حوالے کر دی۔ ایمان کبھی کبھی اُس سے پوچھتی کہ آج کل وہ اتنا سنجیدہ کیوں رہنے لگا ہے؟ تو وہ صنوبر کے مقدمے کا بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ ایمان اچھی لڑکی تھی، وہ اُسکے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز اُنکی زندگی میں ایسا آیا، جس نے اُن سب کی تقدیریں بدل دی۔ اُس روز حور عین کو اُسکی ساس نے ضد کر کے اظہر کے ساتھ شادی کی خریداری پر بھیج دیا۔ اظہر کو کیا پسند کرنا تھا؟ وہ تو بیزار منہ بنائے، بس اس انتظار میں تھا کہ حور عین اپنی خریداری کرے اور وہ یہاں سے بھاگے۔ بار بار منہ بناتا گھڑی دیکھتا، جیسے پتہ نہیں کتنا وقت برباد ہو رہا ہو؟ حور عین کو اُسکی بیزاری نظر آ رہی تھی، پھر بھی ڈھیٹ بنی پورا مال گھومتی رہی۔

''حور عین! اگر آپ کو کچھ پسند نہیں آ رہا تو بتا دیجیے۔ ہم پھر کسی دن آ جائیں گے۔''بلآخر جب اظہر کا ضبط جواب دے گیا تو اُس نے ذرا ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے درخواست کی۔

''ارے! دوبارہ کیوں آ جائیں گے؟ ابھی تو ایک ہی فلور دیکھا ہے، پہلے تسلی سے پورے مال کی دوکانیں دیکھ لوں، پھر آخر میں فیصلہ کروں گی کہ کہاں سے لہنگا لینا ہے۔''اُس نے بھی ڈھٹائی سے کہا تو اظہر نے ضبط کیا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کرتے کیا ہیں؟ چھے مہینے پاکستان اور چھے مہینے دبئی۔ یہ کیسا کام ہے؟''اُسکے ساتھ چلتے ہوئے حور عین نے اُسکی بوریت دور کرنے کے لیے سوال کیا۔

''آپکو میرے کام سے کیا لینا دینا؟''اُس نے یکدم ہی رک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا مطلب مجھے کیا لینا دینا؟ مجھے لینا دینا نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا؟''وہ حیران ہوئی۔ سال ہونے والا تھا انکی منگنی کو اور حور عین کو اب تک اُسکے بارے میں بنیادی معلومات بھی نہ تھیں۔

''حور عین!''وہ رکا تو وہ بھی رک گئی، اُسکے چہرے پر ناگواری سی چھائی ہوئی تھی۔''ایک بات میری آپ آج اچھے سے ازبر کر لیں۔ مجھے وہ عورتیں ہرگز نہیں پسند جو مردوں سے سوال جواب کرتی ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں، کہاں آتا جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں؟ یہ آپکا میٹر نہیں ہے۔ ازاٹ کلیئر؟''اُس نے اتنی سختی سے کہا کہ وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔ اتنی سختی سے اُس سے آج تک کسی نے بات نہیں کی تھی۔

''اب آپ کو کچھ نہیں لینا تو فوڈ کورٹ چلتے ہیں۔ امی نے کہا تھا کہ آپکو لنچ کروا کر ہی آؤں۔''وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ آنسو پیتی اُسکے پیچھے آئی۔ وہ تیز تیز چلتا اُس سے بہت آگے جا رہا تھا، اُس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش میں وہ تھکنے لگی تھی۔ اُسی لمحے حور عین کو احساس ہوا کہ وہ تاعمر اُسکے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکے گی۔ وہ فوڈ کورٹ میں پہنچے تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سامنے ہی حسین اور ایمان ساتھ مل گئے تھی۔

''تم دونوں؟''حور عین اُنہیں دیکھ کر حیران ہوئی۔ اظہر بھی رک گیا۔

''ایمان کا نکاح کا جوڑا غلط آگیا ہے، اُسے تبدیل کروانے آئے تھے۔ سوچا کہ لنچ بھی کر لیں۔''حسین نے اظہر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

''ہم بھی لنچ ہی کرنے آئے ہیں۔ چلیں ساتھ ہی کرتے ہیں، اگر آپ دونوں کو برا نہ لگے تو۔''اظہر نے ایمان کی جانب دیکھتے پیشکش کی، تو حور عین کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''نہیں! ہمیں کیوں برا لگے گا؟''ایمان نے کہا۔

''چلیں! پھر آئیں۔''وہ لوگ ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

''تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''حسین نے پیچھے آتی حور عین سے آہستگی سے پوچھا۔

''میرا کیوں منہ لٹکا ہوگا؟ بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بلکہ منہ تو آج کل تمہارا لٹکا ہوا ہے۔''اُس نے دوبدو جواب دیا تو وہ اداسی سے مسکرایا۔ جب سے اُسکے دوست الگ ہوئے تھے، وہ چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔ وہ لوگ میز پر پہنچے تو اظہر، ایمان سے اُسکی پڑھائی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''کھانا کون آرڈر کر رہا ہے؟''حور عین نے بیٹھتے ہی اپنے لاپرواہ انداز میں کہا تو اظہر نے بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔

''کھانا ہم آرڈر کر دیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' حسین نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اظہر کے سامنے بھی وہ بائولی اپنے ازلی انداز میں ہی بات کر رہی تھی۔

''ہاں! اور بعد میں تم مجھ سے حساب کتاب کرو گے؟ ایسا ہر گز نہیں ہو رہا۔ ابھی فیصلہ کرو۔'' وہ شاید اُسکا اشارہ سمجھی نہ تھی۔

''جانے دو نہ حور! آج حسین کی طرف سے لنچ ہے۔'' ایمان نے درمیان میں کہا۔

''ٹھیک ہے! لنچ میری طرف سے اور ڈرنک حور کی طرف سے۔'' حسین نے فوراً اعلان کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ڈرنک لینے اٹھے تو وہ اسی بہانے اُسے اکیلے میں سمجھا سکے کہ اُسکی ان بچکانہ حرکتوں کو اظہر سخت ناگوار نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

''آ گئے نا اصل بات پر؟ پتہ تھا مجھے۔'' اُس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں آ گیا مطلب کی بات پر، اب اٹھو اور جا کر ڈرنک آرڈر کرو۔ میں کھانا آرڈر کر کے آتا ہوں۔'' حسین نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک نگاہ، اظہر پر ڈالی جو شدید ناگواری سے حور عین کو دیکھ رہا تھا۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتا آگے بڑھا، وہ بھی اُسکے پیچھے ہی آ رہی تھی۔

''کیا آپکی اور حسین کی پسند کی شادی ہے؟'' اُنکے جانے کے بعد اظہر نے ایمان سے پوچھا۔ نظریں دور ہوتے حسین پر تھیں۔

''نہیں! بڑوں کی مرضی پر ہو رہی ہے۔ پر ہماری رضامندی شامل ہے۔'' ایمان نے آہستگی سے کہا۔ وہ ایسی ہی تھی، آہستہ سے اور نرمی سے بات کرنے والی۔

''کیوں ایمان؟'' اُس نے اچانک ہی کہا تو وہ حیران ہوئی۔ ''آئی مین (میرا مطلب)۔۔۔۔ آپ اتنی سمجھدار اور میچور لڑکی ہیں۔ آپ نے حسین جیسے لاابالی لڑکے کے لیے ہاں کیوں کی؟'' کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس وقت اپنے منگیتر کو لاابالی کہنے پر اُسے ٹھیک ٹھاک سناتی۔ پر ایمان نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے، شاندار شخصیت کے مالک مرد کو دیکھا۔ وہ بے حد پڑھا لکھا، رکھ رکھاؤ والا اور بہت ٹھہری ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ پھر ایک نظر نگاہوں سے دور ہوتے حسین کو دیکھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا اظہر! کیا دیکھا تھا اُس نے حسین میں؟

جب وہ اُن دونوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، تب حسین نے یکدم ہی حور عین کا بازو پکڑا اور اُسے تیزی سے فوڈ کورٹ سے باہر لے آیا۔

''کیا ہوا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' اُس نے اپنا بازو چھڑاتے غصّے سے کہا۔

''اظہر کے سامنے اس طرح کی حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اُس نے خفگی سے پوچھا۔

''ایسا کیا کر دیا میں نے جو تم اس طرح سوال کر رہے ہو؟'' وہ واقعی حیران تھی۔

''دیکھو حور! میری اور تمہاری بچپن کی دوستی اپنی جگہ پر اب تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ تمہارا اس طرح میرے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنا درست نہیں ہے۔'' اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھانا چاہا۔

''تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اُس نے بھی سینے پر بازو باندھتے اُسے سنجیدگی سے دیکھا۔

''اظہر تمہیں بہت ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال سے اُسے تمہارا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''میں اُسکی پسند ناپسند کی ذمّے دار نہیں ہوں۔'' اُس نے رکھائی سے کہا۔ شاید تھوڑی دیر پہلے کے اظہر کے رویے کا اثر تھا۔

''تم ذمّے دار ہو حور! وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔ تمہیں اُسکی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی میں کوئی اونچ نیچ ہو۔'' وہ اُسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا، اُسکی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ اسی لیے تو پسند تھا اسے وہ، اُسکے پاس ایک احساس کرنے والا دل تھا۔ اور وہ احساس کرنا جانتا تھا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ آنسو اندر اتارتی واپس پلٹ گئی۔

حسین اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

--------+---------+----------

گھر میں ایک طوفان مچ گیا تھا۔ آج مہندی کی رسم تھی، اور ایمان نے فون کر کے شادی سے نہ صرف انکار کیا تھا، بلکہ ڈھٹائی سے اظہر سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ایمان سے اس جرات کی کسی کو امید نہ تھی۔ حسین کو پتہ چلا تو وہ کتنی ہی دیر گنگ کھڑا رہا۔ بے شک، وہ اُس سے کوئی دلی لگاؤ نہیں رکھتا تھا، پر پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ اُسکی منگیتر تھی، اور پھر اُس نے ایمان کے احساسات و جذبات کا خیال کیا تھا، اُسکا دل نہیں توڑا تھا۔ پر اُس لڑکی نے کیا کیا؟ کتنے آرام سے اُس کے اوپر کسی اور کو فوقیت دے دی؟ ذرا دیر کو بھی نہ اُسکا سوچا نہ اپنے خاندان والوں کا۔ شام کو اس مسئلے پر بات کرنے کے لیے بڑوں کی مشاورت بیٹھی تھی۔

''تم نے کیا فیصلہ کیا پھر؟'' حسین کے ابّا نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

''مرتضیٰ بھائی! میں نے اظہر کی والدہ سے بات کی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور وہ رات کو رسم کے لیے آ رہے ہیں۔'' اس بات پر حسین نے اچھنبے سے اُنہیں دیکھا۔

''چاچو! آپ نے اظہر سے بات کی؟ وہ کیا کہتا ہے؟'' حسین کے بھائی نے پوچھا۔

''نہیں! اظہر سے میری بات نہیں ہو سکی، وہ میرا فون نہیں اٹھا رہا۔ لینڈ لائن پر کیا تھا تو پہلے اُسکی والدہ نے ہی اٹھایا اور کہا کہ وہ کل سے دوستوں میں گیا ہوا ہے۔''اس بات پر سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پر کہا کچھ نہیں۔

''چاچو! آپ انجان ہیں یا جان کر انجان بننا چاہ رہے ہیں؟''اُس سوال پر اُنہوں نے ناپسندیدگی سے حسین کو دیکھا۔

''کیا مطلب ہے اِس بات کا؟''

''اظہر کا فون نہیں اٹھانا، اسی بات کی نشان دہی ہے کہ وہ حور سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں کیا حور کو اُسکے حوالے کرنا چاہیے؟''حسین کے بجائے اُسکے بڑے بھائی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ کمرے کے باہر کھڑی حور عین نے ضبط سے آنکھیں میچی۔

''یہ تم لوگوں نے اپنی مرضی سے مفروضے قائم کر لیے ہیں؟ جب اظہر نے ایسا کچھ نہیں کہا، اور اُسکی ماں نے بھی اس بات کی تردید کر دی ہے، تو میں کیوں پریشان ہوں؟ حور کی شادی ہو گی اور اظہر سے ہی ہو گی۔''انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''چاچو! کیا آپ اُس وقت تک انتظار نہیں کر سکتے، جب تک کہ اظہر کی جانب سے کوئی تصدیق یا تردید نہیں آ جاتی؟''حسین نے کہا تو وہ غصّے سے کھڑے ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔

''تم یہ سب اِس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہاری منگیتر نے تم سے منگنی ختم کرنے کے لیے اظہر کا نام لے لیا ہے؟ اپنے ساتھ تم اور تمہاری وہ منگیتر، میری بیٹی کی زندگی بھی تباہ کرنا چاہتے ہو۔''اُنکے الفاظ نے وہاں کھڑے ہر شخص کو حیران کر دیا تھا۔

''چاچو! چاچو۔۔۔ آپ اندھے ہو گئے ہیں اظہر کی دولت کے آگے، آپ دیکھ نہیں۔۔۔''حسین نے اشتعال میں کہا اور اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر پڑا تھا۔

''اوقات میں رہو اپنی!''وہ دھاڑے تھے۔

''چاچو!''اُس نے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''حسین! یہ تم نے کس طرح بات کی ہے اپنے چچا سے؟ معافی مانگو فوراً!''اُسکے ابّا نے فوراً اُسے ڈانٹا تھا۔

''سوری!''اُس نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر رک کر ایک نظر دور کھڑی حور عین کو دیکھا۔

''سوری حور!''اُسے بھی آہستہ سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

''ابّو! آپ نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟''اگلے ہی لمحے روتی ہوئی حور عین کمرے میں داخل ہوئی اور تڑپ کر اپنے باپ سے بولی۔

''حور! تم خاموش رہو، تمہارا۔۔۔''

''نہیں ابّا! آپ بھلے میری شادی اظہر سے یا کسی بھی ایرے غیرے سے کروادیں، پر آپ نے حسین کو کیوں مارا؟ اُس کی بات پوری سننی چاہیے تھی آپ کو۔'' وہ رونے لگی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں کو ہو کیا گیا تھا اچانک؟

''بس حور! جاؤ اب یہاں سے۔'' اُنہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

وہ رات حسین کے لیے بہت بھاری تھی۔ دوستوں کے ساتھ وہ مخلص تھا، پر انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ایمان کے ساتھ وہ مخلص تھا، اُس نے بھی ایک پل نہ سوچا اُسکا۔ وہ اُسکو کہہ سکتی تھی، اُسکے ساتھ شیئر کر سکتی تھی، اگر وہ پسند نہ تھا تو بتا دیتی، وہ خود اُسکے راستے سے ہٹ جاتا۔ چچا کے ساتھ وہ مخلص تھا پر انہوں نے کیا کیا؟ سب کے سامنے، سارے خاندان کے سامنے اسے تھپڑ مار دیا۔

سارا گھر حور کی مہندی کے فنکشن میں گیا ہوا تھا، پر وہ نہ گیا۔ اُسکی امی آئی تھیں اُسے بلانے، پر وہ نہیں آیا۔ انہوں نے بھی اسے اکیلے چھوڑ دیا۔ اظہر بھی مہندی میں نہیں آیا، ہاں پر اُسکے گھر والے سب آئے تھے۔ چچا کا دل جہاں اُنہیں دیکھ کر مطمئن ہوا تھا، وہیں اظہر کے غائب ہونے پر وہ مشکوک بھی ہوئے تھے۔

''اُسے ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑا ہے۔ کل تک آجائے گا۔'' اُسکی والدہ سے سوال پوچھنے پر انہوں نے کہا تھا۔ چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔

مہندی کا فنکشن اپنے زوروں پر تھا۔ حسین الگ بخار میں تپ رہا تھا۔ حور عین کی خاموشی، حسین کی چچا سے بدمزگی اور اظہر کی غیر موجودگی نے تقریب کو جیسے سرد سا کر دیا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ دلہن بنے ہونے کے باوجود حور عین کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔

مہندی کا فنکشن بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ اگلے روز نکاح ہونا تھا۔ حسین کمرے سے باہر ہی نہیں آیا، اُسکے گھر والے اُسکی وجہ سے الگ پریشان تھے۔ وہ بخار کی دوا کھا کر ایسا سویا کہ پھر کسی نے اُسے نہ اٹھایا۔ اُسکی تمام تر اوٹ پٹانگ حرکتوں کے باوجود بھی، پہلی بار اُسکے ابّا اُس سے متفق تھے۔ پر نظریں چرائے ہوئے تھے۔ حور عین اُنہیں بھی بہت پیاری تھی۔ پر وہ کیا کہہ سکتے تھے، جب اُنکا بھائی ہی کچھ سننے کو تیار نہ تھا؟

حور عین تیار بیٹھی تھی، دل الگ بے کل ہو رہا تھا۔ کل سے اُس نے حسین کو نہیں دیکھا تھا، وہ آخری بار اُسکا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ حسین کی غیر حاضری پر کچھ کچھ اُسکے ابّو بھی اب شرمندہ نظر آرہے تھے۔ اُنہیں احساس تھا کہ انہوں بھی بہت غلط کیا ہے، اُسے اشتعال دلانے والے بھی وہ خود تھے۔ نکاح ظہر کے وقت تھا۔ پر لڑکے والے نہ پہنچے۔ فون کیا تو انہوں نے کچھ دیر انتظار کو کہا۔

دوسری جانب اپنے کمرے میں چت لیٹا حسین گھڑی کی سوئیاں دیکھ رہا تھا۔ ظہر کا وقت گزر چکا تھا۔ یقیناً حور کا نکاح ہو چکا ہو گا۔ اُس نے ضبط سے آنکھیں میچی۔ ظہر سے عصر کا وقت ہو گیا، یہاں تک کہ عصر گزر گئی اور مغرب کا وقت آنے لگا تو وہ پریشانی سے اٹھ بیٹھا۔

''یہ لوگ آئے کیوں نہیں اب تک؟''اُس نے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُنکو فون کرتا، گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ جلدی سے دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اپنے گھر والوں کے منہ سے حور عین کے نکاح کے قصّے نہیں سننا چاہتا تھا۔

دروازہ کھل کر فوراً ہی بند کر دیا گیا۔ یعنی سب لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ یقیناً امی اور بھابھیاں حور کی طرف چلی گئی ہوں گی۔ اُس نے دل میں سوچا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ منٹ اسی طرح گزرے، پھر اُسے اپنے کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُسکے چار عدد بھائی کمرے کے دروازے پر دانت نکالے کھڑے، اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟''اُس نے چہرہ اُٹھا کر حیرت سے پوچھا۔ اُن چاروں کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔

''اُٹھ جاؤ مجنوں کے کچھ لگتے۔۔۔''چاروں کمرے میں داخل ہوئے، اور اُسکے بڑے والے بھائی نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟''وہ جھنجھلا اٹھا۔

''مسئلہ تو اب ہو گا۔ تم نے کل جو بدتمیزی کی ہے ناچاچو کے ساتھ۔ اُسکی سزا ملنے کا وقت ہو گیا ہے۔''اُسکے دوسرے نمبر والے بھائی نے اُسکی چادر کھینچی۔

''میں نے بدتمیزی کی؟ پر میں نے تو تھپڑ بھی کھا لیا تھا کل اُن سے، اُس پر سے معافی بھی مانگ لی تھی۔''وہ شدید حیران ہوا۔

''ہاں! پر چاچو کی تسلی نہیں ہوئی، تمہیں مزید سزا دینی ہے۔''اُسکے بڑے بھائی نے اسے زبردستی کھڑا کیا۔

''تو کیا کریں گے اب وہ کہ انکی تسلی ہو؟ گولی ماریں گے یا چوراہے پر لٹکا دیں گے؟''وہ ناراضگی سے بولا۔

''یہ تو وہ ہی بتائیں گے۔ تم بس جا کر کپڑے بدلو۔''اُسکے تیسرے نمبر والے بھائی نے اُسکا نکاح والا شلوار سوٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''دماغ خراب ہے؟ سزا جھیلنے کے لیے کپڑے بدل کر جاؤں؟ اور وہ بھی یہ نئے والے؟''اسے اپنے بھائی کی عقل پر شک گزرا۔

''ساری دنیا سزا جھیلنے ایسے ہی جاتی ہے۔''اُسکا سب سے بڑا بھائی بڑبڑایا۔

''چاچو کو یہیں لے آتے۔''اسے کوفت ہوئی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہاں حور عین ہو گی اور وہ فلحال اُسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسکے بھائیوں نے مسکراہٹ دبا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''جا کر کپڑے بدلو! پھر سارے جواب مل جائیں گے۔''اُسکے بھائی نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

''میں نہیں کرتا چینج، چلنا ہے تو ایسے ہی چلو۔''وہ بھی ضدی لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

---------+---------+--------

''حسین!''وہ ابھی گھر کے دروازے سے داخل ہی ہوا تھا کہ ابّا سامنے کھڑے نظر آئے۔اسے دیکھ کر وہ اُسکی جانب بڑھے۔

''اسے ایسے ہی لے آئے؟''اسے سیاہ ٹراؤزر پر کاہی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے دیکھ کر اُسکی ماں نے اپنے دیگر بیٹوں سے پوچھا۔

''اس نے بات ہی نہ مانی!''اُسکا بھائی شرارت سے مسکرایا۔جبکہ حسین تو سب کی موجودگی کے باوجود وہاں چھائی عجیب سی خاموشی پر حیران تھا۔حور عین سیڑھیوں کے برابر بنے جھولے پر خاموش بیٹھی تھی، جبکہ چاچو سامنے صوفے پر۔

''چھوڑو ان سب باتوں کو، تم میرے ساتھ یہاں آؤ!''حسین کے ابّا نے پہلے اپنی بیگم کو اور پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔پھر اسے اپنے ساتھ لئے صوفے تک آئے۔

''آ گیا ہے یہ۔''اسے اپنے بھائی کے سامنے کھڑا کر کے، انہوں نے کہا۔وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔سب کی نظریں اُن دونوں پر تھیں۔اُسکے ابّا بھی بھائی کے برابر ہی جا بیٹھے۔

''چاچو!''حسین نے آہستگی سے پُکارا۔''میں جانتا ہوں مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔آئی ایم سوری! لیکن اگر پھر بھی آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو، میں سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''اُس نے سر جھکائے شرمندگی سے کہا۔

''سزا؟ کونسی سزا؟''وہ حیران ہوئے۔ اُسکے بھائی پیچھے کھڑے کھی کھی کر رہے تھے۔

''آپ نے ہی تو یہاں مجھے سزا دینے بلایا ہے؟''اُس نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا۔

''ناہنجار! میری بیٹی تمہیں سزا لگتی ہے؟''چاچو کی جگہ اُسکے ابّا نے غضبناک ہو کر جواب دیا تو وہ مزید حیران ہوا۔

''بیٹی؟ آپکی بیٹی کب ہوئی؟''اُسکی زبان پھسلی تو وہاں قہقہہ پڑا، جبکہ اُسکے ابّا نے اپنی لاٹھی کھینچ کر اسکی ٹانگوں پر ماری۔

''آہ!''وہ بلبلا اٹھا۔سب لوگ ہنس رہے تھے اور وہ حیران سا پاؤں سہلاتا سب کو دیکھ رہا تھا۔

''حور کی بات کر رہا ہوں میں، وہ میری بھی بیٹی ہے۔''انہوں نے کہا۔

''میری سزا کا حور سے کیا تعلق؟'' وہ گڑبڑایا۔

''تم نے ہی تو اسے سزا کہا ہے۔'' وہ غصّہ ہوئے۔

''مجھے سیدھے سیدھے بتا دیں کہ چل کیا رہا ہے؟'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

''ہم تمہارا نکاح حور عین سے کروا رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض؟'' اُسکے ابّا نے کہا۔

''میرا نکاح؟'' اسے سمجھنے میں دیر لگی۔ سب اُسکے تاثرات سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''اِس سے؟'' اُس نے دور بیٹھی حور عین کی جانب اشارہ کر کے کہا، تو سب ایک بار پھر ہنسے۔

''کیا مطلب اِس سے؟ تمیز سے بات کرو!'' امی نے ڈانٹا۔

''نہیں! میرا مطلب اظہر کا کیا؟''

''وہ کل ہی ایمان سے شادی کر چکا ہے۔ اور آج نکاح کے لیے آنے سے قبل ہی اُسکی ماں نے فون کر کے یہ اطلاع دی ہے۔'' چاچو نے کہا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔''

''ہاں! تم نے ٹھیک کہا تھا۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔

''تو پھر مارا کیوں تھا مجھے؟'' اُسکی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''مار تمہیں، تمہاری بکواس پر پڑی تھی۔'' ابّا نے جواب دیا۔

''اچھا اب مذاق ختم کرو۔'' چاچو نے سب کو غیر سنجیدہ دیکھ کر کہا تو وہ خاموش ہوئے۔

''بیٹا! کل بارات ہے۔ ہال وغیرہ بک ہیں۔ رشتے دار بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں بدنامی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ بدنام تو وہ ہوں جنہوں نے یہ حرکت کی ہے۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بہت پیسے ضائع ہوں گے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ کل تم حور سے شادی کر لو۔ بارات اور ولیمے کے ہال اور کھانے کی جو پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے اس کا نقصان نہیں ہو گا۔'' چاچو نے چہرے پر مسکینیت سجاتے کہا تو وہ ہنسا۔

''تو چاچو اتنی بڑی سزا؟'' اُس نے بھی مصنوعی دکھ سے کہا۔ تو ایک مرتبہ پھر لاٹھی اُسکے پاؤں پر پڑی۔ اس مرتبہ حور عین بھی کھلکھلا کر ہنسی، تو اُس نے گھور کر دیکھا۔

''خبر دار! میری بیٹی کو ایسے مت گھورنا، ورنہ اور ماروں گا۔'' ابّا نے دھمکی دی تو وہ سیدھا ہوا۔ محفل میں خوشیاں اُتر آئی تھیں جیسے۔

''دیکھو!'' اب کہ ابّا سنجیدہ ہوئے۔ ''میں نے پہلے تمہاری منگنی اپنی مرضی سے ایمان سے کی تھی۔ اُس نے جو کیا، وہ بہت غلط ہے، اسلیئے اس بار میں اپنی مرضی تم پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں حور عین سے شادی پر اعتراض ہے تو بتادو۔ ہم بالکل برا نہیں مانیں گے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکرایا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بزرگوں! سوائے اسکے کہ۔۔۔'' وہ ڈرامائی انداز میں رکا۔

''کہ؟'' سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

''میں ان کپڑوں میں نکاح نہیں کروں گا۔'' اس نے اپنے رات والے حلیے پر نظر ڈال کر اپنے بھائیوں کو گھورا جو اسے سیدھی بات نہیں بتا سکتے تھے۔

''فکر نہ کرو، میں تمھارا سوٹ ساتھ لایا ہوں۔'' اُسکے چوتھے نمبر والے بھائی نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

''ایک اور اعتراض ہے۔ '' اُس نے پھر ڈرامائی انداز میں کہتے دور بیٹھی حور کو دیکھا۔

''اب کیا ہے؟'' ابّا کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔

''میں چار شادیاں کروں گا۔'' کہتے ساتھ ہی وہ باہر بھاگا کیونکہ اس نے ابّا کو جوتا اٹھاتا دیکھ لیا تھا۔

---------+---------+--------

''اور یوں، ہماری شادی ہوگئی۔'' علی کی لائی گئی پیکٹ والی مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالتے اُس نے قصّہ مکمل کیا تھا۔ سب منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ کتنا بڑا چھپا رستم تھا؟

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' سب کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اُس نے پوچھا۔

''تمہاری زندگی بھی تمہاری طرح مضحکہ خیز ہے۔'' یہ تبصرہ علی کی جانب سے آیا تھا، جس نے سب کے چہروں پر تبسم بکھیرا تھا۔

''زندہ دل لوگ ہیں بھئی! مسائل دل سے لگا کر نہیں بیٹھتے۔'' وہ چادر اپنے گرد لپیٹتے بولا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔

''یہ تو ہے۔'' عمر نے اعتراف کیا۔

''چلو! تمہاری کہانی سن کر وقت اچھا گزرا۔'' مقدّم نے انگڑائی لیتے تبصرہ کیا۔ فجر ہونے والی تھی۔

''تو ایمان کبھی ملی نہیں تمہیں دوبارہ؟'' رضا نے اچانک پوچھا۔

''شوق تو مجھے بڑا تھا کہ کبھی واپس آئے، تو میں اُس سے پوچھوں کہ بی بی اگر تمہیں جانا ہی تھا تو پہلے ہی بتا دیتی، میرا فضول کا خرچہ کروایا۔ اُسکی شادی کا لہنگا میں نے اپنے جمع شدہ پیسوں سے لیا تھا۔ وہ بھی واپس نہیں کیا اس نے۔'' اُس کے غم بھی نرالے تھے۔ وہ لوگ ہنسے۔۔۔۔

''ہنسو مت! اظہر کی ماں تو واپس لے گئی تھی اپنا دیا ہوا لہنگا، حور کے لیے بھی مجھے پیسے ضائع کرنے پڑے۔'' اُس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ (صاف اداکاری!)

''تمہارے ساتھ بالکل صحیح ہوا۔'' علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پر ایمان جو اظہر کے ساتھ ملک سے باہر گئی تو پھر واپس ہی نہیں آئی۔ شاید شرمندگی کی وجہ سے۔۔۔ ایک بار آتی تو میں شکریہ ضرور ادا کرتا اُسکا۔'' اُس نے پیکٹ میں رکھی آخری مونگ پھلی بھی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اُسکا شکریہ کس لیے؟'' عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ انکار نہ کرتی تو حور کیسے ملتی مجھے؟'' اُس نے مزے سے کہا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھری۔۔۔ اس مرتبہ ایس ایس پی صاحب کے چہرے پر بھی!۔ رضا نے آسودگی سے مسکراتے اُسے دیکھا، پھر چہرہ جھکا لیا۔

''پہلا آدمی ہے جسے دنیا میں حور مل گئی ہے۔ اسکو جنت میں حوروں کی ضرورت نہیں ہو گی۔'' مقدّم نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

''ایک منٹ!۔۔۔ ایک منٹ!۔۔۔ یہ کس نے کہا تم سے؟'' حسین نے سنجیدگی سے پوچھا تو ایک بار پھر وہاں ہنسی کا دور چلا۔

''نہیں! یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے، جنت والی حوریں جنت والی ہوتی ہیں۔ اُنکو نہیں ٹھکرانا چاہیے۔۔۔'' وہ سمجھداری سے کہہ رہا تھا اور محفل کشت زعفران بن چکی تھی۔

---------+---------+--------

سورج نکلنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جی کڑا کر کے وہ واپسی کے لیے نکلے۔ ایک مرتبہ پھر سے دشوار راستوں کا سفر کر کے وہ لوگ جب حویلی واپس پہنچے تو فیومیگیشن کی ہلکی ہلکی بو سارے میں موجود تھی۔ اکرم نے کھانے کا انتظام کر دیا تھا لیکن وہ لوگ تھک کر جو سوئے تو رات کو ہی جاگے تھے۔ اکرم کا لایا کھانا رات کو کام آ گیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد سب ایک مرتبہ پھر اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے، حویلی سے اُنہیں ایک عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی، کم از کم اس دو کمرے کے ڈربے جیسے گھر سے تو اچھی ہی تھی۔ پہاڑوں کا اتنا لمبا پیدل سفر کر کے اُنکی ٹانگوں کا جو حال ہوا تھا، اُسکے بعد اُن میں سے کوئی بھی کم از کم آج کی رات تو باہر نہیں نکلنے والا تھا۔

''پیر کیسا ہے تمہارا؟'' اپنے کمرے میں رضا نے برابر والے پلنگ پر نیم دراز علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا، جسکا دایاں پاؤں اب بھی سوجا ہوا تھا، وہ اسے ایک کشن پر رکھے نیم دراز تھا۔

''ویسا ہی ہے جیسا سب کا ہوتا ہے۔'' اُس نے جواب دیا تو رضا نے سر تا پاؤں اسے گھورا۔

''مار لیا جوک؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''دیکھ ہی رہے ہو تم کیسا ہے؟'' علی نے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔ خود ہلنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رضا نے یہاں وہاں دیکھتے پیشکش کی۔ علی نے آنکھیں چھوٹی کر کے بغور اسے دیکھا۔ وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا، اب پیشکش کر ہی دی تھی تو براہِ راست بات بھی کر لیتا۔

''واقعی میں؟'' اُس کی آنکھیں شرارت سے چمکی۔

''ہاں! اتنا برا آدمی نہیں ہوں میں۔ انسانیت ہے میرے اندر۔'' اُس نے پھر دیواروں پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ایک کام کرو پھر، مجھے سامنے، جگ سے پانی نکال کر دے دو گلاس میں۔'' اُس نے بنا کسی لحاظ کے آرڈر دیا تو اب کہ رضا نے براہِ راست اسے دیکھا بلکہ گھورا۔

''انسانیت؟'' اسے خود کو گھورتا پا کر علی نے یاد دلایا تو وہ دانت کچکچاتے اٹھا اور میز پر رکھے جگ میں سے پانی نکال کر اسے لا کر دیا۔

''اوہ! وہ میری درد کی دوائی بھی وہیں رکھی ہے۔ دے دینا ذرا!'' علی نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو اُس نے ضبط کے گھونٹ بھرے اور دوبارہ میز تک آیا، پھر اُسکی مطلوبہ دوا نکال کر اُسے لا کر دی۔

''شکریہ!'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو رضا اُسے گھورتا ہوا واپس اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

''رکو رکو!'' علی نے فوراً کہا تو وہ پلٹا۔

''کیا؟''

''یہ واپس کون رکھے گا؟''اُس نے گلاس اور دوا کے پتّے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ رضا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ فوراً بولا۔

''انسانیت؟''وہ کڑے تیوروں سے گھورتا اُسکے پاس آیا، پھر گلاس اور دوا اس سے تقریباً چھینتا ہوا واپس لے گیا۔ پھر اپنے بستر پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ

''یہ ہیٹر ذرا کم کر دو، اور یہ والی لائٹ بھی بند کر دینا، میری آنکھ پر پڑ رہی ہے۔''اُس نے چہرے پر معصومیت سجاتے، شیطانیت سے کہا۔

''انسانیت۔۔۔''اسے منہ کھولتے دیکھ کر پھر یاد دہانی کروائی۔ وہ خون کے گھونٹ بھرتا اُٹھا اور غصّے سے ہاتھ مار کے لائٹ بند کر کے واپس آیا۔

''ہیٹر بھی کہا تھا۔''علی نے یاد دلایا۔

''بھاڑ میں گئی انسانیت۔۔۔''رضا غصّے سے بولا اور لحاف سر تک تانے لیٹ گیا۔ لحاف کے اندر سے اُسکی بڑبڑانے کی آواز واضح تھی۔ علی ہنستا رہ گیا۔

دوسری جانب اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹتے حسین کی آنکھ کھڑکی کی آواز سے کھلی تو اُس نے نیم بیداری میں پلٹ کر دیکھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بند کھڑکی کے پٹ ہلے تھے۔ اُس نے جمائی لیتے کروٹ بدلی تو نوید کا پلنگ خالی پایا، وہ غائب تھا۔ پہلے تو اُس نے نظر انداز کیا، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر پورا ہی بیدار ہو بیٹھا۔ نوید تو کمرے میں آیا ہی نہیں تھا۔ اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے تین بج چکے تھے۔ نوید اتنی دیر سے کہاں تھا؟ وہ متجسس ہوا۔

نوید ہمیشہ اُسکے سونے کے بعد سوتا تھا، اور اُسکے اٹھنے سے پہلے جاگ جایا کرتا تھا۔ یا شاید وہ سوتا ہی نہیں تھا، اور اگر سوتا بھی تھا تو معلوم نہیں کب؟ حسین نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس نے پیروں میں چپل ڈالی، پھر پلنگ کے سرہانے لٹکا اپنا جیکٹ اٹھا کر پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری ہمیشہ کی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ ابھی راہداری میں ہی تھا کہ اسے اپنے کمرے کے برابر والا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے آج تک اِس دروازے کو بند دیکھا تھا، وہ اسے کوئی کمرہ ہی سمجھتا تھا۔ پر وہ ایک راہداری کا دروازہ تھا۔ ایک اور طویل راہداری۔۔۔

''کتنی راہداریاں ہیں اس حویلی میں؟''وہ حیران ہوتا دروازے سے اندر راہداری میں داخل ہوا۔ طویل راہداری میں دونوں جانب دیواروں پر پرانے وقتوں کے اسلحے سجے تھے۔ چھت پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پیلی ایل ای ڈی بلب جل رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا، اسے یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ راہداری کے اختتام پر کیا ہے؟

جیسے ہی راہداری ختم ہوئی، اُسکی آنکھیں حیرت سے پھٹیں اور منہ **اوہ** کے انداز میں کھلا تھا۔ وہ ہال نمبر دو کی پہلی منزل پر کھڑا تھا، سامنے ہی ریلنگ تھی، جس سے نیچے ہال نمبر دو نظر آرہا تھا۔ تو یہ دروازہ ہال نمبر ایک کی پہلی منزل کو حال نمبر دو کی پہلی منزل سے جوڑتا تھا۔ وہ پچھلے دو روز سے یہ سمجھ رہا تھا کہ ہال نمبر دو، جہاں تمام قسم کی چیزیں موجود تھیں، وہاں تک جانے کے لیے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آنا ہوگا اور پھر سیڑھی کے دائیں طرف والے دروازے سے اندر جانا ہوگا، اب اس راہداری کو دیکھ کر، وہ اس حویلی کو تخلیق کرنے والوں کی کاریگری پر عش عش کر اٹھا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ریلنگ تک آیا اور دونوں

ہتھیلیاں اُس پر ٹکا کر نیچے جھانکا اور اُسی لمحے ساکت رہ گیا۔ نیچے ہال میں ایل ای ڈی بلب کی مدھم روشنی میں، ایک کونے پر نیم واضح سا نوید عالم جائے نماز بچھائے، حالت قیام میں تھا۔ وہ یقیناً تہجد پڑھ رہا تھا۔

اسے یاد آیا کہ آج یوم عرفہ شروع ہو چکا تھا۔ پرسوں عید بھی تھی۔ حسین خاموش سا اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، یہاں تک کہ پندرہ سے بیس منٹ گزر گئے۔ اُسکا قیام طویل ہو گیا۔ حسین کو حیرت ہوئی، نوید حافظ نہ تھا، پھر اتنا لمبا قیام کیسے؟ حتیٰ کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا، تب کہیں وہ رکوع میں گیا، اُسکا رکوع بھی لمبا تھا۔ پھر کھڑا ہوا، پھر سجدے میں گیا تو اسکا سجدہ بھی اتنا ہی لمبا ہو گیا جتنا کہ قیام۔ حسین کچھ عقیدت اور کچھ حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے تقریباً ایک گھنٹہ لگا کر ایک رکعت مکمل کی، پھر دوسری رکعت میں کھڑا ہو گیا۔ حسین خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

نوید عالم کو وہ لوگ کبھی نہ سمجھ پائے تھے۔۔۔

نہ کل۔۔۔۔

نہ آج۔۔۔

--------+---------+----------

اُس روز کافی دنوں بعد وہ لوگ ناشتے کی میز پر پہلے سے زیادہ تروتازہ اور بہتر محسوس کر رہے تھے۔ ناشتہ بنانے کی ذمہ داری نشمیہ کے باپ کی تھی، جسے آملیٹ بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ لہٰذا اُس نے آج صرف ڈبل روٹی کے ٹوسٹ بنائے، مکھن اور جیم رکھا، چائے عمر سے بنوائی اور بس! بن گیا اُسکا ناشتہ۔۔۔

''اس دو کمروں کے گھر کے فرش پر رات گزارنے کے بعد مجھے حویلی کی قدر ہو گئی ہے۔'' ناشتے کی میز پر حسین نے کہا تھا۔

''وہ بھی کوئی گھر تھا؟'' مقدّم نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اُس سے اچھا تو تمہارے دادا کا گھر تھا۔'' عمر اچانک ہی بولا۔

''وہ جو سوات میں تھا؟'' حسین نے پوچھا تو ڈبل روٹی پر مکھن لگاتا، مقدّم کا ہاتھ تھما۔

''ایک منٹ!۔۔۔ تمہیں کیسے پتہ کہ میرے دادا کا گھر سوات میں ہے؟'' ڈبل روٹی کا ٹکڑا حسین کے حلق میں اٹکا۔

''تم نے ہی تو بتایا تھا۔'' اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ بھی نہیں بتایا تمہیں۔'' مقدّم نے بھنویں اچکاتے اُسے دیکھا۔

''بتایا تھا! یاد کرو۔۔۔اس دن۔۔۔''وہ ڈھیٹ بھی بضد تھا۔

''ہاں ہاں! کس دن؟''اُس نے دونوں بازو سینے پر باندھتے اُسے گھورا۔

''آں۔۔۔ہاں! یاد آیا۔''اُس نے یاد آنے کی اداکاری کی۔''نوید نے بتایا تھا۔''اُس نے قریب بیٹھے نوید کی جانب اشارہ کر کے کہا، جو بے نیازی سے ڈبل روٹی پر آدھا مکھن اور آدھا جیم لگا رہا تھا۔اس بات پر اُس نے آبرو اٹھا کر ایک نظر سنجیدگی سے حسین کو دیکھا۔

''اور نوید کو کس نے بتایا کہ میرے دادا کا گھر سوات میں ہے؟''مقدّم کا رخ نوید کی طرف ہوا، جبکہ ڈبل روٹی کو دانت سے کترتے، رضا کے لیے نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔

''میں نے اسے نہیں بتایا۔''مختصر جواب دیتے نوید نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔اُس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔

''یعنی تمہیں معلوم ہے؟ کیسے معلوم ہے؟''مقدّم نے اُسکے الفاظ پکڑے تو نوید نے چائے کی پیالی میز پر رکھی، اور سینے پر بازو باندھ کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔وہ سربراہی کرسی پر تھا، اُسکی دائیں جانب حسین اور بائیں جانب والی کرسی پر مقدم تھا۔

''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارے دادا نے دو شادیاں کر رہی تھیں، اور تیسری شادی وہ اپنی جوانی کی سابقہ منگیتر سے کرنے والے تھے کہ تمہاری دونوں دادیوں نے انکے خلاف محاذ کھڑا کر لیا اور وہ دل کے عارضے میں مبتلاء ہو کر دنیا سے چلے گئے۔پر میں نے۔۔۔ان میں سے کچھ بھی۔۔۔اسکو نہیں بتایا۔''نوید نے آخری جملہ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔جبکہ مقدّم کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا تھا۔

''تمہارے دادا تو بڑے رنگین مزاج تھے۔''حسین نے ہنستے ہوئے کہا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔

''آخر تم لوگ میرے دادا کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''وہ جھنجھلا کر بولا۔

''اوکے اوکے!''حسین نے صلح جو انداز میں ہاتھ اٹھائے۔''مجھے رضا نے بتایا تھا۔''اب کہ اُس نے سچ بتایا۔

''رضا کو کیسے معلوم؟''وہ حقیقتاً چڑا۔

''اس روز تم اور عمر رات کو کچن میں تھے نا؟تب میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔''رضا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''شرم نہیں آئی تمہیں؟''مقدّم نے افسوس سے کہا۔

''نہیں! تم دونوں اتنی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے کہ راہداری میں سب واضح سنائی دے رہا تھا۔''اُس نے کہا۔

''ایک تو باتیں سنیں، اوپر سے حسین کو بتا بھی دیں۔'' عمر نے بھی اسے شرم دلانے کی کوشش کی پر اسے رتی بھر فرق نہ پڑا۔

''تم دونوں رات کو کچن میں کر کیا رہے تھے؟'' نوید نے یکدم ہی عمر اور مقدم سے پوچھا۔

''یہ دونوں، کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، کچھ بھی کرتے ہوئے پائے جا سکتے ہیں اور وہ بھی ایک ساتھ!'' یہ بے لاگ تبصرہ علی نے کیا تھا، جس پر رضا اور حسین ایک ساتھ ہنسے تھے۔ عمر اور مقدم نے البتہ اسے سنجیدگی سے گھورا تھا۔

''آئی ایگری (میں مانتا ہوں۔)'' حسین نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم چائے بنا رہے تھے۔'' عمر نے اپنا مشکوک ہوتا کردار صاف کرنا ضروری سمجھا، اس لیے فوراً نوید کو بتایا۔

''اور رضا کیا کر رہا تھا وہاں؟'' اب کہ نوید نے رضا سے پوچھا۔ ایس ایس پی صاحب کا خالص تفتیشی انداز!

''میں اصل میں۔۔۔'' وہ جو بتانے ہی لگا تھا، اپنے سامنے بیٹھے علی کو مسکراتا دیکھ کر یکدم ہی رکا۔ کیا ہی مزہ آئے جو اگر اسکے مسکراتے چہرے کو خراب کر دیا جائے؟

''اصل میں، جتنی چرس، افیم، آئس اور جتنے بھی قسم کے نشے میں ساتھ رکھ کر لایا تھا، وہ ختم ہو گئے تھے۔ تو سوچا جا کر کچن میں دیکھ لوں، کیا معلوم اتفاقاً کہیں کچھ مل ہی جائے۔'' اُس نے مزے سے کہا تو جہاں اب باقی تینوں بیساختہ ہنسے تھے، وہیں علی کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔ اُسکا موڈ غارت ہو گیا؟ ہٹس آف ٹو رضا! نوید البتہ ان تمام صورتحال میں سنجیدہ تھا۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں مجھے ہر بات میں گھسیٹ لیتے ہو؟'' حسبِ توقع علی چڑا تھا۔

''میں نے کب تمہارا نام لیا؟ میں نے تو تمہارا ذکر بھی نہیں کیا؟ کیا میں نے کیا؟'' اُس نے انجان بننے کی انتہا کرتے ہوئے برابر بیٹھے عمر سے پوچھا۔

''نام نہیں لیا پر ذکر میرا ہی کیا۔'' علی کی بھی آج بس ہو گئی تھی۔

''واللہ! میں نے تمہیں ایک لفظ نہیں کہا۔ بلاوجہ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔'' اُس نے مظلوم بننے کی انتہا کی۔

''میں الزام لگا رہا ہوں؟ اور جو تم کر رہے ہو؟'' علی نے اُسکی ساری مظلومیت نکال کر اُسکے ہاتھ پر رکھی۔

''ہاں! تم الزام لگا رہے ہو۔ اور تم ہمیشہ یہی تو کرتے ہو۔ کبھی کہتے ہو میں نشہ کر رہا ہوں، کبھی کہتے ہو میں کھائی میں چھلانگ لگانے والا ہوں، اب کہہ رہے ہو کہ میں ہر گفتگو میں تمہیں گھسیٹ لیتا ہوں۔ صرف ایک قتل کا الزام ہے جو اس آدمی نے میرے اوپر نہیں لگایا۔۔۔ باقی ہر طرح سے میں ہی مجرم ہوں۔'' رضا نے ایک مرتبہ پھر عمر کو دیکھتے ہوئے کہا جو اُسکی بکواس پر مسکرا رہا تھا۔

''تمہاری مشکوک حرکتوں کو دیکھ کر کوئی بھی وہی کہے گا جو میں کہتا ہوں۔ الزام کہاں سے ہوا یہ؟'' علی نے بھی آج غلطی نہ ماننے کی قسم کھائی تھی۔

''تمہارے علاوہ تو کوئی بھی یہ سب نہیں کہتا؟ کیا تم سب میرے بارے میں ایسا سوچتے ہو؟'' رضا نے ایک بار پھر سب کو گھسیٹا۔

''ہاں! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔ معلوم ہے تم کتنے اچھے ہو۔۔۔'' علی نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔

''بس کردو تم دونوں!'' نوید نے غصّے سے میز پر چمچ پٹخا تھا۔ وہاں یکدم ہی خاموشی چھائی، سب نے ایک ساتھ اُسکی جانب دیکھا جسکا پارہ غالباً آسمان چڑھ چکا تھا۔

''تم دونوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے سوائے ایک دوسرے سے لڑنے کے؟ سر میں درد کر کے رکھ دیا ہے۔'' وہ غصّے سے کہتا کرسی گھسیٹ کر اٹھا اور وہاں سے واک آوٹ کر گیا۔ سب کی نظروں اور گردنوں تک نے دور تک اُسکا پیچھا کیا، پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہم تو مذاق کر رہے تھے۔'' سب سے پہلے رضا نے کہا۔

''ہاں واقعی! میں سیریس (سنجیدہ) بالکل نہیں تھا۔'' علی نے بھی تائید کی۔

''میں بھی انجوائے کر رہا تھا۔'' عمر نے معصومیت سے کہا۔

''تو پھر اِسکو کیا ہوا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''اِسکے اندر کا والد، جسے ہم نے سلا دیا تھا وہ پھر سے جاگ گیا ہے۔ اِسکی عقل ٹھکانے لگانے کا وقت ہے۔'' حسین نے بتایا تو سب نے اُسکی تائید میں سر ہلایا تھا۔

جبکہ لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر سیگریٹ پیتا نوید خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ اُسے اچانک سے کیا ہوا تھا؟

رات وہ لوگ حویلی کے باغ میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو، اور سردی کی مہک آپس میں مل جل کر ایک نئی خوشبو پیدا کر رہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے باغ کو لپیٹے میں لے رکھا تھا۔ حویلی کے احاطے سے باہر دیو قامت پہاڑ اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ کل عید الاضحیٰ تھی اور انکے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔

نوید کے علاوہ سب وہاں موجود تھے۔ وہ لوگ جس طرف رخ کیے بیٹھے تھے، اُس طرف حویلی کی شیشے کی محرابی کھڑکیاں تھیں، جس سے اندر ہال میں بیٹھے نوید کو واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی برقرار تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے کھلے تھے۔ اگر اونچی آواز میں بات کی جاتی تو رات کے سناٹے کے باعث اندر بیٹھا شخص بخوبی سن سکتا تھا۔

''یہ کیا ناراض ہو گیا ہے؟'' کرسیوں پر دائرے کی صورت اُن سب کے ساتھ بیٹھے رضا نے، سامنے ہال میں بیٹھے نوید کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

''شاید!'' مقدّم نے کہا۔

''تو کیا ہمیں اسے منانا چاہیے؟'' سوال عمر نے کیا تھا۔

''نہیں! کیوں؟'' علی نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ اُن لوگوں نے دہل کر اور اندر بیٹھے نوید نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''وہ کیا ہمارا بڑا ہے؟ یا کوئی بزرگ ہے جو اُسکو منانا ہم پر فرض ہے؟'' اُس نے آواز بلند رکھتے ہوئے ہی بات مکمل کی۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ بالکل! صحیح کہہ رہے ہو۔'' مقدّم نے بھی باآواز بلند اُسکی تائید کی۔ نوید جو کوئی فائل کھولے بیٹھا تھا، اُس نے زور سے فائل بند کی اور کھڑا ہوا۔ پانچوں کی بولتی بند ہوئی۔ اور پھر سب نے اُسے دائیں طرف والی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا، آگے شیشے کی دیوار کے اُس پار، وہ راہداری پار کر کے ڈائننگ ہال اور پھر باورچی خانے میں گم ہوتا نظر آیا تھا۔

''یہ لان کتنا اچھا ہے، یہاں سے بیٹھ کر پوری حویلی کے اندر نظر رکھی جا سکتی ہے۔'' حسین نے تعریف کی۔

''پوری حویلی نہیں، فقط ہال نمبر ایک، اور یہ ڈائننگ ہال والی راہداری۔'' عمر نے تصحیح کی۔

''چھوڑ دو ان سب باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ یہ باورچی خانے میں گیا کیوں ہے؟'' رضا نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''کہیں کوئی خنجر یا چھرا وغیرہ لینے تو نہیں گیا۔'' علی نے بھی تشویش سے پوچھا۔

''تمہیں ہی شوق تھا نہ اتنا چلا چلا کر بولنے کا۔'' رضا نے کہا۔

''تم جب بھی نوید کی برائی کرتے ہو، وہ ضرور سن لیتا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں تو! میں ڈرتا تھوڑی ہوں اُس سے۔'' اُس نے کہا۔

''میں تھوڑا تھوڑا ڈرتا ہوں، یہ بندے اٹھا اٹھا کر پٹختا جو ہے۔'' حسین نے ڈرنے کی اداکاری کی تھی۔ اُسی لمحے باورچی خانے سے منسلک باغ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی جو یہاں سے نظر نہیں آرہا تھا، تاہم یہ سب کو معلوم تھا کہ یہ اُسی دروازے کی آواز ہے۔ کچھ ہی سیکنڈ بعد نوید ایک ہاتھ میں موبائل، اور ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھامے ٹریک پر چلتے، وہیں آتا دکھائی دیا تو سب کے منہ حیرت سے کھلے۔ چھے عدد پیالیوں والی وہ ٹرے، اُسکے جثّاتی سائز کے ہاتھوں میں چھوٹی لگ رہی تھی۔ وہ موبائل پر کچھ اسکرول کرتا وہاں پہنچا، اور اُنکی کرسیوں کے درمیان رکھی، چٹائی سے بنی میز پر ٹرے رکھ دی۔ خود وہ رضا کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ دائرہ مکمل ہو گیا۔

''یہ کس خوشی میں؟'' مقدّم نے مشکوک انداز میں آنکھوں سے چائے کی جانب اشارہ کر کے اُس سے پوچھا۔

''اپنے لیے بنا رہا تھا، تو تم لوگوں کے لیے بھی بنا دی۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''جج ور گریو یاد ہے تمہیں؟'' حسین نے سرگوشی کے انداز میں مقدم سے کہا، البتہ یہ ایک واضح سرگوشی تھی۔

''بس کر دو! اس نے ہمیں مارنا ہوتا تو کب کا مار چکا ہوتا۔'' رضا نے کہا۔ نوید نے نظر انداز کرتے نظریں موبائل پر مرکوز رکھیں۔

''ایک بات بتاؤ نوید! تمہیں ڈر نہیں لگتا؟'' حسین کو جیسے کچھ یاد آیا تو پوچھا۔ اب وہ آ ہی گیا تھا تو گفتگو میں اسے حصّے دار بنانا فرض تھا۔

''کس سے؟'' اُس نے موبائل پر سے نظریں اٹھا کر اس سے پوچھا۔

''بندوق کی گولی سے؟ کتنی گولیاں کھا چکے ہو اب تک؟'' سوال مقدّم نے مکمل کیا۔

''پتہ نہیں! مجھے یاد نہیں۔ ایک آدھ تو سب ہی کو لگ جاتی ہے سرویس کے دوران۔'' اس نے کندھے اُچکا کر کہا، جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

''تو؟ ڈر نہیں لگتا؟ کبھی ایسی ہی کوئی اندھی گولی موت کا سبب بن گئی تو؟'' عمر نے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ کوئی تمہیں مارنے والا ہے؟ کیا تم لوگ ڈر رہے ہو؟ کیا موت کا خوف نہیں آرہا؟'' اُس نے الٹا سوال کیا۔

''اب عادت ہو گئی ہے، خوف ختم ہو گیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''بالکل! ایسا ہی ہے۔ گولیوں کی آواز سننے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس لیے خوف ختم ہو چکا ہے۔ ویسے بھی، موت اگر میدان جنگ میں ہوتی، تو خالدؓ کبھی بستر پر نہ مرتے۔ (~ حضرت خالد بن ولیدؓ)'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ پانچوں متاثر نظر آنے لگے۔

''خیر! میں یہ بتانے آیا تھا کہ جون کی چھ تاریخ قریب ہے۔ایف آئی نے تم سب کے گھر والوں،اور گھر کے اطراف میں سیکیورٹی سخت کر دی ہے۔ گو کہ کوئی قابلِ ذکر مشکوک سر گرمی یا انسان دیکھنے کو نہیں ملا ہے، پر دیکھتے ہیں! اس دن مجرم پر اُسکی چال الٹتی ہے تو وہ بوکھلاہٹ میں کیا کرتا ہے؟ چھے تاریخ کو جو بھی ہو، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ واپسی تم لوگ فرّخ صاحب کے پاس جاؤ گے، وہ بتائیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے؟''اُس نے تفصیل سے کہا۔

''یعنی! ہم واپس گھر نہیں جائیں گے؟''علی نے پوچھا۔

''فلحال نہیں! پہلے فرّخ صاحب کے پاس ہی جانا ہو گا۔اپنی واپسی کے متعلق اپنے گھر والوں کو کسی قسم کا کوئی عندیہ نہ دینا۔ ''اس نے کہا تو وہاں کچھ دیر کی خاموشی چھا گئی۔ واپسی کے نام پر کچھ ملی جلی سی کیفیت تھی، جسے فلوقت کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

''ایک بات بتاؤ نوید!''حسین کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تو نوید سے پوچھا۔

''ہونہہ؟''اُس نے موبائل پر کچھ لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

''یہ تم نے ہماری معلومات کس خوشی میں اکھٹی کر رکھی تھی؟ کیا تم ابھی بھی ہماری معلومات رکھتے ہو؟''حسین نے باز نہیں آنا تھا۔سب ہی نے اسے گھورا تھا۔ نوید نے موبائل بند کر کے جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور اُسکو دیکھا۔

''میرا پیشہ ہے یہ!''

''ہماری معلومات اکھٹی کرنا؟''

''نہیں! اُس وقت، جب یہ کیس میرے ہاتھ میں آیا تو مجھ تک تم لوگوں کی تمام معلومات پہنچنی ہی تھی۔ جس نے مقدم کے آبائی علاقے میں جا کر اُسکے متعلق معلومات اکھٹی کی تھیں، اسی نے اِسکے دادا کے بارے میں بتایا تھا۔''وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، پر یہ اچھا تھا کہ مکمل بات کر رہا تھا۔ گفتگو میں حصہ لے رہا تھا، یا شاید حسین اسے گفتگو کا حصّہ بنا دیتا تھا، چاہے اُسکی مرضی ہو یا نہیں!

''کافی مشہور تھے تمہارے دادا؟''حسین نے تبصرہ کیا تو مقدّم نے گھورا۔

''مجھے کیس ختم ہونے تک تم لوگوں کی تمام حرکات و سکنات کی خبر ملتی رہیں گی۔ یہ صرف اس کیس تک ہے، جس دن یہ کیس مکمل ہوا، اُس دن تم لوگ جو بھی کرو۔اس سے مجھے یا ایف آئی اے کو کوئی غرض نہیں رہے گی، پر فلحال! تم لوگوں کی معلومات رکھنا میرے کام کا حصّہ ہے۔''اُس نے صاف گوئی سے سب بتایا۔اور اِس سے پہلے کہ کوئی بھی، کسی بھی قسم کا تبصرہ کرتا، نوید نے براہِ راست اپنے برابر بیٹھے رضا کو سنجیدگی سے دیکھا۔

''اور اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ جو کچھ تم کرتے پھر رہے ہو، اُسکی مجھے خبر نہیں ہے یا میں انجان ہوں۔ تو۔۔۔ تم بہت بڑے احمق ہو۔'' چائے کی پیالی رضا کے منہ سے لگی اور۔۔۔ لگی ہی رہ گئی، زبان جل چکی تھی۔ اُس نے یہ کیا کہا تھا؟ اور کیوں؟ پر نوید نے باقی سب کو دیکھ کر گفتگو جاری رکھی، جیسے وہ تو سب ہی سے مخاطب تھا۔

''میں اپنے آس پاس نظر رکھتا ہوں۔'' اُس نے گفتگو سمیٹی تھی۔ کوئی سمجھا نہ سمجھا پر رضا کو بڑے اچھے سے سمجھ آگئی تھی۔

''فاتحہ پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے بیٹا!'' چونکہ حسین، رضا کے برابر ہی تھا، اِس لیے فوراً سے بیشتر سرگوشی کرنا ضروری سمجھا۔

''تم لوگ اپنا سامان اب باندھنا شروع کر دو، ہمیں بہت جلد یہاں سے نکلنے کا حکم مل جائیگا۔'' نوید نے کہا اور چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوا۔ پھر کسی کی بھی طرف دیکھے بنا اندر چلا گیا، اب وہ لوگ شیشے کی کھڑکی کے پار نظر آتے ہال میں اُسے بیٹھے، اپنے سابقہ کام میں مشغول دیکھ سکتے تھے۔ اُسکے جانے کے بعد مقدّم موبائل میں کچھ دیکھنے لگا۔ عمر اور علی اپنے آفس کے متعلق کچھ ڈسکس کرنے لگے۔

''کیا ہوا؟'' حسین نے سرگوشی کے سے انداز میں رضا سے پوچھا، جسکی نظریں ہال میں بیٹھے نوید پر ہی تھیں۔

''یہ کیا کہہ کر گیا ہے ابھی؟'' رضا نے صدماتی انداز میں پوچھا۔

''جو تم نے سنا۔ کیا اسے معلوم ہے؟'' حسین نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ!'' بے بسی سے کہتے رضا نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ حسین کو کیسے معلوم؟

''اگر اُسے معلوم ہوا تو؟'' حسین نے پھر پوچھا، تو اُس نے تھوک نگل کر نوید کو دیکھا۔ نظروں کے سامنے ایس ایچ او سمیر کی خنجر گھونپی گئی آنکھ آگئی۔

آؤچ! اُس نے فوراً جھرجھری لی۔

''میں تو تباہ ہو جاؤں گا۔'' اُسکے منہ سے بیساختہ نکلا تو سب نے رک کر، حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تم تباہ ہو چکے ہو۔'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں تباہ ہو گیا ہے یہ؟'' عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ اصل میں یہ دوبارہ سے نشہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے ایسا مت کرو!'' حسین نے مصنوعی آنسو صاف کرتے کہا تو علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر عمر کو دیکھا۔

''ہم آفس کے ورکرز سے بات نہیں کر سکتے، پر ورکرز پورٹل پر یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں لوگ کتنا کام مکمل کر چکے ہیں۔'' علی نے اُسے کہا۔

''میں تو روز پورٹل دیکھ لیتا ہوں۔ کل ٹکٹس بھی چلائی ہیں میں نے کچھ ایمپلائیز کے نام پر۔ تاکہ وہ اپنا کام مکمل کر لیں۔'' عمر نے کہا۔

''مجھے بھی ذرا ٹکٹس دکھانا۔''

''اوپر کمرے میں آ جاؤ! مجھے پورٹل پر کچھ اور چیزیں بھی تمہیں دکھانی ہے۔'' عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا تو علی بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

''چلو! میں بھی جا رہا ہوں۔'' اُنکے جانے کے بعد حسین بھی جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' رضا نے پوچھا۔

''ایس ایس پی صاحب کا دماغ کھانے۔'' اُس نے مزے سے کہا۔

''سکون سے رہنے دو اُسے کسی وقت۔'' مقدّم نے کہا۔

''سوری! یہ تو نہیں ہو سکتا۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم آ رہے ہو ساتھ؟'' اُس نے رضا سے پوچھا۔

''نہیں! جب تک یہ ہال میں موجود ہے، تب تک تو بالکل نہیں!'' اُس نے ہال میں بیٹھے نوید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو حسین ہنسا، البتہ مقدّم نے کچھ نا سمجھی سے دیکھا۔

''چلو ٹھیک ہے پھر! میں اِسکو ہال سے گم کرتا ہوں۔'' وہ ہنستا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اُسکے جانے کے بعد مقدّم نے اپنی کرسی گھسیٹی اور رضا کے برابر کی جو سیگریٹ جلا چکا تھا۔

''تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اگر تم ناراض نہ ہو تو!'' اُس نے آہستہ اور سنجیدہ انداز میں رضا کو مخاطب کیا۔

''دوست سمجھتے ہو مجھے؟'' رضا کا سوال غیر متوقع تھا۔

''ہاں!'' اُس نے بلا توقف کے کہا۔

''تو پھر میری ناراضگی کی فکر نہ کرو، کیونکہ تم نے ہی تو کہا تھا کہ دوست ہو گا تو برا نہیں مانے گا۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرایا۔

''مجھے یونیورسٹی کے زمانے سے ہی ایک کنفیوژن تھی، سوچا تھا تم سے پوچھوں پر اُس وقت میں پوچھ نہیں سکا۔ وہ کنفیوژن آج بھی ہے۔''اُس نے تمہید باندھی۔

''کیسی کنفیوژن؟''

''مجھے یونیورسٹی کے دور میں ایسا لگتا تھا جیسے۔۔۔''وہ رکا۔''جیسے تم حور عین کو پسند کرتے تھے۔''اُس نے وہ سوال پوچھ لیا جو وہ کب سے پوچھنا چاہتا تھا۔ رضا ہنسا، پھر سیگریٹ کو منہ سے لگا کر دھواں ہوا میں چھوڑا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟''اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ رات کی رانی کی بڑھتی خوشبو میں سیگریٹ کی بو ملنے لگی تھی، سرد ہوا کے جھونکوں نے ہاتھ پاؤں یخ کر دیئے تھے۔

''بس! مجھے تمہارے انداز سے ایسا لگتا تھا کبھی کبھی، اس لیے پوچھ لیا۔ پھر جب ہم نے حور عین کی منگنی کی خبر سنی تھی، اُس وقت بھی تمہارا ردعمل ایسا تھا جیسے تمہیں یہ خبر پسند نہ آئی ہو۔''اِس بات پر وہ پیچھے ہو کر بیٹھا اور اسے دیکھا۔

''مقدّم! حور عین مجھے بھائی کہتی تھی۔ اور بھائی ہی سمجھتی تھی، اس زبانی رشتے کے ناطے میں اُسکی بہت عزت کرتا تھا۔ اور اُسکی منگنی پر میں پریشان اس لیے ہوا تھا، کیونکہ مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے وہ حسین کو پسند کرتی ہے، اس لیے ان دونوں کی منگنی پر مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ بس! اور کوئی بات نہیں ہے۔''اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ محرابی کھڑکیوں کے اُس پار ہال میں بیٹھا حسین حقیقتاً وید کا جینا حرام کرتا نظر آ رہا تھا۔

''وہ تمہیں بھائی سمجھتی تھی۔ اور تم؟''اُس نے پوچھا۔

''وہ ہمارے دوست کی بیوی ہے، اِس رشتے سے ہمیں اُسکی عزت کرنی چاہیے۔ اور ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے، جس سے حسین کے دل میں کوئی غلط خیال آئے۔ اس لیے تم دوبارہ ایسا کچھ مت سوچنا۔ ویسے بھی۔۔۔ جس دور کی تم بات کر رہے ہو، تب میرے پاس یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اور نہ میں ایسے کوئی خواب سجاتا تھا۔ میں لاوارث تھا، آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بھلا میں کیسے کسی کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکتا تھا؟ یا ایسا سوچ بھی سکتا تھا؟''اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کی۔ مقدّم اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے سیدھے سیدھے لفظوں میں جواب نہیں دیا تھا۔

''خیر! تمہیں اب تو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ تمہاری اپنی پہچان ہے، اپنا نام ہے۔ تمہیں کسی والی وارث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے، تم بھی اب گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔''مقدّم نے اسکو خود ترسی کی کیفیت سے نکالنا چاہا۔ رضا کے تصوّر میں سیاہ آنکھوں اور سانولی رنگت والا چہرہ لہرایا۔

''سوچیں گے! پہلے یہاں سے نکل تو جائیں۔''اُس نے سیگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اندر آجاؤ، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''اُس نے مقدّم کو کہا تواُس نے اثبات میں سر ہلایا۔رضا اندر چلا گیا۔مقدّم کی نظروں نے دور تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔اُس نے سیدھے لفظوں میں اُسکی بات کا انکار نہیں کیا۔اُس نے اقرار بھی نہیں کیا تھا۔اُس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اور اُس نے یقیناً اُس دور میں بھی اپنے حالات کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی تھی،اور دل سے وہ تمام خواہشات نکال دی تھیں،جو اُسکے نصیب میں نہیں تھی۔

اُسکی نظروں سے دور ہوتا رضا اُسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔اُس پر فرض تھا کہ وہ اس بات کو ایسے بھلا دیتا جیسے ہوئی نہ ہو۔

سب کو سب کچھ نہیں ملتا۔۔۔۔

کچھ نہ ملنے میں بہتری ہوتی ہے۔۔۔

اور اس سے بہترین کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔۔۔۔

--------+---------+----------

مورخہ چھے جون

وہ دن جسکا سب کو انتظار تھا۔

کل پوری رات عجیب سی بے چینی رہی تھی۔بے شک اُنہیں اللہ کے بعد ایف آئی اے پر بھروسہ تھا۔پر مورخہ چھ وہ تاریخ تھی،جس روز یہ سب ہونا تھا۔اسی طرح بے چینی میں رات گزر گئی۔صبح سویرے اُنہوں نے سامان باندھ لیا۔ناشتہ کر کے سب ہال میں موجود تھے۔پر آج ایک جامد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔نوید مستقل ٹہل رہا تھا،اُسکی نظریں بار بار موبائل پر جاتی تھیں۔ایک عجیب سی خاموشی تھی وہاں۔جیسے طوفان آنے سے پہلے ہوتی ہے۔پھر اُنکا آج حویلی میں آخری دن بھی تھا۔

اُسی طرح کرتے شام ہو گئی۔دوپہر میں نوید کے پاس کوئی فون آیا تھا،جسے سننے کے لیے وہ جا کر کمرے میں جو بند ہوا تو اب شام ہونے کو آئی پر باہر نہ آیا۔اس وجہ سے کسی نے دوپہر میں کچھ کھایا بھی نہ تھا۔اُنکی سانسیں اُسکے فون کے ساتھ اٹک گئی تھیں جیسے۔بلآخر شام پانچ بجے نوید سیڑھیاں اُتر کے آتا دکھائی دیا۔

مورخہ چھے آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی،کچھ وقت اور باقی تھا۔یہی وہ تاریخ تھی جس نے اُنہیں پچھلے چھے ماہ سے جوڑ رکھا تھا۔نوید نیچے آیا تو سب نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہم لوگ اسکردو ایئرپورٹ کے لیے نکل رہے ہیں۔ایک پرائیویٹ جیٹ کے ذریعے ہمیں آج رات ہی کراچی پہنچنا ہے۔فلائٹ چھے بجے کی ہے۔ہم ابھی نکل رہے ہیں۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔البتہ انداز میں ایک تیزی سی تھی۔

''کیا کچھ ہوا ہے؟''عمر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرے گھر کے پاس،آج صبح فجر سے قبل کسی مشکوک انسان کو گرفتار کیا گیا ہے۔فلحال مجھے نہیں بتایا گیا کہ وہ کون ہے۔اُسکے پکڑے جانے کے بعد پچھلے بارہ گھنٹوں سے تم سب کے گھروں کے آس پاس کڑی نگرانی کی گئی ہے،پر کوئی قابل ذکر گرفتاری نہیں ہوئی۔فرّخ صاحب کا کہنا ہے کہ گرفتار ملزم بہت اہم ہے۔ہمیں فوری کراچی پہنچنا ہے۔''اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''ہمارے گھر والے ٹھیک ہیں؟''علی نے پوچھا۔

''ہاں!سب ٹھیک ہے۔ابھی تم سب فرّخ صاحب کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچو گے۔گھر کوئی نہیں جائیگا،اور نہ ہی کوئی گھر والوں کو اطلاع دے گا۔''نوید نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چلو پھر!سامان لے کر باہر آؤ۔ایک مرتبہ دیکھ بھی لینا کوئی چیز رہ نہ گئی ہو۔اکرم ہمیں ایئرپورٹ تک پہنچا دے گا۔''وہ کہہ کر باہر نکلا۔حویلی چھوڑنے پر ایک عجیب سی اُداسی وجود میں سرائیت کرنے لگی تھی۔اس جگہ سے ایک انسیت سی ہو گئی تھی۔یا شاید!یہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارا وقت تھا،جسکی اُنہیں ضرورت تھی۔جاتے وقت نوید نے دونوں دروازے بند کر کے اس پر تالا لگایا،اور اکرم نے مین فیڈر گرا دیا۔حویلی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ایک آخری نگاہ حویلی پر ڈالنے کے بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اکرم نے اُنہیں سکردو ایئرپورٹ چھوڑ دیا۔نوید سارے راستے چوکنا بیٹھا رہا تھا۔اُسکا ہاتھ ہمہ وقت بندوق پر ہی تھا۔ایئرپورٹ پہنچتے ہی اُنہیں جیٹ میں سوار کر دیا گیا۔چھے بجے کی فلائٹ اپنے وقت پر پرواز بھرتی آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔بلندی سے سکردو کے برف میں لپٹے پہاڑ،اور اُنکی چوٹیوں پر پڑتی ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں،ایک الگ ہی اُداس سا الوداع کہہ رہی تھیں۔اُنکے درمیان ویسے ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی،جیسی کسی بھی سفر سے واپسی کے دوران ہوتی ہے۔بلآخر سوا آٹھ بجے اُنہوں نے کراچی کی زمین پر قدم رکھا۔ایئرپورٹ پر انسانوں کا جم غفیر اُمڈ آیا تھا۔ایئرپورٹ سے ہی اُنہیں ایف آئی اے حکام نے باحفاظت گاڑیوں میں بٹھایا تھا۔جہاں سے اب وہ پھر کسی انجان منزل کی طرف جا رہے تھے۔

ایک ماہ اور کچھ دن،خاموش پہاڑوں کے درمیان گزارنے کے بعد شہر کی رونقیں جہاں بھلی لگ رہی تھیں،وہیں شور شرابہ گراں بھی گزر رہا تھا۔گاڑی آٹھ بینتالیس کے قریب ایک مضافاتی علاقے میں بنے گھر کے پاس رکی۔آس پاس بہت سے خالی پلاٹ تھے،لگ رہا تھا جیسے یہ علاقہ ابھی آباد نہیں ہوا ہے۔بہت دور دور گھر بنے نظر آ رہے تھے۔وہ لوگ گاڑی سے اترے۔

''فرّخ صاحب نے تم سب کو فلحال یہاں رہنے کا کہا ہے۔ گھر محفوظ ہے، اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس ملزم سے تفتیش جاری ہے، میں بھی وہیں جارہا ہوں۔''نوید نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اطلاع دی۔ پر باہر نہیں آیا۔

''اور ہم یہاں کیا کریں گے ؟''رضا نے پوچھا۔

''تم لوگ اندر اپنا سامان رکھو، اور فریش ہو جاؤ۔ کچھ دیر میں فرّخ صاحب تم سب کو میٹنگ (مشاورت) کے لیے آفس بلوائیں گے۔''اُس نے کہا۔

''میں چلتا ہوں۔''پھر اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے شیشہ اوپر کر لیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

گھر جدید طرز پر بنا ہوا تھا۔ اندر آکر بھی خاموشی چھائی رہی۔ سامان رکھ کر وہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔ گھر میں ایک آدھ ملازمین بھی موجود تھے۔ اُنکے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے آئے۔ اسی طرح مزید ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔

''ہم کب تک کرائے داروں کی طرح گھر ہی تبدیل کرتے رہیں گے۔''حسین نے ازراہِ مذاق کہا۔

''میں اب تنگ آچکا ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں بس !''علی بھی بیزار ہوا۔

''ہم سب یہی چاہتے ہیں۔''عمر نے کہا۔

''پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔''اُس نے بیزار کن لہجے میں کہتے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''پریشان نہ ہو، کوئی ملزم پکڑا گیا ہے، امید ہے کہ اِس بار سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔''عمر نے کہا۔

''ایسے مجرم پہلے بھی پکڑے گئے ہیں۔ مائیکل اور خلیل ہمارے سامنے ہیں۔ پر کچھ نہیں ہوا۔''پتہ نہیں اُسے کیا ہوا تھا؟ کیوں اتنا بیزار ہو رہا تھا؟ یا شاید سفر کے اختتام پر وہ فطری طور پر اپنے گھر میں موجود ہونا چاہتا تھا۔ اب اِس جگہ آنا اُسے برا لگ رہا تھا۔

''وہ دونوں مردہ تھے، پر ابھی ملزم زندہ پکڑا گیا ہے۔''مقدّم نے کہا۔

''معلوم نہیں ! مجھے زہر لگ رہا ہے یہاں رہنا اب۔''اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''اتنا ہر بات کو دل سے نہ لگایا کرو۔ ہر برا وقت گزر ہی جانا ہوتا ہے۔''حسین نے تسلی دیتے لہجے میں کہا۔

''تمہیں کیا پتہ برا وقت کیا ہوتا ہے ؟''علی نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اُسے فوراً ہی احساس ہوا کہ اس نے غلط کہا ہے۔ ابھی اُسے خود کو بدلنے کے لیے کچھ اور وقت چاہیے تھا، پینتیس سال کی عادت تھی، پینتیس دنوں میں نہیں جاسکتی تھی۔

''میرا مطلب۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینے ہی لگا۔

''تم لوگوں کو مظلوم بننے کی عادت ہو چکی ہے۔''حسین نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا تو سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔نوید بنگلے کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا، چہرے پر سختی، نفرت، غصّہ۔۔۔اور سب کچھ تھا۔

''تم لوگوں کو لگتا ہے دنیا کے سارے غم تمہیں ہی ملے ہیں۔حالانکہ ہوا تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہے۔پر وہی نا! مظلوم بننے کی عادت جو ہو گئی ہے۔''اس نے اپنی بات جاری رکھی۔لیونگ روم میں داخل ہوتا نوید دروازے پر ہی ٹھٹک کر رکا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''یہ بات مقدم کو بھی برا لگا تھا۔

''میرے دو بچے ہیں۔اِس سے قبل تین اور بھی تھے۔دو جڑواں اور ایک اُنکے بعد۔''اس نے بڑے آرام سے بتایا تھا۔لفظ **تھا** پر سب کو سانپ سونگھا۔

''دو جو جڑواں تھے،اُن میں سے ایک کے دل میں سوراخ تھا،اور ایک کا لیور (جگر) مکمل بنا نہیں تھا۔ایک کا انتقال پیدائش کے ساتویں دن ہوا تھا اور دوسرے کا دو ماہ بعد۔تیسرا جو دونوں سے دو سال چھوٹا تھا،وہ میری بیٹی تھی۔اسے ڈاؤن سنڈروم تھا۔اُسکا بھی چھے ماہ کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔''مرکزی دروازے پر لاک پر ہاتھ رکھے کھڑے نوید کا وہی ہاتھ لمحوں کے لیے کانپا تھا۔وہ کہہ رہا تھا،اور سب دم سادھے سن رہے تھے۔''اُسکا جس روز انتقال ہوا، میں گردے کے انفیکشن میں مبتلا تھا۔علاج کروانے کے بجائے پہلے اُسکے لیکر ہسپتال بھاگتا رہا، پھر انتقال ہوا تو میت و تدفین میں لگ گیا۔طبیعت حد سے زیادہ بگڑی تو ڈاکٹر کے پاس گیا،تب معلوم ہوا لاپرواہی کی وجہ سے ایک گردہ فیل ہو چکا ہے۔سرجری ہوئی،اور گردہ ریمو کر دیا گیا۔ٹھیک ہونے کے لیے وقت درکار تھا، صحت یاب ہونے سے قبل ہی معلوم ہوا کہ آفس والوں نے نوکری سے نکال دیا ہے۔میرا بھی دل کیا تھا کہ مظلوم بن جاؤ،روؤں پیٹوں کہ دنیا کے سارے غم تو مجھے ہی مل گئے ہیں،مایوس ہو جاؤں اور غم دل سے لگا کر بیٹھ جاؤں۔پر میرے ماموں۔۔۔انہوں نے مجھے ایک جملہ کہا اور اُس دن میری ساری عقل ٹھکانے آ گئی۔''حسین جب سنجیدگی سے بات کرتا تھا تو آس پاس ہوائیں بھی جیسے تھم جاتی تھیں۔وہ بہت گہرا تھا۔۔۔بہت گہرا!

''انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں حضرت ایوب علیہ السلام سے زیادہ غم ملے ہیں؟ کیا تمہارے اوپر آزمائشیں حضرت محمد ﷺ سے زیادہ آ گئی ہیں؟''اِس سوال پر جو جہاں تھا وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔وہ غمزدہ نہیں تھا،نہ وہ اپنے غم کسی ہمدردی کے لیے بتا رہا تھا۔وہ سمجھانا چاہتا تھا،وہ بات جو انہیں کوئی نہ سمجھا سکا۔

''ہمارے نبی ﷺ کی ایک بیٹی کے علاوہ اُنکی تمام اولادیں اُنکی زندگی میں انتقال کر گئیں، بچپن میں بھی، لڑکپن میں بھی اور جوانی میں بھی۔**(نوید کا سر جھکا)**۔اُنکی سب سے عزیز زوجہ اُس وقت انتقال فرما گئیں، جس وقت انہیں، اُنکی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔**(مقدّم شرمسار ہوا)**۔وہ یتیم پیدا ہوئے تھے، اُنکی ماں اُنہیں چھے سال کی عمر میں چھوڑ گئی تھیں، جس وقت ایک بچے کو سب سے زیادہ اپنی ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔**(رضا کی آنکھوں میں نمی آئی)**۔اُنکے خاندان والوں نے اُن سے منہ موڑ لیا،**(عمر کا چہرہ بھی جھک گیا)**۔اُنہیں اُنکے اپنے قبیلے والوں نے بے گھر کر دیا۔اُنکو ہر اُس شخص نے اکیلا کر دیا،

جو کبھی اُنکی سب سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ **(علی کو لگا جیسے اب وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے گا)**۔ یہ سارے غم فقط ایک ہی ہستی نے اکیلے سہے تھے۔ پر وہ تو نہ دنیا چھوڑ کر بیٹھے، نہ انہوں نے مسکرانا چھوڑا، نہ اپنے مقصد سے پیچھے ہٹے، نہ اپنے غموں کا بدلہ دنیاوالوں سے لیا، نہ کسی کا حق مارا اور نہ ہی کسی کا دل اپنی زبان سے توڑا۔ تو پھر مجھ پر کونسا ایسی آفت آگئی ہے، جو میں دنیا سے منہ موڑ لوں؟ جب یہ دنیا فانی ہے تو یہاں کے غموں کو کیوں سر پر سوار کرنا؟ جو چیز اللہ نے ہی دی تھی، اگر اُس نے واپس لے لی تو اِس میں میرا کیا نقصان؟ وہ تو اسی کی شے تھی۔ اور جو ہم سے چھین جاتا ہے، وہ آخرت میں ضرور واپس ملے گا۔ تو عارضی جدائی پر زندگی سے منہ کیوں موڑنا؟'' حسین نے بات مکمل کر لی تھی۔ وہ زندگی کے کسی بھی مقام پر پہنچ جاتے پر حسین جیسی سمجھ بوجھ کے لیے انہیں شاید ایسی دس اور زندگیاں چاہیے تھیں۔ اُس نے اُنکی سوچ کا ایک نیا در وا کر دیا تھا۔

وہ اِسی لیے کبھی دل میں بغض نہیں رکھتا تھا، اسی لیے وہ ناراضگی ختم کرنے میں ہمیشہ پہل کرتا تھا، کیونکہ اُس نے صحیح معنوں میں اِس دنیا کے غموں کو بیکار ہی سمجھا تھا۔ وہاں ایسی جامد خاموشی چھائی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ اُس نے اُنہیں اپنا محاسبہ کرنے کی دعوت دے دی تھی۔ بلآخر نوید گہری سانس لیکر اندر آیا تو سب کی نظریں اُس پر گئیں۔ اُسکے انداز میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی، جسے فلوقت وہ کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے۔ چہرہ ستا ہوا، حد سے زیادہ سخت تھا۔ لب بھینچے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔

''ہمیں فوری چلنا ہے۔ ایک عورت پکڑی گئی ہے۔ اُس سے کچھ تفتیش بھی ہوئی ہے، تم لوگوں کو بھی اہم اطلاعات دینی ہیں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ آواز بیٹھی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بہت چیخا ہو۔

''سب ٹھیک ہے نوید؟'' علی نے تشویش سے اُسے دیکھا۔

''باہر آجاؤ جلدی! میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا تھا؟

وہ لوگ بھی اُٹھ کر اُسکے پیچھے چل دیئے۔

---------+---------+--------

''صبح کی نیلی روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگا رنگ پھلوں سے سجا باغ صبح کی روشنی میں جنت لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں، اور سامنے بہتے دریا میں گرتی بارش کی بوندیں۔۔۔۔ منظر تھا کہ دل میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ وہیں گھاس پر ایک درخت سے ٹیک لگائے پر سکون بیٹھی تھی۔ دریا اُسکے سامنے تھا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ آواز بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

مما! مما!'' وہ اپنے ننھے ننھے قدموں سے اُسکے پاس آیا تو وہ مسکرائی۔

''میرے دل کے ٹکڑے!'' اُس نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔

''مما!''وہ اُسے چھوٹا سا پھول دینے لگا۔اُس نے ہنستے ہوئے تھام لیا۔

وہ ہنس رہی تھی،بہت زور سے۔۔۔۔

اور اسی لمحے اُسکی آنکھیں کھلی۔چہرے پر مسکراہٹ ابھی بھی تھی۔اُس نے آنکھیں مل کر دوبارہ کھولیں تو منظر تبدیل ہو چکا تھا۔وہ اپنے کمرے میں تھی۔

اور اُسکا بیٹا؟

''میرا بیٹا!''بشریٰ ہڑبڑا کر اٹھی۔رات کے دو بج رہے تھے۔اُسکا بیٹا کہیں نہ تھا۔اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔وہ خواب تھا۔

''تم کہاں ہو نوید؟''اُس نے دل میں نوید کو پکارا تھا۔

---------+---------+--------

ڈیڑھ گھنٹے پہلے:

(ایف آئی اے آفس میں)

''السلام علیکم!''نوید اندر داخل ہوا تھا۔سامنے ہی فرّخ صاحب،فیصل اور شیراز موجود تھے۔

''وعلیکم السلام!''انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کون ہے وہ ملزم؟''اُس نے فوراً پوچھا۔

''اسے ٹیم نے پکڑا تھا۔اس نے اپنا نام شاہانہ بتایا تھا۔اسے ہم تمہارے گھر کے آس پاس بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے۔اُسکی مشکوک سرگرمیوں کی بنا پر اسے گرفتار کیا گیا ہے۔اُسکے پاس اسلحہ بھی موجود تھا،اُسکے موبائل کا ڈیٹا بھی نکلوایا گیا ہے،اس نے مختلف نمبروں سے مائیکل سے رابطہ کیا ہوا ہے۔اُسکی کال آڈیو کو ریکور کیا جا رہا ہے۔لیکن۔۔''وہ رکے۔

''لیکن؟''

''اُسکا نام شاہانہ نہیں ہے۔وہ جب یہاں آئی تب ہمیں معلوم ہوا۔''شیراز نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ اپنا اصلی نام کیوں بتائے گی؟''نوید نے کندھے اچکائے۔ اُسکے نزدیک یہ عام بات تھی۔باقی تینوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔نوید کو اُنکے انداز میں کچھ عجیب لگا۔

''کیا ہوا ہے؟''اُس نے نا سمجھی سے اُنہیں دیکھا۔

''تم میرے ساتھ تفتیشی کمرے میں آؤ!''فرّخ صاحب کھڑے ہوئے۔

''ٹھیک ہے۔''وہ سر ہلاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔اسی لمحے شیراز کا فون بج اٹھا۔اُس نے کال اٹینڈ کر کے فون کان سے لگایا۔اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا دوسری جانب کی آواز سن کر وہ بوکھلایا۔

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟''وہ تقریباً چیخا تھا۔کمرے سے باہر کی طرف بڑھتے نوید اور فرّخ صاحب یکدم ہی رکے۔

''کیا ہوا شیراز؟''فیصل نے پوچھا تھا۔اُسکے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔

''میں آتا ہوں۔''اُس نے تیزی سے فون جیب میں رکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''سر! مجھے فوراً گھر جانا ہے۔''اُس نے فرّخ صاحب کے پاس آتے ہوئے کہا۔اُسکے چہرے پر کچھ تھا۔

''ٹھیک ہے! تم جاؤ۔''اُنہوں نے کچھ بھی پوچھے بنا اُسے فوراً اجازت دی تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''تم آؤ!''فرّخ صاحب نوید کو کہتے آگے بڑھ گئے۔اُنکے انداز میں کچھ خاموشی سی تھی۔وہ بھی چپ چاپ سا اُنکے پیچھے چلنے لگا۔ذہن شیراز کی طرف بھی تھا۔نجانے اسے اچانک کیا ہوا تھا؟فرّخ صاحب نے پوچھا تک نہیں اُس سے۔

بلآخر وہ تفتیشی کمرے میں پہنچے اور دروازہ کھولا۔نیم اندھیرے تفتیشی کمرے کے درمیان میں ایک میز تھی، جسکے اوپر ایک بلب روشن تھا۔دونوں جانب کرسیاں تھیں۔ایک خالی تھی اور ایک پر وہ طرح دار قسم کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔نیم اندھیرے میں اُسکا چہرہ دکھائی نہ دیا۔نوید آگے بڑھا اور دروازہ بند کر دیا۔فرّخ صاحب اُسکے آگے تھے۔جیسے ہی وہ سامنے سے ہٹے، سامنے بیٹھی عورت نے مسکراتے ہوئے چہرہ اٹھایا اور براہ راست اُسے دیکھا۔

اور نوید کے پیروں تلے زمین کھسکی۔۔۔

اسے قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اس عورت سے سامنا کرنے والا ہے۔

''فرح؟''اُس کے لب بے یقینی سے ہلے۔اُسکی مُسکراہٹ گہری ہوئی۔نوید تو پتھر کا بت بنے اُس عورت کو دیکھ رہا تھا۔وہ جو اُسکے بچوں کی قاتلہ تھی۔جس نے اُسکی زندگی تباہ کی تھی، اُسکی پوری کائنات اُجاڑی تھی۔

''تم؟''بے یقینی سے یقین تک کا سفر طے کرتے ہی اُسکے لب بھینچے۔

''کیسے ہوا یس ایس پی نوید عالم؟''وہ مسکرائی۔اگلے ہی لمحے نوید کا ہاتھ اپنی کمر میں رکھی بندوق پر گیا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اُس نے گن اس پر تانی ہی تھی کہ ڈی آئی جی صاحب نے اُسکا ہاتھ نیچے کیا۔

''نوید!''انہوں نے تنبیہہ انداز میں اُسے دیکھا۔وہ جذباتی نہیں ہوتا تھا،پر آج ہو رہا تھا۔

''کیا نوید؟''وہ حلق کے بل چیخا تو اُنہوں نے حیران نظروں سے اُسے دیکھا۔''یہ میرے بچوں کی قاتل ہے۔میں نے بہت صبر کیا ہے،پر آج نہیں!قصاص مجھ پر واجب ہے۔''اُس کے جسم کا سارا خون اِس لمحے اُسکے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''نوید!ہوش میں آؤ۔یہ عورت ہمارے لئے ضروری ہے۔یہی ہمیں اصل قاتل تک لیکر جائے گی۔''انہوں نے سختی سے کہا۔

''بھاڑ میں گیا وہ قاتل۔یہ ہمیشہ میرے سامنے سے چلی جاتی ہے۔میرے بچوں کو زندہ جلا کر یہ آزاد گھوم رہی ہے۔میں نہیں چھوڑ سکتا اِسے۔''اُسکا گلا رندھ گیا۔اِس بات پر وہ طنزیہ ہنسی۔

''بس کرو نوید!یہ عورت بہت سے لوگوں کی مجرم ہے۔تم اسے مار کر اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کے ساتھ زیادتی کرو گے۔یہ منہ کھولے گی،ہر حال میں کھولے گی۔''انہوں نے فرح کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو اب بھی بڑی دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔اُسکا پر سکون انداز نوید کے اندر آگ لگا رہا تھا۔وہ اتنی پر سکون کیوں تھی؟

''اس کی تمام کال ریکارڈ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ یہ اس گروہ کے سرغنہ کی بہت قریبی ساتھی ہے۔اور یہی اُسکے لیے پاکستان میں کاروبار چلاتی ہے، یہاں کے لوگوں سے اُسکی تمام ڈیلنگ بھی اِس عورت کے ہی ذمّے ہے۔مزید معلومات یہ ہمیں خود دے گی۔کیونکہ اپنے لوگوں سے یہ کال کے دوران بھی کوڈورڈز میں بات کرتی رہی ہے۔''ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

''واہ واہ!کتنے ذہین لوگ ہو تم سب۔''فرح نے مذاق اڑایا تھا۔وہ کوئی پاگل ہی تھی۔

''میرا ضبط مت آزماؤ،ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم ایک عورت ہو۔''نوید نے سرخ ہوتی آنکھوں سے کہا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے اسے پیچھے کیا اور خود فرح کے سامنے آئے،پھر دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹکائے،ذرا جھک کر اُسے سرد نگاہوں سے دیکھا۔

''تم ایک ایک لفظ بتاؤ گی۔اِس ملک میں موجود جن جن لوگوں سے تم نے رابطہ کیا ہے،وہ سب صبح تک یہاں ہوں گے۔تم سب کا انجام تمہاری سوچ سے بھی بھیانک ہو گا۔اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہ کیا جائے،تو تم وہ سب بتاؤ گی جو ہم تم سے پوچھیں گے۔''انکا لہجہ لہو جماتا ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہنسی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟''اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے معصومیت سے اُنہیں دیکھا۔

''بس!''نوید نے آگے بڑھ کر چیختے ہوئے میز پر ہاتھ مارا تھا۔اُسکا ضبط جواب دے رہا تھا۔سامنے کوئی مرد ہوتا تو وہ اب تک اُسکی کھال اُدھیڑ چکا ہوتا۔صرف اُسکے عورت ہونے کا لحاظ کر رہا تھا۔

''تمہارے ساتھ اِس سے زیادہ لحاظ نہیں رکھا جائیگا، یہ جان لو۔''نوید نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے چبا چبا کر کہا۔پر اُسکے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے،اگر مجھے کچھ بھی ہوا، تو تم اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکو گے۔''اُس نے کہا، تو نوید اور ڈی آئی جی صاحب نے ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اگر تم نے مزید ہمارا وقت ضائع کیا تو۔۔۔''

''تمہارا بیٹا میرے پاس ہے نوید عالم!''وہ نوید کی بات کاٹتی ہوئی چیخی۔ اگلے ہی لمحے نوید نے وحشت ناک انداز میں اُسکو بالوں سے جکڑا اور اسکا چہرہ اوپر کیا۔اس بار ڈی آئی جی صاحب نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔بلکہ حیران آنکھوں سے اُسے دیکھتے رہے۔

''اپنی بکواس بند کرو!''وہ اُسکے منہ پر دھاڑا۔''میرے بیٹے مر چکے ہیں۔تم نے مارا ہے اُنہیں۔''نوید نے جھٹکے کے ساتھ اُسکے بال چھوڑے۔ اُس نے دوبارہ چہرہ اُس کی جانب موڑا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں بیوقوف تھی؟میں بہت اچھے سے جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن تم مجھے ڈھونڈ کر میری جان لے لو گے۔ایسے دن کے لیے۔۔۔۔ ایسے ہی دن کے لیے میں نے تمہارے بیٹے کو زندہ رکھا۔تمہارا چار ماہ کا چھوٹا بیٹا، جسکی لاش کے نام پر تم نے فقط ہڈیوں کو دفنایا تھا۔وہ زندہ ہے۔۔۔وہ زندہ ہے نوید عالم!اور میرے پاس ہے۔وہ ہڈیاں اُسکی نہیں تھیں۔۔۔وہ کسی اور کی تھیں،اُسے میں زندہ وہاں سے لے گئی تھیں۔اور تم اسے مردہ سمجھتے رہے۔ اُسے میں نے اسی دن کے لیے پالا ہے۔''وہ سفاکی سے ہنستی، کہتی ذہنی مریضہ لگ رہی تھی۔

''جھوٹ۔۔۔جھوٹ بول رہی ہو تم۔''نوید نے بے یقینی سے کہا۔

''تم جھوٹ سمجھتے رہو،اور وہاں تمہارا بیٹا، جو تب نہیں مرا تھا۔وہ اب مارا جائیگا۔بہت بے دردی سے۔۔۔۔''

''جھوٹ بول رہی ہو تم۔''اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید نے زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر دے مارا تھا۔قاتل نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت۔۔۔وہ صرف قاتل ہوتا ہے۔کسی کی سزا صرف اُسکے جنس کی بنا پر کم نہیں کی جاسکتی۔

''اگر مجھے کچھ بھی ہوا نوید عالم!تو تم اپنے بیٹے کو ٹکڑوں میں پاؤ گے۔''وہ چلائی۔

''تم۔۔۔''

''رکو نوید!''ڈی آئی جی صاحب نے کہا، پھر فرح کی جانب دیکھا۔

''کیا ثبوت ہے اس بات کا؟''انہوں نے سخت نظروں سے اُسے دیکھتے پوچھا۔

''میرے بیگ میں اسکے بیٹے کے بال اور ناخن موجود ہیں۔ جاؤ اور جا کر انکا ڈی این اے کروالو۔ تمہیں یقین آجائیگا کہ وہ میرے پاس ہی ہے۔''اُس نے کہا تو انہوں نے فوراً فیصل کو انٹر کام کیا۔

''میں نہیں مانتا۔۔۔ یہ کوئی چال چل رہی ہے۔''نوید کا دل کیا کہ اپنے بال نوچ لے۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور کچھ خواتین عملہ اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم! میں ایس ایس پی ثناء ہوں۔ یہ دونوں میری ماتحت اے ایس پیز ہیں۔''آنے والی نے اپنا تعارف دیا۔

''یہ عورت اب آپ کے حوالے ہے ثناء۔ اس سے تمام حقیقت اُگلوانا آپ کے ذمّے ہے۔ یاد رہے، اسے مرنا نہیں چاہیے۔''ڈی آئی جی صاحب نے اسے کہا۔

''تم میرے ساتھ آؤ نوید!''انہوں نے نوید کو کہا۔

''یاد رکھنا، جتنی خراشیں مجھے آئیں گی۔ تمہیں اتنی ہی خراشوں کے ساتھ اپنا بیٹا واپس ملے گا۔ کیونکہ مجھے زندہ چھوڑے بنا تم اپنا بیٹا نہیں لے سکتے۔''وہ چلائی تھی۔

''خاموش!''ثناء نے زوردار قسم کا تھپڑ اُسکے گال پر جڑا دیا۔ ڈی آئی جی صاحب نوید کو لیے اپنے کمرے میں آگئے، فیصل وہاں پہلے سے موجود تھا۔

''نوید! تمہیں صبر رکھنا ہوگا۔''انہوں نے اُسے بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر کہا۔

''کیسے صبر کروں میں؟ اور کتنا؟ وہ عورت جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہے۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں صبر کروں۔ کیسے یقین کر سکتے ہیں آپ اُسکی بات پر؟''وہ ایک بار پھر حلق کے بل چیخا تھا۔

''ہوش کے ناخن لو نوید! اسکے بیگ سے واقعی ناخن اور بالوں کا ایک پیکٹ ملا ہے۔ یہ ناخن تین سے چار سال کی عمر کے بچے کے ہی لگتے ہیں۔ ہم اسے فوری طور پر ڈی این اے کے لیے بھیج رہے ہیں۔''

''آپ اُسکی بات پر یقین کر رہے ہیں؟''اُس نے بے یقینی سے کہا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے اُسے بازوؤں سے تھاما۔

''اگر وہ سچ کہہ رہی ہو تو؟ کیا تم اپنے بیٹے کو مرنے چھوڑ دو گے؟''اُنکے سوال پر وہ سناٹوں میں رہ گیا۔

''اسی لیے، مجھے میرا کام کرنے دو۔اب تم جاؤ اور اپنے دوستوں کو باحفاظت یہاں لے کر آؤ۔''انہوں نے اپنی کرسی کے پاس جاتے ہوئے کہا۔

''میں کہیں نہیں جارہا۔آپ کسی اور کو بھیج دیں۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈیٹس مائی آرڈر (یہ میرا حکم ہے)!''انہوں نے سختی سے کہا تو وہ لب بھینچتا اُٹھ گیا۔

''تم اسے فوراً ڈی این اے کے لیے دو۔''اُسکے جانے بعد انہوں نے فیصل سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے!''وہ جانے کے لیے مڑا۔

''فیصل!''انہوں نے پکارا تو وہ رکا۔

''شیراز سے کوئی بات ہوئی؟''اُنہیں اُسکی فکر بھی تھی۔

''ابھی تک تو نہیں!''اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''ٹھیک ہے! جیسے ہی کوئی بات ہو تو مجھے بتانا۔''انہوں نے کہا۔

---------+---------+--------

وہ اُنہیں لے کر ایف آئی اے کی بلڈنگ میں داخل ہوا۔اُسکے چہرے پر خطرناک حد تک سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔کسی نے بھی دوبارہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

صرف وہ ہی نہیں، بلکہ ایف آئی اے کے آفس میں بھی ایک نامعلوم سی خاموشی چھائی تھی۔مشاورتی کمرے تک پہنچتے پہنچتے یہ خاموشی بڑھ چکی تھی۔ فیصل اور ڈی آئی جی صاحب بالکل ساکت و جامد سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ لوگ بھی خاموشی سے اپنی نشستیں سنبھالنے لگے۔نوید بھی بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کی آواز گونجی۔

''رکو نوید!''کرسی گھسیٹتے نوید نے رک کر دیکھا۔

''تم فوری طور پر ہسپتال جارہے ہو۔''اس حکم پر اُس کی تیوری پر بل پڑے۔

''اب کیا ہو گیا ہے؟''وہ جھنجھلایا۔

''کچھ لوگوں نے گھر میں گھس کر، شیراز کی بیوی کے گلے پر چاقو پھیر کر اُسے قتل کر دیا ہے۔''انہوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔ کرسی کی پشت پر رکھا نوید کا ہاتھ کانپا تھا۔

''ہاں؟''اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''تم فوراً ہسپتال جاؤ۔''

''کس نے کیا یہ؟''اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھا تھا۔

''تمہیں اِس لیے وہاں بھیج رہا ہوں۔ جائے وقوعہ پر ٹیم موجود ہے، تم ہسپتال جاؤ اور عینی شاہدین سے معلومات لو۔ اپنے ساتھ فیصل اور باقی ٹیم کو بھی لے جاؤ۔''انہوں نے کہا۔

''اُسکی بیوی قتل ہو گئی ہے اور آپ کو تفتیش کی پڑی ہے۔''وہ تاسف سے کہتا باہر نکل گیا۔ ڈی آئی جی صاحب نے لب بھینچے، وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ انہوں نے فیصل کو سر کے اشارے سے اُسکے پیچھے جانے کو کہا تو وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔

انہوں نے گہری سانس بھر کر ماتھا مسلا، پھر سنجیدگی سے اُن سب کو دیکھا جو خاموش بیٹھے تھے۔

''کیسے ہو تم سب؟ ہم نے ایک خاتون کو پکڑا ہے۔ فلحال، اس سے تفتیش جاری ہے اور۔۔''وہ ہر بات بتاتے چلے گئے۔ ہر دن پہلے سے زیادہ بے یقینی لاتا تھا۔ ہر روز ایک نیا انکشاف انکا منتظر ہوتا تھا۔

''اُس نے جن لوگوں سے رابطہ کیا ہے، مجھے امید ہے کہ صبح تک وہ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔ پھر تم لوگ گھر جا سکتے ہو، لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ ہم ہر وقت تمہاری حفاظت کریں گے۔ فلحال! آج رات تم سب کو اسی گھر میں رہنا ہو گا۔''انہوں نے بات مکمل کی۔

''کیا نوید کا بیٹا واقعی زندہ ہو گا؟''علی نے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن اگر وہ سچ بول رہی ہوئی، تو تم لوگ بتاؤ، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا اُسکے بدلے نوید کے بیٹے کو واپس لانا چاہیے یا اُسے کسی بھی حال میں یہاں سے جانے نہیں دینا چاہیے؟''انہوں نے جانچتی نظروں سے سب کو دیکھا تھا۔

''آپ کو نوید کے بیٹے کو حاصل کرنا چاہیے۔''حسین نے سب کی جانب سے جواب دیا تھا۔ باقی سب نے بھی سر ہلا کر تائید کی تھی۔

''اور اتنی ماؤں کے بچے، جو اس نے اسمگل کر کے کسی اور ملک بیچ دیئے، یا جنہیں مار دیا، کیا اُن سب کو بھول جانا چاہیے؟''انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا، تو جواباً سب خاموش رہے۔

''پریشان نہ ہو، میں نہ نوید کے بیٹے کو اور نہ ہی اُس جرائم پیشہ گینگ کے سرغنہ کو ہاتھ سے جانے دوں گا۔''انہوں نے حتمی انداز میں کہا تھا۔

---------+---------+--------

ہسپتال کی راہداری خاموش تھی۔اسٹیل کی کرسیوں میں سے ایک پر شیراز سر جھکائے بیٹھا تھا۔اُسکا لباس خون آلود ہو رہا تھا۔بال بکھرے ہوئے تھے۔اور آنکھیں۔۔۔آنکھیں پتھر ہو چکی تھیں۔

نوید کے برابر فیصل،اور اُن دونوں کے پیچھے مزید دو اہلکار راہداری میں داخل ہوئے،تب بھی اُسکے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔راہداری میں اُس سے تقریباً دس بارہ قدم کے فاصلے پر نوید رک گیا۔شیراز کے سامنے اسٹریچر تھا،جس پر موجود وجود کو سفید چادر سے مکمل ڈھانپ دیا گیا تھا۔سفید چادر اُس وجود کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔نوید کا دل ڈوبا۔قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے۔

''فیصل!''خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے برابر کھڑے فیصل کو آہستہ سے پُکارا۔

''جی سر!''

''تم جاؤ اسکے پاس۔''اُس نے کہا تو فیصل گہرا سانس لیتا شیراز کی جانب بڑھا۔معلوم ہوتا تھا اسکے لیے بھی یہ مرحلہ مشکل ہے۔نوید جانتا تھا کہ اگر وہ خود گیا تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائے گا۔اسے تسلی دینی نہیں آتی تھی۔اور وہ آج بھی نہ آئی تھی۔

فیصل آہستہ سے چلتا اُسکے پاس گیا۔اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔پر شیراز کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔پھر وہ اُسکے قدموں میں بیٹھا۔

''شیراز!''اُس نے آہستہ سے اُسے مخاطب کیا تو شیراز نے آنکھیں اٹھا کر جن نظروں سے اُسے دیکھا تھا،فیصل تو فیصل،اُسکے پیچھے کھڑا نوید بھی اندر تک ہل گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے شیراز کا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔یہ کیسا سوال تھا؟بھلا وہ کیسے ٹھیک ہو سکتا تھا؟ اُس نے کچھ نہ کہا۔اُسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر وہاں داخل ہوا۔اسے دیکھ کر فیصل کھڑا ہوا تو وہ بھی رکا۔

''نمرہ قائم خانی۔۔۔کیا ہوا ہے انہیں؟''فیصل نے پوچھا۔نوید کے پیچھے کھڑے باقی دونوں اہلکار بھی آگے بڑھنے لگے پر اُس نے اشارے سے دونوں کو روک دیا۔

''نمرہ قائم خانی ہمارے پاس زخمی حالت میں لائی گئی تھیں۔اُنہیں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر اُنکے گلے پر چھری پھیر دی گئی تھی۔''ڈاکٹر نے بتایا تھا یا کان میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔نوید نے سختی سے آنکھیں بند کیں۔پھر کھولیں تو اُن میں لہو اتر آیا تھا۔وہ تیزی سے فیصل کے برابر آیا۔

''کس نے کیا ہے یہ سب ؟''وہ ڈاکٹر کے سامنے دھاڑا تھا،اُسکا بس نہیں چل رہا تھا ساری دنیا اُلٹ دے۔یہ تو اسکی حالت تھی، نجانے شیراز کا کیا حال تھا؟وہ تو ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی نمک کا مجسمہ ہو۔

''سمیر!''شیراز کی آواز پر سب نے مڑ کر اُسے دیکھا تھا۔اُسکا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔اگلے ہی لمحے نوید نے وہ کیا،جو اُس نے کسی کے لیے نہیں کیا تھا۔کسی کے لیے بھی نہیں!

وہ اُسکے قدموں میں بیٹھا،ایک ہاتھ اُسکے کندھے پر رکھا کر دوسرے سے اُسکا ہاتھ تھاما۔

''کیا ایس ایچ او سمیر؟''اُس نے پوچھا تھا۔آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

''ہاں!نمرہ نے اپنی آخری سانسیں میرے سامنے ہی لی تھیں۔اُس نے اُسی کا نام لیا تھا۔اس نے۔۔۔''

''بس۔۔۔ٹھیک ہے!''نوید نے اُسکا ہاتھ دبایا۔شیراز کا تنفس تیز ہونے لگا۔

''میں سمجھ گیا ہوں سب کچھ،تمہیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُس نے اُسکا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ایس ایچ او سمیر ہی تھا،جس نے پہلے بھی اُسکے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا۔کاش!اُس روز نوید نے اُسکی آنکھیں پھاڑنے کے بجائے اسے زمین میں گاڑ دیا ہوتا۔وہ کھڑا ہوا۔

''ایک اے ایس پی کے گھر میں اتنا سب کچھ ہو گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی؟کیا کر رہے تھے سیکیورٹی پر مامور اہلکار؟''اُس نے فیصل سے پوچھا۔نمرہ کی سیکیورٹی کے پیش نظر پچھلے کئی دنوں سے اُسکے گھر کی سیکیورٹی بڑھا دی گئی تھی۔

''وہ اپنے باپ کے گھر آئی ہوئی تھی۔وہ عشاء کی نماز کی امامت کیلئے مسجد میں تھے۔اور پیچھے یہ سب ہوا۔''ایک بار پھر شیراز کی آواز گونجی تو نوید نے ضبط سے اپنی گردن دبائی۔اُسکے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔تو شیراز؟اُسکا کیا؟

''شیراز!''نوید نے ایک مرتبہ پھر اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چلو اٹھو!میرے ساتھ آؤ!''نوید نے کہا تو وہ خاموشی سے کھڑا ہوا جیسے روبوٹ ہو۔

''خواتین عملے سے کہو کہ لاش کو فوراً فرانزک کے لیے لے کر جائیں۔اور تم لوگ اس بے غیرت سمیر کو فوراً گرفتار کر کے لاؤ۔چاہے وہ زمین میں دفن کیوں نہ ہو چکا ہو،وہاں سے بھی نکال کر لاؤ اسے۔''نوید نے حکم دیتے ہوئے کہا تو دونوں اہلکار حکم کی تعمیل میں دوڑے۔شیراز نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا پر اُسکے قدم لڑکھڑا گئے۔اسے فوراً ایک جانب سے فیصل نے اور دوسری جانب سے نوید نے تھاما تھا،ورنہ وہ گر جاتا۔

''صبر کرو!''فیصل اسے کہہ رہا تھا۔پر نوید نہیں کہہ سکتا تھا۔کیونکہ وہ جانتا تھا۔۔۔

صبر کرنا آسان نہیں ہوتا!

---------+---------+--------

رات ایک بار پھر بے چینی سے کٹی تھی۔اُن میں سے کوئی بھی نہ سو سکا تھا۔نوید سے دوبارہ انکا سامنا بھی نہ ہوا۔ایسا لگتا تھا جیسے اسکر دو میں گزارا گیا وقت، کوئی اچھا خواب تھا۔اور اب وہ حقیقت کی دنیا میں بیدار ہو گئے تھے۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔نوید، شیراز کے ساتھ ایف آئی اے کے لیونگ ایریا میں بیٹھا تھا۔نمرہ کی لاش کا فرانزک ہو چکا تھا،لاش وہاں سے آجاتی تو اسکے بعد شیراز نے تدفین کے لیے جانا تھا۔اُس کا کل اثاثہ فقط اُسکی ماں اور نمرہ تھی۔اور کوئی نہ تھا اُسکا۔جنازے کا انتظام فیصل نے کر دیا تھا۔شیراز اب تک کل والے خون آلود لباس میں ہی تھا۔

بلڈنگ میں کام کرنے والا دیگر عملہ وہاں سے گزرتا تو کچھ دیر رک کر شیراز سے تعزیت کرتا یا تسلی کے چند بول کہہ دیتا۔وہ کچھ نہ کہتا۔بس سر جھکائے بیٹھا رہتا۔اسکی جانب سے نوید ہی سب کو جواب دے رہا تھا۔

رات سمیر کو ایک قوالی نائٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔وہ کل شام سے رات گرفتاری تک وہیں تھا، سی سی ٹی وی فوٹیج میں اور عینی شاہدین کے مطابق بھی وہ وہیں تھا۔فلحال اسے شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا۔اُس نے بھی بڑے پر سکون انداز میں گرفتاری دے دی تھی۔اور اب تفتیشی کمرے میں بڑے مزے سے بیٹھا ہوا تھا۔

پہلے فرح اور اب یہ بدبخت،اُن دونوں مجرمین کے پر سکون انداز پر نوید کا دماغ گھوم رہا تھا۔

''فرّخ صاحب اندر بلا رہے ہیں۔''فیصل نے آکر اطلاع دی تو وہ کھڑا ہوا، پھر ایک نظر شیراز کو دیکھا۔

''چلو ساتھ!''اُس نے ایک بار پھر اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔ تو وہ پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔کل رات سے اب تک وہ اتنا خاموش تھا جتنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے قوّت گویائی سے محروم ہو گیا ہو،نہ چیخا نہ چلایا نہ آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو کا بہایا۔ایسے جیسے کوئی حس ہی باقی نہ رہی ہو۔یا یہ طوفان آنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔

وہ دونوں اندر آئے تو فرّخ صاحب ہمیشہ کی طرح اپنی کرسی پر تھے، چہرے پر فکروں کے جال بچھے تھے۔فیصل بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا جبکہ نوید نے اپنی مخصوص کرسی کھینچی اور اس پر شیراز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔خود وہ کھڑا رہا۔

''نوید! کیسے ہو تم؟''اس سے پہلے کہ کوئی بھی کچھ کہتا،اُسکے برابر میں آکر کسی نے کہا تو وہ مڑا۔

''ساگر؟''اُسکا ہم منصب،اور ٹریننگ کے دوران اُسکا روم میٹ ایس ایس پی ساگر کمار سامنے تھا۔

''کیسے ہو؟''نوید نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''اُس نے آہستہ سے کہا،اور ایک نظر شیراز کو افسوس سے دیکھا۔

''ایس ایس پی ساگر کمار نے ہی سمیر کا کیس لیا ہے۔کل رات سے تمام تفتیش اسی نے کی ہے۔ ساگر! ہمیں اپڈیٹ کریں۔''فرّخ صاحب نے کہا تو ساگر سامنے اسکرین کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نوید اب بھی نہ بیٹھا۔

''نمرہ۔۔۔''ساگر نے کہنا شروع کیا پھر رکا۔'' یعنی ڈیتھ باڈی کی ابتدائی فرانزک رپورٹ کے مطابق کہیں بھی سمیر کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔وہ کل رات قوالی نائٹ میں تھا۔اور جس وقت حادثہ پیش آیا تب بھی وہ وہیں تھا۔''اُس نے کہا۔

''اسکا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس جرم میں ملوث نہیں ہے۔صاف ظاہر ہے اُس نے خود کو بچانے کے لیے تمام منصوبے بنا رکھے تھے۔''نوید نے کہا۔

''آف کورس! ایسا ہی ہے۔وہ چاروں لوگ جو اِس۔۔۔۔''وہ ایک بار پھر رکا اور زبان لبوں پر پھیرتے ہوئے شیراز کو دیکھا۔جواب بھی سر جھکائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔''جو اِس گینگ ریپ میں شامل تھے۔''شیراز نے سختی سے آنکھیں میچی،نوید کی رگیں تن کر ابھری،آنکھ کے برابر موجود زخم کا نشان واضح ہوا۔''وہ سب کے سب جائے وقوعہ سے فرار ہوتے وقت،ایک ٹرک کی زد میں آکر جانبحق ہو گئے۔ٹرک ڈرائیور مفرور ہے۔ظاہر ہے،اُنہیں مروا دیا گیا ہے۔لیکن۔۔۔''وہ رکا۔

''لیکن؟''فیصل نے پوچھا۔

''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اُن چاروں کا سمیر سے کسی بھی قسم کا رابطہ ثابت نہیں ہو رہا ہے۔نہ سمیر نے پچھلے دنوں اپنے بینک سے کوئی ٹرانزیکشن کی،نہ اُس نے کسی کو کوئی رقم دی۔ہم مزید ڈیٹا اکھٹا کر رہے ہیں۔پر فلحال وہ کسی بھی طرح سے مجرم ثابت نہیں ہو رہا ہے۔''اُس نے بات مکمل کی۔

''تو؟''نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو یہ کہ اگر رات تک آنے والے ڈیٹا میں،ہمیں اُسکے متعلق کچھ نہ ملا تو۔۔۔تو ہمیں اسے چھوڑنا ہو گا۔''جواب فرّخ صاحب نے دیا تھا۔نوید طنزیہ ہنسا۔جیسے وہ اسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔

''جب وہ آپکے پاس تیزاب گردی کے کیس میں آیا تھا،تب تو وہ مجرم تھا،اُسکے خلاف ثبوت بھی موجود تھے۔پھر وہ کیوں آزاد گھوم رہا تھا؟''نوید نے پہلی بار فرّخ صاحب سے سوال کیا تھا۔

''کیونکہ وہ عدالت سے عبوری ضمانت لے چکا تھا۔''انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ چاہتے تو یہ نہ ہوتا۔''نوید نے کہا تو انکے ماتھے پر بل پڑے۔

''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟ میں قانون ہاتھ میں لے لیتا؟ عدالت کے خلاف چلا جاتا؟ اگر وہ مجرم ثابت نہیں ہوا، تو میں اسے حبس بے جا میں نہیں رکھ سکتا ہوں۔ چاہے ہمارے دل کو کتنا ہی پکا یقین کیوں نہ ہو کہ وہ مجرم ہے۔''وہ کل سے اُسکی بدتمیزی برداشت کر رہے تھے۔ آج انہیں بھی غصّہ آ گیا تھا۔ اُنکے جواب پر پہلی بار شیراز نے چہرہ اٹھا کر اُنہیں دیکھا، اُسکی نظروں میں کچھ تھا۔۔۔ کچھ بہت ہی خوفناک سا۔۔۔ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔ کسی نے اسے روکا نہ اُسکے پیچھے گیا۔ اسے اکیلے ہی رہنا چاہیے تھا۔

''آپ اگلے ہفتے ریٹائر ہو رہے ہیں نا؟''نوید کا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔ فرّخ صاحب کی رگیں تنی۔

''آپ یہ کہیں کہ جانے سے پہلے آپ خود کو کسی مسئلے میں پھنسانا نہیں چاہتے، صاف شفاف ریٹائرمنٹ چاہتے ہیں تاکہ باقی کی زندگی سکون سے گزار سکیں۔ ورنہ نمرہ آپکی بیٹی ہوتی تو۔۔۔''

''ایس ایس پی نوید! اپنی۔۔۔ حد میں رہو!''انہوں نے حد درجے سرد لہجے میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔ نوید مسکرایا، اُسکا انداز باغیانہ تھا۔ ایسا تو اُس نے اپنے بچوں کو قتل کرنے والی فرح خالد کو آزاد دیکھ کر بھی نہ کیا تھا۔ ساگر اُسکے قریب آیا اور اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

''تم نے کتنی ہی دفعہ قانون ہاتھوں میں لیا ہے، کتنی بار اپنی من مانی کی ہے۔ اور میں نے ہر بار تمہیں بچایا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، ملک میرے اشاروں پر چلتا ہے؟''انہوں نے مزید کہا۔

''میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔''نوید نے انکی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔''آپکے عہد میں مجرم آزاد گھومتے رہے ہیں۔ جانے سے پہلے یہ سچ قبول کر کے جایئے گا۔''اُس نے آج کوئی لحاظ نہ رکھا تھا۔ فرّخ صاحب نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر شہادت کی انگلی اٹھا کر دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

''آؤٹ!۔۔۔''سختی سے کہے گے اِس لفظ پر اُس نے ایک مرتبہ پھر افسوس بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور باہر نکل گیا۔ فرّخ صاحب نے سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

(راہداری خاموش تھی، آس پاس عملہ موجود نہ تھا۔ اس جانب ویسے بھی ہر کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے میں وہ خطرناک تاثرات اور وحشت ناک حد تک خاموشی لیے اُس کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔)

نوید باہر آیااور بلڈ نگ کے احاطے میں بنے باغ میں رکھی لکڑی اور لوہے سے بنی بینچ پر بیٹھ گیا۔ سورج سروں پر تھا۔اُسکا دماغ آج واقعی کام کرنے سے انکاری ہورہا تھا۔ ورنہ ہر حالت میں کمپوز رہنے والے نوید نے کبھی اتنی جذباتیات نہ دکھائی تھیں، پر کل سے جو ہو رہا تھا، وہ اُسکے اعصاب پر بھی بھاری پڑ رہا تھا۔ کل رات سے وہ بشریٰ سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کر سکا تھا۔ صبح اُس کا میسج آیا تو نوید نے بس اپنی خیریت بتا کر موبائل بند کر دیا۔ نہ اُس سے اُسکی خیریت دریافت کی نہ اُسکے دن کے بارے میں پوچھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ البتہ نمرہ والے واقعی کے بعد اُس نے گھر کے گرد سیکیورٹی سخت کر دی تھی۔ اسے فرح پر کوئی بھروسہ نہ تھا، اُسکے آدمی کہیں بھی ہو سکتے تھے۔

گو کہ فرح کی کسی بھی بات پر اسے یقین نہ تھا۔ بلکہ اسکا کامل یقین تھا کہ اُسکے بیٹے مر چکے ہیں۔ وہ عورت فقط انکا وقت ضائع کرنا چاہتی تھی۔ انہیں ان جھوٹی باتوں میں لگا کر وہ یقیناً کسی اور مقصد کے لیے وقت لے رہی تھی۔ اگر اُسکی بات پر یقین کرنے کے بجائے ایف آئی اے اُس سے کڑی تفتیش کرتا، تو وہ اب تک سب اُگل چکی ہوتی۔ پر نوید اِس معاملے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا، کیوں کہ آخری فیصلہ فرّخ صاحب ہی کرتے تھے۔ جتنا وقت وہ ضائع کروا کے انکا دھیان بھٹکا رہی تھی، اتنے وقت میں وہ یقیناً کوئی بڑا کام کرنے والی تھی۔ وہ بشریٰ، جزا اور امی کے لیے پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

(خاموش راہداری کے اختتام پر اپنے مطلوبہ کمرے کے باہر رک کر اُس نے آس پاس دیکھا، پھر دروازے کے برابر میں رکھا لوہے کا بھاری بھرکم گلدان اٹھالیا، جسکے بارے میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ یہاں کیوں ہے آخر؟)

''اگر آپکی سگی بیٹی ہوتی، تو کیا تب بھی آپ عدالت کے فیصلے کا انتظار کرتے؟'' کمرے کی خاموش فضا میں فیصل کی آہستہ آواز گونجی تو فرّخ صاحب نے چہرہ ہاتھوں سے اٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور اس بار وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

''کیا حیدر نسیم یاد ہے آپکو؟ سائبر کرائمز ڈیپارٹمنٹ کا آفیسر، جس نے ایک دن اپنے ہی آفس میں خودکشی کر لی تھی۔ حالانکہ ہم سب جانتے تھے کہ وہ خودکشی نہیں تھی، پر ہم کچھ نہ کر سکے۔ منہاج لغاری، جس نے ہسپتال میں مریضوں کے اعضاء نکال کر بیچنے والوں کے خلاف پورا کیس اپنے سر لیا تھا۔ اُسکے بھائی کو اُٹھا کر لے گئے تھے وہ لوگ، اور جب چھوڑا تو اُسکا بھائی اپنے دونوں پیروں سے معذور ہو چکا تھا۔ ٹینس کا پلیئر (کھلاڑی) تھا وہ لڑکا۔ اور ایسے بہت سے ہیں سر! بہت سے۔۔۔ جنکے مجرم آزاد ہیں۔ کیونکہ عدالت کچھ ثابت نہ کر سکی۔'' اُس نے کہا۔

''تو تمہارے خیال میں، کیا کروں میں؟'' اب کہ انہوں نے تھک کر پوچھا تھا۔

''آپ اُسے جانے نہ دیں۔ وہ آج چلا گیا تو کل اِس ملک کے کسی بھی کونے میں نہیں مل سکے گا۔ آپ وہ کریں جو آپ اپنی بیٹی کے لیے کرتے۔'' فیصل نے سرخ آنکھوں سے اُنہیں دیکھا۔

''شیراز کی بیوی کل رات بے دردی سے قتل ہو گئی ہے۔''اُنکے کچھ بھی کہنے سے قبل سا گر کمار کی آواز کمرے میں گونجی۔''پر وہ کل سے اب تک کسی مردے کی طرح خاموش ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں میں اُس میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''اُس نے سنجیدگی سے اُنکی آنکھوں میں دیکھا،''ایک اور حیدر نسیم، ایک اور منہاج لغاری، ایک اور نوید عالم۔۔۔ کسی مجرم کو تو روک لیں۔ کسی کو تو۔۔''سا گر نے بھی جیسے التجا کی تھی۔ فرّخ صاحب بھی اپنی جگہ درست تھے۔ وہ کیسے قانون ہاتھ میں لیتے؟ پر وہ سب بھی ٹھیک کہہ رہے تھے، اگر اُنکی اپنی بیٹی نمرہ کی جگہ ہوتی تو وہ دنیا الٹ دیتے۔ وہ عجیب دوراہے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

(اُس نے تفتیشی کمرے کا ہینڈل گھمایا اور اندر آیا۔ دروازہ اپنے پیچھے ہی کھلا چھوڑ دیا۔ جیسے اُسے اب کسی کے اپنے پیچھے آنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اُسکا مجرم سامنے تھا، اُسکی ایک آنکھ پتھر کی تھی، ہتھکڑیاں اُسکے ہاتھوں میں تھیں۔ شیراز کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خباثت سے مسکرایا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اُسکے قریب آیا، اور اگلے ہی لمحے ہاتھ میں پکڑا لوہے کا گلدان پوری قوت سے سمیر کے سر پر دے مارا۔)

باغ میں بیٹھے نوید نے کھلی راہداری میں عملے کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو نا سمجھی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تیزی سے راہداری میں آیا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے قریب سے گزرتے ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔

(سمیر کرسی سمیت نیچے گرا تھا۔ اُسکا سر پھٹ چکا تھا۔ خون چاروں جانب پھیل رہا تھا۔ اسی لمحے شیراز نے گلدان دوبارہ اٹھایا۔

''شیراز! یہ کیا کر رہے ہو؟''کوئی دوسرا آفیسر پیچھے سے چیخا تھا۔ گلدان سمیت شیراز کا بلند ہاتھ ہوا میں ہی رکا۔ اُس نے آہستہ سے پلٹ کر آنے والے کو دیکھا۔ اُسکی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر آنے والے کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔ اُسکے چہرے پر درندوں جیسی وحشت تھی۔

''شی۔۔۔ شیراز!''آنے والا اُسکا نام بھی ادا نہ کر سکا۔ شیراز واپس پلٹا اور اگلے ہی لمحے گلدان ایک بار پھر، پوری قوت سے نیچے گرے سمیر کے سر پر دے مارا۔ آنے والا آفیسر خوفزدہ انداز میں چلا چلا کر باقی عملے کو پکارنے لگا۔ شیراز گہری گہری سانس لیتا اپنے اندر کا لاوا کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔)

''اے ایس پی شیراز۔۔۔۔''وہ آدمی بوکھلایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا شیراز کو؟''نوید چیخا۔

''اُس نے سمیر کو قتل کر دیا ہے۔''اگلے ہی لمحے نوید دوڑتا ہوا تفتیشی کمرے کی جانب گیا تھا۔

عملہ وہاں جمع ہونے لگا۔ سمیر زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اُن میں سے کچھ لوگ شیراز کو روکنے آگے بڑھے، پر اسی لمحے اُس نے جیب سے بندوق نکالی اور اُن سب کے پیروں کے سامنے فائر کیا، سب ہڑ بڑا کر پیچھے ہوئے، یہ اُنکے لیے ایک وارننگ تھی۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔ اُسکی آنکھوں میں موجود وحشت اُنکا دل ہولا رہی تھی۔ اُس نے پلٹ کر نفرت بھری نگاہ نیچے گرے سمیر پر ڈالی، پھر آگے بڑھا اور گلدان دوبارہ ہوا میں بلند کیا۔

''شیراز رک جاؤ!'' نوید پیچھے سے چیخا تھا۔ پر وہ رکا نہیں، اس نے ایک مرتبہ پھر گلدان اُسکے سر پر دے مارا۔ سمیر ساکت ہو گیا۔

''شیراز۔۔۔'' نوید نے لب بھینچے، پھر دوڑ کر سمیر کے پاس آیا۔ جھک کر اسکی نبض چیک کی۔ وہ زندہ تھا۔ حالانکہ نوید کی دلی خواہش تھی کہ وہ جہنم واصل ہو جائے، پر اس وقت شیراز کی بقا کے لیے اُسکا زندہ رہنا ضروری تھا۔

''اسے فوراً ہسپتال لے جانا ہوگا۔ یہ زندہ ہے۔۔۔۔ یہ مرنا نہیں چاہیے۔'' نوید چلا رہا تھا۔ عملہ تیزی سے حرکت میں آ رہا تھا۔ گلدان ہاتھ میں پکڑا شیراز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ خون آلود گلدان اب بھی اُسکے ہاتھوں میں تھا، اُسکی چال، اُسکا چہرہ، وہ کہیں سے بھی نارمل انسان نہیں لگ رہا تھا۔ راہداری میں کھڑے لوگ اپنے آپ پیچھے ہٹنے لگے۔ ساگر، فیصل اور فرّخ صاحب بھی وہاں آ چکے تھے۔ آنکھوں میں بے یقینی لیے وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''شیراز۔۔۔'' فیصل نے آگے بڑھ کر اُسے روکنا چاہا۔ اور کسی کی تو ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔ وہ بنا رکے آگے بڑھتا رہا۔

''شیراز پلیز! میری بات سنو!'' ساگر نے بھی روکنا چاہا پر وہ نہ رکا۔ نوید فوراً باہر آیا، اُسکے پیچھے عملہ سمیر کو اسٹریچر پر لٹا چکا تھا۔

''شیراز۔۔۔'' نوید تیزی سے اُسکے پیچھے آیا اور اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ اگلے ہی لمحے جیسے شیراز کو کرنٹ چھو گزرا تھا، یا کوئی طاقت اُسکے اندر آ سمائی تھی۔ اُس نے پلٹتے ہوئے نوید کا ہاتھ جھٹکا اور

''اکیلا چھوڑ دو مجھے۔۔۔'' وہ اپنی آواز کے آخری نوٹ پر چلایا تھا۔ اتنی بلند، اور فلک شگاف آواز کہ اُسکی شدت سے اُسکے جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہاں کھڑے ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا۔ اُسکی دونوں آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بہہ نکلے تھے۔ نوید کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ یہ وہ لاوا تھا جو کل رات سے پک رہا تھا، اور اب آتش فشاں بن کر پھٹا تھا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' اُس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی اور تیز تیز چلتا وہاں سے نکل گیا۔ نوید اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا، نہ ہی کوئی اُسکے پیچھے گیا نہ فرّخ صاحب کچھ کہہ سکے۔

اُس نے انصاف کا انتظار نہیں کیا تھا۔

اُس نے عدالت خود ہی لگالی تھی۔

---------+---------+--------

رات اُن سب کو ایف آئی اے نے بلوایا تھا۔ ساتھ انکا سامان بھی گاڑی میں رکھ لیا گیا تھا۔ شاید وہ مشاورت کے بعد سیدھا اپنے اپنے گھر جانے والے تھے۔ ایف آئی اے کی بلڈنگ کے احاطے میں وہ سب اُترے تو نوید کو کھلی راہداری میں کھڑا پایا۔ وہ سیاہ شلوار کرتے میں ملبوس، ستون سے ٹیک لگائے، دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے یک ٹک سامنے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر ہو نہ ہو، پر آنکھیں عجیب اُداس سی تھیں۔ اُس نے انکے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ اُسکا چہرہ اُسکے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا غماز تھا۔

''نوید! تم ٹھیک ہو؟'' اُسکے قریب آتے علی نے رک کر پوچھا، تو اُس نے بنا اسکی طرف دیکھے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔ علی نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ دور، باغ میں بنی بینچ پر، نیوی بلیو رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس، سر جھکائے بیٹھے شیراز کو دیکھ رہا تھا۔

دوپہر نمرہ کے جنازے کے لیے نوید اُسے اپنے ساتھ ہی لیکر گیا تھا، جنازے پر بہت بڑی عوام آئی تھی۔ جنازے و تدفین سے واپسی پر نوید اُسے پھر یہیں لے آیا۔ اب وہ شام سے اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ نوید بھی اُس پر سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ فرح خالد کو بھی بھول چکا تھا۔

سمیر کے خلاف تمام ثبوت اکھٹے ہو گئے تھے۔ اس میں کمال صرف ساگر کمار کا تھا۔ وہ اس معاملے کی تہہ تک چند گھنٹوں میں پہنچا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے مفرور ٹرک ڈرائیور کو پکڑا، تھوڑی دیر میں ہی اُس نے بتا دیا کہ اُسے ایک جابر نامی شخص نے قتل کا حکم دیا تھا۔ ڈرائیور کے ذریعے ہی جابر تک پہنچا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ بندہ سمیر سے رابطے میں تھا۔ وہ دونوں فون پر رابطہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اُنہوں نے ایک غیر ملکی عام سی ایپلیکیشن، جسکا اِس ملک میں کسی کو علم بھی نہ تھا، اس مقصد کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ سمیر کا ایک ذاتی کیٹل فارم تھا، وہ کچھ بیوپاریوں کے ذریعے مویشی فروخت کرتا تھا۔ کچھ دنوں پہلے اُس نے آٹھ لاکھ نقد رقم کے عوض ایک جانور بیچا تھا۔ وہ نقد رقم اُس نے جابر کے حوالے کی اور باقی کا تمام کام اُس نے کر دیا۔ اسی لیے اُس رقم کا کوئی ڈیٹا موجود نہ تھا، یہ سب جابر کی زبانی معلوم ہوا۔ سمیر نے جتنی صفائی سے یہ کام کروایا تھا، اُس تک پہنچنا آسان نہیں تھا، اِس میں واقعی ساگر کی ذہانت تھی۔ اُس نے تمام ثبوت اکھٹے کر لیے تھے، اب دنیا کی کوئی طاقت سمیر کا جرم چھپا نہ سکتی تھی۔

بلڈنگ کو صبح سے سانپ سونگھا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی وہاں پر۔ پتہ نہیں شیراز کے بارے میں فرّخ صاحب نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ نوید کو وہ دن یاد آیا جب وہ اسی باغ میں بیٹھ کر گٹار بجاتا گانا گنگنا رہا تھا۔ اچھے دن اتنی جلدی کیوں نکل جاتے تھے؟

''سر! آپ کچھ کھائیں گے؟'' پاس سے گزرتے ملازم نے رک کر پوچھا تو وہ چونکا۔ باقی سب اندر جا چکے تھے۔ ملازم کے ہاتھ میں دو ٹرے تھیں، ایک میں بہت سارے شاورمہ رول پڑے تھے، اور دوسرے میں چائے کی پیالیاں تھیں۔

''ہاں! ایک رول، اور دو کپ چائے دے دو۔''اُس نے کہا تو ملازم نے بینچ پر دونوں ٹرے رکھی، اور اُسکی مطلوبہ پلیٹ بنا کر اسکے حوالے کی۔ نوید نے پلیٹ تھامی اور راہداری سے اُتر کر باغ میں آیا پھر شیراز کے قریب آ رکا، بینچ کے ہینڈل کو کھولا تو وہ ایک ٹرے کی طرح شیراز کے سامنے آ گیا۔ وہ سیدھا ہوا اور ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔ نوید نے چائے اور شاورمہ اُسکے سامنے کھلنے والی ٹرے نما ڈیسک پر رکھا، اور دوسری پیالی اپنے ہاتھ میں لیکر اُسکے برابر بیٹھ گیا۔ شیراز خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''کھالو! تم کل سے بھوکے پیاسے ہو۔''اُس نے نرمی سے کہا۔ آنکھوں میں پر شفیق سا تاثر تھا۔ شیراز نے چہرہ واپس موڑ لیا۔ نوید کو اُس سے ہمدردی نہیں تھی، بلکہ اسکا دکھ اپنے دل پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے اُسکا جونیئر رہا تھا۔ ہر اہم کیس میں اُسکی ٹیم کا حصّہ ہوتا تھا۔ نوید کی بڑے بھائیوں جتنی عزت کرتا تھا۔ اور وہ اسے چھوٹے بھائی جتنا ہی عزیز تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر نوید نے گہری سانس لی اور تھک کر چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔

''میں نے نمرہ کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔''خاموش فضا میں شیراز کی آہستہ آواز گونجی تو نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔

''وہ پردہ کرتی تھی، اور میں اُسکے پردے کا احترام۔ ایک دفع میں نے اُسے بچوں کو درس دیتے ہوئے سنا تھا۔''وہ جیسے یاد کر کے مسکرایا۔ نوید نے اُسے نہیں چھیڑا۔ وہ اُسکی آنکھیں دیکھ رہا تھا، وہ آنکھیں یہاں نہیں تھیں۔ وہ دور کہیں خوبصورت ماضی کو دیکھ رہی تھیں۔

''پھر مجھے معلوم ہوا کہ سمیر نے اُسکے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ وہ ہسپتال میں تھی، تب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ اُسکا آدھے سے زیادہ چہرہ تباہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی شکوے کا اپنی زبان پر نہ لائی، بلکہ صبر کے ساتھ سب برداشت کرتی رہی۔ اُس دن مجھے وہ دنیا کی خوبصورت ترین عورت لگی۔ اور وہ تھی بھی۔۔۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔''اُس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ نوید نے اُس سے نظریں ہٹائی اور سامنے نظر آتی گھاس پر مرکوز کر دیں۔

''جس عورت کے باطن سے محبت ہو جائے، وہی دنیا کی حسین ترین عورت ہوتی ہے۔ پھر اُس میں کوئی عیب نظر بھی نہیں آتا۔''نوید نے مسکراتے ہوئے پہلی بار کسی سے دل کی بات کہی تھی۔ بشریٰ بھی تو اپنی تمام تر خراب ذہنی حالت کے باوجود اُسکے لیے خوبصورت ترین اور مکمل عورت تھی۔

''میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔ اب اُس کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ تم اے ایس پی شیراز کی بیوی ہو، اب کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ پر میں اُسکی حفاظت نہ کر سکا۔۔۔ میں اُسے بچا نہ سکا۔''شیراز کے لہجے میں کچھ ٹوٹا تھا، نوید نے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔

''مجھے معاف کر دو شیراز! اگر کر سکو تو۔۔۔ سارا قصور میرا ہے۔''نوید نے آہستہ سے کہا پر شیراز کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے بات جاری رکھی۔''اُس نے یہ سب ضد میں کیا۔ اگر اُس روز میں اُسے فقط سبق سکھا کر ہی واپس آ جاتا تو بھی کافی تھا اُسکے لیے۔ پر میں شدید غصّے میں تھا، اُس نے میری

بہن کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ واقعہ یاد کر کے اُسکی کنپٹی کی رگیں دوبارہ تنی۔ ''اگر میں اُسکی آنکھ نہ ضائع کرتا تو شاید وہ بھی یہ سب نہ کرتا، اُس نے صرف ضد میں ایسا کیا ہے۔'' نوید کے لہجے میں افسوس بول رہا تھا۔

''اگر آپ نہ بھی کرتے، تب بھی یہ ہونا ہی تھا۔ سمیر نے نہیں رکنا تھا۔ وہ تب بھی نہیں رکا تھا، جب اُسکا کیس میں نے فرّخ صاحب کو اور اُنہوں نے آپکو دیا تھا۔ یہ ایسے ہی ہونا تھا۔'' وہ کہتے ہوئے اچانک، ٹرے گھوماتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ایک لقمہ بھی نہ کھایا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' نوید بھی گھبرا کر اٹھا۔ وہ واقعی اُسکے لیے بہت پریشان تھا۔

''گھر جا رہا ہوں، امی کل سے اکیلی ہیں۔ کچھ دیر آرام چاہتا ہوں۔ کل سے ڈیوٹی جوائن کر لوں گا۔''

''کل سے کیوں؟ تم کچھ دن سکون سے آرام کرو۔'' نوید نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''سکون نہیں ہے میری زندگی میں اب، نہ ہی ذہنی آرام۔۔۔ میں صرف جسمانی آرام کی بات کر رہا ہوں۔ کل سے آجاؤں گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ گیا۔ نوید وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ فرّخ صاحب نے اُسکے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا، سمیر کے زندہ بچ جانے کی وجہ سے اُسکی فکر تھوڑی کم ہوئی تھی۔

سمیر مرا نہیں تھا۔ اُسکی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، چہرے کی دیگر ہڈیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ دماغ سے جسم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ فلحال ہوش میں نہیں تھا۔ پر ڈاکٹر کے مطابق وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی تاعمر کے لیے پیرالائزر رہنے والا تھا۔ اُسکو اِس حالت میں بھی اُسکے رب نے زندہ رکھا تھا۔ یہی اُسکی سزا تھی۔

بیشک رب کا انصاف بہترین ہے۔

اب نوید عالم بھی رب کی طرف سے، اپنے لیے انصاف کا منتظر تھا۔

--------+---------+----------

مشاورتی کمرے میں عجیب سی خاموشی تھی۔ جو شیراز کے ساتھ ہوا وہ اُنہیں بھی معلوم ہو چکا تھا۔ گو کہ اُس سے اُنکی کوئی دلی وابستگی نہ تھی، لیکن وہ اسے جتنا جانتے تھے، اُسکے بعد دل اُسکے لیے بہت افسردہ تھا۔

''وہ تمام لوگ جو فرح سے رابطہ میں تھے، سب کے سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم اُن سے تفتیش کر رہے ہیں۔ جلد ہی یہ معاملہ بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ تم سب آج رات گھر جا سکتے ہو۔ اپنے اپنے کام شروع کر سکتے ہو، جیسے پہلے کر رہے تھے۔ لیکن۔۔۔'' وہ رکے اور ایک نظر دروازے سے داخل ہوتے نوید کو دیکھا۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ اندر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ فرّخ صاحب نے اُسکی طرف سے نظریں پھیریں اور گفتگو جاری رکھی۔

''لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے، لہٰذا نہ صرف تم سب کی کڑی نگرانی کی جائے گی، بلکہ تم سب نے خود بھی احتیاط کرنی ہے۔ غیر ضروری کاموں اور گھومنے پھرنے سے پرہیز کرو، جب تک یہ معاملہ مکمل کسی ایک کروٹ نہیں بیٹھ جاتا۔'' انہوں نے بات مکمل کی۔ نوید کا چہرہ سخت سا تھا۔

''اور وہ عورت؟'' عمر نے جھجھکتے ہوئے فرح کے بارے میں پوچھا۔ نوید کے سامنے وہ کہہ نہ سکا، کہ اسکے بیٹے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا یا نہیں؟

''وہ عورت کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں ہے۔'' اُنکے پیچھے اسکرین پر فرح خالد کی تصویر ابھری، سب کی نظریں ایک ساتھ اس پر گئیں۔

''پر ہم اُس سے جلد سب کچھ اُگلوا۔۔۔''

''فریحہ؟'' اسی لمحے رضاالٰہی کی شدید شاک میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

''کچھ کہا تم نے؟'' فرّخ صاحب نے رک کر اسے دیکھا۔

''یہ تو۔۔۔ یہ تو فریحہ ہے۔'' اُسکے حیرت میں ڈوبے لہجے پر اب کہ نوید نے بھی بھنویں سکیڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''فریحہ کون؟ یہ فرح ہے، فرح خالد۔۔۔ تم اسے جانتے ہو؟'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''یہ فریحہ ہے، میں اسے پچھلے تین سالوں سے جانتا ہوں۔ اسکا بیٹا ولید میرے پاس ہوتا ہے۔'' اگلے ہی لمحے نوید اور فرّخ صاحب دونوں ہی بے ساختہ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا کہا تم نے؟'' نوید نے بے یقین نظروں سے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''رضا مجھے شروع سے بتاؤ!'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔ رضا کو شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

''یہ میرے پاس تین سال قبل آئی تھی، اسکا شوہر مر چکا تھا، اور گھر والے دوسری شادی کر دینا چاہتے تھے۔ اسکا چار ماہ کا بیٹا ولید تھا، جسے نہ تو اُسکا دوسرا شوہر رکھنے کو تیار تھا اور نہ ہی اسکے گھر والے، تو وہ اسے میرے حوالے کر کے چلی گئی۔ ہر دو سے تین ماہ بعد جب اُسکا شوہر ملک سے باہر جاتا ہے، تو وہ ولید کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔'' رضا نے کچھ پریشان لہجے میں کہا۔

''وہ کس تاریخ کو تمہارے پاس ولید کو لائی تھی؟'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔ باقی سب کو کچھ کچھ سمجھ آ رہا تھا۔

''تین سال پہلے، مئی کی چار تاریخ کو۔''نوید کو لگا کہ چھت اُسکے سر پر آ گری ہو۔اس نے فوراً سے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ورنہ شاید وہ گر جاتا۔کل سے اب تک ہونے والے تمام واقعات اُسکے اعصاب پر بری طرح توڑ رہے تھے۔اگر وہ کسی وقت گر پڑتا تو حیرت کی بات نہ تھی۔

''رضا۔۔۔''فرّخ صاحب نے بے بسی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔''وہ اس عورت کا بیٹا نہیں ہے۔وہ نوید کا بیٹا ہے۔''فرّخ صاحب نے وہی کہا جسکی اب کو توقع تھی۔لیکن پھر بھی اس ایک جملے پر سب نے ایک ساتھ نوید کو دیکھا تھا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رضا کو دیکھ رہا تھا۔

ولید عالم۔۔۔

اسکا چار ماہ کا بیٹا۔۔۔

جو تین سال قبل، چار مئی کو جلا تھا۔۔۔

یا شاید۔۔۔

اغوا ہوا تھا۔۔۔

اگلے ہی لمحے نوید تیزی سے رضا کے پاس آیا،اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

''وہ۔۔۔وہ تمہارے پاس ہے ابھی؟''اُس نے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے پوچھا تھا۔اُسکی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، تنفس تیز تھا۔

''ہاں! وہ یقیناً پناہ گاہ میں ہی ہے۔''رضا نے اسے دیکھتے تسلی دی تھی۔ نوید نے پلٹ کر فرّخ صاحب کی طرف دیکھا۔

''جاؤ۔۔۔جاؤ اور اُسے فوراً یہاں لے کر آؤ۔''فرّخ صاحب نے کہا تو وہ رضا کا بازو چھوڑتے تیزی سے باہر نکلا۔

''میں بھی آ رہا ہوں۔''رضا پیچھے گیا۔

''ہم جا سکتے ہیں؟''علی نے بے قراری سے سب کی جانب سے پوچھا۔

''ہاں! جاؤ۔۔۔''انہوں نے کہا تو وہ بھی باہر کی جانب بھاگے تھے۔رضا فوراً عائشہ جی کو فون کرنے لگا،پر وہ فون نہیں اٹھا رہی تھیں۔

نوید کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا،دل کی دھڑکن کی رفتار بھی پہلے سے کہیں آہستہ ہو رہی تھی۔ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے،اور دل کے مقام پر درد اٹھ رہا تھا۔جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

---------+---------+--------

پناہ گاہ کے احاطے میں وہ سب باری باری داخل ہوئے تھے۔ آنے والوں میں سب سے پہلے رضا اور نوید ہی داخل ہوئے تھے۔ لان میں بیٹھی عائشہ جی، جزا کے ساتھ کھڑی تھیں، جس کے کندھوں پر پرس اور سر پر موجود چادر دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ وہ واپس جا رہی تھی، اور عائشہ جی اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔

''عائشہ جی!۔۔۔ عائشہ جی!'' رضا اُنہیں پکارتا تیزی سے وہاں آیا، جبکہ لان کے ٹریک پر ہی نوید نے اپنے قدم روک لیے۔ وہ آگے بڑھ کر اُن تک نہیں آیا۔ جیسے وہ آگے آکر مزید کچھ بھی سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ جزا نے کچھ حیرت سے اپنے بھائی کو دیکھا، جسکا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا۔

''رضا! تم کب آئے؟'' عائشہ جی اُسے سامنے دیکھ کر خوش ہوئیں، اس لیے اُسکا پریشان حال انداز دیکھ نہ سکیں۔ پیچھے باقی چاروں بھی اندر آئے تھے۔ وہ بھی رضا کے قریب ہی رکے تھے، جبکہ نوید پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔

''ولید کہاں ہے؟'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

''کیا ہوا؟ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ سب۔۔۔''

''عائشہ جی ولید کہاں ہے؟'' وہ اُنکی بات کاٹتے، تیز آواز میں بولا تھا۔

''آرام سے۔۔'' عمر نے بے ساختہ اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے، اُسے پر سکون رہنے کا کیا۔

''ولید ٹھیک ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟'' عائشہ جی نے کہا۔

''اُسے لیکر آئیں جلدی!'' وہ بے قراری سے بول رہا تھا۔ جب کے ان سب باتوں کی پرواہ کیے بنا جزا سامنے کھڑے اپنے بھائی کو ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنا بایاں بازو سہلا رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر خوف تھا، وہی خوف جو بچپن میں کوئی غلطی کر دینے کے بعد اُسکے چہرے پر ہوا کرتا تھا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''تو کہاں ہے؟'' وہ چیخ اٹھا۔

''اپنی ماں کے ساتھ ہے وہ رضا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ فریحہ لے گئی ہے اُسے۔'' وہ تو پریشان ہی ہو گئیں۔ جبکہ انکے الفاظ پر جو جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

''کیا مطلب کہ لے گئی؟ کب لے گئی؟'' اُس نے اپنا سر تھامتے پوچھا تھا۔ جزا بیساختہ نوید کے پاس آئی، جو اپنا بایاں بازو تھامے پتھرائی نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ جزا کے علاوہ کسی کا دھیان اُس پر نہ تھا۔

''بھائی! کیا ہو رہا ہے آپکو؟'' جزا نے اُسکے بازو پر ہاتھ رکھتے آہستہ مگر خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو تین روز پہلے اُسے لے گئی تھی۔ ''دوسری طرف عائشہ جی نے جواب دیا۔

''کیسے؟ کیسے جانے دیا آپ نے اسے؟'' وہ تڑپ اٹھا تھا۔

''رضا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' عائشہ جی بھی چلا اٹھیں۔ ''تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ فریحہ جب بھی آئے، چاہے تم یہاں ہو یا نہ ہو، میں فوراً ولید کو اُس کے حوالے کر دوں۔ تم سے اجازت بھی نہ لوں، بس اطلاع دے دوں، اور میں نے تمہیں پرسوں میسیج بھی کیا تھا۔'' رضا دو قدم پیچھے ہٹا۔ یہ اُس نے کیا کر دیا؟ اتنی بڑی غلطی؟

''پر ہوا کیا ہے رضا؟'' وہ تھک کر بولیں۔

''بھائی! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟'' دوسری طرف جزا اُس سے پوچھ رہی تھی۔ جسکا ہاتھ اب اپنے سینے کی طرف، دل کے مقام پر بڑھ رہا تھا۔

''وہ اُسکی ماں نہیں تھی، ولید اُسکا بیٹا نہیں تھا۔ جھوٹ بولا اس عورت نے ہم سے، بیوقوف بنایا اتنے سال۔'' اُسکا بس نہیں چل رہا تھا اپنے بال نوچ ڈالے۔ اس عورت نے کتنی آسانی سے اسکو بیوقوف بنایا تھا۔ مقدّم نے آگے بڑھ کر اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس بات پر جزا نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟ پھر کس کا بیٹا تھا وہ؟'' عائشہ جی نے پوچھا۔

''وہ نوید کا بیٹا تھا، اُس عورت نے اغوا کیا تھا اسے۔۔۔'' عائشہ جی نے منہ ہاتھ رکھ لیا۔ جزا نے پلٹ کر پتھرائی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

''اُس نے ایک اغوا کیے ہوئے بچے کو ہمارے گھر چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اور اب جب ہمیں پتہ چلا، وہ اُس سے پہلے ہی اسے یہاں سے لے گئی۔'' رضا نے بے بسی سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نوید عالم۔۔۔

اپنے بیٹے کو ایک بار پھر نہیں بچا سکا۔۔۔

صحیح کہتا تھا اُسکا باپ۔۔۔ وہ بیکار تھا، کسی کام کا نہیں تھا وہ۔۔۔

اسکے دل میں درد کی شدید ٹیس اٹھی، تو اُس نے بیساختہ اپنے برابر کھڑی جزا کا ہاتھ تھاما تھا۔

''بھائی۔۔۔بھائی! کیاہورہاہے آپکو؟بھائی!''جزایکدم ہی چیخی توسب نے پلٹ کرنوید کودیکھا،اوراس سے پہلے کہ کوئی کچھ بھی سمجھتا،نوید کے چہرے پر کرب آمیز تاثرات نمودار ہوئے،اور وہ نیچے جھکا۔۔۔جیسے گرنے والا ہو۔

''نوید!''اگلے ہی لمحے سب کو جیسے ہوش آیا تھا،علی،مقدّم اور عمر چیختے ہوئے آگے بڑھے تھے،حسین قریب تھاتواُس نے فوراًاسے تھامنے کی کوشش کی پر۔۔۔اُس سے پہلے ہی وہ اپنے پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔

''بھائی۔۔۔''جزاحلق کے بل چیخی،اُسکے ساتھ ہی نیچے بیٹھی تھی۔

''نوید!''باقی سب کے ساتھ رضا کو بھی جیسے اب ہوش آیا تھا۔

''بھائی۔۔۔بھائی اٹھیں۔۔۔بھائی۔۔۔''جزااُسکا سر گود میں رکھے،اُسکا چہرہ تھپتھپاتے پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

''نوید!۔۔۔اٹھونوید۔۔۔''علی نے اسکو جھنجھوڑا تھا۔اُسکی آنکھیں مکمل بند ہو چکی تھیں۔

''بھ۔۔۔بھائی!۔۔۔میرا بھائی۔۔۔''

---------+---------+--------

انیسواں باب

کہانی میں جھول ہے

اسکو سی پی آر دینا ہے فوراً!''سب سے پہلے حسین نے اپنے حواس سنبھالے تھے۔

''عائشہ جی! جزا کو پیچھے ہٹائیں۔''رضا نے کہا تو عائشہ جی نے فوراً روتی بلکتی جزا کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا، اُسکی جگہ رضا نے نوید کا سر نیچے رکھا تاکہ اُسے سیدھا لٹا سکے۔اگلے ہی لمحے حسین نے اسے سی پی آر دینا شروع کیا تھا۔

''یہ سانس نہیں لے رہا۔۔۔''عمر نے اُسکے ناک کے پاس انگلی رکھتے کانپتی آواز میں کہا۔

''نہیں! یہ اُٹھ جائیگا۔''علی نے انکار کیا تھا یا خود کو تسلی دی تھی؟معلوم نہیں!

''یہ نہیں اٹھ رہا۔۔۔میری مدد کرو۔۔۔''حسین چلایا تھا۔سی پی آر کا اثر نہیں ہوا تھا۔

''بھائی۔۔۔بھائی!''جزا بلک بلک کر رو رہی تھی۔ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔اُسے شدید پینک اٹیک آنے والا تھا۔یکدم ہی ذہن میں کسی کی آواز گونجی۔

''ایسی حالت میں حواس باختہ نہیں ہوتے۔اگر آپ ہی پینک (خوفزدہ) کریں گی، تو مریض کی طبیعت اور بگڑے گی، آئندہ اگر ایسا ہو تو سب سے پہلے اپنے حواس بحال رکھ کر ایمبولینس کو کال کریں، پھر مریض کو ابتدائی طبّی امداد دیں۔''

''ایمبولینس۔۔۔ایمبولینس۔۔۔''اُسے یاد آیا تو جلدی سے اپنے پرس سے فون نکالا تاکہ ایمبولینس کو فون کر سکے۔

''نوید۔۔۔نوید!آنکھیں کھولو یار!''وہ علی اُسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔حسین اور مقدم اب مل کر اُسے سی پی آر دے رہے تھے۔پر اُسکے ہاتھ ڈھلک چکے تھے، چہرہ نیلا پڑنے لگا تھا۔رضا نے اُسکی کلائی پکڑ کر نبض چیک کی۔

''اِسکی نبض نہیں چل رہی حسین! سی پی آر کا فائدہ نہیں ہو رہا۔''رضا چلایا تھا۔

''چاہے نبض چلے یا نہ چلے، سی پی آر اُس وقت تک نہیں رکنا چاہیے، جس وقت تک ایمبولینس نہیں آجاتی۔''وہ چلایا تھا۔

''ایمبولینس۔۔۔ایمبولینس نہیں بلائی میں نے۔۔۔''رضا اٹھنے لگا۔

''میں نے ایمبولینس بلالی ہے۔''جزا نے ہانپتے ہوئے اُسے کہا۔

''بھائی کیوں نہیں اُٹھ رہے؟''وہ رودی، عائشہ جی نے اُسکا ہاتھ تھاما۔سب کی موجودگی کے باعث وہ نوید کے قریب نہیں جا پا رہی تھی۔مقدّم، حسین اور اب علی بھی مل کر اُسے سی پی آر دے رہے تھے۔پر پستول سے نکلی گولیاں کھا کر بھی چلنے والا نوید آج نہیں اُٹھ رہا تھا۔ہر بات پر ''میں ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا'' کہنے والا نوید آج آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اُس کا چہرہ دوسری جانب ڈھلک گیا۔

''نوید!''وہ سب ساتھ چلائے،اُسکی نبض مکمل رک چکی تھی۔

''بھائی۔۔۔بھائی۔۔۔''جزا اکھڑتے سانس کے ساتھ گھاس پر بیٹھتی چلی گئی۔

''اُٹھو نوید!۔۔۔اُٹھو۔۔۔''مقدّم کے ہاتھ کانپ اٹھے،اُسے اِس حالت میں دیکھ کر،وہ پیچھے ہوا اور پتھرائی نظروں سے حسین کو دیکھا۔شاید!اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ نوید مر چکا ہے۔پر حسین نہیں رکا تھا۔اُس نے سی پی آر بند نہیں کیا۔اگلے ہی لمحے ایمبولینس کی آواز آئی تو جزا اٹھی اور بھاگ کر دروازہ کھولا۔

''جلدی کریں۔۔۔جلدی کریں!میرا بھائی مر جائیگا۔۔۔پلیز!''وہ روتے ہوئے ایمبولینس کے عملے کو کہہ رہی تھی۔ایمبولینس بہترین اور جدید طبّی سہولیات سے آراستہ تھی۔پیرامیڈک عملہ اسی میں موجود تھا۔وہ ایمبولینس پورچ میں لے آئے۔

''سی پی آر کب سے چل رہا ہے؟''پیرامیڈیک ڈاکٹر نے آتے ہی پوچھا۔

''تقریباً چھے منٹ۔۔۔''مقدّم نے ڈوبتی آواز کے ساتھ کہا،اُسکے دل کو کسی انہونی کا خدشہ تھا۔

''جاری رکھو!''اُس نے عملے سے کہا اور ایمبولینس میں موجود مشینوں کو فعال کرنے لگا۔عملے نے فوراً نوید کو اسٹریچر پر ڈالا،اور سی پی آر دیتے ہوئے ہی اُسے ایمبولینس میں منتقل کیا۔

''نبض نہیں مل رہی؟''پیرامیڈک ڈاکٹر نے نوید کی گردن پر ہاتھ رکھتے کہا۔اُسکے ہاتھ اب اکڑ چکے تھے۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ہمیں اسی وقت انہیں اے ای ڈی دینا ہو گا۔''ڈاکٹر نے کہتے ہوئے اے ای ڈی کیس کھولا۔

''آپ لوگ پیچھے رہیں۔''عملے نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔ایمبولینس کے کھلے حصے سے نوید نظر آ رہا تھا۔

AED آن ہوتے ہی مشین کی مصنوعی آواز ابھری:

"Apply pads to patient's bare chest"

پیرامیڈیک نے اُسکا کرتا قینچی سے کاٹا،پھر ایک الیکٹروڈ دائیں سینے کے اوپری حصے پر چپکایا اور دوسرا بائیں جانب پسلیوں کے نیچے۔

مشین نے فوراً اگلا حکم دیا:

"Analyzing heart rhythm. Do not touch the patient"

''سب پیچھے ہٹو!'' پیرامیڈک نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔ایمبولینس کے پاس موجود سب لوگ چند قدم پیچھے ہو گئے۔ جزا کے دونوں ہاتھ برف ہو رہے تھے۔رو رو کر آنکھیں سوجنے لگی تھیں۔چند سیکنڈ تک صرف مشین کی ہلکی بیپ سنائی دیتی رہی۔پھر آواز آئی:

"Shock advised"

پیرامیڈک نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

''کوئی مریض کے قریب نہ آئے!'' اُس نے ایک بار پھر متنبہ کیا۔

''سب دور ہیں سر!'' دوسرے پیرامیڈک نے سب کلیئر ہونے اشارہ کیا، تو ڈاکٹر نے پیڈز کو مضبوطی سے تھاما۔اور اگلے ہی لمحے شاک بٹن دبا دیا گیا۔نوید کا جسم ایک جھٹکے سے اکڑا اور پھر واپس ڈھلک گیا۔

AED نے فوراً اعلان کیا:

"Begin CPR"

ڈاکٹر نے پیڈز ہٹائے اور دوبارہ سینے پر سی پی آر دینے لگا، جبکہ دوسرا پیرامیڈک وقت دیکھ رہا تھا۔دو منٹ تک مسلسل سی پی آر جاری رہا۔پسینہ عملے کے ماتھوں پر نمایاں تھا۔اُنکی سانسیں نوید کے ساتھ اٹک گئی تھیں جیسے۔

پھر مشین نے دوبارہ کہا:

"Stop CPR. Analyzing rhythm"

عملہ رک گیا۔کچھ لمحوں کی خاموشی چھائی۔نوید کی دھڑکن بحال نہ ہوئی۔آواز پھر ابھری:

"Shock advised"

ڈاکٹر نے پیڈز دوبارہ مضبوطی سے تھامے اور دوسرا جھٹکا دیا گیا۔ایک بار پھر نوید کے جسم نے جھٹکا کھایا تھا۔جزا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔وہ مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔ڈاکٹر نے دوبارہ CPR شروع کیا۔تقریباً تیس سیکنڈ گزرے تھے کہ پیرامیڈک اچانک جھکا۔

''رکیں۔''وہ نبض چیک کرنے لگا۔

ایک لمحہ سرکا۔۔۔

پھر دوسرا۔۔۔

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔اسکرین پر دھڑکن بحال ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''نبض واپس آگئی ہے۔''وہ چیخا۔سب تیزی سے آگے بڑھے، جزانے آنکھیں کھول کر دیکھا۔نوید کی پلکیں ہلکی سی جنبش کرنے لگی تھیں۔سینے سے ایک گہرا،اور بے ترتیب سانس خارج ہوا۔اُسکا سانس بحال ہوا تھا تو جیسے وہاں کھڑے ہر شخص کا سانس بحال ہوا تھا۔

''آکسیجن ماسک لاؤ۔''پیرامیڈکس نے آکسیجن ماسک لگایا،مانیٹر جوڑا پھر اس پر چادر ڈال دی۔

''میں ساتھ جاؤں گی۔''جزاایمبولینس کا دروازہ بند ہونے سے پہلے قریب آئی۔

''ایمبولینس میں جگہ کی کمی ہے،آپ آگے آجائیں۔'' ڈرائیور نے کہا تھا۔

''علی تم ایمبولینس کے ساتھ جاؤ،ہم پیچھے آرہے ہیں۔''اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی رضا نے علی کو کہا تو وہ سر ہلاتے تیزی سے ایمبولینس میں بیٹھا تھا۔جزا کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

''گاڑی میں آؤ جلدی!''مقدّم تیزی سے کہتا باہر نکلا،اُسکے پیچھے عمر اور حسین بھی باہر کی جانب بھاگے تھے تاکہ ایمبولینس کے ساتھ ہی پہنچ سکیں،وہ ایف آئی اے کی گاڑی میں آئے تھے۔ایمبولینس پورچ سے باہر نکلنے لگی۔

''جزا تم میرے ساتھ آؤ!''رضا نے اُسے کہا تو وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں باہر نکلی،ایمبولینس ریورس ہو کر گلی میں آئی اور اُسی لمحے جزا کے دروازے پر کوئی گاڑی آکر رکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نوید کی ذاتی گاڑی تھی،ڈرائیور آگے تھا اور پیچھے سے بشریٰ باہر نکلی تھی۔اُسے دیکھ کر جیسے جزا کی تمام حسیات بیدار ہوئیں۔ایمبولینس سائرن بجاتی،راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔

''بھابھی؟''جزا کے منہ سے بیساختہ نکلا۔گاڑی میں بیٹھتا حسین ٹھٹک کر رکا،اُسکی وجہ سے گاڑی رکی رہی۔عمر اور مقدّم نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔

''کیا ہوا ہے یہاں؟''بشریٰ نے نظروں سے دور ہوتی ایمبولینس کو دیکھتے ہوئے جزا سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔''اُسکی زبان اٹک گئی۔سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔صورتحال ایسی تھی کہ ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

''ایمبولینس کیوں آئی تھی؟اور تم۔۔۔تم رو رہی ہو کیا؟''بشریٰ یکدم ہی اُسکا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوئی۔

''نہیں! میں۔۔۔میں کیوں روؤں گی؟وہ۔۔۔پڑوس میں کسی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''خود کو بہت مشکلوں سے قابو کرتے جھوٹ کہا۔

''اوہ! اچھا تم اندر آؤ، میں تمھارے لیے کچھ لائی ہوں۔''وہ کہتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ جزا نے پلٹ کر رضا کو دیکھا۔

''کیا انکو نہیں بتانا؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں! ابھی نہیں۔۔۔تم ہسپتال جاؤ، میں کچھ دیر میں آرہی ہوں۔''اُس نے کہا اور تیزی سے اندر بڑھ گئی۔رضا بھی سر ہلاتا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''جزا! ڈرائیور کو کہو گاڑی اندر پارک کر دے۔''بشریٰ کی آواز آرہی تھی۔نوید کی ایمبولینس محلے سے باہر نکل چکی تھی،اور بشریٰ اپنے روزمرہ کے کام نمٹا رہی تھی۔

''میں چینج کر کے آتی ہوں۔''جزا اپنی ماں اور بشریٰ کو دیکھ کر کہتی تیزی سے اپنے کمرے میں آکر بند ہوئی۔پھر منہ پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی، اُسکے لیے یہ بہت مشکل تھا۔بہت زیادہ!

''یا اللہ! میں کیا کروں؟''روتے روتے اُسکی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل باہر نکالا اور وحید کو فون کیا۔کچھ دیر بیل جاتی رہی، پھر فون اُٹھا لیا گیا۔

''بھ۔۔۔بھائی۔۔۔بھائی۔۔۔''وہ اُس سے آگے کچھ بول ہی نہ سکی۔اُسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''کیا ہوا جزا؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟''دوسری طرف وہ پریشان ہوا۔

''بھائی!! نوید بھائی کو کارڈیک اریسٹ ہوا ہے۔وہ۔۔۔وہ۔۔''

''کیا؟ کیسے؟ تم کہاں ہو ابھی؟ جزا بتاؤ کچھ!''وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوا تھا۔جواباً وہ سب بتاتی چلی گئی۔

''میں ہسپتال جا رہا ہوں۔''اُس نے سب سننے کے بعد کہا۔

''نہیں بھائی! آپ یہاں آجائیں۔میرے پاس آجائیں پلیز! میں کیسے بتاؤں گی امی کو، بھابھی کو۔۔۔آپ یہاں آجائیں پہلے۔''اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کیا کہہ رہی ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ٹھیک ہے! تم رونا بند کرو پہلے۔منہ دھو جا کر۔امی اور بشریٰ کو کچھ پتہ نہ چلے۔میں آرہا ہوں، میں تمہیں اپنے ساتھ ہسپتال لے جاؤں گا۔''اُس نے اُسے سمجھایا۔پھر فون رکھ دیا۔

وہ دروازے سے سر ٹکائے دوبارہ رو دی۔فون ہاتھ میں تھا، رضا نے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

--------+---------+----------

''تو تمہارا کہنا ہے کہ ہم فرح کو چھوڑ دیں، اور پھر اُسکا پیچھا کر کے یہ دیکھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔''فرّخ صاحب نے اپنے سامنے کھڑے ساگر سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔فیصل بھی ساتھ تھا۔شیراز گھر جا چکا تھا۔نوید کے بیٹے کا پناہ گاہ میں موجود نہ ہونا، اور نوید کی خراب حالت کی اطلاع اُنہیں بھی مل چکی تھی۔نوید جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کے ساتھ ہونے والا واقعہ اُنکے لیے بھی باعث تکلیف تھا، پر اس وقت فرح کی جڑوں تک پہنچنا ضروری تھا۔

''پر تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنی کم عقل ہو گی کہ اُسے اِس بات کا اندازہ نہیں ہو گا؟ اور ہمارے لوگ اُسکا پیچھا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟''فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''ہاں! وہ یقیناً اتنی بیوقوف نہیں ہے۔پر ہم اُسکا پیچھا نہیں کریں گے۔''ساگر کہتے ہوئے اسکرین کی جانب آیا۔

''یعنی؟''

''میں نے ایس ایس پی شناء سے بات کی ہے۔فرح بے ہوش تھی، اِس دوران ہم نے اُسکے بازو میں میکرو ٹریکر انجیکٹ کر دیا ہے۔اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہے اور نہ ہو گا۔اسکے ذریعے ہم اُسکی لوکیشن دیکھتے رہیں گے۔اس طرح ہم اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں، جہاں اس نے ولید کو رکھا ہوا ہے۔''

''ٹریکر اُسکے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔''فیصل نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے، کل یا پرسوں تک ہم اس تک پہنچ چکے ہوں گے۔پھر ٹریکر بھی نکال دیں گے۔''ساگر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اسے رہا کر دو۔پر ہر حال میں اِسکا پیچھا کرنے کے لیے پھر بھی دو اہلکار روانہ کرو۔ہم فقط ایک منی ٹریکر پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔''فرّخ صاحب نے کہا۔

''رضا واپس آجائے، تو ہم اُس سے فرح کی دوسری شناخت کے بارے میں بھی معلومات لیں گے۔''ساگر نے کہا۔

''اُس سے کیا فائدہ ہو گا؟''فیصل نے پوچھا۔

''ہمیں اُسکی دوسری شناخت پر موجود ڈیٹا سے کوئی نہ کوئی معلومات مل سکتی ہے۔ فلحال میں ہسپتال جارہا ہوں۔''فرّخ صاحب نے گفتگو سمیٹی تو باقی سب بھی وہاں سے باہر نکل گئے۔

اب وقت تھا فرح کو رہا کرنے کا۔

---------+---------+--------

''نوید! نوید تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟''بشریٰ کل رات سے پریشان تھی۔ اُسکی نوید سے کسی قسم کی کوئی بات نہ ہوئی تھی، اور نہ ہی اُس نے بشریٰ کے میسج دیکھے تھے۔ وہ خوفزدہ تھی، دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ نہ کسی کام میں دل لگ رہا تھا، نہ سکون آرہا تھا۔ نجانے وہ کس حال میں ہوگا؟ اُسکا آپریشن کیسا جارہا ہوگا؟ کوئی مسئلہ نہ ہو اُسکے ساتھ۔ عجیب عجیب سے وہمے ستا رہے تھے۔

''واپس آجاؤ نوید! پلیز! میرا دم گھٹ رہا ہے۔ دل بند ہو رہا ہے۔''وہ گھبرا کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُسکی طبیعت شاید پھر خراب ہو رہی تھی۔ پر آج نوید نہیں تھا، نہ اُسکے کسی پیغام کا جواب دے رہا تھا۔ نہ اُسکے فون اُٹھا رہا تھا۔

اور نوید کے بغیر اُسکی زندگی بالکل خالی تھی۔

--------+---------+----------

ہسپتال کی راہداری خاموش تھی، تمام نگاہیں کمرے کے دروازے پر جمی تھیں۔ جس میں موجود وجود اُنکو بہت عزیز تھا۔

سب چپ تھے۔۔۔ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش۔۔۔

راہداری کے اختتام پر بنی کھڑکی کے پاس رضا سر جھکائے کھڑا تھا۔ علی اُسکے برابر میں تھا۔

''کیا تم خود کو قصوروار ٹھہرا رہے ہو؟''آہستگی سے اُس سے سوال کیا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

''میں ہوں!''اُس نے خود اذیتی سے کہا۔

''نہیں! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔''علی کا لہجہ نرم تھا۔

''ہے! میں نے ہی اُسے لے جانے کا حکم دے رکھا تھا۔''وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''رضا!''علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے اسے پکارا، اس پکار میں دوستی تھی۔ اپنائیت تھی۔

''تم نے اچھی نیت سے کیا تھا۔ تم خود کو الزام مت دو۔''

''تم نے اُسکی حالت دیکھی تھی؟ وہ کتنی بے قراری سے آیا تھا پناہ گاہ۔ اسے امید تھی کہ ولید وہیں ہوگا۔ اور اُسکی غیر موجودگی اُس سے برداشت نہ ہو سکی۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ علی کا ہاتھ اب بھی اُسکے کندھے پر تھا۔

''وہ ٹھیک ہو جائیگا۔'' علی کے پاس تسلی کے لیے الفاظ کم پڑنے لگے۔

''ہو جائیگا، پر اُسکی حالت نہیں دیکھی جا رہی مجھ سے، وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔'' رضا نے اُسے دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''کر لے گا، وہ گولیاں کھا کر بھی ہمیشہ واپس آ جاتا ہے۔ وہ اس بار بھی ٹھیک ہو جائیگا۔'' اُس نے اُسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے تھوڑی دور کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا۔ اُن دونوں نے ہی اسے دیکھا تھا۔

---------+---------+--------

صبح کی نیلی روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگا رنگ پھلوں سے سجا باغ صبح کی روشنی میں جنت لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں، اور سامنے بہتے دریا میں گرتی بارش کی بوندیں۔۔۔۔ منظر تھا کہ دل میں اترتا جا رہا تھا۔ بشریٰ وہیں گھاس پر ایک درخت سے ٹیک لگائے پر سکون بیٹھی سی تھی۔ دریا اُسکے سامنے تھا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ آواز بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ نوید قریب کھڑا اُسکے لیے پھول چن رہا تھا۔ ساتھ اُسکا معصوم سا بیٹا بھی تھا۔ نوید نے اُسے دیکھا، وہ شاید تین سال کا تھا۔ پر اُسکا قد اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں لمبا تھا۔ اُسکا چہرہ بالکل معید جیسا تھا۔ جیسے اُسی کا جڑواں ہو۔

پر نہیں! فرق تھا۔

معید کا چہرہ مکمل نوید جیسا تھا۔

لیکن اس بچے کا چہرہ نوید جیسا اور آنکھیں بشریٰ جیسی تھیں۔ بڑی بڑی سی، مہربان غلافی آنکھیں۔ وہ معید نہیں تھا تو کون تھا؟

''یہ لو! نوید نے ایک چھوٹا سا پھول توڑ کر اُسے دیا، پھر دور درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی، پر سکون سی بشریٰ کو دیکھا۔

''یہ اپنی مما کو دے دو۔'' اس نے کہا۔ بچے نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پھول تھام لیا۔ پھر بشریٰ کی طرف دوڑا۔

مما! مما!'' وہ چھوٹا معصوم سا بچہ، اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اُسکے پاس آیا تو وہ مسکرائی۔

''میرے دل کے ٹکڑے!'' اُس نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔

''مما!'' وہ اُسے چھوٹا سا پھول دینے لگا۔ اُس نے ہنستے ہوئے تھام لیا۔

وہ ہنس رہی تھی، بہت زور سے۔۔۔۔ نوید اُنہیں دیکھ رہا تھا، مسکراتے ہوئے۔ آنکھیں نم سی تھیں۔

اور اسی لمحے اُسکی آنکھیں کھلی۔

وہ یک ٹک چھت کو دیکھنے لگا۔ ہر طرف سفیدی سی سفیدی تھی۔ دواؤں کی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر، اور دیگر عملہ اُسکے آس پاس تھے۔ ڈاکٹر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ نہ آنکھیں ہلی، نہ لب۔۔۔

اسکے دوست، گھر والے اور نجانے کون کون باہر اُسکے ہوش میں آنے کے انتظار میں تھا؟ پر اُسے کسی کی کوئی پرواہ تھی نہ اطلاع۔۔۔۔

یاد تھا تو بس یہ کہ اسکا بیٹا اُسکے سامنے تھا۔ اُسکی نظروں کے قریب۔۔۔۔

وہ کتنی ہی بار پناہ گاہ آیا تھا؟ برابر میں ہی اُسکی ماں رہتی تھی، وہیں اُسکی بہن روز جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی۔۔۔۔ پھر بھی وہ انجان رہا۔

اسکا بیٹا ایک بار پھر اُسکی نظروں کے سامنے سے چلا گیا اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ ولید۔۔۔ اُسکا بیٹا۔۔۔ اُسکا جگر گوشہ۔۔۔

کیسا دکھتا ہوگا وہ؟ کیا نوید جیسا؟ یا بشریٰ کے جیسا؟ یا اُسکے خواب میں نظر آنے والے بچے جیسا؟

قد میں تو یقیناً لمبا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے مرحوم بھائی معید جیسا ہو؟ اس نے پہلی بار چلنا سیکھا ہوگا تو کیسے ہنسا ہوگا؟ جب پہلا لفظ بولا ہوگا تو کیا کہا ہوگا؟

چھت کو گھورتی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر بہہ نکلا، پھر اُسکی کلموں سے ہوتے بالوں میں جذب ہو گیا۔

''نوید!'' پاس کھڑے وحید سے اسکا آنسو مخفی نہ رہ سکا۔ فوراً اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا، تو پہلی بار اُس نے فقط نظروں کا زاویہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ اُسے اب وحید کی موجودگی کا ادراک ہوا تھا۔ اُسکے پیچھے کھڑی، متورم آنکھوں سے اُسے دیکھتی جزا بھی نظر آگئی۔ امی نہیں تھیں، بشریٰ بھی نہیں تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے نوید؟'' وحید نے نرمی سے پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ہلانے میں درد ہو رہا تھا۔ جسم میں پہلی بار شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

''حالت بہتر ہے انکی اب۔ لیکن فلحال یہ کچھ گھنٹے ہماری نگرانی میں رہیں گے۔ انکا دائیں ہاتھ اکڑنے کی وجہ سے انگلیاں سیدھی ہونے میں کچھ دقت ہو گی، لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دن میں دو تین بار ہاتھوں کا مساج کرنے سے جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ انکی ڈائیٹ میں نے۔۔۔۔'' ڈاکٹر ہدایت پر ہدایت دے رہا تھا۔

''یعنی! ہم اسے صبح تک گھر لے جا سکتے ہیں؟'' وحید نے پوچھا۔

''صبح تک کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ گھنٹے انکابی پی وغیرہ کنٹرول رہا تو آپ لے جا سکتے ہیں انہیں۔ البتہ ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''شکریہ آپکا بہت!'' وحید نے کہا، ڈاکٹر سر ہلاتا باہر چلا گیا۔ اُسکے جانے کے بعد وہ اُسکے قریب آیا، اور اسکا خود کار پلنگ تھوڑا اونچا کیا۔

''کیا ہو گیا ہے نوید تمہیں؟ تم کب سے اتنے کمزور ہو گئے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''گھر جاؤ جزا! میں بہتر ہوں اب۔'' اُس نے وحید کو نظر انداز کرتے پیچھے کھڑی جزا کو دیکھتے کہا۔ وحید نے سر جھٹکا، یہ پہلی بات تھی جو اُس نے کی تھی۔

''بھائی!'' وہ اُسکے قریب آئی۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپکو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔'' اُس نے نوید کا ہاتھ تھامتے کہا۔

''میں کم عمر تھی، نادان تھی۔ زبان پر قابو رکھنا نہیں جانتی تھی، جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ میں نے آپکا دل بہت دکھایا ہے۔ معاف کر دیں مجھے!'' وہ پھر رو دی۔

''تمہارا خط پہنچا دیا تھا میں نے اسے، تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جواب وحید نے دیا تھا۔ اُس نے آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میں نے ہی نوید کو تمہارا بھیجا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صرف میں ہی نہیں، بلکہ نوید بھی یہ بات جان لے کہ غلطی ہم سب کی تھی۔'' وحید نے اُسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پر اُسکی تسلی نہ ہوئی۔ وہ معافی کے الفاظ نوید کے منہ سے سننا چاہتی تھی، لہٰذا روتی آنکھوں سے ایک بار پھر نوید کو دیکھا۔

''بھائی میں۔۔۔'' اس نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''ولید کیسا دکھتا تھا جزا؟'' نوید نے درمیان میں پوچھا تو وہ رکی۔

''میرے جیسا ہے کیا؟'' اُسکے لہجے میں پہلی بار تڑپ اور حسرت تھی۔ وحید اور جزا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اُسے۔۔۔۔

''ہاں! وہ آپکے جیسا ہے۔ مجھے میرا نام لیکر پکارتا ہے۔ جزا کہتا ہے۔۔۔'' بولتے بولتے اُسکی آواز رندھنے لگی، اور نوید کی آنکھیں جلنے لگی۔

''تم نے اُسے گود میں لیا تھا کبھی؟'' اُس نے پوچھا۔ وحید نے گہرا سانس بھر کر خود کو جذباتی ہونے سے باز رکھا۔

''ہاں! میں نے اسے گود میں لیا ہے، اُسے گود میں سلایا بھی ہے۔ وہ بہت پیارا ہے بھائی۔ بہت خوبصورت! بس میں۔۔۔۔ میں اُسے پہچان نہ سکی کبھی۔'' ایک بار پھر اُسکی ہچکیاں بندھنے لگی۔

''کیا تم نے اُسے پیار کیا ہے جزا؟''اُس نے پھر پوچھا،اس بار وحید کی ہمت جواب دے گئی۔

''مت کرو نوید!''اُسکا کندھا دباتے التجا کی۔''مت کرو! تمہیں تکلیف ہو گی ایسے۔۔۔''

''کیا تم نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا ہے کبھی؟''وہ سن ہی نہ رہا تھا جیسا۔

''بھائی!۔۔۔''جزا کے الفاظ اُسکی ہچکیوں کی نذر ہونے لگے۔

''اُسکی آواز کیسی تھی؟وہ بولتے ہوئے کیسا لگتا تھا؟''جزا سے مزید برداشت نہ ہوا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی تیزی سی باہر نکل گئی۔

''نوید پلیز!''وحید نے میں ایک بار پھر التجائیہ انداز میں کہا۔اُسکا بیٹا زندہ تھا۔پر اُسکے پاس نہ تھا،اور اب اُس عورت کے پاس تھا، جس نے اُسکے ایک بیٹے کو زندہ جلایا تھا اور ایک بیٹے کو زندہ رکھ لیا، صرف اپنی زندگی کی ضمانت کے لیے۔

''چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، کچھ بھی۔۔۔پر میں ولید کو واپس لاؤں گا۔زندہ نہیں چھوڑوں گا اس عورت کو۔''وحید نے اُسے تسلی دیتے کہا۔

''اُس نے ولید کو کہاں رکھا ہو گا؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''جب تم بے ہوش تھے،تب فرّخ صاحب سے بات ہوئی تھی میری۔وہ رضا سے معلومات لیں گے،سا گر اس عورت کی دوسری شناخت پر موجود ڈیٹا نکلوانا چاہتا ہے۔جلد ہی ہم ولید تک پہنچ جائیں گے۔''

''کیا وہ واقعی میرا بیٹا ہے؟''اُس نے عجیب سا سوال کیا۔

''صبح تک ڈی این اے رپورٹ آجائے گی۔سب پتہ چل جائیگا صبح تک۔''اُس نے کہا۔اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔

''اگر وہ جھوٹ بول رہی ہو تو؟اگر میرا بیٹا اُسکے پاس نہ ہوا تو؟''اُسکی آنکھوں میں کوئی خوف آسمایا تھا۔وحید کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''تم پریشان نہ ہو نوید! ہو سکتا ہے یہ تمہاری آخری آزمائش ہو۔''اُس نے کہا۔

''تمہارے دوست تم سے ملنا چاہتے ہیں۔میں باہر جا رہا ہوں تا کہ اُنہیں اطلاع دے سکوں۔جزا کو بھی گھر چھوڑ دوں، پھر واپس یہیں آؤں گا۔بشریٰ اور امی کو بس اتنا کہا ہے کہ اُسے کسی کام سے لیکر جا رہا ہوں۔''اُس نے کہا تو نوید نے سر اثبات میں ہلایا۔وہ باہر چلا گیا تو اس نے نگاہیں دوبارہ چھت پر ٹکا دیں۔کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور باقی سب اندر آتے دکھائی دیے۔اُس نے نظریں آنے والوں پر کیں۔وہ پریشان چہروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔بات کرنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔

نوید کا چہرہ چند گھنٹوں میں ہی نقاہت زدہ سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، اور چہرے پر جھریاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ وہ ایک ہی رات میں ڈھے گیا تھا جیسے۔ کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرہ ویران تھا۔

سیکنڈ منٹوں میں تبدیل ہونے لگے پر کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ کچھ بھی نہ۔۔۔۔

''نوید!'' رضا نے سب سے پہلے لب کھولے، پر کچھ کہہ نہ سکا۔

''تم سب کو گھر جانا چاہیے۔'' نوید نے اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے کہا۔ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

''تم ہسپتال سے ڈسچارج ہو جاؤ۔ پھر چلے جائیں گے۔'' علی نے کہا۔ وہ جو اباً چپ رہا، وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کا یہ دورہ طویل ہونے لگا۔ ڈھیروں مکالمے بولنے والا حسین بھی کچھ کہنے سے قاصر تھا۔

خاموشی چبھنے لگی۔۔۔ ایک عجیب سی الجھن سب کو ہونے لگی۔۔۔

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' بلآخر نوید نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ وہ اکیلے رہنا چاہتا تھا یقیناً۔

''ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ ہم باہر ہی ہیں۔'' مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ سب جیسے آئے تھے، ویسے ہی باہر نکل گئے۔ سوائے رضا کے۔ وہ نہیں گیا، وہ وہیں کھڑا نوید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ولید پناہ گاہ میں آنے والا اب تک کا سب سے کم عمر بچہ ہے۔'' رضا کی آہستہ آواز کمرے میں گونجی تو وہ کچھ حیران ہوا۔ سب جا چکے تھے، بس وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔۔

''مجھے بہت پیارا بھی ہے۔ میرے سامنے اُس نے بیٹھنا سیکھا، چلنا سیکھا، بولنا سیکھا۔ شاید اس لیے بھی زیادہ پیارا ہے۔'' نوید نے نظریں اُس سے ہٹا لیں۔ چہرہ فرش کی جانب مرکوز کر دیا، نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسکے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

''پر میں اُسکی حفاظت نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دو، میں اُسکی حفاظت نہیں کر سکا۔ میں اپنے بیٹے کی۔۔ تمہارے بیٹے کی حفاظت نہیں کر سکا۔'' رضا نے سر جھکائے شرمندگی سے کہا تھا۔

''میں بھی نہیں کر سکا۔'' اُس نے ہلکے سے کہا تو رضا نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں نوید!''

''تمہارا قصور نہیں ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میں نے ہی یہ حکم دیا تھا کہ میرے پیچھے فریحہ جب چاہے، ولید کو لے جا سکتی ہے۔''

''تم نہ بھی کہتے تب بھی وہ اُسے لے جاتی۔''نوید اُسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ وہ دو لوگ تھے۔۔۔

جن کے پاس کہنے کے لیے الفاظ ہمیشہ کم ہوتے تھے۔۔۔

اور جنہیں اظہار کرنا سچ میں نہیں آتا تھا۔۔۔

یہ وہ دو لوگ تھے جن کی زندگی دو مشترکہ محبتوں سے جڑی ہوئی تھیں۔۔۔

ایک ولید۔۔۔اور دوسری جزا۔۔۔

قسمت نے بھی بڑے عجیب طریقے سے اُنہیں جوڑا تھا۔۔۔

''مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں ولید کو واپس لانے کے لیے کروں گا۔''رضا نے پھر کہا۔اُسے شاید سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیسے تسلی دے؟

''میں پہلے ہی تمہارا مقروض ہوں۔''اُسکی نگاہیں ابھی بھی فرش پر تھیں۔لیکن اس بار لہجے میں تشکر تھا، عاجزی تھی۔اس بات پر رضا نے رک کر اُسے بغور دیکھا۔پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔نوید نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''بھائی ہو تم میرے۔۔۔''اُس نے وہ کہا جو کہنے میں اسے مدت لگ گئی۔

''اور بھائیوں کے درمیان کچھ بھی قرض نہیں ہوتا۔''اُس کے الفاظ شاید مرہم کا کام کر گئے تھے۔نوید نے آنکھوں میں امڈتے آنسو ایک بار پھر رخ پھیر کر چھپا لیے۔اُسے شاید واپسی کی منزل تک آنے میں اب بھی وقت درکار تھا۔

''رضا!''دونوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔دروازے پر حسین تھا۔

''شیراز باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''اُس نے کہا۔

''آ رہا ہوں!''اُس نے سر ہلاتے جواب دیا۔پھر نوید کو دیکھا۔

''کوئی اطلاع ملی تو فوراً تمہیں آگاہ کروں گا۔''اُس نے کہا اور باہر نکل گیا۔حسین نے رک کر کچھ دیر نوید کو دیکھا، جس پر ایک ہی رات میں عمریں گزر گئی تھیں۔وہ زخم خوردہ شیر بن چکا تھا۔

اور زخمی شیر زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

--------+---------+----------

''کیا تم لوگ ہمیشہ سے ایسے ہی ہو؟'' راہداری میں فرّخ صاحب کی آواز پر رضا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سب سے مخاطب تھے۔

''ایسے یعنی؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''یعنی آج تیسری بار نوید ہسپتال میں ایڈمٹ ہے، اور تم لوگ یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہو۔'' اُنہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''پر آج آپ نے یہ نہیں کہا کہ وہ ٹھیک ہے، اُسے کچھ نہیں ہوا۔'' حسین اُداسی سے مسکرایا۔

''آج میں کہہ بھی نہیں سکتا۔ آج وہ واقعی ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ رنجیدہ تھے۔ ''اگر آج میں اُسکے بیٹے کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو شاید نوید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیگا۔ اس بار ہم اُسے کھو دیں گے۔'' اُنکا لہجہ پہلی بار افسردہ تھا۔

''ایسا نہیں ہو گا۔ ہم ڈھونڈ لیں گے ولید کو۔'' رضا نے کہا۔

''ہاں! مجھے آپ سے فرح عرف فریحہ کے متعلق معلومات لینی ہیں۔ کیا اُسکا کوئی پتہ ہے آپکے پاس؟'' شیراز نے اُسکے قریب آکر سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں! میرے پاس اُسکے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ہے۔ اُس پر اُسکا نام فریحہ ہی درج ہے۔ رہی بات گھر کی تو میں نے کئی مرتبہ اُس سے گھر کے بارے میں پوچھا کہ شاید مجھے کبھی ولید کو چھوڑنے یا لینے کے لیے ضرورت درپیش آجائے، پر اُس نے ہمیشہ ٹال دیا۔ میں نے بھی بار بار پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔'' اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''کیا آپ فوری طور پر اُسکا شناختی کارڈ دکھا سکتے ہیں۔'' شیراز نے پوچھا۔

''میں عائشہ جی سے کہتا ہوں کہ وہ میرے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا نکال کر بھیج دیں۔ کچھ وقت لگے گا اس میں۔'' رضا نے کہا۔

''میں انتظار کر لوں گا۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا ایک طرف ہو گیا۔ رضا نے چند لمحے بغور اُسے دیکھا۔ وہ اُسے زیادہ نہیں جانتا تھا، پر جب بھی ملا تھا، اُسے ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ پر آج وہ اتنا سنجیدہ تھا، جتنا نوید رہتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر فون پر کچھ لکھنے لگا۔

''ہم آج رات فریحہ کو چھوڑ دیں گے۔'' راہداری میں فرّخ صاحب کی آواز گزری۔ سب نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

''کیوں؟'' وحید اُسی لمحے وہاں آیا تھا۔

''کیونکہ ہم اُسکی جڑوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل تک اصل مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔''اُنہوں نے کہا۔

''ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔''حسین نے اُنہیں سنجیدگی سے دیکھا۔

''کونسی بات؟''اُنہوں نے رک کر پوچھا۔

''آپ کے لوگوں نے پچھلے کئی ماہ ہماری نگرانی کی ہے۔یقیناً!رضا کی بھی کی ہوگی۔تو کیا انہوں نے فریحہ کو وہاں آتے نہیں دیکھا؟اگر دیکھا تک آپکو اطلاع کیوں نہ پہنچی۔''سوال معقول تھا۔

''کیونکہ فرح کا کیس کوئی ہائی پروفائل کیس نہ تھا،جسے سب جانتے۔ایف ای اے دن میں سینکڑوں ایسے کیسز پر کام کرتی ہے،ہر کیس الگ ٹیم کے حوالے ہوتا ہے۔ہر کسی نے ہر کیس کے ملزم کو نہیں دیکھا ہوتا۔اور فرح کو میرے اور نوید کے علاوہ سب نہیں جانتے تھے۔خصوصاً وہ ملازمن جو تم لوگوں کی نگرانی پر مامور تھے۔نہ وہ فرح کو جانتے تھے،نہ انہوں نے اسے کبھی دیکھ رکھا تھا۔وہ فقط تمہاری نگرانی کے لیے وہاں تھے،ہاں!اگر ہم نے فرح کی تصویر دکھا کر اُنہیں ہدایت دی ہوتی کہ اِس کی خبر رکھیں،تو یقیناً وہ بتاتے۔پر ہم نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں،نہ ہمارے گمانوں میں تھا کہ وہ تمہارے گھر آتی ہوگی۔'' اُنہوں نے بتایا۔

''اوہ!اگر معلوم ہوتا تو یہ معاملہ پہلے حل ہو جاتا۔''رضا نے افسوس سے کہا۔

''کیا تم لوگ واقعی گھر نہیں جاؤ گے؟''فرخ صاحب نے یکدم ہی پوچھا۔

''کیا ہم جا سکتے ہیں؟''عمر نے الٹا سوال کیا تو وہ مسکرائے۔

''ٹھیک ہے!جیسے چاہو۔''اُنہوں نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''نوید کو ڈاکٹرڈسچارج کر رہے ہیں۔پر وہ فلحال گھر نہیں جانا چاہتا۔''وحید نے سنجیدگی سے اُنہیں بتایا۔

''جس گھر میں وہ رکے ہیں،تم اُسی گھر میں اُسے لے جاؤ۔''انہوں نے جواب دیا۔اتنی دیر میں رضا نے تمام تفصیلات شیراز کے حوالے کر دی تھیں۔

''اس نے بھی وہیں جانے کا کہا ہے،پر مجھے اُسکی فکر ہے،وہاں اُسکا خیال کون رکھے گا؟''وحید نے فکر مندی ظاہر کی۔

''ہم ہیں اُسکے ساتھ وہاں۔'' حسین نے نرمی سے کہا،تو وحید نے اُسے دیکھا۔پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

--------+---------+----------

کمرے میں خاموشی تھی۔ کل رات ٹھیک ٹھاک بارش ہوئی تھی۔ کراچی میں بارش ہو جائے تو موسم حسین تر ہو جاتا ہے، ہر شے اپنے جوبن پر اُتر آتی ہے۔ آج بھی صبح سے موسم ابر آلود تھا، فضا ٹھنڈی اور رم جھم مستقل برس رہی تھی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، یک ٹک سامنے شیشے پر برستی بارش کی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ رات ہسپتال سے یہاں آیا تو دواؤں کے زیرِ اثر سو گیا تھا۔ اب جاگا تو ہر جانب خاموشی تھی۔ جاگنے کے بعد اُس نے موبائل دیکھا تو بشریٰ کے لاتعداد پیغامات اور ڈھیروں مس کالز تھیں۔ اُس نے پیغامات کھولے اور ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیے۔

''کہاں ہو نوید؟''

''فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟''

''تم کب آؤ گے؟ پلیز! جلدی آ جاؤ۔'' آخری پیغام تھا۔ اُسکا دل تڑپ اٹھا۔ پرسوں رات سے وہ اُسے ٹھیک ٹھاک نظر انداز کر چکا تھا۔ فوراً اُسے فون کیا۔ سیکنڈ مکمل ہونے سے بھی قبل فون اُٹھا لیا گیا۔ اُسکے لبوں پر اُداسی سی رینگی۔ وہ موبائل ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی شاید!

''نوید کہاں ہو تم؟'' اُسکی پریشان کن آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپریشن کے آخری لمحات تھے، اس لیے تم سے بالکل بات نہیں ہو پائی۔ جلد ہی گھر آ جاؤں گا۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں! تم تو ٹھیک ہو نا؟ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔'' اُس نے پوچھا، آواز پہلے سے قدرے مطمئن تھی۔

''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟'' اُس نے لہجے میں بشاشت سمونے کی ناکام کوشش کی۔

''میں ٹھیک ہوں بس!۔۔۔۔'' وہ رکی۔

''کیا ہوا؟'' نوید نے پوچھا۔

''بس! تم جلدی آ جاؤ۔'' اُس نے کہا۔

''پریشان نہ ہو جلد آؤنگا۔'' اُس نے کہا، پھر پوچھا؛ ''اور بتاؤ، کیا کر رہی تھی تم؟''

''کچھ خاص نہیں، آج۔۔۔'' وہ بتانے لگی، اور اُسے سنتے نوید کا ذہن بھٹکنے لگا۔ نجانے فرح کا کیا ہوا؟ ولید مل سکے گا یا نہیں؟ ان سب باتوں کے جواب اُسکے پاس نہ تھے۔ وہ اب کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

کن من برستی بارش اُسکے دل کی اداسی کم کرنے میں ناکام تھی۔ اُسی لمحے دروازہ پر دستک ہوئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو ادھ کھلے دروازے پر علی کھڑا تھا۔ ہاتھوں میں ٹرے موجود تھی۔

''آجاؤ!''اُس نے کہاتو وہ اندر آیا۔

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔خیال رکھنا!''نوید نے بشریٰ سے کہااور پھر کال کاٹ دی۔علی نے بستر پر جگہ بنا کر ٹرے اُسکے سامنے رکھی۔دو عدد سینڈوچ،ایک چائے کی پیالی اور ساتھ دوائیں رکھی تھیں۔

''شکریہ!پر میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔''اُس نے آہستگی سے کہاتو علی نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''کیا تم نے بالکل ہی ہمیں اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟کیا ذرا سی بھی گنجائش نہیں بنتی؟''اُس نے نوید کے رویے پر آج چپ توڑنا ضروری سمجھا تھا۔اس طرح وہ اکیلے ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔

''باقی سب کہاں ہے؟گھر کیوں نہیں گئے؟''اُس نے وہی کیا جو وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔علی کو آج سمجھ آیا کہ یہ اپنا من پسند جواب دینے یا نظر انداز کرنے والی عادت نہیں تھی،یہ فرار تھا۔

''باہر ہی ہیں سب،جانا نہیں چاہتے۔تمہاری کل جو حالت تھی۔اُسکے بعد تمہیں چھوڑ کر سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔''اُس نے کہا۔

''ضرورت نہیں تھی اِسکی!''نوید نے جواب دیا۔

''ہر چیز ضرورت کے تحت نہیں کی جاتی نوید!''علی نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں ہماری ضرورت نہیں ہو گی،پر ہم تمہیں اس طرح اکیلے نہیں چھوڑ سکتے۔''اُس نے پھر کہا۔نوید نے اِس بار بھی کوئی جواب نہ دیا تو وہ جانے کے لیے مڑا۔

''جب میرے بیٹے مرے تھے،تب تم میرے پاس نہیں تھے۔مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ضرورت بھی نہیں!دوستی بھی نہیں!''اُس کی ٹھوس آواز پر علی پلٹا اور واپس اُسکے پاس آیا۔

''کیا تم اس بات کا بدلہ تا عمر لو گے؟''اُس نے پوچھا۔

''دوستی تم نے ختم کی تھی۔گھر سے تم نے نکلنے کو کہا تھا۔''اُس نے یکدم ہی کہا۔

''میں غلط تھا۔ناراض تھا،مان جاتا کچھ دنوں میں۔''اُس نے وضاحت دی۔

''میں اسی شہر میں تھا۔دس سالوں میں بھی تم نہ مانے،تو پھر کیا اُمید رکھتا تم سے؟''اُس نے پہلی بار شکوہ کیا۔علی کے پاس وضاحتیں کم پڑنے لگیں۔اُس نے سر جھکایا۔

''میں سمجھ گیا۔'' پھر چہرہ اُٹھا کر اُداسی سے مسکراتے کہا۔

''کیا؟'' نوید نے پوچھا۔

''یہی کہ میں نے اپنا دوست کھو دیا ہے۔'' اُس نے کہا۔ اُسی لمحے دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وحید سامنے کھڑا تھا۔ اُسکے ہاتھ میں کوئی میڈیکل رپورٹ تھی۔ علی جانتا تھا وہ کیا ہے۔

''بھائی!'' نوید کو اُسکے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔

''کیسے ہو نوید؟'' وہ اُسکے قریب آیا، تو علی خاموشی سے نکل گیا۔ نوید نے اُسے کچھ نہ کہا۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' وحید نے پوچھا۔

''کیسی ہو گی؟'' سوال عجیب سا تھا۔ وحید چند لمحوں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ڈی این اے رپورٹ اُسکے سامنے رکھی۔

''وہ ولید ہی ہے، ہمارا ولید!'' اُس نے آہستہ سے کہا، نوید کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ جیسے وہ جانتا تھا، یہی ہو گا۔ پھر اس نے گہرا سانس بھر کر چہرہ اوپر کیا، پھر دوبارہ نیچے کر لیا۔ جیسے بہت سارے آنسو اندر ہی اتارے ہوں۔

''نوید!'' وحید نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

''کیا پتہ یہ آخری آزمائش ہو؟'' اُسکا بازو سہلاتے ایک بار پھر تسلی دی۔

''بھائی! میں آپکو بتا نہیں سکتا۔۔۔۔ سمجھا نہیں سکتا۔۔۔۔ پر میرا دل جل رہا ہے اس وقت۔'' وہ ٹوٹے سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں مر رہا ہوں اندر سے۔ میرا بچہ میرے سامنے سے چلا گیا ہے۔ اُسی عورت کے پاس ہے۔ میں اپنی تکلیف بتا نہیں سکتا آپکو۔'' وہ کتنا جل رہا تھا یہ بات اُسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کل رات جو ہوا تھا اُسکے ساتھ، وہ ہی کافی تھا اُسکے دل کا حال سنانے کو۔

''میں جانتا ہوں، مجھے تمہاری ہر تکلیف معلوم ہے۔'' وحید نے اُسکا بازو سہلاتے کہا۔ ''خود کو اذیت مت دو۔ ہم آج ہی ولید کو لے آئیں گے۔'' اس بات پر نوید نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وحید اُسکے برابر ہی بیٹھ گیا۔

''آج ہی؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں! ساگر کا آئیڈیا کام کر گیا ہے۔ فرح کی لوکیشن معلوم ہو گئی ہے۔ وہ کل رات سے جس جگہ ہے، اُس جگہ کو ہم گھیرے میں لے چکے ہیں۔ اُسکے علاوہ اُسکی دوسری شناخت پر مزید معلومات بھی ملی ہیں۔'' وحید نے کہا۔ ''ایک تو میری سمجھ نہیں آرہا، اس ملک میں ایک ہی شخص کو دو شناختی کارڈ کیسے جاری ہو سکتے ہیں؟'' وہ بڑبڑایا تھا۔

''بھائی!'' نوید نے یکدم ہی اُسے پکارا تو وہ رکا۔

''ہاں! کہو!'' فوراً جواب دیا۔

''میرا بیٹا واپس آجائیگا نا؟ میں بشریٰ کو اُسکی اولاد واپس لوٹا سکوں گا؟'' اُس نے کسی خوفزدہ بچے کی طرح پوچھا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں؟ میں لاؤں گا اُسے واپس۔ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' اُس نے پیار سے اُسکا چہرہ تھپتھپاتے کہا۔ باہر کھڑا علی خاموش قدموں سے جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ اُسکا دوست تھا، وہ چاہتا تھا نوید اُس سے سب کہہ دے۔ اپنے سارے خوف، سارے خدشے۔۔۔

لیکن سب کہنے کے لیے دوست ہونا ضروری نہیں ہے۔

اپنا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔۔۔۔

بس! دل میں مقام حاصل کرنا ضروری ہے۔۔۔۔

اور شاید ابھی وہ اس مقام پر نہیں پہنچے تھے۔۔۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فرّخ صاحب، ساگر، فیصل اور شیراز بھی اُسکی عیادت کو پہنچے۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' فرّخ صاحب نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے پوچھا۔ اُنکے چہرے پر پچھلے دنوں کی کسی بات کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

''بہتر ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''رپورٹ مل گئی تمہیں؟'' وہ اُسکے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے، ساگر بھی ساتھ ہی تھا۔ وحید اُسکے برابر میں تھا، جبکہ فیصل ڈریسنگ ٹیبل سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اور شیراز؟ نوید کی نظروں نے اُسے تلاشا۔ وہ دروازے کے برابر بنے ستون سے ٹیک لگائے، سر جھکائے کھڑا تھا۔

''مل گئی ہے۔'' اُس نے چہرہ واپس موڑتے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم آج رات اُس جگہ ریڈ کرنے جا رہے ہیں، جہاں فرح مقیم ہے۔ وہ شہر سے دور، مضافات میں موجود ایک فارم ہاؤس ہے۔ آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ ہمیں ہر صورت فرح اور ولید کو آج ہی حاصل کرنا ہے۔ اُسی کے ذریعے ہم اصل مجرم تک پہنچ سکتے ہیں۔'' ساگر نے کہا۔

''آپ لوگ کب تک جائیں گے؟'' نوید نے پوچھا تو ساگر نے فرّخ صاحب کا منہ دیکھا۔

''شام میں نکلے گی ٹیم۔'' اُنہوں نے مختصر جواب دیا۔

''میں بھی جاؤں گا۔'' اُس نے پوچھا نہیں تھا، بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اُنہوں نے بھی مزید کچھ نہ کہا، جانتے تھے کہ جب اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو کوئی بھی تاویل بیکار ہے۔

''ٹھیک ہے! پھر تم کچھ دیر آرام کرو۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑے ہوئے، تو ساگر بھی کھڑا ہو گیا۔ ''شام کو ٹیم کے ساتھ جانا ہے۔ اور ہاں!'' وہ رکے۔ ''رضا بھی ساتھ جائیگا۔''

''کیوں؟'' نوید سے پہلے وحید نے پوچھا۔

''ولید اُسے پہچانتا ہے، اُسکا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ میں نے تمہارے دوستوں کو بھی فلحال گھر جانے سے منع کر دیا ہے۔ جب تک مجرم پکڑا نہیں جاتا، اُنہیں یہیں رہنا چاہیے۔ اور اب جبکہ فرح آزاد ہے تو ہم کوئی رسک بھی نہیں لے سکتے۔'' اُنہوں نے کہا۔

''میں چلتا ہوں اب۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''گیٹ ویل سون سر!'' فیصل نے اُسے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساگر بھی اُسے نیک تمنائیں دے کر باہر نکلا۔

''شیراز!'' شیراز جانے لگا تھا، جب نوید نے اُسے پکارا۔ وہ رکا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!'' وہ مختصر الفاظ میں، بنا کسی تاثر کے کہتا باہر چلا گیا۔ نوید کی نظروں نے دور تک اسکا پیچھا کیا تھا۔

---------+---------+--------

رات کے سات بج رہے تھے۔ سارے میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''میں امید کرتا ہوں کہ آج یہ سب ختم ہو جائیگا۔'' عمر نے کہا۔

''ان شاءاللہ!'' علی نے کہا۔

''اور اُسکے بعد؟'' یہ عجیب سا سوال مقدّم کی جانب سے آیا تھا۔ سوال عجیب تھا یا شاید وہ اِس سوال کے لیے تیار نہ تھے۔

''اُسکے بعد سب اپنے اپنے راستے۔ جیسے پہلے تھے۔۔۔'' جواب اِس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ لیکن انہونی یہ تھی کہ دینے والا حسین تھا۔ اس بات پر وہاں ایک جامد خاموشی چھاگئی تھی۔ سب نے نظریں چرائی تھیں۔ حسین ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا، کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کہ سب اپنے آپ میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔

''کیا ہم آج سب ختم نہیں کر سکتے؟ کیا ساری پرانی باتیں؟'' مقدّم نے سب کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''کیا ابھی بھی سب ختم نہیں ہوا؟ اُسکے لیے زبان سے کہنا ضروری ہے؟'' علی نے الٹا سوال کیا تو وہ مسکرایا۔

''ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔'' حسین نے کہا تو سب نے اسے دیکھا۔ ''کیونکہ کچھ لوگوں کے دل ابھی بھی صاف نہیں ہوئے۔''

''اور یہ کچھ لوگ کون ہیں؟'' رضا نے پوچھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نوید کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آیا۔ سیاہ جینز پر، ہمیشہ کی طرح سیاہ شرٹ ٹک ان کیے۔ اپنے تمام اسلحوں اور ہتھیار کے ساتھ وہ جانے کو تیار تھا۔ اُسکی بلٹ پروف جیکٹ اُسکے ہاتھوں میں تھی، دوسرے ہاتھ میں موبائل لیے، اس پر کچھ لکھتا وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہیں آرہا تھا۔

''کچھ لوگوں نے ہمیں زندگی سے مکمل طور پر نکال دیا ہے۔ اور ہمیں ہمارا قصور بھی نہیں بتایا۔'' حسین نے سنجیدگی سے پچھلی بات کا جواب دیا، تو نوید کے قدم رکے، اور اُس نے نظریں اٹھا کر اچھنبے سے اسے دیکھا۔ پر کہا کچھ نہیں۔

''چلو رضا! باہر شیراز انتظار کر رہا ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں رضا کو مخاطب کیا۔ اور باہر نکل گیا۔ چہرے پر نقاہت کے آثار اب بھی نظر آرہے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر! میں چلتا ہوں۔ امید ہے واپسی پر ہم اچھی خبر کے ساتھ آئیں گے۔'' رضا نے سب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' عمر نے کہا۔

''اور ایس ایس پی صاحب کا بھی!'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرایا۔

''وہ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔'' یہ جواب علی نے دیا تھا۔ اُنہیں خدا حافظ کہہ کر رضا باہر آگیا۔ شیراز، فیصل اور ساگر بقیہ ٹیم کے ساتھ موجود تھے۔ نوید کا بھائی بھی موجود تھا، وہ بھی شاید ساتھ ہی جا رہا تھا۔ رضا نے اندازہ لگایا۔

''سب مکمل ہے تو اب فوراً نکلتے ہیں۔'' نوید نے کہا۔

''ٹھیک ہے!''سا گر نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بقیہ ٹیم کو ہدایت دینے لگا۔

''تم بیٹھو! اور یہ پہن لو۔''نوید نے ہاتھوں میں تھامی جیکٹ رضا کی جانب بڑھادی۔

''کیا مجھے اسکی ضرورت ہے؟''

''ہاں! وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''اُس نے کہا۔رضا نے جیکٹ لے لی۔فیصل نے اسے پہننے میں مدد کی۔پھر وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ نوید نے بھی اُسکے برابر میں نشست سنبھال لی۔

راستے بھر خاموشی تھی۔آگے بیٹھا سا گر پل پل کی خبریں فرّخ صاحب کو دے رہا تھا۔وحید، نوید اور رضا کے سامنے بیٹھا تھا۔وہ بغور رضا کو دیکھ رہا تھا، اور وہ اُسکی نظروں سے عجیب الجھن کا شکار تھا۔اُسکی نظریں نوید نے بھی محسوس کیں تو چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے بھائی؟''اُس نے وحید سے پوچھا۔

''ولید کی تصویریں دے دی ہیں تم نے سا گر کو؟''وحید نے اسے نظر انداز کر کے رضا کو مخاطب کیا۔اس سوال پر نوید نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔اسے تو یاد ہی نہ رہا تھا کہ رضا کے پاس ولید کی تصاویر موجود ہوں گی۔

''ہاں!''پھر اُس نے جیب سے موبائل نکالا۔کچھ تلاشا، پھر مطلوبہ شے مل جانے پر موبائل نوید کی جانب بڑھایا۔نوید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارا بیٹا!''اُس نے آہستگی سے کہا تو چند لمحے نوید موبائل کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر اُسے تھاما۔وحید اور رضا، دونوں نے اُسکے ہاتھوں کو لمحے بھر کے لیے کانپتے دیکھا تھا۔وہ باپ تھا۔۔۔ایک لاچار باپ۔۔۔

اُس نے موبائل لیا، اور تصاویر آگے بڑھا کر دیکھنے لگا۔مختلف اوقات کی تصویریں تھیں۔وہ لب بھینچے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے موبائل رضا کو واپس کر دیا۔کوئی ردعمل نہ دیا۔۔۔کچھ نہ کہا۔۔۔

''تمہارا بیٹا مل جائے گا۔''رضا نے تسلی دینی چاہی۔

''پر وہ تو تمہیں باپ سمجھتا ہے۔''سوال نہایت ہی غیر متوقع تھا۔رضا چپ کا چپ رہ گیا۔

''وہ تو فرح کو بھی اپنی ماں سمجھتا ہو گا۔''جواب اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔اور دینے والا وحید۔نوید کے جبڑے تنے، پر وحید بھی اُسی کا بھائی تھا۔اُسی کی طرح، سفاکی کی حد تک صاف گو۔

''رضااور فرح میں فرق ہے۔''اب کہ وحید نے آہستہ سے کہا۔''اِس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کسے کیا سمجھتا ہے؟فرق اِس بات سے پڑتا ہے کہ وہ صحیح سلامت ہمیں مل جائے۔پھر وہ جہاں خوش ہو۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہاتو پہلی بار نوید نے نظریں اٹھا کر اسے ناراضگی سے دیکھا تھا۔کم از کم وہ اس وقت یہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

''وحید بھائی!''رضا نے اسے مخاطب کیا۔پہلی بار۔۔۔اسے بھائی ہی مناسب لگا،تو وہ ہی کہا۔

''میں نے اپنے گھر میں ہر بچے کو اسی امید کے ساتھ پالا ہے کہ ایک روز وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔اور یہ دعا ہر وقت کی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس واپس چلے جائیں۔اگر ایک بچہ بھی اپنے اصل گھر واپس لوٹ جاتا ہے،تو وہ میری سب سے بڑی خوشی ہے۔کیونکہ بچے کو اصل محبت اُسکے اپنے ماں باپ ہی دے سکتے ہیں۔''اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تمہیں تکلیف نہیں ہو گی؟تم تین سال سے اُسے پال رہے ہو۔''وحید نے اس سے پوچھا۔

''میری تکلیف ثانوی ہے،اس تکلیف کے مقابلے میں جو اُسکے ماں باپ پچھلے تین سال سے سہہ رہے ہیں۔''اُس نے کہا۔پہلی بار وحید مسکرایا،تشکر آمیز تاثرات کے ساتھ۔وہ بھی نوید کی طرح کم مسکراتا تھا،پر محسور کن۔۔۔یا شاید،یہ تینوں بہن بھائی ہی ایسے تھے۔

''ہم پہنچ گئے ہیں۔''ساگر کی آواز پر اُنکی توجہ اُسی کی جانب ہوئی۔

''ٹھیک ہے!رضا،تم فلحال یہیں رہو گے۔ہمارا پہلا کام ولید کو کسی نہ کسی طرح باہر لانا ہے۔اور پھر فرح کو پکڑنا۔اگر ہمیں ولید پہلے مل جاتا ہے تو ہم اُسے تمہارے حوالے کریں گے،پھر فرح کے پیچھے جائینگے۔''وحید نے رضا سے کہاتو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نوید کے ماتھے پر پسینے کے قطرے،اور چہرے پر اضطراب واضح تھا۔وحید اتر چکا تھا،نوید جیپ سے اُتر رہا تھا۔

''نوید!کیا تم اندر جاؤ گے؟''رضا نے اتر کر ایک نظر،چند قدم دور نظر آتے اس بنگلے کو دیکھا۔

''ہاں!''

''یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں اس سے بھی زیادہ خطرناک آپریشنز پر جا چکا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔رضا چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔پھر چند قدم آگے بڑھا،نوید نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔اور پھر رضا نے وہ کیا،جو شاید اُسکے تصوّر میں بھی نہیں تھا۔اُس نے آگے بڑھ کر نوید کو گلے لگایا۔نوید ساکت کھڑا رہ گیا۔یہ پہلی پیش قدمی تھی،اُسکے دوستوں میں سے سب سے پہلی۔۔۔

''جیسے جا رہے ہو، ویسے ہی واپس آنا۔''نوید سے الگ ہوتے اس نے کہا۔

''نہیں! ولید کے ساتھ آؤنگا۔''اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، آنکھوں میں پہلی بار نرمی تھی۔

''ان شاءاللہ!''اُس نے کہا۔ پھر نوید آگے بڑھ گیا۔ ساگر، فیصل، شیراز بھی ساتھ گئے تھے۔ وحید دوسری ٹیم کو لیڈ کر رہا تھا، جو باہر کی جانب تھی۔

خدا جانے اب کیا ہونے والا تھا؟

---------+---------+--------

گو کہ رات کا پہلا پہر ہی تھا، لیکن شہر کا مضافات ہونے کی وجہ سے یہاں جامد سنّاٹا تھا۔ وہ لوگ کیمرے سے بچتے، باری باری گھر کے پچھلے حصے میں بنی کھلی راہداری میں کود ے۔

''میں گھر کے اندر جاؤں گا۔ اور تم سب باہر سے میری مدد کرو گے۔''نوید نے باقی تینوں کو دیکھا۔

''کیا تمہارا اکیلے اندر جانا مناسب رہے گا؟''ساگر نے پوچھا۔

''اکیلے جانا ہی مناسب ہے، زیادہ لوگ جائیں گے تو نظروں میں آئیں گے۔ اور اگر ولید اندر رہی ہوا تو وہ اُسے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! خیریت سے جاؤ۔''ساگر نے کہا۔

''میں ولید کو لیکر یہیں آوں گا۔ اللہ کی امان میں ''!اس نے کہا۔

''اللہ کی امان میں!''شیراز اور فیصل نے کہا۔ نوید بنا قدموں کی چاپ پیدا کیے آگے بڑھ گیا۔

''تم دونوں نوید کی حفاظت کے لیے تیار رہو گے، اور میں فرح کو ہر طرح سے فرار ہونے سے روکوں گا۔''ساگر نے اُسکے جانے کے بعد کہا تو دونوں نے اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں۔

دوسری جانب نوید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے راہداری میں آگے بڑھ رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور خالی تھا۔ اُس نے بہت احتیاط سے ہر جانب دیکھا، پر کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے اپنا ٹرانسیور اُٹھایا اور منہ کے قریب کیا۔

''ساگر! گراؤنڈ فلور خالی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں شیراز کو مزید لوگوں کے ساتھ اندر تعینات کر رہا ہوں۔'' ساگر کی آواز ابھری۔ اُسکے بعد نوید نے ایک نظر اوپر کی طرف جاتی سیڑھیوں کو دیکھا، اور پلٹ کر دروازے کی جانب، جہاں سے شیراز بقیہ ٹیم کے ساتھ محتاط انداز میں اندر آ رہا تھا۔ نوید نے اُسے دیکھ کر سر ہلایا، پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔ سامنے لاؤنج تھا، وہ بھی نیم اندھیرا پڑا تھا۔ وہ آہستہ سے قدم بڑھاتا آگے بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ ایک کمرے کے باہر آ کر اُسکے قدم رکے۔

''تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟ میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ انہوں نے مجھے رہا تو کر دیا ہے، اور میں ہر ممکن طریقے سے اُنکی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں آ بھی چکی ہوں۔ پر مجھے بالکل یقین نہیں ہے کہ وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے۔ تم کچھ بھی کر کے مجھے یہاں سے نکالو۔'' یہ فرح کی آواز تھی، سو فیصد!۔۔۔۔ نوید کمرے کے باہر دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوا، اور پستول ہاتھوں میں اٹھائی۔

''تو آخر تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے؟ جب تم کراچی میں ہی ہو، تو مجھے لے کر یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتے؟ ابھی یہاں سے فرار ہونا آسان ہے۔ اگر ایف آئی اے نے کوئی اقدام لے لیا تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ ابھی تو میں اس بچے کے بل بوتے پر بچ گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم آگے کیا ہو گا۔۔۔۔ تم بس!۔۔۔ تم جلدی مجھے یہاں سے لیکر جاؤ۔'' وہ غالباً فون پر بات کر رہی تھی۔ بلکہ چیخ رہی تھی۔

''اوہ! تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم یہاں آنے سے ڈر رہے ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم یہاں آؤ اور پکڑے نہ جاؤ۔'' فرح کی زہر خند آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں!'' وہ دھاڑی تھی۔ ''تمہیں ڈر ہے کہ تم یہاں آؤ گے اور پکڑے جاؤ گے۔ اس لیے تم میری قربانی دینے پر راضی ہو۔ تم نے مجھے گرفتاری کے بعد بھی نہیں بچایا، میں ولید کو سہارا بنا کر وہاں سے نکلی ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا تو میں تمہاری پول بھی کھول دونگی، وہ بھی تمام ثبوتوں کے ساتھ۔'' وہ چلا رہی تھی۔

''وحید بھائی! وہ شخص پاکستان میں ہی ہے۔ آگے سے کچھ نہ کہیے گا۔'' اُس نے ٹرانسیور میں کہا اور بٹن دبا کر اُسے بند کیا۔

دوسری جانب وحید نے اُسکی بات سننے کے بات فوراً عملے کو فرّخ صاحب کو اطلاع دینے کی ہدایت دی، رضا پاس ہی خاموش کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔ نوید نے گہرا سانس لیا، اور اگلے ہی لمحے کمرے کے اندر داخل ہوا، فرح کی اُسکی جانب پیٹھ تھی۔ وہ فون بند کر کے اپنے بستر پر پٹخ چکی تھی، اب سر تھامے یہاں سے وہاں ٹہل رہی تھی۔

''تمہارا کھیل ختم ہوا فرح خالد!'' نوید کی آواز پر وہ جھٹکا کھا کر پلٹی۔

''تم؟'' آنکھوں میں بے یقینی اُتر آئی۔ وہ ایک طرح دار اور خوبصورت عورت تھی، لیکن اتنی ہی سفاک بھی۔

''اپنے آپ کو خاموشی سے پولیس کے حوالے کر دو ورنہ تمہیں یہیں مار دوں گا۔''

''مار دو!'' وہ ایک ادا سے مسکرائی۔ ''پھر اپنے بیٹے کو بھی بھول جانا۔'' اگلے ہی لمحے نوید اپنے اور اُسکے درمیان کا فاصلہ ختم کر کے اُسکے پاس آیا، وہ بنا ایک انچ بھی ہلے مسکرائی۔ نوید نے پستول کی نال اُسکے ماتھے پر رکھی۔

''یہ تمہاری بھول ہے کہ تم میرے بیٹے کو اب کہیں چھپا سکتی ہو۔ تم خاموشی سے گرفتاری دو گی ورنہ تمہیں یہیں گاڑنے میں وقت نہیں لگاؤں گا۔'' اگلے ہی لمحے فرح نے ہاتھوں کی مٹھی نوید کے جبڑے پر دے ماری۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک قدم لڑکھڑا کر پیچھے ہوا، پر اپنی پستول نیچے نہیں کی۔ نوید کے سنبھلنے سے پہلے اُس نے اُسکی ٹانگ پر پیر سے وار کیا، اور سرعت سے اُسکے برابر سے نکلی۔ وہ بھی بنا وقت ضائع کیے اُسکے پیچھے آیا اور اُسے بالوں سے جکڑ کر دیوار پر دے مارا۔ اُسکے بعد بھی وہ ذرا نہ گڑبڑائی بلکہ پلٹ کر دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر، ایک کو چہرے کے قریب کیا اور دوسرے کو نوید کے منہ پر مارنا چاہا، نوید نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنا چہرہ پینتالیس کے زاویے پر ترچھا کیا اور پستول کا بٹ اُسکے سر پر دے مارا، صرف ایک لمحے کو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی، لیکن اب بھی نہ گری۔ دیکھنے میں وہ جتنی نازک تھی اتنی ہی خطرناک تھی۔

''گو کہ تم عورت کے نام پر داغ ہو۔ پر تم ایک اچھی فائٹر ہو۔'' نوید نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اُس نے آبرو اُچکا کر داد وصول کی اور اگلے ہی لمحے اپنا دائیں پاؤں ایک سو اسی کے زاویے پر سیدھا اٹھایا، اتنی تیزی سے کہ اگر مقابل کوئی اور ہوتا تو اپنا منہ تڑوا بیٹھتا، پر وہ نوید تھا۔ اگلے ہی لمحے اُسکا پاؤں پکڑ کر اُسے ہی زمین پر گرا دیا۔

''تم وہ پہلی عورت ہو جسکا لحاظ مجھ پر حرام ہے۔'' نوید نے اُس کے برابر میں تھوکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تاکہ اُسکے ہاتھ باندھ سکے، لیکن اُس نے پلٹ کر چھوٹا سا، نیل کٹر کے سائز کا خنجر اُس کے گلے پر مارا، وہ پلک جھپکنے میں پیچھے ہٹا پر پھر بھی خنجر اُسکے گوشت کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ وہ اس وار کے لیے تیار نہ تھا۔ اُس نے فوراً اپنا ہاتھ گلے پر رکھا، اتنی دیر میں فرح تیزی سے اُٹھ کر کھڑکی تک گئی، اور اُس قد آدم کھڑکی پر اس طرح بیٹھی، کہ بس ابھی چھلانگ لگا دے گی۔ نوید نے اُسکے پیروں پر گولی چلائی۔ گولی اُسکی ران میں گھسی یا چھو کر نکلی، معلوم نہیں! پر وہ صرف ایک لمحے کو لڑکھڑائی، پھر اگلے ہی لمحے اُس نے کھڑکی کا قبضہ تھام کر خود کو سنبھال لیا۔ وہ مضبوط اور بہترین تربیت یافتہ عورت تھی۔

''نوید! یہ آواز کیسی تھی؟ کیا تم ٹھیک ہو؟'' ٹرانسیور سے ساگر کی آواز ابھری۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم ٹھیک ہو؟'' ساگر پریشان تھا۔

''تو تم ہار نہیں مانو گی؟'' اُس نے دوبارہ پستول اُس پر تانی۔

''میری ہار و جیت کی فکر نہ کرو نوید! اپنے بیٹے کی کرو۔'' وہ زہریلے انداز میں مسکرائی۔ نوید کی انگلی ٹریگر پر مضبوط ہوئی۔

''وہاں سامنے کمرے میں ہی ہے تمہارا بیٹا! مگر افسوس، تم اُس سے کبھی نہیں مل پاؤ گے۔''اُس نے پیچھے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، نوید نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اُس نے چھلانگ لگادی۔ نوید آگے نہیں بڑھا۔بلکہ ٹرانسیور کا بٹن دبایااور فوراً بولا۔

''ساگر! وہ پیچھے والی راہداری کے اوپر بنی کھڑکی سے کودی ہے، اُسے فوراً پکڑو!''اُس نے حکم دیااور پلٹا۔اُسکے پیچھے، جہاں فرح نے اشارہ کیا تھا۔وہاں دو دروازے تھے۔ایک بند تھا، جبکہ دوسرا تھوڑا سا کھلا تھا، اندر لائٹ بھی جلی ہوئی تھی۔ وہ دھڑکتے دل سے ادھ کھلے دروازے والے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔دل کو ایک نامعلوم سا احساس ہو رہا تھا۔

دوسری جانب جیسے ہی فرح کھڑکی سے نیچے کود کر واپس کھڑی ہوئی، فیصل اور شیراز نے اُسے چاروں جانب سے گھیر لیا۔

''ہاتھ اوپر!''شیراز کا لہجہ خطرناک حد تک سفاک تھا۔

''آہ! یہاں بھی۔۔۔''وہ جیسے مذاق اڑاتی آگے بڑھی، اور شیراز کو مارنا چاہا، پر اتنے سارے لوگوں سے وہ اکیلے نہیں لڑ سکتی تھی، لہٰذا فوراً ہی اُسے قابو کر لیا گیا۔

''اب تم نہیں بھاگ سکتی۔''ساگر نے اُسکے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔وہ کوئی پاگل تھی، ذہنی مریض!

''میں تو پکڑی گئی، پر تم اب وہ دیکھو گے جو تم نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔''وہ اوپر والی کھڑکی کی جانب دیکھتی بولی۔

''کیا کیا ہے تم نے؟''ساگر نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنسی اور دوبارہ اسی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا، جیسے کہہ رہی ہو کہ لو! خود دیکھ لو۔

دوسری جانب نوید اُس کمرے سے دس بارہ قدم ہی دور تھا، کہ برابر والا کمرہ پلک جھپکتے میں دھماکے سے اڑا تھا، وہ جھٹکا کھا کر پیچھے گرا۔

''آہ!''وہ کراہا اٹھا۔

''نوید!''نیچے کھڑے لوگ چلائے تھے۔جبکہ فرح ذہنی مریضوں کی طرح ہنسنے لگی تھی۔

''نوید!''گھر کا اوپری حصہ دھماکے سے اڑتے دیکھ کر وحید اندھا دھند اُسکی جانب بھاگا تھا، رضا بھی اُسکے پیچھے گیا پر عملے نے اُسے روکا۔

''سر! رک جائیں، آپ وہاں نہیں جا سکتے۔''

''دور ہٹو!''وہ اُنہیں دھکیلتا ہوا گھر کی جانب دوڑا۔

''آہ!''نوید نے کراہتے ہوئے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔گھر میں آگ لگ چکی تھی۔

''ولید۔۔۔''وہ چیخا،اور پوری ہمت مجتمع کر کے کھڑا ہوا۔اُسکی طبیعت ویسے ہی درست نہیں تھی، نقاہت ابھی باقی تھی۔ایسے میں یہ حملہ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔وہ کھڑا ہوا اور ہمت کر کے کمرے کی جانب دوڑا۔جس کمرے کا دروازہ بند تھا وہاں سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔کسی بچے کے رونے کی۔۔۔نوید کا دل ڈوبا۔

''ولید!۔۔۔ولید۔۔۔میرا بیٹا۔۔۔''وہ کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا، جسے چاروں جانب سے آگ نے لپیٹے میں لے لیا تھا۔اُس نے دروازے کو دھکا دینا چاہا پر وہ نہیں کھلا۔

''ولید۔۔۔میرا بچہ۔۔۔۔میرا بیٹا۔۔۔''وہ تڑپ رہا تھا۔اُسکا بیٹا ایک بار پھر آگ کی لپیٹ میں تھا، آج ایک بار پھر وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔

''نوید! نوید تم ٹھیک ہو؟نوید! جواب دو!''ٹرانسیور سے وحید کی آواز گونج رہی تھی۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم سن رہے ہو؟''پھر ساگر کی۔پر اُسے پرواہ نہ تھی، آج وہ نہیں رک سکتا تھا۔آج نہیں! اس نے پوری قوت لگا کر دروازے پر لات ماری، پھر اُسے دھکا دیا تو آگ نے اُسکے بازوؤں کو لپیٹے میں لیا۔اُس نے پیچھے ہٹ کر اپنے بازو پر ہاتھ مار کر آگ بجھائی۔

''نوید۔۔۔نوید بتاؤ تم ٹھیک ہو؟''ٹرانسیور سے آواز گونج رہی تھی۔وہ لوگ یقیناً اوپر نہیں آ سکتے تھے، سیڑھیوں پر آگ لگ چکی تھی۔نوید نے آخری بار دروازے کو دھکا دیا، اور اس بار وہ کھل گیا۔آگ کے شعلے پلٹ کر باہر آئے تو وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔پھر آس پاس دیکھا، قریب کھڑکی پر لٹکے دبیز پردے تک آگ اب تک نہیں پہنچی تھی۔اُس نے آگے بڑھ کر تیزی سے پردہ کھینچا تو وہ روڈ سمیت نیچے آ گیا۔اس نے پردہ کھینچا کے خود پر لپیٹا اور اندر کمرے میں کود گیا۔

''ہمیں اندر جانا چاہیے۔''آگ دیکھ کر رضا چلایا تھا۔

''آگ ہر طرف پھیل رہی ہے، اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''فیصل نے جواب دیا تھا۔

''تو کیا میں اپنے بھائی کو اندر چھوڑ دوں؟''وحید چیختے ہوئے دروازے سے اندر گھسا، تو اُسکے پیچھے رضا اور ساگر بھی اندر دوڑے تھے۔

''فائر ٹینڈر کو بلاؤ! ہمیں آگ بجھانی ہو گی۔''شیراز نے کہا۔

دوسری جانب نوید کمرے میں داخل ہوا اور پردہ پرے پھینکا۔

''ولید! تم کہاں ہو؟ولید!''وہ آس پاس نظریں دوڑانے لگا۔رونے کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔اُسکے دل کو انہونی کا احساس ہونے لگا۔

''نہیں! اس بار نہیں۔۔۔ولید۔۔۔''وہ آگ سے جلتے کمرے میں اُسے ڈھونڈنے لگا۔اور اُسی لمحے۔۔۔

اُسی لمحے جب اُسکی آنکھوں میں دھواں بھرنے سے آنسو جما ہونے لگے تھے۔۔۔

اور اُسی لمحے جب آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر جانے لگے تھے۔۔۔

وہ اُسے سامنے نظر آیا۔ میز کے نیچے، جسے قدرتی طور پر ابھی آگ نے نہیں پکڑا تھا، اُس میز کے نیچے، گھٹنے اوپر کیے، اُسکے گرد بازو لپیٹے بیٹھا ہوا۔

آگ کے شعلے کہیں غائب ہو گئے۔۔۔

دھڑکنیں تھم سی گئیں۔۔۔

ہوائیں، سانسیں، سماعتیں سب خاموش ہو گئیں۔۔۔

نوید وہاں رہ گیا اور سامنے سہما سا بیٹھا وہ بچہ۔۔۔

جسکا چہرہ ہو بہو معید جیسا تھا۔۔۔

اور آنکھیں۔۔۔۔

اُس نے خوفزدہ سی آنکھیں اُٹھا کر نوید کو دیکھا۔

وہ بڑی بڑی، مہربان سی غلافی آنکھیں۔۔۔وہ بشریٰ کی تھیں۔

وہ خوفزدہ سا نوید کو دیکھ رہا تھا، بے آواز سسک رہا تھا۔ نوید کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں آگے بڑھا، پھر اُسکے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ ننھے ہاتھوں نے سہم کر میز کی ٹانگ کو پکڑا۔

''ولید!''نوید کی زبان سے اُسکا نام ادا ہوا۔ آنسو باڑ توڑ کر بھل بھل بہنے لگے۔ وہ رک کر یک ٹک نوید کو دیکھ رہا تھا۔

''اِدھر آؤ! بابا کے پاس!''اُس نے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ وہ ٹکر ٹکر اُسے دیکھنے لگا۔

''یہاں آؤ بیٹا!''گلا رندھنے لگا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ ولید نے گھٹنوں سے ہاتھ ہٹایا، اور اُنہیں زمین پر رکھ کر آگے ہوا، پھر رک گیا۔ غالباً وہ خوفزدہ تھا۔

''ہاں! یہاں آؤ۔''نوید نے مسکراتے ہوئے شفقت سے کہا، اور ہتھیلی مزید آگے کی۔ کھڑکیاں آگ پکڑ رہی تھیں۔ اُس نے اپنا ننھا ہاتھ نوید کے ہاتھوں میں دے دیا، پھر رونے لگا۔ نوید نے کھینچ کر اُسے باہر نکالا اور اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ لمبا تھا، اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت اُسکا قد لمبا تھا۔ اپنا چہرہ اُسکے کندھوں میں چھپا کر وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگا۔ نوید نے بازو اُسکے گرد لپیٹ رکھے تھے۔

''میرا بیٹا!''اُس نے آنکھیں بند کیں،اُسکا سر چوما،اُسکے احساس کو اپنے اندر اُتارا۔

''میرا ولید!''پھر اُسے اور زور سے بھینچا،آنسو آنکھ سے نکل کر ولید کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔اُسی اثنا میں سامنے والی کھڑکی کا پٹ جل کر نیچے گرا۔

''نوید۔۔۔نوید۔۔۔''اُسے دور سے اپنے نام کی پکار سنائی دی،تو وہ ہوش میں آیا۔

''نوید!تم کہاں ہو؟''یہ وحید کی آواز تھی۔اُس نے جلدی سے ولید کو گود میں اٹھایا،اور اُسکے گرد اپنا جیکٹ لپیٹا۔

''بھائی!میں یہاں ہوں۔''وہ چیخا۔

''وہ اُدھر ہے۔''یہ رضا کی آواز تھی۔جانے وہ لوگ کہاں تھے؟نوید اُنہیں دھویں کی وجہ سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔دروازے کے سامنے رکھا فرنیچر جل رہا تھا۔نوید کے پاس باہر جانے کا راستہ نہ تھا۔

اُسی لمحے کسی نے دھکا دے کر سامنے جلتے صوفے کو ہٹایا،اور اُس کے قریب آیا۔

''رضا!۔۔۔تم؟''نوید نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''چلو!فوراً نکلو یہاں سے۔''رضا نے اُسے پکڑ کر گھسیٹا۔وہ اُسکے ساتھ ہی باہر آنے لگا،اُسی لمحے سامنے وحید بھائی دکھائی دیئے۔

''بھائی!ولید ٹھیک ہے۔''اُس نے خود کو کہتے سنا۔اُسکے لہجے میں خوشی کی کھنک بھی تھی،اور آنسوؤں کی نمی بھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ باحفاظت جیپ تک پہنچ چکے تھے۔اُنہیں زندہ سلامت دیکھ کر فرح کو صدمہ ہی پہنچ چکا تھا۔اپنے تئیں وہ تمام انتظام مکمل کر کے آئی تھی۔اسے اندازہ تھا کہ کسی بھی وقت وہ پکڑی جائیگی،لہٰذا اس نے پہلے سے ولید کے کمرے میں ریموٹ بم لگا رکھا تھا۔

نوید نے جیپ کے قریب پہنچ کر جیکٹ اُتاری،فیصل نے جلدی اُسے ٹھنڈا پانی دیا،اُس نے پینے کے بجائے ولید کے منہ سے لگایا تو وہ غٹا غٹ پی گیا۔پھر دوبارہ اُسکے سینے سے لگ گیا،غالباً وہ اچھا خاصا ڈر گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا نوید؟''وحید اُسے پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں!''اُس نے سر ہلایا۔وہ اپنے چہرے پر پانی ڈالنا چاہتا تھا،پر ایک ہاتھ سے ولید کو تھامے ہونے کی وجہ سے وہ کر نہیں سکا۔

''ولید؟''اُس نے اپنے آپ سے لپٹے ولید کو پیار سے پکارا،پر وہ اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں! تم اسے لیکر اندر بیٹھو، ہم فوراً آفس جائیں گے۔'' وحید نے کہا تو وہ اُسے لیکر کھڑا ہوا۔ اِس سے پہلے کہ وہ جیپ میں بیٹھتا، ولید کی نظریں رضا پر پڑیں۔ پہلے اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے پہچاننے کی کوشش کی، پھر جیسے ہی پہچان لیا فوراً نوید کے سینے سے سر اٹھایا اور بولا۔

''بابا!۔۔۔۔ بابا!۔۔۔'' رضا ساکت رہ گیا۔ وہ ہر گز اِسکے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے سامنے اُسے بابا کہہ کر پکار رہا تھا، اپنے بازو وا کیے اُسکی گود میں آنے کے لیے مچل رہا تھا۔ رضا نے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے بلکہ پریشان کن نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ گو کہ ان سب میں اُسکا کوئی قصور نہ تھا، پر نوید کے سامنے اُسکے بیٹے کا اسے بابا کہنا، عجیب طرح سے مجرم بنا گیا تھا۔

''رضا!'' نوید نے پکارا تو اُس نے دیکھا، چہرے پر نرمی تھی۔

''اسے لے لو۔ تمہیں دیکھ کر رک نہیں رہا میرے پاس۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا تو رضا نے اسے گود میں لے لیا۔ اُسکے پاس آکر وہ پر سکون ہو گیا۔

نوید نے ایک نظر دونوں کو دیکھا، پھر مسکراتا ہوا جیپ میں بیٹھ گیا۔

وہ کیوں مسکرایا تھا؟ معلوم نہیں!

پر وہ مسکراتے ہوئے اچھا لگتا تھا۔

---------+---------+--------

''یہ مکمل معلومات ہیں اُس شخص کی۔۔۔'' شیراز نے فائل اُسکی جانب بڑھائی تھی، جسے اُس نے تھام تو لیا، لیکن جانچتی ہوئی نظریں شیراز پر ہی تھیں۔

''ایس ایس پی ساگر نے ابتدائی تفتیش میں جو معلومات حاصل کی ہیں، اُسی کی بنا پر وہ اُس اصل مجرم کو گرفتار کرنے گئے ہیں۔ بقیہ تفتیش فیصل اور میں کر رہے ہیں۔'' اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے!'' نوید نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جانے کے لیے مڑا۔

''شیراز!'' اُس نے پکارا۔

''جی!'' اُس نے پلٹ کر سنجیدگی سے دیکھا۔ نوید چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اُسکی وہ زندہ دل ہنسی کہیں کھو گئی تھی۔ نوید نے گہری سانس بھری، پھر چند قدم چل کر اُسکے پاس آیا۔

''تم نے قانون ہاتھوں میں لیا، صحیح کیا یا غلط میں نہیں جانتا۔'' وہ رکا، اور اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ''لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تم نے وہ کیا جو میں سالوں سے کرنا چاہتا تھا، پر نہیں کر سکا۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''لیکن بعض دفعہ انتقام لیکر بھی سکون نہیں ملتا۔''شیراز نے آہستگی سے کہا۔ پھر جانے کے لیے پلٹ گیا، نوید اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ باہر بارش بھی طوفانی ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت ایف آئی اے کی عمارت میں بنے لیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ ولید درمیان میں رکھی میز پر بیٹھا تھا، اُسکے سامنے رضا کا موبائل تھا، جس پر وہ اپنا پسندیدہ نمبر گیم کھیل رہا تھا۔ باقی سب بھی وہیں تھے۔ خوش بھی تھے، پر اب اپنے گھر واپس جانے کو بے چین بھی۔

''یہ کافی ذہین ہے ماشاءاللہ!''علی نے اسکو مہارت کے ساتھ ایک کے بعد ایک لیول جیتتا دیکھ کر کہا۔

''ہاں! بہت۔۔۔ کبھی کبھی مجھے حیران کر دیتا ہے۔''رضا نے کہا۔ نوید، وحید اور بقیہ ٹیم ایف آئی اے کے مشاورتی کمرے میں تھے، جبکہ اُن سب کو ولید کے ساتھ، یہاں بلوایا لیا گیا تھا۔

''اِس نے ڈیڑھ سال کی عمر میں ایک سے سو تک مکمل گنتی یاد کر لی تھی، پھر لاکھ تک۔ اسے ڈھائی سال کی عمر تک، بنیادی حساب کتاب، جمع و تفریق وغیرہ آ چکا تھا۔ یہ بڑے مزے سے نمبر بلاکس سے کھیلتا ہے۔ اُسکے علاوہ اسے موبائل میں بھی وہی گیمز پسند ہیں جن میں نمبرز ہو۔ ان گیمز سے یہ زیادہ اچھی میتھس سیکھتا ہے۔ اُسکی multiplication مجھ سے بھی کئی گنا اچھی ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یعنی میتھ پسند ہے اسے۔''مقدّم نے کہا۔

''ہاں! بہت زیادہ۔۔۔ یہ گھروں کو انکے ایڈریس سے یاد رکھتا ہے، نام سے نہیں! بعض دفع میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اسے اتنی زیادہ تعداد میں، اور بالکل درست نمبر یاد کیسے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مجھے حیران کر دیتا ہے۔''وہ خوش دلی سے بتا رہا تھا۔

''بچے کا انٹرسٹ (دلچسپی) جس شے میں ہو وہ اسے جلدی سیکھتا ہے۔''عمر نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسے انگلش میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ کوشش کر کے تھک گئے، پر اسے الفابیٹس یاد نہیں ہو کر دیئے۔ تو میں نے بھی چھوڑ دیا۔ جو پسند ہے، ابھی اس پر فوکس کرے، باقی وقت آنے پر سب سیکھ ہی لے گا۔''رضا نے کہا۔ باہر بادل زور سے گرج رہے تھے۔

''میرے بیٹے کو تو بچپن سے ہی درخت پر اُلٹا لٹکنے کا شوق ہے۔''حسین کو یکدم ہی یاد آیا تو کہا۔

''کوئی شک نہیں کہ وہ تمہاری اولاد ہے۔''مقدم نے کہا تو بہت دنوں بعد سب ہنسے تھے۔ حسین نے البتہ کان کھجائے تھے۔

''تم اسے ٹائیکوانڈو سکھا سکتے ہو۔''رضا نے مفت مشورہ دیا۔

''نہیں بھئی! ابھی اس نے تگنی کا ناچ نچایا ہوا ہے، یہ سب سیکھ لیا تو پہلا تجربہ میرے اوپر ہی کرے گا۔''وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو ایک بار پھر سب ہنسے تھے۔

''مکافات عمل ہے یہ۔۔۔''مقدّم نے فقرہ کسا تو وہ مسکرایا۔بس! کچھ ہی گھنٹے تھے، پھر وہ اپنے بچوں کے پاس ہو گا۔مہینے بھر سے انکا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

اسی لمحے نوید مشاورتی کمرے سے باہر آیا،اُسکے آنے پر غیر معمولی طور پر ولید نے اپنا کام چھوڑ کر چہرہ اٹھایا اور اسے دیکھا تھا۔اُس نے بھی رک کر دیکھا،اور مسکرایا۔نرم سی مہربان مسکراہٹ۔۔۔

پھر اُنکے پاس آیا،ہاتھوں میں ایک فائل تھی۔وہ فرح کی گرفتاری کے پورے تین گھنٹے بعد اب آیا تھا۔

''فرح کا کھیل ختم ہوا۔اُسکے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے سب کچھ بتانے کے۔''بنا تمہید کے بات شروع کرتے وہ صوفے پر بیٹھا۔

''اُس نے بتایا جس گینگ، یا مافیا کے لیے وہ کام کر رہی ہے،اُسکے سربراہ نے اُس سے شادی کر رکھی ہے۔مائیکل، بھی اسی گروہ کا حصّہ تھا۔ان لوگوں نے اپنے کاموں کو تقسیم کر رکھا ہے۔اور ہر کام کے لیے ایک ہیڈ ہے،جو اپنے حصے کے لوگوں کا نگراں ہے۔مائیکل ایک قاتل تھا،اور اس گروہ کے لیے قتل و غارت گری کرنے والے تمام لوگوں کا نگران بھی وہی تھا۔یہ لوگ منشیات فروشی،انسانی اعضاء کی خرید و فروخت،اسمگلنگ اور مزید غلط کاموں میں ملوث ہیں،البتہ کام مکمل منظم طریقے سے کرتے ہیں۔''

''پر انکا ہم سے کیا تعلق تھا؟''عمر نے پوچھا۔

''تعلق ہے،ہم سب کا تعلق ہے۔تمہیں یاد ہے صنوبر کو اغوا کرنے والا صرف عاصم نہیں تھا،بلکہ کوئی اور بھی تھا اس کے ساتھ۔۔۔''اُس نے علی کی جانب دیکھا۔یہ صنوبر ایک مرتبہ پھر سے منظر عام پر کیسے آگئی تھی؟

''وہ یہی شخص تھا،اسی گروہ کا سرغنہ۔۔۔اِس نے خود کو بچانے کے لیے سارا الزام اکیلے عاصم کے سر ڈال دیا۔اُسکی ہم سے دشمنی ہی یہی تھی کہ ہم اس کیس کے چشم دید گواہ تھے۔''اِس بات پر سب کا منہ کھلا۔

''تو اس انسان نے اتنے سال ہم سے بدلہ لینے کا پورا منصوبہ بنایا؟''عمر نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں!''نوید نے مختصر جواب دیا اور حسین کو دیکھنے لگا۔

''پر وہ شخص ہے کون؟''مقدّم نے سوال کیا۔

''وہ فرح کا شوہر ہے۔لیکن فرح اُسکی واحد بیوی نہیں ہے۔بلکہ اسکی تیسری بیوی ہے۔جو اُسکے لیے یہ سارے غلط اور غیر قانونی کام کرتی ہے۔اپنی دوسری بیوی کو وہ طلاق دے چکا ہے۔البتہ فرح کا کہنا ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی سے بھی یہی تمام کام کروانا چاہتا تھا،پر وہ اپنی بیٹی سمیت اسے چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔''اُس نے رک کر ایک سرسری سی نظر علی پر ڈالی،جسکا چہرہ تاریک ہوا تھا۔

''اور اُسکی پہلی بیوی، اُسکی خاندانی اور قانونی بیوی ہے۔ جسے اُسکے ان تمام کاموں کی خبر نہیں ہے۔ اور وہ۔۔۔۔''نوید رکا، اور پھر حسین کو دیکھا۔

''وہ ایمان ہے۔ حسین کی ماموں زاد ایمان۔۔۔جو شخص ان تمام کاموں میں ملوث ہے اسکا نام اظہر ہے۔ اظہر الدین تقی۔۔۔''حسین کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ پر جب سمجھ آیا تو لگا جیسے کسی نے زبان مفلوج کر دی ہو۔

''ایسا کیسے۔۔۔۔''وہ کچھ بول نہ سکا۔

''ایسا ہی ہے۔ سب کچھ بہت عجیب ہے۔۔۔پر ایسا ہی ہے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔''اظہر کی گرفتاری کے لیے پچھلے دو گھنٹے سے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اُسکے گھر والے اتفاقاً پاکستان آئے ہوئے ہیں، اُنہیں بھی تفتیش کے لیے گرفتار کیا گیا ہے۔''اُس نے گھر والے کہا، دانستہ ایمان کا نام نہیں لیا۔

''کیا تم لوگ ایمان کو بھی گرفتار کرو گے؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں!''اِس جواب پر اُس نے لب بھینچے۔

''مجبوری ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسکے گھر والے اس جرم میں شریک بھی ہیں یا نہیں!''اُس نے سمجھایا۔

''تو اتنے سال اس نے صرف اس لیے انتظار کیا، کہ وہ ہم سے بدلہ لینا چاہتا تھا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''وہ ایک مکمل سائیکو ہے۔ اُسکی جس انسان سے ذرا سی بھی دشمنی ہو، اُس سے بدلہ ضرور لیتا ہے۔ لیکن اسکے لیے صحیح وقت کا انتظار بھی کرتا ہے۔''اُس نے رک کر علی کو دیکھا، جو اِس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

''سر!''اسی لمحے فیصل دوڑتا ہوا، وہاں آیا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے پوچھا۔

''ایس ایس پی ساگر نے ایئرپورٹ سے ہی اظہر کو گرفتار کر لیا ہے، وہ ملک سے باہر جا رہا تھا، لیکن خراب موسم کی وجہ سے تمام فلائٹ کینسل ہو گئی ہیں۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن ایس ایس پی ساگر نے بروقت وہاں پہنچ کر اُسے گرفتار کر لیا ہے۔''

''وہ لوگ کہاں ہیں اِس وقت؟''

''راستے میں ہیں۔ اُسکے گھر والوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ آ چکے ہیں۔''

''کہاں؟''یہ سوال حسین نے کیا تھا۔

''عمارت کے احاطے میں ہی ہیں۔اُنہیں تفتیش کے لیے لے جایا جارہا ہے۔''اُس نے کہا تو حسین کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکلا۔

''اسکے ساتھ جاؤ!''اُس نے رضا اور مقدّم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔اِس وقت وہی دونوں اُسے سمجھا سکتے تھے۔ وہ دونوں بھی اُسکے پیچھے گئے تھے۔عمر بھی یہاں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا، لہٰذا وہ بھی اُٹھ کر اُنکے پیچھے گیا۔نوید نے جھک کر ولید کو گود میں اٹھالیا۔پھر اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اُسکے گالوں پر پیار کیا۔ یہ محبت کا پہلا عملی مظاہرہ تھا۔وہ ایسے مظاہرے کم ہی کرتا تھا۔پھر وہ گم صم سے بیٹھے علی کے قریب آیا۔

''علی!''اُس نے پکارا۔

''ہونہہ؟''وہ چونکا۔

''پریشان نہ ہو۔فاطمہ اُسکی سابقہ بیوی تھی،اور وہ اُسے سال بھر قبل چھوڑ چکا تھا۔اِس لیے وہ ان سب میں شامل نہیں ہوگی،نہ ہی اُسے گرفتار کرنے کی ضرورت ہے۔اگر ضروری ہوا بھی تو میں خواتین عملہ تمہارے گھر بھیج دوں گا،وہ اُس سے ضروری معلومات لے لیں گی۔''اُس نے نرمی سے کہا۔آج اُسکے انداز میں نرمی،شفقت اور رحم اُتر آیا تھا۔

''شکریہ!لیکن تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ سنجیدگی سے کہتا کھڑا ہوا اور جانے کے لیے مڑا۔

''ہر چیز ضرورت کے تحت نہیں کی جاتی۔''اُس نے آہستہ سے کہا تو علی واپس پلٹا اور اُسے گھورا،پہلی بار وہ مسکرایا۔چہرے پر دوستانہ سا تاثر اُبھرا۔

''تمہیں اپنے آفس بلا کر،تم سے تمہارا مسئلہ پوچھنے والا کون تھا؟تمہارا دشمن؟''اِس سوال پر علی نے مسکراہٹ روکی۔اُس نے صبح ہی کہا تھا کہ میں نے اپنا دوست کھودیا،اب جواب دینا تو بنتا تھا۔

''ہاں!تم مجھ سے میری پریشانی پوچھ سکتے ہو۔پر اپنی بتا نہیں سکتے۔خود کو دوست کہتے ہو،پر مجھے نہیں سمجھتے۔''اس نے کہا۔

''جب ہم دوست تھے میں نے تب بھی اپنی پریشانی نہیں بتائی۔۔۔کبھی نہیں۔اِسکا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا دوست کھودیا۔بس!مجھے عادت نہیں ہے کہنے کی۔''پہلی بار اُس نے دل سے کہا تھا۔ولید اُسکی گود میں اونگھنے لگا تو اپنا سر اُسکے کندھے پر رکھ لیا۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔''علی کے لبوں سے شکوہ پھسلا،دس سال پرانا شکوہ!

''تم اسی لائق تھے۔''اِس بار دونوں ہنسے تھے۔ایس ایس پی صاحب بھی۔

''مجھے عاصم نے فون کیا تھا۔''اُس نے اچانک ہی کہا تو علی نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''کس نے؟''

''عاصم! جس نے صنوبر کو قتل کیا تھا۔ جھگڑے والے روز سے قبل، اُس نے مجھے فون کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ۔۔۔'' وہ رکا۔

''کہ؟'' علی نزدیک ہوا۔

''کہ وہ میرے اور صنوبر کے بارے میں جانتا ہے۔'' اُسکی آواز آہستہ ہوئی۔ غیر محسوس انداز میں اس نے ولید کا سر تھپتھپایا تھا۔

''کیسے؟''

''معلوم نہیں! گو کہ میں نے کبھی صنوبر سے کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ پر اس نے از خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ اور اُس نے مجھے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اُس دوسرے شخص کی جگہ مجھے پلانڈ کر دے گا۔ اِس لیے علی! میں اِس لیے پیچھے ہٹ گیا تھا۔'' نوید میں تبدیلی واضح تھی۔ اُس نے آج کھل کر ساری باتیں کہہ دی تھیں۔

''تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا نوید! اگر تم بتا دیتے تو۔۔۔'' علی کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اُداسی سے مسکرایا۔

''میں نے تو صنوبر کے بارے میں بھی نہیں بتایا تھا۔ میں نے کہا تو، مجھے کہنا ہی نہیں آتا تھا۔ اور پھر اُس وقت میں ڈر گیا تھا علی! میں نے اُسکی ہر بات پر یقین کر لیا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹنا بہتر سمجھا۔ میں جانتا تھا تم ناراض ہو گے پر اتنا۔۔۔ اِسکی امید نہ تھی۔'' اُس نے اپنے تمام خدشات سے آگاہ کر دیا۔

''میں بھی بہت جذباتی تھا۔ اور اسی وجہ سے ہم سب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔'' علی نے بھی اعتراف کیا۔ اِس سے قبل کہ نوید کچھ کہتا، باہر سے شور اٹھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''شاید اظہر کو گرفتار کر کے لے آیا ہے ساگر!'' وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ کھلی راہداری سے گزرتے وہ عمارت کے احاطے میں ناقابلِ یقین رش دیکھ سکتا۔ راہداری پار کر کے وہ جیسے ہی احاطے میں پہنچا، وہاں اُسے میڈیا کا جم غفیر نظر آیا تھا۔ پہلے تو نوید کا منہ کھلا، پھر اُس نے لب بھینچ کر فیصل کو دیکھا۔

''یہ میڈیا یہاں کیا کر رہا ہے؟'' اُس نے سختی سے پوچھا۔

''جب اُسے ایئرپورٹ پر گرفتار کیا گیا تو کچھ لوگوں نے ویڈیو بنا کر وائرل کر دی تھی۔ اب میڈیا اصل حالات جاننے کے لیے یہاں پہنچ چکا ہے۔'' وہ لب بھینچے راہداری سے اُتر کر وہاں تک آیا۔ پولیس ویز اور عملہ موجود تھا۔ میڈیا کے چند ایک لوگ بھی اندر گھس گئے تھے، باقی دروازے سے باہر ہی روک دیے گئے تھے۔

''میڈیا کو باہر نکالو!''نوید نے حکم دیا۔

''سر! آزادانہ رپورٹنگ ہمارا حق ہے۔ ہمیں اندر آنے دیں۔۔۔''ایک رپورٹر چیخا تھا۔

''آزادنہ رپورٹنگ کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ آپ منہ اٹھا کر، بنا اجازت یہاں گھس جائیں۔''ساگر نے سختی سے کہا۔ پھر عملہ اُنہیں باہر دھکیلنے لگا۔

''حسین! تم ٹھیک ہو؟''نوید نے اُسکے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے ایمان کو وین میں بٹھایا ہوا ہے۔ اب تک نہیں اُتارا۔''اُس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''فکر نہ کرو! میڈیا باہر نکل جائے تو اُسے اُتار دیں گے۔''اُس نے تسلی دی تو اُس نے سر ہلایا۔ میڈیا کو باہر نکال کے دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ اب سب سے پہلے اظہر کے گھر والوں کو اتارا گیا۔ ایمان کو بھی دو خاتون عملے نے پکڑ رکھا تھا۔ حسین نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔ جو بھی تھا، وہ اُسکی کزن تو تھی۔ اظہر کا باپ، ماں اور بھائی بھی موجود تھے۔ ایمان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُن سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا، اب دوسری وین سے اظہر الدین تقی کو اتارا جا رہا تھا۔ وہ خوش شکل مگر سفاک انسان تھا، آنکھوں میں خون جما دیتی سرد مہری اور چہرے پر طنزیہ ہنسی موجود تھی۔ جیسے اُسے گرفتاری سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ چاہے فرح ہو، سمیر ہو یا یہ بدبخت۔۔۔۔ان مجرمین کے چہرے سے ہنسی جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ انکو یقین تھا کہ کوئی اُنکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

علی کی رگیں اُسے دیکھ کر تن گئی تھیں، اُس نے ایک بار اس شخص کو فاطمہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا کہ اُسکی بیوی اور بیٹی اِس آدمی کے چنگل سے آزاد ہو چکی تھیں۔ باحفاظت!

اظہر کو روتے ہوئے دیکھتی، ایمان کی نظریں یکدم ہی سامنے کھڑے حسین پر گئیں جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو اُسکی آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں، پھر اُن میں شناسائی کی رمق اُبھری۔

''حسین!''اُسکے لب ہلے۔

''میں اِس سے بات کر سکتا ہوں؟''اُس نے نوید سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے!''اُس نے اثبات میں سر ہلاتے اجازت دی، تو وہ اُس کی جانب بڑھا۔

اُنکی نظریں سکون سے کھڑے اظہر پر تھیں، ایف آئی اے کا پبلک ریلیشن منیجر اُسکی تصاویر لے رہا تھا۔

مجرم بلآخر گرفتار ہو گیا تھا۔۔۔

تو کیا یہ اختتام تھا؟

یا ابھی بھی کچھ باقی تھا؟

---------+---------+--------

اظہر الدین تقی، ایک بڑا کاروباری حلقہ جسکا دوست تھا۔ اپنے باپ کی طرح جس نے بہت دولت سمیٹی تھی، جو اپنے باپ کی تمام تر دولت کا اکلوتا وارث تھا۔ لیکن دولت جسکے لیے کافی نہ تھی۔ اُسے طاقت بھی چاہیے تھی، طاقت کا نشہ، دولت سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

جن دنوں وہ ایک نجی جامعہ میں زیرِ تعلیم تھا، اُس وقت ایک ایسا طبقہ اُسکا دوست بنا، جو دولت کا استعمال حرام کاموں میں کرتا تھا۔ رات بھر عیاشیاں، پارٹیاں اور نشے میں لگے رہنا۔ اُنہی دنوں اُسکی ملاقات صداقت نامی ایک ادھیڑ عمر شخص سے ہوئی۔ وہ اسی نائٹ کلب کا مالک تھا، جس میں اظہر کا روز کا آنا جانا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ یہ شخص صرف اِس کلب کا مالک نہیں بلکہ ایک پورے گروہ کا سرغنہ ہے، تو اُس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنے سے دوگنی عمر کے اس شخص کو دوست بنایا۔

صداقت نے اُسے کچھ منشیات دیں اور کہا کہ اُسے ایک ہفتے میں فروخت کر کے دکھائے، تو وہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کر لے گا۔ اُس سے ڈھیروں نشہ آور چیزیں خرید کر اظہر، اپنے اُس حلقہ احباب میں تقسیم کرنے لگا، جو طبقاتی فرق کی وجہ سے اُس سے دولت میں کہیں پیچھے تھا۔ اظہر جیسے چالاک شخص نے ہر قسم کے لوگوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی، وہ اُن سے ہر طرح کے کام لیتا تھا۔ عاصم بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔

جس سیاسی جماعت سے عاصم تعلق رکھتا تھا، اُسکا سربراہ اظہر کے باپ کا دوست تھا۔ عاصم اُس جماعت کی طالبہ تنظیم کا لیڈر تھا۔ ہر طرح کے برے کاموں میں ملوث یہ شخص انتہائی گھٹیا تھا۔ یہ اظہر سے منشیات خریدنے کر جامعہ کے طلبہ و طالبات کو دیتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے یہی کام فرح کرتی تھی۔

فرح ہاسٹل میں رہنے والی انتہائی نچلے طبقے کی لڑکی تھی، اُسکا باپ گاؤں میں بھٹّی پر روٹیاں لگاتا تھا، بیٹی کو پڑھنے بھیجا تھا تاکہ وہ کچھ بن سکے، پر اُس نے دولت کمانے کے لیے شارٹ کٹ چنا۔ عاصم کی رائٹ ہینڈ کے طور پر وہ ایسی لڑکیوں سے دوستیاں کرتی، جن کا خاندان مضبوط نہ ہوتا، وہ اُنکی عاصم، اور اُسکے گروہ کے دیگر لڑکوں سے دوستیاں کروا دیتی، کچھ کو محبت کے جال میں پھنساتے ہوئے، دوسرے ملکوں میں بیچ دیا جاتا۔ پیچھے انکا خاندان روپیٹ کر خاموش ہو جاتا۔ ان تمام کارروائیوں کے بدلے اظہر نے صداقت کے قریب اپنی جگہ بنالی، اب وہ اُسکا نائب بن چکا تھا۔

جب وہ زمانہ طالب علمی سے فارغ ہوا تو اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا، بادی النظر میں وہ ایک شاندار شخصیت کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ اُنہی دنوں جب صداقت نامی شخص فوت ہوا، اور اُسکے بدلے اظہر جان نشین ہوا، تب ہی اُسکی منگنی فاطمہ سے طے ہو گئی، وہ لڑکی اُسے پسند تو بہت تھی پر وہ ایک گھریلو قسم کی لڑکی تھی، اور اظہر ایسی لڑکی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُسکے نزدیک گھر بیٹھی عورت سوائے شوہر پر نظر رکھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی، وہ ایسی عورت کا متحمل نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ فاطمہ اُسے پسند تھی۔ لہٰذا اُس نے فاطمہ کے گھر والوں سے صاف کہا کہ وہ کریئر اور نٹیڈ لڑکی چاہتا ہے لہٰذا فاطمہ

کو بھی اِس بارے میں سوچنا چاہیے۔اُسے اُمید تھی کہ اُسکی شاندار شخصیت کے آگے کوئی بھی لڑکی زیر ہو سکتی ہے، لہٰذا وہ بھی اِس پر راضی ہو جائیگی، پھر وہ اُسے اُسی کے مستقبل میں مصروف کر دے گا۔ لیکن اُسے حیرت کا شدید جھٹکا تب لگا، جب فاطمہ نے اُسے مسترد کر دیا۔اُسے اُمید نہ تھی کہ ایسا ہو گا۔

اپنی ریجیکشن اُسکے دل پر لگی تھی، پر اُس سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کو اُس نے بعد کے لیے ٹال دیا کہ اُن دنوں اُسکی ماں زور و شور سے اُسکے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں، اور فاطمہ کے فوراً بعد انھوں نے حور عین کو پسند کر لیا تھا۔

دوسری طرف اُنہی دنوں عاصم کو فرح کی روم میٹ لڑکی صنوبر پسند آ گئی، وہ ہر صورت اُسے اپنے لیے چاہتا تھا۔ لیکن اِس مرتبہ فرح کو کھلی ناکامی ہوئی۔ وہ بے شک غریب باپ کی بیٹی تھی لیکن بہت رکھ رکھاؤ والی اور بہت سوبر سی تھی۔ وہ نہ کسی سے دوستی کے حق میں تھی اور نہ کہیں آتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ عاصم کی ضد بن گئی۔ ایک مرتبہ فرح اُسے زبردستی اپنے ساتھ یہ کہہ کر لے گئی کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کسی پارٹی میں جا رہی ہے، وہ اپنے باپ سے اجازت لیکر بہت مشکل سے جانے پر راضی ہوئی۔ وہاں جا کر جب اُس نے عاصم اور بقیہ لوگوں کو نا صرف غیر اخلاقی حرکات بلکہ نشے کے استعمال میں دیکھا تو فوری طور پر وہاں سے بھاگ آئی۔ یہی عاصم کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کہ اُس نے دروازے پر پہرے نہ بٹھائے تھے۔

وہ واپس تو آ گئی پر اُس نے فرح کو یہ دھمکی دی کہ وہ سب کو بتا دے گی۔ اُسکی اِس دھمکی کو عاصم نے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ لیکن مسئلہ تب کھڑا ہوا، جب اُس نے واقعتاً فرح کی شکایت اُس ہاسٹل کی وارڈن سے کر دی۔ اور یہی اُسکی زندگی لینے کا سبب بن گئی۔ ہاسٹل کی وارڈن کو تو فرح نے پیسے دے کر خرید رکھا تھا، البتہ یہ خبر اظہر تک پہنچ گئی۔ اُس نے عاصم کو آڑے ہاتھوں لیا اور فوراً اُس لڑکی کو ختم کرنے کہ مطالبہ کیا۔ عاصم تو پہلے ہی اُس سے بدلہ لینے کو تیار تھا۔

اُس رات دونوں نے صنوبر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ صنوبر کسی صورت آنے کو راضی نہ تھی، لیکن فرح نے اُسے بلیک میل کیا کہ جس رات وہ اُسے نائٹ کلب لے گئی تھی، اس رات کی ویڈیو اور سی سی ٹی وی ریکارڈنگ موجود ہے، اور وہ اُسکے باپ کو بھیج دے گی۔ صرف اِس دھمکی کے زیرِ اثر صنوبر نے وارڈن کو جھوٹ کہا کہ وہ فرح کی بہن کی مایوں میں جا رہی ہے۔ لیکن در حقیقت وہ عاصم سے یہ معاہدہ کرنے گئی تھی کہ وہ اُسکی ویڈیو ڈیلیٹ کر دے، وہ کسی کو کچھ نہ بتائے گی اور اپنا منہ بند رکھے گی۔ بھلا عاصم، یا اظہر کو ایک غریب لڑکی کے منہ کھولنے سے کیا ہی فرق پڑنا تھا؟ وہ تو بس بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اور صنوبر جتنی بھی سمجھدار صحیح، پر یہاں اُس نے بیوقوفی کی انتہا کر دی تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ وہ عاصم سے ڈیل کر لیگی، اور وہ کچھ نہیں کریگا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" بورن فائر والی رات وہ اُس سے جامعہ میں ملی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر اُتر کر کھڑا تھا، اندر ڈرائیونگ پر اظہر بیٹھا تھا، چہرے پر ماسک تھا، نہ بھی ہوتا تب بھی صنوبر اُسے نہ پہچانتی، نہ وہ اسے جانتی تھی۔

"کہیں چل کر بات کرتے ہیں، یہاں کھڑے ہونا اچھا تھوڑی لگ رہا ہے۔" عاصم بے غیرتی سے بولا۔

''میں یہاں تمہارے ساتھ کہیں جانے نہیں آئی۔جو بات کرنی ہے یہیں کرو!''اُس نے آس پاس دیکھتے رک کر کہا۔فرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ اُسے سمجھ آ گیا کہ وہ یہاں آ کر بہت بڑی غلط کر چکی ہے۔

''تو تم چل رہی ہو یا نہیں؟''اُس نے سختی سے پوچھا۔گول سڑک کی دوسری جانب کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔صنوبر کو حوصلہ ملا۔

''نہیں! کیا کرو گے ورنہ؟''وہ حلق کے بل چیخی۔وہ چاہتی تھی کہ اُسکی آواز دوسری طرف نظر آتے لوگوں تک پہنچ جائے۔

''اِسے اندر لاؤ عاصم!''اظہر نے کہا تو اگلے ہی لمحے عاصم نے اُسے جھٹکے سے گاڑی کے اندر کھینچا،اور اُسکے کچھ بھی کرنے سے پہلے اظہر نے گاڑی چلا دی۔

''چھوڑو مجھے!''وہ تڑپ کر چیخی۔

''خاموش!''عاصم نے اُسکے منہ پر تھپڑ دے مارا۔دروازہ لاک ہو چکا تھا۔

''کوئی بچاؤ۔۔۔بچاؤ!''وہ چیختے ہو پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگی۔اُسے وہ لوگ گاڑی کے پیچھے آتے،بھاگتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔اور اُن میں جو سب سے لمبا تھا۔۔اُسے وہ پہچان گئی۔

وہ جو ساری دنیا میں واحد پیارا لگتا تھا۔۔۔

وہ جو نرم گو تھا،اور گھنٹوں اُسکی باتیں سنتا تھا۔۔۔

وہ یعنی نوید عالم!

اُسے امید تھی کہ وہ اسے بچا لے گا۔پر ہر امید پوری نہیں ہوتی۔۔۔

اسی گاڑی میں صنوبر کی زندگی اور عزت کی وہ آخری رات تھی۔

---------+---------+--------

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''اظہر حلق کے بل چیخ رہا تھا۔

''کیسے؟کیسے وہ لوگ عاصم کو پہچان گئے؟اور وہ بھی اتنے اندھیرے میں۔۔۔۔

''میں نے کہا بھی تھا عاصم کو کہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر کر رکھے۔''صنوبر کو وہ لوگ اپنے جانتے دفنا آئے تھے، پر اُسکی لاش مل گئی تھی۔ عاصم پکڑا گیا تھا اور چشم دید گواہ بھی نکل آئے تھے۔ اظہر کو اطلاع ملی تو اُس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اب جبکہ وہ اپنے گروہ کا سرغنہ بن چکا تھا، ایسے میں وہ اتنی بڑی غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''وہ چشم دید گواہ کون ہیں؟''اُس نے اپنے پاس کھڑے، خاص آدمی سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا سر! میڈیا پر کہیں انکی تصاویر اور نام نہیں موجود ہیں۔ نہ ہی کسی کو گواہان کے بارے میں معلومات دینے کی اجازت ملی ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا وہ گواہان کوئی بہت بڑی چیز ہیں؟''وہ سخت غصّے میں تھا۔

''وہ لڑکے جامعہ میں ہی پڑھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک کے گھر، صنوبر کا باپ ڈرائیور تھا۔ اور اس لڑکے کا باپ ہے بھی اچھی خاصی کاروباری شخصیت، وہ کسی صورت عاصم کو نہیں چھوڑے گا۔ اُس نے ہر طرح سے اپنے بیٹے اور اُسکے دوستوں کا نام میڈیا سے چھپا رکھا ہے۔ فلحال تو ہم پیشی آگے بڑھوا رہے ہیں، لیکن سنا ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں عاصم کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کا بھی ذکر کیا ہے۔ پر وہ اُسے جانتے نہیں ہیں۔''

''اب میری بات غور سے سنو! یا تو ہم عاصم کو بچائیں گے، یا خود کو۔ اور اگر خود کو بچانا ضروری ہوا تو عاصم کو فراموش کرنا ہوگا۔''اُس نے اپنے خاص آدمیوں سے کہا۔

''تو کیا اُسکی پارٹی آپکو کچھ نہیں کہے گی؟''

''اُسکی پارٹی اُس سے اعلان لاتعلقی کر چکی ہے۔ ہر شخص کو اپنی ساکھ عزیز ہے۔ تم جاؤ! اور کسی طرح عاصم کو یہ فون دیکر آؤ۔ میرا اُس سے بات کرنا ضروری ہے۔''اُس نے ایک موبائل اپنے خاص بندے کو پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ اُسکے بہت تعلقات تھے، اونچی اونچی جگہوں پر پہنچ تھی۔ جیل میں موبائل پہنچانا تو بہت آسان کام تھا۔

''اُس لڑکی صنوبر کے موبائل سے کچھ ملا؟''اس نے اپنے دوسرے آدمی سے پوچھا۔ صنوبر کے مرنے کے بعد سے اُسکا موبائل انکے پاس بند پڑا ہوا تھا۔

''زیادہ کچھ تو نہیں! لیکن کسی لڑکے سے اُسکی کافی بات چیت تھی۔''اُس نے کہا تو وہ ٹھٹکا۔

''کیسی بات چیت؟''

''کام کے حوالے سے ہی تھی، لیکن صرف ایک یہی لڑکا ہے، جس سے اُس نے بات کی ہوئی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''دیکھتے ہیں۔۔۔''اس نے کہا تو وہ بھی سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز جب اُس نے جیل میں عاصم کو فون کیا تو وہ غصّے میں بھرا بیٹھا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو مجھے ؟ تم مجھے اِس طرح بیچ راستے میں اکیلا چھوڑ دو گے ؟'' وہ چیخا تھا۔

''چلاؤ مت عاصم ! یہ تمہاری ہی غلطی ہے۔ بہر حال ! میں تمہیں وہاں سے نکال لوں گا۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے ؟ کیسے نکالو گے ؟'' اُس نے کہا۔

''دیکھو ! ایک لڑکا ہے، جس سے صنوبر نے کافی بات چیت کی ہوئی ہے۔ میں نے کل اُسکے بارے میں معلومات اکھٹی کروائی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے، بڑا بھائی سیکنڈ لیفٹیننٹ ہے۔ وہ صنوبر کا دوست تھا۔ نوید نام ہے اُسکا۔''

''تو ؟'' عاصم کو ان باتوں میں قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

''تو یہ کہ ہم اُس لڑکے کو پھنسا سکتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''اُس سے کیا ہو گا ؟ میرے اوپر سے جرم نہیں ہٹے گا۔'' عاصم کو اُسکی دماغی حالت پر شک ہوا۔

''مجھے تمہیں جیل سے نکلوا کر غائب کروانے کا موقع مل جائیگا۔ میڈیا پر ہم اُس لڑکے کو مشکوک بنا دیں گے۔ لوگوں کی توجہ بھی تم پر سے ہٹ جائیگی۔'' اُس نے منصوبہ ترتیب دیا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی۔۔۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اُس لڑکے سے، جسکا۔۔۔ کیا نام بتایا ہے ابھی تم نے ؟'' وہ یکدم ہی رکا۔

''نوید۔۔۔ نوید عالم !'' اِس نام پر عاصم چند لمحے خاموش رہ گیا۔

''کیا ہوا ؟ تم جانتے ہو کیا اُسے ؟'' اظہر نے پوچھا۔

''نہیں !'' اُس نے فون کاٹ دیا۔ نوید عالم وہی شخص تھا، جو اُسکے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ اظہر یہ بات نہیں جانتا تھا، پر عاصم جانتا تھا۔

اگلے روز عاصم نے اُسی موبائل سے نوید کو فون کیا۔ نمبر اُس نے اپنے ایک دوست سے حاصل کر لیا تھا۔ اُسکے بہت سے تعلقات جیل میں بھی اُسکے لیے کام کر رہے تھے۔ اُس کے ذہن میں اظہر سے اچھا منصوبہ تھا۔ اُس نے نوید کو فون کر کے دھمکایا کہ وہ گواہی واپس لے لے، ورنہ وہ سارا الزام ثبوتوں کے ساتھ اُسکے سر پر ڈال دیگا۔ اور نوید اُسکی دھمکیوں میں آ گیا۔

اِس سے قبل کہ اگلی پیشی ہوتی، عاصم کے اِس کارنامے کی خبر اظہر کو ہو گئی۔

''تم نے یہ کیا کیا عاصم؟ تم اُسے فون کیسے کر سکتے ہو؟ تم نے سب خراب کر دیا ہے۔'' وہ چلا رہا تھا۔

''میں نے ٹھیک کیا ہے، وہ لڑکا مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیگا۔''

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ لڑکا مقدمے کا گواہ ہے؟ اور سن لو! اُس کے پیچھے ہٹنے سے کچھ نہیں ہو گا، کچھ بھی نہیں۔۔۔ باقی چار گواہ اور بھی ہیں۔ اُنکی گواہی بھی کافی ہے۔ اور ذرا سوچو! اگر اُس نے تمہاری کال ریکارڈ کر لی ہو تو؟''

''تو میں کیا کروں؟'' عاصم دھاڑا تھا، جیل میں رہ رہ کر شاید وہ ذہنی طور پر گھٹ رہا تھا۔

''میں کیا کروں پھر؟ میں چار ماہ سے جیل میں ہوں اور تم صرف تسلیاں دے رہے ہو۔ میری پارٹی بھی میرے لیے کچھ نہیں کر رہی، میری بات غور سے سنو اظہر! اگر تم نے کل تک مجھے مقدمے سے بری نہیں کروایا تو میں بتا دوں گا کہ دوسرے مجرم تم ہو۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون دور پھینکا تھا۔ وہ غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اُسکے سامنے والے کمرے میں موجود ایس ایچ او کا فون بجا۔ اور کچھ دیر میں وہ عاصم کے سامنے تھا۔ اِس سے قبل کے عاصم کچھ سمجھتا، اُس نے اُسکے سینے میں گولی مار کر اُسے ختم کر دیا۔

''اسکی لاش کو ٹھکانے لگاؤ، میڈیا پر خبر دو کہ یہ طبعی موت مر گیا ہے۔ جھوٹی پوسٹ مارٹم اور فرانزک بھی تیار کرواؤ۔'' وہ اپنے ساتھ کھڑے لوگوں کو حکم دیتا چلا گیا تھا۔

اظہر یہ نہیں چاہتا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں تک آنے کے لیے اُسے اپنے ہر ممکن تعلقات لگانے پڑیں گے۔ لیکن عاصم کی جلد بازی کی وجہ سے اُسے یہ کرنا پڑا تھا۔

اور پھر اپنے آپ ہی مقدمہ بند ہو گیا۔

وہ اُن لوگوں سے کبھی نہ مل سکا، جنہوں نے اُس کے خلاف گواہی دی تھی۔

---------+---------+--------

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' ایک سوال۔۔۔ پوچھنے والا بھی ایک۔۔۔ پر جواب دہندہ تین عورتیں تھیں۔

پہلی ایمان تھی۔۔۔

جس روز اُسکا حور عین سے رشتہ طے ہوا وہ اُسی روز سے سخت بیزار تھا۔ وہ پہلے ہی ایک منگنی ختم کرنے کا باعث بنا تھا، لہٰذا اب اُسکی والدہ اِس معاملے میں اُسکی سننے پر تیار نہ تھیں۔ اُسے حور عین کے بچپنے سے مسئلہ نہیں تھا۔ اُسے مسئلہ اُسکی ذہانت اور تیزی سے تھا۔ وہ جانتا تھا حور عین جیسی لڑکی اُسکے روز و شب

کے معمولات کو جلد جانچ لے گی۔ لیکن اُسے یہ بھی سمجھ نہ آرہا تھا کہ والدہ کو کیسے منع کرے؟ سو باتوں کی ایک بات، اُسے اپنی ماں سے محبت تھی۔ اور ماں کو بھی اُسکی پسند ناپسند پر کوئی اعتراض نہ تھا، وہ کسی کو بھی پسند کر لیتا وہ راضی ہو جاتیں۔ اُنہیں بس! اُسکی شادی کرنا تھی۔

اِنہی دنوں اُس نے محسوس کیا کہ حور عین اُس سے بہت زیادہ سوالات کرنے لگی ہے، اُسکے کام کاج کے حوالے سے، اُسکی دلچسپی اور معمولات کے حوالے سے۔ اور اُسی لمحے وہ سمجھ گیا کہ اِس لڑکی کے ساتھ اُسکا گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ خود منع کر دے۔ اپنی ماں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اِس بار، لیکن ماں کی ناراضگی سے اوپر اُسکی ساکھ تھی، اور وہ طاقت تھی، جسکا وہ حال ہی میں نیا وارث بنا تھا۔

اِس سے پہلے کہ وہ خود انکار کرتا، اُسکی ملاقات ایمان سے ہوئی۔ ایمان ایک ایسی لڑکی تھی جو اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اُسکے بڑے بڑے خواب تھے، وہ اُنکے پیچھے پاگل تھی۔ اُس نے ایک بار بھی اظہر سے اُسکے بارے میں نہیں پوچھا، حتیٰ کہ وہ خود اپنے منگیتر حسین کے معمولات میں بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ بس! اسی لمحے اُسے احساس ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے، جو اُسکی خاندانی بیوی بننے کے لائق ہے۔ اپنی شخصیت پر اُسے پورا بھروسہ تھا، وہ جانتا تھا کہ اُسکے سامنے کوئی بھی لڑکی حسین جیسے لاابالی کو پسند نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اُس نے ایمان سے دوستی بڑھائی۔ پہلی بار مال کے فوڈ کورٹ میں اتفاقیہ ملنے کے بعد وہ جان کر اُس سے ملنے لگا، اُسکے دل میں یہ خیال ڈالنے لگا کہ حسین اُسکے لائق نہیں ہے۔ اور ایمان بھی اُسکی محبت کے جال میں بڑے آرام سے آگئی۔ اُس نے اظہر کے کہنے پر اپنے گھر والوں سے صاف صاف بات کی، پر اُنہوں نے بھی صاف صاف انکار کر دیا۔ اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اُسے سخت برا بھلا بھی کہا جو شادی سے چند روز قبل یہ باتیں کر رہی تھی اور وہ بھی حور عین کے منگیتر کے بارے میں۔ اظہر کے لیے تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہ تھا، اُس نے ایمان کو کورٹ میرج کے لیے راضی کر لیا۔ اُس نے بھی حسین کے گھر فون کر کے شادی سے انکار کر دیا، اور خود گھر چھوڑ کر اظہر کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اُسکے گھر والوں نے اُس سے تعلقات ختم کر لیے۔ البتہ اظہر کی والدہ بس چند دن ناراض رہ کر مان گئیں۔ اظہر کے لیے یہ اور بھی اچھا تھا کہ ایمان کے گھر والوں نے تعلقات ختم کر دیے ہیں، ورنہ اُسے اُنکے سوالات بھی جھیلنا پڑتے۔ وہ ایمان کو لے کر بیرونِ ملک آگیا۔ اُسے یہاں کی بہترین یونیورسٹی میں داخل دلوایا، اُسے اُسکا خود کا کاروبار کھول کر دیا اور اُسے اتنا مصروف کر دیا کہ وہ اظہر کے بارے میں کبھی جان ہی نہ پائی۔ اظہر نے بھی اُسکی نظروں میں خود کو ایک پرفیکٹ شوہر بنا رکھا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد اُسکا یہ تمام ناجائز کاروبار مزید پھلنے پھولنے لگا، پاکستان میں اُسکے لیے یہ تمام کام فرح کر رہی تھی۔ وہ بہت ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔

''میں؟ تم سے شادی کروں؟ کیوں؟ تمہارے بنا ہی میری زندگی بہت پر سکون ہے۔'' جب ایک روز اُس نے وہی سوال فرح سے کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''کاروباری شادی!'' اُس نے جواب دیا تو فرح نے بھنویں اُچکائیں جیسے جواب پسند آیا ہو۔

''تم بہت سمجھدار عورت ہو۔ذہین، چلاک اور بیک وقت سفاک بھی۔سب سے اچھی بات، میرے گروہ کے ساتھ وفادار بھی ہو۔اگر تم مجھ سے شادی کرلو گی تو تمہیں برطانوی شہریت مل جائیگی، پاکستان اور وہاں دونوں طرح سے تمہارا کام آسان ہو جائیگا۔اور میری بیوی ہونے کی حیثیت سے کافی جگہوں پر تمہارے لیے آسانی ہو جائیگی۔اور یہاں موجود میرے تمام پارٹنرز کو تم بطور میری بیوی کی حیثیت سے ڈیل بھی کر سکتی ہو۔میں پاکستان میں ہونے والا اپنا تمام کام تمہارے سپرد کردوں گا، اسطرح میرے سر سے بھی بوجھ کم ہو گا۔''

''ہونہہ! پر اِس میں تو صرف تمہارا فائدہ ہے؟''اُس نے ابرو اُچکائی۔

''تو تم اور کیا چاہتی ہو؟''وہ دلچسپی سے بولا۔

''میں یہاں اپنا خود کا گھر، چھوٹا موٹا کاروبار، ذاتی بینک اکاؤنٹز اور ایک اچھی سرکاری نوکری چاہتی ہوں۔''

''بس! اتنا ہی؟''وہ طنزیہ ہنسا۔

''کیوں کم ہے کیا؟''وہ بھی مصنوعی معصومیت سے بولی۔

''کاروبار؟ یا سرکاری نوکری؟''اُس نے فرح کو دو میں سے کوئی ایک چننے کو کہا۔

''دونوں! سرکاری نوکری اپنے تعلقات وسیع کرنے کے لیے اور کاروبار اپنے بوڑھے ماں باپ کی زندگی بہترین اور آسائشات سے پُر کرنے کے لیے۔''وہ جوس کا گلاس لبوں سے لگاتی بولی۔

''تمہاری یہ بات مجھے پسند ہے۔تم صاف اور سیدھی بات کرتی ہو۔'' اُس نے ستائش سے کہا اور پیچھے کو ٹیک لگالی۔

''اور مجھے تمہاری ایک بات بھی نہیں پسند!''اُس نے صفائی سے کہا تو وہ ہنسا۔

''اگر میں تمہارے مطالبات نہ مانوں تو؟''

''تو کیا؟ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔''اُس نے کندھے جھٹکتے کہا۔''مجھے تم سے شادی نہ کر کے کوئی فرق نہیں پڑتا، پر تمہیں پڑتا ہے۔تمہیں میری ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے! مجھے منظور ہے۔لیکن میرے خاندان تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیے کہ تم میری دوسری بیوی ہو۔''وہ راضی ہو گیا۔

''ڈیل!''وہ راضی ہو گیا۔

اسکے بعد دونوں نے قانوناً شادی کر لی، فرح کو ویسے بھی اُس سے یا اُسکے خاندان سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اظہر یہاں رہے یا باہر، اُسے بس دولت سے مطلب تھا۔ فرح سے شادی کر کے وہ بہت مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ بڑے بہترین طریقے سے اُسکے غیر قانونی کاموں کو پاکستان میں سرانجام دے رہی تھی۔

انہی دنوں اُسکا پاکستان آنا ہوا تو اسکی ملاقات اتفاقیہ طور پر فاطمہ سے ہوئی۔ اور وہ ساکت رہ گیا۔ اُسے یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی کہ اُسکی پہلی پسند ہمیشہ سے فاطمہ ہی تھی، ایمان نہ ہوتی تو وہی اُسکی زندگی میں ہوتی۔ لیکن اب؟

اب نہیں۔۔۔ اظہر الدین تقی کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ بدلے کی آگ میں جلنے والا ایک نفسیاتی تھا۔ وہ طاقت کا دلدادہ تھا۔ اُسے لوگ اپنے قدموں میں پسند تھے، جبکہ فاطمہ نے اُسے ٹھکرایا تھا۔ اور یہ بات اُسے کبھی نہیں بھولی تھی۔ وہ بدلے کی کی خاطر پورا پورا منصوبہ ترتیب دینے والا شخص تھا۔ اُس نے اُس پارٹی میں فاطمہ کو حسرت بھری نگاہوں سے اپنی دوستوں کو دیکھتے، دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے کیسے راضی کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اُس نے ہر طرح سے اُسے اپنے جال میں پھنسایا کہ وہ اِس میں ماہر تھا۔ اور وہی ہوا، جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے، فاطمہ راضی ہو گئی۔ پہلے اُسکا ارادہ تھا کہ وہ اُسکی علی سے طلاق کے بعد ہی اُسے چھوڑ دے گا، تاکہ وہ تاعمر پچھتائے اور واپسی کا کوئی راستہ بھی اُسکے پاس نہ ہو۔ لیکن پھر اُسکے دماغ میں ایک منصوبہ آیا۔ اُس نے اپنا ناجائز دھندہ مشرق وسطی میں شروع کیا تو لڑکیوں کو نشہ فراہم کرنے کے لیے اُسے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ فرح پاکستان میں تھی، اُسے وہ، وہاں نہیں بلا سکتا تھا۔ فاطمہ جیسی لڑکی کو قید کر کے، اُسکی بیٹی کو یرغمال بنا کر اُس سے زبردستی یہ کام لینا آسان تھا۔ لہٰذا اُس نے اُس سے بھی شادی کر لی۔

چھے سالوں میں یہ اُسکی تیسری شادی تھی، اور ان سب کے دوران وہ ایمان کو وقت دینا نہیں بھولتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے ذرا بھی شک ہو اور وہ ویسے بھی اظہر پر اندھا بھروسہ کرتی تھی۔ مسئلہ تب کھڑا ہوا، جب ایک ایس ایس پی نے فرح کے قریب رہ کر اُسکی تمام معلومات اکھٹی کر لیں۔

''تم اتنی بڑی بیوقوفی کیسے کر سکتی ہو؟'' اُس نے آتے ساتھ ہی اُسکے چہرے پر تھپڑ جڑا تھا۔ وہ اُسکی بیوی نہیں تھی، صرف ایک ایمپلوئے تھی۔

''میں نے اتنے عرصے میں یہ پہلی غلطی کی ہے اظہر!'' وہ چلائی۔

''لیکن اِس غلطی کا انجام جانتی ہو تم؟ اگر کچھ بھی برا ہوا تو میں تمہیں یہیں دفن کر دوں گا۔'' اُسکا غضب عروج پر تھا۔

''میرا ایک بندہ ایف آئی اے میں ہے۔ اُس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اُس نوید نامی شخص نے تمام معلومات کہاں چھپا رکھی ہیں۔ مجھے ایک دن کا وقت دو میں سب ٹھیک کر لوں گی۔'' پہلی بار وہ ڈری تھی۔

''ٹھیک ہے! صرف ایک دن ہے تمہارے پاس۔ اگر اِس بار کوئی غلطی ہوئی، تو تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی مریں گے۔'' وہ سرد لہجے میں کہتا کمرے میں چلا گیا۔ فرح کے اپنے بھی بہت تعلقات تھے۔ اُس نے نوید کے آفس میں چھپ کر گھسنے کا منصوبہ بنایا۔ اُس کا ارادہ نوید کے آفس کو آگ لگانے کا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے ایک بہترین ہیکر کے ذریعے اُس کے آفس کا پاسورڈ ہیک کیا، وہ دروازہ پاسورڈ سے کھلتا تھا۔ اُس روز، جب اُسے معلوم تھا کہ آج

نوید آفس نہیں آئے گا، وہ وہاں کی تلاشی کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے نوید کو اُسکے گھر والوں کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔ تب ہی اُس کے دماغ نے کھڑے کھڑے وہ منصوبہ ترتیب دیا۔ سارے سی سی ٹی وی وہ پہلے بند کرواچکی تھی۔

وہ وہاں سے واپس آگئی، عمارت کے احاطے میں ہی کھڑے ہو کر اُس نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے انسانی ہڈیاں منگوائیں، جو ایک نو عمر بچے کی تھی۔ اُن کے پاس انسانی اعضاء اور ہڈیاں باآسانی دستیاب رہتی تھیں۔ پھر جب اُس نے نوید کو کسی کام سے نیچے آتے دیکھا تو وہ اوپر پہنچ گئی، نوید نیچے نہ بھی آتا تب بھی وہ اُسے وہاں سے ہٹانے کا طریقہ سوچ چکی تھی، لیکن اُسکی نوبت نہ آئی اور وہ خود ہی کسی سے ملنے چلا گیا۔

پیچھے اُس نے آفس میں قدم رکھے، بشریٰ کو بالکنی میں کھڑا دیکھ کر ولید کو گود میں اٹھایا اور اپنی چادر میں چھپا دیا، پھر اُسکے کاٹ میں ہڈیاں ڈال کر خاموشی سے بالکنی کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کی آواز پر بشریٰ نے پلٹ کر دیکھا۔ پر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے نوید کے آفس کو آگ لگائی اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اُسکے بعد فوری طور پر اُس نے کسی شیلٹر ہوم یا یتیم خانے جانے کی بجائے رضا کی پناہ گاہ کو چنا، اُسے ایک جھوٹی کہانی سنا کر اُسکے ہمدردل کا فائدہ اٹھایا اور ولید کو وہاں رکھوا دیا۔ درمیان میں وہ وقتاً فوقتاً اُسے اپنے گھر لیکر آتی رہتی تھی تاکہ رضا کو شک نہ ہو۔ اظہر اُسکی کارروائی سے مطمئن ہو چکا تھا، حالانکہ نوید کے بھائی نے اُسے عدالتوں میں ٹھیک ٹھاک گھسیٹا تھا، لیکن فرح کی دوشناخت کی وجہ سے ایک شناخت پر شادی ثابت نہیں تھی، لہٰذا اظہر تو کسی معاملے میں پھنسا ہی نہیں۔ اور پھر نوید کے پاس کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مقدمہ بھی ہر حال میں بند ہی ہونا تھا۔

لہٰذا وہ بڑے سکون سے اپنا کام کرتا رہا تھا۔

---------+---------+--------

''ایمان! تم ٹھیک ہو؟'' حسین نے اُسکے قریب آکر پوچھا تھا۔

''حسین۔۔۔ حسین دیکھو! یہ لوگ اظہر کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو ایک اچھا، شریف انسان ہے۔'' وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

''ایمان! تم فکر نہ کرو۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے، تمہیں یہ لوگ چھوڑ دیں گے۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ اظہر نے بھی کچھ نہیں کیا، انکو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔ اُسے بالکل یقین نہ تھا کہ اظہر مجرم ہو سکتا ہے۔

''میں ماموں سے بات کرتا ہوں، وہ تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ ہم تمہاری ضمانت۔۔۔''

''تم میری بات کیوں نہیں سن رہے؟''وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے چیخی۔ حسین نے افسوس سے اُسے دیکھا۔

''ایمان!اظہر مجرم ہے۔بہت بڑا مجرم۔۔۔فرعون سے بھی بدتر ہے وہ، سینکڑوں لوگوں کا قاتل ہے۔''حسین نے سمجھانا چاہا تھا۔

''جھوٹ۔۔۔جھوٹ بول رہے ہو تم۔۔۔تم بھی اِنکی باتوں میں آگئے ہو۔''وہ چلا رہی تھی اور وہ بس اُسے تاسف سے دیکھ رہا تھا۔اُسی لمحے اظہر کو اُسکے سامنے سے لے جایا جانے لگا۔

''اظہر!اظہر۔۔۔''وہ بھاگتی ہوئے اُسکے پاس آئی تھی،اُسکے پیچھے کچھ اہلکار بھی آئے تھے۔اُسے روکنا چاہتے تھے پر نوید نے اشارے سے روک دیا۔اور یہی اُسکی سب سے بڑی غلطی تھی۔

''اظہر تم۔۔۔تم نے کچھ نہیں کیا مجھے معلوم ہے۔یہ لوگ کیوں لیکر جا رہے ہیں تمہیں؟''وہ اُسکا ہاتھ تھامتی گڑگڑائی۔حسین دکھ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر عمر اُسکے پاس آیا اور اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُسے تسلی دی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ایمان! یہ سب۔۔۔یہ سب۔۔۔''وہ کہتے کہتے رکا اور پیچھے کھڑے حسین کو دیکھا، جسکی یہاں موجودگی کا کوئی جواز وہ سمجھ نہ سکا تھا۔

''یہ سب اِس حسین کے لگائے گئے الزامات ہیں۔''اُس نے یکدم ہی کہا تو حسین نے ایک لمحے نا سمجھی سے اُسے دیکھا، جیسے اُسکا دماغ سمجھ نہ سکا ہو کہ اُس نے ابھی ابھی کیا کہا ہے۔

''کیا؟''ایمان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''اس نے اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔۔۔اتنے سنگین الزامات لگا کر۔''اُس نے کہا اور بڑی طنزیہ نظروں سے حسین کو دیکھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''حسین غصّے سے آگے بڑھا، عمر نے اُسے بازو سے تھام کر روکا۔

''یہی سچ ہے۔۔۔اور یہ بات تم اپنے گھر والوں کو ضرور بتانا ایمان!''وہ جاتے جاتے حسین کی زندگی میں آگ لگانے پر تیار تھا۔اِس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتا، نوید کے اشارہ کرنے پر اہلکار اُسے گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے جانے لگے۔

''اِسے چھوڑنا مت ایمان! میری زندگی برباد کرنے کا بدلہ اِس سے ضرور لینا۔''وہ چیخ چیخ کر کہتا اُسکے ذہن میں زہر گھول رہا تھا۔جبکہ وہ ساکت و جامد کھڑی تھی۔

''لے کر جاؤ اِسے یہاں سے۔۔۔''سا گر نے سختی سے کہا تو اُسے وہاں سے لے جایا گیا۔

''انہیں بھی تفتیشی کمرے میں لیکر جاؤ۔''نوید نے اظہر کے گھر والوں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے ہدایت دی تھی۔

''چلیں میڈم!''ایک اہلکار نے ایمان سے کہا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی، وہ اُس اہلکار کی جانب مڑی اور کسی کے بھی کچھ سمجھنے سے پہلے اہلکار کی بیلٹ میں موجود پستول نکال کر اُسے دھکّا دیا۔ اُسے پستول پکڑنے یا چلانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ بس چند مرتبہ اظہر کے ساتھ کلب میں جا کر پستول پکڑنا سیکھا ضرور تھا، پر نشانہ اُسکا زیادہ اچھا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے پستول کا رخ حسین کی جانب کیا تھا۔

''روکو اُسے۔۔۔''ساگر چیخا تھا، اہلکار الٹا خود کو بچاتے دوسری جانب ہوا تھا۔ اِس اچانک افتاد پر سب بوکھلائے تھے۔

''حسین پیچھے ہو۔۔''عمر اُسے پیچھے ہٹانے لگا۔

''اگر کوئی بھی آگے بڑھا تو میں سب کو مار دوں گی۔''اُس نے دونوں ہاتھوں سے پستول تھامے اُن سب کو دھمکی دی، وہ کوئی جنونی لگ رہی تھی۔ یہ وہ ایمان تو نہ تھی، جسکی خاندان میں سب مثالیں دیتے تھے۔

''تم لوگ اندر جاؤ!''نوید باقی سب کو پیچھے ہٹانے لگا، اُسکی گود میں موجود ولید آوازوں سے ڈر کر اٹھا اور رونے لگا۔ اِس وقت ایمان کو روکنے سے زیادہ ضروری خود کو بچانا تھا، وہ بنا کچھ دیکھے گولی چلا سکتی تھی۔ ''اِسے پکڑو!''نوید نے ولید کو رضا کی گود میں دیا اور اپنی پستول نکالی۔

''نہیں نوید!''حسین کے لب ہلے، اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے اشارہ کیا۔ پر نوید نے ایمان پر پستول تان لی تھی۔

''اپنی پستول نیچے کرو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''نوید نے سختی سے اُسے مخاطب کیا تھا۔ اُسکی لغت میں مجرمین کا کوئی جنس تھا نہ اُنکے لیے کوئی نرمی تھی۔

''ورنہ؟ کیا کر لو گے تم؟''اُس نے دھمکی آمیز انداز میں پوچھا۔

''مجھے مجبوراً تمہیں مارنا پڑے گا۔''اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہیں نوید! رک جاؤ۔۔۔میں بات کرتا ہوں اِس سے۔۔''حسین آگے بڑھا۔ وہ آگے ہوا تو مجبوراً عمر کو بھی اُسکے ساتھ آنا پڑا۔

''وہیں رک جاؤ!''ایمان چلائی تو وہ رکا۔ ''میرے شوہر کو چھوڑ دو، میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔''وہ شاید واقع پاگل ہو چکی تھی، حسین کو اُسکی دماغی حالت پر شک گزرا تھا۔

''میں بھی تمہیں بالکل آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اِسے نیچے پھینک دو!''نوید کے لہجے میں کوئی لچک نہ تھی۔

''ٹھیک ہے! ایسے ہے تو ایسے ہی صحیح!''اور پھر اُس نے وہ کیا، جس کی کسی کو کوئی اُمید نہ تھی۔ اگلے ہی لمحے اُس نے بلا اشتعال پستول چلائی تھی۔ جبکہ سب یہی سمجھے تھے کہ وہ صرف دھمکی دے رہی ہو گی۔

"حسین!" مقدم، رضا اور علی ساتھ چلائے تھے۔ نوید سمجھ نہ سکا کہ گولی چلائے یا نہیں! وہ فقط دھمکی دے رہا تھا۔ اُسے اُمید نہ تھی کہ وہ گولی چلادے گی۔ اگلے ہی لمحے وہ جان پر کھیلتے ہوئے اُسکے قریب گیا تھا، لیکن تب تک وہ اندھا دھند پستول خالی کر چکی تھی، نوید نے اُسکے ہاتھوں سے پستول چھینی ہی تھی اور پھر۔۔۔

جاگتی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا۔۔۔

سنتے کانوں نے وہ آواز سنی۔۔۔۔

دو زمین بوس ہوتے وجود کی آواز۔۔۔

بہتے لہو کا رنگ دیکھا۔۔۔۔

ہر شے جیسے رک گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ حسین ایک جانب گرا تھا، تو عمر دوسری جانب کھمبا پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔

کوئی بھاگتا ہوا حسین تک گیا تھا، تو کوئی دوڑتا ہوا عمر کے پاس آیا تھا۔

ایک شے جو دونوں جانب موجود تھی۔۔۔

وہ لہو تھا۔۔۔

حسین کا بہتا لہو۔۔۔

عمر کا بہتا لہو۔۔۔

دونوں کا خون زمین پر پھیلتے ایک مقام پر گڈمڈ ہو رہا تھا۔۔۔

کیا کیا نہیں یاد آیا تھا اِس لمحے؟ اُس کے بچے، جن سے ملنے کے لیے وہ بے تاب تھا۔۔۔۔

عمر کے ماں باپ جن سے وہ ایک بار پھر جھوٹ بول کر آیا تھا۔۔۔

سب پیچھے رہ گیا تھا۔۔۔

آوازیں، سماعتیں، نگاہیں۔۔۔

سب مفلوج ہو گئی تھیں۔۔۔۔

--------+---------+----------

ہسپتال کا سفید فرش۔۔۔

سفید دیواریں۔۔۔

دواؤں کی بو۔۔۔

روتے لوگ۔۔۔

پریشان چہرے۔۔۔

دعاؤں کے لیے اٹھتے ہاتھ۔۔۔

آپریشن تھیٹر کی جلتی لال بتی۔۔۔

اور منتظر نگاہیں۔۔۔۔

ہسپتال اُسے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ رضا، مقدم اور علی۔۔۔

تین نفوس کی موجودگی میں بھی جامد سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ مقدم بے چینی سے دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس کے لیے دل زیادہ تڑپ رہا ہے۔ رضا پتھرائی نگاہوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اور علی سر تھامے بیٹھا تھا۔ جتنا اُنہیں انتظار تھا کہ یہ سب ختم ہو جائے، اتنا وہ کسی نہ کسی مسئلے میں پھنستے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی دلدل ہو، جہاں سے نکلنا ممکن نہ ہو۔

فجر کی اذانیں ہو چکی تھیں، وہ نماز پڑھ کر۔ اپنے دونوں دوستوں کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگ کر واپس آئے تو روشنی ہو چکی تھی، پر آپریشن تھیٹر کا دروازہ نہ کھلا تھا۔ نوید بھی اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

پھر۔۔۔

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔۔۔

رضا کی پتھرائی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔۔۔

علی فوراً کھڑا ہوا۔۔۔

مقدم ٹھہر گیا۔۔۔

ڈاکٹر قریب آیا۔تینوں اُسکے سامنے جا کھڑے ہوئے۔زبان سے کچھ نہ کہا۔پر چہرے پر سوال صاف ظاہر تھا۔

''دونوں پیشنٹس (مریضوں) کی کنڈیشن (حالت) کریٹکل (تشویش ناک) ہے۔''پہلا ہی جملہ اتنا حوصلہ شکن کیسے ہو سکتا ہے؟ اُسے تو پہلے تسلی دینی تھی نا!

''کیا مطلب کریٹکل ہے؟''سوال مقدّم نے کیا تھا۔آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''پیشنٹ عمر! انہیں پانچ گولیاں لگی ہیں۔بازوؤں پر دو، پیٹ پر ایک، سینے کے قریب ایک اور ایک پاؤں میں۔۔۔ایسا لگتا ہے کسی نے اندھا دھند گولی ماری گئی۔سینے پر لگنے والی گولی کے باعث دل کے گرد جھلی میں خون جمع ہو گیا ہے۔ہم اُسے صاف کر رہے ہیں، لیکن دل کی دھڑکن بے ترتیب ہے، پھیپڑے زخمی ہوئے ہیں، تو سانس لینے میں بھی مسئلہ ہے۔آپریشن ابھی جاری ہے، خون کی اشد ضرورت ہے۔اگر آپریشن کے بعد بھی دھڑکن کی رفتار اور سانس معمول پر نہیں آتیں تو ہمیں اُنہیں انتہائی نگہداشت میں رکھنا ہو گا۔''ڈاکٹر تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا یا سر پر ہتھوڑے برسا رہا تھا؟ کیا اُسے پتہ بھی تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟

''وہ بچ جائیگا نا؟''مقدم نے پھر سوال کیا۔اِس بار سوال میں اُمیدیں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''دعا کریں بس!''بس؟اُس نے اتنا ہی کہا؟ کیا وہ ایک جملہ بھی حوصلہ افزا نہیں کہہ سکتا؟ کیا ایک لفظ بھی نہیں؟

''اور حسین؟''رضا نے پوچھا۔ابھی شاید اور امتحان باقی تھا۔

''انھیں تین گولیاں لگی ہیں، لیکن معاملہ نازک ہے۔''وہ کیا حوصلہ شکنی میں ماہر تھا؟ انھیں لگا کسی نے سانسیں روک دی ہیں۔

''سرجری کے دوران معلوم ہوا کہ انکا ایک گردہ نہیں ہے، اور ایک گولی انکے واحد گردے کے قریب لگی ہے، جو اُسے زخمی کر گئی ہے۔''رضا اِس سے زیادہ نہیں سن سکتا تھا۔وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔باقی دونوں کی تو ہمت بھی نہ تھی اُسکی طرف دیکھنے کی۔

''اُسکا گردہ؟''علی کو لگا شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''اُسکا مسئلہ نہیں ہے، وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا ہے۔جلدی زخم بھر جائینگے لیکن۔۔۔''وہ رکا۔پہلی حوصلہ افزا بات کے اختتام میں وہ رک گیا۔

''اصل مسئلہ اِس وقت انکا جگر ہے، ایک گولی کندھے پر لگی ہے، جس سے انکے پٹھے متاثر ہوئے ہیں۔ البتہ جگر میں خون بہنا شروع ہو گیا ہے، جسکی سرجری جاری ہے۔ ہم خون روکنے کی کوئی کر رہے ہیں، آپ لوگوں کو دونوں مریضوں کے لیے بہت وافر مقدار میں خون کا انتظام کرنا ہے۔ میں اطلاع دینے آیا تھا، واپس جارہا ہوں۔ آپ لوگ دعا کیجیے۔'' ڈاکٹر واپس اندر چلا گیا۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہا تھا؟'' مقدّم نے ایسے پوچھا جیسے اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ ڈاکٹر ابھی کیا کہہ کر گیا تھا۔

''ہمیں خون کا انتظام کرنا ہے۔ میں جارہا ہوں۔'' سب سے پہلے علی کے حواس بحال ہوئے تھے۔ وہ اُٹھا اور جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''تم دونوں خود کو سنبھالو! یہ ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔'' وہ دونوں کو کہتا باہر نکلا۔ اُسے خون کا انتظام کرنا تھا۔ ہر حال میں۔۔۔ مقدّم نے موبائل جیب سے نکالا، اُسکے ہاتھ میکانکی انداز میں چل رہے تھے۔ اُسے ابھی خون کے عطیات چاہیے تھے، اپنے تمام ممکنہ رابطے استعمال کرنا ضروری تھا۔

رضا نے نم آنکھیں اٹھا کر تھیٹر کو دیکھا۔ اُسکے دو بہت پیارے وہاں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایک مہربان دوست۔۔۔ جو کسی انجان رات اُسکے غم میں برابر کا شریک ہوا تھا۔۔۔ دوسرا محسن۔۔۔ جو ہر لمحے اُسکا غمگسار رہا تھا۔

مقدم اُسکے پاس آکر بیٹھا۔

''وہ دونوں ٹھیک ہو جائیں گے۔ دیکھنا! جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' پتہ نہیں وہ اُس کو تسلی دے رہا تھا یا خود کو؟ پر اِس تسلی پر اُسے خود بھی مکمل یقین نہ تھا۔

''حسین کو اپنے بچوں سے ملنا تھا۔ عمر کے ماں باپ اُسکا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ دروازہ دیکھتے کہہ رہا تھا۔ مقدّم کی آنکھیں بھی نم ہوئیں۔

''سب ٹھیک ہو جائیگا۔۔۔'' وہ تسلی دے رہا تھا۔۔۔ شاید خود کو!

خون کی بوتلوں کا انتظام کرنے کے لیے دوڑتا علی اپنی آنکھوں میں آتی نمی بار بار پیچھے دھکیل رہا تھا۔ اُس نے عمر کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے جیسے لے کر جارہا ہے، ویسے ہی واپس لائے گا۔ وہ اُنہیں کیا جواب دے گا؟ حسین سے تو وہ اب تک معافی بھی نہ مانگ سکا تھا، اُسے گلے بھی نہ لگا سکا تھا۔

اگر قسمت میں اکھٹے ہونا ہی تھا تو پھر ایسے کیوں؟

کیا اب بھی وقت نہیں آیا تھا؟

کوریڈور میں بیٹھے رضا کا فون بج رہا تھا۔ نمبر انجان تھا۔ اُس نے پہلے نظر انداز کیا، پھر کچھ سوچ کر اُٹھا لیا۔

''رضا بھائی!۔۔۔ رضا بھائی آپ کہاں ہیں؟'' دوسری جانب سے آتی آواز سن کر اُسکے چھکے چھوٹ گئے۔ اُس نے پریشانی سے مقدّم کو دیکھا جو ناسمجھی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''حو۔۔۔حور عین! تم۔۔۔کک۔۔۔کیا ہوا؟''اُس نے انجان بننے کی ناکام کوشش کی۔یقیناً اُسکا نمبر اُسے حسین نے ہی دیا ہوگا۔

''رضا بھائی! آپ حسین کے ساتھ ہیں نا؟''وہ رو رہی تھی۔

''ہاں! اُسکے ساتھ ہی ہوں۔''اُس نے جھوٹ بولا۔

''اسکو فون دیں، بات کروائیں میری۔۔۔''اُس نے کہا تو وہ پریشانی سے کھڑا ہوا۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے۔

''وہ اصل میں۔۔۔۔''وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''مجھے بتائیں کیا ہوا ہے حسین کو؟ یہ نیوز میں کیا آرہا ہے؟ کیا ہوا؟ مجھے بتائیں۔۔۔کچھ بولے رضا بھائی! حسین کیسا ہے؟''وہ چیختی چلی جارہی تھی۔

''نیوز میں؟''وہ سناٹوں میں رہ گیا۔ نجانے دوسری جانب سے کیا کہا جارہا تھا؟ وہ بالکل ساکت تھا۔ مقدّم الگ پریشانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ہسپتال؟ بتاتا ہوں۔۔۔''وہ اُسے ہسپتال کا پتہ بتا رہا تھا۔ اُسکے بعد اُسے تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اُس نے فون کاٹ دیا۔اب وہ یقیناً یہاں آنے والی تھی۔

---------+---------+--------

''کیسے؟۔۔۔''وہ حلق کے بل چیخا تھا۔''کیسے کر سکتے ہو تم سب؟''آواز اونچی تھی۔''اتنی بڑی غلطی؟ اتنی بڑی کوتاہی؟ اِس نااہلی کی کیا سزا دوں میں تم سب کو؟''ایس ایس پی نوید عالم سامنے کھڑے عملے پر گرج برس رہا تھا۔ عملہ سر جھکائے خاموش تھا۔

''سر! انہوں نے اچانک سے۔۔۔''کسی نے وضاحت دینی چاہی۔

''خاموش!۔۔۔''اُسکی دھاڑ پر وہ چپ ہوا، نوید چلتا ہوا اُسکے قریب آیا۔''جب خاتون نے تم سے بندوق چھینی تھی تو تمہیں اپنی جان پر کھیل کر اُسے روکنا تھا۔اور تم نے کیا کیا؟ ہاں؟''وہ اُسکے چہرے کے پاس چیخا تو وہ سر جھکائے کپکپانے لگا۔

''تم نے اپنی جان بچانا ضروری سمجھا۔''ایک مرتبہ پھر چیخا تھا۔ اُسکے اندر اِس وقت جو آگ لگی تھی، وہ چلا چلا کر ختم بھی ہو جاتا، تب بھی نہ بجھتی۔

''سوری سر!''

''شٹ اپ!''وہ پریشانی سے اپنے بال سہلاتا پیچھے ہٹا اور انہیں ہاتھ سے دفع ہو جانے کا اشارہ کیا۔وہ سر جھکائے اُسکے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''نوید! اب بس کرو۔اِن سے مینجمنٹ حساب لے لے گی۔''کافی دیر سے خاموش کھڑے ساگر نے اُسکے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔

''ہسپتال سے کوئی خبر آئی؟''اُس نے ساگر سے پوچھا۔نوید نے ایمان کو قابو کر لیا تھا۔اب وہ حراست میں تھی۔ حسین اور عمر دونوں ہی گولیوں کی زد میں آئے تھے۔دونوں کو بروقت ہسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ باقی سب بھی ساتھ گئے تھے، لیکن نوید یہیں تھا۔اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود عملے کا منہ نوچ لے۔

''فلحال تو نہیں! فیصل ساتھ ہی ہے انکے۔تم کیا اظہر سے تفتیش کے لیے چلو گے؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں! اور وہ خاتون ایمان؟''

''وہ فلحال حراست میں ہے۔''

''حسین نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرفتار ہو۔''نوید نے پریشانی سے کہا۔

''اب تک تو یہی لگتا ہے جیسے وہ ان سب سے انجان تھی،اور جو اُس نے کیا، جذبات میں آکر کیا۔''

''نوید!''اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا اُسے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وحید چلا آرہا تھا۔فرح کی گرفتاری کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے قریب آکر پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔آپ کو یہاں ہونے والے واقعہ کی خبر مل گئی؟''اُس نے پوچھا۔

''مجھ سے پہلے امی کو مل گئی ہے۔وہ الگ پریشان ہیں، بشریٰ بھی بار بار پوچھ رہی ہے۔''اِس بات پر تو دونوں بھونچکا رہ گئے۔

''کیسے؟''ساگر کے منہ سے نکلا۔

''میڈیا۔۔۔میڈیا یہاں تھا۔جو ہوا اُسکی خبر ہر جانب پھیل چکی ہے۔اپوزیشن جماعتیں حکومت سے واقعے کا نوٹس لینے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔''اُس نے بتایا۔

''ایک تو یہ میڈیا!''ساگر نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

''اب ایمان کا کیا ہو گا؟''

''ایمان کون؟''وحید نے پوچھا۔

''جس نے فائرنگ کی ہے۔''سا گر نے کہا۔

''کیا ہو گا بھلا؟''وحید نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔''اُس پر اقدام قتل کے تحت مقدمہ چلایا جائیگا۔وہ اظہر کے جرم میں شریک ہو یا نہ ہو، پر کچھ دیر قبل جو اُس نے کیا وہ سراسر جرم ہے۔''سنجیدگی سے کہتے ہوئے وحید نے صوفے کی جانب دیکھا، جہاں ولید سکون سے سویا ہوا تھا۔

''کیا اسے گھر نہیں لے جانا؟''اُس نے پوچھا، تو نوید نے اُس کی جانب دیکھا۔چہرے پر یکدم ہی نرمی چھائی۔

''میں خود لیکر جانا چاہتا ہوں۔''آہستہ سے کہا، تو وحید نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں پہلے اظہر سے تفتیش کے لیے جاؤں گا۔پھر ہسپتال۔۔۔اسکے بعد اُسے گھر لے جاؤں گا۔''اُس نے کہتے ہوئے اپنا موبائل دیکھا۔بشریٰ کے علاوہ کسی کا میسج نہ تھا۔اُس نے بشریٰ کو تسلی آمیز پیغام بھیجا۔پھر موبائل رکھ کر وحید کو دیکھا جو اب صوفے پر سوئے ولید کا سر سہلاتے اُسے پیار سے دیکھ رہا تھا، وہ مسکرایا۔

''ہمیں تفتیش کے لیے چلنا ہے۔''سا گر نے یاد دلایا۔

''ٹھیک ہے چلو!''وحید کھڑا ہو گیا۔

''آپ بھی چلیں گے؟''نوید نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اسکا خیال رکھنا، میں آرہا ہوں۔''نوید نے ولید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بھروسے کے آدمی کو اُسکے پاس چھوڑا، اُسکے بعد وہ تینوں ہی تفتیشی کمرے میں موجود تھے۔

''کچھ بتایا اِس نے؟''اُس نے کمرے میں موجود شیراز سے پوچھا۔

''کافی کچھ!''اگر شیراز کے چہرے پر غضب کی سنجیدگی نہ ہوتی تو وہ لوگ اُسے یقیناً مذاق سمجھتے۔

''کیا مطلب؟''سا گر نے پوچھا۔

''یہ اپنے جرائم کا اعتراف کر رہا ہے۔اور وہ بھی بڑی ڈھٹائی سے۔۔۔''اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو تینوں نے ساتھ اظہر کو دیکھا۔جو بڑے سکون سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔اُسکے چہرے پر شرمندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''تم۔۔۔''نوید دونوں ہتھیلی میز پر رکھتے جھکا،اور اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔''تم اب کیا کروں گے ہاں؟''اُس نے چبا چبا کر پوچھا تو جواباً وہ ہنسا۔

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے،میرے کلائنٹس صرف تمہارے ہی نہیں،بلکہ آس پڑوس کے ممالک کے وزراء بھی ہیں۔تمہیں کیا لگتا ہے؟تم کچھ کر سکتے ہو؟''وہ بڑے حظ اٹھاتے انداز سے کہہ رہا تھا۔اور نوید نفرت سے اُسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''اس نے صرف جرائم کا اعتراف کیا ہے۔اِسکا دھندہ کہاں کہاں چل رہا ہے،اور اِسکے ساتھ مزید کتنے لوگ شامل ہیں،اُسکے بارے میں اِس نے کچھ نہیں بتایا۔''شیراز نے کہا۔ایسے اعتراف کا کوئی فائدہ نہ تھا،عدالت میں اُس نے مکر ہی جانا تھا۔

''تم یہاں سے اب کبھی نہیں جا سکتے۔''نوید نے اُسے کہا۔

''بھول ہے تمہاری!''وہ پھر ہنسا۔''ایئرپورٹ پر میری گرفتاری کی ویڈیو وائرل کرنے والے میرے ہی لوگ تھے۔اب تک میڈیا،ایک باعزت اور شریف شہری کو بنا کسی وجہ کے گرفتار کرنے پر واویلا کھڑا کر چکا ہوگا۔سی ٹی ڈی کو فوری طور پر میڈیا پر بیان دینا ہوگا۔تم میرے بارے میں،میرے جرائم کے بارے میں سب کو بتاؤ گے۔میڈیا کی خبریں ایوانوں میں بیٹھے ملکی اور غیر ملکی سیاست دانوں تک پہنچے گی۔تو کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اُسکے بعد بھی میرا کچھ بگاڑ سکو گے؟ایک چھوٹا سا ایف آئی اے آفیسر بھلا کیا ہی کر سکتا ہے؟تم سب کو اپنی جانوں کی فکر کرنی چاہیے۔''اُسکو ذرا فرق نہیں پڑ رہا تھا۔اُسکے انداز میں ایک چیلنج تھا کہ لو کر لو جو کر سکتے ہو۔

''تمہارا سامنا اُن لوگوں سے ہے،جنہیں موت اتنی ہی عزیز ہے،جتنی تمہیں زندگی!(~خالد بن ولیدؓ)۔ہم موت سے نہیں ڈرتے،فکر تمہیں کرنی چاہیے۔''نوید نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔اُسی لمحے اُسکی جیب میں رکھا موبائل بجا تو وہ پیچھے ہٹا۔

''اس سے سب اُگلواؤ!''شیراز کو حکم دیتا وہ باہر آیا اور موبائل دیکھا۔رضا کی کال آ رہی تھی۔اُس نے تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ فون اٹھایا۔

''کیا ہوا رضا؟سب ٹھیک ہے؟حسین کیسا ہے؟اور عمر؟''اُس نے رضا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھا تھا۔

''وہ دونوں ابھی تک آپریشن تھیٹر میں ہی ہیں۔لیکن فلحال ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا؟''

''حورعین کو پتہ چل گیا ہے۔وہ ہسپتال آ رہی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''میڈیا!''اُس نے لب بھینچے کہا۔''ٹھیک ہے!اُسے آنے دو۔میں بھی کچھ دیر میں آ رہا ہوں۔''اُس نے کہا پھر فون جیب میں رکھا،اور پیچھے مڑا۔وحید اور ساگر آپس میں اُلجھے،اسی جانب آتے دکھائی دے رہے تھے۔

''اُسے گرفتار کرتے مجھے ہر گز نہیں معلوم تھا کہ کوئی ویڈیو بنا رہا ہے۔ یہ میری غلطی ہے، اگر میں احتیاط برتتا تو ہم خاموشی سے اُسے گرفتار کر کے، اُس سے سب اگلوا سکتے تھے۔ پر اب میڈیا پر سب آ جانے کے بعد، ہم پر بہت بڑا پریشر آنے والا ہے۔ ہمیں اظہر کے بارے میں بتانا پڑے گا، نہ بھی بتایا تب بھی اوپر سے ٹھیک ٹھاک پریشر آئے گا۔'' اُسکے قریب آ کر رکتا ساگر پریشانی سے بول رہا تھا۔

''اوپر والے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہم اپنے، ہم نے اپنے عہدے کے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں کی ہے۔ ہم اُسے گرفتار کر کے لائے ہیں اور اُسے ہر گز نہیں چھوڑیں گے۔ ہم پر اوپر والے پریشر ڈالیں گے بھی نہیں، کیونکہ جب تم میڈیا کو اظہر کے بارے میں بتاؤ گے، اگر اُسکے بعد اُسے چھوڑ دیا تو عوام ہی حکومت کے خلاف ہو جائیگی۔ وہ ہر صورت میں ججز کو نشانہ بنائیں گے۔ اُن پر پریشر ڈالا جائیگا کہ وہ اظہر کو باعزت بری کریں۔ یہ کھیل بہت لمبا چلنے والا ہے۔ تم سب نے ثابت قدم رہنا ہے۔'' وحید نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ تم نے جو کیا، وہ صحیح تھا۔'' نوید نے بھی ساگر کو تسلی دی تھی، پھر وحید کو دیکھا۔

''میں ہسپتال جا رہا ہوں۔'' اسے کہتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا، جہاں سے اُسے ولید کو ساتھ لینا تھا۔

--------+---------+----------

''حسین کہاں ہے؟'' حور عین اُسکے سامنے کھڑی تھی۔ زرد رنگ کے کپڑوں میں اُسکا چہرہ بھی زرد تھا، آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اُسکی گود میں اُسکی بیٹی تھی، پیچھے حسین کا بڑا بھائی کھڑا تھا۔ رضا نے پاس کھڑے علی کو دیکھا، پھر چہرہ جھکا دیا۔

''آپریشن ہو رہا ہے۔'' قریب موجود مقدّم نے آہستگی سے کہا۔

''ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟'' حسین کے بھائی نے پوچھا تھا۔

''فلحال دعا کرنے کہا ہے۔'' علی نے نپا تلا سا جواب دیا۔ حور عین کے لب کپکپائے، آنکھوں میں آنسو نمودار ہوئے تو وہ پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ گود میں سوئی بیٹی کو خود میں بھینچا، جیسے اپنے خوف کو کم کرنا چاہ رہی ہو۔ رضا کو دکھ ہوا۔

''وہ ٹھیک ہو جائیگا نا؟'' چہرہ اٹھا کر اُس نے پوچھا بھی رضا سے ہی تھا۔

''ان شاءاللہ!'' وہ آہستہ سے کہتا علی کے برابر جا کھڑا ہوا۔ یا شاید اُسکے پیچھے خود کو چھپانا چاہا۔

اسی لمحے دو دروازے ایک ساتھ کھلے تھے۔ایک راہداری کا دروازہ تھا،اور ایک آپریشن تھیٹر کا۔راہداری سے داخل ہونے والے پر کسی کی توجہ نہیں گئی تھی، کیونکہ وہ آپریشن تھیٹر سے نکلنے والی پانچ ڈاکٹروں پر مشتمل ٹیم کو دیکھ رہے تھے۔کیا آپریشن مکمل ہو گیا تھا؟تو پھر لال بتی ابھی تک روشن کیوں تھی؟ ڈاکٹر اُنکے پاس آکر رک گئے تھے۔

''حسین کیسا ہے؟''پہلا سوال حور عین نے کیا تھا۔

''آپ کون؟''ڈاکٹر نے پوچھا۔یہ سب میں نیا چہرہ نظر آیا تھا۔

''اُسکی بیوی ہے یہ اور میں اُسکا بھائی ہوں۔وہ ٹھیک ہے نا؟''اُسکے بھائی نے پوچھا تو ڈاکٹر نے گہری سانس لیکر ماسک نیچے کیا۔

''جان کو اب خطرہ نہیں ہے۔''پہلا حوصلہ افزا جملہ،اُنہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''گو کہ جگر کے پاس زخم آنے کی وجہ سے اندرونی خون بہنے لگا تھا،لیکن بروقت طبّی امداد ملنے اور خون مل جانے کی وجہ سے خون نہ صرف روک لیا گیا،بلکہ جگر بھی محفوظ رہا۔جلد زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔ہم اُنہیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں۔ابھی ہفتے بھر اُنکا Dialysis ہو گا۔پھر آپ اُنہیں۔۔۔''

''ڈائیلاسز؟''بہت سے لوگوں کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا؟

''ڈائیلاسز کیوں؟اُسکا گردہ تو ٹھیک ہے۔''حور عین نے کہا۔

''جی جی! گردہ ٹھیک ہے۔لیکن بعض دفعہ کسی گہرے جھٹکے،یا دباؤ کے باعث عارضی طور پر گردہ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔اِنکے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے، جبکہ انکے پاس ایک ہی گردہ ہے،تو دباؤ بھی شدید تھا۔فلحال ڈائیلاسز ہو گا،ان شاءاللہ زخم مندمل ہوتے ہی گردہ کام شروع کر سکتا ہے۔''دوسرے ڈاکٹر نے کہا تھا۔وہ اُمید دلا رہا تھا یا واپس لے رہا تھا؟وہ کیا کر رہا تھا؟حور عین اُسکے بھائی کا بازو پکڑ کر دوبارہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''اور عمر؟''اِس سوال پر سب نے پلٹ کر دیکھا۔وہ نوید تھا،ولید اُسکی گود میں موجود تھا،وہ وہاں کب آیا؟شاید راہداری سے داخل ہونے والا وہی تھا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں۔''اب کہ ڈاکٹر کی آواز آہستہ ہوئی۔دلوں میں کوئی ضرب پڑی تھی۔یہ اتنے حوصلہ شکن جملے کیوں بول رہا تھا؟کیوں؟

''پانچ گولیاں لگنا اپنے آپ میں ہی بہت بڑا خطرہ ہے۔پھیپھڑے زخمی ہیں۔ہم نے دل کے گرد جمع ہونے والا خون صاف کر دیا ہے اور دل پر پڑنے والا دباؤ ختم کر دیا ہے۔لیکن دل کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔اگلے چوبیس گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔اس دوران دل کی دھڑکنیں بے ترتیب رہ سکتی ہیں اور سانس لینے میں بھی دشواری رہے گی۔اگر اگلے چوبیس گھنٹے دل نے مستحکم رہ کر گزار لیے تو خطرہ کافی حد تک ٹل جائے گا۔اِس کے بعد دوائیں بھی اپنا اثر دکھانا شروع

کر دیں گی، سوزش کم ہو جائیگی، زخم بھرنے لگ جائیں گے، اور دل کی دھڑکن اور سانسیں بھی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگیں گی۔ لیکن فلحال اُنکی حالت کے پیش نظر اُنہیں انتہائی نگہداشت یونٹ میں منتقل کر رہے ہیں۔'' آج کے دن کی بدترین خبر!

''وہ ٹھیک ہو جائیگا نا؟'' پھر وہی سوال۔ مقدّم کے لہجے میں اُمیدیں ٹوٹ رہی تھیں۔

''اگر چوبیس گھنٹے نکال لیے تو ہاں!'' راہداری میں سنّاٹا چھا گیا۔

''ہم مل سکتے ہیں اُنہیں؟'' رضا نے پوچھا۔

''حسین سے مل سکتے ہیں۔ اُنہیں وارڈ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ البتہ عمر صاحب سے ملنے کے لیے ایک وقت میں ایک شخص ہی جا سکتا ہے۔'' اُنہوں نے کہا۔ پھر مزید ہدایات دینے کے بعد چلے گئے۔ حور عین پھر سے رو رہی تھی، اُسکی سسکیاں سارے میں گونج رہی تھیں۔ حسین کا بھائی سر تھامے وہیں بیٹھ گیا تھا۔

''رضا! کیا تم اسے دیکھ لوگے؟'' نوید نے رضا کے قریب آتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو نوید نے ولید کو اُسکے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ اب تک گھر نہیں جا سکا تھا۔

''علی!'' پھر اُس نے علی کو مخاطب کیا۔

''ہو نہہ؟''

''عمر کے والدین کو اطلاع دے دو۔'' اِس بات پر تینوں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''پر۔۔۔'' علی نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ ضروری ہے۔'' نوید نے اُسکی بات کاٹ دی۔ ''وہ اُسکے ماں باپ ہیں۔ اُنہیں اپنے بیٹے سے ملنے کا پورا حق ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تو علی نے سر ہلایا اور کانپتے ہاتھوں سے عمر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ پتہ نہیں وہ کیسے کرے گا یہ؟ پر اُسے یہ کرنا تھا۔ اگر خدانخواستہ عمر کو کچھ ہو گیا تو اُسکے ماں باپ یہ غم تا عمر سہہ نہیں پائیں گے۔

''میں آتا ہوں۔'' نوید آہستگی سے کہتے وہاں سے باہر نکلا۔ اُسکے پیچھے جاتی آنکھوں نے، اُسکی سرخ آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ جذبات چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا تو اُسکے لیے فرار بہتر تھا۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' راہداری سے باہر نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا نوید اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بار بار صاف کر رہا تھا۔ اُسے کوئی کونا ڈھونڈنا تھا۔ اُسے رونا تھا۔

پیچھے راہداری میں حور عین کی سسکیاں اب تک گونج رہی تھیں۔

--------+---------+----------

راہداری میں دو نفوس موجود تھے۔ ایک حور اور دوسرا نوید۔

رضا، حسین سے ملنے وارڈ گیا تھا، اور علی اور مقدّم، عمر کو دیکھنے آئی سی یو۔۔۔

حور عین نہیں گئی، وہ وارڈ کے باہر سے حسین کو دیکھ کر روتی ہوئی واپس آگئی تھی۔ اُسکی ہمت نہیں تھی۔ ایک ہنستے کھیلتے، چلبلے انسان کو ایسے دیکھنے کی ہمت اُس میں بالکل نہیں تھی۔

''حسین نے مجھ سے کہا تھا کہ اللہ کے بعد اُسے ایف آئی اے پر بھروسہ ہے، وہ مجھے کچھ نہیں ہونے دے گی۔'' خالی راہداری میں حور عین کی آواز گونجی تو نوید نے اُسے دیکھا۔

''میں نے کہا یہ اندھا بھروسہ ہے حسین!'' اب کہ اُس نے نم آنکھیں اُٹھا کر نوید کو دیکھا۔ اور نوید شرمسار۔۔۔

''اُس نے کہا مجھے میرے دوست پر بھروسہ ہے۔ وہی دوست جس نے اُسے اپنے دروازے سے لوٹایا تھا۔'' اُسکے لہجے میں طنز نہیں تھا، پر دکھ تھے۔

''میں اُسے وضاحت دے چکا ہوں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''پر تم نے اُسے بچایا بھی نہیں!'' اس بات پر نوید کا سر جھکا، پھر اُس نے چہرہ اٹھایا تو آنکھیں سرخ تھیں۔

''اُسے ایمان نے گولی ماری ہے۔'' اُس نے بتانا مناسب سمجھا۔

''ایمان؟'' اُسے نہیں معلوم تھا شاید!

''ہاں! حسین کی کزن ایمان۔۔۔'' پھر وہ اُسے سب بتانے لگا اور وہ حیرت زدہ سی سننے لگی۔

''تم جاؤ مقدّم!'' دوسری جانب آئی سی یو کے باہر رک کر علی نے مقدم سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اندر چلا گیا۔ جبکہ علی گہری گہری سانس لیکر خود کو پر سکون کرنے لگا۔ اُس نے ابھی ہی عمر کے باپ کو اطلاع دی تھی۔

آئی سی یو کے دروازے کے اُس پار وقت جیسے رک گیا تھا۔

سفید روشنی میں نہایا ہوا کمرہ بے حد خاموش تھا، مگر اُس خاموشی کے بیچ، وقفے وقفے سے گونجتی مشینوں کی بیپ دل پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ بستر پر لیٹا وجود ہوش حواس سے بیگانہ تھا۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندوں جیسا نہ تھا۔ اُسے دیکھ کے مقدّم کے دل پر جیسے ہتھوڑا پڑا تھا۔

اُسکا پورا سینہ موٹی سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کندھوں سے بازوؤں تک جا بجا پٹیوں پر نیل اور خون کے داغ پڑ چکے تھے۔ ہاتھ کی رگوں میں کئی کینولا پیوست تھے، جن سے شفاف دوائیں قطرہ قطرہ اُس کے جسم میں اتر رہی تھیں، وہ اب اپنی بقا کی جنگ خود نہیں لڑ پا رہا تھا۔ ناک اور منہ پر آکسیجن کا ماسک چڑھا تھا۔ ہر سانس جیسے کسی دشواری کے ساتھ لے رہا تھا۔

دل کی دھڑکن مانیٹر پر سبز لکیر کی صورت دوڑ رہی تھی۔ کبھی باقاعدہ، کبھی بے ترتیب۔۔۔ اور ہر بے ترتیبی پر مشین ایک تیز آواز کے ساتھ کمرے کی خاموشی چیر دیتی تھی۔ چہرے پر زندگی کا رنگ باقی نہ تھا۔ وہی چہرہ جو ہمیشہ اعتماد، حوصلے اور مسکراہٹ کی علامت تھا، اب زرد پڑا ہوا تھا۔ خشک ہونٹ، بند پلکیں اور جسم پر پٹیاں۔۔۔ وہ مہربان دوست جو دوسروں کے لیے ڈھال بن کر کھڑا رہتا تھا، آج خود بے بس پڑا تھا۔ اتنا بے بس کہ پلک جھپکانے کا اختیار بھی اُس کے پاس نہ تھا۔

مقدّم اُسکے قریب آیا۔ اُسکی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آنسو اُسکی آنکھوں سے چھلک کے نکل پڑے۔

''میں نے لیلیٰ کو کھو دیا ہے عمر! تم مت جانا مجھے چھوڑ کر۔۔۔ خدا کے لیے یار!'' اُس نے جیسے التجا کی تھی۔ اُسکے پاس ہمت اِس سے زیادہ نہ تھی، اِس لیے اُسکا سر سہلاتے واپس باہر چلا گیا۔ وہ گیا تو علی اندر آیا۔ پہلی نظر اُسے دیکھتے ہی اُس نے آنکھیں میچیں۔ اِس طرح اُسے دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر آنکھیں کھولیں تو نگاہیں دھندلا گئیں۔ آنسو باڑ توڑ کر باہر آنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اُسکے پاس آیا۔

اُسے اپنے سامنے بے حس و حرکت پڑا دیکھ کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ دو سال سے عمر کے ساتھ تھا، دو سال میں ایک بار بھی اُس نے علی کو اپنی پریشانی نہیں بتائی۔ وہ اُسے ایک منافق و خود غرض دوست سمجھتا رہا جبکہ خود غرض تو وہ خود تھا۔ کتنا برا دوست تھا وہ؟

علی نے اُسکے پٹیوں سے جکڑے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اُسکے وجود میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اُنکا سب سے حساس دوست تھا۔ ہر وقت دستیاب رہنے والا، دوسروں کے لیے جان تک دے دینے والا۔ اور آج اُسکی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اُس روز بھی نہ تھا جب وہ بیرونِ ملک میں اکیلے زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔

''میں نے تمہارے ابّو سے وعدہ کیا تھا۔'' وہ بولا تو آواز بھرا گئی۔ ''وعدہ کیا تھا کہ اپنے بھائی کو صحیح سلامت واپس لاؤں گا۔ مجھے وعدہ خلاف نہ بناؤ عمر! میں تمہارے ابّو کو کیا جواب دوں گا؟'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ ایک آنسو آنکھوں سے بہہ کر اُسکے ماسک میں جذب ہو گیا۔

کتنا عجیب ہوتا ہے نا!

کبھی ایک انسان پورے ہجوم کا سہارا ہوتا ہے، اور کبھی وہی انسان خاموش پڑا ہوتا ہے، جبکہ پورا ہجوم بے بس ہو کر صرف اُس کے ایک بار آنکھیں کھولنے کی دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف وارڈ میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ وہ خاموشی، جسے اگر کسی نے سب سے زیادہ ناپسند کیا ہوتا، تو وہ خود حسین ہوتا۔ بستر پر لیٹا ہوا شخص اِس وقت پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔

جس کے قہقہوں سے کمرے گونج اٹھتے تھے، آج اُس کے ہونٹوں پر ایک جنبش تک نہ تھی۔ چہرہ زرد اور سوجا ہوا تھا۔ پلکیں بند تھیں، ناک پر آکسیجن کی نلکیاں تھیں، بازوؤں میں ڈرپس لگی تھیں، اور سینے کے نیچے سے نکلتی ڈرین کی باریک نالیاں خاموشی سے خون اور رطوبت اپنے اندر سمیٹ رہی تھیں۔ پیٹ اور پہلو پر بندھی موٹی پٹیاں اُن گولیوں کی گواہی دے رہی تھیں، جنہوں نے اُس کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا۔ ایک گردہ تو وہ پہلے ہی کھو چکا تھا۔ اور اب قسمت نے باقی ماندہ واحد سہارے پر بھی وار کیا تھا۔

مانیٹر پر چلتی سبز لکیر بتا رہی تھی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

مگر حسین کی زندگی کی اصل پہچان تو اُس کی آواز تھی۔

وہ آواز۔۔۔۔۔

جو ہر مشکل لمحے میں کوئی نہ کوئی فضول سا لطیفہ سنا کر سب کو ہنسا دیتی تھی۔۔۔۔

وہ آواز۔۔۔۔

جو ہر اداس چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لے آتی تھی۔

آج پورا کمرہ اُس آواز کا منتظر تھا۔۔۔

کمرے میں بہت دیر سے خاموش کھڑا رضا بھی۔۔۔۔

اُسکے پیچھے بعد میں داخل ہونے والے علی اور مقدّم بھی۔۔۔

اور دروازے پر رک کر کھڑا نوید بھی۔۔۔

مگر وہاں صرف مشینوں کی مسلسل آواز سنائی دے رہی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے نا!

بعض لوگ جب خاموش ہوتے ہیں تو صرف خاموش نہیں ہوتے۔۔۔۔

وہ اپنے ساتھ پوری کائنات خاموش کر دیتے ہیں۔

اور حسین۔۔۔آج پہلی بار اتنا خاموش تھا کہ اُس کی خاموشی،اُس کے ہزاروں قہقہوں سے زیادہ گونج رہی تھیں۔

زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی،اور وہ آنکھیں آج بند تھیں۔۔۔

اُسکا جسم سو جا ہوا تھا۔رضا کب سے کھڑا اُسے یونہی یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

''کیا اس نے آنکھیں کھولیں؟''مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

''ایک بار کھولی تھی،کچھ دیر کے لیے۔پھر بند کر لیں۔''اُس نے بتایا۔بات کرتے یونہی،ایک نظر نوید کو دیکھ لیا۔وہ اب تک دروازے پر کھڑا تھا۔وہ بڑا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ہاں! وہ واقعی کمزور دل تھا۔

اُسی لمحے حسین کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔تینوں بیک وقت اُسکے قریب ہوئے۔نوید بیساختہ وارڈ کے اندر آ گیا۔اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھولی۔

''حسین!۔۔۔تم ٹھیک ہو؟''رضا نے اُسکا ہاتھ تھامتے بے قراری سے پوچھا۔

وہ چند لمحے سب کو دیکھتا رہا۔چہرہ سوجا ہونے کی وجہ سے آنکھیں بھی چھوٹی لگ رہی تھیں۔پھر اُسکے لب ہلے۔

''ہاں! بولو!''مقدّم نے پوچھا تھا۔جیسے اُسے بولنے کے لیے ہمت دی ہو۔

''عم۔۔۔عمر۔۔۔''سب نے بیساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔اُسے اِس حالت میں بھی عمر کی فکر ہوئی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے۔تم پریشان نہ ہو۔''پہلی بار نوید نے جواب دیا تھا۔اُس نے بس سر ہلا دیا۔

''تم نے تو ڈرا دیا تھا حسین!''رضا نے کہا تھا۔پر وہ اُسے نہیں دیکھ رہا تھا۔سیدھی کروٹ پر ڈھلکے چہرے پر سجی آنکھیں،دروازے کی جانب تھیں۔

''تم ٹھیک ہو نا! کہیں درد تو نہیں ہو رہا ہے؟''علی نے پریشانی سے پوچھا تھا۔وہ اب بھی چپ چاپ یک ٹک دروازے کو دیکھ رہا تھا۔اُسکی نظروں کے تعاقب میں سب نے بے ساختہ دروازے کی جانب دیکھا تو وہاں حور عین کو کھڑا پایا۔دروازے کے قبضے پر چہرہ ٹکائے،وہ ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی بچہ شکایت ملنے پر پرنسپل کے کمرے کے باہر کھڑا ہوتا ہے۔ڈری، سہمی اور خوفزدہ سی۔۔۔

وہ حسین کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

اور حسین اُسے۔۔۔۔

؎دل نہ اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے

لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

حسین لحظے بھر کو مسکرایا۔ پھر اُسکی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئی۔

وہ خاموشی سے دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

باہر آئے تو عمر کے والدین آچکے تھے۔ اُسکی امی دل تھامے، بلک بلک کر روتی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ علی کو دیکھ کر حفیظ صاحب فوراً اُسکے پاس آئے تھے۔ اُس نے سر جھکا دیا۔

''تم نے کہا تھا۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ عمر کو کچھ نہیں ہو گا۔ بتاؤ مجھے کہاں ہے میرا بیٹا؟'' وہ اُس پر چیخے تھے۔ علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''تم نے جھوٹ بولا۔ میرے منہ پر مجھ سے جھوٹ بولا۔'' وہ رو رہے تھے اور علی بے بس سا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''انکل! آپ اِدھر بیٹھے۔'' نوید نے انھیں کندھوں سے تھام کر بٹھایا تھا۔ اب وہ اُنہیں کچھ سمجھا رہا تھا۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔'' مقدّم نے چپ چاپ پشیمان کھڑے علی کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے اُسے تسلی دی تھی۔

پر اب کوئی تسلی کام نہیں آنے والی تھی۔

--------+---------+----------

مشاورتی کمرے میں اِس وقت چار نفوس موجود تھے۔ وحید جا چکا تھا، اُسکی ڈیوٹی تھی۔

ساگر، شیراز اور فیصل، ڈی آئی جی فرّخ کے سامنے موجود تھے۔ اظہر سے تفتیش ابھی باقی تھی، اُس نے صرف جرائم کا اعتراف کیا تھا۔ کوئی قابل ذکر معلومات اب تک فراہم نہ کی تھیں۔

''جیسا اظہر نے کہا تھا، بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے۔ یہ کیس حکومتی سطح پر پہنچ چکا ہے اور کچھ ہی دنوں میں یہ ہائی پروفائل کیس بن جائیگا ہے۔ اور اس میں بہت بڑے بڑے نام بھی شامل ہوں گے۔'' ساگر نے کہا۔

''وہ تمام باتیں تو ٹھیک ہیں، لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ اُس نے اپنے آخری جرم کا اعتراف کیوں نہیں کیا؟''فیصل نے پوچھا۔

''آخری جرم؟''شیرازنے نا سمجھی سے دیکھا۔

''نوید سر اور اُنکے دوستوں کا کیس!''اُس نے یاد دلایا۔

''اوہ اچھا!''اُس نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''وہ کیا کہتا ہے؟''فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''وہ کہتا ہے کہ وہ ان چھے لوگوں میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا اور نہ اُسکا اُن میں سے کسی سے کوئی تعلق ہے۔ حسین کو بھی وہ فقط رشتے دار کی حیثیت سے ہی جانتا ہے۔''ساگر نے کہا۔

''جب اُس نے اپنے تمام جرائم بڑی ڈھٹائی سے قبول کیے ہیں تو وہ اِس بات کو قبول کیوں نہیں کر رہا؟''فیصل نے سوال دہرایا۔

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ وہ یہ بات ماننے سے انکاری ہے کہ اُس نے ان لوگوں کے قتل کا حکم مائیکل کو دیا ہو۔ بقول اُسکے وہ تو اُنکو جانتا تک نہیں ہے۔''ساگر نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

''کیا معلوم مائیکل نے خود سے اُن لوگوں کی تصاویر جمع کر رکھی ہوں؟ اظہر کا اُن سے تعلق نہ ہو؟''شیرازنے کہا۔

''ناممکن! اُسکے بقول مائیکل اُس سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتا تھا۔''

''وہ ہمارے ساتھ کوئی کھیل، کھیل رہا ہے۔''فیصل نے غصّے سے کہا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''کمرے میں فرّخ صاحب کی مدھم آواز گونجی تو تینوں نے حیرت سے اُنہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اُسکا اُن چھے لوگوں سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ وہ تصاویر اُس نے ڈائری میں لگائی ہیں۔''اُنکا لہجہ پراسرار سا تھا۔

''تو پھر کس نے لگائی ہیں؟''

''کسی اور نے، جس تک ہم نہیں پہنچ سکے۔''انہوں نے جیسے تھک کر کرسی کی پشت پر سر ٹکایا۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''ساگر نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اظہر نے تمام جرائم قبول کیے، پھر وہ اِس ایک نہ ہونے والے قتل کو کیوں قبول نہیں کرے گا؟ وہ ڈھیٹ شخص بڑے مزے سے ہمیں اپنے تمام قتل کی داستان سنا رہا ہے تو وہ اِس بات پر انجان کیوں بنے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''اگر بالفرض مان بھی لیں کہ وہی ان چھے لوگوں کے پیچھے تھا، تو پچھلے چھ ماہ سے ہم نے کسی کے بھی آس پاس کوئی مشکوک سرگرمی کیوں نہ دیکھی؟ مورخہ چھے کا جتنا خوف ہمارے دلوں میں تھا، اُس روز تو کچھ بھی نہ ہوا۔ فرح بھی فقط پُرانی دشمنی کی بنا پر اُس رات نوید کو قتل کرنے آئی تھی۔ اور جب نوید فرح کے قریبی آدمیوں میں شامل ہوا تھا تو فرح نوید کو کیوں پہچان نہ پائی، جبکہ اظہر تو نوید کو قتل کرنا چاہتا تھا، اور وہ اظہر کے تمام جرائم کو اچھے سے جانتی تھی۔ اُسے تو فوراً نوید کو پہچان لینا چاہیے تھا؟ اور اگر اظہر ان سب کو جانتا تو وہ اتنے سال انتظار کیوں کرتا؟ جب یہ سب الگ تھے تو انہیں زیادہ آسان تھا۔ اُس پر سے مزید برآں یہ کہ وہ نوید کے بیٹے کو رضا کے پاس کیوں رکھواتا؟ اگر وہ واقعی ان سب کا دشمن ہوتا تو وہ اپنے ایک دشمن کے بیٹے کو دوسری کے پاس کیوں رکھوائے گا؟'' اُنکے سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُنکے ہاتھ ایک ڈور آئی تھی۔ اُلجھی ہوئی ڈور!

''ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہو؟ سائیکو تو ہے وہ!۔۔۔'' فیصل نے بھونڈی سی وضاحت پیش کی۔

''اتنا بیوقوفانہ کھیل؟'' انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب سوچو تو بہت بیوقوفانہ لگتا ہے۔''

''یعنی؟'' ساگر نے پوچھا۔

''یعنی۔۔۔'' وہ آگے کو ہوئے۔ ''اس تمام کہانی میں جھول ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا تھا۔

---------+---------+--------

''اگر ایمان انکار نہ کرتی تو تمہیں دنیا کا سب سے بہترین مرد نہ ملتا۔ تمہیں تو اسکا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'' کبھی کسی شام حسین نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ شام یاد کر کے وہ ہسپتال کی راہداری میں بیٹھی اُداسی سے مسکرائی تھی۔

''ہاں! دنیا کا سب سے نکما انسان میرے سر جو تھوپ دیا گیا ہے، اِس بات کا شکریہ؟'' وہ جواباً تڑخ کر بولی تو وہ ہنس دیا تھا۔ اُسکے دونوں گالوں پر گہرے گڑھے پڑے تھے۔

''ناشکری ہی رہنا تم!'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا تھا۔

حسین کے وارڈ سے آوازیں آ رہی تھیں، راؤنڈ پر موجود ڈاکٹر معمول کے چیک اپ کے لیے اندر تھے۔ اسی لمحے دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک نرس بھاگتی ہوئی سینئر ڈاکٹر کے کمرے کی جانب گئی تھی۔

حور عین کے ہاتھ کانپنے لگے۔

''یااللہ! کچھ نہیں۔۔۔کوئی بری خبر نہیں۔۔۔پلیز!۔۔۔''وہ دل پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کر کے دعا مانگ رہی تھی۔

راہداری میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔

آخری باب

یہ کہانی میری تھی

موت کبھی انسان کے ہاتھ میں نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہو گی۔

بچانے والے نے جب بچانا ہوتا ہے تو آگ بھی گلستان بن جاتی ہے، کنواں بھی زندہ رکھتا ہے، مچھلی کا پیٹ بھی عارضی قیام گاہ بن جاتا ہے، سمندر رشق ہو جاتا ہے، اور بندہ زندہ آسمان پر اٹھا لیا جاتا ہے۔

پس اگر بچانے والا بچانا چاہے تو۔۔۔

راہداری میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ حسین کے کمرے سے بھاگ کر، ہانپتے ہوئے باہر آتی نرس کے چہرے پر کچھ تھا۔ کچھ پر جوش سا، آنکھوں میں کوئی خوشی کا تاثر تھا۔ پر حور عین وہاں سے نہ ہلی۔ وہ ڈرپوک تھی، اپنے پیارے کے معاملے میں وہ ایسی ہی ڈرپوک واقع ہوئی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچ لیا۔

نجانے کتنے لمحے سرکے؟

گھنٹے یا صدیاں؟

حسین کے بھائی بھی وہاں آ گئے، اُسکے دوست بھی۔ پھر ڈاکٹر باہر آیا۔ ماتھے سے پسینہ ایسے صاف کیا جیسے کوئی محاذ سر کر کے آیا ہو۔ اُسے دیکھ کر سب اُسکی جانب بڑھے تھے۔ سوائے حور عین کے۔

''کیا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب؟'' حسین کا بھائی پریشان تھا۔

''معجزہ!'' اُس نے یک لفظی جواب دیا اور مسکرایا۔ ''حیران کن طور پر اُنکے گردے نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور الحمدللہ! پہلے کی طرح فعال ہو گیا ہے۔ اُنہیں اب ڈائلیسس کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' ڈاکٹر نے پہلی بار حوصلہ افزا بات کی تو ساتھ میں حوصلے توڑے نہیں تھے۔

''یقیناً آپ سب کی دعائیں تھی انکے ساتھ۔۔۔'' ڈاکٹر جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا؟ پر حور کو اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ اُسے بس اتنا معلوم تھا کہ حسین اُسے چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔ کہیں نہیں!

--------+---------+----------

چوبیس گھنٹے۔۔۔۔

عمر حفیظ نے چوبیس گھنٹے نکال لیے تھے۔اُسکا دل نارمل رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔رات اُس نے آنکھیں بھی کھولی تھیں۔کچھ دیر اپنی روتی ماں کو دیکھتا رہا تھا۔پھر دوبارہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔

صبح تک اُسکی حالت قدرے بہتر ہو گئی تو ڈاکٹر نے اُسے وارڈ میں منتقل کر دیا۔

''دو راتوں سے میں مسلسل جاگ رہا ہوں۔تم دونوں نے ایسی زمین کھینچی ہے قدموں سے کہ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔''جب وہ وارڈ منتقل ہوا تو صبح سب اُس سے ملنے آئے تھے۔تب ہی مقدّم نے اُس سے شکوہ کیا تو وہ مسکرایا۔چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے،پر اب وہ خطرے سے باہر تھا۔آکسیجن ماسک اب بھی لگا تھا کہ پھیپڑوں کے زخم مندمل ہونے میں وقت درکار تھا۔

''حسین کیسا ہے؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے وہ بھی،تم فکر نہ کرو۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''تمہیں کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟''پھر فکر مندی سے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم پیچھے بھی ہٹ جاؤ یہاں سے۔۔۔''اُسی لمحے رضا نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر زبردستی پیچھے ہٹایا تو عمر کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تو میں بات بھی نہ کروں اُس سے؟''اُس نے منہ بنایا۔

''کر تو لی اتنی باتیں،اب پیچھے کھڑے رہو سکون سے۔''رضا کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم ٹھیک ہو نا عمر؟''پھر اُس نے عمر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُس نے ابھی ابھی میری اِسی بات کا جواب دیا تھا۔''مقدّم نے جتایا۔

''میں ٹھیک ہوں اب!''عمر مزید بحث نہیں چاہتا تھا،لہٰذا فوراً جواب دیا۔

''نوید کہاں ہے؟''اُسکی متلاشی نظروں نے نوید کو ڈھونڈا۔

''باہر ہی ہے،ڈاکٹر سے بات کر رہا ہے۔تمہارے ابّو مجھ سے ناراض ہیں۔''جواب علی نے دیا۔

''وہ یقیناً مجھ سے بھی ہوں گے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ عمر کے والدین بھی وہیں آ گئے۔امی تو اُسکی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں، جبکہ ابّو ناراض سے، دور دور سے ہی اُسے دیکھ رہے تھے۔

وارڈ پار کر کے دوسرے وارڈ کی طرف نظریں گھمائی جائیں، تو ایس ایس پی نوید عالم نے ابھی ابھی، عمر سے مل کر آنے والے رضا کے حوالے ولید کو کیا ہے، اور اب وہ حسین کے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ولید بھی رضا کے ساتھ بیٹھا بڑے مزے سے رول کھا رہا تھا، جو اُس نے اپنے باپ سے فرمائش کر کے مانگا تھا۔ تین روز میں وہ نوید سے اچھا خاصا مانوس ہو چکا تھا۔

وہ حسین کے کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہا تھا۔ بستر اوپر کی جانب ہو رکھا تھا، پر وہ ٹیک لگائے سامنے بے آواز چلتے نیوز چینل کو دیکھ رہا تھا۔ نوید کو اندر آتے دیکھا تو نظریں اُسی کی جانب گئی۔

''تم ٹھیک ہو؟''نوید نے اُسکے قریب آ کر سوال کیا۔

''تم گھر نہیں گئے؟''نوید عالم کی عادت حسین کے اندر منتقل ہو رہی تھی شاید!

''آج چلا جاؤں گا۔ تم کیسے ہو؟''اُس نے سوال دہرایا۔

''ایمان کا کیا ہوا؟''آج وہ اُس کو بھی مات دے رہا تھا۔ نوید نے گہری سانس بھر کر اُسے دیکھا۔

''زیرِ حراست ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُسے اپنے شوہر کے کالے کاموں کا کچھ علم نہ تھا۔ البتہ وہ گرفتار اپنے جرم کی بنا پر ہوئی ہے۔''

''میں اُسکے خلاف کوئی بیان نہیں دینا چاہتا۔''حسین نے آہستگی سے کہا۔

''تم بیان دو یا نہ دو، لیکن اُس نے قانون ہاتھوں میں لیا ہے۔ سزا تو ہو گی ہی اُسے۔ اور ابھی عمر کا بیان بھی باقی ہے۔''یکدم ہی حسین کو احساس ہوا کہ وہ صرف حسین کی مجرم نہیں تھی۔ وہ عمر کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے تھک کر سر پیچھے گرا لیا۔

''پریشان نہ ہو، تمہارے ماموں کی فیملی ابھی کچھ دیر قبل ہی اُسکی ضمانت کے لیے آئی ہے، اُمید ہے وہ گھر چلی جائے۔ البتہ مقدمہ تو اُس پر چلے گا۔''نوید نے اُسے تسلی دی۔

''ہمم!''اُس نے فقط اتنا ہی کہا۔

''مجھے تمہاری حفاظت کرنی تھی، پر نہیں کر سکا۔''حسین نے بغور اُسے دیکھا، سر وائیول گلٹ، ہوں مہ!

''تمہیں افسوس تو ہو گا؟''حسین نے کہا تو نوید نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''کس بات کا؟''

''یہی کہ میں نے تمہاری جگہ لے لی۔'' بڑی ہی بے موقع اور غیر متوقع جگت ماری تھی اُس نے۔

''میں چوبیس گھنٹے ہسپتال میں نہیں پڑا رہتا۔'' وہ برا مان گیا۔

''ہاں! پر سال کے بارہ مہینوں میں سے چھے مہینے تو پڑے رہتے ہو۔'' اُس نے چڑایا۔

''میرے خیال سے تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' نوید نے جتایا۔

''اور میرے خیال سے تمہیں اب انسان بن جانا چاہیے۔'' اُس نے دوبدو کہا۔ نوید کے کچھ بھی کہنے سے قبل دروازہ کھلا اور حور عین اندر داخل ہوئی۔ روئی روئی سوجی سی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟'' حسین نے ایسے پوچھا، جیسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیوں رو رہی ہے؟

''تم زندہ جو بچ گئے۔'' اُس نے سوں سوں کرتے کہا تو نوید نے ذرا اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''کتنا افسوس ہو رہا ہو گا نا تمہیں، اچھا بھلا جان چھوٹ رہی تھی مجھ سے؟'' حسین نے پوچھا۔

''ہاں! اتنا اچھا موقع گنوا دیا۔'' اُس نے بھی باز نہیں آنا تھا۔

''نہیں حور عین بی بی! میں رنڈوا ہو جاؤں گا، پر تمہیں بیوہ نہیں ہونے دوں گا۔'' اُس نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو وہ ہنسی۔

''جب تم یہاں سے ڈسچارج ہو جاؤ تو۔۔۔'' کمرے میں نوید کی آواز گونجی تو دونوں نے رک کر اُسے دیکھا۔

''تو یہاں ایک نفسیات کے بہترین ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ اُن سے ضرور ملاقات کرنا۔۔۔ دونوں!'' وہ سنجیدہ تھا۔ بے حد سنجیدہ۔ دونوں ہنس دیئے۔ وہ سر جھٹکتے مسکرایا۔

''آرام کرو! میں چلتا ہوں اب۔'' وہ کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ پیچھے حور عین کی پھر سے سسکنے کی آواز آئی تھی، یقیناً اندر کا غبار حسین کے سامنے ہی باہر آنا تھا۔

وہ باہر آیا تو پہلا سامنا رضا سے ہوا۔ مقدّم اور علی نہیں تھے۔

''باقی دونوں کہاں ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''دونوں گھر چلے گئے ہیں۔میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''اچھا کیا اُنہوں نے۔اب سب کو ہی گھر چلے جانا چاہیے۔''اُس نے کہا۔

''ہاں! اور یقیناً تمہیں اور ولید کو بھی۔''رضا نے مسکراتے ہوئے ولید کو اُسکے حوالے کیا۔

''اسے اب اِسکی ماں سے،اور اِسکے گھر والوں سے مزید دور نہیں رہنا چاہیے۔''اُس نے نوید کو کہا۔

''تم کیسے رہو گے اِسکے بغیر؟''نوید نے جانچتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں نے امانت سمجھ کر پالا ہے۔اور امانت لوٹانے کے لیے ہی ہوتی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ساتھ ہی چلتے ہیں۔''نوید نے یکدم ہی کہا تو وہ رکا۔

''تمہارے گھر؟''وہ حیران ہوا۔

''نہیں! بشریٰ توامی کی طرف ہے۔مجھے وہیں جانا ہے تو تمہیں بھی پناہ گاہ چھوڑ دوں گا۔تب تک تم ولید کے ساتھ کچھ وقت گزار لینا۔''اُس نے کہا تو رضا مسکرایا۔وہ احساس سے عاری ہر گز نہ تھا۔

اب دونوں پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک کو اب ولید کے بغیر رہنا تھا۔

اور دوسرے کو اُسکے ساتھ۔۔۔

دونوں کے لیے یہ ایک نیا احساس تھا۔

--------+---------+----------

ماں کا دل۔۔۔

سمندر سے زیادہ گہرا۔۔۔

موم سے زیادہ نرم۔۔۔

چاند سے بھی زیادہ پیارا۔۔۔

ماں کا دل۔۔۔۔

تین روز سے بشریٰ سخت بے چین تھی۔دل کرتا تھا کہ قبرستان جائے پر نہ جاتی کہ نوید سے وعدہ کیا تھا۔دل تڑپ تڑپ جاتا۔بار بار لگتا جیسے اُسکے بیٹوں کی خوشبو آرہی ہے۔وہ ولید کے کپڑے نکال کر دیکھتی،اُسے سینے سے لگاتی،اُسکا فیڈر جو اُس نے آج تک سنبھال کر رکھا تھا،اُسکے کھلونے۔۔۔پتہ نہیں کیوں پر آج دل بہت تڑپ رہا تھا۔جزااُسکی بے چینی صبح سے محسوس کر رہی تھی پر خاموش تھی۔وحید بھی بیوی بچوں سمیت اُس سے ملنے آیا تھا،پر وہ بھی خاموش تھا۔نوید نے اُن دونوں کو بشریٰ کو کچھ بھی بتانے سے منع کیا تھا۔شام ہوتے تک جب اُسے لگا کہ دل کی بے چینی اب حد سے سوا ہو گئی ہے،اور شاید اُسکا دل اب برداشت نہیں کر پائے گا،تب ہی۔۔۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھلا،اور دراز قد نوید دروازے پر کھڑا نظر آیا۔بشریٰ اُسے ایک ماہ بعد سامنے دیکھ کر بے چین ہو کر کھڑی ہوئی اور تب ہی اُسکی نظریں اُس بچے پر پڑیں۔وہ جسکا پورا ہاتھ نوید کی ایک انگلی کو تھامے کھڑا تھا۔دوسرے ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑے وہ اشتیاق سے گھر کو دیکھ رہا تھا۔

بشریٰ سن سی رہ گئی۔۔۔

ہوائیں۔۔۔سانسیں۔۔۔سماعتیں رک گئی۔۔۔

احساسات۔۔۔جذبات۔۔۔محسوسات۔۔۔سب منجمد ہو گئے۔۔۔

وہ ویسا ہی تھا۔اُسکی سوچوں جیسا۔۔۔اُسکے خواب جیسا۔۔۔

چہرہ معید جیسا اور آنکھیں بشریٰ جیسی۔۔۔۔

وہ آگے بڑھی۔ایک ایک قدم اٹھاتی۔۔۔اُس پر سے نگاہیں نہ ہٹاتی۔۔۔

آیا وہ نظریں پل بھر کو بھی ہٹائے تو وہ غائب ہو جائے۔۔۔

آیا وہ پلکیں جھپکائے اور اِس خواب سے آنکھیں کھل جائیں۔۔۔

وہ کب اُسکے پاس پہنچی معلوم نہیں؟وہ نوید کو۔۔۔اُسکی موجودگی کو فراموش کر گئی اور نوید ساکت سا اُسے دیکھنے لگا۔اُسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔

بشریٰ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ولید کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔وہ چہرہ جو اُس روز وہ تھام نہ سکی تھی۔آج کوئی شیشے کی دیوار نہ تھی،یہ خواب بھی نہ تھا۔ننھا ولید آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''وا۔۔۔ولید۔۔۔''اُس نے پہچان لیا۔ماں کے دل نے اپنی اولاد کو لمحوں میں پہچان لیا۔نوید ساکت آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔اُسے اُمید نہ تھی،اُسکے تصور میں بھی نہ تھا۔کہ وہ اُسے یوں پہچان لے گی۔

''یس !آئی ایم ولید۔(ہاں !میں ولید ہوں۔)''اُس نے خوش ہو کر بتایا۔بشریٰ کو معلوم ہی نہ تھا،ساری عمر کے جمع آنسو آج ہی بھل بھل گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''یہ۔۔۔یہ ولید ہے؟یہ میرا ولید ہے۔۔۔یہ ولید ہے نا؟میرا بیٹا ہے نا؟''وہ نوید سے پوچھ رہی تھی۔رو رہی تھی،تصدیق کر رہی تھی۔۔۔نوید کی زبان منجمد تھی،الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔اُس نے آنسوؤں کا سمندر لیے آنکھوں سمیت،سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''اوہ۔۔۔''بشریٰ کے گلے سے جیسے چیخ برآمد ہوئی تھی۔''اوہ!یہ میرا بیٹا ہے۔''وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چیخی تھی۔پتہ نہیں خوشی سے؟ حیرانگی سے؟یا بے یقینی سے؟

''فرح نے اسکو مارا نہیں تھا۔وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''جواب پیچھے کھڑے وحید نے دیا تھا۔دونوں نے ہی اُسے نہ دیکھا،نہ کچھ کہا۔

''میرا بچہ۔۔۔میرا بیٹا۔۔۔''بشریٰ نے تڑپ کر اُسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

''ولید۔۔۔۔میرا بچہ۔۔۔ولید۔۔۔''وہ اسے چومتی جاتی اور تسبیح کے دانوں کی طرح اُسکے نام کا ورد کرتی جاتی۔اور نوید کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے،وہ بشریٰ کو روتے ہوئے نہیں برداشت کر سکتا تھا۔اُسکا دل اِس معاملے میں بڑا کمزور تھا۔

بشریٰ کو روتا دیکھ کر ولید نے بھی گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔نوید نے ہاتھ بڑھا کر اُسے الگ کرنا چاہا پر وہ بھی بشریٰ سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا،ایسے اُسکے گلے سے چپک گیا جیسے صدیوں سے جانتا ہو۔ وہ دونوں اس اِس طرح رو رہے تھے کہ آس پاس کھڑے تمام لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔نوید اِس سے زیادہ،اِس منظر کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔وہ اٹھا اور غیر محسوس انداز میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آیا۔

اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا،چند قدم آگے آیا۔گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا اور پھر اپنا ماتھا فرش سے ٹکا دیا۔ آنسو اب فرش کو بھگونے لگے تھے۔

سجدہ شکر۔۔۔

شکر اس پر واجب تھا۔وہ تا عمر بھی سر نہ اٹھاتا تو بھی کم تھا۔وہ جانے کتنی دیر اس حالت میں رہا؟اُسے یاد نہیں۔پھر کمرے کا دروازہ کھلا،وہ تب بھی اسی حالت میں رہا۔کسی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی۔اُس نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا تو بشریٰ سامنے تھی،اُسی کے ساتھ گھٹنوں کے

بل بیٹھی۔اُسکی گود میں،اُسکے دوپٹے کو ننھے ننھے ہاتھوں میں جکڑے ولید بھی تھا۔نوید نے اُسکے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر دونوں کو اپنے ساتھ لگالیا۔ بشریٰ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اُسکے کندھے پر ٹکا دیا۔

بالآخر طویل مسافت تمام ہوئی تھی۔

---------+---------+--------

شام کے سات بج رہے تھے۔موسم ابر آلود تھا،ہوا ٹھنڈی اور بارش کے قطروں سے گھلی ہوئی تھی۔وہ پہلے گھر گیا،پھر تازہ دم ہو کر اب اُسکے دروازے پر تھا۔اُس نے بیل پر ہاتھ رکھا اور اِس وقت تک رکھا،جب تک دروازہ کھل نہ گیا۔

''کیا مسئلہ ہو۔۔۔۔''جہاں مقدس کے الفاظ اُسے سامنے دیکھ کر منہ میں ہی رہ گئے تھے،وہیں مقدّم بھی مہینے بھر بعد اُسے سامنے دیکھ کر دل سے مسکرایا تھا۔

''تم؟''اُسکے منہ سے نکلا۔

''باہر ہی کھڑا رکھو گی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آجاؤ!''وہ سنجیدگی سے کہتی سامنے سے ہٹ گئی تو وہ کچھ کچھ حیران ہوتا اندر داخل ہوا۔لان میں نانی کی گود میں بیٹھا مکرم،اُسے دیکھ کر مچھلی کی طرح اُنکی گود سے نکل کر دوڑتا ہوا اُسکے پاس آیا تھا۔مقدم نے اُسے گود میں اٹھالیا،پھر اُسے دل بھر کر پیار کیا۔ نانی بھی اُس سے ملنے وہیں آگئی،پھر کچھ دیر اُس سے بات چیت کرنے کے بعد چائے بنانے اندر چلی گئیں۔اِس دوران مقدس خاموش ہی بیٹھی رہی۔

''شادی کی شاپنگ شروع کر دی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''شادی کی شاپنگ؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں!میں نے کہا تو تھا کہ جب میں واپس آؤں گا تو ہم شادی کر لیں گے۔''وہ حیران ہوا۔

''اوہ ہاں!امی ابو آجائیں۔کوئی تاریخ طے ہو جائے تو پھر دیکھتے ہیں۔''اُس نے عجیب روکھا پھیکا سا جواب دیا تو مقدّم نے گہری سانس بھر کر مکرم کو گود سے اتارا۔وہ گھاس پر کھیلنے لگا۔

''کس بات پر ناراض ہو؟''براہِ راست سوال کیا۔

''کسی بات پر نہیں!''نروٹھے انداز میں کہا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم ناراض نہیں ہوتی۔''اُس نے شرارت چھپاتے کہا۔

''ہاں! کہا تھا۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ تم ناراض کرنے والے کام کرو۔''اُس نے گھورتے ہوئے کہا تو اب کہ وہ ہنسا۔

''ہنسو مت! مجھے اخلاق بھائی نے کچھ دنوں پہلے ہی بتا دیا تھا سب۔''

''اُس نے بتا دیا یا تم نے زبردستی اُگلوالیا؟''

''بات نہ گھماؤ!''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''یعنی میں اتنی سی بھی اہم نہیں ہوں تمہارے لیے؟''ہاتھوں کی چٹکی بنا کر پوچھا۔

''تم بہت اہم ہو میرے لیے، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کوئی تمہیں نقصان پہنچائے۔''عجیب سی وضاحت دی۔

''پر تم بتا سکتے تھے، بتانے سے نقصان نہیں پہنچتا مجھے۔''اُس نے جتایا۔

''یعنی مجھے وضاحت دینی پڑے گی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواباً وہ خاموش رہی۔ وہ ہنسا۔ ناراض ناراض سا انداز پیارا لگا اُسکا۔

اب وہ اُسے سب کچھ بتا رہا تھا۔

کبھی کبھار وضاحت ضروری ہوتی ہے۔۔۔

اور وضاحت دینا برا اتنا برا بھی نہیں۔۔۔

---------+---------+--------

''تمہیں تو کلر کرنا بھی نہیں آتا، تمہیں ڈول ہاؤس سجانا بھی نہیں آتا، تمہیں میرے بال باندھنا بھی نہیں آتے۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں آتا بھائی!''علی ایک ماہ بعد اپنے گھر میں داخل ہوا تو جو پہلی آواز کانوں میں پڑی وہ نشمیہ کی ہی تھی، جو اپنے بھائی کو اُسکی تمام تر نااہلیاں گنوا رہی تھی۔ وہ بیساختہ مسکرایا۔ دل و روح میں جیسے سکون سرائیت کر گیا۔ موسم بھی اچھا تھا، اندر بھی اور باہر بھی۔

اُس نے لاؤنج میں قدم رکھے، جہاں نشمیہ اپنی ڈرائنگ بکس، رنگ برنگے مارکر اور پینٹ پھیلائے اپنے بھائی کو ڈرائنگ سکھا رہی تھی۔ اور اُسکے بھائی کو چار و ناچار یہ کرنا پڑ رہا تھا۔

''تمہیں بھی تو فٹبال نہیں آتی؟''گھر کے خاکے میں رنگ بھرتے احمد نے چڑے ہوئے انداز میں کہا۔یہ اُسکا ناپسندیدہ ترین کام تھا۔

''پر میں تمہارے ساتھ کھیلتی ہوں نا!''اس نے یاد دلایا تو خاموشی سے دونوں کو دیکھتا علی مسکرایا۔یقیناً دونوں بہن بھائیوں میں کوئی معاہدہ ہوا تھا۔

''ہاں تو میں بھی تو کلر کر رہا ہوں نا!''وہ مزید جھنجھلایا۔

''میں فٹبال اچھا کھیلتی ہوں،پر تم ڈرائنگ بالکل اچھی نہیں کرتے۔''اُس نے جتایا۔

''تم کب اچھا فٹبال کھیلتی ہو؟انتہائی برا کھیلتی ہو تم۔''احمد نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''میں تو چھوٹی ہوں نا!''اُسکا پسندیدہ جملہ۔اِس بار علی بے ساختہ ہنسا تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

''بابا!''دونوں ایک ساتھ چیخے تھے،اور اگلے ہی لمحے دونوں دوڑتے ہوئے اُسکے پاس آئے تھے۔نشمیہ بھی۔۔اور احمد بھی۔۔۔

علی نے دونوں کو گلے لگا کر خوب چوما۔

''بابا آ گئے۔۔۔میرے بابا آ گئے!''نشمیہ کی خوشی ہی کم نہیں ہو رہی تھی۔

''کیسے ہو میرے بچوں؟''اُس نے دونوں کو بھینچتے ہوئے کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔شور کی آواز سن کر سفیر صاحب بھی وہیں چلے آئے۔

''علی؟''اُسے دیکھ کر پہلے حیران ہوئے،پھر خوشی سے اُسکو آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

''شکر ہے تم صحیح سلامت واپس آ گئے۔وہ قاتل ملا؟کیا اُسے ڈھونڈ لیا ایف آئی اے نے؟''وہ ایک کے بعد ایک سوال کرنے لگے۔

''سب بتاؤں گا ابّا!آپ پریشان نہ ہو۔سب ٹھیک ہے اب۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں!میں بھی یہیں سوال کرنے کھڑا ہو گیا۔''وہ کہتے ہوئے سامنے سے ہٹے تو علی بھی صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ملازم لڑکا اُسکا سامان گاڑی سے نکال رہا تھا۔نشمیہ اور احمد اُسکے دائیں بائیں جم کر بیٹھ چکے تھے۔اور سفیر صاحب سامنے تھے۔اُس نے نظریں گھما کر سارے گھر کا جائزہ لیا۔پر فاطمہ آفندی کہیں نظر نہ آئی۔وہ نظر نہ آئی تو دل بے چین ہوا۔

''تمہاری امی کہاں ہے؟''اُس نے آہستگی سے احمد سے پوچھا۔

''وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔''اُس نے بتایا تو علی نے اثبات میں سر ہلایا،پھر سفیر صاحب کو دیکھا جو بغور اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''فاطمہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟''اُس نے اُن سے پوچھا۔

''خود پوچھ لو۔''اِس جواب پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

''میں پوچھ لوں گا۔بس! جاننا چاہ رہا تھا کہ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔''اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''تو یہ بھی اُسی سے جان لو۔''انہوں نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تو اُس نے دانت پیسے۔

''مجھے بھوک لگی ہے، کھانا کھانا ہے۔''اُسی لمحے نشمیہ نے اعلان کیا۔

''مجھے بھی لگی ہے۔کھانے میں کیا ہے؟''علی نے بھی اُسکا ساتھ دیا۔

''امی نے بریانی بنائی ہے۔''احمد چہکا تو علی مسکرایا۔

''پھر تو میں نہا کر آتا ہوں۔سب ساتھ مل کھائیں گے، بریانی کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔''وہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔پھر اُنہیں لاؤنج میں چھوڑتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔سیڑھیوں کے پاس ایک مرتبہ رک کر اوپر ضرور دیکھا کہ شاید فاطمہ نظر آجائے پر وہ نظر نہ آئی۔ وہ بھی سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آگیا۔

ابھی اُس نے کمرے میں قدم رکھے ہی تھے کہ پلنگ کی دوسری جانب بنی شیشے کی کھڑکیوں کے پاس فاطمہ جائے نماز پر بیٹھی نظر آئی۔ہلکے پیازی رنگ کے لباس میں اُسکا چہرہ دوپٹے میں لپٹا چمک رہا تھا، وہ بڑی یکسوئی سے دعا مانگ رہی تھی۔اُسے دیکھ کر علی ٹھٹک کر رکا۔وہ سمجھا تھا کہ فاطمہ اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہو گی، پر وہ تو یہاں تھی۔ اُسکے پر سکون اور پر نور سے چہرے کو وہ یک ٹک دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ وہ دعا ختم کر کے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتی اٹھی، پھر جائے نماز طے کرتی مڑی تو نظریں علی پر پڑیں۔

وہ پہلے حیران ہوئی، پھر بے یقین۔۔۔

اور جب یقین آیا تو گڑبڑائی۔۔۔

''وہ مم۔۔۔میں۔۔۔۔اصل میں۔۔۔''سمجھ نہیں آیا کہ علی کو اپنی یہاں موجودگی کا کیا جواب دے؟

''تم کب آئے؟''کچھ سمجھ نہ آیا تو یہی پوچھ لیا۔

''کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔جب وہ جا رہا تھا تو فاطمہ بہتر حالت میں تھی، اب واپس آیا تھا تو وہ بہترین ہو چکی تھی۔پہلے سے صحتمند، تندرست، چمکتے ہوئے شاداب چہرے کے ساتھ۔

''وہ نشمیہ۔۔۔اکثر تمہارے کمرے میں رہنے کی ضد کرتی تھی تو میں بھی یہیں آگئی تھیں۔''اُس نے خود ہی وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں! تم کیسی ہو؟''اِس سوال پر وہ حیران ہوئی۔ جو اُسکے لیے بڑی بات تھی، وہ علی کے لیے کچھ نہ تھی۔

''بہتر ہوں!''اُس نے سر ہلاتے کہا۔'' کھانا لگادوں؟''پھر پوچھا۔

''ہاں! میں چینج کر کے آتا ہوں۔''وہ کہتے ہوئے الماری کی طرف بڑھا تو پیچھے کھڑی فاطمہ نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ پر اب دیر ہو چکی تھی۔

علی نے الماری کھولی تو نیچے ریک میں چند جوڑے فاطمہ کے بھی رکھے نظر آئے۔ اُس نے خاموشی سے اپنے کپڑے نکالے اور پلٹ کر باتھروم کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے دیکھا تھا یا دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا؟ فاطمہ کو نہیں معلوم تھا۔ پر وہ بری طرح شرمندہ تھی۔

پر علی کو معلوم تھا، اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے سنگھار میز پر رکھی فاطمہ کی کنگھی، اُسکی کیچر اور اُسکی کچھ دوائیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ مستقل یہاں رہ رہی تھی۔ علی کو برا نہیں لگا، وہ نشمیہ کی ضد اچھے سے جانتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ نہا دھو کر باہر آیا تو کمرہ خالی تھا۔ نہ فاطمہ وہاں تھی نہ اُسکی کوئی شے۔ اُس نے بلا ارادہ ہی الماری کھولی تو اب اُسکے جوڑے بھی وہاں نظر نہ آئے۔ مطلب وہ چلی گئی تھی؟ اُسکا یا اُسکی چیزوں کا یہاں ہونا علی کو برا نہیں لگا تھا، پر اُسکا جانا ضرور لگا تھا۔

باہر آیا تو میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ بریانی کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فاطمہ کھانا لگا کر بیٹھی تو علی بھی اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر برابر میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ تو ساکت ہی رہ گئی۔ سفیر صاحب پہلی مرتبہ مسکرائے، پر وہ بھی بے نیازی سے بچوں کی پلیٹوں میں کھانا نکالنے لگا۔ بچوں کے بعد اُس نے ایک اور پلیٹ میں کھانا نکالا اور فاطمہ کے آگے رکھ کر اب اپنے لیے کھانا لینے لگا۔ ایسے جیسے روز ہی یہ کرتا ہو۔ وہ چپ چاپ بیٹھی آنسو اپنے اندر اتارتی رہی تھی۔ اُس نے کیا گنوایا تھا، یہ احساس اُسے روز ستاتا تھا۔

''احمد! نشمی! دونوں تیار رہنا۔ ہم کھانے کے بعد کہیں چلیں گے۔''کھانے کے دوران اُس نے دونوں بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کہاں؟''احمد نے پوچھا۔

''کیا ڈال ہاؤس لینے جائیں گے؟''نشمیہ اور اُسکی خواہشات۔

''سرپرائز ہے۔''وہ مسکرایا۔

''مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟''سفیر صاحب نے پوچھا۔

''سرپرائز خراب ہو جائے گا ابّا!''علی سے پہلے نشمیہ نے سمجھداری سے کہا تھا۔ وہ ابھی تک اُنہیں دادا نہیں کہتی تھی۔

''میری بیٹی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔''علی نے طرفداری کی۔

''تو پہلے تھوڑا آرام کر لو، ابھی ہی تو اتنے لمبے سفر سے آئے ہو۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''گھر آتے ساتھ ہی میری تمام تھکن اتر گئی ہے۔ اور ذرا ضروری کام ہے۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''دیکھتے ہیں بھئی کہ کیا سرپرائز ہے۔'' وہ بھی کہتے ہوئے کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔

جبکہ فاطمہ خاموش ہی رہی تھی۔

شاید اُسکی اہمیت اب اتنی ہی تھی۔

---------+---------+--------

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟'' رات جب ولید سو گیا تو اُسکے ننھے ہاتھوں کو چومتے بشریٰ نے نوید سے پوچھا تھا۔

''میں خود انجان تھا۔'' اُس نے ولید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ قدرتی طور پر بشریٰ کے ساتھ پر سکون ہو گیا تھا۔

''اللہ نے کیسے نواز دیا ہے؟ یقین اب تک نہیں آ رہا۔ ایسا لگتا ہے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ کہیں کوئی جگا نہ دے۔'' اُس نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

''اللہ نہ کرے کہ یہ خواب ہو۔'' نوید دہل کر بولا۔

''تمہارا شکریہ نوید!'' اُس نے یکدم ہی کہا تو وہ حیران ہوا۔

''کس لیے؟'' وہ حیران ہوا۔

''تم نے مجھے کسی لمحے اکیلا نہ چھوڑا۔ اُس وقت بھی جب میں ذہنی مریضہ تھی۔'' اُس نے کہا۔

''جب میں بہت برا تھا، جب میں کچھ بھی نہ تھا۔ کیا تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا؟'' اُس نے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔

''نہیں چھوڑا تھا۔'' نفی میں سر ہلاتے خود ہی جواب بھی دیا۔ ''تم نے میرا اچھا برا ہر رویہ سہا تھا۔ میرے برے دنوں میں میرا ساتھ دیا۔ پھر میں کیسے چھوڑ دیتا تمہیں؟ اور پھر تم میرا واحد اثاثہ تھی۔ میری پوری دنیا! میں کیسے تم سے الگ ہوتا؟'' اُس نے پہلی بار اپنی زندگی میں اُسکی اہمیت کا اظہار کیا تھا۔ وہ مسکرائی، پھر ولید کو دیکھنے لگی۔

''تم خوش ہو؟'' نوید نے پوچھا۔

''معید کی موت کا غم ہے،اور کبھی ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ہاں! پر ولید کے آنے سے بہت کم ہو گیا ہے۔میں رب کی ناشکری نہیں کر سکتی۔اُس نے میرا بیٹا مجھے واپس دے دیا۔''اُس نے سچ کہا۔

''اب کبھی نہیں روؤ گی نا؟''نوید نے پوچھا تواُس نے نم آنکھوں سے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔نوید نے ایک اور خوبصورت منظر آنکھوں میں قید کر لیا۔

''ارے! تمہارے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں؟''اُس کو اچانک ہی خیال آیا تو سیدھا ہوا۔

''نہیں! کس نے کہا نہیں ہے؟بہت سے اچھے جوڑے رکھے ہیں۔''اُس نے فوراً سے آنسو پونچھتے جواب دیا۔کل نوید کی والدہ نے اپنے پوتے کی واپسی کی خوشی میں پورے خاندان کی دعوت رکھ دی تھی۔اسی بہانے بشریٰ کے گھر والے بھی ولید سے مل لیتے۔

''بالکل نہیں! کل تم نیا جوڑا پہنو گی۔اٹھو! ہم شاپنگ پر چلتے ہیں۔''نوید کہتے ہوئے واقعی کھڑا ہو گیا تو وہ گڑبڑائی۔

''پر یہ سو رہا ہے ابھی!''

''اُٹھا دو اسے۔اسکے لیے بھی شاپنگ کریں گے۔۔۔ڈھیر ساری!''اُس نے کہا۔

''ہاں! میں اِسکے لیے بہت سے کپڑے لوں گی۔اور کھلونے بھی اور۔۔۔''وہ خوشی خوشی گننے لگی اور نوید مسکراتے ہوئے اُسے سنے گیا۔اِس یقین کے ساتھ کہ اب زندگی سدا یونہی رہے گی۔

---------+---------+--------

دروازے پر ہوتی دستک پر انہوں نے ٹی وی پر چلتی خبروں کی آواز کم کی اور پلٹ کر کچن کی جانب دیکھا۔سب مصروف تھے،یقیناً دروازہ انہوں نے ہی کھولنا تھا۔وہ خاموشی سے اُٹھے اور دروازے کی جانب آئے۔جیسے ہی دروازہ کھولا،اُنکی آنکھیں ساکت رہ گئیں۔جو انھوں نے دیکھا تھا،اُس پر یقین نہیں آیا۔

''تم؟''لبوں سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''نانا ابو! میں آگئی۔''اِس سے قبل کہ علی کوئی جواب دیتا،نشمیہ اُسکے پیچھے سے چلاتی ہوئی نکلی اور دوڑ کر اپنے نانا کے گھٹنوں سے لگ گئی۔

''نشمی!''انہوں نے چہرہ نیچے کر کے دیکھا تو وہ تھوڑی اُنکے گھٹنے پر ٹکائے،معصوم آنکھوں سے اُنہیں ہی دیکھ رہی تھی۔انکا دل بھر آیا،فوراً جھک کر اُسے گود میں اٹھا لیا۔

''میری گڑیا!''پھر اُسے خوب پیار کیا۔علی کی سانسیں بحال ہوئیں۔جو کام اُسے مشکل لگ رہا تھا،وہ اُسکی بیٹی نے آسان کر دیا تھا۔

''نانا!''علی نے اشارہ کیا تو احمد بھی جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔

''احمد؟تم احمد ہو؟''انہوں نے بے یقینی سے دیکھا۔اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔جب آخری بار دیکھا تھا تو وہ چار سال کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ فاطمہ نے احمد کو علی سے لینے سے قبل ہی گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں رہائش اختیار کر لی تھی۔پر احمد کے ساتھ چلے آنے کے بعد اُس نے وہ خط لکھ کر نشمیہ کو اُنکے حوالے کیا اور کہا کہ آخری بار اُسکا ایک کام کر دیں۔نشمیہ کے لیے۔۔۔اور صرف اُسی کے لیے وہ راضی ہو گئے تھے۔

''میرا احمد!''انہوں نے بایاں ہاتھ اُسکے سر پر رکھا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''کتنے لمبے ہو گئے ہو تم؟''اُنکی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔علی مسکرایا۔یہ نانا نانی،اور دادا دادی بھی کتنی عجیب مٹی سے بنے ہوتے ہیں؟اپنے بچوں سے جتنے ناراض ہوں اور انکی اولاد سے ذرا بھر بھی ناراض نہیں رہ پاتے۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''علی نے ادب سے پوچھا تو شہیر صاحب کو یاد آیا کہ وہ بھی یہاں ہے۔

''ہاں!آ جاؤ۔''انہوں نے راستہ دیا تو وہ اندر آیا۔پھر وہ اُن سب کو لیے اپنے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔نشمیہ تو نانا کی گود سے ایسا چپکی کہ پھر اُتری ہی نہیں۔

''تم کونسی کلاس میں آ گئے ہو احمد؟''انہوں نے پوچھا۔

''کلاس فور!''اُس نے بتایا۔

''ماشاءاللہ!تم تو بہت سمجھدار ہو گئے ہو۔''انہوں نے پیار سے کہا۔

''میں بھی ہوں سمجھ۔۔۔''سمجھ سے آگے نشمیہ کو سمجھ نہ آیا کہ کہنا کیا ہے؟شہیر صاحب اور علی بے ساختہ ہنس دیئے۔

''میری بیٹی نے مجھے یاد کیا؟''انہوں نے اُس سے پیار سے پوچھا۔

''ہاں!بہت سارا۔۔۔''اُس نے دونوں بازو پھیلا کر بہت سارا کی مقدار بتائی۔

''میں نے بھی!''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا،پھر سامنے بیٹھے علی کو دیکھا۔

''تم تو اسے یتیم خانے نہیں چھوڑنے والے تھے؟''انہوں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو علی مسکرایا۔غالباً وہ ناراض تھے۔

''میں غصّے میں تھا،صدمے میں تھا۔لیکن شکر کہ میں نے اپنی عقل نہیں کھوئی۔''اُس نے وضاحت دی تو وہ چپ رہے۔

''نشمیہ آپکو یاد کرتی ہے۔میں آپکا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بیٹی کو اتنی محبت سے رکھا۔''اُس نے دل سے کہا تھا،پر وہ افسردہ سے ہو گئے۔

''میں نے اسے محبت دی، پر وہ مقام نہ دے سکا جو ایک بیٹی کو اپنے باپ کے گھر میں ملتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ اب اپنے گھر میں ہے۔'' انہوں نے نشمیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے کہا۔

''اپنی بیٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اِس سوال پر وہ حیران ہوئے۔

''کیا مطلب؟''

''آپ جانتے ہیں کہ میں نے فاطمہ سے شادی کر لی ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''جانتا ہوں۔'' فاطمہ کے ذکر پر اُنکے چہرے پر ناگواری در آئی تھی۔

''تو آپ کیوں نہیں آئے اُس سے ملنے؟ وہ انتظار کرتی رہی تھی آپکا۔'' علی نے کہا۔

''تمہارا دل اُسے معاف کرنے پر کیسے تیار ہوا، مجھے نہیں معلوم! پر میرا دل اتنا بڑا نہیں ہے۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''میں نہیں مانتا۔'' اِس غیر متوقع جواب پر انہوں نے حیرت سے علی کو دیکھا۔

''معاف میں بھی نہ کرتا اُسے، پر میں نے اپنے بچوں کے لیے، اور صرف اُنکی محبت میں اُسے واپس اپنایا ہے۔ جب میں اپنے بچوں کی محبت میں ایسا کر سکتا ہوں تو آپ اپنی اولاد کی محبت میں اُسے معاف نہیں کر سکتے؟ میں نہیں مانتا کہ جس بیٹی کے بچوں سے آپکو اتنی محبت ہے، اُس بیٹی سے آپکو محبت نہ ہو۔ جبکہ وہ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔'' اِس بات پر وہ ٹھٹھکے۔

''موت کے منہ سے؟'' اُنکی زبان لڑکھڑائی تھی۔

''ہاں! اُسے ٹی بی ہو گیا تھا۔ پھیپھڑوں پر اثر پڑا تھا، سانس لینے میں بھی دشواری ہوتی تھی، کھانستی تھی تو خون تھوکتی تھی۔ لیکن اب الحمدللہ بہت بہتر ہے۔ علاج اب بھی چل رہا ہے، لیکن خطرے والی بات نہیں ہے۔'' اِس بات پر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔

''میں جانتا ہوں آپ اُس سے ناراض ہیں۔ پر نفرت انسان کے گناہ سے کرنی چاہیے، انسان سے نہیں۔ کیونکہ اگر ہم انسان سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں تو، جب وہ گناہ چھوڑتا ہے، تب بھی ہم اُسے معاف کرنے پر، اور بخشنے پر تیار نہیں ہوتے۔ جبکہ ایک معافی تو سب کا حق ہے۔ اُس نے جو بھی کیا، پر اب وہ بدل چکی ہے۔ اپنے کیے کا نقصان بھی اٹھا چکی ہے۔ اُسے معاف کر دیں، سدھرنے کا ایک موقع دے دیں۔ پلیز انکل!'' اُس نے جیسے التجا کی تھی۔

''پلیز نانا!'' حالانکہ نشمیہ کو سمجھ کچھ نہ آیا تھا کہ کیا گفتگو چل رہی ہے؟ پر اپنے باپ کی بات دہرانا اُس پر فرض تھا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیئے۔

فاطمہ ابھی عشاء پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ پورچ میں علی کی گاڑی داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ خاموشی سے میز پر کھانا لگانے لگی۔ پتہ نہیں وہ لوگ کہاں گئے تھے؟ اور پتہ نہیں کھانا کھا کر بھی آئے تھے یا نہیں؟ اُسے لاؤنج میں نشمیہ کے دوڑنے اور علی کی اُسے ٹوکنے کی آواز آنے لگی تھی۔ گھر پھر سے جاگ اٹھا تھا۔

وہ کھانا میز پر لگا کر پلٹی تو ساکت رہ گئی۔ آنکھوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ شہیر صاحب سامنے تھے۔ بالکل سامنے۔۔۔

''اب۔۔۔ابّو!'' اُسکے لب ہلے۔ شہیر صاحب کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

''ابّو!'' وہ بھرائی آواز میں کہتی اُنکے پاس آئی، وہ اُنکی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔

''ابّو۔۔۔'' وہ اِس ایک لفظ کے آگے کچھ کہہ ہی نہ پاتی تھی۔ بس بلکتے چہرے کے ساتھ انہیں اِس اُمید پر دیکھ رہی تھی کہ وہ خود ہی سمجھ جائیں۔

سفیر صاحب شاید کہیں جانے کے لیے تیار باہر آئے تھے، پر اُن دونوں کو وہاں دیکھ کر وہ بھی حیرت سے رک گئے۔

''میری بیٹی!'' انہوں نے آگے بڑھ کر فاطمہ کو سینے سے لگایا اور اُس نے ایک زور کی ہچکی بھری اور پھر تڑپ تڑپ کر رو دی۔

بالآخر انہوں نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ سفیر صاحب نے علی کو دیکھا۔ تو یہ تھا اُسکا سرپرائز؟ پھر اُس کے قریب آئے اور اُسکے گرد بازو پھیلا کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اِس ایک لمس میں فخر، مان اور غرور کے تمام تاثرات یکجا ہو گئے۔ علی کا دل آج مکمل ہو گیا۔ اُسکے باپ کو اُس پر فخر ہوا تھا۔ بے حد فخر۔۔۔۔

شہیر صاحب کے سینے سے لگی روتی فاطمہ نے ایک نظر سرخ آنکھوں سے دور کھڑے علی کو دیکھا۔ پھر عقیدت و تشکر سے سر ہلا دیا۔

جیسے اُسکا شکر ادا کر رہی ہو۔

چیزیں جگہ پر آ گئی تھیں، رات فاطمہ نے ضد کر کے شہیر صاحب کو کھانے پر روک لیا۔ سفیر صاحب کو کہیں جانا تھا تو وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ کھانے کے بعد علی، شہیر صاحب کو خود گھر چھوڑنے گیا تھا۔ وہ دونوں کو گھر آنے کی دعوت، اور فاطمہ کو ڈھیر ساری دعاؤں سے نواز کر چلے گئے۔

فاطمہ کے دل میں آج علی کا مقام اور اونچا ہو گیا تھا، اتنا زیادہ کہ وہ اُس تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اُسکی اہمیت نہیں ہے۔

ابھی رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ اُسکے موبائل پر کال آنے لگی۔ اُس نے اٹھا کر دیکھا تو علی کی کال تھی۔ وہ حیران ہوتی اُٹھ بیٹھی، برابر میں نشمیہ سوئی ہوئی تھی۔ احمد اپنے کمرے میں تھا۔ اُس نے فون اٹھایا اور آہستگی سے اُٹھ کر کنارے پر ہوئی۔

''ہیلو!''

''کیا تم جاگ رہی ہو؟'' علی کا سوال عجیب سا تھا۔ اُسے ہنسی آئی، پر ضبط کر گئی۔

''ہاں! جاگ رہی ہوں۔'' فوراً سنجیدگی سے کہا۔

''باہر آسکتی ہو؟ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اُس نے کہا تو وہ حیران ہوئی۔

''آتی ہوں۔'' وہ فون کاٹنے لگے کہ علی یکدم ہی بولا۔

''چادر لیکر آنا۔'' اِس بات پر وہ مزید حیران ہوتی، چادر ہاتھ میں لیے باہر آگئی۔ ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا تو علی لاؤنج میں کھڑا نظر آیا۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے نیچے آتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''باہر چلو میرے ساتھ! کچھ بات کرنی ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''بچے گھر میں اکیلے ہیں۔''

''ابّا آگئے ہیں۔'' اُس نے پیچھے کی جانب اشارہ کیا تو فاطمہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ علی کو دیکھا تو انگوٹھا اٹھا کر سب ٹھیک ہے کا اشارہ کر دیا۔ اُس نے نا سمجھی سے انھیں، پھر علی کو دیکھا۔

''چلو آجاؤ!'' وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی خاموشی سے اُسکے پیچھے آئی تو وہ دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ فاطمہ بھی دروازے سے باہر نکل کر گلی میں آگئی۔ علی نے دروازہ بند کر دیا۔ اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے، اُسکے ساتھ پیدل چلنے لگا۔ گلی ویسے تو خالی ہی تھی، پر اکا دکا لوگوں نے مڑ کر بغور دیکھا ضرور تھا۔ اِس لمحے وہ بری طرح شرمندہ ہوا تھا۔ اُس نے ایسی ہی ایک رات کو فاطمہ کو دھکے مار کر گھر سے نکالا تھا، اِس تماشے کے یہ لوگ گواہ تھے۔ کچھ چیزوں کو وہ چاہ کر بھی تبدیل نہیں کر سکتا تھا، سوائے سدھارنے کے۔

گلی سے نکل کر دونوں باہر آگئے، سامنے سوسائٹی کا پارک تھا، اتنا رش نہیں تھا پر خالی بھی نہ تھا۔ فاطمہ گاہے بگاہے اُسے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتی جو پورے راستے خاموش رہا تھا۔

''علی!'' بالآخر جب پارک میں آکر بھی وہ خاموش رہا تو، اُس نے پکارا۔

''ہونہہ!'' وہ جیسے کسی خیال سے چونکا۔

''تمہارا شکریہ!'' وہ ہچکچائی، پر شکریہ کرنا ضروری تھا۔ ٹریک پر چلتا علی رکا اور مکمل طور پر اُسکی طرف گھوم گیا۔ جامن کا گھنا درخت اُنکے سروں پر آگیا۔

''تمہارے پاس شکریہ اور معافی کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہے؟''اس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیا مطلب؟''اُس نے حیرت سے کہا۔

''گول گپے کھاؤ گی؟''اُس نے بالکل غیر متوقع سوال کیا۔وہ ساکت نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''میں لیکر آتا ہوں۔''وہ اُسے محوِ حیرت چھوڑے گول گپّے کے اسٹال کی جانب چلا گیا۔وہ کچھ حیران پریشان سی،درخت کے نیچے رکھی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی اُسکے چہرے کو منور کر رہی تھی۔چادر اُس نے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔کچھ دیر بعد علی واپس آگیا،اُسکے ہاتھوں میں گول گپے کی ایک ہی پلیٹ تھی۔اُس نے درمیان میں رکھ دی اور بینچ پر بیٹھ گیا۔

''یہ۔۔۔''وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔

''تم کھا سکتی ہو۔ڈاکٹر نے منع نہیں کیا ہے۔''علی نے کہتے ہوئے ایک گول گپا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔

''ہمم۔۔۔نائس!''اُس نے تعریف کی۔اُسکے انداز ہی نرالے تھے آج تو۔۔۔

''میں نے چار سال بعد کھایا ہے اسے۔وہ اور بات ہے کہ میں نے تمہاری بیٹی کی پلیٹ سے کھانے کی کوشش کی تھی پر اُس نے چکھنے بھی نہ دیا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔براہِ راست۔۔۔۔

فاطمہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جمع ہونے لگے۔لب کپکپائے،آنکھیں ڈبڈبائی۔پھر اس اُس سر جھکا لیا۔

''کیا ہوا؟''علی نے پوچھا۔حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا ہوا ہوگا؟پر پھر بھی چاہتا تھا کہ وہ بولے۔

''میں نے بہت کچھ گنوا دیا علی!''اُس نے پہلی بار اپنے دل کی بات ایسے کہی کہ اُسے علی سے جھجھک نہ تھی۔جیسے دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ تو تھا ہی نہیں۔وہ مسکرایا۔

''میں نے بھی!''اُس نے آہستہ سے اعتراف کیا تو اُس نے نم آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''اچھا!چلو یہ ختم کرو۔ہمیں گھر بھی جانا ہے۔''اُس نے پلیٹ اُسکے سامنے کی۔ایسے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''تمہیں تو مجھ سے بات کرنی تھی۔''اُس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''گھر جا کر کر لیں گے۔لوگ گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''تو ہم کونسا ٹین ایجر ہیں جو سب گھور رہے ہیں؟''اُس نے بیساختہ ہی کہا تو علی نے غور سے اُسے دیکھا اور پھر ہنس دیا۔

''میں لگ رہا ہوں گا بے شک! پر تم تو نہیں لگتی نادو بچوں کی ماں۔''ایک بار پھر فاطمہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔ تعریف۔۔۔ستائش۔۔۔یہی وہ شے تھی جسکے لیے وہ ترستی تھی کبھی۔

''تم ایسے کیوں کر رہے ہو؟''اُس نے اچانک پوچھا۔اُسے نہ اپنی کیفیت سمجھ آ رہی تھی نہ علی کا انداز۔

''کیسے کر رہا ہوں؟''اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''جیسے نئی نئی شادی کے بعد کرتے تھے۔''اُس نے فوراً یاد دلایا۔

''ہماری نئی نئی شادی ہی ہوئی ہے۔''اُس نے شکل پر معصومیت سموتے کہا۔اِس بار فاطمہ ہنسی۔۔۔بیساختہ۔۔۔نم آنکھوں والے چہرے کی ہنسی دلکش تھی۔

''تم کمرے سے اپنا سامان کیوں لے گئی؟''اُس نے عام سے انداز میں پوچھا تو وہ حیران ہوئی۔وہ باخبر تھا۔

''میں۔۔۔وہ تو بس کچھ دنوں کے لیے۔۔۔نشمیہ کی وجہ سے۔۔۔''اُس نے بے ربط سے جملوں میں بات مکمل کی۔

''پر وہ کمرہ تو تمہارا ہی ہے۔''اب کہ فاطمہ نے جواب نہیں دیا۔

گول گپے ختم ہو گئے تو دونوں اُٹھ گئے، پھر پیدل پیدل چلتے گھر کی طرف آنے لگے۔اِس مرتبہ دونوں کے درمیان خاموشی نہ تھی۔وہ بچوں کے متعلق پوچھتا،اور وہ اُسکی غیر موجودگی میں ہوئے واقعات اُسے بتانے لگتی۔جیسے وہ تو روز ہی ایسا کرتے ہوں۔

گھر میں داخل ہوئے تو علی لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔دوسری کرسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے بھی بیٹھنے کو کہا۔وہ بیٹھ گئی تو درمیان میں ایک کرسی جتنا فاصلہ رہ گیا۔علی اٹھا،اپنی کرسی کھینچ کر اُسکے برابر میں لگائی اور بیٹھ گیا۔

''فاطمہ!''اُسے پکارا۔دل سے۔۔۔پورے دل سے۔۔۔

''ہونہہ!''آنکھوں کو کوئی مسئلہ تھا شاید۔پانی وہاں پھر سے جمع ہونے لگا۔اُس نے کتنے عرصے بعد اتنے پیار سے پُکارا تھا۔

''میں ہنسنا نہیں جانتا تھا۔بہت تلخ زندگی تھی میری۔بہت محدود سوچ تھی۔پھر تم میری زندگی میں آئی۔اور تم نے مجھے ہنسنا سکھایا۔چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خوشیاں کیسے ڈھونڈتے ہیں؟میں نے تم سے سیکھا تھا۔''رات کے جامد سناٹے میں،خاموش لان میں صرف علی کی ہی آواز تھی۔

''لیکن میں نے اپنی خوشی، اپنی نعمتیں اپنے ہاتھوں سے گنوائی۔ میں ناشکرا تھا، ناقدرا تھا۔''

''علی!'' اُس نے کچھ کہنا چاہا پر اُس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''میں یہاں یہ حساب کرنے نہیں بیٹھا کہ کون کتنا غلط تھا؟ یا کس کا جرم زیادہ تھا اور کس کا کم؟ میں یہاں صرف اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے بیٹھا ہوں۔ مجھے کرنے دو۔ مجھے اپنے خوابوں کی قربانی تم سے نہیں مانگنی تھی، مجھے تمہاری خوشیوں کو اپنے خوابوں کے بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے تھا۔ اگر میں ایک شادی شدہ زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لائق نہیں تھا، تو مجھے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا؟ ابّا ناراض رہتے مجھ سے؟ تو وہ تو تم سے شادی کرنے کے بعد بھی مجھ سے ناراض ہی تھے۔ کونسا فرق پڑ جاتا؟ اور اگر کر ہی لی تھی شادی، تو مجھے نبھانا بھی تھا۔ پر مجھے نبھانا ہی نہ آیا فاطمہ!'' اُسکی آواز بھرائی۔ ''تمہارے جائز مطالبات پر، چھوٹی چھوٹی خواہشات پر میں نے تمہیں ایسے شرمندہ کیا جیسے تم نے کوئی بے جا مطالبہ کر دیا ہو۔ حالانکہ تم نے مجھ سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ کبھی بھی نہیں! صرف اتنا کہا تھا کہ اپنی زندگی سے تھوڑا سا وقت مجھے بھی دے دینا۔'' اُسے یاد تھا۔ سب یاد تھا۔۔۔

''اور میں نے وقت ہی نہیں دیا۔ میں سمجھتا رہا کہ پیسہ کما کر میں تم سب کو بہترین زندگی دے دوں گا۔ لیکن جب تک پیسہ آیا تب تک میں نے سب کھو دیا۔ اور میں مزید بھی گنوا دیتا اگر۔۔۔'' وہ رکا اور اُسے دیکھا۔

''اگر تم نشمیہ کو میرے پاس واپس بھیج کر میری زندگی پر احسان نہ کرتی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے احسان نہیں کیا، اپنی غلطی سدھارنی چاہی تھی۔'' اُس نے کہا۔

''پر تمہاری بیٹی نے مجھے سدھار دیا۔'' وہ ہنسا، تو وہ بھی مسکرائی۔

''دس سال قبل تم نے مجھے ہنسنا سکھایا تھا۔ اور آج دس سال بعد تمہاری بیٹی نے بھی وہی کام کیا، لیکن۔۔۔'' وہ رک گیا۔

''لیکن؟'' اُس نے چہرہ اُٹھا کر پوچھا۔

''تمہاری کمی ہے فاطمہ!'' فاطمہ کا دل جیسے رک گیا۔

''میں تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں، پھر سے تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ میرا گھر تم سے ہی تھا اور تم سے ہی ہے، اور تم ہی مکمل کر سکتی ہو۔'' اُس نے خواہش کی، اور پوری سچائی سے کی۔

''میں؟ میں تو۔۔۔'' اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ اور علی سمجھ گیا۔

''چھوڑ دو پرانی باتوں کو، بھول جاؤ اُنہیں۔ پہلے میں نے مستقبل کی فکر میں زندگی برباد کی تھی، اب ماضی کے پچھتاؤں میں زندگی نہ گزارو۔ زندگی بہت چھوٹی ہے فاطمہ !اِس بار میں کچھ بھی گنوانا نہیں چاہتا۔''اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسکے آنسو صاف کیے۔

''وہ مجھے مارتا تھا، بیلٹ سے۔۔۔''اُس نے علی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تو اُس نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔ پر اُسے کہنے دیا، کہ وہی اُسکا غمگسار تھا، اُسکا لباس تھا۔ علی نے اُسکا ہاتھ تھام لیا۔

''وہ میرا ہاتھ جلا دیتا تھا، میرا کھانا بند کر دیتا تھا، مجھے گالیاں دیتا تھا۔ اور تب مجھے تم یاد آتے تھے۔۔۔''وہ کہہ رہی تھی، اور علی سن رہا تھا۔ وہ اُسے بولنے دے رہا تھا۔ اُسے بول لینا چاہیے، بول کر دل ہلکا کر لینا چاہیے۔ تاکہ اب ماضی کا کوئی پچھتاوا دل میں نہ رہے۔

--------+---------+----------

کیسی ہو؟''ابھی وہ مارٹ سے کچھ ضرورت کا سامان لے کر، گھر کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ برابر سے رضا آتا دکھائی دیا۔ جینز پر پوری آستینوں والی پولو ٹی شرٹ پہنے، وہ عام سے حلیے میں تھا۔

''پہلے جیسی !''اُس نے ایک لفظی جواب دیا۔ آج موسم اچھا تھا، اندر بھی اور باہر بھی۔ لہٰذا وہ بھی چہک رہی تھی۔

''پر میں تو پہلے جیسا نہیں رہا۔''اُس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے بیچارگی سے کہا۔ ہلکی ہلکی پھوار جاری تھی۔

''میں نے کب پوچھا؟''لٹھ مار انداز میں کہتے کندھا اچکایا۔

''پر میں نے سوچا کہ بتا دوں۔''اُس نے بڑی معصوم شکل بنا کر کہا۔

''میں آج پناہ گاہ نہیں آسکوں گی۔ آج گھر میں ولید کی واپسی کی خوشی میں دعوت ہے۔''اُس نے بتایا۔

''واقعی؟ کیسا ہے ولید؟''وہ خوش ہوا۔ ولید کو اُسکا خاندان مل گیا اور کیا چاہیے تھا؟

''بہت اچھا ہے۔ اور مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ میرے اتنے قریب تھا۔ اور مجھ سے اتنا مانوس بھی!''وہ کہنے لگی، سیاہ آنکھوں میں نمی در آئی۔

''یہ سب ایسے ہی لکھا تھا۔''اُس نے کہا۔

''پتہ ہے کل پہلی بار نوید بھائی بہت خوش تھے۔ تمہارا ذکر بار بار کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ۔۔۔''وہ رکی۔

''کہ؟''وہ سیدھا ہوا۔۔۔ متجسس بھی۔

''کہ رضا نے میری ذات پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ بدلے میں جو مانگ لے، بنا ماتھے پر شکن لائے دے دوں گا۔'' جزا نے خوشی خوشی بتایا۔

''پر میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ اور نہ مجھے کسی بدلے کی چاہ ہے۔'' اس بات پر جزا کی مسکراہٹ سمٹی۔ کبھی جو کوئی بات سمجھ جائے یہ خود سے۔۔۔۔

''ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔'' اُس نے جتانا چاہا۔۔۔ سمجھانا چاہا۔۔۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی، بلکہ تمہارا شکریہ کہ تم نے میرے پیچھے پناہ گاہ کا اتنا خیال رکھا۔'' اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ایسے کہا جیسے وہ واقعی عقل سے پیدل ہو۔

''احسان نہیں کیا میں نے۔۔۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا اور دروازہ کھولنے لگی۔

''سنو!'' سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے اُس سانولی رنگت والے پر کشش مرد نے پکارا۔

''کیا ہے؟'' سیاہ آنکھوں پر سیاہ کاجل لگائے، سانولی لڑکی نے ناراضگی سے دیکھا۔

''تمہیں کسی احسان کے بدلے میں تھوڑی مانگنا ہے۔ تمہیں تو پوری عزت و احترام کے ساتھ، دامن پھیلا کر مانگنا ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
قریب کوئی گاڑی آ رہی تھی شاید!

''میں نے ایسا کب کہا؟'' اُس نے یہاں وہاں دیکھا۔ یہ پرپوز کرنے کا کونسا طریقہ تھا؟

''پر میں نے تو یہی کہنا تھا۔'' وہ مسکرایا۔ گاڑی رکی، دروازہ کھلا اور نوید اُترا۔

''بھائی!'' جزا اُسے دیکھ کر حیران ہوئی، اور رضا پتھر۔۔۔

''تم باہر کیا کر رہی ہو؟'' بشریٰ کی طرف کا دروازہ کھولتے اُسکے لہجے میں حیرت تھی۔ کسی فوجی کی طرح اکڑ کر کھڑے رضا نے زحمت بھی نہ کی دیکھنے کی۔ یہ ایس ایس پی صاحب ہمیشہ غلط وقت پر انٹری کیوں دیتے تھے؟

''میں دعوت کی تیاری کے لیے کچھ سامان لینے گئی تھی، امی کو ضرورت تھی۔'' اُس نے کہا۔

''ارے تو نوید کو کہہ دیتی۔'' ولید کو گود میں لیے بشریٰ نے گاڑی سے اترتے کہا۔ رضا کو سامنے دیکھ کر ولید اُسکی گود میں مچلنے لگا تھا۔

نوید قریب آیا اور رضا کو دیکھا، اور رضا نے اُسے۔۔۔

''کیسے ہو؟'' رضا نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ اُس نے ہاتھ ملایا اور ذرا بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔

''میں نے مس جزا کو دیکھا تو سوچا پوچھ لوں کہ آج یہ پناہ گاہ کیوں نہیں آئیں؟'' زندگی میں دوسری بار اُس نے بنا پوچھے وضاحت دی تھی۔ پہلی بار بھی اسی شخص کو دی تھی۔

''تو؟'' ایس ایس پی صاحب کو نہ کل کوئی فرق پڑا تھا اور نہ آج۔ جزا نے اُسکی حالت سے حظ اٹھاتے مسکراہٹ دبائی۔ اور اِس سے قبل وہ کہ اِس تو کا جواب تلاشتا، بشریٰ نے ولید کو گود سے اُتارا اور وہ بھاگتا ہوا رضا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اُس نے جھک کر اُسے گود میں اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔

''میرے جگر کے ٹوٹے۔۔۔ کیسے ہو؟'' اُس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بڑے اچھے وقت پر جان بچائی تھی اُس نے۔

''آپکو پتہ ہے میں نے کل ریموٹ والی کار لی ہے۔'' اُس نے رضا کو بتایا۔

''اوہ! کس نے دلائی؟'' اُس نے جان کر پوچھا۔

''اُنہوں نے۔۔'' اُس نے نوید کی جانب اشارہ کیا جو پیار سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''وہ آپکے بابا ہیں۔ اُنہیں بابا کہو۔'' اُس نے کہا۔ نوید اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

''بابا!'' اس نے فوراً مان لیا۔

''بابا!۔۔۔ بابا!'' اُسکی گود میں ٹیڑھے میڑھے ہو کر پلٹ کر نوید کو دیکھتا وہ ہنس ہنس کر اُسے بابا کہہ رہا تھا، جبکہ نوید اُسے نہال ہوتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اُنکو؟'' بشریٰ کی جانب اشارہ کر کے پوچھا کہ اُسے کیا کہوں۔

''مما کہو!'' رضا نے کہا تو وہ اب بشریٰ کو مما مما پکارنے لگا۔

''اور مجھے پھوپھو کہو!'' جزا نے آگے ہو کر پُرجوش ہوتے کہا۔

''نہیں!'' ولید نے یک لفظی جواب دے کر منہ پھیر لیا تو نوید بے ساختہ ہنسا تھا، جبکہ جزا منہ بسورنے لگی تھی۔ رضا نے فلحال خود کو ہنسنے سے باز ہی رکھا کیونکہ دونوں ہی بہن بھائیوں کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔

''کیا کیا آپ نے کل؟'' رضا، ولید سے بات کرنے میں محو تھا، وہ بھی اُسے نجانے کون کون سی کہانیاں سنانے لگا تھا۔

''کیا میں پناہ گاہ آسکتی ہوں؟'' کانوں میں بشریٰ کی آواز پڑی تو اُس نے رک کر دیکھا۔ نوید نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں عائشہ جی سے، ولید کے دوستوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں؟ ولید کا گھر آپکا بھی گھر ہے۔''رضا نے خوش دلی سے کہتے دروازہ وا کیا اور اُنہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ جبکہ نوید کی افسردہ نظریں ابھی بھی بشریٰ پر ہی تھیں۔ وہ جانتا تھا وہ کیا دیکھنا چاہتی تھی؟ وہ اُس جگہ کو دیکھنا چاہتی تھی، جہاں ولید بڑا ہوا تھا، جہاں اُس نے پہلی بار اپنے قدم اٹھانا سیکھے تھے، جہاں اُس نے بولنا سیکھا تھا، وہ اُسکا گزرا وقت محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''آجائیں اندر!''رضا نے اُنہیں اندر آنے کو کہا تو وہ آگے بڑھی، ولید رضا کی گود سے اُتر کر اندر بھاگ چکا تھا۔ نوید بھی اُسکے پیچھے آیا اور جزا بھی۔۔۔

''تمہیں تو امی کو سامان نہیں دینا؟''نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔

''دے دونگی، پر پہلے مجھے بھی عائشہ جی سے ایک کام ہے۔''وہ جلدی سے کہتی اُسکے برابر سے ہوتی اندر چلی گئی، آیا کہیں گھر واپس ہی نہ بھیج دے۔ رضا اُنہیں لیے اندر آگیا۔ آنے والوں کو دیکھ کر عائشہ جی کھڑی ہوئیں۔

''عائشہ جی! یہ ولید کے والدین ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''اُس نے اُنہیں اُنکا تعارف کروایا۔ بشریٰ تو اُنکے گلے لگ گئی۔ پھر وہ اُنہیں پناہ گاہ دکھانے لگا، ایک ایک بچے سے ملوانے لگا۔ جہاں ولید رہتا تھا، اُسکا کمرہ، اُسکا بستر، اُسکے کپڑے، کھلونے ایک ایک شے بشریٰ چھو چھو کر دیکھتی، محسوس کرتی رہی۔

''مما! یہ میرا نمبر بلاکس۔۔۔''ولید اپنے نمبر بلاکس اُٹھا کر بشریٰ کو دکھانے لایا۔ اور وہ لفظ **مما** کی چاشنی میں کھونے لگی۔

''آؤ! تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔''رضا نے نوید سے کہتے ہوئے ایک بورڈ گیم سامنے کھولا اور اُسے چھوٹی میز پر رکھا۔ پھر ولید کو قریب بلایا، جزا کے پاس کوئی میسج آیا تو وہ غیر محسوس انداز میں وہاں سے باہر نکل گئی۔

''ولید! یہ گن کر بتاؤ کہ بورڈ پر کتنے اسکوائرز (چکور خانے) ہیں۔''اُس نے ولید سے کہا تو نوید کے ساتھ ساتھ سب کو اُمید تھی کہ وہ باقی بچوں کی طرح سارے خانوں کی گنتی کر کے نتیجہ بتائے گا۔ لیکن۔۔۔

''ون، ٹو، تھری، فور، فائیو۔۔۔''اُس نے پہلی رو کے تمام خانے گنے۔ پھر پہلے کالم کے دس خانے۔''فائیو ٹائم ٹین از ایکوال ٹو ففٹی۔۔ ٹوٹل ففٹی اسکوائرز۔۔۔ (پانچ مرتبہ دس، پچاس ہوتے ہیں۔ یعنی کل پچاس خانے۔۔۔)''اُس نے چند سیکنڈز میں جواب دیا تو لمحوں کو سب حیران رہ گئے۔ جبکہ رضا مسکرا رہا تھا۔

''اچھا فائیو ٹائمز فائیو (پانچ مرتبہ پانچ) کتنے ہوتے ہیں؟''رضا نے پوچھا۔

''ٹوئنٹی فائیو۔۔۔''اُس نے ایسے جواب دیا جیسے اُسکے لیے کوئی گیم ہو۔

''اور نائن ٹائمز نائن؟''

''ایٹی ون!''

''گڈ!''اُس نے ولید کا سر سہلاتے شاباشی دی۔

''یہ سب اس نے یاد کیا؟''بشریٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں! اسے میتھس پسند ہے۔ یہ چیزوں کی گنتی کرتا ہے۔اِسکے پاس نمبر بلاکس ہیں، وہ بلاکس کو جوڑ کر اندازہ لگتا ہے کہ کتنے بلاکس کتنی جگہ جوڑنے سے کل تعداد کیا ہوگی؟ یہ موبائل میں بھی نمبر گیمز کھیلتا ہے، اور کارٹون میں بھی نمبر بلاکس ہی دیکھتا ہے۔اسے بس یہی پسند ہے۔''رضا نے بتایا۔

''میں تو اتنا ذہین نہیں تھا۔یہ کس پر چلا گیا؟''نوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اپنے تایا پہ۔۔''اِس آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا تو جزا کے ساتھ وحید کھڑا تھا، پیچھے اُسکی بیوی بھی تھی۔

''معاف کرنا تمہاری اجازت کے بنا آ گیا۔''وحید نے رضا کو دیکھ کہا تو وہ مسکرایا۔

''کوئی بات نہیں!'' بچے اشتیاق سے اتنے سارے نئے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔

''ذہین تو رضا بھی بہت ہے، میں نے تو اکاؤنٹس اور فائنانس سے تنگ آ کر ایم بی اے نہیں کیا، جبکہ یہ تو پوزیشن ہولڈر تھا۔''نوید نے رضا کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہیں بتایا۔

''یہ کیا انگلش بھی شوق سے پڑھتا ہے؟''بشریٰ نے پاس رکھی انگریزی حروف کی کتاب ہاتھ میں لیتے پوچھا۔

''کوشش کر کے تھک چکے ہیں پر اسے انگلش کے الفابیٹس (حروف) کبھی یاد نہیں ہوئے، نہ اسے اُنکی پہچان ہوئی کبھی۔ شاید اِسکی دلچسپی نہیں ہے۔ہم نے بھی چھوڑ دیا کہ وقت کے ساتھ سیکھ جائیگا۔''رضا نے بتایا۔

''حالانکہ اِسکے باپ نے انگریزی میں ماسٹرز کر رکھا ہے۔''وحید نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر مجھے اچھے سے پڑھا لیتے تو میں بھی میتھس اچھے سے پڑھتا۔''نوید نے بھائی پر چوٹ کی تو وہ ہنسا۔

''میں نے تو اسے پہلی بار بولتے ہوئے، چلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔''بشریٰ نے جانے کس احساس کے تحت افسردگی سے کہا تھا۔نوید کا چہرہ یکدم دکھ سے بھر گیا، پر اُس نے کچھ نہ کہا۔البتہ رضا کے ذہن میں کوئی خیال ضرور کوندا تھا، پر فلوقت وہ خاموش رہا۔

''ہمارے گھر دعوت ہے، آپ سب بھی آئیں نا!''ملائکہ (وحید کی بیوی) نے کھڑے کھڑے سب کو دعوت دی۔

''بہت شکریہ! لیکن آج مجھے کچھ کام ہے۔''اُس نے کہا۔

''ارے تو کوئی بات نہیں! ہم تمہارے لیے الگ سے ڈنر رکھ لیں گے۔''وحید نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''اِسکی کیا ضرورت ہے؟''

''بھئی ایک ڈنر تو تمہارے ساتھ بنتا ہے۔''وحید نے کہا۔وہ سب رضا کے ساتھ اس طرح سلوک کر رہے تھے جیسے وہ انہی کے خاندان کا حصہ ہو۔انکا دوستانہ رویہ اُسے اچھا لگا۔

''دعوت ٹھکراتے نہیں ہیں۔''جزا نے پہلی بار کہا تو وہ چونکا۔

''چلیں! پھر جب آپ بلائیں میں پوری کوشش کروں گا۔''وہ راضی ہو گیا تو نوید نے بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔ابھی تو نہیں مان رہا تھا یہ؟

عائشہ جی چائے کے ساتھ لوازمات لے آئیں تو سب نے بیٹھ کر خوشگوار ماحول میں چائے پی، بچوں سے ملاقات کی۔وحید نے تو رضا کا باقاعدہ انٹرویو ہی لے لیا۔نجانے کیوں؟

جبکہ نوید خصوصاً جزا کے برابر میں ایسے ٹک کر بیٹھ گیا کہ اُس پر نظر ہی نہ پڑے۔ واپسی پر وہ اُنہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔

''آپکا ایک بار پھر بہت شکریہ!''بشریٰ نے جاتے ہوئے اظہار تشکر مناسب سمجھا۔ولید کا سامان، عائشہ جی نے، اُسے پیک کر کے دے دیا تھا۔

''شکریہ کہہ کر میرے خلوص کو شرمندہ نہ کریں بھابھی!''اُس نے بھابھی کہا تو نوید نے ذرا چونک کر دیکھا، اُسے اچھا لگا تھا۔ وہ مسکرائی، پھر سب نے واپسی کی راہ لی، وحید نے اُس سے اچھے سے مصافحہ کیا، پھر جب سب ہی چلے گئے تو صرف وہ اور نوید وہاں رہ گئے۔

''تم ہسپتال گئے تھے آج؟''نوید نے اُس سے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں گیا، رات کو علی کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔مقدّم گیا تھا تو اُس سے بات ہوئی تھی۔'' اُس نے عام سے انداز میں بتایا۔

''علی کے ساتھ؟''اُس نے بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھا۔واقعی؟ تم نے علی کہا؟

''کیوں؟ میں اُسکے ساتھ نہیں جا سکتا؟''اُس نے اُس سے بھی زیادہ حیرت سے پوچھا، تو اُس نے سر جھٹکا۔ اور سامنے دیکھنے لگا۔

''اظہر کی کیا خبر ہے؟''رضا نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''کیس چل رہا ہے عدالت میں، میڈیا پر بھی کافی شور مچا ہوا ہے۔ پیر پریشر بھی بہت ہے۔ لیکن دیکھتے ہیں کہ ججز اتنا پریشر برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں؟''
اُس نے تفصیل سے بتایا۔ رضا اُسے بغور دیکھ رہا تھا، یہ آدمی فقط اپنی بیوی کی موجودگی میں ہی مسکراتا تھا کیا؟

''چلو! اللہ بہتر کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ چیزوں کا انجام خوشگوار انداز میں ہوا ہے۔'' اُس نے کہا تو نوید سر ہلاتے ایک قدم آگے بڑھا، پھر رکا اور اُسے دیکھا۔

''مجھے ایک بات یاد آئی۔''

''کیا؟'' رضا نے کچھ حیرت سے دیکھا، اُسکے سنجیدہ چہرے پر یکلخت ہی دوستانہ سا تاثر اُبھرا۔

''تم نے کہا تھا بھائیوں میں کوئی قرض نہیں ہوتا۔''

''ہاں!'' وہ مسکرایا۔

''تو۔۔'' وہ رکا، پھر آگے آیا اور اُسے گلے لگا لیا۔

نوید عالم کی جانب سے پہلی پیش قدمی۔۔۔

پہلا اظہار۔۔۔

واپسی کی منزل پر پہلا قدم۔۔۔

''بھائی کو گلے تو لگا سکتے ہیں نا؟'' اُس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔ رضا کچھ بھی نہ کہہ سکا، بس ذرا سی نم آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

''تم نے جو میرے لیے کیا ہے، بدلے میں تم جان مانگو تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔'' اُس نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''نہیں! تمہاری جان لیکر میں کیا کروں گا؟'' اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو نوید ہنسا۔

''لیکن تم یہ بار بار احسان اور شکریے کا راگ الاپنا بند کرو ورنہ میں دوبارہ دوستی ختم کر سکتا ہوں۔'' رضا نے ذرا دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''دوستی ہوئی کب تھی؟'' اُس نے ایسے پوچھا جیسے بڑی کوئی حیران کن بات کی ہو رضا نے۔ جبکہ اُس نے پہلے چند منٹ گھورا، پھر دونوں ہنس دیئے۔

کچھ دیر بعد وہ اندر آیا تو دروازے پر کھڑی جزا کا منہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔

''تم کیا کر رہی تھی یہاں؟'' نوید نے ذرا حیرت سے آنکھیں وا کرتے اُسے دیکھا۔

''وہ میں آپکو بلانے آئی تھی۔''اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''ہاں! میں ذرا رضا سے کچھ بات کر رہا تھا،اس لیے رک گیا تھا۔''اُس نے موبائل میں آئے میسج کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ آپ رضا کو گلے کیوں لگا رہے تھے؟''اُس نے پوچھ تو لیا،پر نوید کو موبائل سے نظریں اُٹھا کر خود کو سنجیدگی سے گھورتا پایا،تو زبان دانتوں تلے دبائی۔

''وہ۔۔۔میرا مطلب۔۔۔''

''رضا کتنا بڑا ہے تم سے؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی؟''وہ حیران ہوئی،سوال کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔

''جتنا میں بڑا ہوں،اتنا ہی وہ بھی بڑا ہے تم سے۔''

''تو؟''وہ اب بھی نہ سمجھی۔

''بھائی بولا کرو اُسے۔۔۔''وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر یہ جا وہ جا ہو گیا۔جبکہ لان میں کھڑی بشریٰ کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہو گیا تھا۔

''بھائی بولا کرو۔۔۔ہونہہ!''اُس نے تپ کر نوید کی نقل اتاری تو اب کہ بشریٰ نے اپنی ہنسی نہیں روکی تھی۔

--------+---------+----------

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر میری اظہر سے شادی ہو جاتی تو؟''رات وارڈ میں حور عین نے اُسے سوپ پلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تو کیا؟ پھر میں آج ہسپتال میں نہ ہوتا۔''اُس نے حور کو دیکھتے مزے سے کہا۔

''کیوں؟اظہر تو تب بھی مجرم ہوتا۔''اُس نے گھورا۔

''کیونکہ تم میرے اوپر گولی نہیں چلاتی۔وہ ایمان تھی،اُسکے لیے میں پہلے بھی اظہر سے کم تر تھا۔آج بھی ہوں۔''اُس نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''چلو! تم یہ تو جان گئے کہ میرے لیے تم کتنی اہمیت رکھتے ہوئے؟''اُس نے اُسکا دکھ کم کرنے کے لیے بات بدلی۔

''یہ تو میں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔مجھے جب گولی لگی تو آخری چہرہ بھی تمہارا تھا۔آخری خیال بھی تمہارا آیا کہ اگر میں مر گیا تم برداشت نہیں کر سکو گی۔''اُس نے کہا تو حور عین کی آنکھوں میں یکدم ہی آنسو جمع ہونے لگے۔

''یہ مرنے ورنے کی باتیں نہ کرو میرے سامنے!''اُس نے آنسو صاف کرتے خفگی سے کہا۔

''میں نے تو وہ بتایا جو محسوس کیا۔ ویسے مجھے نہیں پتہ تھا تم روتے ہوئے بھی اتنی اچھی لگتی ہو۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو حور عین نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''گولی تمہارے سر پر تو نہیں لگی تھی، پھر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''اِس جواب پر حسین قہقہ لگا کر ہنسا، ہنسا تو کھانسی آگئی، کھانسا تو ٹانکوں میں درد اٹھا۔

''آہ!''وہ کراہ کر رہ گیا۔

''کس نے کہا ہے فضول میں ہنسنے کو؟''حور نے ڈپٹا۔

''تو کس نے کہا ہے جوک مارنے کو؟''اُس نے گھورا۔

''پاگل ہو تم!''اُس نے کہا۔

---------+---------+--------

ایک ماہ بعد:

حسین اور عمر کو آج ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ چاروں اُن سے ملنے آئے تھے۔ ایمان کی ضمانت ہو چکی تھی پر وہ کسی طور حسین سے بات کرنے اور اِس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی کہ اظہر مجرم ہے۔ حسین نے بھی اُسے اُسکے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

''تم اچھے بھلے ہو، زبردستی اپنے پورے وجود کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال رکھا ہے۔''اُسے پارکنگ تک لاتے مقدّم نے کہا تھا۔ حالانکہ اُسے وہیل چیئر پر آنا چاہیے تھا۔ پر وہ چلنا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں مقدّم سے خدمت کروانا چاہتا تھا۔

''ذرا سا سہارا کیا دے دیا، احسان جتانے لگ گئے؟''حسین نے ذرا مزید بوجھ اُسکے کندھوں پر منتقل کیا تو اُس نے گھورا۔

''اگلے مہینے سے پہلے چلنے کے قابل ہو جاؤ ورنہ شادی میں ایسے ہی آنا۔ لنگڑاتے ہوئے۔''مقدّم نے کہا۔

''تم شادی آگے بڑھاؤ! میں ایسے نہیں آوں گا۔''

''شادی اپنی تاریخ پر ہی ہو گی، تمہارے تو اچھے بھی آئیں گے۔''اُس نے حسین کو سہارا دے کر کھڑا کیا تو علی بھی گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ عمر کو رضا وہیل چیئر پر لے کر آیا تھا۔ نوید بھی وہیں تھا۔ پہلے سے خوش، پہلے سے مطمئن۔۔۔

''تم کہاں تھے اتنی دیر سے؟''مقدّم نے علی سے پوچھا۔

''پارکنگ سے گاڑی نکالنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا۔''عمر کو وہی لے کر جانے والا تھا۔ جبکہ حسین کے لیے اُسکے گھر والے آئے تھے۔

''تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔''عمر نے علی کو دیکھتے کہا۔

''ٹھیک ہے تم خود چلے جاؤ!''مقدّم کا ایک ہی کام تھا، دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانا۔

''تم اپنی زبان کے جوہر کم دکھاؤ پلیز!''رضا نے درخواست کی۔

''تم دونوں گھر جا کر آرام کرو، جلدی ٹھیک ہو۔ بہت کام ہیں کرنے کے لیے۔''مقدّم کو پہلے کب فرق پڑا تھا؟

''تم اپنی شادی میں اِن دونوں سے کام کرواؤ گے؟''علی کو یقین نہ آیا۔

''تم سے بھی!''وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''ایس ایس پی صاحب سے پنکھے صاف کروالینا۔''حسین نے مفت مشورہ دیا تھا۔

''میرے خیال سے تمہیں اب گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے۔''نوید نے آگے بڑھ کر اُسے دوسری جانب سے سہارا دیا تاکہ اُسے، اُسکے بھائی کی گاڑی تک لے جاسکے، اور تاکہ اُسکا منہ مزید چلنے سے روکا جاسکے۔

''تم لوگ گاڑی میں بیٹھنے میں عمر کی مدد کرو۔''نوید نے علی کو کھڑے دیکھ کر کہا۔

''کرتا ہوں، لیکن پہلے میں رضا کے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔''علی کی بے سر و پا بات کسی کو سمجھ آئی نہ آئی، پر عمر کی وہیل چیئر پر غور و خوص کرتے رضا نے سر اٹھا کر اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تم مجھے پیشگی معافی دے چکے تھے۔''اُس نے فوراً کہا۔

''میں نے تمہاری اعلیٰ ظرفی تک معافی واپس لے لی تھی۔''اُس نے جتایا۔

''میں ہرگز معافی نہیں مانگنے والا۔''اُس نے کہا۔

''میں روزِ محشر دیکھوں گا۔''اِس بات پر رضا نے دانت کچکچائے۔

''چلو! چلو! معافی مانگ کر اپنا اعمال نامہ صاف کرو جلدی! پھر مجھے گھر بھی جانا ہے، کام ہیں بہت کرنے کو۔''مقدم کی شادی نہیں ہو رہی تھی جیسے کوئی آفت آرہی تھی، اُسکے کام کے رونے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔

''شرم کرو! دوسروں کے گناہ نہیں گنتے۔''حسین نے اُسے شرم دلانی چاہی۔ جبکہ رضا منہ بناتے عمر کی وہیل چیئر کے پیچھے سے باہر آیا۔

''معافی ہی مانگنا۔''حسین نے لقمہ دیا تو سب ہنسے۔

''وہ۔۔۔اصل میں۔۔۔''رضا نے کان کھجائے۔معافی مانگنا آسان کام تھوڑی تھا؟

''ہاں ہاں بولو! میں سن رہا ہوں۔''وہ بھی ہمہ تن گوش تھا۔

''بات کچھ یوں ہے کہ۔۔۔۔''یہاں وہاں دیکھا،سب کے مسکراتے چہرے منہ چڑاتے لگے۔

''جلدی ختم کرو بھئی۔۔۔''مقدّم کو نجانے کس بات کی جلدی تھی؟سب نے اُسے گھورا۔ جبکہ علی منتظر۔۔۔۔

''آدمی تم اچھے ہو،پر تھوڑے گدھے ہو۔''یہ معافی تھی؟علی کا چہرہ حسبِ توقع،حسبِ امید،حسبِ تصور تپا۔باقی سب ایک مرتبہ پھر ہنسے تھے۔

''بھاڑ میں جاؤ!''رضا کا تکیہ کلام اُسی کے منہ پر مارتے وہ عمر کی طرف بڑھا۔جب رضا نے بازو پکڑ کر اُسے روکا،

پھر دیکھتی آنکھوں نے دیکھا۔۔۔۔

سنتے کانوں نے سنا۔۔۔۔

رضاالٰہی نے علی سفیر کو گلے لگالیا۔اُس نے مسکراتے ہوئے،پورے دل سے اُسکے گرد بازو تنگ کر لیا۔

معافی کی ضرورت کسے تھی بھلا؟

مسکراہٹ نے سب کے چہروں کا احاطہ کر لیا تھا۔۔۔

دوستی فضا میں رچ بس گئی تھی۔۔۔

ضروری نہیں کہ ہمیشہ پرانی باتیں دہرائی جائیں۔۔۔

شکوے شکایتیں کی جائیں۔۔۔

''شکر! معاملہ رفع دفع ہوا۔''مقدّم نے تو باقاعدہ سکھ کا سانس لیا تھا۔

''اب تمہاری شادی سکون سے ہو جائے گی؟''یہ پہلی جگت۔۔بالکل پہلی جگت ایس ایس پی صاحب کی جانب سے۔۔۔

''چلو! چلو! اسے گاڑی میں بٹھاؤ بھی!'' مقدّم نے کمال بے نیازی سے نظر انداز کرتے اُن دونوں کو کہا جو الگ ہو چکے تھے، پر چہرے سے خوش تھے۔

بالآخر۔۔۔

معاملہ تمام ہوا۔۔۔

---------+---------+--------

حسین گھر جا چکا تھا، عمر کو بھی علی نے اُسکے گھر چھوڑ دیا تھا۔ واپسی پر نوید کو اپنی والدہ کی طرف جانا تھا تو رضا نے اُسے ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی۔ ویسے بھی، آج کل وہ بلاوجہ ہی مسکراتا تھا۔ تو اُس سے ڈر بھی ذرا کم لگتا تھا۔ راستے بھر نوید کسی وجہ سے فون کال میں مصروف رہا۔ جبکہ دوسری جانب رضا بھی وہی کام کر رہا تھا۔ لیکن غیر محسوس انداز میں۔۔۔

''میں کہہ رہا ہوں یہ اچھا وقت ہے، بول دو اُسے۔ آج کل موڈ بھی اچھا ہے، ایسا نہ ہو بعد میں زبان کاٹ کر کوؤں کو کھلا دے۔'' دائیں کان میں لگے ہیڈ فون میں حسین کی آواز آئی، جو اپنے گھر پہنچ چکا تھا اور اب اُسکا دماغ چاٹ رہا تھا۔

''تم میرا حوصلہ بڑھا رہے ہو یا ڈرا رہے ہو؟'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ نوید بے حد مصروف تھا، دھیان اِس طرف نہ تھا۔

''دیکھو! میں تو سچ بات کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے فون پر ہی رکھنا، تاکہ میں تمہیں موقع کے حساب سے مشورہ دے سکوں۔'' حسین نے کہا۔ پناہ گاہ کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور نوید کو دیکھا۔ اُس نے انگلی سے دو منٹ کا اشارہ کیا تو رضا نے زبردستی مسکرا کر سر ہلایا۔

''میں اب بھی کہہ رہا ہوں، احتیاطاً گاڑی کا دروازہ کھلا رکھو۔ جان بچا کر بھاگنے میں آسانی ہو گی۔'' حسین وہاں اُسکا خون خشک کرنے ہی بیٹھا تھا۔ نوید کی بات ختم ہوئی تو اُس نے فون کاٹا اور اُسکی جانب دیکھا۔

''تھنک یو رضا! اور سوری تمہیں اتنی دیر انتظار کروایا۔'' نوید نے اپنی جانب کا دروازہ کھولتے کہا۔

''ایک منٹ!'' رضا نے فوراً کہا تو وہ رکا اور حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''تم سے بات کرنی تھی۔'' رضا نے ہچکچاتے۔۔۔ گھبراتے۔۔۔ تو تلاتے کہا۔

''ہاں! کہو۔'' وہ دروازہ بند کر کے مکمل اُسکی جانب متوجہ ہو گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہو گی جب ہی روکا ہو گا۔

''ڈرنا بالکل مت! سنجیدگی کے ساتھ، مکمل بردباری سے بات کرنا۔''حسین کا مفت مشورہ!

''تمہاری، میرے بارے میں کیا رائے ہے؟''اُسے پوچھنا کچھ تھا، پوچھ کچھ بیٹھا۔

''گدھے انسان! یہ سوال بعد میں کرنے کا تھا۔''رضا کے کانوں میں آواز اُبھری۔ جبکہ نوید نے ذرا مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''کیا تم کسی سے بات کر رہے ہو؟'' نوید نے پوچھا۔

''نہیں! نہیں! میں کسی سے کیوں بات کروں گا؟''رضا نے کال کاٹتے ہوئے ہیڈ فون کان سے اتارے، دوسری طرف حسین ارے، ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ اُس سے مشورے لینے سے اچھا تو خود ہی بات کر لیتا وہ۔

''تو میں یہ پوچھ رہا تھا، کہ تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟''اُس نے دوبارہ سوال دہرایا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟ میری تمہارے بارے میں اچھی رائے ہی ہو گی۔ تم دوست ہو میرے!''نوید انجان تھا؟ یا جان کر انجان؟ اُسکے دوست کہنے پر رضا کے حوصلے بڑھے۔

''ہاں! وہی میں کہہ رہا تھا کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ایک اچھا آدمی ہوں۔ اور میری زندگی کا ایک اچھا خاصا حصّہ تمہارے سامنے ہی گزرا ہے تو۔۔۔''وہ رکا، ہمت جواب دینے لگی۔ جبکہ نوید کہنی ڈیش بورڈ پر ٹکائے، چہرہ ہاتھوں کی مٹھی پر رکھے اُسے ہی دیکھ رہا، بلکہ گھور رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ایسا ویسا انسان بالکل نہیں ہوں اور میرا زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ۔۔۔''

''ایسا ویسا؟''نوید کو ایسا ویسا پر اعتراض تھا شاید!

''ایسا ویسا یعنی۔۔۔''اُس نے پھر کان کھجائے۔''یعنی میں کبھی کسی غلط کام میں ملوث نہیں رہا۔ تم تو جانتے ہی ہو مجھے۔۔۔''اُس نے تھوک نگلا۔ آخر اِس سے آگے بولا کیوں نہیں جا رہا؟

''تو؟''نوید نے گہری سانس لیتے سینے پر بازو لپیٹے۔ رضا نے اُسکے ماتھے پر پڑتے بلوں کو گنا اور غیر محسوس انداز میں دروازے کے لاک پر ہاتھ رکھ لیا۔ احتیاطاً!

''تو یہ کہ میں آج کل شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ بات ایسے شروع کی جا سکتی ہے۔

''اچھی بات ہے، میری کوئی ضرورت ہے تو ضرور بتانا۔''اُس نے گھورنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! وہی تو۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ میں جو مانگو تم دینے کو تیار ہو۔''اُس نے دل کڑا کر کے کہا۔اِس سے آسان تو لڑکی راضی کرنا ہوتا ہے۔یہ زیادہ مشکل تھا۔

''کہا تھا، تو؟''ایس ایس پی صاحب کا ضبط کسی بھی لمحے جواب دے سکتا تھا۔

''تو۔۔۔''اب سیدھے سیدھے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمہاری بہن کا ہاتھ چاہیے۔

''تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ کون مجھے اپنی بیٹی دے گا؟''پہلی بار۔۔۔ بالکل پہلی بار رضا کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔یکلخت ہی اُسکے اپنے ہاتھ لاک پر ڈھیلے پڑے۔یہ تو اُس نے سوچا ہی نہ تھا۔نوید کے ماتھے کے بل گم ہوئے، چہرے پر نرمی در آئی۔

''کیوں؟ ابھی تو تم نے کہا کہ تم اچھے آدمی ہو؟''اُس نے طنز نہیں کیا تھا۔اُس نے اُسے بتایا تھا، احساس دلایا تھا۔

''ہاں! پر اچھا ہونا کافی نہیں ہے۔خاندان ہونا، نام ہونا ضروری ہے، ایک صاف شفاف ماضی ہونا ضروری ہے۔ماں باپ ہونا ضروری ہے۔اور میرے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔''اُس نے آہستگی سے کہتے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔اُسے لگا شاید وہ کبھی جزا کا ہاتھ نہیں مانگ سکے گا۔

''اچھا ہونا کافی ہے رضا! اچھا ہونا ہی کافی ہے۔۔۔''نوید کی نرم آواز پر اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

''نام رکھنے والے، خاندان رکھنے والے، اور صاف شفاف ماضی رکھنے والے بھی ذہنی مریض نکل آتے ہیں۔زندگی برباد کر دیتے ہیں، اچھا ہونا ہی اہم ہے۔''اُس نے یقین دلاتے انداز میں کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو۔پڑھے لکھے ہو، قابل ہو، انسان دوست دل رکھتے ہو۔یہ کافی ہے۔''اُس نے دل سے کہا تو رضا مسکرایا۔

''لیکن۔۔۔''نوید رکا اور چہرے سے ساری مسکراہٹ غائب کی۔

''میں تمہیں ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ تم بیچ گلی میں کھڑے ہو کر میری بہن کو پرپوز کرو۔''اُس نے کہا تو سنجیدگی سے تھا پر آنکھوں میں کوئی چمک سی تھی، رضا کی ساری مسکراہٹ اُڑن چھو ہو گئی۔

''مم۔۔۔ میں تو۔۔۔ بس۔۔۔''وہ ہکلایا، تو تلایا، گڑبڑایا۔۔۔

''وحید بھائی اگلے ہفتے آئینگے، عائشہ جی کو لے کر آجانا بات کرنے۔''اُس نے ہونٹوں کے کناروں پر مسکراہٹ روکتے کہا، جبکہ رضا ہکا بکا رہ گیا۔

''کیا۔۔۔ کیا سچ میں؟''اُسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں!''پہلی بار نوید نے اُسکی حالت سے حظ اٹھاتے مسکراہٹ چھپائی نہیں۔

''تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟''وہ اب تک بے یقین تھا۔

''جزا کو نہیں ہے، تو مجھے بھی نہیں ہے۔''اُس نے کندھے اچکائے تو رضا کا وجود ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''پر وحید بھائی کو میرے بارے میں۔۔۔''وہ کچھ کہنے لگا۔

''اُنکی فکر نہ کرو، میں دیکھ لوں گا۔''اُس نے بات کاٹتے کہا تو رضا نے تشکر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''لیکن۔۔۔''نوید کی مسکراہٹ ایک مرتبہ پھر سنجیدگی میں ڈھلی تو وہ سیدھا ہوا۔جی جی! بالکل تیر کی طرح۔۔۔

''تب تک تم مجھے جزا کے آس پاس نظر نہ آنا۔ورنہ میری غیرت کبھی بھی جاگ سکتی ہے۔''اُس نے کہا تو رضا نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔اپنی آنکھیں پیاری تھیں اُسے۔۔۔

''تھینکس!''وہ گاڑی سے اترا تو رضا نے دل سے کہا، وہ سر ہلاتے اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔وہ اور بات ہے کہ گھر کے دروازے تک آتے آتے وہ مسکرایا ضرور تھا۔

---------+---------+--------

کمرے کے پردے ہٹے ہوئے تھے، باہر لان میں مالی کاٹ چھانٹ کرتا نظر آ رہا تھا۔سامنے ٹیبلٹ کھلا تھا جس پر عمر، مقدّم کے ولیمے کے ایونٹ کے لیے اسٹیج ڈیزائن کر رہا تھا۔یہ اُسکی طرف سے مقدّم کو تحفہ تھا۔جب کام کرتے کرتے تھک گیا تو ٹیبلٹ رکھ کر گردن پیچھے گرالی۔پھر یونہی، سر پیچھے گرائے باہر لان میں دیکھا، مالی کاٹ چھانٹ کر کے اب کچرا صاف کر رہا تھا۔

اب وہ بغیر اسٹک کے چلنے لگا تھا۔بس تھوڑی تکلیف ہوتی تھی، لیکن پہلے سے کہیں بہتر تھا۔علی کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود کل وہ آفس بھی چلا گیا تھا۔اِس پر وہ خوب خفا بھی ہوا تھا کہ اُسے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔مقدم اکثر ملنے چلا آتا، کبھی ساتھ لے کر چلا جاتا کہ مجھے شاپنگ کرنی ہے۔رضا، علی، حسین اور نوید بھی روزانہ فون کر کے خیریت دریافت کر لیتے، فون نہ کر پاتے تو میسج کرنا کبھی نہ بھولتے۔اظہر کا کیس بھی چل رہا تھا۔عمر نے حسین کی خاطر ایمان کو معاف کر دیا تھا، حالانکہ حسین نے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا پر اُس نے کر دیا تھا۔آخری اطلاعات کے مطابق وہ ملک سے باہر جا چکی تھی۔مقدّم کی شادی تین روز بعد تھی۔رضا نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، یہ خوش خبری بھی اُس تک پہنچ چکی تھی۔امی ابو اُسے معاف کر چکے تھے، ہر شے اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔لیکن۔۔۔

اُس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا، وہ اب بھی خالی ہاتھ تھا۔

ہاں! صرف وہی تو خالی ہاتھ تھا۔

اپنی ہتھیلیوں کو بند کرتے اُس نے ایک مرتبہ پھر سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔مالی جا چکا تھا،لان خالی تھا۔سارے میں سناٹا چھا گیا تھا۔وہ کافی دیر یونہی پڑا رہا، پھر کسی ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس اپنے پیروں پر محسوس ہوا تو آنکھیں کھولیں۔

''بابا!''

یہ خواب تھا؟ یا مذاق تھا؟ وہ جاگ رہا تھا یا اب بھی سویا ہوا تھا؟

عمائمہ اُسکے سامنے کھڑی تھی،گلابی رنگ کے پھولوں والے فراک میں، بالوں کی دو پونیاں بنائے، پہلے سے بڑی بڑی سی۔

''بابا!''عمر کے جواب نہ دینے پر پھر پکارا۔وہ جواب کیا دیتا؟ وہ تو حیرت کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔پتھر کا بت۔۔۔

بے یقین سا۔۔۔

بے قرار سا۔۔۔

''عمائمہ!''اُس کے لب ہلے۔

''بابا!''اب کہ وہ روہانسی ہوئی۔

''میری بیٹی۔۔۔''وہ تیزی سے اٹھا اور اُسے گود میں اٹھا کر گلے لگا لیا۔ایسا کرنے میں اُسے تکلیف ہوئی،زخم ابھی مکمل مندمل نہیں ہوئے تھے۔لیکن اِس تکلیف سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

''میری بیٹی! میری عمائمہ!۔۔۔''وہ بے قراری سے اسے چومتا کہہ رہا تھا۔بے چین دل کو سکون عطا ہونے لگا،زخم پر مرہم پھوار بن کر برسنے لگے تھے۔

''میری جان!''اب کہ اُس نے عمائمہ کو اپنی نظروں کے سامنے کیا۔

''میری گڑیا نے یاد کیا تھا مجھے؟''اُس نے پوچھا۔وہ حیران تھا کہ عمائمہ اُسے بھولی نہیں تھی،ورنہ اِس عمر کے بچے جلدی لوگوں کو بھلا دیتے ہیں۔

''ہاں! میں نے یاد کیا۔۔۔''اُس نے سر ہلاتے زور و شور سے کہا،تو وہ نہال ہو گیا۔

''پر تم کیسے آئی؟''اُسے یکدم ہی یاد آیا تو پوچھا۔اور اِس سے قبل وہ کوئی جواب دیتی عمر کی نظریں سامنے دروازے پر گئی اور وہ ٹھہر گیا۔

وہاں سرخ انگارہ آنکھوں سے اُسے دیکھتی عمارہ کھڑی تھی۔عمر کے ہاتھ کانپ اٹھے،پر اُس نے عمائمہ کو گود سے نہ اُتارا۔

عمارہ چلتی ہوئی اُسکے قریب آئی۔۔۔

براہِ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔

دکھ سے۔۔۔کرب سے۔۔۔تکلیف سے۔۔۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟''اُس نے ضبط کی شدت سے لال ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے پوچھا۔عمر کو سمجھ نہ آیا وہ کیا پوچھ رہی ہے؟

''تم ہر بار ایسا کیوں کرتے ہو؟تم ہمارے حصے کے فیصلے خود کیوں کر لیتے ہو؟ہمیں کیا جاننا ہے اور کیا نہیں،اِسکا فیصلہ ہمیں کرنے دو عمر! یہ تمہارا حق نہ تھا کہ تم ہماری طرف سے تمام فیصلے لے لیتے۔''اُس نے بھڑکتے ہوئے کہا تو عمر ساکت رہ گیا۔

''کیوں؟کیا سمجھتے ہو تم؟بہت بڑا احسان کیا تم نے ہماری ذات پر؟بہت بڑے غم سے بچا لیا تم نے ہمیں؟بہت خوش ہیں ہم؟''وہ چیخی تھی۔

''تمہیں پتہ چل گیا سب؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں!اور یہ بھی کہ تم نے ایک مرتبہ پھر وہی کیا۔جب واپس آ گئے تھے تو سچ بتانے کے بجائے پھر اُسے چھپانے کا فیصلہ کیا،ہمیں انجان رکھنے کا فیصلہ کیا۔تب بھی دل نہ بھرا تو اب ایک بار پھر۔۔۔۔''اُسکی آواز بھرائی۔''ایک بار پھر تم نے انکل آنٹی سے جھوٹ کہا۔تم سچ کیوں نہیں بولتے عمر؟تمہیں لگتا ہے تمہارے جھوٹ سے ہم بہت خوش ہوں گے؟دیکھو!۔۔۔دیکھو!کیا خوش ہیں ہم؟''وہ بول رہی تھی اور عمر کا سر جھکا ہوا تھا۔وہ جانتا تھا اُس نے غلط کیا،پر اِس مرتبہ تو اُسے ناچاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

''تم کیوں ایسے کرتے ہو؟''وہ جیسے تھک گئی تھی۔

''اگر تم واپس آنے کے بعد بھی سچ بول دیتے تو خضر تمہارے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار لیتا،وہ دل میں تم سے ملنے کی چاہ لیے دنیا سے نہ جاتا۔''اُس نے دکھ سے کہا تو عمر کی آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو بہہ نکلا۔

''میں تم سب کو تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔پر۔۔۔میرا طریقہ غلط تھا۔اگر میں وہ سب نہ کرتا تو شاید خضر زندہ۔۔۔''

''نہیں!''عمارہ نے اُسکی بات کاٹی۔''وہ زندہ نہیں ہوتا،کیونکہ اُسکی موت اُسی روز لکھی تھی،اُسے اُسی روز مرنا تھا۔جیسے تمہاری موت نہیں لکھی تھی۔تم دو مرتبہ موت کے منہ سے واپس چلے آئے۔اُسکی موت کا قصور خود کو مت دو۔''اُس نے سمجھانا چاہا۔

''عمارہ!مجھے معاف کر دو۔ان سب میں سب سے زیادہ نقصان تمہارا ہوا ہے۔''اُس نے کہا۔

''نقصان تو تمہارا بھی ہوا ہے۔''عمارہ نے اُسے بغور دیکھا۔

''میرے نقصان میں میرا قصور ہے، تمہارا نقصان میری وجہ سے ہے۔ مجھے معاف کر دو! اگر کر سکو تو۔''

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرتی اگر۔۔۔''عمارہ نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔''اگر تم نے مجھے دھوکا دیا ہوتا، میرے اوپر اپنی خوشیوں کو ترجیح دی ہوتی، تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن تم نے جو بھی کیا، تمہاری نیت کبھی مجھے دھوکا دینے، میری خوشیاں چھیننے کی نہیں تھی۔ تم میرا بھلا چاہتے تھے، تمہاری نیت صاف تھی۔ بس! طریقہ غلط تھا۔اِس لیے میں تمہیں معاف کر چکی ہوں۔ نہ کرتی تو واپس نہ آتی۔''اُس نے کہا تو عمر نے سر جھکا کر آنکھیں بند کیں، رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ پھر دوبارہ چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ تشکر سے، احسان مندی سے۔۔۔

''تم واپس تو نہیں جاؤ گی؟''اُس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں! لیکن جب تک یہاں ہو، تم عمائمہ کہ ساتھ رہ سکتے ہو۔ یہ ویسے بھی تمہیں کبھی نہیں بھولی، مجھے اعتراض نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''شکریہ!''عمر نے احسان مندی سے کہا تو وہ سر ہلاتے جانے کے لیے مڑی۔

''عمارہ!''اُس نے پکارا تو وہ پلٹی۔

''کیا میں اپنے بھائی کی امانت ساری زندگی سنبھال سکتا ہوں؟''پوچھنے کا کتنا پیارا انداز تھا؟ ایک تو وہ تھا بھی پیارا، اوپر سے کچھ معصومیت بھی چہرے پر سجا کر پوچھا تھا۔

''ساری زندگی؟''عمارہ نے اُسکے الفاظ دہرائے۔

''ہاں! اب دور رہنا بہت بڑی سزا ہے میرے لیے۔ جب معاف کر ہی دیا ہے تو سزا بھی نہ دو۔''اُس نے مزید معصومیت سے کہا۔

''تمہاری بیٹی ہے، تمہارے بھائی کی امانت ہے۔ تمہاری مرضی!''اُس نے کندھے اُچکائے۔

''میں نے دونوں کی بات کی ہے۔''عمارہ رک گئی۔۔ ٹھہر گئی۔۔۔ تھم گئی۔۔

عمر آنکھوں میں درخواست لیے، ڈھیروں خواہشات لیے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''سوچوں گی۔''وہ بھی کندھے اُچکاتے، ذرا مسکراتے وہاں سے چلی گئی۔

''میں انتظار کروں گا۔''وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر عمائمہ کو سینے میں بھینچ لیا۔

---------+---------+--------

''تم نے میرا سوٹ نکال دیا ہے؟''نوید ابھی ابھی ڈیوٹی سے گھر پہنچا تھا۔رات مقدم کا ولیمہ تھا۔

''ہاں! نکال بھی دیا ہے،اور استری بھی کروا دیا ہے۔''اُس نے کہا۔

''تم بھی تیار ہو جاؤ،ہم نو بجے نکل جائیں گے۔''نوید نے کہا۔

''پہلے ولید کو تیار کر دوں،پھر۔۔۔اچھا! وہ تمہاری ٹائی مجھے نہیں ملی۔تم دیکھ لیناخود!''ولید کو شرٹ پہناتے،اُس نے مصروف سے لہجے میں کہا۔

''اوکے!''وہ الماری کھول کر کے اپنی ٹائی تلاشنے لگا۔یکدم ہی اُسکی نظر ایک بیگ پر پڑی۔

''یہ بیگ کس کا ہے بشریٰ؟''اُس نے الماری میں منہ دیئے ہی آواز دے کر پوچھا۔

''کونسا؟''اُس نے رک کر دیکھا۔

''یہ ولید کا سامان ہے۔پچھلے دنوں رضا بھائی نے بھجوایا تھا جزا کے ہاتھوں۔میں مصروف تھی تو کھول کر دیکھ نہ سکی۔''اُس نے بتایا۔

''اوہ!''وہ سر ہلاتے یونہی بیگ کھول کر دیکھنے لگا،عادت سے مجبور۔۔۔کہ اُسے ایک یو ایس بی نظر آئی۔

''یہ کیا ہے؟''اُس نے حیرت سے دیکھا۔یو ایس بی پر پیپر ٹیپ لگا تھا،جس پر رضا کی رائٹنگ میں لکھا تھا''میموریز(یادیں)''۔وہ یو ایس بی لے کر اپنے پلنگ پر آیا اور لیپ ٹاپ کھولا۔بشریٰ نے اُس پر دھیان نہ دیا۔لیپ ٹاپ میں یو ایس بی لگا کر اُس نے دیکھا تو وہاں پر صرف ایک فولڈر تھا۔جسکا نام ولید تھا۔فولڈر کھولا تو اندر مزید فولڈر تھے۔کسی پر فوٹوز لکھا تھا،کسی پر ویڈیوز،تو کسی پر ڈاکومنٹس۔اُس نے ڈاکومنٹس کا فولڈر پہلے کھول لیا۔اُس میں ولید کا برتھ سرٹیفکیٹ،ویکسین کی تفصیلات،اور مزید چیزیں تھی۔

اُس نے تصاویر کا فولڈر کھولا تو اُسکی اُنگلیاں تھم گئیں۔وہاں لاتعداد تصاویر تھیں،وہ پہلا دن جب وہ اُسے ملا تھا،اور پھر جب تک اُسکے پاس رہا تب تک کی مختلف تصویریں تھیں۔

''کیا ہوا؟''بشریٰ نے اُسے حیرت کا مجسمہ بنے دیکھا تو پوچھا۔

''یہاں آؤ!''اُس نے بشریٰ کو بلایا تو وہ وہیں آ گئی۔

''کیا ہوا؟''اُس نے پوچھا تو نوید نے لیپ ٹاپ اِسکی جانب گھما دیا۔

''یہ۔۔۔یہ ولید ہے؟''بشریٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''یہ کہاں سے ملی؟''وہ تصویریں آگے بڑھا کر دیکھنے لگی۔

''رضا نے جو سامان دیا تھا اُسی میں تھی۔''وہ نم آنکھوں سے تم تصویریں دیکھنے لگی، پھر ویڈیوز۔۔۔اُسکے چلنے کی ویڈیو، اُسکے بولنے کی، ہنسنے کی، کھیلنے کی، شرارتیں کرنے کی، ہر ہر لمحہ رضا نے قید کر رکھا تھا۔اور بشریٰ۔۔۔اب ہر اُس لمحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جسکا غم کب سے اُسکے دل میں تھا۔

''نوید دیکھو! اُسکے دانت نہیں نکلے تھے تب۔۔۔''وہ دکھانے لگی، وہ ہر ہر ویڈیو پر اسے ایسے ہی پر جوش ہو کر کچھ نہ کچھ دکھانے لگتی، جبکہ نوید فقط اُسکے مسکراتے، خوش چہرے کو دیکھتا رہتا۔

آج رضا نے اُس پر ایک اور احسان کر دیا تھا۔

--------+---------+----------

''تم نے اِس قدر سڑا ہوا منہ کیوں بنا رکھا ہے؟''استقبالیہ پر کھڑے، اپنے مہمانوں کا انتظار کرتے مقدم نے ساتھ کھڑے حسین سے پوچھا، جو کافی دیر سے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔سیاہ تھری پیس میں آنکھوں پر آج سیاہ فریم والا چشمہ ہی لگا رکھا تھا۔ تھوڑا وہ پیارا بھی تھا، اور تھوڑا معصوم بھی۔

''یہ سوال تھوڑی دیر بعد کرنا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا، تو آپس میں محو گفتگو نوید اور عمر نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''کیوں ابھی کیوں نہیں پوچھ سکتے؟''مقدم نے پوچھا۔

''تھوڑی دیر بعد یعنی، جب حور آس پاس نظر آئے، تب پوچھنا اور یہ مت پوچھنا، بلکہ یہ پوچھنا کہ حسین کیا ہوا ہے، تم ٹھیک ہو؟''

''ہیں؟''موبائل سے سر اٹھاتے علی کا ردعمل بیساختہ تھا۔

''کیوں؟''مقدّم کے بھی کچھ نہ سمجھ آیا تھا۔

''دیکھو! تھوڑا حور عین کو بھی احساس ہونا چاہیے کہ میں اُس سے ناراض ہوں۔''اُس نے کہا۔

''کیوں اُسکو احساس نہیں ہے؟''مقدّم نے پوچھا۔

''صبح سے چار مرتبہ احساس دلوایا ہے، ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی کام دے جاتی ہے، اور کہتی ہے کہ پہلے یہ کر لو پھر ناراض ہو جانا۔''اُس نے منہ بسورتے کہا تو وہ ہنسا۔

''ہاں! کیونکہ تم ناراض کم اور مضحکہ خیز زیادہ لگتے ہو۔''علی نے بتایا تو حسین نے کمال بے نیازی سے نظر انداز کیا۔

''تم کدھر ہو؟''کہیں سے رضا نمودار ہوا تھا۔

''مہمانوں کا استقبال کرنے کھڑا ہوں۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''استقبال کرنے کھڑے ہو یا وقت برباد کرنے، جاؤ! فوٹو گرافر بلا رہا ہے۔''اُس نے مقدّم کو وہاں سے چلتا کیا تھا۔

''اِس سے اچھی تصاویر تو میں لے لیتا ہوں۔''وہ بڑبڑاتے ہوئے چلا گیا۔ عمر اب پہلے سے بہتر تھا، صحت کے علاوہ اُسکے چہرے پر بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ نوید تو تھا ہی بے نیاز سا، کچھ وہ لگتا بھی مغرور تھا، کچھ اُسکے چہرے پر موجود نرمی تھی، کچھ بھٹکی نگاہیں تھیں جو بار بار دور بیٹھی بشریٰ کا طواف کر کے واپس آجاتیں۔ آج وہ میرون لباس میں تھی، وہ بھی نوید کی فرمائش پر۔ علی پہلے سے زیادہ مطمئن، پہلے سے زیادہ بردبار اور سمجھدار لگنے لگا تھا۔ اور رضا تو اب ہی جینے لگا تھا۔

اور حسین؟

حسین اِس وقت خود کو ماڈل سمجھے کھڑا تھا، کیمرہ مقدّم کے ہاتھوں میں تھا اور فوٹو گرافر سخت تاسف سے دور کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو! تم ذرا اپنا چشمہ اُتارو!''مقدّم بھول گیا کہ وہ دلہا ہے۔

''خبردار! چشمے کے ساتھ ہی تصویر لو، یہ میری پہچان ہے۔''اُس نے صاف انکار کیا۔

''عقل سے پیدل انسان! چشمے پر عکس پڑ رہا ہے، تمہاری حسین آنکھیں چھپ رہی ہیں۔''اُس نے دانت کچکچاتے کہا۔

''اوہ! تو یوں کہو نا!''اُس نے شرمانے میں عورتوں کو بھی مات دیتے چشمہ اُتارا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔ اِس سے قبل کہ وہ تصویر کھینچتا حور عین اُسکے سامنے آگئی اور تصویر ایسے ہی کلک ہو گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''حسین چیخا، اور حور عین کے منہ پر ہاتھ رکھتے اُسے پیچھے ہٹایا۔ اور یہ منظر بھی کلک کر لیا گیا۔

''اکیلے اکیلے تصویریں نہیں لے سکتے تم۔''وہ بھی ڈھیٹ تھی دوبارہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

''جلدی کرو بھائی! مجھے اسٹیج پر بھی جانا ہے۔''مقدّم نے بگڑتے ہوئے کہا۔

لیکن دونوں اب لڑتے لڑتے کسی بات پر ہنسنے لگے تھے، منظر کیمرے کی آنکھ میں ہمیشہ کے لیے مقید ہو گیا۔

چند روز مزید سر کے تو عمر نے نکاح پر سب کو بلا لیا۔ عمارہ نے سادگی سے نکاح کرنے کی خواہش کی تھی اور وہ بخوشی راضی ہو گیا تھا۔ اُسکے نکاح کے لیے مقدم نے سوات جانے کا منصوبہ ذرا آگے بڑھا دیا تھا۔

''آپکو پتہ ہے؟ میں کلاس ون میں آگئی ہوں۔ اب میں پرائمری میں ہوں، میں بڑی ہو گئی ہوں۔'' نکاح سے کچھ دیر قبل نشمیہ نے عمر کا دماغ کھانا ضروری سمجھا تھا۔ وہ بھی خوشی خوشی اُسکی ہر بات سن رہا تھا، عمائمہ اُسکی گود میں بیٹھے، بڑے شوق سے نشمیہ کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً دونوں باپ بیٹی کو وہ پسند تھی، اُس نے علی کو خاص تاکید کی تھی کہ اُسے ساتھ لے کر آئے۔

''نائس! اب تم نے اچھے سے پڑھنا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''اب میں بڑی ہو گئی ہوں، اور اب میں پائلٹ بن جاؤں گی۔'' اُس نے چیختے ہوئے اعلان کیا تھا۔

''نشمی آہستہ!'' علی نے اُسے ٹوکا۔

''تم ابھی پائلٹ بن جاؤ گی؟'' نوید کو لگا جیسے اُس نے سننے میں غلطی کی ہے تو تصدیق کے لیے پوچھ لیا۔ نشمیہ نے پلٹ کر اُسے دیکھا، جیسے وہ پسند نہ آیا ہو۔

''جی!'' اُس نے سر ہلاتے یک لفظی جواب دیا۔

''پائلٹ بننے کے لیے بڑا ہونا پڑتا ہے۔'' نوید نے اُسکے علم میں اضافہ کیا۔

''میں بڑی ہو چکی ہوں۔ میں پرائمری میں ہوں اب!'' دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر نوید کو جتایا۔

''نہیں! تھوڑا اور بڑا ہونا پڑتا ہے۔'' اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا، یہ اُسکی نشمیہ سے پہلی باضابطہ گفتگو تھی (بحث تھی)۔

''اور بڑا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں!''

''کتنا بڑا؟'' ذرا مایوس بھی ہوئی۔ کیا مطلب اور کتنا بڑا ہونا پڑے گا؟

''بابا جتنا بڑا۔'' نوید نے علی کی جانب اشارہ کرتے کہا۔ باقی سب دلچسپی سے یہ مباحثہ سن رہے تھے۔

''بابا جتنا؟'' یقین نہ آیا۔

''ہاں!''

''اِنکے جتنا؟''انگلی سے علی کی جانب اشارہ کرتے ایک مرتبہ پھر تصدیق چاہی۔

''ہاں!اِنکے جتنا۔''نوید نے تصدیق کر دی،تو وہ کچھ لمحے دکھ اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں کبھی اُسے تو کبھی علی کو دیکھتی رہی،اُسکے تاثرات پر علی کے لیے ہنسی روکنا مشکل تھا۔

''پر۔۔۔''اُس نے کہا پھر رکی،ننھے چہرے پر مایوسی جیسے تاثرات آئے۔''تب تک تو میں بڈھی ہو جاؤں گی۔''اور وہاں چھت پھاڑ قہقہ پڑا تھا۔

''کیا مطلب میں بڈھا ہوں؟''علی نے ذرا ناراضگی سے پوچھا۔

''ہاں!''ڈھیٹ تو وہ اپنے نام کی ایک تھی۔

''بچے من کے سچے!''حسین نے لقمہ دیا تو ایک بار پھر سب ہنس پڑے تھے۔

--------+---------+----------

ایک سال بعد:

بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔موسم بھی ٹھنڈا تھا۔گاڑی سے اتر کر سینٹرل جیل کی عمارت کی طرف بڑھتے مقدّم کے قدم سست روی کا شکار تھے۔ اپنا شناختی کارڈ ریسیپشن پر رکھوائے وہ پولیس کانسٹبل کے ساتھ اندر بڑھنے لگا۔خاموش اور وحشت ناک راہداریوں سے ہوتا بالآخر وہ اُس کمرے میں پہنچا، جہاں عبیر شاہ پہلے سے موجود تھا۔

عبیر شاہ،لیلیٰ کا بھائی۔۔۔

لیلیٰ کا قاتل۔۔۔

مکرم کا باپ۔۔۔

نہ چہرے پر وہ جاہ و حشمت تھی،نہ ہی وہ رعب۔وہ سوکھا،مریل سا آدمی کہیں سے بھی عبیر نہیں لگ رہا تھا۔ہاتھوں اور پیروں تک میں بیڑیاں تھیں۔ مقدّم اُسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم نے عدالت میں عمر قید کی اپیل کیوں کی؟''پہلا سوال،بنا کسی تمہید کے عبیر کی جانب سے آیا تھا۔

''میں تمھارے جتنا کم ظرف نہیں ہوں۔میں نے ایسی کوئی اپیل نہیں کی ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر عدالت نے مجھے پھانسی کیوں نہیں دی؟ سزائے موت سے عمر قید کیوں؟'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

''خاموش رہو!'' باہر کھڑے کانسٹیبل نے اندر جھانکتے ہوئے گھرکا تھا۔

''تمہاری بیماری کی پیش نظر عدالت نے از خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پھانسی نہ دی جائے۔ تم خود ہی چند دنوں میں مر جاؤ گے۔'' مقدّم کے الفاظ میں کوئی رحم تھا نہ دل میں۔

''کیوں؟ کیوں؟ بیماری تو چار سالوں سے ہے، پر موت نہیں آئی۔ یہ کبھی نہیں آئے گی، میں موت کو ترس جاؤں گا۔ تم عدالت سے کہہ کر مجھے پھانسی دلوا دو۔'' لیلیٰ کا قاتل، ہاتھ جوڑ کر اپنے لیے موت مانگ رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو مقدّم! مجھے معاف کر دو۔ میں ظالم تھا، فرعون بن گیا تھا۔'' اب وہ معافی مانگ رہا تھا۔ مقدّم سپاٹ چہرے کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔

''معافی نہیں ہے میرے پاس پر۔۔۔'' عبیر نے اُسکی آواز پر چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ ''پر میں تمہارے جتنا گھٹیا نہیں ہوں۔ تمہارے بیٹے کو تم سے ملنے کا حق ہے، اگلی بار اُسے تمہارے پاس لے کر آؤنگا۔ اِس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''یہ مت کرنا۔ یہ سزا نہ دینا مجھے، میرے بیٹے کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ میں اُسکی نفرت برداشت نہیں کر سکوں گا۔ پلیز!'' وہ رونے لگا۔ مقدّم نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ باہر آیا تو بارش پھوار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گاڑی سے ٹیک لگائے، اُسکے انتظار میں کھڑا اخلاق اُسے دیکھ کے مسکرایا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' قریب آتے پوچھا۔

''جس کے پاس تمہارے جیسا بھائی ہو وہ کیوں ٹھیک نہیں ہوگا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ! آئی ایم اونورڈ!'' اُس نے دل پر ہاتھ رکھتے کہا پھر اُسکے گلے لگ گیا۔

''ہر چیز کے لیے شکریہ اخلاق!'' مقدّم نے دل سے کہا۔

''یہ شکریہ کیا ہوتا ہے؟ ذرا شادی وادی کا سوچو میری۔ کب تک میں اکیلا پھرتا رہوں گا؟'' اِس بات پر وہ ہنس پڑا۔

''یہ کام مجھے کرنا ہوگا؟''

''تو اور کون کرے گا؟ اب تو تم خیر سے گھر بار والے ہو۔ تم ہی کر سکتے ہو، بلکہ کرو گے۔'' گاڑی کا دروازہ کھولتے اخلاق نے کہا تو وہ ہنسا۔

''چلو تو پھر بتا دو کہ کس کے گھر جانا ہے اور کب؟'' مقدم نے گاڑی میں بیٹھتے شرارت سے پوچھا تھا۔

''جلدی کس بات کی ہے ؟''وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

جبکہ مقدم کے موبائل پر نوید کا میسج آیا ہوا تھا۔

---------+---------+--------

''یہ تھا وہ کمرہ، جہاں میں رہتا تھا۔اپنی کم مائیگی پر روتا تھا اور سمجھتا رہتا کہ شاید زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئے گی۔''رضاالٰہی آج اپنی شریک حیات، اپنی متاع حیات جزا کے ساتھ، اپنے اُس پرانے کیبن میں کھڑا تھا، جس میں اُس نے ایک عمر گزاری تھی۔

''تم نے بہت برا وقت دیکھا ہے۔پر اُس بارے وقت نے تمہیں ہیرا بنا دیا ہے۔''جزا نے اُسکا بازو تھامتے کہا۔

''ہاں ! لیکن ہر برا وقت، آنے والے اچھے وقت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔''اُس نے کہا۔''تمہیں پتہ ہے، اُس درخت کے نیچے ایک چارپائی رہتی تھی، شام میں اکثر کھیلتے کھیلتے جب میں تھک جاتا تھا، امی کی گود میں وہیں سر رکھ کر سو جاتا تھا۔''وہ اشارہ کر کے اُسے وہی درخت دکھانے لگا۔جزا نے آنکھ میں آئی نمی چھپائی تھی۔پچھلے سات ماہ میں اُسے رضا نے اپنے ماضی کی تمام باتیں کہہ سنائی تھی، پچھلے سات ماہ میں جزا نے اُس سے بہتر کسی انسان کو نہ پایا تھا۔وہ دونوں اب پناہ گاہ میں رہتے تھے۔رضا نے اُس سے کوئی چاند تارے توڑ لانے کا وعدہ نہ کیا تھا۔بس اتنا کہا تھا کہ تمہاری عزت کروں گا، تمہاری رائے کو اہمیت دوں گا، تمہارے فیصلوں کا احترام کروں گا اور تمہیں انسان سمجھوں گا۔اور اُس نے ایسا کر کے دکھایا بھی تھا۔

بنگلے کا کونا کونا اُسے دکھاتے، اپنا بچپن اُسے سناتے بالآخر وہ لاونج میں آیا، جہاں ماموں پہلے سے بیٹھے تھے۔پہلے سے ضعیف اور لاغر، البتہ گھر کے حالات اب بہتر تھے۔اُنکی بیٹی کمانے لگی تھی، تنخواہ سے اچھا گزر بسر ہو رہا تھا۔

''بہو کو پہلی بار لائے ہو، کچھ کھائے پیے بنا مت جانا۔''مامی نے اُس سے درخواست کی تو وہ خلاف توقع سر ہلاتے بیٹھ گیا۔وہ بخوشی اُنکے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے آئیں۔جبکہ رضا ماموں سے اُنکی صحت کے متعلق پوچھے لگا۔

''خدیجہ گھر ڈھونڈ رہی ہے۔جلد مل جائے گا تو ہم خالی کر دیں گے۔''اُنہوں نے اپنی بیٹی کا نام لیتے بتایا۔

''آپ کو گھر خالی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''رضا کی مستحکم مگر نرم آواز گونجی تو سب کو دھچکا لگا سوائے جزا کے۔

''یہ گھر میں نے آپکے نام کر دیا ہے۔اب آپ ساری عمر اِس میں سکون سے رہ سکتے ہیں۔اگر ضرورت ہو تو میں گھر میں رینوویشن کروا دونگا۔آپ زائد حصّے کو کرائے پر چڑھا سکتے ہیں۔''اُس نے آہستگی سے کہتے جزا کو اشارہ کیا تو اُس نے اپنے پرس سے فائل نکال کر اسکے حوالے کی۔رضا نے فائل ماموں کی جانب بڑھائی تو انہوں نے اُسکا ہاتھ تھام لیا اور بلک بلک کر رو دیئے۔رضا تو ہڑ بڑا گیا۔

''ماموں!''اُس نے پریشانی سے پُکارا۔پر وہ آستینوں سے آنسو پونچھتے روتے رہے۔تو پہلی بار، بالکل پہلی بار رضا کو اُن پر ترس آیا۔وہ اٹھ کر اُنکے پاس آیا۔

''مجھے معاف کر دو!''وہ کہنے لگے۔

''میں معاف کرتا ہوں آپکو۔جو بھی ہو، پر آپ نے مجھے کھلایا پلایا اور مجھے پڑھایا بھی۔احسان تو ہے آپکا۔''حالانکہ کوئی احسان نہیں کیا تھا، وہ اُسکے باپ سے پیسے لیکر ہی اُس پر خرچ کرتے تھے۔لیکن رضا نے جب اُنہیں معاف کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو مزید کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بنگلہ ہمیشہ کے لیے اُنکے حوالے کر کے، اُن سے ملنے آنے کا وعدہ کر کے، اور اُنکو معاف کر کے جب وہ باہر نکلا تو اُسکا دل بہت ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔اب کوئی بوجھ نہ تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے۔اور یقیناً تمہاری امی کو بھی ہو گا۔''گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جزا نے اُس سے کہا تھا۔

''تھنک یو! تم نہ ہوتی تو شاید میں یہ فیصلہ کبھی نہ کرتا۔''اُس نے دل سے کہا۔سچ تو یہ تھا کہ جزا نے ہی اُسے یہ احساس دلایا تھا کہ انتقام میں جلنے والے کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔وہ بھی اپنے بھائیوں سے ناراض رہی اور پھر اُتنا ہی پچھتاتی رہی تھی۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی، رضا کا موبائل بج اٹھا۔ڈیڑھ سال قبل نوید نے مائیکل کے نام سے جو گروپ بنایا تھا، جسکا نام تبدیل کر کے حسین نے کچھ اور ہی کر دیا تھا۔اُسی پر نوید کا میسیج آیا ہوا تھا۔تین عدد تصویریں اور ایک چھوٹا سا پیغام۔

''جزا!''پیغام دیکھ کر رضا نے اُسے تیزی سے پکارا تھا۔

''کیا ہوا؟''وہ گھبرائی۔

''ہمیں فوراً نکلنا ہے۔''اُس نے موبائل جزا کے حوالے کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

---------+---------+--------

''اوہو! آپ کو گول روکنا تھا بابا!''لان میں احمد کی جھنجھلائی سی آواز گونج رہی تھی۔

''اوہ! مجھے روکنا تھا؟''علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! آپکو نشمیہ کا گول روکنا تھا۔''اُس نے سر پر ہاتھ مارتے کہا۔

''اوہ! مجھے لگا کہ یہ تمہارا گول ہے۔''علی نے کھسیا کر کان کھجاتے کہا۔

''آپکواور نشمیہ دونوں کو کھیلنا نہیں آتا۔''وہ ناراض منہ بناتا کرسی پر بیٹھ گیاتووہ مسکرایا۔آج کل اُس پر اپنی بہن کا خوب رنگ چڑھ رہا تھا۔

''اوہو!بھائی تو ناراض ہو گیا۔''نشمیہ نے علی کے قریب آکر سرگوشی کی۔

''غلط بات ہے،تمہاری وجہ سے میں نے چیٹنگ کی ہے،اب نہیں کروں گا۔''اُس نے آنکھیں دکھاتے کہاپھراُسے گود میں اٹھاتاوہیں آکر بیٹھ گیا۔

''ہم بہت برے کھلاڑی ہیں،لیکن تم ایک اچھے کوچ ہو۔اور تم ہمیں جلدی سکھادوگے۔''علی نے احمد کی ناراضگی دور کرنی چاہی۔

''اتنے ٹائم سے سکھارہاہوں،آپ دونوں ہی نہیں سیکھتے۔''وہ روٹھاروٹھاسا پیارا لگا۔

''سیکھنے میں وقت تو لگتا ہے نا!''علی نے کہا۔

''میں نے تو ڈرائنگ جلدی سیکھ لی۔''اُس نے جتایا۔

''کیونکہ میں نے سکھایا اچھا تھا۔''نشمیہ نے بیچ میں بولا تو علی ہنس پڑا۔

''کھیل کود بعد میں،پہلے کچھ کھالو۔''ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے فاطمہ کی چہکتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی تو سب نے اُسے دیکھا۔

''جاؤ جلدی سے ہاتھ دھو کر آؤ دونوں!''علی نے کہاتو دونوں لان میں لگے نل کی طرف بھاگے۔

''خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔کیابنایاہے؟''علی نے ٹرے میں جھانکتے پوچھا۔

''لوڈیڈ فرائیز!''جواب دیتے وہ چائے کی پیالیاں میز پر رکھنے لگی۔ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

''پیاری لگ رہی ہو۔''علی نے تعریف کرنا مناسب سمجھا۔

''بڑھاپا آنے والا ہے کچھ دنوں میں،آج ہی دیکھا میرے کچھ بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لو!مجھے دیکھو!میرے تو اب بال ہلکے ہونے لگے ہیں۔فکر ہو رہی ہے کہ کہیں گنجا ہی نہ ہو جاؤں۔مجھ سے تو جوان ہی ہوا بھی۔''اُس نے بھی منہ بناتے ہوئے کہاتو فاطمہ نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے بغور دیکھا۔

''کوئی نہیں!مجھے تو بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں تمہارے بال۔''اُس نے کہا۔

''ارے واہ فرائیز!''نشمیہ اپنی من پسند شے دیکھ کر خوشی سے چہکی تھی۔

''میں نکال کر دیتی ہوں، دونوں جگہ پر بیٹھو پہلے۔'' وہ بچوں کو کہتے پلٹ میں فرائیز نکالنے لگی۔ آسودگی سے مسکراتے علی نے اپنے موبائل کی روشن ہوتی اسکرین دیکھی، تو وہاں نوید کا میسیج نظر آیا۔ اُس نے فون اُٹھا کر دیکھا۔

''اوہ!'' پیغام دیکھ کر اُسکے لبوں سے نکلا۔ پھر وہ بیساختہ مسکرا اٹھا۔ وہاں ہسپتال کے جھولے میں لیٹی تین عدد نومولود بچیوں کی تصویر تھی۔ گلابی، نیلے اور نارنجی لباس میں ملبوس ننھی ننھی سی پریاں سوئی ہوئی تھیں۔

نیچے پیغام لکھا تھا۔

''میری بیٹیاں! جنت، منت اور آیت''

---------+---------+--------

''اور عنقریب میں تمہیں اتنا دونگا کہ تم راضی ہو جاؤ گے''

انسان شکوہ کرنے پر آتا ہے تو کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ رب کی نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

اور رب نوازنے پر آتا ہے تو نوازتا ہی چلا جاتا ہے، بندے کے گناہ و نافرمانیاں بھلا دیتا ہے۔

رضا بھی رب کے نوازنے کو دیکھ رہا تھا۔ نوید سامنے تھا، وارڈ سے باہر تینوں بچیوں کو بے بی باسینیٹ میں اُسکے پاس لایا گیا تاکہ وہ اُنکے کانوں میں اذان اور اقامت کہہ دے۔ اب وہ اُنہیں گود میں لیے پیار کرتا اور باری باری اذان دیتا تھا۔ جزا، بشریٰ سے ملنے وارڈ گئی تھی۔ ولید بھی اپنی بہنوں سے ملنے آیا تھا۔ رضا ساتھ ہی تھا۔ بشریٰ کل سے ہسپتال میں تھی، وہ لوگ جانتے تھے کہ کسی بھی وقت خبر آسکتی ہے۔ لہٰذا ہسپتال جانے سے قبل رضا ماموں سے ملنے چلا گیا، واپسی پر خبر ملی تو جزا کو لیے سیدھا یہیں آ گیا۔

ولید بے بی باسینیٹ پکڑے، اپنے سے چھوٹے چھوٹے وجود کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

''یہ بے بی ہے؟'' ولید نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے پیار سے کہا۔ پھر سوئی ہوئی اپنی ننھی پریوں کو دیکھا۔ دل محبت سے اتنا بھر گیا تھا جیسے پیالے سے چھلک کر دودھ گرتا ہو۔ جذبات کا اظہار مشکل ہو گیا تھا۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

''مبارک ہو تمہیں!'' رضا نے اُسے کہا۔

''شکریہ، یہ دیکھو، یہ مجھ سے مل رہی ہے نا!'' اُس نے خوش ہوتے رضا سے پوچھا۔

''ہاں! یہ تمہاری جیسی ہی ہے۔ لیکن تمہیں پتہ کیسے چلے گا کہ جنت کونسی ہے؟ منت کونسی اور آیت کونسی والی؟'' رضا نے پوچھا تو نوید نے تینوں کو دیکھا اور ذرا کان سہلاتے کچھ سوچنے لگا۔ اُسکے ہونق انداز پر رضا ہنسنے لگا۔

''اب مجھے کیا پتہ تینوں میں سے کون، کون ہے؟ مجھے تو بس نام پتہ ہے۔ اب کس کو کونسا نام الاٹ (مختص) کرنا ہے، یہ اُنکی ماں بتائے گی۔'' اُس نے حتمی انداز میں کہا۔

''یہ سو کیوں رہی ہیں؟'' ولید کو اُنکے سونے پر اعتراض تھا۔

''کیونکہ یہ چھوٹی ہیں نا!'' نوید نے اُسے اپنے قریب کرتے سمجھایا۔

''تو چھوٹے بچے ہر وقت سوتے ہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! تقریباً ہر وقت!''

''تو پھر میں کھیلوں گا کیسے؟'' وہ پریشان ہوا تو نوید ہنسا۔

''جب یہ تھوڑی بڑی ہو جائیں تب کھیلنا۔'' اُس نے کہا۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' جزا کی خفا آواز کانوں میں پڑی تو نوید نے چہرہ موڑ کر رضا کو دیکھا اور بولا۔

''تمہیں بلا رہی ہے۔''

''تاریخ گواہ ہے کہ اتنے پیار سے وہ صرف اپنے بھائی کو ہی بلاتی ہے۔'' رضا نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''رضا! میں تم سے کہہ رہی ہوں۔'' جزا سروں پر پہنچی۔ ''کب سے کہہ رہی ہوں شزا کا ایگزیبیشن ہے آج، تمہیں وہاں جانا چاہیے۔ میں ہوں نا یہاں۔ لیکن تم ہو کہ سن ہی نہیں رہے۔'' اُس نے ناراضگی سے کہا۔

''کبھی کبھی تاریخ اپنے آپ کو بدل بھی لیتی ہے۔'' نوید سنجیدہ چہرے مگر شرارت آمیز لہجے میں کہتے بے بی باسینیٹ گھسیٹتا اندر چلا گیا۔

---------+---------+--------

~شام سے اک اونچی سیڑھیوں والے گھر کے آنگن میں

سوات کا موسم اچھا تھا۔ حسین، خوبصورت، دل لبھاتا سا۔ مقدّم اپنے دادا کے گھر کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ ہاتھوں میں کیمرہ لیے نیچے باغ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیچے مقدس چار سالہ مکرم کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ پانی کے بلبلے پھلاتی جاتی اور وہ ان بلبلوں کو پکڑنے کی تگ و دو میں پیچھے بھاگتا جاتا تھا۔ مقدم نے یہ منظر کیمرے کی آنکھوں میں مقید کر لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔

چاند کو اترے دیکھا ہم نے، چاند بھی کیسا؟ پورا چاند

نیوی بلیو رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس نوید مطمئن، اور محبت پاش نظروں سے سامنے بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اُسی کے ہم رنگ لباس میں ملبوس ایک ہاتھ سے ولید کو ساتھ لگائے، دوسرے بازو میں اپنی بیٹی کو تھامی وہ پورے اعتماد سے مہمانوں سے بات کر رہی تھی۔ دوسری بیٹی نوید کی والدہ کی گود میں تھی، وہ اپنی دادی کی لاڈلی تھی۔ جزا کی شادی کے بعد سے اُسکی ماں، بشریٰ کو نوید کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اور تیسری؟ تیسری اِس وقت اپنے باپ کے سینے سے لگی انگوٹھا چوستی اپنی پر شوق آنکھوں سے لائٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ نوید نے جھک کر اُسکے گالوں کو چوما تو اُس نے خاصا برا منا کر اپنے باپ کو ننھی ننھی آنکھوں سے گھورا تھا۔ آج ولید کی سالگرہ تھی، یہ اہتمام اُسی خوشی میں تھا۔

انشاجی ان چاہنے والی دیکھنے والی آنکھوں نے

ہسپتال کا وہ پرائیویٹ وارڈ اِس وقت نیلے رنگ کے غباروں اور بیلوں سے سجا تھا۔ اِس سجاوٹ کے لیے عمر نے ہسپتال انتظامیہ سے خصوصی اجازت لی تھی۔

''یہ لو تمہارا بیٹا۔ دیکھو کتنا پیارا ہے؟'' عمارہ کے وارڈ میں منتقل ہونے کے بعد، عمر کی والدہ نے اُس نومولود کو اُسکی گود میں لا کر دیا تھا۔

''کتنا پیارا ہے!'' اُس نے بچے کو پیار کرتے محبت سے کہا تھا۔

''کیا نام رکھو گی اسکا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جو عمر رکھ دے۔'' اُس نے پاس کھڑے عمر کو دیکھتے کہا جسکی گود میں عمائمہ سوئی ہوئی تھی۔

''خضر! خضر رکھیں گے اسکا نام۔'' اُس نے کہا تھا۔

ملکوں ملکوں شہروں شہروں کیسا کیسا دیکھا چاند؟

پناہ گاہ میں رونقیں، اپنے عروج پر تھیں۔ بچوں نے سارے میں شور پھیلا رکھا تھا۔ صرف وہ دونوں بالکل خاموش لان میں بیٹھے تھے۔

''جزا!'' رضا نے اُسے پُکارا تو اُس نے خاموش نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔''اُس نے جزا کا ہاتھ تھامتے کہا۔

''میں مایوس نہیں ہوں۔پر ڈاکٹر نے جو کہا وہ تم نے سنا تو ہے۔''وہ آہستگی سے بولی۔ایسے جیسے شرمندہ ہو۔ایسے جیسے اولاد نہ ہونا اُسکا جرم ہو۔

''جزا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ دیکھو! یہ اتنے سارے بچے، یہ چھوٹے چھوٹے فرشتے یہ ہمارے ہی تو ہیں۔اور اُسے دیکھو!''اُس نے ہاتھوں سے عائشہ جی کی جانب اشارہ کیا، جنکی گود میں وہ دس دن کی بچی تھی، جو انہیں بچھے روز قبل ہی کسی نے لا کر دی تھی۔لانے والے کو وہ کچرا کنڈی سے ملی تھی، کتے اُسکو کاٹ بھی چکے تھے۔یہ پناہ گاہ کی سب سے کم عمر بچی تھی۔

''بتاؤ! کیا ہم بے اولاد ہیں؟''اُس نے محبت سے پوچھا تو جزا مسکرائی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

ہر اک چاند کی اپنی دھج تھی ہر اک چاند کا اپنا روپ

کرسیوں پر مجمعے کے درمیان بیٹھے علی، فاطمہ اور نشمیہ زور و شور سے تالیاں بجا رہے تھے۔جبکہ اپنے اسپورٹس ڈے پر بہترین کارکردگی دکھانے والے، سب سے کم عمر طالب علم کا ایوارڈ تھامے، احمد پُر جوش سا تھا۔ایوارڈ وصول کرنے کے بعد وہ تیزی سے اپنی ماں کے پاس آیا۔

''امی! یہ دیکھیں میرا ایوارڈ، یہ آپکے لیے۔''اُس نے ٹرافی اپنی ماں کو دکھائی۔

''واہ بھئی! سارا دن پریکٹس کے نام پر ہمیں اپنے ساتھ کھلایا اور ٹرافی اور کریڈٹ، اپنی ماں کو۔''علی نے مصنوعی ناراضگی سے اُسے دیکھا تھا۔

''احمد! دیکھو ذرا کوئی جل رہا ہے۔''فاطمہ نے شرارت سے کہا۔

''بابا! آپ کے لیے میں ٹرافی لاؤں گی اگلی بار۔''نشمیہ نے فوراً اپنے باپ کو تسلی دی تو وہ مسکرایا۔

''میں کیوں جلوں گا بھئی؟ میرے پاس تو نشمیہ ہے۔''علی نے منہ چڑاتے کہا تو وہ ہنس دی۔

لیکن ایسا روشن روشن، ہنستا، باتیں کرتا چاند؟

''قسم سے حسین! مجھے لگتا ہے تم ستر سال کی عمر میں بھی بڑے نہیں ہو گے۔''حور عین نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا، جس کے شوہر نامدار نے ابھی ابھی اپنے کوٹ پر چائے گرالی تھی۔اور اب حور اُسے جلدی جلدی صاف کر کے خشک کر رہی تھی، ساتھ اُسے بے نقط سنا بھی رہی تھی۔جسے کوئی فرق ہی نہیں پڑھ رہا تھا۔حور کے بھائی کی آج شادی تھی اور یہ خاندان کی سب سے آخری شادی تھی۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ تمہارا بیٹا اُسی وقت اپنی ٹائیکوانڈو صلاحیت آزمائے گا اور چائے کی پیالی پر ہی وار کر دے گا؟''وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''وہ تو بچہ ہے، تم سے کس نے کہا تھا کہ کوٹ پہن کر چائے پیو؟ گھر سے نکلتے وقت پہن لیتے۔'' وہ استری سے اُسے سوکھاتی ہوئی بولی۔

''ایک ذرا سا کام کیا کر دیا اتنی باتیں سنا رہی ہو۔ اسی لیے انسان کی چار بیویاں ہونی چاہئیں، ایک مصروف ہو تو وہ دوسری کے پاس، دوسری مصروف ہو تو تیسری، اور تیسری مصروف ہو تو۔۔۔'' اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے جب حور عین نے کوٹ سیدھا اُسکے منہ پر پھینکا۔

''جاگ جاؤ خواب سے۔۔۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکلی۔

''جل گئی حور عین۔۔۔'' وہ اُسے چڑاتا ہوا ہنس رہا تھا۔

---------+---------+--------

''رضا اور مقدّم کہاں رہ گئے ہیں آخر؟'' حسین نے سخت تپ کر پوچھا تھا۔

''مجھ سے تو رضا نے کہا تھا کہ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچ جاتا ہوں۔'' موبائل پر رضا کو مسلسل کال ملاتے علی نے کہا تھا، اور وہ تھا کہ فون ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔

''انسان تھوڑا صبر بھی کر ہی لیتا ہے۔'' سیاہ جینز پر سرمئی گول گلے والی جرسی پہنے اور اُس پر سرمئی رنگ کا کیجوال کوٹ ڈالے نوید نے کہا تھا۔ صبح نو بجے کی دھوپ اُسکے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سردی بھی بڑھ چکی تھی۔

''کم از کم بندے کو فون تو اٹھانا چاہیے نا!'' علی نے خفگی سے کہا تو اُسی لمحے رضا کی گاڑی آ کر رکی، اُس نے اندر سے ہی ہاتھ ہلایا پھر اُترا اور اُنکی طرف آیا۔

''چلو جلدی کرو! آڈیٹوریم میں آ جاؤ!'' اُس نے آتے ساتھ ہی حکم دیا تھا۔

''مقدّم کو تو آنے دو۔'' عمر نے کہا تھا۔

''آ جائے گا وہ بھی تم لوگ تو چلو، ورنہ جگہ نہیں ملنی پھر۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے آڈیٹوریم کی جانب بڑھ چکا تھا۔ آج اُنکے بی بی اے کے بیچ کا ری یونین تھا۔

''اتنی جلدی ری یونین رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو فقط بارہ سال ہی ہوئے ہیں پاس آؤٹ (فارغ التحصیل) ہوئے، کم از کم بیس پچیس سال بعد رکھنا چاہیے تھا، مجھے تو اب تک تمام راستے یاد ہیں جامعہ کے۔'' آڈیٹوریم میں سب سے پیچھے اور سب سے اونچی جگہ پر بیٹھتے حسین نے کہا تھا۔

''بیس پچیس سال بعد نجانے دنیا رہے نہ رہے۔'' یہ ٹھنڈی آہ عمر نے بھری تھی، جو اِس لمحے کسی کو پسند نہ آئی تھی۔

''یہاں بیٹھ کر ہم نے کرنا کیا ہے؟'' یہ بے مقصد سوال ایس ایس پی صاحب نے کیا تھا۔

''انتظار کرو، ابھی سنگر آئیں گے تمہیں تمہاری پسند کا گانا سنایا جائے گا، کنسرٹ میں تو آئے ہو تم یہاں۔'' حسین نے کہا۔ نہیں! اُس نے طنز بالکل نہیں کیا تھا۔ نوید نے فقط گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

سامنے اسٹیج پر اُس بیچ کے تمام اساتذہ اور ایچ اوڈی موجود تھے۔ عوام میں بھی بہت سے جانے پہچانے چہرے نظر آرہے تھے۔ روسٹرم پر میزبان نے پروگرام شروع کیا تو اب کہ رضا نے فکرمندی سے یہاں وہاں دیکھا تھا۔

''یہ مقدّم کہاں رہ گیا ہے؟'' اُس نے عمر سے پوچھا۔

''یہی بات باہر بھی کہی تھی ہم نے۔'' حسین آج طنز کر کر کے مقدّم کی کمی پوری کر رہا تھا۔

''پر اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔'' وہ اُسکا فون ملا رہا تھا پر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ فون اُٹھا کر نہیں دے رہا تھا۔

میزبان نے اُسی بیچ کے استاد کو دعوت دی تو وہ روسٹرم پر آئے۔ سب کو سلام کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنی تقریر شروع ہی کی تھی کہ آڈیٹوریم کا بالکل سامنے والا دروازہ کھلا، وہی دروازہ جہاں سے براہِ راست اسٹیج پر آیا جاتا تھا۔ اور وہ بھائی صاحب مقدّم شفیق تھے۔

''ارے! وہاں سے نہیں آنا تھا۔'' اُسے دیکھ کر سب سے پیچھے بیٹھے اُسکے دوستوں نے سر پیٹا تھا۔ روسٹرم پر کھڑے استاد سمیت پورے آڈیٹوریم نے اُسے ہی دیکھا تھا۔ جبکہ اُس نے زبان دانتوں تلے دبائی، بارہ سالوں میں کیا وہ آڈیٹوریم ہی بھول گیا؟

''سوری!'' وہ بری طرح شرمندہ ہوتا باہر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ

''وائے اریولیٹ؟ (آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟)'' روسٹرم پر کھڑے پروفیسر کی کرخت آواز کانوں میں پڑی تو وہ حیرت سے پلٹا، پورا آڈیٹوریم سناٹا۔۔۔

''وہ۔۔۔ میں۔۔۔'' وہ گڑبڑایا۔

''اتنے سالوں میں بھی وقت پر آنا نہیں سیکھا تم نے؟'' اُنکے لہجے میں کوئی فرق نہ آیا، البتہ آنکھوں میں شرارت ضرور واضح تھی۔ مقدّم سمیت سارے مجمع کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''وہ راستے میں گاڑی۔۔۔'' وہ کوئی وضاحت دینے ہی لگا کہ

''پھر بہانے؟'' استاد کی آواز پر مجمعے میں کھی کھی کی آواز ابھری، جبکہ مقدّم نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''گیٹ آؤٹ آف مائی کلاس۔۔۔'' اب کہ سب زور سے ہنسے تھے۔ جبکہ مقدّم واقعی دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

''ارے! یہ واقعی چلا گیا؟''استاد صاحب پریشان ہوئے، سب لوگ چہرہ اُٹھا اُٹھا کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

''کوئی اِسکو بلاؤ بھئی، میں تو مذاق کر رہا تھا۔''استاد صاحب نے رونے جیسا چہرہ بنایا تو وہاں قہقہہ پڑا۔اسی اثنا میں پیچھے والا دروازہ کھلا اور مقدّم وہاں سے نمودار ہوا۔

''شکر!''استاد صاحب نے گہرا سانس بھرنے کی اداکاری کی۔پھر قہقہہ۔۔۔

''آئندہ لیٹ آئے تو پھر دیکھنا!''ایک مرتبہ پھر اُسے جھڑکا جو اُس نے سینے ہاتھ رکھ کر قبول کر لیا۔محفل کشت زعفران بن چکی تھی۔

ری یونین اچھا چلا، استاد صاحب نے کچھ پرانی باتیں و یادیں تازہ کی، کچھ پرانی تصاویر دکھائی گئیں۔سابقہ طلبہ و طالبات میں سے فقط رضا کو ہی روسٹرم پر بلایا گیا کہ وہ بھی وہاں پر اب استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔

تقریب کے اختتام پر انھیں جامعہ گھومنے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کا موقع دے دیا گیا۔جنوری کا مہینہ تھا، اور نئے سیشن کا آغاز ہو چکا تھا۔

جس جامعہ میں کبھی اُنکا پہلا دن تھا، آج وہاں پھر کسی کا پہلا دن تھا۔نئے چہرے ہمیشہ کی طرح پریشان حال ہی تھے، پرانوں میں اب بھی شیطان کے چیلے موجود تھے، جو مدد کم اور پریشان زیادہ کر رہے تھے۔

''ارے حسین!''وہ لوگ باغ میں کھڑے تھے، مقدّم کے کہنے پر تصویر لے رہے تھے، نوید تو مکمل بھاگنے کے موڈ میں تھا لیکن علی اور حسین نے اُسے روک رکھا تھا۔

''آپ؟''حسین نے اپنے نام کی پکار پر آنے والے کو دیکھا تو فوری طور پر پہچان نہ سکا۔

''کیسے ہو حسین؟ کتنے عرصے بعد دیکھا تمہیں۔''وہ بڑا خوش تھا۔حسین نے دماغ پر زور ڈالا، چہرہ ذہن میں تھا پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کون ہے؟

''مجھے پہچانا؟''حسین کو ہونق بنے دیکھ کر اُس نے خود ہی سوال کیا۔

''ہاں! تم شاید۔۔۔''

''تم مستقیم ہو نا!''یہ آواز مقدّم کی تھی۔

''مستقیم؟''حسین بڑبڑایا اور یکدم ہی اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''ارے! یہ وہی مستقیم ہے جسکی تم نے فاتحہ پڑھوادی تھی۔''اِس سے پہلے کہ حسین کچھ کہتا مقدّم نے اُسے یاد دلایا،اُس نے پلٹ کر کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''وہ میں نے جان کر نہیں کیا تھا۔''حسین نے فوراًوضاحت دی۔

''جان کر ہی کیا تھا۔''نوید نے سنجیدگی سے کہاتو وہ لوگ ہنسے۔ایک سے بڑھ کر ایک خبیث دوست تھے اُسکے۔

''کوئی نہیں! میری کور میموری میں آج بھی وہ واقعہ تازہ ہے۔میں یاد کر کے آج بھی ہنستا ہوں۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہاتو حسین مطمئن ہوا۔

''اور آج کل کیا کر رہے ہو؟''حسین نے پوچھا۔

''میں جنرل منیجر ہوں ایک فرم میں،اور نوید۔۔۔تمہیں تو میں پہچان ہی نہیں سکا۔''اُس نے نوید کو دیکھتے کہاتو وہ بس ہلکے سے مسکرادیا۔اتنی دیر میں یہ سولہواں شخص تھا،جس نے نوید کے بارے میں یہ جملہ کہا تھا۔ پھر اُس نے کچھ بات چیت کے بعد سب کو دیکھااور بولا۔

''مجھے یہ دیکھ کر اچھالگا کہ تم سب بارہ سالوں سے ساتھ ہو۔ایسی دوستی کم ہی نصیب ہوتی ہے۔''اِس بات پر علی نے کان کھجاتے رضا کو دیکھا،اُس نے یہاں وہاں،عمر کو تو باقاعدہ کھانسی آئی تھی،جبکہ نوید نے گہری آہ بھر کے سر جھکادیا۔پھر چند ہی سیکنڈ گزرے،اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے،البتہ مستقیم اُنکے ہنسنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

اسی طرح وہ مزید سابقہ اسٹوڈنٹس سے ملتے رہے،اُس دوران عمر کی نذر ایک مرد پر پڑی،اور اُسے فقط ایک سیکنڈ لگا تھا اُسے پہچاننے میں۔

''نواز؟''عمر نے دور کھڑے اُس برد بار سے لڑکے کو دیکھ کر کہا تھا۔

''ہاں! یہ وہی ہے شاید،پر یہاں کیا کر رہا ہے؟''نوید نے بھی اُسے دیکھ کر کہا۔

''نواز یہاں پر انگلش کمپلسری پڑھانے آتا ہے۔''رضا نے بتایاتو عمر نے خوشگوار حیرت سے دیکھا تھا۔یہ وہی لڑکا تھا جو نابینا تھا،اور آج بھی وہ اسٹک کے سہارے ہی کھڑا تھا۔لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر ڈالی تھیں۔

جامعہ آج بھی اپنے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی تھی۔سڑکیں بہتر ہو گئی تھیں،کچھ نئے ڈپارٹمنٹس کا اضافہ بھی ہوا تھا۔

''اگر تم بیس پچیس سال بعد بھی یہاں آتے تو پوائنٹس یہی والے ہوتے۔''رضا نے ٹرمنل میں کھڑے پوائنٹس کو دیکھ کر کہاتو نوید بیساختہ ہنسا۔

''چھے سال میں مجھے صرف سات آٹھ مرتبہ ہی پوائنٹ میں بیٹھنا نصیب ہوا ہو گا۔''نوید نے پوائنٹس کو دیکھتے کہاتو علی حیران ہوا۔

''تم تو پوائنٹ سے ہی آتے تھے۔'' پیچھے کیمسٹری کینٹین میں بیٹھے طلبہ پر شوق نظروں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

''میں نے بیٹھنے کی بات کی ہے، آتا میں اُس میں کھڑے ہو کر تھا۔'' اِس بات پر وہ لوگ ہنسے تھے۔

نئے چہرے آج بھی اپنے مستقبل کی فکر میں تھے، کچھ نئے دوست بنا رہے تھے، کچھ نئی زندگی۔۔۔

اور جو دوست بنا چکے تھے۔۔۔

وہ اُن میں اپنا ماضی تلاشتے مسکرا رہے تھے۔۔۔۔

کہ انکا سفر اب تمام ہوا تھا۔

---------+--------+-------

ہر کہانی کا ایک اختتام ہوتا ہے۔۔۔

پر ہر کردار کا اپنا اختتام ہوتا ہے۔۔۔

ضروری نہیں کہ کردار کا اختتام اور کہانی کا اختتام یکساں ہو۔

کہانی کا اختتام۔۔۔

ابھی باقی ہے۔

---------+--------+-------

دو سال قبل:

مورخہ نو جولائی

''اظہر نے تمام جرائم قبول کر لیے ہیں، پھر وہ اِس ایک نہ ہونے والا قتل کو کیوں قبول نہیں کرے گا؟ وہ ڈھیٹ شخص بڑے مزے سے ہمیں اپنے تمام قتل کی داستان سنا رہا ہے، تو وہ اِس بات پر انجان کیوں بنے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''اگر بالفرض مان بھی لیں کہ وہی ان چھے لوگوں کے پیچھے تھا، تو پچھلے چھ ماہ سے ہم نے کسی کے بھی آس پاس کوئی مشکوک سرگرمی کیوں نہ دیکھی؟ مورخہ چھے کا جتنا خوف ہمارے دلوں میں تھا، اُس روز تو کچھ بھی نہ ہوا۔ فرح بھی فقط پُرانی دشمنی کی بنا پر اُس رات نوید کو قتل کرنے آئی تھی۔ اور جب نوید

فرح کے قریبی آدمیوں میں شامل ہوا تھا، تو فرح نوید کو کیوں پہچان نہ پائی، جبکہ اظہر تو نوید کو قتل کرنا چاہتا تھا، اور وہ اظہر کے تمام جرائم کو اچھے سے جانتی تھی۔ اُسے تو فوراً نوید کو پہچان لینا چاہیے تھا؟ اور اگر اظہر ان سب کو جانتا تو وہ اتنے سال انتظار کیوں کرتا؟ جب یہ سب الگ تھے تو انہیں مارنا آسان تھا۔ اُس پر سے مزید برآں یہ کہ وہ نوید کے بیٹے کو رضا کے پاس کیوں رکھواتا؟ اگر وہ واقعی اُن سب کا دشمن ہوتا تو وہ اپنے ایک دشمن کے بیٹے کو دوسرے کے پاس کیوں رکھوائے گا؟'' اُنکے سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُنکے ہاتھ ایک ڈور آئی تھی۔ اُلجھی ہوئی ڈور!

''ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہو؟ سائیکو تو ہے وہ!۔۔۔'' فیصل نے بھونڈی سی وضاحت پیش کی۔

''اتنا بیوقوفانہ کھیل؟'' انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب سوچو تو بہت بیوقوفانہ لگتا ہے۔''

''یعنی؟'' ساگر نے پوچھا۔

''یعنی۔۔۔'' وہ آگے کو ہوئے۔ ''اس تمام کہانی میں جھول ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا تھا۔

''تو اگر یہ اظہر نے نہیں کیا، تو قوی امکانات ہیں کہ یہ مائیکل نے خود کیا ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہی ہے کہ مائیکل کی ان سے کیا دشمنی تھی؟ یہ وہی بتا سکتا تھا۔'' ساگر نے کہا۔

''اور اب وہ زندہ نہیں ہے۔'' فیصل نے بات مکمل کی۔

''اور مجھے نہیں لگتا کہ اب اِس مسئلے کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ فرّخ صاحب کا کل آخری دن ہے، نئے آنے والے نے ایک ایسے کیس میں قطعاً وقت برباد نہیں کرنا، جس میں نہ کسی کا نقصان ہوا ہے، اور نہ ہی مجرم فرار ہے۔ بہت زیادہ بھی ہوا تو نیا ڈی آئی جی یہ مائیکل کے سر ڈال کر معاملہ ختم کر دے گا۔'' ساگر کی بات سولہ آنے درست تھی۔

''ہاں! میں کل ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اور میرے بعد کسی کو اِس معاملے میں دلچسپی نہیں ہو گی۔ لیکن۔۔۔۔'' وہ رکے اور سب کو دیکھا۔ ''یہ کام مائیکل نے نہیں، بلکہ ایف آئی اے میں ہی سے کسی نے کیا ہے۔ ڈائری ہم تک پہنچنے سے پہلے کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں گئی ہے، جس نے آخری صفحے پر اُن تصاویر کا اضافہ کیا۔'' فرّخ صاحب نے کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ مائیکل کا بیگ میرے پاس آیا تھا، میں نے ہی اُسکی تلاشی لی تھی۔ اُس میں سے ڈائری چھپی ہوئی بھی پہلے مجھے ہی ملی تھی۔'' شیراز نے سنجیدگی سے بتایا۔

''تم سے پہلے بیگ کس کے پاس گیا تھا؟'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''بیگ نوید سر کے پاس تھا اور انہوں نے تلاشی لینے کے بعد میرے حوالے کر دیا کہ بیگ میں کچھ نہیں ہے، پھر میں نے۔۔۔'' یہاں تک بتاتے بتاتے وہ یکدم ہی رک گیا، اور اُسکی آنکھیں جیسے تحیر سے وا ہو گئیں۔

''ایسا۔۔۔ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اُس نے فرخ صاحب کو حیرت سے دیکھا۔

''ہاں! میرا بھی یہی سوال ہے کہ ایسا کیسے ہو سکتا؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو ڈائری تم نے ڈھونڈلی، وہ نوید عالم نہ ڈھونڈ سکا؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنا نالائق ہے؟'' یہ سوال نہیں تھا، دس ہزار کلو کا بم تھا، جو اُنکے سروں پر پھٹ چکا تھا۔

---------+---------+--------

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ دائیں طرف کی دیوار مختلف قسم کے اسلحوں سے مزین تھی۔ کمرے کی دوسری جانب کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے، کھڑکی سے منسلک میز پر کچھ پرانے کاغذ اور ایک لال کور والی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ کرسی پر بیٹھا وجود، ڈائری پر جھکا، کمرے کے نیم اندھیرے میں گم ہو رہا تھا۔ میز پر جلتی اسٹڈی بلب کی ہلکی پیلی روشنی میں اُسکا وجود فقط سائے کی مانند نظر آتا تھا۔ سارے کمرے میں روشنی صرف اُسی جگہ تھی، جہاں وہ بلب روشن تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر قلم اٹھایا اور ڈائری کے صفحے پر کچھ لکھنے لگا۔ پیلی روشنی میں اُسکا لکھا گیا جملہ نیم واضع سا ہوا۔

''میں ڈائری نہیں لکھتا۔ یہ وہ جملہ تھا جو میں نے اُس وقت بھی دہرایا تھا، جب میر یج کاؤنسلنگ کے تھراپسٹ نے مجھے ڈائری دی تھی۔ اور میں نے اُس ڈائری کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ پر جو میں نے اب کیا ہے، اُس نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چھے تصاویر، وہ چھے لڑکے، وہ جو کبھی دوست تھے، جنہیں میں نے یہیں بیٹھ کر، آخری صفحے پر جمع کیا تھا، اسی ڈائری کے آخری صفحے پر، اُس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پر میں نے وہ تصویریں اپنے پاس جمع رکھیں تھی، ہمیشہ۔ پھر وہ تصویریں، میری ڈائری سے، اُس مائیکل کی ڈائری کے آخری صفحے پر منتقل ہو گئیں۔ وہ آخری صفحہ جس نے سی ٹی ڈی والوں کے وجود میں سنسنی دوڑا دی ہے۔ جب ہی تو سب کے سب کو اکھٹا کر لیا۔ سب کے سب۔۔۔نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔۔'' سایہ ہوتا وجود مسکرایا، اُسکی مسکراہٹ دلفریب تھی۔

''جس لمحے میرے ہاتھ میں مائیکل کی ڈائری آئی اسی لمحے میرے دماغ نے ساری کہانی لکھ لی تھی۔ اب اُس کہانی کو مجسم کرنا میرا کام تھا۔ ہاں! میں تو لکھنا بھول گیا۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ بچپن سے۔۔۔

میں کہانیاں صرف لکھتا نہیں تھا، بلکہ اُن میں جیتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں مختلف منظر نامے تخلیق کرتا، پھر اُن میں اتنا گم ہو جاتا کہ خود کو اُسکا حصّہ سمجھنے لگتا۔ وہ میری من پسند جگہ ہوتی تھی، وہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میری زندگی میں نہیں ہو سکا۔ میری تمام محرومی میرے اُن منظر ناموں میں مکمل ہو جایا کرتی

تھیں۔ میرے گھر والے میرا مذاق اڑاتے، مجھے ڈانٹتے اور ایک دن انہوں نے میری کہانی لکھنے پر پابندی عائد کر دی۔ پر میرے دل سے یہ شوق ختم نہ ہوا۔ تھراپسٹ نے مجھے کہا تھا کہ میری کچھ نفسیاتی الجھنیں ہیں، جنکا سلجھانا بہت ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مجھے منظر نامے تخلیق کرنے کا شوق ہے، تو میں اُسے لکھنا شروع کر دوں۔ تاکہ اِس بوجھ سے آزاد ہو جاؤں۔

اور میں نے لکھ لیا۔

میں نے اپنی محرومی پر پہلی کہانی لکھ لی۔

میری محرومی۔۔۔ میرے دوست۔۔۔

میری کہانی کے پانچ کردار۔۔۔۔

اور چھٹا میں۔۔۔"

وہ تھوڑا آگے کو ہوا تو پیلی روشنی نے اُسکا چہرہ مکمل روشن کر دیا۔ اُسکا نیم واضح چہرہ اب مکمل واضح تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لکھ رہا تھا۔

"یہ کہانی میری تھی۔۔۔

میں یعنی ایس ایس پی نوید عالم!"

--------+---------+----------

آدمی کی زندگی کا سب سے خطرناک مسئلہ ایک ہی ہے۔

گلٹ۔۔۔۔

ایس ایس پی نوید عالم پچھلے کئی سالوں سے اپنے دوستوں کی تصویریں اپنے سامان میں رکھ کر گھومتا تھا۔ اُسکے لیے وہ اُسکی فیملی تھے، اُسکے پہلے اور آخری دوست۔۔۔

وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا، اُسے کہنا نہیں آتا تھا۔ وہ کبھی کہہ نہیں پایا کہ اُسکا دل کا قدر پچھتاؤں میں جلتا ہے۔ اس لگتا تھا کہ صنوبر کے بعد ہونے والے جھگڑے میں تمام کردار صرف اور صرف اُسکا تھا۔ عمر کا چلے جانا، یا مقدّم فرار ہو جانا، اصل مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اصل مسئلہ نوید کا پیچھے ہٹنا تھا۔ اُسکا پیچھے ہٹنا ہی تھا، جس نے علی کو ٹریگر کیا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی بزدلی نے انکی دوستی کو تباہ کیا تھا۔ اور اِس بات کا پچھتاوا اُسے ہمیشہ سے تھا۔ لیکن وہی بات۔۔۔ وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا۔

وہ کئی سالوں سے اِس منظر نامے میں جی رہا تھا کہ ایک روز اُسکے تمام دوست اکھٹے ہو گئے۔۔۔۔

اپنی ناراضگیاں ختم کر لیں۔۔۔

اور اُس سے ملنے آ گئے۔۔۔سب بھلا کر۔۔۔

اور یہ صرف منظر نامہ تھا۔ جسے اُسکا دماغ ہر دوسرے روز تخلیق کر لیتا۔ پر اُسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

جس روز مائیکل کا سامان اُنکے ہاتھ لگا، اُس روز اکیلے کمرے میں اُسکے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے، اُسے احساس ہوا کہ بیگ خالی نہیں ہے۔ اُس نے سکینڈ کے ہزارویں حصے میں وہ جگہ ڈھونڈ لی، جہاں سے اُس خفیہ جگہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وہاں اُسے مائیکل کی ڈائری ملی۔ اُسکے ہر صفحے سے معلوم ہوتا تھا کہ مائیکل ایک سیریل کلر ہے۔ لیکن آخری دو صفحے خالی تھے۔

اُسے نہیں معلوم کہ اُس سے قبل اُسکے ذہن نے کام کیوں نہ کیا؟ پر اس روز اُسکے تخلیق کار ذہن نے ایک اور منظر نامہ ترتیب دیا۔ ایک ایسا منظر نامہ جس میں اُسکے سارے دوست اکھٹے ہو گئے، کسی مشکل وقت میں پھر سے ساتھ ہو گئے۔ پہلے وہ سوچتا تھا کہ وہ مر جائے، یا موت کے منہ میں چلا جائے اور اُسکے دوست اُسکی موت پر اکھٹے ہو جائیں۔ پر ایسا نہ ہوا، موت کے منہ سے کئی بار واپس آنے کے بعد موت اُسکے لیے دلچسپ نہ رہی تھی۔

مائیکل کی ڈائری کا آخری صفحہ دیکھ کر، اُس نے وہ منظر سوچ لیا، جب اُسکے تمام دوست یہاں اکھٹے ہوں گے۔ ہاں پر اُس سے آگے اس اُس کچھ نہ سوچا ۔۔۔کچھ بھی نہ۔۔۔

اُس نے اپنے سامان میں رکھی وہ تصویریں نکالی اور آخری صفحے پر چسپاں کر دیں، وہ تلاشی لیتے ہوئے دستانے پہنے ہوئے تھا، اُسے انگلیوں کے نشانات کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اُن پرانی تصویریں کو وہاں لگانے کے بعد، اُس نے ایک تاریخ سوچی، دو ماہ بعد کی۔ اور نہیں! دل نے تردید کر دی، اُسے لمبا وقت چاہیے تھا۔ اِتنا وقت کہ اسکے دوست پھر سے دوست بن جائیں۔

پھر اُس نے سال کے چھٹے مہینے کو چنا ، مہینہ چھٹا چنا تو تاریخ بھی چھے ہی چنی۔ مائیکل کی لکھائی کی بہترین نقل اُتار کر، اُس نے ڈائری کو واپس اُسکی جگہ پر رکھ دیا۔ اور کچھ دیر بعد شیراز کو بلا کر بیگ اُسکے حوالے کرتے یہ ظاہر کیا کہ بیگ خالی ہے، اور وہ جانتا تھا کہ شیراز فوراً جان لے گا کہ بیگ میں کچھ ہے۔ وہ اور بات ہے کہ وہ اُسکی طرح اصل مقام سے ڈائری باہر نہیں نکالے گا، وہ بیگ کو پھاڑ کر اُس میں سے مطلوبہ سامان نکالے گا۔ اور وہی ہوا۔

جب وہ بیگ لے کر آیا تو نوید نے اُسے اتنا خوش ہو کر شاباشی دی، جیسے وہ واقعی ڈائری نہ ڈھونڈ سکا ہو۔ بیچارہ شیراز!

اور پھر ہر شے اُسکی مرضی کے مطابق ہوئی، ایف آئی اے نے کیس اُسکے حوالے کیا، اور اُسکے دوستوں کو اکھٹا کرنے کا عندیہ دے دیا۔ وہ کام جو وہ خود نہ کر سکا، اب ایف آئی اے کے ذریعے ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھا، پُر جوش بھی، اور انکا منتظر بھی۔ پر اُسے اپنے چہرے سے یہ ظاہر نہیں کرنا تھا، اُسے ایسے ہی رہنا تھا جیسے یہ ملاقات اتفاقیہ ہو۔

ہر شے یہاں تک تو ٹھیک تھی، لیکن وہ جانتا تھا، جس روز مائیکل پکڑا گیا، اُس دن یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔

لیکن اسکا حل بھی اُس نے سوچ لیا تھا۔

مائیکل کے پکڑے جانے کے بعد تفتیش کے لیے اُسے یقیناً نوید کے پاس ہی لایا جاتا، وہ اُس سے اُسکے مالک کا نام اُگلوا کر اُسکا قصّہ تمام کر دیتا۔ وہ مر بھی جاتا تو کسی کو کیا فرق پڑنا تھا؟ وہ تو ویسے بھی ایک مہرہ تھا۔ اور نوید اُسے بظاہر اپنے دفاع میں مارنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ وہ تمام انتظام کر چکا تھا مگر۔۔۔

قسمت اُسکے کھیل میں اُسکا بھرپور ساتھ دینا چاہتی تھی۔

--------+---------+----------

وہ کہتے تھے کہ وہ نوید عالم کو کبھی نہ جان سکے۔ پر وہ یہ نہیں جان سکے کہ نوید عالم اپنے دوستوں کو اُنکے سایوں سے بھی زیادہ گہرائی سے جانتا تھا۔

اُسے بہت اچھے سے معلوم تھا کہ پہلی ملاقات کیسی ہو گی؟ اُنکے یہاں آنے سے قبل اُسے ہر ایک کی گزشتہ زندگی کی تمام معلومات مل چکی تھیں۔ اُس نے اُنکے یہاں آنے سے قبل اُنکا دکھ منا لیا تھا۔ عمر کی بیماری سے لے کر علی کی طلاق تک، اور لیلیٰ کی موت سے لے کر رضا کے نشہ کرنے تک، اُسے سارے غم ایک ساتھ جاننے کو ملے تھے، اور اُس نے برداشت بھی کر لیے تھے کہ وہ اُس سے بڑا غم سہہ کر آیا تھا۔ ایک بات تو وہ جان گیا تھا کہ پہلی ملاقات میں سوائے اجنبیت کے اور کچھ نہ ہو گا۔ اور وہی ہوا، لہٰذا اُس نے بھی اجنبیت کا خول خود پر چڑھائے رکھا۔ البتہ یہ ایک دفاع بھی تھا۔ جو وہ اُنکے بارے میں جان چکا تھا، فوری طور پر اُن سے سامنا کرنا آسان نہ تھا۔ فرخ صاحب کے اُنہیں بریف کرنے کے بعد اُنکے چہروں پر جو پریشانی آئی تھی، وہ دیکھ کر اُسے کچھ دیر کے لیے شرمندگی ضروری ہوئی تھی۔ پر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کچھ برا حقیقت میں تو ہونے نہیں والا ہے۔

اگلے ملاقات سے قبل اُنکے پیچھے ایف آئی اے نے اپنے بندے لگا دیے تھے۔ حالانکہ اِسکی ضرورت نہیں تھی، پر نوید اِس کام سے اُنہیں روک بھی نہ سکتا تھا۔ البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا، وہ یہ کہ اُسے اُنکی پل پل کی معلومات ملنے لگی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سب سے پہلے جو دو لوگ دیوار گرنے کی کوشش کریں گے وہ عمر اور مقدّم ہوں گے، کیونکہ اُن دونوں کا جھگڑے سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اُسکا اندازہ صحیح نکلا۔

دوسرا انتظار اُسے حسین کا تھا، وہ جانتا تھا کہ حسین سب سے پہلے جس شخص سے ملنا چاہے گا، وہ رضا ہو گا۔ باوجود اِسکے کہ پہلے بھی دونوں اسی شہر میں تھے، لیکن ملنے پر آمادہ کرنے کہ لیے ایک ضرب کی ضرورت تھی اور وہ نوید نے لگائی تھی۔ اور اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اب وہی ہو گا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔

آخر میں جو شخص اکیلا رہ جاتا وہ علی تھا، اور علی کے لیے وہ کافی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ علی جتنا سب سے ناراض ہے، اور جتنا سب اُس سے بدگمان ہیں، اُس کے لیے کوئی پہل نہیں کرے گا۔ لیکن اِس سے قبل کچھ ایسا ہوا، جس نے نوید کو وقت سے قبل ہی علی سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔

اُس روز وہ واپس جا رہا تھا، جب اُسے راستے میں علی ملا تھا۔ یہ ملاقات بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اُسکے پاس رکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ علی پریشان نظر آ رہا تھا، اتنا کہ اُس نے نوید کے آنے کا نوٹس بھی نہ لیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو اتنی رات کو؟'' وہ بیساختہ ہی اُس سے پوچھ بیٹھا۔ پر علی کے، اجنبی نظروں سے دیکھنے پر، اُسے احساس ہوا کہ اُسے اتنی جلدی اپنے خول سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔

''میرا مطلب تمہیں احتیاط کرنی چاہیے، تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' اُسے فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا وضاحت دے۔ یہ پہلی غلطی تھی جو اُس سے ہوئی تھی۔

پر جب علی نے جواب نہ دیا تو وہ جانے کے لیے پلٹ گیا کہ شاید وہ ابھی بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ پر علی نے اُسے آواز دی، وہ پلٹا اور اُسے دیکھا۔ پھر جو باتیں اُس نے کہیں۔ نوید کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی اُسے آگے سے دو چار طنزیہ باتیں سنا کر جانے لگا، پر قدم جانے سے انکاری ہو گئے۔ علی شکل سے پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُسکی ذاتی زندگی کی اطلاع نوید کو مل چکی تھی۔ اُس رات وہ اُسے وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ اُسے واپس آنا پڑا، صرف اُسکی خاطر۔

لیکن۔۔۔۔

اُسکے بعد جو علی نے کہا، وہ اُسکے لیے مزید شرمندگی کا باعث تھا۔ علی کے الفاظ سے لگتا تھا جیسے وہ خود کو قصوروار سمجھتا ہے۔ اور نوید نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو مزید قصوروار ٹھہرائے، مزید براں نوید عالم تو غلطی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا۔ لہٰذا اُس نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ گھر آیا تو اطلاع ملی کہ بشریٰ نے پھر سے قبرستان جانا شروع کر دیا ہے۔ وہ یا تو اپنے دوستوں کو ملاتا اور اپنی غلطی سدھارتا یا بشریٰ کو توجہ دیتا۔ اور بشریٰ اُسکے لیے زندگی کے ہر معاملے میں سب سے اوپر تھی۔ لہٰذا اُس نے پہلے پہل بشریٰ کو متنبہ کیا۔ فرح ویسے بھی آزاد گھوم رہی تھی۔ وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

اُسی صبح اُسے اطلاع ملی کہ حسین پاکستان آ گیا ہے اور اِس وقت اپنی بیوی کے ساتھ مارٹ میں موجود ہے۔ وہ جان کر اُسی مارٹ پہنچا تاکہ حسین کو ایک نظر دیکھ سکے۔ اُسکی خوش باش زندگی دیکھ کر نوید کے ارادے کچھ دیر کے لیے ڈگمگا گئے۔ جب حسین کو ایف آئی اے کی جانب سے اطلاع ملتی تب وہ کتنا پریشان ہوتا؟ کیا وہ غلط کر رہا تھا؟ کیا وہ اُسکی خوشی چھیننے کا باعث بن رہا تھا؟ اِس سے قبل کہ وہ اپنا ارادہ بدل لیتا، اُس نے وہاں سے نکل جانا ہی ضروری سمجھا۔

دوسری بار اُسے اپنے خول سے تب باہر آنا پڑا، جب علی اور رضا کا معاملہ گڑبڑ ہوا۔ اُن دونوں کے درمیان جو جھگڑا ہوا، اُس پر نوید کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ تو سمجھے بیٹھا تھا کہ ہر شے اُسکے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن یہاں فرّخ صاحب نے اُسکے علم میں لائے بنا ہی رضا کو خلیل سے ملنے بھیج دیا تھا۔ اور اُس پر مزید حیرت اِس بات پر تھی کہ علی تک رضا کی معلومات کیسے پہنچی؟

وہ معاملے کو سلجھانے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھا چکا تھا، لیکن علی نے معاملہ پھر خراب کر دیا تھا۔ دل ہی دل میں اِس صورتحال پر سخت پریشان نوید، علی سے بات کرنا چاہتا تھا، رضا سے معذرت بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن قسمت شاید کسی اور طریقے سے اُنہیں ملوانا چاہتی تھی۔ اُسی روز شر پسند عناصر کے اتفاقیہ ہونے والے حملے میں وہ معمولی زخمی ہو گیا۔ اور وہ جو چاہتا تھا کہ اُسکے دوست اُسکی موت پر اکھٹے ہوں، اُسکا یہ شوق اُس روز پورا ہو گیا۔ سوائے علی کے وہ چاروں آئے تھے۔ صرف اُسکے لیے، وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ البتہ حسین کا اُسکے ساتھ کھینچا کھینچا رویہ اُسکی نظروں سے اوجھل بھی نہ تھا۔ پر وہی بات۔۔۔ اظہار ضروری نہ سمجھا۔

وہ اظہار سے ڈرتا تھا۔۔۔

اُسکے دل کا یہ خوف کہ اظہار کرنے پر اُسے ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنایا جائے گا، یہ آج بھی پہلے دن کی طرح دل میں موجود تھا۔

پھر چیزیں اپنے آپ جگہ پر آنے لگیں۔ اگلی ملاقات سے پہلے اُسے اطلاع ملی کہ رضا اور علی کا اپنے محلّے میں بھی کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے، غالباً رضا اپنے ماموں کو گھر سے نکال رہا تھا۔ وہ اُسی روز جان گیا کہ علی اب تک رضا کے لگائے الزامات کو بھول نہیں پایا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا ایک دوسرے سے لڑنا ضروری ہے، شاید لڑ لڑ کر ہی دونوں تھک جائیں، اور ٹھیک ہو جائیں۔ لیکن ایک بار پھر اُسکی توقع کے برخلاف علی نے رضا سے معافی مانگ لی، وہ بھی سب کے سامنے، اور رضا نے جواباً اُسے کھری کھری سنا دی۔ نوید اُس روز خاموش رہا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اِسکے بعد دونوں کے دلوں سے کدورت کچھ حد تک ختم ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ اِسکے بعد رضا کو بھی احساس ہو گا کہ اُس نے غلط کیا۔ لیکن کوئی بات نہیں! جن کے تعلقات زیادہ خراب ہوں، وہ ٹھیک ہونے میں اتنا ہی وقت لیتے ہیں۔

اُس روز مقدّم نے پہلی بار لیلیٰ کی موت کا ذکر کر دیا، درحقیقت، اُسکا مقصد صرف اور صرف علی کے دل سے یہ خیال نکالنا تھا کہ وہ سب اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ مقدّم کی کوشش اور کوئی سمجھانہ سمجھا پر نوید سمجھ گیا تھا۔ اُسکے بعد علی وہاں اکیلا رہ گیا، وہ جانتا تھا کہ حسین رضا کے پیچھے جائیگا اور عمر مقدم کے۔ تو جس شخص کو اُس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، وہ علی تھا۔ لہٰذا اُس روز نوید کو ایک مرتبہ پھر اپنے خول سے باہر آنا پڑا۔ اُس روز، اُس نے علی کو بات کرنے کا موقع دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو علی اُس وقت جس قسم کے حالات کا سامنا کر رہا تھا، وہ یقیناً اپنے ساتھ کچھ غلط کر لیتا۔ پہلی بار نوید کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اُن میں سے کسی کو بھی علی کا احساس نہیں ہے۔ وہ دوست ہوتے ہوئے بھی اکیلا تھا۔

اِس واقعہ کے اگلے روز بھی اُسے علی کی ہی فکر تھی، وہ اُسکے گھر پہنچا تو اطلاع ملی کہ علی کی بیٹی کو اُسکی سابقہ بیوی نے واپس کر دیا ہے۔ وہ تو جذباتیت میں اُسے یتیم خانے چھوڑنے کی بات کر رہا تھا لیکن نوید کو یہ شک تھا کہ وہ علی کی ہی بیٹی ہے۔ وہ اُسے اپنے طریقے سے سمجھا کر واپس تو آ گیا، مگر قسمت کے اِس طرح ساتھ دینے پر مسکرایا ضرور تھا۔

اُسی رات اُسے معلوم ہوا کہ پولیس جزا کو گرفتار کرنے آئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ہونے والا ہے، چاہتا تو پہلے پولیس کو متنبہ کر دیتا، پر یہاں اُس نے جان کر دیر کی۔ اُسے بہت پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جزا، پناہ گاہ اور رضا کے ہی اسکول میں نوکری کر رہی ہے، گو کہ اُسے اِس بات پر اعتراض نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ رضا کو یہ بات معلوم رہے کہ جزا اُسکی بہن ہے۔ لہٰذا جب پولیس اُسکو گرفتار کرنے پہنچی تو وہ پناہ گاہ میں ہی تھی، یہ دیکھ کر البتہ اُسے جھٹکا ضرور لگا تھا کہ حسین، عمر اور مقدم وہاں پہلے سے موجود تھے۔

اگر چیزیں بہتر ہونے لگی تھیں، تو پھر اُسے پلین بی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مائیکل کو گرفتار کرتا، اور وہی کرتا جو اُس نے سوچا تھا۔ لیکن۔۔۔

قسمت کچھ اور چاہتی تھی۔۔۔

اس نے کہانی بنی، اور قسمت نے اُس کی پروف ریڈنگ شروع کر دی۔

مائیکل اُسکی آمد سے پہلے مارا گیا تھا۔ یقیناً اُسکے گروہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مائیکل بے نقاب ہو چکا ہے۔ اب ہر صورت ایف آئی اے پلین بی پر عمل کرنے والی تھی۔

پلین بی۔۔۔

جو اُسی نے بنایا تھا۔۔۔

وہ جانتا تھا کہ اُسکے دوست ایک ساتھ کچھ وقت ہی گزار لیں گے، تو آپس کے مسائل خود ہی حل کر لیں گے۔ اِس لیے اُس نے یہ منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ لیکن درمیان میں بشریٰ کو سب یاد آ گیا، اور نہ صرف یہ بلکہ اُسکے دوستوں کے معاملات بھی بہتر ہونے لگے تھے۔ اُس پر سے فرح نے بیچ میں اُس پر حملہ کروا دیا تھا، فقط دھمکانے کے لیے۔ وہ بشریٰ کی طرف سے اور زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔ ایسے میں اپنا بنایا پلین بی اُسے غیر ضروری لگنے لگا تھا۔ اسی دوران علی نے اُسے عدالت میں دیکھ لیا، وہ جانتا تھا کہ علی اب اُسے کریدنے کی کوشش کرے گا۔

اور وہی ہوا۔۔۔

نوید کو اُس روز بہت غصّہ تھا۔اِس بات پر نہیں کہ علی نے اُسکی جاسوسی کیوں کی؟ بلکہ اِس بات پر کہ اُسکے دوست آج تک اُسے سمجھے کیوں نہیں؟ وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ نوید اظہار نہیں کر سکتا، وہ توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں کرتا، وہ ڈرتا ہے۔ وہ آج بھی ڈرتا ہے۔ عزت نفس مجروح ہونے سے، مذاق کا نشانہ بننے سے۔ اُسکے دوست اُسے خود سے کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ خود کیوں نہیں سمجھ لیتے؟ حسین سب کا سوچتا ہے پر نوید کا کیوں نہیں؟ اُس روز وہ یقیناً علی کے آگے پھٹ پڑتا لیکن، جب علی نے اُس سے کہا کہ میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں تو لمحوں کے لیے وہ ساکت رہ گیا۔ وہ بیساختہ پوچھ بیٹھا کہ علی اُسکے اور صنوبر کے بارے میں کیسے جانتا تھا؟ بلکہ وہ سب ہی کیسے جانتے تھے؟ تب علی کے انکشافات نے اُسے اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اُسکے دوست اُسے جانتے تھے، بلکہ اندر تک پڑھ لیتے تھے۔ بس خاموش رہتے تھے کہ نوید کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اُس روز۔۔۔ پہلی بار اُسے اپنے دوستوں کی قدر ہوئی۔

پھر رضا کا خودکشی کے لیے نکل جانا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ اُس روز بھی اُس نے ایک غلطی کر دی تھی، جب ریسکیو ور کرنے رضا کی تصویر مانگی تو اِس نے اپنی جیب میں رکھی تصویر ہی اُسکے حوالے کر دی۔ اور یہی اُسکی غلطی تھی، اگر اِس وقت کسی کا بھی دماغ کام کر رہا ہوتا تو وہ مشکوک ضرور ہوتا کہ نوید اُنکی تصویریں ساتھ کیوں رکھ کر گھومتا ہے؟

رضا واپس آ گیا اور چیزیں اپنی جگہ پر آنے لگ گئی اور جب بشریٰ نے بھی اُسے معاف کر دیا تو یکدم ہی ایف آئی اے نے پلین بی پر عمل کرنے کو کہہ دیا۔ پہلی بار اُسے اپنے کسی فیصلے پر پچھتاوا ہوا۔ وہ اِس طرح بشریٰ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب قسمت ایسا چاہتی تھی۔ جانے سے قبل اُس پر انکشاف ہوا کہ جزا اور رضا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ گو کہ یہ قبل از وقت تھا اور اُسکی تصدیق بھی نہ ہوئی تھی، لیکن اُسکی زیرک آنکھوں نے یہ جان لیا تھا۔ اُسے اعتراض کوئی نہ تھا، لیکن ایک بھائی ہونے کے ناطے، اُسے اِس طرح جزا کا رضا کے ساتھ ملنا جلنا پسند نہ آیا۔ لہٰذا اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں دونوں پر واضح ضرور کر دیا کہ وہ یہ جانتا ہے۔ اُسکے بعد اگر رضا چاہتا تو اصولی طریقے سے اُسکا ہاتھ مانگنے آ سکتا تھا۔

پھر جو کچھ ہوا وہ اُسکے ہاتھوں سے باہر نکل چکا تھا۔ اب جو ہو رہا تھا وہ قسمت کی مرضی تھی۔ پر ہاں! اچانک ہی اُسے ان سب میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ اُنکے سامنے تھا اور کوئی اُس تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ یہ کھیل اُسے مزا دینے لگا، اپنی عقل کا وہ خود پرستار ہونے لگا۔

جب چلم کے لیے جیپ بک کرواتے ہوئے، مقدّم نے اُس سے کہا کہ وہ اُنہیں مارنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ہنسا تھا۔ اگر جو مقدم کو معلوم ہو جاتا کہ وہی ہے جو اُنکی تصویروں کو جمع کر رہا تھا تو اسکا ردعمل کیا ہو گا؟

حویلی آنے کے بعد اُس نے حسین کو اپنے ساتھ رکھنا بہتر سمجھا، ویسے بھی حسین اُس سے کچھ زیادہ ہی متنفر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ حسین سے معذرت کرے، لیکن سب کے سامنے نہیں۔ اِس لیے اُس کو اپنے ساتھ رکھا۔ لیکن جب حسین نے بار بار اگاتھا کرسٹی کے ناول کو استعارا استعمال کرنا شروع کیا، تو اُسکے دل کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا، کہ کہیں اُسے نوید پر شک نہ ہو گیا ہو۔ حالانکہ جب ایف آئی اے کو اس اُس شک نہ ہوا تو حسین کیا شے تھا؟ لیکن اُس نے محتاط ہو جانا ضروری سمجھا۔ حسین کو منانے کی بجائے، اُس نے اُسے مزید اپنے آپ سے متنفر کر دیا، جب وہ بنا بتائے مقدم کے ساتھ باہر گیا تھا۔ اِس طرح حسین نے

اُسکے معمولات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ بعد میں اُس نے اُس سے معذرت کرلی۔ حویلی آکر جو بات اُسے بہت پسند آئی، وہ یہی تھی کہ اُسکے دوست اب اُسکے بارے میں سوچ رہے تھے، البتہ وہ اُس سے بات کرنے سے ڈرتے تھے۔ نجانے کیوں؟

نوید کو کہانیاں لکھنے کے بعد جو دوسرا شوق تھا، وہ تھا توجہ کا۔ ہاں! وہی توجہ جو اُسکا دم گھٹاتی تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اُسے دیکھیں، لیکن وہ چاہتا تھا کہ اسکے آس پاس والے، بس اُسی کے بارے میں سوچیں اور وہ اِس میں کامیاب ہو رہا تھا۔ حویلی کے آخری دنوں میں اُسے احساس ہوا کہ اُسے اب اپنے خول کو توڑ دینا چاہیے، اپنے دوستوں کے ساتھ گھل مل جانا چاہیے لیکن۔۔۔

قسمت کچھ اور بھی جانتی تھی۔ قسمت نے اُسے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ میں سمٹنے اور مجبور کر دیا۔ اور اِس مرتبہ اُس نے ایسا جان کر نہیں کیا۔ اُسے اطلاع ملی کہ اُسکے گھر کے ارد گرد مشکوک سرگرمیاں ہو رہی ہیں، تو وہ سمجھ گیا کہ سوائے فرح کے اور کوئی نہ ہوگا۔ اُس کے دل میں جزا، امی اور خصوصاً بشریٰ کی فکر لاحق ہو گئی۔ پھر فرح کے پکڑے جانے کے بعد جو کچھ ہو، وہ نہ اُسکے دماغ نے سوچا تھا نہ تصور نے۔

البتہ۔۔۔۔

اسکا دوستوں کو ملانے کا۔۔۔

اپنی غلطی کو سدھارنے کا منصوبہ کامیاب ہوا تھا۔۔۔

وہ ایک دوسرے کو الزام دیتے رہے اور نوید خود کو۔۔۔۔

وہ معافیاں مانگتے رہے اور نوید اُنکو ملاتا رہا۔۔۔

وہ چھپ کر کام کرتا تھا۔۔۔

اور اُس نے وہی کیا تھا۔۔۔۔

اُس نے خود کو پچھتاؤں سے نکال لیا تھا۔۔۔

مورخہ سات اگست:

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ، اِس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ کمرے کی ایک کونے کی دیوار پر سجے اسلحوں، کے نیچے رکھی میز پر ایک ڈائری پر کچھ صفحات بکھرے پڑے تھے، جو میز پر رکھے پیلے اسٹڈی بلب کی روشنی میں واضح تھے۔ ڈائری مکمل ہو چکی تھی، لیکن اُسکی کہانی نہیں! لہٰذا وہ اب کورے

صفحوں کا استعمال کر رہا تھا۔ آدھوں پر کام ہو چکا تھا اور آدھوں پر، سیاہ لباس میں، نیم اندھیرے کمرے میں گم ہوتا نوید عالم، جھکا ہوا بقایا کام مکمل کر رہا تھا۔ اُس نے صفحہ مکمل کر کے ایک مرتبہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔

وہی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔۔

مقابل کو مبہوت کر دینے والی۔۔۔

پھر اُس نے وہ صفحہ بقیہ صفحات کے اوپر رکھ دیا۔ اب وہ نیا صفحہ کھولے بقیہ کام مکمل کرنے لگا۔ میز کے پیلے بلب کی روشنی میں، اُسکا تھوڑی دیر قبل مکمل کیا گیا صفحہ واضح ہو رہا تھا۔ اُسکی خوبصورت لکھائی میں لکھے الفاظ اب نظر آنے لگے تھے۔

"اور پھر مئی کی تین تاریخ کو ایف آئی اے اُنہیں چھپتے چھپاتے شہر سے دور لے گئی۔ ایف آئی اے کہتی ہے کہ انہیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے اُن چھے لوگوں پر نظر رکھی ہو، وہ ٹھیک کہتی ہے۔ بھلا! میں کسی پر نظریں کیوں رکھواتا؟ جبکہ میں اُنکے سایوں سے بھی زیادہ اُنکے قریب تھا۔ میں ہر ہر لمحہ باخبر تھا۔ چاہتا تو کہہ دیتا، پر نہیں! ایسے تو کھیل میں مزا نہ آتا۔ بچپن سے سب کہتے تھے کہ تمہیں کیا پتہ؟ تم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تم زیادہ جانتے ہو کیا؟ تم بیچ میں نہ بولو، تمہیں کیا معلوم؟ **اٹینشن سیکر۔**

اٹینشن سیکر۔۔۔۔ یہ لفظ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے۔ میں ہوں اٹینشن سیکر! مجھے شوق ہے کہ لوگ میری عقل کے آگے حیران رہ جائیں۔ حیران بھی ایسے کہ وہ کسی بھی طرح میرے منصوبے کو بے نقاب نہ کر سکیں اور کر بھی لیں تو وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ میرا دل کرتا تھا کہ کہہ دوں فرّخ صاحب سے کہ یہ میں ہی ہوں۔ لیکن نہیں! تھوڑا اُن لوگوں کو مجھ سے چھپنے دو۔ تھوڑا اپنا دماغ چلانے دو، لیکن جتنا دماغ چلا لیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں جان سکتا کہ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور کہاں سے اُنہیں دیکھ رہا ہوں؟ اِس کھیل میں مزا بہت آیا تھا۔

پھر وہ لوگ پہنچ گئے۔ اپنی جان بچاتے، مجھ سے چھپتے چھپاتے، وہ لوگ اُس پرانی حویلی پہنچ گئے۔

مجھ سے چھپتے۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔ میں ہنسنا چاہتا ہوں۔

وہ مجھ سے چھپ رہے تھے۔ جبکہ میں تو سب جانتا تھا۔ پر کھیل جاری رہنے دیا کہ اصل مزا تو کھیلنے میں آ رہا تھا۔

اور بالآخر جب وہ دماغ کے گھوڑے دوڑا کر ختم ہو گئے تو اتفاقاً گرفتار ہونے والے اظہر نے اُنکے سامنے میرا جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک انہیں پتہ چلا کہ یہ میں ہوں، تب تک وہ ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اور نئے آنے والے ڈی آئی جی نے بھی اِس مقدمے کو مائیکل کے سر ڈال کر بند کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ساگر، فیصل اور شیراز کو شک ہے کہ یہ میں ہوں۔ پر وہ کچھ نہیں کر سکتے، وہ کیا، کوئی بھی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔" اُس نے صفحے کے آخر میں دستخط کیے۔

شوقیہ دستخط۔۔۔

جواُس نے اپنے عزیز دوست عمر سے سیکھا تھا۔۔۔

وہ جب کوئی نیا قلم چیک کرتا، تو پہلے دستخط کرتا تھا۔۔۔

ایک شوقیہ دستخط۔۔۔

اپنی کہانی مکمل کر کے کہانی نویس کھڑا ہوا۔ اُسکا لمبا قد نیم اندھیرے میں واضح تھا۔اُس نے ڈائری اور کاغذات کا پلندہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ باہر آیا تو آسمان پر صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے پر روشنی نہیں ہوئی تھی۔اب اُسکا رخ سمندر کی جانب تھا۔

سمندر کی لہریں بلند تھیں۔ مہینہ اگست کا تھا۔اِن چند مہینوں میں گہرے سمندر میں جانے پر پابندی عائد رہتی ہے۔ صبح سات بجے کا وقت تھا اور ساحل پر عوام نہ ہونے کے برابر تھی۔

ایسے میں سیاہ سوٹ میں ملبوس ایس ایس پی نوید عالم، ہاتھوں میں کاغذ کے کچھ پلندے لیے سمندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے سورج کی روشنی کو زمین پر آنے سے روکا ہوا تھا، مونسون کا موسم تھا، بارش کسی بھی لمحے ہو سکتی تھی۔

صبح کی ہلکی نیلی، مگر سیاہی مائل روشنی میں، دلفریب مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ ساحل پر آ کھڑا ہوا۔اُسکے ہاتھوں میں موجود صفحوں کی تعداد سو سے بھی زائد لگتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے پنجوں کے بل بیٹھا اور پہلا صفحہ لہروں کی نذر کیا۔بلند ہوتی لہریں صفحے کو لمحوں میں اپنا مسافر بنائے ساتھ لے گئیں۔اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی، سیاہ سوٹ والے، اُس خوبرو مرد نے دوسرا صفحہ بھی پانی کی نذر کیا، پھر تیسرا اور اِسی طرح وہ تمام صفحے لہروں کے حوالے کرتا چلا گیا۔اُسکے آس پاس کی لہروں میں کاغذوں کا ایک سمندر سا بن گیا۔اُس نے آخری صفحہ ہوا میں بلند کر کے دیکھا، اور ہنستے ہوئے اُسے بھی سمندر کے حوالے کر دیا۔آخری صفحے پر موجود اُسکے شوقیہ دستخط آن کی آن میں غائب ہونے لگ گئے۔جب تمام کے تمام صفحات لہروں کے ہم نوا بن گئے تو وہ کھڑا ہوا اور دور ہوتے صفحات کو دیکھا۔

''میں چاہتا تھا کہ ایف آئی اے مجھ تک پہنچے۔پر وہ نہیں پہنچ سکی۔اور یوں۔۔۔ کہانی ختم ہوئی۔''اُس نے ہنستے ہوئے لہروں کو دیکھا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔جہاں آزاد زندگی اُسکا انتظار کر رہی تھی۔ہاں! پچھتاؤں سے آزاد زندگی۔۔۔

سمندر کی بلند ہوتی لہریں، سیاہی مائل نیلی روشنی میں منظر کا حصّہ بنتے، اُس سیاہ سوٹ والے کو جیبوں میں ہاتھ ڈالے جاتا دیکھ رہی تھیں۔جسے اب کبھی واپس نہیں آنا تھا۔

--------+---------+----------

نوید عالم آج بھی اپنے ذاتی کمرے میں نیم اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ سیاہ لباس اُسکی شخصیت کا حصّہ تھا۔ کرسی پر پیچھے کی جانب چہرہ گرائے وہ کمرے میں سگریٹ کا دھواں چھوڑتا جا رہا تھا۔

کورے کاغذات کا پلندہ سامنے تھا۔۔۔

سامنے سیاہ بورڈ اور دو تصاویر لگی تھیں۔ دونوں ایک ہی شخص کی تھیں۔

اے ایس پی شیراز۔۔۔

ایک میں اُسکا چہرہ ہنستا مسکراتا روشن تھا۔۔۔

دوسرے میں خاموش، ویران اور سخت۔۔۔۔

سیگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے وہ سیدھا ہوا۔۔۔

کہانی نویس کے دماغ نے نئی کہانی تیار کر لی تھی۔۔۔

ایک نیا کردار سامنے تھا۔۔۔

ایک نئی کہانی منتظر تھی۔۔۔

---------+---------+--------

(ختم شد)

حرف آخر

نحل ختم ہوا۔ میرا پہلا سلسلہ وار ناول، پہلا طویل ناول جو ایک سال اور تین ماہ جاری رہا۔ آپکے لئے یہ ایک ماہ اور تین سال تھا۔ پر میرے لیے یہ 2020 میں شروع کیا گیا ناول تھا۔ جس کے بارے میں، میں آپکو پیش لفظ میں بتا چکی ہوں۔ سب سے پہلے تو نحل کے کرداروں کے متعلق بات ہو گی۔ تو میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ کرداروں کو حقیقت سے قریب تر رکھوں۔ کسی بھی صورتحال میں انکا ردعمل، اُنکے جذبات واحساسات سے لوگ خود کو جوڑ سکیں نہ کہ یہ کہیں کہ ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اب میں اِس میں کتنا کامیاب ہوئی؟ یہ قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔ ہاں! کچھ چیزیں اِس میں بھی غیر حقیقی ہیں اور وہ ظاہر ہے فکشن کا حصّہ ہوتی ہیں۔

کرداروں کی فرداً فرداً وضاحت دینے سے قبل اِس ناول کے نام کی وضاحت دینا چاہوں گی ایک مرتبہ پھر سے۔ یہ کسی بھی سورۃ کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے۔ نہ اسکا قرآنِ پاک جیسی عظیم شے سے کوئی ذرّہ برابر بھی تعلق ہے اور نہ میں اِس قابل ہوں۔ اردو ادب کا خاصا رہا ہے کہ ہم بات کو خوبصورت بنانے کے لیے عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر چاہے شاعری ہو یا نثر۔ مجھے بھی نام شہد کی مکھی رکھنا تھا۔ لیکن وہ نام پُرکشش نہ لگا۔ فارسی نام مشکل تھا البتہ عربی نام کافی پُرکشش لگا، تو اُسے ہی حتمی قرار دے کے کہانی کا عنوان بنا دیا۔ اسکا نام نحل صرف شہد کی مکھی سے مماثلت کی بنا پر ہے۔ اتنی وضاحت کے باوجود بھی کوئی اسے زبردستی کسی سورۃ سے جوڑنے یا ملانے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ اُسکا اپنا قصور ہے، میرا نہیں!

میں نے نحل کے کرداروں میں مختلف کہانیاں سموئی تھیں، مختلف حالات وواقعات اور انسانی زندگی پر اُسکے اثرات۔ بہت چھوٹے چھوٹے مسائل تھے، جنہیں ہم توجہ دیں تو زندگیاں بہتر ہو سکتی ہیں۔

اور آج میں آپکو ایک مزے کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ مقدّم، حسین، علی، نوید، رضا اور عمر۔ یہ چھے الگ کہانیاں تھیں۔ اِن پر مجھے چھے الگ ناولٹ لکھنے تھے۔ لیکن، قسمت چاہتی تھی کہ میں انہیں جوڑ کر ایک ہی کہانی کے کردار بنا دوں۔ تو قسمت کی مرضی! اور قسمت نے بہتر چاہا۔

میں کامل کردار لکھنا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ کامل کوئی نہیں ہے۔ ہر انسان خود غرض ہے، ہر انسان کہیں برا ہے، اور ہر انسان کے اندر شر چھپا ہے۔ اور میرے کرداروں میں آپ نے یہ بات دیکھ لی ہے۔ ان کے اندر برائی بھی تھی، بعض جگہ ان کے فیصلے اور اقدام آپکو برے بھی لگے اور بعض جگہ آپ نے محسوس کیا کہ ہاں! ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ یہی چیز نحل کے کرداروں کو حقیقت سے قریب تر بناتی ہے۔ میرے ناول میں کوئی پرفیکٹ نہ تھا۔

فاطمہ، اپنی خواہشات کے لیے اُس نے ناجائز راستہ اختیار کیا۔ بیشک علی غلط تھا، لیکن جتنی وہ فاطمہ سے محبت کرتا تھا، اگر وہ چاہتی تو کچھ عرصے اسے اکیلا چھوڑ دیتی، اُس سے ناراض ہو جاتی تو یقیناً! اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ لیکن اُس نے ایک بالکل ہی غلط راستہ چن کر اُس سے دوگنا غلطی کی۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ لوگ برے کو سدھرتا بھی دیکھیں۔ نفرت برائی سے کریں، انسان سے نہیں! کیونکہ اگر ہم انسان سے نفرت کریں گے تو پھر اُنہیں کبھی

معاف نہ کر سکیں گے۔ لوگوں نے کتنے بڑے بڑے ظلم کیے، پر جب اسلام قبول کیا تو اُنہیں کھلے دل سے قبول کیا گیا۔ کیوں؟ کیونکہ نفرت اُن کے گناہ سے کی گئی تھی، اگر اُن سے کی جاتی تو کوئی انہیں دین اسلام میں قبول نہ کرتا۔

جزا کا کردار ہمارے یہاں کی ایک ٹپیکل (عمومی) بہن کا کردار تھا۔ جسے لگتا ہے کہ اسکے بھائی اگر گھر سے الگ ہو گئے تو وہی اُسکے ماں باپ کی موت کے ذمّے دار ہیں۔ جسے لگتا ہے کہ جو بیٹا ماں باپ کے ساتھ نہ رہا، اُسکا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں۔ جو ضد اور انا میں جو منہ میں آئے کہہ دیتی ہے۔ جزا در حقیقت ہمارے یہاں کے عمومی بہن بھائیوں کی عکاسی تھی۔ جو دنیا کے لیے تو اچھے ہوتے ہیں، پر اپنے ہی بہن بھائیوں سے انکی نہیں بنتی۔

بشریٰ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس نے کبھی اپنے لیے آواز نہیں اٹھائی۔ وہ سر جھکائے سب سہتی جاتی تھی، اور جب اُسکی بس ہو جاتی تو وہ یکدم پھٹ پڑتی۔ یکدم پھٹ پڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ انسان وہ سب کہہ دیتا ہے، جو اُسکے لاشعور میں کہیں چھپا ہوتا ہے۔ اُسکا غیر متوازی رویہ ہی اُسکا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اُس نے نہ کبھی ماں باپ کے سامنے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی، نہ سسرال والوں کے اور نہ نوید کے سامنے۔ اور جب پھٹ پڑی، تو ہر شے کا الزام نوید کو دے ڈالا۔

مقدس، عمارہ، لیلیٰ، حور عین یہ سب کہانی کے ثانوی اور سائیڈ کردار تھے۔ جنکا کہانی سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ نہ کوئی سبق دے رہے تھے نہ اُنکی کوئی خاص کہانی تھی، یہ صرف کرداروں کی ضرورت تھے۔ لہٰذا ان پر زیادہ وقت دینا ضروری نہ تھا۔

اب آجائیں مرکزی کرداروں پر تو علی کا کردار میرا سب سے پسندیدہ تھا۔ (نہیں! اسکی حرکتیں نہیں)۔ وہ بطور کردار مجھے اِس لیے پسند ہے کہ اُسے میں نے جیسا سوچا تھا، وہ بالکل ویسا ہی گیا۔ اُس میں شروع سے آخر تک جتنی تبدیلیاں مجھے آہستہ آہستہ لانی تھیں، وہ بالکل ویسے ہی رہیں۔ اُس میں کوئی ردوبدل نہ ہوئی نہ اُس میں میری طرف سے کوئی کمی رہی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک کردار کی ڈیولپمنٹ کے حساب سے علی کا کردار شاندار رہا۔ وہ جذباتی، غلط فیصلے کرنے والا، ہر وقت ہر ایک سے ناراض رہنے والے علی سے، آہستہ آہستہ بات کو سمجھنے والا، بردبار، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والا علی بنا۔ اور یقیناً یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی ہو گی۔ باقی قارئین بہتر بتا سکتے ہیں۔

نشمیہ، میں نہیں جانتی کتنے لوگ اسے مرکزی کردار سمجھتے ہیں یا نہیں؟ مگر میرے لیے نشمیہ علی، ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے لیے اِسکا کردار لکھنا سب سے مشکل تھا۔ اُسکی وجہ یہ تھی کہ کرداروں کو لکھنے کے لیے اُنکی جگہ پر آکر ہر شے سوچنی ہوتی ہے۔ خود کو انکی جگہ پر رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اُس صورتحال میں کیسا ردعمل دیں گے۔ ہر کردار کا ردعمل اُنکے مزاج کے حساب سے لکھنا ہوتا ہے۔ ایک بچہ کیسے بات کرتا ہے؟ کیسے سوچتا ہے؟ یہ لکھنا سب سے مشکل کام تھا۔ بعض جگہ نشمیہ کے مکالمے لکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا، جیسے ایک چار سالہ بچی کے لیے یہ بہت بڑے ہیں، تو میں انہیں تبدیل کر دیتی۔ بعض جگہ ایسا لگتا جیسے بہت بونگے الفاظ لکھ دیے ہیں جو نشمیہ کے مزاج کے خلاف ہیں۔ تو اُنہیں بھی تبدیل کرتی۔ عرض یہ کہ اس کردار میں بہت محنت لگی لیکن اتنا ہی یہ سب کو پسند آیا۔ نویں قسط میں اسکا آنا ہی اس پوری کہانی کو تازگی بخش گیا تھا۔

رضا کا شمار ان لوگوں میں تھا، جو اپنے دشمن آپ ہوتے ہیں، مایوس ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا اُنکے ساتھ کبھی اچھا نہیں کرے گا۔ کبھی خود ترسی سے باہر ہی نہیں آنا چاہتے۔اِس کردار کی میں مزید کیا وضاحت دوں؟ ہر وضاحت کہانی میں ہو چکی ہے۔

مقدّم ایک ہلکا پھلکا سا کردار تھا لیکن اگر غور کریں تو کافی جگہ وہ خود غرض تھا۔اُس نے لیلیٰ کو علی کے اوپر چنا۔اچھا کیا، لیلیٰ بیشک ضروری تھی۔پر اُسے کم از کم کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ اپنے کسی دوست کو رابطہ کر کے بتادے۔وہ چاہتا تو کر سکتا تھا پر اُس نے نہیں کیا۔مقدس کے معاملے میں بھی وہ اکثر خود غرض بن جایا کرتا تھا۔پہلے اپنے فیصلے کو فوقیت دیتا تھا پھر اُسے۔اِس کردار میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لائی گئی کیونکہ مجھے تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

عمر کا کردار اپنے انڈر بہت بڑا سبق لیے ہوئے تھا اور مجھے امید ہے کہ وہ سبق سب تک پہنچ چکا ہو گا۔حد سے زیادہ حساس ہونا، ضرورت سے زیادہ دوسروں کا سوچنا انسان کو اسی دوراہے پر لاتا ہے، جس پر عمر پہنچ گیا تھا۔کل کیا ہو گا؟ کون مرے گا؟ کون جیئے گا؟ یہ سوچنا انسان کا کام نہیں ہے۔رب کا ہے۔عمر نے اپنی زندگی سے سبق حاصل کیا یا نہیں! پر مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں نے ضرور کر لیا ہو گا۔

حسین، میں نہیں جانتی لوگ اس کردار کو کیا سمجھتے ہیں؟ شاید ایک ہنستا مسکراتا کردار؟ پر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ کردار کنویں سے بھی زیادہ گہرا تھا۔یہ واحد شخص تھا جو دل میں بغض، عداوت، کینہ نہیں پالتا تھا۔یہ نہیں سوچتا تھا کہ کس نے اُسکے ساتھ کیا کیا؟ بس اتنا سوچتا تھا کہ زندگی چار دن کی ہے، لڑ کر گزارنے سے بہتر معاف کر دینا ہے۔مجھے حسین پسند تھا۔

نوید۔۔۔آہ! ایس ایس پی نوید عالم۔یقیناً اب تک آپ سوچ رہے ہوں گے کہ نوید کو ہی ان تمام کاموں کے لیے کیوں چنا گیا؟ یہ بات باب تین میں ہی واضح کر دی گئی تھی، پھر باب تیرہ میں بھی۔ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اگر کوئی انسان تھا تو وہ نوید تھا۔اور اُس کے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک، ملنے والی تربیت اور ماحول نے اُسے ایک عام انسان سے ایک نفسیاتی بنا دیا تھا۔نفسیاتی وہ نہیں ہوتا جو پاگل ہو، نفسیاتی وہ بھی ہوتا ہے، جو عام انسانوں سے زیادہ اُلجھا ہوا ہو۔ٹرامٹائز ہو۔نوید نے اپنے اندر تبدیلی پائی یا نہیں؟ یہ آپ بتائیں گے۔نوید ایسا ہی ہے اور شاید ایسا ہی رہے۔اُسکے ذہنی مسائل بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے آس پاس نظر آنے والے، عام زندگی گزارنے والے بہت سے کرداروں کے اندر کوئی نہ کوئی نوید چھپا ہو سکتا ہے، اور ہم انہیں پہچان بھی نہیں سکتے۔اور یہی نوید تھا۔وہ انہی لوگوں کی عکاسی تھا۔نوید میرا پسندیدہ کردار تھا۔ہاں! میں اگر ایک قاری کی حیثیت سے کسی کو پسند کروں تو وہ نوید ہے۔

ناول میں بیشتر جگہ اُسکے متعلق ہنٹ دے دی گئی تھی۔کچھ بھٹکانے کے لیے تھی اور کچھ اُس تک پہنچنے کے لیے۔سب سے بڑی ہنٹ تو اُسکا بچپن تھا۔اُسکا ڈائری نہ لکھنا، اُسکا سیاہ لباس اور اُسکی دلفریب مسکراہٹ۔بہت سے لوگ اُس تک پہنچ گئے، بہت سوں نے یہ بھی بتایا کہ کوئی دوست ہی سب کو ملوانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔لیکن صحیح وجہ کسی نے نہ بتائی کہ نوید ایسا کرے گا تو کیوں؟ وجہ یہی تھی کہ وہ نوید عالم تھا۔۔۔ہاہاہا۔

اور شیراز، بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ شیراز کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ شیراز تو ایک سائیڈ کردار تھا، تو پھر بھی اُس نے آپکے دلوں پر اتنا اثر کیوں ڈالا؟ تو وجہ شیراز کے کردار سے اِس حقیقت کا پردہ چاک کرنا تھا کہ اِس ملک میں انصاف کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ اگر ہماری فورسز ایمانداری سے کام کرتی ہیں، تو انہیں کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے۔ یہ سلوک میں کسی مرکزی کردار کے ساتھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے شیراز کا ذکر کم رکھا کہ دکھ کم ہو۔

کچھ لوگ یہ بھی کہیں گے کہ نوید سیدھا سیدھا کہہ دیتا، بات ختم۔ لیکن نوید کے کردار و مزاج کے خلاف یہ بات ہوتی، اور پھر وہی بات اگر نوید کہہ دیتا تو ناول کیسے بنتا؟ نوید کو اپنے دوستوں کو پھر سے دوست بنانے کے لیے وقت درکار تھا۔ اور وہ اسی صورت اُسے ملا۔

خیر! میں جانتی ہوں کہ بہت سی باتیں رہ گئی ہوں گی۔ لیکن مجھے بس مزید کچھ نہیں کہنا۔ آپ نے اگر ان کرداروں سے سیکھا، اور ان سے خود کو جوڑ سکیں، ان سے عبرت حاصل کی تو میرا مقصد پورا ہوا۔

ثریلہ ظفر

اب نیچے آپکے سوالات کے جوابات ہیں۔ ملاحظہ فرمالیں۔

سوال: آپ نے کرداروں کو مرد ہی کیوں رکھا؟ چھے خواتین دوست کیوں نہیں؟

جواب: کیونکہ خواتین میں مجھے وہ مارجن نہیں مل پاتا، جو مردوں کردار کے ذریعے مجھے ملا۔ خواتین اِس طرح بار بار نہیں مل پاتیں ایک دوسرے سے جیسے مرد، پھر خواتین کا شادی شدہ بال بچوں والی ہوتے ہوئے دوسرے شہر جانا، چھپ کر رہنا بہت مسائل ہوتے، پھر اُن پر الگ سے لکھنا پڑتا۔ مزید یہ کہ خواتین سے پھر کوئی ریلیٹ نہ کرتا، اگر وہ بھی مردوں کی طرح بڑے آرام سے کہیں بھی آجاسکتی۔ لوگ کہہ دیتے کہ حقیقت میں عورت کو اتنی آزادی نہیں ہے۔ تو ان کہانیوں کے لیے مرد کردار بہتر تھے۔ پھر مجھے مردوں کے جذبات بھی دکھانے تھے، جنہیں ہمارے یہاں پتھر سمجھا جاتا ہے۔

سوال: علی نے فاطمہ کو معاف کیوں کیا؟ ایک دھوکے باز کو معافی کیوں؟

جواب: میں نے اوپر ہی بتایا کہ گناہ سے نفرت کریں، گناہ گار سے نہیں۔ یقیناً علی کے فیصلے پر آپکی بھی کوئی رائے ہوگی۔ یقیناً آپ اس پر اختلاف بھی رکھتے ہونگے۔ لیکن! کیا آپ نے اندازہ کیا کہ علی اور فاطمہ کے ٹریک میں درحقیقت یا یوں کہہ لیں کہ پس پردہ کونسا موضوع خاموشی کے ساتھ زیرِ بحث لایا گیا ہے؟

کیا دھوکہ؟ دھوکے کا انجام؟ اپنی ذمّے داریوں سے بھاگنے کا نتیجہ؟ نہیں!

اِسکا اصل موضوع تھا حلالہ۔۔۔۔جی ہاں ! آپ نے صحیح سنا۔ مجھے اس ٹریک کا انجام یہی کرنا تھا۔ پھر چاہے کوئی پسند کرے یا ناپسند۔۔۔

ہمارے معاشرے میں حلالہ کے نام پر جو غلط رواج قائم ہے، اُسے ہی ہم نے عموماً ناولوں میں دکھایا ہے، اور اُسے ہی دکھاتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ہم نے یہی دیکھا ہے۔ اول تو حلالہ نام کا کوئی لفظ اسلام میں موجود نہیں ہے۔ یہ برصغیر کی پیدا کردہ اصطلاح ہے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس موضوع پر لکھا جاتا ہے، اور اُسکی روک تھام پر بات کی جاتی ہے۔ جو کہ بالکل درست ہے۔ لیکن ہم بھول گئے کہ ایک عورت، دوسری شادی میں طلاق یا بیوہ ہونے کی صورت میں دوبارہ اپنے پہلے شوہر سے شادی کر سکتی ہے۔ یہ ایک درست عمل ہے۔ بشرط یہ کہ اس میں نہ کوئی کنٹریکٹ شامل ہو، اور نہ ہی دونوں فریقین نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہو۔ یہ ایک حادثے کی صورت میں دوبارہ ہو جائے تو پھر آپکے پاس پہلے شوہر کا آپشن موجود ہوتا ہے۔ اس پر ہم نے بات نہیں کی۔ معاملہ یہ ہے کہ جب کسی شے کو غلط قرار دیا جائے، یا کسی شے کو ناجائز طریقے سے کیا جائے تو ہماری ذمّے داری ہے کہ اُس شے کا جائز اور صحیح رخ بھی دکھائیں۔

علی اور فاطمہ کے ٹریک میں، میں نے بس ایک وہی سرسری سی کوشش کی ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ کتنے لوگ اس پس پردہ سبق کو کھوج پائے؟ فاطمہ نے علی سے طلاق لی، اور اس میں غلطی تھی تو دونوں کی ہی، پر یقیناً فاطمہ نے زیادہ غلط قدم اٹھایا۔ پر علی بھی بری الزمہ نہیں ہے۔ اب یہ آپ بتائیں گے کہ دونوں میں سے زیادہ غلط کون تھا؟

سوال: کیا نحل میں حقیقی زندگی میں سے کوئی کردار لیا گیا ہے؟

جواب: نحل کے کرداروں کی ذاتی کہانیاں ہمارے معاشرے سے ہی لی گئی ہیں۔ مشاہدے کی بنا پر انھیں لکھا گیا ہے۔ البتہ اگر آپ یہ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ کیا کوئی کردار اصلی ہے تو نہیں، کسی کردار کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب تخلیقی اور فرضی کردار ہیں۔

سوال: نحل لکھنے کا آئیڈیا کہاں سے آیا؟

جواب: اِس سوال کا جواب تو نہ میرے پاس ہے اور نہ مجھے لگتا ہے کہ کوئی اور لکھاری دے سکتا ہے۔ کیونکہ ہمیں خود نہیں معلوم ہوتا کہ خود بخود ایک خالی ذہن میں آئیڈیا کہاں سے آ سماتا ہے؟ یہ تو اللہ کی مرضی ہے یقیناً۔ باقی نحل کے ہر کردار کی کہانی الگ الگ میرے ذہن میں تھی، اُسے جوڑ کر ایک ناول بنایا گیا۔ بعض خیالات ناول کے دوران آئے، بعض چیزیں بعد میں تبدیل کی گئی۔

سوال: علی صنوبر کے کیس کے لیے اتنا پوسیسیو کیوں تھا؟

جواب: غالباً اُسکا جواب آپ لوگ علی کی زبانی پڑھ چکے ہیں۔ لیکن میں دہرا دیتی ہوں، کہ اُسکے باپ نے پہلی بار اُسکا ساتھ دیا تھا۔ اُسے فخر سے دیکھا تھا، اور وہ اپنے باپ سے اِس شاباشی کی خاطر پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ شروعات میں تو وہ فطری غم وغصّے کی وجہ سے اُس کیلئے آواز اٹھا رہا تھا۔ لیکن بعد میں اُسکی غرض شامل ہو گئی تھی۔

سوال: نوید کی بہن جزا کا رویہ اتنا تلخ کیوں تھا بھائیوں کے ساتھ؟ کیا صرف جائیداد مانگنا اتنا بڑا گناہ ہے؟

جواب: یہ سوالات مجھے حیران کر رہے ہیں، اِنکے جواب تو ناول میں ہی مل جانے چاہیے تھے۔ جزا کا خط دوبارہ پڑھیے، آپکے تمام سوالات کے جوابات وہاں ہیں۔ پھر اُن بہن بھائیوں کا رشتہ ہمیشہ سے بہت اچھا نہ تھا ایک دوسرے کے ساتھ، اُنکے درمیان کمیونیکیشن گیپ بہت زیادہ تھا۔

سوال: کیا مزاح حسین کی طرح، اچھی ازدواجی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کی کمی دوسرے جوڑے میں تھی؟

جواب: مزاح خوشگوار زندگی کا جز تو ہو سکتا ہے لیکن خوشی کا ضامن نہیں۔ بہت سے لوگوں کا مزاح صرف دوسرے کا مذاق اڑانا ہوتا ہے۔ اصل شے ایک دوسرے کی حیثیت کو تسلیم کرنا، اور ایک دوسرے کو عزت دینا ہے۔ اچھی زندگی تو نوید اور بشریٰ کی بھی تھی، درمیان میں غلط فہمی ضرور ہوئی لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ باقی ہمیں حسین اور حور عین کو پڑھنے میں اِس لیے خوشگواری کا احساس ہوا کہ مزاح انسان کے مزاج پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔ وہی پڑھنے والوں کے ساتھ ہوا۔

سوال: ہم اپنی غلطیوں کے وکیل اور دوسرے کی غلطیوں کے جج کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: یہی تو انسان کا عمومی رویہ ہے جو معاشرتی برائیوں کا جڑ ہے۔ اسکا حل ہمیں دین اسلام دے کر گیا ہے۔ انسان کے اندر موجود اکڑ اسے ہمیشہ دوسرے سے بالاتر سمجھتی ہے، ہم دوسروں کو ہمیشہ برا اور چھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح اکڑ انسان کو معافی بھی نہیں مانگنے دیتی، وہ خود کو فرشتہ سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دین ہمیں یہ سکھا کر گیا ہے کہ دوسرے کے ساتھ عفو درگزر کیا جائے اور اپنی غلطی کو تسلیم کیا جائے۔ اب ایسا کیوں ہے یہ تو میں نہیں بتا سکتی۔ پر اسکا حل میں نے آپکو دے دیا ہے۔ اپنے اندر سے اکڑ و تکبر ختم کرنا ہی دونوں مسائل کا حل ہے۔

سوال: کسی کو قتل کرنا کتنا خطرناک کام ہے۔ کوئی اتنا ظالم و بے حس کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کی جان لے لے اور پھر اُسکا جواز بھی تلاش کر لے؟

جواب: دیکھیں! شاید انسان پیدائشی طور پر اتنا بے حس نہیں ہوتا کہ کسی کی جان لے اور اُسے کچھ محسوس ہی نہ ہو۔ زیادہ تر انسان، پہلے اپنے اندر موجود اُس آواز کو خاموش کرتا ہے، جو اُسے بتاتی ہے کہ سامنے والا بھی اسی کی طرح جیتا جاگتا انسان ہے۔

پھر آہستہ آہستہ وہ جواز بناتا ہے۔ ''وہ اسی کے قابل تھا، اس نے میرے ساتھ برا کیا تھا، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا، میں نے صرف بدلہ لیا ہے، اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔'' وغیرہ۔

اور شاید یہی سب سے خوفناک چیز ہے۔انسان گناہ کرنے سے پہلے اپنے ضمیر کو قتل کرتا ہے، پھر کسی اور کو۔ یاد رکھیں، قاتل کبھی خود کو قاتل نہیں سمجھتا۔ وہ خود کو مظلوم سمجھ سکتا ہے، بدلہ لینے والا سمجھ سکتا ہے، محافظ سمجھ سکتا ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی حق پر کھڑا ہوا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔

شیطان اُسے یہ نہیں کہتا کہ ''جاؤ! ایک بے گناہ کو قتل کرو۔ وہ پہلے کہتا ہے ''بس ایک بار! تم مجبور ہو، تمہارا حق ہے، وہ اسی کا مستحق ہے۔''

اور جب انسان پہلی بار اپنے ضمیر کے خلاف قدم اٹھالیتا ہے، تو اگلی بار اُسے وہی کام کرنے کے لیے اتنی بڑی جنگ نہیں لڑنی پڑتی۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی انسان قتل کیسے کر سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ انسان اپنے اندر کے اُس شخص کو کہاں کھو آیا تھا، جو کبھی قتل کو قتل سمجھتا تھا؟

شکریہ